مفردات القرآن (اردو)

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری رحمۃ اللہ علیہ

جلد اول

اسلامی اکادمی

۷۔ اردو بازار لاہور۔ فون: ۷۳۵۷۵۸۷-۰۴۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفردات القرآن (اردو)

جلد اول

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہٗ فیروزپوری

شیخ شمس الحق

۲۸-کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

نام کتاب:

مفردات القرآن (اردو)

مصنف:

امام راغب اصفہانی

ترجمہ وحواشی:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروز پوری

نظر ثانی:

مولانا عبدالصمد ریالوی

اہتمام: محمد رمضان محمدی، محمد سلیم جلالی

تعداد: 1000

ناشر: .... شیخ شمس الحق

مطبع: .... عرفان افضل پریس

ملنے کا پتہ:

اسلامی اکیڈیمی، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور

Phone: 042-7357587

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا:

قرآنِ پاک نوع انسانی کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے انسانی عقل وفکر کے لیے ہر دور میں رہنما بن سکتا ہے اس کے مضامین کی وسعت اور ہمہ گیری کا تقاضا یہ تھا کہ اسے اس زبان میں نازل کیا جاتا جو اس وسعت کی متحمل ہوسکے اور اس کے اعجاز بیان کو اپنے اندر سمو سکے۔

یہ ادعا نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ یہ وسعت صرف عربی زبان میں پائی جاتی ہے فصاحت و بلاغت کے جو زاویے اس زبان میں پنہاں ہیں دوسری سامی اور ایریائی زبانوں کا دامن ان سے یکسر تہی ہے اشتقاقات اور مترادفات کی جو فراوانی عربی زبان میں پائی جاتی ہے کسی دوسری زبان کو میسر نہیں۔ محسنات بدیعہ کے خدوخال اور آثار جو اس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔ دوسری زبانیں ان سے عاری نظر آتی ہیں الغرض عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو ہر قسم کی لفظی اور معنوی خوبیوں سے آراستہ پیراستہ ہے اور دوسری زبانوں پر فائق نظر آتی ہے۔

اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ عربی زبان میں جس قدر ضخیم قوامیس و معاجم لکھے گئے ہیں دوسری زبانوں میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا ان معاجم کے ملاحظہ سے عربی زبان کی فراخ دامانی اور جامعیت بخوبی سمجھ آسکتی ہے۔ صحاح جوہری (1) کو لیجیے کہ وہ چالیس ہزار مواد (Roots) پر مشتمل ہے۔ قاموس فیروز آبادی (2) میں ساٹھ ہزار مواد مذکور ہیں، لسان العرب میں ابن منظور افریقی (3) نے اسی ہزار مواد سے بحث کی ہے ان کے بعد تاج العروس شرح قاموس ملاحظہ فرمائیے، جس میں سید مرتضٰی زبیدی نے اپنے تتبع سے ایک لاکھ بیس ہزار مواد جمع کر ڈالے ہیں۔ (4)

ان تصریحات کے پیش نظر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قرآنِ پاک ایسی جامع کتاب کو، جو ابدی حقائق پر مشتمل ہے، عربی زبان میں ہی نازل ہونا چاہیے تھا اور یہی زبان ایسی تھی جو لسانِ وحی کی ترجمان بن سکتی تھی۔ (5)

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عرب محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے اجمال و تفصیل سے کما حقہٗ آگاہ ہو جاتے تھے اور اس کے مفہوم و معنی کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے جیسا کہ ابن خلدون اور ان کے بالتبع بعض دوسرے مؤلفین نے اس قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے۔ کیوں کہ ایسی بات کہنا کسی قوم یا معاشرے کے احوال طبعی سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے موجودہ دور ہی کو لیجئے کہ کسی زبان میں جو علمی کتابیں تالیف کی جارہی ہیں کیا اس زبان کے جاننے اور بولنے والے محض اہل زبان ہونے کی بنا پر ان کتابوں کو سمجھ رہے ہیں جب یہ واقعہ ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے معرفت لسانی کے علاوہ خاص درجہ کی ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ تو ہم یہ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ نزول قرآن کے زمانہ میں جو عام اہل عرب یا صحابہ کرام موجود تھے محض عربی ہونے کی بنا پر خود ہی قرآن سمجھ لیتے تھے اور انھیں کسی معلم یا رہنما کی

---

(1) اسماعیل بن حماد الجوہری المتوفی سنہ ۳۳۲ھ یا ۳۹۳ھ.

(2) القاموس المحیط والقابوس الوسیط فیما ذھب من کلام العرب شماطیط لمجد الدین ابی طاھر محمد بن یعقوب بن محمد الشیرازی الفیروز آبادی (۷۲۹ھ ۸۱٦)

(3) ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری (٦۳۰ھ ۷۱۱)

(4) محمد بن محمد بن عبدالرزاق الحسینی الزبیدی الملقب بمرتضٰی (۱۱٤۵-۱۲۰۵ھ)

(5) راجع شرح دیباچہ القاموس للعلامہ نصر الھورینی، ص ۲۷.

طرف مراجعت کی ضرورت نہ تھی۔

مزید برآں! ہم صحابہؓ میں سے اہل علم حضرات کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے قرآن پاک کے بعض الفاظ کے معنی کے ادراک سے عجز کا اظہار فرمایا ہے۔ علامہ سیوطیؒ الاتقان میں لکھتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ: ﴿ وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴾ میں "اَبًّا" کے معنی سمجھنے سے عجز کا اعتراف کیا ہے۔ ❶

نیز منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر آیت کریمہ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ تلاوت فرمائی اور حاضرین سے تخوف کے معنی دریافت فرمائے۔ اس پر بنی ہذیل سے ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا "اس آیت میں "تخوف"، بمعنی "تنقص" ہے اور اس پر یہ شاہد پیش کیا۔ ❷

تخوف الرجل منها تامكا قرداً كما تخوف عود النبعة السفن

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ترجمان القرآن کے لقب سے معروف ہیں مگر مجاہد رحمہ اللہ راوی کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ ﴾ کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا حتی کہ دو اعرابی ایک کنویں کے متعلق نزاع میرے پاس لائے ان میں سے ایک نے اپنے حق ملکیت کے ثبوت میں کہا: ﴿ اَنَا فَطَرْتُهَا ﴾ کہ اس کنویں کو پہلی مرتبہ میں نے کھودا ہے۔ یہ کلمہ سن کر میری مشکل حل ہوگئی اور فاطر السمٰوٰت کا صحیح مفہوم میں نے سمجھ لیا۔

صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں عدی بن حاتم کا قصہ مشہور ہے جو دلچسپ بھی ہے یعنی کہ جب آیت کریمہ ﴿ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ (البقرہ:۱۸۷) نازل ہوئی تو عدیؓ کا بیان ہے کہ میں نے سیاہ اور سفید دو عقال اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیے کہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگیں گے تو کھانا پینا بند کر دوں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا:

((اِنَّكَ لَعَرِيْض القفا اِنَّمَا هِیَ سَوَاد الليل وبياض النهار))

کہ..... اس سے مراد تو صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی ہے۔ ❸

مندرجہ بالا سطور سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابہ کرام کو بعض مفرد اور مرکب کلمات کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا اپنے رفقاء میں سے کسی دوسرے سے دریافت کرتے تھے اور قرآن فہمی میں سب یکساں صلاحیتوں کے مالک نہ تھے، ابن قتیبہؒ لکھتے ہیں:

عرب قرآن فہمی میں مساوی درجہ پر نہ تھے کہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے غریب اور متشابہات کا ادراک کر لیتا ہو بلکہ وہ مختلف مدارج کے حامل تھے۔

اسی طرح مسروق کا بیان ہے:

میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجالس میں بیٹھتا رہا اور ان سے مستفید بھی ہوتا رہا، میں نے دیکھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال پانی کے جوہڑ کی ہے بعض جوہڑ وہ ہیں جو پورے علاقہ کی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں جن سے بصد مشکل ایک دو آدمی سیر ہو سکتے ہیں۔

---

❶ الجامع الفيض الخير علی نهج التيسير، ص ٣٢-٣٣ بحث ترجمه قرآن۔

❷ ملاحظہ ہو: مقدمه ابن خلدون، ص ٤٨٠۔

❸ المسائل والاجوبه، ص ٨ طبع سعادت مصر ١٣٤٩۔

اس مختصر تمہید سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے ہر مقام کو نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کی ضرورت تھی اور یہ کہ علم و فضل میں سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مساوی صلاحیتوں کے مالک نہ تھے بلکہ طبعی اور فطری طور پر ان میں بھی تفاوت درجات موجود تھا اس کے بعد اب ہم ان وسائل و مصادر سے بحث کرتے ہیں جو دور صحابہ میں موجود تھے جن سے بے نیازی دراصل تفسیر بالرائی کا دروازہ کھولتی ہے۔

تتبع اور جستجو سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن فہمی کے چار ذرائع تھے جن سے صحابہ و تابعین مستفید ہوتے رہے اور آج بھی ان ذرائع کی وہی حیثیت حاصل ہے جو اس دور میں سمجھی جاتی تھی۔

(۱) قرآنِ کریم　　(۲) احادیث نبویہ　　(۳) اسرائیلیات　　(۴) آثارِ صحابہ

(۱) قرآنِ کریم نے اپنے اسلوبِ بیان میں اگر ایک مقام پر اجمال سے کام لیا ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل بھی فرمادی ہے اور بعض آیات میں اگر اطلاق یا عموم پایا جاتا ہے تو دوسرے مقامات پر ان کی تقیید و تخصیص بھی موجود ہے اس بنا پر علماء کرام نے لکھا ہے کہ بفحویٰ "القراٰن یفسر بعضہ بعضاً" لازم ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے پہلے قرآن ہی کا مطالعہ کیا جائے جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک موضوع سے متعلقہ آیات کو یکجا کر کے مجموعی حیثیت سے ان پر غور کیا جائے۔علمائے تفسیر نے اس طریقِ تفسیر کو سب سے مقدم اور بہتر قرار دیا ہے۔حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کے لیے سب سے بہتر طریقہ کیا ہوسکتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ [1]

اس سلسلے میں اختلاف قراءات کو بھی ایک اہم مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے، صحابہ کرام اور تابعینؒ بعض آیات کو سمجھنے کے لیے اختلاف قراءت سے بھی استفادہ کرتے تھے، خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی قراءت بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔حضرت مجاہدؒ بیان فرماتے ہیں:

اگر میں حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت کو اختیار کرتا تو میرے بہت سے سوال ابن عباسؓ سے استفسار کے بغیر ہی حل ہوجاتے۔ [2]

بلکہ بعض علماء نے تفسیر کے ارتقاء اور اس کے مدارج کے سلسلہ میں اختلاف قراءت کو پہلا زینہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی جسے صحابہؓ اور تابعین نے اختیار کیا، مگر اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قراءتِ متواترہ تو نصوص کی حیثیت رکھتی ہیں ہاں قراءت غیر متواترہ کو تفسیر کی حیثیت دے سکتے ہیں۔

مستشرقین نے اختلاف قراءت کو غلط رنگ دے کر اس سے غلط نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں نے قراءت کے قبول کرنے میں تساہل سے کام لیا، حالانکہ نصوص قرآن کا ایک ہی شکل پر ہونا ضروری تھا اور یہ کہ ان قراءت کے موجد صحابہ کرام ہیں مگر یہ تعصب کی ہرزہ سرائی ہے۔اگر یہ لوگ قراءت کی صحت اور اس کی قبولیت کی شرائط پر غور کرلیتے تو کبھی بھی صحابہ کی طرف تساہل کی نسبت نہ کرتے۔

"تفسیر القرآن بالقرآن" کے طرز پر علماء نے تفاسیر بھی لکھی ہیں ان میں سے ایک تفسیر، امام راغب کی طرف بھی منسوب ہے، جس کے متعلق حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ص ۳.

[2] المذھب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن، ص ؟؟؟؟

((وطرزہٗ انّه اوردجُملًا من الآیات ثم فسرھا تفسیراً مشبعًا))

متاخرین میں سے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرز تفسیر کا اعتناء کیا ہے اور نہایت سہولت سے اسے اپنایا ہے حتی کہ علماء نے ان کی تفسیر کو ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کا منبع قرار دیا ہے ان کی یہ تفسیر نہایت صحیح اور قابلِ اعتماد تفاسیر میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ سلفؒ کے مسلک کے مطابق لکھی گئی ہے اس لیے راقم کو اس تفسیر سے خصوصی شغف ہے اور تفسیری حواشی ''اشرف الفوائد'' میں خاص طور پر اس کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شیخ الاسلام مولانا امرتسری مرحوم نے بھی ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' کے نام سے عربی زبان میں نہایت اہم تفسیر تالیف کی ہے جو گو مختصر ہے لیکن قابل قدر ہے تبویب القرآن وغیرہ بھی اسی قسم میں داخل ہوسکتی ہیں۔

(۲) تفسیر قرآن کے سلسلہ میں سنت نبوی کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے اور ائمہ دین نے سنت کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے قبول کیا ہے آیت کریمہ (نحل، آیت ۴۴) ﴿ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ ﴾ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وحی کی تبلیغ کے علاوہ اس کی تبیین بھی لازم تھی۔ علماء نے احادیث کو مدون کر کے اس تبیین (تفسیر نبوی) کو محفوظ کر دیا ہے، علمائے بدعت نے اس تفسیر کو رد کر کے گویا ایک طرف تو تفسیر بالرائی کا دروازہ کھول دیا ہے اور دوسری طرف سنت کی حجیت کے انکار کی بھی طرح ڈال دی ہے۔ محققین علماء نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کے لیے اس کو لازم قرار دیا ہے، چنانچہ امام شافعی ''الرسالہ'' میں لکھتے ہیں:

آنحضرت ﷺ نے جو فیصلہ بھی صادر فرمایا ہے وہ قرآن ہی سے سمجھ کر صادر فرمایا ہے۔ ❶

امام شافعی رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات درج کی ہیں یہاں پر ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سنت قرآن کی شارح ہے اور قرآن فہمی کے لیے قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع ضروری ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے۔ ❷

خصوصاً قرآن میں جس قدر آیات احکام ہیں ان کی تفسیر وتشریح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے، مثلاً نمازوں کی تعداد، ان کا طریقِ اداء، احکام نکاح وطلاق اور بیوع وغیرہا معاملات وہ ہیں کہ ان کا بیان سنت ہی سے مل سکتا ہے۔ ابن جریر طبری اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

جہاں تک قرآن میں احکام کا ذکر ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جاسکتے ہیں، لہٰذا تفسیر قرآن کے لیے سنت کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ ❸

ایک اشکال اور اس کا حل:

یہاں پر ایک بہت بڑا اشکال لازم آتا ہے کہ تفسیری روایات اگر مستند اور قابل اعتناء ہوتیں تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جیسے محدث یہ نہ فرماتے۔ ❹

((ثلاثة لیس لها اصل التفسیر والملاحم والمغازی))

کہ تین قسم کی کتابیں یا روایات بالکل بے بنیاد ہیں یعنی تفسیر، ملاحم اور مغازی۔ مگر خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قول سے

---

❶ الرسالہ، رقم ۳۰۳. ❷ مقدمہ تفسیر، ص ۳.

❸ ص ۳۳۔ ❹ موضوعات ملا علی قاری، ص ۸۵.

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پیش نظر خاص قسم کی روایات یا کتابیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

((اما کتب التفسیر فمن اشهرها کتابا الکلبی ومقاتل بن سلیمان وقد قال احمد فی تفسیر الکلبی من اوله الی اخره کذب))

ورنہ تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے تفسیری روایات پر مشتمل ایک صحیفہ کی خود تحسین فرمائی ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دی ہے۔ ❶

ایک اہم مبحث:

بعض علمائے تفسیر مرفوع تفسیر کو تو حجت مانتے ہیں بشرطیکہ صحت کے ساتھ ثابت ہو مگر ان کا کہنا ہے کہ اس نوع کی تفسیر نہایت قلیل ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے احتجاج کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں ❷:

((لم یکن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یفسر شیئًا من القراٰن الا اٰیات تعد۔ علمهن ایاه جبرئیل))

اسی طرح امام سیوطی رحمہ اللہ اس موضوع پر بحث کے دوران میں لکھتے ہیں:

((الذی صح من ذالك قلیل جداً بل اصل المرفوع منه فی غایة القلة))❸

یعنی حقیقتاً مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مستقل رکن کی حیثیت دینا اور ہر آیت کی تفسیر میں احادیث مناسبہ کو پیش کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا مگر آیات قرآنیہ اور دلائل سے (جو آگے آ رہے ہیں) ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت نے جس طرح صحابہؓ کے سامنے پورے قرآن کی تلاوت فرمائی ہے اسی طرح ان کے سامنے قرآن کے مطالب و معانی بھی بیان کیے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ سورۂ نحل (آیت ۴۴) میں قرآن کی تبیین کو آنحضرت ﷺ کے فرائض سے قرار دیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور ان کے بالتبع دوسرے علماء کا بھی یہی رجحان ہے۔ ❹

ابو عبدالرحمٰن السلمی (عبداللہ بن حبیب تابعی سنہ ۷۲ھ) بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عثمان، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ، جو ہمیں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے...... کا بیان ہے کہ ''جب ہم آنحضرت ﷺ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو جب تک ان کے معنی مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیتے اور پھر عملی طور پر اپنا نہ لیتے ان سے تجاوز نہ کرتے چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان ہے؛

ہم نے قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی سیکھا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام ایک ہی سورہ کے حفظ میں سالہا سال لگے رہتے تھے۔ مؤطا میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ❺:

((انه اقام علی حفظ البقره ثمان سنوات))

''کہ انہوں نے سورۂ بقرہ کے حفظ میں پورے آٹھ برس صرف کر دیئے۔''

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دس برس کی مدت میں یہ سورہ ختم کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض قرآن کی قراءت یا تجوید نہ تھی بلکہ اس کے مطالب پر عبور اور عمل بھی اس میں شامل تھا۔

---

❶ الفوز الدهلوی. ❷ القرطبی، ج ۱، ص ۳۱، طبری، ص ۲۱

❸ الاتقان، ج ۲، ص ۱۷۹.

❹ دیکھئے رسالہ اصول تفسیر لابن تیمیہ.

❺ ابن کثیر، ص ۳.

اور اس بات کو ہم عادۃً باور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص مثلاً حساب کی کوئی کتاب تو پڑھے مگر اس کی تشریح حاصل نہ کرے اور پھر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا بغیر معنیٰ سمجھنے کے پڑھنا آج کل کے عجمی مسلمانوں سے تو ہوسکتا ہے مگر صحابہ کرامؓ کے متعلق اس قسم کا تصور بھی بعید ہے، خصوصاً جب کہ وہ تعلیم کے ساتھ اس کی عملی تطبیق بھی حاصل کرنے پر حریص تھے۔

جولوگ مرفوع تفسیر کے نہایت قلیل ہونے کے قائل ہیں ان کا حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ روایت سے استدلال نہایت ہی مضحکہ خیز ہے۔ اولاً تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہی غریب اور منکر ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن جعفر زبیدی ہے جس پر امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ رجال نے جرح کی ہے۔ خود امام طبری رحمہ اللہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

((انه ممن لا يعرف فى اهل الآثار))

اور پھر یہ روایت واقعات کے بھی خلاف ہے اور بشرط صحت اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد قرآن کی تفسیر کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق مغیبات سے ہے، مثلاً قیامت کے وقت کا علم وغیرہ جس کی تعیین کا اظہار مشیت الٰہی کے خلاف تھا، جب کہ آنحضرت ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے جواب میں "ما المسئول عنها باعلم من السائل" کے جملہ سے اس کی وضاحت فرمادی ہے۔ نیز امام طبریؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں [1]:

تفسیر چار قسم پر ہے ایک قسم تو وہ ہے جسے عرب اپنے محاورات کی روشنی میں سمجھ لیتے اس نوع کی تفسیر کے بیان کی ضرورت نہ تھی...... تیسری قسم تفسیر کی وہ ہے جسے علماء ہی جان سکتے ہیں (جیسے متشابہات) اور چوتھی قسم وہ ہے جو علم الٰہی کے ساتھ خاص ہے اور انسان اس کا ادراک نہیں کرسکتا۔

الغرض قرآن کی تفسیر وتشریح بھی آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے جو کہ کتب احادیث وسنن میں محفوظ ہے اسی بنا پر علماء کرام نے قرآن وسنت کو لازم وملزوم قرار دیا ہے اور سنت کو بھی وحی کا حصہ قرار دیا ہے اور امام اوزاعی رحمہ اللہ، حسان بن عطیہ رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں:

آنحضرت ﷺ پر قرآن کی وحی نازل ہوتی پھر حضرت جبریل علیہ السلام قرآن کی تفسیر کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سنت لے کر حاضر ہوتے۔ [2]

یہی امام اوزاعی، مکحول سے روایت کرتے ہیں:

((القراٰن احوج الى السنة من السنة الى القرآن.))

کہ قرآن اپنی تشریحات کے لیے جس قدر سنت کا محتاج ہے، سنت کے مطالب کی وضاحت کے لیے قرآن کی ضرورت نہیں ہے، خود آنحضرت ﷺ نے ﴿اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهٗ﴾ فرما کر سنت کے اصل مقام کی وضاحت فرمادی ہے کہ سنت میں مزید احکام بھی ہیں جو قرآن میں بطور نص مذکور نہیں ہیں۔ [3]

۳۔ اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جاہلی عرب اہل کتاب کے عادات واطوار اور لغت عرب کے اوضاع واسرار سے بخوبی واقف تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن احوال وظروف میں قرآن نازل ہورہا تھا وہ ان کی نظروں کے سامنے تھے پھر ان کے اذہان بھی صاف ستھرے اور گرد وپیش کی آلائشوں سے منزہ تھے۔ ان جملہ وجوہات کی بنا پر حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

صحابہ کرامؓ قرائن واحوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن پاک ہم سے زیادہ سمجھتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم، علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ [4]

---

[1] ص ۲۵ [2] مراسیل ابی داؤد، قرطبی، ج ۱، ص ۳۷۔۳۸. [3] قرطبی، ص ۳۹. [4] دیکھئے رسالہ امام شافعی.

اس بنا پر علمائے تفسیر نے قرآن وسنت کے بعد اقوال و آثار صحابہ کو تیسرے درجہ پر رکھا ہے۔ ان کے اقوال کی بنیاد تین چیزوں پر تھی:

(۱) اسبابِ نزول کی معرفت۔

(۲) توراۃ وانجیل (اسرائیلیات)

(۳) اوضاع لغت کی معرفت۔

اب ہم ان تینوں کی تفسیری حیثیت سے بحث کرتے ہیں، تاکہ ان سے استفادہ میں غلو سے کام نہ لیا جائے اور نہ ہی ان پر کلی طور پر اعتماد کر کے قطعیت کا حکم لگایا جائے۔

ا۔ اسبابِ نزول:

قرآنِ پاک تدریجاً بحسب الحوائج نازل ہوا ہے اس کا اکثر حصہ تو وہ ہے جو ابتداءً موعظت وعبرت یا تشریعی احکام کے لیے نازل ہوا ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جو کسی حادثہ یا سوال کے جواب میں اترا ہے۔ علماء نے ان حوادث یا سوالات کو ''اسبابِ نزول'' سے تعبیر کیا ہے۔ [1]

اسبابِ نزول کی معرفت سے چونکہ آیت کا پس منظر سمجھ آتا ہے، اس لیے علم تفسیر میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اور علماء نے علوم تفسیر پر جو کتابیں تالیف کی ہیں ان میں اسبابِ نزول کے عنوان کو مستقل جگہ دی ہے، بلکہ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

((افردہٗ بالتصنیف جماعۃ اقدمھم علی بن المدینی شیخ البخاری رحمہ اللہ۔))

''کہ علماء کی ایک جماعت نے اس پر مستقل تالیفات لکھی ہیں اور اس باب میں سب سے پہلی تالیف علی بن المدینی رحمہ اللہ کی ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ ہیں۔'' [2]

فائدہ:...... امام سیوطی رحمہ اللہ نے بعض دوسری تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ واحدی (ابوالحسین علی بن احمد سنہ ۴۲۷ھ) [3] کی تالیف کو مشہور ترین تالیف قرار دیا گیا ہے مگر ساتھ ہی ''فیہ اعواز'' لکھ کر طنز بھی کر دی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۸۵۲ھ) کی اسبابِ نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مات عنہ مسودۃ فلم نقف علیہ کاملاً'' صاحب کشف نے اس باب میں ابن الجوزی، محمد بن اسعد القرانی اور شیخ ابوجعفر مازندرانی کی کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ خود بھی اپنی کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

((وَاَلَّفْتُ فِیہ کتابًا حَافِلاً مُوْجزًا محررًا لم یؤلف مثلُہٗ فی ھٰذَا النوع سمیتہٗ ((لباب النقول فی اسباب النزول.))

بہرحال ''سبب النزول'' کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر کتابیں تالیف کی ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ''الفوز الکبیر'' میں اس کی معرفت کو ''مواضع صعبہ'' سے شمار کیا ہے اور اس فن کے مباحث کو منقح کرنے کی کوشش کی ہے، [4] لہٰذا جن علماء نے اس فن کو تاریخی حیثیت دے کر اس کے ''لاطائل'' ہونے کا گمان کیا ہے ان کا یہ موقف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے کذا قال السیوطی فی اتقانہ۔ [5]

دو گروہ:

بعض علماء نے اس فن کی معرفت کو تفسیر قرآن کا موقوف علیہ قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ واحدی رحمہ اللہ اپنے ''اسباب'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

((لا یمکن معرفۃ تفسیر الآیۃ دون الوقوف علی قصتھا وبیان نزولھا.)) [6]

---

[1] مقدمہ التفسیر، ص ۳۔ [2] الاتقان، ج ۱، ص ۲۸۔ ص ۲۸ ایضاً، کشف الظنون، حاجی خلیفہ، ۳۔

[3] حاجی خلیفہ سنہ ٤٦٨ھ [4] ص ۱۔۲۵ سلفیہ لاہور۔ [5] الاتقان، ص ۲۸، ج ۱۔ [6] ص ۳۔

اسی طرح امام سیوطی رحمہ اللہ بھی اپنے ''لباب'' میں اس فن کی معرفت کے بغیر تفسیر پر اقدام کو حرام قرار دیتے ہیں مگر امام ابن دقیق ابوالفتح قشیری رحمہ اللہ نے اس فن کی معرفت کو فی الجملہ معاون تسلیم کیا ہے نہ یہ کہ اس کے بغیر تفسیر ہی ممکن نہیں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی اسی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

((معرفة سبب النزول تعين على فهم الآية فان العلم بالسبب يورث العلم بالمسبب.)) ❶

اصل میں صحابہؓ یا تابعین کرام رحمہم اللہ نے جو اسباب نزول بیان فرمائے ہیں وہ دو قسم پر ہیں، اسباب نزول کی ایک قسم تو وہ ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے، مثلاً مغازی یا دوسرے واقعات کہ جب تک تفصیلی واقعات سامنے نہ ہوں متعلقہ آیات میں جو جزئیات مختصراً مذکور ہیں صحیح طور پر ذہن نشین نہیں ہوتیں اس قسم کے ''اسباب نزول کے متعلق واقعی کہا جاسکتا ہے کہ ایک مفسرِ قرآن کو ان کا جاننا لازم ہے جیسا کہ علامہ واحدی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے۔ لیکن دوسری قسم اسباب نزول کی وہ ہے جسے صحابہؓ یا تابعین کسی آیت کے تحت (نزلت فی کذا یا انزل اللہ قولہ کذا) کے الفاظ سے ذکر کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی مناسبت سے محولہ آیات کے تحت ذکر کر دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ آیت کے مفہوم کی وضاحت کے سلسلہ میں اس واقعہ کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

((وقد ذكر القدماء المفسرون تلك الحادثة بقصد الاحاطة بالآثار المناسبة للآية او بقصد بيان ما صدق عليه العموم وليس هٰذا القسم من الضروريات.....وكان غرضهم تصوير ما صدقت عليه الآية..... الخ.)) ❷

پہلی قسم کے اسباب نزول میں چونکہ ان کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی بنیاد روایت وسماع پر ہوتی تھی اس بنا پر علماء نے بلا اختلاف اس کو حدیث مسند کا درجہ دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((واذا ذكر سببًا نزلت عَقَبَهٗ فَانهم كلهم يدخلون مثل هٰذ فى المسند لان مثل ذالك لا يقال بالرأى.)) ❸

اور دوسری قسم یعنی جب کوئی صحابی (نزلت فی کذا) کے الفاظ استعمال کرے، میں اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی قسم اول کی طرح مسند حدیث کے حکم میں ہے یا اس کی بنیاد صحابی کے اجتہاد ورائے پر ہے امام حاکم رحمہ اللہ اپنے علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

((اذا اخبر الصحابى الذى شهد الوحى والتنزيل عن آية من القرآن (انها نزلت فى كذا) فانه حديث مسند ومشٰى على هٰذا ابن الصلاح وغيرهٗ۔))

یعنی جب کسی آیت کے متعلق صحابی، جس نے وحی وتنزیل کا مشاہدہ کیا ہو یہ بیان کرے کہ یہ آیت فلاں حادثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو ابن الصلاح رحمہ اللہ وغیرہ محدثین کے نزدیک مسند حدیث شمار ہوگی۔ حافظ ابن تیمیہؒ اس میں تفصیل وتوزیع کے قائل ہیں۔ یعنی اگر ان الفاظ سے سبب النزول مراد ہے تو تمام کے نزدیک حدیث مسند میں داخل ہے کما مرّ اور اگر اس سے صحابی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے، گو اس کا سبب نزول نہیں ہے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی مسند حدیث کے حکم میں ہوگا یا نہیں امام بخاری رحمہ اللہ تو اسے اس صحابی کی مسند میں داخل مانتے ہیں مگر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو مسانید میں شامل نہیں کیا، اکثر علماء حدیث وتفسیر کا میلان امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے قول کی طرف ہے۔ چنانچہ علامہ زرکشی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ❹

---

❶ الاتقان للسيوطى ١/ ٤٨۔ البرهان للزركشى ١/ ٢٢.

❷ الفوز: ٤٤. ❸ منهج الفرقان، ص ٣٩.

❹ ج ١، ص ٣١۔٣٢، الاتقان: ١/ ٣١.

((قد عرف من عادة الصحابة والتابعين ان احدھم اذا قال نزلت ھٰذہ الآیة فی کذا فانه یرید بذالك انها تتضمن ھذا الحکم لا ان ھٰذا کان السبب فی نزولها فھو من جنس الاستدلال علی الحکم بالآیة لا من جنس النقل لما وقع.))

الغرض اسباب نزول کے بیان میں صحابہؓ کے اقوال مبنی بر اجتہاد بھی ہوتے اور بعض اوقات تو خود صحابی کو بھی اپنے بیان پر یقین نہ ہوتا اور وہ (احسب ھٰذہ الآیة نزلت فی کذا) کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ [1] لہٰذا اسباب نزول کے بیان کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ علم، صحابہؓ سے سماع و روایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ واحدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((لا یحل القول فی اسباب نزول الکتاب الا بالروایة والسماع ممن شاھد واالتنزیل ووقفوا علی الاسباب وبحثوا عن علمھا.))

سلف تو اسباب نزول کے سلسلہ میں روایت قبول کرنے میں تشدد سے کام لیتے اور جب تک صحتِ سند کے ساتھ اس کا صحابی سے مروی ہونا ثابت نہ ہو جاتا وہ اسے قابل التفات نہ سمجھتے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدۃ رحمہ اللہ سے ایک آیت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: [2]

((اتق اللّٰه وقل سدادا ، ذھب الذین یعلمون فیما انزل القرآن.))

لیکن اُن کے بعد علماء نے تشدد کو ترک کر کے تساہل سے کام لینا شروع کر دیا، حتیٰ کہ اس سلسلہ میں کذب بیانی کی بھی کچھ پروا نہ کی گئی علامہ واحدی رحمہ اللہ اسی قسم کے علماء پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((واما الیوم فکل احد یخترع شیئًا ویختلق افکا وکذبا ملقیًا زمامه الی الجھالة ، غیر منکر فی الوَعِیدِ للجاھل بسبب الآیة))

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متاخرین نے ہر آیت کے تحت شان نزول بیان کرنے کی کوشش کی اور رطب و یابس سے تفاسیر کو بھر دیا مبالغہ آمیزی اور کذب بیانی کے علاوہ بہت سی تاریخی لغزشوں کا بھی ارتکاب کیا اور امام طبری رحمہ اللہ جیسے مؤرخ بھی ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

لہٰذا اسباب نزول کی روایات پر نقد و نظر کی ضرورت ہے، اور جب تک کسی حادثہ کا صحت اسناد سے سبب ہونا ثابت نہ ہو جائے اسے قبول نہ کیا جائے اور پھر آیت کے مفہوم کو سبب نزول کے ساتھ مختص نہ کیا جائے بلکہ آیت کے معنی و مفہوم کو عموم پر رکھا جائے علامہ سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: [3]

''صحیح یہ ہے کہ نظم قرآن کو عموم پر محمول کیا جائے اور اسباب خاصہ کا اعتبار نہ کیا جائے..... کیونکہ صحابہ کرام پیش آمدہ وقائع کی توضیح میں آیات کے عموم سے استدلال کرتے رہے ہیں گویا ان کے اسباب نزول خاص تھے۔''

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسباب نزول دو قسم پر ہیں۔ بعض اسباب تو وہ ہیں جن سے آیت کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور جب تک اس واقعہ کو بیان نہ کیا جائے پورے طور پر آیت کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہوتا لیکن اکثر واقعات وہ ہیں جو اسباب نزول کے طور پر علمائے تفسیر نے ذکر کر دیئے ہیں مگر نہ وہ درحقیقت اسباب نزول ہیں اور نہ ہی ان سے صرف نظر کرنے پر آیت کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی صعوبت پیش آتی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے الفوز میں تصریح کی ہے۔

---

[1] الاتقان: ۱/ ۳۱. [2] الاتقان: ۱/ ۳۱. [3] الاتقان: ۱/ ۳۱.

روایات اہل کتاب یا اسرائیلیات:

قرآن پاک نے بعض مسائل اور واقعات کے بیان میں توراۃ سے موافقت کی ہے۔اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کے معجزات کے بیان میں انجیل کی تصدیق کی ہے تاہم ان واقعات کے بیان میں کتب سابقہ کے نہج اور اسلوب بیان سے گریز کیا ہے اور قصص کی غیر ضروری جزئیات ترک کر کے صرف ان حصوں کو موضوع بحث بنایا ہے جن کا تعلق عبرت وموعظت سے تھا۔

اس بنا پر بعض مفسرین صحابہ نے ان قصص کی جزئیات معلوم کرنے کے سلسلہ میں مسلمان اہل کتاب علماء کی طرف رجوع کیا اور ان سے روایت بھی لی تاہم نقل وروایت میں حد اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور حدیث ((حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج)) کے تحت جواز کی حد تک ان سے استفادہ کیا اور وہ بھی صرف ان روایات میں جو قرآن وحدیث اور اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہوتیں۔ ❶

جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے اہل کتاب سے روایت نقل کی ہے ان میں سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کی مرویات سے ہمارے دعویٰ کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ❷

اسرائیلی روایات اور تابعین:

البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین نے اہل کتاب سے اخذ وروایات میں توسع سے کام لیا چنانچہ تفسیری روایات میں اسرائیلیات کی کثرت اسی دور کی پیداوار ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس دور میں یہود ونصاریٰ میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور لوگ قصے کہانیاں سننے کے لیے ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے اس دور میں مفسرین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جنہوں نے روایت میں احتیاط سے کام نہ لیا اور رطب ویابس کے بیان کو اپنا مشغلہ بنا لیا، ان میں سے مقاتل بن سلیمان (المتوفی ۱۵۰ھ) اور وہب بن منبہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تابعین کے بعد تو اس شغف علمی نے خاصی ترقی کر لی اور ہر قسم کے خرافات کو تفسیر کے سلسلہ میں روایت کیا جانے لگا۔حتی کہ دور تدوین میں بعض مفسرین نے ان خرافات سے اپنی تفاسیر کو مزین کرنے کی کوشش کی۔

ایک مفسر کا فریضہ:

اہل کتاب سے اس کثرت کے ساتھ نقل وروایت دراصل دین میں ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ الفوز میں لکھتے ہیں:

((ان النقل عن بنی اسرائیل وسیلة دخلت فی دیننا))

لہٰذا ایک مفسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس قسم کی روایات کے نقل میں نہایت مستعدی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے اور غور وفکر سے ایسے نتائج اخذ کرے جو قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہوں اور نقل وروایت میں صرف انہی حصوں پر اکتفا کرے جو قرآن کے مجمل مقامات کو سمجھنے میں ممد ہوں اور پھر سنت سے بھی ثابت ہوں۔ ❸

البتہ جب اس قسم کے خیالات کے بیان میں متقدمین کا اختلاف ہو تو گو ایک شخص مؤلف کی حیثیت سے ان سب کو نقل کر کے ان میں

---

❶ مقدمہ اصول تفسیر ابن تیمیہ ص ۲٦.

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا مقالہ "عدالت صحابہ"

❸ دیکھیے روح المعانی ج ۱۵ ص۹۳.

سے صحیح بات کی نشان دہی کر سکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے ایسے موقع پر اسرائیلیات کو کلیۃً ترک کر کے قرآن پاک پر تدبر میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرے جیسا کہ قرآن پاک نے بعض مقامات پر اس اصول کی طرف راہنمائی کی ہے۔ ❶ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ایک نہایت باریک نکتہ ہے جو طالب علم کے لیے رہنما اُصول کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے:

((انها قد تذكر في القرآن قصة في موضع الاجمال و في موضع بالتفصيل...... فيمكن ان يعلم من التفصيل تفسير الاجمال وينتقل من التفصيل الى الاجمال والله اعلم))

خلاصۂ بحث:

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسرائیلی روایات سے بے شک استفادہ کیا ہے اور ضرورت کی حد تک ان کی روایت کو بھی جائز سمجھا ہے تاہم ان میں حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کا بیان محض ایک تفتیش علمی کی حیثیت رکھتا ہے جسے وضاحت کے سلسلے میں قبول تو کیا جا سکتا ہے مگر میزان صحت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لغت ومحاورات:

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب وسنت اور اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم سے روشنی نہ پڑتی ہو تو پھر لغت ومحاورات عرب کی طرف رجوع ہوگا کیونکہ قرآن فہمی کے سلسلہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((الشعر ديوان العرب فاذا تعاجم علينا شيءٌ من القرآن رجعنا اليه)) ❷

مگر لغت ومحاورات عرب سے قرآن فہمی ہر ایک کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے عربی زبان کا خصوصی ذوق اور اہلیت شرط ہے کیونکہ معاجم وقوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ بلا اسناد جمع کر دیا ہے۔ خصوصاً اشعار وامثال جن کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دیوان العرب قرار دے رہے ہیں علمائے ادبیات جانتے ہیں کہ ان کی نسبت میں اختلاف واختلاط کا بے حد دخل ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی ایسی روایت ہوگی جس پر اعتماد ہو سکے اور پھر محاورات کے بیان میں بھی ان میں باہم اختلاف ہے اور ان علماء نے تشریحات میں عمومی محاورات کو ملحوظ رکھا ہے خاص طور پر الفاظ قرآن کی تشریحات ان کے پیش نظر نہیں ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عام محاورہ قرآن کے مفہوم سے بھی ہم آہنگ ہو اور اگر انہوں نے قرآنی الفاظ کو پیش نظر رکھا بھی ہو تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ وہ لوگ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطہ نظر کے مطابق محاورات عربیہ کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجہ اتم پائی جاتی ہے لہٰذا لغت ومحاورہ عرب سے استفادہ کے لیے چند اُمور کی رعایت ضروری ہے:

۱۔ لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظِ مفردہ کے ان معانی کو سامنے پیشِ نظر رکھا جائے جو زمانہ نزول کے وقت مفہوم ہوتے تھے اور پھر قوانینِ اعراب و بلاغت سے اس کے ترکیبی معنی پر غور کیا جائے اور سیاق وسباق پر بھی نظر ڈالی جائے اور پھر سیاقِ کلام سے معنی مقصود کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((لان الكلمة الواحدة تجيء في لغة العرب لِمعان شتى)) ❸

۲۔ لغت ومحاورہ عرب سے جو تفسیر بھی کی جائے اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی وسیرت کے بھی مطابق ہے

---

❶ الفوز الكبير ص ٤٥-٤٦.

❷ دیکھیے: مقدمه أصول التفسير لابن تيميه ٢٠.

❸ تفسير طبرى ج١٧ ص ١٢٩ مذاهب التفسير الاسلامى ٨٩-٩٠ الفوز الكبير ص٤٦.

اور آپ ﷺ کے اقوال وافعال اور تفسیرِ صحابہ کے منافی تو نہیں ہے کوئی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔

یہ تمام تر غور وفکر اور مساعی اس بنا پر بھی ضروری ہیں کہ کتب لغت بہر حال کتب لغت ہیں ان سے الفاظ کا معنوی حل ہی مل سکتا ہے، وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہر صورت قاصر ہیں اور جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے پر تفسیر کی ہے انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں، اس کا پہلا نمونہ ابوعبیدہ کی مجاز القرآن ہے اور پاک وہند میں جن لوگوں نے تفسیر باللغۃ کی ہے انہوں نے دراصل لغت کا سہارا لے کر مغربی افکار ونظریات کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس طرح پہلے ایک دور میں قرآن کو اسرائیلیات کے لیے تختہ مشق بنانے کی کوشش کی گئی تھی، تفسیر القرآن سرسید اور بُرہان القرآن وغیرہ کی اساس بھی اس قسم کے نظریات پر رکھی گئی ہے اور قرآن جو کتاب ہدایت تھی ان مضحکہ خیز تفاسیر نے اس کی آب وتاب کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے، اس لیے ہم سمجھتے ہیں مقاصدِ قرآن کی وضاحت کے لیے سنت نبوی کی طرف رجوع ضروری ہے چنانچہ علامہ طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مفردات القرآن کے معانی معلوم کرنے کے لیے تو لغت کی طرف رجوع ہوسکتا ہے مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے بہر حال وحی الٰہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارہ کار نہیں۔''

ان تصریحات کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موارد استعمال کے تتبع سے کسی حد تک صرف مفردات کے حل میں مدد ملتی ہے ورنہ یہ ایسا ذریعہ نہیں کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کر سکے یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے تفاسیر میں لغت ومحاورات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کے لیے شواہد تک کو چھان مارا ہے وہ بھی اپنی تفاسیر میں سنت اور اقوال صحابہ سے بے نیاز نہیں ہو سکے اور باوجود معتزلہ اور عقل پسند ہونے کے، حدیث نبوی اور اقوال صحابہ کا سہارا ضرور لیتے رہے ہیں ''الکشاف'' زمخشری کے مطالعہ سے ہر صاحب علم یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس وقت کے اعتزال اور اس زمانہ کے اعتزال میں نظریاتی اختلاف پایا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کے اسلاف تو اعتزال کے ساتھ صفاتِ علم سے بھی متصف تھے اور معتزلہ کا موجودہ گروہ تدلیس وتلبیس میں تو شاطر نظر آتا ہے مگر صفاتِ علم سے عاری ہے۔

بعض علماء نے شرح غریب القرآن کا خصوصی اعتناء بھی کیا ہے مفردات راغب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس لیے اب ہم ان کتابوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

غریب القرآن پر جن علماء نے خصوصی توجہ دی ہے ان میں سرفہرست حبرِ امت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نام ذکر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ عطار رحمہ اللہ مقدمہ الصحاح للجوہری میں لکھتے ہیں۔

((وکانوا یستعینون بالشعر وکلام العرب لبیان معانی القرآن .... وکان اوّل اتجاہ للعنایۃ اللغویۃ ھو رغبۃ دینیۃ محضۃ ولھذا نسب الی ابن عباس کتاب غریب القرآن)) ❶

بروکلمن نے ''تاریخ ادب العرب'' میں اس کے بعض خطی نسخوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ❷ اور التفسیر الکبیر جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے اس میں علی بن ابی طلحہ اور ابن الکلبی کی روایت سے غریب القرآن کی تشریحات منقول ہیں اور علی بن لیث کی روایت سے یہ نسخہ ابو صالح کاتب اللیث مصری کے پاس محفوظ تھا جسے وہ معاویہ بن ابی صالح کے واسطہ سے روایت کرتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اسی نسخہ پر اعتماد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس کی تحسین کی ہے۔ ❸

ان تفاسیر کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما غریب القرآن کی

---

❶ مقدمۃ الصحاح ص ٤٣۔ ❷ ج ١، ص ٧٢١۔

❸ فتح الباری ج ٨ ص ٣٢٢ الاتفاق للسیوطی ج ٢ ص ١٨٨۔١٨٩ منہ نسخہ بمکتبہ "شیخ الاسلام معارف حکمت بالمدینۃ المنورۃ ١٢۔

تشریح کے سلسلہ میں شعراور کلامِ عرب سے استشہاد میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے گو بعض دیگر صحابہ سے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرز پر غریب القرآن کی تشریحات منقول ہو۔ ❶

۳۔ غریب القرآن کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بعد ابان بن تغلب الجریری ۱۴۱ھ کا نام لیا جاتا ہے جو کہ قاری وفقیہ ہونے کے علاوہ نعت میں بھی عظیم پایہ رکھتے تھے اور علی بن علی بن حسین ابوجعفر اور ابوعبداللہ رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں، استاذ عطار لکھتے ہیں:

((.........سمع من العرب والف غریب القرآن وذکر شواھدہ من الشعر))❷

اور یہ ابان بن تغلب وہ ہیں جن سے امام مسلم رحمہ اللہ اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے یہ گو تشیع میں غالی تھے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفضیل کے قائل تھے، تاہم رافضی نہ تھے اور پھر روایت میں ثقہ تھے اس بنا پر محدثین نے ان سے روایت لی ہے۔❸

ان کے بعد بہت سے علماء نے معانی القرآن، مجاز القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر جمع کیں جن کے نام فہرست ابن الندیم کشف الظنون حاجی خلیفہ اور مفتاح السعادۃ میں مذکور ہیں ان میں حسب ذیل ائمہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء ۲۰۷ھ

۲۔ ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ التیمی ۲۱۰ھ

۳۔ ابوعلی محمد بن المستنیر المعروف بہ قطرب ۲۰۶ھ۔

۴۔ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن یحییٰ الیزیدی ۲۶۰ھ

۵۔ ابومحمد عبداللہ بن مسلم الدینوری المعروف بہ ابن قتیبہ ۲۷۶ھ

۶۔ ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن السری الزجاج ۳۱۰ھ

۷۔ امام راغب اصفہانی ۵۰۲ھ

علاوہ ازیں ابوعبید قاسم بن سلام اور ابن ترکمانی نے غریب القرآن کے نام سے کتابیں لکھی ہیں اور ابوالمعالی احمد بن علی البغدادی المعروف بابن سمین (۵۹۶ھ) کی مفردات القرآن کے متعلق امام سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وھو من احسن الکتب المؤلفة فی ھذا الشان))

سجستانی کی غریب القرآن حروف معجم کی ترتیب پر ہے اس لیے اس سے اخذ وتناول میں سہولت پائی جاتی ہے حجم کے اعتبار سے تقریباً راغب کی مفردات کے برابر ہے۔❹

ابوعبیدہ کے حالات میں مذکور ہے کہ انہوں نے مجاز القرآن، معانی القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر تالیف کیں، ❺ ان الفاظ سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مستقل تین کتابیں تصنیف کی ہیں مگر بعض علماء کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک ہی تالیف کے تین نام ہیں، مثلاً زبیدی طبقات النحویین میں لکھتے ہیں:❻

((سألت اباحاتم عن غریب القرآن لابی عبیدہ الذی یقال له المجاز))

اسی طرح ابن خیر الاشبیلی الفہرست میں لکھتے ہیں:❼

---

❶ مقدمہ الصحاح ٤٧.

❷ یاقوت ج١، ص١٠٨ کشف الظنون ج٢، ص١٠٧ طوسی ج٦، ص٤.

❸ ملخص من المیزان للذھبی ص ٦٠٥

❹ کشف الظنون مع حاشیہ کالم ١٢٠٧-١٢٠٨.

❺ الفہرست لابن الندیم ص ....

❻ ص ١٢٥.

❼ ١٣٤ ....

((واوّل کتاب جمع فی غریب القرآن ومعانیه کتاب ابی عبیدة معمر بن المثنیٰ هو کتاب المجاز))

علاوہ ازیں مجاز القرآن کے مختلف نسخوں پر نام میں اختلاف ہے جس سے ہماری تائید ہوتی ہے چنانچہ اسماعیل صائب کے نسخہ میں پہلی جزء پر کتاب ''مجاز القرآن'' کا عنوان ہے اور اس کے آخر میں کتاب غریب القرآن ہے اور مراد مِلا کے نسخہ میں یہ عنوان ہے ''کتاب المجاز التفسیر غریب القرآن''

ابوعبیدہ کے معاصرین نے ان پر تنقید بھی کی ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ابوعبیدہ میں شعوبیت کے علاوہ خارجیت بھی تھی اور خالص عربی کلام سے قرآن کی تفسیر کے قائل تھے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ تفسیر بالرائی کی طرف مائل تھے اور محدثین وفقہاء اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ فراء (۔۲۱۱) اور اصمعی نے ابوعبیدہ کی مخالفت کی ❶ اور ابوحاتم نے ان کی مجاز القرآن کو تنقید کا نشانہ بنایا اور زجاج، زہری اور نحاس نے بھی یہی موقف اختیار کیا۔ ❷

مگر اس مخالفت کے باوجود ان کے بعد جن علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ ابوعبیدہ سے بے نیاز نہ ہو سکے۔ ابن قتیبہ نے اپنی ''المشکل'' اور ''الغریب'' دونوں کتابوں میں مجاز القرآن پر اعتماد کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں مجاز القرآن سے استفادہ کیا ہے۔ ❸

امام طبری (.....۳۱۰) نے اپنی تفسیر میں ان پر اعتماد تو کیا ہے مگر دوسرے علما کے اقوال وآراء نقل کر کے مناقشہ اور مقارنہ بھی کیا ہے، طبری کے علاوہ ابوعبداللہ الیزیدی الزجاج ابن درید نے ''الجمہرہ'' اور سجستانی نے غریب القرآن میں ان سے نقل کیا ہے اور متاخرین میں سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ہیں جنھوں نے فتح الباری میں کتاب المجاز سے استفادہ کیا ہے۔

ابن قتیبہ کی غریب القرآن جو دراصل ان کی کتاب ''مشکل القرآن'' کا تتمہ ہے جیسا کہ اس کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے اس موضوع پر اہم کتاب ہے، مؤلف نے اپنی ان دونوں کتابوں میں اہل بدعت پر تنقید کی ہے اور اہل سنت کے مسلک کو ثابت کیا ہے۔

ابن قتیبہ نے اپنے وقت کے تمام ائمہ سے استفادہ کیا ہے حتیٰ کہ آداب میں جاحظ رحمہ اللہ سے ان کی بعض کتابوں کی اجازت بھی حاصل کی، بعض مخالفین نے ان پر تشبیہ اور خارجیت کی تہمت لگائی ہے مگر یہ شدۃ تعصب کی بنا پر ہے ورنہ تو ابن قتیبہ رحمہ اللہ کو اہل سنت میں وہی اہمیت حاصل ہے جو جاحظ کو معتزلہ میں حاصل ہے یعنی جاحظ اگر خطیب معتزلہ ہیں تو ان کے مقابلے میں ابن قتیبہ رحمہ اللہ اہل سنت کے خطیب مانے گئے ہیں۔

ان کی مشکل اور غریب کو کنانی نے ''القرطین'' کے نام سے یکجا کر دیا ہے جو مصر میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، امیر قنوجی نے الاکسیر میں ابن قتیبہ کو مفسرین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

امام راغب رحمہ اللہ کی مفردات اس موضوع پر اہم کتاب ہے، قبل اس کے کہ ہم اس کے متعلق کچھ عرض کریں یہ واضح کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ امام راغب رحمہ اللہ کے بعد بھی متاخرین نے اس موضوع پر کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے ...... تحفۃ الاریب بما فی القرآن من الغریب'' لابی حیان نحوی (المتوفی ۷۴۵ھ) تراجم الاعاجم تالیف زین المشائخ محمد بن ابو القاسم الخوارزمی (۵۶۲ھ) اور مفردات القرآن سمین حلبی (۷۶۵ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں مگر ان سب کتابوں میں مفردات راغب کو جو شہرت اور امتیاز حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔

---

❶ تاریخ بغداد ۱۳/ ۲۵۵

❷ مقدمہ مجاز القرآن بحوالہ الزبیدی، ص ۱۲۵۔۱۲۶

❸ تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا مقالہ ''امام بخاری رحمہ اللہ اور مجاز القرآن''

مفردات میں راغب رحمہ اللہ نے تقریباً پندرہ سو نو اسی مواد سے بحث کی ہے قرآن کے بعض مواد متروک بھی ہیں تاہم وہ غیر اہم ہیں۔ مؤلف نے اپنی کتاب کو حروف تہجی پر ترتیب دیا ہے اور ہر کلمہ کے حروف اصلیہ میں سے اوّل حرف کی رعایت کی ہے۔طریق بیان فلسفیاتی ہے یعنی پہلے ہر مادہ کے جوہری معنی متعین کرتے ہیں پھر قرآن پاک میں مختلف آیات پر اس معنی کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تشریح لغت میں یہ طریق اُصولی حیثیت رکھتا ہے، اُصول لغت پر جن علماء نے تالیفات لکھی ہیں، انہوں نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے، تمام متعلقہ آیات کو سامنے رکھ لینے سے اس کلمہ کے صحیح معنی سمجھ میں آجاتے ہیں اور سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے ہر قسم کا اشتباہ دور ہو جاتا ہے۔

پھر مؤلف، الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں اشعار و محاورات اور احادیث کو بھی بطورِ شواہد پیش کرتے ہیں اور بعض علمائے تفسیر ولغت کے اقوال بھی بطورِ تائید پیش کرتے ہیں اور بعض مقامات پر وضاحت کے لیے اختلاف قراءات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔

کتاب کی افادیت اور اہمیت کے لیے یہی کافی ہے کہ اصحاب تفسیر کے علاوہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہ اللہ جیسے شارحین حدیث بھی امام راغب سے استفادہ کرتے ہیں، حضرت الامیر القنوجی ان کی مفردات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ومن احسنها المفردات للراغب ....)) وودریں باب اعتماد وجمہور مفسرین بر تحقیقات اوست

اس کتاب کا پورا نام "المفردات فی تحقیق مواد لغات العرب المتعلقة بالقرآن" ہے، مطبوعہ نسخوں پر ''المفردات فی غریب القرآن'' کا عنوان مرقوم ہے، ہم اس کے اُردو ترجمہ کو ''مفردات القرآن'' کے نام سے پیش کررہے ہیں، عربی ایڈیشن کے چار نسخے مطبوعہ ایران ومصر راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں، طبع کراچی میں بھی مصری نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اتنی بڑی اہم کتاب کا اب تک محقق ایڈیشن شائع نہیں ہوا، ہم یہ دُوسرا ایڈیشن پوری تحقیق سے شائع کررہے ہیں، اور اس کے ترجمہ وتحقیق میں مندرجہ ذیل کو ملحوظ رکھا ہے:

۱۔ بعض اہلِ علم احباب کے مشورہ کے مطابق عموماً لفظی یا حرفی ترجمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاہم اس میں حتی الوسع سلاست پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ ہر آیت کے تحت آیت اور سورۃ کا نمبر دے دیا ہے تاکہ سہولت سے مراجعت ہو سکے، مثلاً (۲۔۲۸) سے ہماری مراد سورۃ نمبر ۲ اور آیت نمبر ۲۸ ہے۔

۳۔ آیات کا ترجمہ عموماً مولانا فتح محمد صاحب جالندھری کا ہے لیکن بعض مقامات پر مؤلف کا مقصود ترجمہ ہی لکھ دیا گیا ہے۔

۴۔ پوری کوشش کی ہے کہ حاشیہ میں احادیث واشعار کی مکمل تخریج آجائے۔

۵۔ کتاب کے متن کی تصحیح میں عموماً تاج العروس اور لسان العرب پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ دیگر مراجع۔ سے بھی بلا واسطہ استفادہ کی کوشش کی گئی ہے۔

۶۔ ابتداء میں یہ خیال تھا کہ متروکہ مواد کو آخر میں بطورِ ضمیمہ شائع کر دیا جائے مگر عدیم الفرصتی اس میں حائل رہی اور ہم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا اُمور کی رعایت سے اس اُردو ایڈیشن میں وہ خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں جو عربی ایڈیشن میں نہیں ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس محنت کو قبول فرمائے اور اس کے بعد ''مفردات الحدیث'' کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔

امام راغب اصفہانی

امام راغب پانچویں اور چھٹی صدی کے علماء سے شمار ہوتے ہیں، ان کا پورا نام حسین بن محمد بن مفضل بن محمد ہے اور راغب اصفہانی کے

نام سے مشہور ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

((توفی سنة خمس مائة ونیف))

یعنی ۵۰۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں مگر امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ''بغیۃ الوعاۃ'' میں لکھتے ہیں:

((کان فی اوائل المائة الخامسه))

اور امام سیوطی رحمۃ اللہ اور ان کے بالتبع طاش کبریٰ زادہ نے ان کا نام فضل بن محمد رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے، مگر یہ ان کی فروگزاشت ہے، صحیح نام حسین بن محمد ہی ہے اور وفات ۵۰۲ھ ہے۔

تاریخ اخبار البشر کی غلطی:

سید محسن بن الحسینی صاحب ''روضات الجنات' کے حوالہ سے اپنی کتاب اعیان الشیعہ میں لکھتے ہیں:

''صاحب ''تاریخ اخبار البشر'' نے امام راغب کی وفات ۵۶۵ھ نقل کی ہے مگر یہ ان کی فاش غلطی ہے کیونکہ اس کے بعد انہوں نے خود ہی یہ تصریح کی ہے کہ امام موصوف علامہ جار اللہ زمخشری سے پہلے فوت ہوئے ہیں حالانکہ علامہ رحمۃ اللہ کی وفات بالاتفاق ۵۳۸ھ ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امام موصوف کا سنہ وفات ۵۶۵ھ ہو۔''

علاوہ ازیں حاجی خلیفہ امام راغب رحمۃ اللہ کی کتاب الذریعہ الی مکارم الشریعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

((ان الغزالی کان یستصحب کتاب الذریعه))

کہ امام غزالی مؤلف کی کتاب ''الذریعہ'' ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، اور امام غزالی کی وفات ۵۰۵ھ ہے، لہٰذا قرین قیاس یہ ہے کہ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ ان سے پہلے فوت ہوئے ہیں۔

امام راغب رحمۃ اللہ کی شخصیت:

مؤلف کی تالیفات خصوصاً مفردات القرآن اور محاضرات الادباء کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف جامع علوم وفنون ہونے کے ساتھ بلند پایہ صوفی بھی تھے چنانچہ صاحب ''روضات الجنات'' ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

((الراغب الاصفهانی صاحب لغة العرب والحدیث والشعر والحکمة والکلام وعلوم الاوائل وغیر ذالك و فضله اشهر من ان یوصف وکفاه منقبة قبول العامة والخاصة وفیما تحقق له من اللغة خاصة))[1]

اسی طرح یاقوت معجم الادباء میں لکھتے ہیں:

((احد اعلام العلم بغیر فن من العلوم ادبها وحکمتها له کتاب فی تفسیر القرآن قیل وهو الکبیر))

یعنی موصوف ''کوہ علم'' تھے اور ادب وفلسفہ بلکہ جملہ علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور انہوں نے قرآن پاک کی ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے۔

الغرض موصوف علم وفضل میں یگانۂ روزگار تھے اور ان کے فضل ومرتبہ کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ نے ان کا تذکرہ ''طبقات المفسرین'' میں کیا ہے اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ان کو لغت ونحو کے ائمہ سے شمار کرتے ہیں، علی بن محمد البیہقی نے اپنے ''تتمه صوان

[1] ص ۲۴۸۔۲۵۵.

الحکمة" میں انہیں حکماء کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور یاقوت نے ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا تعارف کروایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ہمہ فنی امام تھے اور بیک وقت تفسیر ولغت کے امام ہونے کے ساتھ بہت بڑے حکیم اور صوفی بھی تھے۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ اور شیعیت:

دار الحدیث رحمانیہ دہلی کے زمانہ میں جب راقم الحروف کو ایک سلسلے میں مفردات القرآن کا استیعاب سے مطالعہ کا اتفاق ہوا کہ بعض مقامات پر امام راغب رحمہ اللہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بجائے نام امیر المؤمنین کے لقب سے ذکر کرتے ہیں جس سے ذہن میں شک پیدا ہوا کہ غالبًا مؤلف شیعہ ہوں گے کیونکہ علمائے شیعہ کی یہ عادت ہے کہ وہ علی رضی اللہ عنہ نام کی بجائے انہیں امیر المؤمنین لکھتے ہیں مگر یہ خیال کر کے کہ بہت سے علماء واہل سنت بھی ایسے ہیں جو حضرت علی، حسن وحسین رضی اللہ عنہم کے ساتھ علیہ السلام لکھ دیتے ہیں اس لیے ضروری نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کی بجائے امیر المؤمنین لکھنے والا ضرور شیعہ ہی ہو۔

اب جب کہ مفردات کی اشاعت کے سلسلہ میں مؤلف کے تعارف کے لیے کتب تراجم اور تذکروں کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس ہوئی تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے مسلکاً شیعہ ہونے کی علامت ہی یہی ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کے لقب سے یاد کرے جیسا کہ صاحب ''روضات الجنات'' نے تصریح کی ہے اور پھر آخر میں لکھا ہے:[1]

((وهذه آية الفطن))

کہ یہ اس کے ذہین وفطین ہونے کی علامت ہے، اسے ہمیشہ یاد رکھیے، صاحب ''اعیان الشیعہ'' لکھتے ہیں:

''اکثر علماء نے تصریح کی ہے کہ امام راغب رحمہ اللہ معتزلی تھے، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ بھی تھے کیونکہ معتزلہ اور شیعہ عموماً اصول میں متحد ہیں اور اصحاب تراجم معتزلہ اور شیعہ کا تذکرہ ایک ساتھ کرتے ہیں۔''[2]

پھر صاحب روضات لکھتے ہیں:

''ان کی کتاب ''محاضرات الادباء'' کے مطالعہ سے گمان ہوتا ہے وہ کٹر سنی تھے۔''

پھر اس پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں مگر امام کی علمی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلکاً سنی شافعی تھے، علامہ سیوطی رحمہ اللہ "بغیة الوعاة" میں لکھتے ہیں:

''پہلے پہل میرا گمان یہ تھا کہ امام موصوف معتزلی تھے مگر جب میں نے ''القواعد الصغریٰ'' لابن عبدالسلام کی پشت پر زرکشی کے ہاتھ سے یہ لکھا ہوا پایا کہ امام فخر الدین رازی نے ''تاسیس التقدیس'' میں تصریح کی ہے کہ امام راغب ائمہ سنت میں سے تھے اور غزالی کے ہم پایہ تو میری یہ بدظنی دور ہوگئی خصوصاً جب کہ امام رازی جیسی شخصیت ان کی تقدیس کررہی ہے۔''[3]

ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ گو امام موصوف کے متعلق لوگوں نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے مگر سیوطی رحمہ اللہ کی رائے اور ان کا آخری میلان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف علمائے سنت سے تھے۔ صاحب ''روضات الجنات'' کے الفاظ سے بھی اس کی تائید ملتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

((كان من الشافعية كما استفيد لنا من محاضراته))

تالیفات:

سید محسن نے ''اعیان الشیعہ'' میں اور بروکلمن نے تاریخ ادب العرب میں ان کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے کل دس کتابوں کا تذکرہ

---

[1] ص ٢٤٨. [2] ص ٢٤٨. [3] جزء ٢٧، ص ٢٢١، اعيان الشيعه.

کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) محاضرات الادباء: ...... یہ کتاب دس جلدوں میں ہے اور ۱۵۰۲ھ میں ابراہیم بن زیدان کی تصحیح سے قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے، اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آ گیا ہے، یہ کتاب عجائب وغرائب سے پر ہے اور نہایت دلچسپ۔ خوانشاری نے اسی کتاب کی بنا پر ان کے سنی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

(۳) حل متشابہات القرآن: ...... نام سے ظاہر ہے کہ مؤلف نے متشابہات پر سیر حاصل بحث کی ہو گی اس موضوع پر شیعہ علماء نے بھی بہت کچھ لکھا ہے، لیکن علمائے سنت نے عموماً اہل بدعت کی تردید کی غرض سے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔

(٤) الذریعہ الی مکارم الشریعہ: ...... اخلاق ناصری کی طرز پر فارسی میں ہے اس میں مؤلف نے کلیلہ ودمنہ سے بہت سی حکامات نقل کی ہیں اور عجیب وغریب اشعار نقل کیے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

زِصد ہزار محمد کہ درجہاں آید — یکے بمنزلۂ جاہِ مصطفیٰ نشود!

وگرچہ عرصۂ عالم ہزار علیؓ گردد — یکے بعلم و سخاوت بہ مرتضیٰ نشود

جہاں گرچہ زِموسیٰ وچوب خالی نیست — یکے کلیم نہ گردد یکے عصا نشود

(۵) درة التاویل فی غرة التنزیل: ...... اس کتاب میں مؤلف نے آیات کے تکرار کی حکمت اور متشابہات کے رموز بیان فرمائے ہیں، مفردات میں بعض مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے، حاجی خلیفہ اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ذکر انه صنفه بعد ما عمل کتاب المعانی الاکبر و املیٰ کتاب کتاب احتجاج القراء))

(٦) تحقیق البیان فی تاویل القرآن: ...... مصنف نے اپنی کتاب الذریعہ کے دیباچہ میں اس تالیف کا نام لیا ہے، حاجی خلیفہ اس کتاب کے تحت امام سیوطی رحمہ اللہ کے طبقات النحاۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مفردات القرآن ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن علماء نے الگ تالیف کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۷) افانین البلاغة: ...... صاحب کشف الظنون نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۸) کتاب الایمان والکفر: ...... عجیب وغریب طرز پر لکھی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اصول میں اشعری تھے۔

(۹) تفصیل النشأتین: ...... یہ کتاب پہلے ۱۳۱۹ھ میں بیروت سے شائع ہوئی، پھر امرتسر سے اُردو ترجمہ کے ساتھ دو کالموں میں اس کا خوبصورت ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

(۱۰) المفردات فی غریب القرآن: ...... جس کا اُردو ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔

(۱۱) کتاب المعانی الاکبر **(۱۲) کتاب احتجاج القراء**

هٰذَا آخر ما اَرَدْنَا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

محمد عبدہ الفلاح

قاسم منزل حاجی آباد لائل پور ۱۰/رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ

❀❀❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلوٰتُہٗ عَلٰی نَبِیِّہٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ اَجْمَعِیْنَ))

امابعد...... بندۂ ناچیز شیخ ابوالقاسم حسین بن محمد بن افضل الراغب (خدا اس پر رحم فرمائے) درگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے انوار قدسیہ سے نور ایمان عطا فرمائے جس کے ذریعہ ہم خیر و شر کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ سکیں اور حق و باطل میں کما حقہ تمیز کر سکیں حتی کہ اس پسندیدہ گروہ میں شامل ہو جائیں جن کا نور ایمان قیامت کے دن ان کے سامنے اور دائیں طرف سے ضوء افشانی کرتا جاتا ہے اور جن کی تعریف میں قرآن فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۴۸-۴)

''وہ ذات ہے جس نے مومنین کے دلوں میں طمانیت اور تسلی نازل فرمائی۔''

﴿اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ (۵۸-۲۲)

''یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو راسخ کر دیا اور ان کی روحانی تائید فرمائی ہے۔''

قبل ازیں ہم اپنی کتاب ''الرسالۃ المنبھۃ علی فوائد القرآن'' میں اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا ہے اور دین اسلام کو تمام ادیان کا ناسخ اور اسے ہر پہلو سے جامع و مکمل بنایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (۵-۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور بحیثیت دین تمہارے لیے اسلام پسند کیا۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر نازل کردہ کتاب یعنی قرآن پاک میں تمام سابقہ کتب سماویہ کے مطالب و مضامین کا نچوڑ اور خلاصہ جمع کر دیا ہے چنانچہ قرآن پاک کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ﴾ (البلد)

''وہ (نبی کریم) پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے جس میں سیدھے (اور دین کو قائم رکھنے والے) نوشتے ہیں۔''

اور اس نے قرآن پاک کو یہ اعجاز بخشا ہے کہ ضخامت و حجم میں مختصر ہوتے ہوئے بھی معنوی عظمت اور مضامین کی وسعت کے لحاظ سے وہ اتھاہ سمندر ہے کہ انسانی عقل و فراست ان کے ادراک سے عاجز ہے اور اس کائنات کے اسباب و وسائل اس کے مضامین کی گہرائیوں تک پہنچنے سے قاصر ہیں، چنانچہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ﴾ (۳۱-۲۷)

''اور زمین کے جتنے بھی درخت ہیں، اگر وہ قلم بن جائیں اور موجودہ سمندر سات گنا بڑھ جائیں، ان سے سیاہی کا کام لیا

جائے تو بھی اللہ کے کلمات ختم ہونے کے نہیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

ہم نے اپنی کتاب "الذریعة الی مکارم الشریعة" میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قرآن پاک کے انوار و برکات سے ہر شخص اپنی (علمی و روحانی) استعداد کے مطابق روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس کی تلاوت سے بقدر ظرف مستفید ہوسکتا ہے، اس لیے کہ بقول: ❶

(۱) کَالْبَدْرِ مِنْ حَیْثُ الْتَفَتَّ رَأَیْتَهُ یُهْدِی اِلٰی عَیْنَیْكَ نُوْرًا ثَاقِبًا

(۲) کَالشَّمْسِ فِیْ کَبِدِ السماء وَضَوءُ هَا یَغْشَی الْبِلَادَ مَشَارِقًا وَمَغَارِبًا

"اس کی مثال ماہ کامل کی ہے جس پہلو سے بھی اس کی جانب دیکھو گے وہ تمہاری آنکھوں کو نور اور بینائی بخشے گا دیا، سورج کی مانند ہے جو وسط آسمان میں نمودار ہوتا ہے، مگر اس کی روشنی مشرق و مغرب تک پھیلی ہوتی ہے۔"

لیکن اس کے محاسن انوار سے صرف اصحاب بصیرت ہی مستنیر ہو سکتے ہیں اور اس کے پاکیزہ معانی اور مطالب سے پاک باز اور برگزیدہ نفوس ہی فیض یاب ہوتے ہیں اور اس کے اکسیری نسخوں سے صرف پاکیزہ طبائع ہی شفایاب ہوسکتی ہیں چنانچہ قرآن پاک نے خود اس کی تشریح کی ہے کہ:

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ o فِیْ کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ o لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَo﴾ (۵۶۔۷۷،۷۸،۷۹)

"یقیناً یہ ایک باعزت کتاب مکنون میں محفوظ ہے صرف پاک باز اور صالح لوگ ہی اس کے حقائق (و معارف) تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔"

نیز اس کے سامعین کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّشِفَآءٌ وَّالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَیْهِمْ عَمًی﴾ (۴۱۔۴۴)

"آپ کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن پاک) ایمان والوں کے لیے ہدایت و شفا ہے اور جو اس پر ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں پر گر انبار گزرتا ہے اور ان پر اس کے معانی مخفی رکھے جاتے ہیں۔"

اور اپنے رسالہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جس طرح خیر و برکت کے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر اور کتا موجود ہو اسی طرح بصیرت افروز اور اطمینان بخش کیفیت اس دل میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتی جو حرص اور کبر و نخوت سے بھر چکا ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

﴿ اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثَاتِ وَالطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبَاتِ ﴾ (۲۴۔۲۶)

" ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے اور (اس طرح) پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لئے ہیں اور پاک باز مرد پاکباز عورتوں کے لئے۔"

نیز اپنی کتاب میں ہم نے اس زادِ راہ کو حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں جن کے ذریعہ انسان امکانی حد تک علوم و معارف میں بلند مقام حاصل کر سکتا ہے اور کتاب الٰہی کی مدد سے آسمان و زمین کے رازہائے سربستہ پر آگاہ ہوجاتا ہے اور پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ اپنے کلام کی توصیف میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ﴿ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ ﴾ (۶:۳۸) کہ ہم نے الکتاب

❶ قاله المتنبي في مدح سيف الدولة والبيت في ديوانه (۲۰۰۱) بشرح العكبري ومجموعة المعاني والاتقان للسيوطي ۱۲۸/۲ و بينهما ثالث كالبحر يقذف للقريب جواهراً جوداً و يبعث للبعيد سحائباً.

میں کسی چیز (کے ذکر کرنے) میں کوتاہی نہیں برتی۔ بالکل صحیح ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جن کی ہدایت کا اس نے ذمہ لیا ہے اور ان کی رفاقت میں بلند مرتبہ اور عالی مقام پر فائز فرمائے اس لئے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نصیب نہ ہو اسے کوئی بھی راہ راست پر نہیں لاسکتا چنانچہ فرمایا:

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (۵۶:۲۸)

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔''

ہم نے اس امر کی بھی وضاحت کردی ہے کہ علوم قرآن میں سب سے پہلے ان علوم کی ضرورت پیش آتی ہے جن کا تعلق نظم قرآن (الفاظ) سے ہے اور ان میں سب سے پہلے مفرد الفاظ کی تحقیق ضروری ہے لہٰذا قرآن کے مطالب ومعانی کی تحقیق کے لئے مفردات قرآن کے معانی حاصل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ عمارت بنانے کے لئے سب سے پہلے اینٹ (اور مسالہ) کا حصول ضروری ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مفردات قرآن کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے محض علوم قرآنی کے سمجھنے ہی میں مدد نہیں ملتی بلکہ اس طرح تمام علوم شرعیہ تک رسائی میں مدد ملتی ہے اس لیے کہ قرآن مجید کے کے مستعمل الفاظ عربی زبان میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا لب لباب اور مغز ہیں احکام ومسائل اور حِکم ومصالح کے استنباط میں فقہاء اور حکماء نے انہی الفاظ کو مبنیٰ قرار دیا ہے اور شعروسخن کے شہسوار بھی انہی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ قرآن کے استعمال کردہ مواد اور ان کے مشتقات کے علاوہ جو الفاظ بھی عربی زبان میں مستعمل ہیں ان کی حیثیت قرآن کے مستعمل الفاظ کے مقابلہ میں وہی ہے جو مغز اور رس کے مقابلہ میں گٹھلی اور چھلکے کو حاصل ہے۔

چنانچہ مفردات قرآن کو حرف ہجا کی ترتیب پر ایک جامع کتاب کی شکل میں تالیف کیلئے میں نے خدا کے حضور استخارہ کیا اس کتاب کی ترتیب میں ہم سب سے پہلے وہ کلمات لکھیں گے جن کے شروع میں الف آتا ہے اور پھر وہ جو حرف باؤ سے شروع ہوتے ہیں اس طرح پوری کتاب میں حروف تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی اس ترتیب میں ہم زوائد کو نظر انداز کر کے حروف اصلی (مادوں) کو پیش نظر رکھیں گے اسی طرح اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ان تعلقات کو بھی زیر بحث لایا جائے جو مستعار الفاظ اور ان کے مشتقات میں پائے جاتے ہیں اور الفاظ کے تعلقات کے متعلق اصول وقواعد اور ان کی تحقیق کو کسی دوسری کتاب میں زیر بحث لائیں گے جو مستقل اسی موضوع پر لکھی جائے گی اور جس کا ہم جابجا حوالہ بھی دیتے جائیں گے۔

اور اس سلسلہ میں جو کچھ ہم نے سپرد قلم کیا ہے اس پر کلی اعتماد کر لینے سے تمام وہ دشواریاں دور ہوجاتی ہیں جو مسابقت الی الخیر کی راہ میں حائل ہوسکتی ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۲۱:۵۷) (اپنے رب کی بخشش حاصل کرنے کے لیئے مسابقت کرو) کے فرمان سے ترغیب دی ہے۔ خدائے عزوجل ہمارے لئے اس راہ پر گامزن ہونا آسان فرمائے۔

انشاء اللہ بشرط زندگی اس کے بعد ایک ایسی جامع کتاب کی پیشکش کا ارادہ رکھتے ہیں جس میں الفاظ مترادف کی تحقیق اور ان کے معانی میں جو فرق پایا جاتا ہے اسے بالوضاحت بیان کیا جائے گا۔ جس سے کہ قرآن مجید کے ایک ہی مضمون میں استعمال کردہ مختلف الفاظ، مثلاً ایک جگہ قَلْبٌ دوسرے موقع پر فُؤَادٌ اور تیسرے مقام پر صَدْرٌ کا لفظ استعمال کرنے میں کیا مصلحت ہے...... کی توجیہ معلوم ہوسکے گی اسی طرح وہاں ہم یہ بھی بتائیں گے کہ ایک ہی قصہ کے خاتمے پر قرآن مجید میں ایک جگہ پر ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (۷۹:۱۶) ارشاد ہے اور دوسرے مقام پر ﴿لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (۲۱:۳۰) اسی طرح تیسرے مقام پر ﴿لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ (۲۴:۳۰) اور کہیں پر ﴿لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ﴾ مذکور ہے۔ تو اس میں کون سی لطافت پائی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ قرآن میں ﴿لِّاُولِي الْاَبْصَارِ لِذِيْ حِجْرٍ﴾ اور ﴿لِّاُولِي النُّهٰى﴾ وغیرہ کلمات جو مختلف مقامات پر استعمال ہوئے ہیں اور انھیں دیکھ کر سطحی اور ظاہر بین حضرات غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اور وہ انہیں مترادف الفاظ قرار دے کر بزعم خود سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کی تفسیر ﴿ الشكر لِلّٰهِ﴾ یا ﴿ لا

رَیْبَ﴾ کی تفسیر لاشک سے بیان کرکے بس قرآنِ مجید کی تفسیر کا پورا پورا حق ادا کردیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق سے ہماری رہنمائی فرمائے اور خلوص ہمارے شامل حال رہے اور جو علم ہمیں بخشا ہے اس کے ذریعہ ہمیں فائدہ پہنچائے اور اسے ہمارے زادِ آخرت بنائے جس کے لیے ہمیں بدیں الفاظ تاکید فرمائی ہے۔ ﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾ (۲:۱۹۷) اور زادِ راہ تیار کرو اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ نِعْمَ الْوَكِيْل﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا

کتاب الهمزة

أ: الف بامعنی کی تین قسمیں ہیں۔ایک وہ جو شروع کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔ تیسرا وہ جو آخر کلام میں آئے۔

(۱) وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے۔اس کی چند قسمیں ہیں:

(۱) الف اْلاِسْتِخْبَار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے بجائے الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ کیونکہ اس میں عمومیت ہے جو استفہام و انکار نفی، تبکیت، (زجر و توبیخ) تسویہ سب پر حاوی ہے۔ چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ (۲:۳۰) (انہوں نے کہا) کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے اور تبکیت ❶ یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور کبھی غیر کو چنانچہ (قسم اوّل کے متعلق) فرمایا: (۱) ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ﴾ (۴۶:۲۰) تم اپنی لذتیں حاصل کر چکے۔

(۲) ﴿اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ (۲:۸۰) کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے؟

(۳) ﴿آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ﴾ (۱۰:۹۱) کیا اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟ اور غیر مخاطب کے متعلق فرمایا:

(۴) ﴿اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا﴾ (۱۰:۲) کیا لوگوں کے لیے تعجب خیز ہے؟

(۵) ﴿اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ﴾ ❷ (۳:۱۴۴) تو کیا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں؟

(۶) ﴿اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ﴾ (۲۱:۳۴) بھلا اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

(۷) ﴿آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ (۶:۱۴۴) بتاؤ تو (خدا نے) دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادوں کو۔

اور معنی تسویة ❸ میں فرمایا: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْنَا

---

❶ هو شامل للانكار التوبيخي والابطالي وهما قسمان متقابلان معنى الاوّل ان ما بعد الهمزة واقع و ان فاعله معلوم كما يظهر من الامثله ۱، ۳، ٤ و معنى الثاني ان ما بعد الهمزة لم يقع و ان مدعيه كاذب كمايظهر من ۲،۵،٦،۷۔

❷ انقلبتم على اعقابكم و به يتم المثال.

❸ وليكن على ذكر منك ان الهمزة التي تدخل على جملة يصح حلول المصدر محلها يقال له همزة التسوية ولا يلزم ان يكون بعد كلمة "سواء كمال توهم نحو ما ابالي اقمت ام قعدت نعم لم يرد في القرآن الابعد كلمة "سواءٌ" رضى على الكافية ج۲ ص۲۷۵ ذذ: بعد سواء او جملة لا ابالي.

اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا﴾ (۲۱:۱۴)اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۶:۲)تم خواہ انہیں نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل ہو تو اسے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اَخَرَجَ (وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں نفی خروج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر نفی کے معنی نہ ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا اور جب کلام منفی پر داخل ہو تو اسے مثبت بنا دیتا ہے۔ کیونکہ کلامِ منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی ہوئی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا ہے۔ ❶ چنانچہ فرمایا:

﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (۷۔۱۷۲) کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟ (یعنی ضرور ہوں)

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ﴾ (۹۵۔۸) کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ یعنی ضرور ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ﴾ (۱۳۔۴۱) کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں؟

﴿اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ﴾ (۲۰۔۱۳۳) کیا ان کے پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔

﴿اَوَلَا يَرَوْنَ﴾ (۹۔۱۲۶) اور کیا یہ نہیں دیکھتے۔

﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ﴾ (۹۔۱۲۶)اور کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی؟

(۲) الف جو مضارع کے صیغہ واحد متکلم کے شروع میں آتا ہے اور ''میں'' کے معنی رکھتا ہے جیسے اَسْمَعُ وَاَبْصُرُ یعنی میں سنتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں۔

(۳) ہمزۂ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی جیسے فرمایا: ﴿اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۵۔۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

﴿رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ (۶۶۔۱۱) اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

(۴) الف جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے لیے آیا ہے جیسے فرمایا اَلْعَالَمِيْنَ (۱۔۱) تمام جہانوں۔

(۵) الف نداء جیسے أَزَيْدُ (اے زید) ❷

(ب) وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس کی پہلی قسم الف تثنیہ ہے، (مثلاً رَجُلَانِ) اور دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں پائی جاتی ہے، مثلاً مُسْلِمَاتٍ وَمَسَاكِيْنَ

(ج) اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا ہے۔ وہ یا تو تانیث کے لیے ہوتا ہے جیسے حُبْلٰى اور بَيْضَاءُ میں آخری الف یا پھر تثنیہ میں ضمیر کے لیے جیسا کہ اِذْهَبَا میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے، جیسے ﴿وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا﴾ (۳۳۔۱۰) ﴿فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا﴾ (۳۳۔۶۷) تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لیے آخر میں بڑھا دیا

---

❶ ولهذا عطف المثبت على المنفى فى سورة الانشراح (۱۔۲) والضحى (۶۔۷) والفيل (۲۔۳) والمعانى الهمزة غير الاستفهام راجع امالى الشجريه (۶٤ ۲+ ۲٦۸).

❷ ليس فى التنزيل نداء بغيرياء الاما قال الفراء فى الاية اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ الَّيْلِ (۳۹۔۱۰) ان الهمزة فيه لنداء خلافا للجمهور ولجوازه وجوه انظر المغنى لابن هشام ج ۱، ص ۵.

جاتا ہے (جیسا کہ ابیات کے اواخر میں الف اشباع بڑھادیتے ہیں۔)

ا ب ب

اَلْاَبُّ: اس گھاس کو کہتے ہیں جو جانوروں کے چرنے اور کٹنے کے لیے بالکل تیار ہو یہ اَبَّ لِکَذَا اَبًّا وَاَبَابَةً وَاَبَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کوئی کام کرنے کے لیے تیار ہو جانا کے ہیں، جیسے محاورہ ہے۔ اَبَّ اِلٰی وَطَنِہٖ وطن کا مشتاق ہو کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اَبَّ لِسَیْفِہٖ تلوار سونتنے کو مستعد ہو جانا اور اسی سے اِبَّانُ ذٰلِكَ کی ترکیب ہے جس میں اِبَّانَ بروزن فِعْلَانَ ہے، ❶ یعنی وہ زمانہ جو کسی کام کرنے کے لیے بالکل مناسب ہو۔

قرآن میں ہے:

﴿وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ (۸۰۔۳۱) اور میوے اور چارہ۔

ا ب د

اَلْاَبَدُ: ایسے زمانہ دراز کے پھیلاؤ کو کہتے ہیں۔ جس کے لفظ زمان کی طرح ٹکڑے نہ کیے جاسکیں۔ یعنی جس طرح زَمَانَ كَذَا (فلاں زمانہ) کہا جاسکتا ہے اَبَدُ كَذَا نہیں بولتے، اس لحاظ سے اس کا تثنیہ اور جمع نہیں بننا چاہیے۔ اس لیے کہ اَبَدٌ تو ایک ہی مسلسل جاری رہنے والی مدت کا نام ہے جس کے متوازی اس جیسی کسی مدت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ اسے ملا کر اس کا تثنیہ بنایا جائے۔ قرآن میں ہے: ❷

﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا﴾ (۹۸۔۱۱) وہ ابدالا باد ان میں رہیں گے۔

لیکن بعض اوقات اسے ایک خاص مدت کے معنی میں لے کر آبَادٌ اس کی جمع بنالیتے ہیں جیسا کہ اسم جنس کو بعض افراد کے لیے مختص کر کے اس کا تثنیہ اور جمع بنالیا جاتا ہے بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ اٰبَادٌ جمع مُوَلَّدْ ہے۔ خالص عرب کے کلام میں اس کا نشان نہیں ملتا اور اَبَدُ اَبِيْدٍ وَاَبَدُ اَبِيْدٍ (ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) میں دوسرا لفظ محض تاکید کے لیے لایا جاتا ہے۔ تَاَبَّدَا الشَّیْءُ کے اصل معنی تو کسی چیز کے ہمیشہ رہنے کے ہیں مگر کبھی عرصہ دراز تک باقی رہنا مراد ہوتا ہے۔ اَلْاٰبِدَةُ وحشی گائے والجمع اوابد (وحشی جانور تَاَبَّدَ الْبَعِيْرُ (وابد) اونٹ بدک کر وحشی جانور کی طرح بھاگ گیا۔ تَاَبَّدَ وَجْهُ فُلَانٍ وَاَبِدَ (اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے) بعض کے نزدیک اس کے معنی غضب ناک ہونا بھی آتے ہیں۔ ❸

ا ب ق

ابق (س ص) اَلْعَبْدُ اَبَاقًا۔ غلام بھاگ گیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ (۳۷۔۱۴۰) جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی میں پہنچے آبِقٌ (صفت فاعلی) بھاگا ہوا غلام والجمع

---

❶ وعند البعض وزن فِعّال: النون اصلية ...... اللسان والنهاية (ابن)

❷ وفي حديث الحج أَلِعَامِنَا هٰذَا أَمْ لِأَبَدٍ قَالَ بَلْ لِأَبَدِ أَبَدٍ اللسان (ابد).

❸ قال في اللسان وأَبِدَ عليه اَبَدًا غضب وفي اتباع في الغيب (ص ١١) عَبِدَ عليه وأَبِدَ وهما واحد غضب عليه فهما اى العين والهمزة من الابدال والمزدوج وجمع ايضًا الابدال لابي الطيب ج: ص ١٠، ٦١ والنوادر لابي سهل ٧٨-١٨٧.

اُبَّاق۔ تَاَبَّقَ الرجل۔ وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح چھپ گیا اور شاعر کے قول ❶

(۳) قد اُحْكِمَتْ حَكَمَاتُ الْقَدِّ وَالْاَبَقَا

"ان گھوڑوں کے چمڑے کے تسمے اور جوٹ کی کنپٹیاں کسی ہوئی ہیں۔"

میں بعض نے کہا ہے کہ اَبَقٌ کے معنی جوٹ یا اس کی رسی کے ہیں۔

ا ب ل

اَلْاِبِلُ۔ اونٹ کا گلہ۔ اس کا واحد اس مادہ سے نہیں آتا قرآن میں ہے: ﴿وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ﴾ (۶۔۱۴۴) اور دو اونٹوں میں سے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ (۸۸۔۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ اِبِلٌ بمعنی سحاب ہے یہ قول صرف معنیٰ تشبیہ کے اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ کثرت اسفار میں بادل اور اونٹ میں یک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ ❷

اَبَلَ الوحشی ابولا واَبَلَ اَبَلاً۔ وحشی جانور کا اونٹ کی طرح پانی سے بے نیاز ہونا۔ تَابَّلَ الرجل عن امرءته۔ عورت سے مقاربت ترک کرنا اَبَّلَ الرجل۔ بہت اونٹوں والا فلاں لا یأبل فلاں اونٹ پر جم کر سوار نہیں ہوسکتا۔ رجل اٰبِلٌ واَبِلٌ اونٹوں کا اچھی طرح انتظام کرنے والا ابل مؤبلة اکٹھے کیے ہوئے اونٹ الاِبَالة۔ لکڑیوں کا گٹھا۔ ❸ اور آیت کریمہ: ﴿وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ (۱۰۵۔۳) میں اَبَابِيل کے معنی یہ ہیں کہ ان پر پرندے اونٹوں کی مختلف ٹکڑیوں کی طرح قطار در قطار بھیجے گئے اور ابابیل کا واحد اِبِّيْلٌ ہے۔ ❹

ا ب و

اَلْاَبُ۔ اس کے اصل معنی تو والد کے ہیں (مجازاً) ہر اُس شخص کو جو کسی شے کی ایجاد، ظہور یا اصلاح کا سبب ہوا سے اَبُوْہُ کہہ دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ﴾ (۳۳۔۶) میں آنحضرت کو مومنین کا باپ قرار دیا گیا ہے۔ ایک قرأت میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ بھی آیا ہے۔ ❺ نیز مروی ہے کہ آنحضرت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ❻ (۱) انا وانت ابو هٰذه

---

❶ قاله زهير بن ابى سلمى بن رباح المزنى وصدره القائد الخيل منكوبًا دوابرها ..... انظر للبيت ديوانه ۱۲ بمشرحه للاعلم الشنتمرى (ليدن ۱۳۰۶) والمختارات ۴۹ ومختار الشعر، مجاهلى ج ۱ ص ۱۷۲ والعقد الثمين ۸۵ والمحكم (حكم) والاشتقاق ۷۶.

❷ قال ابو عمرو بن العلاء من جعله السحاب قرء الى الابل (بتشديد اللام) اعراب ثلاثين ۷۰، الكشاف ۴ : ۲۰۷، والبحر المحيط (۸ : ۴۶۴ واللسان (ابل) وروح المعانى ۳۰ : ۱۱۶ وفى غريب القرآن للقتبى ۴ اشارة اليه.

❸ وفى المثل ضغث على ابالة ومعناه البلية على اخرى الميدانى رقم ۲۲۰۲.

❹ وعند الفراء والاخفش لا واحدله وعند الكسائى واحده ابول مثل عجاجيل وعجول ويمكن ان يكون واحدهٔ ايبالة مثل دينار ودنانير رابع.

❺ ذكر المؤلف هذا القراءة ايضًا فى المحاضرات (۴ : ۴۳۴) وهذه قراة ابى فى مصحفه ومنقول عن ابى عباس. مجاهد وعكرمة ثم نسخ كما يعلم من رواية كنز العمال ۱۸۶۴ والدر ۵ : ۱۸۳.

❻ لم اجدهٔ فليتظر من اخرجهٔ ۱۲.

الامۃ کو میں اور تم اس امت کے باپ ہیں۔ نیز اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا۔ ❶

کل سبب ونسب منقطع یوم القیامۃ الا سببی ونسبی کہ قیامت کے دن میرے تعلق و رشتہ کے سوا تعلقات اور رشتے منقطع ہوجائیں گے۔ اور میزبان کو ابوالاضیاف کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ مہمانوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

ابو الحرب ۔لڑائی کا بھڑکانے والا۔ بڑا جنگجو

ابو عُذْرِتِھَا ۔مرد دوشیزگی ربائے زن (مجازا) موجد

اَلْاَبْوَان ۔یہ لفظ ماں باپ، باپ دادا۔ نیز باپ چچا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰھَکَ وَاِلٰہَ اٰبَائِکَ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰھًا وَّاحِدًا﴾ (۲۔۱۳۲) میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے (تو) انہوں نے کہا آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ، دادا ابراہیمؑ، اسماعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے۔ میں حضرت اسماعیل کو یعقوب علیہما السلام کے آباء کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے، حالانکہ وہ حضرت یعقوب کے چچا تھے۔ اور کبھی استاد اور معلم پر بھی اَبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کا روحانی مربی ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَجَدْنَآ اٰبَاءَ نَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ﴾ (۴۳۔۲۲) میں بعض نے کہا ہے ❷ کہ آباء سے مراد وہ علماء ہیں جو ان کی علمی اور روحانی تربیت کرتے تھے۔ کیونکہ دوسری جگہ آیت: ﴿رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا﴾ (۳۳۔۶۷) میں ان آباء کو سادۃ اور کبراء کہا ہے بعض نے کہا ہے کہ آیت: ﴿اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ﴾ (۳۱۔۱۴) میں وَالِدَیْن سے باپ اور معلم مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ﴾ (۳۳۔۴۰) کہ محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں ...... میں نفی ابوۃ بلحاظ ولادت کے ہے۔ نیز تنبیہ کی ہے کہ متبنیٰ حقیقی اولاد کا حکم نہیں رکھتا۔

اَبٌ کی جمع آبَاءٌ ہے کبھی بُعُوْلَۃٌ اور خُئُوْلَۃٌ (جمع بعل و خال) کی طرح اس کی جمع اُبُوَّۃٌ بھی آجاتی ہے، اصل میں اَبٌ (اَبَوٌ) بروزن فَعَلٌ ہے اور شاعر کے قول ❸

---

❶ رواہ الدار قطنی عن ابن عباس مرفوعًا فی حدیث طویل وقال فی آخرہ۔ تفرد بہ خارجۃ ولیس بثقۃ قال السیوطی روی لہ الترمذی وابن ماجہ وقال ابن عدی ھو ممن یکتب حدیثہٗ اللالی للسیوطی: ۲۶۵ والحدیث فی المجاز لابی عبیدۃ ۲: ۱۷۸ رواہ الحاکم فی المستدرک (۳: ۱۴۲) من حدیث عمرؓ فی قصۃ نکاح ام کلثوم وقال فی آخرہ فانا احببت ان یکون بینی وبین رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سبب ونسب قال الذھبی فی تلخیص المستدرک منقطع وایضًا راجع التذکرۃ للذھبی.

❷ قد بلغنا من المجد غایتاھا۔ وفی العینی (شرح شواھد الکبری علی ھوامش الخزانہ ۱: ۱۳۳) انہ لابی النجم ویقال انہ لرویۃ ولیس فی دیوانہ وفی النواد رلابی زید الانصاری بروایۃ المفضل الضبی عن ابی الغول لبعض اھل الیمن قال السیوطی فی شرح شواھدہ ۴۸: قیل ان الرجز لرؤیۃ وعزاہ الجوھری لابی النجم وراجع للشطر الاول اللسان (ابا) والخزانۃ البغدایۃ (۳: ۳۳۷) وابن عقیل (۱: ۴۱) ومعانی القرآن (المنسوب الی الزجاج) ۲۰۴ والمغنی (۱: ۱۳۱) والشطر الثانی (۱: ۳۷) واسرار الانصاری ۴۶ وعزاہ صاحب التحقیق الیٰ ابی النجم (العجل من بنی بکر بن وائل المتوفی سنہ ۱۳۰ھ) وفی البلدان (ابو قبیس) وذکر الیاقوت نحتا فی اعراب ابی قبیس (جبل فی مکۃ) وقال ینسب فیہ لحن الی ابی حنیفۃ والقصۃ ایضًا فی العقد الفرید (۲: ۴۸۲) والعھدۃ علیہ وانظر ایضًا دفاع الکھنوی فی التعلیق الممجد (مقدمہ) وقد فارھنا عرق العینی واطال البحث فی شرح شواھد (۱: ۱۳۸۔ ۱۳۹).

(۴) اِنَّ اَبَاھَا وَاَبَا اَبَاھَا۔

"اس کا باپ اور دادا۔"

میں اسے قفًا کا حکم دیا گیا ہے یعنی قفًا کی طرح اسم مقصور سمجھ کر نصبی جری حالت میں الف کو ثابت رکھا گیا ہے،

محاورہ ہے: اَبَوْتُ الْقَوْمَ (میں قوم کا باپ بن گیا) فلان یـأبُـوبَهْـمَـهٗ ۔(وہ اپنے جانوروں کی باپ کی طرح حفاظت کرتا) اور ندا کی حالت میں اَبٌ پر تا زیادہ کرکے یا اَبَـتِ (اے میرے باپ) کہا جاتا ہے۔ ❶ بَـأبَـأ الصَّبِیّ (حکایت) بچے نے بابا کہا۔

اب ی

اَلْاِبَـاءُ کے معنی شدت امتناع یعنی سختی کے ساتھ انکار کرنا ہیں۔ یہ لفظ الامتناع سے خاص ہے لہٰذا ہر اباء کو امتناع کہہ سکتے ہیں مگر ہر امتناع کو ابـاء نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے۔ ﴿وَیَأْبَی اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ﴾ (۹۔۳۲) اور خدا اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں۔ ﴿وَتَـأْبٰی قُـلُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۸) لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ ﴿اَبٰـی وَاسْتَـكْبَـرَ﴾ (۲۔۳۴) اس نے سختی سے انکار کیا اور تکبر کیا اِلَّآ اِبْـلِیْسَ اَبٰی (۱۵۔۳۱) مگر ابلیس نے انکار کردیا۔

ایک روایت میں ہے ❷ (۳) ﴿كُـلُّـكُـمْ فِی الْـجَنَّةِ اِلَّا مَنْ اَبٰی﴾ (کہ) تم سب جنتی ہو مگر وہ شخص جس نے (اطاعت الٰہی سے) انکار کیا۔

رَجُـلٌ اَبِیٌّ ۔خوددار آدمی جو کسی کا ظلم برداشت نہ کرے اَبَیْتَ الضَّیْرَ (مضارع تَاْبٰی) تجھے اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رکھے۔ تَیْـسٌ آبٰـی ۔وہ بکرا جو پہاڑی بکروں کا بول ملا ہوا پانی پی کر بیمار ہوجائے اور پانی نہ پی سکے اس کا مؤنث اَبْوَاءُ ہے۔

ا ت ی

اَلْاِتْیَانُ ۔(مص ض) کے معنی کسی چیز کے بسہولت آنا کے ہیں۔ اسی سے سیلاب کو اَتِـیٌّ کہا جاتا ہے ❸ اور اسی سے بطور تشبیہ مسافر کو اَتَاوِیٌّ کہہ دیتے ہیں۔

الغرض اِتْیَـان کے معنی "آنا" ہیں خواہ کوئی بذاتہ آئے یا اس کا حکم پہنچے یا اس کا نظم ونسق وہاں جاری ہو یہ لفظ خیر وشر اور اعیان و اعراض سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّـاعَةُ﴾ (۶۔۴۰) اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو اَتٰـی اَمْـرُ الـلّٰـهِ (۱۶۔۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آہی پہنچا۔

اور آیت کریمہ ﴿فَـاَتَـی اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ﴾ (۱۶۔۲۶) میں اللہ کے آنے سے اس کے حکم کا عملاً نفوذ مراد ہے جس طرح کہ آیت وَجَاءَ رَبُّكَ (۶۔۴۰) میں ہے اور شاعر نے کہا ہے۔ ❹

---

❶ انظر الایات (۳۷۔۱۰۲) (۱۹۔۴۲۔۴۵).

❷ رواہ البخاری من حدیث ابی ہریرۃ ۱۲.

❸ قارن النوادر لابی مسحل وفی النھایۃ (۱:۱۷) عکسہ الاتیّ والاتاوی فی الاصل الغریب ویقال للسیل الذی یاتی من بعید اتی واتاوی ومنہ قیل الطریق مسلوک "میتاء کما فی حدیث اللقطۃ الفائق (۱۔۷).

❹ انظر الکلمۃ النوادر لابی مسحل (۶۔۷) وھو منسوب الی اتی والقیاس اتوی کما فی عدی وعدوی زیدت فیہ الالف للنسبۃ اولاشباع اللفتحہ (۱۔۱۷)، ❺ لم اجدہ ولعلہ للاعشی وصدرہٗ: لکی یعلم الناس انی امرءٌ ...... وفی دیوانہ المعیشۃ بدل المروءۃ فلعل احد اللفظین مصحف مکان الآخر ۱۲.

(۵) اتیت المروءۃ مِنْ بَابِهَا ۔

تو جوانمردی میں اس کے دروازہ سے داخل ہوا اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ (۹۔۵۴) میں یَأْتُون بمعنی یَتَعَاطُوْنَ ہے یعنی مشغول ہونا اور آیت کریمہ: یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ (۴۔۱۵) میں الفاحشۃ (بدکاری) کے متعلق اتیان کا لفظ ایسے ہی استعمال ہوا ہے جس طرح کہ آیت کریمہ: ﴿لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا﴾ (۱۹۔۲۷) فری کے متعلق مجئ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (یعنی دونوں جگہ ارتکاب کے معنی ہیں)

اور آیت (مذکورہ) میں ایک قراءت تَاْتِی الْفَاحِشَةَ بھی ہے اور یہ اَتَیْتُهٗ وَاَتَوْتُهٗ (واوی اور یائی) دونوں طرح آتا ہے۔ ❶ چنانچہ (دودھ کے) مشکیزہ کو بلونے سے جو اس پر مکھن آ جاتا ہے، اسے اتوۃٌ کہا جاتا ہے لیکن اصل میں اَتُوَّۃ اس آنے والی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے حاصل ہو کر آئے لہٰذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔

اَرض کثیرۃ الاِتَاءِ ۔ زرخیز زمین جس میں بکثرت پیداوار ہو اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا﴾ (۱۹۔۶۱) بے شک اس کا وعدہ آیا ہوا ہے) میں مَاْتِيًّا (فعل) اتیته سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں مَاْتِیًا بمعنی آتِیًا ہے (یعنی مفعول بمعنی فاعل) ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ محاورہ میں اتیتُ الْاَمْرَ وَاَتَانِی الْاَمْرُ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ ❷

اَتَیْتُهٗ بکذا واتیتُهٗ کذا ۔ کے معنی کوئی چیز لانا یا دینا کے ہیں قرآن میں ہے:

﴿وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ (۲۔۲۵) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔ ﴿فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا﴾ (۲۷۔۳۷) ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس سے مقابلہ کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔ ﴿وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيْمًا﴾ (۴۔۵۴) اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

جن مواضع میں کتاب الٰہی کے متعلق آتَیْنَا (صیغہ معروف متکلم) استعمال ہوا ہے وہ اُوْتُوْا (صیغہ مجہول غائب) سے ابلغ ہے (کیونکہ) اُوْتُوْا کا لفظ کبھی ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت نہ ہو مگر آتَیْنَا کا صیغہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے، جب دوسری طرف سے قبولیت بھی پائی جائے اور آیت کریمہ ﴿اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ﴾ (۱۸۔۹۶) تو تم لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ۔ میں ہمزہ نے الف موصولہ (اِئْتُوْنِیْ) کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی جِیْئُوْنِیْ کے ہیں۔

اَلْاِیْتَاءُ (افعال) اس کے معنی اِعْطَاءٌ یعنی دینا اور بخشنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں بالخصوص صدقات کے دینے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ (۲۔۲۷۷) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں ﴿وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ﴾ (۲۱۔۷۳) اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا ﴿ولا

---

❶ الواو لغة هذيل يقال: ما احسن أتويدى الناقة واتى يديها قال خالد بن زهيره يا قوم مابال ابى۔ كنت اذا اتواته من غيب (انظر الامالى ۲۔۲۰۵) واللسان (اتى).

❷ يعنى يعدى بحرف الجر وهمزة الافعال ۱۲۔

یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ آتَیْتُمُوْھُنَّ﴾ (۲۔۲۲۹) اور یہ جائز نہیں ہے کہ جو مہر تم ان کو دے چکو اس میں سے کچھ واپس لے لو ﴿وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ﴾ (۲۔۲۴۷) اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔

ا ث ث

اَلْاَثَاثُ ۔ وافر رخت خانہ اصل میں یہ اَثَّ (ن) سے مشتق ہے جس کے معنی زیادہ اور گنجان ہونا کے ہیں۔ پھر یہ لفظ (اَثَاث) ہر قسم کے فراواں مال پر بولا جانے لگا ہے اور مَتَاعٌ کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آ تا اس کی جمع اِثاث (بکسر الھمزہ) ہے۔ نِسَاءٌ اَثَائِثُ ۔ پر گوشت عورتیں گویا گوشت ان پر دافر سامان کی طرح چڑھا ہوا ہے تَاَثَّثَ فُلَانٌ۔ فلاں بہت زیادہ مالدار ہو گیا قرآن میں ہے ﴿ھُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْیًا﴾ (۱۹۔۷۴) وہ ساز و سامان میں زیادہ تھے اور خوش منظر بھی ﴿اَثَاثًا وَّمَتَاعًا﴾ (۱۶۔۸۰) یعنی ساز و سامان

ا ث ر

اَثَرُ الشَّیْءِ (بقیہ علامت) کسی شی کا حاصل ہونا جو اصل شی کے وجود پر دال ہو اس سے فعل اَثَرَ (ض) و اَثَّرَ (تفعیل) ہے اَثَرٌ کی جمع آثَارٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰٓی آثَارِھِمْ بِرُسُلِنَا﴾ (۵۷۔۲۷) پھر ہم نے ان کے پیچھے اور پیغمبر بھیجے ﴿وَآثَارًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۴۰۔۲۱) اور زمین میں نشانات بنانے کے لحاظ سے ﴿فَانْظُرْ اِلٰٓی آثَارِ رَحْمَۃِ اللّٰہِ﴾ (۳۰۔۵۰) تم رحمت الٰہی کے نشانات پر غور کرو، اسی سے ان طرق کو آثار کہا جاتا ہے جن سے گزشتہ لوگوں) کے اطوار و خصائل) پر استدلال ہو سکے جیسے فرمایا: ﴿فَھُمْ عَلٰٓی آثَارِھِمْ یُھْرَعُوْنَ﴾ (۳۷۔۷۰) سو وہ انہیں کے نقش قدم پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ ﴿ھُمْ اُولَآءِ عَلٰٓی اَثَرِیْ﴾ (۲۰۔۸۵) وہ میرے طریقہ پر کاربند ہیں۔

اسی سے مشہور محاورہ ہے سَمِنَتِ الْاِبِلُ عَلٰی اَثَارَۃٍ اَثَرٍ من شَحْمٍ فربہ شدند شتران بر بقیہ پیہ کہ پیش ازیں بود اَثَرْتُ الْبَعِیْرَ ۔ میں اونٹ کے تلوے پر نشان لگایا تا کہ (گم ہو جانے کی صورت میں) اس کا کھوج لگایا جا سکے۔ اور جس لوہے سے اس قسم کا نشان بنایا جاتا ہے اسے اَلْمِئْثَرَۃُ کہتے ہیں۔

اَثَرُ السَّیْفِ ۔ تلوار کا جوہر جو اس کی عمدگی کا نشان ہوتا ہے۔ سَیْفٌ مَأْثُوْرٌ۔ جوہر دار تلوار۔

اَثَرْتُ (ن) الْعِلْمَ اَثْرُہٗ اَثْرًا و اِثَارَۃً وَّاُثْرَۃً ۔ کے معنی ہیں علم کو روایت کرنا در اصل اس کے معنی نشانات علم تلاش کرنا ہوتے ہیں اور آیت ﴿اَوْ اَثَارَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ﴾ [1] (۴۶۔۴) میں اَثَارَۃٍ سے مراد وہ علم ہے جس کے اثار (تا حال) روایت یا تحریر کی وجہ سے باقی ہوں ایک قراءت میں اَثَرَۃٍ ہے یعنی اپنے مخصوص علم سے اَلْمَآثِرِ انسانی مکارم جو نسلاً بعد نسل روایت ہوتے چلے آتے ہیں اسی سے بطور استعارہ اَثَرٌ بمعنی فضیلت بھی آ جاتا ہے اور اَلْاِیْثَارَ (افعال) کے معنی ہیں (ایک چیز کو اس کے افضل ہونے کی وجہ سے دوسری پر) ترجیح دینا اور پسند کرنا اس سے آثَرْتُہٗ ہے۔ یعنی میں نے اسے پسند کیا۔ قرآن پاک میں ہے:......

﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ﴾ (۵۹۔۹)

[1] انظر ایضًا (۱۸۔ ٦٤) (۲۰۔٩٦).

دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں ﴿تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا﴾ (۱۲۔۹۱) بخدا اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت بخشی ہے۔ ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیَاۃَ الدُّنْیَا﴾ (۸۷۔۱۶) مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

(۵) حدیث میں ہے:...... سَیَکُوْنُ بَعْدِیْ اَثَرَۃٌ[1] (میرے بعد تم میں خود پسندی آجائے گی) یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے کو دوسروں سے بہتر خیال کرے گا۔

اَلْاِسْتِئْثَارُ۔ یعنی کسی چیز کو اپنے لیے مخصوص کر لینا اور (محاورہ میں) اِسْتَاْثَرَ اللّٰہُ بِفُلَانٍ فلاں کی موت سے کنایہ ہوتا ہے اس میں تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرف بخشی کے لیے اسے چن لیا ہے اور اپنے لیے خاص کر لیا ہے۔

رَجُلٌ اَثِرٌ جو اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دے۔ لحیانی[2] نے حکایت کی ہے خُذْ اَثِرًا ما، وَاثِرًا مَّا، وَاٰثِرَ ذِی اَثِیْرٍ یعنی سب سے پہلے یہ کام کرو۔[3]

ا ث ل

اَثْلٌ (جھاؤ کا درخت) قرآن میں ہے:...... ﴿ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ﴾ (۳۴۔۱۷) "یعنی دو ایسے باغ دیئے" جن کے میوے بدمزہ اور جھاؤ اور کچھ سبزیاں تھیں

اَثَلَ۔ یعنی وہ درخت جس کی جڑ خوب مضبوط ہو اسی سے شَجَرٌ مُتَاَثِّلٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ درخت جس کی جڑ اثل کی طرح مضبوط ہو۔ تَاَثَّلَ کَذَا وہ چیز اثل کی طرح مضبوطی سے جم گئی اس نے جڑ پکڑ لی اور آنحضرت ﷺ کا وَصِیّ کے متعلق ﴿غَیْرَ مُتَاَثِّلٍ مَالًا﴾ (۵) فرمایا ہے[4] (یعنی یتیم کے مال سے بقدر ضرورت لے اور ذخیرہ اندوزی نہ کرے) یہ مال کے اذخار اور اقتناء سے کنایہ ہے اور اسی سے بطور استعارہ نَحَتَّ اَثْلَتَہٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی غیبت اور بدگوئی کرنا کے ہیں۔

ا ث م

اَلْاِثْمُ وَالْاَثَامُ۔ وہ (اعمال وافعال) جو ثواب سے روکنے اور پیچھے رکھنے والے ہوں اس کی جمع آثَامٌ آتی ہے چونکہ اس لفظ میں تاخیر اور بُطْءٌ (دیر لگانا) کا

---

[1] قالہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم للانصار والحدیث باختلاف الفاظہ وطرقہ فی البخاری ومسلم (۱۔۳۳۸) طبع انصاری ولیس فی شئی من الطرق سیکون فتنبہ لذالک والحدیث فی الکشاف ۲/۲۰۶ وفی الحدیث قصۃ ابی قتادۃ مع معاویۃ راجع الحاکم والبیہقی (تخریج احادیث الکشاف ۸۶ رقم ۱۸۷) والحدیث ایضًا فی النہایۃ واللسان (اثر).

[2] ابو الحسن علی بن مبارک او ابن خازم اللحیانی من بنی لحیان بن ہذیل بن مدرکہ اخذ عن الکسائی وابن زید وابی عمرو الشیبانی وطبقتھم وعمد تھم الکسائی راجع لترجمتہ بغیۃ الوعاۃ ۳۴۶ والفہرست ۷۲ و ۱۲۰ طبقات زبیدی ۲۱۳ والانباہ ۱: ۱۰۹۔ ۲/۲۵۵، ومعجم الادباء ۱۴/۱۰۶۔۱۰۸.

[3] راجع للکلمۃ المعاجم.

[4] راجع للحدیث الکشاف (۱: ۲۴۸) والمصنف لعبد الرزاق والطبری عن الحسن العرنی ومسند احمد وابن ماجہ والنسائی وابو داؤد من روایۃ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ وابن حبان من روایۃ صالح بن رستم عن جابر والکامل لابن عدی (ترجمہ صالح بن رستم) وابو نعیم فی الحلیۃ فی ترجمۃ عمر بن دینار وقال تفرد بہ الخزاز (صالح بن رستم ابو عامر الخزاز) وھو من ثقات البصریین وضعفہ ابن معین (راجع تخریج الکشاف ص ۳۸۔۳۹ رقم ۳۲۳) والنہایۃ ۱/ ۱۹ والفائق ۱/ ۸ وقالہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی وصی الیتیم وعمرؓ حین وقف ارضہٗ لمن ولیھا ایضًا مجمع البحار (اثل).

مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے شاعر نے اونٹنی کے متعلق کہا ہے۔ ❶ (المتقارب)

(۲) جَمَالِيَّةٌ تغتلى بالرادف
اذا كَذبَ الآثماتُ الهجيرا

وہ اونٹ کی طرح مضبوط ہے جب سست رفتار اونٹنیاں دوپہر کے وقت چلنے سے عاجز ہوجاتی ہیں تو یہ ردیف کو لے کر تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ (۲:۲۱۹) میں خمر اور میسر میں اثم کبیر کے یہ معنی ہیں کہ ان کا تناول (اور ارتکاب) انسان کو ہر قسم کے افعال خیر سے روک لیتا ہے۔اَثِمَ (س) اِثْماً وَاَثَاماً فَهُوَ آثِمٌ وَاَثِمٌ وَاَثِيمٌ (گناہ کا ارتکاب کرنا) اور تَاَثَّمَ (تفعل) کے معنی گناہ سے نکلنا (یعنی رک جانا اور توبہ کرنا) کے ہیں جیسے تَحَوَّبَ کے معنی حوب (گناہ) اور تحرج کے معنی حرج یعنی تنگی سے نکلنا کے آجاتے ہیں۔ ❷

اور (الکذب) (جھوٹ) کو اثم کہنا اس وجہ سے ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا گناہ ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ انسان کو حیوان کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے حیوان کہہ دیا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ ﴾ (۲۔۲۰۶) کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عزت نفس (اور ہٹ دھرمی) اسے گناہ پر اکساتی ہے اور آیت: ﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴾ (۲۵۔۶۸) میں آثام سے (مجازاً) عذاب مراد ہے اور عذاب کو اثام اس لیے کہا گیا ہے کہ ایسے گناہ (یعنی قتل وزنا) عذاب کا سبب بنتے ہیں جیسا کہ نبات اور شحم (چربی) کو ندی (نمی) کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ نمی سے نباتات اور (اس سے) چربی پیدا ہوتی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ❸ (طویل)

(۷) تعلى الندى فى متنه وتحدرا

اس کی پیٹھ پر تہ برتہ چربی چڑھی ہوئی ہے اور نیچے تک پھیلی ہوئی ہے۔بعض نے آیت کریمہ میں یَلْقَ اَثَامًا کے یہ معنی بھی کیے ہیں کہ مذکورہ افعال اسے دوسرے گناہوں پر برانگیختہ کریں گے کیونکہ (عموماً) صغائر گناہ کبائر کے ارتکاب کا موجب بن جاتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (۱۹۔۵۹) کی تفسیر بھی ان ہر دو وجہ سے بیان کی گئی ہے۔

اَلْآثِمُ ۔گناہ کا ارتکاب کرنے والا۔قرآن پاک میں ہے: آثِمٌ قَلْبُهٗ (۲۔۲۸۳) وہ دل کا گنہگار ہے۔

اور اِثم کالفظ بِرّ (نیکی) کے بالمقابل استعمال ہوتا

---

❶ قاله الاعشى فى مدح ناقته وقبلهٗ: بناجية كاتان الثميل. تقضى السرى بَعد اين عسيرا۔ وفى رواية تعتلى بالعين المهملة ومعناه تنهض وتطيق راجع ديوانه ۷۰ والاقتضاب ۱۹۹ واللآلى مع السمط (۸۳۱۱) والبحر (۲ : ۵۷) واللسان (اثم، غلا) والاعشى هو ميمون بن قيس ادرك الاسلام.

❷ ههنا سقط وخرم فى النسخ المطبوعة ولعل الصواب وتحرج خرج من حرجه اى ضيقة.

❸ البيت لعمرو بن احمر الباهلى واوله: كثور العداب الفرد يضر به الندى ...... وفى رواية المنعدآب بدل العداب والبيت فى اللسان (ندى) والاقتضاب ٤٤٠ والصاحبى ٩٥ وابن احمر هو ابو الخطاب عمرو بن احمر الباهلى شاعر فحل مخضرم مشهور بالفصاحة والغريب توفى فى خلافة عثمان (قبل سنة ٣٥ هـ) راجع الشعراء ٣١٥ والخزانة ٣ : ٣٨ والبيت ايضًا فى الصحاح والتاج والمحكم (عدب)١٢.

ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (٦)

(٦) اَلْبِرُّ مَا اطمَأَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ ❶ کہ نیکی وہ ہے جس پر طبیعت مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جس کے متعلق دل میں تردد ہو۔ یاد رہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے البر والاثم کی تفسیر نہیں بیان کی ہے بلکہ ان کے احکام بیان فرمائے ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ﴾ (٦٨۔١٢) میں اثیم بمعنی آثم آتا ہے اور آیت: ﴿يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (٥۔٦٢) (کہ وہ گناہ اور ظلم میں جلدی کر رہے ہیں) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ آثم سے آیت: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ﴾ (٥۔٤٤) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے (یعنی عدم الحکم بما انزل الله کفر) اور عُدْوَان سے آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ﴾ (٥۔٤٥) کے مفہوم کی طرف اشارہ (یعنی عدم الحکم بما انزل اللّٰه ظلم) اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ اثم عدوان سے عام ہے۔

ا ج ج

اَلْاُجَاجُ کے معنی سخت کھاری اور گرم پانی کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ (٢٥۔٥٣) ایک کا پانی نہایت شیریں اور دوسرے کا سخت گرم ہے۔ یہ (اُجاج) اجیج النار (شعلہ نار یا اس کی شدید تپش اور حرارت) وَاَجَّجْتُهَا وَقَدْ اَجَّجْتُ۔ میں نے آگ بھڑکائی چنانچہ وہ بھڑک اٹھی (وغیرہ محاورات) سے مشتق ہے۔

اِئْتَجَّ النَّهَارُ۔ دن گرم ہوگیا۔ اسی (اَجَّ) سے ﴿يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ﴾ (١٨۔٩٤) (٢١۔٩٦) ہے ان کے کثرت اضطراب کی وجہ سے مشتعل آگ یا موجزن اور متلاطم پانی کے ساتھ تشبیہ دے کر یاجوج ماجوج کہا گیا ہے۔

اَجَّ الظَّلِيْمُ اَجِيْجًا۔ شتر مرغ نہایت سرعت رفتار سے چلا۔ یہ محاورہ اشتعال نار کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

ا ج ر

اَلْاَجْرُ وَالْاُجْرَةُ کے معنی جزائے عمل کے ہیں خواہ وہ بدلہ دنیوی ہو یا اخروی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ (١١۔٢٩) میرا اجر تو خدا کے ذمے ہے۔ ﴿وَاٰتَيْنَاهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (٢٩۔٢٧) اور ان کو دنیا میں بھی ان کا صلہ عنایت کیا اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔ ﴿وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (١٢۔٥٧) اور جو لوگ ایمان لائے ...... ان کے لیے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔

اَلْاُجْرَةُ (مزدوری) یہ لفظ خاص کر دنیوی بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ اَجْرٌ کی جمع اُجُوْرٌ ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ (٤۔٢٥) اور ان کے مہر بھی

❶ كـلـمـة مـن حديث وابصة الاسدى انظر (حم، طب، في الدلائل عنه حب) ذكرهٔ في كنزل العمال ٣: ٢١٨٤، ٢١٥٨ وبمعناه رواية واصلة ٢١٧٧ ، ٢١٨٢ وذكره الغزالي في الاحياء في مواضع ٣/ ٤٣ بتخريج العراقي.

انھیں ادا کردو میں کنایہ عورتوں کے مہر کو اُجُــوْرٌ کہا گیا ہے پھر اَجْرٌ اور اُجْرَۃٌ کا لفظ ہر اس بدلہ پر بولا جاتا ہے جو کسی عہد و پیمان یا تقریباً اسی قسم کے عقد کی وجہ سے دیا جائے۔ اور یہ ہمیشہ نفع مند بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ ضرر رساں اور نقصان دہ بدلہ کو اجر نہیں کہتے، جیسے فرمایا: ﴿لَهُمْ اَجْــرُهُــمْ عِـنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۲۔۲۷۷) ان کو ان کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا۔ ﴿فَـاَجْـرُهٗ عَلَـى اللّٰهِ﴾ (۴۲۔۱۴۰) تو اس کا بدلہ خدا کے ذمے ہے۔

اَلْـجَـزَاء ہر بدلہ کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی عہد کی وجہ سے ہو یا بغیر عہد کے اچھا ہو یا برا دونوں پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَـزَاهُـمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَـرِيْرًا﴾ (۷۶۔۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت کے باغات اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کریں گے۔ ﴿فَـجَــزَاۗؤُهٗ جَهَـنَّمُ﴾ (۴۔۹۳) اس کی سزا دوزخ ہے۔

محاورہ میں ہے اَجَرَ (ن) زَیدٌ عمراً یا جُرُہ اجـرًا کے معنی ہیں زید نے عمر کو اجرت پر کوئی چیز دی اور اٰجَرَ عمر زیدًا کے معنی ہوں گے عمرو نے زید کو اجرت دی قرآن میں ہے:

﴿عَـلٰـى اَنْ تَـاْجُـرَنِـىْ ثَمٰنِىَ حِجَجٍ﴾ (۲۸۔۲۷) کہ تم اس کے عوض آٹھ برس میری خدمت کرو۔ اور یہی معنی اٰجَرَ (مفاعلہ) کے ہیں لیکن اس میں معنی مشارکت کا اعتبار ہوتا ہے اور مجرد (اَجَــرْتُـهٗ) میں مشارکت کے معنی ملحوظ نہیں ہوتے ہاں مال کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ محاورہ ہے۔ اٰجَـرَهُ الـلّٰهُ وَاَجَرَهٗ دونوں طرح بولا جاتا ہے، یعنی خدا اسے بدلہ دے۔

اَلْاَجِیْرُ بروزن فَـعِیْلٌ بمعنی فاعل یا مفاعل ہے یعنی معاوضہ یا اجرت پر کام کرنے والا۔ اَلْاِسْتِجَارُ کے اصل معنی کسی چیز کو اجرت پر طلب کرنا پھر یہ اجرت پر رکھ لینے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ جس طرح کہ استیجاب (استفعال) بمعنی اَجَـاب آ جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اِسْتَا جِـرْهُ اِنَّ خَيْـرَ مَنِ اسْتَاْ جَـرْتَ الْقَوِىُّ الْاَمِيْـــنُ﴾ (۲۸۔۲۶) اسے اجرت پر ملازم رکھ لیجیے کیونکہ بہتر ملازم جو آپ رکھیں وہ ہے جو توانا اور امانت دار ہو میں (استــجَــار کا لفظ) ملازم رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ا ج ل

اَلْاَجَــلُ کے معنی کسی چیز کی مدت مقررہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلِتَبْلُـغُوْٓا اَجَلًا مُّسَـمًّـى﴾ (۴۰۔۱۶۷) اور تا کہ تم (موت کے) وقت مقررہ تک پہنچ جاؤ۔ ﴿اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ﴾ (۲۸۔۲۸) ان دو معینہ مدتوں میں سے جونسی مدت میں پوری کردوں۔

محاورہ ہے دَيْـنُـهٗ مُـؤَجَّل اس کے قرضہ وصول کرنے کے لیے ایک مدت معین ہے قَدْ اَجَّلْتُهٗ میں نے اس کے لیے مدت مقرر کردی اور انسان کی زندگی کے لیے جو مدت مقرر ہوتی ہے، اسے بھی اَجَـــلٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے، دَنَـا اَجَلُـهٗ یعنی اس کی موت کا وقت قریب آ پہنچا۔ اصل میں اس کے معنی مدت حیاۃ (زندگی) پورا کر لینا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَبَـلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِىْٓ اَجَّلْتَ لَنَا﴾ (۶۔۱۲۹)

اور (آخر) ہم اس وقت معین کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔

یہاں اَجَلٌ سے مراد حدِّ موت ہے اور بعض نے بڑھاپے کی انتہا مراد لی ہے درحقیقت ان دونوں کا ایک مفہوم ہے (کیونکہ) جب انسان بڑھاپے کی انتہاء کو پہنچ جائے تو موت کے قریب ہو جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ﴾ (۶۔۲) میں اجل اول سے حیات دنیوی اور اجل ثانی سے بقاءِ اخروی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اوّل سے دنیا میں بقا اور ثانی سے (برزخی زندگی مراد ہے جو) موت سے لے کر حشر تک کا زمانہ مراد ہے، یہ حسنؒ سے مروی ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت کریمہ ﴿اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا﴾ (۳۹۔۴۲) میں جو دو موتیں مذکور ہیں ان کی طرف اشارہ ہے یعنی اوّل اجل سے نیند اور ثانی سے موت مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں جگہ اَجَلٌ سے مراد موت ہی ہے لیکن بعض کی موت کسی حادثہ مثلاً قتل، آتش زدگی، غرق وغیرہ ناموافق اسباب کی وجہ سے جو اس کی زندگی کے خاتمہ کا باعث بنتے ہیں اور بعض ان حوادث سے محفوظ اور عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں حتی کہ ان کو طبعی موت آجاتی ہے۔ انہی دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ❶

((مَنْ اَخْطَاَتْهُ سَهْمُ الرَّزِیَّةِ لَمْ تُخْطِئْهُ سَهْمُ الْمَنِیَّةِ.)) اگر کوئی مصیبت کے تیر سے بچ بھی جائے تو موت کا تیر اس سے خطا نہیں کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ انسان کی اجل (یعنی موت) دو قسم پر ہے۔ بعض جوانی کی حالت میں (کسی حادثہ کی وجہ سے) مرجاتے ہیں اور بعض عمر کی اس انتہا کو پہنچ کر مرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبعی زندگی کی آخری حد مقرر کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۲۲۔۵) اور بعض (قبل از پیری) مرجاتے ہیں اور بعض (شیخ فانی ہوجاتے اور بڑھاپے کی) نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اور شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (طویل)

(۸) رَأیتُ المنایا خَبْطَ عشواء من تُصِبْ تُمِتْهُ ......۔

"موت اندھی اونٹنی کی طرح مخبوط پھر رہی ہیں جس کو پہنچ جائیں اسے ختم کر ڈالتی ہیں۔"

اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے ❸ (المنسرح)

---

❶ اخرجه.

❷ زهير في معلقته وتكملتهٗ ...... ومن تخطئ يُعَمّر فيهرم راجع للبيت اللسان والمحكم (عشو، خبط) وديوانه ۲۹ وامالی المرتضی ۱: ۲۶۲ ومختار الشعر الجاهلی ۱: ۱۵۷ ومحاضرات المؤلف ۳: ۳۲۹ والجمهرة (۱) والحيوان للجاحظ ۲: ۱۰۲ و ۶: ۵۰۹، والعقد الثمين ۹۶ وايام العرب ۲۷۶ وشرح المعلقات لابن الانباری ۲۸۸.

❸ وتمامه: للموت كأس والمرءُ ذائقها۔ البيت لامية بن ابی ابی الصلت الجاهلی كما فی المحكم واللسان (عبط) وراجع للبيت الكامل للمبرد ۶۶ وقال فی ۲۹۷: قال ابو الحسن الاخفش الاصغر وصاعد اللغوی انه لرجل من الخوارج واحریٰ ان يكون هو الصواب راجع السمط للميمنی والبيت ايضًا فی امالی المرتضی ۱۔۵۳۳، وعيون الاخبار ۲: ۳۷۴، والاغانی ۳: ۱۷۹ والقرطبی ۴: ۲۹۷، والعينی ۲: ۱۸۸ وديوانه رقم ۴۰ وذيل الامالی ۱۳۵۔۱۳۶ فی ثلاثة وفيه لابد ذائقها والنقائض ۷۳ والادبار للمؤلف ۴/۴۸۸ وفی اسد الغابة انشدتهٗ الفادعة اخت امية بين يدی رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قصيدةً لاخيه وفيها البيت.

(۹) مَنْ لَّمْ يَمُتْ عَبْطَةً يَمُتْ هَرَمًا

"جو شخص جوانی میں فوت نہ ہو آخرکار پیر فرتوت ہو کر مرجائے گا۔"

اَلْاٰجِلُ (دیر سے ہونے والا) یہ عَاجِلٌ کی ضد ہے اور ہر اس جنایۃ کو اِجْل کہہ دیا جاتا ہے جس کے انجام بد کا جلد ہی اندیشہ نہ ہو۔اس اعتبار سے ہر اجل جنایۃ ہوتا ہے لیکن ہر جنایۃ اجل نہیں ہے محاورہ ہے:

فَعَلْتُ كَذَا مِنْ اَجْلِهٖ میں نے فلاں کی وجہ سے یہ کام کیا۔قرآن میں ہے:﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ ﴾ (۵۔۳۲) اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا۔یعنی اس قتل کے ارتکاب کی وجہ سے،ایک قراءت میں اِجْل (بکسر الھمزہ) ہے ❶ یعنی اِس جرم کی وجہ سے۔

اَجَلْ (ہاں بےشک) یہ حرف ایجاب ہے اور کسی خبر کی تصدیق کے لیے آتا ہے ❷ اور آیت کریمہ:

﴿ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ ﴾ اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انھیں ...... نکاح میں رہنے دو۔(۲۔۲۳۱) میں بلوغ الاجل سے وہ مدت مراد ہے جو طلاق اور انقضاء عدت کے درمیان ہوتی ہے (نیز بلوغ اجل سے عدت کا ختم ہونا یا عدت کے ختم ہونے تک کی مدت کے قریب پہنچ جانا مراد ہے) اور آیت کریمہ:﴿ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ (۲:۲۳۲) میں بھی انقضاء عدت کی طرف اشارہ ہے یعنی اس وقت ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ ﴾ (۲:۲۳۴) ان پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ اپنے حق میں جو پسند کریں کر گزریں۔

ا ح د

اَحَدٌ کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔کبھی صرف نفی میں اور کبھی صرف اثبات میں۔نفی کی صورت میں ذوی العقول کے لیے آتا ہے اور استغراق جنس کے معنی دیتا ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر مجتمع ہو یا متفرق جیسے مَا فِي الدَّارِ اَحَدٌ (گھر میں کوئی بھی نہیں ہے) یعنی نہ ایک ہے اور نہ دو یا دو سے زیادہ نہ مجتمع اور نہ ہی متفرق طور پر اس معنی کی بنا پر کلام مثبت میں اس کا استعمال درست نہیں ہے کیونکہ دو متضاد چیزوں کی نفی تو صحیح ہوسکتی ہے لیکن دونوں کا اثبات نہیں ہوتا جب فِي الدَّارِ وَاحِدٌ کہا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک اکیلے کا گھر میں ہونا تو ثابت ہوگا ہی مگر ساتھ ہی دو یا دو سے زیادہ کا بھی اجتماعاً و افتراقاً اثبات ہو جائے گا پھر احد کا لفظ چونکہ مَا فَوْقَ الْوَاحِدِ کی بھی نفی کرتا ہے اس لیے مَا مِنْ اَحَدٍ فَاضِلِيْنَ کہنا صحیح ہوگا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے ❸ ﴿ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ﴾ (۶۹:۴۷) پھر تم میں سے کوئی بھی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہوگا۔

کلام مثبت میں احد کا استعمال تین طرح پر ہوتا ہے،

(۱) عشرات کے ساتھ ضم ہو کر جیسے اَحَدَ عَشَرَ (گیارہ)

---

❶ هذه قراءة ابی جعفر وحده راجع فتح القدير ۱ : ۳۳ وشرح الدرة للخفاجی.

❷ وكذا جيرو ان راجع الرضی علی الكافيه (۲ : ۳۸۳) وابن يعيش (۷ : ۱۲٤) وفيه الشواهد.

❸ وايضا قال: وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ (۲ : ۱۰۲).

اَحَدٌ وَّعِشْرُوْنَ (اکیس) وغیرہ۔(۲) مضاف یا مضاف الیہ ہوکر اس صورت میں یہ اول (یعنی پہلا) کے معنی میں ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿ اَمَّا اَحَدُ كُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ﴾ (۴۱:۱۲) یعنی تم میں سے جو پہلا ہے وہ تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا۔

یَوْمُ الْاَحَدِ ہفتے کا پہلا دن یعنی اتوار۔(۳) مطلقاً بطورِ وصف استعمال ہو تو اس صورت میں یہ باری تعالیٰ کا وصف ہی ہوگا (اور اس کے معنی ہوں گے یکتا، یگانہ بے نظیر، بے مثل) جیسے فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱:۱۱۲) کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ ہے، ایک ہے۔

اَحَدٌ اصل میں وَحَدٌ ہے لیکن وَحَدٌ کا لفظ غیر باری تعالیٰ کے لیے استعمال ہے۔ چنانچہ نابغہ نے کہا ہے [1] ع (بسیط)

(۱۰) كَاَنَّ رِحْلِيْ وَقَدْ زَالَ النَّهَارُ بِنَا
بِذِي الْجَلِيْلِ عَلٰى مُسْتَأْنِسٍ وَحَدِ

دن ڈھلے وادی ذی الجلیل میں میری اونٹنی کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جیسے میرا پالان بجائے اونٹنی کے اس گورخر پر کسا ہوا ہے جو تنہا ہو اور انسان کی آہٹ پا کر ڈر کے مارے تیز بھاگ رہا ہو۔

ا خ ذ

اَلْاَخْذُ کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کرلینا، جمع کرلینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ ﴾ (۷۹:۱۲) خدا پناہ میں رکھے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا ہم کسی اور کو پکڑ لیں اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں، جیسے فرمایا: ﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾ (۲۵۵:۲) نہ اس پر اونگھ غالب آسکتی ہے اور نہ ہی نیند۔

محاورہ ہے: اَخَذَتْهُ الْحُمّٰى (اسے بخار چڑھ گیا) قرآن میں ہے: ﴿ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ ﴾ (۶۷:۱۱) اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو چنگھاڑ (کی صورت میں عذاب) نے آ پکڑا۔

﴿ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴾ (۲۵:۷۹) تو خدا نے اس کو دنیا اور آخرت (دونوں) کے عذاب میں پکڑ لیا۔

﴿ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى ﴾ (۱۰۲:۱۱) اور تمہارا پروردگار (جب نافرمان) بستیوں کو پکڑا کرتا ہے تو اُس کی پکڑ اسی طرح ہوتی ہے۔ اور قیدی کو مَاْخُوْذٌ اور اَخِيْذٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَلْاِتِّخَاذُ (افتعال) ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو کر جَعَلَ کے جاری مجری ہوتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿ لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ ﴾ (۵۱:۵) یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَآءَ ﴾ (۳:۳۹) جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے۔ ﴿ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا ﴾

---

[1] قاله النابغة يصف سرعة سيره والبيت في ديوانه وشرح العشر للتبريزي واللسان (انس۔ زول، وحد) وشواهد الكشاف (۳٤) وامالي الشجريه ۲: ۲۷۱ والمعاني الكبير للقبتي ۷۳۲ والخزانة البغداديه (۱: ۵۲۱) ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۷۵) والمحاضرات للمؤلف (٤: ٦٦۳) والشطر الثاني في البلدان (اسم حليل) وفي رواية اللسان والثمين ٦ يوم الحليل بدل بذي الحليل ومستوجس برل مستأنس.

(۲۳:۱۱۰) تو تم نے اسے تمسخر بنالیا۔ ﴿ أَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ ﴾ (۵:۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنالو۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ ﴾ (۱۶:۶۱) میں صیغہ مفاعلہ لاکر معنی مجازات اور مقابلہ پر تنبیہ کی ہے کہ جو انعامات خدا کی طرف سے انھیں ملے ان کے مقابلہ میں انھوں نے شکر گزاری سے کام نہیں لیا۔ فُلَانٌ مَاْخُوْذٌ وَبِهٖ اَخْذَةٌ مِنَ الْجِنِّ فلاں جن کے اثرات میں گرفتار ہے۔ فُلَانٌ يَاْخُذُ مَاْخَذَ فُلَانٍ یعنی فلاں اس جیسا کام کرتا ہے یا اس کے مسلک پر چلتا ہے اور اسی سے محاورہ ہے: ذَهَبُوْا وَمَنْ اَخَذَ اَخْذَهُمْ وَاِخْذَهُمْ وہ اور ان کے ہم مشرب سب چلے گئے۔

رَجُلٌ اُخُذٌ اَوْ بِهٖ اُخُذٌ کنایۃً وہ شخص جو آشوب چشم میں مبتلا ہو۔ اَلْاِخَاذَةُ وَالْاِخَاذُ وہ زمین جسے کوئی شخص اپنے لیے خاص کرلے۔

اخ ر

اٰخِرٌ۔ اوّل کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور اٰخَرُ (دوسرا) وَاحِدٌ کے مقابلہ میں آتا ہے اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے نشأۃ ثانیہ مراد لی جاتی ہے، جس طرح کہ اَلدَّارُ الدُّنْیَا سے نشأۃ ثانیہ مراد لی جاتی ہے جس طرح کہ ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ﴾ (۲۹:۶۴) ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے لیکن کبھی الدار کا لفظ حذف کر کے صرف اَلْاٰخِرَةُ کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ﴾ (۱۱:۱۶) وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور دَارٌ کا لفظ کبھی اٰخِرَة کا موصوف ہوتا ہے اور کبھی اس کی طرف مضاف ہو کر آتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ﴾ اور یقیناً آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ (۶:۳۲)

﴿ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴾ (۱۶:۴۱) اور آخرت کا اجر بہت بڑا ہے۔ اگر وہ اسے جانتے ہوتے۔ یہ اصل میں وَلَاَجْرُ دَارِ الْحَیَاةِ الْاٰخِرَةِ ہے (اور دار کا لفظ اَلْحَیَاةِ الْاٰخِرَةِ کی طرف مضاف ہے)

اور اُخَرُ (جمع الاخریٰ) کا لفظ الاٰخَرُ (معروف باللام) سے معدول ہے اور کلام عرب میں اس کی دوسری نظیر نہیں ہے کیونکہ اَفْعَلُ مِنْ كَذَا (یعنی صیغہ تفضیل) کے ساتھ اگر لفظ مِنْ لفظاً یا تقدیراً مذکور ہو تو نہ اس کا تثنیہ ہوتا اور نہ جمع اور نہ ہی تانیث آتی ہے اور اگر مِنْ مذکور نہ ہو تو معرف باللام ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع دونوں آسکتے ہیں۔ ❶ لیکن لفظ آخَرَ میں اس کے نظائر کے برعکس الف لام کے بغیر اس کے استعمال کو جائز سمجھا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اَلْاٰخَر سے معدول ہے۔

اَلتَّاْخِیْرُ: یہ تقدیم کی ضد ہے (یعنی پیچھے کرنا چھوڑنا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ (۷۵:۱۳) جو عمل اس نے آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے۔

---

❶ وفی القرآن او آخرون اعترفوا بذنوبھم (۹۔۱۰۵) وآخر شیئاً (۹۔۱۰۵) نیز فی الاخرین (۲۶۔۴۳) الاستخار (استفعال) راجع الایات (۱۵۔۱۵) (۱۵).

﴿ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ (۲:۴۸) تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ۔
﴿ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ﴾ (۴۲:۱۴) وہ ان کو اس دن تک مہلت دے رہا ہے جب کہ (دہشت کے سبب) آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔
﴿ رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ﴾ (۴۴:۱۴) اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مہلت عطا کر۔ محاورہ ہے: بِعْتُهُ بِاٰخِرَةٍ میں نے اسے تاخیر اجل کے ساتھ بیچ ڈالا یہ لفظ و معنی نَظِرَةٍ کی طرح ہے اور اَبْعَدَ اللّٰهُ الْاٰخِرَ میں اَلْاٰخِرَ کے معنی مُتَاَخِّرٌ عَنِ الْفَضِیْلَةِ او عن تحری الْحَقِّ کے ہیں یعنی اللہ فضیلت اور حق کی تحری میں کوتاہی کرنے والے کو ہلاک کرے یا اپنی رحمت کو دور رکھے۔

اخ و

اَخٌ (بھائی) اصل میں اَخَوٌ ہے اور ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کا ولادت میں ماں باپ دونوں یا ان میں سے ایک کی طرف سے یا رضاعت میں شریک ہو وہ اس کا اَخٌ کہلاتا ہے لیکن بطور استعارہ اس کا استعمال عام ہے اور ہر اس شخص کو جو قبیلہ، دین و مذہب، صنعت وحرفت، دوستی یا کسی دیگر معاملہ میں دوسرے کا شریک ہو، اسے اَخٌ کہا جاتا ہے [1] چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ ﴾ (۱۵۶:۳) ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کفر کرتے ہیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں۔ میں اِخْوَان سے ان کے ہم مشرب لوگ مراد ہیں اور فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ (۴۹:۱۰) مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

﴿ اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا ﴾ (۴۹:۱۲) کیا تم میں سے کوئی ایسی بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔
اور آیت کریمہ:
﴿ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ ﴾ (۴:۱۱) اگر میت کے بھائی بھی ہوں۔ میں اِخْوَةٌ کا لفظ بہن بھائی دونوں کو شامل ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴾ (۱۵:۴۷) گویا بھائی بھائی مسہریوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں متنبہ کیا ہے کہ اہل جنت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا۔
اَلْاُخْتُ (بہن) یہ اَخٌ کا مؤنث ہے اور اس میں تاء بمنزلہ عوض عن المحذوف کے ہے اور آیت کریمہ: ﴿ یٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ ﴾ (۱۹:۲۸) اے ہارون کی بہن میں بہن بلحاظ نسب مراد نہیں ہے بلکہ صلاح وتقویٰ کے اعتبار سے مریم علیہا السلام کو اخت ہارون کہا گیا ہے۔ جس طرح کہ یَا اَخَاتِمِیْمٍ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:
﴿ اَخَا عَادٍ ﴾ (۴۶:۲۱) میں ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ان پر بھائیوں کی طرح شفقت فرماتے تھے اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:
﴿ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ﴾ (۱۱:۶۱) اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا۔
﴿ وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ ﴾ (۱۱:۵۰) اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی (ہود علیہ السلام) کو بھیجا۔
﴿ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ﴾ (۱۱:۸۴) اور مدین کی

[1] اس کی جمع اخوۃ اور اخوان آتی ہے۔

طرف ان کے بھائی (شعیب علیہ السلام) کو بھیجا۔اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا ﴾ (۴۸:۴۳) اور جو نشانی ہم ان کو دکھادیتے تھے وہ اس کی بہن سے بڑی ہوتی تھی۔ میں أُخْتِهَا پہلی نشانی سے ہے اور اس کو اخت اس لیے کہا ہے کہ صحت وصداقت اور اظہار حق میں دونوں ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ﴾ (۳۸:۷) جب ایک جماعت وہاں داخل ہوگی تو اپنی بہن پر لعنت کرے گی۔ میں أُخْتَهَا سے ان کے دیگر ہم مشرب لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر ﴿ أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ ﴾ (۲۵۷:۲) ان کے دوست طاغوت ہیں۔ اور اسی قسم کی دیگر آیات میں پایا جاتا ہے۔

تَـآخَيْتُ کسی کے ساتھ برادرانہ سلوک کرنا اور چونکہ دو بھائی مل کر رہتے ہیں اس جہت سے اس مادہ میں لزوم اور وابستگی کا مفہوم پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے اس کھونٹے کو اَخِيَّةُ الدَّابَّـه کہہ دیتے ہیں جس سے جانور بندھا رہتا ہے۔

ا د د

قرآن پاک میں ہے:

﴿ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴾ (۸۹:۱۹) یہ تو تم نازیبا اور ناپسندیدہ بات زبان پر لائے ہو۔

إِدًّا کے معنی ہیں: نہایت ہی ناپسندیدہ بات جس سے ہنگامہ بپا ہوجائے گا۔ یہ اَدَّتِ النَّاقَةُ تَئِدُّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں اونٹنی (اپنے بچے کی جدائی میں) سخت روئی اور گریہ کیا۔

آلَادِيْـدُ شور ہنگامہ اور أُدٌّ (نام پدر قبیلہ) یا تو وُدٌّ سے مشتق ہے یا پھر اَدَّتِ النَّاقَةُ سے۔

ا د م

اٰدَمُ۔ابوالبشر آدم علیہ السلام بعض نے کہا ہے کہ یہ اِدِيْمُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے اور ان کا نام آدم علیہ السلام اس لیے رکھا گیا ہے کہ ان کے جسم کو بھی ادیم ارض یعنی روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اُدْمَةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگ کے ہیں۔ چونکہ آدم علیہ السلام بھی گندمی رنگ کے تھے، اس لیے انھیں اس نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ رَجُـلٌ آدَمُ کے معنی گندمی رنگ کے مرد کے ہیں۔ اور بعض نے آدم علیہ السلام کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے کہ وہ مختلف عناصر اور متفرق قویٰ کے امتزاج سے پیدا کیے گئے تھے۔ جیسا کہ آیت ﴿ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ ﴾ (۲:۷۶) مخلوط عناصر سے ...... کہ اسے آزماتے ہیں سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے جَعَلْتُ فُلَانًا أُدْمَةَ اَهْلِيْ میں نے فلاں کو اپنے اہل وعیال میں ملالیا مخلوط کرلیا۔

بعض نے کہا ہے کہ آدم اِدَامٌ سے مشتق ہے اور اِدَامٌ (سالن وغیرہ) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے طعام لذیذ اور خوشگوار محسوس ہو اور آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی روح ڈال کر اسے پاکیزہ بنادیا تھا جیسے کہ آیت ﴿ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي ﴾ (۲۹:۱۵) اور اس میں اپنی روح پھونک دی میں مذکور ہے اور پھر اسے عقل وفہم اور فکر عطا کرکے دوسری مخلوق پر فضیلت بھی دی ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴾ (۱۷:۷۰)

اور ہم نے انھیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

اس بنا پر ان کا نام آدم رکھا گیا ہے اور حدیث میں ❶ ہے

(۸) لَوْ نَظَرْتَ اِلَيْهَا فَاِنَّهٗ اَحْرٰى اَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا. اگر تو اسے (اپنی منگیتر کو) ایک نظر دیکھ لے تو اس سے تمہارے درمیان الفت اور خوشگواری پیدا ہو جانے کا زیادہ امکان ہے۔

ادی (و)

اَلْاَدَاءُ کے معنی ہیں یکبارگی اور پورا پورا حق دے دینا۔ چنانچہ خراج اور جزیہ کے دے دینے اور امانت کے واپس کر دینے کو اداء کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ (۲:۲۸۳) تو امانت دار کو چاہیے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کرے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾ (۴:۵۸) خدا تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے حوالہ کر دیا کرو۔

﴿وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ (۲:۱۷۸) اور پسندہ طریق سے خون بہا اسے پورا پورا ادا کرنا۔ اصل میں یہ اَدَاۃ سے محاورہ ہے اَدَوْتَ تَفْعَلُ كَذَا کسی کام کے لیے حیلہ اور تدبیر کرنا اصل میں اس کے معنی اداۃ (کسی چیز) کو پکڑنے کے ہیں جس کے ذریعے دوسری چیز تک پہنچا جا سکے۔

اذا

اِذَا (ظرف زمان) زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے ❷ کبھی جب اس میں شرطیت کا مفہوم پایا جاتا ہے تو فعل مضارع کو جزم دیتا ہے ❸ اور یہ عام طور پر نظم میں آتا ہے اور اِذْ (ظرف) ماضی کے لیے آتا ہے اور جب ما کے ساتھ مرکب ہو (اِذْمَا) تو معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❹

(۱۱) اِذْ مَا اَتَيْتَ عَلَى الرَّسُوْلِ فَقُلْ لَهٗ.

جب تو رسول اللہ ﷺ کے پاس جائے تو ان سے کہنا۔

اذن

اَلْاُذُنُ کے معنی کان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر ہنڈیا کی کوروں کو اُذُنُ الْقِدْرِ کہا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر اس شخص پر اُذُنٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لیتا ہو۔ چنانچہ فرمایا:
﴿وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ۚ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ﴾ (۹:۶۱) اور کہتے ہیں یہ شخص نرا کان ہے ان سے کہہ دو کہ وہ کان ہے تو تمہاری بھلائی کے لیے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (۵۶:۲۵) اور ان کے

---

❶ لفظ حديث من رواية ابی عبيدفی غريبه والذی فی الترمذی والنسائی وابن ماجة وابن شيبه وابن ابی حبان والحاكم واحمد والبزار وغيرهم فی حديث المغيرة انه خطب امرأة فقال له صلى الله عليه وسلم انظر اليها الخ (راجع تخريج الكشاف للحافظ ص ۱۳۱ رقم: ح ۸۹) والفائق ۱/ ۱۱ والمنتقىٰ بشرحه النيل(۶: ۱۰۶-۱۰۷) والاحياء بتخريج العراقی ۲/ ۳۹ واللسان (ادم) قال الزمخشری فی الحديث اوبمعنی ليت فان الغرض منه الحث علی النظر ومثله قولهم لوتاتينی فتحدثنی۱۲.

❷ وايضًا الاطلاق كمافی التنزيل اَنْ اَدُّ اِلَيَّ عبادالله (۴۴-۱۸) ۱۲.

❸ وان دخل على الماضی نحو اذا جاء نصر الله (۱۱۰/ ۱).

❹ وتارة تدل علی معنی الفجائة نحو اذاهی حية تسعیٰ (۲۰-۲۱). قاله العباس بن مرداس يمدح النبی صلى الله عليه وسلم وتمامه .... حقاً عليك اذااطمان المجلس والبيت فی السيرة ۴: ۱۹۷) والكامل ۲۴۹ والكتاب السيبويه (۱: ۴۳۲)قال الشنتمری والبيت مضمن وتمامه فيما بعده والبيت ايضاً فی الصحاح (اذا)وفی رواية الامير بدل الرسول وهو محرف وفی اللسان "الامين".

کانوں میں گرانی پیدا کردی ہے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بہرے ہوگئے ہیں بلکہ اس سے ان کی جہالت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اور اَذِنَ (الیہ) کے معنی توجہ سے سننا کے ہیں جیسے فرمایا:﴿ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴾ (۸۴:۲، ۵) اور وہ اپنے پروردگار کا فرمان سنے گی اور اُسے واجب بھی ہے اور اِذْنٌ کا لفظ اس علم پر بھی بولا جاتا ہے جو سماع سے حاصل ہو۔ جیسے فرمایا:﴿ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (۲:۲۷۹) تو خبردار ہوجاؤ کہ اللہ اور رسول سے تمہاری جنگ ہے۔ اور اِذْنٌ و اَذَانٌ ہر سنی ہوئی بات کو کہتے ہیں اور ان سے علم مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا اکثر علم مسموعات پر مبنی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:﴿ ائْذَنْ لِّیْ وَلَا تَفْتِنِّیْ ﴾ (۹:۴۹) مجھے اجازت دے دیجیے اور آفت میں نہ ڈالیے۔

﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ ﴾ (۷:۱۶۷) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کردیا تھا۔ اَذِنْتُهٗ بِكَذَا وَاٰذَنْتُهٗ کے ایک معنی ہیں یعنی اطلاع دینا اور اعلان کرنا اور اعلان کرنے والے کو مُؤَذِّنٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:﴿ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ ﴾ (۱۲:۷۰) تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ اے قافلے والو۔

﴿ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَیْنَهُمْ ﴾ (۷:۴۴) (تو اس وقت) ان میں سے ایک پکارنے والا پکار دے گا۔

﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ (۲۲:۲۷) اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کردو۔

اَلْاَذِیْنُ وہ خاص جگہ جہاں اذان کی آواز پہنچتی ہو۔

اَلْاِذْنُ فِی الشَّیْءِ کے معنی ہیں یہ بتادینا کہ کسی چیز میں اجازت اور رخصت ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۴:۶۴) اور ہم نے پیغمبر بھیجا ہی اس لیے ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ میں اِذْن بمعنی ارادہ اور حکم ہے (اسی طرح فرمایا):

﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۳:۱۶۶) اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلے کے دن واقع ہوئی سو خدا کے حکم سے واقع ہوئی۔

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۲:۱۰۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ﴿ وَلَیْسَ بِضَآرِّهِمْ شَیْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۵۸:۱۰) مگر خدا کے حکم کے سوا انھیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی علم الٰہی کے ہیں مگر اِذْن اور علم میں فرق ہے کیونکہ اِذْنٌ کا لفظ خاص ہے اور اس کا استعمال اس موقع پر ہوتا ہے جہاں علم کے ساتھ مشیت بھی شامل ہو عام اس سے کہ وہ فعل پسندیدہ ہو یا پسندیدہ نہ ہو۔ لیکن علم میں مشیت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۱۰:۱۰۰) ''حالانکہ کسی شخص کو قدرت نہیں ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایمان لائے۔''

میں ظاہر ہے کہ اللہ کی مشیت اور اس کا امر دونوں پائے جاتے ہیں۔ [1] اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

---

[1] ایضاً راجع الایة ویمسك السماء ان تقع علی الارض الاباذنه (۲-۲۱۳)-(۲۲-۶۵).

(۱۰۲:۲) اور خدا کے حکم کے سواوہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میں مشیت من وجہ پائی جاتی ہے، کیونکہ یہ امر مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طبعی طور پر ایسا بنایا ہے کہ دوسرے کی ضرب سے متاثر ہو اور اسے اس سے گزند پہنچے۔ وہ پتھر کی طرح نہیں ہے کہ کسی قسم کی ضرب سے اسے تکلیف نہ ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان میں اس قسم کی قوت کا پایا جانا اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہے۔ اس اعتبار سے جب کسی شخص کو ظالم کے ظلم سے تکلیف پہنچتی ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ اللہ کے اذن اور مشیت سے ہی پہنچی ہے۔ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔ جس کی تفصیل کے لیے دوسری کتاب درکار ہے۔

اَلْاِسْتِئْذَانُ کے معنی اجازت طلب کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (۴۵:۹) اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں جو خدا پر اور پچھلے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ﴾ (۶۲:۲۴) سو جب یہ لوگ تم سے (کسی کام کے لیے) اجازت مانگا کریں۔

اِذَنْ۔ یہ جواب اور جزا کے لیے آتا ہے یعنی لفظاً یا تقدیراً جواب کو چاہتا ہے اور اس کے بعد کا کلام جزا کے معنی کو متضمن ہوتا ہے۔ جب یہ شروع کلام میں آئے اور اس کے بعد فعل مضارع ہو تو حتماً اس کو نصب دے گا۔ اِذَنْ اَخْرُجَ لیکن جب اثنائے کلام میں آئے اور پھر اس کے بعد فعل مضارع ہو تو فعل مضارع پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں جیسے اَنَا اِذَنْ اَخْرُجُ وَاَخْرُجَ مگر جب فعل کے بعد آئے یا اس کے بعد فعل مضارع ہی نہ ہو تو عمل نہیں کرتا [1] جیسے اَنَا اَخْرُجُ اِذَنْ قرآن میں ہے: ﴿اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ (۱۴۰:۴) ورنہ تم بھی انہی جیسے ہوجاؤ گے۔

اذی

اَلْاَذٰی ہر اس ضرر کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو پہنچتا ہے [2] وہ ضرر جسمانی ہو یا نفسانی یا اس کے متعلق سے ہو اور پھر وہ ضرور دنیوی ہو یا اخروی چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی﴾ (۲۶۳:۲) اپنے صدقات (وخیرات) کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر برباد نہ کرو۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَاٰذُوْهُمَا﴾ (۱۶:۴) میں مار پٹائی (سزا) کی طرف اشارہ ہے اسی طرح سورۃ توبہ میں فرمایا: ﴿وَمِنْهُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَیَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ﴾ (۶۱:۹) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو خدا کے پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے۔ ﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (۶۱:۹) اور جو لوگ رسولِ خدا کو رنج پہنچاتے ہیں ان کے لیے عذاب الیم (تیار) ہے۔ ﴿لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی﴾ (۶۹:۳۳) تم ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنھوں نے موسیٰ کو تکلیف دی (عیب لگا کر) رنج پہنچایا۔ ﴿وَاُوْذُوْا حَتّٰی اَتٰاهُمْ نَصْرُنَا﴾ (۳۴:۶) اور ایذا (پر صبر کرتے رہے) یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی۔

---

[1] راجع للتفصیل الرضی علی الکافیة ۲/ ۲۳۵-۳۳۶.

[2] وفی حدیث شعب الایمان وادناها اماطة الاذیٰ عن الطریق وفی العقیقة امیطو عنه الاذیٰ ۱۲.

﴿ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ ﴾ (۶۱:۵) تم مجھے کیوں ایذا دیتے ہو؟ اور آیت کریمہ: ﴿ وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ هُوَ اَذًی ﴾ (۲۲۲:۲) میں حیض (کے دنوں میں عورت سے جماع کرنے) کو اَذًی کہنا یا تو از روئے شریعت ہے یا پھر بلحاظ علم طب کے جیسا کہ اس فن کے ماہرین بیان کرتے ہیں۔ اٰذَیْتُهٗ (افعال) اِیْذَاءً وَاَذِیَّةً وَاَذًی کسی کو تکلیف دینا۔

اَلْاٰذِیُّ۔ موج بحر جو بحری مسافروں کے لیے تکلیف دہ ہو۔

ا ر ب

اَلْاَرَبُ کے معنی سخت احتیاج کے ہیں جسے دور کرنے کے لیے حیلہ اور تدبیر کرنی پڑے پس اَرَبٌ خاص اور حَاجَۃٌ عام ہے پھر کبھی اَرَبٌ کا لفظ صرف حاجت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی محض حیلہ اور تدبیر کرنے کے لیے آتا ہے گو حاجت نہ ہو۔ مثلاً محاورہ ہے۔ فُلَانٌ ذُوْ اَرَبٍ وَاَرِیْبٌ! فلاں صاحب حیلہ اور چالاک ہے۔ اَرِبَ اِلٰی کَذَا، اَرَبًا وَاُرْبَةً وَاِرْبَةً وَمَاْرَبَةٌ کے معنی ہیں وہ کسی چیز کا سخت محتاج ہوا۔ (مَاْرَبَةٌ۔ سخت حاجت ج مَاٰرِب) قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ﴾ (۱۸:۲۰) اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی فائدے ہیں۔

وَلَا اَرَبَ لِیْ فِیْ کَذَا: مجھے اس کی کوئی شدید ضرورت نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ﴾ (۳۱:۲۴) نیز وہ خدمت گزار مرد جو عورتوں کی خواہش نہ رکھیں۔ میں اِرْبَۃٌ سے بطور کنایہ حاجت نکاح مراد ہے۔

اَلْاُرْبٰی: بڑی مصیبت جس کے دور کرنے کے لیے تدبیر اور حیلہ کرنا پڑے۔

اَلْاٰرَابُ (واحد اِرْبٌ) وہ اعضاء جن کی انسان کو سخت ضرورت رہتی ہے کیونکہ اعضاء دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کے ذریعہ ہر جاندار چیز اپنی ضروریات پورا کرتی ہے جیسے ہاتھ پاؤں اور آنکھ اور دوسرے وہ جو محض زینت کے لیے بنائے گئے ہیں جیسے بھویں، داڑھی وغیرہ پھر وہ اعضاء جو حوائج کو پورا کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جن کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی اور دوسرے وہ ہیں جن کی سخت احتیاج رہتی ہے اور ان کے بغیر جسم انسانی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اس دوسری قسم کے اعضاء کو اٰرَابٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے [1] (۹) اِذَا سَجَدَ الْعَبْدُ سَجَدَ مَعَهٗ سَبْعَةُ اٰرَابٍ کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اُس کے ساتھ سات اعضاء سجدہ کرتے ہیں، چہرہ، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے اور دو پاؤں اور جب کوئی شخص اپنی ضرورت کے مطابق (وافر) حصہ لے تو کہا جاتا ہے اَرَّبَ نَصِیْبَهٗ اس نے بڑا حصہ لیا اور وافر۔ اسی سے محاورہ ہے: اَرَّبَ مَالَهٗ اس نے اپنا مال بڑھا لیا اَرَّبْتُ الْعُقْدَةَ میں نے مضبوط گرہ لگائی۔

ا ر ض

اَلْاَرْضُ: (زمین، سَمَاءٌ: (آسمان) کے بالمقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع اَرَضُوْنَ ہے۔

---

[1] رواہ الاربعۃ من حدیث ابن عباس ﷺ وفی الصحیحین عنہ امرت ان اسجد علی سبعۃ اعظم وفی لفظ "اعضاء" وفی ابی داؤد ایضاً امرنبیکم راجع تخریج الکشاف للحافظ ابن حجرؒ ۱۷۸ رقم: ۲۳۲. والفیل ۲: ۲۶۷ والعون باب اعضاء السجود ۱۲.

جس کا صیغہ قرآن پاک میں نہیں ہے۔کبھی اَرْض کا لفظ بول کر کسی چیز کا نیچے کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح سماء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔شاعر نے گھوڑی کے وصف میں کہا ہے ❶ (طویل)

(۱۲) وَاَحْمَرَ کَالدِّیْبَاجِ اَمَّا سَمَاؤُھَا فَرَیًّا وَاَمَّا اَرْضُھَا فَمَحُوْلٌ

وہ دیبا کی طرح سرخ ہے اس کا اوپر کا حصہ موٹا گداز ہے لیکن اس کا زیریں حصہ (یعنی ٹانگیں وغیرہ) خشک اور سخت ہے اور آیت کریمہ: ﴿ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ﴾ جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔(۵۷:۱۷)

میں فساد کے بعد تکوین اور بدء کے بعد عود کی طرف اشارہ ہے وہ نظام جو عالم میں جاری و ساری ہے اسی بنا پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے دلوں کو ان کے سخت ہونے کے بعد نرم کرنا مراد ہے۔محاورہ ہے: اَرْضٌ اَرِیْضَۃٌ زرخیز زمین تَاَرَّضَ النَّبْتُ نباتات زمین پر جم گئی اور زیادہ ہوگئی تَاَرَّضَ الْجَدْیُ بکری کے بچہ نے گھاس کھائی اور اَرَضَۃٌ کے معنی دیمک کے ہیں اور اُرِضَتِ الْخَشَبَۃُ کے معنی ہیں لکڑی دیمک خوردہ ہوگئی اور دیمک خوردہ لکڑی کو مَارُوْضَۃٌ کہا جاتا ہے۔

ارک

اَلْاَرِیْکَۃُ (مسہری) حجلہ (چھپر کھٹ) جو سریر یعنی تخت کے اوپر رکھا ہو اس کی جمع اَرَائِکُ ہے اور اسے اَرِیْکَۃَ کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ارض یعنی دنیا میں اراک، (پیلو کی لکڑی) سے بنایا جاتا ہے جو ایک قسم کا درخت ہے اور یہ اَرَاكَ بِالْمَکَانِ اُرُوْکًا سے مشتق ہے جس کے اصل معنی کسی جگہ پر اراكَ (یعنی پیلو) کے پتے چرنے کے لیے ٹھہرنا کے ہیں پھر مطلق ٹھہرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔(اس لیے جنت کے چھپر کھٹوں کو جو اہل جنت کی اقامت گاہ ہوں گے۔

﴿ اَرَائِکُ ﴾ (۱۸:۲۱) کہا گیا ہے۔

ارم

اَلْاِرَمُ۔دراصل اس نشان کو کہتے ہیں جو پتھروں سے بنادیا جاتا ہے اس کی جمع ارامٌ ہے اور پتھروں کو اُرَّم کہا جاتا ہے اور اسی سے غضب ناک آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے۔فُلَانٌ یَحْرِقُ الْاُرَّمَ یعنی فلاں مارے غصے کے دانت پیتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ (۸۹:۷) ارم ستونوں والے۔ میں ارم سے بلند اور مزین ستون مراد ہیں (جو قوم عاد نے بنائے تھے) مَا بِھَا اَرِمٌ وَاَرِیْمٌ یعنی اس میں کوئی نہیں اصل میں اس کے معنی اَللَّازِمُ لِلَّازِمِ کے ہیں اور اس کا استعمال ہمیشہ (حرف) نفی کے ساتھ ہوتا ہے جس طرح کہ مَابِھَا دِیَّارٌ کا محاورہ ہے اور اس کے اصل معنی مقیم فی الدار کے ہیں۔

---

❶ البیت لطفیل الغنوی وفی اللسان (ارض) ارضه وسماء ه بالتذکیر ایضا راجع الاقتضاب ۳۳۵ وتهذیب الاصلاح (۱:۴۰) والعقد (۱:۱۸۵) ومعانی العسکری ۲:۱۰۶) والسمط(۲:۸۸۱) والقالی ۲:۲۴۸ والمعانی للقبتی (۱:۱۵۵)قال وسماء الفرس ماکان من عجب الذنب الی العذر وارضه قوائمه وارض الفرس فی غیر هذاالمواضع حوافره والبیت فی دیوانه ۶۲(ملحقاته) وقانون البلاغه ضمن رسائل البلاغه (صنعة کرد علی) وامالی المرتضی (۲:۱۶۹) وفیه کالدنیا بدل کالدیباج وهو احسن.

ا ز ز

آیت کریمہ:﴿ تَـؤُزُّهُـمْ اَزًّا ﴾ (۱۹:۸۳) کے معنی ہیں کہ وہ ان کو برانگیختہ کرتے رہتے ہیں یہ اَزَّتِ الْقِدْرِ سے ہے جس کے معنی ہیں: ہنڈیا میں جوش اور ابال آ گیا (اسی مناسبت سے ورغلانا یا ابھارنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) ایک روایت میں ہے:

(۷) اَنَّـهٗ عَـلَيْـهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ كَانَ يُصَلِّيْ وَلِـجَـوْفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ کہ آنحضرت نماز پڑھتے تو آپ کے اندرون سے ہنڈیا کے کھدکھدانے کی (طرح رونے کی) آواز آتی۔ اَزَّهٗ اس کو بھڑکایا اور جھنجھوڑا۔ یہ هَذَّهٗ سے ابلغ ہے۔

ا ز ر

اصل میں ازر اور اِزَار کے معنی لباس (یعنی تہبند) کے ہیں اِزَارٌ اِزَارَةٌ وَمِئْزَرَةٌ تینوں ہم معنی ہیں کنایہ کے طور پر اِزَارٌ سے عورت مراد لی جاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❶ ع

(۱۳) اَلَا اَبْلِغْ اَبَا حَفْصٍ رَسُوْلًا
فِدًى لَكَ مِنْ اَخِي ثِقَةٍ اِزَارِي

ابو حفص (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو میرا پیغام پہنچادو تجھ جیسے قابل اعتماد بھائی پر میری بیوی قربان ہو۔

اور عورت کو اِزار اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مرد کے لیے بمنزلہ لباس کے ہے، جیسے فرمایا:﴿ هُنَّ لِبَـاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾ (۱۸۶:۲) وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اَلْاَزْرُ کے معنی قوت شدیدہ کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔﴿ اُشْـدُدْ بِـهٖ اَزْرِيْ ﴾ (۳۱:۲۰) اس سے میری قوت کو مضبوط فرما یعنی مجھے اس سے تقویت حاصل ہوگی۔

اٰزَرَهٗ۔ اعانت کرنا اور تقویت بخشنا۔ اصل میں یہ شَـدُّ الاِزَارِ سے ہے جس کے معنی ہیں چادر باندھنا۔ قرآن پاک میں ہے:﴿ كَـزَرْعٍ اَخْـرَجَ شَـطْـاَهٗ فَاٰزَرَهٗ ﴾ (۲۹:۴۸) وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے) زمین سے اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا۔ محاورہ ہے: اٰزَرْتُهٗ فَتَاَزَّرَ میں نے اسے تہبند پہنائی تو اس نے پہن لی۔ اٰزَرْتُ البِنَاءَ وَاَزَرْتُهٗ میں نے عمارت کی بنیاد کو مضبوط کیا تَـاَزَّرَ النَّبَاتُ نبات بڑھ گئی اور مضبوط ہوگئی اٰزَرْتُـهٗ و وَازَرْتُهٗ میں اس کا وزیر بن گیا اصل میں یہ مثال واوی (وزر) سے ہے (جس کے معنی دوسرے کا بوجھ اٹھانا کے ہیں)

فَرَسٌ اٰزَرُ گھوڑا جس کی ٹانگیں محل اِزار تک سفید ہوں۔

اور آیت کریمہ:﴿ وَاِذْ قَـالَ اِبْـرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ ﴾ (۳۷:۶) اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ تھا اور آزر اسی کا معرب ہے اور بعض نے کہا کہ (یہ لقب ہے

---

❶ قالہ ابو المنهال بقبلة الاكبر الاشجعي في قصيدة ١٤ الى عمرؓ عرض فيها بجعدة بن عبدالله السلمي والى الكوفة والبيت القصة في اللسان (ازر) في ستة ابيات والموتلف للآمدي ٨٢ في خمسة ابيات وابواب مختارة او العقد الفريد (٢ : ٦٣) والفائق (١ : ١٧) والعمدة (١ : ٣١٢) في اربعة والمشكل للقتبي ١٠٨، ٢٠٥ في خمسة ابيات ومجازات القرآن للشريف الرضي ٣٥٣ والاصابة ٢٨٨،٧٢١، رقم وكنزا لعمال برواية ابن سيرين : ج ٥ رقم ١٨٤٦ وفي الصناعتين غير منسوب ١٢.

اوران کی زبان میں آزَرُ کے معنی گمراہ کے ہیں۔

ازف

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ﴾ (۵۳:۵۷) یعنی قیامت قریب آپہنچی اَزِفَ وَاَفِدَ دونوں قریب المعنی ہیں قیامت کو اَزِفَ کہنا بلحاظ ضیق وقت کے ہے جیسے کہا جاتا ہے اَزِفَ الشُّخُوْصُ (کا وقت قریب آپہنچا) اور اَزَفٌ کے معنی ضیق وقت کے ہیں اور قیامت کو اٰزِفَةٌ کہنا اس کے قرب وقت کے اعتبار سے ہے اور اسی بنا پر اس کو سَاعَةٌ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔اور نیز آیت کریمہ:

﴿اَتٰی اَمْرُ اللّٰهِ﴾ (۱:۱۶) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آہی پہنچا۔

میں قیامت کو لفظ ماضی کے ساتھ تعبیر کیا ہے نیز فرمایا: وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ (۴:۸) اوران کو قریب آنے والے دن سے ڈراؤ۔

اس ر

اَلْاَسْرُ کے معنی قید میں جکڑ لینے کے ہیں۔یہ اَسَرْتُ الْقَتَبَ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں: میں نے پالان کو مضبوطی سے باندھ دیا اور قیدی کو اَسیر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ رسی وغیرہ سے باندھا ہوتا ہے۔قرآن میں ہے:

یَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا (۷۶:۸) اور یتیموں اور قیدیوں کو۔پھر ہر اس شخص کو جو گرفتار اور مقید ہو کر آئے الاسیر کہہ دیا جاتا ہے گو وہ باندھا ہوا نہ ہو اَسِیْرٌ کی جمع اَسَارٰی وَاُسَارٰی وَاَسْرٰی ہے [1] اور مجازاً۔اَنَا اَسِیْرُ نِعْمَتِكَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی تیرے احسان کی رسی میں بندھا ہوا ہوں۔اور اُسْرَةُ الرَّجُلِ کے معنی افراد خاندان کے ہیں جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے۔اور آیت کریمہ: وَشَدَدْنَا اَسْرَهُمْ (۷۶:۲۸) اوران کی بندش کو مضبوطی سے باندھ دیا۔میں اس حکمت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی ہیئت ترکیبی میں پائی جاتی ہے جس پر کہ آیت وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱:۲۱) میں غور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اَلْاُسْرُ کے معنی ہیں: پیشاب بند ہو جانا۔اور جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو اسے مَاسُوْرٌ کہا جاتا ہے گویا اس کی پیشاب کی نالی بند کر دی گئی ہے اس کے مقابلہ میں پاخانہ کی بندش پر حُصرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اس س

﴿اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ﴾ (۹:۱۰۹) کے معنی ہیں: اس نے عمارت کی بنیاد رکھی اور بنیاد کو اُسٌّ وَاَسَاسٌ کہا جاتا ہے۔اُسٌّ کی جمع اِسَاسٌ اور اَسَاسٌ کی جمع اُسُسٌ آتی ہے محاورہ ہے: كَانَ ذٰلِكَ عَلٰى اُسِّ الدَّهْرِ (واست الدھر) (بود آں برہمیشگی زمانہ واول آن) یعنی وہ قدیم زمانہ سے ہے جیسا کہ عَلٰی وَجْهِ الدَّهْرِ کا محاورہ مشہور ہے۔

اس ف

اَلْاَسَفُ: حزن اور غضب کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ کبھی آسَفَ کا لفظ حزن اور غضب میں سے ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے۔اصل میں اس کے معنی جذبہ

[1] قران پاک میں ہے وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى (۲۔۵۸) وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى (۸۔۶۶).

انتقام سے دمِ قلب کے جوش مارنا کے ہیں۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمزور آدمی پر پیش آئے تو پھیل کر غضب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اگر اپنے سے قوی آدمی پر ہو تو منقبض ہو کر حزن بن جاتی ہے۔ اس لیے جب حضرت ابن عباسؓ سے حزن اور غضب کی حقیقت دریافت کی گئی تو انھوں نے فرمایا: لفظ دو ہیں مگر ان کی اصل ایک ہی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سے کمزور کے ساتھ جھگڑتا ہے تو غیظ وغضب کا اظہار کرتا ہے اور جب اپنے سے قوی کے ساتھ جھگڑتا ہے تو واویلا اور غم کا اظہار کرتا ہے اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے ❶ ع البسیط

(۱۴) فَحَزْنُ کُلِّ اَخِیْ حُزْنٍ اَخُو الْغَضَب کہ ہر غمزدہ کا حزن غضب کا ساتھی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ (۴۳:۵۵) کے معنی یہ ہیں کہ جب انھوں نے ہمیں غضب ناک کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ یہاں ابوعبداللہ الرضا کا قول ہے کہ اللہ میاں ہماری طرح خفا نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے خفا ہونے سے اس کے اولیاء کا خفا ہونا مراد ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کے معنی اس کے اولیاء کے راضی ہونے کے ہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے: (۱) مَنْ اَهَانَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَةِ یعنی جس نے میرے دوست کی اہانت کی اس نے میرے ساتھ جنگ کی۔ اور قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (۴:۸۰) جو شخص رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی۔ اور آیت کریمہ: ﴿غَضْبَانَ اَسِفًا﴾ (۷:۱۵۰) میں اَسِفٌ کے معنی بھی غضب ناک ہی کے ہیں اور استعارہ کے طور پر ماتحت غلام کو نیز جس کا (بوجہ کراہت کے) نام لینا پسند نہ ہو اسے اَسِفٌ (بیچارہ) کہہ دیا جاتا ہے۔ ❷

ا س ن

اَسَنَ (ـِ) اَلْمَاءُ پانی کا سخت بدبودار ہو جانا مَاءٌ اٰسِنٌ متغیر اور بدبودار پانی۔ چنانچہ فرمایا: مِنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ (۴۷:۱۵) اس پانی کی (نہریں ہیں) جو کبھی بدبودار نہیں ہوگا۔

اَسَنَ الرَّجُلُ پانی کی بدبو سے بیمار اور بیہوش ہونا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۱۵) یَمِیْدُ فی الرُمح مَیْدَ الْمَائِحِ الاَسِنِ۔

نیزے پر اس طرح تڑپتا ہے جیسے کنویں پر اترنے والا بیہوش آدمی تڑپ رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تشبیہ کے

---

❶ وصدره جزاك ربك بالاحزان مغفرة ...... قاله المتنبی فی رثاء اخت سیف الدولة فی (٤٤) بیتاً مطلعها یااخت خیراخ یا بنت خیراب کنایة بهما عن اشرف النسب راجع دیوانه ٣٢٩ طبقة طبعة مصر ١٣٤٢ء وبشرح العکبری (١ : ٩٤) والشطرایضافی محاضرات المولف (٤ : ٥٠٦ و١ : ٢٢٣)، اصله فی الصحیحین ورواه ابن ابی الدنیا فی کتاب الاولیاء والحکیم الترمذی فی جامعه وابن مردویة حل فی الاسماء وابن عساکر عنها انس انظر للحدیث باختلاف الفاظه کنزالعمال (ج: ١ رقم ١١٥٦ و١١٦١ـ١١٦٢) ١٢.

❷ ایضاً اَسَفَی وفی القران یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ (٢ : ١٤) ایضاً رجل اسیف ای سریع الحزن والبکاء کمافی حدیث عائشة : ان ابابکر رجل اسیف راجع الفائق : ١/ ١٩.

❸ قاله زهیر السلمی وصدرهٗ = وقد اترك القِرن مصفراً انامله.......... وفی روایة اللسان (اسن) یغادر بدل اترك وهو الصواب لانه من صفة الممدوح ای ابن سنان راجع للبیت ملحقات دیوانه ١٩٤ والعقد الثمین والمختارات ٥٢ والسمط (١ـ١٩٩) والبحر٧ : ٧٠) والطبرسی (٢٦ـ٣٣) وفی روایة التارك القرن مصفراً انامله ویمیل بدل یمید.

طور تَأَسَّنَ الرَّجُلُ محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بیمار پڑنے کے ہیں۔

ا س و

اَلْاُسْوَۃ وَالْاِسْوَۃُ (قُدْوَۃٌ اور قِدوۃ کی طرح) انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع ہوتا ہے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری، سرور بخش ہو یا تکلیف دہ۔ اسی لیے آیت کریمہ: ﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ (۲۱:۲۲) تمہارے لیے پیغمبر خدا میں اچھا اسوہ ہے۔ میں اُسْوَۃٌ کی صفت حَسَنَۃ لائی گئی ہے۔ ❶

تَأَسِّیْتُ بِہٖ: میں نے اس کی اقتداء کی۔

اَلْاَسٰی: بمعنی حزن آتا ہے اصل میں اس کے معنی کسی فوت شدہ چیز پر غم کھانا ہوتے ہیں۔

اَسِیْتُ عَلَیْہِ اَسًی وَاَسِیْتُ لَہٗ کسی چیز پر غم کھانا قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَا تَأْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ﴾ (۵:۶۸) تو تم قوم کفار پر افسوس نہ کرو۔

شاعر نے کہا ہے: ❷ ع

(۱۶) اَسِیْتُ لِاَخْوَالِیْ رَبِیعہ۔

میں نے اپنے اخوال بنی ربیعہ پر افسوس کیا۔

یہ اصل میں (ناقص) واوی سے ہے کیونکہ محاورہ میں غمگین آدمی کو اَسْوَانُ (بالفتح) کہا جاتا ہے۔ اَلْاَسْوُ کے معنی زخم کا علاج کرنے کے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی ازالۂ غم کے ہیں اور یہ کَرَبْتُ النَّخْلَ کی طرح ہے جس کے معنی: کھجور کے درخت کی شاخوں کی جڑوں کو دور کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے اَسَوْتُہٗ: اَسُوْءُہٗ اَسْوًا (از باب نصر) یعنی میں نے اس کا غم دور کیا اس کو تسلی دی۔

اَلْاَسِیْ: صالح۔ مرہم پٹی کرنے والا۔ اس کی جمع اِسَاءٌ وَاُسَاۃٌ ہے اور زخمی آدمی کو مَاسِیٌّ وَاَسِیٌّ کہا جاتا ہے۔ اَسِیْتُ بَیْنَ الْقَوْمِ: باہم صلح کرانا۔ اٰسَیْتُہٗ (مفاعلہ) کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا۔ (مال وغیرہ کے ذریعہ)۔ شاعر نے کہا ہے ❸ ع

(۱۷) آسیٰ اخاہ بنفسہ (طویل)

جس نے خود کو اپنے بھائی پر نثار کر دیا ہو۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے ❹

(۱۸) فَآسٰی وآداہ فکان کمن جنٰی

اس نے ہمدردی کی اور سامان حرب دیا تو گویا اس نے

---

❶ نیز فرمایا: قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْ اِبْرَاهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (۶۰:۴)۔

❷ قطعة من البيت قاله البحرى فى قصيدة له فى ٤٥ بيتا يمدح المتوكل ويذكر صلح بنى تغلب وتمامه .... ان عفت مصايفها واقوت ربوعها والبيت فى الحصرى (١:١١١) وفى رواية ديوانه ١٢٩٨ بشرح حسن كامل صير فى ـ اذا عفت بدل ان عفت ومصانعها بدل مصايفها .

❸ قطعة من البيت من قصيدة جمهرية فى ٢٥ بيتاً قالها دريدبن الصمة احد بن بكر بن حشم فى رثاء اخيه عبدالله وتكملته: قتال امرء آسى اخاه بنفسه ويعلم ان المرء غير مخلد ـ والبيت فى الحمهرة ٢/٢ والشطر الثانى فى اشعار حطيئة (العمدة لابن رشيق ٢: ١٣٧) وديدهذا شاعر شجاع فارس قتل يوم حنين مع المشركين (بنى هوازن) راجع المعمرين ٢١ـ٢٢ والاستقاى ١٧٧ـ١٧٨ والاغانى ٩٠٢/٩ اوالىلالى ٣٩ـ٤٠ والموتلف اوالخزانة ٤: ٤٤٢ـ٤٤٧/١٣: ٤٦١ـ٤٦٢ والسيرة ٨٤١ـ٨٤٢ (جوتنحن) والشعراء ٧٥ـ٧٢٩.

❹ قاله سويد المرتد الحارثى وصدره: ولم يجنها ولكن جناها وليها ـ وفى البيت آواه (بالمهملة) من الاداة اى عدة الحرب آواه اصله اعداه بالعين فابدلت همزةً (راجع المرزوقى ص ٨١٧ـرقم ٢٧١ ، والكامل ١٢٠٢ فى ابيات والعيون ١: ١٩ واللسان (رجنى) وفى النسخ المطبوعة اذاه (بالمعجمة) مصحف .

جنایت کی۔

یہاں آسٰی بروزن فَاعَلَ یُواسی سے ہے اسی طرح شاعر کے قول [1]

(۱۹) یَکْفُوْنَ اثْقَالَ ثأی المستأسی

المستأی بروزن مستفعل بھی اسی مادہ سے مگر اَلْاِسَاءَۃُ (افعال) جس کے معنی تکلیف پہنچانے کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ سَاءَ (س و ء) سے منقول ہے۔

ا ش ر

اَلْاَشَرُ: بہت زیادہ اترانا اَشِرَ یَاْشَرُ اَشَرًا (س) اَلْاَشِرَ: بہت زیادہ اِترانے والا) قرآن پاک میں ہے:﴿ سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْکَذَّابُ الْاَشِرُ ﴾ (۲۶:۵۴) ان کو کل ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا خود پسند ہے۔پس اَشَرٌ بَطَرٌ سے ابلغ ہے اور بَطَرٌ میں فَرَحٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اور فَرَحٌ اگرچہ عام حالات میں مذموم ہوتا ہے جس طرح کہ قرآن پاک میں ہے:﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ﴾ (۲۸:۷۶) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لیکن ایسے موقع پر جب خوشی کا اظہار ضروری ہو اور وہ اظہار بھی جب ضرورت ہو تو فرحت ممدوح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ﴾ (۱۰:۵۸) تو چاہیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔کیونکہ کبھی سرور کی وجہ سے فرحت کا حصول تقاضائے عقل کے مطابق ہوتا ہے مگر اَشَرٌ اس فرحت کو کہتے ہیں جو مبنی برہوائے نفس ہو اور اسی سے بطورِ تشبیہ نَاقَۃٌ مِئْشِیْرٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی چست اونٹنی کے ہیں اور اس کے معنی دبلی اونٹنی بھی آتے ہیں اس صورت میں یہ اَشَرْتُ الْخَشَبَۃَ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی لکڑی چیرنا کے ہیں۔

ا ص ب ع

اَلِاصْبَعُ: (انگلی) کا لفظ انگلی کی ہڈی ناخن بالائی سرا خم اور جوڑ کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے [2] اور بطورِ استعارہ ظاہری احسان کے معنی میں آتا ہے چنانچہ لَکَ عَلَیْہِ یَدٌ کی طرح لَکَ عَلٰی فُلَانٍ اِصْبَعٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔

ا ص ر

اَلْاَصْرُ: (ض) کے اصل معنی کسی چیز میں گرہ لگانے اور اس کو زبردستی روک لینا کے ہیں اَصَرَ یَأْصِرُ اِصْرًا فَھُوَ مَاصُوْرٌ اور مَاْصَرٌ وَمَاصِرٌ بندرگاہ پر جہاز کھڑا کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَاھُمْ ﴾ (۷:۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ...... اتارتے ہیں۔یہاں اِصْرٌ سے وہ دشواریاں مراد ہیں جو خیرات اور ثواب تک پہنچنے سے ان کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی تھیں اور آیت:

﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا ﴾ (۲:۲۸۶) میں بھی اِصْرٌ اسی معنی پر محمول ہے۔بعض کا قول ہے کہ اِصْرٌ کے معنی بوجھ کے ہیں۔لیکن اس کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔

نیز اِصْرٌ اس عہد موکد کو بھی کہتے ہیں جو خلاف ورزی کرنے والے کو ثواب اور خیرات سے روک دے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] لم احدہ۔

[2] وجمعہ: اصابع راجع الایۃ (۲۔۱۹).

﴿ءَ اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ﴾ (۸۱:۳) بھلا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا پختہ عہد لیا؟

اَلْاِصَارُ: رسی یا میخ جن کے سہارے پر خیمہ کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ مَا یَاْصِرُنِی عَنْكَ شَیْءٌ مجھے تیرے پاس پہنچنے سے کوئی چیز مانع ہے۔ اَلْاَبْصَرُ: وہ کمبل جس میں خشک گھاس بھر کر اونٹ کی کوہان کے گرد لپیٹا جاتا ہے تاکہ اس پر آسانی کے ساتھ سواری ہو سکے۔

ا ص ل

اَصْلُ الشَّیْءِ: (جڑ) کسی چیز کی اس بنیاد کو کہتے ہیں کہ اگر اس کا ارتفاع فرض کیا جائے تو اِس شے کا باقی حصہ بھی معلوم ہو جائے قرآن پاک میں ہے: ﴿اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ﴾ (۲۵:۱۴) اِس کی جڑ (زمین میں) پختگی سے جمی ہے اور شاخیں آسمان میں۔ اور تَاَصَّلَ كَذَا کے معنی کسی چیز کے جڑ پکڑنا ہیں اسی سے اصل اور خاندانی بزرگی مجد کو اَصِیْلٌ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے: فُلَانٌ لَا اَصْلَ لَه وَلَا فَصْلَ یعنی نیست اوراحسب ونہ زبان۔ اَلْاَصِیْلُ وَالْاَصِیْلَةُ کے معنی (عَشِیَّة) عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔﴿سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا﴾ (۴۲:۳۳) اور صبح وشام اس کی تسبیح بیان کرتے رہو۔ اَصِیْلَ کی جمع اُصُلٌ وَاٰصَالٌ اور اَصِیْلَةٌ کی جمع اَصَائِلُ ہے، قرآن پاک میں ہے، ﴿بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ (۲۰۵:۷) صبح اور شام۔

ا ف ف

اَلْاُفُّ: اصل میں ہر گندی اور قابل نفرت چیز کو کہتے ہیں میل کچیل اور ناخن کا تراشہ وغیرہ اور محاورہ میں کسی بری چیز سے اظہار نفرت کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۶۷:۲۱) تف ہے تم پر اور جنھیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو ان پر بھی۔

﴿اَفَّفْتُ لِكَذَا﴾ کسی چیز سے کراہت ظاہر کرنا اُفٍّ کہنا۔ اسی سے اَفَّفَ فُلَانٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل برداشتگی کا اظہار کرنے کے ہیں۔

ا ف ق

اَلْاُفُقُ: کنارہ جمع آفَاقٌ قرآن پاک میں ہے: ﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ﴾ (۵۳:۴۱) ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی ...... نشانیاں دکھائیں گے، آفاق کے معنی اطراف کے ہیں اس کا واحد اُفُق وَاُفْقٌ ہے [1] اور نسبت کے وقت اُفُقِیٌّ کہا جاتا ہے اور اَفِقَ فُلَانٌ کے معنی آفاق (اطراف عالم) میں جانے کے ہیں اور افق کے اطراف میں انتہائی بُعد اور وسعت سے تشبیہ کے طور پر اٰفِقٌ کا لفظ انتہائی سختی پر بولا جاتا ہے۔

ا ف ک

اَلْاِفْكُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بناء پر ان ہواؤں کو جو اپنا رخ چھوڑ دیں، مُؤْتَفِكَةٌ کہا جاتا ہے اور آیاتِ کریمہ: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ﴾ (۹:۶۹) اور الٹنے والی بستیوں نے گناہ کے کام کیے تھے۔ ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰی﴾ (۵۳:۵۳) اور الٹی ہوئی

---

[1] وفی القرآن ﴿ولقد راٰه بالافق المبین﴾ (۸۱-۲۳) ﴿وهو بالافق الاعلیٰ﴾ (۵۳).

بستیوں کو دے پٹکا۔(میں مؤتفکات سے مراد وہ بستیاں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مع ان کے بسنے والوں کو الٹ دیا تھا)

﴿ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ (۹:۳۰) خدا ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔یعنی اعتقاد وحق سے باطل کی طرف اور اچھے کاموں سے برے افعال کی طرف پھر رہے ہیں۔اسی معنی میں فرمایا:﴿ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴾ (۵۱:۹) اس سے وہی پھرتا ہے جو (خدا کی طرف سے) پھیرا جائے۔﴿ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴾ (۶:۹۵) پھر تم کہاں بہکے پھرتے ہو؟ اور آیت کریمہ:﴿ اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ﴾ (۴۶:۲۲) کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمارے معبودوں سے پھیر دو؟

میں اِفك کا استعمال ان کے اعتقاد کے مطابق ہوا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اعتقاد میں آلہہ کی عبادت ترک کرنے کو حق سے برگشتگی سمجھتے تھے

جھوٹ بھی چونکہ اصلیت اور حقیقت سے پھرا ہوتا ہے اس لیے اس پر بھی اِفكٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ﴾ (۲۴:۱۱) جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تمہی لوگوں میں سے ایک جماعت ہے۔﴿ لِكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ (۴۵:۷) ہر جھوٹے گنہگار کے لیے تباہی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴾ (۳۷:۸۶) کیوں جھوٹ (بنا کر) خدا کے سوا اور معبودوں کے طالب ہو۔میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِفْكًا مفعول نہ ہو اَیْ اٰلِهَةً مِنَ الْاِفْكِ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِفْكًا تُرِيْدُوْنَ کا مفعول ہو اور اٰلِهَةً اس سے بدل ...... اور باطل معبودوں کو (مبالغہ کے طور پر) اِفْكًا کہہ دیا ہو۔ ❶

اور جو شخص حق سے برگشتہ ہو اسے مَاْفُوْكٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے ❷ ع (منسرح)

(۲۰) فَاِنْ تَكُ عَنْ اَحْسَنِ الْمُرُوْءَةِ مَأْفُوْا
كَافِفِيْ اٰخَرِيْنَ قَدْ اُفِكُوْا

اگر تو حسن مروت کے راستہ سے پھر گیا ہے تو تم ان لوگوں میں ہو جو برگشتہ ہو چکے ہیں۔

اُفِكَ الرَّجُلُ يُؤْفَكُ کے معنی دیوانہ اور باؤلا ہونے کے ہیں اور باؤلے آدمی کو مافوک العقل کہا جاتا ہے۔

ا ف ل

اَلْاُفُوْلُ کے معنی ماہتاب اور نجوم (وغیرہ نَیِّرَات) کے غروب ہونے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴾ (۶:۷۶) جب وہ غائب ہوگیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہوجانے والے پسند نہیں۔

﴿ فَلَمَّآ اَفَلَتْ ﴾ (۶:۷۸) مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا۔بھیڑ بکری کے چھوٹے بچوں کو افال اور اونٹ کے کمزور اور چھوٹے بچے کو اَفِيْلٌ کہا جاتا ہے۔

---

❶ ذكر الذمخشرى ههُنا ثلاثة اوجه من الاعراب اثنان ذكرهما المؤلف والثالث ان يكون افكا حالا من ضمير الفاعل ٤٩٠٤) طبع مصر.

❷ قاله عمر ابن اذينه والبيت في اللسان والصحاح (انك) والطبرى (٢٦-١٩) وشواهد الكشاف ٨٧ وتهذيب الاصلاح (١:٣٤) والاصلاح ٢٣ وتهذيب الالفاظ ٥٥٢ والبحر٣:٦٠٥/٧:٤٩٤ والغريب القتبى ٣٠.

ا ک ل

اَلْاَکْلُ کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً اَکَلَتِ النَّارُ الْحَطَبَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا ڈالا ۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے اسے اُکُلٌ (بضم کاف وسکون) کہا جاتا ہے ارشاد ہے: اُکُلُھَا دَائِمٌ (۱۳:۳۵) اس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

اَلْاَکْلَۃُ : مرۃ کا صیغہ ہے یعنی ایک مرتبہ کھانا اور اَلْاُکْلَۃُ بمعنی لُقْمَۃ ہے۔

اَکِیْلَۃُ الْاَسَدِ شیر کا شکار کیا ہوا جانور جسے وہ کھاجاتا ہے۔

اَلْاَکُوْلَۃُ بکری جو کھانے کے لیے موٹی کی گئی ہو۔

اَلْاَکِیْلُ: ہم پیالہ کو کہتے ہیں اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے: فُلَانٌ مُؤْکَلٌ وُمُطْعَمٌ (کنایہ مالدار تونگر) ثَوْبٌ ذُوْ اُکْلٍ: سخت بنا ہوا کپڑا، گھنی بناوٹ کا کپڑا۔ اَلتَّمْرُ مَأْکَلَۃٌ لِلْفَمِ: کھجور خوردنی چیز ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ذَوَاتَی اُکُلٍ خَمْطٍ﴾ (۱۶:۳۴) اور کبھی اُکُلٌ کا لفظ نصیبہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فُلَانٌ ذُو اُکُلٍ مِنَ الدُّنْیَا یعنی وہ دنیا سے بہرہ یاب ہے۔ اِسْتَوْفٰی فُلَانٌ اُکُلَہٗ کنایہ از موت یعنی رزق پورا لے لیا۔ اَکَلَ فُلَانٌ فُلَانًا اس نے فلاں کی غیبت کی اور یہی معنی اَکَلَ لَحْمَہٗ کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا﴾ (۴۹:۱۲) کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (طویل)

(۲۱) فَاِنْ کُنْتُ مَاکُوْلًا فَکُنْ اَنْتَ اٰکِلِیْ اگر مجھے کھایا جانا ہے تو تم خود ہی کھالو۔

مَا ذُقْتُ اُکْلًا میں نے کوئی چیز نہیں کھائی اور چونکہ کھانے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت مال کی ہوتی ہے اس لیے اَلْاُکُلُ کے معنی مال خرچ کرنا بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (۴:۲۹) ایک دوسرے کا مال ناحق صرف نہ کرو۔ اور آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا﴾ (۴:۱۰) میں یتامیٰ کا مال کھانے سے اس کو ناجائز طور پر صرف کرنا مراد ہے اور پھر بعد میں ﴿اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ نَارًا﴾ (۴:۱۰) کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ یہ انھیں جہنم میں لے جائے گا۔ اَلْاَکُوْلُ وَالْاَکَّالُ (مبالغہ) زیادہ کھانے والا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ (۵:۴۲) اور (رشوت کا) حرام مال بہت زیادہ کھانے والے ہیں۔

اٰکِلٌ کی جمع اَکَلَۃٌ ہے محاورہ ہے: ھُمْ اَکَلَۃُ رَأْسٍ ۔ یعنی وہ تعداد میں اتنے کم ہیں کہ (بکری کا) ایک سر ہی انھیں

---

❶ قاله الممزق العبدی حینما غضب علیه النعمان بن المنذر وعمرو ابن هند وتمامه .... والافادرکنی ولماامزّق وفی اللسان (مزق) خیر آکلی بدل انت اکلی والبیت ایضاً فی اللسان (اکل) وذیل امالی المرتضیٰ (۱-۳۲۵) والکامل للمبرد (۱:۱۸) والسیوطی: ۷ اوالاصمعیات ۵۸ والاشباہ النحویہ (۲:۲۲۲) فی بحث الفرق بین لم ولماو البحر (۷:۵۵) والموتلف للآمدی ۲۸۳ وکتب عثمان ایام الفتنة الی علیؓ مکتوباً یستنجده وختمة لهذا البیت انظر العمدة (۱:۴۷،۲۶) وابن حشام (۱:۳۰۹) واعراب ثلاثین ۲۰۲ والحصری (۱:۷۵) وامالی ابن الشجری (۱:۱۳۵) والعقد (۱۶۳-۱۶۴) والعیون (۱:۳۴) وایضاً السیوطی ۲۳۳ والشاعر اسمه شاس بن نهار العبدی ولقب بالممزق لقوله فی هذا فی هذا البیت (ومما امزق) راجع الآمدی ۱۸۵، ۱۸۶.

❷ راجع للبحث عن حروف الهجاء المقدمه .

کافی ہے❷ کبھی اَکْــلٌ کے معنی خراب کرنا بھی آ جاتے ہیں (یعنی کھانے کے بعد جو خراب سارہ جاتا ہے) جیسے فرمایا: کَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ: یعنی کھایا ہوا بھس۔

تَاَكَّلَ كَذَا: کسی چیز کا خراب ہو جانا اَصَابَهٗ اُكَالٌ فِیْ رَاْسِهٖ وَفِیْ اَسْنَانِهٖ سر کا کھجلی اور دانتوں کا خوردہ سے خراب ہو جانا واکلنی رأسی یعنی میرے سر کے بال جھڑ گئے میکائیل ایک فرشتے کا نام ہے اور وہ عربی لفظ نہیں ہے۔

ا ل ل

اَلْاِلُّ: ہر وہ صاف اور ظاہری حالت جس کا انکار ناممکن ہو، عہد قرابت داری۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً﴾ (۹:۱۰) یہ لوگ کسی مومن کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا۔

اَلَّ الْفَرَسُ: گھوڑے کا تیز چلنا اس کے اصل معنی چمکنے کے ہیں اور پھر تیز روی کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے جیسے کہ بَرَقَ وَطَارَ کے الفاظ ہیں۔ اَلْاَلَّةُ چمک دار برچھا اَلَّ بِهَا اس نے نیزہ یا برچھا سے مارا اور اسی سے تیز کان کو اُذُنٌ مُؤَلَّلَةٌ کہا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اِلٌّ وَاِیْلٌ اسماء حسنیٰ سے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

اَلْاِلَالُ: چھری کے دنوں پہلو۔

ا ل ف

اَلْاَلِفُ: حروف تہجی کا پہلا حرف ہے❶ اور اَلْاَلِفُ (ض) کے معنی ہیں: ہم آہنگی کے ساتھ جمع ہونا۔ محاورہ ہے: اَلَّفْتُ بَيْنَهُمْ میں نے ان میں ہم آہنگی پیدا کر دی اور اسی سے اُلْفَةٌ (بمعنی محبت) ہے اور کبھی ہر مالوف چیز کو اِلْفٌ و آلِفٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ (۳:۱۰۳) جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ ﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۸:۶۳) اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے۔

اور مُؤَلَّفٌ اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس کے مختلف اجزاء کو یکجا جمع کر دیا گیا ہو اور ہر جزء کو تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے اس کی صحیح جگہ پر رکھا گیا ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ﴾ (۱۰۶:۱) قریش کے مالوف کرنے کے سبب میں اِیْلَافٌ (افعال کا) مصدر ہے اور آیت: ﴿وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾ (۹:۶۰) ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے۔ میں مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبِ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی بہتری کا خیال رکھا جائے حتی کہ وہ ان لوگوں کی صف میں داخل ہو جائیں جن کے وصف میں قرآن پاک نے ﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ فرمایا ہے یعنی مخلص مسلمان ہو جائیں۔

اَوَالِفُ الطَّيْرِ: مانوس پرندے جو گھروں میں رہتے ہیں۔

اَلْاَلْفُ: ایک خاص عدد (ہزار) کا نام ہے اور اسے اَلْفٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعداد کے تمام اقسام جمع ہو جاتے ہیں کیونکہ اعداد کی چار قسمیں ہیں۔ اکائی، دہائی، سینکڑہ، ہزار تو اَلْف میں یہ سب اعداد جمع ہو جاتے ہیں اس کے بعد جو عدد بھی ہو وہ مکرر آتا ہے۔

---

❷ وایضاً (اوك).

بعض نے کہا ہے کہ الف، حروف تہجی بھی اسی سے ہے کیونکہ وہ مبدأ نظام بنتا ہے۔ اَلَفْتُ الدَّرَاهِمَ میں نے درہموں کو ہزار کردیا جس طرح مَاءَیْتُ کے معنی ہیں: میں نے انھیں سو کردیا۔ اٰلَفَتْ وہ ہزار کو پہنچ گئے جیسے اَمَاتْ سو تک پہنچ گئے۔

ا ل ک

اَلْمَلٰئِکَةُ (فرشتے) اور مَلَكٌ اصل میں مَاْلَكٌ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مَلْأَكٌ سے مقلوب ہے اور مَاْلَكٌ وَمَاْلَكَةٌ وَاُلُوْكٌ کے معنی رسالت یعنی پیغام کے ہیں اسی سے اَلِکْنِیْ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں "اسے میرا پیغام پہنچادو۔"

اَلْمَلَائِکَةُ کا لفظ اسم جنس ہے اور واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلَائِکَةِ رُسُلًا﴾ (۲۲:۷۵) خدا فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کرلیتا ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ مَاْلَکَةٌ کے معنی ہیں پیغام اور اسے مَألكة اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی منہ میں چبایا جاتا ہے اور یہ فَرَسٌ یَاْلَكُ اللِّجَامَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گھوڑے کا منہ میں لگام کو چبانا۔

ا ل م

اَلْاَلَمُ کے معنی سخت درد کے ہیں کہا جاتا ہے اَلِمَ یَاْلَمُ (س) اَلَمًا فَھُوَ اٰلِمٌ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاِنَّھُمْ یَاْلَمُوْنَ کَمَا تَاْلَمُوْنَ﴾ (۴:۱۰۴) تو جس طرح تم شدید درد پاتے ہو اسی طرح وہ بھی شدید درد پاتے ہیں۔

اٰلَمْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو سخت تکلیف پہنچائی۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (۲:۱۰) میں اَلِیْمٌ بمعنی مُؤْلِمٌ ہے یعنی دردناک، دکھ دینے والا۔ اور آیت: ﴿اَلَمْ یَاْتِکُمْ﴾ (۵:۶۴) کیا تم کو...... نہیں پہنچی؟ میں الف استفہام کا ہے جو لَمْ پر داخل ہوا ہے (یعنی اس مادہ سے نہیں ہے)

ا ل ہ

اَللّٰهُ (۱) بعض کا قول ہے کہ اللہ کا لفظ اصل میں اِلٰهٌ ہے ہمزہ (تخفیفا) حذف کردیا گیا ہے اور اس پر الف لام (تعریف) لاکر باری تعالیٰ کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے اسی تخصیص کی بنا پر فرمایا: ﴿ھَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا﴾ (۱۹:۶۵) کیا تمھیں اس کے کسی ہمنام کا علم ہے۔

اِلٰـهٌ کا لفظ عام ہے اور ہر معبود پر بولا جاتا ہے (خواہ وہ معبود برحق ہو یا معبود باطل) اور وہ سورج کو اِلَاهَة کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ انھوں نے اس کو معبود بنا رکھا تھا۔

اِلٰـهٌ کے اشتقاق میں مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ اَلَـهَ (ف) یَأَلَهُ فُلَانٌ وَتَاَلَّهَ سے مشتق ہے جس کے معنی پرستش کرنا کے ہیں اس بنا پر اِلٰـهَ کے معنی ہوں گے: معبود اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلِـهَ (س) بمعنی تحیر سے مشتق ہے اور باری تعالیٰ کی ذات و صفات کے ادراک سے چونکہ عقول، متحیر اور درماندہ ہیں اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے فرمایا ہے:[1]

((کَلَّ دُوْنَ صِفَاتِهٖ تحبیرُ الصِّفَاتِ وَضَلَّ هُنَاكَ تَصَارِیْفُ اللّغاتِ .))

اے برون از وھم وقال وقیل من

---

[1] نشر مقفى قاله رضي الله عنه في خطبة المغراء والخطبة بطولها في العقد وفيه "صفته" بذل صفاته وايضاً ابن الحديد.

خاك بر فرق من و تمثيل من

اس لیے کہ انسان جس قدر صفات الٰہیہ میں غور وفکر کرتا ہے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہے اس بناء پر آنحضرت ؐ نے فرمایا ہے: ❶ (۱۱) تَفَكَّرُوْا فِي آلاءِ اللهِ وَلَا تَفَكَّروا فِي اللهِ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کیا کرو اور اس کی ذات کے متعلق مت سوچا کرو۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ اِلٰـہ اصل میں وِلَاہٌ ہے واؤ کو ہمزہ سے بدل کر الاہ بنالیا ہے اور وَلِـهَ (س) کے معنی عشق ومحبت میں وارفتہ اور بیخود ہونے کے ہیں ❷ اور ذاتِ باری تعالیٰ سے بھی چونکہ تمام مخلوق کو والہانہ محبت ہے اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے اگر چہ بعض چیزوں کی محبت تسخیری ہے جیسے جمادات اور حیوانات اور بعض کی تسخیری اور ارادی دونوں طرح ہے جیسے بعض انسان۔ اسی لیے بعض حکماء نے کہا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ تمام اشیاء کو محبوب ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ (۱۷:۴۴) مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں لَاهَ يَلُوْهُ لِيَاهًا سے ہے جس کے معنی پردہ میں چھپ جانا کے ہیں اور ذاتِ باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور اور محجوب ہے اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (۶:۱۰۳) وہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔

نیز آیت کریمہ:

﴿وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (۵۷:۳) میں "الباطن" کہہ کر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اِلٰـہ: یعنی معبود درحقیقت ایک ہی ہے اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس کی جمع نہ لائی جائے، لیکن اہل عرب نے اپنے اعتقاد کے مطابق بہت سی چیزوں کو معبود بنا رکھا تھا، اس لیے اٰلِهَةٌ صیغہ جمع استعمال کرتے تھے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا﴾ (۲۱:۴۳) کیا ہمارے سوا ان کے اور معبود ہیں کہ ان کو مصائب سے بچائیں۔

﴿وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ﴾ (۷:۱۲۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہوجائیں۔ ایک قرأت میں وَاِلَاهَتَكَ ہے جس کے معنی عبادت کے ہیں لَاهِ اَنْتَ۔ یہ اصل میں لِلّٰهِ اَنْتَ سے ایک لام کو تخفیف کے لیے حذف کردیا گیا ہے۔ اَللّٰهُمَّ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی يَا اَللّٰهُ کے ہیں اور اس میں میم مشدد یاء حرف ندا کے عوض میں آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ اصل میں يَا اَللّٰهُ أُمَّنَا بِخَيْرٍ (اے اللہ! تو خیر

---

❶ انظر لـلحديث اللسان (الا) و(ابوالشيخ طس، عدهب عن ابن عمرؓ وفي رواية في خلق الله (حل عن ابن عباس وابو الشيخ عن ابي ذر) وروى في كل شئى (ابو الشيخ في العظمة عن ابن عباسؓ) راجع كنزالعمال ۳/۵۷۷_۵۸۱ ومعناه ۵۸۶_۵۸۷ (ابو الشيخ في العظمة حل عن عبدالله بن سلام).

❷ نسبه الطبرسي الى ابي عمرو.

کے ساتھ ہماری طرف توجہ فرما) ہے (کثرتِ استعمال کی بنا پر)...... حَيْهَلًا کی طرح مرکب کر کے اَللّٰهُمَّ بنالیا گیا ہے۔ ❶ (جیسے هَلُمَّ)

اِلٰی: حرف (جر) ہے اور جہات ستہ میں سے کسی جہت کی نہایۃ حد بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔

ا ل و

اَلَوْت فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں کسی کام میں کوتاہی کرنا گویا کوتاہی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس امر کی انتہا یہی ہے۔ اور اَلَوْتُ فُلَانًا کے معنی اَوْلَيْتُهٗ تَقْصِيْرًا (میں نے اسے کوتاہی کا والی بنادیا) کے ہیں جیسے کَسَبْتُهٗ: اَیْ اَوْلَيْتُهٗ كَسْبًا (میں نے اسے کسب کا والی بنادیا) مَا اَلَوْتُهٗ جُهْدًا: میں نے مقدور بھر اس سے کوتاہی نہیں کی اس میں جہدًا تمیز ہے جس طرح مَا اَلَوْتُهٗ نُصْحًا میں نُصْحًا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ (۳:۱۱۸) یعنی یہ لوگ تمہاری خرابی چاہنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ﴾ (۲۴:۲۲) اور جو لوگ تم میں سے صاحب فضل (صاحب وسعت) ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلَوْتُ سے باب افتعال ہے اور بعض نے اَلَيْتُ بمعنی حَلَفْتُ سے مانا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے متعلق نازل ہوئی تھی جب کہ انھوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ مسطح رضی اللہ عنہ کی مالی امداد نہیں کریں گے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ صیغہ افتعال اَفْعَلَ (مزید فیہ) سے نہیں آتا بلکہ فَعَلَ (مجرد) سے بنایا جاتا ہے، جیسے: کَسَبْتُ سے اِكْتَسَبْتُ اور صَنَعْتُ سے اِصْطَنَعْتُ اور رَاَیْتُ سے اِرْتَاَیْتُ اور روایت۔ ❷

(۱۲) لَادَرَيْتَ وَلَا ائْتَلَيْتَ میں بھی مَا اَلَوْتُهٗ شَيْئًا سے افتعال کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے معنی وَلَا اسْتَطَعْتَ کے ہیں (یعنی تو نے نہ جانا اور نہ تجھے اس کی استطاعت ہوئی) اصل میں اِیْلَاءٌ وَاَلِیَّةٌ اس قسم کو کہتے ہیں جس پر (قسم کھانے والے کو) تکلیف اور کوتاہی کا سامنا کرنا پڑے اور اصطلاح شریعت میں اِیْلَاءٌ اس قسم کو کہتے ہیں جو عورت کے ساتھ جماع پر اٹھائی جائے اس قسم کی کیفیت اور احکام کا بیان کرنا کتب فقہ کے ساتھ مختص ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرُوْا اٰلَاءَ اللّٰهِ﴾ (۷:۷۴) پس خدا کی نعمتوں کو یاد کرو میں اٰلَاءٌ کا واحد اَلًی وَ اِلًی ہے جس طرح کہ اٰنَاءٌ کا واحد اَنًا وَاِنًی آتا ہے بعض نے آیت کریمہ: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (۷۵:۲۳،۲۴) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے) میں اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے معنی اِلٰى نِعْمَةِ رَبِّهَا مُنْتَظِرَةٌ کئے ہیں۔ یعنی اپنے پروردگار کی نعمت کے منتظر ہونگے لیکن بلاغت قرآن کی رو سے یہ سراسر تعسف ہے۔

---

❶ راجع للبحث فی (اللهم) المسائل والاجوبة لابن سیده: ۱/۱۰۹ معالم ص: ۲/۲۲ المطرزی علی المقامات: ص ۵۳ الکناش الکواکبی ص ۸۱ والکلام فی میم (اللهم) ومناقشته فیها: ذخائرالقصرلابن طون آخرص ۵۱.

❷ رواه البخاری ومسلم من حدیث انسؓ لئکن فی روایتهما ولا تلیت والحدیث ایضاً فی مسند البزار واحمد عن عبدالله بن عمرو والطبرانی فی الاوسط.

اَلَا

اَلَا یہ حرف استفتاح ❶ ہے (یعنی کلام کے ابتداء میں تنبیہ کے لیے آتا ہے)

اِلَّا

اِلَّا یہ حرف استثناء ہے۔ ❷

اُولَاءِ (اُولَا)

یہ اسم مبہم ہے جو جمع مذکر ومؤنث کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے اس کا مفرد من لفظہٖ نہیں آتا (کبھی اس کے شروع میں ھا تنبیہ بھی آجاتا ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿ هَا اَنْتُمْ اُولَاءِ تُحِبُّوْنَهُمْ ﴾ (۱۱۹:۳) دیکھو! تم ایسے لوگ ہو کچھ ان سے دوستی رکھتے ہو ﴿ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى ﴾ (۵:۲) یہی لوگ...... ہدایت پر ہیں اور کبھی اس میں قصر (یعنی بحذف ہمزہ آخر) بھی کرلیا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❸

(۲۲) هُؤُلَا ثُمَّ هُؤُلَا كُلًّا اَعْطَيْهِ
تُ نَوالًا مَحْذُوْةً بِمِثَالٍ

ان سب لوگوں کو میں نے بڑے بڑے گرانقدر عطیے دیے ہیں۔

ا م م

اَلْاُمُّ یہ اَبٌ کا بالمقابل ہے اور ماں قریبی حقیقی ماں اور بعیدہ یعنی نانی پرنانی وغیرہ سب کو اُمٌّ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حواء علیہا السلام کو اُمُّنَا کہا گیا ہے اگرچہ ہمارا ان سے بہت دور کا تعلق ہے۔ پھر ہر اس چیز کو اُمٌّ کہا جاتا ہے، جو کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے یا اس کی اصلاح وتربیت کا سبب ہو یا اس کے آغاز کا مبداء بنے۔ خلیل کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس کے اندر اس کے جملہ متعلقات منضم ہوجائیں یا سماجائیں...... وہ ان کی اُمٌّ کہلاتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ ﴾ (۴:۴۳) اور یہ اصلی نوشتہ (یعنی لوح محفوظ) میں ہے۔ میں اُمِّ الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے کیونکہ وہ تمام علوم کا منبع ہے اور اسی کی طرف تمام علوم منسوب ہوتے ہیں اور مکہ مکرمہ کو اُمَّ الْقُرٰی کہا گیا ہے (کیونکہ وہ خطہ عرب کا مرکز تھا) اور بموجب روایت تمام روئے زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی ہے (اور یہ ساری دنیا کا دینی مرکز ہے) قرآن پاک میں ہے:
﴿ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ (۷:۴۲) تاکہ تو مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں۔ بدعملی کے انجام سے ڈرائے۔ اُمُّ النُّجُوْمِ۔ کہکشاں۔ شاعر نے کہا ہے ❹ (طویل)

---

❶ يكون لتوبيخ والتمنى والاستفهام عن النفى والعرض والتحصيص نحو ﴿اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ لَكُمُ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (٢٤-٢٢) وفى معنى التنبيه ﴿اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ﴾ (١١/٧).

❷ وقد يكون صفة بمنزلة غيرنحو ﴿لوكان فيهما الهة الا الله لفسدتا﴾ (الانبياء : ٢١-٢٢) وفيه بحث وعاطفة بمنزلة الواو راجع الاية (٢ : ١٥٠) (٢٧ : ١١٧١) وزائدة فهذه اربعة اوجه واما الافحرف تخصيص اومركب من ان (ان الناصبة المخففة) راجع للبحث المغنى ج ١ص ٧٣-٧٨.

❸ قاله الاعشى وفى جمهرة اشعار العرب نعالا بدل نوالا ومعناه سقيتهم كاس الروى والبيت فى البحر (١٣٨/١) اوديوانه ١٦٧ .

❹ قاله تابط شراد صدره يرى الوحشة الانس الانيس ويهتدى...... والبيت فى الحماسه مع المرزوقى رقم ١٣ فى تسعة ابيات والبيت فى الضاعتين ٣٢٢ والالى (٢-١٣٥) ونقد الشعر ٢٩ والحيوان (٦ : ٢٥٦) فى ستة ابيات و خمار القلوب ٢٠٤ وزهر الآداب (٢ : ٢١) فى عشرة ابيات وام النحو م الشوابك هى الشعرى والبيت فى التحان ٢٤٢ منسوب لسليك بن سلكة وراجع للبيت ايضاً السمط ٧٦٢ وادباء للمؤلف (٤ : ٦١٨).

(۲۳) بحیث اهدَتْ ام النَّجوم الشوابك .

یعنی جہاں کہ کہکشاں راہ پاتی ہے۔

أُمّ الاضیاف ۔ مہمان نواز ۔ اُمّ المساکین ۔ مسکین نواز ۔ مسکینوں کا سہارا۔ ایسے ہی جیسے بہت زیادہ مہمان نواز کو ''ابوالاضیاف'' کہا جاتا ہے اور رئیس جیش کو ام الجیش ۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (طویل)

(۲۴) وام عیال قَدْ شَهِدْتُ تقوتُهُمْ

اور وہ اپنی قوم کے لیے بمنزلہ ام عیال ہے جو ان کو رزق دیتا ہے۔

أُمُّ الکتاب ۔ سورۃ فاتحہ کا نام ہے، کیونکہ وہ قرآن پاک کے لیے بمنزل دیباچہ اور مقدمہ ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ فَأُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴾ (۱۰۱:۹) مثویٰ یعنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ دوزخ کے متعلق مَأْوَاكُمُ النَّارُ (۲۹:۲۵) فرمایا ہے (اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ایک محاورہ ہو) جس طرح کہ وَيْلُ اُمِّهٖ وَهَوَتْ اُمُّهٗ ہے یعنی اس کے لیے ہلاکت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ: ﴿ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ ﴾ (۶:۳۳) میں ازواج مطہرات کو امہات المؤمنین قرار دیا ہے جس کی وجہ بحث (اَبٌ) میں گزر چکی ہے۔ نیز فرمایا: ﴿ يَابْنَ اُمَّ ﴾ (۲۰:۹۴) کہ بھائی۔

اُمٌّ (کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے) بعض نے کہا ہے کہ اُمٌّ اصل میں اُمَّهَةٌ ہے کیونکہ اس کی جمع اُمَّهَاتٌ اور تصغیر اُمَيْهَةٌ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اصل میں مضاعف ہی ہے کیونکہ اس کی جمع اُمَّاتٌ اور تصغیر اُمَيْمَةٌ آتی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ عام طور پر حیوانات وغیرہ کے لیے اُمَّاتٌ اور انسان کے لیے اُمَّهَاتٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اَلْاُمَّةُ: ہر وہ جماعت جن کے مابین رشتہ دینی ہو یا وہ جغرافیائی اور عصری وحدت میں منسلک ہوں پھر وہ رشتہ اور تعلق اختیاری ہو یا غیر اختیاری اس کی جمع اُمَمٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ﴾ (۶:۳۸) اور زمین پر جو چلنے پھرنے والے (حیوان) دو پروں سے اڑنے والے پرند ہیں وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ میں اُمَمٌ سے ہر وہ نوع حیوان مراد ہے جو فطری اور تسخیری طور پر خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ مثلاً: مکڑی جالا بنتی ہے اور سرفۃ (امور سپید تنکوں سے) اپنا گھر بناتی ہے اور چیونٹی ذخیرہ اندوزی میں لگی رہتی ہے اور چڑیا کبوتر وغیرہ وقتی غذا پر بھروسہ کرتے ہیں الغرض ہر نوع حیوان اپنی طبیعت اور فطرت کے مطابق ایک خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے اور آیت کریمہ: ﴿ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ (۲:۲۱۳) (پہلے تو سب) لوگ ایک اُمت تھے۔ کے معنی

---

❶ قاله الشنفری عمرو بن مالك الاروی (۷۰ق هـ ـ ۵۲۷۵ق م) شاعر جاهلی من الصعاليك صاحب لامية العرب التی شرحها الزمخشری فی اعجب العجائب واراد بام عيال تابط شر لانهم حين غزو اجعلوا زادهم اليه فكان يقتر عليهم مخافة ان تطول الغزاة فيموتوا جوعاً والازد تسمی راس القوم وولی امرهم اماً وتمام البيت : اذ اطعمتهم اوتحت واقلت والبيت من كلمةمفضلية رقم : ۲۰ فی ۳۶ بيتاً والبيت فی اللسان (ام) والا فما فی (۲۱ : ۹۰) وفی المطبوع نفوسهم بدل تقويتهم مصحف وفی رواية اتهفت بدل او تحت واحترتهم بدل اطعمتم وارجع للبيت تهذيب الالفاظ ۷۲، ۵٦٥ واللسان (حترام) والتاج (ام) والجمهرة (۱ : ۲۱) والمخصص ۱۳،۳ وكتاب الابدال لابی الطيب والسمط ۴۱۳ والانمانی (۲۱ : ۱۳۴) والخزاز ۲ : ۱٦)فالحماسة مع المرزوقی ۷۵۷ والتبريزی (۲ : ۲۳) ومجمع الامثال (۱ : ۳۲۱) والعينی : ۲ : ۱۱۷.

یہ ہیں کہ تمام لوگ صنف واحد اور ضلالت و کفر کے ہی مسلک پر گامزن تھے اور آیت کریمہ: ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (۴۸:۵) اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ہی شریعت پر کر دیتا۔ میں اُمَّةً وَّاحِـدَةً سے وحدۃ بلحاظ ایمان مراد ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ (۱۰۴:۳) کے معنی یہ ہیں کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو علم اور عملِ صالح کا راستہ اختیار کرے اور دوسروں کے لیے اسوہ بنے اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰى اُمَّةٍ﴾ (۲۲:۴۳) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک متفقہ دین پر پایا ہے میں اُمَّةٍ کے معنی دین کے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶

(۲۵) وَهَلْ يَاْثَمَنْ ذُوْ اُمَّةٍ وَهُوَ طَائِعٌ (طویل)

بھلا کوئی متدین آدمی رضا اور رغبت سے گناہ کر سکتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ﴾ (۴۵:۱۲) میں اُمَّة کے معنی حین، یعنی عرصہ دراز کے ہیں اور ایک قرأت میں بعد اُمَهٍ (بِالْهَاء) ہے ❷ یعنی نسیان کے بعد جب اسے یاد آیا۔ اصل میں بَعْدَ اُمَّةٍ کے معنی ہیں ایک دور کسی ایک مذہب کے متبعین کا دور گذر جانے کے بعد اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ﴾ (۱۲۰:۱۶) کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) عبادت الٰہی میں ایک جماعت اور قوم کے بمنزلہ تھے۔ جس طرح کہ محاورہ ہے: فُلَانٌ فِيْ نَفْسِهٖ قَبِيْلَةٌ کہ فلاں بذاتِ خود ایک قبیلہ ہے۔ یعنی ایک قبیلہ کے قائم مقام ہے۔ (۱۳) وروی انه يحشر زيد بن عمرو بن نفيل امة وحده. اور ایک روایت میں ہے کہ حشر کے دن زید بن عمرو بن نفیل اکیلا ہی امت ہوگا۔ ❸ اور آیت کریمہ:

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ (۱۳:۳) وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں ان اہل کتاب میں کچھ لوگ (حکم خدا پر) قائم بھی ہیں۔

میں اُمَّةٌ بمعنی جماعت ہے زجاج ❹ کے نزدیک یہاں قَآئِمَة بمعنی استقامت ہے یعنی ذو وطَرِيْقَةٍ وَاحِدَةٍ تو یہاں مضمر متروک ہے۔

اَلْاُمِّيُّ وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ ہی کتاب میں سے پڑھ سکتا ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (۲:۶۲) وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں

---

❶ قاله النابغة واوله: حلفت فلم اترك لنفسك ريبة .... والبيت من القصدية التى يعتذر بها الى النعمان بن المنذر عماوشت به بنو قريع وهو فى ديوانه من الستة ١٩ واللسان والصحاح (امم) وذيل مجالس ثعلب ١ / ٥٠ ومجاز القران لابى عبيده ١٠٠ رقم ١٢٢ مختار الشعر الجاهلى (١ : ٨٣) والبلدان (رسم: ثبرة) والعقد الثمين ١٩ والمعانى والمشكل للقتبى ٣٤٦ وفى رواية المرتضىٰ حلفت......... وليس وداء الله للمرء مذهب ـ وهو اطبق لرواية الديوان (٢ : ١٧).
والنوادر لابى مسهل الاعرابى ٤٤٨ والفائق ١ : ٢٦).

❷ قرء بذالك ابن عباس وكان ابو الهيثم يقرء به ايضاً انظر اللسان (امه)

❸ رواه الطبرانى وفى الحديث قصة والبزار باختصار عنه وفيه المسعودى وقد اختلط وبقية رجاله ثقات وابو يعلىٰ وكذا قال ابن مسعود فى معاذ وقد ورد ذالك فى حديث مرفوع راجع مجمع الزوائد: ج ٩ ص ٤١٧ ـ ٤١٨ وتخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم: ٢٦٥ ـ ٢٦٦.

❹ ابو اسحاق ابراهيم بن السرى بن سهل الزجاج توفى بين ٣١٠ هـ ٣١٦ وكان من اشهر تلاميذ المبرد استاذ الزجاجى ومن مؤلفاته .... (١٣٢ ، ٣٠٨) طبقات زبيدى ٤٢ تاريخ بغدادى ٦ : ٨٩ ـ ٩٣ ابن خلقان رقم ١٢ واعلام زركلى.

سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا۔

میں اُمِّیّٖنَ سے یہی مراد ہے۔قطرب ❶ نے کہا ہے کہ اُمِّیَّۃٌ بمعنی غفلت و جہالت کے ہے اور اسی سے امی ہے کیونکہ اسے بھی معرفت نہیں ہوتی، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ ﴾ (۲:۷۸) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی کتاب سے) واقف ہی نہیں ہیں۔

یہاں اِلَّآ اَمَانِيَّ کے معنی اِلَّآ اَنْ يُّتْلٰى عَلَيْهِمْ کے ہیں یعنی مگر یہ کہ انہیں پڑھ کر سنایا جائے۔فَرَّاءَ ❷ نے کہا ہے کہ اُمِّيُّوْنَ سے مراد ہیں جو اہل کتاب نہ تھے اور آیت کریمہ:

﴿ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾ (۷:۱۵۷) اور وہ جو (محمد) رسول (اللہ) نبی امی کی پیروی کرتی ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔میں بعض نے کہا ہے کہ اُمِّيٌّ اس امت یعنی قوم کی طرف منسوب ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو جس طرح کہ عَامِيٌّ اسے کہتے ہیں جو عوام جیسی صفات رکھتا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اُمِّيٌّ کہنا اس بنا پر ہے کہ آپؐ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھتے تھے۔ بلکہ وحی الٰہی کے بارے میں اپنے حافظہ اور خدا کی اس ضمانت پر کہ ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴾ (۸۷:۶) ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے۔ اعتماد کرتے تھے یہ صفت آپ کے لیے باعث فضیلت تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ام القریٰ یعنی مکہ مکرمہ کی طرف نسبت ہے۔ ❸

اَلْاِمَامُ وہ ہے جس کی اقتداء کی جائے خواہ وہ انسان ہو یا اس کے قول وفعل کی اقتداء کی جائے یا کتاب وغیرہ ہو اور خواہ وہ شخص جس کی پیروی کی جائے حق پر ہو یا باطل پر ہو اس کی جمع اَئِمَّۃٌ (اَفْعِلَة) ہے اور آیت:

﴿ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ﴾ (۱۷:۷۱) جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔ میں امام سے وہ شخص مراد ہے جس کی وہ اقتداء کرتے تھے۔اور بعض نے کہا ہے کہ امام بمعنی کتاب ہے۔ ❹ اور آیت کریمہ: ﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ (۲۵:۷۴) اور ہمیں پرہیز گاروں کا امام بنا۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے کہ یہ امام (مفرد) کی جمع ہے ❺ اور دوسرے علماء کے نزدیک یہ دِرْعٌ دِلَاص ودروع دِلَاصٌ کے باب سے ہے ❻ (یعنی فِعَال مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے) اور آیات: ﴿ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً ﴾ (۲۸:۵)

---

❶ محمد بن المستنیر بن احمد ابو علی النحوی المعروف بقطرب (۰۰-۲۰۶) للغوی البصری مولیٰ سالم بن زیاد ولازم سیبویه وکان یدلج الیه فسماه قطر باراى دويلبسة الليل ٤٧ ومن تصانيفه معانی القرآن وهو اوّل من وضع المثلث فی اللغة (وفیات الاعیان ۱/ ٤٩٤)طبقات النحويين ١٠٦ بغية الوعاة ١٠٤ الفهرست ٥٢ معجم المطبوعات ٥١٧ نزهة الالباء ١١٩ .

❷ ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء (۰۰-۲۷۰) روی عن الکسائی وطبقته صاحب التصانیف بغیة الوعاة ٤١١-٤١٢ الفهرست ١٠٠-١٣٠٧ والانباه ١/ ١٠٩و٢/ ٢٥٥ ومعجم الادباء ٢٠/ ١٤ اوکشف الظنون ٢/ ١٩٢٠ .

❸ نسب هذا القول الى الامام الباقر(انظر روح المعانی ص ٧٠ ج ٩).

❹ قراءة الحسن بكتابهم (الكشاف ص : ٦٨٢ ج ٢).

❺ كذا فی الصحاح وعند البعض جمع ام كصائم وصيام كذافی لسان العرب والكشاف للزمخشری ص: ٢٩٦ ج ٣).

❻ وقال الزمخشری ارادائمه فاكتفى بالواحد لدلالته على الجنس ولعدم اللبس : ص ٢٩٦ ج ٣٠.

اوران کوپیشوابنائیں ﴿ وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ (۴۱:۲۸) اورہم نے ان کو پیشوا بنایا تھا وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔

میں اَئِمَّةٌ کا واحد امام ہے اور آیت: ﴿ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (۱۲:۳۶) اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن یعنی لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لوحِ محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔

اَلْاَمُّ (ن) کے معنی ہیں سیدھا مقصد کی جانب متوجہ ہونا (اور کسی طرف مائل نہ ہونا) اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ﴾ (۲:۵) اور نہ ان لوگوں کی جو عزت والے گھر (یعنی بیت اللہ) کو جا رہے ہوں۔ میں اٰمِّيْنَ اسی پر محمول ہے:

اَمَّهٗ بمعنی شَجَّهٗ کسی کا سر پھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے اصل معنی ام دماغ پر مارنا کے ہیں۔ جیسا کہ اہل عرب کسی عضو پر مارنے کے لیے اس سے فَعَلْتُ کا صیغہ بنالیتے ہیں جیسے رَأَسْتُهٗ، رَجَلْتُهٗ، كَبَدْتُهٗ، بَطَنْتُهٗ

ام حرف

اَمْ: جب یہ ہمزہ استفہام کے بالمقابل استعمال ہوتو بمعنی او ہوتا ہے، جیسے اَزَيْدٌ فِي الدَّارِ اَمْ عَمْرٌو یعنی ان دونوں میں سے کون ہے؟ اور اگر ہمزہ استفہام کے بعد نہ آئے تو بمعنی بَلْ ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴾ (۶۳:۳۸)(یا) ہماری آنکھیں ان (کی طرف) سے پھر گئی ہیں۔

اَمَّا حرف

اَمَّــا: یہ کبھی حرف تفصیل ہوتا ہے اور احــد الشیئین کے معنی دیتا ہے اور کلام میں مکرر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ ﴾ (۴۱:۱۲) تم میں سے ایک (جو پہلا خواب بیان کرنے والا ہے وہ) تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا۔ اور کبھی ابتداء کلام کے لیے آتا ہے جیسے اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّهٗ كَذَا.

ا م د

اَلْاَمَدُ: (موت، غایت) قرآن میں ہے: ﴿ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗۤ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا ﴾ (۲۹:۳) تو آرزو کرے گا کہ کاش اس میں اور اس برائی میں انتہائی بعد ہوتا۔

اَلْاَمَدُ وَالْاَبَدُ دونوں قریب المعنی ہیں لیکن اَبَدَ غیر متعین اور غیر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہٰذا اَبَدُ كَذَا (اتنی مدت) کا محاورہ صحیح نہیں ہے اور اَمَدُ غیر معین مگر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہٰذا اَمَدُ كَذَا (اتنی مدت) کہنا صحیح ہے جس طرح کہ زمان کذا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ زَمَانٌ اور اَمَدٌ کے لفظ میں صرف اتنا فرق ہے کہ اَمَدٌ کا لفظ کسی مدت کی نہایت اور غایت کے لیے بولا جاتا ہے اور زمان کا لفظ کسی مدت کے لیے مبدأ اور غایت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اسی بنا پر بعض نے کہا ہے اَلْمَدی وَالْاَمَد دونوں قریب المعنی ہیں (یعنی کسی چیز کی مدت کی غایت بیان کرنے کے لیے آتے ہیں)

ا م ر

اَلْاَمْرُ (اسم) کے معنی: نشان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع اُمُوْرٌ ہے اور اَمَرْتُہٗ (ن) کا مصدر بھی اَمْرٌ آتا ہے جس کے معنی حکم دینا کے ہیں اَمْرٌ کا لفظ جملہ اقوال و

افعال کے لیے عام ہے۔ چنانچہ آیات:

﴿ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ ﴾ (۱۱:۱۲۳) اور تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔ ﴿ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ یُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ ﴾ (۳:۱۵۴) تم کہہ دو کہ بیشک سب باتیں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ یہ لوگ (بہت سی باتیں) دلوں میں مخفی رکھتے تھے جو تم پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی۔ ﴿وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ ﴾ (۲:۲۷۵) اور (قیامت میں) اس کا معاملہ خدا کے سپرد۔ میں امر سے یہی معنی مراد ہیں۔ اور کبھی امر بمعنی ابداع بھی آ جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ﴾ (۷:۵۴) دیکھو! خلق اسی کے اختیار میں ہے اور ابداع بھی۔ اور امر بایں معنی ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی مخلوق اس معنی میں اس کے ساتھ شریک نہیں اور آیت:

﴿ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ﴾ (۴۱:۱۲) اور ہر آسمان میں اس (کے امر) کا حکم بھیجا۔ میں بھی امر اسی معنی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور حکماء امت نے آیتِ کریمہ: ﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ﴾ (۱۷:۸۵) کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔ میں بھی مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے معنی مِنْ اِبْدَاعِهٖ کیے ہیں [1] اور آیت کریمہ: ﴿وَاِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴾ (۱۶:۴۰) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو (ہماری) بات یہی ہے کہ اس کو کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ میں بھی امر اِبْدَاعِی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے باری تعالیٰ کی طرف سے جو اہتمام ہوتا ہے اسے نہایت اختصار اور بلاغت سے اس آیت میں بیان فرمادیا ہے اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ (۵۴:۵۰) اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک (بات) ہوتی ہے۔ میں بھی سرعت ایجاد سے کنایہ ہے اور عالم میں ایجاد و تکوین کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی تیز رفتاری کو بتانے کے لیے ایسا بلیغ طریقہ اختیار کیا ہے جو ہماری قوت واہمہ سے بھی بلند ہے اور امر بمعنی اَلتَّقَدُّم بِالشَّیْءِ (یعنی حکم دینا) عام ہے کہ بصیغہ امر ہو یا بلفظ خبر ہو جیسے فرمایا:

﴿ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ﴾ (۲:۲۲۸) اور طلاق والی عورتیں اپنے تئیں روکے رکھیں۔ اور یا بطریق اشارہ وغیرہ ہو چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ﴾ (۳۷:۱۰۲) میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے انھوں نے کہا: ابا جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجیے۔

میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب میں اپنے بچے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھنے کو امر (مَا تُؤْمَرُ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

---

[1] وفیه لغة أیماً وهو حرف شرط وتفصیل وتوکید ولزمت الفاء بعدها وقد تحذف الفاء للضرورة والدیات التی بغیرفاء کمافی (۳:۱۰٦) و(٤٥-۳۱) فهناك یقدر لفظة فیقال راجع للبحث المغنی ج ۱ص ۵۷۔ وقد یاتی للتوکید والشرط ویفصل بین اماوالفاء بواحد من امور ستة (۱) المبتدا (۲) الخبر (۳) جملته الشرط (٤) اسم منصوب لفظًا ومحلًا بالجواب کما فی سورة الضحی ۹-۱۰-۱۱ (۵) اسم منصوب معمول لمحذوف یفسده بعدالفاء (٦) ظرف معمول لامًا (راجع المغنی ج ۱ص ٦۰-۵۹) والرضی علی الکافیة ج ۲ص ۳۹۵-٤۰۰) وفیه وقد یحذف کمافی نحو وثیابك فطهر والرجز فاهجر الایة .

﴿ وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴾ (۱۱:۹۷) اور فرعون کا معاملہ درست نہیں تھا۔ میں امر کا لفظ فرعون کے جملہ اقوال اورافعال کو شامل ہے اور آیت کریمہ: ﴿ اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ (۱:۱۶) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آ ہی پہنچا۔ میں امر سے مراد قیامت ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ عام لفظ استعمال کیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ﴾ (۱۸:۱۲) بلکہ تمہارے لیے تمہارے دلوں نے بات کو خوشنما بنالیا ہے۔ میں اَمْرًا سے مراد یہ ہے کہ یہ ان برے کاموں سے ہے جن پر نفس امّارہ انسان کو اکساتا رہتا ہے۔

اَمِرَ (س) الْقَوْمُ کے معنی ہیں قوم زیادہ ہوگئی کیونکہ آبادی بڑھ جائے تو امیر (حاکم) کا تقرر ضروری ہوجاتا ہے جس کے بغیر انتظام صحیح نہیں رہ سکتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (بسیط)

(۲۶) لَا يَصْلُحُ النَّاسُ فَوْضٰى لَا سَرَاةَ لَهُمْ

جس قوم کا رئیس نہ ہو اس کا معاملہ درست نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا امر بمعنی کثرت استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ: ﴿اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا ﴾ (۱۶:۱۷) (تو) وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو حکم دیا۔ میں امر بمعنی حکم ہے یعنی ہم انھیں اطاعت الٰہی کا حکم دیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَمَرْنَا بمعنی كَثَّرْنَا ہے یعنی وہاں کے خوشحال لوگوں کو بڑھا دیتے ہیں۔

ابوعمرو کا قول ہے کہ معنی کثرت کے لیے اَمَرْتَ (مجرد) نہیں آتا بلکہ اَمَّرْتُ (تفعیل) وَاٰمَرْتُ استعمال ہوتا ہے لیکن ابوعبیدہ کا قول ہے ❷ کہ کبھی اس معنی کے لیے اَمَرْتُ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ❸ (۱۴) خَيْرُ الْمَالِ مُهْرَةٌ مَاْمُوْرَةٌ وَسِكَّةٌ مَاْبُوْرَةٌ کہ بہتر مال پرورش کیا ہوا بچھڑا اور پیوند کیے کھجور کے درخت ہیں۔ تو مَاْمُوْرَةٌ اَمَرْتُ سے ہے ایک قرأت میں اَمَّرْنَا ہے جس کے معنی ہیں: ہم ان کو امراء بنا دیتے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكَابِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ﴾ کہ ہم نے اسی طرح اس کے اکابر کو مجرم بنادیا تا کہ اس میں مکر و فریب کریں (۱۲۳:۶) اور ایک قرأت میں اٰمَرْنَا بمعنی اَكْثَرْنَا بھی ثابت ہے۔ ❹

اَلْاِئْتِمَارُ کے اصل معنی حکم بجالانا کے ہیں اور تَشَاوُرٌ

---

❶ قاله الاقوه الاودی واسمه صلاءه بن عمرو ويكنى ابا ربيعة والبيت فى العقد: ۱۰، ۴۳) والسمط: ۲۷۰) والامالى ۲: ۲۲۲) قال الاستاذ الميمنى والبيت من كلمة ۱۷ بيتاً فى نسخة ديوان الافوه (الطرائف ۹-۱۰) ولاتوجد كاملة فى الكتب المعروفة وبعضها فى آخر ديوان ابى الاسود صنعة السكرى قال وقد زعم لى بعض الرواة انها للافوه ۱هـ والبيت فى مجموعة المعانى ۱۶، ۱۹-۱۳۰) والشعراء ۱۷۵ ابن الحديد ٤: ۵۳۱ والصحاح واللسان (فوض) والمزهر ۱: ۱٦٤) والنوادر (۱: ۲۹۸) وروضة العقلاء ۲٤٦ والبيت ثالث ثلاثة للافوه التى ذكرها المولف (ا س و) ص ۳۵۵.

❷ انظر لقول ابى عبيدة فى مجازه: ج ۱ ص ۳۷۲-۳۷۳ واللسان (امر) ثم القراءة بالتخفيف مروية عن الصحابة والتابعين الا الحسن فانه قرأ التشديد وتبعه ابو عبيده فى مجازه عن ابى العاليه الرياحى امّرنا بالتشديد وروىت عن علىؓ ۱۲.

❸ راجع للحديث الفائق ۱: ۳۰۰ والنهاية ۱/ ۱۱ واللالى ۳۱۸ والحديث اخرجه ابن كثير من مسند احمد و(حم طب) عن سويد بن هبيرة والماوردى فى ادب الدنيا والدين ۳٦۷ مع شرح المنهاج وهو مثل انظر البيان ۲/ ۱۰ والعيون والمستقصىٰ والقالى ۲/ ۲۰٤ و ۲۱۰ والالفاظ ۳ و ۳ ٦۸ واللسان (امر) وراجع ايضاً ذيل تفسير الكشاف ۲/ ٦۵۵ وفيه التخريج قال البكرى وحمل الحديث على هذه اللغة الفصيحة اولى من حمله على الاتباع.

❹ هى قراءة شاذة عن ابى عثمان النهدى والليث عن ابى عمرو وا بان بن عاصم انُظر القراءات الشاذة لابن خالويه ۷۵.

یعنی باہم مشورہ کرنے کو بھی اِئْتِمَار کہا جاتا ہے، کیونکہ مشورہ میں بھی ایک دوسرے کے حکم کو قبول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُوْنَ بِكَ ﴾ شہر کے رئیس تمہارے بارے میں صلاح مشورے کرتے ہیں۔ (۲۸:۲۰) اور شاعر نے کہا ہے ❶

(۲۷) اَمَرْتُ نَفْسِيْ اَیَّ اَمْرٍ اَفْعَلُ

میں نے اپنے جی میں سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ﴾ یہ تو آپ نے بڑی ناپسندیدہ بات کی (۱۸:۷۱) میں امر بمعنی منکر ہے اور یہ اَمِرَ الْاَمْرُ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی کسی معاملہ کے حد سے بڑھ جانا کے ہیں جس طرح کہ اِسْتَفْحَلَ الْاَمر کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ: ﴿ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ (۴:۵۹) اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں۔ میں بعض کے نزدیک عہد نبوی کے امراء مراد ہیں۔ اور بعض ائمہ اہل بیت مراد لیتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اولی الامر کے معنی اَلْاٰمِرُوْنَ بالمعروف کے ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس سے وہ فقہاء اور اہل علم مراد ہیں۔ جو احکام الٰہی کے فرمانبردار ہوں اور یہ سبھی اقوال صحیح ہیں کیونکہ اولی الامر جو لوگوں کو برائی سے روکتے ہیں چار قسم پر ہیں۔ (۱) انبیاء: جن کا حکم عوام وخواص کے ظاہر و باطن پر نافذ ہوتا ہے۔ (۲) حکام: جن کا حکم صرف لوگوں کی ظاہری حالت پر جاری ہوسکتا ہے۔ دلوں پر ان کی حکومت نہیں ہوتی۔ (۳) حکماء: خواص کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ (۴) وعاظ: جن کا حکم صرف عوام کے قلب ضمیر پر ہی جاری ہوسکتا ہے۔ ❷

ا م ن

اَلْاَمْنُ: اصل میں امن کا معنی نفس کے مطمئن ہونے کے ہیں۔ اَمْنٌ، اَمَانَۃٌ اور اَمَانٌ یہ سب اصل میں مصدر ہیں اور امان کے معنی کبھی حالت امن کے آتے ہیں اور کبھی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی کے پاس بطور امانت رکھی جائے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ ﴾ (۸:۲۷) یعنی وہ چیزیں جن پر تم امین مقرر کیے گئے ہو ان میں خیانت نہ کرو۔ اور آیت کریمہ: ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ہم نے (بار) امانت آسمان اور زمین پر پیش کیا ہے (۳۳:۷۲) کی تفسیر میں بعض نے "عدل و انصاف" مراد لیا ہے۔ بعض نے حروف تہجی اور بعض نے عقل مراد لی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ معرفتِ توحید، عدل وانصاف کا قیام اور حروف تہجی کی معرفت عقل کے بغیر ممکن نہیں، بلکہ انسان کے لیے علوم ممکنہ کی تحصیل اور افعال حسنہ کی سرانجام دہی عقل کے بغیر مشکل ہے۔ اور عقل کے باعث ہی انسان کو اکثر مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ اور جو شخص اس (مبارک) گھر میں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔ (۳:۹۷) میں امن پانے سے مراد دوزخ

---

❶ قاله كعب بن زهير وصدره انحت قلوصي وكتلات بعينهاء راجع السمط (۱: ۲۰۰) واللسان وكلاء ديوانه والبحر (۶: ۱۹) وفي روايتهم جميعاً اى امرى بدل اى امر.

❷ لم يذكر بعده (ا م س) و (ا م ل) راجع المستدرك.

کی آگ سے بے خوف ہونا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان دنیوی مصائب سے بے خوف ہونا مراد ہے جو اُن لوگوں کو پہنچتے ہیں جن کے بارے میں ﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ﴾ خدا چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے۔(۹:۵۵) ارشاد فرمایا ہے اور نہ زیر بحث آیت میں خبر بمعنی انشاء ہے یعنی جو شخص حرم میں داخل ہو اسے امن دیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ ہلاکت سے بے خوف ہونا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اسے پر امن رہنے دیا جائے۔جیسے محاورہ ہے: هٰذَا حَلَالٌ وَهٰذَا حَرَامٌ یعنی اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور دوسری حرام ہے۔لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ مجرم جب تک حرم کے اندر ہے نہ اس سے قصاص لیا جائے اور نہ ہی کسی جرم میں اسے قتل کیا جائے۔ ❶ اسی طرح آیت: ﴿ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا ﴾ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے۔(۲۹:۶۷) اور آیت ﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ﴾ اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔(۲:۱۲۵) میں بھی امن کے یہی معنی مراد ہو سکتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ اَمَنَةً نُّعَاسًا ﴾ تسلی (یعنی) نیند (نازل فرمائی) (۳:۱۵۴) میں اَمَنَةً بمعنی امن ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کَتَبَةٌ کی طرح اٰمِنٌ کی جمع ہے۔نزول مسیح والی حدیث میں ہے۔ ❷ (۱۵) وَتَقَعُ الْاَمَنَةُ فِی الْاَرْضِ اور زمین میں امن قائم ہو جائے گا اور آیت کریمہ:

﴿ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ﴾ پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو۔(۹:۶) میں مَاْمَن ظرف ہے جس کے معنی ''جائے امن'' کے ہیں۔

اٰمَنَ (افعال) دو طرح سے استعمال ہوتا ہے (۱) متعدی بنفسہٖ جیسے اٰمَنْتُهٗ (میں نے اسے امن دیا) اور اسی معنی کے اعتبار سے اسماءِ حسنیٰ میں مُؤْمِنٌ آیا ہے۔

(۲) لازم جس کے معنی ہیں پر امن ہونے والا۔

اَلْاِیْمَانُ کے ایک معنی شریعت محمدی کے آتے ہیں۔چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئُوْنَ ﴾ اور جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (۲:۶۲) میں اٰمَنُوْا کے یہی معنی ہیں اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہو سکتا ہے جو توحید و نبوۃ کا اقرار کر کے شریعت محمدی میں داخل ہو جائے اور بعض نے آیت: ﴿ وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ ﴾ اور ان میں سے اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔(۱۲:۱۰۶) کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

(۲) اور کبھی ایمان کا لفظ بطور مدح استعمال ہوتا ہے اور اس سے ''حق کی تصدیق کر کے اس کا فرمانبردار ہو جانا مراد ہوتا ہے اور یہ چیز تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل

---

❶ کما روی عن عمر رضی اللہ عنہ لوظفرت فیہ بقاتل الخطاب مامسستہ حتی یخرج منہ (راجع الکشاف ج۱ ص ۳۸۹).

❷ والحدیث باختلاف الفاظہ رواہ ابن حبان واصحاب السنن الاربعۃ والشیخان والبیھقی فی الاسماء والصفات وانظر تخریجہ ابن کثیر ۱/ ۵۷۸ـ۵۸۳ وللشوکانی رسالۃ سماھا التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح.

بالجوارح سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے فرمایا:
﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ﴾ (۱۹:۵۷) اور جولوگ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے ہیں وہی صدیق ہیں یہی وجہ ہے کہ اعتقاد، قول صدق اور عمل صالح میں سے ہر ایک کو ایمان کہا گیا ہے، چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ﴾ اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یوں ہی کھودے۔ (۲:۱۴۳) میں ایمان سے مراد نماز ہے اور (۱۶) آنحضرت ﷺ نے حیا اور راستہ سے تکلیف کے دور کرنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور حدیث جبریل میں آنحضرت ﷺ نے چھ باتوں کو اصل ایمان کہا ہے ❶ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ﴾ اور آپ ہماری بات کو، گو ہم سچ ہی کہتے ہوں باور نہیں کریں گے۔ (۱۲:۱۷)
میں مُؤْمِن بمعنی مصدق ہے، لیکن ایمان اس تصدیق کو کہتے ہیں جس سے اطمینان قلب حاصل ہو جائے اور تردد جاتا رہے اور آیت کریمہ: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ﴾ بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔ (۴:۵۱) میں ان کی مذمت کی ہے کہ وہ ان چیزوں سے امن واطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں جو باعث امن نہیں ہوسکتیں کیونکہ انسان فطری طور پر کبھی بھی باطل پر مطمئن نہیں ہوسکتا۔ تو یہاں یُؤْمِنُوْنَ کا لفظ ایسے ہی (بطور طنز کے ہے۔ جس طرح آیت: ﴿مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (بلکہ) وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے۔ (۱۶:۱۰۶) میں کفر کے ساتھ شرح صدر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو یہ اِیْمَانُهُ الْكُفْرُ وَتَحِیَّتُهُ الضَّرْبُ کے قبیل سے ہے۔
رَجُلٌ اَمَنَةٌ وَاُمْنَةٌ ہر ایک پر اعتماد کرنے والا۔ رَجُلٌ اَمِیْنٌ وَاَمَانٌ امانتدار آدمی اَلْاَمُوْنُ۔ وہ اونٹنی جس کے تھک جانے اور لغزش کھانے سے سوار بے خوف ہو۔
اٰمِین: یہ ممدود اور مقصود دونوں طرح بولا جاتا ہے اور صَهٖ وَمَهٖ کی طرح اسم فعل ہے ❷ حسن کے نزدیک آمین بمعنی استجب ہے یعنی میری دعا قبول فرما اور اَمَّنَ (تفعیل) کے معنی آمین کہنے کے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آمین اسماء حسنٰی سے ہے۔ ❸ ابوعلی الفسوی فرماتے ہیں ❹ کہ اسم

---

❶ حدیث شعب الایمان فی الصحیحین مرفوعاً عن ابی ھریرۃ: الایمان بضع وسبعون شعبة اعلاھا قول لااله الله وادناھا اماطة الاذیٰ عن الطریق والحیاء شعبة من الایمان والحدیث ایضاً فی ابی داؤد وابن ماجة والنسائی وحدیث جبریل مروی فی الصحیحین عن عمر بن الخطاب وفیه ان تؤمن بالله وملئکته وکتبه ورسله والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیره وشره.

❷ راجع للبحث عن کلمة آمین الرضی علی الکافیه ٦٧ ج ٢ القرطبین ٩٩۔١٠٠ وزن آمین: المسائل الحلبیه ص ٨٠.

❸ وفی ابن کثیر ١: ٣١ وحکی القرطبی عن مجاهد وجعفر الصادق وبلال بن یساف ان آمین اسم من اسماء الله تعالیٰ قال وروی عن ابن عباس مرفوعا ولایصح قاله ابوبکر ابن العربی المالکی بل وروی ابن مردویه عن ابی ھریرۃ مرفوعاً آمین خاتم رب اللعالمین وفی الدعاء لابن ابی شیبة ان جبریل لقن رسول الله وقال قل آمین فقال آمین واختلف الفقهاء فی انه یستحب برفع الصوت ام باخفائه راجع کتب الخلاف.

❹ ابوعلی الحسن بن احمد (اومحمد) بن عبدالغفار الفسوی الفارسی الشیرازی (٢٨٨۔٣٧٧) من تلامذة السراج والزجاج صاحب التصانیف الشهرة انظر الفهرست ٦٤ ونزهة الاولیاء ٣٨٧ تاریخ بغداد: ٧/٢٧٥ ابن خلکان ١٣٥ الارشاد وللیاقوت ٣: ٢٩۔٢٢ والکامل لابن اثیر ٩: ٣٦ شذرات ٤/٨٨۔٩٩ بغیه ٢١٦.

الٰہی کہنے سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ بمعنی اِسْتَجِبْ کے ہے اور ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ ﴾ (بھلا مشرک اچھا ہے) یا وہ شخص جو رات کے وقتوں میں ......عبادت کرتا ہے۔(۹:۳۹) میں اَمَّنْ اصل میں اَمْ مَنْ ہے اور ایک قرأت میں اَمَنْ ہے۔ بہرحال اس کا تعلق اس مادہ سے نہیں ہے۔

اِنَّ حرف

اِنَّ وَاَنَّ (حرف) یہ دونوں اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں [1] اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اِنَّ جملہ مستقل پر آتا ہے اور اَنَّ کا مابعد ایسے مفرد کے حکم میں ہوتا ہے جو اسم مرفوع، منصوب اور مجرور کی جگہ پر واقع ہوتا ہے جیسے: اَعْجَبَنِی اَنَّكَ تَخْرُجُ وَعَجِبْتُ اَنَّكَ تَخْرُجُ اور تَعَجَّبْتُ مِنْ اَنَّكَ تَخْرُجُ جب اِنَّ کے بعد ما (کافہ) آجائے تو یہ عمل نہیں کرتا اور کلمہ حصر کے معنی دیتا ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ﴾ مشرک تو پلید ہیں (۹:۲۸) یعنی نجاست تامہ تو مشرکین کے ساتھ مختص ہے۔ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ ﴾ اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو......حرام کردیا ہے۔(۲:۱۷۳) یعنی مذکورہ اشیاء کے سوا اور کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا اس میں تنبیہ ہے کہ مطعومات میں سے جو چیزیں اصول شریعت میں حرام ہیں ان میں سے یہ چیزیں سب سے بڑھ کر ہیں۔

اَنْ

یہ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) اَنْ مصدریہ یہ ماضی اور مضارع دونوں پر داخل ہوتا ہے اور اس کا مابعد تاویل مصدر میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مضارع کو نصب دیتا ہے، جیسے: اَعْجَبَنِی اَنْ تَخْرُجَ وَاَنْ خَرَجْتَ.

(۲) اَنْ المخففه مِنَ المثقلة یعنی وہ اَنْ جو ثقیلہ سے خفیفہ کرلیا گیا ہو (یہ کسی شے کی تحقیق اور ثبوت کے معنی دیتا ہے جیسے: اَعْجَبَنِی اَنْ زَیْدٌ مُنْطَلِقٌ (۳) اَنْ (زائدہ) جو لَمَّا کی توکید کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمایا: فَلَمَّا اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ جب خوشخبری دینے والا آپہنچا۔(۱۲:۹۲)

(۴) اَنْ مفسرہ۔ یہ ہمیشہ اس فعل کے بعد آتا ہے جو قول کے معنی پر مشتمل ہو (خواہ وہ لفظاً ہو یا معنی جیسے فرمایا: وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا اور ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو (۳۸:۶) یہاں اَنِ امْشُوْا، قَالُوْا کے معنی کو متضمن ہے۔ [2]

اِنْ

اَنْ کی طرح یہ بھی چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اِنْ شرطیہ: جیسے فرمایا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ اگر ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔(۵:۱۱۸)

(۲) اِنْ مخففہ جو اِنَّ ثقیلہ سے مخفف ہوتا ہے (یہ تاکید کے معنی دیتا ہے اور) اس کے بعد لام (مفتوح) کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا:

---

[1] تحقیق نفیس فی الغرق بینهما الروض الانف ج ۲ص ۳۱٤ بحث انما ۔ بدائع الفوائد لابن قیم ص ۱۰۲ علة تخفیف النون فی اشهد ان لااله وتشدیدها فی وان محمدا(ازاهیر الریاض الربعة للبیهقی فی اللغة۱۹).

[2] راجع المغنی ج ۱ ص ۲٤۔۳۵ وبحث ان ۱۷۔۲٤ ایضاً.

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا (تو) یہ ضرور ہم کو بہکا دیتا (۲۵:۴۲)

(۳) اِنْ نافیہ اس کے بعد اکثر اِلَّا آتا ہے جیسے فرمایا: اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا ...... ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔ (۴۵:۳۲)

اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (پھر بولا) یہ (خدا کا کلام نہیں بلکہ) بشر کا کلام ہے۔ (۷۴:۲۵)

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ. ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا (کر دیوانہ کر) دیا ہے۔ (۱۱:۵۴)

(۴) اِنْ (زائدہ) جو (ما) نافیہ کی تاکید کے لیے آتا ہے، جیسے: مَا اِنْ يَخْرُجُ زَيْدٌ۔ زاید باہر نہیں نکلے گا۔

ا ن ث

اَلْاُنْثٰی (مادہ) یہ ذَکَرٌ یعنی نر کی ضد ہے اصل میں انثٰی و ذکر عورت اور مرد کی شرمگاہوں کے نام ہیں پھر اس معنی کے لحاظ سے (مجازاً) یہ دونوں نر اور مادہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ﴾ جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت۔ (۴:۱۲۴) اور چونکہ تمام حیوانات میں مادہ بنسبت نر کے کمزور ہوتی ہے لہٰذا اس میں معنی ضعف کا اعتبار کر کے ہر ضعیف الاثر چیز کو انثٰی کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ کمزور لوہے کو حَدِيْدٌ اَنِيْثٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۸) ...... عِندي جراز لا افلٌّ ولا أَنِثٌ

میرے پاس شمشیر براں ہے جو کند اور کمزور نہیں ہے۔ اور انثٰی (مادہ) کے ساتھ تشبیہ دے کر نرم اور زرخیز زمین کو بھی ارض انیث کہہ دیا جاتا ہے یہ تشبیہ یا تو محض نرمی کے اعتبار سے ہے۔ اور یا عمدہ اور پیداوار دینے کے اعتبار سے سے اسے انیث کہا گیا ہے جیسا کہ زمین کو عمدہ اور پیداوار کے اعتبار سے حرۃ اور وَلُود کہا جاتا ہے۔

پھر بعض اشیاء کو لفظوں میں مذکر کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کے لیے صیغہ مذکر استعمال کیا جاتا ہے اور بعض کو مؤنث کے ساتھ تشبیہ دے کر صیغہ تانیث استعمال کرتے ہیں۔ جیسے يَدٌ، اُذُنٌ اور خُصْيَةٌ چنانچہ خصیتین پر تانیث لفظی کی وجہ سے انثیین کا لفظ بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷

(۲۹) وَمَا ذَكَرٌ وَاِنْ يَسْمَنْ فَاُنْثٰى

اور کونسا مذکر ہے کہ اگر وہ موٹا ہوجائے تو مؤنث ہوجاتا ہے۔ اس سے مراد قراد یعنی چیچڑ ہے کہ جب وہ بڑھ کر خوب موٹا ہوجاتا ہے تو اسے حَلَمَةٌ بلفظ مؤنث کہا جاتا ہے، اسی طرح آیت کریمہ: ﴿ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ﴾ (۴:۱۱۷) وہ خدا کے سوا جن کی بھی

---

❶ لصخراء لغی واوله : فيعلمه بان العقل .... ۔ والبيت فی اللسان (انث) والبحر(۳:۳۵۲) والاقتضاب ٤٥ وقبله : وليت مبلغاياتی بقولی ۔ لقاء ابی المثله لایرث .

❷ وفی التنبیه للبكری قاله بیاض والبیت فی المخصص (١٦ : ١٠٢) والمفضليات بشرح ابن الانباری ٣٦٠ واللسان والصحاح (ضرس) غیر منسوب والاقتضاب ٤١٨ وفی روایتهم جمیعاً وان یکبر بدل وان یسمن وهو الصواب راجع السمط (١ : ١٧٥) وتمامه : شدید الازم لیس بذی ضروس۔ قال البكری وكذا انشده ابوعلی الفارسی وفی روایة لیس له ضروس والصواب الاول قاله ابن البری وراجع حواش الصحاح والتنبیه للبكری ٣٠ والمزهر (١ : ٢٧٥) وشرح ابیات الایضاح للشنمتری ١٤٧ (مخطوطه) والمعانی للقبتی ٦٣٢ و بعده : انا وجدنا بن سلمة بمنزلة مثل القراد علی حالیه فی الناس وبعده ابیات لغیر فی الشطرنج .

پرستش کرتے ہیں وہ مادہ ہیں، (میں اِنَاث، اُنْثٰی کی جمع ہے) بعض مفسرین نے احکام لفظیہ کا اعتبار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کو جن اسماء سے پکارتے تھے جیسے لات، عزیٰ، منات الثالثہ یہ سب مؤنث ہیں اس لیے قرآن نے اناث کہہ کر پکارا ہے ❶ اور بعض نے معنی کا اعتبار کیا ہے اور کہا ہے کہ ہر منفعل اور ضعیف چیز کو انیث کہا جاتا ہے، جیسے کمزور لوہے پر انیث کا لفظ بولتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ موجودات کی باہمی نسبت کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں۔(۱) فاعل غیر منفعل، یہ صفت صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔(۲) منفعل غیر منفعل، یہ خاصہ جمادات کا ہے۔(۳) ایک اعتبار سے فاعل اور دوسرے اعتبار سے منفعل جیسے جن و انس اور ملائکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے فاعل سے منفعل اور اپنی مصنوعات کے لحاظ سے فاعل ہے اور چونکہ ان کے معبود جمادات کی قسم سے تھے جو منفعل محض ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انھیں اناث کہہ کر پکارا ہے اور اس سے ان کی اعتقادی جہالت پر تنبیہ کی ہے کہ جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں نہ عقل ہے نہ سمجھ، نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں بلکہ کسی حیثیت سے بھی کوئی کام سرانجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (توحید کی طرف دعوت کے سلسلہ میں) اپنے باپ سے کہا۔﴿ يَآ اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا ﴾ (۱۹:۴۲) کہ ابا! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں

لیکن آیت کریمہ:﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴾ (۱۹:۴۳) اور انھوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں (مادہ، خدا کی بیٹیاں) بنادیا۔ میں ملائکہ کو اناث قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

ا ن س

اَلْاِنْسُ یہ جن کی ضد ہے اور اُنْسٌ (بضمہ الھمزہ) نُفُوْرٌ کی ضد ہے اور اِنْسِیٌّ۔ اِنْسٌ کی طرف منسوب ہے اور اِنْسِیٌّ اسے کہا جاتا ہے، جو بہت زیادہ مانوس ہو اور ہر وہ چیز جس سے اُنس کیا جائے اسے بھی اِنْسِیٌّ کہہ دیتے ہیں اور جانور یا کمان کی وہ جانب جو سوار یا کمانچی کی طرف ہو اسے اِنْسِیٌّ کہا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل دوسری جانب کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں، اِنْسٌ کی جمع اَنَاسِیٌّ ہے قرآن پاک میں ہے:

وَاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا (۲۵:۴۹) بہت سے (چوپایوں) اور آدمیوں کو۔ اور نفس انسانی کو اِبْنُ اِنْسِكَ کہا جاتا ہے۔

اٰنَسَ (افعال) کے معنی کسی چیز سے انس پانا یا دیکھنا ہیں۔ قران پاک میں ہے:

﴿ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا ﴾ (۴:۶) اگر ان میں عقل کی پختگی دیکھو۔

اٰنَسْتُ نَارًا (۲۷:۷) میں نے آگ دیکھی۔

اور آیت کریمہ: حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (۲۴:۲۷) کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم ان سے اجازت لے کر انس پیدا نہ کرلو۔

اَلْاِنْسَانُ: انسان چونکہ فطرۃً ہی کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ اس کی زندگی کا مزاج باہم انس اور میل جول کے

---

❶ چنانچہ حسن سے مروی ہے: لَمْ يَكُنْ حَيٌّ من احياء العرب الا ولهم صنم يعبدونه يسمونه انثى بني فلان الكشاف.

بغیر نہیں بن سکتا، اس لیے اسے انسان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان طبعی طور پر متمدن واقع ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آپس میں میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اکیلا ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرسکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اسے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اسی سے مانوس ہوجاتا ہے۔ اس لیے اسے انسان کہا جاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ انسان اصل میں اِنْسِیَان بروزن اِفْعِلَان ہے اور (انسان) چونکہ اپنے عہد کو بھول گیا تھا اس لیے اسے انسان کہا گیا ہے۔

ا ن ف

اَلْاَنْفُ اصل میں اَنْفٌ بمعنی ناک ❶ ہے۔ مجازاً کسی چیز کے سرے اور اس کے بلند تر حصہ کو بھی اَنْفٌ کہا جاتا ہے، چنانچہ پہاڑ کی چوٹی کو اَنْفُ الْجَبَلِ اور کنارہ ریش کو اَنف اللحیۃ کہہ دیتے ہیں۔ اور حمیت وغضب اور عزت وذلت کو انف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ؎

(۳۰) اِذَا غَضِبَتْ تِلْكَ الْاُنُوْفُ لَمْ اُرْضِهَا
وَلَمْ اَطْلُبِ الْعَتْبٰی وَلٰكِنْ اَزِیْدُهَا

اور جب وہ ناراض ہوں گے تو میں انھیں راضی نہیں کروں گا، بلکہ ان کی ناراضگی کو اور بڑھاؤں گا۔

اور متکبر کے متعلق کہا جاتا ہے۔ شَمَخَ فُلَانٌ بِاَنْفِهٖ فلاں نے ناک چڑھائی یعنی تکبر کیا۔

تَرِبَ اَنْفُهٗ وہ ذلیل ہو۔

اَنِفَ فُلَانٌ مِنْ كَذَا: کسی بات کو باعث عار سمجھنا اَنَفْتُهٗ اس کی ناک پر مارا۔ اور اَلْاَنَفَةُ بمعنی حمیت بھی آتا ہے۔

اِسْتَاْنَفْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی شے کے سرے اور مبدأ کو پکڑنے (اور اس کا آغاز کرنے کے ہیں اور اسی سے ارشاد ہے۔ ﴿مَاذَا قَالَ اٰنِفًا﴾ (۱۶:۴۷) انھوں نے ابھی (شروع میں) کہا تھا؟

ان م ل

آیت کریمہ:

﴿عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ﴾ (۱۱۹:۳) (تو) تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کھاتے ہیں۔ میں اَنَامِلُ اَنْمُلَة کی جمع ہے جس کے معنی انگلی کے اوپر کے پور کے ہیں جس میں ناخن ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ مُؤَنْمَلُ الْاَصَابِعِ فلاں کی انگلیوں کے پور غلیظ اور چھوٹے ہیں۔ اس میں ہمزہ زائدہ ہے کیونکہ نَمِلُ الْاَصَابِعِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے صرف لفظی مناسبت کی وجہ سے ہم نے یہاں بیان کردیا ہے۔

اَنّٰی

اَنّٰی: یہ حالت اور جگہ دونوں کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اس لیے بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی اَیْنَ اور كَیْفَ کے آتا ہے پس آیت کریمہ: ﴿اَنّٰی لَكِ هٰذَا﴾ (۳۷:۳) کے معنی یہ ہیں کہ کھانا تجھے کہاں سے ملتا ہے۔

اَنَا

ضمیر واحد متکلم ہے ایک لغت میں وصل کے وقت اس کا الف حذف کردیا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ﴾ (۳۸:۱۸) مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ خدا ہی میرا پروردگار ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ لٰكِنَّا اصل میں لٰكِنْ اَنَا ہے اَنَا کے ہمزہ کو حذف کرکے

❶ وفی القران ۔ والانف بالانف(٥ـ٤٥) .

لٰکِنْ کے نون کو نَا کے نون میں ادغام کردیا گیا ہے ایک قرأت میں لٰکِنَّ هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ ہے، جس میں اَنَا کے آخری الف کو حذف کردیا گیا ہے۔ أَنِیَّۃ الشيئ وَاُنِّیَتَہٗ کے معنی ذات شی کے ہیں اس سے کسی شے کے وجود کی طرف اشارہ ہوتا ہے یہ ترکیب عربی نہیں ہے بلکہ محدث ہے۔

ا ن ی

اٰنَ (ض) الشيءُ: اس کا وقت قریب آ گیا۔ وہ اپنی انتہا اور پختگی کے وقت کو پہنچ گئی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا﴾ کیا ابھی تک مومنوں کے لیے وقت نہیں آیا؟ (۵۷:۱۶)

غَیْرَ نَاظِرِیْنَ اِنَاہُ (۳۳:۵۳) تم کھانے کے وقت کا انتظار کررہے ہو (انی الحمیم۔ پانی حرارت میں انتہا کو پہنچ گیا) قرآن میں ہے حَمِیْمٍ آنٍ (۵۵:۴۴) مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَۃٍ (۸۸:۵) گرم کھولتے ہوئے چشمے سے۔

اَنّی (بتثلیث الھمزہ) وقت کا کچھ حصہ۔ اس کی جمع آنَاءٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

یَتْلُوْنَ آیَاتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ اللَّیْلِ (۳:۱۱۳) جو رات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ ﴿وَمِنْ آنَاءِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ﴾ (۲۰:۱۳۰) اور رات کے اوقات میں (بھی) اس کی تسبیح کیا کرو۔

اِنَــی: ہمزہ مکسور ہونے کی صورت میں اسم مقصور ہوگا اور ہمزہ مفتوح ہونے کی صورت میں اسم ممدود حطیہ نے کہا ہے [1] (الواخر)

(۳۱) آنَیْتُ الْعَشَاءَ اِلٰی سُھَیْلٍ
اَوِ الشعریٰ فطال بِیَ الْاَنَاءُ

میں نے سہیل یا شعریٰ ستارہ کے طلوع ہونے تک کھانے کو مؤخر کردیا اور میرا انتظار طویل ہوگیا۔ آنَیْتُ الشيءَ اِیْنَاءً۔ کسی کام کو اس کے مقررہ وقت سے مؤخر کرنا۔ [2]

تَاَنَّیْتُ: میں نے دیر کی اَلْاَنَاۃُ: حلم، وقار، طمانیت، تَاَنّٰی فُلَانٌ تَاَنِّیًا وَاَنِیَ یَأْنِی اَنْیًا (س) تحمل اور حلم سے کام لینا۔ اِسْتَاْنَیْتُ الشيءَ میں نے اس کے وقت کا انتظار کیا نیز اس کے معنی دیر کرنا بھی آتے ہیں جیسے استأنیتُ الطعام میں نے کھانے کو اس کے وقت سے مؤخر کردیا۔

اَلْاِنَاءُ: برتن۔ جمع آنِیَۃٌ۔ جیسے کِسَاءٌ وَاَکْسِیَۃٌ اس کی جمع الجمع الاَوانِی ہے۔

ا ھ ل

اَھْلُ الرَّجُلِ: ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اس کے ہم نسب یا ہم دین ہوں اور یا کسی صنعت یا مکان میں شریک ہوں یا ایک شہر میں رہتے ہوں اصل میں اھل الرجل تو وہ ہیں جو کسی کے ساتھ ایک مسکن میں رہتے ہوں پھر مجازاً آدمی کے قریبی رشتہ داروں پر اہل بیت

---

[1] قاله حطیئة فی قصیدة ٤٣ بیتاً یهجوفیها الزبرقان بن بدر مطلعها : الابلغ بنی عوف بن کعب فهل قوم علی خلق سواء القصیدة فی دیوانه (۹۸-۱۰۹) (نشر نعمان قاهره ۱۳۷۸ ھ والبیت فی اضدا دالاصمعی ۲۷ وابن السکیت ۱۸۲ واضداد ابن الانباری ۸۲ و اضدادابی الطیب ۶۱۰ واللسان (انی) والطبری ۲۲ : ۳٤ والاشباه النحویة ٤ : ٤۹ وابن ولاد ۸۱،۷ والعمدة (۲ : ۱۷۰) وذیل مجالس ثعلب ۱ : ۲۷٦ وفی روایة ابی عبیدة واکریت بدل وانّیت (اللسان= کرا) واصلاح ابی یعقوب ۲٤۳ وفی روایة الاصمعی انّیت ورواه فی المختارات ۱۳۰ فی قصیدة ٤۳ مطلعها : الاقالت امامة هل تعزی ۔ فقلت امیم قد غلب العزاء.

[2] وفی الحدیث قال صلی الله علیه وسلم لقه آنیت وآزیت فی رحل جاء یوم الجمعة یتخطی رقاب الناس.

الرجل کا لفظ بولا جانے لگا ہے اورعرف میں اہل البیت کا لفظ خاص کر آنحضرتؐ کے خاندان پر بولا جانے لگا ہے کیونکہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ ﴾ (۳۳:۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کی میل کچیل) دور کردے۔

اور کبھی اہل الرجل سے بیوی مراد ہوتی ہے۔ ❶ اور اَھلَ الاسلام کے معنی مسلمان قوم کے ہیں۔شریعت (اسلامیہ) نے اکثر احکام میں کافر اور مسلمان کے مابین چونکہ نسبی تعلق کو کالعدم قرار دیا ہے اس لیے (نوح علیہ السلام) کے لڑکے کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ﴾ (۴۶:۱۱) یعنی یہ تیرے خاندان سے نہیں ہے، اس کے اعمال غیر صالح ہیں۔ اور فرمایا: ﴿وَاَھْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ ﴾ (۴۰:۱۱) اپنے اہل کو کشتی میں سوار کرلو۔ ہاں جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے اس کو سوار نہ کرنا۔

اَھَلَ الرَّجُلُ (ن ض) یَأْھُلُ اَھُوْلًا اس نے شادی کرلی۔

مَکَانٌ مَاھُوْلٌ: آباد جگہ جہاں لوگ بستے ہوں۔اُھِلَ بِهٖ وہ جگہ آباد ہوگئی۔دَابَّۃٌ اَھِلٌ وَاَھْلِیٌّ وہ چوپایہ جو کسی جگہ سے مانوس ہو (پالتو) تَاَھَّلَ الرَّجُلُ اس نے شادی کرلی اس سے (بطورِ دعا) کہا جاتا ہے: اَھَّلَكَ اللّٰہُ فِی الْجَنَّةِ یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں جنت میں بیوی اور اہل بخشے کہ تم ان کے ساتھ رہو۔

فُلَانٌ اَھْلٌ لِکَذَا ۔فلاں اس کا مستحق اور سزاوار ہے اور مہمان کی آمد پر اسے خوش آمدید کے طور پر مَرْحَبًا وَاَھْلًا کہا جاتا ہے یعنی ہمارے پاس تمہارے لیے فراخی ہے اور ہم تمہارے اہل بیت کی طرح تمہارے ساتھ شفقت سے پیش آئیں گے۔اَھْلٌ کی جمع اَھْلُوْنَ وَاَھَالٍ وَاَھْلَاتٌ آتی ہے۔ ❷

اوب

اَلْاَوْبُ: گو اس کے معنی رجوع ہونا کے ہیں لیکن رجوع کا لفظ عام ہے جو حیوان اور غیر حیوان دونوں کے لوٹنے پر بولا جاتا ہے، مگر اَوْبٌ کا لفظ خاص کر حیوان کے ارادۃً لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔اٰبَ اَوْبًا وَاِیَابًا وَمَاٰبًا وہ لوٹ آیا قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّ اِلَیْنَا اِیَابَھُمْ ﴾ (۲۵:۸۸) بیشک ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔﴿ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴾ (۳۹:۷۸) پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنائے۔

اَلْمَاٰبُ یہ مصدر (میمی) ہے اور اسم زمان اور مکان بھی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴾ (۱۴:۳) اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔

اَلْاَوَّابُ یہ تَوَّابٌ کا (صیغہ مبالغہ) ہے یعنی وہ شخص جو معاصی کے ترک اور فعل طاعت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ لِکُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍ ﴾ یعنی ہر رجوع لانے اور حفاظت کرنے

---

❶ وفی القران: وسار باھلہ(۲۸۔۲۹).

❷ ایضاً اھل کتاب الذین عندھم الکتاب سماوی وفی جمیع القران المراد بھم الیھود والنصاری.

والے کے لیے(۳۲:۵۰)﴿ اِنَّهٗ اَوَّابٌ ﴾ (۱۷:۳۸) بیشک وہ رجوع کرنے والے تھے۔

اسی سے اَوْبَةٌ بمعنی توبہ بولا جاتا ہے...... اَلتَّاْدِيْب۔ دن کوسفر کرنا اور شاعر کے قول ع

(۳۲) اٰبَتْ يَدُ الرَّامِيْ اِلَى السَّهْمِ

تیرانداز کا ہاتھ تیر کی طرف لوٹ آیا۔

میں اَوَبٌ (لوٹنا) کی نسبت ید کی طرف کی گئی ہے جو درحقیقت تیرانداز کا فعل ہے۔ اس سے ہمارے سابق بیان پر اعتراض نہیں ہوسکتا ہے کہ اَوْبٌ ارادہ اور اختیار کے ساتھ لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ ❶

اسی طرح نَاقَةٌ اَوُوْبٌ سبک رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے ہاتھ پھرتی سے لوٹتے ہیں۔

اود

اَلْاَوْدُ (ن) آدَ يَـؤُدُ اَوْدًا وَاِيَادًا کے معنی بوجھل اور گرانبار کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَلَا يَـؤُدُهٗ حِـفْـظُهُـمَـا ﴾ (۲:۲۵۵) اور آسمان وزمین کی حفاظت باری تعالیٰ کو بوجھل نہیں کرتی اور یہ بروزن قَـالَ يَقُوْلُ قَوْلًا ہے اس سے واحد متکلم کا صیغہ اُدْتُ بروزن قُلْتُ ہوگا اصل میں آدَهٗ کے معنی ہیں: اس نے اپنے بوجھ اور گرانباری کی وجہ اس کی گذرگاہ سے ٹیڑھا کر دیا۔

اول

اَلْاٰلُ۔ بعض نے کہا ہے کہ آل اصل میں اہل ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُهَيْـــــلٌ آتی ہے مگر اس کی اضافت ناطقین انسان میں سے ہمیشہ عَلَم کی طرف ہوتی ہے کسی اسم نکرہ یا زمانہ یا مکان کی طرف اس کی اضافت جائز نہیں ہے اس لیے آل فلان (علم) تو کہہ سکتے ہیں مگر آل رجل، آل زمان کذا وآل مکان کذا بولنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ہمیشہ صاحب شرف اور افضل ہستی کی طرف مضاف ہوگا اس لیے آل الخیاط بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ آل اللہ یا آل السلطان کہا جائے گا۔ مگر اھل کا لفظ مذکورہ بالا میں سے ہر ایک کی طرف مضاف ہو کر آجاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح اہل زمن کذا وبلد کذا بولا جاتا ہے اسی طرح اہل اللہ واہل الخیاط بھی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ ''آل'' دراصل بمعنی شخص ہے۔ اس کی تصغیر اُوَیْل آتی ہے اور یہ اس شخص کے متعلق استعمال ہوگا جس کو دوسرے کے ساتھ ذاتی تعلق ہو مگر قریبی رشتہ داری یا تعلق والا ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاٰلَ اِبْرَاهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرَانَ ﴾ (۳:۳۳) خاندان ابراہیم اور خاندان عمران۔ ﴿ اَدْخِـلُـوْٓا اٰلَ فِـرْعَوْنَ اَشَـدَّ الْـعَذَابِ ﴾ (۴۰:۴۶) فرعون والوں کو نہایت سخت عذاب میں داخل کردو۔ آلُ النَّبِـی ۔ بعض نے کہا کہ آل النبی سے آنحضرت ﷺ کے رشتہ دار مراد ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہیں علم ومعرفت کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ خصوصی تعلق حاصل ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل دین دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو علم وعمل کے اعتبار سے راسخ اور محکم ہوتے ہیں ان کو آل النبی اور اُمَّتُــــهٗ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا سراسر ذہن تقلیدی ہوتا ہے ان کو اُمت محمد ﷺ تو کہہ سکتے ہیں مگر آلِ محمدؐ نہیں کہہ سکتے اس سے معلوم ہوا کہ امت اور آل میں عموم و

❶ وفی القران: يَاجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ(۲۴-۲۵) وفی الحدیث شغلونا عن الصلوۃ الوسطیٰ حتیٰ آبت الشمس راجع للتاج (اوب).

خصوص کی نسبت ہے یعنی ہر آل نبی اس کی امت میں داخل ہے مگر ہر امتی آلِ نبی نہیں ہوسکتا۔

امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگ تمام مسلمانوں کو آلِ نبی میں داخل سمجھتے ہیں۔ تو انھوں نے فرمایا: یہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ سائل نے عرض کی یہ کیسے؟ فرمانے لگے: غلط تو اس لیے کہ تمام امت آل نبی میں داخل نہیں ہے اور صحیح اس لیے کہ وہ شریعت کے کما حقہ پابند ہوجائیں تو انھیں آل النبی کہا جاسکتا ہے۔ ❶

اور آیت کریمہ: ﴿ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ ﴾ (۴۰:۲۸) اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مؤمن شخص ...... کہنے...... میں اس مردمومن کے آل فرعون ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ (بظاہر) تو اس کے خصوصی اہل کاروں اور فرعونی شریعت کے ماننے والوں سے تھا اور مسکن ونسب کے اعتبار سے انہیں میں سے شمار ہونا تھا نہ اس لیے کہ وہ لوگ بھی اسے اپنی شریعت کا پابند خیال کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جبرئیل اور میکائیل میں اِیل اسماء حسنٰی سے ہے مگر قواعد عربیہ کی رو سے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ اسماء مرکب اضافی ہوتے تو لفظ اِیل کو مضاف الیہ ہونے کی بنا پر مجرور ہونا چاہیے تھا۔

آلُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کا شخص کے ہیں اور جو دور سے مضطرب نظر آ رہا ہو۔

شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۳۳) وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا آلُ خَيْمٍ مُنَضَّدِ

کہ مرتب خیموں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا۔

اور آل اس حالت کو بھی کہتے ہیں جس کی طرف انسان کا معاملہ آخر کار لوٹ کر آئے، شاعر نے کہا ہے ❸

سَاحْمِلُ نَفْسِىْ عَلٰى آلَةٍ
فَإِمَّا عَلَيْهَا وَإِمَّا لَهَا

آخرالامر میں اپنی جان کو ایسے امر پر مجبور کرونگا وہ یا تو اس کے لیے نقصان دہ ہوگی یا فائدہ مند۔

اور آل بمعنی سراب بھی آتا ہے یعنی وہ جو ہوا کے تموج سے یا ویسے بے حقیقت چیز (دوپہر کے وقت) دکھائی دیتی ہے، لہٰذا یہ اصل میں آل یؤل سے ہے جس کے معنی لوٹنا کے ہیں۔ آل اللَّبَنُ دودھ گاڑھا ہوگیا گویا اس میں نقصان کی طرف رجوع ہونے کے معنی ملحوظ ہیں جیسا کہ ناقص چیز کو رَاجِعٌ کہا جاتا ہے۔

اَلتَّاوِيْلُ: یہ بھی اوّل سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی چیز کے اصل کی طرف رجوع ہونے کے ہیں اور جس مقام کی طرف کوئی چیز لوٹ کر آئے اُسے مَوْئِلٌ (جائے بازگشت) کہا جاتا ہے۔ پس تَاوِيْلٌ کسی چیز کو اس غایت کی طرف لوٹانا کے ہیں جو اس سے بلحاظ علم یا عمل کے مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ غایت علمی یا عملی کے مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ

---

❶ وفی الحدیث آل محمد کل تقی (طس والرسالة القثیریه ص ٥٦ عن انس) انظر المجالس للشیخ الحیلانی والشفاء للقاضی عیاض مع شرح نسیم الریاض وایضاً الرمضة (شرح المهذب للنووی).

❷ قاله زهیر یمدح هرم بن سنان وصدره: اربت بها الارواح کل عشیة ـ...... وفی روایة فلم بدل ولم والبیت فی دیوانه ١٨٠ (بشرحه للشنمتری طبع لیدن ١٣٠٦ ﻫ والعقد الثمین ٧٩ ومختار الشعر الحاهلی (١: ٢٠٨) والبحر (١: ٤٥٥) وفیه آل نوی بدل آل خیم وفی اللسان انظر صدرالبیت وعجزه: وسفع علی آس ونوی مثعاب ونسبه الی النابغة ویروی عجزه وثم علی عرش الخیام غسیل وقال ورواه ابو عبیدة للنابغة وثعلب للزهیر.

❸ قاله خنساء فی رثاء ابی عمرو والبیت فی اللسان والمحکم (علا، فوق) وایام العرب ٢٩ یوم حوذة الثانی (٨) والکامل للمبرد (١٢١٦) فی ستة ابیات.

غایت علمی کے متعلق فرمایا:﴿ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ﴾ (۳:۷) حالانکہ اس کی مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ لوگ جو علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں اور غایت عملی کے متعلق شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۳۵) وَلِلنَّوىٰ قَبْلَ يَوْمِ الْبَيْنِ تَاوِيْلٌ

اور جدائی کے دن سے پہلے ہی جدائی کا انجام کار اور اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اور قرآن میں ہے:﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ ﴾ (۷:۵۳) اب صرف وہ اس کی تاویل یعنی وعدہ عذاب کے انجام کار کا انتظار کر رہے ہیں جس دن اس وعدہ عذاب کے نتائج سامنے آجائیں گے۔

یعنی اس دن سے جو غایت مقصود ہے وہ عملی طور پر ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔

اور آیت کریمہ:﴿ ذَالِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلاً ﴾ (۴:۵۹) میں بعض نے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے احسن تاویلا ہونا مراد لیا ہے اور بعض نے آخرت میں بلحاظ ثواب کے احسن ہونا مراد لیا ہے۔

اَلْاَوْلُ: (ن) کے معنی ہیں مآل اور نتیجہ پر رکھتے ہوئے سیاست اور انتظام کرنا۔اسی سے کہا جاتا ہے:قَدْ اُلْنَا وَاِيْلَ عَلَيْنَا ہم نے حکومت کی اور ہم پر حکومت کی گئی۔

اَلْاَوَّلُ: خلیل کے نزدیک اس کی اصل (اول) ہے اس لیے فَعَّلَ کے وزن پر ہوگا بعض کا خیال ہے کہ اس کا مادہ (وول) ہے اس لیے اَوَّل بروزن اَفْعَل ہوگا لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ فا اور عین کلمہ میں دو حرف یک جنس نہایت قلیل الاستعمال ہیں۔ بہت صورت میں یہ اَوْلٌ سے مشتق ہوگا جس کے معنی اصل کی طرف رجوع ہونا کے ہیں اور اَوَّلَ اصل میں اٰوَلُ ہوگا کثرت استعمال کے باعث الف ثانی کو واؤ میں ادغام کر دیا گیا ہے۔

اَوَّلُ: اصل میں صیغۂ صفت ہے کیونکہ اس کی تانیث اُولٰی بروزن اُخْریٰ آتی ہے ❷ بس اَوَّل وہ ہے جس پر اس کا غیر مرتب ہو اور بچند وجوہ استعمال ہوتا ہے۔

(۱) جو دوسرے پر باعتبار زمانہ متقدم ہو جیسے عبدالملک اور ثم منصور کہ پہلے عبدالملک اور پھر منصور۔

(۲) اور مرتبہ اور ریاست کے اعتبار سے دوسرے پر متقدم ہو اور دوسرا اس کی اقتدا کرے جیسے الامیر اولاثم الوزیر۔ کہ پہلے امیر اور اس کے بعد وزیر۔

(۳) وضع اور نسبت کے اعتبار سے پہلے ہو جیسے ایک شخص عراق سے روانہ ہو تو اسے کہا جائے گا القادسية اولا ثم فَيْد۔ کہ پہلے قادسیہ آئے گا اور پھر فید۔اور مکہ سے روانہ ہونے والے کو کہا جائے گا کہ پہلے فید اور پھر قادسیہ آئے گا۔

(۴) جو نظام صناعی کے اعتبار سے متقدم ہو جیسے الاس اولا ثم البناء۔ کہ پہلے بنیاد رکھی جاتی ہے اس پر عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

---

❶ قاله عبدة بن الطيب وصدره وللاحبة ايام مذكرها والبيت في المفضليات (١: ١٣٤) وتفسير الطبرى (٤ : ٤٣) وتاريخ الطبرى (٤ : ٤٣) والقصيدة في منتهى الطلب (١ : ١٨٩_١٩٢).

❷ وفي القرآن : وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلىٰ (٩٢_١٣) راجع ايضاً (الدخان : ٣٥_٧٣٥) النجم : ٢٥_٥٠_٥٦ (الواقعة : ٦٢) (النازعات ٢٥) (الاعلىٰ : ١٨) (الضحىٰ : ٤).

اور جب صفت باری تعالیٰ میں ھو الاول کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ ہو اور جن علماء نے اوّل کے معنی غیر محتاج یا مستغنی بنفسہ کیے ہیں ان کا اشارہ بھی اسی معنی کی طرف ہے۔

اور آیت ﴿ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾ (۶:۱۶۳) اور آیت ﴿ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ (۷:۱۴۳) میں اَوَّلُ کے معنی یہ ہیں کہ اسلام و ایمان میں ہی سب سے پہلے دوسروں کے لیے اسوہ اور مقتدا بنتا ہوں اسی طرح آیت: ﴿ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ﴾ (۲:۴۱) کے معنی یہ ہیں کہ کفر میں پہل کر کے دوسروں کے لیے اسوہ اور پیشوا نہ بنو کہ لوگ تمہاری اقتداء کریں۔

کبھی اوّل کا لفظ بطور ظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ مبنی علی الضم ہوتا ہے، جیسے جِئْتُهُ اَوَّلُ۔ اور کبھی اوّل بمعنی قدیم بھی آ جاتا ہے، جیسے جِئْتُكَ اَوَّلاً وَآخِرًا ای قدیمًا وحدیثًا یعنی پہلے بھی آیا تھا اور اب بھی۔

اور آیت کریمہ: ﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾ (۷۵:۳۵) میں اولیٰ کلمہ تہدید اور تخویف ہے اور جو شخص ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو اسے تنبیہ کرنے کے لیے آتا ہے، پھر جو شخص بڑی ذلت کے بعد ہلاکت سے بچ جائے اسے دوبارہ روکنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے عموماً یہ کلمہ مکرر آتا ہے گویا اسے تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ انجام پر غور کر کے اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ ❶

اون

اَلْآنَ: ہر وہ لمحہ جو ماضی اور مستقبل کے مابین فرض کیا جائے اسے اَلْآنَ کہا جاتا ہے۔ جیسے اَلْآنَ افعل کذا (میں اب کرتا ہوں) اور اَلْآنَ کا لفظ ہمیشہ الف لام تعریف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے ❷ اور اَفْعَلْ كَذَا آوِنَةً کا محاورہ بھی اَلْآنَ سے ماخوذ ہے۔ ھٰذا اوان ذالك (یہ اس کا صحیح زمانہ یا وقت ہے) سیبویہ نے کہا ہے کہ اَلْآنَ آنُكَ کے معنی ہیں ھذا الْوَقت وَقْتُكَ اسی سے فعل آن یؤون اَوْنًا استعمال ہوتا ہے۔

ابوالعباس لکھتے ہیں ❸ کہ یہ "اَلْآنَ" سے نہیں ہے بلکہ ایک مستقل اور علیحدہ فعل ہے۔

اوہ

اَلْاَوَّاہُ: وہ شخص جو بہت زیادہ تاوّہ کرتا ہو اور تَاَوَّہ کے معنی ہیں حزن و غم ظاہر کرنے کے لیے اَوَّہ زبان پر لانا اور ہر وہ کلمہ جس سے تاسف اور حزن کا اظہار ہوتا ہو اسے تَاَوَّہْ سے تعبیر کر لیتے ہیں لہٰذا اَوَّاہُ کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو خشیت الٰہی کا بہت زیادہ اظہار کرنے والا ہو۔

---

❶ قال في اللسان الاصل في "الآن" ان يكون لزمان الحال ثم توسعوا فيه للوصف واللام فيه للتعريف واصل "الآن" اوان حذف الهمزة ثم غيرت واوها الى الف كما في الراح والرياح.

❷ بنصب الآن ورفع آنك قال ابن جني وكذا قرأناه في الكتاب لسيبويه راجع اللسان (اين) والكتاب.

❸ ابوالعباس محمد بن يزيد (۲۱۰ھ ۲۸۶) الثمالي المعروف بالمبرد امام العربية واحد ائمة الادب والاخبار ومن كتبه المطبوعة "الكامل" وشرح لامية العرب المطبوع مع شرح الزمخشري وله كتب اخرى معروفة قال الزبيدي في شرح خطبته القاموس المبرد بفتح الراء المشددة وبعضهم يكسر راجع لاحواله النزهة ۲۸۵ والبغيه ۱۱۶ والفهرست ۵۹ وطبقات للزبيدي رقم ۴۰ والانساب ۱۱۶ (الثمالي) والحصري ۲/۲۱۶ و۲۳۷) والادباء: ۷/۱۳۷ والوجيات: ۱/۴۹۵ ولسان الميزان ۵: ۴۳۰ ومعاني العسكري: ۱/۱۷۸.

اور آیت کریمہ: ﴿ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴾ (۱۱:۷۵) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) مؤمن اور بہت زیادہ دعا کرنے والے تھے مآل کے اعتبار سے یہ معنی بھی ماتقدم کی طرف راجع ہے۔

ابو العباس فرماتے ہیں کہ کام کے روکنے کے لیے کلمہ "اِيْهًا" اور ترغیب دینے کے لیے وَيْهًا کہا جاتا ہے اور اظہار تعجب کے لیے وَاهًا کہتے ہیں۔

اوی

اَلْمَاْوٰی: یہ اَوٰی (ض) اُوِیًّا و مَاْوًی کا مصدر ہے (جس کے معنی کسی جگہ پر نزول کرنے یا پناہ حاصل کرنا کے ہیں) اور اَوٰی اِلٰی کَذَا کے معنی ہیں کسی کے ساتھ مل جانا اور منضم ہو جانا اور آواہ (افعال) اِیْوَاءً کے معنی ہیں کسی کو جگہ دینا قرآن میں ہے: ﴿ اِذْ اَوَی الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ ﴾ (۱۸:۱۰) جب وہ اس غار میں جا رہے۔ ﴿ قَالَ سَاٰوِيْ اِلٰى جَبَلٍ ﴾ (۱۱:۴۳) اس نے کہا کہ میں (ابھی) پہاڑ سے جا لگوں گا۔ ﴿ وَتُـؤْوِيْ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ﴾ (۳۳:۵۱) جسے چاہو اپنے پاس ٹھکانا دو۔ ﴿ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُؤْوِيْهِ ﴾ (۷۰:۱۳) اور اپنا خاندان جس میں رہتا تھا۔ اور آیت کریمہ: ﴿ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴾ (۵۳:۱۵) میں لفظ جَنَّة کی اضافت ماویٰ (مصدر) کی طرف ہے، جیسا کہ ﴿ دَارُ الْخُلْدِ ﴾ (۴۱:۲۸) میں لفظ دار کی اضافت اَلْخُلْد مصدر کی طرف ہے [1] اور آیت ﴿ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ﴾ (۱۷:۹۷) میں مَاْوٰی کے معنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔

اَوَيْتُ لَهٗ اَوْيًا وَاِيَّةً وَمَاْوِيَةً وَمَاْوَاةً کے معنی ہیں: میں نے اس پر رحم کھایا۔ اصل میں اس کے معنی رَجَعْتُ اِلَيْهِ بِقَلْبِيْ کے ہیں یعنی میں دل سے اس کی طرف مائل ہوا۔

اور آیت کریمہ: ﴿ آوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ ﴾ (۱۲:۶۹) کے معنی یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا اور حاتم طائی کے شعر [2] (الطویل)

(۳۶) اَمَاوِيَّ اِنَّ الْمَالَ غَادٍ وَرَائِحُ.

اے ماویہ! بے شک مال صبح شام آنے جانے والی چیز ہے۔

میں اَلْمَاوِيَّة عورت (بیوی) کا نام ہے چنانچہ بعض نے اسے بھی اسی باب (اوی) سے مانا ہے اور کہا ہے کہ گویا قبول صورت (ماوی الصورة) ہونے کی وجہ سے اسے الماویہ کہا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے: یہ مَاءٌ کی طرف نسبت ہے۔ اور اصل میں مَائية ہے ہمزہ کو واو کے ساتھ بدل لیا گیا ہے۔ [3]

---

[1] فی النسخ المطبوعة کلها دار الخلود تصحیف وجاء فی التنزیل یوم الخلود (۵۰۔۳۴) فی آیة فقط واما کلمة خُلد فقد جاء فی آیات (۱۰۔۵۲) (۲۰۔۱۲۰) (۲۱۔۳۴) (۲۵۔۱۵) (۳۲۔۱۴).

[2] قال فی شواهد الکشاف ۶۰ان ماویة اسم ام حاتم وهی بنت عفیر وکانت تلومه فی جودة بالمال واصله نسبة الی الماء لانه تشبیه فی اللین والرقة وعجز البیت .... ویبقی من المال الاحادیث والذکر انظر دیوانه ۵۰فی ۲۰ بیتاً وراجع للبیت ایضًا الخزانة ۴:۱۵۸/۳:۱۹۳ وذیل الامالی ۳۰ فی اربعة ابیات والعقد ۱: ۲۳۶ فی ۱۵ بیتًا وقیل انه افضل ماقیل فی الجود ورایت فی تقدمة دیوان (بیروت ۱۳۸۳ھ) ان ماویه زوجة وذکر فیه قصة زواجه معه.

[3] راجع شرح شواهد الکشاف ۔۶.

ا ی ی

اَیٌّ: جب استفہام کے لیے ہو تو جنس یا نوع کی تعیین اور تحقیق کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اور یہ خبر اور جزا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے [1]، چنانچہ فرمایا: ﴿اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی﴾ (۱۷:۱۱۰) جس نام سے اسے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں۔ ﴿اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ﴾ (۲۸:۱۸) کہ میں جونسی مدت (چاہوں) پوری کردوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

اَلْآیَةُ: اس کے معنی علامت ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں۔ دراصل ''آیۃ'' ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو دوسری ایسی شے کو لازم ہو جو اس کی طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس ظاہر شے کا ادراک کرے گو اس دوسری (اصل) شے کا بذاتہٖ اس نے ادراک نہ کیا ہو مگر یقین کرلیا جائے کہ اس نے اصل شے کا بھی ادراک کرلیا کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے اور لزوم کا یہ سلسلہ محسوسات اور معقولات دونوں میں پایا جاتا ہے، چنانچہ جب کسی شخص کو معلوم ہو کہ فلاں راستے پر فلاں قسم کے نشانات ہیں اور پھر وہ نشان بھی مل جائے تو اسے یقین ہو جائے گا کہ اس نے راستہ پالیا ہے۔ اسی طرح کسی مصنوع کے علم سے لامحالہ اس کے صانع کا علم ہو جاتا ہے۔

آیۃ کا لفظ یا تو اَیٌّ سے مشتق ہے کیونکہ یہ بھی ایک چیز کو دوسری سے تمیز دیتی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ تَاَیِّیْ (مصدر تفعل) سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز پر ٹھہرنے اور تثبت حاصل کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تَاَیَّ (امر) یعنی ٹھہر و اور رفق سے کام لو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَوِیَ اِلَیْهِ سے مشتق ہو۔

(۱) آیۃٌ کا لفظ بلند عمارت پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿أَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ آيَةً تَعْبَثُوْنَ﴾ (۲۶:۱۲۸) کہ تم ہر فضا مقام پر بے کار نشان تعمیر کرتے ہو۔

(۲) اور قرآن پاک کے ہر اس حصہ کو جو کسی حکم پر دال ہو آیۃ کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ایک سورۃ ہو یا اس کی ایک فصل یا کئی فصلیں ہوں۔

(۳) اور کبھی ہر اس کلام کو جو لفظی اعتبار سے دوسرے سے الگ ہو آیۃ کہہ دیا جاتا ہے اسی اعتبار سے سُور کی آیات کو آیات کہا جاتا ہے جن کے ذریعہ سورۃ شمار کی جاتی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۲۹:۴۴) میں آیات سے فکری دلائل مراد ہیں کہ لوگ اپنے مراتب علمیہ کے اعتبار سے ان کی معرفت میں مختلف درجات رکھتے ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا یَجْحَدُ بِـاٰیَاتِنَا اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾ (۲۹:۴۹) بلکہ یہ اہل علم کے نزدیک واضح دلائل ہیں اور ہمارے ان دلائل سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔ ﴿وَكَاَیِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۱۲:۱۰۵) اور آسمان و زمین میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔

پھر قرآن مجید میں کسی خاص معنی کا لحاظ کرتے، بعض مواضع میں آیۃ مفرد اور دوسرے مقامات پر آیات بصیغۂ

---

[1] ای یکون شرطا وقد یاتی موصولا نحو لننزعن من کل شیعة ایهم اشد (۱۹-۶۹) وفی اعراب الآیة اعتراك بین العلماء ویاتی و الاعلی معنی الکمال فیقع صفته للنکرة نحو زید رجل ای رجل وان یکون وصلة الی نداء مافیه ال نحو یاایها الناس فهذه خمسة وجوه.

جمع لایا گیا ہے جس کی تفصیل اور توضیح اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً ﴾ (۲۳:۵۰) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم کو آیَتَیْــــنِ (دو آیتیں) کہنے کی بجائے آیَۃً (ایک آیت) قرار دیا ہے کیونکہ یہ دونوں مل کر (بحیثیت مجموعی) ایک آیت بنتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ﴾ (۱۷:۵۹) میں بعض نے کہا ہے کہ آیات سے جراد، قمل، ضفادع وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جو امم سابقہ پر (بطورِ عذاب) بھیجی گئی تھیں۔ اور ''تخویفا'' کے لفظ سے متنبہ کیا ہے کہ جو لوگ اس قسم کے افعال کا ارتکاب کریں گے ان پر اسی طرح کے عذاب نازل ہوں گے اور یہ کہ اس قسم کی آیات کو طلب کرنا مکلّفین کے خسیس ترین ہونے کی دلیل ہے کیونکہ انسان فعل خیر یا تو کسی رغبت اور خوف کی وجہ سے کرتا ہے یہ سب سے ادنیٰ مرتبہ ہے اور یا اچھی شہرت حاصل کرنے کے لیے۔ مگر اشرف اور اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ فضیلت کو فضیلت سمجھ کر حاصل کیا جائے اور امت محمدیہ چونکہ اشرف امت ہے جیسا کہ آیت: ﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (۳۔۱۱۰) میں مذکور ہے اس لیے انھیں اللہ تعالیٰ نے اس (خسیس) مرتبہ سے بلند قرار دیا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ گو ان میں سے جہلاء یہ کہہ کر۔ اَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ان پر عمومی عذاب نہیں آئے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ آیات سے مراد دلائل ہیں اور تنبیہ کی ہے کہ ان کے سامنے صرف دلائل بیان ہوں گے اور انھیں اس عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا۔ ﴿ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ (۲۲:۴۷) جس کے متعلق یہ جلدی کر رہے ہیں۔

لفظ آیَۃ کے وزن میں تین اقوال ہیں۔ (۱) یہ فَعْلَۃٌ کے وزن پر ہے ایسے کلمات (جن کے عین اور لام کلمہ میں حرف علت ہو) میں حق تو یہ ہے کہ ان کے لام کلمہ میں تعلیل کی جائے نہ کہ عین کلمہ میں جیسے حَیَاۃٌ اور نَوَاۃَ (وغیرہ نظائر موجود ہیں) لیکن عین کلمہ میں حرف یا آنے کی وجہ سے لام کلمہ میں تعلیل نہیں ہوئی، جیسے رَایَۃٌ وغیرہ۔

(۲) بعض نے کہا ہے یہ فَعْلَۃٌ کے وزن پر ہے وہ حرف علت جمع ہونے کی وجہ سے پہلی یاء کو الف سے تبدیل کر دیا گیا ہے جیسے طَائِیٌ اور طَیِّءٌ۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ آیَۃٌ دراصل اٰیِیَۃٌ بروزن فَاعِلَۃٌ ہے بغرض تخفیف یاء اول کو حذف کر کے آیَۃٌ بنالیا گیا ہے مگر یہ آخری قول ضعیف ہے کیونکہ آیَۃٌ کی تصغیر اُیَیَّۃٌ ہے اگر یہ اصل میں فَاعِلَۃٌ کے وزن پر ہوتا تو اس کی تصغیر اُوَیَّۃٌ آنا چاہیے تھی۔

اَیَّانَ

اَیَّانَ: (کب) کسی شے کا وقت دریافت کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ قریب قریب ''متیٰ'' کے ہم معنی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ﴾ (۷۹:۴۲) کہ اس (قیامت) کا وقوع کب ہوگا۔ ﴿ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴾ (۱۶:۲۱) ان کو بھی یہ معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ﴿ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ ﴾ (۵۱:۱۲) کہ جزا کا دن کب ہوگا۔ لفظ اَیَّانَ دراصل اَمیٌّ سے

مشتق ہے اور بعض کے نزدیک اس کی اصل اَیٌّ اَوَانٌ ہے جس کے معنی ہیں ''کون سا وقت'' الف کو حذف کر کے واو کو یاء اور پھر اسے یاء میں ادغام کر کے اَیَّانَ بنالیا گیا ہے۔

اِیَّا

یہ کلمہ ضمیر منصوب منفصل کے تلفظ کے لیے وضع کیا گیا ہے جب ضمیر (منصوب) (اپنے عامل پر) مقدم ہو یا اس پر کسی کلمہ کا عطف ڈالا جائے اور یا الا کے بعد آئے تو اس (اِیَّـــا) کے ساتھ استعمال ہوتی ہے جیسے (تقدیم کی صورت میں فرمایا) اِیَّاکَ نَعْبُدُ (۱:۴) اور عطف کی صورت میں) فرمایا: ﴿نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاکُمْ﴾ (۱۷:۳۱) ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں۔﴿وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ﴾ (۱۷:۲۳) اور تیرے پروردگار نے قطعی طور ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

اِیْ

اِیْ: حرف ایجاب سے کلام متقدم کی تحقیق اور توثیق کے لیے وضع کیا گیا ہے [1] جیسے فرمایا: ﴿قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ﴾ (۱۰:۵۳) کہہ دو ہاں خدا کی قسم یہ سچ ہے۔

اَیْ

اَیْ: یہ حرف ندا ہے جیسے اَیْ زَیْدُ اور کبھی (حرف تفسیر ہوتی ہے اور) اس بات پر تنبیہ کے لیے بھی آجاتا ہے کہ اس کا مابعد اس کے ماقبل کی شرح اور تفسیر ہے۔ [2]

ایا

حرف ندا ہوتا ہے جیسے اَیَا زَیْدُ

اَ

یہ بھی منجملہ حروف ندا ہے، جیسے: أَزَیْدُ

ا ی د

اَلْاَیْدُ: (اسم) سخت قوت اس سے اَیَّدَ (تفعیل) ہے جس کے معنی تقویت دینا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (۵:۱۱۰) ہم نے تمہیں روح قدس سے تقویت دی۔﴿وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۳:۱۳) یعنی جسے چاہتا ہے اپنی نصرت سے بہت زیادہ تقویت بخشتا ہے۔اِدْتُـــهٗ (ض) اَئِیْدُہٗ اَیْدًا جیسے بِـعْتُـهٗ اَبِیْعُهٗ بَیْعًا (تقویت دینا) اور اس سے اَیَّـــدْتُــهٗ (تفعیل) تکثیر کے لیے آتا ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ﴾ (۵۱:۴۷) اور ہم نے آسمان کو بڑی قوت سے بنایا اور اَیْدٌ میں ایک لغت آدٌ بھی ہے اور اسی سے امر عظیم کو مُؤَیَّدٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز دوسری کو سہارا دے اور بچائے اسے اِیَادُ الشيْ کہا جاتا ہے ایک قرأت میں آیَدْتُّكَ ہے جو اَفْعلتُ (افعال) سے ہے اور اِیَـادُ الشيْ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ فـاعـلت (مفاعلہ) مثل عَاوَنتُ سے بھی ہوسکتا ہے۔

ا ی ک

اَلْاَیْكَ: درختوں کا جھنڈ (ذو ایـکة) اور آیت: ﴿اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ﴾ (۱۵:۷۸) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے [3] کہ اَلْاَیْکَةُ ان کے شہر اور آبادی کا نام ہے۔

---

[1] ای سواء کان قبلها خبر او استفهام وعلی کل حال یکون بعدها القسم.

[2] وحینئذ یکون ما بعدها عطف بیان علی ماقبلها اوبدل لاعطف نسق ابن المغنی ۱/ ۸۰.

[3] راجع آیت: (۲۶-۱۷۶) (۳۸-۱۳) (۵۰-۱٤).

ا ی م

اَلْاَیَامٰی: (۳۲:۲۴) یہ اَلْاَیِّم کی جمع ہے اور آمَ الرَّجُلُ وَتَاَیَّمَ کے معنی ہیں مرد رنڈوا ہوگیا۔ اور عورت کے بیوہ ہونے کے لیے آمَتِ الْمَرْءَۃ وَتَأَیَّمَتْ کہا جاتا ہے۔

اِمْرَئَۃٌ اَیِّمَۃٌ: بیوہ عورت رَجُلٌ اَیِّمٌ: رنڈوا مرد اَلْحَرْب مَأْیَمَۃٌ: جنگ مرد کو عورت سے الگ کر دیتی ہے اَلْاَیِّمُ: سانپ۔

این (ظرف)

یہ کلمہ کسی جگہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے، جیسا کہ لفظ ''متیٰ'' زمانہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔ [1]

ا ی ن

اَلْاَیْنُ: (ض) کے معنی تھک کے چلنے سے عاجز ہوجانا کے ہیں۔ نیز آنَ یَئِیْنُ اَیْنًا اور اَنٰی یَأْنِیْ اَنْیًا کے معنی کسی چیز کا موسم یا وقت آجانا کے ہیں اور محاورہ میں بَلَغَ اَنَاہُ کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ اَنٰی (ناقص) سے مقلوب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابوالعباسؒ نے کہا ہے کہ آنَ یَئِیْنُ اَیْنًا کا ہمزہ دراصل حاء سے مقلوب (بدلا ہوا) ہے اور اصل میں حَانَ یَحِیْنُ حَیْنًا ہے اور اصل کلمہ اَلْحِیْن ہے۔

❀❀❀

---

[1] وفی القرآن :فَاَین تَذْھَبُون (۸۱۔۲۶) .

کِتَابُ الْبَاءِ

ب

الباء: (حرف جار) یہ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضمر کے متعلق ہوکر استعمال ہوتی ہے پھر متعلق بفعل ظاہر دو قسم پر ہے۔

(۱) ہمزہ افعال کی طرح تعدیہ فعل کیلئے آتی ہے جیسے ذھبت بہ واذھبتہٗ۔ قرآن پاک میں ہے [1] ﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ (۲۶:۷۲) جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوتو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔

(۲) آلہ کے لیے ہوتی ہے [2] جیسے قطعتہٗ بالسکین (میں نے اسے چھری سے کاٹا) اور متعلق بمضمر کبھی موضع حال میں ہوتی ہے۔ جیسے خرج بسلاحہ (یعنی وہ نکلا) دراں حالیکہ اس پر یا اس کے ساتھ اسلحہ بھی تھا۔ اور کبھی زائدہ ہوتی ہے جیسے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ﴾ (۱۲:۱۷) اور آپ ہماری بات کو باور نہیں کریں گے۔
اس جگہ میں اور مَا اَنْتَ مُؤْمِنًا میں فرق ہے۔ کیونکہ منصوب ہونے کی صورت میں متکلم کے ذہن میں ایک ہی ذات کا تصور ہے جیسا کہ زَیْدٌ خَارِجٌ میں ہے مگر مجرور ہونے کی صورت میں جیسے مَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ہے وہ ذات کا تصور ہے جیسا کہ لَقِیْتُ بِزَیْدٍ رَجُلًا فَاضِلًا میں ہے [3] کہ یہاں فَاضِلًا سے زید ہی مراد ہے مگر اسے ایسی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ اس سے ایک شخص (فَاضِلًا) متصور ہوتا ہے گویا تقدیر کلام یہ ہے رَأَیْتُ بِرُؤْیَتِی لَكَ آخر وھو رجل فاضل اسی طرح رأیت بِكَ حَاتِمًا فِی السخاء کا محاورہ ہے، چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (۲۶:۱۱۴) اور میں مومنوں کو راندنے والا بھی نہیں ہوں۔ ﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ﴾ (۳۹:۳۶) کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں ہے، مگر شیخ فرماتے ہیں کہ یہ کلام محل نظر ہے [4] اور آیت کریمہ: ﴿ تُنْۢبِتُ بِالدُّهْنِ ﴾ (۲۳:۲۰) میں بعض نے کہا ہے یہ تنبت الدہن کے معنی میں ہے [5] مگر اس آیت سے یہ معنی مقصود نہیں ہے بلکہ تُنْبِتُ النبات ومعہ الدھن کے ہم معنی ہے [6] یعنی اس میں بالقوہ روغن موجود ہوتا ہے اور بِالدُّھن کا لفظ لا کر اللہ تعالیٰ کے انعام پر تنبیہ کی ہے نیز اس کے نکالنے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

بعض نے کہا ہے اس میں باء حال کے معنی میں ہے یعنی درآنحالیکہ اس میں روغن موجود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہمزہ اور باء دونوں برائے تعدیہ آتے ہیں اور یہ دونوں ایک ہی کلمہ میں جمع نہیں ہوسکتے۔

---

[1] الباء فی الآیة للالصاق المجازی لا للتعدية وهما نوعان راجع ابن هشام : ج۱ ص ۱۰۶۔۱۰۷ اوباء التعدية تسمیٰ باء النقل والاولیٰ للمثل ذهب الله بنورهم (۲ : ۱۷).

[2] وتسمی باء الاستعانة.

[3] الاولیٰ ان تکون الباء فیها للسببية ای بسبب لقائی اباه واصحاب المعانی یسمون مثل هذاالباء.

[4] ای الشیخ عبدالقادر الجرجانی.

[5] ای الباء زائدة.

[6] فعلی هذا یکون الظرف حالامن المفعول ای تنبیه التسحر مصاحبا للدهن.

اورآیت کریمہ:﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ (۴۸:۲۸) میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے ❶ اور یہ اصل میں وَكَفَى اللّٰهُ شَهِيْدًا ہے جیسا کہ آیت:﴿ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ﴾ (۳۳:۲۵) میں ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے تو لازم آتا ہے آیت مقیس علیہ میں بھی ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ﴾ کہنا صحیح ہو حالانکہ درست نہیں ہے کیونکہ باؤ زائدہ اسی مقام پر آتی ہے جہاں اس کے بعد منصوب موضع حال میں مذکور ہو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے لہٰذا صحیح یہ ہے کہ یہاں کفٰی کا لفظ اِکْتَفِ (امر) کی جگہ لایا گیا ہے ❷ جیسا کہ اَحْسِنْ بزید میں لفظ احسن مااحسن کی جگہ لایا گیا ہے ❸ اور آیت کے معنی یہ ہیں اِکْتَفِ بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اور اسی معنی میں فرمایا:﴿ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴾ (۲۵:۳۱)﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ﴾ (۴:۴۵) اور خدا ہی کارساز کافی ہے۔﴿ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴾ (۴۱:۵۳) کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے اور حُبَّ اِلَيَّ بِفُلَانٍ کا محاورہ بھی اسی توجیہ پر محمول ہوگا۔ ای اَحْبِبْ اِلَيَّ بِهٖ۔ اورآیت کریمہ:﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ (۲:۱۹۵) میں بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے ❹ اور اصل میں لَا تُلْقُوْا اَيْدِيَكُمْ ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی باؤ آلہ کی ہے اور اصل میں لَا تُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ہے مگر مفعول کو عدم ضرورت اور معنوی عموم کے پیش نظر حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جس طرح اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ممنوع ہے، اسی طرح دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اور آیات:﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ (۸۳:۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس سے (خدا کے) مقرب بندے پئیں گے۔﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ﴾ (۷۶:۶) یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے خدا کے بندے پئیں گے...... میں بعض نے کہا ہے کہ باء بمعنی مِنْ ہے ❺ اَيْ يَشْرَبُ مِنْهَا اور بعض نے زائدہ کہا ہے: اَيْ يَشْرَبُهَا ، لیکن صحیح یہ ہے کہ باء کو اس کے معنی پر رہنے دیا جائے اور کہا جائے کہ عَيْنًا سے پانی مراد نہیں ہے، بلکہ چشمہ کا گڑھا ہے، لہٰذا یہ مَكَانًا يَشْرَبُ بِهٖ کی طرح ہوگا۔ ❻

اور آیت:﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ﴾ (۳:۱۸۸) میں بھی بِمَفَازَةٍ کے معنی بِمَوْضِعِ الْفَوْزِ کے ہیں یعنی ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ کسی نجات کی جگہ کے ذریعہ عذاب سے درستگار ہو جائیں گے۔

ب ء ر

اَلْبِئْرُ: (کنویں) اصل میں مہموز (العین) ہے۔ بَأَرْتُ بِئْرًا وَبَأَرْتُ بُؤْرَةً کے معنی گڑھا کھودنے کے ہیں۔ ❼

---

❶ قال الفراء زيدت الباء للمبالغة في المدح كماقالوا: ظرف بعبدالله واقبل بزيد وحسبك بصديقنا (اللسان) .

❷ قاله الزجاج وصرح ابن هشام بان هذا التوجيه بعيدراجع الاتقان ج١ ص ١٥٩ والمغنى .

❸ اى غير الخبر الى معنى الطلب .

❹ ذكره ابن هشام في المغنى وقال الثاني : مماتزادفيه الباء على المفعول كمافى الآية .

❺ قاله الفارسي والاصمعي والقبتي وابن مالك (ابن هشام : ص ١١).

❻ اى الباء للاستعانة كماقاله الزمخشرى فالمعنىٰ يشرب بهاالخمر.

❼ ومنه ابتئر بمعنى ادخروفي الحديث : فلم يبتئر شيئاً اى فلم يدخر (اللسان)

قرآن پاک میں ہے:﴿ وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴾ (۲۲:۴۵) اور بہت سے کنویں بیکار اور محل ویران پڑے ہیں۔

اسی سے اَلْمِئْبَرُ کا لفظ مشتق ہے جو اصل میں اس گڑھے کو کہتے ہیں جس کا منہ اس طرح ڈھانپ دیا جائے کہ جو شخص اس کے اوپر سے گزرے اس میں گر پڑے ایسے گڑھے کو مِغواۃٌ بھی کہا جاتا ہے اور کنایۃً مِئْبَرٌ ایسی سخن چینی کو کہتے ہیں جو انسان کو بلا میں ڈالنے والی ہو اس کی جمع اَلْمَآبِرُ آتی ہے۔

ب ء س

اَلْبُؤْس وَالْبَأْس وَالْبَأْسَاءُ: تینوں میں سختی اور ناگواری کے معنی پائے جاتے ہیں مگر بُؤس کا لفظ زیادہ تر فقر وفاقہ اور لڑائی کی سختی پر بولا جاتا ہے اور اَلْبَأْسُ وَالْبَأْسَاءُ بمعنی نکایہ (یعنی جسمانی زخم اور نقصان کے لیے آتا ہے، قرآن پاک میں ہے:﴿ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَأْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴾ (۴:۸۴) اور خدا لڑائی کے اعتبار سے بہت سخت ہے اور سزا کے لحاظ سے بھی بہت سخت ہے۔﴿ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ ﴾ (۶:۴۲) پھر (ان کی نافرمانیوں کے سبب) ہم انھیں سختیوں اور تکلیفوں میں پکڑتے رہے۔ ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ﴾ (۲:۱۷۷) اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔﴿ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ﴾ (۵۹:۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔

بَؤُسَ يَبْئُوسُ (بَاْسًا) بہادر اور مضبوط ہونا۔ اور آیت کریمہ:﴿ بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ ﴾ (۷:۱۶۵) میں بَئِيْسٌ بروزن فعیل ہے اور یہ بَأْس یا بُؤس سے مشتق ہے یعنی بڑے سخت عذاب میں اور آیت کریمہ:﴿ فَلَا تَبْتَئِسْ ﴾ (۱۱:۳۶) کے معنی یہ ہیں کہ غمگین اور رنجیدہ رہنے کے عادی نہ بن جاؤ۔ حدیث میں ہے:❶﴿ اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَكْرَهُ الْبُؤْسَ وَالتباؤسِ والتَّبَئُّوسَ ﴾ کہ آنحضرت ﷺ کو یہ بات بری لگتی تھی کہ فقراء دوسروں کے سامنے عجز و انکساری کریں یا کوئی شخص اپنے آپ کو ذلیل کرے (اور عزت نفسی کا خیال نہ رکھے) بِئْسَ: فعل ذم ہے اور ہر قسم کی مذمت کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ نِعْمَ ہر قسم کی مدح کے لیے استعمال ہوتا ہے ان کا اسم اگر معرف باللام ہو یا معرف باللام کی طرف مضاف ہو تو اسے رفع دیتے ہیں جیسے بِئْسَ الرجل زيدٌ وبئس غلام الرَّجُل زيدٌ اور اسم نکرہ کو نصب دیتے ہیں جیسے قرآن پاک میں ہے:﴿ بِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (۵:۷۹)﴿ای بِئْسَ شَيْئًا يَفْعَلُوْنَهٗ ﴾ یعنی بلاشبہ وہ برا کرتے تھے۔﴿ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴾ (۱۴:۲۹) اور وہ برا ٹھکانا ہے۔﴿ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾

---

❶ وفی اللسان (باس) اویجوز التبؤس ای بالقصر والتشدید وکذا جاء فی حدیث الصلوۃ : ان تقنع یدیك وتبأس فانه کلمه من بئس بمعنیٰ افتقر والحدیث اخرجه ابو نعیم فی تاریخ اصبھان وحمزہ السلمی فی تاریخ جرجان عن ابی ھریرۃؓ ان الله اذاانعم علی عبد نعمة ویکرہ البوس والتبوس ورواہ ابو یعلیٰ والبیھقی فی الشعب ویبغض البؤس والتبؤس انظر ص ۲۳ رقم ۱۸۹ ص ۴۳ رقم ۳۶۰ عن ابی ھریرۃؓ مرفوعاً وفیه عن ابی سعید وھنا .... عن یحیی بن عبیدۃ مرسلاً...... ویبغض بدل یکرہ والحدیث مذکور مع حدیث ان الله جمیل یحب الجمال راجع تخریج الکشاف وکنزالعمال ۶ : ۵۹۲،۲۵۸۶ لایحب بدل یکرہ (طب ، ھق وایضاً عن زھیر بن ابی علقمة ۲۶۰۲۱, ۲۶۱۱, ۲۶۱۲) ابن میصری فی امالیه ۔ عن ابی ھریرۃؓ).

(۳۹:۷۲) تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے۔ ﴿بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا﴾ (۱۸:۵۰) ظالموں کے لیے برا بدل ہے۔ ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ (۵:۶۳) بلاشبہ وہ بھی برا کرتے ہیں۔ بِئْسَ اصل میں بَئِسَ (س) اور بُؤْسٌ سے مشتق ہے۔

ب ت ر

اَلْبَتْرُ: یہ قریباً بَتْكٌ کے ہم معنی ہے مگر خاص کر دُم کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ پھر مجازاً قطع نسل کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور اَبْتَر اس شخص پر بولا جاتا ہے جس کی موت کے بعد اس کا خلف نہ ہو اور اَبْتَر یا اَبَاتِر وہ ہے جس کا ذکر خیر باقی نہ رہے، نیز ﴿رَجُلٌ اَبَاتِرٌ﴾ قاطع رحم اور جس خُطبہ کے شروع میں حمد و ثنا نہ ہو اسے بھی مجازاً خُطْبَةٌ بَتْرَاء کہا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے [1] ﴿كُلُّ اَمْرٍ لَا يُبْدَءُ فِيْهِ بِذِكْرِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَرُ﴾ (۱۷) ہر وہ کام جس کے شروع میں اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ اَبْتَر ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ (۱۰۸:۳) میں اَبْتَر کے معنی یہ ہیں کہ تیرے مخالف کا ذکر خیر باقی نہیں رہے گا۔ جب کفار نے طعنہ دیا کہ محمد ﷺ کی موت کے ساتھ ہی اس کا نام و نشان منقطع ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کی نسل (اولاد) نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا کہ تمہارا بداندیش ہی مقطوع النسل رہے گا، آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (۹۴:۴) کا مقام بخشا ہے، کیونکہ جملہ مؤمنین آپ کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کے اور آپ کے دین کے محافظ مقرر کر دیا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے [2]۔ (۲۰) اَلْعُلَمَاءُ بَاقُوْنَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ، اَعْيَانُهُمْ مَفْقُوْدَةٌ وَآثَارُهُمْ فِي الْقُلُوْبِ مَوْجُوْدَةٌ۔ علماء تا قیامت باقی رہیں گے ان کے اجسام مفقود ہوتے جاتے ہیں، مگر ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر ثبت رہتے ہیں۔ جب علماء کو یہ فضیلت حاصل ہے جو آنحضرت ﷺ کے متبعین سے ہیں تو آنحضرت ﷺ کی شان تو اس سے کہیں بلند ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''رفع ذکر'' کا شرف بخشا ہے اور آپ کو خاتم الانبیاء قرار دیا ہے۔ صلی اللہ علیہ وعلیہم افضل الصلاۃ والسلام۔

ب ت ک

اَلْبَتْكُ: (ض) یہ قریب قریب بَتٌّ (کاٹنا) کے ہم معنی ہے مگر بَتْكٌ کا لفظ اعضاء یا بال کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے، جیسے بتک شَعْرَهٗ وَاُذُنَهٗ اس نے فلاں کے بال یا کان کاٹ ڈالے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْاَنْعَامِ﴾ (۴:۱۱۹) کہ وہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں۔

---

[1] والحدیث اوردہٗ العلماء بالفاظٍ مختلفةٍ رواہ ابوعوانة فی صحیحه واصحاب السنن .... عن ابی هریرةؓ بلفظٍ لَايُبْدَأُ فِيْهِ بِحَمْدِ لِلّٰهِ اَقْطَعُ احمد فی مسنده من هذا الوجه "لایفتتح بذکر الله فهو ابتر واقطع" وللخطیب فی الجامع عن الزهری "لا یبدأ فیه ببسم الله الرحمن الرحیم فهو اَقْطَعُ ومارواه المؤلف فلم ارفی المراجع بهذا اللفظ راجع تخریج الکشاف ص ۲ رقم ۳.

[2] انظر لقول علی هذا ادب الدنیا والذین نشروا اویس وفا ٦١ ولفظه : وبقی خزان العلم اعیانهم مفقودة واشخاصهم فی القلوب موجودة ۱۲.

اسی سے سَیْفٌ بَــاتِكٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی قاطع تلوار کے ہیں۔اور جب کسی جانور کے بال یا پر پکڑ کر اس طرح کھینچے جائیں کہ وہ جڑ سے اکھڑ جائیں تو اس معنی میں بَتَّكْتُ الشَّعْرَ بولتے ہیں اور اس طرح اکھڑے ہوئے بالوں کے قطعہ کو بِتْــــكَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع بِتَكٌ ہے۔شاعر نے کہا ہے ❶

(۳۷) طَارَتْ وَفِیْ یَدِھَا مِن رِیشھا بِتَك

وہ (قطاۃ) اڑ گئی اور اس کے ہاتھ میں کچھ پر باقی رہ گئے اور بَــتٌّ کا لفظ رسی یا تعلق کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے، محاورہ ہے:طَلَّقْتُ الْمَرْءَ ةَ بَتَّةً وبتلَةً ۔میں نے عورت کو قطعی طلاق دیدی۔بَــتُّ الْحُکْمَ بَیْنَھُمَا ۔میں نے ان کے درمیان قطعی فیصلہ کر دیا۔ایک روایت میں ہے ❷

(۲۱) لاَ صِیَامَ لِمَنْ لَّمْ یَبُتَّ الصِّیَامَ مِنَ اللَّیْلِ

جو شخص رات کو روزہ کی قطعی نیت نہ کرے، اس کا روزہ نہیں ہے۔

اور بَشْكٌ بھی اس کے ہم معنی ہے مگر یہ لفظ کپڑے کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے تیز رو اونٹنی کو نَــاقَةٌ بَشْکیٰ کہا جاتا ہے کیونکہ سرعت رفتار میں اونٹنی کے ہاتھ کو بافندہ عورت کے ہاتھ مشابہ ہوتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❸

(۳۸) فِعْلَ السَّرِیْعَةِ بَادَرَتْ جُدَادُھَا
قَبْلَ الْمَسَاءِ تَھِمُّ بِالْاِسْرَاعِ

جیسا کہ بافندہ عورت کپڑا بنتی ہوئی اس کے دامن تک پہنچ جاتی ہے اور وہ غروبِ آفتاب سے قبل اسے ختم کرنے کے لیے جلدی کرتی ہے۔

ب ت ل

آیت کریمہ: ﴿ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ﴾ (۸:۷۳) کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص نیت اور عبادت میں سب سے کٹ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:﴿ قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ ﴾ (۶:۹۱) کہہ دو کہ (اس کتاب کو) خدا ہی نے (نازل کیا تھا) پھر ان کو چھوڑ دو۔لہٰذا اس آیت یعنی ﴿ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ﴾ اور حدیث ❹ (۲۲) لا رَھْبَــانِیَّةَ وَلَا تبتُّلَ فِی الْاِسْلَامِ کے درمیان منافات نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جس تبتل سے منع کیا گیا ہے وہ نکاح سے کنارہ کشی انقطاع ہے اور اسی معنی میں مریم علیہا السلام کو اَلْــعَذْرَاءُ الْبَتُول کہا جاتا ہے کیونکہ مریم علیہ السلام عمر بھر ازدواجی زندگی سے کنارہ کش رہیں اور ترک نکاح شرعاً ممنوع ہے، جیسے فرمایا:﴿ وَاَنْکِحُوا الْاَیَــامٰــی مِنْکُمْ ﴾ (۲۴:۳۲) کہ اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو

---

❶ قاله زهير وصدرهٗ : حتیٰ اذاما كف الغلام لها.......... والمونث يرجع الى القطاة والبيت فى ديوانه والبحر ۵۔۳/۴۳۳:۳۴۸ و مختار الشعر الجاهلى (۱/ ۱۷۷) وذيل ابدال الى الطيب ۲ : ۵۵ والعقد الثمين ۸۷من قصيدة فى ۳۳ بيتاً قالها حين اغارَ بنو اسد على بابله واستاقتها.

❷ الحديث رواه اصحاب السنن واصله فى الصحيحين .

❸ قاله المسبب بن على والبيت من كلمة مفضيلية (۲ : ۶۰) وايضاً وامالئ المرتضیٰ (۱ : ۵۶۰) وفى المطبوع حدادها (بالحاء) مصحف والجداد معناه هدب الثوب يعنى ان هذالنساجه قد قاربت الفراغ من الثواب وبلغت الى هدبهٖ فهى تبادر للفراغ منه قبل المساء والقصيدة فى ذيل الامالى ۱۳۰۔۱۳۲فى ۲۶ بيتاً وذكر ان ابا جعفر المنصور استحسنها.

❹ حديث النهى عن التبتل رواه الترمذى وابن ماجة عن سمرة رضى الله عنه تعالىٰ وايضاً راجع الفائق ۱/ ۲۶۹ وابو عبيدة فى غريبه.

اور حدیث میں ہے ❶ (۲۳) تَنَاکَحُوْا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یَوْمَ الْقیامۃ کہ نکاح کروتا کہ تمہاری کثرت ہو قیامت کے دن دوسروں کے مقابلہ میں مجھے تمہاری کثرت تعداد سے فخر ہوگا۔

نَخْلَۃٌ مُبْتِلٌ ۔کھجور جس کے ساتھ کا چھوٹا پودا اس سے الگ ہوگیا ہو۔

ب ث ث

اَلْبَثُّ (ن ض) اصل میں بَثٌّ کے معنی کسی چیز کو متفرق اور پراگندہ کرنا کے ہیں جیسے بثَّ الرِّیْحُ التُّرَابَ ۔ ہوا نے خاک اڑائی، اور نفس کے سخت ترین غم یا بھید کو بَثُّ النفس کہا جاتا ہے۔بَثَثْتُہٗ فَانْبَثَّ میں نے اسے منتشر کیا، چنانچہ وہ منتشر ہوگیا اور اسی سے ﴿ فَکَانَتْ ھَبَآءً مُّنْبَثًّا ﴾ (۵۶:۶) ہے یعنی پھر وہ منتشر ذرات کی طرح اڑنے لگیں اور آیت کریمہ:﴿ وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ ﴾ (۲:۱۶۴) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں ہر قسم کے جانوروں کو پیدا کیا اور ان کو ظہور بخشا اور آیت: ﴿ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴾ (۱۰۱:۴) میں المبثوث سے مراد وہ پروانے ہیں جو مخفی اور پرسکون جگہوں میں بیٹھے ہوں اور ان کو پریشان کردیا گیا ہو۔ اور آیت: ﴿اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ﴾ (۱۲:۸۶) میں بَثٌّ کے معنی سخت ترین اور پوشیدہ غم کے ہیں جو وہ ظاہر کر رہے ہیں اس صورت میں مصدر بمعنی مفعول ہوگا۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصدر بمعنی فاعل ہو یعنی وہ غم جس نے میری فکر کو منتشر کر رکھا ہے، جیسا کہ توزعَنِی الْفِکْرُ کا محاورہ ہے یعنی مجھے فکر نے پریشان کردیا۔

ب ج س

بَجَسَ الْمَاءُ وَانْبَجَسَ: پانی پھوٹ کر بہہ نکلا یہ اِنْفَجَرَ کے ہم معنی ہے مگر انْبِجَاسٌ عام طور پر اس مقام پر بولا جاتا ہے جب کسی تنگ مقام سے پانی بہہ نکلا ہو اور اِنْفِجَارٌ کا لفظ عام ہے یعنی وہ کسی تنگ مقام سے پانی بہہ نکلنے پر بھی بولا جاتا ہے اور وسیع جگہ سے بھی۔

یہی وجہ ہے قرآن پاک میں ایک مقام پر ﴿فَانْبَجَسَتْ مِنْہُ اثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا ﴾ (۷:۱۶۰) آیا ہے اور دوسرے مقام پر ﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْہُ اثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا﴾ (۲:۶۰) یعنی تنگ مقام (پتھر) سے پانی بہہ نکلنے پر دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ (مگر جہاں یہ معنی ملحوظ نہیں) جیسے ﴿ وَفَجَّرْنَا خِلٰلَھُمَا نَھَرًا ﴾ (۱۸:۳۳) کہ دونوں کے درمیان ہم نے ایک نہر بھی جاری کردی۔﴿ وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا ﴾ (۵۴:۱۲) کہ ہم نے زمین پر چشمے جاری کردیے۔...... وہاں صرف فَجَّرَ کا لفظ استعمال ہوا بَجَسْنَا نہیں فرمایا۔

ب ح ث

اَلْبَحْثُ: (ف) کے معنی کریدنا اور تلاش کرنا کے ہیں بَحَثْتُ عَنِ الْاَمْرِ وَبَحَثْتُ کَذَا میں نے فلاں معاملہ کے متعلق کرید کی یا فلاں چیز کو تلاش کیا قرآن پاک میں ہے:﴿ فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی

❶ الحدیث بالفاظہ مرفوعاً فی الاحیاء مسند الفردوسی للدیلمی وابن مردویہ فی تفسیرہ موقوفاً علی ابن عمرو اسنادہ ضعیف والبیھقی فی المعرفۃ عن الشافعی انہ بلغہ راجع الاحیاء بتخریج العراقی ۲ / ۲۲ والنیل ۶ / ۱۰۷۔

اَلْاَرْضِ ﴾ (۵:۳۱) اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا۔ اور جب اونٹنی چلتے وقت زمین پر سخت پاؤں رکھنے پر بَحَثَتِ النَّاقَةُ فِي السَّيرِ کہا جاتا ہے۔

ب ح ر

اَلْبَحْرُ: (سمندر) اصل میں اس وسیع مقام کو کہتے ہیں جہاں کثرت سے پانی جمع ہو پھر کبھی اس کی ظاہری وسعت کے اعتبار سے بطور تشبیہ بَحَرْتُ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سمندر کی طرح کسی چیز کو وسیع کردینا کے ہیں اسی سے بَحَرْتُ الْبَعِيْرَ ہے یعنی میں نے بہت زیادہ اونٹ کے کان کو چیر ڈالا یا پھاڑ دیا اور اس طرح کان چرے ہوئے اونٹ کو اَلْبَحِيْرَة کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ ﴾ (۵:۱۰۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے بحیرہ جانور کا حکم نہیں دیا کفار کی عادت تھی کہ جو اونٹنی دس بچے جن چکتی تو اس کا کان پھاڑ کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے اور نہ بوجھ لادتے۔

اور جس کو کسی صنعت میں وسعت حاصل ہوجائے اسے بحر کہا جاتا ہے، چنانچہ بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کو بحر کہہ دیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک گھوڑے پر سواری کے بعد فرمایا ❶ (۴۴) وَجَدْتُهُ بَحْرًا کہ میں نے اسے سمندر پایا۔

اسی طرح وسعت علمی کے اعتبار سے بھی بحر کہہ دیا جاتا ہے اور تَبَحَّرَ فِي كَذَا کے معنی ہیں اس نے فلاں چیز میں بہت وسعت حاصل کرلی اور اَلتَّبَحُّرُ فِي الْعِلْمِ علم میں وسعت حاصل کرنا۔

اور کبھی سمندر کی ملوحت اور نمکینی کے اعتبار سے کھاری اور کڑوے پانی کو بُحْرَانِيٌّ کہہ دیتے ہیں۔ اَبْحَرَ الْمَاءُ، پانی کڑوا ہوگیا۔ شاعر نے کہا ہے ❷

(۳۹) قد عادماء الارض بحراً فزادنی۔
الی مرض ان اَبْحَرَ المشربُ العذبُ

زمین کا پانی کڑوا ہوگیا تو شیریں گھاٹ کے تلخ ہونے سے میرے مرض میں اضافہ کردیا۔

اور آیت کریمہ: ﴿ بَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ﴾ (۲۵:۵۳) دو دریا، ایک کا پانی شیریں پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری ہے، چھاتی جلانے والا میں عَذْبٌ کو بحر کہنا مِلْحٌ کے بالمقابل آنے کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورج اور چاند کو قَمَرَان کہا جاتا ہے اور بَنَاتُ بَحْرٍ کے معنی زیادہ بارش برسانے والے بادلوں کے ہیں۔ اور آیت: ﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ﴾ (۳۰:۴۱) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ بحر سے سمندر مراد نہیں ہے، بلکہ بَرّ سے جنگلات اور بحر سے زرخیز علاقے مراد ہیں۔

لَقِيْتُهُ صَحْرَةً بَحْرَةً میں اسے ایسے میدان میں ملا جہاں کوئی اوٹ نہ تھی۔ ❸

---

❶ من حديث انس بن مالك رواه البخارى فى مواضع من صحيحه باب الركوب على الدابة الصعبة راجع الفتح ومسلم باختلاف الالفاظ واللسان (بحر) قاله فى فرس لابى طلحة يقال له مندوبٌ.

❷ قاله نصيب والبيت فى اللسان والمحكم (بحر) والصحاح وفى روايته فردنى بدل فزادنى والاشباه النحوية ۴۴/۳ والبحر (۹۵:۱) والبلدان (اسم يحار) وفى رواية عذب الماء بدل ماء الارض وعلى ظمائى بدل الى مرض.

❸ اى ليس بينى وبينه حاجزا انظر للكلمته الميدانى ۱۹۵/۲ والصحاح (البحر) وفى هوامش الصحاح: كل من صحرة وبحرة غير منصرف وفى القاموس وينونان.

ب خ س

اَلْبَخْسُ: (س) کے معنی کوئی چیز ظلم سے کم کرنا کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴾ (۱۱:۱۵) اوراس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ ﴿ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ ﴾ (۷:۸۵) اورلوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو۔ اَلْبَخْسُ وَالْبَاخِسُ ۔حقیراورناقص چیز۔اورآیت کریمہ: ﴿ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ ﴾ (۱۲:۲۰) میں بعض نے کہا ہے کہ بَخْسٍ کے معنی حقیر اور ناقص کے ہیں اور بعض نے مَبْخُوس یعنی منقوص کا ترجمہ کیا ہے۔

محاورہ ہے: تَبَاخَسُوْا۔انھوں نے ایک دوسرے کی حق تلفی کی۔

ب خ ع

اَلْبَخْعُ: (ف) کے معنی غم سے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالنا کے ہیں [1] اورآیت کریمہ: ﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ ﴾ (۱۸:۶) شاید تم غم وغصہ سے خودکو ہلاک کر ڈالو...... میں رنج وغم کے ترک کی ترغیب دی گئی ہے، جیسا کہ آیت: ﴿ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ ﴾ (۳۵:۸) میں ہے کہ ان پر حسرتوں کے باعث تمہاری جان نہ نکل جائے۔شاعر نے کہا ہے [2] (طویل)

(۴۰) أَلَا أَيُّهَا الْبَاخِعُ الْوَجْدِ نَفْسَهُ

اسے غم کی وجہ سے خودکو ہلاک کرنے والے۔ بخع فلانٌ بالطاعة فلان نے طاعت میں مبالغہ کیا۔ بخع فلانٌ بما علیه من الحق فلاں نے سخت بیزاری کے ساتھ اپنے اوپر دوسرے کے حق کا اقرار کیا گویا یہاں سخت کراہت اور بیزاری کو خودکو ہلاک کرنے والے کے قائم مقام کردیا گیا ہے۔

ب خ ل

اَلْبُخْلُ: (س) اپنے جمع کردہ ذخائر کوان جگہوں سے روک لینا، جہاں پر خرچ کرنے سے اسے روکنا نہیں چاہیے۔اس کے بالمقابل الجود ہے بَخِلَ: اس نے بخل کیا بَاخِلٌ: بخل کرنے والا۔

اَلْبَخِيلُ: (صیغہ مبالغہ) جو بہت زیادہ بخل سے کام لیتا ہو،جیسا کہ الراحم (مہربان) سے اَلرَّحِيْم مبالغہ کے لیے آتا ہے۔

اَلْبُخْلُ: دوقسم پر ہے ایک یہ ہے کہ انسان اپنی چیزوں کو خرچ کرنے سے روک لے اور دوم یہ کہ دوسروں کو بھی خرچ کرنے سے منع کرے، یہ پہلی قسم سے بدتر ہے، جیسے فرمایا: ﴿ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ﴾ (۴:۳۷) یعنی جو خود بھی بخل کریں اورلوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیں۔

ب د ء

بَدَأْتُ بِكذا وأَبْدَأْتُ وَابْتَدَأْتُ: میں نے

---

[1] اصله فی الذبیحة یقال بخع الذبیحة اذا بالغ فی الذبح حتیٰ یقطع عظم رقبتها والبخاع العرق فی الصلب ثم کثراستعماله للمبالغة فی شیئی (الفائق: ۳۷)

[2] قاله ذو الرمة وتمامه .... بشیئی تحته عن یدیه المقادر۔ راجع دیوانه ۲۵۱ (ط کیمبرج ۱۹۱۹م) ومجاز القرآن لابی عبیدة (۱: ۳۹۳/۲: ۳۸) وغریب القران للقتیبی ۲۶۳ والسیوطی ۲۲۷ والبحر (۶: ۹۲) وعزاه الی الفرزوق والصحاح والتاج والاساس و اللسان (بخع) والبیت من شواهد الطبری فی تفسیره: ۱۵، ۱۹۴/۹، ۵۸) وفی روایة عن یدیك وفی البیت ایضاً شاهد علی وصف ای فی النداء باسم الاشارة موصوف بِألْ والبیت ایضاً فی الفتح: ۳۰۸/۸).

اسے مقدم کیا۔اس کے ساتھ ابتدا کی۔

اَلْبَدْءُ وَالْاِبْتِدَاءُ: ایک چیز کو دوسری پر کسی طور مقدم کرنا، قرآن پاک میں ہے:﴿ وَبَدَأَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ﴾ (۳۲:۷)اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔﴿ كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ﴾ (۲۹:۲۰)اس نے کیسے مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔﴿ اَللّٰهُ يَبْدَءُ الْخَلْقَ ﴾ (۳۰:۱۱) خدا ہی نے مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا۔﴿ كَمَا بَدَءَ كُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴾ (۷:۲۹)اس نے جس طرح تم کو ابتداء میں پیدا کیا تھا،اس طرح تم پھر پیدا ہوجاؤ گے۔

مَبْدَءُ الشَّيْءِ: جس سے کوئی چیز مرکب ہو یا اس سے بنے۔مثلاً حروف تہجی کو مبدء کلام کہا جاتا ہے اور لکڑی دروازے یا تخت کا مبدء ہے،اسی طرح نَوَاةٌ:(گٹھلی) کھجور کا مبدء کہلاتی ہے۔بَدْءٌ(پہلا سردار) یعنی سرداروں کا شمار کیا جائے تو اس سے ابتدا ہو اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِيْدُ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی ابتداء اور انتہا کا سبب اصلی ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔رَجَعَ عَوْدَهٗ علی بَدءِ ہٖ۔یعنی جس راستہ پر آیا اسی پر واپس لوٹا۔فعل ذالك عائدًا وَبَادِئًا اَوْ مُبْدِأً وَمُعِيْدًا ۔اسے سب سے پہلے کیا اَبْدَأتُ مِنْ اَرْضِ كَذَا ۔یعنی میں نے فلاں سرزمین سے سفر شروع کیا اور آیت کریمہ:﴿ بَادِيَ الرَّأْيِ ﴾ (۱۱:۲۷) رائے فطری یعنی وہ رائے جو ابتداء سے قائم کرلی جائے۔

ایک قرأت میں بَادِیَ الرَّأْيِ بدوں ہمزہ کے ہے اس صورت میں اس کے معنی ظاہری رائے کے ہوں گے جس میں غور وفکر سے کام نہ لیا گیا ہو۔

شَيْءٌ بَدِيْءٌ: انوکھی چیز جو پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئے جیسا کہ اَلْبَدِيْعُ جو پہلے معمول نہ ہو۔

اَلْبَدْأَةُ: وہ حصہ جس سے تقسیم کی ابتداء کی جائے،اسی سے گوشت کے بڑے ٹکڑے کو بَدْأٌ کہا جاتا ہے۔

ب د ر

بَدَرْتُ اليه وَبَادرتُ: کسی کام کے لیے جلدی کرنا،قرآن پاک میں ہے:﴿ وَلَا تَأْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا ﴾ (۴:۶) جلدی میں نہ اڑا دینا۔یعنی اسراف اور عجلت سے یتیم کا مال مت کھاؤ اور جو لغزش جلد بازی میں انسان سے سرزد ہو اسے بَادِرَةٌ کہا جاتا ہے۔بَوَادِرُ كَانَتْ مِنْ فُلَانٍ بَوَادِرُ كَانتْ مِنْ فُلَانٍ بَوَادِرُ فِي هٰذَا الامْرِ فلاں سے اس معاملہ میں جلد بازی سے لغزشیں ہوئی ہیں۔

اَلْبَدْرُ: (ماہ کامل) بعض نے کہا ہے کہ پورے چاند کو بَدْرٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سورج سے پہلے طلوع ہوتا ہے اور بعض نے بِدْرَةٌ (روپے سے بھری ہوئی تھیلی) سے اخذ کیا ہے اور کہا ہے کہ پورا چاند بھی بِدْرَةٌ کی طرح بھرپور ہوتا ہے اس لیے اسے بَدْرٌ کہا جاتا ہے اس توجیہ کی بنا پر یہ مصدر بمعنی فاعل ہوگا۔لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ بَدْرٌ کو اس باب میں اصل قرار دیا جائے۔اور دوسرے معانی کو بَدْرٌ کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے اس پر متفرع کیا جائے،مثلاً بَدَر كذا کے معنی ہوں گے وہ بدر کی طرح طلوع اور ظاہر ہوا اور معنی اِمْتِلَاء کے لحاظ سے دراہم سے بھری تھیلی کو بِدْرَةٌ کہہ دیتے ہیں اس طرح کھلیان کو اَلْبَيْدَرُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی غلہ سے پُر ہوجاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ﴾ (۳:۱۲۳)اور خدا نے جنگ بدر میں تمہاری مدد کی

تھی اور اس وقت بھی تم بے سروسامان تھے۔میں بَدْرٌ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ ❶

ب د ع

اَلْاِبْـدَاعُ: کسی کی تقلید اور اقتداء کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنا۔اسی سے نئے کھودے ہوئے کنویں کو رَکِیَّۃٌ بَدِیْعٌ کہا جاتا ہے۔جب اِبْـــدَاعٌ کا لفظ اللہ عزوجل کے لیے استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ بغیر مادہ اور بغیر زمان و مکان کے کسی شئے کو ایجاد کرنا اور یہ معنی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔اور اَلْبَدِیْعُ بمعنی مُبْدِعٌ بھی آیا ہے، جیسے فرمایا:﴿ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔(۲:۱۱۷)

اور بمعنی مُبْدَع (اسم مفعول) بھی آجاتا ہے، جیسے رَکِیَّۃٌ بَدِیْعٌ (نیا کھودا ہوا کنواں)

اسی طرح بِـدْعًا کا لفظ بھی اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:﴿ مَـــا کُنْـتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ کہ میں کوئی نیا پیغمبر نہیں ہوں۔(۴۶:۹) میں بِـدْعًا بمعنی مُبْدَع بھی ہوسکتا ہے یعنی پیغمبر ایسا کہ مجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہ آیا ہو اور بمعنی مُبْدِع کے بھی یعنی میں کوئی نئی بات نہیں کہتا۔

اَلْبِدْعَۃُ: مذہب میں نئی بات داخل کرنا ہوگا جس کا قائل یا فاعل صاحب شریعت کی اقتدا نہ کرے اور نہ ہی سلف صالحین اور اصول شریعت سے اس کا ثبوت ملتا ہو، ایک روایت میں ہے۔ ❷ کُـلُّ مُـحْـدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَـلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَـلَالَۃٍ فِی النَّارِ کہ ہر نئی رسم بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ہے۔اَلْاِبْــــدَاعُ بِـــالــرَّجُلِ: سواری کے ماندہ اور دبلا ہونے کی وجہ سے رفقاء سے منقطع ہوجانا۔ ❸

ب د ل

اَلْاِبْـدَالُ وَالتَّبْدِیْلُ وَالتَبَدُّلُ وَالْاِسْتِبْدَالُ کے معنی ایک چیز کو دوسری کی جگہ رکھنا کے ہیں یہ عوض سے عام ہے کیونکہ عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لینا شرط ہوتا ہے لیکن تبدیل مطلق تغیر کو کہتے ہیں۔خواہ اس کی جگہ پر دوسری چیز نہ لائے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ ﴾ (۲:۵۹) تو جو ظالم تھے انھوں نے اس لفظ کو جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا بدل کر اس کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا۔ ﴿وَلَیُبَـدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ﴾ (۲۴:۵۵) اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔اور آیت:﴿فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنَاتٍ ﴾ (۲۵:۷۰) کے معنی بعض نے یہ کیے ہیں کہ وہ ایسے نیک کام کریں جو ان کی سابقہ برائیوں کو مٹادیں اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور ان کے نیک عملوں کا انھیں ثواب عطا کرے گا۔﴿ فَـمَنْ بَدَّلَہٗ بَعْدَ مَـا سَمِعَہٗ ﴾ (۲:۱۸۱) تو جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے۔﴿ وَاِذَا بَـــدَّلْـنَـا اٰیَۃً مَّـکَـانَ اٰیَۃٍ ﴾

---

❶ راجع لتحقیقه البلدان (ومعجم الباکری) .

❷ کلمة من خطبته صلی الله علیه وسلم انظر (حم،م،ن،ھ) عن جابرؓ وابن حبان فی زوائده رقم ۱۰۲۔

❸ والفعل منه فی هذاالمعنی یستعمل الامجھولا۱۲۔

(۱۰۱:۱۶) جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں۔﴿ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ﴾ (۳۴:۶) ﴿ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ ﴾ (۹۵:۷) پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔

اور آیت کریمہ:﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ ﴾ (۴۸:۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی موجودہ حالت تبدیل کردی جائے گی۔﴿ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ ﴾(۲۶:۴۰) کہ وہ (کہیں) تمہارے دین کو (نہ) بدل دے۔﴿ وَمَنْ يُّبَدِّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ (۱۰۸:۲) اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر اختیار کیا﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴾ (۳۸:۴۷) اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔

اور آیت کریمہ:﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ﴾ (۲۹:۵۰) ہمارے ہاں بات بدلا نہیں کرتی کا مفہوم یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتا پس اس میں تنبیہ ہے کہ جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وقوع پذیر ہوگی وہ اس کے علم کے مطابق ہی وقوع پذیر ہوگی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آسکتی۔

بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس کے وعدہ میں خلف نہیں ہوتا۔اور فرمان باری تعالیٰ:﴿ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ﴾ (۳۴:۶) قوانین خداوندی کو تبدیل کرنے والا نہیں۔نیز:﴿ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ﴾ فطرت الٰہی میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔(۳۰:۳۰) بھی ہر دو معانی پر محمول ہوسکتے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اس آخری آیت میں خبر بمعنی امر ہے اس میں اختصاء کی ممانعت ہے۔

اَلْاَبْدَالُ: وہ پاکیزہ لوگ کہ جب کوئی شخص ان میں سے مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا قائم مقام فرما دیتے ہیں۔ [1] درحقیقت ابدال وہ لوگ ہیں جنھوں نے صفات ذمیمہ کی بجائے صفات حسنہ کو اختیار کرلیا ہو۔اور یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف آیت:﴿ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ ﴾ (۵:۲۵) میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَلْبَادِلَةُ: گردن اور ہنسلی کے درمیان کا حصہ اس کی جمع بَآدِلُ ہے [2] ع (طویل)

(۴۱) وَلَا رَهْلٌ لَبَّاتُهٗ وَبَآدِلُهٗ

اس کے سینہ اور بغلوں کا گوشت ڈھیلا نہیں تھا۔

ب د ن

اَلْبَدَنُ: یہ جَسَدٌ کے ہم معنی ہے لیکن بدن باعتبار عظمت جثہ کے بولا جاتا ہے اور جَسَدًا باعتبار رنگ کے، اسی سے رنگین کپڑے کو ثَوْبٌ مُجَسَّدٌ کہا جاتا ہے اور جسیم عورت کو اِمْرَءَةٌ بَادِنٌ وَبَدِيْنٌ کہتے ہیں اسی سے قربانی کے جانوروں کو اس کے فربہ ہونے کی وجہ سے بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے اور بَدَنَ وَبَدَّنَ کے معنی موٹا ہونے

---

[1] قال علیؓ الابدال بالشام والنجباء بمصر والعصائب بالعراق (الفائق ۱/ ۴۰) والحدیث الابدال راجع مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۲۔۶۳ من علی موقوفا وعن عبادۃ بن الصامت وانس وابن مسعودؓ مرفوعاً ولا یخلو ای حدیث عن مقال۔

[2] وصدرہ: فتی قدَّ قدَّ السیف متضائل .... وفی اللسان وابدال ابی الطیب متأزف بدل متضائل وفی الاصول ولا رھن بدل رھل وقد وقع فی نسبۃ ھذا البیت تخلیط وارتباک ففی المرزوقی (۱۰۴۶۔۱۰۴۹) والحماسۃ مع التبریزی ۳: ۴۶۔لزینب بنت الطثریۃ فی رثاء اخیہ وکان اخوہ شاعرًا مفلقاً کذافی الحماسۃ للبحتری ۲۷۵ والبیان (۱: ۲۱۶) والاغانی (۷: ۱۴۶) وامالی القالی (۲: ۸۵۔۸۶) لکن فی الحماسۃ نفسہ (۲: ۱۹۳) ذکر ھذا البیت مع ابیات بغیر السلولی (عجز بن عبداللہ) وفی الصناعتین ۳۵۲ بغیر عزو فی روایتہ صدرہ طویل نجاد السیف لا متضامل وفی السمط ۶۰۸ انہ لثور بن الطثریہ فی رثاء اخیہ یزید وقیل لام یزید ترثی ابنھا راجع السمط وفی محاضرات المؤلف (۳: ۲۶۶) وبعضھم نسبہ الی الامیر والریاحی (الاغانی: ۱۲/ ۱۱۶۔۱۱۷)

کے ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ بَدَّنَ کے معنی عمر رسیدہ ہو جانا کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے [1] (رجز)

(۴۲) وَكُنْتُ خِلْتُ الشَّيْبَ وَالتَّبْدِيْنَا میں بڑھاپے اور عمر رسیدہ ہونے کو خیال کرتا تھا، اسی معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا [2] (۲۶) لَا تُبَادِرُوْنِیْ بِالرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ فَإِنِّیْ قَدْ بَدَّنْتُ ۔کہ میں بوڑھا اور سن رسیدہ ہوگیا ہوں اس لیے رکوع وسجود میں مجھ سے سبقت نہ کیا کرو۔اور آیت کریمہ:﴿ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ ﴾ (۱۰:۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو (دریا سے) نکال لیں گے۔میں بَدَنٌ بمعنی جَسَدٌ ہے اور بعض نے اس سے زرہ مراد لی ہے کیونکہ زرہ کو بھی جسم پر ہونے کی وجہ بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ قمیص کے بازو کو یَدٌ اور اس کی اگلی اور پچھلی طرف کو ظہر اور بطن کہہ دیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ ﴾ اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے شعائر خدا مقرر کیا ہے۔(۲۲:۳۶) میں بُدْنٌ بَدَنَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہدی یعنی قربانی کے ہیں جو حرم میں لے جا کر ذبح کی جائے۔

ب د و

بَدَا (ن) الشَّيْءُ بُدُوًّا وَبَدَاءٌ کے معنی نمایاں طور پر ظاہر ہو جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴾ (۳۹:۴۷) اور ان پر خدا کی طرف سے وہ امر ظاہر ہو جائے گا، جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔

﴿ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ﴾ (۳۹:۴۷) اور ان کے اعمال کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جائیں گی۔﴿ فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ﴾ (۲۰:۱۲۱) تو ان پر ان کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں۔

اَلْبَدْوِيَه: حَضَرٌ کی ضد ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَجَآءَ كُمْ مِّنَ الْبَدْوِ ﴾ (۱۲:۱۰۰) آپ کو گاؤں سے یہاں لایا۔میں بَدْوٌ بمعنی بَادِيَة (صحراء) ہے اور ہر وہ مقام جہاں کوئی عمارت وغیرہ نہ ہوں اور تمام چیزیں ظاہر نظر آتی ہوں اسے بَدْوٌ (بَادِيَةٌ) کہا جاتا ہے اور اَلْبَادِیْ کے معنی صحراء نشین کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ سَوَاءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ (۲:۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔﴿ لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ ﴾ (۳۳:۲۰) کہ کاش گنواروں میں جا رہیں۔ [3]

ب ذ ر

اَلتَّبْذِیْرُ: (تفعیل) کے معنی پراگندہ کرنے اور بکھیر

---

[1] قاله حميد الارقط وتمامه: وانهم ممايذهل القرينا۔ وفي اللسان (بدن ء كون) واضداد ابی الطيب ۲۲۸ بغير عزو والبيت فی الاقتضاب ۳۷٤ واصطلاح المنطق ۳۳۰ وغريب ابی عبيد ۵۲/۱ وفيه لكيميت .

[2] الحديث باختلاف الفاظه رواه احمد وابوداؤد وابن ماجة عن معاوية (ه) عن ابی موسی وللبيهقی عن معاوية وابن سعد والبغوی عن ابی سعدة صاحب الجيوش انظر كنز العمال : ج ۷ رقم ۲۷۸، ۲۷۸۳، ۲۸۱۳، ۳۸۱۹ وغريب ابی عبيد ۱ : ۵۲ .

[3] الابداء (افعال ظاهر كرنا (۲٤۔۳۱) (۲۔۳۳) (۲۔۷۱).

دینے کے ہیں، اصل میں "تَبْذِیْرٌ" کے معنی زمین میں بیج ڈالنے کے ہیں اور چونکہ زمین میں بیج ڈالنا ناعاقبت اندیش لوگوں کی نظر میں بظاہر ضائع کرنا ہوتا ہے، اس لیے تَبْذِیْر کا لفظ بطور استعارہ مال ضائع کردینے کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْنِ﴾ (۱۷:۲۷) فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں۔ ﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا﴾ (۱۷:۲۶) اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ۔

ب ر ر

اَلْبَرُّ: یہ بَحْرٌ کی ضد ہے (اور اس کے معنی خشکی کے ہیں) پھر معنی کی وسعت کے اعتبار سے اس سے اَلْبِرُّ کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جس کے معنی وسیع پیمانہ پر نیکی کرنا کے ہیں اس کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، جیسے ﴿اِنَّہٗ ھُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ﴾ (۵۲:۲۸) بے شک وہ احسان کرنے والا مہربان ہے۔ اور کبھی بندہ کی طرف جیسے: بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّہٗ (یعنی بندے نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی) چنانچہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ثواب عطا کرنا ہوتے ہیں۔ اور جب بندہ کی طرف منسوب ہو تو اطاعت اور فرمانبرداری کے اَلْبِرُّ: (نیکی) دو قسم پر ہے اعتقادی اور عملی اور آیت کریمہ: ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ﴾ (۲:۱۷۷) دونوں قسم کی نیکی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسی بنا پر جب آنحضرت ﷺ سے بِرٌّ کی تفسیر دریافت کی گئی تو آن جناب ﷺ نے جواباً یہی آیت تلاوت فرمائی کیونکہ اس آیت میں عقائد و اعمال فرائض و نوافل کی پوری تفصیل پائی جاتی ہے۔ ❶

بِرُّ الْوَالِدَیْنِ کے معنی ہیں ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ اور احسان کرنا اس کی ضد عُقُوْقٌ ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ﴾ (۶۰:۸) جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی...... کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا۔

اور بِرٌّ کے معنی سچائی بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی خیر ہے جس میں وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: بَرَّ فِیْ یَمِیْنِہٖ. اس نے اپنی قسم پوری کر دکھائی اور شاعر کے قول ❷

(۴۳) اَکُوْنُ مَکَانَ الْبِرِّ مِنْہُ

میں بعض نے کہا ہے کہ بِرٌّ بمعنی فؤاد یعنی دل ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی بِرٌّ بمعنی نیکی ہے، یعنی میرا مقام اس کے ہاں بمنزلہ بر کے ہوگا۔

بَرَّ اَبَاہُ فَھُوَ بَارٌّ وَبَرٌّ صیغہ صفت جو کہ صَائِفٌ

---

❶ کذا فی الطبری ۲/۹۴ وفی ابن کثیر ۱:۲۰۷ عن ابی ذر انہ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالایمان؟ فتلاعلیہ لکنہ منقطع لان مجاھداً لم یحداباذر و راجع ایضاً البصائر والتاج (بر).

❷ لخداش بن زھیر کما فی التاج (بر) وفی اللسان غیر منسوب لتکن البیت فی روایۃ التاج: یکون مکان البرمنی ودونہ۔ احعل الی دونہ واوامرہٗ.

وَصَیْفٌ وَطَائِفٌ وَطَیْفٌ کی مثل دونوں طرح آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿ وَبَرًّا بِوَالِدَیْهِ ﴾ (۱۴:۹) اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے۔ ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ ﴾ (۱۹:۳۲) اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا (بنا)۔

بَرَّ فِیْ یَمِیْنِهٖ فَهُوَ بَارٌّ وَاَبْرَرْتُهٗ قسم پوری کرنا۔ بَرَّتْ یَمِیْنِیْ میری قسم پوری ہوگئی۔ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ حج جس میں رفث وفسق اور جدال نہ ہو۔

اَلْبَارُّ کی جمع اَبْرَارٌ وَبَرَرَةٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴾ (۸۲:۱۳) بیشک نیکوکار نعمتوں (کی بہشت) میں ہوں گے۔ ﴿ کَلَّا اِنَّ کِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ ﴾ (۸۳:۱۸) اور یہ بھی سن رکھو کہ نیکوکاروں کے اعمال علّیین میں ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿ کِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴾ (۸۰:۱۶) جو سردار اور نیکوکار ہیں۔

میں خاص کر فرشتوں کو بَرَرَةٌ کہا ہے کیونکہ اَبْرَارٌ (جمع) سے زیادہ بلیغ ہے۔ اس لیے کہ بَرَرَة، بَرٌّ کی جمع ہے اور اَبْرَارٌ بَارٌّ کی تو جیسے عَادِلٌ کی بنسبت عَدْلٌ میں مبالغہ پایا جاتا ہے، اسی طرح بَرٌّ میں بَارٌّ سے زیادہ مبالغہ ہے۔

اَلْبَرِیْرُ: خاص کر پیلو کے درخت کے پھل کو کہتے ہیں، عام محاورہ ہے: فُلَانٌ لَا یَعْرِفُ الْبِرَّ مِنَ الْهِرِّ. (وہ چوہے اور بلی میں تمیز نہیں کرسکتا) بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ حکایت کی صورت کے طور پر بولے جاتے ہیں ❶ مگر اس محاورہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خیر خواہ اور بدخواہ میں امتیاز نہیں کرسکتا۔

اَلْبَرْبَرَةُ: بڑبڑ کرنا، یہ بھی حکایت صورت کے قبیل سے ہے۔

ب ر ء

اَلْبُرْءُ وَالْبَرَاءُ وَالتَّبَرِّیْ کے اصل معنی کسی مکروہ امر سے نجات حاصل کرنا کے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے۔ بَرَءْتُ مِنَ الْمَرَضِ میں تندرست ہوا۔ بَرِءْتُ مِنْ فُلَانٍ وَتَبَرَّءْتُ میں فلاں سے بیزار ہوں۔ اَبْرَرْتُهٗ مِنْ کَذَا وَبَرَّءْتُهٗ میں نے اس کو تہمت یا مرض سے بری کردیا۔ رَجُلٌ بَرِیْءٌ پاک اور بے گناہ آدمی۔ بُرَآءُ بَرِیْئُوْنَ: قرآن پاک میں ہے: ﴿ بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (۹:۱) اور اس کے رسول کی طرف سے بیزاری کا اعلان ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ (۹:۳) کہ خدا مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دست بردار) ہے۔ ﴿ اَنْتُمْ بَرِیْئُوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۱۰:۴۱) تم میرے عملوں کے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے عملوں کا جواب دہ نہیں ہوں۔ ﴿ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (۶۰:۴) کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو، بے تعلق ہیں۔ ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴾ (۴۳:۲۶) اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ ﴿ فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ﴾ (۳۳:۶۹) تو خدا نے

❶ کما ورد فی التاج وعن ابن الاعرابی البرسوق الغنم والهردعاؤها قاله القتبی راجع ایضاً کتاب الحیوان (۶: ۴۷۸) والمثل فی اللسان (بر) وادب الکاتب ۳۸ وکتب الامثال.

ان کو بے عیب ثابت کیا۔

﴿ اِذْ تَبَرَّءَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا ﴾ (۲:۱۶۶) اس دن (کفر کے) پیشوا اپنے پیروؤں سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

اَلْبَارِیُٔ: (پیدا کرنے والا) یہ اسماءِ حسنٰی سے ہے۔جیسے فرمایا:﴿ اَلْبَارِیُٔ الْمُصَوِّرُ ﴾ (۵۹:۲۴) ایجاد واختراع کرنے والا صورتیں بنانے والا۔

﴿ فَتُوْبُوْا اِلٰی بَارِئِکُمْ ﴾ (۲:۵۴) تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو۔

اَلْبَرِیَّۃُ کے معنی مخلوق کے ہیں،بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہموز ہے،لیکن ہمزہ کو ترک (یا ادغام) کردیا گیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ بَرَیْتَ الْقَوْسَ سے مشتق ہے اور مخلوق کو بَرِیَّۃٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ البَرٰی یعنی مٹی سے پیدا کی گئی ہے۔جیسا کہ آیت:﴿ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ (۳۵:۱۱) سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:﴿ اُولٰٓئِکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ﴾ (۹۸:۷) یہ لوگ سب مخلوق سے بہتر ہیں۔

ب ر ج

اَلْبُرُوْجُ یہ بُرْجٌ کی جمع ہے،جس کے معنی قصر کے ہیں اسی مناسبت سے ستاروں کے مخصوص منازل کو بروج کہا گیا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴾ (۸۵:۱) آسمان کی قسم جس میں برج ہیں۔﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا ﴾ (۲۵:۶۱) جس نے آسمان میں برج بنائے۔

اور آیت کریمہ:﴿ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ﴾ (۴:۷۸) خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو۔ میں بروج سے مضبوط قلعے اور محلات بھی مراد ہوسکتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ستاروں کی برجیں مراد ہوں اس صورت میں بروج کے ساتھ فقط مُشَیَّدَۃ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا۔

جیسا کہ زہیر نے کہا ہے [1] (طویل)

(۴۴) وَمَنْ هَابَ اَسْبَابَ الْمَنَایَا یَنَلْنَهٗ
وَلَوْ نَالَ اَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمِ

جو شخص اسباب موت سے ڈرتا ہے تو وہ لامحالہ اس کو پالیں گے۔اگرچہ سیڑھی لگا کر آسمان کے اسباب پر کیوں نہ چلا جائے۔

اگر زمین کی برجیں مراد ہوں تو یہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہوگا جسے دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔[2] (بسیط)

(۴۵) وَلَوْ کُنْتُ فِیْ غِمْدَانَ یَحْرُسُ بَابَهٗ
اَرَاجِیْلُ اُحْبُوْشٍ وَاَسْوَدُ اٰلِفُ

(۴۶) اِذًا لَاَتَتْنِیْ حَیْثُ کُنْتُ مَنِیَّتِیْ
یَحُثُّ بِهَا هَادٍ لِاَثْرِیَ قَائِفُ

اور اگر غمدان کے قلعہ میں چلا جاؤں جس کے دروازہ پر

---

[1] انظر دیوانہ ۳۰ وشرح العقائد العشر ۱۲۰ وابن الانباری ۲۸۳ وفی روایتہ اختلاف واللسان (سبب) والمشکل للقتبی ۷۲۔ ۳۵۷ والبحر(۵:۲۶۶/۱:۴۵۶/۳:۲۹۹) والطبری (۸:۷۵) والعمدۃ ۱:۳۳۳ والجعدۃ ۱۱۰۔

[2] من قول ثعلبة بن عمرو العبدی وهما من کلمة مفضلیه (رقم : ۷۴) فی ۱۶ بیتاً وراجع الحماسة للبحتری : ۹۷ والنقائض ۵۶٤ وفی الاغانی (۱۱ـ٤۱ـ۱۷ـ۱۲۹) هما بشیئ من الاختلاف فی الروایة منسوبتان لابی الطحان القینی ولعله تمثل بها وباختلاف طفیف فی دیوان اوس بن حجر (۱ : ۷٤) راجع شرح شواهد علی النفس معجم البکری (یمان).

حبشی پہرہ دے رہے ہوں تو پھر بھی موت میرے پاس پہنچ جائے، جیسے ایک قائف ہدی خواں میرے نقش قدم پر چلا جارہا ہوگا۔ ثَوْبٌ مُبَرَّجٌ: اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر برجوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں پھر اس میں معنی حسن کا اعتبار کرکے تَبَرَّجَتِ الْمَرْءَۃُ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی عورت نے مزین کپڑے کی طرح آرائش کا اظہار کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ تَبَرَّجَتِ الْمَرْءَۃ کے معنی ہیں عورت اپنے قصر سے ظاہر ہوئی جیسا کہ ان دونوں آیتوں: ﴿ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی ﴾ (۳۳:۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح (پہلے) جاہلیت کے زمانہ میں اظہار تجمل کرکے اپنے محلات سے نکلا کرتی تھیں، اسی طرح اب مت نکلو زینت نہ دکھاؤ۔ ﴿ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ ﴾ (۲۴:۶۰) بشرطیکہ اپنی زینت کی چیزیں ظاہر نہ کریں۔ سے معلوم ہوتا ہے اور پھر حسن وسعت میں تشبیہ دے کر وسعت چشم اور حسن نظر کے لیے اَلْبُرْج کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ب ر ح

اَلْبَرَاحُ: اس وسیع جگہ کو کہتے ہیں جہاں عمارت درخت وغیرہ کچھ نہ ہو۔ لہٰذا کبھی اس میں معنی ظہور کا اعتبار لیتے ہیں، جیسے فَعَلَ کَذَا بَرَاحًا یعنی اس نے کھلے بندوں یہ کام کیا۔ بَرِحَ الْخَفَاءُ راز فاش ہوگیا، گویا وہ کھلے میدان میں ہے، اسی سے بُرَاحُ الدَّارِ ہے، جس کے معنی گھر کے کھلے صحن کے ہیں۔

بَرِحَ: کھلے میدان میں چلا جانا۔ اسی سے اَلْبَارِحُ ہے، جس کے معنی سخت ہوا کے ہیں۔

اَلْبَارِحُ مِنَ الظِّبَاءِ وَالطَّیْرِ: خاص کر اس ہرن یا پرندکو کہتے ہیں جو شکاری کے سامنے سے ایسے رخ پر گزرے کہ اس کا نشانہ ممکن نہ ہو، ایسے شکار کو منحوس سمجھا جاتا ہے، اس کی جمع بَوَارِحُ آتی ہے اس کے بالمقابل سَانِحٌ اس شکار کو کہتے ہیں جو ایسے رخ سے آئے کہ اس کا شکار کرنا آسان ہو ایسے شکار کو میمون (مبارک) خیال کیا جاتا ہے۔

اَلْبَارِحَةُ: شب گزشتہ بَرِحَ کھلی جگہ جم کر ٹھہرے رہنا اسی سے فرمانِ الٰہی لَا اَبْرَحُ ہے، یہ لَا اَزَالُ کی طرح معنی مثبت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ بَرِحَ اور زَالَ میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں اور " لَا " بھی نفی کے لیے ہوتا ہے اور نفی پر نفی آنے سے اثبات حاصل ہو جاتا ہے، اسی بنا پر فرمایا: ﴿ لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰکِفِیْنَ ﴾ کہ ہم تو اس (کی پوجا) پر قائم رہیں گے (۲۰:۹۱) ﴿ لَا اَبْرَحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ ﴾ (۱۸:۶۰) کہ جب تک میں دو دریاؤں کے سنگھم پر نہ پہنچ جاؤں ہٹنے کا نہیں۔ اور اَلْبَارِحُ سے معنی نحوست کا اعتبار کرکے تَبْرِیْحٌ اور تَبَارِیْحٌ کا لفظ تکلیف اور شدائد کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، جیسے بَرَّحَ بِیَ الْاَمْرُ: مجھے فلاں معاملہ سے تکلیف پہنچی، بَرَّحَ بِیْ فُلَانٌ فِی التَّقَاضِیْ۔ فلاں نے سخت تقاضا کیا۔

ضَرَبَہٗ ضَرْبًا مُبَرِّحًا اسے سخت مارا۔ جَاءَ فُلَانٌ بِالْبَرْحِ۔ فلاں نے حیرت انگیز کام کیا۔ اَبْرَحْتُ رَبًّا میں اپنے رب کی تعظیم بجا لایا۔ اَبْرَحْتُ جَارًا میں نے ہمسائے کی عزت کی۔ بَرْحٰی (ارے) نشانہ خطا ہونے

پر یہ کلمہ ملامت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل لفظ "مَـرْحَـى" ہے جو نشانہ لگنے پر تحسین کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی: واہ، کیا خوب محاورہ ہے ❶
لَقِيْتُ مِنْهُ الْبَرِحِيْنَ وَالْبُرَحَاءَ مجھے اس سے تکالیف پہنچیں بُرَحَاءُ الْحُمّٰى . بخار کی شدت۔

ب ر د

اَلْبَـرْدُ: (ٹھنڈا) اصل میں یہ حَـرٌّ کی ضد ہے۔ محاورہ میں کبھی اس کی ذات کا اعتبار کر کے کہا جاتا ہے۔ بَـرَدَ (ن ك) كذا: اس نے ٹھنڈ حاصل کی۔ بَـرَدَ (ن) اَلْمَاءُ كَذَا: پانی نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ جیسے ❷ (الطّویل)

(۴۷) سَتَبْرُدُ اَكْبَادًا وَتُبْكِيْ بَوَاكِيَا .

تو بہت سے کلیجوں کو ٹھنڈا کیا اور بہت سی رونے والیوں کو رلا ڈالے گی۔

اور بَرَّدَ (تفعیل) بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے، بعض کے نزدیک اَبْـرَدَ (افعال) بھی اس معنی میں آجاتا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

اسی سے اَلْبَـرَّادَةُ ہے جس کے معنی پانی ٹھنڈا کرنے والی چیز کے ہیں اور محاورہ میں بَـرَدَ كَذَا کے معنی کسی چیز کے البَـرد اولے کی طرح جامد اور ثابت ہونا بھی آتے ہیں جس طرح حَـرٌّ کو حرکت لازم ہے، اسی طرح بَرْدٌ کے ساتھ کسی چیز کا ثبات مختص ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: بَرَدَ عَلَيْهِ دَيْنٌ . اس پر قرض ٹھہر گیا۔

شاعر نے کہا ہے ❸ (رجز)

(۴۸) اَلْيَوْمَ بَارِدٌ سُمُوْمُهٗ .

آج باد سموم جامد ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے ❹ (خفیف)

(۴۹) ...... قَدبَرَدَ المو تُ على مصطلاه

کہ اس کے ہاتھ اور چہرہ پر موت طاری ہوگئی۔ لَـمْ يَبْرُدْ بِيَـدِيْ شَيْءٌ میرے ہاتھ میں کوئی چیز قرار نہیں پکڑتی۔ بَرَدَ الْاِنْسَانُ مرجانا، فوت ہوجانا۔ بَرَّدَهٗ اسے قتل کر ڈالا اسی سے سیوف کو بَوَارِدُ کہا جاتا ہے کیونکہ میت بھی فقدان روح سے سرد پڑجاتی ہے اور اسے سکون لاحق ہوتا ہے۔ یا ظاہری طور پر جلد میں خنکی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ﴾ (۴۲:۳۹) خدا لوگوں

---

❶ قال المرصفى : البرحين مثلث الباء مع فتح الراء و كسر الحاء استعملوه كاوضيق وقد اماتموا واحده لما اراد وا وصف الدواهى بالكثرة ذيل الكامل ٦٩٥ وانظر للكلمته ايضاً تهذيب الالفاظ ٤٣ ومجالس ثعلب : ٥٢٠-٥٢١ وفى الفائق : هو فى الاصل جمع برح جمع السلامة للمبالغة مثل بلغ وبلغين يجوز فى اعرابه ان يجرى على النون وان يجرى على ماقبلها (٦٥١١) .

❷ قاله مالك بن ريب المازنى فى رثاء نفسه وكان فى جند سعيد بن عثمان بطريق فارس وصدره : وعطل قلوصى فى الركاب فانها........ والبيت فى البحر ٦ : ٣١٩ من قصيدة جمهرية فى ٥٢ بيتاً ٢٦٩- ٢٧٢ وذيل الامالى : ١٣٧-١٣٨ وفيه وغيّر بدل وعطل وتمامها فى نواد اليزيدى والاختيارين رقم : ١٠٠ وفى المعجم للمرزبانى ٢٩١ مثله لجعفر بن علبة الحارثى يرثى نفسه لما هموابقتله باختلاف ظفيف وقود قلوصى بينهن فانها بمتحضك مسروراً وتبكى بوكيا۔ واىام العرب ٥٨ وفيه وقوّد بدل عطل .

❸ قاله الراجز وتمامه : من عجزاليوم فلاالومه والشطر فى الجمهرة ١ : ٢٤٠ والتبريزى ١ : ١٩٥ وفى اللسان (برد) من جزع بدل من عجز كمافى السمط ٢٥٤ والفائق (١ : ٤٧).

❹ قاله ابوزيد الطائى فى رثاء الحلاج يصف الموت وتكملته البيت بارزٌ ناجزاه قد بـردالموت على مصطلاه اى بردوالبيت من قصيدة جمهرية ٢٦٩-٢٧٢ فى ٥٨ بيتا والبيت فى اللسان (برد) والمعانى ٨٥٩- ٢٠٥ والاختيارين ١٢٦ وجمهرة الاشعار ٢٧٢ وامالى ليزيدى.

کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کرلیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روحیں) سوتے میں (قبض کرلیتا ہے) اور آیت کریمہ: ﴿لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا﴾ (۷۸:۲۴) میں بھی بَـرْد: بمعنی نیند ہے یعنی وہاں کسی قسم کی راحت اور زندگی کی خوشگواری نصیب نہیں ہوگی اور اس اعتبار سے کہ گرمی میں سردی سے راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے، خوشگوار زندگی کے لیے عَیْشٌ بَارِدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اَلْاَبْرَدَان: صبح وشام۔ کیونکہ یہ دونوں وقت ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اَلْبَرْدُ کے معنی ''اولے'' کے ہیں اور بَـرَد السَّحَابُ کے معنی ہیں بادل نے ژالہ باری کی۔ سَحَابٌ اَبْرَدُ وَبَرِدٌ اور اولے برسانے والے بادل۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْ بَرَدٍ﴾ (۲۴:۴۳) اور آسمان کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

اَلْبَرْدِیُّ نرکل کی قسم کا ایک پودا۔ یہ بَرْد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ بھی پانی میں پیدا ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔ ❶ اَصْلُ کُلِّ دَاءٍ: اَلْبَرْدَةُ کہ بدہضمی ام الامراض ہے، بدہضمی کو بَـرْدَةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس برودت طبعی کی وجہ سے عارض ہوتی ہے اس سے قوت ہضم ناقابل ہوجاتی ہے۔

اَلْبَـرُوْدُ: ٹھنڈ پہنچانے والی چیز کو کہتے ہیں اور کبھی ٹھنڈی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں کیونکہ فَـعُـوْلٌ کبھی بمعنی فاعل ہوتا ہے اور کبھی بمعنی مفعول آتا ہے۔ جیسے: مَاءٌ بَرُوْدٌ (ٹھنڈا پانی) ثَـغْرٌ بَرُوْدٌ (خنک دانت) جیسا کہ آنکھ کو ٹھنڈک پہنچانے والے سرمہ کو بَـرُوْدٌ کہا جاتا ہے ❷ بَـرَدْتُ الْحَدِیْدَ میں نے لوہے کی ریتی سے رگڑا۔ یہ بَرَدْتُهٗ بمعنی قَتَلْتُهٗ سے مشتق ہے اور لوہ وچون کو بُرَادَةٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْمِبْرَدُ: (آلہ) ریتی جس سے لوہے کو ریتے ہیں۔ اَلْبُرْد یہ اَلْبَـرِیْد کی جمع ہے اور محکمہ مواصلات کی اصطلاح میں بُرُدٌ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی جگہ پر پیغام رسانی کے لیے متعین رہتے ہیں۔ وہ ہرکارے چونکہ سرعت سے پیغام رسانی کا کام کرتے تھے، اس لیے ہر تیز رو کے کے لیے هُـوَ یَبْرِدُ کا محاورہ استعمال ہونے لگا ہے۔ اور پرند کے پروں کو بَـرِیْدَان کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ بھی اسے برید کا کام دیتے ہیں تو یہ بـنـاء الفرع عَلَی الفرع کے قبیل سے ہے، جیسا کہ ''علم الاشتقاق'' میں بیان کیا جاتا ہے۔

ب ر ز

اَلْبَرَازُ: کے معنی فضاء یعنی کھلی جگہ کے ہیں۔ اور بَرَزَ (ن) کے معنی ہیں کھلی جگہ میں چلے جانا اور بُرُوْزٌ (ظہور) کئی طرح پر ہوتا ہے۔ (۱) از خود کسی چیز کا ظاہر ہوجانا، جیسے فرمایا: ﴿وَتَرَی الْاَرْضَ بَارِزَةً﴾ (۱۸:۴۷) اور تم زمین کو صاف میدان دیکھو گے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ زمین پر سے عمارات اور ان کے ساکنین سب ختم ہوجائیں گے، اسی سے مُبَـارَزَةٌ ہے، جس کے معنی صفوف جنگ سے آگے نکل کر مقابلہ کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں

---

❶ رواه الدارقطني في العلل: عن إنس وابن السني وابونعيم في الطب عن علي وعن ابي سعيد وعن الزهري مرسلاً قال في النهاية ۱: ۸٦ واللسان (برد) البردة هي التخمة وثقل الطعام على العمدة وايضاً فارن غريب ابي عبيدة.

❷ وفي اللسان (برد) كان رسول الله صلى الله عليه وسلم بالبرودِ.

ہے: ﴿لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ (۳:۱۵۴) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔
﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ (۲:۲۵۰) اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے بالمقابل میں آئے۔

(۲) دوم بُرُوْزٌ کے معنی فضیلت ظاہر ہونے کے ہیں، جو کسی محمود کام میں سبقت لے جانے سے حاصل ہوتی ہے۔

(۳) کسی مستور چیز کا منکشف ہو کر سامنے آ جانا، جیسے فرمایا: ﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۱۴:۴۸) اور سب لوگ خدائے یگانہ زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔

﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (۱۴:۲۱) اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ﴿يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ﴾ (۴۰:۱۶) جس روز وہ نکل پڑیں گے۔
اور آیت کریمہ: ﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ﴾ (۲۶:۹۱) اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ انھیں دوزخ کے سامنے لایا جائے گا۔ محاورہ ہے: تَبَرَّزَ فُلَانٌ کنایہ از قضائے حاجت اور پاکدامن عورت کو اِمْرَءَةٌ بَرْزَةٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کی رفعت پاک دامنی اور عفت میں مضمر ہوتی ہے نہ یہ کہ بَرْزَةٌ کا لفظ اس معنی کا مقتضی ہے۔

ب ر ز خ

اَلْبَرْزَخُ: کے معنی دو چیزوں کے درمیان حد فاصل اور روک کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دراصل یہ بُرْزة (پردہ) سے معرب ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ﴾ (۵۵:۲۰) دونوں میں ایک آڑ ہے کہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ ❶
اور بَرْزَخٌ اس رکاوٹ کو بھی کہا گیا ہے جو آخرت میں انسان اور اس کے منازل رفیعہ تک پہنچنے کے درمیان حائل ہوگی جسے قرآن پاک نے آیت: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ (۹۰:۱۱) مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔ میں عَقَبَةٌ کہا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ (۲۳:۱۰۰) اور ان کے پیچھے برزخ ہے (جہاں وہ) اس دن تک کہ (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے (رہیں گے) لہٰذا عَقَبَة سے مراد وہ موانع ہیں جو بلند درجات تک پہنچنے سے روک لیتے ہیں جن تک کہ نیک لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں برزخ سے موت اور حشر کے مابین کی مدت مراد ہے۔

ب ر ص

اَلْبَرَصُ: پھلبہری۔ مشہور مرض کا نام ہے ❷ اور چاند کو اس سیاہ دھبہ کی وجہ سے جو اس میں نظر آتا ہے، اَبْرَصُ کہا گیا ہے۔ اور سَامُّ اَبْرَصُ کے معنی چھپکلی کے ہیں کیونکہ اس کی جلد پر بھی بَرَص جیسے دھبے ہوتے ہیں۔
اَلْبَرِيْصُ: وہ ہے جو ابرص کی طرح چمکدار ہو، یہی معنی تقریباً بصیص کے ہیں جو بَصَّ يَبِصُّ بمعنی برق سے

---

❶ وايضاً: وجعل بينهما برزخاً وحجراً محجوراً: ۲۵/۵۳.

❷ وفی القرآن ﴿وابرء الاكمه والابرص﴾ (۳-۴۸) ﴿وتبرئ الاكمه والابرص﴾ ۵-۱۱۰.

مشتق ہے۔

ب ر ق

اَلْبَـرْقِ: کے معنی بادل کی چمک کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿ فِيْهِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ﴾ (۱۹:۲) اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہو اور (بادل) گرج (رہا) ہواور بجلی کوندرہی ہو۔

اس سے فعل بَرَقَ وَاَبْرَقَ دونوں آتے ہیں اور بَرَقَ ہر چمک دار چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے، جیسے: سَيْفٌ بَارِقٌ: چمکدار تلوار۔

بَـرِقَ وَبَـرَقَ کے معنی خوف کی وجہ سے آنکھ خیرہ ہوجانا ہیں۔قرآن میں ہے:

﴿ فَـاِذَا بَـرِقَ الْبَصَـرُ ﴾ (۷۵:۷) جب آنکھیں چندھیا جائیں۔ایک قرأت میں بَرَقَ ہے۔

پھر کبھی بَـــرَقَ سے اختلاف رنگ کے معنی لے کر مختلف الوان کی پتھریلی زمین کو بَـرْقَةٌ کہا جاتا ہے۔اَلْاَبْـرَقُ کے معنی سیاہ سفید پہاڑ کے ہیں اسی لیے آنکھ کو بَـرْقَاءُ کہا جاتا ہے۔

نَـــاقَةٌ بَـــرُوْقٌ ۔اونٹنی جو دم اٹھا کر حمل کو ظاہر کرے۔

اَلْبَرُوْقَةُ: ایک قسم کی گھاس جو ابر کو دیکھ کر ہی سرسبز ہو جاتی ہے،اسی سے مثل مشہور ہے۔اَشْـكَـرُ مِنْ بَـرُوْقَةٍ وہ بروق سے بھی یادہ شکر گزار ہے۔بَرَقَ طَعَامَهٗ بِزَيْتِهٖ ۔ روٹی کو زیتون سے چپڑنا۔اَلْبَارِقَةُ وَالْاَبِيْرَقُ ۔چمکدار تلوار۔اَلْبُرَاقُ بعض کہتے ہیں کہ یہ اس دابۃ کا نام ہے۔ جس پر آنحضرت ﷺ شب معراج کو سوار ہوئے تھے، اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔اَلْاِبْرِيْقُ: لوٹا یا صراحی (ج) اَبَارِيق [1] اور بَرَقَ سے کبھی خوف کے معنی لے کر بَرَقَ فُلَانٌ وَاَبْرَقَ وارعد کے معنی دھمکی دینا بھی آجاتے ہیں۔

ب ر ک

اَلْبَـرك: اصل میں البَـرك کے معنی اونٹ کے سینہ کے ہیں (جس پر وہ جم کر بیٹھ جاتا ہے) گو یہ دوسروں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے سینہ کو بِـــرْكَة کہا جاتا ہے۔

بَـرَكَ البَعِيْرُ کے معنی ہیں: اونٹ اپنے گھٹنے رکھ کر بیٹھ گیا پھر اس سے معنی لزوم کا اعتبار کر کے اِبْتَـــرَكُـوْا فِـى الْحَرْبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے،جس کے معنی میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور جم کر لڑنے کے ہیں۔

بُـرَاكَـاءُ الْحَرْبِ وَبَرُوْكَاءُ هَا: سخت کارزار جہاں بہادر ہی ثابت قدم رہ سکتے ہوں۔

اِبْتَـرَكَـت الدَّابَةُ: چوپائے کا جم کر کھڑا ہو جانا بِـرْكَةٌ: حوض، پانی جمع کرنے کی جگہ۔

اَلْبَرَكَةُ کے معنی کسی شے میں خیر الٰہی ثابت ہونا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۷:۹۶) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے۔

یہاں برکات سے مراد بارش کا پانی ہے اور چونکہ بارش کے پانی میں اس طرح خیر ثابت ہوتی ہے جس طرح کہ حوض میں پانی ٹھہر جاتا ہے اس لیے بارش کو بَرَكَاتٌ سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] وفي الواقعة ٥٦ـ١٨ باكواب واباريق ويتصل بذالك لفظ استبرق (الحرير) راجع الآيات (١٨ـ٣١) (٤٤ـ٥٣) (٥٥ـ٥٤).

اَلْـمُبَـارَكُ: ہروہ چیز جس میں خیر وبرکت پائی جائے اور آیت کریمہ: ﴿ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنَاهُ ﴾ (۵۰:۲۱) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔ میں ذکر کو مبارک کہہ کر ان خیرات الٰہیہ پر تنبیہ کی ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں۔ نیز فرمایا: ﴿ كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ ﴾ (۲۹:۳۸) (یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے مبارک ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَجَعَلَنِيْ مُبَارَكًا ﴾ (۲۱:۱۹) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے مجھے خیر و برکت کا محل بنایا ہے۔

﴿ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ ﴾ (۳:۴۴) کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا۔

﴿ رَبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبَارَكًا ﴾ (۲۹:۲۳) یعنی اے پروردگار! ہمیں اس جگہ پر اتاریو جہاں خیر و برکت پائی جاتی ہو۔ اور آیت: ﴿ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبَارَكًا ﴾ (۹:۵۰) اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا۔ میں بارش کے پانی کو بابرکت قرار دیا ہے چنانچہ اس کی برکت کو دوسرے مقام پر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ (۲۱:۳۹) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا، پھر اس سے کھیتی اگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔ ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنَّاهُ فِي الْاَرْضِ ﴾ (۱۸:۲۳) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی نازل کیا پھر اس کو زمین میں ٹھہرا دیا۔

اور خیر الٰہی چونکہ غیر محسوس طریقہ پر صادر ہوتی ہے اور بیشمار طریقوں پر پائی جاتی ہے، اس لیے ہر اس چیز کو جس میں غیر محسوس طور پر زیادتی محسوس ہو اسے مبارک (بابرکت) کہہ دیتے ہیں۔ اور حدیث میں جو مروی ہے۔ ❶

(۲۷) لا يَنْقُصُ مَالٌ مِّنْ صَدَقَةٍ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا۔ تو اس سے بھی اسی قسم کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ورنہ نقصان حسی کی نفی نہیں ہے، جیسا کہ بعض بدنصیب لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ نقصان نہیں ہوتا تو ترازو سے تول کر دیکھ لو اور آیت کریمہ:

﴿ تَبَارَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا ﴾ (۶۱:۲۵) اور (خدا) برکت والا ہے، جس نے آسمانوں میں برج بنائے، میں ان نعمتوں پر تنبیہ کی ہے جو ان برجوں اور نیّرات کے ذریعہ ہم پر نازل ہوتی ہیں اور آیات کریمہ: ﴿ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ﴾ (۱۴:۲۳) تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے، بڑا بابرکت ہے۔ ﴿ تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ ﴾ (۱:۲۵) وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے۔ ﴿ تَبَارَكَ الَّذِيْ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ ﴾ (۱۰:۲۵) وہ (خدا) بہت بابرکت ہے جو اگر چاہے تو تمہارے لیے اس سے بہتر (چیزیں) بنا دے۔

﴿ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (۶۴:۴۰) پس خدائے پروردگار عالم بہت ہی بابرکت ہے۔ ﴿ تَبَارَكَ

❶ راجع کنزالعمال ٦ : رقم ١٨٨) وفی روایة ـ انقصت الحدیث فی رحم ،م، ت وروضة العقلاء (للبستی ٤٥عن ابی هریرة وراجع لمعناه مشكل الحديث لابن قتيبة : ١٢ .

﴿الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ﴾ (۶۷:۱) وہ (خدا) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے۔

میں تنبیہ کی ہے کہ وہ تمام خیرات جن کو لفظ تبارک کے تحت ذکر کیا ہے، ذاتِ باری تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص ہیں۔

ب ر م

اَلْاِبْرَامُ: کے معنی کسی معاملہ کو محکم اور مضبوط کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿اَمْ اَبْرَمُوْا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ﴾ (۴۳:۷۹) کیا انھوں نے کوئی بات ٹھہرا رکھی ہے تو ہم بھی کچھ ٹھہرانے والے ہیں۔ یہ اصل میں اِبْرَامُ الْحَبْلِ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی رسی کو مضبوط بٹنے کے ہیں، شاعر نے کہا ہے [1] (طویل)

(۵۰) عَلٰی کُلِّ حَالٍ مِّنْ سَحِیْلٍ وَّمُبْرَمٍ یعنی ہر حالت میں (تم قابل ستائش ہو)

اَلْبَرِیْمُ: بمعنی مُبْرَم ہے یعنی مضبوط بٹی ہوئی رسی محاورہ ہے: اَبْرَمْتُهٗ فَبَرِمَ فَهُوَ بَرِیْمٌ۔ اسی بنا پر کنجوس آدمی کو جو جوا نہ کھیلتا ہو بَرَمٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ بخیل کو مغلول الید کہتے ہیں۔اور مُبْرِمُ الْحَبَلِ کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس آدمی کو جو کسی معاملہ میں مصر اور بضد ہو اسے اَلْمُبْرِم کہا جاتا ہے یعنی معنی اَلْبَرَم کے ہیں اور جو آدمی دو دو کھجوریں ملا کر کھاتا ہو اسے بھی بَرَمٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں سختی کے ساتھ کھانا کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور رسی بھی دو رنگ پر ہوتی ہے، اس لیے ہر سیاہ سفید پر مشتمل لشکر اور بکریوں کے ملے جلے ریوڑ کو بَرِیْمٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْبُرْمَةُ اصل میں پتھر کی ہنڈیا کو کہتے ہیں۔ج: بِرَامٌ۔ جیسے حُضْرَة کی جمع حِضَار اور یہ ضُحْکَةٌ وَهُزْءَةٍ کی طرح مفعول کے اوزان سے ہے۔

ب ر ہ

اَلْبُرْهَانُ: کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں اور یہ رُجْحَانٌ وَثُنْیَان کی طرح فُعْلَان کے وزن پر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بَرِهَ یَبْرَهُ کا مصدر ہے جس کے معنی سفید اور چمکنے کے ہیں۔صفت اَبْرَهُ مونث بَرْهَاءَ ج: بُرْهٌ اور نوجوان سپید رنگ حسینہ کو بَرَهْرَهَةٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْبَرْهَةُ: وقت کا کچھ حصہ لیکن بُرْهَان دلیل قاطع کو کہتے ہیں جو تمام دلائل سے زور دار ہو اور ہر حال میں ہمیشہ سچی ہو اس لیے کہ دلیل کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) وہ جو ہمیشہ صدق کی مقتضی ہو۔(۲) وہ جو ہمیشہ کذب کی مقتضی ہو۔(۳) وہ جو اقرب الی الصدق ہو۔(۴) جو کذب کے زیادہ قریب ہو۔(۵) وہ جو اقتضاء صدق و کذب میں مساوی ہو۔قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ (۲:۱۱۱) اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ﴾ (۲۱:۲۴) کہہ دو کہ (اس بات پر) اپنی دلیل پیش کرو، یہ (میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے۔ ﴿قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۴:۱۷۴) تمہارے پاس دلیل (روشن) آچکی ہے۔

---

[1] قاله زهیر فی معلقته واوله : یمیناً لنعم السیدان وجدتما۔راجع للبیت شرح المعلقات لابن الانباری ۲۶۰ والعشر للتبریزی ۱۰۸ والسمط ۱ : ۱۲) واللسان (سهل) وشواهد الکشاف والاشباه النحویة (۴ : ۲۰۵) والمعانی للقتبی ۸۸۰ ومختار الشعرا الجاهلی بشرح السقاء (۱ : ۱۵۳ والجمهرة ۱۰۷ والعقد الثمین ۹۵ وایام العرب ۲۷۳ .

ب ز غ

بَزَغَ الشَّمْسُ کے معنی ہیں سورج کا طلوع ہونا.
جب کہ اس کی روشنی پھیل رہی ہو۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً ﴾ (۶:۷۸) پھر جب سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔
﴿ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا ﴾ (۶:۷۷) پھر جب چاند کو چمکے ہوئے دیکھا۔
تشبیہ کے طور پر بَزَغَ النَّابُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی اونٹ کی نیش نکل آنا کے ہیں۔اصل میں یہ بَزَغَ الْبَيْطَارُ الدَّآبَّةَ سے ماخوذ ہے،جس کے معنی جانور کے نشتر لگا کر خون بہانا کے ہیں۔

ب س س

آیت کریمہ:﴿ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴾(۵:۵۶) میں بُسَّتْ کے معنی پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہوجانا کے ہیں اور یہ بَسَسْتُ الْحِنْطَةَ وَالسَّوِيْقَ بِالْمَاءِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی پانی میں گندم یا جو کے ستو ڈال کر نشاستہ نکالنے کے ہیں اور نشاستہ کو بَسِيْسَة کہا جاتا ہے بعض نے اس کے معنی تیز ہنکانا کیے ہیں اور کہا ہے کہ یہ اِنْبَسَّتِ الْحَيَّةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سانپ کے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے بل کی طرف دوڑنا کے ہیں اور اسی معنی کو دوسری جگہ ﴿ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ ﴾ (۱۸:۴۷) اور﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ (۸۸:۲۷) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔
بَسَسْتُ الْاِبِلَ: اونٹوں کو ہنکاتے وقت ڈانٹنا اَبْسَسْتُ بِهَا عِنْدَ الْحَلْبِ کو جو بغیر چمکارنے کے دودھ نہ دے بَسُوْسٌ کہا جاتا ہے۔حدیث پاک میں ہے [1]
(۲۸) جَاءَ اَهْلُ الْيَمَنِ يَبُسُّوْنَ عِيَالَهُمْ کہ اہل یمن اپنے اہل وعیال کو نرمی سے چلاتے ہوئے آپہنچے ہیں۔

ب س ر

اَلْبَسْرُ: کے معنی کسی چیز کو قبل از وقت جلدی لے لینا کے ہیں جیسے بَسَرَ الرَّجُلُ الْحَاجَةَ (اس نے قبل از وقت اپنی ضرورت کو طلب کیا) بَسَرَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ (مادہ کی خواہش کے بغیر اونٹ نے اس سے جفتی کی) مَاءٌ بُسْرٌ بارش کا تازہ پانی جو زمین پر گرنے سے پہلے ہی لے لیا جائے بُسِرَ الْقَرْحُ پھوڑے کو پکنے سے پہلے پھوڑ دینا اسی سے گدری کھجور کو بُسْرٌ کہا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴾ (۷۴:۲۲) پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔میں بَسَرَ کے معنی قبل از وقت منہ بگاڑنے کے ہیں اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر بَسَرَ کے یہی معنی ہیں تو آیت:﴿ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴾ (۷۵:۲۴) اور بہت سے منہ اس دن اداس ہوں گے۔
میں بَاسِرَة کے کیا معنی ہوں گے کیونکہ وہاں تو قبل از وقت منہ بگاڑنا نہیں ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ ان کی حالت آگ میں داخل ہونے سے قبل ہوگی، اس لیے بَاسِرَة کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ گویا آگ میں پہنچنے سے قبل ان کا منہ بگاڑنا محض تکلف اور قبل از وقت ہوگا، جیسا کہ بعد کی آیت:﴿ وَتَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴾ (۷۵:۲۵) خیال کریں گے کہ ان پر مصیبت واقع ہونے

---

[1] الحديث بتفصيله فى (خ) مدنيه و(ط) راجع لشرح الحديث غريب لابى عبيد (لبس) ۳: ۸۹.

والی ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔

ب س ط

بَسَطَ الشَّیَٔ کے معنی کسی چیز کو پھیلانے اور توسیع کرنے کے ہیں۔ پھر استعمال میں کبھی دونوں معنی ملحوظ ہوتے ہیں اور کبھی ایک معنی متصور ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: بَسَطَ الثَّوْبَ (اس نے کپڑا پھیلایا) اسی سے اَلْبِسَاط ہے جو ہر پھیلائی ہوئی چیز پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا﴾ (۱۹:۷۱) اور خدا ہی نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا۔ اور بساط کے معنی وسیع زمین کے ہیں اور بَسِيطُ الْاَرْضِ کے معنی ہیں کھلی اور کشادہ زمین۔ ایک گروہ کے نزدیک بَسِیط کا لفظ بطور استعارہ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس میں ترکیب وتالیف اور نظم متصور نہ ہو سکے۔ اور بسط کبھی بمقابلہ قبض آتا ہے۔ جیسے ﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ﴾ (۲:۲۴۵) خدا ہی روزی کو تنگ کرتا اور (وہی اسے) کشادہ کرتا ہے۔ اور کبھی بمقابلہ قدر (یعنی تنگ کردینا کے جیسے ﴿وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ﴾ (۴۲:۲۷) اور اگر خدا اپنے بندوں کے لیے رزق میں فراخی کردیتا۔

﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ (۲:۲۴۷) اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن وتوش بھی (بڑا) عطا کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کا بسیطة فی العلم یہ تھا کہ انھوں نے اس سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا اور یہ ان کا بَسْطَةٌ یعنی جود وسخا تھا۔

بَسْطُ الْيَدِ کے معنی ہاتھ پھیلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾ (۱۸:۱۸) ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ اور بَسْطُ الْكَفِّ (ہتھیلی پھیلانا) یہ لفظ کبھی طلب وسوال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے: ﴿كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ﴾ (۱۳:۱۴) اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا دے۔ اور کبھی اَخْذٌ یعنی پکڑنے کے معنی میں آتا ہے، جیسے: ﴿وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ﴾ (۶:۹۳) اور فرشتے (ان کی طرف عذاب کے لیے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔ اور کبھی حملہ کرنے والے اور مارنے کے معنی میں آتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْۗءِ﴾ (۶۰:۲) اور ایذا کے لیے تم پر ہاتھ (بھی) چلائیں اور زبانیں (بھی) اور کبھی اس لیے بخشش کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (۵:۶۴) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

اَلْبَسْطُ: وہ اونٹنی جس کے ساتھ اس کے بچے کو چھوڑ دیا گیا ہو اور یہ بمعنی مَبْسُوْطَةٌ ہے، جیسے نِكْثٌ بمعنی منکوث ونقض بمعنی منقوض آجاتا ہے۔ اَبْسَطَ نَاقَتَهٗ اونٹنی کو اس کے بچے کے ساتھ چھوڑ دیا۔

ب س ق

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ﴾ (۵۰:۱۰) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔ اَلْبَاسِقُ کے معنی ہیں بلندی میں لمبا چلا جانے والا۔ چنانچہ اسی سے

بَسَقَ فُلَانٌ عَلٰی اَصْحَابِہٖ ہے جس کے معنی ہیں اپنے ساتھیوں پر فضیلت میں بازی لے جانا۔

بَسَقَ وَبَصَقَ جس کے معنی تھوکنا ہیں اصل میں بَزَقَ ہے، بَسَقَتِ النَّاقَۃُ: اونٹنی کے تھنوں میں بغیر جفتی نر کے تھوک کی طرح معمولی سا دودھ اتر آیا۔

ب س ل

اَلْبَسْلُ: کے معنی کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور روکنا کے ہیں۔ اکٹھا کرنا کے مفہوم کے پیش نظر استعارۃً ترشروئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ترشرو کو باسل ومبسل الوجہ کہا جاتا ہے۔ اور روکنے کے معنی کے پیش نظر حرام اور گروی چیز کو بَسْلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ﴾ (٦:٧٠) یعنی اس (قرآن پاک) کے ذریعے نصیحت کرتے رہو تاکہ (قیامت کے دن) کوئی نفس اپنے اعمال کے ثواب سے محروم نہ رہ جائے ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔

بسل اور حرام میں فرق یہ ہے کہ حرام عام ہے جو ممنوع عنہ حکمی اور قہری دونوں کو شامل ❶ ہے اور بَسْلٌ کا لفظ صرف جبراً کسی چیز سے محروم کردینے پر بولا جاتا ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ﴾ (٦:٧٠) یعنی یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے سبب ثواب سے محروم کردیے گئے۔ بعض نے آیت کریمہ: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴾ (٧٤:٣٨) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے، کے پیش نظر اس کی تفسیر اِرْتِھَانٌ سے بھی کی ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنے اعمال کے بدلے گرو ہوں گے۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۵۱) وَاِبْسَالِیْ بَنِیْ بِغَیْرِ جُرْمٍ (وافر)

اور میرا اپنے بیٹوں کو ناحق (بنی قشیر کے پاس) گرو کرنا اور دوسرے نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۵۲) فَاِنْ تُقْوِیَا مِنْھُمْ فَاِنَّھُمْ بُسُلٌ .

اگر تم انھیں چھوڑ کر چلے جاؤ تو وہ بہادر ہیں۔

یہاں تُقْوِیَا، اقوی الْمَکَانُ سے ہے، جس کے معنی جگہ خالی ہونے کے ہیں اور بسالۃ بمعنی شجاعت ہے اور بُسُلٌ بَاسِلٌ کی جمع ہے اور بہادر کو باسِلٌ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ترش رو رہتا ہے اور یا اس لیے کہ اس کے ہمسروں پر اس کی جان حرام ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ دشمنوں کو اپنے مال سے محروم کردیتا ہے۔

---

❶ لعوف بن الاحوص الباهلي يتحسر على تسليم انباءه لبنى قشير رهناً فى دم رجل منهم اسمه ابوالصحيفة وتمامه بعوناه ولا بدم مراق وبعونا من بعا يبعوبعواً بمعنى الجناية والجرم والبيت فى نوادر ابى زيد ١٥١ والطبرى ٢٣٣ والقرطبى ٧:١٦ وشواهد الكشاف ٨٣ ومعانى الكبير ١١٤ ومجاز القران ١:١٩٤ رقم ٢٢١ والبحر ٤:١٤٤ تهذيب الالفاظ ٤٣٣ واللسان والتاج والمحكم (بسل بعو) وفيه قال ابن البرى انه لعبدالرحمن بن الاحوص وانظر لترجمة الشاعر العجم للمرزبانى ٢٧٥ والسمط ٢٧٧ والمعانى ١١٤.

❷ قاله زهير بن ابى سلمىٰ وصدره : بلاوبهانا ومتهم والفتهم هكذا الرواية فى ديوانه ٩٥ بشرح الاعلم وبها انشدابوعلى فى المعالية ليكن فى كليهما فانهما بدل فانهم وهكذا الرواية فى نوادر ابى زيد ٣ ورواية ابى سعيد حسب رواية المولف اى فانهم بضمير الجمع لكن فيه فان اوحشت بدل فان تقويا وهى موافقة لرواية ابى الطيب عن قطرب (الاضداد او لابى الطيب ١٣) وصلة البيت تربص فان تقوالمرعة منهم ـ وداراتهاالاتقومنهم اذا نخل فان تقويامنهم فان محجراً ـ وجزع الحسامنهم اذا قلما يخلو...... بَلادٌ...... فان اوحشت...... وهى الرواية صحيحة ان شاء الله والبيت فى الاصل ملفق فاختلطت روايته على الرواية ومعنىٰ البيت على رواية المولف فانهم حرام اى حيث كانوا لايقربهم احد ولايغيرعليهم وعلى الثانية فضمير الثنيه يرجع الى الموضعين اى بعد ذهابهم حرام على زيادتهما والبيت فى المختارات والنوادر٣ والامالى ٢:٨٠ وفى اللالى مع السمط ٩٢٢-٩٣٣.

اَبْسَلْتُ الْمَکَانَ کسی جگہ کی حفاظت کرنا اور اس شخص کو جو اسے چھیننا چاہتا ہے محروم کر دینا۔ اَلْبُسْلَةُ: دم جھاڑ کرنے والے کی اجرت یہ رقیہ پڑھنے والے کے قول اَبْسَلْتُ فُلَانًا سے ماخوذ، جس کے معنی کسی شیطان، سانپ اور زہریلے کیڑوں کی مدافعت پر دلیر کرنے کے ہیں یا کسی کو ان چیزوں پر حرام کر دینے کے ہیں۔ بعض نے بَسَلْتُ الْحَنظَلَ کا محاورہ بھی نقل کیا ہے، جس کے معنی حنظل کو طیب بنانے کے ہیں اگر یہ حکایت صحیح ہو تو اس کے اصل معنی حنظل کی بسالت یعنی شدت یا اس کی تحریم یعنی کڑوا پن دور کرنا ہوں گے جو بمنزلہ حرمت کے ہے۔

بَسَلْ ہاں۔بس ❶

ب ش ر

اَلْبَشَرَةُ کے معنی انسان کے جلد کی اوپر کی سطح اور اَدَمَةٌ کے معنی باطنی سطح کے ہیں۔ عام ادباء کا یہی قول ہے مگر ابوزید ❷ نے اس کے برعکس کہا ہے چنانچہ ابوالعباس وغیرہ نے ان کی تردید کی ہے۔ ❸

بَشَرة کی جمع بَشَرٌ وَاَبْشَارٌ آتی ہے اور اسی سے انسان کو بشر کہا جاتا ہے کہ اس کی جلد بالوں سے صاف ہوتی ہے اس کے برعکس دیگر حیوانات کی کھال پر اون، بال یا پشم ہوتی ہے۔

لفظ بَشَرٌ واحد اور جمع دونوں کے لیے برابر طور پر استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ بَشَرَیْنِ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا ﴾ (۲۳:۴۷) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔

اور قرآن پاک میں جہاں کہیں انسان کی جسمانی بناوٹ اور ظاہری جسم کا لحاظ کیا ہے تو ایسے موقع پر خاص کر اسے بَشَر کہا گیا ہے، جیسے فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا ﴾ (۲۵:۵۴) اور وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا۔

﴿ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ﴾ (۳۸:۷۱) کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔

کفار، انبیاء علیہم السلام کی کسر شان کے لیے ان کو بَشَرٌ کہہ کر پکارتے تھے، جیسے:

﴿ اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴾ (۷۴:۲۵) یہ (خدا) کا کلام نہیں بلکہ بشر کا کلام ہے۔

﴿ أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ ﴾ (۵۴:۲۴) بھلا ہم ایک ہے آدمی کی جو ہم ہی میں سے ہے۔

﴿ مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (۳۶:۱۵) کہ تم (اور کچھ) نہیں مگر ہماری طرح کے آدمی (ہو)

﴿ أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا ﴾ (۲۳:۴۷) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔

﴿ فَقَالُوْا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا ﴾ (۶۴:۶) تو یہ کہتے کہ کیا

---

❶ راجع للبحث عن ماده (ب س م) فی الاستدارك.

❷ ابو زید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری الخزرجی من تلامیذ ابی عمروبن العلاء والمفضل الضبی وکان جده من الصحابة وجمع نجوماً من القرآن علی عهد الرسول صلی الله علیه وسلم شدید العنایة یجمع اللغات واللهجات توفی ۲۱۴ھ وقد قارب المأة انظر المعارف لابن قتیبه ۲۷۰ نزهته الاولیاء ۱۷۳-۱۷۹ تاریخ بغداد للخطیب ۹/۷۷-۸۰ الارشاد ۴-۲۳۸-۲۴۰ ابن فلکان رقم ۲۴۹ مرءة الجنان الیافعی ۲/۱۸۵ تهذیب لابن حجر ۴/۳-۵ والبغیة للسیوطی ۲۵۴ وکتاب النوادر من اشهر تالیفه.

❸ قاله ان اضداد ابی الطیب ۷۳-۷۶ وقال ابومالك من قول ابی زید انظر اللسان (بشر).

آدمی ہمارے ہادی بنتے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک نے:﴿ إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (۱۸:۱۱۰) کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، کہہ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ بلاشبہ بشری تقاضوں میں سب انسان برابر ہیں مگر معارف جلیلہ اور اعمال جمیلہ کے لحاظ سے ان میں تفاوت رتبی پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ان معارف و اعمال کے ساتھ مخصوص فرما کر سرفراز کر دیتا ہے۔ چنانچہ جملہ یُوْحٰی اِلَیَّ میں اس حقیقت پر تنبیہ کی ہے کہ میں تم سے صرف وحی الٰہی کے ساتھ ممتاز ہوں۔

﴿ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ﴾ (۱۹:۲۰) مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ میں خاص کر مس بشر کی نفی کی ہے اور آیت کریمہ:﴿ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴾ (۱۹:۱۷) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا میں تَمَثَّلَ کا فاعل فرشتہ ہے اور اس میں تنبیہ کی ہے کہ فرشتہ خوبصورت انسان کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوا تھا اور آیت کریمہ:﴿ مَا هٰذَا بَشَرًا ﴾ (۱۲:۳۱) یہ آدمی نہیں۔ میں بشریت کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ یوسف علیہ السلام کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ تو اس سے بلند و اشرف معلوم ہوتے ہیں کہ انسانی جوہر سے مرکب ہو۔

بَشَرْتُ الْاَدِیْمَ: میں نے کھال کی ظاہری سطح کو چھیل دیا جیسا کہ اَنَفْتُ وَرَجَلْتُ کا محاورہ ہے اور اسی سے بَشَرَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ ہے جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو چٹ کر جانے کے ہیں۔

اَلْمُبَاشَرَۃُ کے اصل معنی تو ایک کی جلد کو دوسرے کی جلد کے ساتھ ملانا کے ہیں مگر کنایۃً عورت سے مجامعت کرنا کے معنی میں آجاتا ہے، جیسے فرمایا:﴿ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ ﴾ (۲:۱۸۷) اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔﴿ فَالْئٰنَ بَاشِرُوهُنَّ ﴾ (۲:۲۷) اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرلو۔ فُلَانٌ مُؤْدَمٌ مُبْشَرٌ فلاں ظاہر و باطن کے لحاظ سے اچھا ہے۔ اصل میں یہ محاورہ اَبْشَرَہُ اللّٰہُ وَاٰدَمَہٗ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی کھال کے ظاہر و باطن کو اچھا کرے، پھر ہر اس کامل شخص کو جو ظاہری و باطنی خوبیوں کا ملک ہو۔ اسے مُؤْدَمٌ وَمُبْشَرٌ کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی کیے ہیں۔ اس کا اَدْمَۃ (باطن) نرم اور بشرہ (ظاہر) سخت ہے۔ اَبْشَرْتُ الرَّجُلَ وَبَشَّرْتُہٗ وَبَشَرْتُہٗ. خوشخبری پہنچانا۔ خوش کن خبر سنانا جس سے انسان کے چہرہ پر انبساط ظاہر ہو کیونکہ انسان کو جب کوئی اچھی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کے جسم میں (وفور مسرت سے) خون اس طرح دورہ کرنے لگتا ہے جیسے درختوں میں پانی، اس لیے التبشیر کے معنی ہیں اس قسم کی خبر سنانا جسے سن کر چہرہ شدت فرحت سے ٹمٹما اٹھے۔ مگر ان کے معانی میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔ تبشیر میں کثرت کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور بَشَرْتُہٗ (مجرد) عام ہے جو اچھی و بری دونوں قسم کی خبر پر بولا جاتا ہے۔ اور اَبْشَرْتُہٗ اَحْمَدْتُہٗ کی طرح لازم و متعدی آتا ہے، جیسے: بَشَرْتُہٗ فَاَبْشَرَ (یعنی وہ خوش ہوا) اور آیت کریمہ:﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ ﴾ (۳:۵۲) کہ خدا تم کو اپنی طرف سے بشارت دیتا ہے، میں ایک قرأت یَبْشُرُکِ وَیُبْشِرُکِ ہے نیز فرمایا:﴿ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ. قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَن مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ

بِالْحَقِّ ﴾ (۱۵:۵۴،۵۵) مہمانوں نے کہا ڈریئے نہیں ہم آپ کو ایک دانشمند بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں۔ تو وہ کہنے لگے، اب کاہے کی خوشخبری دیتے ہو، انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو سچی خوشخبری دیتے ہیں۔﴿ فَبَشِّــرْ عِبَـادِ ﴾ (۳۹:۱۷) تو میرے بندوں کو بشارت سنادو۔﴿ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ ﴾ (۳۶:۱۱) سو اس کو مغفرت کی بشارت سنادو۔

اِسْتَبْشَرَ کے معنی خوش ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:﴿ وَيَسْتَبْشِـرُوْنَ بِـالَّـذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِـنْ خَلْفِهِمْ ﴾ (۳:۱۷۰) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے (اور شہید ہو کر) ان میں شامل نہیں ہو سکے، ان کی نسبت خوشیاں منارہے ہیں۔﴿ يَسْتَبْشِـرُوْنَ بِـنِـعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ﴾ (۳:۱۷۱) اور خدا کے انعامات اور فضل سے خوش ہو رہے ہیں۔﴿ وَجَــآءَ اَهْـلُ الْـمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِـرُوْنَ ﴾ (۱۵:۶۷) اور اہل شہر (لوط کے پاس) خوش خوش (دوڑے) آئے۔ اور خوش کن خبر کو بشَــارۃ اور بُشْرٰی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:﴿ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ﴾ (۱۰:۶۴) ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

﴿ لَا بُشْـرٰى يَـوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴾ (۲۵:۲۲) اس دن گنہگاروں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔﴿ وَلَـمَّـا جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ﴾ (۲۹:۳۱) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے۔

﴿ يَا بُشْرٰى هٰذَا غُـلَامٌ ﴾ (۱۲:۱۹) زہے قسمت یہ تو (حسین) لڑکا ہے۔

﴿ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ ﴾ (۳:۱۲۶) اور اس مدد کو تو خدا نے تمہارے لیے (ذریعۂ بشارت) بنایا۔

اَلْبَشِيْرُ: خوشخبری دینے والا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَـصِيْـرًا ﴾ (۱۲:۹۶) جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا تو کرتہ یعقوب کے منہ پر ڈال دیا اور وہ بینا ہو گئے۔ اور آیت کریمہ:﴿ وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ ﴾ (۳۰:۴۶) کہ ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ خوش خبری دیتی ہیں ❶ میں مُبَشِّــرَات سے مراد بارش کی خوش خبری دینے والی ہوائیں ہیں۔

اور حدیث: ❷

(۲۹) اِنْـقَـطَعَ الْوَحْىُ وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ (کہ وحی منقطع ہوگئی اور مبشرات باقی رہ گئیں) میں مُبَشِّـرَاتِ سے مومن کی سچی خوابیں مراد ہیں جیسا کہ بعد میں وَهِـىَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ الَّتِىْ يَرَاهَا الْمُؤْمِنُ اَوْ تُرٰى لَهٗ سے اس کی تشریح فرمائی ہے اور آیاتِ کریمہ:

﴿ فَبَشِّـرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (۹:۳۴) ان کو عذاب الیم کی خوشخبری سنادو۔﴿ وَبَشِّرِ الْمُنَافِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ ﴾ (۴:۱۳۸) (اے پیغمبر) منافقوں (یعنی دوزخی لوگوں) کو بشارت دو کہ ان کے لیے ﴿ وَبَشِّـرِ الَّـذِيْـنَ كَفَرُوْا

---

❶ هكذا الاية فى النسخ المطبوعة لكن الصحيح بشراً۔ موضع مبشرات راجع سورة الاعراف (٧-٥٧) ولعل المصنف ارادآية سورة الروم ان يرسل الرياح مبشرات ٣٠-٤٦ فوقع الذلة من المصحح ١٢.

❷ الحديث باختلاف الفاظه فى الترمذى وابن ماجة والحاكم والبيهقى واحمد والبزار والكامل لابن عدى وقد اشبع الكلام على طرق الحديث ابن كثير (٢/٤٢٣-٤٢٤) وابن جرير ١١/١٣٤-برواية ابن مسعود ١٢.

بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ (۳:۹) اور (اے پیغمبر) کافروں کو دکھ دینے والے عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ میں تبشیر کے لفظ سے تنبیہ کی ہے کہ سب سے بہتر خوش کن خبر جو وہ سن سکتے ہیں، وہ عذاب الیم ہے جس میں وہ قیامت کے روز گرفتار ہوں گے۔ اور عذاب کے متعلق بَشِّـرْ کا لفظ بطور تہکم استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ❶ ع (وافر)

(۵۳) تَحِیَّةُ بَیْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِیْعٌ.

(ان کا باہمی سلام دردناک ضرب لگاتا ہے۔)

میں ضرب وجیع کے متعلق تحیۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ❷ اور آیت کریمہ: ﴿قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِیْرَکُمْ اِلَی النَّارِ﴾ (۳۰:۱۴) کہہ دو کہ (چند روز) فائدے اٹھالو آخر کار تم کو دوزخ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ میں لفظ تَمَتَّعُ بھی ایسے ہی مفہوم کے پیش نظر آیا ہے، نیز فرمایا: ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ کَظِیْمٌ﴾ (۱۷:۴۳) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جو انھوں نے خدا کے لیے بیان کی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔

اَبْشَرَ کے معنی ہیں اس نے بشارت کو پایا جیسے اَبْقَلَ وَاَمْحَلَ یعنی اس نے بقل اور محل یعنی خشک سالی کو پایا قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (۳۰:۴۱) اور اس بہشت کی خوشی مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ اَبْشَرَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین سبزہ زار ہوگئی اور خوش نظر آنے لگی۔ اسی سے حضرت ابن مسعود کا قول ہے ❸

(۳۰) مَنْ اَحَبَّ الْقُرْاٰنَ فَلْیَبْشِرْ کہ جسے قرآن سے محبت ہے اسے خوش ہونا چاہیے۔ فَرَّاء کا قول ہے ❹ کہ اگر شین مشدد (یعنی باب تفعیل سے) ہو تو بُشْـرٰی سے ہوگا اور اگر خفیفہ یعنی مجرد سے ہو تو بمعنی سرور ہوگا جیسے محاورہ ہے: بَشَرْتُهٗ فَبَشِرَ مثل جَبَرْتُهٗ فَجُبِرَ سیبویہ نے کہا ہے ❺ کہ بَشَرْتُهٗ کا مطاوع اَبْشَرَ بھی آجاتا ہے۔ مگر ابن قتیبہ کی رائے ہے کہ یہاں یعنی حدیث میں فَلْیَبْشِرْ کا لفظ بَشَرْتُ الْاَدِیْمَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھال کو چھیلنا کے ہیں۔ لہٰذا فَلْیَبْشِرْ کے معنی ہوئے تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو کمزور اور دبلا کرے۔ ❻

---

❶ قاله عمرو بن معدی کرب صاحب ریحانة اخت درید بن الصمة واوله: وخیل قد دلفت لها بخیل والبیت من شواهد الطبری (۱: ۳۹۱) راجع للبیت الخزامة والاصمعیات وشواهد الکشاف ۶۸ والبحر (۶: ۱۶۶/ ۲: ۱۱۸) والکتاب (۱: ۴۲۹، ۳۶۵) ولعمدة (۲: ۲۹۲).

❷ آلایة من باب التهکم لکن الاستشهاد بالبیت فیه خلطه وقع لکثیر من الشراح الذین شرحوا کلام الزمخشری لان البیت فیه صنعة التنویع والتنوییع قد یأتی للتهکم قد حققه ابن فارس فی الصاحبی وانظر ایضاً الطراز للخفاجی ۲۹، ۳۴.

❸ راجع الفائق ۱/ ۵۱ واللسان (بشر والنهایة).

❹ فراء ابو زکریا یحییٰ بن زیاد الفراء نسبة الی بیع الضروة.

❺ ابو بشر عمرو بن عثمان بن قنبر المناطب سیبویه ومعناه بالفارسیة (بوئے سیب) من اشتهر تلامیذ الخلیل ومصنف اول کتاب فی النحو الذی تلقاه من شیخه ومناظرته مع الکسائی فی مسئلة الزنبور (اعلان التوبیخ للسخاوی ۳۴) مشهورة حصل الکسائی بواء الفتح توفی ۱۷۷ او ۱۸۰ ھ راجع النزهة لابن الانباری ۷۹، ۸۱ وطبقات الزبیدی رقم ۲۲ و تاریخ بغداد للخطیب ۱۲/ ۱۹۵۔۱۹۹ والارشاد ۶: ۸۰۔۸۸ وفیات لابن خلکان رقم ۴۷۷ مرءة الجنان ۱: ۳۴۸۔۴۱۵ ابو الوفا ۱: ۵۴ بغیه ۳۶۶۔ ۳۶۷ شذرات لابن العماد ۱: ۲۵۳۔۲۵۵ نفخ الطیب للمقری ۲/ ۴۷۸۔۴۷۹ واصح طبقات الکتاب طبعة بولاق ۳۱۶ مع تقریرات بالهامش وزید من شرح السیرانی وفی مفسر شرح الشواهد للاعلم اشقری

❻ اصله من البشارة بالثواب وتاویل ابن قتیبة زکره الزمخشری بلفظه قیل بغیر عزو.

جیسا کہ مروی ہے:

(۳۱) اِنَّ وَرَاءَ نَا عَقَبَةٌ لَا یَقْطَعُهَا اِلَّا الضُّمَّرُ مِنَ الرِّجَالِ. کہ ہمارے سامنے ایک گھاٹی ہے جسے دبلے آدمی ہی عبور کر سکیں گے اور شاعر کا قول ❶

(۵۴) فَاَعِنْهُمْ وَاَبْشِرْ بِمَا بُشِرُوْا بِهٖ
وَاِذَا هُمْ نَزَلُوْا بِضَنْكٍ فَانْزِلِ

(ان کی مدد کرو اور جو چیز انھیں خوش لگتی ہو اسی پر خوش رہو اور جب وہ کسی تنگ مقام پر نازل ہوں تو تم بھی وہاں اتر پڑو۔ پہلے معنی یعنی فراء کے قول پر محمول ہے۔

تَبَاشِیْرُ الْوَجْهِ وَبِشْرُهٗ چہرے پر خوشی کے آثار۔ خوش روئی۔ تَبَاشِیْرُ الصُّبْحِ: آغاز صبح تَبَاشِیْرُ النَّخْلِ: کھجور کا پہلا پختہ پھل۔ بُشْرٰی وبُشَارَة وہ عطیہ (یا انعام) جو بشارت دینے والے کو دیا جائے۔

ب ص ر

اَلْبَصَرُ: کے معنی آنکھ کے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿كَلَمْحِ الْبَصَرِ﴾ (۵۴:۵۰) آنکھ کے جھپکنے کی طرح۔ ﴿وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ﴾ (۳۳:۱۰) اور جب آنکھیں پھر گئیں۔ نیز قوت بینائی کو بصر کہہ لیتے ہیں اور دل کی بینائی پر بَصَرٌ اور بَصِیْرَةٌ دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (۵۰:۲۲) اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ (۵۳:۱۷) ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ آگے بڑھی۔

بَصَرٌ کی جمع اَبْصَارٌ اور بَصِیْرَةٌ کی جمع بَصَائِر آتی ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ﴾ (۴۶:۲۶) تو نہ ان کے کان ہی ان کے کچھ کام آ سکے اور نہ آنکھیں۔

اور آنکھ سے دیکھنے کے لیے بَصِیْرَة کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ بصر کے لیے اَبْصَرْتُ استعمال ہوتا ہے اور بَصِیْرَة کے لیے اَبْصَرت وبَصَرْتُ بِهٖ دونوں فعل استعمال ہوتے ہیں جب حاسۂ بصر کے ساتھ رویۃ قلبی شامل نہ ہو تو بَصُرْتُ کا لفظ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابصار کے متعلق فرمایا:

﴿لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ﴾ (۱۹:۴۲) آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں۔ ﴿رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا﴾ (۳۲:۱۲) اے ہمارے پروردگار! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا۔ ﴿وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ (۱۰:۴۳) اگرچہ کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔ ﴿وَاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ﴾ (۳۷:۱۷۹) اور دیکھتے رہو یہ بھی عنقریب (نتیجہ) دیکھ لیں گے۔ ﴿بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ﴾ (۲۰:۹۶) میں نے ایسی چیز دیکھی جو اوروں نے نہیں دیکھی۔ ﴿اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾

---

❶ قاله عبدالقيس بن خفاف الرجمي ونسبه صاحب اللسان لابي عطية بن زيد الجاهلي والبيت من كلمة مفضلية رقم ١٦ في ١٨ بيتاً وفي رواية : واليسر بما به اى اسرع الى احابتهم والبيت في اللسان (بشر) وتفسير الطبرى ٣ : ٢٥١) ومعاني القران للفراء والاصمعيات ٨٧ وشواهد المغني (٩٥ : ٢٠٣/٢) وتهذيب اصلاح المنطق مع آخر قبله .

(۱۲:۱۰۸) یعنی میں پوری تحقیق اور معرفت کے بعد تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں (اور یہی حال میرے پیروکار کا ہے) اور آیت کریمہ: ﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ﴾ (۷۵:۱۴) میں عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان پر خود اس کے اعضاء میں سے گواہ اور شاہد موجود ہیں جو قیامت کے دن اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے، جیسے فرمایا:

﴿ یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ ﴾ (۲۴:۲۴) جس دن ان کی زبانیں، ہاتھ...... ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

اور کبھی ضَرِیْر (اندھے) کو بھی بَصِیْر کہہ دیا جاتا ہے اور یہ اطلاق الاسم عَلٰی ضدِّہ کے قبیل سے ہے۔ لیکن اولیٰ یہ ہے کہ اسے تَسْمیة الشی باسم ضده کے باب سے نہ بنایا جائے، بلکہ کہا جائے کہ ضَرِیْر کو بصیر کہنا اس کی بصیرۃ قلبی کے لحاظ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مُبْصِرٌ وَبَاصِرٌ نہیں کہا جاتا۔ پس اگر یہ باسم ضدہ کے قبیل سے ہوتا تو یہ اطلاق بھی جائز ہونا چاہیے تھا اور آیت کریمہ:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ﴾ (۶:۱۰۴) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔ میں اکثر علماء نے اَبْصَارٌ کے معنی آنکھ کیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ظاہری آنکھ کے علاوہ اوہام و افہام کی نفی کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا قول ہے: (۳۲) اَلتَّوْحِیْدُ اَنْ لَّا تَتَوَهَّمَهٗ. کہ (حقیقتاً) توحید تو یہ ہے جو انسان کے واہمہ میں بھی نہ آسکے اور فرمایا کہ جو کچھ انسان ادراک کرتا ہے وہ توحید نہیں ہے۔

اَلْبَاصِرَةُ کے معنی ظاہری آنکھ کے ہیں۔ محاورہ ہے: رَأَیْتُهٗ لَمْحًا بَاصِرًا میں نے اسے عیاں طور پر دیکھا۔ اَلْمُبْصِرَةُ روشن اور واضح دلیل قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ اٰیَاتُنَا مُبْصِرَةً ﴾ (۲۷:۱۳) جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں پہنچیں۔ ﴿ وَجَعَلْنَا اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً ﴾ (۱۷:۱۲) یعنی ہم نے دن کی نشانی کو نظروں کو روشنی دینے والی بنایا۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً ﴾ (۱۷:۱۹) اور ہم نے ثمود کی اونٹنی (نبوت صالح) کی کھلی نشانی دی، میں مُبْصِرَةً اسی معنی پر محمول ہے بعض نے کہا ہے کہ یہاں مُبْصِرَةً کے معنی ہیں کہ ایسی نشانی جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ جیسا کہ رَجُلٌ مُخْبِثٌ وَمُضْعِفٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اہل اور قریبی رشتہ دار خبیث اور ضعیف ہوں اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی بَصَائِرَ لِلنَّاسِ ﴾ (۲۸:۴۳) میں بَصَائِرُ بَصِیرۃ کی جمع ہے جس کے معنی عبرت کے ہیں یعنی ہم نے پہلی قوموں کی ہلاکت کو ان کے لیے تازیانہ عبرت بنادیا اور آیت کریمہ:

﴿ وَاَبْصِرْ فَسَوْفَ یُبْصِرُوْنَ ﴾ (۳۷:۱۷۹) کے معنی یہ ہیں کہ انتظار کرو حتیٰ کہ تم سب اپنی آنکھوں سے نتائج ملاحظہ کرلو اور آیت کریمہ: ﴿ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ﴾ (۲۹:۳۸) حالانکہ وہ دیکھنے والے تھے، میں مُسْتَبْصِرِیْنَ کے معنی طالب بصیرت کے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ

بطورِ استعارہ اِسْتِبْصَار (استفعال) بمعنی اِبْصَار (افعال) ہو جیسا کہ اِسْتِجَابَةٌ بمعنی اِجَابَة کے آ جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً﴾ (۵۰:۷) اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں میں تَبْصِرَة کے معنی ہیں دکھانے اور سمجھانے کو اور یہ (تفعلة کے وزن پر) باب تفعیل کا مصدر ہے، جیسے قَدَّمْتُهٗ تَقْدِيْمًا وَتَقْدِمَةً وَذَكَّرْتُهٗ تَذْكِيْرًا وَتَذْكِرَةً اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا يَسْاَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا يُبَصَّرُوْنَهُمْ﴾ (۷۰:۱۰،۱۱) اور کوئی دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا (حالانکہ) ایک دوسرے کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے، میں يُبَصَّرُوْنَهُمْ کے معنی یہ ہیں کہ انھیں ان کے احوال و آثار سے خوب طرح واقف کر دیا جائے گا۔

بَصَّرَ الْجَرْوُ پلے نے آنکھیں کھولیں۔

اَلْبَصْرَةُ: ملائم چمکدار پتھر گویا وہ بینا ہے اور یا اسے بَصْرَةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دور سے چمکتا ہوا نظر آ جاتا ہے اور اسے بَصِر بھی کہا جاتا ہے۔ اَلْبَصِيْرَةُ (ایضاً) خون کا دھبہ جو دور سے چمکتا ہوائی دکھائی دے، چمکدار، ڈھال، کپڑے یا مشکیزے کے دو ٹکروں کے درمیان کا شگاف جس سے آر پار نظر آتا ہو۔ اسی سے بَصَرْتُ الثَّوْبَ وَالْاَدِيْمَ کا محاورہ ہے، جس کے معنی کپڑے یا چمڑے کا درمیانی شگاف سلائی کرنا کے ہیں۔

ب ص ل

اَلْبَصْلُ: پیاز قرآن پاک میں ہے۔﴿وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا﴾ (۲:۶۱) اور مسور اور پیاز۔ اور تشبیہ کے طور پر لوہے کے خود کو بھی بَصَلٌ کہا جاتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] ع (وسل)

(۵۵) وَتَرْكَ كَالْبَصَلِ

اور پیاز جیسی خود۔

ب ض ع

اَلْبِضَاعَةُ: مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لیے الگ کر لیا گیا ہو۔ اَبْضَعَ وَابْتَضَعَ بِضَاعَةً. سرمایہ یا پونجی جمع کرنا۔ الگ کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا﴾ (۱۲:۶۵) یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کر دی گئی ہے۔ ﴿وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ﴾ (۱۲:۸۸) اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لائے ہیں۔

اصل میں بِضَاعَةٍ بَضْعٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں گوشت کا بڑا ٹکڑا۔ بَضَعْتُهٗ وَبَضَّعْتُهٗ گوشت کے

---

[1] وتکملتہٗ : فحمة ذافرا(ترقی بالعریٰ ـقردمانیا.......... والبیت من قصیدة لبیدفی رثاء اخیه مطلعها : ان تقوی ربنا خیرنقل وباذن اللـه ریثی وعـجل (مفید القافیه) فی دیوانه ۱۰۱ـ۱۱۷ والبیت فی وصف کتیبته سهکه من الحدید علیها وردع محکمة فحمة ای کتیبة عـظیـمة (ذفراء اوفراء) ای مننة الریح من الحدید والقرومانی معرب (کروماند) ای عمل وبقی (راجع معجم استنجاس ۱۰۲۲ وابن الانباری (۴۱۵ـ۴۱۶) ای دروع غـلیـظة والتـرک بیـض الحدید والرتومعناه الشدید یقول انشاء الله ان هذه الکتیبة ملبوسة فی دروع طویلة شـدت اطـرافها بالعریٰ وسطها لئلا تنتشر و تشتمر عن لا بسهاوعلی رؤسهم بیض الحدیدمثل البصل وقبله :فمتی ینفع صراح صادق یحلبوها ذات جرس ورحل والبیت فی اللسان والصحاح (ترك رتو قردم ،ذفر) واللسان وحده (بصل) وتهذیب الالفاظ ۴۹۴ والمتوشح ۸۷ والاقتـضـاب ۲۱۵ـ۴۱۹ والـصـناعتین (۱۹۶،۸، ۱۰۷) رواه من روی التشبیه والاصلاح ۳۳۷ـ والمقاییس (۱:۲۵۳ـ۳۴۵/۴:۲۹۵) والـمـعـانـی ۸۷۴، ۲۹،۱،۳۹ـ۱ واضداد لابن السکیت ۱۹۶ واضدداد لابن الانبای ۸۹ وابی الطیب ۲۷۹ ونوادر ابی مسهل ۲۸۸ والمعلقات لابن الانباری (۴۱۵(وکان عمرؓ یاسر بروایة هذاه القصیدة .

بڑے بڑے ٹکڑے بنانا۔اِبْتَضَعَ وَبَتَضَّعَ اس کا مطاوع آتا ہے، جیسے قَطَعْتُہٗ وَقَطَّعْتُہٗ فَانْقَطَعَ وَتَقَطَّعَ

اَلْمِبْضَعُ: (آلہ) نشتر جیسے مِقْطَعٌ کنایہ کے طور بُضْعٌ کے معنی عورت کی شرمگاہ بھی آجاتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے۔مَلَکْتَ بُضْعَھَا کیا تم نے اس عورت سے نکاح کرلیا ہے۔بَاضَعَھَا بِضَاعًا عورت سے مجامعت کرنا۔ فُلَانٌ حسن الْبَضعَ وَالْبَضِیْعِ وَالْبَضْعَۃِ وَالْبَضَاعَۃِ.

فلاں خوب موٹا تازہ ہے۔اَلْبَضِیْعُ: ٹاپو۔وہ جزیرہ جو خشکی سے بہت دور ہو۔فُلَانٌ بَضْعَۃٌ مِّنِیْ: فلاں میرے جسم کا ٹکڑا ہے یعنی نہایت قریبی رشتے دار ہے۔

اَلْبَاضِعَۃُ: زخم جو گوشت کو کاٹ ڈالے۔

اَلْبِضْعُ: (بکسر الباء) عدد جو دس سے الگ/کیے گئے ہیں یہ لفظ تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے۔بعض کہتے ہیں کہ پانچ سے اوپر اور دس سے کم پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے [1]

﴿ بِضْعَ سِنِیْنَ ﴾ (۴۲:۱۲) چند سال۔

ب ط ر

اَلْبَطَرُ: وہ دہشت جو خوشحالی کے غلط استعمال، حق نعمت میں کوتاہی اور نعمت کے غلط طور پر صرف کرنے سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ ﴾ (۸:۴۷) جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے۔

﴿ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَھَا ﴾ (۲۸:۵۸) اپنی معیشت میں اترا رہے تھے۔یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِیْشَتُہٗ ہے فعل کی نسبت اس سے قطع کرکے بطور تمیز اسے منصوب کردیا گیا ہے۔اور قریبًا طَرِبٌ بمعنی بَطَرٌ آتا ہے، مگر طَرَبٌ اس خفت کو کہتے ہیں جو فرط مسرت کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی طَرَبٌ بمعنی غم بھی آجاتا ہے۔اَلْبَیْطَرَۃُ: حیوانات کا علاج کرنا، ان کی چیر پھاڑ کرنا۔

ب ط ش

اَلْبَطْشُ: کے معنی کوئی چیز زبردستی لے لینا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ﴾ (۲۶:۱۳۰) اور جب (کسی کو) پکڑتے تو ظالمانہ پکڑتے ہو۔

﴿ یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَۃَ الْکُبْرٰی [2] ﴾ (۴۴:۱۶) جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔

﴿ وَلَقَدْ اَنْذَرَھُمْ بَطْشَتَنَا ﴾ (۵۴:۳۶) اور لوطؑ نے ان کو ہماری گرفت سے ڈرایا۔

﴿ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ ﴾ (۸۵:۱۲) بیشک تمہارے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے۔

یَدٌ بَاطِشَۃٌ. سخت گیر ہاتھ۔

ب ط ل

اَلْبَاطِلُ: یہ حق کا بالمقابل ہے اور تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے اسے باطل کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

---

[1] قال علماء اللغة والتفسیر البضع مابین الثلاث الی التسع راجع اللسان (بضع) ورواہ الطبرانی وابن مردویہ عن دینار بن مکرم والترمذی عن ابن عباس مرفوعاً.

[2] ارید بالبطشة ابکری یوم بدر او عذاب یوم القیمة (الطبری ۲۵/۱۱۶-۱۱۸).

﴿ ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ﴾ (۳۱:۳۰) یہ اس لیے کہ خدا کی ذات برحق ہے اور جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ لغو ہیں۔

اور باطل کا لفظ قول وفعل دونوں پہ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ﴾ (۳:۷۱) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔

بَطَلَ: (نَ) بُطُوْلًا وَبُطْلًا وَبُطْلَانًا. کسی چیز کا یونہی ضائع چلا جانا۔

اَبْطَلَهٗ. ضائع کردینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (۷:۱۱۸) اور جو کچھ فرعونی کرتے تھے باطل ہوگیا۔

اور ہر وہ آدمی جو دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لیے کوئی مفید کام نہ کرے اسے بَطَّال وذو بِطَالَةٍ کہا جاتا ہے۔

بَطُلَ (ك) دَمُهٗ: خون کا رائیگاں جانا۔

بَطَلٌ: بہادر جو موت سے نہ ڈرے، ایسے آدمی کے خون کو رائے گاں سمجھ کر یہ لفظ اس پر بولا جاتا ہے، شاعر نے کہا ہے [1] (طویل)

(۵۶) فَقُلْتُ لَهَا لَا تَنْكِحِيْهِ فَاِنَّهٗ
لِاَوَّلُ بَطَلٍ اَنْ يُّلَاقِيْ مَجْمَعًا

(میں نے اس سے کہا کہ اس سے نکاح مت کیجیے کیونکہ وہ لڑائی میں بہادر کے ہاتھ سے مارا جائے گا) تو اس معنی کے لحاظ سے بَطَلٌ بروزن فَعَلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے، یعنی وہ جس کا خون رائیگاں جانے والا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فَعَلٌ بمعنی فاعل ہو کیوں کہ وہ اپنے دشمن کے خون کو رائیگاں کردیتا ہے۔

بَطَلَ (ن) اَلرَّجُلُ بُطُوْلَةً: بہادر ہونا بَطَّال یعنی بیکار یہ بَطَالَةٌ (بیکاری) کی طرف منسوب ہے۔ محاورہ ہے: ذَهَبَ دَمُهٗ بُطْلًا اس کا خون رائیگاں گیا۔ اَلْاِبْطَالُ کے معنی کسی چیز کو خراب اور نابود کرنے کے ہیں، خواہ وہ چیز حق ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ ﴾ (۸:۸) تاکہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کردے۔

کبھی اِبْطَالٌ کا لفظ بے حقیقت بات کہنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴾ (۳۰:۵۸) اور اگر تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کرو تو کافر کہہ دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ (۴۰:۷۸) اور اہل باطل نقصان میں پڑ گئے۔

میں مُبْطِلُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ب ط ن

اَلْبَطْنُ: اصل میں بَطْنٌ کے معنی پیٹ کے ہیں، اس کی جمع بُطُوْنٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾ (۵۳:۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

بَطَنْتُهٗ: میں نے اس کے پیٹ پر مارا۔

---

[1] قاله تابط شراماد حاً نفسه عند ما خطب امرءة فمنعها الناس بانه سيقتل فتبقين ايماً والبيت فى الحماسة ٤٩١ بشرحه المرزوقى ١١ بيتاً وقد احسن الشارح فى اعراب البيت وفى روايته : قالوا بدل فقلت ونصل بدل بطل والبيت فى البحر: ٥/ ٣٢٥.

اَلْبَطْن: ہر چیز میں یہ ظَھْرٌ کی ضد ہے اور ہر چیز کی نیچے کی جہت کو بطن اور اوپر کی جہت کو ظہر کہا جاتا ہے اسی سے بطور تشبیہ کہا جاتا ہے۔ بَطْنُ الْاَمْرِ (کسی معاملہ کا اندرون) بَطْنُ الْوَادِیْ (وادی کا نشیبی حصہ) اور بطن بمعنی قبیلہ بھی آتا ہے اس اعتبار سے کہ تمام عرب کو بمنزلہ ایک شخص کے فرض کیا جائے اور ہر قبیلہ بمنزلہ بطن فخذ اور کاہل (کندھا) وغیرہ اعضاء کے تصور کیا جائے۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے ❶ (ع) (سریع)

(۵۷) اَلنَّاسُ جِسْمٌ وَاِمَامُ الْھُدٰی
رَأْسٌ وَاَنْتَ الْعَیْنُ فِی الرَّاْسِ

کہ لوگ بمنزلہ جسم اور امام ہدی بمنزلہ سر ہے، مگر تم سر میں آنکھ ہو۔

اور ہر پیچیدہ معاملہ کو بطن اور جلی اور عیاں کو ظہر کہا جاتا ہے۔ اسی سے بُطْنَانُ الْقِدْرِ وَظَھْرَانُھَا کا محاورہ ہے۔ یعنی دیگ کی اندرونی اور بیرونی جانب۔

ہر اس چیز کو جس کا خاصہ بصر سے ادراک ہو سکے اسے ظاہر اور جس کا خاصہ بصر سے ادراک نہ ہو سکے اسے باطن کہا جاتا ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ﴾ (۶:۱۲۰) اور ظاہری اور پوشیدہ (ہر طرح کا) گناہ ترک کردو۔

﴿ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ ﴾ (۷:۳۲) ظاہری ہوں یا پوشیدہ۔

اَلْبَطِیْنُ: کلاں شکم، اَلْبَطِنُ: بسیار خور۔

اَلْمِبْطَان: جس کا بسیار خوری سے پیٹ بڑھ گیا ہو۔

اَلْبِطْنَۃُ: بسیار خوری۔ مثل مشہور ہے۔

اَلْبِطْنَۃُ تُذْھِبُ الْفِطْنَۃَ ❷ بسیار خوری ذہانت ختم کردیتی ہے۔

بَطِنَ الرَّجُلُ بَطْنًا: شکم پروری اور بسیار خوری سے اترا جانا۔ بَطُنَ (ك) الرَّجُلُ: بڑے پیٹ والا ہونا۔

مُبَطَّنٌ پچکے ہوئے پیٹ والا۔

بُطِنَ الرَّجُلُ: مرض شکم میں مبتلا ہونا۔ اس سے صیغہ صفت مفعولی مَبْطُوْنٌ (مریض شکم) آتا ہے۔

اَلْبِطَانَۃ: کے معنی کپڑے کا استر یا اس کے اندرونی حصہ کے ہیں اور اس کی ضد ظِھَارَۃٌ ہے۔ ❸ جس کے معنی کپڑے کا اوپر کا حصہ یا ابرہ کے ہیں اور بَطَّنْتُ ثَوْبِیْ بِاٰخَرَ کے معنی ہیں: میں نے ایک کپڑے کو دوسرے کے نیچے لگایا۔

بَطَنَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ کسی شخص کے اندرونی معاملات سے واقف ہونا اور بطور استعارہ اَلْبِطَانَۃ کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو دوسرے کا راز دان ہو، چنانچہ قرآن

---

❶ قاله على بن جبلة الحكوك يمدح حميد بن عبدالحميد الطوسی والبيت فی الكامل ۸۷۵ والعمدة (۱: ۲٦٤) وفيه صنعة التوليد وشرح الدرة للخفاجی ۵۷ والورقة لابن الجراح ۱۰٦ وذيل الامالی ۹٦ آخر والطبقات لابن المعتز ٤۳٤ وفی خاص الخاص للثعالبی قبله: دجلة تسقی يطيح من تسقی من الناس ونسبه المؤلف (فی محاضراته الی المنصور الضمری خلافاً لجميع المراجع الاخری وراجع لترجمة العكوك الضرير الاغانی وطبقات لابن المعتز ۱۷۱-۱۸۵ والشعر والشعراء لابن قتيبة ومسالك الابصار وابن خلكان والفهرست وان شعرهٔ مأته وخمسين ورقة ۱۲.

❷ وفی الامثال للثعالبی تافن بدل تذهب يضرب لمن غير استغناء ه عقله وا فسرهٔ راجع رقم ۵۳٤.

❸ بطانة والجميع بطائن ومن قوله تعالىٰ: ﴿ بطائنها من استبرق ﴾ (۵۵-۵٤) قال الحسن اراد ظواهر ها ولذا عده العلماء من الاضداد راجع اضداد لابی الطيب ٦۷.

پاک میں ہے: ﴿لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ (۱۱۸:۳) کسی غیر (مذہب کے آدمی) کو اپنا رازدان نہ بنانا اور بطانة الثوب سے استعارہ ہے، کیونکہ اسی معنی میں لَبِسْتُ فُلَانًا وَفُلَانٌ شِعَارِیْ وَدِثَارِیْ بھی کہا جاتا ہے ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶

(۳۳) مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَّبِيٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيْفَةٍ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَةٌ تَأْمُرُهٗ بِالْخَيْرِ وَتَحُضُّهٗ عَلَيْهِ وبِطَانَةٌ تَأْمُرُهٗ بِالشَّرِّ وَتَحُثُّهٗ عَلَيْهِ. کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کسی کو خلیفہ بنایا ہے مگر ہمیشہ اس کے دو راز دان رہے ہیں ایک راز دار اسے خیر کا مشورہ اور اس کی ترغیب دیتا رہا ہے اور دوسرا اسے شر کا مشورہ اور اسی پر اکساتا رہا ہے۔

اَلْبِطَانُ: تنگ جس سے جانور کا پالان کسا جاتا ہے۔ وَالجمع اَبْطِنَةٌ وَبُطُنٌ۔ اَلْاَبْطَنَان پیٹ کی دو رگیں۔ اَلْبُطَيْنُ۔ ستارہ جو برج حمل کے لیے بمنزلہ شکم کے ہے وآں سہ ستارۂ خرداست کہ برصورت دیگ پایہا واقع شدہ)

اَلتَّبَطُّنُ: (تفعل) کسی معاملہ کی تہ تک پہنچنا۔

﴿اَلظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (۳:۵۷) صفات الٰہی سے ہیں۔اور اَلْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کی طرح مزدوج یعنی ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اَلظَّاهِرُ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ یہ اس معرفت کی طرف اشارہ ہے جو ہمیں بالبداہت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ انسان جس چیز کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھے اس کی فطرت کا یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ (۸۴:۴۳) اور وہی (ایک) آسمانوں میں معبود ہے اور وہی زمین میں معبود ہے۔ اسی لیے بعض حکماء کا قول ہے کہ معرفت الٰہی کے طالب کی مثال اس شخص کی ہے جو اطراف عالم میں ایسی چیز کی تلاش میں سرگردان پھر رہا ہو۔ جو خود اس کے پاس موجود ہو۔اور اَلْبَاطِنُ سے اس حقیقی معرفت کی طرف اشارہ ہے، جس کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ہے:

(۳۴) يَامَنْ غَايَةُ مَعْرِفَتِهٖ الْقُصُوْرُ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ اسے وہ ذات جس کی معرفت کی انتہا اس کی معرفت سے درماندگی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات (دلائل قدرت) کے لحاظ سے ظاہر ہے اور باعتبار ذات کے باطن ہے۔اور بعض نے کہا کہ الظاھر سے اس کا تمام اشیاء پر محیط ہونا مراد ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ ہمارے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتا۔ اَلْبَاطِنُ ہے۔ چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (۱۰۳:۶) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔

حضرت علیؓ سے ایک مقولہ مروی ہے جس سے ان دونوں لفظوں کی تفسیر پر روشنی پڑتی ہے۔وہ فرماتے ہیں ❷

(۳۵) تَجَلّٰى لِعِبَادِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ رَاَوْهُ وَاَرَاهُمْ نَفْسَهٗ مِنْ غَيْرِ اَنْ تَجَلّٰى لَهُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے

❶ الحديث في رحم ،خ ،ن، عن ابي سيعدو بمعناه (خد ، ت عن ابي هريرة ، ف ،عن ابي ايوب وابي هريرة) راجع كنز العمال ٦/ رقم ٣٥١-٣٥٣،٠٠ ٣٥ وبمعناه زوائد ابن حبان رقم ٢١٠٢ وفي الكنز تحضه بدل تحثه .

❷ هذا ذكر العلامة الما وروي في تفسير الآية تسعة اقوال فتذكر١٢ .

اپنے بندوں پر تجلی فرمائی بدوں اس کے کہ بندے اس کو دیکھ سکیں اور اپنی ذات کو دکھایا بدوں اس کے کہ ان کے سامنے جلوہ افروز ہو، مگر اس قول کو سمجھنے کے لیے فہم روشن اور عقل وافر کی ضرورت ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ﴾ (۳۱:۲۰) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ "ظَاهِرَةً" سے نبوت اور بَاطِنَةً سے عقل مراد ہے اور بعض نے ظَاهِرَة سے محسوس نعمتیں مراد لی ہیں اور بَاطِنَةً سے معقولات یعنی وہ نعمتیں مراد لی ہیں جن کا حس سے ادراک نہیں ہو سکتا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ظَاهِرَةً سے وہ غلبہ مراد ہے، جو دشمنوں پر انسانوں کے ذریعہ حاصل ہوا۔ اور باطنۃ سے وہ غلبہ مراد ہے جو فرشتوں کے ذریعہ حاصل ہوا، لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان تمام اقوال کو شامل ہے۔

ب ط ء

اَلْبُطْؤُ: (ك) کے معنی چلنے میں دیر لگانے اور سستی کرنے کے ہیں اور یہ باب کرم و تفاعل و استفعال اور افعال سے استعمال ہوتا ہے، لیکن بَطُؤَ (ك) کے معنی اس وقت بولتے ہیں جب دیر لگانے کے عادی ہو جائے اور تَبَاطَأَ کے معنی میں بتکلف دیر کرنا اور استفعال میں طلب کے معنی پائے جاتے ہیں۔

اِبْطَاءٌ: (افعال) سست رفتاری کے ساتھ متصف ہونا۔ نیز بَطَّأَهُ وَابْطَأَهُ (متعدی) مؤخر کرنا اور آیت کریمہ: ﴿ وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ﴾ (۴:۷۲) اور تم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو (عمداً) دیر لگاتے ہیں۔

میں لَيُبَطِّئَنَّ کے معنی دوسروں سے دیر لگوانا کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی بہت زیادہ سستی کرنا بھی لکھے ہیں حاصل یہ ہے کہ بعض تم میں سے خود بھی دیر لگاتے ہیں اور دوسروں سے بھی دیر لگواتے ہیں۔

ب ظ ر

ایک قرأت میں ہے:

﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُظُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ ﴾ (۱۶:۷۸) اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کی شرمگاہوں سے باہر نکالا۔

بُظُوْرِ بَظَارَة کی جمع ہے جس کے معنی بکری کے تھنوں کے لٹکے ہوئے گوشت کے ہیں اور عورت کی شرمگاہ کے اوپر ابھرے ہوئے گوشت کو بَظَارَةَ کہا جاتا ہے۔ پھر مجازاً بَضْعٌ کی طرح شرمگاہ پر یہ لفظ بولا جاتا

ب ع ث

اَلْبَعْثُ: (ف) اصل میں بعث کے معنی کسی چیز کو ابھارنے اور کسی طرف بھیجنا کے ہیں اور اِنْبَعَثَ دراصل مطاوع ہے، بَعَثَ کا مگر متعلقات کے لحاظ سے اس کے معنی مختلف ہوتے رہتے ہیں، مثلاً بَعَثْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی اونٹ کو اٹھانے اور آزاد چھوڑ دینے کے ہیں اور مردوں کے متعلق استعمال ہو تو قبروں سے زندہ کرکے محشر طرف چلانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ﴾ (۶:۳۶) اور مردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اٹھائے گا۔

﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ﴾ (۵۸:۶) جس دن خدا ان سب کو جلا اٹھائے گا۔

﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ﴾ (۶۴:۷) جولوگ کافر ہوئے ان کا اعتقاد ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ (۳۱:۲۸) تمہارا پیدا کرنا اور جلا اٹھانا ایک شخص (کے پیدا کرنے اور جلا اٹھانے) کی طرح ہے۔ پس بَعْثٌ دو قسم پر ہے اوّل: بعث بَشَرِیْ یعنی جس کا فاعل انسان ہوتا ہے، جیسے بَعْثُ الْبَعِيْرِ (یعنی اونٹ کو اٹھا کر چلانا) اور بَعْثُ الْاِنْسَانِ فِيْ حَاجَةٍ (کسی کو کسی کام کے لیے بھیجنا)

دوم: بعث الٰہی یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اعیان، اجناس اور انواع کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ قسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس پر اس نے کبھی کسی دوسرے کو قدرت نہیں بخشی۔ دوم: مردوں کو زندہ کرنا۔ اس صفت کے ساتھ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بھی سرفراز فرما دیتا ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہم مثل دوسرے انبیاء کے متعلق مذکور ہے اور آیت کریمہ:

﴿ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ ﴾ (۳۰:۵۶) اور یہ قیامت ہی کا دن ہے۔ بھی اسی قبیل سے ہے یعنی یہ حشر کا دن ہے اور آیت کریمہ: ﴿ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ ﴾ (۵:۳۱) اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کریدنے لگا۔ میں بَعَثَ بمعنی قَيَّضَ ہے۔ یعنی مقرر کر دیا اور رسولوں کے متعلق کہا جائے تو اس کے معنی مبعوث کرنے اور بھیجنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا ﴾ (۱۶:۳۶) اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں؛ ﴿ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا ﴾ (۴۴:۲۳) فرمایا ہے اور آیت: ﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴾ (۱۸:۱۲) پھر ان کو جگا اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ جتنی مدت وہ (غار میں) رہے دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔ میں بَعَثْنَا کے معنی صرف (نیند سے) اٹھانے کے ہیں اور اس میں بھیجنے کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

﴿ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ﴾ (۱۶:۸۹) اور اس دن کو یاد کرو، جس دن ہم ہر امت میں سے خود ان پر گواہ کھڑا کریں گے۔

﴿ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ ﴾ (۶:۶۵) کہہ دو کہ (اس پر بھی) قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے .... عذاب بھیجے۔

﴿ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ﴾ (۲:۲۵۹) تو خدا نے اس کی روح قبض کر لی (اور) سو برس تک (اس کو مردہ رکھا) پھر اس کو جلا اٹھایا۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ ﴾ (۶:۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے، پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے۔ میں نیند کے متعلق توفی اور دن کو اٹھنے کے متعلق بعث کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ نیند بھی ایک

طرح کی موت ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ ﴾ (۹:۴۶) لیکن خدا نے ان کا اٹھنا (اور نکلنا) پسند نہ کیا۔ میں انبعاث کے معنی جانے کے ہیں۔

ب ع ث ر

آیت کریمہ: ﴿ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴾ (۸۲:۴) میں بُعْثِرَتْ کے معنی قبروں کی مٹی کو الٹ پلٹ کرنے اور مردوں کو اٹھانے کے ہیں۔ جن علماء کے نزدیک رباعی اور خماسی دو ثلاثی مادوں سے مل کر بنتے ہیں ان کے خیال میں "بُعْثِرَ" بُعِثَ اور اُثِیْرَ سے مل کر بنا ہے، جیسا کہ تَهَلَّلَ وَبَسْمَلَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اور بِسْمِ اللّٰه سے بنے ہیں۔ اور اس میں کچھ بُعد نہیں ہے کیونکہ اَلْبَعْثَرَۃ میں ان دونوں فعلوں کے معنی موجود ہیں۔

ب ع د

اَلْبُعْد: کے معنی دوری کے ہیں یہ قُرْب کی ضد ہے اور ان کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ ایک ہی جگہ کے اعتبار سے ایک کو قریب اور دوسری کو بعید کہا جاتا ہے۔

محسوسات میں تو ان کا استعمال بکثرت ہوتا رہتا ہے مگر کبھی کبھی معانی کے لیے بھی آجاتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴾ (۴:۱۳۶) وہ راہ ہدایت سے بھٹک کر دور جا پڑے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴾ (۴۱:۴۴) ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

بَعُدَ (ک) فَهُوَ بَعِيْدٌ دور ہونا، جیسے فرمایا: ﴿ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴾ (۱۱:۸۳) اور وہ (بستی ان) ظالموں سے کچھ دور نہیں ہے۔

لیکن بَعِدَ (س) کے معنی مرنا کے ہیں۔ اور عموماً اَلْبَعَدُ ہلاک ہونا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴾ (۱۱:۹۵) جیسے ثمود تباہ ہو گئے۔ اور اَلْبُعْد وَالْبَعَدُ کبھی قرب کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے [1] بسیط

(۵۸) فِی الادنیٰ وَفِی الْبَعَدِ

یعنی ہر قریب و بعید پر اس کے احسانات موجود ہیں اور کبھی یہ دونوں (اَلْبَعْد وَالْبُعْد) ہلاکت کے معنی میں بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ انہی معنی میں فرمایا: ﴿ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (۲۳:۴۱) پس ظالم لوگوں پر لعنت ہے۔

﴿ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ (۲۳:۴۴) پس جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان پر لعنت۔

اور آیت کریمہ:

﴿ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ﴾ (۳۴:۸) بات یہ ہے جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ آفت اور پرلے درجے کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔

---

[1] قاله النابغة يمدح النعمان وتكملته : فتلك تبلغى النعمان ان له فضلا على الناس .... والبيت فى العقد الثمين ۷ وشرح العشر للتبريزى ۲۹۵ والخزانة (۱ : ۵۲۲ طبعة بولاق) والسيوطى ۲۸ وديوانة ۲۹ واللسان والتاج (بعد) فى رواية الصحاح والمحكم (بعد) فى الادنين والبُعد وايضاً مثله بعيد بن الابرص وتكملته : اولاتوك بحميع لاكفاء له ـ قوم هم القوم راجع ديوان ابن الابرص مع شرح جالس طبعة لندن ۱۹۱۳ء).

میں اَلـضَّلَال البعید سے ویسی گمراہی مراد ہے جس کے بعد ہدایت کی طرف لوٹنا نہایت مشکل ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص شاہراہ سے بہت دور چلا جائے جس کے بعد دوبارہ اس کے شاہراہ کی طرف لوٹ کر آنے کی امید نہ ہو اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴾ (۸۹:۱۱) اور لوط علیہ السلام کی قوم (تو) تم سے کچھ دور نہیں ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ تم بھی گمراہی میں ان جیسے ہو، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ ان کی طرح تم پر بھی عذاب آ جائے،
بَعْدُ: یہ قَبْلُ کی ضد ہے، لہٰذا قبل کی بحث میں اس کی جمیع انواع بیان کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ب ع ر

اَلْبَـعِيْـرُ: اونٹ (جنس) لفظ انسان کی طرح مذکر و مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے، اس کی جمع اَبْـعِرَةٌ وَاَبَاعِرُ وَبُـعْـرَان آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَلِـمَـنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ ﴾ (۷۲:۱۲) اور جو شخص اس کو لے آئے اس کے لیے بارشتر (انعام) اَلْبَعْرُ۔ اونٹ کی مینگنی۔ اَلْـمُبْعَرُ (جائے بعر) اَلْـمِبْعَارُ: بہت زیادہ مینگنی کرنے والا اونٹ۔

ب ع ض

بَعْضُ الشَّيْءِ: ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اس لیے کل کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے، جیسے: بَعْضُهٗ وَكُلُّهٗ اس کی جمع اَبْعَاضٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے:
﴿ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾ (۳۶:۲) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ ﴿ وَكَـذٰلِكَ نُـوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَـعْـضًا ﴾ (۱۲۹:۶) اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے، ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ﴿ وَيَـلْـعَـنُ بَـعْـضُكُمْ بَعْضًا ﴾ (۲۵:۲۹) اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے اور بَعَّضْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو حصوں میں تقسیم کر دینا ہیں، جیسے جَـزَّءْ تُهٗ اور آیت کریمہ: ﴿ وَلِاُبَيِّـنَ لَـكُمْ بَعْضَ الَّـذِيْ تَـخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ﴾ (۶۳:۴۳) نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو تم کو سمجھا دوں۔
میں ابوعبیدہ نے کہا ہے ❶ کہ یہاں بعض بمعنی کل ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❷ (کامل)

(۵۹) اَوْ يَرْتَبِطْ بَعْضَ النُّفُوْسِ حِمَامُهَا

---

❶ راجع مجازیا: ج ۱ص ۹٤ فانه قال: وبعض یکون شیأً من الشیئی ویکون کل الشئی قال لبید.......... لکن تحت آیة ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم (۳۔۵۰) ثم قال تحت الآیة (٤۳۔٦۳) البحوثة: البعض ههنا الکل قال لبید.......... لان الموت لایعتلق بعض النفوس دون بعض وابو عبیدة معمر بن المثنی ۱۱۰۔ وتاریخ وفاتیه (٤/٩٦) مختلف فیه الاغلب ۲۱۰۔۲۱۳ کان من معاصری تلامذة الخلیل لم یتأثر به تاثر مباشراً کان ابواه من یهود فارس وکان مولی لیتم قریش واخذ فی شبیبة عن ابی عمرو بن العلاء ویونس بن حبیب، اتصل بالخوارج (مقالات الاسلامیین الاشعری، ۱: ۲۰۱والبیان للجاحظ ۱: ۳۲ کان ضعیفاً فی علم النحو (مقدمة تهذیب الازهری) صنف کتابافی مثالب العرب نقماً منهم عیب اعیب علیه نسبته العجم فکرهه الناس حتی لم یحضر جنازته احد من البصریین (راجع ضحی الاسلام لاحمدامین: ۲/٤۰۳ مع المراجع وبر کلن اومجازه، فی تفسیر القران مشهور وعلیه تعلیقات للاصمعی (الارشاد لیاقوت ۷/۱٦۷۔۱٦۸)

❷ قاله لبید بن ربیعة وصدره تراك امكنه ازالم ارضها .... وفی روایة "او یعتلق" بدل اویرتبط والبیت فی معلقته فی شرح العشر ۱۵۵ والقرطبی ٤: ۹٦ وشواهد الکشاف ۲۹۷ والمحکم واللسان (بعض) ومجالس ثعلب ۳٦۸,۵۰ والبحر ۲: ٤٦۸ /۱۷: ٤٦۱ وذیل الجامع الکبیر ۲۷ والزوزنی ۹ والشطر ایضاً فی الصاحبی ۲۵۱.

یا نفوس کو ان کی موت پالے۔

لیکن یہ ابوعبیدہ کی کوتاہ بینی ہے [1] کیونکہ مسائل شریعت کی چار قسمیں ہیں۔ایک قسم وہ ہے جس کا بیان کرنا خلاف مصلحت ہوتا ہے ایسی چیز کا بیان کرنا صاحب شریعت کے لیے جائز نہیں ہوتا۔ جیسے قیامت یا موت کا وقت کہ اس کے بتادینے میں مفسدہ لازم آتا ہے۔

(۲) اور بعض چیزیں محض عقلی ہوتی ہیں جن کا ادراک نبی کے علاوہ دوسرے لوگ بھی کرسکتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت جو کہ آسمان و زمین کی خلق میں پائی جاتی ہے تو ایسی چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر فرض نہیں ہوتا، اسی لیے قرآن پاک نے ان چیزوں کی معرفت عقول کے سپرد کی ہے، جیسا کہ آیت: ﴿ قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۱۰:۱۰۱) (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ اور آیت: ﴿ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ﴾ (۳۰:۸) کیا انھوں نے غور نہیں کیا۔

(۳) بعض چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر واجب ہوتا ہے۔

(۴) بعض احکام فروعی ہوتے ہیں جو اصول شریعت سے مستنبط ہوسکتے ہیں، جس کا بیان کرنا نبی پر واجب نہیں تو صاحب شریعت کو اختیار ہے کہ حسب موقع اسے بیان فرمادے یا سکوت اختیار کرے زیر بحث آیت میں اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ بَعْض سے کل مختلف فیہا اشیا مراد نہیں ہیں۔

پھر جس شعر سے استدلال کیا گیا ہے اس میں بھی شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہے [2] یعنی مگر یہ کہ مجھے موت پالے۔ لیکن شاعر نے تصریح کی بجائے تعریض سے کام لیا ہے، کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ موت سے دور بھاگتا ہے۔

خلیل نے کہا ہے کہ رَأَيْتُ غِرْبَانًا تَبَتَّعِضُ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو پکڑ رہے ہیں اَلْبَعُوْض: (مچھر) یہ بھی لفظ بعض سے بنا ہے۔ مچھر چونکہ دوسرے حیوانات کی بہ نسبت صغیر الجسم ہوتا ہے اس لیے اسے بَعُوْضٌ کہا جاتا ہے۔

ب ع ل

اَلْبَعْلُ: کے معنی شوہر کے ہیں، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ﴾ (۱۱:۷۲) اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں۔

اس کی جمع بُعُوْلَةٌ آتی ہے، جیسے فَحلٌ وَفَحُوْلَةٌ فرمایا: ﴿ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ ﴾ (۲:۲۲۸) اور ان کے خاوند...... ان کو زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔

اور اس تصور کے پیش نظر کہ مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ اسے عورت کا منتظم مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ (۴:۳۴) میں مذکور ہے بنابریں ہر وہ چیز جو دوسری اشیاء پر فوقیت رکھتی

---

[1] ورد علیه ایضاً الطبری ۲۵/ ۵۰) والمبرد والنحاس فی معانیه (۴۲آ) وابن سیده فی المحکم (بعض) والطبری اکثر مایرد علی ابی عبیدة تفسیره ولنا مقالة (ابو عبیدة والطبری فی تفسیر الغریب (الامام البخاری) وقد اشبعنا الکلام فی الرد علی من یلزم البخاری انه قلدابا عبیدة فی تفسیر الغریب .

[2] راجع المبرد والقرطبی ۴ : ۹۶ شایع اباعبیدة وجوزان یکون بعض بمعنیٰ کل .

ہو، اسے بَعْلٌ کہنے لگے ہیں چنانچہ اہل عرب اپنے بت کو جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا چاہتے تھے، بَعْلٌ کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے بلند اور برتر سمجھتے تھے، جیسے فرمایا: ﴿ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴾ (۳۷:۱۲۵) کیا تم بعل کو پکارتے اور (پوجتے) ہو اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو۔ محاورہ ہے: اَتَانَا بَعْلُ هٰذِهِ الدَّابَّةِ اس دابہ کا مالک ہمارے پاس آیا۔

اَلْبَعْلُ: (ایضاً) (۱) بلند زمین (۲) فحل نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا سردار ❶ (۳) ہر وہ بڑا درخت جو اپنی جڑوں کے ذریعہ از خود زمین سے پانی جذب کر لیتا ہو اور اسے آبیاری کی ضرورت نہ ہو۔ حدیث پاک میں ہے ❷ فِيْمَا سُقِيَ بَعْلًا الْعُشْرُ یعنی بَعْل میں عشر (۱/۱۰) ہے اور جب عالی کی اپنی مستولی علیہ ماتحت پر گرفت بھاری اور گراں ہو تو کہا جاتا ہے۔ اَصْبَحَ فُلَانٌ بَعْلًا عَلٰى اَهْلِهٖ یعنی فلاں اپنے علو کی وجہ اپنے اہل پر ثقیل ہے۔ ❸ اور لفظ اَلْبَعْلُ سے مُبَاعَلَةٌ وبِعَالٌ (مصدر مفاعلہ) بنایا گیا ہے جس کے معنی (کنایۃً) مجامعت کے ہوتے ہیں ❹ محاورہ ہے: بَعَلَ الرَّجُلُ (ن) بُعُوْلَةً وَاسْتَبْعَلَ فَهُوَ بَعْلٌ وَمُسْتَبْعِلٌ: شوہر ہونا۔

اِسْتَبْعَلَ النَّخْلُ: کھجور کا تناور ہو جانا۔ اور بَعْلَ کھجور سے ایک جگہ پر قیام اور ثبات کے معنی کا تصور کر کے ہر اس آدمی کو جو اپنے معاملہ میں حیرت کی بنا پر ایک جگہ پر کھڑا رہے اس کے متعلق بَعِلَ فُلَانٌ بِاَمْرِهٖ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے معاملہ میں حیران ہے، جیسا کہ اس شخص کے متعلق جو اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہے۔ مَا هُوَ اِلَّا شَجَرٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

ب غ ت

اَلْبَغْتُ: (ف) کے معنی کسی چیز کا یکبارگی ایسی جگہ سے ظاہر ہو جانا کے ہیں، جہاں سے اس کے ظہور کا گمان تک بھی نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ﴾ (۷:۱۸۷) اور ناگہاں تم پر آ جائے گی۔ ﴿ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ ﴾ (۱۲:۱۰۷) یا ان پر ناگہاں قیامت آ جائے۔

بَغَتَ كَذَا فَهُوَ بَاغِتٌ. کسی چیز کا ناگہاں آ پہنچنا، شاعر نے کہا ہے ❺

(۶۰) اِذَا بَغَتَتْ اَشْيَاءُ قَدْ كَانَ مِثْلُهَا
قَدِيْمًا فَلَا تَعْتَدَّهَا بَغْتَاتٍ

ب غ ض

اَلْبُغْضُ: کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل کا تنفر اور

---

❶ وفی اللسان فحل النحل وکذافی اضداد ابی الطیب ۶۸۔۷۳۔
❷ نصب بعلاً علی الحال کذافی الفائق ۱: ۵۵ والحدیث رواہ ابن جریر عن معاذ ولفظہ: اوسقی بعلاً العشر (کنزالعمال: ۶/۲۳۶۸) وفی روایة النسائی وابی داؤد وابن ماجة من حدیث ابن عمرؓ اوکان بعلاً العشر وفی بعض الروایات عثریا بدل بعلاً راجع غریب ابی عبید ۱: ۶۶۔
❸ کذافی الفائق ۱: ۵۵۔
❹ ومنه الحدیث ایام التشریق ایام اکل وشرب وبعال ای ملاعبة الرجل اهله سیأتی تخریجه (عود)۔
❺ قاله ابن الرومی یحث علی تصور المصائب والاستعداد لها والبیت فی محاضرات المؤلف فی خمسة ابیات وقبله ولاعوفصت فی البلوی وقد رأت عظات من الایام بعد عظات راجع دیوانی ابن الرومی وفی المطبوع (فی جمیع الطبعات) بعث بالعین المهملة والثاء المثلثه مصحف۔

بیزار ہونا کے ہیں۔ یہ حُبّ کی ضد ہے۔ جس کے معنی کسی پسندیدہ چیز کی طرف دل کا منجذب ہونا کے ہیں، کہا جاتا ہے۔ بَغِضَ (س) اَلشَّیْءُ بُغْضًا وَبَغَضْتُہٗ (ن) بَغْضَاءَ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَاءَ ﴾ (۶۴:۵) اور ہم نے ان کے باہم عداوت اور بغض قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔

﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَاءَ ﴾ (۹۱:۵) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوادے۔ اور حدیث پاک میں ہے [1] (۳۷) اِنَّ اللّٰـہَ یَبْغَضُ الْفَاحِشَ وَالْمُتَفَحِّشَ. بیشک اللہ تعالیٰ بدکلام گالی دینے والے سے نفرت کرتا ہے۔ یہاں بغض کا لفظ بول کر اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ باری تعالیٰ اس سے اپنا فیضان اور توفیق احسان روک لیتا ہے۔ [2]

ب غ ل

اَلْبَغْلُ: (خچر) وہ جانور جو گدھے اور گھوڑی کے باہم ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ (والجمع بغالۃ) قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ ﴾ (۸:۱۶) اور اسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے۔

تَبَغَّلَ الْبَعِیْرُ: اونٹ کا خچر کی طرح تیز چلنا۔ کبھی خچر کی شرارت اور خباثت کے پیش نظر کمینے شخص کو بھی بَغْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

ب غ ی

اَلْبَغْیُ: کے معنی کسی چیز کی طلب میں درمیانہ روی کی حد سے تجاوز کی خواہش کرنا کے ہیں۔ خواہ تجاوز کر سکے یا نہ۔ اور بَغْیٌ کا استعمال کمیت اور کیفیت یعنی قدر و وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے، کہا جاتا ہے۔

بَغَیْتُ الشَّیْءَ وَابْتَغَیْتُہٗ کسی چیز کے حاصل کرنے میں جائز حد سے تجاوز کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَۃَ مِنْ قَبْلُ ﴾ (۴۸:۹) یہ پہلے بھی طالب فساد رہے ہیں۔

﴿ یَبْغُوْنَکُمُ الْفِتْنَۃَ ﴾ (۴۷:۹) تم میں فساد ڈلوانے کی غرض سے۔

بَغْیٌ: دو قسم پر ہے۔ محمود یعنی حد عدل و انصاف سے تجاوز کر کے مرتبہ احسان حاصل کرنا اور فرض سے تجاوز کر کے تطوع بجالانا۔

۲۔ مذموم۔ یعنی حق سے تجاوز کر کے باطل یا شبہات میں واقع ہونا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا [3] (۳۸) اَلْحَقُّ بَیِّنٌ وَالْبَاطِلُ بَیِّنٌ وَبَیْنَ ذٰالِكَ اُمُوْرٌ مُشْتَبِھَاتٌ وَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمٰی اَوْ شَكَ اَنْ

---

[1] الحدیث فی(حم الساعة) بدون الواو وفی روایة لایحب (حل عن جابر و(عن عائشة) وفی (مسلم عن عائشة) لایحب الفحش والتفحش وفی (حم عن الساعة ایضاً) کل فاحش متفحش (ای بدون اللام والواو والاحادیث فی ذم الفحش کثیرة راجع الکنز للمتقی (۳: ۳۳۹ـ ۳۴۰).

[2] سقط لفظ المنع من المطبوع.

[3] والمعروف فی الروایة الحلال بین والحرام بین راجع (ق ٤، طس ـعن عمرـق ه ك عن سلمان) الفتح الکبیر۲ : ۸۲ـ۸۳).

یَقَعَ فِیْہِ . حق بھی واضح ہے اور باطل بھی واضح ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں اور جو جانور چراگاہ کے اردگرد کھائے گا، کچھ بعید نہیں کہ چراگاہ میں چرنے لگے اور چونکہ بغی محمود بھی ہوتی ہے اور مذموم بھی، اس لیے آیت کریمہ: ﴿ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ﴾ (۴۲:۴۲) الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ میں عقوبۃ کو بغی بغیر الحق کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اَبْغَیْتُكَ کسی شے کی طلب میں مدد کرنا۔ بَغِیَ الْجُرْحُ زخم کا بہت زیادہ بگڑ جانا۔ بَغَتِ الْمَرْءَۃُ: عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور زنا کو بَغْیٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی حدود عفت سے تجاوز کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ﴾ (۲۴:۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو...... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔ بَغَتِ السَّمَآءُ: بادل کا ضرورت سے زیادہ برسنا اور بَغْیٌ کے معنی تکبر کرنا بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اپنی حد سے تجاوز کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور یہ ہر امر کے متعلق استعمال ہوتا ہے (گو لغت میں بَغْیٌ کا لفظ محمود اور مذموم دونوں قسم کے تجاوز پر بولا جاتا ہے مگر قرآن پاک میں اکثر جگہ معنی مذموم کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسے فرمایا:

﴿ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ﴾ (۱۰:۲۳) تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔

﴿ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ ﴾ (۱۰:۲۳) تمہاری شرارت کا وبال تمہاری ہی جانوں پر ہوگا۔

﴿ ثُمَّ بُغِیَ عَلَیْہِ لَیَنْصُرَنَّہُ اللّٰہُ ﴾ (۲۲:۶۰) پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے تو خدا اس کی مدد کرے گا۔

﴿ اِنَّ قَارُوْنَ کَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی فَبَغٰی عَلَیْھِمْ ﴾ (۲۸:۷۶) قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا اور ان پر تعدی کرتا تھا۔

﴿ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ ﴾ (۴۹:۹) اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔

اور آیت کریمہ: ﴿ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ﴾ (۲:۱۷۳) (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا ہی لے جتنی اسے ضرورت ہے اور حد متعین سے آگے نہ بڑھے۔ امام حسنؒ [1] نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ نہ تو محض لذت کے لیے کھائے اور نہ ہی سد رمق (یعنی ضرورت سے) تجاوز کرے۔

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے [2] کہ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کے

---

[1] راجع بقول الحسن (الطبری ۲ : ۸۳) والحسن بن یسار البصری ابو سعید التابعی احدالعلماء الفقہاء فی البصرۃ وعلیہ کتاب لاحسان عباس (الحسن البصری) ولقاءہ لعلیؓ والباسہ الخرقۃ غیر محقق انکرہ الشاہ ولی اللہ والامیر القنوجی واثبتہ صاحب "فخر الحسن" وفی الجملہ ان الباس الخرقۃ بدعۃ حقیقتہ فی حواشی مآثر الکرام (فارسی، بلجرامی) فراجعہ (راجع التراجم الحسن تھذیب ومیزان الاعتدال ۱ : ۲۵۴ وامالی المرتضیٰ ۱ : ۱۰۶.

[2] وقول مجاھد ھذا ذکر الشوکانی فی الفتح ۱ : ۱۷۰ وفی اکل المضطر المیتۃ ومال الغیر اختلاف بین الفقہاء ولم ینصب من انکر اکل مال الغیر مطلقاً راجع القرطبی وایضاً ابن کثیر وامام مجاھد فھو ابن جبر المکی (۲۱ـ۱۰۴) تلمیذ ابن عباس فی التفسیر قال الذھبی شیخ القراء والمفسرین وھو وان من الثقات لکن لایعتمد علی تفسیرہ لانہ ینقل عن اھل الکتاب وراجع طبقات الفقہاء ۵ والارشاد ۶ : ۲۴۲ ومیزان الاعتدال ۳/۹ والمجمع بین رجال الصحیحین ۵۱۰ راجع الاعلام.

یہ معنی ہیں بشرطیکہ وہ نہ تو امام وقت سے باغی ہو اور نہ ہی معصیت کا ارتکاب کر کے راہِ حق سے تجاوز کرنے والا ہو۔

اَلْاِبْتِغَاءُ: یہ خاص کر کوشش کے ساتھ کسی چیز کو طلب کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اگر اچھی چیز کی طلب ہو تو یہ کوشش بھی محمود ہوگی (ورنہ مذموم) چنانچہ فرمایا:

﴿ اِبْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ (۲۸:۱۷) اپنے پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں۔

﴿ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴾ (۲۰:۹۳) بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے۔ اور یَنْبَغِی (انفعال) بَغٰی کا مطاوع آتا ہے اور یَنْبَغِی اَنْ یَّکُوْنَ کَذَا کا محاورہ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ (۱) اس شے کے متعلق جو کسی فعل کے لیے مسخر ہو جیسے اَلنَّارُ یَنْبَغِی اَنْ تُحْرِقَ الثَّوْبَ یعنی کپڑے کو جلا ڈالنا آگ کا خاصہ ہے۔ (۲) یہ کہ وہ اس کا اہل ہے یعنی اس کے لیے ایسا کرنا مناسب اور زیبا ہے، جیسے: فُلَانٌ یَنْبَغِی اَنْ یُّعْطِیَ لِکَرَمِهٖ کہ فلاں کے لیے اپنے کرم کی وجہ سے بخشش کرنا زیبا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ ﴾ (۶۹:۳۶) اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھلائی اور نہ وہ ان کو شایاں ہے۔

پہلے معنی پر محمول ہے، یعنی نہ تو آنحضرت ﷺ فطرتاً شاعر ہیں۔ اور نہ ہی سہولت کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ آپؐ کی زبان پر شعر جاری نہ ہوتا تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ﴾ (۳۵:۳۸) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔ (دوسرے معنی پر محمول ہے۔ یعنی میرے بعد وہ سلطنت کسی کو میسر نہ ہو)

ب ق ر

اَلْبَقَرُ: (اسم جنس) کے معنی (بیل یا) گائے کے ہیں اس کا واحد بَقَرَةٌ ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ﴾ (۲:۷۰) کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ ﴿ بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ﴾ (۲:۶۸) کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔ ﴿ بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا ﴾ (۲:۶۹) کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہے۔

بَقَرَة کی جمع بَاقِرٌ وَبَقِیْر (بروزن حکیم) آتی ہے جیسے حَامِلُ وَحَمِیْلٌ اور بعض کے نزدیک اس کی جمع بَیْقُوْرٌ بھی آتی ہے اور بیل کو ثَوْرٌ کہا جاتا ہے، جیسے: نَاقَةٌ وَجَمَلٌ وَرَجُلٌ وَامْرَءَةٌ اور بیل چونکہ کھیتی باڑی کے کام آتا ہے اس لیے زمین کو پھاڑنے اور جوتنے کے لیے بَقَرَ الْاَرْضَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس لیے ہر وسیع شگاف کے متعلق یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے، چنانچہ محاورہ ہے۔ بَقَرْتُ بَطْنَهٗ میں نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باقر کا لقب دیا گیا ہے [1] کیونکہ ان کو دقائق و رموز علمیہ کے متعلق گہری تحقیق حاصل تھی۔ بَیْقَرَ الرَّجُلُ فِی الْمَالِ وَفِی

---

[1] محمد بن علی زین العابدین الحسین ابو جعفر الباقر(۵۷ھ ۱۴٤) خامس الأمة الاثنی عشر عند الامامیة وله فی العلم وتفسیر القرآن آراء راجع کتاب اخبار ابی جعفر الباقر للجلودی (۳۰۲ھ) وتذکرة الحفاظ ۱: ۱۱۷ والذریعة ۱: ۳۱۵ ونزهة الجلیس ۲: ۲۳ ومنهاج السنة ۲: ۱۱٤ و۱۲۳ والیعقوبی ۳: ۶۰.

غَیْرِہٖ کسی کا بہت زیادہ مال دار ہونا۔ بَیْقَرَ فِیْ سَفَرِہٖ ملک در ملک پھرنا۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (طویل)

(۶۱) الاھل اتاھا والحوادث جُمَّةٌ
بان امرئ القیس یھلك بیقرا

کیا اسے یہ خبر ملی ہے کہ زمانہ کی بوقلمونیوں کی وجہ سے امرئ القیس بن تملک دربدر دھکے کھا رہا ہے۔ بَقَرَ الصِّبْیَانُ بچوں کا بُقَّیْرٰی کھیل کھیلنا یہ بچوں کے ایک کھیل کا نام ہے جس میں ریت کا ڈھیر لگا کر اس کے آس پاس گڑھے کھود دیتے ہیں (فارسی میں اسے کوہا موئی کہا جاتا ہے)

اَلْبَیْقَرَان: ایک قسم کے گھاس کا نام ہے کیونکہ وہ جب اگتا ہے تو زمین میں شگاف ڈال دیتا ہے اور اس کی جڑیں زمین میں دور تک چلی جاتی ہیں۔

ب ق ل

قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا﴾ (۶۱:۲) کہ ترکاری اور ککڑی

بَقْل: ان سبزیوں کو کہتے ہیں، جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں۔

اس سے فعل مشتق کر کے بَقَلَ بمعنی نَبَتَ استعمال ہوتا ہے اور تشبیہ کے طور پر بَقَلَ وَجْهُ الصَّبِی کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں لڑکے کے چہرہ پر سبزہ نمودار ہونے لگا۔ ابن السکیت ❷ کے نزدیک بَقَلَ نَابُ الْبَعِیْرِ کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کیلے نکل آئے اَبْقَلَ الْمَکَانُ فَھُوَ مُبْقِلٌ: جگہ کا سرسبز ہونا۔ بَقَلْتُ الْبَقْلَ: میں نے سبزی کاٹی اَلْمَبْقَلَةُ: (ظرف) سبزیوں کی جگہ۔

ب ق ی

اَلْبَقَاءُ: کے معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں یہ فناء کی ضد ہے۔ یہ باب بَقِیَ (س) یَبْقٰی بَقَاءً ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کا باب بَقٰی (ض) بَقْیًا بھی آتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے ❸

(۳۹) بَقَیْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ یعنی ہم آنحضرت ﷺ کے منتظر رہے اور کافی عرصہ تک آپ کی نگہبانی میں بیٹھے رہے۔ اَلْبَاقِیْ: (صفت) دو قسم پر ہے ایک الْبَاقِیْ بِنَفْسِہٖ جو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہے اور اس پر کبھی فنا طاری نہ ہو اس معنی میں یہ حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ دوم: الباقی بغیرہٖ اس میں سب ماسوی اللہ داخل ہیں کہ ان پر فناء اور تغیر کا طاری ہونا صحیح ہے۔ اَلْبَاقِیْ بِاللّٰہِ بھی دو

---

❶ قاله امرء القيس راجع الطبري ۷: ۱۳۹ ومعاني القران للفراء والستة ۱۳۰ وديوانة ٤٦ (ضعة سندوبي والسمط ٤٠ والاقتضاب ٤٧٧ وتهذيب الالفاظ ٤٨٧ والبحر ۳: ۳۵۷ والبلدان (اسم وبيقر) وشرح السبع لابن الانباري ٤٥٩ واللسان (بيقر) والاغاني ۸: ٦١ والمعاني ۸۷۵ وفي بعض الروايات بن تملك بدل يهلك وهي بنت عمرين زبيدام امرئ القيس.

❷ هو ابو يوسف يعقوب بن اسحاق بن السكيت تأدب على الكسائي والفراء واخذ عن الاصمعي وابي عبيدة البصري واشتهر بمصنفاته وكان مؤدباً لابن المعتز توفي في رجب ٢٤٣ـ٢٤٤هـ صنف كتاب اصلاح المنطق والالفاظ وكتاب المقصود والممدود والقلب والابدال والاضداد وقد انشرت راجع لتراجمه معجم الادباء ٢٠/٥٢ والبغيه ٤١٨ـ٤١٩ شذرات ٢/١٠٦ وابن خلكان ٧٩٨ والارشاد ٧/٣٠٠ـ٣٠٢ واليافعي ٢/١٤٧ـ١٤٩.

❸ وتمامه: ذات ليلةفي صلاة العشاء والحديث في الكشاف ۲: ۳۷ والفائق (۱: ۵۷) وابي داؤد بين حديث معاذ بن جبل (تخريج الكشاف ۸۸رقم ۱۹۹.

قسم پر ہے۔ایک وہ جو بِذَاتِہٖ جب تک اللہ کی مشیت ہو، باقی رہے جیسے اجرام سماویہ۔دوم: وہ جس کے افراد و اجزاء تو تغیر پذیر ہوں مگر اس کی نوع یا جنس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہو۔جیسے انسان و حیوان۔اسی طرح آخرت میں بھی بعض اشیاء بِشَخْصِہٖ باقی رہیں گی۔جیسے اہل جنت کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں گے۔جیسے فرمایا:

﴿ خَالِدِیْنَ ﴾ (۱۴:۴) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اور بعض چیزیں صرف جنس و نوع کے اعتبار سے باقی رہیں گی۔جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔ ❶

(۴۰) ان اثمار اهل الجنة يقطفها اهلها ويأكلونها ثم تخلف مكانها مثلها. کہ ثمار جنت کو اہل جنت چن کر کھاتے رہیں گے اور ان کی جگہ نئے پھل پیدا ہوتے رہیں گے، چونکہ آخرت کی تمام اشیاء دائمی ہیں اس لیے فرمایا: ﴿ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ (۶۰:۲۸) اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ ﴾ (۴۶:۱۸) میں وہ تمام اذکار و اعمال صالحہ داخل ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہے گا۔بعض نے ان سے پانچ نمازیں مراد لی ہیں۔اور بعض نے اس سے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی تسبیح و تحمید مراد لی ہے۔لیکن صحیح یہ ہے کہ ان میں ہر وہ عبادت داخل ہے جس سے رضائے الٰہی مقصود ہو یہی معنی آیت کریمہ:

﴿ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (۸۶:۱۱) میں بَقِيَّةُ اللّٰهِ کے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ ❷ اور آیت کریمہ:

﴿ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ ﴾ (۸:۶۹) بھلا تو ان میں سے کسی کو بھی باقی دیکھتا ہے۔میں بَاقِيَةٌ کا موصوف جَمَاعة یا فِعْلَةٌ محذوف ہے یعنی باقی رہنے والی جماعت یا ان کا کوئی فعل جو باقی رہا ہو۔اور بعض کے نزدیک بَاقِيَةٌ بمعنی بَقِيَّةٌ ہے، ان کا قول ہے کہ بعض مصادر فاعل کے وزن پر آتے ہیں اور بعض مفعول کے وزن پر لیکن پہلا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ❸

ب ک ک

بَكَّةُ: مجاہدؒ سے منقول ہے کہ یہ اصل میں مَكَّةُ ہے اور اس میں باء میم سے مبدل ہے، جیسا کہ: سَبَدَ رَاْسَهٗ وَسَمَدَهٗ وَضَرْبٌ لَازِبٌ. وَلَازِمٌ میں ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا ﴾ (۹۶:۳) پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکے میں ہے، بابرکت۔

بعض کا قول ہے کہ مکہ سے اندروں مکۃ مراد ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مسجد کا نام ہے۔اور بعض نے بیت اللہ کے اسماء سے شمار کیا ہے اور بعض نے مطاف (طواف گاہ) سے تفسیر کی ہے۔اور یا تو تَبَاكٌ سے ماخوذ ہے، جس

---

❶ في الطبراني والبزار بمعناه عن ثوبان راجع مجمع الزوائد: ۱۰/۴۱۴).

❷ راجع لاقوالهم ابن كثير ۳: ۸۵ واختار العموم ابن جرير الطبرى وايضاً الكشاف ۲: ۲۷۵ واختلف ايضاً في الآية (۲: ۲۴۸) راجع البغوى ۱: ۲۱۶) وفي الآية اولوبقية (۱۱: ۱۱۶) المراد بها اهل الفضل (بيضاوى ۳۳۸۱۱).

❸ اوله ابوعبيدة بالمصدر فرد عليه المؤلف واكثر مايرد عليه.

کے معنی ازدھام کے ہیں اور وہاں چونکہ طواف کے لیے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لیے اس کو بکہ کہا گیا ہے۔ ❶ بعض کہتے ہیں کہ بَکَّۃَ بَكٌّ (ن) سے مشتق ہے، جس کے معنی مزاحمت کرنے اور پھاڑ ڈالنے کے ہیں چونکہ سنت الٰہی جاری ہے کہ جو ظالم وہاں الحاد وظلم پھیلانا چاہتا ہے۔ اس کی گردن توڑ دی جاتی ہے، اس لیے اسے اس نام سے پکارا گیا ہے۔

ب ک ر

اس باب میں اصل کلمہ بُكْرَةٌ ہے، جس کے معنی دن کے ابتدائی حصہ کے ہیں، پھر اس سے صیغہ فعل مشتق کر کے کہا جاتا ہے۔ بَكَرَ (ن) فُلَانٌ بُكُوْرًا کسی کام کو صبح سویرے نکلنا۔ اَلْبَكُوْرُ (صیغہ مبالغہ) بہت سویرے جانے والا۔

بَكَّرَ ...... فِيْ حَاجَةٍ وَابْتَكَرَ وَبَاكَرَ مُبَاكَرَةً. صبح سویرے کسی کام کے لیے جانا اور بُکْرَۃ (دن کا پہلا حصہ) چونکہ دن کے باقی حصہ پر متقدم ہوتا ہے، اس لیے اس سے شتابی کے معنی لے کر ہر اس شخص کے متعلق بَكِرَ (س) فعل استعمال ہوتا ہے، جو کسی معاملہ میں جلد بازی سے کام لے شاعر نے کہا ہے ❷ ع (الکامل)

(۶۲) بَكَرَتْ تَلُوْمُكَ بَعْدَ وَهْنٍ فِي النَّدٰى
بُسْلٌ عَلَيْكَ مَلَامَتِيْ وَعِتَابِيْ

وہ کچھ عرصہ کے بعد جلدی سے سخاوت پر ملامت کرنے لگی میں نے کہا کہ تم پر مجھے ملامت اور عتاب کرنا حرام ہے۔

بِكْرٌ: پہلا بچہ اور جب ماں باپ کے پہلا بچہ پیدا ہو تو احتراماً انہیں بِکْران کہا جاتا ہے جیسا کہ بیت اللہ بولا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ثواب الٰہی اور ان غیر فانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے تیار کی ہیں۔ ❸ جس کی طرف آیت کریمہ:

﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ﴾ (۲۹:۶۴) اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے۔ میں اشارہ فرمایا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❹ ع (رجز)

(۶۳) يَا بِكْرَ بِكْرَيْنِ وَيَا خِلْبَ الْكَبِدِ

اے والدین کے اکلوتے بیٹے اور جگر گوشے۔

پس آیت کریمہ:

﴿ لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ﴾ (۲:۶۸) نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔ میں بِكْرٌ سے نوجوان گائے مراد ہے جس نے

---

❶ لان الباء والميم من حروف الابدال راجع ابدال والى الطيب. قارن مجاز القران لابى عبيدة (۱: ۷۹۷) وغريب القران للسجستانى ۳۵ واللسان (بكر) وثلاثون الاربعة والاشتقاق فى الفتح للشوكانى (۱: ۳۶۲).

❷ البيت لضمرة بن ضمرة النهشلى انشده ابوزيد التوزى وابو حاتم فى ان البسل من الاضداد والبيت فى النوادر لابى زيد ۲ والسمط ۹۲۲ والامالى ۲: ۲۷۹) والدرة مع شرح الخفاجى ۱۹۳ والاقتضاب ۴۲۸ وفيه ان لفظة بكرقديأتى مثلاللتعجيل كمافى هذاالبيت وفى رواية الكامل ۸۴۲ هبت بدل بكرت والبيت فى الفاضل ۷۹۱ والاضداد لابى حاتم رقم ۱۴۳ ص ۱۰۳ ولباب الآداب وطبقات السيرانى ۵۷ والوحشيات رقم ۲۴ فى خمسة ابيات والبيت ارلها والمجالس۴۶۸ وابدال ابى الطيب (۲: ۵۳۶) وفى روايته ام عمروبدل بعدهن وبعده : أأضرها وبنى عمرو ساغب فكفاك من ابته على وعاب راجع اضداد للجستانى وابن الانبارى ۶۲ واضداد ابى الطيب ۳۲ واعراب ثلاثين لابن خالويه واللسان (بسل) والطبرى .

❸ ولعله اشارة الى تفسير الآية ولهم رزقهم فيها بكرة وعشيا(۱۹۔۱۱) وههنا سقط والله اعلم .

❹ قاله الراجز وبعده : اصبحت منى كذراع من عضد ۔والشطر فى اللسان (بكر) وفى الصحاح بغير عزو (بكر) والبحردا: ۲۴۸) واضداد لابن الانبارى ۲۳۴۶ واضدادابى الطيب ۹۱ وامالى القالى (۱: ۲۴) .

ابھی تک کوئی بچہ نہ دیا ہو۔ اور ثَیِّب کے اعتبار سے دوشیزہ کو بھی بِکْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اسے مجامعت کے لیے ثیب پر ترجیح دی جاتی ہے۔ بِکْرٌ کی جمع اَبْکَارٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴾ (۵۶:۳۵،۳۶) ہم نے ان (حوروں) کو پیدا کیا تو ان کو کنواریاں بنایا۔

اَلْبَکَرَۃُ چھوٹی سی چرخی۔ کیونکہ وہ تیزی کے ساتھ گھومتی ہے۔

ب ک م

اَلْاَبْکَمُ، پیدائشی گونگا اور اخرس عام گونگے کو کہتے ہیں، لہٰذا اَبْکَمْ عام اور اخرس خاص ہے، قرآن میں ہے:

﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ ﴾ (۱۶:۷۶) اور خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں ایک ان میں گنگا اور (دوسرے کی ملک) ہے (بے اختیار و ناتوان) کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

اور اَبْکَمَ کی جمع بُکْمٌ آتی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ صُمٌّۢ بُكْمٌ ﴾ (۲:۱۸) یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اور جو شخص ضعف عقلی کے سبب گفتگو نہ کر سکے اور گونگے کی طرح چپ رہے تو اس کے متعلق بَکَمَ عن الْکَلَامِ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ کلام سے عاجز ہو گیا۔

ب ک ی

بَکٰی یَبْکِیْ کا مصدر بُکًی وَبُکَآءً یعنی ممدود اور مقصور دونوں طرح آتا ہے اور اس کے معنی غم کے ساتھ آنسو بہانے اور رونے کے ہیں اگر آواز غالب ہو تو اسے بُکَآءٌ (ممدود) کہا جاتا ہے جیسے رُغَاءٌ وَثُغَاعٌ اور اس نوع کے دیگر اوزان جو صوت کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور اگر غم غالب ہو تو اُسے بُکًی (بالقصر) کہا جاتا ہے۔

اَلْبَاكِيُ رونے والا۔ غم اور اندوہ سے آنسو بہانے والا اس کی جمع بَاکُوْنَ وَبُکِیٌّ آتی ہے، قرآن میں ہے: ﴿ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴾ (۱۹:۵۸) تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے رہتے تھے۔

اصل میں بُکِیٌّ (بُکُوْیٌ بروزن فُعُوْلٌ ہے، جیسے سَاجِدٌ وَسُجُوْدٌ وَرَاكِعٌ وَرُكُوْعٌ وَقَاعِدٌ وَقُعُوْدٌ واؤ کو یاء سے تبدیل کر کے یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے، جیسے جَاثٍ وَجُثِيٌّ وَعَاتٍ عُتِيٌّ نیز: بُکًی کے اصل معنی تو غم کے ساتھ آنسو بہانا کے ہوتے ہیں، مگر کبھی صرف آنسو بہانے اور کبھی صرف غم کھانے کے لیے بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ﴾ (۹:۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں)...... بہت سا رونا ہوگا۔

میں مطلق خوشی اور غم کے معنی مراد ہیں اور ضحک کے ساتھ قہقہہ اور بکاء کے ساتھ آنسو بہانا ضروری نہیں ہے۔ یہی معنی آیت کریمہ:

﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ﴾ (۴۴:۲۹) پھر ان پر نہ تو آسمان اور زمین کو رونا آیا۔

میں مراد ہیں ہاں جو لوگ آسمان اور زمین کے لیے زندگی اور علم ثابت کرتے ہیں وہ اسے حقیقی معنی پر حمل کرتے ہیں اور جو زندگی کے قائل نہیں ہیں وہ نسبت مجازی قرار دیتے

ہیں یعنی ان سے آسمان اور زمین کے باشندے مراد ہیں [1]

بَلْ (حرف)

بَلْ: حرف استدراک ہے اور تدارک کی دوصورتیں ہیں۔(۱) جبکہ بل کا مابعد اس کے ماقبل کی نقیض ہو تو اس صورت میں کبھی تو اس کے مابعد حکم کی تصحیح سے ماقبل کی تردید مقصود ہوتی ہے۔اور کبھی اس کے برعکس ماقبل کی تصحیح اور مابعد کے ابطال کی غرض سے بل کو لایا جاتا ہے۔

چنانچہ پہلی صورت کے متعلق فرمایا:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴾ (۸۳:۱۴) جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں دیکھو یہ جو (اعمال بد) کر رہے ہیں ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

تو بَلْ کا معنی یہ ہیں کہ آیات الٰہی کو اَسَاطِیْر کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ان کی جہالت ہے، پھر رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کہہ کر ان کی جہالت پر تنبیہ کی ہے۔اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا:﴿ قَالُوْٓا ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓاِبْرٰهِیْمُ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ ﴾ (۲۱:۶۱،۶۲) (جب ابراہیم علیہ السلام آئے تو) ان بت پرستوں نے کہا کہ ابراہیم بھلا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کیا ہے؟ (ابراہیم علیہ السلام نے) کہا (نہیں) بلکہ یہ ان کے اس بڑے (بت) نے کیا (ہوگا) اگر یہ بولتے ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔

اور دوسری صورت میں ماقبل کی تصحیح اور مابعد کے ابطال کے متعلق فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ۝ ﴾ (۸۹:۱۵،۱۷) مگر انسان (عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ (آہا) میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ (ہائے) میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا نہیں بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے۔

یعنی رزق کی فراخی یا تنگی، اکرام یا اہانت کی دلیل نہیں ہے (بلکہ یہ پروردگار کی طرف سے آزمائش ہے) مگر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ یہ مال کو بیجا صرف کر رہے ہیں اور اسی طرح آیت ﴿ صٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ ﴾ (۳۸:۱،۲) قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے (کہ تم حق پر ہو) مگر جو لوگ کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔ میں وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ کہہ کر یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن تذکیر یعنی نصیحت حاصل کرنے کی کتاب ہے اور کفار کا اس کی طرف متوجہ نہ ہونا اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کا اعراض

---

[1] قال الحسن ای اهل السماء والارض كمافی قوله تعالیٰ حتی تضع الحرب اوزارها (۴۷-۴) ویمكن ان یكون المراد المبالغة فی وصف القوم بالصغر فی القدر او كنایة عن عدم عملهم الصالح فی الارض یرفع الی السماء كماروی عن ابن عباسؓ وقال السدی لماقتل الحسین بن علی بكت السماء علیه وبكاء ها حمرة اطرافها لكن الروایة غیرثابت واللّٰه اعلم۔

محض غرور اور مخالفت کی وجہ سے ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا﴾ (۵۰:۱،۲) قرآنِ مجید کی قسم (کہ محمد ﷺ پیغمبر ہیں) لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا۔بھی اسی معنی پر محمول ہے، یعنی ان کا قرآن پاک پر ایمان نہ لانا قرآن کے بزرگ ہونے کے منافی نہیں ہے بلکہ محض ان کی جہالت ہے۔بَلْ عَجِبُوْٓا کہہ کر ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہے کیونکہ کسی چیز پر اسی وقت تعجب ہوتا ہے جب اُس کا سبب معلوم نہ ہو۔نیز فرمایا:

﴿مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝﴾ (۸۲:۶،۹) تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکہ دیا (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا۔اور (تیری قامت کو) معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا جوڑ دیا۔مگر ہیہات تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو۔

یعنی رب کریم کے بارے میں کوئی چیز سوائے اس کے دھوکے میں ڈالنے والی نہیں ہے کہ وہ دین کو جھٹلا رہے ہیں۔

(۲) تدارک کی دوسری صورت یہ ہے کہ دوسری کلام کے ذریعہ پہلی کلام کی وضاحت اور اس پر اضافہ مقصود ہوتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ (۲۱:۵) بلکہ (ظالم) کہنے لگے کہ (یہ قرآن) پریشان (باتیں ہیں جو) خواب (میں دیکھ لی) ہیں (نہیں، بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہے (نہیں) بلکہ یہ (شعر ہے) جو اس شاعر (کا نتیجہ طبع) ہے۔

یہاں متنبہ کیا ہے کہ اوّلاً انھوں نے قرآن کو خیالات پریشان کہا پھر اس پر اضافہ کرکے اسے افتراء بتلانے لگے پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ کے متعلق (نعوذ باللہ) کذاب ہونے کا ادعاء کرنے لگے کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں شاعر فطرۃً کاذب کو کہا جاتا ہے اور آیت:

﴿لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ﴾ (۲۱:۳۹،۴۰) اے کاش! کافر اس وقت کو جانیں جب وہ اپنے مونہوں پر سے (دوزخ کی) آگ کو روک نہ سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں پر سے اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا، بلکہ قیامت ان پر ناگہاں آواقع ہوگی اور ان کے ہوش کھو دے گی۔بھی اس معنی پر محمول ہے کہ کاش وہ اس کے علاوہ دوسری بات کو جانتے ہوتے جو پہلی بات سے زیادہ اہم ہے یعنی یہ کہ قیامت ان پر ناگہاں آواقع ہوگی۔قرآن پاک میں جتنی جگہ بھی بَلْ آیا ہے ان دونوں معنی میں سے کسی ایک پر دلالت کرتا ہے اگرچہ بعض مقامات ذرا وضاحت طلب ہیں [1] اور ان کے پیچیدہ ہونے کی بنا پر بعض علماء نحو نے غلطی سے کہہ دیا ہے کہ قرآن پاک میں بل صرف معنی

---

[1] قال فی المغنی : بل حرف اضراب فان تلاها جملة کان معنی الاضراب اماالابطال ای الاول واماالانتقال من غرض الی آخر وھی فی ذالك کلة حرف ابتداء لاعاطفة علی الصحیح وان تلاھا مفرد فھی عاطفة ثم ان تقدمها امراوایجاب فھی تجعل ماقبلها کالمسکوت عنه واثبات الحکم لمابعدھاوان تقدمها نفی اونھی فھی لتقریر ماقبلها علی حالته وجعل ضده لمابعده (راجع ۱:۱۱۹۔۱۲۰).

ثانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ❶

ب ل د

اَلْبَلَدُ: (شہر) وہ مقام جس کی حد بندی کی گئی ہو اور وہاں لوگ آباد ہوں۔ اس کی جمع بِلَادٌ اور بُلْدَانٌ آتی ہے، اور آیت:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ﴾ (۹۰:۱) ھٰذَا الْبَلَدِ سے مکہ مکرمہ مراد ہے، دوسری جگہ فرمایا: ﴿رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا﴾ (۱۴:۳۵) کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لیے) امن کی جگہ بنادے۔ ﴿بَلْدَۃٌ طَیِّبَۃٌ﴾ (۳۴:۱۵) پاکیزہ شہر ہے۔

﴿فَاَنْشَرْنَا بِہٖ بَلْدَۃً مَّیْتًا﴾ (۴۳:۱۱) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کردیا۔

﴿فَسُقْنٰہُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ﴾ (۳۵:۹) پھر ہم ان کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ (۲:۲۶) اے پروردگار! اس جگہ کو امن کا شہر بنا۔

میں بھی مکہ مکرمہ مراد ہے لیکن ایک مقام پر اسے معرفہ اور دوسرے مقام پر نکرہ لانے میں جو لطافت اور نکتہ ملحوظ ہے، اسے ہم دوسری کتاب میں بیان کریں گے اور بَلَدٌ کے معنی بیابان اور قبرستان بھی آتے ہیں کیونکہ پہلا وحشی جانوروں دوسرا مردوں کا مسکن ہوتا ہے۔ اَلْبَلْدَۃُ: منازل قمر سے ایک منزل کا نام ہے اور تشبیہ کے طور پر ابرو کے درمیان کی جگہ اور اونٹ کے سینہ کو بھی بَلْدَۃٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی شہر کی طرح محدود ہوتے ہیں اور بطور استعارہ انسان کے سینہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اثر یعنی نشان کے معنی کے اعتبار سے بِجِلْدِہٖ بَلَدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اس کی کھال پر نشان ہے اس کی جمع اَبْلَادٌ آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷

(۶۴) وَفِی النُّحُوْرِ کُلُوْمٌ ذَاتُ اَبْلَادِ.

اور ان کے سینوں پر زخموں کے نشانات ہیں۔

اَبْلَدَ الرَّجُلُ: شہر میں چلا جانا جیسا کہ اَنْجَدَ وَاَتْھَمَ کے معنی نجد اور تہامہ میں چلے جانے کے ہیں۔ بَلَدَ الرَّجُلُ کے معنی شہر میں مقیم ہونے کے ہیں اور کسی مقام پر ہمیشہ رہنے والا اکثر اوقات دوسری جگہ میں جاکر متحیر ہوجاتا ہے اس لیے متحیر آدمی کے متعلق بَلَدَ فِیْ اَمْرِہٖ وَاَبْلَدَ وَتَبَلَّدَ وغیرہا کے محاورات استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❸ ع

(۶۵) لَا بُدَّ لِلْمَحْزُوْنِ اَنْ یَتَبَلَّدَا

کہ وہ اندوہ گیں لازماً متحیر رہے گا۔

اجڈ لوگ عام طور پر بلید یعنی کند ذہن ہوتے ہیں اس لیے ہر جسیم آدمی کو اَبْلَدُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا﴾ (۷:۵۸) (جو زمین

❶ کماقال ابن مالك فی شرح الکافیة (راجع ابن هشام (۱ : ۱۲۰).

❷ قاله القطامی واوله : لیست تجرح فراراً ظهورهم .... والبیت فی اللسان والتاج والصحاح (بلد) وتهذیب الالفاظ ۱۰۸ والاصلاح ۴۱۰ وفی النسخ المطبوعة النجوم بدل النحور مصحف والتصویب من المراجع .

❸ وفی مصارع العشاق (۷۵۔۷۶) مثله لحبابة مع تغییر قالته حین مر یزید بها ورأته متغیراً اورواية البیت : الالاتلمه الیوم ان یتبلدا۔ فقد منع المحزون ان یتجلدا۔ والبیت فی اللسان (بلد) فی اربعة منسوبة الی الاحوص .

پاکیزہ ہے) اس میں سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے (نفیس ہی) نکلتا ہے اور جو خراب ہے۔ اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے) میں بلد کے طیب اور خبیث ہونے سے کنایۃً نفوس کا طیب اور خبیث ہونا مراد ہے۔

ب ل س

اَلْاِبْلَاسُ: (افعال) کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں۔ اَبْـلَـسَ وہ مایوس ہونے کی وجہ سے مغموم ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی سے اِبْلِیس مشتق ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّـاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ (۳۰:۱۲) اور جس دن قیامت برپا ہوگی، گنہگار مایوس ومغموم ہوجائیں گے۔

﴿ اَخَـذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴾ (۶:۴۴) تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔

﴿ وَاِنْ كَـانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَـمُبْـلِسِيْـنَ ﴾ (۳۰:۴۹) اور بیشتر تو وہ مینہ کے اترنے سے پہلے ناامید ہو رہے تھے۔

اور عام طور پر غم اور مایوسی کی وجہ سے انسان خاموش رہتا ہے اور اسے کچھ سوجھائی نہیں دیتا اس لیے اَبْلَسَ فُـلَانٌ کے معنی خاموش اور دلیل سے عاجز ہونے کے ہیں۔

بَـلَسَـتِ الـنَّاقَةُ فَهِيَ مِبْـلَاسٌ آواز نہ کردناقہ از غایت خواہش کش اور بَلَاسٌ بمعنی ٹاٹ فارسی (پلاس) سے معرب ہے۔

ب ل ع

بَلَعْتُ (ف) الشَّيْءَ وَابْتَلَعْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو نگل لینا کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ يَا اَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ ﴾ (۱۱:۴۴) کہ اے زمین! اپنا پانی نگل جا۔

اسی سے بَـلُّـوْعَةٌ ہے، جس کے معنی بدرو اور گندی نالی یا چوبچہ کے ہیں۔ سَـعْـدُ بَـلَعَ ایک ستارے کا نام بَـلَّـعَ الشَّيْبُ فِي رَأْسِهٖ سر میں بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا۔

ب ل غ

اَلْبُـلُوْغُ وَالْبَـلَاغُ: (ن) کے معنی مقصد اور منتہیٰ کے آخری حد تک پہنچنے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ مقصد کوئی مقام ہو یا زمانہ یا اندازہ کیے ہوئے امور میں سے کوئی امر ہو، مگر کبھی محض قریب تک پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے گو انتہا تک نہ بھی پہنچا ہو۔ چنانچہ انتہا تک پہنچنے کے معنی میں فرمایا: ﴿ حَتّٰـى اِذَا بَـلَـغَ اَشُـدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَـعِـيْـنَ سَـنَةً ﴾ (۴۶:۱۵) یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔

﴿ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَـلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ (۲:۲۳۲) اور ان کی عدت پوری ہوجائے تو ان کو......مت روکو۔

﴿ وَمَـا هُـمْ بِبَـالِغِيْهِ ﴾ (۴۰:۵۶) اور وہ اس کو پہنچنے والے نہیں۔

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْىَ ﴾ (۳۷:۱۰۲) جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا۔

﴿ لَـعَـلِّـىْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴾ (۴۰:۳۶) تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) رستوں پر پہنچ جاؤں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ اَمْ لَـكُـمْ اَيْـمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ ﴾ (۶۸:۳۹) یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو چلی جائیں گی۔ یہاں

بَالِغَةٌ سے انتہائی مؤکد قسمیں مراد ہیں۔
اَلْبَلَاغُ کے معنی تبلیغ یعنی پہنچا دینے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:
﴿ هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (۵۲:۱۴) یہ (قرآن) لوگوں کے نام (خدا کا) پیغام ہے۔
﴿ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ (۳۵:۴۶) (یہ قرآن) پیغام ہے سو (اب) وہی ہلاک ہوں گے جو نافرمان تھے۔
﴿ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (۳۶:۱۷) اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔
﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ (۱۳:۴۰) تمہارا کام (ہمارے احکام کا) پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔
اور بَلَاغٌ کے معنی کافی ہونا بھی آتے ہیں، جیسے: ﴿ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴾ (۲۱:۱۰۶) عبادت کرنے والے لوگوں کے لیے اس میں (خدا کے حکموں کی) پوری پوری تبلیغ ہے۔
اور آیت کریمہ: ﴿ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾ (۵:۶۷) اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم نے یہ یا کوئی دوسرا حکم جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے نہ پہنچایا تو گویا تم نے وحی الٰہی سے ایک حکم کی بھی تبلیغ نہیں کی یہ اس لیے کہ جس طرح انبیاء کرام کے درجے بلند ہوتے ہیں اسی طرح ان پر احکام کی بھی سختیاں ہوتی ہیں اور وہ عام مومنوں کی طرح نہیں ہوتے جو اچھے اور برے ملے جلے عمل کرتے ہیں اور انہیں معاف کر دیا جاتا ہے اور آیت کریمہ:
﴿ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ ﴾ (۲:۶۵) پھر جب وہ اپنی میعاد (یعنی انقضائے عدت) کو پہنچ جائیں تو، یا تو ان کو (زوجیت میں) رہنے دو۔ میں بلوغ اجل سے عدتِ طلاق کا ختم ہونے کے قریب پہنچ جانا مراد ہے۔ کیونکہ عدت ختم ہونے کے بعد تو خاوند کے لیے مراجعت اور روکنا جائز ہی نہیں ہے۔ بَلَّغْتُهُ الْخَبَرَ وَاَبْلَغْتُهُ کے ایک ہی معنی ہیں مگر بَلَّغْتُ (تفعیل) زیادہ استعمال ہوتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ ﴾ (۷:۶۲) تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں۔
﴿ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ (۵:۶۷) اے پیغمبر! جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔
﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ﴾ (۱۱:۵۷) اگر تم روگردانی کرو گے تو جو پیغام میرے ہاتھ تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ میں نے تمہیں پہنچا دیا ہے۔
اور قرآن پاک میں ایک مقام پر:
﴿ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ﴾ (۳:۴۰) کہ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ آیا ہے یعنی بلوغ کی نسبت کِبَرٌ کی طرف کی گئی ہے۔ اور دوسرے مقام پر ﴿ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴾ (۱۹:۸) ''اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں۔'' ہے۔ یعنی بلوغ کی نسبت متکلم کی طرف ہے اور یہ اَدْرَکَنِی

الْجَھْدُ وَاَدْرَکْتُ الْجَھْدَ کے مثل دونوں طرح جائز ہے، مگر بَلَغَنِیَ الْمَکَانُ یا اَدْرَکَنِی کہنا غلط ہے۔

اَلْبَلَاغَۃُ کا لفظ دو طرح بولا جاتا ہے، ایک یہ کہ وہ کلام بِذَاتِہٖ بلیغ ہو اور اس کے لیے اوصاف ثلاثہ کا جامع ہونا شرط ہے یعنی وضع لغت کے اعتبار سے درست ہو، معنی مقصود کے مطابق ہو اور فی الواقع سچی بھی ہو اگر ان اوصاف میں کسی ایک وصف میں بھی کمی ہو تو بلاغت میں نقص رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہٗ یعنی متکلم اور مخاطب کے اعتبار سے بلیغ ہو یعنی کہنے والا اپنے مافی الضمیر کو خوبی سے ادا کرے کہ مخاطب کو اس کا قائل ہونا پڑے اور آیت کریمہ: ﴿ وَقُلْ لَّھُمْ فِیٓ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا ﴾ (۴:۶۳) اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں پر اثر کر جائیں۔

میں ''قول بلیغ'' ان ہر دو معنی پر محمول ہو سکتا ہے اور بعض نے اس کے جو یہ معنی کیے ہیں کہ: ''ان سے کہہ دو کہ اگر تم نے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کیا تو قتل کر دیئے جاؤ گے یا یہ کہ انھیں ان پر نازل ہونے والے مصائب سے ڈراؤ'' تو یہ اس کے عام مفہوم میں سے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔

اَلْبُلْغَۃُ: اتنی مقدار جس سے گذر اوقات ہو سکے۔

ب ل و ی

بَلِیَ الثَّوْبُ۔ بِلًی وَبَلَاءً کے معنی کپڑے کا بوسیدہ اور پرانا ہونے کے ہیں۔ اسی سے بَلَاہُ السَّفَرُ ای اَبْلَاہُ کا محاورہ ہے۔ یعنی سفر نے اسے لاغر کر دیا ہے اور بَلَوْتُہٗ کے معنی ہیں: میں نے اسے آزمایا۔ گویا کثرت آزمائش سے میں نے اسے کہنہ کر دیا اور آیت کریمہ: ﴿ ھُنَالِکَ تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ ﴾ (۱۰:۳۰) وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کر لے گا۔

میں ایک قرأت نَبْلُوْا (بصیغہ جمع متکلم) بھی ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہاں ہم ہر نفس کے اعمال کی حقیقت کو پہچان لیں گے اور اسی سے اَبْلَیْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کا امتحان کرنا بھی آتے ہیں۔ اور غم کو بَلَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جسم کو گھلا کر لاغر کر دیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴾ (۲:۴۹) اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ﴾ (۲:۱۵۵) اور ہم کسی قدر خوف...... سے تمہاری آزمائش کریں گے۔

﴿ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ﴾ (۳۷:۱۰۶) بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔

اور تکلیف کو کئی وجوہ کی بناء پر بَلَاءٌ کہا گیا ہے۔ ایک اس لیے کہ تکالیف بدن پر شاق ہوتی ہیں اس لیے انہیں بَلَاءٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تکلیف بھی ایک طرح سے آزمائش ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاھِدِیْنَ مِنْکُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ ﴾ (۴۷:۳۱) اور ہم تم لوگوں کو آزمائیں گے تاکہ جو تم میں لڑائی کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں، ان کو معلوم کریں۔ سوم اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کبھی تو بندوں کو خوش حالی سے آزماتے ہیں کہ شکر گذار بنتے ہیں یا نہیں اور کبھی تنگی کے

ذریعہ امتحان فرماتے ہیں کہ ان کے صبر کو جانچیں۔ لہٰذا مصیبت اور نعمت دونوں آزمائش ہیں۔ محنت صبر کا تقاضا کرتی ہے اور مِنْحَة یعنی فضل وکرم شکر گزاری چاہتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ کماحقہٗ صبر کرنا کماحقہ شکر گذاری سے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لیے نعمت میں بہ نسبت مشقت کے بڑی آزمائش ہے، اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (۳۴) بُلِينَا بِالضَّرَّآءِ فَصَبَرْنَا وَبُلِينَا بِالسَّرَّآءِ فَلَمْ نَصْبِرْ کہ تکالیف پر تو صابر رہے لیکن فراخ حالی میں صبر نہ کر سکے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (۳۵) مَنْ وُسِعَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ فَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّهُ قَدْ مُكِرَ بِهٖ فَهُوَ مَخْدُوْعٌ عَنْ عَقْلِهٖ . کہ جس پر دنیا فراخ کی گئی اور اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ آزمائش کی گرفت میں ہے تو فریب خوردہ اور عقل وفکر سے محروم ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ (۲۱:۳۵) اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

﴿ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ﴾ (۸:۱۷) اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں) سے اچھی طرح آزمالے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴾ (۲:۴۹) اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔ میں بَلَآءٌ کا لفظ نعمت ومشقت دونوں طرح کی آزمائش کو شامل ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ﴾ (۲:۴۹) (تمہارے بیٹوں کو) تو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ میں مشقت کا بیان ہے اور فرعون سے نجات میں نعمت کا تذکرہ ہے اسی طرح آیت:

﴿ وَاٰتَيْنَاهُمْ مِّنَ الْاٰيَاتِ مَا فِيْهِ بَلَآءٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (۴۴:۳۳) اور ان کو ایسی نشانیاں دی تھیں جس میں صریح آزمائش تھی۔ میں دونوں قسم کی آزمائش مراد ہے۔ جیسا کہ کتاب اللہ کے متعلق فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ وَّالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ﴾ (۴۱:۴۴) اِبْتَلٰى فُلَانٌ وَاَبْلَاهُ (کسی کا امتحان کرنا) یہ دو امر کو متضمن ہوتا ہے (۱) تو اس شخص کی حالت کو جانچنا اور اس سے پوری طرح باخبر ہونا مقصود ہوتا ہے، دوسرے (۲) اس کی اچھی یا بری حالت کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا۔ پھر کبھی تو یہ دونوں معنی مراد ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی معنی مقصود ہوتا ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی اس شخص کی خوبی یا نقص کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، کیونکہ ذات باری کی شان عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے، اسے کسی کی حالت سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں، لہٰذا آیت کریمہ: ﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ﴾ (۲:۱۲۴) اور پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ دوسرے معنی پر محمول ہوگی۔ (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود تھا)۔

بَلٰی (حرف)

حرف ایجاب ہے، (پہلی بات میں ❶) نفی کی تردید کے لیے آتا ہے، جیسا کہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ کے بعد فرمایا: ﴿ بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً ﴾ (۸۱:۲) کیوں نہیں! جو برے کام کرے۔ اور یا اس استفہام کے جواب میں آتا ہے جو نفی پر واقع ہو، جیسے:

﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی ﴾ (۱۷۲:۷) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں! وہ کہنے لگے: کیوں نہیں۔ نَعَمْ اور بَلٰی میں فرق یہ ہے کہ نَعَمْ صرف استفہام (یعنی بدوں نفی) کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَکُمْ رَبُّکُمْ حَقًّا قَالُوْا نَعَمْ ﴾ (۴۴:۷) بھلا جو وعدہ تمہارے پروردگار نے تم سے کیا تھا تم نے بھی اسے سچا پایا؟ وہ کہیں گے: ہاں!۔

یہاں پر بَلٰی کا استعمال صحیح نہیں ہے ❷ نیز جب کوئی شخص مَا عِنْدِی شَیْءٌ (کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں) کہے تو اس کے جواب میں اگر "بَلٰی" کہا جائے تو اس کی تردید ہوگی، یعنی غلط کہتے ہو اور اگر نَعَمْ سے جواب دیں تو آپ نے نفی کا اقرار کرلیا یعنی بیشک تمہارے پاس کچھ نہیں ہے ❸ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا کُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ بَلٰٓی اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۲۸:۱۶) تو مطیع ومنقاد ہوجاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کہ ہم کوئی برا کام نہیں کرتے تھے کیوں نہیں! جو کچھ تم کرتے تھے خدا اسے خوب جانتا ہے۔ ﴿ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَۃُ ؕ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّکُمْ ﴾ (۳:۳۴) اور کافر کہتے ہیں کہ (قیامت کی) گھڑی ہم پر نہیں آئے گی۔ کہہ دو کیوں نہیں (آئیگی) میرے پروردگار کی قسم۔ ﴿ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ رَبِّکُمْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا قَالُوْا بَلٰی ﴾ (۷۱:۳۹) تو جہنم کے خازن ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو تمہارے پروردگار کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں۔ ﴿ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَکُ تَاْتِیْکُمْ رُسُلُکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰی ﴾ (۵۰:۴۰) وہ کہیں گے کہ تمہارے پاس تمہارے پیغمبر نشانیاں لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے، کیوں نہیں۔

ب ن ن

اَلْبَنَانُ (واحد بَنَانۃ) کے معنی انگلیاں (یا ان کے اطراف) کے ہیں۔ یہ اَبَنَّ بِالْمَکَانِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ اقامت پذیر ہونے کے

---

❶ حرف جواب تختص النفی وتفید ابطاله سواء کان مجرداً اومقروناً بالاستفهام، وسواء کان الاستفهام حقیقیاً اوتوبیخیاً او تقریریاً (راجع المغنی بحث بلی).

❷ هذا وان کان متفقاً علیه عند العلماء العربیة لکن وقع فی کتب الحدیث ما یقتضی انها یجاب بها الاستفهام المجرد ففی صحیح البخاری انه علیه السلام قال لاصحابه أترضون ان تکونوا ربع اهل الجنة ؟ قالوا بلیٰ ! وفی صحیح مسلم ...... أیسرك ان یکونوا لك فی البر سواءً ! قال : بلی ! وایضاً قال علیها السلام لرجل : انت الذی یقتنی بمکة فقال بلیٰ ۔ لکنّه قلیل ۔

❸ وبذالك قال جماعة من الفقهاء لکن فی المسئلة خلاف راجع المغنی (۱ : ۱۲۱).

ہیں اور چونکہ کسی جگہ اقامت کے لیے ضروریاتِ زندگی کی اصلاح بھی انگلیوں سے ہوتی ہے، اس لیے ان کو بَنَان کہا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴾ (۷۵:۴) ضرور کریں گے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں۔ میں انگلیوں کی درستگی پر اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے۔اسی طرح آیت:

﴿ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴾ (۸:۱۲) اور ان کا پور پور مار (کرتوڑ) دو۔

میں خاص کر ان کے پور پور کاٹ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ مدافعت اور مقاتلہ کا واحد ذریعہ ہیں۔

اَلْبِنَّةُ: بو، اچھی یا بری۔کیونکہ اس میں کسی چیز کے ساتھ لازم ہونے کی وجہ سے ٹھہرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

ب ن ی

بَنَيْتُ اَبْنِيْ بِنَاءً وَبِنْيَةً وَبُنْيًا کے معنی تعمیر کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴾ (۷۸:۱۲) اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔﴿ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ ﴾ (۵۱:۴۷) اور آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا۔

﴿ وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا ﴾ (۹۱:۵) اور آسمان اور اس ذات کی (قسم) جس نے اسے بنایا۔

اَلْبُنْيَانُ: یہ واحد ہے جمع نہیں ہے، جیسا کہ آیات: ﴿ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (۹:۱۱۰) یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (موجب) خلجان رہے گی۔﴿ كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ (۶۱:۴) کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔﴿ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا ﴾ (۳۷:۹۷) وہ کہنے لگے کہ اس کے لیے ایک عمارت بناؤ۔سے معلوم ہوتا ہے؛ بعض کے نزدیک یہ بُنْيَانَةٌ کی جمع ہے اور یہ: شَعِيْرٌ وَشَعِيْرَةٌ وَتَمْرٌ وَتَمْرَةٌ وَنَخْلٌ وَنَخْلَةٌ کی طرح ہے (یعنی جمع اور مفرد میں تا کے ساتھ فرق کرتے ہیں) اور جمع کی اس قسم میں تذکیر و تانیث دونوں جائز ہوتے ہیں۔﴿ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ﴾ (۳۹:۲۰) ان کے لیے اونچے اونچے محل ہیں جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔

بِنَاءٌ: (مصدر بمعنی مفعول) عمارت ج اَبْنِيَةٌ اَلْبَنِيَّةُ سے بیت اللہ مراد لیا جاتا ہے [1]

اَلْاِبْنُ یہ اصل میں بَنَوٌ ہے [2] کیونکہ اس کی جمع اَبْنَاءٌ اور تصغیر بُنَيٌّ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ ﴾ (۱۲:۵) کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔

﴿ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ ﴾ (۳۷:۱۰۲) کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں۔

﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ﴾ (۳۱:۱۳) کہ بیٹا خدا

[1] یقال : لا وحب هذه البنية (كعفنية) وقد كثر قسمهم بها (راجع التاج : ب ن ی).

[2] هذا وان كان في اصله خلاف لكن رجح في التاج ان اصد بنى (محركة بالياء قال ذانماقضينا انه من الياء لان بنى يبنى اكثر في كلامهم من يبنو.

کے ساتھ شرک نہ کرنا۔

﴿ یَا بُنَیَّ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطَانَ ﴾ بیٹا شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ اور بیٹا بھی چونکہ اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے، اس لیے اسے ابن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا بانی بنایا ہے اور بیٹے کی تخلیق میں باپ بمنزلہ معمار کے ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو دوسری کے سبب اس کی تربیت، دیکھ بھال اور نگرانی سے حاصل ہو اسے اس کا ابن کہا جاتا ہے۔ نیز جسے کسی چیز سے لگاؤ ہو اسے بھی اس کا ابن کہہ دیا جاتا ہے، جیسے: فُلَانٌ ابْنُ حَرْبٍ۔ فلاں جنگجو ہے۔ اِبْنَ السَّبِیْلِ: مسافر۔ اِبْنُ اللَّیْلِ: چور۔ اِبْنُ الْعِلْمِ: پروردۂ علم۔

شاعر نے کہا ہے [1]

(۶۲) اُولَاكَ بَنُوْ خَیْرٍ وَشَرٍّ كِلَیْهِمَا

یہ لوگ خیر وشر یعنی ہر حالت میں اچھے ہیں۔

فُلَانٌ ابْنُ بَطْنِهٖ: پیٹ پرست۔ فُلَانٌ ابْنُ فَرْجِهٖ: شہوت پرست۔ اِبْنُ یَوْمِهٖ: جو کل کی فکر نہ کرے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ (۹:۳۰) اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔

﴿ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ ﴾ (۱۱:۴۵) میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے۔

﴿ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ﴾ (۱۲:۸۱) کہ ابا! آپ کے صاحبزادے نے (وہاں جا کر) چوری کی۔

اِبْنٌ کی جمع اَبْنَاءٌ اور بَنُوْنٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِیْنَ وَحَفَدَةً ﴾ (۱۶:۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کیے۔

﴿ یَا بَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ ﴾ (۱۲:۶۷) کہ بیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔

﴿ یَا بَنِیْ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (۷:۳۱) اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین کیا کرو۔

﴿ یَا بَنِیْ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطَانُ ﴾ (۷:۲۷) اے بنی آدم! (دیکھنا کہیں) شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔''

اور اِبْنٌ کی مؤنث اِبْنَةٌ وَبِنْتٌ اور ان کی جمع بَنَاتٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ ﴾ (۱۱:۷۸) یہ (جو) میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں، تمہارے لیے (جائز اور) پاک ہیں۔

﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ ﴾ (۱۱:۷۹) کہ تمہاری (قوم کی) بیٹیوں کی ہمیں کچھ حاجت نہیں۔ بعض کہتے ہیں [2] کہ حضرت لوط علیہ السلام نے

---

[1] قال مسافع بن حذیفة العبسی (کمافی شرح التبریزی) وتمامه: جمیعاً ومعروف الم ومنکر۔ کذا فی الصاعتین ۳۱۲ مع آخر وفی ۴۸ والبیت فی الحماسة مع المرزوقی ۳۴۶ فی اربعة ابیات والاشباه ۳:۱۲۳ مع اختلاف فی بعض الروایة وفی بعض النسخ وابناء معروف بدل جمیعاً ومعروف وفی الحیوان (۲:۸۹) قاله العتبی وفی روایة لکن بدل اولاك والعتبی ھو محمد بن عبداللہ من بنی عتبة بن ابی سفیان ومسافع بن حذیفة شاعر فارسی من شعراء الجاهلیة (راجع الخزانة: ۲/۳۶۰).

[2] مروی عن قتادہ (الطبرسی ۱۲:۱۹۷).

اکابر قوم کو خطاب کیا تھا اور ان کے سامنے اپنی بیٹیاں پیش کی تھیں۔مگر یہ ناممکن سی بات ہے کیونکہ نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ اپنی چند لڑکیاں مجمع کثیر کے سامنے پیش کرے اور بعض نے کہا ہے ❶ کہ بَنَاتِی سے ان کی قوم کی عورتیں مراد ہیں اور ان کو بَنَاتِی اس لیے کہا ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے بلکہ والدین سے بھی اس کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے جیسا کہ اَبٌ کی تشریح میں گزر چکا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ ﴾ (۱۶:۵۷) اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

ب ھ ت

بَهِتَ (س) حیران وششدرہ جانا بَهَتَهٗ (ف) اسے مبہوت کردیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ﴾ (۲:۲۵۸) یہ سن کر کافر حیران رہ گیا۔اور آیت کریمہ:

﴿ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ ﴾ (۲۴:۱۶) یہ تو (بہت) بڑا بہتان ہے۔میں بہتان کے معنی ایسے الزام کے ہیں جسے سن کر انسان ششدر وحیران رہ جائیں۔اور آیت کریمہ:

﴿ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ ﴾ (۶۰:۱۲) نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی۔

میں بہتان زنا سے کنایہ ہے۔بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ اس سے ہر وہ عمل شنیع مراد ہے، جسے ہاتھ اور پاؤں سے سرانجام دیا جائے۔مثلاً ہاتھ سے کسی ناروا چیز کو پکڑنا یا کسی عمل شنیع کا ارتکاب کرنے کے لیے اس کی طرف چل کر جانا۔جَاءَ بِالْبَهِیْتَةِ: اس نے جھوٹ بولا۔

ب ھ ج

اَلْبَهْجَةُ: خوش نمائی۔فرحت وسرور کا ظہور۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ﴾ (۲۷:۶۰) سرسبز باغ۔

بَهُجَ (ک) خوشنما اور تروتازہ ہونا۔اور خوشنما چیز کو بَهِیْج کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِیْجٍ ﴾ (۵۰:۷) اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں۔

اور بَهِجٌ بھی صیغہ صفت ہے۔شاعر نے کہا ہے ❷

(۶۷) ذَاتُ خَلْقٍ بَهِجٌ

اور اس سے بَهُوْجٌ بروزن فَعُوْلٌ استعمال نہیں ہوتا۔اِبْتَهَجَ بِكَذَا کسی چیز پر اس قدر خوش اور مسرور ہونا کہ چہرہ پر خوشی کے آثار ظاہر ہو جائیں۔اَبْهَجَهٗ خوش کرنا۔

ب ھ ل

اَلْبَهْلُ: (ف) اس کے اصل معنی کسی چیز کا اس حال میں ہونا ہے کہ اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے اسی سے اَلْبَاهِلُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پائے بند یا نشان لگائے بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے یا وہ اونٹنی جسے تھن باندھے بغیر چھوڑ دیا ہو، چنانچہ کسی عورت نے اپنے خاوند سے کہا: اَتَیْتُكَ بَاهِلًا غَیْرَ ذَاتِ صِرَارٍ کہ تمہیں پوری آزادی ہے جس طرح چاہو لطف اندوزی کرو اور اَلْبَاهِلُ

---

❶ قاله مجاهد وسعید بن جبیر (الطبرسی ۱۲: ۱۹۷).

❷ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

اونٹ کے ساتھ تشبیہ دے کر اَبْهَلْتُ فُلَانًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی کسی کو اس کی رائے اور ارادہ میں آزاد چھوڑ دینا کے ہیں۔

اَلْبَهْلُ وَالْاِبْتِهَالُ فِی الدُّعَاءِ ۔ کھل کر عاجزی سے دعا کرنا قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ﴾ (۳:٦١) پھر دونوں فریق (خدا سے) دعا و التجا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔

جن لوگوں نے یہاں اِبْتِهَال کے معنی لعنت کیے ہیں وہ محض اس بنا پر کیے ہیں کہ یہاں دعا لعنت کے لیے ہے [1] شاعر نے کہا ہے [2] ع (رمل)

(٦٨) نَظَرَ الدَّهْرُ اِلَيْهِمْ فَابْتَهَلْ

یعنی زمانہ ان کی طرف تیزی سے چلا اور انھیں فنا کر دیا۔

ب ھ م

اَلْبُهْمَةُ: کے معنی ٹھوس چٹان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر بہادر آدمی کو بُهْمَة کہا جاتا ہے نیز ہر وہ حسی یا عقلی چیز جس کا عقل و حواس سے ادراک نہ ہو سکے اسے مُبْهَمٌ کہا جاتا ہے۔

اَبْهَمْتُ كَذَا: مبہم کرنا اس کا مطاوع اِسْتَبْهَمَ ہے۔

اَبْهَمْتُ الْبَابَ دروازے کو اس طرح بند کرنا کہ کھل نہ سکے۔

اَلْبُهَيْمَةُ: چوپایہ، جانور کیونکہ اس کی صورت مبہم ہوتی ہے۔ مگر عرف میں درند اور پرند کے علاوہ باقی جانوروں کو بہیمۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ (۵:۱) تمہارے لیے چارپائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔

لَيْلٌ بَهِيْمٌ: سیاہ رات فَعِيْلٌ بمعنی مُفْعَلٌ ہے اور تاریکی کے باعث اس کا معاملہ بھی چونکہ مبہم ہوتا ہے اس لیے اسے بَهِيْمٌ کہا جاتا ہے یا فَعِيل بمعنی مُفْعِلٌ کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ بَهِيْمٌ یک رنگ گھوڑا جس کی اچھی طرح پہچان نہ ہو سکے اسی سے ایک روایت میں ہے۔ [3]

(۴۱) يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بُهْمًا کہ قیامت کے دن لوگ ننگے بدن اٹھیں گے، بعض نے کہا ہے کہ دنیاوی زیب و زینت اور آرائش سے عاری ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

اَلْبَهْمُ: بھیڑ بکری کے بچے۔ واحد بَهْمَةٌ۔ اَلْبُهْمٰى: ایک قسم کی گھاس جس کے پیچدار ہونے کی وجہ سے اس کی جڑیں معلوم نہیں ہو سکتیں کہ کہاں ہیں اَبْهَمَتِ الْاَرْضُ: زمین میں بَهْمٰی گھاس کا بکثرت ہونا۔ جیسا کہ اَعْشَبَتْ وَاَبْقَلَتْ کے معنی گھاس اور سبزی کے بکثرت ہونے کے ہیں۔

ب و ب

اَلْبَابُ: ہر چیز میں داخل ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

---

[1] قال ابو عبيدة فی مجازة (۱: ۹٦) ثُمَّ نبتهل ای نلتعن يقال ماله بها اللّه ويقال عليه بهلة اللّه راجع ايضاً الكشاف والقرطبی ٤: ١٠٥.

[2] هذا عجزبيت لبيد وصدره فی قوم سادة من قومه انظر ديوانه ص ١٨٠ طبع ليدن ١٨٩١ء والبيت مما استشهد به الطبری فی تفسيره : ۳: ۲۹۸) واماليٰ المرتضى (۱: ٤٥) والبحر: ۲/ ٤٧٠).

[3] وتمام الحديث حفاة ،عراة بهما راجع الفائق ١ : ٦٤ والنهاية واللسان (بهم) ومعنىٰ البهم صحيحة الاعضاء كما فی النهاية.

دراصل امکنہ: جیسے شہر، مکان، گھر، وغیرہ میں داخل ہونے کی جگہ کو باب کہتے ہیں۔اس کی جمع اَبْوَاب ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ ﴾ (۱۲:۲۵) اور دونوں دروازوں کی طرف بھاگے اور عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے (پکڑ کر جو کھینچا تو) پھاڑ ڈالا۔اور دونوں کو دروازوں کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

﴿ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ﴾ (۱۲:۶۷) ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔اور اسی سے (مجازاً) علم میں بَابُ كَذَا کا محاورہ ہے۔نیز کہا جاتا ہے: هٰذَا الْعِلْمُ بَابٌ اِلٰى عِلْمٍ كَذَا کہ یعنی یہ علم فلاں علم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا: ❶

(۴۲) اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا ...... یعنی میں علم کا شہر ہوں۔اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے ❷ (رجز)

(۶۹) اَتَيْتَ الْمَرُوْءَةَ مِنْ بَابِهَا

تم نے جوانمردی کو اسی کی جگہ سے حاصل کیا۔

﴿ فَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ (۶:۴۴) تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

﴿ لَهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ ﴾ (۵۷:۱۳) جس میں ایک دروازہ ہوگا جو اس کی جانب اندرونی ہے، اس میں تو رحمت ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اَبْوَابِ جَنَّة اور ابواب جہنم سے مراد وہ باتیں ہیں جو ان تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ اُدْخُلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ ﴾ (۳۹:۷۲) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

﴿ حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ﴾ (۳۹:۷۳) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو اس کے داروغے ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام۔

اور جو چیز کسی کام کے لیے صلاحیت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ هٰذَا مِنْ بَابَةِ كَذَا۔ کہ یہ اس کے مناسب ہے۔اس کی جمع بَابَات ہے۔خلیل کا قول ہے کہ بَابَةٌ کا لفظ حدود (اور حساب میں) استعمال ہوتا ہے۔ ❸

بَوَّبْتُ بَاباً۔ میں نے دروازہ بنایا۔

اَبْوَابٌ مُبَوَّبَةٌ: بنے ہوئے دروازے، قائم کیے ہوئے

---

❶ مروی عن علیؓ فی الترمذی وابن عباس مرفوعاً فی المستدرك وقال صحیح الاسناد وذکرہ ابن الجوزی فی الموضوعات واوردہ السیوطی فی اللالئی واستوعب طرقہ وذکرنقود العلماء علی هذاالحدیث راجع (۱: ۳۲۹-۳۳۶) وفی تخریج الاحیاء للعراقی (۲ : ۱۹۰) قال ابن حبان لااصل له وقال ابن ظاهر موضوع هذافی الفتح الکبیر (۱ : ۲۷۶) عق ،عد، طب ،ك ـعن ابن عباس (عد،ك،) عن جابر وفی الترمذی عن علیؓ انا دار الحکمة وعلی بابهاوقال غریب.

❷ قدمرفی (اتی)

❸ قال المتنبی : وبابة كل غلام عتیٰ

دروازے۔ اَلْبَوَّابُ: دربان۔ تَبَوَّبْتُ بَابًا: میں نے دروازہ بنایا۔

بَابٌ اصل میں بَوَبٌ ہے اور اس میں الف واؤ سے مبدل ہے۔

ب و ر

اَلْبَوَار: (ن) اصل میں بَارَ الشیئ یبور، بَوْرًا وَبَوَارًا کے معنی کسی چیز کے بہت زیادہ مندا پڑنے کے ہیں اور چونکہ کسی چیز کی کساد بازاری اس کے فساد کا باعث ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ کَسَدَ حَتّٰی فَسَدَ۔ اس لیے بَوَار بمعنی ہلاکت استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴾ (۲۹:۳۵) اس تجارت (کے فائدے) کے جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔

﴿ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ﴾ (۱۰:۳۵) اور ان کا مکر نابود ہوجائے گا۔

ایک روایت میں ہے ❶ (۴۳) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ بَوَارِ الْاَیِّمِ: کہ ہم بیوہ کے مندا پن سے پناہ مانگتے ہیں یعنی یہ کہ اس کے لیے کہیں سے پیغام نکاح نہ آئے۔

﴿ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴾ (۲۸:۱۴) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر اتارا۔

رَجُلٌ حَائِرٌ بَائِرٌ مرد سرگشتہ خودرائے۔

جمع کے لیے حُوْرٌ بُوْرٌ کہا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ حَتّٰی نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا ﴾ (۱۸:۲۵) یہاں تک کہ وہ تیری یاد کو بھول گئے اور یہ ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

میں بُوْرٌ بَائِرٌ کی جمع ہے ❷ بعض نے کہا ہے کہ بُوْر مصدر ہے اور واحد و جمع دونوں کی صفت واقع ہوتا ہے، جیسے: رَجُلٌ بُوْرٌ وَقَوْمٌ بُوْرٌ۔ شاعر نے کہا ہے ❸ ع

(۷۰) یَا رَسُوْلَ الْمَلِیْكِ اِنَّ لِسَانِیْ
رَاتِقٌ مَا فَتَقْتُ اِذَا اَنَا بُوْرٌ

اے اللہ کے رسول! جو گناہ میں نے کفر کی حالت میں کئے اب ان سے تائب ہوتا ہوں۔

بَارَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کے اصل معنی نر شتر کا مادہ کو یہ معلوم کرنے کے لیے سونگھنا کہ آیا حاملہ ہے یا نہیں اور استعارۃ کسی چیز کا امتحان کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: بُرْتُ كَذَا میں نے فلاں چیز کو آزما دیکھا۔

ب و ء

اَلْبَوَاءُ کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزا کا مساوی

---

❶ انظر للحديث، للسان (بور) والنهاية ۱: ۹۸ و غريب القرآن للقتبى ۳۱۱ والصغير للطبرانى ۲۱۸ وفيه تفرد وفى كنزالعمال ۲: رقم ۲۲۳۸ عن ابن عباس (ز،ن) و ۲۱۸۳ عن مجاهد مرفوعا.

❷ وقال تعالىٰ: وكنتم قوماً بوراً (الفتح ۱۲) اى هلكى عن ابن عباس ومجاهد وغير واحد وقيل قوماً فاسدين عن قتادة (الطبرى: ۵۹/۲۶) وابن كثير (۴: ۱۸۹).

❸ قاله عبدالله بن الزبعرىٰ السهمى القرشى وفى اللسان (بور) اَلْاِلٰهِ بدل المليك والبيت من كلمة قالها حين قدم على النبى صلى الله عليه وسلم مسلماو كان هاربا من فى النجران قال السهيلى (فتقت) اى فى الدين فكل اثم فتق و كل توبة رتق۔ اوانابو ريريداذا انا كافر ها لك اھ راجع الروض ۲: ۲۷۹) والموتلف ۱۳۲ والسمط ۳۸۸۔ ۳۹۰، ۸۳۳ واصلاح المنطق ۱۲۵ والسيرة (جوتنجن ۸۲۷) والطبرى (۱۳: ۳۰/۱۳۰: ۲۶۶) وتاريخ الطبرى (۲: ۳۳۹) فى اربعة ابيات وفى (۳: ۱۲۲) والجمهرة (۱: ۲۵۸) والقرطبى (۱۳۔۱۱) والطبرسى (۲۶: ۵۸) واللسان والتاج والمقاييس (بور) ومجاز القرآن لابى عبيدة (۱: ۳۴۰ رقم ۳۹۰) والاتباع لابى الطيب ۲۳ والمخصص (۳: ۴۸) والاغانى (۱: ۳۳/۱۷: ۳۰) والامالى (۲: ۲۱۰) والاقتضاب ۱۱ وانشريسى (۲: ۳۱۸) وابن خالويه ۲۳ وغريب القرآن للقتبى ۳۱۱ وشرح السبع لابن الانبارى ۳۸۹، ۵۹۴، واسد الغابة (۳: ۱۶۰) فى ستة ابيات.

(اور سازگار موافق) ہونے کے ہیں۔ یہ نَبْوَۃٌ کی ضد ہے جس کے معنی اجزاء کی ناہمواری (ناسازگاری) کے ہیں۔ لہٰذا مَکَانٌ بَوَاءٌ اس مقام کو کہتے ہیں۔ جو اس جگہ پر اترنے والے کے سازگار اور موافق ہو۔

بَوَّأْتُ لَہٗ مَکَانًا: میں نے اس کے لیے جگہ کو ہموار اور درست کیا اور تَبَوَّأْتُ اس کا مطاوع ہے، جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْہِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا ﴾ (۸۷:۱۰) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ۔

﴿ وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ ﴾ (۹۳:۱۰) اور ہم نے بنی اسرائیل کے رہنے کو عمدہ جگہ دی۔

﴿ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ﴾ (۱۲۱:۳) ایمان والوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کرنے لگے۔

﴿ یَتَبَوَّاُ مِنْہَا حَیْثُ یَشَآءُ ﴾ (۵۶:۱۲) وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے، رہتے تھے۔

ایک روایت میں ہے ❶ (۴۵) اِنَّہٗ کَانَ عَلَیْہِ السَّلَامُ یَتَبَوَّأُ لِبَوْلِہٖ کَمَا یَتَبَوَّأُ لِمَنْزِلِہٖ ۔ کہ آنحضرت ﷺ پیشاب کرنے کے لیے ہموار اور مناسب جگہ تلاش کرتے، جیسے کوئی شخص اقامت کے لیے جگہ تلاش کرتا ہے۔

بَوَّأْتُ الرُّمْحَ: میں نے مناسب جگہ پر نیزہ مارا۔ ایک حدیث میں ہے: ❷

مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ ۔ جو عمداً مجھ پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ الراعی نے اونٹوں کی صفت میں کہا ہے۔ ❸

(۷۱) لَہَا اَمْرُہَا حَتّٰی اِذَا مَا تَبَوَّأَتْ
بِاَخْفَافِہَا مَأْوٰی تَبَوَّأَ مَضْجَعًا

یعنی چرواہا اونٹ چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ چرنے کے لیے جگہ ہموار پالیتے ہیں تو وہ اپنی آرام گاہ پر آکر سو جاتا ہے۔

اور تَبَوَّأَ فُلَانٌ (کنایہ) کے معنی نکاح کرنے کے ہیں جیسا کہ بَنٰی بِاَھْلِہٖ وغیرہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بَوَاءٌ کا لفظ مصاہرت یا قصاص میں برابر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانٌ بَوَاءٌ لِفُلَانٍ۔ وہ فلاں کا ہمسر ہے یعنی رشتۂ مصاہرت میں اس کا کفو ہے یا قصاص میں اس کے مساوی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ﴾ (۱۶:۸) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی جگہ پر اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب یعنی عقوبت ہے۔ تو یہاں بِغَضَبٍ موضع حال میں ہے، جیسے خَرَجَ بِسَیْفِہٖ میں ہے اور مَرَّ بِزَیْدٍ کی طرح مفعول نہیں ہے۔ اور بِغَضَبٍ پر باء لاکر

---

❶ رواہ فی (طس۔عن ابی ھریرۃ) راجع کنزالعمال (۱۷ رقم ۱۹۶).

❷ من حدیث ابی ھریرۃ رواہ احمد ۲: ۵۰۱ رقم ۱۵۲۰ وابن ماجۃ ۱: ۱۰ والحدیث باختلاف الفاظہ فی مسلم ۱: ۵ والحاکم ۱: ۱۰۲۔۱۰۳ اور مسند احمد رقم ۸۲۴۹ و ۸۷۶۱ و ۹۳۰۵، ۹۳۳۹، ۱۰۰۵۷ و ۲۰۷۳۹ / ۳۲۱، ۳۶۵، ۴۱۰، ۴۱۳، ۴۶۹، ۵۱۹ والشافعی فی الرسالۃ ۱۰۹۱ راجع لتخریجہ ایضاً کنزالعمال ۳: ۳۵۵۔ ۳۵۷ رقم ۳۱۰۵، ۳۱۱۰ ولاتحد فی غیرہ.

❸ قالہ الراعی واسمہ عبیدبن حصین بن معاویۃ من بنی غیر یکنی اباجندل شاعر اسلامی وقبلہ: خذااھل ان یتبع الریح مرۃ یدعھا ویخف الصوت حتیٰ ترفعھا راجع للبیت اللاٰلی ۵۰ السمط ۷۶۵ والامالی ۲: ۱۳۷) وفی روایۃ لاخفافھا مرعیً بدل باخفافھا ماوی وامالی المرتضیٰ (۱: ۳۲۲) والفائق ۱: ۲۲۴) فیہ قصۃ الشعبی مع السائل حین سئل عن رجل لطم عین رجل فشرقت بالام فقال البیت فضربہ مثلاً للعین المضروبۃ ای لادیۃ فیھا حتیٰ یذھب ضوئھا.

تنبیہ کی ہے کہ موافق جگہ میں ہونے کے باوجود وہ غضب الٰہی میں گرفتار ہے تو ناموافق جگہ میں بـاالاولیٰ اس پر غضب ہوگا۔ لہٰذا یہ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ کی مثل ہے اور آیت کریمہ: ﴿ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ ﴾ (۲۹:۵) میں تبوءَ بـاِثْمِیْ کے معنی یہ ہیں کہ تو اس حالت کے ساتھ ہمیشہ رہے۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (طویل)

(۷۲) اَنْکَرْتُ بَاطِلَهَا وَبؤتُ بِحَقِّهَا

میں نے اس کے باطل کا انکار کیا اور اس کے حق پر اقرار کیا۔

جن لوگوں نے اس کے معنی اقررتَ بـحقھـا (یعنی اس کے حق کا اقرار کیا) کیے ہیں تو یہ تفسیر مقتضیٰ لفظ کے مطابق نہیں ہے۔ اَلْبَاءَ ۃُ کنایہ از جماع خلف الاحمر سے منقول ہے کہ حَیَّاكَ اللّٰهُ وَبَیَّاكَ اللّٰهُ میں بَیَّاكَ اصل میں بَوَّءَكَ منزلاً ہے، جیسا کہ اٰتِیْتُهٗ الغَدَایَا وَالعشایا میں ہے۔ یعنی عشایا کی مناسبت سے غدایا کہا جاتا ہے۔

ب ی ت

اَلْبَیْتُ: اصل میں "بیت" کے معنی انسان کے رات کے ٹھکانہ کے ہیں۔ کیونکہ بَـاتَ کا لفظ رات کو کسی جگہ اقامت کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے ظَـلَّ کے معنی دن گزارنے کے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ مطلق مسکن اور مکان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے، عام اس سے کہ وہ مٹی یا پتھر سے بنایا گیا ہو یا اون اور بالوں کا بنا ہوا ہے اس کی جمع بُیُـوت اور ابیَات آتی ہے مگر پہلی جمع مسکن کے لیے مختص ہے اور دوسری بیت بمعنی شعر کے ساتھ۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةٌۢ بِمَا ظَلَمُوْا ﴾ (۵۲:۲۷) یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب خالی پڑے ہیں۔

﴿ وَاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً ﴾ (۸۷:۱۰) اور اپنے گھروں کو قبلہ (یعنی مسجدیں) ٹھہراؤ۔

﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ ﴾ (۲۴:۲۷) دوسرے لوگوں کے گھر میں ...... داخل نہ ہوا کرو۔ اور تشبیہ کے طور پر ایک شعر کو بیت کہہ دیتے ہیں۔ اور ہر چیز کے مکان کو (مجازا) اس کا بیت کہا جاتا ہے۔

اور اَهْلُ الْبَیْتِ کا لفظ آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں متعارف ہو چکا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (۴۱) سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَیْتِ (سلمان ہمارے اہل بیت سے ہے) فرما کر متنبہ کر دیا ہے ❷ کہ غلام کی نسبت اس کے آقا کی طرف ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے ❸ (۴۶) مَوْلَی الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَابْنُهٗ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ کہ کسی قوم کا غلام انہی میں سے ہے اور اس کا لڑکا بھی ان ہی سے ہے۔

بَیْتُ اللّٰهِ وَالْبَیْتُ الْعَتِیْقِ: کعبہ۔ قرآن میں ہے: ﴿ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴾ (۲۲:۲۹) اور

---

❶ قاله لبيدوعجزه: عندى ولم بفخرعلى كرامها - والبيت فى اللسان والتاج والصحاح (بوء).

❷ الحديث رواه الطبرانى فى الكبير والحاكم فى المستدرك عن عمروبن عوف الفتح الكبير ٢: ١٥٩.

❸ وفى روايته من انفسهم راجع له (حم، د، ن، حب، ك، ت) عن ابى رافع دخ - عن انس واحمد من حديث عتبة بن غزوان وابى موسىٰ والطبرانى من حديث ابى سعيد فتح البارى ٥: ٤٣١ وطب - عن مولىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم وطب والبيهقى - عن ابن عباس والبغوى والباوردى وابن عساكر عن طهمان مولىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم كنزالعمال ٦: ١٩٢٨, ١٩٣٥، ١٩٣٧، ١٩٤٢، ١٩٥١ واماالفظه وابنه من انفسهم فلم احدها فى شيئى من المراجع.

خانہ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ ﴾ (۹۶:۳) پہلا بیت جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔

﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ ﴾ (۱۲۷:۲) اور جب ابراہیم علیہ السلام ...... بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ﴾ (۱۸۹:۲) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ (احرام) کی حالت میں گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔

ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو احرام کے بعد اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہونے سے پرہیز کرتے اور اسے احرام کے منافی سمجھتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں متنبہ فرمایا کہ اس قسم کی رسوم بِر کے منافی ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ...... ﴾ (۲۳:۱۳،۲۴) اور فرشتے (بہشت کے) ہر ایک دروازے سے ان کے پاس آئیں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو۔

میں "مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ" سے ہر قسم کی مسرتیں مراد ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿ فِىْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ ﴾ (۳۶:۲۴) ان گھروں میں (ہے) جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلند کیے جائیں۔

میں بقول بعض اس سے بیوت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔جیسا کہ آیت:

﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ ﴾ (۵۳:۳۳) پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو، مگر اس صورت میں کہ تم کو اجازت دی جائے۔میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ فِىْ بُيُوْتٍ سے آپ کے اہل بیت اور قوم مراد ہے۔اور بعض کے نزدیک قلب یعنی دل کی طرف اشارہ ہے۔بعض حکماء نے حدیث [1] (۴۷) لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَّلَا صُوْرَةٌ کے تحت لکھا ہے کہ یہاں بیت سے مراد دل اور کلب سے مراد حرص ہے۔کیوں کہ كَلِبَ فُلَانٌ کے معنی بہت زیادہ حرص کرنے کے ہیں اور کتا حرص میں ضرب المثل ہے۔جیسا کہ کہا جاتا ہے فُلَانٌ اَحْرَصُ مِنَ الْكَلْبِ (فلاں کتے سے زیادہ حریص ہے) اور آیت: ﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ ﴾ (۲۶:۲۲) جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے خانہ کعبہ کو مقرر کیا۔

میں مَكَانَ الْبَيْتِ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿ رَبِّ ابْنِ لِىْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِى الْجَنَّةِ ﴾ (۱۱:۶۶) اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔میں جنت میں گھر بنانے کے معنی یہ ہیں کہ جنت میں داخل ہونا میرے لیے آسان کردے۔اور آیت کریمہ:

﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً ﴾ (۸۷:۱۰) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی

---

[1] متفق علیه من حدیث ابی طلحة زیدبن سهل الانصاری وابن ماجة من حدیث علیؓ ایضاً فی سنن ابی داؤد والنسائی وزوائد ابن حبان رقم: ٤٨٤ لکن بزیادة لفظ "ولاجنب" وهذه الزیادة وردت بطرق ضعاف عون المعبود ١: ٩٠.

کہ اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ ٹھہراؤ۔ میں گھروں کو قبلہ ٹھہرانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر مسجد اقصیٰ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ (۵۱:۳۶) اور اس میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

میں ایک گھر سے ایک خاندان مراد ہے جو ایک گھر میں سکونت پذیر تھے۔ جیسا کہ قریہ بول کر اہل قریہ مراد لیے جاتے ہیں۔

اَلْبَيَاتُ وَالتَّبْيِيْتُ کے معنی رات میں دشمن پر حملہ کرنے یعنی شبخون مارنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰى اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُوْنَ﴾ (۷:۹۷) کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو واقع ہو اور وہ (بے خبر) سو رہے ہوں۔ ﴿ بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَائِلُوْنَ ﴾ (۷:۴) (رات کو) آتا تھا جب کہ وہ سوتے تھے یا (دن کو) جب وہ قیلولہ (یعنی دن کو آرام) کرتے تھے۔

اَلْبُيُوْتُ: وہ معاملہ جس پر رات بھر غور و خوض کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ ﴾ (۴:۸۱) ان میں بعض لوگ رات کو مشورے کرتے ہیں۔

اور بَيَّتَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں رات کے وقت کسی کام کی تدبیر کرنا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ﴾ (۴:۱۰۸) حالانکہ جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کیا کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے ❶ (۴۸) لَا صِيَامَ لِمَنْ لَّمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ مِنَ اللَّيْلِ. کہ جو شخص رات سے روزہ کی پختہ نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ اور بَاتَ فُلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا کے معنی رات بھر کوئی کام کرنا کے ہیں جیسا کہ ظَلَّ کے معنی دن بھر کام کرنا آتے ہیں اور یہ دونوں افعال عادات سے ہیں۔ ❷

ب ی د

بَادَ (ض) الشَّيْءُ يَبِيْدُ بَيَادًا کے اصل معنی بَيْدَاءَ یعنی بیابان میں کسی چیز کے متفرق اور پراگندہ ہونے کے ہیں اور اسی اعتبار سے کامل تباہی اور بربادی کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴾ (۱۸:۳۵) کہ میں خیال نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو۔

اَلْبَيْدَاءُ کے معنی لق و دق صحراء کے ہیں اس کی جمع بِيْدٌ ہے اور مادہ خروشی کو اَتَانٌ بَيْدَانَةٌ کہا جاتا ہے۔

ب ی ض

اَلْبَيَاضُ: سفیدی۔ یہ سَوَادٌ کی ضد ہے۔ کہا

---

❶ والحديث بلفظه في النسائي عن حفصة راجع تخريج الكشاف ۲۱ والفائق ۱: ۳۳ رفع روايته لمن لم يبيت واصحاب السنن من حديث حفصة بلفظ "لمن لم يجمع" وباختلاف الفاظه في (ن ـ عن حفصة) قطء هق عن عائشة وبمعناه في (ھ ، حم ، ۳، عن حفصة .

❷ في المطبوع ههنا اعوجاج والتسديد من المراجع.

جاتا ہے: اِبْيَضَّ، اِبْيِضَاضًا وَبَيَاضًا فَهُوَ مُبْيَضٌّ. قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ (۱۰۶:۳)

جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ۔

﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ (۱۰۷:۳)

اور جن کے منہ سفید ہوں گے۔

اور اَبْيَض کے ایک رگ کا نام بھی ہے جو سفید رنگ ہونے کی وجہ سے ابیض کہلاتی ہے۔

اہل عرب کے ہاں چونکہ سفید رنگ تمام رنگوں میں بہتر خیال کیا جاتا تھا، جیسے کہا گیا ہے: اَلْبَيَاضُ اَفْضَلُ وَالسَّوَادُ اَهْوَلُ وَالْحُمْرَةُ اَجْمَلُ وَالصَّفْرَةُ اَشْكَلُ اس لیے بیاض بول کر فضل وکرم مراد لیا جاتا ہے اور جو شخص ہر قسم کے عیب سے پاک ہو اسے اَبْيَضُ الْوَجْهِ کہا جاتا ہے، اس بنا پر آیت مذکورہ میں اِبْيِضَاضُ الْوُجُوْهِ سے مسرت اور اِسْوِدَاد الوجوہ سے غم مراد ہوگا، جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا﴾ (۵۸:۱۶) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے۔

اور جیسے اِبْيِضَاضُ الْوُجُوْه خوشی سے کنایہ ہوتا ہے، اسی طرح آیت:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ﴾ (۲۲:۷۵) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔ اور آیت: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ﴾ (۳۸:۸۰) اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے اور خوش اور مسرور نظر آئیں گے۔ میں بھی نَضْرَة اور اِسْفَار سے مراد مسرت ہی ہوگی۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (منسرح)

(۷۲) أُمُّكَ بَيْضَاءُ مِنْ قُضَاعَةَ

یعنی تم عفیف اور سخی سردار ہو۔

اسی معنی میں فرمایا:

﴿بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ﴾ (۴۶:۳۷) جو رنگ کی سفید اور پینے والوں کے لیے (سراسر) لذت ہوگی۔

اَلْبَيْضُ: یہ بَيْضَةٌ کی جمع ہے اور انڈے کے سفید ہونے کی وجہ سے اسے بَيْضَة کہا جاتا ہے۔ انڈا سفید اور پروں کے نیچے محفوظ رہتا ہے، اس لیے تشبیہ کے طور بَيْضَةٌ بول کر خوبصورت عورت مراد لی جاتی ہے۔ بَيْضَةَ الْبَلَدِ ❷ یہ لفظ تعریف اور مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب کلمہ تعریفی ہو تو اس سے رئیس شہر مراد ہوتا ہے۔

اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے: ❸ (کامل)

(۷۳) كَانَتْ قُرَيْشٌ بَيْضَةً فَتَفَلَّقَتْ

---

❶ قاله ابن قيس المرقيات وتمامه ......في الـ ......بيت الذى يستظل فى طبنه ـ راجع اللسان (بيض) وشرح ديوان زهير ٥٢ وديوانه ٨٣ واضداد ابى الطيب ١٣ بغير عزو وذكربعضهم تكملته .... قد تمت لها الوالدات والنضد ـ راجع معانى الكبير للقتبى ٥٤٣ والمرزوقى ١٥٠ وفيه يستكن بدل يستظل وفى ص ٤١٩ عزاه فى حواشى المرزوقى لابن قيس الرقيات والشاهدايضاً.

❷ مثل عند الجرجانى ١٠٩ والعسكرى ٦٢ : ١٦٤ والميدانى ١ : ٨٤،٦٤، ٨٧ والكلام عليه مستوفى فى الاضداد لابن الانبارى ٦٤ والسجتانى ١١٧ وذكره فى السمط كلاالمعنيين ٥٤٩ .

❸ البيت فى اللسان والتاج والصحاح (مح) والسيرة (١ : ٩٤) وابن ابى الحديد (٣ : ٤٥٣) والعينى (٤ : ١٤٠) منسوب الى ابن الزبعرى وفى اكثر الروايات فالخ (بالمهملة) وفى رواية اللسان وحدها "خالصها" راجع الامالى المرتضىٰ ٢ : ٨ و٢٦٨ ونسبه الى مطر وبن كعب الخزاعى وفى ٥٤٩ وذكرقصة وتاريخ الطبرى ٢ : ١٤) فى ترجمة ابن عبدمناف واضداد ابن الانبارى ٧٨ وابى الطيب ٥٥ والتنبيه للبكرى ٧٥ ومثله لحسان بن ثابت (ديوانه ١١٤ طبعه دارصادر) لكن فيه عبدالداربدل عبدمناف ١٢.

فَالْمُخُّ خَالِصَةٌ لِعَبْدِ مُنَافٍ

قریش ایک انڈے کی مثل تھے۔ جو ٹوٹا تو عبد مناف کے حصہ میں خالص مخ آئی۔

اور جب مذمت کے لیے استعمال ہو تو اس سے ذلیل آدمی مراد لیا جاتا ہے، جیسے جنگل میں پڑے ہوئے انڈے کی طرح ہر ایک توڑ سکتا ہے اور شکل و رنگ میں مشابہت کی وجہ سے خصیتین کو بَیضَتَا الرَّجُل کہا جاتا ہے۔ بَاضَتِ الدَّجَاجَۃِ: مرغی کا انڈے دینا۔ بَاضَ کَذَا: کسی جگہ پر متمکن ہونا۔ شاعر نے کہا ہے ❶

(۷۴) بَدَا مِنْ ذَوَاتِ الضِّغْنِ یَأْوِیْ
صُدُوْرُھُمْ فَعَشَّ ثُمَّ بَاضَ

بَاضَ الْحَرُّ: گرمی سخت ہونا۔

بَاضَتْ یَدُ الْمَرْءَۃِ: عورت کے ہاتھ پر انڈے کی طرح ورم ہونا۔ دَجَاجَۃٌ بَیُوْضٌ وَدَجَاجٌ بُیُوْضٌ انڈے دینے والی مرغی ج بُیُّضٌ .

ب ی ع

اَلْبَیْعُ کے معنی بیچنے اور شِرَاءُ کے معنی خریدنے کے ہیں۔ لیکن یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور یہ قیمت اور مبیع کے لحاظ سے ہوتا ہے، اسی معنی میں فرمایا: ﴿ وَشَرَوْہُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاھِمَ ﴾ (۱۲:۲۰) اور اس کو تھوڑی سی قیمت (یعنی) معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا۔ اور آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا ❷ (۴۶)

لَا یَبِیْعَنَّ اَحَدُکُمْ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْہِ کہ کوئی اپنے بھائی کی خرید پر خرید نہ کرے۔

اَبَعْتُ الشَّیْءَ: کسی چیز کو بیع کے لیے پیش کرنا۔ شاعر نے کہا ہے ❸ (کامل)

(۷۵) فَرَسًا فَلَیْسَ جَوَادُنَا بِمُبَاعٍ

یعنی ہم عمدہ گھوڑی فروخت کے لیے پیش نہیں کریں گے۔

اَلْمُبَایَعَۃُ وَالْمُشَارَۃُ: خرید و فروخت کرنا۔

﴿ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو ﴾ (۲:۲۷۵) حالانکہ سودے کو خدا نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

﴿ وَذَرُوا الْبَیْعَ ﴾ (۹:۶۲) اور (خرید و فروخت ترک کردو)۔ ﴿ لَا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلَالٌ ﴾ (۱۴:۳۱) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا نہ دوستی (کام آئے گی)

بَایَعَ السُّلْطَانَ (بادشاہ کی بیعت کرنا) اس قلیل مال کے عوض جو بادشاہ عطا کرتا ہے اس کی اطاعت کا اقرار کرنا۔ اس اقرار کو بَیْعَۃٌ یا مُبَایَعَۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ﴾ (۹:۱۱۱) تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو۔ میں بیعت رضوان کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ ﴾ (۴۸:۱۸) (اے پیغمبر) جب

---

❶ لم اجدہ فی المراجع.

❷ رواہ مسلم عن ابی هريرة ط، خ، ف، ہ، عن ابن عمرو عنہ ایضاً حم، ق، د، ت .

❸ واولہ فرضیت آلاء الکمیت فمن یبع ۔ والبیت فی اللسان (بیع) والاقتضاب ۴۰۵ واصلاح یعقوب ۲۳۵ وحواشی المقاییس ۱ : ۲۷) قالہ اجدع بن مالك الهمدانی وفی روایة اذلاء الکمیت بدل آلاء لکمیت وراجع لترجمة الشاعر الاشتقاق (۲ : ۴۲۵ و المؤتلف ۶۱.

مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ﴾ (۹:۱۱۱) میں پایا جاتا ہے۔

اَلْبَاعُ: (دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار جو تقریباً ۶ فٹ ہوتی ہے) یہ مادہ واوی سے ہے کیونکہ بَاعَ فِی السَّيْرِ يَبُوْعُ کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی گھوڑے کے لمبے لمبے قدم رکھنا کے ہیں۔ ❶

ب ی ل

اَلْبَالُ: اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس کی فکر یا پرواہ کی جائے اور یہ مَا بَالَيْتُ بِكَذَا بَالَةً کے محاورہ سے مشتق ہے، جس کے معنی پرواہ نہ کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ﴾ (۴۷:۲) ان سے ان کے گناہ دور کر دیئے اور ان کی حالت سنوار دی۔ ﴿فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى﴾ (۲۰:۵۱) تو پہلی جماعتوں کا کیا حال ہے ❷ اور انسان کے دل اور دل میں گذرنے والے خیال کو بھی بَالٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:

خَطَرَ كَذَا بِبَالِىْ . میرے دل میں یہ بات کھٹکی۔

ب ی ن

اَلْبَيْنُ کے معنی دو چیزوں کا درمیان اور وسط کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا﴾ (۱۸:۳۲) اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔

محاورہ ہے بَانَ كَذَا کسی چیز کا الگ ہو جانا اور جو کچھ اس کے تحت پوشیدہ ہو، اس کا ظاہر ہو جانا۔ چونکہ اس میں ظہور اور انفصال کے معنی ملحوظ ہیں اس لیے یہ کبھی ظہور اور کبھی انفصال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور گہرے کنویں کو بَيُوْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ پانی نیچے اتر جانے کے سبب اس سے پانی نکالتے وقت رسی کو ہاتھ سے جدا کرنا پڑتا ہے، تو اس میں انفصال کا معنی ملحوظ ہے۔

بَانَ الصُّبْحُ: صبح نمودار ہوگئی اور آیت کریمہ: ﴿لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ﴾ (۶:۹۵) آج تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہوگئے۔

میں بَيْنَ کے معنی رشتہ اور تعلق کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ تمہارے اموال، قبیلہ اور اعمال جن پر تم اعتماد کرتے تھے۔ سب ضائع ہوگئے جس کی طرف کہ آیت: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنٌ﴾ (۲۶:۸۸) جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے اور یہی معنی آیت:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى﴾ (۶:۹۴) ایسے ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے۔ کے ہیں۔ واضح رہے کہ لفظ بَيْنَ کبھی اسم بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی ظرف۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں دو قراءتیں ہیں جو اسے اسم قرار دیتے ہیں وہ بَيْنُكُمْ (بضمہ نون) پڑھتے ہیں اور جن کے نزدیک ظرف ہے وہ بَيْنَكُمْ (بفتح نون) پڑھتے ہیں اور ظرف غیر متمکن ہونے کی بنا پر اسے مفتوح رہنے دیتے ہیں ❸ چنانچہ آیات:

---

❶ وایضاً البیعة معبد النصاری ۔ لَهُدِّمَتْ صوامعُ وَبِيَعٌ (۲۲ : ۴۰) .

❷ وایضاً فَمَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ (۱۲ : ۵۰) .

❸ قرأة الرفع منسوب الی حمزة الکوفی احد القراء السبعة والفتح قراء ة نافع والکسائی وحفص (راجع اضداد ابی الطیب (۸۳ وبحر المحیط لابی حیان ۴ : ۱۸۲).

﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (۴۹:۱) (کسی بات کے جواب میں) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔ ﴿ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ﴾ (۵۸:۱۲) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ﴾ (۳۸:۲۲) تو آپ ہم میں انصاف کا فیصلہ کر دیجیے۔ ﴿ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ﴾ (۴:۹۷) اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو۔ میں بَیْنَ ظرف واقع ہوا ہے اور آیت:

﴿ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا ﴾ (۱۸:۶۱) جب ان کے ملنے کے مقام پر پہنچے۔

میں بَیْنَ کا لفظ اسم ظرف بھی ہوسکتا ہے اور بمعنی مصدر بھی یعنی جب وہ ان کے الگ ہونے کے مقام پر پہنچے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ بَیْنَ کا لفظ یا تو وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں مسافت پائی جائے جیسے بَیْنَ الْبَلَدَیْنِ (دوشہروں کے درمیان) یا جہاں دو یا دو سے زیادہ چیزیں موجود ہوں۔ جیسے: بَیْنَ الرَّجُلَیْنِ بَیْنَ الْقَوْمِ اور واحد کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں بَیْنَ کو مکرر لانا ضروری ہوتا ہے۔ [1] جیسے فرمایا:

﴿ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ ﴾ (۴۱:۵) اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے۔

﴿ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا ﴾ (۲۰:۵۸) تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کرلو۔ اور کہا جاتا ہے: هٰذَا الشَّيْءُ بَيْنَ يَدَيْكَ: یعنی یہ چیز تیرے قریب اور سامنے ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:

﴿ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ ﴾ (۷:۱۷) پھر ان کے آگے..... (غرض ہر طرف سے) آؤنگا۔ ﴿ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا ﴾ (۱۹:۶۴) جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو پیچھے...... سب اسی کا ہے۔ ﴿ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا ﴾ (۳۶:۹) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنادی۔ اور ان کے پیچھے بھی۔

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ ﴾ (۵:۲۶) جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے۔

﴿ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ﴾ (۳۸:۸) کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے اور آیت کریمہ:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ (۳۴:۳۱) اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن کو مانیں گے اور نہ ان (کتابوں) کو جو اس سے پہلے کی ہیں۔ میں بَیْنَ یَدَیْهِ سے انجیل اور دیگر کتب سماویہ مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ﴾ (۸:۱) خدا سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔

کے معنی یہ ہیں کہ صلہ رحمی، قرابت، دوستی وغیرہ باہمی رشتوں کا لحاظ کرو جو باہم تم سب کے درمیان مشترک ہیں اور بَیْنَ کے بعد مَا یا الف کا اضافہ کرکے حین کے معنی

---

[1] اما آیۃ لانفرق بین احد من رسلہ ففیھا لفظۃ احد بمعنی الجمیع فلااعتراض (نووی ۱ : ۷).

میں استعمال کر لیتے ہیں ❶ جیسے بَیْنَمَا زَیْدٌ یَفْعَلُ کَذَا وَبَیْنَا نَفْعَل تو یعنی درآنحالیکہ زید یہ کام کر رہا تھا۔ شاعر نے کہا ہے ❷ ع (کامل)

(۷۶) بَیْنَا تَعَنُّقُهُ الْکُمَاةَ وَرَوْعَهُ
یَوْمًا اُتِیْحَ لَهٗ جَرِیٌّ سَلْفَعٗ

اس حال میں کہ وہ ایک روز بہادروں سے مقابلہ اور مرادغہ کر رہا تھا کہ اس کے لیے ایک دلیر بہادر مقصد ہو گیا۔

بَانَ وَاسْتَبَانَ وَتَبَیَّنَ کے معنی ظاہر اور واضح ہو جانے کے ہیں اور بَیَّنْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو ظاہر اور واضح کر دینے کے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَتَبَیَّنَ لَکُمْ کَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ ﴾ (۱۴:۴۵) اور تم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کس طرح (کا معاملہ) کیا تھا۔

﴿ وَقَدْ تَبَیَّنَ لَکُمْ مِنْ مَسَاکِنِهِمْ ﴾ (۲۹:۳۸) چنانچہ ان کے (ویران) گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ﴿ وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴾ (۶:۵۵) اور اس لیے کہ گنہگاروں کا رستہ ظاہر ہو جائے۔

﴿ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ﴾ (۲:۲۵۶) ہدایت صاف طور پر ظاہر (اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

﴿ قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ ﴾ (۳:۱۱۸) ہم نے تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دیں۔

﴿ وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ﴾ (۶۳:۴۳) نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم کو سمجھا دوں۔

﴿ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ﴾ (۱۶:۴۴) ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تا کہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو۔

﴿ لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ﴾ (۱۶:۳۹) تا کہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے۔

﴿ فِیْهِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ ﴾ (۳:۹۷) اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ ﴾ (۲:۱۸۵) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے، جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے۔

اور بیان کرنے والے کے اعتبار سے آیت کو مُبَیِّنَةٌ بھی کہا جاتا ہے، جیسے اٰیَةٌ مُبَیِّنَةٌ وَمُبَیِّنَاتٌ وَمُبَیَّنَاتٌ اَلْبَیِّنَةُ کے معنی واضح دلیل کے ہیں۔ خواہ وہ دلالت عقلیہ ہو یا محسوسہ اور شَاهِدَان (دو گواہ) کو بھی بَیِّنَة کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے ❸ (۴۷) اَلْبَیِّنَةُ عَلَی

---

❶ ویسمیٰ هذه الف الکافة وقال بعض مالکافة وقیل اشباع وبین مضافة الی الجملة (المغنی لابن هشام ۱ : ۴۱۱)

❷ قاله ابوذؤیب المخضرمی فی رثاء بنیه والشطر الاول فی المطبوع مصحف والتسدید من المراجع والبیت فی اللسان والتاج (بین) والمغنیٰ لابن هشام: رقم ۶۹۸ والسیوطی ۹۲۔۲۶۷ وفی روایتهم جمیعاً تعانقه والبیت فی الخزانة ۳ : ۱۸۳ والتبریزی شرح الحماسة (۴ : ۲۹۴ والمرزوقی ۱۷۸۴ واستشهد به الاصمعی وکثیر من النحاة بان لفظة بینا وبینما یاتیان للمفاجاة ولایلزم ان تقع بعدهما اذ او اذا بخلاف ماذهب الیه سیبویه راجع للبحث الکتاب لسیبویه والبیت ایضاً فی الاشباه النحویه ۱ : ۱۶۶) والجمهرة ۲۴۷ فی ۶۲ بیتاً ودیوان الهذ لیین (۱ : ۱۸) وشرح الدرة للخفاجی ۹۷۔

❸ رواه الترمذی عن ابن عمرو لکن لفظة والیمین علی المدعیٰ علیه وفی البیهقی وابن عساکر عن ابن عمر ۔علی من انکر (راجع الفتح الکبیر ۲ : ۲۰)۔

الْمُدَّعِی وَالْیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ. کہ مدعی پر گواہ لانا ہے اور مدعا علیہ پر حلف۔قرآن میں ہے:

﴿ اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ (۱۱:۱۷) بھلا جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل (روشن) رکھتے ہیں۔

﴿ لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ ۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ ۢ بَیِّنَةٍ ﴾ (۸:۴۲) تاکہ جو مرے بصیرت پر (یعنی یقین جان کر) مرے اور جو جیتا رہے وہ بھی بصیرت پر (یعنی حق پہچان کر) جیتا رہے۔

﴿ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ﴾ (۷:۱۰۱) ان کے پاس ان کے پیغمبر نشانیاں لے کر آئے۔

اَلْبَیَانُ کے معنی کسی چیز کو واضح کرنے کے ہیں اور یہ نطق سے عام ہے۔کیونکہ نطق انسان کے ساتھ مختص ہے اور کبھی جس چیز کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔اسے بھی بَیَانٌ کہہ دیتے ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ "بَیَانٌ" دو قسم پر ہے۔ایک بیان بِالتَّخْبِیْرُ یعنی وہ اشیاء جو اس کے آثار صنعت میں سے کسی حالت پر دال ہوں۔دوسرے بیان بالاختیار اور یہ یا تو زبان کے ذریعہ ہوگا اور یا بذریعہ کتابت اور اشارہ کے چنانچہ بیان حالت کے متعلق فرمایا:

﴿ وَلَا یَصُدَّنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ (۴۳:۶۲) اور (کہیں) شیطان تم کو (اس سے) روک نہ دے وہ تو تمہارا اعلانیہ دشمن ہے۔یعنی اس کا دشمن ہونا اس کی حالت اور آثار سے ظاہر ہے۔اور بیان بالاختیار کے متعلق فرمایا:﴿ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ﴾ (۱۶:۴۳،۴۴) اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔اور ان پیغمبروں (کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ﴾ (۱۶:۴۴) اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے وہ ان پر ظاہر کردو۔

اور کلام کو بیان کیا جاتا ہے کیونکہ انسان اس کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿ هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (۳:۱۳۸) یہ (قرآن) لوگوں کے لیے بیان صریح ہے۔اور مجمل ومبہم کلام کی تشریح کو بھی بیان کہا جاتا ہے۔جیسے:﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴾ (۷۵:۱۹) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

بَیَّنْتُهٗ وَاَبَنْتُهٗ کسی چیز کی شرح کرنا۔جیسے فرمایا:﴿ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ﴾ (۱۶:۴۴) تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے وہ ان پر ظاہر کردو۔

﴿ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴾ (۲۶:۱۱۵) کھول کر ڈرانے والا ہوں۔

﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ﴾ (۳۷:۱۰۶) بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔

﴿ وَلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ﴾ (۴۳:۵۲) اور صاف گفتگو بھی نہیں کرسکتا۔

﴿ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ ﴾ (۴۳:۱۸) اور جھگڑے کے وقت بات نہ کرسکے۔

❀❀❀

کتاب التاء

ت (حرف جار)

شروع کلمہ میں قسم کے معنوں میں آتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ ﴾ (۲۱۔۵۷) اوراللہ کی قسم......میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔

(۲) فعل مستقبل کے شروع میں مخاطب پر دلالت کرتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ ﴾ (۱۰۔۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو۔نیز صیغہ تانیث ہونا ظاہر کرتا ہے،جیسے فرمایا:﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (۴۱۔۳۰) ان پر فرشتے اتریں گے۔

(۳) اورآخر کلمہ میں یا تو زائدہ علامت تانیث کے طور پر آتا ہے۔اور یہ کبھی تو حالت وقف میں ھا بن جاتا ہے۔جیسے "قَائِمَة" اور کبھی وقف اور وصل دونوں حالتوں میں ثابت رہتا ہے۔جیسے اُخْتٌ وَبِنْتٌ اور (۲) یا جمع مؤنث سالم کے آخر میں الف کے بعد آتی ہے،جیسے مُسْلِمَاتٌ وَمُؤْمِنَاتٌ .

(۴) فعل ماضی کے آخر میں جب مضموم ہو تو ضمیر متکلم کہلاتی ہے۔جیسے فرمایا:﴿ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴾ (۷۴۔۱۲) اور جس کو ہم نے مال کثیر دیا۔

اور مفتوح ہونے کی صورت میں ضمیر مذکر مخاطب ہوتی ہے،جیسے فرمایا:﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ (۱۔۶) جن پر تو اپنا فضل وکرم کرتا رہا۔

اور مکسور ہو تو واحد مؤنث حاضر کی ضمیر پر دلالت کرتا ہے۔جیسے ﴿ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴾ (۱۹۔۲۷) یہ تو تم نے برا کام کیا۔

ت ب ب

اَلتَّبُّ وَالتَّبَابُ (ض) کے معنی مسلسل خسارہ میں رہنے کے ہیں،کہا جاتا ہے تَبًّا لَّهٗ (اللہ اسے خائب و خاسر کرے) تَبَّ لَهٗ وَتَبَّبْتُهٗ کسی سے " تَبًّا لَّكَ " کہنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ ﴾ (۱۱۱۔۱) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں یعنی وہ ہمیشہ خسارے میں رہے۔یہی مفہوم ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ (۱۱۔۲۲) میں پایا جاتا ہے۔﴿ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴾ (۱۱۔۱۰۱) نقصان میں ڈالنے (یعنی تباہ کرنے) کے سوا ان کے حق میں اور کچھ نہ کر سکے۔

﴿ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴾ (۴۰۔۳۷) اور فرعون کی تدبیر تو بیکار تھی۔

ت ب ت[1]

اَلتَّابُوْتُ کے معنی صندوق کے ہیں۔اور آیت کریمہ:﴿ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ ﴾ (۲۔۲۴۸) کہ

[1] والانسب ذكره فی (ت، دب) لانه وزنه فعلوت لان فاعولاقليل وغير معروف فهو اذافعلوت من التوب وهو الرجوع (ملخصامن الكشاف ۱: ۲۹۳ ج ۱) لكن صاحب اللسان حج كونه (ت، ب، ت) كماذكره المؤلف وقال الصواب ان وزنه فاعولالان تاءه اصليه ۱۲.

تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ وہ صندوق لکڑی کا تھا، جس میں حکمت کی کتابیں تھیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تابوت سے مراد دل ہے اور اس میں سکینت سے مراد علم ہے، اسی لیے دل کو سَفَطُ الْعِلْمِ وَبَيْتُ الْحِكْمَةِ وَتَابُوْتُ الْعِلْمِ وَصندوقُهٗ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:
اِجْعَلْ سِرَّكَ فِيْ وِعَاءٍ غَيْرَ سَرَبٍ. کہ اپنے بھید کو ایسے برتن میں رکھو جو ٹپکتا نہ ہو اور دل کا نام تَابُوْتَ ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق فرمایا ❶ (۴۷) هُوَ كُنَيْفٌ مُلِئَ عِلْمًا وہ ایک ایسا برتن ہے جو علم سے پر ہے۔

ت ب ع

تَبِعَهٗ وَاتَّبَعَهٗ کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں یہ کبھی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہوتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲۔۳۸) تو جنھوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ غمناک ہوں گے۔ ﴿ قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ . اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْأَلُكُمْ اَجْرًا ﴾ (۳۶۔۲۰،۲۱) کہنے لگا کہ اے میری قوم! پیغمبروں کے پیچھے چلو ایسے کہ جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔ ﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ ﴾ (۲۰۔۱۲۳) تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ ﴿ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (۷۔۳) (لوگو!) جو (کتاب) تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نازل ہوئی ہے، اس کی پیروی کرو۔
﴿ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴾ (۲۶۔۱۱۱) اور تمہارے پیرو تو ذلیل لوگ ہوتے ہیں۔ ﴿ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآئِیْ ﴾ (۱۲۔۳۸) اور اپنے باپ دادا ...... کے مذہب پر چلتا ہوں، ﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (۴۵۔۱۸) پھر ہم نے تم کو دین کے کھلے رستے پر (قائم) کر دیا ہے تو اسی (رستے) پر چلے چلو اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔
﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو...... شیاطین پڑھا کرتے تھے۔
﴿ فَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ ﴾ (۲۔۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔
﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (۳۸۔۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمھیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی۔
﴿ هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِ ﴾ (۱۸۔۶۶) اگر آپ اس میں سے مجھے سکھائیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں۔ ﴿ وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ﴾ (۳۱۔۱۵) اور جو شخص میری طرف رجوع لائے، اس کے راستے پر چلنا۔ اَتْبَعَهٗ کسی کے پیچھے چلنا اور اسے پالینا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴾

---

❶ قارن مجازا القرآن لابی عبیدة (۲: ۲۰۹) وزادوموضع تبع الجاهلية موضع الخليفة فى الاسلام وحم ملوك العرب الاعاظم (ايضاً فتح الباری ۸: ۴۳۹).

(۲۶۔۶۰) تو انھوں نے سورج نکلتے ہی جالیا۔
﴿ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴾ (۱۸۔۸۹) پھر اس نے دوسرا راستہ پایا۔ ﴿ وَاَتْبَعْنَاهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ﴾ (۲۸۔۴۲) اور اس دنیا میں ہم نے ان کے ساتھ لعنت لگادی۔ ﴿ فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ ﴾ (۷۔۱۷۵) اس نے اسے پالیا۔ ﴿ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا ﴾ (۲۳۔۴۴) تو ہم بھی بعض کو بعض کے پیچھے لگاتے (یعنی ہلاک کرتے) رہے۔ اَتْبَعْتُ عَلَيْهِ (قرض) دوسرے کے حوالہ کرنا۔ دوسرے پر اتارنا۔ احاطہ کرنا۔ اُتْبِعَ فُلَانٌ بِمَالٍ مال اس پر حوالہ کیا گیا۔
اَلتَّبِيْــعُ: بچھڑا جو ابھی تک گائے کے پیچھے پیچھے چلتا ہو۔
اَلتَّبَــعُ: چارپائے کی ٹانگ۔ گویا دوڑتے وقت اس کی ٹانگیں اُن لوگوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں جو طلب انتقام میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوتے ہیں۔ اَلْـمُتْبِعُ وہ چوپایہ جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو۔ تُبَّـعٌ رؤساء (یمن) کا قلب تھا کیونکہ وہ سیاست و ریاست میں ایک دوسرے کی اتباع کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ تُبَّعٌ ایک بادشاہ کا لقب ہے، جس کی رعیت اس کی مطیع اور فرمانبردار تھی، اس کی جمع تَبَاعَةٌ ہے [1] قرآن پاک میں ہے:
﴿ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ﴾ (۴۴۔۳۷) بھلا یہ اچھے ہیں یا تبع کی قوم۔ اَلتُّبَّــعُ: (ایضاً) سایہ کیونکہ وہ دھوپ کے پیچھے لگا رہتا ہے۔

ت ب ر

اَلتَّبْرُ: (ض) کے معنی توڑ دینے اور ہلاک کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ تَبَرَهٗ وَتَبَّرَهٗ اس نے ہلاک کر ڈالا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ اِنَّ هٰـؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ ﴾ (۷۔۱۳۹) یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ برباد ہونے والا ہے۔ ﴿ وَكُـلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴾ (۱۷۔۱۷) اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔
﴿ وَلَا تَـزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴾ (۷۱۔۲۸) اور ظالم لوگوں کے لیے اور زیادہ تباہی بڑھا۔

ت ت ر

تَتْرٰى یہ مُـوَاتَرَة سے فَـعْلٰى کے وزن پر ہے، جس کے معنی کسی چیز کے یکے بعد دیگرے آنے کے ہیں۔ اصل میں یہ وَتْرٰى واؤ کے ساتھ ہے۔ [2] تُرَاث اور تبحاۃ کی طرح اس کی واؤ تا سے تبدیل ہوگئی ہے [3] کے نزدیک یہ منصرف ہے وہ الف زائدہ بناتے ہیں [4] اور جن کے نزدیک غیر منصرف ہے۔ ان کے نزدیک الف تانیث ہے۔ [5]
قرآن پاک میں ہے:
﴿ ثُـمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا ﴾ (۲۳۔۴۴) پھر ہم پے در پے اپنے پیغمبر بھیجتے رہے۔

---

[1] ولذاذكره المولف ايضاً فى (وتر).

[2] اى على خلاف القياس ومثلها فى احد وآناة والسماء.

[3] ان كانت للالحاق كمافى اوطىٰ بنون نكرة لامعرفة وان كانت اصلية بنون دائما.

[4] وفى شرح الكتاب للسيرانى (۲ : ۹) وجعل بعضهم الفها للتانيث فَيَقْرَءُ بغير تنوين وهى قرأة الجمهور وقرء ابن كثير وابو عمروبالتنوين فوزنه فعل وللفتح بدل من التنوين وخط المصحف يؤيد الانصراف والتنوين.

[5] والفراء.

فراء کہتے ہیں کہ رفعی اور جری حالت میں تَتْـرًی اور نصبی حالت میں تَتْرًا ہے اور الف تنوین کے عوض میں آیا ہے۔ ثعلب کے نزدیک یہ تَفْعَلُ کے وزن پر ہے۔ ابوعلی الغبور کہتے ہیں ❶ کہ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ صفت کا کوئی صیغہ تَفْعَلُ کے وزن پر نہیں آتا۔

ت ج ر

تَجَـرَ (ن) تَجْرًا وَتَجَارَةً کے معنی نفع کمانے کے لیے راس المال کا کاروبار میں لگانے کے ہیں۔ صیغہ صفت تَـاجِرٌ وَتَجْرٌ جیسے صَاحِبٌ وَصَحْبٌ یاد رہے کہ عربی زبان میں اس کے سوا اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جس میں تاء (اصلی) کے بعد جیم ہو۔ رہا تِـجَـاهٌ تو اصل میں وِجَاهٌ ہے اور تَجُوْبُ وغیرہ میں تاء اصلی نہیں ہے بلکہ فعل مضارع کی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (۶۱۔۱۰) میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں عذاب الیم سے نجات دے۔

میں لفظ تـجـارۃ کی تفسیر خود قرآن نے بعد کی آیت: تُـؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ الاٰیۃ، میں بیان فرمادی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿ اِشْتَـرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ ﴾ (۲۔۱۶) ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا۔

﴿ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ﴾ (۴۔۲۹) ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ جائز ہے۔)

﴿ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ ﴾ (۲۔۲۸۲) سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ فُلَانٌ تَاجِرٌ بِكَذَا کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز میں ماہر اور اس سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔

ت ح ت

تَـحْـتُ: (اسم ظرف) یہ فوق کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ (۵۔۶۶) تو ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

﴿ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (۲۔۲۵) (نعمت کے) باغ میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

﴿ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَا ﴾ (۱۹۔۲۴) اس وقت ان کے نیچے کی جانب سے آواز دی۔

تحت اور اسفل میں فرق یہ ہے کہ تحت اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے نیچے ہو مگر اسفل کسی چیز کے نچلا حصہ کو جیسے: اَلْمَالُ تَحْتَهٗ (مال اس کے نیچے ہے) اَسْفَلُهٗ اَغْلَظُ مِنْ اَعْلَاهُ (اس کا نچلا حصہ اعلیٰ حصہ سے سخت ہے۔)

حدیث پاک میں ہے ❷ (۴۸) لَا تَـقُـوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ التُّحُوْتُ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ کمینے لوگ غلبہ حاصل نہ کرلیں۔ بعض نے کہا ہے کہ

---

❶ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

❷ كلمة من حديث طويل ذكره ابن حبان في زوائده في امارات الساعة أثناء حديث ابي هريرة رقم ۱۸۸۶ والحافظ في الفتح ۱۶ : ۱۲۱) من الطبراني في الاوسط وايضاً من طريق ابي علقمة عن ابي هريرة وعبدالله بن مسعود راجع الزمخشري في الفائق ۱ : ۶۹ (تحت) قال وذكره مثلاً للاء (ذ).

حدیث میں آیت کریمہ:

﴿ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴾ (۸۴۔۴) اور جب یہ زمین ہموار کردی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے، اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

ت خ ذ

تَخِذَ: (س) بمعنی اَخَذَ یعنی پکڑنے کے آتا ہے۔شاعر نے کہا ہے ❶ ع (طویل)

(۷۷) وَقَدْ تَخِذَتْ رِجْلِيْ اِلٰى جنب غَرْزِهَا
نَسِيْفًا كَأُفحوصِ القَطَاة المُطوّق

اس کے رکاب کے پہلو میں انڈا دینے والی قطا کے گڑھے جیسے نشان کو میرے پاؤں چھور ہے تھے۔

اسی سے اِتَّخَذَ (افتعال) ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ ﴾ (۱۸۔۵۰) کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو۔

﴿ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا ﴾ (۲۔۸۰) ان سے پوچھو کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے۔

﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ﴾ (۲۔۱۲۵) جس مقام پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے، اس کو نماز کی جگہ بنالو۔

﴿ لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ﴾ (۶۰۔۱) تم میرے اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔

﴿ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴾ (۱۸۔۷۷) اگر آپ چاہتے تو ان سے (اس کا) معاوضہ لیتے (تاکہ کھانے کا کام چلتا)

ت ر ب

اَلتُّرَابُ کے معنی مٹی کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ (۳۰۔۲۰) کہ اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔

﴿ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴾ (۷۸۔۴۰) کہ اے کاش کہ میں مٹی ہوتا۔

تَرِبَ کے معنی فقیر ہونے کے ہیں کیونکہ فقر بھی انسان کو خاک آلودہ کردیتا ہے۔فرمایا: ﴿ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴾ (۹۰۔۱۶) یا فقیر خاکسار کو۔ یعنی جو بوجہ فقر و فاقہ کے خاک آلود رہتا ہے۔اَتْرَبَ (افعال) کے معنی مال دار ہونے کے ہیں۔گویا اس کے پاس مٹی کی طرح مال ہے۔

نیز تُرَاب کے معنی زمین کے بھی آتے ہیں اور اس میں اَلتَّيْرَابُ (ج) تَيَارِبُ اور اَلتَّوْرَابُ وَالتَّوْرَبُ وَالتَّوْرَابُ وغیرہ دس لغات ہیں۔ ❷

رِيْحٌ تَرِبَةٌ: خاک اڑانے والی ہوا۔اسی سے آنحضرت

---

❶ وغريب ابی عبيد۳: ۱۲۵ قاله الممرق العبدی واسمه شاس بن نهار والبيت فی اللسان (ط ر ق) وفی روايته لقد بدل وقد راجع ايضاً التاج واللسان (تخذ، فحص، طرق ، نسف،) والصحاح (طرق) والمحكم (فحص) والاصمعيات ۴۷ والجمهرة ۲: ۶, ۱۶۳، ۳/۳۷۲: ۳۹) والعينی (۴: ۵۹۰) ومجاز القران لابی عبيدة (۱: ۴۱۱) والطبری ۱۵: ۲۹۱) وشواهد الكشاف والسيوطی ۲۳۳ والاشباه النحويه ۱: ۱۰۹, ۳: ۴۱) والشاعر جاهلی قديم ترجم له فی الشعراء ۲۳۶ والموتلف ۱۸۵ والمزربانی ۴۹۵ والاشتقاق ۱۹۹ والبيت ايضاً فی الحيوان ۵: ۵۸۱) والقطاه المطرق التی حان خروج بيضها والنسيف اثر ركض الرجل بجنبی البعير اذا فحص عنه الوبروفی المطبوع المطوق بالواو بدل الراء مصحف والبيت ايستشهد به علی ان تحذياتی بمعنیٰ اتخذ.

❷ راجع المعاجم.

ﷺ کا فرمان ہے❶ (۵۰) عَلَیْكَ بِذَاتِ الدِّیْنِ تَرِبَتْ یَدَاكَ کہ شادی کے لیے دیندار عورت تلاش کرو۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ اس میں تنبیہ ہے کہ دیندار عورت تیرے ہاتھ سے نہ جانے پائے، ورنہ تمہارا مقصد حاصل نہیں ہوگا اور تم غیر شعوری طور پر فقیر ہو جاؤ گے۔❷

بَارِحٌ تَرِبٌ خاک اڑانے والی ہوا۔

تَرَائِبُ سینہ کی پسلیاں (مفرد تَرِیْبَۃٌ) قرآن پاک میں ہے:﴿ یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبْ ﴾ جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:﴿ اَبْکَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا ﴾ (۵۶۔۳۷) کنواریاں اور شوہروں کی پیاریاں اور ہم عمر۔﴿ وَکَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴾ (۷۸۔۳۳) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔﴿ وَعِنْدَھُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴾ (۳۸۔۵۳) اور ان کے پاس نیچی نگاہ رکھنے والی (اور) ہم عمر (عورتیں) ہوں گی۔ میں اتراب کے معنی ہیں ہم عمر جنہوں اکٹھی تربیت پائی ہوگی گویا وہ عورتیں اپنے خاوندوں کے اس طرح مساوی اور مماثل یعنی ہم مزاج ہوں گی جیسے سینوں کی ہڈیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور یا اس لیے کہ گویا زمین پر بیک وقت واقع ہوئی ہیں اور بعض نے یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ وہ اکٹھی مٹی میں ایک ساتھ کھیلتی رہی ہیں۔

ت ر ث

تُرَاثٌ: (ورثہ) یہ اصل میں وِرَاثٌ مثال واوی ہے۔ (جیسا کہ ورث میں بیان ہوگا۔) قرآن پاک میں ہے:﴿ وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا ﴾ (۸۹۔۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

ت ر ف

اَلتُّرْفَۃُ: عیش و عشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے:اُتْرِفَ فُلَانٌ فَھُوَ مُتْرِفٌ وہ آسودہ حال اور کثرت دولت کی وجہ سے بدمست ہے۔ قرآن پاک میں ہے:﴿ وَاَتْرَفْنَاھُمْ فِی الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا ﴾ (۲۳۔۳۳) اور دنیا کی زندگی میں ہم نے اس کو آسودگی دی رکھی تھی۔﴿ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِیْهِ ﴾ (۱۱۔۱۱۶) اور جو ظالم تھے وہ ان ہی باتوں کے پیچھے لگے رہے جن میں عیش و آرام تھا﴿ وَارْجِعُوْا اِلٰی مَآ اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ ﴾ (۲۱:۱۳) اور جن (نعمتوں) میں تم عیش و آسائش کرتے تھے ان کی طرف لوٹ جاؤ۔﴿ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْھِمْ بِالْعَذَابِ ﴾ (۲۳۔۶۴) ہم نے ان میں سے آسودہ حال لوگوں کو پکڑ لیا۔﴿ اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا ﴾ (۱۷۔۱۶) تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو بڑھا دیتے ہیں۔ اور یہی وہ مترفین ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا:﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلَاہُ رَبُّہٗ فَاَکْرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ ﴾ (۸۹۔۱۵) مگر انسان

---

❶ راجع للحدیث النھایہ (ترب) واللسان (ترب) واضداد ابی الطیب ۱۱۶ واختلف فی تاویلہ انظر اعراب ابن خالویہ ۹۳ واصل الحدیث متفق من حدیث ابی ھریرۃ راجع تخریج العراقی الاحیاء (۱: ۳۷ والنیل للشوکانی ۶: ۱۱۲۔۱۱۳، شرح الترمذی للشیخ المبارکبوری وادب الدنیا والدین علماء روی ۲۷۴ وفی روایۃ ابی سعید الخدری تربت یمینك کمافی زوائد ابن حبان رقم ۱۲۳۱.

❷ تالی القالی فی الذیل وحملہ اکثر العماء علی التنبیہ والاغراء وان کان لفظہ الدعاء علیہ (راجع اضدادابی الطیب ۱۱۶۔۱۱۸ والذیل ۵) ومن حملہ علی الدعاء علیہ قال معناہ: ان اخترت غیر ذات الدین وخالفت الوصیۃ۔ وھھنا محمل آخر للحدیث وھوان اترب من الاضداد یاتی بمعنی الفقر وبمعنی الغنٰی فمعناہ الدعاء لہ بالغنااذا اقبل وصیتہ.

(عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے۔

ت ر ق

اَلتَّرْقُوَۃُ کے معنی ہنسلی کی ہڈی کے ہیں [1] (ج)

اَلتَّرَاقِیُ: قرآن پاک میں ہے:

﴿ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ﴾ (۷۵۔۲۶) دیکھو جب جان گلے تک پہنچ جائے۔

ت ر ک

تَرْكُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو چھوڑ دینا کے ہیں [2] خواہ وہ چھوڑنا ارادہ و اختیار سے ہو اور خواہ مجبوراً چنانچہ ارادۃً اور اختیار کے ساتھ چھوڑنے کے متعلق فرمایا:

﴿ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ ﴾ (۱۸۔۹۹) اس روز ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ (روئے زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں۔ ﴿ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ﴾ (۴۴۔۲۴) اور دریا سے (کہ) خشک (ہو رہا ہوگا) پار ہو جاؤ۔

اور بحالت مجبوری چھوڑنے کے متعلق فرمایا: ﴿ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ ﴾ (۴۴۔۲۵) وہ لوگ بہت سے باغ چھوڑ گئے۔

اسی سے جب کوئی شخص اپنی موت کے بعد مال چھوڑ جاتا ہے تو اس کو تَرِکَۃٌ کہا جاتا ہے اور کبھی ہر عمل کے متعلق جو کسی حالت پر منتہی ہو۔ تَرَكْتُهٗ كَذَا یا اس کے ہم معنی جَعَلْتُهٗ کا محاورہ استعمال کر لیتے ہیں، جیسے: تَرَكْتُ فُلَانًا وَحِيْدًا کہ میں نے اسے اس حال میں چھوڑا کہ وہ اکیلا تھا۔

اَلتَّرِيْكَۃُ کے اصل معنی جنگل میں پڑے ہوئے انڈا کے ہیں اور (مجازاً) لوہے کے خود کو بھی تَرِيْكَة کہا جاتا ہے، جیسے کہ اس پر بَيْضَة کا لفظ بولا جاتا ہے۔

ت س ع

تِسْعَةٌ: (نو) اور تِسْعُوْنَ (نوے) اسماء عدد سے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ تِسْعَةُ رَهْطٍ ﴾ (۲۷۔۴۸) نو شخص۔ ﴿ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً ﴾ (۳۸۔۲۳) ننانوے دنبیاں۔ ﴿ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴾ (۷۴۔۳۰) اس پر انیس داروغے ہیں۔ ﴿ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴾ (۱۸۔۲۵) نو اوپر تین سو سال۔

اَلتِّسْعُ: (ایضاً) نو دن کے پیاسے اونٹ۔ اَلتُّسْعُ ہر ماہ کی ساتویں، آٹھویں اور نویں تاریخ (ان تین دنوں) کو تُسْعٌ کہا جاتا ہے۔ تَسَعْتُ الْقَوْمَ قوم کے مال سے نواں حصہ وصول کرنا میں ان میں نواں تھا۔

ت ع س

اَلتَّعْسُ: اصل میں تَعْس کے معنی ہیں لغزش کھا کر گرنا اور پھر اٹھ نہ سکنا، پستی میں گر کر کسی چیز کا ٹوٹ جانا، اور یہ تَعِسَ (س) تَعْسًا وَتَعْسَةً کا مصدر ہے۔ [2] قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَتَعْسًا لَّهُمْ ﴾ (۴۷۔۸) ان کے لیے ہلاکت ہے [3]

---

[1] ذکرہ بعض اصحاب اللغتہ فی (ر ق ی) والصحیح انہ من (ت ر ق) کماھھنا قال فی اللسان (ت ر ق) علی وزن فعلوۃ.

[2] قد یأتی فی معنی ابقی کمافی الآیۃ: وترکنا علیہ فی الآخرین (۳۷۔۷۸) ای ابقینا الثناء علیہ ۱۲.

[3] تعس ۔ والفعل منہ تعس مثل وضع کمافی القاموس. وتعسًا لہ منصوب علی المصدربفعل یجب اضمارہ (راجع الکشاف) وقال الخفاجی فی الدرۃ ۱۲۷ یقال فی الدعاء علی العاثر والفعل منہ بکسر العین ۱۲.

ت ف ث

اَلتَّفَثُ کے اصل معنی ناخن وغیرہ کی میل کچیل کے ہیں، جسے بدن سے دور کیا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ ﴾ (۲۲۔۲۹) پھر چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں۔
یہاں لِيَقْضُوْا قَضَى الشَّيْءَ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو قطع اور زائل کرنے کے ہیں ایک اعرابی کا قول ہے۔مَا اَتْفَثَكَ وَمَا اَدْرَنَكَ تو کس قدر میلا کچیلا ہے۔

ت ق و

اَلتَّقْوٰى: تقویٰ کی تاء واؤ سے مبدل ہے، اس پر اس کے باب (وق ی) میں بحث آئے گی۔

ت ک ء

اَلْمُتَّكَأُ: (اسم مکان)) سہارہ لگانے کی جگہ۔تکیہ جس پر ٹیک لگائی جائے اور آیت کریمہ:﴿ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَـأً ﴾ (۱۲۔۳۱) اور ان کے لیے ایک محفل مرتب کی۔میں مُتَّكَأً کے معنی ترنج کے ہیں [1] اور بعض نے کہا ہے کہ مراد کھانا اور یہ اِتَّكَأَ عَلٰى كَذَا فَاَكَلَهٗ کے محاورہ سے مشتق ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا ﴾ (۲۰۔۱۸) یہ میری لاٹھی ہے، جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں۔
﴿ مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ﴾ (۵۲۔۲۰) تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔
﴿ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴾ (۳۶۔۵۶) تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔
﴿ مُتَّكِئِيْنَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِيْنَ ﴾ (۵۶۔۱۶) آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوئے۔

ت ل ل

اَلتَّلُّ: اصل میں تَلٌّ کے معنی بلند جگہ یعنی ٹیلہ کے ہیں اور تَلِيْلٌ گردن کو کہتے ہیں اور ﴿ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴾ (۳۷۔۱۰۳) کے معنی ٹیلے پر لٹادینے کے ہیں۔ جیسے: تَرَبَّهٗ (کسی کو زمین پر گرانا) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی تَلِيْل یعنی گردن اور رخسار کے بل لٹادینا ہیں جیسا کہ جبین (پٹ پڑی) کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے۔
مِتَلٌّ: نیزہ وغیرہ جسے مار کر کسی کو پچھاڑا جاتا ہے، (سیدھا اور سخت نیزہ)

ت ل و

تَلَاهُ: (ن) کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنا کے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی اجنبی چیز حائل نہ ہو یہ کہیں تو جسمانی طور ہوتا ہے اور کہیں اس کے احکام کا اتباع کرنے سے۔اس معنی میں اس کا مصدر تُلُوٌّ اور تَلْوٌ آتا ہے اور کبھی یہ متابعت کسی کتاب کی قرأت (پڑھنے) اور اس کے معانی سمجھنے کے لیے غور وفکر کرنے کی صورت میں ہوتی ہے، اس معنی کے لیے اس کا مصدر تِلَاوَةٌ آتا ہے۔اور آیت کریمہ:﴿ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلَاهَا ﴾ (۹۱۔۲) اور چاند کی قسم! جب وہ سورج کا اتباع کرتا ہے۔ میں سورج کا اتباع بلحاظ اقتداء اور مرتبہ مراد ہے، اور یہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے اور وہ سورج کے لیے بمنزلہ خلیفہ کے ہے۔چنانچہ بعض

---

[1] قال القبتي المتكأ الطعام قال ابو عبيدة في مجازة ۱: ۳۰۹) وزعم قوم انه لاترج وهذاالبطل باطل في الارض لكن ردعليه ابوعبيدة في غريبه وقال الفقهاء اعلم بالتاويل منه قال الطبري لكن الصحيح ماقال ابوعبيدة واخذه البخاري راجع فتح الباري (۸: ۲۷۰)۱۲۔

نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا ﴾ (۱۰۔۵) میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ضِيَاء بنسبت نُوْر کے معنی زیادہ روشن ہوتی ہے۔ اور لفظ ضِيَـــاء کے اندر نور کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر نُوْرٌ کے اندر ضِيَاء کا مفہوم نہیں آتا۔

اور آیت کریمہ: ﴿ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ ﴾ (۱۱۔۱۷) اور ان کے ساتھ ایک (آسمانی) گواہ بھی اس کی جانب سے ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ ایسا شاہد جو اس کی پیروی کرتا ہے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے۔ ﴿ يَتْلُوْنَ آيَاتِ اللّٰهِ ﴾ (۳۔۱۳) وہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔

اَلتِّلَاوَــــةُ: بالخصوص خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے اتباع کو تِلَاوَــةٌ کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ اتباع ان کی قرأت (پڑھنے) کی صورت میں ہوتی ہے اور کبھی ان کے اوامر ونواھی (احکام) ترغیب وترہیب، اور جو کچھ ان سے سمجھا جاسکتا ہے، ان کی اتباع کی صورت میں، مگر یہ لفظ قرأت (پڑھنے) سے خاص ہے، یعنی تِلَاوَةُ کے اندر قِرَاءَة کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر تِلَاوَة کا مفہوم قِرَاءَة کے اندر نہیں آتا، چنانچہ کسی کا خط پڑھنے کے لیے تَلَوْتُ رُقْعَتَكَ نہیں بولتے بلکہ یہ لفظ صرف قرآن پاک سے کچھ پڑھنے پر بولا جاتا ہے، کیونکہ اس کے پڑھنے سے اس پر عمل کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ ﴾ (۱۰۔۳۰) وہاں ہر شخص اپنے (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرلے گا۔ میں ایک قرأت تَتْلُوْا بھی ہے یعنی وہاں ہر شخص اپنے عمل نامے کو پڑھ کر اس کے پیچھے چلے گا۔

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا ﴾ (۴۵۔۲۵) اور ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔

﴿ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ﴾ (۲۹۔۵۱) کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

﴿ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ ﴾ (۱۰۔۱۶) (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا (تو) میں ہی یہ (کتاب) تم کو پڑھ کر نہ سناتا۔

﴿ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ﴾ (۸۔۲) اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تِلَاوَــة بمعنی قرأت کے ہے اور یہی معنی آیات ذیل میں ہیں۔

﴿ وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ﴾ (۱۸۔۲۷) اور اپنے پروردگار کی کتاب کو جو تمہارے پاس بھیجی جاتی ہے، پڑھتے رہا کرو۔

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ﴾ (۵۔۲۷) اور (اے محمدؐ) ان کو آدم کے دو بیٹوں (ہابیل قابیل) کے حالات (جو بالکل سچے ہیں) پڑھ کر سنادو۔ ﴿ وَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا ﴾ (۳۷۔۳) پھر ذکر (یعنی قرآن) پڑھنے والوں کی۔

اور آیت کریمہ: ﴿ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ (۲۔۱۲۱) وہ اس کو (ایسا) پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے پڑھ کر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ

مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ﴾ (۳-۵۸) یہ ہم تم کو (خدا کی) آیتیں اور حکمت بھری نصیحتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ میں نَتْلُوْہُ کے معنی نازل کرنا کے ہیں۔ کیونکہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی نازل کرنا ہی ہوتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّیٰطِیْنُ﴾ (۲-۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو...... شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ میں شیاطین کے پڑھنے کو تلاوت کہنا ان کے اس ادعا کی بنا پر ہے کہ جو کچھ وہ پڑھ کر سناتے وہ کتب الٰہیہ کا حصہ ہے۔

اَلتَّلَاوَۃُ وَالتَّلِیَّۃُ (قرض وغیرہ کا) باقی ماندہ حصہ جسے وصول کرنے کے لیے پیچھا کرنا پڑتا ہے۔ اَتْلَیْتُہٗ کے معنی کسی کے پیچھے لگانے کے ہیں۔ جیسے اَتْلَیْتُ فُلَانًا عَلٰی فُلَانٍ بِحَقٍّ یعنی میں نے اس کا قرضہ فلاں کے حوالہ کر دیا۔ فَلَا یَتْلُوا عَلٰی فُلَانٍ وَّیَقُوْلُ عَلَیْہِ یعنی وہ فلاں پر جھوٹ بولتا اور اس پر غلط بیانی کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ﴾ (۳-۷۸) اور خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: لَآ اَدْرِیْ وَلَا اَتْلِیْ اَوْلَا تَلَیْتَ وَلَا دَرَیْتَ تو یہاں پر تَلَیْتَ اصل میں تَلَوْتَ ہے، قانون مزاوجت کی وجہ سے تَلَیْتَ کہہ دیا جاتا ہے ❶ جیسا کہ مَوْزُوْرَاتٍ...... ہے۔ یعنی وہ بغیر اجر کے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹیں۔ ❷

ت م م

تَمَامُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کے اس حد تک پہنچ جانے کے ہیں، جس کے بعد اسے کسی خارجی شے کی احتیاج باقی نہ رہے اس کی ضد ناقص ہے، یعنی وہ جو اپنی ذات کی تکمیل کے لیے ہنوز خارج شے کی محتاج ہو اور تمام کا لفظ معدودات کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور مقدار وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً عَدَدٌ تَامٌّ وَکَیْلٌ تَامٌّ۔ قرآن پاک میں ہے:﴿ وَتَمَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ﴾ (۷-۱۳۷) (۶-۱۵)، (۱۱-۱۱۹) اور تمہارے پروردگار کا وعدہ پورا ہوا۔

﴿ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ﴾ (۶۱-۸) حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا۔

﴿ وَاَتْمَمْنٰھَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّہٖ﴾ (۷-۱۴۲) اور دس (راتیں) اور ملا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا تو اس کے پروردگار کی...... میعاد پوری ہوگئی۔ ❸

ت و ب

اَلتَّوْبُ: (ن) کے معنی گناہ کے باحسن وجوہ ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ

---

❶ کما فی الاتباع لابی الطیب (۳۰) وفی الفائق (۱-۷۲) وفی حدیث المنکر فیقول لادریت ولاتلیت ومعناہ لاقرأت ولادرست قال فی النہایۃ (تلا) والمحدثون یرون کذالك والصواب لا اتلیت والکلمۃ افتعال من الوت۔

❷ وذکروا من امثلۃ الازدواج ایضاً حدیث غیر خزایا ولاندمیٰ (راجع فتح الباری ۱: ۱٤۰) والغدایا والعشایا والاقتضاب ۲۷۸) والبحث فی ابن جنی علی تصریف المازنی ٦۱٦-٦۱۷) وشرح الدرۃ: للخفاجی ۷۹ وفی الشریشی ۲: ۳۳۲) ان التشدید فی یاء۔ الشجی للمزاوجۃ مع الخلی والکلام علی الازواج ۔ابن الطیب علی الاقتراح ۱۲۵۲۔

❸ ایضاً تماماً (٦: ۱٥٤) والنذر ۱۱: ٤۰) ۲۳-۲۷)۔

ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لَمْ اَفْعَلْهُ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لیے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشنے لگ جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلائے، الغرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے مگر شرعاً اسے توبہ جب کہیں گے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پر نادم ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔

تَابَ اِلَى اللّٰهِ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ (۲۴۔۳۱) سب خدا کے آگے توبہ کرو۔

﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ ﴾ (۵۔۷۴) تو یہ کیوں خدا کے آگے توبہ نہیں کرتے۔

تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ: اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ اسی سے فرمایا:

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ ﴾ (۹۔۱۱۷) بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین پر۔ ﴿ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ﴾ (۹۔۱۱۸) پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔

﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ (۲۔۱۸۷) سو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے درگزر فرمائی۔

اَلتَّائِبُ: (اسم فاعل) توبہ کرنے والا۔ توبہ قبول کرنے والا بندہ خدا کے سامنے توبہ کرتا ہے اور اللہ توبہ قبول فرماتا ہے، اس لیے تَائِبٌ کا لفظ اللہ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔

اَلتَّوَّابُ: یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صورت ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے چھوڑتے بالکل گناہوں کو ترک کر دے اور جب تواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ (۲۔۳۷) بیشک وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴾ (۲۵۔۷۱) کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ترک کر کے عمل صالح کا نام ہی مکمل توبہ ہے۔

﴿ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴾ (۱۳۔۳۰) میں اسی پر بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ت و ر

اَلتَّوْرَاةُ: آسمانی کتاب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی یہ وَرْیٌ سے مشتق ہے اور تاء واؤ سے مبدل ہے۔ علمائے کوفہ کے نزدیک یہ وَوْرَاةٌ بروزن تَفْعَلَةٌ ہے اور بعض کے نزدیک تَفْعَلُ کے وزن پر ہے، جیسے: تَتْفَلُ لیکن کلام عرب میں تَفْعَلُ کے وزن پر اسم کا صیغہ نہیں آتا۔

علماء بصرہ کے نزدیک یہ وَوْرَی بروزن فَوْعَلَ ہے جیسے حَوْقَلَ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ﴾ (۵۔۴۴) بے شک ہم نے تورات نازل فرمائی، جس میں ہدایت اور

روشنی ہے۔

﴿ذَالِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ﴾ (۴۸۔۲۹) ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔

تارۃ

تارة کے معنی ایک مرتبہ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾ (۲۰۔۵۵) ہم دوسری مرتبہ نکالیں گے۔

بقول بعض یہ تَارَ الْجَرْحُ سے مشتق ہے، جس کے معنی زخم کا بھر جانا اور مندمل ہوجانا کے ہیں۔

ت ی ن

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾ (۹۵۔۱) انجیر کی قسم اور زیتون کی۔بعض کے نزدیک تین اور زیتون دو پہاڑوں کے نام ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کھانے کی دو چیزیں ہیں، ان کے مقام ورود اور اختصاص کی تحقیق اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ت ی ہ

تَـاهَ: (ض) کے معنی متحیر ہونے کے ہیں اور یہ باب تَاه يَتُوْهُ (واوی) بھی آتا ہے، قصہ بنی اسرائیل میں فرمایا:﴿أَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْأَرْضِ﴾ (۵۔۲۶) چالیس برس تک......اور (جنگل کی) زمین میں سرگردان پھرتے رہیں گے۔ تَوَّهَهُ وَتَيَّهَهُ حیران کرنا اور پھینک دینا۔ وَقَعَ فِي التِّيْهِ وَالتَّوْهِ ورطہ حیرت میں پھنس گیا۔ مَفَازَةٌ تَيْهَاءُ وہ جنگل جس میں مسافر بھٹک جائیں۔

❀❀❀

کتاب الثاء

ث ب ت

اَلثَّبَاتُ: یہ زوال کی ضد ہے اور ثَبَتَ (ن) ثَبَاتًا کے معنی ایک حالت پر جمے رہنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا﴾ (۸۔۴۵) مومنو! جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہوتو ثابت قدم رہو۔

رَجُلٌ ثَبْتٌ وَثَبِیْتٌ فِی الْحَرْبِ لڑائی میں ثابت قدم رہنے والا مرد۔اَثْبَتَ السَّهْمَ فِیْهِ اس میں تیر آر پار کردیا۔اور ثَابِتٌ کا لفظ اس پر بھی بولا جاتا ہے جو نظروں کے سامنے موجود ہو اور اس پر بھی جو کسی دلیل سمعی کی رو سے صحیح ہو،مثلاً: فُلَانٌ ثَابِتٌ عِنْدِیْ فلاں حکم میرے نزدیک دلیل کی رو سے صحیح ہے۔نُبُوَّةُ النَّبِیِّ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) ثَابِتَةٌ: آنحضرت کی نبوت ثابت ہے،یعنی ازروئے دلائل صحیح ہے۔

اَلْاِثْبَاتُ وَالتَّثْبِیْتُ: (افعال وتفعیل) کے معنی کبھی تو کسی چیز کو فی الواقع موجود کرنے کے ہوتے ہیں،مثلاً: اَثْبَتَ اللّٰهُ کَذَا (اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو موجود کردیا) اور کبھی ثبوت حکمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔جیسے اَثْبَتَ الْحَاکِمُ عَلٰی کَذَا: (قاضی نے فلاں پر یہ حکم لگایا) اور کبھی اثبات باعتبار قول مراد ہوتا ہے۔خواہ وہ بات نفس الامر میں حق ہو یا باطل جیسے:

اَثْبَتَ التَّوْحِیْدَ وَصِدْقَ النُّبُوَّةِ اس نے توحید اور صدق نبوت کو دلائل سے ثابت کیا۔فُلَانٌ اَثْبَتَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: فلاں نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ثابت کیا اور آیت کریمہ:﴿لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ﴾ (۸۔۳۰) تاکہ تم کو قید کردیں یا جان سے مار ڈالیں۔ میں لِیُثْبِتُوْا کے معنی قید کرنے یا ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (۱۴۔۲۷) خدا مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور پکی) بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے۔ میں "قول ثابت" سے دلائل قویہ مراد ہیں اور آیت:﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا یُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَکَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِیْتًا﴾ (۴۔۶۶) اور اگر یہ اس نصیحت پر کاربند ہوتے جو ان کو کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور (دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔ میں اَشَدَّ تَثْبِیْتًا کے معنی علم وایمان کے لحاظ سے مضبوطی بھی مراد ہوسکتی ہے [1] اور اعمال کی پائیداری اور ان کا ثمرہ حاصل کرنے کے لحاظ سے بھی تثبیت مراد ہوسکتی ہے۔یعنی یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں گے جن کے اعمال کی ناپائیداری بیان کرتے ہوئے،قرآن پاک نے کہا ہے:

﴿وَقَدِمْنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ (۲۵۔۲۳) اور جو انھوں نے عمل کیے ہوں گے

[1] کماقال السدی راجع ابن کثیر (۱: ۵۲۲).

ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کردیں گے۔محاورہ ہے: ثَبَّتُّهٗ: میں نے اسے استحکام بخشا، ثابت قدم رکھا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ﴾ (۷۴-۱۷) اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے۔

﴿فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۱۲-۸) تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

﴿وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۲۶۵-۲) اور خلوص نیت سے۔ ❶ ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ (۱۴۷-۳) اور ہم کو ثابت قدم رکھ۔

ث ب ر

اَلثُّبُوْرُ: (مصدر ن) کے معنی ہلاک ہونے یا (زخم کے) خراب ہونے کے ہیں اور اَلْمُثَابِرُ کسی کام کو مسلسل کرنے والا) ثَابَرْتُ عَلَى الْاَمْرِ سے (اسم فاعل کا صیغہ) ہے۔جس کے معنی کسی کام کو مسلسل کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ○ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا﴾ (۱۳،۱۴-۲۵) تو وہاں ہلاکت کو پکاریں گے، آج ایک ہی ہلاکت کو نہ پکارو، بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا﴾ (۱۰۲-۱۷) اے فرعون! میں خیال کرتا ہوں کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ میں ابن عباسؓ نے مَثْبُوْرًا کے معنی ناقص العقل کیے ہیں کیونکہ نقصانِ عقل سب سے بڑی ہلاکت ہے۔ثَبِيْرٌ مکہ کی ایک پہاڑی کا نام۔

ث ب ط

ثَبَّطَهُ الْمَرَضُ وَاَثْبَطَهٗ: اسے مرض نے روک دیا اور اسے لازم ہوگئی۔قرآن پاک میں ہے: فَثَبَّطَهُمْ (۴۶-۹) تو ان کو ہلنے جلنے نہ دیا۔

ث ب ی (و)

ثُبَةٌ کے معنی الگ جماعت کے ہیں اس کی جمع ثُبَاتٌ وَثُبِيْنَ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا﴾ (۷۱-۴) پھر یا تو جماعت جماعت ہو کر نکلا کرو یا سب اکٹھے کوچ کیا کرو۔

شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۷۸) وَقَدْ اَغْدُوْا عَلٰى ثُبَةٍ كِرَامٍ

اور میں شریف لوگوں کی جماعت کے پاس جاتا ہوں اور اسی سے ثَبَّيْتُ عَلٰى فُلَانٍ کا محاورہ ہے، جس کے معنی کسی کے متفرق محاسن بیان کرنے کے ہیں۔ثُبَةٌ کی تصغیر ثُبَيَّةٌ ہے، لہٰذا اس میں یاء محذوف ہے ❸ لیکن ثُبَةُ الْحَوْضِ جس کے معنی وسطِ حوض ہیں جہاں پانی جمع ہوتا ہے یہ اجوف سے ہے اور اس میں عین کلمہ محذوف ہے۔ ❹

---

❶ ای مقرین بانها مما یثیب الله علیها (الزجاج).

❷ زهیر وتمامه: نشاوی واجدین لمانشاء راجع دیوانه مع شرح الاعلم الشنتمری ۵۸ (طبعة لیدن والعقد الثمین ۷۷ والطبری ۵: ۱۶۴ واللسان (نشو، مجاز القرآن رقم ۱۵۶ مختار الشعر الجاهلی ۲۵ (حلبیة) وابن الانباری ۴۰۰ ومجموعة المعانی ۱۹۸ ومعاهد التنضیص ۲: ۵۳ فی روایة علی شرب بدل ثبة فلاشاهد.

❸ والمختار عندالمحققین انه ثبته من الواو واصلها ثبوته وبه قال ابن جنی والمؤلف انه من الیاء.

❹ ذهب الجوهری وبعض علماء اللغة انهامن ثبة الحوض والذاهبة الواو من وسطه وبه قال ابواسحاق بدلیل ثویبة لکن الاکثر علی النقص ۱۲.

ث ج ج

ثَجَّ (ن) ثُجُوْجًا اَلْمَاءُ: پانی کا زور سے بہنایا برسنا محاورہ ہے: اَتَی الْوَادِیْ بِثَجِیْجِهٖ: زبردست سیلاب آنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴾ (۷۸۔۱۴) اور نچڑے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔

حدیث میں ہے (1) (۵۰)

اَفْضَلُ الْحَجِّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ یعنی افضل حج وہ ہے، جس میں زور زور سے لبیک پکارا جائے اور کثرت سے قربانی کا خون بہایا جائے۔

ث خ ن

ثَخُنَ (ك) الشَّيْءُ: کے معنی ہیں کسی چیز کا گاڑھا ہوجانا، اس طرح کہ بہنے سے رک جائے، اسی سے بطورِ استعارہ کہا جاتا ہے۔

اَثْخَنْتُهٗ ضَرْبًا وَاسْتِخْفَافًا: میں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ اپنے مقام سے حرکت نہ کرسکا، قرآن پاک میں ہے:

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ﴾ (۸۔۶۷) پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کرکے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہادے۔

﴿ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ﴾ (۴۷۔۴) جب ان کو خوب قتل کرچکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کرلو۔

ث ر ب

اَلتَّثْرِیْبُ (تفعیل) کے معنی ہیں کسی کو اس کی غلطی پر سرزنش اور زجر و توبیخ کرنا، قرآن پاک میں ہے: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ (۱۲۔۹۲) (یوسفؑ نے) کہا کہ آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (و ملامت) نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے (2) (۵۱)

اِذَا زَنَتْ اَمَةُ اَحَدِكُمْ فَلْيَجْلِدْهَا وَلَا يُثَرِّبْهَا. کہ جب کوئی لونڈی زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے اور صرف ملامت پر اکتفا نہ کرے۔

اور عربی زبان میں اس سے صرف ثَرْبٌ کا لفظ معروف ہے، جس کے معنی باریک اور پتلی سی چربی کے ہیں (3) (جو انتڑیوں کے ساتھ ہوتی ہے) اور آیت کریمہ: ﴿ يَآ اَهْلَ يَثْرِبَ ﴾ (۳۳۔۱۳) اے اہل مدینہ! میں ہوسکتا ہے کہ يَثْرِبَ اسی مادہ سے ہو اور اس میں یاء زائدہ ہو۔ (4)

ث ع ب

ثَعَبَ (ف) ثَعْبًا۔ الْمَاءَ کے معنی ہیں اس نے پانی بہایا فَانْثَعَبَ اس کا مطاوع ہے، جس کے معنی ہیں، چنانچہ وہ بہ نکلا۔ اسی سے ثَعْبُ الْمَطَرِ ہے (جس کے معنی بارش کا بہتا ہوا پانی یا برساتی نالہ کے ہیں) اور ہوسکتا

---

(1) الترمذی والنسائی من حدیث عمرو ابن ماجة من حدیث محمد بن المنکدر عن جابر کر، هق عن ابی بکر ع۔عن ابن ابن مسعود راجع کنزالعمال ٥ رقم او راجع لشرحہٖ غریب ابی عبید ۳ : ۱٤۰.

(2) اصل الحدیث متفق علیه رواہ احمد وابوداؤد ومن حدیث ابی هریرة ولفظ الحدیث کمافی المراجع اذازنت امة احد فتبین زناها فلیجدها الحد ولا یثرب علیها وفی روایة النسائی ولایعنفها.

(3) وفی الحدیث ان المنافق یؤخر العصر حتیٰ اذاصارت الشمس کثرب البقرة صلاها.

(4) ام قدیم للمدینة باسم اول من سکنها من ولد سام بن نوح وقد نهی النبی , ان یقال لها یثرب وسماهاطیبة وطابة لان فی مادة ثرب معنیٰ الفساد ۱۲.

ہے کہ آیت کریمہ: ﴿ فَاِذَا ھِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ﴾ (۲۶۔۳۲) تو وہ اسی وقت صریح اژدہا بن گئی۔ میں ثُعْبَان (اژدہا) بھی ثَعَبْتُ الْمَاءَ کے محاورہ سے ماخوذ ہو سانپ بھی چونکہ زمین پر اس طرح چلتا ہے۔ جیسے پانی بہ رہا ہوتا ہے، اس لیے اسے ثُعْبَان کہا گیا ہو۔

ثُعْبَۃٌ: خبیث قسم کا گرگٹ ج ثُعَبٌ یہ بھی چونکہ شکل و صورت میں سانپ کے مشابہ ہوتا ہے اس لیے اسے ثُعْبَۃٌ کہا جاتا ہے اور جسم میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کے لفظ میں اختصار کرلیا گیا ہے۔

ث ق ب

اَلثَّاقِبُ: انتا روشن کہ جس چیز پر اس کی کرنیں پڑیں اس میں چھید کرتی پار گزر جائیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴾ (۳۷۔۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ ان کے پیچھے لگتا ہے۔

﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ○ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الطَّارِقُ ○ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ○ ﴾ (۸۶۔۱۔۳) آسمان اور رات کے وقت آنے والے کی قسم، اور تم کو کیا معلوم کہ رات کے وقت آنے والا کیا ہے؟ وہ تارا ہے چمکنے والا۔

اَلثَّاقِبُ: اصل میں ثُقْبَۃ سے ہے، جس کے معنی سوراخ کے ہیں۔ اَلْمِثْقَبُ: پہاڑ میں سخت اور دشوار گزار راستہ گویا وہ سوراخ کی مثل ہے۔ ابوعمرو کا قول ہے کہ صحیح لغت مَثْقَبٌ (بفتح المیم) ہے [1] محاورہ ہے: ثَقَبْتُ النَّارَ: میں نے آگ بھڑکائی۔

ث ق ف

اَلثَّقْفُ: (س ك) کے معنی ہیں کسی چیز کے پالینے یا کسی کام کے کرنے میں حذاقت اور مہارت سے کام لینا۔ اسی سے اَلْمُثَاقَفَۃُ کا لفظ مستعار ہے۔ (جس کے معنی ہتھیاروں کے ساتھ باہم کھیلنے کے ہیں اور سیدھے نیزے کو رُمْحٌ مُثَقَّفٌ کہا جاتا ہے۔ اور اَلثِّقَافُ اس آلہ کو کہتے ہیں، جس سے نیزوں کو سیدھا کیا جاتا ہے۔

ثَقِفْتُ كَذَا کے اصل معنی مہارت نظر سے کسی چیز کا نگاہ سے ادراک کرلینا کے ہیں۔ پھر مجازاً محض کسی چیز کے پالینے پر بولا جاتا ہے، خواہ اس کے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ﴾ (۲۔۱۹۱) اور ان کو جہاں پاؤ قتل کردو۔

﴿ مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴾ (۳۳۔۶۱) پھٹکارے ہوئے، جہاں پائے گئے پکڑے گئے۔ اور جان سے مار ڈالے گئے۔

ث ق ل

اَلثِّقَلُ: یہ خِفَّۃٌ کی ضد ہے اور اس کے معنی بھاری اور انبار ہونا کے ہیں اور ہر وہ چیز جو وزن یا اندازہ میں دوسری پر بھاری ہو اسے ثَقِيْلٌ کہا جاتا ہے۔ اصل (وضع) کے اعتبار سے تو یہ اجسام کے بھاری ہونے پر بولا جاتا ہے، لیکن (مجازا) معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے:

اَثْقَلَهُ الْغُرْمُ وَالْوِزْرُ اسے تاوان یا گناہ کے بوجھ نے دبالیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اَمْ تَسْــَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴾ (۵۲۔۴۰) (اے پیغمبر!) کیا تم ان سے صلہ مانگتے ہو کہ

[1] راجع التاج (ثقب) لكن معناه الطريق ۱۲.

ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔
اور عرف میں انسان کے متعلق ثقیل کا لفظ عام طور تو بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مدح بھی آ جاتا ہے ❶ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۷۹) تَخِفُّ الْاَرْضُ اِذْ مَا زِلْتَ عَنْهَا
وَتَبْقٰى مَا بَقِيْتَ بِهَا ثَقِيْـلًا

(۸۰) حَلَلْتَ بِمُسْتَقَرِّ الْعِزِّ مِنْهَا
فَتَمْنَعُ جَانِبَيْهَا اَنْ تَمِيْـلَا

کہ جس سرزمین سے تم چلے جاؤ وہ ہلکی ہو جاتی ہے اور وہ اسی وقت تک بھاری رہتی ہے جب تک تم اس پر رہو۔ تم زمین میں عزت کے مقام پر فروکش ہو اور تمہاری وجہ سے اس میں توازن قائم ہے، کہا جاتا ہے۔
فِیْ اُذُنِہٖ ثِقْلٌ یعنی اس کی قوت سماعت کمزور ہے۔ (ضد فِیْ اُذنہ خِفَّۃٌ) گویا جو بات اس سے کی جاتی ہے اس کو سمجھنے میں گرانی محسوس کرتا ہے اور کسی بات کا سننا ناگوار محسوس ہو تو کہا جاتا ہے۔ ثَقُلَ الْقَوْلُ...... چنانچہ اسی معنی میں قیامت کے متعلق فرمایا: ﴿ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۸۷) وہ آسمان اور زمین میں ایک بھاری بات ہوگی۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾ (۹۹۔۲) اور زمین اپنے (اندر کے) بوجھ نکال ڈالے گی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ زمین کے دفینے مراد ہیں اور بعض نے حشر کے روز قبروں سے زندہ ہو کر نکلنا مراد لیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ﴾ (۱۶۔۷) اور...... وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ میں اثقال سے بھاری بوجھ مراد ہیں اور آیت: ﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ (۲۹۔۱۳) اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور لوگوں کے بوجھ بھی۔ میں گناہوں کے بوجھ مراد ہیں جو انہیں ثواب سے روک دیں گے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:
﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ﴾ (۱۶۔۲۵) (اے پیغمبر! ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ اور آیت کریمہ:
﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾ (۹۔۴۱) تم سبکسار ہو یا گرانبار گھروں سے نکل آؤ۔
میں بعض نے خفاف اور ثقال سے جوان اور بوڑھے مراد لیے ہیں اور بعض ❸ نے خفاف سے نادار اور ثقال سے غنی لوگ مراد لیے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان سے غریب الوطن اور مقیم لوگ مراد ہیں۔ اور بعض نے خفاف سے چست اور ثقال سے سست مراد لیے ہیں۔ لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان جملہ معانی کو شامل ہے کیونکہ

---

❶ ومنه قوله تعالیٰ: ایها الثقلان (۵۵۔۳۱) للجن والانس لماخصابه من العقل والتميز من سائر الحيوان (راجع اللسان مثقل).

❷ قاله زهير بن ابی سلمیٰ والشطر الثانی فی الثانی من اجازة ابنه كعب وفيه قصة راجع امالی المرتضیٰ (۱: ۹۷) وفيه الاول: تزال الارض اذامامت خفا وتحیٰ ماحييت بها ثقيلاً وفيه نزلت بدل حللت ديوانه والعقد الثمين ۱۷۳ محاضرات المولف وفی روايته اختلاف يسير.

❸ قال العماد (۲: ۳۵۹) والامالی حمله علیٰ العموم ۱۲۔

قرآن پاک کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دینا ہے کہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی ہر حال میں تمھیں جہاد کے لیے چل کھڑے ہونا چاہیے۔

اَلْمِثْقَالُ: ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے، جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے، چنانچہ ہر بات کو مثقال کہہ سکتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ (۹۹۔۷،۸) تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور آیت کریمہ:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴾ (۱۰۱۔۸) اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے۔

میں وزن کے ہلکا نکلنے سے اعمال حسنہ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

ثقیل اور خفیف کے الفاظ دو طرح استعمال ہوتے ہیں ایک بطور مقابلہ کے یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے اعتبار سے ثقیل یا خفیف کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور دوسرے یہ کہ جو چیزیں (طبعًا) نیچے کی طرف مائل ہوتی ہیں، انھیں ثقیل کہا جاتا ہے، جیسے حجر مدر وغیرہ اور جو چیزیں (طبعًا) اوپر کو چڑھتی ہیں، جیسے آگ اور دھواں انھیں خفیف کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ﴾ (۹۔۳۸) تو تم زمین پر گرے جاتے ہو۔ میں زمین پر گرنا دوسرے معنی کے اعتبار سے ہے۔

ث ل ل

اَلثَّلَّةُ: (بفتح الثا) کے اصل معنی اون کے ڈھیر کے ہیں اس لیے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو بھی ثَلَّة کہا جاتا ہے [1] اور معنی اجتماع کے اعتبار سے آدمیوں کی جماعت کو ثُلَّةٌ.

قرآن پاک میں ہے:

﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ (۵۶۔۳۹،۴۰) (یہ) بہت سے تو اگلے لوگوں میں سے ہیں اور بہت سے پچھلوں میں سے۔

ثَلَلْتُ كَذَا: میں نے اس سے کافی مقدار لی۔ ثَلَّ عَرْشَهٗ اس کی حکومت برباد کردی۔ اس کی عزت ضائع کردی۔ اَلثَّلَلُ: دانتوں کا گرنا۔ اسی سے اَثَلَّ فَمُهٗ کا محاورہ ہے، جس کے معنی دانت گرنے کے ہیں۔ تَثَلَّلَتِ الرَّكِيَّةُ کنواں منہدم ہوکر پٹ گیا۔

ث ل ث

اَلثَّلَاثَةُ، تین (مؤنث) ثَلَاثُوْنَ تیس (مذکر و مؤنث) ثَلَاثَةُ الْاٰلَافِ: تین ہزار (مذکر و مؤنث) اَلثُّلُثُ: تہائی (تثنیہ ثُلُثَان اور جمع اَثْلَاثٌ) قرآن میں ہے: ﴿ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ﴾ (۴۔۱۱) تو ایک تہائی مال کا حصہ۔ ﴿ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً ﴾ (۷۔۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

﴿ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ ﴾ (۵۸۔۷) (کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع) سرگوشی نہیں کرتا مگر وہ ان میں چوتھا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ﴾ (۵۸۔۲۴) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے (کے)

---

[1] فی المطبوع: للمقیم مصحف والصحیح للغنم کمافی التاج (ثلل).

ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ تین اوقات ستر کے ہیں۔
﴿ وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ ﴾ (۱۸۔۲۵) اور اصحاب کہف اپنے غار میں (نو اوپر) تین سو سال رہے۔
﴿ بِثَلٰثَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴾ (۳۔۱۲۴) تین ہزار فرشتے نازل کر کے تمھیں مدد دے۔ ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ ﴾ (۷۳۔۲۰) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم...... (کبھی) دو تہائی کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات قیام کرتے ہو۔
﴿ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ (۴۔۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔
ثَلَّثْتُ الشَّیْءَ: تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔
ثَلَثْتُ الْقَوْمَ میں نے قوم کے مال سے ایک تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثْلَثْتُهُمْ: دو میں شامل ہو کر تین بنا دیا۔ مال سے تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثْلَثْتُ الدَّرَاهِمَ: تین درھم کر دیئے (یعنی دو سے تین کر دیئے)
اَثْلَثَ الْقَوْمُ: وہ تین ہو گئے۔ حَبْلٌ مَثْلُوْثٌ تین بٹوں سے بٹی ہوئی رسی۔ رَجُلٌ مَثْلُوْثٌ جس کے مال سے تہائی لے لی گئی ہو۔ ثَلَّثَ الْفَرَسُ وَرَبَّعَ (دوڑ میں) گھوڑے کا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آنا، محاورہ ہے:
أَثَلَاثَةٌ وَّثَلَاثُوْنَ عِنْدَكَ اَوْ ثَلَاثٌ وَّثَلَاثُوْنَ: یعنی کیا تمہارے پاس ۳۳ مرد ہیں یا عورتیں؟ جَاؤُا ثُلٰثَ وَ مَثْلَثَ وہ تین تین آئے۔ نَاقَةٌ ثَلُوْثٌ: جس کے تین تھنوں سے دودھ دوہیا جائے۔ اَلثَّلَاثَاءُ: منگوار (اسی طرح) اَلْاَرْبِعَاءُ: بدھوار۔ ان میں الف ھا کے عوض ہے (جیسے: حَسَنَةٌ وَحَسْنَاءُ) اور یہ ایام کے ساتھ مخصوص ہیں۔
ثَلَّثَ الْبُسْرُ: گدر کھجوریں دو تہائیں پک گئیں۔
اسی طرح ثَلَّثَ الْعِنَبُ کا محاورہ ہے، یعنی انگور دو تہائی پختہ ہو گئے۔ ثَوْبٌ ثُلَاثِيٌّ تین گز کپڑا۔

ث م م

ثُمَّ ❶ یہ حرف عطف ہے اور پہلی چیز سے دوسری کے متاخر ہونے پر دلالت کرتا ہے، خواہ یہ تاخیر بالذات ہو یا باعتبار مرتبہ اور یا باعتبار وضع کے ہو، جیسا کہ قَبْلُ اور اول کی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ❷
﴿ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾ (۱۰۔۵۱) کیا جب وہ آ واقع ہوگا، تب اس پر ایمان لاؤ گے (اس وقت کہا جائے گا کہ) اب (ایمان لائے) اس کے لیے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔
﴿ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ (۱۰۔۵۲) پھر ظالم لوگوں سے کہا جائے گا۔
﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ (۲۔۵۲) پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا۔
ثُمَامَةٌ: ایک قسم کی گھاس جو نہایت چھوٹی ہوتی ہے اور ثَمَّتِ الشَّاةُ کے اصل معنی بکری کے ثُمَامَه گھاس چرنا کے ہیں جیسے درخت چرنے کے لیے شَجَّرَتْ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، پھر ہر قسم کی گھاس چرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ثَمَمْتُ الشَّیْءَ اس چیز کو اکٹھا اور درست

---

❶ حرف عطف يقتضي ثلاثة امور التشريك في الحكم والترتيب والمهلة وفي كل منها خلاف راجع المغني ١: ١٢٤).

❷ قال الطبري: معناه أهنالك وليست ثم التي تأتي للعطف قال ابن هشام وهذا وهم منه.

کیا۔اسی سے محاورہ ہے: كُنَّا اَهْلَ ثُمِّهٖ وَرُمِّهٖ ہم اس کی اصلاح ومرمت کے اہل تھے۔

اَلثُّمَّةُ خشک گھاس کا مٹھا۔

ثَمَّ (وہاں): اسم اشارہ بعید کے لیے آتا ہے اور اس کے بالمقابل هُنَالِكَ اسم اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ دونوں لفظ دراصل اسم ظرف ہیں ❶ اور آیت کریمہ: ﴿ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا ﴾ (۷۶۔۲۰) اور بہشت میں (جہاں) آنکھ اٹھاؤ گے، کثرت سے نعمت...... دیکھو گے۔ میں ثَمَّ مفعول واقع ہوا ہے۔ ❷

ث م د

ثَمُوْدُ: (حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام) بعض اسے معرب بتاتے ہیں اور قوم کا علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے اور بعض کے نزدیک عربی ہے اور ثَمَدٌ سے مشتق ہے (بروزن فَعُوْلٌ) اور ثَمَدٌ (بارش کے) تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو جاری نہ ہو۔

اسی سے رَجُلٌ مَثْمُوْدٌ کا محاورہ ہے، یعنی وہ آدمی جس میں عورتوں سے کثرت جماع کے سبب مادہ منویہ باقی نہ رہے۔ نیز مَثْمُوْد اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جسے سوال کرنے والوں نے مفلس کر دیا ہو۔

ث م ر

اَلثَّمَرُ: اصل میں درخت کے ان اجزاء کو کہتے ہیں جن کو کھایا جا سکے، اس کا واحد ثَمَرَةٌ اور جمع ثِمَارٌ وَثَمَرَات آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ﴾ (۲۔۲۲) اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لیے انواع واقسام کے میوے پیدا کیے۔

﴿ وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ ﴾ (۱۶۔۶۷) اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی۔

﴿ اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ﴾ (۶۔۹۹) ان کے پھلنے اور پکنے پر غور کرو۔ ❸

﴿ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ﴾ (۱۳۔۳،۱۶،۱۱) اور ہر طرح کے میوے۔

ثَمَرَ اور ثِمَار کے ایک ہی معنی ہیں، بعض نے کہا ہے کہ ثِمَارٌ، ثَمَرٌ کی جمع ہے، پھر بطور کنایہ ثمر کا لفظ ہر قسم کے کمائے ہوئے مال پر بولا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ﴾ (۱۸۔۳۴) (اس طرح) (اس شخص) کو (ان کی) پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔ میں ابن عباسؓ نے ثمر کے یہی معنی کیے ہیں۔

محاورہ ہے: ثَمَّرَ اللّٰهُ مَالَهٗ اللہ تعالیٰ اس کا مال بڑھائے اور مجازاً ہر چیز کے نفع پر ثمر کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ثَمَرَةُ الْعِلْمِ الْعمل الصالح کہ علم کا ثمرہ نیک عمل ہیں۔ وَثَمَرُ العمل الصالح الجَنَّةُ. اور نیک عمل کا ثمرہ جنت ہے۔

اور صوری مشابہت اور نیچے کی طرف لٹکنے کے اعتبار سے چابک کے سر کی گرہ کو بھی ثَمَرَةُ السَّوْطِ کہا جاتا ہے۔

---

❶ ای ظرف لایتصرف ۱۲۔

❷ قال ابن هشام وغلط من اعرابه مفعولاً لرأیت فی هذالایة ۱۲۔

❸ وفی النسخ المطبوعة القديمة والكراتشي "كلوا من ثمره" مصحف ۱۲ ۱۲۔

کیونکہ وہ بھی اسی طرح چابک سے نیچے لٹکتی ہوئی نظر آتی ہے، جیسے درخت سے پھل کا گچھا لٹک پڑتا ہے۔

اَلثَّمِیْرَۃ: مکھن کے بلبلے جو دودھ کو بلونے سے اس پر نظر آتے ہیں۔صوری تشابہ کی وجہ سے ان کو ثَمِیْرَۃُ اللَّبَن کہا جاتا ہے اور پھر وہ دودھ سے حاصل بھی ہوتا ہے، جیسے پھل درخت سے۔

ث م ن

اَلثَّمَنُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو فروخت کرنے والا اپنی چیز کے عوض خریدار سے وصول کرتا ہے، خواہ وہ زرنقد ہو یا سامان۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَشَرَوْہُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاھِمَ ﴾ (۱۲۔۲۰) اور اسے تھوڑی سی قیمت یعنی چند درہموں پر بیچ ڈالا۔ اور وہ کچھ جو کسی چیز کے عوض میں حاصل ہو وہ اس کا ثمن کہلاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلاً ﴾ (۳۔۷۷) جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں (کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ﴾ (۱۶۔۹۵) اور خدا سے جو تم نے عہد کیا تھا (اس کو مت بیچو اور) اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لو۔

﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ﴾ (۵۔۴۴) اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا۔

محاورہ میں: اَثْمَنْتُ الرَّجُلَ بِمَتَاعِہٖ وَاَثْمَنْتُ لَہٗ کے معنی کسی چیز کی زیادہ قیمت دینے کے ہیں۔اور قیمتی چیز کو شَيْءٌ ثَمِیْنٌ کہا جاتا ہے۔

ثَمَانِیَۃٌ: آٹھ (مذکر) ثَمَانُوْنَ۔ اسی (مذکر و مؤنث)

اَلثُّمْنُ آٹھواں حصہ۔

ثَمَنْتُہٗ آٹھواں ہونا۔کسی شخص کے مال سے آٹھواں حصہ لینا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿ ثَمٰنِیَۃَ اَزْوَاجٍ ﴾ (۶۔۱۴۳) (یہ بڑے چھوٹے چارپائے) آٹھ قسم کے ہیں۔﴿ سَبْعَۃٌ وَّثَامِنُھُمْ کَلْبُھُمْ ﴾ (۱۸۔۲۲) وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

﴿ عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ﴾ (۲۸۔۲۷) اس (عہد) پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو۔اَلثَّمِیْنُ: بمعنی ثُمُن یعنی آٹھواں حصہ۔شاعر نے کہا ہے ❶ طویل

(۸۱) فَمَا صَارَلِیْ فِی الْقَسْمِ اِلَّا ثَمِیْنُھَا

اس مقاسمہ میں میرا آٹھواں حصہ تھا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَلَھُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَکْتُمْ ﴾ (۴۔۱۲) تو جو مال تم (مرد) چھوڑ مرو تو اس میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔

ث ن ی

اَلثِّنْیُ وَالْاِثْنَانُ: یہ دونوں ان تمام کلمات کی اصل ہیں جو اس مادہ سے بنتے ہیں یہ کبھی معنی عدد کے اعتبار سے

---

❶ قالہ یزید بن الطشریہ (والطشریہ امہ وھو احد الشعراء الذین اشتھر وا با مھاتھم واسم ابیھا الصمۃ) واولہ : والقیت سھمی وسطھم حین اوخشوا والبیت فی اللسان (ثمن والاقتضاب ٤٦٥) فی خمسۃ ابیات وتھذیب الالفاظ ٥٨٩ والدرۃ مع الخفاجی ٨٩ وادب الکاتب ٤٥٧ وقبلہ ۔ اری سبعۃ یسعون للوصل کلھم ۔لہ عند لیلیٰ دینۃ یستد ینھا ۔ ومعنی اوخشوا ردوا اسھام المیسر فی خریطتھا والقسم بمعنیٰ المقاسمۃ ١٢.

استعمال ہوتے ہیں اور کبھی تکرار معنی کے لحاظ سے جوان کے اصل مادہ میں پایا جاتا ہے اور کبھی ان میں عدد و تکرار دونوں ملحوظ ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ ثَانِیَ اثْنَیْنِ ﴾ (۹۔۴۰) دو میں دوسرا۔﴿ اِثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ﴾ (۲۔۶۰) بارہ چشمے۔مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبَاعَ (۴۔۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔کہا جاتا ہے: ثَنَيْتُهٗ تَثْنِيَةً: میں دوسرا تھا، میں نے اس کا نصف مال لے لیا۔ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کو ملا کر دینا۔
اَلثِنٰی: جس کا دو مرتبہ اعادہ ہو حدیث میں ہے: ❶
لَا ثِنٰی فِی الصَّدَقَةِ ...... یعنی صدقہ سال میں دو مرتبہ نہ لیا جائے۔شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)
(۸۲) لَقَدْ كَانَتْ مَلَامَتُهَا ثِنٰی ”بے شک اس نے بار بار ملامت کی۔“ اِمْرَءَةٌ ثِنْیٌ: جس عورت نے دو بچے جنے ہوں اس دوسرے بچہ کو ثِنْیٌ کہا جاتا ہے۔
حَلَفَ يَمِيْنًا فِيْهَا ثِنْیٌ وَثَنْوٰی وَثَنِيَّةٌ وَمَثْنَوِيَّةٌ اس نے استثناء کے ساتھ قسم اٹھائی۔ثَنَا (ض) ثَنْيًا۔اَلشَّيْءَ کسی چیز کو موڑنا، دوہرا کرنا لپیٹنا قرآن پاک میں ہے:
﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ ﴾ (۱۱۔۵) دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں۔
حضرت ابن عباسؓ کی قرأت يَثْنَوْنٰی صُدُوْرَهُمْ ہے۔جو اِثْنَوْنَيْتُ کا مضارع ہے۔❸
اور آیت کریمہ: ﴿ ثَانِیَ عِطْفِهٖ ﴾ (۲۲۔۹) (اور تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے۔
میں گردن موڑنے سے مراد تکبر اور اعراض کرنا ہے جیسا کہ لَوٰی شِدْقَهٗ وَنَاٰی بِجَانِبِهٖ کا محاورہ ہے۔اَلثِّنٰی (ایضاً بکری) جو دوسرے سال میں داخل ہو (اونٹ) جس کے ثنیہ دانت گر گئے ہوں اور اس معنی میں فعل اَثْنٰی ہے۔ ثَنَيْتُ الشَّيْءَ اَثْنِيْهِ. کسی کو ثنایین رسی کے ساتھ باندھنا۔یہ غیر مہموز ہے بعض نے اس کے غیر مہموز ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہ کلمہ تثنیہ ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کا واحد ثناءٌ نہیں بولا جاتا۔❹
اَلْمُثَنَّاةُ: دوسری رسی۔
الثُّنْيَان: سادات کے شمار کے وقت دوسرے درجہ کا سردار۔ ثُنْيَةٌ فرومایہ محاورہ ہے۔فُلَانٌ ثُنْيَةُ اَهْلِ بَيْتِهٖ فلاں اپنے اہل میں ثنیہ یعنی سب سے کم مرتبہ ہے۔
ثَنِيَّةٌ: وہ پہاڑ جسے عبور کرتے وقت اوپر چڑھنا اور نیچے

---

❶ والحديث فی الصحاح (ثنیٰ والفائق ۱ : ۸۳ والديلمی والنهاية واموال ابی عبيد عن علیؓ راجع كنزالعمال ٦ رقم ۱۹۹٥ و ۱۳۲۲) او غريب ابی عبيدا/۹۸.
❷ قاله كعب بن زهير فی امرء ته حين لامته فی بكر وتكملة البيت أفی جنب بكر قطعتنی ملامة ...... لعمری ...... والبيت فی اللسان (ثنیٰ) وديوانه ۱۲۸ والبحر (۷ : ٤۳٥) ونسبه الصاحی ۱۳٤ الی اوس بن حجر وجمعه الدكتور محمد يوسف نجم فی مختلط شعره راجع ديوانه ۱٤۱ وفی روايته خزاية بدل ملامة وضبطه الجامع بالرفع والصواب النصب علی التميز وفاعل قطعتنی امرء ته وقبله وهو مطلع القصيدة : الا بكرت عرسی توائم من لحی ۔ واقرب باحلام النساء من الرویٰ.
❸ راجع ابن كثير ۲/٤۳٦ من اثنونیٰ (افعوعل) كمااحلولیٰ من الحلاوة ۔
❹ ذكره الجوهری فی الصحاح وكذا فی النهاية فی شرح حديث عمرو بن دينار رأيت ابن عمر ينحر بدنته وهی باركة مثنية بثنايين.......... وبعده : قال الاصمعی وان مده مادٌ لكان صواباً فحوزا الاصمعی ثناآن كماتقول كساآن لكن النحاة اتفقوا علی ترك الهمزة فی الثنايين وقد روی الزهری بالبسط فی تهذيبه علی من همزه فتدبر۱۲.

اترنا پڑے گویا دوہرا سفر کرنا پڑ رہا ہے، شکل وصورت اور صلابت کے لحاظ سے پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دے کر سامنے کے چار دانت (دواز فوق دواز تحت) میں سے ہر ایک کو ثَنِيَّة کہا جاتا ہے، (جمع ثنایا)

اَلثُّنْيَا: (من الجزور) ذبح کیے گئے اونٹ کا سر اور صلب جو قصاب اپنے لیے مستثنیٰ کر لیتا ہے۔ ❶

اور ان کو ثُنْوٰی بھی کہا جاتا ہے۔

اَلثَّنَاءُ: کے معنی بار بار کسی کی خوبیاں بیان کرنے کے ہیں اور اَثْنٰی عَلَيْهِ کے معنی کسی کی ثنا کرنے کے ہیں۔

تَثَنّٰی (تفعل) فِیْ مِشْيَتِهٖ: تکبر سے لڑکھڑا کر چلنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ ﴾ (۱۵۔۸۷)

اور ہم نے آپ کو سات مثانی (سورتیں) عطا کیں۔ میں قرآن کی سورتوں کو مثانی کہا ہے۔ ❷ کیونکہ مرورِ ایام کے ساتھ بار بار ان کا ذکر اور اعادہ ہوتا رہے گا۔ لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ نہ تو ان میں کسی قسم کا تغیر آئے گا اور نہ ہی دوسری اشیاء کی طرح یہ زوال پذیر ہیں۔ اسی بنا پر فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا ﴾ (۳۹۔۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دوہرائی جاتی ہیں۔

اور قرآن پاک کو مثانی کہنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ بار بار اعادہ سے اس کے عجائب وغرائب منقطع نہیں ہوتے اور ہر بار نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے وصف میں ایک روایت مروی ہے۔ ❸ (۵۳) لَا يَعْوَجُّ فَيَقَوَّمُ وَلَا يَزِيْغُ فَيُسْتَعْتَبُ وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ. کہ اس میں کجی نہیں آئے گی کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئے اور نہ اس میں زیغ پیدا ہوگا کہ اس کا ازالہ کرنا پڑے اور اس کے عجائب وغرائب کبھی منقطع نہیں ہونگے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَثَانِيْ ثناء سے مشتق ہو تو اس سے اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ قرآنِ پاک سے ہمیشہ ایسے مضامین ظاہر ہوتے رہیں گے جو اس کی، اس کو پڑھنے والوں، اس کا علم حاصل کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی تعریف کا موجب ہوں گے اور اسی معنی میں قرآن پاک کو آیت: ﴿ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴾ (۵۶۔۷۷) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔ میں کرم کے ساتھ متصف کیا ہے اور آیت:

﴿ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴾ (۸۵۔۲۱) بلکہ یہ قران عظیم الشان ہے۔ اس کے وصف میں مجید کا لفظ ذکر کیا ہے۔

اَلْاِسْتِثْنَاء کے معنی کلام میں ایسا لفظ لانے کے ہیں جو پہلے عام حکم سے بعض افراد کی تخصیص یا اس عام حکم کے کلیۃ مرتفع ہونے کا فائدہ دے، چنانچہ عموم حکم سے بعض افراد کی تخصیص کے متعلق فرمایا: ﴿ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ

---

❶ ومافی المعاجم من الراس والقوائم وذکره بعضهم معهما لفظ الصلب ۱۲.

❷ راجع للبحث علی المثانی التاج (ثنی) وغريب ابی عبيد ۳: ۱۴۵۔۱۴۷.

❸ کلمة من حديث طويل فی فضل القران راجع المصاحف لابن النباری ك، ھ، ب عن ابن مسعود، ش، ومحمد بن نصر) کنزالعمال ۱: رقم ۲۳۵۶.

مَـآ اُوْحِـیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّـكُـوْنَ مَیْتَةً ﴾ (۶۔۱۴۵) کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں، میں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو۔

اور پہلے کلام کی کلیۃ نفی جیسے:

وَالـلّٰـهِ لَاَفْعَلَنَّ كَذَا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ: میں یہ کام ضرور کروں گا ان شاء اللہ۔

اِمْـرَءَ تُـهٗ طَالِقٌ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ: اس کی عورت کو طلاق ہے، ان شاء اللہ۔

عَبْـدُهٗ عَتِیْقٌ اِنْ شَاءَ اللّٰه . اس کا غلام آزاد ہے، ان شاء اللہ۔ اور آیت کریمہ:

﴿ اِذْ اَقْسَـمُـوْا لَیَـصْـرِ مُـنَّهَا مُصْبِحِیْنَ ٥ وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ ﴾ (۶۸۔۱۷،۱۸) جب انھوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہی ہم اس کا میوہ توڑ لیں گے۔ اور ان شاء اللہ نہ کہا۔ میں وَلَا یَسْتَثْـنُوْنَ سے بھی یہی مراد ہیں۔

ث و ب

ثَـوْبٌ کا اصل معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آنا کے ہیں یا غور وفکر سے جو حالت مقدر اور مقصود ہوتی ہے، اس تک پہنچ جانا کے ہیں۔ چنانچہ حکماء کے اس قول اَوَّلُ الْـفِـكْـرَةِ اٰخِـرُ الْعَمَلِ میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی آغاز فکر ہی انجام عمل بنتا ہے۔ چنانچہ اوّل معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔

ثَـابَ فُـلَانٌ اِلٰی دَارِهٖ: فلاں اپنے گھر کو لوٹ آیا۔

ثَـابَـتْ اِلَیَّ نَفْسِیْ: میری سانس میری طرف لوٹی اور کنوئیں کے منہ پر جو پانی پلانے کی جگہ بنائی جاتی ہے، اسے مَثَـابَةٌ کہا جاتا ہے اور غور وفکر سے حالت مقدرہ مقصود تک پہنچ جانے کے اعتبار سے کپڑے کو ثَـوْبٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ سوت کاتنے سے غرض کپڑا بننا ہوتا ہے، لہٰذا کپڑا بن جانے پر گویا سوت اپنی حالت مقصودہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہی معنی ثواب العمل کا ہے۔ اور ثَوْبٌ کی جمع اَثْوَابٌ وَثِیَبٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿ وَثِیَـابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ (۷۴۔۴) اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ میں بعض نے ثِیَـابَ سے اس کے حقیقی معنی یعنی کپڑے پاک رکھنا مراد لیا ہے ❶ اور بعض نے کہا ہے کہ ثِیَاب سے (کنایۃ) نفس مراد ہے ❷ (یعنی نفس کو رذائل سے پاک رکھنا مراد ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❸ (طویل)

(۸۳) ثِیَابُ بَنِیْ عَوْفٍ طَهَارٰی نَقِیَّةٌ

کہ بنی عوف کے نفوس پاک وصاف ہیں۔

---

❹ نسبه ابن كثير ٤ : ٤٤) الیٰ محمد بن سیرین و رجحه ابن جریر.

❷ نقل عن ابن عباس واكثر التابعين ويؤيده كلام العرب .

❸ قاله امرء القيس في مدح بني عوف وتمامه : واوجههم بيض المسافر غران (مقيد القافيه من كلمة ١٦ بيتاً ولاتوجد تامة عند غير ابن الانبارى ٤٣٦ وفي رواية والسمط ٩١) يوم الكريهه بدل بيض المسافر والبيت في اللسان والصحاح (ثوب، غرر) وديوانه ١١٥ والعقد الثمين ١٦١ وايام العرب ٥٠ وشرح السبع لابن الانبارى ٤٦ وفيه عند المشاهد بدل بيض المسافر والمعاني للقبتى ٤٨٥۔٨١ والسيوطى ١٣٩ والصناعتين ٣٥٣ ومختار الشعر ٢٣ والعمدة ١ : ١٤٨ في اربعة ابيات والشطر في حواشي تهذيب الالفاظ ٤٨٣ والبحر (٢ : ٤١٦) والشطر الثاني في البحر (٣ : ٢٢/٨۔٣٧١).

اسی طہارت نفسانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ (۳۳۔۳۳) (اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کردے اور تمہیں بالکل پاک صاف کردے۔

اَلثَّوَابُ: انسان کے عمل کی جو جزا انسان کی طرف لوٹتی ہے اسے ثواب کہا جاتا ہے۔ اس تصور پر کہ وہ جزا گویا عین عمل ہی ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴾ (۹۹۔۷) تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ میں جزا کو نفس عمل ہی قرار دیا ہے اس لیے یہاں یَرَ جَزَآءَهٗ نہیں کہا حالانکہ مراد یہی ہے۔

گو لغوی اعتبار سے ثَوَابٌ کا لفظ خیر و شر دونوں قسم کی جزا پر بولا جاتا ہے، لیکن اکثر اور متعارف استعمال نیک اعمال کی جزا پر ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴾ (۳۔۱۹۵) (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

﴿ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ﴾ (۳۔۱۴۸) تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں بھی بہت اچھا بدلہ (دے گا)۔ اسی طرح لفظ مَثُوْبَةٌ بھی زیادہ تر جزائے خیر پر بولا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ ﴾ (۵۔۱۶۰) کہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ خدا کے ہاں اس سے بھی بدتر جزا پانے والے کون ہیں۔ میں جزائے بد کے لیے مَثُوْبَةٌ کا بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ جزائے خیر کے متعلق فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ﴾ (۲۔۱۰۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔

اَلْاِثَابَةُ: (افعال) کے معنی بھی جزا دینے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (۵۔۸۵) تو خدا نے ان کو ان کے کہنے کے عوض (بہشت کے) باغ عطا فرمائے، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ ﴾ (۲۔۱۵۲) تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا۔ میں بری جزا کو ثواب قرار دینا بطور استعارہ ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَلتَّثْوِيْبُ: (تفعیل) قرآن پاک میں: لفظ صرف بری جزا کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ ﴾ (۸۳۔۲۶) تو کافروں کو پورا پورا بدلہ مل گیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ ﴾ (۲۔۱۲۵) اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے کی جگہ مقرر کیا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ مَثَابَة کے معنی جائے ثواب کے ہیں اور خانہ کعبہ کو مَثَابَةٌ اس لیے کہا ہے کہ وہاں ثواب اعمال لکھا جاتا ہے۔ اَلثَّيِّبُ: بیوہ یا مطلقہ عورت کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی خاوند سے جدا ہو کر (گویا پہلی حالت کی طرف) لوٹ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ﴾ (۶۶۔۵) بن شوہر اور

کنواریاں۔ اَلتَّشْوِیْبُ کے معنی بار بار منادی کرنے کے ہیں، اسی سے تَشْوِیْبُ فِی الْاَذَانِ ہے (یعنی فجر کی اذان میں حَیَّعَلَتَیْنِ کے بعد اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہنا)

ثَوْبَاء: (غشی) کیونکہ وہ بھی دورہ کے ساتھ بار بار طاری ہوتی ہے۔

اَلثُّبَۃُ: جماعت کیونکہ اس کے افراد بھی بظاہر ایک دوسرے کی طرف لوٹتے ہیں، قرآن میں ہے: ﴿ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ﴾ (۴۔۷۱) شاعر نے کہا ہے [1]

وَقَدْ اغد وعلی ثبۃ کرام.

ثبۃ الحوض: حوض کا وسط جس کی طرف پانی لوٹ کر آتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

ث و ر

ثَارَ (ن) ثَوْرًا وَثَوْرَانًا۔ الغبارُ والسحابُ کے معنی غبار یا بادل کے اوپر اٹھنے اور پھیلنے کے ہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَتُثِیْرُ سَحَابًا ﴾ (۳۰۔۴۸) تو وہ بادل کو اوپر اٹھاتی ہیں۔

﴿ اَثَارُو الْاَرْضَ وَعَمَرُوْھَا ﴾ (۳۰۔۵) انھوں نے زمین کو جوتا اور اس کو...... آباد کیا۔

اور غبار کے منتشر ہونے کے ساتھ تشبیہ دے کر ثَارَتِ الْحَصْبَۃ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی کنکر کے پھیل جانے کے ہیں اور اسی طرح (یعنی مجازاً) ثَوَّرَ شَرًّا (شر کی آگ بھڑکانا) کہا جاتا ہے۔

ثَارَ ثَائِرُہٗ (کنایہ) یعنی وہ غضب ناک ہوگیا۔ ثَاوَرَہٗ اس پر حملہ کردیا۔

اَلثَّوْرُ: بیل کیونکہ اس سے زمین جوتی جاتی ہے۔ یہ اصل میں مصدر بمعنی فاعل ہے، جیسا کہ ضَیْفٌ وَطَیْفٌ بمعنی ضَائِف وَطَائِفٌ استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:

سَقَطَ ثَوْرُ الشَّفَقِ: یعنی شفق کی سرخی غروب ہوگئی۔

اَلثَّاْرُ کے معنی ''خون کا بدلہ'' کے ہیں، یہ اصل میں مہموز العین ہے اور اس مادہ سے نہیں ہے۔

ث و ی

اَلثَّوَاءُ: (ص) کے اصل معنی کسی جگہ پر مستقل طور پر اقامت کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے: ثَوٰی یَثْوِیْ ثَوَاءً وہ اقامت پذیر ہوگیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَا کُنْتَ ثَاوِیًا فِیْٓ اَھْلِ مَدْیَنَ ﴾ (۲۸۔۴۵) اور نہ تم مدین والوں میں رہ رہے تھے۔

﴿ اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی لِّلْمُتَکَبِّرِیْنَ ﴾ (۳۹۔۶۰) کیا غرور والوں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے۔

﴿ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ ﴾ (۴۷۔۱۲) اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ﴿ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَھَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْھَا فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَ ﴾ (۴۰۔۷۶) (اب) جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ ہمیشہ اسی میں رہو گے۔ متکبروں کا کیسا برا ٹھکانا ہے۔

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوٰکُمْ ﴾ (۶۔۱۲۸) خدا فرمائے گا (اب) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔

مَنْ اُمُّ مَثْوَاكَ (کنایہ) تمہارا میزبان کون ہے۔

اَلثَّوِیَّۃُ: بھیڑ بکریوں کے باڑہ کو کہتے ہیں۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

[1] قد مر تخریج فی (ث، ب، و).

کتاب الجیم

ج ء ر

اَلْجُؤار: (ف) کے اصل معنی وحشیات جیسے ہرن وغیرہ کے گھبراہٹ کے وقت زور سے آواز نکالنے اور چیخنے کے ہیں، پھر تشبیہ کے طور پر دعا اور تضرع میں افراط اور مبالغہ کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَاِلَیْهِ تَجْئَرُوْنَ ﴾ (۱۶۔۵۳) تو تم اسی کے سامنے آہ وگریہ کرتے رہو۔ ﴿ اِذَا هُمْ یَجْئَرُوْنَ ﴾ (۲۳۔۶۴) تو اس وقت چلائیں گے۔ ﴿ لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ ﴾ (۲۳۔۶۵) آج مت چلاؤ۔

ج ب ب

اَلْجُبُّ: کنواں جو پختہ یا لیپا ہوا نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَاَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ﴾ (۱۲۔۱۰) کسی گہرے گڑھے میں ڈال دو۔

اور اس کنوئیں کو جُبٌّ یا تو اسلئے کہا گیا ہے کہ وہ جَبُوْب یعنی سخت زمین میں کھدا ہوا تھا اور یا اسلئے کہ وہ گہرا گڑھا سا تھا۔ [1] اصل میں اَلْجَبُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو اس کے اصل سے کاٹ دینے کے ہیں، جیسے جَبُّ النَّخْلِ کھجور کو گھابھا دینا اور زَمَنَ الصِّرَام کی طرح زَمَنَ الْجَبَاب کا محاورہ بھی مشہور ہے جس کے معنی کھجور کو گھابھنے کا موسم کے ہیں۔ بَعِیْرٌ اَجَبُّ شتر کوہان برید اور نَاقَة جباء جیسا کہ مرد مقطوع الید کو رَجُلٌ اَقْطَعُ کہا جاتا ہے اور ایسی عورت کو قَطْعَاءُ کہتے ہیں۔

مَجْبُوْبٌ: وہ مرد جس کا آلۂ تناسل جڑ سے قطع کر دیا گیا ہو۔ اسی سے جُبَّةٌ (نوعے از پیراہن) ہے اور تشبیہ کے طور پر نیزہ کے اس پور کو بھی جُبَّة کہا جاتا ہے جس میں بھالا پیوست ہوتا ہے۔ اَلْجُبَابُ کفک شیر شتر کہ بمسکہ ماند جَبَّتِ الْمَرْءَةُ النِّسَاءَ حُسْنًا: حسن میں برتر ہونا غالب رہنا یہ بھی جَبٌّ بمعنی قطع سے مستعار ہے، جیسا کہ منازعت (بحث ومباحثہ) میں غالب ہونے کے لیے قَطَعْتُه کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جَبْجَبَةٌ جس کے معنی طبل یا چرمیں زنبیل کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ محض اس صوت کی وجہ سے اسے جَبْجَبَة کہا جاتا ہے جو اس سے مسموع ہوتی ہے۔

ج ب ت

اَلْجِبْتُ جِبْتٌ اور جِبْسٌ اس دھون کو کہتے ہیں جو کسی کام کا نہ ہو اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل جِبْسٌ کے سین کو تاء سے تبدیل کر لیا گیا ہے۔ تاکہ معنی مبالغہ پر دلالت کرے۔ شاعر نے کہا ہے۔ [2] (رجز)

---

[1] علی اثنی عشر میلامن طبریه او بین سنجل ونابلس (التاج).

[2] انشد فی الامالی (۲ : ۶۷) ثلاثة اشطار عن القراء : یاقبح الله نبی السعلات ۔عمرو بن یربوع شرار النات لیسوا اعضاء ولا اکیات راجع للشطر النوادر لابی زید ۲۰۴ وفیه الاقاتل الله بدل یا فتح الله والجمهرة لابن درید ۳ : ۳۳) قال الاستاذ المیمنی فی طرته علی اللآلی والاشعار فی القلب ایضاً وراجع ابدال ابی الطیب ۱ : ۱۱۷) واللسان تا، س) والخصائص لابن جنی ۴۵ وسر الصناعة ۱۱۹ والمخصص لابن سیدة ۳ : ۳۶) ومبادی اللغة للاسکانی وتفسیر الطبری ۸ : ۲۲۲) والصباحی ۱۰۹) وفیه عمر بن مسعود والمفصل ۳۶۸ والشطر منسوب لعلباء بن ارقم الیشکری کمافی اللآلی واللسان (تا) وهو شاعر جاهلی قدیم .

(۸۴) عمرو بن یربوع شرار النَّاتِ

یعنی عمرو بن یربوع تمام لوگوں سے ناکام ہے۔

نیز ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے وہ جِبْتٌ کہلاتی ہے اور ساحر کاہن کو بھی جِبْت کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ ﴾ (۴۔۵۱) کہ بے اصل باتوں اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

ج ب ر

اَلْجَبْرُ: اصل میں جبر کے معنی زبردستی اور دباؤ سے کسی چیز کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے جَبَرْتُهٗ (ن) فَانْجَبَرَ وَاجْتَبَرَ: بعض نے جَبَرْتُهٗ فَجَبَرَ بھی نقل کیا ہے، یعنی جَبَرَ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (رجز)

(۸۵) قَدْ جَبَرَ الدِّيْنَ الْإِلٰهُ فَجَبَرَ

یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کو درست کیا تو وہ درست ہو گیا۔

یہی قول اکثر ائمہ لغت کا ہے، لیکن بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں فَجَبَرْ (انفعال) یعنی لازم نہیں ہے بلکہ متعدی ہے اور تکرار سے اصلاح اور اس کی تکمیل پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ نے دین کی اصلاح کی ابتداء کی اور پھر اسے تکمیل تک پہنچا دیا کیونکہ فَعَلَ کا صیغہ جس طرح کسی کام کو شروع کرنے کا معنی دیتا ہے اسی طرح اس کے معنی کسی کام کو سرانجام دے کر اس سے فارغ ہو جانا بھی آتے ہیں اور اس سے مبالغہ کے معنی یا تکلف کو ظاہر کرنے کے لیے تَجَبَّرَ (تفعل) کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۸۵) تَجَبَّرَ بَعْدَ الْاَكْلِ فَهُوَ غَيِّضٌ

گھاس چرانے کے بعد دوبارہ ہری ہو گئی ہے۔

پھر جبر کا لفظ کبھی صرف اصلاح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ کا قول ہے۔ (۵۴) يَا جَابِرَ كُلِّ كَسِيْرٍ وَمُسَهِّلَ كُلِّ عَسِيْرٍ اے ہر شکستہ کی اصلاح کرنے والے اور ہر مشکل آسان کرنے والے اور اسی معنی میں روٹی کو جَابِر بن حَبَّةَ کہا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ کبھی محض استبداد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے۔ ❸ (۵۵) لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيْضَ کہ انسان نہ تو مجبور محض ہے نہ کلی طور پر مختار۔ علم ریاضی کی اصطلاح میں الجبر کے معنی ہیں کسی چیز کی

---

❶ نصف مطلع من ارجوزة العجاج فی نحو مأتی اشطار وهی موقوفة مقیدة یمدح بهما عمربن عبدالله بن معمر وكان عبدالمالك وجهه لقتال ابی فدیك الخارجی فاوقع به و باصحابه فذالك ذكرالجبارالدین وبعدهٗ: وعور الرحمن من ولی العور وقد جمع الشاعربین اللازم والواقع راجع له الخزانة ۱: ۱۰۳ والطبری ۶: ۱۷۴) العمدة ۱: ۸۹) واصلاح یعقوب ۲۸۸) واللسان (جبر) والاقتضاب ۴۰۷.

❷ قاله امرء القیس فی قصیدة ۲۵ بیتا مطلعها: أمن ذكر سلمیٰ اذتأتك تنوص۔فتقصر عنها خطوة وتبوص وصدرالبیت: ویاكلن من قولعاماً وربة وفی روایة الدیوان نمیص بدل غیض (كمافی بعض الطباعة) وهو مصحف والتصویب من المراجع وهی موافقه لمافی اللسان (جبر، نمص) قال السند بی ونمیص ذاهب الشعروفی اللسان: النمیص: النبات حین طلع ورقه راجع للبیت اللسان (جبر) والعقدالثمین ۱۳۷ ودیوانه ۷۸ (صنعة السند وبی) والجمهرة لابن درید ۳: ۸۹) وابدال ابی الطیب ۲: ۳۸۸) وغریب ابی عبید ۱: ۱۶۶)

❸ وردعن علی موقوفاً فی خطبة طویله انظر (حل) كنزالعمال رقم ۱۵۶۸ رواه الشافعی.

اصلاح کے لیے اس کے ساتھ کچھ الحاق کر دینا اور اَلْجَبْرُ بمعنی بادشاہ بھی آتا ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۸۷) وَانْعِمْ صَبَاحًا اَیُّهَا الْجَبَر

کہ اے بادشاہ سلامت! تم خوش رہو۔

بادشاہ کو جبر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کے مطابق لوگوں کو مجبور کر لیتا ہے یا اس لیے کہ وہ ان کے امور کی اصلاح کرتا ہے۔

اَلْاِجْبَارُ: (افعال) اس کے اصل معنی کسی کو مجبور کرنا کہ وہ دوسرے کی اصلاح کرے۔لیکن عرف میں محض اکراہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔جیسے اَجْبَرْتُهٗ عَلٰی کَذَا (کسی کام پر مجبور کرنا) اور جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو گناہ پر مجبور کرتا ہے، انھیں متکلمین کی اصلاح میں مُجَبِّرَۃ کہا جاتا ہے اور متقدمین انہیں جَبْرِیَه یا جَبَرِیَّه کہتے ہیں۔ ❷

اَلْجَبَّارُ: انسان کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ناجائز تعلّی سے اپنے نقص کو چھپانے کی کوشش کرنا۔ بدیں معنی اس کا استعمال بطورِ مذمت ہی ہوتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴾ (۱۴۔۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد رہ گیا۔

﴿ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴾ (۱۹۔۳۲) اور مجھے سرکش اور بد بخت نہیں بنایا۔

﴿ اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ﴾ (۵۔۲۲) وہاں تو بڑے زبردست لوگ (رہتے) ہیں۔

﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ (۴۰۔۳۵)......اسی طرح خدا ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

یعنی جو شخص قبول حق اور اس پر ایمان لانے سے بالاتر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کبھی کبھی محض دوسرے پر استبداد کرنے والے کو جَبَّار کہا جاتا ہے، اسی معنی میں فرمایا:

﴿ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ﴾ (۵۰۔۴۵) اور تم ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو۔

اور ہمسروں پر تَعَلّی کے معنی کے لحاظ سے بلند کھجور یا اونٹنی کو جَبَّارَة کہا جاتا ہے اور جو حدیث میں آیا ہے ❸ ضِرَاسُ الْكَافِرِ مِثْلُ اُحُدٍ وَّ كَثَافَةُ جِلْدِهٖ اَرْبَعُوْنَ ذِرَاعًا بِذِرَاعِ الْجَبَّارِ کہ دوزخ میں کافر کی ڈاڑھ کا حجم مثل اُحد کے ہوگا اور اس کی کھال کی کثافت

---

❶ قاله ابن احمر واوله : واسلم براووق حيث به قال ابن جنى ولم يسمع بالجبر الملك الافى شعر ابن احمر والبيت فى اللسان (جبر) والمعانى للقبتى ٤٥٥ قال والجبر الرجل اصله سريانى .

❷ خلاف القدريه قال الحافظ فى التبصير وهو طريق متعلمى الشافعيه وفى البصائر وهذا قول المقتدمين واما فى عرف المتكلمين فيقال لهم المجبرة (كذا فى التاج) ابوعبيد هو كلام مولد وهم فرقة اهل اهواء منسوبون الى شيخهم الحسين بن محمد النجار البصرى (فى التاج) قلت هو ابو عبدالله الحسين بن محمد بن عبدالله النجار وكان جملة المجبرة ومتكلميهم وله مع النظام مجالس ومناظرات وله كتب فى القضاء والقدر وراجع الفهرست لابن النديم ٢٥٤ والجواهر لمضيئه ١٦٤ وايضاً التبصير ص ٦١.

❸ فى رواية الترمذى عن ابى هريرة اثنان واربعون ذراعاً وليس فيه ذكر ذراع الجبار وفى مسند احمد من حديث ابى عمر سبعون ذراعاً واما لفظه ضرس الكافر مثل احد فرواه مسلم وفيه غلظ جلده مسيرة ثلاث راجع تخريج الاحياء للعراقى ٤: ٥٣٣) وذكر ذراع الجبار ورد فى الفائق ١: ٨٦ وفيه وكان هذا الملك من ملوك العجم تام الذراع وكذا قال القبتى (راجع التاج).

جبار کے چالیس ذراع کے برابر ہوگی...... تو اس حدیث کی تفسیر میں ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ یہاں جَبَّـار سے مراد بادشاہ ہے اور اس ذراع کو ذِرَاعُ الشَّاۃ کہا جاتا تھا۔ ❶

اور جب الجبار باری تعالیٰ کی صفت ہو، جیسے فرمایا:﴿ اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ﴾ (۵۹۔۲۳) غالب زبردست بڑائی والا۔ تو اس کے اشتقاق میں اہل لغت سے دو قول منقول ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ جَبَـرْتُ الْـفَقِيْرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی فقیر کی حالت کو درست کرنے اور اسے بے نیاز کر دینا کے ہیں اور باری تعالیٰ بھی چونکہ اپنے فیضان نعمت سے لوگوں کی حالتیں درست کرتا اور ان کے نقصانات پورے فرماتا ہے، اس لیے اسے اَلْجَبَّار کہا جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کے سامنے مقہور کر لیتا ہے، اس لیے اسے الـجبَّـار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لیکن بعض ارباب لغت نے بحیثیت لفظ اور صیغہ کے اس معنی پر اعتراض کیا ہے کہ اَفْـعَـلْـتُ سے صیغہ فَـعَّـال (مبالغہ) قیاساً نہیں آتا۔ لہٰذا اَلْـجَبَّار کا صیغہ اِجْبَـار (افعال) سے نہیں بن سکتا۔ ❷ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جَبْر سے بنا ہے نہ کہ اِجْبَارٌ سے اور جَبْر کے معنی بھی مجبور کرنا آجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے ❸ لاَ جَبْـرَ وَلاَ تَـفْـوِیْضَ . (کہ نہ مجبور کرنا ہے اور نہ سونپ دینا)

اور معتزلہ کی ایک جماعت نے معنوی لحاظ سے اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کی شان اس سے بلند ہے کہ بندوں کو مجبور کرے، حالانکہ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (تکوینی طور پر) بندوں کو بہت سی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے جن سے رہائی پانا ان کے اختیار سے باہر ہے اور جبر کے یہ معنی مقتضائے حکمت الٰہیہ کے عین مطابق ہیں نہ کہ اس کے خلاف جیسا کہ جاہل اور گمراہ لوگوں کا خیال ہے، مثلاً مرض، موت بعث بعد از موت وغیرہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خاص صنعت اور اعمال و اخلاق میں کوئی طریقہ اختیار کرنے پر مسخر کر رکھا ہے اور اسے مجبور بصورت مختار بنایا ہے کہ ہر انسان جس دھن میں لگا ہے اس میں مگن ہے یا اس سے بیزار ہے لیکن بادل نخواستہ اسے کیا چلا جا رہا ہے کہ گویا اس کے بدلہ میں کوئی اور کام اسے نظر ہی نہیں آتا۔ اسی بنا پر ارشاد ہے:

﴿ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ ۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ (۲۳۔۵۳) تو پھر آپس میں اپنے کام کو متفرق کر کے جدا جدا کر دیا جو چیز جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہو رہا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿ نَـحْـنُ قَسَـمْـنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الـدُّنْيَـا ﴾ (۴۳۔۳۲) ہم نے ان میں ان کی معیشت کو

---

❶ وکذا فی التاج (جبر).

❷ قالہ القبتی کما فی التاج وجوزہ الفراء وقال: لم اسمع فعّال الا من افعل الا فی حرفین وھو جبار من اجبرت ودرّاك من ادركت وایضاً وافقہ الازھری.

❸ قد مر الآن تخریجہ وایضاً الشاھد فی ارجوزۃ العجاج وسیاتی من قول علیؓ.

دنیا کی زندگی میں تقسیم کردیا۔

اس معنی میں الجبّار اللہ تعالیٰ کی صفت ہونا ظاہر ہے، کیونکہ اگر وہ کسی پر جبر کرتا ہے تو اقتضائے حکمت کے مطابق کرتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے [1]

(۵۶) یَا بَارِئَ الْمَسْمُوْکَاتِ وَجَبَّارَ الْقُلُوْبِ عَلٰی فِطْرَتِهَا شَقِیِّهَا وَسَعِیْدِهَا . کہ اے روحوں کو پیدا کرنے والے اور دلوں کو ان کی اچھی یا بری فطرت پر جوڑنے والے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دلوں کو علم وعرفان کے لحاظ سے ان کی اصلی فطرت پر جوڑ دیا ہے اور یہ ماتقدم کے عموم میں داخل ہے۔

اَلْجَبَرُوْتُ: (قدرت) طاقت، عظمت۔ یہ تجبر (تفعل) سے فَعَلُوْتٌ کے وزن پر ہے۔

اِسْتَجْبَرْتُ حَالَهٗ، میں نے اس کی حالت درست کرنے کے لیے اس کی دیکھ بھال کی۔

اَصَابَتْهُ مُصِیْبَةٌ لَا یَجْتَبِرُ: اسے اتنی بڑی مصیبت پہنچی کہ وہ اس کے جبر کا قصد نہیں کرسکتا۔ اور جَبْرُ الْعَظْمِ (ہڈی کو جوڑنا) اَلْجَبِیْرَةُ سے مشتق ہے، جس کے معنی اس پٹی کے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے اور اَلْجِبَارۃ اس لکڑی کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے۔ اَلْجَبِیْرَۃ کی جمع اَلْجَبَائِر آتی ہے۔ نیز تشبیہ کے طور پر کنگن اور بازو بند کو بھی جِبَارَۃ کہا جاتا ہے اور اَلْجِبَار جس کی دیت ساقط ہو۔ [2]

ج ب ل

اَلْجَبَلُ: پہاڑ۔ ج اَجْبَال وَجِبَالٌ

قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ٥ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴾ (۷۸-۶،۷) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو (اس کی) میخیں (نہیں) ٹھہرایا؟

﴿ وَالْجِبَالَ اَرْسَاهَا ﴾ (۷۹-۳۲) اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا۔

﴿ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا ﴾ (۳۵-۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔

﴿ وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا ﴾ (۲۰-۱۰۵) اور تم سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ اللہ ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔

﴿ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فَارِهِیْنَ ﴾ (۲۶-۱۴۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

اور پہاڑ کی مختلف صفات کے اعتبار سے استعارۃً ہر صفت کے مطابق اشتقاق کر لیتے ہیں، مثلاً معنی ثبات کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ جَبَلٌ لَا یَتَزَحْزَحُ . کہ فلاں نہ ہلنے والا پہاڑ ہے۔ جَبَلَهُ اللّٰهُ عَلٰی کَذَا . اس کی فطرت ہی ایسی ہے، یعنی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ فُلَانٌ ذُوْ جَبِلَّةٍ . فلاں بھدے جسم کا ہے۔ ثَوْبٌ جَیِّدُ الْجِبْلَةِ

[1] وفی الفائق ۱ : ۱۹۳ عن سلامۃ الکندی کان علیؓ یعلمنا الصلوۃ علی النبیؐ ونقلہ بتمامھا قریباً فی سبعۃ اسطر.

[2] ومنه فی الحدیث المعدن جبار والبئر جبار والعجماء جبار ـ ای الجرح والدم فی هذه الثلاثة هدرٌ لاارش فیها هذا وفی المطبوع من الارض مکان من الارش مصحف والتصدید من المراجع ۱۲.

عمدہ اور مضبوط بنا ہوا کپڑا۔

اور بڑائی وعظمت کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے بڑی جماعت کو جِبِلٌّ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا﴾ (۳۶۔۶۲) اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

ایک قرأت میں جُبُلًا تشدید کے ساتھ ہے۔ تَوَّزِیْ نے کہا ہے کہ جُبْلاً وَجَبْلاً وَجُبُلاً وَجِبِلا کے ایک ہی معنی ہیں۔ ❶

اور دوسرے علماء نے کہا ہے جِبِلاً جِبِلَّۃٌ کی جمع ہے اور اسی سے آیت: ﴿وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۸۴) میں جبلۃ سے مراد ان کے وہ احوال ہیں جن پر ان کو پیدا کیا تھا اور وہ راستے جن پر چلنے کے وہ فطرۃً پابند تھے۔ جس کی طرف آیت کریمہ: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ (۱۷۔۸۴) کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جَبُلَ فُلَانٌ فلاں پہاڑ کی طرح غلیظ الجسم ہے۔

ج ب ن

اَلْجَبِيْنُ: پیشانی کا کنارہ۔ اور پیشانی کے دونوں طرف کے کناروں کو جَبِيْنَان کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ﴾ (۳۷۔۱۰۳) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹالیا۔

اَلْجُبْنُ: (بزدلی) دل کا ایسے موقع پر کمزوری کا اظہار کرنا جہاں اسے قوت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ جَبَانٌ: بزدل (مذکر ومؤنث) اَجْبَنْتُهٗ بزدل پانا کسی پر بزدلی کا حکم لگانا۔ اَلْجُبْنُ (ایضاً) پنیر تَجَبَّنَ اللَّبَنُ: دودھ پنیر بن گیا یا پنیر کی طرح جم گیا۔

ج ب ہ

اَلْجَبْهَةُ: (ماتھا، پیشانی) سر کا وہ حصہ جو سجدہ کی حالت میں زمین پر لگتا ہے، اس کی جمع جِبَاهٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۳۵) پھر ان سے ان (بخیلوں) کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا۔

اور جَبْهَةٌ کے معنی ثریا ستارہ کے بھی آتے ہیں۔ گویا وہ بھی برج اسد کے لیے بمنزلہ پیشانی کے ہے۔ جَبْهَةُ الْقَوْمِ: سرداران قوم جیسا کہ انھیں وُجُوْهُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے اور جَبْهَة کے معنی گھوڑے بھی آتا ہے، جیسا کہ مروی ہے ❷ (۵۷) اَنَّهٗ لَيْسَ فِي الْجَبْهَةِ صَدَقَةٌ. یعنی گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

ج ب ی

جَبٰى: (ض) جِبَايَةً، اَلْمَاءَ فِي الْحَوْضِ: حوض میں پانی جمع کیا اور بڑے حوض کو جَابِيَة کہا جاتا ہے اس کی جمع جَوَابِ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

---

❶ ففيه اربع قراءت جبلاً نسبه الطبرى الى روح وزيد وقال هو قراءة الحسن والاعرج والزهرى راجع الطبرسى ۲۳ : ۳۴ التفسير للدانى ۸۴ او توزى هو ابو محمد عبدالله بن محمد التوزى من علماء البصرة ـ ۲۳۰) راجع البغيه ۲۹۰ والانباه ۲ : ۱۲۶.

❷ وفى الفائق ۱ : ۸۶ وسميت بذالك لانها خيار البهائم والحديث باختلاف الفاظه فى (البيهقى عن ابى هريرة والحاكم فى امكنى عن الحسن عن عبدالرحمن بن سمرة وفى مراسله والبيهقى ايضاً عن الحسن مرسلا وابو عبيد فى غريبه راجع لتخريجه (خيل).

﴿ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ ﴾ (۳۴۔۱۳) اور لگن جیسے بڑے بڑے حوض۔ اور اسی سے بطور استعارہ جَبَيْتُ الْخَرَاجَ جِبَايَةً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی مال خراج جمع کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ (۲۸۔۵۷) جہاں ہر قسم کے میوے پہنچائے جاتے ہیں۔

اَلْاِجْتِبَاءُ: (افتعال) کے معنی انتخاب کے طور پر کسی چیز کو جمع کرنے کے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ: ﴿ وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ﴾ (۷۔۲۰۳) اور جب تم ان کے پاس (کچھ دنوں تک) کوئی آیت نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ تم نے (اپنی طرف) سے کیوں نہیں بنالی۔ میں لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا کے معنی یہ ہوں گے کہ تم خود ہی ان کو تالیف کیوں نہیں کر لیتے، دراصل کفار یہ جملہ طنزاً کہتے تھے کہ یہ آیات اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ بلکہ تم خود ہی اپنے طور بنا لیتے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اسے اپنے فیض کے لیے برگزیدہ کر لیتا ہے، جسے گوناگوں نعمتیں جدوجہد کے بغیر حاصل ہو جاتی ہیں، یہ انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے اور صدیقوں اور شہیدوں کے لیے جوان کے قریب درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ ﴾ (۱۲۔۶) اور اسی طرح خدا تمہیں برگزیدہ (وممتاز) کرے گا۔

﴿ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ (۶۸۔۵۰) پھر پروردگار نے ان کو برگزیدہ کر کے نیکوکاروں میں کر لیا۔

﴿ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (۶۔۸۷) ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔

﴿ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ﴾ (۲۰۔۱۲۲) پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔

﴿ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ (۴۲۔۱۳) جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے، اسے اپنی طرف رستہ دکھا دیتا ہے۔

اس اجتباء کو دوسرے مقام پر اخلاص سے تعبیر فرمایا ہے۔

﴿ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴾ (۳۸۔۴۶) ہم نے ان کو ایک (صفت) خاص (آخرت کے) گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا۔

ج ث ث

جَثَّهٗ (ن) جَثًّا کے معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے ہیں اور اِنْجَثَّ اس کا مطاوع آتا ہے، جیسا کہ جَسَّ کا مطاوع اِجْتَسَّ آتا ہے قرآن پاک میں ہے [1]

﴿ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ ﴾ (۱۴۔۲۶) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔

اَلْمِجَثَّةُ: ہر وہ آلہ جس سے درخت کو اکھاڑا یا کھودا جائے۔

جُثَّةُ الشَّيْءِ کے معنی کسی کے ابھرے ہوئے شخص کے ہیں اور اَلْجُثُّ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے، جو زمین سے بلند ہو جائے، جیسے ٹیلہ وغیرہ۔

---

[1] وفی الحدیث قال رجل لنبی صلی اللہ علیہ وسلم ماھذہ الکمأۃ الاشجرۃ التی اجتثت من فوق الارض فقال لابل (من المن (التاج) ۱۲.

اَلْجَثِيْثَةُ: کھجور کا پودا جو اکھاڑ کر لگایا گیا ہو۔ ❶

اَلْجُثْجَاثُ: ایک قسم کا گھاس۔ایک کڑوا خوشبودار زرد درخت جس میں بابونہ کی طرح پھول ہوتے ہیں۔

ج ث م

جَثَمَ (ض ن) جَثْمًا وَجُثُوْمًا: الطائر پرندکا زمین پر سینہ کے بل بیٹھنا اور اس کے ساتھ چمٹ جانا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر فرمایا: ﴿ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ (۷۔۹۱) اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

اَلْجُثْمَانُ: بیٹھے ہوئے انسان کا شخص۔رَجُلٌ جُثْمَةٌ وَجَثَّامَةٌ بہت سونے والا سست آدمی۔

ج ث و

جَثَا (ن) جُثُوًّا وَجِثِيًّا۔ الرَّجُلُ: گھٹنوں کے بل بیٹھنا یہ عَتَا (ن) عَتُوًّا وَعِتِيًّا کی طرح (باب نصر سے آتا ہے) جَاثٍ (صیغہ صفت) ج جُثِیٌّ جیسے بَاكٍ وَبُكِيٌّ. اور آیت کریمہ:

﴿ وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾ (۱۹۔۷۲) اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے۔ میں جِثِيًّا ، جَاثٍ کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور مصدر بمعنی اسم فاعل بھی اور آیت کریمہ: ﴿ وَتَرٰی كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ﴾ (۴۵۔۲۸) اور تم ہر ایک فرقے کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوگا۔ میں " جَاثِيَةً " جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے: جَمَاعَةٌ قَائِمَةٌ اَوْ قَاعِدَةٌ

ج ح د

جَحَدَ (ف) جَحْدًا وَجُحُوْدًا: (جان بوجھ کر انکار کر دینا) کے معنی دل میں جس چیز کا اقرار ہو، اس کا انکار اور جس کا انکار ہو اس کا اقرار کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ﴾ (۲۷۔۱۴) اور ان سے انکار (کیا) کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے۔ ﴿ بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴾ (۷۔۵۱) اور ہماری آیتوں سے منکر ہورہے تھے۔ کہا جاتا ہے:

رَجُلٌ جَحْدٌ یعنی کنجوس اور قلیل الخیر آدمی جو فقر کو ظاہر کرے۔

اَرْضٌ جَحْدَةٌ: خشک زمین جس میں روئیدگی نہ ہو۔ محاورہ ہے: جَحْدًا لَّهٗ وَنَكِدًا . (اسے خیر حاصل نہ ہو)

اَجْحَدَ. (افعال) انکار کرنا۔ منکر ہونا۔

ج ح م

اَلْجَحْمَةُ: آگ بھڑکنے کی شدت اسی سے اَلْجَحِيْمُ (فعیل) ہے، جس کے معنی دوزخ یا دہکتی ہوئی آگ کے ہیں۔

اور جَحْمَةَ النَّارِ سے بطور استعارہ جَحِمَ (س) وَجْهُهٗ مِنْ شِدَّةِ الْغَضَبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی غصہ سے چہرہ جل بھن جانے کے ہیں، کیونکہ غصہ کے وقت بھی حرارت قلب بھڑک اٹھتی ہے، کہا جاتا ہے:

جَحَمَ (ف) الْاَسَدُ بِعَيْنَيْهِ شیر کی آنکھیں بھی آگ

---

❶ فی الطبوع "بعد طحنه" مصحف والصحیح بعد قلعه کمافی المعاجم.

کی طرح روشن ہوتی ہیں۔

ج د د

اَلْجَدُّ: (مصدر ض) کے اصل معنی ہموار زمین پر چلنے کے ہیں۔ اسی سے جَدَّ فِی سَیْرِہٖ ہے جس کے معنی تیز روی کے ہیں اور جب کوئی شخص اپنے معاملہ میں محنت اور جانفشانی سے کام کرے تو کہا جاتا ہے: جَدَّ فِیْ اَمْرِہٖ اور اَجَدَّ (افعال) کے معنی صاحب جد ہونے کے ہیں اور جَــدَدْتُ الْاَرْضَ سے کسی چیز کو کاٹنے کا معنی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے جَدَدْتُہٗ (میں نے درست کرنے کے لیے اسے کاٹا) اور ثَوْبٌ جَدِیْدٌ کے اصل معنی قطع کیے ہوئے کپڑا کے ہیں اور چونکہ جس کپڑے کو کاٹا جاتا ہے وہ عموماً نیا ہوتا ہے، اس لیے ہر نئی چیز کو جَــدِیْــدٌ کہا جانے لگا ہے اس بنا پر آیت: ﴿بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾ (۵۰۔۱۵) میں خلق جدید سے نشأۃ ثانیہ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے پیدا ہونا مراد ہے، کیونکہ کفار اس کا انکار کرتے ہوئے کہتے تھے:

﴿ءَ اِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِیْدٌ﴾ (۵۰۔۳) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے (تو پھر زندہ ہوں گے؟) یہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید ہے۔ اور جدید (نیا) خلق یعنی پرانا کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، اس اعتبار سے رات دن کو جَــدِیْـدَانِ اور اَجَـدَّانِ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ﴾ (۳۵۔۲۷) اور پہاڑوں پر سفید رنگ کے قطعات ہیں۔ میں جُدَدٌ کا واحد جُدَّۃٌ ہے، جس کے معنی کھلے راستہ کے ہیں اور یہ طَرِیْقٌ مَجْدُوْدٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ راستہ جس پر چلا جائے، اسی سے جَادَّۃُ الطَّرِیْقِ ہے، (جس کے معنی شاہراہ یا ہموار اور راستہ کے درمیانی حصہ کے ہیں، جس پر عام طور پر آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔)

اَلْجَدُوْدُ وَالْجَدَّاءُ: خشک تھنوں والی بھیڑ بکری اور سب وشتم کے طور پر کہا جاتا ہے۔ جُدَّ ثَدْیُ اُمِّہٖ اس کی ماں کے پستان خشک ہو جائیں اور جَـدٌّ کا لفظ فیض الٰہی پر بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاَنَّهٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا﴾ (۷۲۔۳) اور یہ کہ ہمارے پروردگار کا فیضان بہت بڑا ہے۔

میں جَــدٌّ بمعنی فیض الٰہی ہی کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی عظمت کے ہیں [1] لیکن اس کا مرجع بھی معنی اول کی طرف ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت اختصاص ملک کے طریق سے ہے اور حظوظ دنیوی جو اللہ تعالیٰ انسان کو بخشتا ہے پر بھی جَـدٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے، جس کے معنی بخت ونصیب کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: جُدِدْتُ وَحُظِظْتُ خوش قسمت اور صاحب نصیب ہو گیا اور حدیث (۵۸) وَلَا یَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ. کے معنی یہ ہیں کہ دنیاوی مال وجاہ سے آخرت میں ثواب حاصل نہیں ہو سکے گا، بلکہ اُخروی ثواب کے حصول کا ذریعہ صرف طاعت الٰہی ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا

---

[1] راجع غریب القرآن للقبتی ١٩. اخرجه مسلم فی صحیحه ١: ٩٠ من حدیث ابی سعید الخدری (ابن عباس (باب الدعاء بعدالرکوع) والنسائی عن معاویة: مایقول اذاانصرف من الصلوة کنزالعمال ٢: رقم ٢٠٨٩) ١٢.

نَشَآءُ ﴾ کے بعد فرمایا:

﴿ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾ (۱۷۔ ۱۹) اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور اس میں اتنی کوششیں کرے۔ جتنی اسے لائق ہے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

نیز اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنٌ ﴾ (؟......؟) جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔

اَلْجَدُّ (ایضاً) دادا۔ نانا۔

بعض نے کہا ہے کہ لَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ کے معنی یہ ہیں کہ اسے آبائی نسب فائدہ نہیں دے گا اور جس طرح کہ آیت: ﴿ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنٌ ﴾ میں اولاد کے فائدہ بخش ہونے کی نفی کی ہے، اسی طرح حدیث میں آباؤ اجداد کے نفع بخش ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

ج د ث

جَدَثٌ: قبر۔ ج: اَجْدَاثٌ۔ قرآن میں ہے:

﴿ یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا ﴾ (۷۰۔۴۳) اس دن یہ قبر سے نکل کر (اس طرح) دوڑیں گے۔

اور سورۂ یٰسین میں ہے: ﴿ فَاِذَا هُمْ مِنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ ﴾ (۳۶۔۵۱) یہ قبروں سے (نکل کر) اپنے پروردگار کی طرف دوڑیں گے۔ اور قبر کو جَدَفٌ بھی کہا جاتا ہے۔ [1]

ج د ر

اَلْجِدَارُ کے معنی حَائِط (دیوار) ہی کے ہیں، لیکن اس اعتبار سے کہ وہ زمین سے اونچی اور بلند ہوتی ہے، اسے جِدَار کہا جاتا ہے اور اس اعتبار سے کہ احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسے حَائِط کہا جاتا ہے۔ جِدَارٌ کی جمع جُدُرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَیْنِ ﴾ (۱۸۔۸۲) اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں کی تھی۔

﴿ جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ﴾ (۱۸۔۷۷) ایک دیوار (دیکھی) جو (جھک کر) گرا چاہتی تھی۔ خضرؑ نے اس کو سیدھا کر دیا۔

﴿ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ﴾ (۵۹۔۱۴) یا دیواروں کی اوٹ میں۔ اور حدیث پاک میں ہے [2] (۵۹) حَتّٰی یَبْلُغَ الْمَاءُ الْجُدُرَ . (جب تک کہ پانی دیواروں تک نہ پہنچ جائے۔)

جَدَرْتُ الْجِدَارَ: دیوار کو اونچا کر دیا۔

اور اس میں معنی ارتفاع کے اعتبار سے جَدَرَ الشَّجَرُ کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں، چنے کے دانے کی طرح درخت کے کونپل نکل آئے اسی طرح وہ روئیدگی جو زمین پر ظاہر ہو۔ اسے جِدْرٌ کہا جاتا ہے، اس کا واحد جِدْرَةٌ ہے اور اَجْدَرَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین

---

[1] راجع کتاب الابدال لابی الطیب ۱: ۱۹۲۔

[2] قال صلی اللہ علیہ وسلم فی شراج الحرۃ حین اختصم الیہ الزبیر بن العوام وحاطب بن ابی بلتعہ فقال یا زبیر اسق ثم ارسل الماء الی جارك فغضب الانصاری وقال: ان كان ابن عمتك فقال صلی اللہ علیہ وسلم اسق یا زبیر ثم احبس الماء حتیٰ یرجع الی الجدر الحدیث والكشاف ۱: ۲۷۸) وابن ابی الحاتم عن سعید بن المسیب وفی الصحیحین من طریق الزهری عن عروۃ (راجع تخریج الكشاف ٤٥ رقم ٧٢ وغریب ابی عبید ٤: ٢٠١ والفائق ١: ٦٥٢.

سبزہ زار ہو گئی۔

جدر (ن) الصَّبیُّ وَجُدِرَ (بچے کو چیچک نکل آئی) یہ محاورہ درخت کے کونپل کے ساتھ تشبیہاً بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْجِدْرِیُّ وَالْجِدْرَۃ کے معنی غدود یا آبلہ کے ہیں جو جسم پر ظاہر ہوتا ہے، اس کی جمع اَجْدَارٌ ہے۔ شَاۃٌ جِدَارٌ گوسپند آبلہ زدہ۔

اَلْجَیْدَرُ کوتاہ قد۔ یہ بھی جدار سے مشتق ہے، لیکن بطور تحکم اس میں یا زائدہ کر دی گئی ہے۔ حقارت کو ظاہر کرنے کے لیے اس میں یا بڑھا دی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی کتاب ''اصول الاشتقاق'' میں بیان کر چکے ہیں۔

اَلْجَدِیْرُ: (سزاوار) اس کے معنی منتہی کے ہیں۔ کیونکہ اس تک کسی امر کی انتہا ہوتی ہے۔ جیسا کہ دیوار تک پہنچ کر کوئی چیز رک جاتی ہے اور جَدُرَ (ك) بِكَذَا کے معنی کسی چیز کے لائق ہونے کے ہیں۔ اس سے صیغہ صفت جَدِیْرٌ آتا ہے۔

مَا اَجْدَرَہٗ وَاَجْدِرْ بِہٖ: (صیغہ تعجب) وہ اس کے لیے کس قدر زیبا ہے۔

ج د ل

اَلْجِدَالُ: (مفاعلۃ) کے معنی ایسی گفتگو کرنا کے ہیں، جس میں طرفین ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں، اصل میں یہ جَدَلْتُ الْحَبْلَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں رسی کو مضبوط بٹنا، اسی سے بٹی ہوئی رسی کو اَلْجَدِیْلُ کہا جاتا ہے۔ جَدَلْتُ الْبِنَاءَ: مضبوط عمارت بنانا۔ دِرْعٌ مَجْدُوْلَۃٌ مضبوط زرہ۔

اَلْاَجْدَلُ شکرا۔ کیونکہ اس کا بدن بھی گٹھا ہوا ہوتا ہے۔

اَلْمِجْدَلُ: مضبوط محل۔

اسی سے اَلْجِدَالُ (جھگڑنا) ہے، کیونکہ جھگڑنے والے بھی ایک دوسرے کو اس کی رائے سے اس طرح پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ رسی کو بیچ دیا جاتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اصل میں جِدَال کے معنی صِرَاع یعنی ایک دوسرے کو جِدَالَۃ یعنی سخت زمین پر پچھاڑ دینا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ (۱۶۔۱۲۵) اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔ ﴿ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ ﴾ (۴۰۔۳۵) جو لوگ ...... خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔

﴿ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ ﴾ (۲۲۔۶۸) اور اگر یہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ ...... اللہ ان سے خوب واقف ہے۔

﴿ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا ﴾ (۱۱۔۳۲) تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور جھگڑا بھی بہت کیا۔ ایک قرأت میں جَدَلْنَا بھی ہے۔

﴿ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ﴾ (۴۳۔۵۸) انھوں نے (عیسیٰ کی) جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

﴿ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ﴾ (۱۸۔۵۴) لیکن انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔

﴿ وَهُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ﴾ (۱۳۔۱۳) اور وہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔

﴿ یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴾ (۱۱۔۷۴) وہ قوم لوط کے بارے میں لگے ہم سے بحث کرنے۔

﴿ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ ﴾ (۴۰۔۵) اور بیہودہ (شبہات سے) جھگڑتے رہے۔
﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ ﴾ (۲۲۔۳) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا کی شان میں ...... جھگڑتے ...... ہیں۔
﴿ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ﴾ (۲۔۱۹۷) تو حج (کے دنوں) میں ...... نہ کسی سے جھگڑے۔

ج ذ ذ

اَلْجَذُّ: (ن) کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں اور پتھر یا سونے کے ریزوں کو جُذَاذ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:
﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا ﴾ (۲۱۔۵۸) پھر ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔
﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ (۱۱:۱۰۸) یہ (خدا کی) بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہو گی۔
محاورہ ہے: مَا عَلَيْهِ جُذَّةٌ. یعنی اس کے بدن پر چیتھڑا بھی نہیں ہے۔

ج ذ ع

اَلْجِذْعُ: درخت کا تنا۔ ج: جُذُوْعٌ. قرآن پاک میں ہے: ﴿ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ (۲۰۔۷۱) جَذَعَهٗ (ف) شاخ یا تنے کی طرح کاٹ ڈالنا۔ اَلْجَذَعُ (من الابل) شتر بسال پنجم (من الشاۃ) گوسپند بسال دوم اور چوپایوں کے ساتھ تشبیہ دے کر زمانہ کو بھی جَذَعٌ کہا جاتا ہے (کیونکہ زمانہ بھی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔)

ج ذ و

اَلْجَذْوَةُ وَالْجُذْوَةُ: (انگارہ) جلنے اور شعلہ ختم ہو جانے کے بعد جو ایندھن باقی رہ جاتا ہے، اسے جَذْوَة کہا جاتا ہے۔ ج جِذًى و جُذًى. قرآن پاک میں ہے:
﴿ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ ﴾ (۲۸۔۲۹) یا آگ کا انگارہ۔ خلیلؒ نے کہا ہے کہ جَذَا اور جَثَا ہم معنی ہیں یعنی چمٹ جانا، مگر جَذَا میں شدت لزوم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:
جَذَا الْقُرَادُ فِيْ جَنْبِ الْبَعِيْرِ. کہ چچڑی اونٹ کے پہلو میں سختی کے ساتھ چمٹ گئی۔
اَجْذَتِ (افعال) الشَّجَرَةُ درخت کا جڑ پکڑ لینا۔ حدیث میں ہے۔ [1]
(۲۰) كَمَثَلِ الْاَرْزَةِ الْمُجْذِيَةِ. اس کی مثال مضبوط جڑ والے صنوبر کے درخت کی ہے، (یعنی جو ہوا کے جھکولوں سے ادھر ادھر نہیں جھکتا)
رَجُلٌ جَاذٍ: مرد کوتاہ دست و کوتاہ ارش۔ مؤنث جَاذِيَةٌ: کوتاہ ہونے میں اس کے دونوں ہاتھ گویا پارۂ آتش ہیں۔

ج ر ح

جَرَحَهٗ (ف) جَرْحًا زخمی کرنا صفت مفعولی جَرِيْحٌ وَمَجْرُوْحٌ (زخمی) جُرْح (اسم) ج: جُرُوْحٌ۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ﴾ (۵۔۴۵) اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے۔

---

[1] راجع الفائق ۱: ۱۸۶ ولفظة الحديث متفق عليه من حديث كعب بن مالك في اثناء حديث: مثل المؤمن الحديث راجع مسلما مع النووى ۲: ۳۷۵ طبقه الهند وضبط النووى المجذبة بالباء من اجذب والبخارى مرضى۔ توحيد و"دى" افاق (حم) ۲: ۴۲۳۔۵: ۱۴۲ وغريب ابى عبيد ج ۱ ص ۱۱۶۔۱۱۷۔

اور زخم کے ساتھ تشبیہ دے کر گواہ پر بحث کرنے کو بھی جَــرْح کہا جاتا ہے اور کتے، چیتے اور پرندے شکاری جانور کو جَـارِحَۃ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع جَوَارِحُ ہے اور شکاری جانوروں کو جَـوَارِح یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتے ہیں اور یا اس لیے کہ وہ کما کر لاتے ہیں ان ہر دو وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر اعضاء کاسبہ یعنی ہاتھ پاؤں کو جَــوَارِحُ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ ﴾ (۵۔۴) (اور وہ شکار بھی حلال ہے) جو تمہارے شکاری جانوروں نے پکڑا ہو۔جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔اَلْاِجْتِــرَاحُ (جرائم کا ارتکاب کرنا) اصل میں جَـرَاحَۃ سے ہے جیسا کہ اِقْتِرَاف کا لفظ قَـرَفَ الْقَرْحَۃَ سے مشتق ہے،جس کے معنی زخم کے چھیلنے کے ہیں۔قرآن میں ہے:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ ﴾ (۴۵۔۲۱) جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ خیال کرتے ہیں۔

ج ر د

اَلْجَرَادُ: ٹڈی۔اس کا واحد جَرَادَۃ ہے۔قرآن میں ہے:

﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ ﴾ (۷۔۱۳۳) ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں...... بھیجیں۔

﴿ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ﴾ (۵۴۔۷) الغرض جَرَادٌ کے معنی ٹڈی کے ہیں۔اس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اصل ہو اور اس سے جَـرَدَ الْاَرْضَ مشتق ہو۔جس کے معنی ہیں ٹڈی زمین پر سے گھاس چٹ کر گئی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جراد خود جَرَدَ سے مشتق ہو،جس کے معنی ننگا کرنے کے ہیں اور چونکہ ٹڈی زمین کی روئیدگی کو کھا کر اسے ننگا اور صاف کر دیتی ہے،اس لیے ٹڈی کو جراد کہا گیا ہے اور اَرْضٌ مَجْرُوْدَۃٌ اس زمین کو کہا جاتا ہے جس کی نباتات کو ٹڈیوں نے کھا کر صاف کر دیا ہو۔

فَرَسٌ اَجْرَدُ بے بال یا چھوٹے بالوں والا گھوڑا۔ثَوْبٌ جَــرْدٌ۔ پرانا کپڑا۔کیونکہ اس کی روئیں جھڑ جاتی ہیں اور کمزور ہو جاتا ہے۔تَـجَـرَّدَ عَـنِ الثَّـوْبِ ننگا ہونا۔کپڑے اتار دینا۔

جَرَّدَہٗ (عن الثِّیَاب) ننگا کرنا۔

اِمْرَءَۃٌ حَسَنَۃُ الْمُتَجَرِّدِ یعنی خوب صورت بدن است وقت برہنگی ایک روایت میں ہے۔ ❶

(۶۱) جَرِّدُوا الْقُرْاٰنَ: قرآن کو علیحدہ رکھو یعنی اس کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط نہ کرو۔

اِنْجَرَدَ بِنَا السَّيْرُ دراز گردید سفر۔

جَرِدَ الْاِنْسَانُ: خراج برآرد پوست انسان از خوردن ملخ یعنی ملخ کے کاٹنے سے جسم پر پتی اچھلنا۔

ج ر ز

جُــــرُزٌ: وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو،نیز فرمایا:﴿ صَعِيْدًا جُرُزًا ﴾ (۱۸۔۸) بنجر میدان......

---

❶ موقوفا علی ابن مسعود وتمامہ لیربو فیہ صغیر کم ولاینأی عنہ کبیر کم فان الشیطان یخرج من بیت تقرء فیہ سورۃ البقرۃ الفائق ۱ : ۹۶ وفی تاویلہ قولان : ارادرضی اللہ عنہ تحریدہ عن النقط والعشور لئلا تنشانشوء فیری انہا من القران وقیل ھو حث علی ان لا یتعلم غیر مالی خصوہ بالتعلم غریب ابی عبید ٤ : ٤٦-٤٩).

یعنی جس پر گھاس درخت وغیرہ کوئی چیز نہ ہو۔
اَرْضٌ مَجْرُوْزَةٌ: زمین جس سے گھاس چر کر ختم کر دیا گیا ہو۔
اَلْجَرُوْزُ: جو دستر خوان کو صاف کر ڈالے۔ مثل مشہور ہے: لَا تَرْضٰی شَانِئِهٖ اِلَّا بِجَرْزِهٖ. یعنی اس کے دشمن اس کا استیصال کیے بغیر خوش نہیں ہوں گے۔
اَلْجَارِزُ: سخت کھانسی (اس میں معنی جرز کا تصور پایا جاتا ہے)
اَلْجُرَازُ: تلوار سے کاٹنا۔ سَیْفٌ جُرَازٌ شمشیر بڑان۔

ج ر ع

جَرَعَ (ف) جَرْعًا۔ اَلْمَاءُ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پینا۔ اور بقول بعض جرع (س) آتا ہے۔
تَجَرَّعَهٗ (تفعل) تکلف سے گھونٹ گھونٹ کر کے پی گیا۔ گویا اس کا پینا طبیعت پر ناگوار گذر رہا ہے۔ قرآن میں ہے:
﴿ یَتَجَرَّعُهٗ وَ لَا یَکَادُ یُسِیْغُهٗ ﴾ (۱۴۔۱۷) وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیے گا اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔ جَرْعَةٌ ایک مرتبہ گھونٹ سے نگلنا۔ مثل مشہور ہے ❶ اَفْلَتَ بُجَرِیْعَةِ الذَّقَنِ. وہ ہلاکت کے قریب پہنچ کر بچ نکلا۔
نُوْقٌ مَجَارِیْعُ: وہ اونٹنیاں جن کا دودھ تقریباً خشک ہو گیا ہو۔
اَلْجَرْعُ وَالْجَرْعَاءُ: ریگستان جس میں کچھ نہ اُگے۔ گویا وہ بیج کو نگل لیتا ہے۔

ج ر ف

قرآن پاک میں ہے: ﴿ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ ﴾ (۹۔۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارے پر۔
اَلْجُرُفُ: دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو کٹ کٹ کر نیچے گر رہا ہو۔ محاورہ ہے: جَرَفَ الدَّهْرُ مَالَهٗ. حوادث زمانہ نے اس کے مال کو تباہ کر دیا۔
رَجُلٌ جُرَافٌ: مرد بسیار جماع شادماں۔ گویا وہ اس شغل میں بہہ رہا ہے۔

ج ر م

اَلْجَرْمُ: (ض) اس کے اصل معنی درخت سے پھل کاٹنے کے ہیں یہ صیغہ صفت جَارِمٌ ج جِرَام۔
تَمْرٌ جَرِیْمٌ: خشک کھجور۔ جُرَامَةٌ ردی کھجوریں جو کاٹتے وقت نیچے گر جائیں۔ یہ نُفَایَةٌ کے وزن پر ہے (جو کہ ہر چیز کے ردی حصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔)
اَجْرَمَ: (افعال) جرم والا ہونا۔ جیسے اَثْمَرَ وَاَتْمَرَ وَاَلْبَنَ اور استعارہ کے طور پر اس کا استعمال اکتساب مکروہ پر ہوتا ہے۔ اور پسندیدہ کسب پر بہت کم بولا جاتا ہے۔ اس کا مصدر جَرْمٌ ہے، شاعر نے عقاب کے متعلق کہا ہے ❷.

(۸۸) جَرِیْمَةُ نَاهِضٍ فِیْ رَاْسِ نِیْقٍ

---

❶ افلت یکون لازما ومتعدیا والباء بمعنیٰ مع و جریعة تصغیر جرعة والمرا ومنه النفس ای خلص مع جریعة الذقن ای فیه بقیة ارواحه بقدر جرعة فی الفم راجع لتفصیله المیدانی ۶۹۔۷۰ وابدال ابی الطیب ۳: ۲۷۳۔۲۷۴ واللسان (جرع) .

❷ قاله ابوخراش المهری یصف عقابا شبه فرسه بهاترزق فرخها وتمامه : تری لعظام ماجمعت صلیبًا وفی اللسان (جرم) صلب) والاساس (جرع) ناهض بدل نامص والبیت فی الاقتضاب ۳۱۷ والمعانی للقبتی ۲۸۔۴۱۵ وغریب القران للقبتی ۱۳۹ واصلاح یعقوب وادب الکاتب ۶۶ والد ولبحر ۵: ۲۱۳ والحیون ۶: ۳۳۷ واشعار الهذلیین ۲: ۵۷).

جیسا کہ (عقاب) بلند پہاڑ کی چوٹی پر اپنے بچوں کے لیے روزی کما کران کو کھلاتا ہے۔

یہاں شاعر کا ''شاہین کے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کا جرم کہنا'' یا تو اس بنا پر ہے کہ وہ پرندوں کو شکار کر کے لاتا ہے اور یا اس کو ایسا شخص فرض کیا ہے جو اپنی اولاد کی خاطر گناہ کرتا ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ ہر صاحب اولاد خواہ بہائم ہی کیوں نہ ہوں اپنی اولاد کے لیے ضرور ہی جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔

قرآنِ مجید میں اِجْرَام (افعال) اور جَرْم (ض) دونوں فعل استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ اجرام کے متعلق فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ ﴾ (۸۳۔۲۹) جو گنہگار (یعنی کفار) ہیں وہ (دنیا میں) مومنوں سے ہنسی کیا کرتے تھے۔

﴿ کُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّکُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴾ (۷۷۔۴۶) (اے جھٹلانے والو!) تم کسی قدر کھالو اور فائدے اٹھالو تم بیشک گنہگار ہو۔

﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴾ (۵۴۔۴۷) بیشک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں۔

﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴾ (۴۳۔۷۴)

اور جَرَمَ (ض) کے متعلق فرمایا:

﴿ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْٓ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ ﴾ (۱۱۔۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرادے کہ...... تم پر واقع ہو۔

یہاں اگر یَجْرِمَنَّکُمْ فتحہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو بَغَیْتُهٗ مَالاً کی طرح ہوگا اور اگر ضمہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو اَبْغَیْتُهٗ مَالاً (یعنی میں نے مال سے اس کی مدد کی) کے مطابق ہوگا۔

﴿ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ﴾ (۵۔۸) اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ اور آیت کریمہ:

﴿ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ ﴾ (۱۱۔۳۵) تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر۔ میں ہوسکتا ہے کہ اِجْرَام (بکسر الهمزہ) باب افعال سے مصدر ہو اور اگر اَجْرَام (بفتح الهمزہ) پڑھا جائے تو جَرْم کی جمع ہوگی۔ [1]

اور جرم بمعنی قطع سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے: جَرَمْتُ صُوْفَ الشَّاةِ: میں نے بھیڑ کی اُون کاٹی۔ تَجَرَّمَ اللَّیْلُ. رات ختم ہوگئی۔

اَلْجِرْم: (جسم) اصل میں یہ بمعنی مَجْرُوْم ہے یعنی قطع کیا ہوا۔ جیسے: نِفْضٌ وَنِقْضٌ بمعنی منفوض و منقوض کے آتا ہے۔

پھر یہ جسم پر بولا جاتا ہے اور فُلَانٌ حَسَنُ الْجِرْمِ کے معنی ہیں کہ خوبصورت ہے، جیسا کہ حَسَنُ السَّخَا کا محاورہ ہے اور حَسَنُ الجرم کے معنی حسن صوت بھی آتے ہیں اور اس میں درحقیقت جرم سے محل صوت کی طرف اشارہ ہوتا ہے نہ کہ نفس صوت کی طرف لیکن اس سے آواز کی خوبصورتی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے اس کے معنی حسن صوت کردیئے جاتے ہیں، جیسا کہ اسی

[1] قال الزمخشری وینصر الجمع ان فسرہٗ الاولون بآثای (الکشاف ۳۹۲ ج ۲)۔

معنی میں طَیِّبُ الْحَلْقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ حلق سے موت مراد لی جاتی ہے نہ کہ بذاتِ خود حلق مراد ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿ لَا جَرَمَ ﴾ (۱۶۔۱۰۹) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے لاَ اَصل میں محذوف پر داخل ہوا ہے،جیسا کہ لَآ اُقْسِمُ میں لاآتا ہے اور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ ع (متقارب)

(۸۹) لاَ وَاَبِیْكِ ابْنَةُ الْعَامِرِیِّ

اور جَرَمَ فعل ماضی ہے،جس کے معنی اَکْسَبَ وَجَنٰی کے ہیں اس کے بعد اَنَّ لَهُمُ النَّارُ (جملہ) موضع مفعول میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے لیے (دوزخ کی) آگ حاصل کی۔

بعض نے کہا ہے کہ جَرَمَ اور جُرْمٌ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن لاَ کے ساتھ جَــرَمَ آتا ہے،جیسا کہ قسم کے ساتھ عَمرو کا لفظ مختص ہے اگرچہ عَمْرٌ و عُمْرٌ کے معنی ایک ہی ہیں اور معنی یہ ہے کہ ان کے لیے آگ کا ہونا کسی کا جُرم نہیں ہوگا بلکہ یہ ان کے عملوں کی سزا ہوگی اور انھوں نے خود ہی اسے اپنے لیے حاصل کیا ہوگا،جیسا کہ آیت:

﴿ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ﴾ (۴۱۔۴۶) اور جو برے کام کرے گا۔تو ان کا ضرر اسی کو ہوگا۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس کی تفسیر میں اور بھی بہت سے اقوال منقول ہیں۔❷ لیکن ان میں سے اکثر تحقیق کی رو سے صحیح نہیں ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿ فَالَّذِیْنَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ لاَ جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴾ (۱۶۔۲۲،۲۳) تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے،ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں خدا ضرور اس کو جانتا ہے۔﴿ لاَ جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ (۱۶۔۱۰۹) کچھ شک نہیں کہ یہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

ج ر ی

جَرٰی (ض) جِرْیَةً وَجَرْیًا وَجِرَیَانًا کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔اصل میں یہ لفظ پانی اور پانی کی طرح چلنے والی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔❷

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ﴾ (۴۳۔۵۱) اور یہ نہریں جو میرے (محلوں کے) نیچے بہہ رہی ہیں کیا میری نہیں ہیں؟

---

❶ قاله امرؤ القيس يخاطب ابنه عمه فاطمه وللبيت من مطلع قصيدة عدتها ۴۲ بيتاً وتمامه .... لا يدعى القوم اى افر. والبيت فى الحماسة مع الزروقى ۔ راجع الخزانة ۱ : ۳۳۷۔۴ : ۴۸۹ والعين ۱ : ۹۶ وشرح المفضليات والعلقات لابن الانبارى ۴۴ والعقد الثمين ۱۲۶ والسيوطى ۲۱۷ والطبرى ۲۷۔۱۳۱) والفخر ۳۰۔۲۱۴) والبيت ايضاً من شواهد الكشاف ۴۵ قال المحب وقيل البيت لربيعة بن جشم اليمنى وايضاً المغنى ۱ : ۲۷۶ وديوانه ۹۴.

❷ وقيل "ان فى موضع رفع وجرم بمعنى وجب ان لهم النار وانهم مفرطون بحث الفالى فى نوادره فى لاجرم" ومنه اخذ ابن الانبارى وغيرهم معظم هذاالباب ولم يخرج المؤلف مماهنالك و ذكروا فيه وجوه ذهب الفراء تبعاً للكسائى ان جرم اسم لا وذهب سيبويه فى الكتاب بانه فعل ماضى راجع للبحث النوادر ۲۱۲۔۲۱۳ الخزانة ۴ : ۳۱۱ والصحاح والتاج (جرم) وامالى المرتضىٰ ۱ : ۱۱۰) والفاخر لابى طالب ۱۹۹ واعراب القران المنسوب الى الزجاج ۱۱۷۔۱۱۸ وفى ابن كثير ۴ : ۸۰) قال السدى وابن جرير "لاجرم" معناه حقاً وقال الضحاك لاكذب وثال على بن طلحة عن ابن عباس لاجرم معناه بلىٰ ...... وفى التاج ومايجرى بجريه وفى المطبوع .... ومايجرى بجريه ۱۲.

﴿ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (۲۔۲۵) باغ، میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔
﴿ وَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ ﴾ (۳۰۔۴۶) اور تاکہ...... کشتیاں چلیں۔﴿ فِیْهَا عَیْنٌ جَارِیَةٌ ﴾ (۸۸۔۱۲) اس میں چشمے بہہ رہے ہوں گے۔اور آیت کریمہ:
﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِیَةِ ﴾ (۶۹۔۱۱) جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کرلیا۔
میں جَارِیَةٌ سے مراد کشتی ہے،اس کی جمع جَوارٍ آتی ہے جیسے فرمایا:﴿ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتِ ﴾ (۵۵۔۲۴) اور جہاز جو...... اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔
﴿ وَمِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴾ (۴۲۔۳۲) اور اسی کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز، میں (جو) گویا پہاڑ ہیں۔
اور پرند کے سنگدانہ کو جَــرِیَّةٌ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کھانا چل کر وہاں پہنچتا ہے اور یا اس لیے کہ وہ طعام کا مجریٰ بنتا ہے۔اَلْاِجْرِیَّا: عادت جس پر انسان چلتا ہے۔
اَلْـجَرِیُّ: وکیل۔یہ لفظ رسول اور وکیل سے اخص ہے۔ اور جَرَّیْتُ جَرِیًّا کے معنی وکیل بنا کر بھیجنے کے ہیں۔اور حدیث میں ہے [1] (۶۲)
لَا یَسْتَجْرِیَنَّكُمُ الشَّیْطَانُ یہاں یہ لفظ اپنے اصل معنی پر بھی محمول ہوسکتا ہے، یعنی شیطان اپنے حکم کی بجا آوری اور اطاعت میں بہہ جانے پر تمھیں برانگیختہ نہ کرے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جَرِیٌّ بمعنی رسول یا وکیل سے مشتق ہو اور معنی یہ ہوں گے کہ شیطان کی وکالت اور رسالت کے سرپرست مت بنو گویا یہ آیت کریمہ:
﴿ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ﴾ (۴۔۷۶) شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا:
﴿ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ﴾ (۳۔۱۷۵) یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔

ج ز ء

جُــزْءُ الشَّــيْءِ: چیز کا ٹکڑا جس سے وہ چیز مل کر بنے۔جیسے اَجْـزَاءُ السَّفِیْنَةِ اَجْزَاءُ الْبَیْتِ اور حساب میں اَجْـزَاءُ الْـجُمْلَةِ (یعنی کل مجموعہ کے اجزاء) وغیرہ محاورات بولے جاتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ﴾ (۲۔۲۶۰) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھوا دو۔
﴿ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴾ (۱۵۔۴۴) ہر ایک دروازے کے لیے ان میں ایک حصہ تقسیم کردیا گیا ہے۔
﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ﴾ (۴۳۔۱۵) اور انھوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لیے اولاد مقرر کی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ جُزْءًا سے مراد اِنَاثٌ ہیں، میں انھوں نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا اور یہ اَجْـزَأَتِ الْمَرْءَةُ کے محاورہ سے مشتق ہے، جس کے معنی مادینہ اولاد کو جنم دینا کے ہیں۔
جَـزَءَ الْاِبِلُ مَجْزَءً وَجَزْأً: اونٹ تر گھاس کھانے کی

[1] الحدیث فی النهایة وقبله قولوا بقولکم .... وذالك انهم مدحوه فکره لهم المبالغة فی المدح ای لاتتکلفوا فی المدح فیتخذکم الشیطان جریا ای وکیلاً: ۱/ ۲۶٤.

وجہ سے پانی سے بے نیاز ہو گئے۔محاورہ ہے: اَللَّحْمُ السَّمِیْنُ اَجْزَءُ مِنَ الْمَهْزُوْلِ: موٹا گوشت دبلے گوشت سے زیادہ کفایت کرنے والا ہوتا ہے۔

جُزْءَۃُ السِّکِّیْنِ . چھری کا دستہ کیونکہ وہ اس کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

ج ز ع

اَلْجَزَعُ: بے صبری۔قرآن پاک میں ہے: ﴿سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا﴾ (۱۴۔۲۱) اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں۔ ہمارے حق میں برابر ہے۔ یہ حزن سے خاص ہے کیونکہ جَزَعٌ خاص کر اس غم کو کہتے ہیں جو انسان کو جس چیز کے وہ درپے ہو اس سے پھیر دے اور اس سے تعلق قطع کر دے۔

اصل میں جَزْعٌ (ف) کے معنی رسی کو نصف سے کاٹ دینے کے ہیں اور اِنْجَزَعَ (انفعال) اس کا مطاوع آتا ہے، جیسے جَزَعْتُهٗ فَانْجَزَعَ میں نے اسے کاٹا چنانچہ کٹ گیا۔ اور معنی انقطاع کے تصور کی بنا پر وادی کے موڑ کو جَزْعُ الْوَادِیْ کہا جاتا ہے اور تغیر سے بھی چونکہ اصل رنگ کٹ جاتا ہے، اس لیے متلون خرمہرے کو جَزْعٌ کہتے ہیں اسی سے لَحْمٌ مُجَزَّعٌ کا محاورہ مستعار ہے، جس کے معنی دو رنگ کے گوشت کے ہیں اور نیم پختہ کھجور کو مُجَزَّعٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْجَازِعُ: شہتیر کو کہتے ہیں جو چھت کے وسط میں ڈالا جاتا ہے اور دونوں طرف سے چھوٹے شہتیر آ آ کر اس پر مل جاتے ہیں تو اسے جَازِع یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ بوجھ اٹھانے کی وجہ سے گویا وہ بے صبر ہو رہا ہے اور یا اس لیے کہ کمرے کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے گویا وہ اسے دو حصوں میں قطع کر دیتا ہے۔

ج ز ی

اَلْجَزَاءُ: (ض) کافی ہونا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا﴾ (۲:۴۸) کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

لَا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْئًا . کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا۔ اَلْجَزَاءُ: (اسم) کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو، جیسے خیر کا بدلہ خیر سے اور شر کا بدلہ شر سے دیا جائے۔ کہا جاتا ہے۔ جَزَیْتُهٗ کَذَا بِکَذَا میں نے فلاں کو اس کے عمل کا ایسا بدلہ دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَکّٰی﴾ (۲۰۔۷۶) اور یہ اس شخص کا بدلہ ہے جو پاک ہوا۔

﴿فَلَهٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰی﴾ (۱۸۔۸۸) اس کے لیے بہت اچھا بدلہ ہے۔

﴿وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (۴۲۔۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔

﴿وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِیْرًا﴾ (۷۶۔۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت (کے باغات) اور ریشم (کے) ملبوسات عطا کرے گا۔

﴿جَزَآؤُکُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا﴾ (۱۷۔۶۳) اور وہ پوری پوری جزا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (۲۵۔۷۵) ان (صفات) کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیئے جائیں گے۔

﴿وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۳۷۔۳۹)

اورتم کو بدلا ویسا ہی ملے گا، جیسے تم کام کرتے تھے۔

اَلْجِزْیَۃُ: وہ ٹیکس جو ذمیوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ اور اسے جِزْیَہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے جان و مال کی حفاظت کے بدلہ میں ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ (۹۔۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

محاورہ ہے: جَازِیْكَ فُلَانٌ یعنی فلاں تجھے کافی ہے۔ جَزَیْتُہٗ بِكَذَا وَجَازَیْتُہٗ: میں نے اسے بدلہ دیا۔ قرآن پاک نے جَــــزٰی (ض) کا لفظ استعمال کیا ہے اور جَازٰی (مفاعلہ) استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ مجَازاۃ کے معنی مکافات کے ہوتے ہیں یعنی کسی کے احسان (نعمت) کے بدلے میں اسی قسم کا احسان کرنا۔ یہ چیز دو آدمیوں کے درمیان تو باہم مشترک ہوسکتی ہے۔ لیکن نعمت الٰہی کی کوئی شخص مکافات نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں مکافات کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے، (جس کی دلیل کی ضرورت نہیں۔)

ج س س

اَلْجَسُّ: کے اصلی معنی ہیں رگ کو چھونا اور نبض دیکھ کر معلوم کرنا کہ بیمار ہے یا تندرست۔ یہ حَــــسٌّ سے خاص ہے۔ کیونکہ حَسٌّ کے معنی قوۃ احساس سے کسی چیز کا ادراک کرنا کے ہیں۔ لیکن جَسٌّ کسی اندرونی حالت کے معلوم کرنے کو کہتے ہیں اور لفظ جَسٌّ سے جَاسُوْسٌ کا لفظ مشتق ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَا تَجَسَّسُوْا ﴾ (۴۹۔۱۲) اور ایک دوسرے کے اندرونی حالات کا تجسس نہ کیا کرو۔

ج س د

اَلْجَسَدُ: (اسم) جسم ہی کو کہتے ہیں مگر یہ جسم سے اخص ہے، خلیلؒ فرماتے ہیں کہ جسد کا لفظ انسان کے علاوہ دوسری مخلوق پر نہیں بولا جاتا۔ نیز جَسَد رنگدار جسم کو کہتے ہیں مگر جسم کا لفظ بےلون اشیاء مثلاً پانی، ہوا وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ ﴾ (۲۱۔۸) کہ ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں ...... سے خلیل کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ نیز قرآن پاک میں ہے:

﴿ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ﴾ (۲۰۔۸۸) ایک بچھڑا یعنی قالب، جس کی آواز گائے کی سی تھی۔

﴿ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴾ (۳۸۔۳۴) اور ان کے تخت پر ہم نے ایک دھڑ ڈال دیا، چنانچہ انھوں نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ اور لون کے اعتبار سے زعفران کو جساد کہا جاتا ہے اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے کو ثَـوْبٌ مُّـجَسَّدٌ کہتے ہیں۔

اَلْمِجْسَد۔ کپڑا جو بدن سے متصل ہو۔ اَلْجَسَد وَالْجَاسِدُ وَالْجَسِد خشک خون۔

ج س م

اَلْجِسْمُ: وہ ہے جس میں طول، عرض اور عمق پایا جائے اور اجزاء جسم خواہ کتنے ہی لطیف کیوں نہ ہوں اجسام ہی کہلاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ﴾ (۲۔۲۴۷) اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی

(بڑا عطا کیا ہے۔)
اور آیت کریمہ:
﴿ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ﴾ (۳۶-۴)
اور جب تم ان (کے تناسب اعضا) کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمھیں (کیا ہی) اچھے معلوم ہوتے ہیں۔
میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بظاہر ان کی شکل و صورت اگرچہ جاذب نظر آتی ہے، لیکن ان کے اندر کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہے۔
اَلْجِسْمَانُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کے شخص کے ہیں لیکن کسی شخص کے اجزاء ضروری نہیں کہ تقطیع اور تجزیہ کے بعد بھی ان کو شخص ہی کہا جائے مگر جسم کے اجزاء کو خواہ کتنا ہی باریک کیوں نہ کر دیا جائے وہ جسمیت سے خارج نہیں ہوتے۔

ج ع ل

جَـعَـلَ: (ف) یہ لفظ ہر کام کرنے کے لیے بولا جاسکتا ہے اور فَـعَـلَ وَصَنَعَ وغیرہ افعال کی بنسبت عام ہے۔ اور یہ پانچ طرح پر استعمال ہوتا ہے۔
(۱) بمعنی صَارَ وَطَفِقَ اس صورت میں متعدی نہیں ہوتا جیسے جَـعَـلَ زَيْدٌ يَقُوْلُ كَذَا (یعنی زید یوں کہنے لگا)
شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)
(۹۶) فَقَدْ جَعَلَتْ قُلُوْصُ بَنِي سُهَيْلٍ
مِنَ الْاَكْوَارِ مَرْتَعُهَا قَرِيْبٌ
اب بنی سہیل کی اونٹنی اکوار (جمع کور) کے قریب چرنے لگی ہے۔
(۲) بمعنی اَوْجَدَ (یعنی ایجاد اور پیدا کرنا) اس صورت میں یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ ﴾ (۶-۱) اور اندھیرے اور روشنی بنائی۔
﴿ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ ﴾ (۱۶-۷۸) اور اس نے تم کو کان، آنکھیں اور دل (اور اس کے علاوہ اور اعضاء) بخشے۔
(۳) ایک شے کو دوسری شے سے پیدا کرنا اور بنانا جیسے فرمایا: ﴿ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ﴾ (۴۲-۱۱) اسی نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے۔
﴿ وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا ﴾ (۱۶-۸۱)
اور پہاڑوں میں غاریں بنائیں۔
﴿ وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا ﴾ (۴۳-۱۰) اور اس میں تمہارے لیے رستے بنائے۔
(۴) بمعنی تصییر یعنی کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کر دینا۔ جیسے فرمایا:
﴿ اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ﴾ (۲-۲۲)
جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا...... بنایا۔
﴿ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا ﴾ (۱۶-۸۱)
اور اللہ ہی نے تمہارے (آرام کے) لیے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے۔

[1] قاله رجل من يحتر بن عتود والبيت في الحماسة رقم ۹۹ مع المرزوقي في ثلاثة بغير عزو والبيت من شواهد الخزانة ٤: ٩٢) وفي رواية "ابني زياد" ولم اراحد من الشرح نسبها الى قائلها و وجدت نسبتها عند الصاغاني في العباب (الخيل) والبيت في اللسان (جعل) والعيني والخزانة ٢: ٣٣٦)١٢.

﴿ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا ﴾ (۷۱۔۱۶) اور چاند کو ان میں (زمین کا) نور بنایا۔

﴿ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ (۴۳۔۳) کہ ہم نے اس کو قرآن عربی بنایا ہے۔

(۵) کسی چیز پر کسی چیز کے ساتھ حکم لگانا عام اس سے کہ وہ حکم حق ہو یا باطل، حق کی مثال جیسے:

﴿ إِنَّا رَآدُّوْهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ (۲۸۔۷) ہم ان کو تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے اور (پھر) اسے پیغمبر بنادیں گے۔

اور باطل کی مثال جیسے:

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا ﴾ (۶۔۱۳۶) اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں یعنی کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔

﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ ﴾ (۱۶۔۵۷) اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔

﴿ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴾ (۱۵۔۹۱) یعنی قرآن کو (کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے سے) ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا۔

اَلْجِعَالَةُ: چولہے سے دیگ اتارنے کا چیتھڑا۔ ہنڈیا اتارنے کا رومال۔

اَلْجُعْلُ وَالْجَعَالَةُ وَالْجَعِيْلَةُ: جو چیز کسی شخص کے لیے کسی کام کے عوض مقرر کیا جائے۔ یہ اجرت اور ثواب سے اعم ہے۔

كَلْبٌ يُجْعِلُ (کنایہ) کتے کا جفتی کی خواہش کرنا۔ ❶

اَلْجُعَلُ: گبریلا۔ سیاہ بھونرا۔ ج جِعْلَانٌ.

ج ف ن

اَلْجَفْنَةُ: پیالہ۔ خاص کر کھانے کے برتن کو کہتے ہیں۔ ج جِفَانٌ۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ ﴾ (۳۴۔۱۳) اور لگن جیسے بڑے حوض۔ حدیث میں ہے: ❷

(۶۳) وَاَنْتِ الْجَفْنَةُ الْغَرَّاءُ تم سخی سردار ہو۔ اور لگن کے ساتھ تشبیہ دے کر چھوٹے کنوئیں کو بھی جَفْنَةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْجَفْنُ: اس کے معنی خاص کر تلوار کی نیام یا آنکھ کے پپوٹے کے آتے ہیں۔ ج: اَجْفَانٌ اور انگور کی بیل کو بھی جَفْن کہا جاتا ہے گویا وہ انگور کے لیے بمنزلہ برتن کے ہے۔

ج ف و

اَلْجُفَاءُ: وہ کوڑا کرکٹ جو وادی کے دونوں کناروں پر رہ جاتا ہے یا ہانڈی کا میل کچیل جو ابال آنے سے ادھر اُدھر گر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے اَجْفَأَتِ الْقِدْرُ زَبَدَهَا ہنڈیا نے اپنا ابال پھینک دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ﴾ (۱۳۔۱۷) سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے۔

---

❶ راجع التاج والمعروف مجعل والفعل اجعل(افعال) والبحث فی الحیوان للجاحظ ۵ : ۳۵۰)۔

❷ النهاية افانت الجفنة الغراء وفی الكامل للمبرد: قول رسول الله صلى الله عليه انا الجفنة الغراء وفی النهاية واللسان انه قيل له انت كذا وانت الجفنة الغراء وفی الفائق ۱ : ۲۰۱) من قول عبدالله بن الشخير حين قدم على رسول الله صلى الله عليه وسلم كذافی التاج وراجع النهاية واللسان (جفن) قال فی حاشية الكامل ولم ارهذاالحديث ۷۷۹ وفی المطبوع وانت الجفنة الغراء ای الطعام مصحف والتسديدمن المراجع والجملة من تحية الجاهلية لملوكهم .

اور بے فائدہ اور بے کار چیز کو جَـفَـاء کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: اَجْفَأَتِ الْاَرْضُ زمین جفا یعنی جھاگ کی طرح ناکارہ اور بے خیر ہوگئی۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں ناقص واوی ہے۔ لہٰذا جَـفَـتِ الْـقِدْرُ وَاَجْفَتْ کہا جائے گا۔ اور اسی سے اَلْجَفَاءُ بمعنیٰ ظلم ہے۔ اور جَفَاهُ (ن) جَفْوَةٌ وَجَفَاءً کے معنی ہیں کسی پر ظلم کرنا اور اسی سے محاورہ ہے۔ جَـفَـا السَّرْجَ عَنْ ظَهْرِ الدَّابَّةِ (گھوڑے کی پشت سے زین کو اٹھا دیا۔)

ج ل ل

اَلْـجَلَالَةُ کے معنی ہیں عظیم القدر یعنی قدر و منزلت میں بڑا یعنی بلند مرتبہ ہونا کے ہیں اور (ۃ) کے بغیر اَلْـجَلَالِ کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں عظمت کی آخری حد جس کے بعد اور مرتبہ نہ ہو۔ اسی لیے یہ اللہ تعالیٰ کی وصف کے ساتھ مختص ہے۔ اور دوسروں کے حق میں استعمال نہیں ہوتا، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ ذُوا الْـجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ (۵۵۔۲۷) صاحب جلال و عظمت۔

اَلْـجَلِيْلُ: اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اَلْـجَلِيْلُ ❶ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے بڑی بڑی عظیم الشان چیزوں کو پیدا کیا ہے جن سے اس کی ذات بابرکت پر استدلال ہوسکتا ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی ذات اَلْجَلِيل اس لیے ہے کہ وہ احاطہ سے بلند ہے اور یا اس ❷ لیے کہ اس کے ذریعہ اس کا ادراک نہیں ہوسکتا۔

اصل وضع کے اعتبار سے جَلِيل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے، جو جسامت کے اعتبار سے بڑی بھی ہو اور غلیظ یعنی موٹی اور سخت بھی پھر معنی غلظت کے اعتبار سے یہ دقیق کے مقابلہ میں استعمال ہونے لگا ہے اور عظیم کا لفظ صغیر کے مقابلہ میں، چنانچہ کہا جاتا ہے جَـلِيـل و دقيق وعظيم و صغير اور باہم مقابلہ کے اعتبار سے اونٹ کو جلیل اور بھیڑ بکری کو حقیر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: ❸ ماله جَلِيْل وَلا دقيق (کہ اس کے پاس نہ اونٹ ہے اور نہ بھیڑ بکری) مَا اَجَلَّنِيْ وَلا اَدَقَّنِي (اس نے مجھے نہ اونٹ دیئے اور نہ بھیڑ بکری) ...... یہ اس کے اصل معنی ہیں ...... پھر یہ لفظ ہر بڑی اور چھوٹی چیز پر بولا جاتا ہے۔

اَلْجَلَالَةُ: خاص کر کلاں جسم اونٹنی کو کہتے ہیں اور اَلْـجِلَّة کلاں سال کو۔ اَلْـجَلل ہر بڑی چیز۔ کار بزرگ۔ جَـلَلت كذا: میں نے اس کا بڑا حصہ لے لیا۔ تجللت البعير❹ میں نے کلاں جسم اونٹ یا ان کی بڑی مقدار لی۔ اَلْجَلل ❺ (ایضاً)

---

❶ وفی القران: تتجافی جنوبهم عن المضاجع (۳۲۔۱۶)۔

❷ الزيادة " " من التاج قدسقط فی المطبوع۔

❸ وفی التاج ماله جليلة ولادقيقة ولا اجلنی ولااحشانی۔

❹ فی المطبوعه تحللت البقر خلاف جميع الاصل وفی الاصول وفی التاج قال الراغب تجللت البعيراه وعليه اعتمدنا۔

❺ وفی المطبوع الحلل المتناول من البقروفی التاج قال الراغب .... من البعر ونتصحف والاسف ان المفردات للراغب لم يطبع الى الآن طبعاً محققاً مقابلاً.......... بالاصول وانا اكلت جوادی فی تسديده وساخرومه والحمد لله علی ذلك.

جو مینگنی اٹھائی جائے ۔ اسی سے کنایۃً ہر حقیر چیز کو جلل کہا جاتا ہے ۔ شاعر نے کہا ہے ۔ ❶

(۹۱) کل مصیبۃ بعدہٗ جَلَل

کہ ہر مصیبت اس کے بعد حقیر ہے ۔

اَلْـجُـلُّ کے معنی مصحف کے غلاف کے ہیں پھر اس سے مصحف کو مَجَلَّۃ کہا جانے لگا ہے ۔ ❷ اَلْـجُلْجُلَۃ جس کے معنی حکایت صوت کے ہیں وہ اس مادہ سے نہیں ہے اور اسی سے سَحَابٌ مُجَلْجِلٌ کا محاورہ ہے، جس کے معنی گرجنے والے بادل کے ہیں ۔ ہاں سَـحَـابٌ مُـجَـلِّـلٌ کا محاورہ اس مادہ سے ہے، جس کے معنی عام بارش برسانے والے بادل کے ہیں ۔ گویا وہ پانی اور نباتات سے زمین کو چھپا دیتا ہے ۔

ج ل ب

اَلْـجَـلْـبُ: (ن ض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں ۔ شاعر نے کہا ہے ۔ ❸

(۹۲) وَقَدْ یَجْلِبُ الشَّیْءَ الْبَعِیْدَ الْجَوَابُ

کبھی جواب دور کی چیز کو کھینچ کر لے آتا ہے ۔

اَجْلَبَ (افعال) عَلَیْہِ: کسی پر چلا کر زبردستی اسے آگے بڑھانا کے ہیں ۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ ﴾ (۱۷۔۶۴) اور ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کو چڑھا کر لاتا رہ ۔

اور حدیث ❹ (۶۸) لَا جَلَبَ (یعنی جلب جائز نہیں ہے) کے دو معنی بیان کیے جاتے ہیں ۔ ایک یہ کہ مصدق یعنی زکوٰۃ جمع کرنے والا چراگاہ سے کہیں دور بیٹھ جائے اور وہاں جانوروں کو حاضر کرنے کا حکم دے اور گھڑ دوڑ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوڑ میں اپنے گھوڑے پر چیخنے کے لیے ایک آدمی کو مقرر کرے تاکہ وہ آگے بڑھ جائے ۔

اَلْجُلْبَۃُ: پوست جراحی کہ خشک شدہ باشد ۔

اَلْجُلْبُ: پتلا سا بادل جو زخم کے پردہ کی طرح ہوتا ہے ۔

اَلْجَلَابِیْبُ: اس کا واحد جِلْبَابٌ ہے جس کے معنی چادر یا قمیص کے ہیں ۔

ج ل ت

جَـالُوْت: یہ اسم عجمی ہے، عربی میں اس کی اصل نہیں ہے ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ﴾ (۲۔۲۵۰) اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل میں آئے ۔

ج ل د

اَلْـجِلْدُ: کے معنی بدن کی کھال کے ہیں اس کی جمع جُلُوْدٌ آتی ہے ۔ قرآن پاک میں ہے:

---

❶ لم اجدہ ومثلہ یوجد فی شعرامرء القیس : الاکل شیء سواہ جلل وفی المزروقی ٤ : ۱۰۲۰) قال زویھر بن الحرث .... فکل الذی لاقیت من بعد جلل وایضاً انشدابن درید : فعظیم کل مصیبۃ جلل.

❷ وفی التاج قال الراغب الجل مکان الحلل والمصحف مکان الصحف وعلیہ اعتمدنا لان الحلل بالفك لم یرد فی الاصول بھذا المعنی .

❸ لم اجدہ ویرجیٰ.

❹ الحدیث فی الفائق ۱ : ۱۰٤ والنسائی والضیاء عن ابن عمرو (حم ق، ن وابن حبان فی زوائدہ رقم ۱۱۷۰ عن عمران بن حصین والطبرانی عن انس وش عن عطاء ومرسلاً وش عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ راجع کنزالعمال ٦ : ۱۳۲٦ و۱۳۲۸ و ۱۳۳۷ و ۱۳۳۹. فی غریب القران للقبتی ۳۸۹ ولحذار ای السدی والفراء وغیرھما۱۲.

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا﴾ (۴۔۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دہرائی جاتی (ہیں) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہو کر) خدا کی یاد کی طرف (متوجہ) ہو جاتے ہیں۔

میں جُلُوْد سے مراد ابدان اور قلوب سے مراد نفوس ہیں اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ......﴾ (۴۱۔۲۰،۲۱) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور چمڑے (یعنی دوسرے اعضا) ان کے خلاف ان کے اعمال کی شہادت دیں گے اور وہ اپنے چمڑوں (یعنی اعضا) سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ جُلُوْدٌ سے فروج یعنی شرمگاہیں مراد ہیں۔

جَلَدَهٗ: (ض) کسی کے چمڑے پر مارنا۔ جیسے: بَطَنَهٗ وَظَهَرَهٗ اور اس کے دوسرے معنی دُرّے لگانا بھی آتے ہے، جیسے: عَصَاهُ (یعنی لاٹھی کے ساتھ مارنا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً﴾ (۲۴۔۴) تو ان کو اسی (۸۰) درے مارو۔

اَلْجَلَدُ وَالْجِلْدُ۔ اونٹنی کے بچہ کی بھس بھری ہوئی کھال۔

جَلُدَ (ك) جَلَدًا کے معنی قوی ہونے کے ہیں۔

صیغہ صفت جَلْدٌ وَجَلِيْدٌ ہے اور اس کے اصل معنی اِكْتِسَابُ الْجِلْدِ قُوَّةً یعنی بدن میں قوت حاصل کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے: مَالَهٗ مَعْقُوْلٌ وَلَا مَجْلُوْدٌ: اس میں نہ عقل ہے نہ قوت۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو اَرْضٌ جَلْدَةٌ کہا جاتا ہے اس طرح قوی اونٹنی کو نَاقَةٌ جَلَدَةٌ کہتے ہیں۔

جَلَّدْتُ كَذَا میں نے اس کی جلد باندھی۔

فَرَسٌ مُجَلَّدٌ: مار سے نہ ڈرنے والا گھوڑا یہ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ مُجَلَّدٌ اس شخص کو کہتے ہیں جسے مارنے سے درد نہ ہو۔ اَلْجَلِيْدُ: پالا، یخ گویا صلابت میں چمڑے کے متشابہ۔

ج ل س

اَلْجَلْسُ: اس کے اصل معنی سخت زمین کے ہیں۔ اسی لحاظ سے نَجْدٌ یعنی بلند زمین کو جَلْسٌ کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے [1] (۶۳) اَعْطَاهُمُ الْمَعَادِنَ الْقَبَلِيَّةَ غَوْرِيَّهَا وَجَلْسَهَا...... کہ آنحضرت نے

---

[1] وفی الفائق ۱: ۱۰۴ اعطی بلال بن الحارث معاون القبيلة جلسيها وغوريها والحديث فی (دق، کرعن ابن عباس (دق كثير بن عبدالله المزنی عن ابيه عن جده (طب ك، عن بلال بن الحارث راجع كنزالعمال ۳: ۳۹۸۷.

انھیں (ہلال بن حارث) قَبلیة کا نشیبی اور بلند سب کی سب (بطور جاگیر) عطا کردیں۔

اصل میں جَلَسَ کے معنی انسان کے اپنی مقعد کو سخت زمین پر رکھنے کے ہیں۔ پھر محض بیٹھنے کو جُلُوْس اور بیٹھنے کی جگہ کو مَجْلِسٌ کہا جاتا ہے اور مَجْلِسٌ کی جمع مَجَالِسُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ (۵۸۔۱۱) جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھا کرو خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔

ج ل و

اَلْجَلْوُ: (ن) کے اصل معنی کسی چیز کے نمایاں طور پر ظاہر ہوجانا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: اَجْلَيْتُ الْقَوْمَ عَنْ مَنَازِلِهِمْ فَجَلَوْا عَنْهَا (یعنی) میں نے انھیں جلاوطن کیا تو وہ چلے گئے اور جَلَاہُ (متعدی) بھی استعمال ہوتا ہے۔ ❶ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❷ ع

(۹۲) فَلَمَّا جَلاهَا بِالْأَيَامِ تَحَيَّرَتْ
ثُبَاتٍ عَلَيْهَا ذُلُّهَا وَاكْتِئَابُهَا

جب انگبین گیرندہ نے شہد کی مکھیوں کو دھواں کے ذریعہ سے دور ہٹایا تو وہ ٹکڑیاں ہوکر غم واندوہ کے ساتھ ایک طرف سکڑ گئیں۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ﴾ (۵۹۔۳) اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلاوطن کرنا نہ لکھ دیا ہوتا تو ان کو دنیا میں بھی عذاب دے دیتا۔

اسی سے جَلَالِيَ خَبَرٌ (کسی خبر کا ظاہر ہونا) وخَبَرٌ جَلِيٌّ (واضح خبر) وقِيَاسٌ جَلِيٌّ (اور واضح قیاس) کے محاورات ہیں اور صیغہ صفت (فاعل) جَالٍ مسموع نہیں ہے۔

جَلَوْتُ الْعَرُوْسَ جُلْوَةً (وَجِلَاءً) دلہن کو بناؤ سنگھار کرکے پیش کرنا۔

جَلَوْتُ السَّيْفَ جِلَاءً تلوار کو صیقل کیا۔ اَلسَّمَاءُ جَلْوَاءُ: آسمان بے ابر اور صاف ہے۔ رَجُلٌ اَجْلٰی وہ شخص جس کے سر کے بال اڑ گئے ہوں۔ اَلتَّجَلِّيْ کے معنی ہیں ظاہر ہونا اور ہویدا ہونا اور جلوہ بار ہونا اور یہ (تجلی) کبھی بالذات ہوتی ہے، جیسے: ﴿ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ﴾ (۹۲۔۲) اور دن کی جب نمایاں طور پر روشنی ہوجائے۔

اور کبھی بذریعہ امر اور فعل کے ہوتی ہے۔ ❸ جیسے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ ﴾ (۷۔۱۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر جلوہ افروز ہوا۔ کہا جاتا ہے: فُلَانٌ ابْنُ جَلَا ...... یعنی فلاں مشہور ومعروف ہے ❹

---

❶ وفی التاج : واجلی یتعدیٰ ولایتعدی کلاھما ومن الثلاثی المتعدی حدیث الحوض فیحلون عنه ای ینفون ویطردون .

❷ قاله ابوذؤیب الھذلی یصف مشتاراً وفی روایة تحیرت بالراء المھملة والبیت فی اللسان (جلا، ایم) والاقتضاب ۴۰۳ والبحر ۴۰۳ والبحر ۳: ۲۹۰ والمعانی ۶۱۹ وفی روایة الدیوان ایضاً تحیرت قال فی التاج ویروی : فلما اجتلاھا مکان جلاھا.

❸ وقال الزجاج ان ظھر وبان وھذا مذھب اھل السنة والمؤلف مال الی التاویل فزاغ.

❹ قال سحیم بن وثیل الریاحی انا ابن جلا وطلاع الثنایا حتیٰ اضع العمامة تعرفونی وقد تمثل الحجاج بقوله .

اَجْلَوْا عَنْ قَتِیْلٍ: وہ مقتول سے الگ ہوگئے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

ج م م

اَلْجَمُّ: کے معنی ہر چیز کی کثرت اور زیادتی کے ہیں یہ جُمَّةُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے اور جُمَّةُ الْمَاء اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہت بڑی مقدار میں جمع ہو جاتا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴾ (۸۹۔۲۰) اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔

اصل میں اَلْجَمَام سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں راحت کے لیے کسی جگہ پر ٹھہر جانا اور محنت و مشقت چھوڑ دینا۔

جُمَامُ الْمَكُّوْكِ دَقِيْقًا: آٹے سے لبالب بھرا ہوا مکوک جس میں مزید گنجائش نہ ہو۔ اور معنی کثرت کے لحاظ سے جُمَّةٌ کا لفظ لوگوں کی اس بڑی جماعت پر بولا جاتا ہے جو کسی مصیبت کا بوجھ اٹھانے کے لیے جمع ہوں۔ نیز جُمَّةٌ کے معنی ہیں، پیشانی کے مجتمع بال۔

جُمَّةُ الْبِئْرِ: پانی سے بھرا ہوا کنواں گویا کئی دنوں سے اس میں پانی جمع ہو رہا ہے اور متواتر اور سخت دوڑنے والے گھوڑے کو جَمُوْمُ الشَّدِّ کہا جاتا ہے۔

اَلْجَمَّاءُ الْغَفِيْرُ وَالْجَمُّ الْغَفِيْرُ ہجوم۔ لوگوں کی بڑی جماعت۔ شَاةٌ جَمَّاءُ: بے سینگ کے بکری یہ جُمَّةُ النَّاصِيَةِ سے ہے۔

ج م ح

جَمَحَ (ف) جَمْحًا وَجِمَاحًا وَجُمُوْحًا: گھوڑے کا تیزی کے ساتھ دوڑتے جانا اور سوار کے قابو میں نہ رہنا یہ نشاط اور مَرَحٌ سے زیادہ بلیغ ہے۔ پھر کسی آدمی کے سرکشی کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴾ (۹۔۵۷) رسیاں تڑاتے ہوئے۔ اَلْجُمَّاحُ: بے پھل کا تیر جس سے بچے کھیلتے ہیں اس کے سرے پر غلیلہ سا لگا ہوتا ہے۔

ج م ع

اَلْجَمْعُ: (ف) کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ملا دینا۔ محاورہ ہے: جَمَعْتُهٗ فَاجْتَمَعَ: میں نے اسے اکٹھا کیا، چنانچہ وہ اکٹھا ہوگیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ (۷۵۔۹) اور سورج اور چاند جمع کردیئے جائیں گے۔ ﴿ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴾ (۷۰۔۱۸) اور (مال) جمع کیا اور بند رکھا۔

﴿ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴾ (۱۰۴۔۲) مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ ﴿ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ﴾ (۳۴۔۲۶) ہمارا پروردگار ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ ﴿ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾ (۳۔۱۵۷) تو جو (مال و متاع) لوگ جمع کرتے ہیں اس سے خدا کی بخشش اور رحمت کہیں بہتر ہے۔

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ ﴾ (۱۷۔۸۸) کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں۔ ﴿ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴾ (۱۸۔۹۹) تو ہم سب کو جمع کرلیں گے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴾

(۴۔۱۴۰) کچھ شک نہیں کہ اللہ منافقوں ......کو جمع کرنے والا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ (۲۴۔۶۲)

اور جب کبھی ایسے کام کے لیے جو جمع ہو کر کرنے کا ہو، پیغمبر خدا کے پاس جمع ہوں۔ میں امر جامع کے معنی اہم معاملہ کے ہیں جس کے لیے لوگ جمع ہوں تو گویا اس معاملے نے ان کو جمع کرلیا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ ﴾ (۱۱۔۱۰۳) یہ وہ دن ہوگا جس میں سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے۔ جیسے فرمایا:

﴿ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾ (۴۲۔۷) قیامت کے دن کا۔

﴿ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ﴾ (۶۴۔۹) جس دن وہ تم کو اکٹھا ہونے (یعنی قیامت) کے دن اکٹھا کرے گا۔

اور مَجْمُوْعٌ ، جَمْعٌ ، جَمِيْعٌ اور جَمَاعَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ﴾ (۳۔۱۶۶)

اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلہ کے دن واقع ہوئی۔

﴿ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴾ (۳۶۔۳۲) اور سب کے سب ہمارے روبرو حاضر کیے جائیں گے۔

اَلْجُمَّاع: مختلف قبائل کے لوگ جو ایک جگہ جمع ہوں۔ شاعر نے کہا ہے [1] (سریع)

(۹۳) بِجَمْعٍ غَيْرِ جُمَّاعٍ

ایسا مجمع جو مختلف قسم کے لوگوں پر مشتمل نہ تھا۔اور اَجْمَعْتُ كَذَا عام طور پر اس عزم وارادہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے، جس تک غور وفکر سے پہنچا جائے۔ جیسے فرمایا:

﴿ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ﴾ (۱۰۔۷۱) تم اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر ایک کام (جو میرے بارے میں کرنا چاہو) مقرر کرلو۔اور شاعر نے کہا ہے [2] (رجز)

(۹۴) هَلْ اَغْزُوَنْ يَوْمًا وَاَمْرِىْ مُجْمَعٌ

کیا میں کسی روز جنگ کروں گا اور میرا سامان حرب فراہم ہوگا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ﴾ (۲۰۔۶۴) تو تم (جادو کا) سامان اکٹھا کرو۔

اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى كَذَا: کسی معاملہ پر امت مسلمہ کا متفق ہوجانا۔ نَهْبٌ مُجْمِعٌ: لوٹ جو نہایت فکر و تدبر سے حاصل کی جائے۔اور آیت کریمہ:

﴿ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ ﴾ (۳۔۱۷۳) کے بعض نے یہ بھی معنی کیے ہیں کہ انھوں نے تمہارے خلاف تدبیر پر اتفاق کرلیا ہے۔اور بعض نے لشکر کثیر جمع کرنا مراد

---

[1] قاله ابو القيس بن اسلم اسلمي يصف الحرب واوله : حتىٰ انتهينا ولناغاية .... وفى الرواية اللسان (عم) من بين جمع بدل بجمع وثم تجلت بدل انتهينا والبيت من كلمة مفضلية ٢ : ٨٥ في ٢٤ بيتاً وراجع للبيت ايضاً المرزوقى ١٠٨٦ والاقتضاب ٣٥٨ وتهذيب الالفاظ ٣٧ و المحكم (جمع والجمهرة ٢٣٥ وفيه حتى التقينا وفى الفائق ١ : ١١٠) من بين وغير جماع.

[2] قاله الراجز واوله "ياليت شعرى والمنىٰ لاتنفع فى اللسان "(جمع وفيه اغدؤن بدل اغزون راجع الطبرى ١٦ : ١٨٣/١١ : ١٤١) والسيوطى ٢٧٤ وشرح السبع لابن الانبارى ٤٥٢ وشواهد الكشاف (٧٠) وفى اصلاح يعقوب ٢٦٣) غير منسوب وامالى المرتضىٰ ١ : ٥٥٩) والبحر ٥ : ١٧٩).

لیا ہے۔

جَمِیْعٌ وَاَجْمَعُ وَاَجْمَعُوْنَ: یہ تینوں الفاظ کسی امر پر اجتماع کی تو کید کے لیے استعمال ہوتے ہیں لیکن اَجْمَعُوْنَ کا لفظ ہمیشہ اسم معرفہ کی صفت بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی بھی حال بن کر منصوب نہیں ہوتا، جیسے فرمایا:﴿ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴾ (۳۸۔۷۳) تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔﴿ وَاْتُوْنِیْ بِاَھْلِکُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴾ (۱۲۔۹۳) اور اپنے تمام اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔

اور جَمِیْعٌ کا لفظ کبھی منصوب علی الحال ہو کر تو کید کا فائدہ دیتا ہے، جیسے فرمایا:﴿ اھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا ﴾ (۲۔۳۸) تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔﴿ فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ﴾ (۱۱۔۵۵) تم سب مل کر میرے بارے میں (جو) تدبیر (کرنی چاہو) کرلو۔

اور جمعہ کے دن کو یَوْمُ الْجُمُعَۃِ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں لوگ نماز کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:﴿ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ ﴾ (۶۲۔۹) جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (یعنی نماز) کے لیے جلدی کرو۔

اور مسجد الجامع کی اصل مَسْجِدُ الْاَمْرِ الْجَامِعِ او الوقت الجامع ہے۔ لہٰذا یہاں جامع مسجد کی صفت نہیں ہے۔ جَمَّعُوْا کے معنی نماز جمعہ ادا کرنے یا جامع یا جماعت میں حاضر ہونے کے ہیں۔ اَتَانٌ جَامِعٌ: حاملہ گدھی۔ قِدْرٌ جَامِعٌ: بڑی دیگ۔ اِسْتَجْمَعَ الْفَرَسُ جَرْیًا کے معنی ہیں گھوڑا سرپٹ دوڑا، پوری قوت سے بھاگا۔ اس میں جمع کے معنی ظاہر ہیں۔ مَاتَتِ الْمَرْءَۃُ بِجُمْعٍ ❶ حمل کی حالت میں مرگئی۔ یہ محاورہ بھی عورت اور اس کے حمل میں اجتماع کے تصور پر استعمال ہوتا ہے۔ ھِیَ مِنْہُ بِجُمْعٍ ❷ (وہ اپنے خاوند سے) ابھی حالت دوشیزگی میں ہے۔ میں یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب اس کے خاوند نے مجامعت کر کے اس کے پردہ بکارت کو زائل نہ کیا ہو۔

ضَرَبَہٗ بِجُمْعِ کَفِّہٖ اس نے اسے مکا مارا۔

اَعْطَاہُ مِنَ الدَّرَاھِمِ جُمْعَ الْکَفِّ: اسے مٹھی بھر درہم دیئے، اَلْجَوَامِعُ: زنجیر، طوق، کیونکہ اس سے ہاتھ پاؤں باندھے جاتے ہیں۔

(ج م ل)

اَلْجَمَالُ کے معنی حسن کثیر کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔

(۱) خوبی جو خاص طور پر بدن، نفس یا عمل میں پائی جاتی ہے۔

(۲) وہ خوبی جو دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے اسی معنی میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:❸

---

❶ وفی الحدیث ای امرءۃ ماتت بجمع اولم تطمث دخلت الجنۃ راجع النہایۃ ۱:۲۰۶) والفائق ۱:۲۱۱ واللسان (جمع) وغریب ابی عبید ۱:۱۲۵ والحدیث فی (د) جنائز (ن) جنائز (حم) ۵:۳۰۵).

❷ وفی اضداد ابی الطیب ۱۷۸: ومنہ قول الدھناء بنت مسھل: ۱فی منہ جمع.

❸ الفائق ۱:۱۰۵ والحدیث باختلاف الفاظہ البیھقی وابو یعلیٰ عن ابی سعید ومسلم والترمذی من روایۃ عبداللہ ابن مسعود والطبرانی عن ابی امامۃ: و (ك) عن ابن عمر راجع للتفصیل الفتح الکبیر نبھانی ۱:۳۳۱ وتخریج الکشاف ص ۴۳ رقم ۳۶۰ و کنزالعمال.

(٦٦) اِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ سے خیرات کثیرہ کا فیضان ہوتا ہے لہٰذا جو اس صفت کے ساتھ متصف ہوگا ۔ وہی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوگا۔اور قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ﴾ (۱۶۔۶) اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو...... تو ان سے تمہاری عزت وشان ہے۔
اور جَمِيلٌ وَ جَمَالٌ وَجُمَّالٌ: مبالغہ کے صیغے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ﴾ (۱۲۔۱۸) اچھا صبر (کہ وہی خوب ہے)﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ﴾ (۷۰۔۵) تو تم (کافروں کی باتوں کو) حسن صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہو۔جَامَلْتُ فُلَانًا ۔کسی کے ساتھ اچھا معاملہ کرنا تواضع انکساری سے پیش آنا۔اَجْمَلْتُ فِي كَذَا: کسی کام کو عمدگی سے سرانجام دینا۔اعتدال اختیار کرنا جَمَالَكَ: یعنی اعتدال سے کام لو۔پھر اس سے کثرت کے معنی کا اعتبار کر کے ہر مجموعہ اشیاء کو جملہ کہتے ہیں اسی سے مجموعی حساب کو بھی جس کی تفصیل نہ کی گئی ہو جملہ کہا جاتا ہے۔اور جس کلام کی تفصیل بیان نہ کی گئی ہو اسے مُجْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اَجْمَلْتُ الْحِسَابَ وَاَجْمَلْتُ فِي الْكَلَامِ کے معنی حساب یا کلام کو اجمال سے بیان کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً﴾ (۲۵۔۳۲) اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر قرآن پاک ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا۔

اور فقہانے مجمل کی تعریف میں جو یہ کہا ہے کہ اَلْمُجْمَلُ مَا يَحْتَاجُ اِلَى الْبَيَانِ کہ مجمل وہ ہوتا ہے جو بیان کا محتاج ہو تو یہ مُجْمَلٌ کی تحدید یا تفسیر نہیں ہے، بلکہ صرف اس کی ایک حالت کا ذکر ہے جو بعض لوگوں کو پیش آتی ہے اور شے کی تحدید میں اس کے کسی کو پیش آتی ہے، اور شے کی تحدید میں اس کے کسی ایسے ذاتی وصف کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے ، جس سے وہ ممتاز ہو جائے اور مجمل درحقیقت وہ ہے جو بہت سی اشیاء کے ایسے مجموعہ پر مشتمل ہو جن کی تلخیص نہ کی گئی ہو۔
اَلْجَمَلُ: جوان اونٹ، جو کم از کم پانچ سال کا ہو۔اس کی جمع جِمَال وَاَجْمَالُ وَجِمَالَةٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے۔﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (۷۔۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔اور آیت کریمہ ہے:﴿كَاَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ (۷۷۔۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔
میں جِمٰلَتٌ جِمَالَةٌ کی جمع ہے اور جِمَالَةٌ جَمَلٌ کی اور ایک قرأت میں جُمَالَاتٌ بضمہ جیم ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی جوان اونٹنیوں کے ہیں
اَلْجَامِلُ: اونٹوں کا گلہ جن کے ساتھ ان کا چرواہا بھی ہو یہ بَاقِرٌ کی طرح ہے اور اِتَّخَذَ اللَّيْلَ جَمَلاً (کہ اس نے رات کو اونٹ بنا لیا) محاورہ مجاز پر محمول ہے جس کے معنی ہیں: اس نے ساری رات سفر کیا۔جیسا کہ رَكِبَ اللَّيْلَ کا محاورہ ہے اور اونٹ کو جَمَلٌ کہنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ عرب لوگ اونٹ کو اپنے لیے باعث زینت اور فخر سمجھتے تھے جیسا کہ آیت:﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ﴾

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ جَمَلْتُ الشَّحْمَ: چربی پگھلانا اور پگھلائی ہوئی چربی کو اَلْجَمِیْلُ کہا جاتا ہے اور اِجْتِمَالٌ کے معنی چربی کو بطور تیل ملنے کے ہیں، ایک عورت نے اپنی لڑکی سے کہا:

تَجَمَّلِیْ وَتَعَفَّفِیْ: یعنی چربی پگھلا کر کھایا کرو۔ اور عفافه یعنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ پیا کرو۔

(ج ن ن)

اَلْجَنَّ۔(ن) کے اصل معنی کسی چیز کو حواس سے پوشیدہ کرنے کے ہیں، چنانچہ محاورہ ہے: جَنَّهُ اللَّیْلُ وَاَجَنَّهُ اسے رات نے چھپالیا۔ جُنَّ عَلَیْهِ: اسے جنون ہوگیا۔ پس جَنَّهُ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں، اور اَجَنَّهُ کے معنی چھپانے کے لئے کوئی چیز دینے کے ہیں، جیسے: قَبَرْتُهُ وَاَقْبَرْتُهُ وَسَقَیْتُهُ وَاَسْقَیْتُهُ جَنَّ عَلَیْهِ کَذَا۔ کسی چیز نے اسے چھپالیا۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رٰاٰی کَوْکَبًا﴾ (۶۔۷۷) جب رات نے ان کو (پردۂ تاریکی سے) چھپا دیا تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا۔

اَلْجَنَانُ: دل کیونکہ وہ حواس سے مستور ہوتا ہے۔

اَلْمِجَنُّ وَالْمِجَنَّةُ: ڈھال۔ کیونکہ اس سے انسان اپنے آپ کو بچاتا اور چھپاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔﴿اِتَّخَذُوْا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ (۶۳۔۲) انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔

اور حدیث میں ہے [1] (۶۵) اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ: کہ روزہ ڈھال ہے۔

اَلْجَنَّةُ: ہر وہ باغ جس کی زمین درختوں کیوجہ سے نظر نہ آئے جنت کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔﴿لَقَدْ کَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْکَنِهِمْ اٰیَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّشِمَالٍ﴾ (۳۴۔۱۵) (اہل) سبا کے لئے ان کے مقام بود و باش میں ایک نشانی تھی (یعنی دو باغ ایک دائیں طرف اور (ایک) بائیں طرف۔

﴿وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ﴾ (۱۸۔۳۹) اور (بھلا) جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو.......... کیوں نہ۔

بعض نے کہا ہے کہ ان گنجان درختوں کو بھی جنت کہا جاتا ہے جو زمین کو چھپائے ہوئے ہوں اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے [2] (بسیط)

(۹۵) مِنَ النَّوَاضِحِ تَسْقِیْ جَنَّةً سَحِقًا

اور نخلستان کو سیراب کرنے والی سدھائی ہوئی اونٹنی پر رکھے ہوتے ہیں۔

اور بہشت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے، اگرچہ دونوں میں بون بعید ہے اور یا اس لئے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں، جیسا کہ فرمایا:﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ﴾ (۳۲۔۱۷) کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے

---

[1] ای یقی صاحبه من الشهوات انظر للحدیث النهایة ۱: ۲۱٤ واللسان (جنن) وزوائد ابن حبان ـعن کعب بن عجرة انظر رقم ۲۵۵۳ و ۲٦۱ و ۱۵٦۹.

[2] قاله زهیر بن ابی سلمٰی واوله ـ کان عینی فی غربی مقتله والبیت فی دیوانه مع شرح الاعلام الشنتمری ۱۱۷ طبعة لیدن ۱۳۰٦ والعقد الثمین ۸٤ واللسان (قتل) شواهد الکشاف ۸۲ ومختار الشعر الجاهلی ۱: ۱۷۱ والبحر ۳٤/۷/۳۱۳۰۵.

کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جَنَّاتِ جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔ ❶

(۱) جَنَّةُ الْفِرْدَوْس

(۲) جَنَّةُ عَدْنٍ

(۳) جَنَّةُ النَّعِيْم

(٤) دَارُ الْخُلْدِ

(٥) جَنَّةُ الْمَاوٰى

(٦) دَارُ السَّلَامُ

(٧) عِلِّيِّيْنُ

اَلْـجَـنِـيْـنُ: بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں رہے اسے جَنِيْنٌ کہا جاتا ہے، اس کی جمع اَجِنَّةٌ آتی ہے۔ قران میں ہے۔ ﴿وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ﴾ (۵۳۔۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

اور یہ یعنی جـنـيـن فعیل بمعنی مفعول سے ہے یعنی چھپا ہوا۔ اَلْجَنِيْنُ: قبر کو بھی کہتے ہیں۔ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ یعنی چھپانے والی۔

اَلْـجِـنُّ: جن (اس کی جمع جِـنَّةٌ آتی ہے اور) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

(۱) انسان کے مقابلہ میں ان تمام روحانیوں کو جن کہا جاتا ہے جو حواس سے مستور ہیں۔ اس صورت میں جن کا لفظ ملائکہ اور شیاطین دونوں کو شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا تمام فرشتے جن ہیں لیکن تمام جن فرشتے نہیں ہیں، اسی بنا پر ابو صالح نے کہا ہے کہ سب فرشتے جن ہیں۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ نہیں۔ بلکہ جِـنٌّ روحانیوں کی ایک قسم ہیں کیونکہ روحانیات تین قسم ہیں۔

(۱) اَخْيَار (نیک) اور یہ فرشتے ہیں۔

(۲) اَشْرَار (بد) اور یہ شیاطین ہیں۔

(۳) اَوْسَاط جن میں بعض نیک اور بعض بد ہیں۔

اور یہ جن ہیں۔ چنانچہ سورت جن کی ابتدائی آیات: ﴿قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ .... وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقَاسِطُوْنَ﴾ (۷۲۔۱،۱۴) اور یہ کہ ہم بعض فرمانبردار ہیں اور بعض (نافرمان) گنہگار ہیں۔ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں بعض نیک اور بعض بد ہیں۔

اَلْجِنَّةُ: جنوں کی جماعت قرآن میں ہے: ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ (۱۱۴۔۶) (خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں میں سے۔ ﴿وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا﴾ (۳۷۔۱۵۸) اور انہوں نے خدا میں اور جنوں میں رشتہ مقرر کیا۔

اَلْـجِـنَّةُ: (ایضا) جنون۔ دیوانگی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ﴾ (۷۔۱۸۴) کہ ان کے رفیق (محمد ﷺ) کو (کسی طرح کا بھی) جنون نہیں ہے۔ اور دیوانگی کو جنون اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کے دل اور عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ جُـنَّ فُلَانٌ۔ اسے جن لگ گیا۔

امراض کے معانی میں دوسرے افعال کی طرح یہ بھی فعل

---

❶ وفی الفتح ٤: ٢٨: ملح المولف (البخاری) ههنا باسماء الجنة وهما عشرة وتزید سبعة المذكورة (٨) دارالمقامة و(٩) المقام الامين و(١٠) مقعد صدق و(١١) الحسنىٰ وكلها فی القران وزادبعضهم دارالحيوان اخذًا من الاية وفيه نظر.

مجہول ہی استعمال ہوتا ہے۔جیسے زُکِـــــمَ (اسے زکام ہوگیا) لُـقِیَ (اسے لقوہ ہوگیا) حُـمَّ (اسے بخار ہوگیا) وغیرہ بعض نے کہا ہے کہ جُنَّ فُلَانٌ کے معنی ہیں: اس کے قلب کو عارضہ ہوگیا۔اور بعض نے کہا کہ دیوانگی نے اس کی عقل کو چھپالیا اور آیت کریمہ:﴿مُـعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ﴾ (۴۴۔۱۴) کے معنی ہیں کہ اسے وہ جن چمٹا ہوا ہے جو اسے تعلیم دیتا ہے اور یہی معنی آیت:﴿اَئِنَّـا لَتَـارِكُوْا اٰلِهَتِـنَـا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ﴾ (۳۷:۳۶) کہ بھلا ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔میں شاعر مجنون کے ہیں۔

جُـنَّ التِّلَاعُ وَالْاٰفَـاقُ: یعنی ٹیلوں اوران کے گردونواح کو گھاس نے چھپالیا،اور آیت کریمہ ہے:﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنَا هُ مِـنْ قَبْـلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴾ (۱۵۔۲۷)اور جان کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

میں جَـانٌّ سے بھی جنوں کی ایک قسم مراد ہے۔ [1] لیکن آیت کریمہ:﴿كَـاَنَّهَـا جَآنٌّ﴾ (۲۷۔۱۰) میں جَان سے ایک قسم کا سانپ مراد ہے۔

(ج ن ب)

اَلْجَنْبُ: اصل میں اس کے معنی پہلو کے ہیں،اس کی جمع جُنُوبٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔﴿قِيَاماً وَّقُعُوداً وَّ عَلٰى جُنُوبِهِمْ﴾ (۳۔۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے۔

﴿فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ﴾ (۹۔۳۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو...... داغے جائیں گے۔

﴿تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ (۳۲۔۱۶) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔

پھر بطور استعارہ پہلو کی سمت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔جیسا کہ یمین، وشمال اور دیگر اعضا میں عرب لوگ استعارات سے کام لیتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے [2] ع (الکامل)

(۹۶) مِـنْ عَـنْ يَّمِيْنِىْ مَرَّةً وَّاَمَامِىْ

کبھی دائیں جانب سے اور کبھی سامنے سے اسی سے جَـنْـبُ الْحَائِطِ وَجَانِبُهٗ کا محاورہ ہے۔یعنی دیوار کی جانب۔

اور﴿اَلـصَّـاحِـبِ بِالْجَنْبِ﴾ (۴۔۳۶) کے معنی قریبی دوست کے ہیں،اور آیت کریمہ:﴿يٰـحَسْـرَتٰى عَـلٰـى مَا فَرَّطْتُ فِىْ جَنْبِ اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۵۶) کہ (ہائے ہائے) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

میں جَـنْـبِ اللّٰـهِ سے خدا تعالیٰ کے اوامر اور حدود مراد ہیں جو اس نے ہمارے لئے مقرر فرمادیئے ہیں۔

سَـارَ جَنِيْبَهٗ وَجَنِيْبَتَهٗ وَجَنَابَيْهِ وَجَنَابَتَيْهِ اس کے پہلو پر چلا وَجَـنَبْتُهٗ میں اس کے پہلو پر مارا جیسے كَبَـدْتُهٗ

[1] الجان ابو الجن عن ابن عباس وابليسى عن قتادة وعندبعض ابو الشيطان ابليس راجع عثمان ٤ : ٥٣.

[2] البيت لـقـطـرى بن فجاة المانى احد زعماء الخوارج فى زمان مصعب بن الزبير٦٦ ه‍ وسنة ٧٦ واسمه جعرز بن مازن وصدره : فـلـقـارانى للاماح وريئة ...... والبيت فى الحماسة مع المزروقى رقم ٢٠ والشجرى ٢ : ٢٥٤و ٢٢٩) والقالى (٢ : ١٨٦) والخزانه ٤ : ٢٥٨ وابن عقيل ١ : ٢٣٤ وابن هشام رقم ٢٦٥ واستشهد به النحاة على ان لفظه "عن قد تكون اسماً بمعنىٰ جانب قال ابن هشام وذالك يتعين فى ثلاثة مواضع احدها ان يدخل عليها من وهو كثير كقول الشاعر .

میں نے اس کے کلیجے پر مارا فَـأَدْتُـهٗ: میں نے اس کے فؤاد یعنی دل پر مارا۔ جُنِبَ الرَّجُلُ...... پہلو کے درد میں مبتلا ہونا جیسے کُبِدَ وَ فُئِدَ اور جَنْبٌ سے فعل دو معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک، کسی کی سمت مخالف کو جانا یا اس سے دور ہونا۔ دوم سمت موافق کو آنا یا اس کے قریب ہونا۔ اول معنی کی مثال جیسے جَنَبْتُهٗ وَاَجْنَبْتُهٗ میں نے اسے جانب مخالف یعنی دور کردیا۔ اسی سے۔ ﴿اَلْـجَارِ الْـجُنُبِ﴾ (۴۔۳۶) ہے جس کے معنی اجنبی یعنی دور کے ہمسایہ کے ہیں، شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۹۷) فَلاَ تَحْرِمَنِّی نَائِلاً عَنْ جَنَابَةٍ

تو مجھ جیسے غریب الوطن کو دور ہی سے عطا سے محروم نہ کر

رَجُلٌ جَنِبٌ وَجَانِبٌ اجنبی آدمی۔

اَلْاِجْتِنَـابُ: (افتعال) بچنا، یکسور ہنا، پہلوتہی کرنا، قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَـنْـهُ﴾ (۴۔۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جس سے تم کو منع کیا جاتا ہے۔ اجتناب رکھو گے۔

﴿اَلَّـذِیْـنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ﴾ (۵۳۔۳۲) جو...... بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

﴿وَ اجْتَنِبُـوْا قَـوْلَ الزُّوْرِ﴾ (۲۲۔۳۰) اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو، اور آیت کریمہ: ﴿وَاجْتَـنِبُـوا الـطَّاغُوْتَ﴾ (۳۹۔۱۷) میں بتوں سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے طاغوت کی عبادت یکسر ترک کردی اس طرح وہ طاغوت سے دور رہے۔ نیز فرمایا: ﴿فَـاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۵۔۹۰) سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ اور یہ یعنی اِجْتَنِبُوا بنسبت اُتْرُكُوا کے زیادہ بلیغ ہے۔

جَنَّبَ بَنُوا فُلاَنَ بے شیر شدن قوم۔

جَنَبَ فُلاَنٌ خَیْراً ۔ فلاں خیر سے محروم ہوگیا۔

جَنَبَ شَرّاً ۔ وہ شر سے دور رہا۔ چنانچہ قرآن پاک میں نار جہنم کے متعلق ہے:

﴿وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی﴾ (۹۲۔۱۷،۱۸) اور جو بڑا پرہیز گار ہے وہ اس (نار) سے بچالیا جائے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے، تاکہ پاک ہو، لیکن اگر مطلق یعنی بغیر کسی متعلق کے جَـنَـبٌ فُلاَنٌ کہا جائے تو اس کے معنی خیر سے محروم ہونا ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعائے خیر کے لئے بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ (۱۴۔۳۵) اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں، بچائے رکھ۔

میں اُجْـنُـبْـنِیْ ، جَنَبْتُهٗ عَنْ كَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز سے دور رکھنے اور بچانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ جَـنَـبْـتُ الْـفَرَسَ کے محاورہ سے ماخوذ

---

[1] قاله علقمة بن عبدة التمیمی المعروف بعلقمة الفحل صاحب امرء القیس یخاطب به الحارث بن جبلة یمدحه و كان قد اسراخاه شاسا فی تسعین رجلا من بنی تمیم وتمامه .... فانی امرء وسط انقباب غریب والبیت فی دیوانه من الستة ۱۰۷ والمفضلیات ۲ : ۱۹٤) والكامل ۷۲۳ والزجاج ۱ : ۷۱ مخطوطة) والشنتمری ۲ : ٤۲۳) والقرطبی ۵ : ۱۸۳/ ۱۳ : ۲۵۷) واللسان والتاج (جبب) ابو عبیدة ۲ : ۹۸/ ۱ : ۱۲٦) وشواهد الشافیه ٤۹٤ ومختار الشعرالجاهلی ۱ : ۳۲۳) والبحر ۳ : ۲۳۰) وامالی الثجریه ۱ : ۱٤) والعمدة ۱ : ۵۷) والعقد الثمین ۱۰۷۔ وایام العرب ۵۸.

ہے جس کے معنی کوتل ہانکنا کے ہیں ۔ اور گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ اپنے لطف وکرم اور اسباب مخفیہ کے ذریعہ اسے شرک کی جانب سے کھینچ لائے اور اسی طرح اس سے دور رکھے۔

اَلْجَنَبُ: (ایضاً) پیدائشی طور پر پاؤں کا ایک دوسرے سے دور ہونا اور آیت کریمہ: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ (۵۔۶) کے معنی یہ ہیں کہ جب تم حالت جنابت میں ہوا کرو تو غسل کرلو۔ ❶ اور شرعاً جَنَابة کا لگنا یا تو انزال یعنی خروج منی سے ثابت ہوتا ہے، اور یا دو ختنوں کے التقاء یعنی مرد کے عضو تناسل کے عورت کی شرم گاہ میں داخل ہونے ❷ سے اور جنبی ہونے کے معنی میں جَنَبَ (ك ، ن ، س) وَتَجَنَّبَ وَاجْتَنَبَ تینوں باب استعمال ہوتے ہیں، اور جَنَابَة کو جنابت اس لئے کہا گیا ہے، کہ یہ شرعاً نماز سے دور رہنے کا سبب بنتی ہے۔

اَلْجَنُوبُ: (جنوبی ہوا) اس میں کعبہ کی جانب سے آنے اور اس کی جانب جانے دونوں معنی کا اعتبار ہوسکتا ہے کیونکہ اس میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں ، جَنُوبٌ سے جَنَبَتِ الرِّيحُ کا محاورہ لیا گیا ہے، جس کے معنی جنوبی ہوا چلنے کے ہیں۔

اَجْنَبْنَا: ہم جنوب میں داخل ہوئے۔ جُنِبْنَا ہمیں جنوبی ہوا لگی۔ سَحابَةٌ مَجْنُوبَةٌ وہ بادل جسے جنوبی ہوا چلا کر لائی ہو۔

(ج ن ح)

اَلْجَنَاح: پرند کا بازو۔ اسی سے جَنَحَ الطَّائِرَ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی اس کا بازو توڑ دینا کے ہیں، قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (۶۔۳۸) یا دو پرندوں سے اڑنے والا جانور ہے۔

پھر کسی چیز کے دونوں جانب کو بھی جَنَاحَيْنِ کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً جَنَاحَا السَّفِينَةِ (سفینہ کے دونوں جانب) جَنَاحَا الْعَسْكَرِ (لشکر کے دونوں جانب) اسی طرح جَنَاحَا الْوَادي وادی کے دونوں جانب اور انسان کے دونوں پہلوؤں کو جَنَاحَا الْإِنْسَان کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ﴾ (۲۰۔۲۲) اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے لگالو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ (۲۸۔۳۲) اور خوف دور ہونے (کی وجہ) سے اپنے بازو کو اپنی طرف سکیڑ لو۔ میں جَنَاحَ بمعنی يَدٌ کے ہے۔ کیونکہ پرند کا بازو اس کے لیے بمنزلہ ہاتھ کے ہوتا ہے، اسی لئے جَنَاحَا الطَّيْرِ کو يَدَا الطَّيْرِ بھی کہا جاتا ہے، اور آیت کریمہ:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (۱۷۔۲۴) اور عجز و نیاز سے انکے آگے جھکے رہو۔

میں ذُلٌّ کے لئے جَنَاحٌ بطور استعارہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ذُلٌّ یعنی ذلت وانکساری دو قسم پر ہے، ایک ذلت وہ ہے جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرا دیتی ہے اور دوسری وہ ہے جو انسان کے مرتبہ کو بلند کر دیتی ہے ، اور یہاں چونکہ ذلت کی دوسری قسم مراد ہے ، جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرانے کی بجائے بلند کر دیتی ہے، اس لئے

---

❶ وايضاً جنب بمعنى بعيد كمافي قوله تعالىٰ فبصرت به عن جنب ۲۸۔۱۱ اى عن بعد ۱۲۔

❷ وفي الحديث عن عائشة : اذا مس الختان فقد وجب الغسل وفي رواية جاوزو هذا يوضح المراد راجع العون (۱ : ۱۲).

جناح کا لفظ بطور استعارہ (یعنی معنیٰ رفعت کی طرف اشارہ کے لئے) استعمال کیا گیا ہے، گویا کہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ رحمت الٰہی حاصل کرنے کے لئے اس کے سامنے ذلت کا اظہار کرتے رہو، اور یا یہ معنی ہیں کہ ان پر رحمت کرنے کے لئے ذلت کا اظہار کرو۔

جَنَحَتِ الْعِيْرُ فِي سَيْرِهَا: قافلہ تیزی سے چلا۔ گویا وہ اپنے دونوں بازؤں سے اڑ رہا ہے۔ جَنَحَ اللَّيْلُ: رات کی تاریکی چھا گئی، اَلْجُنْحُ: رات کا سیاہ حصہ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ (۸۔۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ۔

میں جَنَحُوْا کے معنی مائل ہونے کے ہیں یہ جَنَحَتِ السَّفِيْنَةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کشتی کے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ اسی لئے ہر وہ گناہ جو انسان کو حق سے مائل کر دے اسے جُنَاحٌ کہا جاتا ہے، پھر عام گناہ کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے، قرآن پاک میں متعدد مواضع پر لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ آیا ہے۔

جَوَانِحُ الصُّدُوْرُ (دو پسلیاں جن کے سرے سینے کے وسط میں باہم متصل ہوتے ہیں۔ اس کا واحد جَانِحَةٌ ہے اور اِن پسلیوں کو جوانح اسی لئے کہا جاتا ہے، کہ ان میں میلان یعنی خم ہوتا ہے۔

(ج ن د)

اَلْجُنْدُ کے اصل معنی سنگستان کے ہیں بمعنی غلظت اور شدت کے اعتبار سے لشکر کو جُنْدٌ کہا جانے لگا ہے۔ اور مجازاً ہر گروہ اور جماعت پر جُنْدٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے (حدیث میں ہے [1]) اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ: کہ ارواح کے بھی گروہ اور جماعتیں ہیں، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۷۳) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

﴿اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ﴾ (۴۴۔۲۴) (تمہارے بعد) ان کا تمام لشکر ڈبو دیا جائے گا۔

اور جُند کی جمع اَجْنَادٌ وَجُنُوْدٌ آتی ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَ جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ﴾ (۲۶۔۹۵) اور شیطان کے لشکر سب کے سب داخل جہنم ہوں گے۔

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوْ﴾ (۷۴۔۳۱) اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور آیت کریمہ: ﴿اُذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ (۳۳۔۹) خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت کی) جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کئے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں پہلے جُنُوْد سے مراد کفار کی فوجیں ہیں اور

---

[1] وتمامه: فماتعارف منهما ائتلف وماتناكرمنهما اختلف محاضرات للمؤلف ۳ : ۵۳) والحديث اخرجه مسلم من حديث ابى هريرة والبخارى تعليقاً من حديث عائشة والطبرانى من حديث ابن مسعود وبمعناه اخرجه الطبرانى فى الاوسط من حديث على وفيه قصة امرء تين المكية والمدينه اخرجه الحسن بن سفيان فى مسنده بسند حسن والديلمى والحزائطى فى ائتلاف القلوب عن على ومسدد عن عمرو بمعناه السلفى فى انتخاب حديث الفراء راجع تخريج الاحياء للعراقى ۲ : ۱۶۱۔۱۶۲ وادب الدنيا والدين للماوردى ۲۹۱ بشرح خان زاده وكنزالعمال ۹ رقم ۳۳,۱۰۳، ۱۰۴ و ۹۲۱۔۹۲۳.

دوسرے سے فرشتوں کے لشکر مراد ہیں، جو انہیں نظر نہیں آتے تھے۔

(ج ن ف)

اَلْجَنَفُ: اس کے اصل معنی فیصلہ میں ایک طرف مائل ہونے (یعنی جانبداری یا ظلم کرنے) کے ہیں ۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ جَنَفاً﴾ (۲۔۱۸۲) اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرف داری کا اندیشہ ہو۔ میں صریح طور پر جانب داری مراد ہے، اسی طرح فرمایا: ﴿غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ﴾ (۵۔۳) (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو۔

(ج ن ی)

جَنَیْتُ (ض) جَنْیاً۔ الثَّمْرَۃَ وَاجْتَنَیْتُهَا میں نے درخت سے پھل توڑا۔

اَلْجَنِیُّ وَالْجَنیٰ چنے ہوئے پھل، چھتہ سے نکالا ہوا شہد لیکن عام طور پر جَنِیٌّ تازہ پھل کو کہتے ہیں جو حال ہی میں توڑا گیا ہو، قرآن پاک میں ہے: ﴿تُسَاقِطْ عَلَیْكِ رُطَباً جَنِیّاً﴾ (۱۹۔۲۵) تم پر تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔

﴿وَجَنَی الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ﴾ (۵۵۔۵۴) اور دونوں باغوں کے میوے قریب (جھک رہے) ہیں۔

اَجْنَی الشَّجَرُ درخت کے پھل پک گئے توڑنے کے قابل ہو گئے۔ اَجْنَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین زیادہ پھلوں والی ہوگئی۔ اسی سے یعنی پھل توڑنے کے معنی سے بطور استعارہ جَنیٰ فُلاَنٌ جِنَایَۃً گناہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اِجْتَرَمَ کا محاورہ بطور استعارہ اس معنی میں آتا ہے۔

(ج ھ د)

اَلْجَھْدُ وَالْجُھْد کے معنی وسعت و طاقت اور تکلیف و مشقت کے ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ اَلْجَھْد بفتح جیم کے معنی مشقت کے ہیں اور اَلْجُھْد (بضم جیم) طاقت اور وسعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ الجھد کا لفظ صرف انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ لاَ یَجِدُونَ اِلاَّ جُھْدَھُمْ﴾ (۹۔۷۹) اور جنہیں اپنی محنت و مشقت (کی کمائی) کے سوا کچھ میسر نہیں ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ﴾ (۱۶۔۳۸) کے معنی یہ ہیں کہ وہ بڑی زور زور سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ اس میں اپنی انتہائی کوشش صرف کریں گے۔

اَلْاِجْتِھَادُ: (افتعال) کے معنی کسی کام پر پوری طاقت صرف کرنے اور اس میں انتہائی مشقت اٹھانے پر طبیعت کو مجبور کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: جَھَدْتُ رَاْیِیْ وَاَجْھَدْتُہٗ میں نے غور و فکر سے اپنی رائے کو مشقت اور تعب میں ڈالا۔

اَلْجِھَادُ وَالْمُجَاھَدَۃُ: دشمن کے مقابلہ اور مدافعت میں اپنی انتہائی طاقت اور وسعت خرچ کرنا۔ اور جہاد تین قسم پر ہے (۱) ظاہری دشمن یعنی کفار سے جہاد کرنا۔ (۲) شیطان اور (۳) نفس سے مجاہدہ کرنا۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَجَاھِدُوا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ﴾ (۲۲۔۷۸) کہ اللہ کی راہ میں پوری طرح جہاد کرو............ تینوں قسم

کے جہاد پر مشتمل ہے۔ نیز فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۴۱) کہ خدا کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو۔ ﴿اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۲۰) جو لوگ ایمان لائے اور وطن چھوڑ گئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرتے رہے۔ اور حدیث میں ہے۔ ❶ (۶۶)

جَاهِدُوْا اَهْوَاءَ كُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَآءَ كُمْ کہ جس طرح اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو اسی طرح اپنی خواہشات سے بھی جہاد کیا کرو۔

اور مجاہدہ ہاتھ اور زبان دونوں کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❷ (۶۷) جَاهِدُوا الْكُفَّارَ بِاَيْدِيْكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ کہ کفار سے ہاتھ اور زبان دونوں کے ذریعہ جہاد کرو۔

(ج ھ ر)

اَلْجَهْرُ: (ف) اس کے اصل کسی چیز کا حاسہ سمع یا بصر میں افراط کے سبب پوری طرح ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں چنانچہ حاسہ بصر یعنی نظروں کے سامنے کسی چیز کے ظاہر ہونے کے متعلق کہا جاتا ہے رَأَيْتُهُ جِهَارًا کہ میں نے اسے کھلم کھلا دیکھا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (۲۔۵۵) کہ جب تک ہم خدا کو سامنے نمایاں طور پر نہ دیکھ لیں تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (۴۔۱۵۳) ہمیں نمایاں اور ظاہر طور پر خدا دکھا دو۔

اور اسی معنی سے جَهَرَ الْبِئْرَ وَاجْتَهَرَهَا ہے، جس کے معنی ہیں اس نے کنواں (کو صاف کرکے) اس کا پانی ظاہر کر دیا۔ محاورہ ہے مَافِي الْقَوْمِ اَحَدٌ يَجْهَرُهُ عَيْنِيْ۔ قوم میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جو میری نظر میں بڑا معلوم ہوتا ہو۔

اَلْجَوْهَرُ: یہ بھی اسی مادہ سے فَوْعَلٌ کے وزن پر ہے اور جوہر اسے کہتے ہیں جس کے بطلان سے اس کے جملہ محمولات کا بطلان لازم آتا ہو، اور اسے جوہر اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ حاسہ بصر یعنی نظر کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔

اور حاسہ کے سامنے ظاہر ہونے کے متعلق فرمایا: ﴿سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ﴾ (۱۳۔۱۰) کہ تم میں سے کوئی چپکے سے بات کہے یا با آواز بلند پکار کر (اس کے نزدیک) دونوں برابر ہیں، ﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ (۲۰۔۷) تم پکار کر بات کہو وہ تو چھپے ہوئے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

﴿وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ﴾ (۶۷۔۱۳) اور تم پوشیدہ بات کرو یا ظاہر۔

﴿وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾ (۴۹۔۲) اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے کے سامنے بات کرتے ہو (اسی طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔

---

❶ حوالہ نہیں ہے۔

❷ الحديث باختلاف لفظه في الدارمي عن أنس وايضاً ابن حبان والنسائي وصححه ورجال اسناده رجال الصحيح ۱۲.

كَلَامٌ جَهُوْرِيٌّ: بلند گفتگو اور بلند آواز شخص کو جَهِيْرٌ کہا جاتا ہے، نیز جَهِيْرٌ کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنے حسن وجمال سے نظر کو خیرہ کردے۔

(ج ھ ز)

اَلْجَهَازُ: سازوسامان جو تیار کر کے رکھا جائے۔قرآن پاک میں ہے، ﴿فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ﴾ (۱۲۔۵۹) جب ان کے لئے ان کا سامان تیار کر دیا۔

اَلتَّجْهِيْزُ: (تفعیل) تیار کردہ سامان کو لادنا یا بھیجنا ضَرَبَ الْبَعِيْرُ بِجَهَازِهٖ: [1] اونٹ نے اپنا سامان (پالان اور بوجھ) نیچے پھینک دیا اور بدک کر بھاگ گیا۔

جَهِيْزَةٌ: ایک احمق عورت [2] نیز مادہ گرگ جو دوسرے کے بچے کو دودھ پلاتی ہو، اسے بھی جَهِيْزَةٌ کہا جاتا ہے۔ [3]

(ج ھ ل)

اَلْجَهْلُ: (جہالت، نادانی) جہالت تین قسم پر ہے۔

(۱) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا اور یہی اس کے اصل معنی ہیں اور بعض متکلمین نے کہا ہے کہ انسان کے وہ افعال جو نظام طبعی کے خلاف جاری ہوتے ہیں ان کا مقتضی بھی یہی معنی جہالت ہے۔

(۲) کسی چیز کے خلاف واقع یقین واعتماد قائم کرلینا۔

(۳) کسی کام کو جس طرح سرانجام دینا چاہیے اس کے خلاف سرانجام دینا اس سے کہ اس کے متعلق اعتقاد صحیح ہو یا غلط مثلاً کوئی شخص دیدہ دانستہ نماز ترک کردے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے آیت: ﴿أَتَتَّخِذُنَا هُزُواً قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (۲۔۶۷) میں هُزُواً کو جہالت قرار دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔﴿فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْماً بِجَهَالَةٍ﴾ (۴۹۔۶) تو خوب تحقیق کرلیا کرو (مبادا) کہ تم کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو۔

اور جاھل کا لفظ عموماً بطور مذمت بولا جاتا ہے۔مگر کبھی بطور مذمت نہیں بھی آتا۔چنانچہ آیت: ﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (۲۔۲۷۳) کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔ میں الجاھل سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کی حالت سے ناواقف ہیں لہٰذا یہاں یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں ہے۔ [4]

اَلْمَجْهَلُ: (سبب جہالت) ہر وہ معاملہ یا عادت یا زمین جو کسی چیز کے متعلق واقع کے خلاف اعتقاد قائم کرلینے کا سبب بنے اسے مَجْهَلٌ کہا جاتا ہے۔

اِسْتَجْهَلَتِ الرِّيْحُ الْغُصْنَ۔ ہوا نے شاخ کو اس طرح زور سے ہلایا گویا وہ اسے جہالت پر مجبور کر رہی ہے۔ یہ کس قدر عمدہ استعارہ ہے۔

---

[1] مثل يضرب عنداظهار النفورعن شيء راجع الميداني رقم ۲۲۰ وفيه جهازه وفي من صلة المعنىٰ اى صارعا ثراً في جهازه.

[2] وفي المثل قطعت جهيرة قول كل خطيب انُظر المثل والقصة الميداني رقم ۳۸۳۰.

[3] وفي الحيوان ۲: ۷۹ يقال واحمق من جهيزه لانها تترك ولدها وترضع ولد الضبع راجع للمثل المعاني للقتبي ۲۱۲ واللسان (جهز) وجهيزة الامثال ۱: ۳۶۴.

[4] وايضاً الاية: الجاهلية الاولى (۳۳۔۳۳) فيقال على العادات التي كانت فيهم قبل الاسلام وفي الاية ۲۵۔۶۳) جاء لفظة الجاهلون في مقابلة عبادالرحمن ۱۲.

(ج ھ ن م)

جَهَنَّمَ: دوزخ کا نام ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصل میں فارسی لفظ جہنام سے معرب ہے۔ واللہ اعلم۔

(ج و و)

اَلْجَوُّ: کے معنی فضا کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (۱۶۔۷۹) کہ فضا میں .... ان کو خدا ہی تھامے رکھتا ہے اور یمامہ کو جوٌ بھی کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

(ج و ب)

اَلْجَوْبُ: (ض) اس کے اصل معنی جَوْبَة قطع کرنے کے ہیں اور یہ پست زمین کی طرح (زمین میں گڑھا سا) ہوتا ہے۔ پھر ہر طرح زمین کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ (۸۹۔۹) اور ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی (قریٰ) میں پتھر تراشتے (اور مکانات بناتے تھے۔

(الْجَائِبَةُ: پھیلنے والی) محاورہ ہے: هَلْ عِنْدَكَ مِنْ جَائِبَةِ خَبَرٍ؟ کیا تمہارے پاس کوئی نشر ہونے والی خبر ہے۔

جَوَابُ الْكَلَامِ۔ اور کسی کلام کے جواب کو بھی جواب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قائل کے منہ سے نکل کر فضا کو قطع کرتا ہوا سامع کے کان تک پہنچتا ہے مگر عرف میں ابتداءً کلام کرنے کو جواب نہیں کہتے ہیں بلکہ کلام کے لوٹانے پر جواب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قران میں ہے: ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا﴾ (۲۷۔۵۶) تو ان کی قوم کے لوگ (بولے تو) یہ بولے اور اس کے سوا ان کا جواب نہ تھا۔

پھر جواب کا لفظ سوال کے مقابلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور سوال دو قسم پر ہے۔

(۱) گفتگو کا طلب کرنا۔ اس کا جواب گفتگو ہی ہوتی ہے۔

(۲) طلب عطا یعنی خیرات طلب کرنا اس کا جواب یہ ہے کہ اسے خیرات دے دی جائے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا: ﴿اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ﴾ (۴۶۔۳۱) خدا کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو۔ ﴿وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ﴾ (۴۶۔۳۲) اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات قبول نہ کرے۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے فرمایا: ﴿قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا﴾ (۱۰۔۸۹) کہ تمہاری دعا قبول کرلی گئی تو تم ثابت قدم رہنا اَلْاِسْتِجَابَةُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی اِجَابَةٌ (افعال) کے ہے اصل میں اس کے معنی جواب کے لئے تحری کرنے اور اس کے لئے تیار ہونے کے ہیں لیکن اسے اِجَابَةٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِسْتَجِیْبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ﴾ (۸۔۲۴) کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو۔

﴿اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (۴۰۔۶۰) کہ تم مجھ سے دُعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ﴾ (۳۔۱۹۵) تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کرلی۔ ﴿وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (۴۲۔۲۶) اور جو ایمان لائے اور عمل نیک کئے ان کی دعا قبول فرماتا۔ ﴿وَالَّذِیْنَ

اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ﴾ (۴۲۔۳۸) اور جو اپنے رب کا فرمان قبول کرتے ہیں۔ ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ﴾ (۲۔۱۸۶) اور اے پیغمبر! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں۔ ﴿اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (۳۔۱۷۲) جنہوں نے باوجود زخم کھانے کے خدا اور رسول کے حکم کو قبول کیا۔

(ج و د)

اَلْجُوْدِیُّ: اس پہاڑی کا نام ہے جو موصل اور جزیرہ کے درمیان واقع ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ﴾ (۱۱۔۴۴) اور کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری۔ یہ دراصل اَلْجَوْدُ کی طرف منسوب ہے اور اَلْجُوْدُ کے معنی مقتنیات (ذخائر) کو صرف اور خرچ کرنے کے ہیں عام اس سے کہ وہ ذخیرہ علم ہو یا ذخیرہ مال کا ہو۔

رَجُلٌ جَوَادٌ: سخی آدمی۔ فَرَسٌ جَوَادٌ (تیز رفتار عمدہ گھوڑا) جو دوڑنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دے اس کی جمع اَلْجِیَادُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿بِالْعَشِیِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ﴾ (۳۸۔۳۱) (جب ان کے سامنے) شام کو خاصے کے گھوڑے (پیش کئے گئے۔)

جَوْدٌ: زیادہ بارش۔ اور گھوڑے میں جو تیز رفتاری کی صفت ہوتی ہے اسے جُوْدَةٌ کہتے ہیں اور سخاوت مال کو جُوْدٌ کہا جاتا ہے۔

جَادَ (ن) الشَّیْءُ جَوْدَةً: کسی چیز کا عمدہ اور جید ہونا اس سے صیغہ صفت جَیِّدٌ آتا ہے اشیاء میں جو عمدگی (جودة) پائی جاتی ہے۔ اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾ (۲۰۔۵۰) کہ اس نے ہر چیز کو اس کی (مناسب) شکل وصورت بخشی اور پھر راہ دکھائی۔

(ج و ر)

اَلْجَارُ: (پڑوسی۔ ہمسایہ) ہر وہ شخص جس کی سکونت گاہ دوسرے کے قرب میں ہو وہ اس کا جَارٌ کہلاتا ہے۔ یہ "اسماء متضایفه" یعنی ان الفاظ سے ہے جو ایک دوسرے کے تقابل سے اپنے معنی دیتے ہیں جیسا کہ اَخٌ اور صَدِیْقٌ کے الفاظ ہیں (کہ اخوت اور صداقت دونوں جانب سے ہوتی ہے) کیونکہ کسی کا پڑوسی ہونا اسی وقت متصور ہو سکتا ہے کہ جب دوسرا بھی اس کا پڑوسی ہو۔ چونکہ ہمسائے کا حق عقلاً اور شرعاً بہت بڑا حق سمجھا گیا ہے اس بنا پر ہر وہ شخص جس کا حق بڑا ہو یا وہ کسی دوسرے کے حق کو بڑا خیال کرتا ہو اسے اس کا "جَارٌ" کہہ دیتے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ (۴۔۳۶) اور رشتہ دار ہمسایہ اور اجنبی ہمسایوں۔

اِسْتَجَرْتُهٗ فَاَجَارَنِیْ: میں نے اس سے پناہ طلب کی چنانچہ اس نے مجھے پناہ دے دی[1] چنانچہ آیت کریمہ

[1] وفی التنزیل وان احد من المشرکین استجارك فاجره (۹: ۶) قل لن یجیرنی من اللّٰه احد (۷۲۔۲۲) فمن یجیر الکافرین (۶۷۔۲۸)

ہے:﴿وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ﴾ (۸۔۴۸) اور میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں۔ میں جَارٌ اسی معنی پر محمول ہے نیز فرمایا:﴿وَھُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ﴾ (۲۳۔۸۸) اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے بالمقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اور جَارٌ میں معنیٰ قرب کے تصور کی بنا پر جَارَہٗ وَجَاوَرَہٗ وَتَجَاوَرَ (افعال) استعمال ہونے لگے ہیں، یعنی کسی کے قرب وجوار میں رہنا قرآن پاک میں ہے:﴿لَا یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْھَآ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۳۳۔۶۰) وہ اس (شہر) میں عرصہ قلیل کے سوا تمہارے ہمسایہ بن کر نہیں رہ سکیں گے۔﴿وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ﴾ (۱۳۔۴) اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعات ہیں۔

اور معنیٰ قرب کے اعتبار سے جَارَعَنْ الطَّرِیْقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ (صلہ عن کی وجہ سے راستہ سے ایک جانب مائل ہوجانے کے ہیں پھر مطلقاً حق سے عدول کرنے کے لئے اس کو اصل قرار دے کر اس سے اَلْجَوْرُ بمعنیٰ ظلم بنایا گیا ہے۔قرآن میں ہے:﴿وَمِنْھَا جَآئِرٌ﴾ (۱۶۔۹) اور بعض راستے سیدھی راہ سے ایک جانب مائل ہورہے ہیں (جو باری تعالیٰ تک نہیں پہنچتے) بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَائِرُ (جَور سے صیغہ فاعل) انسانوں میں سے ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو احکام شریعت کے التزام سے رک جائے (اور اسی کا نام ظلم ہے)

(ج و ز)

جَوْزُ الطَّرِیْقِ کے معنیٰ راستہ کے وسط کے ہیں اسی سے جَازَ الشَّیْءُ ہے جو کسی چیز کے جائز یا خوشگوار ہونے کی تعبیر ہے گویا۔اس نے وسط طریق کو لازم پکڑا۔

جَوْزُ السَّمَاءِ: وسط آسمان۔اَلْجَوْزَاءُ: آسمان کے ایک برج کا نام ہے کیونکہ وہ بھی وسط آسمان میں ہے۔

شَاۃٌ جَوْزَاءُ: سیاہ بھیڑ جس کے وسط میں سفیدی ہو۔

(جَاوَزَہٗ) کسی چیز کے وسط سے آگے گزر جانا) قرآن میں ہے:﴿فَلَمَّا جَاوَزَہٗ ھُوَ﴾ (۲۔۲۴۹) پھر جب وہ (حضرت طالوت علیہ السلام) اس دریا کے وسط سے آگے گزر گئے یعنی پار ہوگئے،﴿وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْبَحْرَ﴾ (۱۰۔۹۰) اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کردیا۔

جُزْتُ الْمَکَانَ: کسی جگہ میں گزرنا۔اَجَزْتُہٗ میں نے اسے نافذ کردیا اس کو پیچھے چھوڑ دیا[1] اِسْتَجَزْتُ فُلَانًا فَجَازَنِیْ: میں نے اس سے (جانوروں یا کھیتی کے لئے) پانی طلب کیا چنانچہ اس نے مجھے دے دیا۔ یہ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور کسی لفظ کا حقیقی معنی وہ ہوتا ہے جو اپنے وضعی معنیٰ میں استعمال ہو اور اس سے تجاوز نہ کرے[2] اور نہ اسے مجاز کہتے ہیں۔

(ج و س)

آیت کریمہ:﴿فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ﴾ (۱۷۔۵) میں جَاسُوْا کے معنیٰ ہیں کہ وہ تمہارے دیار کے اندر گھس گئے اور ان میں خوب پھرے (غارت گری اور قتل سے کنایہ ہے) اور واسُو کے معنیٰ بھی اسی (جَاسُوا) کے قریب قریب ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَوس کے معنیٰ کسی چیز کو استقصار کے ساتھ طلب کرنا کے ہوتے

---

[1] وفی الحدیث الصراط فاکون انا وامتی اول من یجیز علیہ .

[2] ھھنا التواء فتفکر۔۱۲.

ہیں۔

اَلْمَجُوسُ: ایک معروف فرقے کا نام ہے۔

(ج و ع)

اَلْجُوعُ: وہ تکلیف جو کسی حیوان کو معدہ کے طعام سے خالی ہونے کی وجہ پہنچتی ہے۔

الْمَجَاعَة: خشک سالی کا زمانہ۔کہا جاتا ہے: رَجُلٌ جَائِعٌ: بھوکا آدمی اور جب بہت زیادہ بھوکا ہو تو اسے جَوعَانٌ کہا جاتا ہے۔

(ج و ل)

جَالُوت: ایک سرکش بادشاہ کا نام ہے جسے حضرت داوٗد علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔چنانچہ آیت: ﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ (۲۔۲۵۱) میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

(ج ی ء)

جَاءَ (ض) جِیْئَۃً وَمَجِیْئًا: یہ اَلْاِتْیَان کے ہم معنیٰ ہے جس کے معنیٰ آنا کے ہیں،لیکن مَجِیْء کا لفظ اِتیَان سے زیادہ عام ہے کیونکہ اِتْیَان کا لفظ خاص کر کسی چیز کے بسہولت آنے پر بولا جاتا ہے نیز اِتْیان کے معنیٰ کسی کام کا مقصد اور ارادہ کرنا،بھی آجاتے ہیں گو اس کا حصول نہ ہو۔

لیکن مَجِیْءٌ کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب وہ کام واقعہ میں حاصل بھی ہو چکا ہو نیز جَآءَ کے معنیٰ مطلق کسی چیز کی آمد کے ہوتے ہیں،خواہ وہ آمد بالذات ہو یا بالامر اور پھر یہ لفظ اعیان واعراض دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔اور اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کسی جگہ،کام یا وقت کا قصد کرے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَۃِ رَجُلٌ یَّسْعٰی﴾ (۳۶۔۲۰) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آ پہنچا۔ ﴿وَلَقَدْ جَآءَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنَاتِ﴾ (۴۰۔۳۴) اور پہلے یوسف علیہ السلام بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔ ﴿وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِیْٓءَ بِهِمْ﴾ (۱۱۔۷۷) اور جب ہمارے فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غمناک ہوگئے۔ ﴿فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ﴾ (۳۳۔۱۹) پھر جب خوف کا وقت آئے۔ ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ﴾ (۳۵۔۴۵) جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ ﴿بَلٰی قَدْ جَآءَتْكَ اٰیَاتِیْ﴾ (۳۹۔۵۹) کیوں نہیں میری آیتیں تیرے پاس پہنچ گئی تھیں۔

اور آیت: ﴿فَقَدْ جَآؤُوْا ظُلْمًا وَّزُوْرًا﴾ (۲۵۔۴) کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے یہ بات کہہ کر ظلم اور جھوٹ کا قصد کیا ہے اور حد سے تجاوز کیا ہے،تو یہاں پر ظلم اور زور کے متعلق مَجِیْء کا لفظ استعمال کرنا ایسے ہی ہے جیسا ان کے متعلق اَلْقَصْد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

﴿اِذْ جَآءُوْکُمْ مِنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ﴾ (۳۳۔۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (۸۹۔۱۲) میں پروردگار کے آنے سے اس کے حکم کا آجانا مراد ہے۔یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے اور یہی معنیٰ آیت ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ﴾ (۱۰۔۷۶) میں الحق کے آنے کے ہیں۔

جَآئَهٗ بِكَذَا وَاَجَآئَهٗ (متعدی بحرف جار وہمزہ) وہ اسے لے آیا۔قرآن پاک میں ہے:﴿فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ﴾ (۱۹۔۲۳) تو دردِزہ ان کو کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔بعض نے یہاں اَجَآءَ کے معنیٰ اِلْجَاءَ یعنی مجبور اور لاچار کرنا بھی کئے ہیں مگر یہ جَاءَ سے (ہمزہ تعدیہ) متعدی بنایا گیا ہے۔چنانچہ اسی سے مثل مشہور ہے۔❶ شَرٌّ مَا اَجَائَكَ اِلٰى مُخَّةِ عُرْقُوبٍ یعنی انتہائی فقر ہی تمہیں عرقوب سے مخ جوسنے کے لئے لے آیا ہے شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۹۸) اَجَاءَتْهُ الْمَخَافَةُ وَالرَّجَاءُ

اسے امید وبیم تمہارے پاس لے آئی ہے

جَآءَ بِكَذَا اس نے لا حاضر کیا قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوْلَا جَآؤُا عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ (۲۴۔۱۳) یہ افتراز پردار اپنی بات کی تصدیق کے لئے چار گواہ کیوں نہیں لائے۔

﴿وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ﴾ (۲۷۔۲۲) اور میں تمہارے پاس شہر سبا سے ایک سچی خبر لے کر آیا ہوں۔ اور جو چیز لائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے جَاءَ بِكَذَا کے معنیٰ بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

(ج ی ب)

اَلْجَيْبُ: کے معنیٰ گریبان کے ہیں،(مجاز اً سینہ) اس کی جمع اَلْجُيُوْبُ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ (۲۴۔۳۱) ان کو چاہئے کہ اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھا کریں۔

❀❀❀

❶ راجع للمثل الميداني رقم ۱۹,۷ وفيه يحيئك بدل اجاءك واللسان (عرقب ويضرب للمضطر وذالك لان العرقوب لامخ له والعرقوب ايضاً اسم رجل ومواعيد عرقوب مثل فى خلف الوعد.

❷ قاله زهير بن ابى سلمىٰ واوله : وجاءٍ سار معتمداً اليكم۔ قال الفراء اصله من جئت وقد جعلته بمعنىٰ الجأ راجع اللسان والتاج والبيت من شواهد الطبرى ۱۶۔۶٤) ومختار الشعر الجاهلى (۱ : ۱۹٦) والبحر ٦ : ۱۸۲) والعقد الثمين ۷۷ ومحاضرات للمؤلف (۱ : ۲٦۸) ومجاز القرآن ۲ : ٤ وديوانه ۷۷ والقرطبى ۱۱۔۹۲)۱۲.

کِتَابُ الْحَاءِ

(ح ب ب)

اَلْحَبُّ وَالْحَبَّةُ: (فتحہ حاء) گندم، جووغیرہ مطعومات کے دانہ کو کہتے ہیں اور خوشبودار پودوں اور پھولوں کے بیج کو حِبٌّ وَحِبَّةٌ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ ، فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ﴾ (۲۔۲۶۱)(ان کے مالوں) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بالی میں سوسو دانے ہوں۔

﴿وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمَاتِ الْاَرْضِ﴾ (۶۔۵۹) اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى﴾ (۶۔۹۵) بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر (ان سے درخت اگاتا ہے۔) اور آیت کریمہ ہے: ﴿فَاَنْبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ﴾ (۵۰۔۹) اور اس باغ سے دبستان اگائے اور اناج۔ میں حَبَّ الْحَصِيْدِ سے گندم وغیرہ مراد ہے جو کاٹا جاتا ہے، اور حدیث میں ہے [1] (٦٩) كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِيْ حَمِيْلِ السَّيْلِ۔ جیسے گھاس پات کے بیج جو سیلاب کے بہاؤ میں اُگ آتے ہیں۔

اَلْحِبُّ: (محبوب، عاشق) جس کی محبت حد سے بڑھ جائے دانوں کے ساتھ تشبیہ دے کر حَبَبُ الْاِنْسَانِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ دانتوں کی ہمواری اور موزونیت کے ہیں۔ اسی طرح شکل وصورت میں حبوب کے ساتھ تشبیہ دے کر پانی کے بلبلہ کو حَبَابُ الْمَآءِ کہا جاتا ہے۔ حَبَّةُ الْقَلْبِ: سویدائے قلب۔ یہ بھی ہیئت میں تشبیہ کے اعتبار سے ہے۔

حَبَبْتُ فُلَانًا اصل معنیٰ تو یہ ہیں کہ میں نے اس کے حَبَّةُ الْقَلْبِ پر مارا جیسا کہ كَبَدْتُّهٗ فَاَدْتُّهٗ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اَحْبَبْتُ فُلَانًا اصل معنیٰ تو یہ ہیں کہ میں نے اپنا دل اس کی محبت کے لئے پیش کیا مگر عرف میں مَحَبٌّ کی جگہ پر محبوب بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَلْمَحَبَّةُ کے معنیٰ کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس کا ارادہ کرنے اور چاہنے کے ہیں، اور محبت تین قسم پر ہے۔ (۱) محض لذت اندوزی کے لئے جیسے مرد کسی عورت سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا﴾ (۷۶۔۸) میں اسی نوع کی محبت کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) محبت نفع اندوزی کی خاطر جیسا کہ انسان کسی نفع بخش اور مفید شے سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنیٰ میں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ (۶۱۔۱۳) اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو یعنی تمہیں

---

[1] قطعه من حديث طويل ورد في اهل النار بعد مايخرجون منها ويلقون في نهر الحياة راجع البخاري مع الفتح ١٤ : ٢٥٥ وفي رواية مسلم لقتادة بدل الحبة وحمئة السيل بدل حميل السيل والحديث في الفائق ٢ : ٢٦ وغريب ابي عبيدة وهناك تخريجه ١٢.

خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح حاصل ہوگی۔

(۳) کبھی یہ محبت محض فضل وشرف کی وجہ سے ہوتی ہے، جیسا کہ اہل علم وفضل آپس میں ایک دوسرے سے محض علم کی خاطر محبت کرتے ہیں۔اور بعض نے مثل آیت: ﴿فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا﴾ (۹۔۱۰۸) میں محبت کی تفسیر ارادہ سے بھی کی ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ لفظ محبت میں بنسبت ارادہ کے معنوی طور پر زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے، کیونکہ ہر محبت میں ارادہ تو پایا ہی جاتا ہے مگر ہر ارادے کو محبت نہیں کہہ سکتے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ﴾ (۹۔۲۳) کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیں اور پسند کریں۔اصل میں اِسْتِحْبَابٌ کے معنیٰ کسی چیز میں ایسا معنیٰ تلاش کرنے کے ہیں جس کی بنا پر اس سے محبت کی جائے مگر یہاں علی (صلہ) کی وجہ سے اس میں ایثار اور ترجیح کے معنیٰ پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی﴾ (۴۱۔۱۱) کے معنی بھی یہ ہیں کہ انہوں نے اندھا پن کو ہدایت پہ ترجیح دی۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ﴾ (۵۔۵۴) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور جسے وہ دوست رکھیں گے۔

میں اللہ تعالیٰ کے ان سے محبت کرنے سے مراد ان پر انعام کرنا ہے اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کے معنیٰ ہیں ''بندہ تقرب الٰہی حاصل کرنیکی طلب میں لگا رہے'' اور آیت کریمہ: ﴿اِنِّیْ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ﴾ (۳۸۔۳۲) کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں نے گھوڑوں سے اس طرح محبت کی جس طرح کہ مجھے خیر سے محبت ہے۔

(اس طرح میں اللہ کی یاد سے غافل ہو گیا اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ﴾ (۲۔۲۲۲) میں اللہ تعالیٰ کے توابین اور متطہرین سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ثواب دے گا اور ان پر فضل وکرم فرمائے گا اور آیت کریمہ: ﴿وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ﴾ (۲۔۲۷۶) اور آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (۱۸۔۲۱) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔

میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ گناہوں کے ارتکاب سے انسان اس قدر سرکش ہو جاتا ہے کہ توبہ کرنے کا نام نہیں لیتا اور جب توبہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ان معنوں سے محبت نہیں کرتا جن معنوں میں کہ وہ توابین اور متطہرین سے محبت کرتا ہے، یعنی انعام وافضال کرنا اور ثواب سے نوازنا۔

حَبَّبَ اللّٰهُ اِلَیَّ کَذَا: فلاں چیز اللہ نے مجھے عزیز کر دی قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلٰکِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ﴾ (۴۹۔۷) لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا۔

اَحَبَّ الْبَعِیْرُ: اونٹ کا ماندہ اور بیمار ہو کر ایک جگہ پڑے رہنا۔گویا اسے اس جگہ سے محبت ہے۔

حَبَابُكَ اَنْ تَفْعَلَ کَذَا یعنی تیری انتہائی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تم ایسا کرو۔

(ح ب ر)

اَلْحِبْرُ: وہ نشان جو عمدہ اور خوبصورت معلوم ہو

حدیث میں ہے (۱) (٦٥) يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ رَجُلٌ قَدْ ذَهَبَ حِبْرُهٗ وَسِبْرُهٗ کہ آگ سے ایک آدمی نکلے گا جس کا حسن وجمال اور چہرے کی رونق ختم ہو چکی ہوگی اسی سے روشنائی کو حِبْرٌ کہا جاتا ہے۔ (۲) شَاعِرٌ مُحَبِّرٌ: عمدہ گو شاعر (۳) شِعرٌ مُحَبَّرٌ: عمدہ شعر۔ ثَوبٌ حَبِيرٌ: ملائم اور نیا کپڑا۔ اَرْضٌ مِحْبَارٌ: جلد سرسبز ہونے والی زمین (والجمع محابير) اَلْحَبِيرُ (من السحاب) خوبصورت بادل۔

حُبِرَ فُلان: اس کے جسم پر زخم کا نشان باقی ہے۔

اَلْحَبْرُ: عالم کو کہتے ہیں اس لئے کہ لوگوں کے دلوں پر اس کے علم کا اثر باقی رہتا ہے۔ اور افعال حسنہ میں لوگ اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اسی معنیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (۴) (٦٦) کہ علماء تا قیامت باقی رہیں گے، اگرچہ ان کی شخصیتیں اس دنیا سے فنا ہو جاتی ہیں، لیکن ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر باقی رہتے ہیں۔

حَبْرٌ کی جمع اَحْبَارٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۳۱) انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ...... کو اللہ کے سوا خدا بنالیا ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿فِىْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۵) کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جنت میں اس قدر خوش ہوں گے کہ وہاں کی نعمتوں کی تروتازگی کا اثر ان کے چہروں پر ہویدا ہوگا۔

(ح ب س)

اَلْحَبْسُ: (ض) کے معنیٰ کسی کو اٹھنے سے روک دینا کے ہیں، قرآن پاک میں ہے: ﴿تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ﴾ (۵۔۱۰۶) تو ان کو (عصر کی) نماز کے بعد روک لو۔

نیز حَبْسٌ اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جو پانی روکنے کے لیے بنائی گئی ہو۔ اس کی جمع اَحْبَاسٌ ہے۔

اَلتَّحْبِيْسُ: ہمیشہ کے لئے وقف کرنا۔ کہا جاتا ہے: هٰذَا حَبِيسٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ اللہ کی راہ میں وقف ہے۔

(ح ب ط)

اَلْحَبْطُ: (س) کے معنیٰ کسی کام کا اکارت اور ضائع ہو جانا کے ہیں) قرآن پاک میں ہے: ﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ (۳۔۸۸) جن کے اعمال ضائع ہو گئے۔ ﴿وَاَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ (۶۔۸۸) اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل وہ کرتے تھے سب ضائع ہو جاتے۔ ﴿لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ (۳۹۔ ۶۵) تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے۔

اَلْاِحْبَاطُ: (افعال) اکارت کر دینا) قرآن پاک میں ہے: ﴿وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۳۲) اور خدا ان کا سب کیا کرایا اکارت کر دے گا۔

---

(۱) قال في الفائق ١ : ١١٦) الحبر والسبر بالكسر وقد روى فيهما الفتح ايضاً راجع غريب ابى عبيد ١ : ٨٥-٨٧) وايضاً اصلاح يعقوب ١.

(۲) ومنه سمى كعب الاحبار لانه كان صاحب كتب وهو كعب بن ماتع الحميدى ابواسحاق تابعى مخضرم توفى ٣٢ھ فى خلافة عثمان وقدجاوز المأة فى القاموس كعب الحبر ولاتقل الاحبار لكن روه العلماء راجع مشارق عياض وتهذيب النووى .

(۳) قال الاصمعى وكان يقال لطفيل الغنوى فى الجاهلية المحبر لانه كان يحسن الشعر غريب ابى عبيد١ : ٨٦.

(۴) راجع لقول علیؓ العقد٢ : ٢١٢) وفيه امثالهم بدل واشخاصهم كذافى ابن الحديد١٢.

﴿فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۲۸) تو اس نے بھی ان کے عملوں کو برباد کردیا۔

حَبطِ عمل کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ وہ اعمال دینوی ہوں اس لئے قیامت کے دن کچھ کام نہیں آئیں گے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ (۲۵۔۲۳) اور جوانہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کردیں گے۔

(۲) اعمال تو اخروی ہوں لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے نہ کیا گیا ہو جیسا کہ مروی ہے ❶ (۶۹) اَنَّهٗ يُؤْتٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِرَجُلٍ فَيُقَالُ لَهٗ بِمَا كَانَ اشْتِغَالُكَ قَالَ بِقِرَآءَةِ الْقُرْآنِ فَيُقَالُ لَهٗ قَدْ كُنْتَ تَقْرَءُ لِيُقَالَ هُوَ قَارِیٌٔ وَقَدْ قِيْلَ ذَالِكَ فَيُؤْمَرُ بِهٖ اِلَى النَّارِ کہ قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قسم کے عمل کرتا رہا وہ جواب دے گا کہ میں قرآن پاک پڑھتا رہا تو اس سے کہا جائے گا کہ تونے قران اس لئے پڑھا تھا کہ تجھے قاری کہا جائے سولوگ تجھے قاری کہتے رہے حکم ہوگا کہ اسے دوزخ میں لے جاؤ۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال صالحہ کئے ہوں گے لیکن ان کے بالمقابل گناہ کا بار اسقدر ہوگا کہ اعمال صالحہ بے اثر ہوکر رہ جائیں گے اور گناہوں کا پلہ بھاری رہے گا اسی کی طرف خفة المیزان سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ❷

اصل میں حَبْط کا لفظ حَبَطَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں کہ جانور اتنا زیادہ کھاجائے کہ اس کا پیٹ اپھر جائے۔ حدیث میں ہے: ❸ (۷۰) اِنَّ مِمَّا يُنْبِتُ الرَّبِيْعُ مَا يَقْتُلُ حَبَطاً اَوْ يُلِمُّ: بعض اوقات موسم ربیع کی گھاس یا پیٹ میں اپھار کی وجہ سے قتل کردیتی ہے اور یا بیمار کردیتی ہے۔ ایک شخص حارث کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ نفخ بطن سے مرگیا تھا تو اس کا نام الحارث الحَبط پڑ گیا اور اس کی اولاد کو حَبِطات کہا جاتا ہے۔ ❹

(ح ب ک)

(اَلْحِبْكَةُ وَالْحِبَاكُ کے معنیٰ راستہ کے ہیں اَلْحُبُكَ) آیت کریمہ:

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ﴾ (۵۱۔۷) اور آسمان کی قسم جس میں رستے ہیں۔

میں بعض نے الحبك سے ستاروں اور کہکشاں کے محسوس راستے مراد لئے ہیں اور بعض نے عقلی راستے مراد لئے ہیں۔ جن کا تعلق بصیرت سے ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا﴾ (۳۔۱۹۱) میں بھی اسی معنیٰ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

---

❶ الحديث باختلاف الفاظه فی مسلم ۲ : ۱٤۰۔من حديث ابی هريرة .

❷ ای فی الآية ۱۰۱ : ۹۷۸) وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَة .

❸ راجع للحديث كنزالعمال ۳ رقم ۱۱۰٤، ٥٥ بجميع فحارجه وفيه مثل للمفرط من جمع الدنيا ومنعها من حقها الميدانی ۳ : وفی رواية مايقتل خبطاً غريب ابی عبيد بخاری جهاد ورقاق مسلم (قاق ، الغائق ۱ : ٥٥٦) .

❹ وهم خمسة عامر ، سعد ، انمار ،عمرو (التاج) ۱۲.

اصل میں یہ بَعِیرٌ مَحْبُوكُ الْقُوَیٰ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی وہ اونٹ جس کے جوڑ بند نہایت مضبوط ہوں۔
اَلِاحْتِبَاكُ: (افتعال) کس کر اور مضبوطی سے باندھنا۔

(ح ب ل)

اَلْحَبْلُ۔ کے معنی رسی کے ہیں قرآن پاک میں ہے :﴿فِیْ جِیْدِهَا حَبلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ (۱۱۱۔۵) اس کے گلے میں کھجور کی رسی ہوگی۔
پھر چونکہ رگ بھی شکل وصورت میں رسی سے ملتی جلتی ہے اس لئے شہرگ کو حَبْلُ الْوَرِيْدِ (۵۰۔۱۲) اور حَبلُ الْعَاتِقِ کہتے ہیں اور ریت کے لمبے ٹیلے کو حَبْلُ الرَّمْلِ کہا جاتا ہے۔استعارتاً حَبلٌ کے معنی ملا دینا بھی آتے ہیں، اور ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز تک پہنچ جائے حَبْلٌ کہلاتی ہے اس لئے آیت کریمہ:﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً﴾ (۳۔۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑے رہنا۔ میں حَبْلُ اللّٰہِ سے مراد قرآن پاک اور عقل سلیم وغیرہما اشیاء ہیں جن کے ساتھ تمسک کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور عہد و پیمان کو بھی حَبْلُ کہا جاتا ہے، اور آیت کریمہ ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ (۳۔۱۱۲) یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت کو دیکھو گے کہ ان سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ اللہ اور (مسلمان) لوگوں کے عہد (معاہدہ میں آجائیں میں متنبہ کیا گیا ہے کہ کافر کو اپنی جان ومال کی حفاظت کے لیے دو قسم کے عہد و پیمان کی ضرورت ہے ایک عہد الٰہی اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص اہل کتاب سے ہو اور کسی سماوی کتاب پر ایمان رکھتا ہو۔ورنہ تو اسے اس کے دین پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور نہ ہی اسے ذمہ اور امان مل سکتا ہے دوسرا عہد وہ ہے جو لوگوں کی جانب سے اسے حاصل ہو۔
اَلْحِبَالَةُ: خاص کر صیاد کے پھندے کو کہا جاتا ہے اسکی جمع حَبَائِلُ ہے۔ایک حدیث میں ہے ❶:(۷۱) اَلنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں۔
اَلْمُحْتَبِلُ وَالْحَابِلُ پھندا لگانے والا۔ضرب المثل ہے ❷ وَقَعَ حَابِلُهُم عَلىٰ نَابِلِهِم یعنی انہوں نے آپس میں شر وفساد پیدا کر دیا یا ان کا اول آخر پر گھوم آیا۔اَلْحُبْلَةُ جو چیز ہار میں ڈالی جائے۔

(ح ت م)

اَلْحَتْمُ کے معنی قضاء مقدر کے ہیں ❸ اَلْحَاتِمُ کالا کوا جو اہل عرب کے خیال کے مطابق کائیں کائیں کر کے جدائی ڈال دیتا ہے۔

حَتّٰی (حرف)

کبھی تو ''الیٰ'' کی طرح یہ حرف جر کے طور پر استعمال

---

❶ قاله ابن مسعود راجع الميدانی ۲ : ۳٤٠) وفی الاحياء ۳ : ۹٦ مرفوعاً وتهامه : ولولا هذه الشهوة لماكان للنساء سلطنة علی الرجال قال العراقی فی تخريجه الاصفهانی فی الترغيب والترهيب من حديث خالد بن زيد الجهنی باسناد فيه جهالة .

❷ راجع للمثل اللسان والصحاح (حبل).

❸ وفی التنزيل : وكان علی ربك حتما مقضيا(۱۹۔۱۷ ۔)

ہوتا ہے لیکن اس کے مابعد غایت ماقبل کے حکم میں داخل ہوتا ہے اور کبھی عاطفہ ہوتا ہے اور کبھی استیناف کا فائدہ دیتا ہے۔ جیسے اَکَلْتُ السَّمْکَۃَ حَتّٰی رَاْسَھَا (عاطفہ) رَاْسِھَا (جارہ) رَاْسُھَا (مستانفہ) قرآن پاک میں ہے: ﴿لَیَسْجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیْنٍ﴾ (۱۲۔۵۳) کچھ عرصہ کے لئے انہیں قید ہی کر دیں۔

﴿حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (۹۷۔۵) طلوع صبح تک..... جب یہ فعل مضارع پر داخل ہوتے ہیں اور ان میں ہر ایک کی دو وجہ ہوسکتی ہیں نصب کی صورت میں حَتّٰی بمعنیٰ (۱) اِلٰی اَنْ یا (۲) کَیْ ہوتا ہے اور مضارع کے مرفوع ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ حتی سے پہلے فعل ماضی آجائے جیسے:

مَشَیْتُ حَتّٰی اَدْخُلَ الْبَصْرَۃَ (یعنی میں چلا حتی کہ میں داخل ہوا) دوسری صورت یہ ہے کہ حتیٰ کا مابعد حال واقع ہو جیسے مَرِضَ حَتّٰی لَا یَرْجُوْنَ (وہ بیمار ہوا اس حال میں کہ سب اس سے ناامید ہوگئے) اور آیت کریمہ: ﴿حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ﴾ (۲۔۲۱۴) یہاں تک کہ پیغمبر.......... پکار اٹھے۔ میں یَقُوْلُ پر رفع اور نصب دونوں منقول ہیں اور ان ہر دو قرأت میں دونوں معنیٰ بیان کئے گئے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ حتیٰ کا مابعد اس کے ماقبل کے خلاف ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا﴾ (۴۔۴۳) اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کرو۔ وہاں اگر بحالتِ سفر رستے چلے جا رہے ہو (اور غسل نہ کرسکو تو تیمم سے نماز پڑھ لو۔

مگر کبھی اس طرح نہیں بھی ہوتا جیسے مروی ہے ❶ (۷۲) اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوا: پس اس حدیث کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ تمہارے تھک جانے کے بعد ذات باری تعالیٰ بھی تھک جاتی ہے۔ بلکہ معنیٰ یہ ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کو کبھی ملال لاحق نہیں ہوتا۔

(ح ج ج)

اَلْحَجُّ: (ن) کے اصل معنیٰ کسی کی زیارت کا قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (طویل)

(۹۹) یَحُجُّوْنَ بَیْتَ الزِّبْرِ قَانِ الْمُعَصْفَرا

وہ زبرقان کے زرد رنگ کے عمامہ کی زیارت کرتے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں اقامت نسک کے ارادہ سے بیت اللہ کا قصد کرنے کا نام حج ہے۔ اَلْحَجُّ: (بفتح الحا) مصدر ہے اور اَلْحِجُّ (بکسر الحا) اسم ہے اور آیت کریمہ: ﴿یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ﴾ (۹۔۳) میں حج اکبر سے مراد یوم نحر یا یوم عرفہ ہے۔ ایک روایت میں ہے ❸

---

❶ قطعة من حديث طويل لعائشة متفق عليه وفي الموطا بلاغاً راجع لشرحه الزرقاني ۱: ۲۴۳۔۲۴۴۔

❷ قاله المخبل السعدي كمافي المعاني الكبير للقبتي ۱: ۴۷۸ واصلاح يعقوب ۳۷۲ وصدره واشهد من عوف حلولا كثيرة وفي اللسان (سب) والطبري ۲: ۱۹۴) المزعفر بدل المعصفر قال في ذيله هكذا وردالبيت في الاصول المطبوعة والمخطوطة لئكن استدرك مصحح اللسان على قول "بيت" وقال الصواب "سب" بسين مهملة مسكورة وباء موحدة ومعناه العمامة وهو المناسب لقوله المزعفر اوالمعصفر وقال قطرب معناه الاست لانه كان مقرئ ونسبه الى الابنة راجع الجمهرة ۱: ۳۱) والخزانة ۳: ۴۲۸) وفيه خلاف انظر السهيلي ۲: ۳۳۵) وتهذيب الالفاظ ۶۳ ه والبيت في الغريب اللقتبي ۳۲ والصاحبي ۸۱ بغير عزو والبيان ۳: ۵۱) والسمط ۹ والصحاح والاساس والمحكم (حج) والتاج واللسان (سب).

❸ رواه الشافعي في الام (راجع الشوكاني).

(۷۳) اَلْعُمْرَۃُ الْحَجُّ الْاَصْغَرُ: عمرہ حج اصغر ہے۔

اَلْحُجَّۃُ: اس دلیل کو کہتے ہیں جو صحیح مقصد کی وضاحت کرے اور نقیضین میں سے ایک کی صحت کی مقتضی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (۶۔۱۴۹) کہہ دو کہ خدا ہی کی حجت غالب ہے۔

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ (۲۔۱۵۰) (یہ تاکید) اس لئے (کی گئی ہے) کہ لوگ تم کو کسی طرح کا الزام نہ لگا سکیں۔ مگر ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں تو دیں۔ اس آیت میں ظالموں کے احتجاج کو حجۃ سے مستثنیٰ کیا ہے گو اصولاً وہ حجت میں داخل نہیں ہے۔ پس یہ استشہاد ایسا ہی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❹ (طویل)

(۱۰۰) وَلَا عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ اَنَّ سُيُوْفَهُمْ
بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

ان میں صرف یہ عیب پایا جاتا ہے کہ لشکروں کے ساتھ لڑنے سے ان کی تلواروں پر دندانے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے اس احتجاج کو حجت قرار دینا ایسا ہی ہو۔ جیسا کہ آیت:

﴿وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۴۲۔۱۶) اور جو لوگ خدا کے بارے میں بعد اس کے کہ اسے مومنوں نے مان لیا ہو، جھگڑتے ہیں ان کے پروردگار کے نزدیک ان کا جھگڑا لغو ہے۔ میں ان کے باطل جھگڑے کو حجت قرار دیا گیا ہے اور آیت کریمہ:

﴿لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ (۴۲۔ ۱۵) اور ہم میں اور تم میں کچھ بحث وتکرار نہیں ہے۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ ظہور بیان کی وجہ سے بحث وتکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلْمُحَاجَّةُ: اس جھگڑے کو کہتے ہیں جس میں ہر ایک دوسرے کو اس کی دلیل اور مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ﴾ (۶۔۸۰) اور ان کی قوم ان سے بحث کرنے لگی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں (کیا بحث کرتے ہو۔

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ (۳۔۶۱) پھر اگر یہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت الحال تو معلوم ہو ہی چکی ہے۔

﴿لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ﴾ (۳۔۶۵) تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔

﴿هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾

---

❹ قاله النابغة في مدح ملوك غسان وهذاالبيت مشهورته اورده العلماء في تصانيفهم وقد اوردالعلماء البديع شاهداً لتاكيد المدح بمايشبه الذم انظر لكلمة الفصل على البيت الخزانة ۳: ۲۲۹) واللسان (فلل) وشواهد الكشاف ۱۰ والكامل للمبرد ۴۸۔۳۰۰) والعمدة ۲: ۴۱۱) وذيله ۱: ۳۱۶) وديوانه ۶ والصناعتين ۴۰۸ ومختار الشعرا الجاهلي ۱: ۸۷) والبحر ۵: ۶/۷۲: ۲/۲۰۲: ۳/۵۱۶ والكتاب ۱: ۳۶۷) ومحاضرات المؤلف ۳: ۱۵۶) والحيوان ۴: ۲۷۴) والعقد الثمين ۳ والصاحبي ۲۶۷ والمعاني الكبير ۳۶۰ والسيوطي ۲۱ (شواهد بيدا) ۱۲.

(۳۔۶۶) دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا جس کا تمہیں کچھ علم تھا بھی مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو کچھ بھی علم نہیں۔

﴿وَاِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ﴾ (۴۰۔۴۷) اور جب وہ دوزخ میں جھگڑیں گے۔

اور حَجٌّ کے معنیٰ زخم کی گہرائی ناپنا بھی آتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے ❶ (البسیط)

یَحُجُّ مَأْمُوْمَةً فِیْ مَعْرِهَا لَجَفٌ

وہ سر کے زخم کو سلائی سے ناپتا ہے جس کا قطر نہایت وسیع ہے۔

(ح ج ب)

اَلْحَجْبُ وَالْحِجَابُ:(ن) کسی چیز تک پہنچنے سے روکنا اور درمیان میں حائل ہو جانا اور وہ پردہ جو دل اور پیٹ کے درمیان حائل ہے اسے "حجاب الجوف" کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ ہے:﴿وَبَیْنَهُمَا حِجَابٌ﴾ (۵۔۴۶) اور ان دونوں (بہشت اور دوزخ) کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ میں حجاب سے وہ پردہ مراد نہیں ہے جو ظاہری نظر کو روک لیتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ آڑ ہے جو جنت کی لذتوں کو اہل دوزخ تک پہنچنے سے مانع ہوگی اسی طرح اہل جہنم کی اذیت کو اہل جنت تک پہنچنے سے روک دے گی۔جیسے فرمایا:

﴿فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ (۵۷۔۱۳) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی اس کے باطن میں رحمت ہوگی اور بظاہر اس طرف عذاب ہوگا۔اور آیت کریمہ ہے:

﴿مَاکَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ (۴۲۔۵۱) اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعے) سے یا پردے کے پیچھے سے۔ میں پردے کے پیچھے سے کلام کرتے ہیں، وہ ذات الٰہی کو دیکھ نہیں سکتا اور آیت کریمہ:﴿حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ (۳۸۔۳۲) کے معنیٰ ہیں حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا۔

اَلْحَاجِبُ: دربان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ تک پہنچنے سے روک دیتا ہے۔

اور حَاجِبَانِ (تثنیہ) بھویں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھوں کے لئے بمنزلہ سلطانی دربان کے ہوتی ہیں۔

حَاجِبُ الشَّمْسِ: سورج کا کنارہ اس لئے کہ وہ بھی بادشاہ کے دربان کی طرح پہلے پہل نمودار ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (۸۳۔۱۵) کے معنیٰ یہ ہیں کہ قیامت کے روز تجلی الٰہی کو ان سے روک لیا جائے گا (اس طرح وہ دیدار الٰہی سے محروم رہیں گے) جس کے متعلق آیت کریمہ:﴿فَضُرِبَ

---

❶ قاله غداءة بن درة الطائی وتمامه : فاست الطبیب قذاها کالمغارید ۔انظر التاج واللسان والمحکم (حج) والکامل للمبرد ۹۸، ۴۲۲ والمعجم للیاقوت (۱۵: ۷۳۔۷۴) حیث الکلام طویل علی البیت والحیوان (۳: ۴۲۵) والمحفص ۱۳: ۱۸۲ ولمعنیٰ بالعجزان الطبیب بجزع من هولها فالقذی یتساقط من استه کالمغارید وهو جمع مغرود ومعناه کماصغار قال القبتی فی المعانی ۹۷۷ یحج ای یصلح ولحف ان یذهب فی احد النّاحیتین فالطبیب ممایری من هولها تقذی استه کالمغادیر وهذا آخرماقیل فی شرح البیت ۱۲.

بَيْنَهُمْ بِسُورٍ﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(ح ج ر)

اَلْحَجَرُ: سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع اَحْجَارٌ وَحِجَارَةٌ آتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (۲۔۲۴) جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ میں بعض نے یہی مراد لئے ہیں اور اس سے آگ کی ہولناکی پر تنبیہ کی ہے کہ وہ پتھروں اور انسانوں سے بھڑکائی جائے گی بخلاف دنیا کی آگ کے کہ یہ جلنے کے بعد پتھروں پر تھوڑا بہت اثر کرتی ہے۔ لیکن انہیں جلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہیں جیسے پتھر چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا: ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (۲۔۷۴) گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔

اَلْحَجْرُ وَالتَّحْجِيْرُ کے معنی کسی جگہ پر پتھروں سے احاطہ کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَجَرْتُهٗ حَجْرًا فَهُوَ مَحْجُوْرٌ وَحَجَّرْتُهٗ تَحْجِيرًا فَهُوَ مُحَجَّرٌ اور جس جگہ کے اردگرد پتھروں سے احاطہ کیا گیا ہو۔ اسے حِجْرٌ کہا جاتا ہے اس لئے حطیم کعبہ اور دیار ثمود کو حِجْرٌ کہا گیا ہے ❶ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (۱۵۔۸۰) اور (وادی) حجر کے رہنے والوں نے بھی پیغمبروں کی تکذیب کی۔ اور حِجْرٌ (پتھروں سے احاطہ کرنا) سے حفاظت اور روکنے کے معنی لے کر عقل انسانی کو بھی حِجْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی انسان کو نفسانی بے اعتدالیوں سے روکتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿هَلْ فِيْ ذَالِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ﴾ (۸۹۔۵) (اور) بے شک یہ چیزیں عقلمندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق ہیں۔

مبرد (لغوی) نے کہا ہے کہ گھوڑی کو بھی حِجْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پیٹ کے اندر حمل روکے رکھتی ہے۔ اور حِجْرٌ حرام چیز کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کا تناول ممنوع ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَالُوا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ﴾ (۶۔۳۸) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ جو چوپائے اور کھیتی حرام ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ (۲۵۔۲۲) میں حِجْرًا مَحْجُوْرًا ایک محاورہ ہے جاہلیت کا دستور تھا کہ جس کسی کے سامنے کوئی ایسا شخص آ جاتا جس کی اذیت کا خوف ہوتا تو حِجْرًا مَحْجُوْرًا کہہ دیتا (یعنی ہم تمہاری پناہ چاہتے ہیں) یہ الفاظ سن کر دشمن اسے کچھ نہ کہتا) تو قرآن پاک نے یہاں بیان کیا کہ کفار بھی (عذاب کے) فرشتوں کو دیکھ کر (حسب عادت) یہ الفاظ کہیں گے کہ شاید عذاب سے پناہ مل جائے ❷ اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ (۲۵۔۵۳) اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔

---

❶ ناحية الشام عند وادى القرىٰ وهم قوم صالح النبى صلى الله عليه وسلم اماحجر (بفتحه جيم معروف) فقصبته اليمامة.

❷ وبهذا فسر الليث وابن جريج ورده الازهرى وقال ان علماء التفسير الذى يعتمدون، على خلاف ذالك وقالوا ان ذالك كله من قول الملائكة راجع الطبرى (۱۹۔۳) والتاج واللسان (حجر).

میں "حِجراً مَهْجُوراً" سے مراد ایسی مضبوط رکاوٹ ہے جو دور نہ ہو سکے۔

فُلَانٌ فِیْ حِجْرِ فُلَان: وہ فلاں کے زیر نگرانی ہے۔ یعنی اس کی طرف سے اس کے مال اور دیگر اختیارات پر پابندی ہے اس کی جمع حُجُورٌ آتی ہے۔قرآن میں ہے: ﴿وَرَبَآئِبُکُمُ اللّٰاتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ﴾ (۴۔۲۳) اور وہ لڑکیاں جنہیں تم پرورش کرتے ہو۔

حَجْرُ الْقَمِیْصِ: یعنی قمیص کا اگلا حصہ جس میں کوئی چیز رکھ لی جاتی ہے اور حجر سے احاطہ کے معنیٰ لے کر کہا جاتا ہے۔

حُجِرَتْ عَیْنُ الْفَرَسِ یعنی گھوڑی کی آنکھ کے گرد داغ دیا گیا۔ حُجِّرَ الْقَمَرُ: چاند کے گرد ہالہ ہونا۔

اَلْحَجُّوْرَةُ: ایک قسم کا بچوں کا کھیل جو وہ خط مستدیر کھینچ کر کھیلتے ہیں۔اسی سے مَحْجَرُ الْعَیْنِ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ خانہ چشم کے ہیں تَحَجَّرَ کَذَا کسی چیز کا پتھر کی طرح سخت ہو جانا اَلْاَحْجَارُ: بنی تمیم کے چند بطون (جو اس نام سے مشہور ہوئے) اَحْجَارٌ: کیونکہ ان کے بزرگوں کے نام جندل حجر اور صخر وغیرہ تھے۔ [1]

(ح ج ز)

اَلْحَجْزُ: (ن ض) کے معنیٰ دو چیزوں کے درمیان روک اور حد فاصل بنانے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: : ﴿حَجَزَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا﴾ (۲۷۔۶۱) اور (کس نے) دو دریاؤں کے بیچ اوٹ بنادی۔

اور حِجَاز کو بھی حجاز اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شام اور بادیہ کے درمیان حائل ہے اور آیت کریمہ: ﴿فَمَا مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِیْنَ﴾ (۶۹۔۴۷) پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہیں ہے۔ میں حَاجِزِیْنَ، اَحَدٍ کی صفت ہے کیونکہ احد کا لفظ معنیٰ جمع ہے نیز حجاز اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی کلائی میں ڈال کر اسے اس کی کمر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں (تاکہ ہل نہ سکے) پھر حجز میں معنیٰ منع کے پیش نظر اِحْتَجَزَ فُلَانٌ عَنْ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔جس کے معنی کسی چیز کے رک جانے کے ہیں اِحْتَجَزَ بِاِزَارِہٖ تہبند باندھنا۔اسی سے حُجْزَةُ السَّرَاوِیْلِ ہے جس کے معنیٰ ازار بند کے نیفہ کے ہیں [2] مشہور محاورہ ہے۔ اِنْ اَرَدْتُمُ الْمُحَاجَزَةَ فَقَبْلَ الْمُنَاجَزَةِ یعنی ایک دوسرے کو روکنے اور صلح کرنے کا موقع لڑائی سے قبل ہوتا ہے۔ [3]

حَجَازَیْكَ یعنی ان کے درمیان حائل ہو جایئے۔

(ح د د)

اَلْحَدُّ: دو چیزوں کے درمیان ایسی روک جو ان کو باہم ملنے سے روک دے۔ حَدَدْتُ کَذَا میں نے فلاں چیز کے لئے حد ممیز مقرر کردی۔ حَدُّ الدَّارِ مکان کی حد،

---

[1] کذافی اللسان والتاج (حجر) قال واباهم عنی الشاعر بقوله وکل انثی حملت احجاراً.

[2] ومنه الحدیث وانا آخذ بحجزکم.

[3] کذافی التاج (حجز) وفی المیدانی المثل یروی عن اکثم بن صیفی قال ابو عبید معناه: رنج بنفسك قبل لقاء من لاتقاومه (المیدانی رقم (۱۴۹) ۱۲.

جس کی وجہ سے وہ دوسرے مکان سے ممیز ہوتا ہے حَدُّ الشَّیءِ: کسی چیز کا وہ وصف جو دوسروں سے اسے ممتاز کردے اور زنا و شراب کی سزا کو بھی حد اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا دوبارہ ارتکاب کرنے سے انسان کو روکتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَاللّٰهِ﴾ (۶۵۔۱)......اور یہ خدا کی حدیں ہیں۔ جو خدا کی حدود سے تجاوز کرے گا۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ (۲۔۲۲۹) یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں ان سے تجاوز مت کرو۔ اور آیت کریمہ: ﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَاَجْدَرُ اَنْ لَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (۹۔۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل نہیں کہ جو احکام (شریعت) خدا نے نازل فرمائے ہیں ان سے واقف (ہی) ہوں۔

میں بعض نے حدود کے معنیٰ احکام کئے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حقائق و معانی مراد ہیں۔

جملہ حدود الٰہی چار قسم پر ہیں۔

(۱) ایسے حکم جن میں نقص و زیادہ دونوں ناجائز ہوتے ہیں جیسے فرض نمازوں میں تعداد رکعات کو جو شارع علیہ السلام نے مقرر کردی ہیں ان میں کمی بیشی قطعاً جائز نہیں ہے۔

(۲) وہ احکام جن میں اضافہ تو جائز ہو لیکن کمی جائز نہ ہو۔

(۳) وہ احکام جو اس دوسری صورت کے برعکس ہیں یعنی ان میں کمی تو جائز ہے لیکن ان پر اضافہ جائز نہیں ہے۔

(۴) اور آیت کریمہ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۵۸۔۲۰) جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔

میں يُحَآدُّوْنَ کے معنیٰ اللہ رسول کی مخالفت کے ہیں اور اس مخالفت کو يُحَآدُّوْنَ کہنا یا تو روکنے کے اعتبار سے ہے اور یا الحدید کے استعمال یعنی جنگ کی وجہ سے۔ حَدِيْدٌ: لوہا۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ (۵۷۔۲۵) اور لوہا پیدا کیا اس میں اسلحہ جنگ کے لحاظ سے پُرخطر بھی شدید ہے۔

حَدَدْتُ السِّكِّيْنَ: میں نے چھری کی دھار تیز کی۔ اور اَحْدَدْتُهٗ اس کے لئے حد مقرر کردی پھر ہر وہ چیز جو بلحاظ خلقت یا بلحاظ معنیٰ کے ایک ہو۔ جیسے نگاہ اور بَصِيْرَة اس کی صفت میں الحدید کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے۔ هُوَ حَدِيْدُ النَّظَرِ (وہ تیز نظر ہے) هُوَ حَدِيْدُ الفَهْمِ (وہ تیز فہم ہے) قرآن میں ہے: ﴿فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (۵۰۔۲۲) تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ اور جب زبان بلحاظ تیزی کے لوہے کی سی تاثیر رکھتی ہو تو صَارِمٌ وَمَاضٍ کی طرح اس کی صفت حدید بھی آجاتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ﴾ (۳۳۔۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارے میں تیز زبانی کریں۔ اور روکنے کے معنیٰ کے پیش نظر دربان کو حِدادٌ کہا جاتا ہے اور بدنصیب اور محروم آدمی کو رَجُلٌ مَحْدُوْدٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح د ب)

حَدِبَ (س) حَدَباً ۔ الرَّجُلُ وَاَحْدَبَ واحْدَوْدَبَ کبڑا ہونا۔ ہوسکتا ہے کہ حَدَبُ الظَّهْرُ کا لفظ اس مادہ میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہو جس کے معنیٰ کبڑی پیٹھ کے ہیں۔ پھر تشبیہ کے طور پر لاغر اونٹنی کو جس

کے سرینوں کی ہڈیاں نمایاں ہوں، نَاقَةٌ حَدْبَاءُ کہہ دیتے ہیں اور اسی سے (مجازاً) بلند اور سخت زمین کو حَدَبٌ کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۶) اور وہ (یاجوج ماجوج) بلندی سے دوڑ رہے ہوں گے۔

(ح د ث)

اَلْحُدُوْثُ: (ن) کے معنیٰ ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے نہ ہو۔ عام اس سے کہ وہ جوہر ہو یا عرض اور اِحْدَاث صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مُحْدَثٌ (صیغہ صفت مفعولی) ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئی ہو اور کسی چیز کا اِحداث کبھی اس شخص کے اعتبار سے ہوتا ہے جسے وہ حاصل ہوئی ہو۔ جیسے: اَحْدَثْتُ مِلْكًا میں نے نیا ملک حاصل کیا۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ﴾ (۲۱۔۲) ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی (میں اسی دوسرے معنیٰ کے اعتبار ذکر کو محدث کہا گیا ہے) اور ہر قول و فعل جو نیا نیا ظہور پذیر ہوا ہو اسے بھی مُحْدَث کہہ دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتّٰى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾ (۱۸۔۷۰) جب تک میں خود ہی پہل کر کے تجھ سے بات نہ کروں۔

﴿لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾ (۶۵۔۱) شاید اللہ اس کے بعد کوئی (رجعت) کی سبیل پیدا کر دے۔

ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعہ پہنچے اسے حدیث کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہو یا بحالت بیداری۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا﴾ (۶۶۔۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ (۸۸۔۱۰) بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت) کا حال معلوم ہوا ہے۔

اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ (۱۲۔۱۰۱) اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا میں احادیث سے رُؤیا مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو بھی حدیث کہہ کر پکارا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ﴾ (۵۲۔۳۴) تو ایسا کلام بنا لائیں۔

﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ﴾ (۵۳۔۵۹) (اے منکرین خدا) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو،

﴿فَمَالِ هٰٓؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ (۴۔۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟۔

﴿حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ﴾ (۶۔۵۹) یہاں تک کہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں۔

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۴۵۔۶) تو یہ خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ اور خدا سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔

اور حدیث میں ہے [1] (۷۴) اِنْ يَّكُنْ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ مُحَدَّثٌ فَهُوَ عُمَرُ ۔ کہ اگر اس امت میں کوئی

---

[1] اخرجه البخاری من حدیث ابی هریرة ولفظه لقد کان فیماقبلکم من الامم محدثون فان یك فی امتی احد فانه عمرؓ رواه مسلم من حدیث عائشة الفتح ٦ : ٤٠٠) وایضاً فی مناقب عمروهناك الکلام علیه وتخریج الاحیاء ٣ : ٢٤ وبمعناه المستدرك للحاکم ٣ : ٨٦)عن عائشة والفائق ١ : ٢٣).

محدث ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہے اور محدث سے آپ کی مراد وہ شخص ہے جس کے دل میں ملأ اعلیٰ کی طرف سے القاء ہوتا ہو۔اور آیت کریمہ ہے:﴿فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ﴾ (۳۴۔۱۹) تو ہم نے (انہیں نابود کر کے) ان کے افسانے بنا دیئے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی داستانیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔جو بطور مثال کے ذکر کی جاتی ہیں۔

اَلْحَدِيْثُ: (ایضاً) تازہ پھل رَجُلٌ حَدُوثٌ یعنی خوش گفتار آدمی۔هُوَحِدْثُ النِّسَاءِ وہ عورتوں سے باتیں کرنے کا عادی ہے۔حَادَثْتُهٗ وَتَحَدَّثْتُهٗ وَتَحَادَثُوا: باہم بات جیت کرنا۔صَارَ اُحْدُوْثَةً وہ افسانہ بن چکا ہے۔

رَجُلٌ حَدَثٌ وَحَدِيْثُ السِّنِّ نوعمر آدمی۔

حَادِثَةٌ: مصیبت۔اس کی جمع حوادث آتی ہے۔

(ح د ق)

اَلْحَدِيْقَةُ: (مرغزار) وہ قطعہ زمین جس میں پانی جمع ہو اور ہیئت وصورت اور پانی کے ہونے کی وجہ سے اسے حَدَقَةُ الْعَيْنِ (آنکھ کی پتلی) کے ساتھ تشبیہ دے کر اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔اس کی جمع حَدَائِقَ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ﴾ (۲۷۔۶۰) سرسبز باغ۔اور حَدَقَةٌ کی جمع حِدَاقٌ وَاَحْدَاقٌ آتی ہے حَدَّقَ النَّظْرُ: گھور کر دیکھنا نظر جما کر دیکھنا۔حَدَقُوا بِهٖ وَاَحْدَقُوا۔انہوں نے اس کے گرد احاطہ کر لیا یہ معنیٰ بھی حَدَقَةُ الْعَيْنِ کے گھمانے سے لئے گئے ہیں۔

(ح ذ ر)

اَلْحَذَرُ: (س) خوف زدہ کرنے والی چیز سے دور رہنا۔کہا جاتا ہے:حَذَرَ حَذَرًا وَحَذِرْتُهٗ: میں اس سے دور رہا۔قرآن میں ہے:

﴿يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ﴾ (۳۹۔۹) آخرت سے ڈرتا ہے۔

﴿اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ﴾ (۲۶۔۵۶) اور ہم سب باساز وسامان ہیں۔

ایک قرأت میں حَذِرُوْنَ ہے۔

﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ﴾ (۶۳۔۴) یہ (تمہارے دشمن ہیں ان سے محتاط رہنا۔

﴿اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ (۶۵۔۱۴) تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔

حَذَّرَ: کسی امر سے محتاط رہنے کے لئے کہنا۔قرآن میں ہے:

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (۳۔۲۸) اور خدا تم کو اپنے (غضب) سے محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

اَلْحِذْرُ: بچاؤ اور آیت کریمہ:﴿خُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾ (۴۔۷۱) (جہاد کے لئے) ہتھیار لے لیا کرو۔میں حِذْر سے مراد اسلحۂ جنگ وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ دشمن سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔حَذَارِ (اسم فعل بمعنیٰ امر) بچو جیسے مَنَاعِ بمعنیٰ اِمْنَعْ۔

(ح ر ر)

اَلْحَرَارَةُ: یہ بَرُوْدَةٌ کی ضد ہے اور حرارت دو قسم پر ہے۔

(۱) وہ حرارت جو گرم اجسام سے نکل کر ہوا میں پھیل جاتی ہے جیسے سورج اور آگ کی گرمی

(۲) وہ حرارت جو عوارض طبعیہ سے بدن میں پیدا ہو جاتی ہے۔جیسے محموم (بخار زدہ) کے بدن کا گرم ہونا کہا جاتا ہے۔

حَرَّ (س) حَرَارَةً الیومُ او الریحُ: دن یا ہوا گرم ہو گئی۔ ایسے دن کو مَحْرُوْرٌ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حَرَّ الرَّجُلُ کا محاورہ ہے قرآن میں ہے: ﴿لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا﴾ (۹۔۸۱) کہ گرمی میں مت نکلنا (ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔

اَلْحَرُوْرُ: گرم ہوا، لو۔ ارشاد ہے۔: ﴿وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ﴾ (۳۵۔۲۱) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ کی تپش۔

اسْتَحَرَّ الْقَيْظُ: گرمی سخت ہوگئی۔

اَلْحَرَرُ: یبوست جو شدت پیاس کی وجہ سے جگر میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اَلْحِرَّةُ: (اسم مرۃ از حَرَّ) کہا جاتا ہے۔ ❶ (مثل) حِرَّةٌ تَحْتَ قِرَّةٍ: یعنی سخت پیاس سردی کے ساتھ (بددعا) اَلْحَرَّةُ: (ایضا) پتھر جو گرمی کی شدت سے سیاہ ہوجائے۔ اسی سے اِسْتَحَرَّ الْقَتْلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنیٰ کشت وخون کا معرکہ گرم ہونے کے ہیں۔

حَرُّ الْعَمَلِ: کام کی شدت، صعوبت عمل۔

مشہور ہے (مثل) اِنَّمَا يَتَوَلّٰى حَارَّهَا مَنْ تَوَلّٰى قَارَّهَا...... جس نے اس کی ٹھنڈک سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہی اس کی گرمی برداشت کرے۔

اَلْحُرُّ: عبدٌ کی ضد۔ کہا جاتا ہے۔ حُرٌّ بَيِّنُ الْحُرُوْرِيَّةِ اَوِ الْحُرُوْرَةِ: وہ آدمی جس کی شرافت نمایاں ہو۔

حُرِّيَّةٌ: (آزادی) یعنی آزادی دو قسم پر ہے۔

(۱) جو کسی کا غلام نہ ہو جیسے فرمایا: ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ (۲۔۱۷۸) کہ آزاد کے بدلے آزاد۔

(۲) جسے صفات ذمیمہ یعنی حرص، لالچ دنیوی مال ومتاع کا غلام نہ بنادیں۔

ضد عبودیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❷ (۷۲) تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ: (درہم ودینار کا بندہ ہلاک ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❸ ع

(۱۰۲) وَرِقُّ ذَوِي الْاَطْمَاعِ رِقٌّ مُخَلَّدٌ

حریص اور لالچی لوگ ہمیشہ غلام رہتے ہیں۔

مثل مشہور ہے۔ (مثل)

عَبْدُ الشَّهْوَةِ اَذَلُّ مِنْ عَبْدِ الرِّقِّ ۔کہ شہوت کا بندہ غلام سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔

اَلتَّحْرِيْرُ کے معنیٰ کسی انسان کو آزاد کرنا کے ہیں۔ چنانچہ تحریت کے اول معنیٰ کے پیش نظر فرمایا: ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ تو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہیے اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے فرمایا: ﴿نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا﴾ (۳۔۳۵) جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں۔ چنانچہ بعض نے اس کے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ وہ اپنے بیٹے سے کسی قسم کا دنیوی فائدہ حاصل نہیں کرے گی۔ جس کی طرف آیت: ﴿بَنِيْنَ وَحَفَدَةً﴾ (۱۶۔۷۲) میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ خالص عبادت الٰہی کے لئے وقف رہے گا۔

❶ انظر فی (ق، ر، ر).

❷ مرّ تخریجه فی (عبد).

❸ لم اجده فی المراجع ۱۲.

اسی بنا پر شعبی نے مُحَرَّرًا کے معنی مخلصاً کئے ہیں اور مجاہد نے مُحَرَّراً کے معنی خادم مَعبد کئے ہیں۔امام جعفر نے کہا ہے۔کہ امور دنیوی سے آزاد ہوگا۔لیکن مآل کے لحاظ سے سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔حَرَّرْتُ الْقَوْمَ: میں نے انہیں قید خانہ سے رہا کردیا۔صَرُّ الْوَجْهِ: وہ شخص جو احتیاج کے پنجہ میں گرفتار نہ ہوا ہو۔

حُرُّ الدَّارِ گھر کا درمیان۔

اَحْرَارُ الْبَقْلِ: وہ ترکاریاں جو کچی کھائی جاتی ہیں۔

اور شاعر کا قول ❶ ع (الکامل)

(۱۰۳) جَادَتْ عَلَيْهِ كُلُّ بِكْرٍ حُرَّةٍ

موسم بہار کی پہلی موسلا دھار بارش نے اس پر سخاوت کی ہے۔

بَاتَتِ الْمَرْءَةُ بِلَيْلَةٍ حُرَّة ❷ (شب زفاف کہ شوہر درآں بکارت نتواں زائل کرد۔) یہ سب استعارات ہیں۔

اَلْحَرِيْرُ: (ریشمی کپڑا) ہر ایک باریک کپڑے کو حریر کہا جاتا ہے۔فرمایا:

﴿وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ﴾ (۲۲۔۲۳) وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔

(ح ر ب)

اَلْحَرْبُ: جنگ کارزار۔اور فتحہ را کے ساتھ معنی لڑائی میں کسی کا مال چھیننے کے ہیں پھر ہر قسم کے سلب کو حَرَبٌ کہا جاتا ہے اور حَرَبَ معنوی لحاظ سے حَرْب سے مشتق ہے کہا جاتا ہے: حُرِبَ الرَّجُلُ: اس کا سامان چھین لیا گیا۔فَهُوَ حَرِيْبٌ یعنی لٹا ہوا۔

اَلتَّحْرِيْبُ: لڑائی کا بھڑکانا۔رَجُلٌ مِحْرَبٌ جنگجو گویا وہ لڑائی بھڑکانے کا آلہ ہے۔اَلْحَرْبَةُ: برچھا۔

اصل میں یہ حَرْبٌ یا حِرَابٌ سے فَعْلَة کے وزن پر ہے اور مسجد کے محراب کو محراب یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان اور خواہشات نفسانی سے جنگ کرنے کی جگہ ہے اور یا اس لئے کہ اس جگہ میں کھڑے ہوکر عبادت کرنے والے پر حق یہ ہے کہ دنیوی کاروبار اور پریشان خیالیوں سے یک سو ہو جائے۔

بعض کہتے ہیں کہ اصل میں "محراب البیت" صدر مجلس کو کہتے ہیں اسی بنا پر جب مسجد میں امام کی جگہ بنائی گئی تو اسے بھی محراب کہ دیا گیا۔

اور بعض نے اس کے برعکس محراب المسجد کو اصل اور محراب البیت کو اس کی فرع مانا ہے۔اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ﴾ (۳۴۔۱۳) وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی محراب اور مجسمے۔

اَلْحِرْبَاءُ: گرگٹ۔کیونکہ وہ سورج کے سامنے اس طرح بیٹھ جاتی ہے گویا اس سے جنگ کرنا چاہتی ہے نیز زرہ کے

---

❶ قاله عنترة وتمامه: فتكون كل قرارة كالدرهم۔وفى رواية الامالى (۲: ۲۹۷) عين قرّة بدل بكر حرة وحديقة بدل قرارة وكذا فى معلقته (العشر للتبريزى ۲۶۸) وفى شرح التبريزى ۱۸۰) كماههنا والسمط ۹۴۵) والصحاح واللسان (حر) والمحكم (حد ق) والكامل ٦ والصناعتين ۲۸۲) والمختار الشعر الجاهلى (۱: ۱۸۲) ونقد ٦۸ والبحر ۵: ۵۴۲/۱: ۱۶۰/۷: ۱۷۲) والحيوان ۲: ۳۱۲) والعقد الثمين ۴۵ وطراز المجالس ۱٦ وفى البيت بحث يتعلق بلفظ كل والبيت فى ديوانه ۴۵ وابن هشام ۱: ۲۱۷) بحث كل والجمهرة ۱٦۳ وابن الانبارى ۳۱۲.

❷ انظر للمثل المعانى للقبتى ۵۰۸ والمعدانى ۵۰۱.

حلقہ یا میخ کو بھی صوری مشابہت کی بنا پر حِـرْبـاء کہا جاتا ہے جیسا کہ ضَبٌّ اور کَـلْبٌ کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کے بعض حصوں کو ضَبَّۃٌ اور کَلْبٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح ر ث)

اَلْحَرْثُ: (ن) کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اور اسے زراعت کے لئے تیار کرنے کے ہیں اور کھیتی کو بھی حَـــرْث کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَارِمِیْنَ﴾ (۶۸۔۲۲) کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔ اور کھیتی سے زمین کی آبادی ہوتی ہے اس لئے حرث بمعنیٰ آبادی آجاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْلَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنیا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَمَالَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ﴾ (۴۲۔۲۰) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طلب گار ہے اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے۔ اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے۔ اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

اور ہم اپنی کتاب مکـارم الشـریعہ میں دنیا کے کھیتی اور لوگوں کے کسان ہونے اور اس میں بیج بونے کی کیفیت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ایک روایت میں ہے [1] (۷۲) اَصْدَقُ الْاَسْمَاءِ الحارث کہ سب سے سچا نام حارث ہے کیونکہ اس میں کسب کے معنیٰ پائے جاتے ہیں ایک دوسری روایت میں ہے [2] (۷۵) اُحْرُثْ فِی دُنْیَاکَ لِاٰخِرَتِکَ کہ اس دنیا میں آخرت کے لئے کاشت کرلو۔

حَـرْثُ الْاَرْضِ: (زمین کاشت کرنا) سے تھییج بھڑکانا کے معنی کے پیش نظر حَـرَّثْـتُ النَّارَ کہا جاتا ہے میں نے آگ بھڑکائی اور جس لکڑی سے آگ کریدی جاتی ہے اسے محرث کہا جاتا ہے کسی کا قول ہے۔[3]

اُحْـرُثِ الْقُرانَ: یعنی قرآن کی خوب تحقیق سے کام لو۔

حَرَثَ نَاقَتَہٗ: اونٹنی کو کام اور محنت سے دبلا کردیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انصار سے دریافت کیا کہ تمہارے پانی کھینچنے والے اونٹ کیا ہوئے؟ تو انہوں نے جواب دیا [4] حَرَثْنَا ھَا یَوْمَ بَدْرٍ کہ ہم نے بدر کے دن انہیں دبلا کردیا۔اور آیت کریمہ:

﴿نِسَآءُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ﴾ (۲۔۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔

میں استعارہ عورتوں کو حَـرْث کہا ہے کہ جس طرح زمین کی کاشت پر افراد انسانی کی بقا کا مدار ہے۔اس طرح نـوعِ انســان اور اس کی نسل کا بقا عورت پر ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ﴾ (۲۔۲۰۵) اور کھیتی کو

---

[1] النهاية (حرث).

[2] الحديث ورد بالفاظ مختلفه راجع النهاية ١ : ٣٥٩.

[3] عن حديث عبدالله بن مسعود رضى الله عنه النهاية ١ : ٣٩.

[4] راجع النهاية ١ : ٣٠.

(برباد) اور انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کردے۔ دونوں قسم کی کھیتی کو شامل ہے۔

(ح ر ج)

اَلْحَرَجُ وَالْحَرَاجُ: (اسم) کے اصل معنی اشیاء کے مجتمع یعنی جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور موجود ہے اس لئے تنگی اور گناہ کو بھی حَرَجٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ثُمَّ لاَ یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا﴾ (۴۔۶۵) اور...... اپنے دل میں تنگ نہ ہوں۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (۲۲۔۷۸) اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔

حَرِجَ (س) حَرَجاً ۔ صَدْرُهٗ ۔ سینہ تنگ ہو جانا قرآن پاک میں ہے: ﴿یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقاً حَرَجًا﴾ (۶۔۱۲۵) اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ ایک قرأت میں حَرِجاً ہے [1] یعنی کفر کی وجہ سے اس کا سینہ گھٹا رہتا ہے اس لئے کہ عقیدۂ کفر کی بنیاد ظن پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو کبھی سکون نفس حاصل نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ (۲۔۷) سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلاَ یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِنْهُ﴾ (۷۔۲) اس سے تم کو تنگ دل نہیں ہونا چاہیے۔

میں لاَ یَكُنْ فعل نہی کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور...... جملہ دعائیہ بھی۔ بعض نے اسے جملہ خبریہ کے معنی میں لیا ہے جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (۹۴۔۱) سے مفہوم ہوتا ہے۔

اَلْمُنْحَرِجُ: (صفت فاعلی) گناہ اور تنگی سے دور رہنے والا جیسے مُنْحَوِبٌ ، حُوْبٌ (یعنی گناہ) سے بچنے والا۔

(ح ر د)

اَلْحَرْدُ: (ض) تیزی اور غصہ کے ساتھ کسی چیز کو روکنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قَادِرِیْنَ﴾ (۶۸۔۲۵) اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔
یعنی وہ اس بات پر قدرت رکھتے تھے کہ مسکینوں کو اپنے باغ میں آنے سے روک دیں۔
نَزَلَ فُلاَنٌ حَرِیدًا: یعنی فلاں قوم سے الگ تھلگ اترا۔ هُوَ حَرِیدُ الْمَحَلِّ: یعنی الگ تھلگ رہنے والا۔
حَارَدَتِ السَّنَةُ: یعنی امسال بارش نہیں ہوئی۔
حَارَدَتِ النَّاقَةُ اونٹنی نے دودھ روک لیا۔ (یعنی اس کا دودھ کم یا خشک ہو گیا) حَرِدَ: (س) غضبناک ہونا۔
حَرَّدَهٗ كَذَا۔ فلاں چیز نے اسے غضب ناک کر دیا۔
بَعِیرٌ اَحْرَدُ: اونٹ جس کی اگلی ٹانگ کا پٹھا ڈھیلا ہو۔
اَلْحُرْدِیَّةُ: سرکنڈے کا باڑہ۔

(ح ر س)

اَلْحَرَسُ وَالْحُرَّاسُ: (جمع) پاسبان۔ اس کا واحد حَارِسٌ ہے [2] قرآن پاک میں ہے۔

---

[1] قراءۃ ابن عباس وعمرؓ۔
[2] قال فی التاج: والحرسی لاتقل حارس لانہ قد صار اسم جنس الان یذھب بہ الی معنی الحرامۃ ۱۲۔

﴿فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَساً شَدِيْداً﴾ (۷۲۔۸) تو اس کو مضبوط چوکیداروں .... سے بھرا ہوا پایا۔

اَلْحَرْسُ: (ض) اور اَلْحِرْزُ کے جس طرح الفاظ ملتے جلتے ہیں ایسے ہی ان کے معنیٰ بھی قریب قریب ایک ہی ہیں ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ حِرْزٌ کا استعمال زیادہ تر نقدی اور سامان کی حفاظت کے لئے آتا ہے۔شاعر نے کہا ہے۔[1] (الکامل)

(۱۰۴) فَبَقِيْتُ حَرْساً قَبْلَ مَجْرَى دَاحِسٍ
لَوْ كَانَ لِلنَّفْسِ اللَّجُوْجِ خُلُوْدُ

میں داحس کی دوڑ سے پہلے اس کی حفاظت کرتا رہا کاش سرکش نفس کے لئے ہمیشہ رہنا ہوتا۔

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں حَرْساً کے معنیٰ دَهْراً کے ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ اگر صرف اس شعر کی بنا پر حرس کے معنیٰ زمانہ کئے گئے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ شعر مذکور میں ہوسکتا ہے کہ حرس مصدر بمعنیٰ فاعل موضع حال میں ہو ای بقیت حارساً: اب رہا اس کا زمانہ یا مدت کے معنیٰ پر دلالت کرنا تو یہ لفظ حرس کے اصل معنیٰ نہیں ہیں بلکہ مقتضائے کلام سے مفہوم ہوتے ہیں۔

اَحْرَسَ: صاحب حراست ہونا۔(اس میں صاحب مآخذ ہونے کے معنیٰ پائے جاتے ہیں جیسا کہ باب افعال کا خاصہ ہے۔

حَرِيْسَةُ الْجَبَلِ: وہ مال جو رات کے وقت پہاڑ میں حفاظت کے لئے رکھا جاتا ہے[2]۔ابوعبیدہ کا قول ہے کہ الحريسة بمعنیٰ مَحْرُوسة ہے نیز اَلْحَرِيسية بمعنیٰ مسروقة بھی آجاتا ہے یعنی چوری کیا ہوا مال اور اس معنیٰ میں باب حَرَس (ض) يَحْرِس حَرْساً آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اَلْحَرِيسة سے بنا ہے کیونکہ اہل عرب سے الحريسية کے بمعنیٰ سَرْقه یعنی چوری بھی منقول ہے۔

(ح ر ص)

اَلْحِرْصُ: شدتِ آز (حرص) یا فرط ارادہ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدَاهُمْ﴾ (۱۶۔۳۷) یعنی ان کی ہدایت کے لئے تمہارے دل میں شدید آرزو اور خواہش ہو۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيَاةٍ﴾ (۲۔۹۶) بلکہ ان کو تم اور لوگوں سے زندگی پر کہیں زیادہ حریص دیکھو گے۔

﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۲۔۱۰۳) اور بہت سے آدمی گو تم (کتنی ہی) خواہش کرو۔ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اصل میں یہ حَرَصَ الْقَصَّارُ الثَّوْبَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ہیں دھوبی نے کپڑے کو پتھر پر مار مار کر پھاڑ دیا۔

---

[1] قاله لبيد كما في اللسان والتاج (جرى) والعمرين ٦٣ وفي رواية وغنيت سبتاً بدل بقيت حرساً وفي مجاز القران ١: ٢٨٩ رقم ٣٢٢ والمحكم والمرزوقي ٧١٤: وعمرت حرسا والبيت في ديوانه (١: ٢٥) واصلاح يعقوب ١٠ وتهذيب الاصلاح ١: ١٦) مع آخر قبله والبحر ١: ٢٤٠).

[2] ومنه في الحديث في حريسة الجبل (التاج) لانه ليس في حرز.

اَلْحَارِضَۃُ: وہ زخم جوجلد کو پھاڑ ڈالے۔

اَلْحَارِضَۃُ وَالْحَرِیصَۃُ اس بادل کو کہتے ہیں جو اپنی بارش سے زمین کی بالائی سطح کو کھرچ ڈالے۔

(ح ر ض)

اَلْحَرَضُ: اس چیز کو کہتے ہیں جو نکمی ہو جائے اور درخور اعتناء نہ رہے اس لئے جو چیز قریب بہ ہلاکت ہوجائے اس کے متعلق حَرِضَ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰی تَكُونَ حَرَضًا﴾ (۱۲۔۸۵) یا تو قریب بہ ہلاکت ہو جاؤ گے۔اور اَحْرَضَه کے معنیٰ گھلا دینے اور قریب بہ ہلاکت کر دینے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۱۰۵) اِنِّی امْرُءٌ نَابَنِیْ هَمٌّ فَاَحْرَضَنِی:

میں وہ آدمی ہوں جسے تمہارے غم نے گھلا دیا ہے۔

اَلْحُرْضَۃُ: گھٹیا قسم کا آدمی جو خود ایک دام بھی خرچ نہ کرے بلکہ جوئے بازی کا گوشت مفت کھانے کا عادی ہو۔

اَلتَّحْرِیضُ: کے معنیٰ ازالہ حرض کے معنی میں ہیں یعنی کسی چیز سے بگاڑ اور خرابی کو دور کر دینا جیسے مَرَّضْتُہٗ اور قَذَّیْتُہٗ کے معنی مرض اور تنکے کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔تَحْرِیضٌ کے معنی کسی کو مزین کر کے اور اسے آسان صورت میں پیش کر کے اس پر برانگیختہ کرنے کے ہیں۔ [2]

اَحْرَضْتُہٗ: (افعال) کسی چیز میں خرابی پیدا کر دینا۔جیسے اَقْذَیْتُہٗ: کسی چیز کو قذا آلود کرنا ہوتے ہیں۔

(ح ر ف)

حَرْفُ الشَّیءِ کے معنیٰ کسی چیز کے کنارہ کے ہیں حَرْفٌ کی جمع اَحْرُفٌ وَحُرُوفٌ آتی ہے اور پہاڑ کشتی اور تلوار کے کنارہ کو حَرْفٌ کہا جاتا ہے اور حُرُوْفُ الْهِجَاءِ کے معنیٰ اطراف کلمہ کے ہیں اور اصطلاحِ نحاۃ میں اَلْحُرُوْفُ الْعَوَامِلُ ان حروف کو کہا جاتا ہے جو کلموں کے اطراف میں واقع ہوتے ہیں اور ان کو باہم مرتبط کرتے ہیں اور حَرْفُ الجبل: یعنی پہاڑ کے کنارے اور باریکی میں حرف کے ساتھ تشبیہ دے کر لاغر اونٹنی کو حرف کہا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُاللّٰهِ عَلٰى حَرْفٍ﴾ (۲۲۔۱۱) اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں۔جو کنارے پر (کھڑا ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں...... میں عَلٰی حَرْفٍ کے معنیٰ خود قرآن پاک نے ہی بعد میں فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرٌ الاٰیة سے بیان کر دیئے ہیں یعنی جب تک اطاعت وعبادت میں کچھ دنیاوی فائدہ نظر آتا ہے تو اس کو کرتا رہتا ہے اور جب کوئی تکلیف نظر آتی ہے تو چھوڑ بیٹھتا ہے۔اور یہی معنیٰ آیت:

﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ (۴۔۴۳) کے ہیں۔

اِنْحَرَفَ عَنْ كَذَا وَتَحَرَّفَ: کسی چیز سے کنارہ کرنا

---

[1] قاله العرجی عبدالله بن عمر بن عبدالله وتمامه : حتیٰ بلیت وحتیٰ شفی السقم ۔ والبیت فی اللسان والصحاح والتاج (حرض) ومجاز القران ۱ : ۳۱۷ رقم ۳٦٦ والطبری ۱۳ : ٤۲) وفی روایة لج بی حب بدل نابنی هم والقرطبی ۹ : ۲۵۰) والشطر فی فتح الباری ۸ : ۲۷۳) وراجع الترجمة الشاعر الاغانی ۱ : ۳۸۳) والاشتقاق ٤۸ والسمط ٤۲۲) والبحر ۵ : ۳۲۷) .

[2] وفی التنزیل حرض المؤمنین علی القتال ٤ : ۸٤).

ایک جانب مائل ہونا۔ اَلاِحْتِرَافُ: کوئی پیشہ اختیار کرنا۔

اَلْحِرْفَةُ: (فعلة) پیشہ، پیشے کی حالت جیسے قِعْدَةٌ وَ جِلْسَةٌ۔

اَلْمُحارَفُ: وہ شخص جو خیر سے محروم اور اس کے کنارہ پر ہو (کم نصیب)

اَلتَّحْرِيْفُ: (الشیء) کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو ایک جانب مائل کر دینا۔ جیسے تَحْرِيْفُ الْقَلَمِ قلم کو ٹیڑھا قط لگانا۔

اور تَحْرِيْفُ الْكَلَامِ کے معنیٰ ہیں کلام کو اس کے موقع محل سے پھیر دینا کہ اس میں دو احتمال پیدا ہو جائیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (۵۔۱۳) یہ لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔ اور دوسرے مقام پر ہے: ﴿مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ﴾ (۵۔۴۱) یعنی ان کے محل اور صحیح مقام پر ہونے کے بعد۔

﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ﴾ (۲۔۷۵) (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے سمجھ لینے کے بعد اس کو (جان بوجھ کر) بدل دیتے رہے ہیں۔

اَلْحَرِفُ: وہ چیز جس میں تلخی اور حرارت ہو۔ گویا وہ حلاوت اور حرارت سے پھیر دی گئی ہے۔ طَعَامٌ حِرِيْفٌ: چرچراہٹ والا کھانا۔ ایک روایت میں ہے۔ ❶ (۷۶) نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔

اس کی تحقیق ہمارے رسالہ المنبهة علی فوائد القرآن میں ملے گی۔

(ح ر ق)

اَحْرَقَ كَذَا: (کسی چیز کو جلانا) اِحْتَرَقَ: (جلنا)

اَلْحَرِيْقُ: (آگ) قرآن میں ہے:

﴿ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (۳۔۱۸۱) کہ عذاب (آتش) سوزاں کے مزے چکھتے رہو۔

﴿فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ﴾ (۲۔۲۶۶) تو (ناگہاں) اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولا چلے اور وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے۔

﴿قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ﴾ (۲۱۔۶۸) تب وہ کہنے لگے......تو اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

﴿لَنُحَرِّقَنَّهٗ﴾ (۲۰۔۹۷) ہم اسے جلا دیں گے۔ ایک قرأت میں لَنَحْرُقَنَّهٗ ہے ❷ پس حَرْقُ الشَّیْءِ کے معنیٰ کسی چیز میں بغیر اشتعال کے جلن پیدا کرنے کے ہیں جیسے دھوبی کے پٹخنے سے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔

حَرَقَ (ن) الشَّیْءَ ریتی سے رگڑنا اسی سے حَرَقَ

---

❶ کذافی غریب ابی عبید ۳: ۱۵۹۔۱۶۲ وتمامه کلها شاف کاف ۔ وبعضهم یرویه فاقرؤا کماعلمتم راجع الفائق ۱: ۳۴) والصحیح انزل بدل نزل والحدیث باختلاف الفاظه فی (حم ق) عن عباس والسجزی فی الابانة عن زید بن ثابت و(هب) عن عمرو ابن العاص د(دن) عن ابی بن کعب (حم طب) عن عبادة بن الصامت (حم م ك) عن ابی بکر و عمر (حم) عن ابی جهیم (حم ف) عن ابی حم عن حذیفة وطب عن معاذ وعن ابن مسعود وابن الضریس عن ابن عباس وابن جریرعن ابن مسعود وابن عمر (حم وابن جریر طب) وابو نصر السخری فی الابانة راجع کنزالعمال ج ۲: ۱۸۶۔۲۲۵) وفی بعضها ثلاثة احرف وفی بعضها اربعة احرف لکن حدیث سبعة اکثر واصح فلها الاعتبار.

❷ وهی قرأة علی رضی الله عنه.

النَّابَ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ دانت پیسنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ يَحْرُقُ عَلَيَّ الْاُرَّمِ: یعنی وہ مجھ پر دانت پیتا ہے۔ حَرِقَ الشِّعْرُ اس کے اشعار مشہور ہو گئے۔ مَاءٌ حُرَاقٌ: بہت کھاری پانی جو کھاری پن سے جلا ڈالے اَلْاِحْرَاقُ: کسی چیز کو جلانا اسی سے استعارۃً جب کہ بہت زیادہ ملامت کر کے اذیت پہنچائے تو کہا جاتا ہے۔ اَحْرَقَنِی بَلَوْمِهٖ یعنی اس نے مجھے ملامت سے جلا ڈالا۔

(ح ر ک)

اَلْحَرَكَةُ: یہ سکون کی ضد ہے اور جسم کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جسم کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو حرکت کہا جاتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز میں تغیر ہونے یا اس کے اجزاء میں کمی بیشی واقع ہونے پر بھی تحرك كذا کہہ لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ﴾ (۷۵۔۱۶) اور (اے محمد ﷺ) وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ چلایا کرو۔

(ح ر م)

الْحَرَامُ: وہ ہے جس سے روک دیا گیا ہو خواہ یہ ممانعت تسخیری یا جبری، یا عقل کی رو سے ہو اور یا پھر شرع کی جانب سے ہو اور یا اس شخص کی جانب سے ہو جو حکم شرع کو بجالاتا ہے۔ پس آیت کریمہ ہے۔

﴿وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ﴾ (۲۸۔۱۲) اور ہم نے پہلے ہی سے اس پر (دائیوں کے) دودھ حرام کر دیئے تھے۔ میں حرمت تسخیری مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنَا هَا﴾ (۲۱۔۹۵) اور جس بستی والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا محال ہے کہ وہ دنیا کی طرف رجوع کریں۔

کو بھی اسی معنیٰ پر محمول کیا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک آیت: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ (۵۔۲۶) کہ وہ ملک ان پر چالیس برس تک کے لئے حرام کر دیا گیا۔

میں بھی تحریم تسخیری مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ منع جبری پر محمول ہے اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ﴾ (۵۔۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا۔ خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا۔

میں بھی حرمت جبری مراد ہے اسی طرح آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾ (۷۔۵۰) کہ خدا نے بہشت کا پانی اور رزق کافروں پر حرام کر دیا ہے۔

میں تحریم بواسطہ منع جبری ہے اور حرمت شرعی جیسے (۷۷) آنحضرت ﷺ نے طعام کی طعام کے ساتھ بیع میں تفاضل کو حرام قرار دیا ہے [1] اور آیت کریمہ: ﴿وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسَارٰى تُفَادُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ﴾ (۲۔۸۵) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلا دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا۔

میں بھی تحریم شرعی مراد ہے کیونکہ ان کی شریعت میں یہ چیزیں ان پر حرام کر دی گئی تھیں۔ نیز تحریم شرعی کے متعلق فرمایا: ﴿قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْمَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا

---

[1] متفق علیه من حدیث عمربن الخطاب ورواه النسائی وابن ماجة وابوداؤد من حدیث عبادة بن الصامت راجع النیل ٥ : ٢٠٤).

عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ﴾ (۶۔۱۴۵) کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھاتا ہو حرام نہیں پاتا۔

﴿وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ﴾ (۶۔۱۴۶) اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے۔

سَوْطٌ مُحَرَّمٌ: بے دباغت چمڑے کا کوڑا۔ گویا دباغت سے وہ حلال نہیں ہوا جو کہ حدیث ❶ كُلُّ اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ کا مقتضی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مُحَرَّمٌ اس کوڑے کو کہتے ہیں جو نرم نہ کیا گیا ہو۔

اَلْحَرَمُ کو حرام اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کے اندر بہت سی ایسی چیزیں حرام کر دی ہیں جو دوسری جگہ حرام نہیں ہیں اور یہی معنیٰ الشہر الحرام کے ہیں۔ رَجُلٌ حَرَامٌ وَمُحَرَّمٌ: یعنی وہ شخص جو حالت احرام میں ہو اس کے بالمقابل رَجُلٌ حَلَالٌ وَمُحِلٌّ ہے اور آیت کریمہ: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ (۶۶۔۱) کے معنی یہ ہیں کہ تم اس چیز کی تحریم کا حکم کیوں لگاتے ہو جو اللہ نے حرام نہیں کی کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے حرام نہ کی ہو وہ کسی کے حرام کرنے سے حرام نہیں ہو جاتی۔ جیسا کہ آیت: ﴿وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا﴾ الْاٰیَة (۶۔۱۳۸) اور بعض چار پائے ایسے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کر دیا گیا ہے۔ میں مذکور ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ﴾ (۶۸۔۲۷) بلکہ ہم (برگشتہ نصیب) بے نصیب ہیں ان کے محروم ہونے سے بدنصیبی مراد ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (۵۱۔۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) میں محروم سے مراد وہ شخص ہے جو خوشحالی اور وسعت رزق سے محروم ہو اور بعض نے کہا ہے کہ المحروم سے کتا مراد ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ محروم کتے کو کہتے ہیں جیسا ان کی تردید کرنے والوں نے سمجھا ہے بلکہ انہوں نے کتے کو بطور مثال ذکر کیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر کتے کو لوگ دور ہٹاتے ہیں اور اسے کچھ نہیں دیتے۔

اَلْمَحْرُمَةُ وَالْمَحْرَمَةُ کے معنیٰ حرمت کے ہیں۔

اِسْتَحْرَمَتِ الْمَاعِزُ: بکری نے نر کی خواہش کی (یہ حِرْمَة) سے ہے جس کے معنیٰ بکری کی جنسی خواہش کے ہیں)

(ح ر ی)

حَرَی (ض) الشَّیْءَ وَتَحَرَّاہُ کے معنیٰ کسی چیز کے حَرٰی یعنی جانب کا قصد کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا﴾ (۷۲۔۱۴) یہی لوگ ہیں جنہوں نے سیدھی راہ کا قصد کیا۔ اور حَرَی الشَّیْءُ حَرْیًا کے معنیٰ کسی چیز کے کم ہونے کے ہیں گویا وہ ایک جانب پڑی رہی اور پھولی پھلی نہیں شاعر نے کہا ہے ❷ (الکامل)

---

❶ اخرجه هذااللفظ الطبرانی عن ابن عباس والمعروف من لفظ الحدیث ایما بدل کل راجع (حم ت ن ه) والمسلم عن ابن عباس وكذا فی مسند احمد ورواه الشافعی وابن حبان والدارقطنی ورواه الخطیب فی تلخیص المتشابه من حدیث جابر وفی روایة الدارقطنی عن عائشة مرفوعاً طهور کل ادیم دباغها راجع النیل ۱ : ۷۵) وکنزالعمال ۹رقم ۲۱۴۴, ۲۱۲۹ بالفاظ وطرق .

❷ لسلمة بن عویه بن ربیعة الضبی من قصیدة طویلة وصدره حتیٰ کانی خاتل قنصا ونسبه المرتضیٰ ۱ : ۲۴۴ عن الجاحظ لذی الاصبع ونسبه القالی ۲ : ۱۶۶) ۱۲ بیتاً لسلمی بن غزیه قال الاستاذ المیمنی وهو غویة بن سلمی انظر السمط ۳۲۲ ومجالس ثعلب ۱ : ۲۴۵ واللالئی ۷۹ وقد ذکره المرزبانی فی معجمه فی حرف العین المهملة وقال لایقال غویه بالمعجمة (فی البحتری ۲۹۶) لغزیه بن سلمیٰ.

(۱۰۶) وَالْمَرْءُ بَعْدَ تَمَامِهٖ یَحْرِیْ
انسان کامل ہونے کے بعد ڈھلنا شروع ہوجاتا ہے۔
رَمَاہُ اللّٰہِ بِاَفْعیٰ حَارِیَۃٍ (1) (مثل)
اللہ تعالیٰ اس پر بوڑھا اژدھا مسلط کرے۔

(ح ز ب)

اَلْحِزْبُ: وہ جماعت جس میں سختی اور شدت پائی جائے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصیٰ لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا﴾ (۱۸۔۱۲) دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔
﴿اُولٰئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ﴾ (۵۸۔۱۹) یہ (جماعت) شیطان کا لشکر ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَمَّا رَاَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ﴾ (۳۳۔۲۲) اور جب مومنوں نے کافروں کے لشکر کو دیکھا۔ میں احزاب سے وہ لوگ مراد ہیں جو (مختلف قبائل سے) آنحضرت ﷺ کے خلاف جنگ کے لئے جمع ہوگئے تھے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۵۔۵۶) اور خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔ میں حزب اللہ سے انصار اللہ یعنی دین الٰہی کی مدد کرنے والے لوگ مراد ہیں۔
﴿یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْھَبُوْا وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّھُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ﴾ (۳۳۔۲۰) (خوف کے سبب) خیال کرتے ہیں کہ فوجیں نہیں گئیں اور اگر لشکر آجائیں تو تمنا کریں کہ (کاش!) گنواروں میں جا رہیں۔

اس کے بعد تھوڑا سا آگے چل کر فرمایا:
﴿وَلَمَّا رَاَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ﴾ (۳۳۔۲۲)

(ح ز ن)

اَلْحُزْنُ وَالْحَزَنُ کے معنیٰ زمین کی سختی کے ہیں۔
نیز غم کی وجہ سے جو بے قراری سی طبیعت کے اندر پیدا ہوجاتی ہے اسے بھی حَزَنٌ یا حُزْنٌ کہا جاتا ہے اس کی ضد فَرَحٌ ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنیٰ معتبر ہوتے ہیں اس لئے غم زدہ ہونے کے لئے خَشَنَتْ بِصَدْرِہٖ بھی کہا جاتا ہے۔ حَزِنَ (س) غمزدہ ہونا۔ حَزَنَہٗ (ن) وَاَحْزَنَہٗ: غمگین کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لِکَیْلَا تَحْزَنُوا عَلٰی فَاتَکُمْ﴾ (۳۔۱۵۳) تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے...... اس سے تم اندوہناک نہ ہو۔
﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ (۳۵۔۳۴) کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔
﴿تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا﴾ (۹۔۹۲) تو وہ لوٹ گئے اور...... ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
﴿اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ﴾ (۱۲۔۸۶) کہ میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (۳۰۔۱۳۹) اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔
اور ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ (۹۔۴۰) کہ غم نہ کر۔

---

(1) انظر السمط ۴۹۰ والقالی ۲: ۱۷۲، ۱۷۰ وذیل الامالی ۵۵ فی مبحث "وعاء العرب" قال والجاریۃ التی رجع سمہا فیہا فاحرقہا فہوا شد لضربتہا والمیدانی ۱: ۲۷۱، ۲۰۸، ۲۸۲ والحیوان ۴: ۲۴۴ والمثل فی حل المعاجم.

میں اندوہگین ہونے سے منع نہیں کیا اس لئے کہ مغموم ہونا کسی انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے۔جس سے منع کرنے کی ضرورت پیش آئے بلکہ یہاں دراصل ان کاموں کے کرنے سے منع کرنا مقصود ہے جو غم واندوہ کا باعث بنتے ہیں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے [1] ع

(۱۰۸) مَنْ سَرَّهٗ اَنْ لَّا یَرٰی مَا یَسُوْءُهٗ
فَلَا یَتَّخِذْ شَیْئًا یُبَالِیْ لَهٗ فَقْدًا

(جسے یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی چیز اسے غمگین نہ کرے تو وہ ایسی چیز حاصل نہ کرے جس کے گم ہونے کا اندیشہ ہو) نیز انسان کو دنیا کے نظام پر غور کرنا چاہیے (کہ یہاں کس طرح سلسلۂ اضداد قائم ہے) تا کہ جب اس پر اچانک کوئی مصیبت آ پڑے تو اس سے زیادہ پریشان نہ ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ انسان معمولی مصیبتیں برداشت کرنے کا عادی بن جائے تا کہ بڑے مصائب کو بھی برداشت کر سکے۔

(ح س س)

اَلْحَاسَّةُ: اس قوۃ کو کہتے ہیں جس سے عوارض حِسِّیْہ کا ادراک ہوتا ہے اس کی جمع حَوَاسٌّ ہے جس کا اطلاق مشاعر خمسہ (یعنی سمع، بصر، شم، ذوق، اور لمس) پر ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ:

حَسَسْتُ(ن) وَحَسِیْتُ وَأَحْسَسْتُ: محسوس کرنا اور اَحْسَسْتُ (افعال) دو طرح استعمال ہوتا ہے۔

(۱) قوت حس سے کسی چیز تک پہنچنا (محسوس کرنا) جیسے عِنْتُهٗ وَرُعْتُهٗ۔

(۲) کسی کے حاسہ پر مارنا۔جیسے کَبَدْتُهٗ وَفَأَدْتُهٗ اور حاسہ پر مارنے سے کبھی انسان قتل ہو جاتا ہے۔اس لئے حَسَسْتُهٗ بمعنیٰ قَتَلْتُهٗ آ جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ (۳۔۱۵۲) جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔

اور حَسِیْس بمعنیٰ قَتِیْل بھی آتا ہے اور اسی سے پکی ہوئی جراد کو جَرَادٌ مَحْسُوس کہا جاتا ہے۔عرب لوگ کہتے ہیں حَسَّ الْبَرْدُ النَّبَاتَ: پالے نے نبات کو جلا ڈالا۔ اِنْحَسَّتْ اَسْنَانُهٗ: اس کے دانت گر گئے۔اور حَسِسْتُ (س) فَهِمتُ وَعَلِمْتُ کے ہم معنیٰ ہے مگر یہ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جو بذریعہ حواس کے معلوم ہو۔اور حَسَیْتُ میں ایک سین کو یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے اور اَحْسَسْتُهٗ کے اصل معنیٰ بھی کسی چیز کو محسوس کرنے کے ہیں اور اَحَسْتُ بھی اَحْسَسْتُ ہی ہے مگر اس میں ایک سین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ ظَلْتُ (میں ایک لام محذوف ہے) اور آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ (۳۔۵۲) جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف سے نافرمانی اور نیت قتل دیکھی۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اس قدر برملا طور پر کفر کیا کہ عقل وفہم کی بجائے وہ ہر ایک کو محسوس ہو رہا تھا اور یہی معنیٰ آیت:

---

[1] قاله عبدالله بن طاهر وعده الثعالبی فی خاص الخاص ۱۰۶ من ظریف شعره وقبله الم تران الدهر یهدم مابنی ـ ویأخذ مااعطی ویفسد مااسدی.

﴿فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْ سَنَا اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ﴾ (۲۱۔۱۲) جب انہوں نے ہمارے (مقدمہ) عذاب کو دیکھا تو لگے اس سے بھاگنے۔

میں مراد ہے۔اور ایت کریمہ:

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ﴾ (۲۰۔۹۸) کے معنیٰ یہ ہیں کہ کیا تم کسی کو بھی ان میں سے محسوس کر سکتے ہو۔

اَلْحَسِيْسُ وَالْحِسُّ: حرکت، آہٹ کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا﴾ (۲۱۔۱۰۲) (یہاں تک کہ) اس کی آہٹ بھی تو نہیں سنیں گے۔

اَلْحَسَّاسُ: سوءِ خلق یہ زُکام وسُعال کی طرح (فعال) کے وزن پر ہے (جو بیماری یا عیب کے معنیٰ کے ساتھ خاص ہے)۔

(ح س ب)

اَلْحِسَابُ کے معنیٰ گننے اور شمار کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔حَسَبْتُ (ض) اَحْسِبُ حِسَاباً وَحُسْبَاناً قرآن پاک میں ہے:

﴿لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ (۱۷۔۱۲) اور برسوں کا شمار اور حساب جان لو۔

﴿وَجَاعِلُ الَّيْلِ سَكَناً وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَاناً﴾ ❶ (۶۔۹۶) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام (ٹھہرایا) اور سورج اور چاند کو (ذرائع) شمار بنایا ہے۔

بعض نے کہا کہ ان کے حُسْبَان ہونے کی حقیقت خدا ہی جانتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَاناً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۱۸۔۴۰) اور وہ تمہارے باغ پر آسمان سے آفت بھیج دے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ حُسْبَاناً کے معنیٰ آگ اور عذاب کے ہیں اور حقیقت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس پر محاسبہ کیا جائے اور پھر اس کے مطابق بدلہ دیا جائے۔ حدیث ❷ میں ہے (۷۷) آنحضرت ﷺ نے آندھی کے متعلق فرمایا: اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْهَا عَذَاباً وَّ حُسْبَاناً کہ الٰہی اسے عذاب یا حُسبان نہ بنا اور آیت کریمہ:

﴿فَحَاسَبْنٰهَا حِسَاباً شَدِيْداً﴾ (۶۵۔۸) تو ہم نے ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا۔ میں حدیث ❸ (۷۸) مَنْ نُّوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ (کہ جس سے حساب میں سختی کی گئی اسے ضرور عذاب ہوگا۔)

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ (۲۱۔۱) لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آپہنچا (اپنے مضمون میں) وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ کی طرح ہے اور آیت

---

❶ هی قرأة الاکثر وفی قرأة الکوفة جعل (فعل ماضی) وکلاهما قرئتان مستفیضتان (الطبری ۷: ۲۸۳ والدانی ۱۰۵ وحسبانا جمع حساب مثل شهاب وشهبان قاله الاخفش والفتح للشوکانی وایضاً ابو عبیده فی مجازه ۱: ۲۰۱ وقیل هو مصدر (الطبرسی ۷: ۱۳۸).

❷ راجع غریب ابی عبید ۱: ۲۰۱ وابو داؤد (جنائز) والترمذی فی التفسیر والمستدرك ٦: ٤٨.

❸ من حدیث عائشة وفی المطبوع معذب والتصحیح من الاصول راجع للحدیث ومحاورة عائشة رضی الله عنها مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الفتح للحافظ ۱٤: ۱۹۱۔۱۹۳ والحدیث فی الفائق ۲: ۲۸۸ والنهایة واصله فی الصحیحین ۱۲.

کریمہ: ﴿وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ﴾ (۶۹۔۲۶) اور مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ﴾ (۶۹۔۲۰) مجھے یقین تھا کہ مجھ کو میرا حساب (وکتاب) ضرور ملے گا۔ میں ''ہ'' وقف کی ہے جیسا کہ مَالِيَهْ وسُلْطَانِيَهْ میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ (۱۵۔۵۱) بے شک خدا جلد حساب لینے والا ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿جَزَاءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا﴾ (۷۸۔۳۶) یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے صلہ ہے انعام کثیر۔ میں بعض نے کہا ہے کہ حِسَابًا کے معنی کَافِيًا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى﴾ (۵۳۔۳۹) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۲۔۲۱۲) اور خدا جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔ میں بغیر حساب کی متعدد توجیہات ہوسکتی ہیں۔

(۱) استحقاق سے زیادہ عطا فرماتا ہے۔

(۲) جسے چاہے عطا فرماتا ہے اور پھر اس سے واپس نہیں لیتا۔

(۳) اس قدر عطا فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اس کا احصاء ممکن نہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

(۱۰۹) عَطَايَاهُ يُحْصٰى قَبْلَ اِحْصَائِهَا الْقَطْرُ کہ بارش کے قطروں سے بھی اس کے عطایا زیادہ ہوجاتے ہیں۔

(۴) بغیر کسی تنگی کے دیتا ہے۔اور یہ حَاسَبْتُهٗ سے ہے جس کے معنی ضَايَقْتُهٗ یعنی تنگی کرنا آتے ہیں۔

(۵) لوگوں کے عام اندازہ سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔

(۶) اپنی مصلحت کے مطابق عطا فرماتا ہے کہ لوگوں کے حساب کے مطابق جیسا کہ آیت:

﴿وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ﴾ (۴۳۔۳۳) اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی ...... جماعت ہوجائیں گے تو جو لوگ خدا سے انکار کرتے ہیں۔ میں تنبیہ فرمائی ہے۔

(۷) مومن کو جو کچھ دیتا ہے اس پر محاسبہ نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن دنیا میں بقدر کفایت حاصل کرتا ہے اور وہ بھی جائز طریقہ سے اور حسب ضرورت اور اسی طریق سے خرچ کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے آپ پر محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ اس سے اس طرح حساب نہیں لے گا جس سے کہ اسے نقصان پہنچے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ (۷۹) مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهٗ فِي الدُّنْيَا لَمْ يُحَاسِبْهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ کہ جو شخص دنیا میں اپنے نفس پر محاسبہ کرتا رہے گا۔قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے حساب نہیں لے گا۔(یعنی جس سے کہ اسے نقصان پہنچے)۔

(۸) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے استحقاق سے زیادہ بدلہ عطا فرمائے گا۔جیسے فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرًا﴾ (۲۔۲۴۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اسکو کئی حصے زیادہ دے گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۴۰-۴۰) تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہاں ان کو بے شمار رزق ملے گا۔

﴿هٰذَا عَطَآءُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۸-۳۹) یہ ہماری بخشش ہے (چاہو) تو احسان کرو یا (چاہو) تو رکھ چھوڑ دو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔

میں بغیر حساب کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ اس میں اس شخص کی طرح تصرف کرو جسے محاسبہ کا خوف نہ ہو۔ یعنیٰ (مومن کی طرح) واجب طریق سے بوقت ضرورت اور بقدر کفایت لیا کرو اور پھر اسی طریق سے خرچ کرتے رہو۔ اَلْحَسِيْبُ وَالْمُحَاسِبُ کے اصل معنیٰ حساب لینے والا یا حساب کرنے والا کے ہیں۔ پھر حساب کے مطابق بدلہ دینے والے کو بھی حَسِیْب کہا جاتا ہے۔ (اور یہی معنیٰ اللہ تعالیٰ کے حسیب ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا﴾ (۴-۶) تو خدا ہی (گواہ اور) حساب لینے والا کافی ہے۔ میں حسیب بمعنیٰ رقیب ہے یعنیٰ اللہ تعالیٰ ان کی نگہبانی کے لئے کافی ہے جو ان سے محاسبہ کرے گا۔

حَسْبُ: (اسم فعل) بمعنیٰ کافی جیسے فرمایا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ﴾ (۹-۵۹) ہمیں اللہ کافی ہے۔

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ﴾ (۵۸-۸) ان کو دوزخ (ہی کی سزا کافی ہے) اور آیت کریمہ: ﴿مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ (۶-۵۲) ایسے ہی ہے جیسے کہ آیت:

﴿عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ (۵-۱۰۵) اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اور آیت: ﴿وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ﴾ (۲۶:۱۱۲-۱۱۳) مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے ہیں ان کا حساب (اعمال) میرے پروردگار کے ذمہ ہے۔ کے مفہوم کے مطابق ہے بعض نے آیت مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ کے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ ان کو کافی ہونا تمہارا کام نہیں ہے۔ بلکہ تیرے اور ان کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿عَطَآءً حِسَابًا﴾ (۷۸-۳۶) میں حساب بمعنیٰ کافی ہے اور یہ حَسْبِيْ كَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنْ حِسَابِهِمْ سے ان کے اعمال مراد ہیں یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے تجھ پر گرفت نہیں ہوگی اور اعمال کو بلحاظ مال کے حساب کہا گیا ہے۔

اِحْتَسَبَ ابْنَآلَهٗ: یعنی اس نے اپنے بیٹے کی موت پر یہ سمجھ کر صبر کیا کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گا۔ اور اس کے عمل کو حِسْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

اور آیات:

﴿الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ﴾ (۲۹-۲) کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں۔

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (۲۹-۴) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

(۱۴۔۴۲) اور (مومنو) مت خیال کرو کہ یہ ظالم جو عمل کر رہے ہیں خدا ان سے بے خبر ہے۔

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ﴾ (۱۴۔۴۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے اس کے خلاف کرے گا۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ (۲۔۲۱۴) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یوں ہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

میں سب کا مصدر اَلْحِسْبَانُ ہے اور اَلْحِسبان کے معنی یہ ہیں کہ نقیضین میں سے کسی ایک کے بارے میں اس طرح حکم لگایا جائے کہ دوسری کا دل میں خیال تک بھی نہ آنے پائے اسی کو گنتی میں لائے اور اس پر ہی انگلی کو گرہ لگائے مگر اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہو اور یہی معنی تقریباً ظن کے ہیں مگر ظن کی صورت اور پھر ایک کو دوسری پر غلبہ دے کر حکم لگایا جاتا ہے۔

(ح س د)

اَلْحَسَدُ: (ن) کسی مستحق نعمت سے اس نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنے کا نام حسد ہے۔ بسا اوقات اس میں اسی مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے ایک روایت میں ہے ❶ (۸۰) اَلْمُؤْمِنُ یَغْبِطُ وَالْمُنَافِقُ یَحْسُدُ کہ مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۲۔۱۰۹) اپنے دل کی جلن سے۔

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ﴾ (۱۱۳۔۵) اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب حسد کرنے لگے۔

(ح س ر)

اَلْحَسْرُ: (ن ض) کے معنی کسی چیز کو ننگا کرنے اور اس سے پردہ اٹھانے کے ہیں کہا جاتا ہے حَسَرْتُ عَنِ الذِّرَاعِ: میں نے آستین چڑھائی اَلْحَاسِرُ: بغیر زرہ یا بغیر خود کے۔

اَلْمِحْسَرَةُ

فُلَانٌ کَرِیْمُ الْمَحْسِرِ: کنایہ یعنی نَاقَۃٌ حَسِیْرٌ تھکی ہوئی اور کمزور اونٹنی جس کا گوشت اور قوت زائل ہوگئی ہو اس کی جمع حَسْرٰی ہے۔

اَلْحَاسِرُ: تھکا ہوا۔ کیونکہ اس کے قویٰ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ عاجز اور درماندہ کو حَاسِرٌ بھی کہتے ہیں اور مَحْسُوْرٌ بھی۔ حَاسِرٌ تو اس تصور کے پیش نظر کہ اس نے خود اپنے قویٰ کو ننگا کر دیا اور مَحْسُوْرٌ اس تصور پر کہ درماندگی نے اس کے قویٰ کو ننگا کر دیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ﴾ (۶۷۔۴) تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

میں حَسِیْرٌ بمعنی حَاسِرٌ بھی ہو سکتا ہے اور مَحْسُوْرٌ بھی ﴿فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (۱۷۔۲۹) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اَلْحَسْرَةُ: غم جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اس پر پشیمان اور نادم ہونا گویا وہ جہالت اور غفلت جو اس کے ارتکاب کی باعث تھی وہ اس

---

❶ کذا ذکر الغزالی فی الاحیاء مرفوعاً قال العراقی فی تخریجہ ۳: ۱۸۹ لم اجدلہ اصلاً مرفوعاً وانماھو من قول الفضیل بن عیاض کذا رواہ ابن ابی الدنیا فی ذم الحسد راجع لمعنیٰ الحسد والغبطۃ النہایۃ تحت حدیث لاحسد فی اثنتین الخ (۱: ۳۸۳) ۱۲.

سے دور ہوگئی یا فرطِ غم سے اس کے قویٰ ننگے ہوگئے یا اس کوتاہی کے تدارک سے اسے درماندگی نے پالیا قرآن میں ہے:

﴿لِيَجْعَلَ ذَالِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۳۔۱۵۶) نیز یہ کافروں کے لئے (موجب) حسرت ہے۔

﴿يَاحَسْرَتٰى عَلٰى مَافَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۵۶) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

﴿كَذَالِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ﴾ (۲۔۱۶۷) اسی طرح خدا ان کے اعمال انہیں حسرت بنا کر دکھائے گا۔

﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ﴾ (۳۶۔۳۰) بندوں پر افسوس ہے۔ اور فرشتوں کے متعلق فرمایا:

﴿لاَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلاَ يَسْتَحْسِرُوْنَ﴾ (۲۱۔ ۱۹) وہ اس کی عبادت سے نہ کنیاتے ہیں اور نہ درماندہ ہوتے ہیں۔ اس میں لاَ يَحْسِرُوْنَ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ح س م)

اَلْحَسْمُ: (ض) کے معنی کسی چیز کے نشان کو زائل کرنے اور مٹا دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ قَطَعَهٗ فَحَسَمَهٗ یعنی اسے قطع کیا اور پھر اس کا نشان تک مٹا دیا۔ پھر اس اعتبار سے تلوار کو حُسام کہا جاتا ہے۔

حَسْمُ الدَّاءِ: زخم کو مسلسل داغ دے کر اس کے نشان کو مٹا دینا اور جب نحوست انسان کے نشان کو مٹا ڈالے تو کہا جاتا ہے نَالَهٗ حَسُوْمٌ اور آیت کریمہ:

﴿ثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا﴾ (۶۹۔۷) آٹھ دن لگا تار۔ میں بعض نے کہا ہے کہ ان کے گھروں کے نشانات مٹا دینے والی ریح مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نام ونشان مٹا دینے والی مراد ہے اور بعض نے ان کی عمروں کو قطع کر دینے والی مراد لی ہے اور یہ سب معانی حَسُوْمٌ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

(ح س ن)

اَلْحَسَنُ: ہر خوش کن اور پسندیدہ چیز کو حَسَنٌ کہا جاتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) وہ چیز جو عقل کے اعتبار سے مستحسن ہو۔

(۲) وہ جو خواہش نفسانی کی رو سے پسندیدہ ہو۔

(۳) صرف نگاہ میں بھلی معلوم ہو۔

اَلْحَسَنَةُ: ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا اس کی کسی حالت میں حاصل ہو کر اس کے لئے مسرت کا سبب بنے حَسَنَةٌ کہلاتی ہے اس کی ضد سَيِّئَةٌ ہے اور یہ دونوں الفاظ مشترکہ کے قبیل سے ہیں اور لفظ ''حیوان'' کی طرح مختلف انواع کو شامل ہیں چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ﴾ (۴۔۷۸) اور ان لوگوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچتا ہے۔

میں حَسَنَة سے مراد فراخ ولی، وسعت اور کامیابی ہے اور سَيِّئَة سے قحط سالی، تنگی اور ناکامی مراد ہے اور یہی معنی آیت:

﴿فَاِذَا جَآءَ تْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ﴾ (۷۔۱۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں، میں مراد ہیں اور آیت: ﴿مَآ اَصَابَكَ

مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (۴۔۷۹)(اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔
میں حَسَنَة سے ثواب اور سَيِّئَة سے عتاب مراد ہے۔
اَلْحَسَنُ وَالْحَسَنَةُ: اور اَلْحُسْنٰى: (یہ تین لفظ ہیں اوران) میں فرق یہ ہے کہ حَسَنٌ اعیان واعراض دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی طرح حَسَنَــه جب بطور صفت استعمال ہوتو دونوں پر بولا جاتا ہے اور اسم ہو کر استعمال ہوتو زیادہ تر اَحْداث (احوال) میں استعمال ہوتا ہے اور حُسْنٰى کا لفظ صرف احداث کے متعلق بولا جاتا ہے۔ اَعْيَان کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اور اَلْحَسَنُ کا لفظ عرف عام میں اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو بظاہر دیکھنے میں بھلی معلوم ہو جیسے کہا جاتا ہے رَجُلٌ حَسَنٌ حَسَّانٌ وامْرئة حَسَنَةٌ وَحَسَّانَة۔ لیکن قرآن پاک میں حَسَنٌ کا لفظ زیادہ تر اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو عقل وبصیرت کے رو سے اچھی ہو اور آیت کریمہ:
﴿اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ (۳۹۔۱۸) جو بات کو سنتے اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں، میں اَحْسَنَ سے وہ بات مراد ہے جو شک وشبہ سے دور (اور بالا) ہو، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے ❶ (۸۱) اذَا شَكَكْتَ فِيْ شَيْءٍ فَدَعْ

کہ جس چیز میں تجھے شبہ ہو اسے ترک دے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْناً﴾ (۲۔۸۳) اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ میں حُسن سے اچھی بات مراد ہے اسی طرح فرمایا:
﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْناً﴾ (۲۹۔۸)
﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ﴾ (۹۔۵۲) کہدو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ (۵۔۵۰) اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟
میں اگر اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو بہر حال اچھا ہے خواہ کوئی یقین کرے یا نہ کرے تو پھر "لِقَوْمٍ يُوْقِنُوْنَ" کی تخصیص کیوں کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں بلکہ ظہور حسن کا قصد اور اس پر مطلع ہونا مراد ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حکم الٰہی کا حسن اسی شخص کے سامنے ظاہر ہوگا۔ جو پاکیزہ نفس ہو اور حکمت الٰہی پر اس کی نظر ہو ورنہ جہال پر تو یہ راز منکشف نہیں ہوسکتا۔
اَلْاِحْسَانُ: (افعال) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے اول یہ کہ دوسروں پر انعام کرنا، کہا جاتا ہے: اَحْسَنَ اِلٰى فُلَان اس نے فلاں پر انعام کیا۔ دوم یہ کہ اپنے فعل میں حسن پیدا کرنا اور یہ چیز حسن علم اور حسن عمل سے پیدا ہوتی ہے اسی معنٰی میں امیر المؤمنین نے فرمایا ❷ (۸۲)

❶ ولم اجده بهذا اللفظ وحديث دع ما يريبك معروف وسياتي في (ريب) واورده الغزالي في الاحياء ۹۵ وقد عقده الشافعي مع ثلاثة: احراتق الشبهات وازهد ودع ماليس يعنيك واعملن بالنية (العاهر ۲: ۸).

❷ انظر في ادب الدنيا والدين للماوردي قال الشارح معناه اى ابناه ما ينسبون اليه من العلوم والصنائع فيقال مثلاً فلان العالم وفلان المجاهد وفي معناه قول عائشة راجع المحاضرات للمؤلف ۳: ۳۱.

اَلنَّاسُ اَبْنَاءُ مَا یُحْسِنُوْنَ: یعنی لوگ اپنے علم وفضل اور اعمال حسنہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ﴾ (۳۲۔۷) جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا (یعنی) اس کو پیدا کیا۔

اِحْسان انعام سے اعم ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ﴾ (۱۷۔۷) اگر تم نیکوکاری کرو گے تو اپنی جان کے لئے کرو گے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾ (۱۶۔۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ میں اشارہ ہے کہ احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کر دینا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے لہٰذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اور انسان پر عدل وانصاف سے کام لینا تو واجب اور فرض ہے مگر احسان مندوب ہے اسی بنا پر فرمایا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (۴۔۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔

اور فرمایا:

﴿وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ (۲۔۱۷۸) اور پسندیدہ طریق سے (قرارداد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خونبہا) کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لئے بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (۲۹۔۶۹) اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (۲۔۱۹۵) بے شک خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

﴿مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ﴾ (۹۔۹۱) نیکوکاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔

﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ﴾ (۳۹۔۱۰) جنہوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے بھلائی ہے۔

(ح ش ر)

اَلْحَشْرُ: (ن) کے معنیٰ لوگوں کو ان کے ٹھکانہ سے مجبور کر کے نکال کر لڑائی وغیرہ کی طرف لے جانے کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے۔[1] (۸۳) اَلنِّسَآءُ لَا یُحْشَرْنَ کہ عورتوں کو جنگ کے لئے نہ نکالا جائے اور یہ انسان اور غیر انسان سب کے لئے استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ حَشَرَتِ السَّنَةُ مَالَ بَنِیْ فُلَانٍ: یعنی قحط سالی نے مال کو ان سے زائل کر دیا اور حَشْرٌ کا لفظ صرف جماعت کے متعلق بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۳۶) اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے۔

﴿وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً﴾ (۳۸۔۲۹) اور پرندوں کو بھی کہ جمع رہتے تھے۔

﴿وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ﴾ (۸۱۔۱۹) اور جب وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے۔

---

[1] راجع للحدیث النهایة ۱: ۳۸۹ وفیه: لایعشرن ولایحشرن ۱۲.

﴿مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوا لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ (۵۹۔۲) حشر اول کے وقت تمہارے خیال میں بھی نہ تھا۔ کہ نکل جائیں گے۔

﴿وَحُشِرَ لِسُلَیْمَانَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ﴾ (۲۷۔۱۷) اور سلیمان علیہ السلام کے لئے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے اور قسم وار کئے جاتے تھے۔

اور قیامت کے متعلق فرمایا: ﴿وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاءً﴾ (۴۶۔۱۶) اور جب لوگ جمع کئے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے۔

﴿فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا﴾ (۴۔۱۷۲) تو خدا سب کو اپنے پاس جمع کرلے گا۔

﴿وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا﴾ (۱۸۔۴۷) اور ان لوگوں کو ہم جمع کرلیں گے۔ تو ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور قیامت کے دن کو یَوْمَ الْحَشْرِ بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے یَوْمَ الْبَعْثِ اور یَوْمَ النُّشُوْر کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔

رَجُلٌ حَشْرُ الْاُذُنَیْنِ لطیف اور باریک کانوں والا۔

(ح ص ص)

﴿حَصْحَصَ الْحَقُّ﴾ (۱۲۔۵۱) کے معنیٰ حق بات جو کسی دباؤ کی وجہ سے چھپی ہوئی اب اس دباؤ کے دور ہونے کی وجہ واضح ہو کر سامنے آ گئی اور حَصَّ وَحَصْحَصَ (ثلاثی ورباعی) دونوں طرح آتا ہے۔ جیسے کَفَّ وَکَفْکَفَ وکَبَّ وَکَبْکَبَ۔ حَصَّهٗ (ن) کسی چیز سے ایک حصہ کاٹ لینا۔ یہ کاٹنا خواہ حقیقی طور پر ہو یا حکمی طور پر حقیقی کی مثال جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] ع (سریع)

(۱۱۹) قَدْ حَصَّتِ الْبَیْضَةُ رَأْسِیْ

یعنی مسلسل خود پہنے رہنے کی وجہ سے میرے سر کے بال جھڑ گئے۔

اسی سے رَجُلٌ اَحَصُّ کا محاورہ ہے (یعنی مرد موئے رفتہ از سر) مؤنث حَصَّاءُ رَجُلٌ اَحَصُّ: منحوس مرد، جو اپنی نحوست کی وجہ سے لوگوں سے خیرات کو قطع کردے۔

اَلْحِصَّةُ کے معنیٰ کل میں سے ایک ٹکڑہ کے ہیں اور بمعنیٰ بہرہ یعنی نصیب کے استعمال ہوتا ہے۔

(ح ص د)

اَلْحَصَدُ وَالْحَصَادُ کے معنیٰ کھیتی کاٹنے کے ہیں یہ زَمَنَ الْحَصَادِ وَالْحِصَادِ یہ (زَمَنَ الْجَدَادِ وَالْجِدَاد کی طرح (بکسرہ حاو فتحہا) دونوں طرح آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ (۶۔۱۴۱) اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔

میں وہ کھیتی مراد ہے جو اس کے صحیح وقت میں کاٹی

---

[1] قالہ اخو الاوس ابو القیس بن الاسلت وتمامہ ....فما ...... اطعم نوماً غیر تهجاع وفی روایة الضبی غمضاً بدل نوماً والبیت من کلمة مفضلیة ۲ : ۸٤ بیتاً جمهریة ۲۳٤ـ ۲۳٦ بتقدم وتاخر والبیت فی اللسان والصحاح والتاج والمحکم (حصص والموشح ۲٤٦ والکامل ۱۵۵ وابن اثیر ۱ : ۲۸٤ والاغانی والخزانه ۲ : ٤۸ـ ۵۳٤ والتنبیه للبکری والکنزاللغوی ۱۷۷ والمرزوقی ۱ : ۱۰٦ والجمحی ۸۸ والحماسة للبحتری ۳٤ وشواهد الکشاف ۷٦ ومحاضرات المولف ۳ : ۱٦٦ ، ۳۳۵ والحیوان للجاحظ ٦ : ٤۱۹ وایام العرب ۸۲ .

گئی ہو۔ ❶ مگر آیت۔

﴿حَتّٰی اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰهَا اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ﴾ (۱۰۔۲۴) یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کر ایسا کر) ڈالا گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ میں حَصِیْد سے مراد وہ کھیتی ہے جو بیوقت افساد اور تباہی کی غرض سے کاٹی گئی ہو۔ اور اسی سے حَصَدَ هُمُ السَّيْفُ کا استعارہ ہے یعنی تلوار نے انہیں تباہ کر دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ﴾ (۱۱۔۱۰۰) ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور بعض کا تہس نہس ہوگیا۔

میں حَصِیْد سے تباہ و برباد کی ہوئی بستیاں مراد ہیں۔ جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۶۔۴۵) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور حَبَّ الْحَصِيْدِ سے مراد اناج ہے اور حدیث میں ہے ❷ (۸٤)

وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ: لوگوں کو دوزخ میں اوندھے منہ صرف وہی گرائے گا جو ان کی زبانوں نے کاٹا ہوگا۔

یہاں زبان کے ساتھ حصائد کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی سے حَبْلٌ مَّحْصُوْرٌ (رسی محکم تافتہ)

وَدِرْعٌ حَصْدَاءُ: (زرہ تنگ حلقہ و محکم تافتہ) وَ شَجَرَةٌ حَصْدَاءُ: (درخت بسیار برگ) کے محاورات ہیں۔

تَحَصَّدَ الْقَوْمُ: لوگوں کا جمع ہو کر ایک دوسرے سے قوت حاصل کرنا۔

(ح ص ر)

اَلْحَصْرُ: (ن) کے معنیٰ تضییق یعنی تنگ کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَاحْصُرُوْهُمْ﴾ (۹۔۵) اور گھیر لو یعنی انہیں تنگ کرو۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا﴾ (۱۷۔۸) اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے۔ میں حَصِيْرٌ کے معنیٰ مہاد یعنی بچھونے کے ہیں گویا ان کے نزدیک اس سے حصیر مرمول یعنی چٹائی مراد ہے اور چٹائی کو حصیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ریشے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں، اور لبید کے شعر ❸ ع (الکامل)

(۱۱۰) وَمَعَالِمِ غُلْبِ الرِّقَابِ كَاَنَّهُمْ
جِنٌّ لَدَی بَابِ الْحَصِيْرِ قِيَامٌ

---

❶ وفی المطبوع المحمود مصحف والصواب المحصود ۱۲۔

❷ اخرجه الترمذی وصححه وابن ماجة والمحکم من حدیث معاذ بن جبل وقال صحیح علی شرط الشیخین راجع تخریج الاحیاء العلوم للغزالی ۳: ۱۰۹۔

❸ وفی روایة قماقم بدل ومقامة وهی جمع قماقم بضمة القاف ومعناه الرئیس الجواد والبیت فی الطبری ۱۵: ۴۵ والسمط ۹۵۵ فی ثلاثة ابیات والامالی ۲: ۳۰۸ والقرطبی ۱۰: ۲۲۴ والصحاح واللسان والتاج حصر ومجاز القران ۱: ۳۷۱ رقم ۴۳۳ والبحر ۶: ۱۱، ۶: ۶۰ وفی روایة الدیوان ۲: ۳۹ طرف الحصیر بدل باب الحصیر قال فی الصحاح وهذه روایة غیر ابی عبیدة وفی المطبوع (مصر وکراتشی) ومعالم وهذا تصحیف فی قماقم ۱۲۔

اور بہت سے موٹی گردنوں والے بہادر ہیں جو بادشاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے جنات معلوم ہوتے ہیں۔ میں حصیر کے معنیٰ بادشاہ کے ہیں اور بادشاہ کو حصیر یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ محصور رہتا ہے جیسا کہ اسے مُحَجَّبٌ کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ جسے چاہے اسے اپنے پاس آنے سے روک سکتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ (۲۔۳۹) اور سردار ہوں گے۔ اور عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے۔ میں حصورًا کے معنیٰ عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والا کے ہیں خواہ یہ نامردی کی وجہ سے ہو خواہ عفت اور ازالۂ شہوت میں مجاہدہ اور ریاضت کی بنا پر۔ مگر یہاں دوسرے معنیٰ زیادہ مناسب ہیں کیونکہ یہ لفظ ان (یحیٰی علیہ السلام) کے لئے بطور مدح کے استعمال ہوا ہے۔

اَلْحَصْرُ وَ الْاِحْصَارُ: دونوں کے معنیٰ حج سے روک دینے کے ہیں۔ مگر احصار (ظاہری اور باطنی) دونوں قسم کی رکاوٹ کے متعلق بولا جاتا ہے جیسے دشمن کا آڑے آ کر روک دینا یا مرض وغیرہ کی وجہ سے رک جانا مگر جب وہ رکاوٹ باطنی اسباب جیسے مرض وغیرہ کی بنا پر ہو تو اس موقع پر حَصْرٌ ہی بولا جاتا ہے۔ پس آیت کریمہ: ﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (۲۔۱۹۲) اور اگر (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو کر (کردو) میں دونوں قسم کی رکاوٹیں مراد ہیں اسی طرح آیت: ﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۷۳) ان حاجت مندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں رک کے بیٹھے ہیں۔ میں بھی احصار کے عام معنیٰ مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اَوْ جَآؤُكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ﴾ (۴۔۹۰) یا اس حال میں کہ ان کے دل .... رک گئے ہوں تمہارے پاس آ جائیں۔

میں بخل بزدلی وغیرہ کی وجہ سے سینوں کا تنگ ہونا مراد ہے اور ان کو حصر کے ساتھ تعبیر کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ ان معانی کو ضیق الصدر کے لفظ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور ان کے اضداد (جود و شجاعت وغیرہ پر) اَلْبِرُّ اور اَلسَّعَةُ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

(ح ص ن)

اَلْحِصْنُ: (قلعہ) اس کی جمع حُصُوْنٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مَانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِنَ اللّٰهِ﴾ (۵۹۔۲) کہ ان کے قلعے ان کو خدا (کے عذاب) سے بچالیں گے۔

اور آیت کریمہ: ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ﴾ (۵۹۔۱۴) یہ سب جمع ہو کر بھی تم سے (بالمواجھہ) نہیں لڑ سکیں گے۔ مگر بستیوں کے قلعوں میں۔

میں مُحَصَّنَة سے مراد وہ بستیاں ہیں جو قلعوں کی طرح محفوظ اور محکم بنائی گئی ہوں۔

تَحَصَّنَ کے اصل معنیٰ تو قلعہ کو مسکن بنا لینے کے ہیں مگر مجازاً ہر قسم کا بچاؤ حاصل کرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی سے دِرْعٌ حَصِيْنَةٌ (زرہ محکم) اور فَرَسٌ حِصَانٌ (اسپ نرونجیب) کا محاورہ ہے۔ کیونکہ زرہ بدن کے لئے

اور گھوڑا اپنے سوار کے لئے ایک طرح سے بمنزلہ قلعہ کے ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر نے کہا ہے ❶ ع (الکامل)

(۱۱۱) اِنَّ الْحُصُوْنَ الْخَیْلُ لَا مُدْنَ الْقُرٰی

کہ حقیقی قلعے تو نجیب گھوڑے ہیں نہ کہ شہر اور قصبے اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا یُحْصِنُوْنَ﴾ (۱۲۔۴۸) صرف وہی تھوڑا (سارہ جائے گا جو تم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے۔ میں تُحْصِنُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ قلعے جیسی محفوظ جگہوں میں حفاظت سے رکھ چھوڑو۔ کہا جاتا ہے۔

اِمْرَءَۃٌ حَصَانٌ وَحَاصِنٌ: (عفیفہ عورت) حَصَانٌ کی جمع حُصُنٌ اور حَاصِنٌ کی جمع حَوَاصِنُ آتی ہے اور حَصَانٌ کے معنیٰ پاکدامن یا معزز عورت کے ہوتے ہیں ❷ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا﴾ (۱۲:۶۶) اور (دوسری) عمران کی بیٹی مریم کی جنہوں نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

اَحْصَنَتْ وَحَصَّنَتْ کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔

﴿فَاِذَآ اُحْصَنَّ﴾ (۴۔۲۵) یعنی جب نکاح کرلیں اور اُحْصِنَّ (مجہول) ہو تو نکاح کر دی جائیں۔

اَلْحِصَانُ کے معنیٰ مُحْصِنَۃ عورت کے ہیں خواہ وہ اِحْصَان پاک دامنی کی وجہ سے ہو یا کسی کے ساتھ نکاح کر لینے کی وجہ سے اور یا اپنے شرف اور حریت کی وجہ سے محفوظ ہو اور عورت کو مُحْصِنٌ (بصیغہ فاعل) بھی کہا جاتا ہے اور مُحْصَن (بصیغہ مفعول) بھی اول یعنی صیغہ فاعل اس تصور کی بنا پر ہے کہ وہ خود اپنی ذات کی حفاظت کرتی ہے اور اسم مفعول دوسرے کی جانب سے حفاظت کی وجہ سے ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنَاتٍ غَیْرَ مُسَافِحَاتٍ......... فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (۴۔۲۵۔) اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کردو۔ بشرطیکہ عفیفہ ہوں نہ ایسی کھلم کھلا بدکاری کریں .... پھر اگر نکاح میں آ کر بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں تو جو سزا آزاد عورتوں (یعنی بیبیوں) کے لئے ہے اس کی آدھی اِن کو دی جائے۔

میں اول مُحْصَنات سے شوہر والی عورتیں مراد ہیں گویا خاوند ان کی حفاظت کرتے ہیں اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی مُحصنات کا لفظ آیا ہے وہاں فتحہ اور کسرہ دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے لیکن جہاں حُرِّمَت کے بعد آیا ہے وہاں صرف فتحہ صاد کے ساتھ ہی پڑھا جائے گا کیونکہ شوہردار عورتوں کے ساتھ ہی نکاح حرام ہے نہ کہ عفیفہ کے ساتھ۔

---

❶ العجز للاشعر بن حمران الجعفی قاله بعد مااخذ ثأر ابیه واتخذ الخیل یذکر فضلها واوله : ولقد علمت علی توقی الردی ...... وفی روایة الاصمعی علی تجنب الردیٰ راجع اللسان (حصن) والبیت من شواهد الکشاف ٤٧ وفی المطبوع مون القری والتسدید من المراجع والبیت من کلمة اصمعیة فی الوحشیات رقم ٥٨ فی ٣٥ بیتاً والطبری ١٢ : ٢٤ والمحاضرات للمؤلف ٤ : ٤٣٦) والحیوان للجاحظ ١ : ٣٤٦ وکتاب الخیل لمعمر بن المثنیٰ فی ثمانیة ابیات وکتاب العرب للقتبی ٣٤٩ ضمن رسائل البلغاء (صنعة کردعلی).

❷ وقال حسان فی عائشة رضی الله عنها حصان رزان تزن بریبة وتصبح غرثیٰ من لحوم الغوافل ١٢.

(ح ص ل)

اَلتَّحْصِیل: (تفعیل) کے معنیٰ چھلکے سے گودہ اور مغز نکالنے کے ہیں۔مثلاً معدن کے پتھروں سے سونا نکالنا یا بھوسے اور گندم کے دانوں کو الگ الگ کرنا پس آیت کریمہ: ﴿وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ (۱۰۰۔۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جو بھید سینوں میں ہیں وہ اس طرح نکال کر جمع کردیئے جائیں گے جس طرح کہ چھلکے سے مغز الگ کرلیا جاتا ہے۔یا جیسے حساب کا حاصل ظاہر کیا جاتا ہے اور حُثَالَةٌ (یعنی جھان وغیرہ) کو حصیل کہا جاتا ہے۔

حَصِلَ الْفَرَسُ گھوڑے کا حثالہ وغیرہ کھانے کی وجہ سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہونا اور پرند کے پوٹے یا سنگدانے کو حَوْصَلَةُ الطَّیرِ کہا جاتا ہے۔

(ح ص ی)

اَلْاِحْصَاءُ: (افعال) کے معنیٰ عدد کو حاصل کرنا، کہا جاتا ہے اَحْصَیْتُ کَذَا: میں نے اسے شمار کیا۔ اصل میں یہ لفظ حَصَی (کنکریوں) سے مشتق ہے اور اس سے گننے کا معنیٰ اس لئے لیا گیا ہے کہ عرب لوگ گنتی میں کنکریوں پر اس طرح اعتماد کرتے تھے جس طرح ہم انگلیوں پر کرتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا﴾ (۷۲۔۲۸) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو گن کر رکھا ہے۔اور اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ایک حدیث میں ہے ❶ (۸۵) مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّةَ کہ جو شخص ان (اسمائے حسنیٰ) کا احصاء کرلے گا (یعنی یاد کرلے گا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ❷: (۸٦) نَفْسٌ تُنْجِیْھَا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ اِمَارَةٍ لَّا تُحْصِیْھَا کہ ایک جان کو ہلاکت سے بچالینا اس امارت سے بہتر ہے جسے تم نباہ نہ سکو۔قرآن پاک میں ہے: ﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْہُ﴾ (۷۳۔۲۰) اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔ ایک اور روایت میں ہے ❸ (۸۷) اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا کہ سیدھے رہو اور تم پوری طرح استقامت حاصل نہیں کرسکو گے۔

استقامت کے احصاء اور تحصیل کے متعذر اور مشکل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حق صرف ایک ہے اور باطل کی بے شمار قسمیں ہیں۔ بلکہ حق کی مثال بنسبت باطل کے دائرہ کے اجزاء ہیں ایک نقطہ کی ہے یا کسی ہدف میں نشانہ لگانے کی جگہ کی ہے۔اس لئے اسے حاصل کرنا نہایت کٹھن کام ہے اسی معنیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ

---

❶ الحدیث متفق علیه والترمذی عن ابی ھریرة وابن عساکر عن عمروایضاً ابن مردویه وابو الشیخ معاً فی التفسیر وابو نعیم فی الاسماء الحسنیٰ راجع کنزالعمال رقم ۱۹۳٤۔۱۹٤۰.

❷ ذکره الغزالی فی الاحیاء فی محادثة عبدالرحمن بن عمرو مع ابی جعفر المنصور فقال قد سال جدك العباس النبی صلی الله علیه وسلم امارة مکه والطائف فقال النبی صلی الله علیه وسلم یاعباس یاعم النبی .... اخرجه ابن ابی الدنیا هکذا معضلا بغیر اسناد رواه البیهقی من حدیث جابر متصلاً من روایة المنکدر مرسلاً وقال هذا هوالمحفوظ مرسلاً راجع تخریج العراقی ۲ : ۳۵۰ وادب الدنیا للماوردی بشرح خان زاده ۳۸۲ وفی العقد ۱ : ۲٤ تحییها وولایة بدل امارة ٤ : ۱۳۰ فی خطبة لعبدالله بن مسعود .

❸ الحدیث فی ابن ماجة والحاکم والدارمی والطبری فی الصغیر ۲۱۰ والبزار عن ثوبان وفی بعض طرقه انقطاع الکافی ۹۵ والنهایة ۱ : ۲۳٤۔۲۳۵ واللسان (قوم) والفتح الکبیر ۱ : ۱۸۱ وابن قتیبه فی غریبه ۳۸۹ وفی کنزالعمال باستیعابه ۳ : ۳٤٦ وایضاً تخریج الکشاف للحافظ ۲۵۹.

نے فرمایا ❶: (۸۸) مجھے سورہ ہود اور اس کی مثل دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا تو صحابہ نے عرض کی کہ ان میں کونسی آیت ہے جس نے آپ ﷺ کو بوڑھا کر دیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ﴾ (۱۱۔۱۱۲) ہے۔یعنی جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق پوری استقامت سے رہو۔

اہل لغت نے یہاں لَنْ تُحْصُوْا کے معنیٰ لاَ تُحْصُوْا ثَوَابَهٗ کئے ہیں۔یعنی تم اس ثواب کو شمار میں نہیں لاسکوگے۔

(ح ض ض)

اَلْحَضُّ: (ن) کے معنیٰ حَثٌّ کی طرح کسی کام پر ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کے ہیں۔مگر حَثٌّ کا لفظ سواری وغیرہ کو تیز چلانے کے لئے آتا ہے۔اور حَضٌّ کا لفظ سواری ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برانگیختہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اصل میں حَضٌّ کے معنیٰ جانور کو الحضیض یعنی نشیب زمین کی طرف ہانکنے کے ہیں (پھر ابھارنے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ (۶۹۔۳۴) (۱۰۷۔۳) ❷ اور نہ فقیر کے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔

(ح ض ب)

اَلْحَضَبُ: کے معنیٰ ایندھن کے ہیں اور آگ کریدنے کی لکڑی کو مِحْضَب کہا جاتا ہے اور ﴿حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (۲۱۔۹۸) میں ایک قرأت حَضَبُ جَهَنَّمَ (دوزخ کا ایندھن) بھی ہے۔

(ح ض ر)

اَلْحَضَرُ: یہ البدو کی ضد ہے اور اَلْحِضَارَةُ حاء کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے جیسا کہ بَدَاوۃ وبِداوۃ اس کے اصل شہر میں اقامت کے ہیں۔ پھر کسی جگہ پر یا انسان وغیرہ کے پاس موجود ہونے پر حَضَارَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۲۔۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے۔

﴿وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ﴾ (۴۔۸) اور جب تم میراث کی تقسیم کے وقت...... آموجود ہوں۔

﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (۴۔۱۲۸) اور طبائع میں بخل ودیعت کر دیا گیا ہے۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ﴾ (۸۱۔۱۴) تب ہر شخص معلوم کرلے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ﴾ (۲۳۔۹۸) میں کنایہ ہے کہ اے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں کہ جن و شیاطین میرے پاس آحاضر ہوں۔

---

❶ الحديث باختلاف الفاظه في الترمذي والدارقطني والدلائل للبيهقي وابن سعد في الطبقات وابن عدي في الكامل راجع ايضاً في ۱۲(٥٤٧.

❷ وفي التنزيل: ولاتحاضون على طعام المسكين (۸۹۔۱۸)

اوربطور کنایہ مجنون اور قریب المرگ شخص کو مُحْتَضَرٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ آیت:﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۵۰۔۱۶)اورآیت کریمہ:﴿يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيَاتِ رَبِّكَ﴾ میں اس معنیٰ پر متنبہ کیا گیا ہے اورآیت کریمہ:﴿مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا﴾ (۳۔۳۰) کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان جو نیکی بھی کرے گا۔

قیامت کے دن اس کا اس طرح مشاہدہ اور معاینہ کرلے گا جیسا کہ کوئی شخص سامنے آموجود ہوتا ہے ۔ اور آیت کریمہ:﴿وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ﴾ (۷۔۱۶۳)اوران سے اس گاؤں کا حال پوچھو جولب دریا پرواقع تھا۔میں حَاضِرَةَ الْبَحْرِ کے معنیٰ دریا کے قریب (یعنی ساحل کے ہیں)اورآیت کریمہ:﴿تِجَارَةً حَاضِرَةً﴾ (۲۔۲۸۲)میں حَاضِرَةً کے معنیٰ نقد کے ہیں نیز فرمایا:﴿وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ﴾ (۳۶۔۳۲)اور سب کے سب ہمارے روبروحاضر کئے جائیں گے۔

﴿فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۶)وہ عذاب میں ڈالے جائیں گے۔اورآیت کریمہ:﴿كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ﴾ (۵۴۔۲۸)ہر باری والے کواپنی باری پر آنا چاہیے۔میں پانی کی باری کے محتضر ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ باری والے اس گھاٹ پرموجود ہوں۔

اَلْحضرُ: خاص کرگھوڑے کی تیز دوڑکو کہتے ہیں کہا جاتا ہے:اَحْضَرَ الْفَرْسُ: گھوڑا تیز دوڑا۔اِسْتَحْضَرتُ الفَرْسَ: میں نے گھوڑے کوسرپٹ دوڑایا۔حَاضَرْتُهٗ مُحَاضَرَةً وَحِضَارًا: باہم جھگڑنا،مباحثہ کرنا۔یہ یاتو حضُور سے ہے گویا ہر فریق اپنی دلیل حاضر کرتا ہے اور یاحُضر سے ہے جس کے معنیٰ تیز دوڑ کے ہوتے ہیں جیسا کہ.........جَارِيَتُهٗ کہا جاتا ہے۔

اَلْحَضِيْرَةُ: لوگوں کی جماعت جو جنگ میں حاضر کی جائے اور کبھی اس سے پانی پر حاضر ہونے والے لوگ بھی مراد لئے جاتے ہیں۔اَلْمَحْضَرُ (اسم مکان) حاضر ہونے کی جگہ اور حَضَرْتُ (فعل) کا مصدر بھی بن سکتا ہے۔

(ح ط ط)

اَلْحَطُّ: (ن) کے معنیٰ کسی چیز کواوپر سے نیچے اتارنے کے ہیں۔کہا جاتا ہے:حَطَطْتُ الرَّحْلَ (میں نے سواری سے پالان اتارکر نیچے رکھ دیا)جَارِيَةٌ مَحْطُوطَةُ الْمَتْنِ (دختر پست شکم کہ پشت وی دراز وہموار باشد)اورآیت کریمہ:﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ (۲۔۵۸) اور حطۃ کہنا۔میں بنی اسرائیل کو یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا جس کے معنیٰ ہیں"اے اللہ ہمارے گناہ ہم سے اتار دے"❶ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنیٰ قُوْلُوْا صَوَابًا کے ہیں یعنی صحیح بات کہنا۔

(ح ط ب)

اَلْحَطَبُ: (ایندھن)ہروہ چیز جو آگ جلانے کے لئے تیار کی جائے۔حَطَبٌ کہلاتی ہے۔اورحَطَبَ (ض)حَطْباً وَاحْتَطَبَ کے معنیٰ ایندھن جمع کرنا کے

❶ وهي مصدر من حطّ عنا ذنوبنا رفع حكاية (راجع الطبرى ١ : ٢٣٠) ومجازابى عبيدة ١ : ٤١ وفتح البارى ٨ : ٢٢٩)١٢.

ہیں ۔قرآن میں ہے:﴿فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَباً﴾ (۷۲۔۱۵) تو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

اپنی گفتگو میں رطب و یابس ملانے والے کو حاطِبُ لَیْلٍ کہا جاتا ہے کیونکہ رات کو لکڑی جمع کرنے والا بھی یہ نہیں دیکھتا ہے کہ رسی میں کیا باندھ رہا ہے۔

حطبْتُ لِفُلَان حَطَباً: کسی کے لئے کام کرنا۔

مَكَانٌ حَطِيْبٌ وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں۔ (صفت از حَطِبَ الْمَكَانُ)

نَاقَةٌ مُحَاطِبَةٌ (ناقہ کہ خار خشک خورد)

اور آیت کریمہ:﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ (۱۱۱۔۴) جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے۔

میں سخن چینی سے استعارہ ہے اور حَطَبَ فُلَانٌ بِفُلَان کے معنی کسی کی چغلی کھانا کے ہیں۔اسی طرح کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ يُوْقِدُ بِالْحَطَبِ الْجَزْلِ (مثل) فلاں بہت بڑا چغلی خور ہے۔

(ح ط م)

اَلْحَطْم: کے اصل معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں جیسا کہ اَلْهَشْيم وغیرہ الفاظ اسی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔پھر کسی کو ریزہ ریزہ کردینے اور روندنے پر حَطْمٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُوْدُهٗ﴾ (۲۷۔۱۸) ایسا نہ ہو کہ سلیمان (علیہ السلام) اور اس کا لشکر تم کو کچل ڈالیں۔

کہا جاتا ہے کہ حَطَمْتُهٗ فَانْحَطَمَ (میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ چیز ٹوٹ گئی)

سَائِقٌ حُطَمٌ: بے رحم چرواہا۔جو اونٹوں کو سخت ہنکا کر ان پر ظلم کرے [1] اور دوزخ کو حُطَمَة کہا گیا ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةِ﴾ (۱۰۴۔۴،۵) حطمہ میں..........اور تم کیا سمجھے کہ حُطمہ کیا ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر بہت زیادہ کھانے والے کو بھی حُطَمَةٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ شاعر نے پیٹ کو تنور کے ساتھ تشبیہ دی ہے [2] ع ( )

( ) كَأَنَّمَا فِيْ جَوْفِهٖ تَنُّوْرٌ

گویا اس کے پیٹ میں تنور ہے۔

دِرْعٌ حُطَمِيَّةٌ: زرہ بننے والے یا استعمال کرنے والے کی طرف منسوب ہے اور حَطِيْم وَزَمْزَم (حرم میں) دو جگہوں کے نام ہیں۔

اَلْحُطامُ: جو خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔

قرآن پاک میں ہے:﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَاماً﴾ (۳۹۔۲۱) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو (کہ زرد (ہوگئی ہے) پھر اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔

(ح ظ ظ)

اَلْحَظُّ کے معنی معین حصہ کے ہیں کہا جاتا ہے کہ حَظِظَ وَاَحَظَّ فَهُوَ مَحْظُوظٌ۔

حَظٌّ کی جمع اَحَاظٍ وَاَحُظٌّ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:﴿فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ (۵۔۱۴) مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی ایک حصہ

---

[1] ومنه الحديث شر الرعاء الحطمة وفي رواية بغيرهاء(النهاية .

[2] لم اجده .

فراموش کردیا۔

﴿لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ﴾ (۴۔۱۱) کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے۔

(ح ظ ر)

اَلْحَظْرُ: (ن) کے معنیٰ کسی چیز کو حَظِیْرَۃ یعنی احاطہ میں جمع کرنے کے ہیں اور ممنوع کو مَحْظُور کہا جاتا ہے۔ اَلْمُحْتَظِر: باڑہ بنانے والا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَکَانُوا کَھَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ (۵۴۔۳۱) تو وہ ایسے ہوگئے جیسے باڑوالے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔

جَاءَ فُلَانٌ بِالْحَظِرِ الرَّطْب (مثل) یعنی اس نے بہت قبیح جھوٹ بولا۔

(ح ف ف)

اَلْحَفُّ: (ن) کے معنیٰ کسی چیز کو حافتین یعنی دونوں جانب سے گھیرنے یا احاطہ کر لینے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَفَفْنَاھُمَا بِنَخْلٍ﴾ (۱۸۔۳۲) اور ان کے گردا گرد کھجوروں کے درخت لگا دیئے تھے۔

﴿وَتَرَی الْمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ﴾ (۳۹۔۷۵) اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔یعنی اس کے دونوں جانب کو گھیرے ہوئے ہیں ایک حدیث میں ہے [1] (۸۹) تَحُفُّہُ الْمَلَآئِکَۃُ بِاَجْنِحَتِھَا: اس کو کہ فرشتے اس پر اپنے پروں کے ساتھ گھیرا ڈال لیتے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے [2] ع (طویل)

(۱۱۳) لَہٗ لَحَظَاتٌ فِیْ حَفَا فِیْ سَرِیْرِہٖ

اس کی نظریں اس کے تخت کے دونوں جانب لگی رہتی ہیں۔

حَفَافٌ کی جمع اَحِفَّۃٌ ہے۔کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ فِیْ حَفَفٍ مِّنَ الْعَیْشِ یعنی تنگ حال ہے [3] گویا وہ خوشحالی سے ایک جانب میں ہے۔اس کے برعکس خوشحالی کے لئے کہا جاتا ہے۔ھُوَفِیْ وَّاسِطَۃٍ مِّنَ الْعَیْشِ اسی سے محاورہ ہے [4] (مثل)

مَنْ حَفَّنَا اَوْرَفَّنَا فَلْیَقْتَصِدْ: یعنی جو شخص ہماری تعریف کرے اسے چاہیے کہ میانہ روی سے کام لے (نہایہ)

حَفِیْفُ الشَّجَرِ وَالْجَنَاحِ: درخت کے ہلنے پر پرند کے پروں کی سرسراہٹ۔یہ حکایت صوت ہے۔

اَلْمُحَفُّ: شانہ بافندہ وتیغ آں (کیونکہ اس سے حرکت

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظه فی فضیلة مجلس الذکر عن ابی ھریرۃ وغیرہ رواہ مسلم والغزالی فی الاحیاء العلوم راجع تخریج العراقی ۱:۳۰۲ ونھایة ابن الاثیر ۱:۴۰۸.

[2] قاله ابراهیم بن هرمة فی مدح المنصور واجازه به عشرة الاف کمافی ذیل الامالی (۴۰) وتمامه .... اذاکرها فیها عقاب ونائل ۔راجع للبیت الحیوان ۳:۱۳۴ والاغانی ۶:۱۰۹ وعیون الاخبار ۱:۲۹۴ وفی روایتهم جمیعاً عن حفافی وفی العقد ۴: ۳۲۹ عن خفاء سریره وفی العمدة ۲:۱۰۹عن حفافی وفی الحصری ۲:۲۶۲ من بدل عن وفی العقد ۱:۳۷۰ عذاب بدل عقاب وبعده :فام الذی امنت آمنة الردیٰ .... وام الذی اوعدت بالثکل ثاکل وفی روایة حاولت والبیت فی البحر (۷:۴۲۷) من غیر عزو.

[3] ومنه الحدیث انه علیه السلام لم یشبع من الطعام الاعلی حفف ای ضیق وقلة (نهایة ۱:۴۰۸).

[4] مثل وفی روایة فلیترك راجع للمثل المیدانی ۲:۱۷۶، ۲۲۱، ۲۳۷ والعسکری ۱۸۴، ۲:۱۹۱ وشرح الدرة للخفاجی ۸۳.

کے وقت آواز آتی ہے۔)

(ح ف د)

اَلْحَافِد: ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو تبرعاً تیزی سے ساتھ خدمت بجالائے خواہ وہ اجنبی ہو یا رشتہ دار۔ اسی کی جمع حَفَدَۃٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً﴾ (۱۶۔۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔

مفسرین کا قول ہے کہ یہاں حَفَدَۃٌ سے مراد اَسْبَاط یعنی پوتے، نواسے وغیرہم ہیں۔ کیونکہ ان کی خدمت زیادہ سچی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔[1] (الکامل)

(۱۱۴) حَفَدَ الْوَلَائِدُ بَيْنَهُنَّ

فُلَانٌ مَحْفُوْدٌ فلاں مخدوم ہے۔

الغرض حَفَدَۃٌ کا اطلاق سسر اور اولاد دونوں طرف کے رشتہ داروں پر ہوتا ہے۔ اور دعا میں ہے [2] اِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ: ہم تیری طرف دوڑتے ہیں۔

سَيْفٌ مُحْتَفِدٌ: قاطع تلوار۔

اصمعی کہتے ہیں کہ اصل میں حَفْدٌ کے معنی پھرتی اور جلدی کرنا کے ہیں۔

(ح ف ر)

اَلْحَفْرُ: وہ مٹی جو گڑھے سے نکالی جاتی ہے (یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے) جیسا کہ نَقْضٌ بمعنی منقوض آجاتا ہے۔

اَلْحَفْرَۃُ وَالْحَفِيْرُ: گڑھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۔۱۰۲) اور تم لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ اَلْمَحْفَارُ وَالْمِحْفَرُ وَالْمِحْفَرَۃُ: بیلچہ وغیرہ جس سے گڑھا کھودا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کو حَافِرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دوڑتے وقت اپنے سم سے مٹی اڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَئِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ (۷۹۔۱۰) کیا ہم الٹے پاؤں پھر لوٹیں گے؟

میں مَرْدُوْدٌ فِي الْحَافِرَۃِ۔ ایک مثل ہے اور یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو جدھر سے آئے اسی طرف لوٹا دیا جائے ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَافِرَۃ سے مراد وہ زمین ہے جس میں ان کی قبریں بنائی گئی تھیں اور حَافِرَۃٌ یہاں موضع حال میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ کیا ہم لوٹائے جائیں گے اس حال میں کہ قبروں میں ہوں گے۔ محاورہ ہے۔ رَجَعَ عَلٰى حَافِرَتِهٖ اَوْ رَجَعَ الشَّيْخُ اِلٰى حَافِرَتِهٖ: یعنی بوڑھا ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۱۰۔۷۰)

---

[1] تکملة البیت .... واسلمت باکفهن ازمة الاجمال البیت من شواهد ابی عبیدة فی مجازه ۱ : ۳٦٤ ونسبه لجمیل بن عبدالله العزری والبیت فی الطبری ١٤ : ١٤٤ـ١٤٦) واللسان والتاج (حفد) والانصاف ۹۷) والبحر المحیط ٥ : ٥٠) بغیر عزو و الجمهرة ۲ : ۱۲۳ والقرطبی ۱۰ : ۱٤۳ ونسبه ابن دریدالی الفرزدق ومسائل نافع بن الازرق (ترتیب فوائد عبدالباقی) قال مرتبه ولاادری کیف اضبطه و جمیل هو جمیل بن عبدالله الحارثی العذری من شعراء الدولة الامویة له ترجمة فی الشعراء والاغانی (۷ : ۷۲) والخزانة (۱ : ۹) وغریب ابی عبید۳ / ۳۷٤ ونسبه الی الاخطل ولیس فی دیوانه ۱۲۔ [2] کلمة من دعاء القنوت فی الوتر راجع غریب القران للقتبی ۲٤۷ واللسان (حفد) والطبری ج ١٤ وسنه ولتخریجه فی (قنت) وهناك الموعدان شاء الله .

آیا ہے۔

اور جو چیز نقد فروخت کی جائے اس کے متعلق عرب لوگ کہتے ہیں ❶ (مثل) اَلنَّقْدُ عِندَالْحَافِرَۃ ۔اور اصل میں یہ گھوڑے کی بیع کے متعلق بولا جاتا ہے۔جیسے:

لَایَزُوْلُ حَافِرُہٗ اَوْیُنْقَدُ ثَمَنُہٗ کہ اس کا سم یہاں سے جدا نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی قیمت نقد ادا نہ کی جائے۔

اَلْحَفَرُ تَأْکُلُ الْاَسْنَانَ دانتوں کی زردی ان کو کھا جاتی ہے۔

حُفِرَ فُوْہٗ حَفْراً: اس کے دانت خراب ہوگئے اَحْفَرَ الْمُھْرُ: بچھڑے کے ثنائی یا رباعی دانت گر گئے۔

(ح ف ظ)

اَلْحِفْظُ: کا لفظ کبھی تو نفس کی اس ہیئت (یعنی قوت حافظہ) پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ جو چیز سمجھ میں آئے وہ محفوظ رہتی ہے اور کبھی دل میں یاد رکھنے کو حفظ کہا جاتا ہے اس کی ضد نسیان ہے، اور کبھی قوت حافظہ کے استعمال پر یہ لفظ بولا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔

حَفِظْتُ کَذَا حِفْظاً: یعنی میں نے فلاں بات یاد کرلی۔ پھر ہر قسم کی جستجو، نگہداشت اور نگرانی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قران میں ہے۔

﴿وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ﴾ (۱۵-۹) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

﴿حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ﴾ (۲-۲۳۸) سب نمازیں ...... پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔

﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حَافِظُوْنَ﴾ (۲۳-۵) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحَافِظَاتِ﴾ (۳۳-۳۵) اور اپنے ستر کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ میں حفظ فرج عفت اور پاک دامنی...... سے کنایہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ﴾ (۴-۳۴) اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ان کے عہد کی حفاظت کرتی ہیں اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے ❷ اور ایک قرأت میں حَفِظَ اللّٰہَ، اللہ پر نصب کے ساتھ ہے اس وقت معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ اللہ کے حق کی نگہبانی کے لئے حفاظت کرتی ہیں نہ کہ کسی قسم کی ریاکاری اور تصنع کے طور پر۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظًا﴾ (۴-۸۰) تو اے پیغمبر! تمہیں ہم نے انکا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا میں حفیظ بمعنیٰ حافظ یعنی نگہبان کے ہیں جیسا کہ: ﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِجَبَّارٍ﴾ (۵۰-۴۵) اور ﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ﴾ (۶-۱۰۸) میں فَعّال اور فَعِیل بمعنیٰ فاعل ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَاللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظاً﴾ (۱۲-۶۴) تو خدا ہی بہتر نگہبان ہے۔

---

❶ کذافی اللآلی ۱: ۱۲۱ والقالی ۱: ۲۶-۲۷) وفی مجالس ثعلب یقال عند السبق ای عند اول قدم یضع الفرس رجلہ اذا سبق راجع المیدانی ۲: ۲٦٤ نقلاً عن ثعلب وقد اسھب اللسان فی شرحہ (حفد) ۱۲۔

❷ ای فی مھو رھن والزام ازواجھن النفقۃ علیھن قالہ الزجاج (الطبری ٥: ٩٥).

میں ایک قرأت حِفْظاً ہے یعنی اس کی حفاظت دوسروں سے بہتر ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ﴾ (۵۰۔۴) اور ہمارے پاس تحریری یادداشت بھی ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ کتاب ان کے اعمال کی حفاظت کرنے والی ہے تو یہاں بھی حفیظ بمعنی حافظ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ﴾ (۶۔۱۰۸) میں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حفیظ بمعنی محفوظ ہو یعنی وہ کتاب ضائع نہیں ہوگی۔
جیسے فرمایا:
﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى......﴾ (۲۰۔۵۲)
اَلْمحافَظَة وَالحِفَاظُ: (مفاعلہ) ایک دوسرے کی حفاظت کرنا اور آیت کریمہ: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ (۷۰۔۳۴) اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں۔
میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات اور اس کے ارکان کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی پابندی کرتے ہیں۔ اور نماز ان کی حفاظت کرتی ہے۔ یعنی وہ انہیں بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (۲۹۔۴۵) کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔
اَلتَّحَفُّظُ: (تفعل) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عقل کی کمی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی قوت حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تکلف سے کسی چیز کو یاد کرنے کے ہیں۔ اور قوت حافظہ چونکہ اسباب عقل سے ہے اس لئے اس کی تفسیر میں لوگوں نے وسعت سے کام لیا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔
اَلْحَفِيْظَةُ: کے اصل معنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے غصہ اور حمیت سے کام لینے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ محض غصہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے کہا جاتا ہے۔
اَحْفَظَنِيْ فُلَانٌ یعنی فلاں نے مجھے غصہ دلایا۔

(ح ف و)

اَلْاِحْفَاءُ: کے معنی کسی چیز کے مانگنے میں اصرار کرنے یا کسی کی حالت دریافت کرنے لئے بحث اور کاوش میں لگے رہنے کے ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اَحْفَيْتُ السُّؤَالَ وَاَحْفَيْتُ فُلَاناً فِي السُّؤَالِ دونوں طرح کہا جاتا ہے۔
﴿اِنْ يَّسْأَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا﴾ (۴۷۔۳۷) اگر وہ تم سے مال طلب کرے اور تمہیں تنگ کرے تو تم بخل کرنے لگو۔
اصل میں یہ اَحْفَيْتُ الدَّآبَّةَ (اے سادہ گردانیدم پائے ستور را) سے ہے جس کے معنی گھوڑے یا اونٹ کو زیادہ چلا کر اس کے سم یا پاؤں کو گھسا ہوا کردینے کے ہیں اور حَفِيَ حَفاً وَحَفْوَةً کے معنی زیادہ چلنے سے پاؤں کے چھل جانے کے ہیں۔ اسی سے اَحْفَيْتُ الشَّارِبَ (نیک برید بردت را) ہے جس کے موچھوں کو اچھی طرح کاٹ کر صاف کردینے کے ہیں۔
اَلحَفِيُّ: نیکوکار اور نہایت مہربان قران میں ہے: ﴿اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا﴾ (۱۹۔۴۷) بے شک وہ مجھ پر نہایت

مہربان ہے۔

کہا جاتا ہے اَحْفَيْتُ بِفُلَانٍ وَتَحْفَيْتُ بِهٖ: میں نے اس کے اعزاز واکرام کے بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اَلْحَفِیُّ: (ایضاً) کسی چیز کا اچھی طرح جاننے والا۔ [1]

(ح ق ق)

اَلْحَقُّ: (حق) کے اصل معنیٰ مطابقت اور موافقت کے ہیں۔جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔اور لفظ ''حق'' کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔اسی معنیٰ میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقُّ﴾ (۶۔۶۲) پھر (قیامت کے دن تمام) لوگ اپنے مالک برحق خداتعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔نیز فرمایا:

﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ﴾ (۱۰۔۳۲) یہی خدا تمہارا پروردگار برحق ہے اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے سوا ہے ہی کیا؟ تو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

(۲) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ...... مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ (۱۰۔۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں...... یہ (سب کچھ) خدا نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔

اور قیامت کے متعلق فرمایا:

﴿وَ يَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِیْ وَ رَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ﴾ (۱۰۔۵۳) اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ سچ ہے کہہ دو ہاں خدا کی قسم سچ ہے۔﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ (۳۔۷۱) اور حق کو کیوں چھپاتے ہو۔نیز فرمایا:

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۳۔۶۰) (یہ بات) تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔

﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۲۔۱۴۹) بے شک وہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔

(۳) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ بعث، ثواب وعقاب اور جنت ودوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَهَدَی اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾ (۲۔۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی۔

(۴) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی

---

[1] وفی التنزیل یسئلونك كانك حفی عنها ۷ : ۱۸۷) ای كانك عالم بها.

اعتبار سے کہا جاتا ہے۔کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿کَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ﴾ (۱۰-۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد.........ثابت ہو کر رہا۔

﴿حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ﴾ (۳۲-۱۳) میری طرف سے یہ بات قرار پاچکی ہے کہ میں دوزخ کو......بھر دوں گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآئَهُمْ﴾ (۲۳-۷۱) اور اگر (خدائے) برحق ان کی خواہشوں پر چلے۔

میں الحق سے مراد ذات باری تعالیٰ بھی ہوسکتی ہے۔ اور وہ حکم بھی ہوسکتا ہے جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔کہا جاتا ہے۔

اَحْقَقْتُ كَذَا: میں نے اس کا حق ہونا ثابت کردیا یا اس پر حق ہونے کا حکم لگایا۔اور آیت کریمہ: ﴿لِیُحِقَّ الْحَقَّ﴾ (۸-۸) تاکہ سچ کو سچ کردے۔میں احقاقِ حق دو طرح ہوسکتا ہے۔

(۱) ادلہ اور آیات کے اظہار سے جیسے فرمایا: ﴿وَاُولٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا﴾ (۴-۹۱) یعنی ہم نے تمہیں ان پر حجت قویہ عطا فرمائی۔

(۲) شریعت حقہ کی تکمیل اور لوگوں میں اس کی نشرواشاعت کے ذریعہ جیسے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ﴾ (۶۱-۸) حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے گا۔خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (۶۱-۹) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے دیگر سب دینوں پر غالب کرے۔اور آیت کریمہ: ﴿اَلْحَآقَّةُ مَا الْحَآقَّةُ﴾ (۶۹-۱،۲) سچ مچ ہونے میں قیامت کی طرف اشارہ ہے۔جیسا کہ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اور قیامت کو حَآقَّةُ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جزائے اعمال واقع ہوگی۔

کہا جاتا ہے: حَاقَقْتُهٗ فَحَقَقْتُهٗ: میں نے حق کے متعلق اس سے جھگڑا کیا اور اس پر غالب رہا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔[1] (۹۰)

"اِذِ النِّسَاءُ بَلَغْنَ نَصَّ الْحِقَاقِ فَالْعَصْبَةُ اَولٰى فِیْ ذَالِكَ" جب عورتیں بالغ ہوجائیں تو عصبہ زیادہ حق دار ہیں۔

فُلَانٌ نَزِقُ الْحِقَاقِ: فلاں معمولی باتوں میں جھگڑا کرتا ہے اور کبھی لفظ حق واجب، لازم اور لائق کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۰-۱۰۳) اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۰-۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم ہے۔

[1] کذا نسبه المولف ای عمرؓ والذی فی اللسان ومختار الصحاح للرازی ۲۹۸ وغریب ابی عبید ۳: ۴۵۷ والفائق ۲: ۲۷۷ والنهایة (حق) انه من قول علی وفی روایة نص الحقائق والمراد بنص الحقائق الادرك یعنی ما دامت الجاریة صغیرة فامها اولی بها فاذابلغت فالعصبة اولیٰ من امهاانظر ایضاً کنزالعمال ۱۱ رقم ۱۶۵۔

﴿حَقِيْقٌ عَلٰى اَنْ لَّا اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ......﴾ (۷۔۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ کہوں سچ ہی کہوں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ حقیق بمعنیٰ جَدِيْرٌ (یعنی سزاوار) ہے اور بعض نے بمعنیٰ واجب لکھا ہے ایک قرأت میں حَقِيْقٌ عَلَيَّ بھی ہے۔نیز فرمایا:﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذَالِكَ﴾ (۲۔۲۲۸) اوران کے خاوند...... اس (مدت) میں ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔
اور اَلْحَقِيقَةُ کا لفظ کبھی اس چیز کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جسے ثبات اور وجود حاصل ہو جیسے آنحضرت ﷺ نے حارثہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا[1] تھا(۹۱) کہ لِكُلِّ حَقٍّ حَقِيْقَةٌ فَمَا حَقِيْقَةُ اِيمَانِكَ کہ ہر حق چیز کو کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے۔تو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی یہ کیسے معلوم ہوا کہ جس چیز کے تم مدعی ہو وہ حق ہے۔
فُلَانٌ يَحْمِيْ حَقِيْقَتَهٗ یعنی وہ اس چیز کی حفاظت کرتا ہے جس کی حفاظت اس پر واجب ہے۔کبھی حَقِيقَةٌ کا لفظ اعتقاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور کبھی عمل اور قول کے متعلق جیسے کہا جاتا ہے۔فُلَانٌ لِفِعْلِهٖ حَقِيقَةٌ: فلاں کا فعل صحیح ہے یعنی وہ ریا کار نہیں ہے۔وَلِقَوْلِهٖ حَقِيْقَة: یعنی وہ نہ رخصت پر عمل کر رہا ہے اور نہ زیادتی سے کام لے رہا ہے۔اس کے برعکس معنیٰ میں متجوز، متوسع یا متفسح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں،کہا گیا ہے۔الدُّنْيَا بَاطِلٌ وَالْاٰخِرَةُ حَقِيْقَةٌ کہ دنیا فانی ہے اور بقا صرف آخرت کو ہے۔
فقہا اور متکلمین کے نزدیک حقیقت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی لفظ اصل لغت کے لحاظ سے اپنے معنیٰ موضوع لہ میں استعمال ہو۔
اَلْحَقُّ: وہ اونٹ جو بار برداری کے قابل ہو جائے مونث حِقَّةٌ ج حِقَاقٌ اور کہا جاتا ہے۔
أَتَتِ النَّاقَةُ عَلٰى حِقِّهَا: یعنی وہ وقت آ گیا ہے جس میں گزشتہ سال اس پر اونٹ بٹھایا گیا تھا۔

(ح ق ب)

قرآن پاک میں ہے:
﴿لٰبِثِيْنَ فِيْهَا اَحْقَابًا﴾ (۷۸۔۲۳) اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔
بعض نے کہا ہے کہ اَحْقَاب کا واحد حُقْبٌ ہے جس کے معنیٰ زمانہ کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حِقْبَةٌ کا لفظ اسی سال کی مدت پر بولا جاتا ہے[2] اس کی جمع حِقَبٌ آتی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ مدت غیر معینہ پر بولا جاتا ہے۔
اَلْاِحْتِقَابُ: (افتعال) سوار کا اپنے پیچھے حقیبہ یعنی سامان سفر کا تھیلا باندھنا، چنانچہ کہا جاتا ہے۔اِحْتَقَبَهٗ وَاسْتَحْقَبَهٗ: اس نے اسے پالان کے پیچھے باندھ لیا۔حَقِبَ الْبَعِيْرُ: شتر کے غلاف نرہ میں اس کے تنگ کے داخل ہونے کی وجہ سے پیشاب کا رک جانا یا تکلیف سے آنا۔
اَلْاَحْقَبُ: سرخ رنگ کا گورخر بعض نے کہا ہے کہ اَحْقَبُ ایسے گورخر کو کہتے ہیں جس کے دونوں پہلو

---

[1] وفی تاریخ الطبری قال شیخ من بنی عامر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل قول حقیقۃ فانبئنی بحقیقۃ قولك وبدء شانك ۱ : ۵۷۵.

[2] روی ذلك عن ابن عمر وابی ھریرۃ وعن الحسن انہ سبعون سنۃ وقال الفراء انہ سنۃ بلغۃ قریش (راجع التاج).

باریک ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ سفید پہلوؤں والے گورخر کو کہا جاتا ہے اس کا مؤنث حَقْبَاءُ ہے۔

(ح ق ف)

اَلْحِقفُ: منحنی تودہ ریت۔اس کی جمع اَحْقَافٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿اِذْ اَنْذَرَ قَومَهٗ بِالْاَحْقَافِ﴾ (۴۶۔۲۱) کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ہدایت کی۔ظَبْيٌ حَاقِفٌ: وہ ہرن جو ریت کے تودوں میں رہتا ہو۔اِحْقَوْقَفَ: مائل ہو کر ریت کے تودہ کی طرح ہو جانا شاعر نے کہا ہے۔❶ ع (رجز)

(۱۱۵) سَمَاوَةُ الْهِلَالِ حَتّٰى احْقَوقَفَا

چاند کو راتیں تدریجاً کم کرتی رہتی ہیں حتیٰ کہ وہ کمان کی طرح خمیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

(ح ک م)

حَكَمَ کے اصل معنیٰ کسی چیز کی اصلاح کے لئے اسے روک دینے کے ہیں۔اسی بنا پر لگام کو حَكَمَةُ الدَّابَّةِ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتا ہے) کہا جاتا ہے۔حَكَمْتُ الدَّابَّةَ: میں نے اسے لگام دی۔اسی طرح حَكَمْتُ السَّفِينَةَ وَاَحْكَمْتُهَا بھی کہا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۱۱۶) اَبَنِي حَنِيفَة اَحْكِمُوْا سُفَهَاءَ كُم

اے بنی حنیفہ! اپنے سفہاء کے منہ میں لگام دو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ (۲۲۔۵۲) تو جو (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔

اَلْحُكْمُ: کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کا نام حکم ہے یعنی وہ اس طرح ہے یا اس طرح نہیں ہے خواہ وہ فیصلہ دوسرے پر لازم کر دیا جائے یا لازم نہ کیا جائے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ (۴۔۵۸) اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

﴿يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ (۵۔۹۵) جسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کر دیں۔

شاعر نے کہا ❸ ع (البسیط)

(۱۱۷) فَاحْكُمْ كَحُكْمِ فَتَاةِ الْحَيِّ اِذْ نَظَرَتْ

---

❶ قالها العجاج راجع لتخريجه (زلف).

❷ قاله جرير وتمامه .... انى اخاف عليكم ان اغضبا راجع للبيت البحر المحيطُ ٥: ٢٠٠/٤: ٣٣٧) وديوانه ٧ والفائق ١: ١٤١ والمحكم (حكم).

❸ قاله نابغة وقال بعضهم انه ليس من الحكم فى شيئى بل معناه كن حكيما وانظر للبيت ديوانه ٣٣ بشرح البطليوسى وادب الاكاتب ٢٢ والاقتضاب ٢٩٤ وشواهد الكشاف ٣٣ ومختار الشعر الجاهلى ١: ٧٨ والفخر ٢١: ١٩١ والجمحى ١٨٥ والكتاب ١: ٨٥ والعقد الثمين والعشر للتبريزى ٢٩٧ والمعانى للقبتى ٢٩٩ والعينى ٢: ٤٥٤ والسيوطى ٢٨ وذيل الامالى ١: ٢٢٩ وابن الشجرى ٢: ٢٨٩ والصناعتين ١٤٧ فى خمسة ابيات وفى رواية شراع كمافى الحيوان ٣: ٢٢١) وهى رواية الاصمعى كمافى الخزانة ١: ٣٠٠ لئكن روايته انسب۔

اِلَــی حَمَــامٍ سِــرَاعٍ وَارِدِ الثَّمَدِ

اس نوجوان عورت کی طرح عدل وانصاف سے فیصلہ کرو جس نے پانی پر وارد ہونے والی کبوتروں کی ٹکڑی کو دیکھ کر (ان کی صحیح تعداد بتادی تھی) اور بعض نے اس کے معنیٰ کن حَکِیْمًا کئے ہیں نیز فرمایا: ﴿اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوقِنُونَ﴾ (۵۔۵۰) کیا یہ زمانہ جاہلیت کے حکم کے خواہاں ہیں۔ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟

اور جو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے اسے حاکِمٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع حُکَّامٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ﴾ (۲۔۱۸۸) اور نہ اس کو (رشوۃ) حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔

اور حَکَمٌ (منصف) ماہر حاکم کو کہا جاتا ہے اس لئے اس میں لفظ حاکم سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَماً﴾ (۶۔۱۱۴) (کہو) کیا میں خدا کے سوا اور منصف تلاش کروں۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (۴۔۳۵) تو ایک منصف، مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف، عورت کے خاندان میں سے مقرر کردو۔ میں حاکِمًا کی بجائے حَکَمًا کہنے سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ کہ وہ منصف مقرر کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ دونوں تفصیلات کی طرف مراجعت کئے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں خواہ وہ فیصلہ فریقین کی مرضی کے موافق ہو یا مخالف اور حَکَمٌ کا لفظ واحد جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ تَحَاکَمْنَا اِلَی الْحَاکِمِ: ہم حاکم کے پاس فیصلہ لے گئے قرآن پاک میں ہے:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ﴾ (۴۔۶۰) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں۔

حَکَّمْتُ فُلَانًا: کسی کو منصف مان لینا قرآن میں ہے۔

﴿حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (۴۔۶۵) جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ حَکَمَ بِالبَاطِلِ تو اس کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ اس نے باطل کو بطور حکم کے جاری کیا اَلْحِکْمَةُ کے معنیٰ علم وعقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں لہٰذا حکمت الٰہی کے معنیٰ اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت احکام کے ساتھ ان کو موجود کرنا ہے اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو سر انجام دینے کا نام ہے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ﴾ (۳۱۔۱۲) اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی۔

میں حکمت کے یہی معنیٰ مراد ہیں جو کہ حضرت لقمان علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے متعلق حکیم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنیٰ مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے کے ہوتے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا:

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ﴾ (۹۵۔۸) کیا اللہ تعالیٰ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟۔

اور قرآن پاک کو حکیم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حکمت

کی باتوں پر مشتمل ہے جیسے فرمایا: ﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾ (۱۰۔۱) یہ بڑی دانائی کی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نیز فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ﴾ (۵۴۔۴،۵) اور ان کو ایسے حالات (سابقین) پہنچ چکے ہیں جن میں عبرت ہے اور کامل دانائی (کی کتاب بھی)۔

اور بعض نے کہا ہے کہ قرآن پاک کے وصف میں حکیم بمعنیٰ محکم ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ﴾ (۱۱۔۱) جس کی آیتیں مستحکم ہیں۔

اور یہ دونوں قول صحیح ہیں کیونکہ قرآن پاک کی آیات محکم بھی ہیں اور ان میں پراز حکمت احکام بھی ہیں لہٰذا ان ہر دو معانی کے لحاظ سے قران محکم ہے۔

حکم کا لفظ حکمۃ سے عام ہے ہر حکمت کو حکم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر حکم حکمت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حکم کے معنیٰ کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ کہ وہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً کہ بعض اشعار مبنی برحکمت ہوتے ہیں جیسا کہ لبید نے کہا ہے ❷ (رمل)

(۱۱۸) اِنَّ تَقْوٰى رَبِّنَا خَيْرُ نَفَلْ

کہ خدائے تعالیٰ کا تقویٰ ہی بہترین توشہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاٰتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ (۱۹۔۱۲) اور ہم نے ان کو لڑکپن میں ہی دانائی عطا فرمائی تھی۔

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ❸ (۹۳) اَلصَّمْتُ حِكْمَةٌ وَقَلِيلٌ فَاعِلُهٗ کہ خاموشی بھی حکمت ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ اسے اختیار کرتے ہیں۔ یہاں (آیت اور حدیث میں) حکم کے معنیٰ حکمت کے ہیں ❹ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۲۔۱۲۹) اور ان (لوگوں) کو کتاب اور دانائی سکھایا کرے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ (۳۳۔۳۴) اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی

---

❶ انظر لحديث (حم ق د ه ـعن الى رت عن ابن مسعود (طب عن عمرو بن عوف وعن ابى بكرة) (حل عن ابى هريرة) (خط عن عائشة عن حسان بن ثابت (ابن عساكر عن عمر) (ق عن ابن عباس) (عسكرى عن عائشة) (كرعن عائشة) وفى كلها حكمة بدون اللام ولها طرقا فيها حكماً وفى بعضها لحكماء انظر كنزالعمال لعلى المتقى ۳ : ۳۲۱ ثم ذكر۳ : ٤١٦ عن احمر بن بكر الاسدى وفيه لحكمة كمارواه الاكثر ۱۲.

❷ قاله لبيد بن ربيعة العامرى وتمامه : وباذن الله ريثى وعجل ـ البيت فى ديوانه ۳۹ وامالى المرتضىٰ ۱ـ۲۱ والعقد ۲ : ۳۷۸ والمشكل للقبتى ۲۸ وغريبه ۷۷ وجمهرة الاشعار ۱۷۰ اوالكامل ۲ : ٢٤٦ ونظام الغريب ۲۳۷ والبحر ٦ : ٤٥٥ واللسان (نفل) وشواهد الكشاف ۲۲۹ والطبرى (۹ : ۱۷۱) والقرطبى ۷ : ۳٦۱ ومحازالقران رقم ۲۷۲ وفى كنزالعمال ۳ : ٤٨٩ ان عمربن الخطاب كان يامر برواية هذاالقصيدة (وكيع).

❸ اخرجه ابو منصور الديلمى فى مسند الفردوس من حديث ابن عمر بسندضعيف والبيهقى فى الشعب والقضاعى من حديث انس ان لقمان قال الخ كما فى البيهقى وروضة العقلاء ۲۸ بسند صحيح عن انس راجع كنزالعمال ۳ : ۲۰۰ـرقم ۷۵۲ اوتخريج الاحياء للعراقى ۳ : ۱۱۸ وفى الاحياء الصمت حكمة غلط ،غلط فيه عثمان بن سعيد الراوى .

❹ راجع الطبرى ۱ : ٤٧٦ وقول السدى هو المنقول عن قتادة راجع فتح القدير للشوكانى ۱۲.

ہیں ان کو یاد رکھو۔

میں حکمت سے مراد تفسیر قرآن ہے یعنی جس پر کہ قرآن نے آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَحْکُمُ مَایُرِیْدُ......﴾ میں تنبیہ کی ہے کہ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے حکمت بنا دیتا ہے تو اس میں ترغیب ہے کہ لوگوں کو اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے۔ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰهِ وَالْحِکْمَةِ میں حکمت سے ناسخ، منسوخ، محکم اور متشابہات کا علم مراد ہے۔اور ابن زید کہتے ہیں کہ آیات وحِکَم کا علم مراد ہے سدّی نے کہا کہ حکمت سے سنت نبوی مراد ہے۔بعض نے کہا ہے کہ حقائق کا فہم مراد ہے کیونکہ بعض حقائق کا بیان اولوالعزم پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور اس معاملہ میں دوسرے انبیاء ان کے تابع ہوتے ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿یَحْکُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا﴾ (۵۔۴۴) اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے۔ یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں۔میں یَحْکُم کے معنی اس حکمت کے بیان کرنے کے ہیں جو انبیاء کے ساتھ مختص ہوتی ہے اور یا یہ حکم ہی سے ماخوذ ہے یعنی فیصلہ کرتے رہے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿مِنْهُ اٰیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (۳۔۷) جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور جو بعض متشابہ ہیں۔میں محکمات سے وہ آیتیں مراد ہیں جن میں لفظی اور معنوی اعتبار سے کسی قسم کا اشتباہ نہ پایا جاتا ہو۔اور متشابہ کی چند قسمیں ہیں جنہیں ان کے باب (ش ب ہ) میں بیان کیا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

حدیث میں ہے [1] (۹۴) کہ جنت مُحَکِّمِیْن کے لئے ہے بعض نے کہا ہے کہ مُحَکِّمِیْن سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کہا جائے کہ یا تو مرتد ہو جاؤ ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے تو وہ قتل ہونا پسند کریں اور بعض نے کہا ہے کہ محکمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکمت کے ساتھ مختص ہیں۔

(ح ل ل)

اَلْحَلُّ: اصل میں حَلٌّ کے معنی گرہ کشائی کے ہیں۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ﴾ (۲۰۔۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

میں یہی معنی مراد ہیں اور حَلَلْتُ کے معنی کسی جگہ پر اترنا اور فروکش ہونا بھی آتے ہیں اصل میں یہ حَلُّ الْاَحْمَالِ عندالنزول سے ہے، جس کے معنی کسی جگہ اترنے کے لئے سامان کی رسیوں کی گرہیں کھول دینا کے ہیں۔پھر محض اترنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ لہٰذا حَلَّ (ن) حُلُوْلًا کے معنی کسی جگہ پر اترنا ہیں اور اَحَلَّهٗ کے معنی اتارنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ تَحُلُّ قَرِیْباً مِّنْ دَارِهِمْ﴾ (۱۳۔۳۱) یا ان کے مکانات کے قریب نازل ہوتی رہے گی۔

﴿وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ (۱۴۔۲۸) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر اتارا۔

---

[1] والمحكمين على صيغة المفعول وبكسر الكاف معناه المنصف من نفسه راجع للحديث الفائق ١ : ١٤١ واللسان والنهاية (حكم).

حَلَّ الدَّیْنُ: قرض کی ادائیگی کا وقت قریب آ پہنچا۔
اَلْحِلَّةُ: نازل ہونے والی قوم (اسی سے کہا جاتا ہے)
حَیٌّ حَلَالٌ جبکہ لوگ ایک دوسرے کے جوار میں مقیم ہوں اَلْمَحِلَّةُ: (اترنے کی جگہ) اور حَلُّ الْعُقْدَةِ (گرہ کھولنا) سے بطور استعارہ حَلَّ (ض) الشَّیْءُ حِلًّا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کے حلال ہونا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ (۵۔۸۸) اور جو حلال طیب روزی خدا نے تم کو دی ہے اسے کھاؤ۔
﴿هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ﴾ (۱۶۔۱۱۶) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔
اور الْحُلُوْلُ سے اَحَلَّتِ الشَّاةُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ بکری کے تھنوں سے دودھ اتر آنا کے ہیں۔ مگر اَحَلَّ اللّٰهُ كَذَا کے معنیٰ کسی چیز کو حلال کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ (۵۔۱) تمہارے لئے چوپائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ﴾ (۳۳۔۵۰) اے پیغمبر! ہم نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیئے ہیں حلال کر دی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں۔
میں ازواج مطہرات کی حلت تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کے عقد میں تھیں اور بنات العم وغیرہ کی حلت سے نکاح مراد ہے۔
بَلَغَ الْاَجَلُ مَحِلَّهٗ: ادائیگی قرض کا وقت قریب آ پہنچا قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾ (۲۔۱۹۶) جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے۔
رَجُلٌ حَلَالٌ وَمُحِلٌّ جو احرام کھول دے یا وہ آدمی جو حدود حرم سے باہر چلا جائے قرآن میں ہے: ﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ (۵۔۲) اور جب احرام اتار دو تو پھر شکار کرو۔
﴿وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ (۹۰۔۲) اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔
اور آیت کریمہ:
﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ (۶۶۔۲) خدا نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمہاری قسموں کی گرہ کشائی کا کفارہ بیان کر دیا ہے۔ حدیث میں ہے [1] (۹۵) لَا يَمُوْتُ لِلرَّجُلِ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْاَوْلَادِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ اِلَّا

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظه فی اللسان(حلل) والفائق ۱ : ۱٤۲ ولفظه لایموت لمؤمن وفی ابن کثیر لمسلم وفی روایة من مات له راجع للحدیث المسند عبدالرزاق وابو داؤد والطیالسی واصله فی الصحیحین من حدیث ابی هریرة انظر ابن کثیر ۳ : ۱۳۳ وکنزالعمال ۳ : ۱٦۳ ـ ۱٦٤ وایضاً الاستثناء الاتحلة القسم ورد للحارث فی سبیل الله فی مسند احمد والروایة فی الترمذی والنسائی وابن ماجة وتحلة القسم مثل فی القلیل المفرط فی القلة وقیل اشار الی قوله تعالی وان منکم الاواردها والذی ذهب الیه المؤلف هو اعتبار بالاصل یخاف المنقول فی تفسیره)۱۲.

تَحِلَّةَ الْقَسَمِ کہ جس مسلمان کے تین بچے مرجائیں (اور وہ صبر کرے) تو اسے دوزخ کی آگ صرف تَحِلَّةَ الْقَسَمِ کی مقدار سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔یعنی جتنی دیر میں کہ انشاء اللہ کہے۔ اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے۔ ❶ ع

(۱۱۹) وَقْعُهُنَّ الْاَرْضَ تَحْلِيلٌ

کہ ان کے قدم کا زمین پر پڑنا تحلۃ القسم کی مقدار ہے یعنی برائے نام ہے۔

اَلْحَلِيلُ: خاوند۔مؤنث حَلِيْلَةٌ میاں بیوی کو حَلِيْلٌ وَحَلِيْلَةٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے اپنی چادر کھولتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اسی لئے جو شخص کسی کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا ہو وہ اس کا حَلِيلٌ کہلاتا ہے۔اور یا یہ حَلَالٌ سے ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حلال ہیں۔اور حَلِيلة کی جمع اَلْحَلَائِلُ ہے۔قرآن میں ہے:

﴿وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُم الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ (۴۔۲۳) اور تمہارے صلبی بیٹوں کی عورتیں بھی۔

اَلْحُلَّةُ: (کپڑوں کا جوڑا) اِزار اور رداء (اوپر اور نیچے کی چادریں)

اَلاِحْلِيلُ: پیشاب نکلنے کا سوراخ، کیونکہ پیشاب کے وقت اس کی گرہ کھل جاتی ہے۔

(ح ل ف)

اَلْحِلْفُ: عہدو پیمان جو لوگوں کے درمیان ہو۔

اَلْمُحَالَفَةُ: (مفاعلہ) معاہدہ بمعنیٰ باہم عہدو پیمان کرنے کو کہتے ہیں۔پھر محالفت سے لزوم کے معنیٰ لے کر کہا جاتا ہے فُلَانٌ حِلْفُ كَرَمٍ وَحِلْفُ كرمٍ یعنی وہ کرم سے جدا نہیں ہوتا۔حَلِيفٌ جس کے ساتھ عہدو پیمان کیا گیا ہو اس کی جمع اَحْلَافٌ (وحُلَفَاءُ) آتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے ❷ (الطویل)

(۱۲۰) تَدَارَكْتُمَا الْاَحْلَافَ قَدْثُلَّ عَرْشُهَا

تم نے ان حلیفوں کا تدارک کردیا جن کے پائے ثبات متزلزل ہو چکے تھے۔

اَلْحِلْفُ اصل میں اس قسم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے عہدو پیمان کیا جائے اسکے بعد عام قسم کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ﴾ (۶۸:۱۰) یہ خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے (تو کچھ) نہیں کہا۔

---

❶ قطعة من البيت لكعب بن زهير السلمى من قصيدة جمهرة (۲۸۲۔۲۸۷) فى ۸۵ بيتاً وصدره تخدى على لسيرات وهى لاهته زوابل .... وفى رواية اللسان لاحقة بدل لاحقة باربع بدل ذوابل وفى رواية المحكم (حلل) نحالب بدل ذوابل والبيت فى النهاية (حلل) والعمدة ۲ : ۸۸) وجمهرة اشعارالعرب ۳۱۰ وديوانه ۱۳ ؛مثله لعبدة بن الطبيب من قصيدة مفضلية رقم ۲۶ فى ۸۱ بيتاً بذكرثورا وصدره يخفى التراب باظلاف ثمانية فى اربع .... والبيت فى امالى المرتضىٰ والنوادر ۹ وديوان المعانى ۲ : ۱۰۸ واللسان (حلل) لكن فيه مسهن بدل وقعهن ۱۲.

❷ قاله زهيريمدح زهير بن سنان والحارث بن عوف والاحلاف غطفان وقيس وتمامه : وذهيان قد زلت باقدا مها النعل راجع ديوانه ۱۰۹ وشواهد الكشاف ۱۰۰ والمعلقات العشر والمختارات ۶۲ ومختارالشعر الحاهلى (۱ : ۱۶۲) والاتباع لابى الطيب ۳۴ واضداد ابى الانبارى ۳۸۷ واضداد ابى الطيب ۱ : ۱۳۷) واللسان (ثلل).

﴿وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ﴾ (۹۔۶۲) یہ لوگ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش کر دیں۔

شَيْءٌ مُحْلِفٌ (مشکوک چیز) جس کے ثابت کرنے کے لئے قسم کی ضرورت ہو۔

كُمَيْتٌ مُحْلِفٌ: گھوڑا جس کے کمیت اور اشقر ہونے میں شک ہوا۔ ایک قسم کھائے کہ یہ کمیت ہے اور دوسرا حلف اٹھائے کہ یہ اشقر یعنی سرخ ہے اَلْمُحَالَفَةُ کے اصل معنیٰ تو ایک دوسرے کے سامنے قسم کھانا کے ہیں اس سے یہ لفظ محض لزوم کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے اور جو کسی سے الگ نہ ہوتا ہو اسے اس کا حِلْفٌ یا حَلِيفٌ کہا جاتا ہے حدیث میں ہے ❶ (۹۶) لَاحِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ: اسلام میں زمانہ جاہلیت ایسے معاہدے نہیں ہیں۔

فُلَانٌ حَلِيفُ اللِّسَانِ: فلاں چرب زبان ہے گویا اس نے بولنے سے عہد کر رکھا ہے اور اس سے ایک لحہ نہیں رکتا حَلِيفُ الْفَصَاحَةِ: وہ فصیح ہے۔

(ح ل ق)

اَلْحَلْقُ: حلق (وہ جگہ جہاں سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے) حَلَقَهٗ (ض) اس کے حلق کو قطع کر ڈالا۔ پھر یہ لفظ بال مونڈنے پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ حَلَقَ شَعْرَهٗ اس نے اپنے بال منڈوا ڈالے۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُؤُوْسَكُمْ﴾ (۲۔۱۹۶) اور...... سر نہ منڈواؤ۔

﴿مُحَلِّقِيْنَ رُؤُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ﴾ (۴۸۔۲۷) اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر۔

رَأْسٌ حَلِيْقٌ مونڈا ہوا سر۔

لِحْيَةٌ حَلِيْقَةٌ: مونڈی ہوئی داڑھی۔

اور کسی انسان کے حق میں بددعا کے وقت عَقْرٰی حَلْقٰی کہا جاتا ہے یعنی اسے ایسی مصیبت پہنچے جس پر عورتیں اپنے سر کے بال مونڈوا ڈالیں۔ بعض نے کہا ہے اس کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے حلق کو قطع کر ڈالے۔ اَلْمَحَالِقُ: وہ کمبل جو کھردرا ہونے کی وجہ سے بدن کے بال کاٹ ڈالے۔

حَلْقَةٌ یا حَلَقَةٌ جماعت جو دائرہ کی شکل میں جمع ہو۔ کیونکہ وہ دائرہ ہیئت میں انسان کے حلق کے مشابہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَلَقَةٌ کا لفظ صرف اس جماعت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے سر منڈوا ڈالتے ہیں ❷

اِبِلٌ مُحَلَّقَةٌ: شتران کہ بشکل حلقہ داغ بر آنہا کردہ باشند اور حلقہ میں معنیٰ دوران کا اعتبار ہے۔ جس طرح حَلَقَةُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے نیز کہا جاتا ہے حَلَّقَ الطَّائِرُ جس کے معنیٰ پرند کا چکر لگا کر اڑنا کے ہیں ❸

---

❶ رواه الحاكم فی المستدرك والمسلم وابوداؤد والنسائی عن جبير بن مطعم (راجع الفتح للنبهانی ۳: ۳۴۳) والحديث فی النهاية (حلف) وغريب ابی عبيد ۱۲.

❷ وعلىٰ هذا فهی جمع حالق (علی الاول مفرد وجمعه حَلَقٌ واما الحلقة بسكون اللام فجمعه حلق وعند البعض حلق علی غير قياس (النهايه)

❸ (۵۶-۸۳) میں حلقوم بمعنی حلق آیا ہے وفی التنزيل الحلقوم (۵۶-۵۳) بمعنى الحلق قال بعضهم الميم فيه اصلية وعند البعض الواو والميم زائد تان (النهايه).

(ح ل م)

اَلْحِلْمُ کے معنیٰ ہیں نفس وطبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ وغضب کے موقع پر بھڑک نہ اٹھے۔ اسکی جمع اَحْلَامٌ ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿اَمْ تَأْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ﴾ (۵۲۔۳۲) کیاان کی عقلیں ان کو......سکھاتی ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَحْلَام سے عقلیں مراد ہیں اصل میں حلم کے معنیٰ متانت کے ہیں مگر چونکہ متانت بھی عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے حلم کا لفظ بول کر عقل مراد لے لیتے ہیں جیسا کہ مسبب بول کر سبب مراد لے لیا جاتا ہے۔ حَلُمَ: بردبار ہونا۔ حَلَّمَهُ الْعَقْلُ وَتَحَلَّمَ عقل نے اسے بردبار بنادیا۔ اَحْلَمَتِ الْمَرأَةُ: عورت کا حلیم بچے جننا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ﴾ (۱۱۔۷۵) بے شک ابراہیم علیہ السلام بڑے تحمل والے، نرم دل والے اور رجوع کرنے والے تھے۔اور آیت کریمہ: ﴿فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ﴾ (۳۷۔۱۰۱) تو ہم نے ان کوایک نرم دل لڑکے کی خوش خبری دی۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس غلام میں، قوت برداشت......تھی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ﴾ (۲۴۔۵۹) اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہوجائیں۔

میں حُلم کے معنیٰ سنِ بلوغت کے ہیں اور سنِ بلوغت کو حُلم اس لئے کہتے ہیں کہ اس عمر میں عام طور پر عقل وتمیز آجاتی ہے کہا جاتا ہے۔ حَلَمَ (ن) فِيْ نَوْمِهٖ خواب دیکھنا۔ مصدر حِلْمٌ اور حُلْمٌ اور حلم مثل رُبْعٌ بھی کہا گیا ہے۔اور یہی معنیٰ تَحلَّم وَ احْتَلَمَ کے ہیں۔

حَلَمْتُ بِهٖ فِيْ نَومِيْ: میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالُوْا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ﴾ (۱۲۔۴۴) انہوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔

اَلْحَلَمَةُ: بڑی چیچڑی۔ کیونکہ وہ ایک جگہ پر جمے رہنے کی وجہ سے حلیم نظر آتی ہے اور سر پستان کو حَلَمَةُ الثَّدْيِ کہنا محض ہیئت میں چیچڑی کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس مجاز کی دلیل یہ ہے کہ سر پستان کو قُراد بھی کہہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:[1] ع (الطویل)

(۱۲۱) كَاَنَّ قِرَادَىْ زَوْرِهٖ طَبَعَتْهُمَا
بِطِيْنٍ مِنَ الْحَولَانِ كُتَّابٌ اَعْجَمِيٌّ

(اس کے سینے پر پستانوں کے نشانات اس طرح خوشنما نظر آتے ہیں کہ گویا کہ کسی کاتب نے مٹی کی مہریں لگادی ہیں) حَلِمَ الْجِلْدُ چمڑے کو کیڑا الگ جانا۔ حَلَّمْتُ

---

[1] قاله عدى بن الرقاع فى قصيدة له يمدح فيها عمر بن هيرة وروى ايضاً للملحقه الحرمى كمافى اللسان (قرد، عجم) والمعرب للجواليقى ۱۰۵ والحماسة ۲: ۳۵۱۔۳۵۲ والمرزوقى رقم ۷۸۱ من خمسة ابيات والاقتضاب ۹۷ والبيت بغير عزوفى المخصص ۲: ۱۴۸ والطبرسى ۱: ۹۴ والحولان (بفتح الجيم حبل من نواحى دمشق وطينه مشهور للختم وروى صاحب الاقتضاب ان الحولان اسم للطين الذى يطبع به وفى المطبوع الحولان (بالمهملة) مصحف انشد الجوهرى (قرد) لابن ميادة يمدح بعض الخلفاء وفى رواية صدره بدل زوره وعدى بن الرقاع هوعدى بن زيد بن مالك بن عدى بن الرقاع العاملى وكان شاعراً مقدماً عند بنى امية خاصاً بالوليد بن عبد الملك وعده ابن سلام فى الطبقة الثامنة من شعراء الاسلام راجع الاغانى ۸: ۷۲۔۱۷۷) وابن سلام ۲۰۹۔۲۱۳) والمؤتلف ۱۰۶ والمرزبانى ۲۵۳.

اَلْبَعِیْرَ: میں نے اونٹ سے چیچڑ نکالے ۔ حَلَّمْتُ فُلَانًا: کسی پر قدرت حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ مدارات سے پیش آنا تا کہ وہ مطمئن رہے جیسا کہ اونٹ سے چیچڑ دور کرنے سے اسے سکون اور راحت محسوس ہوتی ہے اور انسان اس پر پوری طرح قدرت پالیتا ہے۔

(ح ل ی)

اَلْحُلِیُّ: (زیورت) یہ حَلْیٌ کی جمع ہے جیسے ثَدْیٌ کی جمع ثُدِیٌّ آ جاتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ﴾ (۷۔۱۴۸) اپنے زیور کا ایک بچھڑا (بنالیا) وہ ایک جسم تھا جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔

حِلِیَ یَحْلٰی آراستہ ہونا اور (حَلَّی آراستہ کرنا) قرآن پاک میں ہے: ﴿یُحَلَّوْنَ فِیهَا اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ﴾ (۱۸۔۱۳) ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

﴿حُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ (۷۶۔۲۱) اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

اور حِلْیَةٌ کے معنیٰ زیور کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوَ مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ﴾ (۴۳۔۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

(ح م م)

اَلْحَمِیْمُ کے معنیٰ سخت گرم پانی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسُقُوْا مَاءً حَمِیْمًا﴾ (۴۷۔۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔

﴿اِلَّا حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا﴾ (۷۸۔۲۵) مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔

﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ﴾ (۱۰۔۴) اور جو کافر ہیں ان کے پینے کو نہایت گرم پانی۔

﴿یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ﴾ (۲۲۔۱۹) اور ان کے سروں پر جلتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔

﴿ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَیْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِیْمٍ﴾ (۲۲۔۱۹) پھر اس (کھانے) کے ساتھ ان کو گرم پانی ملا کر دیا جائے گا۔

﴿هٰذَا فَلْیَذُوْقُوْهُ حَمِیْمٌ وَّغَسَّاقٌ﴾ (۳۸۔۵۷) یہ گرم کھولتا ہوا پانی اور پیپ (ہے) اب اس کے مزے چکھیں۔

اور گرم پانی کے چشمہ کو حَمَّةٌ کہا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے [1] (۹۷)

اَلْعَالِمُ كَالْحَمَّةِ یَاْتِیْهَا الْبُعَدَاءُ وَیَزْهَدُ فِیْهَا الْقُرَبَاءُ: کہ عالم کی مثال گرم پانی کے چشمہ کی سی ہے۔ جس (میں نہانے) کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں اور شفایاب ہوکر لوٹتے ہیں۔ اور قرب و جوار کے لوگ اس سے بے رغبتی کرتے ہیں (اس لئے اس کے فیض سے محروم رہتے ہیں)

اور تشبیہ کے طور پر پسینہ کو بھی حَمِیم کہا جاتا ہے اسی سے اِسْتَحَمَّ الْفَرَسُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ گھوڑے کے پسینہ پسینہ ہونے کے ہیں اور حَمَّام کو حَمَّام یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پسینہ آور ہوتا ہے اور یا اس لئے

[1] الحدیث فی النهایة (حم) والفائق ۱: ۱۵۰ وفیه ویترکها القرباء وغریب ابی عبید ۳: ۲۰۱ والمعاجم (حم) قال الحافظ فی تخریج الکشاف لم اجده ٤: ٦٠).

کہ اس میں گرم پانی موجود رہتا ہے۔

اِسْتَحَمَّ فُلَانٌ۔حمام میں داخل ہونا۔

پھر مجازاً قریبی رشتہ دار کو بھی حمیم کہا جاتا ہے۔اس لئے کہ انسان اپنے رشتہ داروں کی حمایت میں بھڑک اٹھتا ہے اور کسی شخص کے اپنے خاص لوگوں کو حَامَّة کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اَلْحامَّةُ وَالعَامَّةُ: خاص وعام کا محاورہ ہے قرآن میں ہے:

﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلاَ صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ﴾ (۲۶۔۱۰۲،۱۰۱) تو (آج) نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا ہے اور نہ گرم جوش دوست۔

نیز فرمایا:

﴿وَيَسْأَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا﴾ (۷۰۔۱۰) اور کوئی دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا۔

اور اس کی دلیل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسان کے قریبی مہربانوں کو حُزَانَتُه بھی کہا جاتا ہے۔کیونکہ وہ اس کے غم میں شریک رہتے ہیں کہا جاتا ہے۔

اِحْتَمَّ فُلَانٌ لِفُلَان: فلاں اس کے لئے غمگین ہوا یا اس کی حمایت کے لئے جوش میں آ گیا۔اس میں باعتبار معنیٰ اِهْتَمَّ سے زیادہ زور پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں غم زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ جوش اور گرمی کے معنیٰ بھی پائے جاتے ہیں۔

اَحَمَّ الشَّحْمُ: چربی کو پگھلایا۔یہاں تک کہ وہ گرم پانی کی طرح ہوگئی اور آیت کریمہ:

﴿وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ﴾ (۵۶۔۴۳) اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں۔

میں يَحْمُوْم حمیم سے یفعول کے وزن پر ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنیٰ سخت سیاہ دھواں کے ہیں۔ اور اسے يَحْمُوْم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں شدت حرارت پائی جاتی ہے جیسا کہ بعد میں لاَ بَارِدٍ وَّلاَ كَرِيْمٍ سے اس کی تفسیر کی ہے۔اور یا اس میں حَمَمَةٌ یعنی کوئلے کی سی سیاہی کا تصور موجود ہے۔ چنانچہ سیاہ کو يَحْمُوْم کہا جاتا ہے اور یہ حَمَمَةٌ (کوئلہ) کے لفظ سے مشتق ہے۔چنانچہ اسی معنیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَهُمْ مِنْ فَوقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ......﴾ (۳۹۔۱۶) ان کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے اور نیچے (ان) کے فرش ہوں گے۔

اور حِمام بمعنیٰ موت بھی آ جاتا ہے جیسا کہ کسی امر کے مقدر ہونے پر حُمَّ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور بخار کو اَلْحُمّٰى کہنا یا تو اس لئے ہے کہ اس میں حرارت تیز ہوجاتی ہے۔چنانچہ اسی معنیٰ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا [1] (۹۸)

اَلْحُمّٰى مِنْ فِيْحِ جَهَنَّم۔کہ بخار جہنم کی شدت سے ہے اور یا بخار کو حُمّٰى اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں پسینہ

---

[1] متفق عليه من حديث بن عمر وعند البخاري عن عائشة موصولا وفي الموطا عن عروة مرسلا وعند الترمذي عن ثوبان وبمعناه رواه الحاكم والنسائي عن ابن عباس وفي رواية عن انس زائدالموت (ابن السني وابو عظيم في الطب، هنا وفي الزهد وابن ابي الدنيا في المرض والكفارات عن الحسن مرسلاً وراجع لتخريجه كنزالعمال ۳: رقم ۱۶۱٦ ـ ۱٦۱۷ـ۱٦۳٤ و ج ۱۰ رقم ۱۷۰ والفتح للنبهانی ۲: ۸۲ وایضاً الکنز ج ۱۰ رقم ۱۵۹ـ۱٦۵ـ ۱٦٦.

اترتا ہے اور یا اس لئے کہ یہ موت کی علامات میں سے ایک علامت ہے جیسا کہ عرب لوگ کہتے ہیں اَلْحُمّٰی بَرِیْدُ الْمَوْتِ (کہ بخار موت کا پیغام بر ہے) اور بعض اسے باب الموت یعنی موت کا دروازہ بھی کہتے ہیں اور اونٹوں کے بخار کو حُمام کہا جاتا ہے یہ بھی حِمَام (موت) سے مشتق ہے کیونکہ اونٹ کو بخار ہو جائے تو وہ شاذونادر ہی شفایاب ہوتا ہے۔

حَمَّمَ الْفَرخُ: پرند کے بچے نے بال و پر نکال لئے کیونکہ اس سے اس کی جلد سیاہ ہو جاتی ہے۔

حَمَّمَ وَجْهُهٗ: اس کے چہرہ پر سبزہ نکل آیا۔

یہ دونوں محاورے حُمَمَةٌ سے ماخوذ ہیں۔

اور حَمْحَمَتِ الفَرسُ: جس کے معنیٰ گھوڑے کے ہنہنانے کے ہیں۔ یہ اس باب سے نہیں ہے۔

(ح م د)

اَلْحَمدُ لِلّٰهِ (تعالی) کے معنیٰ اللہ تعالیٰ کی فضیلت کے ساتھ اس کی ثنا بیان کرنے کے ہیں۔ یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے۔ کیونکہ مدح ان افعال پر بھی ہوتی ہے۔ جو انسان سے اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اوران اوصاف پر بھی جو پیدائشی طور پر اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح مال کے خرچ کرنے اور علم وسخا پر انسان کی مدح ہوتی ہے اس طرح اسکی درازئ قد وقامت اور چہرہ کی خوبصورتی پر بھی تعریف کی جاتی ہے۔لیکن حمد صرف افعال اختیاریہ پر ہوتی ہے۔ نہ کہ اوصاف اضطراریہ پر اور شکر تو صرف کسی کے احسان کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ہر شکر حمد ہے۔ مگر ہر حمد شکر نہیں ہے اور ہر حمد مدح ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے [1] اور جس کی تعریف کی جائے اسے محمود کہا جاتا ہے۔ مگر مُحَمَّدٌ صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو نیز جب کوئی شخص محمود ثابت ہو تو اسے بھی محمود کہہ دیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ﴾ (۱۱-۷۳) وہ سزاوار تعریف اور بزرگوار ہے۔

میں حمید بمعنیٰ محمود بھی ہو سکتا ہے اور حامد بھی۔

حُمَادَاكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذا: یعنی ایسا کرنے میں تمہارا انجام بخیر ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ﴾ (۶۱-۶) اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ﷺ ہوگا۔ ان کی بشارت سناتا ہوں۔

میں لفظ احمد سے آنحضرت ﷺ کی ذات کی طرف اشارہ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کا نام احمد ہوگا اسی طرح آپ اپنے اخلاق واطوار کے اعتبار سے بھی محمود ہوں گے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی بشارت میں لفظ احمد (صیغہ تفضیل) بولنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے پیشرو جملہ انبیاء سے افضل ہیں اور آیت کریمہ:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (۴۸-۲۹) محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

میں لفظ محمد ﷺ گو من وجہ آنحضرت ﷺ کا نام ہے

---

[1] انظر الکشاف ج ۱ص ۸-۱۰.

لیکن اس میں آنجناب کے اوصاف حمیدہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔جیسا کہ آیت کریمہ:
﴿اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامِ نِ اسْمُهٗ يَحْيٰى﴾ (۱۹۔۷) میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا یہ نام معنیٰ حیات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اس کے مقام پر مذکور ہے۔

(ح م ر)

اَلْحِمَارُ: (گدھا) اس کی جمع حُمُرٌ وَحَمِيْرٌ وَاَحْمِرَةٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ﴾ (۱۶۔۸) اور گھوڑے خچر اور گدھے۔
کبھی حمار کے لفظ سے جاہل اور بے علم آدمی بھی مراد ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (۶۲۔۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔
﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ﴾ (۷۵۔۵۰) گویا وہ گدھے ہیں جو بدک جاتے ہیں۔
حِمَارُ قُبَّانَ: ایک قسم کا کیڑا (جسے فارسی میں خرک کہا جاتا ہے۔) اَلْحِمَارَان: دو پتھر جن پر پنیر خشک کیا جاتا ہے۔ ہیئت میں حمار سے تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے اور گدھے کے ساتھ جلادت میں تشبیہ دے کر دوغلی نسل کے گھوڑے کو بھی اَلْمُحْمَر کہا جاتا ہے۔
اَلْحُمْرَةُ: سرخی اَلْاَحْمَرُ وَالْاَسْوَدُ: عرب وعجم (اس میں عمومی رنگت کا لحاظ کیا گیا ہے) اور کبھی حَمْرَاءُ العجان (کنایہ از عجم) بھی کہا جاتا ہے۔ [1]
اَلْاَحْمَرَان: گوشت اور شراب [2] اَلْمَوْتُ الْاَحْمَرُ: سخت موت، وہ موت جو قتل سے واقع ہو سَنَةٌ حَمْرَاءُ: قحط سالی۔ کیونکہ اس میں فضا کا رنگ سرخ نظر آتا ہے اسی بنا پر سخت گرمی کو حَمْرَّةُ القیظ کہا جاتا ہے۔ وَطْأَةٌ حَمْرَاءُ: قدم کا تازہ نشان اس کے بالمقابل مٹے ہوئے نشان کو وَطْأَةٌ دَهْمَاءُ بولتے ہیں۔

(ح م ل)

اَلْحَمْلُ: (ض) کے معنیٰ بوجھ اٹھانے یا لادنے کے ہیں اس کا استعمال بہت سی چیزوں کے متعلق ہوتا ہے اس لئے صیغہ فعل یکساں رہتا ہے۔ مگر بہت سے استعمالات میں بلحاظ مصادر کے فرق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بوجھ جو حسی طور پر اٹھائے جاتے ہیں جیسا کہ کوئی چیز پیٹھ پر لادی جائے اس پر حمل (بکسر الحا) کا لفظ بولا جاتا ہے اور جو بوجھ باطن یعنی کوئی چیز اپنے اندر اٹھائے ہوئے ہوتی ہے اس پر حَمْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ۔ بادل میں پانی اور عورت کے حمل کے ساتھ تشبیہ دیکر درخت کے پھل کو بھی حَمْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ﴾ (۳۵۔۱۸) اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ

---

[1] وفی حدیث علی عارضه رجل من الموالی فقال: اسکت یاابن حمراء العجان ای یاابن الامة والعجان مابین القبل والدبر وهی کلمة تقولها العرب فی السب والذم (النهایة ۱: ۴۴۰).

[2] وایضاالذهب والزعفران ویقال للماء واللبن الابیضان وللتمر والماء الاسوادان (النهایة).

بٹانے کوکسی کو بلائے تو وہ اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا۔

اور حَمَلْتُ کا صیغہ ہر قسم کا بوجھ اٹھانے پر بولا جاتا ہے خواہ وہ بوجھ ظاہری ہو یا باطنی مثلاً کہا جاتا ہے حَمَلْتُ الثِّقْلَ حَمْلًا میں نے بوجھ اٹھایا۔ الرسالة پیغام اٹھایا۔ اَلْوِزْرَ: گناہ کا بوجھ اٹھایا۔ قرآن میں ہے:

﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ (۲۹۔۱۳) یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور (لوگوں کے) بوجھ بھی۔

﴿وَمَا هُمْ بِحَامِلِيْنَ مِنْ خَطَايَاهُمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ (۲۹۔۱۲) حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بوجھ اٹھانے والے نہیں۔

﴿وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ مَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ﴾ (۹۔۹۲) اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر تم کو سوار کروں۔

﴿لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (۱۶۔۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ﴾ (۶۲۔۵) جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی پھر انہوں نے اس (کے بارِ تعمیل) کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر احکام توراۃ کی بجا آوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی مگر انہوں نے اس میں کوتاہی کی۔ کہا جاتا ہے۔ حَمَلْتُهٗ وَحَمَلْتُ عَلَيْهِ كَذَا: میں نے اس کے ذمہ فلاں کام لگایا۔ تَحَمَّلَ وَاحْتَمَلَ وَحَمَلَ اس کے مطاوع آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔

﴿حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ (۶۹۔۱۱) تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کر لیا۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ......﴾ (۲۴۔۵۴) اگر منہ موڑو گے تو رسول پر (اس چیز کا ادا کرنا) ہے جو ان کے ذمے ہے اور تم پر (اس چیز کا ادا کرنا) ہے جو تمہارے ذمے ہے۔

﴿لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا﴾ (۲۔۲۸۶) ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار! جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو۔

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ (۵۴۔۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔

﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا﴾ (۱۷۔۳) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا بے شک

نوح (ہمارے) شکر گزار بندے تھے۔

﴿وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ﴾ (۶۹۔۱۴) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھالئے جائیں گے۔

حَمَلَتِ الْمَرْأَةُ: عورت کا حاملہ ہونا اسی طرح حَمَلَتِ الشَّجَرَةُ. کا محاورہ استعمال ہوتا ہے حَمْلٌ کی جمع اَحْمَالٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (۶۵۔۴) اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے۔

﴿وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ﴾ (۴۱۔۴۷) اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔

﴿حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ﴾ (۷۔۱۸۹) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے اور اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔

﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَّحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (۴۶۔۱۵) اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی سال میں ہوتا ہے۔

اصل میں حَمْلٌ کے معنی پیٹھ پر بوجھ لادنا کے ہیں پھر بطور استعارہ عورت کے حمل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا اونٹنی کے حاملہ ہونے کے لئے وَسَقَتِ النَّاقَةُ بولا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَمُوْلَةُ (بالفتح) اسے کہتے ہیں جس پر بوجھ لادا گیا ہو۔ اور یہ قَتُوْبَة اور رَكُوْبَة کی طرح ہے اور جو بوجھ لدا ہوا ہے اسے حُمُولة (بالضم) کہا جاتا ہے اور حَمَلٌ بمعنی محمول آتا ہے اور یہ خاص کر بھیڑ کے چھوٹے بچے پر بولا جاتا ہے کیونکہ اسے چلنے سے عاجز یا نوزائیدہ ہونے کی وجہ سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور حَمْلٌ کی جمع اَحْمَال وَحِملان آتی ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر بادل کو حامل کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا﴾ (۵۱۔۲) اور پانی کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اَلْحَمِيلُ: بہت پانی والا بادل۔ نیز حمیل اس کوڑا کرکٹ کو بھی کہا جاسکتا ہے جو سیلاب بہا کر لے آتا ہے اور اجنبی مسافر اور ضامن پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ ضامن بھی مقروض کے ساتھ اس کی ضمانت کا بوجھ اٹھائے ہوتا ہے۔ نیز اَلْحَمِيل اس بچے کو کہتے ہیں جس کا نسب ثابت نہ ہو۔ چنانچہ میراثُ الحمیل کا مسئلہ ہے یعنی اس شخص کی میراث جس کا سبب متحقق نہ ہو۔ ❶

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ: کنایۃً چغل خور۔

فُلَانٌ يَحْمِلُ الْحَطَبَ الرَّطَب: یعنی فلاں چغلی کھاتا ہے۔

(ح م ی)

اَلْحَمْیُ۔ وہ حرارت جو گرم جواہر جیسے آگ، سورج وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی جو بدن میں

❶ وفي حديث انه كتب الى شريح الحميل لايورث الابيينة (النهاية) وفي الترمذي .... كان ابي حميلا فورثه مسروق.

❷ الاول قراءة ابن مسعود الحسن والثاني ابن عباس وعليه المصحف وفي مجاز ابي عبيدة: في عين حمئة (۸۶) تقديرها فعلة وهي مهموز ومجازها ذات حمأة ومن لم يهمز جعل مجازه مجازفعلة من الحرالحامي وموضعها حامية.

قوت حارہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ عَيْنٍ حَامِيَةٍ﴾ (۱۸۔۸۶) گرم چشمے میں۔

ایک قرأت میں حَمِئَةٍ ہے [2]

﴿يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ﴾ (۹۔۳۵) جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا۔

حَمِيَ النَّهَارُ: دن گرم ہو گیا۔اُحْمِيَتِ الْحَدِيْدَةُ: لوہا گرم کیا گیا۔

حُمَيَّا الْكَاسِ: شراب کی تیزی، اور انسان کی قوت غصبیہ جب جوش میں آ جائے اور حد سے تجاوز کر جائے تو اسے بھی حَمِيَّة کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے حَمِيْتُ عَلٰى فُلَانٍ: میں فلاں پر غصے ہوا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ (۴۸۔۲۶) اور ضد بھی جاہلیت کی۔

پھر استعارہ کے طور پر حَمَيْتُ الْمَكَانَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کسی جگہ کی حفاظت کرنا۔ایک روایت میں ہے [1] (۹۹) لَا حِمٰى اِلَّا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کہ چراگاہ کا محفوظ کرنا صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے۔

حَمَيْتُ اَنْفِيْ مَحْمِيَةً: میں نے اپنی عزت کی حفاظت کی۔حَمَيْتُ الْمَرِيْضَ حَمْيًا: بیمار کو نقصان دہ چیزوں سے روک دیا۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا حَامٍ﴾ (۵۔۱۰۳) اور نہ حام۔

میں بعض کے نزدیک حَامٍ سے وہ نر اونٹ مراد ہے جس کی پشت سے دس بچے پیدا ہو چکے ہوں (اس کے متعلق) کہہ دیا جاتا تھا حُمِيَ ظَهْرُهٗ فَلَا يُرْكَبُ اس کی پشت محفوظ لہٰذا اس پر کوئی سوار نہ ہو۔

اَحْمَاءُ الْمَرْءَةِ: خاوند کی طرف سے عورت کے رشتہ دار کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اضافت کے وقت تینوں حالتوں میں حَمَاهَا وَحَمُوْهَا وَحَمِيْهَا کہا جاتا ہے۔بعض حَمْءٌ (مہموز) بھی بولتے ہیں جیسا کہ كَمْءٌ ہے۔

اَلْحَمْأَةُ وَالْحَمَأُ سیاہ بدبودار مٹی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (۱۵۔۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔کہا جاتا ہے حَمَأْتُ الْبِئْرَ: کیچڑ میں نے کنوئیں کو صاف کیا۔اَحْمَأْتُهَا: اسے کیچڑ سے بھر دیا۔

ایک قرأت میں ﴿عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ (۱۸۔۸۶) ہے یعنی سیاہ بدبودار کیچڑ والا چشمہ۔

(ح ن ن)

اَلْحَنِيْنُ: کسی چیز کی طرف مشفقانہ کھنچنا کہا جاتا ہے۔

حَنَّتِ الْمِرءَةُ وَالنَّاقَةُ لِوَالِدِهَا عورت اور اونٹنی کا اپنے بچے کا مشتاق ہونا اس اشتیاق کے ساتھ چونکہ کبھی آواز بھی ہوتی ہے اس لئے حنین اس آواز کو کہتے ہیں

---

[1] الحديث في النهاية (حمى) وباختلاف الفاظه في معجم الاصبهاني وابن النجار عن ابن عباس (حم خ د) عن الصعب بن جثامة راجع كنزالعمال ۱۲.

[2] وفي النهاية : انه كان يصلي الى جذع في مسجده فلما عمل له المنبر صعد عليه فحن الجذع اليه كذافي النهاية وفي رواية كان يخطب بدل يصلي ثم حديث حنين الجزع معروف رواه جماعة من الصحابة وفي بعض الروايات فخار كخوار الثور حتىٰ ارتج المسجد فلامعنىٰ لتاويل المؤلف وحمله على المجاز راجع للحديث الدارمي رقم ۳۱-۴۲.

کہ جس میں اشتیاق اور شفقت پائی جائے یا اشتیاق کی صورت کا تصور کے بھی یہ لفظ بو لا جاتا ہے چنانچہ (حدیث) حَنِیْنُ الْجِذْعِ اس معنیٰ پر محمول ہے ❷

رِیْحٌ حَنُوْنٌ: سرسراہٹ سے چلنے والی ہوا۔

قَوْسٌ حَنَّانَۃٌ: آواز نکالنے والی کمان۔محاورہ ہے (مثل) مَالَہٗ حَانَّۃٌ وَّلَا آنَّۃٌ ۔یعنی اس کے پاس نہ اونٹنی ہے اور نہ کوئی موٹی بھیڑ اس میں اونٹنی اور بھیڑ کی یہ صفت ان کے صوت کی بنا پر ہے ۔ اور حنین چونکہ معنیٰ شفقت پر مشتمل ہوتا ہے اور شفقت میں ہمیشہ جذبہ رحمت کارفرما ہوتا ہے اس لئے اس سے مراد رحمت لے لی جاتی ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا﴾ (۱۹۔۱۳) اور اپنے پاس سے شفقت ....دی تھی۔

اسی سے اسمائے حسنیٰ اَلْحَنَّانُ وَالْمَنَّانُ ہے جس کے معنیٰ بہت زیادہ رحم کھانے کے ہیں۔حَنَانَیْكَ: تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہو۔یہ لَبَّیْكَ وَ سَعْدَیْكَ کی طرح تثنیہ لایا جاتا ہے۔

حُنَیْن: (مکہ اور طائف کے درمیان) ایک مشہور مقام کا نام ہے (جہاں ۸ھ کو جنگ حنین ہوئی تھی) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ﴾ (۹۔۲۵) اور (جنگ) حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرّہ تھا۔

(ح ن ث)

اَلْحِنْثُ: گناہ، نافرمانی قرآن پاک میں ہے:

﴿وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ﴾ (۵۶۔۴۶) اور گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔

اسی لئے یَمِیْن غَمُوْص: (جھوٹی قسم) کو بھی حِنْثٌ کہا جاتا ہے۔اور حَنِثَ فِیْ یَمِیْنِہٖ کے معنیٰ قسم توڑنے کے ہیں اور حِنْث کے معنیٰ سن بلوغت کے بھی آتے ہیں ۔ کیونکہ اس عمر میں انسان جو گناہ کرے گا اس پر اس کا مواخذہ ہوگا۔کہا جاتا ہے بَلَغَ فُلَانٌ الْحِنْثَ: فلاں بالغ ہوگیا۔اَلْمُتَحَنِّثُ وہ شخص جو اپنے آپ سے گناہ کو دور کرنے کے لئے عبادت کرے جیسے متحرج اور متأثم کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

(ح ن ج ر)

اَلْحَنْجَرَۃُ: (نرخرہ) نائے گلو یعنی بیرونی جانب سے حلقوم کا سرا اس کی جمع حنَاجِر آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿لَدَی الْحَنَاجِرِ کَاظِمِیْنَ﴾ (۴۰۔۱۸) غم سے بھر کر گلو تک آ رہے ہوں گے۔

﴿وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ (۳۳۔۱۰) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔

(ح ن ذ)

اَلْحَنِیْذُ: (بھونا ہوا) قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ﴾ (۱۱۔۶۹) کہ ایک بھونا ہوا بچھڑا لے آئے۔

یعنی وہ بچھڑا جو دو گرم پتھروں کے درمیان رکھ کر کباب کیا گیا تھا اور یہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اس سے لزوجت بہہ کر نکل جائے۔یہ حَنَذْتُ الْفَرَسَ سے ماخوذ ہے

جس کے معنیٰ پسینہ لانے کے لئے گھوڑے کو ایک دو چکر دوڑا کر اس پر جھول ڈال دینے کے ہیں ایسے گھوڑے کو مَحْنُوْذٌ اور حَنِیْذٌ کہا جاتا ہے۔

حَنَذَتْنَا الشَّمْسُ: ہمیں سورج نے جھلس دیا۔

اور پسینہ سے چونکہ معمولی سا پانی نکلتا ہے۔اس لئے جب کوئی شراب پلائے تو اس سے کہا جاتا ہے۔اَحْنِذْ یعنی اس میں تھوڑا سا پانی ملا لو یعنی پسینہ کی مقدار میں یا اس رطوبت کی طرح جو حَنِیذ یعنی کباب کئے ہوئے گوشت سے نکلتی ہے۔

(ح ن ف)

اَلْحَنْفُ کے معنیٰ گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔اس کے بالمقابل جَنفٌ ہے جس کے معنیٰ ہیں استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا۔

اَلْحَنِیْفُ: (بروزن فعیل) جو باطل کو چھوڑ کر استقامت پر آ جائے قرآن پاک میں ہے:

﴿قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا﴾ (۱۶۔۱۲۰) اور خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک کے ہو رہے تھے۔

﴿حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ (۳۔۶۷) سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو رہے تھے۔

حَنِیْفٌ کی جمع حُنَفَاء آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ﴾ (۲۲۔۳۰، ۳۱) اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو صرف ایک خدا کے ہو کر۔

تَحَنَّفَ فُلَانٌ: راہ استقامت کی تلاش کرنا۔

ہر وہ شخص جو بیت اللہ کا حج کرتا اور ختنہ کرواتا عرب کے لوگ اسے حَنِیْف کہہ کر پکارتے تھے۔یعنی وہ دینِ ابراہیم کا پابند ہے۔

اَلْاَحْنَفُ: جس کے پاؤں میں کجی ہو۔کبھی تفاعل کے طور پر کسی کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔بعض کہتے ہیں کہ صرف مائل ہونے کے معنیٰ میں بطور استعارہ آتا ہے۔

(ح ن ک)

اَلْحَنْكُ: کے معنی انسان یا چوپائے کے تالو کے ہیں اور کوّے کی چونچ کو حنک کہا جاتا ہے۔کیونکہ یہ اس کے لئے بمنزلہ انسان کے تالو کے ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

اَسْوَدُ مِثْلَ حَنَكِ الْغُرَابِ اَوْ حَلَكِ الْغُرَابِ (وہ کوّے کی چونچ یا اس کے پروں کی طرح سیاہ ہے) یہاں حنك کے معنیٰ منقار اور حلک کے معنیٰ پروں کی سیاہی کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (۱۷۔۶۲) تو میں تھوڑے شخصوں کے سوا اس کی (تمام) اولاد کی جڑ کاٹتا رہوں گا۔

میں یہ حَنَكْتُ الدَّابَّةَ سے بھی مشتق ہو سکتا ہے جس کے معنیٰ اس کے منہ میں لگا دینے یا رسی باندھنے کے ہیں۔پس یہ لَاُلْجِمَنَّ فُلَانًا وَلَاُرْسِنَنَّهٗ کی طرح ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِحْتَنَكَ الْجَرادُ الْاَرْضَ سے مشتق ہو جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو صفا چٹ کر دینے کے ہیں پس آیت کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ میں انہیں اس طرح تباہ و برباد کروں گا جیسے ٹڈی زمین پر

سے نبات صفاحیٹ کر دیتی ہے۔
حَنَّكَهُ الدَّهْرُ: زمانہ نے اسے تجربہ کار بنا دیا۔
جیسا کہ نَجَّرَهُ وَقَرَعَ سِنَّهُ وَافْتَرَّهُ وغیرہ استعارات تجربہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ح و ب)

اَلْحَوْبُ: (ن) جرم کا ارتکاب کرنا۔ حُوْبٌ (اسم) گناہ۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا﴾ (۴۔۲) کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔
ایک روایت میں ہے [1]
(۱۰۰) طَلَاقُ اُمِّ اَيُّوْبَ حُوْبٌ کہ ام ایوب کو طلاق دینا گناہ عظیم ہے۔ اور طلاق کو حوب کہنا اس بنا پر ہے کہ وہ ممنوع عنہ ہے اور یہ حَابَ حُوْبًا وَحَوْبًا وَحِيَابَةً سے ہے جس کے معنیٰ ارتکاب جرم کے ہیں۔
اصل میں حَوَبٌ کا لفظ کلمہ زجر ہے جو اونٹوں کو ڈانٹنے کے لئے بولا جاتا ہے۔
فُلَانٌ يَتَحَوَّبُ مِنْ كَذَا: فلاں گناہ سے بچتا ہے جیسے يَتَأَثَّمُ عرب لوگ کہتے ہیں (مثل) اَلْحَقَ اللّٰهُ بِهِ الْحَوْبَةَ: اللہ اسے مسکنت اور احتیاج میں مبتلا کرے اصل میں حَوْبَة اس حاجت کو کہتے ہیں جو انسان کو ارتکاب جرم پر آمادہ کر لے کہا جاتا ہے کہ بَاتَ فُلَانٌ بِحِيْبَةِ سُوْءٍ: فلاں نے بری حالت میں رات گزاری۔
اَلْحَوْبَاءُ فُلَانٌ: بقول بعض نفس کے معنیٰ میں آتا ہے۔ لیکن اصل میں حَوْبَاءُ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہ کا مرتکب ہو جسے قرآن پاک: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (۱۲۔۵۳) میں نفس امارہ سے تعبیر کیا ہے۔

(ح و ت)

اَلْحُوْتُ بڑی مچھلی کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿نَسِيَا حُوْتَهُمَا﴾ (۱۸۔۱۶) تو اپنی مچھلی بھول گئے۔
﴿فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ﴾ (۳۷۔۱۴۲) پھر مچھلی نے ان کو نگل لیا۔
اس کی جمع حِيْتَانٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا﴾ (۷۔۱۶۳) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں۔
اور مچھلی چونکہ رخ بدلتی رہتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے حَاوَتَنِيْ فُلَانٌ اس نے مجھے مچھلی کی طرح دھوکا دیا۔

(ح و ج)

الْحَاجَةُ: اس چیز کی ضرورت کو کہتے ہیں جس کی دل میں محبت ہو اس کی جمع حَاجَاتٌ و حَوَائِجُ آتی ہے اور حَاجَ (ن) يَحُوْجُ وَاحْتَاجَ کے معنیٰ ضرورت مند ہونے کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰهَا﴾ (۱۲۔۶۸) ہاں وہ یعقوب کے دل کی خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی۔
﴿حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا......﴾ (۵۹۔۹) اور جو کچھ ان کو

---

[1] اخرجه ابوداؤد وفی المرسل وابراهيم الحربی فی الغريب من رواية ابن سيرين ورواه يحیٰ الهمدانی فی مسنده والطبرانی فی الاوسط عن ابن سيرين عن ابن عباس وزاد: قال ابن سيرين الحوب الاثم وروی الحاكم عن انس لئكن فيه ان طلاق ام سليم لحوب (راجع للتفصيل ذيل الكشاف ۱: ۴۶۶ وتخريج الكشاف ۳۸ رقم ۳۱۶، وفی ذيل الامالی الزق والحوبة المسكنه ۱۲.

ملا اس سے کچھ خواہش۔
اَلْحَوجَاءُ کے معنیٰ حاجت ہی کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ حَاجٌ ایک قسم کے کانٹے کو کہتے ہیں۔

(ح و ذ)

اَلْحَوْذُ: (ن) کے معنیٰ ہیں ہانکنے والا، جو اونٹ کے پیچھے اس کے رانوں کے عین بیچ میں چل کر وہاں سے سختی کے ساتھ اسے ہانکے جائے۔ حَاذَ الْاِبِلَ: سختی کے ساتھ ہانکنا اور آیت:
﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ﴾ (۵۸۔۱۹) شیطان نے ان کو قابو میں کرلیا ہے۔
میں استحوذ کے معنیٰ ان پر مسلط ہو کر ہانکنے کے ہیں۔ یہ اِسْتَحْوَذَ الْعِيْرُ عَلَى الْاَتَانِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی گدھے کا مادۂ خر کی پشت پر چڑھ کر دونوں جانب سے قابو پالینا (جیسا کہ جفتی کی صورت میں ہوتا ہے) اس میں ایک قرأت اِسْتَحَاذَ بھی ہے جو قیاس کے مطابق ہے آیت میں شیطان کے بنی آدم پر غلبہ پانے کے لئے اِسْتَحْوَذَ کا استعمال بطور استعارہ کے ہے جیسا کہ اِقْتَعَدهُ الشَّيْطَانُ وَارْتَكَبَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شیطان نے اسے اپنی سواری بنالیا۔
اَلْاَحْوَذِيُّ: مردسبک فہم و نیک کارگزار، کسی چیز کا ماہر یہ حَوْذٌ بمعنیٰ سَوْقٌ (چلانا) سے مشتق ہے۔

(ح و ر)

اَلْحَوْرُ: (ن) کے اصل معنیٰ پلٹنے کے ہیں خواہ وہ پلٹنا بلحاظ ذات کے ہو یا بلحاظ فکر کے اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾ (۸۴۔۱۴) اور خیال کرتا تھا کہ (خدا کی طرف) پھر کر نہیں آئے گا۔
میں لَنْ يَّحُوْرَ سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:
﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰى وَ رَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ﴾ (۶۴۔۷) جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دو کہ ہاں ہاں!! میرے پروردگار کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔
حَارَ الْمَاءُ فِي الْغَدِيْرِ: پانی کا حوض میں گھومنا۔
حَارَ فِيْ اَمْرِهٖ: کسی معاملہ میں متحیر ہونا۔
اسی سے مِحْوَرٌ ہے۔ یعنی وہ لکڑی جس پر چرخی گھومتی ہے اور گھومنے کے معنیٰ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔
سَيْرُ السَّوَانِيْ اَبَدًا لَّا يَنْقَطِعُ کہ پانی کھینچنے والے اونٹ ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔
مَحَارَةُ الْاُذُنِ کان کا گڑھا۔ یہ مَحَارَةُ الْمَاءِ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں آواز سے ہوا اس طرح چکر کاٹتی ہے۔ جیسے گڑھے میں پانی گھومتا ہے۔ اَلْقَوْمُ فِيْ حَوَارٍ یعنی زیادتی کے بعد نقصان کی طرف لوٹ رہے ہیں حدیث میں ہے [1]
(۱۰۱) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ: ہم زیادتی کے بعد کمی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یا کسی کام کا

---

[1] الحدیث فی اللسان(حور) کور، کون ،) ومجالس ثعلب ۳۵۱ ومجازات القران للشریف الرضی ۲۸۳ والمجازة النبویة واساس البلاغة والفائق ۲: ۳۱۱ وفیه بعدالکون وغریب ابی عبید۱: ۲۱۹ والترمذی فی الدعوات والنسائی فی الاستعاذة و(حم) ۵: ۸۲-۸۳. المثل فی حل المعاجم

عزم کر لینے کے بعد اس میں تردد سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اسی طرح کہا جاتا ہے (مثل)

حَارَ بَعْدَ مَا كَارَ: زیادہ ہونے کے بعد کم ہو گیا۔

اَلْمُحَاوَرَةُ وَالْحِوَارُ: ایک دوسرے کی طرف کلام لوٹانا اسی سے تَحَاوُرٌ (تبادلہ گفتگو) ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَ كُمَا﴾ (۵۸۔۱) اور خدا تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

كَلَّمْتُهٗ فَمَا رَجَعَ اِلَىَّ حَوَارًا اَوْحَوِيْرًا اَوْ مَحْوَرَةً: میں نے اس سے بات کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مَا يَعِيْشُ بِاَحْوَرَ وہ عقل مندی سے زندگی بسر نہیں کر رہا ہے۔ اور آیات کریمہ:

﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرَاتٌ فِى الْخِيَامِ﴾ (۵۵۔۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔

﴿حُوْرٌ عِيْنٌ﴾ (۵۶۔۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

میں حُوْرٌ اَحْوَرٌ اور حَوْرَاءُ کی جمع ہے اور حَوْرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ بقول بعض آنکھ کی سیاہی میں تھوڑی سی سفیدی ظاہر ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔!

اِحْوَرَّتْ عينُهٗ: یعنی اس کی آنکھ بہت سیاہی اور سفیدی والی ہے۔ اور یہ آنکھ کا انتہائی حسن سمجھا جاتا ہے۔ جو اس سے مقصود ہو سکتا ہے۔

حَوَّرْتُ الشَّيْءَ: کسی چیز کو گھمانا۔ سفید کرنا (کپڑے کا) اسی سے اَلْخُبْزُ الْحَوَّارُ ہے جس کے معنی میدے کی روٹی کے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے انصار واصحاب کو حَوَّارِيِّيْنَ کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قصّار یعنی دھوبی تھے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ صیاد یعنی شکاری تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حواری اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو علمی اور دینی فائدہ پہنچا کر گناہوں کی میل سے اپنے آپ کو پاک کرتے تھے جس پاکیزگی کی طرف کہ آیت:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (۳۳۔۳۳) میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر انہیں تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قَصَّارٌ کہہ دیا گیا ہے ورنہ اصل میں وہ دھوبی پن کا کام نہیں کرتے تھے۔ اور اس سے وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جو معرفت حقائق کی بنا پر عوام میں متداول پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار نہ کرے اسی طرح ان کو صیاد اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو حیرت سے نکال کر حق کی طرف لا کر گویا ان کا شکار کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا [1]: (۱۰۲) الزبیر ابن عمتی وحواریَّ کہ زبیر میرا پھوپھی زاد بھائی اور حواری ہے نیز فرمایا: [2] (۱۰۳) لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيٌّ وَحَوَارِيَّ

[1] اخرجه النسائی والترمذی والبخاری من حدیث جابر و(ت ك)عن علی راجع الفتح مناقب زبیر بن العوام وتخریج الکشاف لابن حجر ۱۲۔

[2] قاله نابغة واوله: ولاارى فاعلافى الناس يشبهه الشطرفى الاشباه النحويه (۲: ۷) والبيت فى مختار الشعرالجاهلى ۱: ۷۷ والعقد الثمين ۷ واللسان (حشى) وديوانه ۴۲) والخزانة ۲: ۴۴) والمغنى لابن هشام ۱: ۱۳۰) والعينى (۱: ۳۸) والسيوطى ۲۸۔۲۷) واسرار ابن الانبارى ۲۰۸ وشرح العشر للتبريزى ۲۹۶ و اسمه ابوامامة زيادبن معاويه المتوفى (نحو ۱۸ق) واختلف العلماء فى حاشى هل هو فعل اوحرف جر واستدل المبرد بهذاالبيت على ان حاشىٰ قد تكون فعلاً انظرللتفصيل فى البغداديه ۲: ۴۴۔۴۵)۔

الزبیر کہ ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری رہا ہے اور میرا حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہے ۔ اس روایت میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حواری کہنا محض نصرت اور مدد کے لحاظ سے ہے ۔جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا۔

﴿مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ (۱۶۔۱۴) بھلا کون ہیں جو خدا کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں ۔حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔

(ح و ش)

حَاشا (کلمہ استثناء اور تنزیہہ ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ﴾ (۱۲۔۱۳) یعنی وہ شخص ہر نقص سے پاک اور دور ہے۔

ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ یہ تنزیہ اور استثناء کے لئے آتا ہے۔ ابوعلی الفسوی کا قول ہے کہ حاش اسم نہیں ہے۔کیونکہ اس پر حرف جر داخل نہیں ہوتا۔اور نہ حرف ہے کیونکہ حرف میں جب تک تضعیف نہ ہو اس میں سے حذف نہیں ہوتا۔ حالانکہ حاش وحاشی دونوں طرح بولتے ہیں۔پس بعض حاش کو مستقل کلمہ مان کر اسے حَوش بمعنیٰ وَحْشی سے مشتق مانتے ہیں۔اور اسی سے حُوْشِیُّ الْکَلَامِ (وحشی کلام) ہے اور بعض نے کہا ہے حَوش کے معنیٰ مذکر جن کے ہیں اور اسی کی طرف وَحشۃُ الصید منسوب ہے۔اور اَحْشَتْہُ کے معنیٰ میں کہ شکار کو ہر طرف سے گھیر کر پھندے کی طرف لایا۔

وَاسْتَوحَشُوہٗ وَتَحوّشُوہٗ: انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اَلْحَوْشُ (ن) ایک کنارے سے کھانا۔بعض نے کہا ہے کہ یہ حشی سے مقلوب ہے اور اسی سے حَاشِیۃ ہے جس کے معنیٰ کنارے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے (بسیط)

(۱۲۲) وَمَا اُحَاشِیْ مِنَ الْاَقْوَامِ مِنْ اَحَدٍ

اور لوگوں سے میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا (گویا شاعر نے کہا) ہے کہ میں کسی کو ایک حشا میں نہیں رکھتا۔کہ تمہاری فضیلت بیان کرتے وقت اسے مستثنیٰ کرنا پڑے۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے (طویل)

(۱۲۳) وَلَا یَتَحَشَّی الْفَحْلُ اِنْ اَعْرَضَتْ بِہٖ
وَلَا یَمْنَعُ الْمِرْبَاعَ مِنْہُ فصیلھا

(ح و ط)

اَلْحَائِطُ: دیوار جو کسی چیز کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور اِحَاطۃ (افعال) کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اجسام کے متعلق جیسے۔اَحَطْتُ بِمَکَانِ کَذَا یہ کبھی ❶ بمعنیٰ حفاظت کے آتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اَلَا اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُحِیْطٌ﴾ (۴۲۔۵۴) سن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یعنی وہ ہر جانب سے ان کی حفاظت کرتا ہے ۔ اور کبھی روکنے کے معنیٰ میں آتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اِلَّا اَنْ یُّحَاطَ بِکُمْ﴾ (۱۲۔۶۶) مگر یہ کہ تم گھیر لئے جاؤ۔یعنی تمہیں روک لیا جائے۔اور آیت کریمہ:

﴿اَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْئَتُہٗ﴾ (۲۔۸۱) اور اس کے گناہ (ہر طرف سے) اس کو گھیر لیں۔

میں بہت بلیغ استعارہ ہے کیونکہ انسان جب کسی صغیرہ گناہ

---

❶ قالہ رجل من بنی عکل والبیت فی المعانی للقتبی ۳۹۲ و ۱۲۳۷ اللسان (حشی) عن الباھلی فی المعانی ۱۲۳).

کا ارتکاب کرتا ہے اور اسے بار بار کرتا ہے تو یہ اسے کسی بڑے گناہ کے ارتکاب کی طرف کھینچ کرلے جاتا ہے۔ اس طرح وہ برابر گناہوں کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور وہ گناہ کو چھوڑ نہیں سکتا (تو گویا گناہ نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا)۔

(۲) دوم احاطہ بالعلم ہے جیسے فرمایا:

﴿قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ (۶۵۔۱۲) اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ﴾ (۳۔۱۲۰) یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيطٌ﴾ (۱۱۔۹۲) میرا پروردگار تو تمہارے سب اعمال پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اور کسی چیز پر علم کے ذریعے احاطہ کر لینے کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس چیز کے وجود، جنس، کیفیت، اس کی غرض اور اس کو مالہ وماعلیہ کو پوری طرح جان لے۔ اور اس طرح کا احاطہ اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قرآن پاک نے مخلوق سے اس قسم کے احاطہ علمی کی نفی کی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ﴾ (۱۰۔۳۹) حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر یہ قابو نہیں پاسکتے اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا۔ اور خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا:

﴿وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا﴾ (۱۸۔۶۸) اور جس بات کی تمہیں خبر ہی نہیں اس پر صبر کر بھی کیونکر سکتے ہو۔

اس میں تنبیہ ہے کہ جب تک کسی چیز پر پوری طرح احاطہ نہ ہو اس وقت تک کامل صبر بہت مشکل ہوتا ہے اور کسی چیز کے بغیر ناممکن ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ﴾ (۱۰۔۲۲) اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (اب تو لہروں میں) گھر گئے۔

میں احاطہ بالقدرۃ مراد ہے اسی طرح فرمایا:

﴿وَاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا﴾ (۴۸۔۲۱) اور غنیمتیں دیں جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (اور) وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں۔

﴿اِنِّیْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ﴾ (۱۱۔۸۴) مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تم کو گھیر کر رہے گا۔

اَلْاِحْتِيَاطُ: (افتعال) یعنی ایسے وسائل بروئے کار لانا جن کے ذریعہ کسی (مضر) سے بچاؤ ہوسکے۔

(ح و ل)

اَلْحَوْلُ: (ن) دراصل اس کے معنیٰ کسی چیز کے متغیر ہونے اور دوسری چیزوں سے الگ ہونا کے ہیں۔ معنیٰ تغیر کے اعتبار سے حَالَ الشَّیْءُ يَحُوْلُ حُوُوْلًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کسی شے کے متغیر ہونے کے ہیں۔ اور استحَالَ کے معنیٰ تغیر پذیر ہونے کے لئے مستعد ہونے کے اور معنیٰ انفصال کے اعتبار سے حَالَ بَيْنِیْ وَبَيْنَكَ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی میرے اور اس کے درمیان فلاں چیز حائل ہوگئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ (۸۔۲۴) اور جان رکھو! کہ خدا آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے۔

میں باری تعالیٰ کے مقلب القلوب ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تقاضوں کے

مطابق انسان کے دل میں ایسی بات ڈال دیتا ہے جو اسے اس کے مقصد سے پھیر دیتی ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ﴾ (۳۴۔۵۴) (ان میں اور ان کی خواہش کی چیزوں کے درمیان پردہ حائل کردیا گیا) بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے۔بعض نے آیت ﴿يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرءِ وَقَلْبِهٖ﴾ کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مہلت دے رکھتا ہے۔تاکہ وہ ارذل عمر کی حد تک پہنچ جائے اور جاننے کے بعد کسی چیز کو بھی نہ جان سکے۔
حَوَّلْتُ الشَّيْءَ: کسی چیز کو متغیر کرنا اور پھیر دینا۔
اور یہ تغیر کبھی باعتبار ذات کے ہوتا ہے اور کبھی باعتبار حکم اور قول کے۔اسی سے کہا جاتا ہے۔أَحَلْتُ عَلٰى فُلَانٍ بِالدَّيْنِ: میں نے فلاں پر قرض کا حوالہ کردیا۔حَوَّلْتُ الْكِتَابَ: کتاب کو نقل کرنا۔مثل مشہور ہے ❶ لَوْ كَانَ ذَا حِيْلَةٍ لَتَحَوَّلَ: اگر صاحب تدبیر ہوتا تو پھر جاتا اور آیت کریمہ:
﴿لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ (۱۸۔۱۰۸) اور وہاں سے مکان بدلنا نہ چاہیں گے۔میں حِوَلاً کے معنیٰ تَحَوَّل یعنی پھرنے کے ہیں۔
اَلْحَوْلُ: سال کو کہتے ہیں اس لئے کہ سال بھر میں سورج اپنی گردش پوری کرلیتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (۲۔۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔

﴿مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾ (۲۔۲۴۰) کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔
اسی سے حَالَتِ السَّنَةُ تَحُوْلُ کا محاورہ ہے۔جس کے معنیٰ ہیں سال گزر گیا۔حَالَتِ الدَّارُ گھر کی حالت متغیر ہوگئی۔
اَحَالَتْ وَاَحْوَلَتْ: اس پر ایک سال پورا ہوگیا۔جیسا کہ اَعَامَتْ وَاَشْهَرَتْ کا محاورہ ہے۔
اَحَالَ فُلَانٌ بِمَكَانِ كَذَا: وہ فلاں جگہ پورا ایک سال رہا۔
حَالَتِ النَّاقَةُ تَحُوْلُ حِيَالًا اونٹنی کا حاملہ نہ ہونا۔گویا اسکی پہلی حالت متغیر ہوگئی۔
اَلْحالُ: انسان وغیرہ کی وہ حالت جو نفس جسم اور مال کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے اور حَوْل کالفظ مالی، بدنی، اور جسمانی تینوں قسم کی قوت پر بولا جاتا ہے اسی سے کہا جاتا ہے۔لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ: اللہ کے سوا کچھ حیلہ اور قوت نہیں ہے۔
حَوْلُ الشَّيْءِ: کسی چیز کی وہ جانب جس کی طرف اسے پھیرنا ممکن ہو، حَول کہلاتا ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ﴾ (۴۰۔۷) اور جو لوگ عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے گرداگرد (حلقہ باندھے ہوئے) ہیں۔
اَلْحِيْلَةُ وَالْحُوَيْلَةُ: اس تدبیر کو کہتے ہیں جس سے کسی

---

❶ راجع للمثل الميداني رقم ٣٢٣٤, ٢٦٤١, ١٣٤.

چیز تک پوشیدہ طور سے پہنچا جا سکے۔ عام طور پر اس کا استعمال بری تدبیر کے لئے ہوتا ہے لیکن کبھی ایسی تدبیر کے متعلق بھی ہوتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اسی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کے وصف میں: ﴿وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ﴾ (۱۳۔۱۳) آیا ہے یعنی باری تعالیٰ خفیہ سے اس کام کو سرانجام دیتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اور اسی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کو مکر وکید کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے۔ نہ کہ بطور مذمت کے اللہ تعالیٰ تو ہر قبح سے پاک اور بالا ہے اور حِیْلَةٌ بھی حَول سے مشتق ہے۔ واؤ کا ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے اسے یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے اور اسی سے رَجُلٌ حَول کا محاورہ ہے یعنی بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔

اَلْمَحَالُ کے معنیٰ ہیں دو متناقض چیزوں کا ایک جگہ جمع ہونا یہ کبھی قول میں ہوتا ہے جیسے کہا جائے ایک جسم دو جگہوں میں ایک ہی حالت میں پایا جاتا ہے۔اِسْتَحَالَ الشَّيْءُ: کسی چیز کا محال ہونا اور اس چیز کو مُسْتَحِيلٌ کہا جاتا ہے یعنی محال ہونے لگی۔اَلْحِوَلَاءُ: یعنی سبزی جھلی جو اونٹنی کے پیٹ سے بچے کے ساتھ نکلتی ہے۔

مثل مشہور ہے ❶ وَلَا اَفْعَلُ كَذَا مَا اَرْزَمَتْ اُمُّ حَائِلٍ: جب تک کہ اونٹنی آواز نکالتی رہے، میں اس کام کو نہیں کروں گا اور ام حائل اس شتر بچہ مادینہ کو کہتے ہیں جو ابھی پیٹ سے باہر آیا ہو اور اس میں شبہ نہ رہا ہو کہ یہ مادہ ہے حالت اشتباہ کے دور ہونے کی وجہ سے اسے ام حائل کہا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں مذکر کو سقب کہا جاتا ہے۔ اَلْحَالُ: لغت میں اس صفت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی چیز موصوف ہوتی ہے اور اہل منطق کی اصطلاح میں سریع الزوال کیفیت کو حالت کہا جاتا ہے۔ جیسے حرارت برودت، یبوست اور رطوبت جو کسی چیز کو عارض ہوتی ہے۔

(ح و ی)

اَلْحَوَايَا (انتڑیاں) یہ حَوِيَّةٌ کی جمع ہے جس کے معنیٰ آنت کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوِ الْحَوَايَا اَوْمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ﴾ (۱۴۶۔۶)

انتڑیوں میں ہو یا ہڈی میں ملی ہو۔

اور حَوِيَّة اس کمبل کو بھی کہتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کے اردگرد لپٹا جاتا ہے۔ یہ اصل میں حَوَيْتُ (ض) حَيًّا وَحَوَايَة سے مشتق ہے جس کے معنیٰ جمع کرنے کے ہیں۔

اَلْاَحْوٰی: کالا سیاہ مائل بہ سبزی۔ یہ حُوَّةٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ سبزی مائل سیاہی ہیں اور اس کا باب احْوَوٰی يَحْوَوِی اِحْوِوَاءٌ آتا ہے جیسے اِرْعَوٰی بعض نے کہا ہے کہ اس وزن پر یہ دو باب ہی آتے ہیں وَلَا ثَالِثَ لَهُمَا حَوِيَ حُوَّة سیاہ سبزی مائل ہونا اسی سے اَحْوٰی ہے جس کے معنیٰ سخت سیاہ کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی﴾ (۵۔۸۷) پھر اس کو سیاہ رنگ کا کوڑا کر دیا۔

یہاں اَحْوٰی سے مراد ہے وہ گھاس جو پرانی بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ❷ ؏

---

❶ ای لا افعله ابداً راجع اللسان (حول) والامالی امر ۲۱.

❷ لم اجرها ویرجی ۱۲.

(۱۲٤) طَالَ حَبْسٌ بِالدَّرِیْنِ الاَسْوَد:
پرانی خشک اور سیاہ گھاس میں عرصہ سے محبوس ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کی ترتیب اصل یہ ہے [1] وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۔ اَحْوٰی فَجَعَلَه غُثَاءً: یعنی اللہ تعالیٰ سبز چارہ اگاتا ہے پھر اس کو کوڑا بنا دیتا ہے۔

(ح ی ث)

حَیْثُ: (یہ ظرف مکان مبنی بر ضم ہے) اور مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ﴾ (۲۔۱۴۴) اور تم جہاں ہوا کرو۔
﴿وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ﴾ (۲۔۱۴۹) اور تم جہاں سے نکلو۔

(ح ی د)

اَلْحَیْدُ: (ض) کے معنیٰ پہلوتہی کرنے اور دور بھاگنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ذٰلِكَ مَا کُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ﴾ (۵۰۔۱۹) (اے انسان) یہی (وہ حالت) ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

(ح ی ر)

حار (ض) حَیْرَةً فَهُو حَائِرٌ وَحِیْرَان وتَحَیَّرَ وَاستَحارَ کے معنیٰ کسی کام سے بھکنے اور متردد ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿کَالَّذِیْ اسْتَهْوَتْهُ الشَّیطَانُ فِی الْاَرْضِ حَیْرانَ﴾ (۶۔۷۱) جیسے کسی کو جنات نے جنگل میں بھلا دیا ہو۔ (اور وہ) حیران ہو رہا ہو۔

اَلْحَائِرُ: جائے گرداب۔ شاعر نے کہا ہے [2]

(۱۲۵) وَاسْتَحَارَ شَبَابُهَا

اور اس کی جوانی بھر پور ہوگئی۔ اور استحار کے معنیٰ پانی سے پیٹ کے اس قدر پر ہو جانے کے ہیں کہ اسے حیرت لاحق ہو جائے۔
اَلْحِیْرَةُ: ایک مقام کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پانی کے جمع ہونے کی وجہ سے اس مقام کا نام حیرہ پڑ گیا تھا۔

(ح ی ص)

حاصَ (ض) عنِ الحَقِّ کے معنیٰ حق سے بھاگ کر شدت ومکروہ کی طرف جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿هَلْ مِنْ مَّحِیْصٍ﴾ (۵۰۔۳۶) کہ کہیں بھاگنے کی جگہ ہے۔
﴿مَالَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ﴾ (۱۴۔۲۱) کوئی جگہ گریز اور رہائی ہمارے لئے نہیں ہے۔
یہ اصل میں حَیْصٌ وَبَیْصٌ سے ہے جس کے معنیٰ شدت اور سختی کے ہیں۔ مگر اَلْحوصُ (اجوف وادی) ہو تو اس کے معنیٰ چمڑا سلنا ہوتے ہیں اور اسی سے حُصْتُ عینَ الصَّقْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ صقرہ کی آنکھیں سی دینے کے ہیں۔

---

[1] وعلیٰ هذا التقدیر یکون احویٰ حالاً کمافی الکشاف ٤ : ۷۳۸ وذکره ثعلب فی مجالسه ۳۷۰ فی امثلة القلب ۱۲.

[2] قاله ابو ذؤیب الهذلی وتکملته ثلاثة اعوام فلماتجرمت ۔تقتضی شبابی .... والبیت فی اللسان والصحاح والتاج (حرم) والمحکم (حیر) وفی روایته احوال بدل اعوام الینا بهون بدل تقتضی بدل تقضیٰ شبابی ودیوان الهذلیین الستة (۱ : ۷۱) والسیوطی ۹ فی روایته علینا بهون وکذافی (س) ودیوان الهذلیین ۱۲.

(ح ی ض)

اَلْـحَـیْـضُ: وہ خون جومخصوص دنوں میں صفت خاص کے ساتھ عورت کے رحم سے جاری ہوتا ہے اسے حیض کہا جاتا ہے اور مَحِیض کے معنی حیض، وقت حیض اور مقام حیض کے ہیں۔ کیونکہ فعل سے اس قسم کے مصادر مَفعَلٌ کے وزن پر آتے ہیں جیسے مَعَاشٌ وَمَعَادٌ اور شاعر کے قول ❶ ع (الکامل)

(۱۲۶) لَا یَسْتَطِیْعُ بِهَا الْقُرَادُ مَقِیْلًا

(کہ چچڑی اس میں قیلولہ کی جگہ بھی نہیں پاتی)

میں مقیلا ظرف ہے یعنی قیلولہ کرنے کی جگہ گو بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے اور کہا جاتا ہے مَافِیْ بُرِّكَ مَكِیلٌ وَمَكَالٌ کہ تیرے غلہ میں ماپ نہیں ہے۔

(ح ی ف)

اَلْـحَیْفُ: (ض) فیصلہ کرنے میں ایک جانب کو جھک جانا انصاف نہ کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (۲۴۔۵) یا ان کو خوف ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان کے حق میں ظلم کریں گے۔ (نہیں) بلکہ یہ خود ظالم ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

تَحَیَّفْتُ الشَّیْءَ میں نے اسے کناروں سے پکڑا۔

(ح ی ق)

اَلْحُیُوْقُ وَالْحَیَقَانُ: (ض) کے معنی کسی چیز کو گھیرنے اور اس پر نازل ہونے کے ہیں۔ اور یہ باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا یَحِیْقُ الْمَكْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ (۳۵۔۴۳) اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔

﴿وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ (۴۶۔۲۶) اور جس چیز سے استہزاء کیا کرتے تھے اس نے ان کو آ گھیرا۔

(ح ی ن)

اَلْـحِیْـنُ: اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو۔ یہ ظرف مبہم ہے اور اس کی تعیین ہمیشہ مضاف الیہ سے ہوتی ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ﴾ (۳۸۔۳) اور وہ رہائی کا وقت نہ تھا۔

اور بعض نے حِیْنٌ (رفع کے ساتھ) پڑھا ہے پس حین کا استعمال چند وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) مدت اور اجل کے معنیٰ میں جیسے فرمایا:

﴿وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ﴾ (۱۰۔۹۸) اور ایک مدت تک (فوائد دینوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔

(۲) سال اور برس کے معنیٰ میں جیسے:

﴿تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا﴾ (۱۴۔۲۵) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو۔

---

❶ قاله الراعی النمیری عبید بن حصین بن جندل الراعی (ابو جندل هو من فحول الشعراء) وصدره: بنیت مرافقهن فوق مزلة ...... والبیت من کلمة جمهریة طویلة (۳۳۱-۳۳۷) وراجع للبیت اللسان (زلل) وامالی المرتضیٰ ۱: ۳۲۳) والبحر ۲: ۱۶۷) والکتاب ۲: ۳۴۷) مع شرحه للشنتمری المخصص ۹: ۵۵/۱۶/۱۲ والمحکم (حیض) واللسان وفیه مایستطیع والحیوان (۵: ۴۳۷) وفی روایته نبتت بدل بنیت وفی بعض الروایات ثبتت ۱۲۔

(۳) ایک ساعت اور گھڑی کے معنیٰ میں جیسے فرمایا:

﴿حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۷)

تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو......

(۴) مطلق زمانہ اور وقت کے معنیٰ میں جیسے فرمایا:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ (۷۶۔۱) بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے۔

﴿وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ﴾ (۳۸۔۸۸) اور تم کو اس کا حال ایک وقت کے بعد معلوم ہو جائے گا۔ اور کسی ایک معنیٰ کی تعیین موقع محل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: عَامَلْتُهٗ مُحَايَنَةً: میں نے اس سے وقتاً فوقتاً معاملہ کیا۔

اَحْيَنْتُ بِالْمَكَانِ: میں وہاں ایک عرصہ ٹھہرا رہا۔

حَانَ حِيْنُ كَذَا: فلاں چیز کا موسم قریب آ پہنچا۔

حَيَّنْتُ الشَّيْءَ: کسی چیز کے لئے وقت مقرر کرنا۔ اور اَلْحَيْنَ (بفتح الحاء) کے معنیٰ موت اور ہلاکت کے ہیں۔

(ح ی ی)

اَلْحَيَاةُ: (زندگی، جینا یہ اصل میں حَيِيَ (س) يَحْيٰى کا مصدر ہے) کا استعمال مختلف وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) قوت نامیہ جو حیوانات اور نباتات دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی معنیٰ کے لحاظ سے نبات کو حَيٌّ یعنی زندہ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۵۷۔۱۷) جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔

﴿فَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا﴾ (۵۰۔۱۱) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (۲۱۔۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

(۲) دوم حیاۃ کے معنیٰ قوت احساس کے آتے ہیں اور اسی قوت کی بنا پر حیوان کو حیوان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَاءً وَّ اَمْوَاتًا﴾ (۷۷۔۲۵،۲۶) اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الَّذِيْ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۴۱۔۳۹) تو جس نے زمین کو زندہ کیا وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

میں زمین کو زندہ کرنے سے اسے قوت نامیہ عطا کرنا مراد ہے اور مُحْيِ الْمَوْتٰى سے قوت احساس کے عطا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) قوت عاقلہ عاملہ کا عطا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتاً فَاَحْيَيْنَا﴾ (۶۔۱۲۲) بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۲۷) لَقَدْ اَسْمَعْتَ لَوْنَادِيْتَ حَيًّا

---

[1] البيت فى التاج غير منسوب والطبرسى ۱:۹۶) والطبرى ۵:۷۸ والبحر ۱:۳۷۲۔۴۸۶) وتنزيه القران اوفيه لقد بدل وقد وايضاً لطالف المعارف للبونى ۳۲۷ وفى المطبوع وقد ناديت لواسمعت حيامقلوب ثم رايت فى البلدان (رسم ابيه) ان قائله كثير يرثى صديقه خندفانى ۱۹ بيتاً ۱۲.

وَلٰــكِــنْ لَّا حَيَــاةَ لِـمَــنْ تُـنَــادِيْ

اگر تو کسی زندہ کو پکارتا تو وہ سُن لیتا۔لیکن جس کو تم پکارتے رہے ہو اس میں زندگی نہیں ہے (یعنی عقل سے محروم ہے)

(۴) غم کا دور ہونا مراد ہوتا ہے۔اس معنٰی میں شاعر نے کہا ہے ❶ (ضعیف)

(۱۲۸) لَيْسَ مَنْ مَّاتَ فَاسْتَرَاحَ بِمَيْتٍ
اِنَّــمَـــا الْــمَيْــتُ مَيِّــتُ الْاَحْيَـاءِ

جو شخص مر کر راحت کی نیند سو گیا وہ درحقیقت مردہ نہیں ہے۔حقیقتاً مردے وہ ہیں جو زندہ ہونے کے باوجود مردے بنے ہوئے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَـحْسَبَـنَّ الَّـذِيْـنَ قُتِـلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْـوَاتاً بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۳-۱۶۹) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔

میں شہدا کو اسی معنٰی میں اَحْيَـــاءٌ یعنی زندے کہا ہے۔کیونکہ وہ لذت وراحت میں ہیں۔جیسا کہ ارواح شہداء کے متعلق بہت سی احادیث مروی ہیں۔

(۵) حیات سے آخرت کی دائمی زندگی مراد ہوتی ہے۔جو کہ علم وعقل کی زندگی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِسْتَـجِيْبُـوْا لِلّٰـهِ وَلِلـرَّسُولِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُـحْيِيْكُمْ﴾ (۸-۲۴) خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو جب کہ رسول خدا تمہیں ایسے کام کے لئے بلاتے ہیں جو تم کو زندگی (جاوداں) بخشتا ہے۔اسی طرح آیت کریمہ:

﴿يَـالَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي﴾ (۸۹-۲۴) کاش میں نے اپنی زندگی (کی جاودانی کے لئے) کچھ آگے بھیجا ہوتا۔میں بھی اخروی دائمی زندگی مراد ہے۔

(۶) وہ حیات جس سے صرف ذات باری تعالیٰ متصف ہوتی ہے۔چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں حَـــيٌّ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات اقدس ہوتی ہے جس کے متعلق موت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔

پھر دنیا اور آخرت کے لحاظ سے بھی زندگی دو قسم پر ہے یعنی حیات دنیا اور حیات آخرت چنانچہ فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ○ وَاٰثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾ (۷۹-۳۷، ۳۸) تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم

---

❶ البیت مقطوعة لعدی بن الرعلاء الغسانی جاهلی وهو الذی یقال له کوثی ابن الرعلا(التاج ـ کوت ـ کوث) والنحویون یستشهدون به راجع معالم الابتداء للزبیدی ص) والبیت فی الاصمعیات ٥ : وتهذیب الالفاظ ٤٤٨ والمعجم والمرزبانی ٨٦ والسمط ٨ : ٦,٣ والخزانة ٤ : ١٨٧) وابن الشجری ٥١ والسیوطی ٤،٣٨ : ٤٨٧ والاقتضاب ٨٩ ومجازالقران ١٤٩ رقم ١٧٩ والصناعتین ٣١٥ والبحر (١ : ٢٠٩)وایام العرب ٥٣ والرسالة القشیریه ٣٤ والمحکم(شعث) فی امثلة بیت التشعیث واضداد ابی الطیب ١ : ٣١٨ ونسبه البحتری فی الحماسة ٢١٤ ویاقوت فی الارشاد ٩ : ١٢ والمعجم ٢٦٩الی صالح بن عبدالقدوس قال الاستاذ المیمنی فی ذیل السمط وهو به الیط وبمذهبه اوفق والاسس ان الاستاذ حسن کامل الصیرفی نقل تخریج المیمنی بغیر عزوفی تعلیقاته علی دیوان البحتری وذکرالجاحظ فی البیان (١ : ١٣٢) ان الحسن البصری کان یتمثل بهذا البیت فی مجلسه ومواعظه راجع الحیوان ٦ : ٥٠٧ وکنز العمال رقم ٢٥٥١ (الدیلمی عن انس او ابن عباس واضداد ابی الطیب ٣١٨ ولطائف المعارف للبونی ٣٢٧ وفی المیدانی ٢٨٩١مثل یضرب بمن یوعظ فلایقبل ولایفهم وفی المعجم للمرزبانی واللالئی ان الشاعر قالها فی وقعة عین اباغ بین الغساسنه بالشام والمناذرة بالعراق واولها : کم ترکنابالعین عین اباغ من ملوك وسوقة القاء وبعد الشاهد انما المیت من یعیش ذلیلا ـ کاسفاباله قلیل الرجاء وبهذایتضح المراد ١٢.

سمجھا۔
﴿اِشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ (۲۔۸۶) جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔
﴿وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ﴾ (۱۳۔۲۶) اور دنیا کی زندگی آخرت (کے بدلے) میں (بہت) تھوڑا فائدہ ہے۔ یہاں متاع سے دنیاوی ساز وسامان مراد ہے۔
﴿وَرَضُوْا بِالْحَیَاةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوا بِهَا﴾ (۱۰۔۷) اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی سے مطمئن ہو بیٹھے۔
﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ﴾ (۲۔۹۶) بلکہ تم ان کو اور لوگوں سے زندگی پر کہیں حریص دیکھو گے اور آیت کریمہ:
﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ....﴾ (۲۔۲۶۰) اور جب ابراہیم نے (خدا سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔
میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اخروی زندگی کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کے متعلق سوال کیا تھا۔ جو دنیوی آفات کے شوائب سے پاک ہوگی۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ (۲۔۱۷۹) اور اے اہل عقل! (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگی ہے۔ میں قصاص میں حیات ہونے کے معنٰی یہ ہیں کہ قصاص کے خوف سے لوگ قتل پر اقدام کرنے سے رکے رہیں گے۔ لہٰذا اس سے لوگوں کو زندگی حاصل ہوگی۔

﴿وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا﴾ (۵۔۳۲) اور جو اس کی زندگی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگی کا موجب ہوا۔
یعنی انہیں ہلاکت سے نجات بخشی اور آیت کریمہ:
﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ﴾ (۲۔۲۵۸) میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے وہ بولا کہ جلا اور مار تو میں بھی کرسکتا ہوں۔
میں بھی یہی معنٰی مراد ہیں اس کافر کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک شخص کو معاف کرکے اسے زندگی بخشتا ہوں۔
اَلْحَیَوَان: یہ زندگی کا مقام اور مقر ہوتا ہے اور دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
(۱) وہ جس میں قوت احساس ہو۔
(۲) وہ جسے دائمی بقا حاصل ہو اور آیت کریمہ:
﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۹۔۶۴) اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) آخرت کا گھر ہے۔ کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔
میں اسی دوسرے معنٰی کے لحاظ سے دار آخرت کو حیوان کہا گیا ہے۔ اور لَهِیَ الْحَیَوَان کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ حقیقی اور سرمدی زندگی تو وہ ہے جس کے بعد فنا نہ آئے نہ کہ وہ جو کچھ مدت کے بعد فنا ہو جائے۔
بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ حَیَوَان اور حیاة دونوں ہم معنیٰ ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حَیَوَان وہ ہے جس میں حیاة یعنی زندگی ہو اس کے مقابل مَوتَان وہ ہے جس میں زندگی نہ ہو۔ اور بارش کو حَیَا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ﴾ (۲۱۔۳۰)

میں اسی معنیٰ کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُهٗ یَحْیٰ﴾ (۱۹۔۷) میں انہیں یحییٰ کہنے سے صرف یہ مقصود نہیں تھا۔ کہ وہ اس نام سے مشہور ہوں گے۔ کیونکہ اس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا تھا کہ گناہوں سے ان کا دل مردہ نہیں ہوگا جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے اور آیت کریمہ:
﴿یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ﴾ (۳۰۔۱۹) وہی زندے کو مردے سے نکالتا ہے اور (وہی) مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ نطفہ سے انسان پیدا کرتا ہے اور انڈے سے مرغی۔ اسی طرح زمین سے نباتات نکالتا ہے اور انسان سے نطفہ۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا﴾ (۴۔۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دیا کرو یا انہی لفظوں سے دعا دو۔ نیز ﴿فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (۲۴۔۶۱) اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں کو) سلام کیا کرو۔ (یہ خدا کی طرف سے...... تحفہ ہے۔
میں تَحِیَّة کے معنیٰ کسی کو حَیَّاكَ اللّٰهُ کہنے کے ہیں یعنی اللہ تجھے زندہ رکھے۔ یہ اصل میں جملہ خبریہ ہے لیکن دعا کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے حَیَّا فُلَانٌ فُلَانًا تَحِیَّةً: فلاں نے اسے حَیَّاكَ اللّٰهُ کہا۔ اصل میں تَحِیَّة حیات سے مشتق ہے۔ پھر دعائے حیات کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کیونکہ جملہ اقسام تحیۃ حصول حیاۃ یا سبب حیاۃ سے خارج نہیں ہیں خواہ یہ دنیا میں حاصل ہو یا عقبیٰ میں۔ اسی سے اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ ہے [1] اور آیت کریمہ:
﴿وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ﴾ (۲۔۴۹) اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔
کے معنیٰ عورتوں کو زندہ چھوڑ دینے کے ہیں۔
اَلْحَیَاءُ کے معنیٰ قبائح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حَیِیَ فَهُوَ حَیٌّ وَاسْتَحْیَا فَهُوَ مُسْتَحْيٍ: اور بعض نے اِسْتَحٰی فَهُوَ مُسْتَحٍ (تخفیف یاء) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔
قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۲۔۲۶) خدا اس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے۔
﴿وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ (۳۳۔۵۳) لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔
ایک روایت میں ہے:
(۱۰۳) اِنَّ اللّٰهَ یَسْتَحْیِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَةِ الْمُسْلِمِ اَنْ یُّعَذِّبَهٗ کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے شرماتا ہے۔
پس اللہ کی طرف جب حیا کی نسبت ہو تو اس کے معنیٰ

[1] ویسمیٰ التشهد فی الصلوة والفاظه وددت فی غیر حدیث والمعروف تشهد عبدالله بن مسعود اخرجه الائمة الستة ومنها تشهد ابن عباس واختاره الشافعی وذهب مالك واصحابه الی تشهد عمرراجع الزرقانی علی الموطا ۱: ۱۷۶۔ ۱۷۸).

انقباض نفس کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذات باری تعالیٰ منزہ ہے بلکہ اس سے مراد اسے عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے۔ (1)

(۱۰۴) اِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ کہ اللہ حَیٌّ ہے تو اس کے معنیٰ بھی یہی ہیں کہ اللہ قبائح کو چھوڑنے والا اور محاسن یعنی افعال حسنہ کو سرانجام دینے والا ہے۔

❀❀❀

(1) ورد الحدیث بالفاظ مختلفه وتمامه کریم یستحي من عبده اذارفع یدیه ان یردهما ضفرا راجع ابوداؤد والترمذی وابن ماجة من حدیث سلمان والحدیث ایضاً فی المستدرك للحاکم عن انس وابی یعلیٰ عن جابر ابن عمر عن الطبرانیٰ وراجع عون المعبود ۱: ۵۵۳ والکافی لابن حجر رقم ۳۶ وکنزالعمال رقم ۲۴۳ و ۲۴۶ و ۳۵۳ و ۲۸۴ (عبدالرزاق عن انس) والحکیم الترمذی ایضاً عن انس ج۲ وایضاً ۳۸۴۔۳۸۶.

کِتَابُ الْخَاءِ

(خ ب ء)

اَلْخَبْءُ: (ف) کسی چیز کے پوشیدہ اور مخفی ذخیرہ کو خباءٌ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْأَ﴾ (۲۷۔۲۵) جو چھپے ہوئے خزانے نکالتا ہے۔

اسی سے جَارِیَۃٌ خُبَأَۃٌ (طُلَعَۃٌ) کا محاورہ ہے❶ یعنی وہ لڑکی جو کبھی پردہ میں چلی جاتی ہو اور کبھی باہر نکل آتی ہو۔

اَلْخِبَاءُ۔ وہ نشان جو (اونٹنی کے) کسی خفیہ مقام پر لگایا جاتا ہے۔

(خ ب ت)

اَلْخَبْتُ: نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں۔ اور اَخْبَتَ الرَّجُلُ کے معنیٰ نشیبی اور نرم زمین کا قصد کرنے یا وہاں اترنے کے ہیں (جیسے اَسْھَلَ وَاَنْجَدَ) اس کے بعد لفظ اَلْاِخْبَاتُ (افعال) اور تواضع کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا۔

﴿وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰی رَبِّھِمْ﴾ (۱۱۔۲۳) اور اپنے پروردگار کے آگے عاجزی کی۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ﴾ (۲۲۔۳۴) اور عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنادو۔

یعنی تواضع کرنے والوں کو جیسا کہ دوسری جگہ انہی لوگوں کے متعلق:

﴿لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ﴾ (۷۔۲۰۶) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَتُخْبِتَ لَہٗ قُلُوْبُھُمْ﴾ (۲۲۔۵۴) تو ان کے دل اللہ کے سامنے عاجزی کریں میں اخبات کے معنیٰ دلوں کے نرم ہونے اور عاجزی کرنے کے ہیں۔ اور یہاں اس کے معنیٰ قریباً وہی ہیں جو کہ آیت:

﴿وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ﴾ (۲۔۷۴) اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ میں ہبوط کے ہے۔

(خ ب ث)

اَلْمُخْبِثُ وَالْخَبِیْثُ: ہر وہ چیز جو ردی اور خسیس ہونے کی وجہ سے بری معلوم ہو خواہ وہ چیز محسوسات سے ہو یا معقولات (یعنی عقائد وخیالات) سے تعلق رکھتی ہو اصل میں خبیث ردی اور ناکارہ چیز کو کہتے ہیں جو بمنزلہ لوہے کی میل کے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے

(۱۰۹) سَبَکْنَاہُ وَنَحْسِبُہٗ لُجَیْناً
فَاَبْدَی الْکِیْرُ عَنْ خَبَثِ الْحَدِیْدِ

ہم نے اسے اس خیال سے ڈھالا کہ یہ چاندی ہے لیکن بھٹی میں ڈالنے سے معلوم ہوا کہ یہ لوہے کا میل ہے۔ اس اعتبار سے یہ اعتقاد باطل کذب اور فعل قبیح سب کو شامل

---

❶ والمعروف فی المثل خُبَأَۃٌ طُلَعَۃٌ فھھنا سقوط.

ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (۷۔۱۵۷) اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔
یعنی محظورات جو طبیعت کے ناموافق ہیں ۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (۲۱۔۷۴) اور اس بستی سے جہاں کے لوگ گندے کام کرتے تھے بچا نکالا۔
میں عمل خبائث میں لذت اندوزی کے لئے مردوں کی طرف مائل ہونے سے کنایہ ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۳۔۱۷۹) جب تک خدا ناپاک کو پاک سے الگ نہ کردے گا۔ میں اعمال خبیثہ کو اعمال صالحہ سے اور بد باطن لوگوں کو نفوس زکیہ سے تمیز دینا مراد ہے۔اور آیت:
﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾ (۴۔۲) اور ان کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو اپنے ناقص اور برے مال سے نہ بدلو۔
میں خبیث اور طیب سے حلال اور حرام مراد ہیں۔اور فرمایا:
﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ﴾ (۲۴۔۲۶) ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے۔
یعنی افعال قبیحہ اور آوارہ کام، بدباطن اور آوارہ لوگ ہی کرتے ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ﴾ (۵۔۱۰۰) کہدو کہ ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں۔
میں خبیث اور طیب سے کافر اور مومن اور اچھے اور برے اعمال مراد ہیں۔اور آیت:
﴿مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ﴾ (۱۴۔۲۶) اور ناپاک بات کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے۔ میں کفر، جھوٹ، چغلی ہر قسم کی قبیح باتیں داخل ہیں حدیث میں ہے:
اَلْمُؤْمِنُ اَطْيَبُ مِنْ عَمَلِهٖ وَالْكَافِرُ اَخْبَثُ مِنْ عَمَلِهٖ کہ مؤمن اپنے عمل سے پاک اور کافر اپنے عمل سے ناپاک ہے۔
اور خبیث و مُخبِث خبث کے مرتکب کو بھی کہا جاتا ہے۔

(خ ب ر)

اَلْخَبْرُ: جو باتیں بذریعہ خبر کے معلوم ہوسکیں ان کے جاننے کا نام "خبر" ہے کہا جاتا ہے۔
خَبَرْتُهٗ خُبْرَةً وَاَخْبَرْتُ: جو خبر مجھے حاصل ہوئی تھی اس کی میں نے اطلاع دی۔ بعض نے کہا ہے کہ خُبْرَةٌ کا لفظ کسی معاملہ کی باطنی حقیقت کو جاننے پر بولا جاتا ہے۔
اَلْخَبَارُ وَالْخَبْرَآءُ: نرم زمین۔اور کبھی درختوں والی زمین پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔
اَلْمُخَابَرَةُ: بٹائی پر کاشت کرنا۔اسی سے کسان کو "خَبِيرٌ" کہا جاتا ہے۔
اَلْخِبْرُ: چھوٹا توشہ دان۔تشبیہ کے طور پر زیادہ دودھ دینے والی اونٹنی کو بھی خِبْرٌ کہا جاتا ہے۔اور آیت ہے:
﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (۵۰۔۳) اور جو کچھ تم

کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی حقیقت کو جانتا ہے۔
اور بعض نے کہا ہے کہ وہ تمہارے باطن امور سے واقف ہے۔اور بعض نے خَبِیرٌ بمعنی مُخْبِرٌ کہا ہے۔جیسا کہ آیت:
﴿فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۶۲۔۸) پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتا دے گا سے مفہوم ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَنَبْلُوا اَخْبَارَكُمْ﴾ (۴۷۔۳۱) اور تمہارے حالات جانچ لیں۔
﴿قَدْ نَبَّأَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ﴾ (۹۔۹۴) خدا نے ہم کو تمہارے سب حالات اللہ نے بتا دیئے ہیں۔
یعنی تمہارے احوال سے ہمیں آگاہ کر دیا گیا ہے۔

(خ ب ز)

اَلْخَبزُ: روٹی۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اَحْمِلُ فَوقَ رَأْسِی خُبْزًا﴾ (۱۲۔۳۶) کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔
اَلْخُبْزَةُ: نان کو ماج۔اَلْخَبْزُ۔ (مصدرض) روٹی بنانا۔
اخْتَبَزَ: (افتعال) روٹی بنانے کا حکم دینا۔
اَلْخِبازَةُ: نانبائی کا پیشہ۔
استعارہ کے طور پر خُبزٌ کے معنی سخت ہنکانے کے بھی آ جاتے ہیں۔کیونکہ ہانکنے والا بھی اسی طرح ہاتھ مارتا ہے جیسے روٹی بنانے والا کرتا ہے۔

(خ ب ط)

اَلْخَبْطُ: (ض) کے معنی کسی چیز کو اندھا دھند بدون استواری کے مارنے کے ہیں۔جیسے اونٹ کا زمین پر اگلا پاؤں مارنا یا آدمی کا لاٹھی کے ساتھ درخت سے پتے جھاڑنا۔اور درخت سے جھاڑے ہوئے پتوں کو بھی خَبَطٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ مضروب پر ضَربٌ کا لفظ بول لیتے ہیں۔پھر استعارہ کے طور پر بادشاہ کے ظلم پر بھی خَبْطٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ ظالم بادشاہ کو خَبُوطٌ کہا جاتا ہے۔
اِخْتِبَاطُ الْمَعْرُوفِ کے معنی ہیں کسی سے زبردستی احسان کا مطالبہ کرنا یہ محاورہ خَبْطُ الوَرْقِ (درخت سے پتے جھاڑنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔
اور آیت: ﴿یَتَخَبَّطُهُ الشَّیطَانُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (۲۔۲۷۵) جیسے کسی کو جن نے لپیٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔
میں یَتَخَبَّطُ کے معنی خَبطُ الشَّجَرِ سے بھی لئے جا سکتے ہیں۔اور اختباط سے بھی۔جس کے معنی احسان کا مطالبہ کے ہیں۔ایک روایت میں ہے [1]
(۱۰۵) اَللّٰهُمَّ اَعُوذُ بِكَ اَنْ یَتَخَبَّطَنِیَ الشَّیطَانُ مِنَ الْمَسِّ: اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان مجھے لپٹ کر دیوانہ بنا دے۔

(خ ب ل)

اَلْخَبَالُ وَالْخَبَلُ وَالْخَبْلُ: اس فساد یا خرابی کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو لاحق ہو کر اس میں اضطراب اور بے چینی پیدا کر دے۔جیسے جنون یا وہ مرض جو عقل و فکر پر اثر انداز ہو۔کہا جاتا ہے۔خَبَلَهُ وَخَبَّلَهُ فَهُوَ خَابِلٌ وَالْجَمعُ خُبَّلٌ رَجُلٌ مُّخَبَّلٌ۔دیوانہ۔قرآن پاک میں ہے:
﴿یَآیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ

---

[1] رواه النسائی ۲: ۳۲۰ من حدیث ابی الیسر ۱۲۔

دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ (۳۔۱۱۸) مومنو! (کسی غیر (مذہب کے آدمی) کو اپنا راز دان نہ بنانا۔ یہ لوگ تمہاری خرابی (اور فتنہ انگیزی کرنے) میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔

﴿وَمَا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا﴾ (۹۔۴۷) تو تمہارے حق میں شرارت کرتے۔

اور حدیث میں ہے [1]

(۱۰۶) مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ ثَلَاثًا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَّسْقِيَهٗ مِنْ طِيْنَةِ الْخَبَالِ: جو شخص تین مرتبہ شراب پئے گا تو اللہ تعالیٰ اسے لازماً دوزخیوں کی پیپ پلائے گا۔

زہیر نے کہا [2] ع (طویل)

(۱۳۰) هُنَالِكَ اِنْ يُّسْتَخْبَلُوا الْمَالُ يُخْبِلُوا

یعنی ایسے موقعہ پر اگر ان سے مال مانگا جائے تو وہ مال دے دیتے ہیں۔

(خ ب و)

خَبَتِ (ن) النَّارُ: آگ کا شعلہ افسردہ ہوگیا اور اس پر راکھ کا خِبَاء یعنی پردہ سا آ گیا۔ اصل میں خِبَاءٌ اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔ اسی بنا پر جو یا گیہوں کی بالی کے چھلکے کو بھی خِبَاء کہا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:

﴿كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيْرًا﴾ (۱۷۔۹۷) جب اس کی آگ بجھنے کو ہوگی تو ہم ان کو (عذاب دینے کے لئے) اور بھڑکا دیں گے۔

(خ ت ر)

اَلْخَتْرُ: اصل میں اس غداری کو کہتے ہیں جسے اس قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان کمزور پڑ جائے اور اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں قرآن پاک میں ہے:

﴿كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ﴾ (۳۱۔۳۲) جو عہد شکن اور ناشکرے ہیں۔

(خ ت م)

اَلْخَتْمُ وَالطَّبْعُ: کے لفظ دو طرح سے استعمال ہوتے ہیں کبھی تو خَتَمْتُ اور طَبَعْتُ کے مصدر ہوتے ہیں اور اس کے معنیٰ کسی چیز پر مہر کی طرح نشان لگانا کے ہیں اور کبھی اس نشان کو کہتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا ہے۔

مجازاً کبھی اس سے کسی چیز کے متعلق وثوق حاصل کر لینا اور اس کا محفوظ کرنا مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ کتابوں یا

---

[1] الحديث باختلاف الفاظه في النسائي عن ابن عمرو وحم ق ه ن عن ابن عمرو (ه عن ابى هريرة) و(طب عن ابن عمرو) والترمذى عن ابن عمرو ورد(ة عن ابن عمرو) راجع الفتح الكبير ج ۳: ۲۰۱-۲۰۲).

[2] قاله زهير بن ابى سلمىٰ المزنى وتمامه .... وان يسئلوا يعطوا وان ييسروا يغلوا والبيت فى اللسان (خيل، خول) وفى رواية الطبرى ۲۳-۱۹۹/۷: ۲۷۸) وان يستخولوا بدل يستخبلوا ويخولوا بدل يخبلوا وكذا فى رواية ابى عبيد فى غريبه والعسكرى فى الصناعتين وعده من جيد المديح قال فى الامالى (۲: ۱۵٤) ومايبالى مدح بهذين البيتين الايمدح بغيرهما والبيت فى مختار الجاهلى بشرح المصطفىٰ السقا (۱: ۱٦۳) والمختارات ٦۲ والعمدة (۲: ۱۲۷) و نقدالشعر ۳۳ فى سبعة ابيات والبحر (۷: ۱٤۳) والعقد الثمين ۹۱ والمعانى الكبير ۵۲۹ والسيوطى ۱۰۸ قال فى اللسان والاخبال اعطاء البعير اوالناقة للركوب واستخبل اى استعارمنه والاصمعى وابو عبيدة فى روايتهما عن ابى عمرو انكر الاستخبال وغيرهما اثبته (والمعانى للقبتى ۵٤۰).

دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (۲۔۷) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

﴿وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ﴾ (۴۵۔۲۳) اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی۔

اور کبھی کسی چیز کا اثر حاصل کر لینے سے کنایہ ہوتا ہے جیسا کہ مہر سے نقش ہو جاتا ہے اور اسی سے خَتَمْتُ الْقُرْآنَ کا محاورہ ہے یعنی قرآن پاک ختم کر لیا اور آیت کریمہ:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (۲۔۷) خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔اور آیت:

﴿قُلْ اَرَأَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ﴾ (۶۔۴۶) (ان کافروں سے) کہو بھلا دیکھو تو اگر تمہارے کان یا دو آنکھیں چھین لے اور اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے۔میں عادت الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اعتقادِ باطل یا محرمات کے ارتکاب میں حد کو پہنچ جاتا ہے اور کسی طرح حق کی طرف التفات نہیں کرتا تو اس کی ہیئت نفسانی کچھ ایسی بن جاتی ہے کہ گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی خو بن جاتی ہے۔ گویا اس طرح اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔چنانچہ اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ﴾ (۱۶۔۸،۱۰) یہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر خدا نے مہر لگا رکھی ہے۔اسی طرح آیات کریمہ:

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸۔۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے............اس کا کہنا نہ ماننا۔

﴿وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ﴾ (۱۷۔۴۶) اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔

﴿وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً﴾ (۵۔۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

میں اِغْفَالٌ کِنٌّ اور قَسَاوَةٌ سے بھی علی الترتیب یہی معنیٰ مراد ہیں۔

جبائی کہتے ہیں [1] کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے ان کے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔لیکن یہ بے معنیٰ سی بات ہے۔کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامت سے بے نیاز ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنیٰ ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۳۶۔۶۵) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں۔کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ

---

[1] هو ابو علی محمد بن عبدالوهاب الجبائی المتوفی ۳۰۳ ھ والجباء مثل رمان كورة بخوزستان من نواحي الاهواز بين فارس وواسطه والنضرة منها (التاج).

کلام نہیں کر سکیں گے۔ اور آیت (۳۳۔۴۰) میں آنحضرت ﷺ کو خَاتَمَ النَّبِيِّيْن فرمانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آنحضرت نے اپنی آمد سے سلسلہ نبوت کو مکمل کر دیا ہے۔(اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَخِتَامُهُ مِسْكٌ﴾ (۸۳۔۲٦) جس کی مہر مسک کی ہوگی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ خِتَامٌ کے معنیٰ مَا يُخْتَمُ بِهٖ کے ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے مگر آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کا آخری لطف اور برتن میں باقی ماندہ چھوٹ مسک کے طرح مہکے گا اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی۔ مگر یہ بے معنیٰ سی بات ہے۔ کیونکہ شراب کو بذاتِ خود لذیذ ہونا چاہیے اگر وہ بذات خود لذیذ نہ ہو تو اس پر مسک کی مہر لگانا چنداں مفید نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کی لذت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔

(خ د د)

اَلْخَدُّ وَالْاُخْدُوْدُ کے معنیٰ ہیں زمین میں مستطیل اور گہرا گڑھا اَلْاُخْدُوْدُ کی جمع اَخَادِيْد ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ﴾ (۸۵۔۴۰) کہ خندقوں کے (کھودنے) والے ہلاک کر دیئے گئے۔

اصل میں خَدُّ الْاِنْسَان کے معنیٰ انسان کے رخسار کے ہیں [1] اور استعارۃً زمین اور دوسری اشیاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ لفظ وجہ (چہرہ) ہے تَخَدَّدَ

اَللَّحْمُ: جسم کا لاغر ہو کر جھری دار ہو جانا خَدَّوْتُهٗ کسی کو دبلا کرنا۔ اس کا مطاوع تَخَدَّدَ آتا ہے۔

(خ د ع)

اَلْخِدَاعُ کے معنیٰ جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کر کے کسی کو اس چیز سے پھیر دینا جس کے وہ درپے ہو اور آیت کریمہ:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ (۲۔۹) یہ (اپنے پندار میں) خدا کو چکمہ دیتے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے اس کے رسول اور اولیاء کو فریب دینا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کوئی سا معاملہ کرنا گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ (۴۸۔۱۰) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔

اور ان کے اس فعل کی شناخت اور آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے خِداع سے تعبیر کیا ہے۔

اور اہل لغت کا یہ کہنا کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل میں يُخَادِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ہے۔ پھر مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ مضاف محذوف کو ذکر کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے

[1] وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱: ۱۸) ای لاتعرض عنهم استكباراً.

کہ ایک تو یہاں ان کی فریب کاریوں کی شناخت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔اور دوسرے یہ بتانا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ آیت: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَ﴾ میں بیان ہو چکا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَھُوَ خَادِعُھُمْ﴾ (۴۔۱۴۲) اور وہ انہی کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔

کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی فریب کاریوں کا بدلہ دے گا اور بعض نے کہا ہے کہ مقابلہ اور مشاکلہ کے طور پر یہ کہا گیا ہے جیسا کہ آیت وَمَکَرُوْا وَمَکَرَاللّٰہُ میں ہے۔خَدَعَ الضَّبُّ: گوہ کا اپنی بل میں داخل ہو جانا اور گوہ کے بل میں چھپ جانے کے لئے خدع کا استعمال اس بنا پر ہے کہ اس کی بل کے دروازے پر ہمیشہ ایک بچھو تیار بیٹھا رہتا ہے۔جو بل میں ہاتھ ڈالنے والے کو ڈس لیتا ہے۔اسی بنا پر کہا گیا ہے اَلْعَقْرَبُ بَوَّابُ الضَّبِّ: کہ بچھو گوہ کا دربان ہے۔

چونکہ اہل عرب کے ہاں ضَبٌّ کی مکاری ضرب المثل تھی اس لئے کہا گیا ہے [1] (مثل) ھُوَ اَخْدَعُ مِنَ الضَّبِّ کہ وہ ضب سے زیادہ مکار ہے طَرِیْقٌ خادِعٌ وَخَدِیْعٌ: گمراہ کرنے والا راستہ گویا وہ مسافر کو دھوکہ دیتا ہے۔اَلْھِدْعُ: بڑے کمرے کے اندر چھوٹا کمرہ گویا اس بڑے کمرے سے چیز اٹھانے والے کو دھوکا دینے کے لئے بنایا ہے۔خَدَعَ الرِّیْقُ: منہ سے تھوک کا خشک ہونا اس میں بھی دھوکے کا تصور پایا جاتا ہے۔اَلْاَخْدَعَانِ: گردن کی دو رگیں کیونکہ وہ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔کہا جاتا ہے خَدَعْتُہٗ: میں نے اس کی اخدع رگ کو کاٹ دیا۔حدیث میں ہے [2]

(۱۰۷) بَیْنَ یَدَیِ السَّاعَةِ سِنُوْنَ خَدَّاعَةٌ: کہ قیامت کے قریب دھوکا دینے والے سال ہوں گے۔کیونکہ وہ بھی خشک سالی اور خوشحالی سے رنگ بدلتے رہیں گے۔

(خ د ن)

اَلْخِدْنُ: کے معنیٰ مصاحب اور رفیق کے ہیں۔مگر عام طور پر اس مصاحب پر بولا جاتا ہے جو جنسی خواہش پوری کرنے کے لئے کسی کے ساتھ رہتا ہو اسی سے خِدْنُ الْمَرْئَةِ وَخَدِیْنُھَا کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ عورت کے آشنا کے ہیں۔اَلْخِدْنُ کی جمع اَخْدَانٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ﴾ (۴۔۲۵) اور شاعر کے قول [3] ع

(۱۳۱) "خَدِیْنُ الْعُلٰی"

وہ بلندیوں کا ساتھی ہے۔

میں بلندیوں کے لئے خَدِیْنٌ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ یَعْشَقُ الْعُلٰی: (وہ بلندیوں پر عاشق ہے) یُشَبِّبُ بِالنَّدٰی (وہ سخاوت کے ساتھ تشبیب کرتا

---

[1] راجع للمثل المیدانی رقم ۱۳۷۳ والحیوان ۶: ۴۳، ۴۵/۷۔۱۰ واللسان (خدع)۔

[2] الحدیث باختلاف الفاظه فی النهایة (خدع) وغریب ابی عبید( ) وفی تاویله اختلاف وفی المحکم (خدع) ان قبل الساعة سنین خداعة واللآلئ مع السمط ۱۲۷ وفیه ان قبل الدجال سنین خداعة ای قاطعة الزکوة اوقلیل المطر کذافی الفائق ۲: ۱۰۷ وفیه ایضاً بین یدی الساعة سنین خدارة ای یکثر فیها المطر ویقل النبات۔

[3] لم اجدہ ویرجیٰ ۱۲۔

ہے) یَنْسِبُ بِالْمَکَارِمِ: (اس کا نسب مکارم سے ملتا ہے) وغیرھا استعارات ہیں۔

(خ ذ ل)

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَکَانَ الشَّیْطَانُ لِلْاِنسَان خَذُوْلًا﴾ (۲۵۔۲۹) اور شیطان انسان کو عین موقعہ پر دغا دینے والا ہے۔

اَلْخَذُوْلُ: (صیغہ مبالغہ) بہت زیادہ خُذْلان یعنی دغا دینے والا۔ اَلْخُذْلَانُ ایسے شخص کا عین موقعہ پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہوجانا جس کے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کرے گا اسی بنا پر کہا جاتا ہے: خَذَلَتِ الْوَحْشِیَّةُ وَلَدَھَا: وحشی گائے نے اپنے بچہ کو چھوڑ دیا۔ تَخَاذَلَتْ رِجْلَا فُلَان اس کی ٹانگیں کمزور پڑ گئیں اسی سے اعشی نے کہا ہے [1] (الرمل)

(۱۳۲) بَیْنَ مَغْلُوْبِ تَلِیْلٍ خَدُّہٗ
وَخَذُوْلِ الرِّجْلِ مِنْ غَیْرِ کَسَحٍ

(بعض مغلوب ہوکر رخسارے کے بل گر پڑے ہیں اور بعض کی ٹانگیں بدوں بے حسی کے جواب دے چکی ہیں۔

رَجُلٌ خُذَلَۃٌ بے بس آدمی۔

(خ ر ر)

خَرَّ (ن ض) خَرِیْرًا کے معنٰی کسی چیز کے آواز کے ساتھ نیچے گرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ﴾ (۳۴۔۱۴) جب عصا گر پڑا تب جنوں کو معلوم ہوا۔

﴿کَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۲۔۳۱) تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے۔ ﴿فَخَرَّ عَلَیْھِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِھِمْ﴾ (۱۶۔۲۶) اور چھت ان پر ان کے اوپر سے گر پڑی۔ اَلْخَرِیْرُ: پانی وغیرہ کی آواز کو کہتے ہیں جو اوپر سے گر رہا ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿خَرُّوْا سُجَّدًا﴾ (۳۲۔۱۵) تو سجدے میں گر پڑتے ہیں خَرُّوا کا لفظ دو معنوں پر دلالت کرتا ہے۔یعنی (۱) گرنا اور (۲) ان سے تسبیح کی آواز کا آنا۔ اور اس کے بعد آیت وَسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ سے تنبیہ کی ہے کہ ان کا سجدہ ریز ہونا اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ تھا نہ کہ کسی اور امر کے ساتھ۔

(خ ر ب)

خَرِبَ الْمَکَانُ خَرَابًا کسی جگہ کا اجاڑ ہونا۔ یہ عَمَارَۃٌ (آباد ہونا) کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا﴾ (۲۔۴) اور انکی ویرانی میں ساعی۔

اَخْرَبَہٗ وَخَرَّبَہٗ: ویران کردینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یُخَرِّبُوْنَ بُیُوْتَھُمْ بِاَیْدِیْھِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۵۹۔۲) کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔

وہ اپنے ہاتھوں سے اس لئے ویران کرتے تھے تاکہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے کام نہ آئیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بربادی ان کی جلاوطنی کی وجہ سے

[1] قالہ الاعشیٰ فی قصیدۃ طویلۃ فی دیوانہ (۳۸۔۴۲) یمدح فیھا ایاس بن قبیصۃ الطائی وفی روایۃ اللسان والمحکم (کسح ، خذل وصدرہ کل وضاح کریم جدہ ۔ وفی روایۃ ص و س صدرہ بین مغلوب بنیل جدہ کذا رواہ ابن بری واما روایۃ المؤلف فلم ارھا الافی بعض ھوامش دیوانہ ۱۶۳ ویروی : قلیل والبیت فی اللسان (خذل) ودیوانہ ۴۱ وغریب ابی عبید (۴ : ۲۸۳)۱۲.

تھی۔

اَلْخَرْبَۃُ: کان میں وسیع چھید گویا اس سے کان میں خرابی پیدا ہوگئی اور اَقْطَعُ وَقَطْعَاءُ کی طرح اَخْرَبُ وَخَرْبَاءُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔اور تشبیہ کے طور پر مشکیزہ کے سوراخ کو بھی خِرْبَۃُ الْمَزَادَۃ کہا جاتا ہے جیسا کہ مَجَازًا اُذُنُ الْمَزَادَۃِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اور خَارِبٌ کے معنیٰ خاص کر اونٹوں کے چور کے ہیں ❶ اَلْخَرَبُ (نر سرخاب) شتر مرغ کی قسم کا ایک پرند، اس کی جمع خِرْبَانٌ ہے کسی شاعر نے کہا ہے: ❷ (رجز)

(۱۴۳) اَبْصَرَ خِرْبَانَ فِضَآءٍ فَانْکَدَرَ

کہ وہ فضا میں سرخابوں کو دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

(خ ر ج)

خَرَجَ: (ن) خُرُوْجًا کے معنیٰ کسی کے اپنی قرار گاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔عام اس سے کہ وہ قرار گاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا کپڑا ہو اور یا کوئی حالت نفسانی ہو جو اسباب خارجیہ کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو قرآن پاک میں ہے:

﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ﴾ (۲۸۔۲۱) موسیٰ وہاں سے ڈرتے ڈرتے نکل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

﴿فَمَايَكُونُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ﴾ (۷۔۱۳) فرمایا: تو بہشت سے اتر جا۔ تجھے شایاں نہیں کہ یہاں غرور کرے۔پس نکل جا۔

﴿وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَةٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا﴾ (۴۱۔۴۷) اور نہ پھل گابھوں سے نکلتے ہیں۔

﴿فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ﴾ (۴۰۔۱۱) تو کیا نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَاهُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا﴾ (۵۔۳۷) (ہر چند) چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں مگر اس سے نہیں نکل سکیں گے۔اور اِخْرَاجُ کا لفظ زیادہ تر اعیان کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ﴾ (۲۳۔۳۵) تو تم (زمین سے) نکالے جاؤ گے۔﴿كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ﴾ (۸۔۵) جس طرح تمہارے پروردگار نے تم کو تدبیر کے ساتھ گھر سے نکالا۔

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا﴾ (۱۷۔۱۳) اور قیامت کے روز وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے۔

﴿اَخْرِجُوْآ اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ﴾ (۲۷۔۵۶) کہ لوط کے گھر والوں کو اپنے شہر سے نکال دو۔اور کبھی اِخْرَاجُ بمعنیٰ تکوین الٰہی بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ﴾ (۱۶۔۱۷۸) "اور اللہ ہی نے تم کو ماؤں کے شکم سے پیدا کیا۔﴿فَأَخْرَجْنَا

---

❶ قاله الاصمعی والجمع خراب والجوهری۔

❷ قاله العجاج فی مشطورته یمدح فیها عمربن عبیدالله بن معمر التمیمی وکان قد وجهه عبدالملك الی ابی فدیك الحروری حین خرج علیه وقبله: تقضی البازی اذاالبازی کسر۔ وفی روایة آنس بدل ابصر والشطر فی الطبری (۹: ۶۹)(۳۰: ۶۵) واللسان (کذا) ودیوانه، (طبعة لیبك ۱۹۰۳ء) رقم البیت ۷۶ والبیت من شواهد ابی عبیده فی مجازه تحت قوله واذاالنجوم انکدرت (تکویر: ۷۲) والشطر الاول فی ابن الشجری (۱: ۳۸۹) والاقتضاب ۴۱۳ والامالی (۲: ۱۷۱) والشطر فی المسط ۷۹ والبحر ۸: ۴۳۰) وفیه فلاة بدل فضاء ۱۲۔

بِہٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی﴾ (۲۰۔۵۳) پھر اس نے انواع واقسام کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔

﴿یُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ﴾ (۳۹۔۲۱) اس سے کھیتی اُگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔

اَلتَّخْرِیْجُ: (تفعیل) یہ عام طور پر علوم وصناعات کی ایجاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔اور زمین کی پیداوار اور جو کچھ حیوان کے اوجھ سے نکلتا ہے۔اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو خَرْجٌ وَخُرَاجٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمْ تَسْئَلُھُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّکَ خَیْرٌ﴾ (۲۳۔۷۲) کیا تم ان سے (تبلیغ کے سلسلے میں) کچھ مال مانگتے ہو تو تمہارے پروردگار کا مال بہت اچھا ہے۔

یہاں خراج کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ نے اسے لازم وواجب کیا ہے۔اور خَرْجٌ خَرَاجٌ سے عام ہے کیونکہ خَرْجٌ کا لفظ دَخْلٌ (آمدنی) کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فَھَلْ نَجْعَلُ لَکَ خَرْجًا﴾ (۱۸۔۹۴) بھلا ہم آپ کے لئے خرج (کا انتظام) کردیں۔

مگر خَرَاجٌ کا لفظ عموماً زمین کے لگان پر بولا جاتا ہے محاورہ ہے۔اَلْعَبْدُ یُؤَدِّیْ خَرْجَۃَ غلام اپنی آمدنی سے مقرر حصہ ادا کرتا ہے۔وَالرَّعِیَّۃُ تُؤَدِّی اِلَی الْاَمِیْرِ الْخَرَاجُ رعیت حاکم کو لگان ادا کرتی ہے۔اَلْخَرْجُ (ایضا) بادل کی ایک قسم ہے۔اس کی جمع خُرُوْجٌ آتی ہے ایک روایت میں ہے [1]

(۱۰۷) اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ: یعنی مال بائع سے جو فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ مبیع کی اس ضمانت کے عوض سمجھا جائے گا جو اس سے ساقط ہوچکی ہے۔

اَلْخَارِجِیُّ: وہ شخص جو بذات خود اپنے ہمسروں کی صفات سے باہر نکل جائے اگر یہ خروج کسی اعلیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو بطور مدح بولا جاتا ہے اور اگر ادنیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو لفظ بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے۔جس طرح کہ فُلَانٌ لَیْسَ بِاِنْسَانٍ: یعنی کسی سے انسانیت کی نفی کبھی بطور مدح ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [2] (طویل)

(۱۳٤) فَلَسْتَ لِاِنْسِیٍّ وَلٰکِنْ کَمَلْأَكٍ
تَنَزَّلَ مِنَ جَوِّ السَّمَآءِ یَصُوْبُ

تم انسان نہیں ہو بلکہ فرشتہ کی مثل ہو جو آسمان کی بلندی سے زمین پر اتر آئے۔

اور کبھی مذمت کے لئے۔جیسے فرمایا:

---

[1] الحدیث مروی مختصرًا مطولاً راجع ابوداؤد والترمذی ۲: ۲۶۰۔۲۶۱ مع التحفة والنسائی وابن ماجة راجع لتخریجه الرسالة رقم ۱۲۳۲ مع التحقیق احمد شاکر وکنزالعمال ٤ رقم ۵۰۵ وابن حبان فی زوائده رقم ۱۱۲۵، ۱۱۲٦.

[2] اختلفوافی نسبة هذا البیت قال العینی(٤ : ۵۲٤) قاله رجل من عبدالقیس یمدح النعمان وقیل هولابی وجزة یمدح عبدالله بن الزبیر ونسبه الاعلم فی هامش الکتاب ۲ : ۳۷۹) الی علقمة والبیت من شواهد الطبری (۱ : ۱٤۸، ۱۹۸) وراجع للبیت ایضاً الصحاح والتاج (الك، ملك، صوب) والقرطبی ۹ : ۱۸۳،) وامالی ابن الشجری ۲ : ۲۰، ۲۹۲) والاشتقاق ۱۷) والمجازلابی عبیدة (۱ : ۳۳) ومختار الشعرالجاهلی وتهذیب الاصلاح ۱ : ۱۲٦) والبحره: ۳,۳۰٤ : ٤۰٤,۱ : ۱۳۷) وابن خالویه ۸۳ وابن الانباری فی السبع ۵۲۲ والبیت من کلمة مفضلیة من زیادات المرزوقی ۲ : ۱۹٤ وصدره ولست یحبتی ولکن ملائماً ۱۲.

﴿اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ﴾ (۲۵۔۴۴) یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں۔

اَلْـخَـرَجُ: دورنگ سیاہ وسپید (درہم) اسی سے کہا جاتا ہے۔ ظَلِيْمٌ اَخْرَجُ وَنَعَامَةٌ خَرْجَاءُ: ابلق شتر مرغ۔ اَرْضٌ مُخْتَرِجَةٌ: زمین کے جائے ازاں باگیاہ وجائے بے گیاہ باشد۔اور اَلْخَوَارِجُ کوخوارج اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ امام کی اطاعت سے باغی ہو گئے تھے۔

(خ ر ص)

اَلْـخَـرْصُ: پھلوں کا اندازہ کرنا اور اندازہ کئے ہوئے پھلوں کو خَرِصٌ کہا جاتا ہے یہ بمعنی مخروصٌ ہے۔ جیسے نَقْضٌ بمعنی مَنْقُوضٌ۔ بعض نے کہا ہے کہ خَرْصٌ بمعنی کذب آ جاتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ (۴۳۔۲۰) یہ تو صرف اٹکلیں دوڑارے ہیں۔میں بعض نے کہا ہے کہ يَخْرُصُوْنَ بمعنی يُكَذِّبُوْنَ ہے یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۰) اٹکل کرنے والے ہلاک ہوں۔

کے معنی بقول بعض یہ ہیں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو، اصل میں ہر وہ بات جو ظن وتخمین سے کہی جائے اسے خَرْصٌ کہا جاتا ہے۔عام اس سے کہ وہ اندازہ غلط ہو یا صحیح۔ کیونکہ تخمینہ کرنے والا نہ تو علم یا غلبہ ظن سے بات کرتا ہے، اور نہ سماع کی بنا پر کہتا ہے۔ بلکہ اس کا اعتماد محض گمان پر ہوتا ہے۔جیسا کہ تخمینہ کرنے والا پھلوں کا تخمینہ کرتا ہے اور اس قسم کی بات کہنے والے کو بھی جھوٹا کہا جاتا ہے۔خواہ وہ واقع کے مطابق ہی کیوں نہ بات کرے جیسا کہ منافقین کے بارے میں فرمایا:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (۶۳۔۱) اے محمد! ﷺ جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (ازراہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق (دل سے نہ اعتقاد رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔

(خ ر ط)

اَلْـخُـرْطُوْمُ: اس کے اصل معنی ہاتھی کی سونڈ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾ (۶۸۔۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

میں انسان کی ناک پر خرطوم کا اطلاق کیا ہے تو یہ محض مذمت کے لئے ہے۔ یعنی اُسے نہ مٹنے والی عار لاحق ہوگی۔ یہ جُدِعَتْ اَنْفُهٗ کی طرح کا محاورہ ہے۔

(خ ر ق)

اَلْخَرْقُ: (ض) کسی چیز کو بلاسوچے سمجھے بگاڑنے کے لئے پھاڑ ڈالنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا﴾ (۱۵۔۱۷) کیا آپ نے اس کو اس لئے پھاڑا ہے کہ مسافروں کو غرق کردیں۔

خَرْقٌ خَلْقٌ کی ضد ہے جس کے معنی اندازہ کے

مطابق خوش اسلوبی سے کسی چیز کو بنانا کے ہیں ۔ اور خَرْق کے معنی کسی چیز کو بے قاعدگی سے پھاڑ ڈالنے کے ہیں ۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وخَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ وَبَنَاتٍ بِغَیْرِ عِلْمٍ﴾ (۶۔۱۰۰) اور بے سمجھے (جھوٹ بہتان) اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بنا گھڑی ہیں۔ یعنی بے سوچے یہ بات کہتے ہیں۔ پھر معنی قطع کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: خَرَقَ الثَّوْبُ وَخَرَّقَهٗ: کپڑے کو پھاڑ ڈالا خَرَقَ الْمَفَاوِزَ ریگستان طے کئے۔

اِخْتَرَقَ الرِّیْحُ: ہوا کا تیز چلنا۔

اَلْخَرْقُ وَالْخَرِیْقُ: خاص کر کشادہ بیابان کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ وسیع ریگستان کی صورت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

اَلْخَرْقُ: (خاص کر) کپڑے میں سوراخ اور کان میں کشادہ سوراخ۔ صَبِیٌّ اَخْرَقُ وَامْرَأَةٌ خَرْقَاءُ: جس کے کان کشادہ چھید ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ﴾ (۱۷۔۳۷) کی تفسیر میں دو قول ہیں (۱) یہ کہ تو زمین کو طے نہیں کر سکے گا۔ (۲) یا یہ کہ تو زمین کو اپنے پاؤں سے پھاڑ نہیں ڈالے گا۔ یہ دوسرا معنی خرق فی الاذن سے ماخوذ ہے اور بے سوچے سمجھے کام کرنے کے اعتبار سے احمق اور نادان شخص کو اَخْرَقُ وَخَرِقٌ کہا جاتا ہے اس کی مؤنث خرقاء ہے۔ اور تند ہوا کو بھی خرقاء کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ [1]

(۱۰۸) مَادَخَلَ الْخَرْقُ فِی شَیْءٍ اِلَّا شَانَهٗ: جس چیز میں نادانی کا عمل دخل ہو تو وہ عیب ناک ہو جاتی ہے اور خَرَقَ سے مَخْرَقَةٌ کا لفظ لیا گیا ہے [2] جس کے معنی کسی کام میں حیلہ جوئی کے لئے بے وقوفی کا اظہار کرنے کے ہیں۔

اَلْمِخْرَاقُ: کپڑے کا کوڑا جس سے بچے کھیلتے ہیں گویا اسے بھی کسی چیز کو واقع کے خلاف ظاہر کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔

خَرِقَ الغِزَالُ: ہرن کا نادانی کی وجہ سے دوڑ نہ سکنا۔

(خ ز ن)

اَلْخَزْنُ: کے معنی کسی چیز کو خزانے میں محفوظ کر دینے کے ہیں ۔ پھر ہر چیز کی حفاظت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے ۔ جیسے بھید وغیرہ کی حفاظت کرنا اور آیت:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ﴾ (۱۵۔۲۱) اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں۔

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۶۳۔۷) حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا ہی کے ہیں۔ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے ۔ یا اس معنیٰ کی طرف اشارہ ہے۔ جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [3]

---

[1] الحدیث فی التاج والنهایة (خرق).

[2] قال الاصمعی مولد (الجوهری) ۱۲۱.

[3] راجع لحدیث فرغ الله باختلاف الفاظه (والنهایة) وطس عن ابن مسعود والطبرانی عن ابی الدرداء وکنزالعمال ۱: ۹۴ والفتح للنبهانی ۲: ۲۶۶.

(۱۰۹) فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنْ خَلْقِ الْخَلْقِ وَالرِّزْقِ وَالْاَجَلِ کہ خداتعالیٰ مخلوق کی پیدائش کے رزق اور اجل سے فارغ ہو چکا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَاَسْقَيْنَاكُمُوْهُ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخَازِنِيْنَ﴾ (۱۵۔۲۲) اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔

میں بعض نے خَازِنِيْنَ کے معنیٰ حَافِظِيْنَ کئے ہیں۔ یعنی شکر گزاری سے تم اس کی حفاظت نہیں کر سکتے بعض نے کہا کہ یہ آیت کریمہ:

﴿اَفَرَأَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ أَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ﴾ (۵۶۔۶۸،۶۹) بھلا دیکھو تو سہی کہ جو پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا ہے۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْخَزَنَةُ: یہ خازن کی جمع ہے چنانچہ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا﴾ (۳۹۔۷۱) تو اس کے داروغے اس سے کہیں گے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ﴾ (۶۔۵۰) کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔ میں خَزَآئِنُ اللّٰهِ سے وہ مقدورات الٰہیہ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے روک رکھی ہیں۔ کیونکہ لفظ خزن میں منع کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وسیع جود اور قدرت مراد ہے۔ اور بعض نے اس سے کلمۂ کن مراد لیا ہے۔ خَزَنَ اللَّحْمَ کے اصل معنیٰ تو گوشت کی ذخیرہ اندوزی کے ہیں۔ لیکن کنایۃً گوشت کے بدبودار ہو جانے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور یہی خَنَزَ (بہ تقدیم نون) کے ہیں۔

(خ ز ی)

خَزِيَ (س) الرَّجُلُ رسوا ہونا۔ خواہ وہ رسوائی انسان کو خود اس کی ذات سے لاحق ہو یا غیر کی طرف سے پھر جو رسوائی اپنی جانب سے لاحق ہوتی ہے اسے حیائے مفرط کہا جاتا ہے اور اس کا مصدر خَزَايَةٌ ہے۔ اس سے صیغۂ صفت مذکر خَزْيَانُ اور مؤنث خَزْيٰ خَزَايَا۔ حدیث میں ہے [1]

(۱۱۰) اَللّٰهُمَّ احْشُرْنَا غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَادِمِيْنَ: اے خدا! ہمیں اس حالت میں زندہ نہ کرنا کہ ہم شرم اور ندامت محسوس کرنے والے ہوں۔ اور جو رسوائی دوسروں کی طرف سے لاحق ہوتی ہے وہ ذلت کی ایک قسم ہے۔ اور اس کا مصدر خِزْيٌ ہے۔ اور رَجُلٌ خِزْيٌ کے معنیٰ ذلیل آدمی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا﴾ (۵۔۳۳) دنیا میں ان کی رسوائی ہے۔

﴿اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾ (۱۶۔۲۷) کہ آج کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔

﴿فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ (۳۹۔۲۶) پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا۔

﴿لِنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (۴۱۔۱۶) تا کہ ان کو دنیا کی زندگی میں ذلت کے عذاب کا مزہ چکھائے۔

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى﴾ (۲۰۔۱۳۴) کہ

---

[1] فلينظر من اخرجه ۱۲.

ہمارے ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے۔

اخزیٰ (افعال) یہ خِزْیٌ اور خَزَایۃٌ دونوں سے آتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (٦٦۔٨) اس دن خدا پیغمبر کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کرے گا۔

کے دونوں معنیٰ ہو سکتے ہیں۔لیکن خِزْیٌ سے لینا انسب معلوم ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ﴾ (٣۔١٩٢) اے پروردگار! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا اسے رسوا کیا۔

میں اَخْزَیْتَہٗ، خَزَایَۃٌ سے ہے مگر خِزْیٌ سے بھی ہوسکتا ہے یہی معنیٰ مندرجہ ذیل آیات میں مراد ہیں۔

﴿مَنْ یَّاْتِیْہِ عَذَابٌ یُّخْزِیْہِ﴾ (٣٩۔٤٠) کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا۔

﴿وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾ (٣۔١٩٤) اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔

﴿وَلِیُخْزِیَ الْفَاسِقِیْنَ﴾ (٥٩۔٥) کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔

﴿وَلَا تُخْزُوْنَ فِیْ ضَیْفِیْ﴾ (١١۔٨٧) اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری آبرو نہ کھوؤ۔جس طرح خَزِیَ دو قسم پر ہے یعنی رسوائی کبھی اپنی ذات کی طرف سے لاحق ہوتی ہے اور کبھی دوسروں کی طرف سے اسی طرح ذَلَّ وَھَانَ بھی دو قسم پر ہے جو ذلت انسان کو خود اس کی ذات کی جانب سے لاحق ہو اسے ھَوْن وَذُلٌّ کہا جاتا ہے۔اور یہ صفات محمودہ سے ہے مگر جو دوسروں کی طرف سے پہنچے اسے ھُوْنٌ، ھَوانٌ اور ذُلٌّ کہتے ہیں اور یہ مذموم سمجھی جاتی ہے۔

(خ س ء)

خَسَأْتُ الْکَلْبَ فَخَسَأَ: میں نے کتے کو دھتکارا تو وہ دور ہو گیا۔اور کسی کو دھتکارنے کے لئے عربی میں اِخْسَأْ کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں کفار کے متعلق فرمایا:

﴿اِخْسَؤُا فِیْھَا وَلَا تُکَلِّمُوْنَ﴾ (٢٣۔١٠٨) اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

﴿فَقُلْنَا لَھُمْ کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ﴾ (٢۔٦٥) تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔

اسی سے خَسَأَ الْبَصَرُ: کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ہیں نظر درماندہ ہو کر منقبض ہو گئی۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ﴾ (٦٧۔٤) کہ وہ نظر درماندہ اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

(خ س ر)

اَلْخُسْرُ وَالْخُسْرَانُ: رأس المال میں کمی آجانا خسارہ کی نسبت کبھی انسان کی طرف ہوتی ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے خَسِرَ (س) فُلَانٌ فلاں نے نقصان اٹھایا۔اور کبھی فعل کی طرف ہوتی ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے خَسِرَتْ تِجَارَتُہٗ اس کی تجارت خسارہ میں ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ﴾ (٧٩۔١٢) یہ لوٹنا تو (موجب) زیاں ہے۔

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔جیسا کہ مال وجاہ وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت وسلامتی، عقل وایمان وثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالیٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿الَّذِينَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ (۳۹۔۱۵) جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا۔دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ﴾ (۲۔۱۲۱) اور جو اس کو نہیں مانتے وہ خسارہ پانے والے ہیں۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (۲۔۲۷) جو خدا کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں ...... یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (۵۔۳۰) مگر اس کے نفس نے اس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اس نے اسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگیا۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ﴾ (۵۵۔۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔

میں ہوسکتا ہے کہ ماپ تول میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے اور ظلم ترک کرنے کا حکم ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان افعال کے ارتکاب سے منع کیا ہو جو قیامت کے دن میزان عمل میں کمی کا موجب ہوں جس کی وجہ سے آدمی ان لوگوں سے ہوجائے جن کے متعلق قرآن پاک نے:﴿فَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ (۱۰۱۔۸) کہا ہے۔یہ دونوں معنیٰ باہم لازم ملزوم ہیں۔اور جہاں کہیں قرآن پاک میں خُسرانَ کا لفظ آیا ہے وہ اسی دوسرے معنیٰ پر محمول ہے دنیوی کاروبار اور دیگر چیزوں میں نقصان اٹھانا مراد نہیں ہے۔

(خ س ف)

اَلْخُسُوْفُ: کا لفظ چاند کے بے نور اور کُسُوفَ کا لفظ سورج کے بے نور ہونے پر بولا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ خسوف قدرے بے نور ہونے کو کہا جاتا ہے۔اور کُسُوفٌ پوری طرح بے نور ہوجانے کو کہا جاتا ہے۔عام اس سے کہ وہ سورج ہو یا چاند کہا جاتا ہے۔خَسَفَهُ اللّٰهُ: اللہ نے اسے زمین میں دھنسا دیا (متعدی) خَسَفَ هُوَ: (لازمی) زمین میں دھنس جانا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ﴾ (۲۸۔۸۰) پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔

﴿لَوْلَا اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا﴾ (۲۸۔۸۲) اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔

حدیث میں ہے [1]

(۱۱۱) اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ

---

[1] الحديث في الصحيحين وابي داؤد والنسائي عن عائشة (صلوة الكسوف) والطيالسي عن انس وايضاً البخاري والنسائي عن ابي بكرة راجع الفتح النبهاني ج ۱ ص ۳۰۵۔۳۰۶۔

لَا یَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَیَاتِہٖ کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو کسی کی موت یا پیدائش کی وجہ سے بے نور نہیں ہوتے۔اور عَیْنٌ خَاسِفَۃٌ (اندر دھنسی ہوئی آنکھ) کا محاورہ خَسَفَ الْقَمَرُ سے منقول ہے بِئْرٌ مَّخْسُوْفَۃٌ: وہ کنواں جس کا پانی غائب ہوگیا ہو اور چاند گہن لگنے سے چونکہ ماند پڑ جاتا ہے اس لئے بطور استعارہ خَسْفٌ بمعنیٰ ذلت ورسوائی بھی آجاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

تَحَمَّلَ فُلَانٌ خَسْفاً: فلاں شخص ذلیل ہوگیا۔

(خ ش ب)

اَلْخَشَبُ: (موٹی لکڑی ج خُشُبٌ) اور آیت کریمہ:

﴿کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ﴾ (۶۳۔۴) گویا لکڑیاں ہیں جو دیوار سے لگائی گئی ہیں۔

میں انہیں نکما ہونے میں لکڑیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔اور خَشَبٌ کے لفظ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے خَشَبْتُ السَّیْفَ: تلوار کو صیقل کرنا اور صیقل کے آلہ کو مِخْشَب کہا جاتا ہے۔ سَیْفٌ خَشِیْبٌ: تلوار جو تازہ صیقل کی گئی ہو۔ جَمَلٌ خَشِیْبٌ: نیا اونٹ جو سدھایا نہ گیا ہو۔

تَخَشَّبَتِ الْاِبِلُ: لکڑی کھانا۔سوکھی گھاس چرنا۔

جَبْھَۃٌ خَشْبَاءُ: لکڑی کی طرح سخت اور کھردری پیشانی (کنایہ) بے حیا۔جیسا کہ شاعر نے صخر یعنی چٹان کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا ہے (۱۳۵)

وَالصَّخْرُ ھَشٌّ عِنْدَ وَجْھِکَ فِی الصَّلَابَۃِ

تیرے چہرے کے مقابلہ میں تو پتھر بھی ہشاش بشاش معلوم ہوتا ہے۔

اَلْمَخْشُوْبُ: وہ چیز جس میں لکڑی ملائی گئی ہو۔اور یہ ردی چیز سے کنایہ ہوتا ہے۔

(خ ش ع)

اَلْخُشُوْعُ: (ن) کے معنی ضَرَاعَۃٌ یعنی عاجزی کرنے اور جھک جانے کے ہیں۔مگر زیادہ تر خُشُوْع کا لفظ جوارح اور ضَرَاعت کا لفظ قلب کی عاجزی پر بولا جاتا ہے۔اسی لئے ایک روایت میں ہے [1]

(۱۱۲) اِذَا ضَرَعَتِ الْقَلْبُ خَشَعَتِ الْجَوَارِحُ جب دل میں فروتنی ہو تو اسی کا اثر جوارح پر ظاہر ہوجاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیَزِیْدُھُمْ خُشُوْعاً﴾ (۱۷۔۱۰۹) اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِی صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ (۲۳۔۲) جو نماز میں زیادہ عجز و نیاز کرتے ہیں۔

﴿وَکَانُوْا لَنَا خَاشِعِیْنَ﴾ (۲۱۔۹۰) اور ہمارے آگے عاجزی کیا کرتے تھے۔

﴿وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ﴾ (۲۰۔۱۰۸) اور............ آوازیں پست ہوجائیں گی۔

﴿خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ﴾ (۶۸۔۴۳) ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔

﴿اَبْصَارُھَا خَاشِعَۃٌ﴾ (۷۹۔۹) اور آنکھیں جھکی ہوئی۔ یہ ان کی نظروں کے مضطرب ہونے سے کنایہ ہے۔جیسا کہ زمین وآسمان کے متعلق بطور کنایہ کے فرمایا:

---

[1] لم اجدہ ۱۲.

﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا﴾ (۵۶۔۴) جب زمین بھونچال سے لرزنے لگے۔

﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ (۹۹۔۱) جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی۔

﴿يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا﴾ (۵۲۔۹،۱۰) جس دن آسمان لرزنے لگے کپکپا کر۔ اور پہاڑ اڑنے لگیں (اون ہوکر)

(خ ش ی)

اَلْخَشْيَةُ: اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہوجائے۔ یہ بات عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (۳۵۔۲۸) اور خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔ میں خشیت الٰہی کے ساتھ علماء کو خاص کیا ہے۔

﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى﴾ (۸۰۔۸،۹) اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور (خدا سے) ڈرتا ہے۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۵۰۔۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

﴿فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا﴾ (۱۸۔۸۰) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (بڑا ہوکر جو بدکردار ہوتا کہیں) ان کو سرکشی اور کفر میں پھنسا دے۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ﴾ (۲۔۱۵۰) سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا۔

﴿يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً﴾ (۴۔۷۷) لوگوں سے یوں ڈرنے لگے جیسے خدا سے ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ﴾ (۳۳۔۳۹) جو خدا کے پیغام (جوں کے توں) پہنچاتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ﴾ (۴۔۹)..... اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے۔

یعنی ان کو اپنے فقر کے خوف کا احساس ہونا چاہیے۔

﴿خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ (۱۷۔۳۱) مفلسی کے خوف سے۔ یعنی اس اندیشے سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو کہ یہ مفلس ہوکر ذلیل ہوجائے گی۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۵۰۔۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

یعنی اس کے دل میں ایسا خوف ہو جو کہ معرفت الٰہی کا تقاضہ ہے۔

(خ ص ص)

اَلتَّخْصِيْصُ وَالْاِخْتِصَاصُ وَالْخُصُوْصِيَّةُ وَالتَّخَصُّصُ: کسی چیز کے بعض افراد کو دوسروں سے الگ کر کے ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا یہ اَلْعُمُوْمُ وَالتَّعَمُّمُ وَالتَّعْمِيْمُ کی ضد ہے۔

خُصَّانُ الرَّجُلِ۔ جن پر خصوصی نوازش کرتا ہو۔

اَلْخَاصَّةُ: یہ عامۃ کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ (۸۔۲۵) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت

کے ساتھ انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گناہ گار ہیں بلکہ سب پر واقع ہوگا۔

خَصَّهٗ بِکَذَا وَاخْتَصَّهٗ: کسی کو کسی چیز کے ساتھ مختص کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ﴾ (۲۔۱۰۵) جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے۔ خَصَاصُ الْبَيْتِ: مکان میں شگاف کو کہتے ہیں۔ اسی سے خَصَاصَةٌ اس فقر اور احتیاج کو کہتے ہیں جو ختم نہ ہوئی ہو۔ اس قسم کے فقر کو خَلَّةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (۵۹۔۹) اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔ لہٰذا آپ اسے خصاص سے ماخوذ قرار دے سکتے ہیں۔

اَلْخُصُّ: بانس یا لکڑی کا جھونپڑا اور اسے خُصٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جھروکے نظر آتے ہیں۔

(خ ص ف)

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ﴾ (۲۰۔۱۲۲) یعنی آدم اور حوّا اپنے اوپر خَصَفَة یعنی درخت کے پتے چپکانے لگے اسی سے زنبیل کو جو کھجوریں ڈالنے کے لئے کھجور کے پتوں سے بنایا جاتا ہے اور گاڑھے کپڑے کو خَصَفَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع خَصَفٌ (وَخِصَافٌ) آتی ہے۔ اور خصْفَةٌ (بسکون صاد) چمڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کے اوپر اس جیسا دوسرا ٹکڑا رکھ کر جوتا بنایا جائے خَصَفْتُ النَّعْلَ بِالْمِخْصَفِ: ستالی کے ساتھ جوتا سینا۔

ایک روایت میں ہے:[1]

(۱۱۳) كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْصِفُ نَعْلَهٗ کہ رسول اللہ ﷺ اپنا جوتا خود ہی مرمت کرلیا کرتے تھے۔

خَصَفْتُ الْخَصْفَةَ۔ زنبیل بننا۔

اَلْاَخْصَفُ وَالْخَصِيفُ: دو رنگ کا کھانا۔ اصل میں اس دودھ وغیرہ کو کہتے ہیں جو چمڑے کے مشکیزے میں ڈالا جائے اور اس چمڑے کا رنگ اسی کے ساتھ مل جائے۔[2]

(خ ص م)

اَلْخَصْمُ: یہ خَصِيمَةٌ کا مصدر ہے جس کے معنیٰ جھگڑنے کے ہیں کہا جاتا ہے: خَصَمْتُهٗ وَخَاصَمْتُهٗ مُخَاصَمَةً وَخِصَامًا: کسی سے جھگڑا کرنا قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ (۲۔۲۰۴) اور وہ حالانکہ سخت جھگڑالو ہے۔

﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ (۴۳۔۱۸) اور جھگڑنے کے وقت بات نہ کرسکے۔

اور مُخَاصِمٌ کو خَصِيمٌ کہا جاتا ہے اور خصم کا لفظ واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی تثنیہ بھی آجاتا ہے۔[3]

---

[1] کلمة من حديث عائشة رواه الترمذى وفى كنزالعمال (المتفرقات) ۷: رقم ۸۳۴ (حم ۔عن عائشة) وفى تخريج العراقى على الاحياء ۲: ۳۶۰ اخرجه احمد من حديث عائشة ورجاله رجال الصحيح ورواه ابو الشيخ ايضاً وابن حبان فى زوائده رقم ۲۱۳۳ ۔ ۲۱۳۵).

[2] قال الجوهرى الخصيف اللبن الحليب يصب عليه الرائب فان جعل عليه التمر والسمن فهو العوثبانى .

[3] قال الجوهرى ومن العرب من يثنيه ويجمعه.

اصل میں خَصَمٌ کے معنیٰ کنارہ کے ہیں۔اور مخاصمت کے معنیٰ ایک دوسرے کو کنارہ سے پکڑنے کے ہیں۔اور بوری کو کونے سے پکڑ کر کھینچنے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ایک حدیث میں ہے [1]

(۱۱٤) نَسِيتُهَا فِي خُصْمِ فِرَاشِيْ کہ میں اسے اپنے بستر ہ کے کونے میں بھول آیا ہوں۔خَصْمٌ کی جمع خُصُومٌ وَ اَخْصَامٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا﴾ (۲۲۔۹) دو فریق جھگڑتے ہیں۔میں خَصْمَانِ سے دو فریق مراد ہیں اسی لئے اخْتَصَمُوا آیا ہے۔

اَلْاِخْتِصَامُ: (افتعال) ایک دوسرے سے جھگڑنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ﴾ (۵۰۔۲۸) ہمارے حضور ردوکد نہ کرو۔

﴿وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ﴾ (۲۶۔۹۶)......وہ آپس میں جھگڑیں گے۔

اَلْخَصِيْمُ: جھگڑالو بہت زیادہ جھگڑنے والا جیسے فرمایا:

﴿فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۱۶۔۴) مگر وہ (اس بارے میں) علانیہ جھگڑنے لگا۔

اَلْخَصِمُ: سخت جھگڑالو جس کا شیوہ ہی جھگڑنا ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ﴾ (۴۳۔۵۸) حقیقت یہ ہے یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔

(خ ض د)

خَضَدْتُهٗ فَانْخَضَدَ کے معنیٰ ہیں: میں نے درخت کے کانٹے توڑے چنانچہ وہ ٹوٹ گئے اور ایسے درخت کو جس کے کانٹے توڑ دیئے گئے ہوں اسے مَخْضُوْدٌ اور خضید کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ﴾ (۵۶۔۲۸) یعنی بے خار کی بیریوں میں۔

اور خُضْدٌ بمعنی مَخْضُوْدٌ آتا ہے جیسے نَقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ اور اسی سے استعارۃً خَضَدَ عُنُقَ الْبَعِيْرِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔یعنی اس نے اونٹ کی گردن توڑ ڈالی۔

(خ ض ر)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً﴾ (۲۲۔۶۳) تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔

﴿ثِيَابًا خُضْرًا﴾ (۱۸۔۳۱) سبز رنگ کے کپڑے۔

خُضْرًا کا واحد اَخْضَرُ ہے اور اَلْخُضْرَةُ: ایک قسم کا رنگ ہوتا ہے جو سفیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے مگر سیاہی غالب ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اَسْوَدُ (سیاہ) اور اَخْضَرُ (سبز) کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے [2] (البسیط)

---

[1] راجع اللسان (خصم) من حديث ام سلمة قالت يارسول الله اراك ساهم الوجه أمن علة قال لكنّه من السبعة الدنانيرالتى اتينابها امس فى خصم الفراش فبت ولم اقسمها.

[2] قاله ذوالرمة ويروى المجهول بدل المحهور ومعسفه بدل معسفة كمافى اللسان (هوم) والاقتصاب وفى رواية اغضف بدل اخضر هو المثنىٰ وادب الكاتب ۲۳ : ۱۹۱ والبيت فى ديوانه ٥٧٤ واضداد ابن الانبارى ٣٤٨ واللسان (خضر، عسف) واضداد ابى الطيب ٢٣٠ والحيوان (٦ : ١٧٥) والسيوطى : ١٥٠ والمحكم (عسف) ومعنىٰ العسف ركوب المفازة وقصعها بغير قصد ولاهداية ولاتوخى صواب ولاطريق مسلوك ١٢.

(۱۳۶) قَدْ اَعْسَفَ النَازِحَ الْمَجْهُوْدَ مَعْسَفَةً
فِی ظِلِّ اَخْضَرَ یَدْعُوْهَا مَهُ الْیَوْمُ

میں تاریک اور بھیانک راتوں میں دور دراز راستوں میں سفر کرتا ہوں جو بے نشان ہوتے ہیں۔اور سبزی اور شادابی کی وجہ سے عراق کے ایک حصہ کو سَوَادُ الْعِرَاق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿مُدْهَآمَّتَانِ﴾ (۵۵۔۶۴) کے معنیٰ سرسبز کے ہیں اور خُضْرَة کی جگہ دُهْمَة کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ سیاہی کے ہیں۔حدیث میں ہے ❶

(۱۱۴) اِیَّاکُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ: تم کوڑی کی سرسبزی سے بچو۔اور خَضْرَاءَ الدِّمَنِ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اَلْمَرْأَةُ الْحَسَنَةُ فِی مَنْبَتِ السُّوْءِ: یعنی خوبصورت عورت جو بدطینت ہو۔

اَلْمُخَاضَرَةُ: سبزیوں اور کچے پھلوں کی بیع کرنا۔

اَلْخَضِیْرَةُ: کھجور کا درخت جس کی سبز اور نیم پختہ کھجوریں جھڑ جائیں۔

(خ ض ع)

اَلْخُضُوْعُ کے معنی خشوع یعنی جھکنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَجُلٌ خُضَعَةٌ﴾ وہ شخص جو ہر ایک کے سامنے عاجزی اور انکساری ظاہر کرتا پھرے۔

خَضَعْتُ اللَّحْمَ: میں نے گوشت کاٹا۔

ظَلِیْمٌ اَخْضَعُ: شترمرغ جس کی گردن میں پستی اور جھکاؤ ہو۔

(خ ط ط)

اَلْخَطُّ: (مثل مَدٌّ) جس میں طول ہو اہل ہندسہ کے نزدیک خطوط کئی قسم پر ہیں۔یعنی مسطوح، مستدیر مقوّس اور ممال وغیرھا اور ہر مستطیل علاقہ کو خَطٌّ کہہ دیتے ہیں جیسے خَطُّ الْیَمِنِ: جو یمن کے ایک علاقہ کا نام ہے جس کی طرف خطی نیزے منسوب ہیں اور زمین کا وہ حصہ جو انسان اپنے لئے مخصوص کرے اور کھودے اسے خَطٌّ اور خِطَّةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَطِیطَةُ: وہ زمین جس کے اردگرد بارش ہوئی اور وہ درمیان میں خط منحرف کی طرح بے بارش کے رہ گئی۔اور اَلْخَطُّ کے معنیٰ لکھنا، کتابت کرنا بھی ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِيْنِكَ﴾ (۲۹۔۴۸) اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے۔

(خ ط ی)

اَلْخَطَأُ وَالْخَطَأَةُ کے معنیٰ صحیح جہت سے عدول کرنے کے ہیں۔اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) کوئی ایسا کام بالارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔یہ خطا تام ہے جس پر مؤاخذہ ہوگا۔اس معنیٰ میں فعل خَطِیءَ یَخْطَأُ خِطْأً وَخِطْأَةً بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا﴾ (۱۷۔۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت جرم ہے۔

---

❶ رواه الدارقطني في الافراد والرامهرمزي في الامثال من حديث الحذري قال الدارقطني تفردبه الواقدي وهو ضعيف (تخريج احياء للعراقي ۲: ۴۱) والحديث مثل راجع الميداني ۱: ۳۲ والفائق ۱: ۱۷۵ وغريب ابي عبيد الحصري ۱: ۵۹.

﴿وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ﴾ (۱۲۔۹۱) اور بلاشبہ ہم خطا کار تھے۔

(۲) ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہو جائے۔ کہا جاتا ہے۔

اَخْطَأَ يُخْطِيءُ اِخْطَاءً فَهُوَ مُخْطِيءٌ: اس میں اس کا ارادہ تو درست ہوتا ہے مگر اس کا فعل غلط ہوتا ہے اسی قسم کی خطا کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶

(۱۱۵) رُفِعَ عَنْ اُمَّتِيْ الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ کہ میری امت سے خطا اور نسیان اٹھا لئے گئے ہیں۔ نیز فرمایا: ❷

(۱۱۶) مَنِ اجْتَهَدَ فَاَخْطَأَ فَلَهٗ اَجْرٌ: جس نے اجتہاد کیا۔ لیکن اس سے غلطی ہوگئی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ﴾ (۴۔۹۲) اور جو غلطی سے مومن کو مار ڈالے تو (ایک تو) .... غلام کو آزاد کردے۔

(۳) غیر مستحسن فعل کا ارادہ کرے لیکن اتفاق سے مستحسن فعل سرزد ہو جائے۔ اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے مگر ارادہ غلط ہے لہٰذا اس کا قصد مذموم ہوگا فعل بھی قابل ستائش نہیں ہوگا۔ اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے ❸

(۱۳۷) اَرَدْتُّ مَسَاءَتِيْ فَاَجْرَتْ مَسَرَّتِيْ
وَقَدْ يَحْسُنُ الْاِنْسَانُ مِنْ حَيْثُ لَا يَدْرِيْ

(تو نے میری برائی کا ارادہ کیا لیکن مجھے خوشی حاصل ہوگئی کبھی انسان نادانستہ طور پر بھی اچھا کام کر لیتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جس شخص سے اتفاقاً ارادہ کے خلاف فعل صادر ہو جائے۔ تو اس کے متعلق "اخطأ" کہا جاتا ہے اور اگر ارادہ کے مطابق وہ فعل صادر ہو تو اصاب کہتے ہیں۔ مگر کبھی اَخْطَأَ کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جس نے کسی غیر مستحسن فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کسی نازیبا کام کا ارادہ کیا ہو۔ لہٰذا اَصَابَ الْخَطَأَ وَاَخْطَأَ الصَّوَابَ وَاَصَابَ الصَّوَابَ وَاَخْطَأَ الْخَطَأَ: ہر طرح کہنا درست ہوگا اور یہ لفظ مشترک ہے جو بہت سے معانی کا محتمل ہوتا ہے اس لئے جو شخص حقائق کا متلاشی ہو اسے اس کے متعلق خوب غور سے کام لینا چاہیے۔

اَلْخَطِيْئَةُ: یہ قریب قریب سَيِّئَةٌ کے ہم معنیٰ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ﴾ (۲۔۸۱) اور اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں گے۔

لیکن زیادہ تر خَطِيْئَةٌ کا استعمال اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جو بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کا ارادہ اس کے صدور کا سبب بن جائے مثلاً کسی نے شکار کو نشانہ لگایا مگر نشانہ خطا ہو کر کسی انسان کو جا لگا یا کسی مسکر چیز کا استعمال کیا اور نشہ کی حالت میں کسی جرم کا ارتکاب کر بیٹھا یہ سبب دو قسم پر ہے ایک سبب محظور جیسے مسکر چیز پینا اس حالت میں جو فعل سرزد ہوگا وہ قابل گرفت ہوگا۔ دوم سبب مباح جیسے شکار کو نشانہ بنایا اس حالت میں اگر کوئی خطا سرزد ہوگی اس پر گرفت نہیں ہوگی اس قسم کی غلطی کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ اَخْطَأْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ

---

❶ وفی روایة وضع وفی ابن عدی عن ابی بکرة مرفوعاً رفع الله عن هذه هذا الامة ثلاثاً الخ قال الحافظ فی تخریجه ص ۱۳۲ رقم ۲۰۳ هذه من منکرات جعفر وفی روایة ابن ماجة والبیهقی وابن حبان عن ابن عباس ان الله تجاوز عن امتی (راجع المشکوة واللآ ئی للسیوطی.

❷ لم احده .

❸ لم احده ویرجی ۱۲ .

﴿مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ﴾ (۳۳۔۵) اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں لیکن جو قصد دلی سے کرو (اس پر مؤاخذہ ہے)

اور آیت کریمہ:

﴿وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْئَۃً اَوْ اِثْمًا﴾ (۴۔۱۱۲) اور جو کوئی قصور یا گناہ خود کرے۔

میں خَطِیَّتُہٗ سے وہ فعل مراد ہے جو بلا قصد سرزد ہوا ہو اسی قسم کی خطأ کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا۔

﴿وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓـئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ﴾ (۲۶۔۸۲) اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

خَطِیْئَۃٌ کی جمع خَطِیْٓـئَات و خَطَایَا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَزِدِالظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا مِّمَّا خَطِیْٓـئٰتِہِمْ﴾ (۷۱۔۲۴، ۲۵) اور ظالم لوگوں کے لئے اور زیادہ تباہی بڑھا (آخر) وہ اپنے گناہ کے سبب ہی۔

﴿اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَا﴾ (۲۶۔۵۱) ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ بخش دے گا۔

﴿وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ وَمَا ھُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰھُمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ (۲۹۔۱۲) ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بھی بوجھ اٹھانے والے نہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿نَغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ﴾ (۲۔۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کردیں گے۔

سے وہ مراد ہیں جو عمداً کئے ہوں۔

اَلْخَاطِیءُ بالا ارادہ گناہ کرنے والے کو کہتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ o لَّا یَاْکُلُہٗٓ اِلَّا الْخٰطِئُوْنَ﴾ (۶۹۔۳۶،۳۷) اور نہ پیپ کے سوا (اس کے لئے) کھانا ہے جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

مگر کبھی نفس گناہ پر بھی خَاطِئَۃٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَالْمُؤْتَفِکٰتُ بِالْخَاطِئَۃِ﴾ (۶۹۔۹) اور وہ جو الٹی بستیوں میں رہتے تھے سب گناہ کے کام کرتے تھے۔ یعنی وہ گناہ عظیم کا ارتکاب کرتے تھے جیسا کہ (بطور مبالغہ) شِعْرٌ شَاعِرٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔لیکن جو گناہ بلا قصد سرزد ہوجائے اس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ وہ قابل گرفت نہیں ہے [1] مگر آیت کریمہ:

﴿نَغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ﴾ (۲۔۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کردیں گے۔میں وہی معنی مراد ہیں جسے ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔

(خ ط ب)

اَلْخَطْبُ وَالْمُخَاطَبَۃُ وَالتَّخَاطُبُ: باہم گفتگو کرنا۔ایک دوسرے کی طرف بات لوٹانا اسی سے خُطْبَۃٌ اور خِطْبَۃٌ کا لفظ ہے لیکن خُطْبَۃٌ وعظ و نصیحت کے معنی میں آتا ہے اور خِطْبَۃٌ کے معنی ہیں نکاح کا پیغام قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا عَرَّضْتُمْ بِہٖ مِنْ خِطْبَۃِ النِّسَآءِ﴾ (۲:۲۳۵) اگر تم کنایہ کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو......تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔

اصل میں خِطْبَۃٌ اسی حالت کو کہتے ہیں جو بات کرتے وقت ہوتی ہے جیسا کہ جِلْسَۃٌ اور قِعْدَۃٌ پھر خُطْبَۃٌ سے تو خَاطِبٌ اور خَطِیْبٌ (دونوں لفظ استعمال

---

[1] وقد مرالآن ۱۲۔

ہوتے ہیں مگر خِطْبَۃٌ صرف خَاطِبٌ کا لفظ ہی بولا جاتا ہے۔اور خَطَبَ فعل دونوں معنی کے لیے آتا ہے۔

اَلْخَطْبُ: اہم معاملہ جس کے بارے میں کثرت سے تخاطب ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ﴾ (۲۰:۹۵)(پھر سامری سے کہنے لگے) کہ سامری تیرا کیا حال ہے۔

﴿فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (۵۱:۳۱) کہ فرشتو تمہارا مدعا کیا ہے۔

﴿فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (۳۸:۲۰) دوٹوک بات، فیصلہ کن بات جس سے نزاع ختم ہوجائے۔

(خ ط ف)

خَطِفَ يَخْطَفُ خَطْفًا وَاخْتَطَفَ اخْتِطَافًا کے معنیٰ کسی چیز کوسرعت سے اچک لینا کے ہیں۔

یہ باب (س ض) دنوں سے آتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ﴾ (۳۷۔۱۰) ہاں جو کوئی (فرشتوں کی) بات کو) چوری سے جھپٹ لینا چاہتا ہے۔

طا پر فتحہ اور کسرہ دونوں منقول ہیں اور اس سے مراد شیاطین ہیں جو چوری چھپے ملاا علیٰ کی گفتگو سنا کرتے تھے۔نیز فرمایا:

﴿تَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ﴾ (۲۲۔۳۱) پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ﴾ (۲۔۲۰) قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں (کی بصارت کو اچک لے جائے۔

﴿وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ (۲۹۔۶۷) اور لوگ ان کے گردونواح سے اچک لئے جاتے ہیں۔یعنی ان کے گردونواح میں قتل وغارت کا سلسلہ جاری ہے۔

اَلْخَطَّافُ: (۱) ابابیل کی قسم کا ایک پرندہ جو پرواز کرنے میں کسی چیز کو جھپٹ لیتا ہے۔(۲) آہن کج جس کے ذریعے کنوین سے ڈول نکالا جاتا ہے گویا وہ ڈول کو اچک کر باہر لے آتا ہے۔(۳) وہ لوہا جس پر کنویں کی چرخی گھومتی ہے۔ج خَطَاطِيْفُ بَازٍ مُخْطِفٌ: باز جو اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

اَلْخَطِيْفُ: تیز رفتاری۔اَخْطَفُ الحشَا و مُخْتَطِفُهٗ: مرد باریک شکم جس کے دبلا پن کی وجہ سے ایسا معلوم ہو کہ اس کی انتڑیاں اچک لی گئی ہیں۔

(خ ط و)

خَطَوْتُ اَخْطُوْ کے معنی چلنے کے لئے قدم اٹھانے کے ہیں۔خَطْوَۃٌ ایک بار قدم اٹھانا۔اَلْخُطْوَۃ: وہ فاصلہ جو دو قدموں کے درمیان ہو۔

اَلْخُطْوَۃ: کی جمع خُطُوَاتٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ (۲۔۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔

یعنی شیطان کی اتباع نہ کرو۔اور یہ آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى﴾ (۳۸۔۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرو۔

کی طرح ہے۔

(خ ف ف)

اَلْخَفِيْفُ: (ہلکا) یہ ثقیل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔اس کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے۔

(۱) کبھی وزن میں مقابلہ کے طور پر یعنی دو چیزوں کے باہم مقابلہ میں ایک کو خفیف اور دوسری کو ثقیل کہہ دیا جاتا ہے۔جیسے دِرْهَمٌ خَفِيْفٌ وَدِرْهَمٌ ثَقِيْلٌ: یعنی وہ درہم ہلکا ہے۔اور یہ بھاری ہے۔

(۲) اور کبھی تقابل زمانی کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک گھوڑا جو فی گھنٹہ دس میل کی مسافت طے کرتا ہو اور دوسرا پانچ میل فی گھنٹہ دوڑتا ہو تو پہلے کو خفیف (سبک رفتار) اور دوسرے کو ثقیل (سست رفتار) کہا جاتا ہے۔
(۳) جس چیز کو خوش آئند پایا جائے اسے خفیف اور جو طبیعت پر گراں ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے اس صورت میں خفیف کا لفظ بطور مدح اور ثقیل کا لفظ بطور مذمت استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ آیات کریمہ:
﴿اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ﴾ (۸۔۶۶) اب خدا نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا۔
﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ (۲۔۸۶) سو نہ تو ان پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔اسی معنیٰ پر محمول ہیں بلکہ ہمارے نزدیک آیت۔
﴿حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا﴾ (۷۔۱۸۹) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔بھی اسی معنی پر محمول ہے۔
(۴) جو شخص جلد طیش میں آجائے اسے خفیف اور جو پر وقار ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے۔اسی معنیٰ کے اعتبار سے خفیف صفت ذم ہوگی اور ثقیل صفت مدح۔
(۵) جو اجسام نیچے کی طرف جھکنے والے ہوں انہیں ثقیلہ اور جو اوپر کی جانب چڑھنے والے ہوں انہیں خفیفہ کہا جاتا ہے۔اسی معنیٰ کے لحاظ سے زمین پانی وغیرہا کو اجسام ثقیلہ اور ہوا، آگ وغیرہا اجسام خفیفہ میں داخل ہوں گے۔
خَفَّ (ض) خَفًّا وَخِفَّةً وَتَخَفَّفَ: ہلکا ہونا۔خَفَّفَهُ تَخْفِيفًا: ہلکا کرنا۔اِسْتَخَفَّهُ: ہلکا سمجھنا۔خَفَّ الْمَتَاعُ سامان کا ہلکا ہونا اسی سے كَلَامٌ خَفِيفٌ عَلَى اللِّسَانِ کا محاورہ مستعار ہے یعنی وہ کلام جو زبان پر ہلکی ہو۔اور آیت کریمہ:
﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ﴾ (۴۳۔۵۴) غرض اس نے اپنی قوم کی عقل ماردی اور انہوں نے اس کی بات مان لی۔
کے ایک معنیٰ تو یہ ہیں کہ اس نے اپنی قوم کو اکسایا کہ اس کے ساتھ تیزی سے چلیں اور یا یہ کہ انہیں اجسام وعزائم کے اعتبار سے ڈھیلا پایا اور بعض نے یہ معنیٰ بھی کئے ہیں کہ انہیں جاہل اور کم عقل سمجھا۔اور آیت کریمہ:
﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهٗ﴾ (۷۔۹) اور جن کے وزن ہلکے ہوں گے۔
میں اعمال صالحہ کی کمی کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ﴾ (۳۰:۶۰) اور وہ تمہیں اوچھا نہ بنا دیں۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ شبہات پیدا کر کے تمہیں تمہارے عقائد سے متزلزل اور برگشتہ نہ کر دیں۔
خَفُّوا عَنْ مَنَازِلِهِمْ: وہ تیزی سے کوچ کر گئے۔
اَلْخُفُّ: موزہ۔انسان کے موزہ سے تشبیہ دے کر خُفُّ النَّعَامَةِ وَالْبَعِيرِ (سپل شتر وسم شتر مرغ) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(خ ف ت)

اَلْمُخَافَتَةُ وَالْخَفْتُ پوشیدہ گفتگو کرنا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۰۔۱۰۳) وہ آپس میں آہستہ آہستہ کہیں گے۔
﴿وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ (۱۷۔۱۱۰) اور نہ آہستہ۔کسی شاعر نے کہا ہے [1]
(۱۳۷) وَشَتَّانَ بَيْنَ الْجَهْرِ وَالْمَنْطِقِ الْخَفْتِ
کہ بلند اور پوشیدہ گفتگو میں بیّن فرق ہوتا ہے۔

[1] البیت فی الصحاح واللسان (خفت) بغیر عزو وصدرہ : اخاطب جهراً اذلهن تخافت ۱۲۔

(خ ف ض)

اَلْخَفْضُ یہ رَفْعٌ کی ضد ہے اور خَفْضٌ کے معنیٰ نرم رفتاری اور سکون وراحت بھی آتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ﴾ (۱۷۔۲۴) اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔ میں ماں باپ کے ساتھ نرم برتاو اور ان کا مطیع اور فرمانبردار ہو کر رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ گویا یہ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ (کہ مجھ سے سرکشی نہ کرنا) کی ضد ہے اور قیامت کے متعلق فرمایا:

﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ (۵۶۔۳) کسی کو پست کرے اور کسی کو بلند۔

کیونکہ وہ بعض کو پست اور بعض کو بلند کردے گی پس خَافِضَةٌ میں آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾ (۹۵۔۵) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

(خ ف ی)

خَفِیَ (س) خُفْيَةً الشَّیْءُ: پوشیدہ ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً﴾ (۷۔۵۵) اپنے پروردگار سے عاجزی اور چپکے چپکے سے دعائیں مانگا کرو۔

اَلْخِفَاءُ: (مثل غِطَاءَ) کے معنیٰ پردہ کے ہیں۔

خَفَيْتُهُ: میں نے اس سے پوشیدگی دور کردی۔ یعنی ظاہر کر دیا۔ اَخْفَيْتُهُ پوشیدہ کرنا۔ چھپانا یہ اِبْدَاء اور اعلان کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۷۱) اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور وہ بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔

﴿وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ﴾ (۱۔۶۰) جو کچھ تم مخفی طور پر اور جو علی الاعلان کرتے ہو وہ مجھے معلوم ہے۔

﴿بَلْ بَدَالَهُمْ مَّاكَانُوا يُخْفُوْنَ﴾ (۶۔۲۸) ہاں یہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے (آج) ان پر ظاہر ہو گیا ہے۔

اَلْاِسْتِخْفَاءُ: چھپنا قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ﴾ (۱۱۔۵) دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں تاکہ خدا سے پردہ کریں۔

اَلْخَوَافِی: پرند کے بازوؤں کے نیچے چھپے ہوئے پر۔ اس کا مفرد خَافِيَةٌ ہے اور یہ اَلْقَوَادِمُ کی ضد ہے۔

(خ ل ل)

اَلْخَلَلُ: دو چیزوں کے درمیان کشادگی اور فاصلہ کو کہتے ہیں مثلاً بادل اور گھروں کے درمیان کا فاصلہ یا راکھ وغیرہ کا اندرونی حصہ اس کی جمع خِلَالٌ ہے۔ چنانچہ بادل کے متعلق فرمایا:

﴿فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلاَلِهِ﴾ (۳۰۔۴۸) تم دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ میں سے بارش برسنے لگتی ہے۔

اور گھروں کے متعلق فرمایا:

﴿فَجَاسُوا خِلاَلَ الدِّيَارِ﴾ (۱۷۔۵) اور وہ شہروں

کے اندر پھیل گئے۔

شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۳۹) اَرَىٰ خَلَلَ الرَّمَادِ وَمِيْضَ جَمْرٍ

میں راکھ کے اندر آگ کے انگارے کی چمک دیکھتا ہوں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَاْ اَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ﴾ (۹۔۴۷) اور تم میں دوڑے دوڑے پھرتے۔یعنی چغل خوری اور فساد سے تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کی کوشش کرتے۔

اَلْخِلَالُ: دانت وغیرہ صاف کرنے کا تنکا کہا جاتا ہے۔ خَلَّ سِنَّهٗ اس نے اپنا دانت صاف کیا۔خَلَّ ثَوبَهٗ کپڑے میں سوراخ کرنا۔خَلَّ (ن) لِسَانَ الْفَصِيلِ اونٹ کے بچے کی زبان کو چھید کر تھوتھنی ڈالنا تاکہ اونٹنی کا دودھ نہ پی سکے۔

خَلَّ الرَّمِيَّةَ بِالسَّهْمِ نشانہ پر تیز مار کر سوراخ کر دیا۔

حدیث میں ہے: [2]

(۱۱۷) خَلِّلُوا اَصَابِعَكُمْ (وضو میں انگلیوں کا خلال کیا کرو) اَلْخَلَلُ فِي الْاَمْرِ کسی کام میں خرابی کا پیدا ہو جانا۔جیسا کہ دو چیزوں کے درمیان رخنہ پڑ جاتا ہے۔

خَلَّ (ض) خَلاًّ وَّ خِلَالاً لَحْمُهٗ گوشت کا دبلا اور کم ہو جانا۔شاعر نے کہا ہے [3]

(۱۴۰) اِنَّ جِسْمِي بَعْدَ خَالِي لَخَلٌّ

کہ ماموں کے مرنے کے بعد میرا جسم گھل گیا ہے۔

اَلْخَلَّةُ ریگ زار کے اندر راستہ کو کہتے ہیں اور اسے خَلَّة یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دشوار گزار ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ راستہ ریگ زار کے اندر سے گزرتا ہے۔نیز ترش سرکہ کو بھی خَلَّة کہتے ہیں۔کیونکہ ترشی اس میں سرایت کئے ہوتی ہے۔اَلْخِلَّةُ تلوار کی نیام کا چمڑا جو اس کے اوپر منڈھا ہوا ہوتا ہے۔نیام چونکہ اس کے اندر رہتی ہے اس لئے اس چمڑے کو خِلَّة کہا جاتا ہے۔

اَلْخَلَّةُ (ایضا) طبیعت کی خرابی یا عارضہ جو کسی چیز کی خواہش یا سخت احتیاج کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَلَّة کے معنیٰ حاجت اور خصلت بیان کئے جاتے ہیں۔

---

[1] قاله بعض شعراء الامويين وتمامه : اخاف ان يكون له ضرام ـ والبيت في اللسان (ضرم) ونسبه ابن برى لابى مريم وفى روايته خلل الرماد بدل خلال الرماد وفى تاريخ الطبرى (٦ : ٣٦) كتب نصر بن سيار الى مروان بن محمد وفى العقد (٤ : ٤٧٧) إلى هشام بن عبدالملك يخبره بخروج ابى مسلم الخراساني عليه والبيت ايضاً فى الاخبار الطوال لابى حنيفة الدينورى المتوفى ٢٨٢ھ فى خمسة ابيات كذا فى مجموعة المعانى ١١٢ وعزاه لابى مريم النحلى وفى محاضرات المؤلف ٣ : ١٧٧) معزولابى مهيم والبيت ايضاً فى الاغانى (٦ : ١٢) وفيه واحربان بدل احاذران وفى ابن عساكر (٤ : ١٩١) خليق ان وفى الاغانى (٦ : ١٢٨) انه ارسل الابيات اى الوليد بن يزيد وفى العقد ١ : ١١١) ناربدل جمر كذافى الاصول سوى العيون ١ : ١٢٨).

[2] راجع (حم) عن ابن عباس و(قط) عن عائشة و(قط) عن ابى هريرة (الفتح للنبهانى ج ٢ص ٩٠).

[3] وصدره فاسقنيها ياسواد بن عمرو والبيت فى قصيدة حماسية لتابط شرافى رثاء خاله بعد ان اخذ بثاره و مطلعها ان بالشعب الذى دون سلع ـ لقتيلاً دمه مايطل ـ وفى نسبته اختلاف كبير نسبه ابو تمام فى الحماسة لتأبط شراً (٢ : ٣١٣ـ٣١٩) المرزوقى ـ والتبريزى الى خلف الاحمر ٢ : ٦٠) وطبقات الشعراء لابن سلام ٩٧ وبعضهم الى ابن اخت تابط شرا ثم اختلف فى ابن اخته فقيل الشنفرىٰ كما فى الاغانى ٥ : ١٦٢) وامالى المرتضىٰ (٢ : ١٨٥ وذيله ١ : ٢٨٠) واللسان (خلل) قال فى السمط ٩٢٠ قوله بعد خالى يريداً اختيالى وقيل اراد بعد قتل خالى وفى امالى القالى (٢ : ٢٧٨) الخل الرجل النحيف الجسم وعده العلماء من الاضداد١٢.

اَلْخُلَّةُ: مودت، دوستی، محبت اور دوستی کو خُلَّة یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دل کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔اور یا اس لئے کہ وہ دل کے اندر داخل ہو کر اس طرح اثر کرتی ہے جس طرح تیر نشانہ پر لگ کر اس میں نشان ڈال دیتا ہے۔اور یا اس لئے کہ اس کی سخت احتیاج ہوتی ہے۔اسی لئے کہا جاتا ہے۔

خَالَلْتُهٗ مُخَالَّةً وَخِلَالًا فَهُوَ خَلِيْلٌ: اور آیت کریمہ: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ (۴-۱۲۵) اور خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنایا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے خلیل کہا ہے کہ وہ ہر حال میں باری تعالیٰ کے محتاج تھے اور یہ احتیاج ویسے ہی ہے۔جس کی طرف آیت: ﴿اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ﴾ (۲۸-۲۴) میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔اسی معنیٰ میں کہا گیا ہے ❶

(۱۱۸) اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْكَ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْكَ: اے اللہ! مجھے اپنی احتیاج کے ساتھ غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے کسی دوسرے کا محتاج نہ بنا۔

بعض نے کہا ہے کہ خَلِیْلٌ خُلَّةٌ سے ہے اور اللہ کے حق میں خُلَّة کے لفظ کے وہی معنیٰ ہیں جو لفظ محبت کے ہیں ابوالقاسم البلخی کا کہنا ہے ❷ کہ یہ خُلَّة (احتیاج) سے ہے اور خُلّة (دوستی) سے نہیں ہے۔جو لوگ اسے حبیب پر قیاس کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی بندے سے محبت کرنا تو جائز ہے اس لئے کہ محبت اس کی ثنا میں داخل ہے۔لیکن خُلّة دوستی جائز نہیں ہے کیونکہ خلّة کے معنیٰ دوستی کے دل میں سرایت کر جانے کے ہیں۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❸

(۱۴۱) قَدْ تَخَلَّلْتَ مَسْلَكَ الرُّوْحِ مِنِّیْ
وَبِهٖ سُمِّیَ الْخَلِيْلُ خَلِيْلًا

تم میرے لئے بمنزلہ روح کے ہو اور اسی سبب سے خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے۔اسی بنا پر مشہور محاورہ ہے۔تَمَازَجَ رُوْحَانَا: ہماری روحیں باہم مخلوط ہیں۔

اور محبت کے معنیٰ حبہ قلب میں دوستی رچ جانے کے ہیں۔یہ حَبَبْتُهٗ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ حبہ پر مارنے کے ہیں۔لیکن جب اللہ تعالیٰ کے متعلق محبت کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد احسان اور مہربانی کے ہوتے ہیں لہٰذا یہی معنیٰ خُلّة سے مراد ہوں گے۔کیونکہ اگر ایک میں یہ تاویل صحیح ہے تو دوسرے میں بھی ہو سکتی ہے۔مگر حُبٌّ سے حَبَّةُ الْقَلْبِ مراد لینا اور خُلَّة سے اللہ تعالیٰ کے حق میں تخلل کا معنیٰ لینا صحیح نہیں ہے۔کیونکہ ذات باری تعالیٰ ان باتوں سے بلند ہے۔❹ اور آیت کریمہ: ﴿لَا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ﴾ (۲-۲۵۴) جس میں نہ اعمال کا سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئے گی۔

---

❶ کتاب میں حوالہ نہیں لکھا۔

❷ راجع لاحواله فی (ذرء).

❸ قاله بشار بن برد الاعمیٰ والبیت فی ادب الدنیا والدین للماوردی ۲۹۰ والبحر ۳۴۸:۳ ومحاضرات المؤلف ۱۳:۳.

❹ قال البغدادی فی لباب التاویل ۱:۵۰۲) وخلة الله للعبدهی تمکینه من طاعته وعصمته وتوفیقه وستر خلله ونصره والثناء علیه۱۲.

کے معنیٰ یہ ہیں کہ قیامت کے دن نہ تو حسنات کی خرید وفروخت ہوگی اور نہ ہی مودت کے ذریعہ حاصل ہو سکیں گی تو گویا یہ آیت:

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلَالٌ﴾ (۱۴۔۳۱) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئے گی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خِلاک باب مفاعلہ سے مصدر ہے۔اور بعض کے نزدیک یہ خَلِيْل کی جمع ہے۔کیونکہ اس کی جمع اَخِلَّةٌ وَّخِلَالٌ دونوں آتی ہیں اور یہ پہلی آیت کے ہم معنیٰ ہے۔

(خ ل د)

اَلْخُلُوْدُ: (ن) کے معنیٰ کسی چیز کے فساد کے عارضہ سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں۔اور جب کسی چیز میں عرصۂ دراز تک تغیر وفساد پیدا نہ ہو اہل عرب اسے خلود کے ساتھ متصف کردیتے ہیں۔مثلاً چولہے کے ان تین پتھروں کو جن پر دیگ چڑھائی جاتی ہے۔"خَوَالِدٌ" کہا جاتا ہے۔کیونکہ وہ دیر تک ایک جگہ پڑے رہتے ہیں نہ اس لئے کہ ان کو دوام وبقا حاصل ہے۔کہا جاتا ہے۔

خَلَدَ يَخْلُدُ خُلُوْدًا عرصۂ دراز تک رہنا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۲۹) شاید تم ہمیشہ رہو گے۔اور خَلَدٌ انسان کے اس حصہ کو کہا جاتا ہے جو تا زندگی ایک حالت پر قائم رہتا ہے اور دوسرے اعضاء کی طرح اس میں تغیر نہیں ہوتا۔

اصل میں مُخَلَّدٌ اسے کہتے ہیں جو عرصۂ دراز تک باقی رہے اس بنا پر جس شخص میں باوجود بڑی عمر کے بڑھاپا نہ آئے اسے مُخَلَّدٌ کہا جاتا ہے۔اور جس جانور کے (رباعی) دانت نکلنے تک ثنایا دانت قائم رہیں اس مُخَلَّدَةٌ کہا جاتا ہے۔اور بطور استعارہ ہمیشہ رہنے والی چیز کے متعلق خلود کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

جنت میں خلود کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اُولٰئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (۱۱۔۲۳) یہی صاحب جنت ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

﴿اُولٰئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (۲۔۸۱) تو ایسے لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں۔اور وہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۤؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا﴾ (۴۔۹۳) اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا۔اور آیت کریمہ:

﴿يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۷) نوجوان خدمت گار جو ہمیشہ (ایک ہی حالت میں) رہیں گے ان کے آس پاس پھریں گے۔

کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ وہ علیٰ حالہ قائم رہیں گے اور ان کی حالت تبدیل نہیں ہوگی اور بعض نے اس کے معنیٰ مُقَرَّطُوْنَ بِالْخُلْدَةِ کئے ہیں یعنی بالیاں

پہنے ہوئے ہوں گے۔کیونکہ خَلَـدَةٌ ایک قسم کی بالی کو کہتے ہیں۔

اَلْاِخْلَادُ کے معنیٰ کسی چیز کو باقی رکھنے یا اس پر بقا کا حکم لگانے کے ہیں اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿وَلٰکِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۷۶) یعنی زمین کی طرف مائل ہوگیا یہ خیال کر کے کہ وہ اس پر ہمیشہ رہے گا۔

(خ ل ص)

اَلْخَالِصُ: (خالص) اور اَلصَّافِیْ دونوں مترادف ہیں مگر الصافی کبھی ایسی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں جس میں پہلے آمیزش نہ ہو اور خالص اسے کہتے ہیں جس میں پہلے آمیزش ہو مگر اس سے صاف کرلیا گیا ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

خَلَصْتُهٗ فَخَلَصَ: میں نے اسے صاف کیا تو وہ صاف ہوگیا اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۴۲) خُلَاصُ الْخَمْرِ مِنْ نَسْجِ الْفِدَامُ

جیسے شراب صافی سے صاف ہوکر نکل آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُکُوْرِنَا﴾ (۶۔۱۳۹) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جو بچہ ان چارپایوں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے۔

محاورہ میں هٰذَا خَالِصٌ وَخَالِصَةٌ (مذکرومؤنث) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔جیسے وَاهِیَةٌ وَرَاوِیَةٌ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا﴾ (۱۲۔۸۰) جب وہ اس سے ناامید ہوگئے تو الگ ہوکر صلاح کرنے لگے۔

میں خَلَصُوا کے معنیٰ دوسروں سے الگ ہونا کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ﴾ (۲۔۱۳۹) اور ہم خالص اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔

﴿اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (۱۲۔۲۴) بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے۔ میں مخلص بندہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ نہ تو یہود کی طرح تشبیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح تثلیث کے قائل تھے چنانچہ تثلیث کے متعلق فرمایا:

﴿لَقَدْ کَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ﴾ وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے اور مسلمانوں کے متعلق فرمایا:

﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (۹۸۔۵) کہ اخلاص کے ساتھ۔

﴿وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ﴾ (۴۔۱۴۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہوگئے۔

نیز موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّهٗ کَانَ مُخْلَصًا وَّ کَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ (۱۹۔۵۱) بے شک وہ (ہمارے) برگزیدہ اور پیغمبر مرسل تھے۔ اور حقیقتاً اخلاص ماسوی اللہ سے بیزار ہونے کا نام ہے۔

---

[1] قاله المتنبی یصف حمی فالته بمصر فی ذی الحجة سنة ثمان واربعین وثلاث مأة فی قصیدہ ۴۱ بیته وصدره : وضاقت خطة فخلصت منها راجع دیوانه ۳۶۶ هندیه بمصر ۱۹۲۳۔

(خ ل ط)

اَلْخَلْطُ: (ن) کے معنیٰ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے اجزا کو جمع کرنے اور ملا دینے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ چیزیں سیال ہوں یا جامد یا ایک مائع ہو اور دوسری جامد اور یہ مَزْجٌ سے اعم ہے۔ کہا جاتا ہے: اِخْتَلَطَ الشَّیْءُ (کسی چیز کا دوسری کے ساتھ مل جانا) قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ﴾ (۱۰۔۲۴) پھر اس کے ساتھ سبزہ............مل کر نکلا۔

خَلِیْطٌ کے معنیٰ دوست، پڑوسی یا کاروبار میں شریک کے ہیں۔ اسی سے کتب فقہ میں خَلِیْطَان کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا مال اکٹھا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (۳۸۔۲۴) اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔

اور خَلِیْطٌ کا لفظ واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1] (بسیط)

(۱۴۳) بَانَ الْخَلِيْطُ وَلَمْ يَاوُوْا لِمَنْ تَرَكُوْا

ساتھی جدا ہو گئے اور انہوں نے جن کو چھوڑا ان پر رحم نہ کھایا۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا﴾ (۹۔۱۰۲) انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا۔
یعنی نیک اور بد دونوں قسم کے عمل کرتے رہے۔ محاورہ ہے۔

اَخْلَطَ فُلَانٌ فِیْ كَلَامِهٖ (فلاں نے بکواس کی)
اَخْلَطَ الْفَرَسُ فِیْ جَرْيِهٖ: گھوڑے کا دوڑنے میں کوتاہی کرنا۔

(خ ل ع)

اَلْخَلْعُ: اس کے معنیٰ اتار دینے کے ہیں اور یہ انسان کا اپنے کپڑے وغیرہ اور گھوڑے کا جھول اور پوزی وغیرہ اتارنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ﴾ (۲۰۔۱۲) تو اپنی جوتیاں اتار دو۔
بعض نے کہا ہے کہ یہاں لفظی معنیٰ مراد ہیں اور انہیں جوتا اتارنے کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ مردار گدھے کے چمڑے سے بنا ہوا تھا بعض صوفیا نے کہا ہے کہ یہ دراصل تمثیل ہے کہ یہاں اطمینان سے اقامت پذیر ہو جاؤ جیسا کہ جب کسی کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ یہاں جم کر بیٹھ جاؤ تو اس کے لئے اِنْزِعْ ثَوْبَكَ اَوْ خُفَّكَ وغیرہ محاورات استعمال کئے جاتے ہیں۔ کبھی اس کا صلہ علیٰ لا کر اس سے بخشش کے معنیٰ بھی لئے جاتے ہیں۔ جیسے خَلَعَ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانٍ: فلاں نے اسے خلعت دی یا درہے کہ عَلٰى (صلہ) کی وجہ سے عطا کے معنیٰ مفہوم ہوتے ہیں ورنہ اس کے بغیر یہ معنیٰ صحیح نہیں ہوتے۔

(خ ل ف)

خَلْفٌ: (پیچھے) یہ قدام کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ (۲۔۲۵۵) جو کچھ ان کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔

---

[1] قاله زهير في مطلع قصيدة في ٣٣ بيتاً وتمامه: وزودوك اشتياقاً اية سلكوا والبيت في النقائض ١٦٩ وديوانه والعقد الثمين ٨٦-٢٨٣.

﴿لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ﴾ (۱۳۔۱۱) اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں۔

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾ (۱۰۔۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو (دریا سے) نکال لیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لئے عبرت ہو۔

اور خَــلَفَ کے معنیٰ پیچھے رہ جانے اور کسی کا جانشین ہونے کے ہیں۔ یہ تَقَدَّمَ اور سَلَفَ کی ضد ہے اور جو مرتبہ میں گرا ہوا ہو اسے بھی خَلْف کہا جاتا ہے اسی بنا پر ردی چیز کو خَلْفٌ کہتے ہیں اور خلف کے معنیٰ متاخر اور جانشین کے بھی آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ﴾ (۷۔۱۶۹) پھر ان کے بعد ناخلف ان کے قائم مقام ہوئے۔

امثال عرب ہے ❶ (مثل)

سَكَتَ اَلْفاً وَّ نَطَقَ خَلْفاً: کہ وہ ہزار باتوں سے خاموش رہا اور آخر بات کی تو بے ہودہ اور ردی۔

خُــلْــفَةٌ: سرین جب اس سے گوز نکل جائے کم عقل جو بے ہودہ بات کرے۔

تَخَلَّفَ فُلَانٌ عَنْ فُلَان: کسی سے پیچھے رہ جانا کسی کا جانشین ہونا۔ اس کا مصدر خِلَافَةٌ ہے جس کے معنیٰ جانشینی کے ہیں مگر خَــلَفَ خَلَافَةٌ (بفتح الخاء) کے معنیٰ کم عقل ہونے کے ہیں اور کم عقل آدمی کو خَالِفٌ کہا جاتا ہے۔ اور کبھی خَلْفٌ سے ناخلف بھی مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ﴾ (۱۹۔۵۹) پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو (چھوڑ دیا گوا سے) کھو دیا۔

اور جو کسی کا جانشین اور قائم مقام ہوا سے خَــلَفٌ (بفتح اللام) کہا جاتا ہے۔ خِلْفَةٌ: ایک کا دوسرے کے بعد آنا قائم مقام ہونا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾ (۲۵۔۶۲) اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔

کہا جاتا ہے:

اَمْرُهُمْ خِلْفَةٌ: یعنی ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۱٤٤) بِهَا الْعِيْنُ وَالْاٰرَامُ يَمْشِيْنَ خِلْفَةً

اس میں گاوان دشتی اور ہرنیاں ایک دوسرے کے پیچھے چلتی ہیں۔

اَصَابَتْهُ خِلْفَةٌ: پیچش لگ جانا۔

خَــلَفَ فُلَانٌ فُلَانًــا: وہ اس کا جانشین ہوا خواہ اس کی موجودگی میں ہو یا بعد میں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ﴾ (۴۳۔۶۰) اگر ہم چاہتے تو تم میں سے

❶ المثل فی المیدانی رقم ۱۷۷۲ و الاشتقاق ۱۳۷ وفی جل المعاجم ۱۲.

❷ قاله زهیر فی معلقته وتمامه ۔ واطلاؤها ینهضن من كل مجثم والبیت فی دیوانه ٥ وشرح القصائد العشر للتبریزی ۱۰۱ ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱٥۱) وتفسیر الطبری ۲: ٦۳/ ۱۹: ۳۳) واللسان (خلف، طلی) والاقتضاب ۱٦۱ ومحاضرات المؤلف ٤: ٦٦۳) والجمهرة ۱۰٥ وغریب القران ۳۱٤ والمعانی الكبیر ٦۹٦ والقرطبی ۳: ٦٥ ومجاز القران ۲: ۸۰ والعقد الثمین ۹٤ وایام العرب ۲۷۱ وشرح المعلقات لابن الانباری ۲۳۹,٦۱ والسیوطی ۲٥٥.

فرشتے بنا دیتے جو تمہاری جگہ زمین میں رہتے۔
اَلْخِلَافَةُ کے معنیٰ دوسرے کا نائب بننے کے ہیں۔ خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب سے ہو۔ اس آخری معنیٰ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے چنانچہ فرمایا:
﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ (۶-۱۶۵) اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا۔
﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۵-۳۹) وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا۔
﴿وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (۱۱-۵۷) اور میرا پروردگار تمہاری جگہ اور لوگوں کو لا بسائے گا۔
اَلْخَلٰٓئِفُ کا واحد خَلِيْفَةٌ ہے اور خُلَفَآءُ کا خَلِيْفٌ قرآن پاک میں ہے:
﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۸-۲۶) اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔
﴿وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ﴾ (۱۰-۷۳) اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔
﴿اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ﴾ (۷-۶۹) جب اس نے تم کو قوم نوح کے بعد سردار بنایا۔
اَلْاِخْتِلَافُ وَالْمُخَالَفَةُ کے معنیٰ کسی حالت یا قول میں ایک دوسرے کے خلاف طریق کار اختیار کرنے کے ہیں۔ اور خِلَافٌ کا لفظ ان دونوں سے اعم ہے کیونکہ ضدین کا مختلف ہونا تو ضروری ہوتا ہے مگر مختلفین کا ضدین ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر لوگوں کا باہم کسی بات میں اختلاف کرنا عموماً نزاع کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے استعارۃً اختلاف کا لفظ نزاع اور جدال کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ﴾ (۴۳-۶۵) لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔
﴿وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾ (۳۰-۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔
﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ الَّذِیْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ﴾ (۷۸-۳) (یہ لوگ) کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں؟ (کیا) بڑی خبر کی نسبت؟ جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔
﴿اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ (۵۱-۸۰) (اے اہل مکہ) تم ایک متناقض بات میں (پڑے ہوئے) ہو۔
﴿مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ﴾ (۱۶-۶۹) جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔
﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ (۳-۱۰۵) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور احکام بین کے آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف) اختلاف کرنے لگے۔
﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾ (۲-۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھا دی۔
﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا﴾ (۱۰-۱۹) اور (سب) لوگ (پہلے) ایک ہی امت (یعنی

ایک ہی دین پر) تھے پھر جدا جدا ہو گئے۔
﴿وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ وَاِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ (۱۰۔۹۳) اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کی بڑی عمدہ جگہ دی اور کھانے کو پاکیزہ چیزیں عطا کیں۔ لیکن وہ باوجود علم حاصل ہونے کے اختلاف کرتے رہے۔ بے شک جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا۔
اور قیامت کے دن کے متعلق فرمایا:
﴿وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ (۱۶۔۹۲) اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا۔
﴿لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيهِ﴾ (۱۶۔۳۹) تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ وہ ان پر ظاہر کر دے اور آیت کریمہ:
﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ﴾ (۲۔۱۷۶) اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ اخْتَلَفُوْا بمعنی خَلَفُوْا ہے۔ جیسے کَسَبَ وَاکْتَسَبَ اور بعض نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے خلاف اس میں ردو بدل کر دیا۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ﴾ (۸۔۴۲) تو وقت معین (پر جمع ہونے) میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی۔
میں اخْتَلَفْتُمْ کا لفظ خلاف سے بھی ہو سکتا ہے اور خُلْفٌ سے بھی۔ نیز فرمایا:
﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ (۴۲۔۱۰) اور تم جس بات میں اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ خدا کی طرف (ہوگا)۔
﴿فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ (۳۔۵۵) تو جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے...... ان کا فیصلہ کر دوں گا۔ اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ (۱۰۔۶) رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں (اختلاف سے ان کا یکے بعد دیگرے آنا مراد ہے)۔
اَلْخُلْفُ کے معنی وعدہ شکنی کے ہیں۔ محاورہ ہے:
وَعَدَنِيْ فَاَخْلَفَنِيْ: اس نے مجھ سے وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا قرآن پاک میں ہے:
﴿بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ﴾ (۹۔۷۷) کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا۔
﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ (۳۔۹) بے شک اللہ خلاف وعدہ نہیں کرتا۔
﴿فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ قَالُوا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا﴾ (۲۰۔۸۶،۸۷) تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا (اس کے) خلاف کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلافی نہیں کی۔
اَخْلَفْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو وعدہ خلاف پایا۔
اَلْاِخْلَافُ: ایک دوسرے کے بعد پانی پلانا۔
اَخْلَفَ الشَّجَرُ: پت جھڑ کے بعد درخت کا دوبارہ سر سبز ہونا۔
اَخْلَفَ اللّٰهُ عَلَيْكَ: اللہ تعالیٰ تجھے ضائع شدہ چیز کا نعم

البدل عطا فرمائے۔

خَلَّفَ اللّٰهُ: اللہ کی جانب سے تیرا خلیفہ ہو۔اور آیت کریمہ:

﴿لَا یَلْبَثُوْنَ خَلْفَكَ﴾ (۱۷۔۷۶) تمہارے پیچھے یہ بھی نہ رہتے۔

میں خَلف کے معنیٰ بعد کے ہیں ایک قرأت میں خِلافَكَ ہے۔یعنی میری مخالفت کرکے اور آیت کریمہ:

﴿اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ﴾ (۵۔۳۳) یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔

یعنی ایک سیدھی جانب سے اور دوسرا الٹی جانب سے خَلَّفْتُهٗ میں نے اسے پیچھے چھوڑا۔قرآن میں ہے:

﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۸۱) جو لوگ (غزوہ تبوک میں) پیچھے رہ گئے۔وہ پیغمبر خدا کی (مرضی) کے خلاف بیٹھ رہنے سے خوش ہوئے۔یعنی اللہ کے پیغمبر کے مخالفت ہو کر۔

﴿وَعَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا﴾ (۹۔۱۱۸) اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔

﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ﴾ (۴۸۔۱۶)........جو......پیچھے رہ گئے تھے ان سے کہدو۔

اَلْخَالِفُ: نقصان یا کوتاہی کی وجہ سے پیچھے رہنے والا اور یہی معنیٰ مُتَخَلِّفٌ کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخَالِفِیْنَ﴾ (۹۔۸۳) پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے ہو۔

اَلْخَالِفَةُ: خیمے کا پچھلا ستون بطور کنایہ اس سے مراد عورتیں لی جاتی ہے۔کیونکہ یہ مجاہدین سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔اس کی جمع خَوَالِف ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ﴾ (۹۔۸۷) یہ اس بات سے خوش ہیں کہ عورتوں کے ساتھ جو پیچھے رہ جاتی ہیں (گھروں میں) بیٹھ رہیں۔

وَجَدْتُّ الْحَیَّ خَلُوْفاً: یعنی مرد گئے ہوئے ہیں۔صرف عورتیں موجود ہیں۔ ❶

اَلْخَلْفُ: (ایضاً)۔کلہاڑی کی دھار۔پہلو کی سب سے چھوٹی پسلی جو پیٹ کے جانب سب سے آخری ہوتی ہے۔

اَلْخِلَافُ: بید کی قسم کا ایک درخت کیونکہ وہ امید کے خلاف اگتا ہے یا اس کا باطن ظاہر کے خلاف ہوتا ہے۔

مُخْلِفُ عَامٍ اَوْ عَامَیْنِ: شتر کہ از نہ سالگی یک یا دوسال درگذشتہ باشد۔اَلْخِلِّیْفٰی: خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ❷

(۱۱۸) لَوْلَا الْخِلِّیْفٰی لَاَذَّنْتُ: اگر بار خلافت نہ ہوتا تو میں خود ہی اذان دیا کرتا۔(اذان کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے)۔

(خ ل ق)

اَلْخَلْقُ: اصل میں خلق کے معنیٰ (کسی چیز کو بنانے کے لئے) پوری طرح اندازہ لگانا کے ہیں۔اور کبھی خلق

---

❶ ومنه حديث المرئة والمزادتين : والحی خلوف ای رجالنا غيب (النهاية خلف).

❷ وفی الفائق (۱ : ۱۸۲) ولفظه لواطيق الاذان مع الخليفی لاذنت وهو مصدر معناه كثرة جهده فی ضبط امور الخلافة وتصريف اعنتها كذافی النهاية (خلف) ولفظه لواطقت قال وهو مصدر مثل الرميا والدليلا وفی غريب ابی عبيد۳ : ۳۱۹ اسم علی وزن هِجِّيْرًا ومعناه الخلافة وامثاله معدودة ۱۲.

بمعنی ابداع بھی آ جاتا ہے۔یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے اور بغیر کسی کی تقلید پیدا کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ (۱۶۔۳)

اسی نے آسانوں اورزمین کومنی برحکمت پیدا کیا۔میں خلق بمعنی ابداع ہی ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اسی کو ﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۲۔۱۱۷) سے تعبیر کیا ہے۔

نیز ایک چیز کو دوسری شے سے بنانے اور ایجاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (۴۔۱) تم کو ایک شخص سے پیدا کیا۔

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ (۱۶۔۴) اسی نے انسان کو نطفے سے بنایا۔

﴿خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ﴾ (۲۳۔۱۲) ہم نے انسان کو خلاصے سے پیدا کیا۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ﴾ (۷:۱۱) اور تم کو ہم نے (ابتدا میں مٹی سے) پیدا کیا۔

﴿خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ﴾ (۵۵۔۱۵) اور جنات......کو شعلے سے پیدا کیا۔

خیال رہے کہ خلق بمعنی ابداع ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ ذات باری تعالیٰ اور دوسروں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۷) تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے۔تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔

البتہ خلق بصورتِ استحالہ کے ہوتا ہے بعض اوقات ذاتِ باری تعالیٰ دوسروں کو بھی اس کا اختیار دے دیتی ہے۔جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرکے فرمائیں گے۔

﴿اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ﴾ (۵۔۱۱۰)

اور جب تم میرے حکم سے مٹی کا جانور بنا کر

اور عام لوگوں کے لئے خلق کا لفظ صرف دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اندازہ کرنا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۱۴۵) وَلَانْتَ تَفْرِیْ مَا خَلَقْتَ
وَبَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَايَفْرِیْ

تم جو سوچتے ہو کر گزرتے ہو۔اور بعض لوگ تجاویز کرتے رہتے ہیں مگر انہیں عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔

(۲) جھوٹ بولنے کے معنی میں فرمایا:

﴿وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا﴾ (۲۹۔۱۷) اور طوفان باندھتے ہو۔اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت کریمہ:

﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ (۲۳۔۱۴) تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔بڑا بابرکت ہے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق کے ساتھ خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے بھی متصف ہو سکتے ہیں۔تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ بمعنی اَحْسَنُ الْمُقَدِّرِيْنَ

---

[1] البیت لزهیر بن ابی سلمة من قصیدة یمدح هرمانی ۲۱ بیتاً راجع دیوانه ۲٤ والعقد الثمین ۸۲ والمعانی للقبتی ۳۲۱، ۵۳۹ والاضداد لابن السکیت ۲۰۵ والاصمعی ۵۵ وابن الانباری (۱۵۹) وابی الطیب (۵٦۱) وشرح شواهد الشافیه (۲۳۹) والکتاب ۲۸۹:۲ ومقاییس اللغه (۲:۲۱٤) والحیوان (۳:۲۸۳) واللسان (خلق، دی) والطبری (۱۸۔۱۹) والبحرالمحیط (۱:۹۳/۲:٤٦۵/٦:۳۹۸) والمشکل للقتبی ۳۸۸ والصناعتین (۳۸٦، ٤٤۷) وفیه وادراك بدل ولانت وفی مختار الشعرالجاهلی (۱:۱۹۰) فلابدل ولا والبیت ایضاً فی ثلاثین لابن خالویه ٤۵.

ہے یعنی اللہ تعالیٰ سب بہتر اندازہ کرنے والا ہے (اور خلق بمعنیٰ تقدیر دوسروں کی صفت بھی آ جاتا ہے) اور دوسرا جواب یہ ہے۔کہ یہاں اللہ تعالیٰ پر اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کا اطلاق کفار کے اعتقاد کے اعتبار سے ہے۔ان کا زعم یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے بھی پیدا کرتے ہیں تو پھر بھی ذات باری تعالیٰ ان کے اعتقاد کے بموجب، ان سب سے بہتر پیدا کرنے والی ٹھہری جیسے فرمایا:

﴿خَلَقُوْا کَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَیْهِمْ﴾ (۱۳۔۱۶) کیا انہوں نے خدا کی سی مخلوقات پیدا کی ہے جس کے سبب ان پر مخلوقات مشتبہ ہوگئی ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ (۴۔۱۱۹) اور (یہ بھی) کہتا رہوں گا۔کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلتے رہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خَلْقُ اللّٰهِ کی تغیر سے مراد خصاء (یعنی خصی ہونا) اور نتف اللحیة (داڑھی کے بال اکھاڑ ڈالنے) وغیرہ کے ذریعہ (فطرتی صلاحیتوں اور) صورتوں کو تبدیل کرنا مراد ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ احکام الٰہی میں تحریف وتبدیل کرنا مراد ہے [1] (اس صورت میں خلق اللہ سے مراد دین الٰہی ہوگا) اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ (۳۰۔۲۰) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ "خلق اللہ" سے قضا وقدر الٰہی مراد لی ہے۔اور بعض نے تغیر خِلْقت یعنی شکل وصورت کا بدلنا مراد لیا ہے۔اور آیت کریمہ:﴿وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَکُمْ رَبُّکُمْ﴾ (۲۶۔۱۶۶) اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لئے (بیبیاں) پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو۔

میں "مَا خَلَقَ" سے کنایہ عورتوں کی شرمگاہیں مراد ہیں۔اور وہ ہر مقام جہاں خلق کا لفظ کلام کے متعلق استعمال ہوا ہے۔اس سے جھوٹ ہی مراد ہیں۔اس بنا پر اکثر لوگ قرآن پاک کے متعلق خلق کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتے تھے چنانچہ اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿اِنْ هٰذَا اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۳۷) یہ تو اگلوں کے ہی طریق ہیں اور ایک قرأت میں ﴿اِنْ هٰذَا اِلَّا خَلْقُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۳۷) بھی ہے یعنی یہ تو پہلے لوگوں کی ایجاد واختراع ہے۔

﴿مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ﴾ (۳۸۔۷) یہ پچھلے مذہب میں ہم نے کبھی سنی ہی نہیں۔یہ بالکل بنائی ہوئی بات ہے۔

خَلْقٌ کا لفظ مخلوق کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔خَلْقٌ اور خُلْقٌ اصل میں دونوں ایک ہی ہیں۔جیسے شَرْبٌ وَشُرْبٌ وَصَرْمٌ وَصُرْمٌ مگر ان میں اتنا فرق ہے کہ خَلْقٌ بمعنیٰ خِلقت یعنی اس شکل وصورت پر بولا جاتا ہے۔جس کا تعلق ادراکِ بصر سے ہوتا ہے اور خُلْق کا لفظ قوی باطنہ اور عادات وخصائل کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔جن کا تعلق بصیرت سے ہے [2] قرآن

---

[1] ولکلاالقولین محمل وکل منهی منقول عن السلف راجع ابن کثیر ۱: ۵۵۶ ومعالم التنزیل للبغوی ۱: ۴۹۹۔

[2] والعلماء دون الاخلاق علی حدة وصنفوافیها الکتب ومنها تهذیب الاخلاق لیحیٰ بن عدی وکتب الامام الغزالی انفع للتربیة فی هذاالباب۔

پاک میں ہے:
﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (۶۸-۴) اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں۔
اَلْخَلَاقُ: وہ فضیلت جو انسان اپنے اخلاق سے حاصل کرتا ہے۔قرآن میں ہے:
﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (۲-۲۰۰) ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔
فُلَانٌ خَلِيْقٌ بِكَذَا: فلاں اس کا اہل ہے گویا وہ خوبی اس میں پیدا کی گئی ہے۔جیسا کہ فُلَانٌ مَّجْبُوْلٌ عَلٰى كَذَا وَمَدْعُوٌّ اِلَيْهِ مِنْ جِهَةِ الْخَلْقِ کا محاورہ ہے۔
خَلَقَ الثَّوْبُ وَاَخْلَقَ: کپڑے کا پرانا ہوجانا اور پرانے کپڑے کو خَلَقٌ وَمُخْلَقٌ وَاَخْلَاقٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ حَبْلٌ اَرْمَامٌ وَاَرْمَاتٌ کا محاورہ ہے اور کپڑے کے پرانا ہونے سے ملائم اور چکنا ہونے کا معنیٰ لیا جاتا ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے۔
جَبَلٌ اَخْلَقُ وَصَخْرَةٌ خَلْقَاءُ: چکنا پہاڑ یا چکنا پتھر۔
خَلَّقْتُ الثَّوْبَ: میں نے کپڑے کو پرانا کیا۔اخْلَوْلَقَ السَّحَابُ اَنْ تُمطِرَ: امید ہے کہ بارش ہوگی۔
یہ یا تو خَلَّقْتُ الثَّوْبَ سے ماخوذ ہے اور یا هُوَ خَلِيْقٌ بِكَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔
اَلْخَلُوْقُ: ایک قسم کا خوشبو۔

(خ ل و)

اَلْخَلَاءُ: خالی جگہ جہاں عمارت ومکان وغیرہ نہ ہو اور اَلْخُلُوُّ کا لفظ زمان ومکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔چونکہ زمانہ میں مَضِيٌّ (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔اس لئے اہل لغت خَلَا الزَّمَانُ کے معنیٰ زمانہ گذر گیا کر لیتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (۳-۱۴۴) اور محمد ﷺ تو صرف خدا کے پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر گزرے ہیں۔
﴿وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ﴾ (۱۳-۶) حالانکہ ان سے پہلے عذاب (واقع) ہوچکے ہیں۔
﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ (۲-۱۳۴) یہ جماعت گذر چکی۔
﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ (۳-۱۳۷) تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گذر چکے ہیں۔
﴿اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (۳۵-۲۴) مگر اس میں ہدایت کرنے والا گذر چکا ہے۔
﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (۲-۲۱۴)...... تم کو پہلے لوگوں کی سی۔
﴿وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ (۳-۱۱۹) اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ﴾ (۱۲-۹) پھر ابا کی توجہ تمہاری طرف ہوجائے گی۔کے معنیٰ یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے رہ جائے گی۔
خَلَا الْاِنْسَانُ: تنہا ہونا۔خَلَا فُلَانٌ بِفُلَانٍ کسی کے ساتھ تنہا ہونا۔
خَلَا اِلَيْهِ: کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيَاطِيْنِهِمْ﴾ (۲-۱۴) اور جب

وہ اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔

خَلَّیْتُ فُلَانًا کے اصل معنیٰ کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ دینے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔فرمایا:

﴿فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ (۹۔۵) تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

نَاقَةٌ خَلِيَّةٌ: اونٹنی کو دودھ دوہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔

اِمْرَأَةٌ خَلِيَّةٌ: مطلقہ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد چھوڑ دی گئی ہو۔ اور جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی ہو اسے بھی خَلِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَلِيُّ: جو غم سے خالی ہو۔جیسا کہ مُطَلَّقَةٌ کا لفظ سکون واطمینان کے معنیٰ میں آجاتا ہے۔

چنانچہ شاعر نے ❶ (طویل)

(۱٤٦) مُطَلَّقَةٌ طَوْرًا وَطَوْرًا تُرَاجَعُ

میں (کبھی اسے سکون ہوجاتا ہے اور کبھی وہ درد عود کر آتی ہے) میں مُطَلَّقَةٌ کا لفظ اسی معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔

اَلْخَلَاءُ: خشک گھاس کہا جاتا ہے: خَلَيْتُ الْخَلَاءَ میں نے خشک گھاس کاٹی۔

خَلَيْتُ الدَّابَّةَ: جانور کو خشک گھاس ڈالی۔ سَيْفٌ يَّخْتَلِيْ: تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

(خ م د)

خَمَدَتِ النَّارُ: آگ کے شعلوں کا ساکن ہوجانا (جب کہ اس کا انگارہ نہ بجھا ہو) اور اسی سے بطور استعارہ خَمَدَتِ الْحُمّٰى کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ بخار کا جوش کم ہوجانے کے ہیں۔ اور کبھی بطور کنایہ یہ خَمُوْدٌ بمعنیٰ موت بھی آجاتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿جَعَلْنَا هُمْ حَصِيْدًا خَامِدِيْنَ﴾ (۲۱۔۱۵) ہم نے ان کو (کھیتی کی طرح) کاٹ کر (آگ کی طرح) بجھا کر ڈھیر کردیا۔

﴿فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ﴾ (۳۶۔۲۹) سو وہ (اسی سے) ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔

(خ م ر)

اَلْخَمْرُ: (ن) اصل میں خَمْرٌ کے معنیٰ کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اسی طرح خُمَارٌ اصل میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی چیز چھپائی جائے مگر عرف میں خِمارٌ کا لفظ صرف عورت کی اوڑھنی پر بولا جاتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنے سر کو چھپاتی ہے اس کی جمع خُمُرٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ (۲۴۔۳۱) اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔

کہا جاتا ہے:

اِخْتَمَرَتِ الْمَرْأَةُ وَتَخَمَّرَتْ: عورت نے سر پر اوڑھنی ڈال لی۔

خَمَّرْتُ الْاِنَاءَ میں نے برتن ڈھانپ دیا۔ ایک روایت میں ہے ❷

---

❶ قاله النابغة الذبياني وصدره: تناذرها الراقون من سوء سمها ـ وفي المطبوع مطلقة محرف والبيت في اللسان (طلق، نذر) والكامل (٨٥٦) ومختار الشعر الجاهلي (١: ٨٢) والبحر (٥: ٤٢٢) والعمدة (١: ٢٣٨) والمخصص (٩: ٦٥) وديوانه ٥٢ والحيوان (٤: ٢٤٨) والعقد الثمين ١٩.

❷ وتمامه واوكوا اسقيتكم واجيفوا ابو ابكم واطفئوا مصابيحكم واكفتوا ابناء كم الخ الحديث في الفائق ١: ١٨٤.

(۱۲۱) خَمِّرُوْا اٰنِیَتَکُمْ: کھانے کے برتن ڈھانپ کرر کھا کرو۔

اَخْمَرْتُ الْعَجِیْنَ: گوندھے ہوئے آٹے میں خمیر ملانا اور خَمْرَۃٌ کو خمیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے مخْمُوْرَۃٌ ہوتا ہے دَخَلَ فِی خُمَارِ النَّاسِ: لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو کر چھپ گیا۔

اَلْخَمْرُ: شراب نشہ۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے بعض لوگوں کے نزدیک ہر نشہ آور چیز پر خَمْر کا لفظ بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک صرف اسی چیز کو خمر کہا جاتا ہے جو انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے۔ ❶

(۱۲۲) اَلْخَمْرُ مِنْ هَاتَیْنِ، النَّخْلَةِ وَالعِنَبَةِ: (کہ خمر (شرابِ حرام) صرف وہی ہے جو ان دو درختوں یعنی انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ "خمر" صرف غیر مطبوخ ہے یعنی اسی کو کہتے ہیں جو پکائی نہ گئی ہو۔ پھر اس بارے میں فقہاء مختلف ہیں کہ کس حد تک پکانے کے بعد اس پر خمر کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اَلْخُمَارُ: بیماری جو شراب نوشی سے لگ جاتی ہے۔ یہ بھی زُکَامُ اور سُعَالُ کی طرح فُعَالٌ کے وزن پر ہے جو کہ بیماری کے معنیٰ کے لئے مخصوص ہے۔

خَمْرَۃُ الطِّیْبِ خوشبو خَامِرَہٗ وَخَمَّرَہٗ: کسی سے گھل مل جانا اس سے الگ نہ ہونا۔ اسی سے بطور استعارہ شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)(۱۴۷) "خَامِرِی اُمَّ عَامِرِ" کہ اے ام عامر چھپ جا۔

(خ م س)

اَلْخَمْسُ: (پانچ) اصل میں یہ لفظ اسم عدد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸۔۲۷) اور کچھ لوگ کہتے ہیں اصحاب کہف پانچ تھے اور ان کا چھٹا ان کا کتا تھا۔ وَقَالَ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا﴾ (۲۹۔۱۴) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہے۔

اَلْخَمِیْسُ: (جامۂ پانچ گزی) روز شنبہ۔

رُمْحٌ مَّخْمُوْسٌ: نیزہ پانچ گزی۔ اَلْخِمْسُ: پیاسے اونٹ جو چوتھے روز پانی پر وارد ہوں۔

خَمَسْتُ الْقَوْمَ: (ن) پانچواں حصہ لینا۔

خَمَسْتُهُمْ (ض) پانچواں ہونا۔

---

❶ رواه الدارمی ۲ : ۳۸ من حدیث ابی هریرة والحدیث فی مسلم والاربعة واحمد فی مسنده .

❷ قطعة من البیت وتکملته : فلاتدفنونی ان دفنی محرم ـعلیکم ولکن ...... قال المرتضیٰ (۲ : ۷۳) البیت لتأبط شراویروی للشنهریٰ (صاحب لامیة العرب التی شرحها الزمحشری باعجب العجاب) وللاستاذ المیمنی حقق هذه فی الطرائف (۱ : ۳٦) راجع للبیت وقصته الاغانی (۲۱ : ۱۳٦) وطبقات الشعراء لابن سلام (۱ : ۷٤) والحیوان (٦ : ٥٠) والمعانی الکبیر ۲۱۳ وامالی ابن البختری (۱ : ۳٦) والحماسة بالتبریزی (۲ : ۲٤) وذیل الامالی ۳٦ والصناعتین ۸۸۳ والصاحبی ۲۲٤ والبحر (۳ : ۳۷۷) ومجمع البیان ۱ : ۷٤ والمحاضرات للمؤلف ۳ : ۳۹۸ وابن ابی الحدید ۱ : ٥۷ واللسان (عمر) وفی روایة ابشری بدل خامری ـ قال صاحب العقد (۱ : ۱۱۸ـ۷/۱۱۹ـ٤ : ۲۱۹) ان روایة خامری بعید عن المعنیٰ راجع الازمنه والامکنه ومعنیٰ البیت لاتدفنونی بل دعونی للتی یقال لها اذا صیدت خامری ام عامر ای للضبع قال الخَلیل ونقل عنه سیبویه فی "الکتاب" والخفاجی فی شرح الدرة (۱٤ـ۱٥) وصدرا لافاضل فعلیٰ هذا لیس فی البیت التفات کماذهب الیه البعض والقطعة ایضاً فی بیت الاخطل اللسان (وشظ) والمرزوقی والقطعة مثل راجع الحرجانی ۹۰ والعسکری والمیدانی ۱۲.

(خ م ص)

اَلْـمَـخْـمَـصَةُ: ایسی بھوک جس سے پیٹ پچک جائے۔قرآن میں ہے:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ﴾ (۵۔۳) ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے۔کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ خَامِصٌ: پچکے ہوئے۔پیٹ والا اَخْمَصُ الْقَدَمِ پاؤں کے تلوے کا گڑھا۔

(خ م ط)

اَلْـخَمْطُ ۔درخت بے خار۔بعض نے کہا ہے کہ خَمْطٌ پیلو کے درخت کو کہتے ہیں۔

اَلْخَمْطَةُ: ترش شراب۔تَخَمَّطَ: غضبناک ہونا۔کہا جاتا ہے۔تَخَمَّطَ الْفَحْلُ سانڈ کا مستی سے بربرانا۔

(خ ن ز ر)

اَلْخِنْزِیْرُ کے معنیٰ سور کے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ﴾ (۵۔۶۰) اور (جن کو) ان میں سے بندر اور سور بنا دیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خاص کر سور ہی مراد ہے اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے افعال و عادات بندر اور سور جیسے ہو گئے تھے۔نہ کہ وہ بلحاظ صورت کے بندر اور سور بن گئے تھے۔ ❶ مگر زیر بحث آیت میں دونوں معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں۔کیونکہ مروی ہے کہ ایک قوم کی صورتیں مسخ ہو گئی تھیں اور وہ بندر اور سور بن گئے تھے۔ ❷ اسی طرح انسانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو شکل وصورت کے لحاظ سے گو انسان نظر آتے ہیں لیکن اخلاق وعادات کے اعتبار سے بندر اور سور بنے ہوئے ہیں۔

(خ ن س)

اَلْـخَنْسُ: (ن) کے معنیٰ پیچھے ہٹنے اور سکڑ جانے کے ہیں اسی سے شیطان کو خَـنَّـاس کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر الٰہی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور وسوسہ انداز نہیں ہو پاتا۔قرآن میں ہے:

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۱۱۴۔۴) شیطان وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿فَـلَآ اُقْسِمُ بِـالْـخُنَّسِ﴾ (۸۱۔۱۵) ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

میں خُـنَّـس سے وہ ستارے مراد ہیں جو دن کو الٹی رفتار چلتے ہیں یہ خَـانِسٌ کی جمع ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے زحل، مشتری اور مریخ مراد ہیں۔کیونکہ یہ الٹی چال چلتے رہتے ہیں۔

اَخْنَسْتُ عَنْهُ حَقَّهُ: میں نے اس کے حق کو مؤخر کر دیا، روک لیا۔

(خ ن ق)

اَلْـمُـنْـخَـنِـقَةُ: (۵۔۳) جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے۔

اَلْمِخْنَقَةُ: کے معنیٰ قلادہ کے ہیں۔

---

❶ ذهب الجمهور الی ان المسخ كان عقوبة وحقيقتاً وقال مجاهد بالقول الثانی واول المسخ علی تغيير الاخلاق والله اعلم راجع التفاسير.

❷ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

(خ و ر)

اَلْخُوَارُ: دراصل یہ لفظ گائے بیل کی آواز کے ساتھ مختص ہے پھر استعارۃً اونٹ کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عِجْلًا جَسَدًا لَهٗ خُوَارٌ﴾ (۲۰۔۸۸) ایک بچھڑا (یعنی اس کا) قالب جس کی آواز گائے کی سی تھی۔

اَرْضٌ خَوَّارَةٌ: دو بلندیوں کے درمیان پست زمین۔

رُمْحٌ خَوَّارٌ کمزور نیزہ۔

اَلْخَوْرَانُ: بہائم کی آواز۔ جانوروں کے گوبر کرنے کا راستہ۔

(خ و ض)

اَلْخَوْضُ: (ن) کے معنی پانی میں اترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں بطور استعارہ کسی کام میں مشغول رہنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کا زیادہ تر استعمال فضول کاموں میں لگے رہنے پر ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ﴾ (۹۔۶۵) اور اگر تم ان سے (اس بارے میں) دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی بات چیت اور دل لگی کرتے تھے۔

﴿وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا﴾ (۹۔۶۹) اور جس طرح وہ باطل میں ڈوبے رہے اسی طرح تم بھی باطل میں ڈوبے رہے۔

﴿ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ (۶۔۹۱) پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں۔

﴿وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ﴾ (۶۔۶۸) اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بے ہودہ بکواس کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہوجاؤ۔ یہاں تک کہ اور باتوں میں مشغول ہوجائیں۔

اَخَضْتُ دَابَّتِیْ فِی الْمَآءِ: میں نے اپنی سواری کو پانی میں ڈال دیا۔

تَخَاوَضُوْا فِی الْحَدِیْثِ: باہم باتوں میں مشغول ہوگئے۔

(خ و ف)

اَلْخَوْفُ: (س) کے معنی ہیں قرائن وشواہد سے کسی آنے والے خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ رجاء اور طمع کا لفظ قرائن وشواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے خوف کی ضد امن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ﴾ (۱۷۔۵۷) اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ (۳۲۔۱۶) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔ (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا﴾ (۴۔۳) اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ ...... انصاف نہ کرسکو گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ (۴۔۳۵) اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں اَن بن ہے۔ میں بعض نے خِفْتُمْ کے معنیٰ عَرَفْتُمْ کئے ہیں یعنی اگر تمہیں معلوم ہو مگر اس کے اصل معنیٰ یہ ہیں کہ اگر حالات سے واقفیت کی بنا پر تمہیں اندیشہ ہو کہ اَلْخَوْفُ مِنَ اللّٰهِ: (اللہ تعالیٰ سے ڈرنے) کے یہ معنیٰ نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔ اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہو جائے بلکہ خوف الٰہی کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے۔ اور طاعات کو اختیار کرے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہوسکتا۔

اَلتَّخْوِيْفُ: (تفعیل) ڈرنا اللہ تعالیٰ کے لوگوں کو ڈرانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو برے کاموں سے بچتے رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ﴾ (۳۹۔۱۶) بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے اور باری تعالیٰ نے شیطان سے ڈرنے اور اس کی تخویف کی پرواہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۔۱۷۵) یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے لہٰذا اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

یعنی شیطان کا حکم مت بجالاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو کر رہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ﴾ (۱۹۔۵) اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔ میں خوف کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنے مال کی فکر تھی کہ موالی اس کے وارث بن جائیں گے۔ جیسا کہ بعض جہلاء نے سمجھا ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا درجہ اس سے کہیں بلند ہوتا ہے کہ وہ دینوی مال واسباب کی فکر کریں بلکہ موالی سے انہیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ ان کے مرنے کے بعد شریعت کی رعایت اور نظامِ دین کی حفاظت نہیں کریں گے۔

اَلْخِيْفَةُ: کے معنیٰ خوف کی حالت کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى قُلْنَا لَا تَخَفْ﴾ (۲۰۔۶۷) (اس وقت) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔

اور کبھی خِيفَة بمعنیٰ خوف بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ﴾ (۱۳۔۱۳) اور فرشتے سب اس کے خوف سے۔

﴿تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۳۰۔۲۸) (اور کیا) تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنوں سے ڈرتے ہو۔

یہاں خوف کی بجائے خیفة کا لفظ لانے سے اس بات کی

---

[1] ذهب الفراء الى ان معناه التنقص والزجاج الى معنى الاخافة راجع التاج واللسان (خوف).

طرف اشارہ ہے کہ ان کی حالت لازمہ بن چکی تھی جوان پر ہر آن طاری رہتی تھی۔

اَلتَّخَوُّفُ: (تفعل) کسی انسان کا اظہار خوف کرنا۔

تَخَوَّفْنَاهُمْ: ہم نے انہیں اتنا کم کیا جس قدر کہ خوف اس کا مقتضی تھا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ﴾ (۱۶۔۴۷) یا جب ان کو عذاب کا ڈر پیدا ہوگیا ہو اس وقت پکڑے۔ ❶

(خ و ل)

اَلتَّخْوِيْلُ: (تفعیل) کے اصل معنیٰ خَوَلَ یعنی حشم وخدام عطا کرنے کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنیٰ ایسی چیزیں عطا کرنے کے ہیں جو انسان کو خوَلَ کا کام دے اور بقول بعض ایسی چیزیں عطا کرنا جن کی نگہداشت کی ضرورت پڑے۔اور یہ فُلَانٌ خَالُ مَالٍ اَوْ خَائِلُ مَالٍ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی فلاں مال کی خوب نگہداشت کرنے والا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرَكْتُمْ مَاخَوَّلْنَاكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ (۶۔۹۴) اور جو مال ومتاع ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔

اور "اَلْخَالُ" اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو وحشی جانوروں کو ڈرانے کے لئے کھیت میں لٹکا دیا جاتا ہے۔نیز خَالٌ کے معنیٰ تِل یعنی بدن پر سیاہ نشان کے بھی آتے ہیں ❶

(خ و ن)

اَلْخِيَانَةُ: خیانت اور نفاق دونوں ہم معنیٰ ہیں مگر خیانت کا لفظ عہد اور امانت کا پاس نہ کرنے پر بولا جاتا ہے اور نفاق دین کے متعلق بولا جاتا ہے۔پھر ان میں تداخل ہوجاتا ہے۔پس خیانت کے معنیٰ خفیہ طور پر عہد شکنی کرکے حق کی مخالفت کے آتے ہیں اس کی ضد امانت ہے۔اور محاورہ میں خُنْتُ فُلَاناً وَاَمَانَةَ فُلَانٍ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمَانَاتِكُمْ﴾ (۸۔۲۷) نہ تو خدا اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا﴾ (۶۶۔۱۰) خدا نے کافروں کے لئے نوح علیہ السلام کی بیوی اور لوط علیہ السلام کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے ان کی خیانت کی۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ﴾ (۵۔۱۳) اور .... ہمیشہ تم ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔

کے معنیٰ بعض نے عَلٰى جَمَاعَةٍ خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ کئے ہیں یعنی خَآئِنَةٍ کو جماعةٍ کی صفت مانا ہے اور بعض نے اس کے معنیٰ عَلٰى رَجُلٍ خَائِنٍ کئے ہیں یعنی اسے رَجُلٌ کی صفت مانا ہے اور کہا ہے کہ رَجُلٌ خَائِنٌ وَخَائِنَةٌ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ رَاوِيَةٌ (روایت کرنے والا) اور دَاهِيَةٌ کے الفاظ ہیں۔

---

❶ وايضاً الخال والخالة اخوالام واختها وفي التنزيل خالك ۳۳۔۵۰ اوبيوت اخوالكم اوبيوت خالاتكم ۲۴۔۶۱ خالاتك ۳۳۔۵۰ خالاتكم ۴: ۲۳).

بعض نے کہا کہ خَائِنَةٌ یہاں مصدر کی جگہ پر استعمال ہوا ہے جیسا کہ قُمْ قَائِمًا کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ: ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ﴾ (۴۰-۱۹) وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔ بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ﴾ (۸-۷۱) اور اگر یہ لوگ تم سے دغا کرنا چاہیں تو یہ پہلے ہی اللہ سے دغا کر چکے ہیں تو اس نے ان کو (تمہارے) قبضے میں دے دیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۲-۱۸۷) خدا جانتا ہے کہ تم اپنے حق میں خیانت کرنا چاہتے تھے۔

میں اخْتِيَان کے معنیٰ خیانت کے لئے حیلہ کرنے کے ہیں۔ اس بنا پر تَخُوْنُوْنَ اَنْفُسَكُمْ نہیں کہا کیونکہ ان سے خیانت کا صدور نہیں ہوا تھا جس کے معنیٰ قصدِ خیانت کے لئے جذبات کے حرکت میں آنے کے ہیں اسی معنیٰ کی طرف اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ، میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

(خ و ی)

اَلْخَوَاءُ: کے معنیٰ خالی ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے: خَوٰی (ض) خَوًی ۔ بَطَنُهٗ مِنَ الطَّعَامِ: یعنی اس کا پیٹ طعام سے خالی ہو گیا۔ اور تشبیہ کے طور پر خَوَی الْجَوْزُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ خالی ہونے کے ہیں۔

خَوَتْ خَوَاءَ الدَّارُ: گھر ویران ہو کر گر پڑا❶ اور جب ستارے کے گرنے سے بارش نہ ہو تو تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ خَوَی النَّجْمُ وَاَخْوٰی یہاں خوٰی کی نسبت اخوٰی کے لفظ میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے جیسا کہ سقٰی اور اَسقٰی ہیں۔

اَلتَّخْوِيَةُ: دو چیزوں کے درمیان جگہ خالی چھوڑنا۔

(خ ی ب)

اَلْخَيْبَةُ (ض) کے معنیٰ ناکام ہونے اور مقصد فوت ہو جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ﴾ (۱۴-۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد ہو گیا۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى﴾ (۲۰-۶۱) اور جس نے افترا کیا وہ نامراد رہا۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (۹۱-۱۰)❷ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

(خ ی ر)

اَلْخَيْرُ: وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو۔ مثلاً عقل عدل وفضل اور تمام مفید چیزیں یہ اَلشَّرُّ کی ضد ہے۔ اور خیر دو قسم پر ہے۔

(۱) خیر مطلق جو ہر حال میں اور ہر ایک کے نزدیک پسندیدہ ہو جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے جنت کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا❸:

---

❶ وفي التنزيل وهي خاوية على عروشها وايضاً ۲: ۲۵۹) ۶۹-۷).

❷ وایضاً ۳: ۱۲۶).

❸ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

(۱۱۹) لا خَیرَ بِخَیرٍ بَعدَہُ النّارُ وَلا شَرَّ بِشَرٍّ بَعدَہُ الجَنَّۃُ کہ وہ خیر کچھ بھی خیر نہیں ہے جس کے بعد آگ ہو اور وہ شر کچھ بھی شر نہیں ہے جس کے بعد جنت حاصل ہو جائے۔

(۲) دوسری قسم خیر و شر مفید کی ہے یعنی وہ چیز جو ایک کے حق میں خیر اور دوسرے کے لئے شر ہو مثلاً دولت کہ بسا اوقات یہ زید کے حق میں خیر اور عمر کے حق میں شر بن جاتی ہے۔ اس بنا پر قرآن پاک نے اسے خیر و شر دونوں سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ تَـرَكَ خَیْـرًا﴾ (۲۔۱۸) اگر وہ کچھ مال چھوڑ جاتے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿اَیَـحْسَبُـوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّ هُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِیْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرَاتِ﴾ (۲۳۔۵۵،۵۶) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں (تو اس سے) ان کی بھلائی میں جلدی کر رہے ہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مال پر خیر کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ مال کثیر ہو اور حلال طریق سے جمع کیا گیا ہو جیسا کہ مروی ہے [1] (۱۲۱) کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ایک غلام کے پاس گئے تو اس نے دریافت کیا کہ اے امیر المؤمنین! میں کچھ وصیت نہ کر جاؤں؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کے لئے ''ان تـرك خیـرًا'' فرمایا ہے۔ اور خیر مال کثیر کو کہا جاتا ہے'' چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاِنَّـهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ﴾ (۱۰۰۔۸) وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔ میں بھی خیر کے معنیٰ مال کثیر کے ہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: اِنْ تَرَكَ خَیرًا میں مال کو خیر کہنے میں ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وصیت صرف اس مال میں بہتر ہے جو محمود طریق سے جمع کیا گیا ہو۔ اس معنیٰ میں فرمایا:

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ﴾ (۲۔۱۱۵) کہہ دو (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو (وہ درجہ بدرجہ اہل استحقاق میں) ماں باپ کو۔

﴿وَمَـا تَفْعَلُوا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ (۲۔۱۹۷) اور جو نیک کام کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیهِمْ خَیْرًا﴾ (۲۴۔۳۳) اگر تم ان میں (صلاحیت اور) نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کر لو۔

میں بعض نے خَیـرًا سے مال مراد لیا ہے یعنی اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے پاس مال ہے اور بعض نے خیر بمعنیٰ ثواب لیا ہے کہ اگر تمہیں یقین ہو کہ ان کی آزادی تمہارے اور ان کے حق میں فائدہ مند یعنی باعث ثواب ہوگی۔ خیر و شر کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

کبھی بطور اسم کے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور آیت کریمہ:

---

[1] الحدیث ذکرہ فی الکشاف قال الحافظ فی تخریجہ رواہ عبدالرزاق عن معمر عن ھشام عن ابیہ وایضاً ابن ابی شیبہ عن ابی خالد الاحمر عنہ ومثلہ عن عائشۃ ان رجلا اراد ان یوصی فسألتہ کم مالك (عبدالرزاق عن عبداللہ بن عبید بن عمیر وابن ابی شیبۃ عن ابن ابی ملیکۃ عن عائشۃ) انظر تخریج الحافظ (۱۴ رقم ۱۰۶۹۱۰۴)۔

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ (۳۔۱۰۴) اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔

میں بھی خیر بطور اسم کے استعمال ہوا ہے اور کبھی یہ دونوں بطور وصف کے آتے ہیں اور اَفْعَلُ مِنْ کی تقدیر میں ہوتے ہیں جیسے هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ ذَالِكَ وَاَفْضَلُ: یعنی یہ اس سے بہتر اور افضل ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا﴾ (۲۔۱۰۶) تو اس سے بہتر بھیج دیتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَاَنْ تَصُوْمُوا خَيْرٌ لَّكُمْ......﴾ (۲۔۱۸۴) تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

میں خیر اسم بھی ہوسکتا ہے اور بمعنیٰ اَفْعَلُ مِنْ بھی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ (۲۔۱۹۷) اور زادراہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر (فائدہ) زادراہ کا پرہیزگاری ہے۔

میں خیر بمعنیٰ افْعَلُ مِنْ کے ہے۔

پھر کبھی تو خیر لفظ شر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اور کبھی ضُرٌّ کے مقابلہ میں جیسے فرمایا:

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۶۔۱۷) اور اگر خدا تم کو کوئی سختی پہنچائے تو اس کے سوا اس کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر نعمت (وراحت) عطا کرے (تو کوئی اس کو روکنے والا) نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿فِيْهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ﴾ (۵۵۔۷۰) ان میں سے نیک سیرت (اور) خوبصورت۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خَيْرَاتٌ اصل میں خَيِّرَات ہے تخفیف کے لئے ایک یاء کو حذف کردیا گیا۔ کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ خَيْرٌ وَامْرَأَةٌ خَيْرَةٌ، وَهٰذَا خَيْرُ الرِّجَالِ وَهٰذِهٖ خَيْرَةُ النِّسَاءِ: اور خیرات سے مراد یہ ہے کہ ان میں نیک سیرت عورتیں ہوں گی۔ اَلْخَيِّرُ بہتر جو خیر کے ساتھ مختص ہو۔ نَاقَةٌ خِيَارٌ وَجَمَلٌ خِيَارٌ (مذکر ومؤنث) بہتر اونٹنی یا اونٹ۔

اَلاِسْتِخَارَةُ: کے معنیٰ طلب خیر کے ہیں اس کا مطاوع خَارَ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔

اِسْتَخَارَ اللّٰهَ الْعَبْدُ فَخَارَ لَهٗ: بندے نے اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کی تو اللہ تعالیٰ نے جو بہتر تھا وہ بتا دیا۔

خَايَرْتُ فُلَانًا كَذَا فَخِرْتُهٗ: میں نے فلاں سے (علم میں) مسابقت کی تو میں غالب رہا۔

اَلْخِيَرَةُ: سے مراد وہ حالت ہے جو طلب خیر یا مختار کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ قِعْدَةٌ وَّ جِلْسَةٌ کا لفظ قَاعِدٌ اور جَالِسٌ کی ہیئت اور حالت پر بولا جاتا ہے۔

اَلْاِخْتِيَارُ: (افتعال) بہتر چیز کو طلب کرکے اسے کر گزرنا۔

اور کبھی اختیار کا لفظ کسی چیز کو بہتر سمجھنے پر بھی بولا جاتا ہے گو نفس الامر میں وہ چیز بہتر نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۴۴۔۳۲) اور ہم نے بنی اسرائیل کو اہل علم سے دانستہ

منتخب کیا تھا۔

میں ان کے بلحاظ خلقت کے بہتر ہونے کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں دوسروں پر فوقیت بخشنا مراد ہو۔متکلمین کی اصطلاح میں مختار کا لفظ ہر اس فعل سے متعلق بولا جاتا ہے جس کے کرنے میں انسان پر کسی قسم کا جبر واکراہ نہ ہو۔لہٰذا ھُوَ مُخْتَارٌ فِی کَذَا کا محاورہ ہے فُلَانٌ لَـهٗ اِخْتِیَارٌ کے ہم معنیٰ نہیں ہے۔ کیونکہ اخْتِیَارٌ کے معنیٰ اس کام کے کرنے کے ہوتے ہیں جسے انسان بہتر خیال کرتا ہو۔مگر مُخْتَارٌ کا لفظ فاعل اور مفعول دونوں پر بولا جاتا ہے۔

(خ ی ط)

اَلْخَیْطُ: دھاگا۔وَالْجَمعُ الْخُیُوطُ۔

خَاطَ (ض) خِیَاطَةٌ وَخَیَّطَ الثَّوبَ کے معنیٰ کپڑا سینے کے ہیں اور کپڑا سینے کی سوئی کو الْخِیَاطُ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ﴾ ''یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نکل جائے۔''

اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (۲-۱۸۷) یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔

میں خَیْطِ اَبْیَض اور اَسْوَد سے صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی مراد ہے۔اور شاعر کے قول [1] (طویل)

(۱٤۸) تَدَلّٰی عَلَیْهَا بَیْنَ سِبٍّ وَ خَیطَةٍ:

وہ رسی اور میخ کے مابین اس پر اٹک گیا۔

میں خَیْطَةٌ کا لفظ بطور استعارہ رسی یا میخ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ایک روایت میں ہے [2]

(۱۲۲) کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے سیاہ اور سفید دو عقال (ڈورے) رکھ لئے ان کی طرف دیکھتے جاتے اور کھانا کھاتے جاتے یہاں تک کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگے پھر انہوں نے آنحضرت کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا:

اِنَّكَ لَعَرِیْضُ الْقَفا وَاِنَّمَا ذَالِكَ بَیَاضُ النَّهَارِ وَسَوَادُ اللیل کہ تم تو نرے ہی عریض القفاء (احمق) ہو۔اس سے مراد تو رات کی سیاہی اور فجر کی سفیدی ہے۔

خَیَّطَ الشَّوْبُ فِیْ رَأْسِهٖ: اس کے سر میں دھاگے کی طرح بڑھاپا ظاہر ہوگیا۔اَلْخَیْطُ: (ایضا) شتر مرغ اس کی جمع اَلْخِیطَانُ ہے۔نَعَامَةٌ خَیْطَاءُ: دھاگے کے طرح لمبی گردن والا شتر مرغ۔

(خ ی ل)

اَلْخَیَالُ: اس کے اصل معنیٰ صورت مجردہ کے ہیں جیسے وہ صورت جو خواب یا آئینے میں نظر آتی ہے یا کسی کی عدم موجودگی میں دل کے اندر اس کا تصور آتا ہے۔پھر (مجازا) ہر اس امر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا تصور کیا

---

[1] قاله ابو ذویب یصف مشتار العسل وتمامه........ بجرداء مثل الوکف یکبو غرابها وفی التهذیب والقالی (۲: ۲۵۸) شطره الثانی شدید الوصاة نابل وابن نابل والبیت من شواهد الکشاف ۳ ۱٤۳ لکن فیه تمامه تدلی ولو النمائح المتشمر والله اعلم والبیت فی تهذیب الاصلاح واللسان (سب، خیط.)

[2] حدیث عدی بن حاتم متفق علیه وفی ابی داؤد من حدیث الشعبی عنه والصحیح انه صلی الله علیه وسلم قاله مزاحاً ولم یعیره بالحمق وان کانت اللفظة تاتی بمعنیٰ الحمق ایضاً ۱۲۔

جائے اور ہر اس پتلے دبلے شخص کو خیال کہا جاتا ہے جو بمنزلہ خیال اور تصور کے ہو۔

اَلتَّخْلِیْلُ: (تفعیل) کے معنیٰ کسی کے نفس میں کسی چیز کا خیال یعنی تصور قائم کرنے کے ہیں اور اَلتَّخَیُّلُ معنیٰ از خود اس قسم کا تصور قائم کر لینے کے ہیں۔ اور خِلْتُ بمعنیٰ ظَنَنْتُ آتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ مظنون چیز بھی بمنزلہ خیال کے ہوتی ہے۔

خَیَّلَتِ السَّمَاءُ: آسمان میں بارش کا سماں نظر آنے لگا۔

فُلَانٌ مُخِیلٌ بِکَذَا: فلاں اس کا سزاوار ہے اصل میں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ فلاں اس خیال کو ظاہر کرنے والا ہے۔ اَلْخَیْلَاءُ تکبر جو کسی ایسی فضیلت کے تخیل پر مبنی ہو جو انسان اپنے اندر خیال کرتا ہو۔ اسی سے لفظ خیل لیا گیا ہے کیونکہ جو شخص گھوڑے پر سوار ہو وہ اپنے اندر نخوت و غرور پاتا ہے۔ دراصل خَیل کا لفظ گھوڑے اور سوار دونوں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ﴾ (۸-۶۰) اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے اور کبھی ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے [1]

(۱۲۲) یَا خَیلَ اللّٰہِ ارْکَبِیْ:

اے اللہ! کے سوار! گھوڑے پر سوار ہو جا، تو یہاں خیل بمعنیٰ فارس کے ہے اور ایک حدیث میں ہے۔ [2]

(۱۲۳) عَفَوتُ لَکُم عَنْ صَدَقَةِ الْخَیْلِ:

شقرا (ایک پرندہ) کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور ہر لحظہ خیال ہوتا ہے۔ کہ دوسرے رنگ کا ہے۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے [3] (مجزوالکامل)

(۱٤۹) کَاَبِیْ بِرَاقِشَ کُلُّ لَونٍ لَونُهٗ یَتَخَیَّلُ

ابو براقش کی طرح جو ہر آن نیا رنگ بدلتا ہے۔

❀❀❀

---

[1] رواہ الشیخ فی الناسخ والمنسوخ وعزاہ السھیلی فی الروض لمسلم والحدیث باختلاف الفاظه فی ابی داؤد والمستدرك للحاکم وفی الردۃ للعواقدی قاله خالد بن الولید لاصحابه یوم الیمامة راجع الکافی رقم ۲۹٤ والحیوان ۱ : ۳۳۵ من کلمات النبی صلی اللہ علیه وسلم لم یتقدمه فیهن احد وفی اضداد ابی الطیب یقولون یاخیل اللہ ارکبی علی القلب وعدہ من المجاز .

[2] رواہ ابو داؤد والترمذیٰ من حدیث علی مرفوعاً قال الدارقطنی الصواب وقفه علی علی وفی المسئلة اختلاف راجع لاختلاف الفاظه النیل ٤ : ١٤٦-١٤٧ وکنزالعمال ٦ رقم ١٢٥٨.

[3] قاله الاسدی فی ذم قوم مشهورین بالمقالج وفی المطبوع مسمادت "کادت" بدل کابی مصحف راجع اللسان (برقش) والاقتضاب ۳۵۳ والعیون ۲ : ۲۹ والحیوان (۳ : ٤۷) وانظر للبیت والروایات ومامثل فیه دیوان المعانی (۱ : ۲۸۲) وخزانة الادب ۳ : ٦٦۰ والصناعتین ۱۰۳ وذیل الامالی ۸۳ والمحاضرات للمولف (۱ : ۱۵).

کِتَابُ الدَّال

(د ء ب)

اَلدَّأْبُ کے معنی مسلسل چلنے کے ہیں کہا جاتا ہے۔
دَأَبَ فِی السَّیْرِ دَأْباً: وہ مسلسل چلا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ﴾ (۱۴۔۳۳) اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں (دن رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں۔
نیز دَأْبٌ کا لفظ عادۃ مستمرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿کَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ (۳۔۱۱) ان کا حال بھی فرعونیوں جیسا ہے۔
یعنی ان کی عادات جس پر وہ ہمیشہ چلتے رہے ہیں۔

(د ب ب)

اَلدَّبُّ وَالدَّبِیْبُ: (ض) کے معنی آہستہ آہستہ چلنے اور رینگنے کے ہیں ۔ یہ لفظ حیوانات اور زیادہ تر حشرات الارض کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔اور شراب اور کہنگی وغیرہ کے (جسم اور کپڑے وغیرہ میں) سرایت کر جانے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔جن کی حرکات کا علم حاسہ بصر سے ادراک نہ ہوسکتا ہو۔ یہ لفظ گو عرف میں خاص کر گھوڑے پر بولا جاتا ہے مگر (لغۃ) ہر حیوان یعنی ذی حیات چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ﴾ (۲۴۔۴۵) اور خدا ہی نے ہر چلتے پھرتے جانور کو پانی سے پیدا کیا۔
﴿وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ﴾ (۲۔۱۶۴) اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلائے ہیں۔
﴿وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا﴾ (۱۱۔۶) اور زمین پر چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔
﴿وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ......﴾ (۶۔۳۸) اور زمین پر چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والا پرند نہیں ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ﴾ (۳۵۔۴۵) اور اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر کسی ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔
کی تفسیر میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہاں دَآبَّۃ سے خاص کر انسان مراد ہیں [1] مگر اولیٰ یہ ہے کہ اسے عموم پر رکھا جائے اور اس سے ہر ذی حیات چیز مراد لی جائے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْھِمْ اَخْرَجْنَا لَھُمْ دَآبَّۃً

[1] ونصه ومجاز دابة ها هنا انسان راجع مجازه (۲ : ۱۵۶) وقارن الطبری ۱۲.

مِّنَ الْاَرْضِ تُکَلِّمُھُمْ﴾ (۲۷۔۸۲) اور جب ان کے بارے میں (عذاب کا) وعدہ پورا ہوگا تو ہم ان کے لئے زمین میں سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک غیر معروف قسم کا جانور ہوگا جو قیامت کے قریب خروج کرے گا۔ اور بعض نے اس سے وہ شریر لوگ مراد لئے ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح ہوں گے۔ اس صورت میں لفظ دَآبَّۃ جمع ہوگا (جیسا کہ خائن کی جمع خَائِنَۃ آجاتی ہے) اور ہر چلنے پھرنے والی چیز کو شامل ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۸۔۲۲) کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانوروں میں سب سے بدتر۔

میں دَوَآبّ کا لفظ جملہ حیوانات کو شامل ہے۔ محاورہ ہے:

نَاقَۃٌ دَبُوْبٌ: ضعف اور سستی کی وجہ سے آہستہ چلنے والی اونٹنی۔

مَا بِالدَّارِ دُبِیٌّ [1]: گھر میں کوئی نہیں۔

اَرْضٌ مَدْبُوبَۃٌ: وہ زمین جس میں چھوٹے چھوٹے رینگنے والے جانور کثرت سے ہوں۔

(د ب ر)

دُبُرٌ: پشت، مقعد یہ قُبُل کی ضد ہے اور یہ دونوں لفظ بطور کنایہ جائے مخصوص کے معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں اور اس میں دُبُرٌ اور دُبْرٌ دو لغات ہیں اس کی جمع اَدْبَارٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗ﴾ (۸۔۱۶) اور جو شخص جنگ کے روز ان سے پیٹھ پھیرے گا۔

﴿یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ﴾ (۸۔۵۰) ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر (کوڑے و ہتھوڑے وغیرہ) مارتے ہیں۔

﴿فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ﴾ (۸۔۱۵) تو اُن سے پیٹھ نہ پھیرنا۔

یعنی ہزیمت خوردہ ہو کر مت بھاگو اور آیت کریمہ:

﴿وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ (۵۰۔۴۰) اور نماز کے بعد (بھی) میں ادبار کے معنیٰ نمازوں کے آخری حصے (یا نمازوں کے بعد) کے ہیں۔ اور ﴿اَدْبَارَ النُّجُوْمِ﴾ (۵۲۔۴۹) میں ایک قرأت اِدْبَارَ النُّجُوْمِ بھی ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر بمعنیٰ ظرف ہوگا یعنی ستاروں کے ڈوبنے کا وقت جیسا کہ مَقْدَمَ الْحَاجِّ اور خُفُوْقَ النَّجْمِ میں ہے۔ اور اَدْبَارَ (بفتح الھمزۃ) ہونے کی صورت میں جمع ہوگی۔ اور الدبر سے مشتقات (جیسے دَبَرَ وَاَدْبَرَ وَدَابِرٌ) کبھی باعتبار فاعل (یعنی فعل لازم) کے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے: دَبَرَ فُلَانٌ (فلاں نے پیٹھ پھیری) اَمْسِ الدَّابِرُ (کل گذشتہ) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ﴾ (۷۴۔۳۳) اور رات کی جب پیٹھ پھیرنے لگے۔

اور کبھی باعتبار مفعول (یعنی فعل متعدی) کے جیسے دَبَرَ السَّھْمُ الْھَدَفَ: (تیر نشانہ سے پرے گر پڑا)۔

دَبَرَ فُلَانُ الْقَوْمَ: (یعنی وہ قوم سے پیچھے رہ گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۶۔۴۵)

---

[1] وَدَبِیٌّ قال الحیری ولایتکلم بھا الافی الجحد ای النفی۔

غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔

﴿اِنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ﴾ (۱۵۔۶۶) کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہی کاٹ دی جائے گی۔

اور دَابِرٌ کے معنی متاخر یا تابع کے آتے ہیں خواہ وہ تاخر باعتبار مکان یا زمان کے ہو اور خواہ باعتبار مرتبہ کے۔

اَدْبَرَ: اعراض کرنا۔ پشت پھیرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ﴾ (۷۴۔۲۳) اور پھر پشت پھیر کر چلا اور (قبول حق سے) غرور کیا۔

﴿تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى﴾ (۷۰۔۱۷) ان لوگوں کو بلائے گی جنہوں نے (دین حق سے) اعراض کیا۔ حدیث میں ہے [1]:

(۱۲۵) لَا تَقَاطَعُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوا عِبَادَاللّٰهِ اِخْوَانًا: کہ نہ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو اور نہ آپس میں روٹھو اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔

بعض نے لَاتَدَابَرُوْا کے معنی یہ کئے ہیں کہ پس پشت ایک دوسرے کی برائی بیان نہ کرو۔

اَلاِسْتِدْبَارُ: (استفعال) پشت پھیرنا۔ کسی چیز کے پیچھے ہونے کو طلب کرنا۔

تَدَابَرَ الْقَوْمُ: باہم اختلاف کر کے قطع تعلق کرنا۔

اَلدِّبَارُ: یہ دَابَرَهٗ کا مصدر ہے جس کے معنی پسِ پشت دشمنی کرنے کے ہیں۔

اَلتَّدْبِيْرُ: (تفعیل) کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور وفکر کرنا قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا﴾ (۷۹۔۵) پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔

یعنی وہ فرشتے جو امور دینوی کے انتظام کے لئے مقرر ہیں۔ اَلتَّدْبِيْرُ: (ایضاً) آزاد کردن بندہ پس از مرگ۔

اَلدَّبَارُ: (بفتح الدال) ہلاکت جو قوم کی جڑ کو کاٹ ڈالے۔ نیز ایام جاہلیت میں بدھ کے دن کو دبار کہا جاتا تھا۔ کیونکہ عرب لوگ اس سے بدشگونی لیتے تھے۔

اَلدِّبِيْرُ: ریسماں کہ برکشند بوقت رشتن سپس اودیہ (وضدِ آں قبیل است)

رَجُلٌ مُّقَابَلٌ وَّ مُدَابَرٌ: نجیب الطرفین۔

شَاةٌ مُقَابَلَةٌ مُدَابَرَةٌ: بکری جس کا اگلی اور پچھلی جانب سے کان کٹا ہوا ہو۔

دَابِرَةُ الطَّائِرِ: پرند کے پاؤں کا رخار پرند کی پانچویں انگلی جو دوسری انگلیوں کے اوپر نکلتی ہے۔

دَابِرَةُ الحَافِرِ: ناخن کہ برباز وئے ستور برآید۔

اَلدَّبُوْرُ: پچھوائی ہوا۔ اَلدَّبَرَةُ: قابل کاشت زمین کا ٹکڑا اس کی جمع دِبَارٌ ہے شاعر نے کہا ہے کہ [2] (طویل)

(۱۵۰) جِرْبَةٍ تَعْلُوا الدِّبَارَ غُرُوبُهَا

---

[1] متفق علیه من حدیث ابی هريرة ورواه البخاری عن انس بمعناه والطبرانی عن ابی ایوب راجع كنزالعمال ۹: ۲۲۹و۹۳۸ وتخریج الاحیاء ۲: ۱۷۸،۱۸۰).

[2] قاله بشر بن ابی جازم وتكملته : تحدرماء البئر عن جرشيته على ...... وفی المطبوع جريه (بالياء) مصحف والصواب بالموحدة والشاء ومعناه المزرعة والدبار جمع دبرة اودبارة وهی القطعة من المزرعة والجرشية ناقة منسوبة الى جرش وهى ارض باليمن واهلها يستقون على الابل فالشاعر شبه تحدردموعه بتحدر ماء على جربة من غروب يستقى عليها كذاقال الجوهرى ...... جرش، دبر) والبيت ايضاً فی اللسان (جرب ، دبر، جرش) والمفضليات ۲ : ۳۰ وفيه الغرب مكان البئر راجع ايضاً البلدان (رسم جرش) وفيه ان جرش فتحت فی حياة النبی صلى الله عليه وسلم فی سنة عشر من الهجرة صلحاً على الفیء وجرش بالضم والفتح ۱۲۔

جیسے کہ یمنی اونٹنی کے پانی سے بھرے ہوئے ڈول زمین پر گرتے ہیں۔

اَلدَّبْرُ: شہد کی مکھیوں، بھڑوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا غول جن کا ڈنگ ان کی مقعد پر ہوتا ہے۔ اس کا واحد دَبْرَةٌ ہے۔

اَلدِّبْرُ: مالِ کثیر جو میت چھوڑ مرے۔ اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ ❶

دَبِرَ الْبَعِیرُ: زخمی پیٹھ والا ہونا۔ ایسے اونٹ کو اَدْبَرُ وَدَبِرٌ کہتے ہیں۔ الدَّبْرَةُ: (بفتح الباء وسکونہا) شکست در کارزار۔ ❷

(د ث ر)

اَلْمُدَّثِّرُ: (از تفعل) اصل میں مُتَدَثِّرٌ تھا۔ تاء کو دال سے بدل کر دال کو دال میں ادغام کر دیا۔ اس کے معنی کپڑا اوڑھنے والے کے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دَثَّرْتُہٗ فَتَدَثَّرَ: (میں نے اسے کپڑے میں لپیٹا چنانچہ وہ لپٹ گیا) قرآن پاک میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ﴾ (۷۴۔۱) اے (محمد ﷺ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو۔ اَلدِّثَارُ: وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ جائے جیسے چادر کمبل وغیرہ۔

تَدَثَّرَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ: سانڈھ اونٹنی پر چڑھ گیا۔

تَدَثَّرَ الرَّجُلُ الْفَرَسَ: آدمی گھوڑے پر کود کر سوار ہو گیا۔ رَجُلٌ دَثُوْرٌ: گم نام آدمی۔

سَیْفٌ دَاثِرٌ: زنگ آلود تلوار، جسے پالش کئے بہت عرصہ گزر گیا ہو۔ اسی سے جس منزل کے نشانات مٹ گئے ہوں اُسے دَاثِرٌ کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ دِثْرُ مَالٍ: وہ مال کی اچھی طرح خبر گیری کرنے والا ہے۔

(د ح ر)

اَلدَّحْرُ وَالدُّحُورُ: (ن) کے معنی دھتکار دینے اور دور کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اُخْرُجْ مِنْھَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ (۷۔۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل دھتکارا ہوا۔

﴿فَتُلْقٰی فِیْ جَھَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ (۷۔۳۵) ملامت زدہ اور درگاہ خدا سے راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔

﴿وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا﴾ (۳۷۔۹) اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں (یعنی وہاں سے) نکال دیئے گئے۔

(د ح ض)

دَاحِضَةٌ: (اسم فاعل) باطل اور زائل ہونے والی (دلیل) قرآن پاک میں ہے:

﴿حُجَّتُھُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ﴾ (۴۲۔۱۶) ان کے پروردگار کے نزدیک ان کی دلیل بالکل بودی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اَدْحَضْتُ فُلَانًا فِیْ حُجَّتِہٖ فَدَحَضَ وَاَدْحَضْتُ حُجَّتَہٗ فَدَحَضَتْ (میں نے اس کی دلیل کو باطل کیا تو وہ باطل ہو گئی) ❸

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِہٖ

---

❶ کذا فی الصحاح.

❷ ومنه المثل شر الرأی الدبری ای الذی یسنح اخیراً عند فوت الحاجة.

❸ وفی التنزیل: فساھم فکان من المدحضین ۳۷۔۱۴۱.

الْـحَـقَّ﴾ (۱۸۔۵٦) اور جو کافر ہیں، وہ باطل (سے استدلال کرکے) جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو اس کے مقام سے پھسلا دیں۔

اصل میں دَحْضُ الرِّجْلِ سے مشتق ہے۔جس کے معنی پاؤں کے پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کے ہیں۔اس بنا پر مناظرہ کے بارے میں کسی نے کہا ہے ❶ ع (الکامل)

(۱۵۱) نَـظَـرًا یُّزِیْلُ مَوَاقِعَ الْاَقْدَامِ: ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔ اور بطور استعارہ دَحَـضَـتِ الشَّمْسُ: کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سورج ڈھلنے کے ہیں۔

(د ح و)

اَلـدَّحْوُ: کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کر دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

وَالْاَرْضَ بَـعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَا (۷۹-۳۰)

اور اس کے بعد زمین کو اس کے مقر سے دور کیا۔

یعنی اسے اس کی قرار گاہ سے زائل کر دیا جیسا کہ آیت کریمہ: یَـوْمَ تَـرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْـجِبَـالُ (۷۳-۱٤) میں ہے۔یہ دَحَـا الْـمَـطَرُ الْحَصٰی عَـنْ وَّجْهِ الْاَرْضِ: (کہ بارش زمین سے کنکر بہا کر لے گئی) کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔نیز کہا جاتا ہے۔

مَـرَّ الْـفَـرَسُ یَدْحُوْدَحْوًا ، گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا خاک اڑاتا چلا گیا۔اور اسی سے اُدْحِـیُّ الـنَّعَامِ ہے جس کے معنی ریت میں شتر مرغ کے انڈے دینے کی جگہ کے ہیں۔یہ دَحْـوٌ سے اُفْـعُـوْلٌ کے وزن پر ہے۔ دِحْیَةُ ایک مرد کا نام تھا (جو دحیہ کلبی کے نام سے مشہور تھا۔)

(د خ ر)

اَلـدَّخْرُ وَالدُّخُوْرُ: (ف۔س) کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ اَدْخَرْتُهٗ فَدَخِرَ: میں نے اسے ذلیل کیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهُمْ دَاخِرُوْنَ﴾ (١٦-٤٨) اور وہ ذلیل ہو کر۔ ﴿اِنَّ الَّـذِیْـنَ یَسْتَـكْبِـرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَـدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ﴾ (۴۰-٦۰) جو لوگ میری عبادت سے ازراہ تکبر کنیاتے ہیں عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔

اور یَدَّخِرُ اصل میں یَذْتَخِرُ تھا۔پہلے تاء کو دال سے تبدیل کیا پھر ذال کو دال بنا کر دال کو دال میں ادغام کرکے یَـدَّخِرُ بنالیا اور یہ اس باب (د خ ر) سے نہیں ہے۔

(د خ ل)

اَلدُّخُوْلُ: (ن) یہ خروج کی ضد ہے۔اور مکان و زمان اور اعمال سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ دَخَـلَ مَـكَـانَ كَذَا (فلاں جگہ میں داخل ہوا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اُدْخُـلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ﴾ (۲-۵۸) کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔

---

❶ والبیت من شواهد الکشاف ۱۲۳ واوله : یتقارضون اذاالتقوا فی محلس ـ والبیت فی محاضرات المؤلف (۱ : ۷۳) والصناعتین ۲۸۱، ۳۵۷ وفیه مواطی بدل مواقع واللسان (نظر،قرض ، زال) وفی روایته فی موطن بدل فی مجلس والشطر فی المقاییس (۳ : ۲۱) والبیت فی المشكل للقتبی ۱۳۰ ومجازات القران للرضی ۳٤۳ والشوكانی ۲٦۹ والقرطبی ۲۵٦ والفخر (۳۰ : ۱۰۰) والبحر ۳۱۷ والطبری (۲۹ : ۳۰) والغریب للقتبی ٤۸۲ والبیان للجاحظ (۱ : ۱۱) وفی روایته فی موقف بدل فی محلس ۱۲.

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۳۲) جوتم عمل کیا کرتے تھے ان کے بدلے بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

﴿اُدْخُلُوا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا﴾ (۱۶-۲۹) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ اس میں رہو گے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (۵۸-۲۲) اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں داخل کرے گا۔

﴿وَيُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ﴾ (۷۶-۳۱) جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾ (۱۷-۸۰) اور کہو کہ اے پروردگار! مجھے (مدینے میں) اچھی طرح داخل کیجیے۔

میں مَدْخَلٌ (بفتح المیم) دَخَلَ يَدْخُلُ سے ہوگا اور مُدْخَلٌ (بضمہ میم) ہوتو اَدْخَلَ يُدْخِلُ سے جیسے فرمایا:

﴿لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ﴾ (۲۲-۵۹) وہ ان کو ایسے مقام میں داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے۔اور آیت کریمہ:

﴿مُدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ (۴-۳۱)

میں ہر دو قراءت منقول ہیں یعنی (میم کا ضمہ اور فتحہ) ابوعلی الفسوی لکھتے ہیں ❶ کہ مَدْخَلًا (بفتح المیم) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جنت میں قصد اور ارادہ سے داخل ہوں گے۔

اور ان کی حالت اہل دوزخ کی سی نہیں ہوگی جن کے بارے میں قرآن پاک نے کہا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ﴾ (۲۵-۳۴) جو لوگ اپنے چہروں کے بل دوزخ کی طرف جمع کیے جائیں گے۔

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ﴾ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی (اور) گھسیٹے جائیں گے۔

اور مُدْخَلًا پڑھا جائے تو یہ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ کی طرح ہوگا۔

اِدَّخَلَ: کسی جگہ میں بہ صد مشقت داخل ہونا، گھس جانا۔قرآن پاک میں ہے۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا (۹-۵۷) اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مغاک یا (زمین کے اندر گھسنے کی جگہ مل جائے۔

اَلدَّخَلُ: یہ دَغَلٌ کی طرح اندرونی عداوت، فساد یا کسی نسب کا دعویٰ کرنے سے کنایہ ہوگا۔کہا جاتا ہے۔

دُخِلَ فُلَانٌ ﴿فِيْ عَقْلِهٖ اَوْ جَسَدِهٖ﴾ فَهُوَ مَدْخُوْلٌ وَدَخِلَ (س) دَخَلًا (کنایہ) یعنی اس کے عقل و جسم یا اصل میں خرابی پائی جاتی ہے۔اسی سے اندر سے کھوکھلے درخت کو شَجَرَةٌ مَّدْخُوْلَةٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ

❶ الفارسي صاحب الايضاح والتكملة (المتولد ۲۸۸ھ المتوفیٰ ۳۷۷ھ راجع لاحواله (من بحث آمين).

(۱۶-۹۲) تم اپنی قسموں کو باہمی فساد کا ذریعہ بنانے لگو۔

اَلدِّخَالُ: (اَلابل) وہ اونٹ جو ایک مرتبہ پانی پی چکا ہو اور اسے دوبارہ پیاسے اونٹوں کے درمیان حوض پر داخل کیا جائے تاکہ مزید پانی پی لے۔ اَلدُّخَّلُ: ایک چھوٹا سا دھندلے رنگ کا پرند اور اسے دُخَّلٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گنجان درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔

اَلدَّوْخَلَةُ: کھجور کے پتوں کا زنبیل۔

دَخَلَ بِامْرَءَتِهٖ (کنایہ) اس نے اپنی عورت سے مباشرت کی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ نِّسَآئِكُمُ اللَّاتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ (۴-۲۳) جن عورتوں سے تم مباشرت کر چکے ہو.......... ہاں اگر ان کے ساتھ تم نے مباشرت نہ کی ہو تو (ان کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح کر لینے میں) تم پر کچھ گناہ نہیں۔

(د خ ن)

اَلدُّخَانُ: یہ اَلْعُثَان کے ہم معنیٰ ہے یعنی اس دھوئیں کو کہتے ہیں جو آگ کے شعلہ کے ساتھ نکلتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ﴾ (۴۱-۱۱) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ دھوئیں کی مثل تھا یعنی اس میں تماسک نہیں تھا۔

دَخَنَتِ النَّارُ تَدْخُنُ: آگ کا کثرت سے دھواں دینا۔اسی سے دُخْنَةٌ ہے لیکن عرف میں اس خوشبو کو دُخْنَةٌ کہا جاتا ہے جس سے دھونی دی جاتی ہے۔دَخِنَ الطَّبِيْخُ پکی ہوئی چیز کا دھوئیں سے خراب ہو جانا۔اور دُخان سے لون (رنگ) کے معنیٰ لے کر کہا جاتا ہے۔ شَاةٌ دَخْنَاءُ وَذَاتُ دَخْنَةٍ دھوئیں جیسی سیاہ بکری۔

لَيْلَةٌ دَخْنَانَةٌ: تاریک رات۔

اور اس سے ایذا رسائی کے معنیٰ لے کر هُوَ دَخِنُ الْخُلُقِ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔یعنی وہ بد خلق ہے۔ایک روایت میں ہے۔[1]

(۱۲۵) هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ یعنی صلح ہو جائے گی لیکن دلوں میں کینہ ہوگا۔

(د ر ر)

اَلْمِدْرَارُ: (صیغۂ مبالغہ) بہت برسنے والا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا﴾ (۶-۶) اور ان پر آسمان سے لگا تار مینہ برسایا۔

﴿يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا﴾ (۷۱-۱۱) وہ تم پر آسمان سے لگا تار مینہ برسائے گا۔

اصل میں مِدْرَار، دَرٌّ اور دِرَّةٌ سے ہے جس کے معنیٰ دودھ کے ہیں۔پھر بطور استعارہ بارش کے لئے استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ اونٹ کے دیگر اسماء و اوصاف بطور

[1] من حديث حذيفة بن اليمان وبعده وجماعة على اقذاء مثل لكدورنيا تهم وفقد تصافيهم الفائق ۲: ۳۲۲ وابوداؤد (۲۱: ۵۸۳.)

استعارہ ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔
لِلّٰهِ دَرُّهٗ اس کی خوبی اللہ کے لئے ہے (تعجب)
دَرَّ دَرُّكَ: تمہاری خیر زیادہ ہو۔
پھر بطور استعارہ بازار کے پر رونق ہونے پر لِلسُّوقِ دِرَّةٌ (بازار پر رونق ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
مثل مشہور ہے (مثل) سَبَقَتْ دِرَّتُهٗ غِرَارَهٗ: اس کی تلوار پر خون سبقت کر جاتا ہے۔ جیسا کہ ضرب المثل کے طور پر (مثل) سَبَقَ سَيْلُهٗ مَطَرَهٗ (اس کی بارش سے قبل ہی سیلاب آ جاتا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
اسی سے کہا جاتا ہے۔ اسْتَدَرَّتِ الْمِعْزیٰ: یعنی بکری نے نر سے جفتی کی خواہش کی کیونکہ بکری حاملہ ہوگی تو بچہ جنے گی اور بچہ جنے گی تو دودھ دے گی لہٰذا اِسْتِدْرَارَ کا لفظ بول کر نر کی خواہش سے کنایہ کیا جاتا ہے۔

(د ر ی)

اَلدَّرْءُ: (ف) کے معنیٰ (نیزہ وغیرہ کے) ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔
قَوَّمْتُ دَرْئَهٗ: میں نے اس کی کجی کو درست کر دیا۔ دَرَئْتُ عَنْهُ: میں نے اس سے دفع کیا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ﴾ (۱۳۔۲۲) اور نیکی کے ذریعہ برائیوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔
﴿وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ﴾ (۱۴۔۱۸) اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے۔
حدیث میں ہے۔ (۱۲۶) اِدْرَؤُ الْحُدُودَ بِالشُّبُهَاتِ شرعی حدود کو شبہات سے دفع کرو اس میں متنبہ کیا گیا ہے حدود کو دفع کرنے کے لئے حیلہ کرنا چاہیے قرآن پاک میں ہے:
﴿فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ﴾ (۳۔۱۶۸) تو اپنے اوپر سے موت کو ٹال دینا۔ اور آیت کریمہ:
﴿فَادّٰرَأْتُمْ فِيْهَا﴾ (۲۔۷۲) (تو اس میں تم باہم جھگڑنے لگے۔ میں اِدَّارَأْتُمْ اصل میں تَدَارَأْتُمْ ہے تخفیف کے لئے تاء کو دال سے بدل کر ادغام کر دیا گیا ہے اور شروع میں ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصلی لایا گیا ہے لہٰذا یہ اِفَّاعَلْتُمْ کے وزن پر ہے۔ [1] بعض ادباء نے کہا ہے کہ اِدَّارَأْتُمْ بروزن اِفْتَعَلْتُمْ ہے مگر یہ چند وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔ اوّل یہ کہ اِدَّارَأْتُمْ کے آٹھ حروف ہیں اور اِفْتَعَلْتُمْ کے صرف سات حروف ہیں۔ [2] دوم یہ کہ اس میں ہمزہ وصلی کے بعد حرف تاء ہے جسے دال سے تبدیل کیا گیا ہے اور اِفْتَعَلْتُمْ (میں ایسے نہیں ہے) سوم یہ کہ اگر اِفْتَعَلْتُمْ کے وزن پر ہوتا ہے تو دوسرے حرف کے بعد دال کو تاء سے تبدیل کرنا چاہئے تھا۔ چہارم یہ کہ جس فعل کا عین کلمہ حرف صحیح ہو اس میں تاء افتعال کا مابعد ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ مگر یہاں اسے ساکن بنا لیا گیا ہے۔ پنجم یہ کہ یہاں تاء اور دال کے درمیان حرف زائد لایا گیا ہے۔ حالانکہ باب افتعال میں یہ نہیں ہوتا۔ ششم یہ کہ اسے باب افتعال سے ماننے کی صورت میں الف کو عین کلمہ ماننا پڑے گا۔ حالانکہ وہ موضع عین میں نہیں ہے۔

---

[1] روی عن علی مرفوعاً لکنه منکر وعن ابن مسعود موقوفاً وفی مسند ابی حنیفة الحارثی عن ابن عباس مرفوعاً و کذا عن عقبة بن عامر ومعاذ وعمرو غیر واحد من الصحابة لکن جملة الآثار لاتخلو عن ضعف اونکارة واصح مافیه قول ابن مسعود راجع النیل (۷: ۱۱۰۔۱۱۱) وبمعناه فی ابن ماجة وعن عائشة فی الترمذی موقوفاً.

[2] قارن الطبری (۱: ۳۵۶۔۳۵۷).

ہفتم یہ کہ دوحروف افْتَعَلَ کی تاء سے قبل ہیں اور اس کے بعد بھی دو ہی ہیں ۔مگر ادَّرَأْتُمْ میں تاء کے بعد تین حروف ہیں ۔

(د ر ج)

اَلـــدَّرَجَةُ: کا لفظ منزلۃ کے ہم معنیٰ ہے مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مَــنْــزِلَةٌ (اترنے کی جگہ) کو درجۃ اس وقت کہتے ہیں جب اس سے صعود یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار کیا جائے ورنہ بسیط جگہ پر امتداد کے اعتبار سے اسے درجۃ نہیں کہتے جیسا کہ چھت اور سیڑھی کے درجات ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا اطلاق منزلہ رفیعہ یعنی بلند مرتبہ پر بھی ہو جاتا ہے ۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَلِـلـرِّجَـالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (۲۔۲۲۸)

البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے ۔میں تنبیہ کی ہے کہ عقل وسیاست وغیرہ کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے جس کی طرف آیت:

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (۴۔۳۴)

مرد عورتوں کے قوام اور منتظم ہیں ۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے ۔اور اہل جنت کے متعلق فرمایا: ﴿لَهُــمْ دَرَجٰــتٌ عِـنْـدَ رَبِّهِـمْ﴾ (۸۔۴) اور ان کے لئے پروردگار کے ہاں (بڑے بڑے) درجے...... ہیں ۔

﴿هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَاللّٰهِ﴾ (۳۔۱۶۳) یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصحاب درجات ہوں گے اور تشبیہ کے طور پر ستاروں کے منازل کو دَرَجَاتُ النُّجُومِ کہا جاتا ہے ۔

مَدْرَجَةٌ: راستے کا وسط اور وسیع حصہ ۔

فُـلَانٌ يَتَدَرَّجُ فِي كَذَا: فلاں اس پر درجہ بدرجہ چڑھ رہا ہے ۔

دَرَجَ الشَّـيْـخُ وَالـصَّبِيُّ دَرَجَاناً: بوڑھے اور بچے کا اس طرح آہستہ آہستہ چلنا جیسا کہ سیڑھی پر چڑھنے والا چلتا ہے ۔

اَلـدَّرْجُ: کتاب یا کپڑے کی تہ اور لپیٹے ہوئے مراسلہ یا کپڑے کو بھی دَرج کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ دَرج بمعنیٰ موت بھی آ جاتا ہے ۔جیسا کہ طَـوَتْهُ الْمَنِيَّةُ میں طَيٌّ کا لفظ موت کے لئے مستعار ہے ۔اور محاورہ ہے ۔

مَنْ دَبَّ وَدَرَجَ: جو زندہ اور چل پھر رہا ہے اور جو مر چکا ہے اور اس نے اپنے دفتر زندگی کو لپیٹ لیا ہے ۔اور آیت کریمہ:

﴿سَـنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۷۔۱۸۲) ہم ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم نہ ہوگا ۔کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں ہم انہیں کتاب کی طرح لپیٹ لیں گے ۔

یہ ان کی بے خبری اور غفلت سے کنایہ ہے ۔جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تُـطِـعْ مَـنْ اَغْـفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸۔۲۸)

اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے......اس کا کہنا نہ ماننا ۔

بعض نے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ ہم انہیں بتدریج پکڑیں گے بایں طور کہ انہیں آہستہ آہستہ کسی چیز (جہنم) کے قریب لا رہے ہیں جیسا کہ سیڑھیوں اور منزلوں پر چڑھایا ان سے نیچے اترا جاتا ہے ۔

دَرْجٌ: چھوٹا سا تھیلا جس میں عورتیں خوشبو اور سنگار کا دیگر سامان رکھتی ہیں ۔اَلـدُّرْجَةُ: وہ لتہ جسے لپیٹ کر ناقہ کی کُس میں رکھ دیا جاتا ہے ۔

اَلدُّرَّاجُ: تیتر ۔کیونکہ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہے ۔

(د ر س)

دَرَسَ الدَّارُ: گھر کے نشان باقی رہ گئے اور نشان کا باقی رہنا چونکہ شے کے فی ذاتہٖ مٹنے کو چاہتا ہے اس لئے دُرُوسٌ کے معنیٰ اِنْمِحَاءٌ یعنی مٹ جانا کر لئے جاتے ہیں اسی طرح دَرَسْتُ الْکِتَابَ وَالْعِلْمَ کے اصل معنیٰ کتاب یا علم کو حفظ کر کے اس کا اثر لے لینے کے ہیں اور اثر کا حاصل ہونا مسلسل قرأت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے دَرَسْتُ الْکِتَابَ کے معنیٰ مسلسل پڑھنا کے آتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَدَرَسُوا مَا فِيهِ﴾ (۷۔۶۹) اور جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اس کو انہوں نے پڑھ بھی لیا ہے۔

﴿بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ (۳۔۷۹) کیونکہ تم کتاب (خدا کی) تعلیم دیتے اور اسے پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔

﴿وَمَآ اٰتَيْنَاهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا﴾ (۳۴۔۴۴) اور ہم نے نہ تو ان کو کتابیں دیں جن کو یہ پڑھتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلِيَقُوْلُوا دَرَسْتَ﴾ (۶۔۱۰۵) میں ایک قرأت دَارَسْتَ بھی ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ کافر یہ نہ کہیں کہ تم نے کتاب کو دوسروں سے پڑھ لیا۔بعض نے کہا ہے کہ: ﴿وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ﴾ (۷۔۱۶۹) کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے اس پر عمل ترک کر دیا اور یہ دَرَسَ الْقَوْمُ الْمَكَانَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔یعنی انہوں نے مکان کے نشانات مٹا دیئے۔دَرَسَتِ الْمَرْاَةُ (کنایہ) عورت کا حائضہ ہونا۔دَرَسَ الْبَعِيْرُ: اونٹ کے جسم پر خارش کے اثرات ظاہر ہونا۔

(د ر ک)

اَلدَّرْكُ اور دَرْجٌ کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔لیکن اَلدَّرْجُ کا لفظ اوپر چڑھنے کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اور اَلدَّرْكُ کا لفظ نیچے اترنے کے لحاظ سے اس لئے دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ اور دركَاتُ النَّارِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ پستی کے اعتبار سے دوزخ کو هَاوِيَة کہا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (۴۔۱۴۵) کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہوں گے۔

اور سمندر کی گہرائی کی تہہ اور اس رسی کو جس کے ساتھ پانی تک پہنچنے کے لئے دوسری رسی ملائی جاتی ہے بھی دَرْكٌ کہا جاتا ہے اور دَرْكٌ بمعنیٰ تاوان بھی آتا ہے مثلاً خرید و فروخت میں بیعانہ کو دَرْكٌ کہا جاتا ہے۔قرآن میں ہے:

﴿لَا تَخَافُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى﴾ (۲۰۔۷۷) پھر تم کو نہ تو (فرعون کے) آ پکڑنے کا خوف ہوگا اور نہ (غرق ہونے کا) ڈر۔

اَدْرَكَ: کسی چیز کی غایت کو پہنچنا، یا پالینا جیسے کہ اَدْرَكَ الصَّبِيُّ: لڑکا بچپن کی آخری حد کو پہنچ گیا یعنی بالغ ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ﴾ (۱۰۔۹۰) یہاں تک کہ اس کو غرق (کے عذاب) نے آ پکڑا۔اور آیت کریمہ:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (۶۔۱۰۳) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔کو بعض نے ادراک بصری کی نفی پر حمل کیا ہے اور بعض نے ادراک کی نفی بلحاظ بصیرت مراد لی ہے اور کہا ہے کہ اس آیت سے

اس معنیٰ پر تنبیہ کی ہے کہ جو کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول "یَامَنْ غَایَةُ مَعْرِفَتِهٖ الْقُصُوْرُ عَنْ مَّعْرِفَتِهٖ": اے وہ ذات جس کی غایت معرفت بھی اس کی معرفت سے کوتاہی کا نام ہے۔) میں پایا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی غایت یہ ہے کہ انسان کو تمام اشیاء کا کماحقہ علم حاصل ہونے کے بعد یہ یقین ہوجائے کہ ذات باری تعالیٰ نہ کسی کی جنس ہے اور نہ کسی چیز کی مثل ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کی موجد ہے۔

اَلتَّدَارُكُ: (پالینا) نہ زیادہ تر نعمت اور فریادرسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْلَآ اَنْ تَدَارَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (۶۸۔۴۹) اگر تمہارے پروردگار کی مہربانی ان کی یاوری نہ کرتی اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا﴾ (۷۔۳۸) یہاں تک کہ جب سب اس میں داخل ہوجائیں گے۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب سب کے سب اس میں ایک دوسرے کو آملیں گے۔پس اِدَّارَكُوْا اصل میں تَدَارَكُوْا ہے۔اسی طرح آیت کریمہ:﴿بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ (۲۷۔۶۶) بلکہ آخرت (کے بارے میں) ان کا علم منتہی ہوچکا ہے۔میں اِدَّارَكَ اصل میں تَدَارَكَ ہے تاء کو دال میں ادغام کرنے کے بعد ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصلی لایا گیا ہے جس طرح کہ آیات:

﴿اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (۹۔۳۸) اور ﴿اِطَّيَّرْنَا بِكَ﴾ (۲۷۔۴۷) میں ہے ایک قرأت میں بَلْ اَدْرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ہے۔حسن نے اس کے یہ معنیٰ کیے ہیں کہ وہ امور آخرت سے سراسر غافل ہیں، مگر اس کے اصل معنیٰ یہ ہیں کہ آخرت کو پالینے سے انکا علم منتہی ہو چکا ہے۔اس بنا پر وہ اس سے جاہل اور بے خبر ہیں۔بعض نے کہا ہے: اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہیں آخرت میں ان چیزوں کی حقیقت معلوم ہوجائے گی کیونکہ دنیا میں جو چیزیں محض ظنون نظر آتی ہیں آخرت میں ان کے متعلق یقین حاصل ہوجائے گا۔

(د ر ھ م)

اَلدِّرْهَمُ: چاندی کے ایک سکہ کا نام ہے اس کی جمع دَرَاهِمُ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ﴾ (۱۲۔۲۰) اور اس کو تھوڑی سی قیمت (یعنی) معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا۔

(د ر ی)

اَلدِّرَايَةُ: اس معرفت کو کہتے ہیں جو کسی قسم کے حیلہ یا تدبیر سے حاصل کی جائے اور یہ دَرَيْتُهٗ وَدَرَيْتُ بِهٖ دِرْيَةً: دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔(یعنی اس کا تعدیہ باء کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔اور باء کے بغیر بھی) جیسا کہ فَطِنْتُ وَشَعَرْتُ ہے اور اِدَّرَيْتُ بمعنیٰ دَرَيْتُ آتا ہے۔شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۱۵۲) وَمَا ذَا يَدَّرِي الشُّعَرَآءُ مِنِّيْ
وَقَدْ جَاوَزْتُ رَأْسَ الْاَرْبَعِيْنَ

اور شعراء مجھے کیسے دھوکہ دے سکتے ہیں جب کہ میں

---

[1] قاله سحيم بن نيل الرياحي وفي اللسان والمحكم (طبع) حر بدل رأس والبيت في البحترى ۲۵ والكامل ۴۵۰ وفي ترجمته في الاصابة ۲: ۱۱۰ والسمط (۵۵۸) والسيوطي ۱۵۷ والعينى (۱: ۱۹۱) والخزانة (۱: ۱۲۶) والاصمعيات ۷۳ واصلاح يعقوب ۵۶ او نقد الشعر ۷۰ وفيه تبتغى بدل يدرى ومجالس ثعلب ۱۷۶ والاشباه (۴: ۱۵۲) والبيت كانه مقيدة القافيه وفيه اقواء وبعده : اخو خمسين مجتمع اشدى ونجذني مداورة السنين ۱۲.

چالیس سے تجاوز کر چکا ہوں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لا تدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذَالِكَ اَمْرًا﴾ (۶۵۔۱۰) تجھے کیا معلوم شاید خدا اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کردے۔
﴿وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ﴾ (۲۱۔۱۱) اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لئے آزمائش ہو۔
﴿مَا كُنْتُ تَدْرِیْ مَاالْكِتَابُ﴾ (۴۲۔۵۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے۔
اورقرآن پاک میں جہاں کہیں وَمَآ اَدْرٰكَ آیا ہے وہاں بعد میں اس کا بیان بھی لایا گیا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿وَمَا اَدْرَاكَ مَا هِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ﴾ (۱۰۱۔۱۰،۱۱) اور تم کیا سمجھے کہ (ہاویہ) کیا ہے؟ (وہ) دھکتی ہوئی آگ ہے۔
﴿وَمَا اَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ﴾ (۹۷۔۲،۳) اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر۔
﴿وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْحَآقَّةُ﴾ (۶۹۔۳) اور تم کو کیا معلوم ہے کہ سچ مچ ہونے والی کیا چیز ہے؟
﴿ثُمَّ مَآ اَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ (۸۳۔۱۷) اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے۔
اورآیت کریمہ: ﴿قُلْ لَّو شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰكُمْ بِهٖ﴾ (۱۰۔۱۶) (یہ بھی) کہدو کہ اگر خدا چاہتا تو (نہ تو) میں ہی یہ (کتاب) تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ ہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔ میں اَدْرٰكُمْ دَرَيْتُ سے ہے کیونکہ اگر دَرَاْتُ سے ہوتا تو وَلَا اَدْرَاْتُكُمُوْهُ کہا جاتا ❶ اور جہاں کہیں قرآن پاک میں وَمَا يُدْرِيْكَ آیا ہے اس کے بعد اسکا بیان مذکور نہیں ہے ❷
(جیسے فرمایا): ﴿وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى﴾ (۸۰۔۳) اور تم کو کیا خبر کہ شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔ ﴿وَمَا يُدرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ﴾ (۴۲۔۱۷) اور تم کو کیا معلوم کہ شاید قیامت قریب ہی آ پہنچی ہو۔یہی وجہ ہے کہ دِرَايَةٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔اور شاعر کا قول ہے ❸

(۱۵۳) لَا هُمَّ لَا اَدْرِیْ وَاَنْتَ الدَّارِیْ

اے اللہ! میں نہیں جانتا اور تو خوب جانتا ہے۔
میں جو اَنْتَ الدَّارِیْ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوا ہے تو یہ سمجھ اور اجڈ بدو کا قول ہے (لہٰذا حجت نہیں ہوسکتا)
اَلدَّرِيَّةُ: (۱) ایک قسم کا حلقہ جس پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہے۔
(۲) وہ اونٹنی جسے شکار کو مانوس کرنیکے لئے کھڑا کردیا جاتا ہے۔اور شکاری اس کی اوٹ میں بیٹھ جاتا ہے تاکہ شکار کر سکے۔
اَلْمِدْرٰی (۱) بکری کا سینگ کیونکہ وہ اس کے ذریعہ مدافعت کرتی ہے۔اسی سے استعارۃً کنگھی یا باریک سینگ کو مِدرّی کہا جاتا ہے۔❹ جس سے عورتیں اپنے بال درست کرتی ہیں۔

---

❶ وفی الصحاح : وقری (ولاادرأکم به) والوجه فیه ترك الهمزة (ه) وفی اعراب ثلاثین همزه الحسن البصری فی بعض الایات وکذبه النحویون وکذا الاختلاف فی الدرية ـ قال ابوزید هومهموز لکن الجمهور علی ترك الهمزة .
❷ منقول عن الفراء راجع اعراب ثلاثین لابن خالویه ۴۰ .
❸ البیت فی الصحاح واللسان (وری ، لهم) وتمامه .... کل مرئی منك علی مقدار ۱۲ .
❹ وفی الحدیث ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان فی یده مدری یحك به رأسه (الفائق ۱ : ۱۹۶).

(د س ر)

اَلدُّسُرُ: میخیں اس کا واحد دِسَارٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ (۵۴۔۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کرلیا۔

اصل میں دَسْرٌ کے معنی کسی چیز کو زور سے مار کر ہٹا دینے کے ہیں۔کہا جاتا ہے: دَسَرَهٗ بِالرُّمْحِ: اسے نیزہ مار کر پیچھے ہٹا دیا اور رَجُلٌ مِطْعَنٌ کی طرح مِدْسَرٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔جس کے معنی بہت بڑے نیزہ باز کے ہیں۔ایک روایت میں ہے۔[1]

(۱۲۷) لَيْسَ فِي الْعَنْبَرِ زَكٰوةٌ اِنَّمَا هُوَ شَيْءٌ دَسَرَهُ الْبَحْرُ: کہ عنبر میں زکوۃ نہیں ہے وہ ایک چیز ہے جسے سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے۔

(د س س)

الدَّسُّ: (ن) کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں زبردستی داخل کردینے کے ہیں کہا جاتا ہے کہ دَسَسْتُهٗ فَدَسَّ: میں نے اسے ٹھونسا تو وہ ٹھس گیا۔

دُسَّ الْبَعِيرُ بِالْهِنَاءِ: اونٹ پر زبردستی قطران مل گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ قطران کے متعلق دَسٌّ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ﴾ (۱۶۔۵۹) یا زمین میں گاڑ دی۔

(د س ی)

دَسّٰی: (تفعیل) کے معنی کسی چیز کو مٹی میں چھپا دینے اور گم کر دینے کے ہیں۔یہ اصل میں دَسَّسَ تھا تخفیف کے لئے ایک سین کا یاء سے تبدیل کردیا گیا جیسا کہ تَظَنَّنْتُ سے تَظَنَّيْتُ بنا لیتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (۹۱۔۱۰) اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد اور ناکام رہا۔

(د ع ع)

اَلدَّعُّ: کے معنی سختی کے ساتھ دھکا دینے کے ہیں۔ اصل میں یہ کلمہ زجر ہے جس طرح پھسلنے والے کو (بطور دعا، لَعا کہا جاتا ہے اسی طرح دَعْ دَعْ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا﴾ (۵۲۔۱۳) جس دن وہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائیں گے۔

﴿فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ﴾ (۱۰۷۔۲) یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔شاعر نے کہا ہے:[2]

(۱۵٤) دَعَّ الْوَصِيِّ عَلٰى قَفَاءِ يَتِيْمِهٖ

جیسا کہ وصی یتیم کو گدی پر گھونسا مارتا اور اسے دھکے دیتا ہے۔

(د ع و)

اَلدُّعَاءُ: (ن) کے معنی ندا کے ہیں مگر نداء کا لفظ کبھی صرف یا، آیا وغیرہما حروف ندا پر بولا جاتا ہے۔

---

[1] الحديث موقوف على ابن عباس راجع الفائق ۱: ۱۹۷ وبحث عنه صاحب الامالى وعنه ايضًا ليس العنبر بركاز راجع البخارى مع الفتح ۸: ۱۰۵۔

[2] وفي الحديث العرق وساس من رواية ابن عمر (الفائق ۱: ۲۲)۔

اگر چہ ان کے بعد منادیٰ مذکور نہ ہو لیکن دعاء کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب حروف ندا کے ساتھ اسم (منادیٰ) بھی مذکور ہو ❶ جیسے: یَافُلَانُ ۔ کبھی یہ دونوں یعنی دعا اور ندا ایک دوسرے کی جگہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ (۲۔۱۷۱) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

اور کبھی دُعَــاء بمعنیٰ تسمیہ (نام رکھنا) آجاتا ہے جیسے دَعَوْتُ ابْنِی زَیْدًا میں نے اپنے بیٹے کا نام زید رکھا۔ اور آنحضرت کی تعلیم پر رغبت دلاتے ہوئے فرمایا: ❷

﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا﴾ (۲۴۔۶۳) مومنو! پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔

کیونکہ بعض لوگ آنحضرت ﷺ سے مخاطبت کے وقت آپ کو "یا محمد" کہہ کر پکارتے تھے۔ اور دَعَوْتُہٗ کے معنیٰ سوال یا مدد طلب کرنا بھی آتے ہیں۔ ❸ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ﴾ انہوں نے کہا (اب کے) اپنے پروردگار سے پھر درخواست کیجئے۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَةُ اَغَیْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ﴾ (۶۔۴۰،۴۱) کہو (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو تو کیا تم (ایسی حالت میں) خدا کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ اگر سچے ہو (تو بتاؤ) (نہیں) بلکہ (مصیبت کے وقت تم) اسی کو پکارتے ہو۔

میں تنبیہ کی ہے کہ جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا اور عاجزی کرتے ہو۔

﴿وَادْعُوْا رَبَّکُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا﴾ (۷۔۵۶) اور خدا سے خوف کرتے ہوئے اور امید رکھ کر دعائیں مانگتے رہنا۔

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ (۲۔۲۳) اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلالو اگر تم سچے ہو۔

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ﴾ (۳۹۔۸) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کو پکارتا (اور) اس کی طرف دل سے رجوع کرتا ہے۔

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖ﴾ (۱۰۔۱۲) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا ہوا ہمیں پکارتا ہے۔

﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ﴾ (۱۰۔۱۰۶) اور خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کو نہ پکارنا

---

❶ لم اجده ویرجیٰ۔ قارن الفتح للحافظ ۱۳۔۳۳۸۔

❷ کذاذکر الحافظ فی الفتح ۱۳۔۳۳۸۔

❸ و حملة القول ان لفظ الدعاء جاء فی القران لستة معان العبادة و لم یذکره المؤلف والایة ادعونی استجب لکم بمعنیٰ العبادة بدل مابعدها والاستغاثة والسوال والقول والنداء والثناء راجع شرح الاسماء الحسنیٰ لابی القاسم (القشیری) ۔

جونہ تمہارا بھلا کر سکے اور نہ کچھ بگاڑ سکے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُورًا كَثِيرًا﴾ (۲۵۔۱۴) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بہت سی موتوں کو پکارو۔

دعائے ثبور سے یَالَهْفَاهُ یَاحَسْرَتَاهُ وغیرہ کلمات تاسف کہنا اور واویلا کرنا مراد ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ آج تم پر ایک مصیبت نہیں ہے بلکہ بہت سے غموم ومصائب کا سامنا ہوگا۔ ❶

اَلدُّعَاءُ (اِلَى الشَّیءِ) کے معنیٰ کسی چیز کا قصد کرنے پر رغبت دلانے اور اُکسانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْ اِلَيْهِ﴾ (۱۲۔۳۳) کہ پروردگار! جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ﴾ (۱۰۔۲۵) اور اللہ تعالیٰ تو سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

﴿وَيٰقَوْمِ مَالِيْ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُوْنَنِيْ اِلَى النَّارِ o تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ﴾ (۴۰۔۴۱،۴۲) اور اے قوم میرا حال ہے کہ میں تو تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے (دوزخ کی) آگ کی طرف بلاتے ہو۔تم مجھے اس لئے بلاتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کروں اور...... اس کا شریک مقرر کروں۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا جَرَمَ اَنَّ مَا تَدْعُوْنَنِيْ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ﴾ (۴۰۔۴۳) سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کو دنیا اور آخرت میں بلانے (یعنی دعا قبول کرنے) کا مقدور نہیں ہے۔

میں دَعْوَةٌ کے معنیٰ رفعت اور عظمت کے ہیں ❷ اَلدِّعْوَةُ کے معنیٰ خاص کر نسبت کا دعویٰ کرنے کے آتے ہیں۔ اصل میں یہ قِعْدَةٌ وَجِلْسَةٌ کی طرح فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے جو حالت کے لئے آتا ہے۔مثل مشہور ہے۔

دَعْ دَاعِيَ اللَّبَنِ (مثل) یعنی دودھ اتارنے کے لئے تھوڑا سا دودھ تھنوں میں چھوڑ دے۔ ❸

اَلادِّعَاءُ کے معنیٰ کسی چیز کے متعلق دعوی کرنے کے ہیں (کہ یہ میری ہے) اور جنگ میں اِدِّعَاءَ کے معنیٰ اپنے کو کسی طرف منسوب کرنا ہوتے ہیں۔ ❹ (کہ میں فلاں قوم سے ہوں یا فلاں کا بیٹا ہوں وغیرہ) اور آیت کریمہ:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا﴾ (۴۱۔۳۱،۳۲) اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لئے (موجود ہوگی) (یہ) مہمانی ہے۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم جنت میں جو چیز طلب کرو گے حاضر کر دی جائے گی۔

---

❶ وایضاً دعا بمعنیٰ جعل کمافی قوله تعالیٰ: ان دعوا للرحمن والداً (۱۹۔۹۱).

❷ کذا نقل عن المؤلف الحافظ فی الفتح ۱۳۔۳۳۸).

❸ امر صلی اللّٰه علیه وسلم ضرار بن ازور ان یحلب ناقت فقال له (الفائق ۱: ۱۹۸ والنهایة (دعا) وغریب ابی عبید.

❹ کماقال صلی اللّٰه علیه وسلم یوم الاحد: انا ابن عبدالمطلب ومن الدعوة الدعی وجمعه ادعیاء ۳۳۔٤).

اور دَعْوٰی کبھی بمعنٰی اِدِّعَاءٌ بھی آ جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿فَمَا كَانَ دَعْوٰهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَأْسُنَآ﴾ (۷۔۵) تو جس وقت ان پر عذاب آتا تھا ان کے منہ سے یہی نکلتا تھا۔
اور کبھی بمعنٰی دعا کے [1] جیسے فرمایا:
﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱۰۔۱۰) اوران کا آخری قول یہ ہوگا کہ خدائے رب العٰلمین کی حمد اوراس کا شکر ہے۔

(د ف ء)

اَلدِّفْءُ: گرمی، حرارت یہ بَرْدٌ (سردی) کی ضد ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ﴾ (۱۶۔۵) ان میں تمہارے لئے جڑاول اور بہت سے فائدے ہیں۔
میں دِفْءٌ سے جاڑے کا سامان مراد ہے۔
رَجُلٌ دِفْاٰن: (مؤنث دِفْأٰی) گرمی حاصل کرنے والا۔
بَيْتٌ دَفِيْءٌ: گرم مکان۔

(د ف ع)

اَلدَّفْعُ: (دفع کرنا، ہٹا دینا) جب اس کا تعدیہ بذریعہ اِلٰی ہوتو اس کے معنٰی دے دینے اور حوالے کر دینا ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:
﴿فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ﴾ (۴۔۶) تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔
اور جب بذریعہ عَنْ متعدی ہوتو اس کے معنٰی مدافعت اور حمایت کرنا ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:
﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۲۔۳۸) اللہ تو مومنوں سے ان کے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔
﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ (۲۔۲۵۱) اور خدا لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے ہٹاتا نہ رہتا۔
اور آیت کریمہ:
﴿لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾ (۷۰۔۲،۳) کوئی اس کو ٹال نہ سکے گا۔ (اور وہ) خدائے صاحب درجات کی طرف سے (نازل ہوگا)۔
میں دَافِعٌ کے معنٰی حامی اور محافظ کے ہیں۔
اَلْمُدَفَّعُ: ہر جگہ سے دھتکارا ہوا۔ ذلیل اور رسوا۔
اَلدُّفْعَةُ: بارش کی بوچھاڑ۔ الدُّفَاعُ سیلاب کا زور۔

(د ف ق)

اَلدَّفْقُ: (مصدر ن) کے معنٰی سرعت کے ساتھ بہنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
﴿مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ﴾ (۸۶۔۶) (اچھل کر تیزی سے گرنے والے پانی سے۔
اسی سے بطور استعارہ جَآءُوْا دُفْقَةً (وہ یکبارگی آ گئے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور تیز رفتار اونٹ کو بَعِيْرٌ اَدْفَقُ کہتے ہیں۔
مَشَى الدِّفْقٰى: اس طرح تیز رفتاری سے چلا جیسے زور سے بہنے والا پانی اچھل کر گرتا ہے اور بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔
مَشَوْ دِفْقًا: وہ تیز چلے۔

(د ک ک)

اَلدَّكُّ: (اسم) کے معنٰی نرم اور ہموار زمین کے

---

[1] والدعوی ھھنا بمعنی القول راجع الفتح للحافظ ۱۳ : ۳۳۸.

ہیں۔اور دَکَّہٗ (ن) دَکًّا کے معنیٰ کوٹ کر ہموار کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً﴾ (۶۹۔۱۴) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھالئے جائیں گے۔ پھر ایک بارگی توڑ کر برابر کردیئے جائیں گے۔

﴿وَدُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ ❶ (۸۹۔۲۱) یعنی زمین کوٹ کوٹ کر ہموار کردی جائے گی۔

﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ (۷۔۱۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر نمودار ہوا تو (تجلی انوار ربانی نے) اس کو ریزہ ریزہ کردیا۔

اور اسی سے دُکَّانٌ ہے جس کے معنیٰ ہموار چبوترہ کے ہیں۔

اَلدَّکْدَاكُ: نرم ریت۔اَرْضٌ دَکَّآءُ: ہموار زمین ج دُکٌّ۔ اور ہموار زمین کے ساتھ تشبیہ دے کر نَاقَةٌ دَکَّآءُ اس اونٹنی کو کہہ دیتے ہیں جس کو کوہان نہ ہو۔ ❷

(د ل ل)

الدَّلَالَةُ: جس کے ذریعہ کسی چیز کی معرفت حاصل ہو، جیسے الفاظ کا معانی پر دلالت کرنا اور اشارات ورموز اور کتابت کا اپنے مفہوم پر دلالت کرنا اور حساب میں عقود کا عدد مخصوص پر دلالت کرنا وغیرہ اور پھر دلالت عام ہے کہ جاعل یعنی واضع کی وضع سے ہو یا بغیر وضع اور قصد کے ہو مثلاً ایک شخص کسی انسان میں حرکت دیکھ کر جھٹ جان لیتا ہے کہ وہ زندہ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ﴾ (۳۴۔۱۴) تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہو۔مگر گھن کے کیڑے سے۔اصل میں دَلَالَةٌ کا لفظ کِنَایَةٌ وَاَمَارَةٌ کی طرح مصدر ہے۔اور اسی سے دَالٌّ صیغہ صفت فاعل ہے یعنی وہ جس سے دلالت حاصل ہو اور دَلِیْلٌ صیغہ مبالغہ ہے، جیسے عَالِمٌ وَعَلِیْمٌ وَقَدِیْرٌ ❸ ہے کبھی دَآلٌّ وَدَلِیْلٌ بمعنیٰ دَلَالَةٌ (مصدر آجاتے ہیں) اور یہ تسمیہ الشیء بمصدرہ کے قبیل سے ہے۔

(د ل ک)

دُلُوْكُ: (الشَّمْسِ) کے معنیٰ ہیں آفتاب کا (زوال) مائل بہ غروب ہونا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ (۱۷۔۷۸) (اے محمد ﷺ!) سورج کے ڈھلنے سے...... نماز ...... پڑھا کرو۔

یہ اصل میں دَلَکْتُ الشَّمْسَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ہیں کوئی چیز دیکھنے کے لئے آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھ کر دھوپ کو دفع کرنا۔اور اسی سے دَلَکْتُ الشَّیْءَ فِی الرَّاحَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کو ہتھیلی میں لے کر ملنے کے ہیں۔دَلَکْتُ الرَّجُلَ: لیت لعل کرنا۔

اَلدَّلُوْكُ: ایک قسم کی خوشبو جسے بدن پر ملا جاتا ہے۔

اَلدَّلِیْكُ: ایک قسم کا کھانا جو مسکہ اور کھجور سے تیار ہوتا ہے۔

---

❶ وفی المطبوع الجبال مکان الارض خطأ مطبعی ۱۲.

❷ قارن المجاز لابی عبیدہ (۱:۴۱۵).

❸ وفی التنزیل ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلا (۲۵:۴۵).

(د ل و)

دَلَوْتُ الدَّلْوَ: کے معنیٰ کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں اور اَدْلَیْتُھَا کے معنیٰ ڈول بھر کر نکالنے کے۔ ابومنصور نے لکھا ہے کہ اَدْلیٰ کے معنیٰ ڈول کنویں میں ڈالنے کے آجاتے ہیں قرآن پاک میں ہے:❶

﴿فَاَدْلٰی دَلْوَہٗ﴾ (۱۲۔۱۹) اس نے کنویں میں ڈول لٹکایا۔اسی سے بطور استعارۃ اَدْلٰی کے معنیٰ کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی آجاتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔❷

(۱۵۵) وَلَیسَ الرِّزْقُ عَنْ طَلَبِ حَثِیْثٍ
وَلٰکِنْ اَلْقِ دَلْوَکَ فِی الدِّلَاءِ

رزق جدوجہد سے حاصل نہیں ہوتا ہاں تمہیں اس کے لئے وسائل تلاش کرنا چاہیے۔اس بنا پر وسیلہ کو مَائِحٌ کہا جاتا ہے۔شاعر نے کہا:❸

(۱۵۶) وَلِیَ مَائِحٌ لَمْ یُوْرِدِ النَّاسُ قَبْلَہٗ
مُعَلًّی وَاَشْطَانُ الطَّوِیِّ کَثِیْرٌ

میرے پاس اظہار مطلب کے لئے ایسا بلند قدر وسیلہ ہے جو اچھوتے مضامین بیان کرتا ہے۔اور گفتگو کے اسباب بہت ہیں اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتُدْلُوْا بِھَآ اِلَی الْحُکَّامِ﴾ (۲۔۱۸۸) اور نہ ان اموال کے ذریعہ (رشوت دے کر) حکام تک رسائی حاصل کرو۔

اِتَّدَلّٰی (تفعل) قریب ہونا۔اور اترانا قرآن میں ہے:

﴿ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی﴾ (۵۳۔۸) پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔

(د م دم)

اَلدَّمْدَمَۃُ: (فعللۃ) ہلاک کرنا۔اور آیت:

﴿فَدَمْدَمَ عَلَیْھِمْ رَبُّھُمْ﴾ (۹۱۔۱۴) کے معنیٰ یہ ہیں کہ خدا نے انہیں ہلاک کر ڈالا اور پریشان و بے چین کر دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ دَمْدَمَۃٌ (اسم صوت ہے اور) بلی کی آواز کی حکایت کو کہتے ہیں۔اسی سے دَمْدَمَ فُلَانٌ فِی کَلَامِہٖ کا محاورہ ہے یعنی اس نے پریشان کن سی گفتگو کی۔دَمَمْتُ الثَّوبَ کپڑے کو رنگ سے طلا کرنا۔

اَلدِّمَامُ: ہر چیز جس سے طلا کی جائے۔

بَعِیْرٌ مَدْمُوْمٌ بِالشَّحْمِ۔ بہت موٹا اور چربی والا اونٹ گویا چربی اس پر طلائی کی گئی ہے۔

اَلدِّمَّاءُ وَالدُّمَمَۃُ: جنگلی چوہے کا بل۔

اَلدَّمَّاءُ (بتخفیف میم) وَالدَّیْمُوْمَۃُ صحراء،ریگستان۔

---

❶ راجع تاج المصادر لابی جعفر البیھقی۔

❷ البیت فی محاضرات المولف ۲: ۴۹۲ وفی روایۃ: وما طلب المعیشۃ بالتمنی .... ومجموعۃ المعانی ۷۳ او المیدانی رقم ۳۳۲۰ مع آخر ولم ارفی المراجع من نسبہ۔

❸ قال العجب السلولی وعنیٰ بالمائح لسانہ وفی اللسان (میح) الماء بدل الناس ویعلیٰ بدل معلیٰ والدلاء بدل الطوی والبیت فی المحکم (میح) ومجالس ثعلب ۵۲۴۔۵۲۳ فی تسعۃ والازمنہ والامکنۃ (۲: ۱۵۹) وھی قصیدۃ فی ۱۱ بیتاً انشدھا الشاعر بین یدی عبدالملک بن مروان والعجیر ھو عمیر بن عبداللہ بن عبیدۃ شاعر مقل وکان خبیثاً راجع الاغانی (۱۱: ۱۴۶۔۱۵۳) والخزانۃ (۲: ۳۹۹) وابن سلام (۱۹۹۔۲۰۰)۔

(د م ر)

اَلتَّدْمِیْرُ: (تفعیل) کے معنی ہیں کسی چیز پر ہلاکت لا ڈالنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَدَمَّرْنَاھُمْ تَدْمِیْرًا﴾ (۱۷۔۱۶) اور ہم نے انہیں ہلاک کر ڈالا۔

﴿ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۷۲) پھر ہم نے اوروں کو ہلاک کر دیا۔

﴿وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُہٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ﴾ (۷۔۱۳۷) اور فرعون اور قوم فرعون جو (محل بناتے اور انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿دَمَّرَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ﴾ (۴۷۔۱۰) خدا نے ان پر تباہی ڈال دی۔

میں دَمَّرَ کا مفعول محذوف ہے۔

محاورہ ہے: مَا بِالدَّارِ تَدْمُرِیٌّ: یعنی گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔

(د م ع)

دَمَعَتِ (ف) الْعَیْنُ دَمْعًا وَّ وَدَمْعَانًا: آنسو جاری ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَوَلَّوْا وَّ اَعْیُنُھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا﴾ (۹۔۹۲) تو وہ لوٹ گئے۔ اور اس غم سے .... ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ الدمع اسم بھی آتا ہے جس کے معنی ہیں آنسو اور (باب مذکور کا) مصدر بھی۔

(د م غ)

اَلدَّمْغُ: (ف) کے اصل معنی دماغ پھوڑ دینے کے ہیں (اس سے نیست و نابود کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُہٗ﴾ (۲۱۔۱۸) (نہیں) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا مغز توڑ دیتا ہے۔

حُجَّۃٌ دَامِغَۃٌ: حجت قاطع، سر پھوڑ دلیل۔ نیز دَامِغَۃٌ ایک قسم کے شگوفہ کو کہتے ہیں جو کھجور کے تنا سے پھوٹ نکلتا ہے۔ اگر اسے کاٹا نہ جائے تو کھجور کے درخت کو خشک اور خراب کر دیتا ہے۔ نیز دامِغۃٌ اس لوہے کو بھی کہتے ہیں جو پالان کی لکڑی کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے۔

یہ تمام الفاظ دَمْغٌ سے بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں۔ جس کے معنی دماغ کو توڑنا کے ہیں۔

(د م ی)

اَلدَّمُ: خون۔ یہ اصل میں دَمَیٌ تھا (یاء کو برائے تخفیف حذف کر دیا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ وَالدَّمُ﴾ (۵۔۳) تم پر مردار جانور اور (بہتا) ہوا لہو .... یہ سب حرام ہے۔

دَمٌ کی جمع دِمَآءٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ﴾ (۲۔۱۴۰) کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا۔

دَمِیَتِ (س) الْجِرَاحَۃُ: زخم سے خون بہنا۔

فَرَسٌ مُدْمِیٌ: خون کی طرح نہایت سرخ رنگ کا گھوڑا۔

اَلدُّمْیَۃُ: گڑیا (جو خون کی مانند سرخ اور منقوش ہو)

شَجَّۃٌ دَامِیَۃٌ: سر کا زخم جس سے خون بہہ رہا ہو۔

(د ن ر)

اَلدِّیْنَارُ: (اشرفی) اصل میں دِنَّارٌ تھا۔ ایک نون

گویا سے تبدیل کیا گیا ہے (واجمع ودنانیر) بعض نے کہا ہے کہ یہ فارسی لفظ دین آر سے معرب ہے یعنی وہ جسے شریعت لے آئی ہو۔ ❶ قرآن میں ہے۔

مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ (۳-۷۵) کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو۔

(د ن و)

اَلدُّنُوُّ(ن) کے معنی قریب ہونے کے ہیں اور یہ قریب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی، اور قرب بلحاظ مرتبہ سب کو شامل ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ﴾ (۶۔۹۹) اور کھجور کے گابھے میں سے قریب جھکے ہوئے خوشے کو۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى﴾ (۵۳۔۸) پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔

میں قرب حکمی مراد ہے اور لفظ ادنیٰ کبھی بمعنی اَصْغَرَ (آتا ہے) اس صورت میں اَکْبَر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا ❷:

﴿وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ﴾ (۵۸۔۷) اور نہ اس کے کم نہ زیادہ۔

اور کبھی اَدنیٰ بمعنی اَرْذَلُ استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ خیر کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ﴾ (۲۔۶۱) بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو۔

اور کبھی بمعنی اول (نشأۃ اولی) استعمال ہوتا ہے۔

اور الآخر۔(نشأۃ ثانیہ) کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ (۲۲۔۱۱) اس نے دنیا میں بھی نقصان اُٹھایا اور آخرت میں بھی۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (۱۶۔۱۲۲) اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔

اور کبھی اَدنیٰ بمعنی اقرب آتا ہے اور اقصیٰ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى﴾ (۸۔۴۲) (جس وقت تم (مدینے کے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔

اَلدُّنْيَا کی جمع الدُّنیٰ آتی ہے جیسے اَلْكُبْرٰى کی جمع اَلْكُبَرُ والصُّغْرٰى کی جمع اَلصُّغَرُ۔

اور آیت کریمہ:

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ﴾ (۵۔۱۰۸) اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح صحیح شہادت ادا کریں۔

میں اَدنی بمعنی اَقْرَبُ ہے یعنی یہ اَقْرَبُ ہے کہ شہادت ادا کرنے میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھیں۔

اور آیت کریمہ:

---

❶ المعرب للجواليقي وراجع الاتقان (۱: ۱۳۹.)

❷ والصواب في التمثيل ولنذيقنهم من العذاب الادنىٰ دون العذاب الاكبر (۳۲-۲۱.)

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ﴾ (۳۳-۵۱) یہ (اجازت) اس لئے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔ بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۲-۲۱۹، ۲۲۰) تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں (غور کرو)۔

دنیا اور آخرت کے تمام احوال کو شامل ہے کہا جاتا ہے۔

اَدْنَيْتُ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ وَاَدْنَيْتُ اَحَدَهُمَا مِنَ الْآخَرِ: یعنی دو چیزوں کو باہم قریب کرنا۔ یا ایک چیز کو دوسری کے قریب کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ (۳۳-۵۹) کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنی چادریں اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔

اَدْنَتِ الْفَرَسُ: گھوڑی کے وضع حمل کا وقت قریب آ پہنچا۔

اَلدَّنِيُّ: خاص کر حقیر اور رذیل آدمی کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ سَيِّءٌ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔

هُوَ دَنِيٌّ یعنی نہایت رذیل ہے۔ اور جو مروی ہے [1]

(۱۲۸) اِذَا اَكَلْتُمْ فَدَنُّوا تو یہ دُوْنَ سے ہے یعنی جب کھانا کھاؤ تو اپنے سامنے سے کھاؤ۔

(د ھ ر)

اَلدَّهْرُ: (زمانہ) اصل میں مدتِ عالم کو کہتے ہیں یعنی ابتداء آفرینش سے لے کر اس کے اختتام تک کا عرصہ۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ (۷۶-۱) بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے۔

میں اَلدَّهْرُ سے یہی معنیٰ مراد ہیں پھر (مجازاً) اس سے ہر طویل مدّت مراد لی جاتی ہے۔ برخلاف لفظ ''زمان'' کے کہ یہ مدت قلیلہ اور کثیرہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور دَهْرُ فُلَانٌ کے معنیٰ اس کی مدت حیاۃ کے ہیں اور جو عادت زندگی بھر باقی رہے اس پر بھی استعارۃً دَهْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: مَا دَهْرِيْ بِكَذَا: میں اس کا عادی نہیں ہوں۔ اور خلیل نے حکایت کی ہے: دَهَرَ فُلَاناً نَائِبَةٌ دَهْراً: (یعنی فلاں پر مصیبت نازل ہوگئی) تو یہاں دَهْر کا لفظ مصدر ہے اور بعض نے دَهْرٌ دَاهِرٌ وَدَهِيْرٌ: زمانہ بے انتہا وقت ایک حدیث میں ہے۔ [2]

(۱۲۹) لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔ (کہ زمانہ کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے) بعض نے اللہ تعالیٰ کے دَهْر ہونے کے یہ معنیٰ بیان کیے ہیں کہ جو خیر و شر اور خوشی اور ناخوشی زمانہ کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کا فاعل حقیقی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے لہٰذا جب تم زمانہ کو برا بھلا کہو گے جو تمہارے اعتقاد کے مطابق فاعل ہے۔ تو

---

[1] وفي النهاية (دنا) سَمُّوا الله وَدَنُّوا او سمتوا قال وهو فَعِّلُوا من دَنَا يَدْنُوا ومعناه كلوا ممايليكم ومابين يديكم.

[2] اخرجه البخارى واللسان (دهر) والفائق (۱: ۳۱۵) وانظر لتاويل الحديث امالى المرتضىٰ (۱: ۴۵-۴۶) وابن كثير (۴: ۱۵۱) والطبرى (۲۵: ۱۵۲) بسياق غريب جداً الحديث باختلاف الفاظه فى (م، حم م ق) (وابن عساكر فى معجمه وابن النجار كلهم عن ابى هريرة) راجع كنزالعمال (۳: ۳۴۵) ۱۲.

گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کو گالیاں دے رہے ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حدیث میں دَھر ثانی دَھر اول کا غیر ہے اور یہ مصدر بمعنیٰ فاعل ہے یعنی فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الدَّھْرُ اور معنیٰ یہ ہیں کہ ہر قسم کا تصرف وتدبیر اور جو کچھ رونما ہوتا ہے اس کا فیضان اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے مگر معنیٰ اول اظہر وانسب ہے۔ اور قرآن پاک نے مشرکین عرب کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيٰ وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (۴۵۔۲۴) کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور یہ صرف زمانہ ہی ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔

اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں دَھْرٌ سے مراد زمانہ ہی ہے۔

(د ھ ق)

اَلدَّھْقُ (ف) کے معنیٰ لبالب بھرنے اور چھلکنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَأْسًا دِهَاقًا﴾ (۷۸۔۳۴) اور لبالب اور چھلکتا ہوا پیالہ۔

محاورہ ہے:

اَدْھَقْتُ الْکَأْسَ فَدَھَقَ (میں نے پیالہ بھرا تو وہ بھر گیا) دَھَقَ لِیْ مِنَ الْمَالِ دَھْقَۃً (اس نے مجھے بہت مال دیا) جیسا کہ قَبَضَ لِیْ قَبْضَۃً کا محاورہ ہے۔

(د ھ م)

اَلدُّھْمَۃُ: کے اصل معنیٰ تورات کی سیاہی کے ہیں اور یہ لفظ گھوڑے کی سیاہی پر بولا جاتا ہے کبھی اس سے نہایت گہرا سبز رنگ مراد ہوتا ہے جیسا کہ ہلکے سیاہ رنگ کو خُضْرَۃٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں قسم کی رنگت قریباً ملتی جلتی سی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مُدْهَامَّتَانِ﴾ (۵۵۔۶۴) دونوں خوب گہرے سبز۔ یہ اِدھامَّ اِدھِیماماً سے مُفعَالٌّ کے وزن پر ہے۔ کسی شاعر نے رات کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔ [1] (البسیط)

(۱۳۶) فِي ظِلِّ اَخْضَرَ يَدْعُوهَا مَهُ الْيَوْمُ

یعنی تاریک رات جس میں کہ بوم اپنے ہام کو بلا رہا ہوتا ہے۔

(د ھ ن)

اَلدُّھْنُ: تیل، چکناہٹ، ج اَدْھَان قرآن پاک میں ہے:

﴿تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ﴾ (۲۳۔۲۰) جو روغن ...... لئے ہوئے اگتا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ (۵۵۔۳۷) پھر ...... تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ دِھان کے معنیٰ تلچھٹ کے ہیں۔

اَلْمُدْھُنُ: ہر وہ برتن جس میں تیل ڈالا جاتا ہے۔ یہ اسم آلہ کے منجملہ ان اوزان کے ہے جو (بطورِ شاذ) مُفعُلٌ کے وزن پر آتے ہیں اور بطور تشبیہ (پہاڑ میں) اس مقام (چھوٹے سے گڑھے) کو بھی مُدْھَنٌ کہا جاتا ہے۔ جہاں تھوڑا سا پانی ٹھہر جاتا ہو اور دُھْنٌ سے بطور استعارہ کم دودھ والی اونٹنی کو دَھِیْنٌ کہا جاتا ہے اور یہ فعیل بمعنیٰ فاعل کے وزن پر ہے یعنی وہ بقدر دہن کے

---

[1] قاله ذوالرمة والبيت في اللسان (عسف، هوم) وقد مرتخريجه في (خضر) .

دودھ دیتی ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ فَعِیلٌ بمعنیٰ مفعول ہے۔گویا اسے دودھ کا دُھن لگایا گیا ہے۔یہ بھی دودھ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے یہ دوسرا قول اقرب الی الصحۃ معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ اس کے آخر میں "ۃ" تانیث نہیں آتی۔(جو فعیل بمعنیٰ مفعول ہونے کی دلیل ہے)

دَھَنَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ: بارش نے زمین کو ہلکا سا نم کردیا جیسا کہ سر پر تیل ملا جاتا ہے۔

دَھَنَہٗ بِالْعَصَا (کنایۃ) لاٹھی سے اس کی تواضع کی۔یہ بطور تہکم کے بولا جاتا ہے۔جیسا کہ مَسَحْتُہٗ بِالسَّیْفِ وَحَیَّیْتُہٗ بِالرُّمْحِ: کا محاورہ ہے۔لیکن یہ تصنع، نرمی برتنے اور حقیقت کا دامن ترک کردینے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ تَقْرِیْدٌ کا لفظ جس کے اصل معنیٰ اونٹ سے چیچڑ دور کرنا کے ہیں پھر تصنع اور نرمی برتنا کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَفَبِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْھِنُوْنَ﴾ (۵۶-۸۱) کیا تم اسی کتاب سے انکار کرتے ہو؟

شاعر نے کہا ہے [1] (السریع)

(۱۵۷) اَلْحَزْمُ وَالْقُوَّۃُ خَیْرٌ مِنَ
الدِّھَانِ وَالْقِلَّۃِ وَالْھَاعِ

کہ حزم واحتیاط اور قوت چاپلوسی اور جزع فزع سے بہتر ہیں۔

دَاھَنْتُ فُلَانًا مُدَاھَنَۃً: میں نے فلاں کے سامنے چاپلوسی کی۔قرآن میں ہے:

﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْھِنُ فَیُدْھِنُوْنَ﴾ (۶۸-۹) کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم مداہنت سے کام لو یہ بھی نرم ہو جائیں۔

(د و د)

دَاوٗد (داؤد علیہ السلام) یہ عجمی نام ہے (اور عجمہ وعلمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے)۔

(د و ر)

اَلدَّارُ: منزل، مکان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ چار دیواری سے گھرا ہوتا ہے۔بعض نے دَارَۃٌ بھی کہا ہے۔اس کی جمع دِیَارٌ ہے۔پھر دار کا لفظ شہر، علاقہ بلکہ سارے جہاں پر بولا جاتا ہے اور اَلدَّارُ الدُّنْیَا اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَۃ سے نشأۃ اولیٰ اور نشأۃ ثانیہ میں دو قرار گاہوں کی طرف اشارہ ہے۔بعض نے دَارُ الدُّنْیَا وَدَارُ الْاٰخِرَۃِ (باضیافت) بھی کہا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَھُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّھِمْ﴾ (۶-۱۲۷) ان کے لئے ان کے اعمال کے صلے میں پروردگار کے ہاں سلامتی

---

[1] قالہ ابو قیس بن الاسلت الانصاری وفی روایۃ الاکثر: الکیس والقوۃ خیر من ال: اشفاق والفھۃ والھاع۔ والبیت من کلمۃ مفضلیۃ ۲۳۵فی ۲۴ بیتاً وفی روایتہ الفکۃ بدل القلۃ وفی روایۃ احمد بن عبید الفھۃ کمافی اللسان (فلك) ومعناہ الضعف والھاع سوء الحرص مع الضعف والبیت فی الحیوان (۳: ۴۶) والبیان (۱: ۲۰۴) والامالی (۲: ۲۱۲) والسمط (۷۳۷) والبحر (۸: ۲۰۸) وابدال ابی الطیب (۲: ۳۷۵) وفی العمدۃ (۲: ۱۸) اثناء الامثلۃ مماعیب فی المقابلۃ وابو القیس اختلف فی اسمہ ذکرہ الحافظ فی الاصابۃ والراجح صیفی بن الاسلت وکان الدوس اسندامرھا الیہ فی الحروب الاخیرۃ بین الدوس والخزرج فکفی وساد حتیٰ شحب وتغیر ولبث اشھراً لایقرب من امرئتہٖ ثم انہ جاء لیلۃ فدق علی امرئتہٖ ففتحت لہ فاھویٰ الیھا بیدہ فدفعتہ وانکرتہ فقال انا ابو قیس فقالت واللہ عرفتك حتیٰ تکلمت فقال فی ذالك القصیدۃ مطلعھا قالت ولم تقصد لقیل الخناء مھلاً فقد ابلغت اسماعی۔وفیھا الشاھد واختلف فی اسلامہ راجع الاصابۃ (۴: ۱۵۸-۵: ۲۵۷/۴: ۲۵۲) والاغانی (۱۵: ۱۵۴) واسدالغابۃ (۱: ۱۸۴) والخزانۃ (۳: ۳۷۵-۳۷۸.)

کا گھر ہے۔

یہاں دارالسلام سے جنت مراد ہے اور ﴿دَارُ الْبَوَارِ﴾ (۱۴۔۲۸) ہلاکت کا گڑھا سے جہنم۔ نیز فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ (۲۔۹۴) کہہ دو کہ اگر آخرت کا گھر...... تمہارے لئے ہی مخصوص ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ (۲۔۲۴۳) بھلاتم نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جو ...... اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے۔

﴿وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا﴾ (۲۔۲۴۶) جب کہ ہم وطن...... سے خارج کردیئے گئے ہیں۔

﴿سَاُرِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (۷۔۱۴۵) میں عنقریب تم کونافرمان لوگوں کا گھر دکھاؤں گا۔

کہا جاتا ہے مَابِهَا دَيَّارٌ یعنی یہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ دَارٌ سے فَيْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ کیونکہ اگر فَعَّالٌ کے وزن پر ہوتا تو دَيَّارٌ کی بجائے دَوَّارٌ کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ (قول سے) قَوَّالٌ اور (جور سے) جوَّارٌ ہے۔

اَلدَّائِرَة: خط محیط (سرکل) کو کہتے ہیں یہ دَارَ يَدُوْرُ دَوْرَانًا سے ہے جس کے معنیٰ چکر لگانا کے ہیں پھر مصیبت گردش زمانہ کو بھی دائرۃ (یادارۃ) کہہ دیا جاتا ہے اسی مناسبت سے زمانہ کو...... اَلدَّوَّارِيُّ کہتے ہیں کیونکہ اس کی گردشیں بھی انسان پر گھومتی رہتی ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1] (الرجز)

(۱۵۸) وَالدَّهْرُ بِالْاِنْسَانِ دَوَّارِيٌّ

کہ زمانہ انسان کو گھما رہا ہے۔

اور الدورۃ والدائرۃ کا لفظ مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو محبوب چیز گھوم کر آئے اسے دَوْلَة کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ﴾ (۵۔۵۲) ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر زمانے کی گردش نہ آجائے دَآئِرَة کی جمع دَوَآئِرُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ﴾ (۹۔۹۸) کہ وہ تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں انہی پر بری مصیبت واقع ہو یعنی تباہی اور بربادی انہیں ہر طرف سے اس طرح گھیر لے جیسا کہ کوئی شخص دائرہ کے اندر ہوتا ہے۔ اور ان کے لئے اس بربادی سے نکلنے کی صورت باقی نہ رہے۔

اَلدَّوَّارُ: ایک بت کا نام ہے جس کے گرداگرد لوگ طواف کیا کرتے تھے۔

اَلدَّارِيْ: یہ الدار کی طرف منسوب [2] ہے مگر عطار (عطر

---

[1] بیت من مشطورة الرجز للعجاج فی وصف الدهر وبعده : افنی القرون وهو قعسری وقبله : أطَرَباً وانتَ قِنَّسْرى والرجز فی اللسان (قعسردور) والصحاح (دور) وتفسیرالطبری (۱۹ : ۱٤) واراجیز العرب للسید توفیق البکری ۱۷٤ ومجموع اشعار العرب ۲ : ٦٦) والخزانة ۳ : ۵۱۱) وابن هشام (۱ : ۱۲) رقم ۱۲ وثلاثین ۱۹ والسیوطی ۱۸ والمزروقی ٤ : ۸۱۸ والمحکم (قعسر)۱۲.

[2] ذکر علماء اللغة والغریب قولین فی هذه النسبة الاول نسبة الی الدار وهی عَلَمٌ لموضع بین البصرة والبحرین کمافی الیاقوت (رسم : الدار) وذکره ابن دریدفی الملاحم وقال : الدار موضع بالبحرین معروف والیه ینسب الداری العطار والثانی انه نسبة الی فرضة البحرین یقال لها دارین : قال الیاقوت : والنسبة الیها داری والیه ذهب ابن الاثیر فی النهایة (دار) والجوهری فی الصحاح (دار) وفی البلدان هی بلدة فتحت فی ایام ابی بکر رضی الله عنه سنة ۱۲ وکان علی الغزاة العلاء بن الحضرمی وفیه یقول الفرزدق کان تریکة من ماء مزن۔ وداری الذکی من المدام راجع البلدان (ارسم : دارین)۱۲.

فروش) کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے ❷ جیسا کہ اَلْهَالِكِيُّ کالفظ قَیْــن یعنی لوہار پر خاص کر بولا جاتا ہے۔حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۲۹) مَثَلُ الْجلِيْسِ الصَّالِحِ كَمَثَلِ الدَّارِيِّ کہ نیک صحبتی کی مثال عطار کی سی ہے۔

اور جو شخص گھر کے اندر ہی جم کر بیٹھا رہے اور باہر نہ نکلے اسے بھی دَارِیٌّ کہا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ﴾ (۲۔۲۸۲) ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔

یعنی نقد اور ہاتھوں ہاتھ لین دین ہو اور اس میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔

(د و ل)

اَلدَّوْلَةُ وَالدُّوْلَةُ: دونوں کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔ یعنی گردش کرنا۔بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ کا لفظ مال وزر کے گھومنے پر بولا جاتا ہے اور دُولَةٌ لڑائی اور عزت وجاہ کے ادلنے بدلنے پر۔بعض نے ان دونوں میں یہ فرق کیا ہے کہ دَولَةٌ اسم ہے اور اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ لین دین کیا جائے اور دُولَةٌ (بضم الدال) مصدر ہے یعنی لین دین کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿كَيْلَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں یہ پھرتا رہے۔

تَدَاوَلَ الْقَوْمُ كَذَا: کسی چیز کو دولت کی طرح باری باری لینا۔

دَاوَلَ اللّٰهُ كَذَا بَيْنَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان اسے گھمایا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (۳۔۱۴۰) اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

اَلدُّؤْلُوْلُ: بڑی مصیبت۔ج اَلدَّأٰلِيْلُ وَالدُّؤْلَاءُ۔

(د و م)

اَلدَّوَامُ: اصل میں دوام کے معنیٰ سکون کے ہیں کہا جاتا ہے۔دَامَ الْمَآءُ (پانی ٹھہر گیا) اور (حدیث میں ❷

(۱۳۰) اَلْمَآءُ الدَّآئِمُ: یعنی کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اَدَمْتُ الْقِدْرَ وَدَوَّمْتُهَا: تھوڑا سا پانی ڈال کر ہانڈی کو ٹھنڈا کر دیا۔اسی سے دَامَ الشَّیْءُ کا محاورہ ہے یعنی وہ چیز جو عرصہ دراز تک رہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ﴾ (۵۔۱۱۷)

---

❶ وتتمة الحديث ذكره المولف في الاخوانيات من محاضراته (۳: ٦) والزمخشري في الفائق (۱: ۲۰٦) والنهاية (دار) راجع للحديث (د،ك عن انس) ودع والرامهرمزي، د، حب، في روضة العقلاء عن شبل عن انس وابن حبان والرامهرمزي ايضاً عن ابي موسىٰ ولفظ الاكثر مثل العطار لان اصحاب الغريب ذكروالفظ الداري بدل العطار راجع للمراجع كنزالعمال ۹، ۵، ۵ والفتح للنبهاني ۳: ۱۲۸ ومجمع البحار (۱: ۴۵۲)۱۲۔

❷ ولفظة الحديث ولايبولن احدكم في الماء الدائم راجع تخريجه في كنزالعمال ۹: ۱۷۷۲۔۱۷۸٦ وفي كتب الغريب النهاية (دوم) والفائق ۱: ۲۰۵)۔

اور جب تک میں ان میں رہا ان (کے حالات) کی خبر رکھتا رہا۔

﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآئِمًا﴾ (۳-۷۵) جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو۔

﴿لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا﴾ (۵-۲۴) جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جا سکتے۔

اور یہ باب دِمْتَ تَدَامُ سے آتا ہے اور بعض نے دُمْتَ تَدُوْمُ کہا ہے جیسے مُتَّ تَمُوْتُ دَوَّمَتِ الشَّمْسُ فِی کَبِدِ السَّمَآءِ: وسط آسمان میں سورج ٹھہر گیا۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۱۵۹) وَالشَّمْسُ حَیریٰ لَهَا فِی الْجَوِّ تَدْوِیْمُ:

سورج حیران پریشان ہو کر فضا میں ٹھہرا ہوا ہے۔

دَوَّمَ الطَّیْرُ فِی الْهَوَاءِ پرند فضا میں منڈلایا۔

اِسْتَدَمْتُ الْاَمْرَ: میں نے اس پر دیر تک غور و فکر کیا۔

اَلظِّلُّ الدُّوْمُ: (دَائِمٌ) ہمیشہ رہنے والا سایہ۔

اَلدِّیْمَةُ: بارش جو لگاتار کئی روز تک برستی رہے۔

(د و ن)

اَلدُّوْنَ: جو کسی چیز سے قاصر اور کوتاہ ہو وہ "دون" کہلاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دُنُوٌّ کا مقلوب ہے اور اَلْاَدْوَنُ بمعنی دَنِیءٌ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَاتَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُوْنِکُمْ﴾ (۳-۱۱۸) کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان لوگوں کو راز دار مت بناؤ جو دیانت میں تمہارے ہم مرتبہ (یعنی مسلمان) نہیں ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جو قرابت میں تم سے نیچے ہیں۔ یعنی تمہارا ان سے تعلق نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَالِكَ﴾ (۴-۴۰) اور اس کے سوا اور گناہ.........معاف کر دے۔

میں مَادُوْنَ سے وہ گناہ مراد ہیں جو شرک سے کم درجہ کے ہیں یا وہ جو شرک کے علاوہ ہیں۔ اور یہ دونوں معنیٰ ایک دوسرے کے لازم ملزوم ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِی وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۵-۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو۔ میں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے معنیٰ غَیْرُ اللّٰهِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہم دونوں کو معبود بنا لو۔ بعض نے یہ معنیٰ کیے ہیں کہ دو معبود جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا جائے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیعٌ﴾ (۶-۱۵) اس کے سوا نہ تو ان کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا۔ اور نیز آیت:

﴿وَمَالَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ﴾ (۲-۱۰۷) اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ حکم الٰہی کے بغیر کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی مدد کر سکے اور یہی معنیٰ آیت کریمہ: ﴿قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا﴾ (۶-۷۱) کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکے نہ برا۔

---

[1] قاله ذو الرمة فی میمیته یصف جندباً الذی یصیح فی حر الشمس واوله: معروریاً رمض الرضراض یرکضه ـ والبیت فی اللسان (دوم) والاقتضاب ۱۵۹ والبحر (۲: ۴۹۸) والمحاضرات للمولف ۵۴۹ والمعانی الکبیر ۶۱۱ دیوانه ۵۷۸ ابو الطیب فی اضداده (۲۶۷).

میں مراد ہیں کہ دُوْنَ میں ایک لغت دَوْن (بفتح الدال) بھی ہے کہا جاتا ہے کہ دَوْنَكَ كَذَا: یعنی یہ پکڑلو۔قتیبی نے کہا ہے کہ دَانَ یَدُوْنُ دَوْنًا کے معنیٰ کمزور ہونے کے ہیں۔ ❶

(د ی ن)

دِنْتُ الرَّجُلَ کے معنیٰ قرض لینے اور اَدَنْتُهٗ کے معنیٰ ہیں کہ میں نے اُسے دائن بنادیا یعنی قرض دیا۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ دِنْتُهٗ کے معنیٰ اَقْرَضْتُهٗ یعنی قرض دینا کے ہیں۔اور مقروض کو مَدِيْنٌ وَمَدْيُوْنٌ کہا جاتا ہے دِنْتُهٗ کے معنیٰ قرض لینا بھی آتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۱۶۰) نَدِيْنُ وَيَقْضِى اللّٰهُ عَنَّا وَقَدْ نَرٰى
مَصَارِعَ قَوْمٍ لَّا يَدِيْنُوْنَ ضُيَّعًا

ہم قرض لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہم سے اس قرض کو ادا کردیتا ہے اور جو لوگ قرض نہیں لیتے ان کی قبریں ضائع ہونے والی دیکھتے ہیں اور اَدَنْتُ دِنْتُ کی طرح ہے یعنی اس کے معنیٰ قرض لینا کے ہیں اور اَدَنْتُ کے معنیٰ قرض دینا بھی ہیں۔

اَلتَّدَايُنُ وَالْمُدَايَنَةُ: قرض کا معاملہ کرنا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ (۴۔۱۲) (یہ حصے بھی) بعد ادائے وصیت وقرض۔

اَلدِّيْنُ کے معنیٰ طاعت اور جزا کے آتے ہیں اور بطور استعارہ دین بمعنیٰ شریعت بھی آتا ہے۔اور دین ملّت کی طرح ہے لیکن شریعت کی طاعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے اسے دین کہا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (۳۔۱۹) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (۴۔۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے۔

﴿وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ﴾ (۴۔۱۴۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہوگئے۔اور آیت کریمہ:

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ﴾ (۵۔۷۷) اے اہل کتاب! اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ کرو۔

میں آنحضرت کے دین یعنی اسلام کی اتباع پر ترغیب پائی جاتی ہے جو تمام ادیان سے معتدل دین ہے اور افراط وتفریط سے پاک ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (۲۔۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ﴾ (۲۔۲۵۶) دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔

میں بعض نے دین کے معنیٰ طاعت کیے ہیں۔ کیونکہ طاعت حقیقت میں وہی ہے جو مبنی بر اخلاص ہو اور

---

❶ قال فی الصحاح ولا یشتق منه فعل وبعضهم یقول منه: دان یدون دونًا راجع ایضاً اللسان (دون).

❷ وفی اللسان ضُيّع بالخفض على الصفة للقوم والبيت للعجير السلولی (قبله): فعد صاحب اللحام سيفاتبيعه۔وزدد رهمًا فوق المغالين واخنع۔ والبيت فی الصحاح (دين) وفی روايته ايضاً ضَيَّعًا وقال ابن برى: صوابه ضيع بالخفض على الصفة (لقوم).

اخلاص کی صورت میں اکراہ وجبر کیسے ہوسکتا ہے بعض نے کہا ہے کہ عدم جبر کا حکم ان اہل کتاب کے ساتھ مختص ہے جو جزیہ ادا کریں۔اور آیت کریمہ:

﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ﴾ (۳۔۸۳) کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟

میں دِيْنِ اللّٰهِ سے دین اسلام مراد ہے۔کیونکہ (قرآن پاک نے) دوسری آیت میں تصریح فرمادی ہے۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (۳۔۸۵) اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی یہ معنیٰ مراد ہے:

﴿هُوَالَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ (۹۔۳۳) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔

﴿وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ﴾ (۹۔۲۹) اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (۴۔۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿فَلَوْلَا اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ﴾ (۵۶۔۸۶) میں غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ کے معنیٰ غَيْرَ مَجْزِيِّيْنَ کے ہیں۔یعنی اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا نہیں دی جائے گی۔

اَلْمَدِيْنُ وَالْمَدِيْنَةُ: (ایضاً) کے معنیٰ غلام اور لونڈی کے بھی آتے ہیں۔ابوزید نے کہا ہے [1] کہ دُيِّنَ فُلَانٌ يُدَانُ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ کسی ناپسند کام پر مجبور کیے جانے کے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ دِنْتُهٗ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ طاعت کی جزا دینے کے ہیں بعض نے لفظ مَدِيْنَة (شہر) بھی اسی معنیٰ سے لیا ہے۔

❀❀❀

[1] ابو زید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری و جده من الصحابة باشديد العناية لجمع اللغات واللمحات توفی ۲۱۴ھ وقد قارب المأة كان من تلامذة عمرو بن العلاء و زليزيدى كان رفيقه فى الدرس راجع لاحواله (بشد)۱۲.

کِتَابُ الذَّال

(ذ ی ب)

اَلذِّئْبُ: کے معنیٰ بھیڑیا کے ہیں اصل میں یہ ذِئْبٌ یعنی مہموز ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿فَاَکَلَهُ الذِّئْبُ﴾ (۱۲۔۷) تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔اَرْضٌ مَذْءَبَةٌ: بہت بھیڑیوں والی سرزمین۔

ذِئِبَ فُلَانٌ۔درگوسپنداں وے گرگ افتاد۔

تَذَاءَبَتِ الرِّیْحُ: ہوا ہر طرف سے چلی۔یہ بھیڑیئے کی آمد کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

تَذَاءَبَتِ الرِّیْحُ: ہوا ہر طرف سے چلی یہ بھیڑیے کی آمد کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

تَذَاءَبْتُ لِلنَّاقَةِ: اونٹنی کو بچے پر مہربان کرنے کیلئے بھیڑیے کا روپ دھار لینا اور ہیئت کذائی میں مشابہت کے پیش نظر پالان کے پہلوؤں کے درمیان کی کشادگی کو ذِئْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ذ ی م)

ذَأَمَهُ یَذْءَمُهُ ذَأْمًا اور ذَمَّهُ (ن) ذَمًّا اور ذَامَهُ کے ایک ہی معنیٰ ہیں کسی کو حقیر اور مذموم گرداننا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ (۷۔۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل راندہ ہوا۔

(ذ ب ب)

اَلذُّبَابُ: کے معنیٰ مکھی کے ہیں اور یہ لفظ شہد کی مکھی اور بھڑ وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔❶ (طویل)

(۱۶۱) فَهٰذَا اَوَانُ الْعِرْضِ حَیٌّ ذُبَابُهٗ
زَنَابِیْرُهٗ وَالْاَزْرَقُ الْمُتَلَمِّسُ

یہ وادی کے پر رونق ہونے کا موسم ہے اس کے زنابیر اور سبز مکھیاں خوب بھن بھنا رہی ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا﴾ (۲۲۔۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے میں ذباب کے معنیٰ مکھی کے ہیں۔

ذُبَابُ الْعَیْنِ: آنکھ کی پتلی۔اسے ذُبَاب یا تو ہیئت میں تشبیہ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ آنکھ کی پتلی سے بھی مکھی کی طرح شعاعیں نکلتی ہیں۔اور ایذا رسانی میں مکھی کے ساتھ تشبیہ دے کر تلوار کی دھار کو ذُبَابُ السَّیْفِ کہا جاتا ہے۔اسی طرح موذی شخص کو بھی ذُبَابٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

---

❶ قال المتملس ولقب به بهذا البيت في الحماسة (۲: ۱۰۲) والخزانة (۳: ۲۷۰) والاغانی (۲۱: ۲۰) والسمط ۲۵۰ والاقتضاب وديوانه رقم ٥ والسيوطي ۱۰٤،۱۷ والمختارات ۳۳ والمحکم (عرض) والحيوان (۳: ۳۹۱) والمعانی الکبير للقتبی وفی روايته وذاك بدل فهذا والمرزوقی ٦٦٢ وفی روايته حن ذبابه بدل حي ذبابه والمتلمس شاعر جاهلی اسمه جرير بن عبد المسيح الضبعی راجع لترجمته السيوطي ۱۰۲۔۱۰٤ والاغانی (۲۱: ۱۲۷: ۱۳۵) والخزانة (۱: ٤٧٦) والشعراء (۱۳۱۔۱۳٦).

ذَبَّبَ عَنْ فُلَانٍ: کسی سے مکھی کو دور ہٹانا۔
اَلْمِذَبَّةُ: مورچھل، مکھیاں اڑانے کا آلہ۔
استعارہ کے طور پر ذَبٌّ کا لفظ ہر چیز کے دفع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:
ذَبَّبْتُ عَنْ فُلَانٍ: میں نے فلاں سے مکھیوں کو دور ہٹایا۔ ذُبَّ الْبَعِيْرُ: اونٹ کی ناک میں مکھی داخل ہوگئی۔ یہ بھی بیماری کے دوسرے صیغوں کی طرح (جیسے زُکِمَ وغیرہ) فعل مجہول استعمال ہوتا ہے۔
بَعِيْرٌ مَذْبُوْبٌ وَذُبَّ جِسْمُهٗ: اونٹ دبلا ہو کر مکھی یا تلوار کی دھار کی طرح ہوگیا۔
اَلذَّبْذَبَةُ: اصل میں معلق چیز کے ہلنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ پھر بطور استعارہ ہر قسم کی حرکت اور اضطراب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذَالِكَ﴾ (۴-۱۴۳) بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں۔
یعنی وہ ہمیشہ مضطرب سے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کی طرف جھک جاتے ہیں اور کبھی کفار کی طرف۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۱۶۲) تَرٰى كُلَّ مُلْكٍ دُوْنَهَا يَتَذَبْذَبُ

کہ اس کی سلطنت کے ورے ہر ایک سلطنت مضطرب نظر آتی ہے۔
ذَبَّبْنَا اِبِلَنَا: ہم نے اونٹوں کو سخت ہنکایا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (متقارب)

(۱۶۳) يُذَبِّبُ وَرْدٌ عَلٰى اِثْرِهٖ

کہ وَرْد اس کے پیچھے سخت دوڑ رہا تھا۔

(ذ ب ح)

اَلذَّبْحُ: (ف) اصل میں اس کے معنیٰ حیوانات کے حلق کو قطع کرنے کے ہیں اور ذِبْحٌ بمعنیٰ مَذْبُوْحٌ آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾ (۲۷-۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کا ان کو فدیہ دیا۔
﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ (۲-۶۷) کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو۔
ذَبَحْتُ الْفَارَةَ: میں نے نافہ مشک کو چیرا۔ یہ حیوان کے ذبح کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح ذَبَحَ الدَّنَّ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ مٹکے میں شگاف کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ﴾ (۲-۴۹) تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالتے تھے۔
میں صیغہ تفعیل برائے تکثیر ہے یعنی وہ کثرت کے ساتھ یکے بعد دیگرے تمہارے لڑکوں کو ذبح کر رہے تھے۔
سَعْدُ الذَّابِحِ: (برج جدی کے ایک) ستارے کا نام ہے۔ اور سیلاب کے گڑھوں کو مَذَابِحُ کہا جاتا ہے۔

(ذ خ ر)

اَلادِّخَارُ: (افتعال) اصل میں اِذْتِخَارٌ تھا۔ کہا جاتا ہے:

---

❶ قاله النابغة فی قصیدة یمدح فیها النعمان بن المنذر واوله: الم تر ان الله اعطاك سورة وسیأتی فی (سور).

❷ وتمامه: و ادركه وقع مردی خشب والبیت لغنترة بن مشداد والعبسی ابو المغلس راجع المرزوقی ۱۴۴ وفی روایة المختار الجاهلی ۱: ۳۱۰ والعقد الثمین ۳۵ تذائب بدل یذیب ومردبدل مردی والبیت فی اللسان (خشب) والمعانی ۱۸۲۰.

ذَخَرْتُهٗ وَادَّخَرْتُهٗ: (مستقبل کے لئے ذخیرہ جمع کرنا) ایک روایت میں ہے۔ ❶

اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ لَا یَدَّخِرُ لِغَدٍ کہ آنحضرت ﷺ کل کے لئے کوئی چیز جمع نہ کرتے تھے۔

اَلْمَذَاخِرُ: پیٹ اور انتڑیاں جن میں طعام کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الطویل)

(۱٦٤) فَلَمَّا سَقَیْنَاھَا الْعَکِیْسَ تَمَلَّأَتْ
مَذَاخِرُھَا وَامْتَدَّ رَشْحاً وَرِیْدُھَا

جب ہم نے اس عکیس یعنی شوربے میں ملا ہوا دودھ پلایا تو اس کا پیٹ بھر گیا اور رگیں پھول کر پسینہ بہنے لگا۔

اَلْاِذْخِرُ: ایک قسم کی خوشبودار گھاس۔

(ذ ر ر)

اَلذُّرِّیَّۃُ: نسل، اولاد۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (۲۔۱۲۴) اور میری اولاد میں سے بھی۔

﴿وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ (۲۔۱۲۸) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بناتے رہیو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ (۴۔۴۰) خدا کسی کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کرتا۔

اور کہا گیا ہے کہ ذُرِّیَّۃٌ اصل میں مہموز اللام ہے اور (ذ ر ء) میں اس پر بحث آرہی ہے۔

(ذ ر ی)

اَلذَّرْءُ کے معنی ہیں اللہ نے جس چیز کا ارادہ کیا اسے ظاہر کردیا۔ کہا جاتا ہے:

ذَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ: یعنی ان کے اشخاص کو موجود کیا قرآن میں ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (۷۔۱۷۹)

اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کیے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ ذَرَاَ نَا لِجَهَنَّمَ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا﴾ (۶۔۱۳۶) اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں (یعنی) کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔

﴿وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا یَذْرَؤُكُمْ فِیْهِ﴾ (۴۲۔۱۱) اور چارپایوں کے بھی جوڑے (بنائے اور) اسی طریق پر تم کو پھیلاتا رہتا ہے۔

اور ﴿تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ﴾ (۱۸۔۴۵) میں ایک قرأت

---

❶ رواہ الترمذی عن انس مسندًا وعن ثابت مرسلاً وتاویل الحدیث ای لنفسه فلاینافی انه صلی الله علیه وسلم کان یحبس لاهله قوت سنتهم والحدیث رواہ ابن حبان فی زوائدہ رقم ۲۵۵۰۔۲۱۳۹ قال المناوی فی شرح الجامع الصغیر اسنادہ جید وفی الترمذی غریب (راجع التحفة ج ۳ص ۲۷۲).

❷ وفی اللسان (مدح) قاله الراعی ابو منصور الاسدی یصف فرساً والصواب انه للراعی النمیری یصف امْرَءَ ةًوهی ام خنزر بن ارقم وکان بینه وبین خنزر هجاء فَهَجاه بکون امه تطرقه وتطلب من القریٰ ویدل علیه ماقبله: فلماعرفنا انها ام خنزر۔جناها موالیها وغاب مفیدها الی آخر ماقال ثلاثة ابیات اللسان (مدح) والصحاح (مدح، ذخر) وتهذیب الالفاظ ٦٤٠ مع آخر والحماسة لابی تمام بالتبریزی (٤: ٣٩) والمعانی للقتبی ٣٨٤ والمحکم (عکس مدح) ومشاهد الانصاف ١٣٧ وفی روایة البیت اختلاف ففی روایة تمدحت بدل تملأت کمافی الصحاح واللسان وخواصرها بدل نداخرها وازداد بدل امتد ١٢.

تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ بھی ہے۔ ❶

اَلذُّرْءَةُ: بڑھاپے یا نمک کی سفیدی۔

کہا جاتا ہے کہ مِلْحٌ ذَرْآنِیٌّ: نہایت سفید نمک ❷ اور جس کے بال سفید ہو جائیں اسے رَجُلٌ اَذْرَءُ کہا جاتا ہے۔اس کی مؤنث ذَرْآءُ ہے۔

ذَرِئَ شَعْرُهٗ (وَذَرَءَ کفرح ومنع) اس کے بال سفید ہو گئے۔

(ذ ر ع)

اَلذِّرَاعُ: ہاتھ (کہنی سے لے کر درمیانی انگلی کے آخر تک) کبھی ذِراع کا لفظ بول کر مَذْرُوْع یعنی وہ چیز بھی مراد لی جاتی ہے جس کی پیمائش کی گئی ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ﴾ (۶۹۔۳۲) پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دو۔

اور ذِرَاعٌ مِّنَ الثَّوْبِ وَذِرَاعٌ مِّنَ الْاَرْضِ وغیرہ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور حیوان کے بازو کے ساتھ تشبیہ دے کر ایک ستارے کو بھی ذِرَاعُ الْاَسَدِ کہا جاتا ہے۔

ذِرَاعُ الْعَامِلِ: نیزے کا اگلا حصہ محاورہ ہے۔

هٰذَا عَلٰی حَبْلِ ذِرَاعِكَ: یہ تیرے اختیار میں ہے جیسا کہ هُوَ فِیْ كَفِّكَ کا محاورہ ہے

ضَاقَ بِكَذَا ذِرَاعِیْ: یعنی میں اس سے عاجز ہوں۔ ❸ جیسا کہ ضَاقَتْ بِهٖ یَدِیْ محاورہ ہے۔

ذَرَعْتُهٗ: (۱) بازو پر مارنا۔اور ذَرَعْتُ کے معنیٰ (۲) بازو پھیلانا بھی آتے ہیں اور اسی سے ذَرَعَ الْبَعِیْرُ فِیْ سَیْرِهٖ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ اونٹ کے بازو پھیلا کر چلنے کے ہیں۔(تیز چلنا) فَرَسٌ ذَرِیْعٌ وَذَرُوْعٌ۔ کشادہ قدم گھوڑا (تیز رو) مُذَرَّعٌ (سفید بازو والا گھوڑا یا بیل) اور زِقٌّ ذِرَاعٌ کے معنیٰ بعض کے نزدیک بڑی مشک کے ہیں اور بعض کے نزدیک چھوٹی مشک کو کہتے ہیں۔پہلی صورت میں بازوؤں والی مشک کو کہتے ہیں۔اور دوسری صورت میں بغیر بازو مشک کے یعنی جس کے بازو کاٹ دیئے گئے ہوں۔

محاورہ ہے کہ ذَرَعَةُ الْقَیْءُ اس پر قے غالب آ گئی ذَرَعَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا کشادہ قدم چلنا۔

تَذَرَّعَتِ الْمَرْأَةُ الْخُوْصَ: عورت کا ٹوکری وغیرہ بنانے کے لئے کھجور کی شاخوں کو کاٹنا۔اسی سے تشبیہ کے طور پر تَذَرَّعَ فِیْ كَلَامِهٖ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کلام میں تیزی کرنے کے ہیں جیسا کہ سَفْسَفَ فِیْ كَلَامِهٖ (لغوگوئی کرنا) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جو اصل میں سَفِیْفُ الْخُوصِ کھجور کے پتوں کی ٹوکری) سے ماخوذ ہے۔

(ذ ر و)

ذِرْوَةُ السَّنَامِ وَذُرَاهُ: کوہان کا بلند حصہ۔اسی سے محاورہ ہے اَنَا فِیْ ذُرَاكَ میں تیری جناب میں

---

❶ قرأة شاذة وفی حرف ابن مسعود تذربه الرياح وايضاً تذريه فهذه ثلاث ذكرها اصحاب التفاسير (راجع الطبری والشوكانی).

❷ وفی المعاجم بفتح الراء وسكونها.

❸ وفی التنزيل: وضاق بهم ذرعاً (۱۱۔۷۷).

باعزت ہوں ❶ (میں تیری پناہ میں ہوں) اَلْمِذْرَاوَان: سرین کے دونوں کنارے (وَلَا وَاحِدَ لَه) ❷

ذَرَتْهُ الرِّيْحُ تَذْرُوْهُ وَ تَذْرِيهِ: ہوا کا کسی چیز کو بکھیر دینا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالذَّارِيَاتِ ذَرْوًا﴾ (۱۸۔۴۵) کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔

اَلذُّرِّيَّةُ کے اصل معنیٰ چھوٹی اولاد کے ہیں مگر عرف میں مطلق اولاد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اصل میں یہ لفظ جمع ہے مگر واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ❸ قرآن پاک میں ہے:

﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ (۳۔۳۴) ان میں سے بعض بعض کی اولاد تھے۔

﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ﴾ (۱۷۔۳۰) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ (۳۶۔۴۱) اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔

﴿اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ (۲۔۲۴) میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا انہوں نے کہا کہ (پروردگار) میری اولاد سے بھی۔

ذُرِّيَّةٌ کے اصل میں تین اقوال ہیں۔

(۱) بعض نے کہا ہے کہ یہ ذَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ سے ہے یعنی اصل میں مہموز اللام ہے مگر کثرت استعمال کے سبب دَوِّيَّةٌ وَبَرِيَّةٌ کی طرح ہمزہ کو ترک کردیا گیا ہے۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں ذُرْوِيَّةٌ بروزن فُعْلِيَّةٌ تھا اور ذَرٌّ سے مشتق ہے۔جیسے قُرِّيَّةٌ قَرٌّ سے۔

(۳) ابوالقاسم البلخی کہتے ہیں: ❹ کہ آیت کریمہ: ﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ﴾ (۷۔۱۵۹) اور ہم نے...... جہنم کے لئے پیدا کیے۔

میں ذَرَأْنَا ذَرَيْتُ الْحِنْطَةَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ گندم کو اَساون کرنے کے ہیں گویا وہ اسے بھی مہموز نہیں سمجھتے۔ ❺

(ذ ع ن)

اَلْاِذْعَانُ: (افعال) کے معنیٰ کسی کا مطیع اور منقاد ہوجانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿يَاْتُوْا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ﴾ (۲۴۔۴۹) تو ان کی طرف مطیع ہوکر چلے آتے۔

نَاقَةٌ مِذْعَانٌ: سواری کی مطیع اور فرمانبردار اونٹنی۔

---

❶ والمعروف بفتح الذال ای فی ظلك و كنفك.

❷ راجع الامالی ج (۱ ص ۱۹۹).

❸ وفی اشتقاقه اختلاف ذكره اصحاب المعاجم فی (ذرر) وفی (ذرء) ونی (ذرو).

❹ ابو القاسم البلخی عبدالله بن احمد الحنفی المعروف بالكعبی احد شيوخ المعتزلة وراس طائفة فيهم يقال لهم الكعبية وفی النحل للشعر ستانی (۱: ۳۷) وكان تلميذاً لابی الحسين الخيّاط المعتزلی ومذهبه وفی كشف الظنون (۱: ۲۳۴) وابن النديم ۱۵۷ انه الف تفسيرًا كبيرًا فی اثنی عشر جلداً توفی رحمه الله فی سنة ۳۱۹، ۳۱۷ راجع لترجمه لسان الميزان ۳: ۲۵۵ وابن خلكان ۱: ۲۵۲

❺ لان المهموز معناه يخالف الاعتزال فتجهم وتلوى راجع الكشاف ۱۲.

(ذ ق ن)

ذَقَــنٌ: ٹھوڑی۔اس کی جمع اَذْقَــانٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَيَـخِـرُّوْنَ لِلْاَذْقَـانِ يَبْكُوْنَ﴾ (۱۸۔۱۰۹)اور ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں (اور) روتے جاتے ہیں۔
ذَقَنْتُهٗ میں نے اس کی ٹھوڑی پر مارا۔
نَــاقَةٌ ذَقُـوْنٌ: وہ اونٹنی جو ٹھوڑی کے سہارے پر چلتی ہو۔ ❶ پھر تشبیہ کے طور پر ڈول کو جو ایک جانب مائل ہوا سے بھی دَلْوٌ ذَقُوْقٌ کہہ دیتے ہیں۔ ❷

(ذ ک ر)

اَلــذِّكْرُ: یہ کبھی تو اس ہیئت نفسانیہ پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے علم کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ قریباً حفظ کے ہم معنیٰ ہے مگر حفظ کا لفظ احراز کے لحاظ سے بولا جاتا ہے اور ذِکْرٌ کا لفظ استحضار کے لحاظ سے۔اور کبھی "ذِکْرٌ" کا لفظ دل یا زبان پر کسی چیز کے حاضر ہونے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ "ذِکْـرٌ" دو قسم پر ہے۔ذکر قلبی اور ذکر لسانی۔ پھر ان میں سے ہر ایک دو قسم پر ہے نسیان کے بعد کسی چیز کو یاد کرنا یا بغیر نسیان کے کسی کو ہمیشہ یاد رکھنا اور ہر قول کو ذکر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذکر لسانی کے بارے میں فرمایا:
﴿لَـقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيْهِ ذِكْرُكُمْ﴾ (۲۱۔۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے۔
﴿وَهٰـذَا ذِكْـرٌ مُّبَـارَكٌ اَنْـزَلْنٰهُ﴾ (۲۱۔۵۰)اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔
﴿وَهٰـذَا ذِكْـرُ مَنْ مَّعِىَ وَذِكْرُ مِنْ قَبْلِىْ﴾ (۲۱۔۲۴) یہ میری اور میرے ساتھ والوں کی کتاب ہے اور مجھ سے پہلے (پیغمبر) ہوئے ہیں۔
اور آیت کریمہ:
﴿ءَ أُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا﴾ (۳۸۔۸) کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے۔
میں ذکر سے مراد قرآن پاک ہے۔ نیز فرمایا:
﴿صٓ o وَالْقُرآنِ ذِى الذِّكْرِ﴾ (۳۸۔۱) ص۔قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَاِنَّـهٗ لَـذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَومِكَ﴾ (۴۳۔۴۴)اور یہ (قرآن) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے نصیحت ہے۔
میں ذکر بمعنیٰ شرف ہے یعنی یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لئے باعث شرف ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿فَسْـئَـلُـوْا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ (۱۶۔۴۳) تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔
میں اہل ذکر سے اہل کتاب مراد ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَسُوْلًا﴾ (۶۵۔۱۱۱) خدا نے تمہارے پاس نصیحت (کی کتاب) اور اپنے پیغمبر (بھی بھیجے) ہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلـذِّکْرُ آنحضرت ﷺ کا وصف ہے۔جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وصف میں کَلِمَۃٌ کا لفظ وارد ہوا ہے۔اور آنحضرت ﷺ کو اَلــذِّکــر اس لحاظ

---

❶ وفي الصحاح ترخي ذقنها في السير وفي الاساس تمدخطاها وتحرك رأسها قوة ونشاطافي السير ۱۲۔
❷ وفي الصحاح والمحيط اذا حرزتها فجائت شفتها مائلة (التاج) ۱۲۔

سے کہا گیا ہے۔ کہ کتب سابقہ میں آپ ﷺ کے متعلق خوش خبری پائی جاتی تھی۔ اس قول کی بنا پر رَسُوْلًا ذِکْرًا سے بدل واقع ہوگا۔ ❶ بعض کے نزدیک رَسُوْلًا پر نصب ذِکْرٌ کی وجہ سے ہے گویا آیت یوں ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا ذِکْرًا رَسُوْلًا یَتْلُوا﴾ ❷ جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَتِیْمًا﴾ (۹۰۔۱۴) میں یَتِیْمًا اِطْعَامٌ کی وجہ سے منصوب ہے اور نسیان کے بعد ذکر کے متعلق فرمایا:

﴿فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَا اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَهٗ﴾ (۱۸۔۶۳) تو میں مچھلی (وہیں) بھول گیا اور مجھے (آپ سے) اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

اور ذکر قلبی اور لسانی دونوں کے متعلق فرمایا:

﴿فَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا﴾ (۲۔۲۰۰) تو (منیٰ میں) خدا کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

﴿فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوْهُ کَمَا هَدٰکُمْ﴾ (۲۔۱۹۸) تو مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں خدا کا ذکر کرو اور اس طرح ذکر کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ﴾ (۲۱۔۱۰۵) اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

میں اَلذِّکْر سے کتب سابقہ مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا﴾ (۷۶۔۱) انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔ میں شَیْئًا مَّذْکُوْرًا کے معنیٰ یہ ہیں کہ بذات خود اس کا وجود نہ تھا اگرچہ علم الٰہی میں اس وقت بھی موجود تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۹۔۶۷) کیا (ایسا) انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ حشر ونشر کے منکر کو اپنی پہلی پیدائش یاد نہیں ہے جس سے وہ دوبارہ جی اٹھنے پر استدلال کر سکتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۳۶۔۷۹)

﴿وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَاُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ﴾ (۳۰۔۲۷)

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ﴾ (۲۹۔۴۵) اور خدا کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے۔

کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو یاد کرنا بندے کے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے بڑھ کر ہے۔ گویا اس میں کثرت سے ذکر الٰہی کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

اَلذِّکْرٰی: کثرت سے ذکر الٰہی کرنا اس میں "اَلذِکر" سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَحْمَةً مِّنَّا وَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (۳۸۔۴۳) (یہ) ہماری طرف سے رحمت اور عقل والوں کے

---

❶ علی سبیل المبالغة اوعلی حذف مضاف من الاول تقدیره: انزل ذاذکر رسولا (فتح القدیر ۵: ۲۴۶۔۲۴۷).

❷ قاله ابوعلی الفارسی لان المصدر المنون یعمل (السابق) فالمراد بالذکر القران راجع الطبری ۱۲.

لئے نصیحت ہے۔
﴿وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۵۱۔۵۵) اور نصیحت کرتے رہو کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔
اسی طرح بہت سی آیات میں ذِکرٰی کا لفظ آیا ہے۔
اَلتَّذْكِرَةُ: جس کے ذریعہ کسی چیز کو یاد دلایا جائے۔اور یہ دلالت اور امارت سے اعم ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ﴾ (۷۴۔۴۹) ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں۔
﴿كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ﴾ (۸۰۔۱۱) دیکھو یہ قرآن نصیحت ہے۔مراد قرآن پاک ہے۔
ذَكَّرْتُهُ كَذَا: کسی کو کچھ یاد دلانا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ﴾ (۱۴۔۵) اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دن یاد دلاؤ۔
اور آیت کریمہ:
﴿فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى﴾ (۲۔۲۸۲) تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔
کے بعض نے یہ معنیٰ کیے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلا دے۔
اور بعض نے یہ معنیٰ کیے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذکر بنا دے گی بعض علماء نے آیت کریمہ:
﴿فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ﴾ (۲۔۱۵۲) سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔
اور ﴿اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيْ﴾ (۲۔۴۰) میرے وہ احسان یاد کرو۔میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اُذْكُرُوْنِيْ کے مخاطب آنحضرت ﷺ کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الٰہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس کے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الٰہی میں غور و فکر کرتے رہو حتیٰ کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔
اَلذَّكَرُ: یہ اُنْثٰى (مادہ) کی ضد ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى﴾ (۳۔۳۶) اور (نذر کے لئے) لڑکا (موزوں تھا کہ وہ) لڑکی کی طرح (ناتواں) نہیں ہوتا۔
﴿ءٰۤالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ (۶۔۱۴۴) کہ (اللہ تعالیٰ نے) دونوں کے نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں (کی) مادینوں کو۔
ذَكَرٌ کی جمع ذُكُوْرٌ وَذُكْرَانٌ آتی ہے چنانچہ فرمایا:
﴿ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا﴾ (۴۲۔۵۰)...... بیٹے اور بیٹیاں۔
اور ذَكَرٌ کا لفظ بطور کنایہ عضو تناسل پر بھی بولا جاتا ہے۔
اور جو عورت نرینہ بچہ دے اسے مُذْكِرٌ کہا جاتا ہے۔مگر اَلْمِذْكَارُ وہ ہے جس کی عادت نرینہ اولاد کو جنم دینا ہو۔
نَاقَةٌ مُذَكَّرَةٌ: وہ اونٹنی جو عظمت جثہ میں اونٹ کے مشابہ ہو۔
سَيْفٌ ذُوْذُكْرٍ وَّمُذَكَّرٍ: آبدار اور تیز تلوار صارم ذُكُوْرُ الْبَقَلِ: وہ ترکاریاں جو لمبی اور سخت ہوں۔

(ذ ک و)

ذَكَتِ (ن) النَّارُ کے معنیٰ آگ جلنے اور روشن ہونے کے ہیں اور ذَكَّيْتُهَا (تفعیل) کے معنیٰ جلانے اور روشن کرنے کے ہیں۔ذُكَاءُ: سورج اور فجر کو سورج کا بیٹا تصور کرکے اسے اِبْنُ ذُكَاءَ: کہا جاتا ہے اور اس کا

حاجب اور دربان تصور کر کے اسے حَاجِبُ الشَّمْسِ کہہ دیتے ہیں۔

اور بطور کنایہ ذُکَاءٌ کے معنیٰ ذہانت اور زود فہمی کے بھی آتے ہیں۔جیسا کہ فُلَانٌ هُوَ شُعْلَةُ نَارٍ۔کا محاورہ ہے کہ فلاں آتش کا پرکالا ہے۔ذَكَّيتُ الشَّاةَ: بھیڑ ذبح کرنا۔

اصل میں تَذْكِيَةٌ (تفعیل) کے معنیٰ حرارت غریزی خارج کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں مخصوص طریقہ سے حیاۃ زائل کرنے کو تذکیۃ کہتے ہیں۔ [1] اس اشتقاق کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ میت کو خَامِدٌ اور هَامِدٌ کہا جاتا ہے۔اور دوسری طرف بجھی ہوئی آگ کو مَيْتَةٌ کہا جاتا ہے۔

ذَكِيَ الرَّجُلُ: جب کوئی شخص سن رسیدہ ہو کر کثرت تجارب کی بنا پر ذکاوت اور فہم سے بہرہ مند ہو جائے تو اس کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اس اشتقاق کے اعتبار سے صرف اسی عمر رسیدہ کو مُذَكّی کہا جائے گا جو کار آزمودہ ور یاضت چشیدہ ہو اور پھر تجارب اور ریاضت عام طور پر چونکہ عمر رسیدہ آدمیوں میں پائے جاتے ہیں اس لیے ان کے بارے میں ذکاوت کا لفظ استعمال ہوا تو اس مناسبت سے عمدہ اور عمر رسیدہ گھوڑوں کے متعلق بھی ذُكَاءٌ کا لفظ بولا جانے لگا چنانچہ محاورہ ہے: جَرْيُ الْمُذْكِيَاتِ غِلَابٌ: کہ بوڑھے گھوڑے دوڑ میں غالب رہتے ہیں۔ [2]

(ذ ل ل)

اَلذُّلُّ: (ن) یہ ذَلَّ يَذِلُّ کا مصدر ہے اور ذُلٌّ (بضمہ ذال) زور وقہر کی وجہ سے جھکنے کو کہتے ہیں مگر جب طبیعت کی تیزی اور سختی از خود مغلوب ہو جائے تو اسے ذِلٌّ (بکسرۂ ذال) کہا جاتا ہے۔لہٰذا آیت کریمہ:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (۱۷۔۲۴) کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کے سامنے مقہور ومجبور بن کر رہو۔اور ایک قرأت میں جَنَاحَ الذِّلِّ (بکسرۂ ذال) ہے۔ [3] یعنی ان کے سامنے نرم خو اور طاعت کیش بن کر رہا کرو۔بغیر تاء کے ذُلٌّ اور تاء کے ساتھ ذِلَّةٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ قُلٌّ اور قِلَّةٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ (۱۰۔۲۷) اور ان کے مونہوں پر ذلت چھا جائے گی۔

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ (۲۔۶۱) اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (وبے توانائی) ان سے چمٹا دی گئی۔

﴿سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ﴾ (۷۔۱۵۲) ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور ذلت (نصیب ہوگی)

ذَلَّتِ الدَّابَّةُ ذُلًّا منہ زوری کے بعد سواری کا مطیع ہو جانا اور اس قسم کی مطیع اور منقاد سواری کو ذَلُوْلٌ (صفت

---

[1] ای فی التنزیل الاما ذکیتم ای الاان تذبحوا۔

[2] المثل لقیس بن زهیر العبسی ویضرب عن یوصف بالتبریز علی اقرانه فی حلبة الفضل راجع للمثل اللسان (ذکی) والمیدانی رقم ۸۲۱) وجمهرة الامثال ۷۸ والمشکل للقتیبی ٦٥ وسمط اللالی ٥٨٣ قال المیمنی فی طرته ویروی غلاء والمثل فی الکامل ۲۱۹ والمستقصی والثمار ۲۸٥ والعسکری ۱۰۷۷: ۳۰۳ والنریری ۳: ۲۳.

[3] وهی قرائة ابن عباس وعروة بن جبیر وغیرهما وبالضم قرأة الجمهور (ابو حیان ٦: ۲۸ وابن الانباری ۴۷۳).

فاعلی) کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ﴾ (۲۔۷۱) کہ وہ بیل کام میں لگا ہوا نہ ہو۔ نہ تو زمین جوتتا ہو۔
پھر اگر انسان کی ذلت خود اس کے اپنے اختیار وارادہ سے ہو تو وہ محمود سمجھی جاتی ہے جیسا کہ قرآن پاک نے مؤمنین کی مدح کرتے ہوئے فرمایا:
﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۵۔۵۴) جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں۔
﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ (۳۔۱۲۳) اور خدا نے جنگِ بدر میں بھی تمہاری مدد کی تھی اور اس وقت بھی تو تم بے سروسامان تھے۔
﴿فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا﴾ (۱۶۔۶۹) یعنی بغیر کسی قسم کی سرکشی کے نہایت مطیع اور منقاد ہوکر اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا﴾ (۷۶۔۱۴) کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ گچھے اس طرح جھکے ہوئے ہوں گے۔ کہ ان کو نہایت آسانی سے توڑ سکیں گے۔
محاورہ ہے: مثل۔
اَلْاُمُوْرُ تَجْرِيْ عَلٰى اَذْلَالِهَا: کہ تمام امور اپنے راستوں پر اور حسب مواقع جاری ہیں۔

(ذ م م)

ذَمَّهٗ (ن) ذَمًّا کے معنیٰ مذمت کرنے کے ہیں۔ اس سے صیغۂ صفت مفعولی مَذْمُوْمٌ وَّ ذَمِيْمٌ آتا ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۸) نفرین سنکر اور (درگاہِ خدا سے) راندہ ہوکر۔
اور بعض ذَمَمْتُهٗ صیغۂ واحد متکلم میں دوسری میم کو تاء سے بدل کر ذَمَتُّهٗ بھی کہہ دیتے ہیں۔
اَلذِّمَامُ: وہ عہد وغیرہ جس کا ضائع کرنا باعث مذمت ہو۔ یہی معنیٰ ذِمَّةٌ وَمَذِمَّةٌ کے ہیں۔ کہا گیا ہے لِيْ مَذَمَّةٌ فَلَا تَهْتِكْهَا کہ میرے عہد یا حرمت کا پاس کیجئے توڑیئے نہیں۔
اَذْهِبْ مَذَمَّتَهُمْ بِشَيْءٍ یعنی ان کے حق احترام کا بدلہ اتاریئے۔
اَذَمَّ بِكَذَا: اس کی حرکت کو ضائع کر دیا۔ تہاون سے کام لیا۔ رَجُلٌ مِذَمٌّ: بے حس وحرکت [1] بِئْرٌ ذَمَّةٌ: کم پانی والا کنواں [2] چیونٹی کے انڈوں کی طرح سفید سا مادہ جو ناک پر ظاہر ہو جاتا ہے اسے اَلذَّمِيْمُ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ [3]

(۱٦٥) وَتَرَى الذَّمِيْمَ عَلٰى مَرَاسِنِهِمْ
يَوْمَ الْهِيَاجِ كَمَازِنِ النَّمْلِ

لڑائی کے دن ان کی ناک پر چیونٹی کے انڈوں کی طرح سفید سی پھنسیاں نظر آتی ہیں۔

---

[1] ایضاً مُذِم ومُذَم (الصحاح).
[2] وجمعها ذمام.
[3] قاله الحاورة الذبیانی وفی روایة اللسان: کمازن الجثل وفی الجمهرة لابن درید غب العجاج اوغب الهیاج (۱۹) بدل یوم الهیاج وفی روایة الابدال لابی الطیب (۱: ۱۹٦) وتری الذفیق قال فی الصحاح الذمیم المخاط والبول الذی یذم ویذن من قضیب التیس الذمیم ایضاً شیء یخرج من سام المارن کبیض النمل وذهب ابن دریدالی ان الذمیم ههنا هو الندی ۔ راجع للبیت اللسان والتاج (جثل، ذمم، مزن) والصحاح (ذمم) والمخصص (۲: ٥٦/٥: ٨٤) والاساس (رسن) ومبادی اللغة للاسکافی ٧٦.

(ذ ن ب)

ذَنَبُ الدَّآبَّةِ وَغَیْرِھَا: چوپایہ وغیرہ کی دم کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق کم مرتبہ اور رذیل آدمی پر ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

ھُمْ اَذْنَابُ الْقَومِ: یعنی وہ رذیل ہیں اور اسی سے بطور استعارہ ٹیلوں میں پانی کے راستوں کو مَذَانِبُ التِّلاعِ کہا جاتا ہے۔

اَلْمِذْنَبُ: (ایضاً) وہ کھجور جو پچھلی جانب سے پکنا شروع ہو۔

اَلذَّنُوبُ: لمبی دم والا گھوڑا۔ دم دار ڈول سَجْلٌ کی طرح بطور استعارہ ذَنُوبٌ کے معنیٰ بھی نصیبہ اور حصہ آجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحَابِھِمْ﴾ (۵۲۔۵۹) کہ ان ظالموں کے لیے بھی (عذاب کی) نوبت مقرر ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کی نوبت مقرر تھی۔

اَلذَّنْبُ: (ض) کے اصل معنیٰ کسی چیز کی دم کو پکڑنا کے ہیں کہا جاتا ہے کہ ذَنَبْتُہٗ: میں نے اس کی دم پر مارا۔ دم کے اعتبار سے ہر اس فعل کو جس کا انجام برا ہو اسے ذَنْبٌ کہہ دیتے ہیں اسی بنا پر انجام کے اعتبار سے گناہ کو تَبِعَۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔ ذَنْبٌ کی جمع ذُنُوبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَخَذَ ھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ﴾ (۳۔۱۱) تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (عذاب میں) پکڑ لیا تھا۔

﴿فَکُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِہٖ﴾ (۲۹۔۴۰) تو ہم نے سب کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا۔

﴿وَمَنْ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ﴾ (۳۔۱۳۵) اور اللہ تعالیٰ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔ وَغَیْرُ ذٰلِکَ مِنَ الْاٰیَاتِ

(ذ ھ ب)

اَلذَّھَبُ: سونا۔ اسے ذَھَبَۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ ذَھَبٌ: جو کان کے اندر زیادہ سونا دیکھ کر ششدر رہ جائے۔

شَیْءٌ مُذَھَّبٌ (او مُذْھَب) زراندودہ طلاء کی ہوئی چیز۔

کُمَیْتٌ مُّذَھَّبٌ (اَو مُذْھَبٌ) کمیت گھوڑا جس کی سرخی پر زردی غالب ہو۔ گویا وہ سنہری رنگ کا ہے۔

اَلذَّھَابُ (وَالذُّھُوْبُ) کے معنیٰ چلا جانے کے ہیں۔

ذَھَبَ (ف) بِالشَّیءِ وَاَذْھَبَہٗ: لے جانا۔ یہ اعیان ومعانی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ﴾ (۳۷۔۹۹) کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔

﴿فَلَمَّا ذَھَبَ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ الرَّوْعُ﴾ (۱۱۔۷۴) جب ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف جاتا رہا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا تَذْھَبْ نَفْسُکَ عَلَیْھِمْ حَسَرَاتٍ﴾ (۳۵۔۸) تو ان لوگوں پر افسوس کر کے تمہارا دم نہ نکل جائے۔ میں ذَھَابِ نَفْس موت سے کنایہ ہے اور فرمایا:

﴿اِنْ یَّشَأْ یُذْھِبْکُمْ وَیَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾ (۱۴۔۱۹) اگر وہ چاہے تو تمہیں نابود کر دے اور (تمہاری جگہ) نئی مخلوق پیدا کر دے۔

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ (۳۵۔۳۴) وہ کہیں گے خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُاللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ﴾ (۳۳۔ ۳۳) اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کردے۔

اور آیت:﴿فَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ لِتَذْھَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ﴾ (۴۔۱۹) کے معنٰی یہ ہیں کہ تم ان کو اپنے گھروں میں اس لیے نہ روک رکھو کہ اس طرح مہر وغیرہ کی کچھ رقم ان سے واپس لو۔ اور فرمایا:

﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ﴾ (۸۔ ۴۶) اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا (ایسا کروگے تو) تم بزدل ہوجاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔

﴿ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ﴾ (۲۔۱۷) تو خدا نے ان لوگوں کی روشنی زائل کردی۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَذَھَبَ بِسَمْعِھِمْ﴾ (۲۔۲۰) اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں (کی شنوائی)......کو زائل کردیتا۔

﴿لَیَقُوْلَنَّ ذَھَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ﴾ (۱۱۔۱۰) تو (خوش ہوکر) کہتا ہے کہ (آہا) سب سختیاں مجھ سے دور ہوگئیں۔

(ذ ھ ل)

اَلذُّھُوْلُ (ف): ایسی مشغولیت جو غم ونسیان کی موجب ہو۔ کہاجاتا ہے۔ وَھَلَ عَنْ کَذَا: وہ اس سے غافل ہوگیا۔ اَذْھَلَہٗ کَذَا: فلاں چیز نے غافل کردیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ﴾ (۲۲۔۲) (اے مخاطب) جس دن تو اس کو دیکھے گا (اس دن یہ حال ہوگا کہ) تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی۔

(ذ و)

ذُوْ: (والا، صاحب) یہ دوطرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) یہ کہ اسماء اجناس وانواع کے ساتھ توصیف کے لیے اُسے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ اسم ضمیر کی طرف مضاف نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اسم ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع بھی آتا ہے۔ اور مؤنث کے لیے ذَاتُ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ ذَوَاتَا اور جمع ذَوَاتٌ آتی ہے۔ اور یہ تمام الفاظ مضاف ہوکر استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْعَالَمِیْنَ﴾ (۲۔ ۲۵۱) لیکن اللہ تعالیٰ اہل علم پر بڑا مہربان ہے۔

﴿ذُوْ مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی﴾ (۵۳۔۶) (یعنی جبرئیل علیہ السلام) طاقتور نے۔ پھر وہ پورے نظر آئے۔

﴿وَذِیْ الْقُرْبٰی﴾ (۲۔۸۳) اور رشتہ داروں۔

﴿وَیُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ﴾ (۱۱۔۳) اور ہر صاحب فضل کو اس کی بزرگی (کی داد) دے گا۔

﴿ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی﴾ (۲۔۱۷۷) رشتہ داروں اور یتیموں۔

﴿اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (۱۱۔۵) وہ تو دلوں تک کی باتوں سے آگاہ ہے۔

﴿وَنُقَلِّبُھُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (۱۸۔ ۱۸) اور ہم ان کو دائیں اور بائیں کروٹ بدلاتے ہیں۔

﴿وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ﴾ (۸۔۷) اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان وشوکت

(یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے۔

﴿ذَوَاتَـآ اَفْنَانٍ﴾ (۵۵۔۴۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں)۔علمائے معانی (منطق، فلسفہ) ذات کے لفظ کو بطور استعارہ عینِ شی کے معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں اور یہ جوہر اور عرض بدونِ اضافت کے استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی اسم ضمیر کی طرف مضاف ہوکر اور کبھی معرف باللام ہوکر۔اور یہ لفظ بمنزلہ نفس اور خاصہ کے بولا جاتا ہے۔اور نَفْسُهٗ وَخَاصَّتُهٗ کی طرح ذَاتُهٗ بھی کہا جاتا ہے۔مگر یہ عربی زبان کے محاورات سے نہیں ہے۔

(۲) بنی طیی ذُو بمعنیٰ اَلَّذِیْ استعمال کرتے ہیں اور یہ رفعی، نصبی، جری، جمع اور تانیث کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۱٦٦) وَبِئْرِیْ ذُو حَفَرْتُ وَذُوطَوَیْتُ

یعنی کنواں جسے میں نے کھودا اور صاف کیا ہے۔

(ذا)

ہاں "هٰذا" میں "ذا" کا لفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے۔هٰـذا وَهٰـذِیْ وَهَاتا۔ان میں سے صرف هَـاتا کا تثنیہ هَاتَانِ آتا ہے۔هٰذِهٖ اور هٰذِیْ کا تثنیہ استعمال نہیں ہوتا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَرَأَیتَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ﴾ (۱۷۔۶۲) کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ (۳۸۔۵۳) یہ چیزیں ہیں جن کا ...... تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

﴿هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۴) یہ وہی ہے جس کے لیے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

﴿اِنْ هٰـذٰیـنِ لَسٰـحِرٰنِ﴾ (۲۰۔۶۳) کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔

﴿هٰـذِهِ الـنَّـارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ﴾ (۵۲۔۱۴) یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ (۵۔۴۳) یہی وہ جہنم ہے جسے گنہگار لوگ جھٹلاتے تھے۔

"هٰـذا" کے بالمقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔اس کے لیے ذَاکَ اور ذٰلِکَ استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿الٓمّٓo ذٰلِكَ الْكِتَابُ﴾ (۲۔۱،۲) الٓمّٓ یہ کتاب۔

﴿ذٰلِكَ مِـنْ اٰیـاتِ الـلّٰـهِ﴾ (۱۸۔۱۷) یہ خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔

﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّـمْ یَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰی﴾ (٦۔۱۳۱) یہ اس لیے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو...... ہلاک کردے۔

(ما ذا)

اور "مَاذا" بھی دوطرح استعمال ہوتا ہے۔اول یہ "مَـا" ذَا کے ساتھ مل کر بمنزلہ ایک اسم کے ہو۔دوم یہ کہ ذَا بمنزلہ اَلَّذِیْ کے ہو (مَا بمعنیٰ ای شیء کے ہو)

---

[1] قـالـه سنان بن فحل الطائی حین اختصم الی عبدالرحمن بن الضحاك والی المدینة (۱۰۳۔۱۰٤) ایام یزید بن عبدالملك والبیت من خمسة اوردها ابوتمام فی الحماسة رقم ۱۹۲ المرزوقی وقد عیب به علی المولف ایراده فی باب الحماسة (راجع شرح الحماسة امین الدین الطبری) وفی اللسان (زود) غیر منسوب وامالی الشجریه (۲ : ۳۰٦) والخزانة (۲ : ۵۱۱) ۱۲.

پہلی قسم کی مثال جیسے:
عَمَّاذَا تَسَاَلُ (کہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہو) اس صورت میں چونکہ "ذا" کے ساتھ مل کر ایک اسم بنتا ہے۔اس لیے "مَـا" کے الف کو حذف نہیں کیا گیا۔
اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے ❶ (الوافر)

(۱۶۷) دعِـیْ مَاذَا عَلِمْتِ سَاَتَّقِیْهِ

یعنی جو چیز تجھے معلوم ہے اسے چھوڑ دے میں اس سے بچنے کی کوشش کروں گا۔اور آیت کریمہ: ﴿يَسْـَٔـلُوْنَكَ مَـاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ (۲۔۲۱۹) اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں (کہ خدا کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں۔
میں جولوگ قُلِ الْعَفْوَ میں اَلْعَفْوَ کو نصب پڑھتے ہیں۔ وہ "مَـاذَا" کو بمنزلہ ایک اسم کے مانتے ہیں یعنی کونسی چیز صرف کریں مگر جن کے نزدیک "الـعفو" مرفوع ہے ان کے نزدیک "ذا" بمعنیٰ اَلَّذِیْ ہے اور مَا استفہامیہ ہے اَیْ مَـا الَّـذِیْ یُـنْـفِـقُوْنَ یعنی وہ کونسی چیز ہے جسے خرچ کریں۔اس بنا پر آیت کریمہ:
﴿مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۱۶۔۲۴) کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔
میں اَسَاطِیْر پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں۔ ❷

(ذ و د)

ذُدْتُهٗ: (ن) عَنْ كَذَا کے معنیٰ کسی چیز سے دفع کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدَانِ﴾ (۲۸۔۲۳) اور دیکھا ان کے ایک طرف دو عورتیں (اپنے مال کو) روکے کھڑی ہیں۔یعنی اپنے ذَوْدٌ کو روکے کھڑی ہیں۔اور ذَوْدٌ دس اونٹوں کی جماعت کو کہا جاتا ہے۔

(ذ و ق)

اَلذَّوْقُ: (ن) کے معنیٰ چکھنے کے ہیں۔اصل میں ذَوْقٌ کے معنیٰ تھوڑی چیز کھانے کے ہیں۔کیونکہ کسی چیز کو زیادہ مقدار میں کھانے پر اَكْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔قرآن پاک نے عذاب کے متعلق ذوق کا لفظ اختیار کیا ہے اس لیے کہ عرف میں اگر چہ یہ قلیل چیز کھانے کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر لغوی معنیٰ کے اعتبار سے اس میں معنیٰ کثرت کی صلاحیت موجود ہے۔لہٰذا معنیٰ عموم کے پیش نظر عذاب کے لیے یہ لفظ اختیار کیا ہے۔تاکہ قلیل وکثیر ہر قسم کے عذاب کو شامل ہوجائے قرآن پاک میں بالعموم یہ لفظ عذاب کے ساتھ آیا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ (۴۔۵۹) تاکہ (ہمیشہ) عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔
﴿وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ﴾ (۳۲۔۲۰) اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کے مزے چکھو۔
﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ (۶۔۳۰) اب کفر کے بدلے (جو دنیا میں کرتے تھے) عذاب (کے

---

❶ قالہ المثقب العبدی عائذ بن محصن وتمامہ : لٰکن بالمغیب نبئینی ۔ والبیت فی الخزانة (۲ : ۵۵٤) وابن هشام (۱ : ۳۳۳) والعینی (۱ : ٤۸۸) والسیوطی ٦۹ قال السیوطیُ اوردہ المؤلف في ماذا علٰی انها موصول اوجنس بمعنیٰ ای شیء وعلمت ضبطه النحاس بکسر التاء والاخفش عن ابی اسحاق بضمها واللسان (ذو) ونسبه الی ابی حیة النمیری والبحر ۱ : ۱۱۹ والکتاب ۱ : ٤۰۵ والشنتمری بغیر عزو ۱۲.

❷ قارن المشکل للقتبی (۱۲٤۔۱۲۵) ۱۲.

مزے) چکھو۔

﴿ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ﴾ (۴۴۔۴۹)

(اب) مزہ چکھوتو بڑی عزت والا (اور) سردار ہے۔

﴿اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ﴾ (۳۷۔۳۸)

بے شک تم تکلیف دینے والے عذاب کا مزہ چکھنے والے ہو۔

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ﴾ (۳۲۔۲۱) اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے۔

اور بعض مقامات پر رحمت کے ساتھ بھی آیا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً﴾ (۱۱۔۹) اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں۔

﴿وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ﴾ (۱۱۔۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

اور کبھی بطور استعارہ ابتلاء اور اختیار کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے اَذَقْتُهٗ كَذَا فَذَاقَ: میں نے اسے مزہ چکھایا چنانچہ اس نے چکھ لیا۔ فُلَانٌ ذَاقَ كَذَا وَاَنَا اَكَلْتُهٗ (مثل) فلاں نے تو اسے چکھا ہے اور میں کھا چکا ہوں یعنی میں نے اس سے زیادہ باخبر ہوں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ (۱۶۔۱۱۲)

تو اللہ نے ان کے اعمال کے سبب انکو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھایا۔

میں لباس کے ساتھ ذوق کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ اس سے اختبار و ابتلاء مراد ہے یعنی بھوک اور خوف سے اس طرح دوچار کیا کہ وہ انکا تجربہ کرنے لگے بعض نے کہا ہے کہ یہاں دراصل دو جملے ہیں اور تقدیر کلام یہ ہے اَذَاقَهَا طَعْمَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ وَاَلْبَسَهَا لِبَاسَهُمَا: یعنی انہیں بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا اور ان دونوں کو لباس اوڑھا دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً﴾ (۴۲۔۴۸) اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں۔

میں رَحْمَةً کے ساتھ اَذَاقَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور رحمة کے بالمقابل سَيِّئَة (یعنی سختی اور مصیبت) کے لیے اَصَابَ کا لفظ آتا ہے تو لفظ اَذَاقَ لا کر تنبیہ کی ہے کہ انسان ادنیٰ سی نعمت پا کر اترا جاتا ہے اور گھمنڈ کرنے لگ جاتا ہے اس سے آیت کریمہ:

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى﴾ (۹۶۔۶،۷) مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔ کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

❀❀❀

کِتَابُ الرَّاءِ

(ر ب ب)

اَلــرَّبُّ: (ن) کے اصل معنیٰ تربیت کرنا یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حدکمال تک پہنچانا کے ہیں اور رَبَّـہٗ ، وَرَبَّـاہٗ وَرَبَّبَہٗ تینوں ایک ہی معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں۔کسی نے کہا ہے۔ (1) لَاَنْ یَـرُبَّـنِـیْ رَجُلٌ مِنْ قُرَیْشٍ اَحَـبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ یُرَبِّنِیْ رَجُلٌ مِنْ هَــوَازِنَ: کہ کسی قریشی کا سردار ہونا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے کہ بنی ہوازن کا کوئی آدمی مجھ پر حکمرانی کرے۔ رَبٌّ کالفظ اصل میں مصدر ہے اور استعارۃً بمعنیٰ فاعل استعمال ہوتا ہے اور مطلق (یعنی اضافت اور لام تعریف سے خالی) ہونے کی صورت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو جملہ موجودات کے مصالح کا کفیل ہے ، اور کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے:

﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ﴾ (۳۴۔۱۵) عمدہ شہر اور (آخرت میں) گناہ بخشنے والا پروردگار نیز فرمایا:

﴿وَلَا یَـأْمُـرُكُـمْ اَنْ تَتَّخِذُوْا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيِّيْنَ اَرْبَــابًـا﴾ (۳۔۸۰) اور وہ تم سے (کبھی بھی) یہ نہیں کہے گا کہ فرشتوں اور انبیاء کرام کو خدا مانو (یعنی انہیں معبود بناؤ) اور مسبب الاسباب اور مصالح عباد کو کفیل سمجھو۔

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھی بولا جاتا ہے۔اور دوسروں پر بھی۔چنانچہ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱۔۱) ہر طرح کی حمد خدا ہی کو (سزاوار) ہے (جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

﴿اَللّٰهَ رَبَّكُمْ رَبَّ اٰبَآءِ كُمُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۳۷۔۱۲۶) یعنی اللہ کو جو تمہارا (بھی) پروردگار ہے اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا بھی۔

رَبُّ الدَّارِ: گھر کا مالک رَبُّ الْـفَـرَسِ: گھوڑے کا مالک اسی معنیٰ کے اعتبار سے فرمایا:

﴿اُذْكُـرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهٖ﴾ (۱۲۔۴۲) اپنے آقا سے میرا بھی تذکرہ کرنا۔سو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے تذکرہ کرنا بھلا دیا۔

﴿اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ﴾ (۱۲۔۵۰) اپنے سرکار کے پاس

---

(1) قالہ صفوان بن امية كمافى الكشاف (۱ : ۸) والمغازى لان اسحاق ومن طريقة اخرجه ابن حبان فى صحيحه والبهيقى فى الدلائل وذكر الدارقطنى فى الغرائب عن الزهرى مرسلاً كذاذكره والصواب ان صفوان قاله لكلدة بن حنبل اخيه من امه وحديثه انه لماانهزم الناس عن الرسول الله صلى الله عليه وسلم يوم حنين وتكلم الناس فقال سفيان بن حرب لاتنتهى هزيمتهم دون البحر وصرح كلدة بن حنبل الابطل السحر واليوم فقال له صفوان اسكت فض الله فاك انظر للكلمة سيرة ابن هشام ٤ : ٨٦ واللسان (ربب) والفائق (۲ : ١٤٥) واضداد ابن السكيت ٢٠٤ واضداد ابن الطيب ٣١٤ وفى اللسان (ربب) وكذا قال ابن عباس فى حوار لابن الزبير لان يربنى نبوعمى احب الى من ان يربنى غيرهم يعنى ان بنى امية خيرمنك ١٢.

لوٹ جاؤ۔ اور آیت:

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ﴾ (۱۲۔۲۳) (یوسف نے کہا) معاذ اللہ وہ (تمہارا شوہر) میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رَبِّیْ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور بعض نے عزیز مصر مراد لیا ہے لیکن پہلا قول انسب معلوم ہوتا ہے۔ ❶

رَبَّانِیٌّ بقول بعض یہ رَبَّانَ (صیغہ صفت) کی طرف منسوب ہے۔ لیکن عام طور پر فِعْلَانُ (صفت) فَعِلَ سے آتا ہے۔ جیسے عَطْشَانُ سَکْرَانُ اور فَعِلَ (فتحہ عین سے بہت کم آتا ہے) جیسے نَعْسَانَ (مِنْ نَعَس)

بعض نے کہا کہ یہ رَبٌّ (مصدر) کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسے حکیم (یعنی جو حکمت کو فروغ دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَبٌّ مصدر کی طرف ہی منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ وہ ہے جو علم سے اپنی پرورش کرے درحقیقت یہ دونوں معنیٰ باہم متلازم ہیں کیونکہ جس نے علم کی پرورش کی تو اس نے علم کے ذریعہ اپنی ذات کی بھی تربیت کی اور جو شخص اس کے ذریعہ اپنی ذات کی تربیت کرے گا وہ علم کو بھی فروغ بخشے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ رَبٌّ بمعنیٰ اللہ کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِیٌّ بمعنیٰ اِلٰهِیٌّ ہے (یعنی اللہ والا) اور اس میں الف نون زائد تان ہیں جیسا کہ جِسْمٌ وَلِحْیٌ کی نسبت میں جِسْمَانِیٌّ وَلِحْیَانِیٌّ کہا جاتا ہے ❷

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: (۱۶۸) اَنَا رَبَّانِیُّ هٰذِهِ الْاُمَّةِ: میں اس امت کا عالم ربانی ہوں اس کی جمع رَبَّانِیُّوْنَ ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْلَا یَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِیُّوْنَ﴾ (۵۔۶۳) انہیں ان کے رَبِّیْ (یعنی مشائخ) کیوں منع نہیں کرتے۔

﴿کُوْنُوْا رَبَّانِیّٖنَ﴾ (۳۔۷۸) (بلکہ دوسروں سے کہے گا) کہ تم خدا پرست ہو کر رہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ رَبَّانِیٌّ اصل میں سریانی لفظ ہے اور یہی قول انسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عربی زبان میں یہ لفظ بہت کم پایا جاتا ہے۔ ❸ اور آیت کریمہ:

﴿رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ﴾ (۳۔۴۵) بہت سے اللہ والوں نے۔ میں رِبِّیٌّ بمعنیٰ رَبَّانِیٌّ ہے۔ ❹

اَلرَّبُوْبِیَّةُ وَالرَّبَانِیَّةُ: یہ دونوں مصدر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے رَبُوْبِیَّةٌ اور دوسروں کے لیے رَبَانِیَّةٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اَلرَّبُّ (صیغہ صفت) جمع ارباب قرآن پاک میں ہے:

﴿ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (۱۲۔۳۹) بھلا دیکھو تو سہی کہ جدا جدا معبود اچھے یا

---

❶ وهذا هو قول الزجاج راجع فتح القدير للشوكاني ۳:۷ او الفيوضات الالهيه (۲:۴۴۵).

❷ والزائدتان للمبالغة في النسبة كمافي رقباني وشعراني راجع الكتاب لسيبويه واضداد ابی الطيب (۳۰۵).

❸ قال ابو عبيدة في مجازه (۱:۹۷) لم يعرفو ربانيين وفي العرب للجواليقي (۱۶۱) قال ابو عبيد احسن الكلمة ليس بعربية انما هي عبرانية او سريانية وذلك لان اباعبيدة زعم ان العرب لاتعرف الربانيين ـ زادابو عبيدوانما عرفها الفقهاء واهل العلم راجع ايضاً اللسان (ربی) وانظر في القرطبي (۴:۱۲۲) وغريب ابی عبيد.

❹ في مجاز ابی عبيدة: الربيون الجماعة الكثيرة والواحد منها ربی ايضاً قارن الفتح (۸:۱۵۵).

خدائے یگانہ اور زبردست۔

اصل تو یہ تھا کہ رَبٌّ کی جمع نہ آتی۔کیونکہ قرآن پاک میں یہ لفظ خاص کر ذات باری تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن عقیدۂ کفار کے مطابق بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے اور اَرْبَابٌ کے علاوہ اس کی جمع اَرِبَّةٌ وَرُبُوبٌ بھی آتی ہے۔چنانچہ شاعر نے کہا ہے (1) (بسیط)

(۱٦٨) كَانَتْ اَرِبَّتُهُمْ بَهْزٌ وَغَرَّهُمْ
عَقْدُ الْجِوَارِ وَكَانُوا مَعْشَرًا غُدُرًا

ان کے ہم عہد بنی بہز تھے جنہیں عقد جوار نے مغرور کر دیا اور درحقیقت وہ غدار لوگ ہیں۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے (2) (طویل)

(۱٦٩) وَكُنْتَ امْرَءًا اَفْضَتْ اِلَيْكَ رِبَابَتِيْ
وَقَبْلَكَ رَبَّنِيْ فَضِعْتُ رُبُوبُ

تم وہ آدمی ہو جس تک میری سر پرستی پہنچی ہے تم سے پہلے بہت سے میرے سر پرست بن چکے ہیں۔مگر میں ضائع ہوگیا ہوں۔رِبَابَةٌ: عہدو پیمان یا اس چیز کو کہتے ہیں جس میں قمار بازی کے تیر لپیٹ کر رکھے جاتے ہیں۔

رَابَّةٌ: وہ بیوی جو پہلے شوہر سے اپنی اولاد کی تربیت کر رہی ہو۔اس کا مذکر رَابٌّ ہے۔لیکن وہ اولاد جو پہلے شوہر سے ہو اور دوسرے شوہر کی زیر تربیت ہو یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی کی آغوش میں پرورش پا رہی ہو۔اسے رَبِيبٌ يَارَبِيْبَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع رَبَائِبُ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ﴾ (۴۔۲۳) اور تمہاری بیویوں کی (پچھلی) اولاد جو تمہاری گودوں میں (پرورش پاتی) ہے۔

رَبَّيْتُ الْاَدِيْمَ بِالسَّمْنِ: میں نے چمڑے کو گھی لگا کر نرم کیا۔

رَبَّيْتُ الدَّوَاءَ بِالْعَسَلِ: میں نے شہد سے دوا کی اصلاح کی۔سِقَاءٌ مَرْبُوْبٌ: پانی مشک جسے تیل لگا کر نرم کیا گیا ہو۔شاعر نے کہا ہے (3) (طویل)

(۱۷۰) فَكُوْنِيْ لَهٗ كَالسَّمْنِ رُبَّتْ لَهُ الْاَدَمُ

تم اس کے لیے ایسی ہو جاؤ جیسے رُبّ لگا ہوا چمڑا گھی کے لیے ہوتا ہے۔

اَلرَّبَابُ: بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ نباتات کی پرورش کرتا اور اسے بڑھاتا ہے اسی معنیٰ کے اعتبار سے مَطَرٌ کو دَرٌّ (دودھ) اور بادل کو تشبیہاً اَلْقُوحٌ (یعنی دودھیل اونٹنی) کہا جاتا ہے محاورہ ہے۔

---

(1) قاله ابو ذهيب الهزلي وبهزی بطن من سليم والبيت في اللسان (رب) والمعاني الكبير (٤٤٠.)

(2) قاله علقمة بن عبده في قصيدة مفضلية (٢: ١٩٤) وفي روايته اماتني بدل ربابتي وربتني)بتاء التانيث والبيت في منتهى الطلب (١: ٢٩) والطبرى (١: ٦٢ / ٣١: ٣٢٧) واللسان (رب) ومختار الشعر الجاهلي (١: ٣٢١) والعقد الثمين (١٠٧) وايام العرب ٥٧ وفي الهامش قال بعض مصحح اللسان قال الصاغاني والرواية "انت امرءٌ" والمخاطب حارث بن نضلة ١٢.

(3) قال عمرو بن شاس الاسدى يخاطب امرئته ام احسان ابنة الحارث وكانت تكره ابنه عرارافطلقها ثم ندم ولام نفسه وصدره فان كنت مني او تريدين صحبتي ـ وقوله ربت له الادم اى جعل فيها الرب لئلا تفسد والادم واحدها اديم يريد الاسقية التي يجعل فيها الرب لتصلح للسمن وفي رواية اسد الغابة به بدل له والبيت في الحماسة مع المرزوقي ٢٨٠ والشعراء ٣٨٩ والكامل ١٥٤ والطبقات للجمحي ٧٦ وانظر والابيات ايضاً في الاغاني (١٠: ٦٠) والامالي (٢: ١٨٤-١٨٥) وفي روايته رب له الادم والتبريزی (والسمط ٨٠٣).

اَرَبَّتِ السَّحَابَۃُ: بدلی متواتر برستی رہی اوراس کے اصل معنیٰ ہیں بدلی صاحب تربیت ہوگئی۔اس کے بعد اس سے ٹھہرنے کا معنیٰ لے کر یہ لفظ کسی جگہ پر مقیم ہونے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔جیسے اَرَبَّ فُـلَانٌ بِمَکَان کَذَا: اس نے فلاں جگہ پر اقامت اختیار کی۔

رُبَّ تقلیل کے لیے آتا ہے اور کبھی تکثیر کے معنیٰ بھی دیتا ہے۔❶

جیسے فرمایا:

﴿رُبَـمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوا لَوکَانُوا مُسْلِمِیْنَ﴾ (۱۵۔۲) کافر بہتیرے ہی ارمان کریں گے (کہ) اے کاش (ہم بھی) مسلمان ہوئے ہوتے۔

(ر ب ح)

اَلـرِّبْحُ: وہ فائدہ جو خرید وفروخت سے حاصل ہو مجازاً ثمرۂ اعمال کو بھی رِبْحٌ کہا جاتا ہے۔اس کی نسبت کبھی سامان تجارت کی طرف ہوتی ہے۔اور کبھی صاحب سامان کی طرف۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَـمَـا رَبِحَتْ تِجَارَتُھُمْ﴾ (۲۔۱۶) سو نہ تو ان کی تجارت سودمند ہوئی۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

(۱۷۱) قَـرَوْا اَضْیَافَھُمْ رُبَحًا بِبَحٍ

بعض نے کہا ہے کہ رُبَحٌ ایک پرندے کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ رُبَحٌ بمعنیٰ چربی ہے لیکن ہمارے خیال میں رُبَحٌ سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو رِبْحٌ سے حاصل ہوئی ہو جیسا کہ نَقص سے جو اثر ظاہر ہوتا ہے اسے نُقص کہا جاتا ہے۔اور بُـحٌّ قرعہ اندازی یا قمار بازی کے تیر کو کہتے ہیں۔تو شعر کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے اپنے مہمانوں کی مہمان داری سے تعریف کا بہت بڑا فائدہ حاصل کیا جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔❷ (طویل)

(۱۷۲) فَاَوْسَعَنِی حَمْدًا و اَوْسَعْتُہٗ قِرِیً
وَاَرْخِـصْ بِـحَـمْـدٍ کان کَاسِبُہٗ الْاَکْلُ

اس نے میری تعریف میں فروگذاشت نہ کی اور میں نے بھی اس کی خوب مہمان نوازی کی۔وہ تعریف کتنی سستی ہے جو چند لقموں سے حاصل ہو جائے۔

(ر ب ص)

اَلتَّـرَبُّصُ کے معنیٰ انتظار کرنے کے ہیں۔خواہ وہ انتظار سامان تجارت کی گرانی یا ارزانی کا ہو یا کسی امر کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا ہو۔تَرَبَّصْتُ لِکَذَا وَلِیْ رُبْصَۃٌ لِکَذَا وَتَرَبُّصٌ: کسی چیز کا انتظار کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْـمُـطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ﴾ (۲۔۲۲۸) مطلقہ عورتوں کو چاہیے کہ انتظار کریں۔

﴿قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّی مَعَکُمْ مِنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ﴾ (۵۲۔۳۱) ان سے کہو کہ (بہت اچھا) تم (بھی) انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔

﴿قُـلْ ھَـلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ وَنَـحْـنُ نَتَـرَبَّـصُ بِکُمْ﴾ (۹۔۵۲) اے پیغمبر! ان

---

❶ قالہ خفان بن ندبہ وتمامہ یعیش بفضلھن الحی سمر۔ والبیت فی اللسان والمحکم والتاج (ربح بح) وقبلہ: اذا الحسناء لم ترحص یدیھا ولم یقصر لھا بصر بستر.

❷ البیت فی الفاضل للمبرد (۲۸) والحماسۃ (۴: ۶۳) والمرزوقی (۱۵۶۹) فی ثلاثۃ بغیر عزو ۱۲.

لوگوں سے) کہو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے (خواہ نخواہ) ایک نہ ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمہارے حق میں انتظار کرتے ہیں۔

(ر ب ط)

رَبْطُ الْفَرَسِ کے معنیٰ گھوڑے کو کسی جگہ پر حفاظت کے لیے باندھ دینے کے ہیں اور اسی سے رِبَاطُ الْجَیْشِ ہے یعنی فوج کا کسی جگہ پر متعین کرنا اور وہ مقام جہاں حفاظتی دستے متعین رہتے ہوں اسے رِبَاط کہا جاتا ہے۔ اور رَبَطْتُ وَرَابَطْتُ کا مصدر بھی رِبَاط آتا ہے۔ اور مُرَابَطَةٌ کے معنیٰ حفاظت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (۸۔۶۰) اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھے رکھنے سے جس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو مرعوب کرو۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾ (۳۔۱۹۹) (ان تکلیفوں کو جو راہ خدا میں تم کو پیش آئیں) برداشت کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہو۔

پس معلوم ہوا کہ مُرَابَطَة کی دو قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ اسلامی سرحدوں پر دفاع کے لیے پہرہ دینا اور دوسرے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنا اور اس میں کوتاہی نہ کرنا۔ جیسے مجاہدۂ نفس کی صورت میں ہوتا ہے اور اس مجاہدہ نفس کا ثواب بھی جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے[1]: مِنَ الرِّبَاطِ اِنْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ: کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا بھی ”رباط“ ہے۔ فُلَانٌ رَابِطُ الْجَأْشِ فلاں مضبوط دل ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِهَا﴾ (۲۸۔۱۰) اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کیے رہتے (تو عجب نہ تھا کہ وہ ہمارا معاملہ ظاہر کر دیتیں)۔

﴿وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ﴾ (۸۔۱۱) تاکہ تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھائے۔

اور اسی معنیٰ کی طرف دوسرے مقام پر اشارہ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ (۵۸۔۲۲) وہ خدا ہی تو تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل ڈالا اور اپنے فیضان غیبی سے ان کی تائید کی۔

کیونکہ ان کے دل ایسے نہیں تھے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (ہیں کہ) ہوا ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

اور اسی سے فُلَانٌ رَابِطُ الْجَأْشِ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنیٰ مضبوط دل شخص کے ہیں۔

(ر ب ع)

اَرْبَعٌ وَّاَرْبَعُوْنَ وَرُبُعٌ وَرِبَاعٌ: ان سب کی ایک ہی اصل ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸۔۲۲) (اصحاب

[1] اخرجه ابن حبان فی زوائده من حدیث جابر انظر رقم ۱۶۱ وفی روایته افضل الرباط انتظار الصلوة بعدالصلوة (عب وابن جریر عن ابی هریرة) راجع كنزالعمال ۱۲.

کہف) تین تھے اور چوتھا (ان کے ساتھ) ان کا کتا تھا۔
﴿اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (۵۔۲۶) چالیس برس تک (وہ سرزمین ان کے نصیب نہ ہوگی اور) اس بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔
﴿اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (۷۔۱۴۲) (یوں) چالیس رات (کا وعدہ پورا ہوگیا)
﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ (۴۔۱۲) اور تم کچھ (ترکہ) چھوڑ مرو تو بیویوں کا حصہ چوتھائی ہے۔
﴿مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ (۴۔۳) دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کرلو۔
رَبَعْتُ الْقَوْمَ: (۱) میں نے قوم سے چوتھائی حصہ وصول کیا۔ (۲) میں نے انہیں چار بنادیا۔
رَبَعْتُ الْحَبْلَ: رسی کو چار ریشوں سے بٹنا۔
رِبْعٌ (۱) چار دن کے پیاسے اونٹ۔ (۲) چوتھیا بخار
اَرْبَعَ اِبِلَهٗ: اونٹوں کو چوتھے روز پانی پلانا۔
رَجُلٌ مَرْبُوْعٌ وَمُرْبَعٌ: جسے چوتھیا بخار ہو۔
اَلْاَرْبِعَاءُ چہار شنبہ۔ کیونکہ عربی میں ہفتہ کا پہلا دن اتوار ہے۔ جسے یوم الاحد کہا جاتا ہے۔
رَبِيْعٌ: موسم بہار (کیونکہ یہ سال کا چوتھا موسم ہے) اسی سے محاورہ ہے:
رَبَعَ فُلَانٌ وَارْتَبَعَ: اس نے فلاں جگہ پر موسم بہار گذارا مجازاً کسی جگہ پر اقامت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ اقامت موسم بہار میں ہو یا کسی اور موسم میں ہو۔ حتیٰ کہ ہر منزل کو رَبْعٌ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اصل معنیٰ موسم ربیع کی اقامت گاہ کے ہیں۔
اَلرُّبَعُ وَالرُّبَعِیُّ: جانور کا وہ بچہ جو موسم ربیع میں پیدا ہو اور موسم بہار جانوروں کی ولادت کے لیے چونکہ سال میں پہلا اور بہتر موسم ہے اس لیے استعارہ کے طور پر وہ بچہ جو کسی کے ہاں عالم شباب میں پیدا ہوا ہو رِبْعِیٌّ کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے:❶
اَفْلَحَ مَنْ كَانَ لَهٗ رِبْعِيُّوْنَ: سعادت مند ہے وہ شخص جس کے ہاں عالم شباب میں اولاد ہو جائے۔
اَلْمِرْبَاعُ: موسم بہار میں بچہ دینے والی اونٹنی۔
غَيْثٌ مُرْبِعٌ: موسم بہار کی بارش۔
رَبَعَ الْحَجَرَ وَالْحِمْلَ پتھر یا بوجھ کو چاروں طرف سے پکڑ کر اٹھانا۔
اَلْمِرْبَعُ: لکڑی جس کے ذریعہ چوپایہ پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ اِرْبَعْ عَلٰى ظَلْعِكَ: یعنی طاقت سے زیادہ کام نہ کرو یا تو رَبَعَ بمعنیٰ اقامۃ سے ہے اور یا رَبَعَ الْحَجَر سے اَلْمِرْبَاعُ: اموال غنیمت کا چوتھا حصہ جو رئیس قبیلہ وصول کیا کرتا تھا یہ رَبَعْتُ الْقَوْمَ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ رُبْعٌ وصول کرنے کے ہیں اور اسی سے استعارہ کے طور پر رِبَاعَةٌ بمعنیٰ سیادت آتا ہے۔ مشہور مثل ہے:

---

❶ وقبله : ان بنی صبية صفيون والشطر قد اصبح مثلاً يضرب فی التندم علی مافات وقد تمثل بهما سليمان بن عبدالملك وهو يجود بنفسه الفائق (۲: ۲۵) و الاخبار الطوال (۳۳۰) والمثل فی الميدانی (۱: ۱٤) والرجز ايضاً فی الاصلاح (۲٦۲،٤۷۰) والحيوان (۱: ۱۰۹) والاشتقاق: (۱۰۲,٤۳) والعقد (۳: ۱۰۳) والمقاييس (۳: ۳۲٦) والالفاظ (۳۹٦) والفائق (۲: ٤۷) والمخصص (۱: ۳۰) والمحكم والتاج (ربع) وجمهرة الامثال (۱: ٤۰) واللسان (ربع ،صيف) والشطر الثانی فی شرح الحماسة للمرزوقی ۱۳۹٥ والاول فی المعانی للقتبی ۳۱۱ واختلف فی اول قائله ففی نوادر ابی زيد ۸۷ هو اكثم بن صيفی وفی الميدانی سعد بن مالك بن ضبعة وقيل بن معاوية بن قشير وفی محاضرات المؤلف (۳: ۲۰۱) قاله دهقان لملك من ملوك العجم وفيه الخبر و فی اللسان اواكثم بن صيفی ۱۲.

لَا یُقِیمُ رِبَاعَةَ الْقَوْمِ اِلَّا فُلَانٌ کہ قوم کی سیاست کی باگ ڈور فلاں شخص ہی سنبھال سکتا ہے۔

رَبِیعَۃٌ: (ایضاً) اصل میں ڈبیہ کو کہا جاتا ہے۔کیونکہ اس کے چار طبقے یا چار نگیں ہوتی ہیں۔

اَلرُّبَاعِیَّتَان: دو دانتوں کا نام۔بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان چونکہ چار دانتوں کا فاصلہ ہوتا ہے اس لیے انہیں رباعیتان کہا جاتا ہے۔

اَلْیَرْبُوعُ: جنگلی چوہا۔کیونکہ یہ چوکھا بل بناتا ہے۔

اَرْضٌ مَرْبَعَۃٌ: بہت چوہوں والی زمین جیسا کہ زیادہ سوسمار والی زمین کو مُضَبَّۃ کہا جاتا ہے۔

(ر ب و)

رَبْوَۃٌ: (مثلثۃ الراء) وَرَبَاوَۃ (بفتح الراء وکسرھا) بلند جگہ یا ٹیلے کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ﴾ (۲۳۔۵۰) ایک اونچی جگہ جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب (بھی تھی)۔

ابوالحسن نے کہا ہے کہ رَبْوَۃٌ کا لفظ زیادہ جید ہے۔کیونکہ اس کی جمع رُبًی آتی ہے۔اور رَبَا فُلَانٌ فلاں اونچی جگہ پر چلا گیا۔اور رَبْوَۃ کو رَابِیَۃ بھی کہا جاتا ہے گویا وہ خود بلندی پر ہے اور اسی سے رَبَا ہے جس کے معنٰی بڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَاۗءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ (۲۲۔۵) پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہلہانے اور ابھرنے لگتی ہے۔

﴿فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔

﴿فَاَخَذَھُمْ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً﴾ (۶۹۔۱۰) تو خدا نے بھی انہیں بڑا سخت پکڑا۔

اَرْبٰی عَلَیْہِ: کسی پر بلند ہونا یا کسی کی نگرانی کرنا۔

رَبَیْتُ الْوَلَدَ فَرَبَا: میں نے بچے کی تربیت کی چنانچہ وہ بڑھ گیا بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں رَبَبْتُ ہے۔ تخفیف کے لیے ایک باء کو یاء سے بدل دیا۔جیسا کہ تَظَنَّیتُ کہ اصل میں تَظَنَّنْتُ ہے تخفیفاً ایک نون کو یاء سے تبدیل کر دیا ہے۔

اَلرِّبَا: (سود) رأس المال یعنی اصل سرمایہ پر جو بڑھوتی لی جائے وہ رِبٰو کہلاتی ہے۔لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ زیادہ ہونے کے اعتبار سے فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ﴾ (۳۰۔۳۹) اور تم جو چیز (عطیہ) زیادہ لینے کے لیے دو تا کہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتی ہو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھے گی۔

اور آیت:

﴿یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ﴾ (۲۔۲۷۶) اللہ سود کو بے برکت کرتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔ میں محق کا لفظ لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ "ربا" یعنی سود میں برکت نہیں ہوتی اس کے مقابلہ میں زکوۃ کے متعلق فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰۗئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾ (۳۰۔۳۹) اور جو تم (محض) خدا کی رضا جوئی کے ارادے سے زکوۃ دیتے ہو تو جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی اپنے دیئے ہوئے کو خدا کے ہاں بڑھا رہے ہیں۔

اَلْاُرْبِیَّتَان: سرینوں کے جوڑ ھے۔

اَلـرَّبْوُ: سانس پھولنا۔سانس پھول کر چونکہ اوپر کو چڑھتا ہے اس لیے اس کو رَبْــــــوٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ سانس پھولے ہوئے آدمی کے متعلق هُـوَ يَتَنَفَّسُ الصَّعْدَاء کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اور اَلــرَّبِيئَةُ: جس کے معنیٰ جاسوس ہیں (رب ء) سے ہے اور اس مادہ (رب و) سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

(ر ت ع)

رَتَـعَ (ف) رَتْعًا وَرُتُوعًا ۔وَرَتْعَةً کے اصل معنیٰ جانوروں کے چرنے کے ہیں۔پھر استعارہ کے طور پر انسانوں کے جی بھر کر کھانے پینے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَـرْتَـعْ وَيَـلْـعَـبْ﴾ (۱۲۔۱۲) کہ (جنگل کی پھل پھلاری) کھائے پیئے اور کھیلے (کودے)

اور تشبیہ کے طور پر (بدگوئی کے معنیٰ میں بھی آتا ہے (جیسا کہ) شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۱۷٤) وَإِذَا يَـخْـلُوْلَهُ لَحْمِیْ رَتَعْ

جب تنہائی میں اس کے پاس ہوتا تو میرا گوشت کھانے لگ جاتا ہے یعنی غیبت کرتا ہے۔

مویشی کے لیے راتـع کی جمع رِتَــاعٌ آتی ہے اور انسان کے لیے رَاتِعُوْنَ۔

(ر ت ق)

اَلـرَّتْقُ: اس کے اصل معنیٰ جوڑنا اور ملانا کے ہیں خواہ خلقی طور پر ہو یا صناعی طریقہ سے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿كَـانَتَـا رَتْـقًا فَفَتَقْنَاهُمَا﴾ (۲۱۔۳۰) (کہ آسمان وزمین) دونوں ایک ہیولیٰ تھے تو ہم نے (اس کو توڑ کر) زمین وآسمان کو الگ الگ کیا۔

رَتْـقَاء: وہ عورت جس کی شرمگاہ کے دونوں کنارے باہم چسپیدہ ہوں اور اس سے ہم بستری نہ ہو سکے۔

مشہور محاورہ ہے:

فُــلَانٌ رَاتِـقٌ وَفَـاتِقٌ فِي كَذَا (مثل) فلاں اس معاملہ میں کرتا دھرتا ہے۔

(ر ت ل)

اَلرَّتَلُ: کسی چیز کا حسن تناسب کے ساتھ منتظم اور مرتب ہونا۔رَجُـلٌ رَتَـلُ الْاَسْـنَـانِ آدمی جس کے دانت آبدار اور حسن ترتیب کے ساتھ ہوں اور تَــرتِيل کے معنیٰ سہولت اور حُسن تناسب کے ساتھ کسی کلمہ کو ادا کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَتِّـلِ الْـقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ (۷۳۔۴) اور تم قرآن پاک کو خوب حسن ترتیب کے ساتھ پڑھا کرو۔

﴿وَرَتَّـلْـنَــاهُ تَرْتِيْــلًا﴾ (۲۵۔۳۲) اور ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب اور تناسب کے ساتھ اتارا۔

(ر ج ج)

اَلــرَّجُّ (ن) اس کے معنیٰ کسی چیز کو ہلانے اور جنبش دینے کے ہیں اور اِرْتِــجَــاج (افتعال) اس کا

---

[1] مقید القافیہ قالہ سوید بن کاهل الیشکری فی کلمۃ مفضلیۃ ۱۸۸ بیتاً بعضها فی الامالی (۱:۱۰۱،۲:۳۱۹) وصدره : ويحيني اذا لاقيته والبیت فی اللسان (رتع) والشعراء ۲۵۱ والخزانۃ (۲ :۵٤۷) وشواهد الكشاف ۷۲ وفی روایۃ اذا يخلوبدل خلوا وحبيب لی بدل ويحيين ۱۲۔

مطاوع ہے جس کے معنیٰ ہلنے اور مضطرب ہونے کے ہیں ۔جیسے رَجَّـهٗ فَـارْتَجَّ: اسے ہلایا چنانچہ وہ ہلنے لگا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا﴾ (۵۶۔۴) اور قیامت اس وقت واقع ہوگی۔ جب کہ زمین بڑے زور سے ہلنے لگے گی۔

اسی کو دوسرے مقام پر: ﴿اِذَا زُلْـزِلَـتِ الْاَرْضُ﴾ (۹۹۔۱) (جب زمین بڑے زور سے ہلادی جائے گی۔ سے تعبیر کیا ہے۔

اَلـرَّجْرَجَةُ: اضطراب۔ کَتِیبَةٌ رَجْرَاجَةٌ: لشکر جرار۔ جَارِيَةٌ رَجْرَاجَةٌ: تھرتھرا کر چلنے والی چھوکری۔ اِرْتَجَّ کَلَامُهٗ: کلام کرتے وقت آواز میں گونج اور لہر پیدا ہونا۔ رِجْرِجَة: تھوڑا سا پانی جو ہلانے سے گدلا ہو جائے۔

(ر ج ز)

اَلـرِّجْـزُ: اس کے اصل معنیٰ اضطراب کے ہیں۔ اور اسی سے رَجَـزَ الْبَعِیرُ ہے جس کے معنیٰ ضعف کے سبب چلتے وقت اونٹ کی ٹانگوں کی کپکپائی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے ہیں ایسے اونٹ کو اَرْجَـزُ اور ناقہ کو رَجْزَاء کہا جاتا ہے اور شعر کے ایک بحر کا نام بھی رَجَـزٌ ہے جس میں شعر پڑھنے سے زبان میں اضطراب سا معلوم ہوتا ہے اور جو قصیدہ اس بحر میں کہا جائے اسے اُرْجُـوْزَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع اَرَاجِیْز آتی ہے اور رَجَـزَ فُـلَانٌ وَارْتَجَزَ کے معنیٰ بحر رجز پر شعر بنانے یا اُرجُوہ پڑھنے کے ہیں اور رجـز گو شاعر کو رَاجِـزٌ ، رَجَّازٌ اور رجَّازَة کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿عَذَابٌ مِنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ﴾ (۳۴۔۵) (ان کے لیے عذاب دردناک کی سزا ہے۔ میں لفظ رِجْز زلزلہ کی طرح عذاب سے کنایہ ہے اور فرمایا:

﴿اِنَّـا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۹۔۳۴) ہم ان پر ایک آسمانی آفت نازل کرنے والے ہیں۔

﴿وَالـرُّجْـزَ فَـاهْجُرْ﴾ (۷۴۔۵) اور نجاست سے الگ رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رُجْـزٌ سے بت مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر وہ عمل مراد لیا ہے جس کا نتیجہ عذاب ہو اور گناہ کو بھی مآل کے لحاظ سے عذاب کہا جاسکتا ہے۔ جیسے ندی بمعنیٰ شحم آجاتا ہے اور آیت:

﴿وَيُـنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُـذْهِـبَ عَـنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ﴾ (۸۔۱۱) اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی کو تم سے دور کرے۔

میں رِجْزَ الشَّيْطَان سے مراد خواہشات نفسانی ہیں جیسا کہ اس کے محل میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے کفر بہتان طرازی ، فساد انگیزی وغیرہا گناہ مراد ہیں جس کی شیطان ترغیب دیتا ہے۔

رِجَازَةٌ وہ کمبل جس میں پتھر وغیرہ باندھ کر اونٹ کے ہودہ...... کا توازن قائم رکھنے کے لیے ایک طرف باندھ دیتے ہیں۔ اس میں بھی حرکت واضطراب کے معنیٰ ملحوظ ہیں۔

(ر ج س)

اَلـرِّجْـسُ: پلید، ناپاک، جمع اَرْجَاسٌ کہا جاتا ہے رَجُـلٌ رِجْـسٌ: ناپاک آدمی۔ وَرِجَـالٌ

اَرْجَاسٌ: قرآن پاک میں ہے:

﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ﴾ (۵۔۹۰)(توبس) ناپاک اورشیطانی کام ہیں۔

جاننا چاہئے کہ رِجْسٌ چار قسم پر ہے۔(۱)صرف طبیعت کے لحاظ سے(۲)صرف عقل کی جہت سے۔(۳)صرف شریعت کے روسے۔ (۴) ہرسہ کی روسے جیسے میتۃ (مردار) سے انسان کی طبعی نفرت بھی ہے اور عقل وشریعت کی روسے بھی ناپاک ہے۔رجس شرعی، جیسے جوا اورشراب ہے کہ شریعت نے انہیں رجس قراردیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ چیزیں عقل کی روسے بھی رجس ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۲۔۲۱۹)(مگر) فائدہ سے ان کا گناہ (اورنقصان) بڑھ کر۔ میں اسی معنیٰ پر تنبیہ کی ہے کیونکہ جس چیز کا نقصان اس کے نفع پر غالب ہو ضروری ہے کہ عقل سلیم اس سے مجتنب رہنے کا حکم دے اسی طرح کفار کو رجس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ شرک کرتے ہیں اورشرک عندالعقل قبیح ترین چیز ہے جیسے فرمایا:

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ رِجْسٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ﴾ (۹۔۱۲۵)اورجن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) خباثت پر ایک اورخباثت بڑھاوی۔

﴿وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ﴾ (۱۰۔۱۰)اورخدا (شرک وکفرکی) نجاست انہیں لوگوں میں ڈالتا ہے جو (دلائل وحدانیت) میں عقل کو کام میں نہیں لاتے۔

بعض نے رِجْسٌ سے نتن (بدبودار) اوربعض نے عذاب مراد لیا ہے اوریہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ (۹۔۲۸)مشرک تو (نرے) گندے ہیں۔ میں مشرکین کواورآیت کریمہ:

﴿اَوْلَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ﴾ (۶۔۱۴۵)(یا سورکا گوشت کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں۔ میں خنزیر کے گوشت کورجس کہا گیا ہے یعنی شرعاً ناپاک ہونا مراد ہے۔

رَجْسٌ وَرَجْزٌ: سخت آواز چیخ۔ بَعِیْرٌ رَجَّاسٌ: مست اونٹ غَمَامٌ ، رَاجِسٌ وَرَجَّاسٌ: بہت گرجنے والا بادل۔

(ر ج ع)

اَلرُّجُوْعُ: اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کے اپنے مبدأ حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں۔خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اورخواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جزؤ کے اور یا باعتبار (فعل کے ہو) الغرض رجوع کے معنیٰ عود کرنے اورلوٹنے کے ہیں اوررَجْعٌ کے معنیٰ لوٹانے کے اوررَجْعَةٌ کا لفظ طلاق کے بعدرجوع کرنے یا موت کے بعددنیا کی طرف لوٹنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے[1]: فُلَانٌ یُؤْمِنُ بِالرَّجْعَةِ: فلاں رجعت پر ایمان رکھتا ہے اوررِجَاع کا لفظ خاص کر پرند کے اپنی جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد واپس اس طرف لوٹ آنے پر بولا جاتا ہے چنانچہ رجوع کے معنیٰ میں فرمایا:

﴿لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَی الْمَدِیْنَةِ﴾ (۶۳۔۸)اوریہ منافق

---

[1] قال فی اللسان ومن جملتهم طائفة من الرافضة یقولون ان علی بن ابی طالب مستتر فی السحاب فلایخرج مع من خرج من ولده حتیٰ ینادی منادمن السماء :اخرج مع فلان ۱۲.

کہتے ہیں کہ اگر مدینے لوٹ کر گئے۔

﴿فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰی اَبِیْهِمْ﴾ (۱۲۔۶۳) تو جب (یہ لوگ) اپنے والد کے پاس لوٹ کر گئے۔

﴿وَلَمَّا رَجَعَ مُوسٰی اِلٰی قَوْمِهٖ﴾ (۷۔۱۵۰) اور جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے۔

﴿وَاِنْ قِیلَ لَکُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوْا﴾ (۲۴۔۲۸) اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ آؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ۔ رَجَعْتُ عَنْ کَذَا: میں نے فلاں بات سے رجوع کرلیا رَجَعْتُ الْجَوَابَ: (متعدی) جواب دینا جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰی طَآئِفَةٍ﴾ (۹۔۸۳) اگر خدا تم کو (جہاد پر سے ان منافقوں کے) کسی گروہ کی طرف (صحیح وسلامت) لوٹا کر لے جائے۔

﴿اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُکُمْ﴾ (۱۱۰۔۴) تم (سب) کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی﴾ (۹۶۔۸) بے شک (ان سب کو) تمہارے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ﴾ (۱۰۔۴) اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔

مَرْجِعٌ رُجُوعٌ سے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ آیت: ﴿ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (۲۔۲۸) پھر اس کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

میں ہے اور رَجْعٌ (متعدی) سے بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ایک قرأت: ﴿ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (۲۔۲۸) پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

بھی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّقُوا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیهِ اِلَی اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۸۱) اور دیکھو اس دن (کی پرسش) سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹائے جاؤ گے۔

میں ایک قرأت تَرْجِعُوْنَ (بصیغۂ معروف) بھی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ (۴۳۔۲۸) کہ (اب بھی) یہ لوگ باز آجائیں۔

میں رَجُوعٌ عَنِ الذَّنْبِ: یعنی گناہ سے باز آجانا مراد ہے اسی طرح آیت:

﴿وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَکْنَاهَا اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۵) کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہے کہ توبہ کرکے شرک وکفر یا گناہوں سے باز آجائیں کیونکہ مرنے کے بعد توبہ نہیں ہے اسی بنا پر منافقین کو استہزاء کے طور پر کہا جائے گا۔

﴿ارْجِعُوْا وَرَآئَکُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾ (۵۷۔۱۳) (الایۃ) تو (ان سے کہا جائے گا) کہ (نہیں) اپنے پیچھے (یعنی دنیا) کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) کوئی اور روشنی تلاش کرو۔

(یعنی توبہ کرکے ایمان لاؤ جو اس روشنی کا سبب ہے۔ اور آیت:

﴿بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (۲۷۔۳۵) کہ ایلچی کیا لے کر آتے ہیں۔

میں یَرْجِعُ رجوع سے بھی ہوسکتا ہے اور رَجْعَ الْجَوَابِ سے بھی جیسا کہ فرمایا:

﴿یَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضِ نِ الْقَوْلَ﴾ (۳۴۔۳۱) اور ایک کی بات ایک رد کر رہا ہوگا۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ﴾ (۲۷۔۲۸) پھر ان سے (الگ) ہٹ جا۔ اور دیکھتا رہ کہ لوگ کیا جواب دیتے ہیں۔

میں یَرْجِعُوْنَ رَجَعَ الْجَوَابَ سے ہے نہ کہ رجوع سے اور آیت کریمہ:

﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾ (۸۶۔۱۱) اور پانی برسانے والے آسمان کی قسم۔

میں رَجْعٌ کے معنیٰ بارش کے ہیں اور بارش کو رَجْعٌ اس لیے کہا گیا ہے کہ اولاً سمندروں سے بخارات بن کر پانی اوپر چلا جاتا ہے اور پھر ہوا بارش کی صورت میں انہیں زمین پر واپس لے آتی ہے اور تالاب کو بھی رَجْعٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لیے کہ اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ اس کی لہروں میں تلاطم ہوتا رہتا ہے محاورہ ہے:

لَيْسَ لِكَلَامِهٖ مَرْجُوْعٌ: اس کی بات کا جواب نہیں۔

دَابَّةٌ لَّهَا مَرْجُوْعٌ: وہ جانور جسے استعمال کے بعد بیچنا ممکن ہو۔

نَاقَةٌ رَاجِعٌ: اونٹنی جو جفتی سے حاملہ نہ ہو گویا وہ نر کے نطفہ کو واپس لوٹا دیتی ہے۔

اَرْجَعَ يَدَهٗ اِلٰى سَيْفِهٖ: اس نے تلوار سونتنے کے لیے ہاتھ کو واپس لوٹایا۔

اَلْاِرْتِجَاعُ: (افتعال) واپس لے لینا۔ اِرْتَجَعَ اِبِلًا۔ نر شتر بیچ کر ان کے عوض مادہ شتر خریدنا اس میں اگرچہ بعینہٖ چیز کو لوٹانے کے معنیٰ نہیں پائے جاتے لیکن پہلی تقدیراً واپس لوٹانے کے معنیٰ ملحوظ ہیں۔

اِسْتَرْجَعَ فُلَانٌ۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہا۔

اَلتَّرْجِيْعُ: (۱) غنا یا قرأت کے وقت آواز کو حلق میں لوٹانا۔ (۲) کوئی بات دوبارہ کہنا، اسی سے ترجیع فی الاذان ہے جس کے معنیٰ اذان میں شہادتین کو ایک مرتبہ پست آواز سے کہنے کے بعد دوبارہ بلند آواز سے کہنے کے ہیں۔

اَلرَّجِيْعُ: (۱) انسان یا چوپایہ کا فضلہ، اسے اگر رجوع سے مانا جائے تو فعیل بمعنیٰ فاعل ہوگا اور اگر رَجْعٌ (متعدی) سے مانا جائے تو فعیل بمعنیٰ مفعول ہوگا۔

جُبَّةٌ رَجِيْعٌ: وہ جبہ جسے ادھیڑ کر دوبارہ سلا گیا ہو۔

(۲) نیز رجیع اس سواری کو کہتے ہیں کہ جو ایک سفر سے واپس آنے کے بعد متصل ہی دوسرے سفر پر چلی جائے اس کی مؤنث رَجِيْعَةٌ ہے اور کنایہ کے طور پر کثرت اسفار کی وجہ سے لاغر اور دبلی سواری کو بھی دَابَّةٌ رَجِيْعٌ وَرَجْعُ سَفَرٍ کہہ دیتے ہیں۔

(۳) نیز مکرر کلام کو بھی رَجِيْعٌ کہا جاتا ہے۔ (۴) وہ کلام جو بوجہ کراہت متکلم کی طرف لوٹا دی جائے اسے بھی رَجِيْعٌ ہی کہا جاتا ہے۔

(ر ج ف)

اَلرَّجْفُ: (ن) اضطراب شدید کو کہتے ہیں اور (رَجَفَتِ الْاَرْضُ اَوِ الْبَحْرُ) کے معنیٰ زمین یا سمندر میں زلزلہ آنا کے ہیں۔ بَحْرٌ رَجَّافٌ: متلاطم سمندر قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ﴾ (۷۳۔۱۴) جب کہ زمین اور پہاڑ ہلنے لگیں گے۔

﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ (۷۹۔۶) جب کہ زمین لرز جائے گی۔

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ (۷۔۷۸) پس ان کو زلزلے

نے پالیا۔

اَلْاِرْجَافُ: (افعال) کوئی جھوٹی افواہ پھیلا کر یا کسی کام کے ذریعہ اضطراب پھیلانا کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ﴾ (۳۳۔۶۰) اور جو لوگ مدینے میں جھوٹی افواہیں پھیلاتے ہیں۔

مثل مشہور ہے۔ ❶ اَلْاَرَاجِیْفُ مَلَاقِیْحُ الْفِتَنِ: کہ جھوٹی افواہیں فتنوں کی جڑ ہیں۔

(ر ج ل)

اَلرَّجُلُ: کے معنیٰ مرد کے ہیں اس بنا پر قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا﴾ (۶۔۹) اگر ہم (رسول کا مددگار) کوئی فرشتہ بناتے تو اس کو بھی آدمی ہی بناتے۔

رَجُلَةٌ: عورت جو مردسی وضع اختیار کرلے۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۱۷۵) "لَمْ يُبَالُوا حُرْمَةَ الرَّجُلَةِ"

اس مرد نما عورت کی حرمت کی پرواہ نہ کی۔

اور رَجُلٌ کے معنیٰ مرد کامل بھی آتے ہیں جس میں مردانگی کے جوہر نمایاں ہوں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَاءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى﴾ (۳۶۔۲۰) اور شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا آیا۔

رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ: فرعون کے لوگوں میں سے ایک مرد مومن یعنی جو قوی اور بہادر تھا (یہ ماجرا سن کر بولا) ﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ﴾ کیا تم (صرف اتنی بات پر) ایک شخص کے قتل کے درپے ہو کہ وہ اللہ ہی کو اپنا پروردگار بناتا ہے۔ محاورہ ہے: هُوَ اَرْجَلُ الرَّجُلَيْنِ: کہ وہ دونوں میں زیادہ جوانمرد ہے۔

اَلرِّجْلُ: پاؤں۔ اس کی جمع اَرْجُلٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَامْسَحُوا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (۵۔۶) اپنے سروں کا مسح کرلیا کرو اور اپنے پاؤں بھی ٹخنوں تک دھولیا کرو۔

رَاجِلٌ وَرَجِلٌ: پاپیادہ چلنے والا۔ یہ بھی الرِّجْل بمعنیٰ پاؤں سے مشتق ہے اور راجل کی جمع رِجَالَة اور رَجْلٌ آتی ہے جیسے رَكْبٌ جو کہ رَاكِبٌ کی جمع ہے اور رَاجِلٌ کی جمع رِجَالٌ بھی آجاتی ہے جیسے رَاكِبٌ وَرِكَابٌ۔ اور رَجُلٌ رَاجِلٌ اسے کہتے ہیں جو چلنے پر قدرت رکھتا ہو اس کی جمع رِجَالٌ آجاتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ (۲۔۲۳۹) تو پاؤں پیدل یا سوار اسی طرح رَجِيْلٌ وَذُو رَجْلَةٌ کے معنیٰ بھی بہت زیادہ یا پیادہ چلنے والے شخص کے ہیں۔

حَرَّةٌ رَجْلَاءُ: جس میں صعوبت سے چلا جاسکے۔

اَلْاَرْجُلُ: سفید پاؤں والا گھوڑا۔ بڑے پاؤں والا۔

رَجَّلْتُ الشَّاةَ: میں نے بکری کو پاؤں سے باندھ کر لٹکا دیا۔ اور بطور استعارہ رَجُلٌ کے معنیٰ (۱) ٹڈی دل اور پانی بہنے کا راستہ بھی آجاتے ہیں اس کا واحد رِجْلَةٌ ہے اور سَيْلُ الْمَاءِ کو رِجْلٌ کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے

---

❶ راجع للمثل المعاجم وفی المیدانی ۱۲.

❷ لم احده قائله واوله: خرقوا جیب فتاتهم۔ والبیت فی اللسان (رجل) والکامل ۲۴۱ وتفسیر الطبری (۸: ۱۴۶) والبحر (۲: ۱۷۶) وفی المطبوع لم ینالوا مصحف۔ کل جار ظل مغتبطا۔ غیر جیران بنی جبلة۔ والبیت ایضاً فی امالی ابن الشجری (۲: ۲۸۷) واعراب ثلاثین لابن خالویه (۴۴) وفی روایته صولة بدل حرمة والاعجاز للباقلانی.

مذانب کہہ دیتے ہیں۔

رِجْلَةٌ: بـقلة الحمقاء: کیونکہ وہ بھی عموماً راستہ میں اگتا ہے۔

اور کسی شخص کے عہد حکومت کو بھی رِجْـل کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے: کَـانَ ذَالِكَ عَـلٰـى رِجْلِ فُـلَانٍ (کہ فلاں کے عہد حکومت میں تھا) جیسا کہ عَلٰى رأسِ فُلَانٍ کا محاورہ ہے۔

اِرْتَـجَـلَ الْـكَلَامَ فِـى البديهـه کہنا۔اِرْتَـجَلَ الْفَرَسُ فِي عدوِهٖ: گھوڑے کا درمیانی دوڑ دوڑنا۔

تَرَجَّلَ الرَّجُلُ: سواری سے اتر کر پیدل چلنا۔

تَرَجَّلَ فِي الْبِئْرِ: بغیر رسی کے کوئیں میں اترنا۔

تَرَجَّلَ النَّهَارُ: سائے کا دیواروں سے نیچے اترنا گویا وہ پیدل چل رہا ہے۔

رَجَّـلَ شَعرَهٗ کے معنیٰ بالوں کو کنگھی کرنا کے ہیں کیونکہ کنگھی کرنے سے بال نیچے پاؤں کی طرف اتر آتے ہیں۔

اَلْمِرْجَلُ: نصب کی ہوئی دیگ۔اَرْجَلْتُ الْفَصِيلَ اونٹنی کے بچہ کو اس کی ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا۔

(ر ج م)

اَلـرِّجامُ: پتھر۔اسی سے الـرجم ہے جس کے معنیٰ سنگسار کرنا کے ہیں۔کہا جاتا ہے۔رَجَـمَـهٗ: اسے سنگسار کیا اور جسے سنگسار کیا گیا ہو اسے مَـرْجُـوْمٌ کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَتَـكُـوْنَـنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۱۶) کہ تم ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

﴿اِنَّهُمْ اِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ﴾ (۱۸۔۲۰) کیونکہ تمہاری قوم کے لوگ تمہاری خبر پائیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

پھر استعارۃ کے طور پر رَجْـم کا لفظ جھوٹے گمان، تو ہم، سب وشتم اور کسی کو دھتکار دینے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿رَجْـمًا بِالْغَيْبِ﴾ (۱۸۔۲۲) یہ سب غیب کی باتوں میں اٹکل کے تکے چلاتے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (طویل)

(۱۷۶) "وَمَا هُوَ عَنْهَا بِالْحَدِيثِ المرجَّم"

اور لڑائی کے متعلق یہ بات محض اندازے سے نہیں ہے۔

اور شیطان کو رجیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خیرات اور اعلیٰ کے مراتب سے راندہ ہوا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ﴾ (۱۶۔۹۸) تو شیطان مردود کے وساوس سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔

﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ﴾ (۳۸۔۷۷) تو بہشت سے نکل جا کہ راندہ درگاہ ہے۔

اور شُهُـبٌ (ستاروں) کو رُجُـوْمٌ کہا گیا ہے قرآن پاک میں ہے:

❶ قاله زهير في معلقته من السبعة واوله : وما الحرب الاما علمتم وذقتم ۔ والبيت في مجازابى عبيدة ٣٩٨ رقم٤٦٤ وعنه فى الفتح (٦: ٣٩٣) والعقد الثمين ٩٥ وايام العرب ٢٧٤ والاساس رجم والمحاضرات للمولف (٣: ١٧٦) والجمهرة ١٠٧ وديوانه ١٧ وشرح العشر للتبريزى (١١٢) والبحر (٦: ١١٤) والقرطبى (١٠: ٣٨٣) والخزانة (٣: ٤٣٥ ومختار الشعرالجاهلى (١: ١٥٤) وشرح السبع لابن الانبارى (٢٦٧).

﴿رُجُوْمًا لِّلشَّیَاطِیْنِ﴾ (۶۷-۵) ان کو شیاطین کے لیے ایک طرح کا زور بنایا ہے۔

رَجْمَة ورُجْمَة: قبر کا پتھر جو بطور نشان اس پر نصب کیا جاتا ہے۔ مجازاً اس سے قبر مراد لیتے ہیں۔ اس کی جمع رِجَامٌ وَرُجُمٌ آتی ہے۔ اور رَجَمْتُ الْقَبْرَ کے معنیٰ قبر پر پتھر نصب کرنا کے ہیں۔ حدیث میں ہے: ❶

(۱۵۰) لَا تَرْجُمُوْا قَبْرِیْ۔ کہ میری قبر پر پتھر نہ لگانا۔

اَلْمُرَاجَمَةُ: باہم ایک دوسرے کو مغلظات سنانا۔ مُقَاذَفَةٌ کی طرح یہ لفظ بھی اس معنیٰ میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور رَجْمٌ سے تَرْجُمَان بروزن تَفْعُلَان آجاتا ہے۔

(ر ج و)

رَجَا الْبِئْرِ: کنویں کا کنارہ۔ رَجَا السَّمَاءِ: آسمان کا کنارہ۔ اس کی جمع اَرْجَاءٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْمَلَكُ عَلٰٓی اَرْجَآئِهَا﴾ (۶۹-۱۷) اس کے کنارے پر فرشتے ہوں گے۔

اور رَجَاءٌ ایسے ظن کو کہتے ہیں جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا﴾ (۷۱-۱۳) تو تمہیں کیا بلا مارگئی کہ تم نے خدا کا وقار دل سے اٹھادیا۔

میں بعض مفسرین نے اس کے معنیٰ لَا تَخَافُوْنَ کیے ہیں یعنی کیوں نہیں ڈرتے جیسے کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (طویل)

(۱۷۷) اِذَا لَسَعَتْهُ النَّحْلُ لَمْ یَرْجُ لَسْعَهَا
وَحَالَفَهَا فِیْ بَیْتِ نُوْبٍ عَوَاسِلُ

جب اسے مکھی ڈنگ مارتی ہے تو وہ اس کے ڈسنے سے نہیں ڈرتا۔ اور اس نے شہد کی مکھیوں سے معاہدہ کر رکھا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف ورجاء باہم متلازم ہیں (جب کسی محبوب چیز کے حصول کی توقع ہوگی) ساتھ ہی اس کے تضیع کا اندیشہ بھی دامن گیر رہے گا۔ اور ایسے ہی اس کے برعکس صورت میں اندیشہ کے ساتھ ہمیشہ امید پائی جاتی ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا یَرْجُوْنَ﴾ (۴-۱۰۴) اور تم کو خدا سے وہ وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں۔

﴿وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ﴾ (۹-۱۰۶) اور کچھ اور لوگ ہیں کہ حکم خدا کے انتظار میں ان کا معاملہ ملتوی ہے۔

اَرْجَتِ النَّاقَةُ: اونٹنی کی ولادت کا وقت قریب آگیا۔ اس کے اصل معنیٰ یہ ہیں کہ اونٹنی نے اپنے مالک کو قربِ ولادت کی امید دلائی۔

---

❶ وصية اوصى بها عبدالله بن مغفل وقت الموت اى لاتجعلوا عليها الرجم ومعناه النهى عن التسنيم والرفع انظر الفائق ۱: ۲۳۳ والنهاية (۲: ۲۰۵) قال الجوهرى المحدثون يرونه بتخفيف الجيم والصحيح تشديدها ۱۲.

❷ قاله ابوذهيب الهذلى فى وصف مشتاروالبيت من شواهد الكشاف ۱۴۴ والطبرى (۱: ۳۱۳) والطبرسى وديوان الهذليين (۱: ۱۴۳) والاساس (۲: ۴۷۹) واللسان (نوب) ومجازالقران رقم ۳۰۹ والخزانة (۲: ۴۹۲) ورسالة المبرد (مااتفق لفظه واختلف معناه) والاضداد لابن الانبارى ۹ وابن السكيت ۷۹ والمقاييس (نوب) وابن ولاد ۴۳ والمعانى الكبير ۶۲۷ والجمهرة (اشعار) ۶۲ والقرطبى (۸: ۳۱۱) والدرة للحريرى ۱۰۷ وتهذيب اصلاح المنطق (۱۴۲/۱: ۲۰۴) ومعانى القران المنسوب الى الفراء (۱: ۲۸۶) وفيه عوامل بدل عواسل والمشكل للقتبى ۱۴۷ وغريبه ۲۷۱ وفى روايه ابى الطيب (ابدال ۲: ۳۸۴) ورسالة الغفران (۲: ۴۳۲) والمخصص (۸: ۱۲۸/۱۷: ۱۱) والصحاح (نوب) واللسان والتاج (خلف) رجاء، دبر) واضداد ابى الطيب ۲۹۹ خالفها (بالخاء المعجمة) ورواية الاضداد اوللثلاثة حالفها (بالحاء المهملة) ۱۲.

اَلْاُرْجُوَان: ایک قسم کا سرخ رنگ جو رَجا ء کی طرح فرحت بخش ہوتا ہے۔

(ر ح ب)

اَلرَّحْبُ: (اسم) جگہ کی وسعت کو کہتے ہیں۔ اسی سے رَحْبَۃُ الْمَسْجِد ہے جس کے معنیٰ مسجد کے کھلے صحن کے ہیں اور رَحُبَتِ الدَّارُ کے معنیٰ گھر کے وسیع ہونے کے۔ پھر یہ رَحْبٌ کا لفظ استعارۃً پیٹ یا سینہ کی وسعت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے رَحِبُ الْبَطْنِ: (بسیار خور) رَحْبُ الصَّدْرِ (فراخ سینہ) عالی ظرف کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے برعکس ضیق الصدر کا لفظ مجازاً تنگ سینہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾ (۹۔۲۵) اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگ ہوگئی۔

اور بطور استعارہ جس کے نوکر چاکر بہت زیادہ ہوں اسے رَحِيْبُ الْفِنَاءِ کہا جاتا ہے۔

مَرْحَبًا وَّاَهْلًا: تو نے کشادہ جگہ پائی اور اپنے اہل میں آیا (یہ لفظ خوش آمدید کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے)

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا مَرْحَبًا بِهِمْ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ۔ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ﴾ (۳۸۔۵۹،۶۰) ان پر خدا کی مار بے شک یہ بھی دوزخ ہی میں آرہے ہیں۔ (یہ سن کر وہ کہیں گے) بلکہ تم پر خدا کی مار۔

(ر ح ق)

رَحِيْقٌ: (خالص عمدہ شراب جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو) قرآن پاک میں ہے:

﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ﴾ (۸۳۔۲۵) ان کو شراب خالص سربند پلائی جائے گی۔

(ر ح ل)

اَلرَّحْلُ: ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اس لیے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہوا جائے پھر یہ لفظ مجازاً خود اونٹ پر بولا جانے لگا ہے اور کبھی رَحْلٌ کا لفظ اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جس پر گھر میں بیٹھا جاتا ہے۔ اس کی جمع رِحال آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ﴾ (۱۲۔۶۲) تو اس نے اپنے نوکروں سے کہا کہ ان کا سرمایہ ان کے کجاووں میں رکھ دو۔

اَلرِّحْلَةُ: (مصدر) اس کے اصل معنیٰ سفر یا کوچ کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ (۱۰۶۔۲) جاڑے اور گرمی کے سفروں کو (اکٹھا رکھنے والے)

اَرْحَلْتُ الْبَعِيْرَ: میں نے اونٹ پر پالان کسا۔

اَرْحَلَ الْبَعِيْرُ: نے اونٹ کا اس قدر موٹا ہو جانا گویا موٹاپے کی وجہ سے اس کی پیٹھ پر پالان رکھا ہوا ہے۔

رَحَلْتُهٗ: میں نے اسے اس جگہ سے دور ہٹایا۔

اَلرَّاحِلَةُ: اونٹ جو سواری کے قابل ہو جائے۔

رَاحَلَهٗ: سفر کرنے میں اس کی مدد کی۔ مُرَحَّلٌ: وہ کپڑا جس پر کجاوے کی تصویریں بنی ہوئی ہوں۔

(ر ح م)

اَلرَّحِمُ: عورت کا رحم۔ اور رَحُوم اس عورت کو

---

❶ ملاحظہ ہو فقہ اللغۃ للثعالبی ۱۲ مترجم۔

کہتے ہیں جسے خرابی رحم کی بیماری ہو اور استعارہ کے طور پر رحم کا لفظ قرابت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔کیونکہ تمام اقرباء ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔اور اس میں رِحِمٌ وَرُحْمٌ دولغت ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَقْرَبُ رُحْمًا﴾ (۱۸۔۸۱)اور قرابت میں (اس سے) بہتر (ہو)

اَلرَّحْمَةُ: وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنیٰ میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔جیسے: رَحِمَ اللّٰهُ فُلَانًا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے جب اس کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے صرف احسان مراد ہوگا جیسا کہ مروی ہے:

(۱۵۱) اِنّ الرَّحمة مِنَ اللّٰهِ اِنْعام وافضال وَمن الادميين رقة وتعطف: کہ اللہ کی طرف سے رحمت اس کے انعام وفضل سے عبارت ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف سے رقّت اور شفقت کے معنیٰ میں آتی ہے۔اسی معنیٰ میں آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے۔❶

(۱۵۲) ((اَنَّهٗ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الرَّحِمَ قَالَ لَهٗ اَنَا الرَّحْمٰنُ وَاَنْتَ الرَّحِمُ شَقَقْتُ اسْمَكَ مِنِ اسْمِي فَمَنْ وَصَلَكَ وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَكَ قَطَعْتُهٗ .)) کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس نے فرمایا: ''میں رحمان ہوں اور تو رحم ہے میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے پس جو تجھے ملائے گا۔(یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرے گا میں اسے پارہ پارہ کروں گا''❷

اس حدیث میں بھی معنیٰ سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کردی ہے اور احسان کو اپنے لیے خاص کرلیا ہے تو جس طرح لفظ رحم، رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنیٰ جو لوگوں میں پایا جاتا ہے وہ بھی اس معنیٰ سے ماخوذ ہے جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنیٰ میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ، الرَّحِيْمُ: یہ دونوں فَعلاَن وَفَعِيل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں❸ جیسے نَدْمَانٌ و نَدِيْمٌ پھر رحمٰن کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سما لیا ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے۔اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنیٰ بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر بھی جائز ہے۔ چنانچہ فرمایا:﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۲۔۱۷۳) بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا:
﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ

❶ اخرجه ابوداود.
❷ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔
❸ راجع غريب القران للقتبى ٦ ومجازالقران لابى عبيدة ٢١ والطبرى (١: ٥٨، ٥٩) وعلى ابى عبيدة ردا غيفا لقوله : ان الرحمن مجازه ذوالرحمة والرحيم مجازه الرحيم .

مَاعَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۹۔۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہُوکا ہے اور مسلمانوں پر نہایت درجے شفیق (اور) مہربان ہیں۔

بعض نے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ دُنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔جیسا کہ آیت:

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ﴾ (۷۔۱۵۶) اور ہماری جو رحمت ہے وہ (اہل وناہل) سب چیزوں کو شامل ہے پھر اس کو خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ لیں گے جو پرہیز گاری اختیار کریں گے۔

میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الٰہی عام ہے اور مومن وکافر دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت میں مؤمنین کے ساتھ مختص ہوگی (اور کفار اس سے کلیۃً محروم ہوں گے)۔

(ر خ و)

اَلرُّخَاءُ: لینت یعنی نرمی کو کہتے ہیں اور یہ شَيْءٌ رِخْوٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنٰی نرم چیز کے ہیں اور باب رَخِيَ يَرْخٰى بروزن عَلِمَ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاءً حَيْثُ اَصَابَ﴾ (۳۸۔۳۶) تو ہم نے ہوا کو ان کا تابع کردیا کہ جہاں پہنچنا چاہتے ان کے حکم کے مطابق اسی طرف وہ نرمی سے چلتی۔

اور اسی سے اَرْخَيْتُ السِّتْرَ کا محاورہ لیا گیا ہے۔جس کے معنٰی پردہ لٹکانے کے ہیں پھر اِرْخَاءُ السِّتْرِ سے بطور استعارہ اِرْخَاءُ سَرْحَان بولا جاتا ہے جس کے معنٰی بھیڑیے کی تیزی کے ہیں۔اور ذؤیب نے کہا ہے: [1] (الکامل)

(۱۷۸) "فَهِيَ رِخْوٌ تَمْزَعُ"

اور وہ ہوا کی طرح تیز اور نرم رفتار ہے۔

فَرَسٌ مِرْخَاءٌ: تیز گھوڑی۔خَیل مراخ تیز رو گھوڑے۔

اَرْخَيْتُهٗ: میں نے اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی کہ تیز رفتاری سے چلے۔

(ر د د)

اَلرَّدُّ: (ن) اس کے معنٰی کسی چیز کو لوٹا دینے کے ہیں خواہ ذات شے کو لوٹایا جائے یا اس کی حالتوں میں سے کسی حالت کو۔محاورہ ہے۔رَدَدْتُهٗ فَارْتَدَّ: میں نے اسے لوٹایا پس وہ لوٹ آیا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ (۶۔۱۴۸) (مگر تاکہ) لوگوں سے اس کا عذاب تو ہمیشہ کے لیے ٹلنے والا ہی نہیں۔

اور ذات شے کو واپس لوٹانے کے متعلق فرمایا:

---

[1] قطعة من عجز البيت لابی ذؤیب وتكملته : فعدوابه خوصا يفصم جريها ـ حَلق الرحالة .... والبيت من كلمة مفضلية جمهرية طويلة فی ٦٥ بيتاً (٢٢١ـ٢٢٩) والبيت فی السمط (٤٤٨ـ٧٤١) والسيوطی ٩٢ والجمهرة ٢٤٦ و الا قتضاب ٤١٣ والمحكم (رحل) وديوان الهذليين (١ : ١٦) واللسان (خو).

﴿لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ (۶۔۲۸) اور اگر (دنیا میں) واپس بھیج دیئے گئے تو جس چیز سے ان کو منع کیا گیا ہے اس کو دوبارہ کریں۔

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۷۔۶) پھر ہم نے (تم کو) دشمنوں پر (غلبہ دے کر دوبارہ) تمہارے دن پھر دیئے۔

﴿رُدُّوْهَا عَلَيَّ﴾ (۳۸۔۳۳) (تو) ان گھوڑوں کو میرے پاس لوٹا لاؤ۔

﴿فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ﴾ (۲۸۔۱۳) غرض ہم نے پھر موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔

﴿يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ﴾ (۶۔۲۷) اے کاش ہم پر دنیا میں واپس بھیج دیے جائیں اور پروردگار کی آیتوں (کو) نہ جھٹلاتے۔

اور کسی کو اس کی پہلی حالت کی طرف رد کرنے کے متعلق ہے۔ فرمایا:

﴿يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ﴾ (۳۔۱۴۱) تم کو الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا کر لے جائیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ﴾ (۱۰۔۱۰۷) اگر (اللہ تعالیٰ) تجھ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے فضل کا روکنے والا نہیں۔ میں رَآدَّ کے معنیٰ روکنے والا اور دفع کرنے والا کے ہیں۔ اور یہ معنیٰ آیت:

﴿عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ﴾ (۱۱۔۷۶) (اور ان لوگوں پر ایسا) عذاب آنے والا ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ میں مراد ہے اور اسی سے اَلرَّدُّ اِلَى اللّٰهِ ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا﴾ (۱۸۔۳۶) (تو جب) میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹا جاؤں گا تو جہاں لوٹ کر جاؤں گا۔ (بہر حال) اس دنیا سے (تو اس جگہ کو) بہتر ہی پاؤں گا۔

﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۹۔۹۴) پھر آخر کار تم اس (قادر مطلق) کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب دونوں کو جانتا ہے۔

﴿ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾ (۶۔۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس بلائے جائیں گے۔

تو یہاں رَدٌّ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسے کہ آیت ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ میں رَجْعٌ کا لفظ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلرَّدُّ اِلَى اللّٰهِ کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک معنیٰ وہ ہے جس کا ذکر آیت کریمہ: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ﴾ (۲۰۔۵۵) میں ہے (یعنی فوت کر کے) زمین کی طرف لوٹا دینا اور دوسرے معنیٰ وہ ہیں جس کی طرف کہ:

﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ (۲۰۔۵۵) میں ارشاد فرمایا ہے یعنی فوت کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا لیکن یہ دو معنیٰ دو حالتوں کے اعتبار سے ہیں اور رَدٌّ کا لفظ اپنے عموم کے اعتبار سے دونوں معنیٰ کو شامل ہے اور آیت:

﴿فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۴۔۹) کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں ایک یہ کہ غصہ سے پشت دست کاٹنے لگے۔ دوم یہ کہ منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہنے کی طرف اشارہ ہے تیسرے یہ کہ اَفْوَاهِهِمْ میں هِمْ کی ضمیر کا مرجع انبیاء کو قرار دیا جائے یعنی انہوں نے انبیاء کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور انہیں خاموش کر دیا

اور ردٌّ کا لفظ لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہو کہ انہوں نے بار بار ایسا کیا۔ ❶

اور آیت: ﴿لَو یَرُدُّوْنَکُمْ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِھِمْ کُفَّارًا﴾ (۲۔۱۰۹) کہ ایمان لاچکنے کے بعد تم کو کافر بنا دیں۔

میں رَدٌّ کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ تمہیں دوبارہ حالت کفر کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں جسے تم چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اِنْ تُطِیْعُوا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ یَرُدُّوْا بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کَافِرِیْنَ﴾ (۳۔۹۹) لوگو! تم اہل کتاب کے کسی فرقے کا بھی کہا مانو گے تو وہ تمہارے ایمان لائے پیچھے تم کو پھر کافر بنا دیں گے۔

اَلارْتِدَادُ وَالرِّدَّةُ: اس راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو۔لیکن رِدَّۃ کا لفظ کفر کی طرف لوٹنے کے ساتھ مختص ہو چکا ہے اور ارتداد عام ہے جو حالت کفر اور غیر دونوں کی طرف لوٹنے پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی﴾ (۴۷۔۲۵) بے شک جو لوگ اپنی پشتوں پر لوٹ گئے (اس کے) بعد کہ ان کے سامنے ہدایت واضح ہوگئی۔اور آیت کریمہ:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ﴾ (۵۔۵۴) میں اسلام سے کفر کی طرف لوٹنا مراد ہے اور یہی معنیٰ آیت:

﴿وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ﴾ (۲۔۲۱۷) میں مراد ہیں: ﴿وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا﴾ (۶۔۷۱) تو (کیا اس کے بعد) بھی الٹے پیروں (کفر کی طرف) لوٹ جائیں گے۔

اور غیر کفر کی طرف لوٹنے کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَرْتَدُّوا عَلٰٓی اَدْبَارِکُمْ﴾ (۵۔۲۱) اور اپنی پشتوں پر مت پھرو یعنی کسی کام کی تحقیق کر لینے اور اس کی اچھائی کو جان لینے کے بعد اسے مت چھوڑو۔

﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا﴾ (۱۸۔۶۴) پھر دونوں اپنے (پیروں کے) نشانوں کے کھوج لگاتے الٹے پاؤں پھرے۔

﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰهُ عَلٰی وَجْھِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا﴾ (۱۲۔۹۶) پھر جب یوسف علیہ السلام کے زندہ وسلامت ہونے کی خوشخبری دینے والا (یعقوب علیہ السلام کے پاس) آپہنچا تو اس نے (آنے کے ساتھ ہی یوسف کا کرتہ) یعقوب علیہ السلام کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ فوراً بینا ہو گئے۔یعنی ان کی بینائی ان کی طرف لوٹ آئی اور رَدَدْتُ الْحُکْمَ اِلٰی فُلَانٍ کے معنیٰ کسی کے فیصلہ سپرد کر دینے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ﴾ (۴۔۵۹) پھر اگر کسی امر میں تم (اور حاکم وقت) آپس میں جھگڑ پڑو تو اس امر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرو۔

---

❶ والبسط ماراتيت البحث فی الآیة فی امالی المرتضیٰ راجع (۳٦۵۔۳٦۷)۔

عام محاورہ ہے: رَادَّہٗ فِی کَلَامِہٖ: کسی سے بحث کرنا حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۵۳) اَلْبَیِّعَانِ یَتَرَادَّانِ: یعنی بائع اور مشتری بیع کو رد کر دیں۔

رَدَّۃُ الْاِبِلِ: اونٹوں کا دوبارہ پانی پینے کو جانا۔

اَرَدَّتِ النَّاقَۃُ: (۱) اونٹنی کا ولادت سے قبل پستان نکالنا۔ (۲) نمناک زمین پر بیٹھنے کی وجہ سے اونٹنی کے پستان اور مخصوص جگہ پر ورم ہو جانا۔

اِسْتَرَدَّ الْمَتَاعَ: سامان واپس لے لینا۔

(ر د ی)

اَلرِّدْءُ: جو دوسرے کا مددگار بن کر اس کے تابع ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْءًا یُّصَدِّقُنِیْ﴾ (۲۸۔۳۴) ان کو مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج دو کہ میری تصدیق کریں۔

اور اَرْدَاَہٗ کے معنیٰ کسی کی مدد کرنا کے ہیں اور رَدِیءٌ (ردی) بھی اصل میں رِدْءٌ کے ہم معنیٰ ہے مگر عرف میں متاخر مذموم پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رَدُءَ الشَّیْءُ رَدَاءَۃً فَھُوَ رَدِیءٌ: کسی شے کا ردی ہونا۔

(ر د ف)

اَلرِّدْفُ: تابع یعنی ہر وہ چیز جو دوسرے کے پیچھے ہو اور رِدْفُ الْمَرْاَۃِ کے معنیٰ عورت کی سرین کے ہیں۔

اَلتَّرَادُفُ: یکے بعد دیگرے آنا۔ ایک دوسرے کی پیروی کرنا۔

اَلرَّادِفُ: متاخر، یعنی پچھلا۔

اَلْمُرْدِفُ: اگلا جس نے اپنے پیچھے کسی کو سوار کیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ﴾ (۸۔۹) سو اس نے تمہاری سن لی (اور فرمایا) کہ ہم لگاتار ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کریں گے۔

ابو عبیدہ کے نزدیک رَدِفَ وَاَرْدَفَ: یعنی مجرد اور مزید فیہ ایک ہی معنیٰ میں آتے ہیں ❷ اس لیے انہوں نے مُرْدِفِیْنَ کا معنیٰ "بعد میں آنے والے" کیا ہے۔ اور یہ شاہد پیش کیا ہے۔ ❸

(۱۷۹) "اِذَا الْجَوْزَاءُ اَرْدَفَتِ الثُّرَیَّا"

جب ثریا کے پیچھے جوزاء ستارہ نکل آیا۔

---

❶ رواہ النسائی عن سمرۃ وابوداؤد وابن ماجۃ عن ابی بردۃ والمستدرک عن ابن عمرو والبخاری عن ابن عمرو متفق علیه عن حکیم ابن حزام (راجع الفتح للنبھانی (۲ : ۲۰).

❷ وکذا قال ابن الاعرابی راجع شرح الدرۃ ۲۰۱ ومجاز ابی عبیدۃ (۱ : ۲۴۱) والحجۃ لابی علی الفارسی (۱ : ۱۹۳) والقرطبی (۷ : ۳۷۱) ونقل عن ابی عبیدۃ الحافظ فی الفتح (۸ : ۲۳).

❸ راجع اللسان (ردف، قرط) قاله خزیمۃ بن نھد وکان یعشق فاطمۃ بنت یشکر وفیھا یقول وتمامه : ظننت بآل فاطمۃ الظنونا۔ وبعدہ یقول : حالت دون ذالک من ھموم ۔ ھموم تورث الداء الدفینا والبیت فی الطبری (۹ : ۱۹۱) وشرح الدرۃ ۲۰۱ والبحر (۷ : ۲۱٦) غیر منسوب وفی السمط (۱ : ۹۹) انه لخزیمۃ (مثل کریمۃ) بن نھد قال الاستاذ المیمنی ھذا ھو الصحیح وھو مصحف فی جل الکتب بخزیمۃ او جذیمۃ الافی المعجم البکری ۱۴ والمشتبه فانه ضبطه بالصواب والبیت فی التاج (ردف) وشرح المعلقات لابن الانباری ۷۸ والتبریزی ۳۷ وخزیمۃ ھذا مترجم له فی المعجم البکری ۱۴ ورجع ایضاً المیدانی (۲۸۸، ۳۷۴، ۳۹۰) وکتاب البسوس ۷ وانظر لمعناہ الانواء للقتبی والخبر بطوله فی الاغانی (۱۱ : ۱۵۴).

مگر ابوعبیدہ کے علاوہ دوسرے علماء نے مُرْدِفِیْنَ کے معنیٰ یہ کیے ہیں "دوسرے فرشتوں کو پیچھے لانے والے" تو اس لحاظ سے گویا دو ہزار فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی گئی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ مُرْدِفِیْنَ سے مراد وہ فرشتے ہیں۔ جو اسلامی لشکر کے آگے آگے چلتے تھے تاکہ کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیں۔

اور ایک قرأت میں مُرْدَفِیْنَ فتح دال کے ساتھ ہے ❶ یعنی ہر ایک مسلمان فوجی کے پیچھے اس کی مدد کے لیے ایک فرشتہ متعین تھا۔

ایک اور قرأت میں مُرَدِّفِیْنَ بتشدید دال ہے جو دراصل مُرْتَدِفِیْنَ باب افتعال سے ہے۔ صرفی قاعدہ کے مطابق تاء کو دال میں ادغام کرکے اس کی حرکت دال کو دے دی گئی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلِیْنَ o بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیْنَ﴾ (۳۔۲۳،۲۴) کیا تم کو اتنا کافی نہیں کہ تمہارا رب (آسمان سے) تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد فرمائے (ضرور کافی ہے) بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو (اور خدا اور رسول کی نافرمانی سے) بچو اور دشمن (ابھی) اسی دم تم پر چڑھ آئیں تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو بڑی سج دھج سے آموجود ہوں گے۔

اَرْدَفْتُهٗ: میں نے اسے اپنے پیچھے سوار کیا۔

اَلرِّدَافُ: سواری پر ردیف کے بیٹھنے کی جگہ۔

دَابَّةٌ لَا تُرَادِفُ اَوْلَا تُرْدِفُ: سواری جو ردیف کو سوار نہ ہونے دے۔

جَاءَ وَاحِدٌ فَاَرْدَفَهٗ اٰخَرُ۔ ایک کے بعد دوسرا آیا۔

اَرْدَافُ الْمُلُوْكِ۔ بادشاہوں کے جانشین، نائب۔

(ر د م)

اَلرَّدْمُ: پتھروں سے کسی شگاف کو بند کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَجْعَلْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ رَدْمًا﴾ (۱۸۔۹۵) میں تم (لوگوں) میں اور ان (لوگوں) میں ایک روک بنا دوں۔

رَدْمٌ بمعنیٰ مَرْدُوْمٌ یا مُرْدَمٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷ (الکامل)

(۱۸۰) هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمٍ

کیا شعراء قدیم نے کوئی قابل اصلاح مقام چھوڑا ہے (جس پر طبع آزمائی کی جائے)

اَرْدَمَتْ عَلَیْهِ الْحُمّٰی: کسی کو دائمی بخار رہنا۔

سَحَابٌ مُرْدِمٌ ساکن اور ایک جگہ پر ٹھہرنے والا بادل۔

(ر د ی)

اَلرَّدٰی: (س) کے معنیٰ ہلاکت کے ہیں اور التَّرَدِّیْ: (تفعل) کے معنیٰ ہیں اپنے آپ کو ہلاکت

---

❶ قرء اهل المدینة ویعقوب مردفین بفتح الدال والباقون بالکسر وقریء فی الشواذ مردّفین (راجع الطبری ۹: ۱۱۱).

❷ قاله عنترة العبسی وتمامه: ام هل عرفت الدار بعد هم والبیت من معلقته تسمیٰ المذهبة راجع السیوطی ۱٦٤ والامالی (۲: ۱٤۲) قال المیمنی فی السمط ۷٦۹ البیت لایوجد فی شرحی التبریزی والزوزنی ویوجدفی دیوان الستة ٤٤ (العقد الثمین) رقم ۲۱ مطلع قصیدة وانظر ایضاً ابن الانباری ۲۹٤ والتبریزی ۱۷۲ رواه ابو عمرو عن ابی حزام العکلی فقط والبیت من شواهد الطبری (۱٦: ۲۳) والشعراء الجاهلی (۱: ۳۷۹) واللسان (روم) ویروی من مترجم وفی روایة ابی عبیدة مترجم راجع ابدال ابی الطیب (۲: ۵۸) والجمهرة ۱٦۱ والشطرفی المثل السائر (۱: ۳٤۷).

کے سامنے پیش کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗ اِذَا تَرَدّٰى﴾ (۹۲۔۱۱)اور جب وہ جہنم میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

﴿وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدٰى﴾ (۲۰۔۱۶)اور وہ اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے پڑا(اگر ایسا کروگے) تو تم تباہ ہوجاؤ گے۔

۔(اَلْاِرْدَاءُ: (افعال)ہلاک کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ﴾ (۳۷۔۵۶)خدا کی قسم تو تو مجھے تباہ کرنے کو تھا۔

اَلْمِرْدَاةُ: پتھر جس سے دوسرے پتھر توڑے جاتے ہیں۔

(رذل)

اَلرَّذْلُ وَالرُّذَالُ: وہ چیز جس سے اس کے ردی ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔

قرآن میں ہے:

﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۱۶۔۷۰) اور تم میں سے ایسے بھی ہیں جو بدترین حالت کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾ (۱۱۔۲۷) مگر جو ہم میں سے رذالے ہیں (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے۔

﴿اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۱۱) کیا ہم تمہاری بات تسلیم کرلیں۔حالانکہ ادنیٰ درجے کے لوگ تمہارے متبع ہیں۔

یہ ارذل کی جمع ہے جس کے معنیٰ حقیر اور ذلیل شخص کے ہیں۔

(رزق)

اَلرِّزْقُ: وہ عطیہ جو جاری ہو خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور رزق بمعنیٰ نصیبہ بھی آجاتا ہے۔اور کبھی اس چیز کو بھی رزق کہا جاتا ہے جو پیٹ میں پہنچ کر غذا بنتی ہے۔کہا جاتا ہے۔

اَعْطَى السُّلْطَانُ رِزْقَ الْجُنُوْدِ: بادشاہ نے فوج کو راشن دیا۔

رُزِقْتُ عِلْمًا: مجھے علم عطا ہوا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۶۳۔۱۰)یعنی جو کچھ مال و جاہ اور علم ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے صَرف کرو اسی طرح آیت:

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (۲۔۳)اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے (راہِ خدا میں) صَرف کرتے ہیں۔میں بھی رزق عام ہے جو ان تینوں کو شامل ہے۔

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ (۲۰۔۸۱)اور ہم نے جو تم کو عمدہ اور پاکیزہ (روزیاں) دی ہیں (شوق سے) کھاؤ۔

اور آیت کریمہ:﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ (۵۶۔۸۲) میں رزق کے معنیٰ حصہ اور نصیبہ کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نعمت الٰہی کی تکذیب کو تم نے اپنا حصہ بنا لیا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ﴾ (۵۱۔۲۲)اور تمہارا رزق آسمان میں ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد بارش ہے جو ہر

ذی حیات کے لیے باعث حیات ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾ اور ہم نے آسمان سے بارش کی اور بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد نصیبہ ہے اور آیت میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ حظوظ یعنی نصیبے مقادیر کے ساتھ ہیں اور آیت:

﴿فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ﴾ (۱۸۔۱۹) تو اس میں سے (بقدر ضرورت) کھانا تمہارے پاس لے آئے۔

میں رزق سے مراد طعام ہی ہے جو انسانی غذا بنتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ﴾ (۵۰۔۱۰، ۱۱) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کے گیلیں خوب گتھی ہوئی ہیں بندوں کو روزی دینے کے لیے۔

میں رزق سے مراد غذائی اشیاء مراد ہیں اور بعض کے نزدیک کھانے پہننے اور ہر قسم کے استعمال کی چیزیں مراد ہیں۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں قدرت الٰہی کے ساتھ بارش کے ذریعہ ہی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور آیت:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوا فِيْ سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (۳۔۱۶۸) اور (اے پیغمبر!) جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں ان کو مرا ہوا خیال نہ کرنا (یہ مرے نہیں) بلکہ زندہ ہیں ان کو ان کے پروردگار کے ہاں روزی ملتی ہے۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر اخروی نعمتوں کا برابر فیضان ہو رہا ہے۔

اسی طرح آیت:

﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا﴾ (۱۹۔۶۲) اور وہاں ان کا کھانا صبح وشام (جس وقت وہ چاہیں گے ان کو ملا کرے گا) میں انعامات اخروی ہی مراد ہیں۔ اور آیت:

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ (۵۱۔۵۸) اللہ تعالیٰ خود بڑا روزی دینے والا، قوت والا اور زبردست ہے۔

میں رزق کا لفظ عموم پر محمول ہوگا اور ذات باری تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ لیکن رَازِقٌ کا لفظ خالق رزق اور اس کے دینے والے اور مسبب تینوں پر بولا جاتا ہے اس لیے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر بھی ہوتا ہے اور اس انسان پر بھی جو دوسروں تک رزق پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا آیت: ﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرَازِقِيْنَ﴾ (۱۵۔۲۰)...... اور ہم (ہی) نے زمین میں تمہارے لیے سامان معیشت پیدا کیا اور ان کے لیے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے۔ یعنی جن کی روزی کا نہ تم سبب بنتے ہو اور نہ ہی تمہیں ان کی روزی میں کسی قسم کا دخل ہے اسی طرح آیت:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْئًا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ﴾ (۱۶۔۷۳) اور خدا کے سوا ان (معبودوں) کی پرستش کرتے ہیں جو آسمانوں وزمین میں ان کو رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی (ایسے اختیار پر) دسترس پاسکتے ہیں۔ میں لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا سے مراد یہ ہے کہ انہیں رزق دینے میں کسی قسم کا بھی دخل نہیں ہے (اور تمام اسباب رزق خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔) عام محاورہ ہے: اِرْتَزَقَ الْجُنْدُ: یعنی لشکر نے اپنا مقررہ راشن حاصل کیا اور وہ راشن جو ایک دفعہ دیا جائے

اسے رَزْقَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ر س س)

﴿وَاَصْحٰبُ الرَّسِّ﴾ (۵۰۔۱۲) اور رس کے رہنے والوں نے۔

بعض نے کہا ہے: رَسٌّ ایک وادی کا نام ہے ❶ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الطویل)

(۱۸۱) وَهُنَّ لِوَادِي الرَّسِّ كَالْيَدِ لِلْفَمِ

اور وہ وادی رس کے لیے جیسے ہاتھ منہ کی طرف اصل میں رَسٌّ کسی چیز کے تھوڑے سے نشان کو کہا جاتا ہے۔ عام محاورہ ہے:

سَمِعْتُ رَسًّا مِّنْ خَبَرٍ: میں نے کچھ یوں ہی سی خبر سنی رَسَّ الْحَدِيثُ فِي نَفْسِي: میرے دل میں تمہاری بات کا تھوڑا سا اثر ہوا۔

وَجَدَ رَسًّا مِنْ حُمَّى: اس نے بخار کا تھوڑا سا اثر محسوس کیا۔

رُسَّ الْمَيِّتُ: میت دفن ہوگئی اور اس کی شخصیت کے بعد اب اس کے آثار باقی رہے۔

(ر س خ)

رَسُوخُ الشَّيْءِ: کسی چیز کا محکم اور جائے گیر ہو جانا۔ رَسَخَ الْغَدِيرُ: جوہڑ کا پانی خشک ہو کر زمین میں جذب ہوگیا۔

اَلرَّاسِخُ فِي الْعِلْمِ: وہ محقق جسے کوئی اشکال اور شبہ پیش نہ آئے گویا یہ راسخ فی العلم لوگ وہی ہیں۔ جو آیت: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ (۴۹۔۱۵) پس سچے مسلمان تو وہ ہیں) جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک وشبہ نہیں کیا میں مذکور صفات کے ساتھ متصف ہیں۔ اور اسی طرح سورۂ نسا میں فرمایا: ﴿لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ﴾ (۴۔۱۶۲) لیکن (اے پیغمبر) ان میں سے جو علم میں بڑی پائے گاہ رکھتے ہیں۔

(ر س ل)

اَلرِّسْلُ: اصل میں اس کے معنیٰ آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں اور نَاقَةٌ رِسْلَةٌ: نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں اور سبکی کے ساتھ اٹھنے والے اونٹوں کو اِبِلٌ مَرَاسِيلُ کہا جاتا ہے۔ اسی سے رسول ہے جس کے معنیٰ ہیں روانہ ہونے والا پھر کبھی رفق اور نرمی کے لحاظ سے عَلٰى رِسْلِكَ کہہ دیتے ہیں یعنی اپنے حال پر سکون سے ٹھہرے رہیے اور کبھی صرف روانہ ہونے کا معنیٰ لے لیتے ہیں چنانچہ اسی اعتبار سے اس سے رسول مشتق ہے مگر کبھی رسول کا لفظ صرف پیغام پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۱۸۲) اَلَا اَبْلِغْ اَبَا حَفْصٍ رَسُوْلًا

---

❶ ابن کثیر (۳: ۳۱۹) عن ابن عباس قرية من قرئ ثمود وفی رویة ابن ابی حاتم عن ابن عباس انها اسم بئر فی آذر بائیجان قیل ان قوماً دفنوا فیها نبیهم وفی تفسیر الطبری ان اصحاب الرس هم اصحاب الاخدود وفی البخاری الرس معدن وجمعه ارساس وقیل قوم شعیب راجع البخاری مع الفتح .

❷ قاله زهیر فی معلقته دیکھیے صفحہ ۳۹۶ حاشیہ نمبر ۱ .

❸ قاله زهیر بن ابی سلمیٰ واوله : بكرن بكوراواستحرن بسحرة ـ والبیت فی الكامل ۸۱٤ ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۵۲) والبحر (۲: ۳۹۸) والعقد: ٥٤ وایام العرب ۲۷۲ والتبریزی فی العشر ۱۰٥ وابن الانباری ٥۰ وفی روایته فهن و وادی الرس ۱۲ .

ابوحفص (عمر رضی اللہ عنہ) کو میرا پیغام پہنچادو۔

اور کبھی اس شخص پر جسے پیغام دے کر بھیجا گیا ہو اور واحد جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ (۹۔۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔

اور فرمایا:

﴿اِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۶) ہم تمام جہان کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اور شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۱۸۳) اَلِكْنِي اِلَيْهَا وَخَيرُ الرسُولِ
اَعْلَمُ بِنَواحِي الْخَبرِ

اسے میرا پیغام پہنچادو اور بہتر پیغام بر تو وہ ہوتا ہے جو خبر کو اچھی طرح جانتا بھی ہو۔

اور رسول کی جمع رُسُلٌ آتی ہے اور قرآن پاک میں رسول اور رُسُلُ اللّٰہِ سے مراد کبھی فرشتے ہوتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ (۸۱۔۱۹) کہ یہ (قرآن) بے شک معزز فرشتے (یعنی جبریل) کا (پہنچایا ہوا) پیام ہے۔

﴿اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا اِلَيْكَ﴾ (۱۱۔۸۱) ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

﴿وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ﴾ (۱۱۔۷۷) اور جب ہمارے فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ غمزدہ ہوئے۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيمَ بِالْبُشْرٰى﴾ (۱۱۔۶۹) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔

﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا﴾ (۷۷۔۱) قسم ہے ان فرشتوں کی جو پیام الٰہی دے کر بھیجے جاتے ہیں۔

﴿بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (۴۳۔۸۰) کیوں نہیں (ضرور سنتے ہیں) اور (سننے کے علاوہ) ہمارے فرشتے ان کے پاس (تعینات ہیں کہ وہ ان کی سب باتیں) لکھے جاتے ہیں۔

اور کبھی اس سے مراد انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ (۳۔۱۴۴) اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہے اور بس۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۵۔۶۷) اے پیغمبر! جو احکام تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئے ہیں (بلاکم وکاست) ان کو لوگوں تک پہنچادو۔

اور آیت: ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ (۶۔۴۸) اور پیغمبروں کو ہم صرف اس غرض سے بھیجا کرتے ہیں کہ (نیکوں کو خوشنودی خدا کی) خوشخبری سنائیں اور (بروں کو عذاب سے) ڈرائیں۔

---

[1] قاله جعدة بن عبدالله السلمي وتمامه: فدى لك من اخى ثقة ازارى - والبيت فى اللسان (ازر) فى ستة ابيات قال احد مصحح اللسان ولعل الاولىٰ ان يقول قول نضيلة الاكبر الاشجعى بدل جعدة والبيت فى الوحشيات ١٠٨ مع الخمسة قال فى زيله لبقيلة الاكبرا ولرجل من الانصار مع سلمة راجع الآمدى ٦٣٠ وكنايات الثعالبى ٣ واللسان (قلص، ازر) والعمدة (١: ٢١٤) والفصول والغايات ١٦٥ قال احمد شاكر ووهى ايضاً طبقات ابن سعد (٣: ٢٠٥) والفائق (٢: ١٣١) والصناعتين ٣٥٣.قاله ابوذؤيب الهذلى والبيت من شواهد الطبرى (٣٦-١٥٨) والطبرسى.......... واللسان (رسل، الك) والمحكم (حى)١٢.

میں ملائکہ اور انسان دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور آیت: ﴿یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ (۲۳۔۵۱) (ہم نے اپنے پیغمبروں سے یہی ارشاد کرتے رہے ہیں کہ اے گروہِ پیغمبران! ستھری چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے تمام برگزیدہ اصحاب مراد ہیں اور صحابہ کرام پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ تبعاً رُسُل کا لفظ بولا گیا ہے جیسا کہ مُهَلَّبُ اور ان کی اولاد کو مَهالبه کہا جاتا ہے۔

اَلْاِرْسَالُ: (افعال) کے معنی بھیجنے کے ہیں اور اس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے اور دوسری محبوب یا مکروہ چیزوں کے لیے بھی آتا ہے کبھی (۱) یہ تسخیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے ہوا، بارش وغیرہ کا بھیجنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا﴾ (۶۔۶) اور (اوپر سے) ان پر موسلا دھار مینہ برسایا۔ اور کبھی (۲) کسی با اختیار وارادہ شخص کے بھیجنے پر بولا جاتا ہے جیسے پیغمبر بھیجنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ یُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً﴾ (۶۔۶۱) اور تم لوگوں پر نگہبان (فرشتے) تعینات رکھتا ہے۔

﴿فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۵۳) اس پر فرعون نے (لوگوں کی بھیڑ) جمع کرنے کے لیے شہروں میں ہرکارے دوڑائے۔

اور کبھی (۳) یہ لفظ کسی چیز کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دینے اور اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا﴾ (۱۹۔۸۳) (اے پیغمبر) کیا تم نے (اس بات پر) غور نہیں کیا کہ ہم نے شیاطین کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے اور وہ انہیں انگیخت کر کے اکساتے رہتے ہیں۔

اور کبھی (۴) یہ لفظ امساک (روکنا) کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا یُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ (۳۵۔۲) تو اللہ جو اپنی رحمت (کے لنگر لوگوں کے لیے) کھول دے تو کوئی اس کا بند کرنے والا نہیں اور بند کرے تو اس کے (بند کیے) پیچھے کوئی اس کا جاری کرنے والا نہیں۔

اور رَسْلٌ اس اونٹنی یا بکری کو کہتے ہیں جو پیہم اور نرم رفتاری سے چلے اور اگر لوگ یکے بعد دیگرے متواتر آئیں تو کہا جاتا ہے جَاؤُا اَرْسَالًا یعنی وہ یکے بعد دیگرے آئے۔ اور اسی سے رِسْلٌ اس زیادہ دودھ کو کہتے ہیں جو مسلسل آ رہا ہو۔

(ر س و)

رَسَا الشَّیْءُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے کسی جگہ پر ٹھہرنے اور استوار ہونے کے ہیں اور اَرْسٰی کے معنی ٹھہرانے اور استواء کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ﴾ (۳۴۔۱۳) اور بڑی بھاری بھاری دیگیں جو ایک جگہ پر جمی رہیں۔

﴿وَّ رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ﴾ (۷۷۔۲۷) اور اونچے اونچے پہاڑ۔ یہاں پہاڑوں کو بوجہ ان کے ثبات اور استواری کے رَوَاسِیْ کہا گیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ الْجِبَالَ اَرْسٰىهَا﴾ (۷۹۔۳۲) اور پہاڑوں

کو (اس میں گاڑ کر) پلایا۔

اسی طرح معنیٰ ثبات کے اعتبار سے پہاڑوں کو اوتاد فرمایا ہے۔ جیسے: ﴿وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ (۷۸۔۷) اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا۔

کسی شاعر نے کہا ہے۔ (1) (البسیط)

(۱۸۴) وَلَا عِمَادَ اِذَا لَمْ تُرْسِ اَوْتَادَ

اور میخوں کے بغیر ستون نہیں ٹھہر سکتے۔ عام محاورہ ہے: اَلْقَتِ السَّحَابَۃُ مَرَاسِیْھَا کہ بادل نے اپنے لنگر ڈال دیے یعنی جم کر برسنے لگا جیسا کہ اسی معنیٰ میں اَلْقَتْ طُنُبَھَا کہا جاتا ہے اور قرآن پاک میں ہے: ﴿بِسْمِ اللّٰہِ مُجْرٖھَا وَمُرْسٰھَا﴾ (۱۱۔۱۴) اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا ہے۔

تو یہ اَجْرَیْتُ وَاَرْسَیْتُ (باب افعال) سے ماخوذ ہے اور مُرْسًی کا لفظ مصدر میمی بھی آتا ہے اور صیغۂ ظرف زمان و مکان اور اسم مفعول بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت مذکورہ الصدر میں ایک قرأت مَجْرٰھَا وَمَرْسٰھَا بھی ہے۔ (2) اور آیت:

﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا﴾ (۷۔۱۸۷) (اے پیغمبر! لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کہیں اس کا تھل بیڑا بھی ہے؟ (یعنی کب واقع ہوگی۔

میں مُرْسَاھَا سے اس کے بپا ہونے کا زمانہ مراد ہے۔ عام محاورہ ہے: رَسَوْتُ بَیْنَ الْقَوْمِ: میں نے قوم کے درمیان صلح کو پختہ کر دیا۔

(ر ش د)

اَلرَّشَدُ وَالرُّشْدُ: یہ غَیٌّ کی ضد ہے اور ہدایت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور یہ باب نَصَرَ وَعَلِمَ دونوں سے آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ (۲۔۱۸۶) تا کہ وہ سیدھے رستے پر لگ جائیں۔

﴿قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ﴾ (۲۔۲۵۶) گمراہی سے ہدایت الگ ہو چکی۔

﴿فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا﴾ (۴۔۶) اور اگر تم ان میں صلاحیت دیکھو۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰھِیْمَ رُشْدَہٗ مِنْ قَبْلُ﴾ (۲۱۔۶۱) اور ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی۔

ان آیات میں ابراہیم اور یتیم دونوں کے متعلق رُشْد کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن دونوں میں بون بعید پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا کہ رَشَدٌ (بفتح الراء والشین) رُشْد بضم الراء سے اخص ہے کیونکہ رُشْد کا لفظ امور دینوی اور اخروی دونوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ (۴۹۔۷) یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

﴿وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ﴾ (۱۱۔۹۷) اور فرعون کی

---

(1) قاله الافوه الاودی (واسمه، صلاءة بن عمرو يكنى ابا ربيعة) وصدره : والبيت لا يبتنى الا ماعمدة .... وفى القالى الاله عمدٌ۔ وفى المطبوع ولاحبال ۔اخشى ان يكون مصحفا والبيت من باب التمثيل اى لاينال الامر الابتو فراسبابه وفى الطرائف من شعر الافوه الاودى والبيت فى روضة العقد ٢٤٦ والبحر ٨ : ٤١١ وانظر لتخريجه ايضاً (امر) .

(2) نسبه ابن كثير ابى رجاء العطاردى (٢ : ٤٤٦).

بات کچھ راہ کی بات تو تھی نہیں۔

(ر ص ص)

رَصٌّ (ن) کے معنیٰ دو چیزوں کو باہم ملا کر جوڑ دینے کے ہیں اور رَصَاصٌ سیسہ کو کہتے ہیں اور اسی سے فرمایا:

﴿کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾ (۶۱۔۴) گویا ایک مضبوط دیوار ہیں جس میں سیسہ پلا دیا گیا ہے۔

اور رَصَصْتُہٗ (ن) ورَصَّصْتُہٗ (تفعیل) کے ایک ہی معنیٰ ہیں یعنی کسی چیز کو سیسہ پلا کر مضبوط کرنا اور جوڑنا اور تَـرَاصُّوْا فِی الصَّلٰوۃِ کے معنیٰ ہیں نماز میں صف میں باہم پیوستہ ہو کر کھڑے ہونا اور تَرْصِیْصُ الْمَرْءَۃِ کے معنیٰ ہیں عورت کا نقاب مضبوطی سے باندھنا اور اس میں تَرَصُّصٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ر ص د)

اَلرَّصْدُ: گھات لگا کر بیٹھنا۔ اور رَصَدَلَہٗ وَتَرَصَّدَ کے معنیٰ ہیں کسی کے لیے گھات لگانا اور اَرْصَدْتُـہٗ: کسی کو گھات لگانے کے لیے مقرر کرنا اور اَرْصَدَلَـہٗ کے معنیٰ پناہ دینا بھی آتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِرْصَـادًا لِّـمَـنْ حَـارَبَ اللّٰـہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْـلُ﴾ (۹۔۱۰۷) اور ان لوگوں کو پناہ دیں جو اللہ اور رسول کے ساتھ پہلے لڑ چکے ہیں۔

﴿اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْـمِرْصَادِ﴾ (۸۹۔۱۴) بے شک تیرا پروردگار (نافرمانوں کی) تاک میں (لگا رہتا ہے)

رَصَدٌ: (صیغہ صفت) یہ معنیٰ فاعلی اور مفعولی دونوں کے لیے آتا ہے اور واحد اور جمع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَسْـلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا﴾ (۷۲۔۲۷) تو ان کے آگے اور ان کے پیچھے (فرشتوں سے) پہرہ دینے والے ان کے ساتھ رہتے ہیں۔

تو یہاں رَصَـــدًا سے واحد اور جمع دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

اَلْمَرْصَدُ: گھات لگانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ﴾ (۹۔۵) اور ہر گھات کی جگہ پر ان کی تاک میں بیٹھو۔

اور مِرصَاد بمعنیٰ مَرْصَدٌ آتا ہے لیکن مِرْصَاد اس جگہ کو کہتے ہیں جو گھات کے لیے مخصوص ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ جَھَنَّمَ کَانَتْ مِرْصَادًا﴾ (۷۸۔۲۱) بے شک دوزخ گھات میں ہے۔

تو آیت میں اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ جہنم کے اوپر سے لوگوں کا گزر ہوگا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّـنْـکُمْ اِلَّا وَارِدُھَـا﴾ (۱۹۔۷۱) اور تم میں سے کوئی (ایسا بشر) نہیں جو جہنم پر سے ہو کر نہ گزرے۔

(ر ض ع)

رَضَـعَ الْمَوْلُوْدُ: (ض س) رِضَـاعًـا وَّرَضَاعَۃً: بچے کا دودھ پینا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر انتہائی کمینے کو لَئِیْمٌ رَاضِعٌ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس کنجوس شخص پر بولا جاتا ہے جو انتہائی بخل کی وجہ سے رات کے وقت اپنی بکریوں کے پستان سے دودھ چوس لے تاکہ کوئی ضرورت مند دودھ دوہنے کی آواز سن کر سوال نہ کرے۔ پھر اس سے رَضُـعَ فُـلَانٌ بمعنیٰ لَـئُمَ استعمال ہونے

لگا ہے۔رَاضِعَتَان: بچے کے اگلے دو دانت جن کے ذریعہ وہ ماں کی چھاتی سے دودھ چوستا ہے۔اور اَرْضَاع (افعال) کے معنیٰ دودھ پلانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (۲۔۲۳۳) اور جو شخص پوری مدت تک دودھ پلانا چاہے تو اس کی خاطر مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔ نیز فرمایا:

﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ (۶۵۔۶) اگر وہ (بچے کو) تمہارے لیے دودھ پلانا چاہیں تو انہیں ان کی دودھ پلائی دو۔

عام محاورہ ہے:

فُلَانٌ اَخُوْهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ: (بضم الراء) وہ فلاں کا رضائی بھائی ہے۔حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۵۵) يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ: جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں وہ بوجہ رضاعت کے بھی حرام ہوجاتے ہیں۔

اَلاِسْتِرْضَاعُ: کسی سے دودھ پلوانا۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ﴾ (۲۔۲۳۳) اگر تم اپنی اولاد کو (کسی دایہ سے) دودھ پلوانا چاہو۔یعنی انہیں مزدوری دے کر دودھ پلوانے کا ارادہ ہو۔

(ر ض و)

رَضِيَ (س) رِضًا فَهُوَ مَرْضِيٌّ وَمَرْضُوٌّ۔ ❷ راضی ہونا۔ واضح رہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ قضائے الٰہی سے اس پر وارد ہو وہ اسے خوشی سے برداشت کرے اور اللہ تعالیٰ کے بندے پر راضی ہونے کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ اسے اپنے اوامر کا بجا لانے والا اور منہیات سے رکنے والا پائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (۵۔۱۱۹) اللہ تعالیٰ ان سے خوش اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش۔

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۸۔۱۸) تو اللہ تعالیٰ ضرور ان مسلمانوں سے خوش ہوتا ہے۔

﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (۵۔۳) اور ہم نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا۔

﴿اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۹۔۳۸) کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر قناعت کر بیٹھے ہو۔

﴿يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۸) اپنی زبانی باتوں سے تو تم کو رضا مند کر دیتے ہیں اور ان کے دل ہیں کہ ان باتوں سے انکار کرتے ہیں۔

﴿وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا اٰتَيْتَهُنَّ﴾ (۳۳۔۵۱) اور آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ (بھی) تم ان کو دو گے وہ (لے کر سب کی سب) راضی ہوجائیں گی۔

اَلرِّضْوَانُ: رضائے کثیر یعنی نہایت خوشنودی کو کہتے ہیں۔ چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے اس لیے قرآن پاک میں خاص کر رضائے الٰہی کے

---

❶ الحديث في (حم، ق، د، ن، ه عن عائشة حم، م، ن، ه، عن ابن عباس) وفي رواية من الولادة بدل النسب وابن جرير عن عائشة بمعناه (ت، حسن، صحيح) والطبراني عن ابن عباس.

❷ قال في الصحاح فجاء وابه على الاصل والقياس ۱۲.

لیے رِضْوانٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:
﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ (۵۷۔۲۷) اور (لذت) دنیا کا چھوڑ بیٹھنا جس کو انہوں نے از خود ایجاد کیا تھا ہم نے وہ طریق ان پر فرض نہیں کیا تھا.................. مگر (ہاں) انہوں نے اس کو خدا (ہی) کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا۔
﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ (۴۸۔۲۹) اور خدا کے فضل اور خوشنودی کی طلب گاری میں لگے رہتے ہیں۔
﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ﴾ (۹۔۲۱) ان کا پروردگار ان کو اپنی مہربانی اور رضامندی کی خوشخبری دیتا ہے۔
اور آیت کریمہ: ﴿اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۲: ۲۳۲) جب جائز طور پر آپس میں وہ راضی ہو جائیں۔ میں تَرَاضَوْا باب تفاعل سے ہے جس کے معنی باہم اظہار رضامندی کے ہیں۔

(ر ط ب)

اَلرَّطْبُ: (تر) یہ یَابِسٌ (خشک) کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:
﴿وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ......﴾ (۶۔۵۹) اور (دنیا کی) تر اور خشک چیزیں (سب ہی تو) کتاب واضح (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہوئی موجود ہیں۔
اور رُطَبٌ کا لفظ (پختہ اور) تازہ کھجور کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَهُزِّيْ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾ (۱۹۔۲۵) اور کھجور کی شاخ کو اپنی طرف ہلا تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔
اَرْطَبَ النَّخْلُ کے معنی ہیں درخت خرما پکی کھجوروں والا ہو گیا۔ اس میں صاحب ماخذ ہونے کا خاصہ پایا جاتا ہے۔ جیسے اَثْمَرَ وَاَجْنٰی میں ہے۔ عام محاورہ ہے: اَرْطَبْتُ الْفَرَسَ وَرَطَّبْتُهٗ: میں نے گھوڑے کو تازہ گھاس کھلائی اور رَطِبَ الْفَرَسُ: (باب عَلِمَ سے لازمی ہے اور اس) کے معنی گھوڑے کا تر گھاس کھانا کے ہیں۔
رَطِبَ الرَّجُلُ: تر وخشک ہر قسم کی باتیں کرنا خوش گپیاں اڑانا یہ محاورہ رَطِبَ الْفَرَسُ کے ساتھ بطور تشبیہ استعمال ہوتا ہے۔
اَلرَّطِيْبُ۔ نرم وملائم کو کہتے ہیں۔

(ر ع ب)

اَلرُّعْبُ: اس کے اصل معنی خوف سے بھر کر کٹ جانے کے ہیں کہا جاتا ہے: رَعَبْتُهٗ فَرَعَبَ رُعْبًا۔ میں نے اسے خوف زدہ کیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اور خوف زدہ شخص کو رَعِبٌ کہا جاتا ہے۔ اَلتِّرْعَابَةُ: (صیغہ صفت) بہت زیادہ ڈرپوک۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (۳۔۱۵۱) ہم عنقریب تمہاری ہیبت کافروں کے دلوں میں بٹھا دیں گے۔
﴿وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ (۱۸۔۱۸) اور ان کی (صورت حال سے) تجھ میں ایک دہشت سما جائے۔ پھر کبھی یہ صرف بھرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے رَعَبْتُ الْحَوْضَ: میں نے حوض کو پانی سے پر کر دیا۔

سَیْلٌ رَاعِبٌ: سیلاب جو وادی کو پُر کر دے۔ اور جَارِیَۃٌ رُعْبُوبَۃٌ کے معنیٰ جوانی سے بھر پور اور نازک اندام دوشیزہ کے ہیں اور اس کی جمع رَعَابِیْبُ آتی ہے۔

(ر ع د)

اَلرَّعْدُ: (اسم) بادل کی گرج مروی ہے۔

(۱۵٦) اَنَّهٗ مَلَكٌ یَسُوْقُ السَّحَابَ کہ رَعْدٌ اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں کو چلاتا ہے۔❶ کہا جاتا ہے: رَعَدَتِ السَّمَاءُ وَبَرَقَتْ: بادل گرجا اور چمکا۔ اور یہی معنیٰ اَرْعَدَتْ وَاَبْرَقَتْ کے ہیں اور کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ تہدید یعنی ڈرانے اور دھمکانے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور صَلَفٌ تَحْتَ رَاعِدَۃٍ ضرب المثل ہے، جو اس شخص کے حق میں بولی جاتی ہے جو نرا باتونی ہو اور کچھ کر کے نہ دکھاتا ہو۔❷

اَلرَّعْدِیْدُ: بزدلی کی وجہ سے کانپنے والا نیز محاورہ ہے: اُرْعِدَتْ فَرَائِصُهٗ خَوْفًا یعنی مارے خوف کے اس کے پٹھے کانپنے لگے۔

(ر ع ن)

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ (۲-۱۰۴) یعنی راعنا کہہ کر خطاب نہ کیا کرو۔

﴿رَاعِنَا لَیًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ﴾ (۴-۴٦) اور اپنی زبانیں مروڑ کر اور دین اسلام میں طعنے کی راہ سے کہہ کر تم سے خطاب کرتے ہیں۔

اس کلمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو بطور تہکم خطاب کرتے تھے اور آپ ﷺ پر رعونت کا الزام دھرتے اور ظاہر یہ کرتے کہ ہم رَاعِنَا کا کلمہ کہتے ہیں جس کے معنیٰ ہیں ہمارا خیال کیجئے اور رَاعِنًا (رعن سے مشتق ہے) اور رَعُنَ الرَّجُلُ (ک) کے معنیٰ کسی آدمی کے سست اور بے وقوف ہونے کے ہیں اس سے صیغۂ صفت اَرْعَنُ اور رَعِنٌ آتا ہے جس کے معنیٰ کم فہم آدمی کے ہیں یہ دراصل رَعْنٌ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے جس کے معنیٰ بنی کوہ کے ہیں یعنی پہاڑ کا وہ حصہ جو باہر نکلا ہوا ہو اور اَرْعَنُ کی مؤنث رَعْنَاءُ آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔❸

(۱۸۵) لَوْلَا ابْنُ عُتْبَۃَ عَمْرٍو وَالرَّجَاءُ لَهٗ
مَا کَانَتِ الْبَصْرَۃُ الرَّعْنَاءُ لِیْ وَطَنًا

اگر عمرو بن عتبہ اور اس کے عطایا کی امید نہ ہوتی تو میں بَصْرۃ رعنا کو کبھی وطن نہ بناتا۔

بصرۃ کو رَعْنَاء یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بادیۃ کی بنسبت نشیبی ہونے کے سبب کو یا رَعْنَاءُ (سست عورت) کے مشابہ ہے اور یا اس لیے کہ اس کی ہوا میں تغیر اور تکسر پایا جاتا ہے۔

---

❶ هکذا ورد فی الحدیث مرفوع عن ابن عباس والحدیث فی الترمذی والنسائی واحمد والطبرانی فی الاوسط من روایة جابر وابی عمران الکوفی ـ عن ابن جریج راجع التفاسیر تحت الایة (۱۳ـ۱۳) وتخریج الکشاف رقم: ۲۲۵ وقد ذکر کلا معنیه ابوعبیدة فی مجازه (۱: ۳۲۵).

❷ مثل فی جل المعاجم وفی الصحاح: لمن یکثر الکلام ولا خیر فیه.

❸ قاله الفرزوق فی عمرو بن عتیبة وفی اللسان (رعن) صدره: لولا ابو مالك المرجو نائلهٗ وفی روایة الحمقاء بدل الرعناء والبیت فی الاقتضاب ۴۰۱ ودیوانه والبلدان (رسم: بصرة) وفیه وجة تلقیبها بالرعاء ۱۲.

(ر ع ی)

اَلرَّعْیُ: اصل میں حیوان یعنی جاندار چیز کی حفاظت کو کہتے ہیں۔خواہ غذا کے ذریعہ ہو جو اس کی زندگی کی حافظ ہے۔یا اس سے دشمن کو دفع کرنے کے ذریعہ ہوا اور رَعَیْتُہٗ کے معنیٰ کسی کی نگرانی کرنے کے ہیں اور اَرْعَیْتُہٗ کے معنیٰ ہیں میں نے اس کے سامنے چارا ڈالا اور رِعْیٌ چارہ یا گھاس کو کہتے ہیں مَرْعیٰ (ظرف) چراگاہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كُلُوْا وارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ (۲۰:۵۴)تم بھی کھاؤ اور اپنے چارپاؤں کو بھی کھلاؤ ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآئَهَا وَمَرْعَاهَا﴾ (۷۹:۳۱) اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

﴿وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعیٰ﴾ (۸۷۔۴) اور جس نے (خوش نما) چارہ (زمین سے) نکالا۔

رَعْیٌ اور رِعَاءٌ کا لفظ عام طور پر حفاظت اور حسنِ انتظام کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا رَعَوهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ (۵۷۔۲۷) لیکن جیسے اس کی نگداشت کرنا چاہئے تھی انہوں نے نہ کی۔

اور ہر وہ آدمی جو دوسروں کا محافظ اور منتظم ہو اسے رَاعِیٌ کہا جاتا ہے۔حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۵۷) ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) تم میں سے رہ شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال ہوگا شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (السریع)

(۱۸۶)...... وَلَا اَرْمَرعِی فِی الْاَقْوَامِ کَالرَاعِی

اور محکوم قومیں حاکم قوموں کے برابر نہیں ہوسکتیں۔

اور رَاعِیٌ کی جمع رِعَاءٌ وَرُعَاة آتی ہے۔اَلْمُرَاعَاةُ: کسی کام کے انجام پر غور کرنا اور دیکھنا کہ اس سے کیا صادر ہوتا ہے کہا جاتا ہے: رَاعَیتُ النَّجُومَ: میں نے ستاروں کے غروب ہونے پر نگاہ رکھی قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا﴾ (۲۔۱۰۴) (مسلمانو! پیغمبر سے) رَاعِنَا کہہ کر مت خطاب کیا کرو بلکہ اُنظُرنَا کہا کرو۔

کہا جاتا ہے:

اَرْعَيتُهٗ سَمْعِی: میں نے اس کی بات پر کان لگایا یعنی غور سے اس کی بات کو سنا۔اسی طرح محاورہ ہے: اَرْعِنِیْ سَمْعَكَ: میری بات سنیے۔

اور اَرْعِ عَلیٰ کَذَا کے معنیٰ کسی پر رحم کھانے کے اور اس کی حفاظت کرنے کے ہیں۔

(ر غ ب)

اَلرَّغْبَةُ: اس کے اصل معنیٰ کسی چیز میں وسعت کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ: رَغُبَ الشَّیءُ کسی چیز کا وسیع ہونا اور حَوضٌ رَغِیبٌ: کشادہ حوض کو کہتے ہیں۔عام محاورہ ہے:

فُلَانٌ رَغِیبُ الْجَوفِ فلاں پیٹو ہے۔

فَرَسٌ رَغِیبُ الْعَدْوِ: تیز رفتار اور کشادہ قدم گھوڑا

اَلرَّغْبَةُ وَالرَّغَبُ وَالرَّغْبیٰ: ارادہ اور خواہش کی

---

❶ اصل الحديث متفق عليه وايضاً فى الترمذى وابى داؤد والبيهقى من انس وابن عباس والطبرانى من حديث ابن عباس راجع لتخريجه احياء العلوم للغزالى بتخريج العراقى (۲: ۳۱) وكنزالعمال (۶: ۱۹, ۱۳۱) والفتح الكبير (۲: ۳۳۰۔۳۳۱) .

❷ قاله ابوقيس بن الاسلت وتكملته ليس قطاً مثل قطى .... والبيت من كلمة مفضلية (۲: ۵۸) جمهرة فى ۱۹ بيتاً راجع السمط ۸۳۷ والميدانى (۲: ۱۰۹) واللسان (قطا) (رعى) وايام العرب ۸۳ وخاص الخاص للثعالبى ۱۴ والمثل ايضاً فى الميدانى (۲: ۸۶،۱۱۶) والعسكرى (۲:۱۷۹، ۱۷۶).

وسعت کو کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا﴾ (۲۔۹۰) اور وہ ہم کو (ہمارے فضل کی توقع اور ہمارے غذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں۔

اور رَغِبَ فِيهِ وَاِلَيْهِ کے معنی کسی چیز پر رغبت اور حرص کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا اِلَى اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ﴾ (۹۔۵۹) ہم تو اللہ سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔

لیکن رَغِبَ عَنْ کے معنی کسی چیز سے بے رغبتی اختیار کرنا کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ رَغِبَ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ﴾ (۲۔۱۳۰) اور کون ہے جو ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقے سے انحراف کرے۔

﴿اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ﴾ (۱۹۔۴۶) (اے ابراہیم علیہ السلام) کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے۔

اور رَغِيْبَة کے معنی بہت بڑے عطیہ کے ہیں (ج: رَغَائِبُ) یہ رغبت سے مشتق ہے یا تو اس لئے کہ وہ مرغوب فیہ ہوتی ہے اور یا اصل معنی یعنی وسعت کے لحاظ سے عطیہ کو رغیبہ کہا جاتا ❶ ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

(۱۸۷) "يعطِي الرغائب مَنْ يَّشاء وَيمنع"

وہ جسے چاہتا ہے بڑے بڑے عطایا بخشا اور جس سے چاہتا ہے روک دیتا ہے۔

(ر غ د)

رَغَداً وَرَغِيداً: آسودہ زندگی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا﴾ (۲۔۳۵) اور اس میں سے تم دونوں بافراغت کھاؤ۔

﴿يَأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾ (۱۶۔۱۱۲) ہر طرف سے ان کا رزق بافراغت ان کے پاس چلا آتا تھا۔

اَرْغَدَ الْقَوْمُ: آرام وراحت میں بسر کرنا۔

اَرْغَدَ مَا شِيَتَهٗ: اس نے اپنے مویشی چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیئے۔

ان میں اول یعنی اَرْغَدَ الْقَوْمُ جَدَبَ وَاَجْدَبَ کی طرح لازم ہے اور دوسرا یعنی اَرْغَدَ مَا شِيَتَهٗ اَدْخَلَ کی طرح متعدی ہے۔

اَلْمِرْغَادُ: ایک قسم کا کھانا جو دودھ میں خرما وغیرہ ڈال کر بنایا جاتا ہے اور وافر ہونے کی وجہ سے زندگی کی آسودگی پر دلالت کرتا تھا۔

(ر غ م)

الرُّغَامُ: اصل میں خاک کو کہتے ہیں اور رَغِمَ اَنْفُ فُلَانٍ کے معنی اس کی ناک خاک آلود ہو یعنی وہ ذلیل ہو اور اَرْغَمَهٗ: کسی کو ذلت کے ساتھ خاک میں ملا دینا مجازاً رَغِمَ اَنْفُ فُلَانٍ کے معنی ناراض ہونا بھی آتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۱۸۸) اِذَا رَغِمَتْ تِلْكَ الْاُنُوْفُ لَمْ اُرْضِهَا
وَلَمْ اَطْلُبِ الْعُتْبٰى وَلٰكِنْ اَزِيْدُهَا

اگر وہ ناراض ہوں گے تو میں ان کو راضی کرنے کی کوشش نہیں کروں گا بلکہ اس کی ناراضگی کو اور بڑھا دوں گا۔

یہاں رغم کو ارضاء کے بالمقابل لانا اس بات کی

---

❶ لعبدة بن الطيب من قصيدة يعظ فيها بنيه وصدره: اوصيكم بتقى الاله فانه .... راجع للبيت شرح شواهد التلخيص (۱: ۳۶)۔

❷ قد مرفي (انف) رقم ۳۱ وفيه غضب بدل اغمت.

دلیل ہے کہ اس کے معنیٰ سَخِطَ یعنی غصے اور ناراض ہونے کے ہیں اسی بنا پر کہا جاتا ہے:

اَرْغَمَ اللّٰهُ اَنْفَ فُلَانٍ اَوْ اَرْغَمَهٗ: یعنی اللہ اسے ذلیل کرے اور رَاغَمَهٗ (باب مفاعلہ) کے باہم ناراض ہونے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی کوشش کے ہیں بعدازاں مُرَاغَمَۃٌ کا لفظ منازعت کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور آیت:

﴿يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً﴾ (۴۔۱۰۰) تو روئے زمین میں اس کو رہنے سہنے کی وافر جگہ اور ہر طرح کی کشائش ملے گی۔

میں مُرَاغَمًا سے مراد پناہ گاہ ہے یعنی برائی کو دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش کرے اگر اس سلسلہ میں اسے وطن بھی ترک کرنا پڑے تو ہراساں نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے کوئی اچھی پناہ گاہ دے گا۔ جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہوگی اور یہ رَغَمْتُ اِلَيْهِ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں کسی کے پاس چلا جانا۔ جیسے غَضِبْتُ اِلٰى فُلَانٍ مِنْ كَذَا یعنی ناراض ہو کر فلاں کے پاس چلا گیا۔

(ر ف ف)

رَفِيفُ الشَّجَرِ: درخت کی شاخوں کا ہوا سے لہلہانا اور منتشر ہونا۔ کہا جاتا ہے:

رَفَّ الطَّيْرُ جَنَاحَيهِ: پرند کا اپنے بچے کی حفاظت کے لئے دونوں بازو پھیلانا۔ یہ باب رَفَّ يَرُفُّ (ن) سے ہے اور استعارہ کے طور پر رَفٌّ کا لفظ کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ عام محاورہ میں کہا جاتا ہے:

مَا لِفُلَانٍ حَافٌّ وَّلَا رَافٌّ: یعنی اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ اس پر کوئی شفقت کرنے والا نہیں رہا۔ مثل مشہور ہے۔[1]

مَنْ حَفَّنَا اَوْ رَفَّنَا فَلْيَقْتَصِدْ: جو ہم پر شفقت کرے اسے چاہیئے کہ اعتدال سے کام لے۔

اَلرَّفْرَفُ: کے معنیٰ درخت کے منتشر پتوں کے ہیں۔ اور قرآن پاک میں ہے:

﴿عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ﴾ (۵۵۔۷۶) وہ سبز قالینوں پر (تکیہ لگائے)

رَفْرَفٍ سے خاص قسم کے کپڑے مراد ہیں جو مرغزار کے مشابہ ہوتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ رَفْرَفٌ سے خیمے کا کنارہ مراد ہے جو زمین پر پڑا رہتا ہے اور حسن (بصری) سے مروی ہے کہ اس سے گل تکئے مراد ہیں۔

(ر ف ت)

اَلرَّفْتُ: یہ باب نصر کا مصدر ہے اور رَفَتِ الشَّيْءَ کے معنیٰ کسی چیز کا چوراچورا کر دینے کے ہیں اور جو بھوسہ وغیرہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے اسے رفات کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالُوْا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا﴾ (۱۷۔۴۹) اور کہا کرتے کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

اور استعارہ کے طور پر رُفَات اس رسی کو بھی کہتے ہیں جو بوسیدہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہو۔

---

[1] انظر للمثل النهاية لابن الاثير (۲: ۹۸) واللسان والصحاح (رفف) ومجالس ثعلب (۲: ۴۱۱) وفي اتباع ابي الطيب ۴۸ فليترك بدل فليقتصد وكلهم جعل الكلمة من قبيل المثل الا اباالطيب فانه قال جاء في الحديث ۔۱۲۔

(ر ف ث)

اَلرَّفَثُ: (ن) وہ فحش باتیں جن کا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا یعنی جماع اور اس کے دواعی کا تذکرہ اور آیت کریمہ:

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ (۲۔۱۸۷) مسلمانو! ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے جائز کر دیا گیا ہے۔

میں کنایۃً جماع مراد ہے اور اس سے متنبہ کیا گیا ہے کہ ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کو جماع کے لئے بلانا اور ان سے اس کے متعلق گفتگو کرنا جائز ہے اور اسے بواسطہ الیٰ متعدی کر کے معنیٰ افضاء کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور آیت:

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ......﴾ (۲۔۱۹۷) (اور حج میں) نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ گناہ کی۔

میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جماع کی ممانعت کی گئی ہو اور یہ بھی کہ اس کے متعلق گفتگو سے منع کیا گیا ہو کیونکہ یہ گفتگو جماع کے مقدمات میں شامل ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ دورانِ طواف میں یہ شعر پڑھا۔[1] (رجز)

(۱۸۹) وَهُنَّ يَمْشِيْنَ بِنَا هَمِيْسًا
اِنْ تَصْدُقِ الطَّيْرُ نَنِكْ لَمِيسًا

اور اونٹ ہمیں لے کر آہستہ آہستہ نرم رفتاری سے چلتے ہیں اگر پرند سچ بولتا ہے تو ہم لمیس سے جماع کریں گے۔

اور رَفَثَ وَاَرْفَثَ دونوں ایک دوسرے کی جگہ میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ رَفَثَ کے معنیٰ مباشرت کرنے کے ہیں اور اَرْفَثَ کے معنیٰ رَفَثَ (ماخذ) کے ساتھ متصف ہونا کے اور یہ دونوں باتیں لازم ملزوم ہیں۔

(ر ف د)

اَلرِّفْد: (ن) اس کے معنیٰ عطا اور مدد کے ہیں اور رَفْدٌ مصدر (ض) ہے جس کے معنیٰ مدد دینے کے اور عطا کرنے کے ہیں اور مِرْفَدٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں عطیہ ڈال کر دیا جائے عام طور پر پیالوں میں خیرات ڈال کر دی جاتی ہے اس لئے مِرْفَدٌ بمعنیٰ پیالہ آتا ہے اور رَفَدْتُهٗ کے معنیٰ عطیہ دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ﴾ (۱۱۔۹۹) بہت ہی برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا۔

اور اَرْفَدْتُهٗ کے معنیٰ کسی کے لئے عطا مقرر کرنے کے ہیں کہ وہ مقررہ مقدار میں اس سے لیتا رہے۔ رَفَدَهٗ وَاَرْفَدَهٗ دونوں سَقَاهُ وَاَسْقَاهُ کی طرح متعدی بن کر استعمال ہوتے ہیں۔

اور رُفِدَ فُلَانٌ فَهُوَ مُرْفَدٌ سے بطور استعارہ وہ شخص بھی مراد ہوتا ہے جسے ریاست (سرداری) دی گئی ہو۔

اَلرَّفُوْدُ: اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک بار دودھ دوہنے سے پیالہ بھر دے لہٰذا یہ (فعول) بمعنی فاعل کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ مَرَافِید ان اونٹنیوں اور بکریوں کو کہتے

---

[1] راجع للقصة والبيت الكشاف والمستدرك للحاكم والطبرى (۲: ۲۶۵) وفى روايته خرجن يسرين مكان هن يمشين والرجز ايضاً فى البحر (۱۶: ۲۷۱) والعمدة (۱: ۳۰) والمحاضرات للمولف (۱: ۷۹) وابن كثير (۱: ۲۳۷) والحيوان للحاحظ (۳: ۴۰) والعيون (۱: ۳۲۱/۳: ۲۲).

ہیں جو موسم گرما اور سرما میں برابر دودھ دیتی ہوں اور ان کا دودھ کبھی خشک نہ ہوتا۔ ہو شاعر نے کہا ہے۔ (1)

(۱۹۰) اَطْعَمْتَ الْعِرَاقَ وَرَافِدَيْهِ
فَـزَارِيًّـا اَحَـذَّ يَـدِ الْـقَـمِيْـصِ

یعنی تو نے عراق اور دجلہ وفرات پر ایک فزاری کو عامل بنا کر بھیجا ہے جو خیانت میں نہایت ماہر ہے۔

یہاں رافدیہ سے دجلہ اور فرات مراد ہیں کیونکہ ان کا پانی مسلسل جاری رہتا ہے۔

تَـرَافَدُوْا کے معنیٰ ایک دوسرے سے تعاون کرنا کے ہیں اسی سے رِفَـادہ ہے یعنی وہ فنڈ جو قریش نادار حجاج کی مدد کے لیے جمع رکھتے تھے (رف ع) اَلـرَّفْعُ (ف) کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں یہ کبھی تو مادی چیز جو اپنی جگہ پر پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَرَفَعْنَا فَوقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ (۲۔۶۳) اور ہم نے طور پر پہاڑ کو تمہارے اوپر لا کر کھڑا کیا۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (۱۳۔۲) اللہ وہ قادر مطلق ہے جس نے آسمان کو بدوں کسی سہارے کے اونچا بنا کھڑا کیا۔

اور کبھی عمارت کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ (۲۔۱۲۷) اور جب ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور کبھی ناموری اور شہرت کا ذکر بلند کرنے کے لئے جیسے فرمایا: ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (۹۴۔۴) اور ہم نے تمہارے ذکر خیر کا آوازہ بلند کیا۔

اور کبھی مرتبہ کی بلندی بیان کرنے کے لئے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ (۶۔۱۶۶) اور ان میں سے بعض کو بعض پر بلحاظ درجات کے فوقیت دی۔

﴿نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَآءُ﴾ (۱۲۔۷۶) اور ہم جس کو چاہتے ہیں (حسن تدبیر میں) اس کے درجے بلند کر دیتے ہیں۔

﴿رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُوالْعَرْشِ﴾ (۴۰۔۱۵) خدا بڑا عالی مرتبہ (اور) عرش (بریں) کا مالک ہے۔

اور آیت: ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ (۴۔۱۵۸) بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔

میں رفع کے معنیٰ آسمان کی طرف اٹھا لے جانا بھی ہو سکتے ہیں اور رفع (2) بلحاظ شرف بخشی بھی اور (قیامت کے متعلق) آیت:

---

(1) قاله الفرزوق يهجو عمربن هبيرة الفزارى ويخاطب يزيدبن عبدالملك لماولاه العراق ۱۰۲ هـ وقبله : تفهيق بالعراق ابو المثنىٰ وعلم قومه اكل الخبيص والبيت فى السمط ۸۶۲ واللسان والمحكم والصحاح (حذذ) وديوانه (۲ : ۴۸۸) رقم ۳۰۴ والحصرى (۱ : ۵۷) والجرجانى ۷۴ والكامل ۸۰۸ والرافدان : الدجلة والفرات والبيت ايضاً فى الحيوان (۵ : ۶/۱۹۷ : ۵۱۰) فى اربعة ابيات والخبر فى الفاضل ۱۱۱ وادب الكاتب للصولى والبيت ايضاً فى مجازات القران ۲۹۱ والمعارف للقتبى ۱۷۹ والمعانى للقتبى ۵۹۷ والرواية فى معظم المصادر "أطعمت" وفى الاغانى (۱۹۔۱۷) والامالى (۱۲۳ت) والصحاح أوليت وفى الحيوان والاساس واللسان (رفد) "بعثت الى" فاظن ان الفاء فى المطبوع مصحف قال القتبى فى المعانى الاحذ معناه سريع اليد واراد خفة يده فى السرقة والخيانة (كذا فى الصحاح) وزكرالقميص لتسديد القافيه وذكر الاخباريون : فعزله يزيد ۱۰۵هـ ثم لم يسمع له ذكر.

(2) لكن الرفع الى السماء متعين فى الآية لان الاحاديث تدل بالتواتر على هذا المعنى راجع (ى ق ن) .

﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ (۵۶۔۳) بعض کو نیچا دکھائے گی اور بعض کو (بلحاظ درجہ) بلند کرے گی۔

(میں زمین بھی) رَافِعَةٌ کا لفظ خافضة کے مقابلہ میں آیا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ رفع بلحاظ درجات مراد ہے۔اور آیت:

﴿وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ﴾ (۸۸۔۱۸) اور آسمان کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کیسا اونچا بنایا۔

میں دونوں قسم کی بلندی کی طرف اشارہ ہے یعنی بلندی بلحاظ محل اور بلندی بلحاظ شرف ومنزلت اور آیت ﴿وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ﴾ (۵۶:۳۴) اور اونچے اونچے فرش میں فرش کی بلندی سے ان کے عمدہ اور نفیس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔اسی طرح آیت:

﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ (۸۔۱۳،۱۴) ان اوراق میں (لکھا ہوا ہے) جن کی تعظیم کی جاتی ہے اور وہ پاکیزہ اونچی جگہ پر رکھے ہوئے ہیں۔

میں بھی بلندی بلحاظ شرف ومنزلت ہی مراد ہے۔اور آیت:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ.........﴾ (۲۴۔۳۶) ایسے گھروں میں جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی عزت کی جائے۔

میں بھی رَفَعَ بلحاظ عزوشرف مراد ہے یعنی ان کی تعظیم کی جائے اور ان کے اندر کوئی نازیبا حرکت نہ کی جائے جوان کے ادب واحترام کے خلاف ہو اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ (۳۳۔۳۳) (اے پیغمبر کے) گھر والو! خدا کو تو بس یہی منظور ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) گندگی کو دور کرے۔

میں رَجس کے دور کرنے سے عزوشرف بخشنا مراد ہے اور رفع کے معنیٰ تیز رفتاری بھی آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: رَفَعَ الْبَعِيْرُ فِي سَيْرِهٖ: اونٹ تیز رفتاری سے چلا اَرْفَعْتُهٗ اَنَا: میں نے اسے تیز چلایا بَعِيْرٌ مَرْفُوْعُ السَّيْرِ: تیز رفتار اونٹ۔اور رَفْعٌ کے معنیٰ کسی کے راز کو فاش کرنا بھی آتے ہیں جیسے: رَفَعَ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانٍ میں نے اس سے پردہ اٹھادیا یعنی اس کے راز کو فاش کردیا اور رِفَاعَةٌ اس چھوٹی سی گدی کو کہتے ہیں جسے عورتیں اپنی سرین پر باندھ لیتی ہیں تاکہ وہ بڑی معلوم ہوں۔

(ر ق ق)

اَلرِّقَّةُ: (باریکی) اور دِقَّةٌ کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔ لیکن رقة بلحاظ کناروں کی باریکی کے استعمال ہوتا ہے اور دِقَّةٌ بلحاظ عمق کے بولا جاتا ہے۔پھر اگر رقت کا لفظ اجسام کے متعلق استعمال ہو تو اس کی ضد صفاقت آتی ہے جیسے ثَوْبٌ رَقِيْقٌ: (باریک کپڑا) اور ثوب صفیق (موٹا کپڑا) اور دل کے متعلق استعمال ہو تو اس کی ضد قساوت اور جفاء آتی ہے مثلاً نرم دل کے متعلق کہا جاتا ہے۔فُلَانٌ رَقِيْقُ الْقَلْبِ اور اس کے بالمقابل سخت دل آدمی کو قَاسِيَ الْقَلْبِ کہتے ہیں۔

اَلرَّقُّ: کاغذ کی طرح کی کوئی چیز جس پر لکھا جائے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ﴾ (۵۲۔۳) (اور چوڑے چکلے) کاغذ پر لکھی ہوئی (کتاب کی قسم ہے)

اور نر کچھوے کو بھی رِقٌّ کہا جاتا ہے۔

اَلرِّقُّ کے معنیٰ غلاموں کا مالک ہونے کے ہیں اسی سے مملوک غلام کو رَقِیق کہتے ہیں اس کی جمع اَرِقَّاءُ آتی ہے اور اِسْتَرَقَّ فُلَانٌ فُلَانًا کے معنیٰ کسی کو غلام بنانے کے ہیں۔

اَلرَّقْرَاقُ: شراب کی چمک دمک کو کہتے ہیں اور رَقْرَقَةٌ کے معنیٰ شفاف شراب کے ہیں نیز ہر وہ قطعہ زمین جو پانی سے متصل ہوا سے رِقَّةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ مرطوب ہونے کی وجہ سے وہ نرم رہتی ہے مثال مشہور ہے۔

اَعَنْ صَبُوْحٍ تُرَقْرِقُ: کیا تمہارا اشارہ صبح کی شراب سے ہے۔ یہ حسنِ طلب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ [1]

(ر ق ب)

اَلرَّقَبَةُ: اصل میں گردن کو کہتے ہیں پھر رَقَبَةٌ کا لفظ بول کر مجازاً انسان مراد لیا جاتا ہے اور عرف عام میں اَلرَّقَبَةَ غلام کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ لفظ رَأْسٌ اور ظَهْرٌ بول کر مجازاً سواری مراد لی جاتی ہے چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانٌ يَرْبَطُ كَذَا ظَهْرًا اَوْ كَذَا رَأْساً...... یعنی فلاں کے پاس اتنی سواریاں ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ (۴۔۹۲) کہ جو مسلمان کو غلطی سے (بھی) مار ڈالے تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرائے۔

اور رَقَبَةٌ کی جمع رِقَابٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ (۲۔۷۷) اور غلام کو آزاد کرنے میں۔ مراد مکاتب غلام ہیں۔ کیونکہ مال زکوۃ کے وہی مستحق ہوتے ہیں اور رَقَبْتُهٗ (ن) کے معنیٰ گردن پر مارنے یا کسی کی حفاظت کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ....﴾ (۹۔۱۰) کسی مسلمان کے بارے میں نہ تو قرابت کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں اور نہ ہی عہد و پیمان کا۔

اسی سے نگران کو رَقِيْبٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ اس شخص کی گردن پر نظر رکھتا ہے جس کی نگرانی منظور ہوتی ہے اور یا وہ نگرانی کے لئے بار بار اپنی گردن اٹھا کر دیکھتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَارْتَقِبُوا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ﴾ (۱۱۔۹۳) تم بھی منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

﴿اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (۵۰۔۱۸) مگر ایک چوکیدار (اس کے لکھنے کو) تیار رہتا ہے۔

اَلْمَرْقَبُ: بلند جگہ جہاں رقیب (نگران) بیٹھ کر چوکسی کرتا ہے اور قمار بازوں کے محافظ کو بھی رَقِيب کہا جاتا ہے جو قمار بازی کے بعد شراب نوشی کرتے ہیں۔ اسی طرح قمار بازی کے تیسرے درجہ کے تیر کو بھی رَقِيْبٌ کہتے ہیں۔

تَرَقُّبٌ: (تفعل) کے معنیٰ ہیں انتظار کرتے ہوئے کسی چیز سے بچنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ﴾ (۲۸۔۲۱) چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) شہر سے نکل بھاگے اور دوڑتے ہوئے جاتے تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

رَقُوْبٌ: اس عورت کو کہتے ہیں جو کثرت اولاد کی وجہ سے اپنے بچوں کی موت کی منتظر ہو۔ نیز وہ اونٹنی جو پانی پینے کے لئے باری کے انتظار میں ہوا سے بھی رَقُوْبٌ کہا

---

[1] راجع للمثل المعاجم.

جاتا ہے اَرْقَبَ: (افعال) کے معنیٰ رُقْبیٰ کرنے کے ہیں یعنی کسی کو اس کی زندگی بھر کے لئے مکان وغیرہ ہبہ کر دینا اور اس کی موت کے بعد اس عطا کو واپس لے لینا اور اسے رُقْبیٰ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہبہ کے بعد گویا وہ اس کی موت کا انتظار کرتا ہے۔ اور ایسے ہبہ کو عمریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ ❶

(ر ق د)

اَلرُّقَادُ: خوشگوار اور ہلکی سی نیند کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے رَقَدَ (ن) رُقُوْدًا فَھُوَ رَاقِدٌ اور رَاقِدٌ کی جمع رُقُوْدٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَھُمْ رُقُوْدٌ﴾ (۱۸۔۱۸) حالانکہ وہ (اصحاب کہف) سوئے ہوئے ہیں۔

اصحاب کہف کی گہری اور لمبی نیند کے باوجود ان پر رقود کا لفظ بول کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نیند خواہ کتنی ہی گہری اور لمبی کیوں نہ ہو موت کے مقابلہ میں وہ نوم خفیف کی حیثیت رکھتی ہے لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اصحابِ کہف فوت ہو چکے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَھُمْ رُقُوْدٌ﴾ کہہ کر ان سے موت کی نفی کی ہے۔

اور مَرْقَدٌ (ظرف) خواب گاہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿یٰوَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ (۳۶۔۵۱) ہم پر افسوس ہے کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے جگا اٹھایا۔

اور اَرْقَدَ الظَّلِیْمُ: کے معنیٰ شتر مرغ کے تیز دوڑنے کے ہیں گویا اس نے تیز روی سے اپنی نیند کو دور کر دیا۔

(ر ق م)

اَلرَّقْمُ: کے معنیٰ گاڑھے خط کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ رَقْمٌ کے معنیٰ کتاب پر اعراب اور نقطہ لگانے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ﴾ (۸۳۔۹) وہ ایک کتاب ہے (وقتاً فوقتاً) اس کی خانہ پری ہوتی رہتی ہے۔

میں مَرْقُوْمٌ کے دونوں معنیٰ ہو سکتے ہیں یعنی گاڑھے اور جلی خط میں لکھی ہوئی یا نقطے لگائی ہوئی۔ اور جو شخص کسی کام کا ماہر اور حاذق ہو اس کے متعلق ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ یَرْقُمُ فِی الْمَآءِ: یعنی وہ ماہر ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اَصْحَابَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ﴾ (۱۸۔۹) کہ غار اور لوح والے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ رَقِیْم ایک مقام کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس پتھر کی طرف نسبت ہے جس میں ان کے نام کندہ تھے اور گدھے کے دونوں بازوؤں پر جو نشان ہوتے ہیں انہیں رَقْمَتَا الْحِمَارِ کہا جاتا ہے اور اَرْضٌ مَرْقُومَةٌ تھوڑی گھاس والی زمین کو کہتے ہیں گویا وہ کتابت کے نشانات کی طرح ہے۔

اَلرَّقِمِیَّاتُ: تیروں کو کہتے ہیں جو مدینہ کے ایک مقام کی طرف منسوب ہیں۔

(ر ق ی)

رَقِیَ (س) رُقِیًّا۔فی السُّلَّمِ کے معنیٰ سیڑھی پر چڑھنے کے ہیں اور اِرْتَقیٰ (افتعال) بھی اسی معنیٰ میں

---

❶ لکن اصحاب غریب الحدیث فرقوابین العمری والرقبی ۱۲۔

استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ﴾ (۳۸۔۱۰) تو ان کو چاہیے کہ سیڑھیاں لگا کر آسمان پر چڑھیں۔
مثل مشہور ہے[1]: اِرْقَ عَلٰى ظَلْعِكَ: یعنی اپنی طاقت کے مطابق چلو اور طاقت سے زیادہ اپنے آپ پر بوجھ نہ ڈالو۔
اور رَقَيْتُ بمعنیٰ رقیہ یعنی افسوں کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔محاورہ ہے:
كَيْفَ رَقْيُكَ اَوْ رُقْيَتُكَ: کہ تمہارا افسوں کیسا ہے۔
اس میں رَقْیٌ مصدر ہے اور رُقْيَةٌ اسم۔اور آیت کریمہ:
﴿وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ﴾ (۱۷۔۹۳) یعنی ہم تیرے افسوں پر یقین کرنے والے نہیں ہیں۔
میں رُقِیٌّ بمعنیٰ رُقْيَةٌ کے ہے اور آیت:
﴿وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ﴾ (۷۵۔۲۷) اور کون افسوں کرے۔
میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس وقت جھاڑ پھونک سے کوئی اس کی جان نہیں بچا سکے گا۔چنانچہ اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے۔[2] (الکامل)

(۱۹۰) وَاِذِ الْمَنِيَّةُ اَنْشَبَتْ اَظْفَارَهَا
اَلْفَيْتَ كُلَّ تَمِيْمَةٍ لَا تَنْفَعُ

کہ جب موت اپنا پنجہ گاڑ دیتی ہے تو کوئی افسوں کارگر نہیں ہوتا۔
ابن عباس نے مَنْ رَاقٍ کے معنیٰ کئے ہیں کہ کون سے فرشتے اس کی روح لے کر اوپر جائیں یعنی ملائکہ رحمت یا ملائکہ عذاب۔
اَلتَّرْقُوَةُ: ہنسلی کی ہڈی کو کہتے ہیں اس لحاظ سے کہ سانس پھول کر وہیں تک چڑھتی ہے اس کی جمع تَرَاقِیُ ہے۔
چنانچہ قرآن میں ہے:
﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ﴾ (۷۵۔۲۶) سنو جی! جب جان بدن سے نکل کر گلے تک پہنچ جائے گی۔

(ر ک ب)

اَلرُّكُوْبُ: کے اصل معنیٰ حیوان کی پیٹھ پر سوار ہونے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً﴾ (۱۶۔۸) تاکہ ان سے سواری کا کام لو اور (سواری کے علاوہ یہ چیزیں) موجب زینت (بھی) ہیں۔
مگر کبھی کشتی وغیرہ پر سوار ہونے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ﴾ (۲۹۔۶۵) پھر جب لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔
مگر عرف میں رَاكِبٌ کا لفظ شتر سوار کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔اس کی جمع رَكْبٌ وَرُكْبَانٌ اور رُكُوْبٌ تینوں آتی ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ (۸۔۴۲) اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف کو (ہٹا ہوا) تھا۔

---

[1] المثل فی جل المعاجم.

[2] قاله ابو ذؤيب الهذلي يرثي بنيه والبيت من كلمة مفضلية (۲ : ۲۲۰) جمهرية (۳٤۱) في ٦۲ بيتاً مذكوره بعضها في اللسان (نسب) والخزانة (۱ : ۲۰۲) والسيوطي (۳،۹۲/٤۹۳) وديوان الهذليين (۱ : ۳) والعقد (۲ : ۱۵) والاصابة ۲۵۰۷ والاسد (٥ : ۱۹۰) والسمط (٤٤۹،۸۸۸) والحماسة للبحتري ۹۹ والكامل ٥۱۸ وشواهد الكشاف ونقد الشعر ٦۷ ومحاضرات المؤلف (٤ : ٤۸۹) وخاص الخاص ۱۸۲ والفاضل للمبرد ٥۱ وفي تاريخ الطبري ان معاوية تمثل به عند موته ۱۲.

﴿فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ (۲۔۲۳۹) تو پیادہ یا سوار ہو کر۔

اور ''رکاب'' خاص کر مرکوب یعنی سواری پر بولا جاتا ہے۔

اَرْكَبَ الْمُهْرُ: بچھیرا سواری کے قابل ہو گیا۔

اَلْمُرْكَبُ خاص کر اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے کے گھوڑے پر سوار ہو یا جو شخص سواری نہ کر سکے یا سوار ہونا نہ جانتا ہو۔

اَلْمُتَرَاكِبُ: وہ چیز جو تہ برتہ ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا﴾ (۶۔۱۰۰) پھر ہم سبز کونپلیں نکالتے ہیں کہ ان سے گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔

رُكْبَةٌ کے معنیٰ زانو کے ہیں اور رَكَبْتُهٗ کے معنیٰ ہیں: میں نے اس کے زانو پر مارا جیسے فَأَدْتُهٗ (میں نے اس کے دل پر مارا) رَأَسْتُهٗ میں نے اس کے سر پر مارا۔اور نیز رَكَبْتُهٗ کے معنیٰ گھٹنے سے مارنا بھی آتے ہیں۔جیسے يَدَيْتُهٗ: میں نے اسے ہاتھ سے مارا۔عِنْتُهٗ: میں نے اسے نظر لگادی وغیرہ۔پھر کنایہ کے طور پر عورت کے ستر کو بھی رَكَبٌ کہہ دیتے ہیں۔ [1] جیسا کہ مجازاً عورت کو مطیۃ (سواری) یا مَعِيْدَةٌ (بمعنیٰ مُقْتَعِدَةٌ) کہا جاتا ہے۔

(ر ک د)

رَكَدَ(ن) رُكُوْدًا کے معنیٰ پانی یا ہوا وغیرہ کے ٹھہر جانے کے ہیں۔اسی طرح کشتی کے ٹھہر جانے پر بھی رُكُوْدٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارُ فِى الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ٥ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ﴾ (۴۲۔۳۲،۳۳) اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے (بادبانی) جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح (اونچے اونچے) دکھائی دیتے ہیں اگر خدا چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔

جَفْنَةٌ رَكُوْدٌ: لبالب بھرا ہوا پیالہ۔

(ر ک ز)

اَلرِّكْزُ: دھیمی آواز (یا آہٹ) کو کہتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ (۱۹۔۹۸) اب تم ان میں سے کسی کو (بھی) دیکھتے ہو یا ان کی بھنک بھی سنتے ہو۔

اور رَكَزْتُ كَذَا کے معنیٰ ہیں: میں نے اسے مخفی طور پر دفن کر دیا اسی سے اَلرِّكَازُ ہے جس کے معنیٰ دفینہ ہیں۔خواہ اسے کسی انسان نے دفن کیا ہو، جیسے خزانہ وغیرہ یا قدرتی طور پر زمین کے اندر پایا جائے جیسے معدنیات اور اَلرِّكَاز کا لفظ ان دونوں کو شامل ہے۔اور حدیث ہے۔ [2]

(۱۵۹) وَفِى الرِّكَازِ الْخُمُسُ: (رکاز میں خمس ہے) میں رکاز کے دونوں معنیٰ بیان کئے گئے ہیں۔عام محاورہ ہے: رَكَزْرُمْحَهٗ: اس نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا۔اور فوج کی فرودگاہ کو مَرْكَز کہا جاتا ہے کیونکہ وہ

---

[1] وفی الصحاح: الرکب (بالتحریک) منبت العانة وقال الخلیل یختص بالمرأة وقیل یعم.

[2] الاول عند اهل الحجاز والثانی عند اهل العراق (القولات تحتملها اللغة (النهاية) والحديث رواه الجماعة عن ابی هريرة وله الفاظ وطرق راجع النيل ٤ : ١٥٧ ومالك فی مؤطاهٗ عن الزهری والشافعی فی الام (٢ : ٣٧) والرسالة رقم (٥٣٣) تحقيق احمد شاكر ومسند احمد (٣ : ٣٣٥) رقم (٤٦٤٤) (ایضاً عن ابن عباس (طب عن ثعلبة طس عن جابر وابن مسعود.

جہاں ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ وہاں زمین میں اپنے نیزے (جھنڈے) گاڑ دیتے ہیں۔

(ر ک س)

اَلرَّکْسُ: کے معنیٰ کسی چیز کو اس کے سر پر الٹا کر دینا یا اس کے اول سرے کو موڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ ملا دینا کے ہیں۔محاورہ ہے:
اَرْکَسْتُہٗ: میں نے اسے الٹا کر دیا اور رُکِسَ اس کا مطاوع آتا ہے اور اِرْتَکَسَ فِیْ اَمْرِہٖ کے معنیٰ کسی معاملہ میں الجھ جانے کے ہیں (یعنی کسی مصیبت سے رہائی کے بعد دوبارہ اس میں پھنس جانا) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاللّٰہُ اَرْکَسَھُمْ بِمَا کَسَبُوْا﴾ (۴۔۸۸) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر کفر میں پلٹا دیا ہے۔

(ر ک ض)

اَلرَّکْضُ: اس کے اصل معنیٰ ٹانگ کو حرکت دینے کے ہیں اگر سوار کے متعلق بولا جائے جیسے: رَکَضْتُ الْفَرَسَ: تو اس کے معنیٰ گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لئے ایڑھ لگانا کے ہوتے ہیں اور پیادہ یا آدمی کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنیٰ پاؤں کے ساتھ زمین کو روندنا کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿اُرْکُضْ بِرِجْلِكَ﴾ (۳۸۔۴۲) یعنی اپنی ٹانگ زمین پر مارو۔
اور آیت کریمہ:
﴿لَا تَرْکَضُوْا وَارْجِعُوْا اِلٰی مَا اُتْرِفْتُمْ فِیْہِ﴾ (۲۱۔۱۳) مت بھاگو! اور ساز و سامان (دنیا کی) طرف لوٹ جاؤ جس میں تم چین کرتے تھے۔
میں انہیں شکست خوردہ ہو کر بھاگنے سے منع کیا گیا ہے۔ (اور یہ نہی تہدید اور تعجیز کے لئے ہے)

(ر ک ع)

اَلرُّکُوْعُ: اس کے اصل معنیٰ انحناء یعنی جھک جانے کے ہیں اور نماز میں خاص شکل میں جھکنے پر بولا جاتا ہے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے معنیٰ میں آتا ہے خواہ بطور عبادت ہو یا بطور عبادت نہ ہو۔قرآن پاک میں ہے:
﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ (۲۲۔۷۷) مسلمانو! (خدا کے حضور) سجدے اور رکوع کرو۔
﴿وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ﴾ (۲۔۴۳) جو (ہمارے حضور بوقت نماز) جھکتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ جھکا کرو۔
﴿وَالْعَاکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ﴾ (۲۔۱۵۲) مجاوروں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں (کے لئے)
﴿اَلرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ﴾ (۹۔۱۱۲) رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے۔
شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطویل)

(۱۹۱) اُخَبِّرُ اَخْبَارَ الْقُرُوْنِ الَّتِیْ مَضَتْ
اَدِبُّ کَاَنِّیْ کُلَّمَا قُمْتُ رَاکِعٗ

میں گذشتہ لوگوں کی خبر دیتا ہوں (میں سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے) رینگ کر چلتا ہوں اور خمیدہ پشت کھڑا ہوتا ہوں۔

(ر ک م)

رَکْمٌ: (ن) کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا قرآن پاک میں ہے: ﴿سَحَابٌ مَّرْکُوْمٌ﴾ (۵۲۔۴۴)

[1] قالہ لبید فی قصیدۃ لہ فی الحکم راجع (۱: ۳۶) والمعمرین (۶۱) والشعراء ۱۵۲ والاغانی (۱۴: ۹۶، ۱۳۴) مجاز القران (۱: ۵۴) واضداد ابی الطیب (۶۵۸) والمعانی للقتبی (۱۲۱۶) واللسان والتاج (رکع) ومجموعۃ المعانی ۱۲۳ فی ثلاثۃ ابیات والبحر (۱: ۱۷۳) والعقد (۲: ۷۸).

تہ بہ تہ بادل۔

اَلـرُّکَـامُ: اوپر تلے رکھی ہوئی چیزیں جیسے فرمایا: ﴿ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُکَامًا﴾ (۲۴۔۴۳) پھر اسے تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔

اسی سے ریت کے ٹیلے اور لشکر کو بھی رُکام کہا جاتا ہے اور مُرْتَکَمُ الطَّرِیْقِ: شاہراہ کو کہتے ہیں جس میں آمد ورفت کے نشانات بکثرت ہوں۔

(ر ک ن)

رُکْنٌ: کسی چیز کی وہ جانب جس کے سہارے پردہ قائم ہوتی ہے استعارہ کے طور پر زور اور قوت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ﴾ (۱۱۔۸۰) اے کاش! (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔

اور رَکَنْتُ اِلٰی فُلَانٍ اَرْکُنُ کے معنیٰ کسی کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ یہ فتح کاف کے ساتھ ہے مگر صحیح رَکَنَ یَرْکُنُ (ن) یا رَکِنَ یَرْکَنُ (س) ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَرْکَنُوْۤا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۱۱۔۱۱۳) اور جن لوگوں نے ہماری نافرمانی کی ان کی طرف نہ جھکنا۔

نَاقَةٌ مُرَکَّنَةُ الضَّرْعِ: بڑے تھنوں والی اونٹنی۔

لَهٗ اَرْکَانٌ تُعَظِّمُهٗ: اس کی قوم اسے عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

اَلْمِرْکَنُ: لگن۔ ٹب اور اَرْکَانُ الْعِبَادَاتِ سے عبادات کے وہ جوانب مراد ہوتے ہیں جو ان کا مبنی بنتے ہیں اور ان کے ترک سے وہ باطل ہو جاتی ہیں۔

(ر م م)

الـرَّمُّ: (ن) کے معنیٰ پوشیدہ چیز کی اصلاح اور مرمت کرنے کے ہیں رِمَّةٌ خاص کر بوسیدہ ہڈی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ﴾ (۷۶۔۷۸) ہڈیاں جب بوسیدہ ہو جائیں گی تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے۔

﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ کَالرَّمِیْمِ﴾ (۵۱۔۴۲) جس چیز پر سے ہو کر وہ گزرتی ہے اُسے پرانی ہڈی کی طرح (چورہ) کئے بغیر نہ چھوڑتی۔

اَلرُّمَّةُ: خاص طور پر بوسیدہ رسی کو کہا جاتا ہے اور اَلرِّمُّ: لکڑی، بھوسہ وغیرہ کے چورہ کو کہتے ہیں۔

رَمَّمْتُ الْمَنْزِلَ: عمارت کی مرمت کرنا۔ جیسے تَفَقَّدْتُ (کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا) مشہور محاورہ ہے۔[1] (مثل) (اِدْفَعْهُ اِلَیْهِ بِرُمَّتِهٖ) اسے کُلِّیَةً اس کے سپرد کر دیجئے۔

اَلْاِرْمَامُ: اس کے معنیٰ خاموش ہونے کے ہیں اور اَرَمَّتْ عِظَامُهٗ کے معنیٰ ہڈیوں کا اس قدر بوسیدہ ہو کر باریک ہو جانا کہ پھونکنے سے اڑ جائیں اور آواز نہ آئے

تَرَمْرَمَ الْقَوْمُ کے معنیٰ مہمل بڑبڑانے یا گفتگو کے لئے ہونٹ ہلا کر رہ جانے کے ہیں۔

اَلرُّمَّانُ: (فعلان) انار کو کہتے ہیں۔

(ر م ح)

اَلرُّمْحُ: کے معنیٰ نیزہ کے ہیں اس کی جمع رِمَاحٌ آتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] انظر للکلمۃ ادب الکاتب لابن قتیبه ۴۲ والمیدانی (۱ : ۳۳)

﴿تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ﴾ (۵۔۹۴) جہاں تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچ سکیں۔
اور رَمَحَهٗ کے معنیٰ کسی کو نیزہ سے مارنے کے ہیں اور رَمَحَتْهُ الدَّابَةُ: کے معنیٰ جانور کے دولتی جھاڑنے کے ہیں۔اَلسِّمَاكُ الرَّامِحُ: ایک ستارے کا نام ہے۔ کیونکہ اس کے پیش پیش ایک دم دار ستارہ ہوتا ہے۔ جو دیکھنے میں نیزے جیسا معلوم ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔ ❶
اَخَذَتِ الْاِبِلُ رِمَاحَهَا: اونٹوں نے اپنے نیزے سنبھال لئے یعنی شیر دار یا موٹا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ذبح سے بچالیا۔
اَخَذَتِ الْبُهْمٰی رُمْحَهَا: گھاس خاردار ہوگئی کیونکہ وہ بھی خاردار ہونے کی وجہ سے چرواہوں سے محفوظ ہوجاتی ہے۔

(ر م د)

رَمَادٌ وَ رِمْدَادٌ وَاَرْمَدٌ وَاَرْمِدَاءُ: (خاکستر) راکھ کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿كَرَمَادِنِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ﴾ (۱۴۔۱۸) گویا راکھ کا ڈھیر ہے جسے آندھی کے دن ہوا اڑا کر لے جائے۔
رَمَدَتِ النَّارُ کے معنیٰ آگ کے بجھ کر راکھ بن جانے کے ہیں پھر استعارہ کے طور پر ہلاکت کے معنیٰ میں استعال ہوتا ہے۔جیسا کہ هَمُوْدٌ کا لفظ مجازاً بمعنیٰ ہلاکت آجاتا ہے۔اور رَمِدَ الْمَاءُ کے معنیٰ پانی کے گدلا ہوجانے کے ہیں۔گویا اس میں راکھ ڈال دی گئی ہے اور اَلْاَرْمَدُ: خاکستری رنگ کی چیز کو کہتے ہیں اور مچھر کو رَمْدٌ کہا جاتا ہے (جو اَرْمَدُ کی جمع ہے) اور رَمَادَةٌ کے معنیٰ قحط سالی کے ہیں۔

(ر م ز)

اَلرَّمْزُ: (ن) ہونٹ کے ساتھ اشارہ کرنے یا ہلکی سی آواز کے ہیں۔اور ابرو کے ساتھ اشارہ کرنے کو غمز کہا جاتا ہے۔پھر استعارہ کے طور پر ہر وہ کلام جو اشارہ کی طرح ہو رَمْزٌ کہلاتی ہے۔جیسا کہ شکایت کو غَمْزٌ کہہ دیتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اٰيَتُكَ اَنْ لَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا﴾ (۳۔۴۱) نشانی (جو تم مانگتے ہو) یہ ہے کہ تین روز تک لوگوں سے بات نہ کرو مگر اشارہ سے۔
اور مَا اَرْمَازَّ کے معنیٰ ہیں اس نے اشارہ سے بھی بات نہ کی اور كَتِيْبَةٌ رَمَّازَةٌ: بڑے لشکر کو کہتے ہیں کیونکہ بوجہ کثرت ازدحام کے اس میں آواز سنائی نہیں دیتی اور صرف اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔

(ر م ض)

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ (۲۔۸۵) روزوں کا مہینہ یہ رَمَضٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ سورج کی سختی و تپش کے ہیں۔اَرْمَضَتْهُ: سخت تپش نے اسے جھلس دیا۔ فَرَمِضَ چنانچہ وہ جھلسا گیا۔
اَرْضٌ رَمِضَةٌ: سخت گرم سرزمین۔رَمِضَتِ الْغَنَمُ: سخت گرمی میں باہر چرنے کی وجہ سے بکریوں کے جگر زخمی ہوگئے۔
فُلَانٌ يَتَرَبَّضُ الظِّبَاءَ: فلان سخت گرم جگہ میں ہرن کا شکار کرتا ہے۔

(ر م ی)

اَلرَّمْیُ: (ض) کے معنیٰ پھینکنے کے ہیں یہ اجسام

---

❶ ویروی اسلحتها المیدانی (۱: ۲٤).

(مادی چیزیں) جیسے تیر اور پتھر وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (۸۔۱۷) اے پیغمبر! جب تو نے تیر چلائے تو تم نے تیر نہیں چلائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تیر چلائے۔

اور اقوال کے متعلق استعمال ہو تو "قذف" کی طرح اس کے معنیٰ سب وشتم اور تہمت طرازی کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ﴾ (۲۴۔۹) جو لوگ اپنی بیبیوں پر زنا کا عیب لگائیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ﴾ (۲۴۔۴) جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں۔

محاورہ ہے: اَرْمٰى عَلٰى مِائَةٍ: وہ سو سے زائد ہیں۔ خَرَجَ يَتَرَمّٰى: وہ نکل کر نشانہ بازی کرنے لگا۔

(ر ھ ب)

اَلرَّهْبُ وَالرَّهْبَةُ: ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو۔ قرآن میں ہے:

﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً﴾ (۵۰۔۱۳) تمہاری ہیبت تو (ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے) بڑھ کر ہے۔

﴿جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ (۲۸۔۳۲) (اور دفع) خوف کے لئے اپنے بازو سکیڑ لو۔

اس میں ایک قرأت رُهْب بضمہ الراء بھی ہے۔ جس کے معنیٰ فَزَعٌ یعنی گھبراہٹ کے ہیں۔

مقاتل کہتے ہیں کہ میں رَهْبٌ کی تفسیر معلوم کرنے کی غرض سے نکلا۔ دریں اثناء کہ میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک اعرابی عورت آئی۔ اور اُس نے کہا "اے اللہ کے بندے! مجھے کچھ خیرات دیجئے جب میں لپ بھر کر اسے دینے لگا تو کہنے لگی: هٰهُنَا فِىْ رَهْبِىْ یعنی یہاں میری آستین میں ڈال دیجئے۔ (تو میں سمجھ گیا کہ آیت میں بھی رھب بمعنیٰ آستین کے ہیں) لیکن پہلے معنیٰ یعنی گھبراہٹ کے زیادہ صحیح ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَغَباً وَّ رَهَباً﴾ (۲۱۔۹۰) (ہمارے فضل کی) توقع اور (ہمارے عذاب کے) خوف سے (ہمیں پکارتے رہتے ہیں۔

﴿تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ﴾ (۸۔۶۰) اس سے تم اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے۔

اور آیت:

﴿وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ﴾ (۷۔۱۱۶) اور ان کو دہشت میں ڈال دیا۔ میں اِسْتِرْهَاب کے معنیٰ دہشت زدہ کرنے کے ہیں۔

﴿وَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (۲۔۴۰) اور مجھ ہی سے ڈرو۔

اور تَرَهُّبٌ (تفعّل) کے معنیٰ تعبد یعنی راہب بننے اور عبادت میں خوف سے کام لینے کے ہیں اور فرط خوف سے عبادت گذاری میں غلو کرنے کو رَهْبَانِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَنِ ابْتَدَعُوْهَا﴾ (۵۷۔۲۷) اور رہبانیت (لذت دنیا کا چھوڑ بیٹھنا) جو انہوں نے از خود ایجاد کی تھی۔

اور رُهبان (صومعہ نشین لوگ) واحد بھی ہوسکتا ہے اور جمع بھی، جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کی جمع رَهَابِيْن آتی ہے لیکن اس کی جمع رَهَابِيَةٌ بنانا زیادہ

مناسب ہے۔

اَلْاِرْھَابُ: (افعال) کے اصل معنیٰ اونٹوں کو خوف زدہ کرنے کے ہیں۔اور اسی سے "رَھْبٌ" ہے جس کے معنیٰ لاغر اونٹنی (یا شتر نر قوی وکلاں جثہ) کے ہیں مشہور محاورہ ہے۔ ❶

رَھَبُوْتٌ خَیْرٌ مِنْ رَّحَمُوْتٍ: کہ رحم سے خوف بہت ہے۔

(ر ھ ط)

اَلرَّھْطُ: دس آدمیوں سے کم جماعت کو رھط کہتے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق چالیس آدمیوں تک کی جماعت پر ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿تِسْعَةُ رَھْطٍ یُّفْسِدُوْنَ﴾ (۲۷:۴۸) نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے۔

﴿وَلَوْلَا رَھْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ﴾ (۱۱-۹۱) اگر تیری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کردیتے۔

﴿یٰقَوْمِ اَرَھْطِیْٓ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ﴾ (۱۱-۹۲) میری قوم! کیا میری برادری کے لوگ تمہیں (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ عزیز ہیں۔

اَلرَّھْطَاءُ: جنگلی چوہے کا بل اور اس کو رَھْطَةٌ بھی کہا جاتا ہے اور شاعر کے شعر ❷ (المتقارب)

(۱۹۲) اَجْعَلْكَ رَھْطًا عَلٰی حُیَّضٍ

(میں تجھے حیض والی عورتوں کا لتہ بنادوں گا یعنی نہایت ذلیل کروں گا)

میں بعض نے رَھط کے معنیٰ اس چمڑے کے لئے ہیں جو حائضہ عورتیں ایام ماہواری میں پہنا کرتی تھیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں رھط سے مراد وہ چیتھڑا ہے جو حائضہ عورت جائے مخصوص میں رکھتی ہے۔اور اسی سے مشہور محاورہ ہے: ھُوَ اَذَلُّ مِنَ الرَّھْطِ وہ حیض کے چیتھڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔

(ر ھ ق)

رَھِقَهٗ (س) رَھَقاً۔ اَلْاَمْرُ: کسی معاملہ نے اسے بزور وجبر دبالیا۔اور رَھِقَهٗ وَاَرْھَقَهٗ: (مجرد ومزید فیہ) دونوں کے ایک ہی معنیٰ ہیں جیسے رَدِفَهٗ وَاَرْدَفَهٗ وَبَعَثَهٗ وَاَبْعَثَهٗ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرْھَقُھُمْ ذِلَّةٌ﴾ (۱۰-۲۷) اور ان پر ذلت چھا رہی ہوگی۔

﴿سَاُرْھِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ (۷۴-۱۷) ہم عنقریب اس کو عذاب سخت میں مبتلا کریں گے۔

اور اسی سے اَرْھَقْتُ الصَّلٰوةَ ہے، جس کے معنیٰ نماز کو آخر وقت تک مؤخر کرنے کے ہیں حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔

(ر ھ ن)

اَلرَّھْنُ: (گروی رکھی ہوئی چیز) اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جو قرض میں بطور ضمانت رکھ لی جائے۔اور

---

❶ ای لان یفرق منك خیرمن ان تحب راجع المیدانی ۳ : ۷۷ رقم ۲۷۵۸ واللسان (رھب) وغریب القران للقتبی ۱۹ وفی الکامل ۱۷ رھبوتی اخیر لك من رحموتی .

❷ قاله ابو المثلم الھذلی وصدره : متیٰ ما أشاء غیر زھو الملوك .... والبیت فی اللسان (رھط بزھو) والمقاییس (۲ : ۴۵/ ۳ : ۲۹) بغیر عزو والمعانی الکبیر (۱ : ۴۸۴ ، ۵۹۳) والمشکل للقتبی (۱۱۹) فی اربعة وتھذیب الالفاظ ۶۶۱ (باب الشیاب) ودیوان الھذلیین (۲ : ۲۲۳ - ۲۲۴) والشاعر من بنی خزاعة بن سعد بن ھذیل وترجمته فی المؤلف (۲۷۷-۲۷۸) قال القتبی فی المعانی الرھط جلد یشق اسفله ویترك اعلاه فیلبسه الصبیان وقد وکانوا فی الجاھلیة یطوفون عراة والنساء فی ارھاط وھو شقة قدر مابین الرکبة الی السرة.

یہی معنیٰ رِھَانَ کے ہیں۔لیکن رھان خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ میں شرط کے طور پر رکھ لی جائے اصل میں یہ دونوں لفظ مصدر ہیں جیسے رَھَنْتُ الرِّھْنَ وَرَاھَنْتُهٗ رِھَاناً اور رَھِیْنٌ وَمَرْھُوْنٌ: صیغۂ صفت ہیں اور رَھْنٌ کی جمع رِھَانٌ، رَھْنٌ اور رُھُوْنٌ آتی ہے۔اور آیت:

﴿فَرِھَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ (۲۔۲۸۳) تو کچھ رہن قبضہ میں رکھ لو۔

میں ایک قرأت رُھُنٌ بھی ہے۔اور آیت: ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَھِیْنَةٌ﴾ (۷۴۔۳۸) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ رَھِیْنَةٌ فعیل بمعنیٰ فاعل سے ہے اور اس کے معنیٰ ثابت اور قائم رہنے والی کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ فعیل بمعنیٰ مفعول سے ہے اور اس کے معنیٰ ہیں کہ ہر شخص اپنے گزشتہ اعمال کی پاداش میں رکا رہے گا۔

پھر رَھْنَ میں چونکہ حبس (روکنے) کے معنیٰ پائے جاتے ہیں اس لئے کبھی مجازاً رَھن بمعنیٰ حبس یعنی مطلق کسی چیز کو روکنے کے آ جاتا ہے جیسا کہ آیت مذکور میں ہے۔اور رَھَنْتُ فُلَاناً وَرَھَنْتُ عِنْدَهٗ کے معنیٰ کسی کے پاس گروی رکھنے کے ہیں اور اِرْتَھَنْتُ (افتعال) کے معنیٰ گروی لینے کے ہیں۔

اور اَرْھَنْتُ (افعال) فِی السِّلْعَةِ کے معنیٰ بعض نے سامان تجارت کو گراں فروخت کرنا کئے ہیں۔ اصل میں اس کے معنیٰ بیعانہ کے طور پر کچھ سامان دے دینے کے ہیں۔ جو قیمت ادا کرنے تک بطور ضمانت بائع کے پاس رہتا ہے۔

(ر ھ و)

اَلرَّھْوُ: ساکن چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَھْوًا﴾ (۴۴۔۲۴) اور دریا کو ساکن چھوڑ دے۔

میں رَھْو کے معنیٰ ساکن کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے راستہ کی کشادگی مراد ہے اور یہی معنیٰ صحیح ہیں۔ [1] اور اسی سے رَھَاءٌ ہے جس کے معنیٰ ہموار جنگل کے ہیں اور ہر وہ ہموار قطعۂ زمین جہاں پانی جمع ہوتا ہو اسے رَھْو کہا جاتا ہے اسی سے ایک حدیث ہے۔ [2]

(۱٦٠) لا شُفْعَةَ فِی رَھْوٍ...... کہ پانی کی گذرگاہ کی مشترک ہونے سے حق شفع ثابت نہیں ہوتا۔

ایک اعرابی نے ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوئے اونٹ کو دیکھ کر کہا:

رَھْوٌ بَیْنَ سَنَامَیْنِ: کہ یہ دونوں بلندیوں کے درمیان رَھْوٌ یعنی کشادگی ہے۔

(ر و ح)

اَلرَّوْحُ وَالرُّوْحُ: دراصل ایک ہی ہیں۔رُوْح کا اطلاق سانس پر ہوتا ہے۔شاعر نے آگ کے متعلق کہا ہے۔ [3] (طویل)

---

[1] قال الطبری (۲۵: ۱۲۱۔۱۲۲) واولی الاقوال فی ذالك بالصواب ای الساكن .

[2] الحدیث فی الفائق (۳: ۱۲۲) وغریب ابی عبید (۳: ۱۲۱) وفی الصحاح (رھو) والتاج واللسان (رھا) .

[3] قالہ ذولرمة وفی لسان العرب وحایها واقتت لها قیتة قدرابدل واجعل لها الخ یقال واقتت ضارك قبتة ای اطعمها والبیت من شواھد الطبری (٦: ٣٦) واللسان (قتت، نفخ، حی) ودیوانه ٢٤ من قصیدة له والمشكل للقتبی (٣٧١) فی ثلاثة ابیات والبحر (٣: ٤٠١).

(۱۹۵) فَقُلْتُ لَهٗ اَرْفَعْهَا اِلَیْكَ وَاَحْیِهَا بِرُوْحِكَ وَاجْعَلْ لَهَا قِیْتَةً قَدْرًا

تو میں نے کہا کہ اسے اٹھاؤ اور قدرے نرم پھونک مار کر اسے سلگاؤ اور اس میں تھوڑا سا ایندھن ڈال دو۔اور سانس بھی چونکہ روح کا ایک جزء ہے...... اس لئے مجازاً اسے روح کہہ دیا ہے۔جیسا کہ نوع کو اسم جنس سے تعبیر کر لیتے ہیں مثلاً: تَسْمِیَةُ الْاِنْسَانِ بِالْحَیَوَانِ: اور کبھی روح کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ زندگی حرکت، منافع کا حصول اور مضرات سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ (۱۷۔۸۵) اور تجھ سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ میرے پروردگار کا ایک حکم ہے۔

﴿وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ﴾ (۱۵۔۲۹) اور میں نے اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دی۔

میں روح کے یہی معنیٰ مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا اضافت ملک کے طور پر ہے جس سے اس کی شرافت کا اظہار مقصود ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:

﴿وَطَهِّرْ بَیْتِیَ﴾ (۲۔۲۶۲) میں بیت کی اضافت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔اسی طرح آیت کریمہ:﴿یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا﴾ (۳۹۔۵۳) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی۔

میں عباد کی نسبت بھی یاء متکلم (ذات باری تعالیٰ) کی طرف اضافت تشریفی ہے۔

اور قرآن پاک میں ذوشرف ملائکہ کو بھی اَرْوَاح سے موسوم کیا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلَائِکَةُ صَفًّا﴾ (۷۸۔۳۸) جس روز کہ روح (فرشتہ) اور دیگر ملائکہ صفیں باندھ کر کھڑے ہوں گے۔

﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِکَةُ وَالرُّوْحُ﴾ (۷۰۔۴) فرشتے اور جبریل علیہ السلام اس کی طرف چڑھتے ہیں۔

اور آیت:﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ﴾ (۲۶۔۱۹۳) اسے روح امین لے کر اترا۔

میں روح امین سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور دوسری آیت میں جبرئیل علیہ السلام کو روح القدس بھی کہا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ﴾ (۲۔۷۲) اس قرآن پاک کو روح القدس لے کر آتے ہیں۔

قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہہ کر پکارا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ (۴۔۱۷۱) وہ ایک روح تھی جو خدا کی طرف سے آئی۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کو روح اس لئے کہا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

اور قرآن پاک کو بھی روح کہا گیا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَکَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (۴۲۔۵۲) اس طرح ہم نے اپنے حکم سے (دین کی) جان (یعنی یہ کتاب) تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجی۔ اس لئے قرآن پاک سے حیات اخروی حاصل ہوتی ہے جس کے متعلق فرمایا:

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ﴾ (۲۹۔۶۴) اور دار آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

اور رَوح (بفتح الراء) کے معنیٰ سانس کے ہیں اور اَرَاحَ الْاِنْسَانُ کے معنیٰ تنفس، یعنی سانس لینے کے اور آیت کریمہ: ﴿فَرَوْحٌ وَّ رَیْحَانٌ﴾ (۵۶۔۸۹) تو راحت اور رزق ہے۔ میں رَیحان سے خوشبو دار چیزیں مراد ہیں اور بعض نے رزق مراد لیا ہے اور کھانے کے اناج کو بھی ریحان کہتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَان﴾ (۵۵۔۱۲) اور ہر طرح کے اناج جو (بھوسی کے) خول کے اندر ہوتے ہیں اور کھانے کا اناج۔

ایک اعرابی سے پوچھا گیا کہ کہاں جا رہے ہو۔ تو اس نے جواب دیا: "اَطْلُبُ مِنْ رَّیْحَانِ اللّٰهِ" کہ میں اللہ کے رزق کی تلاش میں ہوں۔ لیکن اصل معنیٰ وہی ہیں جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ (یعنی خوشبودار چیز) ایک حدیث میں ہے [1]: (۱٦۲) اَلْوَلَدُ مِنْ رَیْحَانِ اللّٰهِ کہ اولاد بھی اللہ کے ریحان سے ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔ [2]

(۱۹٦) یَا حَبَّذَا رِیْحُ الْوَلَدْ
رِیْحُ الْخُزَامِیْ فِی الْبَلَدْ

اولاد کی خوشبو کیسی پیاری ہے یہ خزامی گھاس کی خوشبو ہے جو شہر میں مہکتی ہے اور اولاد کو ریحان اس لئے کہا ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے۔

اَلرِّیْحُ کے معنیٰ معروف ہیں۔ یعنی ہوا متحرک کو کہتے ہیں عام طور پر جن مواضع میں ارسال الرِّیح صیغہ مفرد کے ساتھ مذکور ہے وہاں عذاب مراد ہے اور جہاں کہیں لفظ جمع کے ساتھ مذکور ہے وہاں رحمت [3] مراد ہے۔ چنانچہ رِیحٌ کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا﴾ (۵۴۔۱۹) ہم نے ان پر ایک زناٹے کی آندھی چلائی۔

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا﴾ (۳۳۔۹) تو ہم نے ان پر آندھی چلائی۔

﴿کَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ﴾ (۳۔۱۱۷) مثال اس ہوا کی ہے جس میں بڑی ٹھر بھی ہو۔

﴿اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ﴾ (۱۴۔۱۸) اس کو سخت ہوا لے اڑی۔

اور رِیَاح (جمع کا لفظ) کے متعلق فرمایا:

﴿وَاَرْسَلْنَا الرِّیَاحَ لَوَاقِحَ﴾ (۱۵۔۲۲) اور ہم ہی ہوا کو چلاتے ہیں جو بادلوں کو پانی بار دار کرتی ہے۔

﴿اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرَاتٍ﴾ (۳۰۔۴٦) کہ وہ ہواؤں کو اس غرض سے بھیجتا ہے کہ لوگوں کو بارش کی خوشخبری پہنچائیں۔

﴿یُرْسِلُ الرِّیَاحَ بُشْرًا﴾ (۷۔۵۷) باران رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے تا کہ لوگوں کو مینہ کی آمد

---

[1] کلمة من حدیث طویل راجع الفائق (۱ : ۸٦) (جبن) انکم لمن ریحان الله وفی (الحکیم عن خولة بنت حکیم الولد من ریحان الجنة وفی العیون (۳ : ۹٤) والعقد (۲ : ٤۳۸) الولد من ریحان الله راجع العراقی (۲ : ۲۱۸) والطبرانی فی الصغیر ۱٦۹ والفتح الربانی (۱ : ٤۳۳ .)

[2] الا عرابیه کانت ترقص ولدها راجع ادب الدنیا والدین بشرحه لخان زاده والعیون ۳ : ۹٤).

[3] نسبه فی الاتقان الی ابی ابن کعب یؤیده ما ورد فی الادعیة المأثورة اللهم اجعلها ریاحا ولا تجعلها ریحاً(الفائق ۱ : ۲٥٤) وقد رواه الخفاجی فی شرح الدرة ۱۲۳۔۱۲٤ وردفی القران خلافه ولسلیمان الریح عاصفة ۱٤ : ۱۸) وجرین بهم بریح طیبة ۱۰ : ۲۲) وفی الحدیث نصرت بالصبادی ریح الانبیاء ۱۲.

کی خوشخبری پہنچادیں۔

اورآیت:﴿يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا﴾ (۳۰۔۴۸) اور وہ قادر مطلق ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ ہوائیں بادلوں کوان کی جگہ سے ابھارتی ہے۔

میں بھی چونکہ معنیٰ رحمت اغلب ہے اس لئے یہاں لفظ جمع کی قرأت زیادہ صحیح ہے۔

کبھی مجازاً رِیح بمعنیٰ غلبہ بھی آ جاتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿فَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ (۸۔۴۶) اورتمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

محاورہ ہے۔

اَرْوَحَ الْمَاءُ: پانی متغیر ہوگیا۔ خاص کر بدبودار ہونے کے وقت بولتے ہیں۔

رِيْحَ الْغَدِيْرُ يُرَاحُ: جوہڑ پر ہوا کا چلنا۔ اور اَرَاحُوا کے معنیٰ رَوَاح یعنی شام کے وقت میں داخل ہونے کے ہیں اور خوشبودار تیل کو دُهْنٌ مُرَوَّحٌ کہا جاتا ہے ایک حدیث میں ہے۔❶ (۱۶۳) لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ کہ وہ جنت کی خوشبو تک نہیں پائے گا۔

اَلْمَرْوَحَةُ: ہوا چلنے کی سمت۔ اَلْمِرْوَحَةُ (آلہ) پنکھا۔

اَلرَّائِحَةُ: مہکنے والی خوشبو۔

محاورہ ہے:

رَاحَ فُلَانٌ اِلٰى اَهْلِهٖ: (۱) فلاں اپنے اہل کی طرف ہوا کی طرح تیزی کے ساتھ گیا۔ (۲) اس نے اپنے اہل وعیال میں پہنچ کر راحت حاصل کی۔

اَلرَّاحَةُ: آرام یہ بھی رَوحٌ سے ماخوذ ہے مشہور محاورہ ہے: اِفْعَلْ ذَالِكَ فِي مَرَاحٍ وَرَوَاحٍ کہ آرام سے یہ کام کرو۔

اَلْمُرَاوَحَةُ کے معنیٰ ہیں دوکاموں کو باری باری کرنا۔ اور استعارہ کے طور پر رَوَاح سے دوپہر کو آرام کا وقت مراد لیا جاتا ہے اور اسی سے کہا جاتا ہے اَرَحْنَا اِبِلَنَا کہ ہم نے اونٹوں کو آرام دیا (یعنی باڑہ میں لے آئے) اور پھر اَرَحْتُ الْاِبِلَ سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

اَرَحْتُ اِلَيْهِ حَقَّهٗ کہ میں نے اس کا حق واپس لوٹا دیا اور مُرَاح باڑے کو کہا جاتا ہے اور تَرَوَّحَ الشَّجَرُ وَرَاحَ يَرَاحُ کے معنیٰ درخت کے شگوفہ دار ہونا اور نئے پتے نکالنے کے ہیں اور کبھی رَوْحٌ سے وسعت اور فراخی کے معنیٰ بھی مراد لئے جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے۔

قَصْعَةٌ رَوْحَاءُ: فراخ پیالہ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ......﴾ (۱۲۔۸۷) اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔

میں بھی وسعت رحمت مراد ہے جو لفظ رَوح سے مفہوم ہوتی ہے۔

(ر و د)

اَلرَّوْدُ: اس کے اصل معنیٰ نرمی کے ساتھ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمد ورفت کے ہیں اور اس معنیٰ میں فعل رَادَ وَارْتَادَ آتا ہے اسی سے رَائِدٌ ہے جس کے معنیٰ ہیں وہ شخص جسے پانی اور چارہ کی تلاش کے لئے قافلہ سے آگے بھیج دیا گیا ہو اور رَادَ الْاِبِلُ کے معنیٰ گھاس کی تلاش

❶ حدیث لم یرح رائحة الجنة وردفی قتل المعاهد (حم، خ، ن، ه عن ابن عمر) والفائق (۱: ٥٤) والغریب لابی عبید (۱۰٥) راجع کنزالعمال ج ٤ رقم ۱۸۲۱، ۱۸۳٤، ۱۸۳٥ وزوائد ابن حبان رقم ۱۳۳۰، ۱۳۳۳ عن ابی بکرة ۱۲.

میں اونٹوں کو ادھر ادھر لئے پھرنا کے ہیں پھر رونق کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: رَادَتِ الْاِبِلُ فِی مَشْیَتِھَا یَرُوْدُ رَوَدَانًا: اونٹ نرم رفتار چلے۔ اور اسی سے مِرْوَدٌ ہے جس کے معنیٰ سرمہ لگانے کی سلائی یا حلقہ لگام کے لوہا کے ہیں اور اَرْوَدَ یُرْوِدُ (افعال) کے معنیٰ ہیں نرمی کرنا اور اس سے رَوَیْدًا (اسم فعل) ہے۔ جیسے رُوَیْدَكَ الشِّعْرَ یَغِبِّ: کل تک شعر کو مہلت دو یعنی اس پر غور کرلو۔

اِلْاِرَادَةُ: یہ رَادَ یَرُوْدُ سے ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں اور ارادۃ اصل میں اس قوۃ کا نام ہے جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھنچنا اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہیے یا نہیں بعد ازاں یہ کبھی دل کے کسی طرف کھنچنے کے لئے بولا جاتا ہے جو کہ ارادہ کا مبدأ ہے اور کبھی صرف منتہیٰ کے معنیٰ مراد ہوتے ہیں۔ یعنی محض فیصلہ کے لئے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو منتہیٰ کے معنیٰ مراد ہوتے ہیں یعنی کسی کام کا فیصلہ نزوع نفس کا معنیٰ مراد نہیں ہوتا کیونکہ ذات باری تعالیٰ خواہشات نفسانی سے مبرا ہے۔ لٰہذا اَرَادَ اللّٰہُ کَذَا کے معنیٰ ہوں گے۔ اللہ نے فلاں کلام کا فیصلہ کیا چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ اَرَادَبِکُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِکُمْ رَحْمَةً﴾ (۳۳۔ ۱۳) یعنی اگر خدا تمہاری برائی کا فیصلہ کرے یا تم پر اپنا فضل وکرم کرنا چاہے۔

اور کبھی ارادہ بمعنیٰ امر کے آتا ہے مثلاً: اُرِیْدُ مِنْكَ کَذَا کے معنیٰ یہ ہیں کہ تجھے فلاں کام کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ جیسے فرمایا:

﴿یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾ (۲۔ ۱۸۸) اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔

(یعنی آسان کاموں کا حکم دیتا ہے اور ایسے امور کا حکم نہیں دیتا (جس سے تم سختی میں مبتلا ہو جاؤ) اور کبھی ارادہ بمعنیٰ قصد آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۸۔ ۸۳) وہ دنیا میں کسی طرح کی شیخی نہیں کرنا چاہتے۔

یعنی نہ اس کا قصد کرتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنا مطلوب بناتے ہیں پھر جس طرح یہ لفظ قوت اختیار یہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح قوت تسخیری یعنی اضطراری اور غیر اختیاری امور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے ارادہ کا لفظ حیوانات اور جمادات دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں دیوار کے متعلق فرمایا:

﴿یُرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ﴾ (۱۸۔ ۷۷) کہ وہ گرا چاہتی تھی۔ یعنی گرنے کے قریب تھی اور محاورہ ہے:

فَرَسِیْ تُرِیْدُ التِّبْنَ: کہ میری گھوڑی بھوسہ کھانا چاہتی ہے۔

اَلْمُرَاوَدَةُ: (مفاعلہ) یہ بھی رَادَ یَرُوْدُ سے ہے اور اس کے معنیٰ ارادوں میں باہم اختلاف اور کشیدگی کے ہیں۔ یعنی ایک کا ارادہ کچھ ہوا اور دوسرے کا کچھ اور رَاوَدْتُّ فُلَانًا عَنْ کَذَا کے معنیٰ کسی کو اس کے ارادہ سے پھسلانے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ھِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ﴾ (۱۲۔ ۲۶) اس نے مجھے میرے ارادے سے پھیرنا چاہا۔

﴿تُرَاوِدُ فَتٰھَا عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ (۱۲۔ ۳۰) وہ اپنے غلام

سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کے درپے ہے۔
یعنی اسے اس ارادہ سے پھسلانا چاہتی ہے۔
﴿سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ﴾ (۱۲۔۶۱) ہم اس کے باپ کو اس سے پھیرنے کی کوشش کریں گے۔
(یعنی اسے آمادہ کریں گے کہ وہ برادر یوسف علیہ السلام کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔)
﴿وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ (۱۲۔۳۲) بے شک میں نے اس سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنا چاہا۔

(ر ء س)

اَلرَّأْسُ: سر کو کہتے ہیں اور اس کی جمع رُؤُوْسٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَیْبًا﴾ (۱۹۔۴) اور سر بڑھاپے (کی آگ) سے بھڑک اٹھا ہے۔
﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُؤُوْسَكُمْ﴾ (۲۔۱۹۶) اپنے سر نہ منڈاؤ۔ اور کبھی رَأْسٌ بمعنیٰ رئیس بھی آتا ہے اور اَرْئَسُ (اسم تفضیل) کے معنیٰ بڑے سر والا کے ہیں اور سیاہ سر والی بکری کو شَاةٌ رَأْسَاءُ کہتے ہیں اور رِیَاسُ السَّیْفِ کے معنیٰ ''دستہ شمشیر'' کے ہیں۔

(ر و ض)

اَلرَّوْضُ: اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو اور سرسبز بھی ہو۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۵) باغ بہشت میں ان کی خاطرداریاں ہو رہی ہوں گی۔
اور پانی کے جمع ہونے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: اَرَاضَ الْوَادِیْ وَاسْتَرَاضَ: وادی میں پانی وافر ہو گیا اور اَرَاضَهُمْ کے معنیٰ ہیں ''اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا''۔
اَلرِّیَاضَةُ: کسی سے بکثرت کوئی کام لینا تا کہ اسے اس میں سدھاؤ اور مہارت پیدا ہو جائے۔اسی سے رُضْتُ الدَّابَّةَ ہے یعنی سواری کو سدھانا اور مطیع کرنا۔اور اِفْعَلْ كَذَا مَادَامَتِ النَّفْسُ مُسْتَرَاضَةً کے معنیٰ ہیں کہ اس وقت تک یہ کام کرو جب تک نفس محنت کے قابل رہے یا اس میں وسعت رہے اور یہ اِرَاضَةٌ یا رَوْضٌ سے مشتق ہو گا اور آیت کریمہ:
﴿فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۵) میں رَوْضَةٌ سے جنت کے سبزہ زار یعنی اس کے محاسن اور لذات مراد ہیں اور آیت: ﴿فِیْ رَوْضَاتِ الْجَنَّةِ﴾ میں (صیغہ جمع سے) ان ظاہری نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں اصحاب جنت کے لئے تیار کی گئی ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ان علوم و اخلاق کی طرف اشارہ ہے جن میں تخصص حاصل کر لینے سے انسان کا دل پاکیزہ ہو جاتا ہے۔

(ر و ع)

اَلرُّوْعُ: کے معنیٰ خَلَدٌ یعنی دل کے ہیں جیسے حدیث میں ہے۔[1]
(١٦٤) اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ...... کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔
اور رَوْع (بفتح الراء) خوف کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ﴾ (۱۱۔۷۴) پھر جب ابراہیم علیہ السلام کے دل سے خوف دور ہوا۔

---

[1] وفی الصحاح (تریع السراب) (ریع) .

محاورہ ہے: رُعْتُہٗ وَرَوَّعْتُہٗ: خوف زدہ کرنا، گھبرا دینا۔
نَاقَۃٌ رَوْعَاءُ: ڈرپوک اونٹنی۔
اَرْوَعُ: وہ چیز جو اپنے حسن و جمال سے دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دے گویا خوف زدہ کر رہی ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ (1)

(۱۹۸) یَھُوْلُکَ اِنْ تَلْقَاہُ فِی الصَّدْرِ مَحْفَلاً:
کہ محفل میں اس سے ملاقات کرے تو دل میں ہول پیدا کر دے۔

(ر و غ)

اَلـــرَّوْغُ: کے معنی کسی حیلہ اور تدبیر کی خاطر ایک جانب مائل ہونے کے ہیں اسی سے رَاغَ الثَّعْلَبُ (ن) رَوَغَـانًا ہے: یعنی لومڑ کا فریب دہی کے طور پر ادھر اُدھر جانا اور کج راستہ کو رَائِـــغ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے پیچ وخم سے فریب دے رہا ہے۔
رَاوَغَ فُـلَانٌ فُـلَانًا: کسی سے فریب کھیلنا۔
اور رَاغَ فُـــلَانٌ اِلـیٰ فُـلَان کے معنی ہیں فلاں کی طرف اس طرح لوٹا کہ اپنا مقصد حیلے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَرَاغَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ﴾ (۵۱۔۲۶) پھر وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچا۔
﴿فَـرَاغَ عَـلَیْھِـمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ﴾ (۳۷۔۹۳) تو بڑی قوۃ سے ان کے مارنے کے لئے مائل ہوئے۔

اور اصل میں اس کے معنیٰ ہیں داؤ لگا کر کسی چیز کو حاصل کرنا اور علیٰ (صلہ) کے لفظ سے معنیٰ استیلاء کا اظہار مقصود ہے۔

(ر و م)

رُوْمٌ: ایک مشہور قوم ہے۔کبھی یہ لفظ رُوْمِـــیٌّ کی جمع کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے جیسے عَـجَـــمٌ وَعَجَمِیٌّ۔قرآن پاک میں ہے:
﴿الٓـمّٓ غُـلِبَـتِ الرُّوْمُ﴾ (۳۰۔۱،۲) رومی مغلوب ہو گئے۔

(ر و ی)

مَـــاءٌ رَوَاءٌ وَرِوًی: بہت زیادہ سیراب کرنے والے پانی کو کہتے ہیں اور رِوًی بروزن عِـــدًی اور سِوًی ہے۔شاعر نے کہا ہے۔ (2) (رجز)

(۱۲۲) مَـنْ شَکَّ فِـیْ فَلَجٍ فَھٰذَا فَلَجْ
مَـــــاءٌ رَوَاءٌ وَطَـــرِیـــقٌ نَھْـــج

جسے مقام فلج میں شبہ ہو وہ دیکھ لے کہ یہی فلج ہے (یعنی سیراب کرنے والا پانی اور کھلا راستہ۔
اور آیت:
﴿ھُـمْ اَحْسَـنُ اَثَـاثًا وَّرِئْیًا﴾ (۱۹۔۷۴) جن کے ساز و سامان اور جن کی (ظاہری) رواداری اِن سے کہیں عمدہ تھی۔
جو لوگ اسے مہموز نہیں بناتے ان کے نزدیک رَوِیَ سے

---

(1) راجع للحدیث اللالی ۴۰۸ واللسان وشرح السنة من روایة عبدالله بن مسعود والعسکری فی الامثال والغزالی فی الاحیاء وفی روایة روح الامین قال العراقی فی تخریج الاحیاء اخرجه ابن ابی الدنیا فی القناعة والحاکم (۳:۳۲۸) وکنزالعمال (۴:۱۱۷۔۱۱۹) لم اجده ویرجی ۱۲.

(2) البیت لراجر من بنی العنبر من تمیم والفلج ماء لهم قاله فی البلدان وابو عبیدة البکری فی معجمه (رسم للج) ومجازالقران لابی عبیده (۱:۱۶۸) والبیت فی السحاو ندی (۱:۱۴۴) بغیر عزو ۱۲.

مشتق ہے اور خوبصورت کو رِیٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ حسن سے پر ہے۔لیکن اگر اسے مہموز پڑھا جائے تو رِئیاً سے مراد وہ چیز ہوگی جس کی خوبصورتی کی وجہ سے اس کی طرف نظریں اٹھتی ہوں بعض کے نزدیک بغیر ہمزہ کے بھی رُؤْیَۃٌ سے مشتق ہے اور رِیٌّ کے معنیٰ منظر (ظاہری حالت) کے ہیں اور اسی سے رِوَاءٌ (خوش نمائی) ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ رَوَاءٌ میں قلب ہوا ہے اور یہ رَأیتُ سے مشتق ہے۔ابوعلی الفسوی کہتے ہیں کہ لفظ مَرُوْءَۃٌ بھی حَسَنَ فِیْ مِرءَۃِ الْعَیْنِ کَذَا: (ظاہر دیکھنے میں خوبصورت ہے) سے ماخوذ ہے۔لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ مِرأۃٌ میں میم زائدہ ہے اور مَرُوْءَۃٌ بروزن فَعُوْلَۃٌ ہے۔اور اس میں میم اصلی ہے اور اَنْتَ بِمَرِیءٍ وَمَسْمَعٍ کے معنیٰ ہیں کہ تم اس قدر میرے قریب ہو کہ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔اور تمہاری بات سن سکتا ہوں۔ بعض یاء کو حذف کر کے اَنْتَ مِنِّي مَرْأًی وَمَسْمَعٌ بولتے ہیں اور مَرْئیٌ بروزن مَفْعَلٌ ہے اور رَأَیْتُ سے ماخوذ ہے۔

(ر ی ب)

رَابَنِی کَذَا وَاَرَابَنِی کے معنیٰ ہیں فلاں معاملہ نے مجھے رَیْب میں ڈال دیا اور رَیب کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی طرح کا وہم ہو مگر بعد میں اس توہم کا ازالہ ہو جائے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ﴾ (۲۔۲۵) اگر تم کو (قیامت کے دن) پھر جی اٹھنے میں کسی طرح کا شک ہو۔اور آیت:

﴿فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا﴾ (۲۔۲۳) (اگر تمہیں) مَا اَنْزَلْنَا میں کسی قسم کا شک وشبہ ہے۔

اور آیت:

﴿رَیْبَ الْمَنُوْنُ﴾ (۵۲۔۳۰) گردش زمانہ (کا انتظار کرتے ہیں)۔

گردش زمانہ کو رَیْب کہنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کے وقوع میں شک وشبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے انہیں ریب کہا ہے کہ ان کے تعین اوقات میں انسان متردد رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آ جائے لہٰذا انسان نفس گردش کے وقوع کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے تعین اوقات کے لحاظ سے ہمیشہ رَیْبَ الْمَنُوْنِ میں مبتلا رہتا ہے۔اسی بناء پر شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۱۹۳) اَلنَّاسُ قَدْ عَلِمُوْا اَنْ لَا بَقَآءَ لَهُمْ
لَوْ اَنَّهُمْ عَلِمُوْا مِقْدَارَ مَا عَلِمُوْا

کہ لوگوں کو اس بات کا تو یقین ہو چکا ہے کہ ان کے لئے بقا نہیں ہے کاش انہیں اس کا وقت بھی معلوم ہوتا۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔[2]

(۱۹۴) اَمِنَ الْمَنُوْنِ وَرَیْبِهَا تَتَوَجَّعُ

کہ کیا تو زمانہ اور اس کی گردشوں پر جزع فزع کرتا ہے

---

[1] قاله ديك الجن راجع المحاضرات للمؤلف (٤: ٤٩١).

[2] قاله ابو ذؤيب الهذلي في مطلع رثاء نبيه راجع الانصاف ٧٦ وخاص بيتاً وتمام البيت والدهر ليس بمعتب من يجزع والبيت في الاستيعاب ٦٦٧ والاغاني (٦: ٩٥) والخزانة (١: ٢٠٢) والسيوطي (٩٢) والبيهقي (٣: ٤٩٣) والعقد (٢: ١٥) والاصابة (٤٥٤) واسد الغابة (٥: ١٩٠) رقم (٢٥٠٧) ومجازات القران للرضي (٢٨٣) وتهذيب الالفاظ ٤٥٤ ونظام الغريب ٢٣٠ وشواهد المغني (٢: ٤٧٢) واضداد ابي الطيب٦٢٣ وشرح السبع لابن الانباري ٤٦ والبحر (٧: ض٤٩٤).

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَفِیْ شَكٍّ مِنْهُ مُرِیْبٍ﴾ (۱۱۔۱۰) قرآن پاک کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جس نے انہیں حیران کر رکھا ہے۔

﴿مُعْتَدٍ مُّرِیْبٍ﴾ (۵۰۔۲۵) حد (عبودیت) سے بڑھے ہوئے اور شک وشبہ پیدا کرنے والے (کی اطاعت مت کر)

اور اِرْتِیَابٌ (افتعال) اَرَابَهٗ کے ہم معنیٰ ہے جس کے معنیٰ شک وشبہ میں پڑنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ﴾ (۲۴۔۵۰) یا شک میں پڑے ہوئے ہیں اور اس بات سے ڈرتے ہیں۔

﴿وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ﴾ (۵۷۔۴) اور اس بات کے منتظر رہے (کہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو) اور (اسلام کی طرف سے) شک میں پڑے ہوئے۔

اور مومنین سے ارتیاب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُو الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۷۴۔۳۱) اور اہل کتاب اور مسلمانوں (ان باتوں میں کس طرح کا) شک وشبہ نہ لائیں۔

﴿ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾ (۴۹۔۱۵) پھر کسی طرح کا شک وشبہ نہیں کیا۔

ایک حدیث میں ہے۔[1] (۱۶۱) دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُكَ کہ شک وشبہ چھوڑ کر وہ کام کرو جس میں شک وشبہ نہ ہو۔

اور گردش زمانہ کو رَیْبُ الدَّهْرِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں فریب کاری کا وہم ہوتا ہے (کَمَا مَرَّ) اور رَیْبَةٌ رَیْب سے اسم ہے جس کے معنیٰ شک وشبہ کے ہیں (جمع رَیْبٌ) قرآن پاک میں ہے:

﴿بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۹۔۱۱۰) کہ وہ عمارت ان کے دلوں میں رِیبَة بنی رہے گی۔

یعنی ہمیشہ ان کے دلی کھوٹ اور خلجان پر دلالت کرتی رہے گی۔

(ر ی ش)

رِیْشُ الطَّائِرِ: پرند کے پروں کو کہتے ہیں اور کبھی یہ لفظ خصوصیت کے ساتھ بازوؤں کے پروں پر بولا جاتا ہے اور چونکہ پرند کے پر اس کے لئے بمنزلہ لباس کے ہوتے ہیں۔ اس لئے استعارہ کے طور پر یہ لفظ لباس کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرِیْشًا وَّلِبَاسُ التَّقْوٰی﴾ (۷۔۲۶) اور موجب زینت اور پرہیزگاری کا لباس۔

عام محاورہ ہے:

اَعْطَاهٗ اِبِلًا بِرِیْشِهَا: اسے سامان سمیت اونٹ دے دیئے۔ یعنی مال ومتاع سمیت جو ان کے اوپر تھا۔

اور رِشْتُ السَّهْمَ اَرِیْشُهٗ رِیْشًا کے معنیٰ تیر کو پر لگانے کے ہیں اور تیر پر نہادہ کو مَرِیْشٌ (کمبیع) کہتے ہیں پھر

---

[1] الحدیث بطوله رواه الترمذی فی آخر الطب والحاکم فی الاحکام والبیوع والطبرانی والبزار من حدیث الحسن بن علی وطس عن عمرو النسائی عن الحسن بن علی وابن حبان فی زوائده رقم ۵۱۲ عن الحسن والحدیث بطرقة واختلاف الفاظه فی کنز العمال (۳: ۲۴۵۔۲۴۶) والکاف الشاف لابن حجر رقم ۱۷ والفتح الباری (۴: ۲۳۴)۔

استعارہ کے طور پر اصلاح امر کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا رِشْتُ فُلَانًا فَارْعَاشَ کے معنیٰ ہیں: میں نے اس کی اصلاح کی تو اس کی حالت سدھر گئی۔شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۱۹۷) فَرِشْنِیْ بِحَالٍ طَالَمَا قَدْ بَرَیْتَنِیْ
فَخَیْرُ الْمَوَالِیْ مَنْ یَرِیْشُ وَلَا یَبْرِیْ

مجھے عرصہ دراز تک تم نے تراشا ہے کبھی تو میری اصلاح کیجئے۔بہتر موالی وہ ہیں جو بگاڑتے نہیں بلکہ سنوارتے ہیں۔

اور نیزہ کے پر سے کمزوری کے معنیٰ کے تصور کی بنا پر کمزور ؔ محاورہ ہے: نیزہ کو رُمح راش کہہ دیتے ہیں۔

(ر ی ع)

اَلرِّیْعُ: بلند جگہ کو کہتے ہیں۔جو دور سے ظاہر ہو اس کا واحد رِیعَۃٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۸) کیا تم ہر اونچی جگہ پر بے ضرورت یادگاریں بناتے ہو۔

اور معنیٰ ارتفاع کے لحاظ سے کنویں کی منڈیر کو رَیْعٌ کہا جاتا ہے پھر ہر چیز کے اوائل کو رَیْعَانٌ کہا جاتا ہے۔اور استعارہ کے طور پر رَیْعٌ ہر چیز کے زائد حصہ اور بلندی کے لئے آتا ہے اور اسی سے تَرَیَّعَ السَّحَابُ ہے جس کے معنیٰ بادل کے نمایاں اور ظاہر ہونے کے ہیں۔

(ر ی ن)

اَلرَّیْنُ: اس زنگ کو کہتے ہیں جو کسی صاف چیز پر لگ جائے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (۸۳۔۱۴) نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

یعنی ان کے مجلی قلوب پر زنگ بیٹھ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتے۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (البسیط)

(۱۹۹) اِذَا رَانَ النُّعَاسُ بِهِمْ

جب نیند نے ان پر غلبہ پالیا۔

رِیْنَ عَلٰی قَلْبِہٖ: اس کے دل پر زنگ بیٹھ گیا۔

(ر ء ف)

اَلرَّأْفَةُ یہ رَؤُفَ (ک) سے ہے اور اس کے معنیٰ شفقت اور رحمت کے ہیں صفت کا صیغہ رَؤُوْفٌ اور رَئِفٌ مثل حَذِرٌ وَیَقِظٌ آتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ﴾ (۲۴۔۲) اور اللہ کے حکم (کی تعمیل) میں تم کو ان کے حال پر کسی طرح کا ترس دامن گیر نہ ہو۔

(ر ء ی)

رأی: یہ مہموز العین اور ناقص یائی ہے کیونکہ اس سے اسم مشتق رُؤْیَۃٌ آتا ہے چنانچہ اسی سے شاعر نے قلب

---

❶ قاله سويد بن الصامت الانصارى لكامل فى قومه راجع السيرة (٢: ٦٧) والاساس (١: ٣٨٨) والاصابة ( ) والعيون (٣: ٨١) فى اربعة ابيات وفى اللسان (نشر) فى ستة ولسبه لمعر بن حباب قال احد مصححيه عبارة شارح القاموس قال سويد الانصارى هوالصواب ١٢.

❷ قطعة من البيت قاله عبدة بن الطبيب من كلمة مفضلية (١: ١٣٩) وتكملته : اوردته القوم........ فقلت اذانكهو امن جمة قيلوا والبيت فى الامالى (١: ٢٧٠) والسمط ٦٠٥ والمفضليات وفى المطبوع اذا ابدل قد مصحف والتصويب من المراجع .

کر کے کہا ہے۔ [1]

(۲۰۰) وَكُلُّ خَلِيْلٍ رَائَنِيْ فَهُوَ قَائِلٌ
مِنْ اَجْلِكَ هٰذَا هَامَةُ الْيَوْمِ اَوْ غَدِ

جو دوست مجھے دیکھتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ بدحالی تمہاری وجہ سے ہے اور یہ آج یا کل مرجائے گا۔

اور مضارع میں ہمزہ کو حذف کر کے تَرٰی ، يَرٰی اور نرٰی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا﴾ (۱۹۔۲۶) اگر کوئی آدمی نظر پڑے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلَّانَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (۴۱۔۲۹) شیطان اور آدمی جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا ایک نظر ان کو ہمیں بھی تو دکھاؤ۔

میں ایک قرأت اَرْنَا بھی ہے۔

اَلرُّؤْيَةُ: کے معنیٰ کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا کے ہیں اور قوائے نفس (قوائے مدرکہ) کے اعتبار سے رُؤْيَة کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) حاسہ بصر یا کسی ایسی چیز سے ادراک کرنا جو حاسہ بصر کے ہم معنی ہے جیسے قرآن پاک میں ہے: ﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ﴾ (۱۰۲۔۶) تم ضرور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے (اگر دیکھو گے بھی تو غیر مشتبہ) یقینی دیکھنا دیکھو گے۔

﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۶۰) اور تم قیامت کے روز دیکھو گے کہ جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا۔

اور آیت:

﴿فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ﴾ (۹۔۱۰۵) اللہ تعالیٰ بھی تمہارے کردار کو دیکھے گا۔

میں اللہ تعالیٰ کے علم کو آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی طرح قرار دے کر يَرَى کا لفظ لایا گیا ہے ورنہ آنکھ سے دیکھنا اللہ تعالیٰ کے حق میں صحیح نہیں ہے۔

اِنَّهٗ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ کہ وہ شیطان اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھ لیتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

(۲) وہم وخیال سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے: اَرٰی اَنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ میرا خیال ہے کہ زید جا رہا ہوگا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ تَرٰى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۸۔۵۰) اور کاش تم اس وقت کی کیفیت خیال میں لاؤ جب فرشتے کافروں کی جانیں نکالتے ہیں۔

(۳) کسی چیز کے متعلق تفکرا اور اندیشہ محسوس کرنا جیسے فرمایا:

﴿اِنِّيْ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ﴾ (۸۔۴۹) میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔

(۴) عقل وبصیرت سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے فرمایا:

﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى﴾ (۵۳۔۱۱) پیغمبر نے جو دیکھا تھا اس کے دل نے اس میں کوئی جھوٹ نہیں ملایا۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:

---

[1] قاله كثير عزة يخاطب حبيبته والبيت في اللسان (رءى) هوم وامالي ابن الشجري (۲: ۱۹) والكامل ۲۲۶۔۱۱۳ و البحر (٦: ۲۱۱) واستشهد القلب في الكتاب (۲: ۱۳۰) وفي مصارع الشاق ۷٦ مثله ليذ يدوقف على قبر جارية يقول وهناك وفيه عليل بدل خليل ۱۲.

﴿وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَةً اُخْرٰی﴾ (۵۳۔۱۳) ایک دفعہ اور بھی (اصلی صورت پر) دیکھا۔

اور رایٰ کے جب دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنیٰ ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ (۳۴۔۱۶) اور اے پیغمبر! جن لوگوں کو صحف آسمانی کا علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں۔

﴿اِنْ تَـرَنِ اَنَـا اَقَلَّ مِنْكَ﴾ (۱۸۔۳۹) اگر مال اور اولاد کے اعتبار سے تو مجھ کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے۔ اور اَرَاَیْـتَ (ہمزہ استفہام) اَخْبِـرْنِـیْ کے قائم مقام ہوتا ہے اور اگر اس پر کاف (ضمیر خطاب) داخل ہو۔ تو حالت تثنیہ، جمع اور تانیث میں تاء کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اِن حالتوں میں تاء کی بجائے کاف میں حسب مقام تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اَرَأَیْتَكَ هٰـذَا الَّـذِیْ﴾ (۱۷۔۶۲) بھلا بتایئے یہی وجہ ہے۔

﴿قُلْ اَرَأَیْتَكُمْ﴾ (۶:۴۰) اے پیغمبر! ان سے پوچھو کہ بھلا دیکھو تو سہی۔

﴿اَرَءَیْـتَ الَّـذِیْ یَنْهٰی﴾ (۹۶۔۹) (اے پیغمبر) تم نے اس شخص کے حال پر (بھی) نظر کی جو منع کرتا ہے۔

﴿قُـلْ اَرَأَیْتُـمْ مَّا تَدْعُونَ﴾ (۴۶۔۴) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ جن کو تم (اللہ کے سوا) پکارتے ہو۔

﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ......﴾ (۲۸:۷۱) اے پیغمبر! ان سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ اللہ تعالیٰ لے آئے۔

﴿قُـلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كَانَ﴾ (۴۶۔۱۰) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے) کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ اگر یہ ہو۔

﴿اَرَءَیْـتَ اِذْ اَوَیْـنَـا اِلَـی الصَّـخْـرَةِ﴾ (۱۸۔۶۳) آپ نے یہ بھی دیکھا کہ جب ہم (دریا کے کنارے) اس پتھر کے پاس ٹھہرے۔

اِن تمام آیات میں تنبیہ کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔

رَأْیٌ: غلبۂ ظن کی بنا پر کسی معاملہ کے دو متناقض پہلوؤں میں سے کسی ایک کی صحت کا یقین کر لینا رائے کہلاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿یَـرَوْنَهُمْ مِثْلَیْهِمْ رَأْیَ الْعَیْنِ﴾ (۳۔۱۳) جن کو آنکھوں دیکھتے مسلمانوں کا گروہ اپنے سے دو چند دکھائی دے رہا ہے۔

میں "یَـرَوْنَ رَأْیٌ" سے مشتق ہے جس کے معنیٰ گمان کرنے کے ہیں اور معنیٰ یہ ہیں کہ عینی مشاہدے کی رو سے وہ انہیں اپنے سے دو چند خیال کرتے تھے جیسے کہا جاتا ہے:

فَعَلَ ذَالِكَ رَأْیَ عَیْنِیْ اَوْ رَائَةَ عَیْنِیْ کہ اس نے یہ کام میرے سامنے کیا ہے۔

اَلـرَّوِیَّةُ وَالتَّرْوِیَّةُ کے معنیٰ کسی چیز پر غور و فکر کرنے اور ایک رائے اختیار کرنے کے لئے یکسوئی سے اس کی طرف توجہ دینے کے ہیں۔ اور اَلْـمُـرْتَـئِیُّ وَالْمُرَوِّیْ بمعنیٰ متفکر ہے اور رَأَیـتُ متعدی بہ اِلٰی ہو تو اس کے معنیٰ کسی چیز کی طرف اس طرح نظر ڈالنے کے ہیں کہ اس کے بعد انسان کو عبرت حاصل ہو جیسے فرمایا:

﴿اَلَـمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ......﴾ (۲۵۔۴۵) (اے پیغمبر) کیا تو نے اپنے پروردگار کی (قدرت کی) طرف نظر نہیں کی۔

اور آیت: ﴿بِـمَـا اَرَاكَ اللّٰـهُ﴾ (۴۔۱۰۵) میں اَرٰی (افعال) بمعنیٰ تعلیم کے ہے یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھایا ہے۔

اَلرَّایَۃُ اس علامت کو کہتے ہیں جو دیکھنے کے لئے نصب کی گئی ہو اور محاورہ ہے:
مَعْ فُلَانٍ رَئِیٌّ مِّنَ الْجِنِّ: یعنی وہ آسیب زدہ ہے۔
اور اَرْئَتِ النَّاقَۃُ فَھِیَ مُرْءٍ: اونٹنی کا حاملہ ہونا ظاہر ہو جانا۔

اَلرُّؤْیَا بمعنیٰ خواب کے ہیں اور یہ ہمزہ کے ساتھ بروزن فُعْلیٰ ہے اور کبھی ہمزہ کو حذف کر کے واؤ کے ساتھ اَلرُّوْیَا کہہ دیتے ہیں ایک حدیث میں ہے۔❶
(۱٦۵) لَمْ تَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الرُّؤْیَا کہ مبشرات نبوت سے صرف خواب رہ گئے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا بِالْحَقِّ﴾ (۴۸۔۲۷) بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واقعی سچا خواب دکھایا تھا۔
﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنَاكَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ﴾ (۱۷۔٦۰) اور خواب جو ہم نے تم کو دکھایا تھا تو بس اس کو لوگوں (کے ایمان) کی آزمائش (کا ذریعہ) ٹھہرایا۔
﴿فَلَمَّا تَرَآئَی الْجَمْعَانِ﴾ (۸۔۴۷) پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔

یعنی جب وہ باہم اس طرح آمنے سامنے ہوئے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور اسی سے وہ حدیث ہے جس میں فرمایا:❷
(۱٦٦) لَا یُتَرَای نَارُھُمَا کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے محاورہ ہے:
مَنَازِلُھُمْ رِئَاءٌ کہ ان کے مکانات باہم متقابل ہیں۔
فَعَلَ ذَالِكَ رِئَاءَ النَّاسِ: اس نے نمودار اور دکھاوے کے لئے یہ کام کیا۔
یہ رَأَیْتُ سے مِفْعَلَۃ کے وزن پر ہے جیسے صَحَفْتُ سے مصْحَفَۃٌ اور اس کی جمع مَرَائِیْ آتی ہے۔

اَلرِّئَۃُ پھیپھڑا۔اس کی جمع مِنْ لَفْظِہٖ رِؤُوْنَ آتی ہے۔ اس پر ابوزید نے اس شعر سے استشہاد کیا ہے۔❸
(۱۲۱) حَفِظْنَاھُمُوْا حَتّٰی اَتَی الْغَیْظُ مِنْھُمُوا
قُلُوْبًا وَاَکْبَادًا لَھُمْ وَرِئِیْنَا
ہم نے انہیں غصہ دلایا حتیٰ کہ غیظ وغضب ان کے دل وجگر اور پھیپھڑوں میں سرایت کر گیا۔
اور اسی سے رِئْتُہٗ ہے جس کے معنیٰ پھیپھڑے پر مارنے کے ہیں۔

❀❀❀

❶ رواہ ابوداؤد باب علی مایقال المشرکون من حدیث جریر بن عبداللہ والنسائی فی باب القود بغیر حدیدۃ مرسلاً والحدیث فی اللآلی ۵۷ وانظر لتخریجہ الکاف الشاف لابن حجر ۵۵ وتخریج العراقی علی الاحیاء (۲ : ۱٦۹) والفائق (۱ : ۲۱۹) وغریب ابی عبید ۱۲.
❷ البیت فی اللسان (رای) بغیر عزو فیہ فعظناھم بدل حفظناھم.
❸ رواہ ابوداؤد فی باب الدعاء فی الرکوع والسجود من حدیث ابن عباس وفیہ الرؤیا الصالحۃ راجع العون (۱ : ۳۲۷) والحدیث ایضاً رواہ مسلم (۱ : ۱۹۱) طبع ھند والنسائی وابن ماجۃ ۱۲.

كِتَابُ الزَّاءِ

(ز ب د)

اَلزَّبَدُ: جھاگ کو کہتے ہیں اور اَزْبَدَ الْمَاءُ کے معنیٰ ہیں: پانی کے اوپر جھاگ آ گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً﴾ (۱۳۔۱۷) سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے۔

پھر محض رنگ میں مشابہت کی وجہ سے مسکہ کو بھی زُبْدٌ کہا جاتا ہے اور زَبَدتُّهٗ زَبداً کے معنیٰ ہیں "میں نے اسے جھاگ کی طرح بکثرت مال دیا" یا "میں نے اسے مسکہ کھلایا"

اَلزَّبَادُ: پھول یا کلی جو جھاگ کی طرح سفید ہوتی ہے۔

(ز ب ر)

اَلزُّبْرَةُ: لوہے کی بڑی سل کو کہتے ہیں اور اس کی جمع زُبَرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اٰتُونِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ﴾ (۱۸۔۹۶) (اچھا) لوہے کی سلیں ہم کو لا دو۔

اور کبھی زُبْرَةٌ کا لفظ بالوں کے گچھا پر بولا جاتا ہے اس کی جمع "زُبَـــرٌ" آتی ہے اور استعارہ کے طور پر پارہ پارہ کی ہوئی چیز کو زُبُرٌ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا﴾ (۲۳۔۵۳) پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ کر کے اپنا (اپنا) دین جدا جدا کر لیا۔

زَبَرْتُ الْکِتَابَ: میں نے کتاب کو موٹے خط میں لکھا اور ہر وہ کتاب جو جلی اور گاڑھے خط میں لکھی ہوئی ہوئے زَبُـــوْرٌ کہا جاتا ہے لیکن عرف میں زبور کا لفظ اس آسمانی کتاب کے لئے مخصوص ہو چکا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾ (۴۔۱۶۳) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا کی۔

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ﴾ (۹۔۱۰۵) اور ہم نصیحت (کی کتاب یعنی توراۃ) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

اس میں ایک قرأت زُبُـــوْر (بضمہ زاء) بھی ہے جو یا تو زَبُوْرٌ بفتحہ الزاء کی جمع ہے، جیسے ظَرِيفٌ کی جمع ظُرُوْفٌ آ جاتی ہے اور یا زِبْرٌ (بکسرۂ زاء) کی جمع ہے۔ اور زِبر گو اصل میں مصدر ہے لیکن بطور استعارہ اس کا اطلاق کتاب پر ہوتا ہے جیسا کہ خود کتاب کا لفظ ہے کہ اصل میں مصدر ہے لیکن بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے پھر جس طرح کتاب کی جمع کتب آتی ہے اس طرح زِبْـرٌ کی جمع زُبُـرٌ آ جاتی ہے بعض نے کہا ہے کہ زبور کتب الہیہ میں سے ہر اس کتاب کو کہتے ہیں جس پر واقفیت دشوار ہو۔

قرآن میں ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَفِىْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۹۶) اس میں شک نہیں کہ یہ (یعنی اس کی پیشین گوئی) اگلے پیغمبروں کی

---

❶ هو مستعار من زبرت الفضة وقال قتادة ومجاهد الزبر بمعنىٰ الكتب جمع زبور راجع تفسير الكشاف (ص ٦٦ ج ٢ معالم ج ٣ ص ٥٢).

کتابوں میں موجود ہے۔

﴿وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيْرِ﴾ (۳۔۸۳) اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔

﴿اَمْ لَهُمْ بَرَآئَةٌ فِي الزُّبُرِ﴾ (۵۴۔۴۳) یا تمہارے لئے صحیفوں میں معافی (لکھی ہوئی) ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جو صرف حِکَم عقلیہ پر مشتمل ہو اور اس میں احکام شرعیہ نہ ہوں۔ اور الکتاب ہر اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو احکام و حِکَم دونوں پر مشتمل ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں کوئی حکم شرعی نہیں ہے۔

زِئْبَرُ الثَّوبِ: کپڑے کا رواں۔ اسی سے کہا جاتا ہے:

هَاجَ زِئْبِرُهٗ: وہ غصہ سے بھڑک اٹھا۔

اور بڑے کندھوں والے شخص کو اَزْبَرُ کہا جاتا ہے۔

(ز ج ج)

اَلزُّجَاجُ: ایک قسم کا شفاف پتھر (شیشہ) اس کا مفرد زُجَاجَةٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ زُجَاجَةٍ: اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾ (۲۴۔۳۵) ایک شیشہ میں ہے (اور) شیشہ گویا چمکتا ہوا تارا ہے۔

اَلزُّجُّ: نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا۔ جمع زِجَاجٌ اور زَجَجْتُ الرَّجُلَ کے معنیٰ ہیں: میں نے اسے نیزہ کی نوک سے مارا۔ اَزْجَجْتُ الرُّمْحَ: میں نے نیزہ میں زج لگائی یا اس سے زج کو نکال لیا۔

اَلزَّجَجُ: ابرو کی درازی اور باریکی جو نیزہ کی انی کے مشابہ ہو۔

ظَلِيْمٌ اَزَجُّ وَنَعَامَةٌ زَجَّاءُ: دراز گام شتر مرغ۔

(ز ج ر)

اَلزَّجْرُ: اصل میں آواز کے ساتھ دھتکارنے کو کہتے ہیں۔ زَجَرْتُهٗ: میں نے اسے جھڑکا، روکا۔

اِنْزَجَرَ: (جھڑکنے پر) کسی کام سے رک جانا۔ یہ زَجَرَ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا﴾ (۳۷۔۲) میں زَاجِرَاتِ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ڈانٹ کر چلاتے ہیں۔

اور آیت: ﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ (۷۹:۱۳) اور قیامت تو ایک ڈانٹ ہے۔

﴿مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ﴾ (۵۴۔۴) جس میں (کافی) تنبیہ ہے۔ میں مُزْدَجَرٌ سے ایسی باتیں مراد ہیں جو ارتکاب معاصی سے روکتی اور سختی سے منع کرتی ہیں۔ اور آیت:

﴿وَازْدُجِرْ﴾ (۵۴۔۹) اور اسے جھڑکیاں دی گئیں۔ کے معنیٰ ہیں: ڈانٹ کر نکال دیا گیا۔ یہاں زجر کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مار بھگانے کے وقت تہدید آمیز کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے جا چلا جا، دور ہو جاو غیرہ۔

(ز ج و)

اَلتَّزْجِيَةُ کے معنیٰ کسی چیز کو دفع کرنے کے ہیں تاکہ چل پڑے مثلاً: پچھلے سوار کا اونٹ کو چلانا یا ہوا کا بادلوں کو چلانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يُزْجِيْ سَحَابًا﴾ (۲۴۔۴۳) (اللہ ہی) بادلوں کو ہنکاتا ہے۔

﴿يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ (۱۷۔۶۶) جو تمہارے لئے (سمندروں میں) جہازوں کو چلاتا ہے۔

اور اسی سے کہا جاتا ہے کہ رَجُلٌ مُزْجِيٌّ: ہنکایا ہوا آدمی۔ یعنی کمزور اور ذلیل آدمی۔

اَزْجَیْتُ رَدِیْءَ التَّمْرِ: میں نے ردی کھجوروں کو دور پھینک دیا۔اور زَجَا (لازم) اَزْجیٰ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

زَجاالْخَراجُ (ن) خراج کا سہولت سے جمع ہوجاتا۔ اور "خَرَاجٌ رَاجٍ "اس خراج کو کہتے ہیں جو معمولی ہونے کی وجہ سے سہولت سے جمع ہوجائے۔کسی شاعر نے کہا ہے۔

(۲۰۳) وَحَاجَةٍ غَیرُ مُزْجَاةٍ عَنِ الْحَاجِ

اور حاجت مندوں کی بعض حاجتیں معمولی نہیں ہوتیں کہ انہیں پورا کیا جاسکے۔

(ز ح ز ح)

اَلزَّحْزَحَةُ کے معنیٰ ہیں دور ہٹانا اور برطرف کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ﴾ (۳۔۱۸۴) پس جو شخص آگ سے دور رکھا گیا۔

(ز ح ف)

اَلزَّحْفُ: اصل میں اس کے معنیٰ پاؤں کے گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا کے ہیں جیسا کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے سے پہلے اور اونٹ تھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں گھسیٹ کر چلتا ہے یا فوج کثرت ازدحام کی وجہ سے آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا﴾ (۸۔۱۵) جب کفار سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہوجائے۔

اور زَاحِفٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ سے ورے گر جائے۔

(ز خ ر ف)

اَلزُّخْرُفُ: اصل میں زینت کو کہتے ہیں جو ملمع سے حاصل ہو۔اسی سے سونے کو بھی زُخْرُفٌ کہا جاتا ہے (کیونکہ یہ زیبائش کے کام آتا ہے۔) قرآن پاک میں ہے:

﴿اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا﴾ (۱۰۔۲۴) یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی۔

﴿بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ (۱۷۔۹۳) طلائی گھر۔

﴿وَزُخْرُفًا﴾ (۴۳۔۳۵) اور سونے کے (دروازے)

اور ﴿زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (۶۔۱۱۲) کے معنیٰ ہیں "ملمع کی ہوئی باتیں"

(ز ر ب)

اَلزَّرَابِیُّ: یہ زِرْبٌ کی جمع ہے جو ایک عمدہ قسم کا کپڑا ہے اور ایک مقام کی طرف منسوب ہے پھر تشبیہ واستعارہ کے طور پر زَرَابِیُّ بمعنیٰ فرش کے بھی آجاتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ﴾ (۸۸۔۱۶) اور بچھائے ہوئے فرش۔

اور زَرْبٌ وَزَرِیْبَةٌ: بکریوں کے باڑہ اور تیر انداز کے چھپنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں۔

(ز ر ع)

الزَّرْعُ: اس کے اصل معنیٰ اِنْبَات یعنی اگانے کے ہیں اور یہ کھیتی اگانا دراصل قدرت کا کام ہے اور انسان کے کسب وہنر کو اس میں دخل نہیں ہے اسی بنا پر آیت کریمہ:

﴿اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ (۵۶۔۶۴) بھلا بتاؤ کہ جو تم بوتے

ہو کیا اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔ میں حَــرْث (بونا) کی نسبت تو انسان کی طرف کی ہے مگر زَرْعٌ (اگانے) کی انسان سے نفی کر کے اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اور کھیتی اگانے کے اسباب مثلاً زمین کو تیار کر کے اس میں تخم ریزی کرنا اور مناسب احتیاطیں برتنا چونکہ انسان سرانجام دیتا ہے اس لئے مجازاً انسان کی طرف بھی زَرع کی نسبت کر دیتے ہیں جیسا کہ اَنْبَـتُّ کَـذَا کا محاورہ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان منجملہ اگانے کے اسباب سے ہے۔

زَرْعٌ اصل میں مصدر ہے اور اس سے مَــــزْرُوْع (اسم مفعول) یعنی کھیتی مراد ہوتی ہے جیسے فرمایا:

﴿فَـنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا﴾ (۳۲-۲۷) پھر ہم اس (پانی) کے ذریعہ کھیتی نکالتے ہیں۔

﴿وَزُرُوْعٍ وَّمَـقَـامٍ كَرِيْمٍ﴾ (۴۴-۲۶) اور کتنی ہی کھیتیاں اور کتنے ہی عمدہ عمدہ مکانات۔

اور تشبیہ کے طور پر جس طرح انسان کے متعلق اَنْبَتَـهُ اللّٰهُ کا محاورہ ہے استعمال ہوتا ہے اس طرح محاورہ میں زَرَعَ اللّٰهُ وَلَدَكَ (اللہ تمہاری اولاد کو نمو بخشے) بھی کہہ دیتے ہیں اور مُــــزْرِع بمعنیٰ زرَّاع یعنی کسان کے ہیں اور اِزْدَرَعَ النَّبَاتُ کے معنیٰ ہیں نباتات بڑھ گئی۔

(ز ر ق)

اَلزُّرْقَةُ: (نیلاہٹ) ایک رنگ جو سپیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے۔ محاورہ ہے: زَرِقَـتْ عَيْنُهٗ زُرْقَةً وَزُرْقَانًا: اس کی آنکھ نیلی ہوگئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿زُرْقًـا يَتَـخَـافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۰-۱۰۲،۱۰۳) نیلی آنکھوں والے جو آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے۔

میں زُرْقًا کے معنیٰ اندھے، جن کی آنکھوں میں نور نہ ہو۔

اَلــزُّرْقُ: ایک پرند کا نام ہے (سفید شاہین) محاورہ ہے زَرَقَ الـطَّائِرُ: پرند کا بیٹ کرنا اور زَرَقَـهٗ بِالْمِزْرَاقِ کے معنیٰ ہیں ''اسے چھوٹے نیزہ سے مارا''

(ز ر ی)

زَرَيْتُ عَـلَيْـهِ کے معنیٰ کسی پر عیب لگانے کے ہیں اور اَزْرَيْتُ بِهٖ وَازْدَرَيْتُ (افتعال) کے معنیٰ ہیں ''کسی کو حقیر اور بے وقعت گرداننا'' قرآن پاک میں ہے:

﴿تَـزْدَرِیْ اَعْيُـنُـكُمْ﴾ (۱۱-۳۱) (جنہیں) تمہاری نظریں حقیر دیکھتی ہیں۔

یہ اصل میں تَـزْدَرِيْهِمْ اَعْيُنُكُمْ ہے یعنی اس کا مفعول محذوف ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ تم انہیں نظر حقارت سے دیکھتے ہو۔

(ز ع ق)

الــزُّعَــاقُ: سخت کھاری اور کڑوے پانی کو کہتے ہیں اور جس کھانے میں حد سے زیادہ نمک ہو اسے طعام مزعوق کہا جاتا ہے۔

زَعَقَ (ف) بِهٖ کے معنیٰ کسی پر چلا کر اسے گھبرا دینے کے ہیں اور اِنْزَعَقَ (لازم) گھبرا جانا۔

اَلزَّعِقُ: بہت چلانے والا۔

اَلزَّعَّاقُ: بہت بلند آواز نکالنے والا۔

(ز ع م)

اَلزَّعْمُ: اصل میں ایسی بات نقل کرنے کو کہتے ہیں جس میں جھوٹ کا احتمال ہو اس لئے قرآن پاک میں یہ لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت

مقصود ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۶۴۔۷) کفار (یہ) زعم کرتے ہیں۔

﴿بَلْ زَعَمْتُمْ﴾ (۱۸۔۴۸) مگر تم یہ خیال کرتے ہو۔

﴿كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ (۶۔۲۲) (جن کو تم شریک خدائی سمجھتے تھے۔

﴿زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ﴾ (۱۷۔۵۶) (جنہیں تم نے اللہ کے سوا (معبود) خیال کیا۔

اور زَعَامَةٌ کے معنیٰ ذمہ داری اٹھانے اور ریاست (سرداری) کے ہیں اور کفیل (ضامن) اور رئیس کو زَعِیمٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی بات میں جھوٹ کا احتمال ہوسکتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ﴾ (۱۲۔۷۲) اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

﴿اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ﴾ (۶۸۔۴۰) ان میں سے کون اس کا ذمہ دار ہے۔ یہاں زَعِیمٌ یا تو زَعامہ بمعنیٰ کَفالۃ سے ہے اور یا زعم بالقول سے ہے۔

(ز ف ف)

زَفَّ الْاِبِلُ يَزِفُّ زَفًّا وَزَفِيفًا کے معنیٰ ہیں: اونٹ کا تیز چلنا اور اَزَفَّهَا (افعال) کے معنیٰ تیز چلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ﴾ (۳۷۔۹۴) وہ اس کی طرف دوڑتے آئے۔

اور ایک قرأت میں يُزِفُّوْنَ (بضمہ یاء) ہے یعنی وہ اپنے ساتھیوں کو تیز روی پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ اصل میں زَفِیفٌ کے معنیٰ ہوا کے تیز چلنے یا شتر مرغ کے اس قدر تیز چلنے کے ہیں جس میں نیم پرواز پائی جائے۔ کہا جاتا ہے: زَفْزَفَ النَّعَامُ: شتر مرغ تیز چلا پھر اسی سے استعارہ کے طور پر زَفَّ الْعَرُوْسُ کہا جاتا ہے۔ یعنی دلہن کو شوہر کے پیش کیا۔ اس میں بھی معنیٰ سرعت ملحوظ ہے۔ مگر اس کا تعلق چلنے سے نہیں ہے بلکہ پیش کرنے والوں کے وفور شوق سے ہے۔

(ز ف ر)

اَلزَّفِيْرُ: اس کے اصل معنیٰ سانس کی اس قدر تیزی سے آمد وشد کے ہیں کہ اس سے سینہ پھول جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ﴾ (۱۱۔۱۰۶) ان کے لئے اس میں چیخنا ہے۔

اِزْدَفَرَ (افتعال) فُلَانٌ كَذَا: کسی چیز کو مشقت سے اٹھانا جس سے سانس پھول جائے اس لئے پانی لانے والی لونڈیوں کو زَوَافِرُ کہا جاتا ہے۔

(ز ق م)

اَلزَّقُّوْمُ: تھوہر کا درخت اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ﴾ (۴۴۔۴۳) بے شک سینڈھ کا درخت۔ میں زَقُّومٌ سے دوزخ کے کریہہ کھانے مراد ہیں۔ اور اس سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

زَقَمَ فُلَانٌ وَتَزَقَّمَ: اس نے کوئی کریہہ چیز نگل لی۔

(ز ک و)

اَلزَّكَاةُ: اس کے اصل معنیٰ اس نمو (افزونی) کے ہیں جو برکت الٰہیہ سے حاصل ہو اس کا تعلق دنیاوی چیزوں سے بھی ہے اور اخروی امور کے ساتھ بھی چنانچہ

کہا جاتا ہے۔
زَكَاالزَّرْعُ يَزْكُوْ: کھیتی کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا اور آیت کریمہ:
﴿أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا﴾ (۱۸۔۱۹) کس کا کھانا زیادہ صاف ستھرا ہے۔
میں أَزْكَىٰ سے ایسا کھانا مراد ہے جو حلال اور خوش انجام ہو اور اسی سے زکوۃٌ کا لفظ مشتق ہے یعنی وہ حصہ جو مال سے حق الٰہی کے طور پر نکال کر فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوۃ یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے یعنی خیرات وبرکات کے ذریعہ اس میں نمو ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے تسمیہ میں ان ہر دو امور کا لحاظ کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ دونوں خوبیاں زکوۃ میں موجود ہیں۔
قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ساتھ زکوۃ کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا:
﴿وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (۲۔۴۳) نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرتے رہو۔
اور تزکیہ نفس سے ہی انسان دنیا میں اوصاف حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر وثواب بھی اسی کی بدولت حاصل ہوگا۔ اور تزکیہ نفس کا طریق یہ ہے کہ انسان ان باتوں کی کوشش میں لگ جائے جن سے طہارت نفس حاصل ہوتی ہے۔ اور فعل تزکیہ کی نسبت کبھی تو انسان کی طرف کی جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ (۹۱۔۹) کہ جس نے اپنی روح کو پاک کیا (وہ ضرور اپنی) مراد کو پہنچا۔
اور کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فی الحقیقت وہی اس کا فاعل ہے۔ چنانچہ فرمایا:
﴿بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ﴾ (۴۔۴۹) بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔
اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (۹۔۱۰۳) کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو۔
﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِنَا وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (۲۔۱۵۱) وہ پیغمبر انہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں بذریعہ تعلیم (اخلاق رذیلہ) سے پاک کرتا ہے۔
اور کبھی اس کی نسبت عبادت کی طرف ہوتی ہے کیونکہ عبادت تزکیہ کے حاصل کرنے میں بمنزلہ آلہ کے ہے چنانچہ یحیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:
﴿وَحَنَانًا مِنْ لَدُنَّا وَزَكٰوةً﴾ (۱۹۔۱۳) اور اپنی جناب سے رحمدلی اور پاکیزگی دی تھی۔
﴿لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا﴾ (۱۹۔۱۹) تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں۔
یعنی وہ فطرتاً پاکیزہ ہوگا اور فطرتی پاکیزگی جیسا کہ بیان کر چکے ہیں۔ بطریق اجتباء حاصل ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیتا ہے اور یہ پاکیزگی تعلیم وممارست سے نہیں بلکہ محض توفیق الٰہی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اکثر انبیاء اور رسل کے ساتھ

ہوا ہے۔ اور آیت کے یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ لڑکا آئندہ چل کر پاکیزہ اخلاق ہوگا لہٰذا زَکِیًّا کا تعلق زمانۂ حال کے ساتھ نہیں بلکہ استقبال کے ساتھ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ﴾ (۲۳۔۴) اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔

یعنی وہ عبادت اس غرض سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کر دے یا وہ اپنے نفوس کو پاک کرنے کی غرض سے عبادت کرتے ہیں۔ وَالْمَالُ وَاحِدٌ۔ لہٰذا لِلزَّكٰوة میں لام تعلیل کے لئے ہے جسے لام علت وقصد کہتے ہیں اور لام تعدیہ نہیں ہے حتیٰ کہ یہ فَاعِلُونَ کا مفعول ہو۔ انسان کے تزکیۂ نفس کی دو صورتیں ہیں ایک تزکیہ بالفعل یعنی اچھے اعمال کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرنا یہ طریق محمود ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (۹۱۔۹) اور آیت: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (۸۷۔۱۴) میں تزکیہ سے یہی مراد ہیں۔ دوسرے تزکیہ بالقول ہے جیسا کہ ایک ثقہ شخص دوسرے کے اچھے ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اگر انسان دوسرے کے اچھا ہونے کا دعویٰ کرے اور خودستائی سے کام لے تو یہ مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تزکیہ سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۵۳۔۳۲) اپنے آپ کو پاک نہ ٹھہراؤ۔

اور یہ نہی تادیبی ہے۔ کیونکہ انسان کا اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا یہ عقلاً ہی درست نہیں ہے۔ اور نہ ہی شرعاً۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دانش مند سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی بات ہے جو باوجود حق ہونے کے زیب نہیں دیتی تو اس نے جواب دیا۔ مَدْحُ الْاِنْسَانِ نَفْسَهٗ کہ خودستائی کرنا۔

(ز ل ل)

اَلزَّلَّةُ: کے اصل معنیٰ بلاقصد کے قدم پھسل جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: زَلَّتْ (ض) رِجْلٌ تَزِلُّ اور پھسلنے کی جگہ کو زَلَّةٌ کہا جاتا ہے نیز جو گناہ بلاقصد سرزد ہو جائے تو اسے بھی بطور تشبیہ زَلَّةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ﴾ (۲۔۲۰۹) اگر تم لغزش کھا جاؤ۔

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ (۲۔۳۶) انہیں شیطان نے پھسلا دیا۔

اِسْتَزَلَّهٗ: (استفعال) کسی کو پھسلانے کا قصد وارادہ کرنا اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ﴾ (۳۔۱۵۴) شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔

کے یہ معنیٰ ہیں کہ شیطان انھیں آہستہ آہستہ پھسلانے کی کوشش کرتا رہا حتیٰ کہ وہ پھسل گئے۔ کیونکہ جب انسان صغائر سے بے پرواہی سے کام لیتا ہے تو وہ شیطان کے تسلط کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔[1]

(۱۶۶) مَنْ اُزِلَّتْ اِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا کہ جسے بلاطلب نعمت مل جائے اسے منعم کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ جب بلاقصد نعمت حاصل ہونے

[1] فی الفائق مرفوعاً (۱: ۳۶۸) وفی غریب ابی عبید (۱: ۱۵) ھب۔عن یحییٰ بن عبداللہ بن صیفی مرسلاً بلفظ من اولیت الیہ ومن انزلت قال ابوعبید لیس هذا بمحفوظ فی ابن عساکر عنہ مرسلاً من ازلفت الیہ ید راجع کنزالعمال (۶: رقم ۱۹۸۸، ۱۹۹۲۰.)

پر شکر گزاری لازم ہے تو جو احسان کسی کے قصد اور ارادہ سے ہو اس کا شکریہ بالاولیٰ ضروری ہے۔

اَلتَّزَلْزُلُ: اس کے معنیٰ اضطراب کے ہیں اور اس میں تکرار حروف تکرار معنیٰ پر دال ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ (۹۹۔۱) جب زمین بڑے زور سے ہلائی جائے گی۔

﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ﴾ بے شک قیامت کا زلزلہ (بڑی سخت) مصیبت ہوگی۔

﴿وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا﴾ (۳۳۔۱۱) اور وہ (دشمنوں کے رعب سے) خوب ہی جھڑ جھڑائے گئے۔

(ز ل ف)

اَلزُّلْفَةُ: اس کے معنیٰ قرب اور مرتبہ کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً﴾ (۶۷۔۲۷) سو جب وہ قریب دیکھیں گے۔

کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ جب وہ مومنین کے مراتب قرب کو دیکھیں گے اور وہ ان سے محروم ہوں گے اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں زُلْفَةً سے مراد عذاب کا قرب ہے اور عذاب کو زُلْفَةً کہنا، حالانکہ یہ مراتب محمودہ میں استعمال ہوتا ہے۔بطور تہکم ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق بشارت یا اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور منازل لیل یعنی رات کے حصوں کو بھی زُلَفٌ کہا گیا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ﴾ (۱۱۔۱۱۴) اور رات کے کچھ حصوں میں۔

شاعر نے کہا ہے۔[1] (رجز)

(۲۰۴) طَیُّ اللَّیَالِیْ زُلَفًا فَزُلَفًا

اور راتوں کا تھوڑا تھوڑا کر کے گزرنا۔

اَلزُّلْفٰی: قرب و مرتبہ۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی﴾ (۳۹۔۳) کہ خدا کے ہم کو قریب کر دیں۔

﴿وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ (۵۰۔۳۱) اور بہشت پرہیز گاروں کے قریب لائی جائے گی۔

اور لَیْلَةُ الْمُزْدَلِفَةِ کو اس نام سے اس لئے پکارتے ہیں کہ حجاج کرام عرفات سے لوٹنے کے بعد اس رات منیٰ کے قریب پہنچ جاتے ہیں اور حدیث میں ہے۔[2]

(۱۶۷) اِزْدَلِفُوْا اِلَی اللّٰهِ بِرَكْعَتَیْنِ: کہ دو رکعت نماز سے اللہ کا قرب حاصل کرو۔

(ز ل ق)

زَلَقٌ اور زَلَلٌ تقریباً ہم معنیٰ ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿صَعِیْدًا زَلَقًا﴾ (۱۸۔۴۰) صاف میدان۔

یعنی چکنی زمین جس میں کوئی سبزہ نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَتَرَكَهٗ صَلْدًا﴾ (۲۔۲۶۴) اسے سپاٹ کر (کے بہہ بہا) گیا۔

اَلْمُزْلَقُ: پھسلنے کی جگہ۔اور آیت کریمہ:

---

[1] وقبلٌ : ناج طواه الاین هماً وجفاً وثاله : سماوة الهلال حتیٰ احقوقفا ۔ والشطر من ارجوزة للعجاج راجع اراجیز العرب للسید البکری ۵۲ ومجاز القران لابی عبیدة (۱ : ۳۰۰) والطبری (۱۹ : ۸۱) والکامل ۱۲۹ , ۸۲٤ فی ثلاثة اشطار وادب الکتاب للصولی (۱۲۳) والصحاح والتاج واللسان (زنف) والشنتمری (۱ : ۱۸۰) ودیوانه ۸٤ والکتاب (۱ : ۱۵۰) والبحر (۱ : ۸۳) وابن خالویه ۹۸ والعینی (۱ : ۲۹).

[2] وفی النهایة (زلف) فی حدیث مصعب بن عمیر : فاذازالت الشمس فازدلف الی الله برکعتین واخطب فیهما ای تقرب ۱۲۔

﴿لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ﴾ (۶۸۔۵۱) اپنی نظروں سے (گھور کر) تجھے تیرے مکان سے پھسلا دیں۔
میں ابصار کے متعلق زَلَقَ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❶ (الکامل)

(۲۰۵) نَظَرٌ يُّزِيْلُ مَوَاضِعَ الْاَقْدَامِ

ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔
کہا جاتا ہے زَلَقَهٗ وَاَزْلَقَهٗ: اسے پھسلایا فَزَلِقَ چنانچہ پھسل گیا۔
یونس لغوی کا قول ہے کہ زَلَقٌ اور اِزْلَاق کا یہ محاورہ صرف قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے اور ابی بن کعب نے اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (۲۶۔۶۴) میں ازلقنا (قاف کے ساتھ) پڑھا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم نے وہاں دوسرے لوگوں کو لا کر ہلاک کر ڈالا۔

(ز م ر)

زُمْرَةٌ کے معنیٰ چھوٹی سی جماعت کے ہیں۔اس کی جمع زُمَرٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَسِيقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ (۳۹۔۷۳) اور جنہوں نے اپنے رب کا تقویٰ اختیار کیا وہ بہشت کی طرف گروہ گروہ کر کے چلے جائیں گے۔اور اسی سے شَاةٌ زَمِرَةٌ ہے جس کے معنیٰ کم اُون والی بھیڑ کے ہیں اور بے مروت آدمی کو زَمِرٌ کہا جاتا ہے اور زَمَرَتِ النَّعَامَةُ تَزْمِرُ زِمَارًا کے معنیٰ ہیں شتر مرغ نے سیٹی بجائی اور اس سے کنایہ کے طور پر فاجرہ عورت کو زَمْرٌ وَزَمَارَةٌ کہا جاتا ہے۔❷

(ز م ل)

﴿يَآاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ (۷۳۔۱) اے اوڑھنے والے۔تو مُزَّمِّلٌ اصل میں مُتَزَمِّلٌ ہے جس کے معنیٰ کپڑے میں لپیٹنے کے ہیں اور استعارہ کے طور پر سستی اور کوتاہی کرنے والے کو بھی تعریضاً مُزَّمِّلٌ کہا جاتا ہے اسی سے زُمَيْلٌ ہے جس کے معنیٰ کمزور اور ناتواں کے ہیں تَاَبَّطَ شَرًّا کے متعلق اس کی والدہ نے کہا ہے۔❸

لَيْسَ بِزُمَيْلٍ شَرُوبٍ لِلْغِيْلِ

کہ وہ کمزور اور ناتواں نہیں ہے کہ دوپہر کے وقت دودھ پینے کی ضرورت ہو۔

(ز ن م)

اَلزَّنِيْمُ یا مُزَنَّمٌ اسے کہتے ہیں جو کسی قوم سے نسبتی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اس کے ساتھ یونہی ملحق ہو۔جیسے زَنَمَتَا الشَّاةِ: یعنی گوشت کے دو زائد ٹکڑے جو بکری کے گلے یا کان سے نیچے لٹک رہے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿عُتُلٍّ بَعْدَ ذَالِكَ زَنِيْمٍ﴾ (۶۸۔۱۳) سخت جھگڑالو اس کے علاوہ بدذات بھی۔

---

❶ وفی اللسان انشده ابو اسحاق راجع (زلق قرض) وقد مر تخریجه فی (دحض) والبیت فی المعانی للقبتی ۱۱۲۹،۸۴۵ والصناعتین ۲۸۱ والطبرسی (۲۸: ۳۷)۱۲۔

❷ وفی الحدیث نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن کسب الزمارة وهی التی تزمر او الزانیة (راجع غریب ابی عبید (۱: ۳۴۱) والفائق (۱: ۵۳۹) .

❸ ترثیه انظر المعانی فی الکبیر ۱۲۳۰ وفیه وفی اللسان (قیل) رثائها : وابناه ، وابن اللیل ـ لیس بزمیل شروب للقیل ، کمقرب الخیل ـ ترید بابن اللیل ـ انه صاحب غارات والقیل اللبن الذی یشرب وقت القیلولة ای نوم الظهیرو الفعل من قال واقتال ای لیس هو شروب للقیل مهیانا دقیق الخصر یحتاج الی الشرب نصف النهار وفی المطبوع الفیل مکان القیل والتصحیح من اللسان (زمل)۱۲.

اور زَنِیْمٌ اس غلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی قوم کی طرف منسوب ہو۔ یعنی زَلَمَةَ یا زَنَمَةَ کی طرح لٹک رہا ہو درحقیقت ان سے نہ ہو شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۰۷) فَاَنْتَ زَنِیْمٌ نِیْطَ فِیْ اٰلِ هَاشِمٍ
كَمَا نِیْطَ خَلْفَ الرَّاكِبِ الْقَدَحُ الْفَرْ

اور تو حرام زادہ ہے جو آل ہاشم کے ساتھ اس طرح معلق ہے جیسے لکڑی کا خالی پیالہ سوار کے پیچھے لٹک رہا ہوتا ہے۔

(ز ن ی)

اَلزِّنَا: عقد شرعی کے بغیر کسی عورت سے ہم بستری کرنے کا نام زنا ہے یہ اسم مقصور ہے اگر اسے ممدود پڑھا جائے تو باب مفاعلہ کا مصدر بھی ہوسکتا ہے اور اس کی طرف نسبت کے وقت زَنَوِیٌّ کہا جائے گا اور فُلَانٌ لِزِنْيَةٍ (بکسرہ زاوفتح آں) کے معنیٰ ہیں: فلاں حرام زادہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ﴾ (۲۴۔۳) زانی مرد سوائے زانیہ یا مشرکہ عورت کے کسی سے نکاح نہیں کرتا اور فاجرہ عورت سوائے فاجر کے کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرتی۔

﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ﴾ (۲۴۔۲) زانیہ عورت اور زانی مرد۔

اور اگر مہموز اللام سے ہو جیسے: زَنَأَ فِی الْجَبَلِ زَنَاءً وَزُنُوءً: تو اس کے معنیٰ پہاڑ پر چڑھنے کے ہوتے ہیں۔

اَلزَّنَاءُ حاقن: یعنی پیشاب روکنے والے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ ❷

(۱۶۸) لَا یُصَلِّیْ اَلرَّجُلُ وَهُوَ زَنَاءٌ: کہ آدمی کو چاہیے کہ حاقن ہونے کی صورت میں نماز نہ پڑھے۔

(ز ھ د)

اَلزَّهِیْدُ کے معنیٰ حقیر چیز کے ہیں اور کسی چیز سے بے رغبتی کرنے والے یا حقیری چیز پر راضی ہوجانے والے کو زَاهِدٌ فِی الشَّیْءِ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزَّاهِدِیْنَ﴾ (۱۲۔۲۰) اور اس کے بارہ میں وہ بے رغبت تھے۔

(ز ھ ق)

زَهَقَتْ نَفْسُهٗ کے معنیٰ ہیں کسی چیز پر رنج وغم سے اس کی جان نکل گئی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ﴾ (۹۔۵۵) اور ان کی جانیں (اس حال میں) نکلیں۔

(ز ی ت)

زَیْتٌ وَزَیْتُوْنَةٌ مثل شَجر وَشَجرة: ایک مشہور درخت کا نام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ﴾ (۲۴۔۱۳۵) زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے۔ جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔

اَلزَّیْتُ: زیتون کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْءُ﴾ (۲۴۔۳۵) قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی کرے۔

اور زَاتَ طَعَامَهٗ کے معنیٰ ہیں اس نے طعام میں زیتون

---

❶ قاله حسان بن ثابت يهجو ابا سفيان بن الحارث بن عبدالمطلب من شواهد الكشاف ۳۸ وديوانه ۸۹ والبحر (۸: ۳۰۵) والحصرى (۱: ۶۳) واللسان (زنم) وفيه وانت والمزروقى (۵۰۴).

❷ الحديث فى اللسان (زنا) الفائق (۱: ۲۷۰) وراجع لتاويله المرتضىٰ (۲: ۲۸۵ ـ ۲۸۶) وغريب ابى عبيد (۱: ۱۴۹).

کا تیل ڈالا جیسے سَمِنَہٗ اور دَھَنَہٗ بِہٖ کی طرح زَاتَ رَأْسَہٗ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا جس کے معنیٰ ہیں ۔ (اس نے سر پر تیل لگایا) اور اِزْدَاتَ بمعنیٰ اِدَّھَنَ کے ہیں۔

(ز و ج)

اَلزَّوْجُ: جن حیوانات میں نر اور مادہ پایا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نر اور مادہ دونوں میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیاء میں جفت کو زَوْجٌ کہا جاتا ہے جیسے موزے اور جوتے وغیرہ۔ پھر ہر اس چیز کو جو دوسری کی مماثل یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہو وہ اس کا زوج کہلاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى﴾ (۷۵۔۳۹) اور (آخر کار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرد اور عورت۔

﴿وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ (۲۔۳۵) (تو) اور تیری بی بی جنت میں رہو۔

اور بیوی کو زَوْجَةٌ (تاء کے ساتھ) کہنا عامی لغت ہے اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۰۸) فَبَكَا بَنَاتِي شَجْوَهُنَّ وَزَوْجَتِي

تو میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔

اور زَوْجٌ کی جمع اَزْوَاجٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ﴾ (۳۶۔۵۶) وہ اور ان کے جوڑے۔ اور آیت:

﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ﴾ (۳۷۔۲۲) جو لوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کرو۔

میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو ہر فعل میں ان کی اقتدا کیا کرتے تھے اور آیت کریمہ:

﴿اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا﴾ (۲۰۔۱۳۱) اس کی طرف جو مختلف قسم کے لوگوں کو ہم نے (دنیاوی سامان) دے رکھے ہیں۔

اشباہ واقران یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ مراد ہیں۔ اور آیت:

﴿سُبْحَانَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ﴾ (۳۶۔۳۶) پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم) کی چیزیں پیدا کیں۔ نیز فرمایا:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ (۵۱۔۴۹) اور تمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنائیں۔

میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ تمام چیزیں جوہر ہوں یا عرض، مادہ وصورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بتا رہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور اس کے لئے صانع (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز تنبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس (خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ اس میں ترکیب پائی جاتی ہے۔ بلکہ نفس ترکیب سے تو

---

❶ قاله عبدة بن الطبيب التميمي والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۷ في ۳۰ بيتاً ينصح فيها بنيه حين كبر وتمامه: والاقربون الى ثم تصدعوا والبيت في اضداد ابن الانباري ۳۷۴ والمخصص (۱۷ : ۳۴) واضداد ابي الطيب ۳۴۰.

کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جوہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے۔ لہٰذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت:
﴿اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی﴾ (۲۰۔۵۳) طرح طرح کی مختلف روئیدگیاں۔
میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنیٰ آیت:
﴿مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ﴾ (۳۰۔۱۰) ہر قسم کی عمدہ چیزیں (اگائیں)
اور آیت کریمہ: ﴿ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾ (۶۔۴۴) (نر اور مادہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔ میں مراد ہیں اور آیت:
﴿كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً﴾ (۵۶۔۷) میں اَزْوَاجٌ کے معنیٰ ہیں۔ قُرَنَاءُ یعنی امثال ونظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو۔ چنانچہ اس کے بعد اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ (۸۱۔۷) اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔
میں بعض نے زُوِّجَتْ کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ ہر پیرو کار کو اس کے پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت: ﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ﴾ (۳۷۔۲۲) میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ اس روز روحوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملا دیا جائے گا جیسا کہ آیت:
﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ (۸۹۔۲۷،۲۸) اے اطمینان پانے والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔
میں بعض نے رَبِّكِ کے معنیٰ صَاحِبِكِ یعنی بدن ہی کے کئے ہیں اور بعض کے نزدیک زُوِّجَتْ سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت کریمہ ہے:
﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ (۳۔۳۰) جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائے گا۔
میں بھی اس معنیٰ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:
﴿زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ﴾ (۷۲۔۲۰) اور ہم انہیں حورعین کا ساتھی بنا دیں گے۔
میں زَوَّجْنَا کے معنیٰ باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زَوَّجْنَا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازدواجی تعلقات نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بِحُوْرٍ کی بجائے زَوَّجْنَاهُمْ حُوْرًا کہتا۔ جیسا کہ زَوَّجْتُهُ امْرَأَةً کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کر دیا۔ [1]

---

[1] هذا ذهب اليه يونس وابو عبيدة من علماء العربية قال الواحدى والتنزيل يدل على ما قال يونس (راجع الفخر ۲۷۔۲۵۳) وفى البخارى: زوجناهم بحوارى انكحناهم قال فى الفتح (۶: ۳۵۵) وتعقب بان زوج لايتعدى بالباء ...... وفيه نظر لان صاحب المحكم حكاه لكن قال انه قليل والله اعلم.

(ز و د)

اَلـزَّادُ: موجودہ ضرورت سے زائد اندوختہ کو کہتے ہیں اور اَلتَّـزَوُّدُ (تفعل) کے معنیٰ توشہ لینا ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾ (۲۔۱۹۷) اور زادِ راہ ساتھ لے جاؤ بے شک بہترین توشہ سوال سے بچنا ہے۔

اور اَلْـمِـزْوَدُ اس توشہ دان کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جاتا ہے۔اور اَلْمَزَادَۃُ مشکیزہ جس میں پانی بطور زادِراہ رکھا جاتا ہے۔

(ز و ر)

الزَّوْرُ: سینہ کا بالائی حصہ اور زُرْتُ فُـلَانًا کے معنیٰ ہیں: میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا، یا اس کے سینہ کا قصد کیا (اس کی ملاقات کی) جیسا کہ وَجَّهْتُـهٗ کا محاورہ ہے یعنی اس کے سامنے اپنا چہرہ کیا یا اس کے چہرہ کا قصد کیا۔رَجُلٌ زَائِرٌ: ملاقاتی زَائِرٌ کی جمع زَوْرٌ آتی ہے جیسا کہ سَافِرٌ کی جمع سَفْرٌ مگر کبھی رَجُلٌ زَوْرٌ بھی آ جاتا ہے اس صورت میں یہ مصدر ہوتا ہے جیسا کہ ضَـعِیْفٌ کا لفظ ہے نیز اَلـزَّوَرُ: کے معنیٰ سینہ کے ایک طرف جھکا ہوتا کے ہیں اور جس کے سینہ میں ٹیڑھا پن ہو اسے اَلْاَ زْوَرُ کہتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿تَزَاوَرُ عَنْ کَهْفِهِمْ﴾ (۱۸۔۱۷) کے معنیٰ یہ ہیں کہ سورج ان کے غار سے ایک طرف ہٹ کر نکل جاتا ہے۔ یہاں ''تَـزَاوَرُ'' میں حرف زاء پر تشدید بھی پڑی جاتی ہے اور بغیر تشدید کے بھی اور بعض نے تَزْوَرُّ (افعلال) پڑھا ہے۔ ❶ مگر الحسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ قرأت یہاں موزوں نہیں ہے کیونکہ اَلْاِزْوِرَارُ کے معنیٰ ہیں: منقبض ہونا۔کہا جاتا ہے: تَـزَاوَرَعَـنْـهُ وَازْوَرَّعَنْهُ: اس نے اس سے پہلوتہی کی۔اس سے ایک جانب ہٹ گیا اور جس کنویں کی کھدائی میں ٹیڑھا پن ہوا سے بِـئْـرٌ زَوْرَاءُ کہا جاتا ہے اسی سے جھوٹ کو اَلـزُّوْرُ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی جہت راست سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ظُلْمًا وَّ زُوْرًا﴾ (۲۵۔۴) ظلم اور جھوٹ سے۔

﴿قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (۲۲۔۳۰) جھوٹی بات سے۔

﴿مِنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا﴾ (۵۸۔۲) اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔

﴿لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾ (۲۵۔۷۲) وہ جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔

اور شاعر کا قول ہے۔

(۲۰۹) وَجَاءُوْا بِـزُوْرَیْهِـمْ وَجِئْنَا بِالْاَصَمِ

وہ اپنے دو جھوٹے خدا لے کر آ گئے اور ہم اپنے بہادر سردار کو۔

میں زُوْرٌ کے معنیٰ بت کے ہیں۔❷ کیونکہ بت پرستی بھی

---

❶ بالتشدید قرائة الحرمین وابی عمرو بالتخفیف قرائة الکوفیین والاعمش وطلحة وابن ابی لیلیٰ واماتزورفهی قرائة قتادة وابن ابی اسحاق وابن عامر وفیه قرائة اخریٰ ای تزوارعلی مثال تحمار روهی قرائة ابی رجاء وایوب السختیانی وابن ابی عبلة وجابر وقرائة ابن مسعود راجع ابی حیان (٦: ١٠٧۔١٠٨).

❷ الرجز للاغلب العجلی قاله یوم الزویرین حرب کانت بین بکر وبین بنی تمیم ۔ والاصم لقب لعمربن قیس بن عامر الشیبانی رئیس بکر بن وائل یومئذ ویعنی بزوریهم بکرین مجللین قد قیدوهما وقالوهذان زوراناای الاهنا وبعده شیخ لناقد کان من عهد ارم ۔ وفی المطبوع بزور بینهم مصحف والزجر فی الامالی (٢: ١٨٠) والسمط (٨٠١) والعقد (٣: ٣٤٣) (٥: ٢٠٦) وایام العرب ٢١٤ والحماسة وابن الشجری ٣٧ واللسان والتاج (زور،اصم) وفیه عن ابی عبیدة والرجز لیحیٰ بن منصور راجع ابدال ابی الطیب (٢: ٩٩) وابدال یعقوب ٦٥ وشرح السبع لابن الانباری ٤٩٢ وفی روایته بشیخیهم وزاد الثالث : قد کدم الشیخ قفاه وکدم والاغلب العجلی (٣١ ھ) راجز جاهلی اسلامی احد المعمرین واستشهد فی وقعة نها وند انظر الموتلف ٢٣ والخزانة البغدادیة (١: ٣٣٣) والاعلام للزرکلی (١: ٣٣٩)١٢.

جھوٹ اور حق سے ہٹ جانے کا نام ہے۔

(ز و ل)

زَالَ الشَّیءُ یَزُوْلُ زَوَالًا: کسی چیز کا اپنا صحیح رخ چھوڑ کر ایک جانب مائل ہو جانا (اپنی جگہ سے ہٹ جانا) اور اَزَلْتُهٗ وَزَوَّلْتُهٗ کے معنیٰ ہیں: ایک جانب مائل کر دینا کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنْ تَزُوْلَا﴾ (۳۵۔۴۱) کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔

﴿وَلَئِنْ زَالَتَا﴾ (۳۵۔۴۱) اگر وہ ٹل جائیں۔

﴿لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ (۱۴۔۴۶) کہ اس سے پہاڑ ہی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔

(ز ی د)

اَلزِّيَادَةُ: اس اضافہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد بڑھایا جائے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: زِدْتُهٗ: میں نے اسے بڑھایا فَازْدَادَ: چنانچہ بڑھ گیا اور آیت:

﴿وَنَزْدَادُ کَیْلَ بَعِیْرٍ﴾ (۱۲۔۶۵) اور (اس کے حصہ کا) ایک بار شتر غلہ اور لیں گے۔

میں نَزْدَادُ فعل متعدی ہے حتیٰ کہ کَیْلَ بَعِیْرٍ کو اس کا مفعول کہا جائے گا، بلکہ یہ اِزْدَدْتُ فَضْلًا کی طرح ہے جس کے معنیٰ فضل میں زیادہ ہونے کے ہیں اور یہ باب سَفِهَ نَفْسَهٗ کے قبیل سے ہے۔

اور زیادہ (زیادتی) کبھی مذموم ہوتی ہے یعنی کسی چیز کا ضرورت سے زیادہ ہونا: مثلاً انگلیوں اور جانور کی ٹانگ میں زیادتی اور اسی طرح جگر میں جو گوشت کا زائد ٹکڑا پایا جاتا ہے وہ چونکہ کھایا نہیں جاتا اس لئے اسے زائد اور بے فائدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور کبھی زیادتی محمود ہوتی ہے جیسے فرمایا:

﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ﴾ (۱۰۔۲۶) جو نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک بدلہ ہے اور بڑھ کر کئی طرق سے مروی ہے۔ (۱۶۹) کہ یہاں زیادہ سے نظر الی وجه الله مراد ہے اور اس سے ان انعامات اور احوال کی طرف اشارہ ہے جن کا اس زندگی میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ [1] اور آیت:

﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ (۲۔۲۴۷) اور علم و جسم میں اسے زیادہ کشائش بخشی۔

میں زیادہ سے مراد یہ ہے کہ وہ علم و جسم میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿وَیَزِیْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا هُدًی﴾ (۱۹۔۷۶) اور اللہ ان کو روز بروز زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔ اور مذموم زیادتی کے متعلق فرمایا:

﴿مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ (۳۵۔۴۲) ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

﴿زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ﴾ (۱۶۔۸۸) اور ہم ان کے حق میں عذاب پر عذاب بڑھاتے جائیں گے۔

﴿فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ﴾ (۱۱۔۶۳) (الٹا) میرا اور نقصان ہی کر رہے ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ (۲۔۱۰) سو اللہ نے ان کے مرض میں اور اضافہ کر دیا۔

---

[1] قال ابن کثیر (۲: ۴۱۴) فی تفسیره وهذا هو المروی عن السلف والخلف وقد وردت فیه احادیث کثیرة عن السلف.

میں مرض کے بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی سرشت کچھ ایسی ہے کہ جب وہ کوئی برایا اچھا فعل سرانجام دیتا ہے تو جوں جوں اس فعل کو انجام دیتا رہتا ہے توں توں اس فعل کا ملکہ اس میں قوی ہوتا رہتا ہے اور آیت:

﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ (۵۰۔۳۰) کیا کچھ اور ہے؟

میں طلب زیادہ بھی مراد ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں دوزخ کے بھر جانے پر تنبیہ ہو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو دوزخ سے وعدہ کیا ہے کہ:

﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ والنَّاسِ﴾ (۱۱۔۱۱۹) کہ ہم (کیا) جنات اور (کیا) بنی آدم سب سے دوزخ بھر دیں گے۔

وہ پورا ہو کر رہے گا اور زِدْتُــــهٗ فعل متعدی ہے اور زَادَ بمعنیٰ اِزْدَادَ (لازم) بھی آیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَازْدَادُوْا تِسْعاً﴾ (۱۸۔۲۵) اور نو (برس اس کے اوپر) اور ہیں۔

﴿ثُــمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ (۳۔۹۰) پھر وہ کفر میں (اور) بڑھ گئے۔

﴿وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَاتَزْدَادُ﴾ (۱۳۔۸) اور نیز (ہر ماہ کے پیٹ کا گھٹنا اور بڑھنا) اور شَرٌّ، زَائِدٌ وَزَيْدٌ دونوں طرح کہا جاتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۱۰) وَاَنْتُــمُوْا مَعْشَرٌ زَيْدٌ عَلٰى مِائَةٍ

فَـــاَجْـمِـعُــوْا اَمْـرَكُـمْ كَيْدًا فَكِيْدُوْنِىْ

اور تم سو سے زیادہ آدمی ہو تو تم میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو کرو۔

(ز ی غ)

اَلــزَّيْـغُ: کے معنیٰ حالت استقامت سے ایک جانب مائل ہو جانا کے ہیں اور اَلتَّزَايُغُ کے معنیٰ تَمَايُلٌ یعنی بہت زیادہ مائل ہو جانا ایک دوسرے سے مائل ہونا۔ رَجُــلٌ زَائِـــغٌ: مائل ہونے والا۔ اس کی جمع زَاغَةٌ وَزَائِغُوْنَ آتی ہے۔ زَاغَـتِ الشَّمْسُ: سورج مائل بزوال ہو گیا۔ زَاغَ الْبَـصَرُ: نگاہ نے غلطی کی ایک طرف ہٹ گئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذْزَاغَـتِ الْاَبْصَارُ﴾ (۳۳۔۱۰) کے یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ خوف وہراس کی وجہ سے انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا اور یہ بھی کہ یہ آیت:

﴿يَـرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ (۳۔۱۳) کے ہم معنیٰ ہو یعنی نگاہیں صحیح طور پر کسی چیز کا ادارک نہیں کر سکیں گی۔ نیز فرمایا:

﴿مَـا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ (۵۳۔۱۷) نظر نہ تو حقیقت سے ایک طرف ہٹی اور نہ ہی اس نے حد سے تجاوز کیا۔

﴿مِـنْ بَـعْـدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ﴾ (۹۔۱۱۷) اس کے بعد کہ...... پھر جانے کو تھے۔

---

[1] قالہ ذوالاصبع العدوانی واسمہ حرثان بن محدث وفی الصحاح (زید) والامالی (۱:۲۵۳) طراً بدل کیداً وفی المفضلیات (۱: ۱۶۱) والسیوطی ۱۴۸ شتیٰ بدلہ ۔ والبیت فی اللسان (زید) والمحکم (عشر) ھو من قصیدۃ مفضلیۃ ۳۶ والبیت ۲۹ والقصیدۃ بتمامھافی الامالی (۱:۲۵۲۔۲۵۴) والکامل (۴۵۰) وفیہ کیدکم بدل امرکم وانظر للقصیدۃ منتھی الطلب (۱:۱۹۶۔۱۹۷) والاغانی (۳:۸۔۱۰) والشعراء (۶۳۶۔۶۳۸) والبیت فی الکتاب والحماسۃ لابن الشجری ۷۱ والخزانۃ (۳:۲۲۶) والعین (۳:۲۸۷) والمرتضیٰ ۲۵۲ ولترجمۃ الشاعر راجع الاشتقاق ۱۶۳ والمعمرین ۹ والشعراء (۲۸۸۔۲۹۰) والخزانۃ (۲۰۶۔۲۰۹)۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَلَمَّا زَاغُوا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ﴾ (۶۱۔۵) کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ از خود صحیح راہ سے ہٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو اسی طرف جھکا دیا۔

(ز ی ل)

زَالَـهٗ یَزِیْلُهٗ زَیْـلًا کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کرنا کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۱۱) "زَالَ زَوَالُهَـــا"

کہ اللہ تعالیٰ محبوبہ کے خیال کو میرے دل سے زائل کر دے۔

اور زَوَالٌ کے معنی التـصـرف یعنی پھرنا بھی آتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْـکَـتَ الـلّٰهُ نَامَتَهٗ کی طرح محاورہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو ختم کر دیا۔ اور یہی معنی زِیلَ زَوِیلُهٗ کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۱۲) اِذَمَا رَاَتْنَا زَالَ مِنْهَا زَوِیْلُهَا

جب وہ ہمیں دیکھتی ہے تو بدک کر بھاگ جاتی ہے اور جن کے نزدیک زال متعدی نہیں ہے وہ شعر اول میں زَوَالَهَا کو منسوب علی المصدر مانتے ہیں یعنی مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

تَزَیَّلُوْا: وہ متفرق ہو گئے قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوْ تَزَیَّلُوْا﴾ (۴۸۔۱۲۵) اگر وہ الگ الگ ہو جاتے۔

اور آیت: ﴿فَزَیَّلْنَا بَیْنَهُمْ﴾ (۱۰۔۱۲۸) پھر ہم ان میں جدائی ڈال دیں گے۔

میں اگر زِلْتُــــهٗ کو متعدی کہا جائے تو باب تفعیل تکثیر کے لئے ہوگا یعنی بالکل الگ الگ کر دینا جیسے: مِزْتُهٗ وَمَیَّزْتُهٗ

اور مَازَالَ اور لَا یَزَالُ ہمیشہ حرف نفی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور یہ کَانَ فعل ناقص کی طرح اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتے ہیں اور اصل میں یہ اجوف یائی ہیں کیونکہ عربی زبان میں زَیَّـلْـتُ (تفعیل) یاء کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور مَازَالَ کے معنی ہیں: مَـا بَرِحَ یعنی وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وَلَا یَـزَالُـوْنَ مُـخْتَـلِفِیْنَ﴾ (۱۱۔۱۱۸) وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

﴿لَا یَـزَالُ بُنْیَانُهُمْ﴾ (۹۔۱۱۰) وہ عمارت ہمیشہ (ان کے دلوں میں باعث اضطراب بنی) رہے گی۔

﴿وَلَا یَـزَالُ الَّـذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ (۲۲۔۵۵) کافر لوگ ہمیشہ...... رہیں گے۔

﴿مَـــازِلْتُـمْ فِـیْ شَكٍّ﴾ (۴۰۔۳۴) تم برابر شبہ میں رہے۔ اور محاورہ میں مَـازَالَ زَیْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کہنا صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ مَـاکَانَ زَیْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقاً کہا جاتا ہے کیونکہ زَالَ میں ثَبَتَ کی ضد ہونے کی وجہ سے نفی کے

---

❶ قطعة بن عجز البيت قاله الاعشىٰ وتكملته : هذا النهار يدالها من همها۔ مابالها بالليل زال زوالها ۔ والبيت من قصيدة يمدح فيها قيس بن معديكرب مطلعها : (حلت ، سمية غدوة اجمالها ۔غضبى عليك) فما تقول بدالها دويوانه (۱۵۰۔۱۵٤) واللسان (زول) مثل للعرب قديم واختلف فى اى زوالها منصوب اللام اومرفوعها ومن رواه برفع اللام (زط لها) قال فيه اقواء راجع اللسان (قوى) وفى ذيل الامالى ٥٧ يقال : زال زوالا وزيل زويله (دعاء) اى ذهب ومات .

❷ قاله ذوالرمة يصف بيضة وصدره وبيضاء لاتنحاش منا وامها ...... وفى رواية اللسان (منازول ، حوش ، زيل) منها بدل زال منها ومعناه ذعرت مناونفرت والبيت فى ديوانه ٥٥٤ والاضداد لابن الانبارى ٢٧٧ والفائق (١ : ١٥٦) والاضداد لابى الطيب (١ : ٣٢٤) والحيوان (٥ : ٥٧٤) والمعانى للقتبى ٢٥٥ والفائق (١ : ٨٢ ، ١٥٧) وفى كل المراجع زيل منها بدل زال منها ولكلا الروايتين محمل وان كان الاول اكثر ولم يروالثانى سوى المولف .

معنی پائے جاتے ہیں اور "مَاَ" و "لَا" بھی حروف نفی سے ہیں اور نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے لہٰذا مَازَالَ مثبت ہونے میں کَانَ کی طرح ہے تو جس طرح کَانَ زَیْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کی ترکیب صحیح نہیں ہے اسی طرح مَازَالَ زَیْدٌ اِلَّا مُنطَلقًا بھی صحیح نہیں ہوگا۔

(ز ی ن)

اَلزِّیْنَۃُ: زینت حقیقی وہ ہوتی ہے جو انسان کے لئے کسی حالت میں بھی معیوب نہ ہو یعنی نہ دنیا میں اور نہ ہی عقبیٰ میں اور وہ چیز جو ایک حیثیت سے موجب زینت نہ ہو وہ زینت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ اسے صرف ایک پہلو کے اعتبار سے زینت کہہ سکتے ہیں اور اجمالاً زینت کی تین اقسام ہیں۔

(۱) زینت نفسی جیسے علم اور اعتقادات حسنہ جو نفس انسانی کے لئے باعث آرائش بنتے ہیں۔

(۲) زینت بدنی جیسے قوت اور طول قامت وغیرہ چیزیں جو جسم کے لئے خوبصورتی کا سبب بنتی ہیں۔

(۳) زینت خارجیہ جیسے مال وجاہ وغیرہ جو انسان کے لئے باعث زینت بنتے ہیں۔لہٰذا آیت کریمہ:

﴿حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ (۴۹۔۷) خدا نے تمہیں ایمان کی محبت دے دی اور اس کو تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔

میں زینت سے نفسانی زینت مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ﴾ (۷۔۳۲) (ان سے پوچھو کہ) اللہ نے جو زینت (کے ساز و سامان پیدا کئے ہیں) ان کو کس نے حرام کیا ہے۔

کو بعض نے زینت خارجی پر محمول کیا ہے جیسا کہ مروی ہے [1] کہ کچھ لوگ برہنہ ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے تو اس آیت کے ذریعہ انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا۔اور بعض نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں زِیْنَۃَ اللّٰہِ سے وہ کرم مراد ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ﴾ (۴۹۔۱۳) اور تم میں بڑا شریف تو وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔ میں پایا جاتا ہے چنانچہ اسی معنیٰ میں شاعر نے کہا ہے۔[2]

(۱۲۳) وَزِیْنَۃُ الْمَرْءِ حُسْنُ الْاَدَبِ

کہ حسن ادب ہی انسان کے لئے باعث زینت بن سکتا ہے۔اور آیت:

﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ فِیْ زِیْنَتِہٖ﴾ (۲۸۔۷۹) الغرض (ایک دن قارون) اپنے تزک سے اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ میں مال وجاہ اور ساز و سامان وغیرہ دینوی زینت مراد ہے۔زَانَہٗ کَذَا وَزَیَّنَہٗ کے معنیٰ کسی چیز کے حسن کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ بالفعل آراستہ کرکے یا بذریعہ قول کے (جیسے کسی چیز کو لوگوں کی نظر میں بھلا کر کے دکھانا) اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر تزیین کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے مگر بعض آیات میں اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور بعض آیات مواقع میں بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں لایا گیا ہے چنانچہ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتے ہوئے ایمان کے متعلق فرمایا:

---

[1] راجع ابن کثیر .

[2] لم اجده .

﴿وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ (۴۹۔۷) اور اس ایمان کو تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔

اور کفار کے متعلق فرمایا:

﴿زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۲۷۔۴) ہم نے ان کے اعمال کو ان کے لئے عمدہ کر دکھایا۔

﴿زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ﴾ (۶۔۱۰۹) اور ہم نے ہر امت کے لئے ان کا عمل اچھا کر دکھایا۔

اور شیطان کی طرف نسبت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۸۔۴۸) اور شیطان نے ان لوگوں کے اعمال بد ان کو اچھے کر دکھائے۔

﴿لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ (۱۵۔۳۹) میں دنیا میں ساز و سامان زندگی کو انہیں عمدہ کر دکھاؤں گا۔

اور بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں فرمایا:

﴿زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ (۳۔۱۴) (طبعی طور پر) لوگوں کو (دنیا کی) مرغوب چیزوں کے ساتھ وابستگی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

﴿زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ﴾ (۹۔۳۷) ان کی بد کرداریاں ان کو بھلی کر کے دکھائی گئیں۔

﴿زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا﴾ (۲۔۲۱۲) جو لوگ دینِ حق کے منکر ہیں دنیا کی زندگی انہیں عمدہ کر دکھائی گئی۔

اور آیت:

﴿زَیَّنَ لِکَثِیْرٍ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ﴾ (۶۔۱۳۷) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے شریکوں نے ان کے بچوں کو جان سے مار ڈالنا اچھا کر دکھایا ہے۔ میں زُیِّنَ اصل میں زَیَّنَهٗ شُرَکَآؤُهُمْ ہے اور آیات:

﴿زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ﴾ (۶۷۔۵) ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے زینت دی۔

﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ بِزِیْنَةِ نِ الْکَوَاکِبِ﴾ (۳۷۔۶) اور ہم ہی نے آسمان دنیا (ایک) زینت یعنی ستاروں سے آراستہ کیا۔

﴿وَزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ﴾ (۱۵۔۱۶) اور ہم نے دیکھنے والوں کے لئے اسے خوبصورت بنایا۔

میں اس زینت کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق حاسۂ بصر سے ہے اور جسے عوام و خواص محسوس کرتے ہیں نیز اس میں زینت معنوی یعنی ستاروں کی رفتار ان کے احکام کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے جس کی معرفت خواص کو حاصل ہوسکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو زینت بخشنا تکوین وابداع سے ہوتا ہے یعنی ان کو آراستہ حالت میں پیدا کرنا اور لوگوں کا کسی چیز کو زینت بخشنا یا تو ملمع سازی سے ہوتا ہے اور یا بذریعہ قول کے یعنی کسی چیز کی تعریف کرنا اور اسے خوشنما صورت میں پیش کرنا۔

❀❀❀

کِتَابُ السِّین

(س ء ل)

اَلسُّؤْل: دراصل اس حاجت کو کہتے ہیں جس پر نفس حریص ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يَا مُوْسٰى﴾ (۲۰۔۳۶) موسیٰ تمہاری دعا قبول کر لی گئی۔اور یہ سُؤْل وہی ہے جس کا تذکرہ آیت:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ (الآیۃ) میں ہے السُّؤْل اور اَلْاُمْنِيَّة کے قریب قریب ایک ہی معنیٰ ہیں لیکن امنیة کا لفظ اس خواہش پر بولا جاتا ہے جو تا حال انسان کے دل میں ہو اور اس کا اظہار نہ کیا ہو۔لیکن سُؤْل اس حالت کو کہتے ہیں جو طلب بھی کی جا چکی ہو تو گویا سُؤْل کا درجہ امنیہ کے بعد کا ہے۔

(س ب ب)

اَلسَّبَبُ: اصل میں اس رسی کو کہتے ہیں جس سے درخت خرما وغیرہ پر چڑھا (اور اس سے اترا) جاتا ہے اس کی جمع اسباب ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ﴾ (۳۸۔۱۰) تو ان کو چاہیے کہ سیڑھیاں لگا کر (آسمان پر) چڑھیں۔

اور یہ معنوی لحاظ سے آیت:

﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ﴾ (۵۲۔۳۸) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر چڑھ کر (آسمان سے باتیں) سن کر آتے ہیں۔کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔پھر اسی مناسبت سے ہر اس شے کو سَبَبٌ کہا جاتا ہے جو دوسری شے تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہو۔چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وَاٰتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا فَاَتْبَعَ سَبَبًا﴾ (۱۸۔۸۴) اور اسے ہر قسم کے ذرائع بخشے سو وہ ایک راہ پر چلا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر چیز کی معرفت اور سامان وذرائع عطا کئے تھے جس کے ذریعہ وہ اپنے مقصود تک پہنچ سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک ذریعہ اختیار کیا اور آیت کریمہ:

﴿لَعَلِّيْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ﴾ (۴۰۔۳۶،۳۷) تاکہ جو آسمان تک پہنچنے کے ذرائع ہیں ہم ان تک جا پہنچیں۔

میں بھی اسباب سے مراد ذرائع ہی ہیں۔یعنی تاکہ ہم ان اسباب وذرائع کا پتہ لگائیں جو آسمان میں پائے جاتے ہیں اور ان سے موسیٰ (علیہ السلام) کے مزعومہ خدا کے متعلق معلومات حاصل کریں اور عمامہ، دوپٹہ اور ہر لمبے کپڑے کو طول میں رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر بھی سَبَبٌ کہا جاتا ہے۔اسی جہت سے شاہراہ کو بھی سَبَبٌ کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ شاہراہ کو بھی خَيْطٌ (دھاگہ) اور کبھی محدود کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

اَلسَّبُّ: (مصدر ن) کے معنیٰ مغلظات اور فحش گالی دینا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۶۔۱۰۹) تو جو لوگ خدا کے سوا (دوسرے) معبودوں کو حاجت روائی کے لئے بلایا (یعنی ان کی پرستش کیا کرتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ بھی ازراہ نادانی ناحق، خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

ان کے اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ وہ صریح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیں گے۔ کیونکہ اس طرح تو کوئی مشرک بھی نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ جوش میں آ کر شان الٰہی میں گستاخی کریں گے۔ اور ایسے الفاظ استعمال کریں گے جو اس کی ذات کے شایان شان نہیں، جیسا کہ عام طور پر مجادلہ کے وقت ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔[1]

فَمَا كَانَ ذَنْبُ بَنِي مَالِكٍ
بِأَنْ سُبَّ مِنْهُمْ غُلَامٌ فَسَبَّ
بِأَبْيَضَ ذِي شَطْبٍ قَاطِعٍ
يَقُدُّ الْعِظَامَ وَيَبْرِي الْقَصَبَ

بنی مالک کا صرف اتنا گناہ ہے کہ ان میں سے ایک لڑکے کو بخل پر عار دلائی گئی اور اس نے عار کے جواب میں سفید دھاری دار قاطع تلوار سے اپنی موٹی اونٹنیوں کو ذبح کر ڈالا جو ہڈیوں کو کاٹ ڈالتی ہو اور قصب یعنی بانس کو تراش دیتی ہو۔ ان اشعار میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جس کو دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔[2]

نَشْتِمُ بِالْأَفْعَالِ لَا بِالتَّكَلُّمِ

کہ ہم زبان کی بجائے افعال سے گالی دیتے ہیں۔ اور سِبٌّ (فِعلٌ) بمعنیٰ دشنام دہندہ کے لئے آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔[3]

لَا تُسُبَّنَنِي فَلَسْتَ بِسِبِّي
اِنَّ سِبِّي مِنَ الرِّجَالِ الْكَرِيْمِ

مجھے گالی نہ دو تم مجھے گالی دینے کے لائق نہیں ہو کیونکہ نہایت شریف درجہ کا آدمی ہی مجھے گالی دے سکتا ہے۔

اَلسُّبَّةُ: ہر وہ چیز جو عار وننگ کی موجب ہو اور کنایہ کے طور پر دبر کو بھی سُبَّةٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسے سوْءَةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اَلسَّبَّابَةُ انگشت شہادت یعنی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کیونکہ گالی دیتے وقت اس کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے جیسا کہ اس انگلی کو مُسَبِّحَةٌ (انگشت شہادت) کہا جاتا ہے کیونکہ تسبیح کے وقت اشارہ کے لئے اسے اوپر اٹھایا جاتا ہے۔

---

[1] قاله زوالحزق الطهوری واسمه قرط يتعصب لغالب بن صعصعة ابی الفرزدق وكان بينه وبين سحيم بن دشيل الرحاحی معاقرة يوم صوءر (موضع قريب من الكوفة) واختلف الروايات فی القصيدة راجع الخبر والاختلاف فی ذيل الامالی ۵۲۔۵۴ والسمط ۷۴۶۔۷۴۷ والابيات مقيلة القافيه فی اللسان (سب) والنقائض ۱۰۷۰ والامالی (۲: ۱۱۷) والموتلف اللآمدی ۱۷۲ وايام العرب ۴۰۱۔۴۰۶ وفی روايةبنی عامر بدل بنی مالك وهو وهم نبه عليه ابن دريد والازهری وردالبكری فی التبنيه راجع ايضاً المعانی للقتبی ۱۰۸۷ والمحكم (عقر) والثانی من الابيات: عراقيت كوم طوال الذریٰ۔ تخربوا ئكها للركب ۱۲.

[2] قاله معبدبن علقمة يخاطب زهيراً واوله: تجهل ايدينا ويحلم رأينا۔ والبيت من كلمة فی الحماسة رواه التبريزی (۲: ۹۱) وفی السمط (۱: ۳۴۳) فی ثلاثة والتنبيه للبكری ۴۵ وفی العيون (۱: ۲۸۶) والشطر منسوب لاياس بن قتادة وعجزه فيه: تعاقب ايدينا ويحلم رأينا والبيت فی المضنون ۸۳ والصناعتين ۴۹.

[3] البيت فی اصلاح يعقوب ۱۴ (دار المعارف ۱۳۷۵ھ) ولم ينسبه التبريزی فی تهذيبه ۲۱ وهو لعبدالرحمان بن حسان يهجو مسكينا الداری قال والسب الذی يسابك ۱۲.

(س ب ت)

اَلسَّبْتُ کے اصل معنیٰ قطع کرنے کے ہیں اور اسی سے کہا جاتا ہے۔سَبَتَ السَیرَ اس نے تسمہ کو قطع کیا سَبَتَ شعْرَہٗ: اس نے اپنے بال مونڈے سَبَتَ اَنْفَہٗ اس کی ناک کاٹ ڈالی۔

بعض نے کہا ہے کہ ہفتہ کے دن کو بھی یَومَ السَّبْتِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق اتوار کے دن شروع کی تھی اور چھ دن میں تخلیق عالم فرما کر سنیچر کے دن اسے ختم کردیا تھا اسی سے سَبَتَ فُلَانٌ ہے۔جس کے معنیٰ ہیں: وہ ہفتہ کے دن میں داخل ہوا۔ اور آیت کریمہ:

﴿یَومَ سَبْتِھِمْ شُرَّعًا﴾ (۸۔۱۶۳) سنیچر کے دن (مچھلیاں) سینہ سپر ہوکر ان کے سامنے آجاتیں۔

میں بعض نے یَوْمَ سَبْتِھِمْ سے ان کے کاروبار کو چھوڑنے کا دن مراد لیا ہے اس اعتبار سے یَومَ لَا یَسْبِتُونَ کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جس روز وہ کاروبار نہ چھوڑتے اور بعض نے اس کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ جس روز سنیچر نہ ہوتا ان ہر دو معنیٰ کا مآل ایک ہی ہے اور آیت:

﴿اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ﴾ (۱۶۔۱۲۴) میں سبت سے مراد سنیچر کے دن ترک عمل کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سنیچر کے روز کام کاج چھوڑنے کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا......اور آیت:

﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا﴾ (۷۸۔۹) اور نیند کو (موجب) راحت بنایا۔میں سبات کے معنیٰ ہیں، حرکت وعمل کو چھوڑ کر آرام کرنا اور یہ رات کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:

﴿لِتَسْکُنُوا فِیہِ﴾ (۲۸۔۱۷۳) تا کہ تم رات میں راحت کرو میں مذکور ہے یعنی رات کو راحت وسکون کے لیے بنایا ہے۔

(س ب ح)

اَلسَّبْحُ: اس کے اصل معنیٰ پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں۔سَبَحَ (ف) سَبْحًا وَسَبَاحَۃً: وہ تیز رفتاری سے چلا پھر استعارہ کے طور پر یہ لفظ فلک میں نجوم کی گردش اور تیز رفتاری کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿کُلٌّ فِی فَلَكٍ یَّسْبَحُونَ﴾ (۲۱۔۳۳) سب (اپنے اپنے) فلک یعنی دوائر میں تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اور گھوڑے کی تیز رفتاری پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا﴾ (۷۹۔۳) اور فرشتوں کی (قسم جو آسمانوں اور زمین کے درمیان) تیرتے پھرتے ہیں۔اور کسی کام کو سرعت کے ساتھ کر گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿اِنَّ لَكَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیلًا﴾ (۷۳۔۷) دن کے وقت تو تم بہت مشغول کار رہتے ہو۔

اَلتَّسْبِیحُ کے معنیٰ تنزیہ الٰہی بیان کرنے کے ہیں اصل میں اس کے معنیٰ عبادت الٰہی میں تیزی کرنا کے ہیں...... پھر اس کا استعمال ہر فعل خیر پر ہونے لگا ہے جیسا کہ اِبْعَاد کا لفظ شر پر بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے: اَبْعَدَہُ اللّٰہُ خدا اسے ہلاک کردے۔پس تسبیح کا لفظ قولی، فعلی اور قلبی ہر قسم کی عبادت پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَولَآ اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِینَ﴾ (۳۷۔۱۴۳) تو

اگر یونس علیہ السلام اس وقت (خدا کی تسبیح وتقدیس) کرنے والوں میں نہ ہوتے۔

یہاں بعض نے مُسَبِّحِیْنَ کے معنیٰ مُصَلِّیْنَ کئے ہیں لیکن انسب یہ ہے کہ اسے تینوں قسم کی عبادت پر محمول کیا جائے۔

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ﴾ (۲۔۳۰) اور صبح وشام اسی کی تسبیح وتقدیس کرتے رہنا۔

﴿فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ (۵۰۔۴۰) (اور رات میں بھی) اس کی تسبیح وتقدیس کرو اور نمازوں کے بعد بھی۔

﴿لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ﴾ (۶۸۔۲۸) یعنی اس کی عبادت اور شکرگزاری کیوں نہیں کرتے ہو۔

بعض نے اسے استثنا کے معنیٰ پر محمول کیا ہے یعنی تم ان شاء اللہ کیوں نہیں کہتے اور اس کی دلیل آیت کریمہ: ﴿اِذْ اَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ﴾ (۶۸۔۱۷) ہے یعنی انہوں نے قسمیں کھائیں کہ صبح ہوتے ہی پھل کاٹ لیں گے اور استثناء نہ کیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ (۱۷۔۴۴) ساتوں آسمانوں اور زمین اور جو (فرشتے اور آدمی) آسمان وزمین میں ہیں (سب) اس کی تسبیح (وتقدیس) کرتے ہیں اور جتنی چیزیں ہیں سب اس کی حمد وثناء کے ساتھ اس کی تسبیح وتقدیس کررہی ہیں مگر تم لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

میں تسبیح کے وہی معنیٰ مراد ہیں جو کہ آیت کریمہ:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا﴾ (۱۳۔۱۶) اور جس قدر مخلوق آسمانوں وزمین میں ہے (سب) چاروناچار اللہ ہی کے آگے سربسجود ہے۔

اور آیت:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (۱۶۔۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں (سب) اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں۔

میں سجدہ کے ہیں یعنی تسبیح کے حقیقی معنیٰ مراد ہیں جیسا کہ سجدہ کے ہیں مگر ان کا ادراک ہماری سمجھ سے بالاتر ہے جیسا کہ آیت:

﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ کے استدراک اور آسمان وزمین کے ذکر کے بعد وَمَنْ فِيْهِنَّ کے عطف سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے اس کی تقدیر یہ بیان کی ہے۔

يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَيَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي الْاَرْضِ مگر یہ صحیح نہیں ہے اولاً تو اس لئے کہ "مَنْ" یعنی ذوالعقول کی تسبیح کو ہم سمجھتے ہیں اور قرآن پاک نے وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ کہا ہے اور ثانیاً اس لئے کہ بعد میں وَمَنْ فِيْهِنَّ عطف کے ساتھ مذکور ہے پھر اگر شروع آیت میں بھی مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ کی تقدیر کو مان لیا جائے (جیسا کہ بعض نے کہا ہے) تو اس عطف کا بے معنی ہونا لازم آتا ہے (لہٰذا صحیح یہ ہے کہ سب اشیاء (بشمول آسمان وزمین) کی تسبیح اور سجود کو حقیقی معنیٰ پر محمول کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں اور اس کے سامنے سربسجود رہتی ہیں لیکن بعض تسخیری طور پر اور بعض اپنے اختیار اور ارادہ سے اور یہ بات تو بلا

اختلاف بھی مانتے ہیں کہ آسمان وزمین اور دواب، جانوروں کی تسبیح تسخیری ہے یعنی ان کے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ پر دال ہیں۔ البتہ اختلاف اس میں ہے کہ آیا آسمان وزمین تسبیح بالاختیار کرتے ہیں؟ تو آیت اسی معنیٰ کی مقتضی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

سُبْحَانٌ یہ اصل میں غُفْرانٌ کی طرح مصدر ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۷) سوجس وقت تم لوگوں کو شام ہو اللہ کی تسبیح بیان کرو۔

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا﴾ تو پاک ہے ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (سریع)

(۲۱۸) سُبْحَانَ مِنْ عَلْقَمَةَ الْفَاخِرِ

سبحان اللہ! علقمہ بھی فخر کرتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سُبْحَانَ عَلْقَمَةَ ہے اس میں مِنْ معنیٰ اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے زائد ہے اور علقمہ کی طرف سبحان کی اضافت بطور تہکم ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں "سُبْحَانَ اللّٰهِ مِنْ اَجْلِ عَلْقَمَةَ ہے اس صورت میں اس کا مضاف الیہ محذوف ہوگا۔

اَلسُّبُّوحُ الْقُدُّوْسُ: یہ اسماء حسنیٰ سے ہے اور عربی زبان میں فُعُّولٌ کے وزن پر صرف یہ دو کلمے ہی آتے ہیں اور ان کو فاء کلمہ کی فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے کَلُّوبٌ وَسَمُّودٌ۔

اَلسُّبْحَةُ: بمعنیٰ تسبیح ہے اور اُن منکوں کو بھی سُبْحَةٌ کہا جاتا ہے جن پر تسبیح پڑھی جاتی ہے۔

(س ب خ)

اَلسَّبْخُ: کے معنیٰ وسعت کے ہیں اور آیت:

﴿اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا﴾ (۷۳۔۷) کہ تیرے لئے دن میں بڑا مشغلہ ہے۔ میں ایک قرأت سَبْخاً بھی ہے۔

سَبَخَ اللّٰهُ عَنْهُ الْحُمّٰى: اللہ تعالیٰ نے اس کا بخار ہلکا کر دیا۔

اَلسَّبِيْخُ: پرند کے پر اور دھنکی ہوئی روئی وغیرہ کو کہا جاتا ہے جن میں اکتناز اور ثقل نہیں ہوتا۔

(س ب ط)

اَلسَّبْطُ: اس کا اصل معنیٰ سہولت کے ساتھ کسی چیز کا منبسط ہونا ہیں اور سَبَطَ (س) سُبُوطًا وَسَبَاطَةً وَسَبَاطًا کے معنیٰ بالوں کے سیدھا اور دراز ہونے کے ہیں اور سیدھے بالوں کو جن میں گھنگٹ نہ ہوں سَبِطٌ یا سَبْطٌ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح خوش قامت عورت کو بھی سَبِطَةٌ کہا جاتا ہے اور دراز کفِ دست آدمی کو سَبْطُ الْكَفَّيْنِ کہتے ہیں اور یہ سخاوت سے کنایہ ہوتا ہے۔ اَلسِّبْطُ اس کے معنیٰ اولاد کی اولاد یعنی پوتے اور نواسے کے ہیں گویا اس میں فروع کے امتداد کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] قاله الاعشیٰ فی هجوعلقمة وصدره: اقول لماجاء فی فخره ـانظر الخبر وترجمة الشاعر فی الاغانی (۱۵و۵۵) والخزانة (۲: ۴۲ـ ۴۴) والبیت فی دیوانه ۱۰۶ والجمهرة (۱: ۲۲۹) والشنتمری (۱: ۱۶۳) ومجازالقراٰن رقم ۳۶ واللسان والتاج والاساس والمحکم (سبح) والسمط (۱: ۵۵۵) والقرطبی (۱: ۲۷۶) والطبری (۱: ۲۱۱) والصحاح (سبح) وغریب القراٰن للقتبی ۸ وعلقمة هو علقمة ابن علاثة صحابی قدم علی رسول الله صلی الله علیه وسلم وهوشیخ فاسلم وبایع وروی حدیثاً واحداً واستعمله عمربن الخطاب علی حوران فمات بها والبیت فی مجالس ثعلب (۱: ۲۱۶) وامالی الشجری (۲: ۲۵۰) وابن خالویه (۵۴.)

﴿وَيَعْقُوبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ (۲۔۱۴۰) اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد۔
یہاں اسباط سے مراد قبائل ہیں۔ ہر قبیلہ ایک شخص کی اولاد سے تھا۔ جیسے فرمایا:
﴿اَسْبَاطًا اُمَمًا﴾ (۷۔۱۶۰) (الگ الگ) بارہ قبیلے بنا دیئے۔ اَلسَّابَاطُ: وہ مسقّف راستہ جو دو مکانوں کے درمیان ہو۔ اور اَخَذَتْ فُلَانًا سَبَاط کے معنٰی ہیں فلاں کو بخار چڑھ گیا مثل مشہور ہے۔ ❶ (مثل)
اَلسُّبَاطَةُ خَيْرٌ مِنْ قُمَامَةٍ کہ خاک روبہ کوڑے سے بہتر ہے۔
سَبَطَتِ النَّاقَةُ وَلَدَهَا: اونٹنی نے ناتمام بچہ گرادیا۔

(س ب ع)

اَلسَّبْعُ اصل میں "سَبْعٌ" سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ (۲۔۲۹) سات آسمان، ﴿سَبْعًا شِدَادًا﴾ (۷۸۔۱۲) سات مضبوط (آسمان بنائے)۔ ﴿سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ﴾ (۱۲۔۴۶) سات بالیں۔ ﴿سَبْعَ لَيَالٍ﴾ (۶۹۔۴۶) سات راتیں۔ ﴿سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸۔۲۲) (وہ) سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔
﴿سَبْعُونَ ذِرَاعًا﴾ (۶۹۔۳۲) ستر گز۔ ﴿سَبْعِيْنَ مَرَّةً﴾ (۹۔۸۰) ستر مرتبہ۔ اور آیت:
﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ (۱۵۔۸۷) (الحمد کی) سات آیتیں (عطا فرمائیں) جو نماز کی ہر رکعت میں مکرر پڑھی جاتی ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ سورۃ الحمد مراد ہے کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَلسَّبْعُ الطِّوَالُ یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک ساتھ لمبی سورتیں مراد ہیں۔ اور قرآن پاک کی تمام سورتوں کو بھی مثانی کہا گیا ہے کیونکہ ان میں واقعات تکرار کے ساتھ مذکور ہیں اور منجملہ ان کے یہ سات سورتیں ہیں۔
اَلسَّبِيْعُ وَالسِّبْعُ: اونٹوں کو ساتویں روز پانی پر وارد کرنا۔ اَلْاُسْبُوْعُ: ایک ہفتہ یعنی سات دن جمع اَسَابِيعُ طُفْتُ بِالْبَيْتِ اُسْبُوْعًا میں نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے۔ سَبَعْتُ الْقَوْمَ: میں ان کا ساتواں بن گیا۔ اَخَذْتُ سُبْعَ اَمْوَالِهِمْ: میں نے ان کے اموال سے ساتواں حصہ وصول کیا۔
اَلسَّبُعُ: درندہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے جیسا کہ سات کا عدد "عدد تام" ہوتا ہے هُذَلِیْ نے کہا ہے۔ ❷

(۲۱۹) ......كانه عَبْدٌ لِاٰلِ اَبِیْ رَبِيعَة مُسْبَعٌ

گویا وہ آل ابی ربیعہ کا غلام ہے جس کی بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لئے درندے آگئے ہوں۔
بعض نے کہا ہے کہ مُسْبَعٌ کا معنٰی مُهْمَلٌ مَعَ السِّبَاعِ کئے ہیں۔ یعنی وہ جو درندوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے اور بعض نے مُسْبَعٌ (بفتح باء) پڑھا ہے۔ اور یہ دَعِیٌّ سے

❶ المثل فی جل المعاجم ۱۲.
❷ قالہ ابو ذؤیب الهذلی یصف حمارا لوحشی واوله :صحب الشوائب لایزال ...... والبیت من کلمة مفضلیة فی ٦٥ بیتاً وفی الجمهرة (۲:۲٤۲) اوردمنها المولف (۳٦٦، ۳۷٥، ۳٤۷) راجع نظام الغریب للربعی ۱۳۳ واصلاح یعقوب ۲٤۷ والمحکم (سبع۔ ربع) واللسان (شرب) سبع والاغانی (۱:۲۹) والمزهر (۱:۳٥) والصاحبی ٦۹ قال یعقوب فی اصلاحه اسبعت عبدی اذااهملته فهو مسبع وفی الصاحبی لفظة مسبع مافسر حتیٰ الان تفسیراً شافیا.

کنایہ ہے یعنی وہ شخص جس کا نسب معلوم نہ ہو۔

سَبَعَ فُلَانًا کسی کی غیبت کرنا اور درندہ کی طرح اس کا گوشت کھانا۔ اَلْمُسْبِعُ: درندوں کی سرزمین۔

(س ب غ)

دِرعٌ سَابِغٌ پوری اور وسیع زرہ کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿اَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ﴾ (۳۴۔۱۱) کہ کشادہ (اور پوری) پوری زرہیں بناؤ۔

اسی سے استعارہ کے طور پر اِسْبَاغُ الْوُضُوءِ (پورا وضو کرنا) اور اِسْبَاغُ النِّعَمِ: پورا پورا انعام کرنا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ﴾ (۳۱۔۲۰) اور تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کیا۔

(س ب ق)

اَلسَّبْقُ: اس کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھ جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا﴾ (۷۹۔۴) پھر وہ (حکم الٰہی) کو سننے کے لئے لپکے ہیں۔

اَلْاِسْتِبَاقُ کے معنی تسابق یعنی ایک دوسرے سے سبقت کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ﴾ (۱۲۔۱۷) ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرنے لگ گئے۔

﴿وَاسْتَبَقَا الْبَابَ﴾ (۱۲۔۲۵) اور دونوں دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچے۔

مجازاً ہر شے میں آگے بڑھ جانے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿مَا سَبَقُوْنَا اِلَيْهِ﴾ (۴۶۔۱۱) تو یہ ہم سے اس کی طرف سبقت نہ کر جاتے۔

﴿وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۲۰۔۱۲۹) اگر تمہارے پروردگار نے پہلے سے ایک بات نہ فرمائی ہوتی۔

پھر استعارہ کے طور پر احراز فضیلت کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿اَلسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۰) اور آگے نکل جانے والے ہی اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔

تو سَابِقُوْنَ سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اعمال صالحہ کے ذریعہ ثواب الٰہی اور جنت کی طرف پیش پیش جانے والے ہیں۔جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا:

﴿يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ﴾ (۲۳۔۶۱) یہی لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور ان کے لئے لپکتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ﴾ (۵۶۔۶۰) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ہماری گرفت اور قبضہ سے باہر نہیں نکل سکتے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا﴾ (۸۔۵۹) کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے قابو سے نکل گئے ہیں۔

﴿وَمَا كَانُوْا سَابِقِيْنَ﴾ (۲۹۔۳۹) اور نہ وہ (ہم سے کہیں) بھاگ کر جا سکے۔

(س ب ل)

اَلسَّبِيْلُ: اصل میں اس رستہ کو کہتے ہیں جس میں سہولت سے چلا جا سکے، اس کی جمع سُبُلٌ آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنْهَارًا وَّسُبُلًا﴾ (١٦۔١٥) دریا اور راستے۔
﴿وَجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا﴾ (٧١۔٣٠) اور تمہارے لئے اس میں راستے بنادیئے۔
اور آیت:
﴿وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ﴾ (٤٣۔٣٧) اور وہ صحیح راہ سے روکتے ہیں۔
میں "السَّبِيْل" سے مراد طریق حق ہے کیونکہ اسم جنس جب مطلق استعمال ہو تو حق (یعنی فرد کامل) ہی مراد ہوتا ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا:
﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ (٨٠۔٢٠) پھر (اس پر) راہ آسان کردی۔
اور راہ گیر کو سَابِلٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَابِلَةٌ ہے اور جس راہ پر بہت زیادہ آمد ورفت ہو اسے سَبِيلٌ سَابِلٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ شِعْرٌ شَاعِرٌ کا محاورہ ہے۔ ❶
اِبْنُ السَّبِيْلِ اس مسافر کو کہتے ہیں جو اپنی منزل مقصود سے دور ہو اور سبیل کی طرف اس کی نسبت بوجہ ممارست کے ہے۔ پھر سبیل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز تک رسائی کا ذریعہ ہو عام اس سے کہ وہ چیز خیر ہو یا شر چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ (١٦۔١٢٥) اللہ کے راستہ کی طرف دعوت دو۔
﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ﴾ (١٢۔١٠٨) (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔
ان دونوں آیتوں میں سبیل سے مراد راہ حق ہی ہے لیکن پہلی آیت میں مبلغ (پہنچانے والے) کی طرف نسبت ہے اور دوسری آیت میں ان کو لے کر چلنے والے یعنی پیغمبر کی طرف۔
﴿قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (٤٧۔٤) جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو گئے۔
﴿اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ﴾ (٤٠۔٢٩) اور وہی راہ دکھاتا ہوں جو سیدھی ہے۔
﴿وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ (٦۔٥٥) تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔
﴿فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ﴾ (١٦۔٦٩) (مزے سے) اپنے پروردگار (کے تعلیم کئے ہوئے آسان) راستوں پر چل۔
اور سبیل کے معنی شاہراہ بھی آتے ہیں۔
جیسے فرمایا:
﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ﴾ (١٢۔١٠٨) (اے پیغمبر) کہہ دو یہی میرا راستہ ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿سُبُلَ السَّلَامِ﴾ (٥۔١٦) سلامتی کے راستوں (کی طرف) میں سبل السلام سے جنت کے راستے مراد ہیں۔
﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ﴾ (٩۔٩١) محسنین پر کوئی الزام نہیں۔
﴿فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيْلٍ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ﴾ (٤١۔٤١، ٤٢) تو یہ لوگ (معذور ہیں) ان پر کوئی الزام نہیں۔ الزام تو ان پر ہی ہے۔
﴿اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾ (١٧۔٤٢) مالک عرش (یعنی خدا تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہوتا۔)
عام محاورہ ہے:

---

❶ ولمثل هذا الكلام يقال له مجاز في الاسناد ١٢.

اَسْبَلَ السِّتْرَ وَ الذَّیْلَ: اس نے پردہ دامن لٹکا دیا۔
فَرَسٌ مُسْبِلُ الذَّنَبِ: دراز دم گھوڑا۔ سَبَلَ الْمَطَرُ وَاَسْبَلَ: بارش برسنا اور وہ بارش جو آسمان سے بہہ کر زمین کی طرف آرہی ہو اور ہنوز زمین پر نہ گری ہوا سے سَبَلٌ کہا جاتا ہے اور سَبَلَةٌ خاص کر مونچھوں کے بالوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ (بھی بڑھ کر) نیچے کو لٹکے پڑتے ہیں۔
اَلسُّنْبُلَةُ: بال۔ اس کی جمع سَنَابِل آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ﴾ (۱۲۔۴۶) سات سبز بالیں۔
اَسْبَلَ الزَّرْعُ: کھیتی میں بالیں پڑ گئیں (ماخذ کے ساتھ متصف ہونا کے معنیٰ پائے جاتے ہیں) جیسے اَحْصَدَ الزَّرْعُ واجنی النخل کا محاورہ ہے۔
اَلْمُسْبِلُ: جوئے کے تیروں سے پانچواں تیر۔

(س ب ی)

سَبَأٌ: ایک شہر کا نام ہے جو پرانے زمانے میں (سیل العرم سے) تباہ ہو گیا تھا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِيْنٍ﴾ (۲۷۔۲۲) اور میں سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔ اور اسی سے ایک ضرب المثل ہے۔
ذَهَبُوْا اَيَادِيْ سَبَا: یعنی وہ تتر بتر ہو گئے اور اہل سبا کی طرح ان کا نام ونشان مٹ گیا۔
سَبَأْتُ الْخَمْرَ: میں نے پینے کے لئے شراب خریدی۔
اَلسَّابِيَاءُ: مشیمہ یعنی وہ جھلی جس میں بچہ ہوتا ہے۔

(س ت ت)

سِتَّةٌ: چھ کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ (۷:۵۴) چھ روز میں۔ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (۵۸:۴) ساٹھ مساکین کو۔
اور سِتٌّ اصل میں سِدْسٌ ہے جسے اس کی بحث میں ذکر کیا جائے گا۔ (انشاء اللہ)

(س ت ر)

اَلسِّتْرُ: (مصدر ن) اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کو چھپا دینے کے ہیں سِتْرٌ وَسُتْرَةٌ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز چھپائی جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِنْ دُوْنِهَا سِتْرًا﴾ (۱۸۔۹۰) جن کے لئے ہم نے اس (سورج) سے بچنے کے لئے کوئی اوٹ نہیں بنائی۔
﴿حِجَابًا مَسْتُوْرًا﴾ (۱۷۔۴۵) ایک گاڑھا پردہ (حائل کر دیتے ہیں)
اَلِاسْتِتَارُ: اس کے معنیٰ چھپ جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ﴾ (۴۱۔۲۲) اور اس لئے نہ چھپتے تھے۔

(س ج د)

اَلسُّجُوْدُ: (ن) اس کے اصل معنیٰ فروتنی اور عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس کی عبادت کرنے کو سُجُوْدٌ کہا جاتا ہے اور یہ انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے (کیونکہ) سجود کی دو قسمیں ہیں سجود اختیاری جو انسان کے ساتھ خاص ہے۔ اور اسی سے ثواب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْهُ﴾ (۵۳۔۶۲) سو اللہ کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

اور سجود تسخیری جو انسان، حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ (۱۳۔۱۵) (فرشتے) جو آسمانوں میں ہیں اور جو (انسان) زمین میں ہیں چاروناچار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور صبح وشام ان کے سایے (بھی اسی کو سجدہ کرتے ہیں) اور نیز فرمایا:

﴿يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ﴾ (۱۶۔۴۸) اس کے سائے (کبھی) دائیں طرف کو اور (کبھی) بائیں طرف کو جھکے (ہوتے ہیں گویا) اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔

تو اس سے مراد سجود تسخیری ہے یعنی وہ زبان حال سے گویا ہیں کہ ان کو کسی صانع حکیم نے بنایا ہے۔ اور وہ اس کی مخلوق ہیں۔ اور آیت:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۱۶۔۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں اور فرشتے (سب) اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں اور (ذرا بھی) تکبر نہیں کرتے۔

دونوں قسم کے سجود یعنی تسخیری اور اختیاری پر مشتمل ہے اور آیت:

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾ (۵۵۔۴) اور نجم وشجر اس کے سامنے سربسجود ہیں۔ میں سجود تسخیری مراد ہے۔ اور آیت:

﴿اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ (۲۔۳۴) آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے اس کو قبلہ بنانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کے سامنے انکساری اور ان کی اولاد کے مصالح کا بندوبست کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ سو بجز ابلیس کے تمام فرشتے یہ حکم بجالائے تھے۔ اور آیت:

﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ (۲۔۵۸) اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ انکسار وانقیاد کے ساتھ وہاں جانا اصطلاح شریعت میں سجود کو نماز کا خاص رکن قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا اطلاق سجود قرآن اور سجود شکر پر بھی ہوتا ہے جو سجدہ نماز کے حکم میں ہے اور کبھی اس سے مراد نفس نماز ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ (۵۰۔۴۰) اور نماز کے پیچھے بھی۔ یعنی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اور چاشت کی نماز کو سُبْحَةُ الضُّحٰى اور سُجُوْدُ الضُّحٰى کہتے ہیں۔ اور آیت:

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ (۵۲۔۴۸) اپنے پروردگار کی حمد وثناء کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرو۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں تسبیح سے نماز مراد ہے۔ اَلْمَسْجِدُ (ظرف) کے معنیٰ جائے نماز کے ہیں اور آیت: ﴿وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ﴾ (۷۲۔۱۸) اور مسجدیں تو خدا ہی (کی عبادت کے لئے ہیں) میں بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے روئے زمین مراد ہے۔ کیونکہ آنحضرت علیہ السلام کے لئے تمام زمین کو مَسْجِدًا اور طَهُوْرًا بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں مروی ہے۔ [1]

---

[1] ولفظه : جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً اخرجه الجماعة .

(۱۷۰) اور بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے اعضاء سجود یعنی پیشانی، ناک، دونوں ہاتھ، دونوں زانوں اور دونوں پاؤں مراد ہیں۔ ❶ اور آیت:

﴿اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰهِ﴾ (۲۷۔۲۵) (اور نہیں سمجھتے) کہ اللہ کو...... سجدہ کیوں نہ کریں۔

میں لا زائدہ ہے اور معنیٰ یہ ہیں کہ میری قوم اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اور آیت:

﴿وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ (۱۲۔۱۰۰) اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔

میں اظہار عاجزی مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مراد سجدۂ خدمت ہے جو اس وقت جائز تھا اور شعر ❷ (الکامل)

(۲۲۰) وَافٰی بِهَا کَدَارَاهِمِ الْاَسْجَادِ

میں شاعر نے وہ دَرَاهِم مراد لئے ہیں جن پر بادشاہ کی تصویر ہوتی تھی اور لوگ ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔

(س ج ر)

اَلسَّجْرُ: اس کے اصل معنیٰ زور سے آگ بھڑکانے کے ہیں۔ اور سَجَرْتُ التَّنُّوْرَ کے معنیٰ ہیں میں نے تنور جلا دیا اسے ایندھن سے بھر دیا اسی سے فرمایا:

﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ﴾ (۵۲۔۶) اور (نیز) جوش مارنے والے سمندر کی۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❸ (المتقارب)

(۱۲۲) اذا شَاءَ طَالِعَ مَسْجُوْرَةً

تَرٰی حَوْلَهَا النَّبْعَ وَالسَّمْسَمَا

جب وہ چاہتا ہے تو پانی سے پُر گڑھا اسے نظر آجاتا ہے جس کے گرداگرد نبع اور سمسم کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔

اور آیت: ﴿وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ﴾ (۸۱۔۶) اور جس وقت دریا پاٹ دیے جائیں۔

کے معنیٰ حسن بصری رحمہ اللہ نے یہ کئے ہیں کہ جب دریا آگ سے بھڑکا دیئے جائیں اور بعض نے یہ معنیٰ کیا ہے کہ جب ان کے پانی خشک کردیئے جائیں اور یہ ان میں آگ بھڑکانے کی غرض سے ہوگا۔ ﴿ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ﴾ (۴۰۔۷۲) پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (۲۔۲۴) جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

سَجَرَتِ النَّاقَةُ: اونٹنی دوڑ میں بھڑک اٹھی یعنی سخت

---

❶ ابن عطاء کمافی البحر (۸: ۳۵۲) واللسان (۱: ۲۰۴ و ۴: ۱۸۸) والکشاف (۴: ۱۴۸) وقد اشار الیه ابن قتیبه فی غریبه ۱۲.

❷ قاله اسود بن یعفر النهشلی وصدره: من خمرذی نطف اغن منطق .... والبیت فی اللسان (سجد) والمفضلیات (۲: ۱۸) وفیه لدراهم بدل کدراهم والاسجاد بکسر الهمزة السجود قال الاصمعی: وراهم الایجاد، وراهم الاکاسرة ای النصاری وهی دراهم الحزیة التی اذلتهم ۱۲.

❸ البیت لنمربن تولب العکل والشاعر یصف دغلاً وفی روایة السماسمابدل السمسما وهو شجریشبه الآبنوس اونفسه والبیت من شواهد الطبری (۲۷.۱۹) والطبرسی (۲۹: ۴۵) والخزانة (۴: ۴۳۸) ومجازالقران لابی عبیدة ...... وتهذیب الالفاظ ۵۶۰ وکتاب الابدال لابی الطیب (۱: ۴۷,۳۵۱) واللسان والتاج (اسم) والمختارات الشجریة ۱۷۴ (مسمورة بدل مسجورة) والاضداد للاصمعی ۱۶۸ والقرطین (۲: ۴۱) والجمهرة ۲۱ وابن درید (۲: ۷۶) والسیوطی ۹۶ وشرح السبع لابن انباری ۵۵۶ واضداد ابن الانباری ۵۴ وابن السکیت ۱۶۸ والسجستانی ۲۶ واضداد لابی الطیب ۳۶۲ وغریب القران للقتبی ۴۲۴.

دوڑی جیسے اِشْتَعَلَتِ النَّاقَۃُ کا محاورہ ہے اور اَلسَّجِیْرُ کے معنیٰ مخلص دوست کے ہیں گویا وہ محبت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ مُحْرَقٌ فِیْ مَوَدَّۃٍ: کہ فلاں سوختہ محبت ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۲۲) سُجَرَاءُ نَفْسِیْ غَیْرُ جَمْعٍ اُشَابَۃٍ

(س ج ل)

اَلسَّجْلُ: بڑے ڈول کو کہتے ہیں اور سَجَلْتُ الْمَاءَ فَانْسَجَلَ کے معنیٰ ہیں: میں نے پانی بہایا تو وہ بہہ گیا، اور اَسْجَلْتُہٗ کے معنیٰ ہیں میں نے اسے پانی سے بھرا ہوا ڈول دیا اور استعارہ کے طور پر عطائے کثیر کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔

اَلْمَسَاجَلَۃُ: کے اصل معنیٰ ڈول کے ساتھ کھیتی سیراب کرنے کے ہیں اور پھر مبارات اور مناضلت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۲۳) مَنْ یُسَاجِلْنِیْ یُسَاجِلْ مَاجِدًا

جو میرے ساتھ مقابلہ کرے گا تو وہ ایک شریف آدمی سے مقابلہ کرے گا۔ یعنی میں ماجد اور شریف ہوں۔

اَلسِّجِّیْلُ: سنگِ گل کو کہتے ہیں۔ اور اصل میں جیسا کہ کہا گیا ہے۔ یہ لفظ فارسی سے معرب ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلسِّجِلُّ کے اصل معنیٰ اس پتھر کے ہیں جس پر لکھا جاتا تھا بعدہ ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے، سِجِلٌّ کہنے لگے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ﴾ (۲۱۔۱۰۴) جیسے خطوں کا مکتوب لپیٹ لیا جاتا ہے یعنی لکھی ہوئی چیزوں کی حفاظت کے لئے اسے لپیٹ کر رکھ لیتے ہیں۔

(س ج ن)

اَلسَّجْنُ: (مصدر ن) قید خانہ میں بند کر دینا۔ اور آیت: ﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ﴾ (۱۲۔۳۳) اے میرے پروردگار! قید خانہ میں رہنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ میں ایک قرأت اَلسَّجْنُ (بفتحہ سین) بھی ہے۔

﴿لَیَسْجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیْنٍ﴾ (۱۲۔۳۵) (ان کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ) ایک وقت خاص تک اس کو قید رکھیں۔

﴿وَدَخَلَ مَعَہُ السِّجْنَ فَتَیَانِ﴾ (۱۲۔۳۶) اور (اتفاق سے) یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو جوان (اور بھی) جیل خانہ میں داخل ہوئے۔

اَلسِّجِّیْنُ یہ عِلِّیِّیْنُ کے مقابلہ میں جہنم کا نام ہے اور اس میں الفاظ کی زیادتی، معنیٰ کی زیادتی پر دال ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ زمین کے ساتویں طبقہ کا نام ہے۔ قرآن

---

❶ قالہ ابو کبیر الھذلی (عامر بن الحلیس) وتمامہ: حُشداً والاسلك المفارش عزل والبیت فی تھذیب الاصلاح ٤٦٧ مع آخر دیوانہ دون الھذلیین (۲: ۹۰) والمعانی الکبیر ٥٢١ والمرزوقی ٢٣٣ والمحکم (عزل، حشد) وفیہ قال ابن جنی: روی حشد مثلث الدال.

❷ قالہ الاخضر اللبھی (فضل بن عباس) وتمامہ: یملأ الدلوالی عقد الکرب ـ والبیت فی اللسان (سجل) وتفسیر الطبری (۲: ۹٤) والامالی (۲: ٥٤) والسمط (٧٠٠) والکامل ٦٥ والاغانی (١٤: ١٧١ / ١٥: ٣) وکنایات الجرجانی ٥١ والمعانی للقتبی ٧٩٥ والاضداد لابن الانباری ٣٣٥ وبعدہ: اناالاخضر من یعرفنی ـ اخضر الجلد فی بیت العرب وانما قال انا الاخضر لانہ کان شدیدا الادمۃ والخضرۃ انما اتہ من قبل جدتہ (وامہ ام الفضل بنت العباس بن عبدالمطلب) وکانت حبشیۃ وفی مصارع العشاق ٣٧٩ تمامہ: اخضر الجلدۃ فی بیت العرب قال وتعنی بہ عبداللہ بن جعفر فی مجلس معاویۃ بالابطح وفی الحصری (۳: ١٦١) واختلاط.

پاک میں ہے:
﴿لَفِیْ سِجِّیْنٍ وَمَآ اَدْرٰاكَ مَا سِجِّیْنٌ﴾ (۸۳۔۸۷) (بدکارلوگوں کے نامۂ اعمال) سجین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ عام طور پر جس چیز کو قرآن پاک نے مَـــا اَدْرٰاكَ کے ساتھ بیان فرمایا ہے اسے بعد میں بیان کر دیا گیا ہے اور جسے مَا یُدْرِیْكَ کے ساتھ بیان کیا ہے اسے مبہم چھوڑ دیا ہے لیکن یہاں باوصف اس کے کہ سِجِّیْنَ اور عِـلِّیِّیْنَ کو ماادراک کے بعد بیان فرمایا ہے پھر بھی انہیں مبہم رکھا گیا ہے اور کتاب کی تفسیر بیان فرمادی ہے۔تو اس میں ایک باریک نکتہ ہے جسے اس کتاب کے بعد دوسری جگہ پر بیان کیا جائے گا۔

(س ج و)

سَـجَا اللَّیْلُ: رات پرسکون ہوگئی۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی﴾ (۹۳۔۲) اور رات کی (قسم) جب ساکن ہو جائے۔
اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ رات کے پرسکون ہونے کے لئے کہا جاتا ہے۔
هَــدَأَتِ الْاَرْجُـلُ: یعنی پاؤں کی چاپ رک گئی۔اور عَیْنٌ سَاجِیَةٌ کے معنیٰ خاموش آنکھ کے ہیں اور سَجَی الْبَحْرُ کے معنیٰ ہیں سمندر پُرسکون ہوگیا اسی سے استعارہ کے طور پر میت کو کفن میں چھپانے کے لئے تَسْـجِیَةُ الْمَیِّتِ کہا جاتا ہے۔

(س ح ب)

اَلسَّـــحْـــبُ: اس کے اصل معنیٰ کھینچنے کے ہیں۔ چنانچہ دامن زمین پر گھسیٹ کر چلنے یا کسی انسان کو منہ کے بل گھسیٹنے پر سَـحْـبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اسی سے بادل کو سَـحَـابٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ اسے ہوا کھینچ کر لے چلتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ خود پانی کو کھینچ کر لاتا ہے۔اور یا اس بنا پر کہ وہ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھسٹتا ہوا چل رہا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ﴾ (۵۴۔۴۸) جس دن ان کو ان کے منہ کے بل (دوزخ کی) آگ میں گھسیٹا جائے گا۔
اور فرمایا: ﴿یُسْحَبُوْنَ ۝ فِـی الْحَمِیْمِ﴾ (۴۰۔۷۱،۷۲) انہیں دوزخ میں کھینچا جائے گا۔
محاورہ ہے۔
فُــلَانٌ یَتَسَـحَّبُ عَلٰی فُــلَان: کہ فلاں اس پر جرأت کرتا ہے۔جیسا کہ یَتَجَرَّءُ عَلَیْهِ کہا جاتا ہے۔
اَلسَّـحَـابُ: ابر کو کہتے ہیں خواہ وہ پانی سے پر ہو یا خالی اس لئے خالی بادل کو سَـحَـابٌ جَهَـامٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اَلَـمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا﴾ (۲۴۔۴۳) کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے۔
﴿حَتّٰی اِذَا اَقَلَّتْ سَحَابًا﴾ (۷۔۵۷) حتیٰ کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھالاتی ہیں۔
﴿وَیُنْشِـیءُ السَّـحَابَ الثِّقَالَ﴾ (۱۳۔۱۲) اور وہ بھاری بادل اٹھاتا ہے۔
اور کبھی لفظ سحاب بول کر بطور تشبیہ کے اس سے سایہ اور تاریکی مراد لی جاتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَوْ کَظُلُمَاتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ

مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (۲۴۔۴۰) یا (ان کے اعمال کی مثال) بڑے گہرے دریا کے اندرونی اندھیروں کی سی ہے کہ دریا کو لہرنے ڈھانپ رکھا ہے اور (لہر بھی ایک نہیں بلکہ) لہر کے اوپر لہران کے اوپر بادل (کی تاریکی غرض) اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک۔

(س ح ت)

اَلسُّحْتُ: اصل میں اس چھلکے کو کہتے ہیں جو پوری طرح اتار لیا جائے۔ (اور اس سے ہلاک کردینے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ﴾ (۲۰۔۶۱) ورنہ وہ (تم پر کوئی) عذاب (نازل کر کے اس) سے تم کو ملیا میٹ کر دے گا۔ اس میں ایک قرأت فَيَسْحَتُكُمْ (فتح یاء کے ساتھ) بھی ہے اور سَحَتَهٗ (ض) وَاَسْحَتَهٗ (افعال) کے ایک ہی معنیٰ آتے ہیں یعنی بیخ کنی اور استیصال کرنا۔ پھر اسی سے سُحْتٌ کا لفظ ہر اس ممنوع چیز پر بولا جانے لگا جو باعث عار ہو کیونکہ وہ انسان کے دین اور مروت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ (۵۔۴۲) اور مال حرام کو کھاتے چلے جاتے ہیں۔

یعنی وہ چیز جوان کے دین کا ناس کرنے والی ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔[1] (۱۷۱) كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ اَوْلٰى بِهٖ...... جو گوشت مال حرام کے کھانے سے پیدا ہو وہ آگ کے لائق ہے اور اسی سے ''رشوت'' کو سُحت کہا گیا ہے۔[2] (۱۷۲) ایک روایت میں ہے۔[3] (۱۷۳) کہ حجام (پچھنا لگانے والے) کی کمائی ''سحت'' ہے تو یہاں سُحت بمعنیٰ حرام نہیں ہے۔ جو دین کو برباد کرنے والا ہو بلکہ سُحت بمعنیٰ مکروہ ہے یعنی ایسی کمائی مروت کے خلاف ہے کیونکہ آنحضرت علیہ السلام نے ایسی کمائی سے اونٹنی کو چارہ ڈالنے اور غلاموں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ہے۔

(س ح ر)

اَلسَّحَرُ کے معنیٰ حلق کے کنارہ اور پھیپھڑے کے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔

اِنْتَفَخَ سَحْرُهٗ: اس کا پھیپھڑا پھول گیا (یعنی وہ بزدل ہے) اور بڑے حلق والے اونٹ کو بَعِيرٌ سَحِرٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز ذبح کے وقت نرخرے سے اتار کر پھینک دی جاتی ہے اسے ''سُحَارَةٌ'' کہا جاتا ہے۔ اور یہ نُفَايَةٌ وَسُقَاطَةٌ کے وزن پر ہے اور فُعَالَةٌ کا وزن ردی اشیاء کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اسی سے سِحْرٌ مشتق ہے جس کے معنیٰ گلے یا پھیپھڑے پر مارنے کے ہیں۔ اور سِحْرٌ کا لفظ مختلف معانی میں

---

[1] الحدیث بھذااللفظ فی شعب الایمان من حدیث کعب بن عجرة وباختلاف الفاظ فی الدارمی (۲:۳۲۸) والمستدرك للحاكم والترمذی ولفظه لا یربو لحم نبت من سحت فالناراولیٰ به (هب حل عن ابی بکروابن جریر۔ عن ابن عمر کنزالعمال (٤ رقم ٦٦ وبمعناه ۷۰،۷۵، ۱٦/۷۹ : ٥٢٧) راجع تخریج العراقی علی الاحیاء (ج ۱ ص ۲) وتخریج الکشاف رقم (٤٥٦).

[2] راجع للحدیث الفائق (۱ : ۸۲) ابن جریرعن ابن عمرو (وابن مردویه عن ابی هریرة ست خصال من السحت رشوة الامام (الحدیث.)

[3] الطبرانی عن رافع بن خدیج والخطیب عن ابی هریرة وابن النجار۔عن السائب بن یزید ایضاً ق عن ابی هریرة وضعفه .انظر ضمن حدیث رافع بن خدیج المذکور الآن والترمذی وابو داؤد وحسنه وابن ماجة من حدیث محیصته تخریج احیاء العلوم (۲ : ۱۱٤.)

استعمال ہوتا ہے اول دھوکا اور بے حقیقت تخیلات پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی صفائی سے نظروں کو حقیقت سے پھیر دیتا ہے یا نَـمَّامٌ ملمع سازی کی باتیں کر کے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک دیتا ہے چنانچہ آیت:

﴿سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ﴾ (۷۔۱۱۶) تو انہوں نے جادو کے زور سے لوگوں کی نظر بندی کر دی اوران سب کو دہشت میں ڈال دیا۔

﴿يُـخَيَّـلُ اِلَيْـهِ مِـنْ سِحْرِهِمْ﴾ (۲۰۔۶۶) (تو) موسیٰ علیہ السلام کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا۔ میں سِـحْرٌ کا لفظ اسی معنیٰ پر محمول ہے اور بنابریں انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو سَاحِرٌ کہہ کر پکارا تھا چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿فَـقَـالُـوا يٰٓاَيُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ (۴۳۔ ۴۹) تو ان لوگوں نے کہا اے جادوگر! ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کر۔

دوم: شیطان سے کسی طرح کا تقرب حاصل کر کے اس سے مدد چاہنا۔جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَـلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِيْنُ تَنَزَّلُ عَـلٰـى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴾ (۲۶۔۲۲۲) (کہ) کیا میں تمہیں بتاؤں کس پر شیطان اترا کرتے ہیں (ہاں تو وہ اترا کرتے ہیں ہر جھوٹے بدکردار پر۔

اور اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ (۲۔۱۰۲) بلکہ کفر (کیا تھا تو) شیاطین نے کیا تھا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔

اوراس کے تیسرے معنیٰ وہ ہیں جو عوام مراد لیتے ہیں یعنی سِـحْرٌ وہ علم ہے جس کی قوت سے صور اور طبائع کو بدلا جا سکتا ہے۔ (مثلاً) انسان کو گدھا بنا دیا جاتا ہے۔لیکن حقیقت شناس علماء کے نزدیک ایسے علم کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ ❶

پھر کسی چیز کو سِحْرٌ کہنے سے کبھی اس شے کی تعریف مقصود ہوتی ہے جیسے کہا گیا ہے۔❷ (۱۷٤) اِنَّ مِـنْ الْبِيَانِ لَسِحْرًا (کہ بعض بیان جادو اثر ہوتا ہے۔)

اور کبھی اس کے عمل کی لطافت مراد ہوتی ہے چنانچہ اطباء، طبیعت کو "سَـاحِـرَةٌ" کہتے ہیں اور غذا کو سِـحْرٌ سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ اس کی تاثیر نہایت ہی لطیف اور باریک ہوتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿بَـلْ نَـحْـنُ قَـوْمٌ مَّسْـحُـوْرُوْنَ﴾ (۱۵۔۱۵) یہ تو نہیں کہ ہم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

یعنی سحر کے ذریعہ ہمیں اس کی معرفت سے پھیر دیا گیا

---

❶ وقد نقد عليهم ابن قتيبه فى مشكله وتلهف على عقول من انكره وقال فى ختام [illegible] فمن آمن بمحمد صلى الله عليه وسلم وبان ماجاء به الحق بحميع هذا وشرح صدره به ومن انكره...... لانه لايومن الا بماوجد [illegible] والقياس على ماشاهد ورأى فى الموات والحيوان ......فماذا ابقىٰ على المسلمين؟ واى شيىء ترك للملحدين انظر نمتخبه من ۸۳......۹۲ وغرائب القران للنيسابورى والطبرى والفخر وبجانبه ماكتب صاحب الكشاف والجاحظ فى الحيوان تجدمابين الفريقين من خلاف ۱۲۔

❷ قال صلى الله عليه وسلم حين وفد عليه عمروبن الاهتم والزبرقان بن بدر وقيس بن عاصم والمثل يضرب فى استحسان المنطق وايرادالحجة البالغة راجع للمثل الميدانى (۱: ۷) والحديث فى (مالك، حم، خ، د، ت،) عن ابن عمرو بدون اللام فى (حم، د) عن ابن عباس وفى (د) عن بريدة.

ہے۔ اور اسی معنیٰ میں فرمایا:
﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ﴾ (۱۵۔۱۵) تم پر تو بس کسی نے جادو کر دیا ہے۔
بعض نے کہا ہے: مُسَحَّرٌ وہ ہے جس کے سَحَرٌ یعنی پھیپھڑا وغیرہ ہو اور مطلب یہ تھا کہ تم غذا کے محتاج ہو (پھر پیغمبر کیسے ہو سکتے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ (ان کے اعتراض کو نقل کرتے ہوئے قرآن نے) فرمایا:
﴿مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ﴾ (۲۵۔۷) یعنی یہ تو ہماری طرح کا کھانے پینے والا انسان ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ (۲۶۔۱۵۴) کہ تم بھی ہم ہی جیسے آدمی ہو۔
اور بعض نے کہا ہے کہ مُسَحَّرٌ کے معنیٰ ہیں وہ شخص جسے جادو کا علم دیا گیا ہو اور وہ اپنے دعویٰ کو لطف و وقت سے ثابت کر سکتا ہو۔ اور آیت:
﴿اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا﴾ (۱۷۔۴۷) کہ تم مسحور آدمی کے پیچھے پڑے ہو۔
میں مَسْحُوْرًا کے دونوں معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ اور فرمایا:
﴿فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۰۱) تو فرعون نے ان سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام! میں تیری نسبت ایسا خیال کرتا ہوں کہ کسی نے تجھ پر جادو کر (کے تجھے دیوانہ بنا) دیا ہے۔
لیکن آیت:
﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ﴾ (۵۔۱۱۰) کہ یہ صریح جادو ہے۔
دوسرے معنیٰ پر دلالت کرتی ہے۔ اور فرمایا:
﴿وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ﴾ (۷۔۱۱۶) اور (بہت ہی) بڑا (بھاری) جادو (بنا کر) لائے۔
﴿اَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ﴾ (۱۰۔۷۷) کیا یہ جادو ہے۔ اور جادوگروں (کا یہ حال ہے کہ ان) کو (کبھی) کامیابی نہیں ہوتی۔
﴿فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۲۶۔۳۸) غرض دن مقرر ہوا اور (اس) معین دن کے وعدے پر جادوگر جمع کیے گئے۔
﴿فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ﴾ (۲۶۔۴۶) یہ دیکھ کر جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سجدے میں گر پڑے۔
اَلسَّحَرُ وَالسَّحَرَةُ اصل میں تو اس کے معنیٰ آخر شب کی تاریکی کے ہیں جو دن کی ابتدائی روشنی میں مخلوط ہو۔ پھر اس وقت کا نام ہی سَحَرٌ رکھ دیا گیا ہے۔ محاورہ ہے: لَقِیْتُهٗ بِاَعْلَی السَّحَرَیْنِ: یعنی میں اسے صبح کاذب کے وقت ملا۔ اور مُسْحِرٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جو سحری کے وقت گھر سے نکلا ہو اور اَلسَّحُوْرُ اس طعام کو کہتے ہیں جو بوقت سحر تناول کیا جائے اور تَسَحُّرٌ کے معنیٰ سحور تناول کرنے کے ہیں۔

(س ح ق)

اَلسَّحْقُ: (ض ک) اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں۔ زیادہ تر دوا کے پیسنے پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:
سَحَقْتُهٗ فَانْسَحَقَ: میں نے دوا کو پیسا چنانچہ وہ پس گئی
اَسْحَقَ الثَّوْبُ کے معنیٰ کپڑے کا پرانا ہو جانا کے ہیں اور پرانے کپڑے کو سَحَقٌ کہا جاتا ہے اسی سے اَسْحَقَ الضَّرْعُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ہیں دودھ خشک ہو جانے کی وجہ سے تھن مرجھا گئے ......اور

ہوسکتا ہے کہ "اِسْحٰق"(علم) بھی اسی سے مشتق ہو اس صورت میں یہ اسم منصرف ہوگا۔ اور کپڑے کے بوسیدہ کردینے پر سَحَقَہٗ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے۔اور محاورہ میں اَسْحَقَہُ اللّٰہُ کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے اسی سے فرمایا:

﴿فَسُحْقًا لِّاَصْحَابِ السَّعِيْرِ﴾ (۶۷۔۱۱) کہ دوزخیوں کے لئے دوری ہے۔اور فرمایا:

﴿اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّيْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾ (۲۲۔۳۱) یا اس کو ہوا کسی دور جگہ لے کر ڈال دے گی۔

اور استعارہ کے طور پر جاری خون کو مُنْسَحَقٌ وَسَحُوقٌ کہا جاتا ہے جیسے مزرُوْرٌ

(س ح ل)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾ (۲۔۳۹) تو دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔

یہ اصل میں سَحَلَ الْحَدِیْدَ سے ہے جس کے معنیٰ ریتی سے لوہے کا برادہ بنانا اور چھیلنے کے ہیں ۔بعض کا خیال ہے دریا کے کنارے کو ساحل کی بجائے مَسْحُوْلٌ کہنا چاہیے تھا مگر اسم مفعول کی بجائے اسم فاعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ھَمٌّ نَاصِبٌ کہا جاتا ہے حالانکہ ھَمٌّ مَنْصُوبٌ ہوتا ہے۔بعض کے نزدیک سَاحِلٌ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ پانی کو متفرق اور محدود کردیتا ہے اس صورت میں ساحل بمعنیٰ فاعل ہوگا۔

اَلسُّحَالَۃُ: برادہ کو کہتے ہیں اور گدھے کی ہنہناہٹ کو سَحِیلٌ یا سَحَالٌ کہا جاتا ہے گویا کرخت ہونے کے لحاظ سے اس کی آواز لوہے کو رگڑنے کی آواز کے مشابہ ہے۔

اور بلند آواز آدمی کو مِسْحَلٌ کہا جاتا ہے گویا وہ سَحِیْلُ الْحِمَارِ کے مشابہ ہے یعنی رفع صوت کے لحاظ سے نہ کہ آواز کے کرخت ہونے کے لحاظ سے جیسا کہ قرآن پاک نے گدھے کی آواز کے متعلق کہا ہے:

﴿اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ (۳۱۔۱۹) اور وہانۂ لگام کے دونوں طرف کے حلقوں کو مِسْحَلَتَانِ کہا جاتا ہے۔

(س خ ر)

اَلتَّسْخِیْرُ: (تفعیل) کے معنیٰ کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۵۴۔۱۳) اور جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اس نے (اپنے کرم سے) ان سب کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔

﴿سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ......﴾ (۱۴۔۳۳) اور (اسی طرح ایک اعتبار سے) سورج اور چاند کو تمہارے اختیار میں کر دیا کہ دونوں پڑے چکر کھا رہے ہیں اور (ایسے ہی ایک طرح سے) رات اور دن کو تمہارے اختیار میں کردیا۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ (۱۴۔۳۲) اور کشتیوں کو تمہارے اختیار میں کردیا۔جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (۲۲۔۳۶) ہم نے یوں ان (جانوروں) کو تمہارے بس میں کردیا ہے تاکہ تم (ہمارا) شکر کرو۔

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا﴾ (۴۳۔۱۳) پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا ہے۔

تو مُسَخَّرٌ وہ ہے جسے کسی کام پر مجبور کر کے لگایا گیا ہو اور سِخْرِیٌّ وہ جسے اولاً تو کسی کام پر مجبور کیا جائے پھر وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِیَتَّخِذَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا﴾ (۴۳۔۳۲) تا کہ وہ ایک دوسرے کو تابع بنائے رہیں۔

اور سَخِرْتُ مِنْہُ وَاسْتَسْخَرْتُہٗ کے معنیٰ کسی سے مذاق کرنے اور اس کی ہنسی اڑانا ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْکُمْ کَمَا تَسْخَرُوْنَ﴾ (۱۱۔۳۸) وہ (حضرت نوح علیہ السلام ان کے تمسخر کا یہ) جواب دیتے کہ اگر (آج) تم ہم پر ہنستے ہو تو جس طرح تم (ہم پر) ہنستے ہو (اسی طرح) ہم (ایک دن) تم پر ہنسیں گے۔

﴿بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۲) (اے پیغمبر) بات یہ ہے کہ تم (ان کے انکار قیامت سے) تعجب کرتے ہو اور یہ (تمہاری باتوں پر) ہنستے ہیں۔ رَجُلٌ سُخَرَۃٌ ہنسی اڑانے والا۔ اور سُخْرَۃٌ وہ ہے جس کی لوگ ہنسی اڑائیں اور ہنسی اڑانے والے کے اس فعل کو سُخْرِیَّۃٌ وَ سِخْرِیَّۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَاتَّخَذْتُمُوْھُمْ سُخْرِیًّا﴾ (۲۳۔۱۱۱) تو تم نے ان کی ہنسی بنائی۔ میں سُخْرِیًّا تسخیر سے بھی ہو سکتا ہے اور سُخْرِیَّۃٌ یعنی ہنسی اڑانے کے معنیٰ میں بھی۔ اور اسی طرح آیت:

﴿وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا کُنَّا نَعُدُّھُمْ مِنَ الْاَشْرَارِ ○ اَتَّخَذْنَاھُمْ سِخْرِیًّا﴾ (۳۸۔۶۳) اور دوزخی آپس میں یہ بھی کہیں گے کہ جن لوگوں کو ہم برے لوگوں میں شمار کرتے تھے کیا بات ہے کہ ہم ان کو (یہاں دوزخ میں) نہیں دیکھتے کیا ہم نے ان کی (ناحق) ہنسی بنائی۔ میں دونوں معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں لیکن اس کے بعد ﴿وَکُنْتُمْ مِنْھُمْ تَضْحَکُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۱) سے دوسرے معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔

(س خ ط)

اَلسَّخَطُ وَالسُّخْطُ: اس سخت غصہ کو کہتے ہیں جو سزا کا مقتضی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا ھُمْ یَسْخَطُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۱) تو وہ فوراً غصہ سے بھر جاتے۔

اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد انزال عقوبت ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰہَ﴾ (۴۷۔۲۸) (اور ان کی) یہ نوبت اس لئے (ہوگئی) کہ جو چیز خدا کو بری لگتی ہے یہ اسی (کے رستے) پر چلے۔

﴿اَنْ سَخِطَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ﴾ (۵۔۸۰) (نتیجہ یہ ہوا کہ (دنیا میں بھی) خدا ان سے ناراض ہوا۔

﴿کَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ﴾ (۳۔۱۶۱) اس شخص جیسا (فعل سرزد) ہو سکتا ہے جو خدا کے غضب میں آ گیا ہو۔

(س د د)

اَلسَّدُّ: (دیوار، آڑ)

بعض نے کہا ہے کہ سَدٌّ اور سُدٌّ کے ایک ہی معنیٰ ہیں اور بعض دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ سُدٌّ (بضمہ

سین) اس آڑ کو کہتے ہیں جو قدرتی ہو اور سَدٌّ (بفتحہ سین) مصنوعی اور بنائی ہوئی روک کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ سَدَدْتُہٗ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنیٰ رخنہ کو بند کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا﴾ (۱۸۔۹۴) کہ (آپ) ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیں۔

اور تشبیہ کے طور پر ہر قسم کے موانع کو سَدٌّ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا﴾ (۳۶۔۹) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی۔

ایک قرأت میں سُدًّا بھی ہے۔

اَلسُّدَّةُ: برآمدہ، جو دروازے کے سامنے بنایا جائے تاکہ بارش سے بچاؤ ہو جائے کبھی دروازے کو بھی سُدَّۃٌ کہہ دیتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے۔ ❶

اَلْفَقِيْرُ الَّذِيْ لَا تُفْتَحُ لَهٗ سُدَدُ السُّلْطَانِ یعنی وہ فقیر جن کے لئے بادشاہ کے دروازے نہ کھولے جائیں

اَلسَّدَادُ وَالسَّدَدُ کے معنیٰ استقامت کے ہیں اور اَلسِّدَادُ اسے کہتے ہیں جس سے رخنہ اور شگاف کو بھرا جائے۔ اور استعارہ کے طور پر ہر اس چیز کو سَدَادٌ کہا جاتا ہے جس سے فقر کو روکا جائے۔

(س د ر)

اَلسِّدْرُ: (بیری کا) درخت جس کا پھل بہت کم غذائیت کا کام دیتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَّ اَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ﴾ (۳۴۔۱۶) اور جن میں کچھ تو جھاؤ تھا اور تھوڑی سی بیریاں۔

اور کبھی (گابھا دے کر) اسے بے کانٹا کر کے اس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے اس لئے اسے جنت کے آرام اور اس کی نعمتوں کے لئے بطور مثال کے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ﴾ (۵۶۔۲۸) بے خار کی بیریوں میں (مزے کر رہے) ہوں گے۔

کیونکہ ایسا درخت بہت زیادہ سایہ دار ہوتا ہے اور آیت:

﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى﴾ (۵۳۔۱۶) جب کہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔

میں السِدْرَۃَ سے اس مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں کہ آنحضرت ﷺ کو فیوضات الٰہیہ اور بھاری انعامات سے خاص طور پر نوازا گیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ درخت ہے جس کے نیچے آنحضرت ﷺ نے بیعت رضوان لی تھی اور وہاں اللہ تعالیٰ نے مومنین پر سکینت الٰہیہ نازل فرمائی تھی۔

اَلسَّدْرُ کے معنیٰ خیرہ چشم ہونے کے ہیں اور خیرہ چشم کو سَادِرٌ کہا جاتا ہے اور سَدَرَ شَعْرَہٗ کے معنیٰ بال لٹکانے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ (دَسَرَ) سے مقلوب ہے۔

(س د س)

اَلسُّدُسُ: (اسم عدد چھٹے حصے کو کہتے ہیں۔)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ﴾ (۴۔۱۱) تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔

---

❶ وفی وارو الحوض: هم الذين لاتفتح لهم السدد (النهاية: اسد).

اَلسِّدْسُ: پیاسے اونٹوں کو چھٹے روز پانی پلانے کی باری اور سِتٌّ بھی اصل میں سِدْسٌ ہی ہے۔ سَدَسْتُ الْقَومَ کے معنیٰ قوم میں چھٹا آدمی ہونے یا ان کے اموال سے چھٹا حصہ وصول کرنے کے ہیں۔ اور جَاءَ سَادِساً وَسَاتًّا وَسَادِيًا کے ایک ہی معنیٰ ہیں یعنی وہ چھٹے درجہ پر آیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ (۵۸۔۷) اور نہ کہیں پانچ کا (مجمع ہوتا ہے) مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔

﴿وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸۔۲۲) اور (بعض) کہیں گے کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔

محاورہ مشہور ہے: لَا اَفْعَلُ كَذَا سَدِيْسَ عَجِيْسَ: میں کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔

اَلسَّدُوْسُ: طیسان کو کہتے ہیں اَلسُّنْدُسُ: باریک اور اس کے مقابل اِسْتَبْرَقٌ موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔

(س ر ر)

اَلْاِسْرَارُ: کسی بات کو چھپانا یہ اعلان کی ضد ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ (۲۔۲۷۴) اور پوشیدہ اور ظاہر اور فرمایا:

﴿يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ﴾ (۲۔۷۷) کہ جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں خدا کو سب معلوم ہے۔

﴿وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ﴾ (۶۷۔۱۳) اور تم لوگ بات پوشیدہ کہو یا ظاہر۔

اور اس کا استعمال اعیان و معانی دونوں میں ہوتا ہے۔

اَلسِّرُّ: اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں پوشیدہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ (۲۰۔۷) وہ چھپے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

نیز فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ﴾ (۹۔۷۸) کہ خدا ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے واقف ہے۔

سَارَّهٗ: (مفاعلہ) کے معنیٰ ہیں کسی بات کو چھپانے کی وصیت کرنا اور تَسَارَّ الْقَومُ کے معنیٰ لوگوں کا باہم ایک دوسرے کو بات چھپانے کی وصیت کرنے یا باہم سرگوشی کرنے کے ہیں اور آیت:

﴿وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ﴾ (۱۰۔۵۴) (پچھتائیں گے) اور ندامت کو چھپائیں گے۔

تو یہاں اَسَرُّوْا کے معنیٰ چھپانے کے ہیں اور بعض نے اسکے معنیٰ ظاہر کرنا بھی کئے ہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے:

﴿فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا﴾ (۶۔۲۷) اور کہیں گے کہ اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹا دیئے جائیں تاکہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں۔

لیکن یہ معنیٰ صحیح نہیں ہیں کیونکہ آیت مذکورہ میں جس ندامت کے چھپانے کا ذکر ہے اس سے وہ ندامت مراد نہیں ہے جس کے اظہار کی طرف آیت یٰلَیْتَنَا میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

اَسْرَرْتُ اِلٰى فُلَانٍ حَدِيْثاً: کسی سے پوشیدہ طور پر

راز کی بات کہنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا﴾ (۶۶۔۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر علیہ السلام نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔
اور آیت:
﴿وَتُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (۶۰۔۱) اور تم ان کی طرف پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔
کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم انہیں اپنی پوشیدہ دوستی سے آگاہ کرتے ہو۔ اس بنا پر بعض نے یہاں تُسِرُّوْنَ کے معنیٰ تُظْهِرُوْنَ کئے ہیں اور یہی معنیٰ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اِسْرَارُ اِلَی الْغَیْرِ: کسی سے بھید کی بات کہنا۔ جس طرح دوسروں سے اخفا کو مقتضی ہے اسی طرح اس شخص کے سامنے اظہار کو مستلزم ہے جس سے وہ بھید کہا جاتا ہے لہٰذا اَسْرَرْتُ اِلٰی فُلَانٍ یعنی دوسرے سے راز کی بات کہنا۔ میں من وجہ اخفا اور من وجہ اظہار کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ اور آیت:
﴿وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا﴾ (۷۱۔۹) (ظاہر) اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔ بھی اسی معنیٰ پر محمول ہے۔
اور کنایہ کے طور پر اَلسِّرُّ کے معنیٰ نکاح (جماع) کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چھپ کر کیا جاتا ہے اور سِرٌّ خالص چیز کو کہتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے هُوَ مِنْ سِرِّ قَوْمِهٖ وہ اپنی قوم میں سب سے بہتر ہے اور اسی سے سِرُّ الْوَادِیْ وَسَرَارَتُهٗ ہے۔ جس کے معنیٰ وادی کے بہتر حصہ کے ہیں۔
سُرَّةُ الْبَطْنِ: ناف کا وہ حصہ جو قطع کرنے کے بعد باقی رہ جاتا ہے اور یہ چونکہ عکن بطن میں مخفی رہتا ہے اس لئے اسے سُرَّةُ الْبَطْنِ کہتے ہیں۔ اور وہ چیز جو ناف سے قطع کی جاتی ہے اسے سُرٌّ وَ سُرُرٌ کہا جاتا ہے۔ ہتھیلی کی لکیروں کو اَسِرَّةُ الرَّاحَةِ کہتے ہیں اسی طرح پیشانی کے خطوط کو اَسَارِیْرُ الْجَبْهَةِ کہا جاتا ہے اسی طرح مہینہ کی آخری تاریخ جس میں چاند نظر نہیں آتا اسے سَرَارٌ کہا جاتا ہے۔
اَلسُّرُوْرُ: قلبی راحت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا﴾ (۷۶۔۱۱) (تو خدا) ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔
﴿تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ﴾ (۲۔۶۹) (کہ) دیکھنے والے کے دل کو خوش کر دیتا ہو۔
اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:
﴿وَیَنْقَلِبُ اِلٰی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ (۸۴۔۹) اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔
اور اہل نار کے متعلق فرمایا:
﴿اِنَّهٗ كَانَ فِیْ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ (۸۴۔۱۳) یہ اپنے اہل وعیال میں مست رہتا تھا۔
تو اس میں تنبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔
اَلسَّرِیْرُ: (تخت) وہ جس پر کہ (ٹھاٹھ سے) بیٹھا جاتا ہے یہ سُرُوْرٌ سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں اس کی جمع اَسِرَّةٌ اور سُرُرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:
﴿مُتَّكِئِیْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ﴾ (۵۲۔۲۰) تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں۔ تکیہ لگائے ہوئے۔
﴿فِیْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ﴾ (۸۸۔۱۳) وہاں تخت ہوں

گے اونچے بچھے ہوئے۔
﴿وَلِبُیُوتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّكِئُوْنَ﴾ (۴۳۔۳۴) اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنادیئے) اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔
اور میت کے جنازہ کو اگر سَرِیْرُ الْمَیِّتِ کہا جاتا ہے تو یہ سَرِیر (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یا نیک شگون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قید خانہ سے رہائی پا کر جوار الٰہی میں خوش وخرم ہے جس کی طرف کہ آنحضرت ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا❶:
(۱۷۵) اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ کہ مومن کو دنیا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

(س ر ب)

اَلسَّرَبُ: (مصدرن) اس کے اصل معنیٰ نشیب کی طرف جانے کے ہیں اور اسم کے طور پر نشیبی جگہ کو بھی سَرَبٌ کہہ دیتے ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا﴾ (۱۸۔۶۱) تو اس نے دریا میں سرنگ کی طرح اپنا رستہ بنالیا۔
سَرَبَ (ن) سَرَبًا وَسُرُوْبًا (جیسے مَرَّ مَرًّا وَمُرُوْرًا) اور اِنْسَرَبَ (انفعال) کے ایک ہی معنیٰ آتے ہیں لیکن سَرَبَ بالذات فاعل سے فعل صادر ہونے پر بولا جاتا ہے یعنی وہ فعل جو دوسرے سے متاثر ہو کر کیا جائے۔
سَرِبَ الدَّمْعُ: (س) آنسو رواں ہونا۔
اِنْسَرَبَتِ الْحَیَّةُ اِلٰی جُحْرِهَا: سانپ کا اپنے بل میں اتر جانا۔ اسی طرح سَرِبَ (س) الْمَاءُ مِنَ السِّقَاءِ: کے معنیٰ مشکیزے سے پانی ٹپکنا کے ہیں اور وہ پانی جو مشکیزے سے ٹپک رہا ہو اسے مَاءٌ سَرَبٌ وَسَرِبٌ کہتے ہیں۔
اَلسَّارِبُ: کسی راستہ پر (اپنی مرضی سے) چلا جانے والا۔ ﴿وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ﴾ (۱۳۔۱۰) یا رات کو کہیں چھپ جائے یا دن کی روشنی میں کھلم کھلا چلے پھرے۔
سَارِبٌ کی جمع سَرَبٌ آتی ہے۔ جیسے رَکْبٌ وَرَاکِبٌ اور عرف میں اونٹوں کے گلہ کو سَرْبٌ کہا جاتا ہے مثلاً محاورہ ہے ذُعِرَتْ سَرْبُهٗ: اس کے اونٹ ڈر کر متفرق ہوگئے (یعنی بدحال ہوگیا) اور هُوَ اٰمِنٌ فِیْ سِرْبِهٖ: وہ خوش حال ہے میں سِربٌ کے معنیٰ نفس کے ہیں اور بعض نے کنایۂ اہل وعیال مراد لیا ہے۔ اسی سے کنایہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔
اِذْهَبِیْ فَلَا اَنْدَهُ سِرْبَكِ: جاؤ تجھے طلاق ہے اور اصل معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے اونٹ جدھر جانا چاہیں آزادی سے چلے جائیں میں انہیں نہیں روکوں گا۔
اَلْمَسْرُبَةُ: (بضمہ راء) سینہ کے درمیان کے بال جو نیچے پیٹ تک ایک خط کی صورت میں چلے جاتے ہیں۔
اَلسَّرَابُ: (شدت گرما میں دوپہر کے وقت) بیاباں میں جو پانی کی طرح چمکتی ہوئی ریت نظر آتی ہے اسے "سَرَابٌ" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بظاہر دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے پانی بہہ رہا ہے۔ پھر اس سے ہر بے حقیقت چیز کو تشبیہ کے طور پر سَرَابٌ کہا جاتا ہے اور اس

❶ وجنة الكافر للحديث راجع (حم، م، ت، ه) عن ابي هريرة وابن حبان في زوائده رقم ۲۴۸۸ (طب، ك، عن سلمان البزار عن ابن عمر) وفي رواية سجن المؤمن وسنته راجع تخريج عراقي على الاحياء (۳: ۲۰۲)۔

کے بالمقابل جو چیز حقیقت رکھتی ہو اسے شَرَابٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾ (۲۴۔۳۹) جیسے میدان میں سراب کہ پیاسا اسے پانی سمجھے۔

﴿وَّسُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَکَانَتْ سَرَابًا﴾ (۷۸۔۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو کر رہ جائیں گے۔

(س ب ل)

اَلسِّرْبَالُ: کرتہ،قمیص خواہ کسی چیز سے بنی ہوئی ہو۔جیسے فرمایا:

﴿سَرَابِیْلُھُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ﴾ (۱۴۔۱۵۰) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔

﴿سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ﴾ (۱۶۔۸۱) اور تمہارے (آرام کے) واسطے کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور کرتے یعنی زرہیں جو تم کو (اسلحہ) جنگ (کے ضرر) سے محفوظ رکھیں۔

تو بَاْسَکُمْ سے مراد یہ ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ رکھتے ہیں۔

(س ر ج)

اَلسِّرَاجُ: (چراغ) وہ چیز جو بتی اور تیل سے روشن ہوتی ہے۔مجازاً ہر روشن چیز کو "سِرَاجٌ" کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ (۷۱۔۱۶) اور سورج کو چراغ ٹھہرایا ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّھَّاجًا﴾ (۷۸۔۱۳) اور روشن چراغ بنایا۔

تو یہاں "روشن چراغ" سے مراد سورج ہے۔

اَسْرَجْتُ السِّرَاجَ کے معنیٰ چراغ روشن کرنے کے ہیں اور سَرَّجْتُ کَذَا کے معنیٰ چراغ کی مثل کسی چیز کو خوبصورت بنانے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۲۲۴) وَفَاحِماً وَمَرْسَناً مُسَرَّجاً

کوئلہ کی مثل سیاہ بال اور سراج کی مثل خوبصورت ناک

اَلسَّرْجُ کے معنیٰ زین کے ہیں اور زین ساز کو سَرَّاجٌ کہا جاتا ہے۔

(س ر ح)

اَلسَّرْحُ: ایک قسم کا پھلدار درخت ہے اس کا واحد سَرْحَۃٌ ہے اور سَرَّحْتُ الْاِبِلَ کے اصل معنیٰ تو اونٹ کو "سرح" درخت چرانے کے ہیں بعدہ چراگاہ میں چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دینے پر اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَکُمْ فِیْھَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ (۱۶۔۶) اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو اور جب صبح کو جنگل چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت وشان ہے۔

اور چرواہے کو "سَارِحٌ" کہا جاتا ہے اس کی جمع سَرْحٌ

---

[1] قاله العجاج يصف امرئة وقبله : ازمان ابدت واضحاً مفلجا۔اغربراقا وطرفا ابرجا ومقلة وحاجباً مزججا .... وانظر فى ديوانه ٨ واراجيز العرب ٧٣ والامالى وتهذيب الالفاظ ٢٠٧ والمعاهد ٦ والعينى (١ : ٢٩) وفى المتداولات ان لفظه المسرج فى الشطر غريب وليت شعرى ماالغربة فيه الاان يقال ان ماخذه دقيق ولاياباه الذوق .

ہے جیسے شَارِبٌ کی جمع شَرْبٌ اور رَاکِبٌ کی جمع رَکْبٌ آتی ہے اور تَسْرِیْحٌ کا لفظ طلاق دینے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ (۲۔۲۲۹) یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔اور اسی طرح آیت:

﴿وَسَرِّحُوْھُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا﴾ (۳۳۔۴۹) اور ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر اچھی طرح سے رخصت کردو۔

میں بھی سَرِّحُوْھُنَّ کے معنیٰ طلاق دینے کے ہیں اور یہ تَسْرِیْحٌ سے مستعار ہے جس کے معنیٰ جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑ دینا کے ہیں۔ جیسا کہ خود طلاق کا لفظ اِطْلَاقُ الْاِبِـلِ: (اونٹ کا پائے بند کھولنا) کے محاورہ سے مستعار ہے۔اور کبھی سَرْحٌ میں تیز روی کے معنیٰ کا اعتبار کرکے تیز رو اور سہل رفتار اونٹنی کو نَاقَةٌ سَرْحٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے بطور استعارہ شعر کے ایک بحر کا نام مُنْسَرِحٌ رکھا گیا ہے۔

(س ر د)

اَلسَّرْدُ: اصل میں اس کے معنیٰ کسی سخت چیز کو سینے کے ہیں جیسے زرہ بنانا اور چمڑے کو سینا پھر بطور استعارہ لوہے کی کڑیوں کو مسلسل جوڑنے کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدِّرْ فِی السَّرْدِ﴾ (۳۴۔۱۱) اور کڑیوں کو اندازہ سے جوڑو۔

اور صِرَاط وَسِرَاط وَزِرَاطٌ کی طرح سَرْدٌ کو زَرْدٌ اور سَرَّادٌ کو زَرَّادٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمِسْرَدُ (اسم آلہ) سوراخ کرنے کا اوزار۔

(س ر د ق)

اَلسُّرَادِقُ: فارسی سے معرب ہے [1] کلام عرب میں کوئی ایسا اسم مفرد نہیں ہے جس کا تیسرا حرف الف ہو اور اس کے بعد دو حرف ہوں۔ [2] قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَحَاطَ بِھِمْ سُرَادِقُھَا﴾ (۱۸۔۲۶) جس کے شامیانے ان کو گھیر رہے ہوں گے۔

اور بَیْتٌ مُسَرْدَقٌ: اس مکان کو کہتے ہیں جو شامیانہ کی طرز پر بنایا ہو۔

(س ر ط)

اَلسِّرَاطُ کے معنیٰ ''آسان راستہ'' کے آتے ہیں اور اصل میں سَرَطْتُ الطَّعَامَ وَزَارَدْتُہٗ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ طعام کو نگل جانے کے ہیں۔اور راستہ کو صراط اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راہرو کو گویا نگل لیتا ہے یا رہرو اس کو نگلتا ہوا چلا جاتا ہے۔مثل مشہور ہے۔قَتَلَ اَرْضًا عَالِمُھَا وَقَتَلَتْ اَرْضٌ جَاھِلَھَا کہ واقف کار رہرو تو زمین کو مار ڈالتا ہے لیکن ناواقف کو زمین ہلاک کردیتی ہے۔ابوتمام نے کہا ہے۔ [3]

رَعَتْہُ الْفَیَافِیْ بَعْدَ مَا کَانَ حِقْبَةً

---

[1] من سرابرده ومن سراادر ۱۲.

[2] الاحرفان وھما علابط وحلاحلٌ ۲.

[3] قاله ابو تمام من قصیدته التی یمدح فیها عبدالله بن طاهر والبیت فی دیوانه ٤٤ والحفاجی ۳۳ والامالی ۱: ۵۸۵ وفی المطبوع دعته مصحف وفی روایة الدیوان ماء الروض بدل ماء المزن وبعده فکم جزع واوجب ذروة غارب ومن قبل کانت اتمکنه مذانبه (الاتماك الاسمان والمذانب مجاری الماء ۱۲.)

رَعَاهَا اِذَا مَا الْمُزْنُ يَنْهَلُّ سَاكِبُهُ

اس کے بعد کہ اُس نے ایک زمانہ دراز تک سرسبز جنگلوں میں گھاس کھائی اب اس کو جنگلات نے کھا لیا یعنی دبلا کر دیا۔

اسی طرح راستہ کو لَقَمٌ اور مُلْتَقَمٌ بھی کہا جاتا ہے اس لحاظ سے کہ گویا رہرواس کو لقمہ بنالیتا ہے۔

(س ر ع)

اَلسُّرْعَةُ: اس کے معنیٰ جلدی کرنے کے ہیں اور یہ بُطْأٌ (درنگ کردن) کی ضد ہے۔اجسام اور افعال دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: سَرُعَ (ک)فَهُوَ سَرِيْعٌ وَاَسْرَعَ (افعال)فَهُوَ مُسْرِعٌ: اس نے جلدی کی اور اَسْرَعُوا کے معنیٰ سَارَتْ اِبِلُهُمْ سِرَاعًا: (ان کے اونٹ تیز رفتاری سے چلے گئے) آتے ہیں۔جیسا کہ اس کے بالمقابل اَبْلَدُوْا کے معنیٰ سست ہونا آتے ہیں۔

سَارَعُوا وَتَسَارَعُوْا: ایک دوسرے سے سبقت کرنا چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۳۔۱۳۳)

اور اپنے پروردگار کی بخشش (اور بہشت کی) طرف لپکو۔

﴿وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرَاتِ﴾ (۳۔۱۱۴) اور نیکیوں پر لپکتے ہیں۔

﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا﴾ (۵۰۔۴۴)

اس روز زمین ان پر پھٹ جائے گی اور جھٹ پٹ نکل کھڑے ہوں گے۔

﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾ (۷۰۔۴۳)

اور کسی کام میں قوم سے آگے نکل جانے والوں کو سَرَعَانُ کہا جاتا ہے۔

مثل مشہور ہے [1] سَرْعَانَ ذَااِهَالَةً یہ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو قبل از وقت کسی واقعہ کی پیش گوئی کرے۔تو یہ سَرَعَ سے مبنی برفتحہ ہے۔جیسا کہ وَشَكَ سے وَشْكَانَ اور عَجَلَ سے عَجْلَانُ آجاتا ہے اور آیت:﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ (۳۔۹۹) او رخدا جلد از جلد عذاب دینے والا ہے۔

اور اسی طرح آیت ﴿اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ﴾ ''بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے۔'' میں سَرِيْعٌ کے لفظ سے اس معنیٰ پر متنبہ کرنا مقصود ہے جو کہ آیت:

﴿اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (۳۶۔۸۲) اس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔سے مفہوم ہوتے ہیں۔

(س ر ف)

اَلسَّرَفُ کے معنیٰ انسان کے کسی کام میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں مگر عام طور پر اس کا استعمال انفاق یعنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کر جانے پر ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا﴾ (۲۵۔۶۷) اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں۔

﴿وَلَا تَاْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا﴾

---

[1] اهالة منصوب على الحال والتقدير سرعان اهالة بهذه (منتهى الادب).

(۴۔۶) اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (یعنی بڑے ہو کر تم سے اپنا مال واپس لے لیں گے) اسے فضول خرچی اور جلدی میں نہ اڑا دینا۔

اور یہ یعنی بے جا سرف کرنا مقدار اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے بولا جاتا ہے چنانچہ حضرت سفیان (ثوری رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی میں ایک حبہ بھی صرف کیا جائے تو وہ اسراف میں داخل ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (۶۔۱۴۲) اور بے جا اڑانا کہ خدا بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

﴿وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحَابُ النَّارِ﴾ (۴۰۔۴۳) اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں۔

یعنی جو اپنے امور میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾ (۴۰۔۲۸) بے شک خدا اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے تجاوز کر جانے والا ہو اور جھوٹا ہو۔

اور قوم لوط علیہ السلام کو بھی مُسْرِفِيْنَ (حد سے تجاوز کرنے والے) کہا گیا ہے۔کیونکہ وہ بھی خلاف فطرت فعل کا ارتکاب کر کے جائز حدود سے تجاوز کرتے تھے اور عورت جسے آیت:

﴿نِسَائُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔

میں حَرْثٌ قرار دیا گیا ہے......میں بیج بونے کی بجائے اسے بے محل ضائع کر رہے تھے اور آیت:

﴿يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ﴾ (۳۹۔۵۳) (اے پیغمبر! میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی۔میں اَسْرَفُوْا کا لفظ مال وغیرہ ہر قسم کے اسراف کو شامل ہے اور قصاص کے متعلق آیت:

﴿فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ﴾ (۱۷۔۳۳) تو اس کو چاہئے کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے۔

میں اِسْرَاف فِي الْقَتْل یہ ہے کہ غیر قاتل کو قتل کرے اس کی دو صورتیں ہیں۔مقتول سے بڑھ کر باشرف آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔یا قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرے جیسا کہ جاہلیت میں رواج تھا۔

عام محاورہ ہے: مَرَرْتُ بِكُمْ فَسَرَفْتُكُمْ کہ تمہارے پاس سے بے خبری میں گزر گیا۔

تو یہاں سَرَفْتُ بمعنیٰ جَهِلْتُ کے ہیں۔یعنی اس نے بے خبری میں اس حد سے تجاوز کیا جس سے اسے تجاوز نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہی معنیٰ جہالت کے ہیں۔

اَلسُّرْفَةُ: ایک چھوٹا سا کیڑا جو درخت کے پتے کھا جاتا ہے اس میں اسراف کا تصور کر کے اسے سُرْفَةٌ کہا جاتا ہے پھر اس سے اشتقاق کر کے کہا جاتا ہے۔

سُرِفَتِ الشَّجَرَةُ: درخت کرم خوردہ ہو گیا۔

اور ایسے درخت کو سُرْفَةٌ (کرم خوردہ) کہا جاتا ہے۔

(س ر ق)

السَّرِقَةُ: (مصدر ض) اس کے اصل معنیٰ خفیہ طور پر اس چیز کے لے لینے کے ہیں جس کا لینے کا حق نہ ہو اور اصطلاح شریعت میں کسی چیز کو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں لے لینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ﴾ (۵۔۳۸) اور جو چوری

کرے مرد ہو یا عورت۔

﴿قَالُوْا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۲۔۷۷) (برادران یوسف علیہ السلام نے کہا) کہ اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ اس کے ایک بھائی نے بھی پہلے چوری کی تھی۔

﴿اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّکُمْ لَسَارِقُوْنَ﴾ (۱۲۔۷۰) کہ قافلہ والو! تم تو چور ہو۔

﴿اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ﴾ (۱۲۔۸۱) کہ آپ کے صاحبزادے نے (وہاں جاکر) چوری کی۔

اور اِسْتَرَقَ السَّمْعَ کے معنیٰ چوری چھپے سننے کی کوشش کرنا ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ﴾ (۱۵۔۱۸) ہاں! اگر کوئی چوری سے سننا چاہے۔

اَلسَّرَقُ و السَّرَقَةُ: سفید ریشم۔

(س ر م د)

اَلسَّرْمَدُ: کے معنیٰ دائم ہمیشہ کے ہیں۔ ❶

قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْکُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا﴾ (۲۸۔۷۱) کہو بھلا دیکھو تو اگر خدا تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک رات (کی تاریکی) کیے رہے۔

اسی طرح اس کے بعد آیت میں النَّهَارَ سَرْمَدًا فرمایا ہے۔

(س ر ی و)

اَلسُّرٰی کے معنیٰ رات کو سفر کرنے کے ہیں اور اسی معنیٰ میں سَرٰی (ض) وَ اَسْرٰی (افعال) دونوں استعمال ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ﴾ (۱۱۔۸۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا﴾ (۱۷۔۱) وہ ذات (پاک) ہے جو ایک رات اپنے بندے کو...... لے گیا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْرٰی (باب افعال) سَرٰی یَسْرِی سے نہیں ہے جس کے معنیٰ رات کو سفر کرنے کے ہیں۔ بلکہ یہ سَرَاةٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کشادہ زمین کے ہیں۔اور اصل میں اس کے لام کلمہ میں واو ہے اور اسی سے شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (البسیط)

(۲۲۶) بِسَرْوِ حِمْیَرِ اَبْوَالُ الْبِغَالِ بِهٖ

حمیر کی کشادہ زمین میں جہاں خچروں کا پیشاب یعنی کہ سراب نظر آتے ہیں۔

پس اَسْرٰی کے معنیٰ کشادہ زمین میں چلے جانا ہیں۔

---

❶ وفی الکشاف انه مشتق من السرد علی وزن فَعْمَلٌ فالمیم فیه زائدة وان کان رباعیاً فوزنه فَعللٌ (اکشاف والروح).

❷ من کلمة جمهریة (۳۰۶۔۳۱۰) فی ۵۰ بیتاً مطلعها طاف الخیال رکب الیمانینا ودون لیلی عوادٍ لوتعدینا قاله تمیم بن مقبل العامری فی مشوبته (ومشحبات العرب سبع قصائد وتمامه: انی اتسدیت وهناً ذالك الینا وسرو حمیر من منا زلهم بالیمن وابواب البغال یراد وبها السراب تشبیهاً لان بول البغال کاذب لایفتح وکذا السراب والبین: الارض الواسعة قد رمدالبصر کمافی المعاجم راجع المقاییس واللسان (بین، سدی) واصلاح یعقوب ۵ واعراب ثلاثین ٤٦ والبیت ایضاً فی امالی المرتضیٰ (۱: ۲۹۱) وتهذیب المنطق (۱: ۷) وفیه سرو حمیر بدون الباء وسرو حمیر مکان یوصف بالبعدوفی حدیث عمر لئن عشت الی قابل لاسوین بین الناس حتیٰ یاتی الراعی حقه بسر و حمیر لم یعرق جبینه راجع للبیت السبع لابن الانباری والاشتقاق ۷۰ والبلدان وراجع ایضاً غریب ابی عبید (۳: ۲۶۷۔۲۶۸).

جیسے اَجْبَلَ کے معنیٰ ہیں وہ پہاڑ پر چلا گیا اور اَتْھَمَ کے معنیٰ وہ تہامہ میں چلا گیا۔

لہٰذا آیت:

﴿سُبْحَانَ الَّذِیٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ﴾ کے معنیٰ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو وسیع اور کشادہ سرزمین میں لے گیا۔ نیز سَرَاۃ ہر چیز کے افضل اور اعلیٰ حصہ کو بھی کہتے ہیں اسی سے سَرَاۃُ النَّھَارِ ہے جس کے معنیٰ دن کی بلندی کے ہیں اور آیت: ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا﴾ (۱۹۔۲۴) تمہارے پروردگار نے تمہارے نیچے ایک چشمہ پیدا کر دیا ہے۔

میں سِرِیٌّ سے نہر جاری مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سَرْوٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ رفعت کے ہیں اور بلند قدر آدمی کو رَجُلٌ سَرْوٌ کہا جاتا ہے تو لفظ سری سے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اس شرف کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص طور پر نوازا تھا۔

محاورہ ہے۔

سَرَوْتُ الثَّوْبَ عَنِّیْ: میں نے اپنے اوپر سے کپڑا اتار دیا۔

وَسَرَوْتُ الْجُلَّ عَنِ الْفَرَسِ: میں نے گھوڑے سے جھول اتار دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ اسی سے رَجُلٌ سَرِیٌّ ہے کیونکہ بلند قدر آدمی ہوشیار رہتا ہے گویا وہ کپڑے اتارے ہوئے ہے اس کے برعکس کاہل سست اور ناتوان آدمی کو مُتَدَثِّرٌ مُتَزَمِّلٌ اور زُمَیْلٌ وغیرہ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے کپڑوں میں لپٹا ہوا ہے اور السَّارِیَۃُ اس جماعت کو کہتے ہیں جو رات کو سفر کرتی ہو اور اس کے معنیٰ رات کے بادل اور ستون بھی آتے ہیں۔

(س ط ح)

اَلسَّطْحُ: مکان کے اوپر کے حصے، یعنی چھت کو کہتے ہیں اور سَطَحْتُ الْبَیْتَ کے معنیٰ چھت ڈالنے کے ہیں۔ لیکن سَطَحْتُ الْمَکَانَ کے معنیٰ کسی جگہ کو چھت کی طرح ہموار کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ﴾ (۸۹۔۲۰) اور زمین کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی۔

اِنْسَطَحَ الرَّجُلُ کے معنیٰ چت لیٹنے کے ہیں اور (بنی ذئب کے) ایک کاہن کا نام سَطِیحٌ مشہور ہو گیا تھا کیونکہ وہ زمانت (کی مرض میں مبتلا ہونے) کے باعث زمین پر پڑا رہتا تھا۔

اَلمِسْطَحُ: خیمہ کا ستون جس پر خیمہ نصب کیا جاتا ہے۔

سَطَحْتُ الثَّرِیْدَۃَ فِی الْقَصْعَۃِ: میں نے پیالہ میں ثرید کو پھیلایا۔

(س ط ر)

اَلسَّطْرُ وَالسَّطَرُ: قطار کو کہتے ہیں خواہ کسی کتاب کی ہو یا درختوں اور آدمیوں کی۔ اور سَطَرَ فُلَانٌ کَذَا کے معنیٰ ایک ایک سطر کر کے لکھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ﴾ (۶۸۔۱) ن، قلم کی اور جو اہل قلم لکھتے ہیں اس کی قسم۔

﴿وَکِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ﴾ (۵۲۔۲) اور کتاب جو لکھی ہوئی ہے۔

﴿کَانَ ذَالِكَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُوْرًا﴾ (۳۳۔۶)

یہ حکم کتاب (یعنی قرآن پاک) میں لکھ دیا گیا ہے۔ یعنی محفوظ اور ثابت ہے۔

اور سَطْرٌ کی جمع اَسْطُرٌ وَسُطُوْرٌ وَاَسْطَارٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۲۷) اِنِّیْ وَاَسْطَارِ سُطِرْنَ لَنَا سَطْرًا

یعنی قسم ہے قرآن کی سطروں کی کہ میں...... اور آیت ہے:

﴿اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۶۔۲۵) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ میں مبرد نے کہا ہے کہ یہ اُسْطُوْرَۃٌ کی جمع ہے جیسے اُرْجُوحَۃٌ کی جمع اَرَاجِیْحُ اور اُثْفِیَۃٌ کی جمع اَثَافِیُّ اور اُحْدُوثَۃٌ کی جمع اَحَادِیْثُ آتی ہے۔

اور آیت:

﴿وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ مَّاذَا اَنْزَلَ رَبُّکُمْ قَالُوْا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۱۶۔۲۴) اور جب ان (کافروں سے) کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔

یعنی انہوں نے بزعم خود یہ کہا ہے کہ یہ جھوٹ موٹ کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ان کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَھَا فَھِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا﴾ (۲۵۔۵) (اور کہتے ہیں کہ یہ) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے وہ صبح و شام ان کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ اور آیت:

﴿فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُسَیْطِرٍ﴾ (۸۸۔۲۱،۲۲) تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔

میں لفظ مُسَیْطِرٍ اور اسی طرح آیت:

﴿اَمْ ھُمُ الْمُسَیْطِرُوْنَ﴾ (۵۲۔۳۷) یا یہ (کہیں کے) داروغہ ہیں۔

میں مُسَیْطِرُوْنَ، تَسَیْطَرَ فُلَانٌ عَلٰی کَذَا وَسَیْطَرَ عَلَیْهِ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کی حفاظت کے لئے اس پر سطر کی طرح سیدھا کھڑا ہونے کے ہیں۔ پس آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم ان پر (نگہداشت کے لئے) مقرر نہیں ہو۔ اور یہاں مُسَیْطِرٌ کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:

﴿اَفَمَنْ ھُوَ قَآئِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ﴾ (۱۳۔۳۳) تو کیا جو (خدا) ہر متنفس کے اعمال کا نگران (ونگہبان) ہے۔

میں قَآئِمٌ کا۔ اور آیت:

﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِحَفِیْظٍ﴾ میں حفیظ کا لفظ ہے۔ بلکہ بعض نے تو آیت: ﴿لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُسَیْطِرٍ﴾ کے معنیٰ ہی ﴿لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِحَفِیْظٍ﴾ کئے ہیں لہٰذا مُسَیْطِرٌ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:

---

[1] قاله رؤبة بن العجاج وتمامه: القائل يانصر نصراً والشطر في الخزانة (٢: ١٩) وفي الشطر الثاني بحث قرءوه على ثلاثة اوجه وفي الباب للصاغاني و (بالصاد المهملة) مصحف والصواب المعجمة وهواسم الحاجب وتبعه صاحب القاموس ليكنه خطأ والبيت من شواهد الكشاف ٥٢ والطبري (٢٩-١٨) ومجازالقرآن لابي عبيدة (٢: ٢٣٠-٤٦٤) وفي رواية وايات بدل واسطا والشنتمري (١: ٣٠٤) والسيوطي ٧٤ وديوانه ١٧٤ (ط ليبسك) واللسان والصحاح سطر والرجز مما استشهد به النحويون توابع المنادى انظر السيوطي وابن يعيش في شرح المفصل وابن ليعون في شرح ابيات الايضاح وحاشية امير على المغني (٢: ٥١) والدسوقي (٢: ٤٦) والشنز ور ٤٣٧ وابن هشام رقم ٧٢٧.

﴿وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (۴۳۔۸۰) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔

میں کتابت کا لفظ ہے اور یہ کتابت وہی ہے جو کہ آیت:

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذَالِكَ فِيْ كِتَابٍ اِنَّ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (۲۲۔۷۰) کیا تم نہیں جانتے کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے خدا اس کو جانتا ہے یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ سب کچھ آسان ہے۔ میں مذکور ہے۔

(س ط و)

اَلسَّطْوَةُ: (تعدیہ بواسطہ باء) کے معنیٰ کسی کو سختی سے پکڑنے کے ہیں۔ جیسے سَطَابِهٖ (ن) اس کو سخت پکڑا یا اس پر حملہ کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِنَا﴾ (۲۲۔۷۲) قریب ہوتے ہیں کہ جو لوگ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں ان پر حملہ کردیں۔ یہ اصل میں سَطَا الْفَرْسُ (ن) عَلَى الرَّمْكَةِ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ نر گھوڑے کے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اپنی مادہ پر چڑھ جانے کے ہیں خواہ بوجہ نشاط کے ہو یا جفتی کی غرض سے۔ اسی طرح سَطَا الرَّاعِيْ عَلَى النَّاقَةِ کے معنیٰ چرواہے کے اونٹنی کے فرج میں ہاتھ ڈال کر اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکالنے کے ہیں۔ [1]

پھر استعارہ کے طور پر طَغْوٌ کی طرح سَطْوَةٌ کا لفظ بھی پانی کی زیادتی پر بولا جاتا ہے اور طَغَى الْمَاءُ وَسَطَا کے معنیٰ پانی کی طغیانی میں آجانے کے ہیں۔

(س ع د)

اَلسَّعْدُ وَالسَّعَادَةُ: (خوش نصیبی) کے معنیٰ ہیں حصول خیر میں امور الٰہیہ کا انسان کے لئے ممد اور معاون ہونا۔ اس کی ضد شَقَاوَةٌ (بدبختی) ہے سَعِدَ (لازم کے معنیٰ نیک بخت ہونے اور اَسْعَدَهُ اللّٰهُ کے معنیٰ نیت بخت کرنے کے ہیں۔ سَعِيْدٌ (نیک بخت) جمع سُعَدَاءُ) اور سب سے بڑی سعادت مندی جنت میں جانا ہے اسی لئے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ﴾ (۱۱۔۱۰۸) اور جو نیک بخت ہوں گے وہ بہشت میں (داخل کئے جائیں گے۔

اور فرمایا:

﴿فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ﴾ (۱۱۔۱۰۵) پھر ان میں سے کچھ بد بخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔

اَلْمُسَاعَدَةُ: (کار خیر میں مدد کرنا) کے معنیٰ ایسے کام میں معاونت کے ہیں جس میں سعادت کا گمان ہو۔ اور لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ کے معنیٰ یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بہت زیادہ سعادت بخشے اور تمہاری مساعدت فرمائے۔ لیکن پہلے معنیٰ زیادہ بہتر ہیں۔

اَلْاِسْعَادُ: خاص کر نوحہ خوانی میں کسی کی مدد کرنا۔ جیسے محاورہ ہے:

اِسْتَسْعَدْتُهٗ فَاَسْعَدَنِيْ: میں نے اس سے مدد مانگی تو اس نے میری مدد کی۔

اَلسَّاعِدُ: کلائی یا بازو کو کہتے ہیں (کیونکہ انسان دفاع اسی کے زور سے کرتا ہے تو) گویا اس میں مُسَاعَدَةٌ کے

[1] وفي الحديث لابأس ان يسطوالرجل على المرئة اذاخيف عليها و لم توجد امرأة تعالجها (النهاية).

معنیٰ پائے جاتے ہیں اسی بنا پر پرند کے بازوں کو سَاعِدَیْنِ کہا جاتا ہے جیسا کہ (معنیٰ قوت کے لحاظ سے) انہیں یَدَیْنِ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اَلسَّعْدَانَۃُ: ایک خاردار گھاس جس کے کھانے سے اونٹنی کا دودھ بڑھ جاتا ہے۔ اسی لئے مثال مشہور ہے۔ [1]

مَرْعًی وَلَا کَالسَّعْدَانَۃِ کہ گھاس تو ہے لیکن سَعدانۃ کی سی نہیں۔ اَلسَّعْدَانَۃ کے معنیٰ کبوتر، تسمہ کی گرہ اور اونٹ کے سینہ کے بھی آتے ہیں۔ اور سَعُوْدُ الْکَوَاکِبِ مشہور دس ستارے ہیں جن میں سے ہر ایک کو سَعْدٌ کہا جاتا ہے۔

(س ع ر)

اَلسَّعْرُ: کے معنیٰ آگ بھڑکنے کے ہیں۔ اور سَعَرْتُ النَّارَ وَاَسْعَرْتُھَا کے معنیٰ آگ بھڑکانے کے۔ مجازاً لڑائی وغیرہ بھڑکانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اِسْتَعَرَا لْحَرْبُ: لڑائی بھڑک اٹھی اِسْتَعَرَ اللُّصُوصُ: ڈاکو بھڑک اٹھے۔ یہ اِشْتَعَلَ کے ہم معنیٰ ہے اور نَاقَۃٌ مَسْعُوْرَۃٌ کے معنیٰ دیوانی اونٹنی کے ہیں جیسے مُوقَدَۃٌ وَمُھَیَّجَۃٌ کا لفظ اس معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔

اَلْمِسْعَرُ: آگ بھڑکانے کی لکڑی (کہنی) لڑائی بھڑکانے والا۔

اَلسُّعَارُ: آگ کی تپش کو کہتے ہیں اور سَعَرَ الرَّجُلُ کے معنیٰ آگ یا گرم ہوا سے جھلس جانے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا﴾ (۴۔۱۰) اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

﴿وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ﴾ (۸۱۔۱۲) اور جب دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی۔

﴿عَذَابُ السَّعِیْرِ﴾ (۶۷۔۵) دہکتی آگ) کا عذاب (تیار کر رکھا ہے۔

تو یہاں سَعِیْرٌ بمعنیٰ مَسْعُوْرٌ ہے۔

نیز قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلَالٍ وَّ سُعُرٍ﴾ (۵۴۔۴۷) بے شک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں۔

السُّعْرُ کے معنیٰ مروجہ نرخ کے ہیں اور یہ استعارہ النار (آگ کا بھڑکنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

(س ع ی)

اَلسَّعْیُ: تیز چلنے کو کہتے ہیں اور یہ عَدْوٌ (سرپٹ دوڑ) سے کم درجہ (کی رفتار) ہے) (مجازاً) کسی اچھے یا برے کام کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا﴾ (۲۔۱۱۴) اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو۔

﴿نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ﴾ (۶۶۔۸) (بلکہ)

---

[1] انظر للمثل الکامل (۹۔۱۰) کالسعدان بدون الهاء قال الشاعر: ماءٌ والاکصداء مرعیً ولا کالسعدان یضرب للشیء الذی فیه فضل وغیره افضل اول من قال ذالك خنساء بنت عمرو بن الشرید وحکی انه لامرئة من طیی تزوجها امرؤ القیس (لا) حجر الکندی انظر المثل والقصة المیدانی رقم ۳۸۳۷ و۳۸۴۳ والسمط ۳۶۴ والفاخر رقم ۱۲۱ والعسکری ۱۸۷ ۲/۲۰۲ والضبی ۵۴، ۶۹ والالفاظ ۵۵۷ والنویری ۳: ۵۱ والمستقصی ۱۲.

ان کا نور (ایمان) ان کے آگے...... چل رہا ہوگا۔

﴿وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا﴾ (۵۔۳۳) اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں۔

﴿وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا﴾ (۲۔۲۰۵) اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں (فتنہ انگیزی کرنے کے لئے) دوڑتا پھرتا ہے۔

﴿وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ﴾ (۵۳۔۳۹،۴۰) اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

﴿وَأَنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ﴾ (۹۲۔۴) تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔

﴿وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا﴾ (۱۷۔۱۹) اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

﴿فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ﴾ (۲۱۔۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔

لیکن اکثر طور پر سَعْیٌ کا لفظ افعال محمودہ میں استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۲۸) إِنْ أَجْزِ عَلْقَمَةَ بْنَ سَيْفٍ سَعْيَهُ
لَا أَجْزِهِ بِبَلَاءِ يَوْمٍ وَاحِدِ

اگر میں علقمہ بن سیف کو اس کی مساعی کا بدلہ دوں تو اک دن کے حسن کردار کا بدلہ نہیں دے سکتا اور قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ﴾ (۳۷۔۱۰۲) جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا۔

یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹا سکے اور مناسک حج میں سَعْیٌ کا لفظ صفا اور مروہ کے درمیان چلنے کے لئے مخصوص ہو چکا ہے اور سِعَايَة کے معنیٰ خاص کر چغلی کھانے اور صدقہ وصول کرنے کے آتے ہیں اور مُكَاتَب غلام کے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لئے مال کمانے پر بھی سِعَايَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مُسَاعَدَةٌ کا لفظ فسق و فجور اور مَسْعَادَةٌ کا لفظ اچھے کاموں کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ﴾ (۲۲۔۵۱) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں اپنے زعم باطل میں ہمیں عاجز کرنے کے لئے سعی کی۔ میں سعی کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے ہماری نازل کردہ آیات میں ہمارے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے پوری طاقت صرف کر ڈالی۔

(س غ ب)

اَلْمَسْغَبَةُ: (س ن) بھوک۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ﴾ (۹۰۔۱۴) یا بھوک کے دن کھانا کھلانا۔

میں مَسْغَبَةٌ سَغَبٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ بھوک سے درماندہ ہوجانے کے ہیں اور پیاس سے نڈھال ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے: سَغَبَ

---

❶ قاله الغدكي في مدح علقمة بن سيف العتابي وللشعر قصة انظر التبريزي والبيت في الحماسة (۲: ۲۶۷) والمرزوقي رقم ۶۷۹ واللسان (لمم) والبيان (۳: ۱۳۸) والمعجم للمرزباني والبيت معزو للمرناق الطائي وفي المطبوع بن سعد والتصحيح من البيان وشرح الحماسة والبيت ايضاً في الحيوان (۳: ۴۶۷) في ثلاثة ۱۲.

(س)سَغَبًا وَسُغُوْبًا وَهُوَ سَاغِبٌ اورصفت کا صیغہ سَغْبَانٌ مثل عَطْشَانٌ بھی آتا ہے۔

(س ف ر)

اَلسَّفْرُ: اصل میں اس کے معنیٰ "کشف غطاء یعنی پردہ اٹھانے کے ہیں اور یہ اَعْیَان کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے سَفَرَ الْعِمَامَةَ عَنِ الرَّأْسِ: اس نے سر سے عمامہ اتار دیا۔سَفَرَ عَنِ الْوَجْهِ: چہرہ کھولا اور سَفْرُ الْبَیْتِ کے معنیٰ گھر میں جھاڑو دینے اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے ہیں اور جھاڑو کو مِسْفَر اور اس گرد وغبار کو سَفِیْرٌ کہا جاتا ہے جو جھاڑو دے کر دور کی جاتی ہے۔

اَلْاِسْفَارُ: (افعال) یہ الوان کے ساتھ مختص ہے یعنی کسی رنگ کے ظاہر ہونے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ﴾ (۷۴۔۳۴) اور قسم ہے۔صبح کی جب روشن ہو۔اور فرمایا:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ﴾ (۸۰۔۳۸) کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے۔

اور حدیث [1]

(۱۷۶) اَسْفِرُوْا بِالصُّبْحِ تُوْجَرُوْا: صبح خوب روشن ہونے کے بعد نماز پڑھا کرو تو زیادہ ثواب ملے گا۔ میں اَسْفِرُوْا اَسْفَرْتُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ روشنی میں داخل ہونے کے ہیں۔جیسے اَصْبَحْتُ (میں صبح میں داخل ہوا)

سَفَرَ الرَّجُلُ: اس نے سفر کیا اور سَافَرَ (مسافر) کی جمع سَفْرٌ آتی ہے۔جیسے رَاكِبٌ کی جمع رَكْبٌ (وعلیٰ ہذا القیاس)

اور سَافَرَ کے معنیٰ ہیں "اس نے سفر کیا" یہ خاص کر باب مفاعلہ سے آتا ہے گویا اس میں جانبین یعنی وطن اور آدمی کے ایک دوسرے سے دور ہونے کے معنیٰ کا لحاظ کیا گیا ہے۔اور سَفَرٌ سے ہی سُفْرَةٌ کا لفظ مشتق ہے جس کے معنیٰ طعام سفر یا توشہ دان ہیں جس میں سفری کھانا رکھا جاتا ہے۔قرآن میں ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ (۴۔۴۳) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو۔

اَلسِّفْرُ: اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حقائق کا بیان ہو گویا وہ حقائق کو بے نقاب کرتی ہے اس کی جمع اَسْفَارٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (۶۲۔۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

یہاں مُمَثَّلٌ بِهٖ میں خصوصیت کے ساتھ اَسْفَارَ کا لفظ ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ تورات اگرچہ اپنے مضامین کو محقق طور پر بیان کرتی ہے لیکن جاہل (یہود) پھر بھی اس کو نہیں سمجھ پاتے۔ لہٰذا ان کی مثال بعینہٖ اس گدھے کی سی ہے جو علم وحکمت کے پشتارے اٹھائے ہوئے ہو اور آیت: ﴿بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ (۸۰۔۱۵،۱۰۶) (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار نیکوکار ہیں۔ میں سَفَرَة سے مراد وہ

---

[1] كذا رواه الشافعي في اختلاف الحديث (۲۰۷) والمعروف من الفاظ الحديث اسفر وابالفجر فانه اعظم للاجر من حديث رافع بن خديج رواه الترمذي والشافعي في الرسالة رقم ۴۷۳ وابن حبان في زوائده رقم ۲۶۴ ـ ۲۶۵ وفي ۲۶۳ اصبحوا بالصبح .

فرشتے ہیں جنہیں دوسری جگہ ﴿كِـرَامًـا كَـاتِبِيْنَ﴾ (۸۲۔۱۱) (عالی قدر لکھنے والے۔) کہا ہے اور یہ سَافِرٌ کی جمع ہے۔ جیسے كَاتِبٌ کی جمع كَتَبَةٌ۔

اَلسَّفِيْرُ: اس فرستادہ کو کہا جاتا ہے جو مُرْسِلٌ کی غرض کو مُرْسَلُ اِلَيهِ پر کھولتا اور فریقین سے منافرت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ فَـعِيْـلٌ بمعنیٰ فاعل سے ہے اور سِفَارَةٌ بمعنیٰ رسالت آتا ہے پیغمبر، فرشتے اور (سماوی) کتابیں لوگوں پر حقائق کی کشادگی کرنے میں باہم شریک ہیں (اس لئے ان سب کو سَـفِيْـرٌ کہہ سکتے ہیں۔) اور سَـفِيْـرٌ (فعیل) بمعنیٰ مفعول ہو تو اس کے معنیٰ کوڑا کرکٹ کے ہوتے ہیں۔ جو جھاڑو دے کر صاف کر دیا جاتا ہے۔ اور شاعر کے قول ❶

(۲۲۹) وَمَـا السِّـفَـارُ قُبِّحَ السُّفَارِ

میں بعض نے سِفَار کے معنیٰ اس لوہے کے کئے ہیں جو اونٹ کی ناک میں ڈالا جاتا ہے اور اس معنیٰ پر اگر اس شعر کے علاوہ اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہ سَافَرْتُ (مفاعلہ) کا مصدر بھی ہوسکتا ہے۔ ❷

(س ف ع)

اَلسَّــفْـعُ: کے معنیٰ گھوڑے کو سوار ناصیہ یعنی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَـنَسْـفَـعاً بِالنَّاصِيَةِ﴾ (۹۶۔۱۵) تو ہم (اس کی) پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

اور سیاہی کے معنیٰ کے اعتبار سے چولہے کے پتھروں (اَثَـافِيُّ) کو بھی سُـفْعٌ کہا جاتا ہے اور محاورہ ہے: بِـهٖ سُفْعَةُ غَضَبٍ اس کے چہرہ پر غصے کا اثر ہے کیونکہ سخت غصہ کے وقت چہرہ کا رنگ دخانی سا ہو جاتا ہے۔ اور شکرے کو اَسْـفَـعُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پردوں میں سیاہ چمک سی پائی جاتی ہے۔ اور اِمْـرَاَئَةٌ سَفعَاءُ اللَّونِ سیاہ رنگ عورت کو کہتے ہیں۔

(س ف ک)

اَلسَّفْكُ (ض) کے معنیٰ خون ریزی کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَسْـفِكُ الـدِّمَـآءَ﴾ (۲۔۳۰) اور کشت و خون کرتا پھرے۔

ویسے یہ لفظ ہر سیال چیز اور آنسو بہانے کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔

(س ف ل)

اَلسُّفْلُ یہ عُلُوٌّ کی ضد ہے اور سَفُلَ (سُفُوْلًا) فَهُـوَ سَـافِـلٌ کے معنیٰ پست اور حقیر ہونے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُـمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾ (۹۶۔۵) پھر (رفتہ رفتہ) اس کی حالت کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا۔

نیز فرمایا:

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى﴾ (۹۔۴۰) اور کافروں کی بات کو پست کر دیا۔

کبھی اَسْــفَـلُ "فَـوْقٌ" کے بالمقابل بھی استعمال ہوتا

---

❶ لم اجده.

❷ کماقال حسان رضی اللہ عنہ: لولاالسفار وبعده خرق مهمه۔ لترکتها تحبوعلی العرقوب وقول الاخطل یؤید قول البعض وموقع اثر السفار بخطمه من سود عقة اوبنی الجوال ۱۲۔

ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ (۳۳۔۸) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر (چڑھ) آئے۔

سُفَالَةُ الرِّيحِ: ہوا کی بائیں جانب یعنی جدھر کو چل رہی ہو۔اس کی ضد عُلَاوَةٌ ہے جس کے معنیٰ اوپر کی جانب کے ہیں یعنی جس طرف سے آ رہی ہو۔

اَلسِّفْلَةُ: کمینے لوگ۔جیسے دُوْنٌ۔

اَمْرُهُمْ فِي سَفَالٍ: ان کا معاملہ انحطاط میں ہے یعنی ان کی حالت دگرگوں ہے۔

(س ف ن)

اَلسَّفْنُ: اس کے اصل معنیٰ چوب اور چمڑا وغیرہ کو چھیلنے کے ہیں۔اور سَفَنَ الرِّيحُ التُّرَابَ عَنِ الْاَرْضِ کے معنیٰ ہیں، ہوا نے زمین سے مٹی کو گھس ڈالا۔شاعر نے کہا ہے۔❶

(۲۳۰) فَجَاءَ خَفِيًّا يَسْفِنُ الْاَرْضَ صَدْرَهٗ

وہ زمین پر اپنا سینہ رگڑتے ہوئے پوشیدہ طور پر وہاں جا پہنچا۔اور تراشی ہوئی چیز کو سَفْنٌ (فعل بمعنیٰ مفعول) کہتے ہیں جیسے نِقْضٌ بمعنیٰ منقوض آ جاتا ہے اور اَلسَّفْنُ خاص کر اس کھردرے چمڑے کو کہا جاتا ہے جس کو تلوار کے قبضہ پر لگاتے ہیں اور چوب تراشی کے اوزار کو بھی سَفَنٌ کہا جاتا ہے۔جیسے تیشہ وغیرہ۔اور چھیلنے کے معنیٰ کے لحاظ سے کشتی کا نام سَفِيْنَةٌ رکھا گیا ہے۔کیونکہ وہ بھی سطح آب کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَمَّا السَّفِيْنَةُ﴾ (۱۸۔۷۹) لیکن کشتی پھر مجازاً کشتی کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر آرام دہ سواری کو سَفِيْنَةٌ کہا جاتا ہے۔

(س ف ه)

اَلسَّفَهُ: اس کے اصل معنیٰ جسمانی ہلکا پن کے ہیں اسی سے بہت زیادہ مضطرب رہنے والی مہار کو زِمَامٌ سَفِيْهٌ کہا جاتا ہے اور ثَوبٌ سَفِيْهٌ کے معنیٰ ردی کپڑے کے ہیں۔پھر اس سے یہ لفظ نقصان عقل کے سبب خفت نفس کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ❷ جو اصل میں سَفِهَ نَفْسُهٗ ہے پھر اس سے فعل کی نسبت قطع کر کے بطور تمیز کے اسے منصوب کر دیا ہے۔جیسے بَطِرَ مَعِيْشَتَهٗ کہ یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِيْشَتُهٗ ہے۔❸

اور سَفَهٌ کا استعمال امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق ہوتا ہے چنانچہ امور دینوی میں سفاہت کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ﴾ (۴۔۵) اور بے عقلوں کو ان کا مال......مت دو۔

---

❶ قاله امرء القيس يصف رَبِيئًا يسفن اى يمسح وعجزه : ترى الترب منه لاصقاً كل ملصق والبيت في اللسان (سفن) وديوانه ۹۰ (صنعة السندوبى) والعقد الثمين ۱٤۱ والمعانى الكبير ۷۷۷ ومختار الشعر الجاهلى (۱ : ٦۱) ونقدالشعرا (٥٦) وفيه لازقا كل ملزق وحضيا(بالمهملة) والبيت ايضاً فى تهذيب اصلاح المنطق (۱ : ۹۷) وفى الاصلاح ٥٤٠ ويروئ لبعض الطائيين ۱۲.

❷ وفى الاية (۲ : ۱۳۰) الامن سفه نفسه .

❸ وفيه اختلاف قال المبرد انه متعدبنفسه فلاتاويل كماورد فى الحديث الكبير ان تسفه الحق وعند البعض منصوب على التمييز كما ذَهَبَ اليه المؤلف راجع الكشاف .

اور سفاہت اخروی کے متعلق فرمایا:

﴿وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا﴾ (۷۲۔۴) اور یہ کہ ہم میں سے بعض بے وقوف خدا کے بارے میں جھوٹ افتراء کرتے ہیں۔

یہاں سفاہت دینی مراد ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے اور آیت کریمہ:

﴿اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ﴾ (۲۔۱۳) تو کہتے ہیں کیا اسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں؟

میں ان کو سفیہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ ان کا مؤمنین کو سُفَهَآءُ کہنا بنا برحماقت ہے اور خود ان کی نادانی کی دلیل ہے۔اسی معنیٰ میں فرمایا:

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَاوَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ (۲۔۱۴۲) احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ پر (پہلے چلے آتے تھے) اب اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے۔

(س ق ر)

سَقَرٌ: (جہنم) یہ اصل میں سَقَرَتْهُ الشَّمْسُ وَصَقَرَتْهُ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں اسے دھوپ نے جھلس دیا اور پگھلا دیا۔پھر جہنم کا علم بن گیا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ﴾ (۷۴۔۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

اور نیز فرمایا:

﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ (۵۴۔۴۸) اب آگ کا مزہ چکھو۔

پھر چونکہ سَقَرَ اپنے اصل کے لحاظ سے جھلسا دینے کے معنیٰ کو مقتضی ہے اس لئے آیات:

﴿وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ﴾ (۷۴۔۲۷تا۲۹) اور تم کیا سمجھتے ہو کہ سقر کیا ہے؟ (وہ آگ ہے کہ) نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی اور بدن کو جھلس کر سیاہ کردے گی۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ سقر کے جو احوال تم مشاہدہ سے جانتے ہو اس کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے۔

(س ق ط)

اَلسُّقُوْطُ: (ن) اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کے اوپر سے نیچے جھک جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا﴾ (۵۲۔۴۴) اور اگر یہ آسمان (سے عذاب) کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں۔

﴿فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۶۔۱۸۷) تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لاگراؤ۔

اور اس کے معنیٰ قدر و قیمت اور مرتبہ کے لحاظ سے گر جانا بھی آتے ہیں۔جیسے فرمایا:

﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ (۹۔۴۹) دیکھو یہ آفت میں پڑ گئے۔

اَلسَّقَطُ وَالسُّقَاطَةُ: ناکاری اور ردی چیز کو کہتے ہیں اور اسی سے رَجُلٌ سَاقِطٌ ہے جس کے معنیٰ کمینے آدمی کے ہیں۔اَسقَطَهٗ كَذَا: فلاں چیز نے اس کو ساقط کردیا۔

اور اَسْقَطَ الْمَرْئَةُ: (عورت نے ناتمام حمل گرادیا) میں اوپر سے نیچے گرنا اور ردی ہونا دونوں معنیٰ اکٹھے پائے جاتے ہیں۔کیونکہ اَسْقَطَتِ الْمَرْأَةُ: اس وقت بولتے

ہیں جب عورت ناتمام بچہ گرادے اور اسی سے ناتمام بچہ کو سَقْطٌ یاسِقْطٌ کہا جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر چقماق کی ہلکی سی (ناقص) چنگاری کو سِقْطُ الزَّنْدِ کہا جاتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کبھی اس کے ساتھ بچہ کو بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيْدِيْهِمْ﴾ (۷۔۱۴۹) اور جب وہ نادم ہوئے۔

میں پشیمان ہونا مراد ہے۔ [1] اور آیت:

﴿تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾ (۹۔۲۵) تم پر تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔

میں ایک قرأت تَسَّاقَطْ بھی ہے اور اس کا فاعل نَخْلَةٌ ہے اور ایک قرأت میں تَسَاقَطْ ہے جو اصل میں تَتَسَاقَطُ فعل مضارع کا صیغہ ہے اس میں ایک تاء محذوف ہے اس صورت میں یہ باب تفاعل سے ہوگا اور یہ اگرچہ فَاعَلَ کا مطاوع آتا ہے لیکن کبھی متعدی بھی ہوجاتا ہے۔ اور ایک دوسری قرأت میں يَسَّاقَطْ (صیغہ مذکر) ہے اس صورت میں اس کا فاعل جِذْعٌ ہوگا۔ [2]

(س ق ف)

سَقْفُ الْبَيْتِ: مکان کی چھت کو کہتے ہیں اس کی جمع سُقُفٌ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ﴾ (۴۳۔۳۳) (ہم) ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنادیتے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالسَّقْفُ الْمَرْفُوْعِ﴾ (۵۲۔۵) اور اونچی چھت کی (قسم) میں مراد آسمان ہے جیسا کہ آیت:

﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ (۲۱۔۳۲) میں آسمان کو محفوظ چھت فرمایا ہے۔

اور ہر وہ جگہ جو مُسَقَّفٌ ہو اسے سقیفہ کہا جاتا ہے۔ جیسے صُفَّةٌ (چبوترہ) مکان وغیرہ۔

اور چھت کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس لمبی چیز کو جس میں خم سا پایا جائے سَقْفٌ کہہ دیتے ہیں۔

(س ق م)

اَلسَّقَمُ وَالسُّقْمُ: خاص کر جسمانی بیماری کو کہتے ہیں۔ بخلاف مَرَضٌ کے کہ وہ جسمانی اور قلبی دونوں قسم کی بیماریوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ (۲۔۱۰) ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا۔ اور آیت:

﴿فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ﴾ (۳۷۔۸۹) اور کہا میں تو بیمار ہوں۔ میں سَقِيْمٌ کا لفظ یا تو تعریض کے طور پر استعمال ہوا ہے اور یہ زمانہ ماضی یا مستقبل کی طرف اشارہ کے لئے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس ہلکی سی بدنی تکلیف کی طرف اشارہ ہو جو اس وقت ان کو عارض تھی۔ کیونکہ انسان بہرحال کسی نہ کسی عارضہ میں مبتلا رہتا ہے اگرچہ وہ اسے محسوس نہ کرے اور خوف ناک جگہ کو مَكَانٌ سَقِيْمٌ کہا جاتا ہے۔

(س ق ی)

اَلسَّقْيُ وَالسُّقْيَا کے معنیٰ پینے کی چیز دینے کے

---

[1] راجع (یدی).

[2] راجع للقرائات التاج (سقط).

ہیں۔اور اِسْقَاءٌ کے معنیٰ پینے کی چیز پیش کردینے کے ہیں تاکہ حسبِ منشالے کر پی لے لہٰذا اِسْقَاء بنسبت سَقْیٌ کے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اِسْقَاء میں مَاسَقٰی مِنْہُ کے پیش کردینے کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ پینے والا جس قدر چاہے اس سے نوش فرمالے۔مثلاً: اَسْقَیْتُہٗ نَھْرًا کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ میں نے اسے پانی کی نہر پر لے جاکر کھڑا کردیا۔چنانچہ قرآن پاک سَقْیٌ کے متعلق فرمایا:

﴿وَسَقَاھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا﴾ (۷۶۔۲۱) اور ان کونہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

﴿وَسُقُوْا مَاءً حَمِیْمًا﴾ (۴۷۔۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔

﴿وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ﴾ (۲۶۔۸۲) اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اور اِسْقَاء کے متعلق فرمایا:

﴿وَاَسْقَیْنَاکُمْ مَاءً فُرَاتًا﴾ (۲۷۔۷۷) اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔

﴿فَاَسْقَیْنَاکُمُوْہُ﴾ (۱۵۔۲۲) اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ میں:

﴿نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِھَا﴾ (۲۳۔۲۱) (کہ) جو ان کے پیٹوں میں ہے اس سے ہم تمہیں (دودھ) پلاتے ہیں۔میں ایک قرأت فتحہ نون کے ساتھ بھی ہے۔

سِقْیٌ کے معنیٰ پانی کا حصہ اور سیراب شدہ زمین دونوں آتے ہیں کیونکہ سِقْیٌ بمعنیٰ مَسْقِیٌّ (اسم مفعول) کے ہے۔جیسے نِقْضٌ بمعنیٰ مَنْقُوْضٌ ہے۔اور یہ دونوں چیزیں بھی مفعول بنتی ہیں اس لئے سِقْیٌ کا لفظ ان دونوں چیزوں پر بولا جاتا ہے۔

اَلْاِسْتِسْقَاءُ کے معنیٰ کسی سے پانی طلب کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی﴾ (۲۔۶۰) اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے (اللہ سے) پانی مانگا۔

اَلسِّقَاءُ: (مشکیزہ) وہ برتن جس میں پینے کی چیز رکھی جائے اسی سے ہے: اَسْقَیْتُكَ جِلْدًا کہ میں نے تمہیں (مشکیزہ بنانے کے لئے چمڑا دیا) اور آیت کریمہ:

﴿جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْہِ﴾ (۱۲۔۷۰) (تو) اپنے بھائی کے شلیتے میں پینے کا برتن رکھ دیا۔

میں سِقَایَةٌ سے مراد وہی ہے جسے (بعد کی آیت میں) صُوَاعَ الْمَلِكِ کہا گیا ہے اس ایک ہی برتن کے یہ دو نام دو اعتبار سے ہیں یعنی اس کے ساتھ پانی پینے کے لحاظ سے اسے سِقَایَةٌ کہا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس کے ساتھ غلہ ماپا جاتا ہے سے صُوَاع کہہ دیا ہے۔

(س ک ب)

مَاءٌ مَسْكُوْبٌ کے معنیٰ بہائے ہوئے پانی کے ہیں۔[1]

اور تیز رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ سَكْبُ الْجَرْیِ کہا جاتا ہے۔محاورہ ہے: سَكَبْتُہٗ فَانْسَكَبَ: میں نے اسے بہایا تو وہ بہہ پڑا اور دَمْعٌ (آنسوؤں) کو بصورت فاعل تصور کرکے۔سَاكِبٌ (بہنے والے) کہا جاتا ہے اور کبھی دَمٌ مُنْسَكِبٌ بھی بولتے ہیں اور باریک کپڑے کو بھی سیال چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر ثَوْبٌ سَكْبٌ کہہ دیتے

---

[1] وفی القران وماء مسکوب (۵۶۔۳۱)۔

ہیں گویا وہ بہتا ہوا پانی ہے۔

(س ک ت)

اَلسُّکُوتُ: (ن) اس کے اصل معنیٰ تو ترکِ کلام یعنی خاموش ہونے کے ہیں۔ اور بہت زیادہ چپ رہنے والے آدمی کو رَجُلٌ سِکِّیْتٌ وَسَاکُوتٌ کہا جاتا ہے اور سَکْتَۃٌ یاسُکَاتٌ مرض سکتہ کو کہتے ہیں اور موسیقی میں سَکْتٌ کا لفظ سکون نفس کے ساتھ مخصوص ہے اور افتتاح صلوٰۃ کی حالت اور قرأت سے فارغ ہونے کے بعد سکوت کرنے کو سَکَتَاتٌ فِی الصَّلٰوتِ کہا جاتا ہے۔

اَلسُّکَّیْتُ: دوڑ میں سب سے آخر آنے والا گھوڑا۔ پھر چونکہ سُکُوْتٌ میں ایک گونہ سکون پایا جاتا ہے۔ اس لئے آیت:

﴿وَلَمَّا سَکَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ﴾ (۷۔۱۵۴)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا۔

میں بطور استعارہ غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَکَتَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(س ک ر)

اَلسُّکْرُ: اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اس کا نام استعمال شراب کی مستی پر ہوتا ہے اور کبھی شدت غضب یا غلبۂ عشق کی کیفیت کو سُکر سے تعبیر کرلیا جاتا ہے اسی لئے شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۳۱) سُکْرَانِ سُکْرَ ھَوًی وَسُکْرَ مُدَامِ

نشے دو ہیں ایک نشۂ محبت اور دوسرا شراب۔

اور اسی سے سَکَرَاتُ الْمَوتِ (موت کی بے ہوشی) ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَاءَتْ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (۵۰۔۱۹)

اور موت کی بے ہوشی حقیقت کھولنے کو طاری ہو گئی۔

اَلسَّکَرُ: (بفتح السین والکاف) نشہ آور چیز۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَتَّخِذُوْنَ مِنْہُ سَکَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا......﴾ (۱۶۔۶۷) کہ ان سے شراب بناتے ہو اور عمدہ رزق (کھاتے ہو)

اور شراب سے انسان اور اس کی عقل کے درمیان بھی چونکہ دیوار کی طرح کوئی چیز حائل ہو جاتی ہے اس اعتبار سے سَکْر کے معنیٰ پانی کو بند لگانے اور روکنے کے آجاتے ہیں اور اس بند کو جو پانی روکنے کے لئے لگایا جائے سِکْرٌ کہا جاتا ہے۔ (یہ فعل بمعنیٰ مفعول ہے) اور آیت:

﴿اِنَّمَا سُکِّرَتْ اَبْصَارُنَا......﴾ (۱۵۔۱۵) کہ ہماری آنکھیں مخمور ہو گئی ہیں۔ میں سُکِّرَتْ بعض کے نزدیک سُکْر سے ہے اور بعض نے سَکْر سے لیا ہے اور پھر سِکْر سے سکون کے معنیٰ لے کر پر سکون بات کو لَیْلَۃٌ سَاکِرَۃٌ کہا جاتا ہے۔

(س ک ن)

اَلسُّکُوْنُ: (ن) حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو سُکُوْنٌ کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سَکَنَ فُلَانٌ مَکَانَ کَذَا کے معنیٰ ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کرلی۔ اسی اعتبار

---

[1] وتمامہ: فمتٰی یفیق فتیً بہ سُکرَان والبیت فی الرسالۃ بغیرعزو وفی المطبوع مدام بغیر ھاء ۱۲.

سے جائے رہائش کو مَسْــکَــنٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَسَاکِنُ آتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَایُـرٰی اِلَّا مَسَـاکِنُهُمْ......﴾ (۴۶۔۲۵) کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔
اور فرمایا:
﴿وَلَـهٗ مَاسَکَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّهَارِ﴾ (۶۔۱۱۳) اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔
﴿وَلِتَسْـکُنُوا فِیْهِ﴾ (۲۸۔۷۳) تاکہ تم اس میں آرام کرو۔
تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سَـکَّـنْتُـهٗ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اَسْکَنْتُهٗ کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿رَبَّنَا اِنِّی اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (۱۴۔۳۷) اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد...... لابسائی ہے۔
﴿اَسْکِنُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ﴾ (۶۵۔۶) (مطلقہ) عورتوں کو (ایام عدت میں) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو۔ اور آیت:
﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَاَسْکَنَّاهُ فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۳۔۱۸) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے ساتھ پانی نازل کیا۔پھر اسے زمین میں ٹھہرایا۔میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وجود میں لانے اور پھر ایجاد کے بعد اس کے نابود کردینے پر قادر ہے (جیسا کہ آیت کے تتمہ: ﴿وَاِنَّا عَلٰی ذَهَابٍ بِهٖ لَقَادِرُوْنَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے) اَلسَّکَنُ کے معنی سَکُوْنٌ کے ہیں اور ہر وہ چیز جس سے راحت حاصل ہو اسے "سَکَنٌ" کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاللّٰـهُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ بُیُوتِکُمْ سَکَنًا﴾ (۱۶۔۸۰) اور خدا ہی نے تمہارے لیے گھروں کو سکون کی جگہ بنایا۔اور فرمایا:
﴿اِنَّ صَـلٰوتَكَ سَکَنٌ لَّهُمْ﴾ (۹۔۱۰۳) تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔
﴿وَجَـعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا﴾ (۶۔۹۷) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام ٹھہرایا۔
اور سَـکَنٌ اس آگ کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ سکون حاصل کیا جاتا ہے۔
اَلسُّکْنٰی: کسی کو بغیر کرایہ کے رہائش کے لئے جگہ دینے کو سُـکْـنٰی کہا جاتا ہے اور ایک مکان میں رہنے والے لوگوں کو سَـکْـنٌ کہا جاتا ہے یہ سَاکِنٌ کی جمع ہے جیسے سَـافِـرٌ کی جمع سَـفْـرٌ آتی ہے۔بعض نے کہا ہے کہ سَـاکِنٌ کی جمع سُـکَّـانٌ (بضمہ سین) آتی ہے اور سَـکَّـانٌ (بفتحہ سین) کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کشتی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔
اَلسِّـکِّیْـنُ: (چھری) کو سکین اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مذبوح کی حرکت کو زائل کردیتی ہے (تو یہ سکون سے فِعِّیْلٌ کے وزن پر اسم مشتق ہے) اور آیت:
﴿اَنْـزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۴۸۔۴) (وہی تو ہے) جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ سَکِیْنَةٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومن کے دل کو تسکین دیتے ہیں۔جیسا کہ امیر المؤمنین

(حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے (اِنَّ السَّکِیْنَۃَ لَتَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ) (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر سَکِیْنَۃٌ گویا ہے اور بعض نے اس سے عقلِ انسانی مراد لی ہے اور عقل کو بھی جب کہ وہ شہوات کی طرف مائل ہونے سے روک دے سَکِیْنَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ......﴾ (۱۳-۲۸)

اور جن کے دل یادِ خدا سے آرام پاتے ہیں۔ بھی اس معنیٰ پر دلالت کرتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سَکِیْنَۃٌ اور سَکَنٌ کے ایک ہی معنیٰ ہیں یعنی رعب اور خوف کا زائل ہونا۔ اور آیت:

﴿اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ (۲-۲۴۸) کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا، اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسلی ہوگی۔

میں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں اور بعض مفسرین نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ وہ چیز تھی جس کا سر بلی کے سر کے مشابہ تھا وغیرہ تو ہمارے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ ❶

اَلْمِسْکِیْنُ: بعض نے اس کی تفسیر مَنْ لَّا شَیْءَ لَہٗ (یعنی جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو) کے ساتھ کی ہے۔ اور یہ فقیر سے ابلغ ہے (یعنی بنسبت فقیر کے زیادہ نادار ہوتا ہے) لیکن آیت:

﴿وَاَمَّا السَّفِیْنَۃُ فَکَانَتْ لِمَسَاکِیْنَ﴾ (۱۸-۷۹)

اور کشتی غریب لوگوں کی تھی۔

میں (باوجود کشتی کا مالک ہونے کے) انہیں مسکین قرار دینا مَایؤُوْلُ کے لحاظ سے ہے یعنی کشتی کے چلے جانے کے بعد کی حالت کے لحاظ سے انہیں مسکین کہا گیا ہے۔ یا اس لئے کہ ان کی احتیاج اور مسکنت کے مقابلہ میں کشتی کی کچھ بھی حیثیت نہ تھی۔ اور آیت:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ﴾ (۲-۶۱)

(اور آخر کار) ذلت (ورسوائی) اور محتاجی (وبے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی۔

میں اصح قول کے لحاظ سے مَسْکَنَۃٌ کی میم زائد ہے (اور یہ سکون سے ہے)

(س ل ل)

سَلَّ (ن) الشَّیْءَ مِنَ الشَّیْءِ کے معنیٰ ایک چیز کے دوسری سے کھینچ لینے کے ہیں، جیسے تلوار کا نیام سے سونتنا، یا گھر سے کوئی چیز چوری کھسکا لینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا﴾ (۲۴-۶۳) جو تم میں سے آنکھ بچا کر چل دیتے ہیں۔

اسی مناسبت سے باپ کے نطفہ پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ......﴾ (۳۲-۸)

خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی۔

وہ ہر جوہر جو غذا کا خلاصہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں بطور کنایہ نطفہ مراد ہے۔ اور نطفہ پر اس کا اطلاق اس جوہر کے لحاظ سے ہے۔ جس سے نطفہ بنتا ہے۔

اَلسُّلُّ: سل کی بیماری کیونکہ یہ انسان سے گوشت اور قوت کو کھینچ لیتی ہے اور اَسَلَّہُ اللّٰہُ کے معنیٰ ہیں ''اللہ

---

❶ وفیھا حکایات غریبۃ (راجع الدر للسیوطی) ۱۲۔

تعالیٰ نے اسے سِل کی بیماری میں مبتلا کر دیا'' حدیث میں ہے۔ ❶

(۱۷۷) لَا اِسْلَالَ وَلَا اِغْلَالَ کہ چوری اور خیانت نہیں ہے۔

تَسَلْسَلَ الشَّیْءِ کے معنیٰ کسی چیز کے مضطرب ہونے کے ہیں۔گویا اس میں بار بار کھسک جانے کا تصور کر کے لفظ کو مکرر کر دیا ہے تاکہ تکرار لفظ تکرار معنیٰ پر دلالت کرے اسی سے سِلْسِلَةٌ ہے جس کے معنیٰ زنجیر کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے ﴿فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا﴾ (۳۲:۶۹) پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے۔(جکڑ دو)

سِلْسِلَةٌ کی جمع سَلَاسِلُ آتی ہے۔چنانچہ فرمایا: ﴿سَلَاسِلَ وَاَغْلَالًا وَّ سَعِیْرًا﴾ (۷۶۔۴) زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ (تیار کر رکھی ہے)

﴿وَالسَّلَاسِلُ یُسْحَبُوْنَ﴾ (۴۰۔۷۱) اور زنجیریں ہوں گی اور گھسیٹے جائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے۔ ❷

(۱۷۸) یَا عَجَبًا لِّقَوْمٍ یُقَادُوْنَ اِلَی الْجَنَّةِ بِالسَّلَاسِلِ: اس قوم پر تعجب ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جا رہے ہیں۔

اور مَاءٌ سَلْسَلٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو اپنی قرار گاہ میں مضطرب ہو کر صاف ہو جائے۔شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۲۳۲) اَشْهٰی اِلَیَّ مِنَ الرَّحِیْقِ السَّلْسَلِ

وہ مجھے شفاف شراب سے زیادہ مرغوب ہے۔

اور آیت: (۷۶۔۱۸) میں سَلْسَبِیْلًا (سلسبیل) کے معنیٰ تیزی سے بہتے ہوئے صاف،لذیذ اور خوشگوار پانی کے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے،اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سَلْ اور سَبِیْل سے بنا ہے اور حَوْقَلَة وَبَسْمَلَةٌ وغیرہ کی طرح الفاظ مرکبہ کے قبیل سے ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ہر تیز رو چشمے کو سَلْسَبِیْل کہا جاتا ہے۔ اور زبان کے باریک سرے کو اَسَلَةُ اللِّسَان کہتے ہیں۔

(س ل ب)

اَلسَّلْبُ: اس کے معنیٰ کسی سے کوئی چیز چھین لینا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ (۲۲۔۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔

اَلسَّلِیْبُ: لٹا ہوا آدمی۔وہ اونٹنی جس کا بچہ چھن گیا اور اَلسَّلَبُ کے معنیٰ چھینی ہوئی چیز اور درخت سے اتاری ہوئی چھال کے ہیں۔اور شاعر کے قول ❹

(۲۳۳) فِی السُّلُبِ السُّوْدِ وَفِی الْاَمْسَاحِ

(سیاہ ماتمی لباس اور ٹاٹ پہنے ہوتے ہیں)

---

❶ غریب ابی عبید (۱: ۱۹۸) وابوداؤد فی الجها دوالحاکم (۴: ۳۲۵) والفائق (۲: ۲۱۳) والطبرانی عن کثیر بن عبدالله عن ابیه عن جده عن عمرو بن عوف سیاتی فی (غلل).

❷ الحدیث باختلاف الفاظه فی (حم، خ، وعن ابی هریرة) راجع کنز العمال (۳: ۱۷۸).

❸ قاله ابو کبیر الهذلی (عامر بن الحلیس) وصدره ام لاسبیل الی الشباب وذکره والبیت فی اللسان (سلسل).

❹ قاله لبید حین شرب عامر بن مالك وغنت له قینتان واختلف فی قرینه ففی اللسان (سلب) یخمشن حراوجه صحاح وفی المحبر (۴۷۳) هذا اول البیت وعجزة ۔ ابنا ملاعب الرماح وبعده: یاعامراً! یاعامر الصحاح ۔ وعامر الکتیبة الرواح۔ وله قصة راجع المحبر والشطر فی الاشتقاق ۳۰۴ واللسان (نوح).

میں بعض نے کہا ہے کہ سیاہ ماتمی لباس مراد ہے جو مصیبت زدہ شخص پہن لیتا ہے اور ماتمی لباس کو سُلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اصل لباس اتار کر اسے پہنا جاتا ہے۔ پھر جیسا کہ اَحَدَّتِ الْمَرْئَۃُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ماتمی لباس پہننے کے ہیں ایسے ہی تَسَلَّبَتِ الْمَرْئَۃُ بھی کہا جاتا ہے اَلْاُسْلُوْبُ طریقہ، روش۔ جمع اَسَالِیْبُ۔

(س ل ح)

اَلسِّلَاحُ: (ساز جنگ) یعنی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ لڑائی کی جائے جیسے تلوار، کمان، نیزہ، چوب دستی وغیرہ (اس کی جمع) اَسْلِحَۃٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلْیَأْخُذُوْا حِذْرَھُمْ وَاَسْلِحَتَھُمْ﴾ (۴۔۱۰۲) اور ہوشیار اور مسلح ہو کر (تمہارے ساتھ نماز ادا کریں)

اَلْاِسْلِیْحُ: ایک قسم کی گھاس ہے جس کے کھانے سے اونٹ موٹے ہوجاتے ہیں۔ مادہ اونٹنی کھالے تو اس کا دودھ بڑھ جاتا ہے گویا وہ موٹے ہو کر مسلح ہوگئے اور ذبح ہونے سے بچ گئے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: [1]

(۲۳۴) اَزْمَانَ لَمْ تَأْخُذْ عَلَیَّ سِلَاحَھَا
اِبِلِیْ بِجُلَّتِھَا وَلَا اَبْکَارَھَا

اس زمانہ میں جب کہ میرے بڑے اور جوان اونٹوں نے ہتھیار نہیں پہنے تھے یعنی موٹے نہیں ہوئے تھے۔

اَلسِّلَاحُ: اصل میں اونٹ کے اس گوبر کو کہتے ہیں جو اِسْلِیْح گھاس کھانے کے بعد کرتا ہے پھر بطور کنایہ ہر فضلہ پر بولا جاتا ہے حتیٰ کہ حباری جانور کے متعلق مشہور محاورہ ہے۔

سِلَاحُہٗ سَلَاحُہٗ کہ اس کا فضلہ ہی اس کا ہتھیار ہے۔

(س ل خ)

اَلسَّلْخُ: اس کے اصل معنیٰ کھال کھینچنے کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے:

سَلَخْتُہٗ فَانْسَلَخَ: میں نے اس کی کھال کھینچی تو وہ کھچ گئی پھر اسی سے استعارہ کے طور پر زرہ اتارنے اور مہینہ کے گزر جانے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے جیسے سَلَخْتُ دِرْعَہٗ: میں نے اس کی زرہ اتاری۔ سَلَخَ الشَّھْرُ وَانْسَلَخَ: مہینہ گزر گیا۔ قرآن میں ہے:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ﴾ (۹۔۵) جب عزت کے مہینے گزر جائیں۔

﴿نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ……﴾ (۳۶۔۳۷) کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

اور محاورہ ہے:

اَسْوَدُ سَالِخٌ، سَلَخَ جِلْدَہٗ: نر سیاہ سانپ نے اپنی کینچلی اتار دی۔ اور کھجور کے جس درخت کی کچی کھجوریں جھڑ جائیں اسے نَخْلَۃٌ مِسْلَاخٌ کہا جاتا ہے۔

(س ل ط)

اَلسَّلَاطَۃُ: اس کے معنیٰ غلبہ حاصل کرنے کے

---

[1] قاله النمر بن تولب في وصف الابل والبيت في اللسان والمحكم (سطح، جلل) وامالي المرتضىٰ (۲: ۱۱۹) والثمار ۲۷۹ والمعاني للقتبي (۳۹۱۔۲۳۱) والميداني ۱: ۲۰، ۱۶، ۲۲، ۴۹، ۳۷، ۵۰) وفي اللسان ايام بدل ازمان وفي المطبوع على بدل الى مصحف والمراد من سلاح الابل سمنها وحسنها وانه يمنع صاحبها من العقر والذبح وفي المرتضىٰ في سلاح الابل اشعار والبيت ايضاً في اللاليء مع السمط ۶۳۲، ۷۸۳ وغريب ابي عبيد (۱: ۲۰۵).

ہیں اور سَلَّطْتُہٗ فَتَسَلَّطَ کے معنیٰ ہیں ''میں نے اسے مقہور کیا تو وہ مقہور ہوگیا'' قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ﴾ (۴۔۸۹) اگر خدا چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ (۵۹۔۶) لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جن پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے۔

اور اسی سے بادشاہ کو ''سلطان'' کہا جاتا ہے۔ اور سلطان کا لفظ تسلط اور غلبہ کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا﴾ (۱۷۔۳۳) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ﴾ (۱۶۔۹۹۔۱۰۰) کہ جو مومن ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں ان پر اس کا کچھ زور نہیں چلتا۔ اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں۔

﴿لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ﴾ (۵۵۔۳۳) اور زور کے سوا تم نہیں نکل سکتے۔

عام طور پر صاحب سلطنت کو سلطان کہا جاتا ہے اور حجت (دلیل) کو بھی سلطان کہا گیا ہے۔ [1] کیونکہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے لیکن عام طور پر اس کا تسلط ان اصحاب علم و حکمت پر ہوتا ہے جو ایمان دار (دیانتدار) ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ﴾ (۴۰۔۳۵) جو لوگ بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آئی خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔

﴿فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۱۱۔۹۶) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیاں اور دلیل روشن دے کر بھیجا۔

﴿اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا﴾ (۴۔۱۴۴) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر خدا کا صریح الزام لو۔ اور آیت:

﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ﴾ (۶۹۔۲۹) (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی۔

میں سلطان کے دونوں معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں یعنی اس سے مراد دلیل بھی ہو سکتی ہے اور غلبہ بھی۔

اَلسَّلِيْطُ: اہل یمن کی زبان میں زیتون کے تیل کو کہتے ہیں۔ اور سَلَاطَةُ اللِّسَانِ کے معنیٰ گفتگو پر قدرت کے ہیں اور یہ عموماً مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور زبان دراز عورت کو اِمْرَاَةٌ سَلِيْطَةٌ کہا جاتا ہے اور سَنَابِكُ سَلْطَاتٌ کے معنیٰ تیز سموں کے ہیں گویا قوت اور طول کی وجہ سے انہیں تسلط حاصل ہے۔

(س ل ف)

اَلسَّلْفُ: کے معنیٰ متقدم یعنی پہلے گزر جانے والا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ﴾ (۴۳۔۵۶) ان کو گئے گزرے کر دیا اور پچھلوں کے لئے عبرت بنا دیا۔

﴿فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ (۲۔۲۷۵) تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا۔ یعنی اس کے پہلے گناہ کو معاف کر دیا جائے گا۔ اور اس

---

[1] وعن ابن عباس: قد جاء السلطان بمعنى الحجة فى جميع القرآن ۱۲.

پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔اسی طرح آیت:

﴿اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ (۴۔۲۲) مگر (جاہلیت میں) جو ہو چکا (سو ہو چکا)۔

میں مَاسَلَفَ سے مراد یہ ہے کہ جو گناہ اس سے قبل ہو چکے ہیں وہ معاف کر دیئے جائیں گے۔تو یہاں استثناء جواز فعل سے نہیں ہے کہ جو نکاح پہلے ہو چکے ہیں وہ جائز اور مباح ہیں بلکہ یہاں استثناء گناہ سے ہے یعنی اس سے قبل جو نکاح ہو چکے ہیں ان کا گناہ معاف کر دیا جائے گا اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ ❶ اور لِفُلَانٍ سَلَفٌ کَرِیْمٌ کے معنیٰ ہیں اس کے آباؤاجداد کریم تھے۔

سَلَفٌ کی جمع اَسْلَافٌ اور سُلُوْفٌ آتی ہے۔

اور کسی چیز کی پیشگی قیمت ادا کرنے کو بھی سَلَفٌ کہا جاتا ہے۔

اَلسَّالِفَۃُ: گردن کے کنارے کو کہتے ہیں اور لڑائی میں ہر اول دستہ یا سفر میں قافلہ سے آگے جانے والے لوگوں کو سَابِقَۃٌ اور سَلَافٌ کہا جاتا ہے۔

سُلَافَۃُ الْخَمْرِ: باقی ماندہ عصیرہ۔اَلسُّلْفَۃُ: (ناشتہ) یعنی وہ طعام جو مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کیا جاتا ہے۔

محاورہ ہے:

سَلِّفُوا ضَیْفَکُمْ وَلَھِّنُوْہُ: اپنے مہمان کو نُکل کھلاؤ۔

(س ل ق)

اَلسَّلْقُ: قہر و غلبہ کے ساتھ دست یا زبان دارزی کرنا کے ہیں اور اسی سے تَسَلَّقَ عَلَی الْحَائِطِ ہے جس کے معنیٰ دیوار پھاندنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿سَلَقُوْکُمْ بِاَلْسِنَۃٍ حِدَادٍ﴾ (۳۳۔۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارے میں زبان درازی کریں گے۔

محاورہ ہے: سَلَقَ امْرَاَتَہٗ: اپنی عورت کو زبردستی لٹا کر اس کے ساتھ جماع کیا۔مسیلمہ نے ایک عورت سے کہا۔ ❷

(۲۳۵) اِنْ شِئْتِ سَلَقْنَاكِ
وَاِنْ شِئْتِ عَلٰی اَرْبَعٍ

چاہو تو چت لیٹ جاؤ اور چاہو تو پٹ لیٹو۔اور سَلْقٌ کے معنیٰ شلیتے کے ایک حلقے کو دوسرے میں داخل کرنے کے ہیں اور میدہ کی روٹی کو سَلِیْقَۃٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَلَائِقُ آتی ہے۔اور سَلِیْقَۃٌ بمعنیٰ طبیعت بھی آتا ہے اور سَلْقٌ کے معنیٰ ہموار اور عمدہ زمین کے ہیں۔

(س ل ک)

اَلسُّلُوْكُ: (ن) اس کے اصل معنیٰ راستہ پر چلنے کے ہیں۔سَلَکْتُ الطَّرِیْقَ: اور یہ فعل متعدی بن کر بھی استعمال ہوتا ہے یعنی راستہ پر چلانا چنانچہ پہلے معنیٰ کے متعلق فرمایا:

﴿لِتَسْلُکُوْا مِنْھَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾ (۷۱۔۲۰) تاکہ اس کے بڑے بڑے کشادہ راستوں میں چلو پھرو۔

﴿فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا﴾ (۱۶۔۶۹) اور اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا۔

﴿یَسْلُكُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ﴾ (۷۲۔۲۷) (اور) اس کے آگے...... مقرر کر دیتا ہے۔

---

❶ وفی البیضاوی: الاستثناء من المعنیٰ اللازم للنھی ویحتمل الانقطاع (لانوارالتنزیل ج ۱ ص ۸۳ بحلالین علی الھوامش).

❷ فی اربع ابیات مقیدۃ القافیہ خاطب بھا سجاح التی تنبأت من بنی تغلب فی خلوۃ ثم واقعھا فصدقت بنبوتہ انظر القصۃ فی الطبری (۲: ۴۹۹) والمحاضرات (۴: ۴۳۱) وفی روایتہ علقناك بدل سلقناك محرف ۱۲.

﴿وَسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا﴾ (۲۰۔۵۳) اور اس میں تمہارے لئے رستے جاری کئے۔

اور دوسرے معنیٰ یعنی متعدی کے متعلق فرمایا:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرٍ﴾ (۷۴۔۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

﴿كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِىْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ (۱۵۔۱۲) اس طرح ہم اس (تکذیب وضلال) کو گنہگاروں کے دلوں میں داخل کردیتے ہیں۔

﴿كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ﴾ (۲۶۔۲۰۰) اسی طرح ہم نے انکار کو......داخل کردیا۔

﴿فَاسْلُكْ فِيْهَا﴾ (۲۳۔۲۷)......کشتی میں بٹھالو۔

﴿يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا﴾ (۷۲۔۱۷) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

بعض نے سَلَكْتُ فُلَانًا فِىْ طَرِيْقِهٖ کی بجائے سَلَكْتُ فُلَانًا طَرِيْقًا کہا ہے اور عذابًا کو یَسْلُكْهُ کا دوسرا مفعول بنایا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عَذَابًا فعل محذوف کا مصدر ہے اور یہ اصل میں نُعَذِّبُهٗ ہے اور نیزے کی بالکل سامنے کی اور سیدھی ضرب کو طَعْنَةٌ سُلْكَةٌ کہا جاتا ہے۔ (سُلْكٰى سیدھا نیزہ) اور سُلْكَةٌ مادہ کبک کو کہتے ہیں اس کا مذکر سُلَكٌ ہے۔

(س ل م)

اَلسَّلْمُ وَالسَّلَامَةُ کے معنیٰ ظاہری اور باطنی آفات سے پاک اور محفوظ رہنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ......﴾ (۲۶۔۸۹) پاک دل (لے کر آیا وہ بچ جائے گا۔ یعنی وہ دل جو دغا اور کھوٹ سے پاک ہو تو یہ سلامت باطن کے متعلق ہے اور ظاہری عیوب سے سلامتی کے متعلق فرمایا:

﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا﴾ (۲۔۷۱) اس میں کسی طرح کا داغ نہ ہو۔

پس سَلِمَ يَسْلَمُ سَلَامَةً وَسَلَامًا کے معنیٰ سلامت رہنے اور سَلَّمَهُ اللّٰهُ (تفعیل) کے معنیٰ سلامت رکھنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ﴾ (۸۔۴۳) لیکن خدا نے (تمہیں) اس سے بچالیا۔

﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ﴾ (۱۵۔۴۶) ان میں سلامتی (اور خاطر جمع) سے داخل ہوجاؤ۔

اسی طرح فرمایا:

﴿اِهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا......﴾ (۱۱۔۴۸) ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ......اتر آؤ۔

اور حقیقی سلامتی تو جنت ہی میں حاصل ہوگی جہاں کہ بقا ہے۔ فنا نہیں، غنا ہے احتیاج نہیں، عزت ہے، ذلت نہیں، صحت ہے بیماری نہیں چنانچہ اہل جنت کے متعلق فرمایا:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ﴾ (۶۔۱۲۸) ان کے لئے......سلامتی کا گھر ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ﴾ (۱۰۔۲۵) اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

﴿يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ﴾ (۵۔۱۶) جس سے خدا اپنی رضامندی پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا ہے۔

ان تمام آیات میں سلام بمعنیٰ سلامتی کے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلسَّلَامُ اسمائے حسنیٰ سے ہے اور یہی معنیٰ آیت "لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ" میں بیان کئے گئے

ہیں۔ اور آیت:

﴿اَلسَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ﴾ (۵۹۔۲۳)

سلامتی امن دینے والا نگہبان۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وصف سلام کے ساتھ موصوف ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ عیوب وآفات مخلوق کو لاحق ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔ اور آیت:

﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ (۳۶۔۵۸)

پروردگار مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائے گا)

﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ﴾ (۱۳۔۲۴) (اور کہیں گے) تم پر رحمت ہو (یہ) تمہاری ثابت قدمی کا بدلہ ہے۔

﴿سَلٰمٌ عَلٰى اِلْيَاسِيْنَ﴾ (۳۷۔۱۳۰) کہ الیاسین پر سلام اور اس مفہوم کی دیگر آیات میں سلام علیٰ آیا ہے تو ان لوگوں کی جانب سے تو سلامتی بذریعہ قول مراد ہے یعنی سَلٰمٌ عَلٰی...... کے ساتھ دعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے سلامتی بالفعل مراد ہے۔ یعنی جنت عطا فرمانا۔ جہاں کہ حقیقی سلامتی حاصل ہوگی۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور آیت:

﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (۲۵۔۶۳) اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔ میں قَالُوا سَلٰمًا کے معنیٰ ہیں ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں۔ تو اس صورت میں سَلٰمًا منصوب بالفعل المضمر ہوگا۔ یعنی نَطْلُبُ مِنْكَ السَّلَامَ اور بعض نے قَالُوا سَلٰمًا کے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ وہ اچھی بات کہتے ہیں تو اس صورت میں یہ مصدر محذوف (یعنی قولاً) کی صفت ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ﴾ (۵۱۔۲۵) جب وہ ان کے پاس آئے تو سلام کہا۔ انہوں نے بھی (جواب میں) سلام کہا۔

میں دوسرے سلام پر رفع اس لیے ہے کہ یہ باب دعا سے ہے اور صیغہ دعا میں رفع زیادہ بلیغ ہے گویا اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ادب کو ملحوظ رکھا ہے جس کا کہ آیت:

﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا﴾ (۴:۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دو۔

میں حکم دیا گیا ہے اور ایک قرأت میں سِلْمٌ ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ سَلٰام سِلْم (صلح) کو چاہتا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے خوف محسوس کر چکے تھے پھر جب انہیں سلام کہتے ہوئے سنا تو اس کو پیغام صلح پر محمول کیا اور جواب میں سِلْمٌ کہہ کر اس بات پر تنبیہ کی کہ جیسے تم نے پیغام صلح دیا ہے۔ ایسے ہی میری جانب سے بھی پیغام صلح قبول ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ (۵۶۔۲۵،۲۶) وہاں نہ بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ۔ ہاں ان کا کلام سلام (ہوگا)

کے معنیٰ یہ ہیں کہ بات صرف بذریعہ قول ہی نہیں ہوگی۔ بلکہ قولاً اور فعلاً دونوں طرح ہوگی۔ اسی طرح آیت:

﴿فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ﴾ (۵۶۔۹۱) تو (کہا جائے گا کہ) تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام۔

میں بھی سلام دونوں معنیٰ پر محمول ہوسکتا ہے اور آیت:

﴿وَقُلْ سَلٰمٌ﴾ (۴۳۔۸۹) اور سلام کہہ دو۔

میں بظاہر تو سلام کہنے کا حکم ہے لیکن فی الحقیقت ان کے شر سے سلامتی کی دعا کرنے کا حکم ہے اور آیات سلام جیسے۔

﴿سَلَامٌ عَلٰی نُوحٍ فِی الْعَالَمِیْنَ﴾ (۳۷۔۷۹) (یعنی) تمام جہاں میں..... نوح علیہ السلام پر سلام۔

﴿سَلَامٌ عَلٰی مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۲۰) کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام۔

﴿سَلَامٌ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ﴾ (۳۷۔۱۰۹) ابراہیم علیہ السلام پر سلام۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء اور ابراہیم علیہ السلام کو اس قدر مرتبہ عطا کیا تھا کہ لوگ ہمیشہ ان کی تعریف کرتے اور ان کے لئے سلامتی کے ساتھ دعا کرتے رہیں گے اور فرمایا:

﴿فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ﴾ (۲۴۔۶۱) اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں) کو سلام کیا کرو۔ یعنی تم ایک دوسرے کو سلام کہا کرو۔

﴿اَلسَّلَامُ وَالسِّلْمُ وَالسَّلْمُ﴾ کے معنیٰ صلح کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ (۴۔۹۴) اور جو شخص تم سے سلام علیك کہے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں۔

بعض نے کہا ہے: یہ آیت اس شخص کے حق میں نازل ہوئی جسے باوجود اظہار اسلام اور طلب صلح کے قتل کر دیا گیا تھا اور فرمایا:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً﴾ (۲۔۲۰۸) مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ﴾ (۸۔۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں۔

اس میں ایک قرأت سَلَمَ (بفتحہ سین) بھی ہے۔

﴿وَاَلْقَوْا اِلَی اللّٰہِ یَوْمَئِذِ نِ السَّلَمَ﴾ (۱۶۔۸۷) اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔

﴿یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَھُمْ سَالِمُوْنَ﴾ (۶۸۔۴۳) (اس وقت) سجدے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ جب کہ صحیح وسالم تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ﴾ (۳۹۔۲۸) اور ایک آدمی خاص ایک شخص کا (غلام) ہے۔

میں ایک قرأت سَلْمًا وَسِلْمًا بھی ہے اور یہ دونوں مصدر ہیں اور حَسَنٌ وَنَکْدٌ کی طرح صفت کے صیغے نہیں ہیں کہا جاتا ہے۔

سَلِمَ سَلْمًا وَسِلْمًا جیسے رَبِحَ رَبْحًا وَرِبْحًا اور بعض نے کہا ہے کہ سِلْمٌ اسم ہے اور اس کی ضد حَرْبٌ ہے۔

اَلْاِسْلَامُ: اس کے اصل معنیٰ سِلْم (صلح) میں داخل ہونے کے ہیں اور صلح کے معنیٰ یہ ہیں کہ فریقین باہم ایک دوسرے کی طرف سے تکلیف پہنچنے سے بے خوف ہو جائیں اور یہ اَسْلَمْتُ الشَّیْءَ اِلٰی فُلَانٍ (باب افعال) کا مصدر ہے اور اسی سے بیع سَلَم ہے۔

شرعًا اسلام کی دو قسمیں ہیں کوئی انسان محض زبان سے اسلام کا اقرار کرے، دل سے معتقد ہو یا نہ ہو اس سے انسان کا جان ومال اور عزت محفوظ ہو جاتی ہے مگر اس کا درجہ ایمان سے کم ہے۔ اور آیت:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ

﴿قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا﴾ (۴۹۔۱۴) دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو اسلام لائے ہیں۔
میں اَسْلَمْنَا سے یہی معنیٰ مراد ہیں۔ دوسرا درجہ اسلام کا وہ ہے جو ایمان سے بھی بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کے اعتراف کے ساتھ ساتھ دلی اعتقاد بھی ہو اور عملاً اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔ مزید برآں یہ کہ ہر طرح سے قضا وقدر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔ جیسا کہ آیت:
﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (۲۔۱۳۱) جب ان سے ان کے رب نے فرمایا: کہ اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کی کہ میں رب العالمین کے آگے سر اطاعت خم کرتا ہوں۔
میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے اور فرمایا:
﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامَ﴾ (۳۔۱۹) (کہ) دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔ اور آیت: ﴿وَتَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا﴾ (۱۲۔۱۰۱) تو مجھے اپنی اطاعت (کی حالت) کیجیئو۔ اٹھائیو۔ کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں میں داخل کیجیئو جو تیری رضا کے تابع ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں۔ کہ کلیۃً شیطان کے پنجے سے آزاد کردے۔ جیسا کہ شیطان نے کہا تھا۔
﴿لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ﴾ (۳۸۔۸۳) میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا۔ سوا ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں۔ اور آیت:
﴿اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (۳۰۔۵۳) تم تو انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں سو وہی فرمانبردار ہیں۔
میں مُسْلِمُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کے تابع اور فرمانبردار ہیں۔ اور آیت:
﴿یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا﴾ (۵۔۴۴) اسی کے مطابق انبیا جو (خدا کے) فرمانبردار تھے...... حکم دیتے رہے ہیں۔
میں وہ انبیاء مراد ہیں جو اگرچہ اولوالعزم پیغمبروں کے تابع تھے لیکن حکم الٰہی سے ہدایت پاتے تھے اور مستقل شرائع لے کر مبعوث ہوئے تھے۔
اَلسُّلَّمُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بلند مقامات پر چڑھا جاتا ہے۔ تاکہ سلامتی حاصل ہو پھر سَبَبٌ کی طرح ہر اس چیز کو سُلَّمٌ کہا گیا ہے جو کسی بلند جگہ تک پہنچنے کا وسیلہ بنے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ﴾ (۵۲۔۳۸) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر آسمان سے باتیں سن آتے ہیں۔
﴿اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ﴾ (۶۔۳۵) یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کرو)
اور شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۳۶) وَلَوْ نَالَ اَسْبَابَ السَّمَآءِ بِسُلَّمٖ

گو سیڑھی لگا کر آسمان پر کیوں نہ چڑھ جاتے اور سَلْمٌ وَسِلَامٌ ایک قسم کے بڑے درخت کو کہتے ہیں کیونکہ وہ

---

[1] لزهیر واورد (رهن) اسباب المنية ينلنه .... وفی اللسان وام بدل نال وقد مر فی (برج) وفی السبع لابن الانباری ۲۸۳ ولورام ان یرقی السماء بسلم۱۲.

ہر قسم کی آفت سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔
اَلسِّلَامُ: ایک قسم کا سخت پتھر (اس کا واحد سَلِمَةٌ ہے)

(س ل و)

اَلسَّلْوٰی: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے لئے تسلی کا باعث ہو، اسی سے اَلسُّلْوَانُ وَالتَّسَلِّیْ ہے جس کے معنیٰ اطمینان اور راحت ہیں۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ (۲۔۵۷) اور (تمہارے لئے) من وسلویٰ اتارتے رہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بٹیر کی قسم کے جانور مراد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ من ایک چیز ہے جو آسمان سے اترتی تھی اور سَلْوٰی ایک پرند کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی کے الفاظ بطور مثال کے ذکر کئے گئے ہیں اور مراد وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے گوشت اور سبزیوں کی صورت میں انہیں دیا تھا۔ اصل میں سَلْوٰی کا لفظ تَسَلِّیْ سے ماخوذ ہے اور سَلَيْتُ عَنْ كَذَا وَسَلَوْتُ عَنْهُ وَتَسَلَّيْتُ کے معنیٰ کسی چیز سے تسلی حاصل کرنے اور اس کی محبت کو بھلا دینے کے ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ سُلْوَان اسے کہتے ہیں جو انسان کو تسلی دے اور ایک قسم کے مہرے کو بھی سُلْوَانٌ کہا جاتا ہے جسے عرب لوگ محبت اور عشق سے تسلی حاصل کرنے کے لئے گھس کر پیتے تھے۔

(س م م)

اَلسَّمُّ: (فتحۂ سین وضمۂ آں) کے معنیٰ تنگ سوراخ کے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک اور کان کا سوراخ ہوتا ہے۔ اس کی جمع سُمُوْم آتی ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (۷۔۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور سَمَّهٗ (ن) کے معنیٰ کسی چیز میں گھس جانا کے ہیں۔ اور اسی سے "اَلسَّامَّةُ" ہے یعنی وہ خاص لوگ جو ہر معاملہ میں گھس کر اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں دُخَّلٌ بھی کہا جاتا ہے۔
اَلسَّمُّ: زہر قاتل کو کہتے ہیں کیونکہ یہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور یہ اصل میں مصدر بمعنیٰ فاعل ہے۔
اَلسُّمُوْمُ: (لو) گرم ہوا جو زہر کی طرح بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ﴾ (۵۲۔۲۷) اور ہمیں لو کے عذاب سے بچا لیا۔
﴿فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ﴾ (۵۶۔۴۲) (یعنی دوزخ کی) لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی میں۔
﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴾ (۱۵۔۲۷) اور جنوں کو اس سے بھی پہلے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

(س م د)

اَلسَّامِدُ: غافل تکبر سے سر اٹھانے والا۔ یہ سَمَدَ الْبَعِيْرُ فِيْ سَيْرِهٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ اونٹ کے گردن اٹھا کر تیز چلنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ﴾ (۵۳۔۶۱) اور تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔

اور سَمَدَ رَأْسَهٗ وَسَبَدَ کے معنیٰ سر کے بالوں کو جڑ سے مونڈ ڈالنے کے ہیں۔

(س م ر)

اَلسُّمْـرَۃُ: گندمی رنگ کو کہتے ہیں اور کنایہ کے طور پر سَمْـرَاءُ گندم کو کہا جاتا ہے اور اَلسَّمَـارُ: پتلا دودھ جس میں بکثرت پانی کی آمیزش ہو۔

اَلسُّمْرَۃُ: ببول کا درخت۔ غالبًا اس کی رنگت کے اعتبار سے یہ نام رکھا گیا ہے۔

اَلسَّمَرُ: اصل میں رات کی تاریکی کو کہتے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔ ❶ لَا اٰتِیْكَ السَّمَـرَ وَالْقَمَرَ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا پھر رات کو باتیں کرنا کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا ہے اور سَـمَرَ فُـلَانٌ کے معنیٰ ہیں: اس نے رات کو باتیں کیں۔ اسی سے مشہور محاورہ ہے۔ ❷

لَا اٰتِیْكَ مَا سَمَرَا بْنَا سَمِیْرٍ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا اور آیت کریمہ:

﴿مُسْتَـکْبِرِیْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ﴾ (۲۲۔۶۷) ان سے سرکشی کرتے کہانیوں میں مشغول ہوتے۔ اور بے ہودہ بکواس کرتے تھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سَامِرٌ کے معنیٰ تاریک رات کے ہیں۔ سَامِرٌ کی جمع سُـمَّارٌ، سَمَرَۃٌ اور سَامِرُوْنَ آتی ہے۔ اور سَـمَرْتُ الشَّیْءَ (ن) کے معنیٰ کسی چیز میں میخ لگا کر مضبوط اور استوار کرنے کے ہیں۔ اور مہمل چھوڑے ہوئے اونٹوں کو اِبِـلٌ مُسْـمَرَۃٌ کہا جاتا ہے اور سَامِرِیٌّ ایک قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

(س م ع)

اَلسَّـمْـعُ: قوت سامعہ، کان میں ایک حاسہ کا نام ہے جس کے ذریعہ آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور اس کے معنیٰ سننا (مصدر) بھی آتے ہیں۔ اور کبھی اس سے خود کان مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ﴾ (۲۔۷) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔

اور کبھی لفظ سماع کی طرح اس سے مصدری معنیٰ مراد لیا جاتا ہے (یعنی سننا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۱۲) وہ (آسمانی باتوں کے) سننے (کے مقامات) سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔

﴿اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ (۵۰۔۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

اور کبھی سَـمْـعٌ کے معنیٰ فہم و تدبر اور کبھی طاعت بھی آ جاتے ہیں مثلاً تم کہو: اِسْـمَـعْ مَـا اَقُوْلُ لَكَ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ لَـمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ لَكَ تم نے میری بات سمجھی نہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا تُتْلٰـی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَـآءُ لَـقُلْنَـا......﴾ (۸۔۳۱) اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں (یہ کلام) ہم نے سن لیا ہے اگر چاہیں تو اسی طرح کا (کلام) ہم بھی

---

❶ انظر للمثل المستقصی والثمار ۲۲۴ و لعسکری ۲۰۱۹۶ : ۲۲۶ واللسان والتاج (سمر).

❷ ابنا سمیر اللیل والنہار فالمراد الدھر فمعنی المثل لاآتیك ابداً راجع السمط ۵۳۰).

کہہ دیں۔

اور آیت: ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ (۲۔۹۳) (وہ کہنے لگے) ہم نے سن تو لیا۔مگر مانتے نہیں۔ کے معنیٰ ہیں ہم نے تمہاری بات سمجھ لی ہے مگر ماننے کے نہیں۔اسی طرح آیت:

﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ (۲۔۲۸۵) کے معنیٰ ہیں "ہم نے تیرا حکم سمجھ لیا اور قبول کیا"

اور آیت: ﴿لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ﴾ (۸۔۲۱) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم خدا) سن لیا مگر (حقیقت میں) نہیں سنتے۔

میں سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ کے یہ معنیٰ بھی ہوسکتے ہیں۔کہ ہم نے سمجھ لیا حالانکہ وہ سمجھتے نہیں۔اور یہ بھی کہ ہم نے سمجھ لیا مگر وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتے کیونکہ جب انہوں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو گویا اس شخص کی طرح ہیں جو سرے سے سنتا ہی نہیں۔پھر اس کے بعد فرمایا: ﴿وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا......﴾ (۸۔۲۳) اگر خدا ان میں نیکی (کا مادہ) دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق بخشتا اور اگر (بغیر صلاحیت ہدایت کے) سماعت دیتا تو وہ...... بھاگ جاتے۔

تو یہاں بھی وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ کے معنیٰ ہیں اگر وہ انہیں قوت فہم بخشتا جس سے وہ سمجھتے ،اور آیت: ﴿وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ (۴۔۴۶) میں (سنئے نہ سنوائے جاؤ) کا محاورہ دو طرح بولا جاتا ہے۔ایک بد دعا کے طور پر کہ وہ بہرا ہو جائے۔دوم دعا کے طور پر پہلے معنیٰ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے: اَسْمَعَكَ اللّٰهُ: اللہ تجھے بہرہ کر دے اور دوسرا معنیٰ کے لحاظ سے اَسْمَعْتُ فُلَانًا بولتے ہیں یعنی میں نے فلاں کو خوب سنائیں۔یعنی گالیاں دیں تو یہ گالی دینے کے معنیٰ میں متعارف ہے۔

مروی ہے کہ اہل کتاب نبی ﷺ کو یہ کلمہ کہا کرتے اور اس سے آنحضرت کو اس فریب میں ڈالنے کی کوشش کرتے کہ وہ آپ کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ کے حق میں دعا کرتے ہیں۔مگر درحقیقت وہ آپ کے حق میں بددعا کرتے تھے۔

ہر وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لئے سماعت کو ثابت کیا ہے یا کفار سے اس کی نفی کی ہے یا اس کی کوشش پر رغبت دلائی ہے تو اس سے مقصود اس کلام کے معنیٰ کی طرف توجہ دینا اور اس میں غور وفکر کرنا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ (۷۔۱۹۵) یا ان کے لئے کان ہیں جن سے سنیں؟

اور (کفار سے نفی کرتے ہوئے) فرمایا:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ﴾ (۲۔۱۸) (یہ) بہرے ہیں گونگے ہیں۔

﴿وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (۴۱۔۴۴) اور ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہرا پن) ہے۔

اور جب سمع کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے مراد تو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام مسموعات کا علم ہے یا یہ کہ اس نے جزا دینے کا ارادہ فرمایا ہے۔جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ (۵۸۔۱) (اے پیغمبر!) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے

بارے میں بحث وجدال کرتی ہے.......... خدانے اس کی التجاسن لی۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْا﴾ (۳۔۱۸۱) خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ...... اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ (۲۷۔۸۰) کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے اور بہروں کو...... آواز نہ سنا سکتے ہو۔

میں لَا تُسْمِعُ کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم انہیں کچھ بھی سمجھا نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ اپنی بدعملی کی وجہ سے قوت حافظہ کو جو کہ انسانیت کے لئے مخصوص سرمایۂ حیات ہے کھو بیٹھنے میں مردوں کی طرح ہیں۔ اور آیت:

﴿اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ﴾ (۱۸۔۲۶) وہ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے۔ میں اس شخص کے متعلق فرمایا کہ یہ شخص حکمت الٰہی کے عجائبات سے کس قدر آگاہ ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق مَا اَبْصَرَهٗ وَمَا اَسْمَعَهٗ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کو صرف انہی صفات کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے جو بطریق سمع ثابت ہوں۔ اور کفار کے متعلق جو یہ فرمایا ہے۔

﴿اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا﴾ (۱۹۔۳۸) وہ جس دن ہمارے سامنے آئیں گے، کیسے سننے والے اور کیسے دیکھنے والے ہوں گے۔

تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو باتیں ان کے اپنے نفوس پر ظلم کرنے اور نظر وفکر ترک کر دینے کی وجہ سے آج ان پر مخفی ہیں وہ اس روز ان کو سن اور دیکھ رہے ہوں گے۔

اور فرمایا:

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا﴾ (۲۔۹۳) کہ جو کتاب تم کو دی گئی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو (اور جو تمہیں حکم ہوتا ہے) اس کو سنو۔

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ﴾ (۵۔۴۲) (یہ) جھوٹی باتیں بنانے کے لئے جاسوسی کرنے والے۔

یعنی دوسروں کے سامنے جھوٹی باتیں بنانے کے لئے تمہاری باتیں سنتے ہیں اور جو ابھی تمہارے پاس نہیں آئے۔

یعنی وہ تمہاری باتوں کو ان تک پہنچانے کے لئے سنتے ہیں

اَلْاِسْتِمَاعُ: اس کے معنیٰ غور سے سننے کے ہیں جیسے فرمایا:

﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ......﴾ (۱۷۔۴۷) یہ لوگ جب تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جس نسبت سے یہ سنتے ہیں ہم سے خوب جانتے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ﴾ (۶۔۲۵) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تمہاری (باتوں کی) طرف کان رکھتے ہیں۔

﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ﴾ (۵۰۔۴۱) اور سنو جس دن پکارنے والا...... پکارے گا۔

اور آیت: ﴿اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ﴾ (۱۰۔۳۱) یا (تمہارے) کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔

یعنی ان کا پیدا کرنے والا اور ان کی حفاظت کا متولی کون ہے۔

اور مِسْمَعٌ یا مَسْمَعٌ کے معنیٰ کان کے سوراخ کے ہیں

اور اسی کے ساتھ تشبیہ دے کر ڈول کے دستہ کو جس میں رسی باندھی جاتی ہے مَسْمَعُ الْغَرْبِ کہا جاتا ہے۔

(س م ک)

اَلسَّمْكُ: چھت کو کہتے ہیں اور سَمَكَهٗ (ن) کے معنیٰ بلند کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا﴾ (۷۹۔۲۸) اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کیا۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۳۷) اِنَّ الَّذِیْ سَمَكَ السَّمَاءَ بَنٰی لَنَا

وہ ذات جس نے آسمان کو بلند بنایا۔

اور ایک دعاء ماثورہ میں ہے ❷ (۱۷۹) یَابَارِیَٔ السَّمٰوٰتِ الْمَسْمُوْكَاتِ اے بلند آسمان کے پیدا کرنے والے۔

اور سَنَامٌ سَامِكٌ: بلند کوہان کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جس سے کوئی چیز بلند کی جائے۔

اِسے سِمَاكٌ (بکسرۂ سین) کہا جاتا ہے اور سِمَاكٌ ایک ستارے کا نام بھی ہے اور اَلسَّمْكُ کے معنیٰ مچھلی کے ہیں۔

(س م ن)

اَلسِّمَنُ کے معنیٰ موٹاپہ کے ہیں اور یہ هُزَالٌ کی ضد ہے اور سَمِیْنٌ (صیغۂ صفت کے معنیٰ ہیں فربہ) ج سِمَانٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ﴾ (۱۲۔۴۶) ہمیں (اس خواب کی تعبیر) بتایئے کہ سات موٹی گایوں......اور

اَسْمَنْتُهٗ وَسَمَّنْتُهٗ کے معنیٰ موٹا کرنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ﴾ (۸۸۔۷) جو نہ فربہی لائے اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔

اَسْمَنْتُهٗ: فربہ جانور خریدنے یا دینے کے ہیں۔اور اِسْتَمَنْتُهٗ کے معنیٰ فربہ پانے کے۔

اَلسُّمْنَةُ: ایک دوا جو فربہ ہونے کے لئے کھائی جاتی ہے۔

اَلسَّمْنُ: گھی کیونکہ گھی بھی فربہی کی قسم سے ہے اور اس کے کھانے سے انسان موٹا ہوتا ہے اَلسُّمَانیٰ: ایک پرند کا نام ہے۔

(س م و)

سَمَاءٌ: ہر شے کے بالائی حصہ کو سَمَاءٌ کہا جاتا ہے شاعر نے ایک گھوڑے کے وصف میں کہا ہے۔ ❸

(۲۳۸) وَاَحْمَرُ کَالدِّیْبَاجِ اَمَّا سَمَائُهٗ
فَرَیًّا وَاَمَّا اَرْضُهٗ فَمَحُوْلٌ

وہ دیباج کی طرح سرخ ہے اس کا بالائی حصہ موٹا اور گداز ہے اور زیریں حصہ لاغر اور سخت ہے۔بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر "سماء" اپنے ماتحت

---

❶ البیت للفرزدق من نقیضته المشهو رمطلعها هذالبیت وتمامه : بیتاً دعائمه اعزواطول ۔ والقصیدة فی دیوانه (۲ : ۷۱٤ ـ ۷۲٥) والنقائض (۱ : ۱۸۲ ـ ۲۱۱) والبیت فی العمدة (۱ : ۲٥۲) وفیه قصة الفرزدق مع الطرماح ومجازالقران (۲ : ۱۲۱) وشرح الدرة للخفاجی ۷۳ والمرزبانی فی المعجم ٤٦۷ والمواشح ۱۲۳ وابن عقیل رقم ۲۷۸ ومصارع العشاق ۷۷ والصاحبی ۲٥۷ والطبری (۲۱ : ۳۷) والقرطبی (۱٤ : ۲۱) والخزانة (۳ : ۱٤۷ ـ ٤۸۰) والاشباه النحویة (۳ : ۱۹۳) والکامل (٦۹۷) ولعینی (٤ : ٤۲).

❷ وفی النوادر۱۷۳ اللهم واحی المدحوات وباری المسموکات الخ وهذه الصلوة فی ۱۰ اسطار وهذه من حملة من الصلوة علی النبی التی کان علی یعلم اصحابه ۱۲.

❸ قاله طفیل الغنوی وقد مرفی (ارض)۱۲.

کے لحاظ سے سَمَاءٌ ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے اَرْضٌ کہلاتا ہے بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔ اور آیت:
﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ (۶۵۔۱۲) خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں
کو اسی معنیٰ پر محمول کیا ہے۔
نیز مَطَرَ (بارش) کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اوپر سے آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سماء اس بارش کو کہا جاتا ہے جو ہنوز زمین پر نہ گری ہو تو اس میں بھی بلندی کے معنیٰ ملحوظ ہیں۔
اور نباتات کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ بارش سے اگتے ہیں اور یا اس لئے کہ وہ زمین سے بلند ہوتے ہیں پھر لفظ سماء جو ارض کے بالمقابل ہے مؤنث ہے لیکن کبھی مذکر بھی آجاتا ہے اور واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ﴾ (۲۔۲۹) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا۔
اور کبھی اس کی جمع سَمٰوٰتٌ بھی بنا لیتے ہیں چنانچہ فرمایا:
﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ﴾ (۳۱۔۱۰) اسی نے آسمانوں کو...... پیدا کیا۔
﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ﴾ (۱۳۔۱۶) ان سے پوچھو کہ آسمانوں...... کا پروردگار کون ہے؟
اور آیت: ﴿اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ﴾ (۷۳۔۱۸) جس سے آسمان پھٹ جائے گا۔
میں سماء کو مذکور استعمال کیا ہے لیکن کئی ایک آیات جیسے:
﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ (۸۴۔۱) جب آسمان پھٹ جائے گا۔
اور آیت: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ (۸۲۔۱) جب آسمان پھٹ جائے گا۔
میں مؤنث استعمال ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سماء کا لفظ اشجار میں نَخْلٌ یا اس قسم کے دوسرے اسماء جنس کی طرح ہے جو مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں اور سَمَاءٌ کے معنیٰ بارش ہوں تو یہ ہمیشہ مذکر استعمال ہوگا اور اس کی جمع اَسْمِیَةٌ آئے گی۔ اور کسی بلند چیز کے کالبد کو سَمَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1]
(۲۳۹) سَمَاوَةُ الْهِلَالِ حَتّٰی اِحْقَوْقَفَا
(راتیں تدریجاً) افق پر ابھرے ہوئے چاند کو (لپیٹتی رہیں) حتیٰ کہ وہ ٹیڑھا ہوگیا۔
اور سَمَالِیَ الشَّیْءُ کے معنیٰ ہیں: دور سے کسی چیز کا بلند شکل میں ظاہر ہونا۔
اور سَمَا الْفَحْلُ عَلَى الشَّوْلِ سَمَاوَةً: سانڈھ اونٹ اونٹنی پر چڑھ گیا۔
اَلْاِسْمُ: کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ یہ اصل میں سِمْوٌ ہے کیونکہ اس کی جمع اَسْمَاءٌ اور تصغیر سُمَیٌّ آتی ہے۔ اور اسم کو اسم اس لئے کہتے ہیں کہ اس

[1] قاله العجاج واوله ناج طواه الاين هماً وجفاً طى الليالى زلفا وزلفا والشطر فى اللسان (زلف) والحكم حقت وقد مرفى (زلف) ۱۲.

سے مسمّٰی کا ذکر بلند ہوتا ہے اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِيهَا﴾ (۱۱۔۴۱) اور (نوح عَلَيْهِ السَّلَام نے) کہا کہ خدا کا نام لے کر (کہ اسی کے ہاتھ میں) اس کا چلنا (ہے) سوار ہو جاؤ۔
﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (۲۷۔۳۰) وہ سلیمان عَلَيْهِ السَّلَام کی طرف سے ہے اور (مضمون یہ ہے) کہ شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔
اور آیت: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ (۲۔۳۱) اور اس آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔
میں اسماء سے یہاں الفاظ و معانی دونوں مراد ہیں۔ خواہ مفرد ہوں یا مرکب، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ اسم دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ایک اصطلاحی معنیٰ میں اور اس صورت میں ہمیشہ مخبر عنہ بنتا ہے۔جیسے رَجُلٌ وفَرَسٌ دوم وضع اول کے لحاظ سے اس اعتبار سے (کلمہ کی) انواع ثلاثہ یعنی مخبر عنہ (اسم) خبر اور رابطہ (حرف) تینوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ میں یہی دوسرے معنیٰ مراد ہیں کیونکہ آدم عَلَيْهِ السَّلَام نے جس طرح اسماء کی تعلیم حاصل کی تھی۔اسی طرح افعال و حروف کا علم بھی انہیں حاصل ہو گیا تھا۔اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کی ذات کا علم حاصل نہ ہو محض نام کے جاننے سے انسان اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا۔مثلاً اگر ہم ہندی یا رومی زبان میں چند چیزوں کے نام حفظ کر لیں تو ان چیزوں کے اسماء کے جاننے سے ہم ان کے مسمیات کو نہیں پہچان سکیں گے۔بلکہ ہمارا علم انہی چند اصوات تک محدود رہے گا اس

سے ثابت ہوا کہ اسماء کی معرفت مسمیات کی معرفت کو مستلزم نہیں ہے اور نہ ہی محض اسم سے مسمّٰی کی صورت ذہن میں حاصل ہو سکتی ہے۔لہٰذا آیت:
﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ میں اسماء سے کلام کو انواع ثلاثہ اور صوَر مسمیات بمع ان کی ذوات کے مراد ہیں اور آیت:
﴿مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَا﴾ (۱۲۔۴۰) جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں۔کیونکہ وہ اصنام ان اوصاف سے عاری تھے۔جن کا وہ ان اسماء کے اعتبار سے ان کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے۔اور آیت:
﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ﴾ (۱۳۔۳۳) اور ان لوگوں نے خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں۔ان سے کہو کہ (ذرا) ان کے نام تو لو۔
میں سَمُّوْهُمْ سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات، عزیٰ وغیرہ ان کے نام بیان کرو بلکہ آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ جن کو تم اِلٰـهٌ (معبود) کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق کر کے یہ تو بتاؤ کہ آیا ان میں ان اسماء کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔جن کے ساتھ تم انہیں موسوم کرتے ہو (یعنی نہیں) اسی لئے اس کے بعد فرمایا: ﴿اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ......﴾ (۱۳۔۳۳) (کہ) کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جس کو وہ زمین میں (کہیں بھی) معلوم نہیں کرتا یا (محض) ظاہری (باطل اور جھوٹی) بات کی (تقلید کرتے ہو)
اور آیت:
﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ﴾ (۵۵۔۷۸) تمہارے پروردگار......

کا نام بڑا بابرکت ہے۔

میں اسم رب کے بابرکت ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کی صفات، الکریم، العلیم، الباری، الرحمن، الرحیم کے ذکر میں برکت اور نعمت پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَىٰ﴾ (۸۷۔۱) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو۔

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (۷۔۱۸۰) اور خدا کے نام سب اچھے ہی اچھے ہیں۔

اور آیت:

﴿اِسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ (۱۹۔۷) جس کا نام یحییٰ ہے۔اس سے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی شخص پیدا نہیں کیا۔

میں سَمِيًّا کے معنیٰ ''ہم نام'' کے ہیں اور آیات:

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ (۱۹۔۶۵) بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔

میں سَمِيًّا کے معنیٰ نظیر کے ہیں یعنی کیا اس کی کوئی نظیر ہے جو اس نام کی مستحق ہو اور حقیقتاً اللہ کی صفات کے ساتھ متصف ہو اور اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ کیا تم کسی کو ایسا بھی پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو کیونکہ ایسے تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر اللہ پر بھی اطلاق ہوسکتا ہے یا ہوتا ہے۔لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان سے معانی بھی وہی مراد ہوں جو اللہ تعالیٰ پر اطلاق کے وقت ہوتے ہیں۔اور آیت:

﴿يُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى﴾ (۵۳۔۲۷) اور وہ فرشتوں کو (خدا کی) لڑکیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

میں لڑکیوں کے نام سے موسوم کرنے کے معنیٰ یہ ہیں۔کہ وہ فرشتوں کو ''بنات الله'' کہتے ہیں۔

(س ن ن)

اَلسِّنُّ: دانت۔اس کی جمع اَسْنَانٌ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلسِّنُّ بِالسِّنِّ﴾ (۵۔۴۵) دانت کے بدلے دانت۔

﴿سَانَّ الْبَعِيْرُ النَّاقَةَ﴾ نر اونٹ نے دانت سے کاٹ کر اونٹنی کو نیچے بٹھالیا۔

اَلسَّنُوْنُ: دانتوں کا منجن ایک دوا جس سے دانتوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

سَنُّ الْحَدِيْدِ کے معنیٰ لوہے کو تیز کرنے (اور پگھلانے کے ہیں) اور جس چیز سے لوہے کو تیز کرتے ہیں اسے مِسَنٌّ (سان) کہا جاتا ہے اور اَلسِّنَانُ: (بھالا) خاص کر اس لوہے کو کہتے ہیں جو نیزے کے سرے میں لگایا جاتا ہے۔پھر سَنُّ الْحَدِيْدِ: (تیز کرنا) کے ساتھ تشبیہ دے کر سَنَنْتُ الْبَعِيْرَ کہا جاتا ہے جس کے معنیٰ اونٹ کو سخت ہنکا کر دبلا کر دینے کے ہیں اور پگھلانے کے معنیٰ کے لحاظ سے سَنَنْتُ الْمَاءَ بولتے ہیں جس کے معنیٰ پانی بہانے کے ہیں۔محاورہ ہے۔

تَنَحَّ عَنْ سَنَنِ الطَّرِيْقِ: (بسین مثلثہ) راستہ کے کھلے حصہ سے ہٹ جاؤ۔پس سُنَنٌ کا لفظ سُنَّةٌ کی جمع ہے اور سُنَّةُ الْوَجْهِ کے معنیٰ دائرہ رو کے ہیں ار سُنَّةُ النَّبِيِّ سے مراد آنحضرت کا وہ طریقہ ہے جسے آپ ﷺ اختیار فرماتے تھے۔اور سُنَّةُ اللّٰهِ سے مراد حق تعالیٰ کی حکمت

اور اطاعت کا طریقہ مراد ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ (۴۸۔۲۳) (یہی) خدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت کبھی بدلتی نہ دیکھو گے۔

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا﴾ (۳۵۔۴۳) اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔

تو آیت میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ شرائع کے فروعی احکام کی گو مختلف صورتیں چلی آئی ہیں لیکن ان سب سے مقصد ایک ہی ہے یعنی نفس کو پاک کرنا اور اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب اور اس کا جواز حاصل کرنے کے لئے تیار کرنا اور یہ مقصد ایسا ہے کہ اس میں اختلاف یا تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اور آیت:

﴿مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (۱۵۔۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مسنون کے معنیٰ متغیر کے ہیں۔ اور آیت:

﴿لَمْ يَتَسَنَّهْ ......﴾ (۲۔۲۵۹) (سڑی) بسی نہیں۔ میں لَمْ يَتَسَنَّهْ کے معنیٰ بھی لَمْ يَتَغَيَّرْ ہیں اس میں ہائے استراحت یعنی سکتہ کے ہے۔ [1]

(س ن م)

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ﴾ (۸۳۔۲۷) اور اس میں تسنیم (کے پانی) کی آمیزش ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ تَسْنِيْم جنت میں ایک اعلیٰ قسم کے چشمے کا نام ہے جیسا کہ بعد میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (۸۳۔۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے۔

(س ن و)

اَلسَّنَا: (اسم مقصور) چمک دار روشنی کو کہتے ہیں۔ اور اَلسَّنَاءُ (ممدود) کے معنیٰ رفعت کے ہیں۔ اور معنیٰ رفعت کے اعتبار سے آب کشی کے جانور کو "سَانِيَةٌ" کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:

﴿يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ﴾ (۲۴۔۴۳) اور بادل میں جو چمک آنکھوں کو (خیرہ کر کے بینائی کو) اچکے لئے جاتی ہے۔

اور سَنَتِ النَّاقَةُ تَسْنُوْ کے معنیٰ ہیں اونٹنی نے کنویں سے پانی نکالا اور زمین کو سیراب کیا اور ایسی اونٹنی کو سَانِيَةٌ کہا جاتا ہے (والجمع السوانی)

اَلسَّنَةُ: (سال) اس کی اصل دو طرح بیان کی جاتی ہے ایک یہ کہ اصل میں سَنْهَةٌ ہے کیونکہ محاورہ ہے سَانَهْتُ فُلَانًا کہ میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کیا۔ نیز اس کی تصغیر سُنَيْهَةٌ آتی ہے اور ایک قول کے مطابق اسی سے ﴿لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ (۲۔۲۵۹) ہے جس کے معنیٰ ہیں کہ وہ سالہا سال گزر جانے سے بھی متغیر نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی تازگی ختم ہوئی ہے۔

[1] بيناه على قرأة حمزة والكسائي واصله عندهم لم يتسنّى (من الواو) ويحتمل ان يكون اصله لم يتسنن ماخوذاً من سنن فابدلت نونه الاخيرة حرف علة وسقطت بالجزم (راجع انوار التنزيل ۱۲).

بعض کے نزدیک اس کی اصل سَنْوَۃٌ ہے۔کیونکہ اس کی جمع سَنَوَاتٌ آتی ہے اور اسی سے سَانَیْتُ فعل ہے اس صورت میں سَــنَةٌ میں ہاء برائے وقف ہوگی۔جیسا کہ کِتَابِیَه وحِسَابِیَه میں ہے۔❶ قرآن میں ہے:

﴿اَرْبَعِیْنَ سَنَةً﴾ (۵۔۲۶) چالیس برس کے لئے۔

﴿سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا﴾ (۱۲۔۴۷) سات سال متواتر

﴿ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ﴾ (۱۸:۲۵) تین سو برس۔اور آیت:

﴿وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ﴾ (۷۔۱۳۰)

اور ہم نے فرعونیوں کو کئی سال تک قحط میں مبتلا رکھا۔

میں سِنین سے مراد قحط سالی ہے اور زیادہ تر سَــنَةٌ کا لفظ قحط سالی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے:

اَسْنَتَ الْقَوْمُ: لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوگئے۔

شاعر نے کہا ہے۔❷

(۲۴۰) لَهَا اَرَجٌ مَا حَوْلَهَا غَیْرُ مُسْنِتٌ

جس کی خوشبو مہک رہی ہو اور اس کے اردگرد تازگی پھیلی ہوئی ہو۔دوسرے شاعر نے کہا ہے۔❸

(۲۴۱) فَلَیْسَتْ بِسَنْهَاء ولَا رُجَّبِیَّةٌ

اسے نہ تو خشک سالی نے نقصان پہنچایا ہے اور نہ ہی کمزور ہونے کی وجہ سے اسے ستون لگا کر کھڑا کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ اس شعر میں ہاء اصلی ہے۔ایک اور شاعر نے کہا ہے۔❹

(۲۴۲) یَـأکُـلُ اَزْمَانَ الْهُزَالِ وَالسِّنِیْ

جو ہزال اور قحط سالی کے زمانہ میں چرتا رہا ہو۔

یہاں اَلسِّــنِیْ سَنَةٌ سے مرخم نہیں ہے۔بلکہ یہ فُعُوْلٌ کے وزن پر جمع ہے جیسے مِـــائَةٌ کی جمع مِــئِیْــنَ وَمِئُوْنَ آتی ہے اور عَصِیٌّ کی طرح فاء کلمہ مکسور ہے مگر برعایت قافیہ تخفیف کر کے ایک یا کو ساقط کر دیا گیا ہے۔

اور آیت:

﴿لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ (۲۔۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

میں سِنَةٌ وَسَنٌ سے ہے اور اس باب سے خارج ہے۔

(س ھ ر)

اَلسَّــاھِـرَۃُ کے معنیٰ میدان یا روئے زمین کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَاھُـمْ بِـالسَّـاھِرَۃِ﴾ (۷۹۔۱۴) اس وقت وہ (سب) میدان (حشر) میں آ جمع ہوں گے۔

---

❶ اصحاب المعاجم ذکرہ فی (س، ن، ہ) و(س، ن، و،)۱۲.

❷ قاله الشنفریٰ الازدی وصدرہ : بریحانة من حلیة نورت .... والبیت من کلمة مفضلیة رقم ۲۰ فی ۳٦ بیتاً انظر الاغانی (۲۱ : ۹۰) والبیت فی اللسان (حلا) والمحکم (روح).

❸ قاله سوید بن الصامت الانصاری وقد نسب الی احیحة بن الجلاح قال فی السمط (۱ : ۳٦۱) والاول اثبت وتمامه ولکن عرایانی السنین الحوائجَ فی ابیات له یصف نخلابالجودة یقول : نخلی لیست بسنهاء ولاممنوعة الثمر ولکن اعربها الناس و"رجبیة" یروی بفتحه الجیم بالتخفیف والتشدید وکلاھما نَسَبٌ نَادِرٌ والتشدید اذھب فی الشذود وفی مجالس ثعلب السنها النخلة التی تحمل سنة وسنة لا والرجبیة التی یخاف سقوطها فیعمل لها رجبة وفی السمط الرجبة الخطیرة تبنیٰ حول النخلة یمنع بها من ثمرها ای لیست ممنوعة الثمر واللفظان اختلف فی تفسیر ھما راجع اللسان (رجب، سنة، عری) ومجالس ثعلب (۲ : ۲۸۵) والقرطبی (۳: ۲۹۳) والقالی (۱ : ۱۲۰) واضداد ابی الطیب ٦۹٤ ومعانی القران المنسوب الی الفراء (۱ : ۱۷۳) وغریب القران للقتبی ۹٤.

❹ والبیت فی اللسان (حتم) بغیر عزو قال ابن بری الشطر لامرئة من بنی عقیل تفخر باخوالها من الیمن وذکر ابوزید انه للعامریة وصلته : حیدة خالی ولقیط وعلی وحاتم الطائی وھاب المئی ولم یکن کخالك العبد الدعی .... ھیاب عمیر غیر ذکی.

بعض نے کہا ہے کہ سَاهِرَةٌ سے مرادروئے زمین (یعنی یہی زمین) ہے اور بعض کے نزدیک اَرْضِ آخرت مراد ہے اور اصل میں سَاهِرَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر کثرت سے آمدورفت ہو۔گویا وہ آمدورفت سے بیدار ہوچکی ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۴۳) تَحَرَّكَ يَقْظَانُ التُّرَابِ وَنَائِمُهُ

تو بیدار اور سوئی زمین ہل جاتی ہے۔

اور ناک کی دونوں رگوں کو اَسْهَرَان کہا جاتا ہے۔

(س ھ ل)

اَلسَّهْلُ کے معنٰی نرم زمین کے ہیں اس کی جمع سُهُوْلٌ آتی ہے۔اور یہ حَزْنٌ کی ضد ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا﴾ (۷۔۷۴)

(کہ) نرم زمین سے (مٹی لے کر) محل تعمیر کرتے ہو۔

اور اَسْهَلَ کے معنٰی نرم زمین میں جانے کے ہیں اور رَجُلٌ سَهْلِيٌّ کے معنٰی میدانی علاقہ میں رہنے والا آدمی کے ہیں نَهْرٌ سَهْلٌ: جوئے ریگ ناک اور نرم خو آدمی کو رَجُلٌ سَهْلُ الْخُلُقِ کہا جاتا ہے۔(اس کی ضد) حَزْنُ الْخُلُقِ ہے اور سُهَيْلٌ ایک ستارے کا نام ہے۔

(س ھ م)

اَلسَّهْمُ: وہ تیر جو چلایا جاتا ہے نیز قرعہ اندازی کے تیر وغیرہ کو سَهْمٌ کہا جاتا ہے۔اسی سے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ﴾ (۳۷۔۱۴۱)

اس وقت قرعہ ڈالا تو انہوں نے زک اٹھائی۔

اور اِسْتَهَمُوْا (افتعال) کے معنٰی قرعہ اندازی کرنے کے ہیں اور بُرْدٌ مُسَهَّمٌ اس چادر کو کہتے ہیں جس پر تیر کی تصویر ہو۔

سَهُمَ (ف) سُهُوْمًا۔ اَلْوَجْهُ لاغرپن کی وجہ سے چہرے کا متغیر ہونا۔اور اَلسُّهَامُ (بالضم والفتح) اس مرض کو کہتے ہیں جس سے چہرہ متغیر ہوجاتا ہے۔

(س ھ و)

اَلسَّهْوُ: (ن) وہ غلطی جو غفلت کی وجہ سے سرزد ہو اس کی دو قسمیں ہیں۔ایک یہ کہ اس کے اسباب اور مولدات انسان کے اپنے اختیار سے پیدا کردہ نہ ہوں جیسے مجنون آدمی کا کسی انسان کو گالی دینا۔دوم یہ کہ اس کے مولدات انسان کے خود پیدا کردہ ہوں جیسے کوئی شخص شراب نوشی کرے اور پھر اس سے (نشہ میں) بغیر ارادہ کے کوئی برائی صادر ہو پہلی قسم کی خطا تو عفو کے حکم میں ہے لیکن دوسری قسم کی خطا پر مواخذہ ہوگا۔اور اس دوسری قسم کے سہو کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۱) بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں۔

﴿عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ (۱۰۷۔۵) نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

---

[1] قاله ابان بن عبدة في قصيدة وصدره : وذانحن سرنابين شرق وغرب راجع الحماسة بشرح التبريزى (۲ : ۹۴) والمرزوقى ۲۰۸ والحمان لابن ناقياص (۳۶۹).

(س ی ب)

﴿اَلسَّآئِبَۃُ﴾ (۵-۱۰۳) وہ جانور ہے جو چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور اسے پانی اور چارہ سے کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو (جاہلیت میں) اس قسم کی آزادی اس جانور کو دی جاتی تھی جو پانچ بچوں کو جنم دے چکا ہوتا۔ (1) اور اَلسَّائِبَۃُ اس غلام کو بھی کہتے ہیں جو آزاد کیا جائے اور اس کی ولاء کا حق دار معتق (آزاد کنندہ) ہو۔ (2) اور اسے حق حاصل ہو کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور اسی کے متعلق نہی وارد ہوئی ہے۔ (3)

اَلسَّیْبُ عطا کو کہتے ہیں اور اَلسِّیْبُ (بکسرہ سین) پانی کے جاری ہونے کی جگہ اصل میں یہ سَیَّبْتُہٗ فَسَابَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں: میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا چنانچہ وہ چلا گیا۔ اور اِنْسَابَتِ (انفعال) اَلْحَیَّۃُ کے معنیٰ سانپ پانی کی طرح تیزی سے اپنے بل میں اتر گیا۔

(س ی ح)

اَلسَّاحَۃُ کے معنیٰ فراخ جگہ کے ہیں۔ اسی اعتبار سے مکان کے صحن کو سَاحَۃُ الدَّارِ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ﴾ (۳۷-۱۷۷) مگر جب وہ ان کے میدان میں آ اترے گا۔

اور وسیع مکان میں ہمیشہ جاری رہنے والے پانی کو سَائِحٌ کہا جاتا ہے اور سَاحَ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ کے معنیٰ پانی کی طرح زمین میں چکر کاٹنا کے ہیں اور قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسِيْحُوا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ (۹-۱۲) تو (مشرکو تم) زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔

اور اسی سے ہمیشہ سفر کرنے والے آدمی کو سَائِحٌ یا سَیَّاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت: ﴿اَلسَّآئِحُوْنَ﴾ (۹-۱۱۲) روزہ رکھنے والے۔

میں سَائِحُوْنَ بمعنیٰ صَائِمُوْنَ کے ہے۔ اسی طرح ﴿اَلسَّآئِحَاتُ﴾ (۶۶-۵) سے روزہ رکھنے والی عورتیں مراد ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ روزہ دو قسم پر ہے ایک حقیقی روزہ جو کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنے سے عبارت ہوتا ہے اور دوسرا روزہ حکمی ہے۔ جو کہ جوارح یعنی آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کو معاصی سے روکنے کا نام ہے۔ تو سَائِحُوْنَ سے دوسری قسم کے روزہ دار مراد ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سَائِحُوْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو آیت:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوا فِی الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ (۲۲-۴۶) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔

کے مقتضیٰ کے تحت زمین میں سفر کرتے ہیں۔ (یعنی

---

(1) فی الصحاح: عشرۃ ابطن وقد نهی عنه القران ولاسائبة (۵: ۱۰۳).

(2) کذافی المطبوع وفی الصحاح: ولایکون ولاءه وهو الصحیح.

(3) راجع المعاجم وابن الاثیر. راجع المستدرك الحاکم عن ابی هریرة (انظر کنزالعمال ج ۲ رقم ۲۲ وفی الطبری (۱۱: ۲۸) مرفوعاً عن ابی هریرة وفی اللسان قال الزجاج فی قول اهل التفسیر واللغة جمیعاً السالحون بمعنیٰ الصائمون قارن غریب القران للقتبی ۱۹۳.

قدرت الٰہی کے آثار وعجائبات دیکھتے اور ان پرغور وفکر کرتے رہتے ہیں۔

(س و د)

اَلسَّوَادُ: (ضد بیاض) سیاہ رنگ کو کہتے ہیں۔اور اِسْوَدَّ (افعال) وَاِسْوَادَّ (افعیلال) کے معنٰی کسی چیز کے سیاہ ہونے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ﴾ (۳۔۱۰۶) جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ۔ تو چہروں کے سفید ہونے سے اظہار مسرت اور سیاہ ہونے سے مراد اظہار غم ہے اسی طرح آیت:

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ﴾ (۱۶۔۵۸) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہناک ہو جاتا ہے۔

میں بھی مُسْوَدًّا سے بھی مغموم ہونا مراد ہے۔بعض نے آیت:

﴿تَبْیَضُّ﴾ میں حسّی سفیدی اور سیاہی کے معنٰی مراد لئے ہیں۔لیکن پہلا معنٰی زیادہ بہتر ہے۔کیونکہ یہ چیز تو قیامت کے دن اعمال کے اعتبار سے حاصل ہوگی عام اس سے کہ وہ دنیا میں سیاہ فام ہوں یا سفید فام اور اسی سفیدی اور سیاہی کو دوسری آیات میں یوں فرمایا:

﴿وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ﴾ (۷۵۔۲۲) اس دن بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔

﴿وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ بَاسِرَۃٌ﴾ (۷۵۔۲۴) اور بہت سے منہ اس روز اداس ہوں گے۔

﴿وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْھَا غَبَرَۃٌ تَرْھَقُھَا قَتَرَۃٌ﴾ (۸۰۔۴۰،۴۱) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی (اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی)۔

﴿وَتَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ مَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ کَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْھُھُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا﴾ (۱۰۔۲۷) اور ان کے منہ پر ذلت چھا جائے گی اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا ان کے مونہوں (کی سیاہی) کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر گویا اندھیری رات کے ٹکڑے اوڑھا دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح مومنین کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ ❶

(۱۸۰) یُحْشَرُوْنَ غُرًّا مُّحَجَّلِیْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ کہ قیامت کے دن آثار وضو سے ان کے ہاتھ پاؤں اور چہرے چمک رہے ہوں گے۔

اور دور سے جو چیز نظر پڑے اسے بھی سَوَاد کہا جاتا ہے اسی طرح آنکھ کی سیاہی کو بھی سَوَادُ الْعَیْنِ سے تعبیر کرلیتے ہیں۔جیسا کہ کسی نے کہا ہے لَا یُفَارِقُ سَوَادِیْ سَوَادَہٗ میری آنکھ اس کے شخص سے جدا نہیں ہوتی اور بڑی جماعت کو بھی سَوَادٌ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ مروی ہے۔ ❷

عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ: مسلمانوں کی بڑی جماعت کا ساتھ نہ چھوڑو (نہ اس سے علیحدگی اختیار کرو) اور سَیِّدٌ کے معنٰی بڑی جماعت کا سردار کے ہیں چنانچہ

---

❶ اخرجه الشيخان عن ابي هريرة وفي روايتهم جميعاً: ان امتي يدعون يوم القيامة غرا.......... راجع كنزالعمال (۱۹ رقم ٤٩٧).

❷ رواه ابن ماجة وتتمته ان امتي لن تجتمع علي ضلالة عن انس وذكر النبهاني في الفتح (۱: ۳۷۵).

اضافت کے وقت سَیِّدُ الْقَوْمِ تو کہا جاتا ہے۔مگر سَیِّدُ الثَّوبِ یا سَیِّدُ الْفَرَسِ نہیں بولا جاتا اور اسی سے سَادَ الْقَومَ یَسُوْدُھُمْ کا محاورہ ہے چونکہ قوم کے رئیس کا مہذب ہونا شرط ہے اس اعتبار سے ہر فاضل النفس آدمی کو سَیِّدٌ کہا جاتا ہے چنانچہ آیت: ﴿وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ (۳۔۳۹) اور سردار ہوں گے اور عورت سے رغبت نہ رکھنے والے۔

میں بھی سَیِّدٌ کا لفظ اسی معنیٰ پر محمول ہے۔اور آیت: ﴿وَاَلْفَیَا سَیِّدَھَا﴾ (۱۲۔۲۵) اور دونوں کو......عورت کا خاوند مل گیا۔

میں خاوند کو سید کہا گیا ہے کیونکہ وہ بیوی کا نگران اور منتظم ہوتا ہے۔اور آیت:

﴿رَبَّنَا اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآئَنَا﴾ (۳۳۔۶۷)

اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا۔

میں سَادَتَنَا سے ولاۃ اور حکام مراد ہیں۔

(س ی ر)

اَلسَّیْرُ: (ض) کے معنیٰ زمین پر چلنے کے ہیں۔ اور چلنے والے آدمی کو سَائِرٌ وَسَیَّارٌ کہا جاتا ہے اور ایک ساتھ چلنے والوں کی جماعت کو سَیَّارَۃ کہتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَآئَتْ سَیَّارَۃٌ﴾ (۱۲۔۱۹) (اب خدا کی شان دیکھو کہ اس کنویں کے قریب) ایک قافلہ وارد ہوا۔

سِرْتُ: (ض) کے معنیٰ چلنے کے ہیں اور سِرْتُ بِفُلَانٍ نیز سِرْتُہٗ کے معنیٰ چلانا بھی آتے ہیں اور معنیٰ تکثیر کے لئے سَیَّرْتُہٗ کہا جاتا ہے۔

(الغرض سَیْرٌ کا لفظ چار طرح استعمال ہوتا ہے) چنانچہ پہلے معنیٰ کے متعلق فرمایا:

﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۱۲۔۱۰۹) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر (وسیاحت) نہیں کی۔

﴿قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۶۔۱۱) کہو کہ (اے منکرین رسالت) ملک میں چلو پھرو۔

﴿سِیْرُوْا فِیْھَا لَیَالِیَ﴾ (۳۴۔۱۸) کہ رات...... چلتے رہو۔اور دوسرے معنیٰ یعنی سِرْتُ بِفُلَانٍ کے متعلق فرمایا:

﴿سَارَ بِاَھْلِہٖ﴾ (۲۸۔۲۹) اور اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر چلے۔

اور تیسری قسم یعنی سِرْتُہٗ (بدوں صلہ) کا استعمال قرآن پاک میں نہیں پایا جاتا اور چوتھی قسم (یعنی معنیٰ تکثیر) کے متعلق فرمایا:

﴿وَسُیِّرَتِ الْجِبَالُ﴾ (۷۸۔۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے۔

﴿وَھُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۱۰۔۲۲) وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرانے کی توفیق دیتا ہے۔

اور آیت: ﴿سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۶۔۱۱) کہ ملک میں چلو پھرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سیاحت جسمانی ملک میں سیر (وسیاحت کرنا مراد ہے) اور بعض نے سیاحت فکری یعنی عجائبات قدرت میں غور وفکر کرنا اور حالات سے باخبر رہنا مراد لیا ہے جیسا کہ اولیاء کرام کے متعلق مروی ہے۔

اَبْدَانُھُمْ فِی الْاَرْضِ سَائِرَۃٌ وَقُلُوبُھُمْ فِی الْمَلَکُوتِ جَائِلَۃٌ (کہ ان کے اجسام تو زمین پر چلتے

پھرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی روحیں عالم ملکوت میں جولانی کرتی رہتی ہیں) بعض نے کہا ہے اس کے معنیٰ ہیں: عبادت میں اس طرح کوشش کرنا کہ اس کے ذریعہ ثواب الٰہی تک رسائی ہوسکے اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے۔ ❶

(۱۸۱) سَافِرُوْا تَغْنَمُوْا: سفر کرتے رہو غنیمت حاصل کرلو گے بھی اسی معنی پر محمول ہے پھر تسییر دو قسم پر ہے ایک وہ جو چلنے والے کے اختیار وارادہ سے ہو، جیسے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ﴾ (۱۰۔۲۲) وہی تو ہے جو تم کو...... چلنے کی توفیق دیتا ہے۔

دوم وہ جو بذریعہ تسخیر کے ہو اور سَائِرٌ یعنی چلنے والے کے ارادہ واختیار کو اس میں کسی قسم کا دخل نہ ہو جیسے جبال کے متعلق فرمایا:

﴿وَسُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾ (۷۸۔۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہوکر رہ جائیں گے۔

﴿وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ﴾ (۸۱۔۳) اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

اَلسِّیْرَةُ: اس حالت کو کہتے ہیں جس پر انسان زندگی بسر کرتا ہے عام اس سے کہ اس کی وہ حالت طبعی ہو یا اکتسابی۔ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ حَسَنُ السِّیْرَةِ: فلاں کی سیرت اچھی ہے۔

فلاں قَبِیْحُ السِّیْرَةِ: اس کی سیرت بری ہے اور آیت:

﴿سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی﴾ (۲۰۔۲۱) ہم اس کو ابھی اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

میں سیرۃ اولیٰ سے اس عصا کا دوبارہ لکڑی بن جانا ہے۔

(س و ر)

اَلسَّوْرُ: اس کے اصل معنیٰ بلندی پر کودنے کے ہیں اور غصہ یا شراب کی شدت پر بھی سَوْرَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: سَوْرَةُ الْغَضَبِ اور سَوْرَةُ الشَّرَابِ: (شراب کی تیزی) سِرْتُ اِلَیْكَ کے معنیٰ ہیں: میں تیری طرف چلا اور سَاوَرَنِیْ فُلَانٌ کے معنیٰ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے ہیں۔ اور سَوَّارٌ بمعنیٰ وَثَّابٌ یعنی عربدہ گر کے ہیں اور اَلْاَسْوَارُ اَسَاوِرَةُ الْفَرَسِ کا مفرد ہے جس کے معنیٰ تیر انداز کے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے۔

سِوَارُ الْمَرْاَةِ: (عورت کا بازو بند) یہ بھی معرب ہے اور اصل میں دَسْتْوَار ہے بہرحال اس کی اصل جو بھی ہو اہل عرب اسے استعمال کرتے ہیں اور اس سے اشتقاق کرکے کہا جاتا ہے۔

سَوَّرْتُ الْمَرْاَةَ: میں نے عورت کو کنگن پہنائے اور جَارِیَةٌ مُسَوَّرَةٌ وَمُخَلْخَلَةٌ: اس لڑکی کو کہتے ہیں جس نے بازو بند اور پازیب پہن رکھی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

---

❶ ولفظة الحديث سافر وا تصحوا ونغنموا والحديث فی (هق عن ابن عباس) الشيرازی فی الالقاب ملس وابو نعيم فی الطب والقضاعی عن ابن عمر وفی رواية : وترزقوا (عب، عن محمد بن عبدالرحمن مرسلاً) راجع للحديث باختلاف الفاظه كنزالعمال ج (٦ص ٢٨٨٨۔٢٨٩٢) فانه ذكره بطرقة المختلفة وقد عقده ابوالفتح بن ابی حصين فی بيت سافر وا تغنموا وقدقا ل عليه السلام صوموا تصحوا(راجع خاص الخاص للثعالبی ١٦٠) وفی المعاهد (٢ : ٨٥) اتمام الحديث بدل عليه السلام وقد نسبه الی عبدالمحسن بن محمد الصوری ١٢۔

﴿اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَھَبٍ﴾ (۴۳۔۵۳) سونے کے کنگن۔

﴿اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ (۷۶۔۲۱) چاندی کے کنگن۔

اور قرآن پاک میں سونے کے ساتھ اَسْوِرَةٌ جمع لاکر پھر خاص کر اُلْقِیَ کا صیغہ استعمال کرنا اور فِضَّةٌ سے قبل اَسَاوِرَ کا لفظ لاکر اس کے متعلق حُلُّوْا کا صیغہ استعمال کرنے میں ایک خاص نکتہ ملحوظ ہے جس کی تفصیل دوسری کتاب میں بیان ہوگی۔ ❶

اَلسُّوْرَةُ کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۴۴) اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ اَعْطَاكَ سُوْرَةً
تَرَىٰ كُلَّ مَلِكٍ دُوْنَهَا يَتَذَبْذَبُ

بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا مرتبہ بخشا ہے جس کے ورے ہر بادشاہ متذبذب نظر آتا ہے۔

اور سُوْرُ الْمَدِيْنَةِ کے معنی شہر پناہ کے ہیں اور سُوْرَةُ الْقُرْاٰن (قرآن کی سورت) یا تو سُوْرُ الْمَدِيْنَةِ سے ماخوذ ہے کیونکہ سورہ بھی شہر پناہ کی طرح قرآن پاک کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے انہیں سورۃ القرآن کہا جاتا ہے۔اور یا سورۃ بمعنی مرتبہ سے مشتق ہے اور سورۃ بھی منازل قمر کی طرح ایک منزلۃ ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور یہ دونوں اشتقاق اس وقت ہو سکتے ہیں جب اس میں واؤ کو اصلی مانا جائے لیکن اگر اسے اصل میں سُؤْرَةٌ مہموز مانا جائے تو یہ اَسْأَرْتُ سے مشتق ہوگا جس کے معنی کچھ باقی چھوڑ دینے کے ہیں۔اور سورۃ بھی چونکہ قرآن پاک کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہوتی ہے۔اس لئے اس کو سورۃ کہا جاتا ہے اور آیت:

﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنَاهَا﴾ (۲۴۔۱) یہ (ایک) سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا۔

میں سورۃ سے مراد احکام وحِکَم ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَسْأَرْتُ فِی الْقَدْحِ: سے مشتق ہے جس کے معنی پیالہ میں کچھ باقی چھوڑنے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❸

(۲۴۵) لَا بِالْحَصُوْرِ وَلَا فِيهَا بِسَآرِ

نہ تنگ دل اور بخیل ہے اور نہ عربدہ گر۔

ایک روایت میں وَلَا بِسَوَّارٍ ہے جو سَوْرَةٌ بمعنی شدت غضب سے مشتق ہے۔

(س و ط)

اَلسَّوْطُ (چمڑے کا کوڑا) بٹے ہوئے چمڑے کو

---

❶ اشارة الی تفسیر القران الذی الفه بعد مفرداته .

❷ قاله النابغة فی مدح نعمان بن المنذر معتذراً انظر دیوانه ۱۳ ومختار الشعر الجاهلی ۱۷۵ وتفسیر الطبری (۵: ۳۳۵) وامالی المرتضیٰ (۱: ۴۸۷) والصناعتین (۷۰۵) مع آخر ونقد الشعر ۲۶ والحیوان (۳: ۹۵) والعقد (۵) والحصری (۳: ۹۲) والسیوطی ۸۰ والعقد الفرید (۲: ۱۶۳) والصاحبی ۱۹۸.

❸ قاله الاخطل التغلبی واوله : وشارب مربح بالكاس نادمنی والبیت من قصیدة جمهریة ۳۲۶۔۳۳۰ فی ۵۰ بیتاً فیها یزید بن معاویة والبیت فی دیوانه ۱۱۶ (ط بیروت ۱۸۹۱ء والبحر ۱: ۱۰۱/۲: ۴۴۸ ومجالس ثعلب ۱: ۳۱۵ والطبری ۳: ۲۵۵/۱۵: ۴۶ وشواهد الکشاف ۴۳ واللسان والمحکم والصحاح (حصر) والقرطبی ۴: ۷۸ ومجاز القران ۱: ۹۲ وتهذیب الالفاظ ۲۲۶ وتهذیب الاصلاح ۱: ۲۵ مجموعة المعانی ۱۹۸ والقتبی المعانی ۴۶۴ وفی روایته ولا بسوار وهی روایة یعقوب فی اصلاحه ۱۴۲، ۲۳۰ وابن قتیبه فی المعانی والجوهری فی صحاحه ۱۲.

کہتے ہیں جس کے ساتھ پیٹا جاتا ہے۔اصل میں سَوْطٌ کے معنیٰ کسی چیز کو خلط ملط کرنا کے ہیں اور اس سے فعل سُطْتُہٗ وَسَوَّطْتُہٗ آتا ہے اور کوڑے کو سوط اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بھی چند تسمے بٹنے سے باہم خلط ملط ہوجاتے ہیں۔اور آیت:

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ (۸۹۔۱۳)

تو تمہارے پردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا نازل کیا۔

میں عذاب الٰہی کو دنیاوی سزا کے ساتھ تشبیہ دے کر سوط سے تعبیر کیا ہے کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں کوڑے سے سزا دی جاتی تھی بعض نے کہا ہے کہ سَوْطَ عَذَابٍ لفظ سے انواع عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف کہ آیت:﴿حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا﴾ (۷۸۔۲۵) میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

(س و ع)

اَلسَّاعَةُ: (وقت) اجزاء زمانہ میں سے ایک جزء کا نام ہے اور اَلسَّاعَةُ بول کر قیامت بھی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾ (۵۴۔۱) قیامت قریب آ پہنچی۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ﴾ (۸۰۔۴۲) (اے پیغمبر لوگ) تم سے قیامت کے دن کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

﴿وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (۴۳۔۸۵) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

تو قیامت کو سَاعَةٌ کہنا یا تو سرعت حساب میں تشبیہ کے طور پر ہے جیسے فرمایا:

﴿وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ﴾ (۶۔۶۲) اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے۔

اور یا اس معنیٰ کے پیش نظر اسے سَاعَةٌ کہا ہے جس پر کہ آیت کریمہ:

﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحَاهَا﴾ (۷۹۔۴۶) جب وہ اس کو دیکھیں گے تو ایسا خیال کریں گے کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے ہیں۔

﴿لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ﴾ (۴۶۔۳۵) (تو خیال کریں گے) کہ گویا دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر دن۔

اور آیت:

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ﴾ (۳۰۔۱۴) اور جس دن قیامت برپا ہوگی۔ میں تنبیہ فرمائی ہے۔اور پہلی آیت یعنی ﴿يَوْمَ يَرَوْنَهَا﴾ میں ''ھَا'' ضمیر سے مراد قیامت ہے اور دوسری آیت میں سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ سے وقت قلیل مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ سَاعَات جن سے قیامت مراد ہوتی ہے تین ہیں۔

(۱) اَلسَّاعَةُ الْكُبْرٰی: یعنی لوگوں کو محاسبہ کے لئے اٹھانا یا دوبارہ زندہ کرنا اور اسی کے متعلق آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

(۱۸۲) لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ الْفُحْشُ وَالتَّفَحُّشُ وَحَتّٰى يُعْبَدَ الدِّرْهَمُ وَالدِّيْنَارُ......... کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا نہ ہونے لگ جائے اور درہم ودینار کی پرستش نہ ہونے لگے اور آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی بہت سی

علامات کا تذکرہ فرمایا ہے جو نہ آپ کے زمانہ میں ظاہر ہوئیں اور نہ بعد میں اب تک ان کا ظہور ہوا ہے۔ ❶

(۲) اَلسَّاعَةُ الوُسْطیٰ: جو کہ ایک قرن کے لوگ گزر جانے سے عبارت ہے جیسا کہ آنحضرت سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا: ❷

(۱۸۳) اِنْ یَّطُلْ عُمُرُ هٰذَا الْغُلَامِ لَمْ یَمُتْ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ: اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ قیامت سے پہلے نہیں مرے گا۔

چنانچہ بعض کا قول ہے کہ وہ صحابہ کرام میں سب سے آخر فوت ہوئے ہیں۔

(۳) اَلسَّاعَةُ الصُّغْریٰ: جو کہ انسان کی موت سے عبارت ہے پس اس معنیٰ کے لحاظ سے ہر انسان کی موت اس کے لئے قیامت ہے۔ ❸ چنانچہ اسی معنیٰ کی طرف آیت:

﴿وَاَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا اَخَّرْتَنِیْ اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ﴾ (۶۳۔۱۰) جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس (وقت) سے پیشتر خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو (اس وقت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت:

﴿قُلْ اَرَاَیْتَكُمْ اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ﴾ (۶۔۴۰) (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو۔

میں اَلسَّاعَةُ سے مراد موت ہی ہے ایک حدیث میں ہے۔

(۱۸۴) کہ جب سخت آندھی چلتی تو آپ ﷺ کا چہرہ متغیر ہوجاتا اور فرماتے تَخَوَّفْتُ السَّاعَةَ کہ مجھے قیامت کا اندیشہ ہے۔ نیز فرمایا:

(۱۸۵) وَمَا اَحُدُّ طَرَفِیْ وَلَا اَغُضُّهَا اِلَّا وَاَظُنُّ اَنَّ السَّاعَةَ قَدْ قَامَتْ کہ جب میں اپنی نظر اٹھاتا ہوں یا نیچی کرتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ بس قیامت آچکی یعنی مجھے اپنی موت کا ہر لحہ خیال رہتا ہے جس طرح کہ عَامَلْتُهٗ مُعَاوَمَةً و یا مُشَاهَرَةً کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ سال یا مہینہ کے حساب سے معاملہ کرنے کے ہیں اسی طرح ساعات کے حساب سے معاملہ کرنے کے معنیٰ میں عَامَلْتُهٗ مُسَاوَعَةً استعمال ہوتا ہے اور جَائَنَا بَعْدَ سَوْعٍ مِنَ اللَّیْلِ وَسَوَاعٍ کے معنیٰ ''سکون شب کے بعد وہ ہمارے پاس آیا'' اور پھر سَاعَةٍ سے کبھی اہمال (ضائع کرنا) کے معنیٰ بھی

---

❶ منها خروج الدابة ونزول المسيح وظهور الدجل وطلوع الشمس من مغربها والى ذالك ۱۲.

❷ وفی صحيح مسلم (۲: ٤٠٦) والبخاری من حديث النبی صلى الله عليه وسلم: ان يعش هذالغلام فعسىٰ ان لايدركه الهرم حتىٰ تقوم الساعة واما اسم هذالغلام اراه فی رعاية صحيحة وفی صحيح مسلم الى غلام من ازد شنوئة وقال انس وكان من اترابی ومعنىٰ الحديث يموت ذالك القرن واولائك المخاطبون قال النووی ويحتمل انه علم ان هذا الغلام لايبلغ الهرم راجع للبحث الفتح للحافظ (١٤: ١٤٩ـ٥٠).

❸ وفی الحديث من مات فقد قامت قيامته. كماروی فی الحديث من مات فقد قامت قيامته انظر الفردوس لابی شجاع الديلمی وبمعناه فی الطبری من حديث المغيرة بن شعبة وابن ابی الدنيا من حديث انس بسند ضعيف راجع تخريج الكشاف رقم ٥ وتخريج الاحياء للعراقی (٤: ٦٤)

لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

اَسَغْتُ الْاِبِلَ: (افعال) میں نے اونٹوں کو بے کار چھوڑ دیا یا ضائع کر دیا۔ ھُوَ ضَائِعٌ سَائِغٌ: وہ مہمل اور بے کار ہے۔

سُوَاعٌ: ایک بت کا نام ہے۔❶ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا﴾ (۷۱۔۲۳) اور ود اور سُواع...... کو کبھی ترک نہ کرو۔

(س و غ)

سَاغَ الشَّرَابُ فِی الْحَلْقِ: کے معنیٰ شراب کے آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتر جانا کے ہیں وَاَسَاغَهٗ کَذَا (افعال) کے معنیٰ حلق سے نیچے اتارنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ﴾ (۱۶۔۶۶) پینے والوں کے لئے خوش گوار ہے۔

﴿وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُهٗ﴾ (۱۴۔۱۷) اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ سَوَّغْتُهٗ مَالًا میں نے اس کے لئے مال خوشگوار بنا دیا یعنی مباح کر دیا اور پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ سَوْغُ اَخِیْهِ کا محاورہ اس بچے کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے بھائی کے بعد جلدی ہی پیدا ہو (یہ مذکر ومؤنث دونوں کے حق میں بولا جاتا ہے)

(س و ف)

سَوْفَ: (حرف تسویف) یہ حرف ہے جو فعل مضارع کو معنیٰ حال سے مجرد کر کے معنیٰ استقبال کے لئے خاص کر دیتا ہے (اسی لئے سے حرف استقبال بھی کہتے ہیں) چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْ﴾ (۱۲۔۹۸) میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا۔

اور آیت: ﴿فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ (۶۔۱۳۶) عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔

میں متنبہ کیا ہے کہ جس بات کا وہ مطالبہ کرتے ہیں اگرچہ فی الحال وہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن وہ لامحالہ ہو کر رہے گی۔ اور اس میں مُمَاطَلَۃ (ٹال مٹول) اور تاخیر کے معنیٰ پائے جاتے ہیں اور چونکہ وعدہ کرنے والا سَوْفَ اَفْعَلُ کَذَا کا محاورہ استعمال کرتا ہے اس لئے اَلتَّسْوِیْفُ (تفعیل) کے معنیٰ ٹال مٹول کرنا بھی آجاتے ہیں۔

اَلسَّوْفُ (ن) کے معنیٰ مٹی یا بول کی بو سونگھنے کے ہیں پھر اس سے اس ریگستان کو جس میں راستہ کے نشانات مٹے ہوئے ہوں اور (قافلہ کا) رہنما اس کی مٹی سونگھ کر راہ دریافت کرے اسے "مَسَافَۃٌ" کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے۔❷

(۲۴۶) اِذَا الدَّلِیْلُ اسْتَافَ اَخْلَاقَ الطُّرُقِ

---

❶ سواع لم یوجد اصله فی کلام العرب ویمکن ان یکون مشتقا من السوع بمعنی الزمان وانظر لود(ورد) وهما من الآلهة التی کانت قوم نوح تعبدها.

❷ قاله رؤبة بن العجاج الراجز الاسلامی فی ارجوزة له ۱۷۴ بیتاً وهی فی دیوانه (۱۰۴۔۱۰۸) وقبله، مسودة الاعطاف من وسم العرق وبعده: کانها حقباء بلقاء الزحق والشطر وحده فی خزانة الادب (۱:۸۸) ودیوانه (۱۰۵) والاقتضاب (۳۱۲) وادب الکاتب ۵۱ واضداد ابی الطیب ۶۹۸ واصلاح یعقوب ۳۱۶.

جب رہنما بے نشان راستوں پر سونگھ سونگھ کر چلے۔
اَلسُّوَافُ: اونٹوں کے ایک مرض کا نام ہے جس کی وجہ سے وہ مرنے کے قریب ہو جاتے ہیں اور اس سے موت کی بو سونگھ لیتے ہیں یا موت ان کو سونگھ لیتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے جلدی ہی ان کی موت آ جاتی ہے۔

(س و ق)

سَوْقُ الْاِبِلِ: کے معنیٰ اونٹ کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں یہ سُقْتُہٗ (ن) کا مصدر ہے اور اِنْسَاق (انفعال) کے معنیٰ ہنکانے کے بعد چل پڑنے کے ہیں۔ ان جانوروں کو جو ہنکائے جاتے ہیں، سَیِّقَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور عورت کو مہر ادا کرنے کے لئے سُقْتُ الْمَھْرَ اِلَی الْمَرْأَۃِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ عرب حق مہر میں (عام طور پر) اونٹ دیا کرتے تھے۔ اور آیت: ﴿اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ﴾ (۷۵۔۳۰) میں مساق کے معنیٰ پروردگار کی طرف چلنا کے ہیں جیسا کہ آیت: ﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَھٰی﴾ (۵۱۔۴۲) میں ہے یعنی تمہیں اپنے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔
اور آیت: ﴿مَعَھَا سَائِقٌ وَّشَھِیْدٌ﴾ (۵۰۔۲۱) اس کے ساتھ چلانے والا ہوگا اور ایک (اس کے عملوں کی) گواہی دینے والا۔

میں سائق سے وہ فرشتہ مراد ہے جو اسے چلا کر حساب کے لئے پیش کرے گا اور دوسرا فرشتہ شہید (بطور گواہ) کے اس کے ساتھ ہوگا جو اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گا بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ﴾ (۸۔٦) گویا موت کی طرف دھکیلے جاتے ہیں۔ کے ہم معنیٰ ہے اور آیت:

﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ﴾ (۷۵۔۲۹) اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قبض روح کے وقت پنڈلیوں کا لپٹنا مراد ہے اور بعض نے پنڈلیوں کا کفن میں لپیٹنا مراد لیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اُن کے لپیٹنے سے مراد موت ہے کہ زندگی میں وہ اس کے بوجھ کو اٹھا کر چلتی تھیں لیکن موت کے بعد وہ اس بار کی متحمل نہیں ہوسکیں گی۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک شدت کا دوسری شدت سے لپٹنا مراد ہے اسی طرح آیت: ﴿یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ (٦۸۔۴۲) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا۔ میں پنڈلی سے کپڑا اٹھانا صعوبت حال سے کنایہ ہے۔ اور یہ کَشَفَتِ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِھَا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ لڑائی کے سخت ہو جانے کے ہیں۔ بعض نے اس کی اصل یہ بیان کی ہے کہ جب اونٹنی کے پیٹ میں بچہ مرجاتا ہے تو مُزَمِّرْ (جنوانے والا) اس کے رحم کے اندر ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے پنڈلیوں سے پکڑ کر زور سے باہر نکالتا ہے اور یہ کَشَفَ عَنِ السَّاقِ کے اصل معنیٰ ہیں پھر ہر ہولناک امر کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہونے لگا ہے تو یہاں بھی شدت حال سے کنایہ ہے اور آیت:
﴿فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ﴾ (۴۸۔۲۹) اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ سُوْق سَاقٌ کی جمع ہے جیسے لَابَۃٌ کی جمع لُوْبٌ اور فَارَۃٌ کی جمع فُوْرٌ آتی ہے اور اسی طرح آیت:
﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾ (۳۸۔۳۳)

پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

میں بھی سُوْق صیغہ جمع ہے اور رَجُلٌ اَسْوَقُ کے معنیٰ بڑی پنڈلیوں والے آدمی کے ہیں اس کی مؤنث سُوْقَاءُ آتی ہے اور سُوْقٌ کے معنیٰ بازار بھی آتے ہیں جہاں خرید و فروخت ہوتی ہے اور فروخت کے لئے وہاں سامان لے جایا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَسْوَاقٌ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَالِ هٰذَاالرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ﴾ (۲۵۔۷) یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

اَلسَّوِيْقُ کے معنیٰ ستو کے ہیں کیونکہ وہ بغیر چبائے حلق سے نیچے اتر جاتے ہیں۔

(س و ل)

اَلتَّسْوِيْلُ: کے معنیٰ نفس کے اس چیز کو مزین کرنا کے ہیں جس پر اسے حرص بھی ہو اور اس کے قبح کو خوشنما بنا کر پیش کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا﴾ (۱۲۔۸) بلکہ تم اپنے دل سے (یہ) بات بنالائے۔

﴿اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ﴾ (۴۷۔۲۵) شیطان نے (یہ کام) انہیں مزین کر دکھایا۔

بعض ادباء نے ❶

(۲٤۷) سَاَلَتْ هُذَيْلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاحِشَةً

(بنی ہذیل نے آنحضرت ﷺ سے ایک فحش امر کا مطالبہ کیا)

میں کہا ہے کہ یہاں سَاَلَتْ بمعنیٰ طَلَبَتْ ہے اور یہ سَأَلَ (مہموز) سے نہیں ہے جیسا کہ اکثر ادباء نے خیال کیا ہے۔

(س ی ل)

سَالَ الشَّيْءُ يَسِيْلُ کے معنیٰ کسی چیز کے بہنے کے ہیں۔ اور اَسَلْنَا کے معنیٰ بہا دینے کے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ﴾ (۳۴۔۱۲) اور ان کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔

یہاں اَسَلْنَا کے معنیٰ پگھلا دینے کے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت اِسَالَةٌ کا لفظ قطر کی اس حالت پر بولا جاتا ہے جو پگھلانے کے بعد ہوتی ہے۔

اَلسَّيْلُ: (ض) یہ اصل میں سَالَ يَسِيْلُ کا مصدر ہے جس کے معنیٰ بہنے کے ہیں اور بطور اسم اس پانی پر بولا جاتا ہے جو دور سے بہہ کر کسی جگہ پر آ جائے اور وہاں برسا نہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر (برساتی) نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔

﴿سَيْلَ الْعَرِمِ.........﴾ (۳۴۔۱۶) زور کا سیلاب۔

اَلسَّيْلَانُ: (دنبالۂ شمشیر و کارد وغیرہ) اس لمبے لوہے کو کہتے ہیں جو نصاب کی جانب سے تلوار، چھری وغیرہ کے

---

❶ قاله حسان بن ثابت الانصاری وتمامه : ضلت هذيل بماجائت ولم تصب والبيت فی ديوانه ٣٤ والكتاب (٢ : ٣٠) وقال اصله مهموز۔ وزكر المولف فی محاضراته (٣ : ٢٥٩) ان اباكبير الهذلی جاء الی رسول الله صلی الله عليه وسلم فسأله ان يحل الزنا فقال اتحب ان يوتی اليك فی حرمك مثل ذالك قال لاثم قال فادع الله ان يذهب منی الشبق فدعا له فقال حسان...... وانظر للقصة ايضاً اسد الغابة (٥ : ٢٨٢) ذكر ابو كبير الهذلی وبعده اشعار.

دستہ میں لگا ہوتا ہے۔

(س ء ل)

اَلسُّؤَالُ کے معنیٰ کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کے ہیں جو مؤدی الی المعرفۃ ہو۔ نیز مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کو بھی سُؤَالٌ کہا جاتا ہے جو مؤدی المال ہو پھر کسی چیز کی معرفت کی استدعا کا جواب اصل میں تو زبان سے دیا جاتا ہے لیکن کتابت یا اشارہ اس کا قائم مقام بن سکتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب اصل میں تو ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن زبان سے وعدہ یا انکار اس کے قائم مقام بن سکتا ہے پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سوال کے معنیٰ استدعا معرفت کیسے صحیح ہو سکتے ہیں جب کہ یہ ثابت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے سوال کرے گا۔

جیسے فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ﴾ (۵۔۱۱۶) اور (اس وقت) کو بھی یاد رکھو۔ جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے سوال کرنا کسی قسم کی معرفت حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ تو علام الغیوب ہے۔ (وَلَا تَخْفٰى عَلَيْهِ خَافِيَةٌ) بلکہ لوگوں کو بتلانے اور انہیں سرزنش کرنے کی غرض سے ہوگا لیکن پھر بھی یہ سوال سوال عن المعرفۃ، کبھی کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور کبھی محض سرزنش کے لئے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ﴾ (۸۱۔۸) جب لڑکی سے جو زندہ دفنائی گئی ہے پوچھا جائے گا۔

اور کبھی صرف مسؤل (جس سے سوال کیا جائے) کو جتلانے کے لئے (نہ کہ خود کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے)

اور سوال جب کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مفعول ثانی کی طرف کبھی تو وہ متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے اور کبھی حرف جار کے ذریعہ چنانچہ تم کہو گے: سَأَلْتُهٗ كَذَا وَسَاَلْتُهٗ عَنْ كَذَا وَبِكَذَا: لیکن زیادہ تر بواسطۂ عن کے متعدی ہوتا ہے جیسے کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ (۱۷۔۸۵) اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ﴾ (۱۸۔۸۳) اور تم سے ذی القرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ﴾ (۸۔۱) (اے محمد ﷺ! مجاہد لوگ) تم سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

اور فرمایا:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ﴾ (۲۔۱۸۲) اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں۔

﴿سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ﴾ (۷۰۔۱) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا جو نازل ہو کر رہے گا۔

اور جب سوال طلب مال کے لئے ہو تو وہ متعدی بنفسہٖ بھی ہوتا ہے۔اور بذریعہ "مِنْ" کے بھی چنانچہ فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ (۳۳۔۵۳) اور جب پیغمبروں کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔

﴿وَاسْأَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا﴾ (۶۰۔۱۰) اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہو تم ان سے طلب کرو۔اور جو کچھ انہوں نے (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کرلیں۔

﴿وَاسْأَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴۔۳۲) اور خدا سے اس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو۔

فقیر کو بھی جب وہ کسی چیز کی استدعا کرے تو اسے سائل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (۹۳۔۱۰) اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

﴿لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمُ﴾ (۵۱۔۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے والے۔

(س و م)

اَلسَّوْمُ: کے معنیٰ کسی چیز کی طلب میں جانے کے ہیں پس اس کا مفہوم دو اجزاء سے مرکب ہے یعنی طلب اور جانا پھر کبھی صرف ذہاب یعنی چلے جانا کے معنیٰ ہوتے ہیں۔جیسے سَامَتِ الْاِبِلُ: اونٹ چراگاہ میں چرنے کے لئے چلے گئے۔اور ان اونٹوں کو جو باہر چرنے کے لئے جاتے ہیں سَائِمَةٌ کہا جاتا ہے اور کبھی صرف طلب کے معنیٰ پائے جاتے ہیں جیسے سُمْتُ كَذَا: میں نے اسے فلاں تکلیف دی چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ (۲۔۴۹) وہ لوگ تم کو بڑا دکھ دیتے ہیں۔اور سِيْمَ فُلَانٌ الْخَسَفَ (فلاں کو خسف کا عذاب دیا گیا) يَا هُوَ يُسَامُ الْخَسْفَ کا محاورہ بھی اسی سے ماخوذ ہے اور اسی سے بَيعَ میں السَّوْمُ ہے جس کے معنیٰ نرخ کرنا کے ہیں چنانچہ کہا گیا ہے۔ ❶

(۱۸۶) صَاحِبُ السِّلْعَةِ اَحَقُّ بِالسَّوْمِ: سامان کا مالک نرخ کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔

اور سُمْتُ الْاِبِلَ فِي الْمَرْعٰى کے معنیٰ چراگاہ میں چرنے کے لئے اونٹ بھیجنے کے ہیں۔اور اسی معنیٰ میں اَسَمْتُ الْاِبِلَ (افعال) وَسَوَّمْتُهَا (تفعیل) آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۰) اور اس سے درخت بھی (شاداب) ہوتے ہیں جن میں تم اپنے چارپایوں کو چراتے ہو۔

اَلسِّيْمَاءُ وَالسِّيْمِيَاءُ کے معنیٰ علامت کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الطّویل)

---

❶ البخاری فی ترجمة الباب۔

❷ فی اللسان (سوم) قاله ابن عنقاء الفزاری فی عمیلة الفزاری واوله :غلام رماه الله بالخیر بافعاً...... وفی روایة ابن الانباری بالحسن بدل الخیر وانظر الخبر والشعرفی الحماسة (۴ : ۶۸ط مصر) والمرزوقی ۱۵۸۸والحصری (۴ : ۱۰۴) والکامل (۱ : ۲۲) والاغانی (۱۷ : ۱۱۷) والطُبری (۳ : ۹۸/۴ : ۸۴/۸ : ۱۹۶) وشواهد الکشاف ۵۲ وابن ولاد ۶۲ والبحر (۲ : ۳۱۶/ ۸ : ۱۰۲) والمعجم للمرزبانی (۱۹۹) فی خمسة ابیات والموتلف للآمدی ۲۳۸ وبعده کان الثریاعلقت فی جبینه وفی انفه الشعری وفی جیدها القمر وفی روایة فوق نحره وعنقاء امه واسمه قیس بن بجیره الفزاری المخضرمی والبیت الثانی قاله علی بن طلحة حین قال فیه قوم راجع العقد (۴ : ۳۲۲).

(۲۴۸) لَهٗ سِيمِيَاءُ لَا تَشُقُّ عَلَى الْبَصَرِ
اس کے چہرے پر نشان ہے جو آنکھوں پر گراں نہیں گزرتا
قرآن پاک میں ہے:
﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ (۴۸۔۲۹) (کثرت سجود کے اثر سے) ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔
اور سَوَّمْتُهٗ کے معنیٰ نشان زدہ کرنے کے ہیں۔
اور ﴿مُسَوِّمِيْنَ﴾ (۳۔۱۲۵) کے معنیٰ مُعَلِّمِيْنَ کے ہیں یعنی نشان زدہ اور مُسَوِّمِيْنَ (بصیغہ فاعل) کے معنیٰ ہیں: اپنے آپ پر یا اپنے گھوڑوں پر نشان امتیاز بنانے والے یا ان کو چھوڑنے والے۔
آنحضرت ﷺ سے ایک روایت میں ہے [1]:
(۱۸۷) تَسَوَّمُوْا فَاِنَّ الْمَلَآئِكَةَ قَدْ تَسَوَّمَتْ
کہ تم بھی نشان بنا لو کیونکہ فرشتوں نے اپنے لئے نشان بنائے ہوئے ہیں۔

(س ء م)

اَلسَّآمَةُ: اس کے معنیٰ کسی چیز کے زیادہ عرصہ تک رہنے کی وجہ سے اس سے کبیدہ خاطر یا دل برداشتہ ہوجانے کے ہیں اور یہ فعلاً (کسی کام کو زیادہ عرصہ تک کرنے) اور انفعالاً (کسی چیز سے زیادہ متاثر ہونے) دونوں طرح ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ﴾ (۴۱۔۴۹) اور (کبھی) تھکتے ہی نہیں۔
نیز فرمایا:
﴿لَا يَسْأَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ﴾ (۴۱۔۴۹) انسان بھلائی کی دعائیں کرتا کرتا تو تھکتا نہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ [2] (الطّویل)
(۲۴۹) سَئِمْتُ تَكَالِيْفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَّعِشْ
ثَمَانِيْنَ حَوْلًا لَا اَبَا لَكَ يَسْأَمِ
میں زندگی کی خوشگواریوں سے اکتا چکا ہوں۔ ہاں جو شخص اسّی کو پہنچ جائے وہ لامحالہ اکتا ہی جاتا ہے۔

(س ی ن)

طُوْرِ سَيْنَاءَ: یہ مشہور پہاڑ کا نام ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ﴾ (۲۳۔۲۰) (اور وہ درخت بھی ہم ہی نے پیدا کیا) جو طور سیناء میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ حرف اول یعنی سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ فتح کی صورت میں قطعی طور پر الف ممدودہ برائے تانیث ہوگا کیونکہ عربی زبان میں فَعْلَالٌ کا وزن صرف کلمہ مضاعف کے ساتھ مختص ہے جیسے زَلْزَالٌ وَقَلْقَالٌ اور سین کے مکسور ہونے کی صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا الف عِلْبَاءَ اور حِرْبَاءُ کی طرح (برائے تانیث) ہو اور یہ بھی صحیح ہے کہ الف سِرْوَاحٌ کے ساتھ ملحق کرنے کے لئے ہو اور اسی کو (دوسری جگہ) ﴿طُوْرِ سِيْنِيْنَ﴾ (۹۵۔۲) بھی کہا گیا ہے۔
اَلسِّيْنُ: حروف ہجاء میں سے ایک حرف کا نام ہے۔

---

[1] اخرجه الطبری عن عمیر بن اسحاق (٤: ٨٢) وفی النهاية (سوم) سوّموا فان الملائكة قد سومت ١٢.

[2] قاله زهير بن ابی سلمیٰ والبيت فی مختار الشعر الجاهلی (١: ١٥٧) والبحر (٢: ٣٥١) والمحاضرات (٤: ٤٩٨) والجمهرة ١١٠ والعقد الثمين ٩٦ وايام العرب ٢٧٦ والجامع الكبير للجزری ١٢٠ والمعلقات لابن الانباری ٢٨٧ وفی روايته عاماً بدل حولا وابن الشجری (١: ٣٦٢) والسيوطی ١٣٢.

(س و ی)

اَلْمُسَاوَاۃُ کے معنی وزن، کیل یا مساحت کے لحاظ سے دو چیزوں کے ایک دوسرے کے برابر ہونے کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے:

هٰذَا الثَّوْبُ مُسَاوٍ لِّذَاكَ الثَّوْبِ یہ کپڑا اس کپڑے کے مساوی ہے۔ هٰذَا الدِّرْهَمُ مُسَاوٍ لِّذَالِكَ الدِّرْهَمِ: یہ درہم اس درہم کے مساوی ہے اور کبھی لحاظ کیفیت کے برابری ہونے پر بولا جاتا ہے جیسے: هٰذَا السَّوَادُ مُسَاوٍ لِّذَالِكَ السَّوَادِ کہ یہ سیاہی اُس سیاہی کے برابر ہے مگر اصل میں یہاں مساوات بلحاظ ذات سواد کے مراد نہیں ہوتی بلکہ بلحاظ محل کے ہوتی ہے اور معنیٰ معادلت (برابر) کے لحاظ سے یہ لفظ یوں عدل وانصاف کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الطّویل)

(۲۵۰) اَبَيْنَا فَلَا نُعْطِى السَّوَاءَ عَدُوَّنَا

ہم انکار کردیتے ہیں اور اپنے دشمن کو عدل وانصاف نہیں دیتے۔ اِسْتَوٰی: اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے ایک یہ کہ ایک دو یا دو سے زیادہ فاعل کی طرف اس کی اسناد ہو جیسے: اِسْتَوٰی زَيْدٌ وَعَمْرٌو فِي كَذَا کہ زید اور عمر وفلاں چیز میں برابر ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۹-۱۹) یہ لوگ خدا کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔

دوم: یہ کسی چیز کے اپنی ذات کے اعتبار سے حالت اعتدال پر ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰى﴾ (۵۳-۶) (یعنی جبرائیل علیہ السلام) طاقتور نے۔ پھر وہ پورے نظر آئے۔

﴿فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ﴾ (۲۳-۲۸) جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جاؤ۔

اور محاورہ ہے:

اِسْتَوٰى اَمْرُ فُلَانٍ کہ فلاں کا معاملہ ٹھیک اور صحیح ہوگیا اور جب عَلٰی کے ذریعہ متعدی ہو تو اس کے معنیٰ کسی چیز پر (چڑھنے، قرار پکڑنے اور) مستولی ہونا کے ہوتے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے:

اِسْتَوٰى فُلَانٌ عَلٰى عُمَالَتِهٖ فلاں نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ قرآن میں ہے:

﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ﴾ (۴۳-۱۳) تاکہ تم ان کی سواری کرو۔

﴿فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ (۴۸-۲۹) اور پھر وہ اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

اور اسی سے آیت:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (۲۰-۵) (خدائے) رحمٰن، جس نے عرش پر قرار پکڑا ہے اور بعض نے اس کے معنیٰ یہ کئے ہیں کہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں اس کے سامنے مساوی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ان کو درست بنانے سے سب اس کے ارادہ کے مطابق ٹھیک اور درست ہوگئی ہیں۔ جیسا کہ آیت:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ﴾ (۲-۲۹) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک (سات آسمان) بنادیا۔

میں ہے بعض نے آیت: ﴿اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾

---

[1] قاله عنترة وتمامه: قياماً باعضاد السراء المعطف والبيت فى مختار الشعر الجاهلى (۱: ۲۹) والعقد الثمين.

کے معنیٰ یہ بیان کئے ہیں کہ تمام چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف برابر ہے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ بنسبت دوسری چیز کے اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اجسام پر قیاس نہیں کر سکتے جو ایک جگہ موجود ہوتے ہیں اور دوسری جگہ نہیں ہوتے۔

اور جب یہ لفظ (اِسْتَوٰی) متعدی بإلٰی ہو تو اس کے معنیٰ کسی چیز تک بالذات یا بالتدبیر پہنچ جانے کے ہوتے ہیں اور آیت:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ﴾ (۴۱۔۱۱) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔

میں دوسرے معنیٰ مراد ہیں یعنی اَلْاِنْتِهَاءُ اِلَیْهَا بِالتَّدْبِیْرِ: یعنی تدبیر کرنا۔

اَلتَّسْوِیَةُ کے معنیٰ کسی چیز کو ہموار کرنے کے ہیں اور آیت:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ﴾ (۸۲۔۷) (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضاء کو ٹھیک کیا۔

میں سَوّٰىكَ سے مراد یہ ہے کہ انسان کی خلقت کو اپنی حکمت کے اقتضاء کے مطابق بنایا اور آیت: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا﴾ (۹۲۔۷) اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے قویٰ کو برابر بنایا۔

میں لفظ "هَا" سے ان قوائے نفسانیہ کی طرف اشارہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نفس کے لئے مُقَوِّم بنایا ہے چنانچہ فعل کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ بحث دوسرے مقام پر مذکور ہوچکی ہے کہ فعل کی نسبت جس طرح فاعلِ حقیقی کی طرف ہوتی ہے اسی طرح آلہ اور ان تمام چیزوں کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوتی ہے جن کا کہ وہ فعل محتاج ہوتا ہے۔ جیسے سَیْفٌ قَاطِعٌ (کہ یہاں فعل قطع کی نسبت تلوار کی طرف ہے جو آلہ قطع ہے) اور آیت کی یہ توجیہ جو ہم نے بیان کی ہے اس قول سے بہتر ہے جو مَا سَوّٰىهَا سے اللہ تعالیٰ مراد لیتے ہیں کیونکہ لفظ ما جنس کے لئے موضوع ہے اور سمع (یعنی کسی دلیل سمعی) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے حق میں استعمال ہوا ہو۔ لہٰذا اس سے ذات باری تعالیٰ مراد نہیں ہوسکتی۔ اور آیت:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى﴾ (۸۷۔۱،۲) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو جس نے (انسان کو) بنایا پھر اس کے اعضاء کو درست کیا۔

میں سَوّٰی فعل (بلا اختلاف) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اسی طرح آیت کریمہ:

﴿فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ﴾ (۱۵۔۲۹) جب اس کو (صورت انسانیہ میں) درست کرلوں اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔ اور اسی طرح دوسری آیت:

﴿رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا﴾ (۷۹۔۲۸) اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کردیا۔

میں بھی فعل تَسْوِیَة کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے اور آیت فَسَوّٰىهَا میں آسمان کا تسویہ اس کی بناوٹ اور تزیین دونوں کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ﴾ (۳۷۔۶) بے شک ہم ہی نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا۔ میں مذکور ہے۔

اَلسَّوِیُّ: اسے کہتے ہیں جو مقدار اور کیفیت دونوں کے

لحاظ سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا.........﴾ (۱۹۔۱۰) سالم تین رات اور دن.........
﴿مَنْ اَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ﴾ (۲۰۔۱۳۵) (دین کے) سیدھے راستے پر چلنے والے کون ہیں۔
اور رَجُلٌ سَوِيٌّ: اس مرد کو کہا جاتا ہے جس میں خلق وخلقت دونوں اعتبار سے اعتدال پایا جائے اور افراط وتفریط سے محفوظ ہو۔اور آیت:
﴿عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ.....﴾ (۷۵۔۴) ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی پور پور درست کردیں۔
میں تَسْوِيَةُ الْبَنَانِ سے مراد ہتھیلی کو اونٹ کے پاؤں کی طرح بنا دینا مراد ہے کہ اس کی انگلیاں نہ ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ تَسْوِيَةُ الْبَنَانِ سے تمام انگلیوں کو یکساں بنا کر بے کار کر دینا مراد ہے کیونکہ انگلیوں کے قدر وہیئت میں متفاوت ہونے کی حکمت ظاہر ہے کہ وہ اس صورت میں کسی چیز کے پکڑنے میں باہم تعاون کرتی ہیں اور اگر وہ سب برابر ہوتیں تو یہ تعاون ناممکن تھا اور آیت:
﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰىهَا﴾ (۹۲۔۱۴) تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا، سب کو (ہلاک کر کے) برابر کر دیا۔
میں سَوّٰىهَا سے ان کے شہروں کو برباد کر کے زمین کے ساتھ برابر کر دینا مراد ہے جیسا کہ فرمایا:
﴿وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ (۲۔۲۵۹) جو کہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہوئی تھیں۔
اور بعض نے فَسَوّٰىهَا کے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ ان کے شہروں کو ان پر برابر کر دیا جیسا کہ آیت:

﴿لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ﴾ (۴۔۴۲) کہ کاش ان کو زمین میں مدفون کر کے مٹی برابر کر دی جاتی۔
میں مذکور ہے اور یہ کفار کے اس قول کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت: ﴿وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾ (۷۸۔۴۰) اور کافر کہے گا: اے کاش! میں مٹی ہوتا۔ میں مذکور ہے۔
مَكَانٌ سُوًى وَسَوَاءٌ کے معنیٰ وسط کے ہیں۔اور سَوَاءٌ وَسِوًى وَسُوًى: اسے کہا جاتا ہے جس کی نسبت دونوں طرف مساوی ہوں اور یہ یعنی سَوَاءٌ وصف بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور ظرف بھی۔لیکن اصل میں یہ مصدر ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فِيْ سَوَاءِ الْجَحِيْمِ.....﴾ (۳۷۔۵۵) (تو اس کو) وسط دوزخ میں۔
﴿سَوَآءَ السَّبِيْلِ.....﴾ (۲۔۱۰۸) (تو وہ) سیدھے راستے سے۔
﴿فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ (۸۔۵۸) تو (ان کا عہد) انہی کی طرف پھینک دو اور برابر کا جواب دو۔
تو یہاں عَلٰى سَوَآءٍ سے عادلانہ حکم مراد ہے۔جیسے فرمایا:
﴿اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ (۳۔۱۴) (اے اہل کتاب!) جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ۔
اور آیات:
﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ (۲۔۶) انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے۔
﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ

لَهُمْ﴾ (۶۳۔۶) تم ان کے لئے مغفرت مانگو یا نہ مانگو ان کے حق میں برابر ہے۔
﴿سَوَاءٌ عَلَيْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا﴾ (۱۴۔۲۱) اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔
میں سَواءٌ سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں عدم نفع میں برابر ہیں۔ نیز فرمایا:
﴿سَوَاءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ﴾ (۲۲۔۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔
اور کبھی سِویً وَسَوآءٌ بمعنیٰ غیر (حرف استثناء) بھی آجاتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۵۱) فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا سِوىٰ هَامِدِ

جسم مردہ کے سوا ان میں کوئی شخص باقی نہ رہا۔
اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الطّویل)

(۲۵۲) وَمَا قَصَدَتْ مِنْ اَهْلِهَا لِسَوَائِكَا:

اور اس اونٹنی نے اس شہر کے اہل میں سے تیرے سوا کسی کا قصد نہیں کیا۔
وَعِنْدِيْ رَجُلٌ سِوَاكَ : تیرے علاوہ میرے پاس دوسرا آدمی ہے۔
اَلسِّيُّ: کے معنیٰ مساوی کے ہیں۔ جیسے عِدل بمعنیٰ مُعَادِلٌ اور قِتْلٌ بمعنیٰ مُقَاتِلٌ کے آجاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے:
سِيَّانِ زَيْدٌ وَعَمْرٌو زید اور عمرو دونوں برابر ہیں۔ اور سِيٌّ کی جمع اَسْوَاءٌ آتی ہے جیسے نِقْضٌ کی جمع اَنْقَاضٌ اور بہت سے ہم مرتبہ یا برابر کے لوگوں کے لئے قَوْمٌ اَسْوَاءٌ وَمُسْتَوُوْنَ کہا جاتا ہے۔
اَلْمُسَاوَاةُ: عرف میں ثمنی اشیاء کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جیسے هٰذَا الثَّوبُ يُسَاوِىْ كَذَا کہ اس کپڑے کی اتنی قیمت ہے اصل میں یہ سَاوَاهُ فِى الْقَدْرِ یا مرتبہ میں برابر ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿حَتّٰى اِذَا سَاوىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ﴾ (۱۸۔۹۶) جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان (کا حصہ) برابر کردیا۔

(س و ء)

اَلسُّوْءُ: ہر وہ چیز جو انسان کو غم میں مبتلا کردے اسے سوء کہا جاتا ہے خواہ وہ امور دنیوی کے قبیل سے ہو یا اخروی کے۔ اور عام اس سے کہ اس کا تعلق احوال نفسانیہ سے ہو یا بدنیہ سے یا ان امور خارجیہ سے ہو جن کا تعلق جاہ وجلال کے چلے جانے یا کسی قریبی رشتے دار یا دوست کے فوت ہوجانے سے ہوتا ہے اور آیت:
﴿بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ﴾ (۲۰۔۲۲) وہ کسی عیب کے بغیر (چمکتا دمکتا) نکلے گا۔
میں سوء سے مراد آفت یعنی بیماری ہے بعض نے سُوءٌ سے برص مراد لی ہے لیکن یہ منجملہ ان امراض کے ایک ہے

---

❶ لم اجده ویرجیٰ.
❷ البیت من قصیدة لاعشیٰ میمون مدح بها هوذة بن علی بن ثمامه رئیس الیمامة وصدره: تجانف عن جوالیمامة ناقتی وفی روایة اللسان والتاج (سوی) عدلت بدل قصدت وفی روایة ابن الشجری (۱: ۳۵) جل الیمامه بدل الیمامة وفی الخزانة (۳: ۳۹۹) عمدت بدل قصدرت والبیت ایضاً فی اللسان (جنف) وامالی ابن الشجری (۲: ۴۵, ۲۵۳) وشرح الدیوان لثعلب ۶۴ وابن ولاد ۶۲ والاشباه (۳: ۶۹) ودیوانه ۱۳۱ والکامل ۱۱۸ والبحر (۱: ۴۹۸) والصاحبی ۱۵۴ وشرح شواهد للشنتمری (۱: ۱۳) والکتاب (۱: ۲۰۳) والبلدان (جو) واضداد ابی الطیب ۳۵۸ وفیه تزاور بدل تجانف واضداد ابن الانباری وفی روایته عدلت بدل قصدت والبیت من شواهد النحاة علی ان لفظة سواء قد یکون اسماً بمعنیٰ غیر وفیه بحث ۱۲.

جو ہاتھ کو لگ جاتے ہیں اور (عذاب) اخروی کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۱۶:۲۷) ان کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔

اور ہر وہ چیز جو قبیح ہو اسے "سُوْآی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ لفظ "اَلْحُسْنٰی" کے مقابلہ میں آتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓاٰۗی﴾ (۳۰۔۱۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی انکا انجام بھی برا ہوا۔

جیسے اس کے مقابلہ میں فرمایا:

﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ﴾ (۱۰۔۲۶) جن لوگوں نے نیکو کاری کی ان کے لئے بھلائی ہے اور مزید برآں اور بھی۔

اور سَیِّئَۃٌ کے معنیٰ برائی کے ہیں اور یہ حَسَنَۃٌ کی ضد ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً﴾ (۲۔۸۱) ہاں! جو برے کام کرے۔

﴿لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبْلَ الْحَسَنَۃِ﴾ (۲۷۔۴۶) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لئے کیوں جلدی کرتے ہو۔

﴿یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ (۱۱۔۱۱۴) گناہوں کو دور کر دیتی ہے۔

﴿مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ﴾ (۴۔۷۹) (اے آدم زاد!) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔

﴿فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا﴾ (۱۶۔۳۴)

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ﴾ (۲۳۔۹۶) اور بری بات کے مقابلہ میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔

اور حدیث میں ہے۔[1] (۱۸۶)

((یَااَنَسُ اَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُهَا)) کہ انس برائی کے بعد نیکی کرو جو نیکی برائی کے اثر کو مٹا ڈالے گی۔

حَسَنَۃ اور سَیِّئَۃ دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو عقل اور شریعت دونوں کی رو سے بھلی یا بری ہو۔ چنانچہ اس معنیٰ کے لحاظ سے فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا﴾ (۶۔۱۶۱) جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔

دوسری حَسَنَۃ اور سَیِّئَۃ وہ ہے جو باعتبار طبیعت کے ہے یعنی وہ چیزیں جو طبیعت کو سبک یا گراں محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَۃُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَۃٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗ﴾ (۷۔۱۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر سختی پہنچتی تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفیقوں کی بدشگونی بتاتے۔

﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الْحَسَنَۃَ﴾ (۷۔۹۵) پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔

اور سَآءَ فِیْ کَذَا وَسُؤْتَنِیْ کہا جاتا ہے۔ اور اَسَأْتُ

---

[1] وفی روایۃ قالہ لابی ذروبعدہ وخالق الناس بخلق حسن وایضاً بمعاذ راجع ابن اللاثیر ج (۲ ص ٤٦٤)۔

اِلٰی فُلَان (بصلہ الیٰ) بولتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿سِیْئَتْ وُجُوْہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا......﴾ (۶۷۔۲۷) تو کافروں کے منہ برے ہوجائیں گے۔

﴿لِیَسُوْٓؤا وُجُوْھَکُمْ﴾ (۱۷۔۷) تاکہ تمہارے چہروں کو بگاڑیں......اور آیت:

﴿وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَبِہٖ﴾ (۴۔۱۲۳) جو شخص برے عمل کرے گا اسے (اسی طرح) کا بدلہ دیا جائے گا۔

میں سوء سے اعمال قبیحہ مراد ہیں۔اسی طرح آیت:

﴿زُیِّنَ لَھُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِھِمْ﴾ (۹۔۳۷) ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔

میں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں۔اور آیت:

﴿عَلَیْھِمْ دَآئِرَۃُ السَّوْءِ﴾ (۹۔۹۸) انہیں پر بری مصیبت (واقع) ہو۔

میں دَآئِرَۃُ السَّوْءِ: سے مراد ہر وہ چیز ہوسکتی ہے جو انجام کار غم کا موجب ہو اور آیت:

﴿وَسَآءَتْ مَصِیْرًا﴾ (۴۔۱۱۵) اور وہ بری جگہ ہے۔

﴿سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا﴾ (۲۵۔۶۶) (دوزخ) ٹھہرنے کی بری جگہ ہے۔میں بھی یہی معنیٰ مراد ہے۔

اور کبھی سَآءَ بِئْسَ کے قائم مقام ہوتا ہے۔یعنی معنیٰ ذم کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِھِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِیْنَ﴾ (۳۷۔۱۷۷) مگر جب وہ ان کے مکان میں آاترے گا۔تو جن کو ڈر سنایا گیا تھا ان کے لئے برا دن ہوگا۔﴿سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ﴾ (۵۔۶۶) ان کے عمل برے ہیں۔

﴿سَآءَ مَثَلاً......﴾ (۷۔۱۷۷) مثال بری ہے۔

اور آیت:

﴿سِیْئَتْ وُجُوْہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ (۶۷۔۲۷) (تو) کافروں کے منہ برے ہوجائیں گے۔

میں سِیْئَتْ کی نسبت وجوہ کی طرف کی گئی ہے کیونکہ حزن وسرور کا اثر ہمیشہ چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور آیت:

﴿سِیْٓءَ بِھِمْ وَضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا﴾ (۱۱۔۷۷) تو وہ (ان کے آنے سے) غمناک اور تنگدل ہوئے۔

یعنی ان مہمانوں کو وہ حالات پیش آئے جن کی وجہ سے اسے صدمہ لاحق ہوا اور فرمایا:

﴿لَھُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ﴾ (۱۳۔۱۸) ایسے لوگوں کا حساب بھی برا ہوگا۔

﴿وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ (۱۳۔۲۵) اور ان کے لئے گھر بھی برا ہے۔

اور کنایہ کے طور پر سَوْءَۃٌ کا لفظ عورت یا مرد کی شرمگاہ پر بھی بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَۃَ اَخِیْہِ﴾ (۵۔۳۱) اپنے بھائی کی لاش کو کیونکر چھپائے۔

﴿فَاُوَارِیَ سَوْءَۃَ اَخِیْ﴾ (۵۔۳۱) کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔

﴿یُوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ﴾ (۷۔۲۶) کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔

﴿بَدَتْ لَھُمَا سَوْاٰتُھُمَا﴾ (۷۔۲۲) تو ان کے ستر کی چیزیں کھل گئیں۔

﴿لِیُبْدِیَ لَھُمَا مَا وٗرِیَ عَنْھُمَا مِنْ سَوْاٰتِھِمَا﴾ (۷۔۲۰) تاکہ ان کے ستر کی چیزیں جو ان سے پوشیدہ تھیں کھول دے۔

❀❀❀

کتَابُ الشِّیْنِ

(ش ب ہ)

اَلشِّبْہُ وَالشَّبَہُ وَالشَّبِیْہُ کے اصل معنیٰ مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلاً لون اور طعم میں مماثل ہونا یا عدل وظلم میں اور دو چیزوں کا حسّی یا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو سکیں شُبْھَة کہلاتا ہے پس آیت کریمہ:

﴿وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا﴾ (۲۔۲۵) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔ میں مُتَشَابِھًا کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اور مزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔ بعض کے نزدیک کمال اور عمدگی میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿مُتَشَابِھًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِہٍ﴾ (۶۔۱۰۰) جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔

میں ایک قرأت مُتَشَابِھًا ہے مگر دونوں کے معنیٰ قریب قریب ایک ہی ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَہَ عَلَیْنَا﴾ (۲۔۷۰) کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ میں تَشَابَہَ فعل ماضی مذکر کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور تَشَابَہَ فعل مضارع مؤنث بھی جو اصل میں تَتَشَابَہُ ہے اور تاء شین میں مدغم ہے۔ اور آیت: ﴿تَشَابَھَتْ قُلُوْبُھُمْ﴾ (۲۔۱۱۸) ان لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

میں ان کے قلوب کا گمراہی اور جہالت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے۔ اور آیت:

﴿وَاُخَرُ مُتَشَابِھَاتٌ﴾ (۳۔۶) اور بعض متشابہ ہیں۔ میں مُتَشَابِھَاتٌ سے مراد وہ آیات ہیں جن کی لفظی یا معنوی مماثلت کی وجہ سے تفسیر بیان کرنا مشکل ہو۔ عام فقہاء کے نزدیک متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظاہری معنیٰ سے مقصود کا علم نہ ہو سکے۔

اصل میں آیات تین قسم پر ہیں۔

(۱) بعض علی الاطلاق محکم ہیں۔

(۲) بعض علی الاطلاق متشابہ ہیں۔

(۳) اور بعض من وجہ محکم اور من وجہ متشابہ ہیں۔

پھر متشابہات بھی تین قسم پر ہیں۔

متشابہ بلحاظ لفظ، متشابہ بلحاظ معنیٰ اور متشابہ بلحاظ لفظ و معنیٰ اور متشابہ بلحاظ لفظ پھر دو قسم پر ہے ایک وہ تشابہ جو الفاظ مفردہ میں ہوتا ہے۔ دوم وہ جو کلام مرکب میں پایا جاتا ہے۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت الفاظ کے ہوگا جیسے اَبٌّ وَیَزِفُّوْنَ کے دونوں غریب معنیٰ ہیں اور یا بوجہ لفظ کے مشترک ہونے کے، جیسے یَدٌ وَعَیْنٌ کہ یہ دونوں مختلف معانی کے لئے موضوع ہیں اور کلام مرکب میں تشابہ تین قسم پر ہے۔

بوجہ اختصار، جیسا کہ آیت: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا

تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ (۴۔۳) اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ (یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں...... ان سے نکاح کر لو۔

دوسرے بوجہ بسط کلام کے، جیسے فرمایا:

﴿لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ (۴۲۔۱۱) اس جیسی کوئی بھی چیز نہیں۔

کیونکہ اگر یہاں کاف نہ بڑھایا جاتا اور لَیْسَ مِثْلَهٗ شَیْءٌ کہا جاتا تو مطلب زیادہ صاف اور واضح ہو جاتا۔

تیسرے وہ اشتباہ جو ترتیب کلام میں تغیر کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت:

﴿اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَهٗ عِوَجًا قَیِّمًا﴾ (۱۸۔۱،۲) جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر اپنی کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں رکھی (بلکہ) سیدھی (اور سلیس اتاری)

یہ اصل ترتیب کے لحاظ سے قَیِّمًا وَّلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا تھا۔ نیز فرمایا:

﴿لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ......اِلٰی قوله...... لَوْ تَزَیَّلُوْا﴾ (۴۸۔۲۵) اور اگر ایسے مرد اور (عورتیں) نہ ہوتیں...... اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے۔

متشابہ بلحاظ معنیٰ جیسے صفات باری تعالیٰ اور احوال قیامت کہ یہ اوصاف نہ محسوس ہیں اور نہ محسوسات کی جنس سے ہیں اور جو چیز محسوس یا اس کی جنس سے نہ ہو اس کا تصور ہمارے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ اور متشابہ من حیث اللفظ والمعنیٰ کی پانچ قسمیں ہیں اول تشابہ بلحاظ کمیت کے مثلاً کسی حکم کے عام یا خاص ہونے کے متعلق شبہ پیدا ہو جائے چنانچہ فرمایا:

﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ﴾ (۹۔۵) تو مشرکوں کو...... قتل کر دو۔

دوم: بلحاظ کیفیت کے مثلاً کسی حکم کے واجب یا مندوب ہونے میں شک وشبہ پایا جاتا ہو چنانچہ فرمایا:

﴿فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ﴾ (۴۔۳) تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔

سوم: بلحاظ زمانہ کے یعنی کسی آیت کے ناسخ یا منسوخ ہونے میں تشابہ پایا جاتا ہو جیسے فرمایا:

﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (۳۔۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

چہارم: تشابہ بلحاظ مکان اور اسباب نزول کے جیسے فرمایا:

﴿لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ (۲۔۱۸۹) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ تم (احرام کی حالت) میں گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔ ﴿اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ﴾ (۹۔۳۷) مہینے کو پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔

تو ظاہر ہے کہ جو شخص ان کے رسم ورواج اور جاہلی عادات سے واقف نہ ہو وہ اس آیت کی تفسیر کو نہیں سمجھ سکتا۔

پنجم: وہ تشابہ جو کسی فعل کے صحت وفساد کی شروط کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز اور نکاح کی شروط نہ جاننے سے اشتباہ ہو جاتا ہے۔

الغرض تشابہ کے یہ چند اقسام ہیں جن کا تصور کر لینے سے معلوم ہو جائے گا کہ مفسرین نے تشابہ کی جتنی بھی تشریحات بیاں کی ہیں ان میں سے کوئی بھی مندرجہ بالا اقسام سے خارج نہیں ہے۔ مثلاً بعض کا قول ہے کہ الم

(حروف مقطعات) متشابہات سے ہے اور قتادہ نے کہا ہے کہ ناسخ محکم ہیں اور منسوخ متشابہ میں داخل ہیں اور الاصمّ کا قول ہے کہ جس آیت کی تفسیر متفق علیہ ہو وہ محکم اور جس کی تفسیر میں اختلاف ہو وہ متشابہ ہے پھر جملہ متشابہات تین قسم پر ہیں۔ایک وہ جن کا علم ہمارے لئے ناممکن ہے جیسے قیامت کا وقت اور دابۃ الارض کا خروج اور اس کی کیفیت وغیرہ۔دوم وہ جن کا علم ہمیں ہوسکتا ہے۔جیسے الفاظ غریبہ اور احکام مشکلہ۔سوم وہ جو ان دونوں کے بین بین ہیں۔جن کا علم صرف راسخین فی العلم کو ہی ہوسکتا ہے ہر ایک کے لئے ان تک رسائی ممکن نہیں۔اسی قسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا:(۱۸۷) ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ)) کہ اے اللہ! اسے دین میں سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما یہی دعا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی مروی ہے۔[1]

(۱۸۸) پس اس بحث کے پیش نظر رکھ لینے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ آیت کریمہ:

﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (۳۔۷) حالانکہ مراد، اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔میں اِلَّا اللّٰهُ پر بھی وقف صحیح ہے اور اَلرَّاسِخُوْنَ کے ساتھ ملا کر پڑھنا بھی جائز ہے اور ہر ایک یعنی وقف اور وصل کی ایک خاص وجہ ہے جو مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوسکتی ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِهًا﴾ (۳۹۔۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں) ملی جلی ہیں۔

میں مُتَشَابِهًا کے معنیٰ یہ ہیں کہ احکام حکمت اور استقامت نظم کے لحاظ سے قرآن مجید کی تمام آیات ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (۴۔۱۵۷) بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی۔

میں شُبِّهَ کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا شخص مسیح علیہ السلام کے مشابہ بنا دیا گیا تھا جسے انہوں نے مسیح سمجھ (کر قتل کر دیا تھا)

اَلشَّبَهُ: (پیتل) جواہر میں سے اسے کہا جاتا ہے جس کا رنگ سونے کے مشابہ ہوتا ہے۔

(ش ت ت)

اَلشَّتُّ کے معنیٰ قبیلہ کو متفرق کر دینے ہیں۔محاورہ ہے۔

شَتَّ جَمْعُهُمْ شَتًّا وَشَتَاتًا: ان کی جمعیت متفرق ہوگئی۔جَاءُوْا اَشْتَاتًا: وہ پراگندہ حالت میں آئے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ (۹۹۔۶) اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے۔

﴿مِنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی﴾ (۲۰۔۵۳) (یعنی انواع

---

[1] واما دعاءه صلى الله عليه وسلم لابن عباس فمعروف (متفق عليه) من حديث ابن عباس دون قوله "وعلمه التاويل" فانه اخرجه بهذه الزيادة احمد و ابن حبان و الحاكم وصححه (تخريج العراقى على الاحياء (۳: ۲۴) وفى رواية الترمذى لابن عباس: اللهم علمه الحكمة (۳: ۲۲۲) مع التحفة ۱۲.

واقسام) کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔
﴿وَقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى﴾ (۵۹۔۱۴) (مگر) ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔
یعنی ان کی حالت مسلمانوں کی حالت کے برعکس ہے جن کے متعلق فرمایا:
﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ﴾ (۸۔۶۳) مگر خدا ہی نے ان میں الفت ڈال دی۔
شَتَّانَ: یہ اسم فعل بروزن وَشْكَانَ ہے۔ محاورہ ہے۔ شَتَّانَ مَا هُمَا وَشَتَّانَ مَا بَيْنَهُمَا ان دونوں میں کس قدر بُعد اور تفاوت ہے۔

(ش ت و)

قرآن مجید میں ہے:
﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ (۱۰۶۔۲) (یعنی) ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب۔ اور شَتّٰى اور اَشْتٰى کے معنیٰ کسی جگہ موسم سرما گزارنے یا موسم سرما میں داخل ہونے کے ہیں۔ جیسے صَافَ وَاَصَافَ کے معنیٰ موسم گرما گزارنے یا موسم گرما میں داخل ہونے کے ہوتے ہیں۔
اَلْمَشْتٰى وَالْمَشْتَا (جاڑے کا زمانہ) اسم ظرف ہے اور کبھی مصدر بن کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:[1]
(۲۵۳) نَحْنُ فِي الْمَشْتَاةِ نَدْعُوا الْجَفَلٰى
ہم موسم سرما یعنی قحط سالی میں دعوت عام دیتے ہیں۔

(ش ج ر)

اَلشَّجَرُ: (درخت) وہ نبات جس کا تنہ ہو۔ واحد شَجَرَةٌ جیسے ثَمَرٌ و ثَمَرَةٌ۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (۴۸۔۱۸) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔
﴿ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا﴾ (۵۶۔۷۲) کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا۔
﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾ (۵۵۔۶) اور بوٹیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔
﴿مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ﴾ (۵۶۔۵۲) تھوہر کے درخت سے۔
﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ﴾ (۴۴۔۴۳) بلاشبہ تھوہر کا درخت۔
وَادٍ شَجِيْرٌ: گنجان درختوں والی وادی۔ بہت درختوں والی جگہ۔
هٰذَا الْوَادِيْ اَشْجَرُ مِنْ ذَالِكَ: اس وادی میں اس سے زیادہ درخت ہیں۔
اَلشِّجَارُ وَالْمُشَاجَرَةُ وَالتَّشَاجُرُ: باہم جھگڑنا اور اختلاف کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (۴۔۶۵) اپنے تنازعات میں۔
شَجَرَنِيْ عَنْهُ: مجھے اس سے جھگڑا کر کے دور ہٹا دیا یا روک دیا۔ حدیث میں ہے۔[2] (۱۸۹) فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهٗ: اگر تنازع ہو جائے تو جس عورت کا ولی نہ ہو بادشاہ اس کا ولی ہے۔

---

[1] قاله عنترة وتمامه: لاترى الآدب فيها ينتقر والبيت في الكامل (۲: ۷۷۸) وديوانه ٦٨ واللسان (جفل، نقر، ادب) والاقتضاب ٣٤٦ والبخلاء ٣١٦ واصلاح يعقوب ٣٨١ والمرتضىٰ في اماليه (١: ٣٥٤) ومختار الشعر الجاهلي (١: ٢٤٤) وابن دلاو ١٢ وتهذيب الالفاظ (٦١٤ رقم ٤٩٠) والعقد الثمين ٦٢ والمعاني للقتبي ٣٧٧.

[2] اخرجه ابن حبان في زوائدة من حديث عائشة رقم ٢٤٧ وفي الدار قطني عنها بلفظة: فان اشتجروا بدل تشاجروا (راجع النيل (٦: ١٢٤۔١٢٥)

اَلشِّجَارُ: ہودہ کی لکڑی، چھوٹی پالکی۔
اَلْمِشْجَرُ: لکڑی کا اسٹینڈ جس پر کپڑے رکھے یا پھیلائے جاتے ہیں۔
شَجَرَهٗ بِالرُّمْحِ: اسے نیزہ مارا یعنی نیزہ مار کر اسی میں چھوڑ دیا۔

(ش ح ح)

اَلشُّحُّ: (اسم) کے معنیٰ حرص کے ساتھ بخل کے ہیں جو انسان کی عادت میں داخل ہو چکا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (۴۔۱۲۸) اور طبائع تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔
﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ﴾ (۵۹۔۹) اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا۔
رَجُلٌ شَحِيْحٌ: بخیل آدمی۔ قَوْمٌ اَشِحَّةٌ: بخیل لوگ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ﴾ (۳۳۔۹) مال میں بخل کریں۔
﴿اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ﴾ (۳۳۔۱۹) (یہ اس لئے کہ) تمہارے بارے میں بخل کرتے ہیں۔
خَطِيْبٌ شَحِيْحٌ: خوش بیان اور بلیغ لیکچرار یہ شَحْشَحَ الْبَعِيْرُ فِىْ هَدِيْرِهٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ اونٹ کے مستی میں آواز کو پھرانے کے ہیں۔

(ش ح م)

اَلشَّحْمُ: (چربی ج شُحُوْمٌ) قرآن مجید میں ہے:
﴿حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا......﴾ (۶۔۱۴۷) انکی چربی حرام کر دی تھی۔

شَحْمَةُ الْاُذُنِ: کان کا نرم حصہ جس میں بالیاں پہنی جاتی ہیں۔ یہ نرم ہونے کے لحاظ سے چونکہ چربی جیسا ہوتا ہے اس لئے اسے شَحْمَة کہا جاتا ہے اور شَحْمَةُ الْاَرْضِ: (کیچوا) گرگٹ کی قسم کا ایک جانور، جو زمین یا ریت میں گھس کر رہتا ہے۔
رَجُلٌ مُشْحِمٌ: گھر میں بہت زیادہ چربی رکھنے والا۔
شَحِمٌ: چربی کھانے کا حریص۔ لیکن جو اپنے دوستوں کو بہت چربی کھلانے والا ہو اسے شَاحِمٌ کہا جاتا ہے۔ اور شَحِيْمٌ کے معنیٰ موٹے تازے اور چربی دار کے ہیں۔

(ش ح ن)

اَلشَّحْنُ: کشتی یا جہاز میں سامان لادنا، بھرنا۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ (۲۶۔۱۱۹) بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے۔
اَلشَّحْنَاءُ: کینہ وعداوت جس سے نفس پُر اور بھرا ہوا ہو۔
عَدُوٌّ مُشَاحِنٌ: بہت سخت دشمن گویا وہ دشمنی سے پُر ہے۔
اَشْحَنَ لِلْبُكَاءِ: غم سے بھر کر رونے کے لئے آمادہ ہونا۔

(ش خ ص)

(اَلشَّخْصُ) کھڑے انسان کا جسم جو دور سے نظر آئے اسے شَخْصٌ کہا جاتا ہے اور شَخَصَ مِنْ بَلَدِهٖ کے معنیٰ شہر سے چلے جانا کے ہیں۔ شَخَصَ بَصَرُهٗ: اس کی آنکھ پتھرا گئی۔ شَخَصَ سَهْمُهٗ: تیر نشانے سے اونچا نکل گیا۔ اور اَشْخَصَ (افعال) اس نے نشانے سے اونچا نکال دیا۔ قرآن مجید میں ہے:
﴿تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ﴾ (۱۴۔۴۲) جب کہ

(دہشت کے سبب) آنکھ کھلی کی کھلی رہ جائے گی۔

﴿شَاخِصَةٌ اَبْصَارُالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۲۱-۹۷) کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

(ش د د)

اَلشَّدُّ یہ شَدَدْتُ الشَّیْءَ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنیٰ مضبوط گرہ لگانے کے ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

﴿وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ﴾ (۷۶-۲۸) اوران کے مفاصل کو مضبوط بنایا۔

﴿شُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ (۴۷-۲۸) ان کی مضبوطی سے قید کرلو۔

اور شِدَّةٌ کا لفظ عہد، بدن، قوائے نفس اور عذاب، سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ (۵-۴۴) وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے۔

﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى﴾ (۵۳-۵) ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا۔

نہایت قوت والے سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔

﴿غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ (۶۶-۶) تند خو اور سخت مزاج (فرشتے)

﴿بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ﴾ (۵۹-۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔

اَلشَّدِيْدُ وَالْمُتَشَدِّدُ: بخیل۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ (۱۰۰-۸) اور وہ تو مال کی سخت محبت والے ہیں۔

یہاں شَدِيْدٌ بمعنیٰ مفعول بھی ہوسکتا ہے۔گویا وہ خرچ کرنے سے باندھ دیا گیا ہے کہ اس معنیٰ میں غُلٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ (۵-۶۴) یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہی کے ہاتھ باندھے جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شَدِيْدٌ بمعنیٰ فاعل کے ہو تو گویا مُتَشَدِّدٌ وہ ہے جس نے تھیلی کو (بوجہ بخل کے) مضبوطی سے باندھ رکھا ہوا۔اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ (۴۶-۱۵) یہاں تک کہ جب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ جب انسان اس عمر یعنی چالیس (برس کو پہنچ جاتا ہے) جس میں اس کے قویٰ مضبوط ہو جاتے ہیں تو اس کی عادات پختہ ہوجاتی ہیں اور وہ انہیں ترک نہیں کر سکتا شاعر نے کیا ہی خوب اشارہ کیا ہے۔[1] (۲۵۴،۵۵)

وَاِذَا الْمَرْءُ وَافِي الْاَرْبَعِيْنَ وَلَمْ يَكُنْ
لَهٗ دُوْنَ مَا يَهْوٰى حَيَاءٌ وَلَا سَتْرٌ
فَدَعْهُ وَ لَا تَنْفِسْ عَلَيْهِ الَّذِيْ مَضٰى
وَاِنْ جَرَّ اَسْبَابَ الْحَيَاةِ لَهُ الْعُمُرُ

[1] فی سبعة ابیات نسبها القالی ۱۷۷ الی ایمن بن خریم بن فاتك الاسدی قال البکری ۲٦۱ والصحیح انها لاقیشر مغیرة بن اسود من بنی اسدبن خزیمة وفی الوحشیات ۲۷۷ منسوبة لاعرابی نزل بیحیٰ بن حبریل۔یقال من لم یرو هذه الابیات فلامروئة له انظر لتخریجه السمط ۲٦۱ والشعراء ٥٤٤ (تحقیق احمد شاکر) وفی روایة الوحشیات (الحماسة الصغریٰ) وفی بدل وافی ویاتی بدل یهوی واتی بدل مضی والدهر بدل العمروالبیت فی الروح آلوس (۱۷-٦۲).

جب انسان چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور اسے اس کی خواہش سے حیا کا پردہ مانع نہ ہو تو اسے اس کی حالت پر چھوڑ دے اور گزشتہ پر کسی قسم کا دریغ نہ کر اگرچہ عمر اس کے لئے زندگی کے تمام اسباب کھینچ کر کیوں نہ لے آئے۔

شَدَّ فُلَانٌ وَاشْتَدَّ: تیزی سے چلنا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ شَدَّ حِزَامَهٗ لِلْعَدْوِ کے محاورہ سے مشتق ہو جس کے معنیٰ دوڑنے کے لئے کمر بستہ ہونے کے ہیں جیسا کہ اسی معنیٰ میں اَلْقیٰ ثِیَابَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اِشْتَدَّتِ الرِّیْحُ: کے محاورہ سے ماخوذ ہو جس کے معنیٰ زور کی ہوا چلنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ﴾ (۱۴۔۱۸) کہ اس پر زور کی ہوا چلے۔

(ش ر ر)

اَلشَّرُّ: وہ چیز ہے جس سے ہر ایک کراہت کرتا ہو۔ جیسا کہ خیر اسے کہتے ہیں جو ہر ایک کو مرغوب ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا﴾ (۱۹۔۷۵) کہ مکان کس کا برا ہے۔ ﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ﴾ (۸۔۲۲) کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے...... ہیں۔

شر کا اصل معنیٰ اور اس کے جملہ اقسام خیر کی بحث میں بیان ہو چکے ہیں۔

رَجُلٌ شَرِیْرٌ وَشِرِّیْرٌ: شریر آدمی وَقَوْمٌ اَشْرَارٌ: برے لوگ۔ اَشْرَرْتُهٗ: کسی کی طرف شر کی نسبت کرنا بعض نے کہا ہے کہ اَشْرَرْتُ کَذَا کے معنیٰ کسی چیز کو ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اور شاعر کے اس قول سے استدلال کیا ہے۔[1]

(۲۵۶) اِذَا قِيْلَ اَيُّ النَّاسِ شَرٌّ قَبِيْلَةٍ
اَشَرَّتْ كُلَيْبٌ بِالْاَكُفِّ الْاَصَابِعَا

جب یہ پوچھا جائے کہ کونسا قبیلہ سب سے برا ہے تو ہاتھ انگلیوں سے بنی کلیب کی طرف اشارہ کر دیتے مگر اس شعر کے علاوہ اس معنیٰ پر اگر اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہاں اَشَرَّتْ کے معنیٰ یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ہاتھ انگلیوں سے ان کی طرف شر کی نسبت کر دیتے ہیں۔

اَلشُّرُّ: (بضمہ الشین) شر مکروہ چیز۔ شَرَارُ النَّارِ: آگ کی چنگاری۔ آگ کی چنگاری کو شَرَارٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے بھی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ﴾ (۷۷۔۳۲) اس سے آگ کی (اتنی اتنی بڑی) چنگاریاں اڑتی ہیں جیسے محل۔

(ش ر ب)

اَلشُّرْبُ: کے معنیٰ پانی یا کسی اور مائع چیز کو نوش کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک نے اہل جنت کے متعلق فرمایا: ﴿وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ (۷۶۔۲۱) اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

---

[1] قاله الفرزوق فی هجو جریر ولفظه کلیب بالجر علی حذف الجار وابقاء عمله ویروی بالرفع علی تقدیر هذه کلیب ففی البیت حذف وقلب واصله: اشرت الاکف بالاصابع الی کلیب وفی روایة اشارت والبیت فی ابن عقیل رقم (۲۱۸) والخزانة (۳: ۶۶۹) ودیوانه ۵۲۰ والمغنی ۳ فی الخطبة والسیوطی ٤ والعینی (۲: ۵٤۲) وکلیب هی کلیب بن یربوع قبیلة جریری.

اور اہل دوزخ کے متعلق فرمایا:

﴿لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ.........﴾ (۶-۷۰) ان کے لئے پینے کو کھولتا ہوا پانی۔

شَرَابٌ کی جمع اَشْرِبَةٌ ہے اور شَرِبْتُهٗ شَرْبًا وَشُرْبًا کے معنیٰ پینے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي اِلٰى قَوْلِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ﴾ (۲-۲۴۹) جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے نہیں ہے چنانچہ انہوں نے اس سے پی لیا۔ نیز فرمایا:

﴿هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۲۶-۱۵۵) یہ اونٹنی ہے (ایک دن) اس کی پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری۔

﴿كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ﴾ (۵۴-۲۸) ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیے۔

اَلْمَشْرَبُ: (مصدر) پانی پینا (ظرف زمان یا مکان پانی پینے کی جگہ یا زمانہ) قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ (۲-۶۰) تمام لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر کے پانی پی لیا۔

اَلشَّرِيْبُ: ہم پیالہ یا شراب کو کہتے ہیں اور مونچھ کے بالوں اور حلق کے اندرونی رگ کو شَارِبٌ کہا جاتا ہے گویا ان کو پینے والا تصور کیا گیا ہے اس کی جمع شَوَارِبٌ آتی ہے۔ ھُذلی نے گورخر کے متعلق کہا ہے۔ ❶ (الکامل)

(۲۵۷) "صَخِبُ الشَّوَارِبِ لَا يَزَالُ كَاَنَّهٗ"

اس کی مونچھیں سخت گویا وہ..........

اور آیت کریمہ:

﴿وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ (۲-۹۳) اور ان (کے کفر کے سبب) بچھڑا (گویا) ان کے دلوں میں رچ گیا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَشْرَبْتُ الْبَعِيْرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ اونٹ کے گلے میں رسی باندھنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۵۸) وَاَشْرَبْتُهَا الْاَقْرَانَ حَتّٰى وَقَصْتُهَا
بِقُرْحٍ وَقَدْ اَلْقَيْنَ كُلَّ جَنِيْنٍ

میں نے انہیں باہم باندھ لیا حتیٰ کہ قُرح (منڈی) میں لا ڈالا اس حال میں کہ انہوں نے حمل گرا دیئے تھے۔ تو آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ گویا بچھڑا ان کے دلوں پر باندھ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے یہ معنیٰ بیان کئے ہیں کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی ہے کیونکہ عربی محاورہ میں جب کسی کی محبت یا بغض دل کے اندر سرایت کر جائے تو اس کے لئے لفظ شَرَابٌ کو بطور استعارہ بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ بدن میں نہایت تیزی سے سرایت کرتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❸ (الوافر)

---

❶ قاله ابو ذؤیب وتمامه : عبدالآل ابی ربیعة مسبع ـ والبیت فی اللسان (سبع) وقد مر.

❷ انشده فی هذا المعنیٰ ایضاً ثعلب والبیت لبعض بنی اسد من اللصوص انظر مجالس ثعلب (۳۱۱) واللسان (شرب) والبلدان والمحکم (قرح) فی اربعة ابیات مع خلاف فی الترتیب والقرح اسم سوق وادی القری وقصبتها والعائد زود الکلابی وقبله : لقد علمت ذو وا الکلابی اننی ینهن باجواز الفلاة مهین والذو واسم جماعة من الابل اذا کانت اناثا.

❸ قاله عبدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود احدالفقهاء السبعة فی المدینة فی زوجته عثمة وله فیها اشعار کثیرة والبیت فی الحماسة مع المرزوقی رقم (۵۵۰) ومجالس ثعلب ۲۸٤ وامالی المرتضیٰ (۱: ۲۱۷ـ۴۰۰) والقالی (۳: ۲۱۹) فی خمسة والاغانی (۸: ۹۳) والسمط (۷۸۱) والحماسة بالتبریزی (۳: ۱۶۷) والاصبهانی (۸ص ۹٤) والحصری (۱: ۲۱۲) فی ثلاثة اشعار ومجموعة المعانی (۱۶۲) وعزاه فی المحاضرات (۳: ٤٤) الی ابی عبدالله بن طاهر وقبله : شققت القلب ثم ذرأت فیه هواك فلیم فالتزام الفطور.

(۲۵۹) تـغلغل حَيْثُ لَمْ يَبْلغ شَرَابٌ
وَلا حُـــزْن وَلَـــمْ يَبْـلُـغْ شَـرُورٌ
اس کی محبت وہاں تک پہنچ گئی جہاں کہ نہ شراب اور نہ ہی حزن وسرور پہنچ سکتا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر زیادہ نہیں تھی تو ہم کہیں گے کیوں نہیں؟ عجل کا لفظ بول کر ان کی فرط محبت پر تنبیہ کی ہے کہ بچھڑے کی صورت ان کے دلوں میں اس طرح نقش ہوگئی تھی کہ محو نہیں ہوسکتی تھی مثل مشہور ہے۔اَشْـرَبْتَـنِـیْ مَالَمْ اَشْرَبْ: یعنی تو نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔

(ش ر ح)

شَـرَحْتُ اللَّحْمَ وَشَرَّحْتُهٗ کے معنیٰ گوشت (وغیرہ کے لمبے لمبے ٹکڑے کاٹ کر) پھیلانے کے ہیں اور اسی سے شرح صدر ہے یعنی نور الٰہی اور سکون واطمینان کی وجہ سے سینے میں وسعت پیدا ہوجانا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ﴾ (۲۰۔۲۵) (کہا) اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔

﴿اَلَـمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (۹۴۔۱۱) (اے محمدؐ) ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا؟

﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ﴾ (۳۹۔۲۲) بھلا جس کا سینہ اللہ نے ......کھول دیا ہو۔

شَـرْحُ الْمُشْكَلِ مِنَ الْكَلَامِ کے معنیٰ مشکل کلام کی تشریح کرنے اور اس کے مخفی معنیٰ کو ظاہر کرنے کے ہیں۔

(ش ر د)

شَـرَدَ الْبَعِیْرُ کے معنیٰ ہیں: اونٹ بدک کر بھاگ نکلا۔شَـرَّدْتَ فُـلَانًـا فِی الْبِـلَادِ میں نے شہروں میں بھگا دیا وَشَـــرَّدْتَ بِـهٖ: یعنی میں نے اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس جیسا کام نہ کریں جیسے: نَكَّلْتُ بِهٖ کہ میں نے اسے دوسروں کے لئے عبرت بنادیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَشَرِّدْبِهِـمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ﴾ (۸۔۵۷) تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہوں وہ ان کو دیکھ کر بھاگ جائیں۔

مشہور محاورہ ہے۔

فُـلَانٌ طَرِیْدٌ شَرِیْدٌ: فلاں راندہ درگاہ ہے۔

(ش ر ذ م)

اَلشِّرْذِمَةُ: تھوڑی سی جماعت جو لوگوں سے الگ ہوگئی ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿شِـرْذِمَةٌ قَـلِیْـلُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۵) یہ لوگ تھوڑی سی جماعت ہیں۔

یہ ثَـوْبٌ شَرَاذِمٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ پھٹے پرانے چیتھڑوں کے ہیں۔

(ش ر ط)

اَلشَّرْطُ: وہ معین حکم جس کا وقوع کسی دوسرے امر پر معلق ہو اسے شرط کہتے ہیں۔وہ دوسرا امر اس کے لئے بمنزلہ علامت کے ہوتا ہے اور شَـرِیْطٌ بمعنیٰ شرط آتا ہے

---

❶ واشراط الساعة بمعنیٰ العلامات او البیانات ثم الاشراط بمعنیٰ العلامات علی نوعین وھی التی لم تبق الدنیا بعد وقوعھا الا یسیر کخروج المھدی وظھور الدجال وخروج الدابة وطلوع الشمس من مغربھا وغیر ذالك وغیر مضیقة وھی اکثر الاشراط راجع الفخر والفت فیھا کتب مختصرة ومطولة ولسیوطی رسالة سماھا "الکشف" عن مجاوزة ھذہ الامة الالف وبحور الزاخرة فی علوم الآخرة للسفارینی .

اس کی جمع شرائط ہے۔ اِشْتَرَطْتُّ كَذَا: کوئی شرط لگانا۔ اور اسی سے شَـرَطٌ بمعنیٰ علامت ہے۔ اور اَشْـرَاطُ السَّاعَةِ کے معنیٰ علامت قیامت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَقَدْ جَاءَتْ اَشْـرَاطُهَا﴾ (۴۷۔۱۸) سو اس کی نشانیوں (وقوع میں) آ چکی ہیں۔

اور پولیس کو شُـرَط کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ بھی ایسی علامت لگا لیتے ہیں جس سے ان کی پہچان ہو سکتی ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اشراط الابل سے مشتق ہے جس کے معنیٰ رذیل اونٹوں کے ہیں۔ اور پولیس میں بھی چونکہ (عام طور پر) رذیل لوگ ہوتے تھے اس لئے انہیں شُرَطٌ کہہ دیا گیا ہے۔

اَشْـرَطَ نَفْسَهٗ لِلْهَلَكَةِ: اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یا کسی کام میں ہلاکت کی بازی لگانا۔

(ش ر ع)

اَلشَّـــرْعُ: سیدھا راستہ جو واضح ہو، یہ اصل میں شَـرَعْـتُ لَهٗ طَرِيْقًا: (واضح راستہ مقرر کرنا) کا مصدر ہے اور بطور اسم کے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ واضح راستہ کو شَرْعٌ وَشِرِيْعَةٌ کہا جاتا ہے پھر استعارہ کے طور پر الٰہیہ پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شِـرْعَةً وَّمِنْهَـاجًـا﴾ (۵۔۴۸) ایک دستور اور طریق۔ اس میں دو قسم کے راستوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک وہ راستہ جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مسخر کر رکھا ہے کہ انسان اسی راستہ پر چلتا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور شہروں کی آبادی سے ہے چنانچہ آیت:

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَـعْـضُـهُـمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ (۴۳۔۳۲) اور ہر ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تا کہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔

میں اسی طرف اشارہ ہے دوسرا راستہ دین کا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے مقرر فرما کر انہیں حکم دیا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس پر چلے جس کے بیان میں شرائع کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں نسخ ہوتا رہا ہے اور جس پر کہ آیت:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا﴾ (۴۵۔۱۸) پھر ہم نے تمہیں دین کے کھلے راستہ پر (قائم) کر دیا تو اسی (راستے) پر چلے چلو۔ دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ شِـرْعَةً وہ راستہ ہے جسے قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے۔ اور مِنْهَاج وہ ہے جسے سنت نے بیان کیا ہے اور آیت کریمہ:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ﴾ (۲۔۱۱۳) اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔

میں دین کے ان اصول کی طرف اشارہ ہے جو تمام ملل میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور ان میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ جیسے معرفت الٰہی اور وہ امور جن کا بیان آیت:

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ (۴۔۱۳۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اس کے پیغمبروں سے انکار کرے۔ میں پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شریعت کا لفظ شَـرِيْـعَةُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ پانی کے گھاٹ کے ہیں اور شریعت

کو شریعت اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی صحیح حقیقت پر مطلع ہونے سے سیرابی اور طہارت حاصل ہو جاتی ہے ۔ سیرابی سے مراد معرفت الٰہی کا حصول ہے جیسا کہ بعض حکماء کا قول ہے کہ میں پیتا رہا لیکن سیر نہ ہوا ۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی تو بغیر پینے کے سیری حاصل ہوگئی اور طہارت سے مراد وہ طہارت ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (۳۳۔۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کی میل کچیل صاف کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے، میں پایا جاتا ہے ۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا﴾ (۷۔۱۶۳) (یعنی) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں ۔

میں شُرَّعًا ، شَارِعٌ کی جمع ہے ۔ اور شَارِعَةُ الطَّرِيْقِ کی جمع شَوَارِعُ آتی ہے جس کے معنیٰ کھلی سڑک کے ہیں ۔

اَشْرَعْتُ الرُّمْحَ قِبَلَهٗ: میں نے اس کی جانب نیزہ سیدھا کیا ۔ بعض نے شَرَعْتُهٗ فَهُوَ مَشْرُوْعٌ کہا ہے اور شَرَعْتُ السَّفِيْنَةَ کے معنیٰ جہاز پر بادبان کھڑا کرنے کے ہیں جو اسے آگے چلاتے ہیں ۔ هُمْ فِيْ هٰذَا شِرْعٌ: یعنی وہ سب اس میں برابر ہیں ۔ یعنی انہوں نے اسے ایک ہی وقت میں شروع کیا ہے اور شَرْعُكَ مِنْ رَجُلٍ زَيْدٌ بمعنیٰ حَسْبُكَ ہے یعنی زید ہی اس قابل ہے کہ تم اس کا قصد کرو یا اس کے ساتھ مل کر اپنا کام شروع کرو ۔

اَلشِّرْعُ: بربط کے وہ تار جن سے راگ شروع کیا جاتا ہے ۔

(ش ر ق)

شَرَقَتْ (ن) شُرُوْقًا الشَّمْسُ: آفتاب طلوع ہوا ۔ مثل مشہور ہے (مثل)

لَا اَفْعَلُ ذَالِكَ مَا ذَرَّ شَارِقٌ وَاَشْرَقَتْ: جب تک آفتاب طلوع ہوتا رہے گا میں یہ کام نہیں کروں گا ۔ یعنی کبھی بھی نہیں کروں گا ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ﴾ (۳۸۔۱۸) صبح اور شام ۔ یہاں اشراق سے مراد وقتِ اشراق ہے ۔

اَلْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ: جب مفرد ہوں تو ان سے شرقی اور غربی جہت مراد ہوتی ہے اور جب تثنیہ ہوں تو موسم سرما اور گرما کے دو مشرق اور دو مغرب مراد ہوتے ہیں اور جمع کا صیغہ ہو تو ہر روز کا مشرق اور مغرب مراد ہوتا ہے یا ہر موسم کا ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (۷۳۔۹) وہی مشرق اور مغرب کا مالک (ہے)

﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ (۵۵۔۱۷) وہی دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک ہے ۔

﴿وَرَبُّ الْمَشَارِقِ﴾ (۳۷۔۵) اور مشرقوں کا رب ہے ۔

﴿مَكَانًا شَرْقِيًّا﴾ (۱۹۔۱۶) مشرق کی طرف (چلی گئی)

اَلْمِشْرَقَةُ: جاڑے کے زمانہ میں دھوپ میں بیٹھنے کی جگہ جہاں سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی دھوپ پڑتی ہو ۔

شَرَّقْتُ اللَّحْمَ: گوشت کے ٹکڑے کر کے دھوپ میں خشک کرنا ۔ اَلْمُشَرَّقَ: عیدگاہ کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں طلوع شمس کے بعد نماز ادا کی جاتی ہے ۔ شَرِقَتِ

اَلشَّمْسُ آفتاب کا غروب کے وقت زردی مائل ہونا اسی سے اَحْمَرُ شَارِقٌ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ نہایت سرخ کے ہیں۔

اَشْرَقَ الثَّوْبَ: کپڑے کو خالص گہرے رنگ کے ساتھ رنگنا۔

لَحْمٌ شَرِقٌ: سرخ گوشت جس میں بالکل چربی نہ ہو۔

(ش ر ک)

اَلشِّرْكَةُ وَالْمُشَارَكَةُ کے معنیٰ دوملکیتوں کو باہم ملا دینے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ ایک چیز میں دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے شریک ہونے کے ہیں۔خواہ وہ چیز مادی ہو یا معنوی، مثلاً انسان اور فرس کا حیوانیت میں شریک ہونا یا دو گھوڑوں کا سرخ یا سیاہ رنگ کا ہونا اور شَرِكْتُهُ وَشَارَكْتُهُ وَتَشَارَكُوْا اوراِشْتَرَكُوْا کے معنیٰ باہم شریک ہونے کے ہیں۔اور ﴿اَشْرِكْهُ فِيْ اَمْرِيْ﴾ (۲۰۔۳۲) اوراسے میرے کام میں شریک کر۔

اورحدیث میں ہے۔(۱۹۱)

((اَللّٰهُمَّ اَشْرِكْنَا فِيْ دُعَاءِ الصّٰلِحِيْنَ)) اے اللہ! ہمیں نیک لوگوں کی دعا میں شریک کر۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو فرمایا: (۱۹۲) ((اِنِّيْ شَرَّفْتُكَ وَفَضَّلْتُكَ عَلٰى جَمِيْعِ خَلْقِيْ وَاَشْرَكْتُكَ فِيْ اَمْرِيْ)) کہ میں نے تمہیں تمام مخلوق پر شرف بخشا اور تجھے اپنے کام میں شریک کر لیا۔یعنی میرے ذکر کے ساتھ تمہارا ذکر ہوتا رہے گا اور میں نے اپنی طاعت کے ساتھ تمہاری طاعت کا بھی حکم دیا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (۵۔۹۲) اور خدا کی فرمانبرداری اور رسول خدا کی اطاعت کرتے رہو۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَفِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ﴾ (۳۷۔۳۳) (اس دن) عذاب میں شریک ہوں گے۔

شَرِيْكٌ: ساجھی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ (۱۷۔۱۱۱) اور نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے۔

اس کی جمع شُرَكَآءُ ہے جیسے فرمایا:

﴿شُرَكَآءُ مُتَشَاكِسُوْنَ﴾ (۳۹۔۲۹) جس میں کئی آدمی شریک ہیں۔(مختلف المزاج) اور بدخو۔

﴿شُرَكَآءُ شَرَعُوْا لَهُمْ﴾ (۴۲:۲۱) کیا ان کے وہ شریک ہیں جنھوں نے ان کے لئے ایسا دین منفرد کیا ہے۔

﴿اَيْنَ شُرَكَآءِيَ﴾ (۴۱۔۴۷) میرے شریک کہاں ہیں۔دین میں شرک دو قسم پر ہے۔شریک عظیم یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا اور اَشْرَكَ فُلَانٌ بِاللّٰهِ کے معنیٰ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے ہیں اور یہ سب سے بڑا کفر ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ......﴾ (۴۔۱۱۶) خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔اور فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ (۴۔۱۱۵) اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ رستے سے دور جا پڑا۔

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ......﴾ (۵۔۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شریک

کرے گا خدا اس پر بہشت کو حرام کردے گا۔
﴿یٰٓاَیُّھَا۔۔۔ یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا﴾ (۶۰۔۱۲) اس بات پر بیعت کرنے آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ شرک کریں گے۔
﴿سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا﴾ (۶۔۱۴۹) جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔
دوم: شرک صغیر کہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرنا اسی کا دوسرا نام ریا اور نفاق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
﴿شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰھُمَا فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ﴾ (۷۔۱۹۰) تو اس (بچے) میں جو وہ ان کو دیتا ہے اس کا شریک مقرر کرتے ہیں جو وہ شرک کرتے ہیں خدا کا (رتبہ) اس سے بلند ہے۔
﴿وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ﴾ (۱۲۔۱۰۶) اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔
بعض نے اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ کے معنٰی یہ کئے ہیں کہ مگر وہ شَرَکٌ یعنی دنیا کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور اسی سے علیہ السلام نے فرمایا: [1] (۱۹۳) ((اَلشِّرْکُ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ۔۔۔۔۔۔)) یعنی اس امت میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہوگا پس لفظ شِرْکٌ الفاظ مشترکہ سے ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا﴾ (۱۸۔۱۱۰) پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔
میں دونوں قسم کا شرک مراد ہے اور آیت کریمہ:
﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ﴾ (۹۔۵) مشرکوں کو۔۔۔۔۔۔ قتل کردو۔ میں اکثر فقہاء نے تمام کفار مراد لئے ہیں۔ کیونکہ یہود بھی (اہل کتاب تھے) عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰہِ﴾ (۹۔۳۰) یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں۔
اور بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار مراد ہیں کیونکہ آیت:
﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصّٰبِئِیْنَ وَالنَّصٰرٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا﴾ (۲۲۔۱۷) جو لوگ مومن (یعنی مسلمان) ہیں اور جو یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک۔
میں مشرکین کو یہود ونصاریٰ سے الگ عطف کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب مشرکین سے خارج ہیں۔

(ش ر ی)

شِرَاءٌ اور بَیْعٌ دونوں لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ

---

[1] السلمان والنھایۃ (شرک) والحکیم عن ابن عباس وعائشۃ وعن ابی بکروحل عن ابی عباس وفی جمیع الروایات فی امتی بدل ھذہ الامۃ وفی روایۃ الذربدل النمل وفی تخریج العراقی (۳:۶۰۳) اتقوا ھذاالشرک فانہ اخفیٰ من دبیب النمل رواہ ابن حبان فی الضعفاء من حدیث ابی بکرالصدیق والطبرانی من حدیث ابی موسیٰ الاشعری ونزھۃ المجالس للصفوری ص ۷ راجع کنزالعمال ج ۳: رقم ۲۳۷۴، ۲۳۷۶، ۲۳۷۷، ۲۳۹۶).

مُشْتَرِیْ کے معنیٰ قیمت دے کر اس کے بدلے میں کوئی چیز لینے والے کے ہیں۔ اور بائع اسے کہتے ہیں جو چیز دے کر قیمت لے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک طرف سے نقدی اور دوسری طرف سے سامان ہو۔ لیکن جب خرید وفروخت جنس کے عوض جنس ہو۔ تو دونوں میں سے ہر ایک کو بائع اور مشتری تصور کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بیع اور شِراء کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر سَرَیْتُ بمعنیٰ بِعْتُ اور اِبْتَعْتُ بمعنیٰ اِشْتَرَیْتُ آتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ﴾ (۱۲۔۲۰) اور اس کو تھوڑی سے قیمت پر بیچ ڈالا۔

﴿يَشْرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ (۴۔۷۴) جو لوگ آخرت (کو خریدتے اور اس) کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں۔

پھر شِرَاءٌ اور اِشْتِرَاءٌ کا لفظ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے عوض میں دوسری چیز لی جائے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۷۷) جو لوگ خدا کے اقرار کو بیچ کر اس کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

﴿لَا يَشْتَرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۱۹۹) وہ خدا کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔

﴿اِشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ﴾ (۲۔۸۶) جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔

﴿اِشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ﴾ (۲۔۱۶) جنہوں نے گمراہی خریدی۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۱۱) خدا نے مومنوں سے.........خرید لئے ہیں۔

اور جس چیز کے بدلے اللہ تعالیٰ نے ان کی جانیں خرید کی ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ (یعنی خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوتے ہیں) اور خوارج اپنے آپ کو شُراۃ کے نام سے موسوم کرتے تھے اور آیت کریمہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۰۷) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہو۔ سے استدلال کرتے تھے کہ یہاں يَشْرِيْ بمعنیٰ يَبِيْعُ ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ش ط ط)

اَلشَّطَطُ: کے معنیٰ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے کے ہیں۔ جیسے شَطَّتِ الدَّارُ وَاَشَطَّ (گھر کا دور ہونا) اور یہ کسی مقام یا حکم یا نرخ میں حد مقررہ سے تجاوز کرنے پر بولا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔ [1] (البسیط)

(۲۶۰) شَطَّ الْمَزَارُ بِجَذْوٰى وَانْتَهَى الْاَمَلُ

یعنی حذوٰی (محبوبہ) کی زیارت مشکل ہوگئی اور ہر قسم کی

---

[1] وتمامه: فلاخيال ولاعهد ولاطلل وبعده الارجاء فماندرى أندركه ـ ام يستمرفياتى دونه الاحل والبيت من قصيدة لابن احمر مدح بها النعمان بن بشير بن سعد الانصارى وهو اول ولد فى الاسلام من الانصار وآخر من ولى الكوفة لمعاوية بن ابى سفيان قتلته بنو كلب فى فتنة مروان وكان عثمانيا وابو ه بشر بن سعد عقبى بدرى والشطرا فى الذيل ٨ والبيت فى التاج (شط) واللسان (جدا) واللالفاظ ۳۳۹ والسمط ۳ : ۷ وجدوىٰ اسم امرئة .

امیدیں منقطع ہوگئیں۔

اور کبھی شَطَطٌ بمعنیٰ جَوْر بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا﴾ (۱۸۔۱۴) تو ہم نے بعید از عقل بات کہی۔

شَطُّ النَّهْرِ: دریا کا کنارہ۔ جہاں سے پانی دور ہو۔

(ش ط ر)

شَطْرُ الشَّيءِ کے اصل معنیٰ نصف یا وسط شے کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۲۔۱۴۴) اور اپنا منہ مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کی طرف پھیر لو۔

یہاں شطر بمعنیٰ سمت ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ (۲۔۱۴۴) (نماز کے وقت) اس مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو۔

شَاطَرْتُهُ شِطَارًا: آدھا آدھا تقسیم کر لینا۔

شَطَرَ بَصَرَهُ: اس طرح دیکھنا کہ تمہاری طرف بھی نظر رہے اور دوسرے کی طرف بھی۔

حَلَبَ فُلَانٌ الدَّهْرَ اَشْطُرَهُ: اس نے زمانہ کے خیرو شر کو پہچان لیا۔ اصل میں یہ لفظ اونٹنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص اونٹنی کے اگلی طرف کے تھنوں سے دودھ نکال لے اور پچھلی طرف کے چھوڑ دے تو اس کے متعلق حَلَبَ اَشْطُرَهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور شَطُورٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے ایک جانب کے تھن خشک ہوگئے ہوں اور شُطُورٌ اس بکری کو بھی کہا جاتا ہے جس کا ایک تھن دوسرے سے لمبا ہو۔

شَطَرَ کے معنیٰ ایک جانب ہوجانے کے ہیں۔ اور شَاطِرٌ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو دور رہتا ہو اس کی جمع شُطُرٌ آتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (المتقارب)

(۲۶۱) اَشَاقَكَ بَيْنَ الْخَلِيْطِ الشُّطُرُ

دوستوں میں تجھے رہنے والوں نے اپنا مشتاق بنا لیا ہے۔

اور شاطر بعید عن الحق کو بھی کہتے ہیں اور اس کی جمع شُطَّارٌ آتی ہے۔

(ش ط ن)

اَلشَّيْطَانُ: اس میں نون اصلی ہے اور یہ شَطَنَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ دور ہونے کے ہیں۔ ❷ اور بِئْرٌ شَطُوْنٌ (بہت گہرا کنواں)

شَطَنَتِ الدَّارُ: گھر کا دور ہونا۔ غُرْبَةٌ شَطُوْنٌ: (وطن سے دوری) وغیرہ محاورات اسی سے مشتق ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ شَيْطَانٌ میں نون زائدہ ہے اور یہ شَاطَ يَشِيْطُ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ غصہ سے سوختہ ہوجانے کے ہیں اور شیطان کو بھی شیطان اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (۵۵۔۱۵) اور جنات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ اس سے قوت غضبیہ

---

❶ وتمامه : وفيمن اقام من الحی و البيت لامرىء القيس رواه فی اللسان (شطر) وفی رواية "اشاقك" وفی رواية الديوان (صنعة السندوبی) ۵۲۔وفيمن اقام مَن الحی هر۔ام الظاعنون بهافی الشطر وهذا البيت مع آخر قد نقد عليه رسائل البلغاء (۳۳۔۳۳۲) وفيه شاقذ بدل شاقك .

❷ راجع مجازه ۱ : ۳۲ واللسان (شطن) وفيهما كل عاتٍ متمرد مكان كل عارم .

اور حمیت مذمومہ افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے اس بنا پر اس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے۔ (1) کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ وہ جن وانس سے ہو یا دیگر حیوانات سے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شَیَاطِیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (۶۔۱۱۲) شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو۔

﴿وَاِنَّ الشَّیَاطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ﴾ (۶۔۱۲۱) اور شیطان (لوگ)...... دلوں میں (یہ بات) ڈالتے ہیں۔

﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیَاطِیْنِهِمْ﴾ (۲۔۱۴) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔

یعنی جب جنوں اور انسانوں میں سے اپنے اصحاب کے پاس جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیَاطِیْنِ﴾ (۳۷۔۶۵) جیسے شیطانوں کے سر۔

میں بعض نے کہا ہے کہ شیاطین سے باریک جسم کے سانپ مراد ہیں اور بعض نے سرکش جن مراد لئے ہیں اور (ناگ پھنی تھوہر کے پتوں کو) بدنما ہونے کی وجہ سے بطور تشبیہ رؤس الشیاطِیْن کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُو الشَّیَاطِیْنُ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو (سلیمان علیہ السلام کے عہد سلطنت میں) شیاطین پڑھا کرتے تھے۔

میں شیاطین سے سرکش جن مراد ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سرکش انسان بھی مراد ہوں شاعر نے کہا ہے۔ (2)

(۲۶۲) لَوْ اَنَّ شَیْطَانَ الذُّئَابِ الْعُسَّلِ

اگر سرکش تیز رو بھیڑیا۔

یہاں عُسَّلٌ ، عَاسِلٌ کی جمع ہے اور عَاسِلٌ کے معنیٰ نہایت سرعت کے ساتھ دوڑنے والے کے ہیں اور عَسَلَانٌ کا لفظ بھیڑیے کی تیز روی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ (3) (الزجر)

(۲۶۳) مَا لَیْلَةُ الْفَقِیْرِ اِلَّا شَیْطَانٌ

کہ مقام فقیر میں رات شیطان کی طرح بھیانک ہوتی ہے۔

اور انسان کی ہر بری خصلت کو شیطان کہا جاتا ہے چنانچہ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ (4) اَلْحَسَدُ شَیْطَانٌ وَالْغَضَبُ شَیْطَانٌ کہ حسد بھی شیطان ہے اور غصہ بھی شیطان ہے۔

(ش ط ی)

شَاطِیءُ الْوَادِیْ کے معنیٰ وادی کے کنارہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیءِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ﴾ (۲۸۔۳۰) تو میدان کے دائیں کنارے سے آواز آئی۔

شَاطَأْتُ فُلَانًا کے معنیٰ ہیں میں اس کے ساتھ ساتھ وادی کے کنارے پر چلا۔

---

(1) فعلیٰ هذا یکون وزنه فیعالا واذا کانت نونه زائدة فوزنه فعلان من شاط (اعراب ثلاثین لابن خالویه ۷۔۸).

(2) لم اجده .

(3) وتمامه مجنونة تودی بروح الانسان والبیت فی اللسان (فقر) بغیر عزو وفی البلدان (فقر) عجزه محبون تودی قریح الاسنان وسیاتی فی (فقر).

(4) لم اجده ۱۲ .

شَطْأُ الزَّرْعِ کھیتی کی سوئی جو زمین سے نکل کر دونوں جانب پھیل جاتی ہے ج اَشْطَاءٌ قرآن پاک میں ہے جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی۔

ایک قرأت میں شَطَأَهٗ ہے جیسے: شَمْعٌ وَشَمَعٌ وَنَهْرٌ وَنَهَرٌ وغیر ذالك۔

(ش ع ب)

اَلشِّعْبُ: اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو ایک قوم سے پھیلا ہو۔ اس کی جمع شُعُوْبٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ﴾ (۴۹۔۱۲) قومیں اور قبیلے (بنائے)

اَلشِّعْبُ مِنَ الْوَادِيْ وادی کا وہ مقام جہاں اس کا کنارہ ملتا اور دوسرا جدا ہوتا ہو جب تم اس جگہ کو دیکھو جہاں اس کا کنارہ جدا ہو رہا ہے تو ایسا معلوم ہو کہ ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا اس سے ملتا ہے تو ایسا محسوس ہو کہ دونوں سرے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ شِعْبٌ کے معنیٰ جمع کرنا اور متفرق کرنا دونوں آتے ہیں اور شُعَيْبٌ یا تو شَعْبٌ کی تصغیر ہے جو مصدر یا اسم ہے اور یا شِعْبٌ کی تصغیر ہے۔ اَلشَّعِيْبُ: پرانی مشک جو مرمت اور درست کی گئی ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ﴾ (۷۷۔۳۰) اس سائے کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں۔

کی تشریح اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔

(ش ع ر)

اَلشَّعَرُ: بال۔ اس کی جمع اَشْعَارٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا﴾ (۱۶۔۸۰) اون اور ریشم اور بالوں سے۔

شَعَرْتُ کے معنیٰ بالوں پر مارنے کے ہیں۔ اور اسی سے شَعَرْتُ كَذَا مستعار ہے جس کے معنیٰ بال کی طرح باریک علم حاصل کر لینے کے ہیں اور شاعر کو بھی اس کی فطانت اور لطافت نظر کی وجہ سے ہی شاعر کہا جاتا ہے تو لَيْتَ شِعْرِيْ كَذَا کے محاورہ میں شعر اصل میں علم لطیف کا نام ہے پھر عرف میں موزون اور مقفیٰ کلام کو شعر کہا جانے لگا ہے اور شعر کہنے والے کو شاعر کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ (۲۱۔۵) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے نہیں۔ بلکہ (یہ شعر ہے جو اس) شاعر (کا نتیجہ طبع) ہے۔

نیز آیت کریمہ:

﴿لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ﴾ (۳۷۔۳۶) ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے۔

اور آیت: ﴿شَاعِرٌ نَتَرَبَّصُ بِهٖ﴾ (۵۲۔۳۰) شاعر ہے اور ہم اس کے حق میں...... انتظار کر رہے، میں بہت سے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ پر شعر بمعنیٰ منظوم اور مقفیٰ کلام بنانے کی تہمت لگائی تھی۔ حتیٰ کہ وہ قرآن پاک میں ہر اس آیت کی تاویل کرنے لگے جس میں وزن پایا جاتا ہے جیسے ﴿وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رَّاسِيَاتٍ﴾ اور ﴿تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾

لیکن بعض حقیقت شناس لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے ان کا مقصد منظوم اور مقفیٰ کلام بنانے کی تہمت لگانا نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن پاک اسلوب شعری سے مبرا ہے اور اس حقیقت کو عوام عجمی بھی سمجھ سکتے ہیں پھر فصحاء

عرب کا کیا ذکر ہے۔ بلکہ وہ آپ ﷺ پر (نعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنیٰ کذب اور شاعر بمعنیٰ کاذب استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جھوٹے دلائل کو اَدِلَّۃٌ شِعْرِیَّۃٌ کہا جاتا ہے اسی لئے قرآن پاک نے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۴) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

اور شعر چونکہ جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے۔ اس لئے مقولہ مشہور ہے کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُهُ: سب سے بہتر شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہو اور کسی حکیم نے کہا ہے کہ میں نے کوئی متدین اور راست گو انسان ایسا نہیں دیکھا جو شعر گوئی میں ماہر ہو۔

اَلْمُشَاعِرُ: حواس کو کہتے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ:

﴿وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ (۲۔۴۹) اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم حواس سے اس کا ادارک نہیں کر سکتے۔ اور اکثر مقامات میں جہاں لَا تَشْعُرُوْنَ کا صیغہ آیا ہے اس کی بجائے لَا یَعْقِلُوْنَ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محسوس تو نہیں ہو سکتیں لیکن عقل سے ان کا ادارک ہو سکتا ہے اور مَشَاعِرُ الْحَجِّ کے معنیٰ رسوم حج ادا کرنے کی جگہ کے ہیں اس کا واحد مَشْعَرٌ ہے اور انہیں شَعَائِرُ الحَجِّ بھی کہا جاتا ہے اس کا واحد شَعِیرَۃٌ ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ﴾ (۲۲۔۳۲) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے۔

﴿عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ (۲۔۱۹۸) مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا تُحِلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ﴾ (۵۔۲) خدا کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا۔

میں شَعَآئِرُ اللّٰهِ سے مراد قربانی کے وہ جانور ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ اور قربانی کو شَعِیْرَۃٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ شَعِیْرَۃٌ (یعنی تیز لوہے) سے اس کا خون بہا کر اس پر نشان لگا دیا جاتا تھا۔

اَلشِّعَارُ: وہ لباس جو انسان کے جسم کے ساتھ ملا رہتا ہے نیز لڑائی میں فوجی اشارہ کو بھی شِعَارٌ کہا جاتا ہے اَشْعَرَهُ الْحُبُّ: محبت اس کا لباس بن گئی۔

اَلْاَشْعَرُ: لمبے بالوں والا آدمی یا وہ گھوڑا جس کے کھر کے ارد گرد لمبے بال ہوں اور سخت مصیبت کو کہا جاتا ہے اور شُعْرَاءُ کتے مکھی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت اس کے بالوں پر بیٹھی رہتی ہے۔

اَلشَّعِیرُ: جو کا دانہ۔ اَلشِّعْرٰی ایک ستارے کا نام ہے (جو سخت گرمی کے زمانہ میں طلوع ہوتا ہے) اور آیت کریمہ:

﴿هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی﴾ (۵۳۔۴۹) وہی شعریٰ کا مالک ہے، میں شِعْرٰی کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ وہ ایک قوم کا معبود تھا۔

(ش ع ف)

آیت کریمہ: ﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا﴾ (۱۲۔۳۰) میں ایک قرأت قَدْ شَعَفَهَا بعین مہملہ ہے۔ ❶ جو کہ

---

❶ وفی مجاز ابوعبیدة ویقرؤه قوم (قد شعفها) وهو من المشعوف قال فی الطبری (۲ : ۱۱۰) ۱۱۱) قرء بالمهملة ابو رجاء والاعرج وعرف وزویت عن علی والجمهور بالمعجمة (راجع الفتح ۸ : ۲۷۲).

شَعْفَةُ الْقَلْبِ سے مشتق ہے اور شَعْفَةُ الْقَلْبِ دل کے اس سرے کو کہتے ہیں جو شہ رگ کیساتھ لٹکا ہوا ہوتا ہے اور شَعْفَةُ الْجَبَلِ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔اسی سے محاورہ ہے:

فُلَانٌ مَشْعُوْفٌ بِكَذَا: فلاں اس پر فریفتہ ہے گویا محبت اس کے شعفہ قلب تک پہنچ گئی ہے۔

(ش ع ل)

اَلشَّعْلُ: آگ کا بھڑکنا یا بھڑکانا کہا جاتا ہے شُعْلَةٌ مِّنَ النَّارِ: آگ کا شعلہ اور قَدْ اَشْعَلْتُهَا کے معنیٰ ہیں: میں نے آگ بھڑکائی۔

ابوزید کے نزدیک شَعَلْتُهَا (فعل مجرد) کہنا بھی جائز ہے۔اَلشَّعِيْلَةُ: جلتی ہوئی بتی۔بعض نے سفیدی کے چمکنے کے لئے بھی بَيَاضٌ يَشْتَعِلُ کا محاورہ استعمال کیا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ (۱۹۔۴) اور سر ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے شعلہ مارنے لگا ہے۔

یہاں رنگت کے لحاظ سے بالوں کی سفیدی کو آگ کے ساتھ تشبیہ دے کر اشتعال کا لفظ استعمال کیا ہے اِشْتَعَلَ فُلَانٌ غَضَبًا: فلاں غصہ سے بھڑک اٹھا۔یہاں غصہ کو حرکت کے لحاظ سے آگ کے بھڑکنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اسی سے اَشْعَلْتُ الْخَيْلَ فِي الْغَارَةِ کا محاورہ ہے یعنی میں نے غارت گری کے لئے سواروں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔جیسا کہ اَوْقَدْتُهَا وَهَيَّجْتُهَا وَاَضْرَمْتُهَا کے محاورات ہیں۔

(ش غ ف)

اَلشُّغْلُ وَالشَّغْلُ: ایسی مصروفیت جس کی وجہ سے انسان دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ دے سکے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ شُغُلٍ فَاكِهُوْنَ﴾ (۳۶۔۵۵) عیش ونشاط کے مشغلے میں ہوں گے۔

ایک قرأت میں شُغْلٌ ہے یہ شُغِلَ فَهُوَ مَشْغُوْلٌ (باب مجرد) سے آتا ہے اُشْغِلَ استعمال نہیں ہوتا شُغْلٌ شَاغِلٌ مصروف رکھنے والا کام۔

(ش ف ع)

اَلشَّفْعُ: کے معنیٰ کسی چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے کے ہیں اور جفت چیز کو شَفْعٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ (۸۹۔۳) اور جفت اور طاق کی۔

بعض نے کہا ہے کہ شَفْعٌ سے مراد مخلوق ہے کیونکہ وہ جفت بنائی گئی ہے۔جیسے فرمایا:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ (۵۱۔۴۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں۔

اور وتر سے ذات باری تعالیٰ مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے یگانہ ہے بعض نے کہا کہ شفع سے مراد یَوْمَ النَّحْرِ ہے کیونکہ اس کے بعد دوسرا دن اس کی مثل ہوتا ہے اور وَتْرٌ سے مراد یوم عرفہ ہے۔ [1] اور بعض نے کہا ہے کہ شفع سے اولادِ آدم اور وتر سے آدم علیہ السلام مراد ہیں

[1] قول ابن عباس وعكرمة والضحاك .

کیونکہ وہ بن باپ کے پیدا کئے گئے تھے۔ ❶

اَلشَّفَاعَۃُ: کے معنیٰ دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا شفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں عام طور پر کسی بڑے با عزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اس کی مدد کے لئے شامل ہو جانے پر بولا جاتا ہے اور قیامت کے روز شفاعت بھی اسی قبیل سے ہوگی۔ ❷ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَھْدًا﴾ (۱۹۔۸۷) (تو لوگ) کسی کی سفاش کا اختیار رکھیں گے مگر جس نے خدا سے اقرار لیا ہو۔

﴿لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ﴾ (۲۰۔۱۹) اس روز کی سفارش فائدہ نہ دے گی۔ مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے۔

﴿لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ شَیْئًا﴾ (۵۳۔۲۶) جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی۔

﴿وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی﴾ (۲۱۔۲۸) وہ اس کے پاس کسی کی سفارش نہیں کر سکتے مگر اس شخص کی جس سے خدا خوش ہو۔

﴿فَمَا تَنْفَعُھُمْ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیْنَ﴾ (۷۴۔۴۸) (اس حال میں) سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے حق میں کچھ فائدہ نہ دے گی۔

یعنی جن معبودوں کو یہ اللہ کے سوا سفارش کے لئے پکارتے ہیں وہ ان کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔

﴿مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ﴾ (۴۰۔۱۸) کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات قبول کی جائے۔

﴿وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا﴾ (۴۔۸۵) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔ یعنی جو شخص اچھے یا برے کام میں کسی کی مدد اور سفارش کرے گا وہ بھی اس فعل کے نفع و نقصان میں اس کا شریک ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شفاعت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے لئے کسی اچھے یا برے مسلک کی بنیاد رکھے اور وہ اس کی اقتداء کرے تو وہ ایک طرح سے اس کا شفیع بن جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❸

(۱۹۵) ((مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً فَلَہٗ اجرھا وَاَجرُ مَن عَمِلَ بِھَا وَمَن سن سُنَّۃً سَیِّئَۃً فعلَیہِ وزرھا وَوزر من عمل بِھَا)) کہ جس شخص نے اچھی رسم جاری کی اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اسے اجر ملے گا اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا گناہ ہوگا۔ اور جو اس پر عمل کرے گا اس کے گناہ میں بھی وہ شریک ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِہٖ﴾ (۱۰۔۳) کوئی (اس کے پاس) اس کا اذن لئے بغیر کسی کی سفارش نہیں

---

❶ مجاھد والحسن وفی تفسیر الآیۃ اقول اخریٰ (الطبری۔۳: ۱۷۰۔۱۷۲)۔

❷ انکر الشفاعۃ المعتزلہ وقالوا اخلاف العدل وانکر ولاحادیث الواردۃ فی اثباتہ وھی اول فرقۃ انکر الحدیث (راجع کتب الاصول)۔

❸ رواہ الحاکم ومسلم والترمذی والنسائی وابن ماجۃ ۔عن جریر وباختلاف الفاظہ ۔عن ابی جحیفۃ (راجع الفتح ۳: ۲۰۰)۔

کر سکتا۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اکیلا ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور نظام کائنات کے چلانے میں کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ ہاں جب وہ امور کی تدبیر و تقسیم کرنے والے فرشتوں کو اجازت دیتا ہے تو وہ اس کی اجازت سے تدبیر امر کرتے ہیں۔

اِسْتَشْفَعْتُ بِفُلَانٍ عَلٰی فُلَانٍ فَتَشَفَّعَ لِیْ: میں نے فلاں سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد کی۔

شَفَّعَہٗ کے معنیٰ کسی کی سفارش قبول کرنے کے ہیں۔اور اسی سے نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔❶ (۱۹۶) ((اَلْقُرْاٰنُ شَافِعٌ وَمُشَفَّعٌ)) کہ قرآن شافع اور مشفع ہوگا یعنی قرآن کی سفارش قبول کی جائے گی۔

اَلشُّفْعَۃُ: کے معنیٰ ہیں کسی مشترکہ چیز کے فروخت ہونے پر اس کی قیمت ادا کرکے اسے اپنے ملک میں شامل کرلینا یہ شَفْعٌ سے مشتق ہے۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا:❷ (۱۹۷) ((اِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ فَلَا شُفْعَۃَ)) جب حدود مقرر ہو جائیں تو حق شفعہ باقی نہیں رہتا۔

(ش ف ق)

اَلشَّفَقُ: غروب آفتاب کے وقت دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں مل جانے کو شفق کہتے ہیں۔قرآن میں ہے: ﴿فَلَا اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ﴾ (۸۴۔۱۶) ہمیں شام کی سرخی کی قسم!

اَلْاِشْفَاقُ: کسی کی خیر خواہی کے ساتھ اس پر تکلیف آنے سے ڈرنا کیونکہ مشفق ہمیشہ مشفق علیہ کو محبوب سمجھتا ہے اور اسے تکلیف پہنچنے سے ڈرتا رہتا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿وَھُمْ مِنَ السَّاعَۃِ مُشْفِقُوْنَ﴾ (۲۱۔۴۹) اور وہ قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں۔

اور جب یہ فعل حرف مِنْ کے واسطہ سے متعدی ہو تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور اگر بواسطہ فِیْ کے متعدی ہو تو عنایت کے معنیٰ نمایاں ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَھْلِنَا مُشْفِقِیْنَ﴾ (۵۲۔۲۶) اس سے قبل ہم اپنے گھر میں خدا سے ڈرتے رہتے تھے۔

﴿مُشْفِقُوْنَ مِنْھَا﴾ (۴۲۔۱۸) وہ اس سے ڈرتے ہیں۔

﴿مُشْفِقِیْنَ مِمَّا کَسَبُوْا﴾ (۴۲۔۲۲) وہ اپنے اعمال (کے وبال سے) ڈر رہے ہوں گے۔

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا﴾ (۵۸۔۱۳) کیا تم اس سے کہ..... پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔

(ش ف و)

شفا: کنوئیں وغیرہ کے کنارہ کو کہتے ہیں۔یہ قرب ہلاکت کے لئے ضرب المثل ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ﴾ (۹۔۱۰۹) گرجانے والی

---

❶ الحدیث اخرجه ابن حبان من روایة جابر والحاکم من حدیث معقل بن یسار والطبرانی من حدیث ابن مسعود وابو عبیدة فی فضائل القران (راجع لتخریجه الکاف ۹۲ وکنزالعمالج (۱ رقم ۲۳۰۷ و۲۳۶۳).

❷ رواه الترمذی من حدیث جابر بن عبدالله قال وقد رواه بعضهم مرسلا عن ابی سلمة والمسئلة مختلف فیها بین الفقهاء راجع التحفة شرح الترمذی (۲ض۲۹۴) وباختلاف الفاظه فی البخاری ومسند احمد وابی داؤد وابن ماجة والشافعی عن الزهری عن ابی سلمة وسعید بن المسیب مرسلاً (راجع کنزالعمال ۷ : ۳).

کھائی کے کنارہ پر۔
﴿عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۔۱۰۳) (اور تم) آگ کے گڑھے کے کنارے تک..........
اَشْفٰى فُلَانٌ عَلَى الْهَلَاكِ: فلاں ہلاکت کے قریب پہنچ گیا۔ اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے مَا بَقِيَ مِنْ كَذَا اِلَّا شَفًى ...... کہ فلاں چیز تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے (یہ چاند یا سورج کے غروب ہونے یا کسی کی موت کے وقت بولا جاتا ہے) شَفًا تثنیہ شفوان اور جمع اَشْفَاء آتی ہے۔

(ش ف ی)

اَلشِّفَاءُ (ض) مِنَ الْمَرَضِ: سلامتی سے ہمکنار ہونا۔ یعنی بیماری سے شفا پانا۔ یہ مرض سے صحت یاب ہونے کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں شہد کے متعلق فرمایا:
﴿فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ﴾ (۱۶۔۶۹) اس میں لوگوں کے (امراض کی) شفا ہے۔
﴿هُدًى وَّ شِفَاءٌ﴾ (۴۱۔۴۴) وہ ہدایت اور شفا ہے۔
﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (۱۰۔۵۷) وہ دلوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔
﴿وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۴) اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔

(ش ق ق)

اَلشَّقُّ: شگاف کو کہتے ہیں، شَقَقْتُه بِنِصْفَيْنِ میں نے اسے برابر دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا﴾ (۸۰۔۲۶) پھر ہم نے زمین کو چیرا پھاڑا۔
﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ﴾ (۵۰۔۴۴) اس روز زمین (ان پر سے) پھٹ جائے گی۔
﴿وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ﴾ (۶۹۔۱۶) اور آسمان پھٹ جائے گا۔
﴿وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ (۸۴۔۱) اور چاند شق ہو گیا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ انشقاق قمر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اور بعض نے اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے معنیٰ وَضَحَ الْاَمْرُ: کئے ہیں۔ یعنی معاملہ واضح ہو گیا۔
اَلشِّقَّةُ: پھاڑا ہوا ٹکڑا۔ اسی سے محاورہ ہے:
طَارَ فُلَانٌ مِنَ الْغَضَبِ شِقَاقًا: فلاں غصہ سے پھٹ گیا۔ جیسا کہ قُطِعَ غَضَبًا کا محاورہ ہے۔ طَارَتْ مِنْهُمْ شُقَّةٌ ان کا ایک حصہ اڑ گیا یعنی غضب ناک ہوئے۔
اَلشِّقُّ: اس مشقت کو کہتے ہیں جو تنگ دو سے بدن یا نفس کو لاحق ہوتی ہے جیسا کہ الانکسار کا لفظ بطور استعارہ نفس کی درماندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ (۱۶۔۷) زحمت شاقہ کے بغیر۔
اَلشُّقَّةُ: وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ﴾ (۹۔۴۲) لیکن مسافت ان کو دور (دراز) نظر آئی۔
اَلشِّقَاقُ: (مفاعلہ) کے معنیٰ مخالفت کے ہیں گویا ہر فریق جانب مخالف کو اختیار کر لیتا ہے اور یا یہ شَقَّ الْعَصَا بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ باہم افتراق پیدا کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ (۴۔۳۵) اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے۔

﴿فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾ (۲۔۱۳۷) تو وہ تمہارے مخالف ہیں۔

﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي﴾ (۱۱۔۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرادے۔

﴿لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾ (۲۔۱۷۶) وہ ضد میں (آ کر نیکی سے) دور ہو گئے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۸۔۱۳) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے۔ یعنی اس کے اولیاء کی صف کو چھوڑ کر ان کے مخالفین کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۹۔۶۳) یعنی جو شخص خدا اور رسول کا مقابلہ کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ﴾ (۴۔۱۱۵) اور جو شخص پیغمبر کی مخالفت کرے۔

اَلْمَالُ بَيْنَنَا شَقَّ الشَّعْرَةِ اَوْ شَقَّ الْاُبْلُمَةِ ❶ یعنی مال ہمارے درمیان برابر برابر ہے۔

فُلَانٌ شَقُّ نَفْسِي اَوْ شَقِيقُ نَفْسِي: یعنی وہ میرا بھائی ہے میرے ساتھ اسے گونہ مشابہت ہے۔

شَقَائِقُ النُّعْمَانِ: گلِ لالہ یا اس کا پودا۔ ❷

شَقِيقَةُ الرَّمْلِ: ریت کا ٹکڑا۔

اَلشَّقْشَقَةُ: اونٹ کا ریہ جو مستی کے وقت باہر نکالتا ہے اس میں چونکہ شگاف ہوتا ہے اس لئے اسے شَقْشَقَةٌ کہتے ہیں۔ ❸

بِيَدِهٖ شُقُوْقٌ: اس کے ہاتھ میں شگاف پڑ گئے ہیں

شِقَاقٌ: سم کا شگاف فَرَسٌ اَشَقُّ: راستہ سے ایک جانب مائل ہو کر چلنے والا گھوڑا۔

اَلشُّقَّةُ: اصل میں کپڑے کے نصف حصہ کو کہتے ہیں اور مطلق کپڑے کو بھی شُقَّةٌ کہا جاتا ہے۔

(ش ق و)

اَلشَّقَاوَةُ: بدبختی۔ یہ سعادت کی ضد ہے اور شَقِيَ (س) شَقْوَةٌ وَشَقَاوَةٌ وَشَقَاءٌ کے معنی بدبخت ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (۲۳۔۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب آ گئی۔

میں ایک قرأت شَقَاوَتُنَا ہے۔ ❹ تو شِقْوَةٌ بروزن رِدَّةٌ ہے۔ سعادت کی طرح شقاوت بھی امور اضافیہ سے ہے۔ جیسا کہ سعادت دو قسم پر ہے، دنیوی و اخروی اور پھر سعادت دینوی تین قسم پر ہے۔ نفسانی، بدنی، اور خارجی، اسی طرح شقاوت بھی انہی اقسام طرف منقسم ہوتی ہے۔ چنانچہ شقاوت اخروی کے متعلق فرمایا:

---

❶ والابلمة الخوصة اى نحن متساوون فيه لان الخوصة اذاشقت طولا انشقت نصفين.

❷ واحده شقيقة واضيف الى النعمان بن المنذر لانه حمى ارضا فكثر فيها وقيل النعمان اسم الدم فشبهت حمرتها لحمرة الدم واللسان : شق.

❸ وفى اللسان : ولاتكون الاللجمل العربى والجمع اشق ومن سميت الخطب شقا وفى حديث على ان كثير امن الخطب شقائق الشيطان لان الشطان يدخل فيها من الكذب وفى الفائق القول منسوب لمعر.

❹ وهى قرأة ابن مسعود والاول قراة اهل المدينة (اللسان).

﴿فَـلَا يَـضِـلُّ وَلَا يَشْقٰى﴾ (۲۰۔۱۲۳) وہ نہ گمراہ اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

﴿رَبَّـنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (۲۳۔۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب آ گئی۔

اور شقاوت دنیوی کے متعلق فرمایا:

﴿فَـلَا يُـخْـرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى﴾ (۲۰۔۱۱۷) تو یہ کہیں تو دونوں کو جنت سے نکلوانہ دے پھر تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی شِـقَـاءٌ کا لفظ تَـعَـبٌ کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے شَـقَـيْتُ فِيْ كَذَا: یعنی میں نے فلاں معاملہ میں مشقت اٹھائی اور ان دونوں میں عموم خصوص کی نسبت ہے۔ ہر شـقـاوت کو تعب کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تعب شقاوقت نہیں ہوتی لہٰذا تعب شقاوت سے عام ہے۔

(ش ک ک)

اَلشَّكُّ: کے معنیٰ دونقیضوں کے ذہن میں برابر ومساوی ہونے کے ہیں یہ یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ ان دونوں کی علامتیں یکساں طور پائی جاتی ہیں اور یا اس لئے کہ دونوں میں سے کسی پر بھی دلیل نہیں ہوتی۔

اَلشَّكُّ: کبھی تو نفس شے میں ہوتا ہے کہ کون سی جنس سے ہے اور کبھی اس کی صفت میں اور کبھی اس غرض کے بارے میں جس کے لئے وہ چیز وجود میں لائی گئی ہے۔

شک جہالت ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس سے اخص ہے کیونکہ جہل میں کبھی سرے سے نقیضین کا علم ہی نہیں ہوتا پس ہر شک جہل ہے مگر ہر جہل شک نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَفِـيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ﴾ (۱۱۔۱۰) وہ تو اس سے قوی شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔

﴿بَـلْ هُـمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ﴾ (۴۴۔۹) لیکن یہ لوگ شک میں کھیل رہے ہیں۔

﴿فَـاِنْ كُنْـتَ فِـيْ شَكٍّ﴾ (۱۰۔۹۴) اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں کچھ شک ہے۔

اور یہ (شک) یا تو شَـكَـكْـتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ چاک کر ڈالنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الکامل)

(٢٦٤) وَشَكَكْتُ بِالرُّمْحِ الْاَصَمِّ ثِيَابَهٗ
لَيْـسَ الْـكَـرِيْـمُ عَـلَـى الْقَنَا بِمُحَرَّمٍ

میں نے ٹھوس نیزے سے اس کا دل (یا درع کو) چاک کر ڈالا اور شریف آدمی نیزے پر حرام نہیں ہوتا۔

تو گویا شک کے معنیٰ کسی چیز میں شگاف ڈالنے کے ہیں اور کسی شی کے اس طرح ہونے کے ہیں کہ اس میں رائے کو قرار حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس پر اعتماد ہو سکے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اس شَكٌّ سے مستعار ہو جس کے معنیٰ بازو کے پہلو سے چمٹ جانے کے ہیں اس طرح شک کا مفہوم یہ ہوگا کہ دو متضاد چیزوں کا باہم دیگر اس طرح مل جانا کہ رائے اور فہم ان میں داخل ہوکر ایک دوسری سے الگ نہ کر سکے اور اِلْتَبَسَ الْاَمْرُ واخْتَلَطَ وَاَشْكَلَ وغیرھا استعارات سے بھی اس اشتقاق کی

[1] قاله عنترة انظر اللسان (شك) والطبرسی (۲۹ : ۱۰۷) ومحاضرات المؤلف (۳ : ۱۶۰) والجمهرة ۱۶۷ والمعلقات لابن الانباری ۳۴۷,۴۶ والعشر للتبریزی ۱۹۶ والمعانی للقتبی وديوانه ۲۱.

تائید ہوتی ہے۔

اَلشِّکَّۃُ: ہتھیار، جس سے کسی چیز کو پھاڑا جاتا ہے۔

(ش ک ر)

اَلشُّکْرُ کے معنیٰ کسی نعمت کا تصور اور اسکے اظہار کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کَشْرٌ سے مقلوب ہے جس کے معنیٰ کشف یعنی کھولنا کے ہیں۔ شکر کی ضد کفر ہے جس کے معنیٰ نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا رکھنے کے ہیں اور دَابَّۃٌ شَکُوْرٌ اس چوپائے کو کہتے ہیں جو اپنی فربہی سے یہ ظاہر کر رہا ہو کہ اس کے مالک نے اس کی خوب پرورش اور حفاظت کی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ عَیْنٌ شَکْرٰی سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ آنسوؤں سے بھرپور آنکھ کے ہیں اس لحاظ سے شکر کے معنیٰ ہوں گے منعم کے ذکر سے بھر جانا۔

شکر تین قسم پر ہے شکر قلبی یعنی نعمت کا تصور کرنا۔ شکر لسانی یعنی زبان سے منعم کی تعریف کرنا۔ شکر بالجوارح یعنی بقدر استحقاق نعمت کی مکافات کرنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا﴾ (۳۴۔۱۳) اے داؤد کی آل میرا شکر کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں شُکْرًا منصوب علی التمیز ہے اور معنیٰ یہ ہیں کہ جو عمل کرو وہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے لئے کرو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شُکْرًا اِعْمَلُوْا کا مفعول ہے۔ اور اُشْکُرُوْا کی بجائے اِعْمَلُوْا اس لئے کہا گیا ہے تاکہ شکر کی انواع ثلاثہ یعنی شکر قلبی، شکر لسانی، اور شکر بالجوارح کے التزام پر تنبیہ ہو جائے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ﴾ (۳۱۔۱۴) کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی۔

﴿وَسَنَجْزِی الشّٰکِرِیْنَ﴾ (۳۔۱۴۵) اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب (بہت اچھا) صلہ دیں گے۔

﴿وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ﴾ (۲۷۔۴۰) اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدہ کے لئے۔ اور آیت کریمہ:

﴿قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ﴾ (۳۴۔۱۳) اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کما حقہ شکر گزار ہونا بہت مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء میں سے شکر گزاری پر صرف دو پیغمبروں کی تعریف کی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جیسے فرمایا:

﴿شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ﴾ اس کی نعمتوں کا شکر گزار ٹھہرے تھے۔ دوم حضرت نوح علیہ السلام کی جیسے فرمایا:

﴿اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا﴾ (۱۷۔۶) بے شک نوح ہمارا شکر گزار بندہ تھا۔

اور جب شکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جیسے: ﴿اِنَّہٗ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ (۶۴۔۱۷) بے شک خدا قدر شناس اور بردبار ہے۔

تو اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام کرنا اور ان کی عبادت گزاری کی پوری پوری جزا دینا مراد ہوتا ہے نَاقَۃٌ شَکِرَۃٌ: دودھ سے بھرے ہوئے تھنوں والی اونٹنی (یہ شُکر سے صیغہ صفت ہے) مقول مشہور ہے۔ [1]

ھُوَ اَشْکَرُ مِنْ بَرُوْقٍ: وہ بروق گھاس سے بھی زیادہ

---

[1] انظر للمثل اللسان (برق) والمیدانی رقم (۲۰۵۳) وفیه تخصر من غیر مطربل تنبت بالسحاب اذانشا ۱۲۔

شکر گزار ہے۔ بروق گھاس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہلکی سی بارش سے ہری بھری ہو جاتی ہے اور شَکَرٌ کے معنیٰ کنایہ کے طور پر عورت کی شرمگاہ اور اس سے جماع کے بھی آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔ [1]

اِنْ سَأَلَتْكَ ثَمَنَ شَكْرِهَا وَشَبْرِكَ اَنْشَأَتَ تَطُلُّهَا: اگر وہ تجھ سے اپنی شرمگاہ اور جماع کی اجرت طلب کرتی ہے تو تو اس میں حیلے بہانے کرتا ہے۔

اَلشَّكِيرُ: تروتازہ گھاس جو درخت کے تنہ میں ہو۔ اور شَكِرَتِ (س) اَلشَّجَرَةِ کے معنیٰ درخت کی شاخوں کے گنجان ہونے کے ہیں۔

(ش ک س)

اَلشَّكِسُ: بدمزاج کو کہتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُوْنَ﴾ (۳۹-۲۹) جس میں کوئی آدمی شریک ہیں (مختلف المزاج) اور بدخو۔ یعنی اپنی بدمزاجی کی وجہ سے باہم جھگڑا کرنے والے ہیں۔

(ش ک ل)

اَلْمُشَاكَلَةُ: کے معنیٰ شکل وصورت میں مشابہ ہونے کے ہیں اور نِـــد کے معنیٰ جنس میں شریک ہونے کے ہیں اور شَبَہٌ کے معنیٰ کیفیت میں مماثلت کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٌ﴾ (۳۸-۵۸) اور اس طرح کے اور بہت سے (عذاب ہوں گے) میں ہیئت اور تعاطی فعل کے لحاظ سے مماثلت مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ شَكْلٌ کے معنیٰ دَلٌّ یعنی عورت کے ناز وانداز کے ہیں لیکن اصل میں اس نسبت کو کہتے ہیں جو دو ہم مشرب وہم پیشہ شخصوں میں پائی جاتی ہے چنانچہ اسی سے محاورہ ہے۔ اَلنَّاسُ اَشْكَال وَاُلَّافٌ کہ لوگ باہم مشابہ اور الفت کروالے ہیں۔

اصل میں مُشَاكَلَةٌ شکل سے ہے اور شَكَّلْتُ الدَّابَّةَ کے معنیٰ ہیں "میں نے جانور کی ٹانگیں (اشکال سے) باندھ دیں اور شکال اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اس کی ٹانگیں باندھ دی جاتی ہیں پھر اس سے استعارہ کے طور پر قَيَّدْتُ الْكِتَابَ کی طرح شَكَّلْتُ الْكِتَابَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کتاب کو اعراب لگانے کے ہیں۔

دَابَّةٌ بِهَا شِكَالٌ: وہ جانور جس کے ایک اگلے اور ایک پچھلے پاؤں میں شِكَال یعنی پائے بند کی طرح سفیدی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ (۱۷-۸۴) کہو کہ ہر ایک اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔

یعنی اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے جو اسے پائے بند کے ہوئے ہے کیونکہ فطرت انسان پر سلطان قاہر کی طرح غالب رہتی ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب "اَلذَّرِيْعَةُ اِلٰى مَكَارِمِ الشَّرِيْعَةِ" میں بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ ایسے

---

[1] قاله يحيىٰ يعمر لرجل خاصمته اليه امرئته فى مهرها اوروه القتبى فى ادب الكتاب ص ١٢ مثلاً للتقعير والتقعيب وفيه الخبر ومجالس ثعلب (٤٦٥) قال وانشكر: الفرج والكامل للمبرد٦٨ وكتب تراجم النحويين مع اختلاف فى الرواية وفى اللسان (ضهل، طلل) والفائق (١: ٣٣٣) بزيادة تضهلها اى تعطيها القليل من حقها والنهاية (شكر) وفيه أان بزيادة همزة الاستفهام وفى المطبوع تصحيف وارتباك .

ہی جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ❶:

(۱۹۹) کُلٌّ متیسرٌ لِمَا خُلِقَ لہٗ (فکر ہر کسی بقدر ہمت اوست)

اَلْاَشْکَلَۃُ: حاجت جو انسان کو پابند کر دے اور اَلْاِشْکَالُ کے معنیٰ (بطور استعارہ) کسی کام کے پیچیدہ ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ اشتباہ کا لفظ شَبَہٌ سے مشتق ہے اور مجازاً کسی امر کے مشتبہ ہونے پر بولا جاتا ہے۔

(ش ک و)

اَلشَّکْوُ وَالشِّکَایَۃُ وَالشَّکَاۃُ وَالشَّکْوٰی کے معنیٰ اظہار غم کے ہیں اور شکَوتُ وَاَشْکَیتُ دونوں ایک ہی معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ (۱۲۔۸۶) کہ میں تو اپنے غم اور اندوہ کا اظہار (خدا سے کرتا ہوں۔

﴿وَتَشْتَکِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ (۵۸۔۱) اور خدا سے شکایت (رنج وملال) کرتی ہے۔

اَشْکَاہُ: (افعال) کے معنیٰ کسی کو صاحب شکوہ کر دینے کے آتے ہیں جیسے اَمْرَضَہٗ (اس کو صاحب مرض کر دیا) اور کسی کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ❷

(۱۰۰) شَکَوْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ حَرَّ الرَّمْضَاءِ فِیْ جِبَاھِنَا وَاَکُفِّنَا فَلَمْ یُشْکِنَا: کہ ہم نے آنحضرت کے پاس اپنی پیشانیوں اور ہاتھوں میں گرمی کی شدت کی شکایت کی لیکن آپ ﷺ نے ہماری شکایت کا ازالہ نہ کیا۔

اصل میں شَکْو کے معنیٰ شَکْوۃ یعنی چھوٹے مشکیزہ کو کھولنے اور اس کے اندر کی چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں لہٰذا یہ دراصل بَثَثْتُ لَہٗ مَا فِیْ وِعَائِیْ اور نَفَضْتُ مَا فِیْ جِرَابِیْ کی طرح استعارہ ہے جس کے معنیٰ دل کی بات کو ظاہر کر دینے کے ہیں۔ اَلْمِشْکٰوۃُ: طاق جو آر پار نہ ہو قرآن پاک میں ہے:

﴿کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ﴾ (۲۴۔۳۵) گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہو۔

تو مِشکوٰۃٌ سے مراد مومن کا دل اور مصباح سے نور الٰہی مراد ہے۔

(ش م ت)

اَلشَّمَاتَۃُ: کے معنیٰ دشمن کی مصیبت پر خوش ہونے کے ہیں اور یہ شَمِتَ بِہٖ فَھُوَ شَامِتٌ کا مصدر ہے اور اَشْمَتَ اللّٰہُ بِہِ الْعَدُوَّ: کے معنیٰ ہیں اللہ اسے مصیبت پہنچائے جس سے اس کے دشمن خوش ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَاءَ﴾ (۷۔۱۵۰) تو ایسا نہ کیجئے کہ دشمن مجھ پر ہنسیں۔

تُشْمِتُ کے معنیٰ چھینکنے والے کو دعا دینے کے ہیں۔ گویا ازالۂ شماتۃ کی دعا ہے جیسے تَعْرِیْضٌ کے معنیٰ مرض کو

---

❶ رواہ الحاکم وابوداؤد واصلہ متفق علیہ عن عمران بن حصین والترمذی عن عمر والحاکم ایضاً عن ابی بکرفی حدیث طویل.

❷ اخرجہ مسلم بعدان اوردا حادیث ابرادالظھر والبیھقی من حدیث خباب راجع النیل (۲: ۳۲۹) والزرقانی علی المؤطا (۱: ۴۰) والحدیث فی حل کتب الحدیث وفی الفائق (۱: ۲۵۲) والنھایۃ (شکو) ۱۲.

زائل کرنے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۲۶۵) .... فَبَاتَ لَهُ

طَوعَ الشَّوامِت ....

تو اس نے خوف وہراس اور سردی میں کھڑے ہو کر رات گزاری۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شوامت سے قوائم یعنی ٹانگیں مراد ہیں، لیکن یہ معنیٰ محل نظر ہیں اس لئے کہ اس بیت کے علاوہ اس معنیٰ پر اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

(ش م خ)

اَلشَّامِخُ: بلند، ج مؤنث شَامِخَاتٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَوَاسِیَ شَامِخَاتٍ﴾ (۷۷۔۲۷) اونچے اونچے پہاڑ۔ اور اسی سے شَمَخَ بِاَنْفِهٖ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ تکبر کرنے کے ہیں۔

(ش م ء ز)

اَلاِشْمَأْزَازُ: منقبض وگرفتہ ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ﴾ (۳۹۔۴۵) (تو) ان لوگوں کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔

(ش م س)

اَلشَّمْسُ: کے معنیٰ سورج کی ٹکیہ یا دھوپ کے ہیں ج: شُمُوسٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ (۳۶۔۳۸) اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے۔

﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ (۵۵۔۵) سورج اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں۔

شَمَسَ یَوْمُنَا وَاَشْمَسَ: دن کا دھوپ والا ہونا۔

شَمَسَ فُلَانٌ شِمَاسًا: گھوڑے کا بدکنا ایک جگہ پر قرار نہ پکڑنا۔ گویا قرار نہ پکڑنے میں سورج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

(ش م ل)

اَلشِّمَالُ: بایاں۔ ضد یمین۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ﴾ (۵۰۔۱۷) جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں۔

نیز چھوٹی چادر جس سے بائیں جانب ڈھانپ لی جائے اسے بھی شِمَالٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ عربی زبان میں دوسرے اعضاء کی مناسبت سے لباس کے مختلف نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً قمیص کی آستین کو یَدٌ (ہاتھ) اور جو حصہ سینہ اور پشت پر آئے اسے صَدْرٌ اور ظَهْرٌ کہا جاتا ہے اور پائجامہ کے پائنچہ کو رِجْلٌ سے موسوم کر دیتے ہیں۔ وغیر ذالک

اور اَلْاِشْتِمَال بِالثَّوْبِ: کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے حدیث میں ہے۔ [2]

(۱۰۱) ((نُهِیَ عَنْ اشْتِمَالِ الصَّمَّاءِ)) کہ اشتمال الصماء ممنوع ہے۔

---

[1] قاله النابغة والبيت بتمامه : فارتاع من صوت كلاب خباب له طوع انشوامت من خوف ومن بردا والبيت فى اللسان (شمت) ومختار الشعرالجاهلى (١ : ٧٥) والمحكم (طوع) وفيه "من صرد" والكلاب صاحب الكلاب والشوامت القوائم اى بات الثور طوع قوائم (يعنى قائما) وهذاعلى رواية من روىٰ طوع بالنصب ومن رفعه فانه يريد من طوع الشوامت اى ماتشتهيه اعداده راجع للبيت ايضاً البحر (٥ : ٢٣٧) والعقدالثمين ٦ والعشر للتبريزى ٢٩٤ والبيت من ابيات المعانى راجع اللسان والمعانى الكبير للقتبى (٧٣٩).

[2] متفق عليه وابوداؤد والبيهقى من حديث ابن عمر راجع ايضاً الزرقانى على المؤطا (٤ : ٢٨٧) والفائق (٢ : ٢٠).

اور استعارہ کے طور پر کمبل کو جو جسم پر لپیٹا جاتا ہے۔ شَمْلَةٌ وَمِشْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شَمَلَهُمُ الْاَمْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ کسی امر کے سب کو شامل اور عام ہو جانے کے ہیں۔ پھر شَمال کے لفظ سے مجازاً کہا جاتا ہے۔

شَمَلْتُ الشَّاةَ: بکری کے تھنوں پر غلاف چڑھنا۔ اور شِمَالَ کے معنیٰ عادت بھی آتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی چادر کی طرح انسان پر مشتمل ہو جاتی ہے۔

اَلشَّمُوْلُ: شراب۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور شراب کو شمول کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ عقل کو ڈھانپ لینے کی وجہ سے خَمْرٌ کہا جاتا ہے۔

اَلشِّمَالُ: (بکسر الشین) وہ ہوا جو کعبہ کی بائیں جانب سے چلتی ہے اور اس میں ایک لغت شَمَالٌ (بفتحہ شین) بھی ہے۔

شَامَلَ وَاَشْمَلَ کے معنیٰ شمال کی جانب میں جانے کے ہیں۔ جیسے جنوب سے اَجْنَبَ (جنوب کو جانا) کنایہ کے طور پر تلوار کو مُشْتَمَلٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے رِدَاءٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے مُرْتَدٍ بِالسَّيْفِ وَمُتَدَرِّعًا لَهٗ کی طرح جَاءَ مُشْتَمِلًا بِسَيْفِهٖ کا محاورہ ہے۔

نَاقَةٌ شِمِلَّةٌ وَشِمَالٌ: بادشمالی کی طرح تیز رو اونٹنی۔ اور شاعر کے قول۔ ❶ (الکامل)

(۲۶۶) وَلَتَعْرِفَنَّ خَلَائِقًا مَشْمُوْلَةً
وَلَتَنْدَمَنَّ وَلَاتَ سَاعَةَ مَنْدَمٍ

تم عمدہ اخلاق کو پہچان لوگے اور تم پشیمانی اٹھاؤ گے لیکن وہ وقت پشیمانی کا نہیں ہوگا۔

میں مَشْمُوْلَةٌ سے مراد پاکیزہ اخلاق ہیں گویا بادشمالی نے (شراب کی طرح) انہیں ٹھنڈا اور خوش گوار بنا دیا۔

(ش ن ی)

شِنِئْتُهٗ: (ف س) کے معنیٰ بغض کی وجہ سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے ہیں۔ اسی سے اَزْدِشَنُوْئَةَ مشتق ہے جو ایک قبیلہ کا نام اور آیت کریمہ: ﴿شَنَاٰنُ قَوْمٍ﴾ (۵۔۲) لوگوں کی دشمنی۔

میں شَنَاٰنُ کے معنیٰ بغض اور دشمنی کے ہیں ایک قرأت میں شِنْاٰنٌ بسکون نون ہے۔ پس تخفیف (یعنی سکون نون) کی صورت میں اسم اور فتح نون کی صورت میں مصدر ہوگا۔ ❷ اور اسی سے فرمایا:

﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ (۱۰۸۔۳) کچھ شک نہیں کہ تمہارا دشمن ہی بے اولا د رہے گا۔

(ش ہ ب)

اَلشِّهَابُ: کے معنیٰ بلند شعلہ کے ہیں خواہ وہ جلتی ہوئی آگ کا ہو یا فضا میں کسی عارضہ کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ﴾ (۳۷۔۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے لگتا ہے۔

﴿شِهَابٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۱۵۔۱۸) روشنی کرنے والا انگارہ۔

﴿شِهَابًا رَّصَدًا﴾ (۷۲۔۹) انگارہ تیار۔

---

❶ والبیت من شواھد الطبری (۲۳۔۲۲) وراجع له ایضاً اضداد ابی الطیب (۴۱۳) والاصمعی (۱۸) وابن السکیت ۱۷۳ وابن الانباری ۱۶۸ وفی کل المراجع بغیر عزو والخزانة البغدادیة ۲: ۱۴۸.

❷ الاسم مثل سکران وعطشان من سکر وعطش والمصدر مثل طیران ونسلان وعسلان ورملان قال الطبری (۶: ۱۶۴) واولی القرائتین قراءة من یفتح النون لان المصادر یاتی علی فعلان .

اَلشُّھْبَۃُ: سفیدی ۔ جس میں کچھ سیاہی ملی ہوئی ہو۔ جیسا کہ انگارہ کی روشنی کے ساتھ دھواں ملا ہوتا ہے اسی سے کَتِیبَۃٌ شَھْبَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ مسلح لشکر کے ہیں کیونکہ اس میں ہتھیاروں کی چمک سے ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ سیاہی اور سفیدی ملی ہوئی ہیں ۔

(ش ھ د)

اَلْمَشْھُوْدُ وَالشَّھَادَۃُ کے معنیٰ کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کے ہیں خواہ بصر سے ہو یا بصیرت سے اور صرف حاضر ہونے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ﴾ (۵۹۔۱۲) پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ۔

لیکن اولیٰ یہ ہے کہ شُھُوْدٌ کے معنیٰ صرف حاضر ہونا ہوں اور شَھَادَۃٌ میں حاضر ہونے کے ساتھ مشاہدہ کا بھی اعتبار کیا جائے ۔ اَلْمَحْضَرُ: بمعنیٰ مشھد یعنی حاضر ہونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے مُشْھِدٌ وہ عورت جس کا خاوند حاضر ہو اور مَشْھَدٌ کی جمع مَشَاھِدُ آتی ہے اسی سے مَشَاھِدُ الْحَجِّ ہیں یعنی وہ مواضع شریفہ جہاں کہ فرشتے اور نیک لوگ حاضر ہوتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ مَشَاھِدُ الحَجِّ کے معنیٰ مناسک حج کے ہیں ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ﴾ (۲۲۔۲۸) تاکہ وہ اپنے فائدہ کے لئے حاضر ہوں ۔

﴿وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا﴾ (۲۴۔۲) اور ان کی سزا کے وقت ...... موجود ہو ۔

﴿مَا شَھِدْنَا مَھْلِكَ اَھْلِهٖ﴾ (۲۷۔۴۹) ہم تو اس کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں ۔

﴿وَالَّذِیْنَ لَا یَشْھَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾ (۲۵۔۷۲) اور وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے ۔

یعنی نہ تو زَوْرٌ کے موقع پر خود ہی حاضر ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کا قصد یا ارادہ کرتے ہیں ۔

اَلشَّھَادَۃُ: وہ بات جو کامل علم ویقین سے کہی جائے خواہ وہ علم مشاہدۂ بصر سے حاصل ہوا ہو یا بصیرت سے ۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَشْھِدُوْا خَلْقَھُمْ﴾ (۴۳۔۹) کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے ۔

میں مشاہدہ بصر مراد ہے اور پھر سَتُکْتَبُ شَھَادَتُھُمْ (عنقریب ان کی شہادت لکھ لی جائے گی) سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ شہادت میں حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاَنْتُمْ تَشْھَدُوْنَ﴾ (۲۔۸۴) اور تم اس بات کے گواہ ہو ۔

میں تَشْھَدُوْنَ کے معنیٰ تَعْلَمُوْنَ کے ہیں یعنی تم اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہو ۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَا اَشْھَدْتُّھُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ﴾ (۱۸۔۵۱) میں نے نہ تو ان کو آسمان کے پیدا کرنے وقت بلایا تھا ۔

میں تنبیہ کی ہے کہ اس لائق نہیں ہیں کہ اپنی بصیرت سے خلق آسمان پر مطلع ہو جائیں اور آیت کریمہ:

﴿عَالِمُ الغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ﴾ (۲۳۔۹۲) وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے ۔

میں غائب سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کا ادارک نہ تو ظاہری حواس سے ہو سکتا ہو اور نہ بصیرت سے اور شہادت

سے مراد وہ اشیاء ہیں جنہیں لوگ ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

شَہِدْتُّ کالفظ دوطرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) علم کی جگہ آتا ہے اور اسی سے شہادت ادا ہوتی ہے مگر اَشْهَدُ بِكَذَا کی بجائے اگر اَعْلَمُ کہا جائے تو شہادت قبول نہیں ہوگی بلکہ اَشْهَدُ ہی کہنا ضروری ہے۔

(۲) قسم کی جگہ پر آتا ہے چنانچہ اَشْهَدُ بِاللّٰهِ اَنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ میں اَشْهَدُ بمعنیٰ اُقْسِمُ ہے بعض نے کہا ہے کہ اگر اَشْهَدُ کے ساتھ باللّٰهِ نہ بھی ہو تب بھی یہ قسم کے معنیٰ میں ہوگا اور کبھی عَلِمْتُ بھی اس کے قائم مقام ہو کر قسم کے معنیٰ دیتا ہے اور اس کا جواب بھی جواب قسم کی طرح ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الکامل)

(۲۶۷) وَلَقَدْ عَلِمْتُ لَتَاْتِيَنَّ مَنِيَّتِيْ

مجھے یقین ہے کہ میری موت ضرور آکر رہے گی۔

شَاهِدٌ اور شَهِيْدٌ کے ایک ہی معنیٰ ہیں شَهِيْدٌ کی جمع شُهَدَاءُ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ﴾ (۲۔۲۸۲) اور وہ مردوں کو گواہ کرلیا کرو۔

شَهِدْتُ کے معنیٰ کسی جگہ پر حاضر ہونے کے ہیں اور شَهِدْتُ عَلٰى كَذَا کے معنیٰ کسی واقعہ کی شہادت دینے کے قرآن پاک میں ہے:

﴿شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ﴾ (۴۱۔۲۱) ان کے کان ان کے خلاف (ان کے اعمال کی) شہادت دیں گے۔

اور کبھی شہادت کے معنیٰ فیصلہ اور حکم کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (۱۲۔۲۶) اس کے قبیلہ میں سے ایک فیصلہ کرنے والے نے فیصلہ کیا۔

اور جب شہادت اپنی ذات کے متعلق ہو تو اس کے معنیٰ اقرار کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ﴾ (۲۴۔۶) اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ چار بار خدا کی قسم کھائے۔

اور آیت کریمہ: ﴿مَا شَهِدْنَا اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا﴾ (۱۲۔۸۱) اور ہم نے تو اپنی دانست کے مطابق (اس کے لے آنے کا) عہد کیا تھا۔

میں شَهِدْنَا بمعنیٰ اَخْبَرْنَا کے ہے اور آیت کریمہ:

﴿شَاهِدِيْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ﴾ (۹۔۱۷) جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں گے۔

میں شَاهِدِيْنَ بمعنیٰ مُقِرِّيْنَ کے ہیں یعنی کفر کا اقرار کرتے ہوئے۔

﴿لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا﴾ (۴۱۔۲۱) تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔

اور آیت کریمہ: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ (۳۔۱۸) خدا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ۔

میں اللہ تعالیٰ کے اپنی وحدانیت کی شہادت دینے سے مراد

[1] والسیوطی ۲۸۰ البیت منسوب للبید ولم اجده فی دیوانه وتمامه ان المنایا لاتطیش سهامها وقد روی عجزه ماخوف علی ولاعدم ۱۲ كذاقال العینی فی شرح الشواهد راجع رقم ۲۵۲.

عالم اور انفس میں ایسے شواہد قائم کرنا ہے جو اس کی واحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(٢٦٨) فَفِیْ کُلِّ شِیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

ہر چیز کے اندر ایسے دلائل موجود ہیں جو اس کے یگانہ ہونے پر دلالت کر رہے۔

بعض نے کہا ہے کہ باری تعالیٰ کے اپنی ذات کے لئے شہادت دینے سے مراد یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو نطق بخشا اور ان سب سے اس کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی﴾ اور فرشتوں کی شہادت سے مراد ان کا ان افعال کو سرانجام دینا ہے جن پر وہ مامور ہیں۔ جس پر کہ آیت:

﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا﴾ (۷۹۔۵) پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔ دلالت کرتی ہے اور اُولُو العزم کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ وہ مخلوق کے رموز و اسرار پر مطلع ہوتے اور ان کا اقرار کرتے ہیں۔ اور شہادت بایں معنیٰ اہل علم کے ساتھ ہی مخصوص ہے کیونکہ جہلاء اس قسم کی شہادت سے کوسوں دور ہیں اسی لئے کفار کے متعلق فرمایا:

﴿مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۱۸۔۵۱) میں نے ان کو نہ تو آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (۳۵۔۲۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

میں بھی اسی معنیٰ پر تنبیہ کی ہے اور آیت:

﴿وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ﴾ (۴۔۶۹) اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ۔

میں بھی شہداء سے یہی لوگ مراد ہیں۔

شَهِیْدٌ: یہ کبھی شاہد یعنی گواہ آتا ہے۔ چنانچہ آیت:

﴿سَآئِقٌ وَّ شَهِیْدٌ﴾ (۵۰۔۲۱) اس کے ساتھ (ایک چلانے والا) اور ایک گواہ ہوگا۔ میں شہید بمعنیٰ گواہ ہی ہے جو اس کے لئے یا اس پر گواہی دے گا۔ اسی طرح آیت:

﴿فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیْدًا﴾ (۴۔۴۱) بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو لوگوں کا حال بتانے کو گواہ طلب کریں گے۔

میں بھی شہید بمعنی شاہد ہی ہے اور آیت کریمہ:

﴿اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ (۵۰۔۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں ان کے دل اس کی شہادت دیتے ہیں بخلاف ان لوگوں کے جن کے متعلق فرمایا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ﴾

❶ البیت فی البحر (٢ : ٤٠٢ / ٣ : ١٣٩ / ٤ : ٤٣٢) ومحاضرات المؤلف (٤ : ٣٩٨) فی ثلاثة ابیات والطبرسی (وفی ابن کثیر قبله) فواعجباً کیف یعصی الاله ۔ام کیف یجحده الجاهد ۔ونسبه الی ابن المعتز وفی طبقات ابن المعتز ٢٠٧ انه لابی العتاهیة وفیه قصة ابی نواس حجاراته ایاه وهوالصواب کمافی زهر الآداب للحصری (٢ : ٤٩) وطرازالمجالس ١١٦.

(۴۱۔۴۴) ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ .... اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (۱۷۔۷۸) کیونکہ صبح کے وقت ..... قرآن پاک کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔

میں قرآن پاک کے مشہود ہونے کے معنٰی یہ ہیں کہ اس کی قرأت کرنے والے پر شفا، رحمت، توفیق، سکینت، اور ارواح نازل ہوتی ہیں۔ جن کا کہ آیت:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۷۔۸۲) اور ہم قرآن پاک کے ذریعہ سے وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَادْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ﴾ (۲۔۲۳) اور جو تمہارے مددگار ہیں ان کو بلالو۔ میں شُهَدَاء کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جن پر معنٰی شہادت مشتمل ہے چنانچہ ابن عباس نے اس کے معنٰی اَعْوَان یعنی مددگار کے لئے ہیں اور مجاہد نے اس کے معنٰی یہ کئے ہیں کہ جو تمہارے حق میں گواہی دیں اور بعض نے شہداء سے وہ لوگ مراد لئے ہیں جن کے موجود ہونے کو قابل قدر اور معتبر سمجھا جائے یعنی وہ ایسے لوگ نہ ہوں جن کے متعلق کہا گیا ہے۔ [1] (البسیط)

(۲۶۹) مُخْلِفُوْنَ وَيَقْضِي النَّاسُ اَمْرَ هُمُوْ
وَهُمْ بِغَيْبٍ وَفِيْ عَمْيَاءَ مَا شَعَرُوْا

وہ پیچھے رہتے ہیں اور لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے ہیں وہ غیر حاضر اور بے خبر ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کا علم تک نہیں ہوتا اور آیت:

﴿وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا﴾ (۲۸۔۷۵) اور ہم امت میں سے گواہ نکال لیں گے۔

میں بھی شہید کا لفظ انہی معانی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنَّهٗ عَلٰى ذَالِكَ لَشَهِيْدٌ﴾ (۱۰۰۔۱۷) اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔

﴿اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا﴾ (۱۸۔۲۸) اور (حق ظاہر کرنے کو) خدا ہی کافی ہے۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ﴾ (۴۰۔۱۶) اور کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں رہے گی۔

﴿يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ (۲۰۔۷) وہ تو چھپے بھید اور پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس متعدد آیات ایسی ہیں جو اس معنٰی (یعنی علم باری تعالیٰ) کے محیط ہونے) پر دال ہیں۔ اور قریب المرگ شخص کو بھی شہید کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا﴾ (۴۱۔۳۰) ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ خوف نہ کرو۔

میں بھی اسی معنٰی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور فرمایا:

﴿وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ (۵۷۔

[1] قاله الاخطل فی كليب بن يربوع رهط جرير وبعده: الاكلون خبيث الزاد وحدهم ـ والسائلون بظهر الغيب: مالخبر والبيت فی الكامل ومحاضرات المؤلف (۱: ۳۱۱) وديوانه ۱۰ والسيوطی ۳۲۸ وفيه يعصی بدل يقضی وقبله: اما كليب بن يربوع فليس لها عند التفاخر ايراد ولا صدر.

۱۹) اور اپنے پروردگار کے نزدیک شہید ہیں ان کے لئے ان کے اعمال کا صلہ ہوگا۔اور شُهَدَاءُ کو شُهَدَاء یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حالت نزع میں ان نعمتوں کو مشاہدہ کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے ارواح باری تعالیٰ کے ہاں حاضر کئے جاتے ہیں۔جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا﴾ (۳۔۱۶۹) اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ مت سمجھنا اور آیت کریمہ:

﴿وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۵۷۔۱۹) اور پروردگار کے نزدیک شہید ہیں۔بھی اسی معنیٰ پر دلالت کرتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَّشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ﴾ (۸۵۔۳) اور حاضر ہونے والے کی اور جو اس کے پاس حاضر کیا جائے اس کی قسم۔ میں بعض نے کہا ہے کہ مَشْهُوْدٌ سے یوم جمعہ مراد ہے اور بعض نے یوم عرفہ مراد لیا ہے اور بعض نے یوم قیامت اور شَاهِدٌ سے ہر وہ شخص مراد لیا ہوسکتا جو اس روز میں حاضر ہوگا اور آیت کریمہ:

﴿يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ﴾ (۱۱۔۱۰۳) (اور یہی وہ) دن ہے (جس میں خدا کے روبرو) حاضر کئے جائیں گے۔ میں مَشْهُوْدٌ بمعنیٰ مُشَاهِدٌ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ وہ دن ضرور آ کر رہے گا۔

اَلتَّشَهُّدُ کے معنیٰ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھنے کے ہیں اور عرف میں تشہد کے معنیٰ اَلتَّحِيَّاتُ اور ان اذکار کے ہیں جو حالت تشہد (جلسہ) میں پڑھے جاتے ہیں۔

(ش ھ ر)

اَلشَّهْرُ: (مہینہ) وہ مدت معینہ جو چاند کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔یا دورانِ شمس کے بارہ کے حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ہے جو ایک نقطہ سے شروع ہوکر دوسرے نقطہ پر ختم ہو جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ﴾ (۲۔۱۸۵) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں.........

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ﴾ (۲۔۱۹۷) حج کے مہینے معین ہیں جو معلوم ہیں۔

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا﴾ (۹۔۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں۔

﴿فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ (۹۔۲) تو مشرکو! زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔

اَلْمُشَاهَرَةُ کے معنیٰ ہیں مہینوں کے حساب سے معاملہ کرنا۔ جیسے مُسَانَهَةٌ (سال وار معاملہ) کرنا اور مُيَاوَمَةٌ (دنوں کے حساب سے معاملہ کرنا) اَشْهَرْتُ بِالْمَكَانِ: کسی جگہ مہینہ بھر قیام کرنا۔شَهَرَ فُلَانٌ وَاشْتَهَرَ کے معنیٰ مشہور ہونے کے ہیں خواہ وہ شہرت نیک ہو یا بد۔

(ش ھ ق)

اَلشَّهِيْقُ کے معنیٰ لمبی سانس کھینچنا کے ہیں لیکن شَهِيْقٌ سانس لینے اور زَفِيْرٌ سانس چھوڑنے پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا﴾ (۶۷۔۷) اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔

اصل میں یہ لفظ جَبَلٌ شَاهِقٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ انتہائی بلند پہاڑ کے ہیں۔

(ش ھ و)

اَلشَّھْوَۃُ کے معنیٰ نفس کا اس چیز کی طرف کھنچ جانا جسے وہ چاہتا ہے خواہشات دنیوی دو قسم پر ہیں صادقہ اور کاذبہ۔

سچی خواہش وہ ہے جس کے حصول کے بغیر بدن کا نظام مختل ہو جاتا ہے۔ جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہا اور جھوٹی خواہش وہ جس کے عدم حصول سے بدن میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ پھر شَھْوَۃٌ کا لفظ کبھی اس چیز پر بولا جاتا ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور کبھی خود اس قوت شہویہ پر اور آیت کریمہ:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ (۳۔۴) لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں (بڑی) زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔

میں شہوت سے دونوں قسم کے خواہشات مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ﴾ (۹۔۵۹) اور خواہشات نفسانی کے پیچھے لگ گئے۔

میں جھوٹی خواہشات مراد ہیں یعنی ان چیزوں کی خواہش جن سے استغنا ہو سکتا ہو۔ اور جنت کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ﴾ (۴۱۔۳۱) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گا۔

﴿فِيمَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ﴾ (۲۱۔۱۰۲) اور جو کچھ ان کا جی چاہے گا اس میں ....

رَجُلٌ شَھْوَانٌ وَشَھْوَانِیٌّ: خواہش کا بندہ شَیءٌ شَھِیٌّ: لذیذ چیز، مرغوب شے۔

(ش و ب)

اَلشَّوْبُ: (ن) کے معنیٰ ہیں: خلط ملط کرنا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ﴾ (۳۷۔۶۷) گرم پانی ملا کر۔

اور عَسَلٌ یعنی شہد کو شَوْبٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ تمام مشروبات میں ملایا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ اس کے ساتھ موم ملا ہوا ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔ [1]

مَا عِنْدَہٗ شَوْبٌ وَّلَا رَوْبٌ: نہ اس کے پاس شہد ہے اور نہ دودھ بالکل قلاش ہے۔

(ش و ر)

اَلشَّوَارُ: کے معنیٰ ظاہری سامان آرائش کے ہیں اور کنایہ کے طور پر اندام نہانی پر بولا جاتا ہے اور شَوَّرْتُ بِہٖ کے معنیٰ ہیں: میں نے اسے شرمندہ کیا۔ گویا اس کے ستر کو ننگا کر دیا۔

شِرْتُ العَسَلَ وَاَشَرْتُہٗ: چھتے سے شہد نکالنا شاعر نے کہا ہے۔ [2]

(۲۷۰) وَحَدِيْثٍ مِثْلُ مَا ذِیْ مُشَارٍ

---

[1] کذافی النوادر لابی سھل ۵۱ وراجع للمثل اللسان (روب۔ شوب) ومنه فی الحدیث: لاشوب ولاروب ای انی بری منھن عیبھا قال ابن الاثیر فی تفسیر ھذاالحدیث ای لاغش والتخلیط.

[2] قاله عدی بن زید العبادی وھومن اشھر شعرائھم ذکرہ بردکلن فی تاریخه (۱: ۱۲٤) وایضاً الخزانة (۲: ۲۰) واوله فی سماع یأذن الشیخ له والبیت فی اللسان (اذن، شوذ، موذ) والفائق (۱: ۱۳ و۱: ۲۳۷) والطبرسی (۳۰: ۷۷) والتراجمه الاغانی (۲: ٤۳۰۱۸) وجمھرة اشعار العرب (۱۰۳) وتاریخ الطبری والبیت فی الامالی المرتضیٰ (۱: ٤۲۳) بغیر عزو والصحاح (موذ) وملاب قد تلھیت بھا۔ قصرت الیوم فی بیت غدارہ والقصیدة مقیدة القافیة. وفی الصحاح: ایاك والخطب فانھا: مشوار کثر العشار ۱۲.

اور باتیں جو چھتے سے نکالے ہوئے تازہ شہد کی طرح شیریں تھیں۔

اور شہد نکالنے کے اعتبار سے شِرتُ الدَّابَةَ کے معنیٰ ہوئے: گھوڑے کی دوڑ معلوم کرنا کہ کس قدر دوڑ سکتا ہے اور خطبوں کے متعلق کہا جاتا ہے: مشوار کثیر العثار کے خطبے ایسی منڈی ہے جہاں بہت زیادہ لغزش کا خطرہ ہے۔

اور اَلتَّشَاوُرُ وَالْمُشَاوَرَۃُ وَالْمَشُوْرَۃُ کے معنیٰ ہیں ایک دوسرے کی طرف بات لوٹا کر رائے معلوم کرنا یہ بھی شِرْتُ العَسْلَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ چھتہ سے شہد نکالنا کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ (۳۔۱۵۹) اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو۔

اَلشُّوْرٰی: ہر وہ امر جس میں مشورہ کیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ﴾ (۴۲۔۳۸) اور اپنے کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں۔

(ش و ظ)

اَلشُّوَاظُ: آگ کا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ﴾ (۵۵۔۳۵) آگ کے شعلے اور دھواں۔

(ش و ک)

اَلشَّوْکُ: کانٹا اور کبھی شَوْکٌ اور شِکَّۃٌ کے لفظ سے اسلحہ اور شدت مراد ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَةِ﴾ (۸۔۷) کہ جو قافلہ بے شان وشوکت (یعنی ہتھیار) ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر بچھو کے ڈنگ کو بھی شَوْكٌ کہا جاتا ہے اور خار دار درخت کو شَجَرَۃٌ شَاکَۃٌ وَشَائِکَۃٌ کہہ دیتے ہیں۔ شَاکَنِی الشَّوْكُ: مجھے کانٹا چبھ گیا شَوَّكَ الْفَرْخُ: چوزے نے کانٹے اور پر نکال کئے شَوَّكَ ثَدیُ الْمَرْاَۃِ: عورت کی چھاتی ابھر آئی۔ شَوَّكَ الْبَعِیْرُ: اونٹ کے انیاب کا لمبا اور کانٹے کی طرح تیز ہونا۔

(ش و ی)

شَوَیْتُ اللَّحْمَ وَاشْتَوَیْتُهٗ کے معنیٰ گوشت بھوننا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَشْوِی الْوُجُوْهَ﴾ (۱۸۔۲۹) ان کے چہروں کو جھلس دے گا۔

شاعر نے کہا ہے۔[1] (الکامل)

(۲۷۱) فَاشْتَوٰی لَیْلَةَ رِیْحٍ وَاجْتَمَلَ

تو اس نے ٹھنڈی رات (یعنی قحط سالی) میں گوشت بھونا اور چربی پگھلا کر کھائی۔

اَلشَّوَیٰ: جسم کے اطراف، ہاتھ، پاؤں، وہ اعضاء جن پر زخم لگنے سے موت واقع نہ ہو۔ محاورہ ہے: رَمَاهُ فَاَشْوَاهُ: اسے تیر مارا تو اس کے اطراف پر لگا یعنی ایسے عضو پر نہیں لگا جس پر زخم لگنے سے انسان مر جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی﴾ (۷۰۔۱۶) کھال ادھیڑ ڈالنے والی۔

[1] قاله لبيد اوله: اونهته فاتاه رزقه وقبله: وغلام ارسلته امه۔ بالوك فبذلنا ماسأل۔ وفي رواية واحتمل بالحاء بدل الجيم وقال في شواهد الكشاف ۱۰ ورواية الجيم انسب وافيد والبيت في تهذيب الالفاظ (۶۱۱) وديوانه ۳۹ والمعاني للقتبي ۴۱۰ (ط، حيدرآباد ۱۳۳۸)۔

اوراسی سے غیراہم معاملہ کوبھی شَوٰی کہا جاتا ہے کیونکہ شَوٰی مَقْتَل: یعنی عضورئیس نہیں ہوتا(جس پر زخم لگنے سے انسان مرجائے)

اَلشَّاةُ: بھیڑ۔یہ اصل میں شَاھَۃ ہے کیونکہ اس کی جمع شِیَاہٌ اور تصغیر شُوَیْھَۃٌ آتی ہے۔

(ش ی ء)

اَلشَّیْءُ: بعض کے نزدیک شی وہ ہوتی ہے جس کا علم ہوسکے اور اس کے متعلق خبری دی جاسکے اور اکثر متکلمین کے نزدیک یہ اسم مشترک ہے جو اللہ تعالیٰ اوراس کے ماسوا پر بھی بولا جاتا ہے اور موجودات اور معدومات سب کوشی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ شی صرف موجود چیز کو کہتے ہیں یہ اصل میں شَاءَ کا مصدر ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق شے کا لفظ استعمال ہوتو یہ معنیٰ شَاءٍ یعنی اسم فاعل کے ہوتا ہے اور غیراللہ پر بولا جائے تو مَشِیْءٌ (اسم مفعول) کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔پس آیت کریمہ:

﴿اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ﴾ (۳۹۔۶۲) خداہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔

میں لفظ شی چونکہ دوسرے معنیٰ (اسم مفعول) میں استعمال ہوا ہے اس لئے یہ عموم پہ محمول ہوگا اور اس سے کسی قسم کا استثناء نہیں کیا جائے گا کیونکہ شی مصدر بمعنیٰ المفعول ہے مگرآیت کریمہ:

﴿قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً﴾ (۶۔۹) ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر(قرین انصاف) کس کی شہادت ہے۔

میں شی اسم فاعل ہے اوراللہ تعالیٰ کو اَکْبَرُ شَھَادَۃً کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت: ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ﴾ (۲۳۔۱۴)(توخدا جوسب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے) میں ذات باری تعالیٰ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا گیا ہے۔

اَلْمَشِیْئَۃُ: اکثر متکلمین کے نزدیک مشیت اورارادہ ایک ہی صفت کے دونام ہیں لیکن بعض کے نزدیک دونوں میں فرق ہے۔(۱) مشیت کے اصل معنیٰ کسی چیز کی ایجاد یا کسی چیز کو پالینے کے ہیں۔اگرچہ عرف میں مشیت ارادہ کی جگہ استعمال ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی مشیت کے معنیٰ اشیاء کوموجود کرنے کے ہیں اورلوگوں کی مشیت کے معنیٰ کسی چیز کو پالینے کے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو چاہنا چونکہ اس کے وجود کو مقتضی ہوتا ہے۔اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ (مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَاءْ لَمْ یَکُنْ) کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے نہیں ہوتا۔

ہاں اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کا ارادہ کرنا اس کے حتمی وجود کونہیں چاہتا۔چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾ (۲۔۱۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔

﴿وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (۴۰۔۳۱) اور خدا توبندوں پر ظلم کرنانہیں چاہتا۔

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ لوگوں میں عُسْرٌ اور ظلم پائے جاتے ہیں۔

(۲) مشیت اور ارادہ میں دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کا ارادہ تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر ہوسکتا ہے مثلاً انسان چاہتا ہے کہ اسے موت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو مار لیتا

ہے لیکن مشیت انسانی مشیت الٰہی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ﴾ (۸۱۔۲۹) اور تم کچھ بھی نہیں چاہتے مگر وہی جو خدائے رب العلمین چاہے۔

ایک روایت ہے کہ جب آیت:

﴿لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ (۸۱۔۲۸) یعنی اس کے لئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے۔ نازل ہوئی تو کفار نے کہا ہے یہ معاملہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم چاہیں تو استقامت اختیار کریں اور چاہیں تو انکار کردیں اس پر آیت کریمہ:

﴿وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ﴾ نازل ہوئی۔ بعض نے کہا ہے کہ اگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال اس پر معلق اور منحصر نہ ہوتے تو لوگ تمام افعال انسانیہ میں انشاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہوسکتے تھے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (۳۷۔۱۰۴) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پاؤ گے۔

﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ صَابِرًا﴾ (۱۸۔۶۹) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

﴿يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ......﴾ (۱۱۔۳۳) اگر اس کو خدا چاہے گا تو نازل کرے گا۔

﴿اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ﴾ (۱۲۔۹۹) مصر میں داخل ہوجایئے خدا نے چاہا تو............

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ﴾ (۷۔۱۸۸) کہدو کہ میں اپنے فائدہ اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو خدا چاہے: ﴿وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ......﴾ (۷۔۹۸) اور ہمیں شایاں نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں ہاں خدا جو ہمارا پروردگار ہے وہ چاہے تو (ہم مجبور ہیں)۔

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّىْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ﴾ (۱۸۔۲۳) اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کردوں گا مگر (ان شاء اللہ کہہ کر یعنی اگر خدا چاہے۔

(ش ی ب)

اَلشَّيْبُ وَالْمَشِيْبُ: بڑھاپا۔ بالوں کی سفیدی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا﴾ (۱۹۔۴) اور بڑھاپے سے سر شعلہ مارنے لگا۔

بَاتَتِ الْمَرْئَةُ بِلَيْلَةٍ شَيْبَاءَ: عورت نے شب زفاف گزاری۔ یعنی جس میں اس کی بکارت زائل کی گئی ہو اس کے برعکس بَاتَتِ الْمَرْئَةُ بِلَيْلَةٍ حَرَّةٍ: وہ رات جس میں اس کی بکارت زائل نہ کی گئی ہو۔

(ش ی ت)

شِيَةٌ: اصل میں وِشْيَةٌ ہے اس کی بحث باب الواو میں بیان ہوگی۔

(ش ی خ)

اَلشَّيْخُ کے معنی معمر آدمی کے ہیں۔ عمر رسیدہ آدمی کے چونکہ تجربات اور معارف زیادہ ہوتے ہیں اس مناسبت سے کثیر العلم شخص کو بھی شیخ کہہ دیا جاتا ہے۔ محاورہ ہے:

شَيْخٌ بَيِّنُ الشَّيْخُوخَةِ وَالشَّيْخِ وَلَتَيَشُّخِ یعنی وہ

بہت بڑا عالم ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿هٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا﴾ (۱۱۔۷۲) یہ میرے میاں (بھی) بوڑھے ہیں۔
﴿اَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ﴾ (۲۸۔۲۳) ہمارے والد بڑی عمر کے بوڑھے ہیں۔

(ش ی د)

اَلْمَشِیْدُ: (پلستر کیا ہوا، بلند) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَصْرٍ مَّشِیْدٍ﴾ (۲۲۔۴۵) اور بہت سے بلند محل ہیں۔تو مَشِیْدٌ کے معنی یا تو پلستر کی ہوئی عمارت کے ہیں اور یا مُطَوَّلٌ یعنی بلند کے ہیں۔اگر چہ یہ بھی مآل کے لحاظ سے پہلے معنی کی طرف راجع ہے محاورہ ہے: شَیَّدَ قَوَاعِدَہٗ: اس کی بنیادوں کو اسی طرح محکم بنایا جیسے گچ کی ہوئی ہوتی ہیں۔
اَلْاِشَادَۃُ: (افعال) کے معنی بلند آواز سے شعر پڑھنا یا گانا) کے ہیں۔

(ش ی ط)

اَلشَّیْطَانُ: اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔[1]

(ش ی ع)

اَلشِّیَاعُ: کے معنی منتشر ہونے اور تقویت دینا کے ہیں۔کہا جاتا ہے:
شَاعَ الْقَوْمُ: قوم منتشر اور زیادہ ہوگئی۔
شَیَّعْتُ النَّارَ بِالْحَطَبِ: ایندھن ڈال کر آگ تیز کرنا۔
اَلشِّیْعَۃُ: وہ لوگ جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے۔اور وہ اس کے اردگرد پھیلے رہتے ہیں۔اسی سے بہادر کو مَشِیْعٌ کہا جاتا ہے۔
شِیْعَۃٌ کی جمع شِیَعٌ وَاَشْیَاعٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ﴾ (۳۷۔۸۳) اور ان ہی یعنی نوح علیہ السلام کے پیروؤں میں ابراہیم علیہ السلام تھے۔
﴿هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ﴾ (۲۸۔۱۵) ایک تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں میں سے تھا۔
﴿وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا﴾ (۲۸۔۴) وہاں کے باشندوں کو گروہ در گروہ کر رکھا تھا۔
﴿فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۱۵۔۱۰) پہلے لوگوں میں (بھی)۔
﴿وَلَقَدْ اَهْلَکْنَا اَشْیَاعَکُمْ﴾ (۵۴۔۱۵۱) اور ہم تمہارے ہم مذہبوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔

(ش ی ن)

شَأْنٌ: کے معنی حالت اور اس اتفاقی معاملہ کے ہیں جو کسی کے مناسب حال ہو اس کا اطلاق صرف اہم امور اور حالات پر ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ﴾ (۵۵۔۲۹) ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔
شَأْنُ الرَّأْسِ: کھوپری کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ جس سے انسان کا قوام ہے اس کی جمع شُؤُوْنٌ آتی ہے۔

تمّت الجزالاوّل

❀❀❀

---

[1] راجع (ش ط ن)۔

کتاب الصاد

(ص ب ب)

صَبُّ الْمَاءِ کے معنی اوپر سے پانی گرانا کے ہیں۔محاورہ ہے: صَبَّ الْمَاءَ فَانْصَبَّ وَصَبَبْتُهُ فَتَصَبَّبَ: یعنی اس نے اوپر سے پانی گرایا چنانچہ پانی گر گیا، قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا﴾ (۸۰۔۲۵) ''بے شک ہم نے ہی (اوپر سے) پانی برسایا۔''

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ (۸۹۔۱۳) تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔

﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ﴾ (۲۲۔۱۹) ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی گرایا جائے گا۔

صَبَّ اِلٰی كَذَا صَبَابَةً: عاشق ہونا۔اور صفت کا صیغہ خاص کر صَبٌّ (بروزن فَعْلٌ) آتا ہے۔

چنانچہ محارہ ہے۔

فُلَانٌ صَبٌّ بِكَذَا: فلاں اس پر فریفتہ ہے۔اور صِرْمَةٌ کی طرح صَبَّةٌ کے معنی بھی جانوروں کی ٹکڑی یا جماعت کے ہیں۔ اَلصَّبِيْبُ: بارش کا پانی۔کسی چیز کا عصارہ۔بہایا ہوا خون۔اَلصَّبَابَةُ وَالصُّبَّةُ: کسی چیز کا باقی ماندہ جو گرانے کے لائق ہو تَصَابَبْتُ الاناء(تَفَاعِلٌ) میں نے برتن سے باقی ماندہ پانی بھی پی لیا۔تَصَبْصَبَ (تَفَعْلَلَ) کسی چیز کا باقی ماندہ بھی ختم ہو جانا۔

(ص ب ح)

اَلصُّبْحُ وَالصَّبَاحُ: دن کا ابتدائی حصہ جب کہ افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ﴾ (۱۱۔۱۸) کیا صبح کچھ دور ہے فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ (۳۷۔۱۷۷) تو جن کو ڈرسنایا گیا ہے ان کے لیے برا دن ہوگا۔

اَلتَّصَبُّحُ صبح کے وقت سونا۔اَلصَّبُوْحُ صبح کی شراب کو کہتے ہیں اور صَبَحْتُهُ کے معنی صبح کی شراب پلانے کے ہیں۔

اَلصَّبْحَانُ: صبح کے وقت شراب پینے والا (مؤنث صَبْحٰی) اَلْمِصْبَاحُ (۱) پیالہ جس میں صبوحی پی جائے (۲) وہ اونٹ جو صبح تک بیٹھا رہے (۳) قندیل جس میں چراغ رکھا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ۔اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ﴾ (۲۴۔۳۵)

اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ اور چراغ ایک قندیل میں ہے۔

اور چراغ کو مِصْبَاحٌ کہا جاتا ہے اور صُبَاحٌ کے معنی بتی کی لو کے ہیں۔اَلْمَصَابِيْحُ چمکدار ستارے جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ﴾ (۶۷۔۵۰) اور ہم نے قریب کے آسمان کو (تاروں کے) چراغوں سے زینت دی۔

صَبَّحْتُهُمْ مَاءَ كَذَا: میں صبح کے وقت ان کے پاس فلاں

پانی پر جا پہنچا❶ اور کبھی صُبْحٌ یَا صَبَاحٌ کی مناسبت سے بالوں کی سخت سرخی کو بھی صُبْحٌ کہا جاتا ہے۔
صَبُحَ فُلَانٌ خوبصورت اور حسین ہونا۔❷

(ص ب ر)

اَلصَّبْرُ کے معنی ہیں: کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا چنانچہ صَبَرْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہوں گے: میں نے جانور کو کھلائے بغیر باندھ رکھا۔
صَبَرْتُ فُلَانًا: میں نے اسے زبردستی قسم کھلائی۔ لہٰذا اَلصَّبْرُ کے معنی ہوئے: عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا پس صبر ایک عام لفظ ہے جو مختلف مواقع استعمال کے اعتبار سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے چنانچہ کسی مصیبت پر نفس کو روک رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے۔ یہ جَزَعٌ کی ضد ہے اور جنگ میں نفس کو روک رکھنا کو شجاعت کہا جاتا ہے اس کی ضد جُبْنٌ (بزدلی) ہے۔ یہی صبر اگر کسی پریشان کن حادثہ کو برداشت کرنے کی صورت میں ہو تو اسے رَحْبُ الصَّدْرِ (کشادہ دلی) کہتے ہیں جس کی ضد ضَجْرٌ ہے۔ اگر کسی بات کو روک رکھے تو اسے کِتْمَان کہتے ہیں اس کی ضد مَذَلٌ (مجبور ہو کر راز فاش کر دینا) ہے۔ قرآن پاک نے ان تمام صفات کو صبر کے لفظ سے یاد کیا ہے۔❸ چنانچہ فرمایا:
﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ (۲۔۱۷۷) سختی اور تکلیف کے وقت ثابت قدم رہیں۔
﴿وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ﴾ (۳۳۔۳۵) صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔
اور روزہ کو صَبْرٌ کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ضبط نفس کی ایک قسم ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا۔❹ (۱) صِيَامُ شَهْرِ الصَّبْرِ وَثَلَاثَةِ اَيَّامٍ فِیْ كُلِّ شَهْرٍ يُذْهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ: ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں اور آیت کریمہ:
﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ (۲۔۱۷۵) یہ آتش (جہنم) کی کیسی برداشت رکھنے والے ہیں۔ کی تفسیر میں ابوعبیدہ نے کہا ہے۔❺ کہ لغت میں صبر کے معنی جرات بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اعرابی نے اپنے خصیم سے کہا۔❻
مَا اَصْبَرَكَ عَلَى اللهِ کہ تم خدا پر کتنے جری ہو۔

---

❶ راجع الآية (٥٤۔٣٨).
❷ واصبح يأتي بمعنى صار كما في الآية (٥۔٣٠)(٣۔١٠٢).
❸ وقد فصل الغزالي في الاحياء (٤: ٦٦۔٦٧) احسن تفصيل و ابسط من هذا فليراجع اليه وقد كان المولف معاصراً للغزالي والغزالي مع فضله كان يستفيد من كتب المولف كما ذكرنا في التقدمة.
❹ وفي الكنز عن اعرابي مرفوعاً: صم شهر الصبر وصوم ثلاثة ايام من كل شهر يذهبن و حرا الصدر و بمعناه راجع ابن جرير عن عليؓ موقوفاً (٨: رقم ٣٠٢٠، ٣٠١٦، ٣٠٢١).
❺ لم اجده في مجازه بل قالهٗ ابن قتيبة في مشكله (٦٩) وحكى عن الفراء من الاصمعي قول الاعرابي فابن قتيبة تصحف بابي عبيدة و نسب الطبري هذا المعنى الى قتادة واختاره (٢: ٩١۔٩٢) وايضاً قارن حجاز ابي عبيدة (١: ٤٦) ولحكاية الاعرابي معاني القرآن للفراء (١: ١٠٣) والكشاف (١: ١٠٨).
❻ حكاهٗ والاصمعي عن قاضي اليمن (المشكل ٦٩).

لیکن یہاں مجاز بصورت حقیقت ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو نے گناہ پر جرأت کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو کیسے برداشت کیا اور جن لوگوں نے اس کے معنی مَـاأَلْقَاهُمْ عَلَى النَّارِ یا مَاأَعْمَلَهُمْ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ کیے ہیں ❶ تو اس کا بھی یہی مفہوم ہے کیونکہ کبھی صبر کے ساتھ وہ شخص بھی متصف ہوتا ہے جو درحقیقت تو صابر نہ ہو لیکن بظاہر دیکھنے میں صابر نظر آتا ہو لہٰذا اس موقع پر صیغہ تعجب کا استعمال مخلوق کے لحاظ سے ہے نہ کہ باری تعالیٰ کے لحاظ سے اور آیت کریمہ ہے:

﴿اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوا﴾ (۳۔۲۰۰) ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو۔

کے معنی ہیں کہ عبادت الٰہی پر اپنے آپ کو روک رکھو اور خواہشات نفسانی کے خلاف جہاد کرو اور آیت کریمہ:

﴿وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ﴾ (۱۹۔۶۵) اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہو، میں اِصْطَبِرْ کے معنی مشقت کے ساتھ صبر کرنے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿أُوْلٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ کے معنی یہ ہیں کہ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے جو تکالیف انہوں نے برداشت کیں اس کے بدلے انہیں جنت میں بالا خانے دیئے جائیں گے اور آیت:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ﴾ (۱۲۔۱۸) اچھا صبر (کہ وہی) خوب ہے۔ میں صبر کا حکم اور اس کی تلقین ہے۔

اَلصَّبُوْرُ: صبر پر قدرت رکھنے والا۔ صَبَّارٌ کے معنی تکلیف اور مجاہدہ سے صبر کرنے والے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ﴾ (۳۴۔۱۹) اس میں ہر صابر شاکر کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور چونکہ انتظار میں صبر لازم ہے بلکہ یہ صبر ہی کی ایک قسم ہے اس لیے کبھی صبر کا لفظ بول کر انتظار کے معنی مراد لے لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ (۶۸۔۴۷) تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو۔ یعنی کفار پر خدا کے حکم کا انتظار کیجئے۔

(ص ب غ)

اَلصَّبْغُ: یہ صَبَغْتُ (ص) کا مصدر ہے اور صِبْغٌ بمعنی مَصْبُوْغٌ آتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۳۸) (کہہ دو کہ ہم نے) خدا کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ میں اس عقل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر پیدا کی ہے اور وہ اس کے ذریعہ بہائم سے ممتاز ہوتا ہے جیسا کہ فطرت انسانیہ۔

نصاریٰ کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا تو وہ ساتویں روز اسے ”عمودیۃ“ (زرد رنگ کے پانی) میں غوطہ دیتے اور اس کا نام صِبْغَةٌ یعنی دین رکھتے اس لیے اللہ تعالیٰ نے دین کو صِبْغَةَ اللّٰهِ کہا اور فرمایا۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ (۲۔۱۳۸) خدا سے بہتر رنگ یعنی دین کس کا ہوسکتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ﴾ (۲۳۔۲۰) اور کھانے والے کے لیے سالن۔ میں صِبْغٌ کے معنی سالن کے ہیں اور یہ اَصْبَغْتُ بِالْخَلِّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سرکہ میں روٹی ڈبو کر کھانے کے ہیں۔

---

❶ منسوب الی مجاهدؒ.

(ص ب و)

اَلصَّبِیُّ: نابالغ لڑکا۔رَجُلٌ مُّصْبٍ: عیال دار جس کے بچے نابالغ ہوں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا﴾ (۱۹۔۲۹) (وہ بولے کہ) ہم اس سے جو کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

صَبَا فُلَانٌ یَصْبُو صَبْوًا وَصَبْوَۃً: کسی چیز کی طرف مائل ہوکر بچوں کے سے کام کرنے لگا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ﴾ (۱۲۔۳۳) تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں داخل ہو جاؤں گا۔

اَصْبَانِیْ فَصَبَوْتُ اس نے مجھے گرویدہ کیا چنانچہ میں گرویدہ ہوگیا۔

اَلصَّبَا: پروائی ہوا۔صَابَیْتُ السَّیْفَ: الٹی تلوار نیام میں ڈالی۔صَابَیْتُ الرُّمْحَ: نیزہ مارنے کے لیے جھکا دیا۔

اَلصَّابِئُوْنَ: ایک فرقے کا نام ہو جو نوح علیہ السلام کے دین پر ہونے کے مدعی تھا اور ہر وہ آدمی جو ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے اسے صَابِئٌ کہا جاتا ہے۔یہ صَبَأَ نَابُ الْبَعِیْرِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: اونٹ کے کچلی نکل آئی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالصَّابِئِیْنَ وَالنَّصَارٰی﴾ (۲۲۔۱۷) اور ستارہ پرست اور عیسائی۔

﴿وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ﴾ (۲۔۶۲) اور عیسائی یا ستارہ پرست۔

اور ایک قرات میں صَابِیْنَ (بدوں ہمزہ کے) ہے۔بعض نے کہا ہے کہ ہمزہ تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿لَا یَاْکُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطُوْنَ﴾ (۶۹۔۳۷) جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

میں اَلْخَاطُوْنَ اصل میں خَاطِئُوْنَ ہے۔اور بعض نے کہا: نہیں بلکہ یہ صَبَا یَصْبُوْ سے مشتق ہے جس کے معنی مائل ہونا اور جھکنا کے ہیں۔ ❶

(ص ح ب)

اَلصَّاحِبُ کے معنی ہیں: ہمیشہ ساتھ رہنے والا۔خواہ وہ کسی انسان یا حیوان کے ساتھ رہے یا مکان یا زمان کے اور عام اس سے کہ وہ مصاحبت بدنی ہو جو کہ اصل اور اکثر ہے یا بذریعہ عنایت اور ہمت کے ہو، جس کے متعلق کہ شاعر نے کہا ہے (الطویل) ❷ (۲۷۲) لَئِنْ غِبْتَ عَنْ عَیْنِیْ لَمَا غِبْتَ عَنْ قَلْبِیْ (اگر تو میری نظروں سے غائب ہے تو دل سے تو غائب نہیں ہے) اور عرف میں ''صاحب'' صرف اسی کو کہا جاتا ہے جو عام طور پر ساتھ رہے اور کبھی کسی چیز کے مالک کو بھی ''هُوَ صَاحِبُهٗ'' کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح اس کو بھی جو کسی چیز میں تصرف

---

❶ وکذا ذکر المؤلف تحت (ص ب و).

❷ وصدرہ: انا والذی لو شاء لم یخلق الهوی۔ والبیت فی الامالی (۲: ۱۹۲) وقال انشدنا منصور بن بشر و فیه النوٰی، بدل الهوی والحصری فی زهره (۱: ۱۹۳) بغیر عزو وفیه فما بدل لما و بعده: یوهمنیك الشوق حتی کانما انا حیلك عن قرب وان لم تکن قربی وفی روایة تربنیك ولم اجد من عزاه الی قائله.

کا مالک ہو۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَاتَحْزَنْ﴾ (۹۔۴۰) اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو۔
﴿قَالَ لَہٗ صَاحِبُہٗ وَھُوَ یُحَاوِرُہٗ﴾ (۱۸۔۳۷) تو اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا۔
﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ﴾ (۱۸۔۹) کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور لوح والے۔
﴿وَاَصْحَابُ مَدْیَنَ﴾ (۲۲۔۴۴) اور مدین کے رہنے والے بھی۔
﴿اَصْحَابُ الْجَنَّۃِ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ﴾ (۲۔۸۲) وہ جنت کے مالک ہوں گے (اور) ہمیشہ اس میں (عیش کرتے) رہیں گے۔
﴿وَلَاتَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ (۶۸۔۴۷) اور مچھلی (کا لقمہ ہونے والے یونسؑ) کی طرح نہ ہونا۔اور آیت کریمہ:
﴿مِنْ اَصْحَابِ السَّعِیْرِ﴾ (۳۵۔۶) (تاکہ وہ) دوزخ والوں میں ہوں۔اور آیت کریمہ:
﴿وَمَاجَعَلْنَا اَصْحَابَ النَّارِ اِلَّا مَلآئِکَۃً﴾ (۷۴۔۳۱) اور ہم نے دوزخ کے داروغہ فرشتے بنائے ہیں۔
میں اَصْحَابَ النَّارِ سے دوزخی مراد نہیں ہیں بلکہ دوزخ کے داروغے مراد ہیں۔جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔
پھر ''صاحب'' کا لفظ کبھی ان کی طرف مضاف ہوتا ہے جو کسی کے زیر نگرانی ہوتے ہیں جیسے صَاحِبُ الْجَیْشِ (فوج کا حاکم) اور کبھی حاکم کی طرف جیسے: صَاحِبُ الْاَمِیْرِ (بادشاہ کا وزیر) اَلْمُصَاحَبَۃُ وَالْاِصْتِحَابُ میں بنسبت لفظ اَلْاِجْتِمَاعُ کے مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ مُصَاحَبَۃٌ کا لفظ عرصہ دراز تک ساتھ رہنے کو مقتضی ہے۔اور لفظ اجتماع میں یہ شرط نہیں ہے۔لہٰذا اِصْطِحَابٌ کے موقعہ پر اجتماع کا لفظ تو بول سکتے ہیں مگر اجتماع کی جگہ پر ہر مقام میں اِصْطِحَابٌ کا لفظ نہیں بول سکتے۔اور آیت کریمہ:
﴿مَابِصَاحِبِکُمْ مِّنْ جِنَّۃٍ﴾ (۳۴۔۴۶) تمہارے رفیق کو سودا نہیں۔میں آنحضرتؐ کو صَاحِبُکُمْ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ زندگی بسر کی ہے ان کا تجربہ کر چکے ہو اور ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہو چکے ہو پھر بتاؤ کہ ان میں کوئی دماغی خلل یا دیوانگی پائی جاتی ہے.....؟ یہی معنی آیت:
﴿وَمَاصَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ (۸۱۔۲۲) کے ہیں۔ اَلْاِصْحَابُ لِشَیْءٍ کے معنی ہیں: وہ فرمانبردار ہوگیا اصل میں اس کے معنی کسی کا مصاحب بن کر اس کے ساتھ رہنے کے ہیں۔چنانچہ اَصْحَبَ فُلَانٌ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا بیٹا بڑا ہو کر اس کے ساتھ رہنے لگے۔اور اُصْحِبَ فُلَانٌ فُلَانًا کے معنی ہیں: وہ اس کا ساتھی بنا دیا گیا قرآن میں ہے:
﴿وَلَاھُمْ مِّنَّا یُصْحَبُوْنَ﴾ (۲۔۴۳) اور نہ ہم سے پناہ ہی دیئے جائیں گے۔
یعنی ہماری طرف سے ان پر سکینت، تسلی کشائش وغیرہ کی صورت میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی چیزوں سے اولیاء اللہ کی مدد کی جاتی ہے۔
اَدِیْمٌ مُصْحَبٌ: کچا چمڑہ جس سے بال نہ اتارے

گئے ہوں۔

(ص ح ف)

اَلصَّحِيْفَةُ کے معنی پھیلی ہوئی چیز کے ہیں جیسے صَحِيْفَةُ الْوَجْهِ (چہرے کا پھیلاؤ) اور وہ چیز جس میں کچھ لکھا جاتا ہے اسے بھی صحیفہ کہتے ہیں اس کی جمع صَحَائِفُ و صُحُفٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾ (۸۷۔۱۹) یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اور آیت کریمہ:

﴿يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ (۹۸۔۳۰) پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم (آیتیں) لکھی ہوئی ہیں، میں بعض نے کہا ہے کہ صُحُفٌ سے قرآن پاک مراد ہے اور اس کو صُحُفًا اور فِيْهَا كُتُبٌ اس لیے کہا ہے کہ قرآن پاک کتب سابقہ کی بنسبت بہت سے زائد احکام اور نصوص پر مشتمل ہے۔

اَلْمُصْحَفُ متعدد صحیفوں کا مجموعہ اس کی جمع مَصَاحِفُ آتی ہے اور اَلتَّصْحِيْفُ کے معنی اشتباہ حروف کی وجہ سے کسی صحیفہ کی قراءت یا روایت میں غلطی کرنے کے ہیں۔

اور صَحْفَةٌ (چوڑی رکابی) چوڑے پیالے کی طرح کا ایک برتن۔ ❶

(ص خ خ)

اَلصَّآخَّةُ یہ صَخَّ يَصِخُّ صَخًّ فَهُوَ صَاخٌّ سے اسم ہے جس کے معنی کسی ذی نطق کی آواز کی سختی اور کرخت پن کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ﴾ (۸۰۔۳۲) تو جب (قیامت کا) غل مچے گا۔ میں صَآخَّةٌ سے مراد قیامت ہے جس کی طرف کہ آیت کریمہ:

﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ﴾ (۲۰۔۱۰۲) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور اسی سے اَصَاخَ يُصِيْخُ مقلوب ہے۔ جس کے معنی آواز کی سختی سے کسی کو بہرہ کر دینا کے ہیں۔

(ص خ ر)

اَلصَّخْرُ کے معنی سخت پتھر یا چٹان کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ﴾ (۳۱۔۳۱) اور ہو بھی کسی پتھر کے اندر ﴿وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ (۸۹۔۹) اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جنہوں نے وادی (قری) میں چٹانیں تراش کر (مکان بنائے)

(ص د د)

اَلصُّدُوْدُ وَالصَّدُّ: کبھی لازم ہوتا ہے۔ جس کے معنی کسی چیز سے روگردانی اور اعراض برتنے کے ہیں جیسے فرمایا:

﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا﴾ (۴۔۶۱) کہ تم سے اعراض کرتے اور رکے جاتے ہیں۔

اور کبھی متعدی ہوتا ہے یعنی روکنے اور منع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ﴾ (۲۹۔۳۸) اور شیطان نے ان کے اعمال ان کو آراستہ کر دکھائے اور ان کو سیدھے راستے سے روک دیا۔

﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۱۶۔۱۸۸) جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) خدا

❶ وجمعه صِحَاف (۶۳۔۷۱)۔

کے رستے سے روکا۔

﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۸۔۴۷) اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔

﴿قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَّصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۱۷) (اے پیغمبر) کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا۔

﴿وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللّٰهِ بَعْدَ إِذْ أُنْزِلَتْ إِلَيْكَ﴾ (۲۸۔۸۷) اور وہ تمہیں خدا کی آیتوں (کی تبلیغ) سے بعد اس کے کہ وہ تم پر نازل ہو چکی ہیں روک نہ دیں۔

علیٰ هٰذا القياس اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یہ لفظ روکنے اور منع کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور صُدُوْدٌ وَصَدٌّ دونوں مصدر ہیں۔ نیز پہاڑ کی روک کو بھی صَدٌّ کہا جاتا ہے۔[1]

اَلصَّدِيْدُ: پیپ کیونکہ وہ چمڑے اور گوشت کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اور دوزخیوں کے طعام کو بطور مثال کے صدید کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَيُسْقٰى مِنْ مَّاءٍ صَدِيْدٍ﴾ (۱۴۔۱۶) اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔

(ص د ر)

اَلصَّدْرُ: سینہ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ (۲۰۔۲۵) میرے پروردگار! اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دے۔ اس کی جمع صُدُوْرٌ آتی ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (۲۲۔۴۶) بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں۔ پھر بطور استعارہ ہر چیز کے اعلیٰ (اگلے) حصہ کو صَدْرٌ کہنے لگے ہیں جیسے صَدْرُ الْقَنَاةِ (نیزے کا بھالا) صَدْرُ الْمَجْلِسِ (رئیس مجلس) صَدْرُ الْكِتَابِ اور صَدْرُ الْكَلَامِ وغیرہ صَدَرَهٗ کے معنی کسی کے سینہ پر مارنے یا اس کا قصد کرنے کے ہیں جیسا کہ ظَهَرَهٗ وَكَتَفَهٗ کے معنی کسی کی پیٹھ یا کندھے پر مارنا کے آتے ہیں۔ اور اسی سے رَجُلٌ مَصْدُوْرٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ شخص جو سینہ کی بیماری میں مبتلا ہو پھر جب صَدَرَ کا لفظ عَنْ کے ذریعہ متعدی ہو تو معنی اِنْصَرَفَ کو متضمن ہوتا ہے جیسے۔ صَدَرَتِ الْاِبِلُ عَنِ الْمَاءِ صَدَرًا وَصَدْرًا: اونٹ پانی سے سیر ہو کر واپس لوٹ آئے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا﴾ (۹۹۔۶) اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے۔

اور مَصْدَرٌ کے اصل معنی پانی سے سیر ہو کر واپس لوٹنا کے ہیں یہ ظرف مکان اور زمان کے لیے بھی آتا ہے اور علمائے نحو کی اصطلاح میں مَصْدَرٌ اس لفظ کو کہتے ہیں جس سے فعل ماضی اور مستقبل کا اشتقاق فرض کیا گیا ہو اور صِدَارٌ بروزن دِثَارٌ وَلِبَاسٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے سینہ ڈھانپا جائے اور اسے صُدْرَةٌ بھی کہا جاتا ہے اور صِدَارٌ اس داغ کو کہتے ہیں جو اونٹ کے سینہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

صَدَّرَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑ میں اول آنا۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں قلب کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں صرف علم وعقل کی طرف اشارہ

---

[1] وایضاً صدَّ (ض) يَصِدُّ صَدِيْدًا (۴۳۔۵۷).

ہے جیسے فرمایا:
﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ---﴾ (۵۰۔۳۷) جو شخص دل آگاہ رکھتا ہے اس کے لیے اس میں نصیحت ہے۔
اور جہاں صُدُوْرٌ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے وہاں علم وعقل کے علاوہ شہوت، ہوائے نفس اور غضب وغیرہ قوی نفسانیہ کی طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ﴾ (۲۰۔۲۵) میں نفسانی قوی کی اصلاح کا ہی سوال ہے اسی طرح آیت کریمہ:
﴿وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ (۱۰۔۵۷) میں بتایا ہے کہ قرآن پاک نفسیاتی امراض کے لیے شفا ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ (۹۔۱۴) میں اشارہ ہے کہ مومن ہی اس سے نفسیاتی شفا حاصل کرتے ہیں۔
اور آیت کریمہ: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ (۲۲۔۴۶) بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔
میں قلوب سے مراد وہ عقول ہیں جو جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کر ان میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں اور صحیح راستے کی طرف ہدایت نہیں پا سکتیں۔

(ص د ع)

اَلصَّدْعُ: کے معنی ٹھوس اجسام۔ جیسے شیشہ لوہا وغیرہ میں شگاف ڈالنا کے ہیں۔ ❶ صَدَعَ (ف) وَصَدَّعَ متعدی ہے اور اِنْصَدَعَ وَتَصَدَّعَ لازم اسی سے استعارہ کے طور پر صَدَعَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی امر کے ظاہر اور واضح کر دینے کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (۱۵۔۹۴) پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے اسے کھول کر بیان کر دو اور اسی سے صُدَاعٌ کا لفظ مستعار ہے جس کے معنی دردِ سر کے ہیں جس سے گویا سر پھٹا جا رہا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۹)
اس سے نہ تو دردِ سر ہوگا اور نہ ان کی عقلیں زائل ہوں گی۔
اور اسی صَدِیْعٌ بمعنی فجر ہے۔ اور صَدَعْتُ الْفَلَاةَ کے معنی بیاباں طے کرنے کے ہیں۔ تَصَدَّعَ الْقَوْمُ: لوگ منتشر ہو گئے۔ قرآن میں ہے:
﴿یَوْمَئِذٍ یَّصَّدَّعُوْنَ﴾ (۳۰۔۴۳) اس روز سب لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔

(ص د ف)

صَدَفَ عَنْهُ کے معنی سخت اعراض برتنے کے ہیں اور اَلصَّدَفُ: اصل میں (۱) پہاڑ کے کنارہ (۲) سیپ اور (۳) اونٹ کی ٹانگوں میں کجی کو کہتے ہیں پھر ٹانگوں کے ٹیڑھے پن یا پہاڑ اور سیپ کی سختی کے اعتبار سے شدت اعراض کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے قران پاک میں ہے:
﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ......بِمَا كَانُوْا یَصْدِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۵۷) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرے اور ان سے منہ پھیر لے

❶ وفی القرآن: وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۸۶۔۱۲)۔

جو ہماری آیتوں سے اعراض برتتے ہیں اس اعراض کے سبب ہم ان کو......سزا دیں گے۔

(ص د ق)

اَلصِّدْقُ: یہ اَلْکِذْبُ کی ضد ہے۔اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔پھر قول میں بھی صرف خبر کے لیے آتے ہیں اور اس کے ماسوا دیگر اصناف کلام میں استعمال نہیں ہوتے۔اسی لیے ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا﴾ (۴-۱۲۲) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہوسکتا ہے۔

﴿اِنَّهٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ (۱۹-۵۴) وہ وعدے کے سچے......تھے۔

مگر کبھی بالعرض یعنی ضمنی طور پر دیگر اصناف کلام مثلاً استفہام امر دعا وغیرہ کے لیے بھی آجاتے ہیں مثلاً: اَزَیْدٌ فِی الدَّارِ؟ (کیا زید مکان کے اندر موجود ہے؟) بظاہر استفہام کلام ہے مگر ضمناً اس میں خبر کے معنی بھی پائے جاتے ہیں یعنی یہ کہ متکلم زید کی حالت سے بے خبر ہے اسی طرح وَاسِنِیْ (میرے ساتھ ہمدردی کیجئے) اصل میں درخواست ہے مگر ضمناً معنی خبر مفہوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ میں ہمدردی کا محتاج ہوں اسی طرح جب لَا تُؤْذِ (مجھے تکلیف مت دو) کہا جائے تو اس کے ضمن میں یہ معنی پایا جاتا ہے کہ وہ اسے ایذا پہنچاتا ہے۔

اَلصِّدْقُ کے معنی ہیں: دل وزبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا۔ایسی صورت میں یا تو وہ کلام صدق کے ساتھ متصف ہی نہیں ہو گی اور یا وہ مختلف حیثیتوں سے کبھی صِدق اور کبھی کذب کے ساتھ متصف ہو گی۔مثلاً: ایک کافر جب اپنے ضمیر کے خلاف مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ کہتا ہے تو اسے نفس واقعہ کے مطابق ہونے کی حیثیت سے صِدق (سچ) بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کے دل وزبان کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے کِذْبٌ (جھوٹ) بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس دوسری حیثیت سے اللہ نے منافقین کو ان کے اس اقرار میں کہ:

﴿نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ﴾ (۶۳-۱) ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں۔جھوٹا قرار دیا ہے کیونکہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ بات کہہ رہے تھے۔

اَلصِّدِّیْقُ: بہت سچ بولنے والا۔بعض نے کہا ہے: نہیں بلکہ صِدِّیْقٌ اسے کہتے ہیں "جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو" اور بعض نے کہا ہے: بلکہ صِدِّیْقٌ وہ ہے جو سچ کا اس قدر خوگر ہو کہ اس سے جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو۔اور بعض کے نزدیک صدیق وہ ہے جو قول واعتقاد میں سچا ہو اور پھر اپنی سچائی کی صِدِّیْقٌ اپنے عمل سے بھی کر دکھائے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا﴾ (۱۹-۴۱) اور کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرو بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔

﴿وَاُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ﴾ (۵-۷۵) اور ان کی والدہ (مریم علیہا السلام) خدا کی ولی تھی۔اور آیت:

﴿مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ﴾ (۴-۶۹)

یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء میں صِدِّیْقِیْن سے وہ لوگ مراد ہیں جو فضیلت میں انبیاء سے کچھ کم درجہ کے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم اپنی کتاب "الذریعة الی مکارم الشریعة" میں بیان کر چکے ہیں۔کبھی صدق وکذب کا استعمال ہر اس چیز کے متعلق ہوتا ہے جو عقیدۃ میں ثابت اور موجود ہو جیسے صَدَقَ ظَنِّیْ وَکَذَبَ (اس نے میرا گمان سچ کر دکھایا یا جھوٹ کر دکھایا) اور کبھی ان کا استعمال افعال جوارح کے متعلق ہوتا ہے۔مثلاً: کوئی شخص جنگ میں حق شجاعت ادا کرے اور جو کچھ اور جیسا کہ اس پر واجب ہو اسے کر دکھائے تو ایسے شخص کے متعلق کہا جاتا ہے۔صَدَقَ فِی الْقِتَالِ (وہ جنگ میں سچا رہا) اور اگر اس کے خلاف کرے تو کَذَبَ فِی الْقِتَالِ (یعنی وہ جنگ میں جھوٹا نکلا) کہا جاتا ہے اسی کے مطابق قرآن پاک میں ہے:

﴿رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ (۳۳۔۲۳) یعنی ایسے شخص بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔اور آیت کریمہ:

﴿لِيَسْئَلَ الصَّادِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ﴾ (۳۳۔۱۷) کے معنی یہ ہیں کہ زبان سے سچ بولنے والوں سے ان کی عملی سچائی کے متعلق دریافت کرے۔اس میں تنبیہ ہے کہ نجات کے لیے زبان سے حق کا اعتراف ہی کافی نہیں ہے جب تک کہ انسان عملاً اسے پورا کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ﴾ (۴۸۔۲۷) میں صدق فعلی مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی خواب کو عملاً سچ کر دکھایا اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ﴾ (۳۹۔۳۳) کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص جو سچائی لوگوں کے پاس لے کر آئے اور پھر اسے اپنے عمل سے بھی سچ کر دکھایا۔نیز ہر وہ فعل جو ظاہر و باطن کے اعتبار سے فضیلت کے ساتھ متصف ہو اسے صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے اس بنا پر ایسے فعل کو صدق کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۵۴۔۵۵) یعنی سچے مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔

﴿اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۱۰۔۲) کہ ان کے پروردگار کے ہاں ان کا سچا درجہ ہے۔

﴿اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ﴾ (۱۷۔۸۰) (اور کہو کہ اے پروردگار) مجھے (مدینے) اچھی طرح داخل کیجئیو اور مکے سے اچھی طرح نکالیو۔اور آیت:

﴿وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ﴾ (۲۶۔۸۴) اور پچھلے لوگوں میں میرا ذکر نیک (جاری) کر۔میں یہ دعا کی ہے کہ اللہ! مجھے ایسا صالح بنا دے کہ میری موت کے بعد جب لوگ میری تعریف کریں تو ان کی تعریف غلط نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسا کہ شاعر نے کہا[1] ہے۔

(۲۷۳) اِذَا نَحْنُ اَثْنَيْنَا عَلَيْكَ بِصَالِحٍ
فَاَنْتَ الَّذِيْ نُثْنِيْ وَفَوْقَ الَّذِيْ نُثْنِيْ

جب ہم کسی بھی اچھے کام پر تیری تعریف کرتے ہیں تو تم

---

[1] قاله ابو نواس فی مدح الامین والبیت فی الوساطة ۳۱۸ و دیوانه والصناعتین ۲۰۸ والحصری(٤ : ٧١) وستة و بعده: وان جرت الالفاظ یوماً بمدحة لغیرك انسانا فانت الذی تعنی ۱۲۔

واقعی اس تعریف کے اہل نکلتے ہو بلکہ ہماری تعریف سے بھی تم بڑھ کر ہو۔

اور صَــدَقَ کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ (۳۔۱۵۲) اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا ہے۔

صَـدَّقْتُ فُــلَانًا کے معنی ہیں کسی کو سچائی کی طرف منسوب کرنا اور اَصْـدَقْتُـهٗ کے معنی سچا پانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں فعل ہم معنی ہیں اور ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (۲۔۱۰۱) اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے پیغمبر (آخر الزماں) آئے اور وہ ان کی آسمانی کتاب کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔

﴿وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (۵۔۴۶) اور ان پیغمبروں کے بعد انہی کے قدموں پر ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا۔ جو اپنے سے پہلے (کی) کتاب (توراۃ) کی تصدیق کرتے تھے۔

اَلتَّصْدِيْق کا لفظ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس میں کسی چیز کی تحقیق پائی جائے محاورہ ہے۔

صَـدَّقَنِىْ فِعْلُهٗ وَكِتَابُهٗ: اس نے اپنے عمل یا کتاب سے میری تصدیق کر دی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (۲۔۸۹) اور جب خدا کے ہاں سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان کی (آسمانی) کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے۔

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (۳۔۳) اس نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر سچی کتاب نازل کی جو پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

﴿وَهٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا﴾ (۳۔۳) اور یہ کتاب عربی زبان میں ہے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یعنی پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے یہاں لِسَـانًا منصوب علی الحال ہے مثل مشہور ہے۔ (1) (مثل) صَدَقَنِىْ سِنَّ بَكْرِهٖ یعنی اس نے اپنے دل کی بات صحیح طور پر بتا دی۔

اَلــصَّــدَاقَةُ کے معنی سچی دوستی کے ہیں اور یہ انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ﴾ (۲۶۔۱۰۱) (تو آج) نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا ہے اور نہ گرم جوش دوست۔ اس میں آیت کریمہ:

﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ (۴۳۔۶۷) جو (آپس میں) دوست (ہیں)، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اَلــصَّــدَقَةُ: (خیرات) ہر وہ چیز جو انسان اپنے مال سے قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور یہی معنی

---

(1) انظر للكلمة الميداني رقم (۲۰۸۳، ۲۱۱۰) وسن منصوب على معنى عرفني ديرنه ى بالرفع على التوسع قاله عليؓ و ابو عمر و نسبه الى الاحنف حين رجع من عند معاوية والخبر فى الميداني واللسان (صدق) ۱۲.

زکوٰۃ کے ہیں مگر صَدَقَةٌ اسے کہتے ہیں جو واجب نہ ہو اور زکوٰۃ وہ ہے جس کا دینا واجب ہو۔ اور کبھی واجب کو بھی صَدَقَةٌ سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ خیرات دینے والا اس سے صدق یعنی صلاح تقویٰ کا قصد کرے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ (۹۔۱۰۳) ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کر لو۔

﴿اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ﴾ (۹۔۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ وخیرات) تو مفلسوں کا حق ہے۔

صَدَّقَ وَتَصَدَّقَ کے معنی صدقہ دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿فَلاَ صَدَّقَ وَلاَ صَلّٰی﴾ (۷۵۔۳۱) تو اس (نا عاقبت اندیش) نے نہ تو زکوٰۃ دی اور نہ نماز پڑھی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِی الْمُتَصَدِّقِيْنَ﴾ (۱۲۔۸۸) کہ خدا خیرات کرنے والوں کو ثواب دیتا ہے۔

﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ﴾ (۵۷۔۱۸) جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی۔ اسی طرح اور بھی بہت سی آیات میں اور تَصَدَّقَ بِهٖ کے معنی اپنے حق سے دست بردار ہو جانا بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ﴾ (۵۔۴۵) اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۸۰) اور اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو اسے کشائش کے حاصل ہونے تک مہلت دو اور اگر زر قرض بخش ہی دو، تو تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔

میں مُعْسِرٌ یعنی تنگ دست کو معاف کر دینے کو صَدَقَةٌ کے قائم مقام قرار دیا ہے اور اسی معنی میں آنحضرت سے مروی ہے۔❶ (۲)

((مَاتَاْكُلُهُ الْعَافِيَةُ فَهُوَ صَدَقَةٌ)) کہ جو کھیتی جانور کھا جائیں وہ بھی صدقہ ہے۔

اسی بنا پر آیت کریمہ:

﴿فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا﴾ (۴۔۹۲) اور دوسرے مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے ہاں اگر وہ معاف کر دیں۔ میں معاف کر دینے کو صدقہ قرار دیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً﴾ (۵۸۔۱۲) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ﴾ (۵۸۔۱۳) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔ میں صحابہ کو حکم دیا گیا تھا کہ جو شخص آنحضرت سے سرگوشی

---

❶ انظر مجمع البحار (۲/۴۱۳) والنهاية (صدق) وبمعناه متفق عليه من (وحم، ت) حديث انسؓ راجع الفتح (۵/۳۰۲) وفی الدارمی من حديث جابر: وما اكلت العافية منه و ای من حاصل الارض) ايضاً الترمذی و ابن حبان، عن جابر (كنزالعمال ج۳، ص: ۵۱۳).

کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ سرگوشی سے پہلے حسب توفیق کچھ نذرانہ پیش کرے جس کی قرآن نے کوئی مقدار متعین نہیں کی تھی اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (۶۳۔۱۰) اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سے اور مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں خیرات کر لیتا اور نیک لوگوں میں داخل ہو جاتا۔ میں اَصَّدَّقَ صِدْقٍ سے بھی ہو سکتا ہے اور صَدَقَۃٌ سے بھی۔

صَدَاقُ الْمَرْءَۃِ (بفتحہ صاد وکسرآں) وَصَدَقَتُھَا[1] کے معنی عورتوں کے مہر کے ہیں اور اَصْدَقْتُھَا کے معنی ہیں: میں نے اس کا مہر مقرر کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِھِنَّ نِحْلَۃً﴾ (۴۔۴) اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔

(ص د ی)

اَلصَّدٰی! صدائے بازگشت جو کسی شفاف مکان سے ٹکرا کر واپس آئے اور اَلتَّصْدِیَۃُ (تفعیل) ہر اس آواز کو کہتے ہیں جو صَدَی کی طرح ہو یعنی جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ اور آیت:

﴿وَمَا کَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً﴾ (۸۔۳۵) اور لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔ میں بتایا ہے کہ ان کی نماز بے معنی ہونے میں صدی یا پرند کی چہچہاہٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اَلتَّصَدِّیْ: صدائے بازگشت کی طرح کسی چیز کے درپے ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی﴾ (۸۰۔۵،۶) جو پرواہ نہیں کرتا اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو۔

اَلصَّدٰی کے معنی بومہ یا دماغ کے ہیں کیونکہ دماغ بھی بومہ کی شکل پر ہوتا ہے اسی لیے اس کو ہامہ بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے۔ (مثل)

اَصَمَّ اللّٰہُ صَدَاہُ: خدا اسے ہلاک کرے۔ یعنی اس میں آواز ہی نہ رہے حتیٰ کہ اس کی صدائے بازگشت آئے۔

صَدًی: پیاس۔ صَدْیَانٌ: پیاسا آدمی۔ اِمْرَءَۃٌ صَدْیَاءُ وَصَادِیَۃٌ: پیاسی عورت۔

(ص ر ر)

اَلْاِصْرَارُ: کسی گناہ پر سختی سے جم جانا اور اس سے باز نہ آنا اصل میں یہ صَرٌّ سے ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور صُرَّۃٌ اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں نقدی باندھ کر رکھ دی جاتی ہے اور صِرَارٌ (پستان بند) اس لتہ کو کہتے ہیں جس سے اونٹنی کے تھن باندھ دیئے جاتے ہیں تاکہ اس کا بچہ دودھ نہ پی سکے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَافَعَلُوْہُ﴾ (۳۔۱۳۵) اور وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے۔

﴿ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا﴾ (۴۵۔۸) مگر پھر غرور سے ضد کرتا ہے۔

﴿وَاَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوا اسْتِکْبَارًا﴾ (۷۱۔۷) اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

﴿وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ﴾ (۵۶۔۴۶) اور گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔

---

[1] قال الجوھری اَلصُّدُقَۃُ بالضم وتسکین الدال لغۃ ورد فی القرآن صدقۃ بضم الدال و جمعہ صدُقات.

اَلْاِصْرَارُ: پختہ عزم کو کہتے ہیں۔محاورہ ہے:
هٰذَا مِنِّیْ صِرِّیْ وَاَصِرِّیْ وصُرِّیْ وَصِرِّیْ وَصَرِّیْ وَصُرِّیْ: وہ مرد یا عورت جو حج نہ کرے وہ شخص جسے نکاح کی خواہش نہ ہو۔ ❶ اور آیت کریمہ:
﴿رِیْحًا صَرْصَرًا﴾ (۴۱۔۱۶) زور کی ہوا (چلائی) میں صَرْصَرٌ کا لفظ صِرٌّ سے ہے گویا سخت سرد ہونے کی وجہ سے اس میں بستگی پائی جاتی ہے۔
اَلصَّرَّةُ جماعت جس کے افراد باہم ملے جلے ہوں گویا وہ کسی تھیلی میں باندھ دیئے گئے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ﴾ (۵۱۔۲۹) ابراہیم علیہ السلام کی بیوی چلاتی آئی۔
بعض نے کہا ہے کہ صَرَّةٍ کے معنی چیخ کے ہیں۔ ❷

(ص ر ح)

اَلصَّرْحُ: بلند، منقش و مزین مکان۔ہر قسم کے عیب سے پاک ہونے کے اعتبار سے اسے صَرْحٌ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ﴾ (۵۔۲۷۔۴۴) ایسا محل ہے جس کے (نیچے بھی) شیشے جڑے ہوئے ہیں۔
﴿وَقِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الصَّرْحَ﴾ (۲۷۔۴۴) (پھر) اس سے کہا گیا کہ محل میں چلئے۔
لَبَنٌ صَرِیْحٌ: خالص دودھ۔ صَرِیْحُ الْحَقِّ: خالص حق جس میں باطل کی آمیزش نہ ہو صَرَّحَ فُلَانٌ فِیْ نَفْسِهٖ: فلاں نے اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کر دی۔محاورہ ہے:
عَادَ تَعْرِیْضُكَ تَصْرِیْحًا: تمہاری تعریض نے تصریح کا کام دیا۔
جَاءَ صُرَاحًا: وہ کھلے بندوں آیا۔

(ص ر ط)

اَلصِّرَاطُ: سیدھی راہ۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا﴾ (۶۔۱۵۳) اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔
اسے سِرَاط (بسین مهملة) پڑھا جاتا ہے۔ملاحظہ ہو (س ر ط)

(ص ر ع)

اَلصَّرْعُ: (ف) کے معنی ہیں: زمین پر پٹخ دینا، پچھاڑ دینا۔ صَرَعْتُهٗ صَرْعًا: میں نے اسے پچھاڑ دیا اَلصِّرْعَةُ: پچھڑے ہوئے آدمی کی حالت۔ اَلصِّرَاعَةُ کشتی لڑنے کا فن۔رجل صَرِیْعٌ: پچھاڑا ہوا آدمی۔ قَوْمٌ صَرْعٰی: پچھڑے ہوئے لوگ۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰی﴾ (۶۹۔۷) یعنی تم دیکھو گے کہ لوگ پچھڑے پڑے ہیں۔
اور قریتان کی طرح هُمَا صِرْعَانِ کہا جاتا ہے یعنی وہ دونوں ایک دوسرے کے برابر اور مثل ہیں۔
اَلْمِصْرَعَانِ مِنَ الْبَابِ: دروازے کے دو پٹ۔پھر تشبیہ کے طور پر شعر کے دونوں مصرعوں کو بھی مِصْرَعَانِ کہا جاتا ہے۔

---

❶ وفی روایة عن ابن عباس (لا صرورة فی الاسلام) رواه ابو داؤد والحاکم والطبرانی النیل (۶: ۱۰۸) وقال الجاحظ فی الحیوان (۱: ۳۴۸) انه اسم اسلامی وانظر بخصوص الحدیث وینسنك ۲۹۸ سطر ۱۳ والفائق ۲ / ۱۰۔

❷ هکذا قال المفسرون و نقل ذالك عن ابن عباسؓ و مجاهد و قال ابو عبیدة معناه شدة الصوت وقال الزجاج: اَلصَّرَّةُ اَشَدُّ الصیاح تکون فی الطائر والانسان وغیرهما وما اعلم احداً من المفسرین ذهب الی ان المرامن صرة مهنا الجماعة والله اعلم.

(ص ر ف)

اَلصَّرْفُ: کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا یا کسی اور چیز سے بدل دینا۔ محاورہ ہے: صَرَفْتُہٗ فَانْصَرَفَ: میں نے اسے پھیر دیا چنانچہ وہ پھیر گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ (۳۔۱۵۲) پھر خدا نے تم کو ان کے مقابلے سے پھیر کر اُن کو بھگا دیا۔

﴿اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ﴾ (۱۱۔۸) دیکھو جس روز وہ ان پر واقع ہوگا پھر ٹلنے کا نہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ (۹۔۱۲۷) میں بددعا بھی ہو سکتی ہے اور اس حالت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا﴾ (۲۵۔۱۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم میں قدرت نہیں ہوگی کہ ہمارے عذاب کو اپنے آپ سے پھیر سکو یا اپنی جانوں کو آگ سے بچا سکو۔

اور بعض نے صَرْفًا کے معنی کیے ہیں کہ تم اپنی حالت کو تبدیل نہیں کر سکو گے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ [1] (۳)

مِنْهُ صَرْفٌ وَّلَا عَدْلٌ: یعنی نہ ان کا فرض قبول ہوگا اور لَا يَقْبَلُ نہ نفل۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ﴾ (۴۶۔۲۹) کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کا رخ تیری طرف پھر دیا یعنی ان کو تمہارے پاس لے آئے کہ تم سے قرآن پاک سنیں۔

اَلتَّصْرِيْفُ بمعنی صَرْفٌ ہے، لیکن اس میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں اور عام طور پر یہ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنے یا ایک امر سے دوسرے امر کی طرف تبدیل کرنے کے لیے آتا ہے اور ﴿تَصْرِيْفِ الرِّيَاحِ﴾ (۲۔۱۶۴) کے معنی ہیں: ہواؤں کے رخ کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَصَرَّفْنَا الْاٰيَاتِ﴾ (۴۶۔۲۷) اور آیات کو لوٹا لوٹا کر بیان کر دیا۔

﴿وَصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ﴾ (۲۰۔۱۱۳) اور اس میں طرح طرح کے وعید بیان کر دیئے ہیں۔

اور اسی سے محاورہ ہے:

تَصْرِيْفُ الْكَلَامِ: یعنی بات لوٹا لوٹا کر بیان کرنا۔

تَصْرِيْفُ الدَّرَاهِمِ: دراہم کو پرکھنے کے لیے الٹنا پلٹنا۔

تَصْرِيْفُ النَّابِ: دانت پیسنا کہا جاتا ہے۔ لِنَابِهٖ صَرِيْفٌ: وندانش بانگ کنند۔

اَلصَّرِيْفُ: (ایضًا) دودھ جس کے جھاگ بیٹھ گئے ہوں۔ گویا وہ جھاگ سے پھیر دیا گیا ہے یا جھاگ اس سے پھیر دیئے گئے ہیں۔

رَجُلٌ صَيْرَفٌ وَصَيْرَفِيٌّ وَصَرَّافٌ: سکہ پرکھنے والے یا ان کا تبادلہ کرنے والے۔ عَنْزٌ صَارِفٌ بکری جسے نر کی خواہش ہو اور اسے صَارِفٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نر کو اپنی جانب پھیرنے کی کوشش کرتی ہے۔

---

[1] متفق علیہ من روایۃ علیؓ و انسؓ و فی مسلم من روایۃ ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ انظر تخریج الکشاف للحافظ، رقم: ۵۰ قالہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذکر المدینۃ و فی الفائق ۲/ ۱۰ الصرف التوبۃ والعدل: الفدیۃ۔

اَلصِّرْفُ: خالص سرخ رنگ اور ہر خالص چیز کو جس میں ملاوٹ نہ ہو۔ صِرْفٌ کہا جاتا ہے گویا اس سے ملاوٹ کو پھیر دیا گیا ہے۔
اَلصَّرْفَانُ: قلعی یا سکہ۔ گویا وہ چاندی کے برابر ہونے سے پھیر دیا گیا ہے۔

(ص ر م)

اَلصَّرْمُ: کے معنی ریوڑ کے ہیں اور اَلصَّرِیْمَۃُ کسی کام کے احکام اور ابرام کو کہتے ہیں اور ریت کے علیحدہ ٹکڑے کو اَلصَّرِیْمُ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فَاَصْبَحَتْ کَالصَّرِیْمِ﴾ (۶۸۔۲۰) تو وہ ایسے ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔
کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ وہ باغ ان درختوں کی طرح ہو گیا جن کے پھل کاٹ لیے گئے ہوں یعنی صَرِیْمٌ بمعنی مَصْرُوْمٌ ہے بعض نے کہا ہے کہ صَرِیْمٌ رات کو بھی کہتے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ یعنی کھیتی سوختہ ہو کر رات کی طرح سیاہ ہو گئی۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّھَا مُصْبِحِیْنَ﴾ (۶۸۔۱۷) جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہوتے ہم اس کا میوہ توڑ ڈالیں گے۔
﴿فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَارِمِیْنَ﴾ (۶۸۔۲۱) جب صبح ہوئی تو وہ لوگ ایک دوسرے کو پکارنے لگے: اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔
اَلصَّارِمُ: تیز تلوار۔ نَاقَۃٌ مَصْرُوْمَۃٌ: اونٹنی جس کا دودھ خشک ہو گیا ہو۔ گویا اس کے پستان کاٹ دیئے گئے ہیں۔
تَصَرَّمَتِ السَّنَۃُ: سال گزر گیا۔ اِنْصَرَمَ الشَّیْءُ: کسی چیز کا منقطع ہو جانا اَصْرَمَ الرَّجُلُ: وہ آدمی بدحال ہو گیا۔

(ص ط ر)

صَطَرَ وَسَطَرَ (ن) کے ایک ہی معنی ہیں یعنی لکھنا (سیدھی لائنوں میں) اور آیت:
﴿اَمْ ھُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ﴾ (۵۲۔۳۷) یا یہ (کہیں کہ) داروغہ ہیں۔ میں اَلْمُصَیْطِرُوْنَ سَطْرٌ سے مُفَیْعِلٌ کے وزن پر ہے۔ اور اَلتَّسْطِیْر، جس کے معنی لکھنے کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ کیا تخلیق سے قبل یہ اپنے نوشتہ تقدیر کے لکھنے پر مقرر تھے (کہ انہیں ہر بات کا علم ہو چکا ہے؟ یعنی نہیں) اس میں آیت کریمہ: ﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ کِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ﴾ (۲۲۔۷۰) یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ بے شک یہ سب خدا کو آسان ہے۔ اور آیت ﴿کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ﴾ اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن (لوح محفوظ) میں لکھ رکھا ہے کے معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت:
﴿لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ﴾ (۸۸۔۱۲۷) تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم ان پر لکھنے کے لیے مقرر نہیں ہو اور نہ ہی اس چیز کو ثابت کرنے کے ذمہ دار ہو جس کے یہ متولی بنتے ہیں اور عربی میں سَیْطَرْتُ وَبَیْطَرْتُ کے علاوہ تیسرا لفظ اس وزن پر نہیں آتا تشریح کے لیے دیکھیے (س ط ر)

(ص ع د)

اَلصُّعُوْدُ کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔ ایک ہی جگہ کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صَعُوْدٌ اور نیچے اترنے کے

لحاظ سے حَدُوْرٌ کہا جاتا ہے۔اصل میں صَعَدٌ وَصَعِیْدٌ وَصَعُوْدٌ تینوں ہم معنی ہیں،لیکن صَعُوْدٌ وَصَعَدٌ کا لفظ عقبہ یعنی گھاٹی پر بولا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر دشوار اور گراں امر کو صَعَدٌ کہہ دیتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا.........﴾ (۷۲-۱۷) اور جو شخص اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیرے گا وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

﴿سَأُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ (۷۴-۱۷) ہم اسے صَعُوْدٌ پر چڑھائیں گے۔

اور صَعِیْدٌ کا لفظ وَجْهُ الْاَرْضِ یعنی زمین کے بالائی حصہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[1] قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (۴-۴۳) تو پاک مٹی لو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صَعِیْدٌ اس گردوغبار کو کہتے ہیں جو اوپر چڑھ جاتا ہے لہٰذا نماز کے تیمّم کے لیے ضروری ہے کہ گردوغبار سے ہاتھ آلودہ ہو جائیں اور آیت کریمہ:

﴿كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (۶-۱۲۶) گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔میں یَصَّعَّدُ اصل میں یَتَصَعَّدُ ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔

اَلْاِصْعَادُ: (افعال) بقول بعض اس کے معنی زمین میں دور تک چلے جانا کے ہیں۔عام اس سے کہ وہ جانا بلندی کی طرف ہو یا پستی کی طرف۔گو اس کے اصل معنی بلند جگہوں کی طرف جانا کے ہیں۔مثلاً بصرہ سے نجد یا حجاز کی طرف جانا بعدہٗ صرف دور نکل جانے پر اِصْعَادٌ کا لفظ بولا جانے لگا ہے جیسا کہ تَعَالَ کہ اس کے اصل معنی علو یعنی بلندی کی طرف بلانے کے ہیں اس کے بعد صرف آنے کے معنی میں بطور امر استعمال ہونے لگا ہے عام اس سے کہ وہ آنا بالائی کی طرف ہو یا پستی کی طرف۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ﴾ (۳-۱۵۳) جب تم لوگ دور نکلے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اِصْعَادٌ سے دور نکل جانا مراد نہیں ہے۔بلکہ اشارہ ہے کہ انہوں نے بھاگنے میں عُلُوٌّ اختیار کیا یعنی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی جیسے محاورہ ہے:

اَبْعَدْتُ فِيْ كَذَا وَارْتَقَيْتُ فِيْهِ كُلَّ مُرْتَقًى: یعنی میں نے اس میں انتہائی کوشش کی لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم نے دشمن کا خوف محسوس کرنے اور لگا تار ہزیمت کھانے میں انتہا کر دی اور استعارہ کے طور پر صُعُوْدًا کا لفظ انسانی اعمال کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جو خدا تک پہنچتے ہیں جیسا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان تک پہنچتی ہے اسے نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۳۵-۱۰) اسی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا﴾ (۷۲-۱۷) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔میں صَعَدًا کے معنی شاق یعنی سخت کے ہیں اور یہ تَصَعَّدَ فِيْ كَذَا کے محاورہ سے ماخوذ

[1] قال الزجاج لا اعلم خلافاً بين اهل اللغة في ذالك والطبري (۵: ۱۱۴).

ہے جس کے معنی کسی امر کے دشوار اور مشکل ہونے کے ہیں۔ (1) چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ (2) (۴)
(مَا تَصَعَّدَ نِیْ اَمْرٌ مَا تَصَعَّدَ فِیْ خُطْبَةُ النِّکَاحِ) کہ مجھے کوئی چیز خطبہ نکاح سے زیادہ دشوار محسوس نہیں ہوتی۔

(ص ع ر)

اَلصَّعَرُ: کے اصل معنی گردن میں کجی کے ہیں۔ اور تَصْعِیْرٌ کے معنی ہیں تکبر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا کرنا اور اعراض برتنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ (۳۱۔۱۸) اور (تکبر کی بنا پر) لوگوں سے روگردانی نہ کرو۔
اور ہر مشکل امر کو مُصْعَرٌ کہا جاتا ہے شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پیدائشی طور پر اَصْعَرُ یعنی کج گردن ہوتا ہے۔

(ص ع ق)

اَلصَّاعِقَةُ اور صَاقِعَةُ دونوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ہولناک دھماکہ لیکن صَقْعٌ کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور صَعْقٌ اجسام علوی کے بارے میں بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ صَاعِقَةٌ تین قسم پر ہے۔ اول بمعنی موت اور ہلاکت جیسے فرمایا:
﴿فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۹۔۶۸) تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب کے سب مر جائیں گے۔
﴿فَاَخَذَتْکُمُ الصَّاعِقَةُ﴾ (۵۱۔۴۴) سو تم کو موت نے آ پکڑا۔
(دوم) بمعنی عذاب جیسے فرمایا:
﴿اَنْذَرْتُکُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (۴۱۔۱۳) میں تم کو مہلک عذاب سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر وہ (عذاب) آیا تھا۔
(سوم) بمعنی آگ (اور بجلی کی کڑک) جیسے فرمایا:
﴿وَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۱۳۔۱۳) اور وہی بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے گرا بھی دیتا ہے۔
لیکن یہ تینوں چیزیں دراصل صَاعِقَه کے آثار سے ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو فضا میں سخت آواز کے ہیں۔ پھر کبھی تو اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے یعنی دراصل وہ ایک ہی چیز ہے اور یہ سب چیزیں اس کے آثار سے ہیں۔

(ص غ ر)

اَلصِّغَرُ: یہ اَلْکِبَرُ کی ضد ہے جو کہ ایک دوسرے کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں ایک ہی چیز دوسری چیز کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے اور وہی کسی چیز کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے پھر صغیر وکبیر کا اطلاق کبھی تو باعتبار زمانہ کے ہوتا ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے سے عمر میں چھوٹا ہوتا ہے اور دوسرا بڑا۔ اور کبھی باعتبار جسامت کے اور کبھی بلحاظ

---

(1) راجع الغریب للقتبی ۴۹۱ والمجاز لابی عبید ۱۲.
(2) انظر لقول عمر الغریب للقتبی ۴۹۱ والقرطبی ۱۸ والکشاف ۴۹۵ والفخر (۳۰۔۱۶۲) والنهایة (۲۔۲۶۳) وائق (۲: ۲۴) واللسان (صعد) والبحر ۳۵۲ وفی اللسان (کاؤ) واضداد ابی الطیب ۶۰۹ ما تکاؤ فی شیء ما تکاؤنی خطبة النکاح والغریب لابی عبید (۳۸۷/۳) عن عروة عن عمرؓ.

قدرومنزلت کے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌ﴾ (۵۴۔۵۳) یعنی ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔
﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾ (۱۸۔۴۹) نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَالِكَ وَلَا أَكْبَرَ﴾ (۱۰۔۶۱) اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے اور نہ بڑی۔ میں بلحاظ قدرومنزلت کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑا اور چھوٹا ہونا مراد ہے۔
صَغِرَ صِغَرًا کے معنی چھوٹا ہونا کے ہیں جو اَلْكِبَرُ کی ضد ہے اور صَغُرَ صَغْرًا وَّصَغَارًا کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں اور ذلیل اور کم مرتبہ آدمی کو جو اپنی ذلت پر قانع ہو صَاغِرٌ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ (۹۔۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

(ص غ و)(ی)

اَلصَّغْوُ (ن) کے معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں مثلاً صَغَتِ النُّجُوْمُ وَالشَّمْسُ: ستاروں یا سورج کا مائل بہ غروب ہونا۔ صَغَيْتُ الْإِنَاءَ وَأَصْغَيْتُهُ: میں نے برتن کو مائل کر دیا۔ جھکا دیا۔ وَأَصْغَيْتُ إِلَىٰ فُلَانٍ میں نے اس کی طرف کان لگایا۔ اس کی بات سننے کے لیے مائل ہوا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ﴾ (۶۔۱۱۳) اور (وہ ایسے کام) اس لیے بھی (کرتے تھے) کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے دل اس کی طرف مائل رہیں۔
اور کلام عرب میں صَغَوْتُ إِلَيْهِ أَصْغُوْ صَغْوًا وَصَغَيْتُ أَصْغَىٰ صُغِيًّا: (دونوں طرح) منقول ہے اور بعض نے أَصْغَيْتُ أُصْغِيْ: یعنی باب افعال بھی استعمال کیا ہے اور جو لوگ کسی کے طرفدار اور حمایتی ہوں۔ انہیں صَاغِيَةُ الرَّجُلِ کہا جاتا ہے فُلَانٌ مُصْغًى إِنَاؤُهُ: فلاں بدنصیب ہے ❶ اور کبھی یہ ہلاکت سے بھی کنایہ ہوتا ہے۔ عَيْنُهُ صَغْوَاءُ إِلَىٰ كَذَا: وہ فلاں چیز کی طرف مائل ہے اور اَلصَّغَىٰ کے معنی تالو یا آنکھ میں کجی کے ہیں۔

(ص ف ف)

اَلصَّفُّ: (ن) کے اصل معنی کسی چیز کو خط مستوی پر کھڑا کرنا کے ہیں، جیسے انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کرنا یا ایک لائن میں درخت وغیرہ لگانا اور بقول ابوعبیدۃ کبھی صَفٌّ بمعنی صَافٍّ بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ آیات کریمہ:
﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا......﴾ (۶۱۔۴) جو لوگ خدا کی راہ میں (ایسے طور پر) پرے جما کر لڑتے ہیں...... وہ بیشک محبوب کردگار ہیں۔
﴿ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا﴾ (۲۰۔۶۴) پھر قطار باندھ کر آؤ۔
﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (۸۹۔۲۲) اور فرشتے قطار باندھ کر آ موجود ہوں گے۔ میں صَفًّا مصدر بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی صَافِّيْنَ (اسم فاعل) بھی اور آیات:
﴿وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّوْنَ﴾ (۳۷۔۱۶۵) اور ہم صف باندھتے رہتے ہیں۔
﴿وَالصَّافَّاتِ صَفًّا﴾ (۳۷۔۱) قسم ہے صف بستہ

❶ الصحیح ان یقال مصغًی اناؤہ ای من اصغیٰ انظر الصحاح للجوهری و اساس البلاغة للزمخشری ۱۲۔

جماعتوں کی میں صَآفُّوْنَ اور صَآفَّاتٌ سے مراد فرشتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ﴾ (۲۴-۴۱) اور پرند بازو پھیلائے ہوئے۔

﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ صَوَآفَّ﴾ (۲۲-۳۶) تو قربانی کرنے کے وقت قطار میں کھڑے ہوئے اونٹوں پر خدا کا نام لو۔

اور صَفَفْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کی صف لگانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ﴾ (۵۲-۲۰) صف میں لگائے تختوں پر۔

صَفَفْتُ اللَّحْمَ: کے معنی گوشت کے پارچوں کو بریاں کرنے کے لیے سیخ کشید کرنے کے ہیں اور سیخ کشید کیے ہوئے پارچوں کو صَفِيْفٌ کہا جاتا ہے۔

اَلصَّفْصَفُ: ہموار میدان۔ گویا وہ ایک صف کی طرح ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا﴾ (۲۰-۱۰۶-۱۰۷) اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا جس میں نہ تم کجی (اور پستی) دیکھو گے اور نہ ٹیلا اور نہ بلندی۔

اَلصُّفَّةُ کے معنی سایہ دار چبوترہ یا برآمدہ کے ہیں۔ تشبیہ کے طور پر زین کی گدی کو صُفَّةُ السَّرْجِ کہا جاتا ہے۔

اَلصَّفُوْفُ: وہ اونٹنی جو زیادہ دودھ دینے کی وجہ سے دو یا تین برتن بھر دے یا وہ جو دودھ دوہنے کے وقت اپنی ٹانگوں کو ایک قطار میں رکھ کر کھڑی ہو جائے۔

اَلصَّفْصَافُ: بید کا درخت۔

(ص ف ح)

صَفْحٌ کے معنی ہر چیز کا چوڑا پہلو یا جانب کے ہیں۔ مثلاً: صَفْحَةُ الْوَجْهِ (چہرے کی جانب) صَفْحَةُ السَّيْفِ: (تلوار کا چوڑا پہلو) صَفْحَةُ الْحَجَرِ (پتھر کی چوڑی جانب) وغیرہ۔

اَلصَّفْحُ: (مصدر) کے معنی ترک ملامت اور عفو کے ہیں۔ مگر یہ عفو سے زیادہ بلیغ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ (۲-۱۰۹) تو تم معاف کر دو اور درگزر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا دوسرا حکم بھیجے۔ میں عفو کے بعد صَفْحٌ کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات انسان عفو یعنی درگزر تو کر لیتا ہے لیکن صَفْحٌ سے کام نہیں لیتا۔ یعنی کسی سے اس قدر درگزر کرنا کہ اسے مجرم ہی نہ گردانا جائے نیز فرمایا:

﴿فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ﴾ (۴۳-۸۹) اس لیے درگذر کرو اور سلام کہہ دو۔

﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ (۱۵-۸۵) تو تم ان سے اچھی طرح درگذر کرو۔

﴿اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا﴾ (۴۳-۵) بھلا اس لیے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے؟

صَفَحْتُ عَنْهُ (۱) میں نے اس سے درگذر کرتے ہوئے اسے صَفْحٌ جَمِيْلٌ کا والی بنایا یعنی اس کے جرم سے کلیۃً اعراض برتا (۲) اس سے دور ہوتے ہوئے ایک جانب سے ملا (۳) میں نے کتاب کے اس صفحہ سے تجاوز کیا جس میں اس کا جرم لکھ رکھا تھا۔ اس صورت میں یہ تَصَفَّحْتُ الْكِتَابَ سے ماخوذ ہوگا۔ جس کے معنی

کتاب کے صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ (۱۵۔۸۵) اور قیامت تو ضرور آ کر رہے گی لہٰذا تم (ان سے) اچھی طرح درگزر کرو۔

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ...... ﴾ (۱۶۔۱۲۷) اور ان کے بارے میں غم نہ کرو اور جو یہ بداندیش کر رہے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو۔

اَلْمُصَافَحَةُ مصافحہ کرنا، ہاتھ ملانا۔

(ص ف د)

اَلصَّفَدُ وَالصِّفَادُ کے معنی لوہے کی زنجیر یا طوق کے ہیں اس کی جمع اَصْفَادٌ ہے یعنی لوہے کے زنجیر جن سے قیدیوں کو جکڑا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ (۳۸۔۳۸) جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

نیز اَلصَّفَدُ کے معنی عطیہ بھی آتے ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے۔ اَنَا مَغْلُوْلُ اَيَادِيْكَ وَاَسِيْرُ نِعْمَتِكَ: میں تیرے احسانات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں اور تیری انعام کا قیدی بن چکا ہوں وغیر ذالك من المحاورات۔

(ص ف ر)

اَلصُّفْرَةُ: (زردی) ایک قسم کا رنگ جو سیاہی اور سفیدی کے مابین ہوتا ہے مگر اس پر چونکہ سیاہی غالب ہوتی ہے اس لیے کبھی اس کے معنی سیاہی بھی آجاتے ہیں۔اسی بنا پر حسنؒ نے آیت:

﴿بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا﴾ (۲۔۶۹) اس کا رنگ گہرا زرد ہو، میں صَفْرَاءُ کے معنی سیاہ کیے ہیں۔ [1]

مگر بعض نے کہا ہے کہ اگر اس کے معنی سیاہ ہوتے تو اس کی صفت فَاقِعٌ نہ آتی بلکہ صَفْرَاءُ کے بعد حَالِكَةٌ کہا جاتا ہے۔ [2] نیز فرمایا:

﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا﴾ (۳۹۔۲۱) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ (۷۷۔۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صُفْرٌ اَصْفَرٌ کی جمع ہے۔ [3] اور بعض نے کہا ہے کہ صُفْرٌ ایک دھات کا نام ہے (جس کے ساتھ زردی میں تشبیہ دی گئی ہے) اسی سے نُحَاسٌ (پیتل) کو صُفْرٌ اور خشک بُهْمَىٰ (گھاس) کو صُفَارٌ کہا جاتا ہے اور کبھی صَفِيْرٌ کا لفظ ہر اس آواز کی حکایت پر بولا جاتا ہے جو (دور سے) سنائی دے۔اسی سے صَفِرَ الْاِنَاءُ کا محاورہ ہے جس کے اصل معنی تو اس خالی

---

[1] راجع لقول الحسن الدر المنثور (۱:۷۸) و تفسیر الطبری (۱:۳٤٥) و رد علی الحسن ابن قتیبة فی غریبه (۵۳۔۵٤) والطبری والشوکانی (۱:۹۸) وقال هذا من بدع التفاسیر و منکراتها و قال ابو عبیدة فی مجازه (۱:٤٤) فان شئت صفراء و ان شئت سوداء و به فسر السجستانی فی غریبه (۱۰۹۔۱۱۰) والبخاری قال فی الفتح (۸:۱۲۳) من الاضداد والسجستانی فی اضداده.

[2] کذا فی الشوکانی (۱:۹۸).

[3] قاله ابو عبیدة فی مجازه (۲:۲۸۱).

برتن کے ہیں جس سے صَفِیْرٌ کی سی آواز سنائی دے پھر عرف میں ہر خالی چیز کو صِفْرٌ کہنے لگے ہیں خواہ وہ برتن ہو یا اور کوئی چیز اور پیٹ اور رگوں کے غذا سے خالی ہونے کو صَفَرٌ کہا گیا ہے اور ان رگوں کو جو جگر اور معدہ کے مابین پھیلی ہوئی ہیں، جب غذا میسر نہ ہو تو وہ معدہ کے اجزاء کو چوسنے لگتی ہیں اس بنا پر جاہل عربوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ صَفَرٌ پیٹ میں ایک سانپ کا نام ہے جو بھوک کے وقت پسلیوں کو کاٹتا ہے۔ حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کو لَاصَفَرَ کہہ کر اس عقیدہ کی نفی کرنا پڑی۔ ❶ (۵) یعنی پیٹ میں اس قسم کا سانپ نہیں ہوتا جس کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (ع بسیط)

(۲۷۳) وَلَا یَعَضُّ عَلٰی شُرْسُوْفِهِ الصَّفَرُ: اور نہ اس کی پسلیوں کو صفر (سانپ) کاٹتا ہے۔

اور ماہ صفر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں ان کے گھر توشہ سے خالی ہو جاتے تھے اس لیے اسے صفر کہتے تھے اور جو بچہ ماہ صفر میں پیدا ہو اسے صَفَرِیٌّ کہا جاتا ہے۔

(ص ف ن)

اَلصَّفْنُ: دو چیزوں کو اس طرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے کچھ حصے دوسروں کے ساتھ مل جائیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: صَفَنَ الْفَرَسُ قَوَائِمَهٗ: گھوڑے کا تین پاؤں پر کھڑے ہو کر چوتھے پاؤں کا سم اس طرح اٹھانا کہ اس کا اگلا حصہ زمین پر لگا رہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ﴾ (۳۸۔۳۱) خاصے کے گھوڑے پیش کیے گئے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ﴾ (۲۲۔۳۶) تو قربانی کرنے کے وقت صف بستہ کھڑے اونٹوں پر خدا کا نام لو۔ میں ایک قراءت صَوَافِنَ بھی ہے۔ ❸ اور باطن صلب کی رگ کو جو نیاط قلب کو جمع کرتی ہے بھی صَافِنٌ کہا جاتا ہے صَفَنٌ کے معنی خصیتین کی تھیلی کے ہیں۔ صُفْنٌ وہ ڈول جس کے ساتھ حلقہ بندھا ہوا ہو۔

(ص ف و)

اَلصَّفَاءُ کے اصل معنی کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش

---

❶ رواہ البخاری و مسلم و ابو داؤد فی سننہ من حدیث ابی ھریرۃ والسائب بن یزید والترمذی فی القدر وغریب ابی عبید (۱ : ۲۵) والفائق (۲ : ۶۱).

❷ البیت لا عشیٰ باہلة واسمه عامر بن الحارث یرثی المنتشر بن وھب اخیه لامه واختلف الروایات فی صدره: ففی اللسان (صفر) و جمھرۃ اشعار العرب ۲۵۶ صدره: لا یتأسی لمافی القدر یرقبه، وھذا یوفق روایة الامالی (۲ : ۱۹۷) و روایة المرتضیٰ (۲ : ۲۲) وملحقات یوان الاعشیٰ ۲٦۸ لکن بلفظ یتاری بدل یتاسی و خطأه والصاغانی وروی صدره لا یغمز الساق من این ولا وصب وھذا مطابق لما رواه الطبری فی تفسیر (۱٤ : ۱۱۹) وھی الروایة فی امالی المرتضیٰ (۱ : ۲۳۰) و یوافق ما فی اللا لیٔ ۷۵ والکامل بشرح المرصفی (۸ : ۲۱۲) والمحاضرات للمولف (٤ : ٦۱۹) و روایة جمھرة اشعار العرب ۲۸۲ والمعانی للقتبی ۱۲۳۱ و ٤۰٦ ایضاً راجع الاصمعیات ۳۳ (طبع برلن) وقبله کما فی الکامل ۱۲۳، لا یتاری لما فی القدر یرقبه ولا تراه امام القوم یفتقر والرثاء فی الکامل فی ۲۳ بیتاً والمختارات ۹۔۱۲ (صنعة ھبة الله الحسین) فی ۳۰ بیتاً والبیت فی الفائق (۲ : ۱٦) و غریب ابی عبید (۱ : ۲٦) و تھذیب الاصلاح (۲ : ۳۷) و ادب الکاتب ۳۲ والخزانة (۱ : ۹۲) والبخلاء (۱۱۹) وفی الاقتضاب کلام جید علی البیت (۳٤۰۔۳۵).

❸ وھی قراءة ابن عباس و جماعة من الصحابة والتابعین و فی قراءة صوا فی راجع اباحیان (٦۔۳٦۹) واتحاف الفضلاء ۳۱۵.

سے پاک اور صاف ہونا کے ہیں۔اسی سے اَلصَّفَا ہے جس کے معنی صاف اور چکنا پتھر کے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ﴾ (۲۔۱۵۸) بے شک کوہ صفا اور مروۃ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔میں اَلصَّفَا ایک پہاڑی کا نام ہے۔

اَلْاِصْطِفَاءُ کے معنی صاف اور خالص چیز لے لینا کے ہیں۔جیسا کہ اِخْتِیَارٌ کے معنی بہتر چیز لے لینا کے آتے ہیں اور اَلْاِجْتِبَاءُ کے معنی جِبَایَہ یعنی عمدہ چیز منتخب کر لینا آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا۔کبھی بطور ایجاد کے ہوتا ہے یعنی اسے ان اندرونی کثافتوں سے پاک وصاف پیدا کرتا ہے جو دوسروں میں پائی جاتی ہیں اور کبھی بطریق اختیار اور حکم کے ہوتا ہے گویا یہ قسم پہلے معنی کے بغیر نہیں پائی جاتی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ (۲۲۔۷۵) خدا فرشتوں اور انسانوں میں رسول منتخب کر لیتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا﴾ (۳۔۳۳) خدا نے آدم اور نوح......کو(تمام جہان کے لوگوں میں) منتخب فرمایا تھا۔

﴿اِصْطَفَاکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفَاکِ﴾ (۳۔۴۲) خدا نے تم کو برگزیدہ کیا اور پاک بنایا اور......منتخب کیا۔

﴿اِصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ﴾ (۷۔۱۴۴) میں نے تم کو......لوگوں سے ممتاز کیا۔

﴿وَاِنَّھُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ﴾ (۳۸۔۴۷) اور یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب اور بہتر افراد تھے۔اِصْطَفَیْتُ کَذَا عَلٰی کَذَا: ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دینا اور پسند کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَصْطَفَی الْبَنَاتِ عَلَی الْبَنِیْنَ﴾ (۳۷۔۱۵۲) کیا اس نے بیٹوں کی نسبت بیٹیوں کو پسند کیا۔

﴿سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی﴾ (۲۷۔۵۹) اس کے بندوں پر سلام ہے جن کو اس نے منتخب فرمایا:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ (۳۵۔۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا۔

اَلصَّفِیُّ وَالصَّفِیَّۃُ: مال غنیمت کی وہ چیز جسے امیر اپنے لیے منتخب کر لے (جمع صَفَایا) شاعر نے کہا ہے۔[1] (الوافر)

(۲۷۴) لَکَ الْمِرْبَاعُ مِنْھَا وَالصَّفَایَا: تمہارے لیے اس سے ربع اور منتخب کی ہوئی چیزیں ہیں۔

نیز صَفِیٌّ وَصَفِیَّۃٌ (۱) بہت دودھ دینے والی اونٹنی (۲) بہت پھلدار کھجور۔اَصْفَتِ الدَّجَاجَۃُ: مرغی انڈے دینے سے رک گئی۔گویا وہ انڈوں سے خالص ہو گئی اس معنی کی مناسبت سے جب شاعر شعر کہنے سے رک جائے تو اس کے متعلق اَصْفَی الشَّاعِرُ کہا جاتا ہے اور یہ اَصْفَی الْحَافِرُ کے

---

[1] قال عبدالله بن عنمة فی مرثیة بسطام بن قیس الشیبانی راجع شروح سقط الزند ۱۹۷۲ والا شتقاق لابن درید (۱۹۹، ۲۰۰) وبسطام هذا احد الفرسان الثلا ثة (التبریزی) قتله عاصم بن خلیفة الضبی والبیت من ثمانیة رواها ابو تمام فی الحماسة (۱: ۴۲) والمرزوی (۳۵۵) وتمامه: وحکمك و والنشطة والفضول، والبیت فی اللسان (ربع، نشط، صفا، فضل) والطبرسی (۲۸۔۳۰) والنقائض (۱۹۲، ۲۳۵) والعقد الفرید (۳۰: ۳۴۲) الاصمعیات ٦۳ والمعانی للقتبی ۹۴۸ والامالی (۱: ۴۴) والسمط (۱: ۳۸۹) والحیوان (۱: ۲۳).

محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کنواں کھودنے والا صفا یعنی چٹان تک پہنچ گیا، جس نے اسے آئندہ کھدائی سے روک دیا جیسا کہ اَکْدٰی وَاَحْجَرَ کے محاورات اس معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اور اَلصَّفَا کی طرح صَفْوَانٌ کے معنی بھی بڑا صاف اور چکنا پتھر کے ہیں۔اس کا واحد صَفْوَانَۃٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ﴾ (۲۔۲۶۴) اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو۔

یَوْمٌ صَفْوَانٌ: خنک دن میں سورج صاف ہو (یعنی بادل اور غبار نہ ہو)

(ص ل ل)

اصل میں صَلْصَالٌ کے معنی کسی خشک چیز سے آواز آنا کے ہیں، اسی سے صَلَّ الْمِسْمَارُ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی میخ کو کسی چیز میں ٹھونکنے سے آواز پیدا ہونا کے ہیں اور (کھنکنے والی) خشک مٹی کو بھی صَلْصَالٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ (۵۵۔۱۴) ٹھیکری کی طرح کھنکناتی مٹی سے.........

﴿مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (۱۵۔۳۳) کھنکنے والی خشک مٹی۔ یعنی سنے ہوئے گارے سے اور صَلْصَلَۃٌ کے معنی باقی ماندہ پانی کے ہیں کیونکہ مشکیزہ میں باقی ماندہ پانی کے ہلنے سے کھنکناہٹ کی آواز پیدا ہو جاتی ہے بعض نے کہا ہے کہ صَلْصَال کے معنی سڑی ہوئی مٹی کے ہیں اور یہ صَلَّ اللَّحْمُ سے مشتق ہے جس کے معنی گوشت کے بدبودار ہو جانے کے ہیں صَلْصَالٌ اصل میں صَلَّالٌ ہے۔ایک لام کو صاد سے بدل دیا گیا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿اَئِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۲۔۱۰) کیا جب ہم زمین میں ملیا میٹ ہو جائیں گے میں ایک قراءت صَلَلْنَا بھی ہے۔یعنی جب ہم گل سڑ جائیں گے اور یہ صَلَّ اللَّحْمُ وَاَصَلَّ کے محاورہ سے مشتق ہے۔

(ص ل ب)

اَلصُّلْبُ کے معنی سخت کے ہیں اور پشت کو بھی اس کی صلابت اور سختی کی وجہ سے صُلْبٌ کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿یَخْرُجُ مِنْۢ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾ (۸۶۔۷) جو پیٹھ اور سینے کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَحَلَائِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ (۴۔۲۳) اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی۔ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اولاد باپ کا جز ہوتی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔[1] (السریع)

(۲۷۵) وَاِنَّمَا اَوْلَادُنَا بَیْنَنَا
اَکْبَادُنَا تَمْشِیْ عَلَی الْاَرْضِ:

ہماری اولاد ہمارے جگر گوشے ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔[2] (الرجز)

---

[1] والبیت مع خمسة اخری فی الامالی(۲ : ۱۸۵)ونسبه فی اللالی والتبریزی ٤١ (طبعه اوردبا)الی حطان بن المعلی قَالَةُ تَأَسفاً علی ریب الزمان راجع المرزوقی ۲۸۸ والمحاضرات للمولف (۱ : ۳۲۱)والبحر(۲ : ۳۹٦)والماوردی ۳٦٥ والعقد الفرید(۲ : ٤۳۸)و نسبه الی المعلی بن الخطاب الطائی و فی العیون(۳ : ۹٥) و قال اعرابی.

[2] قاله العجاج یصف امراءة و قبله سیا العظام فخمة المخدم و بعده: الی سواء قطن مؤکم و البیت من شواهد الکشاف ۱۲٥ و ایضاً تهذیب الاصلاح (۱ : ٦٤)واللسان (صلب)و اضداد ابی الطیب ۲۳ و فیه بعده: و کفل بنحضه ملکم والارجوزة بتما مها فی دیوانه ۱۷٥۔۱۸۰).

(۲۷۶) فِیْ صُلْبٍ مِثْلِ الْعِنَانِ الْمُؤْدَمِ:
ایسی پشت میں جو چپڑی ہوئی لگام کی طرح نرم ہے۔
اَلصَّلَبُ وَالْاِصْطِلَابُ کے معنی ہڈیوں سے چکنائی نکالنا کے ہیں اور صَلَبَ جس کے معنی قتل کرنے کے لیے لٹکا دینا کے ہیں۔ بقول بعض اسے صَلَبٌ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں اس شخص کی پیٹھ لکڑی کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صَلَبُ الْوَدْكِ سے ہے جس کے معنی ہڈیوں سے چکنائی نکالنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ (۴۔۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔
﴿لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾ (۲۰۔۷۱) اور کھجور کے تنوں پر سولی چڑھوا دوں گا۔
﴿اَنْ يُّقَتَّلُوْا اَوْ يُصَلَّبُوْا﴾ (۵۔۳۳) کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی پر لٹکوا دیئے جائیں۔
اَلصَّلِيْبُ: اصل میں سولی کی لکڑی کو کہتے ہیں۔ نیز صلیب اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جو عیسائی بطور عبادت کے گلے میں اس خیال پر باندھ لیتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس پر سولی لٹکایا گیا تھا۔ اور جس کپڑے پر صلیب کے نشانات بنے ہوئے ہوں اسے مُصَلَّبٌ کہا جاتا ہے۔
صَالِبٌ: سخت بخار جو پیٹھ کو چور کر دے یا پسینہ کے ذریعہ انسان کی چربی نکال لائے۔
صَلَّبْتُ السِّنَانَ: میں نے نیزے کے بھالے کو تیز کیا۔
اَلصُّلْبِيَّةُ: سان کا پتھر (جس پر اوزار تیز کیے جاتے ہیں)۔

(ص ل ح)

اَلصَّلَاحُ: (درست، باترتیب) یہ فساد کی ضد ہے عام طور پر یہ دونوں لفظ افعال کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں لفظ صَلَاحٌ کبھی تو فساد کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور کبھی سَيِّئَةٌ کے۔ چنانچہ فرمایا:
﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا﴾ (۹۔۱۰۲) انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا دیا تھا۔
﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا﴾ (۷۔۵۶) اور ملک میں اصلاح کے بعد خرابی پیدا نہ کرنا۔
اور قرآن پاک میں اکثر مقامات پر (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) آیا ہے جس کے معنی صلاحیت بخش کام کرنا کے ہیں اور اَلصُّلْحُ کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت کو دور کر کے (امن و سلامتی پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے) چنانچہ اِصْطَلَحُوْا وَتَصَالَحُوْا کے معنی باہم امن و سلامتی سے رہنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَّالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ (۴۔۱۲۸) کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کر لیں اور صلح ہی بہتر ہے۔
﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا﴾ (۴۔۱۲۹) اور اگر باہم موافقت پیدا کرو اور تقویٰ اختیار کرو۔
﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾ (۴۹۔۹) تو ان میں صلح کرادو۔
﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (۴۹۔۱۰) تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کر دیا کرو۔
اور اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کی اصلاح کرنا کے کبھی تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرۃ صالح بنایا اور کبھی اس کے معنی اس سے خرابی اور نقص کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۲) اور ان کی حالت سنوار دی۔

﴿يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ (۳۳۔۷۱) وہ تمہارے اعمال درست کو دے گا۔

﴿وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ (۴۶۔۱۵) اور میرے لیے میری اولاد میں صلاح اور (تقویٰ) پیدا کر۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ (۱۰۔۸۱) خدا شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔ کے معنی یہ ہیں کہ مفسد لوگ چونکہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ کی مخالفت کر کے خرابیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے برعکس ذات باری تعالیٰ ہر کام میں اصلاح کو پسند کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے اعمال کو درست قرار دے اور صالحؑ ایک پیغمبر کا نام بھی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا﴾ (۱۱۔۶۲) صالح ......ہم تم سے کئی طرح کی امیدیں رکھتے تھے۔

(ص ل د)

اَلصَّلْدُ کے معنی ٹھوس اور چکنا پتھر کے ہیں جس پر کچھ پیدا نہ ہو سکے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَرَكَهٗ صَلْدًا﴾ (۲۔۲۶۴) تو اسے صاف کر ڈالے اسی سے رَأْسٌ صَلْدٌ: ہے یعنی وہ سر جس پر بالکل بال نہ ہوں۔ نَاقَةٌ صَلُوْدٌ وَصَلَادٌ: کم دودھ والی اونٹنی فَرَسٌ صَلُوْدٌ: وہ گھوڑا جسے پسینہ نہ آئے صَلَدَ الزَّنْدُ: چقماق سے آگ نکلنا۔

(ص ل و)

اَلصَّلٰوةُ: بہت سے اہل لغت کا خیال ہے کہ صَلَاةٌ کے معنی دعا دینے، تحسین وتبریک اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے صَلَّيْتُ عَلَيْهِ: میں نے اسے دعا دی، نشوونما دی اور بڑھایا اور حدیث میں ہے۔ [1] (۲)

((اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ اِلٰى طَعَامٍ فَلْيُجِبْ وَاِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ)) کہ جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کر لے اگر روزہ دار ہے تو وہ ان کے لیے دعا کر کے واپس چلا آئے اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (۹۔۳۹) اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے۔

﴿يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ﴾ (۳۳۔۵۶) (خدا اور اس کے فرشتے) پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں مومنو! تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجا کرو۔

﴿وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ﴾ (۹۔۸۹) اور پیغمبر کی دعاؤں کا...... اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے دعا کرنے کے معنی ہیں ان کو نشو نما دینا، بڑھانا چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ (۲۔۱۵۷) یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی رحمت اور مہربانی ہے۔

اور انسانوں کی طرح فرشتوں کی طرف سے بھی صَلَاۃٌ کے معنی دعا اور استغفار ہی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾ (۳۳۔۵۶) بے شک خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے

[1] مختصر من حديث ابى هريرة فى (حم، م، د، ت) و فى رواية ابن مسعود (طب) فليدع انظر كنز العمال (۹: رقم ۱۲۷۳، ۱۲۷۴) و غريب ابى عبيد (۱/۱۷۶، ۱۷۷) واستشهد به الزمخشرى فى الفائق (۲/۱۷) و ابن الاثير فى النهاية۱۲۔

ہیں اور اَلصَّلٰوۃُ جو کہ ایک عبادت مخصوصہ کا نام ہے اس کی اصل بھی دعا ہی ہے اور نماز چونکہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے اسے صَلٰوۃ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تَسْمِیَۃُ الشَّیْءِ بِاسْمِ الْجُزْءِ کے قبیل سے ہے یعنی کسی چیز کو اس کے ضمنی مفہوم کے نام سے موسوم کرنا اور صَلَاۃٌ (نماز) ان عبادات سے ہے جن کا وجود ہر شریعت میں ملتا ہے گو اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ (۴۔۱۰۳) بے شک نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ لفظ صَلٰوۃ دراصل صِلَاءٌ سے مشتق ہے لہٰذا صَلَّی الرَّجُلُ کے معنی ہیں: اس شخص نے اس عبادت کے ذریعہ اپنے آپ کو صَلَاءٌ یعنی دوزخ کی آگ سے دور کیا اور جس طرح مَرَّضَ کا لفظ مرض کو دور کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح صَلّٰی میں بھی سلب ماخذ کے معنی پائے جاتے ہیں اور کبھی عبادت گاہ کو بھی صَلَاۃ کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں کَنَائِسُ یعنی یہود کی عبادت گاہوں کو صَلَوٰۃٌ کہا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ﴾ (۲۲۔۴۰) تو راہبوں کے صومعے عیسائیوں کے گرجے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو چکی ہوتیں۔

اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی نماز ادا کرنے کی تعریف کی گئی ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے وہاں اسے لفظ اقامت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ﴾ (۴۔۱۶۲) اور نماز پڑھتے ہیں۔

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (۲۔۱۱۰) اور نماز ادا کرتے رہو۔

﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (۲۔۲۷۷) اور نماز پڑھتے رہے۔

اور محض مُصَلِّیْنَ کا لفظ صرف منافقین کے متعلق وارد ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ (۱۰۷۔۵،۴) تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

﴿وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَهُمْ کُسَالٰی﴾ (۹۔۵۴) اور نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

اور صَلٰوۃ کے ساتھ لفظ اِقَامَۃٌ ذکر کرنے سے غرض یہ ہے کہ نماز کو محض ہیئت مخصوصہ کے ساتھ ادا کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے حقوق وفرائض کو پورا کرنا بھی ضروری ہے اس بنا پر ایک روایت میں ((اَنَّ الْمُصَلِّیْنَ کَثِیْرٌ وَالْمُقِیْمِیْنَ لَهَا قَلِیْلٌ)) کہ محض نماز پڑھنے والے تو بہت ہیں مگر اس کو حقوق وفرائض کے ساتھ ادا کرنے والے بہت کم ہیں اور آیت کریمہ: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ﴾ (۷۴۔۴۳) ہم مصلین سے نہیں تھے۔ کے معنی یہ ہیں کہ ہم انبیاء کرام کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ اور آیت: ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی﴾ (۷۵۔۳۱) نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی میں وَلَا صَلّٰی سے مراد یہ ہے کہ اس نے محض رسمی نماز بھی نہیں پڑھی چہ جائیکہ اس کے حدود وفرائض کے ساتھ اسے ادا کرتا۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَا کَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَةً﴾ (۸۔۳۵) اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس

سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔ میں ان کی نماز کو مُکَاءً اور تَصْدِیَۃً کہہ کر بتایا ہے کہ ان کی نماز بے روح تھی اور ان کا یہ عمل بے وقعت بلکہ ان کی اس نماز کی حیثیت پرندوں کی چہچہاہٹ اور گنبد کی آواز سے زیادہ نہیں تھی۔اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ کے بعد ﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ﴾ (۲۳۔۹) اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، میں صلوٰۃ کو دوبارہ لانے کی وجہ ہم اس کتاب کے بعد (یعنی تفسیر قرآن میں) ذکر کریں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

(ص ل ی)

اَلصَّلْیُ (س) کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں صَلِیَ بِالنَّارِ: اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا۔ صَلِیَ بِکَذَا: اسے فلاں چیز سے پالا پڑا۔ صَلَیْتُ الشَّاۃَ: میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مَصْلِیَّۃٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِصْلَوْھَا الْیَوْمَ﴾ (۳۶۔۶۴) آج اس میں داخل ہو جاؤ۔

﴿یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی﴾ (۸۷۔۱۲) بڑی تیز آگ میں داخل ہوگا۔

﴿تَصْلٰی نَارًا حَامِیَۃً﴾ (۸۸۔۴) دھکتی آگ میں داخل ہوں گے۔

﴿وَیَصْلٰی سَعِیْرًا﴾ (۸۴۔۱۲) اور دوزخ میں داخل ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا﴾ (۴۔۱۰) اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے، میں ایک قراءت ضمہ یا (افعال) کے ساتھ بھی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿حَسْبُھُمْ جَھَنَّمُ یَصْلَوْنَھَا﴾ (۵۸۔۸) ان کو دوزخ ہی کی سزا کافی ہے (یہ) اسی میں داخل ہوں گے۔

﴿سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ﴾ (۷۴۔۲۶) ہم عنقریب اسے سقر میں داخل کریں گے۔

﴿وَتَصْلِیَۃُ جَحِیْمٍ﴾ (۵۶۔۹۴) اور جہنم میں جلنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا یَصْلٰھَآ اِلَّا الْاَشْقَی الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی﴾ (۹۲۔۱۵۔۱۶) اس میں وہی داخل ہوگا جو بڑا بد بخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں لَا یَصْلٰھَآ کے معنی لَا یَصْطَلِیْ بِھَا ہیں یعنی دوزخ کے ساتھ وابستہ اور چمٹے نہیں رہیں گے۔ اور خلیل نے کہا ہے کہ صَلِیَ الْکَافِرُ النَّارَ کے معنی یہ ہیں کہ کافر نے دوزخ کی تکلیف برداشت کی جیسے فرمایا:

﴿یَصْلَوْنَھَا فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ﴾ (۵۸۔۸) اسی میں داخل ہوں گے اور وہ بری جگہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ صَلِیَ النَّارَ کے معنی آگ میں داخل ہونے کے ہیں اور اَصْلَاھَا کے معنی داخل کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا﴾ (۴۔۳۰) ہم اسے عنقریب جہنم میں داخل کریں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ ھُمْ اَوْلٰی بِھَا صِلِیًّا﴾ (۱۹۔۷۰) اور ہم ان لوگوں سے خوب واقف ہیں جو اس

میں داخل ہونے کے زیادہ لائق ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ صِلِيًّا، صَالٍ کی جمع ہے [1]۔ صِلَاءٌ (۱) آگ جلانے کا ایندھن (۲) بھنی ہوئی چیز۔

(ص م م)

اَلصَّمَمُ کے معنی حاسۂ سماعت ضائع ہوجانا کے ہیں (مجازاً) اس کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہوتا ہے جو نہ تو حق کی آواز سنے اور نہ ہی اسے قبول کرے (بلکہ وہ اپنی مرضی کرتا چلا جائے) قرآن پاک میں ہے:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ (۲۔۱۸) یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں۔ ﴿صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾ (۲۵۔۷۳) اندھے اور بہرے ہوکر۔

﴿وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيَانِ﴾ (۱۱۔۲۴) اور بہرہ ہو اور ایک دیکھتا سنتا، بھلا، دنوں کا حال یکساں ہوسکتا ہے۔

﴿وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا﴾ (۵۔۷۱) اور یہ خیال کر کے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آنے کی یہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی لیکن پھر اندھے اور بہرے ہوگئے۔

اور تشبیہ کے طور پر ہر اس چیز کو صَمَمٌ کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے جس کی آواز سنائی نہ دے چنانچہ محاورہ ہے۔ [2] صُمَّتْ حَصَاةٌ بِدَمٍ یعنی خون ریزی اس کثرت سے ہوئی ہے کہ اگر اس میں کنکر ڈالا جائے تو اس کی حرکت سنائی دے۔

ضَرْبَةٌ صَمَّاءٌ: مہلک ضرب جس کے بعد مضروب کی آواز ہی سنائی نہ دے اسی سے اس بہادر کو جو تلوار کی ایک ہی ضرب سے دوسرے کو ہلاک کرڈالے صِمَّةٌ کہا جاتا ہے صَمَمْتُ الْقَارُوْرَةَ: میں نے شیشی پر کاک لگایا جس سے اس کا منہ بند ہوگیا یہ اَلْاَصَمّ (بہرے کے ساتھ) تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

صَمَّمَ فِي الْاَمْرِ: اس نے اپنی مرضی کی اور کسی کی نہ سنی صَمَّانٌ: سخت زمین اِشْتِمَالُ الصَّمَّاءِ: کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ جسم کا کوئی حصہ ننگا نہ رہے۔

(ص م د)

اَلصَّمَدُ: وہ سردار جس کی طرف ہر معاملہ میں رجوع کیا جائے۔ صَمَدَ صَمْدَهٗ کسی کو معتمد سمجھ کر اس کی جانب قصد کرنا۔ بعض نے کہا ہے۔ [3] لَهٗ صَمَدٌ ٹھوس اور بے جوف چیز کو کہتے ہیں۔ اور بے جوف چیزیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جو انسان سے کم درجہ کی ہیں، جیسے جمادات اور دوم وہ جو انسان سے اعلیٰ درجہ کی ہیں، جیسے باری تعالیٰ اور فرشتے اور آیت کریمہ:

﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ (۱۱۲۔۲) اللہ بے نیاز ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کو صمد کہہ کر اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ مشرکین نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے۔ ذات الٰہی

---

[1] وفی القرآن (الامن هو صال الجحيم) (۳۷۔۱۶۳۰) والصحیح ان صلیا مصدر صلی و منه اصطلیٰ (افتعال) کما فی آية(۲۷۔۷).

[2] انظر للکلمة المیدانی رقم: ۲۰۸۵ واللسان والمحکم (صمم) والحیوان (۴: ۳۹۲) والمعانی للقتبی ۸۵۷ مثل یقال عند شد اد الحرب و کثرة الاراء قال ابن بری: والصحیح ان یقال بدمی بدل بدم و فی المجالس للثعلب (۵۲۱) یقال فی الداهیته.

[3] وفی الطبرسی ۲۸۰/۳۰ الی الامام الباقر و کذا قال ابن عباس و عکرمة و الضحاك والحن علی ما فی القرطبی والطبری وقال القتبی فی غریبه (۵۴۲) و علی هذا الدال فیه مبدلة من تارت قارن ما ذکره ابو الطیب اللغوی فی ابد اله و (حرف الدال)۱۲.

ان سب کے برعکس ہے چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (۵۔۷۵) اور ان کی والدہ (مریم خدا کی ولی اور) سچی فرمانبردار تھیں دونوں (انسان تھے اور) کھانا کھاتے تھے۔ میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

(ص م ع)

اَلصَّوْمَعَةُ: (راہب کی کوٹھری) ہر وہ عمارت جس کا سر لمبا اور نوکدار ہو (جیسے گرجے کا منارہ) اس کی جمع صَوَامِعُ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ﴾ (۲۲۔۴۰) تو (راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے) گرجے...... ویران ہو چکے ہوتے۔
اور اَصْمَعُ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے کان چھوٹے ہوں گویا وہ سر کے ساتھ پیوست ہیں۔ قَلْبٌ اَصْمَعُ: بہادر گویا اس کی حالت ان لوگوں کے خلاف ہے جو کہ آیت ﴿وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے کے مصداق ہیں۔
اَلصَّمْعَاءُ: بہمی گھاس جس کے شگوفے تا حال ظاہر نہ ہوئے ہوں کِلَابٌ صُمْعُ الْكُعُوْبِ: یعنی چھوٹے اور باریک ٹانگوں والے کتے۔

(ص ن ع)

اَلصُّنْعُ (ف) کے معنی کسی کام کو کمال مہارت سے اچھی طرح کرنے کے ہیں اس لیے ہر صُنْع کو فعل تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر فعل کو صنع نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی لفظ فعل کی طرح حیوانات اور جمادات کے لیے بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۲۷۔۸۸) یہ خدا کی صنعت کاری ہے جس نے ہر چیز کو نہایت مہارت سے محکم طور پر بنایا ہے۔
﴿وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ﴾ (۱۱۔۳۸) تو نوح علیہ السلام نے کشتی بنانی شروع کر دی۔
﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ﴾ (۱۱۔۳۷) اور ایک کشتی...... بناؤ۔
﴿أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾ (۱۸۔۱۰۴) کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔
﴿صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ﴾ (۲۱۔۸۱) تمہارے لیے نہایت عمدگی سے ایک طرح لباس بنانا۔
﴿مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ (۵۔۶۳) جو کچھ وہ کرتے ہیں۔
﴿وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا﴾ (۱۱۔۱۶) اور جو عمل انہوں نے (دنیا میں) کیے سب برباد۔
﴿تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا، إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ﴾ (۲۰۔۶۹) کہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے اسے نگل جائے گی جو بھی انہوں نے بنایا وہ تو جادوگر کے ہتھکنڈے ہیں۔
﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ﴾ (۲۹۔۴۵) اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔
اور لفظ صُنْع میں چونکہ عمدگی کے ساتھ کسی کام کو سرانجام دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے کسی کام کے ماہر کاریگر کو جو عمدہ طور پر کام کرتا ہو، صَنَعٌ اور ماہر عورت کو صَنَّاعٌ کہا جاتا ہے اور ہر اچھے اور نیک کام کو صَنِيعَةٌ کہا جاتا ہے فَرَسٌ صَنِيعٌ عمدہ طور پر پرورش کیا ہوا گھوڑا اور معزز اور پررعب مقامات کو مَصَانِعَ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اور یہ مَصْنَعٌ کی جمع ہے۔جیسے فرمایا: ﴿وَتَتَّخِذُونَ

مَصَانِعَ﴾ (۲۶۔۱۲۹) اور محل بناتے ہو۔اور کنایہ کے طور پر مُصَانَعَةٌ کے معنی رشوت دینا بھی آتے ہیں

اَلْاِصْطِنَاعُ کسی چیز کی نہایت زور اور توجہ سے اصلاح کرنا۔اور آیت کریمہ:﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ﴾ (۲۰۔۴۱) اور میں نے تم کو (اپنے کام کے لیے) بنایا ہے۔اور آیت:

﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِیْ﴾ (۲۰۔۳۹) اور اس لیے کہ تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔

میں حکماء کے اس قول کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالٰی کسی بندہ کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو اس کی اس طرح دیکھ بال کرتا ہے جیسے ایک دوست اپنے دوست کی۔

(ص ن م)

اَلصَّنَمُ: کے معنی بت کے ہیں جو کہ چاندی، پیتل یا لکڑی وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔عرب لوگ ان چیزوں کے مجسمے بنا کر (ان کی پوجا کیا کرتے اور انہیں تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے) صَنَمٌ کی جمع اَصْنَامٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً﴾ (۶۔۷۵) کہ تم بتوں کو کیوں معبود بناتے ہو۔

﴿لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ﴾ (۲۱۔۵۷) میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے خدا کے سوا پوجا جائے بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا تعالٰی سے بیگانہ بنا دے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری جانب منعطف کر دے صَنَمٌ کہلاتی ہے۔چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ:

﴿وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ (۱۴۔۳۵) مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی پرستش اختیار کریں۔

تو اس سے بھی ایسی چیزوں کی پرستش مراد ہے۔کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معرفت الٰہی کے تحقق اور اس کی حکمت پر مطلع ہونے کے بعد یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اور ان کی اولاد بت پرستی شروع کر دے گی۔

(ص ن و)

اَلصِّنْوُ: کسی درخت کی جڑ سے جو مختلف شاخیں پھوٹتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو صِنْوٌ کہا جاتا ہے۔محاورہ ہے فُلَانٌ صِنْوُ اَبِيْهِ: فلاں اس کے باپ کا حقیقی بھائی ہے۔[1] کیونکہ باپ اور چچا ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہوتی ہیں صِنْوٌ کا تثنیہ صِنْوَانِ اور جمع صِنْوَانٌ آتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے هُمَا صِنْوَا نَخْلَةٍ: وہ دونوں ایک ہی کھجور کی دو شاخیں ہیں (یعنی ان کی اصل ایک ہی ہے)۔قرآن پاک میں ہے:

﴿صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ﴾ (۱۳۔۴) بعض کھجوریں ایسی ہیں جو ایک ہی جڑ سے پھوٹتی ہیں اور بعض الگ الگ جڑوں سے۔

(ص ھ ر)

اَلصِّهْرُ: کے معنی اَلْخَتَنُ بھی آتے ہیں یعنی وہ رشتہ دار جو شوہر کی جانب سے ہوں نیز بیوی کے خاندان والوں کو اَصْهَارٌ کہا جاتا ہے یہ قول خلیل کا ہے۔ابن

[1] وفی الحدیث العباس صنوابی ای شقیقه الفائق(۲/ ۲۱).

الاعرابی نے کہا ہے [1] کہ پڑوس، نسب یا شادی کی وجہ سے جو تعلق پیدا ہو جائے اسے اِصْهَارٌ (افعال) کہا جاتا ہے رَجُلٌ مُصْهِرٌ: وہ مرد جسے اس قسم کا تعلق حاصل ہو اور آیت کریمہ:

﴿فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا﴾ (۲۵۔۵۴) میں نسب سے وہ رشتے داری مراد ہے جو آباء واجداد کی جانب سے ہو اور صِهْر سے مراد وہ رشتہ جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔

اَلصَّهْرُ (ف) کے معنی ہیں چربی وغیرہ کو گرم کر کے پگھلانا قرآن پاک میں ہے:

﴿يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ﴾ (۲۲۔۲۰) اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں کے اندر ہے گال دیا جائے گا۔

اَلصُّهَارَةُ: پگھلائی ہوئی چربی۔ ایک اعرابی کا قول ہے کہ لَاَصْهَرَنَّكَ بِيَمِيْنٍ مُرَّةٍ: یعنی میں تمہیں پگھلا کر چھوڑوں گا۔ [2]

(ص و ب)

اَلصَّوَابُ: (صحیح بات) کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے (۱) کسی چیز کی ذات کے اعتبار سے یعنی جب کوئی چیز اپنی ذات کے اعتبار سے قابل تعریف ہو اور عقل و شریعت کی رو سے پسندیدہ ہو۔ مثلاً تَحَرِّي الْعَدْلِ صَوَابٌ (انصاف کو مدنظر رکھنا صواب ہے) اَلْكَرَمُ صَوَابٌ (کرم و بخشش صواب ہے) (۲) قصد کرنے والے کے لحاظ سے یعنی جب کوئی شخص اپنی حسب منشا کسی چیز کو حاصل کر لے تو اس کے متعلق اَصَابَ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے مثلاً: اَصَابَهٗ بِالسَّهْمِ (اس نے اسے تیر مارا، پھر اس دوسرے کے معنی کے اعتبار سے اس کی چند قسمیں ہیں۔ (۱) اچھی چیز کا قصد کرے اور اس کر گزرے یہ صواب تام کہلاتا ہے اور قابل ستائش۔

(۲) مستحسن چیز کا قصد کرے لیکن اس سے غیر مستحسن فعل سرزد ہو جائے یہ بھی صواب میں داخل ہے کیونکہ اس نے اجتہاد کے بعد اسے صواب سمجھ کر کیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے فرمان ((كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيْبٌ)) (کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے) کا بھی یہی مطلب ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ ((اَلْمُجْتَهِدُ مُصِيْبٌ وَاِنْ اَخْطَاَ فَهٰذَا لَهٗ اَجْرٌ)) کہ مجتہد مصیب ہوتا ہے اگر خطاوار بھی ہو تو اسے ایک اجر حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے۔ [3]

((مَنِ اجْتَهَدَ فَاَصَابَ فَلَهٗ اَجْرَانِ وَمَنِ اجْتَهَدَ فَاَخْطَاَ فَلَهٗ اَجْرٌ)) کہ جس نے اجتہاد کیا اور صحیح بات کو پالیا تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جس نے اجتہاد کیا اور غلطی کی تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

(۳) کوئی شخص صحیح بات یا کام کا قصد کرے مگر کسی سبب سے اس سے غلطی سرزد ہو جائے۔ مثلاً: ایک شخص شکار پر تیر چلاتا ہے مگر اتفاق سے کسی انسان کو لگ جاتا ہے اس

[1] ابو عبد الله محمد بن زياد والاعرابي شيخ ابي العباس و ربيب المفضل الضبي ولد سنه ۱۵۰ هجرى وتوفى ۲۳۱ وقد جاور الثمانين۔ ابن النديم (۶۹۔۱۹۰۔ ۱۳۰) وامالي القالي (۱/۱۶۵، ۲/۲۳۷) والانباه (۱۰۔۱۰۹)(۳/۱۳۱) و معجم الادباء (۱۸/۱۹۴۱) والمنهر (۱: ۳۹۴، ۴۳۹، ۴۷۹، ۵۰۵، ۲/۷۷) كشف الظنون (۲/۱۹۸۰) تاريخ بغداد (۵/۲۸۲۔۲۸۵) المراجع في بروكلمن (۲۰۳۰۔۲۰۵).

[2] وفي المطبوع بيميني مرة والتصويب من المعاجم.

[3] الحديث باختلاف الفاظه مروى عن ابي هريرة و عمرو بن العاص رواه احمد و اصحاب الكتب الستة و ابن عبدالحكيم في فتوح مصر باسانيد من طريق ابن الهاد (۲۲۷۔۲۲۸) راجع الرسالة للشافعي رقم: (۱۴۰۹۔۱۴۰۱۔) تحقيق احمد شاكر۔

صورت میں اسے معذور سمجھا جائے گا۔

(۴) ایک شخص کوئی برا کام کرنے لگتا ہے مگر اس کے برعکس اس سے صحیح کام سرزد ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کے متعلق کہا جائے گا کہ گو اس کا ارادہ غلط تھا مگر اس نے جو کچھ کیا وہ درست ہے۔

اَلصَّوَابُ: (ن) کے معنی بھی اِصَابَۃٌ (افعال) ہی ہیں اور صَابَہٗ وَاَصَابَہٗ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی پہنچنا یا لگانا اور صَوْبٌ اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو صرف اسی قدر برسے جس حد تک کہ مفید ہو چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ﴾ (۴۳۔۱۱) ایک اندازے کے ساتھ آسمان سے پانی نازل کیا، میں بِقَدَرٍ سے یہی معنی مراد ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔[1] (الکامل)

(۲۷۷) فَسَقٰی دِیَارَكَ غَیْرَ مُفْسِدِھَا...... صَوْبُ الرَّبِیْعِ وَدِیْمَۃٌ تَھْمِیْ

موسم ربیع کی بارش اور متواتر برسنے والا پانی تمہارے شہر کو سیراب کرے۔

اور صَیِّبٌ خاص کر صَابَ یَصُوْبُ سے فَعِیْلٌ کے وزن پر (مبالغہ کا صیغہ) ہے جس کے معنی ہیں بارش کا گرنا، اوپر سے نیچے آنا۔شاعر نے کہا ہے۔[2] (طویل)

(۲۷۸) فَکَاَنَّھُمْ صَابَتْ عَلَیْھِمْ سَحَابَۃٌ گویا اس پر (زور کا) بادل برسا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَوْکَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۔۱۸) یا ان کی مثال اس بارش کی ہے جو آسمان سے (برس رہی ہو) میں بعض نے کہا ہے کہ صَیِّبٌ کے معنی بادل ہیں۔اور بعض نے بارش مراد لی ہے۔اور بارش کو مجازاً صَیِّبٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے سَحَابٌ کہہ دیتے ہیں اَصَابَ السَّھْمُ: تیر ٹھیک نشانہ پر جا لگا۔اور مُصِیْبَۃٌ: اصل میں تو اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھ جائے اس کے بعد (عرف میں) ہر حادثہ اور واقعہ کے ساتھ یہ لفظ مخصوص ہو گیا ہے۔قرآن میں ہے:

﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْھَا﴾ (۳۔۱۶۵) (بھلا یہ) کیا بات ہے کہ جب احد کے دن کفار کے ہاتھ سے تم پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو چند مصیبت تمہارے ہاتھ سے انہیں پہنچ چکی تھی۔

﴿فَکَیْفَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ﴾ (۴۔۶۲) تو کیسی (ندامت کی بات) ہے کہ جب...... ان پر کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے۔

﴿وَمَآ اَصَابَکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ﴾ (۳۔۶۶)

---

[1] قاله طرفة والبيت فى اللسان (همى) و ديوانه ٦٢ مع شرحه لاحمد شنقيطى وفيه بلادك والصناعتين ٣٩٠ فى بحث التتميم والتكميل وفى ٤٠٨ بحث الاستثناء والعمدة (٢ : ٥٠)و مختارالشعر الجاهلى(١ : ٢٥٨)و نقد الشعر ٤٩ والعقد الثمين ١٧ و فى غريب ابى عبيد(١ : ٢٣)و يقال انه لمرقش.

[2] قاله علقمة بن عبدة وتمامه: صواعقهايطر بن وهيب والبيت من كلمة مفضيلته (٢ : ١٩٥)فى ٤٣ بيتاً وفى الموشح ٩١(فى امثله الابيات المستكرمته)و ديوانه من الستة ١٠٥ والطبرى (١ : ١٤٨)واللسان والتاج (صوب) و مختار الشعر الجاهلى(١ : ٣٢٢)والبحر(١ : ١٨٤)، ٤٥٥/٤ : ٣٢٨) والحيوان (٣ : ١٧٦) مع آخر والمعانى للقتبى ٨٦٠ و شرح السبع لابن الانبارى ٥٢٢ والعقد الثمين ١٠٧ و ايام العرب ٥٨ و فى المطبوع فكانما صابت عليه مصحح.

اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مابین مقابلہ کے دن واقع ہوئی۔

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ (۴۲۔۳۰) اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے اعمال سے۔

اور اَصَابَ (افعال) کا لفظ خیر وشر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ﴾ (۹۔۵۰) اگر تم کو آسائش حاصل ہوتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر مشکل پڑتی ہے۔

﴿وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۴۔۷۳) اور اگر خدا تم پر فضل کرے۔

﴿فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ﴾ (۲۴۔۴۳) تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔

﴿فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ (۳۰۔۴۸) پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اسے برسا دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ جب اَصَابَ کا لفظ خیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ صَوْبٌ بمعنی بارش سے مشتق ہوتا ہے اور جب برے معنی میں آتا ہے تو یہ معنی اَصَابَ السَّهْمُ کے محاورہ سے ماخوذ ہوتے ہیں مگر ان دونوں معانی کی اصل ایک ہی ہے۔

(ص و ت)

اَلصَّوْتُ: (آواز) اس ہوا کو کہتے ہیں جو دو جسموں کے ٹکرانے سے منضغط یعنی دب جائے۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) وہ صوت جو ہر قسم کے تنفس سے خالی ہوتا ہے جیسے صوت ممتد (۲) وہ صوت جو تنفس کے ساتھ ملا ہوتا ہے پھر صوت تنفس دو قسم پر ہے ایک غیر اختیاری جیسا کہ جمادات اور حیوانات سے سرزد ہوتا ہے۔ دوم اختیاری جیسا کہ انسان سے صادر ہوتا ہے۔ جو صوت انسان سے صادر ہوتا ہے پھر دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو ہاتھ کی حرکت سے پیدا ہو، جیسے عُوْد (ستار) اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی آواز۔ دوم وہ جو منہ سے نکلتا ہے اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو نطق کے ساتھ ہو۔ دوم وہ جو بغیر نطق کے ہو۔ جیسے نے یعنی بانسری کی آواز پھر نطق کی دو صورتیں ہیں ایک مفرد، دوم مرکب۔ جو کہ انواع کلام میں سے کسی ایک نوع پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ (۴۹۔۲) اپنی آوازیں پیغمبر ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو، میں خصوصیت کے ساتھ صوت یعنی آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ نطق وکلام سے عام ہے اور ہو سکتا ہے کہ ممانعت کا تعلق صوت یعنی محض آواز کے ساتھ ہو نہ کہ بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے۔ نیز اس کی وجہ تخصیص یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آواز سے بلند آواز کرنے کی کراہت ظاہر کرنا مقصود ہو اور مطلق بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے ممانعت مقصود نہ ہو۔

رَجُلٌ صَيِّتٌ: بلند آواز والا آدمی رَجُلٌ صَائِتٌ چیخنے والا اَلصِّيْتُ کے اصل معنی مشہور ہونے کے ہیں مگر استعمال میں اچھی شہرت کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔

اَلْاِنْصَاتُ کے معنی چپ کر کے توجہ کے ساتھ کسی کی بات سننا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (۷۔۲۰۴) اور جب قرآن پاک پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو۔

بعض نے کہا ہے کہ اِنْصَاتَ کے معنی جواب دینا بھی آتے ہیں۔ ❶ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جواب تو انصات یعنی بات سننے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اگر اس معنی میں استعمال بھی ہو تو آیت میں اس امر پر ترغیب ہوگی کہ کان لگا کر سنو تاکہ اسے قبول کرنے پر قوت حاصل ہو۔

(ص و ر)

اَلصُّوْرَۃُ ۔ کسی عین یعنی مادی چیز کے ظاہری نشان اور خدوخال جس سے اسے پہچانا جا سکے اور دوسری چیزوں سے اس کا امتیاز ہو سکے یہ دو قسم پر ہیں۔ (۱) محسوس، جن کا ہر خاص و عام ادراک کر سکتا ہو۔ بلکہ انسان کے علاوہ بہت سے حیوانات بھی اس کا ادراک کر لیتے ہیں جیسے انسان، فرس، حمار وغیرہ کی صورتیں دیکھنے سے پہچانی جا سکتی ہیں۔ (۲) صورۃ عقلیہ، جس کا ادراک خاص خاص لوگ ہی کر سکتے ہوں اور عوام کے فہم سے وہ بالا تر ہوں جیسے انسانی عقل وفکر کی شکل وصورت یا وہ معانی یعنی خاصے جو ایک چیز میں دوسری سے الگ پائے جاتے ہیں، چنانچہ صورت کے ان پر ہر دو معانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ﴾ (۷۔۱۱) پھر تمہاری شکل وصورت بنائی۔

﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ (۶۴۔۳) اور اس نے تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی نہایت حسین بنائیں۔

﴿فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ﴾ (۸۲۔۸) اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

﴿اَلَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ﴾ (۳۔۵) جو ماں کے پیٹ میں.........تمہاری صورتیں بناتا ہے۔

اور حدیث ❷ (۷) ((اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ)) کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس کی خصوصی صورت پر تخلیق کیا۔ میں ''صورت'' سے انسان کی وہ شکل اور ہیئت مراد ہے جس کا بصر اور بصیرت دونوں سے ادراک ہو سکتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان کو بہت سی مخلوق پر فضیلت حاصل ہے (اور صُوْرَتِہٖ میں اگر ہ ضمیر کا مرجع ذات باری تعالیٰ ہو تو) اللہ تعالیٰ کی طرف لفظ صورت کی اضافت تشبیہ یا تبعیض کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اضافت ملک یعنی بلحاظ شرف کے ہے یعنی اس سے انسان کے شرف کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جیسا کہ بَيْتُ اللّٰهِ یا نَاقَةُ اللّٰهِ میں اضافت ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (۳۸۔۷۲) میں روح کی اضافت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور آیت کریمہ:

﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ﴾ (۲۰۔۱۰۲) جس روز صور پھونکا جائے گا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ صُوْر سے قرن یعنی نرسنگھے کی طرح کی کوئی چیز مراد ہے، جس میں

---

❶ كما فى قولهم وعى فانصات (راجع الصحاح والمعاجم) لكن فى الآية من (ن ص ت) معناه السكوت والاستماع للحديث لامن (ص و ت) كما ذكره المولف قال الثعلب معنى الآية واذا قرء الامام فاستمعوا لقراء ته ولا تتكلموا فتدبر ۱۲ .

❷ الحديث متفق عليه عن ابى هريرة راجع كنز العمال (٦ ،رقم ٥٥٠) و ايضاً حم و قط فى الصفات وطب فى السنة عن ابى هريرة وعب عن قتادة مرسلاً و قط فى الصفات عن بن عمر راجع تخريج العراقى على الاحياء ج۲ ، ص۱٦۸ والكنز ج (۱، ص۲۰۲،۲۰۳).

پھونکا جائے گا۔

تو اس سے انسانی صورتیں اور روحیں ان کے اجسام کی طرف لوٹ آئیں گی۔ایک روایت میں ہے۔[1] ((ان الصور فیہ صورۃ الناس کلھم)) کہ صُوْر کے اندر تمام لوگوں کی صورتیں موجود ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ (۲۔۲۶۰) میں صِرْهُنَّ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی طرف مائل کرلو اور ہلا لو اور یہ صُوْرٌ سے مشتق ہے جس کے معنی مائل ہونے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی پارہ پارہ کرنے کے ہیں۔[2] ایک قراءت میں صُرْهُنَّ[3] ہے بعض کے نزدیک صِرْتُهٗ وَصُرْتُهٗ دونوں ہم معنی ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ صُرْهُن کے معنی ہیں انہیں چلا کر بلاؤ چنانچہ خلیل نے کہا ہے کہ عُصْفُوْرٌ صَوَّارٌ اس چڑیا کو کہتے ہیں جو بلانے والے کی آواز پر آ جائے۔

ابوبکر نقاش نے کہا ہے کہ اس میں ایک قراءت فَصُرْهُنَّ ضاد کے ضمہ اور رمشدوہ مفتوحہ کے ساتھ بھی ہے یہ صَرٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور ایک قرأت میں فَصِرَّهُنَّ ہے جو صَرِيْر بمعنی آواز سے مشتق ہے اور معنی یہ ہیں کہ انہیں بلند آواز دے کر بلاؤ اور قطع کرنے کی مناسبت سے بھیڑ بکریوں کے گلہ کو صِوَارٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ صِرْمَةٌ قَطِيْعٌ اور فِرْقَةٌ وغیرہ الفاظ ہیں کہ قطع یعنی کاٹنے کے معنی کے اعتبار سے ان کا اطلاق جماعت پر ہوتا ہے۔[4]

(ص و ع)

اَلصُّوَاعُ: اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی مشروب ڈال کر پیا جاتا ہے یا اس سے غلہ ماپ کر دیا جاتا ہے اسے صَاعٌ بھی کہتے ہیں۔اور یہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں آیت: ﴿نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ﴾ (۱۲۔۷۲) کہ بادشاہ (کے پانی پینے) کا پیمانہ کھویا گیا ہے۔کے بعد ﴿ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا﴾ (۱۲۔۷۶) فرمایا ہے (یعنی ھا ضمیر مونث اس کی طرف لوٹ رہی ہے)

اور حدیث[5]: ((صَاعٌ مِّنْ بُرٍّ وَصَاعٌ مِّنْ شَعِيْرٍ)) میں صَاعٌ سے وہ چیز مراد ہے جو اس سے ماپی جاتی ہے۔(یعنی ظرف بول کر مظروف مراد لیا ہے بعض نے کہا ہے کہ کبھی ''صَاعٌ'' کے معنی بطن ارض یعنی گڑھا کے آ جاتے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔[6] (الکامل)

(۲۷۹) تکرو بِکَفّی لَاعِبٍ فِیْ صَاعٍ

---

[1] کذا مروی عن علماء التفسیر انظر القرطبی.

[2] منسوب الی ابن عباس والتابعین کما فی الفتح (۸/ ۱۵۰).

[3] وھی قراءۃ علی و ابن عباس والاکثر و اما الکسر فقراءۃ ابن مسعود وھی لغۃ سلیم قارن اضدا و ابی الطیب (۴۱۸۔۴۲۴) و فی الدانی (۸۲) حمزۃ بکسر الصاد الباقون بضمھا و فی مجاز ابی عبیدۃ (۸۰۔۸۱) معناہ بالضم: ضمھن الیك و بالکسر فطعھن الاصمعی فی اضدادہ ۳۳ و ابن السکیت ۵۷ او اللسان (صور).

[4] والجماعۃ النحل الصور و فی الحدیث یطلع من تحت ھذا الصور رجل من اھل الجنۃ فالطلع ابو بکرؓ الفائق (۲/ ۲۱).

[5] والحدیث باختلاف الفاظہ فی ابوداؤد والبخاری ومسلم والنسائی و ابن ماجۃ من حدیث ابن عمر و راجع العون (ج۲، ص۲۶، ۲۷)۔ والنیل (۴/ ۱۹۰) والزرقانی (ج۲، ص۱۴۷۔۱۴۹۰).

[6] قالہ المسیب بن علس واولہ: مرحت یداھا للنجاء کانما و فی المطبوع ذکر و ابدل تکر و مصحف والبیت من کلمۃ مفضیلۃ رقم ۱۱ فی ۲۶ بیتاً ذکرھا القالی کلھافی ۱۳۰۔۱۳۲ والبیت فی المرتضی (۱: ۵۶) و فی روایتہ قاع بدل صاع وما قط بدل لاعب وایضاً اصلاح یعقوب (۲۴۴) والفائق (۲/ ۲۲).

جیسا کہ کھیلنے والا اپنے ہاتھوں سے تیزی کے ساتھ گولی کو گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں صاع کے معنی چوگان کے ہیں جس سے گیند کھیلی جاتی ہے تَصَوَّعَ النَّبْتُ پودا ہوا سے ہلا اور لہلہایا۔ تَصَوَّعَ الشَّعْرُ: بال پراگندہ ہو گئے محاورہ ہے: اَلْكَمِيُّ يَصُوْعُ اَقْرَانَهٗ: کہ بہادر اپنے ہمسروں کو منتشر کر دیتا ہے۔ آیت کریمہ: ﴿صُوَاعَ الْمَلِكِ﴾ میں ایک قرأت صَوْغُ الْمَلِكِ بھی ہے کیونکہ وہ صاع سونے سے ڈھال کر بنایا گیا تھا۔

(ص و ف)

اَلصُّوْف (اون) کی جمع اَصْوَافٌ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴾ (۱۶۔۸۰) اور ان کی اون اور پشم اور بالوں سے تم سامان اور دیگر مفید چیزیں (بناتے ہو جو) مدت تک کام دیتی ہیں۔

اَخَذَ بِصُوْفَةِ قَفَاهُ: اسے گدی کے بالوں سے پکڑ لیا۔ كَبْشٌ صَافٍ وَاَصْوَفُ وَصَائِفٌ: بہت اون والا مینڈھا اور خانہ کعبہ کے خدام کو بھی صُوْفَةٌ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ کعبہ کے ساتھ اس طرح چمٹے رہتے تھے جیسے بھیڑ پر اون جمی رہتی ہے۔ اَلصُّوْفَانُ: ایک قسم کی گھاس جو چھوٹی سی ہوتی ہے بعض نے کہا ہے کہ لفظ صُوْفِيٌّ بھی صوف کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ لوگ اون کا لباس پہنا کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صُوْفَةٌ کی طرف منسوب ہے جس کے معنی خدام کعبہ کے ہیں۔ صوفی لوگ بھی چونکہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے اس لیے انہیں صوفی کہہ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صُوْفِيْ صُوْفَان کی طرف منسوب ہے جس کے معنی نو روئیدہ گھاس کے ہیں اور صوفی لوگ بھی چونکہ زہد سے کام لیتے۔ اور معمولی سی غذا کھاتے تھے جو عدم کفایت میں صوفان گھاس کی مثل ہوتی تھی۔

(ص و م)

اَلصَّوْمُ (ن) کے اصل معنی کسی کام سے رک جانا اور باز رہنا کے ہیں خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا چلنے پھرنے یا گفتگو کرنے سے۔ اس بنا پر گھوڑا چلنے سے رک جائے یا چارہ نہ کھائے اسے بھی صَائِمٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے۔ [1] (البسیط)

(۲۸۰) خَيْلٌ صِيَامٌ وَاُخْرٰى غَيْرُ صَائِمَةٍ

کچھ گھوڑے اپنے تھان پر کھڑے ہیں اور دوسرے میدان جنگ میں ہیں۔

اور ہوا کے ساکن ہونے اور دوپہر کے وقت پر بھی صوم کا لفظ بولا جاتا ہے اس تصور پر کہ اس وقت آفتاب وسط آسمان میں ٹھہر جاتا ہے اسی اعتبار سے قَامَ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دوپہر کے وقت سورج کے خط نصف النہار پر ہونا کے ہیں مَصَامُ الْفَرَسِ اَوْ مَصَامَتُهٗ: گھوڑے کے کھڑا ہونے کی جگہ۔ اصطلاح شریعت میں کسی مکلّف کا روزہ کی نیت کے ساتھ

---

[1] قاله النابغة الذبياني و تمامه: تحت العجاج واخرى تعلك اللجما و فى اللسان (صوم) و خيل بدل و اخرى والبيت فى الصحاح والتاج والمحكم (صوع، كرا) والصاحبى ٨١ والطبرى (١٢٨/٢) والبحر (٢: ٢٦) و مجاز القرآن لابى عبيدة (٢: ٦) وملحق ديوانه والعقد الثمين (١٧٤) والكامل (٤٨٣).

صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے، پینے، منی خارج کرنے اور عمداً قے کرنے سے رک جانے کا نام صوم ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾ (۱۹۔۲۵) کہ میں نے خدا کے لیے روزے کی منت مانی ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صوم سے مراد کلام سے رکنے یعنی خاموش رہنا کے ہیں۔جیسا کہ بعد میں فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا (تو آج میں کسی آدمی سے ہرگز کلام نہ کروں گی) سے اس کی تفسیر کی گئی ہے۔

(ص ی ح)

اَلصَّیْحَۃُ کے معنی آواز بلند کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً﴾ (۳۶۔۲۹) وہ تو صرف ایک چنگھاڑ تھی۔(آتشین) اور آیت کریمہ:

﴿یَوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَۃَ بِالْحَقِّ﴾ (۵۰۔۴۲) جس روز لوگ چیخ یقیناً سن لیں گے۔

میں صَیْحَۃٌ کے معنی صور (نرسنگھے) میں پھونکنے کی آواز کے ہیں۔دراصل صَیْحٌ کے معنی آواز پھاڑنا کے ہیں اور یہ اِنْصَلَحَ الْخَشَبُ اَوِالثَّوْبُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: لکڑی یا کپڑا پھٹ گیا اور اس سے آواز نکلی اور یہی معنی صِیْحَ الثَّوْبُ کے ہیں۔بِاَرْضِ فُلَانٍ شَجَرٌ قَدْ صَاحَ: یعنی فلاں جگہ ایک درخت ہے جو اپنے طول کی وجہ سے نمایاں نظر آتا ہے۔گویا وہ اپنی ذات پر ایسے ہی دلالت کرتا ہے جیسا کہ چیخنے والے کی آواز اس کے موجود ہونے پر دال ہوا کرتی ہے۔پھر چیخ کبھی گھبراہٹ کا باعث ہوتی ہے۔لہٰذا صَیْحَۃٌ کے معنی فَزَعٌ یعنی چنگھاڑ کے بھی آتے ہیں۔جیسے فرمایا:

﴿فَاَخَذَتْھُمُ الصَّیْحَۃُ مُشْرِقِیْنَ﴾ (۱۵۔۷۳) سو ان کو سورج نکلتے ہی چنگھاڑ نے آ پکڑا۔

اور صَائِحَۃٌ کے معنی مجلس نوحہ خوانی کی چیخ وپکار کے ہیں۔

محاورہ ہے: مَا یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ صَیْحَۃِ الْحُبْلٰی: یعنی وہ شرِ عاجل کا انتظار کر رہے ہیں۔

اَلصَّیْحَانِیُّ۔ایک قسم کی کھجور۔

(ص ی د)

اَلصَّیْدُ: (ض) یہ صاد کا مصدر اور اس کے اصل معنی تو کسی محفوظ چیز پر قدرت حاصل کر کے اسے پکڑ لینے کے ہیں مگر شرعاً ان حیوانات کے پکڑنے پر بولا جاتا ہے جو اپنی حفاظت آپ کریں بشرطیکہ وہ جانور حلال ہوں اور کسی کی ملکیت نہ ہوں اور کبھی مَصِیْدٌ یعنی شکار کیے ہوئے جانور کو بھی صَیْدٌ کہہ دیتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ﴾ (۵۔۹۶) کے معنی ہیں کہ (احرام کی حالت میں) تمہارے لیے سمندری جانوروں کا شکار حلال ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ (۵۔۹۵) جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا۔

﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ (۵۔۲) اور جب احرام اتار دو تو (پھر اختیار ہے کہ) شکار کرو۔

﴿غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ (۵۔۱) مگر احرام (حج) میں شکار کو حلال نہ جاننا میں فقہا نے تصریح کی ہے کہ یہاں اَلصَّیْدُ سے وہ جانور مراد ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا

ہے۔کیونکہ حدیث میں ہے۔ (1)

(۸) ((خَمْسَةٌ يَقْتُلُهُنَّ الْمُحْرِمُ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ: الْحَيَّةُ وَالْعَقْرَبُ وَالْفَأْرَةُ وَالذِّئْبُ وَالْكَلْبُ الْعَقُوْرُ)) پانچ جانور یعنی سانپ، بچھو، چوہیا، بھیڑیا اور کاٹ کھانے والے کتے یعنی درندہ جانور کو محرم حرم کی حدود کے اندر اور باہر ہر جگہ قتل کرسکتا ہے۔

اَلْاَصْيَدُ: وہ شخص جس کی گردن ایک جانب جھکی ہوئی ہو۔اور متکبر آدمی کے لیے یہ لفظ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور صَيْدَانٌ کے معنی ہنڈیا کے پتھر کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔ (2) (الطّویل)

(۲۸۱) وَسُوْدٍ مِنَ الصَّيْدَانِ فِيْهَا مَذَانِبُ

اور سیاہ دیگیں جن میں نضار لکڑی کے چمچے رکھے ہوئے ہیں۔

اور اسے صاد بھی کہہ دیتے ہیں۔ (3) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ (4) (الطّویل)

(۲۸۲) رَاَيْتُ قُدُوْرَ الصَّادِ حَوْلَ بُيُوْتِنَا

میں نے پتھر کی ہنڈیاں اپنے خیموں کے اردگرد دیکھیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿ص، وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ (۳۸۔۱) قسم ہے قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے میں ص حروف مقطعات سے ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ صَادَيْتُ كَذَا سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں ''اسے لے کر قبول کرو''۔

(ص ی ر)

اَلصَّيْرُ: کے معنی ایک جانب یا طرف کے ہیں دراصل یہ صَارَ (ض) کا مصدر ہے۔اور اسی سے آیت فَصُرْهُنَّ میں ایک قرأت فَصِرْهُنَّ ہے۔صَارَ ض اِلٰی كَذَا کے معنی کسی خاص مقام تک پہنچ جانا کے ہیں اسی سے صِيْرُ الْبَابِ ہے جس کے معنی دروازہ میں شگاف اور جھروکا کے ہیں اور اسے صَيْرٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نقل وحرکت کا منتہی ہوتا ہے اور صَارَ کا لفظ ایک حالت سے دوسرے حالت میں منتقل ہونے پر بولا جاتا ہے۔اسی سے اَلْمَصِيْرُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز نقل وحرکت کے بعد پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ (۵۔۱۸) یعنی اللہ تعالیٰ ہی لوٹنے کی جگہ ہے۔ (5)

---

(1) حديث قتل الخمس من الدواب رواه مالك فى مؤطاه من حديث ابن عمر قال فى المنتهیٰ رواه الجماعة الا الترمذى و فيه حديث عائشة متفق عليه والحديث باختلاف الفاظه فى النسائى و احمد و ماروا ه المصنف من الدواب معدودة فى خمس الا الذئب قال فى الفتح (٤ : ٤٠٧)ووقع ذكر الذئب فى حديث مرسل اخرجه ابن ابى شيبة وابوداؤد من طريق سعيد بن المسيب و كذا فى احمد من حديث ابن عمرؓ مرفوعاً و موقوفاً راجع النيل (٤ : ٢٨٩ـ٢٩)و الزرقانى(٢ : ٢٨٧ـ٢٨٨)والمعروف فى اكثر الروايات الحدأة والغراب مكان الحية والذئب والتفصيل فى الفتح.

(2) قاله ابو ذؤيب الهذلى وتمامه...... الذُّضار اذا لم نستفدحا بعارب والصيدان يروى بفتح الصاد (جمع صيدا روهى البرمة) وبكسر ها(جمع صادو هوا النحاس) راجع اسمط (١ : ٣٥١)واللسان (صدن، صيد)والاقتضاب (٤٦٢) والكلمة فى ديوانه رقم ٥ فى ٤١ بيتاً وفى اللسان نضار بدل النضار (اى بدون اداة التعريف) كذا فى المعانى للقتيبى ٣٦٥ ، البيت (ابو ذؤيب) ايضاً فى "البلغنه فى شذور اللغة ١٣٠١ كتاب الرحل والمنزل.

(3) قال الاصمعى الصاد ويكون للصفروا لحجارة.

(4) قاله حسان بن ثابت وتمامه: قنابل سحمافى المحلة صيّما والبيت فى ديوانه (٣٧٠مع شرح المرزوقى)والصحاح (صدد)وفيه دهما بدل سحماً واللسان(صيد).

(5) وفى القرآن (وَاِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ) (٤٢ـ٥٣). وايضاً راجع (٢٥ـ١٥)(٣ـ٢٧)(٢ـ١٢٦).

(ص ی ص)

اَلصِّیْصَۃُ ہراس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اپنے آپ کو محفوظ کیا جائے مثلاً حفاظت گاہ اور قلعہ) اس کی جمع اَلصِّیَاصِیُ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ﴾ (۳۳-۲۶) اور اہل کتاب میں سے جنہوں نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے (جن میں وہ محفوظ ہوگئے تھے) اتار دیا۔

پھر معنی حفاظت کے اعتبار سے گائے کے سینگ کو صِیْصَۃٌ کہا جاتا ہے نیز اس کے معنی خارخروس بھی آتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ اپنے آپ کی حفاظت کرتا ہے اور دوسروں سے لڑتا ہے۔

(ص ی ف)

اَلصَّیْفُ: گرمی کا موسم یہ اَلشِّتَاءُ کے بالمقابل ہے جس کے معنی سردی کا موسم کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ﴾ (۱۰۶-۲) جاڑے اور گرمی کے زمانے کا سفر۔

اور گرمی کے موسم میں جو بارش ہو اسے بھی صَیْفٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ موسم بہار کی بارش کو ربیع کہتے ہیں۔ صَافُوْا: گرمی کے موسم میں کسی جگہ چلے گئے اور اَصَافُوْا موسم گرما میں داخل ہوئے۔

❀❀❀

كِتَابُ الضَّادِ

(ض ء ن)

اَلـضَّـاْنُ کے معنی بھیڑ اور دنبہ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مِـنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ﴾ (۶۔۱۴۳) دو (دو) بھیڑیوں میں سے۔

اَضْــأَنَ الـرَّجُلُ: بہت بھیڑ والا ہو گیا بعض نے کہا ہے: ضَأْنٌ کا واحد ضَائِنَةٌ ہے۔

(ض ب ح)

اَلضَّبْحُ کے معنی سرپٹ دوڑ کے وقت گھوڑے کے ہانپنے کے ہیں۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَالْـعَـادِيَاتِ ضَبْحًا﴾ (۱۰۰۔۱) ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں۔کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ضَبْحًا کے معنی گھوڑوں کے ہانپنے کی آواز کے ہیں۔کیونکہ وہ ضُبَاحٌ یعنی لومڑی کی آواز سے یک گونہ مشابہت رکھتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی دوڑنے کی آواز کے ہیں اور یہ لفظ سرپٹ دوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے۔اور بقول بعض ضَبْحٌ اور ضَبْعٌ دونوں لفظ ہم معنی ہیں اور ان کے معنی گھوڑے کا اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلا کر دوڑنا کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی لکڑی کو جلانا کے ہیں پھر تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے دوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ سرعت رفتاری میں گھوڑے کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

(ض ح ک)

اَلـضِّـحْكُ: (س) کے معنی چہرہ کے انبساط اور خوشی سے دانتوں کا ظاہر ہو جانا کے ہیں اور ہنستے وقت چونکہ سامنے کے دانت ظاہر ہو جاتے ہیں اس لیے ان کو ضَـوَاحِكُ کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ ضحک بمعنی تمسخر بھی آجاتا ہے۔چنانچہ ضَـحِـكْـتُ مِنْهُ کے معنی ہیں: میں نے اس کا مذاق اڑایا اور جس شخص کا لوگ مذاق اڑائیں اسے ضُـحْـكَةٌ اور جو دوسروں کا مذاق اڑائے اسے ضُحَكَةٌ (بفتح الحاء) کہا جاتا ہے۔[1] قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُـنْـتُـمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۱۰) اور تم ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

﴿إِذَاهُـمْ مِّـنْهَا يَضْحَكُوْنَ﴾ (۴۳۔۴۷) تو وہ ان کا مذاق اڑانے لگے۔

﴿تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ﴾ (۵۳۔۶۰) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو۔

اور کبھی صرف خوشی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

[1] وكذا لُعْنَة ولعنة وهذءة وهزوة و سخرة وخدعة راجع شرح كتاب الفصيح لابى سهل الهروى و تهذيب اصلاح المنطق للتبريزى وقارن المشكل للقتبى ١٢ والصاحبى ١٩٢.

﴿ضَاحِكَةٌ﴾ (۸۰۔۳۹) چمک رہے ہوں گے اور خنداں۔
﴿فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا﴾ (۹۔۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا خوش ہولیں۔
﴿فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا﴾ (۲۷۔۱۹) تو وہ اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔
شاعر نے کہا ہے۔ [1] (المدید)

(۲۸۳) يَضْحَكُ الضَّبُعُ لِقَتْلٰى هُذَيْلٍ...... وَتَرَى الذِّئْبَ لَهَا تَسْتَهِلُّ

بنی ہذیل کے مقتولوں کی وجہ سے بجّو خوش ہو رہے ہیں۔ اور بھیڑیے خوشی سے چلا رہے ہیں۔

اور کبھی ضِحْكٌ محض تعجب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ضحک انسان کا خاصہ ہے دیگر حیوانات اس کے ساتھ متصف نہیں ہوتے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى﴾ (۵۳۔۴۳) اور یہ کہ وہی ہنساتا اور رلاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ﴾ (۱۱۔۷۱) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی (جو پاس) کھڑی تھی ہنس پڑی۔
میں ان کی بیوی کا ہنسنا تعجب کی بنا پر تھا جیسا کہ اس کے بعد کی آیت کریمہ:
﴿اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۷۳) کیا خدا کی قدرت سے تعجب کرتی ہو، سے معلوم ہوتا ہے نیز آیت کریمہ:
﴿ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ .... عَجِيْبٌ﴾ (۱۱۔۷۲)
اے ہے میرے بچہ ہوگا؟ میں تو بڑھیا ہوں.......... بڑی عجیب بات ہے، بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور جن لوگوں نے یہاں ضَحِكَتْ کے معنی حَاضَتْ کیے ہیں [2] انہوں نے ضَحِكَتْ کی تفسیر نہیں کی ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے، بلکہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کی حالت کا بیان کرنا مقصود ہے کہ جب ان کو خوشخبری دی گئی تو بطور علامت کے انہیں اسی وقت حیض آ گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کا حاملہ ہونا بھی کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ عورت کو جب تک حیض آتا رہے وہ حاملہ ہو سکتی ہے اور شاعر نے سبزہ زار کی صفت میں کہا ہے۔ [3] (البسیط)

(۲۸۴) يُضَاحِكُ الشَّمْسَ مِنْهَا كَوْكَبٌ شَرِقٌ

اس کے پھول اور کلیاں دھوپ میں چمکتے اور سورج کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔

یہاں شاعر نے اس روضہ کی چمک دمک کو بطور تشبیہ ضحک سے تعبیر کیا ہے اسی سے چمکنے والے بادل، سفید چمکدار پتھر اور گدری کھجور کا شگوفہ جب شگفتہ ہو جائے تو اس کو ضَاحِكٌ کہا جاتا ہے طَرِيْقٌ ضَحُوْكٌ: واضح راستہ ضَحِكَ

---

[1] البیت فی الحماسة مع المرزوقی (۲ : ۱٦٤) منسوب لتابط شراقاله فی ثارقتیل حین اخذ الثارمن بنی هذیل والبیت فی البحر (۱ : ۳۷۸) والمعانی للقتبی ۹۲۷ والمحکم (ضحك) وفی السمط ۱۱۹ تستهل مالیا، وتضحك بدل یضحك واختلف فی نسبة القصیدة راجع (خلل).

[2] ذکره ابو جعفر البیهقی فی تاج المصادر ونقل عن ثعلب و ابن الاعرابی وهذا قول عکرمة ومجاهد الفیوضات الالهیة ۲/٤۲٦ والفتح للشوکانی ۲/۱۱۰ وقال الفراء: واما قولهم فضحکت ای حاضت فلم اسمعه من ثقه و سئل ابو العباس عن هذا فقال لیس من کلام العرب و ایضاً روی ابن درید قول ابن الاعرابی ویؤید قول المؤلف ۱۲.

[3] قاله الاعشیٰ و تمامه: موزر بعمیم النبت مکتهل راجع (کهل) والبیت فی العینی (۲ : ٥۰٥) وقانون البلاغة ٤٥٥ ضمن رسائل البلغاء وقبله آخر وفیه صنعة التقریع ۱۲.

اَلْغَدِیْرُ حوض لبریز ہو کر چمکنے لگا اَضْحَکْتُہٗ: میں نے اسے لبریز کردیا۔

(ض ح و)

اَلضُّحٰی۔ کے اصل معنی دھوپ پھیل جانے اور دن چڑھ آنے کے ہیں پھر اس وقت کو بھی ضُحٰی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰھَا﴾ (۹۱۔۱) سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی۔

﴿اِلَّا عَشِیَّۃً اَوْ ضُحٰھَا﴾ (۷۹۔۴۶) ایک شام یا صبح۔

﴿وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی﴾ (۹۳۔۱) آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی جب چھا جائے۔

﴿وَاَخْرَجَ ضُحٰھَا﴾ (۷۹۔۲۹) اور اس کی روشنی نکالی۔

﴿وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًی﴾ (۲۰۔۵۹) اور یہ لوگ اس دن چاشت کے وقت اکٹھے ہو جائیں۔

ضَحِیَ یَضْحٰی: شمس۔ یعنی دھوپ کے سامنے آنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی﴾ (۲۰۔۱۱۹) اور یہ کہ نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کھاؤ یعنی نہ ہی دھوپ سے تکلیف اٹھاؤ گے۔

تَضَحّٰی ضحی کے وقت کھانا کھانا جیسے تَغَدّٰی (دوپہر کا کھانا کھانا) اور اس طعام کو جو ضحی اور دوپہر کے وقت کھایا جائے اسے ضَحَاءٌ اور غَدَاءٌ کہا جاتا ہے۔ اور ضَاحِیَۃٌ کے معنی کسی چیز کی کھلی جانب کے ہیں اس لیے آسمان کو الضَّوَاحِیْ کہا جاتا ہے۔ لَیْلَۃٌ اِضْحِیَانَۃٌ وَضَحْیَاءُ: روشن رات جس میں شروع سے آخر تک چاندنی رہے۔

اُضْحِیَۃٌ کی جمع اَضَاحِیُ اور ضَحِیَّۃٌ کی ضَحَایَا اور اَضْحَاۃٌ کی جمع اَضْحٰی آتی ہے اور ان سب کے معنی قربانی کے ہیں اور شرعاً قربانی بھی چونکہ نماز عید کے بعد چاشت کے وقت دی جاتی ہے اس لیے اسے اُضْحِیَّۃٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ (۹)❶ ((مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ صَلٰوتِنَا ھٰذِہٖ فَلْیُعِدْ)) کہ جس نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر دیا وہ دوبارہ قربانی دے۔

(ض د د)

بعض نے کہا ہے: ضِدَّانِ ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت ہوں مگر ان میں سے ہر ایک اپنے خصوصی اوصاف کے باعث دوسری سے مخالف ہو اور ان میں انتہائی بُعد پایا جائے جیسے سفیدی و سیاہی اور خیر و شر اور جو متغایر چیزیں ایک جنس کے تحت نہ ہوں انہیں ضدان نہیں کہا جاتا جیسے حلاوت اور حرکت۔

علماء نے کہا ہے کہ ضد متقابلات کی ایک قسم کا نام ہے کیونکہ وہ دو چیزیں جن میں ذاتی اختلاف ہو اور یہ دونوں بیک وقت ایک جگہ میں اکٹھی نہ ہو سکتی ہوں انہیں متقابلین کہا جاتا ہے اور تقابل چار قسم پر ہے (۱) تقابل تضاد، جیسے سفیدی اور سیاہی (۲) تقابل تناقض، جیسے ضِعف (دوچند) اور نصف (۳) تقابل عدم ملکہ، جیسے بصر و عمی (۴) تقابل ایجاب وسلب، جو جملہ خبریہ میں ہوتا ہے جیسے کُلُّ اِنْسَانٍ ھٰھُنَا وَلَیْسَ کُلُّ اِنْسَانٍ ھٰھُنَا: اکثر متکلمین اور اہل لغت ان سب کو تقابل تضاد کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضد ان ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک محل میں جمع نہ ہو سکتی ہوں

❶ الحدیث باختلاف الفاظہ اخرجہ البخاری فی صحیحہ (۲/ ۳٤) (طبعۃ ہند) عن انسؓ.

اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق لَا نِــدَّلَهٗ وَلَا ضِدَّلَهٗ کہہ کر دونوں کی نفی کی جاتی ہے۔کیونکہ نِدَّ شریک فی الجوہر کو کہتے ہیں اور ان دو متخالف چیزوں کو ایک دوسری کی ضد کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت علی سبیل التعاقب پائی جاتی ہوں اور چونکہ ذات باری تعالیٰ جو ہریت اور جنسیت دنوں سے منزہ ہے اس لیے نہ اس کا کوئی نِدّ ہوسکتا ہے اور نہ ضد اور آیت کریمہ:

﴿وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا﴾ (۱۹۔۸۲) اور وہ ان کے دشمن اور مخالف ہوں گے۔میں ضد کے معنی دشمن اور مخالف کے ہیں۔

(ض ر ر)

اَلضُّرُّ: کے معنی بدحالی کے ہیں خواہ اس کا تعلق انسان کے نفس سے ہو، جیسے علم وفضل اور عفت کی کمی اور خواہ بدن سے ہو، جیسے کسی عضو کا ناقص ہونا یا قلت مال وجاہ کے سبب ظاہری حالت کا برا ہونا۔اور آیت کریمہ:

﴿فَكَشَفْنَا مَابِهٖ مِنْ ضُرٍّ﴾ (۲۱۔۸۴) اور جوان کو تکلیف تھی وہ دور کردی۔

میں لفظ ضُرٌّ سے تینوں معنی مراد ہوسکتے ہیں نیز فرمایا:

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ﴾ (۱۰۔۱۲) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے.......................

﴿وَاَنَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّكَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ﴾ (۱۰۔۱۲) پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں جو اسے پہنچی ہوتی ہے تو (بے لحاظ ہو جاتا ہے اور) اس طرح گزر جاتا ہے گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ ضَرَّهٗ ضَرًّا کے معنی کسی کو ضرر (گزند) پہنچانے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّا اَذًى﴾ (۳۔۱۱۱) اور یہ تمہیں خفیف سی تکلیف کے سوا کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔میں متنبہ کیا ہے کہ انہیں کفار کی طرف سے معمولی سی تکلیف کے سوا کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچے گا اور یہ کہ ان کے ضرر سے بے فکر رہیں، جیسے فرمایا:

﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (۳۔۱۰) تو ان کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

﴿وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا﴾ (۵۸۔۱۰) اس سے انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۰۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس جادو سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

﴿وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَايَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ایسے منتر سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔اور ان دونوں آیتوں:

﴿يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَضُرُّهٗ وَمَالَا يَنْفَعُهٗ﴾ (۲۲۔۱۲) یہ خدا کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے جو اسے نقصان پہنچائے اور نہ فائدہ دے سکے۔

﴿يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ﴾ (۲۲۔۱۱۳) بلکہ ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدے سے زیادہ قریب ہے۔

میں سے پہلی آیت میں نفع اور ضرر کی نفی سے مراد یہ ہے کہ وہ بے جان بُت ہیں جو قصد و ارادہ سے کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دوسری آیت میں جس ضرر کو ثابت کیا ہے اس سے وہ ضرر مراد ہے جو بتوں کی عبادت اور ان سے مدد طلب کرنے کی وجہ سے انسان کو پہنچتا

ہے نہ کہ ان کے قصد وارادہ سے اور ضَـرَّاءُ کالفظ سَـرَّاءُ اور نَـعْمَاءُ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور ضُرٌّ کالفظ نفع کے مقابلہ میں، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَـئِـنْ اَذَقْنَاهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ﴾ (۱۱۔۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

﴿وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ (۲۵۔۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں۔

اور کنایہ کے طور پر رَجُـلٌ ضَـرِيْـرٌ نابینا شخص کو کہتے ہیں اور ضَـرِيْـرُ الْوَادِيْ، وادی کے اس کنارہ کو کہتے ہیں جسے پانی سے نقصان پہنچا ہو۔

اَلضَّرَرُ: بمعنی مُضَارٌ یعنی تنگی ہے اور ضَارَرْتُهٗ کے معنی کسی کو نقصان پہنچانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ﴾ (۶۵۔۶) اور ان کو تکلیف نہ دو۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ﴾ (۲۔۲۸۲) اور کاتب دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح نقصان نہ کریں۔میں يُضَآرَّ صیغہ معروف ہونے کی صورت میں اصل میں لَا يُـضَـارِرْ ہوگا۔اور صیغہ مجہول ہونے کی صورت میں لَا يُضَارَرْ اور معنی ہوں گے کہ انہیں گواہی کے لیے بلا کر ان کے کاروبار سے روک کر انہیں نقصان نہ پہنچایا جائے اور آیت کریمہ:

﴿لَا تُـضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا﴾ (۲۔۲۳۳) اور نہ تو ماں کر اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے۔میں لَا تُضَآرَّ کو ضمہ را کے ساتھ پڑھا جائے تو خبر بمعنی امر ہوگا اور فتح را کی صورت میں صیغہ امر (یعنی) نہی ﴿ضِـرَارًا لِتَـعْتَدُوْا﴾ (۲۔۲۳۱) اور اس نیت سے انہیں نکاح میں نہ رہنے دینا چاہیے کہ انہیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔

ضَـرَّةٌ اصل میں اس کام کو کہتے ہیں جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے اور ایک مرد کی دو بیویاں ضَـرَّتَـان کہلاتی ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا ان میں ہر ایک دوسری کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے اسی معنی کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے فرمایا[1] (۱۰) ((لَا تَسْـاَلُ الْمَرْءَ ةُ طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَكْفِئَ مَافِيْ صَحْفَتِهَا)) کہ کوئی عورت اپنی بہن کے برتن کو انڈیلنے کے لیے اس کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے۔

اَلْاِضْـرَارُ: ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی لانا اور جس مرد کی ایک سے زائد بیویاں ہوں اس کو مُـضِـرٌّ کہتے ہیں اور ان میں ہر عورت دوسری کی مُضِرَّةٌ کہلاتی ہے۔

اَلْاِضْـطِـرَارُ کے اصل معنی کسی کو نقصان دہ کام پر مجبور کرنے کے ہیں اور عرف میں اس کا استعمال ایسے کام پر مجبور کرنے کے لیے ہوتا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ وہ مجبوری کسی خارجی سبب کی بنا پر ہو، مثلاً مار پٹائی کی جائے یا دھمکی دی جائے حتیٰ کہ وہ کسی کام کے کرنے پر رضا مند ہو جائے یا زبردستی پکڑ کر اس سے کوئی کام کروایا جائے جیسے فرمایا:

﴿ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ﴾ (۲۔۱۲۶) پھر اس کو عذاب دوزخ کے بھگتنے کے لیے ناچار کر دوں گا۔

﴿ثُـمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ﴾ (۳۱۔۲۴) پھر عذاب شدید کی طرف مجبور کر کے لے جائیں گے۔

دوم یہ کہ وہ مجبوری کسی داخلی سبب کی بنا پر ہو اس کی دو قسمیں ہیں (۱) کسی ایسے جذبہ کے تحت وہ کام کرے جسے نہ کرنے

[1] اخرجہ ابو داؤد فی سننہ (۱/ ۲۹۶) اصح المطابع والطبرانی عن ابن عمر (راجع کنز العمال ٤ : ٣٥٥).

سے اسے ہلاک ہونے کا خوف نہ ہو مثلاً شراب یا قمار بازی کی خواہش سے مغلوب ہو کر اس کا ارتکاب کرے (۲) کسی ایسی مجبوری کے تحت اس کا ارتکاب کرے جس کے نہ کرنے سے اسے جان کا خطرہ ہو، مثلاً بھوک سے مجبور ہو کر مردار کا گوشت کھانا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ (۲۔۱۷۳) ہاں جو ناچار ہو جائے بشرطیکہ خدا کی نا فرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اور آیت کریمہ:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ﴾ (۵۔۳) ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے، میں اضطرار کے یہی معنی ہیں اور آیت:

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾ (۲۷۔۶۲) بھلا کون بے قرار کی التجاء قبول کرتا ہے۔ میں اضطرار کا لفظ اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی اضطرار داخلی اور خارجی دونوں کو شامل ہے۔

اور اَلضَّرُوْرِيُّ کا لفظ تین طرح پر استعمال ہوتا ہے ایک وہ جو کسی دباؤ کی وجہ سے ہو مثلاً: سخت ہوا چلنے سے درخت بالضرور ہلتا ہے۔ دوم: وہ جس کے بغیر کوئی چیز باقی نہ رہ سکے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ حفظ بدن کے لیے غذا ضروری ہے۔ سوم: وہ جس کی جانب مخالف ممکن نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے: اَلْجِسْمُ الْوَاحِدُ لَا يَصِحُّ حُصُوْلُهٗ فِيْ مَكَانَيْنِ فِيْ حَالَةٍ وَّاحِدَةٍ بِالضَّرُوْرَةِ: بعض نے کہا ہے کہ ضَرَّةٌ کے معنی انگلی یا پستان کی جڑ کے ہیں۔ نیز وہ چربی جو ران سے نیچے ڈھلک پڑتی ہے اسے بھی ضَرَّةٌ کہا جاتا ہے۔

(ض ر ب)

اَلضَّرْبُ کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر واقع کرنا یعنی مارنا کے ہیں اور مختلف اعتبارات سے یہ لفظ بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے (۱) ہاتھ، لاٹھی، تلوار وغیرہ سے مارنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ (۸۔۱۲) ان کے سر مار کر اڑا دو اور ان کا پور پور مار کر توڑ دو۔

﴿فَضَرْبَ الرِّقَابِ﴾ (۴۷۔۴) تو ان کی گردنیں اڑا دو۔

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ (۲۔۷۳) تو ہم نے کہا کہ اس بیل کا سا ٹکڑا مقتول کو مارو۔

﴿اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ (۲۔۶۱) اپنی لاٹھی پتھر پر مارو۔

﴿فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ﴾ (۳۷۔۹۳) پھر ان کو داہنے ہاتھ سے مارنا اور توڑنا شروع کیا۔

﴿يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ﴾ (۸۔۵۰) ان کے مونہوں .... پر مارتے ہیں۔

(۲) اور ضَرْبُ الْاَرْضِ بِالْمَطَرِ کے معنی بارش برسنے کے ہیں (۳) اور ضَرْبُ الدَّرَاهِمِ (دراہم کو ڈھالنا) کا محاورہ اَلضَّرْبُ بِالْمِطْرَقَةِ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے۔ اور ٹکسال کے سکہ میں اثر کرنے کی مناسبت سے طَبْعُ الدِّرْهَمِ کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر انسان کی عادت کو ضَرِيْبَةٌ اور طَبِيْعَةٌ بھی کہہ دیتے ہیں۔

ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ کے معنی سفر کرنے کے ہیں کیونکہ انسان پیدل چلتے وقت زمین پر پاؤں رکھتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ (۴۔۱۰۱) اور جب سفر کو جاؤ۔

﴿وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۔۱۵۶) اور ان کے مسلمان بھائی جب خدا کی راہ میں سفر کریں......تو ان کی نسبت کہتے ہیں۔
﴿لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۔۲۷۳) اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہی معنی آیت:
﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ﴾ (۲۰۔۷۷) کے ہیں یعنی انہیں سمندر میں (خشک) راستے سے لے جاؤ۔
ضَرَبَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ: (نر کا مادہ سے جفتی کرنا) یہ محاورہ ضَرَبَ بِالْمِطْرَقَةِ (ہتھوڑے سے کوٹنا) کی مناسبت سے طَرَقَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کا محاورہ بولا جاتا ہے۔
ضَرْبُ الْخَیْمَةِ: خیمہ لگانا۔ کیونکہ خیمہ لگانے کے لیے میخوں کو زمین میں ہتھوڑے سے ٹھونکا جاتا ہے اور خیمہ کی مناسبت سے آیت: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ (۲۔۶۱) اور (آخر کار) ذلت......ان سے چمٹا دی گئی۔ میں ذِلَّةٌ کے متعلق ضَرَبَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذلت نے انہیں اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا جیسا کہ کسی شخص پر خیمہ لگا ہوا ہوتا ہے اور یہی معنی آیت:
﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الْمَسْکَنَةُ﴾ (۳۔۱۱۲) اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے۔ کے ہیں اور آیت کریمہ:
﴿فَضَرَبْنَا عَلٰۤی اٰذَانِهِمْ فِی الْکَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا﴾ (۱۸۔۱۱) تو ہم نے غار میں کئی سال تک ان کے کانوں پر نیند کا پردہ ڈالے (یعنی ان کو سلائے) رکھا۔ نیز آیت کریمہ:
﴿فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ﴾ (۵۷۔۱۳) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔ میں ضَرْبٌ کا لفظ ضَرْبَ الْخَیْمَةَ کے محاورہ سے مستعار ہے۔ ضَرْبُ الْعُوْدِ وَالنَّایِ وَالْبُوْقِ: عود اور نے بجانا یا نرسنگھے میں پھونکنا۔
ضَرْبُ اللَّبِنِ: اینٹیں چننا، ایک اینٹ کو دوسری پر لگانا ضَرْبُ الْمَثَلِ کا محاورہ ضَرْبُ الدَّرَاهِمِ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی بات کو اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے:
﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا﴾ (۳۹۔۲۹) خدا ایک مثال بیان فرماتا ہے۔
﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا﴾ (۳۶۔۱۳) اور ان سے......قصہ بیان کرو۔
﴿ضَرَبَ لَکُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ﴾ (۳۰۔۲۸) وہ تمہارے لیے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔
﴿وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ﴾ (۳۰۔۵۸) اور ہم نے......ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔
﴿وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا﴾ (۴۳۔۵۷) اور جب مریم کے بیٹے (عیسیٰؑ) کا حال بیان کیا گیا۔
﴿مَا ضَرَبُوْهُ لَکَ اِلَّا جَدَلًا﴾ (۴۳۔۵۸) انہوں نے عیسیٰ کی جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔
﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (۱۸۔۴۵) اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کر دو۔
﴿اَفَنَضْرِبُ عَنْکُمُ الذِّکْرَ صَفْحًا﴾ (۴۳۔۵) بھلا (اس لیے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو) ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے۔
اَلْمُضَارَبَةُ: ایک قسم کی تجارتی شرکت (جس میں ایک شخص کا

سرمایہ اور دوسرے کی محنت ہوتی ہے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں) اَلْمُضَرَّبَةُ: (دلائی رضائی) جس پر بہت سی سلائی کی گئی ہو۔ اَلتَّضْرِيْبُ: اکسانا۔ گویا اسے زمین میں سفر کی ترغیب دی جاتی ہے۔

اَلْاِضْطِرَابُ: کثرت سے آنا جانا، حرکت کرنا یہ معنی ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ سے ماخوذ ہیں۔

اِسْتَضْرَبَ النَّاقَةَ: سانڈھ نے ناقہ پر جفتی کھانے کی خواہش کی۔

(ض ر ع)

اَلضَّرْعُ: اونٹنی اور بکری وغیرہ کے تھن۔

اَضْرَعَتِ الشَّاةُ: قرب ولادت کی وجہ سے بکری کے تھنوں میں دودھ اتر آیا، یہ اَتْمَرَ وَاَلْبَنَ کی طرح کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: زیادہ دودھ یا کھجوروں والا ہونا۔ اور شَاةٌ ضَرِيْعٌ کے معنی بڑے تھنوں والی بکری کے ہیں۔ مگر آیت کریمہ:

﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّامِنْ ضَرِيْعٍ﴾ (۸۸۔۶) اور خار جھاڑ کے سوا ان کے لیے کوئی کھانا نہیں ہوگا میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ضَرِيْعٌ سے خشک شبرق مراد ہے۔[1] اور بعض نے سرخ بدبودار گھاس مراد لی ہے جسے سمندر باہر پھینک دیتا ہے۔[2] بہر حال جو معنی بھی کیا جائے اس سے کسی مکروہ چیز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ضَرَعَ الْبُهْمُ: چوپایہ کے بچہ نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لیا بعض کے نزدیک اسی سے ضَرَعَ الرَّجُلُ ضَرَاعَةً کا محاورہ ہے جس کے معنی کمزور ہونے اور ذلت کا اظہار کرنے کے ہیں۔ اَلضَّارِعُ وَالضَّرِعُ (صفت فاعلی) کمزور اور نحیف آدمی۔ تَضَرَّعَ: اس نے عجز وتذلل کا اظہار کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ (۶۔۶۳) عاجزی اور نیاز پنہانی سے۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ (۶۔۴۲) تاکہ عاجزی کریں۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ﴾ (۷۔۹۴) تاکہ وہ عاجزی (اور زاری) کریں۔

یہ اصل میں يَتَضَرَّعُوْنَ ہے تاء کو ضاد میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿فَلَوْلَا اِذْجَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوْا﴾ (۶۔۴۳) تو جب ان پر ہمارا عذاب آتا رہا کیوں نہیں عاجزی کرتے رہے۔

اَلْمُضَارَعَةُ: کے اصل معنی ضَرَاعَةَ یعنی عجز وتذلل میں باہم شریک ہونے کے ہیں۔ پھر محض شرکت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اسی سے علماء نحو نے الفعل المضارع کی اصطلاح قائم کی ہے کیونکہ اس میں دو زمانے پائے جاتے ہیں۔

(ض ع ف)

اَلضَّعْفُ: (کمزوری) یہ اَلْقُوَّةُ کے بالمقابل آتا ہے۔ ضَعُفَ فَهُوَ ضَعِيْفٌ کمزور ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ﴾ (۲۲۔۷۳) طالب اور مطلوب یعنی (عابد اور معبود دونوں) گئے گزرے ہیں اور اَلضَّعْفُ: رائے کی کمزوری پر بھی بولا جاتا ہے اور بدن اور حالت کی کمزوری پر بھی۔ اور اس میں ضَعْفٌ اور ضُعْفٌ دو لغت ہیں قرآن پاک میں ہے:

[1] قاله مجاهد و نسب بعضهم الى الفراء راجع العينى شرح البخارى: (ص ۲٦٥ ج ۱۹).

[2] كذا قال الخليل العينى شرح البخارى: (ص۲٦٥، ج۱۹).

﴿وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا﴾ (۸۔۶۶) اور معلوم کرلیا کہ ابھی تم میں کس قدر کمزوری ہے۔

خلیل کا قول ہے کہ اَلضَّعِيْفُ عقل ورائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضُعْفٌ بدنی کمزوری کو، چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا﴾ کالفظ ضَعْفٌ سے مشتق ہے اور ضَعِيْفٌ کی جمع ضِعَافٌ اور ضُعَفَاءُ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ﴾ (۹۔۹۱) کمزوروں پر (کچھ گناہ) نہیں ہے۔

اِسْتَضْعَفْتُهٗ: میں نے اسے کمزور سمجھا، حقیر جانا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ (۲۸۔۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جنہیں ملک میں کمزور سمجھا گیا ہے ان پر احسان کریں۔

﴿وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ﴾ (۴۔۷۵) اور ان بے بس مردوں عورتوں اور بچوں ....

﴿قَالُوْا فِيْمَا كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (۴۔۹۷) تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز اور ناتواں تھے۔

﴿اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ﴾ (۷۔۱۵۰) کہ لوگ تو مجھے کمزور سمجھتے تھے۔اور آیت کریمہ:

﴿يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا﴾ (۳۴۔۳۳) اور کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے، میں اِسْتِضْعَاف اِسْتِكْبَارٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا﴾ (۳۰۔۵۴) خدا ہی تو ہے جس نے تمہیں (ابتداء میں) کمزور حالت میں پیدا کیا پھر کمزوری کے بعد طاقت عنایت کی پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا۔

میں پہلے ضُعْف سے نطفہ یا مٹی مراد ہے اور دوسری جگہ اس سے وہ کمزوری مراد ہے جو جنین یا طفولیت کے زمانہ میں پائی جاتی ہے اور تیسرے سے وہ ضعف مراد ہے جو بڑھاپے کی عمر میں انسان کو لاحق ہوتا ہے۔جس کی طرف کہ آیت اَرْذَلِ الْعُمَرِ میں اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح پہلی جگہ قُوَّةً سے وہ قوت مراد ہے جو بچے کو حرکت کرنے، ہدایت پانے، دودھ مانگنے اور روکر اپنے آپ سے تکلیف کو دفع کرنے کے لیے عطا کی جاتی ہے اور دوسری جگہ قُوَّةٍ سے مراد وہ قوت ہے جو بلوغت کے بعد عطا ہوتی ہے اور آیت کریمہ میں ضَعْفٌ کو نکرہ لانا اس بات کی دلیل ہے کہ ہر جگہ ضَعْفٌ سے ایک ایسی حالت کی طرف اشارہ ہے جو پہلی حالت کی غیر ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اسم نکرہ کو مکرر لاکر اگر پہلا معنیٰ مقصود ہو تو اسے معرفہ بنالیا جاتا ہے جیسے رَأَيْتُ رَجُلًا فَقَالَ لِي الرجل كذا۔ مگر جب اس نکرہ کو دوبارہ نکرہ ہی لایا جائے تو پہلے معنیٰ کا غیر مراد ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ:

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ (۹۴:۵۔۶) کی تفسیر میں فرمایا: لَنْ يَّغْلِبَ عُسْرٌ

يُسْرَيْنِ کو دو یسر پر ایک عسر غالب نہیں آ سکتا۔ ❶

اور آیت کریمہ: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾ (۴۔۲۸) اور انسان (طبعًا) کمزور پیدا ہوا ہے، میں ضَعِيفًا کے لفظ سے انسان کی شدت احتیاج کی طرف اشارہ ہے جس سے کہ "ملا اعلیٰ" مستغنی ہوتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ (۴۔۷۶) (ڈرو مت) کیونکہ شیطان کا داؤ کمزور ہوتا ہے۔ میں شیطانی فریب کے کمزور ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے بندوں پر اس کی تدابیر کارگر نہیں ہوسکتیں جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (۱۷۔۶۵) جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

اَلضِّعْفُ: یہ اسمائے متضایفہ سے ہے یعنی وہ الفاظ جو اپنے مفہوم و معنی کے تحقق میں ایک دوسرے پر موقوف ہوتے ہیں جیسے نِصْفٌ زَوْجٌ اور ضِعْفٌ (دگنا) کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ اس کے مثل کا مل جانا اور یہ اسم عدد کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اَضْعَفْتُ الشَّيْءَ وَضَعَّفْتُهٗ وَضَاعَفْتُهٗ کے معنی ہیں: کسی چیز کو دوچند کر دینا۔ بعض نے کہا ہے کہ ضَاعَفْتُ (مفاعلہ) میں ضَعَّفْتُ (تفعیل) سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر قراء نے آیت کریمہ: ﴿يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ (۳۳۔۳۰) ان کو دگنی سزا دی جائے گی۔

اور آیت: ﴿وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضَاعِفْهَا﴾ (۴۔۴۰) اور اگر نیکی (کی) تو اس کو دوچند کر دے گا، میں يُضَاعِفْ (مفاعلہ) پڑھا ہے اور کہا ہے کہ اس سے نیکیوں کے دس گنا ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (۶۔۱۶۷) سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ضَعَفْتُهٗ ضَعْفًا فَهُوَ مَضْعُوْفٌ: تخفیف عین کے ساتھ آتا ہے اس صورت میں ضَعْفٌ مصدر ہوگا۔ اور ضِعْفٌ اس جیسا کہ شَيْءٌ اور شِيْءٌ ہے اس اعتبار سے ضِعْفُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں: کسی چیز کی مثل اتنا ہی اور، جس سے وہ چیز دگنی ہو جائے اور جب اس کی اضافت اسم عدد کی طرف ہو تو اس سے اتنا ہی اور عدد یعنی دوچند مراد ہوتا ہے۔ لہٰذا ضِعْفُ الْعَشْرَةِ اور ضِعْفُ الْمِائَةِ کے معنی بلا اختلاف بیس اور دوسو کے ہوں گے چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ❷ (الطویل)

(۲۸۵) جزيتُكَ ضِعْفَ الوِدِّ لما اشْتَكَيْتَهٗ ...... وَمَا ان جَزَاكَ الضِّعْفَ مِنْ اَحَدٍ قَبْلِيْ جب تو نے محبت کے بارے میں شکایت کی تو میں نے تمہیں دوستی کا دوچند بدلہ دیا اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہیں دوچند بدلہ نہیں دیا۔

❶ رواه اصحاب الآثار عن ابن مسعودؓ مرفوعاً راجع الشوكاني (٤٦٣/٥) قال في الكشاف و عن ابن عباس مثله ولم اجده قال الحافظ في تخريجه: ذكرها الفراء عن ابن الكلبي عن ابي صالح عنه و بمعناه مروى عن انس قال السيوطي و سنده ضعيف والصحيح عن الحسن به مرسلاً رواه عبدالرزاق عن معمر و عن طريقه اخرجه الحاكم والبيهقي في الشعب وله طريق اخرى اخرجها ابن مردويه من رواية عطية عن جابر موصولا واسناده ايضاً ضعيف و في المؤطا عن زيد بن اسلم عن ابيه ان عمر بن الخطاب كتب اليه وقال في الكتاب ولن يغلب عسر يسرين وهذا اصح طرقه راجع تخريج الكشاف للحافظ (١٨٥-١٨٦) رقم ٣٣٢ و تفسير ابن كثير (٤: ٥٢٥-٥٢٦) والطبرى ٣٠/٢٣٥-٢٣٦).

❷ قاله ابو ذؤيب الهذلي وفي اللسان (ضعف) لما استنيته والبيت في ديوان الهذليين (١: ٣٥) والمجاز لابي عبيدة (٤٩/١، ٢٢٣٦/٢: ٢٣٢) والمحكم (ضعف) وفي روايتها لما استشبة اى استغللته وفي المجاز الحب بدل الود والصاحي ١٧٣ و فيه شاهد على ان لفظة من يأتي زائدة.

اور اَعْطِهٗ ضِعْفَی وَاحِدٍ کے معنی یہ ہیں کہ اسے سہ چند دے دو کیونکہ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ ایک اور اس کے ساتھ دو اور دے دو اور یہ کل تین ہو جاتے ہیں مگر یہ معنی اس صورت میں ہوں گے جب ضِعْفٌ کا لفظ مضاف ہو ورنہ بدوں اضافت کے ضعفین کے معنی تو زجین کی طرح دوگنا ہی ہوں گے لیکن جب واحد کی طرف مضاف ہو کر آئے تو تین گنا کے معنی ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ﴾ (۳۴۔۳۷) ایسے لوگوں کو دوگنا بدلہ ملے گا۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ﴾ (۷۔۳۸) تو ان کو آتش جہنم کا دوگنا عذاب دے۔

میں دوگنا عذاب مراد ہے یعنی دوزخی، باری تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے کہ جن لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا انہیں ہم سے دوگنا عذاب دیا جائے ایک تو ان کے خود گمراہ ہونے کا اور دوسرے ہمیں گمراہ کرنے کا جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ﴾ (۱۶۔۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے اعمال کے پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی اُٹھائیں گے۔

سے مفہوم ہوتا ہے پھر اس کے بعد ﴿لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ﴾ (۷۔۳۸) کہہ کر بتایا کہ ان میں سے ہر ایک کو تم سے دگنا عذاب دیا جائے گا۔

بعض نے اس کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ تم اور ان میں سے ہر ایک کو اس سے دگنا عذاب ہو رہا ہے جتنا کہ دوسرے کو نظر آ رہا ہے۔

کیونکہ عذاب دو قسم پر ہے ظاہری اور باطنی۔ ظاہری عذاب تو ایک دوسرے کو نظر آئے گا مگر باطنی عذاب کا ادراک نہیں کر سکیں گے اور سمجھیں گے کہ انہی اندرونی طور پر کچھ بھی عذاب نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہ باطنی عذاب میں بھی مبتلا ہوں گے۔

اور آیت: ﴿لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ (۳۔۱۳۰) بڑھ چڑھ کر سود در سود نہ کھاؤ۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَضْعَافًا کے بعد مُضَاعَفَةً کا لفظ بطور تاکید لایا گیا ہے مگر بعض نے کہا ہے کہ مُضَاعَفَةً کا لفظ ضَعْفٌ (بفتح الضاد) سے ہے جس کے معنی کمی کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ سود، جسے تم افزونی اور بیشی سمجھ رہے ہو یہ دراصل بڑھانا نہیں ہے بلکہ کم کرنا ہے جیسے فرمایا:

﴿یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ﴾ (۲۔۲۷۶) کہ اللہ تعالیٰ سود کو کم کرتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطویل)

(۲۸۲) زِیَادَةُ شَیْبٍ وَهِیَ نَقْصُ زِیَادَتِیْ

کہ بڑھاپے کی افزونی دراصل عمر کی کمی ہے۔

(ض غ ث)

اَلضِّغْثُ: ریحان، خشک گھاس یا شاخیں جو انسان کی مٹھی میں آجائیں اس کی جمع اَضْغَاثٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿خُذْ بِیَدِكَ ضِغْثًا﴾ (۳۸۔۴۴) اپنے ہاتھ میں مٹھی بھر گھاس لو۔

---

[1] قاله المتنبی فی قصیدة له ۳٦ بیتا یمدح فیها احمد بن الحسین ابو الفرج القاضی المالکی (۷۷۔۸۰) مطلعها: لحنیة ام غادةٍ رفع السجف لوحشیة لاما لوحشیة شنف و عجزه وقوة عشق وهی من قوتی ضعف والبیت فی دیوان (۷۷) (طبعة هندیه مصر ۱۳٤۲)۔

اسی سے ایسے خواب کو، جو ملتبس سا ہو اور اس کا مطلب واضح نہ ہو، اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ﴾ (۱۲۔۴۴) انہوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔

یعنی پریشان اور بے معنی خوابوں کے پلندے ہیں۔

(ض غ ن)

اَلضِّغْنُ وَالضَّغْنُ: سخت کینہ اور انتہائی بغض۔ اس کی جمع اَضْغَانٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ﴾ (۴۷۔۲۹) کہ خدا ان کے کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا۔

پھر بطور تشبیہ اس اونٹنی کو جو بدوں مار پٹائی کے صحیح حال نہ چلے اسے نَاقَةٌ ذَاتُ ضِغْنٍ کہا جاتا ہے اسی طرح ٹیڑھے نیزے کو قَنَاةٌ ضَغِنَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

اَلْاِضْغَانُ: (افعال) کپڑا یا اسلحہ وغیرہ پہن کر اس میں مستور ہو جانا۔

(ض ل ل)

اَلضَّلَالُ: کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے ہیں۔ اور یہ ہدایت کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا﴾ (۱۷۔۱۵) جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے اختیار کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا۔

اور ضَلَالٌ کا لفظ ہر قسم کی گمراہی پر بولا جاتا ہے یعنی وہ گمراہی قصداً ہو یا سہواً، معمولی ہو یا زیادہ۔ کیونکہ طریق مستقیم، جو پسندیدہ راہ ہے......... پر چلنا نہایت دشوار امر ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶ (۱۱) ((اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا)) کہ استقامت اختیار کرو اور تم پورے طور پر اس کی نگہداشت نہیں کر سکو گے۔

حکماء نے کہا ہے کہ صحت وراستی کی راہ تو صرف ایک ہی ہے مگر گمراہی کے متعدد راستے ہیں کیونکہ استقامت اور صواب کی مثال تیر کے ٹھیک نشانہ پر بیٹھ جانے کی ہے اور صحیح نشانہ کے علاوہ ہر جہت کا نام ضلالت ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید بعض صالحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جناب کے اس فرمان کے کیا معنی ہیں: ❷ (۱۲) ((شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَةُ هُوْدٍ وَّاَخَوَاتُهَا)) کہ سورہ ہود اور اس کی ہم مثل دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: سورہ ہود کی جس آیت نے مجھے بوڑھا کر دیا وہ آیت: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ﴾ (۱۱۔۱۱۲) ہے یعنی اے پیغمبر!

---

❶ (حم، ك هق) عن ثوبان (طب) عن ابن عمرو (طب) عن سلمة ابن الاكوع (الفتح الربانی ج۱، ص۱۸۱).

❷ الحدیث فی ابن مردویه عن انس (وفی الطبرانی عن ابی بکرؓ و ابن عساکر عن محمد بن علی مرسلاً) هود واخواتها بغیر لفظ السورة والحدیث ایضاً فی الکشاف راجع تخریج الکشاف ۸۷ رقم ۱۹۵ وفی تخریج العراقی۔ اخرجه الترمذی فی الشمائل من حدیث ابن جحیفة وللحاکم من حدیث ابن عباس نحوه قال الترمذی حسن و قال الحاکم صحیح علی شرط البخاری (۲۹۷/۲ و ۱۷۰/۴) و قد اطال الکلام علیه الدار قطنی فی العلل و فی الکامل لابن عدی من روایة یزید الرقاشی عن انسؓ ولیس فیه ذکر هود واخواتها بل الواقعه والقارعة وغیرها من السور.

ٹھیک اسی طرح سیدھے رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ جب کہ ضلال کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے ہیں، خواہ وہ ہٹنا عمداً ہو یا سہواً، تھوڑا ہو یا زیادہ۔ تو جس سے بھی کسی قسم کی غلطی سرزد ہوگی اس کے متعلق ہم ضلالت کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام اور کفار دونوں کی طرف ضلالت میں بون بعید پایا جاتا ہے۔ دیکھئے آنحضرت ﷺ کو آیت کریمہ:

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ (۹۳۔۷) میں ضالاً فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہدایت نبوت کے عطا ہونے سے قبل تم اس راہ نمائی سے محروم تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ان کی اولاد کا یہ کہنا: ﴿اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ﴾ (۱۲۔۹۵) کہ آپ اسی پرانی غلطی میں (مبتلا) ہیں۔ یا یہ کہنا: ﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۱۲۔۸) کچھ شک نہیں کہ ابا صریح غلطی پر ہیں۔ تو ان آیات میں ضلال سے مراد یہ ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی محبت اور ان کے اشتیاق میں سرگرداں ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۱۲۔۳۰) اس کی محبت ان کے دل میں گھر کر گئی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صریح گمراہی میں ہیں۔ میں بھی ضلال مبین سے والہانہ محبت مراد ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ (۲۶۔۲۰) اور میں خطا کاروں میں تھا۔

میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ضال ہونے کا اعتراف کر کے اشارہ کیا ہے کہ قتل نفس کا ارتکاب مجھ سے سہواً ہوا تھا۔ اور آیت: ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا﴾ (۲۔۲۸۲) اور اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی۔ میں تَضِلَّ کے معنی بھول جانا کے ہیں اور یہی وہ نسیان ہے جسے عفو قرار دیا گیا ہے۔ [1] ایک دوسرے اعتبار سے ضَلَالَۃٌ کی دو قسمیں ہیں (۱) علوم نظریہ یعنی توحید ونبوات وغیرہما کی معرفت میں غلطی کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ (۴۔۱۳۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور روز قیامت سے انکار کرے وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑا۔ میں اس قسم کی گمراہی کو ضَلٰلًا بَعِيْدًا کہا گیا ہے۔

(۲) علوم عملیہ میں ضلالۃ ہے جس کے معنی ہیں احکام شرعیہ یعنی عبادات اور معاملات کی معرفت میں غلطی کرنا اور آیت مذکورہ میں ضَلٰلًا بَعِيْدًا سے اس کے کفر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت کے ابتداء وَمَنْ يَّكْفُرْ اور آیت: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ (۴۔۱۶۷) جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسروں کو خدا کے رستے سے روکا، وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑے، سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت: ﴿فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ﴾ (۳۴۔۸) میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور فِيْ کے معنی یہ ہیں کہ اس گمراہی کی سزا میں گرفتار ہوں گے اور یہی معنی آیت: ﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ﴾ (۶۷۔۹) میں مراد ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ (۵۔۷۷) جو (خود بھی) پہلے خود گمراہ ہوئے اور بھی بہت کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک

---

[1] ای فی الحدیث: رُفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرہ ھو علیہ (الطبرانی عن ثوبان).

گئے۔اور آیت کریمہ:

﴿ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۲۔۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جب مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائیں گے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ (۱۔۷) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی﴾ (۲۰۔۵۲) کے معنی ہیں: لَا یَضِلُّ عَنْ رَبِّیْ وَلَا یَضِلُّ رَبِّی عَنْهُ ہیں یعنی میرے پروردگار کو کوئی چیز غافل نہیں کرتی اور آیت:

﴿اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ﴾ (۱۰۵۔۲) کیا ان کی تدبیر کو ضائع نہیں کیا گیا۔

میں فِیْ تَضْلِیْلٍ کے معنی ضائع کر دینا اور غلط راہ پر لگا دینا کے ہیں

اَلْاِضْلَالُ (یعنی دوسرے کو گمراہ کرنے کی دو صورتیں ہو سکتیں ہیں۔ایک یہ کہ اس کا سبب خود اپنی ضلالت ہو۔یہ دو قسم پر ہے:

(۱) ایک یہ کہ کوئی چیز ضائع ہو جائے۔مثلاً: کہا جاتا ہے اَضْلَلْتُ الْبَعِیْرَ: میرا اونٹ کھو گیا۔

(۲) دوم کہ دوسرے پر ضلالت کا حکم لگانا ان دونوں صورتوں میں اِضْلَالٌ کا سبب ضَلَالَۃٌ ہی ہوتی ہے۔دوسری صورت اِضْلَال کی پہلی کے برعکس ہے،یعنی اضلال بذاتہٖ ضلالۃ کا سبب بنے اسی طرح پر کہ کسی انسان کو گمراہ کرنے کے لیے باطل اس کے سامنے پر فریب اور جاذب انداز میں پیش کیا جائے جیسے فرمایا:

﴿لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ (۴۔۱۱۳) ان میں سے ایک جماعت تم کو بہکانے کا قصد کر ہی چکی تھی اور یہ اپنے سوا کسی کو بہکا نہیں سکتے۔

یعنی وہ اپنے اعمال سے تجھے گمراہ کرنے کی کوشش میں ہیں مگر وہ اپنے اس کردار سے خود ہی گمراہ ہو رہے ہیں۔اور شیطان کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ﴾ (۴۔۱۱۹) اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا۔

اور شیطان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْرًا﴾ (۳۶۔۶۲) اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

﴿وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا﴾ (۴۔۶۰) اور شیطان تو چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر رستے سے دور ڈال دے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (۳۸۔۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی۔

اللہ تعالیٰ کے انسان کو گمراہ کرنے کی دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں (۱) ایک یہ کہ اس کا سبب انسان کی خود اپنی ضلالت ہو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف اضلال کی نسبت کے یہ معنی ہوں گے کہ جب انسان ازخود گمراہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں اس پر گمراہی کا حکم ثبت ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آخرت کے دن اسے جنت کے راستہ سے ہٹا کر دوزخ کے راستہ پر ڈال دیا جائے گا۔

(۲) اور اللہ تعالیٰ کی طرف اِضلال کی نسبت کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے انسان کی جبلت ہی کچھ اس قسم کی بنائی ہے کہ جب انسان کسی اچھے یا برے راستہ کو اختیار کر لیتا ہے تو اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور

اسے اچھا سمجھنے لگتا ہے اور آخر کار اس پر اتنی مضبوطی سے جم جاتا ہے کہ اس راہ سے ہٹانا یا اس کا خود اسے چھوڑ دینا دشوار ہو جاتا ہے اور وہ اعمال اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں اسی اعتبار سے کہا گیا ہے کہ عادت "طبیعہ ثانیہ" ہے۔

پھر جب انسان کی اس قسم کی فطرت اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اور دوسرے مقام پر ہم بیان کر چکے ہیں کہ فعل کی نسبت اس کے سبب کی طرف بھی ہو سکتی ہے لہٰذا اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی سکتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کر دیا ورنہ باری تعالیٰ کے گمراہ کرنے کے وہ معنی نہیں ہیں جو عوام جہلاء سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت اسی جگہ کی ہے جہاں کافر اور فاسق لوگ مراد ہیں نہ کہ مومن بلکہ حق تعالیٰ نے مؤمنین کو گمراہ کرنے کی اپنی ذات سے نفی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدَاهُمْ﴾ (۹۔۱۱۵) اور خدا ایسا نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے۔

﴿فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيْهِمْ﴾ (۴۷۔۴) ان کے عملوں کو ہرگز ضائع نہ کرے گا بلکہ ان کو سیدھے رستے پر چلائے گا۔

اور کافر اور فاسق لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۸) ان کے لیے ہلاکت ہے اور وہ ان کے اعمال کو برباد کر دے گا۔

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ﴾ (۲۔۲۶) اور گمراہ بھی کرتا ہے تو نافرمانوں ہی کو۔

﴿كَذَالِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكَافِرِيْنَ﴾ (۴۰۔۷۴) اسی طرح خدا کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔

﴿وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِيْنَ﴾ (۱۴۔۲۷) اور خدا بے انصافوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ﴾ (۶۔۱۱۱) اور ہم ان کے دلوں کو الٹ دیں گے۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (۲۔۷) خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے۔

﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ (۲۔۱۰) ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔

میں دلوں کے پھیر دینے اور ان پر مہر لگا دینے اور ان کی مرض میں اضافہ کر دینے سے بھی یہی معنی مراد ہیں۔

(ض م م)

اَلضَّمُّ: (ن) کے معنی دو بارہ سے زیادہ چیزوں کو باہم ملا دینا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ﴾ (۲۰۔۲۲) اور تم اپنے بازو کو اپنی بغل سے لگا لو۔

﴿وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ﴾ (۲۸۔۳۲) اور بازو کو سمٹائے رکھو۔

اَلْاِضْمَامَةُ: لوگوں کی جماعت، کتابوں کا بنڈل، گھاس وغیرہ کا گٹھا۔

اَسَدٌ ضَمْضَمٌ وَضَمَاضِمٌ: اس شیر کو کہتے ہیں جو ہر چیز کو اپنی ذات کے لیے اکٹھا کرنے والا ہو۔ بعض نے اس کے معنی قوی اور مضبوط بھی کئی ہیں۔

فَرَسٌ سَبَّاقُ الْاَضَامِيْمِ: وہ گھوڑا جو بیک وقت گھوڑوں کی ایک جماعت سے سبقت لے جانے والا ہو۔

(ض م ر)

اَلضَّامِرُ: اس چھریرے گھوڑے کو کہتے ہیں جس کا دبلا پن لاغری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس ریاضت کی وجہ سے ہو جو سدھانے کے لیے اس سے کرائی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ﴾ (۲۲۔۲۷) دبلی سواریوں پر۔

ضَمَرَ ضُمُوْرًا وَاضْطَمَرَ فَهُوَ مُضْطَمِرٌ کے معنی لاغر ہو جانا کے ہیں۔ اور ضَمَّرْتُهٗ کے معنی لاغر کر دینا کے۔

اَلْمِضْمَار: گھوڑ دوڑ کا میدان جہاں گھوڑوں کو دوڑانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

اَلضَّمِيْرُ: وہ بات جو تمہارے دل میں ہو اور اس پر اطلاع پانا دشوار ہو اسی وجہ سے کبھی ضمیر کا لفظ قوت حافظہ پر بھی بولا جاتا ہے۔

(ض ن ن)

اَلضِّنَّةُ (س) کے معنی کسی پسندیدہ اور مرغوب شے سے بخل کرنا کے ہیں۔ اس سے عِلْقٌ مَضَنَّةٌ وَمَضِنَّةٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ نفیس چیز جس پر بخل کیا جائے۔ فُلَانٌ ضِنِّيْ بَيْنَ اَصْحَابِيْ: میرے ساتھیوں میں سے فلاں اس قابل ہے کہ اس پر بخل کیا جائے اور یہ باب ضَرَبَ وَسَمِعَ دونوں سے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: ضَنَنْتُ بِالشَّيْءِ ضَنًّا وَضَنَانَةً وَضَنِنْتُ: اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ﴾ (۸۱۔۲۴) کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے جو وحی ملتی ہے وہ اس (کے عام کرنے) میں بخل نہیں کرتے۔

(ض ن ک)

اَلضَّنْكُ (ک) کے معنی کسی مقام یا معیشت کی تنگی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ (۲۰۔۱۲۴) ان کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہے: ضَنُكَ عَيْشُهٗ: اس کی معیشت تنگ ہو گئی۔ اِمْرَاَةٌ ضِنَاكٌ گھٹیلے جسم والی عورت۔ نیز ضِنَاكٌ کے معنی زکام بھی آجاتے ہیں۔ اس سے زکام زدہ آدمی کو مَضْنُوْكٌ کہا جاتا ہے۔

(ض ھ ی)

اَلْمُضَاهَاةُ۔ کے معنی مشابہ اور مشاکلت کے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۹۔۳۰) یہ بھی انہی جیسی باتیں کرتے ہیں۔

میں یُضَاهُوْنَ کے معنی يُشَاكِلُوْنَ ہیں۔ یعنی دوسروں کے مشابہ اور ہم شکل ہونا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل مہموز ہے اور اس میں ایک قرأت (يُضَاهِئُوْنَ) ہمزہ کے ساتھ بھی منقول ہے۔[1]

اِمْرَءَةٌ ضَهْيَاءُ: وہ عورت جسے حیض نہ آتا ہو اس کی جمع ضُهْيٌ آتی ہے۔

(ض و ء)

اَلضُّوْءُ: کے معنی نور اور روشنی کے ہیں ضَائَتِ النَّارُ وَاَضَائَتْ: آگ روشن ہو گئی اور اَضَائَتْ (افعال) کے معنی روشن کرنا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا اَضَائَتْ مَاحَوْلَهٗ﴾ (۲۔۱۷) جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کر دیں۔

---

[1] قراءة عاصم وعلى الاول اكثر القراء والحمل (۲/۳۲۹).

﴿كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْفِيْهِ﴾ (۲۔۲۰) جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

﴿يَاْتِيْكُمْ بِضِيَاءٍ﴾ (۲۸۔۷۱) جو تم کو روشنی لادے۔

اور سماوی کتابوں کو جو انسان کی رہنمائی کرنے لیے نازل کی گئی ہیں۔ ضِيَاءٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ (تورات کے متعلق) فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَّذِكْرٰى﴾ (۲۱۔۴۸) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت اور گمراہی میں) فرق کر دینے والی اور (سرتاپا) روشنی اور نصیحت (کی کتاب) عطا کی۔

(ض ی ر)

اَلضَّيْرُ: (ض) کے معنی مضرت اور گزند کے ہیں اور ضَارَّهٗ وَضَرَّهٗ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی کو نقصان اور تکلیف پہنچانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ (۲۶۔۵۰) کچھ نقصان (کی بات) نہیں ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اور فرمایا:

﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (۳۔۱۲۰) ان کا فریب تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

(ض ی ز)

آیت کریمہ: ﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ (۵۳۔۲۲) میں ضِيْزٰى کے معنی ناقص اور بے انصافی کے ہیں۔ یہ اصل میں ضُيْزٰى بروزن فُعْلٰى ہے۔ یاء کی مناسبت سے ضاد کو مکسور کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ بقول بعض کلام عرب میں فُعْلٰى کے وزن پر اسم صفت نہیں آتا۔ [1]

(ض ی ع)

ضَاعَ (ض) اَلشَّيْءُ ضَيَاعًا کے معنی ہیں: کسی چیز کا ہلاک اور تلف کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ﴾ (۳۔۱۹۵) اور (فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔

﴿اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا﴾ (۱۸۔۳۰) ہم نیک عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ (۲۔۱۴۳) اور خدا ایسا نہیں جو تمہارے عمل کو یونہی کھودے۔

﴿لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۲۰) خدا نیک کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

ضَيْعَةُ الرَّجُلِ: کے معنی جائیداد کے ہیں کیونکہ اگر اس کی نگہداشت نہ کی جائے تو وہ ضائع ہو جاتی ہے، اس کی جمع ضِيَاعٌ آتی ہے تَضِيْعُ الرِّيْحِ: ہوا کا اس قدر تند ہونا کہ جس چیز پر سے گزرے اسے تلف کرتی چلی جائے۔

(ض ی ف)

اَلضَّيْفُ: (ض) دراصل اس کے معنی کسی جانب مائل ہونا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ضِفْتُ اِلٰى كَذَا میں اس کی طرف مائل ہوا اَضَفْتُ كَذَا اِلٰى كَذَا: اسے ایک طرف مائل کر دیا۔

ضَافَتِ الشَّمْسُ لِلْغُرُوْبِ وَتَضَيَّفَتْ: سورج مائل بغروب ہو گیا۔ وَضَافَ السَّهْمُ وَ تَضِيْفُ عَنِ الْهَدَفِ: تیر نشانہ سے ایک طرف مائل ہو گیا۔

اَلضَّيْفُ: اصل میں اسے کہتے ہیں جو تمہارے پاس ٹھہرنے کے لیے تمہاری طرف مائل ہو مگر عرف میں ضیافت

[1] هذا قول سيبويه وحكى عن ثعلب وغيره من العلماء ضُوزیٰ وضِئزیٰ وقال الكسائی انهما مصدران.

مہمان نوازی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اصل میں چونکہ یہ مصدر ہے اس لیے عام طور پر واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس کی جمع اَضْیَافٌ وَضُیُوْفٌ وَضِیْفَانٌ بھی آ جاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرَاهِيْمَ﴾ (۵۱۔۲۴) بھلا تمہارے پاس ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کی خبر پہنچی ہے۔

﴿وَلَا تُخْزُوْنِیْ فِیْ ضَیْفِیْ﴾(۱۱۔۷۸)اور میرے مہمانوں کے بارے میں میری آبرو نہ کھوؤ۔

﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَیْفِیْ﴾(۱۵۔۶۸) یہ میرے مہمان ہیں۔

اِسْتَضَفْتُ فُلَانًا فَاَضَافَنِیْ: میں نے فلاں سے مہمان نوازی طلب کی تو میری مہمانی کی ضِفْتُهٗ ضَیْفًا کے معنی کسی کی مہمانی کرنا کے ہیں اور میزبان کو ضَائِفٌ اور ضَیْفٌ بھی کہا جاتا ہے۔

علمائے نحو کے نزدیک اَلْاِضَافَةُ کا لفظ اس اسم مجرور کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس سے پہلے کوئی اسم (مضاف) ہو۔اور بعض کے نزدیک اسم اضافی ہر اس اسم کو کہتے ہیں جس کا ثبوت یا فہم دوسرے پر موقوف ہو۔جیسے اَبٌ، اِبْنٌ، اَخٌ، صَدِیْقٌ کہ ان سب کا وجود دوسرے اسماء کے حصول پر موقوف ہے۔اس لیے اس قسم کے اسماء کو اسماء متضایفہ کہا جاتا ہے۔

(ض ی ق)

اَلضِّیْقُ وَالضَّیْقُ کے معنی تنگی کے ہیں اور یہ سَعَةٌ کی ضد ہے اور ضِیْقَةٌ کا لفظ فقر، بخل، غم اور اس قسم کے دوسرے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا﴾ (۱۱۔۷۷) کے معنی ہیں کہ وہ ان کے مقابلہ سے عاجز ہو گئے اور آیات:

﴿وَضَآئِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ﴾ (۱۱۔۱۲) اور اس خیال سے تمہارا دل تنگ ہو۔﴿وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ﴾ (۲۶۔۱۳) اور میرا دل تنگ ہوتا ہے۔

﴿یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا﴾ (۶۔۱۲۵) اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔﴿حَتّٰٓی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ (۹۔۱۱۸) یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہوگئیں۔

﴿وَلَا تَكُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْكُرُوْنَ﴾ (۶۔۱۲۷) اور جو یہ بداندیش کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو، میں ضَیْقٌ بمعنی غم ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْهِنَّ﴾ (۶۵۔۶) اور ان کو تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ دو، میں تَضْیِیْقٌ کا لفظ نان ونفقہ میں بخل اور دل کی تنگی یعنی غم کو شامل ہے۔ اور ضَاقَ وَاَضَاقَ فَهُوَ مُضِیْقٌ کے معنی محتاج ہونا بھی آتے ہیں اور فقر پر بھی ضَیْقٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل غنا کو وُسْعَةٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

❀❀❀

کِتَابُ الطَّاء

(ط ب ع)

اَلطَّبْعُ: (ف) کے اصل معنی کسی چیز کو (ڈھال کر) کوئی شکل دینا کے ہیں۔ مثلاً طَبْعُ السِّکَّۃِ وَطَبْعُ الدَّرَاھِمِ: یعنی سکہ یا دراہم کو ڈھالنا یہ خَتْمٌ سے زیادہ عام اور نَقْشٌ سے زیادہ خاص ہے اور وہ آلہ جس سے مہر لگائی جائے اسے طَابَعٌ وَخَاتَمٌ کہا جاتا ہے اور مہر لگانے والے کو طَابِعٌ مگر کبھی یہ طَابَعٌ کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور یہ نِسْبَۃُ الْفِعْلِ اِلَی الاٰلَۃِ کے قبیل سے ہے۔ جیسے سَیْفٌ قَاطِعٌ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ (۶۳۔۳) تو ان کے دلوں پر مہر لگادی۔

﴿کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (۳۰۔۵۹) اسی طرح خدا ان کے دلوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے مہر لگا دیتا ہے۔

﴿کَذٰلِکَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ﴾ (۱۰۔۷۴) اسی طرح ہم زیادتی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

اور یہ بحث آیت: ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ میں گزر چکی ہے۔ ❶

اور نقش کرنے کے اعتبار سے سَجِیَّۃٌ (خلقی عادت) کو طَبْعٌ یا طَبِیْعَۃٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی دل پر بمنزلہ نقش کے ہوتی ہے۔ عام اس سے کہ پیدائشی ہو یا عادت ہونے کے اعتبار سے لیکن عام طور پر اس کا استعمال خلقی عادت پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ ❷

(۲۸۷) فَتَاْبَی الطِّبَاعُ عَلَی النَّاقِلِ

کہ طبیعت کا بدلنا ممکن نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے آگ یا کسی دوا کا جو مزاج بنایا ہے اس خصوصی مزاج کو ان کی طبیعت کہا جاتا ہے۔

اور طِبْعُ السَّیْفِ کے معنی تلوار کا زنگ اور میل کچیل کے ہیں۔ رَجُلٌ طَبِعٌ گندے اخلاق والا چنانچہ بعض نے آیات: ﴿طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ (۹۔۹۳) خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔ اور ﴿کَذٰلِکَ یَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکَافِرِیْنَ﴾ (۷۔۱۰۱) اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

میں طَبْعٌ کے معنی دلوں کو زنگ آلود یعنی گندہ کر دینا کے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ (۸۳۔۱۴) بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰہُ اَنْ یُّطَھِّرَ قُلُوْبَھُمْ﴾

---

❶ راجع (خ ت م).

❷ قاله المتنبی فی قصیدة له یمدح فیها سیف الدولة ویذکر استنقاذه ابا وائل من امر الخوارج مطلعها ولی م طماعیة العاذل ولا رأی فی الحب للعاقل والبیت فی دیوانه ۲۰۷ (طبعه هندیه مصر ۱۳٤۲ھ، ۱۹۲۳ء) وصدر البیت یرادمن القلب نسیانکم وانظر للبیت ایضاً محاضرات المؤلف (۳۔۱۰۲) فی ثلاثة وشرح ادب الدنیا والدین للماوردی ۱۸۲.

(۴۱-۵) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے پاک کرنا نہیں چاہا۔

بعض نے کہا ہے کہ طَبَعْتُ الْمِكْيَالَ کے معنی ہیں: میں نے پیمانے کو لبالب بھر دیا کیونکہ اس کا بھر جانا بھی گویا اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس میں اب کوئی اور چیز نہیں آ سکتی اور طِبْعٌ بمعنی مَطْبُوْعٌ بھرا ہوا آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے: ❶ (رمل)

(۲۸۸) كَرَوَايَا الطِّبْعِ هَمَّتْ بِالْوَحَلِ

ان کی حالت ان اونٹوں کی سی تھی جن پر پانی کے مشکیزے لدے ہوئے ہوں اور وہ دلدل میں پھنس جائے۔

(ط ب ق)

اَلْمُطَابَقَةُ: اسمائے متضایفہ سے ہے جس کے معنی ایک چیز کے اوپر اس کے برابر دوسری چیز رکھنا۔ اسی سے طَابَقْتُ النَّعْلَ ہے جس کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۸۹) إِذَا لَا وَذَا الظِّلِّ الْقَصِيْرِ بِخُفِّهٖ...... وَكَانَ طِبَاقَ الْخُفِّ اَوْقَلَّ زَائِدًا

پھر طِبَاقَ کا لفظ اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو دوسری کے اوپر ہو اور کبھی اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے مطابق اور موافق ہو جیسا کہ تمام ان الفاظ کا حال ہے جو دو معنوں کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور پھر کسی ایک معنی میں استعمال ہونے لگے ہوں۔ جیسے كَأْسٌ وَنَادِيَةٌ وَغَيْرُهُمَا چنانچہ آیت کریمہ:

﴿الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا﴾ (۶۷-۳) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان اوپر تلے بنائے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ (۸۴-۱۹) کے معنی یہ ہوں گے کہ تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتے چلے جاؤ گے اور یہ ان مختلف احوال و مراتب کی طرف اشارہ ہے جن پر سے انسان گذر کر ترقی کے منازل طے کرتا ہے اور اس تدریجی ارتقاء کی طرف آیت: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ...... الْآيَة﴾ (۳۵-۱۱) اور خدا ہی نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے، میں اشارہ فرمایا ہے نیز آخرت میں حشر و نشر، حساب و کتاب اور پل صراط سے لے کر جنت اور دوزخ میں پہنچنے تک جو مختلف حالات انسان کو پیش آنے والے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے اور ایک جماعت جو باہم مطابقت اور موافقت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ هُمْ فِيْ أُمِّ طَبَقٍ نیز کہا جاتا ہے۔ اَلنَّاسُ طَبَقَاتٌ: لوگوں کے مختلف طبقے ہیں طَابَقْتُهٗ عَلٰى كَذَا وَتَطَابَقُوْا وَاَطْبَقُوْا عَلَيْهِ: باہم مطابق ہونا اسی سے جَوَابٌ يُطَابِقُ السُّوَالَ کا محاورہ ہے۔ یعنی جواب سوال کے عین مطابق ہے۔

اَلْمُطَابَقَةُ: اس آدمی کی طرح چلنا جس کے پاؤں میں بیڑیاں

---

❶ قاله لبيدفي اللذين حاجوه عند النعمان بن المنذر فاد حض حجتهم حتى زلقوا فلم يكلموا فشبههم بروايا مثقلة ارتطمت فى الوحل فلم تستطع الخروج و اوله: فتولوا فاترا معهم .... وقبله: والهبانيق قيام معهم كل مجموم اذا صب همل۔ والبيت فى اللسان والحكم (طبع، روى) ديوانه ۳۸ الاقتضاب ۳۸٤ وتهذيب الالفاظ (۱ : ۱۱)والاصلاح يعقوب ۸ والمعانى للقتبى ٤٦٧ قال فى الاصطلاح: الطبع النهر وجمعه اطباع وطبوع قال لبيد...... كذا قال الاصمعى ۱۲۔

❷ والبيت ايضاً فى التاج بغير عزو.

پڑی ہوں اَلطَّبَقُ وَالطِّبَاقُ: (۱) تھالی یا طباق جس پر پھل رکھتے ہیں۔(۲) ہر چیز کا ڈھکنا(۳) پیٹھ کے مہروں میں سے ہر مہرہ کو طَبَقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باہم مطابق ہوتے ہیں اور طَبَّقْتُهٗ بِالسَّیْفِ کا محاورہ بھی مُطَابَقَةُ النَّعْلِ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں: میں نے ٹھیک اس کے جوڑ میں تلوار ماری اور اسے الگ کردیا۔

طَبَقُ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ: (رات اور دن کی ساعات جو باہم مطابق ہوں۔اَطْبَقْتُ عَلَیْهِ الْبَابَ: میں نے اس پر دروازہ بند کردیا رَجُلٌ عَیَایَاءُ طَبَاقَاءُ: آنکہ بروے سخن بستہ گردد۔یہ اَطْبَقْتُ الْبَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور فَحْلٌ طَبَاقَاءُ اس سانڈھ کو کہتے ہیں جو جفتی سے عاجز ہو اور بڑی مصیبت کو بِنْتُ الطَّبَقِ کہا جاتا ہے۔مثل مشہور ہے وَافَقَ شِنٌّ طَبَقَةً کہ شن طبقہ کے موافق ہوگئی اور شَنٌّ وَطَبَقَةٌ دو قبیلوں کے نام ہیں۔❶

(ط ح و) (ی)

طحو اور دحو دونوں ہم معنی ہیں اور ان کے معنی کسی چیز کو پھیلانے اور لے جانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحَاهَا﴾(۹۱۔۶) اور قسم زمین اور اس کی جس نے اسے پھیلایا۔

شاعر نے کہا ہے۔❷ (الطّویل)

(۲۹۰) طَحَابِكَ قَلْبٌ فِی الْحِسَانِ طَرُوْبٌ

تجھے حسن پرست دل کہاں سے کہاں لے گیا۔

(ط ر ح)

اَلطَّرْحُ کے معنی کسی چیز کو پھینکنے اور دور کر دینے کے ہیں اور دور دراز مقام کو اَلطَّرُوْحُ کہا جاتا ہے۔محاورہ ہے: رَأَیْتُهٗ مِنْ طَرْحٍ: میں نے اسے دور سے دیکھا۔

اَلطِّرْحُ: پھینکی ہوئی چیز جس کی کسی کو ضرورت نہ ہو قرآن میں ہے:

﴿اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِاطْرَحُوْهُ اَرْضًا﴾(۱۲۔۹) تو یوسفؑ کو یا تو جان سے مارڈالو یا کسی دور دراز ملک میں پھینک آؤ۔

(ط ر د)

اَلطَّرْدُ: (ن) کسی کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر دور کر دینا، ہٹا دینا کہا جاتا ہے: طَرَدْتُهٗ: میں نے اسے بھگا دیا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ﴾(۱۱۔۳۰) برادران ملت! اگر میں ان کو نکال دوں تو عذاب خدا سے کون میری مدد کرسکتا ہے۔

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ﴾(۶۔۵۲) اور ان کو مت نکالو۔

﴿وَمَا اَنَا بِطَارِدِالْمُؤْمِنِیْنَ﴾(۱۱۔۲۹) اور میں ان

---

❶ مثل یضرب للمتوافقین فی امرا نظر لقصة المثل المیدانی (۳۵۹/۲) واللسان (طبق) واصلاح یعقوب ۳۲۲ وفی تاریخ الطبری ۱۲ بیتاً قالها حبیب بن خدرة مولیٰ هلال بن عامر والمثل فی المحاضرات (۲۱۵/۳) وبعده: وافقه فاعتقه والصحاح.

❷ قاله علقمة بن الفحل وتمامه: بعید الشباب عصر حان مشیب والبیت من کلمة مفضلیه فی ۳۳ بیتاً یمدح فیها الحارث بن جبلة الغسانی وکان قدا سره فی مأة من تمیم وهذا من احدی مشهوراته الثلاث راجع العمدة لابن رشیق (۱:۱۰۳ـ۱۰۴) وانظر للبیت شواهد المغنی (۳:۱۵/۴:۱۰۵) والشعراء ۵۰۲، ۱۱۰ وشواهد الشافیه ۴۹۶ والعملة (۱:۵۷) والمعاهد (۱:۱۷۳) واضداد سجستانی ۱۴۹ وابن الانباری ۳۹۴ وابن ابی الطیب ۴۶۰ والعقد الثمین ۱۰۵ وایام العرب ۵۵ والمعلقات بشرح ابن الانباری ۱۷۶ وامالی ابن الشجری (۲:۲۶۷) والاغانی (۱۴:۲/۲:۱۱۲) والموشح ۹۳ واللسان (طحا) ومختارا الحاهلی (۱:۳۱۹) الطبقات لابن سلام ۵۱ وعده من ثلاث روائع لا یفوقهن شعر ۱۲.

مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نکالنے والا بھی نہیں ہوں۔
﴿فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (٦۔٥٢) اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔
اَطْرَدَهُ السُّلْطَانُ وَطَرَدَهُ: بادشاہ نے اسے شہر بدر کر دیا اور جہاں سکونت پذیر تھا وہاں سے نکال دینے کا حکم صادر فرمایا۔
طَرْدٌ وَطَرِيْدَةٌ: وہ شکار جسے اس کی جگہ سے نکال بھگایا جائے
مَطَارَدَةُ الْاَقْرَانِ: ہمسروں کا ایک دوسرے پر حملہ کر کے مدافعت کرنا۔
اَلْمِطْرَدُ: دور بھگانے کا آلہ اِطِّرَادُ الشَّيْئِ: کسی چیز کا پے در پے آنا۔

(ط ر ف)

اَلطَّرْفُ: کے معنی کسی چیز کا کنارہ اور سرا کے ہیں اور یہ اجسام اور اوقات وغیرہما کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ﴾ (٢٠۔١٣٠) اور اس کی تسبیح بیان کرو اور دن کے اطراف میں۔
﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ (١١۔١١٤) اور دن کے دونوں سروں (یعنی صبح اور شام کے اوقات میں) نماز پڑھا کرو۔
اور اس سے بطور استعارہ نجیب الطرفین کو كَرِيْمُ الطَّرْفَيْنَ کہا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ طَرْفَيْنَ کے معنی زبان اور ستر کے ہیں اور یہ عفت کی طرف اشارہ ہے۔
طَرْفُ الْعَيْنِ: آنکھ کی پلک۔اور اَلطَّرْفُ کے اصل معنی پلک جھپکنے کے ہیں اور پلک جھپکنے کو دیکھنا لازم ہے اس لیے الطَّرْف کے معنی دیکھنا بھی آ جاتا ہے ۔قرآن پاک میں ہے:
﴿قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ (٢٧۔٤٠) میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے،اور آیت کریمہ:
﴿فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ (٥٥۔٥٦) ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں، میں قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ کے معنی یہ ہیں کہ عفیف ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہیں ہمیشہ نیچے جھکی رہتی ہیں۔
طُرِفَ فُلَانٌ اس کی نظر کو صدمہ پہنچا، اور آیت کریمہ:
﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا﴾ (٣۔١٢٧) تا کہ ایک جماعت کو ہلاک کر دے میں قطع کرنے کو ایک طرف کے ساتھ مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کو نابود کرنے کے لیے اس کی جانب سے شروع ہوا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آیت:
﴿نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا﴾ (١٣۔٤١) ہم زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے آتے ہیں میں بھی کم کرنے کو اطراف کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔
اَلطِّرَافُ: کے معنی چرمی خیمہ کے ہیں، جس کے اطراف کو اوپر اٹھا دیا جاتا ہے۔
مِطْرَفُ الْخَزِّ وَمُطْرَفٌ منقش چادر جس کے کنارے ریشمی ہوں۔ج مَطَارِفُ۔ اَطْرَفْتُ مَالًا: میں نے تازہ مال حاصل کیا۔
نَاقَةٌ طَرِفَةٌ وَمُسْتَطْرِفَةٌ وہ اونٹنی جو اونٹ کی طرح چراگاہ کے اطراف سے گھاس کھائے اور جو گھاس وہ جانور کھاتا ہے اسے طَرِيْفٌ کہا جاتا ہے اور طَرِيْفٌ کے معنی نیا حاصل کردہ مال بھی آتے ہیں۔ نیز جو شخص ایک عورت پر صبر نہ کرے اسے بھی طَرِيْفٌ کہہ دیتے ہیں۔
اَلطِّرْفُ: عمدہ نسل کا گھوڑا جس کے حسن کے سبب اس کی طرف نگاہیں اٹھتی ہوں دراصل طِرْفٌ بمعنی مَطْرُوْفٌ آتا

ہے۔ یعنی جسے نظر اٹھا کر دیکھا جائے جیسا کہ نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ آجاتا ہے اسی اعتبار سے خوبصورت چیز کو جس پر نظر جم جائے اسے قَیْدُالنَّوَاظِرِ کہا جاتا ہے۔

(ط ر ق)

اَلطَّرِیْقُ کے معنی راستہ ہیں، جس پر چلا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِى الْبَحْرِ﴾(۲۰۔۷۷) پھر ان کے لیے دریا میں راستہ بنا دو۔

اسی سے بطور استعارہ ہر اس مسلک اور مذہب کو طریق کہا جاتا ہے جو انسان کوئی کام کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے عام اس سے کہ وہ فعل محمود ہو یا مذموم۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلٰى﴾(۲۰۔۶۳) اور تمہارے بہتر مذہب کو نابود کردیں۔

اور امتداد میں راستہ کے ساتھ تشبیہ دے کر کھجور کے لیے درخت کو بھی طَرِیْقَۃٌ کہہ دیتے ہیں۔

اَلطَّرْقُ کے اصل معنی مارنے کے ہیں مگر یہ ضَرْبٌ سے زیادہ خاص ہے کیونکہ طَرْقٌ کا لفظ چٹاخ سے مارنے پر بولا جاتا ہے جیسے ہتھوڑے سے لوہے کو کوٹنا بعد ازاں ضَرْبٌ کی طرح طَرْقٌ کے لفظ میں بھی وسعت پیدا ہوگئی ہے چنانچہ بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

طَرْقُ الْحَصیٰ: کاہن کا اپنی کہانت کے لیے کنکر مارنا۔

طَرْقُ الدَّوَابِّ: چوپائے، جانوروں کا پانی میں داخل ہو کر اسے پاؤں سے گدلا کر دینا۔ طَارَقْتُ النَّعْلَ وَطَرَقْتُهَا: میں نے جوتے کے ایک پرتلہ پر دوسرا رکھ کر اسے سی دیا۔ پھر طَرْقُ النَّعْلِ کی مناسبت سے طَارَقَ بَیْنَ الدِّرْعَیْنِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ایک زرہ کے اوپر دوسری زرہ پہننا کے ہیں۔ طَرْقُ الْخَوَافِیْ: پرند کے اندرونی پروں کا تہ برتہ ہونا اور اَلطَّارِقُ: کے معنی ہیں: راستہ پر چلنے والا مگر عرف میں بالخصوص اس مسافر کو کہتے ہیں جو رات میں آئے چنانچہ طَرَقَ اَهْلَهٗ طُرُوْقًا کے معنی ہیں وہ رات کو آیا اور ستارے کو بھی اَلطَّارِقُ: کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بالخصوص رات کو ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾(۸۶۔۱) آسمان اور رات کو آنے والے کی قسم۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الرجز)

(۲۹۱) نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقِ ہم طارق یعنی سردار کی بیٹیاں ہیں۔

طَوَارِقُ اللَّیْلِ: وہ مصائب جو رات کو نازل ہوں۔ طُرِقَ فُلَانٌ رات میں صدمہ پہنچا۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الطویل)

---

❶ تمثلت به هند بنت عتبه بن ربیعه یوم احد تحض علی المسلمین (ابن هشام۵٦٢ وابن الانباری ٤٠) والرجز فی الاصل لهند بنت بیاخته الایادیه قالته فی حرب الفرس لایا دوبعده: لانثنی لوامق نمشیٰ علی النمارق۔ المسك علی المفارق۔ راجع اللسان (طرق، والاقتضاب ٣١٨ والبحر (٢٣١:٧) واعراب ثلاثین ٣٨ وایام العرب ٣١ والسیوطی ٢٧٣ والمعانی للقتبی ٥٣٠ وروض الانف (١٢٩:٢)وقد جاء بعض هذا الرجز منسوباً لامرء ة من بنی عجل انشدته یوم ذی قار، راجع التاریخ للطبری (١٥٣:٢) منسوباً لابنة للفند الزمانی انشدته یوم التحالف من ایام حرب بکسر وتغلب (الاغانی ١٤٤:٢٠).

❷ قاله امیة بن الصلت فی قصیده یشکوفیها عقوق ابنه فی سبعة الحماسة مع المرزوقی رقم ٢٥٤ واختلف فی قائلها قال التبریزی تروی لابن عبدالاعلی وقیل لابی العباس الاعمیٰ قال ابو هلال اور دها ابو عبیدة فی اخبار العقفة والبررة ونسبه فی العیون (٨٧:٣)لیحی بن سعید ولیس له لان قائلها انشدبین یدی النبی صلی الله علیه وسلم کما فی الصغیر للطبرانی ١٩٥ فاخذ النبی صلی الله علیه وسلم بتلابیب الولد وسلمه لوالدة قائلا له "انت ومالك لابیك" انظر ایضاً الاغانی (١٩١:٣) وتراجم امیة بن ابی الصلت فی الاصابة رقم: ٥٥٢ والخزانة (١٢٢_١١٩:١)و ابن سلام (٦٦_٦٨) والاشتقاق (١٨٤) والاغانی (١٧٩:٢_١٨٥/١٦:٦٩_٧٦) وابن قتیبة (٤٢٩_٤٣٣).

(۲۹۲) كَاَنِّيْ اَنَاالْمَطْرُوْقُ دُوْنَكَ بِالَّذِيْ...... طُرِقْتَ بِهٖ دُوْنِيْ وَعَيْنِيْ تَهْمَلُ

میں اس طرح بے چین ہوتا ہوں کہ وہ مصیبت جو رات کو تجھ پر آتی ہے مجھے پہنچ رہی ہے اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔

اور معنی ضرب یعنی جفتی کرنے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے، طَرَقَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ: اونٹ کا ناقہ سے جفتی کرنا۔

اَطْرَقْتُهَا: میں نے سانڈھ کو اونٹنی پر چھوڑا۔

اِسْتَطْرَقْتُ فُلَانًا الْفَحْلَ: میں نے فلاں سے جفتی کے لیے سانڈھ طلب کیا اور یہ محاورات ضَرَبَهَا الْفَحْلُ وَاَضْرَبْتُهَا وَاسْتَضْرَبْتُهٗ کی طرح استعمال ہوتے ہیں اور اس ناقہ کو جو گابھن ہونے کے قابل ہو جائے اسے طَرُوْقَةٌ کہا جاتا ہے اور بطور کنایہ طَرُوْقَةٌ بمعنی عورت بھی آجاتا ہے۔

اَطْرَقَ فُلَانٌ فلاں نے نگاہیں نیچی کرلیں گویا اس کی نگاہ زمین کو مارنے لگی جیسا کہ مِطْرَقَةٌ (ہتھوڑے) سے کوٹا جاتا ہے اور طَرِيْقٌ بمعنی راستہ کی مناسبت سے جَاءَتِ الْاِبِلُ مَطَارِيْقُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اونٹ ایک ہی راستہ سے آئے اور تَطَرَّقَ اِلٰى كَذَا کے معنی ہیں: کسی چیز کی طرف رستہ بنانا طَرَّقْتُ لَهٗ: کسی کے لیے راستہ ہموار کرنا۔

اَلطَّرِيْقُ کی جمع طُرُقٌ آتی ہے اور طَرِيْقَةٌ کی جمع طَرَائِقُ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا﴾ (۷۲-۱۱) کے معنی یہ ہیں کہ ہم مختلف مسلک رکھتے ہیں اور یہ آیت کریمہ:

﴿هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَاللّٰهِ﴾ (۳-۱۶۳) ان لوگوں کے خدا کے ہاں (مختلف اور متفاوت) درجے ہیں، کی مثل ہے یعنی جیسا کہ یہاں درجات سے مراد اصحاب الدرجات ہیں اسی طرح طرائق سے اصحاب طرائق مراد ہیں اور آسمان کے طبقات کو بھی طَرَائِقُ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ﴾ (۲۳-۱۷) ہم نے تمہارے اوپر کی جانب سات طبقے پیدا کیے ہیں۔ رَجُلٌ مَطْرُوْقٌ: نرم اور سست آدمی پر هُوَ مَطْرُوْقٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مصیبت زدہ کے ہیں یعنی مصائب نے اسے کمزور کر دیا۔ جیسا کہ مصیبت زدہ آدمی کو مَقْرُوْعٌ یا مَدُوْخٌ کہا جاتا ہے۔ یا یہ نَاقَةٌ مَطْرُوْقَةٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور یہ ذلت میں اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

(ط ر ی) (و)

اَلطَّرِيُّ: تروتازہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَحْمًا طَرِيًّا﴾ (۱۶-۱۴) تازہ گوشت کھاؤ۔

طَرِيًّا کا مصدر طَرَاءٌ وَطَرَاوَةٌ آتا ہے جس کے معنی تروتازہ ہونے کے ہیں۔ محاورہ ہے:

طَرَّيْتُ كَذَا فَطَرِيَ: میں نے اسے تازہ کیا چنانچہ وہ تازہ ہو گیا۔ اسی سے نئے اور تازہ کیے ہوئے کپڑوں کو مُطَرَّاةٌ کہا جاتا ہے اور اِطْرَاءٌ اس تعریف کو کہتے ہیں جس سے ممدوح کی یاد تازہ ہو جائے اور (طَرَءَ) مہموز کے معنی طَلَعَ یعنی اچانک طلوع ہونے کے ہیں۔

(ط س)

طس: یہ حروف مقطعات سے ہیں اور طَسٌّ وَطُسُوْسٌ سے مشتق نہیں ہے جس کے معنی تشت ہیں۔

(ط ع م)

اَلطَّعْمُ: (س) کے معنی غذا کھانے کے ہیں اور ہر وہ چیز جو بطور غذا کھائی جائے اسے طَعْمٌ یا طَعَامٌ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ﴾ (۵۔۹۶) اور اس کا طعام جو تمہارے فائدہ کے لیے۔

اور کبھی طعام کا لفظ خاص کر گیہوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ ابوسعید الخدری سے روایت ہے:[1] ((اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِصَدَقَةِ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ اَوْصَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ)) کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر میں ایک صاع طعام یا ایک صاع جو دینے کا حکم دیا۔'' قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ﴾ (۶۹۔۳۶) اور نہ پیپ کے سوا (اس کے) لیے کوئی کھانا ہے۔

﴿وَطَعَامًا ذَاغُصَّةٍ﴾ (۷۳۔۱۳) اور گلوگیر کھانا ہے۔

﴿طَعَامُ الْاَثِيْمِ﴾ (۴۴۔۴۴) گناہ گار کا کھانا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ (۱۰۷۔۳) اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔

میں طَعَامٌ بمعنی اِطْعَامٌ یعنی کھانا کھلانا کے ہیں۔

﴿فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا﴾ (۳۳۔۵۳) اور جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا﴾ (۵۔۹۳) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی طَعِمْتُ بمعنی شَرِبْتُ آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّیْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ﴾ (۲۔۲۴۹) جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا تو وہ مجھ سے نہیں ہے اور جو شخص اس سے پانی نہ پیے گا تو (اس کی نسبت تصور کیا جائے گا کہ وہ) میرا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مَن لَّمْ يَشْرَبْهُ کی بجائے وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح چلو بھر سے زیادہ محض پانی کا استعمال ممنوع ہے اسی طرح طعام کے ساتھ بھی اس مقدار سے زائد پانی پینا ممنوع ہے کیونکہ جو پانی کھانے کے ساتھ پیا جاتا ہے اس پر بھی طَعِمْتُ کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر مَنْ لَّمْ يَشْرَبْهُ لایا جاتا تو اس سے کھانے کے ساتھ پانی پینے کی ممانعت ثابت نہ ہوتی اس کے برعکس يَطْعَمْهُ کے لفظ سے یہ ممانعت بھی ثابت ہوجاتی ہے اور معین مقدار سے زائد پانی کا پینا بہر حالت ممنوع ہوجاتا ہے اور ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے زمزم کے پانی کے متعلق اِنَّهٗ طَعَامُ طُعْمٍ وشِفَاءُ سُقْمٍ (کہ یہ کھانے کا کھانا اور بیماری سے شفا ہے) فرما کر تنبیہ کی ہے کہ بیر زمزم کے پانی میں غذائیت بھی پائی جاتی ہے جو دوسرے پانی میں نہیں ہے۔ اِسْتَطْعَمْتُهٗ فَاَطْعَمَنِیْ: میں نے اس سے کھانا مانگا چنانچہ اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ (۲۲۔۳۶) اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ﴾ (۷۶۔۸) اور وہ کھانا کھلاتے ہیں۔

﴿اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْيَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ﴾ (۳۶۔۴۷) بھلا ہم

---

[1] اخرجه الائمة الستة فی کتبهم مختصراً مطو لا وذکر الحافظ فی الفتح ان ابن المنذر علی من استدل من هذا الحدیث ان المراد من الطعام الحنطة وقال تفسیر ابن سعید مخالف لهذا الاستدلال ولفظه وقال ابو سعید وکان طعامنا الشعیر والزبیب والا قط والتمروهی ظاهرة فیما قال لکن فی روایة عطف الشعیر علی الطعام وهو یدل علی المغایرة واورد الحافظ هذهِ الروایة من ثلاث طرق والله اعلم.

ان لوگوں کو کھانا کھلائیں جن کو اگر خدا چاہتا تو خود کھلا دیتا۔

﴿اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ﴾(۱۰۶۔۴) جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا۔

﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾(۶۔۱۴) وہی سب کو کھانا کھلاتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا۔

﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ﴾(۵۱۔۵۷) اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھانا کھلائیں۔

اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔❶(۲۱)

((اِذَااسْتَطْعَمَكُمُ الْاِمَامُ فَاَطْعِمُوْهُ)) یعنی جب امام (نماز میں) تم سے لقمہ طلب کرے یعنی بھول جائے تو اسے بتا دو۔ رَجُلٌ طَاعِمٌ: خوش حال آدمی۔ رَجُلٌ مُطْعِمٌ: جس کو وافر رزق ملا ہو۔ مِطْعَمٌ نیک خورندہ۔ مِطْعَامٌ: بہت کھلانے والا، مہمان نواز طُعْمَةٌ کھانے کی چیز، رزق۔

(ط ع ن)

اَلطَّعْنُ: (ف) کے معنی نیزہ، سینگ وغیرہ کسی تیز اور نوکیلی چیز کے ساتھ زخم کرنے کے ہیں۔ تَطَاعَنُوْا وَاطَّعَنُوْا: انہوں نے ایک دوسرے کو نیزہ مارا۔ پھر استعارہ کے طور پر کسی پر الزام لگانے یا اس کی بدگوئی کرنے کے معنی میں بھی طعن کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ﴾(۴۔۴۶) اور دین میں طنز کی راہ سے۔

﴿وَطَعَنُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ﴾(۹۔۱۲) اور تمہارے دین میں وہ طعنے کرنے لگیں۔

(ط غ و) (ی)

طَغَوْتُ وَطَغَيْتُ طَغَوَانًا وَطُغْيَانًا کے معنی طغیان اور سرکشی کرنے کے ہیں اور اَطْغَاهُ (افعال) کے معنی ہیں: اسے طغیان، سرکشی پر ابھارا اور طغیان کے معنی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّهٗ طَغٰى﴾ وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى﴾(۹۶۔۶) مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے۔

﴿قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى﴾ (۲۰۔۴۵) دونوں کہنے لگے کہ ہمارے پروردگار! ہمیں خوف ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرنے لگے یا زیادہ سرکش ہو جائے۔

﴿وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ﴾(۲۰۔۸۱) اور اس میں حد سے نہ نکلنا ورنہ تم پر میرا عذاب نازل ہوگا۔

﴿فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا﴾(۱۸۔۸۰) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ بڑا ہو کر بدکردار ہوتا، کہیں ان کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔

﴿فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾(۲۔۱۵) کہ بے حد سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

﴿اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا﴾(۱۷۔۶۰) بے حد سرکش۔

﴿وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ﴾(۳۸۔۵۵) اور سرکشوں کے لیے برا ٹھکانا ہے۔

﴿قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ﴾(۵۰۔۲۷) اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا اے ہمارے پروردگار! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا۔

---

❶ راجع للحديث الفائق (۲/۴۳) وفيه "انها" والعائد لزمزم واللسان (طعم) وفى الطيالسى عن ابى ذر: وانهاالمباركة راجع الفتح الكبير للنبهانى (۱/۴۴۸). قاله عليؓ راجع النيل (۲/۳۳۹) والفتح الاثر فى الفائق(۲/۴۳) قال وهذا من باب التمثيل۔

اَلطَّغْوٰی: (اسم)طغیان۔یعنی بے حد سرکشی اور آیت کریمہ:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰاهَا﴾(۹۱۔۱۱) قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب پیغمبر ﷺ کو جھٹلایا۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ قوم ثمود کو جب ان کی سرکشی کی پاداش سے ڈرایا گیا تو انہوں نے یقین نہ کیا اور آیت کریمہ:

﴿هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى﴾(۵۳۔۵۲) وہ لوگ بڑے ہی ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ سرکشی کسی حالت میں بھی ہلاکت سے نجات نہیں بخش سکتی۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم ان سے بھی زیادہ سرکش تھی لیکن انہیں ہلاک کر دیا گیا اور آیت:

﴿اِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ﴾(۶۹۔۱۱) جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے..................

میں پانی کے حد سے تجاوز کر جانے کو مجازاً اطغیان سے تعبیر فرمایا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ﴾(۶۹۔۵)سو...... کڑک سے ہلاک کر دیے گئے۔

میں طَاغِيَةٌ سے طوفان کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ آیت ﴿اِنَّالَمَّاطَغَى الْمَاءُ﴾ میں پایا جاتا ہے۔ ❶

اَلطَّاغُوْتُ: سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حدود شکن ہو اور ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے اسے طاغوت کہا جاتا ہے اور واحد جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ❷ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾(۲۔۲۵۶) جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ﴾(۳۹۔۱۷) اور جنہوں نے بتوں کی پوجا اجتناب کیا۔

﴿اَوْلِيٰٓـؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ..........﴾(۲۔۲۵۷) ان کے دوست شیطان ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ﴾(۴۔۶۰) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں۔

میں طاغوت سے حدود شکن مراد ہیں اور نافرمانی میں حد سے تجاوز کی بنا پر ساحر، کاہن، سرکش جن اور ہر وہ چیز جو طریق حق سے پھیرنے والی ہو اسے طَاغُوْتٌ کہا جاتا ہے بعض کے نزدیک یہ فَعَلُوْتٌ کے وزن پر ہے جیسے جَبَرُوْتٌ وَمَلَكُوْتٌ اور بعض کے نزدیک اس کی اصل طَغَوُوْتٌ ہے۔ پھر صَاعِقَةٌ اور صَاقِعَةٌ کی طرح پہلے لام کلمہ میں قلب کیا گیا اور پھر واؤ کے متحرک اور ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے تبدیل کیا گیا۔ ❸

(ط ف ف)

اَلطَّفِيْفُ: کے معنی حقیر اور تھوڑی سی چیز کے ہیں اسی سے ناقابل اعتناء چیز کو طَفَافَةٌ کہا جاتا ہے اور طَفَّفَ الْكَيْلَ کے معنی ہیں: اس نے پیمانے کو پورا بھر کر نہیں دیا۔ اس میں کمی کی قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾(۸۳۔۱) ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔

---

❶ الآية متعلق بقوم ثمود ولا تعلق له بالآية: انا لما طغى الماء.

❷ قدياتي جمعه الى طواغيت كما ورد في الحديث ((لا تحلفوا اباء كم ولا بالطواغيت)).

❸ فوزنه فعلوت.

(ط ف ق)

طَفِقَ يَفْعَلُ كَذَا: وہ ایسا کرنے لگا یہ اَخَذَ يَفْعَلُ کی طرح (کسی کام کے شروع کرنے کا معنی دیتا) ہے اور ہمیشہ کلام مثبت میں استعمال ہوتا ہے لہٰذا مَاطَفِقَ كَذَا کہنا جائز نہیں ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾(۳۸۔۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

﴿وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ﴾(۷۔۱۲۲) اور وہ لگے چپکانے۔

(ط ف ل)

اَلطِّفْلُ: جب تک بچہ نرم ونازک رہے اس وقت تک اسے طِفْلٌ کہا جاتا ہے یہ اصل میں مفرد ہے مگر کبھی بمعنی جمع بھی آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا﴾(۴۰۔۶۷) پھر تم کو نکالتا ہے۔ کہ تم بچے ہوتے ہو۔

﴿اَوِالطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ﴾ (۲۴۔۳۱) یا ایسے لڑکوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں۔

طِفْلٌ کی جمع اَطْفَالٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ﴾(۲۴۔۵۹) اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔

اور نرم ونازک ہونے کے معنی کی مناسبت سے گداز بدن عورت کو طَفْلَةٌ کہا جاتا ہے اور طَفِلَتْ طُفُوْلَةً وَطَفَالَةً کے نرم ونازک ہونے کے ہیں اور جس ہرنی کے ساتھ اس کا بچہ ہو اسے مُطْفِلٌ کہا جاتا ہے طَفَلَتِ الشَّمْسُ اس وقت بولا جاتا ہے جب آفتاب نکلنے کو ہو اور ابھی تک اس کی دھوپ اچھی طرح زمین پر نہ پھیلی ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الرمل)

(۲۹۳) وَعَلَى الْاَرْضِ غَيَابَاتُ الطَّفَلِ

اور زمین پر تا حال صبح کا سوجھا کا موجود تھا۔

اور طَفَّلَ جس کے معنی ایسے کھانے میں شریک ہونا کے ہیں جس پر اسے بلایا نہ گیا ہو، کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ طَفَلَ النَّهَارُ سے ماخوذ ہے یعنی اس وقت آنا اور بعض نے کہا ہے کہ طُفَيْلُ الْعَرَائِسِ ایک مشہور آدمی کا نام ہے ❷ جو بلا دعوت تقریبات میں شریک ہو جاتا تھا اور اسی سے طَفَّلَ ہے جس کے معنی طفیلی بن کر جانے کے ہیں۔

(ط ل ل)

اَلطَّلُّ کے معنی بہت ہلکی سی بارش کے ہیں جس کا معمولی سا اثر ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾(۲۔۲۶۵) اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھوار ہی سہی۔

اور طَلَّ الْاَرْضَ فَهِيَ مَطْلُوْلَةٌ کے معنی، زمین پر اوس پڑنے کے ہیں اسی سے جس خون کی پرواہ نہ کی جائے اور اسے اوس کی طرح معمولی سمجھا جائے اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ طَلَّ دَمُ فُـلَانٍ یعنی فلاں کا خون باطل کر دیا گیا اور شبنم کا چونکہ ہلکا سا اثر ہوتا ہے اس مناسبت سے گھروں کے باقی ماندہ نشانات کو طَلَلٌ کہہ دیتے ہیں اَطَلَّ فُـلَانٌ

---

❶ قاله لبيد يصف فرسه وصدره : فتدليت عليه قافلاً۔ والبيت فی السمط ۸۳۳ وديوانه (۲ : ۱٤)وتهذيب الالفاظ ٤٠٧ والاشتقاق (٨٤۔١٧٣) وقبله فی العالی (۲ : ۲۰۱) مليح الارض لمحاً فی الندی من مرابيع رياض ورحل وايضا راجع اللسان (غيا) وغريب ابی عبيد (۱ : ۹۳).

❷ رجل من اهل الكوفة من بنی عبدالله ابن غطفان (الصحاح).

جھانکنا، دور سے نظر آنا۔

(ط ف ء)

طَفِئَتِ (س) اَلنَّارُ کے معنی آگ بجھ جانے کے ہیں اور اَطْفَاْتُھَا (افعال) کے معنی پھونک سے بجھا دینے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَاللّٰهِ﴾ (۹۔۳۲) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مارکر) بجھا دیں۔

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَاللّٰهِ﴾ (۶۱۔۸) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے چراغ کی روشنی کو منہ سے (پھونک مارکر) بجھا دیں۔

اور دونوں آیتوں میں معنوی طور پر یہ فرق پایا جاتا ہے کہ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا کے معنی نور الٰہی کو بجھانے کا قصد کرنے کے ہیں مگر لِيُطْفِئُوْا کے معنی ایسے امر کا قصد کرنے کے ہیں جو اطفاء نور کا سبب بن سکے۔

(ط ل ب)

اَلطَّلَبُ: (ن) کے معنی کسی شے کے پانے کی تلاش اور جستجو کرنا کے ہیں عام اس سے کہ وہ چیز اعیان واجسام سے تعلق رکھتی ہو یا مقال سے قرآن میں ہے:

﴿فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا﴾ (۱۸۔۴۱) تم اسے تلاش کے باوجود حاصل نہیں کرسکو گے۔

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾ (۲۲۔۷۳) طلب کرنے والا اور جس سے طلب کیا جائے (یعنی عابد اور معبود دونوں) کمزور ہیں۔

اَطْلَبْتُ فُلَانًا (ا) کسی کی حاجت روائی کرنا (۲) کسی کو محتاج کرنا اور جو گھاس پانی سے بہت دور ہو اور اس تک پہنچنے کے لیے تکلیف اٹھانا پڑے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے اَطْلَبَ الْكَلَاءُ۔

(ط ل ت)

﴿طَالُوْتُ﴾ یہ عجمی لفظ ہے [1] بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جالوت کے مقابلہ کے لیے مقرر فرمایا (۲۔۲۴۷)

(ط ل ح)

اَلطَّلْحُ: (موز) ایک درخت کا نام ہے اس کا واحد طَلْحَةٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (۵۶۔۲۹) اور تہ بتہ کیلوں......اور اِبِلٌ طَلَاحِيٌّ۔ طَلْحَةٌ کی طرف منسوب ہے اور طَلَاحِيٌّ وَطَلْحَةٌ ان اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو طلحہ درخت کو کھا کر بیمار ہو گئے ہوں۔ نیز طَلْحٌ وَطَلِيْحُ اَسْفَارٍ محاورہ ہے یعنی کثرت سفر کی وجہ سے دبلی اونٹنی اور اسی سے اَلطَّلَاحُ ہے جو کبھی اَلصَّلَاحُ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔

(ط ل ع)

طَلَعَ (ن) اَلشَّمْسُ طُلُوْعًا وَّمَطْلَعًا کے معنی آفتاب طلوع ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ﴾ (۲۰۔۱۳۰) اور سورج کے نکلنے سے پہلے تسبیح وتحمید کیا کرو۔

﴿حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (۹۷۔۵) طلوع صبح تک۔

اور یہ مَطْلِعٌ کے معنی ہیں "طلوع ہونے کی جگہ" قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ﴾ (۱۸۔۹۰) یہاں تک کہ سورج کے طلوع ہونے کے مقام پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایسے لوگوں پر طلوع کرتا

---

[1] راجع روح المعاني (٢/٤٥٣) والكشاف (١/١٠٠) وابن كثير (١/٣٠٠-٣٠٣).

ہے......

اسی سے استعارہ کے طور پر طَلَعَ عَلَيْنَا فُلَانٌ وَطَلَعَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کسی کے سامنے ظاہر ہونا اور اوپر پہنچ کر نیچے کی طرف جھانکنا قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ اَنْتُمْ مُطَّلِعُوْنَ فَاطَّلَعَ﴾(۳۷۔۵۴) بھلا خود جھانکے گا۔

﴿فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى﴾(۴۰۔۳۷) پھر اوپر جاکر موسیٰ کے خدا کو دیکھ لوں۔

﴿اَطَّلَعَ الْغَيْبَ﴾(۱۹۔۷۸) کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے۔

﴿لَعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى﴾(۲۸۔۳۸) تاکہ میں موسیٰ کے خدا کی طرف چڑھ جاؤں۔

اِسْتَطْلَعْتُ رَاْيَهٗ: میں نے اس کی رائے معلوم کی۔

اَطْلَعْتُكَ عَلٰى كَذَا میں نے تمہیں فلاں معاملہ سے آگاہ کردیا۔ طَلَعْتُ عَنْهُ: میں اس سے پنہاں ہوگیا۔(اضداد)

اَلطِّلَاعُ: (۱) ہر وہ چیز جس پر سورج طلوع کرتا ہو یا(۲) انسان اس پر اطلاع پائے۔ طَلِيْعَةُ الْجَيْشِ: ہراول دستہ اِمْرَءَةٌ طُلَعَةٌ قُبَعَةٌ: وہ عورت جو بار بار ظاہر اور پوشیدہ ہو اور طلوع آفتاب کی مناسبت سے طَلْعُ النَّخْلِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی خرما کے غلاف کے ہیں جس کے اندر اس کا خوشہ ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ﴾(۵۰۔۱۰) جن کا گابھا تہ بتہ ہوتا ہے۔

﴿طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ﴾(۳۷۔۶۵) ان کے شگوفے ایسے ہوں گے جیسے شیطانوں کے سر۔

﴿وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ﴾(۲۶۔۱۴۸) اور کھجوریں جن کے شگوفے لطیف ونازک ہوتے ہیں۔

اَطْلَعَتِ النَّخْلُ: کھجور کا شگوفے دار ہونا۔

قَوْسٌ طِلَاعُ الْكَفِّ: کمان جس سے مٹھی بھر جائے۔

(ط ل ق)

اَلطَّلَاقُ: دراصل اس کے معنی کسی بندھن سے آزاد کرنے کے ہیں محاورہ ہے۔

اَطْلَقْتُ الْبَعِيْرَ مِنْ عِقَالِهٖ وَطَلَّقْتُهٗ: میں نے اونٹ کا پائے بند کھول دیا طَالِقٌ وَطَلْقٌ: وہ اونٹ جو مقید نہ ہو اسی سے خَلَّيْتُهَا کی طرح طَلَّقْتُ الْمَرْءَةَ کا محاورہ مستعار ہے یعنی میں نے اپنی عورت کو نکاح کے بندھن سے آزاد کردیا ایسی عورت کو طَالِقٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾(۶۵۔۱) تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾(۲۔۲۳) طلاق صرف دوبار ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ﴾(۳۔۲۲۸) اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں۔ میں طلاق کا لفظ عام ہے جو رجعی اور غیر رجعی دونوں کو شامل ہے۔ لیکن آیت کریمہ:

﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ﴾(۲۔۲۲۸) اور ان کے خاوند ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔ میں ''واپس لے لینے کا زیادہ حق دار ہونے کا حکم'' رجعی طلاق کے ساتھ مخصوص ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ﴾(۲۔۲۳) پھر اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دے

دے تو...... اس پہلے شوہر پر حلال نہ ہوگی۔ میں مِنْ بَعْدُ کے یہ معنی ہیں کہ اگر بینونت یعنی عدت گزر جانے کے بعد پھر (تیسری) طلاق دے۔ تو اس کے لیے حلال نہ ہوگی تا وقتیکہ دوسرے شوہر سے شادی نہ کرے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَآ اَنْ یَّتَرَاجَعَآ﴾ (۲۔۲۳۱) میں طَلَّقَهَا کے معنی یہ ہیں کہ اگر دوسرا خاوند طلاق دے دے اور وہ پہلے خاوند کے نکاح میں آنا چاہے تو ان کے دوبارہ نکاح کر لینے میں کچھ گناہ نہیں ہے۔ اِنْطَلَقَ فُلَانٌ کے معنی چل پڑنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ یَتَخَافَتُوْنَ﴾ (۶۸۔۲۳) تو وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔

﴿اِنْطَلِقُوْآ اِلٰی مَاکُنْتُمْ بِهٖ تُکَذِّبُوْنَ﴾ (۷۷۔۲۹) جس چیز کو تم جھٹلایا کرتے تھے اب اس کی طرف چلو۔

اور حلال چیز کو طَلْقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے کھا لینے پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔

عَدَا الْفَرَسُ طَلْقًا اَوْ طَلْقَیْنِ: گھوڑے نے آزادی سے ایک دو دوڑیں لگائیں اور فقہ کی اصطلاح میں مُطْلَقٌ اس حکم کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی جزئی مخصوص نہ کی گئی ہو۔

طَلَقَ یَدَهٗ وَاَطْلَقَهَا: اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔

طَلْقُ الْوَجْهِ اَوْ طَلِیْقُ الْوَجْهِ خندہ رو.......... ہنس مکھ۔

طُلِقَ السَّلِیْمُ (مجہول) مارگزیدہ کا صحت یاب ہونا۔ شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطّویل)

(۲۹۴) تُطَلِّقُهٗ طَوْرًا وَطَوْرًا تُرَاجِعُ

کہ وہ کبھی درد سے آرام پا لیتا ہے اور کبھی وہ درد دوبارہ لوٹ آتا ہے۔

لَیْلَةٌ طَلْقَةٌ: وہ رات جس میں اونٹوں کو پانی پر وارد ہونے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ گھاس کھاتے ہوئے اپنی مرضی سے چلے جائیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: اَطْلَقَ الْاِبِلَ: یعنی اس نے پانی پر وارد ہونے کے لیے اونٹوں کو آزاد چھوڑ دیا۔

(ط م م)

اَلطِّمُّ کے معنی پانی سے بھرے ہوئے سمندر کے ہیں اور ایسے سمندر کو اَلطِّمُّ وَالرِّمُّ کہا جاتا ہے اور طَمَّ عَلٰی کَذَا کے معنی کسی پر چھا جانے اور اسے ڈھانپ لینا کے ہیں۔ اسی سے قیامت کو طَامَّةٌ کہا گیا ہے کیونکہ اس کی مصیبت سب پر چھا جائے گی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْکُبْرٰی﴾ (۷۹۔۳۴) تو جب بڑی آفت کر آئے گی۔

(ط م ث)

اَلطَّمْثُ (ن س) کے معنی (۱) دم حیض اور (۲) کسی عورت کی بکارت کو زائل کرنا کے ہیں اور طَامِثٌ کے معنی حیض والی عورت کے ہیں۔ طَمَثَ الْمَرْاَةَ اس نے عورت کی بکارت زائل کر دی قرآن پاک میں ہے:

﴿لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ (۵۵۔۵۶) جن کو اہل جنت سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ کسی جن نے۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے، مَاطَمِثَ هٰذِهِ الرَّوْضَةَ اَحَدٌ قَبْلَنَا: یعنی ہم سے قبل اس سبزہ زار میں کوئی

[1] قالہ النابغة فی وصف السلیم واولہ تناوزھا الراقون من سوء سمھا۔ والقصیدة طویلة یعتذر فیھا الی النعمان بن المنذر وفی دیوانہ من سوء سمعھا والبیت فی المعانی الکبیر والخزانة (۱: ٤٣٤) وقد مرفی۔۲۹۔

اور وارد نہیں ہوا مَاطَمِثَ النَّاقَةَ جَمَلٌ اس اونٹنی کو کسی اونٹ نے بھی نہیں چھوڑا۔

(ط م س)

اَلطَّمْسُ کے معنی کسی چیز کا نام ونشان مٹا دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَاالنُّجُوْمُ طُمِسَتْ﴾(۷۷۔۸) جب ستاروں کی روشنی جاتی رہے گی۔

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ﴾(۱۰۔۸۵) اے پروردگار! ان کے مال ودولت کو تباہ و برباد کر دے۔یعنی ان کا نام ونشان مٹادے۔

﴿وَلَوْنَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْيُنِهِمْ﴾(۳۶۔۶۶) اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا کر اندھا کر دیں۔یعنی آنکھوں کی روشنی سلب کر لیں اور ان کا نشان مٹادیں جس طرح کہ کسی نشان کو مٹادیا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا﴾(۴۔۴۷) قبل اس کے کہ ہم ان کے چہروں کو بگاڑ کر۔

میں بعض نے کہا ہے کہ دنیا میں ان کے چہروں کو بگاڑنا مراد ہے۔مثلاً ان کے چہروں پر بال اُگادیں۔ان کی صورتیں بندروں اور کتوں جیسی کر دی جائیں۔بعض نے کہا ہے کہ یہ آخرت میں ہوگا جس کی طرف کہ آیت:

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتَابَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾(۸۴۔۱۰) اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے۔میں اشارہ پایا جاتا ہے اور چہروں کو مٹانے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کی آنکھیں گدی پر لگادی جائیں اور یا ہدایت سے گمراہی کی طرف لوٹا دینا مراد ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ﴾(۴۵۔۲۳) اور باوجود جاننے بوجھنے کے گمراہ ہو رہا ہے۔(تو) خدا نے بھی اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی۔

بعض نے کہا ہے کہ وجوہ سے قوم کے اعیان واکابر مراد ہیں اور معنی یہ ہیں کہ ہم بڑے بڑے سرداروں کو رعیت اور محکوم بنادیں،اس سے بڑھ کر اور کون سی ہلاکت ہوسکتی ہے۔

(ط م ع)

اَلطَّمْعُ کے معنی ہیں: نفس انسانی کا کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ میلان۔

طَمِعَ(س) طَمْعًا وَطَمَاعِيَّةً: کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ مائل ہونا۔طَمِعٌ وَطَامِعٌ: اس طرح مائل ہونے والا قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَلَنَا رَبُّنَا﴾(۲۶۔۵۱) ہمیں امید ہے کہ ہمارا خدا ہمارے گناہ بخش دے گا۔

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْالَكُمْ﴾(۲۔۷۵)(مومنو) کیا تم آرزو رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے دین کے قائل ہو جائیں گے۔

﴿خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾(۱۳۔۱۲) ڈرانے اور امید دلانے کے لیے۔

اور عموماً چونکہ طمع کی بنا خواہش نفسانی پر ہوتی ہے اس لیے کہا جاتا ہے:اَلطَّمَعُ طَبْعٌ والطبع تدنس الاهاب کہ طمع بھی ایک قسم کی آلودگی ہے جو انسان کے نفس کو ملوث کر ڈالتی ہے۔

(ط م ن)

اَلطَّمَانِيْنَةُ وَالْاِطْمِيْنَانُ کے معنی ہیں خلجان کے

بعد نفس کا سکون پذیر ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ﴾ (۳۔۱۲۶) یعنی اس لیے کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی حاصل ہو۔
﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ﴾ (۲۔۲۶۰) لیکن (میں دیکھنا) اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کر لے۔ اور آیت کریمہ:
﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ (۸۹۔۲۷) میں نفس مطمئنہ سے مراد وہ نفس سے جسے برائی کی طرف کسی طور بھی رغبت نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:
﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (۱۳۔۲۸) اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔
میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ معرفت الٰہی اور کثرت عبادت سے ہی قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ جس قسم کی تسکین کا کہ آیت: ﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ﴾ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا۔ ارشاد ہے: ﴿وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ﴾ (۱۶۔۱۰۶) اور اسکا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔
﴿فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ﴾ (۴۔۱۰۳) پھر جب خوف جاتا رہے۔
﴿وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا﴾ (۱۰۔۷) اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہو بیٹھے۔
وَاطْمَاَنَّ وَتَطَاْمَنَ، مادہ اور معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

(ط ھ ر)

طَهُرَتِ (ك) الْمَرْاَةُ طُهْرًا وَطَهَارَةً وَطَهَرَتْ (ن) کے معنی عورت کے حیض سے پاک ہونا کے ہیں۔ اور اسے فتحہ ھاء کے ساتھ پڑھنا قیاس کے زیادہ مطابق ہے اولاً تو اس لیے کہ یہ طَمَثَتْ کی ضد ہے جس کے معنی حیض آنا کے ہیں اور دوم اس لیے کہ اس سے اسم فاعل طَاهِرَةٌ وَطَاهِرٌ آتا ہے جیسے قَآئِمَةٌ وَقَآئِمٌ وَقَاعِدَةٌ وَقَاعِدٌ۔ [1]
طہارت دو قسم پر ہے طہارت (۱) جسمانی اور (۲) طہارت قلبی قرآن پاک میں جہاں کہیں طہارت کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم دونوں قسم کی طہارت مراد ہے، کہا جاتا ہے۔
طَهَّرْتُهٗ فَطَهُرَ وَتَطَهَّرَ وَاطَّهَّرَ فَهُوَ طَاهِرٌ وَمُتَطَهِّرٌ: میں نے اسے پاک کیا چنانچہ وہ پاک ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ (۵۔۶) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہو جایا کرو یعنی پانی یا جو چیز اس کے قائم مقام ہو اس کے ذریعہ طہارت کر لیا کرو۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ (۲۔۲۲۲) اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو، میں دو فعل لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ عورتیں جب تک حیض سے فارغ ہو کر غسل نہ کر لیں اس وقت تک ان سے مقاربت جائز نہیں ہے اور ایک قرأت میں حَتّٰى يَطَّهَّرْنَ ہے جس سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ (۲۔۲۲۲) اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
میں مُتَطَهِّرِيْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو گناہوں کو ترک کر کے اصلاح نفس میں لگے رہتے ہیں نیز فرمایا:

---

[1] وان کان بضم الطاء فلتکن لصفه منه طهیر مثل کریم لکن قال ابن جنی: طاهر من طهر مثل شاعر من شعر فلذانك جمع الشاعر علی شعراء لانه علی جمع فعیل ۱۲، کذا فی ابی السعود انظر (الفتوحات الالهیة) (۱/ ۳۵۵) ۱۲۔

﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا﴾(۹۔۱۰۸) اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں۔

﴿اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾ (۷۔۸۲) ان کے گھر والوں کو اپنے گاؤں سے نکال دو کہ یہ لوگ پاک بننا چاہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾(۹۔۱۰۸) اور خدا پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

میں مُطَّهِّرِيْنَ سے پاکیزہ قلب لوگ مراد ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾(۳۔۵۵) کے معنی یہ ہیں کہ خدا تجھے ان لوگوں سے نکال کر الگ لے جائے گا اور اس بات سے بلند وبالا رکھے گا کہ ان جیسے کام کرو۔ اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾(۳۳۔۳۳) اور تمہیں بالکل صاف کردے۔

﴿وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۳۔۴۲) اور پاک بنایا اور جہان کی عورتوں میں منتخب کیا۔

﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ﴾(۲۔۲۳۲) یہ تمہارے لیے نہایت خوب اور بہت پاکیزہ بات ہے۔

﴿ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ﴾(۳۳۔۵۳) یہ تمہارے دلوں کے لیے بہت پاکیزگی کی بات ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾(۵۶۔۷۹) اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پاک کے حقائق کی معرفت انہی لوگوں کو حاصل ہوسکتی ہے جو اپنے نفوس کو آلودگیوں سے پاک وصاف رکھتے ہیں اور دل ودماغ کو ہر قسم کی آلائش سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾(۲۷۔۵۶) بطور طنز کہا تھا کیونکہ لوط علیہ السلام نے جب قوم کی بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ﴿هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ﴾ کہا تو انہوں نے طنزاً یہ جواب دیا تھا اور آیت کریمہ:

﴿وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾(۲۔۲۵) اور وہاں ان کے لیے بیبیاں ہوں گی۔

میں مُطَهَّرَةٌ کے معنی ہیں کہ وہ ہر قسم کی دنیاوی کثافتوں اور نجاستوں (یعنی حیض ونفاس وغیرہ) سے پاک ہوں گی اور بعض نے کہا ہے کہ اخلاق رذیلہ سے پاکیزہ ہونا مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں جنتی عورتوں کو ﴿عُرُبًا اَتْرَابًا﴾ (۵۰۔۳۷) شوہروں کی پیاریاں اور ہم عمر۔

کہا ہے اور قرآن پاک میں فرمایا:

﴿مَرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾(۸۰۔۱۴) جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾(۷۴۔۴) اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے: یہاں نفس کو رذائل سے پاک رکھنا مراد ہے۔[1] اور آیت کریمہ:

﴿وَطَهِّرْ بَيْتِىَ﴾(۲۲۔۲۶) اور میرے گھر کو صاف رکھا کرو۔

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ﴾ (۲۔۱۲۵) اور ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو کہا کہ میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔

میں خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک رکھنے کی ترغیب

[1] ذکرہ عکرمة عن ابن عباس (ص۵۰۹ الجمل ج٤).

دی گئی ہے بعض علماء نے کہا ہے کہ دل کو پاک وصاف رکھنا مراد ہے حتیٰ کہ اس کے اندر وہ سکون پیدا ہو سکے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۴۸۔۴) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔ میں پایا جاتا ہے۔

اَلطَّھُوْرُ: یہ کبھی مصدر ہوتا ہے۔❶ جیسا کہ سیبویہ نے اہل عرب سے تَطَهَّرْتُ طَهُوْرًا وَتَوَضَّأْتُ وَضُوْءً کا محاورہ نقل کیا ہے۔ لہٰذا یہ فَعُوْلٌ کے وزن پر مصدر ہے۔ جیسا کہ وَقَدْتُ وَقُوْدًا ہے اور کبھی اسم ہوتا ہے جیسا کہ فَطُوْرٌ، ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے روزہ کھولا جائے اسی طرح وَجُوْرٌ سَقُوْطٌ اور ذَرُوْرٌ ہیں❷ اور کبھی صیغہ صفت ہوتا ہے جیسا کہ رَسُوْلٌ اور اس کے ہم وزن دیگر اسمائے صفت ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ (۷۶۔۲۱) اور ان کا پروردگار ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

تو اس میں تنبیہ کی ہے کہ ان کے مشروبات اہل دوزخ کے مشروبات کے خلاف ہوں گے جن کا ذکر کہ آیت:

﴿وَیُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ﴾ (۱۴۔۱۶) اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا﴾ (۲۵۔۴۸) اور ہم آسمان سے پاک اور نتھرا ہوا پانی برساتے ہیں۔

میں اصحاب شافعیؒ طَھُوْرٌ بمعنی مُطَهِّرٌ لیتے ہیں لیکن یہ لفظاً صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اَفْعَلَ وَفَعَّلَ سے فَعُوْلٌ کے وزن پر صیغہ صفت نہیں آتا بلکہ یہ وزن فَعُلَ کے ساتھ خاص ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لفظ طَھُوْرٌ (معنوی) اعتبار سے تطہیر کو چاہتا ہے۔ کیونکہ طاہر (پاکیزہ) دو قسم پر ہوتا ہے ایک وہ جو خود تو پاک ہو مگر دوسری چیز کو پاک کرنے کی اس میں صلاحیت نہ ہو جیسے کپڑا کہ گو یہ پاک ہے مگر دوسری چیز کو پاک نہیں کر سکتا۔ دوم وہ جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیز کو بھی پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے پانی۔ چنانچہ قرآن پاک نے پانی کو طَھُوْرٌ کہہ کر اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(ط و د)

اَلطَّوْدُ: بلند پہاڑ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ﴾ (۲۶۔۶۳) کہ گویا بڑا پہاڑ ہے۔

اَلطَّوْدُ کے معنی ہی بڑے بلند پہاڑ کے ہیں۔❸ مگر اس کے باوجود اس کے وصف میں عظیم کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ پانی بلند پہاڑ کی طرح تھا نہ یہ کہ وہ سب پہاڑوں سے بلند تر تھا۔

(ط و ر)

طَوَارُ الدَّارِ وَطِوَارُهٗ کے معنی گھر کی عمارت کے امتداد یعنی لمبا ہونے اور پھیلنے کے ہیں۔ محاورہ ہے:

عَدَا فُلَانٌ طَوْرَهٗ: فلاں اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔

لَا اَطُوْرُ بِهٖ میں اس کے مکان کے صحن کے قریب تک نہیں جاؤں گا۔

فَعَلَ كَذَا طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ: اس نے ایک بار کے بعد

---

❶ انظر للبحث اصلاح المنطق ۳۳۲۔۳۳۵ باب فَعُوْلٌ ۱۲.

❷ كما روى في الحديث ((الطهور ماءه والحل ميتته)).

❸ قال الزمخشري انه ماخوذ من البناء المنطادای العالی والفائق (ص ۲٦٥ ج ۲).

دوسری بار یہ کام کیا اور آیت کریمہ:

﴿وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا﴾ (۷۱۔۱۴) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اَطْوَارًا سے ان مختلف منازل ومدارج کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:

﴿خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ﴾ (۲۲۔۵) ہم نے تم کو (پہلی بار بھی) تو پیدا کیا تھا (یعنی ابتداء میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر۔

میں مذکور ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مختلف احوال مراد ہیں جن کی طرف آیت:

﴿وَاخْتِلَافِ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾ (۳۰۔۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔

میں اشارہ فرمایا ہے یعنی جسمانی اور اخلاقی تفاوت جو ہر معاشرہ میں نمایا طور پر پایا جاتا ہے۔

اَلطُّوْرُ (ایلہ کے قریب ایک خاص پہاڑ کا نام ہے) اور بعض نے کہا ہے ہر پہاڑ کو طور کہہ سکتے ہیں۔ [1] اور بعض کے نزدیک طور سے وہ سلسلہ کوہ مراد ہے جو کرہ ارض کو محیط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالطُّوْرِ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ﴾ (۵۲۔۲۰۱) کوہ طور کی قسم اور کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے۔

﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ﴾ (۲۸۔۴۶) اور نہ تم اس وقت طور کے کنارے پر تھے۔

﴿وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ﴾ (۹۵۔۲) اور طور سینین کی۔

﴿وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ﴾ (۱۹۔۵۲) اور ہم نے ان کو طور کی ذنی جانب سے پکارا۔

﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ﴾ (۲۔۹۳) اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کر کھڑا کیا۔

(ط و ع)

اَلطَّوْعُ کے معنی (بطیب خاطر) تابعدار ہو جانا کے ہیں اس کے بالمقابل کُرْہٌ ہے جس کے معنی ہیں: کسی کام کو ناگواری اور دل کی کراہت سے سرانجام دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْكَرْهًا﴾ (۴۱۔۱۱) آسمان وزمین سے فرمایا: دونوں آؤ دل کی خوشی سے یا ناگواری سے۔

﴿وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا اَوْ كَرْهًا﴾ (۳۔۸۳) حالانکہ سب اہل آسمان وزمین بطیب خاطر یا دل کے جبر سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔

یہی معنی اَلطَّاعَةُ کے ہیں لیکن عام طور پر طَاعَةٌ کا لفظ کسی حکم کے بجالانے پر آجاتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ﴾ (۴۔۸۱) اور یہ لوگ منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم دل سے آپ کے فرمانبردار ہیں۔

﴿طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ﴾ (۴۷۔۲۱) (خوب بات) فرمانبرداری اور پسندیدہ بات کہنا ہے۔

طَاعَ لَهٗ يَطُوْعُ وَاَطَاعَهٗ يُطِيْعُهٗ: کسی کی فرمانبرداری کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (۴۔۵۹) اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (۴۔۸۰) جو

---

[1] وفی البخاری عن مجاهدان الطور اسم سریانی بمعنی الجبل ولکن القرآن اطلقه علی جبل مخصوص واختلف فی تعیینه معجم البلدان للحموی.

شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی۔

﴿وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ﴾ (۳۳۔۸) اور کافروں کا کہانہ مانو۔

اور حضرت جبریل علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٌ﴾ (۸۱۔۲۱) سردار اور امانت دار ہے۔

اَلتَّطَوُّعُ: (تفعل) اس کے اصل معنی تو تکلیف اٹھا کر حکم بجالانا کے ہیں۔مگر عرف میں نوافل کے بجالانے کو تَطَوُّعٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ﴾ (۲۔۱۸۴) اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو وہ اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔

ایک قرأت میں وَمَنْ يَّطَّوَّعَ خَيْرًا ہے۔

اَلْاِسْتِطَاعَةُ: (استفعال) یہ طوع سے استفعال کے وزن پر ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا موجود ہونا مگر محققین کے نزدیک اِسْتِطَاعَةٌ نام ہے ان اسباب وذرائع اور صلاحیتوں کا جن کے ذریعہ انسان کو کسی کام کے کرنے پر قدرت ہو جائے اور وہ چار چیزیں ہیں۔(۱) فاعل کا مخصوص ڈھانچہ (۲) فعل کا تصور (۳) مادہ جو فعل کے اثر کو قبول کر سکے (۴) اگر وہ فعل کسی آلہ کا محتاج ہے تو اس آلہ کا فراہم ہونا مثلاً لکھنا کہ کاتب لکھنے کے لیے ان چار چیزوں کا محتاج ہے اور جب کسی شخص کو ان اشیاء میں سے ایک چیز بھی حاصل نہ ہو تو اس کو غیر مستطیع کہا جائے گا۔

اِسْتِطَاعَةٌ کی ضد عَجْزٌ ہے یعنی ان اشیاء میں سے ایک دو یا سب کا حاصل نہ ہونا اور جب کسی شخص کو یہ ساری چیزیں حاصل ہو جائیں تو اسے مُسْتَطِيْعٌ مطلق کہا جاتا ہے اور جب ان میں سے کوئی بھی حاصل نہ ہو تو سے عاجز مطلق کہا جائے گا اور جب کچھ حاصل ہوں اور کچھ حاصل نہ ہوں تو گو ایک اعتبار سے وہ مستطیع ہے مگر دوسرے اعتبار سے وہ عاجز ہے اور اسے عاجز کہنا زیادہ بہتر ہے اور استطاعت قدرت سے اخص ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۲۱۔۴۳) وہ نہ تو آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ﴾ (۵۱۔۴۵) پھر وہ نہ تو اٹھنے کی طاقت رکھتے تھے۔

﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (۳۔۹۷) جو اس (گھر) تک جانے کا مقدور رکھے۔

یعنی اس کے پاس یہ چار چیزیں مہیا ہو جائیں اور حدیث میں استطاعت حج کی جو تشریح زاد راہ اور سواری سے کی گئی ہے۔[1] (۲۲) تو اس سے صرف ان اسباب وذرائع کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو حج کے لیے لازم ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ باقی تینوں چیزوں کا ہونا تو عقلاً ہر کام کے لیے لازم ہے اور شرعاً ان کے بغیر کسی کو مکلّف بنانا ہی جائز نہیں ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ﴾ (۹۔۴۲) اگر ہم طاقت رکھتے تو آپ کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے۔

میں استطاعت سے سواری، مال اور دیگر ذرائع مراد ہیں اسی طرح آیت کریمہ:

---

[1] اخرجه الترمذی وابن ماجة من حديث ابی هريرة وابن عباس والحاكم من حديث انس قال في الكاف اخرجه الدار قطنی باسانيد ضعيفة قال البيهقی والصواب الرواية عن الحسن مرسلاً ولا يثبت مرفوعاً راجع تخريج الكشاف.

﴿وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا﴾(۴۔۲۵) اور جو شخص تم میں سے مقدور نہ رکھے۔

﴿لَایَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً﴾(۴۔۹۸) کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔

اور کبھی فُلَانٌ لَایَسْتَطِیْعُ سے یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ عدم مزاولت کی وجہ سے یہ کام اس پر دشوار ہے یا تو اس لیے کہ جن اسباب وذرائع کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں ہیں اور یا اس لیے کہ اس کام کا تصور یعنی خاکہ اس کے ذہن میں نہیں ہے اس حالت میں انسان کو مکلف بنانا صحیح ہوتا ہے اور اسے معذور نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ آیات:

﴿لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا﴾(۱۸۔۶۷) تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کرسکو گے۔"

﴿مَاکَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا کَانُوْا یُبْصِرُوْنَ﴾ (۱۱۔۲۰) کیونکہ یہ شدت کفر سے تمہاری بات نہیں سن سکتے اور نہ تم کو دیکھ سکتے تھے۔ اور

﴿وَکَانُوْا لَایَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا﴾(۱۸۔۱۰۱) اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

میں استطاعت کی نفی سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا﴾(۴۔۱۲۹) اور تم خواہ کتنا ہی چاہو ہرگز برابری نہیں کرسکو گے بھی اسی معنی پر محمول ہے حالانکہ ان تمام آیات میں استطاعت کی نفی کے باوجود انہیں مکلف بنایا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا﴾(۵۔۱۱۲) کیا تمہارا پروردگار ایسا کرسکتا ہے کہ ہم پر............ نازل کرے۔

کی تفسیر میں بعض نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ازراہ نادانی یہ بات کہی تھی کیونکہ اس وقت ان کو صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں تھی اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں استطاعۃ بمعنی قدرت نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کیا مائدہ کا اتارنا تقاضائے حکمت کے خلاف تو نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں یَسْتَطِیْعُ بمعنی یُطِیْعُ ہے یعنی کیا تمہارا پروردگار ہماری اس عرض کو قبول فرما سکتا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿مَالِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ﴾(۴۰۔۱۸) اور ظالموں کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ سفارشی، جس کی بات قبول کی جائے۔

میں یُطَاعُ بمعنی یُجَابُ ہے یعنی ایسا جس کی بات مانی جاسکے۔ اور ایک قرأت میں هَلْ تَسْتَطِیْعُ رَبَّکَ بھی ہے یعنی کیا تم اپنے پروردگار سے یہ بات منوا سکتے ہو۔ جیسا کہ محاورہ ہے: هَلْ تَسْتَطِیْعُ الْاَمِیْرَ اَنْ یَفْعَلَ کَذَا (کہ کیا تم امیر سے یہ بات منوا سکتے ہو) اور آیت کریمہ:

﴿وَطَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ﴾(۵۔۳۰) مگر اس کے نفس نے اسے ترغیب دی۔

میں طَوَّعَتْ کے معنی ہیں کہ نفسانی جذبات نے تسویل سے اسے اس پر آمادہ کرلیا اور وہ اس کام کے کرنے پر راضی ہوگیا اور طَوَّعَتْ کا صیغہ اَطَاعَتْ سے زیادہ بلیغ ہے اور طَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ کا محاورہ تَاَبَّتْ عَنْ کَذَا نَفْسُہٗ کا بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ اسے یہ کام کرنا گوارا نہیں ہے اور تَطَوَّعَ کَذَا کے معنی ہیں اس نے رضامندی سے اس کام کے لیے تکلیف اٹھانا گوارا کرلیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ﴾ (۲۔۱۸۵) اور جو کوئی نیک کام کرے تو خدا قدرشناس اور دانا ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾(۹۔۷۹)

جوذی استطاعت مسلمان دل کھول کر خیرات کرتے ہیں.........

ان پر جو منافق طعن کرتے.......... ہیں۔

بعض نے کہا ہے طَاعَتْ وَتَطَوَّعَتْ کے ایک ہی معنی ہیں اور اِسْتَطَاعَ وَاسْطَاعَ بھی ہم معنی ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا﴾ (۱۸۔۹۷) پھر ان کو یہ قدرت نہ رہی کہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ یہ طاقت رہی کہ اس میں نقب لگا سکیں۔

(ط و ف)

اَلطَّوْفُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے گرد چکر لگانے اور گھومنے کے ہیں۔ اَلطَّائِفُ: چوکیدار جورات کو حفاظت کے لیے چکر لگائے اور پہرہ دے۔ طَافَ بِهٖ يَطُوْفُ کسی چیز کے گرد چکر لگانا، گھومنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۷) نوجوان خدمت گزار، جو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہیں گے ان کے آس پاس پھریں گے۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (۲۔۱۵۸) اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے۔

اور اسی سے بطور استعارہ جن، خیال، حادثہ، وغیرہ کو بھی طَائِفٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ﴾ (۷۔۲۰۱) جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے۔

میں طائف سے وہ شیطان مراد ہے جو انسان کا شکار کرنے کے لیے اس کے گرد چکر کاٹتا رہتا ہے ایک قرأت میں طَيْفٌ ہے جس کے معنی کسی چیز کا خیال اور اس صورت کے ہیں جو خواب یا بیداری میں نظر آتی ہے اسی سے خیال کو طَيْفٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ﴾ (۶۸۔۱۹) کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے (راتوں) رات اس پر ایک آفت پھر گئی۔

میں طَآئِفٌ سے وہ آفت یا حادثہ مراد ہے جو انہیں پہنچا تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ﴾ (۲۔۱۲۵) طواف کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔

میں طَائِفِيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو (حج یا عمرہ کرنے کے لیے) بیت اللہ کا قصد کرتے اور اس کا طواف کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالطَّوَّافُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (۲۴۔۵۸) اور نہ ان پر جو کام کاج کے لیے تمہارے ارد گرد پھرتے پھیراتے رہتے ہیں۔

میں طَوَّافُوْنَ سے نوکر چاکر مراد ہیں جنہیں خدمت گذاری کے لیے اندروں خانہ آنا جانا پڑتا ہے اسی بنا پر بلی کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ [1] (۲۳) ((اِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ وَالطَّوَّافَاتِ)) کہ یہ بھی ان میں داخل ہے جو تمہارے گرد پھرتے پھراتے رہتے ہیں۔

اَلطَّائِفَةُ: (۱) لوگوں کی ایک جماعت۔ (۲) کسی چیز کا ایک ٹکڑا۔ اور آیت کریمہ:

---

[1] انظر لمخارج حدیث الهر الفتح الکبیر للنبهانی (۱/۴۴۸) والقرطبی (۱۲/۳۰۶) والغریب للقتبی (۳۰۷) والفائق (۲/۴۷) والترمذی والبیهقی وزوائد ابن حبان رقم: ۱۲۱ من حدیث ابی قتادة و صححه الائمه واعله ابن منده وعلیه تعقب للحافظ فی الفتح قال فی النیل (۱/۴۷) وفی الباب عن جابر عند ابن شاهین فی الناسخ والمنسوخ.

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ (۹۔۱۲۲) تو یوں کیوں نہیں کیا کہ ہر ایک جماعت میں چند اشخاص نکل جاتے تا کہ دین کا علم سیکھتے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ کبھی طَآئِفَةٌ کا لفظ ایک فرد پر بھی بولا جاتا ہے۔ ❶ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۹۔۹) اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق.........اور آیت کریمہ:
﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ﴾ (۳۔۱۲۲) اس وقت تم میں سے دو جماعتوں نے چھوڑ دینا چاہا۔
طَآئِفَةٌ سے ایک فرد بھی مراد ہوسکتا ہے مگر جب طَآئِفَةٌ سے جماعت مراد لی جائے تو یہ طَآئِفٌ کی جمع ہوگا اور جب اس سے واحد مراد ہو تو اس صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جمع بول کر مفرد سے کنایہ کیا ہو اور یہ بھی کہ رَاوِيَةٌ وَعَلَامَةٌ کی طرح مفرد ہو اور اس میں تا برائے مبالغہ ہو اَلطُّوْفَانُ: وہ مصیبت یا حادثہ جو انسان کو چاروں طرف سے گھیر لے اس بنا پر آیت کریمہ:
﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ﴾ (۷۔۱۳۳) تو ہم ان پر طوفان وغیرہ کتنی کھلی ہوئی نشانیاں بھیجیں۔ میں طوفان بمعنی سیلاب بھی ہوسکتا ہے کیونکہ نوح علیہ السلام پر جو عذاب آیا تھا وہ پانی کی صورت میں ہی تھا اور دوسری جگہ فرمایا:
﴿فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ﴾ (۲۹۔۱۴) پھر ان کو طوفان (کے عذاب) نے آ پکڑا۔
طَائِفُ الْقَوْسِ: خانہ کمان جو گوشہ اور ابہر کے درمیان ہوتا ہے۔ اَلطَّوْفُ (کنایہ) پلیدی۔ ❷

(طوق)

اَلطَّوْقُ: اس حلقہ کو کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گردن کے گرد بنا ہوتا ہے جیسے کبوتری کی گردن میں یا مصنوعی ہو جیسے سونے چاندی کا حلقہ جو گلے میں ڈالا جاتا ہے پھر بطور توسع کے قَلَّدْتُهٗ کی طرح طَوَّقْتُهٗ كَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں جو مال کے متعلق:
﴿سَيُطَوَّقُوْنَ مَابَخِلُوا بِهٖ﴾ (۳۔۱۸۰) وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں (قیامت کے دن) اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔
فرمایا ہے تو یہ بطور تشبیہ کے ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے ❸
(۲۴) ((يَاْتِيْ اَحَدَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعٌ اَقْرَعُ لَهٗ زَبِيْبَتَانِ فَيُتَطَوَّقُ بِهٖ فَيَقُوْلُ اَنَا الزَّكٰوةُ الَّتِيْ مَنَعْتَنِيْ)) کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی ایک کے پاس گنجا سانپ آئے گا۔ اور اس کے گلے میں طوق بن کر پڑ جائے گا اور کہے گا کہ میں تمہارا خزانہ ہوں جس کی تم نے زکوۃ ادا نہیں کی تھی۔
اَلطَّاقَةُ: اس مقدرت اور قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جاسکے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال

---

❶ عن ابن عباس والحسن ومجاهد و ابراهيم و في الطبرسي ۵/ ۱۰۰۹ وهو المروى عن ابى جعفر

❷ وفي الحديث: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن متحدثين على طوفهما وفي الآخر لا يصلين احدكم وهو يدافعه الطوف والبول انظر الفائق (۲/ ۳۷) والنهاية واللسان (طوف)

❸ اصله في البخارى من حديث ابى هريرة ورحم ن ه ت۔ عن ابن مسعود و (ن ، ه)عن ابى هريرة و (حم ، ن ، عن ابن عمر) والبزار و ابى خزيمة والرؤيانى (ع، حب ، طب ، خل ، ك ، عن ثوبان راجع كنز العمال ج ۳ ، رقم: (۱۲۱۔۱۲۲: ۱۲۲۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷) الكشاف مع التخريج (۱/ ۲۳۳).

دیا ہو پس آیت ہے: ﴿وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ (۲۔۲۸۶) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت نہ ہو بلکہ اس سے ایسے کام مراد ہیں جن کا کرنا ہمارے لیے دشوار ہو جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ﴾ (۷۔۱۵۷) اوران پر سے بوجھ............اتارتے ہیں۔

اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ (۹۴۔۲) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا۔

میں وِزْرٌ سے ان دشوار عبادات کا بوجھ مراد ہے جن کا ترک، گناہ کا موجب تھا۔اسی طرح آیت ہے:

﴿قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهٖ﴾ (۲۔۲۴۹) تو کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اوراس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔میں بھی طَاقَةٌ کی نفی سے یہی معنی مراد ہے اور کبھی طَاقَة کی نفی سے قدرت کا انکار مراد ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنَ﴾ (۲۔۱۸۴) اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔

کے بظاہر معنی تو یہی ہیں کہ یہ جو شخص روزہ کی طاقت رکھتا ہو اس پر فدیہ لازم ہے خواہ روزہ رکھے یا نہ رکھے مگر اس امر پر اجماع ہو چکا ہے کہ صرف دوسری شروط کے ساتھ فدیہ لازم ہوگا۔ایک قرأت میں يُطَوَّقُوْنَهٗ ہے یعنی جن پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ بہ مشقت روزہ رکھیں۔

(ط و ل)

اَلطُّوْلُ: یہ اسمائے اضافیہ سے ہے اوراس کے معنی دراز اور لمبا ہونا کے ہیں۔یہ اَلْقِصَر کے مقابلہ میں آتا ہے اور اعیان واعراض مثلاً زمانہ وغیرہ سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ﴾ (۵۷۔۱۶) پھر ان پر لمبا عرصہ گزر گیا۔

﴿سَبْحاً طَوِيْلاً﴾ (۷۳۔۷) بہت لمبے شغل (ہوتے ہیں) طَوِيْلٌ وَطُوَالٌ: جیسے عَرِيْضٌ وَعُرَاضٌ: دراز لمبا اس کی جمع طِوَالٌ آتی ہے۔اور بعض نے طِيَالٌ بھی کہا ہے اور لمبا ہونے کی مناسبت سے جانور کی پچھاڑی کی رسی کو طِوَلَ کہا جاتا ہے طَوِّلْ فَرَسَكَ: اپنے گھوڑے کی پچھاڑی باندھ دے۔طِوَالُ الدَّهْرِ: عرصہ دراز۔

تَطَاوَلَ فُلَانٌ درازی یا وسعت کو ظاہر کرنا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ﴾ (۲۸۔۴۵) پھر ان پر لمبا عرصہ گزر گیا۔

اور طَوْلٌ کا لفظ خاص کر فضل واحسان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿شَدِيْدُ الْعِقَابِ ذِى الطَّوْلِ﴾ (۴۰۔۳) سخت عذاب دینے والا اور صاحب کرم ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿اِسْتَأْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ﴾ (۹۔۸۶) تو جوان میں دولت مند ہیں وہ تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ میں اُولُوا لطَّوْلِ سے خوش حال طبقہ مراد ہے اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلاً﴾ (۴۔۲۵) اور جو شخص تم میں سے.........مقدور نہ رکھے۔

میں طَوْلاً کنایہ ہے اس مال سے (جو عورت کو) مہر میں یا نان ونفقہ کے طور پر دینا پڑتا ہے۔

طَالُوتُ: یہ اسم عجمی ہے اور بنی اسرائیل کے ایک با اقبال بادشاہ کا نام تھا۔ [1]

(ط و ی)

طَوَیْتُ الشَّیْءَ طَیًّا: کے معنی ہیں کسی چیز کو اس طرح لپیٹ لینا۔ جیسا کہ کپڑے کو اس کی درز پر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿یَوْمَ نَطْوِی السَّمَاءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ﴾ (۲۱۔۱۰۴) جس دن ہم آسمان کو اسی طرح لپیٹ لیں گے جس طرح لکھے ہوئے کاغذوں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اسی سے طَوَیْتُ الْفَلَاۃَ (جنگل کو قطع کرنا) کا محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی مسافت کو قطع کیا گویا راستوں کو لپیٹ لیا طَوَی اللّٰہُ عُمْرَہٗ: اللہ تعالیٰ نے اسکی عمر ختم کردی گویا اس کی مدتِ عمر کو لپیٹ دیا۔ شاعر نے کہا ہے [2] (الوافر)

(۲۹۵) طَوَتْكَ خُطُوبُ دَهْرِكَ بَعْدَ نَشْرٍ

حوادثات زمانہ نے پھیلانے کے بعد تمہیں لپیٹ دیا (یعنی تمہاری عمر ختم کردی) اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ﴾ (۳۹۔۶۷) اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ میں مَطْوِیّٰتٌ کا لفظ یا تو طَوَیْتُ الشَّیْءَ کے محاورہ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی لپیٹ دینا کے ہیں اور یا طَوَی اللّٰہُ عُمُرَہٗ سے ماخوذ ہوگا اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز آسمان کو فنا کردیا جائے گا اور آیت:

﴿إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ (۲۰۔۱۲) تم (یہاں) پاک میدان (یعنی) طویٰ میں ہو۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طویٰ اسی وادی المقدس کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچ چکے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ طوی اس مرتبہ کی طرف اشارہ ہے جس سے انہیں اجتباء کے طور پر نوازا گیا تھا اگر وہ اس مرتبہ کو مساعی اور اجتہاد کی راہ سے حاصل کرسکتے تھے وادی نبوت تک پہنچنے کی تمام مسافتیں ان کے لیے لپیٹ دی گئیں پھر اگر اسے اس وادی کا نام قرار دیا جائے تو اسے غیر منصرف بھی پڑھ سکتے ہیں اور منصرف بھی [3] اور اگر اسے طَوَیْتُ کا مصدر مانا جائے تو منصرف ہی پڑھا جائے گا اور ثَنًی و ثِنًی کی طرح فاکلمہ (ط) پر دونوں حرکتیں جائز ہوں گی اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کو دو مرتبہ پکارا۔

(ط ی ب)

طَابَ (ض) الشَّیْءُ یَطِیْبُ طَیْبًا فَهُوَ طَیِّبٌ (کے معنی کسی چیز کے پاکیزہ اور حلال ہونے کے ہیں)

---

[1] وقد مرفی (ط ل ت)وقیل ان اسمه بالعبرانیة کان شاول بن قیس من اولاد بنیامین بن یعقوبؑ وَلُقِّبَ بطالوت لطوله وکان اطول من کل اَحَدٍ ۱۲.

[2] قاله ابو العتاهیه (اسماعیل بن القاسم) یرثی علی ابن ثابت و تمامه : کذاك خطوبه نشراً وطیا والبیت فی الکامل ۳٥٦ والبیان (۳: ۱/۱۳۰: ۲۱٦) والزجاجی ٥۹ والاغانی (۳: ۱٤۲)والصناعتین ۱۱ والو حشیات (الحماسة الصغری) ۱۳۲ فی ستة ابیات وذیل الامالی ۲ فی خمسة ونسبها الی امرء ة والسمط ٤ قال الاستاذ المیمنی: والابیات لابی العتاهیة حقاً رواها ٤ اللیثی و محمد بن یزید والزجاجی والا صبهانی وابن عبدربه وآخرون یرثی بها علی بن ثابت و کان صدیقاً له ولهٗ فیه ثلاث مراثٍ راجع ادب الدنیا للماوری بشرح اویس و فا ارزنجانی المعروف بخان زاده ۲۱٦ والمعاهد (۲/۱۸٥).

[3] قال فی الفتوحات لیس یرید به طیاً بعلاج و انتصاب و ان المراد بذالك الفناء والذهاب(۳/۷٤۹). واماصرفه فلانه اسم الواد مذکر واما غیره فللتانیث مع العلمیة راجع مجاز القرآن (۲: ۱٦).یمکن ان یکون معناه ان الوادی قدس مرتین (الکشاف ۳/٥٥).

قرآن میں ہے:

﴿فَانْكِحُوا مَاطَابَ لَكُمْ﴾ (۴۔۳) تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں.........ان سے نکاح کرلو۔

﴿فِاِنْ طِبْنَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ (۴۔۴) ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے.........تم کو چھوڑ دیں۔

اصل میں طَيِّبٌ اسے کہا جاتا ہے جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی اور شریعت کی رو سے اَلطَّعَامُ الطَّيِّبُ اس کھانے کو کہا جاتا ہے جو جائز طریق سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہ سے جائز اندازہ کے مطابق لیا جائے کیونکہ جو غذا اس طرح حاصل کی جائے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگوار ثابت ہوگی ورنہ دنیا کی خوشگوار چیزیں آخرت میں نقصان دہ ثابت ہوں گی اسی بنا پر قرآن پاک طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَارَزَقْنَاكُمْ﴾ (۲۔۱۷۲) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ۔

﴿وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلاً طَيِّباً﴾ (۵۔۸۸) اور جو حلال، طیب روزی خدا نے تمہیں دی ہے اسے کھاؤ۔

﴿لاتُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَآاَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (۵۔۸۷) جو پاکیزہ چیزیں خدا نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو۔

﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً﴾ (۲۳۔۵۱) پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو۔ اور یہی معنی آیت:

﴿وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (۷۔۳۲) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں۔ میں مراد ہیں۔ اور آیت:

﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ﴾ (۵۔۵) آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طیبات سے وہ جانور مراد ہیں جنہیں ذبح کر کے کھایا جاتا ہے اور آیت: ﴿رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ﴾ (۱۶۔۷۲) اور کھانے کو تمہیں پاکیزہ چیزیں دیں۔

میں مال غنیمت کی طرف اشارہ ہے۔ اور انسانوں سے "طَيِّبٌ" اس انسان کو کہا جاتا ہے جو جہالت، فسق اور قبیح اعمال کی نجاست سے پاک ہو اور علم وایمان اور محاسن اعمال کے زیور سے آراستہ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ﴾ (۱۶۔۳۲) جب فرشتے ان کی جانیں نکالتے ہیں اور یہ (کفر وشرک سے) پاک ہوتے ہیں۔

میں طَيِّبِيْنَ سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں نیز فرمایا: ﴿طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِيْنَ﴾ (۳۹۔۷۳) تم بہت اچھے رہے اب اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔ ﴿مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ (۳۔۳۸) اپنی جناب سے اولاد طیب۔

﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۸۔۳۷) تاکہ خدا، ناپاک سے الگ کردے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ﴾ (۲۴۔۲۶) اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں۔ میں اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ پاکیزہ اعمال پاکیزہ انسانوں سے ہی سرزد ہوتے ہیں۔

چنانچہ مروی ہے [1]: (۲۵) اَلْمُؤْمِنُ اَطْيَبُ مِنْ عَمَلِهٖ وَالْكَافِرُ اَخْبَثُ مِنْ عَمَلِهٖ۔ (کہ مومن اپنے عمل کی وجہ

[1] قال العلامة القرطبی وهو الصحیح وبذا لك ورد الحدیث من عتبة بن عبد النظر روح المعانی (ص ۱۳۵ ج ۱۳)۔

سے اطیب اور کافر اپنے عمل کی وجہ سے خبیث (گندہ) ہوتا ہے)

اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾ (۴۔۲) کے معنی یہ ہیں کہ اچھے اعمال کو چھوڑ کر بداعمالیاں مت اختیار کرو اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَمَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ﴾ (۱۴۔۲۶) پاک عمل کی مثل شجرۃ طیبہ کی ہے۔

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۳۵۔۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلمے چڑھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً﴾ (۹۔۷۲) کے معنی یہ ہیں...... مکانات صاف ستھرے اور فرحت بخش ہوں گے اور آیت کریمہ:

﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُوْرٌ﴾ (۳۴۔۱۵) (رہنے کو) پاکیزہ شہر ہے اور (وہاں بخشنے کو) خدائے غفار، میں بعض نے کہا ہے کہ جنت اور رب العزۃ کے جوار کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (۵۔۶) تو پاک مٹی لو۔ میں طیب سے پاک مٹی مراد ہے یعنی جس میں نجاست کی آمیزش نہ ہو اور اِسْتِنْجَاء کو بھی اِسْتِطَابَةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے پاکیزگی اور طہارت حاصل ہوتی ہے اور اَلْاَطْيَبَان سے کھانا و نکاح مراد ہے۔ طَعَامٌ مُطَيِّبَةٌ لِلنَّفْسِ: وہ کھانا جس سے طبیعت کو فرحت حاصل ہو اور طَيِّبٌ کو طَابٌ بھی کہا جاتا ہے اور مدینہ طیبہ میں ایک قسم کھجور ہوتی ہے جسے طَابٌ کہا جاتا ہے [1] اور آیت کریمہ: ﴿طُوْبٰى لَهُمْ﴾ (۱۳۔۲۹) ان کے لیے خوشحالی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ طُوْبٰى جنت میں ایک درخت کا نام ہے [2] اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر قسم کی خوش گواریاں مراد ہیں جو جنت میں حاصل ہوں گی مثلاً بقا، عزت، غنا وغیرہ جن کے زوال کا اندیشہ نہیں ہوگا۔ [3]

(ط ی ر)

اَلطَّائِرُ: ہر پردار جانور جو فضا میں حرکت کرتا ہے۔ طَارَ يَطِيْرُ طَيْرَانًا: پرند کا اڑنا۔ اَلطَّيْرُ یہ طَائِرٌ کی جمع ہے۔ جیسے رَاكِبٌ کی جمع رَكْبٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (۶۔۳۸) یا پرند جو اپنے پروں سے اڑتا ہے۔

﴿وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً﴾ (۳۸۔۱۹) اور پرندوں کو بھی جو کہ جمع رہتے ہیں۔

﴿وَالطَّيْرُ صَافّٰتٍ﴾ (۲۴۔۴۱) اور پر پھیلائے ہوئے جانور بھی۔

﴿وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ﴾ (۲۷۔۱۷) اور سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے۔

﴿وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ﴾ (۲۷۔۲۰) انہوں نے جانوروں کا جائزہ لیا۔

تَطَيَّرَ فُلَانٌ وَاطَّيَّرَ: اس کے اصل معنی تو کسی پرندہ سے شگون لینے کے ہیں پھر یہ ہر اس چیز کے متعلق استعمال

---

[1] رطب ابن طاب .

[2] قال الزجاج وهذا مروى عن النبى صلى الله عليه وسلم وحمله سيبويه على الدعاء وقال هو فى موضع رفع من هو و معطوفه وحسن مآب.

[3] وبه قال ابو اسحاق ۱۲ .

ہونے لگا ہے جس سے براشگون لیا جائے اور اسے منحوس سمجھا جائے قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ﴾ (۳۶۔۱۸) ہم تم کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے ❶ (۱۸) لَاطَيْرَ اِلَّا طَيْرُكَ کہ نہیں ہے نحوست مگر تیری طرف سے ہے۔قران میں ہے:

﴿اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا﴾ (۷۔۱۳۱) اگر سختی پہنچتی ہے تو.......... بدشگونی لیتے ہیں۔

یعنی موسیٰ علیہ السلام کو باعث نحوست سمجھتے ہیں (چنانچہ ان کے جواب میں فرمایا) ﴿اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَاللّٰهِ﴾ (۷۔۱۳۱) یعنی یہ ان کی بداعمالیوں کی سزا ہے جو اللہ کے ہاں سے مل رہی ہے۔چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

﴿قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَاللّٰهِ﴾ (۲۷۔۴۷) وہ کہنے لگے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں کو ہم بدشگون خیال کرتے ہیں (صالح علیہ السلام نے) کہا کہ تمہاری بدشگونی خدا کی طرف سے ہے۔

﴿قَالُوا طٰٓئِرُكُمْ مَّعَكُمْ﴾ (۳۶۔۱۹) انہوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے۔

اور آیت ہے : ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ (۱۷۔۱۳) اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔میں انسانی اعمال کو طائر کہا گیا ہے (کیونکہ عمل کے سرزد ہوجانے کے بعد انسان کو یہ اختیار نہیں رہتا کہ اسے واپس لے گویا وہ) اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے تَطَايَرُوْا وہ نہایت تیزی سے گئے منتشر ہوگئے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے ❷ (البسیط)

(۲۹۶) طَارُوْا اِلَيْهِ زَرًا فَاتٍ وَوُحْدَاناً

تو جماعتیں بن کر اور اکیلے اکیلے اس کی طرف اڑتے چلے جاتے ہیں۔

فَجْرٌ مُسْتَطِيْرٌ: منتشر ہونے والی صبح۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا﴾ (۷۶۔۷) اور اس دن سے جس کی سختی پھیل رہی ہوگی،خوف رکھتے ہیں۔

غُبَارٌ مُسْتَطَارٌ: بلند اور منتشر ہونے والا غبار۔فجر کو فاعل تصور کر کے اس کے متعلق مُسْتَطِيْرٌ اسم فاعل کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور غبار کو مفعول تصور کر کے مُسْتَطَارٌ کہتے ہیں۔

فَرَسٌ مُطَارٌ: ہوشیار اور تیز رو گھوڑا۔

خُذْمَاطَارَ مِنْ شَعْرِ رَأْسِكَ: یعنی اپنے سر کے پراگندہ اور لمبے بال کاٹ ڈالو۔❸

(ط ی ن)

اَلطِّيْنُ: پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں، گو اس

---

❶ ایضاً فی التاج ومن قولهم وفی الاصل انه مرفوع من روایة عبدالله بن عمر فی حدیث الطیرة وبعده: ولا خیر الاخیرك (راجع عمل الیوم واللیلة لابن سنی ۲۹۲ وتحفة الذاکرین ۲۱۷۔۲۱۸ ومسنداحمد (۲/۲۲۰) وفی الطبرانی و مجمع الزوائد من حدیث عبدالله بن عمرو بن العاص وفیه ابن لهیعة ضعیف.

❷ قاله قریط بن انیف العنبری واوله: اذا الشرابدی ناجذ یه لهم.......... کذا فی التبریزی وفی التبیه لابن جنی وقد نروی لابی الغیل الطهوی والشطر من شواهد الکشاف والبیت فی اللسان والمحکم (وحده) والصناعتین ۲۸۵ ومجالس ثعلب ۴۰۵ والعیون(۱: ۱۸۸)فی تسعة ابیات والسیوطی ۲۵ وهو من اوّل مقطوعة اختارها ابو تمام فی الحماسة (۲۲۔۳۱ مع المرزوقی)فی سبعة وفی روایة التبریزی ثمانیة ۱۲.

❸ قال فی التاج ومنه الحدیث خذما تطایر من شعرك وفی روایة من شعر راسك راجع ایضاً النهایة (طیر).

سے پانی کا اثر زائل ہی کیوں نہ ہوجائے اور طِنْتُ کذَا وَ طَیَّنْتُہٗ کے معنی دیوار وغیرہ کو گارے سے لیپنے کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿مِنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ﴾ (۳۷۔۱۱) چپکنے والی مٹی سے۔
﴿وَخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ (۷۔۱۲) اور اسے مٹی سے بنایا۔
﴿فَاَوْقِدْ لِیْ یَاھَامَانُ عَلَی الطِّیْنِ﴾ (۲۸۔ ۳۸) ہامان! میرے لیے گارے کو آگ لگوا کر (اینٹیں تیار کرواؤ)

❀❀❀

کِتَابُ الظَّاء

(ظ ع ن)

ظَعَنَ (ف) یَظْعَنُ ظَعْناً کے معنی کوچ کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَیَوْمَ ظَعْنِكُمْ﴾ (۱۶۔۸۰) سفر کے دن۔

اور ظَعِینَۃٌ اس ہودج کو کہتے ہیں جس میں عورت سوار ہو اور کبھی یہ لفظ کنایۃً عورت کے لیے بولا جاتا ہے خواہ وہ ہودج میں ہو یا نہ ہو۔

(ظ ف ر)

الظُّفْرُ: (ناخن) یہ لفظ انسان اور دوسرے جانوروں کے ناخن پر بھی بولا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ﴾ (۶۔۱۴۷) تمام ناخن دار جانور۔ میں ذِیْ ظُفُر سے ذِیْ مِخْلَبْ یعنی پنجہ دار شکاری جانور مراد ہیں اور پرند کا ناخن چونکہ اس کا اوزار ہوتا ہے اس مناسبت سے ظُفُر کا لفظ سلاح یعنی ہتھیار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ کَلِیلُ الظُّفُرِ: فلاں کند ہتھیار یعنی کمزور ہے۔ ظَفَرَہٗ فُلَانٌ فلاں نے اس میں اپنے ناخن گاڑ دیئے۔ اَلْاَظْفَرُ: لمبے ناخن والا۔

اَلظَّفْرَۃُ (ناخن چشم) ایک قسم کی جھلی جو آنکھ کو ڈھانپ لیتی ہے اور ناخن کی طرح سخت ہوتی ہے۔

ظَفِرَتْ عَیْنُہٗ: اس کی آنکھ پر ناخنہ چھا گیا۔

اَلظَّفَرُ: کامیاب ہونا۔ یہ مفہوم دراصل ظَفْرَۃٌ سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی ناخن گاڑ دینے کے ہیں۔ اَظْفَرَ: کامیاب کر دینا قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ﴾ (۴۸۔۲۴) اس کے بعد کہ تمہیں ان پر فتح یاب کر دیا۔

(ظ ل ل)

الظِّلُّ: سایہ۔ یہ اَلضِّحُّ (دھوپ) کی ضد سے اور فَیْءٌ سے زیادہ عام ہے کیونکہ (مجازاً) اَلظِّلُّ کا لفظ تورات کی تاریکی اور باغات کے سایہ پر بھی بولا جاتا ہے نیز ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے اسے ظِلٌّ کہہ دیا جاتا ہے، مگر فَیْءٌ صرف اس سایہ کو کہتے ہیں جو زوال آفتاب سے ظاہر ہوتا اور عزت وحفاظت اور ہر قسم کی خوش حالی کو ظل سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ﴾ (۷۷۔۴۱) کے معنی یہ ہیں کہ پرہیزگار ہر طرح سے عزت وحفاظت میں ہوں گے۔

نیز فرمایا:

﴿اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا﴾ (۱۳۔۳۵) اس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اور اس کی خوش گواریاں بھی۔

﴿هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ﴾ (۳۶۔۵۶) وہ بھی اور ان کی بیویاں بھی ہر قسم کی خوشحالیوں میں۔

ظَلَّنِیَ الشَّجَرُ وَ اَظَلَّنِیْ: درخت نے مجھ پر سایہ کیا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ﴾ (۲۔۵۷) اور ہم نے

بادلوں کا تم پر سایہ کئے رکھا۔

﴿وَاَظَلَّنِیْ فُلَانٌ﴾ اس نے میری حفاظت کی، مجھے اپنے زیر سایہ لے لیا، مجھے عزت سے رکھا۔اور آیت کریمہ ہے:

﴿یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ﴾ (۱۶۔۴۸) جن کے سائے .... لوٹتے رہتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ سائے کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حکمت پر دلالت کرتا ہے۔اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ اِلٰی قَوْلِهٖ وَظِلٰلُهُمْ﴾ (۱۳۔۱۵)

اور..........خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی۔

کی تفسیر میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ (انسان!) تیرا سایہ تو اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے مگر تو کفر پر تلا ہوا ہے ظِلٌّ ظَلِیْلٌ گھنا سایہ۔ مگر آیت کریمہ:

﴿وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا﴾ (۴۔۵۷) اور ان کو ہم گھنے سائے میں داخل کریں گے۔میں ظِلًّا ظَلِیْلًا سے کنایۃً زندگی کی آسائش مراد ہے اور ظُلَّةٌ سایہ فگن بدلی کو کہتے ہیں اور عام طور پر اس کا استعمال ناخوشگوار مواقع پر ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ (۷۔۱۷۱) گویا وہ سایہ دار بدلی ہے۔

﴿عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ (۲۱۔۱۸) ''سائبان کی طرح چھا جانے والے دن کے عذاب نے'' اور آیت کریمہ ہے:

﴿اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ (۲۔۲۱۰) ان پر خدا کا عذاب سایہ دار بادلوں میں نازل ہو۔

میں ظُلَلٌ کا واحد ظُلَّةٌ آتا ہے جیسے غُرْفَةٌ وَغُرَفٌ وَقُرْبَةٌ وَقُرَبٌ اور ایک قرات میں فِیْ ظِلَالٍ مِّنَ الْغَمَامِ بھی ہے۔اور ظِلَالٌ ظُلَّةٌ کی جمع بھی ہو سکتی ہے جیسے غُلْبَةٌ کی جمع غِلَابٌ وَ حُفْرَةٌ کی جمع حِفَارٌ آ جاتی ہے اور ظِلٌّ کی بھی جیسا کہ آیت ہے: ﴿یَتَفَیَّؤُ ظِلَالُهٗ﴾ (۱۶۔۴۸) میں ہے بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ ہر بلند ہونے والی چیز کو ظِلٌّ کہا جاتا ہے۔چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔[1] (البسیط)

(۲۹۷) لَنَا نَزَلْنَا رَفَعْنَا ظِلَّ اَخْبِیَةٍ

''جب ہم فروکش ہوئے تو خیمے نصب کر دیئے۔''

اور یہ ظاہر ہے کہ ظِلٌّ یعنی سایہ کو تو کوئی شخص بھی نصب نہیں کرتا لہٰذا یہاں ظِلَّ اَخْبِیَةٍ سے مراد خیمے ہیں۔اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے۔[2] (الطویل)

(۲۹۸) تَتَبَّعُ اَفْیَاءَ الظِّلَالِ عَشِیَّةً

کہ شام کے وقت سایوں کے پیچھے چلتی ہے۔

مگر ان اشعار سے یہ معنی ثابت نہیں ہوتے کیونکہ مصرعہ اول کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے خیمے نصب کئے جن کے ساتھ ان کے سائے بھی بلند ہو گئے اور دوسرے مصرعہ میں الظِّلَالُ عام ہے اور فَیْءٌ کا لفظ خاص۔لہٰذا اَفْیَاءَ الظِّلَالِ میں اَلظِّلَالِ کی طرف اَفْیَاءَ کی اضافت ایسے ہی ہے جیسے

---

[1] قالہ عبدۃ بن الطیب المحضرحی وتمامہ : وفار للقوم باللحم المراجیل، ولا میتہ ھذہ مفضلیۃ والبیت فی (۱ : ۱۳۹) وفی روایۃ اللالئی مع السمط (۱ : ٦۹)ورد نا بدل نزلنا وارد یۃ بدل اخبیۃ وراجع مترجمۃ الشاعر الاصابۃ وابن الانباری ٦۸ والبیت ایضاً فی لبحر (۵ : ٤۹۸) والکامل ٤۹۰ لکن فیھما نصبنا بدل رفعنا والمحاضرات للمولف (۲ : ٦۱۲)والعقد: (۱ : ۱۹۲).

[2] قالہ علقمۃ بن عبدۃ الفحل والبیت من کلمۃ مفضیلتہ (۲ : ۱۹۳)والضمیر للناقۃ وفی المطبوع یتبع بالیاء محرف وتمامہ : علی طرق کانھن سبوب۔ والبیت فی منتھی الطلب والشعراء ومختار الجاھلی (۱ : ۳۲۱)والعقد الثمین ۱۰٦ وایام العرب ٥٦ والشطر ایضاً فی البحر ۵ : ٤۹۸.

خاص کو عام کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے اور اسے اِضَافَةُ الشَّیءِ اِلٰی جِنْسِہٖ کہتے ہیں۔

نیز اَلظُّلَّةُ کا لفظ کینوپی کی مثل ہر چھا جانے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر آیت کریمہ ہے: ﴿وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ کَالظُّلَلِ﴾ (۳۱۔۳۲) کے معنی یہ ہیں کہ جب بادلوں کی طرح سمندر کی بڑی بڑی موجیں انہیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ﴾ (۳۹۔۱۶) ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں اور نیچے بھی۔

اور ہر ڈھانپ لینے والی چیز کو ظِلٌّ کہا جاتا ہے، خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔ چنانچہ اچھے معنوں میں فرمایا:

﴿وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ﴾ (۳۵۔۲۱) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔

﴿دَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلَالُهَا﴾ (۷۶۔۱۴) ان سے .... ان کے سائے قریب ہوں گے۔

اور برے معنوں میں فرمایا: ﴿ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ﴾ (۵۶۔۴۳) اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ﴾ (۷۷۔۳۰) یعنی تین شاخوں والے سائے کی طرف۔

میں ظِلٌّ۔ ظُلَّةٌ کے ہم معنی ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۹۔۱۶) سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ ظُلَّةٌ کی جمع ہے لہٰذا اس کے بعد لَا ظَلِیْلٍ (۷۷۔۳۱) کے معنی یہ ہیں کہ وہ سایہ دوزخ کی گرمی سے بچانے کا کام نہیں دے گا اور حدیث میں جو آیا ہے: کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا مَشٰی لَمْ یَکُنْ لَهٗ ظِلٌّ کہ آنحضرت جب چلتے تو آپ کا سایہ نہ ہوتا تھا۔ تو اس کی تفسیر دوسرے موقع پر بیان ہوگی۔

ظَلِلْتُ وَظَلْتُ (ایک لام کے ساتھ) یہ اصل میں تو اس کام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو دن کے وقت کیا جائے مگر کبھی بمعنی صِرْتُ ''یعنی ہو جانا'' بھی آ جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَظَلُّوْا مِنْ بَعْدِهٖ یَکْفُرُوْنَ﴾ (۳۰۔۵۱) تو اس کے بعد وہ ناشکری کرنے لگ جائیں۔

﴿ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاکِفًا﴾ (۲۰۔۹۷) جس کی عبادت پر جما ہوا تھا۔

(ظ ل م)

اَلظُّلْمَةُ: کے معنی روشنی کا معدوم ہونا ہیں اس کی جمع ظُلُمَاتٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ کَظُلُمَاتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ﴾ (۲۴۔۴۰) یا (ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے) جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے۔

﴿ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (۲۴۔۴۰) (غرض) اندھیرے ہی اندھیرے ہوں ایک پر ایک چھایا ہوا۔

﴿اَمَّنْ یَّهْدِیْکُمْ فِیْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۲۷۔۶۳) بتاؤ بر و بحر کی تاریکیوں میں تمہاری کون رہنمائی کرتا ہے۔

﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ﴾ (۹۔۱۰) اور تاریکیوں اور روشنی بنائی۔

اور کبھی ظُلْمَةٌ کا لفظ بول کر جہالت، شرک اور فسق و فجور کے معنی مراد لئے جاتے ہیں جس طرح کہ نُورٌ کا لفظ ان کے اضداد یعنی علم و ایمان اور عمل صالح پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (۲۔۲۵۷) ان کوتاریکیوں سے نکال کرروشنی میں لے جاتا ہے۔
﴿اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (۱۴۔۵) کہ اپنی قوم کوتاریکیوں سے نکال کرروشنی میں لے جاؤ۔
﴿فَنَادٰى فِي الظُّلُمَاتِ﴾ (۲۱۔۸۷) آخر تاریکیوں میں خدا کو پکارنے لگے۔اور آیت کریمہ:
﴿كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمَاتِ﴾ (۶۔۱۲۲) کہیں اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھیرے میں ہو۔
﴿كَمَنْ هُوَاَعْمٰى﴾ (۱۳۔۱۹) کے ہم معنی ہے اور آیت سورۃ انعام:
﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ﴾ (۶۔۳۹) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں اور تاریکیوں میں پڑے رہتے ہیں، میں فِي الظُّلُمَاتِ کا لفظ آیت صُمٌّ بُكْمٌ وَّ عُمْيٌ (۲۔۱۸) میں عُمْيٌ کی جگہ پر استعمال ہوا ہے اور آیت کریمہ ہے:
﴿فِيْ ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ (۳۹۔۶) تین اندھیروں میں۔
تین تاریکیوں سے مراد پیٹ، رحم، اور بچہ دانی کی تاریکی مراد ہے۔
اَظْلَمَ کے معنی ہیں تاریکی میں ہوجانا قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاِذَاهُمْ مُّظْلِمُوْنَ﴾ (۳۶۔۳۷) پھر اچانک وہ تاریکی میں رہ جاتے ہیں۔
اَلظُّلْمُ: اہل لغت اور اکثر علماء کے نزدیک ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی یا زیادتی کرکے یا اسے اس کے صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر۔ اسی سے ظَلَمْتُ السِّقَاءَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: مشکیزے میں دودھ جمنے کے لیے رکھا اور دہی بننے سے پہلے ہی پی لیا۔ ❶ اور ایسے دودھ کو............ ظَلِيْمٌ کہتے ہیں۔
ظَلَمْتُ الْاَرْضَ: میں نے زمین کو ایسے مقام سے کھودا جہاں سے کھودنا نہیں چاہتا تھا۔ اس قسم کی زمین کو "مَظْلُوْمَةٌ" کہا جاتا ہے اور اس سے کھود کر جو مٹی نکالی جاتی ہے اس مٹی کو ظَلِيْمٌ کہتے ہیں۔
اور اَلظُّلْم کا لفظ حق سے تجاوز پر بولا جاتا ہے جس کی مثال دائرہ میں مرکزی نقطہ کی ہوتی ہے اور ظلم کا اطلاق چونکہ ہر قسم کے تجاوز پر ہوتا ہے خواہ وہ تجاوز قلیل ہو یا کثیر یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو ابلیس کو ظالم کہا ہے اور دوسری طرف آدم علیہ السلام کو ان کی غلطی کی بنا پر ظلم کہہ دیا گیا ہے گو دونوں کے ظالم ہونے میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔
بعض حکماء نے کہا ہے کہ ظلم تین قسم پر ہے ❷ (ا) وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے حق میں کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی قسم کفر و شرک اور نفاق ہے۔ چنانچہ فرمایا:
﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (۳۱۔۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔
اور آیات: ﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۱۱۔۱۸) سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔
﴿وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ (۷۶۔۳۱) اور ظالموں کے لیے اس نے دکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔
﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۳۲) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ بولے۔

❶ كذا في حبل المعاجم ۱۲.
❷ التقسيم ايضاً مروى عن انسؓ (الطيالسى ۲۱۰۷ لبزار) راجع كنز العمال ج (۳، رقم: ۲٤٦١).

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۱۵) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ افتراء کرے۔ اور اس نوع کی دیگر آیات میں اسی قسم کا ظلم مراد ہے۔

(۲) دوسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان ایک دوسرے پر کرتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفٰى وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۴۲۔۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کرلے تو اس کا بدلہ خدا کے ذمہ ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں ظالمین سے اسی قسم کے لوگ مراد ہیں۔ نیز آیت کریمہ: ﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَی الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ﴾ (۴۲۔۴۲) الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ میں بھی ظلم کے یہی معنی مراد ہیں اسی طرح فرمایا:

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا﴾ (۱۷۔۳۳) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے۔

(۳) تیسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان خود اپنے نفس پر کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ (۳۵۔۳۲) تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

﴿ظَلَمْتُ نَفْسِيْ﴾ (۲۸۔۱۶) میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

﴿اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ﴾ (۴۔۶۴) جب اپنے حق میں ظلم کر بیٹھتے تھے۔

﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۷۔۱۹) ورنہ ظالم ہو جاؤ گے۔ یعنی ان لوگوں سے ہو جاؤ گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ (۲۔۲۳۱) اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرے گا۔

یہ تینوں قسم کا ظلم درحقیقت ظلم علی النفس ہی ہے کیونکہ جب انسان پہلے پہل ظلم کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ظالم اپنے ظلم کی ابتداء ہمیشہ اپنی ذات سے کرتا ہے اس بنا پر متعدد مقامات پر فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (۱۶۔۵۷) وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے۔ بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

اور آیت:

﴿وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ (۶۔۸۳) اور اپنے ایمان کو (شرک کے ظلم) سے محفوظ نہیں کیا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ ظُلْمٌ سے شرک مراد ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا: (۲۶) کہ ظلم سے مراد تو شرک ہے جیسا کہ حضرت لقمان علیہ السلام کے قول:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (۳۱۔۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے، سے معلوم ہوتا ہے۔ [1]

اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا﴾ (۱۸۔۳۳) اور اس کی پیداوار میں کسی طرح کی کمی نہ ہوتی۔

لَمْ تَظْلِمْ کے معنی لَمْ تَنْقُصْ کے ہیں یعنی اس کی پیداوار میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی تھی اور آیت:

---

[1] متفق علیه من حدیث ابن مسعود ۱۲.

﴿وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً﴾ (۳۹۔۴۷) اور اگر ظالموں کے پاس وہ سب مال ومتاع ہو جو زمین میں ہے۔

میں ظلم کا لفظ تینوں قسم کے ظلم کو شامل ہے کیونکہ جس شخص نے دنیا میں ادنیٰ سا ظلم بھی کیا ہوگا وہ قیامت کے دن دنیا کا سب مال ومتاع فدیہ دے کر رہا ہونے کی کوشش کرے گا۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰی﴾ (۵۳۔۵۲) وہ لوگ بڑے ہی ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ ظلم وستم کا انجام برا ہوتا ہے اور ایسے لوگ آخر کار ہلاک ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ اس امر کا شاہد ہے اور قرآن پاک نے ایک موقع پر تو۔ ﴿وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْماً لِّلْعِبَادِ﴾ (۴۰۔۳۱) اور خدا بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، کہا ہے۔ اور دوسرے مقام پر ﴿وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ﴾ (۵۰۔۲۹) اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے، فرمایا ہے پس پہلی آیت میں عباد یعنی بندوں سے ارادہ ظلم کی نفی کرنا مقصود ہے اور دوسری آیت میں بندوں پر سے لفظ ظَلَّامٌ (صیغہ مبالغہ) کے ساتھ نفی کی ہے۔ ان دونوں میں جو باریک فرق پایا جاتا ہے اس کی وضاحت ہم دوسری کتاب میں بیان کریں گے۔ ❶

ظَلِیْمٌ نر شتر مرغ۔ کیونکہ عرب لوگ اسے مظلوم جانور خیال کرتے تھے۔

چنانچہ شاعر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ❷ (السریع)

(۲۹۹) فَصِرْتُ کَالْهَیْقِ غَدَا یَبْتَغِیْ
قَرْناً فَلَمْ یَرْجِعْ بِاُذُنَیْنِ

میں شتر مرغ کی طرف خائب وخاسر ہوکر لوٹا جو گیا تھا سینگ لینے مگر کھو بیٹھا کان بھی۔

ظَلْمٌ کے معنی دانتوں کی آب وتاب کے ہیں۔ خلیل نے کہا ہے ❸ لَقِیْتُهٗ اَدْنیٰ ظَلَمٍ اَوْ ذِیْ ظَلَمَةٍ: یعنی سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی اور میری نظر کو اس نے روکا، وہ فلاں شخص ہے، مگر اس معنی سے فعل مشتق ہوکر استعمال نہیں ہوتا۔

(ظ م ء)

اَلظِّمْءُ دومرتبہ پانی پینے کے درمیان وقفہ اَلظَّمَأُ پیاس جو اس وقفہ میں عارض ہو دراصل یہ ظَمِیءَ یَظْمَأُ فَهُوَ ظَمْآنٌ کا مصدر ہے۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاَنَّكَ لَاتَظْمَأُ فِیهَا وَلَا تَضْحٰی﴾ (۲۰۔۱۱۹) اور یہ کہ نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کھاؤ۔ ﴿یَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَآءً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْئاً﴾ (۲۴۔۳۹) کہ پیاسا اسے پانی سمجھ کر اس کی طرف جاتا ہے مگر جب وہاں پہنچتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔

---

❶ راجع لتاویل الآیة شرح الدرة للخفاجی (۱۳۲۔۱۳۳).

❷ قاله بشار بن برد الاعمیٰ فی قصیدة مطلعها: شط بسلمیٰ عاجل البین وجاوزت اسد بن القین، وقبله: طالبها قلبی فراغت به وامسکت قلبی مع الدین، وفی روایة کالهقل بدل الهیق وفکنت بدل فصرت والبیت فی ذیل الامالی ۱۰۷ فی خمسة وفی روایته فکنت کالهقل۔ والمحاضرات للمولف (۴: ۲،۶۷۱: ۶۰۲)والعیون (۳: ۱۴۱)والسمط (۳: ۵) قال الاستاذ المیمنی وفی ب ۵ کالعیر غدا کذا فی العیون وهو المضروب فیه المثل راجع العیون (۱۴۱/۳) والمیدانی والابیات مع الخبر فی الاغانی (۳: ۲۰۵۔۲۰۶).

❸ راجع للکلمة مجالس ثعلب ۸۰ ومعناه وضح لك ۱۲.

(ظ ن ن)

اَلظَّنُّ: کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اسے ظَنٌّ کہتے ہیں جب یہ علامت قوی ہو تو ان سے علم کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے مگر جب بہت کمزور ہوں تو وہ نتیجہ وہم کی حد سے آگے تجاوز نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ جب وہ نتیجہ قوی ہو جائے اور علم کا درجہ حاصل کر لے یا اسے علم کے درجہ میں فرض کر لیا جائے تو اس کے بعد اَنْ یا اَنَّ استعمال ہوتا ہے ۔ مگر جب وہ ظن کمزور ہو اور وہم کے درجہ سے آگے نہ بڑھے تو پھر اس کے ساتھ (صرف) اَنْ استعمال ہوتا ہے جو کسی قول یا فعل کے عدم کے ساتھ مختص ہے ۔ چنانچہ آیت:

﴿اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ﴾ (۲۔۴۶) جو یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں ۔

﴿یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا اللّٰہِ﴾ (۲۔۲۴۹) جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ ان کو خدا کے روبرو حاضر ہونا ہے ۔

﴿وَظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ﴾ (۷۵۔۲۸) اور اس (جان بلب) نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہے ۔

میں ظَنٌّ کا لفظ علم و یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ﴾ (۸۳۔۴) میں ان کی انتہائی مذمت کی ہے اور معنی یہ ہیں کہ موت کے بعد زندہ ہونے کے دلائل نہایت واضح ہیں مگر یہ اس زندگی کا گمان تک نہیں کرتے ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَظَنَّ اَھْلُھَا اَنَّھُمْ قَادِرُوْنَ عَلَیْھَا﴾ (۱۰۔۲۴) اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ۔

میں اشارہ ہے کہ زیادہ لالچ اور طمع میں آ کر وہ اس امر کا یقین کر بیٹھتے تھے ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰہُ﴾ (۳۸۔۲۴) میں ظن بمعنی علم ہے اور فتنہ کے یہاں وہی معنی ہیں جو کہ آیت:

﴿وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا﴾ (۲۰۔۴۰) میں ہیں اور آیت: ﴿وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ﴾ (۲۱۔۸۷) اور ذوالنون (کو یاد کرو) جب وہ (اپنی قوم سے ناراض ہو کر) غصے کی حالت میں چل دیئے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہیں پا سکیں گے، میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ظَنَّ بمعنی وہم لینا بہتر ہے یعنی ان کے دل میں یہ وہم گذرا کہ ہم ان پر قابو نہیں پا سکیں گے اور آیت کریمہ:

﴿وَاسْتَکْبَرَ ھُوَ وَجُنُوْدُہٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ﴾ (۲۸۔۳۹) اور وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق مغرور ہو رہے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے ۔

میں ظَنَّ کے بعد اَنَّ لایا گیا ہے جو کہ ظَنَّ بمعنی علم کے بعد استعمال ہوتا ہے پس اس سے متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی جگہ پر یقین کر لیا تھا گو یہ یقین بے اصل تھا ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَیَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاھِلِیَّۃِ﴾ (۳۔۱۵۴) وہ خدا کے بارے میں ناحق زمانہ جاہلیت کے سے گمان کرتے ہیں ۔

کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ زمانہ جاہلیت کی طرح اللہ تعالیٰ

کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ یعنی وہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے ان کے سامنے غلط بیانی کی ہے، اس سے تنبیہ کی ہے کہ منافقین کی یہ بدگمانیاں کفار کی سی ہیں اور وہ اس قسم کی افواہیں پھیلا کر کفار کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ مَانِعَتُھُمْ حُصُوْنُھُمْ﴾ (۵۹۔۲) اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے قلعے ان کو.......... بچالیں گے۔

کے معنی یہ ہیں کہ ان کا خیال اس قدر پختہ تھا جیسا کہ کسی شخص کو پورا یقین ہوتا ہے۔ اسی معنی میں فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (۴۱۔۲۲) بلکہ تم یہ خیال کرتے تھے کہ خدا کو تمہارے بہت سے عملوں کی خبر ہی نہیں۔

﴿ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ﴾ (۴۱۔۲۳) اور اسی خیال نے جو تم.......... رکھتے تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ﴾ (۴۸۔۶) جو خدا کے حق میں برے برے خیال رکھتے ہیں۔ میں ظَنَّ السَّوْءِ کی تفسیر بعد کی آیت:

﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ﴾ (۴۸۔۱۲) بات یہ ہے کہ تم لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پیغمبر........ کبھی لوٹ کر آنے والے ہی نہیں۔ میں بیان کر دی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا﴾ (۴۵۔۳۲) ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔

اور ظَنّ چونکہ عام طور پر برا ہوتا ہے اس لیے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُھُمْ اِلَّا ظَنًّا﴾ (۱۰۔۳۶) اور ان میں کے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

﴿وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ﴾ (۵۳۔۲۸) اور ظن (یقین کے مقابلے میں) کچھ کام نہیں آتا۔

﴿وَاَنَّھُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ﴾ (۷۲۔۷) اور یہ کہ ان کا بھی یہی اعتقاد تھا جس طرح تمہارا۔ اور ایک قراءت میں۔

﴿وَمَا ھُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِظَنِيْنٍ﴾ (۸۱۔۲۴) اور وہ پوشیدہ باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں۔

ضَاد کی بجائے ظَاءِ کے ساتھ ہے جس کے معنی متہم کے ہیں۔

(ظ ھ ر)

اَلظَّھْرُ: کے معنی پیٹھ اور پشت کے ہیں اس کی جمع ظُھُوْرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهٗ وَرَاءَ ظَھْرِهٖ﴾ (۸۴۔۱۰) اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا۔

﴿مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّيَّتَھُمْ﴾ (۷۔۱۷۲) یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَنْقَضَ ظَھْرَكَ﴾ (۹۴۔۳) جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔

میں گناہوں کو بوجھ کے ساتھ تشبیہ دے کر ظھر کا لفظ بطور استعارہ استعمال کیا ہے (کیونکہ بوجھ عام طور پر پیٹھ پر اٹھایا جاتا ہے) اور کبھی ظھر کا لفظ بطور استعارہ روئے زمین کے معنی میں بھی آ جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ظَھْرُ الْاَرْضِ زمین کا اوپر کا حصہ اس کے بالمقابل بَطْنُ

الْاَرْضِ: کے معنی ہیں: زمین کا اندرونی حصہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (۳۵۔۴۵) روئے زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

رَجُلٌ مُظَهَّرٌ: قوی پشت، مضبوط آدمی۔ ظَهِرَ پیٹھ کا درد کرنا اور ظَهْرٌ سواری کو کہتے ہیں۔ نیز ظَهْرٌ: مددگار، پشت پناہ۔ بَعِيْرٌ ظَهِيْرٌ: قوی اونٹ ظِهْرِيٌّ: وہ فالتو سواری۔ جسے احتیاطا ساتھ رکھ لیا جائے تاکہ بوقت ضرورت اسے استعمال کیا جاسکے۔

نیز ظِهْرِيٌّ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے پس پشت ڈال کر بھولی بسری کر دیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَآئَكُمْ ظِهْرِيًّا﴾ (۱۱۔۹۲) پیٹھ پیچھے..........

ظَهَرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں: وہ اس پر غالب آگیا۔ قران پاک میں ہے:

﴿اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ﴾ (۱۸۔۲۰) اگر وہ تم پر دسترس پالیں۔

ظَاهِرْتُهٗ: میں نے اس کی مدد کی (اور ظَاهَرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں: اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَظَاهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ﴾ (۶۰۔۹) اورانہوں نے تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی۔

﴿وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ﴾ (۶۶۔۴) اور اگر پیغمبر کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کروگی۔ ایک قرأت میں تَظَّاهَرَا ہے (یعنی تاء کو ظاء میں ادغام کے ساتھ)[1]

﴿اَلَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ﴾ (۳۳۔۲۶) (اور اہل کتاب میں سے) جنہوں نے ان کی مدد کی۔

﴿وَتَظَاهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۲۔۸۵) تم ان کے خلاف گناہ اور زیادتی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔

اَلظَّهِيْرُ: مددگار۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ﴾ (۳۴۔۲۲) اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا مددگار ہے۔

﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۸۔۸۶) تو تم ہرگز کافروں کے مددگار نہ ہونا۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ﴾ (۶۶۔۴) اور ان کے علاوہ اور فرشتے بھی مددگار ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا﴾ (۲۵۔۵۵)

اور کافر اپنے پروردگار کی مخالفت میں بڑا زور مارتا ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ کافر خدائے رحمٰن کی مخالفت میں شیطان کا مددگار بنا ہوا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یہاں ظَهِيْرٌ کے معنی ہیں پس پشت ڈالا ہوا۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر کی مثال اس چیز کی سی ہے جسے بے وقعت سمجھ کر پس پشت ڈال دیا جائے اور یہ ظَهَرْتُ بِكَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور درخو اعتناء نہ سمجھا۔

اَلظِّهَارُ: کے معنی ہیں خاوند کا بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت۔ کہا جاتا ہے: ظَاهَرَ مِنِ امْرَاَتِهٖ: اس نے اپنی بیوی سے ظہار کرلیا۔ قرآن

---

[1] نسب الطبری (۲۸/۷) القراءۃ الاولیٰ الی عامۃ قراء المدینۃ سوا نافع والی عامۃ قراء الکوفۃ سوا عاصم والثانیۃ الی نافع وابو عمرو ۱۲۔

پاک میں ہے:
﴿وَالَّذِیْنَ یُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ﴾ (۵۸۔۳)
اور جولوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرلیں۔
ایک قرأت میں یَظَّاهَرُوْنَ ہے جواصل میں یَتَظَاهَرُوْنَ ہےاورتاء ظاء میں مدغم ہےاورایک قرأت میں یَظَّهَّرُوْنَ ہے۔[1]

ظَهَرَ الشَّیْءُ: کسی چیز کا زمین کےاوپراس طرح ظاہر ہونا کہ نمایاں طور پرنظر آئے اس کے بالمقابل بَطَنَ کے معنی ہیں: کسی چیز کا زمین کے اندر غائب ہوجانا پھر ہر وہ چیز جواس طرح پرنمایاں ہو کہ آنکھ یا بصیرت سے اس کا ادراک ہوسکتا ہو، اسے ظَاهِرٌ کہہ دیا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ﴾(۴۰۔۲۶)
(۶۔۱۵) ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔
﴿اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا﴾ (۱۸۔۲۲) مگر سرسری سی گفتگو۔
اور آیت کریمہ ہے:
﴿یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (۳۰۔۷) یہ دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں۔معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ صرف دنیوی امور سے واقفیت رکھتے ہیں اخروی امور سے بالکل بے بہرہ ہیں اور اَلْعِلْمُ الظَّاهِرُ اور اَلْبَاطِنُ سے کبھی جلی اور خفی علوم مراد ہوتے ہیں اور کبھی دنیوی اور اخروی۔قرآن پاک میں ہے:
﴿بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ (۵۷۔۱۳) جواس کی جانب اندرونی ہے اس میں تو رحمت ہے اور جو جانب بیرونی ہے اس طرف عذاب۔
اور آیت کریمہ:
﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۳۰۔۴۱) خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا۔
میں ظَهَرَ کے معنی ہیں: زیادہ ہوگیا اور پھیل گیا اور آیت ہے:
﴿وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ (۳۱۔۲۰) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردی ہیں۔
میں ظَاهِرَةً سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو ہمارے علم میں آ سکتی ہیں۔اور بَاطِنَةً سے وہ جو ہمارے علم سے بالاتر ہیں چنانچہ اسی معنی کی طرح اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (۱۴۔۳۴) اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کرسکو۔
اور آیت کریمہ:
﴿قُرًى ظَاهِرَةً﴾ (۳۴۔۱۸) کے عام معنی تو یہی ہیں کہ وہ بستیاں سامنے نظر آتی تھیں مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بطور مثال کے انسانی احوال کی طرف اشارہ ہو جس کی تصریح اس کتاب کے بعد (دوسری کتاب میں) بیان کریں گے۔انشاءاللہ

اَظْهَرَهٗ عَلَیْهِ[1] اسے اس پر مطلع کردیا۔
چنانچہ آیت کریمہ:
﴿فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا﴾ (۷۲۔۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اپنے غائب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا
اور آیت کریمہ:
﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (۹۔۳۳) میں یُظْهِرُ

---

[1] وایضاً ظهر علیه اطلع علیه کما فی قوله تعالیٰ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (۲۴: ۳۱).

کے معنی نمایاں کرنا بھی ہو سکتے ہیں اور معاونت اور غلبہ کے بھی یعنی تمام ادیان پر اسے غالب کرے۔ چنانچہ اس دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿اِنْ یَّظْهَرُوْا عَلَیْكُمْ یَرْجُمُوْكُمْ﴾ (۱۸۔۲۰) اگر وہ تم پر دسترس پالیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

﴿یٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ظٰهِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ (۴۰۔۲۹) اے قوم! آج تمہاری ہی بادشاہت ہے اور تم ہی ملک میں غالب ہو۔

﴿فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ﴾ (۱۸۔۹۷) پھر ان میں یہ قدرت نہ رہی کہ اس کے اوپر چڑھ سکیں۔

صَلَاةُ الظُّهْرِ: ظہر کی نماز۔ ظَهِیْرَةٌ: ظہر کا وقت۔ اَظْهَرَ فُلَانٌ فلاں ظہر کے وقت میں داخل ہو گیا۔ جیسا کہ اَصْبَحَ وَ اَمْسٰی: صبح وشام میں داخل ہونا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۸) اور آسمان وزمین میں اسی کے لیے تعریف ہے اور سہ پہر کے وقت بھی اور جب تم ظہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو۔

❀❀❀

كِتَابُ الْعَيْنِ

(ع ب أ)

مَاعَبَأْتُ بِہٖ: مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔اصل میں اَلْعِبْءُ کے معنی ثقل اور بوجھ کے ہیں۔لہٰذا مَاعَبَأْتُ بِہٖ کے معنی ہوں گے میرے نزدیک اس کا کوئی وزن نہیں یا میری نگاہ میں اس کی کچھ بھی قدر وقیمت نہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ مَایَعْبَؤُبِکُمْ رَبِّیْ﴾ (۲۵۔۷۷) کہہ دو کہ میرے پروردگار کی نگاہوں میں تمہاری کچھ بھی قدر وقیمت نہیں۔

بعض کے نزدیک آیت کریمہ میں یَعْبَؤُا کا لفظ عَبَأْتُ الطِّیْبَ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "میں نے خوشبو کو باقی رکھا" پس آیت کے معنی یہ ہیں "اگر تم اللہ کو پکارتے نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں باقی نہ چھوڑتا۔"

عَبَأْتُ الْجَیْشَ وَعَبَّأْتُہٗ میں نے لشکر کو تیار کیا عَبَأَۃُ الْجَاھِلِیَّۃِ: زمانہ جاہلیت کی نحوست جو ان کے دلوں میں رچ چکی تھی اور جسے قرآن پاک نے آیت: ﴿فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ﴾ (۴۸۔۲۶) ان کے دلوں میں زمانہ جاہلیت کی سی حمیت ہے، میں زمانہ جاہلیت کی سی حمیت سے تعبیر کیا ہے۔

(ع ب ث)

اَلْعَبَثُ: دراصل اس کے معنی ہیں، کسی کام کے ساتھ کھیل کود کو ملا دینا اور یہ عَبَثْتُ الْاَقِطَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے پنیر کے ساتھ اور چیز کو ملا دیا اور اَلْعَبِیْثُ وہ کھانا جو کسی چیز کے ساتھ خلط ملط کیا گیا ہو۔اسی اعتبار سے کھجور، گھی اور ستو کے آمیزہ کو عَوْبَثَانِیٌّ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۲۸) تم ہر بلند مقام پر بے مقصد بڑی عمارتیں تعمیر کرتے ہو۔ نیز اَلْعَبَثُ ہر اس کام کو کہتے ہیں جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا﴾ (۲۳۔۱۱۵) کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بے غرض وغایت پیدا کر دیا ہے۔

(ع ب د)

اَلْعُبُوْدِیَّۃُ: کے معنی ہیں کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا۔مگر اَلْعِبَادَۃُ کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکساری ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ معنوی اعتبار سے اَلْعِبَادَۃُ کا لفظ اَلْعُبُوْدِیَّۃُ سے زیادہ بلیغ ہے لہٰذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہوسکتی ہے جو بے حد صاحب افضال وانعام ہو اور ایسی ذات صرف ذات الٰہی ہی ہے۔اسی لیے فرمایا:

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِیَّاہُ﴾ (۱۷۔۲۳) کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

عِبَادَۃٌ: دو قسم پر ہے (۱) عبادت بِالتَّسْخِیْرِ۔ جسے ہم سجود کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں۔(۲) عبادت بالاختیار۔اس

کا تعلق صرف ذوی العقول کے ساتھ ہے یعنی ذوی العقول کے علاوہ دوسری مخلوق اس کی مکلف نہیں ہے اور آیت کریمہ:

﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ (۲۔۲۱) اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ (۴۔۳۶) اور خدا ہی کی عبادت کرو۔ میں اسی دوسری قسم کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے [1] اَلْعَبْدُ (بندہ، غلام) کا لفظ چار معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) اَلْعَبْدُ بمعنی غلام یعنی وہ انسان جس کو خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہو چنانچہ آیات کریمہ:

﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ (۲۔۱۷۸) اور غلام کے بدلے غلام۔

﴿وَعَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ (۱۶۔۷۵) ایک غلام ہے جو بالکل دوسرے کے اختیار میں ہے۔ میں عَبدٌ کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۲) اَلْعَبْدُ بِالْاِيْجَادِ: یعنی وہ بندہ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے اس معنی میں عبودیۃ اللہ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ (۱۹۔۹۳) تمام شخص جو آسمان اور زمین میں ہیں خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) عَبْدٌ وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبودیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے [2] اس لحاظ سے جن پر عَبْدٌ کا لفظ بولا گیا ہے وہ دو قسم پر ہیں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ﴾ (۳۸۔۴۰) اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا﴾ (۱۷۔۳) بے شک نوح علیہ السلام ہمارے شکر گزار بندے تھے۔

﴿نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ﴾ (۲۵۔۱) جس نے اپنے بندے پر قرآن پاک نازل فرمایا:

﴿عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ (۱۸۔۱) جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر یہ کتاب نازل کی۔

﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (۱۷۔۶۵) جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

﴿كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ﴾ (۳۔۷۹) کہ......... میرے بندے ہو جاؤ۔

﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (۱۵۔۴۰) ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

﴿وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ (۱۹۔۶۱) جس کا خدا نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲۵۔۶۳) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

﴿اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا﴾ (۲۰۔۷۷) ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ۔

---

[1] انظر لتفصیلہ لباب التاؤیل (ص۱۹، ج۱) و تاج العروس للزبیدی والمھمائمی (ص۲۴ ج۱) وتفسیر ام الکتاب مولانا ابو الکلام آزاد (ص ۳۵۸۔۲۶۸)۔

[2] ای قدیاتی عَبَدَ بمعنی خدم کما جاء فی تفسیر قولہ تعالیٰ، ﴿وقومھما لنا عابدون﴾ ان العابدون ھٰھنا بمعنی الخادم (الروح ۳۳/۱۸) و ایضاً عَبَدَ بمعنی انف کما فی قولہ تعالیٰ ﴿فانا اوّل العابدین﴾ (۴۳۔۸۱) معناہ مستنکفین (راجع الصحیح ۷۱۳/۲)۔

﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا﴾ (۱۸۔۶۵) (وہاں) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ دیکھا۔

(۲) دوسرے اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔اور اسی کی طرف مائل رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق ہی آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے ❶:(۲۷)((تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ ۔ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ)) درہم ودینار کا بندہ ہلاک ہو) عَبْدٌ کے ان معانی کے پیش نظر یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔لَيْسَ كُلُّ اِنْسَان عَبْدًالِلّٰهِ کہ ہر انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے۔یعنی بندۂ مخلص نہیں ہے۔لہٰذا یہاں عَبْدٌ کے معنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہیں لیکن عَبْدٌ عَابِدٌ سے زیادہ بلیغ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

وَالنَّاسُ كُلُّهُمْ عِبَادُ اللّٰهِ کہ تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں یعنی اللہ ہی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ تمام اشیاء کا یہ حکم ہے۔بعض عبد بالتسخیر ہیں اور بعض عبد بالاختیار اور جب عَبْدٌ کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہو تو اس کی جمع عَبِيْدٌ یا عِبِدٌّ آتی ہے اور جب عَبْدٌ بمعنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہو تو اس کی جمع عِبَادٌ آئے گی لہٰذا جب عَبِيْدٌ کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ عِبَادٌ سے زیادہ عام ہوگا یہی وجہ ہے کہ آیت:

﴿وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ (۵۰۔۲۹) اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے۔میں عَبِيْدٌ سے ظلم کی نفی کر کے تنبیہ کی ہے کہ وہ کسی بندے پر ذرا برابر بھی ظلم نہیں کرتا خواہ وہ خدا کی پرستش کرتا ہو اور خواہ عبد الشمس یا عبد اللات ہونے کا مدعی ہو۔

طَرِيْقٌ مُّعَبَّدٌ: ہموار راستہ جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔بَعِيْرٌ مُّعَبَّدٌ: جس پر تارکول مل کر اسے خوب بدصورت کر دیا گیا ہو۔عَبَّدْتُ فُلَانًا: میں نے اسے مطیع کر لیا محکوم بنالیا قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ﴾ (۲۶۔۲۲) کہ تم نے بنی اسرائیل کو محکوم بنا رکھا ہے۔

(ع ب ر)

اَلْعَبْرُ: دراصل اس کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچ جانا مگر اَلْعُبُوْرُ کا لفظ خاص کر پانی عبور کرنے پر استعمال ہوتا ہے عام اس سے کہ تیر کر عبور کیا جائے یا کشتی، اونٹ اور پل کے ذریعہ سے۔اسی سے عَبْرُ النَّهْرِ ہے جس کے معنی نہر کے اس کنارہ کے ہیں جہاں سے پانی میں اتر کر اسے عبور کیا جاتا ہے یا دوسری جانب سے عبور کر کے وہاں سے ہوا جاتا ہے۔اسی سے عَبْرُ الْعَيْنِ کا محاورہ مشتق ہے جس کے معنی ہیں: آنکھ سے آنسو جاری ہونا۔اَلْعَبْرَةُ: آنسو اور مسافر کو عَابِرُ سَبِيْلٍ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ﴾ (۴۔۴۳) ہاں اگر بحالت سفر رستے چلے جا رہے ہوں۔

نَاقَةٌ عَبْرُ اَسْفَارٍ: مضبوط اونٹنی جو ہر قسم کی زمین میں سفر کر سکے عَبَرَ الْقَوْمُ: لوگ مر گئے۔گویا انہوں نے دنیاوی زندگی کے پل کو عبور کر لیا اس اعتبار سے عِبَارَةٌ خاص کر اس کلام کو کہتے ہیں جو متکلم کے منہ سے نکل کر فاصلہ عبور کر کے سامع کے کان تک پہنچ جائے اور اَلْعَبْرَةُ

---

❶ الحديث في الفائق (۱/ ۷۱) وفي البخاري وابن ماجه عن ابي هريرة وفي رواية الترمذي لُعِنَ بدل تعس راجع كنز العمال (۳/رقم ۱۰۰۲ و ۱۰۴۳) وتخريج الاحياء للعراقي (۳/ ۴۴ و ۳۳۵).

وَالْاِعْتِبَارُ اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی دیکھی ہوئی چیز کی وساطت سے ان دیکھے نتائج تک پہنچا جائے۔ ❶

قرآن پاک میں ہے:﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً﴾ (۳۔۱۳) اس واقعہ میں بڑی عزت ہے۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ﴾ (۵۹۔۲) اے اصحاب بصیرت اس سے عبرت حاصل کرو۔

اور تَعْبِیْرٌ کے معنی ہیں: خواب کا انجام بتانا گویا تاویل بتانے والا اس کے ظاہر سے باطن تک پہنچ جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ﴾ (۱۲۔۴۳) اگر تم خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہو۔

اور تَعْبِیْرٌ کا لفظ تاویل سے خاص ہے کیونکہ تاْوِیْلٌ کے معنی مطلق کسی بات کا انجام بیان کرنے کے ہیں خواہ وہ خواب ہو یا خواب نہ ہو۔ ❷

اور اَلشِّعْرَی الْعَبُوْرُ: ایک ستارے کا نام ہے کیونکہ وہ بھی اپنے فلک میں مسافت طے کرتا رہتا ہے اَلْعَبْرِیُّ: گھاس جو نہر کے کنارے پر اُگ آتی ہے۔ اور شَطٌّ مَعْبَرٌ: نہر کا وہ کنارہ جہاں پر عبری گھاس اُگی ہوئی ہو۔

(ع ب س)

اَلْعَبُوْسُ: (ض) کے معنی سینہ کی تنگی سے چہرہ پر شکن پڑنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی﴾ (۸۰۔۱) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے۔

﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ﴾ (۷۴۔۲۲) پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔

اور اسی سے یَوْمٌ عَبُوْسٌ ہے۔ جسکے معنی سخت اور بھیانک دن کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا﴾ (۷۶۔۱۰) اس دن سے جو (چہروں کو) شکن آلود اور (دلوں کو) سخت مضطر کر دینے والا ہے۔

اور اسی اعتبار سے اَلْعَبَسُ اس گوبر اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے بالوں کے ساتھ لگ کر خشک ہو جاتا ہے عَبَسَ الْوَسَخُ عَلٰی وَجْهِهٖ: اس کے چہرہ پر میل کچیل جم گئی۔

(ع ب ق ر)

عَبْقَرٌ: بعض نے کہا ہے، جنوں کی آبادی کا نام ہے۔ عرب لوگ جب کسی انسان، حیوان یا کپڑے وغیرہ میں نادرہ کاری دیکھتے تو اسے اس کی طرف نسبت کر دیتے اسی بنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا: ❸ (۲۷)

((لَمْ اَرَ عَبْقَرِیًّا مِثْلَهٗ)) کہ میں نے اس جیسا نادر الشال شخص نہیں دیکھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَعَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ﴾ (۵۵۔۷۶) اور نفیس مسندوں پر۔

---

❶ قال الخليل اَلْعِبْرَةُ وَالْاِعْتِبَارُ معناه التذكر منْ الحوادث السالفة ۱۲.

❷ قال الشاعر وقد غابت الشعرىٰ وقد طلع النسر راجع التنبيه للبكرى (۳۸ والاغانى ۱۶/ ۴۵).

❸ راجع للحديث اللسان (فرى) والنهاية (۳/ ۷۰ و ۲۱۵) والاضداد ابى الطيب ۵۶۳ والبخارى مع الفتح فضائل اصحاب النبى و تعبير و توحيد والمسلم فضائل الصحابه والترمذى (رؤيا) والحاكم (۲/ ۲۸) (۵/ ۴۵۵) القالق (۲/ ۲۲۰) وغريب ابى عبيد (۱/ ۸۷) وكما قال لبيد: ومن فاومن اخوانهم وبينهم كهول وشبان كجلة عبقرى راجع التاج (عبقر).

میں عَبْقَرِيّ کے معنی ایک قسم کے عمدہ فرش کے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے جنت کے فروش کے لیے ضرب المثل کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

(ع ت ب)

اَلْعَتَبُ: ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جو وہاں اترنے والے کے لیے سازگار نہ ہو۔ نیز دروازہ کی چوکھٹ اور سیڑھی کو بھی عَتَبَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بیوی سے جو فرمایا تھا۔ ((قُوْلِی لِزَوْجِكِ غَيِّرْ عَتْبَةَ بَابِكَ)) اپنے خاوند سے کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کرلے تو یہاں عَتْبَۃٌ کے معنی بطور کنایہ عورت کے ہیں اور استعارہ کے طور پر عَتَبٌ وَمَعْتَبَۃٌ کے معنی اس ناراضگی یا سختی کے بھی آجاتے ہیں جو انسان کے دل میں دوسرے کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے یہ بھی اصل میں اَلْعَتَبُ ہی سے ہے اسی کے مطابق خَشُنْتُ بِصَدْرِ فُلَانٍ وَوَجَدْتُ فِیْ صَدْرِہٖ غِلْظَۃً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اسی سے کہا گیا ہے۔ حُمِلَ فُلَانٌ عَلٰی عَتَبَۃٍ صَعْبَۃٍ فلاں کو ناگوار حالت پر مجبور کیا گیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❷ (خفیف)

(۳۰۰) وَحَمَلْنَا هُمْ عَلٰی صَعْبَةٍ زَوْ
زَاءَ يَعْلُوْنَهَا بِغَيْرِ وَطَاءِ

ہم نے انہیں نہایت ٹیڑھی حالت پر سوار کیا چنانچہ وہ بغیر نمدہ کے اس پر سوار ہیں۔

اَعْتَبْتُ فُلَانًا (۱) ناراضگی ظاہر کرنا (۲) ناراضگی پر ابھارنا (۳) میں نے اس کی ناراضگی دور کر دی یعنی راضی کرلیا جیسا کہ اَشْکَیْتُہٗ کے معنی ہیں: میں نے اس کی شکایت دور کر دی (یعنی سلب ماخذ کے معنی پائے جاتے ہیں) قرآن میں ہے:

﴿فَمَا هُمْ مِنَ الْمُعْتَبِيْنَ﴾ (۴۱۔۲۴) ان سے عتاب دور نہیں کیا جائے گا۔

اَلْاِسْتِعْتَابُ: (رضامندی چاہنا) کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اپنے عتاب کو دور کر دے تاکہ راضی ہو جائے کہا جاتا ہے: اِسْتَعْتَبَ فُلَانٌ کسی سے عتاب کو دور کرنے کی خواہش کی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ﴾ (۱۶۔۸۴) اور نہ ان کی معذرت قبول کر کے ان سے عتاب کو دور کیا جائے گا۔

لَكَ الْعُتْبٰی: تیرے لیے رضامندی ہے۔ بَيْنَهُمْ أُعْتُوْبَةٌ: وہ باہم کشیدہ ہیں۔

عَتَبَ عَتْبًا: آدمی کا ایک پاؤں پر کود کر چلنا جیسے اوپر چڑھنے والا سیڑھیوں پر قدم رکھتا چلا جاتا ہے۔

(ع ت د)

اَلْعَتَادُ: ضرورت کی چیزوں کا پہلے سے ذخیرہ کر لینا اور یہی معنی اِعْدَادٌ کے ہیں۔ عَتِيْدٌ: (اسم فاعل) تیار کرنے والا (اسم مفعول) تیار کی ہوئی چیز۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِيْدٌ﴾ (۵۰۔۲۳) یہ (اعمال نامہ) میرے سامنے حاضر ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (۵۔۱۸) میں عَتِيْدٌ کے معنی ہیں وہ

---

❶ التفصیل فی البدایہ والنہایہ ج ۱ ص .

❷ قال ابو زبید الطائی والبیت فی النقائض ۱۶۰.

فرشتہ لوگوں کے اعمال لکھنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ (۴۔۱۸) ان کے لیے دردانگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ اَعْتَدْنَا کا لفظ عَتَادٌ سے فعل ماضی اَفْعَلْنَا کے وزن پر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں اَعْدَدْنَا ہے جس میں ایک ''دال'' کو ''ت'' سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔

فَرَسٌ عَتِيْدٌ وَعَتِدٌ: گھوڑا، جو ہر وقت دوڑ کے لیے تیار ہو اَلْعَتُوْدُ: بکری کا یکسالہ بچہ جمع اَعْتِدَةٌ وَعِدَّانٌ (ت کے دال میں ادغام کے ساتھ)

(ع ت ق)

اَلْعَتِيْقُ کے معنی المتقدم یعنی پیش رو کے ہیں خواہ اس کا تقدم زمان کے اعتبار ہو، خواہ مکان یا رتبہ کے اعتبار سے۔اس لحاظ سے اَلْعَتِيْقُ کے معنی کہنہ، نجیب اور آزاد شدہ غلام بھی آجاتے ہیں۔لہٰذا آیت کریمہ:

﴿وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (۲۲۔۲۹) اور خانہ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔میں خانہ کعبہ کو اَلْعَتِيْقُ کہنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جابرۃ کے پنجہ ستم سے ہمیشہ آزاد رہا ہے اور جابر سے جابر بادشاہ بھی اس کے مرتبہ کو پست نہیں کر سکا اَلْعَاتِقَانِ: دونوں طرف سے کندھوں اور گردن کے درمیانی حصے کو کہتے ہیں کیونکہ بدن کا یہ حصہ بھی باقی جسم سے بلند ہوتا ہے نیز عَاتِقٌ اس عورت کو بھی کہا جاتا ہے جو حبالہ نکاح سے آزاد ہو۔کیونکہ شادی شدہ عورت ایک طرح سے خاوند کی ملک میں ہوتی ہے عَتَقَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑ میں آگے بڑھ جانا۔ عَتَقَ مِنِّیْ يَمِيْنٌ: قسم کا واجب ہونا۔شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطویل)

(۳۰۱) عَلَيَّ اَلِيَّةٌ عَتَقَتْ قَدِيْمًا
وَلَيْسَ لَهَا وَاِنْ طَلَبَتْ مَرَامُ

مجھ پر عرصہ قدیم سے قسم واجب ہو چکی ہے اور اسے پورا کرنے سے چارہ کار نہیں ہے۔

(ع ت ل)

اَلْعَتْلُ: کسی چیز کو اس جگہ سے پکڑنا جہاں اس کے سارے سرے جمع ہوتے ہوں اور اسے بزور گھسیٹنا جس طرح کہ اونٹ کی مہار پکڑ کر اسے نہایت بیدردی کے ساتھ کھینچا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ﴾ (۴۴۔۴۷) اور اسے کھینچ کر دوزخ کے اندر لے جاؤ۔

اَلْعُتُلُّ: بسیار خور اور مال کو روک کر رکھنے والا۔جو کسی چیز کو نہایت بے دردی سے گھسیٹتا ہو (سخت گیر) قرآن پاک میں ہے:

﴿عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ﴾ (۶۸۔۱۳) سخت گیر اور اس کے علاوہ بدذات بھی۔

(ع ت و)

عَتَا۔يَعْتُوْ۔عُتُوًّا وَعِتِيًّا: حکم عدولی کرنا۔قرآن میں ہے:

﴿فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ﴾ (۵۔۴۴) تو انہوں نے

---

[1] قال اوس بن حجر انظر دیوانه ۴۶ رقم ۳۴ وفیه فلیس بدل ولیس واللسان (عتق) والسمط ۹۰ ومجاز القرآن رقم ۸۹ والاقتضاب واصلاح یعقوب ۲۳۴ واورده العلماء فی الباب التمثیل وقیل: ان امراء القیس اول من ابتکرهٔ ولم یات املح منه ۱۲.

اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔

﴿وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا﴾ (۲۵۔۲۱) اور (اسی بنا پر) بڑے سرکش ہو رہے ہیں۔

﴿عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا﴾ (۶۵۔۸) اپنے پروردگار کے امر سے سرکشی کی۔

﴿بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ﴾ (۶۷۔۲۱) لیکن یہ سرکشی اور نفرت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا﴾ (۱۹۔۸) کے معنی یہ ہیں کہ میں بڑھاپے کی ایسی حالت تک پہنچ گیا ہوں جہاں اصلاح اور مداوا کی کوئی سبیل نہیں رہتی یا عمر کے اس درجہ میں کہ جس میں ریاضت بھی بیکار ہوتی ہے اور لفظ ریاضت سے وہی معنی مراد ہیں جن کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے۔ [1]

(الکامل)

(۳۰۲) وَمِنَ الْعَنَاءِ رِيَاضَةُ الْهَرِمِ

اور انتہائی بڑھاپے میں ریاضت دینا سراسر تکلیف دہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا﴾ (۱۹۔۶۹) جو خدا سے سخت سرکشی کرتے تھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ عِتِيًّا مصدر اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عَاتٍ کی جمع ہے اور اَلْعَاتِيْ کے معنی سنگ دل اور اجڈ بھی آتے ہیں۔

(ع ث ر)

عَثَرَ۔ یَعْثُرُ۔ عِثَارًا وَعُثُوْرًا کے معنی پھسل جانے اور گر پڑنے کے ہیں۔ مجازاً عَثَرَ عَلٰى كَذَا کے معنی کسی بات پر بغیر قصد کے مطلع ہو جانا بھی آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا﴾ (۵۔۱۰۷) پھر اگر معلوم ہو جائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

اَعْثَرَهٗ عَلٰى كَذَا: اس نے فلاں کو اس چیز سے باخبر کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ﴾ (۱۸۔۲۱) اور اس طرح ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے باخبر کر دیا۔ یعنی لوگوں کے قصد کے بغیر ہی ہم نے ان کے حال پر مطلع کر دیا۔

(ع ث ی)

اَلْعَيْثُ وَالْعِثِيُّ: (سخت فساد پیدا کرنا) بھی جَذَبَ اور جَبَذَ کی طرح تقریباً ہم معنی ہی ہیں۔ لیکن عَيْثٌ کا لفظ زیادہ تر فساد حسی کے لیے بولا جاتا ہے اور اَلْعِثِيُّ کا حکمی یعنی ذہنی اور فکری فساد کے لیے آتا ہے کہا جاتا ہے عَثِيَ يَعْثٰى عِثِيًّا۔ چنانچہ اسی سے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ (۲۔۶۰) اور ملک میں فساد اور انتشار پیدا نہ کرو۔

---

[1] وصدرہٗ: أتروض عرسك بعد ماهرمت...... والبيت في السمط: (۱:۱۰۶) والبيان (۱:۶۶) والبحتری ۳٤۰ والعيون (۲:۳٦۹) والعقد (۲:٤۳٥) وفيه وتروض والحيوان (۱/٤۱۔۳/۱۰۲) وفيه وتلوم بدل أتروض ومجموعة المعاني ۱٥۷ ومحاضرات المؤلف (۱:٤۸) والحصری (۲:۲٥۹) وتاريخ الطبری (٦:۱٥۸) بغير عزو فيه قاله اعرابی انظر الخبر والشطر في طيلسنات الحمدونی والحمدونی هو اسماعيل اعلم الناس شعراً وعامة شعره في طيلسان ابن حرب راجع طبقات ابن المعتز (۳۷۱۔۳۷۲)۔

اور عَثَا یَعْثُوْ اعُثُوًّا: (باب نَصَرَ سے) بھی آتا ہے اور
اَلْاَعْثٰی: سیاہی مائل اور ست۔ نیز احمق آدمی کو بھی
اَعْثٰی کہا جاتا ہے۔

(ع ج ب)

اَلْعَجَبُ اور اَلتَّعَجُّبُ: اس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہو جاتی ہے اسی بنا پر حکماء نے کہا ہے کہ عَجَبٌ اس حیرت کو کہتے ہیں جس کا سبب معلوم نہ ہو اس لیے اللہ تعالیٰ پر تعجب کا اطلاق جائز نہیں ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ تو عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ہے۔ اس بنا پر کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔ عَجِبْتُ عَجَبًا: (س) میں نے تعجب کیا۔ عَجَبٌ: ہر وہ بات جس سے تعجب پیدا ہو اور جس قسم کی چیز عام طور نہ دیکھی جاتی ہو اسے عَجِیْبٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَا﴾ (۱۰۔۲) کیا لوگوں کو اس بات پر حیرت ہے کہ ہم نے وحی بھیجی۔

میں تنبیہ کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف وحی بھیجنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ یہ لوگ پہلے سے سلسلہ وحی کو جانتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿بَلْ عَجِبُوْا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ﴾ (۵۰۔۲) بلکہ ان لوگوں نے تعجب کیا ہے کہ انہی میں سے ایک ہدایت کرنے والا ان کے پاس آیا۔

﴿وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ﴾ (۱۳۔۵) اور اگر تم عجیب بات سننی چاہو تو کافروں کا یہ کہنا عجیب ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا﴾ (۱۸۔۹) کہ وہ ہماری نشانیوں سے عجیب تھے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اصحاب کہف قدرت کے عجائبات سے نہ تھے بلکہ ہماری قدرت کے نشانات ایسے بھی ہیں جو ان سے بڑھ کر اور زیادہ عجیب ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾ (۷۲۔۱) (کہنے لگے) کہ ہم نے ایک عجیب قرآن پاک سنا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن (وحی) کا نہ تو سبب ہی معلوم ہے اور نہ اس جیسا قرآن پاک پہلے دیکھا ہے اور بطور استعارہ یہ لفظ ہر بھلی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:

اَعْجَبَنِیْ کَذَا: یعنی مجھے فلاں چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ﴾ (۲۔۲۰۴) اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو...... تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے۔

﴿وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ﴾ (۹۔۵۸) اور ان کے مال اور اولاد سے تعجب نہ کرنا۔

﴿وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾ (۹۔۶۵) اور جنگ حنین کے دن جب کہ تم کو اپنی کثرت پر غرور تھا۔

﴿اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ (۵۷۔۲۰) اور کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۲) ہاں تم تو تعجب کرتے ہو اور یہ تمسخر کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ دوبارہ زندہ ہونے پر پختہ یقین ہونے کی وجہ سے تمہیں ان کے انکار پر تعجب ہوتا ہے اور یہ لوگ

ازراہ نادانی اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ آپ کو ان کے انکار وحی پر تعجب ہوتا ہے ایک قرات میں بَلْ عَجِبْتُ ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ نے تعجب کو اپنی طرف منسوب کیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ ان چیزوں سے ہے جن پر عَجِبْتُ بمعنی اَنْکَرْتُ ہو جیسا کہ فرمایا:

﴿اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (۱۱-۷۳) انہوں نے کہا: تم خدا کی قدرت سے انکار کرتی ہو۔

﴿اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ (۳۸-۵) یہ تو بڑی منکر بات ہے۔

هُوَ مُعْجَبٌ بِنَفْسِهٖ: وہ غرور اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔

اَلْعَجَبُ: جانور کی دم کا وہ حصہ جو سرین سے ملا ہوا ہوتا ہے۔

(ع ج ز)

عَجُزُ الْاِنْسَان۔ انسان کا پچھلا حصہ تشبیہ کے طور پر ہر چیز کے پچھلے حصہ کو عَجُزٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ ❶ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ﴾ (۵۴-۲۰) جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

عَجْزٌ کے اصل معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانا یا اسکے ایسے وقت میں حاصل ہونا کے ہیں جب کہ اسکا وقت نکل چکا ہو۔ جیسا کہ لفظ اَلدَّبْرُ کسی کام کے کرنے سے قاصر رہ جانے پر بولا جاتا ہے اور یہ اَلْقُدْرَةُ کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ﴾ (۵-۳۱) اے ہے مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں..........

اَعْجَزْتُ فُلَانًا وَعَجَّزْتُهٗ وَعَاجَزْتُهٗ کے معنی کسی کو عاجز کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ﴾ (۹-۲) اور جان رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے۔

﴿وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ (۴۲-۳۱) اور تم زمین میں خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔

﴿وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْٓ اٰیَاتِنَا مُعَاجِزِیْنَ﴾ (۳۴-۵) اور جنہوں نے ہماری آیتوں میں کوشش کی کہ ہمیں ہرا دیں گے۔

ایک قرأت میں مُعَجِّزِیْنَ ہے۔ مُعَاجِزِیْنَ کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے: وہ یہ زعم کرتے ہیں کہ ہمیں بے بس کر دیں گے کیونکہ وہ یہ گمان کر چکے ہیں کہ حشر ونشر نہیں ہے کہ اعمال پر جزا وسزا مرتب ہو لہٰذا یہ باعتبار معنی آیت کریمہ:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا﴾ (۲۵-۴) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے۔ کے مترادف ہوگا اور اگر مُعَجِّزِیْنَ پڑھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے متبعین کی طرف عجز کی نسبت کرتے ہیں۔ جیسے جَهَّلْتُهٗ وَفَسَّقْتُهٗ کے معنی کسی کی طرف جہالت یا فسق کی نسبت کرنا کے ہوتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک مُعَجِّزِیْنَ بمعنی مُثَبِّطِیْنَ ہے۔ یعنی لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی اتباع سے روکتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (۷-۴۵) جو

❶ وفی الفائق (۲/ ۱۶۰)۔العجز لهما والعجیزة للمرأة خاصة.

خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔

اور بڑھیا کو عَجُوْزٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اکثر امور سے عاجز ہو جاتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغَابِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۷۱) مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔

﴿ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ﴾ (۱۱۔۷۲) اے ہے میرے ہاں بچہ ہوگا؟ اور میں تو بڑھیا ہوں۔

(ع ج ف)

اَعْجَفُ: (صفت) کے معنی انتہائی لاغر اور دبلا کے ہیں اس کی مؤنث عَجْفَاءُ ہے اور جمع عِجَافٌ

قرآن پاک میں ہے:

﴿سَبْعٌ عِجَافٌ﴾ (۱۲۔۴۳) سات دبلی۔

دراصل یہ نَصْلٌ اَعْجَفُ سے مشتق ہے جس کے معنی پتلے اور باریک تیر کے ہیں۔ اَعْجَفَ الرَّجُلُ: اس کے مویشی دبلے ہو گئے۔ عَجَفْتُ نَفْسِیْ عَنِ الطَّعَامِ: میری طبیعت کھانے سے اچاٹ ہو گئی۔ عَنْ فُلَانٍ: اس سے دل برداشتہ ہو گئی۔

(ع ج ل)

اَلْعَجَلَةُ: کسی چیز کو اس کے وقت سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اس کا تعلق چونکہ خواہش نفسانی سے ہوتا ہے اس لیے عام طور پر قرآن پاک میں اس کی مذمت کی گئی ہے حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [1] (۲۹) ((اَلْعَجَلَةُ مِنَ الشَّیْطَانِ)) (کہ جلد بازی شیطان سے ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿سَاُرِیْكُمْ آیَاتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ﴾ (۲۱۔۳۷) میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا لہٰذا اس کے لیے جلدی نہ کرو۔

﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ﴾ (۲۰۔۱۱۴) قرآن پاک کی تلاوت کے لیے جلدی نہ کیا کرو۔

﴿وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ﴾ (۲۰۔۸۳) تو تم نے اپنی قوم سے آگے چلے آنے میں کیوں جلدی کی؟ اور آیت کریمہ:

﴿وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی﴾ (۲۰۔۸۴) اور تیری طرف آنے میں اس لیے جلدی کی کہ تم خوش ہو جاؤ۔

میں موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی ہے کہ جلد بازی گو مذموم ہے مگر میں نے اچھے مقصد کے پیش نظر یہ اقدام کیا ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی کی طلب۔

﴿اَتٰی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ (۱۶۔۱) خدا کا حکم یعنی عذاب گویا آ ہی پہنچا (کافرو) اس کے لیے جلدی مت کرو۔

﴿وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ﴾ (۱۳۔۶) اور یہ تجھ سے برائی کے جلد خواستگار ہیں یعنی طالب عذاب۔

﴿لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ﴾ (۲۷۔۴۶) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی کرتے ہو۔

﴿وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ﴾ (۲۲۔۴۷) اور لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔

---

[1] الفائق (۱: ۶۷) رواہ الترمذی عن سھل بن سعد (وھب عن انس) کنز العمال ۳/ ۵۴۷۔۵۴۸ وعن الحسن مرسلا (ابن ابی الدنیا فی ذم الغضب) (الخرائطی فی مکارم الاخلاق) راجع احیاء العلوم بتخریج العراقی۔

﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ﴾ (۱۰۔۱۱) اور اگر خدا لوگوں کی برائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلب خیر میں جلدی کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ (۲۱۔۳۷) انسان جلد بازی ہی سے بنایا گیا ہے۔

میں بعض نے عَجَلٌ کے معنی مٹی کیے ہیں [1] مگر یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ اس سے اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جلد بازی انسان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے جیسا کہ دوسری آیت کریمہ:

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ (۱۷۔۱۱) انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ (۱۷۔۱۸) جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہش مند ہو تو ہم اس میں سے جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں۔

میں اَلْعَاجِلَةَ سے دنیوی ساز و سامان مراد ہے۔ یعنی جو شخص دنیوی ساز و سامان چاہتا ہے اسے ہم جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔

﴿عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ (۳۸۔۱۶) ہم کو ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔

﴿فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ﴾ (۴۸۔۲۰) سو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی۔

اَلْعُجَالَةُ: کھانا جو اصل کھانے سے پہلے یوں ہی کھایا جائے۔ جیسے لُهْنَةٌ اور عَجِلْتُهُمْ وَلَهَنْتُهُمْ کے معنی عُجَالَة یا لُهْنَة پیش کرنے کے ہیں۔

اَلْعِجْلَةُ: چھوٹا سا لوٹا جو جلدی میں رفع حاجت کے وقت ساتھ لے جایا جاتا ہے اَلْعَجَلَةُ: کنویں کی گھرنی (چرخی) جس کے ذریعہ ڈول کھینچا جاتا ہے۔

اور بیل گاڑی کو بھی عَجَلَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سرعت سے چلتی ہے۔

اَلْعِجْلُ: بچھڑے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں پھرتی پائی جاتی ہے جو بیل کی عمر تک پہنچنے پر ختم ہو جاتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿عِجْلًا جَسَدًا﴾ (۷۔۱۴۸) ایک بچھڑا (بنالیا) وہ ایک جسم تھا۔

اور وہ گائے جس کے ساتھ اس کا بچھڑا ہوا سے مُعْجِلٌ کہا جاتا ہے۔

(ع ج م)

اَلْعُجْمَةُ: (کے معنی ابہام اور خفا کے ہیں اور) یہ اَلْاِبَانَةُ کی ضد ہے جس کے معنی واضح اور بیان کر دینا کے ہیں اور اِعْجَامٌ کے معنی ہیں مبہم کرنا اِسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ: گھر سونا ہو گیا۔ اور اس میں جواب دینے والا کوئی نہ رہا اسی بنا پر کسی عربی نے آباد شہروں سے کنایہ کرتے ہوئے کہا خَرَجْتُ عَنْ بِلَادٍ تَنْطِقُ: میں شہروں سے نکلا جو آباد تھے۔ اَلْعَجَمُ: غیر عرب کو کہتے ہیں اور اَلْعَجَمِيُّ: اس کی طرف منسوب ہے اَلْاَعْجَمُ: وہ آدمی جس کی زبان فصیح نہ ہو خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہو

---

[1] نسبه صاحب التاج الى ابن الاعرابى قال ابو عبيدة العجل بمعنى الحمأنى لسان حمير وقال الزمخشرى والله اعلم بصحة هذا القول (۱۱۷/۳)، كذا قال الفراء وقال ابو اسحاق و ابن جنى وهذ هوا الصحيح۔

کیونکہ عرب لوگ عجمی کی گفتگو بہت کم سمجھتے تھے اور اَلْاَعْجَمِیُّ اس کی طرف منسوب ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۹۸)......اور اگر ہم اس کو کسی غیر اہل زبان پر اتارتے۔ میں تخفیف کے لیے یا نسبت کو حذف کر دیا گیا ہے۔

﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيَاتُهٗ ءَ اَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ﴾ (۴۱۔۴۴) اور اگر ہم اس قرآن کو غیر (زبان) عربی میں نازل کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیتیں (ہماری زبان میں) کیوں کھول کر بیان نہیں کی گئیں کیا (خوب کہ قرآن پاک تو) عجمی اور مخاطب عربی۔

﴿وَلِسَانُ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ﴾ (۱۶۔۱۰۳) مگر جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے۔

اسی سے بَهِيْمَةٌ (چوپایہ) کو عَجْمَاءُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ناطق کی طرح الفاظ کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ادا نہیں کرسکتا۔

حدیث میں ہے۔❶ (۳۰) ((جُرْحُ الْعَجْمَاءِ جُبَارٌ)) (چوپایہ اگر کسی کو زخمی کر دے تو مالک پر اس کی دیت نہیں ہے) اور دن کی نماز کو عَجْمَاءُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں قرأت بالجہر نہیں ہوتی اَعْجَمْتُ الْكَلَامَ: میں نے بات مبہم رکھی یہ اَعْرَبْتُ کی ضد ہے کبھی اَعْجَمْتُ الْكَلَامَ کے معنی کلام سے ابہام کو دور کرنا بھی آجاتے ہیں۔❷ جیسا کہ اَشْكَيْتُهٗ: (شکایت زائل کرنا) خلیل سے مروی ہے کہ حروف مقطعہ کو حروف معجمہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اعجمی یعنی گونگے ہوتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ خلیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ حروف مفرد ہونے کی صورت میں ان معانی پر دلالت نہیں کرتے جن پر کہ مرکب ہونے کی حالت میں دلالت کرتے ہیں۔❸ بَابٌ مُعْجَمٌ بند دروازہ۔ اَلْعَجَمُ: کھجور کی گٹھلی۔ مفرد عَجَمَةٌ اور گٹھلی کو عَجَمَةٌ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گودا کے اندر مخفی ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ اس کا چبانا مشکل ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ کھاتے وقت اسے بھی منہ میں ڈال لیا جاتا ہے اور وہ منہ میں مخفی ہو جاتی ہے اور اَلْعَجْمُ کے معنی چبانے کے ہیں محاورہ ہے:

فُلَانٌ صُلْبُ الْعَجْمِ: یعنی وہ آزمائش میں سخت ہے۔

(ع د د)

اَلْعَدَدُ: (گنتی) آحاد مرکبہ کو کہتے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی ''ترکیب آحاد'' یعنی آحاد کو ترکیب دینا بھی کیے ہیں مگر ان دونوں معنی کا مرجع ایک ہی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ (۱۰۔۵) برسوں کا شمار اور (کاموں) کا حساب............اور آیت کریمہ:

﴿فَضَرَبْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ (۱۸۔۱۱) ہم نے غار میں کئی سال تک ان کے

---

❶ ولفظه والعجماء جرحها جبار فی حديث طويل (عم، وابو عوانه) طب، عن عبادة بن الصامت والفائق ۲/ ۵۹ واللسان والنهاية (عجم).

❷ ای تکون الهمزة فيه للسلب كما قال ابن جنی وقال فی المحكم وهذا اسد واصوب.

❸ وانظر بحث حروف المعجم المحكم لابن سيده (۱: ۲۰۷۔۲۰۹).

کانوں پر (نیند کا) پردہ ڈالے (یعنی ان کو سلائے) رکھا۔ کے لفظ سے کثرت تعداد کی طرف اشارہ ہے۔
اَلْعَدُّ کے معنی گنتی اور شمار کرنے کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿لَقَدْ اَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا﴾ (۱۹۔۹۴) اس نے ان سب کا اپنے علم سے احاطہ اور ایک ایک کو شمار کر رکھا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فَاسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ﴾ (۲۳۔۱۱۳) کے معنی یہ ہیں کہ حساب دانوں سے پوچھ دیکھو۔
﴿كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ﴾ (۲۳۔۱۱۲) زمین میں کتنے برس رہے۔
﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (۲۲۔۴۷) بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کی رو سے ہزار برس کے برابر ہے۔
اور مجازاً اَعَدٌّ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) شَيْءٌ مَعْدُوْدٌ اَوْ مَحْصُوْرٌ: تھوڑی سی چیز۔ اس صورت میں یہ اس چیز کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جو بے شمار ہو جس کی طرف قرآن پاک نے بغیر حساب کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ (۲۔۸۰) چند روز کے سوا میں مَعْدُوْدَةً کے معنی چند دنوں کے ہیں کیونکہ یہود یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں تو صرف چند دن عذاب ہوگا جتنے دن کہ ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔
اور کبھی اس کے برعکس کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: جَيْشٌ عَدِيْدٌ: کثیر تعداد لشکر اِنَّهُمْ لَذُوْ عَدَدٍ: وہ بے شمار ہیں۔ اس کے بالمقابل قلیل چیز کو جسے گننے کی ضرورت نہ ہو، شَيْءٌ غَيْرُ مَعْدُوْدٍ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ (۱۸۔۱۱) غار میں کئی سال، میں عَدَدًا کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں اور اسی سے هٰذَا غَيْرُ مُعْتَدٍّ بِهٖ کا محاورہ ہے یعنی یہ چیز شمار کے قابل نہایت حقیر ہے وَلَهٗ عُدَّةٌ: اس کے پاس مال و دولت اور اسلحہ وغیرہ بہت ساساز و سامان تیار رکھا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً﴾ (۹۔۴۶) تو اس کے لیے سامان تیار کرتے۔
اور مَاءٌ عِدٌّ کے معنی بہت زیادہ پانی کے ہیں جس کا ذخیرہ نہ ہو۔ [1] اور اَلْعِدَّةُ شمار کی ہوئی چیز۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ﴾ (۷۴۔۳۱) اور ان کا شمار مقرر نہیں کیا۔
﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ (۲۔۱۸۴) تو دوسرے دنوں میں (رکھ کر) ان کا شمار پورا کرے۔
یعنی جتنے دن ماہ رمضان سے فوت ہو گئے ہوں ان کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھ لے۔
﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ﴾ (۹۔۳۶) (خدا کے نزدیک) مہینے گنتی ہیں۔
اور اَلْعِدَّةُ: کا لفظ عورت کی عدت پر بھی بولا جاتا ہے یعنی وہ مدت جس کے اندر عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔

---

[1] وفي الحديث قال صلى الله عليه وسلم رجل يا رسول الله انما اقطعت له الماء العدّ في قصه استقطاع ابيض بن حمال المازني انظر الفائق (۲ / ۶۱)۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا﴾ (۳۳۔۴۹) تو تم کو کچھ اختیار نہیں کہ ان سے عدت پوری کراؤ۔

﴿وَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ (۶۵۔۱) تو ان کو عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو۔

اَلْاِعْدَادُ: تیار کرنا، مہیا کرنا۔ یہ عَدٌّ سے ہے جیسے سَقْیٌ سے اِسْقَاءٌ اور اَعْدَدْتُ ھٰذَالَكَ کے معنی ہیں کہ یہ چیز میں نے تمہارے لیے تیار کر دی ہے کہ تم اسے شمار کر سکتے ہو اور جس قدر چاہو اس سے حسب ضرورت لے سکتے، ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (۸۔۶۰) اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمیعت سے)......ان کے (مقابلے کے لیے) مستعد رہو۔

﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۔۲۴) جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

﴿وَاَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ (۹۔۱۰۰) اور اس نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ (۴۔۱۸) ایسے لوگوں کے لیے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔

﴿وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ﴾ (۲۵۔۱۱) اور ہم نے جھٹلانے والوں کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً﴾ (۱۲۔۳۱) اور ان کے لیے ایک محفل مرتب کی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَعْتَدَتْ بھی اسی (عَدٌّ) سے ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ (۲۔۱۸۵) تم روزوں کا شمار پورا کرلو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ماہ رمضان کی گنتی پوری کرلو۔ اور ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ (۲۔۱۸۴) گنتی کے چند روز...... میں، ماہ رمضان کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ (۲۔۲۰۳) اور گنتی کے دنوں میں خدا کو یاد کرو۔

میں اَيَّامِ مَّعْدُوْدَاتٍ سے عید قربان کے بعد کے تین دن مراد ہیں اور معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ سے یوم النحر اور اس کے بعد کے دو دن مراد ہیں اس صورت میں "يَوْمُ النَّحْرِ" بھی ان تین دنوں میں شامل ہوگا۔

اَلْعِدَادُ: اس مقررہ وقت کو کہتے ہیں جس میں بیماری کا دورہ پڑتا ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [1] (۳۱) مَازَالَتْ اُكْلَةُ خَيْبَرَ تُعَادُّنِيْ: کہ خیبر کے دن جو مسموم کھانا میں نے کھایا تھا اس کی زہر بار بار عود کرتی رہی ہے۔ عِدَّانُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کے موسم یا زمانہ

---

[1] وتمام الحديث فهذا اوان قطعت ابهری(غريب ابی عبيد(۱/۷۳)والحديث رواه البزاروابو نعيم فی الطب وابن عدی فی الكامل من حديث ابی هريره والحاكم وابو داود ومرسلاً والطبری من حديث بريدة وفيه سمت له امرأة يهودية بخيبر والحديث باختلاف القرآن للقتبی ۱۱۸والفائق(۱/۳۸)اللسان(عدد)والاضدادلابن الانباری ۹۰ والمخصص ۸۸/۵ وتاويل مختلف الحديث والروض للسهيلی قاله صلی الله عليه وسلم فی مرضه الذی مات فيه والحديث يدل علی انه مات شهيدًاوالحديث فی النهاية(۱/۱۵)وفيه تعاودنی بدل تعادنی .۱۲

کے ہیں۔

(ع د س)

اَلْــــعَــــدَسُ :مسور کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا﴾(۲۔۶۱)اور مسور اور پیاز۔اور عَدَسَةٌ ایک قسم کی پھنسی ہے جو مسور کی شکل پر ہوتی ہے اور عدس (اسم صوت) خچر وغیرہ کو ہانکنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی سے عَدَسَ فِی الْاَرْضِ وَھوَ عَدُوْسٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں جانے کے ہیں۔

(ع د ل)

اَلْعَـدَالَةُ وَالْـمُعَادَلَةُ کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں اور معنی اضافی کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے۔یعنی ایک دوسرے کے ہم وزن اور برابر ہونا اور عَـدْلٌ وَعِـدْلٌ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن عَـــدْلٌ کا لفظ معنوی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے احکام شرعیہ۔چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔ ﴿اَوْعَـدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا﴾ (۵۔۹۵) یا اس کے برابر روزے رکھنا۔

اور عِدْلٌ وَعَدِيْلٌ کے الفاظ ان چیزوں کے لیے بولے جاتے ہیں جن کا ادراک حواس ظاہرہ سے ہوتا ہے جیسے وہ چیزیں جن کا تعلق ماپ ،تول یا وزن سے ہوتا ہے، پس عَـدْلٌ کے معنی دو چیزوں کا برابر ہونا کے ہیں۔چنانچہ اسی معنی میں مروی ہے(۳۷) بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (کہ عدل ہی سے آسمان و زمین قائم ہیں) یعنی اگر عناصر اربعہ جن سے کائنات نے ترکیب پائی ہے، میں سے ایک عنصر میں بھی اس کی معینہ مقدار سے کمی یا بیشی ہو جائے تو نظام کائنات قائم نہیں رہ سکتا۔

اَلْعَدْلُ: دو قسم پر ہے اول عدل مطلق: جو عقلاً مستحسن ہوتا ہے یہ نہ تو کسی زمانہ میں منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی کسی اعتبار سے تعدی کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے۔مثلاً کسی کے احسان کے بدلہ میں اس پر احسان کرنا اور جو تمہیں تکلیف نہ دے اسے ایذا رسانی سے باز رہنا وغیرہ۔

دوم: عدل شرعی: جسے شریعت نے عدل کہا ہے اور یہ منسوخ بھی ہو سکتا ہے جیسے قِـصَـاص ، جَنَايَات کی دیت اور مال مرتد کی اصل وغیرہ۔چنانچہ آیات: ﴿فَـمَـنِ اعْتَـدٰی عَـلَيْكُم فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَااعْتَدٰی عَلَيْكُمْ﴾(۲۔۱۹۴) پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔ ﴿وَجَـزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا﴾ (۴۲۔۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔

میں زیادتی اور برائی کی سزا کا کام بھی زیادتی اور برائی ہی قرار دیا ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ الـلّٰـهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾ (۱۶۔۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا......حکم دیتا ہے۔

میں عدل کے یہی معنی مراد ہیں کیونکہ کسی چیز کے برابر اس کا بدلہ دینے کا نام عَدْلٌ ہے یعنی نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے اور نیکی کے مقابلہ میں زیادہ نیکی اور شر کے مقابلہ میں مسامحت سے کام لینے کا نام احسان ہے اور لفظ عدل واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے: رَجُلٌ عَدْلٌ وَرِجَالٌ عَدْلٌ نے کہا ہے۔[1] (الطّويل)

---

[1] قطعة من بيت لزهير في قصيده له في مدح هدم بن سنا ن والحارث بن عوف المريين والقصيدة في ديوانه ۹۶۔۱۵۵ وتكملة ←

(۳۰۳) فَهُمْ رِضًا وَهُمْ عَدْلٌ

وہ راضی رہنے والے اور عادل ہیں۔

دراصل عَدْلٌ کا لفظ مصدر ہے، چنانچہ آیت:۔

﴿وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ (۶۵۔۲) اور اپنے میں سے دو منصف مردوں کو گواہ بنالو۔

میں عَدْلٌ کے معنی عَدَالَۃٌ ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (۴۲۔۱۵) اور مجھے حکم ہوا کہ تم میں انصاف کروں۔

﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا﴾ (۵۔۸)......اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر امادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔انصاف کیا کرو اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ﴾ (۴۔۱۲۹) اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کرسکو گے۔

میں انسان کے طبعی میلان کی طرف اشارہ ہے کہ تمام بیویوں سے برابر درجہ کی محبت اس کی قدرت سے باہر ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ (۴۔۳) اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کرسکو گے تو ایک عورت کافی ہے۔

میں عدل سے نان ونفقہ اور ازدواجی تعلقات میں برابری مراد ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا﴾ (۵۔۹۵) اس کے برابر روزے رکھنا۔

میں عَدْل سے مراد یہ ہے کہ وہ روزے طعام سے فدیہ کے برابر ہوں کیونکہ فدیہ میں مساوات کے معنی ملحوظ ہوں تو اسے بھی عَدْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ [1] اور (۳۳) لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ۔ میں بعض نے کہا ہے کہ عَدْلٌ کا لفظ فریضہ سے کنایہ ہے مگر اس کے اصل معنی وہی ہیں جو ہم بیان کرچکے ہیں اور صَرْفٌ کا لفظ نَافِلَةٌ سے اور یہ اصل فرض سے بڑھ کر کام کرنے کا نام ہے لہٰذا یہ باہم تقابل کے اعتبار سے عدل اور احسان کے ہم مثل ہیں اور لَا يُقْبَلُ مِنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پاس کسی قسم کی نیکی نہیں ہوگی جو قبول کی جائے اور یہ آیت۔

﴿بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ﴾ (۶۔۱۵) کے معنی ہیں کہ وہ دوسروں کو خدا کی مثل اور نظیر قرار دیتے ہیں۔لہٰذا یہ آیت۔

﴿وَهُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۰۰) کے ہم معنی ہوگی۔ بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ افعال الٰہیہ کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں بعض نے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے عدول کرنا مراد لیا ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ﴾ (۲۷۔۶۰) بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

← البیت: حتیٰ یشتجر قوم یقل سرواتهم۔هم بیننا...... والبیت فی دیوانه ۱۰۷ والاضداد للسجستانی ۷۵ ومجاز القرآن ۱۷۶ رقم ۲۰۹ ومختار الشعر الجاهلی (۱/۱۶۱) والعقد الثمین ۹۰ وشرح السبع لابن الانباری ۳۸۷ واضداد ابی الطیب ۳۴ قال وهذا (ای اطلاق المصدر علی الواحد والجمع مشهور فی المصادر خاصه)

[1] متفق علیه من حدیث علی رضی الله عنه وفی مسند عبدالرزاق العدل الفریضه ومن حدیث انس رضی الله عنه وابی هریره رواه مسلم والبخاری وفی ابی داود من حدیث ابی هریره راجع الانصاف ۷ واللسان (صرف) والنهایة (۲/۳۶۰) والغریب للقتبی ۳۱۱

بھی اسی کے معنی پر محمول ہوسکتی ہے یعنی اس کے معنی يَعْدِلُوْنَ بِهٖ کے ہیں۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عَدَلَ عَنِ الْحَقِّ سے مشتق ہو جس کے معنی حق سے ہٹ جانا کے ہیں۔

اَيَّامٌ مُعْتَدِلَاتٌ: معتدل زمانہ یعنی جب رات دن برابر ہوتے ہیں۔

عَادَلَ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ اس نے دو چیزوں کے درمیان موازنہ کیا۔ عَادَلَ الْاَمْرَ: کسی معاملہ میں پھنس گیا اور کسی ایک جانب فیصلہ نہ کر سکا۔ اور جب کسی شخص کی زندگی سے مایوسی ہوجائے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔

وُضِعَ عَلٰى يَدَىْ عَدْلٍ: یعنی اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ [1]

(ع د ن)

عَدْنٌ: (ن ض) کے معنی کسی جگہ قرار پکڑنے اور ٹھہرنے کے ہیں۔کہا جاتا ہے۔

عَدَنَ بِمَكَانِ كَذَا: یعنی اس نے فلاں جگہ قیام کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ (۱۳۔۲۴) یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات۔اسی سے اَلْمَعْدِنُ (کان ہے) ہے کیونکہ کان بھی جواہرات کے ٹھہرنے اور پائے جانے کی جگہ ہوتی ہے۔حدیث میں ہے۔ [2] (۳۴) ((اَلْمَعْدِنُ جُبَارٌ)) کہ اگر کوئی شخص کان میں گر کر مر جائے تو کان کن پر اس کی دیت نہیں ہے۔

(ع د و)

اَلْعَدْوُ: کے معنی حد سے بڑھنے اور باہم ہم آہنگی نہ ہونا کے ہیں۔ اگر اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہو تو یہ عَدَاوَةٌ اور مُعَادَاةٌ کہلاتی ہے اور اگر رفتار سے ہو تو اسے عَدْوٌ کہا جاتا ہے اور اگر عدل وانصاف میں خلل اندازی کی صورت میں ہو تو اسے عُدْوَانٌ اور عَدْوٌ کہا جاتا ہے۔قرآن میں ہے۔﴿فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۶۔۱۰۸) کہ یہ بھی کہیں خدا کو بے ادبی سے بے سمجھے برا نہ کہہ بیٹھیں۔

اور اگر اس کا تعلق کسی جگہ کے اجزاء کے ساتھ ہو تو اسے عَدْوَاءُ کہہ دیتے ہیں، جیسے، مَكَانٌ ذُوْ عَدْوَاءَ: ناہموار مقام۔چنانچہ مُعَادَةٌ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے رَجُلٌ عَدُوٌّ وَقَوْمٌ عَدُوٌّ۔ اور یہ واحد جمع دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۷۔۲۴) (اب سے) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

مگر کبھی اس کی جمع عِدًى ؛ اَعْدَاءٌ بنالیتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَاءُ اللّٰهِ﴾ (۴۱۔۱۹) جس روز خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے۔

اَلْعَدُوُّ: دو قسم پر ہے ایک دشمن تو وہ ہوتا ہے جو قصد وارادہ سے دشمنی کرتا ہے جیسے فرمایا۔

﴿وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ......﴾ (۴۔۹۲)

---

[1] قال ابن الكلبي! هو العدل بن جزء بن سعد العشيرة وكان ولى شرطة لتبع وكان تبع اذا اراد وقتل رجل دفعه اليه فقال الناس وضع على يدى عدل ثم قيل لكل شيء قد يئس منه انظر للكلمة ادب الكاتب ٤٣ واساس البلاغه واللسان (عدل) والميدانى

[2] راجع لتخريج الحديث (ع ج م)

اور اگر مقتول تمھارے دشمنوں کی جماعت سے ہو۔

﴿جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ......﴾ (۲۵۔۳۱) ہم نے گنہگاروں میں سے ہر پیغمبر کا دشمن بنادیا۔

اور دوسری آیت میں ہے۔

﴿عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ (۶۔۱۱۲) شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔

اور دوسرا دشمن وہ ہے جو قصد وارادہ سے تو دشمنی نہیں کرتا لیکن اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جس سے انسان کو ایسے ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے دشمن سے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے

﴿فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْ إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (۲۶۔۷۷) وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست ہے۔)

اور انسان کی اولاد کے متعلق فرمایا۔

﴿عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ......﴾ (۶۴۔۱۴) تمھارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔

اور عَدْوٌ (دوڑنا) کے متعلق شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطویل)

(۳۰۴) فَعَادٰى عِدَاءً بَيْنَ ثَوْرٍ وَنَعْجَةٍ: اس نے ایک ہی دوڑ میں وحشی بیل اور نیل گائے کا شکار کرلیا۔

تَعَادَتِ الْمَوَاشِيْ: مویشی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑے۔ رَأَيْتُ عِدَاءَ الْقَوْمِ: میں نے لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں دوڑتے ہوئے دیکھا۔

اَلْاِعْتِدَاءُ کے معنی حق سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ (۲۔۲۳۱) اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رہنے دینا چاہیے کہ انھیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ﴾ (۴۔۱۴) اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر رہ کردہ حدود سے آگے بڑھے گا۔

﴿اِعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ﴾ (۲۔۶۵) جو تم میں سے ہفتے کے دن میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ یعنی انہوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار حلال سمجھ کر حد سے تجاوز کیا۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ (۲۔۲۲۹) یہ خدا کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلو۔

﴿فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ (۲۳۔۷) وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ (۲۔۱۷۸) جس نے اس کے بعد زیادتی کی ... اور آیت کریمہ۔

﴿بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۶۶) میں عَادُوْنَ کے معنی ہیں (ا) حد سے تجاوز کرنے والے

---

[1] قاله امرؤ القيس وآخره : وراكاو لم ينضح بماء فيغسل ۔اى انه ادركهما سريعا وعقرهما قبل ان يعرق والبيت فى اللسان (عدد) وديوانه ۱۰۳ (صنعة السند وبى) ومختار الشعر الجاهلى ۱۳ والبيت من ابيات المعانى راجع الماعانى للقتبى (۱۲۔۱۳) وفى مختار الشعراء الجاهلى واللسان ايضاً لعلقمة فى بائيته راجع ديوانه ٦٦ وتمامه : وتيس شبوب كالهشيمه قريب وفى رواية فى مجموعة لامية العرب ۸۲ والجمهرة ۱۰۲ والعقد الثمين ٤٩ والسيوطى ٣٤ والقالى (۲ : ۲۲٦) شرح السبع لابن الانبارى ٩٦ ويروى ايضاً فعاديت منه ...... وكان عدائى ان ركبت على بالى ۔وفيه صنعة التبليغ انظر التبريزى على العشر ٤٦

اور یا (۲) دشمنی رکھنے والے اور یا (۳) اپنے مرتبہ سے تجاوز کرنے والے اس تیسری صورت میں یہ عَدَیٰ طَوْرَہٗ (اس نے اپنے مرتبہ سے تجاوز کیا) کے محاورہ سے مشتق ہوگا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾ (۲۔۱۹) مگر زیادتی نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

میں ابتداءً ظلم و زیادتی کرنا مراد ہے نہ کہ کسی سے بدلہ لینے میں حد سے تجاوز کرنا۔ جس کا ذکر کہ آیت کریمہ۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُم ﴾ (۲۔۱۹۴) پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔ میں پایا جاتا ہے یعنی اس کی زیادتی کے مطابق بدلہ دو اور ظلم و زیادتی میں پہل کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵۔۲) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔

اور عدوان یعنی زیادتی کا بدلہ لینے کو بھی قرآن پاک نے عدوان کہا ہے حالانکہ یہ جائز ہے جیسے فرمایا۔

﴿فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (۲۔۱۹۳) تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا﴾ (۴۔۳۰) اور جو تعدی اور ظلم سے ایسا کرے گا ہم اس کو عنقریب جہنم میں داخل کریں گے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ (۲۔۱۷۳) ہاں جو ناچار ہو جائے بشرطیکہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد ضرورت سے باہر نہ نکل جائے۔

میں بَاغٍ سے وہ شخص مراد ہے جو لذت اندوزی کے لیے مردار کا گوشت کھانے کی خواہش کرتا ہے اور عَادٍ سے مراد وہ شخص ہے جو قدر کفایت سے تجاوز کرتا ہے بعض نے بَاغٍ کے معنی خلیفۂ وقت کا باغی اور عَادٍ سے وہ شخص مراد لیا ہے جو عجز و نیاز کرنے والوں کے طریق سے تجاوز کرنے والا ہو [1]۔ اور یہ عَدَیٰ طَوْرَہٗ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: اپنے رتبہ سے تجاوز کرنے والا اور اسی سے تَعْدِيَةٌ فِي الْفِعلِ ہے اور علم نحو میں فعل کو تَعْدِيَة سے مراد ہوتا ہے: فعل کا اپنے فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچ جانا۔ اور مَاعَدَا کا لفظ استثناء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى ﴾ (۸۔۴۲) جس وقت تم (مدینے سے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔ میں عُدْوَةُ الدُّنْيَا سے مدینہ کی جانب کا کنارہ مراد ہے جو حد قریب سے کچھ دور تھا۔

(ع ذ ب)

مَاءٌ عَذْبٌ کے معنی خوش گوار اور ٹھنڈا پانی کے ہیں۔

---

[1] ذكر ابو حيان في بحره (۱/۴۸۱-۴۸۴) تسعة اقوال في تفسير الآية والسيد المرتضى في اماليه (۱/۲۱۵-۲۱۹) خمسة اقوال وراجع الطبري القول الثاني (۲:۳۱۳)

قرآن پاک میں ہے۔

﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ (۲۵۔۵۳) ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار ہے۔

اَعْذَبَ الْقَوْمُ: لوگوں کو شیریں پانی ملنے لگا۔

اَلْعَذَابُ: سخت تکلیف دینا۔ عَذَّبَهٗ تَعْذِيْبًا: اسے عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رکھا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا﴾ (۲۷۔۲۱) میں اسے سخت سزا دوں گا۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (۸۔۳۳) اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور وہ انہیں عذاب دے۔ یعنی بذریعہ عذاب کے ان کا استیصال نہیں کرے گا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ﴾ (۸۔۳۴) اور اب ان کے لیے کون سی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں عذاب نہ دے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اب انھیں تہ تیغ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور فرمایا۔

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ﴾ (۱۷۔۱۵) اور ہم...... عذاب نہیں دیا کرتے۔

﴿وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۳۸) اور ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ﴾ (۳۷۔۱۰) اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (۲۔۱۰) اور...... ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾ (۱۵۔۵۰) اور یہ کہ میرا عذاب بھی درد دینے والا عذاب ہے۔

لفظ عَذَابٌ کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عَذَبَ (ض) الرَّجُلُ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی اس نے (پیاس کی شدت کی وجہ سے) کھانا اور نیند چھوڑ دی اور جو شخص اس طرح کھانا اور سونا چھوڑ دیتا ہے اسے عَاذِبٌ وَعَذُوْبٌ کہا جاتا ہے لہٰذا تَعْذِيْبٌ کے اصلی معنی ہیں، کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر اکسانا اور بعض کے نزدیک یہ عَذْبٌ (شیریں) سے مشتق ہے لہٰذا عَذَّبْتُهٗ کے معنی ہیں، میں نے اسے زندگی کی لذت اور خوشگواریوں سے محروم کر دیا جیسا کہ مَرَّضْتُهٗ (میں نے اس سے مرض کو دور کیا) اور قَذَّيْتُهٗ میں نے اس کی آنکھ سے تنکا نکالا۔

بعض نے کہا ہے کہ دراصل اَلتَّعْذِيْبُ کے معنی ہیں کسی کو کوڑے کے (عَذْبَه) یعنی سر کے ساتھ متواتر مارنا۔ چنانچہ بعض علمائے لغت نے تَعْذِيْبٌ کے معنی ہی مارنا لکھے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مَاءٌ عَذَبٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی مکدر پانی جس کے اوپر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہو۔ اس بنا پر عَذَّبْتُهٗ کے معنی ہیں: میں نے اس کی زندگی کے چشمۂ صافی کو مکدر کر دیا اس سے زندگی کی راحت دور کر دی۔ عَذْبَةُ السَّوْطِ: کوڑے کا سرا۔ عَذْبَةُ اللِّسَانِ: زبان کا سرا عَذْبَةُ الشَّجَرِ: درخت کا سرا۔

(ع ذ ر)

اَلْعُذْرُ: ایسی کوشش جس سے انسان اپنے گناہوں کو مٹا

دینا چاہے اس میں اَلْعُذْرُ اور اَلْعُذُرُ دولغت ہیں اور عُذْرٌ کی تین صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ کسی جرم کے ارتکاب سے قطعاً انکار کردے۔ دوم یہ کہ ارتکاب جرم کی ایسی وجہ بیان کرے جس سے اس کی براءت ثابت ہوتی ہو۔ سوم یہ کہ اقرار جرم کے بعد آئندہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرنے کا وعدہ کرلے۔ عذر کی اس تیسری صورت کا نام توبہ ہے جس سے ثابت ہوا کہ توبہ عذر کی ایک قسم ہے۔ لہٰذا ہر توبہ کو عُذْرٌ کہہ سکتے ہیں مگر ہر عذر کو توبہ نہیں کہہ سکتے اِعْتَذَرْتُ اِلَیْهِ: میں نے اس کے سامنے عذر بیان کیا عَذَرْتُهٗ: میں نے اس کا عذر قبول کرلیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْکُمْ﴾ (۹۔۹۴) تو تم سے عذر کریں گے۔ ﴿قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا﴾ (۹۔۹۴) ان سے کہہ دو کہ عذر مت کرو۔

اَلْمُعْذِر: جو اپنے آپ کو معذور سمجھے مگر دراصل وہ معذور نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ﴾ (۹۔۹۰) عذر کرتے ہوئے (تمھارے پاس آئے۔)

ایک قراءت میں مُعْذِرُوْنَ ہے یعنی عذر پیش کرنے والے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ ❶ کا قول ہے۔

(لَعَنَ اللّٰهُ الْمُعَذِّرِیْنَ وَرَحِمَ الْمُعْذَرِیْنَ) یعنی جھوٹے عذر پیش کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہو اور جو واقعی معذور ہیں ان پر رحم فرمائے اور آیت کریمہ۔

﴿مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّکُمْ﴾ (۷۔۱۶۴) تمہارے پروردگار کے سامنے معذرت کرسکیں۔

میں مَعْذِرَةٌ عَذَرْتُ کا مصدر ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا عذر قبول فرمائے اَعْذَرَ: اس نے عذر خواہی کی اپنے آپ کو معذور ثابت کردیا۔ کہا گیا ہے ❶ اَعْذَرَ مَنْ اَنْذَرَ: یعنی جس نے ڈر سنا دیا وہ معذور ہے بعض نے کہا ہے کہ عُذْر اصل میں عَذِرَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نجاست اور گندگی کے ہیں ❷ اور اسی سے جو چمڑا ختنہ میں کاٹا جاتا ہے اسے عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے ❸ اور عَذَرْتُ الصَّبِیَّ کے معنی ہیں: میں نے لڑکے کا ختنہ کردیا گویا اسے ختنہ کی نجاست سے پاک کردیا اسی طرح عَذَرْتُ فُلَانًا کے معنی: ہیں میں نے اسے معافی دے کر اس سے گناہ کی نجاست کو دور کردیا جیسا کہ غَفَرْتُ لَهٗ کے معنی ہیں: میں نے اس کا گناہ چھپا دیا اور لڑکے کے ختنہ کے ساتھ تشبیہ دے کر لڑکی کے پردہ بکارت کو بھی عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے اور عَذَرْتُهَا کے معنی ہیں: میں نے اس کے پردہ بکارت کو زائل کردیا اور بچے کے حلق کے درد کو بھی عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے اسی سے عُذِرَ الصَّبِیُّ ہے جس کے معنی بچہ کے درد حلق میں مبتلا ہونے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❹

---

❶ انظر للکلمة المیدانی رقم ۲۴۹۶

❷ ومنه قیل للفناء العذرة لالقاء النجاسة فیها وفی الحدیث ((مالکم لاتنظفون عذراتکم)) وفی الحدیث ایضاً ((الیهود انتن خلق الله عزره)) الفائق (۲/۶۲)

❸ وفی الحدیث ((ولد رسول الله صلی الله علیه وسلم معذوراً)) قال فی الفائق (۲/۶۳) ای مسروراً من قطعت سرته

❹ قاله جریر وصدرهٗ: غمزابن مرة یافرزدق کینها۔ والبیت فی حل المعاجم (عذر کین۔نفع) ودیوانه ۳۰۶ والاقتضاب ۳۴۱ والاشتقاق ۵۳۹ والخزانة (۱/۴۸۱) وفی المطبوع نغانع (بالمهملة) مصحف

(۳۰۵) غَمْزَ الطَّبِيْبِ بِعَانِعِ الْمَعْذُوْرِ
جیسا کہ طبیب درد حلق میں مبتلا بچے کا گلا دباتا ہے۔
اور مُعْتَذِرٌ عذرخواہی کرنے والے کی مناسبت سے۔ اِعْتَذَرَتِ الْمِيَاهُ: پانی کے سرچشمے منقطع ہو گئے اور اِعْتَذَرَتِ الْمَنَازِلُ: مکانوں کے نشانات مٹ گئے۔ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں اور عَذِرَةٌ (یعنی نجاست سے اعتبار) سے کہا جاتا ہے۔
اَلْعَاذِرَةُ وہ عورت جسے استحاضہ کا خون آرہا ہو۔ عَذُوَّرٌ: بدخلق آدمی۔ دراصل عَذِرَةٌ کے معنی مکانات کے سامنے کا کھلا میدان ہے اسکے بعد اس نجاست کو عَذِرۃ کہنے لگے ہیں جو اس میدان میں پھینکی جاتی ہے۔

(ع ر ر)

اَلْمُعْتَرُّ: وہ ہے جو کچھ لینے کے لیے تمھارے سامنے آئے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاَطْعِمُوْا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ (۲۲۔۳۶) اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔
عَرَّهٗ يَعُرُّهٗ کے معنی ہیں: بخشش طلب کرنے کے لیے کسی کے سامنے آنا۔
اِعْتَرَرْتُ بِكَ حَاجَتِيْ: میں نے اپنی ضرورت تمہارے سامنے پیش کی۔ اَلْعَرُّ وَالْعُرُّ: خارش کی بیماری کو کہتے ہیں جو بدن کو عارض ہو جاتی ہے اس مناسبت سے مَعَرَّةٌ کا لفظ ہر قسم کی مضرت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۴۸۔۲۶) مبادا انہیں ان کی طرف سے بے خبری میں کوئی نقصان پہنچ جائے۔
اَلْعِرَارُ: اس سنسناہٹ کو کہتے ہیں جو تیز ہوا کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر تشبیہاً نر شتر مرغ کی آواز کو بھی عِرارٌ کہا جاتا ہے۔ عَارَّ الظَّلِيْمُ: شتر مرغ نے آواز کی۔ اَلْعَرْعَرُ (شمشاد کی قسم کا) ایک درخت جو ہوا کے چلنے سے گونجتا ہے۔ عَرْعَارِ: ایک قسم کا بچوں کا کھیل (جس میں وہ یہ کلمہ بولتے ہیں تا کہ دوسرے بچے اپنے چھپنے کی جگہ سے باہر نکل آئیں۔)

(ع ر ب)

اَلْعَرَبُ: حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں
اَلْاَعْرَابُ: دراصل یہ عَرَبٌ کی جمع ہے مگر یہ لفظ بادیہ نشین لوگوں کے ساتھ مختص ہو چکا ہے قرآن پاک میں ہے۔
﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا﴾ (۴۹۔۱۴) بادیہ نشین نے آکر کہا: ہم ایمان لے آئے۔
﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا﴾ (۹۔۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں۔
﴿وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (۹۔۹۹) اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ خدا پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ اَعْرَابٌ کی جمع اَعَارِيْبُ آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الوافر)

(۳۰۶) اَعَارِيْبُ ذَوُوْ فَخْرٍ بِاُفُكٍ
وَاَلْسِنَةٍ لِطَافٍ فِى الْمَقَالِ

اعرابی جو جھوٹے فخر کے مدعی ہیں اور گفتگو میں نرم زبان

[1] البیت فی الحماسۃ مع آخر بغیر عزو راجع المرزوقی ٦٤٨

رکھتے ہیں۔
اَلْاَعْرَابِیُّ: یہ اَعْرَابٌ کا مفرد ہے اور عرف میں بادیہ نشین پر بولا جاتا ہے اَلْعَرَبِیُّ: فصیح وضاحت سے بیان کرنے والا۔ اَلْاِعْرَابُ: کسی بات کو واضح کر دیا۔ اَعْرَبَ عَنْ نَفْسِہٖ: اس نے اپنی بات کو وضاحت سے بیان کر دیا حدیث میں ہے۔ ❶ (۳۵) ((اَلثَّیِّبُ تُعْرِبُ عَنْ نَفْسِھَا)) کہ ثیب اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کر سکتی ہے۔ اِعْرَابُ الْکَلَامِ کلام کی فصاحت کو واضح کرنا۔ علمائے نحو کی اصطلاح میں اِعْرَابٌ کا لفظ ان حرکات وسکنات پر بولا جاتا ہے جو کلموں کے آخر میں یکے بعد دیگرے (حسب عوامل) بدلتے رہتے ہیں۔ اَلْعَرَبِیُّ: واضح اور فصیح کلام کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔
﴿قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا﴾ (۱۲۔۲) واضح اور فصیح قرآن (نازل کیا) ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ﴾ (۲۶۔۱۹۵) فصیح عربی زبان میں..........۔
﴿فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا﴾ (۴۱۔۳) جس کی آیات کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ یعنی واضح قرآن۔
مَا بِالدَّارِ عَرِیْبٌ: گھر میں کوئی نہیں ہے اِمْرَءَۃٌ عَرُوْبَۃٌ: وہ عورت جو اپنے خاوند سے محبت اور پاک بازی کو ظاہر کرنے والی ہو۔ اس کی جمع عُرُوْبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿عُرُبًا اَتْرَابًا﴾ (۵۶۔۳۸) (اور شوہروں کی) پیاریاں اور ہم عمر۔
اور عَرَّبْتُ عَلَیْہِ کے معنی کسی کو اس کی غلطی بتانے کے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے (۳۶) عَرِّبُوْا عَلَی الْاِمَامِ: (امام قرأت میں غلطی کرے تو اسے بتا دو) اَلْمُعْرِبُ: عربی گھوڑے کا مالک، جیسا کہ خارش زدہ کو مُجْرِبٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔
﴿حُکْمًا عَرَبِیًّا﴾ (۱۳۔۳۷) کے معنی واضح اور فصیح کتاب کے ہیں جو حق کو ثابت اور باطل کو غلط ثابت کر دکھائے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کریم اور بلند مرتبہ کے ہیں اور یہ عُرُبًا اَتْرَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو کہ کِتَابٌ کَرِیْمٌ کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ عَرَبِیًّا بمعنی مُعْرِبٌ ہے اور یہ عَرِّبُوْا عَلَی الْاِمَامِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں پہلی کتابوں کے احکام کو منسوخ کرنے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عربی نبی کی طرف منسوب ہے اور عَرَبِیٌّ کی طرف نسبت کے وقت بھی عَرَبِیٌّ ہی کہا جائے گا یعنی تلفظ میں منسوب اور منسوب الیہ ایک ہی ہیں۔ یَعْرُبُ اس شخص کا نام ہے جس نے سب سے پہلے سریانی زبان کو عربی میں منتقل کیا اس لیے اس کا نام ہی یعرب مشہور ہو گیا۔

(ع ر ج)

اَلْعُرُوْجُ کے معنی اوپر چڑھنا کے ہیں ❷ قرآن پاک میں ہے۔
﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ﴾ (۷۰۔۴) جس

---

❶ انظر للحدیث الفائق (۲/۶۵) تخفیف الراء وتشدید ھا راجع غریب ابی عبید (۱:۱۶۲۔۱۶۳) وفی (حہ) فی النکاح والحاکم (۴/۱۹۲)

❷ قد ذکرہ ابو الطیب الحلبی فی الاضداد (۲:۴۹۸۔۴۹۹)

کی طرف روح (الامین) اور فرشتے چڑھتے ہیں۔

﴿فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ﴾ (۱۵۔۱۴) اور وہ اس میں چڑھنے بھی لگیں۔

اور مَعَارِجُ کے معنی سیڑھیوں کے ہیں اس کا مفرد مَعْرَجٌ (اور معراج) ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾ (۷۰۔۳) سیڑھیوں والے خدا کی طرف سے (نازل ہوگا۔)

اور شب معراج کو بھی لَيْلَةُ الْمِعْرَاج اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں دعائیں اوپر چڑھتی ہیں جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۳۵۔۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔

میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

عَرَجَ عُرُوْجًا وَعَرَجَانًا: (ہموار زمین پر) ایسے چلنا جیسے کوئی شخص سیڑھیاں چڑھ رہا ہو جیسا کہ دَرَجَ کا لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو دَرَجٌ یعنی سیڑھی پر چڑھنے والے کی طرح چلے۔ عَرِجَ (س) مستقل طور پر لنگڑا ہونا اور ضَبُعٌ (گفتار) کو عَرْجَاءُ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خِلْقَةً لنگڑا ہوتا ہے اور تَعَارَجَ کے معنی بتکلف لنگڑا کر چلنے کے ہیں جیسا کہ تَضَالَعَ کے معنی بتکلف سیری ظاہر کرنا کے ہوتے ہیں اسی سے استعارتاً شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

(۳۳۷) عَرِّجْ قَلِيْلاً عَنْ مَدَى غَلْوَائِكَا

اَلْعَرَجُ: اونٹوں کا بڑا گلہ گویا وہ اپنی کثرت کے اعتبار سے اوپر چڑھ چکا ہے۔

(ع ر ج ن)

اَلْعُرْجُوْنُ: کھجور کے خوشے کی ڈنڈی جو خشک ہو کر خمیدہ ہو جاتی ہے۔ [2] قرآن پاک میں ہے۔

﴿حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾ (۳۶۔۳۹) یہاں تک کہ کھجور کے خوشے کی ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔

(ع ر ش)

اَلْعَرْشُ: اصل میں چھت والی چیز کو کہتے ہیں اس کی جمع عُرُوْشٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ (۲۔۲۵۹) اور اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گرے پڑے تھے۔

اسی سے عَرَشْتُ (ن) اَلْكَرْمَ وَعَرَّشْتُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی انگور کی بیلوں کے لیے بانس وغیرہ کی ٹٹیاں بنانا کے ہیں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیل کو مُعَرَّشٌ بھی کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَعْرُوْشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوْشَاتٍ﴾ (۶۔۱۴۱) ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے ہوئے۔

---

[1] قالہ ابراهيم بن العباس الصولی وصدره : اباجعفر خف بنوة بعدصولةٍ وفی روايةٍ قصر بدل عرج والبيت فی الشعراء ٢٤ والصداقة٣٥ والاغانی (٩/ ٢١) والادباء (١ : ٢٢٤) ونزهة الجليس (٢ : ٢٦٧) والوفيات (٢ : ٥٦) والطرائف ١٦١ شعر ابراهيم رقم ١٢٤ والعقد(٢ : ٣٥٦) وفيه البيت : اباجعفر عرج على خلطائكا واقصر قليلاًعن مدى غلوائكا والمحاضرات للمؤلف (١٧٥) وفيه دولة بعد صولة وابن عبر نسبه الى على بن الجهم انه كتب الى ابن الزيادوفی رواية العيون (١/ ٢٧٣) والعقدالفريد اباجعفر عرج على خلطائكا ۔واقصر قليلامن مدعى غلوائكا

[2] فنونه اصلية و وزنه فعول كذافی القاموس قال الزجاج وزنه فعلون ونونه زائدة راجع الروح (٢٣/ ٢٠)

﴿وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ﴾ (۱۶۔۶۸) اور درختوں میں اور ان سے جنہیں ٹٹیوں پر چڑھاتے ہیں۔

﴿وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ﴾ (۷۔۱۳۷) جو ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یَعْرِشُوْنَ کے معنی یَبْنُوْنَ ہیں یعنی جو وہ عمارتیں بناتے تھے ❶ اِعْتَرَشَ الْعِنَبَ: انگور کی بیل کے لیے بانس وغیرہ کی ٹٹی بنائی۔ اَلْعَرِیْشُ: چھولداری۔ جس کی ہیئت انگور کی ٹٹی سے ملتی جلتی ہے۔ اسی سے عَرَّشْتُ الْبِئْرَ ہے جس کے معنی کنوئیں کے اوپر چھولداری سی بنانا کے ہیں۔ بادشاہ کے تخت کو بھی اس کی بلندی کی وجہ سے عَرْش کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ﴾ (۱۲۔۱۰۰) اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔

﴿اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا﴾ (۲۷۔۳۸) کوئی تم میں سے ایسا ہے...... کہ ملکہ کا تخت میرے پاس لے آئے۔

﴿نَکِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا﴾ (۲۷۔۴۱) اس کے تخت کی صورت بدل دو۔

﴿اَهٰکَذَا عَرْشُكِ﴾ (۲۷۔۴۱) کہ آپ کا تخت بھی اسی طرح کا ہے۔

اور بطور کنایہ عَرْش کا لفظ عزت، غلبہ اور سلطنت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ قُلَّ عَرْشُهٗ: (یعنی فلاں کی عزت جاتی رہی) مروی ہے (۳۱۸) کہ کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو ان سے دریافت کیا کہ پروردگار نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اگر خدا اپنی رحمت سے میری دستگیری نہ کرتا "لَثُلَّ عَرْشِیْ" تو میں ذلیل ہو جاتا۔ اور عرش الٰہی سے صرف نام کی حد تک ہم واقف ہیں اور اس کی حقیقت انسان کے فہم سے بالاتر ہے اور وہ بادشاہ کے عرش کی طرح نہیں ہے جیسا کہ عوام خیال کرتے ہیں کیونکہ اس صورت میں تو عرش باری تعالیٰ کا حامل قرار پائے گا نہ کہ محمول، حالانکہ ذات الٰہی اس سے بالاتر ہے (کہ کوئی چیز اسے اٹھائے) جیسا کہ خود قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَکَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ﴾ (۳۵۔۴۱) خدا ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے کہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو خدا کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ان کو تھام سکے۔ بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ عَرْش سے فَلَكُ الْاَعْلٰی (فلک الافلاک) اور کُرْسِی سے فلک الکواکب یعنی آٹھواں آسمان مراد ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا۔ ❷ (۳۶) ((مَا السَّمٰوٰت السبع وَالْاَرْضُوْنَ السبع فی جنب الکرسی الا کحلقة ملقاة فِی اَرْضٍ فُلَاةٍ)) کہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے جیسے بیابان میں ایک انگوٹھی پڑی ہوئی ہو اور یہی حیثیت عرش کے مقابلہ میں کرسی کی ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَاءِ﴾ (۱۱۔۱۷) اور (اس

---

❶ راجع مجازه (۱/۲۲۷)

❷ سیاتی فی (کرسی) وهناك الموعد لتخریجه انشاء الله تعالیٰ

وقت) اس کا عرش پانی پر تھا۔

میں متنبہ کیا ہے کہ عرش جب سے وجود میں آیا ہے پانی کے اوپر ہی رہا ہے۔ اور آیات۔

﴿ذُوالْعَرْشِ الْمَجِيْدِ﴾ (۸۵۔۱۵) عرش کا مالک بڑی شان والا۔

﴿رَفِيْعُ الدَّرَجَاتِ ذُوالْعَرْشِ﴾ (۴۰۔۱۵) مالک درجات عالی اور صاحب عرش ہے۔ اور ان کے ہم معنی دیگر آیات میں بعض نے کہا ہے کہ ان سے حق تعالیٰ کی سلطنت اور حکومت کی طرف اشارہ ہے ورنہ ان کے یہ معنی نہیں ہے کہ عرش باری تعالیٰ کا ٹھکانا اور مسکن ہے۔

(ع ر ض)

اَلْعَرْضُ: (کسی چیز کی چوڑائی) یہ اَلطُّوْلِ کی ضد ہے اصل میں اس کا استعمال اجسام کے متعلق ہوتا ہے اس کے بعد غیر اجسام کے متعلق بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَذُوْدُعَاءٍ عَرِيْضٍ﴾ (۴۱۔۵۱) تو لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

اور عَرْضٌ خاص کر ایک جانب اور کنارہ کو کہتے ہیں عَرَضَ الشَّيْءُ: اس کی ایک جانب ظاہر ہوگئی۔ عَرَضْتُ الْعَوْدَ عَلَی الْاِنَاءِ: برتن پر لکڑی کو چوڑی جانب سے رکھا۔

اِعْتَرَضَ الشَّيْءُ فِي حَلْقِهٖ: وہ چیز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اِعْتَرَضَ الْفَرَسُ فِيْ مَشْيِهٖ: گھوڑا اپنے سر اور سینے کو ایک جانب ٹیڑھا کر کے چلا۔ فِيْهِ عُرْضِيَّةٌ اس میں منہ زوری ہے۔

عَرَضْتُ الشَّيْءَ عَلَی الْبَيْعِ: میں نے اسے فروخت کے لیے پیش کیا۔ عَرَضْتُ الشَّيْءَ عَلٰی فُلَانٍ اَوْلِفُلَانٍ میں نے فلاں کے سامنے وہ چیز پیش کی۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ (۲۔۳۱) پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

﴿وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا﴾ (۱۸۔۴۸) اور سب تمہارے پروردگار کے سامنے صف باندھ کر لائے جائیں گے۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ﴾ (۳۳۔۷۲) ہم نے (بار) امانت کو پیش کیا۔

﴿وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا﴾ (۱۸۔۱۰۰) اور اس روز جہنم کافروں کے سامنے لائیں گے۔

﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ﴾ (۴۶۔۲۰) اور جس روز کافر دوزخ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

عَرَضْتُ الْجُنْدَ: لشکر کا جائزہ لیا۔

اَلْعَارِضُ: وہ چیز جو تمہارے سامنے آئے خاص طور پر بادل (جو افق پر پھیلا ہوا ہو) جیسے فرمایا۔

﴿هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ (۴۶۔۲۴) یہ تو بادل ہے جو ہم پر برس کر رہے گا۔

نیز اَلْعَارِضُ کا لفظ عارضۂ مرض پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے: بِهٖ عَارِضٌ مِّنَ الْمَرَضِ: اسے بیماری کا عارضہ ہے۔ اور کبھی بمعنی رخسار آجاتا ہے۔ جیسے اَخَذَ مِنْ عَارِضَيْهِ: (اس نے اس کے رخسار پکڑ لیے) اور کبھی بمعنی دانت، اسی سے ان دانتوں کو جو ہنستے وقت ظاہر

ہوتے ہیں اَلْعَوَارِضُ کہا جاتا ہے۔ اور کنایہ کے طور پر عمدہ گو اور فصیح شخص کو فُلَانٌ شَدِیْدُ الْعَارِضَۃ کہا جاتا ہے بَعِیْرٌ عَرُوْضٌ: اونٹ جو منہ میں دونوں طرف سے کانٹے چبا کر کھاتا ہو۔

اَلْعُرْضَۃُ: جو کسی چیز کے سامنے آ کر آڑ بن جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ﴾ (۲۔۲۲۴) اور خدا کے نام کو اپنی قسموں کے لیے آڑ نہ بناؤ۔

بَعِیْرٌ عُرْضَۃٌ لِلسَّفَرِ: وہ اونٹ جو سفر کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ اَعْرَضَ لِیْ کَذَا کسی چیز کا اس طرح سامنے آنا کہ اس کے پکڑنے پر قدرت ہو جائے۔ اَعْرَضَ عَنِّیْ: اس نے مجھ سے روگردانی کی، اعراض کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْھَا﴾ (۳۲۔۲۲) تو وہ ان سے منہ پھیرے۔

﴿فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَعِظْھُمْ﴾ (۴۔۶۳) تم ان سے اعراض برتو اور نصیحت کرتے رہو۔

﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ﴾ (۷۔۱۹۹) اور جاہلوں سے کنارہ کرلو۔

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ﴾ (۲۰۔۱۲۴) اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا۔

﴿وَھُمْ عَنْ اٰیٰتِھَا مُعْرِضُوْنَ﴾ (۲۱۔۳۲) اس پر بھی وہ ہماری نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔

اور کبھی قرائن کی بنا پر اس کے بعد عَنْ کو حذف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (۲۴۔۴۸) ان میں سے ایک فریق منہ پھیر لیتا ہے۔

﴿ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (۳۔۲۳) تو ایک فریق ان میں سے کج ادائی کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے۔

﴿فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ﴾ (۳۴۔۱۶) تو انہوں نے شکر گزاری سے منہ پھیر لیا۔ پس ہم نے ان پر.......... چھوڑ دیا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (۳۔۱۳۲) اور بہشت ...... جس کا عرض ارض و سماء کے برابر ہے۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَرْضٌ کا لفظ اَلطُّوْلُ کی ضد ہے اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ عالم آخرت میں جنت کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنی کہ اس عالم میں آسمانوں اور زمین کی چوڑائی ہے کیونکہ عالم آخرت کی صفت میں تو قرآن پاک نے کہا ہے۔

﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ (۱۴۔۴۸) جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان۔

اور یہ عین ممکن ہے کہ عالم آخرت کے ارض و سماء اس دنیا کے ارض و سماء سے وسیع اور کشادہ ہوں چنانچہ مروی ہے۔

(۳۸) ((اِنَّ یَھُوْدِیًّا سَاَلَ عَمَرَ عَنْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ فَقَالَ فَاَیْنَ النَّارُ؟ فقال عمرؓ: اذا جاء الَّیْلُ فَاَیْنَ النَّھَارُ)) کہ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا اور کہا (کہ اگر جنت ہی اتنی وسیع ہوگی) تو دوزخ کس جگہ پر ہوگی؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً پوچھا ''جب رات آجاتی ہے تو دن کہاں ہوتا ہے۔'' اور بعض نے کہا ہے: عرض سے مراد وسعت

ہے اور یہ وسعت پیائش کے اعتبار سے مراد نہیں ہے بلکہ مسرت اور خوشی کے اعتبار سے ہے جس طرح کہ اس کے برعکس دنیا کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اَلدُّنْیَا عَلٰی فُلَانٍ حَلْقَةُ خَاتَمٍ وَكِفَّةُ حَابِلٍ (کہ فلاں پر تو دنیا انگشتری کے حلقہ اور شکاری کے پھندے کی طرح تنگ ہوگئی ہے اسی طرح ایک اور محاورہ ہے۔

سَعَةُ هٰذِهِ الدَّارِ كَسَعَةِ الْاَرْضِ: (کہ اس گھر کی وسعت روئے زمین کی وسعت کے برابر ہے) بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَرْضٌ کا لفظ اَلْعَرَضُ لِلْبَيْعِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے چنانچہ جب کوئی چیز کسی قسم کے سامان کے عوض بیچ دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے: بِيْعَ كَذَا (کہ یہ چیز اتنے) سامان کے عوض فروخت کی گئی۔ لہٰذا آیت میں بھی عَرْضُهَا کے معنی عوض اور بدلہ کے ہیں جیسے محاورہ ہے۔ عَرْضُ هٰذَا الثَّوْبِ كَذَا وَكَذَا (کہ اس کپڑے کی قمت اتنی اور اتنی ہے)۔

اَلْعَرَضُ: ہر وہ چیز جسے ثبات نہ ہو۔ [2] اسی اعتبار سے علمائے کلام کی اصطلاح میں اَلْعَرَض کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جو جَوْهَرٌ کے بغیر قائم نہ رہ سکے۔ جیسے رنگ ذائقہ وغیرہ اور دنیا کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

اَلدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ (کہ دنیا تو پیش افتادہ سازو سامان کا نام ہے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ (۸۔۶۷) تم لوگ پیش افتادہ ساز و سامان کے طالب ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے۔

﴿يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى﴾ (۷۔۱۶۹) اس دنیا کی مال و دولت لیتے ہیں۔

﴿وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ﴾ (۷۔۱۶۹) اگر ان کے سامنے (بھی) ویسا ہی مال آجاتا...... اور آیت کریمہ۔

﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا﴾ (۹۔۴۲) کے معنی یہ ہیں اگر کوئی فائدہ آسانی سے حاصل ہونے کی توقع ہوتی۔

اَلتَّعْرِيْضُ: پہلو دار بات کرنا جو سچ جھوٹ اور ظاہر و باطن دونوں معنی پر محمول ہوسکتی ہو۔ اور آیت۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ﴾ (۲۔۲۳۵) اگر تم کنایہ کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو...... تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ نکاح کے پیغام میں تعریض کی صورت یہ ہے کہ عورت سے مثلاً کہا جائے تم بہت خوبصورت ہو پسندیدہ نظر ہو وغیرہ۔

(ع ر ف)

اَلْمَعْرِفَةُ وَالْعِرْفَانُ کے معنی ہیں: کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر کرکے اس کا ادراک کرلینا۔ یہ علم سے اخص یعنی کم درجہ رکھتا ہے اور یہ اَلْاِنْكَار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے یہی وجہ ہے فُلَانٌ يَعْرِفُ اللّٰهَ تو کہا جاتا ہے مگر تعدیہ بیک مفعول کی صورت میں فُلَانٌ يَعْلَمُ اللّٰهَ استعمال نہیں ہوتا کیونکہ انسان ذات الٰہی کا علم حاصل

---

[1] رواه ابن جرير بثلاثة طرف وفيه ان ناس من اليهود وفي مسند احمد روى مرفوعاً وايضاً في ابن جرير وايضاً اجاب به ابن عباس وفي مسند البزار مرفوعاً عن ابن جرير (ابن جرير)

[2] قال ابو عبيدة يقال جمع متاع الدنيا عرض بفتح الراء واما العرض بسكون الراء فهو ماسوى الدنانير والدراهم راجع الجمل لابن فارس (ماخوذ من فتح القدير للشوكاني ۱/ ۵۰۱)

نہیں کر سکتا البتہ کائنات اور آثار قدرت پر غور وفکر کر کے اس کی صفات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اسی طرح اللہ یَعْرِفُ کَذَا نہیں کہتے کیونکہ مَعْرِفَۃ کا درجہ علم سے کم تر ہوتا ہے اور لفظ معرفت اس ادراک پر بولا جاتا ہے جو غور وفکر کے بعد حاصل ہوتا ہے جس سے ذات باری تعالیٰ بلند وبرتر ہے۔ دراصل معرفت کا لفظ عَرفْتُ کَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے اس کی بو پالی اور یا اَصَبْتُ عَرْفَہٗ: (میں نے اس کے رخسار پر مارا) سے یہ لفظ پہچاننے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ (۲۔۸۹) پھر جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آ پہنچی تو اس سے کافر ہو گئے۔

﴿فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ﴾ (۱۲۔۵۸) تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان کو نہ پہچان سکے۔

﴿فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ (۴۷۔۳۰) اور تم ان کے چہروں سے ہی پہچان لیتے۔

﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ﴾ (۲۔۱۴۷) اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں۔

مَعْرِفَۃ کے مقابلہ میں اِنْکَارٌ اور عِلْمٌ کے مقابلہ میں لفظ جَھَالَۃٌ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا﴾ (۱۶۔۸۳) یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں مگر (واقف ہو کر) ان سے انکار کرتے ہیں۔

اور ایک گروہ (یعنی صوفیہ کرام) کی اصطلاح میں عَارِفٌ کا لفظ خاص کر اس شخص پر بولا جاتا ہے جسے عالم ملکوت اور ذات الٰہی اور اس کے ساتھ حسن معاملہ کے متعلق خصوصی معرفت حاصل ہو۔ عَرَّفَہٗ کَذَا: فلاں نے اسے اس چیز کا تعارف کروا دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ﴾ (۶۶۔۳) تو پیغمبر علیہ السلام نے کچھ بات تو بتا دی اور کچھ نہ بتائی۔

تَعَارَفُوْا: انہوں نے باہم ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لِتَعَارَفُوْا﴾ (۴۹۔۱۳) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔

﴿يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ (۱۰۔۴۵) آپس میں ایک دوسرے کو پہچان بھی لیں گے۔

عَرَّفَہٗ کسی چیز کو خوشبودار کر دیا، معطر بنا دیا۔ چنانچہ جنت کے بارے میں ﴿عَرَّفَهَا لَهُمْ﴾ (۴۷۔۶) فرمایا ہے جس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنت کو خوشبو سے بسا دیا ہے اور ان کے لیے آراستہ کر رکھا ہے اور بعض نے اس کے معنی توصیف کرنا، شوق دلانا اور اس کی طرف رہنمائی کرنا بھی بیان کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ﴾ (۲۔۱۹۸) جب تم میدان عرفات سے واپس ہونے لگو۔

میں ''عرفات'' سے میدان عرفات مراد ہے۔ بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اس میدان میں آدم علیہ السلام اور حوا کا باہم (دنیا میں پہلی دفعہ) تعارف ہوا تھا اس لیے عرفات کہا جاتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس میدان میں دعا اور عبادت کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل

کرتے ہیں اس لیے اسے عرفات کہا جاتا ہے۔

اَلْمَعْرُوْفُ: ہراس قول یا فعل کا نام ہے جس کی خوبی عقل یا شریعت سے ثابت ہو اور مُنْکَرٌ ہر اس بات کو کہا جائے گا جو عقل و شریعت کی رو سے بری سمجھی جائے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۳۔۱۱۴) اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے۔

﴿وَقُلْنَ قَوْلاً مَّعْرُوْفًا﴾ (۳۳۔۳۲) اور دستور کے مطابق ان سے بات کیا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ جُـــوْدٌ (سخاوت) میں اعتدال اختیار کرنے کو بھی مَـعْرُوْفٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اعتدال عقل و شریعت کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَـنْ كَـانَ فَـقِيْـرًا فَـلْيَـاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۴۔۶) اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر یعنی بقدر خدمت کچھ لے لے۔

﴿اِلَّا مَـنْ اَمَـرَ بِـصَدَقَةٍ اَوْمَعْرُوْفٍ﴾ (۴۔۱۱۴) ہاں (اس شخص کی مشاورت اچھی ہوسکتی ہے) جو خیرات یا نیک بات...... کہے۔

﴿وَلِـلْـمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۲۔۲۴۱) اور مطلقہ کو بھی دستور کے مطابق نان ونفقہ دینا چاہیے۔

یعنی اعتدال اور احسان کے ساتھ نیز فرمایا۔

﴿فَـاَمْسِـكُـوْهُـنَّ بِـمَـعْـرُوْفٍ اَوْفَـارِقُوْهُنَّ بِـمَـعْرُوْفٍ﴾ تو یا تو ان کو اچھی طرح سے زوجیت میں رہنے دو یا اچھی طرح سے علیحدہ کردو۔

﴿قَـوْلٌ مَـعْـرُوْفٌ وَّمَـغْـفِـرَةٌ خَيْـرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ﴾ (۲۔۲۶۳) نرم بات اور درگزر کرنا صدقہ سے بہتر ہے۔ یعنی نرم جواب دے کر لوٹا دینا اور فقیر کے لیے دعا کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس پر احسان جتلایا جائے۔

اَلْـعُرْفُ: وہ نیک بات جس کی اچھائی کو سب تسلیم کرتے ہوں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأْمُـرْ بِالْعُرْفِ﴾ (۷۔۱۹۹) اور نیک کام کرنے کا حکم دو۔

عُرْفُ الْفَرَسِ: گھوڑے کی ایال۔ عُرْفُ الدِّيْكِ: مرغ کی کلغی جَاءَ الْقَطَاعُرْفًا: قطا جانور آگے پیچھے یکے بعد دیگرے آئے اسی سے قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَالْـمُرْسَلاَتِ عُرْفًا﴾ (۷۷۔۱) ہواؤں کی قسم جو متواتر چلتی ہیں۔

اَلْـعَرَّافُ: یہ کَـاهِنٌ کے ہم معنی ہے مگر عَرَّافٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی باتوں کی خبر دے اور کَـاهِـنٌ اسے کہتے ہیں جو گذشتہ واقعات کے متعلق اطلاع دے اَلْعَرِيْفُ اسے کہتے ہیں جو لوگوں کو جانتا پہچانتا اور ان کا تعارف کراتا ہو۔شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الکامل)

(۳۰۸) بَعَثُوْا اِلَيَّ عَرِيْفَهُمْ يَتَوَسَّمُ

وہ میرے پاس اپنا عریف بھیجیں گے جو پہچان کرلے گا۔

---

[1] اولہ : اوکلما وردت عکاظ قبیلہ ...... والبیت فی اللسان والمحکم والتاج (عرف) ونسبہ الی طریف بن مالک العنبری وقیل طریف بن عمرو کمافی الاقتضاب ٤٦٣ والاشباہ (٤ : ١٠١) والبحر (٥ / ٤٦٣) والکتاب (٢ / ٢١٥) والشنتمری وعزاہ لطریف بن تمیم العنبری

اور عَرُفَ فُلَانٌ عَرَافَةً کے معنی عریف بننے کے ہیں اس لیے عَرِیْفٌ مشہور سردار کو کہا جاتا ہے ۔ شاعر نے کہا ہے ۔[1] (البسیط)

(۳۰۹) بَلْ کُلُّ قَوْمٍ وَاِنْ عَزُّوْا وَاِنْ کَثُرُوْا
عَرِیْفُھُمْ بِاَثَافِی الشَّرِّ مَرْجُوْمُ

ہر قوم خواہ کتنی ہی باعزت اور تعداد میں زیادہ کیوں نہ ہو مگر ان کے سردار بھی شرور زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکتے ۔

یَوْمُ عَرَفَةَ: جس روز حجاج میدان عرفہ میں وقوف کرتے ہیں ۔ اور آیت کریمہ ۔

﴿وَعَلَی الْاَعْرَافِ رِجَالٌ﴾ (۷۔۴۶) اور اعراف پر کچھ آدمی ہوں گے ۔

میں اَلْاَعْرَافُ: سے وہ دیوار مراد ہے جو جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہے ۔

اَلْاِعْتِرَافُ (افتعال) کے معنی اقرار کے ہیں اصل میں اس کے معنی گناہ کا اعتراف کرنے کے ہیں ۔ اس کی ضد جُحُوْدٌ یعنی انکار کرنا ہے ۔ قرآن پاک میں ہے ۔

﴿فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِهِمْ﴾ (۶۷۔۱۱) پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے ۔

﴿فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا﴾ (۴۰۔۱۱) ہم کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے ۔

(ع ر م)

اَلْعَرَامَةُ کے معنی مزاج کی تندی اور درشتی کے ہیں ۔ جس کا اثر انسان کے عمل پر ظاہر ہو، کہا جاتا ہے: عَرَمَ فُلَانٌ فلاں سخت مزاج ہو گیا چنانچہ ایسے شخص کو عَارِمٌ کہا جاتا ہے ۔

اسی سے عُرَامُ الْجَیْشِ ہے ۔ جس کے معنی لشکر کی تندی و تیزی اور کثرت کے ہیں اور آیت کریمہ ۔

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ﴾ (۳۴۔۱۶) کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ ہم نے ان پر سخت سیلاب بھیجا اور بعض نے اَلْعَرِمِ کے معنی بند کیئے ہیں اور بعض نے اَلْعَرِمِ سے جنگلی چوہا مراد لیا ہے اور اس سیلاب کو اس کی طرف اس لیے منسوب کیا ہے کہ چوہوں نے اس بند میں نقاب ڈالے تھے اور وہ بند ٹوٹ گیا تھا ۔

(ع ر و ی)

عَرِیَ مِنْ ثَوْبِهٖ یَعْرٰی: ننگا ہونا چنانچہ، برہنہ اور ننگے شخص کو عَارٍ وَعُرْیَانٌ کہا جاتا ہے ۔ قرآن پاک میں ہے ۔

﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی﴾ (۲۰۔۱۱۸) یہاں تم نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے ۔

هُوَ عَرُوٌّ مِنَ الذَّنْبِ: وہ گناہ سے عاری ہے ۔ اَخَذَهٗ عُرَوَاءُ: برہنگی کی وجہ سے اس پر کپکپی طاری ہو گئی ۔ اور انسان کے ان اعضاء کو جو عام طور پر ننگے رہتے ہیں ۔ جیسے چہرہ ہاتھ اور پاؤں کو اَلْمَعَارِیْ کہا جاتا ہے ۔ چنانچہ محاورہ ہے ۔ فُلَانٌ حَسَنُ الْمَعْرٰی: فلاں کے ننگے

---

[1] قاله علقمه بن عبدة الفحل وفي اللسان (عرف) كل حی بدل كل قومٌ وان كرموای بدل ان كثرواوالبيت من كلمة مفضلية (۲ : ۱۹۷) وفی منتهی الطلب (۱/۲۷۔۲۹) والشعراء (۴۹۸۔۵۰۲) ومختار الشعراء الجاهلی (۱ : ۳۲۷) وديوانه ۱۲۹ والصناعتين ۳۰۰ والحيوان (۷ : ۱۴۹) والمحاضرات للمؤلف (۴۹/۴) وفی رواية وكل قوم بدل كل قوم وكرموابدل كثروا ذكرهٗ العسكری فی امثله روی الاستعارة

اعضاء خوبصورت ہیں۔جیسا کہ حَسَنُ الْمَحْسَرِ وَالْمُجَرَّدِ: کا محاورہ ہے اَلْعَرَاءُ: کھلی جگہ، جہاں کوئی چیز آڑ کے لیے نہ ہو جیسے فرمایا۔

﴿فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ﴾ (۳۷۔۱۴۵) پھر ہم نے اسے جبکہ وہ بیمار تھے کھلے میدان میں ڈال دیا۔

اَلْعَرٰی: (اسم مقصور) کنارہ اور جانب کو کہتے ہیں اور عَرَاہُ واعْتَرَاہُ: اس کے سامنے آیا، اس کی جانب قصد کیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْءٍ﴾ (۱۱۔۵۴) کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھ پر مصیبت ڈال دی ہے۔

اَلْعُرْوَةُ: ہر وہ چیز جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے اور آیت کریمہ۔

﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (۲۔۲۵۶) تو اس نے مضبوط حلقہ ہاتھ میں پکڑا۔

میں (ایمان باللہ کو) بطور تمثیل کے ’’مضبوط حلقہ‘‘ سے تعبیر فرمایا ہے۔نیز عُرْوَة یا عَلْقَه ایک قسم (کی) خاردار جھاڑی یا پیلو کی قسم کے درخت کو بھی کہتے ہیں جو اونٹوں کے لیے آخری سہارا ہوتا ہے۔ اَلْعَرِيُّ وَالْعَرِيَّةُ: سرد ہوا جو انسان کو لگ جاتی ہے۔نیز اَلْعَرِيَّةُ کھجور کا وہ درخت جو بیع سے مستثنیٰ کیا گیا ہو۔بعض کہتے ہیں کہ عَرِيَّةٌ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جس کا پھل اس کے مالک نے کسی محتاج کو ہبہ کر دیا ہو، شرعاً اس درخت کے پھل کو خشک کھجوروں کے عوض بیچنا جائز ہے بعض کہتے ہیں کہ عَرِيَّة کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو کسی آدمی کے باغ میں دوسرے کی ملکیت ہو اور اس کے آنے جانے سے باغ کے مالک کو تکلیف ہوتی ہو تو شریعت نے خشک کھجوروں کے عوض اس کا پھل خریدنے کی اجازت دی ہے۔اس کی جمع عَرَايَا ہے اور آنحضرت ﷺ نے بیع عَرَايَا کی رخصت دی ہے۔[1] (۳۹)

(ع ز ز)

اَلْعِزَّةُ: اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔یہ اَرْضٌ عَزَازٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سخت زمین کے ہیں۔ تَعَزَّزَ اللَّحْمُ: گوشت سخت ہو گیا اور گتھ گیا گویا وہ سخت زمین میں پڑا ہے جس تک رسائی مشکل ہے۔جیسا کہ تَظَلَّفَ کے معنی ظَلِفٌ یعنی سخت زمین میں چلے جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (۴۔۴۰) کیا یہ ان کے ہاں عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔عزت تو سب خدا ہی کی ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۶۳۔۸) حالانکہ عزت خدا کی ہے اور اس کے رسول ﷺ کی اور مومنوں کی۔

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ......﴾ (۳۵۔۱) تمہارا پروردگار جو صاحب عزت ہے اس سے پاک ہے۔

اَلْعِزَّةُ: کبھی باعث مدح ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی باعث مذمت جیسا کہ کفار کے متعلق فرمایا۔

﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾ (۳۸۔۲)

---

[1] والحديث اختلاف الفاظه ايضاً في الموطا (۲/۱۲۵) والرسالة للشافعي رقم (۹۰۹) وتحته التخريج لاحمد شاكر مصرى واختلاف الحديث ۲۱۹ واصحاب الكتب الستة راجع ذخائر المواريث رقم (۱۹۶۱)

مگر جو کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عزت اللہ، رسول اور مسلمانوں کو حاصل ہے وہ دائماً باقی رہنے والی ہے اور یہی عزت حقیقی ہے مگر کفار کو عزت حقیقی حاصل نہیں ہے بلکہ وہ بتکلف اپنے آپ کو قوی اور غالب ظاہر کر رہے ہیں جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ (۴۰) جو عزت اللہ تعالیٰ سے حاصل نہ ہو وہ سراسر ذلت ہے۔اسی معنی میں فرمایا:
﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا﴾ (۱۹۔۸۱) یعنی اللہ کے سوا انھوں نے معبود بنا رکھے ہیں کہ ان کے ذریعہ عذاب سے محفوظ رہ سکیں اور آیت کریمہ۔
﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا﴾ (۳۵۔۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص معزز بننا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے عزت حاصل کرے کیونکہ ہر قسم کی عزت خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے کبھی عزت کا لفظ حمیت اور غلط خودداری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ۔
﴿اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ (۲۔۲۰۶) تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے۔ میں عزت کے معنی حمیت کے ہیں۔
اَلْعَزِيْزُ: وہ ہے جو غالب ہو اور مغلوب نہ ہو۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (۲۹۔۲۶) بے شک وہ غالب حکمت والا ہے۔
﴿يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ﴾ (۱۲۔۸۸) اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔
اَعَزَّهٗ: (افعال) کے معنی کسی کو عزت بخشنے کے ہیں)۔
قرآن پاک میں ہے۔
﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ (۳۔۲۶)
جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔
عَزَّ عَلَيَّ كَذَا مجھ پر یہ بات نہایت ہی گراں گذری۔
قرآن پاک میں ہے۔
﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (۹۔۱۲۸) تمہاری تکلیف ان پر گراں گزرتی ہے۔
اور عَزَّهٗ كَذَا: کے معنی ہیں: فلاں اس پر غالب آ گیا چنانچہ مثل مشہور ہے۔ مَنْ عَزَّبَزَّ: (جس کی لاٹھی اسی کی بھینس) قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ﴾ (۳۸۔۲۳) اور گفتگو میں مجھ پر غالب آ گیا ہے۔
بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ گفتگو اور جھگڑا کرنے میں مجھ سے زیادہ باعزت بن بیٹھا ہے۔
عَزَّ الْمَطَرُ الْاَرْضَ: بارش زمین پر غالب آ گئی۔
عَزَّ الشَّيْءُ: کسی چیز کا نادر اور کمیاب ہونا۔چنانچہ اسی اعتبار سے کہا گیا ہے۔
كُلُّ مَوْجُوْدٍ مَمْلُوْلٌ وَكُلُّ مَفْقُوْدٍ مَطْلُوْبٌ
کہ ہر موجود چیز سے انسان اکتا جاتا ہے اور ہر نایاب چیز کی تلاش کی جاتی ہے۔ شَاةٌ عَزُوْزٌ: بکری کا دودھ کم ہو گیا اور آیت کریمہ۔
﴿اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ﴾ (۴۱۔۴۱) یہ تو ایک عالی رتبہ

کتاب ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اس جیسی کتاب کا کہیں سے حاصل کرنا اور پایا جانا نہایت دشوار ہے۔
اَلْعُزّٰی: ایک بت کا نام ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ الْعُزّٰى﴾ (۵۳۔۱۹) بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔
وَاسْتُعِزَّ بِفُلَانٍ: فلاں مرض یا موت سے مغلوب ہوگیا۔

(ع ز ب)

اَلْعَازِبُ: وہ آدمی جو گھاس کی تلاش میں اپنے اہل وعیال سے دور نکل جائے۔ عَزَبَ يَعْزِبُ وَيَعْزُبُ (ض ن) دور نکل جانا، پوشیدہ ہو جانا۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ﴾ (۱۰۔۶۱) اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔
﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ﴾ (۳۴۔۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔
رَجُلٌ عَزَبٌ: کنوارا، بے زن مرد۔
عَزَبَ عَنْهُ حِلْمُهٗ: اس کی عقل جاتی رہی۔
عَزَبَ طُهُوْهَا: اس کا خاوند غائب ہوگیا۔
قَوْمٌ مُعَزَّبُوْنَ: وہ لوگ جن کے اونٹ چرنے کے لیے دور نکل گئے ہوں۔
ایک حدیث میں ہے۔❶ (۴۱) ((مَنْ قَرَءَ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا فَقَدْ عَزَبَ)) کہ جس نے چالیس دن میں قرآن پاک ختم کیا اس نے بہت دیر کی۔

(ع ز ر)

اَلتَّعْزِيْرُ: اس مدد کو کہتے ہیں جو جذبہ تعظیم کے ساتھ ہو قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَتُعَزِّرُوْهُ﴾ (۴۸۔۹) اور اس کی مدد کرو۔
﴿وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ﴾ (۵۔۱۲) اور ان کی مدد کرو گے۔
اَلتَّعْزِيْرُ: (ایضًا) کسی کو حد شرعی سے کم سزا دینا یہ بھی دراصل پہلے معنی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کیونکہ تادیبی سزا بھی درحقیقت اس شخص کی اصلاح کے لیے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ پہلے معنی کا تعلق کسی مضر چیز کو روکنے سے ہوتا ہے اور تادیب میں کسی شخص کو مضر چیز سے روکا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی کو مضر چیز سے روک دینا بھی اس کی مدد میں شامل ہے۔❷
اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔❸ (۱۴۳)
((اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) اپنے بھائی کی مدد کرو، وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ یہ سن کر ایک شخص نے عرض کی اے اللہ کے رسول ﷺ! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اس کے ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد

---

❶ قال فی الفائق (۲ : ۷۳) ومعناه فقد ابعد العهدباوله وابطأفی تلاوته والحدیث فی الترمذی عن ابن عمر وابن عمرو لفظه ((اقرأ القرآن فی اربعین)) انظر کنز العمال ج (۱ رقم ۲۷۷٤ و۲۸۱۸)

❷ ذهب ابوا لطیب فی اضداده (۵۰۹) انه من الاضداد ویاتی بمعنی التعظیم والتعذیب عن الفراء انه یاتی بمعنی التعلیم ومنه قول سعد بن ابی وقاص ثم هولاء اهل الکوفة یعز روننی اللسان (عزر) والنهایة ۳/۱۰٤

❸ متفق علیه من حدیث انس وذکره ابن حبان فی زوائده ۸٤۷ من حدیث ابن عمرو الدارمی وابن عساکر عن جابر والمستدرك والترمذی عن انس (راجع الفتح الکبیر للنبهانی (۱/۲۸۰-۲۸۱)

کرنے کے کیا معنی ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا اسے ظلم سے روک کر۔ آیت کریمہ۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ن ابْنُ اللّٰهِ﴾ (۹۔۳۰) اور یہود کہتے ہیں کہ عزیز علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ میں عزیر علیہ السلام ایک پیغمبر کا نام ہے۔

(ع ز ل)

اَلْاِعْتِزَالُ کے معنی ہیں کسی چیز سے کنارہ کش ہو جانا عام اس سے کہ وہ چیز کوئی پیشہ ہو یا کوئی بات وغیرہ ہو جس سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا جائے نیز وہ علیحدگی بذریعہ بدن کے ہو یا بذریعہ دل کے دونوں قسم کی علیحدگی پر بولا جاتا ہے۔ عَزَلْتُهٗ وَاعْتَزَلْتُهٗ وَتَعَزَّلْتُهٗ میں نے اس کو علیحدہ کیا فَاعْتَزَلَ چنانچہ وہ علیحدہ ہوگیا۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ (۱۸۔۱۶) اور جب تم نے ان مشرکوں سے اور جن کی یہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے کنارہ کرلیا۔

﴿فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ﴾ (۴۔۹۰) پھر اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی کریں اور لڑیں نہیں۔

﴿وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۱۹۔۴۸) اور میں تم سے اور جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو کنارہ کرتا ہوں۔

﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ﴾ (۲۔۲۲۲) سو...... عورتوں سے کنارہ کش رہو۔ شاعر نے کہا۔ [1] (الکامل)

(۳۱۰) يَا بَيْتَ عَاتِكَةَ الَّتِي اَتَعَزَّلُ اے بیت عاتکہ جس میں کنارہ کش رہتا ہوں۔ اور آیت کریمہ۔

اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۶۔۲۱۲) وہ (آسمانی باتوں کے) سننے (کے مقامات سے) الگ کر دیے گئے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ گو اس سے پہلے شیاطین آسمان سے باتیں سن لیا کرتے تھے مگر اب انہیں سننے سے روک دیا گیا ہے۔

اَلْاَعْزَلُ (۱) غیر مسلح (۲) چوپایہ جس کی دم ایک جانب جھکی ہوئی ہو (۳) بادل بغیر بارش کے۔

اَلسِّمَاكُ الْاَعْزَلُ ستارہ جو اکیلا طلوع کرتا ہے جیسا کہ غیر مسلح شخص ہوتا ہے مگر اس کے بالمقابل اَلسِّمَاكُ الْاَعْزَلُ ستارہ جو اکیلا طلوع کرتا ہے جیسا کہ غیر مسلح شخص ہوتا ہے مگر اس کے بالمقابل اَلسِّمَاكُ الرَّامِحُ اس ستارہ کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ دوسرا ستارہ ہوتا ہے جو اس کے لیے بمنزلہ نیزہ کے ہے۔

---

[1] قاله الاحوص بن محمدبن عاصم بن ابی الفلح حمی الدبر الانصاری فی قصیده له یمدح فیهاعمر بن عبدالعزیز وتمامه خدرالعدیٰ وبه الفواد موکل وفی المطبوع بنت علکمه محرفو فی اللسان والمحکم وعزل اتعزل بدل اتغزل والروایتین لهمامحمل والبیت فی الاغانی (۱۸/۱۹۶) اللالی مع السمط ۲۵۹ والخزاز(۱ : ۲۴۸)والثمار۲۵۳ والوفیات (۱ : ۱۸۵)وکنایات الجرجانی ۸۳والشنتمری (۱ : ۱۹)والعقدالفرید(۴ : ۳۶۳) والعیون (۱ : ۵۱)والمرزوقی (۳۵۹) واختلف فی عاتکة هذا اشبع الکلام علیه الاستاذ المیمنی فی السمط واجادوالقصه فی المعارف ۱۷۸ ویتعلق بالبیت قصة المعدل مع المنصورراجع المعاهد والبیت تمثل به ابن المقفع وقد مربیت نارللمجوس فحر مقتله راجع الامالی للمرتضی (۱ : ۱۳۵)ومحاضرات الادباء(۳ : ۷۲)والخزانه (۱ : ۲۴۸/۳ : ۴۵۹ والحصری (۱ : ۲۴۶)وانشده ایضا یحی بن خالد کمافی الثمار (۲۵۳) وابو العلاء ومالیه ۱۵۳۔۱۵۴)

(ع ز م)

اَلْعَزْمُ وَالْعَزِیْمَۃُ: کسی کام کو قطعی اور حتمی طور پر کرنے کا ارادہ کرنا۔ عَزَمْتُ الْاَمْرَ وَعَزَمْتُ عَلَیْہِ وَاعْتَزَمْتُ: میں نے اس کام کو قطعی طور پر کرنے کا ارادہ کرلیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (۳۔۱۵۹) جب کسی کام کا عزم مصمم کرلو تو خدا پر بھروسہ رکھو۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّکَاحِ﴾ (۲۔۲۳۵) اور ....نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔

﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ (۲۔۲۲۷) اور اگر طلاق کا ارادہ کرلیں۔

﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (۳۱۔۱۷) بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

﴿وَلَمْ نَجِدْلَہٗ عَزْمًا﴾ (۲۰۔۱۱۵) اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ پایا۔

یعنی جس بات کا انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی حفاظت کرنے اور اسے بجالانے میں ثابت قدم نہ پایا۔

اَلْعَزِیْمَۃُ: ایک قسم کا گنڈہ اور تعویذ جس میں اس خیال سے گرہیں لگائی جاتی تھیں کہ گویا شیطان کو ایذا رسانی سے روک دیا گیا ہے۔ عَزِیْمَۃٌ کی جمع عَزَائِمُ آتی ہے۔

(ع ز و)

اَلْعِزَۃُ: گروہ جماعت۔ اس کی جمع حالت رفعی میں عِزُوْنَ اور حالت نصبی اور جری میں عِزِیْنَ (۷۰۔۳۷) آتی ہے اور اس کے معنی ہیں "جماعتیں جو متفرق ہوں" اصل میں یہ عَزَوْتُہٗ فَاعْتَزٰی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں، میں نے اسے منسوب کیا۔ چنانچہ وہ منسوب ہوگیا گویا عِزَۃٌ ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بلحاظ نسب یا بلحاظ مدد کے ایک دوسرے کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسی سے اَلْاِعْتِزَاءُ فِی الْحَرْبِ ہے، جس کے معنی کسی شخص کا لڑائی میں اپنا نسب بیان کرنا اور اَنَا ابْنُ فُلَانٍ وَصَاحِبُ فُلَانٍ کہنا یعنی یہ کہ میں فلاں کا بیٹا یا اس کا ساتھی ہوں۔ مروی ہے۔ [1] (۴۳) کہ مَنْ تَعَزَّی بِعَزَاءِ الْجَاھِلِیَّۃِ فَاَعِضُّوْہُ بِھَنِ اَبِیْہِ یعنی جو شخص اہل جاہلیت کی طرح اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرے اسے کہو کہ اپنے باپ کا مقام ستر کاٹ کھائے۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عِزِیْنَ کا لفظ عَزَا عَزَاءً فَھُوَ عِزٌ سے مشتق ہے جس کے معنی صبر و تسلی حاصل کرنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے عِزَۃٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد ایک دوسرے سے تسلی حاصل لیتے ہوں۔

(ع س س)

اَلْعَسْعَسَۃُ وَالْعِسَاسُ کے معنی تاریکی ہلکی ہونے کے ہیں۔ یہ کیفیت رات کے دونوں اطراف میں ہوتی ہے یعنی جب رات آنے والی ہو یا جانے والی ہو۔ اس لیے آیت کریمہ۔

﴿وَاللَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ﴾ (۸۱۔۱۷) میں عَسْعَسَ کے معنی رات کے آنے اور جانے دونوں ہو سکتے ہیں۔

---

[1] رواہ الحاکم فی المستدرك وابن حبان فی زوائدہ ٧٣٦ بحذف لفظ "بھن ابیہ" والطبرانی والضیاء والترمذی عن ابی والرؤیانی فی الافراد راجع کنز العمال ج (۱ رقم ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۳۰۰٤) وغریب ابی عبید (۱/۳۰۱) والاحادیث فی ذم التفاخر بالآثار کثیرۃ

اَلْعَسُّ وَالْعَسَسُ: رات کے وقت مشتبہ لوگوں کی تلاش میں پھرنا کے ہیں اور رات کے وقت پہرہ دینے والے آدمی کو عَاسٌّ یا عَسَّاسٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع عُسَسٌ ہے مثل مشہور ہے۔❶ ( )

كَلْبٌ عَسَّ خَيْرٌ مِنْ اَسَدٍ رَبَضَ: یعنی رات کے وقت شکار کی تلاش کرنے والا کتا، بیٹھ رہنے والے شیر سے بہتر ہے۔

اَلْعَسُوْسُ: وہ عورت جو رات کو بدمعاشی کے لیے پھرتی رہتی ہو۔ اَلْعَسُّ: بڑا پیالہ۔ جمع عِسَاسٌ۔

(ع س ر)

اَلْعُسْرُ: کے معنی تنگی اور سختی کے ہیں۔ یہ یُسْرٌ (آسانی، فارغ البالی) کی ضد ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ (۹۴۔۵،۶) یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اَلْعُسْرَةُ: تنگ دستی، تنگ حالی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ (۹۔۱۱۷) مشکل کی گھڑی میں ﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ﴾ (۲۔۲۸۰) اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو۔

اور اَضَاقَ فُلَانٌ کی طرح اَعْسَرَ فُلَانٌ کے معنی ہیں، وہ مفلس اور تنگ حال ہو گیا۔ تَعَاسَرَ الْقَوْمُ: لوگوں نے معاملہ کو الجھانے کی کوشش کی، قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى﴾ (۶۵۔۶) اور اگر باہم ضد (اور نااتفاقی) کرو گے تو (بچے) کو اس کے (باپ کے) کہنے سے کوئی اور عورت دودھ پلائے گی۔

يَوْمٌ عَسِيْرٌ: سخت دن۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِيْنَ عَسِيْرًا﴾ (۲۵۔۲۶) اور وہ دن کافروں پر (سخت) مشکل ہوگا۔

﴿يَوْمٌ عَسِيْرٌ عَلَى الْكَافِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ﴾ (۷۴۔۹،۱۰) مشکل کا دن (یعنی) کافروں پر آسان نہ ہوگا۔

عَسَّرَ الرَّجُلُ: تنگدستی کے وقت کسی چیز کا مطالبہ کرنا۔

(ع س ل)

اَلْعَسَلُ: شہد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى﴾ (۴۷۔۱۵) صاف کردہ شہد کی...... اور کنایہ کے طور پر جماع کو عُسَيْلَةٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔❷ (۴۴) ((حَتّٰى تَذُوْقِيْ عُسَيْلَتَهٗ وَيَذُوْقَ عُسَيْلَتَكِ)) جب تک تم دونوں ایک دوسرے سے جماع کی لذت حاصل نہ کر لو (اس وقت تک پہلے خاوند سے نکاح کی اجازت نہیں ہے) اَلْعَسَلَانُ: نیزے کا مضبوط ہونا، دوڑتے وقت اعضا کا ہلنا عام طور پر اَلْعَسَلَانُ: کا لفظ

---

❶ راجع للمثل الميداني رقم ٣٠٤٤ والاتباع لابي الطيب ٦٧ وفيه من كلب بدل من اسدو المثل يقال للحث على الكسب۔

❷ قاله صلى الله عليه وسلم لامسرة رفاعه حين طلقها ثلاثه ونكحت عبدالرحمن بن النزبير والحديث في الستة وايضاً الشافعي في الرسالة رقم ٤٩٤ بتحقيق احمد شاكر والام ٥/٢٢٩ واختلاف الحديث ٣١٤ على هامش الجزء السابع من الام وايضاً المجازات النبويه للشريف الرضى (٢٨٢۔٢٨٣)

بھیڑیے کی تیز روی کے لیے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: مَرَّ یَعْسِلُ وَیَنْسِلُ بھیڑیا تیزی سے دوڑتا ہوا گزرا۔

(ع س ی)

عَسٰی [1] کے معنی توقع اور امید ظاہر کرنا کے ہیں۔ اکثر مفسرین نے قرآن پاک میں اس کی تفسیر لازم معنی یعنی یقین سے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں طمع اور رجا کا استعمال صحیح نہیں ہے مگر یہ ان کی کوتاہ نظری ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں قرآن پاک میں عسیٰ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کا تعلق انسان کے ساتھ ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لہٰذا آیت کریمہ۔

﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ﴾ (۔ ۲۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے امید رکھو کہ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اسی طرح فرمایا۔

﴿عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ﴾ (۵۔۵۲) تو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے۔

﴿عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ﴾ (۶۶۔۵) اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دیں تو عجب نہیں کہ انکا پروردگار......

﴿وَعَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۱۶) مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

﴿فَهَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ﴾ (۴۷۔۲۲) تم سے عجب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ۔

﴿هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ......﴾ (۲۔۲۴۶) کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو عجب نہیں......۔

﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّیَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا﴾ (۴۔۱۹) اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سی بھلائی پیدا کردے۔

اَلْمُعْسِیَانُ: شتر مادہ جس کا دودھ منقطع ہو گیا ہو اور اس کے لوٹ آنے کی امید ہو۔

عَسَی الشَّیْءُ یَعْسُوْ کسی چیز کا سخت ہو جانا۔

عَسَی اللَّیْلُ یَعْسُوْ رات کا تاریک ہو جانا۔

(ع ش ر)

اَلْعَشْرُ......۔ اَلْعُشْرُ: دسواں حصہ اَلْعِشْرُوْنَ: بیس اور اَلْعِشْرُ: (مویشیوں کا دسویں دن پانی پر وارد ہونا) قرآن پاک میں ہے۔

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (۲۔۱۹۶) یہ پورے دس ہوئے۔﴿عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ﴾ (۸۔۶۵) بیس آدمی ثابت قدم۔

﴿تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ (۷۴۔۳۰) انیس (داروغے) عَشَرْتُهُمْ اَعْشِرُهُمْ: میں ان میں دسواں بن گیا۔ عَشَرْهُمْ: ان سے عُشْر: یعنی مال کا دسواں حصہ وصول کیا۔

عَشَّرْتُهُمْ: میں نے ان کے مویشی دس بنا دیئے یعنی

---

[1] کلمة عسی عده العلماء من الاضداد وقال ابن عباس هی واجبة من الله انظر اضداد ابی الطیب ٤٨٧ ولیعلم ایضاً ان کل مافی القرآن من عسیٰ علی موحد الخبر فهو وحد علی تاویل عسی الامر کذا وماکان علی الاستفهام فانه یجمع کمافی الایات ثم الافصح ان یکون بعدها "ان" وربما لم یکن علی عکس کل وفانه الافصح ید عدم کون "ان" راجع للبحث الصاحبی ١٥٧ وابن هشام) ١٦٢۔١٦٥

پہلے نو تھے ان میں ایک اور شامل کر کے دس بنا دیا مِعْشَارُ الشَّیْءِ دسواں حصہ۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَا اٰتَيْنٰهُمْ﴾ (۳۴۔۴۵) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا تھا یہ اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے۔
نَاقَةٌ عَشْرَاءُ: دس ماہ کی حاملہ اونٹنی اس کی جمع عِشَارٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ﴾ (۸۱۔۴) اور جب دس ماہ کی گابھن (حاملہ) اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی۔
جَاوُّا عُشَارَیٰ وہ دس دس افراد پر مشتمل ٹولیاں بن کر آئے۔
اَلْعُشَارِیُّ: ہر وہ چیز جو دس ہاتھ لمبی ہو۔
اَلْعِشْرُ اونٹوں کو پانی نہ پلانے کی مدت (نو دن)۔اِبِلٌ عَوَاشِرُ: نو دن کے پیاسے اونٹ۔
قَدْحٌ اِعْشَارٌ: ٹوٹا ہوا پیالہ۔دراصل اَعْشَارٌ کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جو ٹوٹ کر دس ٹکڑے ہو گیا ہو اسی سے شاعر نے بطور استعارہ کہا ہے۔[1] (الطّویل)

(۳۱۱) بِسَهْمَيْكِ فِيْ اَعْشَارِ قَلْبٍ مُّقَتَّلٍ

تم اپنی (نگاہوں) کے دونوں تیر میرے شکستہ دل کے ٹکڑوں پر (مارنا چاہتی ہو۔)
اَلْعَشُوْرُ: کے معنی گدھے کی آواز کے ہیں کیونکہ گدھا جب آواز کرتا ہے تو دس مرتبہ آواز کرتا ہے۔ اَلْعَشِيْرَةُ انسان کے باپ کی طرف سے قریبی رشتہ دار پر مشتمل جماعت۔ کیونکہ ان سے انسان کثرت عدد حاصل کرتا ہے۔گویا کہ وہ اس کے لیے بمنزلہ عدد کامل کے ہیں کیونکہ عَشَرَةٌ کا عدد ہی کامل ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ﴾ (۹۔۲۴) اور عورتیں اور خاندان کے آدمی۔
لہٰذا عَشِيْرَةٌ انسان کے رشتہ داروں کی اس جماعت کا نام ہے جن سے انسان کثرت (قوت) حاصل کرتا ہے۔
عَاشَرْتُهٗ کے معنی ہیں کہ میں رشتہ دامادی میں اس کے لیے بمنزلہ عَشَرَة کے ہو گیا۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۴۔۱۹) اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔
اَلْعَشِيْرُ: مل جل کر رہنے والا خواہ رشتہ دار ہو یا اجنبی۔

(ع ش و ری)

اَلْعَشِيُّ: زوال آفتاب سے لے کر طلوع فجر تک کا وقت۔قرآن مجید میں ہے۔
﴿اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ (۷۹۔۴۶) گویا (دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے تھے۔
اَلْعِشَآءُ: (ممدود) مغرب سے عشا کے وقت تک اور مغرب اور عشا کی نمازوں کو اَلْعِشَآءَ ان کہا جاتا ہے اور اَلْعِشَا (رتوندی)، تاریکی جو آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ رَجُلٌ اَعْشٰی: جسے رتوندی کی بیماری ہو اس کی

---

[1] قاله امرء القيس في لاميته المشهورة صدره ۔وماذرفت عيناك الا لتضربي ۔شرح المعلقات لابن الانباری رقم ۲۲ والتبریزی ۲۳ واللسان والمحکم (عشر قتل) والمحاضرات ۲۹۱ ودیوانه ۲٦ والعقد الثمین ۱٤۷ وایضا عتین ۳٥٦ ومختار الشعرا لجاهلی اوالجمهرة للقرشی (٤٥٠) والعمدة (۱ : ۲۷۷) وفيه لتقدحی بدل لتضربی فی باب التمثيل وقيل ان امرء القيس اول من ابتكره ولم يات اعلم منه .

مونث عَشْوَاءُ آتی ہے۔ مثل مشہور ہے۔❶ (هُوَ يَخْبِطُ خَبْطَ عَشْوَاءَ: وہ اندھی اونٹنی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ یعنی بلا سوچے سمجھے معاملات سرانجام دیتا ہے۔ عَشَوْتُ النَّارَ: میں نے رات کو آگ کا قصد کیا۔ عُشْوَةٌ (بروزن شُعْلَةٌ) آگ کا شعلہ جو رات کے وقت دور سے دکھائی دے۔ عَشِيَ عَنْ كَذَا: کسی چیز سے آنکھیں بند کر لینا۔ اندھا ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ﴾ (۴۳-۳۶) اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کرے۔

اَلْعَوَاشِيُ: رات کو چرنے والے اونٹ۔ اور اس کا واحد عَاشِيَةٌ ہے اسی سے کہا گیا ہے۔❷ (مثل) اَلْعَاشِيَةُ تُهَيِّجُ الْآبِيَةَ کہ رات کو چرنے والا اونٹ نہ چرنے والے کو رغبت دلاتا ہے یعنی جو اونٹ چارہ نہ کھاتا ہو وہ بھی اسے دیکھ کر چرنے لگ جاتا ہے۔

اَلْعَشَاءُ: شام کا کھانا۔ اَلْعِشَآءُ (بکسر العین) عشاء کی نماز۔ وَقَدْ عَشَيْتُ: میں نے رات کا کھانا کھایا۔ میں اسے رات کا کھانا کھلایا مشہور ہے۔

عِشْ وَلَا تَغْتَرَّ: یعنی رات کو اپنے اونٹ چرواؤ اور غافل نہ رہو۔

(ع ص ب)

اَلْعَصَبُ کے معنی بدن کے پٹھے جو جوڑوں کو تھامے ہوئے ہیں۔ لَحْمٌ عَصِبٌ: بہت پٹھوں والا گوشت۔

اَلْمَعْصُوْبُ: دراصل لوہے کو کہتے ہیں جو پٹھے (کی تانت) کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ پھر عام مضبوطی کے ساتھ باندھنے پر عَصْبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے اہل عرب کہتے ہیں۔❸

لَاَعْصِبَنَّكُمْ عَصْبَ السَّلِمَةِ: میں تمہیں سلمہ درخت کی طرح باندھ کر چھوڑوں گا۔

فُلَانٌ شَدِيْدُ الْعَصَبِ مَعْصُوْبُ الْخَلْقِ: فلان کے جوڑ بند مضبوط ہیں۔ يَوْمٌ عَصِيْبٌ: سخت دن۔ یہاں عَصِيْبٌ کے معنی ہیں: سخت۔ یہ بمعنی فاعل بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی مفعول (مَعْصُوْبٌ) بھی۔ گویا اس کے بدن کے اطراف کو یک جا کر کے رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے جس میں وہ گھرے ہوئے ہیں اور نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ سخت دن کو كَفَّةُ حَابِلٍ يَاحَلْقَةُ خَاتَمٍ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

اَلْعُصْبَةُ: وہ جماعت جس کے افراد ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ﴾ (۲۸-۷۶) ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔ ﴿وَنَحْنُ عُصْبَةٌ﴾ (۱۲-۸) حالانکہ ہم جماعت (کی جماعت) ہیں۔ یعنی ہم باہم متفق ہیں اور ایک دوسرے کے یار و مددگار۔ اِعْصَوْصَبَ الْقَوْمُ: لوگ مجتمع ہو گئے۔ عَصَبُوْا بِهٖ

---

❶ يضرب المثل للمتهافت في اشيء الميداني (۲: ۴۱۴)

❷ قاله يزيد وبن رويم الشيباني انظر للمثل والخبر الميداني رقم (۲۴۰۹،۲۲۱۱،۱۱۷) وفيه خبر طويل والحيوان (۵: ۲۱۲) وعيون الاخبار (۳: ۲۲۵) واللسان (ابا) والجمهرة للعسكري ۱۴۵ ومعناه اذارأت الآبية التي تتعشیٰ اهاجتها للرعي فرعت معها

❸ قاله الحجاج حين خطب الناس بالكوفة اللسان (عصب) وفي الميداني (۹/۲) قاله يزيد بن رويم الشيباني وفيه خبر طويل قال الميداني (۱۷/۲) يضرب للبخيل يستخرج منه الشئي على كره وفي الكامل (۷۶-۳۳۴) لاخرم منكم حزم السلمة وايضاً راجع ابي الطيب (۲-۵۰) والعقد الفريد (۱۱۹/۴) وصبح الاعشى (۱۴۲/۲) عيون الاخبار (۲/۲۰۸-۳۱۰) والخطبة بطولها في البيان والتبيين (۲/۳۰۸-۳۱۰)

۔ اس کا احاطہ کرلیا۔

عَصَبَ الرِّیْقُ بِفَمِہٖ: اس کے منہ میں تھوک خشک ہو گئی اور بول نہ سکا گویا اس کی زبان کو تانت کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔

عَصْبٌ: ایک قسم کی یمنی منقش چادر۔

اَلْعِصَابَۃُ: کے معنی پٹی یا پگڑی کے ہیں۔ تَعَمَّمَ کی طرح اِعْتَصَبَ کے معنی بھی پگڑی باندھنا آتے ہیں۔

اَلْمَعْصُوْبُ: اونٹنی کہ جب تک اس کے پاؤں باندھ کر اسے نہ دوہا جائے دودھ نہ دے۔

اَلْعَصِیْبُ: پھیپھڑا۔ کیونکہ وہ بھی انتڑیوں کے ساتھ لپٹا ہوتا ہے۔

(ع ص ر)

اَلْعَصْرُ: یہ عَصَرْتُ الشَّیْءَ کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: نچوڑنا اَلْمَعْصُوْرُ: وہ چیز جسے نچوڑا گیا ہو اَلْعُصَارَۃُ: شیرہ جو نچوڑ کر نکال لیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

اِنِّیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا (دیکھتا کیا ہوں) کہ شراب (کے لیے انگور) نچوڑ رہا ہوں۔

﴿وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ﴾ (۱۲۔۴۹) اور لوگ اس میں رس نچوڑیں گے۔

یعنی اس میں خیر و برکت حاصل ہوگی۔ ایک قرأت میں یُعْصَرُوْنَ ہے یعنی اس سال خوب بارش ہوگی اِعْتَصَرْتُ مِنْ کَذَا کے معنی کسی چیز سے خیر و برکت حاصل کرنا کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ (1) (السریع)

(۳۱۲) وَاِنَّمَا الْعَیْشُ بِرُبَّانِہٖ
وَاَنْتَ مِنْ اَمَانِہٖ مُعْتَصِرْ

زندگی کا لطف تو اٹھتی جوانی کے ساتھ ہے جب کہ تم اس کی شاخوں سے رس نچوڑتے ہو۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾ (۷۸۔۱۴) اور نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔ میں مُعْصِرَات سے مراد بادل ہیں جو پانی نچوڑتے، یعنی گراتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مُعْصِرَاتِ ان بادلوں کو کہا جاتا ہے جو اِعْصَارٌ کے ساتھ آتے ہیں اور اِعْصَار کے معنی ہیں: گرد و غبار والی تند ہوا۔ قرآن پاک میں ہے۔

فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ (۲۔۲۶۶) تو (ناگہاں) اس باغ پر.....بگولا چلے۔

اَلْاِعْتِصَارُ کے معنی کسی چیز کو دبا کر اس سے رس نچوڑنے کے ہیں۔ اسی سے عُصْرٌ وَعَصَرٌ ہے۔ جس کے معنی جائے پناہ کے ہیں۔ اَلْعَصْرُ وَالْعِصْرُ وقت اور زمانہ۔ اس کی جمع عُصُوْرٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳۔۲،۱) زمانہ کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے۔

اَلْعَصْرُ کے معنی اَلْعَشِیُّ بھی آتے ہیں، یعنی زوال

---

(1) قاله ابن احمرو فی القالی والجمحی واللسان وغيرها مقتفر بدل معتصر وربان العيش حدثانه واوائله والبيت فی اللسان (ربب) والمحكم (عصر) والجمحی (۱۲۹) والمعانی للقبتی (٦٦٧) والسمط (٥٥٥) والقالی (١ : ٢٤٢) وابن دريد (١ : ٢٧٧) وخصائص ابن حنی (١ : ٤٢٢) قال البكری معناه انما الصبا والعيش باوله وحدته ازمان انت معتصر من افنانه وقبله وهو اول الشعر: قد بكرت عاذلتی بكرة تزعم انی بالصباء مشتهر ١٢

آفتاب سے غروب شمس تک کا زمانہ، اسی سے صَلَاةَ الْعَصْرِ (نماز عصر) ہے۔ اَلْعَصْرَان صبح شام، رات دن اور یہ اَلْقَمْرَان: کی طرح ہے جس کے معنی ہیں، چاند اور سورج۔ اَلْمُعْصِرُ: وہ عورت جسے حیض آ جائے اور جوانی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔ ❶

(ع ص ف)

اَلْعَصْفُ وَالْعَصِيْفَةُ: کھیتی کے پتے جو کاٹ لیے جاتے ہیں نیز خشک نباتات جو ٹوٹ کر چورہ چورہ ہو جائے ۔قرآن میں ہے۔

﴿وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ﴾ (۵۵۔۱۱) اور اناج چھلکے کے اندر ہوتا ہے۔

﴿كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ﴾ (۱۰۵۔۵) جیسے کھایا ہوا بھس ہو۔

رِيْحٌ عَاصِفٌ وَعَاصِفَةٌ وَمُعْصِفَةٌ: تند ہوا جو ہر چیز کو توڑ کر بھس کی طرح بنا دے اور مجازاً عَصَفَتْ بِهِمُ الرِّيْحُ کے معنی ہیں: وہ ہلاک اور برباد ہو گئے۔

(ع ص م)

اَلْعَصْمُ کے معنی روکنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۴۳) آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ۔بعض نے لَا عَاصِمَ کے معنی لَا مَعْصُوْمَ بھی کیے ہیں ❷ یعنی آج اللہ کے حکم سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔اس سے یہ ہیں سمجھ لینا چاہیے کہ عربی زبان میں عَاصِم بمعنی مَعْصُوم آ جاتا ہے۔بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ عَاصِم اور مَعْصُومٌ لازم ملزوم ہیں۔یعنی ایک کا حصول دوسرے کے حصول کو مستلزم ہے۔اس لیے لفظ عاصم بول کر معصوم مراد لیا گیا ہے۔

﴿مَالَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ﴾ (۱۰۔۲۷) اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ گا۔

اِلْاِعْتِصَامُ: کسی چیز کو پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (۳۔۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا۔

﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ﴾ (۳۔۱۰۱) اور جس نے خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑ لیا۔

اِسْتَعْصَمَ: وہ باز رہا، گویا اس نے ایسی چیز طلب کی جس کے ذریعہ برائی کے ارتکاب سے بچ جائے لہٰذا ﴿فَاسْتَعْصَمَ﴾ (۱۲۔۳۲) کے معنی ہیں: اس نے ایسی چیز تلاش کی جو برائی کے، ارتکاب سے اس کی حفاظت کرے بچا لے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ (۶۰۔۱۰) میں عِصَمٌ کا واحد عِصْمَةٌ ہے اور عِصْمَةٌ کے معنی عقد نکاح کے ہیں۔پس آیت کے معنی یہ ہیں۔

جو عورتیں مسلمان نہیں ہونا چاہتیں انہیں مت روکو بلکہ عقد نکاح سے آزاد کر دو۔

اَلْعِصَامُ: مشک کی رسی یا تسمہ جس کے ساتھ اس کا منہ

---

❶ وفی الفائق (۲ / ۷۹) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ کان دحیة اذقدم لم تبق معصر الاخرجت الیہ لانہ کان مفرط الجمال۲

❷ وقد عده العلماء من الاضداد (۵۰۶)

باندھا جاتا ہے اور عِصْمَۃُ الْاَنْبِیَاءِ کے معنی انبیاء کی حفاظت کے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے انبیاء کی حفاظت کی ہے۔ اول یہ کہ ان کو صاف شفاف جوہر سے پیدا کیا۔ دوم: انہیں جسمانی اور روحانی فضائل سے آراستہ کیا سوم: ان کی مدد کی، انہیں استقلال بخشا ان پر اپنی طرف سے سکینت نازل کی ان کے دلوں کی حفاظت کی اور انہیں اپنی توفیق خاص سے نوازا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (۵۔۶۷) اور خدا تم کو لوگوں سے بچا رکھے گا۔

اَلْعِصْمَۃُ: بازو بند کے مثل ایک قسم کا حلقہ اَلْعِصْمُ: کلائی اور بازو بند کی مناسبت سے جانور کی کلائی کی سفیدی کو بھی عِصْمَۃٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اس کے پاؤں کی سفیدی کو اَلتَّحْجِیْل کہہ دیا جاتا ہے اسی معنی کے لحاظ سے بز کوہی کو غُرَابٌ اَعْصَمُ کہتے ہیں۔ ❶ کیونکہ اس کے پہنچے سفید ہوتے ہیں اور باقی تمام بدن سیاہ یا سرخ ہوتا ہے۔

(ع ص و ر ی)

اَلْعَصَا: (لاٹھی) یہ اصل میں ناقص واوی ہے کیونکہ اس کا تثنیہ عَصَوَان اور جمع عِصِیٌّ آتی ہے، عَصَوْتُہٗ: میں نے اسے لاٹھی سے مارا عَصَیْتُ بِالسَّیْفِ: تلوار کو لاٹھی کی طرح دونوں ہاتھ سے پکڑ کر مارا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَلْقِ عَصَاكَ﴾ (۲۷۔۱۰) اپنی لاٹھی ڈال دو۔

﴿فَاَلْقٰى عَصَاهُ﴾ (۷۔۱۰۷) موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی۔ (زمین پر) ڈال دی۔

﴿قَالَ هِيَ عَصَايَ﴾ (۱۰۔۱۸) انہوں نے کہا: یہ میری لاٹھی ہے۔

﴿فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ﴾ (۱۰۔۲۶) تو انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں۔

اَلْقٰى فُلَانٌ عَصَاہُ: کسی جگہ پر پڑاؤ ڈالنا کیونکہ جو شخص سفر سے واپس آتا ہے وہ اپنی لاٹھی ڈال دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۳۱۳) وَاَلْقَتْ عَصَاهَا وَاسْتَقَرَّبِهَا النَّوٰى

(فراق نے اپنی لاٹھی ڈال دی اور جم کر بیٹھ گیا۔)

عَصٰی عِصْیَانًا کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں دراصل اس کے معنی ہیں: اس نے لاٹھی (عصا) سے اپنا بچاؤ کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ وفی الحدیث (فی المختالات المتبرجات) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ((لایدخل الجنة منهن الامثل الغراب الاعصم ای القلیل النادر وفی آخره المرأة الصالحة مثل الغراب الاعصم راجع الفائق والنهایة (عصم)

❷ قاله معقر بن اوس بن حمار البارقی وتمامه : کماقرّ عیناًبالایاب المسافر وفی المطبوع واستقرت والتصویب من المراجع والبیت فی التاج والصحاح والمحکم (عصی) من قصیدته المختارة وراجع للبیت المحاضرات للمولف (۱۴۸/۴ : ۴۱۹)والموتلف (۱۲۸) ورأیت فی طراز المجالس للخفاجی (۱۱۳) البیت بواشد بن عبدربه قال وکان من شعراء الصحابه ومن شعره قصیدة له اولها: صحاالقلب عن سلمی واقصرشأ وه ۔وردت علیه مانفته تماضر۔ تم فی الکتاب نفسه ۱۴۸ نسبه الخفاجی الی معقر بن الحارث البارقی وکذا فی العقد (۲ : ۳۰۳، ۵۲) البیت معزوالی راشد والصواب انه للمعقر راجع العقد (۳ : ۶۴۔۶۵) والاشتقاق ۴۸۱ والبیت ایضاً فی تاریخ الطبری (۴ : ۱۱۵/۲ : ۲۶۲)وقال ان عائشة تمثلت به عند مابلغها قتل علی رضی اللہ عنه (المعجم)وتمثل به المنصور حینمابلغه خبر هزیمة ابراهیم وفی المیدانی (۲۸۷۲) لمابویع لابی العباس الفلاح تمام خطیبافسقط القضیب من یده فقام رجل فَاَخَذَا القضیب ودفعه الیه وانشدالبیت وترجمه الشاعر فی الخزانة (۲ : ۲۹۱)

﴿وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی﴾ (۲۰۔۱۲۱) اور آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو (وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔

﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ﴾ (۴۔۱۴) اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔

﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ﴾ (۱۰۔۹۱) (جواب ملا کہ) اب؟ (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا۔ اور اس شخص کے متعلق جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے، کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ شَقَّ الْعَصَا۔

(ع ض ض)

اَلْعَضُّ: کسی چیز کو دانت سے پکڑ لینا یا کاٹنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ﴾ (۳۔۱۱۹) تم پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ﴾ (۲۵۔۲۷) اور جس دن ناعاقبت اندیش ظالم اپنے ہی ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا۔ میں ندامت سے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام پر انتہا درجہ پشیمان ہوتا ہے تو دانت سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگتا ہے۔

اَلْعُضُّ: کھجور کی گٹھلی، خاردار جھاڑی، جسے اونٹ کھاتے ہیں۔

اَلْعِضَاضُ: جانوروں کا ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنا۔ رَجُلٌ مُعِضٌّ: اپنے کام میں نہایت کوشش کرنے والا آدمی۔ گویا وہ اسے دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی یہ لفظ بطور تعریف استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مذمت۔

هُوَ عِضٌّ سَفَرٍ: وہ سفر پر بہت قدرت رکھتا ہے۔

هُوَ عِضٌّ فِی الْخُصُوْمَةِ: وہ جھگڑنے میں نہایت فصیح اور سخنور ہے۔

زَمَنٌ عَضُوْضٌ: خشک سال۔

اَلتَّعْضُوْضُ: ایک قسم کی کھجور جو دشواری کے ساتھ چبا کر کھائی جاتی ہے۔

(ع ض د)

اَلْعَضُدُ: (بازو) کا کہنی سے لے کر کندھے تک کا حصہ

عَضَدْتُہٗ: میں نے اس کے بازو پر مارا اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

عَضَدْتُ الشَّجَرَ بِالْمِعْضَدِ: میں نے اہنسیا سے درخت کو کاٹا۔ جَمَلٌ عَاضِدٌ: نر شتر جو مادہ کے بازو کو پکڑ کو جفتی کرنے کے لیے اسے بٹھا لیتا ہے اور عَضَّدْتُہٗ کے معنی کسی کا بازو پکڑنے اور اسے سہارا دینے کے ہیں اور یَدٌ کی طرح بطور استعارہ عَضُدٌ کا لفظ بھی مددگار کے معنی میں آجاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا کُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا﴾ (۱۸۔۵۱) اور میں ایسا نہیں تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو مددگار بناتا۔

رَجُلٌ اَعْضَدُ: پتلے بازو کا آدمی۔ عُضِدَ: بازو کے درد میں مبتلا ہونا۔ مُعَضَّدٌ: وہ آدمی جس کے بازو پر نشان ہو ایسے نشان کو عِضَادٌ کہا جاتا ہے اور مِعْضَدٌ کے معنی بازو بند کے ہیں۔ اَعْضَادُ الْحَوْضِ: حوض کے جوانب (میں جو پشتہ اس کی حفاظت کے لیے بنا دیا جاتا

ہے) جو اس کے لیے بازو کا کام دیتے ہیں۔

(ع ض ل)

اَلْعَضَلَۃُ: پٹھا جس کے ساتھ سخت گوشت ہو۔ رَجُلٌ عَضِلٌ: وہ شخص جو گوشت سے گٹھا ہوا ہو۔ عَضَلْتُہٗ: میں نے اسے عَضَلٌ یعنی پٹھے کی تانت کے ساتھ باندھ دیا جیسا کہ عَصَبْتُہٗ: اس کے بعد مجازاً یہ لفظ "سختی سے روک دینا" کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَھُنَّ﴾ (۲۔۲۳۲) تو ان کو دوسرے شوہروں کے ساتھ...... نکاح کرنے سے مت روکو۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس کے مخاطب ان کے پہلے خاوند ہیں اور بعض نے اولیاء یعنی سرپرست مراد لیے ہیں۔ اور سختی میں عَضَلَۃ کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ عَضَّلَتِ الدَّجَاجَۃُ بِبَیْضِھَا: مرغی پر انڈہ دینا دشوار ہو گیا۔ عَضَّلَتِ الْمَرْئَۃُ بِوَلَدِھَا: عورت زچہ کی تکلیف میں مبتلا ہو گئی۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الطّویل)

(۳۱٤) تَرَی الْاَرْضَ مِنَّا بِالْفَضَاءِ مَرِیْضَۃً
مُعَضِّلَۃً مِنَّا بِجَمْعٍ عَرَمْرَمٍ

زمین ہمارے لشکر جرار کی وجہ سے اس عورت کی طرح بے چین نظر آتی ہے، جو زچگی کے مرض میں مبتلا ہو۔

دَاءٌ عُضَالٌ: لاعلاج مرض جس سے شفایاب ہونا مشکل ہو اَلْعَضَلَۃُ: بڑی مصیبت۔

(ع ض ہ ر و)

اَلْعِضَۃُ: کے معنی چیز کا ٹکڑا کے ہیں اس کی جمع عِضُوْنَ وَعِضِیْنَ ہے جیسا کہ ثُبَۃٌ اور ظُبَۃٌ کی جمع ثُبُوْنَ وَظُبُوْنَ آتی ہے۔ ❷ اسی سے اَلْعُضْوُ وَالْعِضْوُ ہے جس کے معنی بدن کا ایک حصہ یا ٹکڑا کے ہیں اور عَضَّیْتُہٗ تَعْضِیَۃً کے معنی ہیں: ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اعضا کو کاٹ کر الگ الگ کر دینا۔ الکسائی فرماتے ہیں کہ عِضَۃٌ کی اصل عُضْوٌ بھی ہو سکتی ہے اور عِضَۃٌ کی اصل عُضْوٌ بھی ہو سکتی ہے اور عِضَۃٌ بھی۔ جس کے معنی جادو کے ہیں۔ ❸ لہٰذا بعض کے نزدیک عِضَۃٌ کی اصل بھی عِضْھَۃٌ ہے کیونکہ اسکی تصغیر عُضَیْھَۃَ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسکی اصل عضوۃ ہے کیونکہ اس کا تثنیہ عِضَوَان آتا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ ❹ (۴۲) لَا تَعْضِیَۃَ فِیالْمِیْرَاثِ کہ ترکہ کی تقسیم کے وقت ایسی چیز کو کاٹ کر تقسیم نہ کیا جائے جس کے کاٹنے سے وارثوں کو نقصان پہنچتا ہو مثلاً تلوار وغیرہ کہ اسے کاٹ کر دو ٹکڑے نہ کیے جائیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ﴾ (۱۵۔۹۱) جنھوں نے قرآن پاک کو ٹکڑے ٹکڑے کو ڈالا، یعنی کسی نے کہا کہ جادو

---

❶ قاله اوس بن حجر والبيت في اللسان والحكم (عضل) والسمط ٤٨١ والميداني (٢: ٢٣) والمعاني للقبتي - (٨٩) والشعراء ١٠١ والخزانة (٣: ٤٩٥) والبيت ايضاً من كلمة في ديوانه (٢٧) ومجموعة المعاني (٨٦) وتهذيب الالفاظ (٤٩،٤٤٣)

❷ وكذابرة جمعه بُرين (الطبرى ١٤/ ٦٥)

❸ ومنه في الحديث لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم العاضهة والمسعضة اللسان (عضه)

❹ راجع للحديث الفائق (٢/ ٨١) والنهاية (عضى) وتمامه الاماحمل القسم رواه البيهقى عن ابى بكر بن حزم يرسلا راجع كنز العمال (ج ١١ رقم ٣٣) وبمعنى الحديث غريب ابى عبيد

ہے بعض نے اسے پہلے لوگوں کی کہانیاں اور قصے وغیرہ کہا۔ ❶ بعض مفسرین نے قرآن پاک کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ انھوں نے بعض باتیں مان لیں اور بعض کا انکار کردیا جس کی طرف کہ آیت:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (۲۔۸۵) میں اشارہ پایا جاتا ہے ❷ کہ الکتاب کے کچھ حصہ کو مانتے ہو اور اس کے کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو چنانچہ ایسے لوگوں کے بالمقابل مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتَابِ كُلِّهٖ﴾ (۳۔۱۱۹) کہ تم مکمل کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔

(ع ط ف)

اَلْعَطْفُ: (ن) کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کا ایک سرا دوسرے کی طرف موڑ دیا جائے مثلاً رسی، درخت کی ٹہنی وغیرہ کو دوہرا کرنے کو عَطْفٌ کہا جاتا ہے اور عِطَافٌ کے معنی دوتہوں والی چادر کے ہیں۔

عِطْفَا الْاِنْسَانِ: انسان کے دونوں پہلو یعنی سر سے لے کر سرین تک کے دونوں جانب۔ کیونکہ بدن کے اس حصہ کو آسانی سے موڑا جاسکتا ہے ثَنٰی عِطْفَهٗ کے معنی ہیں اعراض کرنا اور دور ہونا ❸ جیسا کہ نَاٰی بِجَانِبِهٖ وَصَعَّرَ بِخَدِّهٖ وغیرہ محاورات ہیں۔ جب یہ لفظ عَلٰی کے واسطہ سے متعدی ہو تو اس کے معنی کسی پر مائل ہونے اور شفقت کرنا کے آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: عَطَفَ عَلَيْهِ وَثَنَاهُ عَاطِفَةُ رَحْمٍ ظَبْيَةٌ عَاطِفَةٌ عَلٰى وَلَدِهَا وَنَاقَةٌ عَطُوْفٌ عَلٰى بَوِّهَا وغیرہ اور جب تعدیہ بواسطہ عن ہو تو اس کے معنی اعراض کرنا اور دور ہونا ہوتے، ہیں جیسے عَطَفْتُ عَنْ فُلَانٍ میں نے فلاں سے اعراض کیا۔

(ع ط ل)

اَلْعَطْلُ: (س) زیور سے خالی ہونا یا مزدور کا بیکار رہنا کہا جاتا ہے: عَطِلَتِ الْمَرْءَةُ عورت زیور سے خالی ہوگئی ایسی عورت کو عُطُلٌ اور عَاطِلٌ کہا جاتا ہے اسی سے قَوْسٌ عُطُلٌ ہے یعنی وہ کمان جس پر تانت نہ ہو عَطَّلْتُهٗ مِنَ الْحُلِيِّ اَوِ الْعَمَلِ: میں نے اسے زیور یا کام سے خالی کردیا، فَتَعَطَّلَ چنانچہ وہ خالی ہوگیا، بیکار ہوگیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَبِئْرٍ مُعَطَّلَةٍ﴾ (۲۲۔۴۵) اور بہت سے کنویں بیکار پڑے ہیں۔

اور جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس جہاں کا کوئی صانع نہیں ہے جس نے اسے محکم اور آراستہ کیا ہے، انہیں مُعَطِّلَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَطَّلَ الدَّارَ گھر کو ویران کردیا۔

عَطَّلَ الْاِبِلَ: اونٹ بغیر محافظ کے چھوڑ دیئے ان کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا۔ ❹

(ع ط و)

اَلْعَطْوُ (ن) کے معنی ہیں لینا، پکڑنا۔ اور اَلْمُعَاطَاةُ: باہم

---

❶ ذکرہ القبتی فی غریبه ۲۳۹ وابو عبیده فی مجازه واختار الطبری (۱٤/٦٦) وقال وذالك اولی التاویلات ۱۲

❷ نسبه الطبری الی ابن عباس وسعیدبن جبیر وغیره ذلك (۱/٦٤-٦٦) وابن کثیر (۲/۵۵۸)

❸ وفی القرآن ثانیَ عِطفه (۲۲۔۹)

❹ وفی القران اذاالعشارُ عُطلت (۸۱۔٤) وایضا اناا عطینك الكوثر (۱۰۸: ۱)

لینا دینا۔ اَلْاِعْطَاءُ: (افعال) قرآن پاک میں ہے۔ ❶

﴿حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ﴾ (۹۔۲۹) یہاں تک کہ ...... جزیہ دیں۔

اور اَلْعَطِیَّۃُ وَالْعَطَاءُ: خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو محض تفضلاً دی جائے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿هٰذَا عَطَآءُنَا﴾ (۳۸۔۹) یہ ہماری بخشش ہے۔

﴿فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ یُعْطَوْا مِنْهَآ﴾ (۹۔۵۸) اگر ان کو اس میں سے (خاطر خواہ) مل جائے تو خوش رہیں اور اگر اس قدر نہ ملے۔

اَعْطَی الْبَعِیْرُ: اونٹ مطیع ہوگیا۔ دراصل اس کے معنی ہیں اونٹ نے منہ زوری اور سرتابی چھوڑ دی اور اپنا سر سوار کے سامنے جھکا دیا۔

ظَبْیٌ عَطُوٌّ وَّعَاطٍ: وہ ہرن جو درخت کے پتے کھانے کے لیے اپنا سر اوپر اٹھائے ہوئے ہو۔ ❷

(ع ظ م)

اَلْعَظْمُ کے معنی ہڈی کے ہیں۔ اس کی جمع عِظَامٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عِظَامًا فَکَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا......﴾ (۲۳۔۱۴) ہڈیاں (بنائیں) پھر ہڈیوں پر گوشت (پوست) چڑھایا۔

ایک قراءت میں دونوں جگہ عَظْمٌ ہے اور اسی سے عَظْمَۃُ الذِّرَاعِ ہے جس کے معنی بازو کا موٹا حصہ کے ہیں عَظْمُ الرَّحْلِ: بغیر تنگ کے پالان کی لکڑی عَظُمَ الشَّیْءُ کے اصل معنی کسی چیز کی ہڈی کے بڑا ہونے کے ہیں۔ مجازاً ہر چیز کے بڑا ہونے پر بولا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق حس سے ہو یا عقل سے اور عام اس سے کہ وہ مادی چیز ہو یا معنوی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ﴾ (۲۶۔۱۸۹) بڑے (سخت) دن کا عذاب تھا۔

﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ﴾ (۳۸۔۶۷) کہہ دو کہ وہ ایک سخت حادثہ ہے۔

﴿عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ﴾ (۷۸۔۱) یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں کیا بڑے حادثہ کی نسبت؟

﴿عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ﴾ (۴۳۔۳۱) ان دو بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر......۔

اور عظیم کا لفظ جب اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے تو ایسے جسم کے متعلق بولا جاتا ہے جس کے اجزاء متصل ہوں مگر اس کے بالمقابل کثیر کا لفظ افراد پر بولا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں مگر کبھی عظیم کا لفظ بھی افراد کثیرہ پر بولا جاتا ہے جیسے: جَیْشٌ عَظِیْمٌ بھاری لشکر۔ مَالٌ عَظِیْمٌ: زیادہ مال۔ اس صورت میں عَظِیْمٌ کے معنی کَثِیْرٌ ہوتے ہیں۔ اور بڑے حادثہ کو عَظِیْمَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْاِعْظَامَۃُ وَالْعِظَامَۃُ گدے کی مثل ایک چیز جسے عورت اپنے سرین بڑے ظاہر کرنے کے لیے ان پر باندھ لیتی ہے۔

---

❶ وایضا التعاطی الاخذبغیر حق کماقال فی قاتل ناقۃصالحؑ ﴿فتعاطیٰ فعقر﴾ (۵۴۔۲۹)

(ع ف ف)

اَلْعِفَّةُ: نفس میں ایسی حالت کا پیدا ہو جانا جس کے ذریعہ وہ غلبہ شہوت سے محفوظ رہے۔ اَلْمُتَعَفِّفُ: زبردستی سے اپنے اندر ایسی حالت پیدا کرنے والا۔ اصل میں اس کے معنی تھوڑی سی چیز پر قناعت کرنے کے ہیں۔ جو بمنزلہ عُفَافَة یا عُفَّة یعنی بچی کھچی چیز کے ہو یا بمنزلہ عَفْعَفٌ یعنی پیلوں کے ہو۔ اَلْاِسْتِعْفَافُ عفت طلب کرنا، کسی چیز سے پرہیز کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾ (۴-۶) اور جو شخص آسودہ حال ہو اس کو (ایسے مال سے قطعی طور پر) پرہیز رکھنا چاہیے۔

﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا﴾ (۲۴-۳۳) اور جو نکاح کا مقدور نہیں رکھتے انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔

(ع ف ر)

اَلْعِفْرِيْتُ: جنوں میں سے عفریت، اس جن کو کہا جاتا ہے جو نہایت موذی اور شریر ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ (۲۷-۳۹) جنات میں سے ایک موذی اور شریر جن نے کہا۔

پھر جس طرح کبھی شریر انسان کو شیطان کہہ دیا جاتا ہے اس طرح استعارۃً انسان کو عِفْرِيْتٌ بھی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ عِفْرِيْتٌ نِفْرِيْتٌ کا محاورہ ہے (نفریت تابع مہمل ہے) ابن قتیبہ کہتے ہیں❷ کہ اَلْعِفْرِيْتُ کے معنی قوی ہیکل کے ہیں۔

اصل میں عِفْرِيْتٌ کا لفظ اَلْعَفَرَ سے ہے جس کے معنی مٹی کے ہیں اور عَافَرَهٗ کے معنی ہیں: اسے پچھاڑ کر مٹی میں لت پت کر دیا اور رَجُلٌ شِرٌّ وَشِمْرٌ کی طرح رَجُلٌ عِفْرٌ بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں: چالاک اور شریر آدمی۔ لَيْثُ عِفْرِيْنٌ: گرگٹ کی شکل کا ایک جانور ہے سوار پر حملہ کر کے اسے نیچے گرالیتا ہے۔ عِفْرِيَةُ الدِّيْكِ اَوِ الْحُبَارٰى: مرغ یا حباری کے سر کے بال، (کلغی)۔

(ع ف و)

اَلْعَفْوُ: کے معنی کسی چیز کو لینے کا قصد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

عَفَاهُ وَاعْتَفَاهُ: کسی کے پاس جو کچھ ہے وہ لینے کا قصد کیا۔ عَفَتِ الرِّيْحُ الدَّارَ: ہوا نے گھر کے نشانات مٹا دیئے اسی معنی کے لحاظ سے شاعر نے کہا ہے۔❸

(۳۱۵) اَخَذَ الْبِلٰى اٰيَاتِهَا

بوسیدگی نے اس کے نشانات مٹا ڈالے۔

عَفَتِ الدَّارُ: گھر کے نشانات مٹ گئے۔ گویا ان آثار نے از خود مٹ جانے کا قصد کیا۔ عَفَا النَّبْتُ وَالشَّجَرُ نباتات اور درخت بڑھ گئے جیسا کہ اَخَذَ النَّبْتُ فِي الزِّيَادَةِ کا محاورہ ہے یعنی پودے نے بڑھنا شروع کیا۔

عَفَوْتُ عَنْهُ کے معنی ہیں میں نے اس سے درگزر کرتے

---

❶ انظر للكلمة الاتباع لابی الطیب (۹۸) والفالی (۲/۲۱۷) والمخصص (۱۴/۳۷) والمزهر (۱/۴۱۸)

❷ ابو جعفر احمد بن عبدالله بن مسلم قتيبه المتوفى ۳۲۲ھ معجم الادباء (۲/۱۶۰)

❸ لم اجده ويرجى

ہوئے اس کا گناہ مٹا دینے کا قصد کیا لہٰذا یہاں اصل میں اس کا مفعول ترک کردیا گیا ہے اور عَنْ کا متعلق محذوف ہے۔ ای قَصَدْتُ اِزَالَةَ ذَنْبِهٖ صَارِفًا عَنْهُ پس عَفْوٌ کے معنی گناہ سے درگزر کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ﴾ (۴۲۔۴۰) مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کرلے۔

﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ (۲۔۲۳۷) اور اگر تم ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ﴾ (۲۔۵۲) پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کردیا۔

﴿اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ﴾ (۹۔۶۶) اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کردیں۔

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ (۵۔۱۳) تو ان کی خطائیں معاف کردو۔اور آیت کریمہ۔

﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ (۸۔۱۹۹) (اے محمد) عفو اختیار کرو۔ میں اَلْعَفْوَ ہر اس چیز کو کہا گیا ہے جس کا قصد کرنا اور لینا آسان ہو۔ اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں: درگزر کیجیے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (۲۔۲۱۹) (اے محمد ﷺ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کس طرح کا مال خرچ کریں کہہ دو جو چاہو خرچ کرو۔ میں عفو سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ضروریات سے زائد ہو اور اس کے خرچ سے تکلیف نہ ہو۔اور اَعْطٰی عَفْوًا اس نے اسے بے مانگے دے دیا۔یہاں عفوًا مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے اور حال واقع ہوا ہے یعنی بخشش کرتے وقت اس کی حالت یہ تھی کہ گویا خود لے رہا ہے اور اس میں اس عمدہ معنی کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔[1] (الطّویل)

(۳۱۶) كَاَنَّكَ تُعْطِيْهِ الَّذِيْ اَنْتَ سَائِلُهٗ

یعنی جب سائل اس کے پاس آتا ہے تو اس طرح خوش ہوتا ہے گویا جو چیز تم اس سے لے رہے ہو وہ اسے دے رہے ہو۔

اور دعائے ماثورہ میں ہے۔[2] (۴۳) اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ: یعنی اے اللہ! تجھ سے عفو اور تندرستی طلب کرتا ہوں اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو عَفُوٌّ کہا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا﴾ (۴۔۴۳) بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

اور حدیث میں ہے[3] (۴۴) ((مَا اَكَلَتِ الْعَافِيَةُ فَهُوَ صَدَقَةٌ)) یعنی کھیتی سے جو کچھ پرند، چرند اور

---

[1] وصدره: تواه اذا ماحسبته متهللاً تراه اذا ماجسته متهلا اوالبيت في اللسان (هلل) غير منسوب قال احد مصححيه في الحامشية وفي شواهد الكشاف انه لزهير بن ابي سلمیٰ يمدح حصن بن ابي حذيفه ويعلم من رواية انه وصف لمعنی بن زائدة وفي المختارات ٦٥ يمدح هرمافي ٢٣ بيتاً وفي مختار الشعر الجاهلي (١ : ٦٩) في ٤٢ بيتاً ونقد الشعر ٢١ في ثلاثة ابيات معزوالى زهير كذافي البحر (٢ : ٥) والعمدة (٢ : ٣١، ٤٠) والعقد الثمين ٩٣ والحصري (٣ : ١٣٣) وخاص الخاص للثعالبي (٣١٨) قال وهوامدح بيت قالته العرب والعقد (١ : ٣٣٧) ورسائل البلغاء (٢٧٨) والعيون (١ : ٣/٣٤١ : ٥٣) والسيوطي (٩٤)

[2] ابن ماجة عن ابي هريره وفي رواية الحاكم والترمذي عن ابي بكر : سلوا الله العفو والعافية والفائق (٢ : ٨٠)

[3] المستدرك (٣ : ٣١٣) وابو داود (بيوع) وغريب ابي عبيد (١ : ١٤٨) وفي رواية "اصابت" انظر للحديث الفائق (٢/ ٨٣) قال والعافية جماعة ويقال للواحد عافٍ ١٢

ضرورت مند انسان کھا جائیں وہ صدقہ ہے۔

اَعْفَیْتُ کَذَا: یعنی میں نے اسے بڑھنے دیا۔اسی سے "اُعْفُوا اللِّحٰی" ہے۔ ❶ (۴۵) یعنی ڈاڑھی کے بال بڑھنے دو۔

اَلْعِفَاءُ: اون یا پرند کے پر جو بڑھ جائیں اور کسی سے دیگ مستعار لینے والا۔ جو شوربہ اس کی دیگ میں اسے بھیجتا ہے اس شوربہ کو اَلْمَعَافِیْ کہا جاتا ہے۔

(ع ق ب)

اَلْعَقِبُ وَالْعَقْبُ: پاؤں کا پچھلا حصہ یعنی ایڑی اس کی جمع اَعْقَابٌ ہے۔حدیث میں ہے۔ ❷ (۴۵) ((وَیْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ)) کہ (وضو میں خشک رہنے والی) ایڑیوں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور بطور استعارہ عَقِبٌ کا لفظ بیٹے پوتے پر بھی بولا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ﴾ (۴۳۔۲۸) اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے۔

جَآءَ فِیْ عَقِبِ الشَّهْرِ: مہینے کے آخری دنوں میں آیا۔ رَجَعَ عَلٰی عَقِبِهٖ: الٹے پاؤں واپس لوٹا۔

اِنْقَلَبَ عَلٰی عَقِبَيْهِ: وہ الٹے پاؤں واپس لوٹا۔جیسے: رَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِهٖ: کا محاورہ ہے اور جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ (۱۸۔۶۴) تو وہ اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے۔ نیز کہا جاتا ہے۔

رَجَعَ عَوْدُهٗ عَلٰی بَدْئِهٖ: یعنی جس راستہ پر گیا تھا اسی راستہ سے واپس لوٹ آیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا﴾ (۶۔۷۱) تو کیا ہم الٹے پاؤں پھر جائیں۔

﴿اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (۳۔۱۴۴) تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہو جاؤ) اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا۔

﴿نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (۸۔۴۸) تو پسپا ہو کر چل دیا۔

﴿فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ﴾ (۲۳۔۶۶) اور تم الٹے پاؤں پھر جاتے تھے۔

عَقَبَهٗ: وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا، اس کا جانشین ہوا۔جیسا کہ دَبَرَهٗ وَقَفَاهٗ کا محاورہ ہے۔

اَلْعَقِبُ وَالْعُقْبٰى: خاص کر ثواب۔یعنی اچھے بدلے پر بولے جاتے ہیں۔جیسے فرمایا۔

﴿خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا﴾ (۱۸۔۴۴) اس کا صلہ بہتر اور (اس کا) بدلہ اچھا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (۱۳۔۲۲) یہی لوگ ہیں جن کے لیے عاقبت کا گھر ہے۔

---

❶ كلمة من الحديث رواه النسائي والمسلم (طهارة) والبخارى (اللباس) وابوداود (ترجل) والترمذى (آدب) والمستدرك (۱۶/۲) والحديث فى النهاية (۲۶/۳) والاضداد لابى الطيب (۴۸۳/۲) وعده من الاضداد

❷ اصل الحديث متفق عليه من حديث عبدالله بن عمرو رضى الله عنه باختلاف الفاظه ابن ماجه والنسائى وغيرهامن كتب الحديث راجع لتخريجه الكاف الشاف لابن حجر رحمه الله ص ۵۲ رقم ۴۴۰-۴۴۲

اور عَاقِبَۃٌ کا لفظ بھی ثواب کے لیے مخصوص ہے۔جیسے فرمایا۔

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۲۸۔۸۳) اور انجام نیک تو پرہیز گاروں ہی کا ہے۔

مگر یہ اضافت کی صورت میں کبھی عُقُوْبَۃٌ کے معنی میں بھی آجاتا ہے، جیسے فرمایا۔

﴿ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُ وا السُّوْءٰٓى﴾ (۳۰۔۱۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی ان کا انجام بھی برا ہوا۔اور آیت کریمہ۔

﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا اَنَّهُمَا فِى النَّارِ﴾ (۵۹۔۱۷) تو دونوں کا انجام یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں داخل ہوئے۔ میں عَاقِبَة کا لفظ استعارتاً عذاب کے لیے استعمال ہوا ہے جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (۹۔۳۴) ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خوشخبری سنادو۔

میں عذاب کے ساتھ بشارت کا لفظ لایا گیا ہے اور عِقَاب، عُقُوْبَۃٌ اور مَعَاقَبَۃٌ عذاب کے ساتھ مخصوص ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَحَقَّ عِقَابِ﴾ (۳۸۔۱۴) تو سخت عذاب کرنے والا۔

﴿فَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ (۱۶۔۱۲۶) اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو اتنی ہی دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی ہے۔

﴿وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَاعُوْقِبَ بِهٖ﴾ (۲۲۔۶۰) جو شخص کسی کو اتنی ہی سزا دے جتنی سزا کہ اس کو دی گئی ہے۔

اَلتَّعْقِيْبُ: ایک چیز کے بعد دوسری لانا۔

عَقَّبَ الْفَرْسُ فِىْ عَدْوِهٖ: گھوڑے نے ایک دوڑ کے بعد دوسری دوڑ لگائی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ﴾ (۱۳۔۱۱) اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ﴾ (۱۳۔۴۱) کے معنی ہیں کہ اللہ کے فیصلے کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا اور نہ اس پر بحث کرسکتا ہے۔یہ عَقَّبَ الْحَاكِمُ عَلٰى حُكْمِ مَنْ قَبْلَهٗ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی حاکم نے اپنے پیشتر وحاکم کے خلاف فیصلہ دیا۔شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۳۱۷) وَمَا بَعْدَ حُكْمِ اللّٰهِ تَعْقِيْبُ

اللہ کے فیصلہ کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آسکتا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں لوگوں کو اللہ کے حکم اور اس کی مخفی حکمتوں میں خوض کرنے سے منع فرمایا گیا ہو۔جیسا کہ قضا وقدر کے اسرار میں غور وخوض سے منع کیا گیا ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ﴾ (۲۷۔۱۰) میں لَمْ يُعَقِّبْ کے معنی ہیں اس نے مڑ کر پیچھے کو نہ دیکھا۔

اَلْاِعْتِقَابُ کے معنی ایک چیز کے بعد دوسری آنے کے ہیں۔جیسے شب وروز کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔اسی سے اَلْعَقْبَۃُ ہے یعنی دو مسافروں کا یکے بعد دیگرے ایک سواری پر سوار ہونا۔ عُقْبَةُ الطَّائِرِ:

[1] لم اجده فى المراجع

پرند کا کبھی اوپر چڑھنا اور کبھی نیچے اترنا۔ اَعْقَبَہٗ کَذَا: کسی چیز کا وارث بنا دینا ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو اس کا جانشین بنانا ۔ قرآن پاک میں ہے ۔ ﴿فَاَعْقَبَھُمْ نِفَاقًا﴾ (۹۔۷۷) تو خدا نے......ان کے (دلوں میں) نفاق ڈال دیا۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الطّویل)

(۳۱۸) لَہٗ طَائِفَۃٌ مِنْ جِنَّۃٍ غَیْرُ مُعْقِبٍ یعنی اسے جنون کا دورہ پڑتا ہے جس کے بعد افاقہ نہیں ہوتا۔

فُلَانٌ لَمْ یُعْقِبْ: اس نے اولاد نہیں چھوڑی اور اَعْقَابُ الرَّجُلِ کے معنی آدمی کی اولاد کے ہیں اہل لغت کا قول ہے کہ اس کے تحت لڑکی کی اولاد نہیں آتی کیونکہ وہ نسبًا اس کی جانشین نہیں ہوتی لیکن ذُرِّیَّۃٌ کے لفظ میں لڑکی کی اولاد بھی داخل ہوتی ہے۔ اِمْرَءَۃٌ مِعْقَابٌ: وہ عورت جو ایک بار لڑکا اور دوسری بار لڑکی جنے عَقَبْتُ الرُّمْحَ کے معنی نیزے کو عقب یعنی پالان کے پچھلے حصہ کے ساتھ باندھ دیا۔ جیسے عَصَبْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے عَصَبٌ یعنی تانت سے باندھ دیا اَلْعَقَبَۃُ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ اس کی جمع عُقَبٌ وَعِقَابٌ ہے اور شاہین کو بھی عُقَابٌ کہا جاتا ہے کیونکہ شکار کا تعاقب کرتا ہے اور تشبیہ کے طور پر عِقَابٌ کا لفظ (۱) جھنڈے (۲) کنوئیں کے پتھر جس پر پانی پلانے والا کھڑا ہوتا ہے اور (۳) کان کی بالی کے دھاگے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اَلْیَعْقُوْبُ: مذکر چکور۔ کیونکہ اس کی عادت یہ ہے کہ ایک مرتبہ دوڑنے کے بعد ٹھہر جاتا ہے اور پھر دوسری بار دوڑتا ہے۔

(ع ق د)

اَلْعَقْدُ کے معنی کسی چیز کے اطراف کو جمع کر دینے یعنی گرہ باندھنے کے ہیں یہ اصل میں تو سخت اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے، عَقْدُ الْحَبْلِ (رسی کی گرہ باندھنا) عَقْدُ الْبَنَاءِ وغیرہ محاورات ہیں۔ پھر بطور استعارہ معانی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے عَقْدُ الْبَیْعِ سودے کو پختہ کرنا۔ عَقْدُ الْعَھْدِ: محکم عہد باندھنا وغیرہ، چنانچہ کہا جاتا ہے۔

عَاقَدْتُہٗ وَعَقَدْتُہٗ وَتَعَاقَدْنَا وَعَقَدْتُ یَمِیْنَہٗ میں نے اس سے پختہ عہد و پیمان باندھا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿عَاقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ (۴۔۳۳) جن لوگوں سے تم نے پختہ عہد باندھ رکھے ہوں۔

ایک قراءت میں عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ ہے۔ نیز فرمایا۔ ﴿بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ﴾ (۵۔۸۹) پختہ قسموں پر ایک قراءت میں عَقَدْتُّمُ الْاَیْمَانَ ہے۔ اسی سے لِفُلَانٍ عَقِیْدَۃٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی پختہ یقین کے ہیں اَلْعِقْدُ (گلے کا ہار) اور اَلْعَقْدُ یہ اصل میں مصدر ہیں اور بطور اسم کے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی جمع عُقُوْدٌ آتی ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (۵۔۱) اپنے اقراروں کو پورا کرو۔ اَلْعُقْدَۃُ: نکاح، عہد و پیمان وغیرہ جو پختہ کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ﴾ (۲۔۲۳۵) اور

❶ قاله امراء القيس يصف فرساً واوله يحضلفى الآرىّ حتى كانه ـ والبيت في اللسان(عقب) وفى رواية الديوان ٨ وصنعة السندوبى به عشرة اوطائف غير معقب والبيت فى العقد الثمين (١٨) او الفائق (١٧٦/١) و كتاب الخيل لابى عبيدة (١٣٨) وفى رواية كانمابدل كانه

......نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔

عُقِدَ لِسَانُہٗ: اس کی زبان پر گرہ لگ گئی۔ فِیْ لِسَانِہٖ عُقْدَۃٌ اس کی زبان میں لکنت ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ﴾ (۲۰۔۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

اور آیت کریمہ۔
﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ﴾ (۱۱۳۔۴) اور گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔ میں عُقَدٌ عُقْدَۃٌ کی جمع ہے یعنی وہ گرہیں جو جادوگر عورتیں لگاتی ہیں۔ دراصل اس کے معنی عَزِیْمَۃ کے ہیں اس لیے اس پر عُقْدَۃ اور عَزِیْمَۃ دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور جادوگر کو مُعْقِدٌ بھی کہا جاتا ہے۔

لَہٗ عُقْدَۃُ مُلْكٍ: اس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے۔

نَاقَۃٌ عَاقِدَۃٌ وَعَاقِدٌ: وہ اونٹنی جس کی دم گرہ دار ہو جائے اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ نر سے جفتی کی خواہش مند ہے۔

تَیْسٌ وَکَلْبٌ اَعْقَدُ: نر سانڈ یا کتا جس کی دم لپٹی ہوئی ہو۔

تَعَاقَدَتِ الْکِلَابُ: کتوں کا آپس میں جفتی کرنا۔

(ع ق ر)

اَلْعُقْرُ کے معنی حوض یا مکان کے اصل اور وسط کے ہیں اور اسے عَقْرٌ بھی کہتے ہیں حدیث میں ہے۔ ❷ (۴۶)
مَاغُزِیَ قَوْمٌ فِیْ عَقْرِ دَارِھِمْ قَطُّ اِلَّا ذَلُّوْا کہ کسی قوم پر ان کے گھروں کے وسط میں حملہ نہیں کیا جاتا مگر وہ ذلیل ہو جاتی ہیں اور قَصْرٌ یعنی محل کو عُقْرَۃٌ کہا جاتا ہے۔ عَقَرْتُہٗ اس کی عُقْرُ یعنی جڑ پر مارا۔ جیسا کہ رَأَسْتُہٗ کے معنی ہیں۔ میں نے اس کے سر پر مارا۔ اسی سے عَقَرْتُ النَّخْلَ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے کھجور کے درخت کو جڑ سے کاٹ دیا۔ عَقَرْتُ الْبَعِیْرَ: اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں، اسے ہلاک کر دیا۔ عَقَرْتُ ظَھْرَ الْبَعِیْرِ: اونٹ کی پشت کو زخمی کر دیا اِنْعَقَرَ ظَھْرُہٗ: اس کی پیٹھ زخمی ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَعَقَرُوْھَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِکُمْ﴾ (۱۱۔۶۵) مگر انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح علیہ السلام نے کہا کہ اپنے گھروں میں ...... فائدہ اٹھالو۔
﴿فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ﴾ (۵۴۔۲۹) تو اس نے جسارت کر کے اونٹنی کو پکڑا اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

سَرْجٌ مُعْقِرٌ: زخمی کر دینے والی زین۔

کَلْبٌ عَقُوْرٌ: کاٹ کھانے والا کتا، درندہ جانور رَجُلٌ عَاقِرٌ: بانجھ مرد۔

اِمْرَءَۃٌ عَاقِرٌ: بانجھ عورت۔ گویا وہ مرد کے نطفہ کو قطع کر دیتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ فالمراد من النفاثات السواحر كذا ذكره القبتي في المشكل وغريبه وسائر اصحاب التفاسير (۳۰/۳۵۳)

❷ قاله علي رضي الله عنه في خطبة خطبها في نخيلة جالساً على السدة حين بلغه ان خيلا لمعاوية رضي الله عنه قتل عامله حسان بن حسان البكري وكان على الانبار فقتله سفيان بن عوف الاسدي في غارة (بيان والتبيين) (۲/۲۵) والكامل للمبرد ۰(۲۔۲۱) والعقد الفريد (۴/۶۹۔۷۰) كذافي الاغاني (۱۵: ۴۵) والصحيح ان اسمه اشرس بن حسان البكري كمافي الطبري وخطبته هذه مشهورة ۱۲

﴿وَامْرَءَتِیْ عَاقِرٌ﴾ (۳۔۴۰) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

﴿وَکَانَتِ امْرَءَتِیْ عَاقِرًا﴾ (۱۹۔۵) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

قَدْ عَقِرَتْ: وہ بانجھ ہوگئی۔ اَلْعَقْرُ: آخری بچہ بَیْضَۃُ الْعُقْرِ: آخری انڈا۔ عِقَارٌ: (پرانی) شراب۔ کیونکہ وہ عقل کو قطع کر دیتی ہے۔ اَلْمُعَاقَرَۃُ کے معنی ہیں: شراب نوشی کا عادی ہونا اور قَصْرٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر بکریوں کی ٹکڑی کو بھی عُقْرٌ کہا جاتا ہے۔

رَفَعَ فُلَانٌ عَقِیْرَتَہٗ: فلاں نے آواز بلند کی مروی ہے کہ ایک آدمی کی ٹانگ کٹ گئی وہ چلایا تو اس وقت سے بطور استعارہ عَقْرٌ کا لفظ بلند آواز کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ عَقَاقِیْرُ جڑی بوٹیاں۔ اس کا واحد عَقَّارٌ ہے۔

(ع ق ل)

اَلْعَقْلُ: اس قوت کو کہتے ہیں جو قبول علم کے لیے تیار رہتی ہے اور وہ علم جو اس قوت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ اسے بھی عقل کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ❶ (ہزج)

(۳۱۹) (۱) اَلْعَقْلُ عَقْلَانِ ۔ مَطْبُوْعٌ مَسْمُوْعٌ

(۲) وَلَا یَنْفَعُ مَسْمُوْعٌ ۔ اِذَا لَمْ یَكُ مَطْبُوْعٌ ۔

(۳) کَمَا لَا یَنْفَعُ ضَوْءُ الشَّمْسِ وَضَوْءُ الْعَیْنِ مَمْنُوْعٌ

کہ عقل دو قسم پر ہے۔ (۱) عقل طبعی یعنی جو طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے اور (۲) عقل سمعی یعنی وہ جو لوگوں سے باتیں سن کر حاصل ہوتی ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص فطرۃً عقل سے کورا ہو تو سن کر حاصل کی ہوئی عقل اسے کچھ فائدہ نہیں بخشتی۔

(۳) جیسا کہ سورج کی روشنی اندھے آدمی کے لیے بے فائدہ ہوتی ہے۔

عقل کے پہلے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ❷ (۴۷)

مَا خَلَقَ اللّٰہُ خَلْقًا اَکْرَمَ عَلَیْهِ مِنَ الْعَقْلِ

(اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کے نزدیک عقل سے زیادہ باعزت ہو)۔ اور دوسرے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ ❸ (۴۷) ((مَا کَسَبَ اَحَدٌ شَیْئًا اَفْضَلَ مِنْ عَقْلٍ یَهْدِیْهِ اِلٰی هُدًی اَوْ یَرُدُّهٗ عَنْ رَدًی)) کہ کسی شخص نے اس عقل سے بڑھ کر کوئی چیز حاصل نہیں کی جو انسان کی رہنمائی کرے یا اسے ہلاکت سے بچائے۔

---

❶ کذافی الاحیاء (۱۶/۳) وفی ادب الدنیا والدین للماوردی (۱۳۱) ایضاً معزوۃ لعلی رضی اللہ عنہ والابیات فی روضۃ العقلاء للبستی بغیر عزو وفی روایۃ رأیت العقل نوعین وتقسیم العقل من کلام سیابور بن اردشیر وفیہ فاخذہ بعض الشعراء فقال الخ وامانسبۃ لابیات الی علی رضی اللہ عنہ علم احققها

❷ الحدیث اخرجہ الترمذی الحکیم فی نوادرہ باسناد ضعیف والاحیاء (۱۶/۳) بتخریج العراقی وباختلاف عن امامۃ (الطبرانی) وابو نعیم من حدیث عائشۃ وفی روایۃ ابن عساکر عن معاذ قل من العقل بدل اکرم انظر کنز العمال (ج ۳ رقم ۱۹۱۲) وفی الالی (ج ۱ ص ۱۲۹۔۱۳۲) بطرق ماخلقت خلقا احسن منك ولا اکرم

❸ والحدیث بالفاظہ (هب عن عمر) الاابن مااکتسب مکان ماکسب کنزالعمال (ج ۳ رقم ۱۹۱۰) وفی تخریج العراقی اخرجہ المحرفی العقل

چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ﴾ (۲۹۔۴۳) اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔

میں اسی معنی کے اعتبار سے عقل کی نفی کی گئی ہے۔ اور ہر وہ جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے فقدان عقل کی وجہ سے کفار کی مذمت فرمائی ہے وہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں۔ جیسے فرمایا۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً، صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ (۲۔۱۷۱) جو کافر ہیں، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے، بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں کفار سے عقل کی نفی کی گئی ہے اور جس مقام پر عقل نہ ہونے پر انسان کو غیر مکلّف قرار دیا گیا ہے۔ وہاں عقل کے اول معنی کی طرف اشارہ ہے۔

دراصل اَلْعَقْلُ کے معنی روکنا اور منع کرنا ہیں جیسے عِقَالٌ یعنی پائے بند سے اونٹ کا پاؤں باندھ دینا اور دوا کے پیٹ میں قبض کرنے کو بھی عَقْلٌ یعنی پائے بند سے اونٹ کا پاؤں باندھ دینا اور دوا کے پیٹ میں قبض کرنے کو بھی عَقْلٌ کہتے ہیں۔ عَقَلَتِ الْمَرْءَةُ شَعْرَهَا عورت نے اپنے بال باندھ لیے۔ عَقَلَ لِسَانَهٗ: اس نے اپنی زبان روک لی اسی سے حصین یعنی قلعہ کو مَعْقِلٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَعَاقِلُ ہے اور عَقْلُ الْبَعِيْرِ سے عَقَلْتُ الْمَقْتُوْلَ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں: مقتول کی دیت ادا کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَقَلْتُ الْمَقْتُوْلَ کے اصل معنی ہیں ولی الدم یعنی مقتول کے وارثوں کے گھر کے صحن میں اونٹ باندھنا مگر بعض کہتے ہیں: نہیں بلکہ اس کے معنی خونریزی روکنے کے ہیں۔ پھر مطلق خون بہا کو عَقْلٌ کہا جانے لگا ہے خواہ کوئی چیز دی جائے اور جو رشتے دار قاتل کی طرف سے دیت کا بوجھ اٹھاتے ہیں، انہیں عَاقِلَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَقَلْتُ عَنْهُ: کسی کی طرف سے خون بہا ادا کرنا۔ دَمُهٗ مُعْقَلَةٌ عَلٰی قَوْمِهٖ: [1] اس کے خون بہا کا تاوان اس کی قوم پر ہے۔ اِعْتَقَلَهٗ بِالشَّغْرِ بِيَّةِ اسے پیچ لگا کر پچھاڑ دیا۔ اِعْتَقَلَ رُمْحَهٗ بَيْنَ رِكَابِهٖ وَسَاقِهٖ: اس نے نیزے کو اپنی رکاب اور پنڈلی کے درمیان رکھ لیا بعض نے کہا ہے کہ اَلْعِقَالُ کے معنی ایک سال کے صدقہ کے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے [2] (۴۸) لَوْ مَنَعُوْنِيْ عِقَالًا لَقَاتَلْتُهُمْ: کہ اگر وہ ہمیں ایک سال کا صدقہ بھی نہ دیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا اور جب کوئی شخص اونٹ نہ لے اور ان کی بجائے نقدی وصول کرے تو عرب کہتے ہیں: اَخَذَ النَّقْدَ وَلَمْ يَأْخُذِ الْعِقَالَ مگر جب عِقَال کا لفظ صَدَقَة کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ یا تو عِقَالٌ بمعنی پائے بند بول کر کنایتاً اونٹ مراد لیے جاتے ہیں اور یا اونٹ بمعہ ان کی رسیوں کے مراد ہوتے ہیں اور یا یہ عَقَلْتُهٗ عَقْلًا

---

[1] وفي المطبوع دية مصحف والتصويب من المعاجم

[2] كلمة من الحديث في قتال ابي بكر اصحاب الرِّدَّة رواه اصحاب السنة والحديث في الفائق ٧٨٧٢

وَعِقَالاً کا مصدر ہوتا ہے جس کے معنی باندھنا کے ہیں، جیسے کِتَابٌ کہ اصل میں کَتَبْتَ کا مصدر ہے مگر کبھی بمعنی مکتوب آجاتا ہے۔ اسی طرح عِقَال بول کر مَعْقُوْل مراد لیتے ہیں یعنی وہ جانور جو زکوٰۃ میں وصول کیا جائے۔

اَلْعَقِیْلَۃُ: وہ (خوبصورت) عورت یا موتی جسے حفاظت سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ اعلیٰ درجہ کی چیز کو عِلْقُ مُضِنَّۃ کہا جاتا ہے۔ اَلْمَعْقِلُ: (پناہ گاہ) پہاڑ یا قلعہ جس میں پناہ لی جاتی ہے اَلْعُقَّالُ: ایک بیماری جو گھوڑے کے پاؤں میں پیدا ہو جاتی ہے اَلْعَقْلُ کے معنی چلتے وقت پاؤں کا باہم ٹکرانا کے ہیں۔

(ع ق م)

اَلْعُقْمُ: اصل میں اس خشکی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اثر قبول کرنے سے مانع ہو۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ عَقَمَتْ مَفَاصِلُہٗ: (اس کے جوڑ بند خشک ہو گئے) دَاءٌ عُقَامٌ لاعلاج مرض۔ اَلْعَقِیْمُ: (بانجھ) وہ عورت جو مرد کا مادہ قبول نہ کرے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ عَقَمَتِ الْمَرْئَۃُ اَوِالرَّحِمُ: عورت بانجھ ہو گئی یا رحم خشک ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ﴾ (۵۱-۲۹) اور اپنا منہ پیٹ کر کہنے لگی کہ (اے ہے ایک تو بڑھیا (دوسرے) بانجھ۔

اور رِیْحٌ عَقِیْمٌ (خشک ہوا) میں یہ بھی ہو سکتا کہ فعیل بمعنی فاعل ہو۔ یعنی وہ ہوا جو بادلوں کو ساتھ نہیں لاتی یا درخت کو باردار نہیں کرتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فعیل بمعنی مفعول ہو جیسا کہ اَلْعَجُوْزُ الْعَقِیْمُ میں ہے اس صورت میں رِیْحٌ عَقِیْمٌ: کے معنی ہوں گے وہ ہوا جو کسی چیز کا اثر اپنے اندر نہ رکھتی ہو چونکہ ایسی ہوا نہ کسی چیز کے اثر کو قبول کرتی ہے اور نہ کسی سے متاثر ہوتی ہے اس لیے نہ وہ کچھ دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ﴾ (۵۱-۴۱) جب ہم نے ان پر خشک ہوا چلائی۔

يَوْمٌ عَقِيْمٌ سخت دن، جس میں کسی قسم کا سامانِ فرحت نہ ہو۔[1]

(ع ک ف)

اَلْعُکُوْفُ: کے معنی ہیں۔ تعظیماً کسی چیز پر متوجہ ہونا اور اس سے وابستہ رہنا۔ اور اصطلاح شریعت میں اَلْاِعْتِکَافُ کے معنی ہیں: عبادت کی نیت سے مسجد میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾ (۲-۸۱) جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو۔

﴿سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ﴾ (۲۲-۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔

﴿وَالْعَاكِفِينَ﴾ (۲-۱۲۵) اور اعتکاف کرنے والوں۔

﴿فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ﴾ (۲۶-۷۱) اور اس کی پوجا پر قائم رہیں۔

عَکَفْتُہٗ عَلٰی کَذَا: کسی چیز پر روک رکھنا۔

﴿يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَّهُمْ﴾ (۷-۱۳۸) یہ اپنے

[1] راجع الآیۃ (۲۲-۵۵)

بتوں کی عبادت کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔

﴿ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا﴾ (۲۰۔۹۷) جس معبود کی پوجا پر تو قائم اور معتکف تھا۔

﴿وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا﴾ (۴۸۔۲۵) اور قربانی کے جانوروں کو بھی کہ روک دیئے گئے ہیں۔

(ع ل ق)

اَلْعَلَقُ کے معنی کسی چیز میں پھنس جانے کے ہیں کہا جاتا ہے عَلِقَ الصَّيْدُ فِي الْحُبَالَةِ: شکار جال میں پھنس گیا اور جب کسی کے جال میں شکار پھنس جائے تو کہا جاتا ہے اَعْلَقَ الصَّائِدُ۔ اَلْمِعْلَقُ وَالْمِعْلَاقُ: ہر وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو لٹکایا جائے اسی طرح عِلَاقَةُ السَّوْطِ وَعَلَقُ الْقِرْبَةِ: اس رسی یا تسمہ کو کہتے ہیں جس سے کوڑے کو یا مشک کا منہ باندھ کر اسے لٹکا دیا جاتا ہے۔ عَلَقُ الْبَكْرَةِ: وہ لکڑی وغیرہ جس پر کنویں کی چرخی لگی رہتی ہے۔ اسی سے اَلْعُلْقَةُ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے سہارا کے لیے پکڑا جاتا ہے۔ عَلِقَ دَمُ فُلَانٍ بِزَيْدٍ فلاں کا خون زید کے ساتھ چمٹ گیا یعنی زید اس کا قاتل ہے۔

اَلْعَلَقُ: (جونک) ایک قسم کا کیڑا جو حلق کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ نیز جما ہوا خون، اسی سے لوتھڑے کی قسم کے خون کو عَلَقَه کہا جاتا ہے جس سے بچہ بنتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (۹۶۔۲) جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ﴾ () کے آخر میں فرمایا۔

﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ (۲۳۔۱۴) پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی۔

اَلْعِلْقُ: اس عمدہ چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ مالک کا دل چمٹا ہوا ہو اور اس کی محبت دل سے اترتی نہ ہو اَلْعَلِيْقُ: جو وغیرہ جو سفر میں جانور کے کھانے کے لیے اس پر باندھ دیتے ہیں اور اَلْعَلِيْقَةُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ بھیجا جائے۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (رجز)

(۳۲۰) اَرْسَلَهَا عَلِيْقَةً وَقَدْ عَلِمْ
اَنَّ الْعَلِيْقَاتِ يُلَاقِيْنَ الرَّقِمْ

اس نے غلہ لینے کے لیے لوگوں کے ساتھ اپنا اونٹ بھیج دیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ دوسروں کے ساتھ بھیجے ہوئے اونٹ تکالیف سے دوچار ہوتے ہیں۔

اَلْعَلُوْقُ: وہ اونٹنی جو اپنے بچے پر مہربان ہو اور اس سے لپٹی رہے اور موت کو بھی عَلُوْقٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْعَلْقٰى: درخت جس میں انسان الجھ جائے تو اس سے نکلنا مشکل ہو عَلِقَتِ الْمَرْءَةُ: عورت حاملہ ہوگئی۔

رَجُلٌ مِعْلَاقٌ: جھگڑالو آدمی جو اپنے مخالف کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے چمٹا رہے۔

(ع ل م)

اَلْعِلْمُ: کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا۔ اور یہ دو قسم پر ہے اول یہ کہ کسی چیز کی ذات کا ادراک کر لینا: دوم ایک چیز پر کسی صفت کے ساتھ حکم لگانا جو (فی الواقع) اس کے

[1] قاله الراجز والرقم الداهية والمصيبة الذيل للقالي ٦٣ مبحث اسماء الدابية) والرجز ايضاً في اصلاح المنطق ٣٤٣، ٣٤٧ والمحكم واللسان (علق)

لیے ثابت ہو یا ایک چیز کی دوسری چیز سے نفی کرنا جو (فی الواقع) اس سے منفی ہو۔ پہلی صورت میں یہ لفظ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ (۸۔۶۰) جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے۔

اور دوسری صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ﴾ (۶۰۔۱۰) اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں۔

اور آیت ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ﴾ کے آخر میں۔ ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ (۵۔۱۰۹) سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے ہوش و حواس قائم نہیں رہیں گے۔ ایک دوسری حیثیت سے علم کی دو قسمیں ہیں (۱) نظری (۲) عملی۔ نظری وہ ہے جو حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو جائے جیسے وہ علم جس کا تعلق موجودات عالم سے ہے اور علم عملی وہ ہے جو عمل کے بغیر تکمیل نہ پائے جیسے عبادات کا علم ایک اور حیثیت سے بھی علم کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عقلی، یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل نہ ہو بلکہ بذریعہ نقل و سماعت کے حاصل کیا جائے دراصل ہوسکے (۲) سمعی یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل اَعْلَمْتُهٗ وَعَلَّمْتُهٗ کے ایک معنی ہیں مگر اِعْلَامٌ جلدی سے بتا دینے کے ساتھ مختص ہے اور تَعْلِيْمٌ کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلّم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ تَعْلِيْم کے معنی تصور کے لیے نفس کو متوجہ کرنا کے ہیں اور تَعَلُّمٌ کے معنی ایسے تصور کی طرف متوجہ ہونا کے اور کبھی تَعْلِيْمٌ کا لفظ اِعْلَامٌ کی جگہ آتا ہے کہ جب اس میں تاکید کے معنی مقصود ہوں جیسے فرمایا۔

﴿اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ﴾ (۴۹۔۱۶) کیا تم خدا کو اپنی دینداری جتلاتے ہو۔

اور حسب ذیل آیات میں تَعْلِيْمٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ﴾ (۵۵۔۱،۲) خدا جو نہایت مہربان، اس نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔

﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (۹۶۔۴) قلم کے ذریعہ (لکھنا) سکھایا۔

﴿وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْا﴾ (۶۔۹۲) اور تم کو وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے......۔

﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ (۲۷۔۱۶) ہمیں خدا کی طرف سے جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۳۔۱۶۴) اور خدا کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (۲۔۳۱) اور اس نے آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔

میں آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دینے کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے اندر بولنے کی صلاحیت اور استعداد رکھ دی جس کے ذریعہ اس نے ہر چیز کے لیے ایک نام وضع کر لیا یعنی اس کے دل میں القا کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو ان کے کام سکھا دیئے ہیں جسے وہ سرانجام

دیتے رہتے ہیں اور آواز دی ہے جسے وہ نکالتے رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ، قَالَ لَهُ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِـعُكَ عَـلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴾ (۱۸۔۶۵۔۲۲۷) اور اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ جو علم خدا کی طرف سے آپ کو سکھلایا گیا ہے اگر آپ مجھے اس میں سے کچھ رشد و ہدایت (کی باتیں) سکھا دیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایک خاص علم مراد ہے جس پر انسان از خود واقف نہیں ہوسکتا اور جب تک اللہ تعالیٰ اس پر واقف نہ فرمائے لوگ اسے قابل انکار سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ⓫ حضرت خضر کے ساتھ چلے تو جب تک انھوں نے ان واقعات کی حقیقت سے موسیٰ علیہ السلام⓫ کو باخبر نہیں کر دیا وہ ان باتوں کا انکار ہی کرتے رہے اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ۔

﴿قَـالَ الَّـذِيْ عِـنْـدَهٗ عِـلْـمٌ مِّـنَ الْـكِتَـابِ ﴾ (۳۰۔۴۰) ایک شخص جس کو کتاب الٰہی کا علم تھا کہنے لگا، میں بھی علم کے یہی معنی مراد ہیں یعنی جسے علم خصوصی حاصل تھا اور آیت۔

﴿وَالَّـذِيْـنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ﴾ (۵۸۔۱۱) اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ مراتب علم کے اعتبار سے علماء کے بھی مختلف درجے اور مرتبے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿وَفَـوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴾ (۱۲۔۷۶) اور ہر علم والے سے دوسرا علم والا بڑھ کر ہے۔ میں عَـلِـيْـم کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ علم و فضل کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ عَـلِيْمٌ صیغۂ مبالغہ لا کر اس علمی فضیلت کو بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہر شخص اپنے سے کم درجہ کے اعتبار سے عَـلِـيْـمٌ ہے گو اپنے سے بلند درجہ عالم کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عَلِيْمٌ سے ذات باری تعالیٰ مراد ہو گو یہ لفظ نکرہ ہے کیونکہ درحقیقت اس صفت کے ساتھ موصوف ہونے کی اہل تو ذات باری تعالیٰ ہی ہے اس صورت میں كُـلِّ ذِيْ عِـلْـمٍ سے جملہ اہل علم بحیثیت مجموعی مراد ہوں گے اور ہر ایک بحیثیت انفرادی مراد نہیں ہوگا جیسا کہ پہلی صورت میں تھا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ (۳۴۔۴۸) اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے اور کوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ہے اور آیت کریمہ۔

﴿عَـالِـمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَـنِ ارْتَـضٰـى مِنْ رَّسُوْلٍ ﴾ (۲۷۔۲۶،۲۷) وہی غیب کا جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے ۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ اپنے علم خصوصی سے صرف انہیں کو نوازتے ہیں جو اس کے اولیاء کی صف میں داخل ہوں اور اَلْعَالِمُ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی صفت کی حیثیت سے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس پر

کوئی چیز بھی مخفی نہ ہو۔جیسے فرمایا۔
﴿لَا یَخْفٰی مِنْکُمْ خَافِیَةٌ﴾ (۶۹۔۱۸) اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہیں رہے گی۔
اور یہ مفہوم صرف ذات باری تعالیٰ کے حق میں ہی صحیح ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو اس معنی کے ساتھ متصف کرنا صحیح نہیں ہے۔
اَلْعَلَمُ: ایسا نشان جس سے کوئی شے پہچانی جا سکے جیسے عَلَمُ الطَّرِیْقِ: اس نشان کو کہتے ہیں جو راستہ کی پہچان کے لیے اس میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور فوج کے جھنڈے کو عَلَمُ الْجَیْشِ کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے فوج کی پہچان ہو جاتی ہے۔چنانچہ ایک قراءت (میں عیسیٰ علیہ السلام) کو ﴿وَاِنَّهٗ لَعَلَمٌ لِّلسَّاعَةِ﴾ (۴۳۔۶۱) کہا گیا ہے یعنی وہ قیامت کی نشانی ہیں۔اور اس معنی کے اعتبار سے پہاڑ کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع اَعْلَامٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَمِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ﴾ (۴۲۔۳۲) اور اس کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز ہیں جو گویا پہاڑ ہیں۔
اور دوسرے مقام پر فرمایا۔
﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ﴾ (۵۵۔۲۴) اور جہاز بھی اسی کے ہیں جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔نیز اوپر کے ہونٹ کے شگاف اور کپڑے کے نقش و نگار کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے اور محاورہ ہے۔ فُلَانٌ عَلَمٌ فلاں مشہور و معروف ہے جھنڈے کے ساتھ تشبیہ کے اعتبار سے یہ معنی مراد ہوتا ہے۔
اَعْلَمْتُ کَذَا کے معنی کسی چیز پر نشان لگانا کے ہیں۔اور مَعَالِمُ الطَّرِیْقِ اَوِالدِّیْنِ میں مَعَالِمُ کا واحد مَعْلَمٌ ہے اور مَعْلَمٌ اس نشان کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کی پہچان ہو سکے محاورہ ہے۔
فُلَانٌ مَعْلَمٌ لِلْخَیْرِ: فلاں خیر و برکت کا نشان ہے۔
اَلْعُلَّامُ: مہندی۔ اَلْعَالَمُ: فلک الافلاک اور جن جواہر و اعراض پر وہ حاوی ہے سب کو اَلْعَالَمُ: کہا جاتا ہے دراصل یہ فَاعَلٌ کے وزن پر ہے جو اسم آلہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے طَابَعٌ۔ مَایُطْبَعُ بِهٖ۔ مَایَخْتَمُ بِهٖ وغیرہ اسی طرح عَالَمٌ بھی ہے جس کے معنی ہیں مَاعُلِمَ بِهٖ یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ کسی شے کا علم حاصل کیا جائے اور کائنات کے ذریعہ بھی چونکہ خدا کا علم حاصل ہوتا ہے اس لیے جملہ کائنات اَلْعَالَمُ کہلاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت کے سلسلہ میں کائنات پر غور کرنے کا حکم دیا ہے۔چنانچہ فرمایا۔
﴿اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۸۵) کیا انھوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت پر غور نہیں کیا۔
اور اَلْعَالَمُ کی جمع (اَلْعَالَمُوْنَ) اس لیے بناتے ہیں کہ کائنات کی ہر نوع اپنی جگہ ایک مستقل عَالَمٌ کی حیثیت رکھتی ہے۔مثلاً عَالَمُ الْاِنْسَانِ ، عَالَمُ الْمَاءِ وَعَالَمُ النَّارِ وغیرہ۔نیز ایک روایت میں ہے۔[1] (۴۹) ((ان لِلّٰهِ بِضْعَةَ عَشَرَ اَلْفَ عَلَمٍ)) کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] عن وهب بن منبه وفی القرطبی ثمانیة عشر اقوال۔

نے دس ہزار سے کچھ اوپر عالم پیدا کیے ہیں باقی رہا یہ سوال کہ (واؤ نون کے ساتھ) اسے جمع سلامت کے وزن پر کیوں لایا گیا ہے (جو ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ عَالَمٌ میں چونکہ انسان بھی شامل ہیں اس لیے اس کی جمع، جمع سلامت لائی گئی ہے کیونکہ جب کسی لفظ میں انسان کے ساتھ دوسری مخلوق بھی شامل ہو تو تغلیباً اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ بنا لیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ چونکہ لفظ عَالَمٌ سے خلائق کی خاص قسم یعنی فرشتے، جن اور انسان ہی مراد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ❶ اس لیے اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ لائی گئی ہے۔ امام جعفر رضی اللہ عنہ بن محمد کا قول ہے ❷ کہ عَالَمِیْنَ سے صرف انسان مراد ہیں اور ہر فرد بشر کو ایک عَالَم قرار دے کر اسے جمع لایا گیا ہے۔ نیز انھوں نے کہا ہے کہ عَالَمٌ دو قسم پر ہے۔ (۱) اَلْعَالَمُ الْکَبِیْرُ: یعنی فلک و مافیہ (۲) اَلْعَالَمُ الصَّغِیْرُ: یعنی انسان، کیونکہ انسان کی تخلیق بھی ایک مستقل عَالَمٌ کی حیثیت سے کی گئی ہے اور اس کے اندر قدرت کے وہ دلائل موجود ہیں جو عالم کبیر میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱۵۔۷۰) کیا ہم نے تم کو سارے جہاں (کی حمایت وطرفداری سے) منع نہیں کیا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱۔۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۲۔۱۲۲) کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تم یعنی بنی اسرائیل کو ان کی ہمعصر اقوام پر فضیلت دی اور بعض نے اس دور کے فضلاء مراد لیے ہیں جن میں سے ہر ایک نوازشات الٰہی کی بدولت بمنزلہ ایک عالم کے تھا اور ان کو عَالَمٌ سے موسوم کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً﴾ (۱۶۔۱۲۰) ''بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے۔'' میں حضرت علیہ السلام ابراہیم کو اُمَّةٌ کہا ہے۔

(ع ل ن)

اَلْعَلَانِیَةُ: ظاہر اور آشکارا۔ یہ سِرٌّ کی ضد ہے اور عام طور پر اس کا استعمال معانی یعنی کسی بات کے ظاہر ہونے پر ہوتا ہے اور اجسام کے متعلق بہت کم آتا ہے۔ عَلَنَ كَذَا کے معنی ہیں: فلاں بات ظاہر اور آشکارا ہوگئی اور اَعْلَنْتُهٗ اَنَا: میں نے اسے آشکارا کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ﴾ (۷۱۔۹) میں انہیں برملا اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔

﴿مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ (۲۸۔۶۹) جو کچھ ان کے سینوں میں مخفی ہے اور جو یہ ظاہر کرتے ہیں۔

عِلْوَانُ الْكِتَابِ: جس کے معنی کتاب کے عنوان اور سرنامہ کے ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ عَلَنٌ سے مشتق ہو اور عنوان سے چونکہ کتاب کے مشمولات ظاہر ہوتے ہیں اس لیے اسے عِلْوَانٌ کہہ دیا گیا ہو۔

---

❶ الفتح للشوکانی (۲۱/۱) وعن الفراء وابو عبید العالم عباده عمن یعقل وهم اربعة اسم الانس والجن والملائكة والشیاطین

❷ هو ابو عبدالله جعفر الصادق بن محمد الباقر سیدهاشم فی زمنه وقد الف تلمیذه جابر بن حیان الصوفی کتاباً منتظم رسائله وهی خمسمائة رسالة توفی ۱۴۸ھ راجع شذرات ۱/ ۲۲۰

(ع ل و)

اَلْعُلُوُّ: کسی چیز کا بلند ترین حصہ۔ یہ سُفْلٌ کی ضد ہے ان کی طرف نسبت کے وقت عُلْوِیٌّ وَسُفْلِیٌّ کہا جاتا ہے اور اَلْعُلُوُّ بلند ہونا۔ عَالٍ صفت فاعلی، بلند عَلِیَ یَعْلٰی عَلاً عَلِیٌّ مگر عَلاَ (فَعَلَ) کا استعمال زیادہ تر کسی جگہ کے یا جسم کے بلند ہونے پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَالِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ﴾ (۷۶۔۲۱) ان کے بدنوں پر دیبا کے کپڑے ہوں گے۔

بعض نے عَلاَ اور عَلِیَ میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ عَلاَ (ن) محمود اور مذموم دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے لیکن عَلِیَ (س) صرف مستحسن معنوں میں بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۸۔۴) فرعون نے ملک میں سر اٹھا رکھا تھا۔

﴿لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ﴾ (۱۰۔۸۳) (اور فرعون) ملک میں متکبر اور متغلب اور (کبر وکفر میں) حد سے بڑھا ہوا تھا۔

﴿فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ﴾ (۲۳۔۴۶) تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔

﴿اَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ﴾ (۳۸۔۷۵) کیا تو غرور میں آ گیا یا اونچے درجے والوں میں تھا۔

﴿لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۸۔۸۳) جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے۔

﴿وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ (۲۳۔۹۱) اور ایک دوسرے پر غالب آجاتا۔

﴿اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ﴾ (۲۷۔۳۱) کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔

﴿وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا﴾ (۱۷۔۴) اور بڑی سرکشی کرو گے۔

﴿وَاسْتَیْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ (۲۷۔۱۴) اور بے انصافی اور غرور سے (ان کا انکار کیا) کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے۔

اَلْعَلِیُّ کے معنی بلند اور برتر کے ہیں یہ عَلِیَ (بکسر اللام) سے مشتق ہے جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت واقع ہو، جیسے۔

﴿وَهُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ﴾ (۳۴۔۲۳)

﴿اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا﴾ (۴۔۳۴) تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ ذات اس سے بلند و بالاتر ہے کہ کوئی شخص اس کا وصف بیان کر سکے بلکہ عارفین کا علم بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿تَعَالَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ﴾ (۲۷۔۶۳) یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خدا (کی شان) اس سے بلند ہے۔

اور یہاں تَعَالٰی باب تفاعل سے ہے جس کے معنی ہیں ''نہایت ہی بلند'' ورنہ یہاں تکلف کے معنی مقصود نہیں ہیں جیسا کہ جب یہ لفظ انسان کے متعلق استعمال ہو تو یہ معنی مراد لیے جاتے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا﴾ (۱۷۔۴۳) اور جو کچھ یہ بکواس کرتے ہیں اس سے (اس کا رتبہ) بہت عالی ہے۔

میں لفظ عُلُوًّا فعل تَعَالٰی کا مصدر نہیں ہے۔جیسا کہ آیت۔

﴿اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾ (۷۱۔۱۷) اور ﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ (۷۳۔۸) میں نَبَاتًا اور تَبْتِيْلًا مصدر (مِنْ غَيْرِ بَابِهٖ واقع ہوئے) ہیں۔

اَلْاَعْلٰی۔ سب سے بلند اور اشرف۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (۷۹۔۲۴) کہ تمھارا سب سے بڑا مالک میں ہوں۔

اَلاِسْتِعْلَاءُ: (استفعال) کبھی یہ مذموم غلبہ کی طلب کے لیے آتا ہے اور کبھی اس کے معنی طلبِ رفعت کے ہوتے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى﴾ (۲۰۔۶۴) اور آج جو غالب رہا وہی کامیاب ہے۔

میں دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں۔اور آیت کریمہ۔

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ (۸۷۔۱) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل القدر کے نام کی تسبیح کرو۔

پروردگار کے اَلْاَعْلٰی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اس بات سے بلند ہے کہ کسی مخلوق کو اس پر قیاس کیا جائے یا اسے دوسروں کی طرح سمجھا جائے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى﴾ (۲۰۔۴) اور اونچے اونچے آسمان بنائے۔

عُلٰی عُلْيَا کی جمع ہے اور عُلْيَا اَعْلٰی کی تانیث ہے اور معنی یہ ہیں کہ آسمان اس دنیا سے اشرف وافضل ہیں جیسے فرمایا:

﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا﴾ (۷۹۔۲۷) بھلا تمھارا بنانا آسان ہے یا آسمان کا؟ اسی نے اس کو بنایا۔اور آیت کریمہ۔

﴿لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ﴾ (۸۳۔۱۸) علیین میں ہیں۔میں بعض نے کہا ہے کہ عِلِّيِّيْنَ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام کا نام ہے جس طرح کہ سجین دوزخ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ طبقہ کا نام ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل اس کا اطلاق جنتی لوگوں پر ہوتا ہے اور قواعد عربی کے لحاظ سے یہی معنی اَقْرَبُ اِلَى الصَّوَابِ معلوم ہوتے ہیں۔کیونکہ یہ جمع (جمع سالم) ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے اور یہ عِلِّيٌّ بروزن بِطِّيْخٌ کی جمع ہے اور معنی ہیں کہ ابرار بھی عِلِّيِّيْن لوگوں کے زمرہ میں شامل ہوں گے۔جیسے فرمایا۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ﴾ (۴۔۶۹) آلایۃ وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیقین الخ ....اور معنی عُلُوٌّ کے لحاظ سے بلند مقام کو اور بلندی کو عَلْيَاء کہا جاتا ہے اور عُلَيَّةٌ اصل میں تو عَالِيَةٌ کی تصغیر ہے لیکن عرف میں بالا خانہ کو عُلِّيَّة کہا جاتا ہے اس کی جمع عَلَالِيٌّ بروزن فَعَالِيْلُ ہے تَعَالَى النَّهَارُ دن بلند ہوگیا۔ عَالِيَةُ الرُّمْحِ سِنَانٌ (بڑے نیزے) سے چھوٹا نیزہ۔

عَالِيَةُ الْمَدِيْنَةِ: مدینہ کی اعلیٰ جانب اس کی جمع عَوَال ہے اسی سے کہا گیا ہے۔

بُعِثَ اِلٰى اَهْلِ الْعَوَالِيْ کہ اہل عوالی کو بلا بھیجا اور

عَـالِیَۃٌ کی طرف نسبت کے وقت عُـلْوِیٌّ کہا جائے گا اور عَلَاۃٌ کے معنی سَنْدَان یعنی نہائی کے ہیں ❶ عام اس سے کہ وہ لوہے کی ہو یا پتھر کی۔ اَلْـعِـلْیَـانُ بڑا جسیم اونٹ۔

عَلَاوَۃُ الشَّیْءِ: کسی چیز کے اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں اسی سے سر اور گردن کو عِلَاوَۃٌ کہا جاتا ہے۔ نیز پورے بوجھ کے بعد اوپر سے جو زائد بوجھ رکھا جائے اسے بھی عِلَاوَۃٌ کہا جاتا ہے۔❷ عِلَاوَۃُ الرِّیْحِ: جو ہوا اوپر سے آئے۔ اس کی ضد سِفَالَۃٌ ہے۔ اَلْمُعَلّٰی قمار بازی کا ساتواں تیر جو سب سے اشرف اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ اُعْـلُ عَـنِّیْ: مجھ سے دور ہو جا۔

تَـعَـالَ: اس کے اصل معنی کسی کو بلند جگہ کی طرف بلانے کے ہیں۔ پھر عام بلانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں عُـلُـوٌّ ہے جس کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں لہٰذا جب کوئی شخص دوسرے کو تَـعَـالَ کہہ کر بلاتا ہے تو گویا وہ کسی رفعت کے حصول کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جیسا کہ مخاطب کا شرف ظاہر کرنے کے لیے اِفْـعَلْ کَذَا غَیْرَ صَاغِرٍ کہا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔

﴿قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا﴾ (۳۔۶۱) تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں......کو بلائیں۔

﴿تَـعَـالَـوْا اِلٰـی کَلِمَۃٍ﴾ (۳۔۶۴) (جو) بات (یکساں تسلیم کی گئی ہے اس کی) طرف آؤ۔

﴿تَـعَـالَـوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ﴾ (۴۔۶۱) جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف رجوع کرو۔ اور ......آؤ۔

﴿اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ﴾ (۲۷۔۳۱) کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔

﴿تَـعَـالَـوْا اَتْـلُ﴾ (۶۔۱۵۱) کہہ کہ (لوگو) آؤ میں (تمہیں) پڑھ کر سناؤں۔

تَعَلّٰی: بلندی پر چڑھ گیا۔ دور چلا گیا۔

کہا جاتا ہے عَـلَّیْتُہٗ فَتَـعَلّٰی: میں نے اسے بلند کیا، چنانچہ وہ بلند ہو گیا۔

عَلٰی

عَلٰی: یہ حروف جارہ سے ہے مگر کبھی بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے جیسے عَـدَتْ مِـنْ عَلَیْہِ: اس پر اوپر کی جانب سے حملہ کیا۔

(ع م م)

اَلْـعَـمُّ: (چچا) باپ کا بھائی (جمع اَعْـمَامٌ) اَلْـعَمَّۃُ (پھوپھی) باپ کی بہن (جمع عَـمَّـات) قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْ بُیُـوْتِ اَعْـمَـامِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِکُمْ﴾ (۲۴۔۶۱) یا اپنے چچاؤں کے گھر سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے۔

رَجُـلٌ مُـعِـمٌّ مُخْوِلٌ وہ شخص جس کے چچا اور ماموں ہوں یعنی ننہیال اور ددھیال کی طرف قوی ہو۔

اِسْتَـعَـمَّ عَـمًّـا وَ تَعَمَّمَہٗ کسی کو چچا بنانا دراصل یہ

---

❶ وفی الفائق (۲/۹۲) عطاء فی مہبط آدم قال: ھبط معہ بعلاۃ (فعلۃ من العلو)۔

❷ وذکر ابن ابی الدنیا فی العزاز وابن المندرک ق: انہ لمانزلت الذین اذااصابتھم مصیبۃ الآیۃ۔قال عمر رضی اللہ عنہ نعم العدلان ای الصلوت ورحمۃ ونعم الصلاۃ ای اولائك ھم المھتدون۔

عُمُوْم سے ہے جس کے معنی شامل ہونے کے ہیں اور یہ شامل ہونا باعتبار کثرت کے ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ عَمَّهُمْ كَذَا وَعَمَّهُمْ بِكَذَا عَمًّا وَعُمُوْمًا۔ یعنی وہ چیز عام ہوگئی اور پبلک کو اَلْعَامَّة کہا جاتا ہے کیونکہ شہر میں عامی لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے اور معنی شمول یعنی لپیٹنے کے اعتبار سے پگڑی کو اَلْعِمَامَة کہا جاتا ہے اور تَعَمَّمَ کے معنی سر پر پگڑی لپیٹنے کے ہیں جس طرح کہ تَقَنَّعَ وَتَقَمَّصَ کے معنی چہرہ پر پردہ ڈالنا یا قمیص پہننا کے آتے ہیں۔ عَمَّمْتُهٗ: میں نے اسے عمامہ پہنایا۔ اور کنایۃً اس کے معنی کسی کو سردار بنانا بھی آتے ہیں۔

شَاةٌ مُعَمَّمَةٌ: سفید سر والی بکری۔ گویا اس کے سر پر عمامہ بندھا ہوا ہے۔ اور یہ مُقَنَّعَةٌ وَمُخَمَّرَةٌ کی طرح استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

(۳۲۱) يَاعَامِرَ بنَ مَالِكٍ يَاعَمَّا
اَفْنَيْتَ عَما وَجَبَرْتَ عَمَّا

اے میرے چچا عامر بن مالک! تو نے بہت سے لوگوں کو فنا کیا اور بہت سے لوگوں پر بخشش کی۔ اور آیت کریمہ۔

عَمَّ يَتَسَاۗءَلُوْنَ (۷۸۔۱) (یہ) لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔

میں عَمَّ اصل میں عَنْ مَا تھا۔ اور یہ اس باب (ع م م) سے نہیں ہے۔

(ع م د)

اَلْعَمَدُ کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے اور اس پر ٹیک لگانا کے ہیں اور اَلْعِمَادُ وہ چیز ہے جس پر ٹیک لگائی جائے یا بھروسہ کیا جائے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ (۸۹۔۷) جو ارم (کہلاتے تھے اتنے) دراز قد۔

میں اَلْعِمَاد سے وہ چیزیں مراد ہیں جن پر انہیں بڑا بھروسہ تھا۔ محاورہ ہے: عَمَّدْتُ الشَّیْءَ: کسی چیز کو سہارا دے کر کھڑا کرنا۔ عَمَّدْتُ الْحَائِطَ: سہارا دیوار کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اَلْعَمُوْدُ اس لکڑی (بلی) کو کہتے ہیں جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کی جمع عُمُدٌ وَعَمَدٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ (۱۰۴۔۹) (یعنی آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں۔

اور ایک قراءت میں فِیْ عُمُدٍ ہے نیز فرمایا۔

﴿بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (۱۳۔۲) ستونوں کے بغیر...... جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔

نیز اَلْعَمُوْدُ ہر اس لکڑی یا لوہے کو کہتے ہیں جس پر سہارا لگا کر انسان کھڑا ہوتا ہے۔ عَمُوْدُ الصُّبْحِ: صبح کی ابتدائی روشنی کیونکہ یہ بھی ایک دم ستون کی طرح اوپر کو اٹھتی ہے۔ عرف میں اَلْعَمَدُ وَالتَّعَمُّدُ کے معنی قصداً کوئی کام کرنا آتے ہیں اور یہ سَهْو کی ضد ہے۔ [1] قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا﴾ (۴۔۹۳) اور جو کوئی شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔

﴿وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ (۳۳۔۵) لیکن جو قصد دل سے کرو۔ اور محاورہ ہے۔

فُلَانٌ رَفِيْعُ الْعِمَادِ: یعنی وہ دراز قامت ہے۔ اَلْعَمَدَةُ: ہر اس مال وغیرہ کو کہا جاتا ہے جس پر اعتماد کیا

[1] وقد جاء فی القران فی مقابلة الخطاء کمافی (۴/۹۲-۹۳/۴-۳۳/۵)

جائے اس کی جمع عُمُدٌ ہے اور عَمِیْدٌ وہ سردار جس پر معاملات میں لوگ بھروسہ کرتے ہوں اور عَمِیْدٌ: کے معنی حزین بھی آتے ہیں گویا کہ وہ غم کا مقصود ہے جس طرح بیمار کو سَقِیْم کہتے ہیں کہ وہ بیماری کا مقصود بنا ہوا ہوتا ہے۔ وَقَدْ عَمَدَ: اس نے حزن وملال، غصہ یا بیماری کی وجہ سے درد وکرب کا اظہار کیا۔ عَمَدَ الْبَعِیْرُ: پیٹھ کے زخمی ہونے کی وجہ سے اونٹ کراہنے لگا۔

(ع م ر)

اَلْعِمَارَةُ: یہ خَرَابٌ کی ضد ہے۔ عَمَرَ اَرْضَهٗ یَعْمُرُهَا عِمَارَةً: اس نے اپنی زمین آباد کی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۹۔۱۹) اور مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کو آباد کرنا۔

کہا جاتا ہے، عَمَّرْتُهٗ: میں نے اسے آباد کیا۔

فَعَمَّرَ: چنانچہ وہ آباد ہوگئی اور آباد کی ہوئی جگہ کو مَعْمُوْرٌ کہا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿وَعَمَرُوْهَا اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا﴾ (۳۰۔۹) اور اس کو اس سے زیادہ آباد کیا تھا جو انھوں نے آباد کیا۔

﴿وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ﴾ (۵۲۔۴) اور آباد کیے ہوئے گھر کی۔

اَعْمَرْتُهُ الْاَرْضَ وَاسْتَعْمَرْتُهٗ: میں نے اسے آباد کرنے کے لیے زمین دی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا﴾ (۱۱۔۶۱) اور اس میں آباد کیا۔

اور اَلْعَمْرُ وَالْعُمُرُ: اس مدت کو کہتے ہیں جس میں بدن زندگی کے ساتھ آباد رہتا ہے اور یہ بقا سے فروتر ہے چنانچہ طَالَ عُمُرُهٗ کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ اس کا بدن روح سے آباد ہے۔لیکن طَالَ بَقَاءُهٗ اس مفہوم کا متقضی نہیں ہے۔کیونکہ اَلْبَقَاءَ تو فَنَاء کی ضد ہے اور چونکہ بقاء کو عُمُر پر فضیلت ہے اس لیے حق تعالیٰ بقاء کے ساتھ تو موصوف ہوتا ہے مگر عُمُر کے ساتھ بہت کم متصف ہوتا ہے۔

اَلتَّعْمِیْرُ کے معنی ہیں: بالفعل عمر بڑھانا یا زبان کے ساتھ عَمَّرَكَ اللّٰهُ کہنا۔یعنی خدا تیری عمر دراز کرے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ﴾ (۳۵۔۳۷) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو سوچنا چاہتا سوچ لیتا۔

﴿وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖ﴾ (۳۵۔۱۱) اور نہ کسی بڑی عمر والے کو عمر زیادہ دی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے۔

﴿وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ﴾ (۲۔۹۶) اگر اتنی لمبی عمر اس کو مل بھی جائے تو اسے عذاب سے تو نہیں چھڑا سکتی۔اور آیت۔

﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ (۳۶۔۶۸) اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں اسے خِلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔

﴿حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ﴾ (۲۱۔۴۴) یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ان کی عمریں بسر ہوگئیں۔

﴿وَلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۸) اور تم نے برسوں ہمارے ہاں عمر بسر کی۔

اَلْعُمُرُ وَالْعَمْرُ کے ایک ہی معنی ہیں۔لیکن قسم کے موقعہ پر خاص کر اَلْعَمْر کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ عُمْر کا لفظ نہیں بولا جاتا جیسے فرمایا۔
﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ﴾ (۱۵۔۷۲) تمھاری زندگی کی قسم وہ اپنی مستی میں...... عَمَّرَكَ اللّٰهُ خدا تمھاری عمر دراز کرے یہاں بھی چونکہ قسم کی طرح تاکید مراد ہے اس لیے لفظ عَمَّر کو خاص کیا ہے۔
اَلِاعْتِمَارُ وَالْعُمْرَةُ کے معنی ملاقات کے ہیں کیونکہ ملاقات سے بھی محبت اور دوستی کا خانہ آباد ہوتا ہے اصطلاح شریعت میں حج کے علاوہ بیت اللہ کی زیارت اور طواف وسعی کرنے کو عُمْرَة کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ۔
﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ﴾ (۱۹۔۱۸) خدا کی مسجدوں کو تو...... آباد کرتے ہیں۔
میں يَعْمُرُ کا لفظ یا تو اَلْعِمَارة سے ہے، جس کے معنی آباد اور حفاظت کرنا ہیں اور یا اَلْعُمْرَةُ سے جس کے معنی زیارت کے ہیں اور یا عَمَرْتُ بِمَكَان كَذَا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں کیونکہ عَمَرْتُ الْمَكَانَ وَعَمَرْتُ بِالْمَكَان دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اَلْعِمَارَةُ کے معنی مخصوص خاندان کے ہیں اور یہ لفظ اَلْقَبِيْلَة سے اخص ہے یہ اصل میں انسانوں کی اس جماعت کا نام ہے جس سے مکان کی آبادی ہوتی ہے۔
شاعر نے کہا ہے۔❶ (الطویل)

(۳۲۲) لِكُلِّ أُنَاسٍ مِنْ مَّعَدٍّ عِمَارَةٌ

تمام لوگوں کا سلسلہ نسب بنی معد سے ملتا ہے۔ اَلْعَمَارُ: عمامہ یا پھول جو قوم کا سردار اپنی سرداری کی علامت اور اس کی حفاظت کے لیے سر پر رکھتا ہے اور بطور استعارۃ صرف پھولوں کو بھی عَمَارٌ کہا جاتا ہے گو بطور علامت نہ ہوں۔
اَلْمَعْمَرُ: رہائشی مکان کو کہتے ہیں بشرطیکہ اس میں کوئی آباد ہو اور اَلْعَرَمْرَمَةُ رفقاء کی اس جماعت کو کہتے ہیں جو جب کسی مقام پر فروکش ہو تو مقام آباد نظر آئے۔
اَلْعُمْرٰی: وہ عطیہ جو اس شرط پر دیا جائے کہ جب تک میری یا تمھاری زندگی ہے اس وقت تک اس سے فائدہ اٹھالو اس کے بعد واپس لے لیا جائے گا۔ جیسا کہ اَلرُّقْبٰی میں ہوتا ہے اور ایسے عطیہ کو عُمْرٰی کہنے سے اس کے مستعار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْعَمْرُ: مسوڑھوں کا گوشت۔ کیونکہ اس سے دانتوں کی درمیانی خلا پر اور آباد رہتی ہے۔اس کی جمع عُمُوْرٌ ہے أُمُّ عَامِرٍ۔ گفتار۔لگڑ بگڑ اَبُوْ عَمْرَة: مفلسی۔

(ع م ق)

اَلْعُمْقُ: دراصل اس کے معنی نیچے کی طرف دوری یعنی گہرائی کے ہیں اس لیے بہت گہرے کنویں کو بِئْرٌ عَمِيْقٌ کہا جاتا ہے۔راستے کی صفت ہو تو اس کے معنی دور دراز راستہ کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾ (۲۲۔۲۷) دور دراز راستے سے۔

---

❶ قاله الاخنس بن شهاب التغلبي الجاهلي وتمامه ......عروض اليهايلحوون وجانب الشطرفي اللسان (عمر) والمحكم (عرض) والبيت من كلمة مفضلية ۲۷ بيتاً برقم ٤١ معظمهافي الحماسة مع المرزوقي رقم ٢٤٨ وبعضها في المعجم البكري ٥٠٦ والبلدان (اسم: قضه) والبخلاء ٨٤ او البيت في جزيرة العرب للهمداني والسمط ٨٦٨

(ع م ل)

اَلْعَمَلُ: ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃً صادر ہو یہ فِعْل سے اخص ہے کیونکہ فِعْل کا لفظ کبھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں جن سے بلا قصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف اَلْبَقَرُ العوامِلُ: ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ❶ نیز عَمَل کا لفظ اچھے اور برے دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (۲۔۲۷۷) جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے......

﴿وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ﴾ (۲۰۔۱۱۲) اور جو نیک کام کرے گا۔

﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ﴾ (۴۔۱۲۳) جو شخص برے عمل کرے گا، اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائے گا۔

﴿وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ﴾ (۶۶۔۱۱) اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال (زشتہ مال) سے نجات بخشیں۔

﴿اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ﴾ (۱۱۔۴۶) وہ تو ناشائستہ افعال ہے۔

﴿وَالَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ﴾ (۳۵۔۱۰) اور جو برے برے مکر کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا﴾ (۹۔۱۶۰) اور کارکنان صدقات کا حق ہے۔میں عَامِلِیْنَ سے محکمہ زکوٰۃ کے کارندے مراد ہیں۔ جو زکوٰۃ وصدقات وصول کرنے پر مقرر ہوتے ہیں اور ان کی اجرت کو عُمَالَة کہا جاتا ہے۔

عَامِلُ الرُّمْحِ: نیزے کا وہ حصہ جو سنان (بھالا) سے متصل ہوتا ہے۔

اَلْیَعْمَلَةُ کے معنی تیز رو اونٹنی کے ہیں یہ بھی اَلْعَمْل سے مشتق ہے۔

(ع م ہ)

اَلْعَمَهُ کے معنی حیرانگی کی وجہ سے کسی کام میں تردد سے کام لینا کے ہیں

عَمِهَ (س) صیغہ صفت فاعلی عَمِهٌ وَعَامِهٌ اور عَامِهٌ کی جمع عُمَّهٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۔۱۵) وہ اپنی شرارت وسرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

﴿زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۷۔۴) ہم نے ان کے اعمال ان کے لیے آراستہ کر دیئے تو وہ سرگردان ہو رہے ہیں۔

(ع م ی)

اَلْعَمٰی: یہ بصارت اور بصیرت دونوں قسم اندھے پن کے لیے بولا جاتا ہے لیکن جو شخص بصارت کا اندھا ہو اس کے لیے صرف اَعْمٰی اور جو بصیرت کا اندھا ہو اس کے لیے اَعْمٰی وعَمٍ دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی﴾ (۸۰۔۲) کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔

میں اَلْاَعْمٰی سے مراد بصارت کا اندھا ہے مگر جہاں

---

❶ ویقال للناقة السریعة ناقة عملة و و یعملة کماقال عبدالله بن رواحة : ع یازید الیعملات الذبل

کہیں قرآن پاک نے اَلْعَمٰی کی مذمت کی ہے وہاں دوسرے معنی یعنی بصیرت کا اندھا پن مراد لیا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ﴾ (۲۔۱۸) یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔

﴿فَعَمُوْا وَصَمُّوْا﴾ (۵۔۷۱) تو وہ اندھے اور بہرے ہوگئے۔

بلکہ بصیرت کے اندھاپن کے مقابلہ میں بصارت کا اندھاپن۔ قرآن پاک کی نظر میں اندھاپن ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ (۲۲۔۴۶) بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اَلَّذِیْنَ کَانَتْ اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِکْرِیْ﴾ (۱۸۔۱۰۱) جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے اور کور بصری کے متعلق فرمایا۔

﴿لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ﴾ (۲۴۔۶۱) نہ تو اندھے پر کچھ گناہ ہے۔

اور اَعْمٰی کی جمع عُمْیٌ وَعُمْیَانٌ آتی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿بُکْمٌ عُمْیٌ﴾ (۲۔۱۸) گونگے اور اندھے ہیں۔

﴿صُمًّا وَّعُمْیَانًا﴾ (۲۵۔۷۳) اندھے اور بہرے ہوکر...... اور آیت کریمہ۔

﴿وَمَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا﴾ (۱۷۔۷۲) جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اور (نجات کے) رستے سے بہت دور۔

میں پہلا اَعْمٰی صیغہ صفت مشبہ ہے اور ثانی کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ بھی صیغہ صفت مشبہ ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَفْعَلُ مِنْ کَذَا سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے کیونکہ یہ اس اَلْعَمٰی سے مشتق ہے جس کے معنی فقدان بصیرت کے ہیں اس لیے اس میں مَا اَفْعَلَهٗ وَاَفْعَلُ مِنْ کَذَا دونوں طرح کہنا صحیح ہے مگر اس کے برعکس بعض نے آیت مذکور میں پہلے اَعْمٰی کو بصیرت کے اندھا پن اور دوسرے کو بصر کے اندھا پن پر محمول کیا ہے۔ یہ ابوعمرو کا قول ہے۔ اس لیے وہ پہلے اَعْمٰی میں امالہ کا قائل ہے کیونکہ یہ عَمَی الْقَلْبِ سے ہے اور دوسرے میں امالہ کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اسم ہے وَالْاِسْمُ اَبْعَدُ مِنَ الْاِمَالَةِ یعنی اسم میں امالہ جائز نہیں ہے۔ [1] نیز فرمایا۔

﴿وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَیْهِمْ عَمًی﴾ (۴۱۔۴۴) اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہرہ پن) ہے یہ ان کے حق میں (موجب) نابینائی ہے۔

---

[1] قال الزمخشری وقد جوزوان یکون الثانی بمعنی التفضیل: من ثم قرء ابو عمرو الاول ممالا (ای بالامالة) والثانی مفخماً ای بدون الاماله لان افعل التفضیل لما کان تامة بمن کانت الفه فی حکم الواقعة فی وسط الکلام کقولك اعمالکم واما الاول فلم یتعلق به شئی فکانت الفه واقعة فی الطرف معترضة للامالة انظر الکشاف (ص ٦٨٣ ج ٢) طبع الاستقامة القاهره (١٣٦٥ھ ١٢)

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ﴾ (۷۔۶۴) کچھ شک نہیں کہ وہ اندھے لوگ تھے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا﴾ (۱۷۔۹۷) اور ہم ان کو قیامت کے دن اوندھے منہ، اندھے، گونگے اور بہرے بنا کر اٹھائیں گے۔

میں بصر کا اندھا پن بھی مراد ہوسکتا ہے اور دل کی بصیرت کا زائل ہونا بھی عَمِيَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں: اس پر فلاں معاملہ اس طرح غیر واضح اور مشتبہ ہو گیا کہ گویا وہ اس سے اندھا ہے (اور وہ اسے سمجھائی نہیں دیتا) قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَآءُ يَوْمَئِذٍ﴾ (۲۸۔۶۶) تو وہ اس روز خبروں سے اندھے ہو جائیں گے۔

﴿وَاٰتَانِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ﴾ (۱۱۔۲۸) اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے رحمت بخشی ہے جس کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

اَلْعَمَاءُ: بادل، جہالت۔ بعض نے کہا ہے کہ روایت [1]:

((اَنَّهُ قِيْلَ اَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ خَلَقَ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ قَالَ عَمَاءٍ تَحْتَهُ عَمَاءٌ وَفَوْقَهُ عَمَاءٌ)) آپ سے پوچھا گیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا۔ فرمایا اَلْعَمَاء میں جس کے نیچے بھی عَمَاءٌ تھی اور اوپر بھی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جس کا علم حاصل نہیں ہوسکتا اور عَمِيَّةٌ کے معنی جہالت کے ہیں اور اَلْمَعَامِيْ مَعْمَاةٌ کی جمع ہے) اس ریگستان کو کہتے ہیں جس میں کوئی نشانِ راہ نہ ہو۔

(عن) (حرف)

عن: یہ حرف جار ہے اور اپنے مجرور سے تجاوز کو چاہتا ہے جیسے حَدَّثْتُكَ عَنْ فُلَانٍ (میں فلاں سے تمھارے سامنے بیان کر چکا ہوں) وَاَطْعَمْتُهٗ عَنْ جُوْعٍ (میں نے اسے بھوک سے کھلایا) ابومحمد البصری نے کہا ہے کہ عَنْ بلحاظ استعمال کے عَلٰى سے عام ہے کیونکہ یہ جہات، ستہ میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی عَلٰى بھی اس کی بجائے آجاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [2]

(۳۲۳) اِذَا رَضِيَتْ عَلَيَّ بَنُوْ قُشَيْرٍ

جب بنوقشیر مجھ سے راضی ہوں۔

اسی طرح اَطْعَمْتُهٗ عَلٰى جُوْعٍ وَكَسَوْتُهٗ عَلٰى عُرًى میں اگر عَنْ کی بجائے عَلٰى کہا جائے تو صحیح ہوگا۔

(ع ن ب)

اَلْعِنَبُ: (انگور) یہ انگور کے پھل اور اس کے درخت کے لیے بھی بولا جاتا ہے اس کا واحد عِنَبَةٌ ہے اور جمع اَعْنَابٌ قرآن میں ہے۔

---

[1] وفی الفائق (۲/۹۲) وزوائد ابن حبان رقم (۹۳) تحته هواء فوقه هواء کذافی ابن جریر والطبرانی وابی الشیخ فی العظمة عن ابی رزین راجع کنزالعمال رقم ۱۸۶ فلفظة الهواء اکثر ۱۲

[2] قاله القحیف بن سلیم العقیلی من کلمة یمدح فیهماحکیم بن المسیب القشیری وتمامه : لعمرالله اعجبنی رضاها۔ وبعده ولا تنبو سیوف بنی قشیر ولاتمضی الاسنة فی صفاهاوالبیت فی اللسان (رضی) والاقتضاب ۴۳۲ والکامل ۸۲۴،۵۸۳ وادب الکتاب ۴۵او الفرائد للآلوسی ۱۳۷ والبحر (۴۶۲/۵) والخزانة (۲۳۷:۴) وابن عقیل ۲۰۶ وابن هشام (۱۵۳:۱) وامالی ابن الشجری (۲۶۹:۲) والسیوطی (۴۲) او مجاز القران رقم ۶۳۵ ونوادر ابی زید والعینی (۲۸۲:۳) ۱۲

﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ﴾ (۱۶۔۶۷) اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی۔

﴿جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ﴾ (۱۷۔۹۱) کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو۔

﴿وَجَنَّاتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ﴾ (۱۳۔۴) اور انگوروں کے باغ۔

﴿حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا﴾ (۷۸۔۳۲) یعنی باغ اور انگور۔

﴿وَعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا﴾ (۸۰۔۲۷۔۲۸) اور انگور، ترکاری اور زیتون۔

﴿جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ﴾ (۱۸۔۳۲) انگور کے دو باغ۔

اور عِنَبَةٌ کے معنی پھنسی کے بھی آتے ہیں، جو شکل میں انگور کے دانہ کے مشابہ ہوتی ہے۔

(ع ن ت)

اَلْمُعَانَتَةُ: یہ مُعَانَدَة کے ہم معنی ہے یعنی باہم عناد اور دشمنی سے کام لینا لیکن مُعَانَتَة اس سے بلیغ تر ہے کیونکہ مَعَانَتَةٌ ایسے عناد کو کہتے ہیں جس میں خوف اور ہلاکت کا پہلو بھی ہو۔ چنانچہ عَنَتَ فُلَانٌ ۔ يَعْنَتُ عَنَتًا اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایسے معاملہ میں پھنس جائے جس میں تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ﴾ (۴۔۲۵) اس شخص کو ہے جسے ہلاکت میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ (۳۔۱۱۸) اور چاہتے ہیں کہ (جس طرح ہو) تمھیں تکلیف پہنچے۔

﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (۹۔۱۲۸) (۳۔۱۰۷) تمھاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ﴾ (۲۰۔۱۱۱) اور سب (کے) چہرے اس زندہ و قائم کے رو برو جھک جائیں گے۔

میں عَنَتْ کے معنی ذلیل اور عاجز ہو جانے کے ہیں اور اَعْنَتَهٗ کے معنی تکلیف میں مبتلا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ﴾ (۲۔۲۲۰) اور اگر خدا چاہتا تو تم کو تکلیف میں ڈال دیتا۔

اور جس ہڈی کو جوڑا گیا ہو اگر اسے کوئی صدمہ پہنچے اور وہ دوبارہ ٹوٹ جائے تو ایسے موقع پر بھی اَعْنَتَهٗ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(ع ن د)

اَلْعَنِيْدُ کے معنی اَلْمُعْجِبُ بِمَا عِنْدَهٗ کے ہیں یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر اترانے والا۔

اور مُعَانِدٌ اسے کہتے ہیں جسے جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر فخر ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ﴾ (۵۰۔۲۴) ہر سرکش ناشکرے کو۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيَاتِنَا عَنِيْدًا﴾ (۷۴۔۱۶) یہ ہماری آیتوں کا دشمن رہا ہے۔

بعض کے نزدیک اَلْعَنُوْد کے بھی یہی معنی ہیں صرف ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ عَنِيْدٌ اسے کہتے ہیں جو (حق سے) عناد رکھے اور (اس کی) مخالفت کرے اور عَنُوْدٌ وہ ہے جو صحیح راہ سے ہٹ جائے اس لیے بَعِيْرٌ عَنُوْدٌ (وہ اونٹ جو صحیح راہ سے ہٹ کر چلے) تو بولتے ہیں مگر

عَنِیْدٌ نہیں کہتے اور عُنَّدٌ عَانِدٌ کی جمع ہے اور عَنُوْدٌ کی جمع عِنْدَۃٌ اور عَنِیْدٌ کی جمع عِنْدٌ آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْعُنُوْدُ کے معنی راستہ سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ لیکن عَنُوْدٌ خاص کر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو حسی راستہ سے ہٹ جائے اور عَنِیْدٌ وہ ہے جو حکمی راہ سے ہٹا ہوا ہو عَنَدَ عَنِ الطَّرِیْقِ: اس نے راستہ سے عدول کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَانَدَ کے معنی کسی کو لازم پکڑنا بھی آتے ہیں اور اس سے الگ ہونا بھی۔ اور یہ دونوں دو مختلف اعتبار سے مشتق ہیں جیسا کہ اَلْبَیْنُ کا لفظ دو مختلف اعتباروں سے وصل کے معنی بھی دیتا ہے اور جدائی کے بھی۔

(عِنْدَ (ظرف))

عِنْدَ: یہ کسی چیز کا قرب ظاہر کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے کبھی تو مکان کا قرب ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے اور کبھی اعتقاد کے معنی ظاہر کرتا ہے جیسے عِنْدِیْ کَذَا اور کبھی کسی شخص کی قرب و منزلت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ﴾ (۳۔۱۶۹) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ﴾ (۷۔۲۰۹) جو لوگ تمھارے پروردگار کے پاس ہیں وہ ......وہ گردن کشی نہیں کرتے۔

﴿فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ﴾ (۴۱۔۳۸) جو (فرشتے) تمھارے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

﴿رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ﴾ (۶۶۔۱۱) اے میرے پروردگار میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

اور اسی معنی میں اَلْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے مقرب فرشتے) کا محاورہ ہے۔

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی﴾ (۴۲۔۳۶) اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے۔

﴿وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (۴۳۔۸۵) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

﴿وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتَابِ﴾ (۱۳۔۴۳) اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ ھُمُ الْکَاذِبُوْنَ﴾ (۲۴۔۱۳) تو خدا کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔

﴿وَتَحْسَبُوْنَهٗ ھَیِّنًا وَّھُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ﴾ (۲۴۔۱۵) اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔

اور آیت کریمہ۔

﴿اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ﴾ (۸۔۳۲) اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے برحق ہے۔ میں عِنْدَ بمعنی حکم ہے۔

(ع ن ق)

اَلْعُنُقُ: گردن۔ جمع اَعْنَاقٌ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ﴾ (۱۷۔۱۳) اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بہ صورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔

﴿مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾ (۳۸۔۳۳) ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے (لگے)۔

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ﴾ (۴۰۔۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے۔اور آیت کریمہ۔

﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ (۸۔۱۲) کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سروں پر مارو اور اسی سے دراز گردن آدمی کو رَجُلٌ اَعْنَقُ کہا جاتا ہے اِمْرَءَۃٌ عَنْقَاءُ دراز گردن عورت۔ کَلْبٌ اَعْنَقُ: سفید گردن کتا۔

اَعْنَقْتُهٗ کَذَا: میں نے اس کی گردن میں فلاں چیز ڈال دی اس سے بطور استعارہ اِعْتَنَقَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: کسی بات کی ذمہ داری اٹھا لینا۔کسی مسلک کو قبول کر لینا۔ اَلْاَعْنَاقُ کے معنی رؤسائے قوم کے ہیں۔چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ﴾ (۲۶۔۴) پھر ان کے اکابر عاجز و درماندہ ہو کر اس کے سامنے جھک جائیں۔

میں اَعْنَاق سے رؤساء و اکابرین قوم مراد ہیں۔ تَعَنَّقَ الْاَرْنَبُ: خرگوش نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اَلْعَنَاقُ بکری کا مادہ بچہ۔

عَنْقَاءُ مُغْرِبٌ: بعض نے کہا ہے کہ ایک خیالی پرند کا نام ہے جس کا وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا۔

(ع ن و)

﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ﴾ (۲۰۔۱۱۱) اور چہرے اس زندہ و قائم کے سامنے جھک جائیں گے ۔یعنی مصیبت میں گرفتار ہو کر خدا کے سامنے جھک جائیں گے اور عَنَيْتُهٗ کے معنی کسی کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے ہیں اور عَنِيَ کے معنی مصیبت میں مبتلا ہونا یا قیدی بننا کے آتے ہیں اسی سے قیدی کو اَلْعَانِيْ کہا جاتا ہے (اس کی مونث عَانِيَةٌ ہے اور عَانِيَةٌ کی جمع عَوان آتی ہے)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶ (۵۰) ((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ)) کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو۔ بے شک وہ تمھارے پاس ایک طرح سے قیدی ہیں۔محاورہ ہے: عُنِيَ بِحَاجَتِهٖ فَهُوَ مَعْنِيٌّ بِهَا (کسی حاجت میں مبتلا ہونا) بعض نے عُنِيَ فَهُوَ عَانٍ کہا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾ (۸۰۔۳۷) میں ایک قراءت يُعْنِيْهِ بھی ہے یعنی اسے مصروف رکھے گی۔

اَلْعَنِيَّةُ: ایک دوا جو خارشی ہونٹ پر ملی جاتی ہے۔مثل مشہور ہے۔❷

عَنِيَّةٌ تَشْفِي الْجَرَبَ: درحق مرد نیک رائ گویند کہ بفکر خود امور را نیک انجام و بد۔

اَلْمَعْنٰى: مفہوم یا مقصود جو لفظ سے ظاہر ہوتا ہے ہو۔یہ عَنَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ کے محاورہ سے مشتق ہے۔

---

❶ وفي الكشاف فانهن عوان في ايديكم الحديث (۱/۲۵۸) وفي الترمذي والنسائي وابن ماجه من حديث عمرو بن الاحوص في خطبة حجة الوداع وفيها فانهن عوان عندكم روى ابو يعلى والبزار والطبري من رواية موسى بن عبيدة الزندي (واحد الضعفاء) عن ابن عمرؓ مرفوعا: النساء عوان في ايديكم انظر تخريج احاديث الكشاف (ص ۴۰۔۴۱) رقم ۳۳۵ وتخريج العراقي (ص ۴۲ ج ۲) ورواه مسلم من حديث جابر الطويل۔

❷ قال الميداني (۲/۱۸) العنية بول البعير يطلى به الاجرب والمثل يضرب للرجل الجيد الرأي ليستشفي برايه فيما ينوب انظر للمثل الفائق (۲/۹۷)

جس کے معنی ہیں: زمین نے پودے نمودار کیے۔
عَـنَـتِ الْـقِـرْبَـةُ مشک سے پانی بہہ پڑا۔اور جولوگ عِـنْـوَانُ الْكِتَابِ کو عُـنِـیَ سے مشتق مانتے ہیں ان کے نزدیک یہ بھی عَـنَـتِ الْقِرْبَةُ سے ماخوذ ہے اور لفظ اَلْـمَعْنٰى اور التفسیر کا تقریباً ایک ہی مفہوم ہے گو ان میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔

(ع ھ د)

اَلْـعَهْدُ (ض) کے معنی ہیں: کسی چیز کی پیہم نگہداشت اور خبر گیری کرنا۔اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عَـهْـدٌ کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاَوْفُـوْا بِـالْـعَهْـدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً﴾ (۱۷۔۳۴) اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔
﴿لاَ يَـنَـالُ عَهْـدِی الظّٰـالِمِيْنَ﴾ (۲۔۱۲۴) کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہوسکتی۔
﴿وَمَـنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ (۹۔۱۱۱) اور خدا سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔
عَهِـدَ فُلاَنٌ اِلٰـى فُلاَنٍ: کسی سے عہد و پیمان لے کر اسے اس پر قائم رہنے کی تاکید کرنا۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰى اٰدَمَ﴾ (۲۰۔۱۱۵) اور ہم نے...... آدم (علیہ السلام) سے عہد لیا تھا۔
﴿اَلَـمْ اَعْهَـدْ اِلَيْكُمْ﴾ (۳۶۔۶۰) ہم نے تم سے کہہ نہیں دیا تھا؟......
﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْآ اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَا﴾ (۳۔۱۸۳) جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم سے عہد لے رکھا ہے۔
﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ﴾ (۲۔۱۲۵) اور ابراہیم علیہ السلام ......کو کہا اور عَهْـدُ اللّٰهِ (خدائی عہد) سے مراد کبھی تو وہ صلاحیت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری عقلوں میں راسخ کر دی ہے اور کبھی اس سے مراد وہ احکام ہوتے ہیں، جن کا کہ پیغمبروں نے کتاب وسنت کے ذریعہ حکم دیا ہے اور کبھی اس سے مراد وہ عبادات بھی ہوتی ہیں جن کی بجا آوری شرعاً واجب نہ ہو بلکہ ہم اپنی طرف سے اسے اپنے اوپر لازم کریں، جیسے نذر وغیرہ، چنانچہ آیات۔
﴿وَمِـنْهُـمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ﴾ (۹۔۷۵) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے خدا سے عہد کیا تھا۔
﴿اَوَ كُـلَّـمَـا عَاهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ (۲۔۱۰۰) ان لوگوں نے (جب خدا سے) عہدِ واثق کیا تو ان میں سے ایک فریق نے اس کو پھینک دیا۔
﴿وَلَـقَـدْ كَـانُـوْا عَـاهَـدُوا اللّٰـهَ مِنْ قَبْلُ﴾ (۳۳۔۱۵) حالانکہ پہلے اللہ سے اقرار کر چکے تھے۔
میں یہی معنی مراد ہیں اور کفار میں سے جو شخص معاہدہ کے وقت مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوا سے مُعَاهِدٌ یا ذوعہد کہا جاتا ہے۔حدیث میں ہے۔[1] (۵۱) ((لاَ يُـقْتَـلُ مُؤْمِنٌ بِـكَـافِرٍ وَلاَ ذُوْعَهْدٍ فِیْ عَهْدِهٖ)) کہ کسی مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی معاہد کو مدت عہد کے اندر مارا جائے اور حفاظت اور پابندی کے اعتبار سے اس وثیقہ کو بھی عُهْـدَةٌ کہا جاتا ہے جو فریقین عہد و پیمان کے وقت باہم لکھ لیتے ہیں اور محاورہ ہے۔
فِـیْ هٰـذَ الْاَمْـرِ عُهْـدَةٌ یعنی وہ معاملہ ہے جس کی نگہداشت کا حکم دیا گیا ہو اور دیکھ بھال کے اعتبار سے بارش کو بھی

---

[1] متفق علیه من حدیث معقل بن یسار و رواه ابن ماجة۔ عن ابن عباسؓ ۱۲

عَهْدٌ وَعِهَادٌ کہا جاتا ہے اور رَوْضَةٌ مَعْهُودَةٌ کے معنی ہیں: وہ باغ جس پر بارش ہوئی ہو۔

(ع ھ ن)

اَلْعِهْنُ کے معنی رنگین اون کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (۱۰۔۵) دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح۔

یہاں صرف رنگ کے اعتبار سے پہاڑوں کو رنگدار اون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّهَانِ﴾ (۵۵۔۵۷) تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا۔ میں بیان ہو چکا ہے۔

رَمٰی بِالْکَلَامِ عَلٰی عَوَاهِنِهٖ: بے سوچے سمجھے بات کرنا فکر وغور کیے بغیر بات کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے: اَوْرَدَ کَلَامَهٗ غَیْرَ مُفَسَّرٍ: کہ اس نے اپنی بات کی وضاحت نہیں کی۔

(ع و ج)

اَلْعَوْجُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے سیدھا کھڑا ہونے کی حالت سے ایک طرف جھک جانا کے ہیں۔ جیسے عُجْتُ الْبَعِیْرَ بِزِمَامِهٖ: میں نے اونٹ کو اس کی مہار کے ذریعہ ایک طرف موڑ دیا۔ فُلَانٌ مَایَعُوْجُ عَنْ شَیْءٍ یَهُمُّ بِهٖ یعنی فلاں اپنے ارادے سے باز نہیں آتا۔

اَلْعَوْجُ: اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے بسہولت دیکھا جا سکے جیسے کھڑی چیز میں ہوتا ہے مثلاً لکڑی وغیرہ اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو صرف عقل و بصیرت سے دیکھا جا سکے جیسے صاف میدان کی ناہمواری کو غور وفکر کے بغیر اس کا ادراک نہیں ہو سکتا یا معاشرہ میں دینی اور معاشی ناہمواریاں کہ عقل وبصیرت سے ہی ان کا ادراک ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ﴾ (۳۹۔۲۸) (یہ) قرآن عربی (ہے) جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں ہے۔

﴿وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ (۱۸۔۱) اور اس میں کسی طرح کی کجی (اور پیچیدگی) نہ رکھی۔

﴿وَالَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ (۷۔۴۵) جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں......

اور کنایہ کے طور پر کج خلق آدمی کو بھی اَعْوَجُ کہا جاتا ہے۔

اَلْاَعْوَجِیَّةُ یہ اَعْوَج گھوڑے کی طرف منسوب ہے جو جاہلی عرب میں مشہور تھا۔

(ع و د)

اَلْعَوْدُ: (ن) کسی کام کو ابتداء کرنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف پلٹنے کو عَوْدٌ کہا جاتا ہے خواہ وہ پلٹنا بذاتہٖ ہو یا قول وعزم سے ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۰۷) اے پروردگار! ہم کو اس میں سے نکال دے اگر ہم پھر (ایسے کام) کریں تو ظالم ہوں گے۔

﴿وَلَوْرُدُّوْا لَعَادُوْالِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ (۶۔۲۸) اگر یہ (دنیا میں) لوٹائے بھی جائیں تو جن (کاموں) سے ان کو منع کیا گیا تھا وہی کرنے لگیں۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ﴾ (۵۔۹۵) اور جو پھر (ایسا کام) کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا۔

﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ﴾ (۳۰۔۲۷) اور وہی تو ہے جو خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَأُولٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (۲۔۲۷۵) اور جو پھر (سود) لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔

﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ (۱۷۔۸) اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے۔

﴿وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ﴾ (۸۔۱۹) اور اگر پھر (نافرمانی) کرو گے تو ہم بھی پھر (تمھیں عذاب) کریں گے۔

﴿اَوْلَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا﴾ (۷۔۸۸) یا تم ہمارے مذہب میں آجاؤ۔

﴿اِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظَالِمُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۰۷) اگر ہم پھر (ایسے کام) کریں تو ظالم ہوں گے۔

﴿اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ﴾ (۷۔۸۹) اگر ہم...... تمھارے مذہب میں لوٹ جائیں۔

﴿وَمَا يَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَا﴾ (۷۔۸۹) اور ہمیں شایان نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآءِ هِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ (۵۸۔۳) اور جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں، پھر اپنے قول سے رجوع کریں۔

میں اہل ظاہر کہتے ہیں کہ يَعُوْدُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ عورت سے ایک مرتبہ ظہار کرنے کے بعد اگر دوبارہ اسے وہی کلمہ کہے۔ تب اس پر کفارۂ ظہار لازم آتا ہے [1] لہٰذا ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ کا جملہ فَاِنْ فَآءُوْا کی طرح ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عَوْدٌ فِي الظِّهَارِ یہ ہے کہ ظہار کے بعد عورت سے جماع کرے [2] اور امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک یہاں عَوْدٌ کے معنی ہیں ظہار کے بعد عورت کو اتنی مدت تک روک رکھنا جس میں اسے طلاق دے سکتا ہو، لیکن طلاق نہ دے۔ [3] بعض متاخرین نے کہا ہے کہ ظہار بھی ایک طرح کی قسم ہے اور اس کے معنی ہیں کہ خاوند کہے کہ اگر میں فلاں کام کروں تو میری بیوی میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پشت، پھر اس کے بعد اگر وہ اس کام کا ارتکاب کرے تو وہ حانث ہو جائے گا اور آیت ظہار میں بیان کردہ کفارہ کا ادا کرنا اس پر لازم ہوگا۔ لہٰذا آیت۔

﴿ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ (۵۸۔۳) کے معنی یہ ہوں گے کہ جس کام کے نہ کرنے کی انھوں نے قسم کھائی تھی اس کی طرف پلٹیں یعنی اپنی قسم توڑنا چاہیں اور یہ ایسے

---

[1] قال في الطبرسي ۷/۲۸ وعن ابي العاليه وبكير بن عبدالله الاشج و هو مذهب اهل الظاهر لان لفظ العوديدل على تكرير القول وَرَدّه ابو علي الفارسي راجع الفتح للشوكاني والمحلىٰ

[2] العزم على وطئها كما اروى عن قتادة وهو المشهور عن الحنيفة واليه ذهب مالك وائمة البيتؑ راجع الطبرسي وروح المعاني (۷/۲۸)۔

[3] لان السكوت الى زمان يمكنه، ان يطلق فيه ندم منه على ما ابتداء وهو يعود على ماابتداء ه والحاصل ان العود بمعنى الندم كما قال ابن عباس راجع الطبرسي والروح۔

ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: فُلَانٌ حَلَفَ ثُمَّ عَادَ یعنی اس نے وہ کام کیا جس کے نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ ❶ اور اخفش رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ لِمَا قَالُوْا کا تعلق فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ سے ہے اس سے بھی اس آخری قول کی تائید ہوتی ہے نیز اخفش رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس قسم کو توڑنے کے بعد اس پر کفارہ لازم ہوگا جیسا کہ اللہ کی قسم اٹھانے کے بعد اس پر کفارہ لازم آتا ہے ❷ جو کہ آیت کریمہ۔ ﴿فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ﴾ (۵۔۸۹) تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے۔ میں مذکورہ ہے۔

اَلْاِعَادَةُ کے معنی لوٹانا کے ہیں، مثلاً بات وغیرہ کو لوٹانا جیسے فرمایا۔ ﴿سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى﴾ (۲۰۔۲۱) ہم اس کو (بھی) اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ ﴿اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ﴾ (۱۸۔۲۰) یا پھر اپنے مذہب میں داخل کر لیں گے۔

اَلْعَادَةُ: کسی فعل یا انفعال کو بار بار کرنا حتی کہ وہ طبعی فعل کی طرح سہولت سے انجام پا سکے۔ اسی لیے بعض نے کہا ہے کہ عَادَہ طبیعت ثانیہ کا نام ہے۔ اَلْعِيْدُ: وہ ہے جو بار بار لوٹ کر آئے۔ اصطلاح شریعت میں یہ لفظ یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ پر بولا جاتا ہے۔ چونکہ شرعی طور پر یہ دن خوشی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ❸ (۵۲) ((اَيَّامُ اَكْلٍ وَشُرْبٍ وَبِعَالٍ)) کہ عید کے دن کھانے پینے اور جماع سے لطف اندوز ہونے کے دن ہیں اس لیے ہر وہ دن جس میں کوئی شادمانی حاصل ہو اس پر عید کا لفظ بولا جانے لگا ہے چنانچہ آیت کریمہ۔ ﴿اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا﴾ (۵۔۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان (نعمت) نازل فرما۔ ہمارے لیے (وہ دن) عید قرار پائے۔ میں عِيْدٌ سے شادمانی کا دن ہی مراد ہے اور اَلْعِيْدُ اصل میں (خوشی یا غم کی) اس حالت کو کہتے ہیں جو بار بار انسان پر لوٹ کر آئے اور اَلْعَائِدَةُ ہر اس منفعت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی چیز سے حاصل ہو۔

اَلْمَعَادُ کے معنی لوٹنے کے ہیں اور لوٹنے کی جگہ یا زمانہ کو بھی اَلْمَعَادُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ﴾ (۲۸۔۱۰۵) (اے پیغمبر) جس (اللہ) نے تم پر قرآن پاک (کے احکام) کو فرض کیا وہ تمھیں بازگشت کی جگہ لوٹا دے گا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مَعَاد سے مکہ مکرمہ مراد ہے مگر اس کے صحیح معنی وہ ہیں جن کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی ذکر کیے

❶ ذکرہ اصحاب الفروع فی ذیل تعلیق الظھار وھو یصح عند الشافعیہ وکذا فی بعض الصور عند الحنفیۃ۔

❷ ففی الآیۃ تقدیم وتاخیر وھو کثیر فی التنزیل الطبرسی (۷/۲۸) والروح (۹/۲۸)

❸ الفائق (۱/۵۵) والحدیث باختلاف الفاظ فی مسلم واحمد عن کعب بن مالك والدارقطنی عن انس وعبداللہ بن حذافۃ السھمی والنسائی عن ابن مسعود بن الحکم عن امہ ومعناہ النھی فی ایام التشریق عن صیامھا وفی روایۃ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی یوم العید خاصۃ الا ان المؤلف فھم ان وزانھا وزان یومی عید فاطلق الحدیث واللہ اعلم۔

ہیں کہ اس سے جنت مراد ہے۔ جس میں آنحضرت ﷺ کو بالقوہ اس وقت پیدا کیا تھا جب کہ آپ ﷺ صلب آدم علیہ السلام میں تھے پھر وہاں سے عالم دنیا میں لاکر آنحضرت ﷺ کو دنیا پر جلوہ گر کیا گیا۔ جیسا کہ آیت۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ (۷۔۱۷۲) الآیۃ میں مذکور ہے۔

اور اَلْعَوْدُ: عمر رسیدہ اونٹ کو عَوْدٌ یا تو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سیر وعمل کا تکرار کر چکا ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ اس پر متواتر سالہا سال گزر چکے ہوتے ہیں۔ پہلی توجیہ کے لحاظ سے اَلْعَوْدُ (مصدر) بمعنی فاعل ہوگا۔ اور دوسرے اعتبار سے بمعنی مفعول نیز عَوْد پرانے راستہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس پر بار بار سفر ہو چکا ہوتا ہے اور عَوْدٌ سے ہی عِيَادَةُ الْمَرِيْضِ مشتق ہے جس کے معنی تیمارداری کے ہیں۔

عِيْدِيَّةٌ: وہ اونٹ جو عِيْدٌ نامی سانڈ کی نسل سے ہوں۔

اَلْعُوْدُ: بعض نے کہا ہے کہ عُوْد اصل میں اس لکڑی کو کہتے ہیں جسے اگر کاٹ دیا جائے تو اس میں دوبارہ بڑھنے کی قوت ہو، پھر یہ لفظ خاص کر مزمار یعنی ستار یا اس لکڑی پر بولا جانے لگا ہے جس سے دھونی دی جائے۔

(ع و ذ)

اَلْعَوْذُ (ن) کے معنی ہیں: کسی کی پناہ لینا اور اس سے چمٹے رہنا۔ محاورہ ہے:

عَاذَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ: فلاں نے اس کی پناہ لی۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (۲۔۶۷) کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں۔

﴿وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ﴾ (۴۴۔۲۰) اور اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کروا اپنے اور تمھارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ (۱۱۳۔۱) کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

﴿اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ﴾ (۱۹۔۱۸) میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔

اور اَعَذْتُهٗ بِاللّٰهِ اُعِيْذُهٗ کے معنی دوسرے کو اللہ کی پناہ میں دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ﴾ (۳۔۳۶) میں اس کو...... تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ (۱۲۔۲۳) (کہ خدا پناہ میں رکھے۔) کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ کی پناہ لیتے ہیں اور اس قسم کے برے کام سے بچنے کے لیے اس سے مدد مانگتے ہیں کیونکہ یہ گناہ کا کام ہے جس کے ارتکاب سے ہمیں کنارہ کش رہنا چاہیے۔

اَلْعَوْذَةُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی چیز سے بچاؤ حاصل کیا جائے، اسی سے تَمِيْمَة یعنی تعویذ اور رُقْيَة یعنی دم جھاڑ کو عَوْذَةٌ کہا جاتا ہے اور عَوَّذَهٗ کے معنی کسی کو (خطرہ سے) بچانے کے ہیں اور ہر وہ مادہ جس نے حال ہی میں بچہ دیا ہوا سے سات دن تک عَائِذٌ کہا جاتا ہے۔

(ع و ر)

اَلْعَوْرَةُ: انسان کے مقام ستر کو کہتے ہیں مگر اس کے یہ معنی کنائی ہیں اصل میں یہ عار سے مشتق ہے اور مقام ستر کے کھلنے سے بھی چونکہ عار محسوس ہوتی ہے اس لیے اسے عَوْرَة

کہا جاتا ہے اور عورت کو بھی عورت اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے بے ستر رہنے کو باعث عار سمجھا جاتا ہے اسی سے بری بات کو عوراء کہا جاتا ہے۔

عَوِرَتْ عَيْنُهٗ عَوَرًا وَعَارَتْ عَيْنُهٗ عَوْرًا: اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ عَوَّرْتُهَا: میں نے اسے بھینگا کردیا۔ اسی سے بطور استعارہ عَوَّرْتُ الْبِئْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: مٹی ڈال ڈال کر کنوئیں کا پانی خشک کر دینا اور مجازاً انظر کی تیزی کی وجہ سے کوے کو اَلْاَعْوَر کہا جاتا ہے جیسے کسی لفظ کو اس کی ضد میں استعمال کر لیتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الخفیف)

(۳۲٤) وَصِحَاحُ الْعُيُوْنِ يُدْعَيْنَ عُوْرًا

تندرست آنکھوں والے آدمیوں کو بھینگا کہا جاتا ہے۔

اَلْعَوَارُ وَالْعَوْرَةُ کے معنی کپڑے یا مکان وغیرہ میں شگاف کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَّمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ﴾ (۳۳-۱۳) کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے۔ یعنی ان میں جگہ جگہ رخنے پڑے ہوئے ہیں جن میں سے جو چاہے ان کے اندر گھس سکتا ہے اسی سے محاورہ ہے۔ فُلَانٌ يَحْفَظُ عَوْرَتَهٗ کہ فلاں اپنے خلل کی حفاظت کرتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ﴾ (۲۴-۵۸) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے کے ہیں۔

میں ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ سے پردہ کے تین اوقات مراد ہیں یعنی دوپہر کے وقت۔ عشاء کی نماز کے بعد اور صبح کی نماز سے پہلے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ﴾ (۲۴-۳۱) (یا ایسے لڑکوں سے) جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں۔

سے مراد نابالغ لڑکے ہیں جن میں ہنوز جنسیات کے متعلق باتوں کا شعور پیدا نہ ہوا ہو۔ سَهْمٌ عَائِرٌ وہ تیر جو نامعلوم طرف سے آئے لِفُلَانٍ عَائِرَةٌ مِنَ الْمَالِ فلاں کے پاس اتنا زیادہ مال ہے کہ اس کی فراوانی آنکھ کو حیرت زدہ اور خیرہ کر دیتی ہے۔ ❷ اَلْمُعَاوَرَةُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی مستعار لینے کے ہیں اور اسی سے عَارِيَّةٌ بروزن فَعْلِيَّةٌ ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے، تَعَاوَرُوا الْعَوَارِيَّ: استعمال کی چیزیں باہم لینا دینا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عار سے مشتق ہے چونکہ کوئی چیز مستعار دیگر اس کا واپس لینا بھی موجب عار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اسے عَارِيَّةٌ کہا جاتا ہے مثل مشہور ہے کہ عَارِيَّةٌ (مستعار لی ہوئی چیز) سے کسی نے دریافت کیا کہ کدھر جا رہی ہو تو اس نے کہا: میں اپنے اہل کے لیے مذمت اور عار لینے جا رہی ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ عَارِيَّةٌ کا مادہ وادی ہے جیسا کہ تَعَاوَرْنَا کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے اور عَارٌ کا مادہ یائی ہے۔ جیسا کہ

---

❶ قاله الكميت وصدره، والحوار التمام ذالسر منهـ ن...... وفي المطبوع يدعون مصحف والتصويب من المراجع والبيت في المحاضرات للمؤلف۔ (٤: ٦٧٣) والمعاني للقبتي ٢٥٨ والعجز في اللسان والتاج (عور) بغير عزو و قبله: نطعم الجيال اللهيدمن الكوم ولم ندع من يشيط الجزورا۔

❷ انظر للمثل الميداني ٢/٧ وفي تاويله اختلاف اختر نامنه تاويل ابى حاتم ١٢

عَیَّرْتُہٗ بِکَذَا کے محاورہ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ع و ق)

اَلْعَـائِقُ: وہ جو لوگوں کو خیر اور بھلائی سے روکنے والا ہو لوگوں کو ان کے مقاصد سے روک کر اپنی طرف متوجہ کر لیں اور عَـاقَـہٗ عَـوَّقَہٗ وَاعْتَاقَہٗ: اس نے اسے روک دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَـدْ یَعْلَمُ اللّٰہُ الْمُعَوِّقِیْنَ﴾ (۳۳۔۱۸) خدا تم میں سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو لوگوں کو منع کرتے ہیں۔ یعنی جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکتے اور منع کرتے ہیں۔ رَجُـلٌ عَـوْقٌ وَعَوْقَۃٌ جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکے۔

﴿یَـعُـــوْقُ﴾ (۷۱۔۲۳) قبیلہ بنی کنانہ اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے) ایک بت کا نام (تھا)۔

(ع و ل)

عَـالَـہٗ وَغَـالَہٗ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن اَلْـغَـوْلُ کا لفظ اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ جو انسان کو ہلاک کر ڈالے اور اَلْعَوْلُ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو انسان کو گرانبار کر دے اور اس کے بوجھ تلے وہ دب جائے۔ محاورہ ہے۔

مَاعَالَکَ فَھُوَ عَائِلِیْ: کہ جو چیز تجھ پر بار ہے وہ مجھ پر بھی گراں بار ہے اور اسی سے عَـوْل ہے۔ جس کے معنی حق استحقاق سے زیادہ لے کر بے انصافی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰـی اَنْ لَّاتَعُوْلُوْا﴾ (۴۔۳) اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔ ❶

اور اسی سے عَـالَـتِ الْفَرِیْضَۃُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ترکہ کی تقسیم کے وقت وارثوں کے مقررہ حصے دینے کے بعد کچھ مال بچ جانے کے ہیں۔ اَلتَّـعْوِیْلُ کے معنی کسی مشکل کام میں دوسروں پر اعتماد کرنے کے ہیں اسی سے عَـوْلٌ ہے جس کے معنی بھاری مصیبت کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

وَیْـلَــہٗ وَعَـوْلَـہٗ: ہائے اس کی مصیبت۔ اور اسی سے اَلْـعِیَالُ یعنی وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو جن کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہو اس کا مفرد عَیِّـلٌ ہے عَـالَہٗ اس نے فلاں کے اخراجات کا بوجھ اٹھایا۔ اسی سے نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔❷ (۵۳) ((اِبْـدَءْ بِـنَفْسِكَ ثُـمَّ بِـمَنْ تَعُوْلُ)) کہ پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو اور پھر ان پر جن کے اخراجات تمھارے ذمہ ہیں۔ اَعَــالَ الرَّجُلُ وہ آدمی کثیر العیال ہو گیا۔

(ع و م)

اَلْـعَامُ (سال) اور السَّنۃ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن اَلسَّـــنَۃُ کا لفظ عموماً اس سال پر بولا جاتا ہے جس میں

---

❶ من العول المقابل للعدل یقال عال الحاکم اذا جار وعال المیزان اذا مال من جانب الی جانب وایضاً عال الرجل اذا کثرت عیاله وبه قال الشافعی فی تفسیر الآیة والنقد علیه من الحریری فی درته من سوء الادب فان الشافعی اعلم باللغة منه ومن اضرابه راجع الجمل (۱/ ۴۶۲) وروح المعانی (۴/۱۷۵) وشرح الدرة الخفاجی (۲۰۵۔۲۰۶)۔

❷ والخبر فی الدرة للحریری قال الخفاجی فی شرح ۲۰۵ وهو بعض حدیث رواه الطبرانی والحدیث فی الاصل متفق اما لفظ "اِبْدَ بنفسك" فرواه فی (هب ، ن عن جابر) وفی روایة عنه فلیبدأ بنفسه (حم، م، د، ت) ولم یروه الاجابر واما لفظة ((وابد أبمن تعول)) فور وفی حدیث "الید العلیا خیر" وفی "خیر الصدقة ما کان عن ظهر غنی" اور وهما لجمیع الطرق علی المتقی فی کنز (۹ ج ۶ رقم ۲۱۶۔ ۲۲۱)۔

تکلیف یا خشک سالی ہو اس بنا پر قحط سالی کو سَنَةٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور عَامٌ اس سال کو کہا جاتا ہے جس میں وسعت اور فراوانی ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ﴾ (۱۲۔۴۹) اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی اور لوگ اس میں نچوڑیں گے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ (۲۹۔۱۴) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔ میں لفظ سَنَة کو مستثنیٰ منہ اور لفظ عَامُ کو مستثنیٰ لانے میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے ہم اس کتاب کے بعد کسی دوسرے موقع پر بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ۔ اور عَوْمٌ (ن) کے معنی پانی میں تیرنا بھی آتے ہیں چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ سال کو بھی عَامٌ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس مدت میں سورج اپنے تمام برجوں میں تیر لیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ (۳۶۔۴۰) سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔ میں يَسْبَحُونَ کے لفظ سے اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔

(ع و ن)

اَلْعَوْنُ (کے معنی کسی کی مدد اور پشت پناہی کرنا کے ہیں (نیز عَوْنٌ مددگار) کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ عَوْنِي یعنی فلاں میرا مددگار ہے قَدْ أَعَنْتُهُ (افعال) میں نے اس کی مدد کی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ﴾ (۱۸۔۹۵) تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو۔

﴿وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ﴾ (۲۵۔۴) اور دوسرے لوگوں نے اس میں اس کی مدد کی۔

اَلتَّعَاوُنُ: ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵۔۲) نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔

اَلْاِسْتِعَانَةُ: مدد طلب کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ (۲۔۳) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔

اَلْعَوَانُ: ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں۔ قرآن مین ہے۔

﴿عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ﴾ (۲۔۶۸) بلکہ ان کے بین بین یعنی ادھیڑ عمر کی۔

اور کبھی بطور کنایہ کے عمر رسیدہ عورت کو بھی عَوَانٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (البسیط)

(۳۲۵) فَإِنْ أَتَوْكَ فَقَالُوْا إِنَّهَا نَصَفٌ
فَإِنَّ أَمْثَلَ نِصْفَيْهَا الَّذِيْ ذَهَبَا

اگر تمھارے پاس آ کر کہیں کہ ادھیڑ عمر ہے تو تم کہو اس کی عمر کا بہترین حصہ تو گزر چکا ہے۔

اور استعارۃً جو جنگ کئی سال تک جاری ہے اور پرانی ہو

---

[1] البیت فی اللسان والتاج بغیر عزو وفی روایة اطیب بدل امثل وغیر ابدل ذهبا والبیت ایضاً فی المحاضرات للمولف (۳: ۲۰۳) والحماسة مع المرزوقی رقم ۸۷۰ مع آخر وفی التبریزی "وان" بدل فان واختلف فی قرینه ففی الحماسة قبله: لاتنکحن عجوزا وان اتوك بها واخلع ثيابك منه معنا هريا۔ وفی اللسان وفیه اقواء: لا تنکحن عجوزا او مطلقة ولا یسوقنهافی حبلك القدر ۱۲۔

جائے اسے بھی عَـوَانٌ کہا جاتا ہے۔ نیز پرانی کھجور کو بھی عَوَانَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

اَلْعَانَةُ: گورخراس کی جمع عَانَاتٌ وَعُوْنٌ ہے اَلْعَانَةُ موئے زہار۔ اس کی تصغیر عُوَیْنَةٌ ہے۔

(ع ی ب)

اَلْعَیْب وَالْعَابُ: نقص اور خرابی، ہر وہ حالت جس سے کسی چیز میں نقص پیدا ہو جائے اور عِبْتُـهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے عیب دار کر دیا، جیسے فرمایا۔

﴿فَـاَرَدْتُ اَنْ اَعِیْبَهَـا﴾ (۱۸۔۷۹) تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں۔

نیز عِبْتُـهٗ کسی چیز کی مذمت کرنے اور اس کا عیب ظاہر کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے عِبْتُ فُـلَانًا (میں نے اس کی مذمت کی)۔

اور عَیْبَةٌ (بیگ) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز چھپا کر رکھی جائے اسی سے نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ (۵۴)❶

((اَلْاَنْـصَـارُ کَرْشِیْ وَعَیْبَتِیْ)) کہ انصار میرے مخزن اسرار ہیں۔

(ع ی ر)

اَلْعِیْرُ: قافلہ جو غذائی سامان لاد کر لاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ غلہ بردار اونٹوں اور ان کے ساتھ جو لوگ ہوتے ہیں ان کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے مگر کبھی اس کا استعمال صرف ان اونٹوں پر ہوتا ہے جو غذائی سامان اٹھا کر لاتے ہیں اور کبھی ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو کہیں سے غذائی سامان لاتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

﴿فَـلَـمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ﴾ (۱۲۔۹۴) جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا۔

﴿اَیَّتُهَـا الْـعِیْـرُ اِنَّکُمْ لَسَارِقُوْنَ﴾ (۱۲۔۷۰) کہ قافلے والو! تم چور ہو۔

﴿وَالْـعِیْـرَ الَّتِـیْ اَقْبَـلْنَا فِیْهَا﴾ (۱۲۔۸۲) اور جس قافلے میں ہم آئے۔

اور عِیْـرٌ کا لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) گورخر (۲) پاؤں کی پشت پر ابھری ہوئی ہڈی (۳) آنکھوں کی پتلی (۴) کان کی پچھلی طرف ابھری ہوئی نرم ہڈی (۵) خس و خاشاک جو پانی کے اوپر جمع ہو جاتا ہے (۶) میخ (۷) تیر کے پھل کا درمیانی حصہ جو اوپر ابھرا ہوا ہوتا ہے الغرض گو عِیْـرٌ کا لفظ ان سب معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر ان معانی میں باہم مناسبت بیان کرنا تکلف اور تعسف سے خالی نہیں۔

اَلْمِعْیَارُ: ناپ یا تول جانچنے کا معیار۔ اسی سے محاورہ ہے: عَیَّرْتُ الدَّنَانِیْرَ: اشرفیوں کو کسوٹی پر پرکھنا عَیَّرْتُهٗ: میں نے اس کی مذمت کی۔ یہ عَارٌ سے مشتق ہے۔ تَـعَـایَرَ بَـنُـوْفُلَانٍ انھوں نے ایک دوسرے کو عار دلائی یا ایک دوسرے کے عیب بیان کیے۔ بعض نے کہا ہے کہ دراصل تَـعَـایَرَ کے معنی ہیں: گورخر کی طرح ایک دوسرے سے دور بھاگنا اور بدکنا اور اسی سے عَـارَتِ الدَّابَّةُ تَعِیْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں جانور کا بدک کر بھاگ جانا۔ کہا جاتا ہے فُـلَانٌ عَیَّـارٌ: فلاں آوارہ گرد یا غنڈہ ہے۔

---

❶ کلمة من حدیث فی الفائق (۲/۱۹۷) رواہ النسائی عن اسید بن حضیر وانس والترمذی والبخاری و مسلم عن انس بن مالک وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح وتتمته: ((ولولا الهجرة لکنت امرء من الانصار)) راجع غریب ابی عبید (۱/۱۳۷)

(ع ی س)

﴿عِیْسٰی﴾ (۳۔۴۴۔۵۴) یہ ایک پیغمبر کا نام اور اسم علم ہے اگر یہ لفظ عربی الاصل مان لیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ یہ اس عِیْسٌ سے ماخوذ ہو جو کہ اَعْیَسُ کی جمع ہے اور اس کی مونث عَیْسَاءُ ہے اور عِیْسٌ کے معنی ہیں سفید اونٹ جن کی سفیدی میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے عَیْسٌ سے مشتق ہو جس کے معنی سانڈ کے مادہ منویہ کے ہیں اور بَعِیْرٌ اَعْیَسُ وَنَاقَةٌ عَیْسَاءُ (جمع عِیْسٌ اور عَاسَهَا یَعِیْسُهَا کے معنی ہیں: نر کا مادہ سے جفتی کھانا۔

(ع ی ش)

اَلْعَیْشُ: خاص کر اس زندگی کو کہتے ہیں جو حیوان میں پائی جاتی ہے اور یہ لفظ اَلْحَیَاة سے اخص ہے کیونکہ اَلْحَیَاة کا لفظ حیوان، باری تعالیٰ اور ملائکہ سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور اَلْعَیْشُ سے لفظ اَلْمَعِیْشَةُ ہے جس کے معنی ہیں: سامان زیست کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جن پر زندگی بسر کی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (۴۳۔۳۲) ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا۔

﴿مَعِیْشَةً ضَنْكًا﴾ (۲۰۔۱۲۴) اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔

﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ﴾ (۱۵۔۲۰) اور ہم ہی نے تمھارے لیے اس میں زیست کے سامان پیدا کر دیئے۔

﴿لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ﴾ (۷۔۱۰) تمھارے لیے اس میں سامان زیست۔

اور اہل جنت کے متعلق فرمایا۔

﴿فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ﴾ (۱۰۱۔۷) وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور نبی علیہ السلام نے فرمایا۔[1] (۵۵) ((لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَةِ)) کہ حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہی ہے۔

(ع ی ل)

اَلْعَیْلَةُ کے معنی فقر و فاقہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً﴾ (۹۔۲۸) اگر تم کو مفلسی کا خوف ہو۔

عَالَ الرَّجُلُ یَعِیْلُ: وہ آدمی محتاج اور ضرورت مند ہوگیا۔ عَائِلٌ: محتاج، ضرورت مند۔ مگر اَعَالَ (افعال) جس کے معنی کثیر العیال ہونے کے ہیں اجوف وادی (ع و ل) سے ہے۔ اور آیت۔

﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰی﴾ (۹۳۔۸) اور تجھے ضرورت مند پایا تو غنی کر دیا۔

میں عَائِلًا کے معنی ہیں: تجھ سے فقر نفس کو دور کر کے تجھے غنائے اکبر عطا کی، چنانچہ آپ ﷺ نے اس غنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔[2] (۵۶) ((اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ)) (کہ اصل غنی تو نفس کی بے نیازی ہے)

---

[1] الحديث صدر البيت الذي تمثل به رسول الله ﷺ يوم الخندق الا ان في الصحيحين: الاهم ان العيش عيش الآخرة۔ فارحم الانصار والمهاجره والرجز لرجل من المسلمين وروى: اللهم لاخير إِلَّا خَيْرَ الْأَخِرة فانصر الانصار والمهاجره وفي رواية فاغفر وفي رواية فاغفر رواية فاكرم انظر تخريج العراقي (٢/ ٢٧٤) وايضاً في حجة الوداع رواه الشافعي مرسلا والحاكم متصلا (تخريج العراقي (٤/ ١٠٣)

[2] واصل الحديث متفق عليه ورواه الترمذي من حديث ابي هريرة وقال حسن صحيح (٢/ ٦٠) وابن حبان في زوائده (٢٥٢٠)

کہا جاتا ہے۔
مَاعَالَ مُقْتَصِدٌ: اعتدال سے خرچ کرنے والا کبھی فقیر نہیں ہوتا۔ مگر بعض نے آیت کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنی رحمت اور عفو کا محتاج پا کر تمھارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے اور تجھے اپنی مغفرت سے بہرہ وافر عطا فرما کر غنی کر دیا۔

(ع ی ن)

اَلْعَیْنُ کے معنی آنکھ کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔
﴿اَلْعَیْنُ بِالْعَیْنِ﴾ (۵۔۴۵) آنکھ کے بدلے آنکھ۔
﴿لَطَمَسْنَا عَلٰی اَعْیُنِهِمْ﴾ (۳۶۔۶۶) ان کی آنکھوں کو مٹا (کر اندھا) کر دیں۔
﴿وَاَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ (۵۔۸۳) ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔
﴿قُرَّةُ عَیْنٍ لِّیْ وَلَكَ﴾ (۲۸۔۹) (یہ) میری اور تمھاری (دونوں کی) آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
﴿كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا﴾ (۲۰۔۴۰) تا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اور عَیْنٌ کے معنی شخص اور کسی چیز کا محافظ کے بھی آتے ہیں اور فُلَانٌ بِعَیْنِیْ کے معنی ہیں۔ فلاں میری حفاظت اور نگہبانی میں ہے۔ جیسا کہ هُوَ بِمَرْأَی مِنِّیْ وَمَسْمَعٍ کا محاورہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا﴾ (۵۲۔۴۸) تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔
﴿تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا﴾ (۵۴۔۱۴) وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی۔
﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ﴾ (۲۰۔۳۹) اور اس لیے کہ تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔
اور اسی سے عَیْنُ اللّٰهِ عَلَیْكَ ہے جس کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ تمھاری حفاظت اور نگہداشت فرمائے۔ یا اللہ تعالیٰ تم پر اپنے نگہبان فرشتے مقرر کرے جو تمھاری حفاظت کریں اور اَعْیُنٌ وَعُیُوْنٌ دونوں عین کی جمع ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُكُمْ﴾ (۱۱۔۳۱) اور نہ ان کی نسبت جن کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ کہتا ہوں کہ۔
﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ﴾ (۲۵۔۷۴) اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔
اور استعارہ کے طور پر عَیْنٌ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو مختلف اعتبارات سے آنکھ میں پائے جاتے ہیں۔
(۱) مشکیزہ کے سوراخ کو عَیْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہیئت اور اس سے پانی بہنے کے اعتبار سے آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ پھر اس سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے۔
سِقَاءٌ عَیِّنٌ وَمُعِیْنٌ: پانی کی مشک جس سے پانی ٹپکتا ہو عَیِّنْ قِرْبَتَكَ: اپنی نئی مشک میں پانی ڈالو تا کہ تر ہو۔ کر اس میں سلائی کے سوراخ بھر جائیں۔
(۲) جاسوس کو عَیْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دشمن پر آنکھ لگائے رہتا ہے جس طرح کہ عورت کو فَرْجٌ اور سواری کو ظَهْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ ان دونوں سے مقصود یہی دو چیزیں ہوتی ہیں چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانٌ یَمْلِكُ كَذَا فَرْجًا وَكَذَا ظَهْرًا (فلاں کے پاس) اس قدر لونڈیاں

اور اتنی سواریاں ہیں۔ (۳) عین بمعنی سونا بھی آتا ہے کیونکہ یہ جواہر میں افضل سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ اعضاء میں آنکھ سب سے افضل ہوتی ہے اسی سے افاضل قوم کو اَعْیَانٌ کہا جاتا ہے اور ماں باپ دونوں کی طرف سے حقیقی بھائیوں کو اَعْیَانُ الْاِخوَۃِ کہا جاتا ہے۔

(۴) بعض نے کہا ہے کہ عَیْنٌ کا لفظ جب ذات شے کے معنی میں استعمال ہو جیسے کُلُّ مَالِہٖ عَیْنٌ تو یہ معنی مجازی ہوگا، جیسا کہ غلام کو رَقَبَۃٌ (گردن) کہہ دیا جاتا ہے اور عورت کو فَرْجٌ (شرمگاہ) کہہ دیتے ہیں کیونکہ عورت سے مقصود یہی جگہ ہوتی ہے۔

(۵) پانی کے چشمہ کو بھی عَیْنٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پانی ابلتا ہے جس طرح کہ آنکھ سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور عَیْنُ الْمَاءِ سے مَاءٌ مَعِیْنٌ کا محاورہ لیا گیا ہے۔ جس کے معنی جاری پانی کے ہیں جو صاف طور پر چلتا ہوا دکھائی دے اور عَیْنٌ کے معنی جاری چشمہ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا﴾ (۷۶۔۱۸) یہ بہشت میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے۔

﴿وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا﴾ (۵۴۔۱۲) اور زمین میں چشمے جاری کر دیے۔

﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ﴾ (۵۵۔۵۰) ان میں دو چشمے بہ رہے ہیں۔

﴿عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ﴾ (۵۵۔۶۶) دو چشمے ابل رہے ہیں۔

﴿وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ﴾ (۳۴۔۱۲) اور ان کے لیے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا تھا۔

﴿فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ﴾ (۱۵۔۴۵) باغ اور چشموں میں۔

﴿مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ﴾ (۴۴۔۲۵،۲۶) باغ اور چشمے اور کھیتیاں۔

عِنْتُ الرَّجُلَ کے معنی ہیں: میں نے اس کی آنکھ پر مارا۔ جیسے رَأَسْتُہٗ کے معنی ہوتے ہیں: میں نے اس کے سر پر مارا اور فَأَدْتُہٗ: میں نے اس کے دل پر مارا نیز عِنْتُہٗ کے معنی ہیں: میں نے اسے نظر بد لگادی جیسے سَفَتُّہٗ کے معنی ہیں: میں نے اسے تلوار سے مارا، یہ اس لیے کہ اہل عرب کبھی تو اس عضو سے فعل مشتق کرتے ہیں جس پر مارا جاتا ہے اور کبھی اس چیز سے جو مارنے کا آلہ ہوتی ہے جیسے سِفْتُہٗ وَرَمَحْتُہٗ۔ چنانچہ یَدَیْتُہٗ کا لفظ ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی میں نے اسے اپنے ہاتھ سے مارا یا اس کے ہاتھ پر مارا اور عِنْتُ الْبِئْرَ کے معنی ہیں: کنواں کھودتے کھودتے اس کے پانی کے چشمہ تک پہنچ گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ﴾ (۲۳۔۵۰) ایک اونچی جگہ پر جو رہنے کے لائق تھی اور نتھرا ہوا پانی جاری تھا۔

﴿فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ﴾ (۶۷۔۳۰) تو (سوائے خدا کے) کون ہے جو تمھارے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہا لائے۔

بعض نے کہا ہے کہ مَعِیْنٌ میں لفظ میم حروف اصلیہ سے ہے اور یہ مَعَنْتُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: کسی چیز کا سہولت سے چلنا یا بہنا اور عَیْن کا لفظ بطور استعارہ ترازو کے جھکاؤ پر بھی بولا جاتا ہے اور وحشی گائے کو آنکھ کی

خوب صورتی کی وجہ سے اَعْیَنُ وَعَیْنَاءُ کہا جاتا ہے اس کی جمع عِیْـنٌ ہے پھر گاوان وحشی کے ساتھ تشبیہ دے کر خوبصورت عورتوں کو بھی عِیْـنٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَـاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِیْنٌ﴾ (۳۷۔۴۸) جو نگاہیں نیچی رکھتی ہوں (اور) آنکھیں بڑی بڑی۔

﴿وَحُـوْرٌ عِیْـنٌ﴾ (۵۶۔۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

(ع ی ی)

اَلْاِعْیَـاءُ کے معنی اس درماندگی اور تکان کے ہیں جو چلنے سے پیدا ہو جاتی ہے اور عِـیٌّ کے معنی کسی کام یا بات کو نہ کرسکنا کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَفَـعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ (۵۰۔۱۵) کیا ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے ہیں۔

﴿وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ﴾ (۴۶۔۳۳) اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں اور اسی سے ہے: عَیَّ فِیْ مَنْطِقِهٖ عَیًّـا فَهُوَعَـیٌّ۔جس کے معنی سخن سے عاجز ہونے کے ہیں۔ رَجُـلٌ عَیَایَاءُ طِبَاقَاءُ: مرد جو سخن اور کام کرنے سے عاجز ہو دَاءٌ عَیَاءٌ لاعلاج مرض۔

❀❀❀

کتابُ الغَین

(غ ب ر)

اَلْغَابِرُ: اسے کہتے ہیں جو ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جائے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغَابِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۷۱) مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے: غَابِرِیْنَ سے عمر رسیدہ لوگ مراد ہیں اور بعض نے اس سے پیغمبر کے مخالفین لوگ مراد لیے ہیں جو (سدوم میں) پیچھے رہ گئے تھے اور لوط علیہ السلام کے ساتھ نہیں گئے تھے بعض نے عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے والے لوگ مراد لیے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مقام پر۔

﴿اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِیْنَ﴾ (۲۹۔۳۳) بجز ان کی بیوی کے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی۔ اور دوسرے مقام پر:

﴿قَدَّرْنَا اِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِیْنَ﴾ (۱۵۔۶۰) اس کے لیے ہم نے ٹھہرا دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جائے گی۔

فرمایا ہے اور اسی سے غُبْرَةٌ ہے جس کے معنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ کے ہیں۔ اس کی جمع اَغْبَارٌ آتی ہے غُبَّرُ اللَّیْلِ: رات کا بقیہ۔ غُبَّرُ الْحَیْضِ: حیض کا بقیہ۔

اَلْغُبَارُ (مٹی اڑنے کے بعد جو گردو غبار (فضا میں) باقی رہ جاتا ہے، اسے غبار کہا جاتا ہے۔ یہ دُخَانٌ اور عُثَارٌ وغیرہما (فعال) کے وزن پر ہے جو کہ بقیہ شے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور غَبَرَ الْغُبَارُ کے معنی ہیں گردو غبار بلند ہونا اور اُڑنا کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ غَابِرٌ: کا لفظ ماضی اور باقی (مستقبل) دونوں پر بولا جاتا ہے اس قول کو صحیح مان لینے کی صورت میں یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ غبار بھی چونکہ زمین سے اٹھ کر اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے غَابِرٌ بمعنی ماضی آجاتا ہے اور دوڑتے ہوئے چونکہ غبار پیچھے باقی رہ جاتا ہے اس لحاظ سے غَابِرٌ بمعنی باقی یعنی مستقبل آجاتا ہے۔ اور غبار سے غَبْرَةٌ مشتق ہے اور اس کے معنی یا تو اس گردو غبار کے ہیں جو کسی چیز پر جم جاتا ہے اور خاکستری رنگ کی چیز کو بھی غَبَرَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت۔

﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ﴾ (۸۰۔۴۰) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑی ہوئی ہوگی۔

میں بطور کنایہ حسرت آگیں چہرے سے مراد ہیں جو غم کے باعث افسردہ نظر آئیں گے جس طرح کہ ﴿ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا﴾ (۱۶۔۵۸) میں چہرہ کے سیاہ پڑنے سے غمناک ہونا مراد ہے کہا جاتا ہے۔ غَبَرَ، غَبَرَةً وَاغْبَرَّ وَاغْبَارَّ: غبار آلود ہونا اور طرفہ کے شعر ❶ (الطّویل)

(۳۲۶) رَأَیْتُ بَنِیْ غَبْرَاءَ لَا یُنْكِرُوْنَنِیْ

---

❶ وفی اضدا وابی الطیب ۵۲۷ یاتی بمعنی الباقی والماضی والاول اکثر واعرف وعده العلماء من الاضداد۔

فقراء اور مہمان مجھے اجنبی خیال نہیں کرتے ہیں اور نہ اغنیاء مجھ سے ناواقف ہیں۔

میں بَنِیْ غَبْرَاءَ سے ریگستانوں میں رہنے والے لوگ مراد ہیں۔ ❶ جو ہر وقت غبار آلود رہتے ہیں جیسا کہ بنو السبیل سے مراد مسافر ہوتے ہیں۔اور دَاهِيَةٌ غَبْـــرَاء (بڑی مصیبت کا) محاورہ یا تو غَبَرَ الشَّیْءُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی غبار میں واقع ہونے کے ہیں گویا مصیبت بھی انسان کو غبر آلود کر دیتی ہے اور ہوش سنبھالنے نہیں دیتی اور یا یہ غَبْــرٌ سے مشتق ہے جس کے باقی رہنے کے ہیں اس اعتبار سے غَبَرَآءُ اس مصیت کو کہا جائے گا جو باقی رہے اور گزرنے نہ پائے اور یا یہ غَبَـرَةُ اللَّوْن سے مشتق ہے جس طرح کہ دَاهِيَةٌ زَبَاء کا محاورہ ہے اور یا غَبَرَةُ اللبن سے جس کے معنی تھنوں میں بقیہ دودھ کے ہیں۔ اور ان سب اشتقاقات کے اعتبار سے غَبْـرَاءُ اس مصیبت کو کہا جائے گا جو گزر جانے کے بعد بھی اپنا اثر چھوڑ جائے اور یا یہ عِــرْقٌ غَبِـرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیہم تڑپنے والی رگ کے ہیں چنانچہ جاتا ہے (غَبِرَ الْعِرْقُ) رگ پھڑکی۔ اَلْـغُبَيْرَاءُ نوع از گیاہ ریگستانی، ثمرہ گیاہ جو غبار کے رنگ پر ہوتا ہے۔

(غ ب ن)

اَلْــغَبْـنُ (ض) کے معنی باہمی معاملہ میں پوشیدہ طور پر اپنے ساتھی کا حق مارنے کے ہیں ❷ اگر یہ کسی مال وغیرہ میں ہو تو غَبَـــنَ فُلَانٌ کہا جاتا ہے اور اگر رائے وغیرہ میں ہو تو غَبِنَ کہتے ہیں اور غَبَنْتُ كَذَا غَبْنًا کے معنی کسی چیز سے غفلت برتنے کو خسارا خیال کرنے کے ہیں اور قرآن پاک میں ﴿يَوْمُ التَّغَـابُنْ﴾ (۶۴۔۹) نقصان اٹھانے کا دن سے يَـوْمُ الْقِيَامَةِ مراد ہے کیونکہ قیامت کے روز اس مبایعت (معاملہ) میں جس کی طرف کہ آیت:

﴿وَمِـنَ الـنَّـاسِ مَـنْ يَشْـرِىْ نَفْسَـهُ ابْتِغَـآءَ مَـرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۰۷) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۱۱) آلآیۃ خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں۔

﴿اَلَّـذِيْـنَ يَشْتَـرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَـلِيْلاً﴾ (۳۔۷۷) جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں کو (بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

میں اشارہ فرمایا ہے نقصان ظاہر ہوگا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اس معاملہ کو جو انھوں نے اپنے اللہ

---

❶ وتمامه ولا اهل، بذك الطراف الممدد ۔ والبيت من معلقته المشهورة التی مطلعما: لخولة اطلال ببرقة ثهمد۔ تلوح كباقی الوشم فی ظاهر اليد قال المبردارا د ببنی غبراء لـلصوص والمشهور المرادمنه الفقراء والاضياف بالبيت فی الخزانة (۴: ۲۲۸) والـلسـان وشـرح ابـن الانـبـاری (۱۹۲) والـمعانی للقتبی ۲۴۸ والعشر للتبريزی۔ ۸ ومختار الشعرا الجاهلی (۱/۲۳۱) والعينی (۱: ۴۱۰) والفائق (۲: ۸۰) والجمهرة ۵۵ والعقد الثمين ۵۷ والانباری ۴۸۰۔

❷ قـال الـحريری الغبن باسكان الباء فی المال وبفتحها يقع فی العقل و الرأی قـال الخفاجی وهذا ماذهب اليه بعض اهل اللغة و ليس المتعين ۱۲۔

کے ساتھ کیا تھا، چھوڑ کر اس کی بجائے متاع دنیا حاصل کر کے انھوں نے کس قدر نقصان اٹھایا ہے کسی سے دریافت کیا گیا کہ قرآن پاک میں قیامت کو یَوْمُ التَّغَابُنِ کیوں کہا گیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کیونکہ وہاں ان مقادیر (پیمانوں) کے خلاف اشیاء کا ظہور ہو گا جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگایا کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصل میں غَبْنٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اور اَلْغَبَنُ (بفتح الباء) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپائی جائے اور دلیل میں یہ شعر پیش کیا ہے۔ ❶ (المنسرح)

(۳۲۷) وَلَمْ اَرَمِثْلَ الْفِتیَانِ فِیْ غَبَنِ
الرَّأْیِ یُنْسٰی عَوَاقِبُھَا

اس رائے کے چھپانے میں نوجوانوں جیسا کوئی نہیں دیکھا جس کے نتائج کو بھلا دیا جائے۔

چنانچہ مڑنے والے اعضاء جیسے بغل اور کنج ران وغیرہ کو مغابن کہا جاتا ہے کیونکہ اعضاء کے یہ حصے بھی پوشیدہ رہتے ہیں اور (نفاست پسند) عورت کو طَیِّبَۃُ الْمَغَابِنِ کہا جاتا ہے۔

(غ ث و)

اَلْغُثَاءُ: ہانڈی کے جھاگ اور اس کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں جسے سیلاب بہا کر لاتا ہے اور یہ ہر اس چیز کے لیے ضرب المثل ہے جسے (بوجہ بے سود ہونے کے) ضائع ہونے دیا جائے ❷ اور اس کی کچھ بھی پرواہ نہ کی جائے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ غَثَاالْوَادِیْ (ن) غَثْوًا: یعنی وادی میں کوڑا کرکٹ زیادہ ہو گیا۔ غَثَتْ (ض) نَفْسُہٗ تَغْثِیْ غِثْیَانًا اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔

(غ د ر)

اَلْغَدْرُ (ض) اس کے اصل معنی کسی چیز میں خلل واقع کرنے اور اسے چھوڑ دینے کے ہیں اور تَرْکُ الْعَھْدِ یعنی بے وفائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی سے فُلَانٌ غَادِرٌ (بے وفا) کا محاورہ ہے۔ غَادِرٌ کی جمع غَرَرَۃٌ ہے۔ اور بہت بڑے بے وفا اور عہد شکن کو غَدَّارٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْاَغْدَرُ وَالْغَدِیْرُ اس پانی کو کہتے ہیں جو سیلاب کسی جوہڑ میں چھوڑ جائے غَدِیْرٌ کی جمع غُدْرَانٌ وَغُدُرٌ: آتی ہے اور اِسْتَغْدَرَ الْغَدِیْرُ کے معنی ہیں: تالاب میں پانی جمع ہو گیا۔

غَدِیْرَۃٌ: لمبے بال، گیسو بافتہ اس کی جمع اَلْغَدَائِرُ ہے اور غَادَرَہٗ کے معنی ہیں اس نے اسے چھوڑ دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّا اَحْصَاھَا﴾ (۱۸۔۴۹) نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔

﴿فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْھُمْ اَحَدًا﴾ (۱۸۔۴۷) تو ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے۔

غَدَرَتِ الشَّاۃُ (عَنِ الْغَنَمِ) کے معنی بکری کے

❶ قالہ عدی بن زید مناۃ والبیت فی امالی ابن الشجری وشرح الدرۃ للخفاجی ۲۔۳ وفی روایتھا...... فی غبن اللہ ایام ینسون ماعواقبھا والبیت فی الشعراء ۵۲ والعمدۃ (۱:۱۰۴) والاغانی (۲/۱۴۸) والمعانی الکبیر للقبتی ۱۲۷۰ قال وغبن الایام ما یغبن منھما فینقضی ان عملوا فیہ لآخرتھم وبعدہ: ما یغفلوا لایکن لھم یتم فی کل صرف تسعی ماربھا ولم ارفی المراجع من رواہ بروایۃ المؤلف فاخشی ان تکون الروایۃ محرفۃ۔

❷ وفی القرآن فجعلتھم غثاء (۲۳۔۴۱)

دوسری بکریوں سے پیچھے رہ جاتا کے ہیں اس سے صیغہ (صفت فاعلی) غَدِرَۃ ہے اور غَدِرٌ اس سنگ زار زمین کو کہتے ہیں جس میں عرصہ دراز تک ویران پڑا رہنے کی وجہ سے، سوراخ پڑ گئے ہوں اور اس میں اونٹ یا گھوڑا چلے تو لنگڑا ہو جائے اسی سے محاورہ ہے: مَــــا اَثْبَــتَ غَــدَرَ هٰـذَا الْفَرَسِ کہ یہ گھوڑا کس قدر ثابت قدم ہے مَــا اَثْبَــتَ غَدَرَهٗ وہ کس قدر ثابت قدم ہے یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو لغزش کے موقعہ پر ثابت قدم رہے۔

(غ د ق)

اَلْــغَـدَقُ: کے معنی بہت زیادہ اور وافر کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا﴾ (۷۲۔۱۶) تو ہم ان کے پینے کو بہت سا پانی دیتے۔

اور اسی سے غَــدِقَــتْ عَیْنُهٗ تَغْدَقُ ہے جس کے معنی آنکھ سے خوب پانی بہنا کے ہیں اور غَیْدَاقٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو وافر اور زیادہ ہو عام اس سے کہ پانی ہو یا گفتگو اور یا دوڑ ہو۔

(غ د و)

اَلْغُدْوَةُ وَالْغَدَاةُ کے معنی دن کا ابتدائی حصہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں غُدُوٌّ (غُدْوَۃ کی جمع) کے مقابلہ میں اٰصَالٌ استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿بِـالْـغُـدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ (۷۔۲۰۵) صبح وشام (یاد کرتے رہو۔)

(اور غُدُوٌّ (مصدر) رَوَاحٌ کے مقابلہ میں) جیسے فرمایا:

﴿غُـدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ﴾ (۳۴۔۱۲) اس کا صبح کا جانا ایک مہینہ کی راہ ہوتی ہے اور شام کا جانا بھی ایک مہینے کی۔

اور غَدَاۃٌ کے مقابلہ میں عَشِیٌّ جیسے فرمایا۔

﴿بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ﴾ (۶۔۵۲) صبح وشام۔

اَلْـغَادِیَةُ: صبح کا بادل۔ اَلْغَدَآءُ: کھانا جو دن کے ابتدائی حصہ میں کھالیا جائے غَـدَوْتُ اَغْدُوْ کے معنی ہیں: صبح سویرے روانہ ہونا یا کسی جگہ پہنچ جانا ہیں۔قرآن میں ہے۔

﴿اَنِ اغْـدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ﴾ (۶۸۔۲۲) اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔

غَدٌ: کل آئندہ۔جیسا کہ آیت

﴿سَیَـعْلَمُوْنَ غَدًا﴾ (۵۴۔۲۶) ان کو کل معلوم ہو جائے گا۔اور دیگر آیات میں مذکور ہے۔[1]

(غ ر ر)

غَرَرْتُ (ن) فُلَانًا (فریب دینا) کسی کو غافل پا کر اس سے اپنا مقصد حاصل کرنا۔ غِــرَّةٌ: بیداری کی حالت میں غفلت۔ غِرَارٌ: اونگھ کے ساتھ غفلت، اصل میں یہ غُرٌّ سے ہے جس کے معنی کسی شے پر ظاہری نشان کے ہیں۔ اسی سے غُرَّةُ الْفَرَسِ (گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی) ہے اور غِــرَارُ السَّیْفِ کے معنی تلوار کی دھار کے ہیں۔ غَرُّ الثَّوْبِ: کپڑے کی تہ۔اسی سے محاورہ ہے۔

اِطْوِهٖ عَـلٰی غَرِّهٖ: کپڑے کو اس کی تہ پر لپیٹ دو یعنی اس معاملہ کو جوں کا توں رہنے دو۔ غَـرَّهٗ کَذَا غُرُوْرًا: اسے فریب دیا۔گویا اسے اس کی تہ پر لپیٹ دیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الْکَرِیْمِ﴾ (۸۲۔۶) اے انسان!

---

[1] راجع الآیات (۵۹۔۱۸) ۱۸۔۲۳) (۳۱۔۳٤)

تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکا دیا۔

﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ﴾ (۳۔۱۹۶) (اے پیغمبر) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمھیں دھوکا نہ دے۔

﴿وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (۱۷۔۶۴) اور شیطان جو وعدے ان سے کرتا ہے سب دھوکا ہے۔

﴿بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (۳۵۔۴۰) بلکہ ظالم جو ایک دوسرے کو وعدہ دیتے ہیں محض فریب ہے۔

﴿يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (۶۔۱۱۳) وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (۳۔۱۸۵) اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

﴿وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (۶۔۷۰) اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (۳۳۔۱۲) کہ خدا اور اس کے رسول نے ہم سے دھوکے کا وعدہ کیا تھا۔

﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ (۳۱۔۳۳) اور نہ فریب دینے والا (شیطان) تمھیں خدا کے بارے میں کسی طرح کا فریب دے۔

پس غرور سے مال وجاہ، خواہش نفسانی، شیطان اور ہر وہ چیز مراد ہے جو انسان کو فریب میں مبتلا کردے بعض نے غُرُوْرٌ سے مراد صرف شیطان لیا ہے کیونکہ جو چیزیں انسان کو فریب میں مبتلا کرتی ہیں، شیطان ان سب سے زیادہ خبیث ہے اور بعض نے اس کی تفسیر دنیا سے کی ہے کیونکہ دنیا بھی انسان سے فریب کھیلتی ہے دھوکا دیتی ہے نقصان پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

اَلْغُرُوْرُ: دھوکا۔ یہ غَرٌّ سے ہے اور (حدیث میں) بیع اَلْغَرَرِ سے منع کیا گیا ہے۔❶ (۵۷) اَلْغَرِيْرُ: اچھا خلق۔ کیونکہ وہ بھی دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ (بوڑھے شخص کے متعلق محاورہ ہے۔ فُلَانٌ اَدْبَرَ غَرِيْرُهٗ وَاَقْبَلَ هَرِيْرُهٗ (اس سے حسن خلق جاتا رہا اور چڑ چڑا پن آگیا) اور غُرَّةُ الْفَرَسِ سے تشبیہ کے طور پر مشہور معروف آدمی کو اَغَرّ کہا جاتا ہے اور مہینے کی ابتدائی تین راتوں کو غُرَرٌ کہتے ہیں کیونکہ مہینہ میں ان کی حیثیت غُرَّةُ الْفَرَسِ کی ہوتی ہے غِرَارُ السَّيْفِ: تلوار کی دھار اور غِرَارٌ کے معنی تھوڑا سا دودھ کے بھی آتے ہیں اور غَارَّتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں اونٹنی کا دودھ کم ہوگیا حالانکہ اس کے متعلق یہ گمان نہ تھا کہ اس کا دودھ کم ہو جائے گا گویا کہ اس اونٹنی نے مالک کو دھوکا دیا۔

(غ ر ب)

اَلْغَرْبُ: (ن) سورج کا غائب ہوجانا۔ غَرَبَتْ تَغْرُبُ غَرْبًا وَغُرُوْبًا سورج غروب ہوگیا اور مَغْرِبُ الشَّمْسِ وَمُغَيْرِبُهَا (مصغر) کے معنی آفتاب غروب ہونے کی جگہ یا وقت کے ہیں۔❷ قرآن میں ہے۔

❶ رواه الجماعة الاالبخاری من حديث ابی هريرة واحمد من حديث ابن عمرو ابن ماجة من حديث ابن عباس وعن سهل عند الطبرانی والبيع الغررصور (راجع النيل (۵:۱۵۶۔۱۵۷) ومنه المثل الغرة تجلب الدرة (الميدانی ۲/۶۲)

❷ تصغير مغربان

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (۷۳۔۹۰) (وہی) مشرق اور مغرب کا مالک ہے۔
﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ (۵۵۔۱۷) وہی دونوں مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے۔
﴿بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ﴾ (۷۰۔۴۰) مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔
ان کے تثنیہ اور جمع لانے کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ❶
نیز فرمایا۔
﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ (۲۴۔۳۴) کہ نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف۔
﴿حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ﴾ (۱۸۔۸۶) یہاں تک کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا۔
اور ہر اجنبی کو غریب کہا جاتا ہے اور جو چیز اپنی ہم جنس چیزوں میں بے نظیر اور انوکھی ہو اسے بھی غَرِيْبٌ کہہ دیتے ہیں۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ❷
(۵۸) اَلْإِسْلَامُ بَدَءَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَءَ کہ اسلام ابتداء میں غریب تھا اور آخر زمانہ میں پھر پہلے کی طرح ہو جائے گا اور جہلاء کی کثرت اور اہل علم کی قلت کی وجہ سے علماء کو غرباء کہا گیا ہے۔ اور کوّے کو غُرَاب اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ بھی دور تک چلا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ﴾ (۵۔۳۱) اب اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا۔
اور غَارِبُ السَّنَامِ کے معنی کوہان کی بلندی کے ہیں کیونکہ (بلندی کی وجہ سے) اس تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے اور غَرْبُ السَّيْفِ کے معنی تلوار کی دھار کے ہیں کیونکہ تلوار بھی جسے ماری جائے اس میں چھپ جاتی ہے لہٰذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔ پھر جس طرح زبان کو تلوار کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے اسی طرح زبان کی تیزی کو بھی تلوار کی تیزی کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ غَرْبُ اللِّسَانِ (فلاں تیز زبان ہے) کہا جاتا ہے اور کنویں میں بُعد مسافت کے معنی کا تصور کر کے ڈول کو بھی غَرْبٌ کہہ دیا جاتا ہے اور اَغْرَبَ السَّاقِيْ کے معنی ہیں: پانی پلانے والے نے ڈول پکڑا۔ اور غَرْبٌ کے معنی سونا بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی دوسری معدنیات سے قیمتی ہوتا ہے اور اسی سے سَهْمٌ غَرْبٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ تیر جس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ کدھر سے آیا ہے۔ اور بلا ارادہ کسی طرف دیکھنے کو نَظْرٌ غَرْبٌ کہا جاتا ہے اور غَرْبٌ کا لفظ بے پھل درخت پر بھی بولا جاتا ہے گویا وہ ثمرات سے دور ہے۔
بیان کیا جاتا ہے کہ عَنْقَاء جانور ایک لڑکی کو اٹھا کر دور دراز لے گیا تھا۔ اس وقت سے اس کا نام عَنْقَاءُ مُغْرِبٌ اَوْ عَنْقَاءُ مُغْرِبٍ (اضافت کے ساتھ) پڑ گیا۔
اَلْغُرَابَانِ: سرینوں کے اوپر دونوں جانب کے گڑھے جو

---

❷ راجع (ش ر ق)
❸ الحدیث باختلاف الفاظه فی (م،ہ) عن ابی ہریرة رضی اللہ عنه وابن مسعود وانس بن مالك رضی اللہ عنه وفی (طب) عن سلمان وسهل بن سعد وابن عباس وبمعناه فی الترمذی عن عمر بن عوف المزنی وابو نصرالسجزی فی الابانة عن عبدالرحمان بن سنة ونعیم بن حماد فی الفتن عن مجاهد والحاکم عن سعد بن ابی وقاص (انظر کنزالعمال رقم ۱۱۹۳ ـ ۱۱۹۵ و رقم ۱۱۹۹ : ۱۲۰۲۔

ہیئت میں کوے کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اَلْمُغْرَبُ گھوڑا جس کا کرانۂ چشم سفید ہو کیونکہ اس کی آنکھ اس سفیدی میں عجیب وغریب نظر آتی ہے۔اور آیت کریمہ۔
﴿غَرَابِيْبُ سُوْدٌ﴾ (۳۵۔۲۷) کالے سیاہ ہیں۔میں بعض نے کہا ہے کہ غَرَابِيْبُ کا واحد غِرْبِيْبٌ ہے اور اس کے معنی کوے کی طرح بہت زیادہ سیاہ کے ہیں جس طرح کہ اَسْوَدُ كَحَلَكِ الْغُرَابِ کا محاورہ ہے۔ (یعنی صفت تاکیدی ہے اور اس میں قلب پایا جاتا ہے اصل میں سُوْدٌ غَرَابِيْبُ ہے۔ [1]

(غ ر ض)

اَلْغَرْضُ کے اصل معنی نشانہ کے ہیں پھر ہر اس غایت کو جہاں پہنچنا مقصود ہو، غَرْضٌ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع اَغْرَاضٌ آتی ہے۔
غرض دو قسم پر ہے۔غرض ناقص جو بالذات مقصود نہ ہو بلکہ اس سے کوئی دوسری چیز مقصود ہو جیسے تونگری یا ریاست یا اس قسم کی دوسری اغراض جن کے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں (۲) غرض تام: جس کے بعد کسی اور چیز کا اشتیاق باقی نہ رہے۔جیسے جنت۔ [2]

(غ ر ف)

اَلْغَرْفُ (ض) کے معنی کسی چیز کو اٹھانے اور پکڑنے کے ہیں جیسے: غَرَفْتُ الْمَاءَ اَوِالْمَرَقَ (میں نے پانی یا شوربہ لیا) اور غُرْفَةٌ: کے معنی چلو بھر پانی کے ہیں اور اَلْغُرْفَةُ ایک مرتبہ چلو سے پانی نکالنا اَلْمِغْرَفَةُ: چمچ غیرہ جس سے شوربہ وغیرہ نکال کر برتن میں ڈالا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ﴾ (۲۔۲۴۹) ہاں اگر کوئی ہاتھ سے چلو بھر پانی لے لے (تو خیر)۔
اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔ غَرَفْتُ عَرَفَ الْفَرَسِ: میں گھوڑے کی پیشانی کے بال کاٹ ڈالے۔ غَرَفْتُ الشَّجَرَةَ: میں نے درخت کی ٹہنیوں کو کاٹ ڈالا۔
اَلْغَرَفُ: ایک قسم کا پودا (جس سے چمڑے کو دباغت دی جاتی ہے) غَرَفَتِ الْاِبِلُ: اونٹ غرف کھا کر بیمار ہو گئے۔ اَلْغُرْفَةُ: بالا خانہ (جمع غُرَفٌ وَغُرَفَاتٌ) قرآن میں جنت کے منازل اور درجات کو اَلْغُرَفُ کہا گیا ہے۔چنانچہ فرمایا۔
﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (۲۵۔۷۵) ان صفات کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیئے جائیں گے۔
﴿لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا﴾ (۲۹۔۵۸) ان کو ہم بہشت کے اونچے اونچے محلوں میں جگہ دیں گے۔
﴿وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ اٰمِنُوْنَ﴾ (۳۴۔۳۷) اور وہ خاطر جمع سے بالا خانوں میں بیٹھے ہوں گے۔

(غ ر ق)

اَلْغَرْقُ: پانی میں تہ نشین ہو جانا، کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانا۔غَرِقَ (س) فُلَانٌ يَغْرَقُ غَرَقًا: فلاں پانی میں ڈوب گیا۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ﴾ (۱۰۔۹۰) یہاں تک کہ

[1] كذا قال النسفي راجع معجم القرآن لعبد الرؤف مصري ۱۲۔
[2] وليس في القرآن من هذا المادة۔ ۱۲

جب اسے غرقابی نے آلیا۔

اَغْرَقَهٗ (افعال) اس نے اسے ڈبویا غرق کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ﴾ (۲۔۵۰) اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔

﴿فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا﴾ (۱۷۔۱۰۳) تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے، سب کو ڈبو دیا۔

﴿ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۲۰) پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو ڈبو دیا۔

﴿وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ﴾ (۳۶۔۴۳) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں۔

﴿اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا﴾ (۷۱۔۲۵) غرقاب کر دیے گئے پھر آگ میں ڈال دیئے گئے۔

﴿فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ﴾ (۱۱۔۴۳) اور وہ ڈوب گیا

اور تشبیہ کے طور پر زیر بار احسان ہونے کے لیے بھی اَلْغَرْق کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

فُلَانٌ غَرِقٌ فِیْ نِعْمَةِ فُلَانٍ: فلاں اس کے احسانات میں ڈوبا ہوا ہے۔ ❶

(غ ر م)

اَلْغُرْمُ (مفت کا تاوان یا جرمانہ) وہ مالی نقصان جو کسی قسم کی خیانت یا جنایت (جرم) کا ارتکاب کیے بغیر انسان کو اٹھانا پڑے غَرِمَ كَذَا غُرْمًا وَمَغْرَمًا فلاں نے نقصان اٹھایا اُغْرِمَ فُلَانٌ غَرَامَةً اس پر تاوان پڑ گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ﴾ (۵۶۔۶۶) (کہ ہائے) ہم مفت تاوان میں پھنس گئے۔

﴿فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ (۵۲۔۴۰) کہ ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔

﴿يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا﴾ (۹۔۹۸) کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں۔

اور غَرِيْمٌ کا لفظ مقروض اور قرض خواہ دونوں کے لیے آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَالْغَارِمِيْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۶۰) اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے) کے لیے اور خدا کی راہ میں۔

اور جو تکلیف یا مصیبت انسان کو پہنچتی ہے اسے غَرَامٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ (۲۵۔۶۵) کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے۔

یہ هُوَ مُغْرَمٌ بِالنِّسَآءِ (وہ عورتوں کا دلدادہ ہے) کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی وہ شخص جو غَرِيْمٌ (قرض خواہ) کی طرح عورتوں کے پیچھے پیچھے پھرتا ہو۔ حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ❷ كُلُّ غَرِيْمٍ مُفَارِقٌ غَرِيْمَهٗ اِلَّا النَّارُ یعنی ہر قرض خواہ اپنے مقروض کو چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن آگ اپنے غُرَمَاءُ کو نہیں چھوڑے گی۔

بعض نے عذاب جہنم کو غرام کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ

---

❶ وجاء بمعنى المبالغة في الشيء كما في الآية والنازعات غرقا (۷۹۔۱) معناه النزع بالمبالغة والقوة التامة (راجع، الكشاف ۳۰۸/۳) ج ۳۔

❷ راجع لقول الحسنؓ

وہ عذاب ان کا اسی طرح پیچھا کرے گا یا وہ انہیں ہلاک کرنے پر شیفتہ ہے۔

(غ ر و)

غَـرِیَ بِکَذَا کے معنی کسی کے ساتھ چمٹ جانا ہیں اصل میں یہ غَرَاءٌ سے ہے اور غِرَاءٌ اس مادہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسری کے ساتھ پیوست کیا جائے اور اسی سے اَغْـرَیْـتُ فُـلَانًا بِکَذا کے معنی ہیں: میں نے فلاں کو اس پر شیفتہ کر دیا، اس پر ابھارا اور اکسایا اس کے پیچھے لگا دیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَغْـرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ﴾ (۵۔۱۴) تو ہم نے ان کے باہم، قیامت تک کے لیے دشمنی اور کینہ ڈال دیا۔

﴿لَـنُـغْـرِیَنَّكَ بِهِمْ﴾ (۳۳۔۶۰) تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔

(غ ز ل)

اَلْـغَـزْلُ: (ض) کاتے ہوئے سوت کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا﴾ (۱۶۔۹۲) اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے اپنا کاتا ہوا سوت ادھیڑ دیا۔

غَـزَلَتْ غَزْلاً: سوت کاتنا اور ہرنی کے بچہ کو غَزَالٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْغَزَالَةُ: سورج کی ٹکیہ اور کنایہ کے طور پر غَزَلٌ (س) اور مُـغَازَلَةٌ کے معنی غزال یعنی ہرنوٹے جیسی خوبصورت عورتوں کے ساتھ عشق و محبت اور دلبستگی کی باتیں کرنا آتے ہیں۔

غَزِلَ الْكَلْبُ غَزَالاً کتے کا ہرن کو پا کر اس سے پیچھے ہٹ جانا۔

(غ ز و)

اَلْـغَزْوُ کے معنی دشمن سے جنگ کرنے کے ارادے سے نکلنا ہیں۔ غَزَا یَغْزُوْ غَزْوًا: وہ دشمن سے جنگ کے ارادہ سے نکلا ایسے شخص کو اَلْـغَـازِیْ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع غَزَاةٌ وَغُزًّ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْ كَانُوْا غُزًّی﴾ (۳۔۱۵۶) یا وہ جہاد کر رہے ہوں۔

(غ س ق)

غَسَـقُ اللَّیْلِ کے معنی (ابتدائے) شب کی سخت تاریکی کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ﴾ (۱۷۔۷۸) رات کی تاریکی تک۔

اَلْغَاسِقُ: تاریک رات۔ ❶ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِـنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾ (۱۱۳۔۳) اور شب تاریک کی برائی سے جب اس کی تاریکی چھا جائے۔اور اس سے مراد رات کے وقت پیش آنے والی مصیبت یا حادثہ کے ہیں۔جیسے طَارِقٌ (رات کے وقت آنے والا) بعض نے کہا ہے کہ ❷ غَاسِقٌ چاند کو کہتے ہیں جب کہ وہ

---

❶ کـذا فسـره الـقبتـی فی غریبه وفی الفخر ۱۹۴/۳۲: وهذا قول الفراء وابی عبیدة وقال الزجاج الغاسق فی اللغة البارد وسمی اللیل غاسقاً لانه ابرد من النهار (القرطبی ۲۵۶/۲۰) وهو قول ابن عباس وغیره روی مرفوعاً

❷ وهـذا ایـضـا حکاه القتبی فی غریبه ۵۴۳ وقد نقله القرطبی (۲۵۷/۲ والبحر (۵۳۱/۸) والفخر (۱۹۵/۳۲) واللسان (غسق او قـدروی مـرفـوعـا (راجـع الـنهـایـه (۱۶۱/۳) والطبری (۳۵۲/۳۰) والکشـاف (۵۶۸/۴) والدر (۴۱۸) والشوکانی (۵۰۶) راجع کنزالعمال عن عائشة (ج۲ رقم ۷۳)

گھن لگ کر سیاہ ہو جائے۔ اَلْغَسَّاقُ دوزخیوں کے جسموں سے بہنے والا لہو یا پیپ۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا﴾ (۷۸۔۲۵) مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔

(غ س ل)

غَسَلْتُ الشَّیْءَ غُسْلًا: کے معنی کسی چیز پر پانی بہا کر اسے میل کچیل سے پاک کرنے کے ہیں۔ اسی سے غُسْلٌ اسم ہے اور غِسْلٌ وہ چیز ہے جس کے ساتھ کپڑے کو دھویا یا نہایا جاتا ہے (جیسے صابن وغیرہ) قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اَلاٰیَة﴾ (۵۔۶) تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو۔
اَلْاِغْتِسَالُ (افتعال) کے معنی نہانے اور تمام بدن کو دھونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔
﴿حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا﴾ (۴۔۴۳) جب تک کہ غسل نہ کرلو۔
اَلْمُغْتَسَلُ: نہانے کی جگہ یا نہانے کا پانی۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿ھٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ﴾ (۳۸۔۴۲) یہ چشمہ نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو شیریں ہے۔
اَلْغِسْلِیْنُ کے معنی دوزخیوں کے اجسام کا غسالہ (پیپ) کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ﴾ (۶۹۔۳۶) اور نہ پیپ کے سوا ان کے لیے کھانا ہے۔

(غ ش و)

غَشِیَہٗ، غِشَاوَةً وَغِشَاءً: اس کے پاس اس چیز کی طرح آیا جو اسے چھپائے۔ غِشَاوَة: (اسم) پردہ جس سے کوئی چیز ڈھانپ دی جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً﴾ (۴۵۔۲۳) اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔
﴿وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (۲۔۷) اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔
محاورہ ہے: غَشِیَہٗ، تَغَشَّاہُ وَغَشِیْتُہٗ: اسے چھپا لیا۔ قرآن میں ہے۔
﴿وَاِذَا غَشِیَھُمْ مَّوْجٌ﴾ (۳۱۔۳۲) اور جب ان پر لہریں چھا جاتی ہیں۔
﴿فَغَشِیَھُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَھُمْ﴾ (۲۰۔۷۸) تو دریا (کی موجوں) نے ان پر چڑھ کر انہیں ڈھانپ لیا (یعنی ڈبو دیا۔)
﴿وَتَغْشٰی وُجُوْھَھُمُ النَّارُ﴾ (۱۴۔۵۰) اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔
﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی﴾ (۵۳۔۱۶) جب کہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔
﴿وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی﴾ (۹۲۔۱) رات کی قسم جو (دن کو) چھپا لے۔
﴿اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ﴾ (۸۔۱۱) جب اس نے ...... تمہیں نیند (کی چادر) اڑھا دی۔
غَشِیْتُ مَوْضِعَ کَذَا: میں فلاں جگہ پر آیا اور کنایۃً عورت سے مجامعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ غَشَّاھَا وَتَغَشَّاھَا کے معنی ہیں: میں نے عورت سے مجامعت کی۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَلَمَّا تَغَشّٰھَا حَمَلَتْ﴾ (۷۔۱۱۹) سو جب وہ اس سے ہم بستری کرتا ہے تو اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔

یہی معنی اَلْغِشْیَانِ کے ہیں۔ اَلْغَاشِیَۃُ: ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز کو چھپایا جائے۔ مثلاً غَاشِیَۃُ السَّرْجِ: چمڑا جو زین کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اَنْ تَاْتِیَھُمْ غَاشِیَۃٌ﴾ (۱۲۔۱۰۷) کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہو کر ان کو ڈھانپ لے، میں غَاشِیَۃٌ سے مراد وہ مصیبت ہے جو چاروں طرف سے ان پر چھا جائے اور گھوڑے کے جھول کی طرح انہیں ڈھانپ لے بعض نے کہا کہ لفظ غَاشِیَۃٌ اصل میں اچھی چیز کے لیے استعمال ہوا ہے مگر یہاں بطور استعارہ عذاب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح آیت کریمہ۔

﴿لَھُمْ مِّنْ جَھَنَّمَ مِھَادٌ وَّمِنْ فَوْقِھِمْ غَوَاشٍ﴾ (۷۔۴۱) ایسے لوگوں کے لیے (نیچے) بچھانا بھی (آتش) جہنم کا ہوگا اور اوپر سے اوڑھنا بھی۔

میں ہے کہ (یہاں مِھَادٌ (بچھونے) کے مقابل میں غَوَاشٍ کا لفظ آیا ہے جس سے جہنم کا عذاب مراد ہے۔)

اور آیت کریمہ۔

﴿ھَلْ اَتَاکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ﴾ (۸۸۔۱) بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت کا) حال معلوم ہے۔ میں اَلْغَاشِیَۃ سے مراد قیامت ہے اور اس کی جمع غَوَاشٍ ہے غُشِیَ عَلٰی فُلَانٍ اس پر بیہوشی طاری ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿کَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ﴾ (۱۹:۳۳) جیسے کسی پر موت سے غشی طاری ہو۔ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ (۴۷۔۲۰) جس طرح کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو رہی ہو۔ اَغْشَاہُ اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ﴾ (۳۶۔۹) ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو یہ دیکھ نہیں سکتے۔

﴿کَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْھُھُمْ﴾ (۱۰۔۲۷) ان کے مونہوں (کی سیاہی کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر) گویا پردے اڑھا دیئے گئے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَھُمْ﴾ (۷۱۔۷) کے معنی ہیں کہ انھوں نے کپڑوں سے اپنے کان بند کر لیے اور یہ کسی کی بات پر توجہ نہ دینے سے کنایہ ہوتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دور بھاگ جانا ہے جس طرح کہ شَمَّرَ ذَیْلَہٗ اَلْقٰی ثَوْبَہٗ ہے کہ اس کے معنی کسی کام کی تیاری کے آتے ہیں۔ غَشَّیْتُہٗ سَوْطًا اَوْسَیْفًا: میں نے اسے کوڑے یا تلوار سے مارا۔ جس طرح کہ کَسَوْتُہٗ وَعَمَّمْتُہٗ کے معنی کسی کو کِسَاءَ (کمبل) پہنانے اور عمامہ باندھنے کے آتے ہیں۔

(غ ص ص)

اَلْغُصَّۃُ: اس ہڈی کو کہتے ہیں جو حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَطَعَامًا ذَاغُصَّۃٍ﴾ (۷۳۔۱۳) اور گلوگیر کھانا ہے۔

(غ ض ض)

اَلْغَضُّ: (ن) کے معنی کمی کرنے کے ہیں خواہ نظر اور صورت میں ہو یا کسی برتن میں سے کچھ کم کرنے کی صورت میں ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ﴾ (۲۴۔۳۰) مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں۔

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ یَغْضُضْنَ﴾ (۲۴۔۳۱) اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو (کہ اپنی نگاہیں) نیچی رکھا کریں۔

﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ (۳۱۔۱۹) اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا۔

اور شاعر کے قول ❶ (الوافر)

(۳۲۸) فَغُضَّ الطَّرْفَ اِنَّكَ مِنْ نُمَيْرٍ (نگاہ نیچی رکھ تو بنی نمیر سے ہے۔)

میں غَضَّ کا لفظ بطور تہکم استعمال ہوا ہے۔ غَضَضْتُ السِّقَاءَ: میں نے مشک سے پانی کم کر دیا۔ اور غَضٌّ ایسی تر اور تازہ چیز کو کہتے ہیں جس پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو۔

(غ ض ب)

اَلْغَضَبُ: انتقام کے لیے دل میں خون کا جوش مارنا۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❷ (۵۹) ((اتقوا الغضب فانه جمرة توقد فی قلب ابن اٰدم الم تروا الی انتفاخ اوداجہٖ وحمرۃ عینیه۔)) کہ غصہ سے بچو بے شک وہ انسان کے دل میں دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح ہے تم اس کی رگوں کے پھولنے اور آنکھوں کے سرخ ہو جانے کو نہیں دیکھتے۔ لیکن غضب الٰہی سے مراد انتقام (اور عذاب) ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ (۲۔۹۰) تو وہ (اس کے) غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے۔

﴿وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۶۱) اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔

﴿وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ﴾ (۲۰۔۸۱) اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا۔

﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ﴾ (۴۔۹۳) اور خدا اس پر غضب ناک ہو گا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۔۷) نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یہود مراد ہیں۔ ❸ اور غَضْبَةٌ کے معنی سخت چٹان کے ہیں۔

اَلْغَضُوْبُ: بہت زیادہ غصے ہونے والا۔ یہ سانپ اور تندمزاج اونٹنی پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فُلَانٌ غَضْبَةٌ کے معنی ہیں: فلاں بہت جلد غصے ہونے والا ہے۔ بعض نے بیان کیا ہے کہ غَضِبْتُ لِفُلَانٍ کے معنی کسی زندہ شخص کی حمایت میں ناراض ہونا ہیں اور غَضِبْتُ بِهٖ کے معنی کسی مردہ شخص کی حمایت کے لیے غضب ناک ہونا۔

(غ ط ش)

﴿وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا﴾ (۷۹۔۲۹) اور اس نے رات کو تاریک بنایا۔

---

❶ قاله جريرى من كلمته طويلة فى النقائض (٤٤٦) يهجو بها عبيدالله بن الحصين الراعى النميرى فى قصيدته، المشهورة التى تسمىٰ الفاضحه وسما هاجرير الدماغة وتمامه: فلا كعبا بلغت ولا كلابا۔ راجع ديوانه (٥٧) وتفسير الطبرى (١٢٠:٢١) واللسان (غضض) والحكم (حد) والسمط ٨٦١ والاقتضاب ٥٠ والكامل ٢٩٤ واماليى المرتضىٰ (٢٨٩/١) والفاضل (١٠٩) وكنايات الحرجانى ٧٤ والعقد الفريد (٤٦٨:٢) والجمحى (١٣١۔١٤٥) والبحر (٤٤٣:٦) والكتاب (١٦٠:٢) والمعاهد (١٩٩:٢) والعمدة (١٧٠:٢/٥٠:١) والحصرى (٥٦) والماوردى ٦١ ومحاضرات الادبار (١١٤،٣/٨٩:١) والجمهرة (٥٦) والتنبيه (٢٢) والاغانى (٣٩:٧، ٥٠، ٥١/٢٠، ١٦٩) والحيوان (٢٥٩:١) والسيوطى (١٧)۔

❷ رواه الترمذى عن ابى سعيد الخذرى فى حديث طويل راجع تخريج العراقى على الاحياء ١٧٤/٣

❸ قد ثبت مرفوعا عن ابى ذر وعن الناس من اصحاب النبى ﷺ (راجع ابن كثير ١ : ٣٠)

یہ اصل میں رَجُلٌ اَغْطَشُ سے ہے جس کے معنی کمزور نظر اور چندھے آدمی کے ہیں۔
فُلَاۃٌ غَطْشٰی: اس صحرا کو کہتے ہیں جس میں راستہ نہ ملتا ہو۔ اَلتَّغَاطُشُ کسی چیز سے آنکھیں بند کر لینا۔غفلت برتنا۔

(غ ط و)

اَلْغِطَآءُ کے اصل معنی طباق وغیرہ کی قسم کی چیز کے ہیں جو کسی چیز پر بطور سر پوش کے رکھی جائے جیسا کہ غِشَاءٌ لباس وغیرہ کی قسم کی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کے اوپر ڈالا جائے اور بطور استعارہ غِطَاءٌ کا لفظ (پردہ) جہالت وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (۵۰-۲۲) ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

(غ ف ر)

اَلْغَفْرَ (ض) کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینے کے ہیں جو اسے میل کچیل سے محفوظ رکھ سکے۔اسی سے محاورہ ہے۔
اِغْفِرْ ثَوْبَكَ فِي الْوِعَاءِ: اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ میں ڈال کر چھپا دو۔
اِصْبَغْ ثَوْبَكَ فَاِنَّهٗ اَغْفَرُ لِلْوَسَخِ: کپڑے کو رنگ لو کیونکہ وہ میل کچیل کو زیادہ چھپانے والا ہے۔اللہ کی طرف سے مَغْفِرَۃٌ یا غُفْرَانٌ کے معنی ہوتے ہیں بندے کو عذاب سے بچالیا۔قرآن میں ہے۔
﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ (۲-۲۸۵) اے پروردگار! ہم تیری بخشش مانگتے ہیں۔
﴿اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۳-۱۳۳) اور اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف لپکو۔
﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (۳-۱۳۵) اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔
اور کبھی غَفَرَلَهٗ کے معنی کسی کو ظاہری طور پر معاف کر دینا آتے ہیں، خواہ دل سے معاف نہ کیا ہو یعنی درگزر کرنا۔ جیسے فرمایا۔
﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ﴾ (۴۵-۱۴) مومنوں سے کہہ دو کہ جو لوگ خدا کے دنوں کی (جو اعمال کے بدلے کے لیے مقرر ہیں) توقع نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں۔
اور اِسْتِغْفَارٌ کے معنی قول اور عمل سے مغفرت طلب کرنا کے ہیں۔لہٰذا آیت کریمہ۔
﴿اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴾ (۷۱-۱۰) اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، میں صرف زبان کے ساتھ مغفرت مانگنے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ زبان اور عمل دونوں کے ساتھ معافی طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ صرف زبان سے بخشش طلب کرنا کذاب آدمیوں کا کام ہے۔اور یہی معنی آیت کریمہ۔
﴿اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (۴۰-۶۰) کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔
قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ (۹-۸۰) ان کے لیے بخشش مانگو یا نہ مانگو۔
﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۴۰-۷) اور مومنوں کے لیے بخشش مانگتے رہتے ہیں۔

اور اَلْغَافِرُ وَالْغَفُوْرُ اسمائے حسنیٰ سے ہیں [1] اوران کے معنی گناہوں کا بخشنے والا ہیں، چنانچہ فرمایا۔

﴿غَافِرِ الذَّنْبِ﴾ (۴۰۔۳) جو گناہ بخشنے والا ہے۔

﴿اِنَّہٗ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ﴾ (۳۵۔۳۰) وہ تو بخشنے والا قدر دان ہے۔

﴿وَھُوَا لْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴾ (۱۰۔۱۰۷) اوروہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور غَفِیْرَۃٌ بمعنی غُفْرَانَ ہے، اسی سے فرمایا۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ﴾ (۱۴۔۴۱) اے پروردگارا! (حساب کتاب کے دن) مجھے اور میرے ماں باپ......کو بخش دیجیو۔

﴿اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْئَتِیْ﴾ (۲۶۔۸۲) میرے گناہ بخش دے گا۔

﴿وَاغْفِرْلَنَا﴾ (۲۔۲۸۶) اور ہمارے گناہ بخش دے۔

بعض نے کہا ہے کہ اِغْفِرُوْا ھٰذَا الْاَمْرَ بِغَفْرَتِہٖ: کے معنی ہیں کہ اس معاملہ کو اس طرح چھپاؤ جس طرح چھپانے کا حق ہے۔ [2] اَلْمِغْفَرُ: لوہے کا خود۔ اَلْغِفَارَۃُ: اس چیتھڑے کو کہتے ہیں جسے عورت اپنے دوپٹہ کو تیل سے بچانے کے لیے اس کے نیچے سر پر اوڑھ لیتی ہیں نیز غِفَارَۃٌ اس بادل کو کہتے ہیں جو دوسرے بادل پر چھایا ہوا، ہو نیز اس ٹکڑے کو بھی جس سے کمان کے گوشہ کو لپیٹتے ہیں۔

(غ ف ل)

اَلْغَفْلَۃُ: اس سہو کو کہتے ہیں جو قلت تحفظ واحتیاط کی بنا پر انسان کو عارض ہو جاتا ہے۔ غَفَلَ: (ن) اس نے غفلت سے کام لیا۔ چنانچہ ایسے شخص کو غَافِلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَۃٍ مِّنْ ھٰذَا﴾ (۵۰۔۲۲) بے شک تو اس سے غافل ہو رہا تھا۔

﴿وَھُمْ فِیْ غَفْلَۃٍ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (۲۱۔۱) اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔

﴿وَدَخَلَ الْمَدِیْنَۃَ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَۃٍ مِّنْ اَھْلِھَا﴾ (۲۸۔۱۵) اور وہ ایسے وقت شہر میں آداخل ہوئے کہ وہاں کے باشندے بے خبر ہو رہے تھے۔

﴿وَھُمْ عَنْ دُعَائِھِمْ غَافِلُوْنَ﴾ (۴۶۔۵) اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو۔

﴿لَمِنَ الْغَافِلِیْنَ......﴾ (۱۲۔۳) بے خبر تھے۔

﴿فَھُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ (۳۰۔۷) (اور آخرت کی طرف سے) غافل ہیں۔

﴿بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ﴾ (۲۔۱۴۰) جو کچھ یہ کر رہے ہیں خدا اس سے غافل نہیں ہے۔

﴿لَوْتَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِکُمْ وَاَمْتِعَتِکُمْ﴾ (۴۔۱۰۲) کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہو جاؤ۔

﴿فَھُمْ غَافِلُوْنَ﴾ (۳۶۔۶) وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

﴿عَنْھَا غَافِلِیْنَ﴾ (۷۔۱۳۶) ان سے لاپرواہی کرتے تھے۔

اَرْضٌ غُفْلٌ: وہ زمین جس پر نشان راہ نہ ہو اور ناتجربہ

---

[1] وایضاً غفارٌ کما فی الآیات (۷۱۔۱۰) (۳۰۔۸۲) (۳۸۔۶۶) (۳۹۔۵) (۴۰۔۴۲) و راجع لمعناہ الغریب للقتبی (۱۴۔۵)۔

[2] انظر للکلمۃ المیدانی رقم (۲۴۸۳)

کار آدمی کو بھی غُفْلٌ کہا جاتا ہے اور اِغْفَالُ الْکِتَابِ کے معنی کتاب کو (نقطے) اور اعراب لگائے بغیر چھوڑ دینے کے ہیں۔ پس آیت کریمہ۔

﴿مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸۔۲۸) کے معنی یہ ہیں کہ جس کے دل کو ہم نے یوں ہی چھوڑ دیا ہے اور اس میں ایمان کا نقش نہیں بٹھایا جس طرح کہ اس کے برعکس مومنین کے دلوں کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ﴾ (۵۸۔۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ کے معنی دل کو حقائق کی معرفت سے غافل کر دینا کے ہیں۔

(غ ل ل)

اَلْغَلَلُ کے اصل معنی کسی چیز کو اوپر اوڑھنے یا اس کے درمیان میں چلے جانے کے ہیں اسی سے غَلَلٌ اس پانی کو کہا جاتا ہے جو درختوں کے درمیان سے بہہ رہا ہو اور کبھی ایسے پانی کو غِیْلٌ بھی کہہ دیتے ہیں اور اِنْغَلَّ کے معنی درختوں کے درمیان میں داخل ہونے کے ہیں لہٰذا غُلٌّ (طوق) خاص کر اس چیز کو کہا جاتا ہے۔ جس سے کسی کے اعضاء کو جکڑ کر اس کے وسط میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَغْلَالٌ آتی ہے۔ اور غُلَّ فُلَانٌ کے معنی ہیں اسے طوق سے باندھ دیا گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ﴾ (۶۹۔۳۱) اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو۔

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ﴾ (۴۰۔۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق...... ہوں گے۔

﴿وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ﴾ (۷۔۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ اور طوق، جو ان (کے سر) پر (اور) گلے میں) تھے، اتارتے ہیں۔

اور (کنایہ کے طور پر) کنجوس شخص کو مَغْلُوْلُ الْیَدْ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ﴾ (۱۷۔۲۹) اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ کر لو)۔

﴿وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ﴾ (۵۔۶۴) اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں۔

یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر بخل کا الزام لگاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جب انھوں نے یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا فیصلہ کر دیا ہے تو کہنے لگے پھر تو اللہ کا ہاتھ مقید ہے یعنی فارغ ہونے کی وجہ سے مقید کے حکم میں ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا﴾ (۳۶۔۸) ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں۔ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے انہیں ہر قسم کی خبر سے محروم کر رکھا ہے جس طرح کہ ان کے قلوب پر مہر لگانا اور آنکھ و کان پر پردہ ڈالنا ذکر کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں جَعَلْنَا اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن یہ اس سزا کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں انہیں دی جائے گی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

﴿وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ (۳۴۔۳۳) اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔

اَلْـــغُلَالَۃ: اس کپڑے کو کہتے ہیں جو دو کپڑوں کے درمیان میں پہنا جاتا ہے۔چنانچہ شِعَارٌ وہ کپڑا ہے جو غلالہ کے نیچے پہنا جائے مگر کبھی بطور استعارہ غُلَالَۃٌ کا لفظ درع پر بھی بولا جاتا ہے جس طرح کہ دِرْعٌ کا لفظ مجازاً اغلالۃ کے معنی میں آجاتا ہے۔اور غِـــلٌّ کے معنی (کینہ و پوشیدہ) دشمنی کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَنَــزَعْـنَـا مَـا فِـیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ (۷۔۴۳) اور جو کینے ان کے دلوں میں ہوں گے ہم سب نکال ڈالیں گے۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ (۵۹۔۱۰) اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دلوں میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے۔

غَلَّ یَغِلُّ کسی کے متعلق دل میں کینہ رکھنا اور اَلْغُلُوْلُ کے معنی ہیں خیانت کرنا اور یہ غَـلَّ یَغُلُّ: سے ہے جس کے معنی ہیں: خیانت کرنا اور اَغَـــلَّ (افعال) کے معنی خیانت کے ساتھ متصف ہونے کے ہیں اور اَغْـلَـلْتُ فُـــلَانًا کے معنی دوسرے کو خیانت کے ساتھ متہم کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَاکَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ﴾ (۳۔۱۶۱) اور کبھی نہیں ہو سکتا کہ پیغمبر (خدا) خیانت کریں۔

ایک قراءت میں اَنْ یَّغُلَّ ہے جو کہ اَغْلَلْتُہٗ سے ہے یعنی اسے خیانت کے ساتھ متہم کیا جائے۔

﴿وَمَـنْ یَّـغْـلُـلْ یَـاْتِ بِـمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ﴾ (۳۱۔۱۶۱) اور خیانت کرنے والوں کو قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز (خدا کے روبرو) حاضر کرنا ہوگی۔

ایک روایت میں ہے۔ [1] (۶۰) لَااِغْلَالَ وَلَا اِسْلَالَ یعنی خیانت اور چوری نہیں ہے اور حدیث میں ہے۔ [2] (۶۲) ثَلَاثٌ لَا یَغِلُّ عَلَیْهِنَّ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ یعنی تین باتوں پر مومن کا دل کینہ وری سے کام نہیں لیتا۔

اور ایک روایت میں ((لَا یُغِلُّ)) ہے یعنی خیانت نہیں کرتا اَغَـلَّ الْجَازِ رُاَوِ السالِخُ: قصاب کا کھال کے ساتھ کچھ گوشت چھوڑ دینا۔یہ اِغْلَالٌ بمعنی خیانت سے ہے گویا قصاب نے کھال کے ساتھ گوشت چھوڑ کر خیانت کی تاکہ وہ گوشت لے جائے۔

اَلْـغُـلَّۃُ وَالْـغَـلِـیْلُ: پیاس، غصہ یا محبت کی سوزش شَـفَافُلَانٌ غَلِیْلَہٗ: فلاں نے اپنا غصہ نکال لیا اَلْغَلَّۃُ: زمین کی پیداوار۔اسی سے اَغَـلَّـتْ ضَیْعَتُـہٗ ہے جس کے معنی ہیں۔زمین نے پیداوار دی اور مُـغْـلَـغَلَۃٌ اس

---

[1] قال ابن حجر اخرجه ابوداؤد و احمد من روایة الزهری عن المسور ومروان فی حدیث ورواه الدارمی والطبرانی وابن عدی من روایة کثیر بن عبدالله ورواه ابن زنجویه فی الاموال وابراهیم الحربی فی الغریب راجع الکاف ۳۳۔

[2] انظر للحدیث الفائق (۲/۱۱٤) والنهایة (غلل) ورواه الشافعی فی رسالته رقم (۲۔۱۱) والبیهقی فی المدخل وابن ماجة والدارمی عن زید بن ثابت راجع شرح الترمذی (۳/۳۷۲) والمستدرك (۱/۸٦۔۸۸) والترغیب (۱/٦۳۔٦٤) ومجمع الزوائد (۱/۱۳۷۔۱۳۹) ونسبه الحافظ فی تخریجه علی الکشاف الی ابن عدی وابی داؤد والاموال لابن زنجویه والغریب لابراهیم الحربی انظر رقم ۲۷۳) والفتح للنبهانی (۳/۳۰۹)۔

پیغام یا خط کو کہا جاتا ہے جو شہر بشہر پہنچایا جائے۔شاعر نے کہا ہے۔❶ (الوافر)

(۳۲۹) تَغَلْغَلَ حَيْثُ لَمْ يَبْلُغْ شَرَابٌ
وَلَا حُزْنٌ وَلَمْ يَبْلُغْ سُرُوْرٌ

اس کی محبت وہاں پہنچ گئی ہے جہاں شراب اور غم وسرور کا بھی گزر نہیں ہوسکتا۔

(غ ل ب)

اَلْغَلْبَةُ: کے معنی قہر اور بالا دستی کے ہیں۔ غَلَبْتُهٗ (ض) غَلْبًا وَغَلْبَةً: میں اس پر مستولی اور غالب ہوگیا۔اسی سے صیغہ صفت فاعلی غَالِبٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ﴾ (۳۰۔۳۱) الم (اہل) روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوجائیں گے۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۴۹) کہ بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے۔

﴿يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ (۸۔۶۶) دوسو پر غالب رہیں گے

﴿يَغْلِبُوْٓا اَلْفًا﴾ (۸۔۶۵) وہ ہزار پر غالب رہیں گے۔

﴿لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ (۵۸۔۲۱) کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

﴿لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ﴾ (۸۔۴۸) کہ آج کے دن ......کوئی تم پر غالب نہ ہوگا۔

﴿اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ﴾ (۷۔۱۱۳) اگر ہم جیت گئے۔

﴿اِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۲۶۔۴۴) ہم ضرور غالب رہیں گے۔

﴿فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ......﴾ (۷۔۱۱۹) اور وہ مغلوب ہو گئے۔

﴿اَفَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۲۱۔۴۴) کیا یہ لوگ غلبہ پانے والے ہیں۔

﴿سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ﴾ (۳۔۱۲) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں جہنم کی طرف) ہانکے جاؤ گے۔

﴿ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ﴾ (۸۔۳۶) اور وہ مغلوب ہو جائیں گے۔غَلَبَ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر مستولی ہونے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (۲۳۔۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب ہوگئی۔

بعض نے کہا ہے کہ اصل میں غَلَبَتْ کے معنی کسی کی گردن کے موٹے حصہ کو پکڑنے یا اس پر مارنے کے ہیں اور موٹی گردن والے شخص کو اَغْلَبُ کہا جاتا ہے۔اس کی مونث غَلْبَاءُ ہے اور هَضْبَةٌ غَلْبَاءُ کے معنی بلند ٹیلہ کے ہیں جیسا کہ اس معنی میں هَضْبَةٌ رَقْبَاءُ وَعَنْقَاءُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔❷ غَلْبَاءُ کی جمع غُلْبٌ ہے

❶ قاله عبيدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود، احد فقهاء السبعة يشبب بعتمة امراته وقبله: تغلغل حب عثمة فى فوادى۔ فباديه مع الخافى يسير والبيت فى تاريخ الخطيب (۸/۴۷۰) والمصارع (۲۰۱) والاصابة (۴۹۵۴) ونسبه ابن كثير (۱: ۱۲۶) الى النابغة فى زوجته عثمة وحكاه عن القرطبى والله اعلم وقد مر فى (شرب) رقم ۲۵۹۔

❷ وفى الاصول حديقة غلباء وهو نسب لقوله تعالى: وحدائق غلبا (۶۰۔۳۰)

(جس کے معنی گھنے باغات کے ہیں، جیسے فرمایا۔

﴿وحَدَآئِقَ غُلْبًا﴾ (۸۰۔۳۰) اور گھنے گھنے باغ۔

(غ ل ظ)

اَلْـغِـلْـظَةُ: (غین کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) کے معنی موٹا پایا گاڑھاپن کے ہیں۔ یہ رِقَّةٌ کی ضد ہے اصل میں یہ اجسام کی صفت ہے۔لیکن کَبِیْرٌ وَکَثِیْرٌ کی طرح بطور استعارہ معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً﴾ (۹۔۱۲۳) چاہیے کہ وہ تم میں سختی محسوس کریں۔

میں غِلْظَةٌ کے معنی سخت مزاجی کے ہیں۔ نیز فرمایا۔

﴿ثُـمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰی عَذَابٍ غَلِیْظٍ﴾ (۳۱۔۲۴) پھر عذاب شدید کی طرف مجبور کر کے لے جائیں گے۔

﴿مِنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ﴾ (۱۱۔۵۸) عذاب شدید سے۔

﴿جَاهِدِالْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾ (۹۔۷۳) کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سختی کرو۔

اِسْتَغْلَظَ کے معنی موٹا اور سخت ہونے کو تیار ہو جانا ہیں اور کبھی موٹا اور سخت ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ﴾ (۴۸۔۲۹) پھر موٹی ہوئی اور اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

(غ ل ف)

آیت کریمہ۔ ﴿قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ (۲۔۸۸) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہ یعنی (غُلْفٌ) اَغْلَفُ کی جمع ہے (اور اَغْلَفُ اس چیز کو کہتے ہیں جو غلاف میں بند ہو۔) چنانچہ سَیْفٌ اَغْلَفُ: کے معنی ہیں تلوار، جو غلاف یعنی نیام میں بند ہو اور غیر مختون لڑکے کو غُلَامٌ اَغْلَفُ کہا جاتا ہے اور جو چمڑہ ختم کرتے وقت کاٹ دیا جاتا ہے اسے غُلْفَةٌ کہتے ہیں۔ غَلَّفْتُ السَّیْفَ: تلوار کو نیام میں بند کر دیا۔ غَلَّفْتُ الْقَارُوْرَةَ: شیشے کے اوپر غلاف چڑھا دیا۔ غَلَّفْتُ الرَّحْلَ اَوِالسَّرْجَ: پالان یا زین پر چمڑا مڑھ دیا۔ اسی طرح غَلَّفْتُ لِحْیَتَهٗ بِالْحِنَّاءِ کے معنی کسی کی داڑھی کو مہندی سے چھپا دینے کے ہیں اور تَغَلَّفَ (تفعل) بمعنی تَخَضَّبَ ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں اس لیے قرآن کریم کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿قُلُوْبُنَافِیْٓ اَكِنَّةٍ﴾ (۴۱۔۵) اور فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (۵۰۔۲۲) کے ہم معنی ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ (غُلْفٌ) اصل میں غُلُفٌ بضم اللام ہے جیسا کہ ایک قراءت میں ہے۔ اور یہ اَغْلَفُ کی نہیں بلکہ غِلَافٌ کی جمع ہے جیسا کہ کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ آتی ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے گنجینے اور مخزن ہیں اور ان علوم کی موجودگی میں ہم دوسروں کے علوم سے بے نیاز ہیں لہٰذا تم سے کسی قسم کے استفادہ کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

(غ ل ق)

اَلْغَلْقُ وَالْمِغْلَاقُ: قفل وغیرہ، جس کے ساتھ دروازہ بند کیا جاتا ہے اور بعض نے وہ چیز مراد لی ہے جس کے ساتھ اسے کھولا جاتا ہے۔ لیکن اگر معنی بندش کا لحاظ کیا قد

جائے تو اسے مِغْلَقٌ وَمِغْلَاقٌ کہا جائے گا اور کھولنے کے اعتبار سے مِفْتَحٌ یا مِفْتَاحٌ کہا جاتا ہے اور اَغْلَقْتُ الْبَابَ کے معنی دروازہ بند کرنے کے ہیں اور غَلَّقْتُہٗ میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی بہت سے دروازوں کو بند کرنا یا ایک ہی دروازے کو احکام یعنی بڑی مضبوطی سے بند کرنا اس بنا پر آیت کریمہ۔

﴿وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ﴾ (۱۲۔۲۳) اور دروازے بند کر کے، میں ابواب کے ساتھ فعل غَلَّقَ لایا گیا ہے اور تشبیہ کے طور پر غَلَّقَ الرِّھْنَ غَلُوْقًا کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی گروی چیز کو روک لینے کے ہیں۔ ❶ غَلِقَ ظَھْرُہٗ دَبَرًا اونٹ کی پیٹھ کا زخم بھر گیا اور قمار بازی کے ساتویں تیر کو مِغْلَقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جوئے کے باقی ماندہ تمام حصوں کو روک لیتا ہے۔ نَخْلَۃٌ غَلِقَۃٌ وہ کھجور جس کی جڑیں خشک ہوگئی ہوں اور وہ پھل دینے سے رک جائے اور غَلِقَۃٌ زہریلی قسم کے ایک کڑوے درخت کا نام ہے۔

(غ ل م)

اَلْغُلَامُ: اس لڑکے کو کہتے ہیں جس کی مسیں بھیگ چکی ہوں محاورہ ہے غُلَامٌ بَیِّنُ الْغُلُوْمَۃِ وَالْغُلُوْمِیَّۃِ: لڑکا، جو بھرپور جوانی کی عمر میں ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ﴾ (۱۹۔۲۰) میرے ہاں لڑکا کیونکر ہوگا۔

﴿وَاَمَّا الْغُلَامُ فَکَانَ اَبَوَاہُ مُؤْمِنَیْنِ﴾ (۱۸۔۸۱) اور وہ لڑکا تھا جس کے ماں باپ دونوں مومن تھے۔

﴿وَاَمَّا الْجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیْنِ﴾ (۱۸۔۸۲) اور جو دیوار تھی سو وہ دو لڑکوں کی تھی۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا۔

﴿ھٰذَا غُلَامٌ﴾ (۱۲۔۱۹) یہ تو (نہایت حسین) لڑکا ہے۔ غُلَامٌ کی جمع غِلْمَۃٌ وَغِلْمَانٌ آتی ہے۔ اور اِغْتَلَمَ الْغُلَامُ کے معنی ہیں: لڑکا بالغ ہوگیا۔ عام طور پر چونکہ اس عمر میں جنسی خواہش کا غلبہ ہو جاتا ہے اس لیے غُلْمَۃٌ کا لفظ جنسی خواہش کی شدت پر بولا جاتا ہے۔ اور اِغْتَلَمَ الْفَحْلُ کے معنی ہیں سانڈ جنسی خواہش سے مغلوب ہوگیا۔

(غ ل و ر ی)

اَلْغُلُوُّ کے معنی کسی چیز کے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اگر یہ (حد سے تجاوز) اشیاء کے نرخ میں ہو تو اسے غَلَاءٌ (گرانی) کہا جاتا ہے اور قدر و منزلت میں ہو تو اسے غُلُوٌّ کہتے ہیں اور اگر تیر اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو غَلْوٌ مگر ان ہر سہ اشیاء کے متعلق فعل غَلَا یَغْلُوْ (ن) ہی استعمال ہوتا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ﴾ (۴۔۱۷۱) اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔

اور ہنڈیا کے ابال اور جوش کھانے کو غَلْیٌ وَغَلَیَانٌ (باب ضرب) کہتے ہیں۔ اسی سے بطور استعارہ ارشاد ہے۔

﴿طَعَامُ الْاَثِیْمِ۔ کَالْمُھْلِ، یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ﴾ (۴۴۔۴۵۔۴۶) گنہگار کا کھانا ہے جیسے پگھلا ہوا تانبا۔ پیٹوں میں اس طرح کھولے گا جس

❶ وفی الحدیث لا یغلق الرھن ای لا یستحقه المرتھن اذا لم یرد الراھن مارھنه فیه و کان ھذا من فعل الجاھلیة فابطله الاسلام راجع للحدیث کنزالعمال (٤: رقم ١١٦٢ و ١١٦٦) ولمعناہ الزرقانی (٤: ٥-٦)

طرح گرم پانی کھولتا ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر غصہ اور لڑائی کے بھڑک اٹھنے کو بھی غَلَيَان کہہ دیتے ہیں۔ تَغَالِي النَّبْتِ: گھاس کا زیادہ ہونا اور بڑھ جانا۔ غَلْيٌ اور غُلُوٌّ یعنی: واوی اور یائی دونوں سے آتا ہے اور غُلَوَاء کے معنی خودسری میں حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اور اسی سے بطور تشبیہ جوش جوانی کو غُلْوَاءُ الشَّبَابِ کہا جاتا ہے۔

(غ م م)

اَلْغَمُّ: (ن) کے بنیادی معنی کسی چیز کو چھپا لینے کے ہیں اسی سے اَلْغُمّٰی ہے جس کے معنی غبار اور تاریکی کے ہیں۔ نیز اَلْغُمّٰی جنگ کی شدت کو کہتے ہیں جو قوم پر چھا جائے اس طرح بادل کو اَلْغَمَام کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانپ لیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ (۲۔۱۰) کہ خدا کا عذاب بادلوں کے سائبانوں میں آنازل ہو۔ اسی سے غُمَّ الْهِلَالُ (چاند ابر کے نیچے آ گیا اور دیکھا نہ جا سکا) وَيَوْمٌ غَمٌّ (سخت گرم دن وَلَيْلَةٌ غَمَّةٌ وَغُمّٰى (تاریک اور سخت گرم رات) وغیرہا محاورات ہیں کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (رجز)

(۳۲۹) لَيْلَةٌ غُمّٰى طَامِسٌ هَلَالُهَا

تاریک رات جس کا چاند بے نور ہو۔

اور غُمَّةُ الْاَمْرِ کے معنی کسی معاملہ کا پیچیدہ اور مشتبہ ہونا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً﴾ (۱۰۔۷۱) پھر تمھارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ رہے۔

یعنی پھر وہ معاملہ تمھارے لیے قلق و اضطراب کا موجب نہ ہو اور غَمٌّ وَغُمَّةٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حزن وکرب جیسے كَرْبٌ وَكُرْبَةٌ اور غِمَامَةٌ اس چیتھڑے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کی ناک اور آنکھوں پر باندھ دیا جاتا ہے (تاکہ کسی چیز کو دیکھ یا سونگھ نہ سکے) اور نَاصِيَةٌ غَمَّاءُ پیشانی کے لمبے بال جو چہرے کو چھپا لیں۔

(غ م ر)

اَلْغَمْرُ (ض) کے اصل معنی کسی چیز کے اثر کو زائل کر دینے کے ہیں۔ اسی سے غَمْرٌ غَامِرٌ اس زیادہ پانی کو کہتے ہیں جس کا سیلاب ہر قسم کے اثرات کو (چھپا کر زائل کر دے شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (المتقارب)

(۳۳۰) وَالْمَاءُ غَامِرٌ خِدَادَهَا

اور پانی اپنے گڑھوں کو چھپانے والا تھا۔

اسی مناسبت سے فیاض آدمی اور تیز رو گھوڑے کو بھی غَمْرٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ تشبیہ کے طور پر اسے بَحْرٌ کہہ دیا جاتا ہے اور غَمْرَةٌ اس پانی کثیر کو کہتے ہیں جس کی اتھاہ نظر نہ آئے۔ اور یہ اس جہالت کے لیے ضرب المثل ہے جو آدمی پر چھا جاتی ہے۔ اور قرآن پاک نے فَاَغْشَيْنَاهُمْ وغیرہ الفاظ سے اسی معنی کی طرف اشارہ کیا

---

❶ قاله الزّاجر وتمامه او غلتها ومكره ايغالها راجع اللسان والصحاح (غم) واصلاح يعقوب ٢٨٢۔

❶ لم اجده بهذا اللفظ وفي مجالس ثعلب (١: ٢٢٢) والاقتضاب (٤٢٣) والمعاني للقبتي (٤٤٢): والليل غامر حدادها۔ كذافي اللسان (جدد) والمعرب للجواليقي (بكر) وهذا البيت لا عشيٰ يصف خمارا طرقه، لابتياع الخمر فاوُقَدَ سراجا والليل قد غمراى ستر جداد الخباء اى الخيوط المعقدة اواسفلها واوله: اضاء مظلمته بالسراج۔ وبعده: وواهمنا كلها جيدة۔ فلا تحبسنها بتنقاد ها والقصيده في ديوانه (٥٧۔٦١) فاخشى ان يكون البيت مصحفاني المطبوع۔

ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ﴾ (۲۳۔۵۴) تو ان کو .... ان کی غفلت ہی میں رہنے دو۔

﴿اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۱) جو بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں۔

اور غَمَرات کے معنی شدائد کے ہیں (کیونکہ وہ بھی انسان پر ہجوم کر کے اسے بدحواس کر دیتے) ہیں فرمایا:

﴿فِیْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ﴾ (۶۔۹۳) (جب) موت کی سختی میں۔

اور ناتجربہ کار آدمی کو بھی غَمْرٌ کہا جاتا ہے۔

وَالْجَمْعُ اَغْمَارٌ نیز غَمْرٌ کے معنی پوشیدہ کینہ کے بھی آتے ہیں۔ وَالْجَمْعُ غُمُوْرٌ اور غَمَرٌ کے معنی چربی کی بدبو کے آتے ہیں جو تمام چیزوں کی بو پر غالب آجاتی ہے غَمِرَتْ یَدُہٗ: اس کا ہاتھ میلا ہوگیا۔ غَمِرَ عِرْضُہٗ اس کی عزت پر بٹہ لگ گیا۔محاورہ ہے۔

دَخَلَ فِیْ غُمَارِ النَّاسِ وَخُمَارِهِمْ: وہ لوگوں کے ہجوم میں داخل ہوگیا۔

اَلْغُمْرَةُ: زعفران سے تیار کیا ہوا طلا جو چہرے پر ملتے ہیں۔ تَغَمَّرَتُ بِالطِّیْبِ: میں نے (اپنے چہرہ پر) زعفرانی خوشبو ملی اور پانی پینے کے چھوٹے پیالے کو غُمْرٌ کہا جاتا ہے اسی سے تَغَمَّرْتُ ہے جس کے معنی تھوڑا سا پانی پینے کے ہیں اور کسی شخص کو مُغَامِرٌ اس وقت کہتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو لڑائی کی آگ میں جھونک دے اور یہ یا تو دشمن کی صفوں میں گھسنے کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ فُلَانٌ یَخُوْضُ الْحَرْبَ کا محاورہ ہے اور یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے اور اس صورت میں اسے مُغَامِرٌ کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ اناڑی آدمی کو هَوْج وغیرہ کہا جاتا ہے۔

(غ م ز)

اَلْغَمْزُ (س) کے اصل معنی کسی کی عیب جوئی کرتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ یا پلک سے اشارہ کرنے کے ہیں اور اسی سے مَافِیْ فُلَانٌ غَمِیْزَةٌ ہے......یعنی اس میں کوئی ایسا عیب نہیں ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے اور غَمِیْزَةٌ کی جمع غَمَائِزُ آتی ہے (اَلتَّغَامُزُ) باہم کسی کے عیوب کی طرف ہاتھوں یا آنکھوں سے اشارہ کرنا) قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ﴾ (۸۳۔۳۰) اور جب ان کے پاس سے گزرتے ہیں تو حقارت سے اشارہ کرتے ہیں۔

اصل میں یہ غَمَزْتُ الْكَبْشَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مینڈھے کے بدن کو دبا کر دیکھنے کے ہیں کہ اس میں چربی ہے یا نہیں جس طرح کہ عَبَطْتُہٗ کا محاورہ ہے۔

(غ م ض)

اَلْغَمْضُ (ض) کے اصل معنی نیند کے جھونکا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ مَاذُقْتُ غَمْضًا وَلَا غَمَاضًا (یعنی چشم من یکدم نخفتہ) اسی مناسبت سے نرم اور نشیبی زمین کو غَامِضَةٌ وَغَمْضَةٌ کہا جاتا ہے اور دَارٌ غَامِضَةٌ اس سرائے کو کہتے ہیں جو شارع عام پر نہ ہو۔ غَمَضَ عَیْنَہٗ وَاَغْمَضَهَا کے معنی آنکھ کو بند کر لینے کے ہیں اور بطور استعارہ تغافل اور تساہل برتنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ﴾ (۲۔۲۶۷) تو بجز اس کے کہ لیتے وقت آنکھیں بند کرلو ان کو کبھی نہ لو۔

(غ ن م)

اَلْغَنَمُ: بکریاں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَا﴾ (۶۔۶) اور گائیوں اور بکریوں سے ان کی چربی حرام کر دی تھی۔
اَلْغَنَمُ کے اصل معنی کہیں سے بکریوں کا ہاتھ لگنا۔اور ان کو حاصل کرنے کے ہیں پھر یہ لفظ ہر اس چیز پر بولا جانے لگا ہے۔جو دشمن یا غیر دشمن سے حاصل ہو۔قرآن میں ہے۔
﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ (۸۔۴۱) اور جان رکھو کہ جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ۔
﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَیِّبًا﴾ (۸۔۶۹) جو مال غنیمت تم کو ملا ہے اسے کھاؤ کہ تمھارے لیے حلال طیب ہے۔
اَلْمَغْنَمُ: مال غنیمت۔اس کی جمع مَغَانِمُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ﴾ (۴۔۹۴) سو خدا کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں۔

(غ ن ی)

اَلْغِنٰی (تونگری) بے نیازی، یہ کئی قسم پر ہے کلی طور پر بے نیاز ہو جانا، اس قسم کی غناء سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔چنانچہ آیت کریمہ۔
﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾ (۲۲۔۲۴) اور بے شک خدا بے نیاز اور قابل ستائش ہے۔
﴿اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ......﴾ (۳۵۔۱۵) تم سب خدا کے محتاج ہو اور خدا بے پرواہ منزہ اور حمد و ثنا والا ہے۔میں بھی اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے سے یہی معنی مراد ہیں۔
قدرے محتاج ہونا اور ماتیسر پر قانع رہنا۔چنانچہ آیت کریمہ۔
﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی﴾ (۹۳۔۸) اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔
میں اَغْنٰی سے اس قسم کی غنا مراد ہے اور اس قسم کی غنا (یعنی قناعت کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔[1] (۶۲) ((الغنٰی غِنی النفس)) کہ غنی درحقیقت قناعت نفس کا نام ہے اور غنٰی کے تیسرے معنی کثرت ذخائر کے ہیں اور لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے اس کے مختلف درجات ہیں۔جیسے فرمایا۔
﴿وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ﴾ (۴۔۶) جو شخص آسودہ حال ہو اس کو ایسے مال سے قطعی طور پر پرہیز رکھنا چاہیے۔
﴿اَلَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِیَآءُ﴾ (۹۔۹۳) جو دولت مند ہیں اور پھر تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔
﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ﴾ (۳۔۱۸۱) خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں۔خدا فقیر ہے اور ہم امیر ہیں۔
یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب کہ اللہ تعالیٰ نے

[1] رواہ مسلم (۳۳۶/۱) طبعة انصاری ھندو الترمذی من حدیث ابی ھریرۃ وقال حدیث حسن صحیح ص(۶۰ ج ۱۲)۔

آیت کریمہ۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (۲-۲۴۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے۔ نازل فرما کر ان سے صدقات وخیرات کا مطالبہ کیا اور آیت کریمہ۔

﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (۲۱-۲۷۳) کہ نا مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ بظاہر قانع اور بے نیاز رہتے ہیں اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنے کی وجہ سے ناواقف لوگ انہیں تونگر خیال کرتے ہیں چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق آنحضرت ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا:❶ (۲۳) ((خُذْمِنْ اَغْنِيَآءِ هِمْ و رُدَّفِيْ فُقَرَآءِ هِمْ)) کہ ان کے اغنیاء سے صدقات وصول کر کے وہاں کے فقراء میں تقسیم کرو (اور حقیقت یہ ہے کہ نفس قانع نہ ہو تو مال و دولت کے باوجود بھی انسان فقیر ہی رہتا ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❷

(۳۳۱) وَقَدْ يَكْثُرُ الْمَالُ وَالْاِنْسَانُ مُفْتَقِرٌ اور کبھی مال کی فراوانی کے باوجود انسان محتاج ہی نظر آتا ہے۔محاورہ ہے۔

غَنَيْتُ بِكَذَا غِنْيَانًا وَغِنَاءً وَاسْتَغْنَيْتُ وَتَغَنَّيْتُ وَتَغَانَيْتُ: مال دار یا بے نیاز ہونا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاسْتَغْنَى اللّٰهُ ، وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ (۲۴-۴) اور خدا نے بھی بے پروائی کی اور خدا بے پرواہ (اور سزاوار حمد (وثنا) ہے۔

اور اَغْنَانِيْ كَذَا وَاَغْنٰى عَنْهُ كَذَا: کسی چیز کا کافی ہونا اور فائدہ بخشنا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ﴾ (۲۹-۲۸) میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا۔

﴿مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ﴾ (۱۱۱-۲) نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا.............

﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا﴾ (۳-۹) نہ تو ان کا مال ہی خدا کے عذاب سے انہیں بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد ہی کچھ کام آئے گی۔

﴿مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ﴾ (۲۶-۲۰۷) تو جو فائدے یہ اٹھا رہے ہیں ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔

﴿لَا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ﴾ (۳۶-۲۳) ان کی سفارش مجھے کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے گی۔

﴿وَلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ﴾ (۷۷-۳۱) اور نہ لپٹ سے بچاؤ۔

اور اَلْغَانِيَةُ: اس عورت کو کہا جاتا ہے جو اپنے خاوند کے سبب زینت سے بے نیاز ہو۔بعض نے کہا ہے کہ غَانِيَة اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے ذاتی حسن و جمال کی وجہ سے خارجی زیبائش وآرائش سے بے نیاز ہو۔ غَنِيَ فِيْ مَكَانِ كَذَا: کسی جگہ مدت دراز تک اقامت کرنا گویا وہ دوسری جگہوں سے بے نیاز ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ (۷-۹۲) گویا وہ ان میں کبھی

---

❶ رواه الشيخان والترمذي والنسائي من حديث عبدالله بن عباس نظر الصحيح (ص١٩٦ ج١) والترمذي (ص ٨٠ ج١) و مسلم (ص٣٦ ج ١) و النسائي (ص٢٥٨ ج١)۔

❷ انظر ايضاً في المحاضرات للمؤلف (٢: ٥٢١) بغير عزو۔

آباد ہی نہیں ہوئے تھے۔

اَلْـمَـغْـنٰی: یہ اسم مصدر اور ظرف مکان دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

غَنّٰی ، اُغْنِیَّۃٌ ، وَغِنَاءٌ (تَغَنّٰی) گیت گانا۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی (تَـغَنّٰی) بمعنی اِسْـتَـغْنٰی بھی آجاتا ہے۔چنانچہ فرمان نبوی ❶ (۶۴) ((مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ)) (جوشخص قرآن کے ساتھ اکتفانہ کرے) میں لَمْ یَتَغَنَّ بمعنی لَمْ یَسْتَغْنِ ہی ہے۔یعنی جوشخص قرآن پاک کے ساتھ دوسروں سے بے نیاز نہ رہے۔

(غ و ث (غ ی ث)

اَلْغَوْثُ کے معنی مدد اور اَلْغَیْثُ کے معنی بارش کے ہیں اور اِسْتَـغَـثْـتُہٗ: (استفعال) کے معنی کسی کو مدد کے لیے پکارنے یا اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنا آتے ہیں جب کہ اس کے معنی مدد طلب کرنا ہوتو اس کا مطاوع اَغَاثَنِیْ آئے گا مگر جب اس کے معنی بارش طلب کرنا ہوتو اس کا مطاوع غَـاثَنِیْ آتا ہے اور غَوَّثْتُ: میں نے اس کی مدد کی یہ بھی غَوْثٌ سے مشتق ہے جس کے معنی مدد ہیں۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْتَسْتَـغِیْثُـوْنَ رَبَّـكُـمْ﴾ (۸۔۹) جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے۔

﴿فَـاسْتَـغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَى الَّذِیْ مِنْ عَـدُوِّهٖ﴾ (۲۸۔۱۵) توجوشخص ان کی قوم میں سے تھا اس نے دوسرے شخص کے مقابلے میں جو موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں میں سے تھا، موسیٰ علیہ السلام سے مدد طلب کی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَاِنْ یَّسْتَـغِیْثُـوْا یُـغَـاثُـوْا بِـمَـآءٍ كَالْمُهْلِ﴾ (۱۸۔۲۹) اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے کھولتے ہوئے پانی سے ان کی دادرسی کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح گرم ہوگا۔

میں یَسْتَغِیْثُوْا غَوْثٌ (مدد مانگنا) سے بھی ہوسکتا ہے۔ اور غَیْثٌ (پانی مانگنا) سے بھی۔اسی طرح یُغَاثُوْا (فعل مجہول) کے بھی دونوں معنی ہوسکتے ہیں (پہلی صورت میں یہ اَغَـاثَ یعنی (باب افعال) سے ہوگا دوسری صورت میں غَاثَ ، یَغِیْثُ سے اور آیت کریمہ۔

﴿كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ (۵۷۔۱۰) جیسے بارش کہ اس سے کھیتی اگتی اور کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔ میں غَیْـثٌ کے معنی بارش ہیں، چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

---

❶ واختار هذا المعنى ابو عبيد القاسم بن سلام وراجع غريبه) والحديث من رواية عبدالله بن نهيك وفي معناه بحث راجع امالي المرتضىٰ (۱ : ۳۱۔۳۶) ولتخريج (الحديث انظر الكنز للمتقى (رقم ۲۷۷۰) ثم فى (رقم ۲۷۹۸) وتخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم (۲۴۲) والفتح الكبير للنبهاني (۷٦٧/۳) قال البيهقي في سننه الكبرى من كتاب الشهادات عن الشافعي معناه يقرءه تحزينا وليس معناه الاستغناء على ما قالوا وقد كره بعض الفقهاء التحدث لهذا الحديث كراهة ان يتاول بالحان مكروهة (راجع المحاضرات للمؤلف (٤/٤٣٧)۔

❷ قاله ذوالرمة في مدح بلال بن ابى بردة والصيدح اسم ناقته والبيت في اللسان (غيث) والمحكم (صدح) و الكامل (۳۹٦) وشواهد الكشاف ۸۸ الدئة للخفاجي ۲۳۵ وطراز المجالس ۵۸ وفي البيت شاهدان فعل السمع يتعدى الى مفعولين ويدخل على المبتداء والخبر مثل علم وروى برفع الناس على الحكاية اى مقول فيهم كذا وبنصبه على المفعولية والمبحث في المطولات ونظيره وجدت الناس اخبر نقله بهاء السكتة۔

(۳۳۲) سَمِعْتُ النَّاسَ يَنْتَجِعُوْنَ غَيْثًا
فَقُلْتُ لِصَيْدَحَ انْتَجِعِيْ بِلَالًا

میں نے سنا ہے کہ لوگ بارش کے مواضع تلاش کرتے ہیں تو میں نے اپنی اونٹنی صیدح سے کہا تم بلال کی تلاش کرو۔

(غ و ر)

اَلْغَوْرُ کے معنی نشیبی زمین کے ہیں۔محاورہ ہے۔ غَارَالرَّجُلُ وَاَغَارَ: نشیبی زمین میں چلا جانا۔ غَارَتْ عَيْنُهٗ غَوْرًا وَغُوُوْرًا: آنکھ کا اندر گھس جانا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَآءُكُمْ غَوْرًا﴾ (۶۷۔۳۰) تمھارا پانی بہت زیادہ زمین کے نیچے اتر جائے۔

﴿اَوْيُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا﴾ (۱۸۔۴۱) یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے۔

اَلْغَارُ کے معنی غار کے ہیں۔ج (اَغْوَار وَغِيْرَانٌ) قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْهُمَا فِى الْغَارِ﴾ (۹۔۴۰) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے۔

اور کنایہ کے طور پر فرج وبطن یعنی پیٹ اور شرمگاہ کو غَارَان (تثنیہ) کہا جاتا ہے اور مَغَارٌ کا لفظ غَوْرٌ کی طرح اسم مکان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (جمع مَغَارَاتٌ) قرآن میں ہے۔

﴿لَوْيَجِدُوْنَ مَلْجَاءً اَوْمَغٰرٰتٍ اَوْمُدَّخَلًا﴾ (۹۔۵۷) اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مغاک یا (زمین کے اندر) گھسنے کی جگہ مل جائے۔

اور غَارَتِ الشَّمْسُ غِيَارًا کے معنی سورج غروب ہو جانے کے ہیں۔کسی شاعر نے کہا ہے۔ (1) (الطّویل)

(۳۳۳) هَلِ الدَّهْرُ اِلَّا لَيْلَةٌ وَنَهَارُهَا
وَاِلَّا طُلُوْعُ الشَّمْسِ ثُمَّ غِيَارُهَا

(زمانہ دن رات کی گردش اور سورج کے طلوع وغروب ہونے کا نام ہے۔)

غَـوَّرَ کے معنی پست زمین میں چلے جانے کے ہیں۔ وَاَغَارَ عَلَى الْعَدُوِّ اِغَارَةً وَغَارَةً کے معنی دشمن پر لوٹ مارنے کے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَالْمُغِيْرَاتِ صُبْحًا﴾ (۱۰۰۔۳) پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں۔

اور اس سے مراد گھوڑے ہیں (جو صبح کو دشمن پر چھاپہ مارتے ہیں۔)

(غ و ص)

اَلْغَوْصُ کے معنی پانی میں غوطہ لگا کر کوئی چیز نکال لانے کے ہیں اور جو شخص کسی پیچیدہ مسئلہ کی تہ تک پہنچ جائے یا نیچے کی تہ سے کوئی چیز نکال لائے اسے غَائِصٌ کہا جاتا ہے اسی سے غَوَّاص صیغہ مبالغہ ہے جس کے معنی غوطہ خور کے ہیں۔

﴿وَالشَّيَاطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ﴾ (۳۸۔۳۷) اور شیاطین کو بھی (ان کے زیر فرمان کیا) وہ سب عمارتیں بنانے والے اور غوطہ مارنے والے تھے۔

﴿وَمِنَ الشَّيَاطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ﴾ (۲۱۔۸۲) اور شیاطین (کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ

---

(1) البيت من مطلع قصيدة لابي ذؤيب الهذلي في ديوانه،۲ وانظرا للسان (غور) والاقتضاب ۱۷۸ وابن عقيل رقم ۱۶۸ ومجالس ثعلب ۵۸۳۔

ان) میں سے بعض ان کے لیے غوطے مارتے تھے۔ میں پانی کے اندر سے موتی نکالنے والے غوطہ خور ہی مراد نہیں ہیں بلکہ نادر کام کرنے والے اور عجیب وغریب صنعتیں ایجاد کرنے والے بھی ان میں داخل ہیں۔

(غ و ل)

اَلْغَوْلُ: کسی کو اس طرح ہلاک کر دینا کہ اس کا پتہ بھی نہ چل سکے۔ غَالَ یَغُوْلُ غَوْلاً وَاغْتَالَهُ اغْتِیَالاً: اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ اسی سے سِعْلَاةٌ (چڑیل) کو غَوْلٌ کہا جاتا ہے (غَوْل دردسر سے مستی) قرآن پاک نے جنت کی شراب کی صفت بیان کرتے ہوئے لَا فِیْهَا غَوْلٌ (۳۷۔۴۷) نہ اس سے دردسر ہوگا۔

کہہ کر اس سے ہر اس عیب کی نفی کر دی ہے جس کی طرف آیت۔

﴿وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۲۔۲۱۹) (ان میں نقصان بڑے ہیں۔) اور آیت۔

﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ (۵۔۹۰) ناپاک اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا۔

(غ و ی)

اَلْغَیُّ: اس جہالت کو کہتے ہیں جو غلط اعتقاد پر مبنی ہو۔ کیونکہ جہالت کبھی تو کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے اور کبھی عقیدہ کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی جہالت کا نام غَیٌّ (گمراہی ہے۔) قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی﴾ (۵۳۔۲) کہ تمھارے رفیق (محمدؐ) نہ رستہ بھولے ہیں اور نہ بھٹکے ہیں۔

﴿وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ﴾ (۷۔۲۰۲) اور ان (کفار) کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچتے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (۹۔۵۹) سو عنقریب ان کو گمراہی (کی سزا) ملے گی۔

میں غَیٌّ سے عذاب مراد ہے عَذَاب کو غَیٌّ اس لیے کہا ہے کہ گمراہی عذاب کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا عذاب کو غَیٌّ کہنا مجازی ہے یعنی کسی شے کو اس کے سبب نام سے موسوم کر دینا جیسا کہ نبات کو ندّی (طراوت) کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ یہ لوگ عنقریب ہی اپنی گمراہی کا نتیجہ اور ثمرہ پالیں گے مگر مآل کے لحاظ سے دونوں معنی ایک ہی ہیں غَاوٍ: بھٹک جانے والا، گمراہ۔ جمع غَاوُوْنَ وَغَاوِیْنَ جیسے فرمایا۔

﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغَاوِيْنَ﴾ (۲۶۔۹۱) اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائی گی۔

﴿وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۴) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

اَلْغَوِیُّ: گمراہ، غلط رو۔ جیسے فرمایا۔

﴿اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (۲۸۔۱۸) کہ تو تو صریح گمراہ ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ (۲۰۔۱۲۱) اور آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا (تو وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔

میں غَوٰی کے معنی یہ ہیں کہ آدم نے جہالت کا ارتکاب کیا اور بعض نے اس کے معنی خَابَ کیے ہیں یعنی انھوں

نے سراسر نقصان اٹھایا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1]
(الطّویل)

(۳۳٤) وَمَنْ یَغْوِ لاَ یَعْدَمْ عَلَى الْغَيِّ لاَئِمًا

اور اگر ناکام ہو جائے تو ناکامی پر بھی ملامت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

بعض نے غَوٰی کے معنی فَسَدَ عَیْشُهٗ کیئے ہیں یعنی اس کی زندگی تباہ ہوگئی اور یہ غَوِیَ الْفَصِیْلُ وَغَوٰی جیسے هَوِیَ وَهَوٰی: سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا جس سے اسے بدہضمی ہوگئی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ﴾ (۱۱۔۳۴) اور اگر اللہ یہ چاہے کہ تمھیں گمراہ کرے۔

میں یُغْوِیَكُمْ سے مراد گمراہی کی سزا دینے کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی گمراہی کا حکم لگانا بھی کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿قَالَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَا ۚ اَغْوَیْنٰهُمْ كَمَا غَوَیْنَا تَبَرَّاْنَآ اِلَیْكَ﴾ (۲۸۔۶۳) (تو جن لوگوں پر) عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہوگا وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا اور جس طرح ہم خود گمراہ تھے اسی طرح انہیں گمراہ کیا تھا۔

میں بتایا گیا ہے کہ کفار قیامت کے دن اعلان کریں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ انتہائی مخلصانہ سلوک کیا تھا جو کہ ایک انسان اپنے دوست سے کر سکتا ہے کیونکہ انسان کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دوست کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو وہ کہیں گے کہ ہم نے انہیں اپنی طرف سے فائدہ پہنچایا اور انہیں اپنے جیسا سمجھا تھا اور یہی معنی آیت۔

﴿فَاَغْوَیْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِیْنَ﴾ (۳۷۔۳۲) ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا (اور) ہم خود بھی گمراہ تھے، کے ہیں۔

﴿فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ......﴾ (۱۵۔۳۹) جیسا کہ تم نے مجھے رستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لیے (گناہوں کو) آراستہ کر دکھاؤں گا اور ان کو بہکاؤں گا۔

(غ ی ب)

اَلْغَیْبُ: (ض) غَابَتِ الشَّمْسُ وَغَیْرُهَا کا مصدر ہے جس کے معنی کسی چیز کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

غَابَ عَنِّیْ كَذَا فلاں چیز میری نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ﴾ (۲۷۔۲۰) کیا کہیں غائب ہو گیا ہے۔

[1] وفی المعجم للمرزبانی ٥: البیت للمرقش الاصغر (ربیعة بن سلیمان بن سعد بن مالك) وهو ابن اخی المرقش الاکبر وعم طرفة بن العبد اوله: فمن یلق خیرا یحمد الناس امره...... انظر اللسان (غوی) والمفضلیات (١١٨) والبیت من شواهد الطبری (١٦: ١٠١) والخزانة (١: ١٦٤) والاغانی (٥: ١٨٥) والشعرو الشعراء (١٠٧) والحماسة للبحتری (٢٣٦) والمرزبانی (١٠٢) وشعراء الجاهلیة (٣٢٩) والانصاف (١١٨) والمرتضیٰ (١: ٣٦١/٢: ٤٦) والبحر (٦: ٢٠١ـ٢: ٣٢٦) واصلاح یعقوب (٢٠٣) وقبله: امن حلم اصبحت تنکث واجما وقد تعتری الاحلام من کان نائما و البیت ایضاً فی الحصری (٣: ١١) والعقد الفرید (٢: ١٨٦) والسیوطی ١٥٩ والفائق (٢: ١٠١)

اور ہر وہ چیز جو انسان کے علم اور حواس سے پوشیدہ ہو اس پر غیب کا لفظ بولا جاتا ہے یعنی غیب بمعنی غائب ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۲۷۔۷۵) اور آسمانوں اور نہ زمین میں کوئی پوشیدہ چیز نہیں ہے مگر (وہ) کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔

اور کسی چیز کو غَيْبٌ یا غَائِبٌ لوگوں کے لحاظ سے کہا جاتا ہے ورنہ باری تعالیٰ سے تو کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ﴾ (۳۴۔۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ لہٰذا آیت کریمہ۔

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۶۔۷۳) وہی پوشیدہ اور ظاہر (سب) کا جاننے والا ہے۔

میں اَلْغَيْبُ وَالشَّهَادَةُ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو انسان کے علم و حواس سے پوشیدہ ہیں اور جو اس کے سامنے موجود ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۲۔۳) غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

میں الغیب سے وہ تمام اشیاء اور حقائق مراد ہیں جو انسانی حواس سے ماوراء ہیں اور بداہت عقل سے ان کا علم نہیں ہوسکتا بلکہ انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے ہی ان کا علم ہوتا ہے اور انہیں نہ ماننے کی وجہ سے انسان ملحد ہو جاتا ہے [1] اور جن لوگوں نے غیب سے قرآن یا تقدیر مراد لی ہے۔ تو انھوں نے اس کے جزوی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعض نے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے معنی یہ کیے ہیں کہ ''تم سے غائب ہونے کی حالت میں بھی وہ ایمان لاتے ہیں، [2] یعنی وہ ان منافقوں کی طرح نہیں ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ:

﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ، قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ ، اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾ (۲۔۱۴) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ہم (پیروان محمدؐ سے) تو ہنسی کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیات۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ (۳۵۔۱۸) جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے...... ہیں۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۵۰۔۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

وغیرہا میں بھی غیب کے معنی خلوت اور تنہائی کے ہیں۔

﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۱۶۔۷۷) اور آسمانوں اور زمین کا علم خدا ہی کو ہے۔

﴿اَطَّلَعَ الْغَيْبَ﴾ (۱۹۔۷۸) کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے۔

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا﴾ (۷۲۔۲۶) اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا۔

﴿لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ

---

[1] وھو قول جمھور المفسرین کما فی الروح۔

[2] وھوا اختیار ابی مسلم الاصفھانی فعلیٰ ھذا قولہ (بالغیب) صفۃ المومنین (راجع الفخر ۲/۲۷)

اِلَّا اللّٰهُ﴾ (۲۷۔۶۵) کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے۔

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ﴾ (۱۱۔۴۹) یہ (حالات) منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾ (۳۔۱۷۹) اور اللہ تم کو غیب کی باتوں سے مطلع نہیں کرے گا۔

﴿اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ (۵۔۱۱۶) بے شک تو عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّىْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ (۳۴۔۴۸) میرا پروردگار اوپر سے حق اتارتا ہے (اور وہ) غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

اَغَابَتِ الْمَرْءَةُ: وہ عورت جس کا خاوند اس کے پاس موجود نہ ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (۴۔۳۴) اور ان کے پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خاوندوں کی عدم موجودگی میں وہ کام نہیں کرتیں جسے وہ برا سمجھتے ہوں۔

اَلْغِيْبَةُ: کے معنی کسی انسان کی عدم موجودگی میں اس کے اس عیب کو بیان کرنے کے ہیں جو اس میں موجود تو ہو لیکن اس کا ذکر کرنا اس پر ناگوار گزرے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ (۴۹۔۱۲) اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔

اَلْغِيَابَةُ: کے معنی نشیبی زمین کے ہیں اور اسی سے گھنے جنگل کو غَابَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فِىْ غِيَابَةِ الْجُبِّ﴾ (۱۲۔۱۰) کسی کنویں کی گہرائی میں......۔ ایک محاورہ ہے۔

هُمْ يَشْهَدُوْنَ اَحْيَانًا وَيَتَغَايَبُوْنَ اَحْيَانًا کہ وہ کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی چھپ جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَكَانٍ بَعِيْدٍ کے معنی یہ ہیں کہ............۔ (وہ یونہی اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں اور نگاہ و بصیرت سے اس کا ادراک نہیں کرتے۔[1]

(غ ی ر)

غَيْرٌ۔ کا لفظ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ ا۔ محض نفی کے لیے یعنی اس سے کسی دوسرے معنی کا اثبات مقصود نہیں ہوتا جیسے، مَرَرْتُ بِرَجُلٍ غَيْرِ قَائِمٍ: یعنی میں ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو کھڑا نہیں تھا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۲۸۔۵۰) اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

﴿وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ (۴۳۔۱۸) اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔

۲۔ بمعنی اِلَّا جو مستثنیٰ کے لیے آتا ہے۔ اس صورت میں یہ نکرہ کی صفت بن سکتا ہے۔ جیسے مَرَرْتُ بِقَوْمٍ غَيْرِ زَيْدٍ: یعنی میں زید کے علاوہ دوسری قوم کے پاس سے گزرا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَاعَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ﴾ (۲۸۔۳۸) میں تمھارا اپنے سوا کسی کو اللہ نہیں جانتا۔

---

[1] راجع للغيث (غوث)

﴿مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ (۷۔۶۵) اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔

﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ﴾ (۳۵۔۳) کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق (اور رازق) ہے۔

۳۔ کسی چیز سے صرف اس کی صورت یعنی وصف کی نفی کرنے کے لیے آتا ہے۔ جیسے اَلْمَاءُ اِذَا كَانَ حَارًّا غَيْرُهٗ: اِذَا كَانَ بَارِدًا۔ کہ پانی گرم ہونے کی حالت میں ٹھنڈے کا غیر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ (۴۔۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو اور کھالیں بدل دیں گے۔

۴۔ یہ کہ وہ نفی ذات کو بھی شامل ہو۔ جیسے فرمایا۔

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ (۶۔۹۳) آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم خدا پر جھوٹ بولا کرتے تھے۔ یعنی باطل بہتان بندیاں کرتے تھے۔

﴿وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۲۸۔۳۹) اور وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق مغرور ہو رہے تھے۔

﴿اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا﴾ (۶۔۱۶۴) کیا میں خدا کے سوا اور پروردگار تلاش کروں۔

﴿وَيَسْتَبْدِلْ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۴۷۔۳۸) اور تمھاری جگہ اور لوگ پیدا کرے گا۔ ❶

﴿اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ﴾ (۱۰۔۱۵) (یا تو) اس کے سوا کوئی قرآن (بنا) لاؤ۔

اور تَغْيِيْر کا لفظ بھی دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک صرف کسی چیز کی صورت کو بدلنا جیسے غَيَّرْتُ دَارِيْ یعنی میں نے اپنے گھر کی شکل وصورت بدل دی۔ دوم کسی دوسری چیز سے تبدیل کر لینا جیسے: غَيَّرْتُ غُلَامِيْ وَدَابَّتِيْ یعنی میں نے اپنا غلام یا جانور دوسرے سے تبدیل کر لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ (۱۳۔۱۱) خدا اس نعمت کو جو کسی قوم کو حاصل ہے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلیں۔

اور لفظ غَيْرٌ اور مُخْتَلِفٌ میں معنوی لحاظ سے فرق یہ ہے کہ غیر کا مفہوم لفظ مختلف سے زیادہ عام ہے کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز دوسری کی غیر ہے تو ان دونوں چیزوں کا بلحاظ جوہر کے مختلف ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ تغایر فی الوصف کی صورت میں بھی ایک دوسری کا غیر کہا جا سکتا ہے مگر ایک چیز کو دوسری سے مختلف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب کہ ان دونوں میں تغایر بلحاظ جوہر کے پایا جائے۔ بس اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر جگہ مختلفین کو متغائرین تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر موقعہ پر متغایرین کو مختلفین نہیں کہہ سکتے۔

(غ ی ض)

غَاضَ (ض) اَلشَّيْءُ غَيْضًا وَغَاضَهٗ غَيْرُهٗ: یہ نَقَصَ کی طرح لازم ومتعدی دونوں طرح آتا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی کسی چیز کو کم کرنے یا اس کے از خود کم ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَغِيْضَ الْمَاءُ﴾ (۱۱۔۴۴) تو پانی خشک ہو گیا۔

❶ كذا الاية فى الاصل وانما هوزة من المصحح دون لفظ ربى انما جاء فى (۱۱۔۵۷) لكن هناك يستخلف بدل يستبدل

﴿وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ﴾ (۱۳۔۸) اور پیٹ کے سکڑنے۔یعنی وہ نطفہ جسے بگاڑ کر رحم اس پانی کی طرح ضائع کر دیتے ہیں جسے زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے (اور وہ پینے کے کام نہیں آتا۔)

اَلْغَيْضَةُ: وہ جگہ جہاں پانی ٹھہرے اور زمین اسے اپنے اندر جذب کر لے لَيْلَةٌ غَائِضَةٌ: تاریک رات۔

(غ ی ظ)

اَلْغَيْظُ کے معنی سخت غصہ کے ہیں۔یعنی وہ حرارت جو انسان اپنے دل کے دوران خون کے تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ (۳۔۱۱۹) کہہ دو کہ (بدبختو) غصے میں مرجاؤ۔ غَاظَهٗ (کسی کو غصہ دلانا)۔

﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (۴۸۔۲۹) تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

اور اللہ تعالیٰ نے سخت غصہ کے وقت نفس کو روکنے کا حکم دیا ہے اور جو لوگ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں ان کی تحسین فرمائی ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ (۳۔۱۳۴) اور غصے کو روکتے ہیں۔

اور اگر غیظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے انتقام لینا مراد ہوتا ہے۔جیسے فرمایا۔

﴿وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ﴾ (۲۶۔۵۵) اور یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں۔

یعنی وہ اپنی مخالفانہ حرکتوں سے ہمیں انتقام پر آمادہ کر رہے ہیں۔اور تَغَيُّظٌ کے معنی اظہار غیظ کے ہیں جو کبھی ایسی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو سنائی دے، جیسے فرمایا۔

﴿سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا﴾ (۲۵۔۱۲) تو اس کے جوش غضب اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔

❀❀❀

کتابُ الفَاء

(ف ء د)

اَلْفُؤَادُ کے معنی قلب یعنی دل کے ہیں مگر قلب کو فؤاد کہنا معنی تَفَؤُّدُ یعنی روشن ہونے کے لحاظ سے ہے محاورہ ہے فَأَدْتُ اللَّحْمَ: گوشت کو آگ پر بھون لینا۔ لَحْمٌ فَئِیْدٌ آگ میں بھنا ہوا گوشت۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَاکَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی﴾ (۵۳۔۱۱) جو کچھ انھوں نے دیکھا ان کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ﴾ (۱۷۔۳۶) کہ کان آنکھ اور دل ....۔

فُؤَادٌ کی جمع اَفْئِدَۃٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ﴾ (۱۴۔۳۷) لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف جھکے رہیں۔

وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ اور تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔

﴿وَاَفْئِدَتُھُمْ ھَوَآءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔

﴿نَارُاللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ﴾ (۱۰۴۔۶۔۷) وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر جا لپٹے گی۔

اَفْئِدَۃ کی تخصیص سے اس کی شدت تاثیر پر تنبیہ کی ہے جس کی وضاحت اس کے بعد علوم قرآن پر کتابوں میں سے کسی کتاب میں بیان کی جائے گی۔

(ف ت ء)

مَافَتَأْتُ وَمَا فَتِئْتُ اَفْعَلُ کَذَا (بمعنی مَازِلْتُ) میں اس کام کو برابر کرتا رہا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿تَفْتَؤُا تَذْکُرُ یُوْسُفَ﴾ (۱۲۔۸۵) آپ یوسف کو اسی طرح یاد کرتے ہی رہو گے۔

(ف ت ح)

اَلْفَتْحُ کے معنی کسی چیز سے بندش اور پیچیدگی کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ ازالہ دو قسم پر ہے ایک وہ جس کا آنکھ سے ادراک ہو سکے جیسے۔ فَتْحُ الْبَابِ (دروازہ کھولنا) اور فَتْحُ الْقُفْلِ (قفل کھولنا) اور فَتْحُ الْمَتَاعِ (اسباب کھولنا۔قرآن پاک میں ہے۔)

﴿وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَھُمْ﴾ (۱۲۔۶۵) اور جب انھوں نے اپنا اسباب کھولا۔

﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۱۵۔۱۴) اور اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ ان پر کھولتے۔ دوم جس کا ادراک بصیرت سے ہو۔جیسے:

فَتْحُ الْھَمِّ: (یعنی ازالہ غم) اس کی چند قسمیں ہیں (۱) وہ جس کا تعلق دنیوی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے جیسے مال وغیرہ دے کر غم و اندوہ اور فقر و احتیاج کو زائل کر دینا۔ جیسے فرمایا۔

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُکِّرُوْا بِہٖ فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ

كُلِّ شَيْءٍ﴾ (٦۔٤٤) پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی، فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ یعنی ہر چیز کی فراوانی کر دی۔ نیز فرمایا۔

﴿لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ (٧۔٩٦) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔

یعنی انہیں ہر طرح سے آسودگی اور فارغ البالی کی نعمت سے نوازتے۔ (٢) علوم و معارف کے دروازے کھولنا جیسے محاورہ ہے۔

فُلَانٌ فَتَحَ مِنَ الْعِلْمِ بَابًا مُّغْلَقًا: فلاں نے علم کا بند دروازہ کھول دیا۔ یعنی شبہات کو زائل کر کے ان کی وضاحت کر دی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾ (٤٨۔١) (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو فتح دی اور فتح بھی صریح وصاف۔ میں بعض نے کہا ہے یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ اس سے علوم و معارف اور ان ہدایات کے دروازے کھولنا مراد ہے جو کہ ثواب اور مقامات محمودہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے لیے غفران ذنوب کا سبب بنے۔ ❶

اَلْفَاتِحَة: ہر چیز کے مبدء کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ اس کے مابعد کو شروع کیا جائے اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کو فَاتِحَةُ الْكِتَاب کہا جاتا ہے۔ اَفْتَحَ فُلَانٌ كَذَا فلاں نے یہ کام شروع کیا۔ فَتَحَ عَلَيْهِ كَذَا: کسی کو کوئی بات بتانا اور اس پر اسے ظاہر کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ (٢۔٧٦) جو بات خدا نے تم پر ظاہر فرمائی ہے وہ تم ان کو...... بتائے دیتے ہو۔

﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ﴾ (٣٥۔٢) جو لوگوں کے لیے ......کھولدے۔ فَتَحَ الْقَضِيَّةَ فَتَاحًا یعنی اس نے معاملے کا فیصلہ کر دیا اور اس سے مشکل اور پیچیدگی کو دور کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ﴾ (٧۔٨٩) اے ہمارے پروردگار! ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اسی سے ﴿اَلْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ﴾ (٣٤۔٢٦) ہے یعنی خوب فیصلہ کرنے والا اور جاننے والا یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الوافر)

(٣٣٥) وَاِنِّيْ مِنْ فَتَاحَتِكُمْ غَنِيٌّ

---

❶ وهذا هوا المناسب لقوله تعالىٰ بعده ليغفرلك الله الآية۔

❷ والصحيح باني بدل واني وادله: الا ابلغ بني عصم رسولا...... وفي رواية بني عمرو بدل بني عصم وفي رواية المحكم (فتح) صدره: به الامن مبلغ عمرا رسولا۔ وفي الاساس۔ الا ابلغ بني وهب رسولا۔ وفي رواية اللسان غني بدل فني وفي رواية القالي فاني عن "بدل" واني من" والبيت كماترى اختلافافي روايته ايضا مما اختلف في غزوه فنسبه صاحب اللسان الى الاسعر الجعفي وفي زيادات الجمهرة(٢: ٤) منسوب لاعشى قيس لكن الاعشى مصحف من الاسعر تسبه ابن السيرافي الى شو يعر الجعفي وفي الحماسة الصغرى لابي تمام (٤٦) ان البيت لمحمد بن حمران' ابي حمران وابو حمران اسمه مرثد بن حمران ولعل محمد مصحف والبيت في اصلاح المنطق ١١٢ و تهذيبه (١: ٨٨) والبحر(٤: ٣٤٤) وذيل مجازات ←

اور میں تمھارے فیصلہ سے بے نیاز ہوں۔
بعض کے نزدیک فُتَاحَۃٌ فا کے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ صحیح ہے۔ ❶ اور آیت کریمہ۔
﴿اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ (۱۱۰۔۱) جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح حاصل ہو گئی۔
میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَلْفَتْحُ سے نصرت، کامیابی اور حکم مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ علوم و معارف کے دروازے کھول دینا مراد ہو۔ اسی معنی میں فرمایا۔
﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ (۶۱۔۱۳) (یعنی تمھیں) خدا کی طرف سے مدد (نصیب ہوگی) اور فتح عنقریب (ہوگی)۔
﴿فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ﴾ (۵۔۵۲) تو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے۔
﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ﴾ (۳۲۔۲۸) اور کہتے ہیں...... یہ فیصلہ کب ہوگا۔
﴿قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ﴾ (۳۲۔۲۹) کہہ دو کہ فیصلے کے دن......
یعنی حکم اور فیصلے کے دن بعض نے کہا ہے کہ اَلْفَتْحِ سے قیامت بپا کر کے ان کے شک وشبہ کو زائل کرنے کا دن مراد ہے بعض نے یوم عذاب مراد لیا ہے۔ جسے وہ طلب کیا کرتے تھے۔
اَلْاِسْتِفْتَاحُ کے معنی غلبہ یا فیصلہ طلب کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ﴾ (۸۔۱۹) (کافرو) اگر تم محمد ﷺ پر فتح چاہتے ہو تو تمھارے پاس فتح آ چکی۔
یعنی اگر تم کامیابی یا فیصلہ کرتے ہو تو وہ آ چکا ہے اور یا یہ معنی ہیں کہ اگر تم مبدءِ خیرات طلب کرتے ہو تو آنحضرت ﷺ کی بعثت سے تمھیں مل چکا ہے اور آیت کریمہ۔
﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۲۔۸۹) اور وہ پہلے ہمیشہ کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔
میں يَسْتَفْتِحُوْنَ کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں۔
(۱) آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے فتح طلب کرتے تھے (۲) وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے متعلق کبھی لوگوں سے دریافت کرتے تھے اور کبھی کتب سماویہ سے اس پر استدلال کرتے تھے (۳) وہ آنحضرت ﷺ کے ذکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے تھے (۴) وہ کہا کرتے تھے کہ آنحضرت کے ذریعہ ہمیں بت پرستوں پر غلبہ حاصل ہوگا۔
اَلْمِفْتَحُ وَالْمِفْتَاحُ: (کنجی) وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو کھولا جائے اس کی جمع مَفَاتِحُ و مَفَاتِيْحُ آتی ہے اور آیت ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ (۶۔۵۹) اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ میں مَفَاتِحُ سے وہ وسائل مراد ہیں جن کے ذریعہ اس غیب تک رسائی ہوتی ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ

← القرآن لشریف الرضی والطبری (۹: ۲) والسمط ۹۲۷ والقرطبی (۱۳: ۹۴) واللسان والتاج (فتح، فتا) و مجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۲۲۰/۲: ۸۷) وشواھد الکشاف ۵ وفی روایتہ: الاابلغ بنی حمران انی عن عوادتکم نھی فی ۹ ابیات راجع السمط

❶ والصحیح بالضمة والکسرة فانه فی اصلاح یعقوب ۱۲: فی باب الفُعانه والفِعالة

اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (۷۲۔۲۶) اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔ میں ہے اور آیت کریمہ۔

﴿مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ﴾ (۲۸۔۷۶) اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔

میں مَفَاتِحُ سے بعض کے نزدیک خزانوں کی چابیاں مراد ہیں اور بعض نے خزانے ہی مراد لیے ہیں۔

عام طور پر بَابٌ فَتْحٌ کے معنی مَفْتُوْحٌ کے آتے ہیں اور یہ غَلْقٌ کی ضد ہے۔ایک روایت میں ہے۔

﴿مَنْ وَّجَدَ بَابًا غَلْقًا وَجَدَ اِلٰی جَنْبِهٖ بَابًا فَتْحًا﴾ کہ جس سے ایک دروازہ بند ہو جائے تو اس کے لیے دوسرا دروازہ کھلا ہے اور بعض کے نزدیک فَتْحٌ بمعنی وَاسِعٌ ہے۔

(ف ت ر)

اَلْفُتُوْرُ: کے معنی تیزی کے بعد ٹھہرنے، سختی کے بعد نرم اور قوت کے بعد کمزور پڑ جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ﴾ (۵۔۱۹) اے اہل کتاب! پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ جو ایک عرصے تک منقطع رہا تو اب تمھارے پاس ہمارے پیغمبر آ گئے ہیں۔

یعنی سلسلۂ رسالت کے منقطع اور ماند پڑ جانے کے بعد آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے ہیں۔آیت کریمہ۔

﴿لَا یَفْتُرُوْنَ﴾ (۲۱۔۲۰) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور کبھی سست نہیں پڑتے اور ایک روایت میں ہے۔

((اِنَّ لِكُلِّ عَالِمٍ شِرَّةً وَلِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً فَمَنْ فَتَرَ اِلٰی سُنَّتِیْ فَقَدْ نَجَا وَاِلَّا فَقَدْ هَلَكَ)) کہ ہر عالم میں تیزی ہوتی ہے اور ہر تیزی کے بعد فترۃ یعنی سکون ہوتا ہے تو جو شخص میری سنت سے سکون حاصل کرے گا وہ نجات یافتہ ہے ورنہ وہ ہلاک ہو گا۔ پس لِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باطل میں پہلے پہل تو جوش ہوتا ہے مگر جلد ہی مضمحل ہو جاتا ہے اور حق کی سلطنت کبھی ذلیل یا کمزور نہیں ہوتی۔اور مَنْ فَتَرَ اِلٰی سُنَّتِیْ کے معنی سنت نبوی کی پناہ میں سکون حاصل کرنے کے ہیں۔

اَلطَّرْفُ الْفَاتِرُ: نگاہ مست اور یہ اچھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اَلْفِتْرُ: انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان کا فاصلہ اور شَبَرْتُهٗ بِشِبْرِی کی طرح فَتَرْتُهٗ بِفِتْرِیْ کا محاورہ ہے جس کے معنی انگوٹھا اور انگشت شہادت کے ساتھ کسی چیز کو ناپنے کے ہیں۔

(ف ت ق)

اَلْفَتْقُ (ض) کے معنی دو متصل چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں اور یہ رَتْقٌ کی ضد ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا﴾ (۲۱۔۳۰) آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا۔

اَلْفَتْقُ وَالْفَتِیْقُ صبح کو کہتے ہیں (کیونکہ وہ تاریکی سے نمودار ہوتی ہے۔

اَفْتَقَ الْقَمَرُ: چاند کا بادل سے ظاہر ہونا۔

نَصْلٌ فَتِيْقُ الشَّفْرَتَيْنِ: بھالا جس کی دوشاخین ہوں۔گویا ایک کو دوسری سے پھاڑ کر بنایا گیا ہے۔

جَمَلٌ فَتِيْقٌ: اونٹ جس کا چمڑا موٹاپے کی وجہ سے پھٹ گیا ہو اور یہ فَتِیْقَ (س لازم) فَتْقًا سے ہے۔

(ف ت ل)

فَتَلْتُ الْحَبْلَ فَتْلًا کے معنی رسی کو بل دینے کے ہیں اور بٹی ہوئی رسی کو مَفْتُوْلٌ کہا جاتا ہے اور کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں جو باریک سا ڈورا ہوتا ہے اسے بھی فَتِیْلٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رسی کی شکل وصورت پر ہوتا ہے (عربی زبان میں یہ حقیر شے کے لیے ضرب المثل ہے) جیسے فرمایا: ﴿وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا﴾ (۴۔۴۹) اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

فَتِیْلٌ اصل میں اس دھاگے یا میل کو کہتے ہیں جو دو انگلیوں میں پکڑ کر بٹی جاتی ہے اور یہ حقیر چیز کے لیے ضرب المثل ہے۔

نَاقَةٌ فَتْلَاءُ الذِّرَاعَيْنِ: مضبوط بازوؤں والی اونٹنی۔

(ف ت ن)

اَلْفَتْنُ: ❶ دراصل فَتَنَ کے معنی سونے کو آگ میں پگلانے کے ہیں تاکہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے اس لحاظ سے کسی انسان کو آگ میں ڈالنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۳) جب ان کو آگ میں عذاب دیا جائے گا۔اور اس کا اطلاق نفس عذاب پر بھی ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ﴾ (۵۱۔۱۴) اپنی شرارت کا مزہ چکھو۔یعنی عذاب کا مزہ چکھو۔جیسے آیت کریمہ:

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ (۴۔۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے تاکہ (ہمیشہ) عذاب کا مزہ) چکھتے رہیں۔

میں لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ سے تعبیر فرمایا ہے اور آیت: ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا﴾ (۴۰۔۴۶) یعنی آتش جہنم پر پیش کیے جاتے ہیں۔

میں اسی عذاب کو عرض علی النار کہا ہے۔

اور کبھی فتنہ کا لفظ اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو عذاب کا باعث بنتی ہو جیسے فرمایا:

﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ (۹۔۴۹) دیکھو! یہ آفت میں پڑ گئے ہیں۔

اور کبھی اس کے معنی امتحان اور آزمائش کرنے کے آتے ہیں۔جیسے فرمایا:

﴿وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا﴾ (۲۰۔۴۰) اور ہم نے تمہاری کئی بار آزمائش کی۔

اور بلاء کی طرح فتنہ کا لفظ بھی تکلیف اور آزمائش دونوں قسم کی حالت پر بولا جاتا ہے۔جن میں انسان کو مبتلا کر کے اس کی آزمائش کی جاتی ہے (اور اس کے صبر وشکر کا امتحان کیا جاتا ہے)

لیکن شدت کے معنی میں اس کا استعمال زیادہ ظاہر اور اکثر ہے چنانچہ قرآن پاک نے دونوں قسم کے فتنہ کے متعلق فرمایا ہے۔

﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ (۲۱۔۳۵) اور

---

❶ انظر للفظ الفتنة ومعانيها المختلفة فی القرآن۔ الفتح الباری (۱۶/۱۱۸)

ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

اور تکلیف کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ﴾ (۲۔۱۰۲) ہم تو ذریعہ آزمائش ہیں۔ ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (۲۔۱۹۱) اور (دین سے گمراہ کرنے کا) فساد قتل وخون ریزی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ (۲۔۱۹۳) اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو حتیٰ کہ فساد نابود ہو جائے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ (۹۔۴۹) اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے تو اجازت ہی دیجیے اور آفت میں نہ ڈالیے دیکھو یہ آفت میں پڑے ہیں۔

یعنی مجھے بلا اور تکلیف میں نہ ڈالئے حالانکہ وہ بات کہنے کی وجہ سے مصیبت اور عذاب میں گرفتار ہو رہے ہیں۔

﴿فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ﴾ (۱۰۔۸۳) تو موسیٰ علیہ السلام پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم میں سے چند لڑکے اور وہ بھی فرعون اور اس کے اہل دربار سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں وہ ان کو آفت میں نہ پھنسا دے۔

یعنی ایسا نہ ہو کہ انہیں مصیبت اور عذاب میں ڈال دے۔

﴿وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ﴾ (۵۔۴۹) اور ان سے بچتے رہنا کہ...... یہ کہیں تم کو بہکا نہ دیں۔

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ﴾ (۱۷۔۷۳) قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بچلا دیں۔

یعنی تجھے وحی کے احکام سے برگشتہ کر کے مصیبت اور شدت میں مبتلا نہ کر دیں۔

﴿فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۵۷۔۱۴) تم نے خود اپنے تئیں بلا میں ڈالا۔

یعنی اپنے آپ کو بلا اور عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اور اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ (۸۔۲۵) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گنہگار ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (۸۔۲۸) اور جان رکھو کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔

میں اموال واولاد کو فتنہ قرار دیا ہے کیونکہ ان کے سبب سے انسان مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ (۶۴۔۱۴) تمہاری عورتوں اور اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔

میں بعض ازواج اور اولاد کو دشمن قرار دیا ہے کیونکہ بعض اوقات ان سے اس طرح اذیت پہنچتی ہے جس طرح کہ دشمن سے پہنچتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ (۳۔۱۴) لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے...... بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔

میں عورتوں اور بیٹوں کو زینت قرار دیا ہے۔ کیونکہ لوگ ان کو باعث زینت خیال کرتے ہیں نیز قرآن پاک میں

ہے:

﴿الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ﴾ (۲۹۔۱) کیا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے۔ چھوڑ دیئے جائیں گے اور انکی آزمائش نہیں کی جائے گی۔ یعنی انہیں آزمائش میں ڈال کر اچھے اور برے کو الگ الگ نہیں کیا جائے گا جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ﴾ (۸۔۳۷) تاکہ خدا، ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَوَ لَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ﴾ (۹۔۱۲٦) کیا یہ دیکھتے نہیں؟ کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار بلا میں پھنسا دیے جاتے ہیں۔ پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔

میں اس ابتلا کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ (۲۔۱۵۵) الآیۃ اور ہم کسی قدر خوف...... سے تمہاری آزمائش کریں گے۔ میں پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ (۵۔۷۱) اور یہ خیال کرتے تھے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آئے گی۔

میں بھی فِتْنَةٌ اسی معنی پر محمول ہے۔

فِتْنَةٌ کا لفظ بلا، مصیبت قتل اور عذاب وغیرہ، افعال کریہہ پر بولا جاتا ہے اور یہ ان افعال سے ہے جن کا اسناد، اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقتضائے حکمت کے مطابق آزمائش و امتحان مراد ہوتا ہے۔ اور جب اس کا اسناد انسان کی طرف ہو تو اس کے برعکس معنی مراد ہوتے ہیں اس لیے مختلف انواع کے فتنوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جابجا انسان کی مذمت کی ہے چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (۲۔۱۹۱) اور (دین سے گمراہ کرنے کا فساد) قتل و خونریزی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۸۵۔۱۰) جن لوگوں نے مومن مردوں......کو تکلیفیں دیں۔

﴿مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ بِفَاتِنِیْنَ﴾ (۳۷۔۱٦۲) خدا کے خلاف بہکا نہیں سکتے۔

یعنی گمراہ کرنے والے نہیں ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿بِاَیِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ﴾ (٦۸۔٦) کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے۔

میں بقول اخفش مَفْتُوْنَ بمعنی فتنہ ہے جس طرح کہ لَیْسَ لَهٗ مَعْقُوْلٌ وَخُذْ مَیْسُوْرَهٗ وَدَعْ مَعْسُوْرَهٗ میں معقول مَیْسُوْرٌ وَمَعْسُوْرٌ بمعنی عقل، یُسْر اور عُسْر ہیں تو آیت کی اصل بِاَیِّكُمُ الْفُتُوْنُ ہے۔

بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ بِاَیِّكُم میں باؔ زائد ہے جیسا کہ آیت وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا میں ہے لہٰذا یہ اصل میں اَیُّكُمُ الْمُفْتُوْنُ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَ احْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ﴾ (۵۔۴۹) اور ان سے بچتے رہنا کہ کسی حکم سے جو خدا نے تم پر نازل فرمایا ہے یہ کہیں تم کو بہکا دیں۔

میں اَنْ یَفْتِنُوْكَ کے معنی ہیں: خَدَعُوْكَ اس لیے عَنْ (صلہ) کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

(ف ت ی)

اَلْفَتٰی کے معنی نوجوان کے ہیں اس کی مؤنث فَتَاۃٌ اور مصدر فَتَاءٌ ہے بعدہ کنایہ کے طور پر دونوں لفظ (فَتٰی اور فَتَاۃٌ) غلام اور لونڈی کے معنی میں استعمال ہونے لگے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ (۱۲۔۳۰) اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی تھی۔

جس طرح نوجوان آدمی کو فَتٰی کہا جاتا ہے۔اسی طرح نوجوان اونٹ پر فِتِیٌّ (فعیل) بولا جاتا ہے فَتٰی کی جمع فِتْيَةٌ وَفِتْيَانٌ اور فَتَاۃٌ کی جمع فَتَيَاتٌ آتی ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿مِنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (۴۔۲۵) تو مومن لونڈیوں میں سے......

﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (۲۴۔۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو...... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔﴿وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ﴾ (۱۲۔۶۲) اور یوسف علیہ السلام نے اپنے خدام سے کہا۔

﴿اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ﴾ (۱۸۔۱۰) جب وہ جوان غار میں جا رہے۔

﴿اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ﴾ (۱۸۔۱۳) وہ کئی نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے۔

اور کسی مشکل مسئلہ کے جواب کو فُتْيَا وَفَتْوٰی کہا جاتا ہے۔ اِسْتَفْتَاہُ کے معنی فتوی طلب کرنے اور اَفْتَاہُ (افعال) کے معنی فتوی دینے کے ہیں جیسے فرمایا:﴿وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ﴾ (اے پیغمبر) لوگ تم سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں۔کہہ دو کہ خدا تم کو ان کے (ساتھ نکاح کرنے کے) معاملے میں فتویٰ (اجازت) دیتا ہے۔ (۴۔۱۲۷)

﴿فَاسْتَفْتِهِمْ﴾ (۳۷۔۱۱) تو ان سے پوچھو......

﴿اَفْتُوْنِيْ فِيْ اَمْرِيْ﴾ (۲۷۔۳۲) میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔

(ف ج ج)

اَلْفَجُّ: دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی کو کہتے ہیں اس کے بعد وسیع راستہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔اس کی جمع فِجَاجٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾ (۲۲۔۲۷) دور (دراز) راستوں سے۔

﴿فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا﴾ (۲۱۔۳۱) اس میں کشادہ رستے اَلْفَجَجُ انسان کے دونوں گھٹنوں کے درمیان کشادگی ہونا اور ایسے آدمی کو جس کے گھٹنوں میں کشادگی ہو اَفَجُّ کہتے ہیں۔

اسی سے حَافِرٌ مُفَجَّجٌ ہے۔یعنی وہ گھوڑا جس کی ٹانگوں کے درمیان کشادگی ہو اور خام زخم کو جُوْجٌ فِجٌّ کہا جاتا ہے۔

(ف ج ر)

اَلْفَجْرُ کے معنی کسی چیز کو وسیع طور پر پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں۔جیسے محاورہ ہے، فَجَرَ الْاِنْسَانُ السَّكْرَ: اس نے بند میں وسیع شگاف ڈال دیا۔فَجَرْتُهٗ فَانْفَجَرَ: میں نے پانی کو پھاڑ کر بہایا تو وہ بہ گیا فَجَّرْتُهٗ فَتَفَجَّرَ: شدت کے ساتھ پانی کو پھاڑ کر بہایا۔قرآن

پاک میں ہے۔
﴿وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا﴾ (۵۴-۱۲) اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے۔
﴿وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا﴾ (۱۸-۳۳) اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔ ﴿فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا﴾ (۱۷-۱۹) اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو۔
﴿تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا﴾ (۱۷-۹۰) جب تک کہ ہمارے لیے زمین میں سے چشمہ جاری (نہ) کردو۔
اور ایک قرأت میں تُفَجِّرَ (بصیغہ تفعیل) ہے۔
﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ (۲-۶۰) تو پھر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔
اور اسی سے صبح کو فجر کہا جاتا ہے کیونکہ صبح کی روشنی بھی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے۔
﴿وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ (۸۹-۲۸) فجر کی قسم اور دس راتوں کی۔
﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (۱۷-۷۸) کیونکہ صبح کے وقت قرآن پاک پڑھنا موجب حضور (ملائکہ) ہے۔
بعض نے کہا کہ فجر دو قسم پر ہے ایک فجر کاذب جو بھیڑیے کی دم کی طرح (سیدھی روشنی سی نمودار ہوتی ہے) دوم فجر صادق جس کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ کے احکام تعلق رکھتے ہیں۔
چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ (۲-۱۸۷) یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو۔
اَلْفُجُوْرُ کے معنی دین کی پردہ دری یعنی نافرمانی کرنے کے ہیں۔ اس کا باب فَجَرَ يَفْجُرُ فُجُوْرًا فَهُوَ فَاجِرٌ (بدکار) ہے۔ اور فَاجِرٌ کی جمع فُجَّارٌ و فَجَرَةٌ ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿كَلَّا اِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ﴾ (۸۳-۷) سن رکھو کہ بدکاروں کے اعمال سجین میں ہیں۔ ﴿اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ﴾ (۸۲-۱۴) اور بدکار دوزخ میں۔
﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾ (یہ کفار بدکردار ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ﴾ (مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے کو خودسری کرتا جائے۔ یعنی وہ زندگی اس لیے چاہتا ہے کہ اس میں فسق و فجور کا ارتکاب کرے۔ بعض نے اس کے معنی لِيُذْنِبَ فِيْهَا (تاکہ اس میں گناہ کرے) کیے ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ انسان گناہ کرتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ کل توبہ کرلوں گا۔ لیکن پھر تائب نہیں ہوتا تو یہ سراسر فجور ہے کیونکہ وہ عہد کر کے اسے توڑ ڈالتا ہے اور کاذب کو فاجر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کذب بیانی بھی فجور کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ ایک دعا میں ہے۔ [1] (۶۵) وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ یعنی جو تجھے جھٹلاتا ہے اسے ہم ترک کرتے ہیں۔ بعض نے

[1] كلمة في قنوت الوتر عن عبدالرحمن بن العزى قال صليت خلف عمر بن الخطاب الصبح الحديث وفي آخر ←

مَنْ يَفْجُرُكَ کے معنی مَنْ يَتَبَاعَدُ عَنْكَ کیے ہیں یعنی جو تجھ سے علیحدہ اور دور ہوتا ہے۔

ایام الفجار: خانہ جنگی کے ایام جو عربوں میں واقع ہوئی۔

(ف ج و)

اَلْفَجْوَةُ: دو چیزوں کے درمیان کشادگی۔ کھلی جگہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ (۱۸۔۱۷) اور وہ اس کے میدان میں تھے۔

یعنی وسیع میدان میں تھے۔ اس سے قَوْسٌ فَجَاءٌ وَفَجْوَاءُ ہے یعنی کمان جو کھینچی ہوئی حالت میں ہو۔

رَجُلٌ اَفْجٰى: جس کے دونوں پنڈلیوں کے درمیان فاصلہ ہو۔

(ف ح ش)

اَلْفُحْشُ وَالْفَحْشَاءُ وَالْفَاحِشَةُ: اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو قباحت میں حد سے بڑھا ہوا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (۷۔۲۸) کہ خدا بے حیائی کے کام کرنے کا حکم ہرگز نہیں دیتا۔

﴿وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (۱۶۔۹۰) اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

﴿مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ (۳۳۔۳۰) تم میں سے جو کوئی صریح ناشائستہ (الفاظ کہہ کر رسول اللہ کو ایذا دینے کی) حرکت کرے گی۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ﴾ (۲۴۔۱۹) اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت بدکاری کی خبر پھیلے)۔

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ﴾ (۷۔۳۳) کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو...... حرام کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ (۴۔۱۹) ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کی مرتکب ہوں۔

میں فاحشہ مبینہ سے مراد زنا ہے اسی طرح آیت کریمہ ﴿وَ الّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ﴾ (۴۔۱۵) عورتوں میں جو بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ میں بھی فاحشہ سے مراد بدکاری ہے۔ فَحُشَ فُلَانٌ برا ہونا۔ اسی سے شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

← حديث دزعم عبيد انهما سورتان من القرآن فی مصحف عبدالله بن مسعود ايضاً قنت بهولاء الكلمات عثمان وعلى رضی اللہ عنہما (راجع كنز العمال ۸/۵۲) و ايضا المروزی فی الصلاة والطبرانی فی الدعا: ان علی بن ابی طالب حدثنی انه من القرآن

[1] قاله طرفة بن العبد البكرى فی معلقته المشهور مطلعها: لخولة اطلال...... وصدرالبيت: ارى الموت يعتام الكرام ويصطفىٰ۔ والبيت فی الطبری (۳۰: ۲۷۹) واللسان (عوم) لكن فی رواية مال الباخل بدل مال الفاحش؟ والنفوس بدل الكرام والبيت فی مختار الشعر الجاهلی (۱: ۲۳۲) ومجاز القرآن لابی عبيدة (۲/۲۰۸) رقم (۹۴۶) و ذيل الامالی للمرتضى (۱: ۳۸۲) و ذيل المشكل للقبتی (۵۸) محولا على الطبری واللسان والتاج (عدم' فحش) والمحكم (عيم) والكامل (۳۱۴) وشواهد الكشاف (۳۹) وتاريخ الطبری (۵: ۳۸) فی خمسة ابيات والبحر (۲/۲۱۹/۸: ۵۰۵) واضداد ابی الطيب (۷۰۰) والمعلقة فی ديوانه (۲۱۔۳۲) والبيت فی ۳۱ والجمهرة للقرشی (۱۴۹۔ ۱۶۰) و البيت فی (۱۵۶) والعقد الثمين (۵۸) وابن الانباری (۲۰۰) وابن الشجری فی اماليه (۱: ۲۱۱) والسيوطی (۲۷۱) وشرح العشر للتبريزی (۸۵)

(۲۳۶) عَقِيْلَةَ مَالِ الْفَاحِشِ الْمُتَشَدِّدِ یعنی سخت بخیل آدمی کے نفیس مال کو (منتخب کرکے) فنا کرتی ہے تو فاحش متشدد سے بخل میں حد سے بڑھا ہوا شخص مراد ہے۔

اور بہت زیادہ فحش کام کرنے والے کو مُفْتَحِشٌ کہا جاتا ہے۔

(ف خ ر)

اَلْفَخْرُ: (ن) کے معنی ان چیزوں پر اترانے کے ہیں جو انسان کے ذاتی جوہر سے خارج ہوں مثلاً مال وجاہ وغیرہ اور اسے فَخَرٌ (بفتح الخا) بھی کہتے ہیں اور فخر کرنے والے کو فَاخِرٌ کہا جاتا ہے اور فَخُوْرٌ وَفِخِّيْرٌ صیغہ مبالغہ ہیں یعنی بہت زیادہ اترانے والا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (۳۱۔۱۸) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔ فَخَرْتُ فُلَانًا عَلٰى صَاحِبِهٖ اَفْخُرُهٗ فَخْرًا ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا اور ہر نفیس چیز کو فَاخِرٌ کہا جاتا ہے۔ ثَوْبٌ فَاخِرٌ: قیمتی کپڑا اور جس اونٹنی کے تھن تو بڑے بڑے ہوں مگر دودھ بہت کم دے اسے فخور کہتے ہیں۔ ❶ اَلْفَخَّارُ: مٹکوں کو کہا تا ہے کیونکہ وہ ٹھوکا لگانے سے اس طرح زور سے بولتے ہیں جیسے کوئی بہت زیادہ فخر کررہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ (ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے......

(ف د ی)

اَلْفِدٰى وَالْفِدَاء کے معنی کسی کی جانب سے کچھ دیکر اسے مصیبت سے بچالینا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً﴾ (۴۷۔۴) پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے۔ یا کچھ مال لے کر۔ چنانچہ محاورہ ہے: فَدَيْتُهٗ بِمَالٍ۔ میں نے کچھ خرچ کر کے اسے مصیبت سے بچالیا فَدَيْتُهٗ بِنَفْسِيْ: میں نے اپنی جان کے عوض اسے چھڑالیا فَادَاهُ بِكَذَا۔ اس نے کچھ دے کر اسے چھڑالیا قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ﴾ (۲۔۸۵) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر انہیں چھڑا بھی لیتے ہو۔

تَفَادٰى فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ: کسی کا فدیہ دے کر اس کو چھڑالینا۔

﴿وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾ (۳۷۔۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا۔

اِفْتَدٰى کے معنی خود اپنے کو مال کے عوض چھڑانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ (۲۔۲۲۹) رہائی پانے کے بدلے میں......

﴿وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ﴾ (۱۳۔۱۸) (تو وہ سب کے سب) اور ان کے ساتھ ہی اتنے اور (نجات کے) بدلے میں صرف کرڈالیں۔

﴿لَافْتَدَتْ بِهٖ﴾ (۱۰۔۵۴) تو (عذاب سے بچنے کے لیے (سب) دے ڈالے۔

﴿لِيَفْتَدُوْا بِهٖ﴾ (۵۔۳۶) (تاکہ...... بدلہ دیں......

❶ وفی المطبوع كثيرة الدر والتصوب من المراجع۔

﴿وَلَوِ افْتَدٰى بِهٖ﴾ (۳۔۹۱) اگر...... بدلے میں...... دیں ﴿لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ﴾ (۷۰۔۱۱) کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے ڈالے یعنی بیٹے......۔

اور جو مال کسی عبادت میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے خرچ کرکے انسان خود اپنے آپ کو گناہ سے بچاتا ہے اسے بھی فِدْيَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ کفارہ یمین اور صوم کے متعلق فرمایا:

﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ (۲۔۱۹۶) تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

﴿فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (۲۔۱۸۴) روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔

(ف ر ر)

اَلْفَرُّ وَالْفِرَارُ، اس کے اصل معنی ہیں: جانور کی عمر معلوم کرنے کے لیے اس کے دانتوں کو کھولنا۔ اسی سے فَرَّالدَّهْرُ جَذَعًا کا محاورہ ہے یعنی زمانہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آیا۔ اور اسی سے اِفْتِرَارٌ ہے جس کے معنی ہنسنے میں دانتوں کا کھل جانا کے ہیں۔ فَرَّ مِنَ الْحَرْبِ فِرَارًا میدان کارزار چھوڑ دینا۔ لڑائی سے فرار ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ﴾ (۲۶۔۲۱) تو میں تم سے بھاگ گیا۔ ﴿فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾ (یعنی شیر سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

﴿فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِيْ اِلَّا فِرَارًا﴾ (۷۱۔۶) لیکن میرے بلانے سے اور زیادہ گریز کرتے رہے۔ ﴿لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ﴾ (۳۳۔۱۶) (کہہ دو) کہ اگر تم...... بھاگتے ہو تو بھاگنا تم کو فائدہ نہ دے گا۔

﴿فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ﴾ (۵۱۔۵۰) تو تم خدا کی طرف بھاگ چلو۔

اَفْرَرْتُهٗ: کسی کو بھگا دینا۔

رَجُلٌ فَرٌّ وَفَارٌّ: بھاگنے والا۔

اَلْمَفَرُّ: (مصدر) کے معنی بھاگنا (ظرف مکان) جائے فرار (ظرف زمان) بھاگنے کا وقت چنانچہ آیت:

﴿اَيْنَ الْمَفَرُّ﴾ (۷۵۔۱۰) کہ (اب) کہاں بھاگ جاؤں۔ کے معنی تینوں طرح ہو سکتے ہیں۔

(ف ر ت)

اَلْفُرَاتُ کے معنی شیریں یا نہایت شیریں پانی کے ہیں اور یہ واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا﴾ (۷۷۔۲۷) اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔

﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ (۲۵۔۵۳) ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا۔

(ف ر ث)

اَلْفَرْثُ: جو کچھ جانور کی اوجھڑی کے اندر ہوتا ہے اسے فرث کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا﴾ (۱۶۔۶۶) گوبر اور لہو میں سے کس طرح خالص دودھ...... فَرَثْتُ كَبِدَهٗ: میں نے اس کے جگر کو پارہ پارہ کر دیا۔ اَفْرَثَ فُلَانٌ اَصْحَابَهٗ: فلاں نے اپنے ساتھیوں کو ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جو بمنزلہ فَرْث کے تھی (یعنی ریزہ ریزہ کر دینے والی)۔

(ف ر ج)

اَلْفَرْجُ وَالْفُرْجَةُ کے معنی دو چیزوں کے درمیان

شگاف کے ہیں۔ جیسے دیوار میں شگاف یا دونوں ٹانگوں کے درمیان کی کشادگی اور کنایہ کے طے طور پر فرج کا لفظ شرمگاہ پر بولا جاتا ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے اسے حقیقی معنی سمجھا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ الَّتِيۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا﴾ (۲۱۔۹۱) اوران (مریم علیہا السلام) کو (بھی یاد کرو) جنہوں نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔﴿لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ﴾ (۲۳۔۵) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔وَيَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَهُنَّ (۲۴۔۳۱) (اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں)۔

اور استعارے کے طور پر سرحد اور ہر خطرہ کی جگہ کو فرج کہا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسلامی دور حکومت میں فَرْجَانِ کا لفظ ترک اور سوڈان پر بولا جاتا تھا۔اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ﴾ (۵۰۔۶) اور اس میں کہیں شگاف تک نہیں۔

میں فروج بمعنی شگاف ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ﴾ (۷۷۔۹) اور جب آسمان پھٹ جائے۔

میں فُرِجَتْ بمعنی انْشَقَّتْ ہے یعنی جب آسمان شق ہو جائے گا۔

اَلْفَرَجُ کے معنی غم دور ہونے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْكَ: اللہ تجھ سے غم کو دور کرے اور قَوْسٌ فَرْجٌ اس کمان کو کہتے ہیں جس کے دونوں گوشے کشادہ ہوں۔جیسا کہ تانت سے علیحدہ ہونے کی حالت میں اور جو شخص اپنا بھید نہ چھپائے اس کو فَرْج کہا جاتا ہے اور فَرَجٌ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی شرمگاہ پر ستر یعنی پردہ نہ ہو۔

فَرَارِيْجُ الدَّجَاجِ: مرغی کے چوزے۔کیونکہ وہ انڈوں سے نکلتے ہیں اور چوزوں والی مرغی کو مُفْرِجٌ کہا جاتا ہے۔اَلْمُفْرَجُ: وہ قتیل جس سے لوگ دور ہو جائیں اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو سکے۔

(ف ر ح)

اَلْفَرْحُ کے معنی کسی فوری یا دنیوی لذت پر انشراح صدر کے ہیں۔عموماً اس کا اطلاق جسمانی لذتوں پر خوش ہونے کے معنی میں ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰٮكُمۡ﴾ (۵۷۔۲۳) اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اترایا نہ کرو۔

﴿وَ فَرِحُوۡا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا﴾ (۱۳۔۲۶) اور (کافر) لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو رہے ہیں۔

﴿ذٰلِكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ﴾ (۴۰۔۷۵) یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم......خوش ہوا کرتے تھے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا﴾ (۶۔۴۴) یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے جو ان کو دی گئی تھی خوب خوش ہو گئے۔

﴿فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ﴾ (۴۰۔۸۳) تو جو علم (اپنے خیال میں) ان کے پاس تھا اس پر اترانے لگے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡفَرِحِيۡنَ﴾ (۲۸۔۷۶) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور قرآن پاک میں صرف دو آیتیں یعنی......﴿فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا﴾ (۱۰۔۵۸) تو چاہیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ ﴿وَيَوۡمَئِذٍ يَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾ (۳۰۔۴) اور اس

روز مومن خوش ہو جائیں گے۔

ایسی ہیں جن میں فرح کا لفظ پسندیدہ معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مِـفْــرَاحٌ: بہت زیادہ اترانے والا۔ شاعر نے کہا[1] (الطّویل)

(۳۳۷) وَلَسْتُ بِمِفْرَاحٍ اِذَا الْخَیْرُ مَسَّنِیْ
وَلَا جَازِعٍ مِنْ صَرْفِهِ الْمُتَقَلِّبِ

نہ تو میں خیر حاصل ہونے سے اتراتا ہوں اور نہ ہی زمانہ کے حوادثات پر جزع فزع کرتا ہوں۔

محاورہ ہے۔ مَـا یَسُـرُّنِـیْ بِهٰـذَ الْاَمْـرِ مِفْرَحٌ اَوْ مَـفْـرُوْحٌ بہ: مجھے اس امر سے کچھ بھی خوشی نہیں۔ رَجُلٌ مُـفْـرَحٌ: وہ آدمی جو قرض کے نیچے دب گیا ہو۔ حدیث میں ہے[2] (۲۶) ((لَا یُتْــرَكُ فِـــی الْاِسْلَامِ مُفْرَحٌ)) یعنی اسلام میں کسی کو مُفْرَحْ یعنی مقروض نہیں چھوڑا جائے گا۔ گویا اِفْــرَاحُ کا لفظ فرحت کے حاصل ہونے اور زائل کرنے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اِشْکَاءُ کا لفظ جلب شکوٰی وازالہ آں کے معنی میں آتا ہے اور مقروض سے بھی چونکہ اس کی خوشی زائل ہو جاتی ہے اس لیے اسے مفرح کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے: لَا غَمَّ اِلَّا غَمُّ الدَّیْنِ کہ اصل غم تو قرض کا غم ہے۔

(ف ر د)

اَلْـفَرْدُ: (اکیلا) اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دوسری نہ ملائی گئی ہو یہ لفظ وِتــــر (طاق) سے عام اور وَاحِـدٌ سے خاص ہے اس کی جمع فُـرَادٰی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ لَا تَـذَرْنِیْ فَرْدًا﴾ (۲۱۔۸۹) پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ۔

اور اللہ تعالیٰ کے متعلق فرد کا لفظ بولنے میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ وہ تنہا ہے اس کے برعکس باقی اشیاء جوڑا جوڑا پیدا کی گئی ہیں جس پر کہ آیت ﴿وَمِـنْ کُـلِّ شَـیْءٍ خَـلَقْنَا زَوْجَیْنِ﴾ (۵۱۔۴۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ کے فرد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں سے بے نیاز ہے جیسا کہ آیت:

﴿غَـنِـیٌّ عَـنِ الْعٰلَمِیْنَ......﴾ (۳۔۹۷) اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

میں اس پر تنبیہ کی ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ اپنی وحدانیت میں منفرد ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ ذات ہر قسم کی ترکیب اور مجانست سے مبرّا ہے اور جملہ موجودات کے برعکس ہے۔ اور فرید کے معنی واحد یعنی اکیلا اور تنہا کے ہیں۔ اس کی جمع فُــرَادٰی آتی ہے جیسے اَسِیْرٌ کی جمع اُسَارٰی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی﴾ (۶۔۹۴) اور جیسا ہم

---

[1] قالہ هدبة العذری انظر العقد (۱/۱۱۶) وفی روایة سرّنی بدل مسنی وفی العیون (۱/۲۷۶) البیت اللبعیث واخری فیه: (۱ : ۲۸۱) انه لتابط شرا انظر المیسر ۴۹ والمعانی للقبتی (۱۱۵۱)۔

[2] الحدیث فی النهایة (فرح) والحدیث اخرجه الطبرانی فی الکبیر راجع کنز العمال رقم (۴۳۸) عن کثیر بن عبدالله عن ابیه عن جده وفی مجمع بحار الانوار مفرج یا لجیم و معنا ومن لا عشیرة له والفائق (۲/۱۲۶) ولفظه المفرج ذکره العلماء فی الاضداد و معناه المسرورد ایضاً المثقل بالدین۔ (اضد اد ابی الطیب ۵۶۶ وابن الانباری ۱۹۷) ولمعناه انظر غریب ابی عبید ۱۲۔

نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ایسا ہی آج اکیلے ہمارے پاس آئے۔

(ف ر ش)

اَلْفَرْشُ: (ن ض) کے اصل معنی کپڑے کو بچھانے کے ہیں لیکن بطور اسم کے ہر اس چیز کو جو بچھائی جائے فرش و فِرَاش کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ (۲-۲۲) جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا...... بنایا۔ یعنی قابل رہائش بنایا اور اسے ابھرا ہوا نہیں بنایا جس پر سکونت ناممکن ہو اور اَلْفِرَاش کی جمع فُرُشٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ﴾ (۵۶-۳۴) اور اونچے اونچے فرشوں میں۔

﴿فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ﴾ (۵۵-۵۴) ایسے بچھونوں پر جن کے استر اطلس کے ہیں.....اور فرش سے مراد وہ جانور بھی ہوتے ہیں جو بار برداری کے قابل نہ ہوں جیسے فرمایا۔

﴿وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا﴾ (۶-۱۴۲) چوپایوں میں سے بڑی عمر کے جو بار برداری کے کام آتے ہیں اور چھوٹی عمر کے جو بار برداری کا کام نہیں دیتے اور زمین میں لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) بھی۔

اور کنایہ کے طور پر فراش کا لفظ میاں بیوی میں سے ہر ایک پر بولا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا۔ [1] (۶۷) ((اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ)) کہ بچہ خاوند کا ہے۔

اور محاورہ ہے۔فُلَانٌ کَرِیْمُ الْمَفَارِشِ: یعنی اس کی بیگمات اعلیٰ مرتبہ کی ہیں۔

اَفْرَشَ الرَّجُلُ صَاحِبَهٗ: اس نے اپنے ساتھی کی غیبت اور بدگوئی کی۔اَفْرَشَ عَنْهُ: کسی چیز سے رک جانا (اَلْفَرَاشَةُ پروانہ تتلی وغیرہ) اس کی جمع اَلْفَرَاش آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ﴾ (۱۰۱-۴) جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔

اور تشبیہ کے طور پر تالے کے کنڈے کو بھی فَرَاشَةُ الْقُفْلِ کہا جاتا ہے نیز فَرَاشَة کے معنی برتن میں تھوڑا سا پانی کے بھی آتے ہیں۔

(ف ر ض)

اَلْفَرْضُ: (ض) کے معنی سخت چیز کو کاٹنے اور اس میں نشان ڈالنے کے ہیں۔مثلاً فَرْضُ الْحَدِیْدِ: لوہے کو کاٹنا فَرْضُ الْقَوْسِ: کمان کا چلہ فَرْضُ الزَّنْدِ: چقماق کا ٹکڑا اور فُرْضَةُ الْمَاءِ کے معنی دریا کا دھانہ کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ (۴-۱۱۸) میں تیرے بندوں سے (غیر خدا کی نذر دلوا کر) مال کا ایک مقرر حصہ لے لیا کروں گا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں مفروض کے معنی معین کے ہیں اور بعض نے کاٹ کر الگ کیا ہوا مراد لیا ہے۔اور فَرَضَ بمعنی ایجاب (واجب کرنا) آتا ہے مگر واجب کے معنی کسی چیز کے بلحاظ وقوع اور ثبات کے قطعی ہونے کے ہیں اور فرض کے معنی بلحاظ حکم

---

[1] وتمام الحدیث ((وللعاهر الحجر)) انظر للحدیث النهایة (۱/۳۳۵) والفائق (۲/۲۰۱) واللسان (حجر، عهد) والحملة الثانیه فقط فی اضداد ابی الطیب (۱۱۷) واصل الحدیث متفق علیه ورواه ابوداؤد والترمذی وابن ماجة عن عائشة انظر للتفصیل کنز العمال (٦ ج رقم ۷۲۰) و زوائد ابن حبان رقم (۱۳۳٦) عن ابن مسعود والفتح الکبیر للنبهانی (۳-۳۰۸)

کے قطعی ہونے کے۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا﴾ (۲۴۔۱) (یہ ایک) سورۃ ہے جس کو ہم نے نازل کیا اور اس (کے احکام) کو فرض کر دیا ہے۔
یعنی اس پر عمل کرنا فرض کر دیا ❶۔نیز فرمایا:۔
﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ﴾ (۲۸۔۸۵) (اے پیغمبر) جس نے تم پر قرآن (کے احکام) کو فرض کیا ہے......۔
یعنی اس پر عمل کرنا تجھ پر واجب کیا ہے اور اسی سے جو نفقہ وغیرہ، حاکم کسی کے لیے مقرر کر دیتا ہے اسے بھی فرض کہا جاتا ہے اور ہر وہ مقام جہاں قرآن پاک میں فَرَضَ عَلٰی (علی) کے ساتھ آیا ہے۔اس کے معنی کسی چیز کے واجب اور ضروری قرار دینے کے ہیں اور جہاں۔فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ (لام کے ساتھ) آیا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بندش کو دور کرنے اور اسے مباح کر دینے کے ہیں۔چنانچہ فرمایا۔
﴿مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ﴾ (۳۳۔۳۸) پیغمبر پر اس کام میں کچھ تنگی نہیں جو خدا نے ان کے لیے مقرر کر دیا۔
﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَکُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِکُمْ﴾ (۶۶۔۲) خدا نے تم لوگوں کے لیے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً﴾ (۲۔۲۳۷) لیکن مہر مقرر کر چکے ہو۔
کے معنی یہ ہیں چونکہ تم ان کے لیے مہر مقرر اور اپنے اوپر لازم کر چکے ہو اور یہی معنی فَرَضَ لَهٗ فِی الْعَطَاءِ کے ہیں (یعنی کسی کے لیے عطا سے حصہ مقرر کر دینا) اسی بنا پر عطیہ اور قرض کو بھی فرض کہا جاتا ہے اور فَرَائِضُ اللّٰهِ سے مراد وہ احکام ہیں جن کے متعلق قطعی حکم دیا گیا ہے اور جو شخص علم فرائض کا ماہر ہو اسے فَارِضٌ وَفَرَضِیٌّ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ﴾ (۲۔۱۹۷) تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط رکھے نہ کوئی برا کام کرے اور کسی سے جھگڑے۔یعنی جس نے فریضہ حج کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہو اور اس کی پختہ نیت کر لی ہو۔یہاں پر فرض کی نسبت انسان کی طرف کرنے میں اس بات پر دلیل ہے کہ اس وقت مقرر کرنا انسان کا کام ہے (کہ میں امسال حج کروں گا یا آئندہ سال) اور زکوۃ میں جو چیز وصول کی جاتی ہے اس پر بھی فریضہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اِلٰی قَوْلِهٖ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۹۔۶۰) صدقات (یعنی زکوۃ و خیرات) تو مفلسوں......کا حق ہے (یہ) خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔
اسی بنا پر مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عامل کی طرف خط لکھا اور اس میں ارقام فرمایا ❷ (۶۷)

---

❶ وعن عکرمة قدرنا فیها الحدود وفی قراءة بالتشدید عن ابن کثیر وابی عمرو (مجمع البیان للطبرسی (۶/۵)
❷ وکتاب ابی بکر الصدیق فی الصدقات مروی عن انسؓ (حم' واموال ابی عبید) خ' و'ن وابن جریر وابن الجار ود وابن خزیمة والطحاوی راجع کنز العمال (۶ ج رقم ۲۲۶۱)۔

((هٰذِهٖ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِيْ فَرَضَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ)) کہ یہ یعنی جو مقادیر لکھی جا رہی ہیں فریضہ زکوۃ ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔

اَلْفَارِضُ: عمر رسیدہ گائے یا بیل۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ﴾ (۲-۶۸) نہ بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔

بعض نے کہا ہے کہ بیل کو فارض اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کو پھاڑتا یعنی جوتتا ہے اور یا اس لیے کہ اس پر سخت کاموں کا بوجھ ڈالا جاتا ہے اور یا اس لیے کہ گائے کی زکوۃ میں تبیع اور مُسِنَّة لیا جاتا ہے اور تبیع کا لینا تو بعض حالتوں میں جائز ہوتا ہے اور بعض احوال میں ناجائز لیکن مُسِنَّة کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے اس لیے مُسِنَّة کو فَارِضَةٌ کہا گیا ہے اس توجیہ کی بنا پر فَارِضٌ کا لفظ مصطلحات اسلامیہ سے ہوگا۔

(ف ر ط)

فَرَطَ يَفْرُطُ (ن) کے معنی قَصْدًا آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ اسی سے فَارِطٌ ہے جس کے معنی ڈول وغیرہ درست کرنے کے لیے قافلہ سے پہلے پانی پر جانے والا کے ہیں اور اسے فَرَط بھی کہا جاتا ہے اسی سے آنحضرت نے فرمایا:❶ (۶۸) ((اَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ)) میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔

اور چھوٹے بچے پر جنازہ کی دعا میں کہا جاتا ہے۔

❷ (۶۹) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا اے اللہ! اسے ہمارے لیے میر سامان بنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ﴾ (۲۰-۴۵) کہ وہ کہیں ہم سے زیادتی نہ کرے۔

فَرَسٌ فَرَطٌ: تیز رفتار گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے۔

اَلْاِفْرَاطُ کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر جانے کے ہیں❸ اور تَفْرِيْطٌ کے معنی فرط یعنی تقدم میں کوتاہی کرنے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: مَا فَرَّطْتُ فِيْ كَذَا: میں نے فلاں معاملہ میں کوتاہی نہیں کی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ﴾ (۶-۳۸) ہم نے کتاب (یعنی لوح محفوظ میں) کسی چیز (کے لکھنے) میں کوتاہی نہیں کی۔

﴿مَا فَرَّطْتُ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ﴾ (۳۹-۵۶) اس تقصیر پر (افسوس ہے) جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

﴿مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ﴾ (۱۲-۸۰) تم یوسفؑ کے بارے میں قصور کر چکے ہو۔

اَفْرَطْتُ الْقِرْبَةَ: مشکیزہ کو پانی سے خوب بھر دیا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾ (۱۸-۲۸) اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا۔

---

❶ الحديث في الفائق (۱/۲۵٦) والنهاية (۳/۲۱۱) وغريب ابى عبيد (۱: ٤٤) وابن حبان فى زوائده رقم (۱۸۵۸) من حديث قيس بن ابى حازم مرسلا والحديث فى البخارى (فتن' رقاق' طهارة' فضائل راجع الفتح الكبير (۱: ۳۷۵)

❷ اى فى الصلوة على المولود دروراه البيهقى من حديث ابى هريرة انظر النيل (٤/٦٩) و غريب ابى عبيد واللسان والتاج (فرط)

❸ وفى القرآن وانهم مفرطون (٦-٦٢)

یعنی افراط وتفریط میں حد سے بڑھا ہوا ہے۔

(ف ر ع)

فَرْعُ الشَّجَرِ: کے معنی درخت کی شاخ کے ہیں اس کی جمع فُرُوْعٌ آتی ہے۔ اور آیت کریمہ ﴿وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ﴾ (۱۴۔۲۴) اور شاخیں آسمان میں۔ میں فَرْعُهَا کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ بلحاظ طول کے اسے فِی السَّمَآءِ کہا ہو، جیسے محاورہ ہے: فَرَعَ کَذَا (یعنی لمبا ہو جانا) اور سر کے بالوں کو بلندی اور طول کی وجہ سے فَرْعٌ کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ اَفْرَعُ: گھنے اور لمبے بالوں والا اس کی مونث فَرْعَاءُ اور جمع فُرْعٌ آتی ہے اور کہا جاتا ہے۔

فَرَعْتُ الْجَبَلَ: پہاڑ کی چوٹی پر چلا جانا۔

فَرَّعْتُ رَأْسَهٗ بِالسَّيْفِ: اس کا سر تلوار سے قلم کر دیا۔

تَفَرَّعْتُ فِیْ بَنِیْ فُلَانٍ: میں نے ان کے اونچے خاندان میں شادی کر لی۔ دوم یہ کہ عرض یعنی پھیلاؤ کے لحاظ سے اسے فِی السَّمَآءِ کہا ہو اور یہ تَفَرَّعَ کَذَا سے ہو جس کے معنی پھیل جانے کے ہیں اور مسئلہ کی جزئیات کو فروع کہا جاتا ہے۔ اور فُرُوْعُ الرَّجُلِ کے معنی اولاد کے بھی ہیں۔

(ف ر ع ن)

فِرْعَوْنُ: یہ علم عجمی ہے اور اس سے سرکشی کے معنی لے کر کہا جاتا ہے تَفَرْعَنَ فُلَانٌ کہ فلاں فرعون بنا ہو ہے۔ جس طرح کہ ابلیس سے اَبْلَسَ وَتَبَلَّسَ وغیرہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اسی سے سرکشوں کو فَرَاعِنَة (جمع فرعون کی) اور اَبَالِسَة (جمع ابلیس کی) کہا جاتا ہے۔

(ف ر غ)

اَلْفَرَاغُ: یہ شُغل کی ضد ہے۔ اور فَرَغَ (ن) فُرُوْغًا خالی ہونا۔ فَارِغٌ: خالی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا﴾ (۲۸۔۱۰) اور موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہو گیا۔

یعنی خوف کی وجہ سے گویا عقل سے خالی ہو چکا تھا...... جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۳۳۸) کَاَنَّ............ جُؤْ جُؤَهٗ هَوَاءٌ

گویا...... اس کا سینہ ہوا ہو رہا تھا

اور بعض نے فَارِغًا کے معنی موسیٰ علیہ السلام کے خیال سے خالی ہونا کئے ہیں یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا خیال ان کے دل سے بھلا دیا حتیٰ کہ وہ مطمئن ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا انہوں نے گوارا کر لیا بعض نے فارغا کا معنی اس کی یاد کے سوا باقی چیزوں سے خالی ہونا بھی کیے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بعد کی آیت:

﴿وَاِنْ كَانَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِهَا﴾ (۲۸۔۱۰) اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس قصے کو ظاہر کر دیں۔ سے معلوم ہوتا ہے اور اسی سے فرمایا:

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ (۹۴۔۷) تو جب فارغ ہوا کرو تو عبادت میں محنت کیا کرو۔

﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ﴾ (۵۵۔۳۱) اے دونوں جماعتو! ہم عنقریب تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

---

[1] قطعة من كلمة لزهير والبيت بتمامه: كان الرحل منهافوق صعل من الظلمان جؤ جؤه هواءٌ۔ والبيت فی اللسان (هوا) والكامل (۲۸۷) ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۹۳) والبحر (۵: ۴۳) وغريب القرآن للقبتی و ديوانه ۶۳ والحيوان (۴: ۳۹۸) والعقد الثمين (۷۶) والعيون (۲: ۶۹) والمعانی للقبتی (۳۳۵)۔

اور اَفْرَغْتُ الدَّلْوَ کے معنی ڈول سے پانی بہا کر اسے خالی کر دینا کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا﴾ (۲-۲۵۰) ہم پر صبر کے دہانے کھول دے، بھی اسی سے مستعار ہے۔ ذَھَبَ دَمُہٗ فَرْغًا۔ اس کا خون رائیگاں گیا۔ فَرَسٌ فَرِیْغٌ: وسیع قدم اور تیز رفتار گھوڑا گویا وہ دوڑ کر پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔
ضَرْبَۃٌ فَرِیْغَۃٌ: وسیع زخم جس سے خون زور سے بہہ رہا ہو۔

(ف ر ق)

اَلْفَرْقُ وَالْفَلْقُ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن معنی انشقاق یعنی پھٹ جانا کے لحاظ سے فَلَقٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور معنی انفصال یعنی الگ الگ ہونے کے لحاظ سے فَرْقٌ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ﴾ (۲-۵۰) اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا۔
اور اَلْفِرْقُ (۲۶-۲۴) کے معنی الگ ہونے والا ٹکڑہ کے ہیں۔ اسی سے فِرْقَۃٌ (۹-۱۲۲) ہے جس کے معنی لوگوں کا گروہ یا جماعت کے ہیں۔ اور طلوع فجر پر فَرَقٌ اور فلق دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ﴾ (۲۶-۶۳) تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا (کہ) گویا بڑا پہاڑ ہے۔
اور فریق اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَ اِنَّ مِنْھُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَھُمْ بِالْکِتٰبِ﴾ (۳-۷۸) اور اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں کہ کتاب تورات کو زبان مروڑ مروڑ کر پڑھتے ہیں۔ ﴿فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (۵-۷۰) ایک جماعت کو جھٹلا دیتے اور ایک جماعت کو قتل کر دیتے تھے۔
﴿فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ﴾ (۴۲-۷) ایک فریق بہشت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں۔
﴿اِنَّہٗ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْ عِبَادِیْ﴾ (۲۳-۱۰۹) میرے بندوں میں ایک گروہ تھا...... ﴿اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ﴾ (۱۹-۷۳) دونوں فریق میں سے...... کس کے۔
﴿وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْکُمْ مِّنْ دِیَارِھِمْ﴾ (۲-۸۵) اور اپنے میں سے بعض لوگوں کو...... وطن سے نکال بھی دیتے ہو۔
﴿وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ (۲-۱۴۶) مگر ایک فریق ان میں سے سچی بات کو...... چھپا رہا ہے۔
اور فَرَقْتُ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ کے معنی دو چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں خواہ وہ علیحدگی نظر سے محسوس ہو رہی ہو یا اس کا تعلق بصیرت سے ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴾ (۵-۲۵) تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی کر دے۔
﴿فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا﴾ (۷۷-۴) پھر وہ (اشیاء کے درمیان) فرق کر دیتے ہیں۔
یعنی وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اشیاء کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿فِیْھَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ﴾ (۴۴-۴) اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصل کیے جاتے ہیں، میں بھی یفرق اسی معنی پر محمول ہے اور حضرت عمرؓ کو فاروق

اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کرنے والے تھے اور آیت کریمہ: ﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ﴾ (۱۷۔۱۰۶) اور ہم نے قرآن پاک کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے۔
کے معنی ہیں کہ ہم نے قرآن پاک میں تمام احکام کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں اور بعض نے فَرَقْنٰهُ کے معنی مفرق طور پر نازل کرنا بھی لکھے ہیں۔
اَلتَّفْرِیْقُ اصل میں تکثیر کے لیے ہے اور کسی چیز کے شیرازہ اور اتحاد کو زائل کر دینے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:
﴿مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ﴾ (۲۔۱۰۲) جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ﴿فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ (۲۰۔۹۴) کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (۲۔۲۸۵) اور کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ نیز آیت:
﴿لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (۳۔۸۴) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ میں احد کا لفظ چونکہ حرف نفی کے تحت واقع ہونے کی وجہ سے جمع کے معنی میں ہے لہٰذا تفریق کی نسبت اس کی طرف جائز ہے اور آیت کریمہ۔
﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ﴾ (۶۔۱۵۹) جن لوگوں نے اپنے دین میں بہت سے رستے نکالے۔
میں ایک قرأت فَارَقُوْا ہے اور فَرْقٌ وَ مُفَارَقَةٌ کا لفظ عام طور پر اجسام کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَ بَیْنِكَ﴾ (۱۸۔۷۸) اب مجھ میں اور تجھ میں علیحدگی۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ﴾ (۷۵۔۲۸) اس (جان بلب) نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہے، کے معنی یہ ہیں کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بس اب دنیا سے مفارقت کا وقت قریب آ پہنچا ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ﴾ (۴۔۱۵۰) اور خدا اور اس کے پیغمبروں میں فرق کرنا چاہتے ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور آیت کریمہ:
﴿وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (۴۔۱۵۲) اور ان میں کسی میں فرق نہ کیا۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔
اَلْفُرْقَانُ: یہ فَرْقٌ سے ابلغ ہے کیونکہ یہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ رَجُلٌ قُنْعَانٌ (یعنی وہ آدمی جس کے حکم پر قناعت کی جائے) کی طرح اسم صفت ہے مصدر نہیں ہے اور فَرْقٌ کا لفظ عام ہے جو حق کو باطل سے الگ کرنے کے لیے بھی آتا ہے اور دوسری چیزوں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ (۸۔۲۹) مومنو! اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے امر فارق پیدا کر دے گا (یعنی تم کو ممتاز کر دے گا۔ میں فرقان سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر نور اور توفیق پیدا کر دے گا جس کے ذریعہ تم حق و باطل میں امتیاز کر سکو گے تو گویا یہاں فرقان کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ سکینۃ اور

روح کے الفاظ ہیں اور قرآن پاک نے یوم الفرقان اس دن کو کہا ہے جس روز کہ حق و باطل اور صحیح و غلط کے مابین فرق اور امتیاز ظاہر ہوا چنانچہ آیت:۔
﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ (۸۔۴۱) اور اس (نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق و باطل میں) فرق کرنے کے دن نازل فرمائی۔ میں یوم الفرقان سے جنگ بدر کا دن مراد ہے کیونکہ وہ (تاریخ اسلام میں) پہلا دن ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا۔

اور کلام الٰہی (وحی) بھی فرقان ہوتی ہے کیونکہ وہ حق اور باطل عقائد میں فرق کر دیتی ہے سچی اور جھوٹی باتوں اور اچھے برے اعمال کو بالکل الگ الگ بیان کر دیتی ہے اس لیے قرآن کریم، تورات اور انجیل کو فرقان سے تعبیر فرمایا گیا ہے چنانچہ توراۃ کے متعلق فرمایا:﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲۱۔۴۸) اور ہم نے موسیٰ اور ہارونؑ کو (ہدایت اور گمراہی میں) فرق کر دینے والی...... عطا کی۔

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ﴾ (۲۵۔۱) وہ خدائے عزوجل بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا:﴿وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲۔۵۳)﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ﴾ (۲۔۱۸۵) روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔

اَلْفَرَقُ کے معنی خوف کی وجہ سے دل کے پراگندہ ہو جانے کے ہیں اور دل کے متعلق اس کا استعمال ایسے ہی ہے جس طرح کہ صَدْعٌ و شَقٌّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:﴿وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ﴾ (۹۔۵۶) اصل یہ ہے کہ یہ ڈرپوک لوگ ہے۔

اور فَرُوْقٌ وَ فَرُوْقَةٌ کے معنی ڈرپوک مرد یا عورت کے ہیں (وَيَسْتَوِيْ فِيْهِ التَّذْكِيْرُ وَالتَّانِيْثُ) اور اسی سے اس اونٹنی کو جو درندہ کی وجہ سے بدک کر دور بھاگ جائے۔ فَارِقٌ يَا فَارِقَةٌ کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر اس بدلی کو بھی فَارِقٌ کہا جاتا ہے۔ جو دوسری بدلیوں سے علیحدہ ہو۔

اَلْاَفْرَقُ: (۱) وہ مرغ جس کی کلغی شاخ در شاخ ہو۔ (۲) وہ گھوڑا جس کا ایک سرین دوسرے سے اونچا ہو۔
اَلْفَرِيْقَةُ: دودھ میں پکائی ہوئی کھجور۔
اَلْفَرُوْقَةُ گردوں کی چربی۔

(ف ر ہ)

اَلْفَرِهُ: (صفت مشبہ) اترانے والا۔ اور نَاقَةٌ مُفْرِهَةٌ: اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو چست اور پھرتیلے بچے دے (اس سے اسم فاعل فَارِهٌ ہے) قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۴۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

---

❶ وفی المطبوع الکتاب مصحف والالتکررت آلایة واللہ اعلم۔ ۱۲

میں فَارِهِيْنَ کے معنی حَاذِقِيْنَ (یعنی ماہر اور ہنر مند) کے ہیں اور فَرِه کی جمع فُرَّهٌ ہے یہ انسان اور دیگر حیوانات کے لیے استعمال ہوتا ہے ایک قرأت میں فَرِهِيْنَ ہے جو فَارِهِيْنَ کے ہم معنی ہے اور بعض نے (دونوں) کے معنی اَشِرِيْنَ (اترانے والے) بھی کیے ہیں۔

(ف ر ی)

اَلْـفَـرْیُ (ن) کے معنی چمڑے کو سینے اور درست کرنے کے لیے اسے کاٹنے کے ہیں اور اِفْرَاءٌ (افعال) کے معنی اسے خراب کرنے کے لیے کاٹنے کے۔

اِفْتَـرَاءٌ (افتعال) کا لفظ اصلاح اور فساد دونوں کے لیے آتا ہے لیکن اس کا زیادہ تر استعمال افساد ہی کے معنوں میں ہوتا ہے اسی لیے قرآن پاک میں جھوٹ، شرک اور ظلم کے موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ مَـنْ يُّشْـرِكْ بِـالـلّٰـهِ فَـقَـدِ افْتَـرٰی اِثْـمًا عَظِيْمًا﴾ (۴۔۴۸) جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا۔

﴿اُنْظُـرْ كَيْفَ يَـفْتَـرُوْنَ عَـلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ (۴۰۔۵۰) دیکھو یہ خدا پر کیسا جھوٹ (طوفان) باندھتے ہیں۔

اور کذب کے متعلق فرمایا:

﴿افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا﴾ (۶۔۱۴۰) اور خدا پر افتراء کر کے...... وہ بے شبہ گمراہ ہیں۔

﴿وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ (۵۔۱۰۳) بلکہ کافر خدا پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں۔

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ﴾ (۱۱۔۳۵) کیا یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) نے قرآن پاک اپنے دل سے بنا لیا ہے۔

﴿وَمَـا ظَـنُّ الَّـذِيْـنَ يَـفْـتَـرُوْنَ عَـلَـى اللّٰـهِ الْكَذِبَ﴾ (۱۰۔۶۰) اور جو لوگ خدا پر افتراء کرتے ہیں وہ...... کیا خیال رکھتے ہیں؟۔

﴿اَنْ يُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۱۰۔۳۷) کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔ ﴿اِنْ اَنْتُـمْ اِلَّا مُـفْـتَـرُوْنَ﴾ (۱۱۔۵۰) تم (شرک کر کے خدا پر) محض بہتان باندھتے ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَـقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا﴾ (۹۔۲۷) یہ تم نے برا کام کیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ فَـرِيًّا کے معنی عظیم بات کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عجیب بات کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی من گھڑت اور بنائی ہوئی بات کے ہیں لیکن مآل کے اعتبار سے یہ تمام اقوال ایک ہی ہیں۔

(ف ز ز)

اَلْاِسْتِـفْـزَازُ۔ ہلکا سمجھنا گھبرا دینا اور جگہ سے ہٹا دینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاسْتَـفْـزِزْ مَـنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ﴾ (۱۷۔۶۴) اور ان میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے بہکاتا رہ۔

﴿فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُـمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (۱۷۔۱۰۳) تو اس نے چاہا کہ انہیں گڑ بڑا کر سرزمین (مصر) میں سے نکال دے۔

اور فَزَّنِيْ فُلَانٌ کے معنی ہیں: اس نے مجھے پریشان...... کر کے میری جگہ سے ہٹا دیا اور گائے کے بچہ کو فَزٌّ کہا جاتا

ہے کیونکہ اس میں خفت یعنی ہلکی پائی جاتی ہے جس طرح کہ اس میں عجلت (جلد بازی) کا تصور کر کے اسے عِجْلٌ کہا جاتا ہے۔

(ف ز ع)

اَلْفَزَعُ: انقباض اور وحشت کی اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی خوفناک امر کی وجہ سے انسان پر طاری ہو جاتی ہے یہ جَزَعٌ کی ایک قسم ہے اور خِفْتُ مِنَ اللّٰہِ کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے لیکن فَزِعْتُ مِنْہُ کہنا صحیح نہیں ہے اور آیت کریمہ:

﴿لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ﴾ (۲۱۔۱۰۳) ان کو (اس دن کا) بڑا بھاری غم غمگین نہیں کرے گا۔

میں فَزَعٌ اَکْبَرُ سے دوزخ میں داخل ہونے کا خوف مراد ہے۔ نیز فرمایا:

﴿فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۷۔۸۷) اور ایسے لوگ (اس روز) گھبراہٹ سے بےخوف ہوں گے۔

﴿حَتّٰی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِھِمْ﴾ (۳۴۔۲۳) یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے اضطراب دور کر دیا جائے گا۔

یعنی ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی فَزِعَ اِلَیْہِ کے معنی گھبراہٹ کے وقت کسی سے فریاد کرنے اور مدد مانگنے کے ہیں اور فَزِعَ لَہٗ کے معنی مدد کرنے کے۔

❶ شاعر نے کہا ہے ❷ (البسیط)

(۳۳۹) وَکُنَّا اِذَا مَا اَتَانَا صَارِخٌ فَزِعٌ۔

یعنی جب کوئی فریاد چاہنے والا گھبرا کر ہمارے پاس آتا۔

بعض نے فَزِعٌ کے معنی مستغیث کیے ہیں تو یہ لفظ فزع کے اصل معنی نہیں ہیں بلکہ معنی مقصود کی تشریح ہے۔

(ف س ح)

اَلْفُسْحُ وَالْفَسِیْحُ کے معنی وسیع جگہ کے ہیں اور تَفَسَّحَ کے معنی وسیع ہونے کے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فَسَّحْتُ مَجْلِسَہٗ میں نے اس کے لیے محفل میں جگہ کر دی تو وہ اس میں کھل کر بیٹھ گیا۔ قرآن میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ﴾ (۵۸۔۱۱) اے مومنو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھ جایا کرو خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔

اسی سے فَسَّحْتُ لِفُلَانٍ اَنْ یَفْعَلَ کَذَا کا محاورہ ہے جس کے معنی وَسَّعْتُ لَہٗ کے ہیں ھُوَ فِیْ فُسْحَۃٍ مِنْ ھٰذَا الْاَمْرِ وہ اس معاملہ میں آزاد ہے۔

(ف س د)

اَلْفَسَادُ یہ فَسَدَ (ن) اَلشَّیْئُ فَھُوَ فَاسِدٌ کا

---

❶ ومنه قوله ﷺ للانصار: انكم تقلون عند الطمع وتكثرون عند الفزع انظر للكلمة الكامل للمبرد ٤ واضداد ابى الطيب (٥٤١-٥٤٤) وعده العلماء من الاضداد۔

❷ قاله سلامة بن الجندل وتمامه: ...... كان الصراخ له قرع الظنابيب والبيت من قصيدہ' مفضلية (١١٧-١٢٢) والشعراء النصرانية (٤٨٦-٤٩٠) راجع للبيت اضداد الاصمعى (٥٤) وابن السكيت (٢٠٨) واللسان (طنب) واضداد ابى الطيب (٤٣١، ٥٤٠) والمعانى للقبتى (٩٤٣) و ديوانه ١١ والسمط ٤٧ والمرزوقى (١: ١٣٠) و الميدانى (٢: ٩٣) والبحر (٥: ٤١٤) والكامل ٤: ويشتق من هذا المعنى ان يقع مفزع فى معنى اغاث فاللفظ من الاضداد۔

مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں۔عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ یہ اصل میں صلاح کی ضد ہے اور نفس' بدن اور ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو حالت استقامت سے نکل چکی ہو اور اَفْسَدَہٗ کے معنی کسی چیز کا توازن بگاڑنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (۲۳۔۷۱) تو آسمان وزمین......سب درہم برہم ہو جائیں۔﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (۲۱۔۲۲) اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ﴾ (۳۰۔۴۱) خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا۔

﴿وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (۲۔۲۰۵) اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا۔

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (۲۔۱۱) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو۔

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ (۲۔۱۲) دیکھو! یہ بلاشبہ مفسد ہیں۔

﴿لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ﴾ (۲۔۲۰۵) تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے اور کھیتی کو اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے۔

﴿اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا﴾ (۲۷۔۳۴) کہ بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ (۱۰۔۸۱) بے شک خدا شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔

﴿وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ (۲۔۲۲۰) اور خدا خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔

(ف س ر)

اَلْفَسْرُ (ض ن) کے معنی کسی چیز کی معنوی صفت کو ظاہر کرنے کے ہیں اسی سے "تَفْسِرَةٌ" ہے۔جس کے معنی قارورہ کی تشخیص کے ہیں اور (مجازا) قارورۃ (پیشاب کی بوتل) کو تفسرۃ کہہ دیتے ہیں۔التفسیر بھی الفسر کے ہم معنی ہے۔مگر اس میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں اور (عرف میں) تفسیر کا لفظ کبھی تو مفرد اور غریب الفاظ کی تشریح اور وضاحت پر بولا جاتا ہے اور کبھی خاص کر تاویل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ تَاْوِیْل الرؤیا (خواب کی تعبیر) کی بجائے تَفْسِیْر الرؤیا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا﴾ (۲۵۔۳۳) اور خوب مشرح۔میں بھی تفسیر بمعنی تاویل استعمال ہوا ہے۔

(ف س ق)

فَسَقَ فُلَانٌ کے معنی کسی شخص کے دائرہ شریعت سے نکل جانے کے ہیں یہ فَسَقَ الرُّطَبُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی گدری کھجور کے اپنے چھلکے سے باہر نکل آنا کے ہیں (شرعا) فسق کا مفہوم کفر سے اعم ہے کیونکہ فسق کا لفظ چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے گناہ کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اگرچہ عرف میں بڑے گناہوں

کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اور عام طور پر فَـاسِقٌ کا لفظ اس شخص کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو احکام شریعت کا التزام اور اقرار کرنے کے بعد تمام یا بعض احکام کی خلاف ورزی کرے اور کافر حقیقی پر فاسق کا لفظ اس لیے بولا جاتا ہے کہ وہ حکم، عقل یا فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ (۱۸۔۵۰) تو اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہو گیا۔

﴿فَفَسَقُوْا فِيْهَا﴾ (۱۷۔۱۶) تو وہ نافرمانیاں کرتے ہیں۔ ﴿وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (۳۔۱۱۰) اور اکثر نافرمان ہیں۔

﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا﴾ (۳۲۔۱۸) بھلا جو مومن ہے، اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہے؟

﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (۲۴۔۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکار ہیں۔

یعنی جو نعمت الٰہی کی ناشکری کرے گا وہ دائرہ طاعت سے خارج سمجھا جائے گا۔

﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ﴾ (۳۲۔۲۰) اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کے رہنے کے لیے دوزخ ہے۔

﴿وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ (۶۔۴۹) اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کی نافرمانیوں کے سبب انہیں عذاب ہوگا۔

﴿وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (۹۔۲۴) اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (۹۔۶۷) بے شک منافق نافرمان ہیں۔

﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْا﴾ (۱۰۔۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد نافرمانوں کے حق میں ثابت ہو کر رہا۔

﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا﴾ (۳۲۔۱۸) بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح وہ سکتا ہے۔ جو نافرمان ہو۔

یہاں فسق کا لفظ ایمان کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے فاسق کافر سے اعم ہے مگر ظالم فاسق سے بھی عام ہے چنانچہ فرمایا۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ اِلٰى قَوْله وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (۲۴۔۴) اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں...... اور یہی بدکار ہیں۔

اور چوہیا کو اس کی خباثت اور شرارت کی بنا پر فویسقه کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے بار بار اپنے بل سے باہر نکلنے کی وجہ سے اسے فُوَيْسِقَه کہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے [1] (۷۰) ((اُقْتُلُوا الْفُوَيْسِقَةَ۔ فَاِنَّهَا تُوْهِي السِّقَاءَ وَتُضْرِمُ الْبَيْتَ عَلٰى اَهْلِهٖ)) کہ چوہیا کو مار ڈالو کیونکہ وہ پانی کی مشک میں سوراخ کر ڈالتی ہے اور گھروں میں آگ لگا دیتی ہے۔

ابن العربی کا قول ہے کہ فساق کا لفظ صرف قرآن کریم نے انسانوں کے لیے استعمال کیا ہے ورنہ جاہلیت میں یہ لفظ انسانوں کے لیے اس معنی میں نہیں بولا جاتا تھا بلکہ

گدڑی کھجور کے متعلق فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا کا محاورہ استعمال ہوتا تھا۔

(ف ش ل)

اَلْفَشَلُ: (س) کے معنی کمزوری کے ساتھ بزدلی کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ (۳۔۱۴۲) یہاں تک کہ تم نے ہمت ہار دی اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے۔

﴿فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ﴾ (۸۔۴۶) تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔ ﴿لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ (۸۔۴۳) تو تم لوگ جی چھوڑ دیتے اور (جو) معاملہ (درپیش تھا اس) میں جھگڑنے لگتے۔

تَفَشَّلَ الْمَآءُ: پانی بہہ پڑا۔

(ف ص ح)

اَلْفُصْحُ کے معنی کسی چیز کے ہر قسم کی امیزش سے پاک ہونے کے ہیں اصل میں اس کا استعمال دودھ کے خالص ہونے پر ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

فَصَحَ اللَّبَنُ وَاَفْصَحَ کے معنی دودھ کے اوپر سے جھاگ اتار کر اسے بالکل صاف کر لینے کے ہیں اور جس دودھ کے اوپر سے جھاگ اتار کر اسے بالکل صاف کر لیا جائے اسے مُفْصِحٌ یَا فَصِیْحٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مروی❶ ہے۔ (الوافر)

(۳۴۰) وَتَحْتَ الرَّغْوَةِ اللَّبَنُ الْفَصِیْحُ

جھاگ کے نیچے خالص دودھ ہوتا ہے۔

اور اسی سے فَصُحَ الرَّجُلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی کسی شخص کے خوش گفتار ہونے کے ہیں اور اَفْصَحَ کے معنی خالص عربی زبان میں گفتگو کرنے کے ہیں اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے بعض نے کہا ہے کہ فَصِیْحٌ نَاطِقٌ (یعنی انسان فرشتے وغیرہ) کو کہتے ہیں اور اَعْجَمِیٌّ کے معنی غیر ناطق (یعنی چوپایہ وغیرہ) کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا﴾ (۲۸۔۳۴) اور ہارون جو میرا بھائی ہے اس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

اسی سے اَفْصَحَ الصُّبْحُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی صبح کے روشن اور نمودار ہونے کے ہیں اور اَفْصَحَ النَّصَارٰی معنی عیسائیوں کے ایسٹر کی عید (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زندہ ہونے کا تہوار) منانے کے ہیں۔

(ف ص ل)

اَلْفَصْلُ کے معنی دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اسی طرح علیحدہ کر دینے کے ہیں کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اسی سے مَفَاصِلٌ (جمع مَفْصِلٌ) ہے جس کے معنی جسم کے جوڑ کے ہیں اور فَصَلْتِ الشَّاةَ کے معنی بکری کے جوڑ کاٹ کر الگ الگ کر دینے کے ہیں۔

فَصَلَ الْقَوْمُ عَنْ مَكَانِ كَذَا: قوم کا کسی جگہ سے روانہ ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ﴾ (۱۲۔۹۴) اور جب قافلہ

---

❶ قاله النضلة السلمی فی یوم غول واوله: ولم یخیشوا مصالته علیهم وفی روایة الصریح بدل الفصیح والبیت فی الکامل ۸۱ فی خمسة واللسان (فصح) وفی مجالس ثعلب ۸ لرجل من بنی سلیم وفی البیان للجاحظ (۳: ۳۲۸) لابی محجن السلمی وفی مجموعة المعانی (۱۵۵) الفضله السهمی وفیه بسالة بدل مصالته۔

(مصر سے) روانہ ہوا۔
اور یہ اقوال اور اعمال دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن پاک میں ہے:۔
﴿اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیقَاتُهُمْ اَجْمَعِیْنَ﴾ (۴۴۔۴۰) کچھ شک نہیں کہ فیصلے کا دن سب کے اٹھنے کا دن ہے۔
﴿هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ﴾ (۷۷۔۳۸) یہی فیصلے کا دن ہے۔ یعنی آج اللہ تعالیٰ حق کو باطل سے الگ کر دے گا اور لوگوں کے درمیان (انصاف سے) فیصلہ کر دیا جائے گا چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:
یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ...... (۱۲۔۱۷) ان (سب) میں...... فیصلہ کر دے گا۔
﴿وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ﴾ (۶۔۵۷) اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
اور فَصْلُ الْخِطَابِ (۳۸۔۲۰) کے معنی فیصلہ کن بات کے ہیں اور یہی معنی حُکْمٌ فَیْصَلٌ وَّ لِسَانٌ مِفْصَلٌ کے ہیں۔
اَلتَّفْصِیْلُ: واضح کر دینا کھول کر بیان کر دینا چنانچہ فرمایا:
﴿وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا﴾ (۱۷۔۱۲) اور ہم نے ہر چیز (بخوبی) تفصیل کر دی ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ خَبِیْرٍ﴾ (۱۱۔۱) یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔
میں آیت کریمہ:
﴿تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً﴾ (۱۶۔۸۹) کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت...... ہے۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔
فَصِیْلَةُ الرَّجُلِ: آدمی کا خاندان جو اس سے الگ ہوتا ہے جیسے اولاد وغیرہ۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَفَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُؤْوِیْهِ﴾ (۷۰۔۱۳) اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا۔
اَلْفِصَالُ کے معنی بچے کا دودھ چھڑانا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا﴾ (۲۔۲۳۳) اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضا مندی...... سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہئیں۔
﴿وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ﴾ (اور (آخر کار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔
اسی سے اَلْفَصِیْلُ (یعنی دودھ چھڑایا ہوا بچہ) ہے لیکن یہ خاص کر اونٹ کے بچہ پر بولا جاتا ہے۔ اَلْمُفَصَّلُ قرآن پاک کی آخری منزل کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں چھوٹی چھوٹی سورتوں میں تمام قصے الگ الگ بیان کیے گئے ہیں۔ اَلْفَوَاصِلُ: اواخر آیات۔
اور فَوَاصِلُ الْقِلَادَةِ: ان بڑے موتیوں کو کہا جاتا ہے جو ہار کے اندر چھوٹے موتیوں کے درمیان فاصلہ کے لیے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ [1] (۷۱)

---

[1] انظر للحدیث الصحاح للجوهری (فصل) وفی (حم، ع والشاشی) من عبیدة بن الجراح رضی الله عنه فاضلة بالضا و المعجمة انظر کنز العمال (٦: رقم ٢٣٩٨)۔

((مَنْ اَنْفَقَ نَفْقَةً فَاصِلَةً فَلَهٗ مِنَ الْاَجْرِ كَذَا)) یعنی جس نے اتنا زیادہ خرچ کیا جس سے حق و باطل کے درمیان فاصلہ ہو جائے تو اس کے لیے اتنا اور اتنا اجر ہے۔

(ف ض ض)

اَلْفَضُّ کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں جیسے، فَضَّ خَتْمَ الْكِتَابِ: خط کی مہر کو توڑنا۔ اسی سے اَنْفَضَّ الْقَوْمُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی متفق اور منتشر ہو جانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَنِ انْفَضُّوْا اِلَيْهَا﴾ (۶۲۔۱۱) اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو ادھر بھاگ جاتے ہیں۔

﴿لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۳۔۱۵۹) تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

﴿اَلْفِضَّةُ﴾ (۳۔۱۳) چاندی یعنی وہ ادنی جوہر جس کے ذریعہ لین دین کیا جاتا ہے۔

دِرْعٌ فَضْفَاضَةٌ وَفَضْفَاضٌ: فراخ زرہ۔

(ف ض ل)

اَلْفَضْلُ کے معنی کسی چیز کے اقتصاد (متوسط درجہ) سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے (۱) محمود جیسے علم و حلم وغیرہ کی زیادتی (۲) مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا۔ لیکن عام طور اَلْفَضْلُ اچھی باتوں پر بولا جاتا ہے۔ اور اَلْفُضُوْلُ بری باتوں میں اور جب فضل کے معنی ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) برتری بلحاظ جنس کے، جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔

(۲) برتری بلحاظ نوع کے، جیسے نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ....وَ فَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (۱۷۔۷۰) اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی...... اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

(۳) فضیلت بلحاظ ذات مثلاً ایک شخص کا دوسرے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی بلحاظ جوہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا۔ مثلاً گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لیے اس کا اکتساب عین ممکن ہے چنانچہ آیات کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ﴾ (۱۶۔۷۱) اور خدا نے رزق (و دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

﴿لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۱۷۔۱۲) تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔ میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (۴۔۳۴) اس لیے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے، میں انسان کے ان ذاتی امتیازات کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اسے خاص طور پر نوازا جاتا ہے مثلاً مال و جاہ عزت اور قوت وغیرہ نیز فرمایا:

﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (۱۷۔۵۵) اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت

بخشی ﴿فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ﴾ (۴۔۹۴) خدا نے...... جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں زیادہ فضیلت بخشی ہے۔

اور ہر اس عطیہ کو جو دینے والے پر لازم نہیں ہوتا وہ فضل کہلاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴۔۳۲) اور خدا سے اس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ﴾ (۵۔۵۴) یہ خدا کا فضل ہے۔

﴿ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (۳۔۷۴) بڑے فضل کا مالک ہے۔اور اسی معنی میں فرمایا۔

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ﴾ (۱۰۔۵۸) کہدو کہ (یہ کتاب) خدا کے فضل سے ہے۔

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ﴾ (۴۔۸۳) اور اگر...... خدا کا فضل نہ ہوتا۔

(ف ض ی)

اَلْفَضَاءُ کے معنی وسیع جگہ کے ہیں اور اسی سے اَفْضٰى بِيَدِهٖ اِلٰى كَذَا کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی جگہ پر ہاتھ پہنچ جانے کے ہیں اور اَفْضٰى اِلَى امْرَءَتِهٖ: عورت سے جماع کرنے سے کنایہ ہوتا ہے اور یہ خَلَا بِهَا کے محاورہ سے زیادہ صریح ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ (۴۔۲۱) تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو۔

شاعر نے کہا ہے: ❶ (الطّویل)

(۳۴۱) طَعَامُهُمْ فَوْضَى فَضًا فِي رِحَالِهِمْ

ان کے گھروں میں طعام منتشر اور بکھرا پڑا ہے۔

(ف ط ر)

اَلْفَطْرُ: (ن ض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو (پہلی مرتبہ) طول میں پھاڑنے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: فَطَرَ فُلَانٌ كَذَا فَطْرًا کسی چیز کو پھاڑ ڈالنا۔ اَفْطَرَ هُوَ فُطُوْرًا: روزہ افطار کرنا: اِنْفَطَرَ اِنْفِطَارًا: پھٹ جانا اور آیت کریمہ۔

﴿هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ﴾ (۶۷۔۳) بھلا تجھ کو کوئی شگاف نظر آتا ہے۔

میں فُطُوْرٌ کے معنی خلل اور شگاف کے ہیں اور یہ پھاڑنا کبھی کسی چیز کو بگاڑنے اور کبھی مبنی بر مصلحت ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا﴾ (۷۳۔۱۸) اور جس سے آسمان پھٹ جائے گا، یہ اس کا وعدہ (پورا) ہو کر رہے گا۔

فَطَرْتُ الشَّاةَ: میں نے بکری کو دو انگلیوں سے دوہا۔ فَطَرْتُ الْعَجِيْنَ: آٹا گوندھ کر فوراً روٹی پکانا۔اسی سے فطرة ہے جس کے معنی تخلیق کے ہیں اور فَطَرَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس میں کچھ کرنے کی استعداد موجود ہے پس آیت کریمہ:

---

❶ قاله المعذل بن عبدالله البكرى احد بنى قيس بن ثعلبة (المعجم للمرزبانى (۳۸۸) والشعراء (۲۹، ۸۳) يمدح العتيك رهط نهس بن ربيعة العتكى فى خمسة ابيات وعجزه اولا يحسنون السرّالاتنا ديا وفى اللسان (فضاء فوض) ولا يحسبون السوء...... والبيت فى الحماسة بشرح المرزوقى رقم ۷۹۱ فى خمسة وابن ولاد ۹۵۔

﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا﴾ (۳۰۔۳۰) اور خدا کی فطرت کو، جس پر لوگوں کو پیدا کیا (اختیار کیے رہو۔

میں اس مغفرت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو تخلیقی طور پر انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے لہٰذا فطرۃ اللہ سے معرفت الٰہی کی استعداد مراد ہے۔ جو انسان کی جبلت میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (۴۳۔۸۷) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔

میں اسی قوت معرفت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۳۵۔۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

﴿الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ﴾ (۲۱۔۵۶) جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ﴾ (۷۳۔۱۸) اور جس سے آسمان پھٹ جائے۔

میں ہوسکتا ہے کہ انفطار سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر فیضان ہوگا۔ وہ اسے قبول کرلے گا۔

الفطر: روزہ افطار کرنا۔ کہا جاتا ہے۔

فَطَرْتُهٗ وَاَفْطَرْتُهٗ وَاَفْطَرَ هُوَ: یعنی لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور کَمْاَۃٌ (کھمبی) کو فُطْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہے۔

(ف ظ ظ)

اَلْفَظُّ کے معنی بدمزاج کے ہیں اور یہ اس فظ سے مستعار ہے جس کے معنی اونٹ کے اوجھر میں جمع رہنے والا پانی کے ہیں جو سخت ضرورت کے وقت بادل نخواستہ پیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ﴾ (۳۔۱۵۹) اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے۔

(ف ع ل)

اَلْفِعْلُ کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تاثیر عمدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عمدگی کے ہو اور علم سے ہو یا بغیر علم کے قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے پھر وہ تاثیر انسان کی طرف سے ہو یا دوسرے حیوانات اور جمادات کی طرف سے ہو۔ یہی معنی لفظ عمل کے ہیں۔ مگر لفظ صُنْع ان دونوں سے اخص ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے [1]۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ (۲۔۱۹۷) اور جو نیک کام تم کرو گے خدا کو معلوم ہوجائے گا۔ ﴿وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا﴾ (۴۔۳۰) اور جو تعدی وظلم سے ایسا کرے گا۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ (۵۔۶۷) اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔

یعنی اگر تم نے یہ حکم نہ پہنچایا تو گویا تم نے تبلیغ کی ہی نہیں۔

[1] راجع (ص ن ع م) (ع م ل)۔

اور جس پر فاعل اپنا فعل کرتا ہے اسے منفعل اور مفعول کہا جاتا ہے۔
بعض نے مفعول اور منفعل میں یہ فرق کیا ہے کہ فاعل کے فعل کے اعتبار سے اسے مفعول کہا جاتا ہے اور فعل کا اثر...... قبول کر لینے کے لحاظ سے اسے منفعل کہا جاتا ہے پس مفعول منفعل سے اعم ہے کیونکہ منفعل تو اس اثر کو بھی کہا جاتا ہے جو فاعل سے صادر تو ہو مگر اس نے اس کے ایجاد کا ارادہ نہ کیا ہو جیسے خجالت کی سرخی جو کسی انسان کو دیکھ کر عارض ہو جاتی ہے اور طرب جو رقص وسرود کے سننے سے حاصل ہوتا ہے یا عاشق اپنے معشوق کو دیکھ کر بلا اختیار وجد میں آ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر فعل کو انفعال کہہ سکتے ہیں۔ بجز ابداع کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب ہوتا ہے کیونکہ ابداع کے معنی عدم سے وجود میں لانے کے ہیں اور یہ کسی جوہر یا عرض پر عمل کا نام نہیں ہے بلکہ جوہر کو وجود میں لانے کا نام ہے۔

(ف ق د)

اَلْفَقْدُ کے معنی ہیں کسی چیز کے وجود کے بعد اس کا نہ پایا جانا...... اور یہ عَدَمٌ سے اخص ہے کیونکہ عَدَمٌ فَقَدٌ کو بھی کہتے ہیں۔ اور کسی چیز کے سرے سے موجود نہ ہونے کو بھی۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ۔قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ﴾ (۱۲۔۷۱۔۷۲) تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہیں؟ وہ بولے کہ بادشاہ کے پانی پینے کا گلاس کھویا گیا۔ اور تَفَقُّدٌ کے معنی تعہد یعنی کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے ہیں لیکن اصل میں تَفَقُّدٌ کے معنی کسی چیز کے گم ہونے کو معلوم کر لینے کے ہیں اور تَعَهُّدٌ کے معنی عہد متقدم (پرانی ملاقات) کو پہچان لینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ﴾ (۲۷۔۲۰) انہوں نے جانوروں کا جائزہ لیا۔
اور فَاقِدٌ اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا لڑکا یا خاوند فوت ہو گیا ہو۔

(ف ق ر)

اَلْفَقْرُ: کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔
(۱) زندگی کی بنیادی ضروریات کا نہ پایا جانا۔ اس اعتبار سے انسان کیا کائنات کی ہر شئے فقیر (محتاج) ہے۔ چنانچہ اس معنی میں فرمایا:
﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ﴾ (۳۵۔۱۵) لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو۔
اور الانسان میں اسی قسم کے احتیاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
﴿وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ﴾ (۲۱۔۸) اور ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھائیں۔
(۲) ضروریات زندگی کا کما حقہ پورا نہ ہونا۔ چنانچہ اس معنی میں فرمایا:
﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا .... مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (۲۔۲۷۳) تو ان حاجت مندوں کے لیے جو خدا کے راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔
﴿اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۲۴۔۳۲) اگر وہ مفلس ہونگے تو خدا ان کو اپنے فضل سے خوشحال کر دے گا۔
﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ﴾

(۹۔۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ وخیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں ...... کا حق ہے۔

(۳) فَقْرُ النَّفْسِ: یعنی مال کی ہوس۔ چنانچہ فقر کے اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ❶ (۷۲)

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا: کچھ تعجب نہیں کہ فقر کفر کی حد تک پہنچادے اس کے بالمقابل غنی کے معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اَلْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ کہ غنا تو نفس کی بے نیازی کا نام ہے۔ اور اسی معنی میں حکماء نے کہا ہے۔

مَـنْ عَـدِمَ الْقَنَاعَةَ لَمْ يُفِدْهُ الْمَالُ: غِنًى جو شخص قناعت کی دولت سے محروم ہوا اسے مالداری کچھ فائدہ نہیں دیتی۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج جس کی طرف آنحضرت نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ❷ (۷۳)

((اَللّٰهُـمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَيْكَ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِـالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْكَ)) (اے اللہ۔ مجھے اپنا محتاج بنا کر غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے فقیر نہ بنا) اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿رَبِّ اِنِّـیْ لِـمَـآ اَنْـزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ﴾ (۲۸۔۲۴) کہ پروردگار میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔

اس معنی میں شاعر نے کہا ہے ❸ ( )

(۳۴۲) وَيُعْجِبُنِیْ فَقْرِیْ اِلَيْكَ وَلَمْ يَكُنْ
لَيُعْجِبَنِیْ لَوْ لَا مُحَبَّتُكَ الْفَقْرُ

(مجھے تمہارا محتاج رہنا اچھا لگتا ہے اگر تمہاری محبت نہ ہوتی تو یہ بھلا معلوم نہ ہوتا)

اور اس معنی میں اِفْتَـقَرَ فَهُوَ مُفْتَقِرٌ وَفَقِيْرٌ استعمال ہوتا ہے اور فَـقَـرَ کا لفظ اگرچہ قیاس کے مطابق ہے۔ لیکن لغت میں مستعمل نہیں ہوتا۔ اَلْفَقِيْرُ دراصل اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ چنانچہ محاورہ ہے: فَقَرَتْهُ فَاقِرَةٌ: یعنی مصیبت نے اس کی کمر توڑ دی اَفْقَرَكَ الـصَّيْدُ فَارْمِهٖ: یعنی شکار نے تجھے اپنی کمر پر قدرت دی ہے لہٰذا تیر ماریئے بعض نے کہا ہے کہ یہ افقر سے ہے جس کے معنی حُـفْـرَةٌ یعنی گڑھے کے ہیں اور اسی سے فقیر ہر اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔

فَـقَـرْتُ لِـلْفَسِيْلَ: میں نے پودا لگانے کے لیے گڑھا کھودا شاعر نے کہا ہے ❹ (الرجز)

---

❶ اخرجه ابو مسلم الكشي في سننه والبيهقي في الشعب من رواية يزيد الرقاشي عن انسؓ مرفوعًا ويزيد ضعيف و تمام الحديث وكا د الحسد يغلب القدر رواه ابن عدى في الكامل ورواه والطبراني في الاوسط بلفظ وكادت الحاجة ان يكون كفرا وفيه ايضا ضعف نعم ورد في النسائي عن ابي سعيد الخدري انه صلى الله عليه وسلم كان يقول ((اللهم انى اعوذبك من الكفر والفقر)) الحديث راجع تخريج العراقي على الاحياء (۱/۲۳٤) و (۳/۷۸) والمقاصد للسخاوى رقم (۷۸۹)۔

❷ متفق عليه من حديث ابي هريرة والديلمي بلا سند رفعه عن انس ((الغنى غنى النفس والفقر فقر النفس)) ورواه العسكرى من حديث ابي ذر ولكن فيه القلب بدل النفس وفي معناه اشعار ليعقوب الكندى نقل السخاوى في المقاصد رقم (۷۳۲)۔

❸ لم اجده المراجع ۱۲۔

❹ قاله الراجز وابعده: مجنونة تودى بروح الانسان وفي الفائق (۲ : ۱٤۳) يعقل الانسان والرجز في اللسان والصحاح

(۳۴۳)مَا لَيْلَةُ الْفَقِيْرِ اِلَّا شَيْطَانُ

کہ فقیر میں رات بھی شیطان کی مثل ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں الفقیر ایک کنویں کا نام ہے۔

فَقَرْتُ الْخَرَزَ: میں نے منکوں میں سوراخ کیا اَفْقَرْتُ الْبَعِيْرَ: اونٹ کی ناک چھید کر اس میں مہار ڈالنا۔

(ف ق ع)

اَصْفَرُ فَاقِعٌ کے معنی گہرے زرد رنگ کے ہیں اور یہ اصفر کی تاکید ہے جس طرح اَسْوَدُ حَالِكٌ میں حَالِكٌ کا لفظ اَسْوَدُ کی تاکید بن کر استعمال ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿صَفْرَاءُ فَاقِعٌ﴾ (۲۔۶۹) گہرا زرد رنگ۔

فَقْعٌ: ایک قسم کی کھمبی ہے جس کے ساتھ ذلیل آدمی کو تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ هُوَ اَذَلُّ مِنْ فَقْعٍ بِقَاعٍ: وہ جنگل کی کھمبی سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ خَلِيْلٌ نے کہا ہے کہ شراب کو فُقَّاعٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس پر جھاگ ابھر آتی ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر پانی کے بلبلے کو بھی فَقَاقِيْعُ الْمَاءِ بولتے ہیں۔

(ف ق ہ)

اَلْفِقْهُ کے معنی علم حاضر سے علم غائب تک پہنچنے کے ہیں اور یہ علم سے اخص ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَالِ هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ (۴۔۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ﴾ (۱۷۔۴۴) لیکن تم...... نہیں سمجھتے۔

عِلْمُ الْفِقْهِ: احکام شریعت جاننے کا نام ہے۔ فَقُهَ الرَّجُلُ فَقَاهَةً: فقیہ بن جانا۔ فَقِهَ فِقْهًا وَفَقِهَهٗ: کسی چیز کو سمجھ لینا۔

تَفَقَّهَ: علم فقہ حاصل کر کے اس میں تخصیص حاصل کر لینا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ﴾ (۹۔۱۲۲) تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے۔

(ف ک ک)

اَلْفَكُّ: اس کے اصل معنی جدا کر دینے کے ہیں جیسے۔ فَكُّ الرِّهْنِ گروی چیز کو چھڑانا ﴿فَكُّ الرَّقَبَةِ﴾ گردن کا آزاد کرنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ (۹۰۔۱۳) کسی کی گردن کا چھڑانا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ غلام کو آزاد کرانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کلمات طیبہ اور اعمال صالحہ کے ذریعہ انسان کا آپنے آپ اور دوسروں کو عذاب الٰہی سے آزاد کرانا مراد ہے۔ لیکن دوسروں کو جبھی آزاد کرا سکتا ہے جب پہلے اپنے آپ کو رہا کروالے ورنہ جو شخص خود ہدایت یافتہ نہیں ہے وہ دوسروں کو کب ہدایت کر سکتا ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب "مكارم الشريعه" میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

اَلْفَلَكَ کے معنی کمزوری کی وجہ سے شانہ کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کے ہیں۔ اور دونوں جبڑوں کے ملنے کی جگہ کو فکّان کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ﴾ (۹۸۔۱) جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرک وہ کفر سے باز آنے والے نہ تھے۔

میں مُنْفَكِّيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ اَلْبَيِّنَه کے آنے تک ان میں اختلاف نہیں تھا بلکہ سب گمراہی پر متفق تھے۔ جیسے

(فقرا و الظمان ۲۴۸ وفی البلدان (فقر) وعجزه : توذی قريح الاسنان۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً﴾ (۲۔۲۱۳) (پہلے تو سب) لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا۔ مَا انْفَکَّ یَفْعَلُ کَذَا: وہ برابر ایسے کرتا رہا۔

(ف ک ر)

اَلْفِکْرَۃُ: اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے اور تَفَکُّرٌ کے معنی نظر عقل کے مطابق اس قوت کو جولانی دینے کے ہیں۔ اور غور وفکر کی استعداد صرف انسان کو دی گئی ہے دوسرے حیوانات اس سے محروم ہیں اور تَفَکَّرَ فِیْہِ کا لفظ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جس کا تصور دل (ذہن) میں حاصل ہوسکتا ہو اسی لیے مروی[1] ہے (۷۴) ((تَفَکَّرُوْا فِیْ آلَاءِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِی اللّٰہِ)) کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں پر تو غور کیا کرو لیکن خدا کی ذات میں کبھی غور نہ کرو (کہ وہ کیسی ہے) کیونکہ اس کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آسکتا اور وہ صورت کے ساتھ متصف ہونے سے منزہ ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْ اَنْفُسِہِمْ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ﴾ (۳۰۔۸) کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں کو...... پیدا کیا ہے۔

﴿اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا سکتہ مَا بِصَاحِبِہِمْ مِنْ جِنَّۃٍ ط﴾ (۷۔۸۴) کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے رفیق (محمد ﷺ) کو کسی طرح کا بھی جنون نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ (۳۰۔۲۱) جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

﴿یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ۔ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ﴾ (۲۔۲۱۹،۲۲۰) تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں۔

رَجُلٌ فِکِّیْرٌ: (بہت زیادہ غور وفکر کرنے والا) بعض ادباء کا خیال ہے کہ لفظ فِکْرٌ دراصل فَرْکٌ سے مقلوب ہے لیکن فکر کا لفظ معانی کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے معنی معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس کے بارے میں چھان بین کرنے کے ہیں۔

(ف ک ہ)

اَلْفَاکِھَۃُ: بعض نے کہا ہے کہ فَاکِھَۃ کا لفظ ہر قسم کے میوہ جات پر بولا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ انگور اور انار کے علاوہ باقی میوہ جات کو فَاکِھَۃ کہا جاتا ہے۔ اور انہوں نے ان دونوں کو اس لیے مستثنیٰ کیا ہے کہ (قرآن پاک میں) ان دونوں کو فاکہہ پر عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فاکہہ کے غیر ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَفَاکِھَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ﴾ (۵۶۔۲۰) اور میوے جس طرح کے ان کو پسند ہوں۔

﴿وَفَاکِھَۃٍ کَثِیْرَۃٍ﴾ (۵۶۔۲۰) اور میوہ ہائے کثیرہ (کے

---

[1] الحدیث فی اللسان (الا) و (ابوالشیخ طس عدھب عن ابن عمر وفیہ الفرازع بن نافع متروك وقد مرفی ال ہ) وفی روایۃ عن ابن عباس :۔((تفکر وافی خلق اللہ ولا تفکر وافی اللہ فانکم لا تقدرون قدرہٗ)) رواہ فی الحلیۃ باسناد ضعفیف والا صبھانی فی الترغیب والترھیب منہ وجہ آخر اصح من وفی ابن ابی شیبۃ فی کل شیء بدل فی آلاء اللہ قال السخاوی فی المقاصد رقم (۳۴۲) او اسانید ھاضعیفۃ لکن احتماعھما یکتسب قوۃ والمعنی صحیح (راجع ایضاً تخریج العراقی

باغوں) میں۔

﴿وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ (۸۱۔۳۱) اور میوے اور چارہ۔

﴿فَوَاكِهُ وَهُمْ مُكْرَمُوْنَ﴾ (۳۷۔۴۲) (یعنی) میوے اور ان کا اعزاز کیا جائے گا۔

﴿وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ (۷۷۔۴۲) اور میووں میں جو ان کو مرغوب ہوں۔

اَلْفَكَاهَةُ: خوش طبعی کی باتیں، خوش گپی۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ﴾ (۵۶۔۶۵) اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ گے۔

میں بعض نے تَفَكَّهُوْنَ کے معنی خوش طبعی کی باتیں بنانا لکھے ہیں اور بعض نے فروٹ تناول کرنا۔

اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿فَاكِهِيْنَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ﴾ (۵۲۔۱۸) جو کچھ ان کے پروردگار نے ان کو بخشا اس کی وجہ سے خوش حال......۔

میں فَاكِهِيْنَ کی تفسیر میں بھی دونوں قول منقول ہیں۔

(ف ل ح)

اَلْفَلْحُ کے معنی پھاڑنا کے ہیں مثل مشہور ہے اَلْحَدِيْدُ بِالْحَدِيْدِ يُفْلَحُ: لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اس لیے فَلَّاحٌ کسان کو کہتے ہیں۔ (کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتا ہے) اور فلاح کے معنی کامیابی اور مطلب وری کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے دنیوی اور اخروی فلاح دنیوی ان سعادتوں کو حاصل کر لینے کا نام ہے جن سے دنیوی زندگی خوشگوار بنتی ہو یعنی بقاء مال اور عزت و دولت۔ چنانچہ شاعر نے اسی معنی کے مدنظر کہا ہے ❶ (مخلع البسیط)

(۳۴۴) اَفْلِحْ بِمَا شِئْتَ فَقَدْ يُدْرَكُ بِالضَّعْـ
فِ وَقَدْ يُخَدَّعُ الْاَرِيْبُ

جس طریقہ سے چاہو خوش عیشی کرو کبھی کمزور کامیاب ہو جاتا ہے اور چالاک دھوکا کھا جاتا ہے۔

اور فلاح اخروی چار چیزوں کے حاصل ہو جانے کا نام ہے (۱) بقا بلا فنا، (۲) غنا بلا فقر، (۳) عزت بلا ذلت، (۴) علم بلا جہل، اسی لیے کہا گیا ہے ❷ (۷۵) ((لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشَ الْاٰخِرَةِ)) کہ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے اور اسی فلاح کے متعلق فرمایا۔

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (۲۹۔۶۴) اور زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے۔

﴿اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۵۸۔۲۲) (اور) سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔

علی الاحیاء (٤: ٤٣٤)۔

❶ واولہ: حتی تری جماجما تطرح وھو فی الصحاح والتاج (فلح) والقرطبی (۱/۱۵۸) وقد ذھب مثلاً انظر المیدانی رقم (۱۳) والفرائد (۱/۱۸) وشرح المعلقات لابن الانباری (۱۸۱) وفیہ اولہ: قد علمت خیلك این الصحیح ولم اراحدً انسبہ۔ قالہ عبید بن الابرص فی قصیدۃ من الھجز والبسیط فی ٤٨ بیتا وکثیر منھا جاء علی مخلع وکثیر منھا مختلفۃ الوزن والشاعر لایحسن القریض قال فیہ المعری: وقد یخطیٔ الرأی امرؤ و ھو حازم۔ کما اختل فی وزن القریض عبید۔ والبیت فی الجمھرۃ ۱۷٤ والشعر والشعراء ل (۱: ۲۲٦) والغریب للقتبی (۳۹) ومجاز القرآن (۱: ۳۰) والقرطبی (۱: ۱۵۸) والطبری (۱: ۱۰۸) واللسان والمحکم (فلح) وفیھا بالنوك بدل بالضعف وابن خالویہ فی اعرابہ (۱۰۰) والحیوان (۳: ۸۹) فی خمسۃ ابیات وفی روایۃ فقد یبلغ بدل یدرك ۱۲۔

❷ رواہ الشیخان عن انسؓ وفی الباب عن سھل وقد مر

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (۸۷-۱۴) بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (۹۱-۹) جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچ گیا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۲۳-۱) بے شک ایمان والے رستگار ہو گئے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۲۴-۳۱) تا کہ تم فلاح پاؤ۔

﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (۲۳-۱۱۷) کچھ شک نہیں کہ کافر رستگاری نہیں پائیں گے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۷-۸) وہ تو نجات پانے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى﴾ (۲۰-۶۴) اور آج جو غالب رہا وہی کامیاب ہوا۔

میں یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے فلاح دنیوی مراد لی ہو بلکہ یہی معنی (بلحاظ قرائن) اقرب الی الصحت معلوم ہوتے ہیں۔

اور سَحُوْرٌ یعنی طعام سحر کو بھی فَلَاحٌ کہا گیا ہے کیونکہ اس وقت حَيَّ عَلَى الْفَلَاح کی آواز بلند کی جاتی ہے اور اذان میں حَيَّ عَلَى الْفَلَاح کے معنی یہ ہیں کہ اس کامیابی کی طرف آؤ جو نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کر رکھی ہے اور حدیث[1] (۷۶) حَتّٰى خِفْنَا اَنْ يَفُوْتَنَا الْفَلَاحُ (حتی کہ فلاح کے فوت ہو جانے کا ہمیں اندیشہ ہوا) میں بھی فَلَاح سے مراد وہ کامیابی ہے جو صلاۃ عشا ادا کرنے کی وجہ سے ہمارے لیے مقدر کی گئی ہے۔

(ف ل ق)

اَلْفَلْقُ (ض) کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے اور اس کے ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔

فَلَقْتُهٗ میں اسے پھاڑ دیا فَانْفَلَقَ چنانچہ وہ چیز پھٹ گئی۔ قرآن پاک میں ہے:

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ: (۶-۹۶) وہی رات کے اندھیرے سے) صبح کی روشنی پھاڑ نکالتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى﴾ (۶-۹۵) بے شک خدا ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر ان سے درخت وغیرہ اگاتا ہے۔

﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ﴾ (۲۶-۶۳) تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا گویا بڑا پہاڑ ہے۔

اور دو ٹیلوں کے درمیان پست جگہ کو بھی فَلَق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ (۱۱۳-۱) کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

میں فَلَقٌ سے مراد صبح ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے نہریں مراد ہیں جن کا کہ آیت:

﴿اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا﴾ (۲۷-۶۱) بھلا کس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے بیچ نہریں بنائیں۔

میں تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اور بعض نے وہ کلمہ مراد لیا ہے

[1] انظر للحدیث الفائق (۲/۱۴۷) واصحاب السنن ۱۲۔

جس کی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم دی تھی اور انہوں نے اس کی برکت سے سمندر پھاڑ دیا تھا اور فِــلْـقٌ بمعنی مَفْلُوْقٌ ہے جس طرح کہ نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ اور نِـكْثٌ بمعنی مَـنْـكُوْثٌ آتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فِـلْق اور فَيْـلَقٌ کے معنی تعجب کے ہیں اور دو پہاڑوں کی درمیانی جگہ کو فَـلِيْقٌ وَ فَالِقٌ کہا جاتا ہے اور اونٹ کی دو کوہان کے درمیانی حصہ کو بھی فَلِيْقٌ وَ فَالِقٌ کہتے ہیں۔

(ف ل ک)

اَلْـفُـلْكُ کے معنی سفینہ یعنی کشتی کے ہیں۔ اور یہ واحد وجمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن دونوں میں اصل کے لحاظ سے اختلاف ہے فُـلْكٌ اگر مفرد کے لیے ہو تو یہ بروزن قُفْلٌ ہوگا۔ اور اگر بمعنی جمع ہو تو حُمْرٌ کی طرح ہوگا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ﴾ (۱۰۔۲۲) یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو۔

﴿وَ الْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ﴾ (۲۔۱۶۴) اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں...... رواں ہیں۔

﴿وَ تَـرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ﴾ (۱۶۔۱۴) اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔

﴿وَجَـعَـلَ لَـكُـمْ مِّـنَ الْـفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَـا تَـرْكَبُوْنَ﴾ (۴۳۔۱۲) اور تمہارے لیے کشتیاں اور چارپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ اور فلک کے معنی ستاروں کا مدار (مَـجْـرٰى) کے ہیں اور اسے فلک یعنی کشتی نما ہونے کی وجہ سے فلک کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَكُـلٌّ فِـىْ فَـلَكٍ يَسْبَحُوْنَ﴾ (۳۶۔۴۰) سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

اور فَلْكَةُ الْمِغْزَلِ کے معنی چرخے کا دم کڑہ کے ہیں اور اسی سے فَـلَكَ ثَـدْىُ الْمَرْءَةِ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں عورت کی چھاتی کے دم کڑہ کی طرح ابھر آنے کے ہیں اور فَـلَقْتُ الْجَدْىَ کے معنی بکری کے بچے کی زبان پھاڑ کر اس میں پھرکی سی ڈال دینے کے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی ماں کے پستانوں سے دودھ نہ چوس سکے۔

(ف ل ن)

فُـلَانٌ وَ فُـلَانَةٌ انسانوں کے ناموں کے لیے بطور کنایہ بولا جاتا ہے اور اَلْفُـلَانُ وَالْفُـلَا (یعنی الف لام کے ساتھ) انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات کے لیے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے [1] قرآن پاک میں ہے:

﴿يٰـوَيْـلَتٰـى لَيْتَـنِـىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُـلَانًا خَلِيْلًا﴾ (۲۵۔۲۸) ہائے شامت کاش میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔ آیت میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص باطل پرستی میں اپنے دوستوں اور آشناؤں کا ساتھ دینے پر اظہار ندامت کرے گا اور کہے گا کاش! میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا لہٰذا یہ اس آیت کے ہم معنی ہے۔

﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَـوْمَـئِـذٍ بَـعْـضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ (۴۳۔۶۷) جو آپس میں دوست ہیں اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ مگر پرہیز گار لوگ باہم دوست ہی رہیں گے۔

---

[1] کذا ذکره صاحب التاج والمحیط وانظر ایضاً الکشاف ۱۲۔

(ف ن ن)

اَلْفَنَانُ۔ کے معنی اس شاخ کے ہیں جس پر تروتازہ پتے ہوں اس کی جمع اَفْنَانٌ آتی ہے۔

پس آیت کریمہ:۔

﴿ذَوَاتَـا اَفْنَانٍ﴾ (۵۵۔۴۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی) قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں۔ کے معنی ہری بھری شاخوں والے درختوں کے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے انواع و اقسام کے درخت مراد ہوں۔

(ف ن د)

اَلْـفَنَدُ کے معنی رائے کی کمزوری کے ہیں اس سے اَلتَّـفْنِيْدُ (تفعیل) ہے جس کے معنی کسی کو کمزور رائے یا فاتر العقل بتانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿لَـوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ (۱۲۔۹۴) اگر مجھ کو یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے۔

بعض نے اس کے معنی تَـلُوْمُوْنِیْ یعنی ملامت لکھے ہیں لیکن اس کا اصل معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں اور اَلْاِفْـنَادُ (افعال) کے معنی بہکی بہکی باتیں کرنے کے ہیں۔ اور فَـنَدٌ اصل میں پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اور اسی سے بوڑھے کھوسٹ کو فَـنَدٌ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ بھی عمر کی انتہا کو پہنچ چکا ہوتا ہے)۔

(ف ھ م)

اَلْفَهْمُ: انسان کی اس ذہنی قوت کا نام جس سے وہ مطالب کو بہتری اور عمدگی کے ساتھ اخذ کر لیتا ہے اور فَهِـمْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو اچھی طرح سمجھ لینے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ﴾ (۲۱۔۷۹) ہم نے فیصلہ کرنے کا طریقہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا۔

میں تفہیم کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوت فہم میں اضافہ کر دیا جس کے ذریعہ انہوں نے نزاع کی حقیقت کو پالیا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کی حقیقت ان کے قلب پر القا کر دی۔

اَفْهَمْتُهٗ کے معنی کسی کو کچھ سمجھا دینے کے ہیں اور استفہام کے معنی کسی چیز کے سمجھنے کی طلب کے ہیں۔

(ف و ت)

اَلْـفَـوْتُ: (ن) (ہاتھ سے نکل جانا) کسی چیز کا انسان سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لیے دشوار ہو۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِنْ فَـاتَـكُـمْ شَـىْءٌ مِّـنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَـى الْكُفَّارِ﴾ (۶۰۔۱۱) اور اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی عورت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس چلی جائے۔

﴿لِـكَيْلَا تَـاْسَـوْا عَـلٰى مَا فَاتَكُمْ﴾ (۵۷۔۲۳) تاکہ جو مطلب تم سے فوت ہوگیا ہے۔ اس کا غم نہ کھایا کرو۔

﴿وَلَـوْ تَـرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ﴾ (۳۴۔۵۰) اور کاش تم دیکھو جب یہ گھبرا جائیں گے تو (عذاب سے) بچ نہیں سکیں گے۔

یعنی جس عذاب سے وہ گھبرائیں گے اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ محاورہ ہے۔

هُـوَ مِنِّیْ فَوْتَ الرُّمْحِ: وہ میرے نیزے کی دسترس

سے باہر ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ رِزْقَهٗ فَوْتَ فَمِهٖ (اللہ اس کا رزق اس کی دسترس سے باہر کر دے) یعنی رزق سامنے نظر آئے لیکن منہ تک نہ پہنچ سکے (بد دعا)

اسی سے اِفْتِیَاتٌ (افتعال) ہے اور اس کے معنی کسی ایسے شخص سے مشورہ کے بغیر کوئی کام کرنے کے ہیں جس سے مشورہ ضروری ہو۔

اَلتَّفَاوُتُ: (تفاعل) کے معنی دو چیزوں کے اوصاف مختلف ہونے کے ہیں گویا ایک کا وصف دوسری کو یا ہر ایک کا وصف دوسری کو فوت کر رہا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ﴾ (۶۷۔۳) کیا تو (خدا) رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ یعنی اس میں کوئی بات بھی حکمت کے خلاف نہیں ہے۔

(ف و ج)

اَلْفَوْجُ کے معنی تیزی سے گزرنے والی جماعت کے ہیں اس کی جمع افواج ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿كُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ﴾ (۶۷۔۸) جب اس میں ان کی کوئی جماعت ڈالی جائے گی۔

﴿فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ﴾ (۳۸۔۵۹) (یہ) ایک فوج (ہے تمہارے ساتھ) داخل ہوگی۔

﴿فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ (۱۱۰۔۲) غول کے غول خدا کے دین میں......

(ف و ر)

اَلْفَوْرُ کے معنی سخت جوش مارنے کے ہیں یہ لفظ آگ کے بھڑک اٹھنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ہنڈیا اور غصہ کے جوش کھانے پر بھی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهِیَ تَفُوْرُ﴾ (۶۷۔۷) اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔

﴿وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ (۱۱۔۴۰) اور تنور جوش مارنے لگا۔

شاعر نے کہا ہے [1] (المتقارب)

(۳۴۵) وَلَا الْعِرْقُ فَارَا

اور نہ اس کی رگوں میں گرہ یا نفخ ظاہر ہوتا ہے۔

محاورہ ہے:

فَارَ فُلَانٌ مِنَ الْحُمّٰى یَفُوْرُ: فلاں کو زور کا بخار ہے اور ہنڈیا کے ابال کو فَوَّارَة کہا جاتا ہے پھر تشبیہ کے طور پر پانی کے ابلتے ہوئے چشمہ کو بھی فَوَّارَةُ الْمَاءِ کہتے ہیں۔

ایک محاورہ ہے:

فَعَلْتُ كَذَا مِنْ فَوْرِیْ: میں نے جوش میں ایسا کیا یعنی سکون امر سے قبل یہ کام کیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا﴾ (۳۔۱۲۵) اور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعۃً حملہ کر دیں۔

اَلْفَأْرُ: چوہیا اس کی جمع فِیْرَان آتی ہے پھر شکل میں مشابہت کی وجہ سے نافہ مشک کو بھی فَأْرَةُ الْمِسْكِ کہا جاتا ہے۔

مَكَانٌ فَئِرٌ: بہت چوہوں والی زمین۔

---

[1] قطعة من قول العوف بن عطية بن الخرع يصف فرسا والبيت بتمامه' لهارسغ ايد مكرب فلا العظم واه ولا العرق فارا ومعناء اى لا يظهر بعرقه نفخ او عقد يقال: فارت عروقه' تفور فورا وذايكره من الفرس وفى المعانى للقبتى اى لم يكن بها داء فتووج فيفور الدم وقطع الودج كا القصد للانسان والبيت فى اللسان (فور) و كتاب الخيل لابى عبيد (۹۱ و ۱۵۰) والمعانى الكبير للقبتى (۱: ۱۶۳)۔

(ف و ز)

اَلْفَوْزُ کے معنی سلامتی کے ساتھ خیر حاصل کر لینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْكَبِيْرُ﴾ (۸۵۔۱۱) یہی بڑی کامیابی ہے۔
﴿فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ (۳۳۔۷۱) تو بے شک بڑی مراد پائے گا۔
﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ﴾ (۴۵۔۳۰) یہی صریح کامیابی ہے۔
دوسری جگہ پر العظیم ہے (۴۴۔۵۷)
﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ (۹۔۲۰) اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔
اَلْمَفَازَۃُ: تفائل کے طور پر ریگستان کو مَفَازَۃ کہا جاتا ہے۔نیز کامیابی کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے بھی بیابان کا مَفَازَۃ کہتے ہیں۔ [1] کیونکہ بیابان جس طرح ہلاکت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح کبھی کامیابی کا بھی سبب بنتا ہے لہٰذا ان دونوں معنی کے لحاظ سے اسے کبھی قَفْرٌ اور کبھی مَفَازَۃٌ کہا جاتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ لفظ مَفَازَۃ فَوَزَا الرَّجُلُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاک ہو جانے کے ہیں۔اگر یہ مان لیا جائے کہ لغت میں فَوَزَ بمعنی هَلَكَ آتا ہے تو یہ بھی معنی فَوَزَ کے لحاظ سے ہے کیونکہ مرنے کے بعد انسان دنیا کے پھندے سے نجات پا لیتا ہے لہٰذا موت اگر ایک لحاظ سے ہلاکت ہے تو دوسرے لحاظ سے باعث نجات بھی ہے۔اسی بنا پر مثل مشہور ہے۔مَا اَحَدٌ اِلَّا وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لَّهٗ کہ موت ہر ایک کے لیے بہتر ہے۔یہ دنیا کے اعتبار سے ہے۔لیکن اگر اخروی نعمتوں سے ہم آغوش ہونے کا لحاظ کیا جائے تو موت بہت بڑی کامیابی ہے۔
چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (۳۔۱۸۵) تو جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔
اور آیت کریمہ:
﴿فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ﴾ (۳۔۱۸۸) ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہو جائیں گے۔
میں مَفَازَۃٌ فَازَ کا مصدر ہے اور فَوْزٌ اسم ہے یعنی یہ مت سمجھو کہ یہ عذاب سے رہائی حاصل کر لیں گے اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا﴾ (۷۸۔۳۱) بے شک پرہیز گاروں کے لیے کامیابی ہے۔
میں مَفَازًا فَوْزٌ سے اسم ظرف ہے یعنی متقین کے لیے کامیابی کا مقام ہے پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:
﴿حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا﴾ الآیۃ (۷۸۔۳۲) (یعنی) باغ اور انگور وغیرہ۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ اِلٰى قَوْلِهٖ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ (۳۳۔۷۱) تو بے شک بڑی مراد

---

[1] وقد عدا العلماء لفظ "المفازة" من الاضداد لكن المؤلف حمله على المجاز والاستعارة الاضداد لابي الطيب (۵۵۷۔۵۶۰)

پائے گا۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ دنیوی ساز وسامان کی حرص کرتے ہیں اور غنیمت وغیرہ حاصل کر لینے کو ہی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

(ف و ض)

فَـوَّضَ: (الی) کے معنی کوئی معاملہ کسی کے سپرد کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ (۴۰۔۴۴) اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں۔
یعنی میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں اصل میں یہ مَـالُهُمْ فَوْضٰی بَیْنَهُمْ کے محاورہ سے مشتق ہے (یعنی ان کا مال سب میں مشترکہ ہے) شاعر نے کہا ہے ❶ (الطّویل)
(۳۴۶) طَعَامُهُمْ فَوْضٰی فَضًا فِیْ رِحَالِهِمْ۔
ان کے گھروں میں طعام منتشر اور بکھرا پڑا ہے۔ اور اسی سے شِـرْكَةُ مُفَاوَضَةٍ ہے یعنی کمپنی جس میں سب کے حصص مساوی ہوں۔

(ف و ق)

فَوْقٌ: یہ مکان، زمان، جسم، عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور کئی معنوں میں بولا جاتا ہے اوپر (۱) جیسے فرمایا:
﴿وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ (۲۔۶۳) اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا۔
﴿مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۹۔۱۶) ان کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے۔
﴿وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا﴾ (۴۱۔۱۰) اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے۔
اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں چنانچہ فرمایا:
﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ﴾ (۶۔۶۵)
کہہ دو کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔
(۲) صعود: یعنی بلندی کی جانب کے معنی میں اس کی ضد اسفل ہے جس کے معنی پستی کی جانب کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:
﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ (۳۳۔۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔
(۳) کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے جیسے فرمایا:
﴿فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ﴾ (۴۔۱۱) اگر اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ۔
(۴) جسمانیت کے لحاظ سے بڑا یا چھوٹا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔
﴿مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۲۔۲۶) مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی، مکڑی) کی مثال بیان فرمائے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ فَمَا فَوْقَهَا سے مچھر سے بڑی چیز کی طرف اشارہ ہے جیسے مکڑی جس کی کہ دوسری جگہ مثال بیان کی گئی ہے اور بعض نے فوق بلحاظ صغر مراد لیا ہے یعنی مچھر سے بھی چھوٹا اور جنہوں نے اس کی تفسیر

❶ قد مر تخریجه فی (ف ض ی)

مَـادونهـا سے کی ہے ان کی مراد بھی یہی ہے بعض اہل لغت نے اس سے یہ سمجھ لیا ہے کہ فـــوق بمعنی دون بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے اضداد میں شمار کیا ہے مگر یہ محض ان کی خام خیالی ہے۔

(۵) بلحاظ فضیلت دنیوی کے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:
﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ﴾ اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے۔

اور کبھی فضیلت اخروی کے لحاظ سے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿وَالَّـذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (۲۔۲۱۲) لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر فائق ہوں گے۔

﴿فَـوْقَ الَّـذِيْـنَ كَـفَـرُوْا﴾ (۳۔۵۵) کافروں پر فائق۔

(۶) فوقیت معنی غلبہ اور تسلط کے جیسے فرمایا:
﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾ (۶۔۱۸) اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

﴿مِنْ قَـوْمِ فِـرْعَـوْنَ وَاِنَّــا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴾ (۷۔۱۲۷) فرعون سے اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

اور فَوْقٌ کے لفظ سے فَـاقَ فُـــلَان غَيْرَهٗ يَفُوْقُ کا محاورہ ہے جس کے معنی دوسرے پر بازی لے جانے کے ہیں لہٰذا یہ فوق بمعنی فضیلت سے مشتق ہے۔ اور فوق سے فَـوْقُ السَّهْمِ کا محاورہ مشتق ہے جس کے معنی سوفار تیر کے ہیں اور سَهْـمٌ اَفْوَقُ کے معنی پرشکستہ سوفار کے ہیں۔

اَلْاِفَـاقَةُ: (افعال) کے معنی نشہ یا غش کے بعد ہوش میں آنے یا مرض کے بعد ہوش میں آنے یا مرض کے بعد کمزوری سے قوت کی طرف لوٹ آنے کے ہیں نیز اِفَاقَةٌ کے معنی دودھ دوہنے کے بعد دودھ کا پھر تھنوں میں لوٹ آنا بھی آتے ہیں اور جو دودھ تھنوں میں لوٹتا ہے اسے فُـــوْقَةٌ کہا جاتا ہے اور ایک دفعہ تھنوں سے دودھ دوہنے کے بعد پھر ان میں دودھ لوٹنے تک جو وقفہ ہوتا ہے اسے فواق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

﴿مَّـا لَهَـا مِنْ فَوَاقٍ﴾ (۳۸۔۱۵) جس میں (شروع ہوئے پیچھے) کچھ وقفہ نہیں ہوگا۔

جس کے معنی راحت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ دوبارہ دنیا کی طرف لوٹنا نہیں ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے [1] کہ اگر فُـوَاقٍ بضم الفاء پڑھا جائے تو یہ فُوَاقُ النَّاقَةَ کے محاورہ سے مشتق ہوگا اور بعض نے کہا کہ فتحہ اور ضمہ فاء دونوں کے ایک ہی معنی ہیں [2] جیسے جَـمَـــامٌ وَ جُـمَـامٌ اور بعض نے کہا ہے کہ اِسْتَـفِقْ نَاقَتَكَ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی اونٹنی کو چھوڑ دو تا کہ اس کے تھنوں میں دودھ اتر آئے اور فـوق فَصِيْلَكَ کے معنی ہیں کہ اونٹ کے بچہ کو کچھ وقفہ کے بعد دودھ پلاؤ۔ ظَـلَّ يَتَفَوَّقُ الْمَحْضَ وہ دن بھر وقفوں کے ساتھ دودھ بلوتا رہا۔ شاعر نے کہا [3] (البسیط)

---

[1] انظر مجازہ (۲/۷۹)

[2] کمـا یـفـهـم من تفسیر الفراء حیث قال: مالها من راحة وافاقة قرء الحسن وعاصم واهل المدينة فواق بالفتح وهى لغة جيدة وبالضمه حمزه والاعمش والكسائى (راجع الطبرى)۔

[3] قـالـه الاعشى بـن مـيـمـون فى قصيدة يمدح فيها هوذة بن على الحنفى۔ لم يلبس التاج معدى غيره والبيت ال ۳۲ من قصيدة وتمامه: جاء ت لترضع شق النفس لورضعا والبيت من شواهد الطبرى (۲۳/۳۳)

(۳۴۷) حَتّٰی اِذَا فِیْقَةٌ فِیْ ضَرْعِهَا اجْتَمَعَتْ حتیٰ کہ جب اس کے تھنوں میں دودھ دوبارہ جمع ہوگیا۔

(ف و م)

اَلْفُوْمُ: گیہوں۔اور بعض نے کہا ہے کہ فوم اصل میں ثوم ہی ہے (یعنی فاء ثاء سے بدل دی گئی ہے) جیسا کہ جدث وجدف میں ہے اور اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا﴾ (۲۔۶۱) اور گیہوں اور مسور۔

(ف و ہ)

اَفْوَاہ: فَمٌ کی جمع ہے اور فم اصل میں فَوْہٌ ہے اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قول کی نسبت فم یعنی منہ کی طرف کی گئی ہے۔وہاں دروغ گوئی کی طرف اشارہ ہے اور اس پر تنبیہ ہے کہ وہ صرف زبان سے ایسا کہتے ہیں ان کے اندرون اس کے خلاف ہیں جیسے فرمایا:۔

﴿ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ﴾ (۳۳۔۴) یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔

﴿كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۸۔۵) بات جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

﴿يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۸) یہ منہ سے تو تمہیں خوش کر دیتے ہیں۔لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ ﴿فَرَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۴۔۹) تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دیے (کہ خاموش رہو)۔

﴿مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (۵۔۴۱) کچھ تو ان میں سے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔لیکن ان کے دل مومن نہیں ہیں۔

﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۳۔۱۶۷) منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

اور اسی سے فَمُ النَّهْرِ کی طرح فُوْهَةُ النَّهْرِ کا محاورہ ہے۔جس کے معنی نہر کے دہانہ کے ہیں اور اَفْوَاهُ الطِّيْبِ۔ ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو خوشبو کے لیے ڈالی جائیں۔اس کا واحد فُوْهٌ ہے۔

(ف ی ء)

اَلْفَيْئُ وَالْفَيْئَةُ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ﴾ (۴۹۔۹) یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائے۔پس جب وہ رجوع لائے۔

﴿فَاِنْ فَآءُوْ﴾ (۲۔۲۲۶) اگر (اس عرصے میں قسم سے) رجوع کرلیں۔

اور اسی سے فَاءَ الظِّلُّ ہے۔جس کے معنی سایہ کے (زوال کے بعد) لوٹ کر آتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ﴾ (۱۶۔۴۸) جن کے سائے...... لوٹے ہیں۔اور جو مال غنیمت بلا مشقت حاصل ہو جائے اسے بھی فیئی کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ (۵۹۔۷) جو مال خدا نے اپنے پیغمبر کو...... دلوایا۔

﴿مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ﴾ (۳۳۔۵۰) جو خدا نے تمہیں (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مال غنیمت کو فیئی بمعنی سایہ کے

ساتھ تشبیہ دے کرنے کہنے میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ دنیا کا بہترین سامان بھی بمنزلہ ظل زائل کے ہے شاعر نے کہا ہے ❶ (الطویل)

(۳۴۸) اَمَادِیَّ الْمَالُ اَفْیَاءُ الظِّلَالِ عَشِیَّةً

اے مادی مال شام کے ڈھلتے ہوئے سایہ کی طرح ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا ❷

(۳۴۹) اِنَّمَا الدُّنْیَا کَظِلٍّ زَائِلٍ

کہ دنیا زائل ہونے والے سایہ کی طرح ہے۔

اَلْفِئَۃُ: اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد تعاون اور تعاضد کے لیے ایک دوسرے کی طرف لوٹ کر آئیں ❸ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا﴾ (۸۔۴۵) جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔

﴿کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً﴾ (۲۔۲۴۹) بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے...... بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔

﴿فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا﴾ (۳۔۱۳) دو گروہوں میں جو (جنگ بدر میں) آپس میں بھڑ گئے۔

﴿فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ﴾ (۴۔۸۸) کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ۔

مِنْ فِئَۃٍ یَّنْصُرُوْنَہٗ: کوئی جماعت اس کی مددگار نہ ہو سکی۔ (۲۸۔۸۱)

﴿فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ﴾ (۸۔۴۸) جب یہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہوئیں۔

(ف ی ض)

فَاضَ الْمَاءُ کے معنی کسی جگہ سے پانی اچھل کر بہ نکلنا ہیں (اور آنسوؤں کے بہنے کے لیے بھی آتا ہے) چنانچہ فرمایا۔

﴿تَرٰۤی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ (۵۔۸۳) تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔

اور اَفَاضَ اِنَاءَہٗ کے معنی برتن کو لبالب بھر دینے کے ہیں حتیٰ کہ پانی اس سے نیچے گرنے لگے اور اَفَضْتُہٗ کے معنی اوپر سے گرانے اور بہانے کے ہیں جیسے فرمایا:۔

﴿اَنْ اَفِیْضُوْا عَلَیْنَا مِنَ الْمَآءِ﴾ (۷۔۵۰) کہ کسی قدر ہم پر پانی بہاؤ۔

اسی سے فَاضَ صَدْرُہٗ بِالسِّرِّ، جس کے معنی بھید ظاہر کرنے کے ہیں اور سخی آدمی کو فَیَّاضٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَفَاضُوْا فِی الْحَدِیْثِ کا محاورہ مستعار ہے۔ جس کے معنی باتوں میں مشغول ہو جانے اور چرچا کرنے کے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿لَمَسَّکُمْ فِیْمَا اَفَضْتُمْ فِیْہِ﴾ (۲۴۔۱۴) تو جس بات کا تم چرچا کرتے تھے اس کی وجہ سے تم پر............نازل ہوتا۔

﴿ھُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیْضُوْنَ فِیْہِ﴾ (۴۶۔۸) وہ اس گفتگو کو خوب جانتا ہے جو تم اس کے بارے میں کرتے ہو۔

﴿اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْہِ﴾ (۱۰۔۶۱) جب اس میں مصروف ہوتے ہو۔

اور حَدِیْثٌ مُّسْتَفِیْضٌ کے معنی منتشر یعنی عام پھیلی

---

❶ قالہ حاتم الطائی وقد مرفی (اوی)

❷ لم اجدہ

❸ ذکر اصحاب المعاجم ایضاً لفظۃ "الفئۃ" فی رف ء۔

ہوئی بات کے ہیں اور فَيْض کے معنی کثیر پانی کے ہیں۔

چنانچہ محاورہ۔

اَعْطَاهُ غَيْضًا مِّنْ فَيْضٍ: یعنی اسے زیادہ مال میں سے تھوڑا سا دیا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿فَإِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ﴾ (۲۔۱۹۸) اور جب عرفات سے واپس ہونے لگو۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ (۲۔۱۹۹) پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں وہیں سے تم بھی واپس ہو۔

میں اِفَاضَةٌ کے معنی مجمع کثیر کے یکبارگی لوٹنے کے ہیں اور یہ فیضان الماء یعنی (پانی کا زور سے بہہ نکلنا) کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

اَفَاضَ بِالْقِدَاحِ: تیر گھمانا۔

اَفَاضَ الْبَعِيْرُ بِجَرَّتِهٖ: اونٹ کا جگال پھینکنا۔ دِرْعٌ مُفَاضَةٌ: کشادہ زرہ۔ گویا پہننے والے پر اسے بہا دیا گیا ہے جس طرح کہ دِرْعٌ مَّسْنُوْنَةٌ کے معنی بھی وسیع زرہ کے ہیں جو کہ سَنَنْتُ بمعنی صَبَبْتُ سے مشتق ہے۔

(ف ی ل)

اَلْفِيْلُ: ہاتھی جمع۔ فِيْلَةٌ وَ فُيُوْلٌ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ﴾ (۱۰۵۔۱) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔

رَجُلٌ فِيْلُ الرَّأْيِ وَفَالُ الرَّأْيِ: کمزور رائے آدمی۔

اَلْمُفَايَلَةُ: ایک قسم کا کھیل جس میں بچے کوئی چیز مٹی میں چھپا دیتے ہیں پھر اس مٹی کو مٹھیاں بھر بھر کر تقسیم کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس کے حصہ میں آتی ہے اور فَائِلٌ، سرین کے گڑھے یا گوشت کے نیچے ایک رگ کا نام ہے۔

❀❀❀

کتاب القاف

(ق ب ح)

اَلْـقَبِیْـحُ: اس چیز کو کہتے ہیں جس کے دیکھنے سے آنکھ کو نفرت ہو اور اعمال و احوال میں سے اس عمل اور حالت کو کہتے ہیں جس سے طبیعت کو کراہت ہو، کہا جاتا ہے۔
قَبُحَ قَبَاحَةً (ک) فَھُوَ قَبِیْحٌ۔ اور آیت کریمہ:
﴿مِنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ﴾ (۲۸۔۴۲) میں مقبوحین سے بد حال لوگ مراد ہیں اور اس سے کفار کی صفات ذمیمہ کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں وہ پلید اور گندے رہتے ہیں اور آخرت میں سیاہ رو گربہ چشم ہوں گے اور اغلال و سلاسل میں جکڑ کر انہیں گھسیٹا جائے گا۔ الغرض اس قسم کی مذموم صفات مراد ہیں (جن کے ساتھ قیامت کے دن متصف ہوں گے)
قَبَّحَهُ اللّٰهُ عَنِ الْخَیْرِ: اللہ اسے خیر سے دور کرے
القبیح: بازو کی ہڈی جس کا نصف کہنی کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔

(ق ب ر)

اَلْـقَبْرُ کے معنی میت کو دفن کرنے کی جگہ کے ہیں اگر یہ قَبَرْتُهٗ (ضرب ونصر) کا مصدر ہو تو اس کے معنی میت کو قبر میں دفن کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور اَقْبَرْتُهٗ کے معنی کسی کے لیے قبر مہیا کرنے کے ہیں تاکہ اس میں دفن کیا جائے۔ جیسے اَسْقَیْتُهٗ: کے معنی پینے کے لیے پانی مہیا کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ﴾ (۸۰۔۲۱) پھر اس کو موت دی۔ پھر قبر میں دفن کرایا۔
بعض نے اَقْبَرَهٗ کے معنی یہ کیے ہیں کہ اسے الہام کر دیا کہ کس طرح میت کو دفن کیا جائے۔ اَلْمَقْبُرَةُ وَالْمَقْبَرَةُ (قبرستان) جمع مقابر قرآن پاک میں ہے۔
﴿حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (۱۰۲۔۲) (یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔
یہ موت سے کنایہ ہے اور آیت کریمہ:
﴿اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ﴾ (۱۰۰۔۹) کہ جو مردے قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے۔ میں حیات بعد الممات یعنی موت کے بعد زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ دلوں کے اسرار ظاہر کر دینے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب تک انسان دنیا میں رہتا ہے اس کے بھید مستور رہتے ہیں گویا قبر میں مدفون ہیں۔ تو یہاں قبور سے مجازاً دل مراد ہیں۔ بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ جب موت کی وجہ سے جہالت کا پردہ اٹھ جائے گا گویا کافر اور جاہل جب تک دنیا میں رہتے ہیں جہالت کی قبروں میں مدفون رہتے ہیں۔ چونکہ مرنے کے بعد وہ جہالت دور ہو جاتی ہے۔ تو گیا وہ قبر جہالت سے دوبارہ زندہ کر کے نکالے گئے ہیں۔ جیسا کہ مروی ہے اَلْاِنْسَانُ نَائِمٌ فَاِذَا مَاتَ انْتَبَهَ: کہ انسان دنیا میں سویا رہتا ہے جب موت آ کر دستک دیتی ہے تو اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

فرمایا۔
﴿مَـآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ﴾ (۳۵۔۲۲) اور تم ان کو جو قبروں میں مدفون ہیں نہیں سنا سکتے۔یعنی جو (لوگ جہالت کے گڑھے میں گرنے کی وجہ سے) مردوں کے حکم میں ہیں۔

(ق ب س)

اَلْـقَبَسُ: آگ (کا شعلہ یا اس کی چنگاری) جو شعلہ سے لی جائے قرآن پاک میں ہے۔
﴿اَوْ آتِیْـکُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ﴾ (۲۷۔۷) یا سلگتا ہوا انگارہ تمہارے پاس لاتا ہوں۔
اور اَلْقَبسُ (مصدر) وَالْاِ قْتِبَاسُ کے معنی بڑی آگ سے کچھ آگ لینے کے ہیں۔مجازاً علم و ہدایت کی طلب پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (۵۷۔۱۳) ہماری طرف نظر شفقت کیجیے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔
اَقْبَسْتُـهٗ نَـارًا اَوْ عِلْمًا: میں نے اسے آگ دی یا علم سکھایا۔
اَلْقَبِیْسُ: وہ سانڈھ جو تیزی کے ساتھ مادہ کو حاملہ کر دے گویا سرعت میں وہ شعلہ کی طرح ہے۔

(ق ب ص)

اَلْـمَقْبَصُ: (ص) کے معنی چٹکی سے کوئی چیز لینے کے ہیں اور جو چیز چٹکی سے لی گئی ہو اسے قَبْـصٌ وَ قَبِیْـصَةٌ کہا جاتا ہے۔اس لیے قبیص، حقیر چیز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اور آیت: ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً﴾ (۲۰۔۹۶) تو میں نے ایک مٹھی بھر لی۔میں ایک قرأت فَقَبَصْتَ قَبْصَةً (صاد مہملہ) کے ساتھ بھی ہے۔
قَبُـوْصٌ: سبک رفتار اور چست گھوڑا جو دوڑتے وقت صرف سم ہی زمین پر لگائے۔اور تیز رفتار گھوڑے پر اس کا اطلاق مجازی ہے جیسا کہ مجازاً سرعت رفتاری کے لیے قَبْصٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(ق ب ض)

اَلْـقَبْـضُ کے معنی کسی چیز کو پورے پنجے کے ساتھ پکڑنے کے ہیں جیسے قَبَضَ السَّيْفَ وغیرہ تلوار کو پکڑنا۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَـقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ (۲۰۔۹۶) تو میں نے فرشتے کے نقش پا سے مٹی کی ایک مٹھی بھر لی۔
قَبْـضُ الْيَدِ عَلَى الشَّیْءِ کے معنی مٹھی میں لے لینے کے ہیں اور قَبْـضُهَـا عَنِ الشَّـیْءِ کے معنی کسی چیز کو پکڑنے سے ہاتھ سکیڑ لینے کے ہیں۔اسی مفہوم کے لحاظ سے مال خرچ کرنے سے ہاتھ روک لینے کو بھی قبض کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ﴾ (۹۔۶۷) اور (خرچ کرنے سے) ہاتھ بند کیے رہتے ہیں۔
یعنی خرچ نہیں کرتے۔اور استعارہ کے طور پر کسی چیز کے حاصل کر لینے کو بھی قبض کہا جاتا ہے اگرچہ اسے ہاتھ سے نہ پکڑا جائے جیسے محاورہ ہے۔قَبَـضْـتُ الدَّارَ مِنْ فُلَانٍ یعنی اسے اپنے تصرف میں لے لیا۔قرآن پاک میں ہے۔[1]

[1] قال في الكشاف (۲/۴۴۵) وهي قراءة الحسن راجع ايضا ابدال ابي الطيب (۲/۲۴٦) وعلماء اللغة فرقوا بينهما راجع غريب ابي عبيد (۱/۳٦) وكما في قوله تعالىٰ: فرهان مقبوضة (۲/۲۸۳)

﴿وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۳۹۔۶۷) اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔یعنی اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہوگی اور کسی کا ملک نہیں ہوگا۔اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا﴾ (۲۵۔۴۶) پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔

میں سورج کے سایہ کو نقل کرنے کی طرف اشارہ ہے اور استعارہ کے طور پر قبض کے معنی تیز دوڑنے کے بھی آتے ہیں اس لحاظ سے کہ گویا دوڑنے والا زمین سے کسی چیز کو پکڑتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿یَقْبِضُ وَ یَبْصُطُ﴾ (۲۔۲۴۵) (اور خدا ہی روزی کو) تنگ کرتا اور اسے وہی کشادہ کرتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ کبھی چھین لیتا ہے اور کبھی عطا کر دیتا ہے۔یا ایک قوم سے چھین لیتا ہے اور دوسری کو عطا کر دیتا ہے۔یا یہ کہ وہ کبھی جمع کرتا ہے اور کبھی بکھیر دیتا ہے اور یا اس کے معنی زندہ کرنے اور مارنے کے ہیں۔کیونکہ کبھی قبض موت سے کنایہ ہوتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے۔قَبَضَهُ اللّٰهُ: اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اس معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا[1] (۷۷)((مَا مِنْ آدَمِیٍّ اِلَّا وَقَلْبُهٗ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنَ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ)) کہ ہر آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہے یعنی انسان کے سب سے اشرف جزء پر اللہ تعالیٰ کو تصرف حاصل ہے تو دوسرے اعضاء پر بالاولیٰ تصرف حاصل ہوگا۔رَاعِیْ قُبْضَةٍ: منتظم چرواہا۔

اَلْاِنْقِبَاضُ کے معنی اطراف یعنی ہاتھ پاؤں سمیٹ لینے کے ہیں اور ترک تبسط یعنی بے تکلفی چھوڑ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(ق ب ل)

قَبْلُ: یہ تقدم متصل اور منفصل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کی ضد بَعْدُ ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں تقدم متصل کے لیے آتے ہیں اور ان کا ضد دُبْرٌ و دُبُرٌ ہے۔یہ اس کے اصل معنی ہیں اگرچہ مجازاً ہر قسم کے تقدم پر بولا جاتا ہے پس قَبْل چار طرح استعمال ہوتا ہے۔

(۱) تقدم مکانی: یعنی کسی مقام کا دوران سفر میں پہلے آنا اور دوسرے کا اس کے بعد آنا جیسے اصفہان سے مکہ کی طرف جاتے وقت بغداد کوفہ سے پہلے آتا ہے لیکن مکہ سے اصفہان کو جاتے وقت کوفہ بغداد سے پہلے آتا ہے۔

(۲) تقدم زمانی: جیسے عَبْدُالْمَلِكِ قَبْلَ الْمَنْصُوْرِ کہ عبدالملک کا زمانہ منصور سے پہلے کا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ...... ﴾ (۲۔۹۱) تو خدا کے پیغمبروں کو پہلے ہی کیوں قتل کیا کرتے۔

(۳) تقدم بلحاظ مرتبہ: جیسے عَبْدُالْمَلِكِ قَبْلَ الْحَجَّاجِ کہ عبدالملک حجاج سے پہلے ہے یعنی مرتبہ میں بڑا ہے۔

(۴) تقدم صناعی: یعنی ترتیب تعلیمی اور فنی میں ایک چیز کا دوسری سے پہلے ہونا جیسے کہا جاتا ہے۔ تَعَلُّمُ الْهِجَاءِ قَبْلَ تَعَلُّمِ الْخَطِّ کہ حروف ہجا کی تعلیم کتابت سیکھنے سے پہلے دی جاتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْیَةٍ﴾ (۲۱۔۶) ان سے

[1] وبمعناه فی (حم ه ك) عن النواس (الفتح الكبير (للنبهانى) (۷۲۵ ج۳)

پہلے جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا وہ ایمان نہیں لائی تھیں۔

﴿قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا﴾ (۲۰۔۱۳۰) سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔

﴿قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ﴾ (۲۷۔۳۹) قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ (۵۷۔۱۶) (ان سے) پہلے کتابیں دی گئی تھیں۔

ان تمام آیات میں تقدم زمانی مراد ہے اور کنایہ کے طور پر قُبُلٌ وَدُبُرٌ کا لفظ شرمگاہ پر بولا جاتا ہے اور استقبال کی طرح اقبال کے معنی بھی کسی کے روبرو اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ﴾ (۶۸۔۳۰) پھر لگے ایک دوسرے کو رو در رو ملامت کرنے۔ ﴿وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ﴾ (۱۲۔۷۱) اور وہ ان کی طرف متوجہ ہوکر......

﴿فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ﴾ (۵۱۔۲۹) ابراہیم علیہ السلام کی بیوی چلاتی ہوئی آئی۔

اور جو شخص ڈول کی طرف منہ کرکے اسے کنویں سے پکڑتا ہے۔ اسے قابل اور دائی کو قابلہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ولادت کے وقت بچے کو پکڑتی ہے قَبِلْتُ عُذْرَهٗ وَتَوْبَتَهٗ وغیرہ وَتَقَبَّلْتُهٗ: میں نے اس کا عذر اور توبہ وغیرہ قبول کرلی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ (۲۔۱۲۳) اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے۔

﴿وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ (۴۰۔۳) اور توبہ قبول کرنے والا۔

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ﴾ (۴۲۔۲۵) اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا...... ہے۔ اور تَقَبُّلٌ کے معنی کسی چیز کو اس طرح قبول کرنے کے ہیں کہ وہ عوض کی مقتضی ہو جیسے ہدیہ وغیرہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا﴾ (۴۶۔۱۶) یہی لوگ ہیں جن کے اعمال نیک ہم قبول کریں گے۔

﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (۵۔۲۷) کہ خدا پرہیز گاروں ہی کی نیاز قبول فرمایا کرتا...... ہے۔ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر عبادت قبول نہیں ہوتی بلکہ وہی قبول کی جاتی ہے جو مخصوص طریق سے ادا کی جائے۔ فرمایا:

﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ﴾ (۳۔۳۵) تو اسے میری طرف سے قبول فرما۔ كَفَالَةٌ کو قُبَالَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ كَفَالَةَ کے معنی مؤکد طور پر کسی چیز کو قبول کر لینے کے ہیں تو آیت ﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ﴾ میں کفالت کے معنی معتبر ہیں اور لکھے ہوئے عہد کو قُبَالة کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ (۳۔۳۷) پروردگار نے اسے پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تَقَبَّلَهَا کے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تَكَفَّلَهَا کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے درحقیقت مجھے بہت بڑی کفالت کا ذمہ دار بنا دیا ہے اور پھر آیت کریمہ میں بِتَقَبُّلٍ کی بجائے بِقَبُوْلٍ حسن فرمایا ہے تاکہ اس میں دونوں امر جمع ہو جائیں یعنی تقبل جو قبولیت کا اعلیٰ درجہ ہے اور قبول کرنا جو کہ رضا اور

ثواب کا مقتضی ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قَبُوْلٌ کا لفظ فُلَانٌ عَلَیْهِ قَبُوْلٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جو اسے دیکھتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور آیت کریمہ ﴿كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا﴾ (۶۔۱۱۱) سب چیزوں کو...... سامنے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ قُبُلٌ قَابِلٌ کی جمع ہے جس کے معنی سامنے کے ہیں۔ مجاہدؒ نے اس کے معنی جماعت در جماعت کیے ہیں اس صورت میں یہ قبیل کی جمع ہوگی۔ اس طرح آیت کریمہ: ﴿اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا﴾ (۱۸۔۵۵) یا ان پر عذاب سامنے آ موجود ہو۔ میں بھی قُبُلًا کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے قَبَلًا پڑھا ہے جس کے معنی عِیَانًا یعنی سامنے کے ہیں۔

اَلْقَبِیْلُ: یہ قبیلہ کی جمع ہے یعنی وہ جماعت جو ایک دوسرے پر متوجہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ﴾ (۴۹۔۱۳) تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِیْلًا﴾ (۱۷۔۹۲) اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لے آؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں قَبِیْلٌ بمعنی کَفِیْلٌ یعنی ضامن کے ہے اور یہ قَبِلْتُ فُلَانًا وَتَقَبَّلْتُ بِهٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ضامن بننے کے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی مقابلہ یعنی معائنہ کیے ہیں۔ مثل مشہور ہے۔

فُلَانٌ لَا یَعْرِفُ قَبِیْلًا مِّنْ دَبِیْرٍ: وہ عورت کے اگلے اور پچھلے سوت میں تمیز نہیں کر سکتا یعنی بیوقوف ہے۔

اَلْمُقَابَلَةُ وَالتَّقَابُلُ کے معنی ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں خواہ وہ توجہ بذریعہ ذات کے ہو یا بذریعہ عنایت اور مودت کے ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿مُتَّكِئِیْنَ عَلَیْهَا مُتَقَابِلِیْنَ﴾ (۵۶۔۱۶) آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوئے۔

﴿اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ﴾ (۱۵۔۴۷) بھائی بھائی تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔

لِیْ قِبَلَ فُلَانٍ كَذَا کے معنی ہیں: میرے فلاں کی جانب اتنے ہیں اور یہ عِنْدَهٗ کے ہم معنی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ﴾ (۶۹۔۹) اور فرعون اور جو لوگ اس سے پہلے تھے سب...... کرتے تھے۔

﴿فَمَالِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِیْنَ﴾ (۷۰۔۳۶) تو ان کافروں کو کیا ہوا ہے کہ تمہاری طرف دوڑتے چلے آتے ہیں۔

اور استعارہ کے طور پر قوت اور قدرت علی المقابلہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

لَا قِبَلَ لِیْ بِكَذَا: میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا﴾ (۲۷۔۳۷) ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس کے مقابلہ کی ان کو طاقت نہ ہوگی۔

یعنی ان کے سامنے ہونے اور مدافعت کرنے کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔

اَلْقِبْلَةُ: اصل میں بالمقابل آدمی کی حالت کو کہا جاتا ہے جیسے جِلْسَةٌ وَقِعْدَةٌ اور عرف میں اس جہت کو قبلہ کہا جاتا ہے جس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ (۲۔۱۴۴) سو ہم تم کو ایسے قبلہ کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو متوجہ ہونے کا حکم دیں گے۔

اور قَبُوْلٌ کے معنی پُروا کی ہوا کے ہیں اور اسے قَبُوْلٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ قبلہ کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور سر کی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ کو قَبِیْلَةٌ کہا جاتا ہے اور مُقَابَلَةٌ اس بکری کو کہا جاتا ہے جس کا کان سامنے کی جانب سے کٹا ہوا ہو۔ اور قِبَالُ النَّعْلِ کے معنی جوتے کا تسمہ کے ہیں قَابَلْتُ النَّعْلَ: جوتے کو تسمہ لگانا۔

اَلْقَبَلُ: پاؤں کے پنجہ کا اندر کی جانب مڑا ہوا ہونا اَلْقَبَلَةُ: ایک قسم کا منکا جس کے متعلق ساحروں کا خیال ہے کہ وہ باہم محبت کا کام دیتا ہے اسی سے قُبْلَةٌ ہے جس کے معنی بوسہ کے ہیں اس کی جمع قُبَل آتی ہے۔ اور قَبَّلْتُهٗ تَقْبِيْلًا کے معنی بوسہ دینے کے ہیں۔ [1]

(ق ت ر)

اَلْقَتْرُ: (ن) کے معنی بہت ہی کم خرچ کرنے اور بخل کرنے کے ہیں۔ یہ اِسْرَافٌ کی ضد ہے۔ اور یہ دونوں صفات مذمومہ سے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ (۲۵۔۶۷) بلکہ اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔ اسی سے صفت مشبہ کا صیغہ قَتُوْرٌ و مُقْتِرٌ آتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۰۰) اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان فطرةً کنجوس واقع ہوا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (۴۔۱۲۸) اور طبیعتیں تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔

قَتَرْتُ الشَّيْءَ وَاَقْتَرْتُهٗ وَقَتَّرْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں اور مُقْتِرٌ بمعنی فقیر ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾ (۲۔۲۳۶) اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔

اصل میں یہ قُتَارٌ وَقَتَرٌ سے ہے جس کے معنی اس دھواں کے ہیں جو کسی چیز کے بھوننے یا لکڑی کے جلنے سے اٹھتا ہے گویا مُقْتِرٌ اور مُقَتِّرٌ بھی ہر چیز سے دھوئیں کی طرح لیتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾ (۸۰۔۴۱) (اور) سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔

میں قَتَرَةٌ غَبَرَةٌ کی طرح ہے مراد دھوئیں کی طرح سیاہی اور افسردگی ہے جو جھوٹ کی وجہ سے چہرہ پر چھا جاتی ہے۔

اَلْقُتْرَةُ: شکاری کی کمین گاہ جو انسان کی بو کو بھی شکار تک نہیں پہنچنے دیتی۔ کیونکہ شکاری کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بو بھی شکار تک نہ پہنچے تاکہ شکار بھاگ نہ جائے۔

رَجُلٌ قَاتِرٌ: کمزور آدمی۔ گویا وہ ضعف میں دھوئیں کی طرح ہے جیسا کہ کمزور آدمی کو هُوَ هَبَاءٌ کہا جاتا ہے۔

اِبْنُ قَتَرَةٍ: ایک باریک اور چھوٹا سا سانپ۔ اَلْقَتِيْرُ: زرہ کی میخوں کے سرے۔

(ق ت ل)

اَلْقَتْلُ: (ن) الموت کی طرح اس کے معنی بھی جسم سے روح کو زائل کرنے کے ہیں لیکن موت اور قتل میں فرق یہ ہے کہ اگر اس فعل کو سرانجام دینے والے کا اعتبار کیا جائے تو اسے قتل کہا جاتا ہے اور اگر صرف روح کے فوت ہونے کا اعتبار کیا جائے تو اسے موت کہا جاتا

---

[1] انظر فی القبلة لطائف و طرائف (محاضرات الادباء (۳/ ۱۲۰۔۱۲۲)

ہے۔قرآن میں ہے۔

﴿اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ﴾ (۳۔۱۴۴) بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں۔

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ﴾ (۸۔۱۷) تم لوگوں نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا۔

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ﴾ (۸۰۔۱۷) انسان ہلاک ہو جائے۔اور آیت کریمہ:

﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۰) اٹکل دوڑانے والے ہلاک ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بددعا کے لیے ہے اور قتل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ایجاد قتل کے ہوتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۲۔۵۴) اور اپنے تئیں ہلاک کر ڈالو۔

کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو اور بعض نے خواہشات نفسانی کا قلع قمع کر دینا مراد لیا ہے۔اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

قَتَلْتُ الْخَمْرَ بِالْمَاءِ: میں نے شراب میں پانی ملا دیا (جس سے اس کا جوش ٹھنڈا ہو گیا)

قَتَلْتُ فُلَانًا وَقَتَّلْتُهٗ: میں نے اسے ذلیل کر دیا۔

شاعر نے کہا ہے ❶ (البسیط)

(۳۵۰) كَاَنَّ عَيْنَيَّ فِيْ غَرْبَيْ مُقَتَّلَةٍ

گویا میری دونوں آنکھیں بھرے ہوئے ڈول میں رکھی ہوئی ہیں۔

قَتَلْتُ كَذَا عِلْمًا: میں نے اچھی طرح جان لیا۔اور آیت کریمہ

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا﴾ (۴۔۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہیں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا یقین نہیں ہے۔ ❷

اَلْمُقَاتَلَةُ کے معنی جنگ کرنے اور کسی کے درپے قتل ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ (۲۔۱۹۳) اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

﴿وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا﴾ (۵۹۔۱۲) اور اگر ان سے جنگ ہوئی۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ﴾ (۹۔۱۲۳) (اپنے نزدیک کے رہنے والے) کافروں سے جنگ کرو۔

﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ﴾ (۴۔۷۴) اور جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ قِتل کے معنی دشمن اور ہمسر کے ہیں مگر اسکے اصل معنی مقاتل یعنی لڑنے والا کے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ﴾ (۹۔۳۰) خدا ان کو ہلاک کرے۔

بعض کے نزدیک جملہ دعائیہ ہے کہ اللہ ان پر لعنت کرے اور بعض نے اس کے معنی قتل کر دینا کے لکھے ہیں۔لیکن

---

❶ وتمامة: من النواضح تسقى جنة سحقا۔ قاله زهير وقد مر تخريجه (جن) والبيت ايضا فى المحكم (سحق)

❷ راجع (ى ق ن) ۱۲

اصل میں یہ باب مفاعلہ سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے لڑائی کے درپے ہو رہے ہیں اور جو اللہ سے جنگ کرے گا وہ مغلوب ہوگا جیسے فرمایا:
﴿وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۳۷-۱۷۳) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ﴾ (۶-۱۵۲) اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ عَــزْل کے ذریعہ نطفے کو ضائع کرنے اور اسے بے محل ڈالنے سے منع فرمایا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس میں اولاد کو ایسے کاموں میں مشغول رکھنے سے منع کیا ہے جو ان کو حصول علم اور ایسے کاموں میں کوشش کرنے سے روک رکھیں جو ابدی زندگی کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں کیونکہ جاہل اور غافل لوگ آخرت سے مردوں کی طرح بے خبر رہتے ہیں اسی بنا پر آیت:
﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ﴾ (۱۶-۲۱) وہ لاشیں ہیں بے جان۔ میں انہیں مردے کہا ہے اور یہی معنی آیت: ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۴-۲۹) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، کے ہیں کیونکہ اس کے بعد:
﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا﴾ (اور جو تعدی وظلم سے ایسا کرے گا) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾ (۵-۹۵) جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا، اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے تو (یا اس کا) بدلہ (دے) اور وہ یہ ہے کہ اسی طرح کا چارپایہ۔
میں ذبح کی بجائے لفظ قتل اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ سب الفاظ سے اعم ہے اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کی جان لینا بہمہ وجوہ ممنوع ہے۔
اَقْتَلْتُ فُلَانًا میں نے اسے قتل کے لیے پیش کیا۔ اِقْتَتَلَهُ الْجِنُّ وَالْعِشْقُ: اسے عشق یا جن نے قتل کر ڈالا۔ اور یہ لفظ ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا اور اِقْتِتَال بمعنی مُقَاتَلَة بھی آتا ہے جیسے فرمایا:
﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا﴾ (۴۹-۹) مومنوں میں سے...... آپس میں لڑ پڑیں۔

(ق ح م)

اَلْاِقْتِحَامُ کے معنی کسی خوف ناک جگہ میں گھس جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ (۹۰-۱۱) مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔
﴿هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ﴾ (۳۸-۵۹) یہ ایک فوج ہے جو...... داخل ہوگی۔
فَحَّمَ الْفَرَسُ فَارِسَهٗ: گھوڑا اپنے سوار کو لے کر خطرناک جگہ میں جا گھسا۔
فَحَّمَ فُلَانٌ نَفْسَهٗ فِيْ كَذَا اس نے اپنے تئیں بے سوچے سمجھے خطرہ میں ڈال دیا۔
مَقَاحِيْمُ: (واحد مِقْحَامٌ) بے خطر کسی (خوف ناک) امر میں گھس جانے والے۔ شاعر نے کہا ہے۔[1]

[1] لم اجد قائله والبيت في المحاضرات

(۳۵۱) مَقَاحِيْمُ فِي الْاَمْرِ الَّذِيْ يُتَجَنَّبُ وہ قابل اجتناب یعنی خوفناک امور میں بے دھڑک گھسنے والے ہیں...... ایک روایت میں یَتَهَيَّبُ ہے۔

(ق د د)

اَلْــقَــدُّ کے معنی کسی چیز کو طول میں قطع کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ﴾ (۱۲۔۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

﴿وَ اِنْ كَـانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ﴾ (۱۲۔۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

اَلْـقِدُّ: بمعنی مَـقْدُوْدٌ ہے اور اسی سے انسان کے قد و قامت کو قَدٌّ کہا جاتا ہے جیسا کہ۔ تَقْطِيْعُ الْاِنْسَانِ (انسان کا قد و قامت) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

قَدَرْتُ اللَّحْمَ کے معنی گوشت کے پارچے بنانے کے ہیں اور کٹے ہوئے گوشت کو قَدِيْدٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْقِدَدُ اس کا واحد قِدَّةٌ ہے اور اس کے معنی مختلف طرق اور مذاہب کے ہیں جیسے فرمایا:﴿كُنَّـا طَرَائِقَ قِدَدًا﴾ (۷۲۔۱۱) ہمارے کئی طرح کے مذاہب ہیں۔

اور قَـدَّةٌ کے معنی لوگوں کی بولی اور گروہ کے بھی آتے ہیں جیسے قِطْعَةٌ اِقْتَدَّ الْاَمْرَ: کسی کام کی تدبیر کرنا جیسا کہ: فَصَلَ وَحَزَمَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے۔

(قد)

یہ حرف تحقیق ہے اور فعل کے ساتھ مخصوص ہے علماءِ نحو کے نزدیک یہ حرف توقع ہے اور اصل میں جب یہ فعل ماضی پر آئے تو تجدد اور حدوث کے معنی دیتا ہے جیسے فرمایا:

﴿قَـدْ مَـنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ (۱۲۔۹۰) خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ﴾ (۳۔۱۳) تمہارے لیے دو گروہوں میں...... (قدرت خدا کی عظیم الشان) نشانی تھی۔

﴿قَـدْ سَـمِعَ اللّٰـهُ﴾ (۵۸۔۱) خدا نے...... سن لی۔

﴿لَـقَـدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۸۔۱۸) (اے پیغمبر)...... تو خدا ان سے خوش ہوا۔

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ﴾ (۹۔۱۱۷) بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی۔

اور چونکہ یہ فعل ماضی پر تجدد کے لیے آتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے اوصاف ذاتیہ کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔لہٰذا قَدْ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔" کہنا صحیح نہیں ہے اور آیت:

﴿قَـدْ عَـلِـمَ اَنْ سَيَـكُـوْنُ مِـنْكُمْ مَّـرْضٰـى﴾ (۷۳۔۲۰) اس نے جانا کہ تم میں بعض بیمار بھی ہوتے ہیں۔

میں قَـدْ لَفْظًا اگرچہ علم پر داخل ہوا ہے لیکن معنوی طور پر اس کا تعلق مرض کے ساتھ ہے جیسا کہ "مَـا عَـلِـمَ اللّٰهُ زَيْـدًا يَخْرُجُ" میں نفی کا تعلق خروج کے ساتھ ہے۔اور اس کی تقدیر یوں ہے: قَـدْ يَـمْـرَضُـوْنَ فِيْـمَا عَلِمَ الـلّٰـهُ" وَمَا يَخْرُجُ زَيْدٌ فِيْمَا عَلِمَ اللّٰهُ اگر "قَدْ" فعل مستقبل پر داخل ہو تو تقلیل کا فائدہ دیتا ہے یعنی کبھی وہ فعل واقع ہوتا ہے اور کبھی واقع نہیں ہوتا اور آیت کریمہ:

﴿قَـدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ (۲۴۔۶۳) خدا کو یہ لوگ معلوم ہیں جو تم میں سے آنکھ بچا

کر چل دیتے ہیں۔
کی تقدیر یوں ہے قَدْ یَتَسَلَّلُوْنَ اَحْیَانًا فِیْمَا عَلِمَ اللّٰهُ ...... تو یہ آیت بھی ماسبق کی طرح مؤول ہوگی اور قد کا تعلق تسلل کے ساتھ ہوگا۔
قَدْ وَقَطْ یہ دونوں اسم فعل بمعنی حَسْبُ کے آتے ہیں جیسے محاورہ ہے: قَدْنِیْ کَذَا وَقَطْنِیْ کَذَا اور قَدِیْ (بدون نون وقایہ) کا محاورہ بھی حکایت کیا گیا ہے فراء نے قَدْنِیْ اور قَدْكَ پر قیاس کر کے قَدْ زَیْدًا بھی حکایت کیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ قَدْ (اسم فعل) اسم ظاہر کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا بلکہ صرف اسم مضمر کے ساتھ آتا ہے۔

(ق د ر)

اَلْقُدْرَةُ: (قدرت) اگر یہ انسان کی صفت ہو تو اس سے مراد وہ قوت ہوتی ہے جس سے انسان کوئی کام کر سکتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ عاجز نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی معنوی طور پر قدرت کاملہ کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتی اگر چہ لفظی طور پر ان کی طرف نسبت ہو سکتی ہے اس لیے انسان کو مطلقا هُوَ قَادِرٌ کہنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ تقیید کے ساتھ هُوَ قَادِرٌ عَلٰی کَذَا کہا جائے گا لہٰذا اللہ کے سوا ہر چیز قدرت اور عجز دونوں کے ساتھ متصف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے جو ہر لحاظ سے عجز سے پاک ہے۔
اَلْقَدِیْرُ: اسے کہتے ہیں جو اقتضائے حکمت کے مطابق جو چاہے کر سکے اور اس میں کمی بیشی نہ ہونے دے۔ لہٰذا اللہ کے سوا کسی کو قدیر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ﴾ (۴۲۔۲۹) اور وہ جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر...... قادر ہے۔
اور یہی معنی تقریبا مُقْتَدِر کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۵۴۔۵۵) ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔
﴿فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ﴾ (۴۳۔۴۲) ہم ان پر قابو رکھتے ہیں۔
لیکن مقتدر کے ساتھ کبھی انسان بھی متصف ہو جاتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق مقتدر کا لفظ استعمال ہو تو یہ قدیر کے ہم معنی ہوتا ہے اور جب انسان کا وصف واقع ہو تو اس کے معنی تکلیف سے قدرت حاصل کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے۔
قَدَرْتُ عَلٰی کَذَا قُدْرَةً کہ میں نے فلاں چیز پر قدرت حاصل کر لی۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا﴾ (۲۔۲۶۴) (اسی طرح) یہ (ریا کار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ نہیں لے سکیں گے۔
اَلْقَدْرُ وَالتَّقْدِیْرُ کے معنی کسی چیز کی کیت کو بیان کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔ قَدَرْتُهٗ وَقَدَّرْتُهٗ اور قَدَّرَهٗ (تفعیل) کے معنی کسی کو قدرت عطا کرنا بھی آتے ہیں محاورہ ہے۔
قَدَّرَنِیَ اللّٰهُ عَلٰی کَذَا وَقَوَّانِیْ عَلَیْهِ: اللہ نے مجھے اس پر قدرت عطا فرمائی پس "تقدیر الٰہی" کی دو صورتیں ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو قدرت بخشنا (۲) یا اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو مقدار مخصوص اور طرز مخصوص پر بنانا جیسا کہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے اس لیے کہ فعل الٰہی دو قسم پر ہے اول

ایجاد بالفعل یعنی ابتداء ہی سے کسی چیز کو ایسا کامل وجود عطا کرنا کہ جب تک مشیت الٰہی اس کے فنا یا تبدیل کی مقتضی نہ ہو اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے جیسے اجرام سماویہ اور وما فیہا کی تخلیق (کہ ان میں تا قیامت کسی قسم کا تغیر نہیں ہوگا) دوم یہ کہ اصول اشیاء کو بالفعل اور ان کے اجزاء کو بالقوۃ وجود عطا فرمانا اور ان کو اس اندازہ کے ساتھ مقدر کرنا کہ اس کی خلاف ظہور پذیر نہ ہو سکیں جیسا کہ خرما کی گٹھلی کے متعلق تقدیر الٰہی یہ ہے کہ اس سے خرما کا درخت ہی اگتا ہے اور سیب یا زیتون کا درخت نہیں اگ سکتا اسی طرح انسان کی منی سے انسان ہی پیدا ہوتا ہے دوسرے جانور پیدا نہیں ہو سکتے۔ پس تقدیر الٰہی کے دو معنی ہوئے ایک یہ کہ کسی چیز کے متعلق نفی یا اثبات کا حکم لگانا کہ یوں ہوگا اور یوں نہیں ہوگا۔ عام اس سے کہ وہ حکم بر سبیل وجوب ہو یا بر سبیل امکان چنانچہ آیت:

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا﴾ (۶۵۔۳) خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

میں یہی معنی مراد ہیں دوم، کسی چیز پر قدرت عطا کرنے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ﴾ (۷۷۔۲۳) پھر اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی خوب اندازہ مقرر کرنے والے ہیں۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اللہ کا ہر حکم قابل ستائش ہے۔

اور یہ آیت:

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا﴾ (۶۵۔۳) خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

کے ہم معنی ہے اور اس میں ایک قرأت فَقَدَّرْنَا (تشدید دال) کے ساتھ بھی ہے اور اس کے معنی یا تو حکم کرنے کے ہیں اور یا اعطاء قدرت کے اور آیت کریمہ:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَكُمُ الْمَوْتَ ہم نے تم میں مرنا ٹھہرا دیا۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ موت مقدر کرنے والا چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لیے یہ بھی عین حکمت کے مطابق ہے اور مجوس کا یہ زعم غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور ابلیس مارتا ہے۔اور آیت کریمہ ﴿إِنَّآ أَنْزَلْنَاهُ فِی لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ہم نے اس (قرآن پاک) کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔

میں لَیْلَةُ الْقَدْرِ سے خاص رات مراد ہے جسے امور مخصوصہ کی انجام دہی کے لیے اللہ نے مقرر کر رکھا ہے۔

نیز فرمایا۔

﴿إِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (۵۴۔۴۹) ہم نے ہر چیز اندازۂ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ أَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ (۷۳۔۲۰) اور خدا تو رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔

میں سلسلہ لیل ونہار کے اجزاء کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ ان کے اوقات کی معرفت حاصل کرنا اور پھر اوقات معینہ میں حق عبادات ادا کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے اور آیت کریمہ:

﴿مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ﴾ (۸۰۔۱۹) نطفے سے بنایا پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔

میں ان قوی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نطفہ میں

بالقوۃ ودیعت کر رکھے ہیں اور وہ وَقْتًا فَوَقْتًا صورت کا لباس پہن کر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔اور آیت کریمہ۔
﴿وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا﴾ (۳۳۔۳۸) اور خدا کا حکم ٹھہر چکا ہے۔
میں قدر کے لفظ سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جن کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ لوح محفوظ میں لکھے جا چکے ہیں جن کی طرف کہ آنحضرت ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ❶ (۷۸)
((فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْخَلْقِ وَالْاَجَلِ وَالرِّزْقِ)) کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خلق، عمر اور رزق سے فارغ ہو چکا ہے اور مقدور کے لفظ سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جو وقتًا فوقتًا ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔جن کی طرف کہ آیت:
﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ (۵۵۔۲۹) وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔میں اشارہ فرمایا ہے اسی معنی میں فرمایا۔
﴿وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۱۵۔۲۱) اور ہم ان کو بمقدار مناسب اتارتے رہتے ہیں۔
ابوالحسن نے کہا ہے کہ یہ قَدَرٌ وَ قَدْرٌ (بفتح الدال و سکونہا) دونوں طرح بولا جاتا ہے چنانچہ محاورہ خُذْ بِقَدَرِ كَذَا وَقَدْرِ كَذَا (کہ اتنی مقدار میں لے لو) فُلَانٌ يُخَاصِمُ بِقَدَرٍ وَقَدْرٍ اور آیت کریمہ: ﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾ (۲۔۲۳۶) (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق میں قدر کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنی مقدور کے مطابق اخراجات ادا کرے۔اور آیت کریمہ ﴿وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ (۸۷۔۳) اور جس نے (اس کا) اندازہ ٹھہرا دیا (پھر اس کو) رستہ بتایا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وہ کچھ عطا فرما دیا جس میں اس کی مصلحت ہے اور اسے تعلیمی یا تسخیری طور پر ان چیزوں کی طرف ہدایت کر دی ہے جن میں اس کی نجات مضمر ہے جیسے فرمایا ﴿الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (۲۰۔۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی پھر راہ دکھائی۔
جب ''تقدیر'' کا فاعل انسان ہو تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تقدیر محمود یعنی عقل وفکر کے مطابق کسی امر پر غور و فکر کرنا اور پھر اس فارمولا کے مطابق کسی کام کو سرانجام دینا۔دوم تقدیر مذموم کہ انسان اپنی تمنا اور خواہش کے پیمانہ کے مطابق کسی امر پر غور وفکر کرے اور عقل وفکر سے کام نہ لے جیسے فرمایا:
﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ﴾ (۷۴۔۱۸۔۱۹) اس نے فکر کیا اور تجویز کی یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی۔
اور استعارہ کے طور پر قدرۃ اور مقدور کے معنی حالت اور وسعت مالی کے بھی آتے ہیں اور قدر کے معنی اس معین وقت یا مقام کے بھی ہوتے ہیں جو کسی کام کے لیے مقرر ہو چکا ہو چنانچہ فرمایا
﴿اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۷۷۔۲۲) ایک معین وقت تک۔نیز فرمایا:

---

❶ وفي رواية ابن عساكر عن انس مرفوعاً فرغ الله عن اربع من الخلق الخ وفي رواية الطبراني عن ابي الدرداء ((من خمس من اجله ورزقه و اثره مضجعه وشقي اور سعيد)) (راجع كنز العمال رقم ٤٩٤۔٤٩٦) والفتح الكبير للنبهاني (٢/٢٦٦)

﴿فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے۔یعنی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلتے ہیں ایک قرأت میں بِقَدْرِهَا ہے جو بمعنی تقدیر یعنی اندازہ...... کے ہے اور آیت کریمہ۔

﴿وَغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قَادِرِيْنَ﴾ (اور کوشش کے ساتھ) سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔ میں قادرین کے معنی قاصدین کے ہیں یعنی جو وقت انہوں نے مقرر کر رکھا تھا۔ اندازہ کرتے ہوئے اس وقت پر وہاں جا پہنچے اور یہی معنی آیت کریمہ:

﴿فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلٰى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ﴾ (۵۴۔۱۲) تو پانی ایک کام کے لیے جو مقدر ہو چکا تھا جمع ہو گیا۔

میں مراد ہیں۔اور قَدَرْتُ عَلَيْهِ الشَّيْءَ کے معنی کسی پر تنگی کر دینے کے ہیں گویا وہ چیز اسے معین مقدار کے ساتھ دی گئی ہے اس کے بالمقابل بغیر حساب (یعنی بے اندازہ) آتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔﴿وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ﴾ (۶۵۔۷) اور جس کے رزق میں تنگی ہو۔

یعنی جس پر اس کی روزی تنگ کر دی گئی ہو۔نیز فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ﴾ (۱۳۔۲۶) خدا جس پر چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

﴿فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ (۲۱۔۸۷) اور خیال کیا کہ ہم ان پر تنگی نہیں کریں گے۔

اور ایک قرأت میں لن نقدر علیہ ہے اور اسی سے لفظ اقدر مشتق ہے جس کے معنی کوتاہ گردن آدمی کے ہیں اور اقدر اس گھوڑے کو بھی کہتے ہیں جس کے دوڑتے وقت پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اگلے پاؤں پڑے تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (۳۹۔۶۷) ان لوگوں نے اللہ کی قدر شناسی جیسے کرنا چاہیے تھی نہیں کی۔

یعنی یہ لوگ اس کی حقیقت کو نہیں پا سکے اور پھر اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ وہ اس کی کنہہ کا ادراک بھی کیسے کر سکتے ہیں جب کہ اس کی شان یہ ہے کہ ﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (۳۹۔۶۷) اور قیامت کے دم تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِى السَّرْدِ﴾ (۳۴۔۱۱) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور کڑیوں کو اندازے سے جوڑ دو۔

میں قَدِّرْ فِى السَّرْدِ کے معنی یہ ہیں کہ مضبوط اور محکم زرہیں بناؤ۔

اور مِقْدَارُ الشَّيْءِ، اس وقت یا زمانہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (۷۰۔۴) اور اس روز (نازل ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔اور آیت کریمہ:

﴿لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (۵۷۔۲۶) (یہ باتیں) اس لیے (بیان کی گئی ہیں) کہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ خدا کے فضل پر کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے۔

پر بحث تاویل کے ساتھ مختص ہے (یعنی اس میں تاویل

سے چارہ نہیں ہے)

اَلْــقِـدْرُ: (دیگ) برتن جس میں گوشت پکایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ﴾ (۳۴۔۱۳) اور دیگیں جو ایک ہی جگہ رکھی ہیں۔

اور قَـدَرْتُ الـلَّحْمَ کے معنی ہنڈیا میں گوشت پکانے کے ہیں اور ہنڈیا میں پکائے ہوئے گوشت کو قَدِیْرٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْـقُـدَارُ: (قصاب) وہ شخص جو اونٹ کو نحر (ذبح) کر کے دیگ میں اس کا گوشت پکاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۳۵۱) ضَرْبَ الْقُدَارِ نَقِیْعَةَ الْقُدَّامِ

جیسا کہ قصاب سفر سے آنے والے کی خوشی میں دعوت کے لیے گوشت کاٹتا ہے۔

(ق د س)

اَلتَّـقْدِیْـسُ کے معنی اس تطہیر الٰہی کے ہیں جو کہ آیت وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (۳۳۔۳۳) اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔

میں مذکور ہے۔ کہ اس کے معنی تطہیر بمعنی ازالۂ نجاست محسوسہ کے نہیں اور آیت کریمہ ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ﴾ (۲۔۳۰) اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے حکم کی بجا آوری میں اشیاء کو پاک وصاف کرتے ہیں اور بعض نے اس کے معنی۔ نَصِفُكَ بِالتَّقْدِیْسِ بھی لکھے ہیں۔ یعنی ہم تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ﴾ (۱۶۔۱۰۲) کہہ دو کہ اس کو روح القدس...... لے کر نازل ہوئے ہیں، میں روح القدس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قدس یعنی قرآن پاک حکمت اور فیض الٰہی لے کر نازل ہوتے تھے جس سے نفوس انسانی کی تطہیر ہوتی ہے۔ اور البیت المقدس کو بیت مقدس اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نجاست شرک سے پاک صاف ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ:

﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (۵۔۲۱) تو بھائیو! تم ارض مقدس (یعنی ملک شام) میں جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے۔ داخل ہو۔

میں ارض مقدسہ کے معنی پاک سرزمین کے ہیں۔ اور حَظِیْرَةُ الْقُدْسِ سے بعض کے نزدیک جنت اور بعض کے نزدیک شریعت مراد ہے اور یہ دونوں قول صحیح ہیں۔ کیونکہ شریعت بھی ایک ایسا حظیرہ یعنی احاطہ ہے جس میں داخل ہونے والا پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

---

[1] قاله مهلهل بن ربيعه واوله: وانا لنضرب بالصوارم ها مهاونی رواية بالسيوف رؤسهم بدل بالصوارم هامها راجع للبيت الامالی للمرتضیٰ (۱: ۲۸:۲/۳۵۶) وتهذيب الالفاظ (۲۶۵) والبخلاء (۲۱۵) والفاخر (۹۸) والمخصص (۴: ۱۲۰) واللسان (قدر، نقع، قدم) والاشتقاق (۳۲۳) والمقاليس (۵: ۶۶، ۴۷۲) والمرز وقی (۲۵)۔ اونظام الغريب (۲۴۲) والمعافی للقتبی (۳۷۷) و البيت ثالث ثلاثة فی ديوانه (۷۰۔۷۱) وراجع لمعناه المرزوقی والاشتقاق و كتاب النوادر لابی مسهل (۱: ۳۷۔۳۹) والشاعر اسمه امرؤ القيس اوعدی بن ربيعه جاهلی ترجمة فی الشعراء (۲۵۶۔۲۵۹) والمرز بانی (۲۴۸) (۱۱) والآمدی اوالاغانی (۴: ۱۴۰۔ ۱۵۱) واللالی (۲۶۔۲۷۔۱۱۱۔۱۱۲) والعينی (۴: ۲۱۱۔۲۱۲) و شواهد المغنی (۲۲۵)

(ق د م)

اَلْقَدَمُ: انسان کا پاؤں۔جمع اَقْدَامٌ۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ﴾ (۸۔۱۱) اس سے تمہارے پاؤں جمائے رکھے۔
اسی سے تقدم کا لفظ لیا گیا ہے جو کہ تاخر کی ضد ہے اور تقدم چار قسم پر ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ [1] اور قدیم، حدیث کی ضد ہے اور اس کے معنی پرانی چیز کے ہیں (یہ تقدم زمانی سے ہے) اور کبھی تقدم بلحاظ مرتبہ کے ہوتا ہے جیسے فُلَانٌ مُتَقَدِّمٌ عَلٰی فُلَانٍ۔ یعنی فلاں اس سے اشرف ہے۔ اور کبھی متقدم اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر دوسری چیز کا وجود موقوف ہو جیسے اَلْوَاحِدُ مُتَقَدِّمٌ عَلَی الْعَدَدِ کہ واحد عدد پر متقدم ہے کیونکہ واحد کے بغیر عدد کا وجود ناممکن ہے۔ اَلْقِدَمُ کے معنی کسی چیز کے زمانہ ماضی میں موجود ہونے کے ہیں۔ اس کے بالمقابل بقاء ہے جس کے معنی زمانہ مستقبل میں موجود رہنے کے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی وصف میں یاقَدِیْمَ الْاِحْسَانِ تو آیا ہے۔ لیکن کہیں بھی قرآن پاک اور آثار صحیحہ سے قَدِیْم کے لفظ کا اسمائے حسنیٰ سے ہونا ثابت نہیں ہے البتہ علمائے متکلمین اسے بطور صفت الٰہی کے استعمال کرتے ہیں عموماً اَلْقَدِیْم کا لفظ قدم باعتبار زمانہ یعنی پرانی چیز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیمِ﴾ (۳۶۔۳۹) کھجور کی پرانی شاخ کی طرح۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۱۰۔۲) ان کے پروردگار کے ہاں) ان کا سچا درجہ ہے۔
میں قَدَمَ صِدْقٍ سے سابقہ فضیلت مراد ہے اور یہ اسم مصدر ہے اور قَدَّمْتُ کَذَا کے معنی پہلے سے کوئی کام کر چکنے یا بھیجنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقٰتٍ﴾ (۵۸۔۱۳) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو، ڈر گئے ہو۔
﴿لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ (۵۔۸۰) انہوں نے جو کچھ اپنے واسطے آگے بھیجا، ہے برا ہے ﴿بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ﴾ (۲۔۹۵) جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔
اور قَدَّمْتُ فُلَانًا اَقْدُمُهٗ کے معنی کسی کے آگے آگے جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۱۱۔۹۸) وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا۔
اور آیت کریمہ:
﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (۴۹۔۱) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لَا تُقَدِّمُوْا بمعنی لَا تَتَقَدَّمُوْا کے ہیں اور اس کے اصل معنی یہ ہیں۔ کہ قول و حکم میں پیغمبر سے سبقت نہ کرو بلکہ وہی کام کرو جس کا تمہیں حکم دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کے مکرم بندوں یعنی فرشتوں کا کردار بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ﴾ (۲۱۔۲۷) اس کے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے۔

[1] راجع (اخ ر)

اور آیت کریمہ:

﴿لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ (۱۶۔۶۱) ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ تقدم وتاخر کا ارادہ بھی نہیں کر سکتے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَ نَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَھُمْ﴾ (۳۶۔۱۲) جو کچھ وہ آگے بھیج چکے ہیں اور جو ان کے پیچھے نشان (رہ گئے) ہیں ہم ان کو قلم بند کر لیتے ہیں۔

میں مَا قَدَّمُوْا سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ پہلے کر چکے ہیں۔

قَدَّمْتُ اِلَیْهِ بِکَذَا: پہلے سے کسی چیز کے متعلق کہہ رکھنا اور قَدَّمْتُ بِہٖ: وقت حاجت سے پہلے کسی کام کے متعلق آگاہ کرنا۔ اور اسی سے آیت کریمہ: ﴿قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ﴾ (۵۰۔۲۸) ہم تمہارے پاس پہلے ہی عذاب کی وعید بھیج چکے تھے۔

ہے اور قُدَّامٌ خَلْفٌ کی ضد ہے اس کی تصغیر قُدَیْمَۃٌ آتی ہے۔

رَکِبَ فُلَانٌ مَقَادِیْمَہٗ: وہ سیدھا چلا گیا۔ یعنی ادھر ادھر مڑ کر نہیں دیکھا۔

قَادِمَۃُ الرَّحْلِ: کجاوہ کا اگلا حصہ قَادِمَۃُ الْاِطْبَاعِ: (جانور کا اگلا پستان یا پستان کا سرا) قَادِمَۃُ الْجَنَاحِ: پرندے کے بازو کا اگلا حصہ۔ مُقَدَّمَۃُ الْجَیْشِ: لشکر کا اگلا حصہ (ہراول دستہ)۔

اَلْقَدُوْمُ: دیر سے آگے بڑھنے والا آدمی، تیشہ۔ ان تمام الفاظ میں معنی تقدم معتبر ہے۔

(ق ذ ف)

اَلْقَذْفُ: (ض) کے معنی دور پھینکنا کے ہیں پھر معنی بُعد کے اعتبار سے دور دراز منزل کو منزل قذف و قذیف کہا جاتا ہے اسی طرح دور دراز شہر کو بَلْدَۃٌ قَذِیْفَۃ بول لیتے ہیں...... اور آیت کریمہ:

﴿فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ﴾ (۲۰۔۳۹) پھر اس (صندوق) کو دریا میں ڈال دو۔

کے معنی دریا میں پھینک دینے کے ہیں۔ نیز فرمایا ﴿وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (۳۳۔۲۶) اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ﴾ (۲۱۔۱۸) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں۔

﴿یَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ﴾ (۳۴۔۴۸) وہ اوپر سے حق اتارتا ہے اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

﴿وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ﴾ (۳۷۔۸) اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں (یعنی) وہاں سے نکال دینے کو۔

اور رَمْیٌ کی طرح قَذْفٌ کا لفظ بھی بطور استعارہ گالی دینے اور عیب لگانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ [1]

(ق ر ر)

قَرَّ فِیْ مَکَانِہٖ یَقِرُّ قَرَارًا: (ض) کے معنی کسی جگہ ٹھہر جانے کے ہیں اصل میں یہ قر سے ہے جس کے معنی سردی کے ہیں جو کہ سکون کو چاہتی ہے جیسا کہ اس

---

[1] فقذف المحصنات معناه رمیهن بالزنا الا ان فی القرآن یرمون (۲۴۔۴)

کے برعکس حَـرٌّ (گرمی) حرکت کو چاہتی ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَقَــرْنَ فِـىْ بُيُـوْتِكُنَّ﴾ (۳۳-۳۳)اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔

میں ایک قـرأت وَقِرْنَ فِي بُيُوْتِكُنَّ ہے۔بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں اقررن ہے ایک راء کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت: فَـظَـلْتُـم تَفَكَّهُوْنَ میں ظَلْتُمْ اصل میں ظَلَلْتُمْ ہے (اور ایک لام کو تخفیفا حذف کر دیا گیا ہے)

اَلْـقَـرَارُ (اسم) (ٹھہرنے کی جگہ) قرآن میں ہے۔

﴿جَـعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ (۴۰-۶۴)(جس نے) زمین کو قرار گاہ بنایا۔

اور جنت کے متعلق فرمایا:

﴿ذَاتِ قَـرَارٍ وَّمَعِيْنٍ﴾ (۲۳-۵۰) جو رہنے کے لائق اور جہاں نتھرا ہوا پانی جاری تھا (پناہ دی) اور جہنم کے متعلق فرمایا:

﴿وَبِـئْسَ الْقَرَارُ﴾ (۱۴-۲۹) اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اجْتُثَّـتْ مِـنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ﴾ (۱۴-۲۶) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس کو ذرا بھی قرار نہیں۔ میں......قرار کے معنی ثبات کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۳۵۲) وَلَا قَرَارَ عَلٰى زَاْرٍ مِنَ الْاَسَدِ

یعنی شیر کے دھاڑنے پر امن (چین) حاصل نہیں ہوسکتا۔

اور يَـوْمَ النَّحْرِ سے بعد کے دن کو يَـوْمَ الْقِرِّ کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ اس روز منیٰ میں ٹھہرے رہتے ہیں۔

اِسْتَـقَرَّ فُـلَانٌ قرار پکڑنے کا قصد کرنا۔اور کبھی یہ بمعنی قَـرَّ (قرار پکڑنا) بھی آجاتا ہے جیسے استجاب بمعنی اجاب چنانچہ جنت کے متعلق فرمایا: ﴿خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَـــقِيْلًا﴾ (۲۵-۲۴) ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا اور جہنم کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّهَـا سَـآءَتْ مُسْتَقَرًّا﴾ (۲۵-۶۶) اور دوزخ، ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَـمُسْتَـقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ﴾ (۶-۹۸) تمہارے لیے ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی ہیں، ابن مسعودؓ کے نزدیک مستقر سے مراد زمین میں ٹھہرنا ہے اور مستودع سے مراد قبریں ہیں۔ابن عباسؓ کا قول ہے کہ مستقر سے مراد تو زمین ہی ہے لیکن مستودع سے مراد دنیا ہے۔الحاصل ہر وہ حالت جس سے انسان منتقل ہو جائے وہ مستقر تام نہیں ہوسکتا۔

اَلْاِقْــرَارُ: (افعال) کے معنی کسی چیز کو ٹھہرا دینے کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنُقِـرُّ فِـى الْاَرْحَـامِ مَـا نَشَـآءُ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (۲۲-۵) اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک میعاد مقرر تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔

اور کبھی اس کے معنی ثابت کرنا بھی آجاتے اور اقرار کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے اور کبھی ان دونوں

[1] قاله النابغة في اليته وصدره فبئت ان ابا قابوس اوعدني...... والبيت في ديوانه واللسان (قيس) وخاص الخاص ثعالبي ٧٦ والعشر للتبريزي (٣٠٢) والسيوطي (٢٨، ٧٨٥)

سے ۔ توحید اور دیگر ایمانیات کے بارے میں صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے ساتھ دل سے بھی اقرار نہ کرے ۔ اقرار کی ضد انکار آتی ہے اور جحود صرف زبان سے انکار کر دینے پر بولا جاتا ہے خواہ دل سے اسے تسلیم ہی کیوں نہ کرتا ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے [1] ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ (۲۔۸۴) پھر تم نے اقرار کر لیا اور تم اس بات کے گواہ ہو۔

﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا﴾ (۳۔۸۱) پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے۔ تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی (اور عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اقرار پر میرا ذمہ لیا۔ انہوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا۔

قَرَّتْ لَيْلَتُنَا تَقِرُّ: رات کا ٹھنڈا ہونا۔

يَوْمٌ قَرٌّ: (ٹھنڈا دن) لَيْلَةٌ قِرَّةٌ: (ٹھنڈی رات) قُرَّ فُلَانٌ فلاں کو سردی لگ گئی اور مَقْرُوْرٌ کے معنی ٹھنڈ زدہ آدمی کے ہیں ۔ مثل مشہور ہے۔ [2] حِرَّةٌ تَحْتَ قِرَّةٍ یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو اپنے ضمیر کے خلاف بات کرے۔

قَرَرْتُ الْقِدْرَ اَقُرُّهَا: میں نے ہنڈیا میں ٹھنڈا پانی ڈالا ۔ اور اس پانی کو قَرَارَة یا قِرِرہ کہا جاتا ہے۔ اِقْتَرَّ فُلَانٌ اِقْتِرَارًا: یہ تَبَرَّدَ کی طرح ہے۔ جس کے معنی ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے ہیں۔ قُرَّتْ عَيْنُهٗ تَقَرُّ: آنکھ کا ٹھنڈا ہونا۔ مراد خوشی حاصل ہونا ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا﴾ (۲۰۔۴۰) تا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

اور جسے دیکھ کر انسان کو خوشی حاصل ہو اسے قُرَّةُ عَيْنٍ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ﴾ (۲۸۔۹) یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ﴾ (۲۵۔۷۴) اے ہمارے پروردگار! ہمیں بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں قُرٌّ بمعنی سردی سے ہے لہٰذا قَرَّتْ عَيْنُهٗ کے معنی آنکھ کے ٹھنڈا ہو کر خوش ہو جانے کے ہیں بعض نے کہا ہے۔ کہ قَرَّتْ عَيْنُهٗ کے معنی خوش ہونا اس لیے آتے ہیں کہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو چونکہ گرم ہوتے ہیں اس لیے بددعا کے وقت اَسْخَنَ اللّٰهُ عَيْنَهٗ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قرار سے مشتق ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز بخشے جس سے اس کی آنکھ کو سکون حاصل ہو یعنی اسے دوسری چیز کی حرص نہ رہے۔

اَقَرَّ بِالْحَقِّ: حق کا اعتراف کرنا۔ تَقَرَّ الْاَمْرُ عَلٰی كَذَا: کسی امر کا حاصل ہو جانا۔

---

[1] راجع (ج ح د)

[2] اللسان (حر، قر) قال وإنما كسر والحرة مكان القرة والمثل ايضا في الحيوان (۱۰۶/۵) والميدانی ۱۲

اَلْقَارُوْرَۃُ: شیشہ جمع قَوَارِیْرُ...... قرآن پاک میں ہے:
﴿قَوَارِیْرَ مِنْ فِضَّۃٍ﴾ (۷۶۔۱۶) اور شیشے بھی چاندی کے۔ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِنْ قَوَارِیْرَ: یہ ایسا محل ہے جس میں (نیچے بھی) شیشے جڑے ہوئے ہیں (۲۷۔۴۴) یعنی شیشے کا بنا ہوا ہے۔

(ق ر ء)

قَرَءَتِ الْمَرْءَۃُ وَقَرَءَتِ الدَّمَ وَاَقْرَءَتْ:
عورت کو حیض آنا اور قَرَءْتُ الْجَارِیَۃَ: استبراء رحم کرنا۔ القرء کے اصل معنی طہر سے حیض میں داخل ہونے کے ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ طہر اور حیض دونوں کا جامع ہے اس لیے دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو اسم دو چیزوں کے لیے بحیثیت مجموعی وضع کیا گیا ہو وہ ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جا سکتا ہے [1] مثلاً لفظ مَائِدَۃ کہ دستر خوان اور کھانا دونوں کے مجموعہ کے لیے وضع کیا گیا ہے مگر ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے لہٰذا قَرْءٌ نہ صرف حیض کا نام ہے اور نہ صرف طہر کا (بلکہ دونوں کے لیے وضع کیا گیا ہے) اس کی دلیل یہ ہے کہ جس عورت کو حیض نہ آتا ہو اسے ذَاتُ قَرْءٍ نہیں کہا جاتا اور ایسے ہی حائض، جسے متواتر خون آ رہا ہو اور نُفَسَاءُ (صاحب نفاس) کو بھی ذَاتُ قُرْءٍ نہیں کہتے اور آیت کریمہ:
﴿یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ﴾ (۲۔۲۲۸)
تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں۔
میں ثَلَاثَۃَ قُرُوْءٍ کے معنی تین مرتبہ طہر سے حالت حیض کی طرف منتقل ہونے کے ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا [2] (۸۱)
((اُقْعُدِیْ عَنِ الصَّلٰوۃِ اَیَّامَ اَقْرَائِكِ)) کہ حیض کے دنوں میں نماز ترک کر دے۔
یہ محاورہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کہا جائے: اِفْعَلْ كَذَا اَيَّامَ وُرُوْدِ فُلَانٍ کہ فلاں آدمی کی آمد کے دنوں یہ اور یہ کام کرو تو یہاں بھی ایام کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ ورود تو ایک ساعت میں ہو جاتا ہے۔ بعض اہل لغت کا قول ہے کہ قرء کا لفظ قرء سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ تو انہوں نے زمانہ طہر اور زمانہ حیض کو جمع کرنے کے معنی کا اعتبار کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کیونکہ زمانہ طہر میں خون رحم میں جمع ہوتا رہتا ہے۔
اَلْقِرَاءَۃُ کے معنی حرف وکلمات کو ترتیل میں جمع کرنے کے ہیں کیونکہ ایک حروف کے بولنے کو قرأت نہیں کہا جاتا اور نہ یہ عام ہر چیز کے جمع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ لہٰذا اَجْمَعْتُ الْقَوْمَ کی بجائے قَرَءْتُ الْقَوْمَ کہنا صحیح نہیں ہے۔ اَلْقُرْاٰنُ: یہ اصل میں کفران ورجحان کی طرح مصدر ہے چنانچہ فرمایا:
﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ (۷۵۔۱۷۔۱۸) اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم (اس کو سنا کرو اور پھر اسی طرح پڑھا کرو۔
حضرت ابن عباسؓ نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ جب ہم

---

[1] وعلی هذا الاطلاق کلاهما مجاز اوقد عده العلماء من الاضداد (اضداد ابی الطیب (۵۷۱۔۵۷۶)
[2] قاله صلی الله علیه وسلم لام حبیبة بنت جحش او فاطمة بنت ابی حبیس وکلا الحدیثین باختلاف الفاظهما اخرجهما اصحاب السنن (راجع العون (۱۱۔۱۲۲) اوالزرقانی علی الموطا (۲۱۔۲۴) انظر للبحث عن لفظ القرآن مجازا ابی عبیدة من ۱۔۳ وعلیه سلك البخاری فی صحیحه فتح الباری (۸: ۳۴۰۔ ۳۳۹)

قرآن تیرے سینہ میں جمع کر دیں تو اس پر عمل کرو لیکن عرف میں یہ اس کتاب الٰہی کا نام ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل کی گئی اور یہ اس کتاب کے لیے بمنزلہ علم بن چکا ہے جیسا کہ توراۃ اس کتاب الٰہی کو کہا جاتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور انجیل اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو حضرت عیسیٰ پر نازل کی گئی بعض علماء نے قرآن پاک کی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی ہے کہ قرآن پاک چونکہ تمام کتب سماویہ کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہے بلکہ تمام علوم کے ماحصل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس لیے اس کا نام قرآن پاک رکھا گیا ہے جیسا کہ آیت:

﴿وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (۱۲۔۱۱۱) اور ہر چیز کی تفصیل کرنے والا۔اور آیت کریمہ:

﴿تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ (۱۶۔۸۹) کہ اس میں ہر چیز کا بیان مفصل ہے۔

میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔نیز فرمایا: ﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ﴾ (۳۹۔۲۸) یہ قرآن پاک عربی ہے جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں۔ ﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ﴾ (۱۷۔۱۰۶) اور ہم نے قرآن پاک کو جزو و جزو کر کے نازل کیا تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ۔

﴿فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ (۱۷۔۴۱) اس قرآن پاک میں......اور آیت کریمہ:

﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ (۱۷۔۷۸) اور صبح کو قرآن پاک پڑھا کرو میں قرآن پاک کے معنی تلاوت قرآن کے ہیں۔

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ (۵۶۔۷۷) یہ بڑے رتبے کا قرآن پاک ہے۔

اَقْرَءْتُ فُلَانًا كَذَا کے معنی کسی کو کچھ پڑھانے کے ہیں۔چنانچہ فرمایا۔

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى﴾ (۸۷۔۶) (ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ فراموش نہ کرو گے۔

اور تَقَرَّءْتُ بمعنی تَفَهَّمْتُ ہے۔(یعنی میں نے اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا)

قَارَأْتُهٗ: (مفاعلة) باہم مذاکرہ کرنا یا کتاب کا سبق دہرانا۔

(ق ر ب)

اَلْقُرْبُ وَالْبُعْدُ: یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔محاورہ ہے۔قَرُبْتُ مِنْهُ اَقْرُبُ وَقَرَبْتُهٗ اَقْرَبُهٗ قُرْبًا وَقُرْبَانًا: کسی کے قریب جانا اور مکان، زمان، نسبی تعلق، مرتبہ حفاظت اور قدرت سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرب مکانی کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۲۔۳۵) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ﴾ (۶۔۱۵۳) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى﴾ (۱۷۔۳۲) اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔

﴿فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ (۹۔۲۸) تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ ......﴾ (۲۔۲۲۲) ان سے

مقاربت نہ کرو۔میں جماع سے کنایہ ہے۔

﴿فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ﴾ (۵۱۔۲۷)اور (کھانے کے لیے) ان کے آگے رکھ دیا۔

اور قرب زمانی کے متعلق فرمایا:

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ (۲۱۔۱)لوگوں کے حساب (اعمال) کا وقت نزدیک پہنچا۔

﴿اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ (۲۱۔۱۰۹)اور مجھے معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ عنقریب آنے والی ہے یا اس کا وقت دور ہے۔

اور قرب نسبی کے متعلق فرمایا:

﴿وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی﴾ (۴۔۸) اور جب میراث کی تقسیم کے وقت ...... غیر وارث) رشتے دار آ جائیں۔

﴿وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی﴾ (۶۔۱۵۲) گو وہ تمہارے رشتے دار ہی ہوں۔

﴿وَلِذِی الْقُرْبٰی﴾ (۸۔۴۱)اور اہل قرابت کا۔

﴿وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ (۴۔۳۶)اور رشتے دار ہمسایوں ﴿یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ (۹۰۔۱۵) یتیم رشتے دار کو...... اور قرب بمعنی رتبہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا کے متعلق فرمایا:

﴿وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (۴۔۱۷۲)اور نہ مقرب فرشتے (عار) رکھتے ہیں۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴾ (۳۔۴۵) (اور جو) دنیا اور آخرت میں آبرو والا اور (خدا کے) خاصوں میں سے ہوگا۔

﴿عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (۸۳۔۲۸)وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے۔

﴿فَاَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴾ (۵۶۔۸۸) پھر اگر وہ خدا کے مقربوں میں سے ہے۔

﴿قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴾ (۷۔۱۱۴) (فرعون نے) کہا: ہاں (ضرور) اور اس کے علاوہ تم مقربوں میں داخل کر لیے جاؤ گے۔

﴿وَقَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا﴾ (۱۹۔۲۵)اور باتیں کرنے کے لیے نزدیک بلایا۔

اور اَلْقُرْبَةُ کے معنی قرب حاصل کرنے کا ذریعہ کے بھی آتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ﴾ (۹۔۹۹) دیکھو وہ بے شبہ ان کے لیے (موجب) قربت ہے۔

﴿تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی﴾ (۳۴۔۳۷) کہ تم کو ہمارا مقرب بنا دیں۔

اور رعایت ونگہبانی کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (۷۔۵۶) کچھ شک نہیں کہ خدا کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔

﴿فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (۲۔۱۸۶) میں تو تمہارے پاس ہوں۔جب کوئی پکارنے والا پکارتا ہے تو میں اسکی دعا قبول کرتا ہوں اور قرب معنی قدرۃ فرمایا:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب

ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ﴾ (۵۶۔۸۵) اور ہم اس مرنے والے کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔

میں بھی یہ ممکن ہے کہ قرب بلحاظ قدرت مراد ہو۔

اَلْقُرْبَانَ: (نیاز) ہر وہ چیز جس سے اللہ کی قرب جوئی کی جائے اور عرف میں قربان بمعنی نَسِیْكَةٌ یعنی ذَبِیْحَةٌ آتا ہے اس کی جمع قَرَابِیْنُ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا﴾ (۵۔۲۷) جب ان دونوں نے خدا کی جناب میں کچھ نیازیں چڑھائیں۔

﴿حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ﴾ (۳۔۱۸۳) جب تک کوئی پیغمبر ہمارے پاس ایسی نیاز نہ لے کر آئے...... اور آیت کریمہ:

﴿قُرْبَانًا اٰلِهَةً﴾ (۴۶۔۲۸) تقرب خدا کے سوا معبود (بنایا تھا)

میں قُرْبَان کا لفظ قُرْبَانُ الْمَلِكِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بادشاہ کا ہم نشین اور ندیم خاص کے ہیں اور یہ واحد وجمع دونوں پر بولا جاتا ہے اور یہاں چونکہ جمع کے معنی میں ہے اس لیے اٰلِهَةً بلفظ جمع لایا گیا ہے۔

اَلتَّقَرُّبُ: ایسی چیز کا قصد کرنا جس سے دوسرے کے ہاں قدر ومنزلت حاصل ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کے قریب ہو جانا باعتبار مکان کے نہیں ہوتا بلکہ اس پر فضل وکرم اور فیض (خاص) جاری کرنا مراد ہوتا ہے۔اس لیے مروی ہے (۷۹) کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ باری تعالیٰ! کیا تو قریب ہے کہ میں تجھ سے مناجات کروں یا دور ہے کہ میں تمہیں پکاروں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر میں تیرے لیے دوری معین کردوں تو وہاں تک پہنچ نہیں سکے گا اور اگر قرب معین کردوں تو تجھے اس پر قدرت نہیں ہوگی۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔اور کسی بندہ کے مقرب الٰہی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ بہت سی ایسی صفات اپنے اندر پیدا کرلے...... جن کے ساتھ ذات الٰہی متصف ہوتی ہے گو وہ صفات انسان میں اس درجہ نہ پائی جائیں جس درجہ میں کہ ذات الٰہی میں وہ صفات متحقق ہوتی ہیں۔مثلاً انسان، علم وحکمت حلم ورحمت اور بے نیازی جیسی صفات اپنے اندر پیدا کرلے اور یہ ان کے اضداد یعنی جہالت...... طیش وغضب اور احتیاج نفسانی کی میل کچیل سے پاک ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہیں اور یہ قرب جسمانی کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ قرب روحانی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶۔(۸۰)

((مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا)) کہ جو شخص بالشت بھر میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ذراع یعنی ہاتھ بھر اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور نیز ایک روایت میں ہے کہ تقرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعہ میرا قرب

---

❶ متفق عليه من حديث ابی هريرة والحديث باختلاف الفاظه فی المستدرك وابن ماجة عن ابی هريرة وانس وابی ذرو ابی سعيد والطبرانی عن سلمان وابی زر وابو نعيم عنه وابن شاهين فی الترغيب عن ابن عباس (راجع كنز العمال ٤(١١٣٨-١١٣٠) و(١١٧٨-١١٨٤) وتخريج العراقی علی الاحياء (٣/٩)۔

حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔......اور آیت کریمہ:
﴿وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ﴾ (۶۔۱۵۳) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔
میں لَا تَـقْـرَبُوْا کے لفظ میں جو بلاغت پائی جاتی ہے وہ تَـنَاوَلُوْا کے لفظ سے پیدا نہیں ہوسکتی! کیوں کہ کسی چیز کو لینے سے منع کرنے کی بنسبت اس کے قریب جانے سے منع کرنے میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اسی لیے فرمایا ﴿وَلَا تَـقْـرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (۲۔۳۵) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا۔اور آیت کریمہ:
﴿وَ لَا تَـقْـرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ (۲۔۲۲۲) اور جب تک پاک نہ ہوجائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔ میں قرب جماع سے کنایہ ہے۔نیز فرمایا:
﴿لَاتَقْرَبُوا الزِّنٰى﴾ (۱۷۔۳) اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔
اَلْـــقِــرَابُ: (مصدر) بمعنی مقابت ہے شاعر نے کہا ہے ❶ (الطویل)
(۳۵۳) فَـاِنَّ قِـرَابَ الْبَطْنِ يَكْفِيْكَ مِلْؤُهٗ قَدَحٌ
قُرْبَانٌ: تقریباً بھرا ہوا پیالہ۔
اور قِرْبَانُ الْمَرْءَ ةِ: عورت سے مجامعت کرنا۔تَقْرِيْبُ الْـفَـرَسِ: گھوڑے کا دُلکی دوڑنا ایک رفتار جو دوڑ کے قریب ہوتی ہے)۔اَلْقُرَابُ: قریب۔
فَرَسٌ لَا حِقُ الْاَقْرَابِ: گھوڑا جس کی تہی گاہیں پچکی ہوئی ہوں۔
اَلْقِرَابُ: تلوار کی نیام بعض کا قول ہے کہ قِراب نیام کو نہیں کہتے بلکہ نیام کے اوپر کے چمڑے کو کہا جاتا ہے اس کی جمع قُرُبٌ ہے اور قَـرَبْتُ السَّيْفَ وَاَقْرَبْتُهٗ کے معنی تلوار کو نیام کے اندر بند کرنے کے ہیں۔
رَجُلٌ قَارِبٌ: آدمی جو پانی کے قریب پہنچ جائے۔لَيْلَةُ الْقُرْبِ: عرب لوگ اونٹ چراتے چراتے پانی کی طرف چلے جاتے جب ان کے اور پانی کے درمیان ایک شب کا سفر باقی رہ جاتا تو عجلت سے سفر کرتے لہٰذا اس رات کو لَيْـلَةُ الْـقُرْبِ کہتے چنانچہ اسی سے اَقْـرَبُـوْا اِبِلَهُمْ کا محاورہ ہے۔جس کے معنی لَيْـلَةُ الْقُرْبِ میں اونٹوں کو پانی کی طرف ہنکانے کے ہیں۔
اَلْمُقْرِبُ: حاملہ عورت جو قریب الولادت ہو۔

(ق ر ح)

اَلْـــقَـرْحُ: (بفتح القاف) کسی خارجی اثر سے ہونے والے زخم کو قَـــرْح کہا جاتا ہے اور اندرونی طور پر ہونے والے زخم (جیسے پھنسی وغیرہ کا زخم) کو قَـــــرْحٌ۔ قَرَحْتُهٗ (ف) کے معنی زخمی کرنے کے ہیں۔مگر کبھی لازم بھی آتا ہے جیسے قَـرِحُ قَـلْبُـهٗ: (اس کا دل زخمی ہوگیا)

---

❶ قـالـه هـلال بن خثعم وتمامه: ويكفيك عورات الامـور اجتـنـا بهـا والبيت في امالي المرتضى(۱: ۳۷۹) والحيوان (۱: ۳۸۲) فی اربعة والبخلا (۲۰۲) ويروى لقيس بن خطيم وفي العيون (۳: ۱۸۴) البشار بن بشر ولكنه مجهول ولم يـعـرف لهذا الاسم اى شاعر وفي حماسة البحرى (طبعه اروبا البيـت لزياد بن منقذ التميمي وفي مجموعة المعاني رافع بن خميصه وفي رواية لسوء ات الامور بدل عورات الامور كما في الاحيا للغزالي (۳: ۲۴۰) في ثلاثة ابيات وفيه قصه ابی مـحـمـد الـيـزيـدي مـع هارون وفي الحماسة لابن الشجرى والمعاني للقبتي والامالي "مـلاه" بـالـنـصـب علی التميز وهو الصواب وفي المطبوع يكفيك بالموحدة مصحف ۱۲۔

وَاَقْرَحْتُهٗ: اسے زخمی کیا وقَرِحَ (س) زخمی ہو جانا۔
کبھی قَرْحٌ کا لفظ زخم اور قُرْحٌ اس درد والم پر بولا جاتا ہے جو زخم کی وجہ سے ہو قرآن پاک میں ہے: ﴿مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (۳۔۱۷۲) باوجود زخم کھانے کے۔
﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾ (۳۔۴۰) اگر تمہیں زخم (شکست) لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے۔
ایک قرأت میں قُرْحٌ بضمہ قاف ہے۔
اَلْقَرْحَانُ: وہ شخص جو کبھی چیچک وطاعون، جدری وغیرہ بیماری میں مبتلا نہ ہوا ہو۔
فَرَسٌ قَارِحٌ: گھوڑا جس کے ناب (دانت) جو سب دانتوں سے آخر میں نکلتے ہیں ظاہر ہو گئے ہوں مونث قَارِحَةٌ اَقْرَحُ: گھوڑا جس کی پیشانی میں سفید نشان ہو۔
رَوْضَةٌ قَرْحَاءُ: سبزہ زار جس کے وسط میں سفید پھول ہو گویا وہ اَقْرَحُ: گھوڑے کے مشابہ ہے اِقْتَرَحْتُ الْجَمَلَ: کسی اونٹ پر پہلے پہل سواری کرنا اِقْتَرَحْتُ كَذَا عَلٰى فُلَانٍ کسی کے سامنے پہلی مرتبہ کسی رائے کا اظہار کرنا۔ اِقْتَرَحْتُ بِئْرًا: میں نے کنوئیں سے خالص پانی نکالا اَرْضٌ قَرَاحٌ اور سرزمین جس میں نہ گھاس ہو اور نہ پانی۔ اَلْقَرِيْحَةُ: پہلا پانی جو کنوئیں سے نکالا جاتا ہے اور اسی سے قَرِيْحَةُ الْاِنْسَانِ مستعار ہے جس کے معنی انسان کی طبیعت کے ہیں۔

(ق ر د)

اَلْقِرْدُ: بندر اس کی جمع قُرُوْدٌ وقِرَدَةٌ ہے۔
اور آیات کریمہ۔
﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ (۲۔۶۵) ذلیل وخوار بند ہو جاؤ۔
﴿وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ﴾ (۵۔۶۰) اور جن کو ان میں سے بندر...... بنا دیا۔
کو بعض نے ظاہری معنی پر محمول کیا ہے یعنی انہیں سچ مچ بندر بنا دیا گیا تھا بعض نے کہا ہے کہ انکے اخلاق واطوار بندروں جیسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ سچ مچ بندر بنا دیے گئے تھے۔ [1]
اَلْقُرَادُ چیچڑی۔ جمع قِرْدَانٌ۔
صُوْفٌ قَرِدٌ: الجھی ہوئی اون (جو کاتی نہ جا سکے) اسی سے تہ بر تہ چھائے ہوئے بادل کو سَحَابٌ قِرَدٌ کہا جاتا ہے۔
اَقْرَدُ: چیچڑی کی طرح زمین کے ساتھ چمٹ جانا۔
قَرَدَ چیچڑی کی طرح ساکن ہو جانا۔ اور قَرَّدْتُ الْاِبِلَ کے معنی اونٹ سے چیچڑ دور کرنے کے ہیں۔ (ازالہ ماخذ) جیسے قَذَّيْتُ وَمَرَّضْتُ کا محاورہ ہے۔ اور استعارہ کے طور پر قَرَّدَ کے معنی چاپلوسی کے ذریعہ کسی کو دھوکا دینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ يُقَرِّدُ فُلَانًا۔ فلاں مدارات سے اسے فریب دے رہا ہے اور پستان کے سرے کو قُرَدُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی شکل بھی چیچڑ جیسی ہوتی ہے۔

(ق ر ض)

اَلْقَرْضُ: (کرتا) یہ قطع کی ایک قسم ہے پھر جس طرح کسی جگہ سے گزرنے اور تجاوز کرنے لیے قَطَعَ الْمَكَانَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس طرح قَرَضَ

[1] كذا قال مجاهد المعنى الاول ذهب اليه ابن عباس وغيره راجع انوار التنزيل واسرار التاويل للبيضاوى۔

اَلْمَکَانَ بھی کہتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (۱۸۔۱۷) اور جب غروب ہو تو اس سے بائیں طرف کترا جائے۔

یعنی غروب کے وقت انہیں ایک جانب چھوڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔

اور قرض اس مال کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو (اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے) دیا جائے اس شرط پر کہ وہ واپس مل جائے گا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (۲۔۲۴۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے؟

اور شعر گوئی کو بھی مُقَارَضَةٌ کہا جاتا ہے اور شعر کو بطور استعارہ قَرِیْضٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ نَسْجٌ اور حَوْكٌ کے الفاظ اس معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ق ر ط س)

اَلْقِرْطَاسُ: ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ﴾ (۶۔۷) اور اگر ہم تم پر کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب نازل کرتے۔

﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّ هُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ﴾ (۶۔۹۱) کہو کہ جو کتاب موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اسے کس نے نازل کیا تھا جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق (میں نقل) کر رکھا ہے۔

(ق ر ع)

اَلْقَرْعُ: (ف) کے اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنے کے ہیں اسی سے قَرَعَتَهٗ بِالْمِقْرَعَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کوڑے سے سرزنش کرنے کے ہیں (اور قیامت کے حادثہ کو قَارِعَةٌ کہا گیا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌ بِالْقَارِعَةِ﴾ (۶۹۔۴) (وہی) کھڑکھڑانے والی (جس کو ثمود اور عاد (دونوں نے جھٹلایا)۔

﴿اَلْقَارِعَةُ ۔ مَا الْقَارِعَةُ﴾ (۱۰۱۔۱،۲) کھڑکھڑانے والی کیا ہے۔

(ق ر ف)

اَلْقَرْفُ وَالْاِقْتِرَافُ کے اصل معنی کریدنے کے ہیں اور جو چھال یا چھلکا اتارا جاتا ہے۔اسے قرف کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ اِقْتَرَفَ (افعال) کمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خواہ وہ سب اچھا ہو یا برا، جیسے فرمایا﴿سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۲۰) وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔

﴿وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۱۳) اور جو کام وہ کرتے تھے وہی کرنے لگیں۔

﴿وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا﴾ (۹۔۲۴) اور مال جو تم کماتے ہو۔

لیکن اس کا بیشتر استعمال برے کام کرنے پر ہوتا ہے اسی بنا پر محاورہ ہے اَلْاَعْتِرَافُ مُزِيْلُ الْاِقْتِرَافِ کہ اعتراف جرم، جرم کو مٹا دیتا ہے قَرَفْتُ فُلَانًا بِكَذَا میں نے فلاں پر تہمت لگائی اور آیت کریمہ:﴿وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۱۳) کو بھی بعض نے اسی معنی پر محمول کیا ہے۔فُلَانٌ قَرَفَنِیْ: فلان نے مجھ پر تہمت لگائی۔

رَجُلٌ مُقْرِفٌ: دوغلا آدمی۔ قَارَفَ فُلَانٌ اَمْرًا اس نے برے کام کا ارتکاب کیا۔

(ق ر ن)

اَلْاِقْتِرَانُ۔ اِزْدِوَاجٌ کی طرح اِقْتِرَانٌ کے معنی بھی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے کسی معنی میں باہم مجتمع ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِکَةُ مُقْتَرِنِیْنَ﴾ (۴۳۔۵۳) یا یہ ہوتا کہ فرشتے جمع ہو کر اس کے ساتھ آتے۔

قَرَنْتُ الْبَعِیْرَ مَعَ الْبَعِیْرِ: دو اونٹوں کو ایک رسی کے ساتھ باندھ دینا اور جس رسی کے ساتھ ان کو باندھا جاتا ہے اسے قَرَنٌ کہا جاتا ہے اور قَرَّنْتُهٗ (تفعیل) میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَّآخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ﴾ (۳۸۔۳۸) اور اوروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اور وہ آدمی جو دوسرے کا ہم عمر ہو یا بہادری، قوت اور دیگر اوصاف میں اس کا ہم پلہ ہو اسے اس کا قرن کہا جاتا ہے اور ہم پلہ یا ہم سر کو قریب بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ قِرْنُ فُلَانٍ اَوْ قَرِیْنُهٗ: فلاں اس کا ہم عمر یا ہم سر ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنِّیْ کَانَ لِیْ قَرِیْنٌ﴾ (۳۷۔۵۱) کہ میرا ایک ہم نشین تھا۔

﴿وَقَالَ قَرِیْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ﴾ (۵۰۔۲۳) اور اس کا ہم نشین (فرشتہ) کہے گا یہ (اعمال نامہ) میرے پاس تیار ہے۔

یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے دوسری جگہ شہید (گواہ) کہا ہے۔

﴿قَالَ قَرِیْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُهٗ﴾ (۵۰۔۲۷) اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا۔

﴿فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ﴾ (۴۳۔۳۶) تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔

قَرِیْنٌ کی جمع قُرَنَآءَ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ﴾ (۴۱۔۲۵) اور ہم نے شیطان کو ان کا ہم نشین مقرر کر دیا۔

ایک زمانہ کے لوگ یا امت کو قَرْنٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع قُرُوْنٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ اَهْلَکْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ﴾ (۱۰۔۱۳) اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو...... ہلاک کر چکے ہیں۔

﴿وَکَمْ اَهْلَکْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ﴾ (۱۷۔۱۷) اور ہم نے...... بہت امتوں کو ہلاک کر ڈالا۔

﴿وَکَمْ اَهْلَکْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ (۱۹۔۷۴،۹۸) اور ہم نے ان سے پہلے بہت امتیں ہلاک کر دیں۔

﴿وَقُرُوْنًا بَیْنَ ذٰلِکَ کَثِیْرًا﴾ (۲۵۔۳۸) اور ان کے درمیان اور بہت سی جماعتوں کو بھی...... ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِیْنَ﴾ (۲۳۔۳۱) پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کی۔ ﴿قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ﴾ (۲۳۔۴۲) اور جماعتیں...... اَلْقُرُوْنُ (بفتح القاف) کے معنی نفس کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے نیز قَرُوْنٌ وہ اونٹ ہے جو چلتے وقت پچھلے پاؤں اگلے پاؤں کی جگہ پر رکھے گویا وہ ان کو باہم ملا رہا ہے۔

قَرَنٌ: ترکش جب کہ کمان کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ نَاقَةٌ قَـــرُوْنٌ: وہ اونٹنی جس کے پچھلے تھن باہم ملے ہوئے ہوں۔

اَلْـقِرَانُ..... حج اور عمرہ کو جمع کرنا اور مطلق دو چیزوں کے جمع کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

قَرْنٌ: جانور کا سینگ۔ کَبْشٌ اَقْرَنُ: سینگوں والا مینڈھا مؤنث قرناء تشبیہ کے طور پر عورت کے عَـفْلَة کو بھی قَرْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سینگ کی شکل کا ایک مادہ ہوتا ہے جس سے مرد کے عضو مخصوص کو مجامعت کے وقت اس طرح تکلیف محسوس ہوتی ہے گویا اسے سینگ چبھ رہا ہے۔ قَـرْنُ الْجَبَلِ: پہاڑ کا ابھرا ہوا حصہ۔ قَـرْنُ الْـمَرْءَ ةِ عورت کے گیسو قَرْنُ الْمِرْاٰةِ: آئینے کا فریم۔

قَرْنُ الْفَلَاةِ: جنگل کا کنارہ۔ قَرْنُ الشَّمْسِ: آفتاب کا کنارہ۔ قَـرْنُ الشَّـيْطَانِ: شیطان کے سینگ الغرض ان تمام محاوروں میں قرن کا لفظ بطور تشبیہ کے استعمال ہوا ہے۔ اور ذُوْالْقَرْنَيْنِ ایک مشہور بادشاہ کا لقب تھا (جس کا قصہ سورہ کہف ۸۳ تا ۹۸ میں مذکور ہے)

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا [1] (۸۱) ((اِنَّ لَكَ بَيْتًـا فِـي الْـجَـنَّةِ وَاِنَّكَ لَـذُوْ قَرِيْنِهَا)) کہ جنت میں تمہارے لیے ایک مکان مخصوص ہے اور تم اس امت کے ذوالقرنین ہو یعنی بلحاظ مرتبہ کے اس امت میں ذوالقرنین کی مثل ہو۔

(ق ر ی)

اَلْـقَـرْيَةُ: وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر آباد ہو جائیں تو بحیثیت مجموعی ان دونوں کو قریہ کہتے ہیں اور جمع ہونے والے لوگوں اور جگہ پر انفراداً بھی قریہ بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاسْـئَلِ الْـقَـرْيَةَ﴾ (۱۲۔۸۲) اور..... بستی سے دریافت کر لیجیے۔

میں اکثر مفسرین نے اہل کا لفظ محذوف مان کر قریہ سے وہاں کے باشندے مراد لیے ہیں لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قَرْيَةٌ کے معنی ہی باشندوں کے ہیں (لہٰذا اہل کا لفظ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں) چنانچہ اسی معنی میں فرمایا ﴿وَضَـرَبَ الـلّٰـهُ مَثَـلًا قَـرْيَةً كَـانَتْ اٰمِنَةً مُّـطْـمَـئِنَّةً﴾ (۱۶۔۱۱۲) اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو (ہر طرح) امن چین سے بستی تھی ﴿وَكَـاَيِّنْ مِـنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ﴾ (۴۷۔۱۳) اور بہت سی بستیاں تمہاری بستی سے..... زور و قوت میں کہیں بڑھ کر تھیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمَـا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى﴾ (۱۱۔۱۱۷) اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو..... تباہ کر دے۔

میں القریٰ ایک خاص شہر کا نام ہے اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَمَـآ اَرْسَلْـنَـا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِـمْ مِّـنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾ (۱۲۔۱۰۹) اور ہم نے تم سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں مرد ہی بھیجے تھے۔ جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

میں بھی القریٰ شہر کا نام ہے۔ نیز فرمایا:

---

[1] الحدیث فی الفائق (۲/۳۲۷) وغریب ابی عبید (۳/۷۸) والضمیر فی قرنیها یعود الی الامة والعود الی المضمر اکثر فی القرآن وکلام العرب ۱۲۔

﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا﴾ (۴۔۷۵) اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس شہر سے، جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا۔

حکایت کی گئی ہے کہ ایک قاضی، علی بن حسینؓ کے پاس آیا علی بن حسینؓ نے اس سے دریافت کیا کہ آیت ﴿وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً﴾ (۳۴۔۱۸) اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی، ایک دوسرے کے متصل دیہات بنائے تھے۔

کے متعلق تمہارے علماء کا کیا خیال ہے؟ تو اس نے کہا کہ وہ القری سے مکہ مراد لیتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: کہ تم نہیں جانتے کہ اس سے وہاں کے لوگ مراد ہیں تو میں (قاضی) نے کہا کہ کتاب اللہ میں اس کی کوئی دلیل بھی ہے۔ جہاں قریۃ سے مراد لوگ ہوں اس پر انہوں نے فرمایا کہ تم نے آیت کریمہ ﴿وَكَاَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ﴾ (۶۵۔۸) اور بہت سی بستیوں کے رہنے والوں نے اپنے پروردگار اور اس کے پیغمبروں کے احکام کی سرکشی کی۔

نہیں پڑھی (یعنی یہاں قریۃ سے لوگ مراد ہیں)

﴿وَ تِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا﴾ (۱۸۔۵۹) اور یہ بستیاں (جو ویران پڑی ہیں) جب انہوں نے (کفر سے) ظلم کیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔

﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ (۲۔۵۸) اور جب ہم نے ان سے کہا اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ

قَرَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ: میں نے حوض میں پانی جمع کیا............

قَرَيْتُ الضَّيْفَ قِرًى: میں نے مہمان کی مہمانی کی

قَرَى الشَّيْءَ فِي فَمِهٖ مِنْهُ: منہ میں کوئی چیز جمع کرنا۔

قَرَيَانُ الْمَاءِ: پانی جمع ہونے کی جگہ۔

(ق س س)

اَلْقِسُّ وَالْقِسِّيْسُ کے معنی رؤسائے نصاریٰ میں سے خدا پرست عالم کے ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا﴾ (۵۔۸۲) یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی۔

اصل میں قَسٌّ کے معنی رات کے وقت کسی چیز کی جستجو کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

تَقَسَّسْتُ اَصْوَاتَهُمْ بِاللَّيْلِ: میں نے رات کے وقت ان کی آوازوں کی جستجو کی۔

اَلْقَسْقَاسُ وَالْقَسْقَسُ کے معنی رات کے وقت رہنمائی کرنے والے کے ہیں۔

(ق س ر)

اَلْقَسْرُ (ن) کے معنی غلبہ اور تسلط کے ہیں۔

قَسَرْتُهٗ وَاقْتَسَرْتُهٗ: میں نے اسے مجبور کیا۔

اسی سے اَلْقَسْوَرَةُ ہے جس کے معنی شیر کے ہیں نیز تیر انداز اور شکاری کو بھی قسورۃ کہتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ: ﴿فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾ (۷۵۔۵۱) یعنی شیر سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ قَسْوَرَة سے مراد شیر ہے اور بعض نے تیر انداز اور بعض نے شکاری مراد لیا ہے [1]۔

---

[1] وفي الطبري ذهب الى الاول: ابوهريرة وابن عباس وزيد بن السلم الى الثاني: عكرمة ومجاهد والى الثالث: سعيد بن جبير (انظر انظرى ۲۹/۱۶۹)

(ق س ط)

اَلْقِسْط (اسم) تَصْفٌ ونَصَفَةٌ کی طرح قِسْط بھی بمعنی برعدل حصہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ﴾ (۱۰۔۴) تاکہ ایمان والوں اور نیک کام کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔

﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۵۔۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو۔

اور قسط کے معنی دوسرے کا حق مارنا بھی آتے ہیں اس لیے یہ ظلم اور جور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اَلْقَسْطُ: پاؤں میں ٹیڑھا پن یہ اَفْجَحُ کی ضد ہے جس کے معنی پاؤں کے اگلے حصہ کی جانب سے ان کے نزدیک اور ایڑیوں کی جانب سے دور ہونے کے ہیں اَلْاِقْسَاطُ: اس کے اصل معنی کسی کو اس کا حق دینے کے ہیں اسی چیز کا نام انصاف ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ قَسَطَ الرَّجُلُ (فَهُوَ قَاسِط) کے معنی ظلم کرنے اور اَقْسَطَ کے معنی انصاف کرنے کے ہیں۔ [1] قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ (۷۲۔۱۵) اور گنہگار ہوئے وہ دوزخ کا ایندھن بنے۔

﴿وَاَقْسِطُوا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (۴۹۔۹) اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تَقَسَّطْنَا بَيْنَنَا: ہم نے (کسی چیز کو) آپس میں برابر تقسیم کرلیا۔

چنانچہ اَلْقِسْطَاس، ترازو کو کہتے ہیں اور لفظ میزان کی طرح اس سے بھی عدل و انصاف کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ﴾ (۱۷۔۳۵) اور جب تول کردو۔ تو ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو۔

(ق س م)

اَلْقَسْمُ وَالْقِسْمَةُ (ض) کے معنی کسی چیز کے حصے کرنے اور بانٹ دینے کے ہیں۔ مثلاً قِسْمَةُ الْمِيرَاثِ: ترکہ کو وارثوں کے درمیان تقسیم کرنا۔ قِسْمَةُ الْغَنِيْمَةِ: مال غنیمت تقسیم کرنا چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ﴾ (۱۵۔۴۴) ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے جماعتیں تقسیم کردی گئیں ہیں۔

﴿وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ﴾ (۵۴۔۲۸) اور ان کو آگاہ کردو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کردی گئی ہے۔

اِسْتَقْسَمْتُهٗ کے معنی کسی سے تقسیم چاہنا ہیں اور کبھی یہ بمعنی قسم (تقسیم کرنا) بھی آتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ﴾ (۵۔۳) اور یہ بھی کہ پانسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ کے کام ہیں۔

رَجُلٌ مُنْقَسِمُ الْقَلْبِ: وہ آدمی جس کا دل تفکرات سے پریشان ہو گویا تفکرات نے اس کے دل کو تقسیم کرلیا ہے۔ یہ مُتَوَزِّعُ الْخَاطِرِ وَمُشْتَرِكُ اللُّبِّ کی طرح کا محاورہ ہے۔

اَقْسَمَ (افعال) کے معنی حلف اٹھانے کے ہیں یہ دراصل

---

[1] وبه صرح ابن السكيت في الاقتضاب وابوعبيدة في اضداده البحر المحيط (۲/۳۵۱۔۳۵۲)

قَسَامَۃٌ سے مشتق ہے اور قَسَامَۃ ان قسموں کو کہا جاتا ہے جو اولیائے مقتول پر تقسیم کی جاتی ہیں پھر مطلق قسم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے ❶ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾ (۱۶۔۱۳۸) اور یہ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔

﴿اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ﴾ (۷۔۴۹) کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھایا کرتے تھے۔

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (۷۵۔۲،۱) ہم کو روز قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی۔

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ﴾ (۷۰۔۴۰) ہمیں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔

﴿اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ﴾ (۶۸۔۱۷) جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ ہم صبح ہوتے اس کا میوہ توڑ لیں گے۔

﴿فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ﴾ (۵۔۱۰۶) اور دونوں خدا کی قسمیں کھائیں۔

قَاسَمْتُهٗ وَتَقَاسَمَا: باہم قسمیں اٹھانا قرآن پاک میں ہے۔﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ (۷۔۲۱) اور ان کو قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔﴿قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ﴾ (۲۷۔۴۶) کہنے لگے کہ خدا کی قسم کھاؤ۔

فُلَانٌ مُقَسَّمُ الْوَجْهِ اَوْ قَسِيْمُ الْوَجْهِ کے معنی خوبرو کے ہیں اور اَلْقَسَامَۃُ بمعنی حسن۔اصل میں یہ قِسْمَۃٌ سے ہے گویا ہر عضو کو اس کے مناسب حال حسن سے بہرہ ور کیا ہے۔اس لیے ان میں یگانگت پیدا ہوگئی ہے اور عدم تناسب نظر نہیں آتا بعض نے کہا ہے کہ خوب رو کو مُقَسَّمُ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے حسن سے نظر کو تقسیم کر لیتا ہے یعنی نظر جسم کے کسی ایک حصہ پر جم کر نہیں رہ جاتی (بلکہ ہر عضو کی طرف بار بار منتقل ہوتی رہتی ہے) اور آیت کریمہ:

﴿كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ﴾ (۱۵۔۹۰) جس طرح ان لوگوں پر نازل کیا جنہوں نے تقسیم کر دیا۔ میں مُقْتَسِمِيْن سے وہ لوگ مراد ہیں جو مکہ کی مختلف گھاٹیوں میں بٹ کر بیٹھ گئے تھے۔تاکہ نو واردلوگوں کو اسلام سے روکیں اور رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے نہ دیں۔بعض کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازش کرنے پر قسمیں کھائی تھیں۔ ❷

(ق س و)

اَلْقَسْوَۃُ کے معنی سنگ دل ہونے کے ہیں یہ اصل میں حَجَرٌ قَاسٍ سے ہے جس کے معنی سخت پتھر کے ہیں۔

اَلْمُقَاسَاۃُ: سختی جھیلنا۔قرآن پاک میں ہے:﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ (۲۔۷۴) پھر..... تمہارے دل سخت ہوگئے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾

---

❶ وایضاً قسم یطلق علی الدلیل والشھاوۃ کما فی قولہ تعالیٰ وانّہٗ لقسم لو تعلمون عظیم (۵۶۔۷۶)۔

❷ وبہ قال مقاتل والفراء واختارہ البیضاوی وقال ابن عباس وعکرمۃ المرادبہ اھل الکتاب وقال زید بن اسلم المراد منہ قوم صالح تقاسموا علی قتلہ قسموا مقتسمین والتفصیل فی الطبری والقرطبی۔

(۳۹۔۲۲) پس ان پر افسوس ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔

﴿وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ﴾ (۲۲۔۵۳) اور جن کے دل سخت ہیں۔

﴿وَ جَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قٰسِيَةً﴾ (۵۔۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

ایک قرأت میں قَسِيَّةً ہے ❶ یعنی ان کے دل خالص نہیں ہیں یہ دِرْهَمٌ قَسِيٌّ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھوٹے درہم کے ہیں جس میں (سکہ کی) ملاوٹ کی وجہ سے صلابت پائی جائے۔ شاعر نے کہا ہے ❷ (البسیط)

(۳۵۴) صَاحَ الْقَسِيَّاتُ فِيْ اَيْدِي الصَّيَارِيفِ

کھوٹے درہم صرافوں کے ہاتھ میں آواز دیتے ہیں۔

(ق ش ع ر)

اَلْقَشْعَرَةُ: رونگٹے کھڑے ہونا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ (۳۹۔۲۳) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ اس سے ان کے بدنوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

(ق ص ص)

اَلْقَصُّ کے معنی نشان قدم پر چلنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ قَصَصْتُ اَثَرَهٗ: یعنی میں اس کے نقش قدم پر چلا اور قصص کے معنی نشان کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَارْتَدَّا عَلٰی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ (۱۸۔۶۴) تو وہ اپنے اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے۔

﴿وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ﴾ (۲۸۔۱۱) اور اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا۔

اسی سے قَصِيْصٌ ہے جس کے معنی اس باقی ماندہ گھاس کے ہیں جس سے کھوج لگایا جا سکے۔

قَصَصْتُ ظُفْرَهٗ: میں نے اس کے ناخن تراشے۔

اَلْقَصَصُ کے معنی اخبار متتبعہ کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ﴾ (۳۔۶۲) یہ تمام بیانات صحیح ہیں۔

﴿فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ﴾ (۱۲۔۱۱۱) ان کے قصے میں...... عبرت ہے۔

﴿وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ﴾ (۲۸۔۲۵) اور ان سے اپنا ماجرا بیان کیا۔

﴿نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (۱۲۔۳) تمہیں ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔

﴿فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ﴾ (۷۔۷) پھر اپنے علم سے ان کے حالات بیان کریں گے۔

﴿يَقُصُّ عَلٰى بَنِیْ اِسْرَائِيْلَ﴾ (۲۷۔۷۶) بنی اسرائیل کے سامنے...... بیان کر دیتا ہے۔

﴿فَاقْصُصِ الْقَصَصَ﴾ (۷۔۱۷۶) تو ان سے یہ قصہ بیان کر دو۔

اَلْقِصَاصُ کے معنی خون کا بدلہ دینے کے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ (۲۔۱۷۹) حکم

---

❶ وهی قراءة اهل الکوفة ۱۲۔

❷ قاله ابو زبید الطائی فی قصیدة یرثی بها عثمان بن عفان الخلیفه۔ وصدرها لها صو اهل فی صم السلام کما۔ والسلام معناه الصخر والبیت من شواهد الطبری (٦ : ١٥٥) واللسان (قسا) والا مالی (١ : ٢٧) اللالی (١ : ١٢٨) والبحر (٣ : ٤٤٥) والمعانی (٤۔١٢) وبعض الابیات من الرثاء ایضا فی اللسان (۰امر، راجع السمط (٩٤١) ١٢

قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔
﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ (۵۔۴۵) سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے۔
محاورہ ہے: قَصَّ فُلَانٌ فُلَانًا وَضَرَبَهٗ ضَرْبًا فَاَقَصَّهٗ: فلاں کو (مار مار کر) مرنے کے قریب کر دیا۔
القص کے معنی چونہ کے ہیں۔ حدیث میں ہے [1] (۱۸۱) ((نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَقْصِيْصِ الْقُبُوْرِ)) کہ رسول اللہ نے قبروں کو گچ کرنے سے منع فرمایا۔

(ق ص د)

اَلْقَصْدُ: (ض) راستہ کا سیدھا ہونا۔ محاورہ ہے قَصَدْتُّ قَصْدَهٗ: میں اس کی طرف سیدھا گیا۔ اسی سے اِقْتِصَادٌ ہے اور اِقْتِصَاد دو قسم پر ہے (ق) محمود علی الاطلاق: جو افراط و تفریط کے درمیان میں ہو جیسے سخاوت، جو اسراف اور بخل کے مابین کو کہتے ہیں اور شجاعت جو لا پرواہی اور بزدلی کے درمیانی درجہ کا نام ہے چنانچہ اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا: ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْيِكَ﴾ (۳۱۔۱۹) اور اپنی چال میں اعتدال کیے رہنا۔
اور اقتصاد کی اسی نوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا...... الاية﴾ (۲۵۔۶۷) یعنی اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔
(۲) قصد کا لفظ کنایہ کے طور پر ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جس کے محمود اور مذموم ہونے میں شبہ ہو یعنی جو نہ بالکل محمود ہو اور نہ بالکل مذموم بلکہ ان کے درمیان میں ہو۔ مثلاً ایک چیز عدل و جور کے مابین ہو چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ (۳۵۔۳۲) تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں۔
اسی طرح درمیانی مسافت پر بھی قصد کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت ﴿وَسَفَرًا قَاصِدًا﴾ (۹۔۴۲) اور سفر بھی ہلکا سا ہوتا۔ میں قاصدا کے معنی معتدل سفر کے ہیں جو زیادہ دور کا نہ ہو اور بعض نے اس کا معنی سفر قریب لکھا ہے۔ لیکن اصل معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کر دیئے ہیں۔ اَقْصَدَ السَّهْمُ: تیر کا لگ کر فوراً ہلاک کر دینا۔ گویا اس نے اپنے قصد کو پالیا۔ شاعر نے کہا ہے [2] (الکامل)
(۳۵۵) فَاَصَابَ قَلْبَكَ غَيْرَ اَنْ لَّمْ يُقْصِدٖ وہ تیرے دل پر لگا لیکن اس نے قتل نہیں کیا۔ اِنْقَصَدَ الرُّمْحُ کے معنی نیزہ ٹوٹ جانے کے ہیں اور تَقَصَّدٌ بمعنی تَكَسُّرٌ کے ہیں۔
قَصَدَ الرُّمْحَ: نیزہ توڑ دیا۔
نَاقَةٌ قَصِيْدٌ: گوشت سے گتھی ہوئی اونٹنی۔ اَلْقَصِيْدُ کم از کم سات اشعار کی نظم۔

(ق ص ر)

اَلْقِصَرُ: یہ طول کی ضد ہے اور یہ دونوں اسمائے نسبتی سے ہیں جو ایک دوسرے پر قیاس کے ذریعہ سمجھے

---

[1] رواه احمد فی مسنده (۷۸/۸) من رواية ام سلمة وفی معناه روايات فی السنن (مجمع الزوائد ۶۱/۳)
[2] قاله النابغة فی قصيدة فی وصف المجردة امرءة نعمان مطلعها امن آل ميته رائح او مغتدی۔ عجلان ذا زاد وغير مزود وصدر البيت: فی اثر غانية امتك بسهمها والقصيدة فی ديوانه (۳۴۔۳۹) والبيت فی مختار الشعر الجاهلی (۲: ۱۱) واللسان قصد والعقد الثمين ۹ فی ۳۳۔بيتا والعينی (۱: ۸۲)

جاتے ہیں۔

قَصَرْتُ کَذَا کے معنی کسی چیز کو کوتاہ کرنے کے ہیں اور تقصیر کے معنی کوتاہی اور سستی کے ہیں اور قَصَرْتُ کَذَا کے معنی سکیڑنے اور کسی چیز کے بعض اجزاء کو بعض کے ساتھ ملانا کے بھی آتے ہیں۔ اسی سے قَصْر بمعنی محل ہے اس کی جمع قُصُوْرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَصْرٍ مَّشِیْدٍ﴾ (۲۲۔۴۵) اور بہت سے محل۔

﴿وَیَجْعَلْ لَّکَ قُصُوْرًا﴾ (۲۵۔۱۰) نیز تمہارے لیے محل بنا دے گا۔

﴿اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ کَالْقَصْرِ﴾ (۷۷۔۳۲) اس سے آگ کی اتنی (بڑی بڑی) چنگاریاں اٹھتی ہیں جیسے محل۔

بعض نے کہا ہے کہ قصر جمع ہے اور اس کے معنی درخت کی جڑوں کے ہیں۔ اس کا واحد قصرۃ ہے جیسے جَمْرَۃٌ وَجَمْرٌ اور ان شراروں کو قصر کے ساتھ تشبیہ دینا ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ان کو۔

﴿کَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ (۷۷۔۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

کہا ہے اور قَصَرْتُهٗ کے معنی محل میں داخل کرنے کے ہیں اور اسی سے ارشاد الٰہی ہے۔

﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ﴾ (۵۵۔۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔

قَصَرَ الصَّلٰوۃَ: بموجب رخصت شرعی کے نماز کے بعض ارکان کو ترک کر کے اسے کم کر کے پڑھنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ﴾ (۴۔۱۰۱) تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو کم کر کے پڑھو۔ قَصَرْتُ اللِّقْحَةَ عَلٰی فَرَسِیْ: اونٹنی کا دودھ اپنی گھوڑی کے لیے مخصوص کر دیا۔

قَصَرَ السَّهْمُ عَنِ الْهَدَفِ: تیر کا نشانے تک نہ پہنچنا۔ اِمْرَءَۃٌ قَاصِرَۃُ الطَّرْفِ وہ عورت جو نا جائز نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ (۳۷۔۴۸) ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں۔

قَصَّرَ شَعْرَهٗ: بال کتروانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ﴾ (۴۸۔۲۷) اپنے سر منڈوا کر اور بال کتروا کر۔

قَصَرَ فِیْ کَذَا: کسی کام میں سستی کرنا۔ قَصَرَ عَنْهُ: کسی کام میں سستی کرنا۔ قَصَرَ عنه: باوجود قدرت کے کوئی کام کرنے سے باز رہنا❶۔

اِقْتَصَرَ عَلٰی کَذَا: تھوڑی چیز پر اکتفا کرنا۔ اِقْتَصَرَتِ الشَّاۃُ: بوڑھا ہونے کی وجہ سے بکری کے دانتوں کے اطراف کا کوتاہ ہو جانا۔

اَقْصَرَتِ الْمَرْءَۃُ: چھوٹے قد کی اولاد جننا۔ تِقْصَارٌ چھوٹا سا ہار۔

اَلْقَوْصَرَۃُ: کھجور ڈالنے کی زنبیل جو کھجور کے پتوں یا نرکل کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

(ق ص ف)

اَلْقَاصِفُ: (باد سخت شکنندہ) تیز اور سخت ہوا۔ جو درختوں اور عمارتوں کو توڑتی ہوئی چلی جائے۔

---

❶ ومنه قوله تعالیٰ ﴿ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ﴾ (۷۔۲۰۲)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيحِ﴾ پھر تم پر تیز ہوا چلائی۔

رَعْدٌ قَاصِفٌ: بڑے زور کی گرج۔ جس کی آواز میں تکرار ہو۔ اسی سے معازف یعنی آلات موسیقی کی آواز کو قَصْفٌ کہا جاتا ہے اور مجازاً ہر قسم کے لہو کو قَصَفٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ق ص م)

اَلْقَصْمُ: (ض) کے معنی ہلاک کرنے اور کسی چیز کو توڑ دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً﴾ (۲۱۔۱۱) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستمگار تھیں ہلاک کر مارا۔

یعنی انہیں توڑ مروڑ کر ریزہ ریزہ اور ہلاک کر دیا۔ اور ہلاکت کو قَاصِمَةُ الظَّهْرِ کہا جاتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَى﴾ (۲۸۔۵۹) اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے۔

اَلْقُصَمُ: وہ آدمی جو ہر مقاومت کرنے والے کو توڑ ڈالے۔

(ق ص و)

اَلْقَصْى کے معنی بُعد یعنی دوری کے ہیں اور قَصِیٌّ بعید کو کہا جاتا ہے [1] محاورہ ہے۔

قَصَوْتُ عَنْهُ: میں اس سے دور ہوا۔ اَقْصَيْتُهُ: میں نے اسے دور کر دیا۔ اَلْمَكَانَ الْاَقْصٰى: دور دراز جگہ۔ اَلنَّاحِيَةُ الْقُصْوٰى دور یا کنارہ اسی سے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى﴾ (۲۸۔۲۰) اور ایک شخص شہر کی پرلی طرف سے دوڑتا ہوا آیا۔ ﴿اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ (۱۷۔۱) مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک۔

میں المسجد الاقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے اور اسے اَلْاَقْصٰى مخاطبین یعنی آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے مقام سکونت کے اعتبار سے کہا ہے۔ کیونکہ وہ مدینہ سے دور تھی۔

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى﴾ (۸۔۴۲) جس وقت تم (مدینے سے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔

قَصَوْتُ الْبَعِيْرَ: کے معنی اونٹ کا کان قطع کرنے کے ہیں اور کان کٹی اونٹنی کو نَاقَةٌ قَصْوَاءُ کہا جاتا ہے اور اس معنی میں بَعِيْرٌ اَقْصٰى کا محاورہ بھی منقول ہے قَصِيَّةٌ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو کام کاج سے دور رکھی گئی ہو (اصیل اونٹنی)

(ق ض ض)

قَضَضْتُهُ فَانْقَضَّ: میں نے اسے گرایا تو وہ گر پڑا۔

اِنْقَضَّ الْحَائِطُ دیوار گر پڑی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهُ﴾ (۱۸۔۷۷) وہ (جھک کر) گرا چاہتی تھی (خضرؑ نے) اس کو سیدھا کر دیا۔

اَقَضَّ عَلَيْهِ مَضْجَعُهُ: خواب گاہ کا کنکر آلود ہونا (بے چینی کی وجہ سے نیند نہ آنا)

(ق ض ب)

اَلْقَضْبُ: (اسم) کے معنی لمبے اور پھیلے ہوئے

[1] کما فی قولہ تعالیٰ: مکاناً قَصِيًّا (۱۹۔۲۲)

درخت کے ہیں۔مگر آیت کریمہ:

﴿فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا﴾ (۸۱۔۲۷۔۲۸) پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا اور انگور اور ترکاری۔ میں قضب سے مراد تازہ گھاس اور ترکاریاں ہیں ❶

اَلْمَقَاضِبُ: وہ زمین جہاں ساگ پات وغیرہ اگتا ہو۔

اَلْقَضِيْبُ: بمعنی قضب ہے لیکن درخت کی تروتازہ شاخوں کو قَضِيْبٌ اور سبزی ترکاری وغیرہ کو قَضْبٌ کہا جاتا ہے۔ نیز اَلْقَضْبُ (مصدر) کے معنی سبزی ترکاری اور تروتازہ شاخوں کو قطع کرنا بھی آتے ہیں ایک روایت میں ہے ❷ (۸۲) اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا رَاٰى فِيْ ثَوْبٍ تَصْلِيْبًا قَضَبَهٗ کہ آنحضرت ﷺ جب کسی کپڑے میں صلیب کے نشانات دیکھتے تو اسے قطع کر دیتے۔

سَيْفٌ قَاضِبٌ وَقَضِيْبٌ: قاطع تلوار۔

یہ فعیل بمعنی فاعل ہے اور اس سے پہلی مثال میں بمعنی مفعول اس طرح نَاقَةٌ قَضِيْبٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اونٹوں سے الگ کر لی گئی ہو اور قضیب ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کاٹ کر جدا کر دی گئی ہو اور جو چیز غیر مہذب یعنی کانٹ چھانٹ کر درست نہ کی گئی ہو اسے مقتضب کہا جاتا ہے اور اسی سے اقتضب حديثا کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی فی البدیہہ بات کہنے کے ہیں۔

(ق ض ی)

اَلْقَضَاءُ کے معنی قولا یا عملا کسی کام کا فیصلہ کر دینے کے ہیں اور قضاء قولی وعملی میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں ❸ قضا الٰہی اور قضاء بشری چنانچہ قضا الٰہی کے متعلق فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ﴾ (۱۷۔۲۳) اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

﴿وَقَضَيْنَا اِلٰى بَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ﴾ (۱۷۔۴) اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا...... یہاں قضاء سے مراد قطعی طور پر اطلاع دینے اور حکماً فیصلہ کر دینے کے ہیں۔ یعنی ہم نے انہیں اطلاع دے دی اور وحی کے ذریعہ قطعی طور پر حکم دے دیا تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَقَضَيْنَا اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ﴾ (۱۵۔۶۶) اور ہم نے لوط علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی۔

میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

فعلا قضاء الٰہی کے متعلق فرمایا:

---

❶ قال في الكشاف والقضب الرطبة وفي الصحاح القضبة والقضب الرطب قال بعض الفضلاء القضب هوا المسمى في مصر بالبر سيم الحجازي (الكشاف وذيله، (۴/۷۰۴)

❷ الحديث في الفائق (۲/۱۷۵) و غريب ابي عبيد (۱: ۳۲) و باختلاف الفاظه في ابي داود وعن عائشة راجع كنز العمال (۴: رقم ۲۹۴)

❸ ذكر الفخر (۱۲: ۱۵۳) للفظ القضاء ثلاثة معان (۱) بمعنى الحكم والامر كما في (۱۷۔۲۳) بمعنى الخبر والاعلام (۱۷۔۴) و (۳) بمعنى صفة الفعل اذا تم كما في (۴۱۔۱۲) كذا في البخاري۔

﴿وَاللّٰهُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَقْضُوْنَ بِشَیْءٍ﴾ (۴۰۔۲۰) اور خدا سچائی کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی حکم نہیں دے سکتے۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ﴾ (۴۱۔۱۲)

پھر دو دن میں سات آسمان بنائے......

میں اللہ تعالیٰ کی ایجاد ابداعی اور اس سے فارغ ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسے فرمایا:

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۲۔۱۱۷) وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اور آیت کریمہ: ❶

﴿اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیْنَهُمْ﴾ (۴۲۔۱۴) اگر ایک وقت مقرر تک کے لیے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔

میں قُضِیَ بمعنی فُصِلَ ہے یعنی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور قضا بشری بذریعہ قول، جیسے قَضَی الْحَاکِمُ بِکَذَا: حاکم نے فلاں فیصلہ کیا۔

کیونکہ حاکم ہمیشہ زبان کے ساتھ فیصلہ دیتا ہے اور قضا بشری بذریعہ فعل کے متعلق فرمایا۔ ﴿فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ﴾ (۲۔۲۰۰) پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو۔

﴿ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ﴾ (۲۲۔۲۹) پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں پوری کریں۔

اور نیز فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ﴾ (۲۸۔۲۸) مجھ میں اور آپ میں یہ عہد پختہ ہوا کہ میں جونسی مدت چاہوں پوری کر دوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

﴿فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا﴾ (۳۳۔۳۷) پھر جب زید نے اس سے کوئی حاجت متعلق نہ رکھی۔ ﴿ثُمَّ اقْضُوْا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنَ﴾ (۱۰۔۷۱) پھر وہ کام میرے حق میں کر گزرو۔

یعنی تم میرے متعلق اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا لو۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا﴾ (۲۰۔۷۲) تو آپ کو جو حکم دینا ہو دے دیجیے اور آپ جو حکم دے سکتے ہیں وہ صرف اسی دنیا کی زندگی میں دے سکتے ہیں۔ اور اسی طرح شعر ❷ (الطّویل)

---

❶ زلة من المصحح والصواب الی اجل بدل لولا اجل ۱۲۔

❷ قاله شاعر فی رثاء عمرؓ وتمامه بوائج فی اکما مهالم تفتق وفی روایة بوائق بدل بوائج والشعرمما اختلف فی قائله فنسبه، ابو تمام للشماخ بن ضرار و تابع الحصری فی زهره (٤: ١١٥) وابن دریدفی اشتقاقه (١٩٩) و کذافی اللسان والصحاح (بوج) والبیت لیس فی دیوان شماخ ونسبه الجاحظ فی البیان (٤: ٣٦٤) وابو الطیب فی ابداله (١: ٢٤١) لمزربن زرار الغطفانی اخو الشماخ الاکبر (٦٣١١٠م) وفی الاغانی (٨: ١٠٢) والفائق (١: ٦٢) الی الجن والبیت فی الطبری (١: ٥٠٩) والمشکل للقبتی (٣٤٣) والبحر (١: ٣٥٥) بغیر عز وقال فی ذیل الابدال والصحیح انه لجنزء اخی الشماخ راجع المرزوقی رقم (٣٨٨) والیه نسب ابن درید فی الاشتقاق فی ٢٨٦ وشماخ هذا اسمه معقل بن ضرار راجع لترجمته (الاغانی (٨: ٩٧۔١٠٤) والمؤتلف (١٣٨) و اللالی (٥٨۔٥٩) والخزانة (١: ٥١٦) والشعراء ٢٨٤ والاشتقاق ١٧٤۔

(۳۵۶) قَضَيْتَ اُمُوْرًا ثُمَّ غَادَرْتَ بَعْدَهَا

تم نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے امور سرانجام دیئے۔ پھر اس کے بعد...... چھوڑ دیئے ہیں میں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔

یعنی قضاء قولی بھی اور قضا فعلی بھی۔

اور کبھی قضا سے موت مراد ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے فُلَانٌ قَضٰی نَحْبَهٗ: یعنی اس نے اپنے دنیاوی امور جو اس کے ساتھ مخصوص تھے پورے کر لیے یعنی فوت ہو گیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ﴾ (۳۳۔۲۳) تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں۔

کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ انہوں نے اپنی نذر پوری کر لی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ وہ جان قربان کر دیں گے اور کبھی بھی دشمنوں سے شکست کھا کر نہیں بھاگیں گے مگر بعض نے اس کے معنی فوت ہو جانا بھی کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ﴾ (۶۔۲) پھر مرنے کا ایک وقت مقرر کر دیا اور ایک مدت اس کے ہاں اور مقرر ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اجل اول سے دنیاوی زندگی مراد ہے اور ثانی سے موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا مراد ہے اور ارشاد الٰہی:

﴿یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ﴾ (۶۹۔۲۷) اے کاش موت (ابدالاباد کے لیے میرا کام) تمام کر چکی ہوتی۔

﴿وَنَادَوْا یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ﴾ (۴۳۔۷۷) اور پکاریں گے کہ اے مالک تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔

میں بھی موت سے کنایہ ہے۔ نیز فرمایا:

﴿فَلَمَّا قَضَیْنَا عَلَیْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰی مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ﴾ (۳۴۔۱۴) پھر جب ہم نے ان کے لیے موت کا حکم صادر کیا تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا مگر گھن کے کیڑے سے قَضَی الدَّیْنَ قرض ادا کرنا۔

اور اقتضاء کے معنی قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے هٰذَا یَقْتَضِی كَذَا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿لَقُضِیَ اِلَیْهِمْ اَجَلُهُمْ﴾ (۱۰۔۱۱) تو ان کی عمر کی میعاد پوری ہو چکی ہوتی۔

کے معنی یہ ہیں کہ ان کی دنیاوی زندگی کی میعاد پوری کر دی جاتی۔

قضاء الٰہی قدر (تقدیر) سے اخص ہے۔ کیونکہ قضاء کے معنی تقدیر کو قطعی کر دینے کے ہیں لہٰذا قدر بمعنی تقدیر ہے اور قضاء اس کا فیصلہ کرنے کا نام ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ قدر (بمنزلہ اس چیز کے ہے جو ماپ کے لیے تیار کی گئی ہو) اور قضاء بمنزلہ اپنے کے ہے جیسا کہ مروی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ملک شام سے بوجہ طاعون کے واپسی کا ارادہ کیا تو ابوعبیدہؓ نے کہا[1] (۸۳) اَتَفِرُّ مِنَ الْقَضَاءِ (کیا تم قضاالٰہی سے بھاگ رہے ہو) تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: اَفِرُّ مِنْ قَضَآءِ اللّٰهِ اِلٰی قَدَرِ

---

[1] رواه البخاری (۲ : ۸۵۳) (طبعه هند) من حدیث عبدالله بن عباس وعبدالله بن عامر لکن لفظه نفر من قدر الله الی قدر الله واصل الحدیث متفق علیه۔

اللّٰہِ کہ میں قضا الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں۔تو اس میں تنبیہ ہے کہ تقدیر جب تک قضا کے مرحلہ میں داخل نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے (دعا وغیرہ کے وسیلہ سے) روک دے لیکن جب اللہ تعالیٰ قضا یعنی قطعی فیصلہ کر دے تو کسی حیلہ سے اسے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

﴿وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾ (۱۰-۳۱) اور یہ کام مقرر ہو چکا ہے۔

﴿كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ (۱۹-۷۱) یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔

اور اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَقُضِيَ الْاَمْرُ﴾ (۱۱-۴۴) اور کام تمام کر دیا گیا۔ میں قُضِيَ کے معنی فُصِلَ کے ہیں یعنی قطعی فیصلہ کر دیا گیا کہ اس کی تلافی نہیں ہوسکتی اسی طرح فرمایا:﴿وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا﴾ (۲-۱۱۷) اور جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔

اور ہر وہ قول جس میں نفع یا اثبات قطعی کا حکم پایا جائے اسے قضیۃ کہا جاتا ہے اسی لیے یہ صدق و کذب کے ساتھ متصف ہوتا ہے اور اسی بنا پر بعض نے کہا ہے کہ تجربہ خطرناک امر ہے اور قضاء مشکل یعنی کسی چیز کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ یہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے نہایت ہی مشکل امر ہے حدیث میں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا❶ (۸۴) ((عَلِيٌّ اَقْضَاكُمْ)) کہ علیؓ تم سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

(ق ط ط)

اَلْقِطُّ: حصہ۔حساب کا رجسٹر قرآن پاک میں ہے:﴿وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ (۳۸-۱۶) اور کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہم کو ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔اَلْقِطُّ اصل میں صحیفہ کو کہتے ہیں پھر جو چیز (یعنی حکم وغیرہ) لکھا گیا ہو اور جس چیز میں لکھا گیا ہو دونوں کو قِطٌّ کہنے لگے ہیں اور کبھی صرف اس فیصلہ وغیرہ کو قِطٌّ کہا جاتا ہے جو (کسی چیز پر) لکھا گیا ہو جیسا کہ کلام کو کتاب کہا جاتا ہے اگر چہ وہ لکھی ہوئی نہ ہو۔❷

اصل میں قِطٌّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو عرض میں قطع کی گئی ہو جیسا کہ (اس کے بالمقابل) قِدٌّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو طول میں قطع کی گئی ہو۔ پھر (محاورہ میں) اس معین حصہ کو (بھی) قط کہا جاتا ہے جو کاٹ کر الگ کر لیا گیا ہو چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ میں یہی معنی مراد لیے ہیں۔ مَارَاَيْتُهٗ قَطُّ: میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تو قَطُّ سے خاص زمانہ مراد ہے۔

قَطْنِيْ (اسم فعل) مجھے کافی ہے❸

(ق ط ر)

اَلْقُطْرِ کے معنی جانب اور طرف کے ہیں اس

---

❶ عن ابن عباس فی حدیث مرفوع وفی عبدالرزاق عن قتادة مرسلا وعن انس اخرجه البغوی فی شرح السنة والمصابیح وفی معناه احادیث رواها اصحاب السنن (المقاصد رقم ۱٤۲) وایضا قال عمر فیه رضی الله تعالیٰ عنه علی اقضانا وابیٌّ اقرؤنا (المستدرك ۳/۳۰۵)

❷ وعند اکثر اهل التفسیر المراد منه صحیفة الاعمال وقال قتادة المراد منه نصیب العذاب وعن سعید بن جبیر نصیب من الجنة (راجع الطبری ۲۳/۱۳۵-۱۳٤)

❸ قال فی التنبیه ٦۱-٦۲: تاتی قط بمعنی حسب و کفی تقول: قط عبدالله درهم وقطنی درهم وعند اهل البصرة تکون مضافا الی مابعدها تقول قط عبدالله درهم وحینئذ تکون مخففة ومثقلة واما فی الزمان والعدد فلاتاتی الامثقلة ۱۲۔

کی جمع اقطار ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۵۵۔۳۳) اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ۔ ﴿وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَیْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا﴾ (۳۳۔۱۴) اور اگر فوجیں اطراف مدینہ سے ان پر آ داخل ہوں۔ قَطَرْتُهٗ: کسی کو پہلو پر گرا دینا۔
اسی سے قَطَرَ الْمَطَرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بارش برسنے کے ہیں اور اسی وجہ سے بارش کو قطر کہا جاتا ہے۔
تَقَاطَرَ الْقَوْمُ: لوگ بارش کے قطروں کی طرح پیہم آئے۔ اسی سے اونٹوں کی قطر کو قطار کہا جاتا ہے مثل مشہور ❶ ہے۔
اَلنِّقَاضُ یُقَطِّرُ الْجَلَبَ: یعنی توشہ ختم ہو جائے تو عمدہ اونٹ بھی فروخت کے لیے منڈی میں لائے جاتے ہیں۔
اَلْقَطِرَانُ کے معنی پگھلی ہوئی رال یا گندھک کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔
﴿سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ﴾ (۱۴۔۵۰) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔
ایک قرأت میں قِطْرٍ آنٍ ہے جس کے معنی پگھلے ہوئے گرم تانبے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا﴾ (۱۸۔۹۶) (اب) میرے پاس تانبا لاؤ کہ اس پر پگھلا کر ڈال دوں یہاں قِطْرًا کے معنی پگھلا ہوا تانبا کے ہیں۔

(ق ط ع)

اَلْقَطْعُ کے معنی کسی چیز کو علیحدہ کر دینے کے ہیں خواہ اس کا تعلق حاسۂ بصر سے ہو جیسے اجسام وغیرہ یا بصیرت سے ہو۔ جیسے معنوی چیزیں چنانچہ اسی سے اعضاء کا قطع کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ﴾ (۷۔۱۲۴) میں (پہلے تو) تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسرے طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا۔ ﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا﴾ (۵۔۳۸) اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔
﴿وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ﴾ (۴۷۔۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو انکی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا۔
اور اسی سے قطع ثوب ہے جیسے فرمایا:
﴿فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ﴾ جو کافر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے جائیں گے (۲۲۔۱۹)
اور قطع طریق کے دو معنی آتے ہیں (۱) راستہ طے کرنا (۲) رہزنی کرنا۔ جیسے فرمایا:
﴿اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ﴾ (۲۹۔۲۹) تم کیوں (لذت کے ارادے سے) لڑکوں کی طرف مائل ہوتے اور مسافروں کی رہزنی کرتے ہو۔

---

❶ وفی المطبوع الانفاض والتصویب من الاصول راجع للمثل (جلب) والمشکل للقبتی ٦٦ ومجمع الامثال (٤٢١٨) ومعناه اصلح بالك قبل ان یتطرق الافساد۔ قال فی اللسان (نفض) وکان ثعلب یفتح النون ویقول معناه الجدب لکن فی محاصبه ٣٢٤: قال والنقاض بفتح النون وضمها ١٢۔

یہاں قطع سبیل کے وہی معنی ہیں جس کی طرف کہ آیت ﴿الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۱۹) جو خدا کے رستے سے روکتے ہیں۔اور آیت: ﴿فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ﴾ (۲۹۔۳۸) اور ان کو سیدھے رستے سے روک دیا۔

میں اشارہ فرمایا ہے اور راہ گیروں کو لوٹنے پر قطع اس لیے بولا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ راہ چلنا چھوڑ دیتے ہیں۔تو گویا یہ راستہ کو قطع کرنا ہے قَطْعُ الْمَآءِ بِالسَّبَاحَةِ: پیراکی کے ذریعہ پانی عبور کرنا۔قَطْعُ الْوَصْلِ: تعلق قطع کرلینا۔قَطْعُ الرَّحِمِ: رشتہ کاٹ لینا یا احسان کو روک لینا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ﴾ (۴۷۔۲۲) اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔

﴿وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ﴾ (۲۔۲۷) اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑ رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو قطع کر ڈالتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ لْیَقْطَعْ فَلْیَنْظُرْ﴾ (۲۲۔۱۵) پھر اس سے اپنا گلا گھونٹ لے پھر دیکھے......۔

کے معنی بعض نے رسی کاٹ دینا کیے ہیں تاکہ وہ زمین پر گر پڑے اور بعض نے کہا ہے کہ گلے میں پھانسی ڈال کر زندگی کو قطع کر دینا مراد ہے اور یہی معنی حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں۔

قَطْعُ الْاَمْرِ: کے معنی کسی کام کا فیصلہ کرنے کے ہیں اسی سے فرمایا:

﴿مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا﴾ (۲۷۔۳۲) میں کسی کام کو فیصل کرنے والی نہیں۔اور آیت کریمہ۔

﴿لِیَقْطَعَ طَرَفًا﴾ (یہ خدا نے) اس لیے (کیا) کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک...... کر دے۔

کے معنی کفار کی ایک جماعت کو ہلاک کر دینے کے ہیں قَطَعَ دَابِرَ الْاِنْسَانِ کے معنی نوع انسانی کو فنا کر دینے کے ہیں۔چنانچہ فرمایا:

﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۶۔۴۵) غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔

﴿اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِیْنَ﴾ (۱۵۔۶۶) تو ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۱۱۰) مگر یہ کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں۔

میں تقطع قلوب سے مر جانا مراد ہے اور یا اس سے مراد ایسی توبہ کرنے کے ہیں کہ اپنی کوتاہیوں پر ندامت کی وجہ سے انسان کا دل پارہ پارہ ہو جائے۔قِطْعٌ مِّنَ اللَّیْلِ کے معنی رات کے ایک حصہ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّیْلِ﴾ (۱۱۔۸۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

اَلْقَطِیْعُ: بکریوں کا ریوڑ۔جمع قُطْعَانٌ۔

یہ معنی قطع سے مشتق ہے جیسا صِرْمَةٌ اور فِرْقَةٌ وغیرہ الفاظ کے معنی جماعت کے آتے ہیں اور ان میں قطع کا معنی پایا جاتا ہے۔

اَلْقَطِیْعُ کے معنی کوڑا بھی آتے ہیں۔محاورہ ہے: اَصَابَ بِئْرَهُمْ قُطْعٌ: (گرمی کی وجہ سے) ان کے

کنویں کا پانی ختم ہو گیا۔
مَقَاطِعُ الْاَوْدِیَةِ: وادیوں کے سرے۔

(ق ط ف)

قَطَفْتُ (ض) اَلثَّمْرَةَ قَطْفًا کے معنی پھل چنا کے ہیں اور درخت سے توڑے ہوئے پھل کو قِطْفٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع قُطُوْفٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ﴾ (۶۹۔۲۳) جن کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے۔
قَطَفَتِ الدَّابَّةُ قَطْفًا: جانور کا آہستہ چلنا اور ایسے جانور کو قطوف کہا جاتا ہے اور جانور کے متعلق اس کا استعمال صرف تشبیہ اور استعارہ کے طور پر ہوتا ہے۔ یعنی دابۃ کو قَاطِفٌ (پھل چننے والا) کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے جیسا کہ نقص کے ساتھ کوئی چیز متصف ہوتی ہے۔ وَقَدْ تقدم ذکرہ۔ اَقْطَفَ الْكَرْمُ: انگور چننے کا موسم قریب آ گیا۔ اور جو انگور پک کر زمین پر گر پڑیں انہیں قِطَافَة کہا جاتا ہے اور یہ قِفَايَة کی طرح ہے۔

(ق ط م ر)

اَلْقِطْمِيْرُ: (نقطہ سپید بر پشت دانہ کہ خرما از وے روید) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ﴾ (۳۵۔۱۳) اور جن لوگوں کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے نقطہ سپید کے برابر بھی تو کسی چیز کے مالک نہیں۔
قِطْمِيْرٌ: کے معنی اس ہلکے سے سپید نقطہ کے ہیں جو گٹھلی پر ہوتا ہے۔ یہ حقیر اور بے قدر چیز کے لیے ضرب المثل ہے۔

(ق ط ن)

اَلْيَقْطِيْنُ: گیاہ بے ساق مثل درخت کدو وماند آں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ﴾ (۳۷۔۱۴۶) اور ان پر ہم نے کدو کا درخت اگایا۔
اَلْقُطْن: روئی۔ قَطَنُ الْحَيَوَان: میانِ دوران۔

(ق ع د)

اَلْقُعُوْدُ: یہ قِيَامٌ (کھڑا ہونا) کی ضد ہے۔ اس سے قَعْدَةٌ صیغہ مرۃ ہے یعنی ایک بار بیٹھنا اور قِعْدَةٌ (بکسرہ قاف) بیٹھنے کی حالت کو کہتے ہیں اور اَلْقُعُوْدُ قَاعِدٌ کی جمع بھی ہے جیسے فرمایا: ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا﴾ (۴۔۱۰۳) تو کھڑے اور بیٹھے...... ہر حال میں خدا کو یاد کرو۔
﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا﴾ (۳۔۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے...... ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔
اَلْمَقْعَدُ کے معنی جائے قیام کے ہیں اس کی جمع مقاعد ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۵۴۔۵۵) (یعنی) پاک مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔ یعنی نہایت پر سکون مقام میں ہوں گے اور آیت کریمہ:
﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (۳۔۱۲۰) لڑائی کے لیے مورچوں پر، میں لڑائی کے مورچے مراد ہیں جہاں سپاہی جم کر لڑتے ہیں اور کبھی کسی کام میں سستی کرنے والے کو بھی قاعد کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ﴾ (۴۔۹۵) جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھ رہتے ہیں اور لڑنے سے جی چراتے ہیں) ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے۔

اسی سے رَجُلٌ قُعَدَۃ ضُجَعَۃٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی بہت کاہل اور بیٹھے رہنے والے آدمی کے ہیں نیز فرمایا۔
﴿فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (۴۔۹۵) خدا نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجے میں فضیلت بخشی ہے۔
اور کبھی قَعَدَ لَہٗ کے معنی کسی چیز کے لیے گھات لگا کر بیٹھنے اور انتظار کرنے کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (۷۔۱۶) میں بھی سیدھے رستے پر...... بیٹھوں گا۔ نیز فرمایا:
﴿اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (۵۔۲۴) ہم یہیں بیٹھیں رہیں گے یعنی یہاں بیٹھ کر انتظار کرتے رہیں گے۔ اور آیت کریمہ ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ﴾ (۵۰۔۱۷) جو دائیں بائیں بیٹھے ہیں۔
میں قَعِیْدٌ سے مراد وہ فرشتہ ہے جو (ہر وقت اعمال کی) نگرانی کرتا رہتا ہے اور انسان کے اچھے برے اعمال (اس کے نامہ اعمال میں) درج کرتا رہتا ہے یہ واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ نیز جو وحشی جانور پیچھے سے آتا ہے اور اس سے برا شگون لیا جاتا ہے اسے بھی قَعِیْدٌ کہا جاتا ہے اور یہ نَطِیْحٌ کی ضد ہے۔

قَعِيْدَكَ اللّٰهُ وَقِعْدَكَ اللّٰهُ: یعنی میں اللہ تعالیٰ سے تیری حفاظت کا سوال کرتا ہوں۔
اَلْقَاعِدَۃُ: وہ عورت جو عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے، نکاح اور حیض کے قابل نہ رہی ہو۔ اس کی جمع قَوَاعِدُ ہے [1] چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ (۲۴۔۶۰) اور بڑی عمر کی عورتیں۔
اور مُقْعَدٌ اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہو اور اپاہج آدمی جو چل پھر نہ سکے اسے بھی مُقْعَدٌ کہہ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مجازاً مینڈک کو بھی مُقْعَدٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مُقْعَدَات ہے اور ابھری ہوئی چھاتی پر ثَدْیٌ مُقْعَدٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور کنایۃ کے طور پر کمینے اور خسیس اطوار آدمی پر بھی مُقْعَدٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔ [2] قَوَاعِدُ الْبِنَاءِ: عمارت کی بنیادیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ (۲۔۱۲۷) اور جب ابراہیم علیہ السلام...... بیت اللہ کی بنیادی اونچی کر رہے تھے۔
قَوَاعِدُ الْهَوْدَجِ (چوکھٹا) ہودے کی لکڑیاں جو اس کے بمنزلہ بنیاد کے ہوتی ہیں۔

(ق ع ر)

قَعْرُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کی گہرائی کی انتہا کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ﴾ (۵۴۔۲۰) کہ

---

[1] بل القاعد بغيرها ويقال: قعدت عن المحيض فهي قاعد دراجع اضداد ابي الطيب (۵۸۳) والجمع القواعد ۱۲.
[2] هٰهُنَا القواعد جمع قاعدة و في صفة المروة جمع قاعد بغيرها.

گویا کھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔
میں نخل منقعر سے کھجور کے وہ درخت مراد ہیں جن کی جڑیں زمین کی گہرائی تک چلی گئی ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ اِنْقَعَرَتِ الشَّجَرَۃُ کے معنی درخت کے زمین کی گہرائی سے اکھڑ جانے کے ہیں اور بقول بعض اس کے معنی زمین کی گہرائی تک چلے جانے کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح زمین کی گہرائی تک چلے جانے والے نخلۃ کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا یہی مثال ان لوگوں کی ہے کہ ان کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔
قَصْعَۃٌ قَعِیْرَۃٌ: گہرا پیالہ۔قَعَّرَ فُلَانٌ فِیْ کَلَامِہٖ: حلق سے آواز نکالنا جیسا کہ جبڑے سے آواز نکالنے کو شَدَّقَ کہا جاتا ہے۔

(ق ف ل)

اَلْقُفْلُ: تالا جمع۔اَقْفَالٌ محاورہ ہے:
اَقْفَلْتُ الْبَابَ: میں نے دروازے کو قفل لگا دیا اور تمثیل کے طور پر ہر اس چیز کو قفل کہا جاتا ہے جو کسی کام سے مانع اور رکاوٹ بنے۔چنانچہ محاورہ ہے۔فُلَانٌ مُقْفَلٌ عَنْ کَذَا: فلاں کو اس کام سے روک دیا گیا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا﴾ (۴۷۔۲۴) یا انکے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔
اور کنجوس آدمی کو جس طرح مغلول الیدین کہا جاتا ہے اسی طرح مَقْفُوْلُ الْیَدَیْنِ بھی کہہ دیتے ہیں۔
اَلْقُفُوْلُ: سفر سے واپس لوٹنا اور سفر سے واپس آنے والی جماعت کو قافلہ کہا جاتا ہے۔
اَلْقَفِیْلُ: خشک چیز کو کہتے ہیں اس لیے کہ خشک ہونے کی وجہ سے اس کے اجزاء ایک دوسرے کی طرف لوٹ آتے ہیں اور یا اس لیے کہ صلابت کی وجہ سے گویا اس پر قفل لگ جاتا ہے۔محاورہ ہے:
قَفَلَ النَّبَاتُ: نباتات خشک ہوگئی۔
قَفَلَ الْفَحْلُ: مستی سے سانڈھ کا دبلا ہو جانا۔

(ق ف و)

اَلْقَفَا کے معنی گدی کے ہیں اور قَفَرْتُہٗ کے معنی کسی کی گدی پر مارنا اور کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔یہ دونوں محاورے استعمال ہوتے ہیں قَفَوْتُ اَثَرہ وَاقْتَفَیْتُہٗ کے معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں دوسرے کا مصدر اِقْتِفَاء ہے۔جس کے اصل معنی کسی کی قفا کا اتباع کرنے کے ہیں۔لیکن کنایہ کے طور پر کسی کی غیبت اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ﴾ (۱۷۔۳۶) اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔
یعنی محض قیافہ اور ظن سے کام نہ لو بعض کے نزدیک قیافہ کا لفظ بھی اقتفاء سے مقلوب ہے۔جیسے جَذَبَ وَجَبَذَ اور یہ (قیافہ) ایک فن ہے۔اور قَفَّیْتُہٗ کے معنی کسی کو دوسرے کے پیچھے لگانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ﴾ (۲۔۸۷) اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیجتے رہے۔
اَلْقَافِیَۃُ: مصرعہ کے جز آخیر کو کہا جاتا ہے۔جس کے حرف روی کی ہر شعر میں رعایت رکھی جاتی ہے۔
اَلْقَفَاوَۃُ: وہ کھانا جس سے مہمان کی آؤ بھگت کی جائے۔

(ق ل ل)

اَلْقِلَّةُ وَالْکثرۃ: بلحاظ اصل وضع کے صفات عدد سے ہیں جیسا کہ عِظَم اور صِغَر صفات اجسام سے ہیں بعدہ کثرت وقلت اور عظم وصغر میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ بطور استعارہ استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَآ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۳۳۔۶۰) پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔

میں قَلِیْلًا سے عرصہ قلیل مراد ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۷۳۔۲) رات کو قیام کرو، مگر تھوڑی رات۔

﴿وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۳۳۔۱۶) اور اس وقت تم بہت ہی کم فائدہ اٹھاؤ گے۔

﴿نُمَتِّعُهُمْ قَلِیْلًا﴾ (۱۳۔۲۴) ہم ان کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے۔

اور آیت کریمہ:

﴿مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۳۳۔۲۰) تو لڑائی نہ کریں مگر کم۔

قَلِیْلًا مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی قتاًلا قَلِیْلًا اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۱۵۔۱۳) اور تھوڑے آدمیوں کے سوا ہمیشہ ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔

قَلِیْلًا سے مراد تھوڑی سی جماعت اور یہی معنی آیت کریمہ:

﴿اِذْ یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا﴾ (۸۔۴۳) اس وقت خدا نے تمہیں خواب میں کافروں کو تھوڑی تعداد میں دکھایا:

﴿وَیُقَلِّلُكُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ﴾ (۸۔۴۴) اور کافروں کو تمہاری نظروں میں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا، میں مراد ہے اور شاعر کے قول [1] (السریع)

(۳۵۷) وَلَسْتَ بِالْاَکْثَرِ مِنْهُ حَصًا
وَاِنَّمَا الْعِزَّةُ لِلْكَاثِرِ

اور تم تعداد میں ان سے زیادہ نہیں ہو اور عزت صرف کثیر التعداد کے لیے ہے۔

کے پیش نظر کبھی قلت کا لفظ بطور کنایہ ذلت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔ ﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِیْلًا فَكَثَّرَكُمْ﴾ (۷۔۸۶) اس وقت کو یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے تو خدا نے تم کو جماعت کثیر بنا دیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ﴾ (۳۴۔۱۳) اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہیں۔ اور آیت:۔

﴿وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ﴾ (۳۸۔۲۴) اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

میں قلیل کا لفظ بطور عزت واحترام کے استعمال ہوا ہے اس لیے کہ جتنی کوئی چیز زیادہ عزیز القدر ہو اتنی ہی کمیاب ہوتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۱۷۔۸۵) اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مَآ اُوْتِیْتُمْ سے مستثنیٰ ہو

---

[1] قاله الاعشی المیمون وفی روایة فیهم، بدل منه والبیت فی التاج واللسان (کثر) راجع تخریجه (ك ث ر)

یعنی تم میں سے بہت لوگ ایسے ہیں جنہیں اس کا علم دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ قَلِیْلاً مصدر محذوف کی صفت ہو یعنی تمہیں اس کے متعلق علم قلیل (تھوڑا سا علم) دیا گیا ہے۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلاً﴾ (۲۔۴۱) اور میری آیتوں (میں تحریف کر کے ان) کے بدلے تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) نہ حاصل کرو۔

میں قلیل سے مراد دنیوی مال ومتاع ہے کیونکہ دنیوی مال و متاع خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں جو حق تعالیٰ نے متقین کے لیے تیار کی ہیں، نہایت ہی حقیر ہے اسی بناء پر فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ﴾ (۴۔۷۷) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے۔

اور کبھی قلیل کا لفظ بول کر نفی کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ جیسے قَلَّمَا یَفْعَلُ فُلَانٌ بِکَذَا: کہ فلاں ایسا کام نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ نفی کی طرح اس کے بعد بھی استثناء لانا صحیح ہوتا ہے جیسے قَلَّمَا یَفْعَلُ کَذَا اِلَّا قَاعِدًا اَوْ قَائِمًا اَوْمَا یَجْرِیْ مَجْرَاہُ۔ اور بعض نے آیت کریمہ: ﴿قَلِیْلًا مَا تُؤْمِنُوْنَ﴾ (۷۰۔۴۱) لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔

کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی وہ ایمان ہی نہیں لاتے'' اور بعض نے اس کے معنی تُؤْمِنُوْنَ اِیْمَانًا قَلِیْلًا کیے ہیں۔ یعنی وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں اور ایمان قلیل سے مراد صرف زبان کے ساتھ اقرار اور سطحی سی معرفت حاصل کرنے کے ہیں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُشْرِکُوْنَ﴾ (۱۲۔۱۰۶) اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

اَقْلَلْتُ کَذَا کے معنی کسی چیز کو ہلکا پانے کے ہیں کبھی یہ ہلکا سمجھنا محض حکمی ہوتا ہے۔ اَقْلَلْتُ مَا اَعْطَیْتَنِیْ یعنی میں نے تمہارے دیئے ہوئے کو حقیر سمجھا اور کبھی اس شے کی قوت کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا﴾ (۷۔۵۷) جب وہ بھاری بادلوں کو اٹھا لاتی ہے۔ یہاں اقلت کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔ کہ وہ بادل جن کو اٹھا کر لاتی ہے اگرچہ فی نفسہ بھاری ہوتے ہیں مگر ہوا کی قوت کے اعتبار سے نہایت ہلکے ہیں۔ اِسْتَقْلَلْتُہٗ: کسی چیز کو حقیر خیال کرنا جیسے اِسْتَخْفَفْتُہٗ: کسی چیز کو ہلکا خیال کرنا۔ اَلْقُلَّۃُ: ہر چیز کا بالائی حصہ۔ اور قُلَّۃُ الْجَبَلِ: پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں کیونکہ باقی پہاڑ کے مقابلہ میں وہ قلیل سی ہوتی ہے۔

تَقَلْقَلَ الشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے مضطرب ہونے کے ہیں اور تَقَلْقَلَ الْمِسْمَارُ (میخ کا مضطرب ہونا) قَلْقَلَۃ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی حرکت کی آواز کو حکایت کرنے کے ہیں۔

(ق ل ب)

قَلْبُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف قَلْبُ الثَّوْبِ: پلٹنے کے ہیں۔ (کپڑے کو الٹنا) اور قَلْبُ الْاِنْسَانِ کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاِلَیْہِ تُقْلَبُوْنَ﴾ (۲۹۔۲۱) اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اَلْاِنْقِلَابُ کے معنی پھر جانے کے ہیں ارشاد ہے۔

﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (۳-۱۴۴) اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا۔
﴿اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ﴾ (۲۶-۵۰) ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔
﴿اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ (۲۶-۲۲۷) کہ کونسی جگہ لوٹ جاتے ہیں۔
﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ﴾ (۸۳-۳۱) اور جب اپنے گھر کو لوٹتے تو اتراتے ہوئے لوٹتے۔
بعض نے کہا ہے کہ انسان کے دل کو بھی قلب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کثرت سے الٹتا پلٹتا رہتا ہے اور قلب کا لفظ بول کر اوصاف قلبی مراد لیے جاتے ہیں جیسے علم، شجاعت، روح وغیرہ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ (۳۳-۱۰) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔ میں قلوب سے ارواح مراد ہیں اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾ (۵۰-۳۷) جو شخص دل (آگاہ) رکھتا ہے...... اس کے لیے اس میں نصیحت ہے۔
میں قلب سے مراد علم وفہم ہے۔ نیز فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ﴾ (۶-۲۵) اور ہم نے ان کے دلوں پر تو پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کو سمجھ نہ سکیں۔
﴿طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ (۹-۸۷) ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے تو یہ سمجھتے ہی نہیں اور آیت کریمہ:
﴿وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ﴾ (۳-۱۲۶) اس لیے کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی ہو۔
میں قلوب کے مطمئن ہونے سے ان میں بہادری کا ثابت ہونا اور خوف کا زائل ہونا مراد ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس خوف کے طاری ہونے کے متعلق فرمایا:
﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (۳۳-۲۶) اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔
اور آیت کریمہ:۔
﴿ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ﴾ (۳۳-۵۳) یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے بہت پاکیزگی کی بات ہے۔
میں اَطْهَرُ سے جالب عفت ہونا مراد ہے۔ نیز فرمایا:۔
﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۸-۴) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔
اور آیت کریمہ: ﴿وَقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى﴾ (۵۹-۱۴) مگر ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔
میں شتی کے معنی متفرق ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (۲۲-۴۶) بلکہ دل۔ جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ قلوب سے مراد عقلیں ہیں اور بعض نے روحیں مراد لی ہیں۔ لیکن عقل کبھی اندھی نہیں ہوتی لہٰذا تَعْمٰى کی قلوب کی طرف نسبت مجازی ہوگی جیسا کہ آیت کریمہ ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (۲-۱۲۵!) میں (مجازا) جاری ہونے کی نسبت انہار کی

طرف کی گئی ہے حالانکہ انہار جاری نہیں ہوتیں بلکہ ان میں پانی جاری ہوا کرتا ہے۔تَقْلِيْبُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کی حالت کو متغیر کر دینے کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ (۳۳۔۶۶) جس دن ان کے منہ آگ میں الٹائیں جائیں گے۔اور تَقْلِيْبُ الْاُمُوْرِ کے معنی کسی کام کی تدبیر اور اس میں غور وفکر کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ﴾ (۹۔۴۸) اور بہت سی باتوں میں تمہارے لیے الٹ پھیر کرتے رہے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کے دلوں اور بصیرتوں کو پھیر دینے سے ان کی آراء کو تبدیل کر دینا مراد ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ﴾ (۶۔۱۱۰) اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے۔

اور تَقْلِيْبُ الْيَدِ پشیمانی سے کنایہ ہوتا ہے۔کیونکہ عام طور پر نادم آدمی کا یہی حال ہوتا ہے (کہ وہ اظہار ندامت کے لیے اپنے ہاتھ ملنے لگ جاتا ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ﴾ (۱۸۔۴۲) تو.......... (حسرت سے) ہاتھ ملنے لگا۔

شاعر نے کہا ہے❶ ( )

(۳۵۸) كَمَغْبُوْنٍ يَعَضُّ عَلٰى يَدَيْهِ
تَبَيَّنَ غِبْنُهٗ بَعْدَ الْبِيَاعِ

جیسے خسارہ اٹھانے والا آدمی تجارت میں خسارہ معلوم کر لینے کے بعد اپنے ہاتھ کاٹنے لگتا ہے۔اور تقلب (تفعل) کے معنی پھرنے کے ہیں۔ارشاد ہے:۔

﴿وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ﴾ (۲۶۔۲۱۹) اور نمازیوں میں تمہارے پھرنے کو بھی۔

﴿اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ﴾ (۱۶۔۴۶) یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے وہ (خدا کو) عاجز نہیں کر سکتے۔

رَجُلٌ قُلَّبٌ: بہت زیادہ حیلہ گر اور ہوشیار آدمی جو معاملات میں الٹ پھیر کرنے کا ماہر ہو اَلْقُلَابُ: دل کی ایک بیماری (جو اونٹ کو لگ جاتی ہے)

مَابِهٖ قَلْبَةٌ: یعنی وہ تندرست ہے اسے کسی قسم کا عارضہ نہیں ہے جو پریشانی کا موجب❷ ہو اَلْقَلِيْبُ۔ پرانا کنواں جو صاف نہ کیا گیا ہو۔اَلْقُلْبُ: ایک خاص قسم کا کنگن۔

(ق ل د)

اَلْقَلْدُ کے معنی رسی وغیرہ کو بل دینے کے ہیں۔ جیسے قَلَدْتُ الْحَبْلَ: (میں نے رسی بٹی) اور بٹی ہوئی رسی کو قَلِيْدٌ یا مَقْلُوْدٌ کہا جاتا ہے اور قلادۃ اس بٹی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو گردن میں ڈالی جاتی ہے جیسے ڈور اور چاندی وغیرہ کی زنجیر اور مجازاً تشبیہ کے طور پر ہر اس چیز کو جو گردن میں ڈالی جائے یا کسی چیز کا احاطہ کرے قِلَادَةٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے تَقَلَّدَ سَيْفَهٗ کا محاورہ ہے۔کیونکہ وہ بھی قلادۃ کی طرح گردن میں ڈال کر لٹکائی جاتی ہے۔ جیسے وشاح (ہار) سے توشح بہ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور قَلَّدْتُهٗ سَيْفًا کے معنی کسی کی گردن میں تلوار باندھنے یا تلوار سے اس کی گردن مارنے کے ہیں۔قَلَّدْتُهٗ عَمَلًا کوئی کام کسی کے ذمہ لگا دینا۔

---

❶ قاله قيس بن ذريح والبيت في اللسان (بيع) وفي محاضرات الادباء (۳/۱۰۰۔۱۰۱) في ثلاثة بغير عزو ۱۲۔
❷ انظر ادب الكاتب (۱۲۴۳)

قَلَّدْتُهٗ هِجَاءً: کسی پر ہجو کو لازم کر دینا اور آیت کریمہ:
﴿لَہٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۳۹۔۶۳) اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں۔ میں مقالید سے مراد وہ چیز ہے جو ساری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بعض نے اس سے خزانے اور بعض نے کنجیاں مراد لی ہیں لیکن ان سب سے اللہ تعالیٰ کی اس قدرت اور حفاظت کی طرف اشارہ ہے، جو تمام کائنات پر محیط ہے۔

(ق ل م)

اَلْقَلْمُ: (مصدر ض) اس کے اصل معنی کسی سخت چیز کو تراشنے کے ہیں۔ اس لیے ناخن، بانس کی گرہ اور سرکنڈے وغیرہ کے تراشنے پر قَلْمٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور تراشیدہ چیز کو قِلْم کہا جاتا ہے تو قِلْمٌ بمعنی مقلوم ہے جیسے نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ آتا ہے۔

اور (عرف میں) خاص کر لکھنے کے آلہ اور قرعہ اندازی کے تیر پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَقْلَامٌ ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ (۶۸۔۱) قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔
﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ﴾ (۳۱۔۲۷) اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ (۳۔۴۴) جب وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے۔
میں اَقْلَامٌ سے قرعہ اندازی کے تیر مراد ہیں۔ [1]

اور آیت کریمہ:
﴿اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (۹۶۔۴) جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔
میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ انسان کو کتابت کی تعلیم دینا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے اور جو حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ جبریل علیہ السلام سے وحی اخذ کرتے تھے اور جبریل میکائیل سے، وہ اسرافیل سے اور اسرافیل لوح محفوظ سے اور لوح محفوظ قلم سے۔ تو یہاں قلم سے سر الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی تحقیق کا یہاں موقع نہیں ہے۔
اَلْاَقْلِيْمُ: ربع مسکون کا ساتواں حصہ۔ علماء ہیئت کی تحقیق کے مطابق زمین کے سات حصے ہیں۔ اور ہر حصہ پر اقلیم کا لفظ بولتے ہیں اس کی جمع اَقَالِيْمُ ہے۔

(ق ل ی)

اَلْقِلٰی کے معنی شدت بغض کے ہیں قَلَاهُ (ماضی) اور يَقْلِيْهِ وَيَقْلُوْهُ مضارع دونوں طرح آتا ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾ (۹۳۔۳) (اے محمد ﷺ) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔
﴿اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۶۸) میں تمہارے کام کا سخت دشمن ہوں۔
اگر اسے واوی قَلْوٌ سے مشتق مانا جائے جس کے معنی (رَمْیٌ کے ہیں تو یہ قَلَتِ النَّاقَةُ بِرَاكِبِهَا قَلْوًا۔

---

[1] كذا قال عطاء ونقل عن ابن عباس ومجاهد وابن جريج ان المراد بها الاقلام التي كانو يكتبون بها التوراة وكانت من نحاس. انظر الفيوضات الالهية (ص۳۱۸ ج او الطبري (ص۲۴۳ ج۳)۔

(ناقہ نے سوار کو گرا دیا) وَقَلَوْتُ بِالْقُلَّةِ (میں نے گلی کو پھینکا) وغیرہا محاورات سے مشتق ہوگا۔ اور جس چیز سے دل بوجہ بغض یا ناپسندیدہ ہونے کے اس طرح گھن کھائے گویا اسے پھینک رہا ہے تو اسے مَقْلُوْ کہا جائے گا۔ اور اگر ناقص یائی سے مشتق مانا جائے تو یہ قَلَيْتُ الْبُسْرَ وَالسَّوِيْقَ عَلَى الْمِقْلَاةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی مِقْلَاة (فرائی پین) میں کھجور اور ستو ڈال کر تلنے کے ہیں۔

(ق م ح)

اَلْقُمْحُ: خلیل نے کہا ہے کہ قَمْحٌ اس گیہوں کو کہتے ہیں جو پکنے کے وقت سے لے کر ذخیرہ اندوزی تک بالی کے اندر ہی رکھا جائے اور اس گیہوں سے جو ستو بنایا جاتا ہے اسے قَمِيْحَة کہا جاتا ہے۔

(اور ستو کی مناسبت سے) کوئی چیز پھانکنے کے لیے سر اوپر اٹھانے کو اَلْقَمْحُ (ف) کہتے ہیں۔ پھر محض سر اٹھانے پر (خواہ کسی وجہ سے ہو قَمَحَ کہا جانے لگا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے قَمَحَ الْبَعِيْرُ: اونٹ نے (سیری کے بعد حوض سے) سر اوپر اٹھا لیا اَقْمَحْتُ الْبَعِيْرَ: میں نے اونٹ کا سر اونچا کر کے پچھلی جانب باندھ دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ﴾ (۳۶۔۸) تو انکے سر الٹ رہے ہیں۔ میں تشبیہ اور تمثیل کے طور پر ان کو مُقْمَحُوْنَ کہا گیا ہے۔ اور اس سے مقصود قبول حق سے ان کی سرتابی اور سرکشی اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے ان کے انکار کو بیان کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قیامت کے دن ان کی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ آیت ﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ﴾ (۴۰۔۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی۔ میں پایا جاتا ہے۔

(ق م ر)

اَلْقَمَرُ: چاند جب پورا ہو رہا ہو تو اسے قمر کہا جاتا ہے اور یہ حالت تیسری رات کے بعد ہوتی ہے۔ بعض نے کہا کہ چاند کو قَمَر اس لیے کہا جاتا ہے وہ ستاروں کی روشنی کو خیرہ کر دیتا ہے اور ان پر غالب آ جاتا ہے [1] قرآن پاک میں ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ (۱۰۔۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا۔

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ﴾ (۳۶۔۳۹) اور چاند کی (بھی) ہم نے منزلیں مقرر کر دیں۔

﴿وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ (۵۴۔۱) اور چاند شق ہو گیا۔

﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا﴾ (۹۱۔۲) اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے۔

﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ﴾ (۷۴۔۳۲) ہاں ہاں (ہمیں) چاند کی قسم۔

اَلْقَمْرَاءُ: چاند کی روشنی۔ چاندنی۔ تَقَمَّرْتُ فُلَانًا چاندنی رات میں کسی کے پاس جانا۔

قَمِرَتِ الْقِرْبَةُ: چاند کی روشنی سے پانی کی مشک خراب ہوگئی۔

حِمَارٌ اَقْمَرُ: چاند کے رنگ۔ یعنی سبزی مائل سفید رنگ کا گدھا۔

قَمَرْتُ فُلَانًا كَذَا میں نے فلاں کو اس چیز سے دھوکا دیا۔

---

[1] يقال قمره اى غلب عليه فى القمار

(ق م ص)

اَلْقَمِيْصُ: قمیص۔کرتہ جمع قُمُصٌ وَاَقْمِصَةٌ وَقُمْصَانٌ: قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ﴾ (۱۲:۲۶) اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو۔ ﴿وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ﴾ (۱۲۔۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

تَقَمَّصَهٗ قمیص پہننا۔ قَمَصَ (ن۔ض) اَلْبَعِيْرُ اونٹ کا جست کرنا۔

اَلْقُمَاصُ: اونٹ کا ایک مرض جو اسے چین سے کھڑا ہونے نہیں دیتا اور اسی سے لفظ قَامِصَةٌ ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے[1] (۸۵)

(ق م ط ر)

اَلْقَمْطَرِيْرُ: سخت۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا﴾ جو (چہروں کو) کریہہ المنظر اور (دلوں کو) سخت (مضطر) کردینے والا۔(۷۶۔۱)

قَمْطَرِيْرٌ ایک لغت میں قماطیر بھی ہے۔

(ق م ع)

اَلْمَقَامِعُ (مفرد مِقْمَعٌ) ہتھوڑے۔قرآن پاک میں ہے:

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ﴾ (۲۲۔۲۱) اور ان (کے مارنے ٹھوکنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔

مَقَامِعُ کا واحد مِقْمَعٌ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے پیٹ پیٹ کر کسی کو مطیع اور مقہور کیا جائے اسی سے محاورہ ہے۔

قَمَعْتُهٗ فَانْقَمَعَ: میں نے اسے روکا تو وہ رک گیا۔اور

اَلْقَمَعُ وَالْقِمْعُ (قیف) وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی (سیال) چیز (بوتل وغیرہ میں) ڈالی جائے۔تاکہ نیچے نہ گرنے پائے۔حدیث میں ہے[2] (۸۶)

((وَيْلٌ لِاَقْمَاعِ الْقَوْلِ)) یعنی ان پر افسوس ہے جو اپنے کان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے قیفیں بنائے رکھتے ہیں یعنی دوسروں کی باتیں سننے کے درپے رہتے ہیں۔

اَلْقَمَعُ: ذباب ازرق کیونکہ اسے مار کر دور بھگایا جاتا ہے

تَقَمَّعَ الْحِمَارُ: گدھے کا مکھی کو دور ہٹانا۔

(ق م ل)

اَلْقُمَّلُ: چھوٹی مکھیاں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ﴾ (۷۔۱۳۳) اور چھوٹی مکھیاں، مینڈک اور خون۔

اَلْقَمْلُ: کے معنی ہیں۔جوں اور رَجُلٌ قَمِلٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے جوئیں پڑ جائیں اور اسی سے چھوٹے سے بدصورت مرد یا عورت کو قَمِلٌ یاقَمِلَةٌ کہا جاتا ہے گویا وہ جوں یا چھوٹی مکھی کی طرح ہے۔

(ق ن ت)

اَلْقُنُوْتُ: (ن) کے معنی خضوع کے ساتھ اطاعت کا التزام کرنے کے ہیں اس بنا پر آیت کریمہ:۔

﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (۲۔۲۳۸) اور خدا کے آگے

---

[1] روی عن علی انه قضی فی القارصة والقامصة والو اقصة بالدیة اثلاثا راجع للقصة النهایة۔

[2] الکلمة من الحدیث الفائق (۲/۱۸٤) والنهایة (قمع) قال فی الفائق معناه ای لا ینجع فیهم الوعظ کالا قماع التی لا تعی شیئا مما یفرغ فیها ۱۲۔

ادب سے کھڑے رہا کرو۔

میں بعض نے قانتین کے معنی طائعین کیے ہیں ❶ یعنی اطاعت کی حالت میں اور بعض نے خاضعین یعنی خشوع اور خضوع کے ساتھ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ (۲۔۱۱٦) سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ میں بعض نے قٰنِتُوْنَ کے معنی خَاضِعُوْنَ کیے ہیں اور بعض نے طَائِعُوْنَ (فرمانبردار) اور بعض نے سَاکِتُوْنَ یعنی خاموش اور چپ چاپ اور اس سے بالکل خاموش ہو کر کھڑے رہنا مراد نہیں بلکہ عبادت گزاری میں خاموشی سے ان کی مراد یہ ہے جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ❷ ۔(۸۷)

''کہ نماز تلاوت قرآن اور اللہ کی تسبیح وتحمید کا نام ہے اور اس میں کسی طرح کی انسانی گفتگو جائز نہیں ہے۔'' اسی بنا پر جب آپ سے پوچھا گیا کہ کونسی نماز افضل ہے تو آپ نے فرمایا ❸ (۸۸) ((طُوْلُ الْقُنُوْتِ)) یعنی عبادت میں ہمہ تن مصروف ہو جانا اور اس کے ماسوا سے توجہ پھیر لینا قرآن پاک میں ہے ﴿اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا﴾ (۱٦۔۱۲۰) بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام (لوگوں کے) امام اور (خدا کے) فرمانبردار تھے۔ اور مریم علیہا السلام کے متعلق فرمایا ﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِیْنَ﴾ (٦٦۔۱۲) اور فرمانبرداروں میں سے تھیں۔

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا﴾ (۳۹۔۹) یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے۔

﴿اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ﴾ (۳۔۴۳) اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرنا۔

﴿وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (۳۳۔۳۱) اور جو تم میں سے خدا اور اس کے رسول کی فرمانبردار رہے گی۔

﴿وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ﴾ (۳۳۔۳۵) اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں۔

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾ (۴۔۳۴) تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں۔

(ق ن ط)

اَلْقُنُوْطُ (مصدر) کے معنی بھلائی سے مایوس ہونے کے ہیں اور یہ قَنَطَ (ض) وَقَنِطَ (س) قَنُوْطًا یعنی ہر دو ابواب سے استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ﴾ (۱۵۔۵۵) آپ مایوس نہ ہوئیے۔

﴿وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ﴾ (۱۵۔۵٦) خدا کی رحمت سے (میں مایوس کیوں ہونے لگا۔ اس سے) مایوس ہونا تو گمراہوں کا کام ہے۔

---

❶ وفی المستدرك عن ابی سعید: كل حرف فی القرآن یذكر فیه القنوت فهو الطاعة (كنز العمال ۲ رقم ۷۷)

❷ رواه ابوداوٗد و النسائی فی حدیث طویل و مسلم فی صحیح انظر العون (۱: ۳۴۹۔۳۵۱) ورواه الترمذی عن جابر (۱: ۵۱) والحدیث فی اللسان (قنت) و مشكل القرآن للقبتی (۳۵۰) ونسبه المتقی فی التزالی الابانة لابی نصر عبدالله بن سعید بن سعید بن حاتم السخبری رقم ۷۷۔

❸ الحاكم فی المستدرك والترمذی ومسلم وابن ماجة عن جابرؓ والطبرانی عن ابن موسیٰ وعن عمرو بن عبیدة وعن عمر بن قتادة اللیثی والحدیث فی الكشاف (۳/۳۴۰) والفائق (۲/۸۵) قال الحافظ فی تخریجه علی الكشاف: وفی روایة الطحاوی طول القیام (راجع رقم ۳۱۸)

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۵۳) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔

﴿وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَیَئُوْسٌ قَنُوْطٌ﴾ اور اگر تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے اور آس توڑ بیٹھتا ہے (۴۱۔۴۹) اور کبھی قـــنـــط کا لفظ فرح کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اِذَا هُمْ یَقْنَطُوْنَ﴾ (۳۰۔۳۶) تو ناامید ہوکر رہ جاتے ہیں۔

(ق ن ع)

اَلْقَنَاعَة کے معنی ضروریات زندگی میں سے تھوڑی سی چیز پر راضی ہو جانے کے ہیں اور یہ قَنِعَ (س) یَقْنَعُ قَنَاعَةً سے ہے کیونکہ قَنَعَ (ف) یَقْنَعُ قُنُوْعًا کے معنی سوال کرنے کے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ: ﴿وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ (۲۲۔۳۶) اور قناعت سے بیٹھنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔ میں بعض نے کہا ہے کہ قَانِعٌ سے مراد وہ سائل ہے جو باصرار سوال نہ کرے اور جو کچھ مل جائے اسی پر راضی ہو جائے شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۳۵۹) لَمَالُ الْمَرْءِ یُصْلِحُهٗ فَیُغْنِیْ
مَفَاقِرَهٗ اَعَفُّ مِنَ الْقُنُوْعِ

وہ مال جو انسان کی حالت درست رکھے اور احتیاج سے بچائے وہ سوال کرنے سے بہرحال بہتر ہے۔

اَقْنَعَ رَأْسَهٗ: اس نے اپنے سر کو اونچا کیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ﴾ (۱۴۔۴۳) سر اٹھائے ہوئے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں قِنَاعٌ سے مشتق ہے اور قِنَاعٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے سر ڈھانکا جائے اس سے قَنِعَ (س) کے معنی ہیں اس نے اپنے فقر کو چھپانے کے لیے سر پر قناع اوڑھ لیا اور قَنَعَ (ف) کے معنی سوال کرنے کے لیے سر کھولنے یعنی لوگوں کے سامنے احتیاج ظاہر کرنے کے ہیں جیسا کہ خَفِیَ (س) کے معنی چھپنے اور خَفَی (ف) کے معنی خفاء کو دور کرنے یعنی ظاہر ہونے کے ہیں اور رجل مَقْنَعٌ کا محاورہ قَنَاعَة سے ہے یعنی وہ آدمی جس کی شہادت کو کافی سمجھا جائے اس کی جمع مَقَانِعُ ہے۔ شاعر نے کہا ہے [2]۔ (الطّویل)

(۳۶۰) شُهُوْدِیْ عَلٰی لَیْلٰی عُدُوْلٌ مَقَانِعٌ

اور لیلیٰ پر عادل اور پسندیدہ لوگ میرے گواہ نہیں تھے جن

---

[1] قاله شماخ بن ضرار فی ابیات یخاطب امرء ته، عائشه من قصیدة فی دیوانه ٥٦۔٦٢ والبیت فی اللسان والمحکم (قنع والاضداد للاصمعی (٥٠) والسجستانی (١٦) وابن السکیت (٢٠٣) وابن الانباری مع اخر (٦٦۔٦٧) واضدا دوابی الطیب (٥٧٩) والصاحبی (١٦٨۔١٩٧) والمعانی اللقبتی (٤٢٩، ٤٩٩، ٢٣٣) والطبری (١٦٨/١٧) والبحر (٣٤٧/٦) وتهذیب الالفاظ ١٧ والبخلاء (١٨١) ومجاز ابی عبیدة (٢: ٥١) والجمهرة (٣: ١٣٢) والقرطبی (١٢: ٦٤) والمیدانی (١: ٢٥٤) والاشتقاق ٣٥٦۔

[2] قاله البعیث وصدره ١٠ نیت لیلی بالخلاء ولم یکن والبیت فی اللسان (قنع) والاشباه النحویه (٤: ٢٢) لکن فیه خلاء بدل بالخلاء وشهود بدون الاضافة وهی روایة الکامل (٣٩١) والمحاضرات للمؤلف (٨٦) والبیت اُصا فی ایضاً لی (١: ١٩٣) والبلدان (سم: قعاقع) فی ستة ابیات والمحکم (قنع) واضداد ابی الطیب ٥٨٠ وبعده: وما کل مامنتك نفسك خالیا۔ یکون والا کل الهوی انت تابع ١٢۔

کی شہادت پر قناعت ہو سکے۔

اور قِنَاعٌ سے تَقَنَّعَتِ الْمَرْءَ ۃُ کا محاورہ ہے جس کے معنی برقعہ اوڑھنے کے ہیں۔

اور اس کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے: تَقَنَّعَ الرَّجُلُ مرد نے سر پر خود رکھا۔ قَنَّعْتُ رَأْسَهٗ بِالسَّيْفِ او السَّوْط: کسی کے سر پر تلوار یا کوڑا مارنا۔

(ق ن و)

اَلْقِنْوُ کے معنی (کھجور یا انگور کے) خوشے کے ہیں اس کا تثنیہ قِنْوَان اور جمع قِنْوَانٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ﴾ (۶-۹۹) لٹکے ہوئے گچھے۔

اور قَنَاۃ (نیزے کی لکڑی) بھی ٹہنی ہونے میں قِنْوٌ کے مشابہ ہے لیکن وہ قناعت (نالی) جس میں پانی بہتا ہے اسے طول میں نیزے کی لکڑی کے ساتھ تشبیہ دے کر قَنَاۃٌ کہا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ دراصل قَنَيْتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کا ذخیرہ جمع کرنے کے ہیں اور نالی میں بھی چونکہ پانی کا ذخیرہ جمع رہتا ہے اس لیے اسے قَنَاۃٌ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قَانَاہُ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی مل جانے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے [1] (الطویل)

(۳۶۱) كَبِكْرِ الْمُقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصُفْرَةٍ

اس کا رنگ شتر مرغ کے تازہ انڈے جیسا ہے جس کی سفیدی میں ہلکی سی زردی کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اور قنا جس کے معنی ناک کے بانسہ کے اوپر اٹھنے اور اس کی نوک کے جھکی ہوئی ہونے کے ہیں۔ یہ معنی قَنَا بمعنی نیزہ سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ وہ ہیئت میں اس کے مشابہ ہوتی ہے۔ محاورہ ہے:

رَجُلٌ اَقْنٰى وَاِمْرَءَۃٌ قَنْوَاءُ: وہ مرد یا عورت جس کی ناک درمیان سے اٹھی ہوئی ہو اور اس کے نتھنے تنگ ہوں۔

(ق ن ی)

اَلْاِقْنَاءُ: (افعال) کے معنی غنی کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى﴾ (۵۳-۴۸) اور یہ کہ وہی دولت مند بناتا اور مفلس کرتا ہے۔

یہ اِقْنَاءٌ (افعال) سے ہے جس کے معنی اتنا مال دینے کے ہیں کہ احتیاج باقی نہ رہے یا قُنْيَةٌ سے ہے اور اسکے معنی ذخیرہ کیا ہوا مال بخشنے کے ہیں۔ [2] اور بعض نے کہا ہے کہ اَقْنٰى کے معنی اَرْضٰى یعنی راضی کرنا ہیں۔ [3] اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی رضا و اطاعت کا خزانہ بخش دیا اور یہ غنا مادی غنا (مالداری) سے بڑھ کر ہے۔

اور قِنْيَةٌ کی جمع قِنَيَاتٌ آتی ہے اور قَنَيْتُ كَذَا او اَقْتَنَيْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو لازم پکڑنے کے ہیں، اسی سے شاعر نے کہا ہے [4] ()

(۳۶۲) قَنَيْتُ حَيَائِيْ عِفَّةً وَتَكَرُّمًا

---

[1] قاله امرؤالقيس في لاميته يصف حبيبته، وتمامه: غذا ها نمير الماء غير محلل راجع للبيت ديوانه۔ ۱۰ (صنعة السند وبی) والجمهرة ۹۸ والمعانی للقبتی ۳۶۱ ولعمدة (۲: ۹۸) والبحر (۷: ۳۶) ومختار الجاهلی ۱۱ والاشباه (۳: ۲۱۵) واللسان (قنی) وغريب القرآن للقبتی ۳۷۱ والعقد الثمين ۱۴۸ والمعلقات مع الانباری ۷۰ والتبريزی ۳۵ وفيه ضبط اعرابه۔

[2] قال ابن كثير وعليه يدور كلام كثير من المسفرين واختاره بن جرير ورواه عن ابی صالح (ص ۷۵ ج ۲۷)۔

[3] رواه ابن ابی حاتم عن ابن عباسؓ ونقل فيه اقوالا آخر (ص ۷۶ ج ۲۷)

[4] قاله حاتم الطائی واوله۔ اذا قل مالی او نکبت بنكبة والبيت فی اللسان (قنی) ۱۲

تو میں بوجہ عفت وکرم کی وجہ سے حیا کی چادر اوڑھ لیتا ہوں۔

(ق ھ ر)

اَلْـقَھْـرُ کے معنی کسی پر غلبہ پا کر اسے ذلیل کرنے کے ہیں اور دنوں (یعنی غلبہ اور تذلیل) میں سے ہر ایک معنی میں علیحدہ علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾ (۶۔۱۸) اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

﴿وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (۱۳۔۱۶) اور وہ یکتا اور زبردست ہے۔

﴿وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴾ (۷۔۱۲۷) اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ (۹۳۔۹) تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرو۔ یعنی اسے ذلیل نہ کرو۔

اَقْهَرَهٗ: کسی پر ایسے شخص کو مسلط کرنا جو اسے ذلیل کر دے۔

اَلْقَهْقَرٰی: پچھلے پاؤں لوٹنا۔

(ق و ب)

اَلْـقَــابُ کے معنی کمان کے درمیانی حصہ (مقبض) سے لے کر ایک گوشہ کمان تک کے فاصلہ کے ہیں اور قوس کی طرف اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے) چنانچہ فرمایا:

﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ (۵۳۔۹) تو دو کمانوں کے قاب کے فاصلہ پر یا اس سے بھی کم۔

(ق و ت)

اَلْقُوْتُ: غذا جس سے سدِّ رمق ہو سکے اس کی جمع اقوات ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا﴾ (۴۱۔۱۰) اور اس میں سب سامان معشیت مقرر کیا۔

قَاتَهٗ يَقُوْتُهٗ قُوْتًا کے معنی غذا کھلانے کے ہیں، اور اَقَاتَهٗ يُقِيْتُهٗ کے معنی ایسی چیز دینے کے ہیں جس سے وہ قوت حاصل کر سکے۔ حدیث میں ہے [1] (۸۹)

((اِنَّ اَكْبَرَ الْكَبَآئِرِ اَنْ يُّضَيِّعَ الرَّجُلُ مَنْ يَّقُوْتُ)) کہ جس کی قوت انسان کے ذمہ ہو اسے ضائع کرنا سب سے بڑا گناہ ہے ایک روایت میں مَنْ يُقِيْتُ (افعال) بھی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا﴾ (۴۔۸۵) اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بعض نے اس کے معنی مقتدر یعنی قدرت رکھنے والا کیے ہیں اور بعض نے محافظ اور بعض نے شاہد یعنی حاضر رہنے والا...... لیکن اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اللہ ہر چیز کی حفاظت کرتا اور اسے روزی دیتا ہے۔

اور اس میں قوت قُوْتٌ قِيْتٌ وَقِيْتَـهٌ تین لغات ہیں جیسے طُعْمٌ وَطِعْمٌ وَطُعْمَةٌ چنانچہ محاورہ ہے: مَالَهٗ قُوْتُ لَيْلَةٍ وَقِيْتُ لَيْلَةٍ وَقِيْتَةُ لَيْلَةٍ: اس کے پاس ایک رات کا بھی کھانا نہیں ہے شاعر نے آگ کی صفت میں کہا ہے [2] (الطّویل)

---

[1] مجمع البحار والفائق (۱۸۹/۲) وفیه کفی بالرجل اثما ان يُّضِيِّعَ من يقوت وابوداؤد (۲۳۵/۱) والنسائی والحدیث فی الاحیاء للغزالی ولفظه: کفی بالمرء اثما ان یضیع من یعول وهو عند مسلم بلفظ آخر آخر راجع تخریج العراقی علی الاحیاء (۲: ۳۳)۔

[2] قاله ذوالرمة فی وصف نار فی قصیده له فی دیوانه ۲۴ (طبعه کمبرج ۱۹۱۹ وقد مرّفی (روح)

(۳۶۳)فَقُلْتُ لَهُ ارْفَعْهَا اِلَيْكَ وَاَحْيِهَا بِرُوْحِكَ وَاقْتَتْهُ لَهَا قِيْتَةً قَدْرًا

میں نے اسے کہا کہ اسے اپنی طرف اٹھاؤ اور اس پر تھوڑا تھوڑا ایندھن لگا کر نرم پھونک سے اسے سلگاؤ۔

(ق و س)

اَلْقَوْس: کمان۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ (۵۳۔۹) تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔

اور کمان کی ہیئت کذائی کے لحاظ سے تَقَوُّسٌ بمعنی اِنْحِنَاءِ آتا ہے۔محاورہ ہے:۔

قَوَّسَ الشَّيْخُ وَتَقَوَّسَ: بوڑھا خمیدہ ہوگیا۔قَوَّسْتُ الْخَطَّ: میں نے خمیدہ خط کھینچا۔اور خمیدہ خط کو مُقَوَّسٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمِقْوَسُ: وہ جگہ جہاں سے گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑنا شروع کرتے ہیں اور اس کے اصل معنی اس رسی کے ہیں جس سے گھوڑ دوڑ میں گھوڑوں کی صف بندی کی جاتی ہے اور پھر انہیں دوڑنے کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔

(ق و ل)

اَلْقَوْلُ اور اَلْقِيْلَ کے معنی بات کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (۴۔۱۲۲) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہوسکتا ہے۔

قول کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) عام طور پر حروف کے اس مجموعہ پر قول کا لفظ بولا جاتا ہے جو بذریعہ نطق کے زبان سے ظاہر ہوتے ہیں خواہ وہ الفاظ مفرد ہوں یا جملہ کی صورت میں مفرد۔جیسے زَيْدٌ خَرَجَ اور مرکب جیسے زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ وَهَلْ خَرَجَ عَمْرٌو وَنَحْو ذَالِكَ: کبھی انواع ثلاثہ یعنی اسم فعل اور حرف میں ہر ایک کو قول کہا جاتا ہے جس طرح کہ قصیدہ اور خطبہ وغیرہما کو قول کہہ دیتے ہیں۔

(۲) جو بات ابھی ذہن میں ہو اور زبان تک نہ لائی گئی ہو اسے بھی قول کہتے ہیں اس بنا پر قرآن پاک میں آیت کریمہ:﴿وَيَقُوْلُوْنَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ﴾ (۵۸۔۸) اور اپنے دل میں کہتے ہیں (اگر یہ واقعی پیغمبر ہیں تو) جو کچھ ہم کہتے ہیں خدا ہمیں اس کی سزا کیوں نہیں دیتا۔

یعنی دل میں خیال کرنے کو قول سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) رائے خیال اور عقیدہ پر بھی قول کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فُلَانٌ يَقُوْلُ بِقَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ: (فلاں ابو حنیفہؒ کی رائے کا قائل ہے)

(۴) کسی چیز پر دلالت کرنے کو قول سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❷ (الرجز)

(۳۶۴)اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِيْ

حوض بھر گیا اور اس نے کہا بس مجھے کافی ہے۔

---

❶ قاله الراجز وقرينه مهلا رويدا قد ملات بطنى هذه الرواية فى شرح الدرة للخفاجى ۳۱ والصحاح (قطط) والتنبيه للبكرى (۶۲) والمسط (۴۷۵) والابدال لابى الطيب (۱: ۳۷۴) وهى رواية النحاة وفى اللسان والتاج (قطط) وتهذيب اصلاح المنطق (۱: ۱۰۱) واصلاح يعقوب (۵۷، ۳۴۲) وابن الشجرى (۱: ۲/۳۱۳: ۴۰) سلا بدل مهلا وفى المقاييس حسبى بدل قطنى وفى الكامل (۴۲۴) قد خنق بدل امتلا راجع ايضا الانصاف ۷۳ مجالس ثعلب (۱: ۱۵۸) والعينى (۳۶۱) والطبرى (۱: ۵۱۰) والفخر (۲۱: ۱۰۲) والمقاييس (۵: ۱۴) والمرتضى (۲: ۱۰۹) ومجازات القرآن للسيد شريف الرضى (۳۱۱)۔

(۵) کسی چیز کا صدق دل سے اعتبار کرنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا جیسے فُـلَانٌ یَـقُوْلُ بِکَذَا فلاں اس کا صدق دل سے خیال رکھتا ہے۔

(۶) اہل منطق کے نزدیک قول بمعنی حد کے آتا ہے جیسے قَـوْلُ الْـجَـوْهَرِ كَذَا۔ وَقَوْلِ الْعَرْضِ كَذَا یعنی جوہر کی تعریف یہ ہے اور عرض کی یہ۔

(۷) الہام کرنا یعنی کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دینا جیسے فرمایا:

﴿قُـلْـنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ﴾ (۱۸۔۸۶)

ہم نے کہا ذوالقرنین! تم ان کو خواہ تکلیف دو۔

(یہاں قول بمعنی الہام اور القا کے ہے) کیونکہ تاریخ اور روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کو (انبیاء کی طرح) مخاطب نہیں کیا گیا بلکہ یہ بات ان کے دل میں القا کردی گئی تھی چنانچہ اس الہام کو قول سے تعبیر کردیا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ:

﴿قَـالَتَـآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ (۴۱۔۱۱) انہوں نے کہا ہم خوشی سے آتے ہیں۔

میں خطاب ظاہری نہیں تھا بلکہ ان کا یہ امتثال اور اظہار اطاعت تسخیری طریقہ سے تھا اور یہی معنی آیت کریمہ:

﴿قُـلْـنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا﴾ (۲۱۔۶۹) ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور .... (موجب سلامتی بن جا۔)

میں مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿يَـقُـوْلُـوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۳۔۱۶۷) منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

میں اَفْـوَاهِهِمْ کے لفظ سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل اس کی تائید نہیں کرتے اور یہ محاورہ ایسے ہی ہے جس طرح کتابت کے ساتھ ید کا لفظ ذکر کر کے اس کے جھوٹا ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَـوَيْـلٌ لِّـلَّـذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَـقُـوْلُـوْنَ هٰـذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۷۹) تو ان لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے تو کتاب لکھتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے آئی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَـقَـدْ حَـقَّ الْـقَـوْلُ عَـلٰٓـى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۳۶۔۷) ان میں سے اکثر پر خدا کی بات پوری ہو چکی، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ میں قول سے اللہ کا علم اور اس کا حکم مراد ہے۔ ﴿وَ تَـمَّـتْ كَـلِـمَةُ رَبِّكَ﴾ (۶۔۱۱۵) اور تمہارے پروردگار کی باتیں پوری ہو گئیں۔

﴿اِنَّ الَّـذِيْـنَ حَـقَّـتْ عَـلَيْهِـمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُـؤْمِنُوْنَ﴾ (۱۰۔۹۶) جن لوگوں کے بارے میں خدا کا حکم (عذاب) قرار پا چکا ہے وہ ایمان نہیں لانے کے۔

حکم عذاب کو کلمۃ سے تعبیر فرمایا ہے اور آیت کریمہ

﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِىْ فِيْهِ يَـمْتَـرُوْنَ﴾ (۱۹۔۳۴) یہ مریم علیہا السلام کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام ہیں (اور یہ) سچی بات ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔

میں عیسیٰ علیہ السلام کو قول الحق کہہ کر آیت کریمہ:

﴿اِنَّ مَثَـلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِـنْ تُـرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (۳۔۵۹)

اللہ کے ہاں عیسیٰ علیہ السلام کی مثال...... پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا تو وہ (انسان) ہو گئے۔

کے مضمون پر تنبیہ کی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو قول کہنا ایسے ہی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ:

﴿وَ كَلِمَتُهٗٓ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ﴾ (۴۔۱۷۱) اور یہ کلمہ (بشارت) تھا جو اس نے مریم علیہا السلام کی طرف بھیجا تھا۔ میں انہیں کلمہ کہا گیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ (۵۱۔۸) تم ایک متناقض بات میں پڑے ہوئے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ بعث (موت کے بعد زندگی) کے معاملہ میں تمہارے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور بعث کو جو درحقیقت مقول فیہ ہے (مجازاً) قول کہہ دیا ہے۔ جیسا کہ مذکور چیز کو ذکر کہہ دیا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ﴾ (۶۹۔۴۰،۴۱) یہ قرآن پاک فرشتے عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔

میں قرآن پاک کو قولِ رسول یعنی حضرت جبریل کا قول کہنا بنا برمجاز ہے کیونکہ جو پیغام کسی رسول کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے اس کی نسبت رسول اور مرسل دونوں کی طرف صحیح ہوتی ہے یعنی کبھی مجازاً اسے قولِ رسول کہہ دیتے ہیں اور کبھی بنا برحقیقت مرسل کی طرف نسبت کر دیتے ہیں اگر اس پر یہ شبہ وارد ہو کہ اس اصل کی بنا پر تو شعر یا خطبہ کی نسبت بھی ان کے راوی کی طرف صحیح ہونی چاہیے جس طرح کہ انکی نسبت قائل کی طرف ہوتی ہے تو ہم کہیں گے کہ بے شک آپ شعر یا خطبہ کو قولِ راوی کہہ سکتے ہیں لیکن اسے شعر راوی یا خطبۂ راوی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ شعر کا اطلاق قول کی خاص شکل وصورت پر ہوتا ہے اور اس شکل وصورت کے ڈھالنے میں راوی کا کوئی دخل نہیں ہے مگر قول کی نسبت راوی اور مروی عنہ دونوں کی طرف ہوسکتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (۲۔۱۵۶) جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

میں صرف زبان کے ساتھ اِنَّا لِلّٰهِ الخ کہنا مراد نہیں بلکہ اس کے ساتھ اعتقاد وعمل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اَلْمِقْوَلُ کے معنی زبان کے ہیں اور محاورہ میں رَجُلٌ مِقْوَلٌ وَ مِنْطِيْقٌ وَ قَوَّال وَ قَوَّالَةٌ کے معنی زبان دراز آدمی کے ہیں۔

اَلْقِيْلُ: حمیری بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا اور انہیں قیل یا تو اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کی ہر ایک بات پر اعتماد کیا جاتا تھا اور اس کی اقتداء کی جاتی تھی اور یا اس لیے کہ ان میں ہر ایک اپنے آباء کی روش پر چلتا تھا اور یہ تَقَيَّلَ فُلَانٌ اَبَاهُ (گفتار میں اپنے باپ کے مشابہ ہونا) کے محاورہ سے مشتق ہے جس طرح کہ (یمن کے ہر) بادشاہ کو تبع کہا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر بادشاہ اپنے فیصلوں میں اپنے سے پیشرو کی اقتداء کرتا تھا۔

اصل میں یہ واوی ہے کیونکہ اس کی جمع اقوال آتی ہے جیسے مَيْتٌ کی جمع اَمْوَاتٌ آتی ہے۔

نیز یہ قَيِّلٌ کا مخفف ہے جیسے مَيْتٌ وَ مَيِّتٌ اور جولوگ اس کی جمع اَقْيَالٌ بناتے ہیں تو یہ (اقوال جمع قول سے،

فرق کرنے کے لیے ہے جو) جس طرح کہ (عید کی جمع) اَعْیَادٌ ہے پھر اس سے فعل مشتق کر کے تَقَیَّلَ اَبَاہُ کہہ دیتے ہیں جس طرح کہ (عید کے لفظ سے) تعید کہا جاتا ہے۔

اِقْتَالَ قَوْلًا: ایسی بات کہنا جو فائدہ یا نقصان کا باعث بنے اور کبھی اِقْتَالَ بھی اِحْتَکَمَ آتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (الخفیف)

(۳۶۵) یَأْبٰی حَکُوْمَةَ الْمُقْتَالِ

کسی زبردستی حاکم بننے والے کی حکومت کو نہیں مانتا۔

اَلْقَالُ وَالْقَالَةُ: وہ بات جو نشر ہو جائے۔

خلیل نے کہا ہے کہ کبھی قَالَ بمعنی قَائِلٌ بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

اَنَا قَالَ کَذَا یعنی میں اس کا قائل ہوں ❷۔

(ق و م)

قَامَ یَقُوْمُ قِیَامًا فَھُوَ قَائِمٌ...... کھڑا ہونا قَائِمٌ کی جمع (بھی) قیام آتی ہے اور اَقَامَ بِالْمَکَانِ اِقَامَةً کے معنی کسی جگہ قیام کرنے کے ہیں اور قیام کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے:۔

(۱) کسی شخص کا تسخیری طور پر یا اپنے ارادے سے کھڑا ہونا۔

(۲) قِیَامٌ لِّلشَّیْءِ: یعنی شے کی حفاظت اور نگہبانی کرنا۔

(۳) کسی کام کا پختہ ارادہ کر لینا۔

تسخیری طور پر کھڑا ہونے کے معنی میں فرمایا۔

﴿مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِیْدٌ﴾ (۱۱-۱۰۰) ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور بعض تہس نہس ہو گئے ہیں۔ ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓی اُصُوْلِهَا﴾ (۵۹-۵) کھجور کے جو درخت تم نے کاٹے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو خدا کے حکم سے تھا۔

اور قیام اختیاری کے معنی میں فرمایا:

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا﴾ (۳۹-۹) یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا﴾ (۳-۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے...... ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

اور نیز آیت:

﴿وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا﴾ اور وہ لوگ اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے (عجز و ادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔

میں قیام قائم کی جمع ہے اور کسی چیز کی حفاظت اور مراعات کے معنی میں فرمایا:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ (۴-۳۴) مرد عورتوں پر راعی اور محافظ ہیں۔

﴿کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵-۸) انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو۔

❶ قالہ الاعشی فی قصیدۃ لہ فی ۷۵ بیتا یمدح فیها الاسود بن المذر اللخمی وصدرہ: والمثل الذی جمعت لریب الدہر...... والبیت فی اللسان والمحکم (حکم) والمعانی للقبتی (۹۲۳) وفی المطبوع تابی بالتاء والصواب بالیاء کما فی المراجع وفی دیوانہ (۱۶۸) من العدۃ بدل لریب الدهر۔

❷ وایضا ﴿ولو تقول علینا بعض الاقاویل﴾ (۶۹-۴۴) معناہ النسبة الی احد القول کذبا وزورا۔

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (۳۔۱۸) جو انصاف پر قائم ہیں۔
﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۱۳۔۳۳) تو کیا جو خدا ہر متنفس کے اعمال کا نگہبان ہے۔
یہاں (بھی) قائم بمعنی حَافِظٌ ہے۔ نیز فرمایا ﴿لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ (۳۔۱۱۳) یہ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان اہل کتاب میں کچھ لوگ حکم خدا پر قائم بھی ہیں۔
اور آیت کریمہ:
﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا﴾ (۳۔۷۵) تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو۔
میں قَآئِمًا کے معنی برابر مطالبہ کرنے والے کے ہیں اور قیام بمعنی عزم کے متعلق فرمایا:
﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾ (۵۔۶) مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ (۲۔۳) اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ...... ہیں۔
میں يُقِيْمُوْنَ کے معنی نماز پر دوام اور (اس کے ارکان کی) حفاظت کرنے کے ہیں۔
اور قِيَامِ و قِوَامِ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے سہارے کوئی چیز قائم رہ سکے جس طرح کہ عِمَادٌ اور سِنَادٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو سہارا لگا دیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ (۴۔۵) اور بے عقلوں کو ان کا مال، جسے خدا نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا مت دو۔
یعنی ان کو تمہاری بقا کا سبب بنایا، اسی طرح آیت:
﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا﴾ (۵۔۹۷) خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبے کو موجب امن مقرر فرمایا:
میں بیت اللہ کے قِيَامًا لِّلنَّاسِ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی دنیا اور آخرت کی اصلاح اور درستگی بیت اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اصم کا قول ہے [1] کہ یہاں قیام بمعنی قائم ہے یعنی اس کی یہ حیثیت کبھی منسوخ نہیں ہوگی اور ایک قرأت میں قَيِّمًا ہے جو بمعنی قِيَامًا ہے اور بعض اسے قِيْمَةٌ کی جمع بتاتے ہیں لیکن یہ توجیہہ بے معنی سی ہے۔
اور محاورہ میں قَامَ كَذَا وَثَبَتَ وَرَكَزَ کے ایک ہی معنی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى﴾ (۲۔۱۲۵) اور حکم دیا کہ جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنا لو۔
(میں لفظ مقام بھی اسی محاورہ سے ماخوذ ہے۔)
قَامَ فُلَانٌ مَقَامَ فُلَانٍ کے معنی کسی کے قائم مقام ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ﴾ (۵۔۱۰۷) تو جن لوگوں کا انہوں نے حق مارنا چاہا تھا ان میں سے ان کی جگہ اور دو گواہ

[1] هو ابوبكر عبدالرحمٰن بن كيسان الاصم المتوفى ۲٤۰ھ اقدم شيوخ المعتزلة وفى الفهرست ۵۷ ان له كتابافى فى تفسير القرآن وفى لسان الميزان (۳: ٤۲۷) الاصم المعتزلى صاحب المقالات فى الاصول وله تفسير عجيب انظر الملل وذيله (۱: ۳٦)

کھڑے ہوں۔

اور آیت کریمہ: ﴿دِیْنًا قِیَمًا﴾ (۶۔۱۶۲) یعنی دین صحیح ہے۔ میں قِیَمًا بھی ثابت ومقوّم کے معنی میں ہے یعنی ایسا دین جو لوگوں کے معاشی اور اخروی معاملات کی اصلاح کرنے والا ہے ایک قرأت میں قِیَمًا مخفف ہے جو قیام سے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صفت کا صیغہ ہے جس طرح کہ قَوْمٌ عِدًی، مَکَانٌ سِوًی، لَحْمٌ، رِذًی، مَاءٌ رُوًی میں عدًی سِوًی اور رِذًی وغیرہا اسمائے صفات ہیں اور اسی معنی میں فرمادیا۔

﴿ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ﴾ (۹۔۳۶) یہی دن (کا) سیدھا (راستہ) ہے۔

﴿وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا﴾ (۱۸۔۱) اور اس میں کسی طرح کی کجی اور پیچیدگی نہ رکھی بلکہ سیدھی (اور سلیس اتاری ہے)

اور آیت کریمہ: ﴿وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ﴾ (۹۸۔۵) یہی سچا دین ہے۔

میں قَیِّمَۃ سے مراد امت عادلہ ہے جس کی طرف آیت کریمہ:

﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ﴾ (۳۔۱۱۰) تم سب سے بہتر ہو۔

اور آیت:

﴿کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ﴾ (۴۔۱۳۵) انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ﴾ (۹۸۔۲،۳) جو پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔

میں صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً سے قرآن پاک کی طرف اشارہ ہے۔ اور فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃ کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پاک تمام کتب سماویہ کے مطالب پر حاوی ہے کیونکہ قرآن پاک تمام کتب متقدمہ کا ثمرہ اور نچوڑ ہے اور آیت:

﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ (۲۔۲۵۵) خدا وہ معبود برحق ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ، ہمیشہ رہنے والا۔

میں قَیُّوْم (اسمائے حسنٰی سے ہے) یعنی ذات الٰہی ہر چیز کی نگران اور محافظ ہے اور ہر چیز کو اس کی ضروریات زندگی بہم پہنچاتی ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی﴾ (۲۰۔۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی پھر راہ دکھائی۔

﴿اَفَمَنْ ھُوَ قَآئِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ﴾ (۱۳۔۳۳) تو کیا جو (خدا) ہر متنفس کے اعمال کا نگران ہے۔

قَیُّوْمٌ بروزن فَیْعُوْلٌ اور قَیَّامٌ بروزن فَیْعَالٌ سے جیسے دَیُّوْنٌ وَدَیَّانٌ۔

اَلْقِیَامَۃُ: سے مراد وہ ساعت (گھڑی) ہے۔

جس کا ذکر کہ ﴿وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ﴾ (۴۰۔۴۶) اور جس روز قیامت برپا ہوگی۔

﴿یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (۸۳۔۶) جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

﴿وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَۃَ قَآئِمَۃً﴾ (۱۸۔۳۶) اور نہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت برپا ہو۔

وغیرھا آیات میں پایا جاتا ہے۔ اصل میں قیامۃ کے معنی انسان کے یکبارگی قِیَام یعنی کھڑا ہونے کے ہیں اور قیامت کے یکبارگی وقوع پذیر ہونے پر تنبیہ کرنے کے لیے

لفظ قیام کے آخر میں ھاء (ۃ) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ❶

اَلْـمُـقَـامُ: یہ قیام سے کبھی بطور مصدر میمی اور کبھی بطور ظرف مکان اور ظرف زمان کے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ كَـانَ كَبُـرَ عَـلَيْـكُـمْ مَّقَامِىْ وَ تَذْكِيْرِىْ﴾ (۱۰۔۷۱) اگر تم کو میرا رہنا اور...... نصیحت کرنا ناگوار ہو۔

﴿وَذٰلِكَ لِـمَـنْ خَافَ مُقَامِىْ وَخَافَ وَعِيْدِ﴾ (۱۴۔۱۴) یہ اس شخص کے لیے ہے جو قیامت کے روز میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے۔ ﴿وَلِـمَـنْ خَـافَ مَقَـامَ رَبِّـهٖ﴾ (۵۵۔۴۶) اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا۔ ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ (۲۔۱۲۵) اور حکم دیا کہ جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے اس کو نماز کی جگہ بنالو۔

﴿فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۳۔۹۷) اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

﴿وَزُرُوْعٍ وَّمَـقَـامٍ كَرِيْمٍ﴾ (۴۴۔۲۶) اور کھیتیاں اور نفیس مکان۔

﴿اِنَّ الْـمُـتَّـقِيْـنَ فِىْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ﴾ (۴۴۔۵۱) بے شک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔

﴿خَيْـرٌ مَّـقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا﴾ (۱۹۔۷۳) مکان کس کے اچھے اور مجلس کس کی بہتر ہیں۔

﴿وَمَـا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ (۳۷۔۱۶۴) ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقرر مقام ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنَـا اٰتِيكَ بِـهٖ قَبْـلَ اَنْ تَـقُـوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ﴾ (۲۷۔۳۹) قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں، میں اس کو آپ کے پاس حاضر کرتا ہوں۔

کی تفسیر میں اخفش نے کہا ہے کہ یہاں مقام بمعنی مَـقْعَد یعنی نشستگاہ کے ہیں۔ اگر اخفش کا مقصد اس سے یہ ہے کہ مقام اور مقعد بالذات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں صرف نسبت الی الفاعل کے لحاظ سے دونوں میں فرق پایا جاتا (یعنی ایک ہی جگہ کو کسی شخص کے وہاں کھڑے ہونے کے لحاظ سے مقام اور بیٹھنے کے اعتبار سے مقعد کہا جاتا ہے جس طرح کہ صَـعُـوْدٌ اور حَدُوْرٌ کے الفاظ ہیں (کہ ایک ہی جگہ کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صَـعُـوْدٌ اور اس سے نیچے اترنے کے لحاظ سے حَـدُوْرٌ کہا جاتا ہے) تو یہ بجا ہے اور اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ لغت میں مقام بمعنی مقعد آتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض نے الـمـقـامۃ کے معنی جماعت بھی کیے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❷

(الطّویل)

(۳۶۶) وَفِيْهِمْ مَقَامَات حِسَانٌ وُجُوْهُهُمْ

اور ان میں خوبرو لوگوں کی جماعتیں ہیں...... مگر یہ بھی دراصل ظرف مکان ہے اگر چہ (مجازاً) اصحاب مقام مراد

---

❶ و لذا عبر عن اتيا نها بلفظ بغتة راجع (٦۔٣) (٧۔١٨٧) (٢١۔٤٠) (٢٢۔٥٥) (٤٣۔٦٦) (٤٧۔١٨)۔

❷ قـالـه زهير يمدح سنان بن الحارثه وتمامه: واندية ينتابها القول والفعل۔ والبيت فى ديوانه مع شرح الاعلم الشنتمرى۔ رطبعـه ليدن و شواهد الكشاف (٩٠) والعمدة (٢: ١٣٤) والصناعتين (١٠٢) ومختار الشعر الجاهلى (١: ١٦٣) ونقد الشعر ٣٣ فى سبعه ابيك والبحر المحيط (٥/٨٨) (٨/٨٩١) والعقد الثمين ٩١ والعقد الفريد (١: ٣٨٨) والسيوطى (١٠٨)۔

ہیں جس طرح کہ ❶ (الکامل)

(۳۶۷) وَاسْتَبَّ بَعْدَكَ يَا كُلَيْبُ الْمَجْلِسُ

اے کلیب! تیرے بعد لوگ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے ہیں۔

اَلْاِسْتِقَامَةُ: (استفعال) کے معنی راستہ کے خط مستقیم کی طرح سیدھا ہونے کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر راہ حق کو بھی...... صراط مستقیم کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (۱۔۵) ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا﴾ (۶۔۱۵۳) اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۱۱۔۵۶) بے شک میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔

اور کسی انسان کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ (۴۱۔۳۰) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ اس پر قائم رہے۔

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ﴾ (۱۱۔۱۱۲) سو (اے پیغمبر) جیسا کہ تم کو حکم ہوتا ہے اس پر...... قائم رہو۔

﴿فَاسْتَقِيْمُوْۤا اِلَيْهِ﴾ (۴۱۔۶) تو سیدھے اس کی طرف متوجہ ہو۔

اَلْاِقَامَةُ: (افعال) فی المکان کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اِقَامَةُ الشَّیْءِ: (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ﴾ (۵۔۶۸) کہو کہ اے اہل کتاب! جب تک تم توراۃ اور انجیل...... کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں سکتے۔ یعنی جب تک کہ علم وعمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔ اسی طرح فرمایا:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ (۵۔۶۶) اور اگر وہ توراۃ اور انجیل کو...... قائم رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ وہاں اقامۃ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیئت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے اسی بنا پر کئی ایک مقام پر اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اور اَلْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ کہا ہے ❷۔ اور آیت کریمہ:

---

❶ قاله مهلهل بن ربيعه يرثى اخاه كليباً وصدره كما فى امالى القالى (۱ : ۹۵) نبئت انَّ النّارَ بعدك اوقدت والشطر فى مجالس ثعلب ۳۷ والبيت فى الحماسة مع المرزوقى رقم ۳۱۵ والمختارات ۶۲ واللالئى ۲۹۸ وفيها صدره برواية ابن السكيت، ذهب الخيار من المعاشر كلهم والبيت فى الحصرى (۴/۶۳/۲ : ۱۷۹) فى ثلاثة وفى الصناعتين (۲۰۳ والمجالس (۵۸۴) وامالى ابن التجرى (۱ : ۵۲) اودى بدل ذهب فى خمسة والبيت ايضا فى البحر (۱ : ۱۱۳) و محاضرات المولف (۱ : ۲/۷۵ : ۴۰) وانظر القصة (۱/۳۰۱) والعقد فى ايام العرب والاغانى (۴ : ۱۳۹۔۱۵۱)

❷ الآية ۳۵ من سورة الحج هذه قراءة ابن مسعود و بحذف النون والاضافة قراءة ابى عمرو وابن ابى اسحاق والحـ وبحذف النون ونصب الصلوة راجع ابو حبان (۶ : ۳۶۹)

﴿وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى﴾ (۴۔۱۴۲) اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

میں قَامُوْا ، اِقَامَةٌ سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے (جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں) اور آیت: ﴿رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ﴾ (۱۴۔۴۰) اے پروردگار! مجھ کو (ایسی توفیق عنایت) کر کہ نماز پڑھتا رہوں۔

میں دعا ہے کہ الٰہی! مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ (۹۔۵) پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے...... لگیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اقامة سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے کے ہیں۔

اَلْمُقَامُ: یہ مصدر میمی، ظرف مکان، ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف مصدر میمی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا﴾ (۲۵۔۲۶) اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور مقامة (بضم المیم) بمعنی اقامة ہے جیسے فرمایا۔

﴿الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۳۵۔۳۵) جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ کے رہنے کے گھر میں اتارا یہاں جنت کو دَارُ الْمُقَامَةَ کہا ہے جس طرح کہ اسے دَارُ الْخُلْدِ اور جَنّٰتِ عَدْنٍ کہا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا﴾ (۳۳۔۱۳) یہاں تمہارے لیے (ٹھہرنے کا) مقام نہیں ہے تو لوٹ چلو۔

میں مقام کا لفظ قیام سے ہے یعنی تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور ایک قرأت میں مَقَامُ (بضم المیم) اَقَام سے ہے اور کبھی اَقَامَة سے معنی دوام مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿عَذَابٌ مُّقِیْمٌ﴾ (۵۔۳۷) ہمیشہ کا عذاب۔

اور ایک قرأت میں آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ﴾ (۴۴۔۵۱) بے شک پرہیز گار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔ مقام بضمہ میم ہے۔ یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تَقْوِیْمُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (۹۵۔۵) کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

اس میں انسان کے عقل وفہم قد وقامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

تَقْوِیْمُ السِّلْعَةِ: سامان کی قیمت لگانا۔ اَلْقَوْمُ: یہ اصل میں صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ﴾ (۴۹۔۱۱) کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے۔

اور شاعر نے کہا ہے ❶ (الوافر)

(۳۶۸) أَقَوْمٌ آلُ حِصْنٍ اَمْ نِسَاءٌ کہ آل حصن مرد ہیں یا عورتیں؟

اور قرآن پاک میں عموماً مرد وعورتیں سبھی مراد لیے گئے ہیں لیکن اصل میں یہ مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس پر کہ آیت۔

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (۴۔۳۴) مرد عورتوں پر راعی اور حاکم ہیں۔

میں (بھی) تنبیہ پائی جاتی ہے۔ ❷

(ق و و)

اَلْقُوَّۃُ: یہ کبھی قدرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ (۲۔۶۳) اور حکم دیا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی اس کو زور سے پکڑے رہو۔

اور کبھی قوت بمعنی استعداد اور صلاحیت کے آتا ہے جو کسی چیز کے اندر پائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ نَوٰۃ (یعنی کھجور کی گٹھلی) بالقوۃ کھجور کا درخت ہے یعنی اس میں کھجور کا درخت بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اور کبھی قوت بدنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔

اور کبھی قوت قلبی کے لیے اور کبھی کبھی خارجی معاون چیزیں مراد ہوتی ہیں اور کبھی قوت بمعنی قدرت الٰہیہ کے آتا ہے چنانچہ بدنی قوت کے متعلق فرمایا:

﴿مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (۴۱۔۱۵) ہم سے بڑھ کر قوت میں کون ہے۔

﴿فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ﴾ (۱۸۔۹۵) تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو۔

یہاں قوت سے بدنی قوت مراد ہے۔ کیونکہ انہوں نے خارجی مدد کی پیش کش کو مَامَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا اور قوت قلبی کے متعلق فرمایا:

﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ (۱۹۔۱۲) اے یحییٰ! ہماری کتاب کو زور سے پکڑے رہو۔

یعنی پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ کتاب الٰہی پر عمل کرو اور خارجی معاون کے معنی میں فرمایا:۔ ﴿لَوْ اَنَّ لِىْ بِكُمْ قُوَّةً﴾ (۱۱۔۸۰) اگر مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوگی۔

چنانچہ بعض نے اس جگہ قوت سے فوجی یا مالی طاقت مراد لی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿نَحْنُ اُولُوا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ (۲۷۔۳۳) ہم بڑے زور آور اور سخت جنگجو ہیں۔ اور قوۃ بمعنی قدرت الٰہیہ کے متعلق فرمایا:

---

❶ قاله زہیر بن ابی سلمی ہجاء بیت من کلب من بنی سلیم فی قصیدۃ له مطلعها: عفا من آل فاطمة الجوائر۔ فیمن فالقوادم فالحساء راجع اللسان (حصن) ودیوانه (۱۵۹) مع شرح الاعلم الشنتمری وشواهد الکشاف ٦ مختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۹۵) والبحر المحیط (۵: ۸۳/۸: ۱۱۲) والطبری (۲٦: ۹۳) والعمدۃ (۲: ٦٦) فی باب التشکك (۱۷۱) وابن هشام رقم ۵۵، ۲۳۹ العجز والعقد الثمین (۷۷) وامالی ابن الشجری (۲: ۳۳٤) (۱: ۲۲٦) والصاحبی ۱۸۹ والمعاهد (۲: ۵۲) والمعانی الکبیر (۵۹۳) والسیوطی (٤۸، ۱٤۱) وفی صنعة تجاهل العارف انظر قانون البلاغة (٤۵۹) فی ضمن رسائل البغاء

❷ وفی الکشاف القوم الرجال خاصة لانهم القوام بامور النساء قال الله تعالیٰ ﴿الرجال قوامون علی النساء﴾ ص ۱۵۳ ج۳ قال فی الطبری (۲٦/۹۳): وهو قول الخلیل۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾ (۵۷۔۲۵) بے شک خدا قوی (اور) غالب ہے۔
﴿وَ کَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیْزًا﴾ (۳۳۔۲۵) اور خدا طاقت ور اور زبردست ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ﴾ (۵۱۔۵۸) خدا ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔
میں قوت کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ قدرت الٰہی اور اس قدرت کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو عطا کی ہے اور آیات کریمہ ﴿وَ یَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ﴾ (۱۱۔۵۲) اور تمہاری طاقت پر طاقت بڑھائے گا۔
میں اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ان کی استعداد کے مطابق قسما قسم کی قوت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور آیت:
﴿ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ﴾ (۸۱۔۲۰) جو صاحب قوت، مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا۔
میں ذِیْ قُوَّۃٍ سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور اسے لفظ مفرد اور نکرہ کے ساتھ ذی قُوَّۃٍ کہنے سے اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ مَلَأ اَعْلٰی کے لحاظ سے اس کی قوت کم درجہ کی ہے۔ اور پھر آیت کریمہ:
﴿عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی﴾ (۵۳۔۵) ان کو نہایت قوت والے نے سکھلایا۔
میں ان کو جمع معرف بلام الجنس کے ساتھ متصف کر کے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ عالم سفلی اور اہل دنیا کے لحاظ جنہیں وہ تعلیم دیتا ہے وہ بہت بڑی قوت اور قدرت عظیم کا مالک ہے۔
قوت بمعنی استعداد و صلاحیت عام طور پر علمائے فلاسفہ استعمال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص میں صلاحیت موجود ہو لیکن وہ بالفعل اسے استعمال نہ کر رہا ہو جیسے فُلَانٌ کَاتِبٌ بِالْقُوَّۃِ: (فلاں کاتب بالقوہ ہے) یعنی وہ لکھنا تو جانتا ہے لیکن اس وقت بالفعل لکھنے میں مشغول نہیں ہے اور دوسرے معنی فُلَانٌ کَاتِبٌ بِالْقُوَّۃِ کے یہ ہوتے ہیں کہ اس میں کتابت سیکھنے کی صلاحیت ہے۔ نہ کہ وہ فن کتابت جانتا ہے۔
مَفَازَۃٌ: یعنی ریگستان کو قِوَاءٌ کہا جاتا ہے اور اَقْوَی الرَّجُلُ کے معنی کسی آدمی کے قِوَاء یعنی بیابان میں چلے جانے کے ہیں۔ پھر قَفْر یعنی بیابان سے فَقْر کا معنی لے کر اَقْوَی الرَّجُلَ کا محاورہ افتقر یعنی محتاج اور نادار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَّمَتَاعًا لِلْمُقْوِیْنَ﴾ (۵۶۔۷۳) [1] اور محتاج ضرورت مندوں کے لیے سامان آسائش بنایا ہے۔ میں مُقْوِیْنَ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(ق ی ض)

اَلْقَیْضُ کے معنی انڈے کے اوپر کا چھلکا کے ہیں اور چھلکا چونکہ اس کے باقی ماندہ اجزاء پر محیط اور مستولی ہوتا ہے لہٰذا اس سے قَیَّضَ (فعل) کسی چیز پر غالب اور مستولی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

---

[1] اقوی من الاضداد (ابوالطیب ۵۶۹) ویحتمل ان یکون من اقوی الرجل اذا حصل فی القواء الی المفازۃ ۲۔

قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ اور ہم نے شیطانوں کو ہم نشین مقرر کر دیا ہے اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا﴾ (۴۳۔۳۶) اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کرلے (یعنی تغافل کرے) ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔ میں نُقَيِّضْ لَهٗ شيطانا کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سے الگ ہو جاتے ہیں تاکہ شیطان اس پر اس طرح مسلط ہو جائے) جیسے انڈے کا اوپر کا چھلکا اپنے مَا فِيْهَا پر مستولی رہتا ہے۔

(ق ی ع)

اَلْقِيْعَةُ: ہموار میدان۔قرآن پاک میں ہے: ﴿كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ﴾ (۲۴۔۳۹) جیسے میدان میں ریت اَلْقِيعُ وَالْقَاعُ کے معنی ہموار زمین کے ہیں۔اس کی جمع قِيْعَانٌ اور تصغیر قُوَيْعٌ آتی ہے اور اسی سے قَاعَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی نر اونٹ کے ناقہ کے ساتھ جفتی کرنے (اور پوری طرح سوار ہو کر اس پر بیٹھ جانے) کے ہیں۔

(ق ی ل)

اَلْمَقِيْلُ: مقام استراحت چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَاَحْسَنُ مَقِيْلًا﴾ (۲۵۔۲۴) اس دن اہل جنت کا ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا۔ میں مَقِيْلًا قِلْتُ قَيْلُوْلَةً کا مصدر ہے جس کے معنی دوپہر کے وقت استراحت کے لیے لیٹنے کے ہیں اور یا ظرف مکان ہے یعنی قیلولہ کی جگہ [1] محاورہ ہے: قِلْتُهٗ فِي الْبَيْعِ وَاَقَلْتُهٗ وَتَقَلْيلًا: بیع فسخ کرنا۔

❀❀❀

---

[1] القيلوله وزنه فيعلولة ويختص بذوات الياء مثل سار سير ورة وحاد حيدودة الاربعة احرف من ذوات الواو هي: كينونة وديومة هيعوعة وسيدودة راجع ادب الكاتب (٤٩٦) ومن القيلولة قوله تعالى: ﴿اوهم قائلون (٧ـ٤)﴾

کِتَابُ الْکَافِ

(ک (حرف)

الکاف: حروف ہجا سے ہے۔اور تشبیہ یا تمثیل کے معنی ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ﴾ (۲۔۲۶۴) تو اس (کے مال) کی مثال اس چٹان کی سی ہے۔جس پر تھوڑی سی مٹی ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ (۲۔۲۶۴) اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔

میں کاف تشبیہ کے لیے نہیں ہے بلکہ تمثیل کے معنی پر محمول ہے۔جیسا کہ علماء نحو کہتے ہیں۔فَالْاِسْمُ كَقَوْلِكَ زَيْدٌ یعنی اسم کی مثال جیسے زید تو یہاں بھی کاف تمثیل کے لیے ہے۔پھر تمثیل،تشبیہ سے عام ہے۔کیونکہ ہر تمثیل کو تشبیہ کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تشبیہ تمثیل نہیں ہو سکتی۔ [1]

(ک ء س)

اَلْكَاْسُ: پینے کا برتن۔جب کہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا﴾ (۷۶۔۵) اور ایسی شراب نوش جان کریں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔

اور کبھی اس کا اطلاق خالی پیالہ یا صرف پینے کی چیز پر ہوتا ہے۔مثلاً

شَرِبْتُ كَاْسًا: میں نے شراب کا پیالہ پیا۔

كَاْسٌ طَيِّبَةٌ: عمدہ شراب۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ﴾ (۵۶۔۱۸) اور صاف شراب کے گلاس۔كَأَسَتِ النَّاقَةُ تَكْؤُسُ: اونٹنی کا تین پاؤں پر چلنا اور اَلْكَيْسُ کے معنی دانائی اور زیرکی کے ہیں اور اَكْأَسَ الرَّجُلُ وَاَكْيَسَ کے معنی غَدْرٌ یعنی بدعہدی بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں زیرکی سے کام لیا جاتا ہے۔اور یا اس لیے کہ كَيْسَان نامی ایک شخص تھا جو بے وفائی میں ضرب المثل تھا پھر ہر غدار کو كَيْسَان کہا جانے لگا۔جیسا کہ هَالِكِيٌّ اصل میں ایک مشہور آہنگر کا نام تھا پھر ہر حداد یعنی آہنگر پر هَالِكِيٌّ کا لفظ بولا جانا لگا ہے۔

(ک ب ب)

اَلْكَبُّ (ن) کے معنی کسی کو منہ کے بل گرانے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ (۲۷۔۹۰) تو ایسے لوگ اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے

اَلْاِكْبَابُ: کسی چیز پر منہ کے بل گر جانا (اور کنایہ از ہمہ تن مشغول شدن در کارے) اسی سے قرآن پاک میں ہے۔

---

[1] التشبیہ یکون بین المفردات والتمثیل عام ای بین المفردات والمرکبات (البیضاوی)

﴿اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖ اَهْدٰى﴾ (۶۷۔۲۲) بھلا جو شخص چلتا ہوا منہ کے بل گر گر پڑتا ہو۔ وہ سیدھے رستے پر ہے۔یعنی جو غلط روش پر چلتا ہے۔

اَلْكَبْكَبَةُ: کسی چیز کو اوپر سے لڑھکا کر گڑھے میں پھینک دینا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا وَالْغَاوٗنَ﴾ (۹۶۔۹۴) تو وہ اور گمراہ (یعنی بت اور بت پرست) اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔

كَبَّ وَكَبْكَبَ (ثلاثی ورباعی دونوں طرح آتا ہے۔مثل كَفَّ وَكَفْكَفَ وَصَرَّا الرِّيْحُ وَصَرْصَرَ الْكَوَاكِبُ ظاہر ہونے والے ستارے، ستاروں کو کواکب اسی وقت کہا جاتا...... جب نمودار اور ظاہر ہوں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا﴾ (۶۔۷۶) (یعنی) جب رات نے ان کو (پردۂ تاریکی سے) ڈھانپ لیا (تو آسمان میں) ایک ستارہ نظر پڑا۔

﴿كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾ (۲۴۔۳۵) گویا وہ موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔

﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ﴾ (۳۷۔۶) بے شک ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا۔

﴿وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ﴾ (۸۲۔۲) اور جب (آسمان کے) ستارے جھڑ پڑیں گے۔

محاورہ ہے۔ذَهَبُوْا تَحْتَ كُلِّ كَوْكَبٍ: وہ منتشر ہو گئے۔كَوْكَبُ الْعَسْكَرِ لشکر میں اسلحہ کی چمک

(ک ب ت)

اَلْكَبْتُ: (ض) کسی کو سختی اور ذلت کے ساتھ واپس کر دینا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۵۸۔۵) وہ اسی طرح ذلیل کیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے لوگ ذلیل کیے گئے تھے۔

﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ﴾ (۳۔۱۲۷) (یہ خدا نے) اس لیے (کیا) کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک، یا انہیں ذلیل ومغلوب کر دے کہ (جیسے آئے تھے ویسے ہی) ناکام واپس جائیں۔

(ک ب د)

اَلْكَبِدُ: جگر کو کہتے ہیں۔اور اَلْكُبَدُ وَالْكُبَادُ کے معنی درد جگر کے ہیں اور اَلْكَبِدُ (مصدر) کے معنی جگر پر مارنے کے ہیں اس سے كَبِدْتُ الرَّجُلَ (س) کا محاورہ ہے۔یعنی جگر پر مارنا۔پھر انسان کا جگر چونکہ وسط جسم میں ہوتا ہے۔اس لیے تشبیہ کے طور پر وسط آسمان کو كَبِدُ السَّمَآءِ کہا جاتا ہے۔

تَكَبَّدَتِ الشَّمْسُ: (آفتاب کا وسط آسمان میں پہنچنا) نیز اَلْكَبَدُ کے معنی مشقت بھی آتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ (۹۰۔۴) کہ ہم نے انسان کو تکلیف (کی حالت) میں (رہنے والا) بنایا ہے۔

میں متنبہ کیا ہے انسان کی ساخت ہی اللہ تعالیٰ نے کچھ اس قسم کی بنائی ہے کہ جب تک (دین کی) گھاٹی پر ہو کر نہ گزرے وہ نہ تو رنج ومشقت سے نجات پا سکتا ہے۔اور نہ ہی اسے (حقیقی) چین نصیب ہوسکتا ہے جیسا کہ دوسری

جگہ فرمایا:﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ (۸۴۔۱۹) کہ تم درجہ بدرجہ (رتبہ اعلیٰ پر) چڑھو گے۔

(ک ب ر)

کبیر اور صغیر اسمائے اضافیہ سے ہیں۔ جن کے معانی ایک دوسرے کے لحاظ سے متعین ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی چیز دوسری کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے۔ لیکن وہی شے ایک اور کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے۔ اور قلیل وکثیر کی طرح کبھی تو ان کا استعمال کمیت متصلہ یعنی اجسام میں ہوتا ہے۔ اور کبھی کمیتہ منفصلہ یعنی عدد میں۔ اور بعض اوقات کثیر اور کبیر دو مختلف جہتوں کے لحاظ سے ایک ہی چیز پر بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ﴾ (۲۔۲۱۹) کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں۔

کہ اس میں ایک قرأت کثیر بھی ہے۔

یہ اصل وضع کے لحاظ سے تو اعیان میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن استعارہ کے طور پر معانی پر بھی بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ (۱۸۔۴۹) کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے۔ اور نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے گن رکھا ہے۔ ﴿وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ﴾ (۱۰۔۶۱) اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے نہ بڑی۔

اور آیت کریمہ:﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ﴾ (۹۔۳) اور حج اکبر کے دن......

میں حج کو اکبر کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ عمرہ حج اصغر ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے۔

اَلْعُمْرَةُ هِيَ الْحَجُّ الْاَصْغَرُ۔ کہ عمرہ حج اصغر ہے۔

اور کبھی بڑائی بلحاظ زمانہ مراد ہوتی ہے چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ كَبِيْرٌ کہ فلاں سن رسیدہ ہے اور قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ﴾ (۱۷۔۲۳) اگر ان میں سے ایک تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائے۔

﴿وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ﴾ (۲۔۲۶۶) اور اسے بڑھاپا آ پکڑے۔

﴿وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ﴾ (۳۔۴۰) کہ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں۔

اور کبھی بڑائی بلحاظ مرتبہ اور رفعت کے ملحوظ ہوتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ﴾ (۶۔۱۹) ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت ہے۔ کہہ دو کہ خدا ہی مجھ میں اور تم میں گواہ ہے۔

﴿الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ﴾ (۱۳۔۹) سب سے بزرگ (اور عالی رتبہ ہے۔

اور آیت:﴿فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ﴾ (۲۱۔۵۸) پس ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا مگر ایک بڑے (بت) کو (نہ توڑا)

میں صنم کو کبیر کہنا اس کی حقیقی قدر و منزلت کے لحاظ سے نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اعتقاد کی بنیاد پر ہے۔ اور آیت۔ ﴿بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ (۲۱۔۶۳) بلکہ یہ ان کے بڑے (بت) نے کیا (ہوگا) بھی اس معنی پر محمول ہے۔

اور آیت:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا﴾ (۶۔۱۲۳) اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کیے۔

میں اکابر سے وہاں کے رؤساء مراد ہیں اسی طرح آیت: ﴿اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ﴾ (۲۰۔۷۱) بے شک وہ تمہارا بڑا (یعنی استاد) ہے جس نے تم کو جادو سکھایا۔

میں بھی کبیر بمعنی رئیس ہی ہے۔ اور اس معنی میں مشہور محاورہ ہے۔ وَرِثَهٗ كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ۔ یعنی یہ چیز اسے بلند مرتبہ آباؤاجداد سے ورثہ میں حاصل ہوئی ہے۔

اَلْكَبِيْرَةُ: عرف میں اس گناہ کو کہتے ہیں جس کی سزا بڑی سخت ہو۔ اس کی جمع اَلْكَبَائِرُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ (۵۳۔۳۲) جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

اور آیت۔ ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ (۴۔۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے، اجتناب رکھو۔

میں بعض نے کہا ہے۔ کہ کبائر سے مراد شرک ہے۔ کیونکہ دوسری آیت: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (۳۱۔۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔

میں شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کبائر کا لفظ۔ شرک اور تمام مہلک گناہوں کو شامل ہے۔ جیسے زنا اور کسی جان کا ناحق قتل کرنا جیسا کہ فرمایا۔

﴿اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ (۱۷۔۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت گناہ ہے۔ ﴿قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۲۔۲۱۹) کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کے نقصان فائدوں سے زیادہ ہیں۔

اور کبیرۃ اس عمل کو بھی کہتے ہیں جس میں مشقت اور صعوبت ہو۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ (۲۔۴۵) بے شک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جو عجز کرنے والے ہیں۔

﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ﴾ (۴۲۔۱۳) جس چیز کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو وہ ان کو دشوار گزرتی ہے۔

﴿وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ﴾ (۶۔۳۵) اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے اور آیت: ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً﴾ (۱۸۔۵) (یہ) بڑی بات ہے۔

میں اس گناہ کے دوسرے گناہوں سے بڑا اور اس کی سزا کے سخت ہونے پر تنبیہ پائی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے۔ (۶۱۔۳۵) اور آیت۔

﴿وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ﴾ (۶۱۔۳۵) اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا۔

میں تَوَلّٰى كِبْرَهٗ سے مراد وہ شخص ہے جس نے افک کا شاخسانہ کھڑا کیا تھا اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو

شخص کسی برے طریقے کی بنیاد ڈالے اور لوگ اس پر عمل کریں تو وہ سب سے بڑھ کر گنہگار ہوگا۔اور آیت۔

﴿اِلَّا کِبْرٌ مَّا ھُمْ بِبَالِغِیْهِ﴾ (۴۰۔۵۶)(ارادہ) عظمت ہے اور اس کو پہنچنے والے نہیں۔

میں کِبْرٌ کے معنی بھی تکبر ہی کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر بڑا امر مراد ہے۔اور یہ کبر بمعنی پیرانہ سالی سے ماخوذ ہے جیسا کہ آیت: ﴿وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ﴾ میں ہے۔اور اَلْکِبْرُ وَالتَّکَبُّرُ وَالْاِسْتِکْبَارُ کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں پس کبر وہ حالت ہے جس کے سبب سے انسان عجب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اور عجب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرے اور سب سے بڑا تکبر قبول حق سے انکار اور عبادت سے انحراف کر کے اللہ تعالیٰ پر تکبر کرنا ہے۔❶

اَلْاِسْتِکْبَارُ: (استفعال) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کا قصد کرے۔اور یہ بات اگر منشائے شریعت کے مطابق اور برمحل ہو اور پھر ایسے موقع پر ہو۔جس پر تکبر کرنا انسان کو سزاوار ہے تو محمود ہے۔دوم یہ کہ انسان جھوٹ موٹ بڑائی کا اظہار کرے اور ایسے اوصاف کو اپنی طرف منسوب کرے جو اس میں موجود نہ ہوں۔یہ مذموم ہے۔اور قرآن پاک میں یہی دوسرا معنی مراد ہے۔فرمایا۔

﴿اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ﴾ (۲۔۳۴) مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آ گیا۔

﴿اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَھْوٰٓی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ﴾ (۲۔۸۷) تو جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا۔تم سرکش ہو جاتے رہے۔

﴿وَاَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوا اسْتِکْبَارًا﴾ (۷۱۔۷) اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

﴿اسْتِکْبَارًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۵۔۴۳)(یعنی انہوں نے ملک میں غرور کرنا۔

﴿فَاسْتَکْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۹۔۳۹) تو وہ ملک میں مغرور ہو گئے۔

﴿تَسْتَکْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ (۴۶۔۲۰) کہ تم زمین میں ناحق غرور کیا کرتے تھے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اسْتَکْبَرُوْا عَنْھَا﴾ (۷۔۴۰) جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے سرتابی کی۔

﴿مَآ اَغْنٰی عَنْکُمْ جَمْعُکُمْ وَ مَا کُنْتُمْ تَسْتَکْبِرُوْنَ﴾ (۷۔۴۸)(آج) نہ تو تمہاری جماعت ہی تمہارے کسی کام آئی۔اور نہ ہی تمہارا تکبر سود مند ہوا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا﴾ (۴۰۔۴۷) تو ادنیٰ درجے کے لوگ بڑے آدمیوں سے کہیں گے، میں متکبرین کے مقابلہ میں ضعفاء کا لفظ لانے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے۔کہ ان کا استکبار بدنی اور مالی قوت کے حاصل ہونے کی وجہ سے تھا۔اسی طرح آیت۔

❶ وفی الحدیث الکبران تسفه الحق وتغمص الناس (الادب المفرد للبخاری) من روایة عبدالله بن عمرو بن العاص وقال علماء الاخلاق الکبر یکون بالمنزلة الرفیعه والعجب یکون بالفضیلة الماوروی بشر حه منهاج الیقین ۳۹۷

﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ (۷۔۷۵) تو ان کی قوم کے سردار لوگ جو غرور رکھتے تھے غریب لوگوں سے .... کہنے لگے۔ میں بھی متکبرین مستضعفین کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔اور آیت۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ﴾ (۱۰۔۷۵) تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ گنہگار لوگ تھے۔ میں لفظ فَاسْتَكْبَرُوْا سے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے قبول حق کے سلسلہ میں تکبر، خود پسندی، اور نخوت سے کام لیا اور پھر وہ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ان کے سابقہ جرائم نے ہی انہیں تکبر پر اکسایا تھا۔اور یہ تکبر ان کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ ان کا شیوہ بن چکا تھا۔اور فرمایا:

﴿فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۱۶۔۲۲) تو جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کر رہے ہیں۔اور وہ سرکش ہو رہے ہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ﴾ (۱۶۔۲۳) وہ (خدا) سرکشوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اَلتَّكَبُّرُ: اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ فی الحقیقت کسی کے افعال حسنہ زیادہ ہوں اور وہ ان پر دوسروں سے بڑھا ہوا ہو۔اسی معنی میں اللہ تعالیٰ صفت تکبر کے ساتھ متصف ہوتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ (۵۹۔۲۳) غالب زبردست بڑائی والا۔

دوم یہ کہ کوئی شخص صفات کمال کا ادعاء کرے۔لیکن فی الواقع وہ صفات حسنہ سے عاری ہو اس معنی کے لحاظ سے یہ انسان کی صفت بن کر استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا ہے:

﴿فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾ (۴۰۔۷۶) متکبروں کا کیا برا ٹھکانا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ (۴۰۔۳۵) اسی طرح خدا ہر سرکش متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

تو معنی اول کے لحاظ سے یہ صفات محمودہ میں داخل ہے اور معنی ثانی کے لحاظ سے صفت ذم ہے اور کبھی انسان کے لیے تکبر کرنا مذموم نہیں ہوتا جیسا کہ آیت:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۷۔۱۴۶) جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبر بغیر الحق نہ ہو تو مذموم نہیں ہے۔

اور آیت:

﴿عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ (۳۵۔۴۰) ہر متکبر جابر کے دل پر، میں لفظ قلب متکبر کی طرف مضاف ہے۔اور بعض نے قلب تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں متکبر قلب کی صفت ہوگا۔

اَلْكِبْرِيَاءُ: اطاعت کیشی کے درجہ سے اپنے آپ کو بلند سمجھنے کا نام کبریاء ہے۔اور یہ استحقاق صرف ذات باری تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

(۴۵۔۳۷) اور آسمانوں اور زمینوں میں اس کے لیے بڑائی ہے اور اسکا ثبوت اس حدیث قدسی سے بھی ملتا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ❶ (۹۰) ((اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْ وَاحِدٍ مِنْهُمَا قَصَمْتُهٗ)) کہ کبریاء میری رداء ہے اور عظمت ازار ہے۔ جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک میں میرے ساتھ مزاحم ہوگا۔ تو میں اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔ اور قرآن پاک میں ہے: ﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَ نَا وَ تَكُوْنَ لَكُمُ الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ﴾ (۱۰۔۷۸) وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ جس (راہ) پر ہم اپنے باپ دادوں کو پاتے رہے ہیں اس سے ہم کو پھیر دو اور اس ملک میں تم دونوں ہی کی سرداری ہو جائے۔ اَكْبَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو بڑا خیال کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَمَّا رَاَیْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ﴾ (۱۲۔۳۱) جب عورتوں نے ان کو دیکھا تو ان کا رعب ان پر چھا گیا۔

اَلتَّكْبِیْرُ: (تفعیل) اس کے ایک معنی تو کسی کو بڑا سمجھنے کے ہیں۔ اور دوم اللہ اکبر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت کو ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی عظمت کا احساس کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ﴾ (۲۔۱۸۵) اور اس احسان کے بدلے کہ خدا نے تم کو ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو۔ ﴿وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا﴾ (۱۷۔۱۱۱) اور اس کو بڑا جان کر اس کی بڑائی کرتے رہو۔ اور آیت: ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (۴۰۔۵۷) آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

میں اَكْبَرُ کے لفظ سے قدرت الٰہی کی کاریگری اور حکمت کے ان عجائب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جو آسمان اور زمین کی خلق میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کو کہ وہ خاص لوگ ہی جان سکتے ہیں۔ جن کی وصف میں فرمایا: ﴿وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۳۔۱۹۱) اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔

ورنہ ان کی ظاہری عظمت کو تو عوام الناس بھی سمجھتے ہیں (اس لیے یہ معنی یہاں مراد نہیں ہیں) اور آیت: ﴿یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰی﴾ (۴۴۔۱۶) جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔ میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ روز قیامت سے پہلے دنیا یا عالم برزخ میں کافر کو جس قدر بھی عذاب ہوتا ہے عذاب آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اَلْكُبَّارُ۔ اس میں کبیر کے لفظ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اور كُبَّار (بتشدید یاء) اس سے بھی زیادہ بلیغ

---

❶ الحدیث ذکرہ السیوطی فی الدر (٦: ٣٧) وابن کثیر (٤: ١٥٣) وفی روایة ابی داؤد قذفته فی النار وفی روایة مسلم عن ابی هریرة وابی سعید القیته فی النار وغدبته، انظر للحدیث وتخریجه باختلاف الالفاظ کنز العمال (ج٣ رقم ٢٦١٣۔٢٦١٦) عن علی وابی هریرة وابن عباس وابی سعید وتخریج الکشاف للحافظ رقم (١٣٧) وتخریج الاحیاء للعراقی (٣/٣٣٧) وزوائد ابن حبان رقم ٤٩ و منهاج الیقین شرح ادب الدنیا والدین واویس وقا الازرنجانی ٢٩٧۔

ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَمَکَرُوْا مَکْرًا کُبَّارًا ﴾ (۷۱۔۲۲) اور وہ بڑی بڑی چالیں چالیں چلے۔

(ک ت ب)

اَلْکَتْبُ ۔ کے اصل معنی کھال کے دو ٹکڑوں کو ملا کر سی دینے کے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: کَتَبْتُ السِّقَاءَ ''میں نے مشکیزہ کو سی دیا کَتَبْتُ الْبَغْلَۃَ: میں نے خچری کی شرمگاہ کے دونوں کنارے بند کر کے ان پر (لوہے) کا حلقہ چڑھا دیا'' عرف میں اس کے معنی حروف کو تحریر کے ذریعہ باہم ملا دینے کے ہیں مگر کبھی ان حروف کو تلفظ کے ذریعہ باہم ملا دینے پر بھی بولا جاتا ہے الغرض کِتَابَۃ کے اصل معنی تو تحریر کے ذریعہ حروف کو باہم ملا دینے کے ہیں مگر بطور استعارہ کبھی معنی تحریر اور کبھی بمعنی تلفظ استعمال ہوتا ہے اس بنا پر کلام الٰہی کو کتاب کہا گیا ہے گو (اس وقت) قید تحریر میں نہیں لائی گئی تھی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ (۲۔۱) یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں۔

﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ ﴾ (۱۹۔۳۰) میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے۔

اَلْكِتَابُ: اصل میں مصدر ہے اور پھر مکتوب فیہ (یعنی جس چیز میں کچھ لکھا گیا ہو (کو کتاب کہا جانے لگا ہے دراصل اَلْكِتَابُ اس صحیفہ کو کہتے ہیں جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔ چنانچہ آیت:

﴿يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۴۔۱۵۳) (اے محمد) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ تم ان پر ایک لکھی ہوئی کتاب آسمان سے اتار لاؤ۔

میں ''کتاب'' سے وہ صحیفہ مراد ہے جس میں کچھ لکھا ہوا ہو اسی لیے دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ.........﴾ (۶۔۷) اور اگر ہم تم پر کاغذوں پر لکھی ہوئی کتاب نازل کرتے۔

نیز کسی چیز کے ثابت کر دینے، اندازہ کرنے، فرض یا واجب کر دینے اور عزم کرنے کو کِتَابَۃ سے تعبیر کر لیتے ہیں اس لیے کہ پہلے پہل تو کسی چیز کے متعلق دل میں خیال پیدا ہوتا ہے پھر زبان سے ادا کی جاتی ہے اور آخر میں لکھ لی جاتی ہے لہٰذا ارادہ کی حیثیت مبدأ اور کتابت کی حیثیت منتھی کی ہے پھر جس چیز کا ابھی ارادہ کیا گیا ہو تاکید کے طور پر اسے کَتَبَ سے تعبیر کر لیتے ہیں جو کہ دراصل ارادہ کا منتھی ہے...... چنانچہ فرمایا: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ﴾ (۵۸۔۲۱) خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ (۹۔۵۱) کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ جو خدا نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے۔

﴿لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ﴾ (۳۔۱۵۴) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا۔ وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔ اور آیت: ﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (۸۔۷۵) اور رشتے دار خدا کے حکم کی رو سے ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ میں کتاب اللہ سے مراد قانونِ خداوندی ہے اور آیت: ﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ

اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ (۵۔۴۵) اور ہم نے ان لوگوں کے لیے توراۃ میں یہ حکم لکھ دیا تھا۔ کہ جان کے بدلے جان۔ میں کَتَبْنَا بمعنی اَوْحَیْنَا وَفَرَضْنَا ہے یعنی ہم نے وحی بھیجی یا فرض کر دیا اور اسی معنی میں فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۲۔۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آ جائے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (۲۔۱۸۳) مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے۔

﴿لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ﴾ (۴۔۷۷) تو نے ہم پر جہاد (جلد) کیوں فرض کر دیا۔

﴿مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ (۵۷۔۲۷) ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور آیت:

﴿وَلَوْلَا اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ﴾ (۵۹۔۳) اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلا وطن کرنا نہ لکھ رکھا ہوتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے گھروں کو چھوڑنا ان پر ضروری نہ کیا ہوتا (تو ان کو کوئی دوسری سزا دی جاتی) اور کبھی کتابت سے تقدیر حتمی یا حتمی کی مثل مراد ہوتی ہے۔

چنانچہ آیت:۔

﴿بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (۴۳۔۸۰) ہاں ہاں (سب سنتے ہیں) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔ میں بعض نے تقدیر کے نویسندے مراد لیے ہیں اور بعض نے کہا ہے۔ کہ آیت۔

﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ﴾ (۱۳۔۳۹) میں بھی تقدیر کی دونوں اقسام مراد ہیں اور آیت:

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ (۵۸۔۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت ان کفار کے برعکس ہے۔ جن کے متعلق ارشاد ہے۔

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸۔۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اس کا کہا نہ ماننا۔

کیونکہ اَغْفَلْنَا کا لفظ اَغْفَلْتُ الْكِتَابَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کتاب کو مہمل یعنی اعراب و نقاط سے معری چھوڑ دینا کے ہیں۔ اور آیت ﴿فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔ اور ہم اس کے لیے (ثواب اعمال) لکھ رہے ہیں۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعمال کو ثابت رکھا جا رہا ہے۔ اور ان کی ضروری ہی جزا دی جائے گی۔ اور آیت:

﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ (۳۔۵۳) تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ رکھ۔

کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ان کے زمرہ میں داخل فرما۔ اور یہ آیت کریمہ:

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ (۴۔۶۹) وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ جن پر خدا نے بڑا فضل کیا، کے مضمون کی

طرف اشارہ ہے۔اور آیت:﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ (۱۸۔۴۹) ہائے شامت! یہ کیسی کتاب ہے نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے۔ اور نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔ میں الکتاب سے لوگوں کے اعمال نامے مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ (۵۷۔۲۲) مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں (لکھی ہوئی ہے۔)

میں بعض نے کہا ہے کہ ''کتاب'' سے لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتَابٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (۲۲۔۷۰) یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ سب خدا کو آسان ہے۔

﴿وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۶۔۵۹) کوئی تر یا خشک چیز نہیں۔ مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے۔

﴿فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا﴾ (۱۷۔۵۸) یہ کتاب (یعنی تقدیر میں) لکھا جا چکا ہے۔اور آیت:

﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ (۸۔۶۸) اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ بات حکمت الٰہی میں مقدر نہ ہو چکی ہوتی لہٰذا یہ آیت۔

﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (۶۔۵۴) خدا نے اپنی ذات پاک پر رحمت کو لازم کرلیا، کی طرف اشارہ ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ (۸۔۳۳) اور خدا ایسا نہ تھا۔ کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا۔ کی طرف اشارہ ہے۔اور آیت:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ (۹۔۵۱) کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دی ہو۔

میں كَتَبَ کے معنی مقدر اور فیصلہ کرنا کے ہیں اور یہاں عَلَيْنَا کی بجائے لنا کہنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ جو مصیبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں پہنچتی ہے اسے ہم اپنے لیے نعمت سمجھتے ہیں۔ اور نقمت خیال نہیں کرتے اور آیت:﴿اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (۵۔۲۱) (تو بھائیو) تم ارض مقدس (یعنی ملک شام) جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے۔ چل داخل ہو۔ میں بعض نے كَتَبَ اللّٰهُ کے معنی وَهَبَهَا لَكُمْ کئے ہیں یعنی جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کی تھی۔ اور پھر تمہارے وہاں نہ جانے اور اس عطا الٰہی کو قبول نہ کرنے کے باعث اللہ تعالیٰ نے وہ زمین ان پر حرام کر دی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے حق میں اس کا فیصلہ کر دیا تھا۔ بشرطیکہ تم وہاں چلے جاتے اور بعض نے کتب کے معنی اوجب کیے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے وہاں چلے جانا تم پر واجب کر دیا تھا اور پھر عَلَيْكُمْ کی بجائے لَكُمْ اس لیے کہا ہے کہ وہاں چلے جانے میں ان کے دنیوی اور اخروی دونوں قسم کے فوائد مضمر تھے اس لیے وہاں چلے جانا لَكُمْ ہوگا نہ کہ عَلَيْكُمْ جیسا کہ مثلاً کوئی شخص کسی بات کو نقصان دہ خیال کرتا ہو مگر مآل کے اعتبار سے جو فوائد اس میں پنہاں ہیں اس سے غافل اور بے خبر

ہوتو اس سے کہا جائے گا ھٰذَا الْکَلَامُ لَکَ لَا عَلَیْکَ (یعنی اس میں) تمہارا فائدہ ہے نہ کہ نقصان اور آیت۔
﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ﴾ (۳۰۔۵۶) اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا۔ وہ کہیں گے خدا کی کتاب کے مطابق تم قیامت تک رہو گے۔ میں کتاب اللہ سے اللہ کا حکم، فیصلہ اور علم مراد ہے۔ اور یہی معنی آیت۔
﴿لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ﴾ (۱۳۔۳۸) ہر (حکم) قضا (کتاب میں) مرقوم ہے۔ کے ہیں۔ اور آیت:
﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں یعنی...... کتاب خدا میں، میں کتاب اللہ کے معنی بھی حکم الٰہی ہی ہیں۔ اور کبھی کتاب سے وہ حجت الٰہی مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہو چکی ہو چنانچہ فرمایا ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًی وَّ لَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ﴾ (۲۲۔۸) اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے۔
اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ کِتَابًا مِّنْ قَبْلِهٖ: یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی۔
﴿فَاْتُوْا بِکِتٰبِکُمْ﴾ (۳۷۔۵۷) تو اپنی حجت پیش کرو۔ ﴿اُوْتُوا الْکِتَابَ﴾ (۲۔۴۵) جنہیں الکتاب یعنی حجت دی ﴿کِتَابَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۰۱) خدا کی کتاب کو۔ اور آیت: ﴿اَمْ اٰتَیْنَاهُمْ کِتٰبًا﴾ (۴۳۔۲۱) یا ہم نے انکو (اس سے پہلے) کوئی کتاب دی تھی۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَهُمْ یَکْتُبُوْنَ﴾ (۶۸۔۴۷) کہ وہ اسے لکھ لیتے ہیں، میں یَکْتُبُوْنَ سے ان کے علم و تحقیق اور عقیدہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت۔
﴿وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ﴾ (۲۔۱۸۷) اور خدا نے جو تمہاری چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے۔ (یعنی اولاد) اس کو (خدا سے) طلب کرو۔
میں ایک لطیف نقطہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں نکاح کی خواہش اس لیے رکھی ہے کہ وہ اس سے طلب نسل کرے جو نوع انسانی کے بقاء کا موجب ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ نکاح سے اسی چیز کا قصد کرے جو کہ عقل و دیانت کے تقاضا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ یعنی حفظ نسل اور عفت نفس اور بعض نے جو یہ لکھا ہے کہ ما کتب اللہ سے مراد اولاد ہے۔ تو انہوں نے بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور کبھی کتابت سے کسی چیز کا وجود میں لانا۔ اور محو سے کسی چیز کا زائل اور فنا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ آیت:
﴿لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ﴾ (۱۳۔۳۸،۳۹) میں تنبیہ ہے کہ کائنات میں ہر لمحہ ایجاد ہوتی رہتی ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ مقتضائے حکمت کے مطابق اشیاء کو وجود میں لاتی اور فنا کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس آیت کا وہی مفہوم ہے۔ جو کہ آیت ﴿کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ﴾ (۵۵۔۲۹) وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔ اور آیت: (۱۳۔۳۹) میں وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْکِتَابِ (اور اس کے پاس اصل کتاب ہے) کا ہے اور آیت: ﴿وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْکِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ

الْکِتٰبِ﴾ (۳۔۷۸)اوران (اہل کتاب) میں سے بعض ایسے ہیں کہ کتاب کوزبان مروڑ کر پڑھتے ہیں تا کہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں کتاب (توراہ) میں سے ہے۔حالانکہ وہ (کسی سماوی) کتاب سے نہیں ہوتا۔ میں (لفظ الکتاب تین مرتبہ آیا ہے چنانچہ) پہلی جگہ الکتاب سے وہ جھوٹی تحریریں مراد ہیں جن کا تذکرہ آیت: ﴿فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ﴾ (۲۔۷۹) میں کیا گیا ہے۔اور دوسری الکتاب سے توراۃ مراد ہے اور تیسری الکتاب میں الف لام جنس کا ہے اور اس سے ہر آسمانی کتاب اور کلام الٰہی مراد ہوسکتی ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ حکم نہ تو کسی آسمانی کتاب میں موجود ہے اور نہ ہی کلام الٰہی ہوسکتا ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲۔۵۳) اور جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور معجزے عنایت کیے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کتاب اور فرقان دونوں سے توراۃ مراد ہے اس لحاظ سے کہ توراۃ میں احکام الٰہی ثبت ہیں اسے الکتاب کہا گیا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس میں حق کو باطل سے جدا کرنے والے احکام مذکور ہیں اسے الفرقان کہا گیا ہے اور آیت: ﴿وَ مَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ (۳۔۱۴۵) اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر مر جائے (اس نے موت کا) وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے۔ میں کتابا مؤجلا سے حکم الٰہی مراد ہے۔ چنانچہ آیات ﴿لَوْ لَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ﴾ (۸۔۶۸) اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا......تو تم پر...... نازل ہو۔

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ﴾ میں کتاب سے مراد حکم ہی ہے۔اور آیت: ﴿فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ﴾ (۲۔۷۹) تو ان لوگوں پر افسوس ہے۔ جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں۔

میں تنبیہ کی ہے کہ از خود جھوٹی باتیں گھڑ کر لکھ لیتے ہیں۔ اور یہاں جھوٹی تحریروں کو ان کے ہاتھوں کی طرف منسوب کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت ﴿ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ (۹۔۳۰) میں ان کی من گھڑت باتوں کو ان کے مونہوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

اَلْاِکْتِسَابُ (افتعال) کا لفظ عموماً جھوٹی اور جعلی تحریر کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَهَا﴾ (۲۵۔۵) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے۔اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی اہل الکتاب کا لفظ آیا ہے۔ وہاں الکتاب سے توراۃ، انجیل یا دونوں مراد ہیں۔اور آیت:۔ ﴿وَ مَا کَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی اِلٰی قَوْلِهٖ وَ تَفْصِیْلَ الْکِتٰبِ﴾ (۱۰۔۳۷) اور یہ قرآن پاک ایسا نہیں کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔ اور (ان ہی) کتابوں کی (اس میں) تفصیل ہے۔

میں الکتاب سے قرآن پاک سے پہلے کی تمام کتب سماویہ مراد ہیں۔ کیونکہ زیر بحث آیت میں قرآن کو ان کا مصدق ٹھہرایا گیا ہے۔لہٰذا وہ خود ان میں شامل نہیں ہوسکتا اور آیت کریمہ:

﴿وَّ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا﴾ (۶۔۱۱۴) حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح المطالب

کتاب بھیجی ہے۔
میں بعض نے کہا ہے۔کہ الکتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ قرآن پاک کے علاوہ دوسرے دلائل حقہ اور علم وعقل کو بھی شامل ہے۔اسی طرح آیت:
﴿فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ (۲۹۔۴۷) تو جن لوگوں کو ہم نے کتابیں دی تھیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں، میں بھی الکتاب کا مفہوم عام ہے۔اور آیت:
﴿قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ (۲۷۔۴۰) ایک شخص جس کو کتاب الٰہی کا علم تھا کہنے لگا، میں بعض نے کہا ہے۔کہ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ میں مِنْ زائدہ ہے اور اس کے معنی علم الکتاب یعنی کتاب کا علم کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ منجملہ ان علوم کے ایک علم مراد ہے جو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی خاص کتاب میں عطا فرمائے تھے اور انہی کے ذریعے سے ہر چیز حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع ہوگئی تھی۔اور آیت۔
﴿وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ﴾ (۳۔۱۱۹) اور تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔
میں الکتاب سے تمام کتب سماویہ مراد ہیں اور جمع کی بجائے مفرد کا لفظ یا تو اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ اسم جنس ہے۔ جیسا کہ كَثُرَ الدِّرْهَمُ فِيْ اَيْدِي النَّاسِ میں اَلدِّرْهَمُ سے جنس درہم مراد ہے۔اور یا اس لیے کہ یہ اصل میں عدل کی طرح مصدر ہے (جو مفرد وجمع دونوں کے لیے آتا ہے) جیسا کہ آیت:۔
﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (۲۔۴) جو کتاب تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں، میں ہے مگر بعض نے کہا ہے۔کہ الکتاب سے قرآن پاک مراد ہے اور كُلِّهٖ کہہ کر اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہیں ہو۔جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:
﴿وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ (۴۔۱۵۰) اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔
كِتَابَةُ الْعَبْدِ کے معنی غلام کے خود کو اپنے آقا سے اس (مقررہ) مال کے عوض خرید لینے کے ہیں۔ جو وہ کما کر اسے (بالاقساط) ادا کرے گا۔چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ﴾ (۲۴۔۳۳) اور جو غلام تم سے مکاتبت چاہیں...... تو ان سے مکاتبت کرلو۔
میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ كَاتِبُوْهُمْ کتابت بمعنی ایجاب سے مشتق ہو۔اور یہ بھی کہ اَلْكَتَبُ بمعنی نظم یعنی تحریر سے ہو کیونکہ ان دونوں کی نسبت انسان کی طرف ہوسکتی ہے۔

(ک ت م)

كَتَمْتُهٗ (ن) كَتْمًا وَكِتْمَانًا کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۴۰) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا کی شہادت کو، جو اس کے پاس کتاب اللہ میں موجود ہے۔ چھپائے۔
﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۔۱۴۶) مگر ایک فریق ان میں سچی بات

جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔
﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ (۲-۲۸۳) اور (دیکھنا) شہادت کومت چھپانا۔
اور آیت کریمہ:
﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴-۳۷) جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) خدا نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں۔
میں كِتْمَان فَضْل سے کفرانِ نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا:
﴿وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ (۴-۳۷) اور ہم نے ناشکروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾ (۴-۴۲) اور خدا سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔
کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔تو جھٹ سے پکار اٹھیں گے۔ ﴿وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ (۶-۲۳) خدا کی قسم! جو ہمارا پروردگار! ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔
مگر اس کے بعد جب ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ خدا تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپائی ہوتی۔
حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں [1] کہ آخرت میں متعدد مواقع ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کوئی بات چھپا نہ سکنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

(ک ث ب)

اَلْكَثِيْبُ: ریت کا ٹیلہ۔چنانچہ آیت:۔
﴿وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا﴾ (۷۳-۱۴) اور پہاڑ (ایسے بھربھرے گویا) ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے اور كَثِيْبٌ کی جمع اَكْثِبَةٌ وَّكُثُبٌ وَكُثْبَانٌ آتی ہے۔
اور معنی اجتماع کے لحاظ سے دودھ اور کھجوروں کی تھوڑی سی مقدار کو كُثْبَةٌ کہا جاتا ہے۔
كَثَبَ: (ض) اصل معنی اکٹھا کرنا کے ہیں اور اس سے صفت فاعلی كَاثِبٌ آتی ہے جس کے معنی ہیں ''جمع کرنے والا'' اور اَلتَّكْثِيْبُ کے معنی شکار کے اپنے آپ پر موقعہ دینے کے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے: اَكْثَبَكَ الصَّيْدُ فَارْمِهٖ (کہ شکار تجھے پر آ گیا ہے لہٰذا اسے شکار کر لو) اور یہ كَثْبٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہونا کے ہیں۔

(ک ث ر)

پہلے گذر چکا ہے کہ کثرت اور قلت کمیت منفصلہ یعنی اعداد میں استعمال ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ﴾ (۵-۸۶) (اس سے) ان

---

[1] ابو سعيد الحسن البصری من سادات التابعين و امام اهل البصرة توفی سنہ ۱۱۰ھ (شذرات الذهب ۱/۱۳۶) (وابن خلكان ۱/۱۶۰) وقد جمع العاجز تراجمه فی مقالة۔

میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور بڑھے گا۔

﴿وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُوْنَ﴾ (۲۳-۷۰) اور ان میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً﴾ (۲-۲۴۹) بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے .... بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً﴾ (۴-۱) پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیے۔

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ (۲-۱۰۹) بہت سے اہل کتاب...... یہ چاہتے ہیں۔

علی ہذا القیاس بہت سی اس قسم کی آیات ہیں (جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے) اور آیت:

﴿وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ﴾ (۵۶-۳۲) اور میوہ ہائے کثیرہ کے باغوں میں۔

میں فواکہ جنت کو مطعومات دنیا کے لحاظ سے کثیرہ کہا ہے۔ اور اس سے صرف کثرت عدد ہی مراد نہیں ہے۔ بلکہ کثرت بلحاظ فضیلت بھی مراد ہے اور عَدَدٌ كَثِيْرٌ وَّكُثَارٌ وَّكَاثِرٌ کے معنی کثرت تعداد کے ہیں اور رَجُلٌ كَاثِرٌ مال وار آدمی کو کہتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے [1] (السریع)

(۳۶۹) وَلَسْتَ بِالْاَكْثَرِ مِنْهُمْ حَصًى
وَاِنَّمَا الْعِزَّةُ لِلْكَاثِرِ

تم گنتی میں ان سے زیادہ نہیں ہو۔ عزت تو انہی کے لیے ہے جو تعداد میں زیادہ ہوں۔

اَلْمُكَاثَرَةُ وَالتَّكَاثُرُ: کے معنی ایک دوسرے سے مال و دولت اور عزت میں بڑھنے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ (۱۰۲-۱) (لوگو) تم کو (مال کی) بہت سی طلب نے غافل کر دیا۔

اور فُلَانٌ مَكْثُوْرٌ کے معنی مَغْلُوْبٌ فِي الْكَثْرَةِ کے ہیں۔

اَلْمِكْثَارُ: عرف میں بہت سی باتیں کرنے والے کو کہتے ہیں۔

اَلْكَثَرُ کے معنی ہیں خرما کا گودا جب زیادہ ہو۔ اور یہ سکون ثاء کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ایک روایت میں ہے [2] (۹۱)

((لَا قَطْعَ فِيْ ثَمَرٍ وَّلَا كَثَرٍ)) کہ پھل اور گودے کی چوری میں قطع ید نہیں ہے۔ اور آیت:

﴿اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ (۱۰۸-۱) (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو کوثر عطا فرمائی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔

---

[1] قاله الاعشى يعمون من كلمة فى ٦٠ بيتا يهجو فيها علقمة بن علاثة فى منافرته ويمدح عامر بن طفيل والاصح ان الكاثر بمعنى كثير العدد كما فى اللسان (كثر) والقصيدة فى ديوانه (٩٢-٩٦) والبيت فى التاج (كثر) والخزانة (٢: ٨) وتهذيب الالفاظ ٣٤ وابن عقيل رقم (٢٧٧) السيوطى (٣٠٥) وقد مر (قلل)

[2] اورده فى المؤطا من حديث رافع بن خديج (الزرقانى ٤/١٦٣) و الشافعى فى الام (٦: ١١٨) عن مالك وعن سفيان ابن عينية وابو داؤد الطيالسى رقم (٩٥٨) واحمد فى المسند (٣/٤١٣ و ٤٦٤ و٤/١٤٠) والدارمى (٢/١٦٤) وابوداود (٢٣٨) والترمذى (١/٢٧٣-٢٧٤) والنسائى (٢/٢٥٨) و ابن ماجة (٢/٦٦)۔

اور بعض نے خیر کثیر مراد لی ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو عطا کی اور سخی آدمی کو کوثر کہا جاتا ہے تَکَوْثَرَ الشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے بہت زیادہ ہونے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطّویل)

(۳۷۰) وَقَدْ ثَارَ نَقْعُ الْمَوْتِ حَتّٰی تَکَوْثَرَا

موت کا غبار اٹھا۔ یہاں تک کہ بہت زیادہ ہوگیا۔

(ک د ح)

اَلْکَدْحُ کے معنی کوشش کرنا اور مشقت اٹھانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا﴾ (۸۴۔۶) تو اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا ہے۔

اور کبھی کَدْحٌ بمعنی کَدْمٌ بھی آتا ہے جس کے معنی دانت کاٹنے کا نشان کے ہیں۔

(ک د ر)

اَلْکَدَرُ کے معنی کسی چیز میں گدلا پن کے ہیں اور یہ صَفَاءٌ (صفائی) کی ضد ہے، مثلاً: عَیْشٌ کَدِرٌ۔ تیرہ زندگی۔ اَلْکُدْرَۃُ کے معنی بھی گدلا پن کے ہیں مگر اس کا استعمال خصوصیت کے ساتھ رنگ میں ہوتا ہے اور کُدُوْرَۃُ کا پانی اور زندگی میں۔

اَلْاِنْکِدَارُ: (انفعال) اس تغیر کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے بکھر جانے سے واقع ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ﴾ (۸۱۔۲) اور جب ستارے بکھر کر بے نور ہو جائیں گے۔

اِنْکَدَرَ الْقَوْمُ عَلٰی کَذَا: قوم بکھر کر اس پر ٹوٹ پڑی۔

(ک د ی)

اَلْکُدْیَۃُ کے معنی سخت زمین کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔

حَفَرَ فَاَکْدٰی: وہ گڑھا کھودتا ہوا سخت زمین تک جا پہنچا اور مزید کھدائی سے رک گیا اور استعارہ کے طور پر اَکْدٰی کا لفظ تھوڑا سا دے کر ہاتھ روک لینے اور ناکام ہونے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی﴾ (۵۳۔۳۴) تھوڑا سا دیا اور پھر (ہاتھ) روک لیا۔

(ک ذ ب)

اَلْکَذِبُ: (جھوٹ) صِدْقٌ پر بحث کے سلسلہ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ قول اور فعل دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۰۵) جھوٹ اور افتراء تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں۔ جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ﴾ (۶۳۔۱) لیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق (دل سے اعتقاد نہ رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔ میں ان کے کاذب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں گو واقعتاً

---

[1] قالہ حسان بن نشبہ واولہ: ابوا ان یبیحو اجارھم لعد وھم۔ والبیت من قصدیۃ حماسیۃ فی اربعۃ ابیات راجع المرزوقی رقم ۱۱۳ وفی التبریزی حتی تکورا ای من کور العمامۃ والمعنی واحد قال ابو محمد الاعرابی واسم الشاعر مصحف والصواب جساس بن نشبہ قال جریر یھجو حجذب بن خرعب التیمی: احجذب اشبھت التی کان بظرھا کطرثوث ارض غیر ذات اناس: لقد شھدت یتم علی ام حجذب کان سراۃ التیم رھط جساس

صحیح ہے مگر ان کے ضمیر اس کے خلاف ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ﴾ (۵۶۔۲) اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں ہے۔

میں نفس فعل یعنی وقوعؑ کی طرف کذب کی نسبت کی ہے۔ جیسا کہ فِعْلَةٌ صَادِقَةٌ وَّفِعْلَةٌ كَاذِبَةٌ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ﴾ (۹۶۔۱۶) یعنی اس جھوٹے خطا کار کی پیشانی (کے بال) میں ناصیہ کو مبالغہ کے طور پر کاذب کہا ہے) اور كَذَّابٌ كَذُوْبٌ ، كُذُبْذُبٌ وَكَيْذُبَانٌ یہ سب مبالغہ کے صیغے ہیں۔ محاورہ ہے۔

لَا مَكْذُوْبَةَ یعنی...... میں تیرے سامنے جھوٹ نہیں بولتا۔ كَذَبْتُكَ حَدِيْثًا: میں نے تم سے جھوٹ کہا۔ قرآن میں ہے۔

﴿الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ (۹۔۹۰) جنہوں نے خدا اور رسولؐ سے جھوٹ بولا۔

اور کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسا کہ آیت:۔

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ﴾ میں صدق دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ محاورہ ہے۔

كَذَبَهٗ كَذِبًا وَّكِذَّابًا: یعنی اس کے سامنے جھوٹ بولا۔

اَكْذَبْتُهٗ: میں نے اسے جھوٹا پایا۔ كَذَّبْتُهٗ: میں نے اس کی طرف جھوٹ کی نسبت کی (یعنی اسے جھوٹا کہا) خواہ وہ واقعہ میں سچا ہے یا جھوٹا۔ دونوں حالتوں میں اس کا استعمال ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف سچے آدمی کی تکذیب پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ﴾ (۲۔۳۹) اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

﴿رَبِّ انْصُرْنِىْ بِمَا كَذَّبُوْنِ﴾ (۲۳۔۲۶) کہ پروردگار! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے تو میری مدد کرو۔

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ﴾ (۵۰۔۵۰) بلکہ انہوں نے حق کو جھوٹ سمجھا۔

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا﴾ (۵۴۔۹) ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی تکذیب کی تھی تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا۔

﴿وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۳۵۔۲۵) اور (اے پیغمبر) اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی تکذیب کر چکے ہیں۔

﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ﴾ (۶۔۳۳) یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے۔

ایک قراءت میں لَا يُكْذِبُوْنَكَ ہے۔ یعنی وہ نہ تجھے جھوٹا پاتے ہیں۔ اور نہ ہی تیرا جھوٹ ثابت کر سکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ (۱۲۔۱۱۰) یہاں تک کہ جب پیغمبر ناامید ہو گئے اور انہوں نے خیال کیا (کہ اپنی نصرت کے بارے میں جو بات انہوں نے کہی تھی اس میں وہ سچے نہ نکلے۔

یعنی انہوں نے یقین کرلیا کہ یہ لوگ جن کی طرف انہیں بھیجا گیا ہے تکذیب ہی کریں گے تو كُذِّبُوْا کے معنی جھٹلائے جانے کے ہیں جیسے فُسِّقُوْا وَخُطِّئُوْا کے معنی کسی کی طرف فسق یا خطا کاری کی نسبت کرنے کے ہیں۔

چنانچہ فرمایا:
﴿فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ (۳۵۔۴) تو تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے گئے ہیں۔
فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ: تو انہوں نے میرے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
﴿اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ﴾ (۳۸۔۱۴) (ان) سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
مذکورہ بالا آیت (۱۲۔۱۱۰) میں ایک قراءت كُذِبُوْا بتخفیف دال بھی ہے ❶ جو کہ كَذَبْتُكَ حَدِيْثًا سے ماخوذ ہے اس صورت میں كُذِّبُوْا کا فاعل کفار ہوں گے یعنی حتی کہ کفار نے یہ خیال کیا کہ پیغمبر جھوٹ بولتے ہیں کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب نازل ہوگا اور کفار کے دلوں میں یہ خیال اس بنا پر پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دی اور فوراً عذاب نازل نہ کیا۔ اور آیت ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا﴾ (۷۸:۲۵) (وہاں نہ وہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ (وخرافات) میں كِذَّاب کے معنی تَكْذِيْب کے ہیں۔ یعنی وہ جھوٹ ہی نہیں بولیں گے حتیٰ کہ ایک دوسرے کی تکذیب کی نوبت آئے لہٰذا جنت میں تکذیب کی نفی کذب کی نفی کو مستلزم ہے ایک قراءت میں كِذَابًا ہے۔ جو کہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے۔ ''کہ اہل جنت باہم کذب بیانی نہیں کریں گے۔'' جس طرح کہ لوگ دنیا میں کرتے ہیں۔ محاورہ ہے۔
حُمِلَ فُلَانٌ عَلٰى فِرْيَةٍ وَكَذِبٍ: فلاں کو جھوٹ بولنے پر اکسایا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کی ضد میں صَدَقَ استعمال ہوتا ہے۔ اور جب اونٹنی کے متعلق یہ یقین ہو کہ کچھ عرصہ تک اس کا دودھ خشک نہیں ہوگا۔ لیکن توقع کے خلاف اس مدت سے پہلے ہی خشک ہو جائے تو کہا جاتا ہے كَذَبَ لَبَنُ النَّاقَةِ: اونٹنی کا دودھ توقع کے خلاف خشک ہو گیا اور كَذَبَ عَلَيْكَ الْحَجُّ فَبَادِرْ کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تم پر حج فرض ہو چکا ہے۔ اسے فوراً ادا کرو۔ ❷ (۹۲) اور اصل حج کو اس غائب آدمی کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کی آمد میں دیر ہوگئی ہے اور یہ قَدْ فَاتَ الْحَجُّ فَبَادِرْ۔ (کہ حج فوت ہونے کو ہے لہٰذا جلدی کرو) کے ہم معنی ہے اور كَذَبَ عَلَيْكَ الْعَسْلَ میں عَسْل منصوب عَلَى الْاَغْرَاءِ ہے۔ یعنی شہد ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ❸ (۹۳)

---

❶ قال الطبری: وذالك قراءة بعض قراء المدينة وعامة قرار اهل الكوفة ونحن نختار هذا القراءة وماخوذ من التفسير ص(۸۵ ج۱۲)۔

❷ قاله عمر بن الخطاب رضی الله تعالىٰ عنه انظر للاثر و معانيه المختلفة الصحاح واللسان (كذب) واصلاح المنطق لابن السكيت (٣٢٤) قال فى الدنياه (١٣٢/١) ان لاحمد بن محمد لاغسيكفى كتاب كذب عليك كذا، وفى النوادر (١١٢/١ـ١١٥): قال ابو عبيدة الحج مرفوع على الاغراء ثم ذكر الشاهد وجاء فى المنصب ايضا انتهى مختصرا وانظر للاثر ايضا غريب ابى عبيد ٣/والمعانى للقبتى (١٩٠) لزم الحج ١٢۔

❸ وحينئذ يكون عليك اسم فعل بمعنى الزم وفى ابدال ابى الطيب (٣١٩/٢) والفائق (١٩٦/٢) (وفيه البحث على طوله): وشكا عمرو بن معديكرب الى عمرؓ بن الخطاب المعص (اى التواء عصب الرجل فقال كذب عليك العسل اى عليك بالعدد فالعسل ههنا بمعنى العسلان اى الاسراع ومقاربة الخطو كما يفعل الذئب اذا قارب من الشىء والمثل يضرب على طرق شتى قال ابو شميل اللغوى كذب العسل اى امكنك فاعسل واسرع ورفع العسل بكذب ومعناه النصب لانه يريدان يامره بالعسلان كما يقال امكنك الصيد فارمه وانظر ايضا الدرة للحريرى مع شرح الخفا جى (١٤٩ـ١٥٠) فان الشارح قد حقق القول بانه يجوزا النصب والرفع على العسل والحج۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَسَلٌ بمعنی عَسَلَانٌ اور عَسَلَانٌ کے معنی ایک قسم کی دوڑ کے ہیں۔اَلْکِذَابَةُ: ایک قسم کا کپڑا جس پر مصنوعی نقش و نگار کیا گیا ہو مگر ایسا معلوم ہو کہ اس کا نقش و نگار اصلی ہے۔اس کے دیکھنے میں چونکہ انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔اس لیے اسے کِذَابَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ک ر ر)

اَلْکَرُّ: اس کے اصل معنی کسی چیز کو بالذات یا بالفعل پلٹانا یا موڑ دینا کے ہیں۔اور بٹی ہوئی رسی کو بھی کَرٌّ کہا جاتا ہے۔یہ اصل میں مصدر ہے مگر بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔اس کی جمع کُرُوْرٌ آتی ہے اسی سے اَلْکَرَّةُ (دوسری بار) ہے جیسے فرمایا:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّةَ عَلَیْهِمْ﴾ (۱۷۔۶) پھر ہم نے دوسری بار تم کو ان پر غلبہ دیا۔

﴿فَلَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّةً فَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۰۲) کاش ہمیں دنیا میں بھی پھر جانا ہو تو ہم مومنوں میں ہو جائیں۔

﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّةً﴾ (۲۔۱۶۷) (یہ حال دیکھ کر) پیروی کرنے والے (حسرت سے) کہیں گے کہ اے کاش! ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا۔

لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّةً: اگر مجھے پھر ایک بار دنیا میں جانا نصیب ہوتا۔

اَلْکِرْکِرَةُ: (مِثْلُ زِبْرِجَةٌ) شتر کے سینہ کی سخت جگہ کو کہتے ہیں۔اور لوگوں کی مجتمع جماعت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اَلْکَرْکَرَةُ۔ کے معنی ہوا کے بادل کو چلانا کے ہیں اور یہ کَرٌّ سے فعل رباعی ہے۔

(ک ر ب)

اَلْکَرْبُ: کے معنی سخت غم کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ﴾ (۲۱۔۷۶) تو ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بڑی گھبراہٹ سے نجات دی۔

اور کُرْبَةٌ، غُمَّةٌ کی طرح ہے یہ اصل میں کَرْبُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے جس کے معنی زمین میں قلبہ رانی کے ہیں۔اور غم سے بھی چونکہ طبیعت الٹ پلٹ جاتی ہے۔اس لیے اسے کَرْبٌ کہا جاتا ہے۔مثل مشہور ہے۔❶

اَلْکِرَابُ عَلَی الْبَقَرِ: یعنی ہر آدمی کو اس کا کام کرنے دو اور یہ اَلْکِلَابُ عَلَی الْبَقَرِ کے قبیل سے نہیں ہے❷ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کِرَابٌ (سخت غم) کَرَبَتِ الشَّمْسُ سے ماخوذ ہو جس کے معنی ہیں سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا اور اِنَاءٌ کَرْبَانٌ میں کَرْبَانٌ بمعنی قَرْبَانٌ ہے۔یعنی تقریباً بھرا ہوا برتن اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔کہ کَرْبٌ (غم) اَلْکَرْبُ سے مشتق ہو جس کے معنی سخت گرہ کے ہیں جو ڈول کے ساتھ رسی میں لگی رہتی

---

❶ قال فی المیدانی (۲/۱۴۲): یضرب فی تخلیة المرء وصناعة۔

❷ انظر للمثل "الکلاب علی البقر" الحیوان للجاحظ (۱: ۲۶۰) واللسان (کلب) والعیون (۲: ۲) وفی التاج وکذا فی الحیوان للدمیری کلدم فیه کثیر وایضا انظر المزهرا ۶۵ قال فی مجمع الامثال یضرب عند تحریش بعض القوم علی بعض من غیر مبالات۔

ہے۔اور غم بھی دل پر بمنزلہ گرہ کے بیٹھ جاتا ہے۔اس لیے اسے کَرْب کہا جاتا ہو۔اَکْرَبْتُ الدَّلْوَ: ڈول کے دستہ میں چھوٹی سی رسی باندھنا۔

(ک ر س)

اَلْکُرْسِیُّ :عوام کے عرف میں اس شے کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ﴾ (۳۸۔۳۴) اور ان کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا۔

یہ اصل میں کِرْسٌ کی طرف منسوب ہے اور کرس کے معنی ہیں، اوپر تلے جم جانے والا اور جمع ہو جانے والا۔اسی سے کُرَّاسَةٌ (مجموعہ اوراق) ہے۔کَرَسْتُ الْبِنَاءَ فَتَکَرَّسَ: میں نے عمارت کی بنیاد رکھی چنانچہ وہ بنیاد پڑ گئی عجاج نے کہا ہے [1] (الرجز)

(۳۰۸) یَا صَاحِ هَلْ تَعْرِفُ رَسْمًا مُکْرَسًا
قَالَ نَعَمْ اَعْرِفُهٗ وَاَبَاءَ سَا

اے میرے دوست: کیا تم نشان منزل کو پہنچانتے ہو جہاں کہ اونٹوں کا بول و براز جما ہوا ہے۔اس نے کہا ہاں پہنچانتا ہوں اور غم زدہ ہو کر خاموش ہو گیا اَلْکِرْسُ کسی چیز کی اصل اور بنیاد کو کہتے ہیں۔

محاورہ ہے۔

هُوَ قَدِیْمُ الْکِرْسِ: اس کی بنیاد پرانی ہے اور ہر چیز کے ڈھیر کو کِرْسٌ کہا جاتا ہے اور کَرُّوْسٌ کے معنی بڑے سر والا کے ہیں۔اور آیت کریمہ:﴿وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ (۲۔۲۵۵) اس کی ''کرسی'' آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے کی تفسیر میں ابن عباسؓ سے مروی ہے۔کہ کرسی سے علم باری تعالیٰ مراد ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ کرسی کے معنی حکومت واقتدار کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ فلک محیط یعنی فلک الافلاک کا دوسرا نام کرسی ہے [2] اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔کہ سات آسمان کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے بیابان میں ایک انگوٹھی پڑی ہو۔[3]

(ک ر م)

اَلْکَرَمُ: جب اللہ کی صفت ہو تو اس سے احسان وانعام مراد ہوتا ہے جو ذات باری تعالیٰ سے صادر ہوتا رہتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ﴾ (۲۷۔۴۰) تو میرا پروردگار بے پرواہ اور کرم کرنے والا ہے۔

[1] قاله العجاج وثالثهما وانحلبت عيناه من فرط الاسى وفى اللسان وابلسابدل واباسا، انظر للشطر ديوانه ١٦ و الكامل ٥٣٩ و الطبرى (٧: ١١٦) والقرطبى (٦: ٤٢٧) واللسان و التاج (بلس، كرس) ومعانى القرآن المنسوب الى الفراء (١: ٣٣٥) والمكرس موضع فيه الكروس اى ابوال الابل وابعارهما يتلبد بعضها على بعض والرجز ايضا فى الطبرى (١: ٢٢٧/ ٢١: ٢٦) ومجازا القرآن رقم (٢١٧) وتهذيب الالفاظ ٦٢٥ والبحر (٢: ٢٨٠) والثالث فقط فى مجاز القرآن (١٦١)

[2] فسره الزمخشرى بالملك والعلم قال ومنه يقال للعلماء الكراسى ١٢۔

[3] اخرجه ابن جرير وابن المنذر عن ابن عباس وروى بمعناه مرفوعا عن ابى ذر كما فى زوائد ابن حبان رقم (٩٤) فى اثناء حديث طويل وقال فى آخره وفيه ابراهيم بن هشام بن يحيى الغسانى قال ابو حاتم وغيره كذاب انظر لترجمته الجرح عليه لسان الميزان ١٢۔

اور جب انسان کی صفت ہو،تو پسندیدہ اخلاق اور افعال مراد ہوتے ہیں جو کسی انسان سے ظاہر ہوتے ہیں۔اور کسی شخص کو اس وقت تک کریم نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس سے کرم کا ظہور نہ ہو چکا ہو۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ حریت اور کرم ہم معنی ہیں لیکن حریت کا لفظ چھوٹی بڑی ہر قسم کی خوبیوں پر بولا جاتا ہے اور کرم صرف بڑے بڑے محاسن کو کہتے ہیں۔مثلاً جہاد میں فوج کے لیے سازوسامان مہیا کرنا یا کسی ایسے بھاری تاوان کو اٹھا لینا جس سے قوم کے خون اور جان کی حفاظت ہوتی ہو۔اور آیت:۔

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ﴾ (۴۹۔۱۳) اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

میں "اَتْقٰی" یعنی سب سے زیادہ پرہیزگار کو "اَکْرَمُ" یعنی سب سے زیادہ عزت وتکریم کا مستحق ٹھہرانے کی وجہ یہ ہے کہ کَرَم بہترین صفات کو کہتے ہیں اور سب سے بہتر اور پسندیدہ کام وہی ہو سکتے ہیں جن سے رضا الٰہی کے حصول کا قصد کیا جائے لہٰذا جو جس قدر زیادہ پرہیزگار ہوگا اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

نیز اَلْکَرِیْمُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ہم نوع چیزوں میں سب سے زیادہ باشرف ہو چنانچہ فرمایا:﴿فَاَنْبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ﴾ (۳۱۔۱۰) پھر (اس سے) اس میں ہر قسم کی نفیس چیزیں اگائیں۔

﴿وَزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ﴾ (۴۴۔۲۶) اور کھیتیاں اور نفیس مکان۔

﴿اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ﴾ (۵۶۔۷۷) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن پاک ہے۔

﴿وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا﴾ (۱۷۔۲۳) اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا۔

اَلْاِکْرَامُ وَالتَّکْرِیْمُ کے معنی ہیں: کسی کو اس طرح نفع پہنچانا کہ اس میں اس کی کسی طرح کی سبکی اور خفت نہ ہو یا جو نفع پہنچایا جائے وہ نہایت باشرف اور اعلیٰ ہو اور اَلْمُکَرَّمُ کے معنی معزز اور باشرف کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ ضَیْفِ اِبْرٰھِیْمَ الْمُکْرَمِیْنَ﴾ (۵۱۔۲۴) بھلا تمہارے پاس ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے؟ اور آیت کریمہ:۔

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ﴾ (۲۱۔۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے معزز بندے ہیں جیسے فرمایا:۔﴿وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ﴾ (۳۶۔۲۷) اور مجھے عزت والوں میں کیا۔

﴿کِرَامًا کَاتِبِیْنَ﴾ (۸۲۔۱۱) عالی قدر (تمہاری باتوں کے) لکھنے والے۔

﴿بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ﴾ (۸۰۔۱۶) (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار اور نیکوکار ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ﴾ (۵۵۔۲۷) اور جو صاحب جلال اور عظمت ہے۔

میں اکرام کا لفظ ہر دو معنی پر مشتمل ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ عزت وتکریم بھی عطا کرتا ہے اور باشرف چیزیں بھی بخشتا ہے۔[1]

---

[1] وھذا المعنی ھو المراد (۹۶۔۳) (۱۷۔۶۲) (۸۹۔۱۵)

(ک ر ہ)

اَلْکَرْہُ وَالْکُرْہُ: (سخت ناپسندیدگی) ہم معنی ہیں۔ جیسے ضَعْفٌ وَضُعْفٌ بعض نے کہا ہے کہ کَرْہٌ (بفتح الکاف) اس مشقت کو کہتے ہیں۔ جو انسان کو خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی ڈالی جائے۔ اور کُرْہٌ (بضم الکاف) اس مشقت کو کہتے ہیں جو اسے ناخواستہ طور پر خود اپنے آپ سے پہنچتی ہے۔ اور یہ دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو طبعًا ناگوار ہو۔ اور دوم وہ جو عقل یا شریعت کی رو سے مکروہ ہو لہٰذا ایک ہی چیز کے متعلق انسان کہہ سکتا ہے۔ کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور برا بھی سمجھتا ہوں یعنی مجھے طبعا تو پسند ہے لیکن عقل وشریعت کی رو سے اسے ناپسند کرتا ہوں یا عقل وشریعت کی رو سے مجھے پسند ہے لیکن طبعًا ناپسند ہے چنانچہ آیت کریمہ:

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (مسلمانو) تم پر (خدا کے رستے میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہیں ناگوار تو ہوگا۔

میں کُرْہٌ کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری طبیعتیں اسے ناپسند کرتی ہیں پھر اس کے بعد۔

﴿وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ﴾ (۲۔۲۱۶) (مگر) عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور تمہارے حق میں بھلی ہو۔

فرما کر وضاحت کر دی ہے۔ کہ انسان کو چاہیے کہ کسی چیز کو اس وقت تک محبوب یا مکروہ نہ سمجھے جب تک کہ اس کی حقیقت حال سے آگاہ نہ ہو جائے۔

کَرِھْتُ کا لفظ دونوں قسم کی کراہت کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ گو زیادہ تر کُرْہٌ یعنی ناگوار کے معنی دیتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ﴾ (۹۔۳۲) اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔

﴿وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ (۹۔۳۳) اور اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

﴿وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ﴾ (۸۔۵) اور (اس وقت) مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ اور آیت کریمہ: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْهُ﴾ (۴۹۔۱۲) کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے۔ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان اپنے بھائی کا گوشت کھانے کا خواہ قصد بھی کرے مگر طبعًا اسے اس سے ضرور نفرت ہوگی اور آیت کریمہ: ﴿لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْھًا﴾ تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ (۴۔۱۹) میں ایک قراءت کُرْھًا بھی ہے۔ اَلْاِکْرَاہُ: اس کے معنی کسی کو ایسے کام پر مجبور کرنا کے ہیں جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ﴾ (۲۴۔۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو...... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔ میں بدکاری پر مجبور کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس پر کَرْہٌ اور کُرْہٌ دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ﴾ (۲۔۲۵۶) دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے کی مختلف توجیہات بیان کی گئی ہیں: اول یہ کہ شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ کسی پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو جائے تو فبہا

اس پر جبر نہ کیا جائے ❶۔

دوم یہ کہ یہ حکم اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے۔یعنی اگر وہ لوگ جزیہ دینا قبول کرلیں اور دوسری شرائط کی پابندی کریں تو انہیں مسلمان ہونے پر مجبور نہ کیا جائے۔❷

سوم (۳) یہ کہ اس آیت کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو دین باطل کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے اور وہ زبان سے اس کا اقرار کر کے اس دین میں داخل ہو جائے تو اس پر کفر کا حکم عائد نہیں ہوتا۔جیسا کہ آیت:

﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ﴾ (۱۶۔۱۱۶) وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، سے معلوم ہوتا ہے۔

چہارم (۴) زیر بحث آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص دنیا میں کسی طرف سے مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ تو آخرت میں اسے اس کا ثواب نہیں ملے گا بے شک اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔اور وہ اخلاص کے بغیر کسی عمل کو قبول نہیں کرتا ❸ ﴿وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ اسی لیے آنحضرت ﷺ فرمایا ❹ (۹۴) ((اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) کہ اعمال کے ثواب کا مدار نیتوں پر ہے۔ نیز فرمایا ❺: اَخْلِصْ یَكْفِیْكَ الْقَلِیْلُ مِنَ الْعَمَلِ کہ اخلاص کے ساتھ تو تھوڑا عمل بھی کافی ہوتا ہے۔

بعض نے آیت کے معنی یہ کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن احکام کا بھی انسان کو مکلّف بناتا ہے تو وہ درحقیقت اسے کسی امر پر مجبور نہیں کرتا بلکہ اپنی ابدی نعمتوں کے حاصل کرنے کی تکلیف دیتا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس قوم پر تعجب فرماتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔❻ (۹۵)

ششم (۶) یہ کہ دین کے معنی اجزاء کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جزائے اعمال پر مجبور نہیں ہے۔ بلکہ اسے اختیار ہے کہ جس کے ساتھ جس طرح چاہے سلوک کرے۔اور آیت کریمہ: ﴿اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

---

❶ وهذا هوا المروى عن عبدالله بن مسعود وابن زيد وسليمان بن موسى وعندهم هذا الحكم منسوخ بآية: جاهد الكفار والمنافقين۔

❷ وهو المحكى عن الحسن قتادة والضحاك و ورد فى سبب نزوله يؤيده (روح المعانى ص٢ ج٣)

❸ قاله وقال هذا يشير كلام مجاهد واخرج ابن جرير وغيره عن ابى العالية (روح المعانى ١٨٨/٣)

❹ متفق عليه لكن بزياده "انما" وابن حبان فى صحيحه بدونها (المقاصد ٦٨) ومالك برواية محمد بن الحسن والحاكم فى المستدرك واصحاب السنن كلهم عن عمرؓ وايضا مالك فى رواية محمد بن الحسن والشافعى فى مختصر الربيع والحميدى وابن الجارود وابن خزيمة والطحاوى عن غير عمر ايضاً لكن طرقها كلها ضعيفة راجع للبحث (الفتح البارى) (والعينى) فانهما اشبع الكلام والسيوطى فى التدريب فى بحث "الشاذ" والحاصل ان الحديث صحيح غريب وقد تواتر معناه (راجع كنز العمال(٣ رقم ٣٦۔٢١، ٢٤٥) بعض علماء الازهر جمع اسانيده فى رساله مسماة الابتهاج بتخريج احاديث المنهاج۔

❺ والحديث ابن ابى الدنيا فى الاخلاص وللديلمى فى مسنده باسناد منقطع ولفظه اخلص العمل يجزك من القليل (راجع كنز العمال (ج٣ رقم ١٣٠) وتخريج العراقى على الاحياء (٣٨٦/٤)۔

❻ البخارى فى صحيحه فى باب الاسارى فى فى السلاسل من حديث ابى هريرة وابوداؤد و مسلم وباختلاف الفاظه الحاكم فى المستدرك والطبرانى عن ابى امامة (راجع كنز العمال (٤ رقم ١٧٨،٢١٩۔)

طَوْعًا وَّ کَرْهًا﴾ (۳۔۸۳) کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب اہل آسمان وزمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طوعا کا تعلق مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ کے ساتھ ہے اور کَرْهًا کا تعلق اَلْاَرْضِ سے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اہل آسمان تو بطیب خاطر اس کی فرمانبرداری کررہے ہیں اور اہل زمین زبردستی سے یعنی دلائل فطرت سے مجبور ہو کر اس کی اطاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے۔

اَلدَّلَالَةُ اَکْرَهَتْنِیْ عَلَی الْقَوْلِ بِهٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ کہ دلائل سے مجبور ہو کر میں اس مسئلہ کو مانتا ہوں اور اس قسم کا جبر جبر مذموم نہیں ہے یعنی دلائل سے مجبور ہو کر کسی بات کو ماننا سلب اختیار کو مستلزم نہیں ہے (حتیٰ کہ اس پر عدم جزا کا مسئلہ مرتب ہو جیسا کہ جبریہ فرقہ کا مذہب ہے)

(۲) اس آیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مومنین تو خوشی سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور کافر کرھا یعنی زبردستی سے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس بات کا ان سے ارادہ کرتا ہے اور جو بھی ان کے متعلق فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اس سے انکار کی طاقت نہیں رکھتے۔

(۳) قتادہ نے اس کو حالت نزع پر محمول کیا ہے۔ کہ عندالموت مومنین تو خوشی سے اور کفار زبردستی سے اس کی فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ آیت:

﴿فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ﴾ (۴۰۔۸۵) اس وقت ان کے ایمان نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا۔ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) چہارم یہ کہ کَرْهًا مسلمان ہونے سے وہ لوگ مراد ہیں جو لڑائی میں جان بچانے کے لیے مسلمان ہو جاتے تھے۔

(۵) اس آیت میں پانچواں قول ابو العالیہ اور مجاہد کا ہے کہ ہر شخص اللہ کے خالق ہونے کا معترف ہے۔ خواہ مشرک ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ آیت: ﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (۳۱۔۲۵) اور اگر تم اس سے پوچھو کہ آسمان اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔ سے معلوم ہوتا ہے گویا مومن خوشی سے اس کی خالقیت کا اعتراف کرتے ہیں اور کفار زبردستی سے۔

(۶) ابن عباس سے مروی ہے کہ تمام لوگ احوال فطری کے لحاظ سے اس کے فرمانبردار ہیں اگرچہ زبان کے ساتھ وہ اظہار کفر کرتے ہیں اور اس سے مراد ''ذَرِّ اَوَّل'' کے وقت کا اسلام ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی﴾ (۷۔۱۷۲) کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ وہ کہنے لگے: کیوں نہیں، میں پایا جاتا ہے۔ یعنی عقل (وغیرہ) کی قسم کے فطری دلائل مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے مقتضی ہیں اور وہ دلائل وہی جن کی طرف کہ آیت:

﴿وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ﴾ (۱۳۔۱۵) اور ان کے سائے بھی صبح وشام (سجدہ کرتے ہیں) میں اشارہ فرمایا ہے۔

(۷) زیر بحث آیت میں ساتواں قول بعض صوفیاء کرام کا

ہے۔کہ مَنْ اَسْلَمَ طَوْعًا سے وہ لوگ مراد ہیں جو ثواب اور عقاب کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہیں کرتے بلکہ براہ راست اس ذات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ثواب وعقاب دینے والی ہے اور کَرْھًا سے مراد وہ لوگ ہیں جو صرف ثواب وعقاب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔اور ثواب کی رغبت یا عذاب کے خوف سے اس کے فرمانبردار رہتے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا﴾ (۱۳۔۱۵) اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمینوں میں ہیں خوشی سے یا زبردستی سے خدا کے آگے سجدہ کرتی ہیں۔

بھی اس کی مثل ہے (یعنی مذکورۃ الصدر معانی پر محمول ہو سکتی ہے۔)

(ک س ب)

اَلْکَسْبُ: اصل میں جلب نفع یا خوش نصیبی حاصل کرنے کے لیے کسی چیز کا قصد کرنے کو کسب کہتے ہیں، جیسے کسب مال وغیرہ اور ایسے کام کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے جسے انسان اس خیال پر کرے کہ اس سے نفع حاصل ہوگا لیکن الٹا اس سے نقصان اٹھانا پڑے۔ پس اَلْکَسْبُ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات اور اس کے ساتھ دوسروں کے فائدہ کے لیے کرے اسی لیے یہ کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے کَسَبْتُ فُلَانًا کَذَا: میں نے فلاں کو اتنا کچھ حاصل کر کے دیا۔ مگر اَلْاِکْتِسَابُ: ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے لہٰذا ہر اَکْتِسَاب کو کسب لازم ہوتا ہے۔ لیکن ہر کسب کو اکتساب لازم نہیں ہے۔ اور یہ خَبَزَ وَاخْتَبَزَ وَشَوٰی وَاشْتَوٰی، وَطَبَخَ وَاطَّبَخَ کی طرح ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ﴾ (۲۔۲۶۷) جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو...... اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔

کے متعلق آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا [1]
اَیُّ الْکَسْبِ اَطْیَبُ؟ کہ کونسا کسب زیادہ پاکیزہ ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ((عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِہٖ۔ کہ انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور نیز فرمایا [2] (۹۵) ((اِنَّ اَطْیَبَ مَا یَاْکُلُ الرَّجُلُ مِنْ کَسْبِہٖ وَاِنَّ وَلَدَہٗ مِنْ کَسْبِہٖ)) سب سے زیادہ پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھالے اور اسکی اولاد بھی اس کے کسب سے ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا﴾ (۲۔۲۶۴) (اسی طرح یہ ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور قرآن پاک میں نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کے متعلق یہ فعل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:

---

[1] رواہ الترمذی عن عنسة والبخاری عن عبداللہ بن عمر والطبرانی واحمد عن رافع بن خدیج وابن اسحاق عن علی قال فی الکنز (٤ رقم ٦٦٠٦) وتفرد بہ بھلول وقال الحاکم صحیح الاسناد راجع تخریج العراقی علی الاحیاء (٢/٦٣-١٢٦٤)۔

[2] الحدیث فی ابی داؤد عن عائشة رضی اللہ عنھا وزوائد بن حبان رقم (١٠٩١ و ١٠٩٢) وکنز العمال (ج ٤ رقم ٣٢٠٣١، ٤٠٠٣٢) وایضاً تخریج الکشاف للحافظ (ص ١٢٠) رقم (٩٠) وقال الحاکم عن عمارة عن امہ عن عائشہ وذکر الدارقطنی فی العلل وطال ویتعلق بالباب حدیث ((انت ومالك لابیك فارجع الیہ)) قال القبتی فی الغریب وبعضھم فسرآیة اللھب "وما کسب" ای وما ولد

﴿اَوْ کَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِهَا خَیْرًا﴾ (۶۔۱۵۸) یا اپنے ایمان کی حالت میں نیک عمل نہیں کیے ہونگے اور آیت کریمہ:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً الْاٰیة﴾ کے بعد فرمایا:

﴿مِمَّا کَسَبُوْا﴾ (۲۔۲۰۲) ان کے کاموں کا (حصہ) اور اعمال بد کے متعلق فرمایا۔

﴿اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا کَسَبَتْ﴾ (۶۔۷۰) تاکہ (قیامت کے دن کوئی شخص اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا کَسَبُوْا﴾ (۶۔۷۰) یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۲۰) جو لوگ گناہ کرتے ہیں وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے ﴿فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَ وَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ﴾ (۲۔۷۹) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے۔ اس لیے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

﴿فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا وَّلْیَبْکُوْا کَثِیْرًا جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾ (۹۔۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں) ان کو اعمال کے بدلے جو کرتے رہے ہیں بہت سا رونا ہوگا۔ ﴿وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا﴾ (۳۵۔۴۵) اور اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا۔

﴿وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا﴾ (۶۔۱۶۴) اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا ضرر اسی کو ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ﴾ (۲۔۲۸۱) اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا۔ میں مَا کَسَبَتْ کا لفظ نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کو شامل ہے اور اِکْتِسَابِ کا لفظ بھی ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ﴾ (۴۔۳۲) مردوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے اور عورتوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَهَا مَا کَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ﴾ (۲۔۲۸۶) اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا اور برے کام کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا۔

سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ کسب کا لفظ اعمال صالحہ اور اکتساب کا لفظ اعمال سیئہ کے ساتھ مخصوص ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کَسْب سے اعمال اخروی اور اکتساب سے مکاسب دنیوی مراد ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ کسب سے مراد ہر وہ عمل ہے جو فعل خیر یا جلب نفع کے قبیل سے ہو اور دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے جائز طریقے سے انسان اسے کرتا ہے اور اکتساب سے ہر وہ نفع مراد ہے جو انسان اپنی ذات کے لیے حاصل کرتا ہے بشرطیکہ اس کا حصول اس کے لیے جائز ہو لہٰذا آیت میں اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ جو فعل انسان دوسروں

کو فائدہ پہنچانے کے لیے کرتا ہے۔ اس کا اسے ثواب حاصل ہوگا اور جو صرف اپنی ذات کے لیے حاصل کرتا ہے خواہ اس کا حصول جائز طریقے پر ہی کیوں نہ ہو، تو شاذ ونادر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا وبال اس پر نہ پڑے تو یہ اس مقولہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو مصائب کا خوگر بنائے جیسا کہ آیت: ﴿اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (۸۔۲۸) کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔ اور اس قسم کی دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے۔

(ک س ف)

كَسُوْفُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ کے معنی ہیں: سورج یا چاند کا کسی خاص عارضہ سے مستور یعنی گہن میں آجانا کے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر چہرہ یا حالت کے خراب ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے كَاسِفُ الْوَجْهِ یا كَاسِفُ الْحَالِ۔

اَلْكِسْفَةُ: کے معنی بادل، روئی یا اس قسم کے دوسرے متخلخل اجسام کے ٹکڑہ کے ہیں اس کی جمع كِسَفٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿ثُمَّ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا﴾ (۳۰۔۴۸) اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ﴿فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۶۔۱۸۷) تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لا کر گراؤ۔

﴿اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا﴾ (۱۷۔۹۲) یا جیسا تم کہا کرتے ہو ہم پر آسمان کے ٹکڑے لا کر گراؤ۔

ایک قراءت میں كِسْفًا بسکون سین ہے اور كِسَفٌ کا واحد كِسْفَةٌ ہے جیسے سِدْرَةٌ وَسِدَرٌ اور فرمایا۔

﴿وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۵۲۔۴۴) اور اگر یہ آسمان سے عذاب کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں۔

ابوزید نے کہا ہے [1] كَسَفْتُ الثَّوْبَ (ض) كِسْفًا کے معنی کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں بعض نے كَسَفْتُ عُرْقُوْبَ الْاِبِلِ بھی کہا جس کے معنی اونٹ کی کونچ کاٹ دینے ہیں (لیکن) بعض اہل لغت کے نزدیک اس معنی میں صرف كَسَحْتُ (ف) ہی استعمال ہوتا ہے۔

(ک س ل)

اَلْكَسَلُ کے معنی کسی ایسے معاملہ میں گراں باری ظاہر کرنا کے ہیں۔ جس میں گرانباری کرنا مناسب نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مذموم خیال کیا جاتا ہے اور یہ باب كَسِلَ (س) فَهُوَ كَسِلٌ وَّكَسْلَانٌ کا مصدر ہے۔ اور كَسْلَانٌ کی جمع كُسَالٰی وَكَسَالٰی آتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

---

[1] ابوزید البلخی احمد بن سهل (۲۳۵۔۳۲۲) احد الكبار الافذاذ من علماء الاسلام وصاحب التاليفات وكتابه نظم القرآن من امثل ما كتب فيه قال ابو حيان فى كتاب "البصائر والذخائر" قال ابو حامد القاضى لم اركتا با فى القرآن مثل كتاب ابى زيد البلخى وفى الفهرست ۵۹ له كتاب غريب القرآن وقوارع القرآن وغير ذالك وهناك ابوزيد سعيد بن اوس الانصارى وله ايضا كتاب النواد رتوفى سنة ۲۱۵ھ الفهرست ۸۷، لئكن النوا درللبلخى اجمع فى فنون شى جمع بين الشريعة والفلسفة والادب الفنون (راجع لسان الميزان) (۱ : ۱۸۳) ومعجم الادباء (۳ : ۶۵۔۸۶) وحكماء الاسلام (۲۲) ماخوذ من الاعلام للزركلى ۱۲۔

﴿وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ کُسَالٰی﴾ (۹۔۵۴) اور نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا یَکْسِلُهُ الْمَکَاسِلُ: اس کو اسباب کاہلی سست نہیں بناتے۔

فَحْلٌ کَسِلٌ، جو نر کہ جفتی میں سست ہو جائے اِمْرَأَةٌ مِکْسَالٌ: زن سست، جو ناز پروردہ ہونے کی وجہ سے اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلے۔ (صفت مدح)

(ک س و)

اَلْکِسَاءُ وَالْکِسْوَةُ کے معنی لباس کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ کِسْوَتُهُمْ﴾ (۵۔۸۹) یا ان کو کپڑا دینا۔

کَسَوْتُهٗ: میں نے اسے لباس پہنایا۔

اِکْتَسٰی: (افتعال) اس نے پہن لیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اکْسُوْهُمْ﴾ (۴۔۵) ہاں اس میں سے ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو۔

﴿فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾ (۲۳۔۱۴) پھر ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھایا۔

اِکْتَسَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ: زمین نے نباتات کا لباس پہن لیا۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (الطّویل)

(۳۷۲) فَبَاتَ لَهٗ دُوْنَ الصَّبَا وَهِیَ قَرَّةٌ
لِحَافٌ وَمَصْقُوْلُ الْکِسَاءِ رَقِیْقٌ

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مصقول اَلْکِسَاءِ سے مراد دودھ ہے جس پر بالائی کی تہ آ چکی ہو۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے ❷ (المنسرح)

(۳۷۳) حَتّٰی اَرٰی فَارِسَ الصَّمُوْتِ عَلٰی
اَکْسَاءِ خَیْلٍ کَاَنَّهَا الْاِبِلُ

یہاں تک کہ میں ''صموت'' کے شہسوار کو دیکھوں کہ وہ اونٹ جیسے قد آور گھوڑوں کا تعاقب کر رہا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اَکْسَاءٌ بمعنی اعقاب کے ہے۔ لیکن اصل میں اونٹ کے تیز دوڑانے سے جو غبار اٹھتا ہے اور وہ بلند ہو کر انہیں چھپا لیتا ہے۔ اسے اَکْسَاءٌ کہا جاتا ہے۔ یہاں عَلٰی اَکْسَاءِ اِبِلٍ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کے لباس کے غبار میں متصل آ رہا ہے۔

(ک ش ف)

اَلْکَشْفُ یہ کَشَفْتُ (ض) الثَّوْبَ عَنِ الْوَجْهِ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی چہرہ وغیرہ سے پردہ اٹھانا کے ہیں۔ اور مجازاً غم واندوہ کے دور کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ﴾ (۶۔۱۷) اور خدا تم کو سختی پہنچائے تو اس کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔

﴿فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ﴾ (۶۔۴۱) تو جس دکھ

---

❶ قاله عمرو بن الاهتم وقبله: فَبَاتَ لنا منها و للضيف موهنا۔ شواء سمين زاهق وغبوق وفى اللسان (كسا) قال ابن برى: والصواب انشاده وبات بدل فبات والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۳ بيتا راجع عيون الاخبار (۱: ۳٤۲) والمعانى للقبتى ۳۹۸۔

❷ قاله المثلم عن عمرو التنوخى فى اربعة ابيات يصف فرسه الصموت ومعناه هو يهزم اعداءه فيسوقهم من وراءهم ويطردهم كما يطرد الابل والبيت لى اللسان (صمت) والمؤتلف للامدى ۲۷٦ فى خمسة ابيات وقد نسب الى بريق بن عياض الهذلى (بقية اشعار الهذليين ۲۵) وفى رواية انساء خيل بدل اكساء خيل وفى رواية التبريزى كانها أبل (جميع ابيل) والمرزوقى ٤۷۹ وفى الجمحى: ونرويها لرجل من تنوخ ۱۲۔

کے لیے اسے پکارتے ہو.....تو اس کو دور کر دیتا ہے۔
﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ﴾ (۵۰۔۲۲) یہ وہ دن ہے کہ اس سے تو غافل ہو رہا تھا۔اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا۔
﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ﴾ (۲۷۔۶۲) بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے۔اور (کون اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔) اور آیت:
﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ (۶۸۔۴۲) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہ قَامَتِ الْحَرْبُ عَلٰی سَاقٍ کی طرح کا محاورہ ہے یعنی شدت اور سختی..... ظاہر ہونے سے کنایہ ہے۔ [1]
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں تَذْمِيْرُ النَّاقَةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جب کوئی شخص حاملہ اونٹنی کے پیٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر بچہ نکالتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے۔
كُشِفَ عَنِ السَّاقِ (کہ پنڈلی کھولی گئی) تو یہاں بھی صعوبت حال ہی سے کنایہ ہے۔

(ک ش ط)

اَلْكِشْطُ (ض) کے معنی کھال اتارنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ﴾ (۸۱۔۱۱) اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔
یہ كَشْطُ النَّاقَةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹنی کی کھال اتارنے کے ہیں اور اس سے اِنْكَشَطَ رَوْعُهٗ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی خوف زائل ہونے کے ہیں۔

(ک ظ م)

اَلْكَظْمُ: اصل میں ''مخرج النفس'' یعنی سانس کی نالی کو کہتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے:
اَخَذَ بِكَظْمِهٖ: اس کی سانس کی نالی کو پکڑ لیا۔یعنی غم میں مبتلا کر دیا۔
اَلْكُظُوْمُ کے معنی سانس رکنے کے ہیں اور خاموش ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ انتہائی خاموشی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے فُلَانٌ لَا يَتَنَفَّسُ کہا جاتا ہے۔فلاں سانس نہیں لیتا یعنی خاموش ہے۔كُظِمَ فُلَانٌ اس کا سانس بند کر دیا گیا۔(مراد نہایت غمگین ہونا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ﴾ (۶۸۔۴۸) کہ انہوں نے خدا کو پکارا اور وہ (غم) غصہ میں بھرے تھے اور كَظْمُ الْغَيْظِ کے معنی غصہ روکنے کے ہیں۔جیسے فرمایا:
﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ (۳۔۱۳۴) اور غصے کو روکتے۔
اور اسی سے كَظَمَ الْبَعِيْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی اونٹ کا جگالی نہ کرنا کے ہیں۔كظم السِّقَاءَ مشک کو پانی سے بھر کر اس کا منہ باندھ دینا تاکہ اس سے پانی نہ نکل سکے۔اَلْكِظَامَةُ: ترازو کے اس حلقہ کو کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کر کے ترازو کی ڈنڈی کے ساتھ

[1] كذا قال قتادة على ما في المشكل للقبتي ۱۰۳ والطبري وروى نحوه عن ابن عباس ومجاهد وابن جبير وهو اختيار ابي عبيدة واهل اللغة كما في اللسان ۱۲۔

باندھ دی جاتی ہیں۔(۲)اس تسمہ کو بھی کظامۃ کہا جاتا ہے جس کو کمان کی تانت کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔

اَلْکَظَائِمُ: (واحد کِظَامَۃٌ) وہ زمین دوز نالیاں جن کے ذریعہ ایک کنویں کو (دوسرے کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے) تاکہ ایک کا پانی دوسرے میں منتقل ہوتا رہے۔گویا وہ سانس آنے جانے کی نالیاں ہیں ❶

(ک ع ب)

کَعْبُ الرِّجْلِ: (ٹخنہ) اس ہڈی کو کہتے ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ پر ہوتی ہے قرآن پاک میں ہے۔﴿وَ اَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ﴾ (۵۔۶) اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو۔

اَلْکَعْبَۃُ: اصل میں ہر اس مکان کو کہتے ہیں جو ٹخنے کی شکل پر چوکور بنا ہوا ہو اسی سے بیت الحرام کو اَلْکَعْبَۃُ کے نام سے پکارا گیا ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ (۵۔۹۷) خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبے کو لوگوں کے لیے موجب امن قرار فرمایا۔

ذُوْالْکَعْبَاتِ: بنو ربیعہ کی عبادت گاہ کا نام جو انہوں نے جاہلیت میں بنائی تھی۔محاورہ ہے۔

فُلَانٌ حَابِسٌ فِیْ کَعْبَتِہٖ: یعنی فلاں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہے۔جو مکعب شکل پر بنا ہوا ہے اِمْرَأَۃٌ کَاعِبٌ ابھرے ہوئے پستانوں والی لڑکی۔اور یہ کِعَابَۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی عورت کی چھاتی ابھرنے کے ہیں۔

اور کَاعِبُ کی جمع کَوَاعِبُ آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَکَوَاعِبَ اَتْرَابًا﴾ (۷۸۔۳۳) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔

کَعَبَ الثَّدْیُ کَعْبًا وَکَعَّبَ تَکْعِیْبًا: (لڑکی کی) چھاتی ابھر آنا۔

ثَوْبٌ مُکَعَّبٌ: لپیٹا ہوا کپڑا جس کی تہ سخت اور اٹھی ہوئی ہو۔اور سرکنڈے یا نیزے کی دو گرہوں کے درمیان کے حصہ کو بھی تشبیہ کے طور پر کعب (پور) کہا جاتا ہے۔کیونکہ جس طرح ٹخنہ پنڈلی اور پاؤں کے درمیان فاصل ہوتا ہے اس طرح یہ بھی دو گرہوں کے درمیان فاصل ہوتی ہے۔

(ک ف ف)

اَلْکَفُّ ۔کے معنی ہاتھ کی ہتھیلی کے ہیں جس کے ساتھ انسان چیزوں کو اکٹھا کرتا اور پھیلاتا ہے۔کَفَفْتُہٗ کے اصل معنی کسی کی ہتھیلی پر مارنے یا کسی کو ہتھیلی کے ساتھ مار کر دور ہٹانے اور روکنے کے ہیں پھر عرف میں دور ہٹانے اور روکنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے خواہ ہتھیلی سے ہو یا کسی اور چیز سے ❷ رَجُلٌ مَکْفُوْفُ الْبَصَرِ جس کی بینائی جاتی رہی ہو۔اور آیت کریمہ:﴿وَمَآ اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ﴾ (۳۴۔۲۸) اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو گناہوں سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

---

❶ وفی الحدیث: اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کظامۃ قوم فتوضا و مسح علی قدمیہ انظر الفائق (۲/۱۰۲) وغریب ابی عبید (۱/۲۶۸)۔

❷ کما فی قولہ تعالیٰ: کف ایدی الناس عنکم (الفتح۔ ۲۰) وھو الذی کف ایدیھم عنکم (الفتح ۲۵)

میں کَــافَّۃٌ کے معنی لوگوں کو گناہوں سے روکنے والا کے ہیں۔ اس میں ہامبالغہ کے لیے ہے۔ جیسے کہ رَاوِیَۃٌ وَعَلَّامَۃٌ اور نسَّابَۃٌ۔ میں ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَ قَـاتِـلُـوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّۃً﴾ (۹۔۳۶) اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو۔ جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں۔ میں بعض نے دونوں جگہوں میں کَافَّۃً کے معنی کافین یعنی روکنے والے کیے ہیں۔اور بعض نے یہ معنی کیا ہے۔کہ جـمـاعۃً یعنی اجتماعی قوت کی وجہ سے اسے کَافَّۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿یٰـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً﴾ (۲۔۲۰۸) مومنو: اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ میں بھی کَـافَّۃً بمعنی جماعت ہی ہے اور آیت کریمہ ﴿فَـاَصْبَـحَ یُـقَـلِّبُ کَفَّیْہِ عَلٰی مَآ اَنْفَقَ فِیْھَا﴾ (۱۸۔۴۲) تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

پشیمان ہونے والے کی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ انسان پشیمانی کی حالت میں ہاتھ ملتا ہے۔

تَـکَـفَّفَ الـرَّجُـل: سوال کے لیے ہاتھ پھیلانا۔

اِسْتَـــــکَفَّ سوال یا مدافعت کے لیے ہاتھ پھیلانا۔

اِسْتَکَفَّ الشَّمْسَ: ہتھیلی کے ذریعہ دھوپ کو دفع کرنا اور وہ اس طرح کہ دھوپ کی شعاعوں کو روکنے کے لیے ابروں پر بطور سایہ ہاتھ رکھ لے تاکہ جس چیز کو دیکھنا مطلوب ہو آسانی سے دیکھی جاسکے۔

کِـفَّۃُ الْمِیْزَان: ترازو کا پلڑا۔ کیونکہ وہ بھی موزوں چیز کو روک لینے میں، ہتھیلی کے مشابہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی کُـفَّۃُ الْـحِبَـالَۃِ ہے۔ [1] جس کے معنی شکاری کے پھندا کے ہیں۔

کَـفَـفْـتُ الثَّـوْبَ: کچی سلائی کے بعد کپڑے کے اطراف کو سینا۔

(ک ف ت)

اَلْـکَـفْتُ: (ض) کسی چیز کو جمع کرکے اسے قبضہ میں لے لینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿اَلَمْ نَـجْـعَـلِ الْاَرْضَ کِـفَـاتًـا اَحْیَـآءً وَّاَمْوَاتًـا﴾ (۷۷۔۲۵۔۲۶) کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا۔ یعنی زندوں اور مردوں کو۔

یعنی زمین تمام مردوں اور زندوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ احیاء سے مراد انسان، حیوان اور نباتات ہیں اور اموات سے جمادات بعض نے ''کفات'' کے معنی تیزی سے اڑنا بھی کیے ہیں لیکن اصل میں اس کے معنی اڑنے کے لیے پروں کو سمیٹنا کے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَوَلَـمْ یَـرَوْا اِلَـی الطَّیْـرِ فَـوْقَھُمْ صَآفَّاتٍ وَّیَقْبِضْنَ﴾ (۶۷۔۱۹) کیا انہوں نے اپنے سروں پر اڑتے جانوروں کو نہیں دیکھا جو پروں کو پھیلائے رہتے ہیں اور سکیڑ بھی لیتے ہیں۔

تو یہاں قبض کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں کِفَاتٌ کا لفظ ہے۔

اَلْـکَـفْـتُ کے معنی تیز ہانکنا بھی آتے ہیں۔اور قبض کی

---

[1] وفی الکامل یقال لکل مستطیل کفة (بضم الکاف) ومعناه کفة الحاهل ولکل مستدیر کفة ومنه کفة المیزان (۸۵۷/۳)۔

طرح کفت کا لفظ بھی اونٹوں کے ہنکانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قبض الراعی الابل کے معنی ان کو تیز ہانکنے کے ہیں۔ اور منتظم چرواہے کو راعی قبضۃ کہا جاتا ہے۔ اور کَفَتَ اللّٰهُ فُلَانًا اِلٰى نَفْسِهٖ (اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کر لی) قبضہ کے ہم معنی ہے۔ حدیث میں ہے ❶ (۹۸)

((اِكْفِتُوْا صِبْيَانَكُمْ بِاللَّيْلِ)) رات کو اپنے بچوں کو اپنے گھروں میں بند رکھو۔

(ک ف ر)

اَلْكُفْرُ: اصل میں کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اور رات کو کافر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشتکار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لیے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔ اور یہ رات یا کسان کے ناموں میں سے نہیں ہے جیسا کہ بعض اہل لغت نے بطور دلیل مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے ❷ (الکامل)

(۳۷۴) اَلْقَتْ ذُكَاءُ يَمِيْنَهَا فِىْ كَافِرٍ۔

سورج نے اپنا دایاں ہاتھ رات کے اندر ڈال دیا۔ یعنی غروب ہوگیا۔

اَلْكَافُوْرُ: اس غلاف کو کہتے ہیں۔ جو پھل کو اپنے آغوش میں چھپائے رکھتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❸ (الرجز)

(۳۷۵) كَالْكَرْمِ اِذْ نَادٰى مِنَ الْكَافُوْرِ

جیسے انگور غلاف سے ظاہر ہوتا ہے۔

کُفْرٌ یا کفران نعمت کے معنی نعمت کی ناشکری کر کے اسے چھپانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ﴾ (۲۱۔۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، شریعت حقہ یا نبوت کا انکار ہے۔ پھر کفران کا لفظ زیادہ تر نعمت کا انکار کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکارِ دین کے معنی میں اور کُفُوْرٌ کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ كلمة من حديث طويل عن جابر قاله ﷺ فى الآداب والحديث فى الفائق (١٨٤/١) واللسان والنهايه (كفت)

❷ قاله ثعلبه بن صعير المازنى يصف ناقته، وشبيه عيبته والقيان بريش جناحى الظليم حين يكون معارضا لنعامة رائحين بينهما عند غروب الشمس وصدره فتذكر اثقلا ثيد ابعد ما.......... والبيت فى الطبرى (١: ١١١) والطبرسى (٢: ٩٥) واللسان (ثقل اثر، ذكا، كفر، يدى) وتهذيب اصلاح المنطق (١: ٨٤) والاصلاح ٤١٧ والحصرى (٤: ١٢٣) والشعراء ١٥٦ والكنز اللغوى ٥١ والاشتقاق (٣٥١، ١٨٧) وفى الامالى (٢: ١٤٢) غير منسوب ونسبه فى السمط (٧٦٩) مع البينبن وفى رواية المفضيلة ١٥٢ فتذكرت بدل فتذكر اوالبيت ايضا فى ذيل الصناعتين ١٨٥ وابن ولاد ٥٢ وتهذيب الالفاظ ٣٨٧ وابدال ابى الطيب (٢: ٥٧) وابدال يعقوب ٥١ وشرح السبع لابن الانبارى ومبادى اللغة للاسكافى اوالعجز فقط فى نظام الغريب ١٨٥ والمعانى للقبتى ٣٥٨ وهو من قصيدة فى منتهى الطلب (١: ١٦١ـ١٥٢) والمفضلية ٢٤ التى مطلعها: هل عند عمرة من نبات...... والرشيد معناه النضيد فانهم يذكرون ان النعامة تضع بيضها طولا وعرضا على خط وسطر كما فى الحيوان (٤: ٣٢٨) وعيون الاخبار (٢: ٨٧ـ٨٨) والبيت ايضا فى الحيوان (٥: ١٣١) والمخصص (١٩/٩) ٩/١٧) والحصرى (٤: ١١٥) والبا فلانى فى اعجازه ٢٠٠۔

❸ قاله العجاج وقبله غراء تسبى نظر الناظور۔ بفاحم يعكف او منشور (راجع اللسان (١٢: ١١٢) والعمدة (١: ٢٦٧) ومبادى اللغة (١٧٨) ومشكل القرآن للقبتى ١٠٠ وديوانه ٢٧۔

﴿فَاَبَی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا﴾ (۱۷۔۸۹) تو ظالموں نے انکار کرنے کے سوا اسے قبول نہ کیا ﴿فَاَبٰی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا﴾ (۱۷۔۸۹) مگر اکثر لوگوں نے انکار کرنے کے سوا قبول نہ کیا۔ اور فعل كَفَرَ فَهُوَ كَافِرٌ ہر دو معانی کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ معنی کفران کے متعلق فرمایا: ﴿لِيَبْلُوَنِیٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّی غَنِیٌّ كَرِيْمٌ﴾ (۲۷۔۴۰) تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفران نعمت کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے۔ اور جو ناشکری کرتا ہے۔ تو میرا پروردگار بے پروا (اور) کرم کرنے والا ہے۔ ﴿وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ (۲۔۱۵۲) اور میرا احسان مانتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۹) اور تم نے ایک اور کام کیا تھا جو کیا۔ تم ناشکرے معلوم ہوتے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم نے قصداً میری نعمت کی ناشکری کی ہے۔

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِيْدٌ﴾ (۱۴۔۷) اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب بھی سخت ہے۔

اور کفران نعمت چونکہ انکار نعمت کا مقتضی ہے اس لیے یہ مطلقاً انکار کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ﴾ (۲۔۴۱) اور اس سے منکر اول نہ بنو۔

تو یہاں کافر بمعنی جاحد (منکر) کے ہے اور کافر علی الاطلاق یعنی بلا تقیید عرف میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، شریعت اور نبوت میں سے کسی ایک یا تینوں کا منکر ہو۔ اور کبھی کفر کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جو شریعت کے کسی حکم میں خلل اندازی کرتا ہو یا اللہ تعالیٰ کی اس طرح شکر گزاری نہ کرتا ہو جیسے کرنا چاہیے۔ چنانچہ آیت:

﴿مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ﴾ (۳۰۔۴۴) تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی پر ہے۔

میں کفر کے معنی شریعت کے حکم میں خلل اندازی کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل آیت:

﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ﴾ (۳۰۔۴۴) اور جس نے نیک عمل کیے تو ایسے لوگ اپنے ہی لیے آرام گاہ درست کرتے ہیں۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (۸۶۔۸۳) اور یہ اکثر ناشکرے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ﴾ (۲۔۴۱) اور اس سے منکر اول نہ بنو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ائمہ کفر نہ بنو کہ دوسرے لوگ اس میں تمہاری اقتداء کریں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (۱۲۔۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

میں مَنْ كَفَرَ سے حقوق الٰہی کو چھپانے والے لوگ مراد

ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہیں فاسق کہا ہے کیونکہ کفر مطلق فسق سے اعم ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص حق باری تعالیٰ میں جحود سے کام لے گا تو وہ اپنے اس ظلم کے سبب اطاعت الٰہی سے خارج سمجھا جائے گا۔

پھر جس طرح ہر اچھے کام کو ایمان قرار دیا گیا ہے اسی طرح ہر برے کام کو کفر شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سحر کے متعلق فرمایا:
﴿وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ (۲۔۱۰۲) اور سلیمانؑ نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے۔

اور آیت ﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾ کے بعد فرمایا۔﴿وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ (۲۔۲۷۶) کہ اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ اور اسی طرح آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے آخر میں فرمایا:
﴿وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۳۔۹۷) اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو خدا بھی اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

اَلْكَفُوْرُ: (مبالغہ) کے معنی انتہائی درجہ کے ناسپاس کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:
﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ﴾ (۲۲۔۶۶) اور انسان تو بہت ناشکرا ہے۔
﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَ هَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ﴾ (۳۴۔۱۷) یہ ہم نے ان کی ناشکری کی ان کو سزا دی۔ اور ہم سزا ناشکرے ہی کو دیا کرتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں انسان کو كَفُوْرٌ بصیغہ مبالغہ کہا ہے۔ اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ "اِنَّ" ولام تو کید لا کر کلام کو اور بھی زوردار بنا دیا گیا ہے حالانکہ دوسرے مقام پر آیت:
﴿وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ﴾ (۴۹۔۱۷) اور کفر سے تم کو بیزار کر دیا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کفر سے طبعی نفرت ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ" میں "كَفُوْرٌ" کفر سے نہیں ہے۔ بلکہ کفران نعمت سے ہے پس آیت میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ ناسپاسی اور شکر گزاری سے غفلت برتنا انسان کا فطرتی خاصہ ہے۔ اور آیت۔
﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ﴾ (۸۰۔۱۷) انسان ہلاک ہو جائے، کیسا ناشکرا ہے، بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اسی لیے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ (۳۴۔۱۳) اور میرے بندوں سے شکر گزار تھوڑے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا﴾ (۷۶۔۳) اور اسے رستہ بھی دکھا دیا (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔

میں بھی متنبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو (ہدایت اور گمراہی کے) راستے بتا دیئے ہیں جیسا کہ آیت:
﴿وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (۹۰۔۱۰) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ اب کوئی شکر گزاری کے رستہ پر گامزن ہے اور کوئی ناشکری کی راہ پر اور آیت: ﴿وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ (۱۷۔۲۷) اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا (یعنی) ناشکرا ہے۔
میں كَفُوْرٌ کفر سے ہے اور آیت میں كَانَ کے لفظ سے

اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اس نے جنم ہی کفر پر لیا ہے۔

اَلْکُفَّارُ: اس میں کفور سے بھی زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیْدٍ﴾ (۵۰۔۲۴) ہر سرکش ناشکرے کو ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کَاذِبٌ کَفَّارٌ﴾ (۳۹۔۳) بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے، ہدایت نہیں دیتا۔

﴿وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ﴾ (۲۔۲۷۶) اور خدا کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ ﴿اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا﴾ (۷۱۔۲۷) وہ بھی بدکار اور ناشکر گزار ہوگی۔

اور کبھی کَفَّار بمعنی کفور بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ﴾ (۱۴۔۳۴) بے شک انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

کُفَّارٌ اور کَفَرَۃٌ دونوں کافِرٌ کی جمع ہیں۔ لیکن پہلی جمع تو عام طور پر مومنین کے بالمقابل استعمال ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ﴾ (۴۸۔۹) وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں۔

﴿لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ﴾ (۴۸۔۲۹) تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

اور دوسری بمعنی کفرانِ نعمت کے آتی ہے چنانچہ آیت:

﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکَفَرَۃُ الْفَجَرَۃُ﴾ (۸۰۔۴۲) یہ لوگ کفار بدکردار ہیں۔

میں آپ نہیں دیکھتے کہ کَفَرَۃٌ کی صفت فَجَرَۃٌ لائی گئی ہے اور فَجَرَۃٌ فاسق مسلمان کو بھی کہا جاتا ہے (تو معلوم ہوا کہ یہاں کَفَرَۃٌ سے مراد ناشکرے ہی ہیں اور آیت:

﴿جَزَآءً لِّمَنْ کَانَ کُفِرَ﴾ (۵۴۔۱۴) یہ سب کچھ اس شخص کے انتقام کے لیے کیا گیا ہے۔ جس کو کافر مانتے نہ تھے۔

میں لِمَنْ کَانَ کُفِرَ سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے خلفاء مراد ہیں۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں لوگوں کو نصیحت کی لیکن ان کی دعوت پر کسی نے بھی کان نہ دھرا۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا﴾ (۴۔۱۳۷) جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوگئے۔ پھر ایمان لائے پھر کافر ہوگئے۔

کے بعض نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اولاً موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کفر کیا۔ پھر عیسائی عیسیٰ پر ایمان لائے مگر ان کے بعد آنے والے پیغمبر کے ساتھ کفر کیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا پھر انہی کے ساتھ کفر کرنا مراد ہے۔ کیونکہ ان کا کسی دوسرے پر تو ایمان لانا ثابت نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ آیت۔

﴿وَ قَالَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْہَ النَّھَارِ وَ اکْفُرُوْٓا اٰخِرَہٗ﴾ (۳۔۷۲) اور اہل کتاب ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ (جو) کتاب مومنوں پر نازل ہوئی اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو اور اس کے آخر میں انکار کر دیا کرو۔

کی طرح ہے۔ اور اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ دو دفعہ ایمان لائے اور پھر دوبارہ ہی کفر کیا۔ بلکہ اس سے ان کی

مختلف حالتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔بعض نے کہا ہے کہ جس طرح فضائل میں ترقی کے تین درجات ہیں اسی طرح رذائل میں بھی انحطاط کے تین درجے ہیں۔اور آیت کریمہ میں انہی درجات کی طرف اشارہ ہے۔اس مفہوم کو ہم نے اپنی کتاب "الذریعة" میں خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

کَفَرَ فُلَانٌ کے معنی اعتقاد کفر کے بھی ہوتے ہیں اور محض زبان سے اظہار کفر کے بھی۔خواہ دل سے اس کا معتقد نہ ہو۔اسی لیے فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ (۱۶۔۱۰۶) جو شخص ایمان کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

کَفَرَ فُلَانٌ بِالشَّیْطَانِ کے معنی شیطان کی وجہ سے کفر کرنے کے ہیں۔اور کبھی اس کا معنی شیطان کے ساتھ کفر کرنا بھی آجاتے ہیں۔چنانچہ فرمایا:﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ﴾ (۲۔۲۵۶) تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے۔

اَكْفَرَهٗ اِكْفَارًا کے معنی کسی پر کفر کا فتویٰ لگانے کے ہیں۔اور کبھی کفر کے معنی کسی سے بیزار ہونا بھی آجاتے ہیں۔چنانچہ فرمایا۔

﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ﴾ (۲۹۔۲۵) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے کی دوستی سے انکار کردو گے۔

﴿اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۴۔۲۲) میں تو اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ تم پہلے مجھے شریک بناتے تھے۔اور آیت کریمہ:

﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ (۵۷۔۲۰)؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش کہ اس سے کھیتی (اگتی اور) کسانوں کو بھی بھلی لگتی ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کفار سے کسان مراد ہیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتے ہیں جیسا کہ کافر اللہ تعالیٰ کے حق کو چھپاتا ہے۔چنانچہ آیت:﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (۴۸۔۲۹) اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تا کہ کافروں کا جی جلائے۔

بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔کیونکہ بارش کی روئیدگی سے خوش ہونا کافر کے ساتھ مختص نہیں ہے۔بلکہ ہر کاشتکار کو اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر بعض نے کہا ہے کہ یہاں بھی کفار سے کافر ہی مراد ہیں اور ان کی تخصیص اس لیے کہ ہے۔کہ وہ دنیا اور اس کے سازوسامان پر خوش اور اس کی طرف مائل رہتے ہیں۔

اَلْكَفَّارَةُ: جو چیز گناہ دور کردے اور اسے ڈھانپ لے اسے کفارۃ کہا جاتا ہے۔اسی سے كَفَّارَةُ الْيَمِيْنِ ہے چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:﴿ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ﴾ (۵۔۸۹) یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسمیں کھالو۔

﴿فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ﴾ (۵۔۸۹) تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے۔اسی طرح دوسرے گناہ جیسے قتل،ظہار وغیرہ کے تاوان پر بھی کفارہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اَلتَّكْفِيْرُ: اس کے معنی بھی گناہ کو چھپانے اور اسے اس طرح مٹا دینے کے ہیں جیسے اس کا ارتکاب ہی نہیں کیا۔اور ہوسکتا ہے کہ یہ اصل میں ازالہ کفر

یا کفران سے ہو جیسے تمریض کے معنی ازالہ مرض کے آتے ہیں۔اور تَـقْـذِیَۃٌ کے معنی ازالہ قذی یعنی تنکا دور کرنے کے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ (۵۔۶۵) اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے۔

﴿نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ (۴۔۳۱) تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے۔چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (۱۱۔۱۱۴) کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔مگر بعض نے کہا ہے کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں بڑے گناہوں کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔

﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ (۳۔۱۹۵) میں ان کے گناہ دور کر دوں گا۔

﴿لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا﴾ (۳۹۔۳۵) تاکہ خدا ان سے برائیوں کو جو انہوں نے کیں، دور کر دے۔محاورہ ہے۔

كَفَرَتِ الشَّمْسُ النُّجُوْمَ: سورج نے ستاروں کو چھپا دیا۔اور اس بادل کو بھی کافر کہا جاتا ہے جو سورج کو چھپا لیتا ہے: تَكَفَّرَ فِي السِّلَاحِ: اس نے ہتھیار پہن لیے۔

اَلْكَافُوْرُ: اصل میں پھلوں کے غلاف کو کہتے ہیں جو ان کو اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے۔شاعر نے کہا ہے [1] (الرجز)

(۳۷۵) كَالْكَرْمِ اِذْ نَادٰى مِنَ الْكَافُوْرِ۔

جیسے انگور شگوفہ کے غلاف سے ظاہر ہوتے ہیں۔لیکن کافور ایک مشہور خوشبو...... کا بھی نام ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا﴾ (۷۶۔۵) جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔

(ک ف ل)

اَلْكَفَالَةُ: ضمانت کو کہتے ہیں۔اور تَكَفَّلْتُ بِكَذَا کے معنی کسی چیز کا ضامن بننے کے ہیں۔

اور كَفَّلْتُهٗ فُلَانًا کے معنی ہیں: میں نے اسے فلاں کی کفالت میں دے دیا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ (۳۔۳۷) اور زکریاؑ کو اس کا متکفل بنایا۔

بعض نے كَفَلَ تخفیف فاء کے ساتھ پڑھا ہے۔[2] اس صورت میں اس کا فاعل زکریا علیہ السلام ہوں گے یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کو اپنی کفالت میں لے لیا۔

(اَكْفَلَهَا زَيْدًا۔اسے زید کی کفالت میں دے دیا)

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَكْفِلْنِيْهَا﴾ (۳۸۔۲۳) یہ بھی میری کفالت میں دے دو (میرے سپرد کر دو)

اَلْكَفِيْلُ: اصل میں بقدر ضرورت حصہ کو کہتے ہیں۔گویا وہ انسان کی ضروریات کا ضامن ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا﴾ (۱۶۔۹۱) اور تم خدا کو اپنا کفیل بنا چکے ہو۔

اور اَلْكِفْلُ کے معنی بھی اَلْكَفِيْلُ یعنی حصہ کے آتے

---

[1] راجع فی العنوان نفسه۔

[2] وهی قراءة معظم السبعة وقراءة التشديد هی قراءة الكوفيين عاصم وحمزه والكسائی (ابو حيان ۲/۴۲)

ہیں۔چنانچہ فرمایا:
﴿یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ﴾ (۵۷۔۲۸) وہ تمہیں اپنی رحمت سے اجر کے دو حصے عطا فرمائے گا۔یعنی دنیا اور عقبیٰ دونوں جہانوں میں تمہیں اپنے انعامات سے نوازے گا۔اور یہی دو قسم کی نعمتیں ہیں جن کے لیے آیت ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً﴾ (۲۔۲۰۱) کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشیو، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے۔بعض نے کہا ہے کہ یہاں کِفْلَیْنِ'' سے دو نعمتیں مراد نہیں ہیں۔بلکہ اس سے پیہم اور کفایت کرنے والی نعمت مراد ہے۔اور تثنیہ کا لفظ لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ کی طرح تاکید معنوی کے لیے ہے۔اور آیت کریمہ:﴿مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا وَ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا﴾ (۴۔۸۵) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔
میں کِفْلٌ کا معنی کافی حصہ کے نہیں ہے بلکہ استعارۃً اس سے حقیر چیز مراد لی ہے۔اور یہ اس کفل سے مشتق ہے جس کے معنی کولہے کے پچھلے حصہ کے ہوتے ہیں۔چونکہ اس حصہ پر سواری تکلیف دہ ہوتی ہے اس لیے عرف میں کِفْل بمعنی شدت استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ سِیْسَاءَ کا لفظ ہے کہ اصل میں اس کے معنی گدھے کی پشت پر کی ابھری ہوئی ہڈی ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔
لَاَحْمِلَنَّکَ عَلَی الْکِفْلِ اَوْ عَلَی السِّیْسَاءِ اَوْلَاُرْکِبَنَّکَ الْحَسْرٰی۔یعنی میں تمہیں سخت تکلیف پہنچاؤں گا۔اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے [1]۔

(۳۷۷) وَحَمَلْنَا ھُمْ عَلٰی صَعْبَۃٍ زَوْ
رَاءَ یَعْلُوْنَھَا بِغَیْرِ وِطَاءٍ

اور ہم نے ان کو نہایت تند اور ٹیڑھی حالت کی ننگی پشت پر سوار ہونے پر مجبور کر دیا۔
پس آیت (۴۔۸۵) کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی اچھے کام میں دوسرے کا شریک کار ہوگا۔تو اسے بھی اس سے حصہ ملے گا۔اور اگر کوئی شخص برے کام میں دوسرے کی مدد کرے گا تو اسے بھی اس کے انجام بد سے دوچار ہونا پڑے گا۔
بعض کے نزدیک اس آیت میں بھی کفل بمعنی کفیل ہی ہے اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ جو شخص شر یعنی برائی کا جویا ہوگا تو وہ برائی اس پر کفیل ہوگی جو اس سے باز پرس کرے گی۔جیسا کہ محاورہ ہے۔
مَنْ ظَلَمَ فَقَدْ اَقَامَ کَفِیْلًا بِظُلْمِہٖ کہ جس نے ظلم کیا تو اس نے اپنے اوپر ظلم سے کفیل کھڑا کر دیا چنانچہ آیت مذکورہ میں تنبیہ کی ہے کہ برائی میں دوسرے کی مدد کرنے والا کبھی بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

(ک ف ی)

اَلْکُفْوُ کے معنی مرتبہ اور منزلت میں دوسرے کا ہم پلہ ہونے کے ہیں اسی سے کِفَاءٌ کپڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو اس جیسے دوسرے ٹکڑے کے ساتھ ملا کر خیمہ کے پچھلی طرف ڈال دیا جاتا ہے اور اسی سے نکاح یا لڑائی میں ہمسروں کے متعلق کہا جاتا ہے فُلَانٌ کُفُوٌ

---
[1] قالہ ابوزبید الطائی وقد مر تخریجہ، فی (عتب)

لِفُلَانٍ فلاں اس کا ہمسر ہے قرآن میں ہے۔

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (۱۱۲۔۴) اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اسی سے مُكَافَاءَةٌ ہے جس کے معنی کسی کام میں دوسرے کے بالمقابل ہونے کے ہیں۔ نیز محاورہ ہے:

فُلَانٌ كُفُوٌّ لَكَ: فلاں دشمنی میں تیرا ہم پلہ ہے۔

اَلْاِكْفَاءُ کے معنی کسی چیز کو الٹا کر دینے کے ہیں گویا اس میں مساوات کو دور کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور اسی سے اِكْفَاءٌ فِی الشِّعْرِ ہے جس کے معنی قصیدہ میں حرف روی کے مختلف ہونے کے ہیں۔ مُكْفَاءُ الْوَجْهِ اَذْ كَفِیُّ الْوَجْهِ: متغیر رو آدمی۔ كَفَأَةٌ۔ اونٹوں کی ناقص پیدائش۔ محاورہ ہے۔

جَعَلَ فُلَانٌ اِبِلَهٗ كَفْأَتَيْنِ: اس نے اپنے اونٹوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی ایک سال ایک حصہ سے نسل لیتا ہے اور دوسرے سال دوسرے سے۔

(ک ف ی)

اَلْكِفَايَةُ: وہ چیز جس سے ضرورت پوری اور مراد حاصل ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ﴾ (۳۳۔۲۵) اور خدا مومنوں کے لیے جنگ کی ضروریات کے سلسلہ میں کافی ہوا۔

﴿اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ﴾ (۱۵۔۹۵) ہم تمہیں ان لوگوں کے شر سے بچانے کے لیے جو تم سے استہزاء کرتے ہیں، کافی ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ (۴۸۔۹) اور حق ظاہر کرنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ با زائدہ ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی گواہ ہونے کے لیے کافی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ با اصلی ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ گواہ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ پر ہی اِكْتِفَا کرو اَلْكُفْيَةُ مِنَ الْقُوْتِ غذا جو گذارہ کے لیے کافی ہو۔ ج كُفًى محاورہ ہے۔ كَافِيْكَ فُلَانٌ مِّنْ رَّجُلٍ۔ یعنی فلاں شخص تمہارے لیے کافی ہے اور یہ حَسْبُكَ مِنْ رَّجُلٍ کے محاورہ کے ہم معنی ہے۔

(ک ل ل)

كُلٌّ کا لفظ کسی شے کے اجزاء کو یکجا کرنے پر بولا جاتا ہے اور یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) کبھی اس سے کسی چیز کی ذات اور اس کے احوال خصوصی کا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔ اور لفظاً تمام کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ (۱۷۔۲۹) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو)

شاعر نے کہا ہے [1] ( )

(۳۷۸) لَيْسَ الْفَتٰى كُلُّ الْفَتٰى۔ اِلَّا الْفَتٰى فِیْ اَدَبِهٖ

---

[1] قاله ابو محمد اليزيدى (يحيىٰ بن المبارك بن العدوى المتوفى ٢٠٢) وسمى اليزيدى لصحبته يزيد بن منصور خال المهدى و كان شاعرا فصيحا نحويار بيب ابى عمرو بن العلاء زفى النحو واللغة والغريب والقرءة، جعل الرشيد المامون ابنه فى حجره وله فى هجو الاصمعى ابيات منها ابن لى دمى بن اصمعى۔ متى كنت فى الاسرة الفاضلة ومنها: رايت قريب الاصمعى۔ كثيرا فوا ضحه شاملة والبيت فى المواعظ فى ثمانية ابيات وبعده: وبعض اخلاق الفتى۔ اولى به من نسبه۔ راجع للبيت المعجم للمرزبانى ٤٨٧ وروضة العقلا ١٩٨ بغير عزو ولا موال الشاعر الانساب (٥٩٩۔ ٦٠٠) وابن خلكان ٧٧٠ واليافعى (٢: ٧٠٣) والبغيه للسيوطى ٤١٤، وطبقات زبيدى ٢١ وطبقات ابن المعتز ٢٧٣۔٢٧٦ ونزهة الالباء لابن الانبارى ١٠٣۔١١٠)

یعنی کامل جوانمرد تو وہی ہوسکتا ہے جو ادب میں کامل ہو۔

(۲) کبھی اس سے کئی چیزوں کا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔اس صورت میں کبھی تو یہ جمع معرف باللام کی طرف مضاف ہوتا ہے۔جیسے:

كُلُّ الْقَوْمِ: (پوری قوم) اور کبھی جمع معرف باللام کی ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے۔جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ (۱۵۔۳۰) تو فرشتے سب کے سب سجدہ میں گر پڑے۔﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (۹۔۳۳) تا کہ اس (دین) کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ (۱۹۔۹۵) اور سب قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے۔

اور کبھی نکرہ مفردہ کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ﴾ اور ہم نے ہر انسان (کے اعمال کو بصورت کتاب اس کے گلے میں) لٹکا دیا ہے۔ (۱۷۔۱۳) ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (۶۔۱۰۲) اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔وغیر ذالك من الآیت:

اور کبھی بغیر اضافت کے استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کا مضاف الیہ مقدر ہوتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (۳۶۔۴۰) اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

﴿وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ﴾ (۲۷۔۸۷) اور سب اس کے پاس عاجز ہو کر چلے آئیں گے۔

﴿وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ﴾ (۲۱۔۷۲) اور سب کو نیک بخت کیا۔

﴿وَكُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (۱۲۔۸۸) یہ سب صبر کرنے والے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی اس نوع کی بہت سی آیات ہیں۔اور قرآن پاک اور فصحاء عرب کے کلام میں کہیں بھی یہ لفظ [1] معرف باللام یعنی اَلْكُلُّ استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ محض متکلمین، فقہا اور دیگر علمائے فن کی اصطلاح ہے۔

اَلْكَلَالَةُ: باپ اور اولاد کے علاوہ جو وارث بھی ہو وہ كَلَالَةٌ ہے [1]

ابن عباسؓ کا قول ہے کہ كَلَالَةٌ ہر اس وارث کو کہتے ہیں، جو اولاد کے علاوہ ہو، ایک روایت میں ہے [2] کہ آنحضرت ﷺ سے "كَلَالَةٌ" کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ((مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَا وَالِدٌ)) کہ كَلَالَةٌ ہر اس میت کو کہتے ہیں جس کا باپ اور اولاد زندہ نہ ہوں۔اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے خود میت کو کلالۃ قرار دیا ہے اور کلالہ کے یہ دونوں معنی صحیح ہیں کیونکہ "كَلَالَةٌ" مصدر ہے جو وارث اور مورث دونوں پر بولا جا سکتا ہے گویا کلالہ کو کلالہ یا تو اس لیے کہتے ہیں کہ سلسلہ نسب اس تک...... پہنچنے سے عاجز ہو گیا ہے اور یا اس لیے کہ وہ نسب کسی ایک جانب یعنی جانب اصل یا جانب فرع سے اس کے ساتھ بالواسطہ پہنچتا ہے اور یہ (یعنی دو احتمال) اس لیے ہیں کہ نسبی تعلق دو قسم پر ہے انتساب (۱)

---

[1] راجع الآیات (۴۔۱۳) (۴۔۱۷۷)

[2] وفی الطبری من قول ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما ولم یثبت عندی مرفوعا وفی کنزالعمال (۱۱/۷۳۔۷۷) بعض آثار الصـ فلیراجع الیه ۱۲۔

بالعمق (یعنی براہ راست تعلق) جیسے باپ بیٹے کا باہمی تعلق۔نسبت (۲) بالعرض یعنی بالواسطہ جیسے بھائی یا چچا کے ساتھ (رشتے کی نسبت) قطرب کا قول ہے کہ والدین اور بھائی کے علاوہ باقی رشتہ داروں کو کَلَالَۃٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ قول بلا دلیل ہے۔بعض نے کہا ہے کہ کَلَالَۃ کا لفظ ہر وارث پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (مجزء الکامل)

(۳۷۹) وَالْمَرْءُ یَبْخَلُ بِالْحُقُوْقِ
وَلِـلْـکَلَالَۃِ مَـا یُسِیْمُ

انسان حقوق کی ادائیگی میں بخل کرتا ہے حالانکہ اس کا تمام مال اس کے وارثوں کے لیے ہے۔

یُسِیْمُ ، اَسَـامَ الْاِبِلَ سے مشتق ہے۔جس کے معنی اونٹوں کو چراگاہ میں لے جانے کے ہیں مگر لفظ کَلَالَۃٌ سے شاعر نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو اس شارح نے سمجھے ہیں بلکہ شاعر کی مراد یہ ہے کہ انسان کو مال جمع کرنے میں زہد سے کام لینا چاہیے۔کیونکہ کلالہ کے لیے ترک مال اولاد کے لیے ترک مال سے بڑھ کر شاق ہوتا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جن کے لیے تم مرتے وقت مال چھوڑ رہے ہو وہ بمنزلہ کلالہ کے ہیں۔جیسے تم کہو۔مَـا تَجْمَعُہٗ فَھُوَ لِـلْعَدُوِّ: تم جو جمع کرتے ہو وہ تمہارے دشمن کا ہے۔اور اہل عرب کے ہاں محاورہ ہے۔

لَمْ یَرِثْ فُـلَانٌ کَلَالَۃً: فلاں آدمی کلالہ کا وارث نہیں ہے۔اور یہ اس شخص کے حق میں کہتے ہیں جو اپنے باپ سے کسی مال کا وارث ہو۔شاعر نے کہا ہے ❷ (البسیط)

(۳۸۰) وَرِثْتُم قَنَاۃَ الْمُلْکِ غَیْرَ کَلَالَۃٍ
عَنِ ابْنَیْ مُنَافٍ عَبْدِ شَمْسٍ وَّھَاشِم

تمہیں عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے حکومت کا ورثہ ملا ہے۔اور تم اس کے مستحق ہو۔اَلْاِکْلِیْلُ کے معنی تاج کے ہیں۔اور تاج کا نام اکلیل اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ سر پر محیط ہو جاتا ہے۔محاورہ ہے۔

کَـلَّ الـرَّجُلُ فِیْ مِشْیَتِہٖ کَلَالًا ۔انسان کا چلنے سے عاجز ہو جانا ❸

کَـلَّ السَّیْفُ عَـنْ ضَـرِیْبِہٖ کُلُوْلًا وَّکِلَّۃً ۔تلوار کا نشانہ پر نہ لگنا۔

کَلَّ اللِّسَانُ: زبان کا کلام سے عاجز ہو جانا۔

اَکَلَّ فُلَانٌ: کسی کی سواری کا تھک جانا۔

اَلْکَلْکَلُ: سینہ کو کہتے ہیں۔نیز ہر چیز کا اگلہ حصہ۔

کِلَا

کِـلَا: تثنیہ کے معنی دیتا ہے جیسا کہ کُـلٌّ جمع کے لیے آتا ہے۔یہ چونکہ لفظاً مفرد اور معنیً تثنیہ ہوتا ہے اس لیے اسے کبھی مفرد اور کبھی تثنیہ تصور کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا﴾ (۱۷۔۲۳) اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے

---

❶ قالہ یزید بن الحکم الثقفی یعظ ابنہ بدرا والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی (۱۱۹۵) من قصیدۃ فی ۲۳ بیتا وللبیات قصۃ انظر الاغانی (۱۱: ۹۶۔۱۰۲) والخزانۃ (۱: ۱۱۱)۔

❷ قالہ الفرزدق والخطاب لسلیمان بن عبدالملک والبیت فی اللسان (کلل) وفی روایۃ "لاعن" بدل غیر و قناۃ المجد بدل قناۃ الملک وفی روایۃ الکامل (۳: ۶۳۶) اول البیت ورثتم ثیاب المجد فھی لبو سکم والبیت فی الاشباہ (۳: ۱۷۰) والبحر (۳: ۱۸۸) والسیوطی ۳۲۔

بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ کِلَا کا مؤنث کِلْتَا ہے۔
جب یہ اسمِ ظاہر کی طرف مضاف ہوں تو احوال ثلاثہ میں ان کا الف بحالہ باقی رہتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی مگر جب اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوں تو حالت رفعی میں بحالہ باقی رہتا ہے اور نصبی اور جری حالت میں "یٰ" سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے:
جَاءَ فِیْ کِلَاھُمَا رَأیْتُ کِلَیْھِمَا، مَرَرْتُ بِکِلَیْھِمَا اور مؤنث کے لیے کِلْتَا آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔
کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَھَا (۱۸۔۳۳) دونوں باغ کثرت سے پھل لائے۔

(ک ل ی)

اَلْکِلَاءَۃُ کے معنی کسی چیز کی حفاظت کرنے اور اسے باقی رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
کَلَأَكَ اللّٰہُ: اللہ تعالیٰ تمہیں محفوظ رکھے وَبَلَغَ بِكَ اَکْلَأَ الْعُمُرِ تمہیں انتہائی عمر تک بحفاظت پہنچائے۔
اِکْتِلَاتُ بِعَیْنِیْ کَذَا: میں نے بذات خود فلاں چیز کی نگرانی۔ کی قرآن میں ہے:
﴿قُلْ مَنْ یَّکْلَؤُکُمْ بِالَّیْلِ الایة﴾ (۲۱۔۴۲) کہو کہ رات اور دن میں خدا سے تمہاری کون حفاظت کر سکتا ہے۔
اَلْمَکْلَأُ (گودی) ہر وہ مقام جہاں کشتیوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔
اَلْکِلَّاءُ: بصرہ میں ایک مقام کا نام ہے کیونکہ وہاں کشتیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے لے جاتے تھے اور کَالِیٌٔ کے معنی ادھار کے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ (۱۰۳) کہ آنحضرت ﷺ نے بَیْعُ الْکَالِئِ بِالْکَالِیءِ یعنی ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا۔
اَلْکَلَاءُ: اس گھاس کو کہتے ہیں جسے محفوظ کر لیا گیا ہو۔ اور ہر وہ مقام جہاں گھاس زیادہ ہو اسے مَکْلَا یا مَکَانٌ کَالِیٌٔ کہا جاتا ہے۔

(ک ل ب)

اَلْکَلْبُ: (کتا) بھونکنے والا جانور۔ اس کی مؤنث کَلْبَۃٌ اور جمع اَکْلُبٌ وَکِلَابٌ آتی ہے۔ کبھی اس کی جمع کَلِیْبٌ بھی آ جاتی ہے۔ ﴿کَمَثَلِ الْکَلْبِ﴾ (۷۔۱۷۶) تو اس کی مثال کتے کی سی ہے۔
﴿وَ کَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ﴾ (۱۸۔۱۸) اور ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔
اور اسی سے اَلْکَلَبُ (بفتح اللام) مشتق ہے۔ جس کے معنی شدت حرص کے ہیں۔ اسی سے کہا جاتا ہے:
ھُوَ اَحْرَصُ مِنْ کَلْبٍ: وہ کتے سے زیادہ حریص ہے اور رَجُلٌ کَلِبٌ کے معنی سخت حریص آدمی کے ہیں اور کَلْبٌ کَلِبٌ باؤلا کتا جسے انسان کا گوشت کھانے کا چسکا لگ جاتا ہے اور جسے وہ کاٹ کھائے اسے بھی ہڑکائے کتے جیسا مرض لاحق ہو جاتا ہے مفرد کے لیے رَجُلٌ کَلْبٌ اور جمع کے لیے قَوْمٌ کَلْبٰی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے: ❶ (الوافر)

---

❶ اخرجه الدار قطنی من حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ وصححه الحاکم علی شرط مسلم لئکن اهل الحدیث یوهنون هذا الحدیث وایضا فی الطبرانی من حدیث رافع بن حدیج راجع النیل (۵/۶۶) وایضا (ك) هق عنه کنز العمال (٤ رقم ٤١٣) والحدیث فی الفائق (۲/۲۰٦) وغریب ابی عبید (۱: ۲۰) واللسان والنهایة (کلاء)

(۳۸۱) دِمَاءُ هُمْ مِّنَ الْكَلْبِ الشِّفَاءُ

ان کے خون کلب کی مرض سے شفا بخشتے ہیں۔

اور کبھی یہ مرض اونٹ کو بھی لاحق ہو جاتا ہے چنانچہ اَكْلَبَ الرَّجُلُ کے معنی باؤلے اونٹ کا مالک ہونے کے ہیں۔ كَلِبَ الشِّتَاءُ: سردی سخت ہوگئی گویا وہ کتے کی طرح باؤلی ہوگئی ہے۔ دَهْرٌ كَلِبٌ: سخت زمانہ۔ اَرْضٌ كَلِبَةٌ: اس زمین کو کہتے ہیں جو سیراب نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو جائے جیسا کہ باؤلا آدمی پانی نہ پینے کی وجہ سے آخر کار سوکھ کر رہ جاتا ہے۔ اَلْكَلَّابُ وَالْمُكَلِّبُ: اس شخص کو کہتے ہیں جو کتوں کو شکار کے لیے سدھاتا اور انہیں تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ﴾ (۵۔۴) اور وہ شکار بھی حلال ہے جو تمہارے لیے ان شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔

اَرْضٌ مُكَلَّبَةٌ: بہت کتوں والی سرزمین۔

اَلْكِلَابُ وَالْكَلْبُ: میخ جو تلوار کے قبضہ میں لگی ہوتی ہے۔

اَلْكَلْبَةُ۔ توشہ دان باندھنے کے تسمہ سے نیچے کا تسمہ جس سے اسے سیا جاتا ہے۔ اس کا یہ نام شکاری کتے کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ پس كَلَبْتُ الْاَدِيْمَ کے معنی چمڑے کو سینے کے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے [2] (الرجز)

(۳۸۲) سَيْرُ صَنَاعٍ فِيْ اَدِيْمٍ تَكْلُبُهُ

کاریگر عورت کے تسمہ کی طرح ملائم اور چمکدار ہے جس سے وہ مشکیزہ سی رہی ہو۔

اَلْكَلْبُ: تاروں کے ایک جھمکے کا نام ہے جسے کتے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے جھمکے کے تابع ہوتا ہے جسے اَلرَّاعِیْ (چرواہا) کہا جاتا ہے۔ اَلْكَلْبَتَانِ (دسپناہ) لوہار کے ایک اوزار کا نام ہے جس سے وہ گرم لوہے کو پکڑتا ہے کسی چیز کو پکڑنے کے لحاظ سے اسے شکاری کتے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اور دو کنارے ہونے کی وجہ سے تثنیہ کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اَلْكَلُّوْبُ۔ کنڈی۔ كَلَالِيْبُ جمع كَلَالِيْبُ الْبَازِیْ: باز کے پنجے۔ یہ بھی كَلْبٌ سے مشتق ہے۔ کیونکہ جو چیز اس کے پنجہ میں آ جائے اسے کتے کی طرح پکڑ کر روک لیتا ہے۔

(ک ل ف)

اَلْكَلَفُ: (س) کسی چیز پر شیفتہ ہونا۔ محاورہ ہے كَلِفَ

---

[1] وفی اللالی قال الشاعر (وهو الحطيئة) قال الاستاذ الميمنی فی طرقه عليه "اوهذه الزيادة خطا" لانه لا يوجد فی شیء من نسخ ديوان الحطيئه وانما هو لابی ابرج القاسم بن حنبل المری فی زفر بن ابی هاشم (عامل اليمامة يكن ابا حبيب) من ثمانية ابيات وصدره: جناة مكارم واساة كلم...... راجع للبيت المرزوقی رقم ۷۲۷ والمعجم للمرزبانی (۲۱٤) والآمدی ۸۱ فی خمسة مطلعها: اری الخلان بعد ابی خبيب بحجر فی بقائهم جفاء۔ راجع للبيت الحيوان للجاحظ (۲: ۵) وفيه بعد ابی عمير وفيه البيت منسوب الی بعض المريين والشطر ايضا مروی لامية بن ابی السلت وفی المعافی للقبتی بغير عزو (۲٤۳)

[2] قاله دكين بن رجاء الفقيمی يصف فرسا وقبله: كان غير متنه اذ نجنبه من بعد يوم كامل نؤدبه۔ وفی رواية اللسان والصحاح (حزر) خريز بدل اديم والرجز فی الاقتضاب بتقديم وتاخير وراجع للشطر ايضا الجمهرة لابن دريد ۷۵۰۶ والازمنة للمرزوقی (۲: ۷۰) والمعانی للقبتی ۲٦۰ والسمط ۵۸٦ واللسان والصحاح (كلب) ولفظة خريز اكثر من لفظة اديم۔

فُلَانٌ بِكَذَا: فلاں اس پر شیفتہ ہے۔ اَكْلَفْتُهٗ بِهٖ: میں نے اسے شیفتہ کر دیا۔

اَلْكَلَفُ: (ایضاً) چہرہ پر کے سیاہ دھبے، چہرہ کی چھائیاں گویا اس پر کلفت کا اثر ظاہر ہے۔

اَلتَّكَلُّفُ: کوئی کام کرتے وقت شیفتگی ظاہر کرنا باوجودیکہ اس کے کرنے میں مشقت پیش آ رہی ہو اسلئے عرف میں کلفت مشقت کو کہتے ہیں اور تَكَلُّفٌ اس کام کے کرنے کو جو مشقت تصنع یا اوپرے جی سے دکھلاوے کے لیے کیا جائے اس لیے تکلیف دو قسم پر ہے محمود اور مذموم۔ اگر کسی کام کو اس لیے محنت سے سرانجام دے کہ وہ کام اس پر آسان اور سہل ہو جائے اور اسے اس کام کے ساتھ شیفتگی اور محبت ہو جائے تو ایسا تکلف محمود ہے چنانچہ اسی معنی میں عبادات کا پابند بنانے میں تکلیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور اگر وہ تکلیف محض ریاکاری کے لیے ہو تو مذموم ہے۔ چنانچہ آیت:

﴿قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾ (۳۸۔۸۶) (اور اے پیغمبر) کہہ دو کہ میں تم سے اس کا صلہ نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں ہوں، میں تکلیف کے یہی معنی مراد ہیں اور حدیث ہے [1] (۹۹) ((اَنَا وَاَتْقِيَاءُ اُمَّتِيْ بُرَآءُ مِنَ التَّكَلُّفِ)) کہ میں اور میری امت کے پرہیزگار آدمی تکلیف سے بری ہیں۔ اور آیت۔ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲۔۲۸۶) خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ جن احکام کو یہ مشقت سمجھتے ہیں وہ مآل کے لحاظ سے ان کے لیے وسعت کا باعث ہیں جیسے فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۲۲۔۷۸) اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی اور تمہارے لیے تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین پسند کیا۔

اور نیز فرمایا:

﴿فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۱۶) مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

(ک ل م)

اَلْكَلْمُ: یہ اصل میں اس تاثر کو کہتے ہیں جس کا ادراک دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکے چنانچہ کلام کا ادراک قوت سامعہ کے ساتھ ہوتا ہے: اور كَلْمٌ: (زخم) کا ادراک قوت بصر کے ساتھ۔ محاورہ ہے: كَلَمْتُهٗ۔ میں نے اسے ایسا زخم لگایا، جس کا نشان ظاہر ہوا۔

اور چونکہ یہ دونوں (یعنی کلام اور كَلْم) معنی تاثیر میں مشترک ہیں۔ اس لیے شاعر نے کہا ہے [2] (الکامل) (۳۸۳) ....

---

[1] قال النووی لیس بثابت راجع المقاصد للسخاوی رقم ۱۹۱ والحدیث اخرجه الدار قطنی فی الافراد من حدیث الزبیر بن العوام ولفظه: الانی بری من التکلف وصالحو امتی واسناده جید والحدیث بلفظ المؤلف اورده الغزالی فی الاحیاء (راجع بتخریج العراقی ۱۸۹/۲)

[2] قاله طرفة بن العبد والبیت بتمامه: بحسام سیفك اولسانك وار۔ کلم الاصیل کا رعب الکلم والبیت فی الصناعتین ۳۲۷، ۳۹۳ دیوانه ٦١ وفیه قبله: وتصدعنك مخلية الرحل الشنوف موضحة عن العظم وفی نقد الشعر وتکف بدل تصد والقریض بدل الشنوف وفی الشعراء للحمعی ترو " وفی العیون (۲۳/۲) کا وسع الکلم۔

وَالْحِكَمُ الْاَصِيْلُ كَارْغَبِ الْكَلْمِ

اس شعر میں پہلا اَلْکَلِم ، کلمة کی جمع ہے اور دوسرا کَلْمٌ کی جس کے معنی زخم کے ہیں اور اَرْغَبُ کے معنی بہت وسیع کے ہیں پس شعر کے معنی یہ ہیں کہ دل میں لگ جانے والی باتوں کی تاثیر وسیع تر زخموں کی طرح ہوتی ہے اور دوسرے شاعر نے کہا ہے [1] (المتقارب)

(۳۸۴) وَجَرْحُ اللِّسَانِ كَجَرْحِ الْيَدِ

اور زبان کے زخم بھی ہاتھ کے زخم کے مشابہ ہوتے ہیں۔ کَلَامٌ کا اطلاق منظّم و مرتب الفاظ اور ان کے معانی دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ اور اہل نحو کے نزدیک کلام کے ہر جزو پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ خواہ وہ اسم ہو یا فعل ہو یا حرف۔ مگر اکثر متکلمین کے نزدیک صرف جملہ مرکبہ ومفیدہ کو کلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ قَـوْلٌ سے اخص ہے۔ کیونکہ قَـوْلٌ کا لفظ ان کے نزدیک صرف مفرد الفاظ پر بولا جاتا ہے اور کَلِمَةٌ کا اطلاق انواع ثلاثہ یعنی اسم فعل اور حرف تینوں میں سے ہر ایک پر ہوتا ہے۔ اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۸۔۵) یہ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ﴾ (۲۔۳۷) پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کلمات سے رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وغیرہ ادعیہ مراد ہیں [2] (۱۰۰) حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ ان سے مراد یہ دعا ہے [3] (۱۶)

اَلَمْ تَخْلُقْنِیْ بِیَدِكَ؟ اَلَمْ تُسْكِنِّیْ جَنَّتَكَ؟ اَلَمْ تُسْجِدْلِیْ مَلَائِكَتَكَ؟ اَلَمْ تَسْبِقْ رَحْمَتُكَ غَضَبَكَ؟ اَرَاَيْتَ اِنْ تُبْتُ اَكُنْتَ مُمِيْدِیْ اِلَى الْجَنَّةِ؟ (اے باری تعالیٰ) کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ کیا تو نے مجھے اپنی جنت میں نہیں بسایا؟ کیا مجھے مسجود ملائکہ نہیں بنایا؟ کیا تیری رحمت تیرے غضب پر سبقت نہیں لے گئی؟ پھر کیا اگر میں توبہ کرلوں تو مجھے جنت میں دوبارہ لوٹا کر نہیں لے جائے گا؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیوں نہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے مراد وہ امانت ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی مگر انہوں نے

---

[1] وفی الـلالـئ (۵۳۰۔۵۳۱) نسبه بعضهم لامری القیس انظر العقد الثمین (۱۲۳) والمعانی للقبتی ۲۳ وعن ابن درید انه لامری القیس بن عابس الصحابی وهو الصحیح (العینی (۲: ۳۱) وفی روایة وزرواللسان کذا والید (العینی ۲/۳۵) قال ابن الکلبی: والبیت لعمر وابن معدی کرب قاله فی قتله بنی مازن ثم ندم علی قتالهم وصدره: ولو عن نثا غیره جاء نی...... فی خمسة والشطر فی الصناعتین (۳۹۳) والعقد الفرید (۲: ٤٤٥) والعیون (۲: ۲۳) ومختار الشعراء الجاهلی (۱: ٦٦) وفی المقصورة الدریدیة ۱۲۸ بغیر عزو۔

[2] اخرجه الثعالبی عن ابن عباس، وابن المنذر من طریق ابن جریر نحوه والبیهقی فی الشعب عن محمد بن کعب القرظی مثله۔

[3] اخرجه ابن جریر عن ابن عباس ایضا (انظر فتح القدیر للشوکانی (۱/۷۱) والحاکم فی المستدرك فی تنزیه آدم من فضائل الانبیاء (من روایة المنهال بن عمرو عن سعید بن جبیر وقول ابن عباس ایضًا فی الکشاف (راجع تخریج الکشاف وللحافظ ص۷ رقم ٤٤) وذکر الدیلمی فیه قصة طویلة عن علی مرفوعا قال فی الکنز (۲ رقم ۳۵۵) وسنده واه وابن جریر نسب القول الاول الی الحسن ایضا والثانی الی ابن عباس علی عکس ما قال المؤلف ۱۲۔

اس کے اٹھانے سے انکار کردیا جس کا ذکر کہ آیت کریمہ:
﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ الایة﴾ (۳۳-۷۲) ہم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا: میں آچکا ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (۲-۱۲۴) اور جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے ذبح ولد، ختنہ وغیرہ ایسے کام مراد ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی آزمائش کی تھی۔ اور زکریا علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۳-۳۹) خدا تمہیں یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔ جو خدا کے فیض یعنی عیسیٰ کی تصدیق کریں گے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بکلمۃ سے مراد کلمہ توحید ہے اور بعض نے کتاب اللہ مراد لی ہے اور بعض نے عیسیٰ علیہ السلام مراد لیے ہیں پس آیت......
(۳-۳۹) اور آیت کریمہ:
﴿وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ﴾ (۴-۱۷۱) اور اس کا کلمہ (بشارت) تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا۔
میں عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ کلمہ کن سے پیدا ہوئے تھے جیسا کہ آیت ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۳-۵۹) عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک۔
میں مذکور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ لوگوں کے ان کے ذریعہ ہدایت پانے کی وجہ سے انہیں کلمہ کہا گیا ہے جیسا کہ کلام اللہ کے ذریعہ لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس خصوصی رحمت کے سبب سے ہے جو انکے بچپنے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر کی تھی۔ جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔
﴿اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا﴾ (۱۹-۳۰) کہ میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ نبی ہونے کی وجہ سے انہیں کلمۃ اللہ کہا گیا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ ہونے کی وجہ سے ذکر کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا﴾ (۶-۱۱۵) اور تمہارے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں۔
میں کَلِمَة بمعنی قضیہ یعنی فیصلہ کے ہے چنانچہ ہر قضیہ کو خواہ وہ قولی ہو یا فِعْلِی کَلِمَةٌ کہہ سکتے ہیں اور اسے صدق کے ساتھ متصف کرنا اس لیے ہے کہ قول اور فعل دونوں صدق کے ساتھ متصف ہوتے ہیں لہٰذا تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ میں آیت کریمہ:
﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ (۵-۳) (اور) آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا، کے مضمون کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ آج کے بعد شریعت میں "نسخ" نہیں ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں آنحضرت کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے [1] (۱۰۲)

[1] اخرجه احمد مسنده (۳/۱۲۵) وایضاً ابوداود عن عبادة بن الصامت وبمعناه فی (حل، هق) عن ابن عباس والترمذی عن عبادة راجع کنز العمال (۵۳۶) وروضة العقلاء للبستی ۱۳۵۔

((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ اَجْرِ بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے کہا کہ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اسے لکھ دو...... الخ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کَلِمَةٌ سے مراد قرآن پاک ہے اور اسے "کَلِمَةٌ" کہنا ایسا ہی ہے جیسے قصیدہ کو کلمہ کہا جاتا ہے اور تَمَّتْ سے قرآن پاک کے تا قیامت (تحریف سے) محفوظ رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ ماضی لاکر اس بات کے قطعی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور قرآن پاک کی اسی قسم کی حفاظت کی طرف آیت کریمہ: ﴿فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ الْاٰيَةَ﴾ (۶۔۹۰) اگر یہ کفار ان باتوں سے انکار کریں، میں بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ سے ثواب و عقاب کا وعدہ مراد ہے۔ جیسا کہ دیگر آیات میں فرمایا: ﴿بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۳۹۔۷۱) کہیں گے کیوں نہیں۔ لیکن کافروں کے حق میں عذاب کا حکم حق ہو چکا تھا۔ ﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا﴾ (۱۰۔۳۳) اسی طرح خدا کا ارادہ نافرمانوں کے حق میں ثابت ہو کر رہا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے معجزات مراد ہیں جو قوم نے طلب کیے تھے اور لفظ تمت سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ جو آیات بھیجی گئی ہیں وہ اپنی جگہ پر مکمل اور کافی ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ (۱۸۔۲۷) اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، میں ان کے اس مطالبہ کی تردید ہے جو کہ آیت: ﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ﴾ (۱۰۔۱۵) کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ، میں مذکور ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تمت کلمۃ ربک سے احکام الٰہی مراد ہیں اور تمت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وہی احکام اپنے بندوں کے لیے مشروع کیے ہیں جن میں کہ ان کے لیے کفایت ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (۷۔۱۳۷) اور بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے صبر کی وجہ سے تمہارے پروردگار کا وعدہ نیک پورا ہوا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کلمہ حسنیٰ سے مراد وہ فیصلہ ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ (۲۸۔۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں۔

میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا﴾ (۲۰۔۱۲۹) اور اگر یہ بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور (جزائے اعمال کے لیے) ایک میعاد (مقرر نہ ہوتی) تو (نزول) عذاب واقع ہو جاتا۔

نیز دوسری آیت:

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ﴾ (۴۲۔۱۴) اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہی ایک وقت مقرر تک کے لیے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

میں سبق کلمة الله تعالیٰ سے اس حکم ازلی کی طرف

اشارہ ہے جس کی حکمت الہٰی مقتضی تھی اور یہ کہ کلمات الٰہیہ کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی ان میں کسی قسم کے تغیر کی گنجائش ہوتی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ﴾ (۸۔۷) کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے۔

میں کَلِمَاتِہٖ سے وہ دلائل ثابتہ مراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کفار کے خلاف مسلمانوں کے لیے سلطان مبین یعنی زبردست دلیل کی حیثیت سے قائم کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (۴۸۔۱۵) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں۔

میں کلام اللہ سے اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت ﴿فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا﴾ (۹۔۸۳) تو کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ ہرگز نہیں نکلو گے۔ میں مذکور ہے اور بتایا ہے کہ منافقین کا یہ کہنا کہ ﴿ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ﴾ (۴۸۔۱۵) کلام الٰہی میں تبدیلی کے مترادف ہے اور متنبہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہرگز ہرگز تمہارے ساتھ نہیں نکلیں گے اور نکل بھی کیسے سکتے ہیں جب کہ علم الٰہی میں یہ...... فیصلہ ہو چکا ہے کہ ان سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ [1]

بندے سے اللہ تعالیٰ کا ہم کلام ہونا دو قسم پر ہے یعنی یا دنیا میں اور یا آخرت میں۔ چنانچہ آیت: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا﴾ الآیۃ (۴۲۔۵۱) اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام کے ذریعہ سے......۔

میں دنیا میں ہم کلام ہونے کا بیان ہے اور آخرت میں ثواب و کرامت کے طور پر صرف مومنین سے ہم کلام ہوگا جس کی کیفیت ہم سے مخفی ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۷۷) کے آخر میں لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ کفار اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (۴۔۴۶) کہ کلمات کو ان کے مقام سے بدل دیتے ہیں۔ میں کَلِمٌ کَلِمَۃٌ کی جمع ہے۔ اس آیت کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ الفاظ میں تغیّر و تبدّل کرتے تھے اور بعض نے تحریف معنوی مراد لی ہے یعنی آیت کو اس کے مقتضی کے خلاف معنی پر محمول کرنا یہ دوسرا قول قوی تر معلوم ہوتا ہے [2] کیونکہ الفاظ کے مشہور اور متداول ہونے کے بعد ان میں تبدیلی کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ﴾ (۲۔۱۱۸) اور جو لوگ کچھ نہیں جانتے (یعنی مشرک ہیں) وہ کہتے ہیں۔ کہ خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔

کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بالمشافہ گفتگو کیوں نہیں

---

[1] هـذا مـا تاول به عبدالرحمن بن زيد بن اسلم وقال به الجبائی وفيه نظر لان آية البراءة نزلت في غزوة تبوك وهي متاخرة عن عمرة الحديبية باربع سنين (لان صلح الحديبية كان سنة ست وغزوة تبوك سنة تسع) ابن كثير (٤/١٨٦) فالصحيح هو الوعد الذي وعد به اهل الحديبية قال الطبرسی (٢٦/٦٠) وهذا ای قول الجبائی غلط فاحش حمله عليه العصبية ١٢۔

[2] نسبه علماء التفسير الى ابن عباسؓ

کرتا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:
﴿يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (۴۔۱۵۳) (اے محمدؐ) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں۔ ہمیں خدا کو ظاہر (یعنی آنکھوں سے دکھا دو)۔

کَلَّا

یہ حرف ردع اور زجر ہے اور ماقبل کلام کی نفی کے لیے آتا ہے اور یہ۔ ''اِیْ'' حرف ایجاب کی ضد ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالاً وَّ وَلَدًا اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا كَلَّا﴾ (۱۹۔۷۷،۷۸،۷۹) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں سے کفر کیا۔ اور کہنے لگا (اگر میں از سر نو زندہ ہوا بھی تو یہی) مال اور اولاد مجھے وہاں ملے گا کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے یا خدا کے یہاں (سے) عہد لے لیا ہے؟ ہرگز نہیں۔
﴿لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا﴾ (۲۳۔۱۰۰) تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں نیک کام کروں ہرگز نہیں۔
﴿كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ﴾ (۸۰۔۲۳) کچھ شک نہیں کہ خدا نے اسے جو حکم دیا۔ اس نے ابھی تک اس پر عمل نہیں کیا۔
اور اس نوع کی اور بھی بہت آیات ہیں۔

کَمْ

یہ عدد سے کنایہ کے لیے آتا ہے اور یہ دو قسم پر ہے۔ استفہامیہ (۱) اور خبریہ (۲)۔ استفہامیہ ہو تو اس کا مابعد اسم تمیز بن کر منصوب ہوتا ہے (اور اس کے معنی) کتنی تعداد یا مقدار کے ہوتے ہیں جیسے كَمْ رَجُلًا ضَرَبْتَ: اور جب خبریہ ہو تو اپنی تمیز کی طرف مضاف ہو کر اسے مجرور کر دیتا ہے اور کثرت کے معنی دیتا ہے ''یعنی کتنے ہی'' جیسے كَمْ رَجُلٍ ضَرَبْتُ: میں نے کتنے ہی مردوں کو پیٹا اور اس صورت میں کبھی اس کی تمیز پر من جارہ داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا﴾ (۷۔۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے تباہ کر ڈالیں۔ ﴿وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً﴾ (۲۱۔۱۱) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستم گار تھیں ہلاک کر ڈالا۔

(ک م م)

اَلْكُمُّ: آستین کو کہتے ہیں اور اَلْكِمُّ (بکسر الکاف) خوشوں کے غلاف کو..... اس کی جمع اَكْمَام آتی ہے جیسے فرمایا ﴿ذَاتُ الْاَكْمَامِ﴾ (۵۵۔۱۱) اور کھجور کے درخت ہیں جن (کے خوشوں) پر غلاف ہوتے ہیں۔
اَلْكُمَّةُ: ایک طرح کی گول ٹوپی۔ جو سر پر پہنی جاتی ہے۔

(ک م ل)

كَمَالُ الشَّيْءِ: کسی چیز کے کامل ہونے سے مراد ہے، وہ غرض پوری ہو جانا جس کے لیے وہ وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ جب کسی چیز کے متعلق كَمُلَ ذَالِكَ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اس سے مقصود تھا۔ وہ حاصل ہو گیا۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (۲۔۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔

میں کَامِلَیْنِ سے مراد یہ ہے کہ رضاعت کے لیے دو سال کی مدت آخری مدت ہے جس سے بچہ کی نشوونما اور اسکی بیوی کا تعلق ہے اور آیت کریمہ:

﴿لِیَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ کَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۱۶۔۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ انہیں قیامت کے دن پوری سزا ملے گی اور آیت:

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ کَامِلَةٌ﴾ (۲۔۱۹۶) یہ پورے دس ہوئے۔

میں عَشَرَةٌ کی صفت کَامِلَةٌ لانے سے یہ مقصد نہیں ہے کہ سات اور تین مل کر دس ہو جاتے ہیں۔ بلکہ کَامِلَةٌ کے لفظ سے اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ دس دن کے روزوں سے ہدی کا پورا بدل حاصل ہو جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کَامِلَةٌ کا لفظ استطرادًا لایا گیا ہے اور اس سے مقصد اسم عدد میں عشرہ کی فضیلت کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ پہلی (دہائی) ہے جس پر عدد کامل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ان ہی ہندسوں کا تکرار ہوتا رہتا ہے جو اس سے قبل ہوتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عشرۃ ہی کامل عدد ہے۔

(ک م ہ)

اَلْاَکْمَهُ کے معنی پیدائشی اندھا کے ہیں [1] مگر کبھی اس شخص کے لیے آتا ہے جس کی بعد میں بصارت کھوگئی ہو شاعر نے کہا ہے (الرجز)

(۳۸۵) کَمِهَتْ عَیْنَاهُ حَتّٰی ابیضَّتَا

اس کی آنکھیں بےنور ہو کر سفید ہو گئیں۔

(ک ن ن)

اَلْکِنُّ: ہر وہ چیز جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے۔

کَنَنْتُ الشَّیْءَ کَنًّا: کسی چیز کو کِنَّ میں محفوظ کر دیا اور کَنَنْتُ (ثلاثی مجرد) خصوصیت کے ساتھ کسی مادی شی کو گھر یا کپڑے وغیرہ میں چھپانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَاَنَّهُنَّ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ﴾ ((۳۷۔۴۹) گویا وہ محفوظ انڈے ہیں۔

﴿کَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّکْنُوْنٌ﴾ (۵۲۔۲۴) جیسے چھپائے ہوئے موتی۔

اور اَکْنَنْتُ (باب افعال سے) دل میں کسی بات کو چھپانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَوْ اَکْنَنْتُمْ فِیْ اَنْفُسِکُمْ﴾ (۲۔۲۳۵) یا (نکاح کی خواہش کو) اپنے دلوں میں مخفی رکھو۔

اور کِنٌّ کی جمع اَکْنَانٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَکْنَانًا﴾ (۱۶۔۸۱) اور پہاڑوں میں تمہارے لیے غاریں بنائیں۔

اَلْکِنَانُ: پردہ، غلاف وغیرہ جس میں کوئی چیز چھپائی جائے اس کی جمع اَکِنَّةٌ آتی ہے۔ جیسے غِطَاءٌ کی جمع اَغْطِیَةٌ: چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿وَ جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَکِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ﴾ (اور

---

[1] وفی القرآن ﴿وابرئ الاکمه والابرص﴾ (۳۔۴۹)۔

[2] قاله سوید بن ابی کامل الیشکری فی عینیته المشهورة التی تسمی "الیتیمة" راجع المفضلیات (۱ : ۱۸) والبیت فی اللسان (کمه) وتمامه فهو یلحی نفسه لما نزع والبیت من شواهد الطبری (۳/۲۷۷)۔

ہم نے انکے دلوں پر تو پردے ڈال رکھے ہیں کہ اس کو سمجھ نہ سکیں۔اور آیت کریمہ:﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِی اَکِنَّۃٍ﴾ (۴۱۔۵) اور کہنے لگے ہمارے دل پردوں میں ہیں۔

کے بعض نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ ہم تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:﴿قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ کَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ﴾ (۱۱۔۹۱) انہوں نے کہا اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔اور آیت کریمہ:﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ فِیْ کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ﴾ (۵۶۔۷۷،۷۸) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن پاک ہے جو کتاب محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ کتاب مکنون سے لوح محفوظ مراد ہے [1] اور بعض نے کہا ہے کہ یہ قرآن پاک کے عند اللہ محفوظ ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:﴿وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (۱۵۔۹) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

اور شادی شدہ عورت پر بھی کِنَّۃٌ کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے خاوند کی حفاظت میں رہتی ہے اس بنا پر شادی شدہ عورت کو مُحْصَنَۃٌ بھی کہتے ہیں۔گویا وہ اپنے خاوند کی حفاظت کے قلعے میں محفوظ ہے۔

اَلْکِنَانَۃُ: ترکش جو کہیں سے پھٹا ہوا نہ ہو۔

(ک ن د)

اَرْضٌ کَنُوْدٌ: بنجر زمین جہاں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو۔(اور کنایہ کے طور پر ناسپاس گذار کو کَنُوْدٌ کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَکَنُوْدٌ﴾ (۱۰۰۔۶) کہ انسان اپنے پروردگار کا احسان نہ ماننے والا اور ناشکرا ہے۔

(ک ن ز)

اَلْکَنْزُ: (ض) کے معنی دولت جمع کر کے اسے محفوظ رکھ دینے کے ہیں یہ اصل میں کَنَزْتُ التَّمْرَ فِی الْوِعَاءِ سے مشتق ہے۔جس کے معنی کھجور کو باردان میں بھر کر محفوظ کر لینے کے ہیں۔اور کھجور اندوختہ کرنے کے موسم کو زَمَنُ الْکِنَاز کہا جاتا ہے۔اور نَاقَۃٌ کِنَازٌ کے معنی گوشت سے گتھی ہوئی اونٹنی کے ہیں۔اور آیت کریمہ:﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّۃَ﴾ (۹۔۳۴) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں۔

میں یَکْنِزُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سونا اور چاندی جمع کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔اور اسے راہ خدا میں صرف نہیں کرتے ایسے لوگوں کو قیامت کے دن کہا جائے گا۔

﴿فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ﴾ (۹۔۳۵) کہ جو کچھ تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

اور آیت ﴿لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ کَنْزٌ﴾ (۱۱۔۱۲) میں کنز کے معنی خزانہ اور بڑی دولت کے ہیں اور آیت کریمہ:﴿وَ کَانَ تَحْتَهٗ کَنْزٌ لَّهُمَا﴾ (۱۸۔۸۲) اور اس کے نیچے ان کا خزانہ (مدفون) تھا۔میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کنز سے صحیفہ علم مراد ہے۔

(ک ہ ف)

اَلْکَهْفُ کے معنی پہاڑ میں غار کے ہیں اس کی جمع کُهُوْفٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:﴿اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ﴾ (۱۸۔۹) کہ

[1] کما فی قولہ تعالیٰ۔﴿فی لوح محفوظ﴾ (۸۵۔۲۲)

غار اور لوح والے۔

(ک ہ ل)

اَلْکَھْلُ: ادھیڑ عمر آدمی جس کے بال سفید ہو گئے ہوں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَ یُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَ کَھْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (۳۔۴۶) اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر کا ہو کر لوگوں سے گفتگو کرے گا اور نیکوکاروں میں ہوگا۔
اِکْتَھَلَ النَّبَاتُ: پودے کا حد یبوست یعنی بڑھنے کی آخری حد کو پہنچ جانا۔جیسا کہ ادھیڑ عمر آدمی بڑھاپے کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)
(۳۸۶) مُؤَزَّرٌ بِھَشِیْمِ النَّبْتِ مُکْتَھِلٌ
اس کی گھاس آخری حد تک بڑھی ہوئی ہے اور اس نے اپنے گرداگرد دوسرے پودوں کی چادر پہن رکھی ہے۔

(ک ہ ن)

اَلْکَاھِنُ: اس شخص کو کہتے ہیں جو تخمینے سے ماضی کے خفیہ واقعات کی خبر دیتا ہو اور عرّاف اسے جو آئندہ کے متعلق خبر دیتا ہو ان دونوں پیشوں کی بنا چونکہ ظن پر ہے جس میں صواب وخطا کا احتمال پایا جاتا ہے۔اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا [2] (۱۰۴) ((مَنْ اَتٰی عَرَّافًا اَوْ کَاھِنًا فَصَدَّقَہٗ بِمَا قَالَ فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی اَبِی الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ))۔ کہ جو شخص عراف یا کاہن کے پاس جا کر ان کے قول کی تصدیق کرے تو اس نے جو کچھ ابوالقاسم ﷺ (یعنی مجھ پر) اتارا گیا ہے اس کے ساتھ کفر کیا کَھَنَ فُلَانٌ کَھَانَۃً کہانت کرنا۔اور جب کوئی شخص اس پیشہ کے ساتھ مختص ہو تو اس کے متعلق کَھُنَ کہتے ہیں۔
تَکَھَّنَ: بتکلف کہانت کرنا قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ﴾ (۶۹۔۴۲) اور نہ کسی کاہن کے مزخرفات ہیں لیکن تم لوگ بہت ہی کم دھیان دیتے ہو۔

(ک و ب)

اَلْکُوْبُ: پیالہ جس کا دستہ نہ ہو۔اس کی جمع اَکْوَابٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿بِاَکْوَابٍ وَّاَبَارِیْقَ وَکَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ﴾ (۵۶۔۱۸) یعنی آبخورے اور آفتابے اور صاف شراب کے گلاس۔
اَلْکُوْبَۃُ: (ڈگڈگی) یعنی باریک میان طبلک جو تماشہ کے وقت مداری بجاتے ہیں۔

(ک و د)

کَادَ: (س) یہ فعل مقارب ہے یعنی کسی فعل کے قریب ہونے کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے مثلاً کَادَ یَفْعَلُ: قریب تھا کہ وہ اس کام کو کر گذرتا یعنی کرنے والا

---

[1] قالہ الاعشی وصدرہ: یضاحك الشمس منھا کوکب شرق۔ راجع للبیت الصناعتین ۲۷۶ والبلغۃ فی شذور اللغتہ (کتاب النبات الاصمعی ۳۳) ودیوانہ (۱۴۴) افی قصیدۃ مخاطبا لیزید بن مسھر مطلعھا: ودع ھریرۃ ان الرکب مرتحل۔ وھل تطیق وداعا ایھا الرجل۔ وھریرۃ ھذہ قینۃ لبشر بن عمر تکنی بام الخلید والقصیدۃ فی دیوانہ (۱۴۴۔۱۴۹) والبیت فی اللسان (ازر، کمل) وشرح للدیوان ۵۷۔ والطبری (۲۱۔۲۷) والمرتضی (۱: ۲۲۱) والمشکل للقبتی (۱۰۳ والعیون (۲: ۱۰۶) وشرح العشر للتبریزی (۲۷۶) وفی روایتہ بعمیم بدل بھشیم ۱۲۔

[2] عن ابی ھریرۃ مرفوعاً رواہ الحاکم فی المستدرك وعن علیؓ موقوفا (رستہ) انظر کنز العمال (۶: رقم۳۰۹۸ و ۴۰۰۴ ج ۶) وفی روایۃ مسلم والحاکم فقد بری مما انزل اللہ علی محمدض (کنز العمال ۳۰۹۵)

تھا مگر کیا نہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا﴾ (۱۷۔۷۴) تو تم کسی قدر ان کی طرف مائل ہونے ہی لگے تھے ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ﴾ (۱۷۔۷۳) قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بچادیں۔

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ﴾ (۲۔۲۰) قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کی بصارت کو اچک لے جائے۔

﴿يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ﴾ (۲۲۔۷۲) قریب ہوتے ہیں کہ ان پر حملہ کردیں۔

﴿اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ﴾ (۳۷۔۵۶) تو تو مجھے ہلاک ہی کر چکا تھا اور اگر اس کے ساتھ حرف نفی آجائے تو اثباتی حالت کے برعکس فعل کے وقوع کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے جو وقوع کے قریب نہ ہو اور حرف نفی اس پر مقدم ہو یا متاخر دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (۲۔۷۱) اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔

﴿لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ (۴۔۷۸) کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اور کَادَ کے بعد ان کا استعمال صرف ضرورت شعری کے لیے ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الرجز)

(۳۸۷) قَدْ كَادَ مِنْ طُوْلِ الْبِلٰی اَنْ يَّمْصَحَا

قریب تھا کہ زیادہ بوسیدگی کے باعث وہ مٹ جائے۔

(ک و ر)

اَلْكَوْرُ: کے معنی کسی چیز کو عمامہ کی طرح لپیٹنے اور اس کو اوپر تلے گھمانے کے ہیں۔ چنانچہ آیت: ﴿يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ﴾ (۳۹۔۵) اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔

میں مطالع شمسی کے تبدیل ہونے سے دن رات کے بڑھنے اور گھٹنے کو تکویر سے تعبیر فرمایا ہے۔

طَعَنَهٗ فَكَوَّرَهٗ: اس کو نیزہ مار کر گچھلی کر دیا۔

اِكْتَارَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑتے وقت اپنی دم گھمانا اور بہت سے اونٹوں کو بھی كَوْرٌ کہا جاتا ہے اور كُوَارَةُ النَّحْلِ کے معنی شہد کے چھتہ کے ہیں۔

اَلْكُوْرُ کے معنی اونٹ کا پالان بھی آتے ہیں اور ہر بڑے شہر کو كُوْرَةٌ کہا جاتا ہے یعنی وہ علاقہ جس میں بہت سی بستیاں اور دیہات جمع ہوں۔

(ک و ن)

كَانَ۔ فعل ماضی کے معنی کو ظاہر کرتا ہے بیشتر صفات باری تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو ازلیت (یعنی ہمیشہ سے ہے) کے معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (۳۳۔۴۰) اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا﴾ (۴۸۔۲۱) اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

---

[1] قاله رؤبة بن العجاج وقبله: ربع عفاه الدهر طولا فانمحى۔ والرجز فی اسرار ابن الانباری (۱۲۹) واللسان والصحاح (کاد) والکامل (۱٦۷) والعینی (۲: ۲۱۵) وابن یعیش والاقتضاب (۳۹٦) وقال والرجزیروی لرؤبة بن العجاج ولم اجده فی دیوانه وارجع للشطر ایضا المشکل للقبتی (٤۰۷) والکتاب (۱: ٤۷۸) والخزانة (٤: ۹۱) والحمل للزجاجی۔ ۲۱۰ و الانصاف ۲۳٤ والدرر اللوامع (۱/۱۰٥) وادب الکاتب ٤۱۱ ویروی قبله: ربع عفا من بعد ما قد انمحی و کلتا الروایتین ذکرهما الخفاجی فی شرح الدرة ونسبه الی رؤیة وفی الفائق (۲: ۳۱٦) معز والی ابی النحم قال الشنقیطی ولم احقق لسبته۔

اور جب یہ کسی جنس کے ایسے وصف کے متعلق استعمال ہو جو اس میں موجود ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ وصف اس اسم کے ساتھ لازم وملزوم رہتا ہے اور بہت ہی کم اس سے علیحدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات:

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا﴾ (۱۷۔۶۷) اور انسان ہے ہی ناشکرا۔

﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۰۰) اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔ ﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (۱۸۔۵۴) اور انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔

میں تنبیہ کی ہے کہ یہ امور انسان کے اوصاف لازمہ سے ہیں اور شاذ ونادر ہی اس سے منفک ہوتے ہیں اسی طرح شیطان کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا﴾ (۲۵۔۲۹) اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔ ﴿وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ (۱۷۔۲۷) اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا یعنی ناقدرا ہے۔

جب یہ فعل زمانہ ماضی کے متعلق استعمال ہو تو اس میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ چیز تاحال اپنی پہلی حالت پر قائم ہو اور یہ بھی کہ اس کی وہ حالت متغیر ہوگئی ہو مثلاً كَانَ فُلَانٌ كَذَا ثُمَّ صَارَ كَذَا: یعنی فلاں پہلے ایسا تھا لیکن اب اس کی حالت تبدیل ہوگئی ہے نیز یہ ماضی بعید کے لیے بھی آتا ہے جیسے۔ كَانَ فِي اَوَّلِ مَا اَوْجَدَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَذَا۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز پیدا کی تھی اور ماضی قریب کے لیے بھی حتیٰ کہ اگر وہ حالت زمانہ تکلم سے ایک لحہ بھی پہلے ہو تو اس کے متعلق کان کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے لہٰذا جس طرح "كَانَ اٰدَمُ كَذَا" کہہ سکتے ہیں اسی طرح "كَانَ زَيْدٌ هٰهُنَا" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر آیت:

﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ (۱۹۔۲۹) (وہ بولے کہ) ہم اس سے جو گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جو ابھی گود کا بچہ تھا یعنی کم عمر ہے اور یہ بھی کہ "جو ابھی گود کا بچہ ہے" یعنی ماں کی گود میں ہے۔ ❶ لیکن یہاں زمانہ حال مراد لینا بے معنی ہے اس میں زمانہ قریب ہے جیسے آیت ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ (۳۔۱۱۰) جتنی امتیں ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ كُنْتُمْ زمانہ حال پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کے علم اور حکم کے مطابق بہتر تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ﴾ (۲۔۲۸۰) اور اگر (قرض لینے والا) تنگ دست ہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں كَانَ کے معنی کسی چیز کے واقع ہو جانا کے ہیں اور یہ فعل تام ہے۔ یعنی اگر وہ تنگدست ہو جائے بعض لوگ کہتے ہیں کہ کون کا لفظ کسی جوہر کے اپنے سے پست تر جوہر میں تبدیل ہونے کے لیے آتا ہے۔ اور اکثر متکلمین اسے معنی ابداع میں استعمال کرتے ہیں بعض علمائے نحو کا خیال ہے کہ كَيْنُوْنَةٌ کا لفظ اصل میں كَوْنُوْنَةٌ بروزن فَعْلُوْلَةٌ ہے۔ ثقل کی وجہ سے واؤ یاء سے تبدیل ہوگئی ہے مگر سیبویہ کے نزدیک یہ

❶ فی الصورة الثانية يكون تامه وفی الاولی ناقصة (الطبری ص۷۹۔۱۹)

اصل میں کَیْوِنُوْنَة بروزن فَیْعِلُوْلَة ہے۔واؤ کو یا میں ادغام کرنے سے کَیّنُوْنَةٌ ہوگیا پھر ایک یاء کو تخفیف کے لیے گرا دیا تو کَیْنُوْنَةٌ بن گیا جیسا کہ مَیِّتٌ سے مَیْتٌ بنا لیتے ہیں جو اصل میں مَیْوِتٌ ہے۔فرق صرف یہ ہے۔ کہ کَیّنُوْنَة (بتشدید الیاء) استعمال نہیں ہوتا اور مَیِّتٌ تشدید یاء کے ساتھ اکثر استعمال ہوتا ہے۔اَلْمَکَانُ: بعض کے نزدیک یہ دراصل کَانَ یَکُوْنُ (ک و ن) سے ہے مگر کثرت استعمال کے سبب میم کو اصلی تصور کر کے اس سے تَمَکَّنَ وغیرہ مشتقات استعمال ہونے لگے ہیں جیسا کہ مِسْکِیْنٌ سے تَمَسْکَنَ بنا لیتے ہیں حالانکہ یہ (س ک ن) سے ہے۔اِسْتَکَانَ فُلَانٌ فلاں نے عاجزی کا اظہار کیا۔گویا وہ ٹھہر گیا اور ذلت کی وجہ سے سکون وطمانینت کو چھوڑ دیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا اسْتَکَانُوْا لِرَبِّهِمْ﴾ (۲۳-۷۶) تو بھی انہوں نے اللہ کے آگے عاجزی نہ کی۔

(ک و ی)

کَوَیْتُ الدَّابَّةَ بِالنَّارِ کَیًّا کے معنی جانور کو گرم لوہے سے داغ دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ﴾ (۹-۳۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو داغے جائیں گے۔

کَیْ

یہ کسی چیز کے فعل کا سبب بیان کرنے کے لیے آتا ہے بمعنی ”تاکہ“ اور کَیْلَا اس کی نفی کے لیے جیسے فرمایا:﴿کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً﴾ (۵۹-۷) تاکہ مال......گردش نہ کرتا رہے۔

(ک ی د)

اَلْکَیْدُ: (خفیہ تدبیر) کے معنی ایک قسم کی حیلہ جوئی کے ہیں یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی مگر عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح لفظ اِسْتِدْرَاجٌ اور مَکْرٌ بھی کبھی اچھے معنوں میں آجاتے ہیں چنانچہ اچھے معنوں میں فرمایا:۔

﴿کَذٰلِكَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ﴾ (۱۲-۷۶) اسی طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے تدبیر کر دی۔

﴿وَ اُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ﴾ (۷-۱۸۳) اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں۔میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں کید سے مراد عذاب ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے ڈھیل اور مہلت دینا مراد ہے جو آخر کار موجب عذاب بنتی ہے جیسے فرمایا:﴿اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْا اِثْمًا﴾ (۳-۱۷۸) (نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کر لیں۔اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ﴾ (۱۲-۵۲) اور اللہ خیانت کرنے والوں کے مکر کو روبراہ نہیں کرتا۔ خائنین کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی تدبیر سے خیانت کا ارادہ نہیں کرتے ان کی تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ روبراہ اور کامیاب کر دیتا ہے۔جیسا کہ یوسفؑ کی اپنے بھائی کے بارے میں تدبیر کرنا۔اور آیت کریمہ:۔

﴿لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ﴾ (۲۱-۵۷) میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔میں لَاَکِیْدَنَّ کے معنی یہ

ہیں کہ میں ان کے ساتھ بری طرح پیش آؤں گا۔
﴿فَاَرَادُوْا بِہٖ کَیْدًا فَجَعَلْنَاھُمُ الْاَسْفَلِیْنَ﴾ (۳۷۔۹۸) غرض انہوں نے ان کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی اور ہم نے انہی کو زیر کر دیا۔
﴿فَاِنْ کَانَ لَکُمْ کَیْدٌ فَکِیْدُوْنِ﴾ (۷۷۔۳۹) اگر تم کو کوئی داؤ آتا ہو تو مجھ پر کر چلو۔
﴿کَیْدُ سَاحِرٍ﴾ (۲۰۔۶۹) جادو کے ہتھکنڈے......
﴿فَاَجْمِعُوْا کَیْدَکُمْ﴾ (۲۰۔۶۹) تو تم جادو کا سامان اکٹھا کر لو۔
محاورہ ہے: فُلَانٌ یَکِیْدُ بِنَفْسِہٖ: فلاں جان دے رہا ہے اور جب چقماق دیر سے آگ نکالے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کَادَ الزَّنْدُ۔

(ک ی ف)

کَیْفَ: (اسم استفہام) اس چیز کی حالت دریافت کرنے کے لیے آتا ہے۔ جس پر کہ شبیہ اور غیر شبیہ کا لفظ بولا جا سکتا ہو جیسے اَبْیَضُ (سفید) اَسْوَدُ (سیاہ) صَحِیْحٌ (تندرست) سَقِیْمٌ (بیمار) وغیرہ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے متعلق اس کا استعمال جائز نہیں ہے اور کبھی اس چیز پر بھی کَیْفَ کا اطلاق کر دیتے ہیں جس کے متعلق سوال کرنا ہو مثلاً کہا جاتا ہے کہ اسود اور اَبْیَضُ مقولہ کیف سے ہیں اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق کیف کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ تنبیہ یا توبیخ کے طور پر مخاطب سے استخبار کے لیے لایا گیا ہے جیسے فرمایا:
﴿کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ﴾ (۲۔۲۸) کافرو! تم خدا سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو۔
﴿کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا﴾ (۳۔۸۶) خدا ایسے لوگوں کو کیونکر ہدایت دے۔
﴿کَیْفَ یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَھْدٌ﴾ (۹۔۷) بھلا مشرکوں کے لیے کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔
﴿اُنْظُرْ کَیْفَ ضَرَبُوْا لَکَ الْاَمْثَالَ﴾ (۱۷۔۴۸) دیکھو انہوں نے کس کس طرح کی تمہارے بارے میں باتیں بنائیں۔
﴿فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ﴾ (۲۹۔۲۰) اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔
﴿اَوَ لَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰہُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ﴾ (۲۹۔۱۹) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا پھر کس طرح اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔

(ک ی ل)

اَلْکَیْلُ: (ض) کے معنی غلہ ناپنے کے ہیں) اور کِلْتُ لَہُ الطَّعَامَ (صلہ لام) کے معنی ہیں۔ میں نے اس کے لیے غلہ ناپنے کی ذمہ داری سنبھالی اور کِلْتُ الطَّعَامَ (بدوں لام) کے معنی ہیں میں: نے اسے غلہ ناپ کر دیا اور اِکْتَلْتُ عَلَیْہِ کے معنی ہیں۔ میں نے اس سے ناپ کر لیا۔
قرآن پاک میں ہے: ﴿وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ﴾ (۸۳۔۱،۲،۳) ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔

یہ آیت اگرچہ خاص کرناپ میں کمی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔مگراس میں ہرقسم کے لین دین میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے کی تاکید ہے۔نیزفرمایا: ﴿فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ﴾ (۱۲۔۸۸) آپ ہمیں (اس کے عوض) پورا غلہ دیجیے۔

﴿فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ﴾ (۱۲۔۶۳) تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجیے تاکہ ہم پھر غلہ نپوا کر لائیں اور آیت کریمہ:

﴿وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ﴾ (۱۲۔۶۵) (اور ہم) ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ زیادہ لائیں گے۔میں كَيْلَ بَعِيْرٍ کے معنی بارشتر کے برابر غلہ کے ہیں۔

❀❀❀

کتابُ اللّام

(اللام) (حرف)

یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔اول حرف جارہ اوراس کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) تعدیہ کے لیے اس وقت بعض اوقات تو اس کا حذف کرنا جائز نہیں ہوتا جیسے فرمایا:

﴿وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ﴾ (۱۷۔۱۰۳) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹا دیا۔

اور کبھی حذف کرنا جائز ہوتا ہے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ (۴۔۲۶) خدا چاہتا ہے کہ تم سے کھول کھول کر بیان فرمادے۔ میں لام مذکور ہے اور آیت: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا﴾ (۶۔۱۲۵) تو جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔ میں اسے حذف کردیا ہے۔ (یعنی اصل میں لِاَنْ يَّهْدِيَهٗ وَلِاَنْ يُّضِلَّهٗ ہے۔

(۲) مِلک اور استحقاق کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے اور مِلک سے ہمیشہ ملک عین ہی مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ ملک منافع اور مِلک تصرف سب کو عام ہے چنانچہ فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۴۵۔۲۷) اور آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت خدا ہی کی ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۴۸۔۴) اور آسمانوں اور زمین کے لشکر سب خدا ہی کے ہیں اور مِلک تصرف کے لیے مثلاً: کسی شخص کے ساتھ لکڑی اٹھاتے وقت تم اس سے یہ کہو: خُذْ طَرَفَكَ لِآخُذَ طَرَفِيْ کہ تم اپنی جانب سے پکڑلو تا کہ میں اپنی جانب سے پکڑوں۔

اور لِلّٰهِ دَرُّكَ کی طرح جب لِلّٰهِ كَذَا کہا جاتا ہے تو اس میں بعض نے لام تملیک مانا ہے یعنی یہ چیز بلحاظ شرف (منزلت کے اتنی بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس پر کسی کا مِلک نہیں ہونا چاہیے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں لام ایجاد کے لیے ہے یعنی اللہ نے اسے بطریق ابداع پیدا کیا ہے کیونکہ موجودات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اسباب طبعی یا صنعت انسانی کے واسطہ سے ایجاد کیا ہے۔ اور دوم وہ جنہیں بغیر کسی واسطہ کے پیدا کیا ہے جیسے افلاک اور آسمان وغیرہ اور یہ دوسری قسم پہلی کی نسبت اشرف اور اعلیٰ ہے۔ اور آیات کریمہ: ﴿وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ (۴۰۔۵۲) اور ان کے لیے لعنت اور برا گھر ہے۔

اور ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾ (۸۳۔۱) ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔

میں لام استحقاق کے معنی دیتا ہے یعنی یہ لوگ لعنت اور ویل کے مستحق ہیں۔ اور یہ لام بھی لام مِلک کی طرح ہے لیکن لام مِلک اس چیز پر داخل ہوتا ہے جو ملک میں حاصل ہو

چکی ہو اور لام استحقاق اس پر جو تا حال حاصل تو نہ ہوئی ہو مگر اس پر استحقاق ثابت ہونے کے لحاظ سے حاصل شدہ چیز کی طرح ہو بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ میں لام بمعنی علی ہے۔ای عَلَيْهِمُ اللَّعْنَةُ (یعنی ان پر لعنت ہے) اسی طرح آیت کریمہ:

﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ﴾ (۲۴۔۱۱) ان میں جس شخص نے گنہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لیے اتنا ہی وبال ہے۔ میں بھی لام بمعنی علی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی لام بمعنی الی بھی آتا ہے۔ جیسا ﴿بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا﴾ (۹۹۔۵) کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا، میں ہے یعنی اَوْحٰى اِلَيْهَا مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں تو وحی تسخیری مراد ہے اور لام کے ذریعہ اس وحی کے تسخیری ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے اور یہ اس وحی کی طرح نہیں ہوتی جو انبیاء علیہم السلام کی طرف بھیجی جاتی ہے لہٰذا لام بمعنی الی نہیں ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا﴾ (۴۔۱۰۵) اور (دیکھو) دغا بازوں کی حمایت میں بھی بحث نہ کرنا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ لام لامِ اجل ہے اور سبب اور جانب کے معنی دیتا ہے یعنی تم ان کی حمایت میں مت بحث کرو جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ﴾ (۴۔۱۰۷) اور جو لوگ اپنے ہم جنسوں کی خیانت کرتے ہیں ان کی طرف سے بحث نہ کرنا۔

اور یہ لَا تَكُنْ لِّلّٰهِ خَصِيْمًا کے لام کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہاں لام مفعول پر داخل ہوا ہے اور معنی یہ ہیں۔ لَا تَكُنْ خَصِيْمُ اللّٰهِ کہ تم اللہ کے خصیم یعنی فریق مخالف مت بنو۔

(۳) لام ابتداء جیسے فرمایا:

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى﴾ (۹۔۱۰۸) البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

﴿لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا﴾ (۱۲۔۸) کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔

﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً﴾ (۵۹۔۱۳) تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں...... بڑھ کر ہے۔

(۴) چہارم وہ لام جو اِنَّ کے بعد آتا ہے۔ یہ کبھی تو اِنَّ کے اسم پر داخل ہوتا ہے اور کبھی اِنَّ کی خبر اور کبھی متعلق خبر پر، چنانچہ جب اسم خبر سے متاخر ہو تو اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً﴾ (۲۴۔۴۴) اس میں بڑی عبرت ہے۔

اور خبر پر داخل ہونے کی مثال جیسے فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (۸۹۔۱۴) بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ﴾ (۱۱۔۷۵) بے شک ابراہیم علیہ السلام بڑے تحمل والے اور نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

اور یہ لام متعلق خبر پر اس وقت آتا ہے جب متعلق خبر ان کی خبر پر مقدم ہو۔ جیسے فرمایا:

﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (۱۵۔۷۲) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری جان کی قسم! وہ اپنی

مستی میں مدہوش (ہو رہے) تھے۔

(۵) وہ لام جو اِن مخففہ اور اِنْ نافیہ میں فرق کرنے کے لیے اِن مخففہ کے ساتھ آتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (۴۳۔۳۵) اور یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے۔

(۵) لام قسم۔ یہ کبھی اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ﴾ (۲۲۔۱۳) (بلکہ) ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے۔اور کبھی فعل ماضی پر آتا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (۱۲۔۱۱۱) ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے۔

اگر یہ لام فعل مستقبل پر آئے تو اس کے ساتھ نون تاکید ثقیلہ یا خفیفہ کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا: ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (۳۔۸۱) تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا۔اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی۔اور آیت کریمہ: ﴿وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ﴾ (۱۱۔۱۱۱) اور تمہارا پروردگار ان سب کو قیامت کے دن ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

میں لَمَّا کا لام ان کے جواب میں واقع ہوا ہے۔اور لَيُوَفِّيَنَّهُمْ کا لام قسم کا ہے۔

(۷) وہ لام جو "لَوْ" کی خبر پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ﴾ (۲۔۱۰۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔

﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ﴾ (۴۸۔۲۵) اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے تو جو ان میں کافر تھے ان کو ہم......عذاب دیتے ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (۴۔۴۶) اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور آپ کو متوجہ کرنے کے لیے...... رَاعِنَا کی جگہ اُنْظُرْنَا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

اور کبھی لَوْ کے جواب میں لام محذوف ہوتا ہے جیسا لَوْ جِئْتَنِيْ اَكْرَمْتُكَ اصل میں لَاَكْرَمْتُكَ ہے۔

(۸) وہ لام جو "مدعو" یا مدعوالیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مدعو کے لیے یہ مفتوح ہوتا ہے۔جیسے يَالَزَيْدٍ۔اور مدعوالیہ پر آئے تو مکسور ہوتا ہے۔جیسے يَالِزَيْدٍ۔

(۹) لام امر یہ ابتدا میں آئے تو مکسور ہوتا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (۲۴۔۵۸) مومنو! تمہارے غلام، لونڈیا...... تم سے اجازت لیا کریں۔﴿لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ (۴۳۔۷۷) تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔

اور اگر اس پر واو یا فا آجائے تو ساکن ہو جاتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَ لِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۹۔۶۶) اور فائدہ اٹھائیں (سو خیر) عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا ﴿وَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (۱۸۔۲۸) تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

﴿فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ (۱۰۔۵۸) تو چاہیے کہ لوگ

اس سے خوش ہوں۔ایک قرأت میں فَلْتَفْرَحُوْا ہے۔

اور جب اس پر ثم داخل ہوتو اسے ساکن اور متحرک دونوں طرح پڑھنا جائز ہوتا ہے جیسے فرمایا:﴿ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (۲۲۔۲۹) پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں پوری کریں۔اور خانہ قدیم یعنی بیت اللہ کا طواف کریں۔

(ل ء ل ء)

اَللُّؤْلُؤُ: موتی۔جمع لَاٰلِیُٔ۔قرآن پاک میں ہے:

﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا الُّؤْلُؤُ﴾ (۵۵۔۲۲) دونوں دریاؤں سے موتی...... نکلتے ہیں۔

﴿كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ﴾ (۵۲۔۲۴) جیسے چھپائے ہوئے موتی۔اور تَــلَأْلَأَ الشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے موتی کی طرح چمکنے کے ہیں مشہور محاورہ ہے۔لَا اَفْعَلُ ذٰلِكَ مَا لَأْلَاتِ الظِّبَاءُ بِاَذْنَابِهَا: جب تک کہ آہو اپنے دم ہلاتے رہیں گے میں یہ کام نہ کروں گا یعنی کبھی بھی یہ کام نہیں کروں گا۔

(لا (حرف)

لا۔یہ کبھی عدم محض کے لیے آتا ہے۔جیسے:

زَیْدٌ لَا عَالِمٌ: یعنی زید جاہل ہے اور کبھی نفی کے لیے ہوتا ہے۔اور اسم و فعل دونوں کے ساتھ ازمنہ ثلاثہ میں نفی کے معنی دیتا ہے لیکن جب زمانہ ماضی میں نفی کے لیے ہوتو یا تو اس کے بعد فعل کو ذکر ہی نہیں کیا جاتا مثلاً اگر کوئی هَلْ خَرَجْتَ کہے تو اس کے جواب میں صرف "لا" کہہ دینا کافی ہے یعنی لَا خَرَجْتُ اور اگر فعل مذکور بھی ہوتا ہے تو شاذ و نادر اور وہ بھی اس وقت (۱) جب لا اور فعل کے درمیان کوئی فاصل آجائے۔جیسے لَا رَجُلًا ضَرَبْتُ وَلَا اِمْرَاءَةً (۲) جب اس پر دوسرے فعل کا عطف ہو جیسے: لَا خَرَجْتُ وَلَا ضَرَبْتُ اور یا (۳) لا مکرر ہو جیسے:۔

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى﴾ (۷۵۔۳۱) اس ناعاقبت اندیش نے نہ تو کلام خدا کی تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی اور یا (۴) جملہ دعائیہ میں جیسے لَا كَانَ (خدا کرے ایسا نہ ہو)

لَا اَفْلَحَ (وہ کامیاب نہ ہو) وغیرہ۔

اور زمانہ مستقبل میں نفی کے متعلق فرمایا:

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ﴾ (۳۴۔۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔

اور کبھی "لا" کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے اور کلام محذوف کی نفی کے لیے آتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ﴾ (۱۰۔۶۱) اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں...... اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی بعض نے لا کو اسی معنی پر حمل کیا ہے۔

﴿لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (۷۵۔۱) ہم کو روز قیامت کی قسم۔

﴿فَلَا اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ﴾ (۷۰۔۴۰) میں شرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم کھاتا ہوں۔﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۴۔۶۵) تمہارے پروردگار کی قسم یہ مومن نہیں ہوں گے۔

﴿فَلَا اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ﴾ (۵۶۔۷۵)

ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم ❶ اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ❷ (المتقارب)

(۳۸۸) لَا وَاَبِیْكَ اِبْنَةَ الْعَامِرِیِّ

نہیں تیرے باپ کی قسم! اے عامری کی بیٹی۔

اور مروی ہے ❸ (۱۰۵) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہو گیا ہے روزہ افطار کر دیا اس کے بعد سورج نکل آیا تو آپ نے فرمایا:

لَا نَقْضِیْهِ مَا تَجَانَفْنَا الْاِثْمَ فِیْهِ اس میں بھی لا کلام محذوف کی نفی کے لیے ہے یعنی اس غلطی پر جب لوگوں نے کہا ہے کہ آپ نے گناہ کا ارتکاب لیا تو اس کی نفی کے لیے انہوں نے لا فرمایا یعنی ہم گنہگار نہیں ہیں۔ اس کے بعد نَقْضِیْهِ سے از سر نو جملہ شروع کیا ہے۔

اور کبھی یہ لا نہی کے لیے آتا ہے جیسے فرمایا: ﴿لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ﴾ (۴۹۔۱۱) کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ (اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ اور آیت:۔

﴿یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ﴾ (۷۔۲۷) اے بنی آدم! دیکھنا کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔ اور نیز ﴿لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ﴾ (۲۷۔۱۸) ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ السلام اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں...... میں بھی لا نہی کے لیے ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ (۲۔۸۳) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لا نافیہ بمعنی خبر ہے یعنی وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ﴾ (۲۔۸۴) اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں کشت و خون نہیں کرو گے۔

میں بھی لا نفی پر محمول ہے اور فرمان باری تعالیٰ: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ﴾ (۴۔۷۵) تمہیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں نہیں لڑتے۔

میں ہو سکتا ہے کہ لَا تُقَاتِلُوْنَ موضع حال میں ہو۔ اور معنی یہ ہو: مَا لَكُمْ غَیْرَ مُقَاتِلِیْنَ یعنی تمہیں کیا ہوا در آنحالیکہ تم لڑنے والے نہیں ہو۔

اور لا کے بعد اگر اسم نکرہ آجائے تو وہ مبنی برفتحہ ہوتا ہے اور لا نفی کے معنی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ﴾ (۲۔۱۹۷) نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی

---

❶ وبعضهم قال ان "لا" زائدہ فی القسم لٰكن ضعفه الرازی (۳۰/۲۱۴۔۲۱۵)۔

❷ والبیت مطلع قصیدہ لامری القیس عدتها ۴۲ بیتا وغی بابنة العامری فاطمة بنت عمه وتمامه...... لا یدعی القوم انی افر" البیت فی الحماسة فی قصیدة طویلة راجع الخزانة (۱: ۳۳۷/۴: ۴۸۹) والعینی (۱: ۹۶) و شرح المفضلیات والمعلقات لابن الانباری (۴۴) والعقد الثمین (۲۶) والسیوطی (۲۱۷) والطبرسی (۲۷/۱۳۱) والفخر (۳۰/۲۱۴) والبیت من شواهد الكشاف قال المحب: و قیل لبیت الربیعة بن جشم الیمنی۔

❸ انظر لقول عمرؓ وتاویله غریب ابی عبیدة (۳/۳۱۳) فی حدیث عمرو المسند لعمر (۲۔۷) عن زید بن وهب والنهایة (جنف) والفائق (۱/۲۱۸)

برا کام کرے۔

اور کبھی متضاد معنوں کے درمیان لا مکرر آ جاتا ہے۔اور دونوں کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے:۔

لَا زَيْدٌ بِمُقِيمٍ وَّلَا ظَاعِنٍ نہ زید مقیم ہے اور نہ ہی مسافر یعنی کبھی مقیم ہے اور کبھی سفر پر اور کبھی دو متضاد معنوں کی نفی سے ایک درمیانی حالت کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے لَيْسَ اَبْيَضَ وَلَا اَسْوَدَ سے مراد ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں کے درمیان ہے یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا رنگ ہو چنانچہ آیہ کریمہ:﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ (۲۴۔۳۵) یعنی زیتون کی نہ مشرق کی صرف منسوب ہے اور نہ مغرب کی طرف۔کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ وہ بیک وقت مشرقی بھی ہے اور غربی بھی اور بعض نے اس کا افراط اور تفریط سے محفوظ ہونا مراد لیا ہے۔

کبھی لا محض سلب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے ایک شے کی نفی کر کے دوسری کا اثبات مقصود نہیں ہوتا مثلاً لَا اِنْسَانَ کہہ کر صرف انسانیت کی نفی کا قصد کیا جائے اور عامی محاورہ لَا حِدٌّ بھی اس معنی پر محمول ہے۔

(اللّٰات)

اَللّٰات اور اَلْعُزّٰی۔دو بتوں کے نام ہیں۔

اَللّٰات اصل میں اللہ ہے۔ہاء کو حذف کر کے اس کے عوض تاء تانیث لائی گئی ہے۔اور اس تانیث سے اللہ تعالیٰ کے مرتبہ سے کم ہونے پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ کہ وہ اس کو اپنے زعم میں قرب الٰہی حاصل کرنے کا خاص ذریعہ سمجھتے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ﴾ (۳۸۔۳) اور وہ رہائی کا وقت نہیں تھا۔میں فراء کے نزدیک لَاتَ اصل میں لَا حِيْنَ ہے اور اس میں تاء زائدہ ہے جیسا کہ ثُمَّتَ اور رُبَّتَ میں لائی جاتی ہے۔بعض اہل بصرہ نے کہا ہے وَلَاتَ بمعنی لَيْسَ ہے۔ابوبکر العلاف کا قول ہے کہ یہ اصل میں لَيْسَ ہے [1] یا الف سے اور سین تاء سے تبدیل ہو کر لَاتَ بن گیا ہے۔جیسا کہ نَاسٌ میں ایک لغت نَاتٌ بھی ہے۔بعض کا قول ہے کہ لَاتٌ اصل میں لَا ہی ہے۔اس میں تاء تانیث کا اضافہ کر کے ایک ساعت یا مدت کے معنی پر تنبیہ کی گئی ہے اور پوری بات یوں ہے:

لَيْسَتِ السَّاعَةُ اَوِ الْمُدَّةُ حِيْنَ مَنَاصٍ۔

(ل ب ب)

اَللُّبُّ کے معنی عقل خالص کے ہیں جو آمیزش (یعنی ظن و وہم اور جذبات) سے پاک ہو اور عقل کو لُبٌّ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کے معنوی قوی کا خلاصہ ہوتی ہے جیسا کہ کسی چیز کے خالص حصے کو اس کا لُبّ اور لُبَاب کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لُبٌّ کے معنی پاکیزہ اور ستھری عقل کے ہیں چنانچہ ہر لُبٌّ کو عقل کہہ سکتے ہیں لیکن ہر عقل "لُبٌّ" نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام احکام کو جن کا ادراک عقول زکیہ ہی کر سکتی ہیں اُولُوا الْاَلْبَابِ کے ساتھ مختص کیا ہے۔

---

[1] ای بکسر الیاء ذکر ابن هشام فی المغنی (۱/۲۸۱) ولم ینسبه والیه ذهب ابو عبیدة وابن الطراوة و ابوبکر هذا العله الخیاط مکان العلاف لان الخیاط کان من علماء النحاة ذکره السیوطی فی البغیه ۱۹ باب المحمدیین مات سنة عشرین وثلاثمأة وثلاثماته راجع للبحث المغنی لابن هشام فانه یغنیك۔

جیسے فرمایا:

﴿وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (۲۔۲۶۹) اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں اور اس نوع کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

لَبَّ فُلَانٌ (س) کے معنی کسی کے صاحب لُبّ ہونے کے ہیں۔ایک عورت نے اپنے خاوند کولڑکے کے متعلق کہا۔

اِضْرِبْهُ كَیْ یَلُبَّ وَیَقُوْدَ الْجَیْشَ ذَا اللَّجَبِ: اسے پیٹو تاکہ عقلمند ہو جائے اور لشکر جرار کی قیادت کر سکے۔

رَجُلٌ اَلْبَبُ کے معنی عقلمند آدمی کے ہیں اسکی جمع اَلِبَّاءُ آتی ہے۔اور مَلْبُوْبٌ اسے کہتے ہیں جو عقلمندی میں مشہور ہو۔

اَلَبَّ بِالْمَكَان: کسی مقام پر قیام کرنا اس کے اصل معنی اونٹ کا کسی مقام پر اپنا لبہ یعنی سینہ رکھ دینے کے ہیں۔

تَلَبَّبَ: اس کے اصل معنی سینہ پر پٹی باندھنے کے ہیں (پھر مجازا) (احرام باندھنے اور کسی کام کے لیے مستعد ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) لَبَبْتُہٗ کے معنی کسی کے لَبَّۃٌ یعنی سینہ پر مارنے کے ہیں۔اور لَبَّۃٌ (سینہ) کو لَبَّۃٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ قوت عقلی کا مقام ہے۔محاورہ ہے۔فُلَانٌ فِیْ لَبَبٍ: فلاں آسودہ حال ہے۔

لَبَّیْكَ (کلمہ ایجاب ہے) بعض نے کہا ہے کہ یہ لَبَّ بِالْمَكَان وَاَلَبَّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ پر مقیم ہونے کے ہیں اور مؤکد طور پر فرمانبرداری کا اظہار کرنے کے لیے اسے تثنیہ بنالیا گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں لَبَّبَ ہے، اس کی آخری باء کو یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔جیسے تَظَنَّیْتُ کہ اصل میں تَظَنَّنْتُ ہے اس کا آخری نون یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے بعض کا خیال ہے یہ اِمْرَءَۃٌ لَبَّۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اولاد سے محبت کرنے والی عورت کے ہیں۔بعض کے نزدیک اس کے معنی اِخْلَاصٌ لَّكَ بَعْدَ اِخْلَاصٍ کے ہیں یعنی بار بار تمہارے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہوں اور یہ لُبُّ الطَّعَامِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی خالص کھانا کے ہیں۔اسی سے حَسَبٌ لُبَابٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی خالص حَسَبَ کے ہیں۔

(ل ب ث)

لَبِثَ بِالْمَكَان کے معنی کسی مقام پر جم کر ٹھہرنے اور مستقل قیام کرنا کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (۲۹۔۱۴) تو وہ ان میں ...... ہزار برس رہے۔

﴿فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ﴾ (۲۰۔۱۴۰) پھر تم کئی سال ٹھہرے رہے۔

﴿قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ (۲۳۔۱۱۳) خدا پوچھے گا کہ تم کتنے برس رہے۔

﴿قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ﴾ (۲۳۔۱۱۳) وہ کہیں گے کہ ہم ایک روز یا ایک روز سے بھی کم رہے تھے۔

﴿قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾ (۱۸۔۱۹) انہوں نے کہا جتنی مدت تم رہے ہو تمہارا پروردگار ہی اس کو خوب

جاتا ہے۔

﴿لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِیَّةً﴾ (۷۹۔۴۶) کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام رہے تھے۔

﴿لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً﴾ (۴۶۔۳۵) (تو خیال کریں گے کہ) گویا وہ دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر۔﴿مَالَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ﴾ (۳۴۔۱۴) تو ذلت کی تکلیف میں نہ پڑے رہتے۔

(ل ب د)

لِبْدَةٌ: تہ بہ تہ جمی ہوئی اون ج لِبَدٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَکُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا﴾ (۷۲۔۱۹) کافر ان کے گرداگرد ہجوم کر لینے کو تھے۔

یعنی تہ بہ تہ جمی ہوئی اون کی طرح ان کے گرد جمع ہو گئے۔ بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ آپ پر مجتمع ہو کر لبدہ کی طرح گرنے لگے۔ایک قرأت میں لُبْدًا بھی ہے۔یعنی آپ کے گرد ہجوم کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر چڑھ رہے تھے۔اور لُبْدٌ کی جمع اَلْبَادٌ وَّلُبُوْدٌ آتی ہے اَلْبَدْتُ السَّرْجَ: میں نے زین کے لیے نمدہ بنایا اور اَلْبَدْتُ الْفَرَسَ کے معنی ہیں: میں نے گھوڑے پر نمدہ ڈالا۔جیسے اَسْرَجْتُهٗ (میں نے اس پر زین کسی)۔ وَاَلْجَمْتُهٗ: میں نے اسے لگام دی۔اَلْبَبْتُهٗ (سینہ بند باندھا)۔

اَللِّبْدَةُ: یہ لَبَدٌ کا مفرد ہے نمدہ کے ایک ٹکڑہ کو لِبْدَةٌ کہتے ہیں۔مثل مشہور ہے [1]

هُوَ اَمْنَعُ مِنْ لِبْدَةِ الْاَسَدِ: وہ شیر کے لبدہ یعنی سینہ یا ایال سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔لَبَدَ الشَّعْرُ: بالوں کا اوپر تلے جم جانا۔

لَبِدَتِ الْاِبِلُ لَبَدًا: زیادہ گھاس کھانے کی وجہ سے اونٹ پریشان اور سینہ گرفتہ ہو گئے اور آیت کریمہ:

﴿مَالًا لُّبَدًا﴾ (۹۰۔۶) بہت سا مال۔

میں لُبَدٌ کے معنی مال کثیر کے ہیں۔مثل مشہور ہے [2]

مَالَهٗ سَبَدٌ وَّلَا لَبَدٌ: نہ اس کے پاس اون ہے نہ بال یعنی بالکل مفلس ہے نہ تھوڑا ہے نہ بہت۔لُبَدٌ ایک پرند جو زمین کے ساتھ سینہ لگا کر چپک جاتا ہے اور نسور لقمان (لقمان کے گدھوں میں سے آخری نر گدھ) کو لُبَد کہا جاتا ہے۔اَلْبَدَ الْبَعِیْرُ: اونٹ کے سرین پر گوبر کا جم جانا کبھی یہ اس کے خوبصورت اور موٹا ہونے سے کنایہ ہوتا ہے۔

اَلْبَدْتُ الْقِرْبَةَ: مشک کو لَبِیْدٌ یعنی بالوں سے بنی ہوئی چھوٹی بوری میں ڈال دینا۔

(ل ب س)

لَبِسَ الثَّوْبَ: کے معنی کپڑا پہننے کے ہیں اور اَلْبَسَهٗ کے معنی دوسرے کو پہنانا کے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّیَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا﴾ (۱۸۔۳۱) اور وہ سبز کپڑے پہنا کریں گے۔

اَللِّبَاسُ وَاللَّبُوْسُ وَاللَّبْسُ: وہ چیز جو پہنی جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ﴾ (۷۔۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانپے۔

---

[1] المثل فی حل المعاجم۔

[2] انظر للمثل ادب الکاتب (۳۹) وجمهرة العسکری (۱۹۱) والمیدانی (۲: ۲۰۰) واللسان (لبدء والحیوان (۵/۴۷۹) والنوادر لابی مسحل ۱۲۔

اورلباس کالفظ ہراس چیز پر بولا جاتا ہے۔جوانسان کے برے کاموں پر پردہ ڈال سکے۔چنانچہ میاں بیوی میں سے ہرایک کو دوسرے کالباس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو قبائح کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (۲۔۸۷) وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے اپنی بیوی کوازار کہا ہے۔ ❶

(۳۸۹)فِدًی لَّكَ مِنْ اَخِیْ ثِقَةٍ اِزَارِیْ

اے میرے قابل اعتبار بھائی! تجھ پر میری ازار یعنی بیوی قربان ہو۔

اور تمثیل وتشبیہ کے طور پر تقوی'' کو بھی لباس قرار دیا گیا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿لِبَاسُ التَّقْوٰی﴾ (۷۔۲۶) اور جو پرہیز گاری کا لباس ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ (۸۱۔۸۰)(اور ہم نے) تمہارے لیے ان کو ایک طرح کا لباس بنانا...... میں لَبُوْسٌ سے زرہیں مراد ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ﴾ (۱۶۔۱۱۲) تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب بھوک اور خوف کالباس پہنا کر ناشکری کا مزہ چکھا دیا۔

میں جوع یعنی بھوک اور خوف کی تصویر کھینچنے کے لیے اسے لباس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔جیسا کہ:

تَدَرَّعَ فُلَانٌ الْفَقْرَ اَوْلَبِسَ الْجُوْعَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اور شاعر نے کہا ہے ❷ ()

(۳۹۰)وَكِسْوَتُهُمْ مِّنْ خَيْرِ بُرْدٍ مُّنَجَّم

عمدہ دھاری دار چادریں ان کا لباس ہیں۔

بعض نے وَلَبَاسُ التَّقْوٰی پڑھا ہے جو لَبْسٌ بمعنی ستر سے مشتق ہے۔

دراصل لَبْسٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔اور معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔مثلاً لَبَسْتُ عَلَيْهِ اَمْرَهٗ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ﴾ (۶۔۹)اور جو شبہ(اب) کرتے ہیں اسی شبہ میں پھر ڈال دیتے۔

﴿وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (۲۔۴۲)تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ۔

﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (۳۔۷۱)تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ (۶۔۸۲) جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو شرک کے ظلم سے مخلوط نہیں کیا۔

فِی الْاَمْرِ لُبْسَةٌ یعنی اس معاملہ میں اشتباہ ہے۔

لَا بَسْتُ الْاَمُوْر: کسی کام کی مزاولت کرنا۔

لَا بَسْتُ فُلَانًا: کسی سے گھل مل جانا یعنی اندرون سے واقف ہونا۔لَیْسَ فِیْ فُلَانٌ مُلْبَسٌ: یعنی دروے کبروسال خوردگی نیست شاعر نے کہا ہے ❸ (الطّویل)

(۳۹۱)وَبَعْدَ الْمَشِيْبِ طُوْلُ عُمْرٍ وَمَلْبَسَا

---

❶ قاله جعدة بن عبدالسلمی وقد مر فی (ازر)

❷ لم اجده فی المراجع۔

❸ قاله امرؤ القیس وصدر الا ان بعد العدم للمرء قنوة...... والبیت فی اللسان (لبس) ودیوانه (۱۴۲) ومن الستة ۱۳۵ وامالی المرتضیٰ (۱: ۵۹۶) والسمط (۳۳۷) و الصناعتین (۴۴۳) وفی بعد الشباب بدل بعد المشیب ۱۲۔

اور بڑھاپے کے کبرسنی اور کہن سالی ہے:

(ل ب ن)

اَللَّبَنُ: دودھ۔ج۔اَلْبَانٌ۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ﴾ (۴۷۔۱۵)
اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ نہیں بدلے گا۔
﴿مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا﴾ اور اس غذا سے جو نہ فضلہ بنی ہو اور نہ خون ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں۔

لَابِنٌ: بہت دودھ والا۔لَبَنْتُهٗ: میں نے اسے دودھ پلایا۔
فَرَسٌ مَّلْبُوْنٌ: دودھ سے پرورش کیا ہوا گھوڑا۔
اَلْبَنَ فُلَانٌ: بہت سے دودھ کا مالک ہونا اور ایسے آدمی کو مُلْبِنٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْبَنَتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں: اونٹنی بہت دودھ والی ہوگئی عام اس سے کہ طبعی طور پر ہو یا تھنوں میں دودھ چھوڑ دینے کی وجہ سے ہو۔اَلْمَلْبَنُ: دودھ دوہنے کا برتن اور هُوَ اَخُوْهُ بِلِبَانِ اُمِّهٖ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کا رضاعی بھائی ہے اور اس محاورہ میں لِبَانِ اُمِّهٖ کی بجائے لَبَنُ اُمِّهٖ کہنا۔ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ اہل عرب سے مسموع نہیں ہے۔
كَمْ لُبْنُ غَنَمِكَ: یعنی تیری بکریوں میں دودھ والی کتنی ہیں [1]

اَللُّبَانُ کے معنی صدر یعنی سینہ کے ہیں اور لُبَانَةٌ کے اصل معنی تو دودھ کی ضرورت کے ہیں مگر مطلق ضرورت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اور اَللَّبِنُ جس کے معنی عمارتی اینٹ کے ہیں اور اس کا واحد لَبِنَةٌ ہے اس کا لَبَنٌ (دودھ) سے کوئی معنوی تعلق نہیں اللَّبِنُ (اینٹ سے لَبَنَهٗ (ض) يَلْبُنُهٗ کے معنی اینٹ سے مارنے کے ہیں اور اینٹ بنانے والے کو لَبَّانٌ کہا جاتا ہے۔

(ل ج ج)

اَللَّجَاجُ: (مصدر ض س) کے معنی کسی ممنوع کام کے کرنے میں بڑھتے چلے جانے اور اس پر ضد کرنے کے ہیں۔ [2] اس سے فعل لَجَّ فِي الْاَمْرِ استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۳۔۷۵) اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو تکلیفیں انہیں پہنچ رہی ہیں وہ دور کردیں تو اپنی سرکشی پر اڑے رہیں اور بھٹکتے (پھریں)
﴿بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ﴾ (۶۷۔۲۱) لیکن یہ سرکشی اور نفرت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔
اسی سے لَجَّةُ الصَّوْتِ مشہور ہے۔ [3] جس کے معنی آواز کے بار بار آنے جانے اور پلٹنے کے ہیں۔لُجَّةُ الْبَحْرِ: (بضم اللام) سمندر کی موجوں کا تلاطم (ان کا بار بار آنا اور پلٹنا)
لُجَّةُ اللَّيْلِ: رات کی تاریکی کا آنا جانا اور سخت ہونا۔اور لَجَّةٌ وَلُجَّةٌ: میں ایک لغت لُجٌّ اور لِجٌّ بھی ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ﴾ (۲۴۔۴۰) دریائے عمیق میں۔ میں لُجِّيٌّ بھی لُجَّةُ الْبَحْرِ کی طرف منسوب ہے اور

---

[1] وهو جمع لبون بمعنى ذات الدر۔
[2] في معناه استلج وفي الحديث اذا ستلج احدكم بيمينه فانه آثم له عند الله من الكفارة۔
[3] اى ارتفاعه وفي حدث عكرمة: سمعت لهم لجة بآمين (اللسان)

روایت ❶ (۱۰۶) وَضَعَ اللُّجَّ عَلٰی قَفَیَّ (اس نے میری گردن پر تلوار رکھ دی) میں لُجٌّ کے معنی آبدار تلوار کے ہیں اور قَفَیَّ اصل میں قَفَایَ ہے الف یاء سے مبدل ہو کر یاء میں ادغام ہو گیا ہے۔

اَللَّجْلَجَۃُ کے معنی ہکلا پن کے ہیں اور نیز لقمہ کو بغیر چبائے منہ میں پھرانے کو بھی لَجْلَجَۃٌ کہتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۳۹۲) يُلَجْلِجُ مُضْغَةً فِيْهَا اَنِيْضٌ

یعنی منہ میں گوشت کا نیم پختہ ٹکڑا پھرا رہا ہے۔

رَجُلٌ لَجْلَجٌ: ہکلا رک رک کر بات کرنے والا۔

اَلْحَقُّ اَبْلَجُ وَالْبَاطِلُ لَجْلَجٌ: حق واضح ہے اور باطل مشتبہ یعنی کوئی شخص باطل کو نہ تو صاف طور پر بیان کر سکتا ہے اور نہ انشراح صدر کے ساتھ اسے انجام دے سکتا ہے۔ بلکہ اس میں ہمیشہ متردد رہتا ہے۔

(ل ح د)

اَللَّحْدُ: اس گڑھے یا شگاف کو کہتے ہیں جو قبر کی ایک جانب میں بنایا جاتا ہے۔ اور لَحَدَ الْقَبْرَ وَاَلْحَدَہٗ کے معنی قبر میں لحد بنانا کے ہیں۔ لَحَدَ الْمَیِّتَ وَاَلْحَدَہٗ: میت کو لحد میں دفن کرنا اور لَحْدٌ کو مُلْحَدٌ بھی کہا جاتا ہے جو کہ اَلْحَدْتُہٗ (افعال) سے اسم ظرف ہے۔

لَحَدَ بِلِسَانِہٖ اِلٰی کَذَا: زبان سے کسی کی طرف جھکنے یعنی غلط بات کہنا کے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ﴾ (۱۶۔۱۰۳) مگر جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں۔ میں یَلْحِدُوْنَ لَحَدَ سے ہے اور ایک قرأت میں یُلْحِدُوْنَ (اَلْحَدَ سے) ہے۔

کہا جاتا ہے: اَلْحَدَ فُلَانٌ۔ فلاں حق سے پھر گیا۔

اِلْحَادٌ دو قسم پر ہے۔ ایک شرک باللہ کی طرف مائل ہونا۔ (۲) دوم شرک بالاسباب کی طرف مائل ہونا۔

اول قسم کا الحاد ایمان کے منافی ہے اور انسان کے ایمان وعقیدہ کو باطل کر دیتا ہے۔ اور دوسری قسم کا الحاد ایمان کو تو باطل نہیں کرتا لیکن اس کے عروۃ (حلقہ) کو کمزور ضرور کر دیتا ہے چنانچہ آیات:۔ ﴿وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ (۲۲۔۲۵) اور جو اس میں شرارت سے کجروی وکفر کرنا چاہے تو اس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ﴿اَلَّذِیْنَ

---

❶ فی حدیث طلحة و لفظه قدّمونی فوضعوا للجو علی قفی قال فی النهایة (۴/۲۳۴) اللج بالضم السیف بلغة طی وقیل هو اسم سمی به السیف کما قالوا الصمصامة راجع غریب ابی عبید (۴/۹) احادیث طلحة بن عبیدالله التمیمی وهو من العشرة المبشرة قتل یوم الجمل سنة ۳۶ وهو بجانب عائشة و له فی الصحیحین ۳۸ حدیثاً انظر لترجمته الاصابة (۳/۲۹۰) وتهذیب التهذیب (۵/۲۰) والحدیث فی قصه بیعة علیؓ قال طلحة "انی اخذت فادخلت فی الحش وقربوا فوضعوا اللج علی قفی فقالوا: لتبایعن اولنقتلنك فبایعت وانا مکره وراجع للحدیث ایضا الفائق (۳/۹۱) والصواب وضعوا مکان وضع کذافی جمیع المراجع ۱۲۔

❷ قاله زهیر وتمامه: اصلت فهی تحت الکشح واؤ والبیت فی اللسان (انض، لحج، صلل) ودیوانه بشرح الشنتمری ۱۶۳ ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۹۸) وتهذیب الالفاظ ۴۹۷ والبحر (۷: ۲۰۰) وفی روایة الکامل تلجلج (۱: ۱۶) وهی موافقة لروایة الستة (العقد الثمین ۸۷) وهو الصواب لانه خطاب وبعده: و غصصت بینهما فبشمت منها۔ وعندك لواردت لهادواء۔ والبیت من ابیات المعانی انظر المعانی الکبیر للقبتی (۸۴۸،۱۴۱)۔

﴿یُلْحِدُوْنَ فِیْ اَسْمَآئِهٖ﴾ (۷۔۱۸۰) جولوگ اس کے ناموں کے وصف میں کجروی اختیار کرتے ہیں۔

میں یہی دوسری قسم کا الحاد مراد ہے اور اَلْحَادِ فِیْ اَسْمَآئِهٖ یعنی صفات خداوندی میں الحاد کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ باری تعالیٰ کو ان اوصاف کے ساتھ متصف ماننا جو شان الوہیت کے منافی ہوں دوم یہ کہ صفات الٰہی کی ایسی تاویل کرنا جو اس کی شان کے زیبا نہ ہو۔ اِلْتَحَدَ فُلَانٌ اِلٰی کَذَا: وہ (راستہ ہٹ کر) ایک جانب مائل ہوگیا اور آیت کریمہ: ﴿وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾ (۱۸۔۲۷) اور اس کے سوا تم کہیں پناہ کی جگہ بھی نہیں پاؤ گے۔ میں مُلْتَحَدًا مصدر میمی بمعنی اِلْتِحَادِ بھی ہوسکتا ہے اور اسم ظرف بھی (اور اس کے معنی پناہ گاہ کے ہیں) اِلْتَحَدَ السَّهْمُ عَنِ الْهَدَفِ ۔تیر نشانے سے ایک جانب مائل ہوگیا۔ (یعنی ہٹ گیا۔

(ل ح ف)

اَلْاِلْحَافُ کے معنی الحاح یعنی چمٹ کر مانگنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ (۲۔۲۷۳) (اور شرم کے سبب) لوگوں سے منہ پھوڑ کر (اور) لپٹ کر نہیں مانگ سکتے۔

اسی سے استعارہ کے طور پر اَلْحَفَ شَارِبَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی مونچھیں جڑ سے کاٹ دینے کے ہیں اور یہ دراصل لِحَافٌ سے ہے اور لحاف کے معنی اوڑھنے کا کپڑا ہیں۔ اَلْحَفْتُهٗ فَالْتَحَفَ: میں نے اسے لحاف میں ڈھانپ دیا چنانچہ وہ اس میں لپٹ گیا۔

(ل ح ق)

لَحِقْتُهٗ وَلَحِقْتُ بِهٖ کے معنی کسی کو پالینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ﴾ (۳۔۱۶۹) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے۔ (اور شہید ہو کر) ان میں شامل نہ ہوسکے۔

﴿وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ (۶۲۔۳) اور ان میں سے دوسرے لوگوں کی طرف بھی (ان کو بھیجا ہے) جو ابھی ان مسلمانوں سے نہیں ملے محاورہ ہے: اَلْحَقْتُ بِهٖ کَذَا: میں نے اسے اس سے ملا دیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَقَهٗ بمعنی لَحِقَهٗ ہے۔ اور دعائے قنوت میں ❶ (۱۰۶) اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ میں بھی ملحق اسی معنی پر محمول ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلْحَقْتُ بِهٖ کَذَا سے ماخوذ ہے۔

لیکن عذاب کی ہولنا کی بیان کرنے کے لیے اسے مُلْحِقٌ (ملنے والا) کہہ دیا ہے۔ اور کنایۃً مُلْحَقٌ اسے بھی کہتے ہیں جسے کسی خاندان نے اپنے سے وابستہ کرلیا ہو۔ اور وہ نسباً ان سے نہ ہو۔

(ل ح م)

اَللَّحْمُ: (گوشت) کی جمع لِحَامٌ، لُحُوْمٌ اور لُحْمَانٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ﴾ (۲۔۱۷۳) اور سور کا گوشت۔ لَحُمَ الرَّجُلَ فَهُوَ لَحِیْمٌ کے معنی ہیں: وہ پر گوشت

---

❶ وقوله ای قول الداعی او قوله تعالی لان اُبیًّا کان یزید فی مصحفه وبعد القنوت سورتین عن القرآن انظر المشکل للقتبی ۲۰ وایضا فی مصحف بن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه انظر کنز العمال (۴۸/۸) ولتخریجه رقم (۶۹۲) وفی منتهی الارب ملحق بکسر الحاء والفتح احسن واصوب ۱۲۔

اور موٹا ہو گیا۔ اور موٹے چربی چڑھے ہوئے آدمی کو لَاحِمٌ شَاحِمٌ کہا جاتا ہے۔ جیسے: لَابِنٌ وَ تَامِرٌ: لَحِمَ (س) کے معنی گوشت کھانے کا حریص ہونا کے ہیں اسی سے بہت زیادہ گوشت خور باز یا بھیڑیے کو لَحِمٌ کہا جاتا ہے۔

بَیْتٌ لَحِمٌ: وہ گھر جہاں لوگوں کی اکثر غیبتیں کی جائیں۔ حدیث میں ہے ❶ (۱۰۷)

اِنَّ اللّٰهَ یَبْغَضُ قَوْمًا لَحِمِیْنَ کہ اللہ تعالیٰ بہت گوشت خور لوگوں کو ناپسند کرتا ہے یعنی جو ہر وقت لوگوں کی غیبت کرتے رہتے ہیں۔ اَلْحَمَهٗ کے معنی کسی کو گوشت کھلانے کے ہیں۔ اور اسی سے تشبیہ کے طور پر اس آدمی کو جس کی گذران شکار پر ہو۔ رَجُلٌ مُلْحَمٌ کہا جاتا ہے۔ پھر مطلقاً تشبیہا ہر کھاتے پیتے آدمی کو مُلْحَمٌ کہہ دیتے ہیں اور اسی سے "ثَوْبٌ مُلْحَمٌ" کا محاورہ ہے جس کے معنی بنے ہوئے کپڑے کے ہیں کپڑے کے بانا کو لُحْمَةٌ کہا جاتا ہے جو کہ لُحْمَةُ الْبَازِیْ سے مشتق ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ ❷ (۱۰۸)

اَلْوِلَاءُ لُحْمَةٌ كَلُحْمَةِ النَّسَبِ کہ ولاء کا رشتہ بھی نسب کے رشتہ کی طرح ہے شَجَّةٌ مُتَلَاحِمَةٌ زخم پر گوشت چڑھ گیا ہو۔ لَحَمْتُ اللَّحْمَ عَنِ الْعَظْمِ میں نے ہڈی سے گوشت کو الگ کر دیا۔ لَحَمْتُ الشَّیْءَ وَاَلْحَمْتُهٗ وَلَاحَمْتُ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ میں نے ایک چیز کو دوسری کے ساتھ اس طرح گتھی کر دیا۔ جیسے ہڈی کے ساتھ گوشت پیوست ہوتا ہے۔

اَلْلِّحَامُ: وہ چیز جس سے برتن کو ٹانکا لگایا جائے اَلْحَمْتُ فُلَانًا کسی کو قتل کر کے اسکا گوشت درندوں کو کھلا دیا۔

اَلْحَمْتُ الطَّائِرَ: میں نے پرند کا گوشت کھلایا۔

اَلْحَمْتُكَ فُلَانًا: میں نے فلاں کی غیبت کا موقع دیا۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے غیبت و بد گوئی کو اکل اللحم یعنی گوشت کھانے سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا﴾ (۴۹۔۱۲) کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔

فُلَانٌ لَحِیْمٌ فلاں کو قتل کر دیا گیا۔ گویا اسے درندوں کی خوراک بنا دیا گیا۔ اَلْمَلْحَمَةُ معرکہ مَلَاحِمٌ۔

(ل ح ن)

اَللَّحْنُ (ف) کے معنی ہیں بات کو اس کے مستعمل طریقہ اور اسلوب سے پھیر دینا۔ اگر یہ لفظ کے اعراب یا ہیئت تبدیل کر دینے سے ہو جو کہ لَحْنٌ کا عام مفہوم ہے تو یہ قابل مذمت ہے اور اگر تصریح چھوڑ کر بطور تعریض کلام کرنے سے ہو تو اکثر ادباء کے نزدیک فن بلاغت کے لحاظ سے یہ مستحسن اور کلام کی خوبیوں میں شمار ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے ❸ (الخفیف)

(۳۹۳) وَخَیْرُ الْحَدِیْثِ مَاكَانَ لَحْنًا

---

❶ انظر مجمع البحار (۳/۲٤۸) والفائق (۲/۲۲۲) باختلاف یسیر فی اللفظ وكذا فسره سفیان الثوری۔

❷ حدیث مرفوع اخرجه ابویعلی وابن حبان عن ابن عمر انظر الذرقانی علی الموطا (۹٦/٤) وكنز العمال (ج ۱۰ رقم ٥٤۳) ورقم (۱۵۵۷) و (۱٦۲۲) عن علی وعبد الله بن ابی اوفی والفتح الكبیر للنبهانی ۳/۳۰۸

❸ قاله مالك بن اسماء بن خارجه (۷۵٦۔۷۵۸ الشعراء) شاعر اسلامی غزل وصدره منطق رائع ولتحن احیاناد...... ←

بہتر کلام وہ ہے جو تعریض میں ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (۴۷۔۳۰) اور تم انہیں ان کے انداز گفتگو سے پہچان لوگے۔ میں بھی یہی مراد ہے۔ اور اسی سے ذہین آدمی جو کلام کے صحیح مقصد کو خوب سمجھ لیتا ہو۔ لَحِنٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ ❶(۱۰۹)

لَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ: شاید تم میں سے بعض آدمی دوسرے کی نسبت دلیل پر زیادہ قدرت رکھتے ہوں تو اَلْحَنُ کے معنی زبان آور اور فصیح شخص کے ہیں جو اپنے مافی الضمیر کو وضاحت اور استدلال سے بیان کرسکتا ہو۔

(ل د د)

اَلْاَلَدُّ: سخت جھگڑالو آدمی کو کہتے ہیں جو کسی کی بات مانتا ہی نہ ہو۔ اسی کی جمع لُدٌّ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ (۲۔۲۰۴) حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔

﴿وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ (۱۹۔۹۷) تاکہ اس کے ذریعہ سخت جھگڑالو قوم کو بدانجام سے آگاہ کرو۔ اصل میں اَلَدَّ شدید اللدد یعنی اس آدمی کو کہتے ہیں۔ جس کی گردن کا پہلو بڑا سخت ہو۔ اور مجازاً اس شخص پر بولا جاتا ہے جسے اس کے ارادہ سے پھیرا نہ جاسکے۔

فُلَانٌ يَتَلَدَّدُ: فلاں گردن موڑ کر رخ پھیرتا ہے۔

اَللَّدُوْدُ: وہ دوا جو منہ کی جانب سے پلائی جائے۔

❷ اِلْتَدَدْتُ: لدود لینا۔

(ل د ن)

لَدُنْ: یہ عِنْدَ سے اخص ہے کیونکہ یہ کسی فعل کی انتہاء کے آغاز پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے اَقَمْتُ عِنْدَهٗ مِنْ لَّدُنْ طُلُوْعِ الشَّمْسِ اِلٰى غُرُوْبِهَا: آغاز طلوع شمس سے غروب آفتاب تک اس کے پاس ٹھہرا رہا۔ تو یہاں لَدُنْ کا لفظ ٹھہرنے کے آغاز کو بیان کرتا ہے اور کبھی عِنْدَ کی بجائے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ حکایت ہے اَصَبْتُ عِنْدَهٗ مَالًا وَلَدُنْهُ مَالًا: میں نے اس کے پاس مال پایا بعض نے کہا ہے کہ لَدُنْ عِنْدَ سے ابلغ اور اخص ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَا تُصٰحِبْنِيْ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا﴾ (۱۸۔۷۶) تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیے گا کہ آپ کو (مجھے ساتھ نہ رکھنے کے بارے میں) میری طرف سے عذر حاصل ہوگا۔

← وفي مصارع العشاق (٢٦٣) انه قال في امرأته حسينة بنت ابي حندب الانصاري انظر البيت السمط ١٦ والمشاطرة للاستاذ الميمني واماني المرتضى (١/١٤، ١٥) وفي روايتهما جميعا صائب بدل رائع والبيت في ادب الكتاب للصولي (١٣١) والعقد الفريد (٢/٤٨٠) والمعجم للمرزباني (٢٦٦) والبيان للجاحظ ١٤٧ والعيون (٢/١٦١) والخزانة (٢/٤٨٥) والعمدة (١/٣٠٨) وفيه صنعة الاشارة اللحن ومعناه في الآية والبيت الشاهد كلام يعرفه المخاطب بفحواه وان كان على غير وجهه ويسمى اليوم المحا جاة لدلالة الحجا عليها كذا افسر ابن دريد البيت لكن قرينه صائب يا بى عن ذالك الا انه يستلذمن الحواري وايضا راجع هوامش مجالس ثعلب (٥٣١)

❶ قال الحافظ في الكاف اصلحه في الصحيحين قال الذكر ١/٢٠٣) اخرجه مالك والشافعي وابن ابي شيبة والصحيحان عن ام سلمة والحاكم واحمد من رواية اسامة بن زيد وابن حبان في زوائده رقم ١١٩ عن ابي هريرة والحديث في الفائق (٢/٥١، ٢٢١) وغريب القبتي ٧٥

❷ وفي الحديث خير ماتدا ويتم به اللدو دالفائق (٢/٢٢٣)۔

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ (۱۸۔۱۰) اے ہمارے پروردگار ہم پر اپنے ہاں سے رحمت نازل فرما:

﴿فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا﴾ (۱۹۔۵) تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما:

﴿وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ (۱۷۔۸۰) اور اپنے ہاں سے زور وقوت کو میرا مددگار بنائیو۔

﴿وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (۱۸۔۶۵) ہم نے اسے اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔

اور لَدُنْ میں لَدْ، لَدُ، لَدٰی تین لغات اور بھی ہیں۔

اَللَّدِنُ: لچکدار نرم۔

(ل د ی)

لَدٰی یہ تقریباً لَدُن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ﴾ (۱۲۔۲۵) اور دونوں کو دروازے کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

(ل ز ب)

اَللَّازِبُ: اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر شدت سے ثبت ہو جائے اور چمٹ جائے قرآن پاک میں ہے:

﴿مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ﴾ (۳۷۔۱۱) چپکتے گارے سے (بنایا) اور کبھی لَازِبٌ بمعنی واجب بھی آتا ہے جیسا کہ کسی چیز کے لازم اور ضروری ہونے کو بیان کرنے کے لیے ضربة لازب کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اَللَّزْبَةُ: سخت قحط سالی اس کی جمع لَذَبَاتٌ آتی ہے۔

(ل ز م)

لَزِمَهٗ يَلْزَمُهٗ لَزُوْمًا کے معنی کسی چیز کا عرصہ دراز تک ایک جگہ ٹھہرے رہنا کے ہیں۔اور اِلْزَامٌ (افعال) دو قسم پر ہے ایک تو اِلْزَامٌ بِالتَّسْخِيْرِ ہے اسکی نسبت اللہ تعالیٰ اور انسان دونوں کی طرف ہو سکتی ہے اور دوسرے اِلْزَامٌ بِالْحُكْمِ وَالْاَمْرِ یعنی کسی چیز کا حکما واجب کر دینا جیسے فرمایا:

﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾ (۱۱۔۲۸) تو کیا ہم اس کے لیے تمہیں مجبور کر سکتے ہیں۔ اور تم ہو کہ اس سے ناخوش ہو رہے ہو۔ ﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ (۴۸۔۲۶) اور ان کو پرہیز گاری کی بات پر قائم رکھا۔

﴿فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا﴾ (۲۵۔۷۷) سو وہ (سزا) تمہارے لیے لازم ہوگی۔

﴿وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ (۲۰۔۱۲۹) اور اگر ایک بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور اجزائے اعمال کے لیے میعاد مقرر نہ ہو چکی ہوتی۔تو عذاب (تم سے) چمٹ جاتا۔

(ل س ن)

اَللِّسَانُ: زبان اور قوت گویائی کو کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ﴾ (۲۰۔۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

یہاں لِسَانٌ کے معنی قوت گویائی کے ہیں کیونکہ وہ بندش ان کی زبان پر نہیں تھی بلکہ قوت گویائی سے عقدہ کشائی کا سوال تھا۔محاورہ ہے: لِكُلِّ قَوْمٍ لِسَانٌ وَلِسْنٌ (بکسر اللام) یعنی ہر قوم را لغت ولہجہ جدا است۔قرآن

پاک میں ہے:
﴿ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ﴾ (۱۹۔۹۷)(اے پیغمبر) ہم نے یہ قرآن پاک تمہاری زبان میں آسان نازل کیا۔
﴿بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ﴾ (۲۶۔۱۹۵) فصیح عربی زبان میں۔اور آیت کریمہ:
﴿وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ﴾ (۳۰۔۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔
میں السنہ سے اصوات اور لہجوں کا اختلاف مراد ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح دیکھنے میں ایک شخص کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی اسی طرح قوت سامعہ ایک لہجہ کو دوسرے سے الگ کر لیتی ہے۔

(ل ط ف)

اَللَّطِیْفُ: جب یہ کسی جسم کی صفت واقع ہو تو یہ جَثْلٌ کی ضد ہوتا ہے جس کے معنی بھاری اور ثقیل کے ہیں کہتے ہیں شَعْرٌ جَثْلٌ ...... (یعنی زیادہ اور بھاری بال) اور کبھی لَطَافَةٌ یا لُطْفٌ سے حرکت خفیہ اور دقیق امور کا سرانجام دینا مراد ہوتا ہے اور لَطَائِفُ سے وہ باتیں مراد لی جاتی ہیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے لَطِیْفٌ ہونے کے معنی یا تو یہ ہیں کہ وہ انسانی حواس کے ادراک سے مافوق اور بالاتر ہے اور یا اسے اس لیے لطیف کہا جاتا ہے کہ وہ دقیق امور تک سے واقف ہے اور یہ کہ وہ انسانوں کی ہدایت دینے میں نہایت نرم انداز اختیار کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:﴿اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ﴾ (۴۲۔۱۹) خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ﴾ (۱۲۔۱۰۰) بے شک میرا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے حسن تدبیر سے کرتا ہے۔ میں لطیف سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کام کو حسن تدبیر سے سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے انہیں اس مرتبہ تک پہنچا دیا۔ اور کبھی ان تحائف کو بھی لطف کہا جاتا ہے جو دوستی بڑھانے کے لیے ایک دوسرے کو دیئے جاتے ہیں۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا[1] (۱۱۰)
تَهَادُوْا تَحَابُّوْا کہ ایک دوسرے کو تحفے بھیجا کرو۔ تو تمہاری آپس میں محبت بڑھ جائے گی۔
اَلْطَفَ فُلَانٌ اَخَاهُ بِكَذَا: فلاں نے اپنے بھائی کے ساتھ کسی چیز کے ذریعہ حسن سلوک کیا۔[2]

(ل ظ ی)

لَظِیَتِ النَّارُ وَتَلَظَّتْ کے معنی آگ بھڑک اٹھنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿نَارًا تَلَظّٰی﴾ (۹۲۔۱۴) بھڑکتی آگ سے۔
اور لَظٰی آگ کے شعلہ کو کہا جاتا ہے۔ جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو۔ یہ جہنم کا علم اور غیر منصرف ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اِنَّهَا لَظٰی﴾ (۷۰۔۱۵) وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

---

[1] الحدیث اخرجه البخاری فی الادب المفرد والبیهقی من حدیث ابی هریرة بسند جید انظر تخریج الاحیاء (۲/۴۰) وکنز العمال (ج ٦ رقم ٤٧٦، ٤٧٧)۔
[2] وایضاً الآیات (٦۔١٠٤ و ١٨۔١٩)

(ل ع ب)

اَللَّعْبُ: اس مادہ کی اصل لُعَابٌ ہے جس کے معنی منہ سے بہنے والی رال کے ہیں اور لَعَبَ (ف) یَلْعَبُ لَعْبًا کے معنی لعاب بہنے کے ہیں۔لیکن لَعِبَ (س) فُلَانٌ یَلْعَبُ لَعِبًا کے معنی بغیر صحیح مقصد کے کوئی کام کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ﴾ (۲۹۔۶۴) اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے۔

﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا﴾ (۶۔۷۰) اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے۔ان سے کچھ کام نہ رکھو۔

﴿اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ (۷۔۹۸) کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آنازل ہو، اور وہ کھیل رہے ہوں۔

﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ﴾ ((۲۱۔۵۵) وہ بولے کیا تم ہمارے پاس واقعی حق لائے ہو یا ہم سے کھیل کی باتیں کرتے ہو۔﴿وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ﴾ (۲۱۔۱۶) اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو مخلوقات ان دونوں کے درمیان ہیں اس کو لہو ولعب کرتے ہوئے پیدا نہیں کیا اَللَّعْبَةُ: (صیغہ مَرَّۃ) ایک مرتبہ کھیلنا لِعْبَةٌ (بکسر اللام) کھیلنے کی حالت رَجُلٌ تِلْعَابَةٌ کے معنی ہیں ذُوْ تَلَعُّبٍ یعنی بہت بڑا کھلاڑی بے کار کام کرنے والا۔ لُعْبَةٌ۔گڑیا، (شطرنج چوسر وغیرہ جن کے ساتھ کھیلا جاتا ہے) اَلْمَلْعَبُ: (ظرف) کھیلنے کی جگہ یا میدان۔

لُعَابُ النَّحْلِ: شہد۔لُعَابُ الشَّمْسِ: وہ چیز جو دھوپ میں مکڑی کے جالے کی طرح دکھائی دیتی ہے مُلَاعِبُ ظِلِّهٖ: ایک جانور (جس کی گردن چھوٹی اور بازو بڑے ہوتے ہیں۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا پیٹ سفید ہوتا ہے) بیٹھے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سائے سے کھیل رہا ہے۔

(لَعَلَّ)

لَعَلَّ: (حرف) یہ طمع اور اشفاق (ڈرتے ہوئے چاہنے) کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔بعض مفسرین کا قول ہے کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ اپنے لیے استعمال کرے تو اس کے معنی میں قطعیت آجاتی ہے.......... اس بنا پر بہت سی آیات میں لفظ کی اس کی تفسیر کی گئی ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ کے حق میں توقع اور اندیشے کے معنی لینا صحیح نہیں ہیں۔اور گو لَعَلَّ کے معنی توقع اور امید کے ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا تعلق مخاطب سے ہوتا ہے اور کبھی متکلم سے اور کبھی ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص سے ہوتا ہے۔لہٰذا آیت کریمہ:

﴿لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ﴾ (۲۶۔۴۰) تاکہ ہم ان جادوگروں کے پیرو ہوجائیں۔میں توقع کا تعلق قوم فرعون سے ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (۲۰۔۴۴) شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے۔ میں توقع کا تعلق موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ساتھ ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ اس امید پر فرعون سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا کہ ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے اور آیت کریمہ:

﴿فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ﴾

(۱۱۔۱۲) شائد تم کچھ چیز وحی میں سے جو تمہارے پاس آتی ہے چھوڑ دو۔ میں لعل کے معنی یہ ہیں کہ لوگ تمہارے متعلق ایسا گمان کرتے ہیں۔اسی طرح آیت کریمہ:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ﴾ (۱۸۔۶) تو شاید تم اپنے تئیں ہلاک کردو گے۔

میں بھی لعل کا تعلق لوگوں سے ہے یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۶۲۔۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو یاد کرو مگر دل میں یہ امید رکھ کر اللہ کا ذکر کرو کہ اس سے فلاح وکامرانی حاصل ہوگی جیسا کہ دوسری جگہ مومنین کے متعلق فرمایا:

﴿وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُونَ عَذَابَهٗ﴾ (۱۷۔۹۷) کہ وہ اس کی رحمت کے امید وار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

(ل ع ن)

اَللَّعْنُ: کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا اور دھتکار دینا۔خدا کی طرف سے کسی شخص پر لعنت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں تو اللہ کی رحمت اور توفیق سے اثر پذیر ہونے سے محروم ہو جائے اور آخرت میں عقوبت کا مستحق قرار پائے اور انسان کی طرف سے کسی پر لعنت بھیجنے کے معنی بد دعا کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِينَ﴾ (۱۱۔۱۸) سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

﴿وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ﴾ (۲۴۔۷) اور پانچویں (بار) یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (۵۔۷۸) جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر لعنت کی گئی۔

﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴾ (۲۔۱۵۹) اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔[1]

اَللُّعْنَةُ: (بسکون العین) یہ اِلْتَعَنَ سے ہے یعنی اپنے آپ پر لعنت کرنے والا۔ یا جس پر بہت لعنتیں بھیجی جائیں۔مگر اَللُّعَنَةُ (بفتح العین) لَعَنَ (متعدی) سے ہے یعنی دوسروں پر بہت لعنت کرنے والا۔

اَلتَّلَاعُنُ وَالْمُلَاعَنَةُ: لوگوں کا باہم اپنے آپ یا دوسروں پر لعنت بھیجنا۔

(ل غ ب)

اَللُّغُوْبُ کے معنی بہت زیادہ درماندہ ہونے اور تھک جانے کے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے: اَتَانَا سَاغِبًا لَاغِبًا: وہ ہمارے پاس بھوکا اور تھکا ہارا ہو کر پہنچا۔قرآن پاک میں ہے:[2]

﴿وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ (۵۰۔۳۸) اور ہم کو ذرا بھی تکان محسوس نہیں ہوئی۔

سَهْمٌ لَغِبٌ۔ وہ تیر جس کے پر کمزور ہوں۔

رَجُلٌ لَغِبٌ: کاہل اور کمزور رائے آدمی۔

ایک اعرابی کا قول ہے: فُلَانٌ لَغُوْبٌ اَحْمَقُ جَاءَتْهُ كِتَابِيْ فَاحْتَقَرَهٗ کہ فلاں شخص بڑا بے وقوف

---

[1] وایضا راجع الآیات (۳۳۔۶۱) (۱۵۔۳۵) ۲۔۸۸)

[2] وایضاً لاحظ الآیة (۳۵۔۳۵)

اور احمق ہے کہ اس نے میرے خط کو حقیر سمجھا یہاں لَغُوْبٌ کے معنی کمزور رائے آدمی کے ہیں۔اس پر اعرابی سے کسی نے سوال کیا کہ کتاب تو مذکر ہے پھر جَاءَتْہُ کیوں کہا تو اس نے جواب دیا اَلَیْسَ الْکِتَابُ بِصَحِیْفَۃٍ کہ کیا کتاب بھی ایک صحیفہ نہیں ہے (اور صحیفہ مونث ہے)

(ل غ و)

اَللَّغْوُ (ن) کے معنی بے معنی بات کے ہے جو کسی گنتی شمار میں نہ ہو یعنی جو سوچ سمجھ کر نہ کی جائے۔گویا وہ پرندوں کی آواز کی طرح منہ سے نکال دی جائے ابوعبیدہؒ کا قول ہے کہ اس میں ایک لغت لَغَا بھی ہے۔ جیسے عَیْبٌ وَعَابٌ شاعر نے کہا ❶ (الرجز)

(۳۹۴) عَنِ اللَّغَاوَ رَفَثِ التَّکَلُّمِ

جو بے ہودہ اور فحش گفتگو سے خاموش ہیں۔

اس کا فعل لَغِیْتَ تَلْغٰی یعنی سَمِعَ سے ہے۔اور کبھی ہر قبیح بات کو لغو کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا وَّلَا کِذَّابًا﴾ (۷۸-۳۵) وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ اور خرافات ﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ (۲۳-۳) اور جو بیہودہ باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ﴿وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْہُ﴾ (۲۸-۵۵) اور جب بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ ﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا﴾ (۵۶-۲۵) وہاں نہ بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ الزام تراشی۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا کِرَامًا﴾ (۲۵-۷۲) اور جب ان کو بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گزرتے ہیں۔کہ معنی یہ ہیں کہ وہ فحش بات کبھی صراحت سے نہیں کہتے۔ بلکہ ہمیشہ کنایہ سے کام لیتے ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ اگر کہیں اتفاق سے وہ ایسی مجلس میں چلے جاتے ہیں جہاں بے ہودہ باتیں ہو رہی ہوتی ہیں تو اس سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

پس لغو ہر اس بات کو کہا جاتا ہے جو کسی شمار قطار میں نہ ہو۔ اور اسی سے لَغْوٌ فِی الْاِیْمَانِ ہے یعنی وہ قسم جو یونہی بلا ارادہ زبان سے نکل جائے ❷ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ﴾ (۲-۲۲۵) خدا تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

اور شاعر نے کہا ہے ❸ (البسیط)

---

❷ وفی اللسان قاله رؤبة ونسبه ابن بری للعجاج وقبله: ورب اسراب حجیج کظم والشطر فی القرطبی (۲/۴۰۷) وفی مجازالقرآن (۱: ۷۰) وفی دیوانه ۵۹ وابن ولاد (۱۱۲) والطبرسی (۲: ۲۳۳) والاقتضاب (۴۶۱) واللسان والتاج (رفث لغو) وشواهد الکشاف (۲۹۸) وابو علی الفارسی فی الحجة (۲: ۲۶۲) وفی الانصاف ۱۲۲ وصدره: استغفرالرحمن ذاالتعظیم ۱۲۔

❷ کذا فسریه ابن عباس وعکرمة والشعبی وروی مرفوعا عن عائشةؓ قال ابوهریرة والحسن ومجاهد وآخرون اللغو فی الیمین ان یحلف زاعما انه صادق ولا یکون کذالك وروی مرفوعا عن ابن عباس انه لا یمین فی غضب (الطبری ج۲ ص ۴۰۴۔ ۴۱۴)

❸ قاله الفرزق روی ان الحسن سئل عن لغو الیمین فقال للفرزدق وعنی اجب وعنك یا ابا سعید وانشد والبیت من شواهد لکشاف ۱۱ والبحر (۲: ۱۷۹) ومحاضرات المؤلف (۲: ۴۸۱)۔

﴿۳۹۵﴾وَلَسْتَ بِمَاْ خُوْذٍ بِلَغْوٍ تَقُوْلُهٗ
اِذَا لَمْ تُعَمِّدْ عَاقِدَاتِ الْعَزَائِمِ

لغوقسم کھانے پر تم سے مواخذہ نہیں ہوگا بشرطیکہ قصداً عزمِ قلب کے ساتھ قسم نہ کھائی جائے۔اور آیت کریمہ:

﴿لَّا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً﴾ (۸۸۔۱۱)وہاں کسی طرح کی بکواس نہیں سنیں گے۔ میں لَاغِيَةٌ بمعنی لغو کے ہے اور یہ (اسم فاعل) کلام کی صفت واقع ہوا ہے جیسا کہ کَاذِبَةٌ وغیرہ۔

اورخوبہا میں لَغْوٌ اونٹ کے ان بچوں کو کہا جاتا ہے جو گنتی میں شمار نہ کیے جائیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1]

(الوافر)

(۳۹۶)کَمَا اَلْغَيْتَ فِي الدِّيَةِ الْحُوَارْ

جیسا کہ اونٹ کے چھوٹے بچے کو خوبہا میں نا قابل شمار سمجھا جاتا ہے۔

لَغِيَ بِكَذَا کے معنی چڑیا کے چہچہانے کی طرح کسی چیز کا بار بار تذکرہ کرنے کے ہوتے ہیں۔اور اسی سے ہر گروہ کی زبان اور بولی جس کے ذریعے وہ بات کرتا ہے لُغَةٌ کہلاتی ہے۔

(ل ف ف)

لَفَفْتُ الشَّیْءَ لَفًّا کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور مدغم کر دینے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا﴾ (۱۷۔۱۰۴)اور ہم تم سب کو جمع کر کے لے آئیں گے۔اور محاورہ ہے: جَاءُوْا وَمَنْ لَفَّ لَفَّهُمْ: یعنی وہ اور ان کے سب متعلقین آئے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَجَنّٰتٍ اَلْفَافًا﴾ (۷۸۔۱۶)اور گھنے گھنے باغ میں الفاف سے ایک دوسرے سے متصل گھنے اور گنجان درختوں والے باغیچے مراد ہیں۔

اِلْتَفَّ ایک چیز کا دوسری سے لپٹ جانا قرآن پاک میں ہے:

اَلْاَلَفُّ: وہ آدمی جس کی رانیں موٹاپے کی وجہ سے باہم ملی ہوئی ہوں اور بہت زیادہ بھاری جسم اور سست آدمی کو بھی اَلَفُّ کہا جاتا ہے۔لَفَّ رَأْسَهٗ: اس نے اپنے سر کو (کپڑوں...... میں) چھپالیا۔

اَللَّفِيْفُ: مختلف قبائل کے ایک جگہ جمع ہونے والے لوگ اور خلیل نے ہر اس کلمے کا نام لفیف رکھا ہے جس کے حروف اصلی میں سے دو حرف علت ہوں۔

(ل ف ت)

لَفَتَهٗ عَنْ كَذَا: کسی چیز سے پھیر دینا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا﴾ (۱۰۔۷۸) کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ (جس راہ پر ہم اپنے باپ دادا کو پاتے رہے ہیں اس سے ہم کو پھیر دو۔

اور اسی سے اِلْتَفَتَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی رخ موڑنے کے ہیں۔اِمْرَءَةٌ لَفُوْتٌ وہ عورت جو اپنے پہلے خاوند کے بچہ سے محبت کرے اور دوسرے خاوند کی طرف توجہ نہ دے۔

اَللَّفِيْتَةُ: ایک قسم کا گاڑھا حریرہ۔

---

[1] قاله ذوالرمة يهجو هشام بن قيس المرئي (احد بني امرئ القيس بن زيد مناة) وصدره: ويهلك وسطها المرئي لغوا...... قال في اللسان (لغو) وهذا البيت عمل له جرير وقد احس به الفرزدق لما سمعه والبيت في الامالي (۲: ۱۳۷)

(ل ف ح)

لَفَحَتْهُ الشَّمْسُ وَالسَّمُوْمُ کے معنی ہیں: سورج یا بادسموم نے اپنی لپٹ سے جھلسا دیا۔قرآن پاک میں ہے:﴿تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾ (۲۳۔۱۰۴) آگ ان کے چہروں کو جھلس دے گی۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر لَفَحْتُهٗ بِالسَّيْفِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔جس کے معنی تلوار سے سر قلم کر دینا ہیں۔

(ل ف ظ)

اَللَّفْظُ بِالْكَلَامِ کے معنی کلام کرنا کے ہیں اور یہ لَفْظُ الشَّیْءِ مِنَ الْفَمِ یا لَفْظُ الرَّحٰی بِالدَّقِيْقِ کے محاورہ سے مستعار ہے۔اسی سے مرغ کو لَافِظَةٌ کہا جاتا ہے ❶ کیونکہ وہ مرغی کے لیے چوگا ڈالتا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (۵۰۔۱۸) کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔

(ل ف ی)

اَلْفَيْتُ کے معنی وَجَدْتُ یعنی کسی چیز کو پالینا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا﴾ (۲۔۱۷۰) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔

﴿وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ﴾ (۱۲۔۲۵) اور دونوں نے دروازے کے پاس اس کے شوہر کو پایا۔

(ل ق ب)

اَللَّقَبُ: اس نام کو کہتے ہیں جو اصلی نام کے علاوہ ہو...... لقب دینے میں معنی کی رعایت کی جاتی ہے بخلاف اعلام کے کہ ان میں معنوی رعایت نہیں ہوتی اس بنا پر شاعر نے کہا ہے ❷ ()

(۳۹۷) وَقَلَّمَا اَبْصَرَتْ عَلَيْنَاكَ ذَالَقَبٍ
اِلَّا وَمَعْنَاهُ اِنْ فَتَّشْتَ فِیْ لَقَبِهٖ

تم نے کسی صاحب لقب کو نہیں دیکھا ہوگا۔مگر ذرا تلاش کرنے پر اس کے اوصاف اس کے لقب میں مل سکتے ہیں۔

لقب دو قسم پر ہے۔ایک لقب تشریفی جیسا کہ سلاطین کے القاب ہوتے ہیں اور دوسرا لقب تحقیری چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْاَلْقَابِ﴾ (۴۹۔۱۱) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ میں اس دوسری قسم کے القاب سے منع کیا گیا ہے۔کیونکہ ان سے اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔

(ل ق ح)

لَقِحَتِ النَّاقَةُ تَلْقَحُ ۔لَقْحًا وَلَقَاحًا کے معنی اونٹنی کے حاملہ ہونے کے ہیں۔اسی طرح درخت کے پھلدار ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اَللَّقَحُ

---

❶ وفی المثل "اسمح من لافظة" الامالی (۱/۲۴۴) والسمط (۵۵۲) وتهذیب الالفاظ (۲۰۳) والعسکری (۴۴، ۱/۱۷) لکن بلفظ اسخیٰ وفی الثمار (۳۷۴) والمستقصی والبخلاء (۱۳۵) لاقطة بالقاف وقیل اللافظة العنز لانها تلفظ مافی فیها من العلف وقت الحلب والحیوان (۱/۲۲۰، ۷/۱۰) ولا نصیح الالحمله علی الحازة البعیدة راجع الحیوان (۲/۱۴۹۔۱۵۱)

❷ والبیت فی محاضرات الادباء (۳/۳۳۷) بغیر عزو وفی روایة من رجل بدل ذالقب وفی اسم اولقب" بدل ان فتشت فی لقبه۔

اَلْـفَحْلُ النَّاقَةَ وَالرِّيْحُ السَّحَابَ کے معنی سانڈھ کے اونٹنی کو یا ہوا کے بادل کو باردار کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ اَرْسَلْنَا الرِّيْحَ لَوَاقِحَ﴾ (۱۵۔۲۲) اور ہم ہی ہوائیں چلاتے ہیں۔ (جو بادلوں کے پانی سے) بھری ہوئی ہوتی ہیں۔
اَلْـقَـحَ فُلَانُ الـنَّـخْلَ وَلَقَّحَهَا: کھجور کو پیوند کرنا۔ اِسْتَـلْـقَـحَتِ النَّخْلَةُ: کھجور پیوند کے لائق ہوگئی اور حاملہ اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دے کر حَرْبٌ لَاقِحٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سخت لڑائی کے ہیں۔ جو اپنے ساتھ بہت مصائب لائے۔ لِقْحَةٌ۔ شیر دار اونٹنی۔ ج لِقَاحٌ وَلُقَّحٌ۔ اَلْمَلَاقِيْحُ: حاملہ اونٹنیاں۔
نیز بچوں کو بھی ملاقیح کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے (۱) (۱۱۱) نُهِـيَ عَـنْ بيع المـلاقيح والمضامين۔ کہ آنحضرت ﷺ نے ملاقیح ومضامین کی بیع سے منع فرمایا۔ تو ملاقیح کے معنی جنین کے ہیں اور مضامین نر کے مادہ منویہ کو کہتے ہیں۔ جو تا حال اس کی پشت میں محفوظ ہو۔
اَللِّقَاحُ: نر جانور کا مادہ منویہ۔ نیز لَقَاحٌ اس آزاد قبیلے کو بھی کہتے ہیں جو کسی بادشاہ کے زیر حکومت نہ ہو گویا وہ حامل ہے محمول نہیں ہے۔

(ل ق ف)

لَقِفْتُ الشَّيْءَ اَلْقَفُهُ وَتَلَقَّفْتُهُ کے معنی کسی چیز کو ہوشیاری اور خداقت سے لینا کے ہیں اور یہ منہ یا ہاتھ دونوں سے لینے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَـاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ﴾ (۷۔۱۱۷) وہ فوراً جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو (ایک ایک کر کے) نگلنے لگا۔

(ل ق م)

﴿لُقْمَانَ﴾ (۳۱۔۱۲) مشہور حکیم کا نام ہے ہو سکتا ہے کہ یہ بھی لَقِـمْـتُ الطَّعَامَ اَلْقَمُهُ وَتَلَقَّمْتُهُ سے مشتق ہو جس کے معنی کسی چیز کو ہڑپ کر جانا کے ہیں۔ رَجُلٌ تِلْقَامٌ: بڑے بڑے لقمے نگلنے والا۔ اَللَّقِيْمُ۔ لوالا اور راستہ کی ایک جانب کو لَقَمٌ کہا جاتا ہے۔

(ل ق ی)

لَـقِيَـهُ (س) يَـلْقَاهُ لِقَاءً کے معنی کسی کے سامنے آنے اور اسے پالینے کے ہیں اور ان دونوں معنی میں سے ہر ایک پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے اور کسی چیز کا حس اور بصیرت سے ادراک کر لینے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْـمَـوْتَ مِـنْ قَبْـلِ اَنْ تَلْقَوْهُ﴾ (۳۔۱۴۳) اور تم موت (شہادت) آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔
﴿لَـقَـدْ لَـقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ (۱۸۔۶۲) اس سفر سے ہم کو بہت تکان ہوگئی ہے۔
اور ملاقات الٰہی سے مراد قیامت کا بپا ہونا اور اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جانا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ اعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ (۲۔۲۲۳) اور جان رکھو کہ ایک دن تمہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ ﴿قَالَ الَّـذِيْـنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۴۹) جو

(۱) رواه الطبراني عن ابن عباس رضي الله عنه والحديث في الفائق (۲/۲۲۸) وغريب ابي عبيد (۱/۲۰۷) وايضاً الفتح الكبير للنبهاني (۳/۲۷۹)

لوگ یقین رکھتے تھے کہ ان کو خدا کے روبرو حاضر ہونا ہے وہ کہنے لگے۔ اور لِـقَـاءٌ (مصدر) ملاقات کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَائَنَا﴾ (۲۵۔۲۱) اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے۔

﴿اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيْهِ﴾ (۸۴۔۶) اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے میں خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جا ملے گا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا﴾ (۳۲۔۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ تم نے قیامت کے دن اور حشر ونشر کو بھلا رکھا تھا اور ﴿يَوْمَ التَّلَاقِ﴾ (۴۰۔۱۵) سے قیامت کا دن مراد ہے اور قیامت کے دن کو یَوْمَ التَّلَاقِ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس روز سب سے اگلے اور پچھلے یا اہل سماء اور اہل ارض ایک دوسرے کے سامنے آ جائیں گے۔ نیز اس روز ہر شخص اپنے اعمال کے نتائج کو پالے گا۔ لَقِيَ فُلَانٌ خَيْرًا اَوْ شَرًّا فلاں نے خیر یا شر کو پالیا۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الویل)

(۳۹۸) فَمَنْ يَّلْقَ خَيْرًا يَّحْمَدِ النَّاسُ اَمْرَهٗ

جو شخص خیر کو پا لیتا ہے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔

(۳۹۹) وَتَلْقَى السَّمَاحَةَ مِنْهُ وَالنَّدٰى خُلُقًا

سخاوت اور بخشش کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔

لَـقَّيْتُـهٗ بِـكَذَا: میں فلاں چیز کے ساتھ اس کے سامنے پہنچا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلَامًا﴾ (۲۵۔۷۵) اور وہاں ان کا استقبال دعا وسلام کے ساتھ کیا جائے گا۔

﴿وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا﴾ (۷۶۔۱۱) اور تازگی اور شادمانی سے ہمکنار فرمائے گا۔

تَلَقَّاهُ کے معنی کسی چیز کو پالینے یا اس کے سامنے آنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۲۱۔۱۰۳) اور فرشتے ان کو لینے آئیں گے۔

﴿وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ﴾ (۲۷۔۶) اور تم کو قرآن عطا کیا جاتا ہے۔

اَلْاِبْـقَاءُ: (افعال) کے معنی کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا کے ہیں کہ وہ دوسرے کو سامنے نظر آئے پھر عرف میں مطلق کسی چیز کو پھینک دینے پر القاء کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ﴾ (۲۰۔۸۷) اور اسی طرح سامری نے ڈال دیا۔

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ قَالَ اَلْقُوْا﴾ (۷۔۱۱۵۔۱۱۶) تو جادوگروں نے کہا کہ موسیٰ یا تو تم جادو کی چیز ڈالو یا ہم ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا تم ہی ڈالو۔

﴿قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى فَاَلْقٰهَا﴾ (۲۰۔۱۹) فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام اسے ڈال دو تو انہوں نے اس کو ڈال دیا۔

﴿فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾ (۲۰۔۳۹) تو دریا اس کو کنارے پر ڈال دے گا۔

﴿اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا﴾ (۶۷۔۷) جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے۔

---

[1] قاله المرقش الاصغر وتمامه: ومن يغو لا يعدم على الغي لائما۔ وقد مر تخريجه، في (غ و ى)

﴿كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ﴾ (۶۷۔۸) جب اس میں ......کوئی جماعت ڈالی جائے گی۔اور آیت: ﴿وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ﴾ (۸۱۔۴) اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔اور بالکل خالی ہو جائے گی۔دوسری آیت۔﴿وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ﴾ (۸۱۔۴) اور جب قبریں الٹ پلٹ کر دی جائیں گی۔ کے ہم معنی ہے۔اَلْقَيْتُ اِلَيْكَ قَوْلًا وَّسَلَامًا وَكَلَامًا وَّمَوَدَّةً کے معنی ہیں۔تجھ سے کوئی بات کی یا سلام و کلام کیا یا دوستی بڑھائی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (۶۰۔۱) تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔﴿فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ﴾ (۱۶۔۶۸) تو وہ ان سے کہیں گے۔

﴿وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ن السَّلَمَ﴾ (۱۶۔۸۷) اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ (۷۳۔۵) ہم عنقریب تم پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے۔ میں وحی اور نبوت کے اس بوجھ کی طرف اشارہ ہے۔جو آپ پر ڈالا گیا تھا۔اور آیت کریمہ: ﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ (۵۰۔۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔ میں اِلْقَاءِ سَمْع سے کان لگا کر سننا مراد ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا﴾ (۲۰۔۷۰) تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ میں فعل مجہول لا کر اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ کو دیکھ کر وہ سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔اور انہیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔

(لَمْ (حرف))

لَمْ ۔کے بعد اگرچہ فعل مستقبل آتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ اسے ماضی منفی بنا دیتا ہے اور اس پر ہمزہ استفہام تقریر کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا﴾ (۲۶۔۱۸) کیا ہم نے لڑکپن میں تمہاری پرورش نہیں کی تھی۔

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾ (۹۳۔۶) بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی۔بے شک دی)

(لَمَّا (حرف))

یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے زمانہ ماضی میں کسی فعل کی نفی اور اس کے قریب الوقوع ہونے کے لیے جیسے فرمایا:

﴿وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ﴾ (۳۔۱۴۲) حالانکہ ابھی خدا نے تم میں جہاد کرنے والوں کو اچھی طرح معلوم کیا ہی نہیں۔

اور کبھی یہ اسم ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔اور یہ قرآن پاک میں بکثرت آیا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ﴾ (۱۲۔۹۶) جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا۔

(ل م م)

لَمَمْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو جمع کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کے ہیں۔اسی سے لممت شعثہ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کی پراگندہ حالت کو سنوارنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا﴾ (۸۹۔۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اللمم کے اصل معنی معصیت کے قریب جانے کے ہیں کبھی اس سے صغیرہ گناہ بھی مراد لیے جاتے ہیں محاورہ ہے:

فُلَانٌ یَفْعَلُ کَذَا لَمَمًا: وہ کبھی کبھار یہ کام کرتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ (۵۳۔۳۲) جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

میں لَمَمٌ کا لفظ اَلْمَمْتُ بِکَذَا سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کے قریب جانا کے ہیں یعنی ارادہ کرنا مگر مرتکب نہ ہونا۔ نیز محاورہ ہے۔

زِیَارَتُہٗ اِلْمَامٌ: یعنی اس کی زیارت مختصر ہوتی ہے۔

(ل م ح)

اَللَّمْحُ کے معنی بجلی کی چمک کے ہیں۔ محاورہ ہے۔

رَأَیْتُ لَمْحَۃَ الْبَرْقِ میں نے اسے بجلی کی چمک کی طرح ایک جھلک دیکھا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ (۵۴۔۵۰) آنکھ کے جھپکنے کی طرح۔ اور محاورہ ہے:

لَاُرِیَنَّکَ لَمْحًا بَاصِرًا: میں تمہیں صاف طور پر دکھلا دوں گا۔ تم پر حقیقت کھول دوں گا۔

(ل م ز)

لَمَزَہٗ (ض ن) لَمْزًا کے معنی کسی کی غیبت کرنا۔ اس پر عیب چینی کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

لَمَزَہٗ یَلْمِزُہٗ وَیَلْمُزُہٗ: یعنی یہ باب ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّلْمِزُکَ فِی الصَّدَقٰتِ﴾ (۹۔۵۸) اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ تقسیم صدقات میں تم پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ ﴿اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ......﴾ (۹۔۷۹) جو رضا کارانہ خیر خیرات کرنے والوں پر طنز و طعن کرتے ہیں۔..........

﴿وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ﴾ (۴۹۔۱۱) اور اپنے (مومن بھائیوں) پر عیب نہ لگاؤ۔

یعنی دوسروں پر عیب نہ لگاؤ ورنہ وہ تم پر عیب لگائیں گے۔ اسی طرح گویا تم اپنے آپ پر عیب لگاتے ہو۔

رَجُلٌ لَّمَّازٌ وَلُمَزَۃٌ: بہت زیادہ عیب جوئی اور طعن وطنز کرنے والا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ﴾ (۱۰۴۔۱) ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغلخور کی خرابی ہے۔

(ل م س)

اَللَّمْسُ (ن) مَسٌّ کی طرح اس کے معنی بھی اعضاء کی بالائی کھال کے ساتھ کسی چیز کو چھو کر اس کا ادراک کر لینا کے ہیں۔ پھر مطلق کسی چیز کی طلب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (مجز والوافر)

(۴۰۰) اَلمِسُہٗ فَلَا اَجِدُہٗ

میں اسے تلاش کرتا ہوں مگر وہ ملتا نہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ﴾ (۷۲۔۸) اور یہ کہ ہم نے

---

[1] قالہ اعرابی فی رثاء ابن لہ فی ستۃ وھذا خامسہ وصدرہ الام علی تبکیہ والبیت فی الحماسۃ المرزوقی ۳۰۲ واللسان (لمس) والبیت من شواھد الکشاف ۱۳۷ وبعدہ: وکیف یلام محزون کبیر فاتہ ولدہ۔

آسمان کوٹٹولا۔

اور لَـمْــسٌ اور مُلَامَسَة کے معنی کنایۃ جماع کے بھی آتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿اَوْلٰـمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ (۵۔۶) یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو۔

میں ایک قراءت لَمَسْتُمُ النِّسَآءَ بھی ہے اس لئے بعض نے اس سے مطلق ہاتھ لگانا اور بعض نے مجامعت کرنا مراد لیا ہے ❶ اور حدیث میں ہے ❷ (۱۱۲) ((انه نهى عن الملامسة)) کہ آنحضرتؐ نے بیع مُلَامَسَة سے منع فرمایا۔اور بیـــع مـــلامسة کی صورت یہ ہے کہ بائع یا مشتری دوسرے سے کہے کہ جب ہم سے کوئی دوسرے کا کپڑا چھولے گا تو بیع واجب ہو جائے گی۔

الماسة: معمولی حاجت۔

(ل ھ ب)

اَلـــلَّهَــبُ: آگ کا شعلہ۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَّلَا یُـغْنِی مِنَ اللَّهَبِ﴾ (۷۷۔۳۱) اور نہ لپٹ سے بچائے گا۔

﴿سَیَـصْــلٰـی نَـارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ (۱۱۱۔۳) وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں جلے گا۔

اَلـــلَّهِیْبُ: شعلہ۔اور لَهَبٌ کا لفظ دھوئیں اور غبار پر بھی بولا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ (۱۱۱۔۱) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔

میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ابولہب کے لفظ سے اس کی کنیت...... مراد نہیں ہے۔جس کے ساتھ وہ مشہور تھا۔ بلکہ اس سے اس کے دوزخی ہونے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے لہٰذا یہاں اس نام سے اسے موسوم کرنا ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ لڑائی بھڑکانے والے اور ہمیشہ لڑنے والے کو اَبُـو الْحَرْبِ یا اَخُـو الْحَرْبِ کہا جاتا ہے۔فَـرَسٌ مُّلْهِبٌ: برق رفتار گھوڑا گویا وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔اس سے اُلْهُوْبٌ ہے جس کے معنی سخت دوڑ کے ہیں۔

اَلـــلُّهَـــابُ: پیاس کی شدت،اندرونی سوزش جو پیاس کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے۔

(ل ھ ث)

لَهِثَ (س) یَـلْـهَــثُ لَهَثًا: سخت پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالنا۔

ابن درید کہتے ہیں ❸ کہ لَهَثٌ کا لفظ درماندگی اور پیاس دونوں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿کَـمَثَـلِ الْـکَـلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ

---

❶ ذهب الى الاول عمر بن الخطاب وابن مسعود والشعبى وعطاء واختاره الشافعى والى الثانى على وابن عباس ومجاهد والسدى وقتادة واختاره ابو حنيفة وابوعلى الجبائى من المعتزلة وفى الطبرسى (۵/۱۱۳): قصة العرب والموالى واختلافهم فى معنى الآية فقال ابن عباس غلبت الموالى المراد به الجماع ورجحه الطبرسى من الامامية۔

❷ متفق عليه من حديث ابى سعيد وعن انس فى البخارى وعن ابى هريرة رضى الله عنه فى النسائى ومسلم وله ثلاث صور وما ذكره المؤلف منقول عن الزهرى وابى هريرة قال فى الفتح و تفسير ابى هريرة اقعد انظر النيل (۱۵۹۔۱۶۰)

❸ هو ابوبكر محمد بن الحسن بن دريد الحماغى صاحب الجمهرة فى اللغة ولد ۲۲۳ھ وتوفى ۳۲۱ انظر لتراجمه الفهرست ابن نديم (۹۷۔۹۸) وبغية الوطاة للسيوطى (۳۳۰) وامالى القالى (۲/۲۷۹) وكشف الظنون (۲/۱۹۸۰) لكتابه (الجمهرة عدة نسخ والصحة هى نسخة عبيد الله بن عبدالله ۱۲۔

تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾ (۷۔۱۷۶) تو اس کی مثال کتے کی سی ہوگی کہ اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے اور یوں ہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔

(ل ھ م)

اَلْاِلْھَــامُ: (افعال) کے معنی کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینا کے ہیں۔لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القاء کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے کسی کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا﴾ (۹۱۔۸) پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (کرنے) کی سمجھ دی۔
اور اس کو لَمَّةُ الْمَلَكِ يَنْفُثُ فِي الرَّوْعِ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:❶ (۱۱۳)
((اِنَّ لِلْمَلَكِ لَمَّةً وَّلِلشَّيْطَانِ لَمَّةً)) کہ ایک لمۃ فرشتے کا ہے اور ایک لَمَّة شیطان کا ہے۔اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا ❷: (۱۱۴) ((اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ)) کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔
اصل میں یہ اِلْتِھَامُ الشَّیْءِ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی کسی چیز کو نگل جانا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: اِلْتَھَمَ الْفَصِيْلُ مَا فِي الضَّرْعِ ۔کہ اونٹنی کے بچے نے تھنوں سے تمام دودھ چوس لیا۔فَرَسٌ لَھُمٌ: تیز رو گھوڑا۔گویا وہ اپنی تیز روی سے زمین کو نگل رہا ہے۔

(ل ھ و)

اَللَّھْوُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے ہٹائے اور باز رکھے یہ لَھَوْتُ بِكَذَا اولَھَيْتُ عَنْ كَذَا سے اسم ہے جس کے معنی کسی مقصد سے ہٹ کر بے سود کام میں لگ جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ﴾ (۵۷۔۲۰) جان رکھو کہ دنیا کی زندگی تو کھیل اور تماشا ہے۔
پھر ہر وہ چیز جس سے کچھ لذت اور فائدہ حاصل ہو اسے بھی لَھْوٌ کہہ دیا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا﴾ (۲۱۔۱۷) اگر ہم چاہتے کہ کھیل بنائیں تو ہم اپنے پاس سے بنا لیتے۔
اور جن مفسرین نے یہاں لَھْوٌ سے مراد عورت یا اولاد لی ہے انہوں نے دنیاوی آرائش کی بعض چیزوں کی تخصیص کی ہے جو لہو و لعب بنالی گئی ہیں ❸ محاورہ ہے:
اَلْھَاهُ كَذَا: یعنی اسے فلاں چیز نے اہم کام سے مشغول کر دیا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اَلْھٰكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ (۱۰۲۔۱) لوگو! تم کو کثرت مال و جاہ و اولاد کی خواہش نے غافل کر دیا۔﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۲۴۔۳۷) یعنی ایسے لوگ جن کو خدا کے ذکر سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت۔
اس آیت سے تجارت کی ممانعت یا کراہت بیان کرنا

❶ زوائد ابن حبان رقم (۴۰) من حدیث عبداللہ ۱۲۔
❷ رواہ البیهقی وفی شرح السنة راجع لتخریجه (روع)
❸ قاله قتادة والحسن: اللهوا المرءة وقال ابن عباس رضی اللہ عنه هو الولد راجع الطبری والدر وفی الروح لکن حمله علی العموم اولی (۱۷/۱۹) قارن المشکل للقبتی (۱۲۳۔ ۱۲۴)۔

مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں پروانہ وار مشغول ہو کر نماز اور دیگر عبادات سے غافل ہونے کی مذمت کی طرف اشارہ ہے نفس تجارت کو قرآن پاک نے فائدہ منداور فضل الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۲۲۔۲۸) تاکہ اپنے فائدے کے کاموں کے لیے حاضر ہوں۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۲۔۱۹۸) اس کا تمہیں کچھ گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں بذریعہ تجارت) اپنے پروردگار سے روزی طلب کرو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ﴾ (۲۱۔۳) ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے دل غافل ہو کر بیکار کاموں میں مشغول ہیں۔

اَللَّهْوَةُ: آٹا پیستے وقت چکی میں ایک مرتبہ جتنی مقدار میں غلہ ڈالا جائے۔ اسے لَهْوَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع لِهَاءٌ آتی ہے۔ پھر تشبیہ کے طور پر عطیہ کو بھی لَهْوَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

اَللَّهَاةُ: (حلق کا کوا) وہ گوشت جو حلق میں لٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض نے اس کے معنی منہ کا آخری سرا بھی کیے ہیں۔

(ل و ح)

اَللَّوْحُ: تختہ (کشتی وغیرہ کا) اس کی جمع الواح ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ (۵۴۔۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کرلیا۔

اور لوح لکڑی وغیرہ کی اس تختی کو بھی کہتے ہیں جس پر کچھ لکھا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ (۸۵۔۲۲) لوح محفوظ میں۔ میں لوح محفوظ کی اصل کیفیت کو ہم اسی قدر جان سکتے ہیں جو احادیث میں مروی ہے اس کو دوسری آیت میں کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (۲۲۔۷۰) بے شک یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ کسب خدا کو آسان ہے۔

اَللَّوْحُ کے معنی پیاس کے ہیں۔ اور جس چوپایہ کو جلدی پیاس لگتی ہو اسے دَابَّةٌ مِلْوَاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور لوح (ضمہ لام کے ساتھ) آسمان اور زمین کے درمیانی خلا کو بھی کہتے ہیں لیکن اکثر علمائے لغت کے نزدیک فتحہ لام کے ساتھ بمعنی پیاس کے ہے اور ضمہ لام کے ساتھ زمین و آسمان کے درمیانی خلا کے معنی میں آتا ہے گو اس میں فتح لام بھی جائز ہے۔

لَوَّحَهُ الْحَرُّ: اسے گرمی نے جھلس دیا۔

لَاحَ الْحَرُّ لَوْحًا گرمی فضا میں پھیل گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لَمَحَ کی طرح ہے اور اَلَاحَ بِسَيْفِهٖ کے معنی ہیں اس نے تلوار سے اشارہ کیا۔

(ل و ذ)

لَاوَذَ (مفاعلہ) بِكَذَا لِوَاذًا وَمُلَاوَذَةً کے معنی کسی چیز کی آڑ لینا اور اس کے پیچھے چھپ جانا ہیں۔ پس آیت کریمہ:

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ (۲۴۔۶۳) کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو وہ لوگ خوب معلوم

ہیں جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ اور پناہ لے کر یکے بعد دیگر کھسک کر نکل جاتے ہیں اور یہاں لِــوَاذًا لَاوَذَ (مفاعلہ) کا مصدر ہے کیونکہ اگر یہ لَاذَ (ن) کا مصدر ہوتا تو لِیَـــاذًا (بالیاء) آنا چاہیے تھا۔اس لیے کہ لَاذَ لِیَاذًا کہا جاتا ہے۔اَللَّوْذُ: پہاڑ کا کنارہ۔

(ل و ط)

لُــوْطٌ: (حضرت لوط علیہ السلام) یہ اسم علم ہے اور لَاطَ الشَّیْءُ بِقَلْبِی یَلُوْطُ لَوْطًا وَلَیْطًا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی محبت دل میں جاگزیں اور پیوست ہو جانے کے ہیں۔حدیث میں ہے ❶ (۱۱۵) ((اَلْـوَلَـدُ اَلْوَطُ بِالْکَبِدِ)) کہ اولاد سے جگری محبت ہوتی ہے۔

هٰذَا اَمْـرٌ لَا یَلْتَاطُ بِصَفَرِیْ: یہ بات میرے دل کو نہیں کھاتی۔

لُطتُّ الْحَوْضَ بِالطِّیْنِ لَوْطًا: میں نے حوض پر کہگل کی۔گارے سے پلستر کیا......حضرت لوط علیہ السلام کے نام سے اشتقاق کر کے تَـلَـوَّطَ فُـلَانٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے ❷ جس کے معنی خلاف فطرت فعل کرنا ہیں حالانکہ حضرت لوط علیہ السلام تو اس فعل سے منع کرتے تھے اور اسے قوم لوط سے مشتق نہیں کیا گیا جو اس کا ارتکاب کرتے تھے۔

(ل و م)

لُـمْتُهٗ: (ن) لَـوْمًا کے معنی کسی کو برے فعل کے ارتکاب پر برا بھلا کہنے اور ملامت کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۱۴۔۲۲) تو آج مجھے ملامت نہ کرو اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

﴿فَـذٰلِـكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ﴾ (۱۲۔۳۲) یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں۔

﴿وَ لَا یَـخَـافُـوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ (۵۔۵۴) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔

اور مَـلُـوْمٌ (ملامت کیا ہوا) صفت مفعولی ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَـاِنَّهُـمْ غَیْـرُ مَـلُوْمِیْنَ﴾ (۲۳۔۶) ان سے مباشرت کرنے میں انہیں ملامت نہیں ہے۔میں تنبیہ کی ہے کہ جب ان پر ملامت ہی نہیں ہے۔تو اس سے زیادہ سرزنش کے وہ بالاولیٰ مستحق نہیں ہیں۔

اَلَامَ: مستحق ملامت ہونا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَنَبَذْنَاهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ﴾ (۵۱۔۴۰) تو ان کو دریا میں پھینک دیا اور وہ کام ہی قابل ملامت کرتا تھا۔

اَلتَّلَاوُمُ: ایک دوسرے کو ملامت کرنا۔قرآن پاک میں ہے:﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ﴾ (۶۸۔۳۰) پھر لگے ایک دوسرے کو رو در رو ملامت کرنے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (۷۵۔۲) اور نفس لوامہ کی قسم۔کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے۔کہ نفس لوامہ سے مراد نفس ہے جس نے کچھ فضائل حاصل کر لیے ہوں اور کسی غلطی کے ارتکاب پر صاحب نفس کو ملامت کرے۔ اس لحاظ سے لوامہ کا درجہ مطمئنہ سے کم ہوگا بعض نے کہا

---

❶ حدیث ابی بکر فی الجامع الکبیر مسند ابی بکر رقم (۵۳٤) والفائق (۲/٤۷۹) وغریب ابی عبید (۳/۲۲۲) والحدیث ذکرہ الماوردی فی ادبہ ص (۲۶۳)۔

❷ ولا یخفی ان الکلمة قبیحة لان فیه نسبة السوء فالاولی ماورد وفی الحدیث عمل قوم لوط فلیستعمل هذه۔

ہے کہ نفس لوامہ اس نفس کو کہتے ہیں۔ جو بذات خود مطمئن ہو۔ علاوہ ازیں اس میں دوسروں کو تادیب کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو چکی ہو۔ اس لحاظ سے یہ نفس مطمئنہ سے افضل ہوگا رَجُلٌ لَوْمَةٌ: وہ شخص جو دوسروں کو ملامت کرے مگر لَوْمَةٌ (بسکون واؤ) وہ ہے جسے لوگ ملامت کرتے ہوں۔

جیسا کہ سُخَرَةٌ وَسُخْرَةٌ اور هُزَءَةٌ وَهُزْءَةٌ میں فرق پایا جاتا ہے

اَللَّوْمَةُ: کے معنی ملامت کے ہیں۔ اور لَائِمَةٌ اس فعل کو کہتے ہیں۔ جس کا ارتکاب کرنے پر انسان قابل ملامت سمجھا جائے

(ل و ن)

اَللَّوْنُ: کے معنی رنگ کے ہیں اور یہ سیاہ سفید اور ان دونوں سے مرکب یعنی ہر قسم کے رنگ پر بولا جاتا ہے۔

تَلَوَّنَ کے معنی رنگ بدلنے کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا﴾ (۳۵۔۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کی دھاریاں ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ﴾ (۳۰۔۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا۔ میں اختلاف الوان سے انواع و اقسام کے رنگوں اور شکلوں کے مختلف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور باوجود اس قدر تعداد کے ہر انسان اپنی ہیئت کذائی اور رنگت میں دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس سے خدا کی وسیع قدرت پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور کبھی الوان سے کسی چیز کے انواع و اقسام مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ اَتٰی بِالْاَلْوَانِ مِنَ الْاَحَادِيْثِ اس نے رنگا رنگ کی باتیں کیں اور اَلْوَانٌ مِنَ الطَّعَامِ سے مراد ہیں قسم قسم کے کھانے۔

(ل و ی)

لَوٰی (ض) اَلْجَبْلَ يَلْوِيْهِ لَيًّا کے معنی رسی بٹنے کے ہیں۔ لَوٰی يَدَهٗ: اس کے ہاتھ کو موڑا لَوٰی رَاْسَهٗ وَبِرَاسِهٖ اس نے اپنا سر پھیر لیا یعنی اعراض کیا[1]۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ﴾ (۶۳۔۵) تو سر پھیر لیتے ہیں لَوٰی لِسَانَهٗ بِكَذَا: کنایہ ہوتا ہے جھوٹ بولنے اور اٹکل پچو کی باتیں بنانے سے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ﴾ (۳۔۷۸) کتاب (توراۃ) کو زبان موڑ موڑ کر پڑھتے ہیں۔

﴿لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ﴾ (۴۔۴۶) زبان کو موڑ کر۔

محاورہ ہے: فُلَانٌ لَا يَلْوِيْ عَلٰی اَحَدٍ: وہ کسی کی طرف گردن موڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہ سخت ہزیمت کھا کر بھاگ اٹھنے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ﴾ (۳۔۱۵۳) جب تم لوگ دور بھاگے جاتے تھے۔ اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ شاعر نے اس معنی کو یوں ادا کیا ہے[2] (الکامل)

---

[1] ومنه قوله تعالىٰ: ﴿وان تلوا وتعرضوا﴾ (٤-١٣٥)

[2] قاله حسان بن ثابت يعير به الحارث بن هشام حيث فريوم بدر عن اخيه ابى جهل و قبله: ان كنت كاذبة الذى حدثتنى فنجوت منجى الحارث بن هشام والبيت من كلمة فى ديوانه (٩٥ و ٢١٥) و(طبعه وار صاور) والسيرة (٣/٣٨٣) ←

(۴۰۱) تَرَكَ الْاَحِبَّة ان تُقَاتِلَ دُوْنَهٗ
وَنَجَابِرَ أْسِ طِمِرَّةٍ وَثَّابِ

اور اس نے دوستوں کے ورے لڑنا چھوڑ دیا اور چھلانگیں بھر کر دوڑنے والی گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگ گیا۔

اَللِّوَاءُ: جھنڈے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہوا سے لہراتا رہتا ہے۔ اَللَّوِيَّةُ وہ کھانا جو لپیٹ کر توشہ کے طور پر رکھ دیا جائے۔

لَوٰی مَدِیْنَهٗ: اپنے مقروض کو ڈھیل دینا۔

اَلْوٰی: ٹیلے کے لوی یعنی موڑ پر پہنچنا۔

(لو)

لَوْ (حرف) بعض نے کہا ہے کہ یہ اِمْتِنَاعُ الشَّیْءِ لِاِمْتِنَاعِ غَیْرِہٖ کے لیے آتا ہے (یعنی ایک چیز کا دوسری کے امتناع کے سبب ناممکن ہونا) اور معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْ﴾ (۱۷۔۱۰۰) کہہ دو کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے۔

(لولا)

لَوْلَا (حرف) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک شے کے پائے جانے سے دوسری شے کا ممتنع ہونا۔ اس کی خبر ہمیشہ محذوف رہتی ہے۔ اور لَوْلَا کا جواب قائم مقام خبر کے ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوْ لَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۴۔۳۱) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہو جاتے۔

دوم بمعنی هَلَّا کے آتا ہے۔ اور اس کے بعد متصلاً فعل کا آنا ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا: تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا۔ وغیرہ ذالك من الامثلة۔

(ل ی ت)

لَاتَهٗ (ض) عَنْ كَذَا لَيْتًا: کے معنی اسے کسی چیز سے پھیر دینا اور ہٹا دینا ہیں۔ نیز لَاتَهٗ وَاَلَاتَهٗ کسی کا حق کم کرنا پورا نہ دینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ (۴۹۔۱۴) تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ اور اس کے اصلی معنی رَدُّ اللِّيْتِ یعنی گردن کے پہلو کو پھیرنے کے ہیں۔

لَيْتَ: یہ حرف طمع و تمنی ہے یعنی گذشتہ کوتاہی پر اظہار تاسف کے لیے آتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿يَاوَيْلَتٰى لَيْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴾ (۲۵۔۲۸) کہے گا کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا ﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ تُرَابًا﴾ (۷۸۔۴۰) اور کافر کہے گا اے کاش! میں مٹی ہوتا۔ ﴿يٰلَيْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾ (۲۵۔۲۷) کہے گا اے کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ رستہ

← و السهيلى (۲: ۱۱۰) والمحاضرات للمؤلف (۳: ۱۸۶) واعجاز القرآن للباقلانى (۱۰٤) (دارالمعارف ۱۹٦٤) والبحر (٥: ۱٥۸/۳: ۲۹۱) والعقد (۱: ۱۷۰) والعيون (۱: ۱۲۹) والصناعتين ۲۰۸ فى بحث الاستطر ادمع اعتزار الحارث وقال فيه: وهذا اول من اعتذر من هزيمة رويت عن العرب و البيت ايضا فى المحبر لابن حبيب (۲۰٥) والجز فى الفاضل (٥۲) والاصابة رقم (۱٥۰٤) فى ترجمة الحارث بن هشام واسد الغابة (۱: ۳٥۱) وفى روايتهم ولجام وفى المطبوع وثاب والطمزه الفرس الجواد ويستعار للاتان ويروى البيت ايضا لحماس بن قيس بن خالد البكرى ۱۲۔

اختیار کیا ہوتا۔شاعر نے کہا ہے ❶ (الرجز)

(۴۰۲) وَلَیْلَۃٍ ذَاتِ دُجًی سَرَیْتُ
وَلَمْ یَلِتْنِی عَنْ ھَوَاھَا لَیْتُ

بہت سی تاریک راتوں میں میں نے سفر کیے۔لیکن مجھے کوئی پر خطر مرحلہ بھی محبوب کی محبت سے دل برداشتہ نہ کر سکا (کہ میں کہتا کاش میں نے محبت نہ کی ہوتی)۔

یہاں لَیْتَ اسم معرب اور لَمْ یَلِتْ کا فاعل ہے اور یہ قَوْلِی لَیْتَہٗ کَانَ کَذَا کی تاویل میں ہے۔

جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے ❷ (الخفیف)

(۴۰۳) اِنَّ لَیْتًا وَّاِنَّ لَوًّ اعَنَاءٌ

کہ لَیْتَ یا لَوْ کہنا سراسر باعث تکلف ہے۔بعض نے کہا ہے کہ پہلے شعر میں لیت مصدر بمعنی لَائِتٌ یعنی اسم فاعل ہے اور معنی یہ ہیں کہ مجھے اس کی محبت سے کوئی چیز نہ پھیر سکی۔

(ل ی ل)

لَیْلٌ وَّلَیْلَۃٌ کے معنی رات کے ہیں۔اس کی جمع لَیَالٍ وَلَیَائِلُ وَلَیْلَاتٌ آتی ہے اور نہایت تاریک رات کو لَیْلٌ اَلْیَلُ وَلَیْلَۃٌ لَیْلَاءُ کہا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ لَیْلَۃٌ اصل میں لَیْلَاۃٌ ہے کیونکہ اس کی تصغیر لُیَیْلَۃٌ اور جمع لَیَالٍ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰـهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (۹۷۔۱) ہم نے اس قرآن پاک کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ﴾ (۱۴۔۳۳) اور رات، دن کو تمہاری خاطر کام میں لگا دیا۔

﴿وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰى﴾ (۹۲۔۱) رات کی قسم جب ان پر چھا جائے۔

﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً﴾ (۷۔۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

﴿وَلَیَالٍ عَشْرٍ﴾ (۸۹۔۲) اور دس راتوں کی۔

﴿ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا﴾ (۱۹۔۱۰) برابر تین راتیں (دن)

(ل ی ن)

اَللِّیْنُ کے معنی نرمی کے ہیں اور یہ خشونت کی ضد ہے اصل میں تو یہ اجسام کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر استعارہ اخلاق وغیرہ یعنی معانی کے لیے بھی آ جاتے ہیں۔چنانچہ فُلَانٌ لَیِّنٌ یا خَشِنٌ کے معنی ہیں: فلاں نرم یا درشت مزاج ہے۔اور یہ دونوں لفظ حسب موقع ومحل

---

❶ قالہ الراجز ابو محمد الحری الفقعی وفی لسان العرب ندی بدل وجی فلفظة لیت " ھھنا اسم ای لم یلتنی عن سراھا ان اتندم فاقول لیتنی ماسر یتھا وقیل لیت مصدر موضع اسم بمعنی صارف والشطران فی اللسان (لیت، سری) والقالی (۲: ۴۲) فی تسعة ابیات والطبری (۲۰۱۵/۲۶: ۴۳) ونسبھا الطبری وابوحیان فی البحر (۸: ۱۰۴) ویعقوب فی اصلاحہ ۱۳۶ وابن خالویہ فی اعرابہ ۴۷ الی روبہ من العجاج ونسبہ صاحب الحاشیة الی الوھم وھو الحق کما فی الالی والرجز ایضا فی شرح دیوان الحطیئة للسکری (۳۶)۔

❷ قالہ ابو زبید الطائی یصف حال الحیوان عند اشتداد الھجیر واولہ: لیت شعری: واین منی لیت...... والبیت فی اللسان (امالا) والبحر (۱: ۳۶۲) والکتاب (۲: ۳۲) والخفاجی ۴۹ والفتح لابن حجر (۱۶: ۳۵۳) باب مایجوز من اللو والشطر فی الصناعتین ۷۷ ومحاضرات المؤلف ۲/۴۵۵ وفی الوسیط بعدہ ثلاثة اخری وصدر البیت فی البلد ان (رسم برام) من قصیدة قالھا ابو قطیفة عمرو بن الولید بن عقبة بن ابی معیط فی حنین الی المدینة حین نفاہ عبداللہ بن الزبیر فلحق بالشام لکن فیہ عجزہ اعلی العھد یلین خیر ام فی عشرة ابیات ویلین غدیر لمدینة ۱۲۔

کبھی مدح کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اور کبھی مذمت کے لیے آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ (۳۔۱۵۹) (اے محمدؐ) خدا کی مہربانی سے تمہاری افتاد و مزاج ان لوگوں کے لیے نرم واقع ہوئی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۲۳) پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل نرم ہو کر خدا کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ میں اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ کہ اباء اور انکار کے بعد وہ حق کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ﴾ (۵۹۔۵) مومنو! کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے۔ میں لِيْنَة کے معنی نرم و نازک کھجور کا درخت ہیں...... اور یہ فِعْلَة کے وزن پر ہے جیسے حِنْطَة۔ تاہم یہ مختلف انواع میں سے ایک نوع کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

❀❀❀

کتابُ المیم

(ما)

یہ عربی زبان میں دو قسم پر ہے۔ اسمی اور حرفی۔

پھر ہر ایک پانچ قسم پر ہے لہٰذا کل دس قسمیں ہیں (۱) ما اسمی ہو تو واحد جمع اور تذکیر وتانیث کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ پھر لفظاً مفرد ہونے کے لحاظ سے اس کی طرف ضمیر مفرد بھی لوٹ سکتی ہے۔ اور معنی جمع ہونے کی صورت میں ضمیر جمع کا لانا بھی صحیح ہوتا ہے۔ یہ ما[1] کبھی بمعنی اَلَّذِیْ ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔ ﴿وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ﴾ (۱۰۔۱۸) اور یہ (لوگ) خدا کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں تو یہاں مَا کی طرف یَضُرُّهُمْ میں مفرد کی ضمیر لوٹ رہی ہے۔ اس کے بعد معنی جمع کی مناسبت سے هٰٓؤُلَاءِ شُفَعَآءُ نَا عِنْدَاللّٰهِ آ گیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۱۶۔۷۳) اور خدا کے سوا ایسوں کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمین میں روزی دینے کا ذرہ بھی اختیار نہیں رکھتے، میں بھی جمع کے معنی ملحوظ ہیں اور آیت کریمہ:۔

﴿بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ﴾ (۲۔۹۳) کہ تمہارا ایمان تم کو بری بات بتاتا ہے۔

میں بھی جمع کے معنی مراد ہیں۔ اور کبھی (۲) نکرہ ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ (۴۔۵۸) بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔

تو یہاں نِعِمَّا بمعنی نِعْمَ شَیْئًا ہے۔ نیز فرمایا: ﴿فَنِعِمَّا هِیَ﴾ (۲۔۳۵) تو وہ بھی خوب ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۲۔۲۶) کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی۔

میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما نکرہ بمعنی شَیْئًا ہو اور (۳) یہ بھی کہ مَا صلہ ہو اور اس کا مَا بعد یعنی بَعُوْضَةً مفعول ہو ❶ اور نظم کلام دراصل یوں ہو۔ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلاً بَعُوْضَةً۔

اور کبھی (۴) اِسْتِفْهَامِیَه ہوتا ہے۔ اس صورت میں کبھی کسی چیز کی نوع یا جنس سے سوال کے لیے آتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز کی صفات جنسیہ یا نوعیہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔ اور کبھی غیر ذوی العقول اشخاص اور اعیان کے متعلق سوال کے لیے بھی آ جاتا ہے۔

بعض علمائے نحو کا قول ہے کہ کبھی اس کا اطلاق اشخاص ذوی العقول پر بھی ہوتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ﴾ (۲۳۔۶) مگر ان ہی بیویوں یا (کنیزوں سے) جوان کی ملک ہوتی ہیں۔

❶ تنسب العلامة الالوسی هذا الاحتمال الی صاحب البحر (۱/۱۹۰)

اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ﴾ (۲۹۔۴۲) جس چیز کو خدا کے سوا پکارتے ہیں۔ خواہ وہ کچھ ہی ہو۔ خدا اسے جانتا ہے۔
میں خلیل نے کہا ہے کہ مَا تَدْعُوْنَ میں ما استفہامیہ ہے اَیْ اَیُّ شَیْءٍ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اور انہوں نے یہ تکلف اس لیے کیا ہے کہ یہ ہمیشہ ابتدا کلام میں واقع ہوتا ہے اور مــا بعد کے متعلق استفہام کے لیے آتا ہے۔ جو آخر میں واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ آیت:۔
﴿مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ﴾ الایۃ (۳۵۔۲) خدا جو اپنی رحمت کا دروازہ کھول دے۔ اور مثال مَا تَضْرِبْ اَضْرِبْ میں ہے۔
اور کبھی (۵) تعجب کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ ﴿فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَی النَّارِ﴾ (۲۔۱۷۵) یہ (آتش) جہنم کی کیسی برداشت کرنے والے ہیں۔
مــا (۶) حرفی ہونے کی صورت میں بھی پانچ قسم پر ہے
اول (۱) یہ کہ اس کا مابعد بمنزلہ مصدر کے ہو۔ جیسا کہ فعل مستقبل پر اَن ناصبہ داخل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔
چنانچہ فرمایا:
﴿مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ﴾ (۲۔۳) اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔
تو یہاں ما رزق بمعنی رزق مصدر کے ہے اور اس ما کے بمعنی ان مصدریہ ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ اس کی طرف کہیں بھی لفظاً یا تقدیراً ضمیر نہیں لوٹتی۔ اور آیت کریمہ:
﴿بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ﴾ (۲۔۱۰) اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب۔ میں بھی ما مصدری معنی پر محمول ہے۔

اسی طرح اَتَانِی الْقَوْمُ مَا عَدَا زَیْدًا میں بھی ما مصدریہ ہے اور تقدیر ظرف کی صورت میں بھی ما مصدریہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:
﴿کُلَّمَآ اَضَآءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِیْہِ﴾ (۲۔۲۰) جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔
﴿کُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَأَھَا اللّٰہُ﴾ (۵۔۶۴) یہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں۔ خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔
﴿کُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰھُمْ سَعِیْرًا﴾ (۱۷۔۹۷) جب (اس کی آگ) بجھنے کو ہوگی تو ہم ان کو (عذاب دینے) کے لیے اور بھڑکا دیں گے اور آیت کریمہ:
﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (۱۵۔۹۴) پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے وہ (لوگوں کو) سنا دو۔
میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما مصدریہ ہو اور یہ بھی کہ مــا موصولہ بمعنی اَلَّذِیْ ہو۔
یاد رکھو کہ مَــا اپنے مابعد کے ساتھ مل کر مصدری معنی میں ہونے کی صورت میں ہمیشہ حرفی ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اسمی ہو تو اس کی طرف ضمیر کا لوٹنا ضروری ہے۔ پس یہ اُرِیْدُ اَنْ اَخْرُجَ میں اَنْ کی طرح ہوتا ہے جس طرح اَنْ کے بعد ضمیر نہیں ہوتی جو اس کی طرف لوٹ سکے اسی طرح ما کے بعد عائد (ضمیر) نہیں آتی۔
دوم (۲) ما نافیہ ہے۔ اہل حجاز اسے مشروط عمل دیتے ہیں۔
چنانچہ فرمایا:۔
﴿مَا ھٰذَا بَشَرًا﴾ (۱۲۔۳۱) یہ آدمی نہیں ہے۔
تیسرا (۳) ما کافہ ہے جو اِنَّ وَاَخَوَاتُھَا اور رُبَّ کے ساتھ مل کر فعل پر داخل ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (۳۵۔۲۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

﴿اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا﴾ (۲۔۱۷۸) (نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ اور گناہ کر لیں۔

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ گویا موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۱۵۔۲) کسی وقت کافر لوگ آرزو کریں گے۔

میں بھی مَا کافہ ہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ قَلَّمَا اور لَمَّا میں بھی ما کافہ ہوتا ہے۔

چہارم (۴) ما مُسَلِّطَة یعنی وہ ما جو کسی غیر عامل کلمہ کو عامل بنا کر ما بعد پر مسلط کر دیتا ہے جیسا کہ اِذْ مَا وَحَيْثُمَا کا مَا ہے کہ ما کے ساتھ مرکب ہونے سے قبل یہ کلمات غیر عاملہ تھے۔ لیکن ترکیب کے بعد اسمائے شرط کا سا عمل کرتے ہیں۔ اور فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں۔ جیسے حَيْثُمَا تَقْعُدْ اَقْعُدْ وغیرہ۔

پانچواں (۵) ما زائدہ ہے۔ جو محض پہلے لفظ کی توکید کے لیے آتا ہے۔ جیسے اِذَا مَا فَعَلْتَ كَذَا (جب تم ایسا کرو) اِمَّا تَخْرُجُ اَخْرُجْ (اگر تم باہر نکلو گے تو میں بھی نکلوں گا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا﴾ (۱۹۔۲۶) اگر تم کسی آدمی کو دیکھو۔

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ﴾ (۱۷۔۲۳) اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔

(م ی ء)

اَلْمِائَةُ: (سو) یہ اصول اعداد میں تیسری اکائی کا نام ہے۔ کیونکہ اصول اعداد چار ہیں۔ آحاد، عشرات، مئات اور اُلُوف...... قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ (۸۔۶۶) پس اگر تم میں ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے۔

﴿وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۸۔۶۵) اور اگر سو (ایسے) ہوں گے تو ہزاروں پر غالب رہیں گے۔ اور مائۃ کا آخری حرف یعنی لام کلمہ محذوف ہے۔

اَمْاَيْتُ الدَّرَاهِمَ فَامَّأَتْ هِيَ بمعنی میں نے دراہم کو سو کیا تو وہ سو ہو گئے۔

(م ی د)

اَلْمَيْدُ: زمین کی طرح کی کسی بڑی چیز کا مضطرب ہونا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ﴾ (۱۶۔۱۵) کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے۔

﴿اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ﴾ (۲۱۔۳۱) تا کہ لوگوں (کے بوجھ سے ہلنے اور جھکنے) نہ لگے۔

مَادَتِ الْاَغْصَانُ تَمِيْدُ: شاخوں کا مضطرب ہونا بعض نے کہا ہے کہ شاعر کے کلام ❶ ()

---

❶ قاله ابن احمر (ابو الخطاب عمرو بن احمر بن العمرو الباهلي القيسي المتوفى في خلافة عثمان قبل سنة ۳۵ھ راجع الخزانه (۳: ۳۸) واوله...... وصادفت والبيت في اللسان والصحاح (ميد)

(۴۱۷)نَعِیْمًا وَمَیْدَانًا مِّنَ الْعَیْشِ اَخْضَرًا (نعمتیں اور سرسبز لہلہاتی ہوئی زندگی) میں بھی مَیْدَانًا مَادَتِ الْاَغْصَانُ سے ہے اور اس کے معنی کشادہ زندگی کے ہیں اور اسی سے میدان الدابۃ ہے جس کے معنی جانور کے کھلے میدان میں پھرنے کے ہیں۔

اَلْمَائِدَۃُ اصل میں اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ اور ہر ایک پر یعنی کھانے اور خالی خوان پر انفراداً بھی مَائِدَۃٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ مَادَنِیْ یَمِیْدُنِیْ سے ہے جس کے معنی کھانا کھلانے کے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی رات کا کھانا کھلانا بھی کیے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۵۔۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ انہوں نے کھانا طلب کیا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ علم کے لیے دعا کی تھی۔ اور علم کو مَائِدَہ سے اس لیے تعبیر فرمایا ہے کہ علم روح کی غذا بنتا ہے جیسا کہ طعام بدن کے لیے غذا ہوتا ہے۔

(م ی ر)

اَلْمِیْرَۃُ: غلہ جو انسان کھانے کے لیے فراہم کرتا ہے۔ اور مَارَ اَھْلَہٗ یَمِیْرُھُمْ کے معنی اہل وعیال کے لیے غلہ لانے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنَمِیْرُ اَھْلَنَا﴾ (۱۲۔۶۵) اب ہم اپنے اہل وعیال کے لیے پھر غلہ لائیں گے۔

اور خِیْرَۃُ اور مِیْرَۃُ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں۔

(م ی ز)

اَلْمِیْزُ وَالتَّمْیِیْزُ کے معنی متشابہ اشیاء کو ایک دوسری سے الگ کرنے کے ہیں۔ اور مَازَہٗ یَمِیْزُہٗ وَمَیَّزَہٗ تَمْیِیْزًا دونوں ہم معنی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِیَمِیْزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ﴾ (۸۔۳۷) تا کہ خدا ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔ اور ایک قرأت میں لِیُمَیِّزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ ہے۔ اَلتَّمْیِیْزُ کے معنی الگ کرنا بھی آتے ہیں اور اس ذہنی قوت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے ذریعہ انسان معانی کا استنباط کرتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا تَمْیِیْزَ لَہٗ: فلاں میں قوت تمیز نہیں ہے۔

اِنْمَازَ اور اِمْتَازَ کے معنی الگ ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَامْتَازُوا الْیَوْمَ﴾ (۳۶۔۵۹) اور آج الگ ہو جاؤ۔ اور تَمَیَّزَ کَذَا (تفعل) مَازَ کا مطاوع آتا ہے اور اس کے معنی الگ اور منقطع ہونے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ﴾ (۶۷۔۸) گویا مارے جوش کے پھٹ پڑے گی۔

(م ی ل)

اَلْمَیْلُ: اس کے معنی وسط سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ کبھی ظلم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ اجسام کے متعلق استعمال ہو تو بدل میں پیدائشی کجی کو مَیَلٌ (بفتح الیاء) اور عارضی کجی کو مَیْلٌ (بسکون الیاء) کہتے ہیں۔ اور مِلْتُ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَـلَا تَـمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ﴾ (۴۔۱۲۹) تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی طرف ڈھل جاؤ۔

مِـلْـتُ عَلَيْـهِ کے معنی کسی پر حملہ کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا ہے:

﴿فَيَـمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً﴾ (۴۔۱۰۲) تو تم پر یکبارگی حملہ کردیں۔

اور اَلْـمَـالُ کو مال اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ مائل اور زائل ہوتا رہتا ہے۔ بدیں وجہ اسے عرض بھی کہتے ہیں۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ مال کی مثال ایک پیشہ ور عورت کی ہے جو کبھی عَطَّار اور کبھی بَیْطَار کے گھر ہوتی ہے۔

(م ی ہ)

اَلْمَاءُ۔ کے معنی پانی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَيٍّ﴾ (۲۱۔۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

﴿مَآءً طَهُوْرًا﴾ (۲۵۔۴۸) پاک (اور نتھرا ہوا) پانی۔

اور محاورہ ہے۔

مَـاءُ بَنِیْ فُـلَانٍ: فلاں قبیلے کا پانی یعنی ان کی آبادی۔

مَـاءٌ اصل میں مَوَهٌ ہے۔ کیونکہ اس کی جمع اَمْوَاهٌ اور مِيَاه آتی ہے۔ اور تصغیر مُوَيْهٌ پھر ہا کو حذف کر کے واؤ کو الف سے تبدیل کرلیا گیا ہے۔ رَجُـلٌ مَاهُ الْقَلْبِ: پانی دل۔ یعنی بزدل آدمی۔ یہاں ماہ موہ سے بنا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ رَجُـلٌ قَـاهٌ کی طرح ہے۔ یعنی ہا ہمزہ سے مبدل ہے۔ مَـاهَتِ الرَّكِيَّةُ تَمِيْهُ وَتَمَاهُ: کنویں میں پانی بڑھ گیا۔ بِـئْرٌ مَيِّهَةٌ وَّمَاهَةٌ وَمَيْهَة زیادہ پانی والا کنواں۔

اَمَـاهَ الـرَّجُلُ وَاَمْهٰی (کنواں کھودتے ہوئے) پانی تک پہنچ گیا۔

(م ت ع)

اَلْـمُتُـوْعُ کے معنی کسی چیز کا بڑھنا اور بلند ہونا کے ہیں۔

جیسے مَتَعَ النَّهَارُ: (دن بلند ہوگیا)۔

مَتَـعَ الـنَّـبَـاتُ: (پودا بڑھ کر بلند ہوگیا) اَلْـمَتَـاعُ: عرصہ دراز تک فائدہ اٹھانا۔ محاورہ ہے۔

مَتَّـعَـهُ الـلّٰـهُ بِـكَذَا وَاَمْتَعَهٗ: اللہ اسے دیر تک فائدہ اٹھانے کا موقع دے۔ تَمَتَّعَ بِهٖ: اس نے عرصہ دراز تک اس سے فائدہ اٹھایا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ مَتَّـعْـنٰهُمْ اِلٰی حِيْنٍ﴾ (۱۰۔۹۸) اور ایک مدت تک (فوائد دنیوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔

﴿نُـمَتِّـعُهُمْ قَلِيْلًا﴾ (۳۱۔۲۴) ہم ان کو تھوڑا سا فائد پہنچائیں گے۔

﴿فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا﴾ (۲۔۱۲۶) میں اس کو بھی کسی قدر متمتع کروں گا۔

﴿سَـنُـمَتِّـعُـهُـمْ ثُـمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (۱۱۔۴۸) ان کو ہم (دنیا کے فوائد سے) محفوظ کریں گے۔ پھر ان کو ہماری طرف سے عذاب الیم پہنچے گا۔ اور قرآن پاک میں جہاں کہیں دنیاوی سازوسامان کے متعلق تَـمَتَّـعُوْا آیا ہے تو اس سے تہدید مراد ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ عیش کوشی اور وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں اور اِسْتَـمْتَـعَ کے معنی کسی چیز سے نفع حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّـنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾ (۶۔۱۲۸) اے

ہمارے پروردگار ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

﴿فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ﴾ (۹۔۶۹) وہ اپنے حصے سے بہرہ یاب ہو چکے۔ سو جس طرح تم سے پہلے لوگ اپنے حصے کا فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اسی طرح تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھالیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنَ﴾ (۲۱۔۳۶) اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور فائدہ اٹھانا (مقرر کردیا گیا ہے)

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر انسان کو دنیا میں ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ اور پھر آیہ کریمہ: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ (۴۔۷۷) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے۔ میں متاع دنیا کو قلیل کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اخروی ثواب کے مقابلہ میں دنیا کا ساز و سامان بے وقعت ہے اور ناقابل اعتناء جیسا کہ آیت ﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (۹۔۳۸) دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہیں اور آیت:۔

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ﴾ (۱۳۔۲۶) سے واضح ہوتا ہے اور خانگی ضروریات کی چیزوں کو بھی متاع کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ﴾ (۱۳۔۱۷) زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لیے...... اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔

نیز ہر وہ چیز جس سے کسی قسم کا نفع حاصل کیا جائے۔ اسے مَتَاعٌ وَّمُتْعَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کریمہ:۔

﴿وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ﴾ (۱۲۔۶۵) جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔

میں غلہ کو متاع کہا ہے۔ اور بعض نے غلہ کے تھیلے یا بوریاں مراد لیے ہیں اور یہ دونوں متاع میں داخل اور باہم متلازم ہیں کیونکہ غلہ ہمیشہ تھیلوں ہی میں ڈالا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۲۔۲۴۱) اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان و نفقہ دینا چاہیے۔ میں متاع بمعنی متعہ ہے اور متعہ سے یہاں وہ نان و نفقہ مراد ہے جو عورت کو طلاق دینے کے بعد شوہر سے ملتا ہے تاکہ عدت طلاق پوری ہونے تک وہ گذر بسر کرسکے۔ اور اَمْتَعَ وَمَتَّعَ کے معنی متعہ دینے کے ہیں۔ مگر قرآن پاک میں اس معنی کے لیے صرف مَتَّعَ یعنی تفعیل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ (۳۳۔۴۹) تو ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر...... رخصت کردو۔ ﴿قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۲۔۲۳۶) ہاں ان کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق۔

مُتْعَةُ النِّكَاحِ (یعنی نکاح متعہ) کی صورت یہ ہے کہ مرد کسی عورت کو کچھ مال دے کر متعین عرصہ کے لیے اس سے نکاح کر لے۔ پھر جب وہ مدت گذر جائے تو وہ

عورت بغیر طلاق کے خاوند سے الگ ہو جاتی ہے اور حج کے ساتھ عمرہ کرنے کو مُتْعَةُ الْحَجّ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (۲۔۱۹۶) تو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرہ سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔

شَرَابٌ مَاتِعٌ: بعض نے اس کے معنی سرخ شراب" کیے ہیں لیکن اصل میں مَاتِعٌ ہر عمدہ اور اعلیٰ شراب کو کہتے ہیں۔ گو شراب کا سرخ ہونا بھی اس کی عمدگی کی ایک علامت ہے مگر مَاتِعٌ کا لفظ اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

جَمَلٌ مَاتِعٌ: قوی اونٹ ❶ (اور مَاتِعٌ کے معنی راجح اور زائدہ بھی آ جاتے ہیں چنانچہ شاعر کے شعر۔

(۴۰۴) وَمِيْزَانُهُ فِيْ سُوْرَةِ الْبِرِّ مَاتِعٌ

(اس کا ترازو نیکیوں سے جھکا ہوا ہے)

میں مَاتِع معنی راجح اور زائد ہی کے ہیں۔

(م ت ن)

اَلْمَتْنَان: پیٹھ کے دونوں حصے جو ریڑھ کی ہڈی کے اردگرد ہوتے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو المتن کہتے ہیں۔

مَتَنْتُهٗ: کسی کی پیٹھ پر مارنا مَتُنَ مضبوط پشت والا ہونا اور مضبوط پشت والے آدمی کو مَتِيْنٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے حَبْلٌ مَتِيْنٌ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی مضبوط رسی کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ (۵۱۔۵۸) خدا ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔

(م ت ی)

مَتٰى: یہ اسم استفہام ہے اور کسی کام کا وقت دریافت کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ (۳۶۔۴۸) یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟ ﴿مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ﴾ (۳۲۔۲۸) یہ فیصلہ کب ہوگا؟

کہتے ہیں کہ بنی ہذیل، جَعَلْتُهٗ مَتٰى كُمِّيْ (میں نے اسے اپنے آستین کے وسط میں ڈال لیا) کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابو ذویب (الہذلی) نے کہا ہے ❸ (الکامل)

(۴۰۵) شَرِبْنَ بِمَاءِ الْبَحْرِ ثُمَّ تَرَفَّعَتْ
مَتٰى لُجَجٍ خُضْرٍ لَّهُنَّ نَئِيْجُ

---

❶ کذا فی الصلب والصواب حبل بدل جمل کما فی المعاجم۔

❷ قالہ النابغة الذبیانی واولہ الی خیر دین سنة قد علمتہ والبیت فی اللسان (متع) وفی روایة المحدبدل البر والشطر ایضا فی ملحق دیوانہ۔

❸ وفی دیوان الهذلیین تروت بدل شربن وعلی حبشیات بدل لحج خضر والضمیر فی شربن یعود الی حناتم سود فی البیت قبلہ سقی ام عمرو کل آخر لیلة۔ حناتم سود ماء ھن ثجیج، والمراد بھا السحاب والبیت فی الطبری (۲۹: ۲۰۷) وادب الکاتب (۵۱۷) واللسان (متی) وشرح شواهد المغنی للسیوطی (۱۰۹) والاقتضاب (۴٤۷) والجوالیقی (۳٦۷) ودیوان الهذلیین (۱: ۵۱) وفی روایتہ) اختلاف یسیر وفی الصاحبی (۱۷۵) غیر منسوب وفی مشکل القرآن (٤۳۰) (بحث الباء مکان من) والخزانة (۳: ۹۳۔۹۵) والبیت ایضا فی الطبرسی (۲۹: ۱٤۵)۔

انہوں نے سمندر سے پانی پیا پھر سمندر کے گہرے کنڈوں سے بلند ہوئیں اور گرجتے ہوئے تیز رفتاری سے چل پڑیں۔

(م ث ل)

مَثُلَ (ک) اَلشَّیْءُ مُثُوْلًا: کے معنی کسی چیز کا سیدھا کھڑا رہنا یا دوسری چیز کی شکل وصورت اختیار کر لینا کے ہیں۔اسی سے حدیث میں ہے ❶ (۱۱۶) ((مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّمْثُلَ لَہُ الرِّجَالُ فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ)) کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے سیدھے کھڑے رہیں۔تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے۔

اَلْمُمَثَّلُ: وہ چیز جو کسی نمونہ کے مطابق بنائی گئی ہو۔

اَلتِّمْثَالُ: تصویر۔کسی چیز کا مجسمہ ❷ تَمَثَّلَ کَذَا: کسی کی شکل بن جانا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَمَثَّلَ لَھَابَشَرًا سَوِیًّا﴾ (۱۹۔۱۷) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی (کی شکل) بن گیا۔

اَلْمَثَلُ کے معنی ہیں: ایسی بات کے جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو۔اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ دوسری کا مطلب واضح ہوجاتا ہو۔اور معاملہ کی شکل سامنے آجاتی ہو۔مثلاً عین ضرورت پر کسی چیز کو کھودینے کے لیے اَلصَّیْفَ ضَیَّعْتِ اللَّبَنَ کا محاورہ ضرب المثل ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں امثال بیان کرنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

﴿وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ﴾ (۵۹۔۲۱) اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ فکر کریں۔اور دوسرے مقام پر ﴿وَمَا یَعْقِلُھَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾ (۵۹۔۴۳) اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔فرمایا ہے:۔

مَثَلٌ وَمِثْلٌ دونوں ہم معنی ہیں جیسے شَبَہٌ وَشِبْہٌ وَنَقَضٌ وَنِقْضٌ وغیرہ۔اور یہ دوطرح استعمال ہوتا ہے ایک بمعنی وصف جیسے فرمایا ﴿مَثَلُ الْجَنَّۃِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (۱۳۔۳۵) یعنی جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں۔

اور دوم مشابہ کے معنی میں آتا ہے اور ہر قسم کی مشابہت کو شامل ہوتا ہے یعنی عربی میں جو الفاظ بھی مشابہ کے معنی میں آئے ہیں سب سے زیادہ عام ہوتا ہے مثلاً نِدٌّ صرف اس مشابہ کو کہتے ہیں جو دوسرے کے ساتھ اس کے جوہر میں شریک ہو اور شِبْہٌ کا لفظ دوسرے کے ساتھ صرف کیفیت میں شرکت کو ظاہر کرتا ہے اور مساوی اسے کہتے ہیں جو صرف کمیت میں دوسرے کے برابر ہو اسی طرح مشَکْلٌ کا لفظ صرف اندازہ اور پیمائش کے لحاظ سے مشابہت پر بولا جاتا ہے اس بنا پر اللہ تعالیٰ سے من کل الوجوہ تشبیہ کی نفی کرنے کے لیے قرآن پاک نے مثل کا لفظ استعمال کیا ہے۔چنانچہ فرمایا:۔

﴿لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ﴾ (۴۲۔۱۱) اس جیسی کوئی چیز نہیں۔اب رہا یہ سوال کہ اگر یہاں مثل بمعنی مشابہ ہے تو پھر کاف تشبیہ کیوں لایا گیا ہے اسکا جواب یہ ہے کہ ان

---

❶ وفی روایۃ ان تمثل قال الحافظ فی تخریجہ لم اجدہ ھکذا وفی السنن، من حدیث معاویۃ من سرہ ان یتمثل لہ الناس قیاما فلیتبوء مقعدہ من النّار انظر ایضاً تخریج الاحیاء للعراقی (۲/۲۰۵) فی غریب ابی عبید من حدیث البراء راجع الکافی (ص۱۴۲ رقم ۳۰۷) والفائق (۳/۷) والنھایۃ (۴/۸۲)

❷ وجمعہ تماثیل کما فی قولہ تعالیٰ: (۲۱۔۵۲) (۳۴۔۱۳)

دونوں کو تاکید نفی کی غرض سے یکجا لایا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں نہ تو مثل کا استعمال صحیح ہے اور نہ ہی کاف کا اس لیے یکبارگی دونوں کی نفی کر دی ہے۔

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (۱۳-۳۵) جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مثل بمعنی صفت ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کی طرح کسی کی صفت نہی ہے یعنی گو ذاتِ باری تعالیٰ بھی بہت سی ان صفات کے ساتھ متصف ہوتی ہے جن کے ساتھ انسان متصف ہوتا ہے لیکن ان صفات کے وہ معنی نہیں ہیں جو بشر میں لیے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (۱۶-۶۰) جو لوگ آخرت پر ایمان نہں رکھتے انہی کے لیے بری باتیں (شایاں) ہیں۔ اور خدا کو صفت اعلیٰ زیب دیتی ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ نہایت بری صفات کے مالک ہیں۔ اور باری تعالیٰ اعلیٰ صفات کے ساتھ متصف ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ (۱۶-۷۴) تو (لوگو) خدا کے بارے میں (غلط مثالیں پیش نہ کرو)۔

میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے امثال بیان کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ پھر اس خود ہی اس کے بعد آیت:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا﴾ (۱۶-۷۵) الآیۃ۔ خدا ایک (اور) مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے...... میں اپنی ذات کے لیے مثال بھی بیان فرما دی ہے۔ مگر ان میں تعارض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس مثال کے بیان کرنے کے بعد آخر میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ کہہ کر یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم بشری صفات میں سے اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی صفت بیان نہیں کر سکتے۔ بلکہ جو صفات اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے ثابت کی ہیں بیان کر سکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ......﴾ (۶۲-۵) جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی...... ان کی مثال، کے معنی یہ ہیں کہ یہود تورات میں بیان کردہ حقائق کے مفہوم سے اس گدھے کی طرح جاہل ہیں جس کی پشت پر علم وحکمت کی بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾ (۷-۱۷۶) اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا۔ تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی ہے۔ کہ اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے۔ اور یوں ہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔ میں اس شخص کو ہوائے نفسانی کی اتباع اور ہر وقت اس کی تکمیل کے درپے رہنے میں اس کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو ہر حالت میں زبان باہر نکالے رہتا ہے۔ اور کسی حالت میں بھی زبان نکال کر ہانپنا نہیں چھوڑتا اور آیت کریمہ: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ الآیۃ (۲-۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جس نے (شب تاریک میں) آگ جلائی...... میں اس شخص کو جسے اللہ تعالیٰ نے ایک گونہ ہدایت اور اس کے لیے صلاحیتوں کو ضائع کر دیا ہو۔ اور ابدی انعامات کے حاصل کرنے کے لیے انہیں ذریعہ نہ

بنایا ہو۔ اسے اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جس نے تاریکی میں آگ سلگائی ہو لیکن جب اس نے اس کے لیے آس پاس کو روشن کر دیا تو اس نے وہ روشنی ضائع کر دی ہو اور وہ...... دوبارہ اندھیرے میں چلا گیا ہو اور آیت کریمہ:

﴿وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ (۲۔۱۷) جولوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔ میں اس شخص کو جسے ہدایت کی طرف دعوت دی گئی ہو۔ بکریوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ لیکن اختصار کے پیش نظر الفاظ کے باہم مقابلہ اور بسط کلام کے بجائے معنوی مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ کفار کو ہدایت کی طرف دعوت دینے والے شخص اور کفار کی مثال اس چرواہے اور بکریوں کی سی ہے جو انہیں بلانے کے لیے چیختا ہو۔ لیکن وہ اس کے بلانے اور پکارنے کی آواز کے سوا کچھ نہیں سنتیں اور اسی طرح آیات۔

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ (۲۔۲۶۱) جولوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے مال کی مثال اس دانے کی سی ہے۔ جس سے سات بالیں اگیں اور ہر بال میں سو سو دانہ ہو۔

﴿مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ﴾ (۳۔۱۱۷) یہ جو مال دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ہوا کی سی ہے جس میں سخت سردی ہو۔ میں بھی مثل بمعنی مثال کے ہے۔

اَلْمِثَالُ: (۱) ایک چیز کا اس کی نظیر سے مقابلہ کرنا یا (۲) نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔

اَلْمُثْلَةُ: عبرت ناک سزا جس سے دوسرے بھی عبرت حاصل کر کے ارتکاب جرم سے رک جائیں یہی معنی نَكَالٌ کے ہیں۔ اس کی جمع مَثُلَاتٌ و مَثْلَاتٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ﴾ (۱۳۔۶) حالانکہ ان سے پہلے عذاب واقع ہو چکے ہیں۔ میں ایک قرأت اَلْمَثْلَاتُ (سکون ثاء) بھی مروی ہے۔ جیسا کہ عَضُدٌ وَعَضْدٌ میں اور اَمْثَلَ السُّلْطَانُ فُلَانًا کے معنی یہ ہیں کہ بادشاہ نے فلاں کو عبرت ناک سزا دی۔

اَلْاَمْثَلُ: اس شخص کو کہتے ہیں جو نفوس فاضلہ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو اور اقرب الی الخیر ہو اور کنایہ کے طور پر برگزیدہ لوگوں کو اَمَاثِلُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا﴾ (۲۰۔۱۰۴) جب کہ اس وقت ان میں سب سے اچھی راہ والا (یعنی عاقل و ہوشمند) کہے گا کہ نہیں بلکہ ایک ہی روز ٹھہرے ہو۔

میں بھی امثل اسی معنی پر محمول ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَ یَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِكُمُ الْمُثْلٰی﴾ (۲۔۶۳) اور تمہارے شائستہ ترین مذہب کو نابود کر دیں۔

میں مُثْلٰے کا مذکر اَمْثَلُ ہے۔ یعنی وہ راستہ جو دوسروں سے بہتر ہو۔

(م ج د)

مَجَدَ يَمْجُدُ مَجْدًا وَمَجَادَةً کے معنی کرم و شرف اور بزرگی میں وسعت اور پہنائی کے ہیں یہ دراصل مَجَدَتِ الْاِبِلُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: اونٹوں کا کسی وسیع اور زیادہ چارہ والی چراگاہ میں پہنچ جانا...... اور اَمْجَدَهَا الرَّاعِیُ کے معنی ہیں چرواہے کا اونٹوں کو بڑی وسیع چراگاہ میں لے جانا عرب لوگ کہتے ہیں ❶ فِیْ كُلِّ شَجَرٍ نَارٌ وَاسْتَمْجَدَ الْمَرْخُ وَالْعَفَارُ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے مگر مرخ اور عفار درخت میں تو بہت زیاد آگ پائی جاتی ہے۔ المجید اسمائے حسنٰی میں سے ہے جس کے معنی ہیں وہ ذات جو اپنے فضل وکرم خصوصی سے نوازنے میں نہایت وسعت اور فراخی سے کام لینے والی ہو چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ﴾ (۸۵۔۱۵) عرش کا مالک بڑی شان والا ہے۔

میں ذات باری تعالیٰ کا اَلْمَجِيْدُ کے ساتھ متصف ہونا اس کے وسعتِ فیض اور کثرتِ جُود کے سبب سے ہی ہے ایک قرأت میں اَلْمَجِيْدِ کسرہ دال کے ساتھ ہے اس صورت میں یہ اَلْعَرْشِ کی صفت ہوگی اور جلالت قدر اور عظمت شان کے لحاظ سے عرش کو اَلْمَجِيْدِ کہا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے ❷ (۱۱۷)

((مَا الْكُرْسِی فِی جَنْبِ العرش الا كحلقة ملقاة فی ارض فلاة)) کہ عرش کے مقالہ میں کرسی کی حیثیت بیاباں میں پڑی ہوئی ایک انگوٹھی کی ہے اور اسی مفہوم کے پیش نظر آیت کریمہ: ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ﴾ (۲۳۔۱۱۶) میں عرش کو الکریم کہا ہے۔ قرآن پاک کی صفت میں بھی اَلْمَجِيْد آیا ہے کیونکہ قرآن پاک بھی تمام دنیوی اور اخروی مکارم پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جلیل القدر کتاب ہے چنانچہ فرمایا:

﴿قٓ . وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ (۵۰۔۱) قرآن مجید کی قسم ہے۔

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ﴾ (۸۵۔۲۱) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔

اور قرآن پاک کے عظیم الشان اور مکارم دارین کی تعلیمات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ آیت بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

اَلتَّمْجِيْدُ: بندے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی تمجید کے معنی اس کی صفات حسنہ بیان کرنے کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی تمجید کے معنی اس پر فضل وکرم کرنے کے ہوتے ہیں۔

(م ح ص)

اَلْمَحْصُ کے اصل معنی کسی چیز کو کھوٹ اور عیب سے پاک کرنے کے ہیں۔ یہ فَحْصٌ کے ہم معنی ہے مگر فَحْصٌ کا لفظ ایک چیز کو دوسری ایسی چیزوں سے الگ کرنے پر بولا جاتا ہے جو اس میں مل جائیں لیکن درحقیقت اس سے منفصل ہوں۔ مگر مُحْصٌ کا لفظ ان ملی ہوئی چیزوں کو کسی سے الگ کرنے کے لیے آتا ہے۔ جو اس سے متصل اور گھل مل گئی ہوں...... چنانچہ محاورہ ہے۔

---

❶ المثل فی المیدانی (۲ ۵۲ ۷۲) واللسان (مجد) والمخصص (۱۱/۷۲) والخزانة (۱: ۱۵۹) (۲: ۸۶) (۴: ۶۴) بولاق (والحیوان ۴/۴۶۶) وامالی المرتضی (۲/۲۹) والمثل یضرب فی تفضیل بعض الشیء علی بعض۔

❷ اخرجه ابن جریر وابو الشیخ فی العظمة وابن مردویه والبیهقی عن ابیٰ ذر الغفاری (شوکانی)

مَحَصْتُ الذَّهَبَ وَمَحَّصْتُهٗ: سونے کو آگ میں گلا کر اس کی کھوٹ کرالگ کر دیا۔

چنانچہ آیات کریمہ:

﴿وَ لِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۳۔۱۴۱) اور یہ بھی مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو خالص مومن بنا دے۔

﴿وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (۳۔۱۵۴) اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو خالص اور صاف کر دے۔

میں دلوں کے پاک کرنے پر تمحیص کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ تَزْكِیَةٌ وَتَطْهِیْرٌ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں چنانچہ دعا کرتے وقت کہا جاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ مَحِّصْ عَنَّا ذُنُوْبَنَا: اے اللہ! ہمارے گناہوں کو جو ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں دور کر دے۔

مَحَصَ الثَّوْبُ: کپڑے کا رواں استعمال سے گھس گیا اور اس کی تازگی چلی گئی۔

مَحَصَ الْحَبْلُ یَمْحَصُ: رسی پرانی ہوگئی۔ اور اس کا رواں صاف ہوگیا۔ مَحَصَ الصَّبِیُّ: بچہ (طاقت ور ہو کر) دوڑنے لگا۔

(م ح ق)

اَلْمَحْقُ کے معنی گھٹنے اور کم ہونے کے ہیں اور اسی سے اَلْمِحَاقُ قمری مہینہ کی ان آخری راتوں کو کہتے ہیں جن میں چاند نمودار نہیں ہوتا۔ اِنْمَحَقَ وَامْتَحَقَ کے معنی کم ہونا اور مٹ جانا ہیں اور مَحَقَهٗ کے معنی کسی چیز کو کم کرنے اور اس سے برکت کو ختم کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ﴾ (۲۔۲۷۶) خدا سود کو نابود (یعنی بے برکت کرتا) اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے۔

﴿وَ یَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ﴾ (۳۔۱۴۱) اور کافروں کو نابود کر دے۔

(م ح ل)

مَحَلَ (ن) بِهٖ مَحْلًا وَمِحَالًا کے معنی کسی کے خلاف بری تدبیر کرنے کے ہیں چنانچہ آیت:

﴿وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ﴾ (۱۳۔۱۳) جس کے معنی ''عقوبت کے ساتھ سختی سے گرفت کرنے والا کے ہیں'' میں بعض کے نزدیک یہ مَحَلَ بِهٖ کے محاورہ سے ہی مشتق ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اَلْمِحَالُ میں میم زیادہ ہے اور یہ دراصل اَلْحَوْل اور اَلْحِیْلَة سے مشتق ہے۔ ❶

ابوزید نے کہا ہے کہ مَحَلَ الزَّمَانُ کے معنی قحط سالی ہونا کے ہیں اور قحط زدہ علاقہ کو مَكَانٌ مَاحِلٌ وَمُتَمَاحِلٌ کہتے ہیں اور اَمْحَلَتِ الْاَرْضُ کے معنی بارش نہ ہونے کی وجہ سے ملک میں قحط ہونے کے ہیں۔ نیز اَلْمَحَالَةُ پیٹھ کے مہرہ کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع اَلْمَحَالُ ہے اور جو دودھ خراب اور ترش ہو جائے اسے مُمْحِلٌ کہا جاتا ہے۔ مَاحَلَ عَنْهُ کے معنی کسی کی طرف سے جھگڑنے کے ہیں اور مَحَلَ بِهٖ اِلَی السُّلْطَان کے معنی بادشاہ کے پاس کسی چغلی کھانے کے ہیں اور ایک حدیث ہے

---

❶ قاله القبتي في غريبه (۲۲۶) وفي اللسان: قال ابو منصور الازهری قول القتيبی غلط فاحش لان الميم اذا كانت زائدة في "مفعل" يجيء باظهار (الواو والياء مثل مزود ومحول ومحور و ماشاء كلها ومثل هذا النقد ذكر ايضا في القرطبي (۹/۲۹۹) ولعله اخذ من قول قتادة: شديد المحال اى شديد الحيلة وعن عباس رضي الله عنه اى شديد الحول انظر الطبری (۱۳/۱۲۶۔۱۲۸)۔

❶ (۱۱۸) اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلِ الْقُرْآنَ مَا حِلًا بِنَا اے اللہ! قرآن کو ہمارے عیوب ظاہر کرنے والا نہ بنا کہ تیرے سامنے ہماری بدعملیوں کی شکایت کرے۔

(م ح ن)

اَلْمَحْنُ وَالْاِمْتِحَانُ کے معنی آزمانے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿فَامْتَحِنُوْھُنَّ﴾ (۶۰۔۱۰) تو انکی آزمائش کرو۔ اور اِمْتِحَانٌ اور اِبْتِلَاءٌ کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں چنانچہ قرآن پاک نے ایک مقام پر:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی﴾ (۴۹۔۳) خدا نے ان کے دل تقویٰ کے لیے آزما لیے ہیں۔ کہا ہے اور دوسرے مقام پر ﴿لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا﴾ (۸۔۱۷) اس سے غرض تھی کہ مومنوں کو...... اچھی طرح آزمالے۔ فرمایا ہے اور یہاں بَلَاءٌ اور اِمْتِحَانٌ کا وہی مفہوم ہے جو کہ آیت:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ﴾ الایة (۳۳۔۳۳) اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل دور کردے۔ میں جس کے دور کرنے کا معنی ہے۔

(م ح و)

اَلْمَحْوُ (ن) کے معنی کسی چیز کے اثر اور نشان کو زائل کرنا اور مٹا دینا کے ہیں۔ اسی سے بادشمالی مَحْوَةُ کہا جاتا ہے۔ ❷ کیونکہ وہ بادل کے آثار اور نشانات کو مٹا دیتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ﴾ (۱۳۔۳۹) خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔

(م خ ر)

مَخَرَ الْمَاءُ الْاَرْضَ: پانی کا زمین کو چیرنا اور اسمیں چکر لگانا۔ محاورہ ہے۔

مَخَرَتِ السَّفِیْنَةُ مَخْرًا وَمُخُوْرًا: کشتی کا اپنے سینہ سے پانی کو چیرنا اور سمندر چیر کر چلنے والی کشتی کو سَفِیْنَةٌ مَاخِرَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع مَوَاخِرُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ﴾ (۱۶۔۱۴) اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔

اِسْتَمْخَرْتُ الرِّیْحَ وَامْتَخَرْتُهَا: میں ہوا کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ حدیث میں ہے ❸۔

(۱۱۹) ((اِسْتَمْخِرُوا الرِّیْحَ وَاَعِدُّ وَالنَّبْلَ)) (رفع حاجت کے وقت) ہوا کی طرف پشت کر کے بیٹھو اور استنجا کے لیے پتھر ساتھ لے جاؤ۔

---

❶ وفی الکشاف "ولا تجعله ماحلا مصدقا" وفی ابن حبان عن جابر والحاکم عن معقل بن یسار والطبرانی عن انس وابو عبید فی فضائل القرآن "القرآن شافع ومشفع وماحل ومصدق" راجع الکافی ۲۲۸ وکنز العمال رقم (۲۳۷ و ۲۳۶) والفائق (۲ ۲۳۸) موقوفا علی ابن مسعود وقد مر الحدیث فی (ش ف ع) ۱۲

❷ ای غیر مصروفة لکونها علما للشمال انظر الذیل للقالی ۶ وفی السمط (۵۔۶) هذا (تفسیر محوة) قول الاصمعی وتبعه، المبرد فی الکامل (۴۶۳) و قد انکره علی بن حمزة فی التنبیهات علی اغالیط الرواة علیها ۱۲۔

❸ الحدیث فی عب عن سراقة بن مالك مرفوعا انظر کنز العمال (۹ رقم ۳۰۷۔۳۰۸) وفی النهایة واللسان (مخر) والفائق (۲/۲۳۹) قال والنبل حجارة الاستنجاء والحدیث فی مجمع البحار (۳/۲۸۵) قال والمراو ههنا من الاستمخار الاستد بارویاتی بمعنی الاستقبال ایضا ۱۲۔

اَلْمَاخُوْرُ: شراب کی دوکان۔وہ جگہ جہاں شراب فروخت ہوتی ہو۔بَنَاتُ مَخْرٍ: سفید ابر، موسم گرما میں اٹھنے والی بدلیاں۔

(م د د)

اَلْمَدُّ کے اصل معنی (لمبائی میں) کھینچنے اور بڑھانے کے ہیں اسی سے عرصہ دراز کو مُدَّۃٌ کہتے ہیں اور مِدَّۃُ الْجَرْحِ کے معنی زخم کا گندہ مواد کے ہیں۔مَدُّ النَّھْرِ: دریا کا چڑھاؤ۔مَدَّہٗ نَھْرٌ اٰخَرُ۔دوسرا دریا اس کا معاون بن گیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ﴾ (۲۵۔۴۵) تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارا رب سائے کو کس طرح دراز کر کے پھیلا دیتا ہے۔

مَدَدْتُ عَيْنِيْ اِلٰی كَذَا: کسی کی طرف حریصانہ...... اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ﴾ الاية (۱۵۔۸۸) تم...... للچائی نظروں سے نہ دیکھنا۔

مَدَدْتُہٗ فِيْ غَيِّہٖ: گمراہی پر مہلت دینا اور فوراً گرفت نہ کرنا۔

مَدَدْتُ الْاِبِلَ: اونٹ کو مدید پلایا۔اور مدید اس بیج اور آٹے کو کہتے ہیں جو پانی میں بھگو کر باہم ملا دیا گیا ہو۔

اَمْدَدْتُ الْجَيْشَ بِمَدَدٍ: لشکر مدد دینا۔کمک بھیجنا۔

اَمْدَدْتُ الْاِنْسَانَ بِطَعَامٍ: کسی کی طعام (غلہ) سے مدد کرنا۔

قرآن پاک میں عموماً اَمَدَّ (افعال) اچھی چیز کے لیے اور مَدٌّ (ثلاثی مجرد) بری چیز کے لیے استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَاَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ اور جس طرح کے میوے اور گوشت کو ان کا جی چاہے گا ہم ان کو عطا کریں گے۔(۵۲۔۲۲)

﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ (۲۳۔۵۵) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں۔

﴿وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ (۱۷۔۱۲) اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ﴾ (۳۔۱۲۵) تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتے تمہاری مدد کو بھیجے گا۔

﴿اَتُمِدُّوْنَنِيْ بِمَالٍ﴾ (۲۷۔۳۶) کیا تم مجھے مال سے مدد دینا چاہتے ہو۔

﴿وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا﴾ (۱۹۔۷۹) اور اس کے لیے (آہستہ) عذاب بڑھاتے جاتے ہیں۔﴿وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۔۱۵) اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت اور سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

﴿وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ﴾ (۷۔۲۰۲) اور ان (کفار) کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچے جاتے ہیں۔لیکن آیت کریمہ:

﴿وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ﴾ (۳۱۔۲۷) اور سمندر (کا تمام پانی) روشنائی ہو اور سات سمندر اور (روشنائی ہو جائیں) میں يَمُدُّهٗ کا صیغہ مَدَّہٗ نَھْرٌ اٰخَرُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔اور یہ اِمْدَادٌ یا مَدٌّ سے نہیں ہے جو کسی محبوب یا مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتے ہیں بلکہ یہ مَدَدْتُ الدَّوَاۃَ اَمُدُّھَا کے محاورہ

سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوات میں روشنائی ڈالنا کے ہیں اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (۱۸۔۱۰۹) اگر چہ ہم ویسا اور سمندر اس کی مدد کو لائیں۔
میں بھی مدد سے مِدَادٌ یعنی روشنائی کے معنی مراد ہیں۔
اَلْمُدُّ: غلہ ناپنے کا ایک مشہور پیمانہ۔

(م د ن)

اَلْمَدِيْنَةُ: بعض کے نزدیک یہ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر ہے اس کی جمع مُدُنٌ آتی ہے ❶۔ اور مَدَنَتْ مَدِيْنَةٌ کے معنی شہر آباد ہونے کے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس میں میم زیادہ (یعنی دین سے مشتق ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾ (۹۔۱۰۱) اور بعض مدینے والے بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔
﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ﴾ (۳۶۔۲۰) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک آدمی...... آیا۔ ﴿وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ﴾ (۲۸۔۱۵) اور وہ شہر میں داخل ہوئے۔

(م ر ر)

اَلْمُرُوْرُ کے معنی کسی چیز کے پاس سے گذر جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ﴾ (۸۳۔۳۰) اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو باہم آنکھوں سے اشارہ کرتے۔
﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (۲۵۔۷۲) اور جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔ نیز آیت کریمہ میں اس بات پر بھی متنبہ کیا ہے کہ اگر انہیں بیہودہ بات کہنے پر مجبور بھی کیا جائے تو کنایہ سے بات کرتے ہیں اور لغویات سن کر اس سے بہرے بن جاتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں تو اعراض کر لیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ﴾ (۱۰۔۱۲) پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں (تو بے لحاظ ہو جاتا اور) اس طرح گذر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ میں مَرَّ بمعنی اَعْرَضَ ہے۔ جیسے فرمایا:۔
﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰبِجَانِبِهٖ﴾ (۱۷۔۸۳) اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو روگردان ہو جاتا اور پہلو پھیر لیتا ہے۔ اَمْرَرْتُ الْحَبْلَ کے معنی رسی بٹنے کے ہیں۔ اور بٹی ہوئی رسی کو مَرِيْرٌ یامُمَرٌّ کہا جاتا ہے اس سے فُلَانٌ ذُوْمِرَّةٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی طاقت ور اور توانا کے ہیں۔ ❷
قرآن پاک میں ہے: ﴿ذُوْمِرَّةٍ﴾ (۵۳۔۶) طاقتور نے۔ مَرَّ الشَّيْءُ وَاَمَرَّ: کسی چیز کا تلخ ہونا۔ اسی سے محاورہ ہے۔
فُلَانٌ مَا يُمِرُّ وَمَا يُحْلِيْ: کہ فلان نہ تو کڑوا ہے اور نہ میٹھا، یعنی نہ تو اس سے کسی کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی

---

❶ وايضا؟
❷ ومنه في الحديث لا تحل الصدقة لغني ولا لذي مرة سوى اخرجه النسائي وابن ماجة من حديث ابي هريرة والفائق (۲/۲۴۴)۔

نقصان اور آیت کریمہ:

﴿حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهٖ﴾ (۷-۱۸۹)

(تو) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔

میں مَرَّتْ بمعنی اِسْتَمَرَّتْ ہے۔ یعنی وہ اسے اٹھائے چلتی پھرتی رہتی ہے۔

مَرَّةٌ (فَعْلَة) ایک بار مَرَّتَانِ (تثنیہ) دوبار قرآن پاک میں ہے:

﴿يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ﴾ (۸-۵۶) پھر ہر بار اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔ ❶

﴿وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۹-۱۳) اور انہوں نے تم سے پہلی بار (عہد شکنی کی) ابتدا کی۔

﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً﴾ (۹-۸۰) اگر آپ ان کے لیے ستر بار بخشش طلب فرمائیں۔ ﴿اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۹-۸۳) تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر رضامند ہوگئے۔

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾ (۹-۱۰۱) ہم ان کو دوبار عذاب دیں گے۔

﴿ثَلَاثَ مَرّٰتٍ﴾ (۲۴-۵۸) تین دفعہ (یعنی تین اوقات میں)۔

(م ر ج)

اصل میں اَلْمَرَجُ کے معنی خلط ملط کرنے اور ملا دینے کے ہیں اور اَلْمُرُوْجُ کے معنی اختلاط اور مل جانے کے۔

مَرِجَ اَمْرُهُمْ: ان کا معاملہ ملتبس ہوگیا۔

مَرِجَ الْخَاتَمُ فِیْ اَصْبُعِیْ: انگوٹھی انگلی میں ڈھیلی ہوگئی مَارِجٌ (صفت فاعلی) ڈھیلی انگوٹھی۔ اَمْرٌ مَرِيْجٌ گڈمڈ اور پیچیدہ معاملہ۔ غُصْنٌ مَّرِيْجٌ: باہم گتھی ہوئی ٹہنی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَهُمْ فِیْۤ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ﴾ (سو یہ) ایک غیر واضح معاملہ میں ہیں۔

اَلْمَرْجَانُ: مونگا۔ چھوٹا موتی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ (۵۵-۵۸) اور آیت کریمہ:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ﴾ (۵۵-۱۹) اس نے دو دریا رواں کے جو آپس میں ملتے ہیں۔

میں مَرَجٌ کا لفظ مَرَج ❷ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور جس زمین میں گھاس بکثرت ہو اور جانور اس میں مگن ہو کر چرتے رہیں اسے مَرَجٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (۵۵-۱۵) آگ کے شعلے سے۔ میں مَارِجٌ کے معنی آگ کے (دھوئیں سے) مخلوط شعلے کے ہیں۔

اَمْرَجْتُ الدَّابَّةَ فِی الْمَرْعٰی: میں نے جانور کو چراگاہ میں کھلا چھوڑ دیا چنانچہ وہ آزادی سے چرتا رہا۔

(م ر ح)

اَلْمَرَحُ کے معنی ہیں: بہت زیادہ اور شدت کی خوشی جس میں انسان اترانے لگ جائے، قرآن پاک میں ہے:

---

❶ وفی المطبوع "فی کل عام مرة" زلة من المصحح وهی آیة اخری: یفتنون فی کل عام مرة او مرتین۔ (۹-۱۲۶) ۱۲۔

❷ وفی الطبعة الاولی کان ههنا بیاض وفی الطبعة الحلبیه (تحقیق وضبط محمد سعید کیلانی) من قولهم مرج ولم یترك الفراغ فخلط علی خلط والصواب من قولهم مرج الدابة اذا اخلاها فی المرج ترعی (راجع الغریب للقبتی ۴۳۸) وفی اللسان وهذا لایقوله الا اهل تهامة واما النحویون فیقولون امرجته ۱۲۔

﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ (۱۷۔۳۷) اور زمین پر اکڑ کر (اور اتھلا کر) مت چل۔
اس میں ایک قرأت مَرِحًا بمعنی فَرِحًا بھی ہے۔
مَرْحٰی: یہ کلمہ تعجب ہے (اور اَحْسَنْتَ یا اَصَبْتَ کی جگہ استعمال ہوتا ہے) یعنی خوب کیا کہنے ہیں!۔

(م ر د)

اَلْمَارِدُ وَالْمَرِیْدُ: جنوں اور انسانوں سے اس شیطان کو کہا جاتا ہے جو ہر قسم کی خیر سے عاری ہو چکا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَحِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ﴾ (۳۷۔۷) اور ہر شیطان سرکش سے اس کی حفاظت کے لیے۔
یہ شَجَرٌ اَمْرَدُ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں: وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں۔ اور اسی سے رَمْلَةٌ مَّرْدَاءُ ہے یعنی ریت کا ٹیلہ جس پر کوئی چیز نہ اگتی ہو اور اس سے اَمْرَدُ اس نوجوان کو کہتے ہیں جس کے ہنوز سبزہ نہ اگا ہو۔
حدیث میں ہے ❶ (۱۲۰)
((اَهْلُ الْجَنَّةِ کُلُّهُمْ مُرْدٌ)) کہ اہل جنت سب کے سب امرد ہوں گے۔ چنانچہ بعض نے اس حدیث کو ظاہری معنی پر ہی حمل کیا ہے۔ اور بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ ہر قسم کے عیوب سے پاک ہوں گے۔
جیسے محاورہ ہے:۔
مَرَدَ فُلَانٌ عَنِ الْقَبَائِحِ فلاں ہر قسم کی قباحت سے پاک ہے۔
مَرَدَ فُلَانٌ عَنِ الْمَحَاسِنِ وہ محاسن سے عاری ہے
مَرَدَ عَنِ الطَّاعَةِ: سرکشی کرنا۔ پس آیت کریمہ: وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ کے معنی یہ ہیں۔ کہ اہل مدینہ سے بعض لوگ...... نفاق پر اڑ کر ہر قسم کی خیر سے محروم ہو گئے ہیں۔ ❷ اور آیت کریمہ:۔
﴿مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ﴾ (۲۷۔۴۴) شیشے جڑے ہونے کی وجہ سے ہموار۔
میں مُمَرَّدٌ کے معنی ہموار یا چکنا کیا ہوا کے ہیں۔ اور یہ شَجَرَةٌ مَّرْدَاءُ سے ماخوذ ہے۔ گویا مُمَرَّدٌ کے لفظ سے اس کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے یوں بیان کیا ہے ❸ (سریع)

(۴۰۲) فِیْ مَجْدَلٍ شُیِّدَ بُنْیَانُهٗ
یَزِلُّ عَنْهُ ظُفُرُ الطَّائِرِ

ایک مضبوط محل میں جس پر ایسا پلاسٹر لگایا گیا ہے کہ اس سے پرند کے ناخن بھی پھسل جاتے ہیں۔

---

❶ رواه الدارمی (۲/۳۳۵) والحدیث فی النهایة (۱/۱۸۱ و ۴/۱۰) الاضداد لابی الطیب (۱۶۲) وفی الکشاف: یدخل اهل الجنة الجنة جردا مردا۔ قال الحافظ فی الکافی (ص۱۶۳ رقم ۷۶) رواه احمد وابن ابی شیبة وابو یعلی الطبرانی فی الاوسط من روایة سعید بن المسیب عن ابی هریرة وروی مرسلا قال الترمذی وفی الباب عن معاذ بن جبل وروی مرسلا وفی البیهقی موصلا: ۱۲۔

❷ "ومرد علی" یاتی بمعنی التمرن والتعود علی الشیء لکن علی توجیه المؤلف تکون صلته، محذوفة وعلی النفاق حال ای ارتکسوا عن الخیر وهم علی النفاق ۱۲۔

❸ البیت من قصیدة لاعشی یهجو علقمة بن علاثة ویمدح عامر بن الطفیل فی المنافرة التی جرت بینهما والقصیدة فی بوانه (۹۲۔۹۶) والبیت فیه ۹۶ واللسان (شید، جدل) وفی روایة شدد بدل شید والبلدان (رسم: وسط) وفیه منزل بدل مجدل والمراء حصن الورد وفی المطبوع الظافر بدل الطائر ولعلم زلة من المصحح وما اثبتناه طبقا للمراجع هوالا نسب ۱۲۔

مَارِدُ ایک مشہور قلعے کا نام ہے۔ ❶ مثل مشہور ہے تَمَرَّدَ مَارِدٌ وَعَزَّ الْاَبْلَقُ: مارد (قلعہ) نے سرکشی کی اور ابلق (قلعہ) غالب رہا۔ یعنی یہ دونوں قلعے سر نہ ہو سکے۔ یہ مقولہ ایک بادشاہ کا ہے جو ان دونوں قلعوں کو زیر نہیں کر سکا تھا۔

(م ر ض)

اَلْمَرَضُ کے معنی ہیں انسان کے مزاج خصوصی کا اعتدال اور توازن کی حد سے نکل جانا اور یہ دو قسم پر ہے مرض (۱) جسمانی جیسے فرمایا:

﴿وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ (۲۴۔۹۱) اور نہ بیمار پر کچھ گناہ ہے۔

﴿وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى﴾ (۹۔۹۱) اور نہ بیماروں پر۔

دوم (۲) مرض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بولا جاتا ہے اور اس سے جہالت بزدلی، بخل، نفاق وغیرہ جیسے اخلاق رذیلہ مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ان کے دلوں میں کفر کا مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔ (۲۔۱۰) ﴿اَفِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا﴾ (۲۴۔۵۰) کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ شک میں ہیں۔ ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ﴾ (۹۔۱۲۵) اور جن کے دلوں میں مرض ہے۔ ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا﴾ (۵۔۶۴) اور یہ (قرآن پاک) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس سے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر بڑھے گا۔

اور نفاق، کفر وغیرہ اخلاق رذیلہ و (مجازاً بطور تشبیہ مرض کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لیے کہ اس قسم کے اخلاق کسب فضائل سے مانع بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ بیماری جسم کو کامل تصرف سے روک دیتی ہے۔ اور یا اس لیے کہ اخروی زندگی سے محرومی کا سبب بنتے ہیں۔

جس قسم کی زندگی کا کہ آیت کریمہ:

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۹۔۶۴) اور ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے کاش کہ یہ لوگ سمجھتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یا رذائل کو اس لیے مرض کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی طبیعت کو ردی اخلاق کی طرف مائل کر دیتے ہیں جیسا کہ بیماری جسم کو مضر اشیاء کے کھانے پر اکساتی ہے اور چونکہ ایسے اخلاق بھی ایک طرح کا مرض ہی ہیں اس لیے قلب وصدر میں کینہ وکدورت پیدا ہونے کے لیے دَوِیَ صَدْرُ فُلَانٍ وَنَغِلَ قَلْبُهٗ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں ایک حدیث میں ہے: ❷ (۱۲۱)

((وَاَیُّ دَاءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ)) اور بخل سے بڑھ کر اور کونسی بیماری ہوسکتی ہے۔

اور شَمْسٌ مَرِيْضَةٌ اس وقت کہتے ہیں، جب گرد وغبار یا

---

❶ قالته زباء والابلق المارد و كانا حصنين فى دومة الجندل للسموءل بن عاديا ليهودى فعزتها زباء فاستصعبا عليها فقالت المثل انظر المثل والخبر الميدانى رقم (۲۵۹۶) والبلدان (رسم: مارد) والحيوان (۱/۷۲)

❷ قاله ابوبكر الصديق مخاطبا جابر بن عبدالله حين عيره بالبخل فى حديث طويل او ر دهٗ البخارى فى كتاب الكفالة والشهادات وفى فرض الخمس وفى المغازى (الفتح ۸/۷۸) ۱۲

کسی اور عاضہ سے اس کی روشنی ماند پڑ جائے۔ اَمْرَضَ فُلَانٌ فِیْ قَوْلِہٖ کے معنی تعریض اور کنایہ سے بات کرنے کے ہیں۔

اَلتَّمْرِیْضُ: تیمارداری کرنا۔ اصل میں تَمْرِیْض کے معنی مرض کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ...... تَقْذِیَۃٌ کی طرح ہے جس کے معنی آنکھ سے خاشاک دور کرنا کے ہیں۔

(م ر ء)

مَرْءٌ وَامْرُءٌ: مرد اور مَرْءَۃٌ وَامْرَءَۃٌ کے معنی عورت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنِ امْرُؤٌ ھَلَكَ﴾ (۴۔۱۷۶) اگر کوئی ایسا مرد مر جائے ﴿وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا﴾ (۱۹۔۵) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

اور مُرُوْءَۃ کے معنی کمال مردانگی کے ہیں اور یہ لفظ رَجُوْلِیَّۃ کے ہم معنی ہے۔ اور اَلْمَرِیُٔ اس نالی کو کہتے ہیں۔ جو معدہ کے سرے سے حلق تک ملی ہوتی ہے۔ اسی سے مَرُؤَ الطَّعَامُ وَاَمْرَءَ کے معنی ہیں: کھانا خوشگوار ہو گیا اور طبیعت کے موافق ہونے کی وجہ سے غذا کی نالی میں بسہولت اتر گیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ (۴۔۴) تو اسے کھالو لذیذ اور خوش ہضم۔

(م ر ی)

اَلْمِرْیَۃُ کے معنی کسی معاملہ میں تردد کرنے کے ہیں اور یہ شک سے خاص ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ﴾ (۲۲۔۵۵) اور کافر لوگ ہمیشہ اس سے شک میں رہیں گے۔

﴿فَلَاتَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ﴾ (۱۱۔۱۰۹) تو یہ لوگ جو غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اس سے تم خلجان میں نہ پڑنا۔

﴿فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ﴾ (۳۲۔۲۳) تو تم اس کے ملنے سے شک میں نہ ہونا۔

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ﴾ (۴۱۔۵۴) دیکھو! یہ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے سے شک میں ہیں۔

اَلْاِمْرَاءُ وَالْمُمَارَاۃُ کے معنی ایسے کام میں جھگڑا کرنا کے ہیں۔ جس کے تسلیم کرنے میں تردد ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ﴾ (۱۹۔۳۴) یہ سچی بات ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔ ﴿بِمَا كَانُوْا فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ﴾ (۱۵۔۶۳) جس میں لوگ شک کرتے تھے۔

﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی﴾ (۵۳۔۱۲) کیا جو کچھ وہ دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو۔

﴿فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا﴾ (۱۸۔۲۲) تو تم ان کے معاملے میں گفتگو نہ کرنا۔ مگر سرسری سی گفتگو۔

دراصل مَرَیْتُ النَّاقَۃَ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں: اونٹنی کے تھنوں کو سہلانا تاکہ دودھ دے دے۔

(مَرْیَمُ) علیہا السلام۔ یہ عجمی لفظ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام (قرآن پاک نے) ﴿مَرْيَمُ﴾ (۳۔۴۵) بتایا ہے۔

(م ز ن)

اَلْمُزْن کے معنی سفید چمک دار بادل ہیں۔ اس بادل کے ایک ٹکڑے کو مُزْنَۃٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک

میں ہے:

﴿ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ﴾ کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا یا ہم نازل کرتے ہیں۔

اِبْنُ مُزْنَةٍ: ماہ نو جو بادل سے نمودار ہو۔

فُلَانٌ يَتَمَزَّنُ کے معنی ہیں: فلاں بادل کی طرح سخاوت کرتا ہے یعنی بتکلف سخاوت کرتا ہے۔ مَزَّنْتُ فُلَانًا میں نے اسے بادل کے ساتھ تشبیہ دی اور مَازِنٌ چیونٹی کے انڈوں کو کہتے ہیں۔

(م ز ج)

مَزَجَ الشَّرَابَ کے معنی شراب میں کوئی چیز ملا دینا کے ہیں۔ اور جو چیز شراب میں ملائی جائے اسے مِزَاجٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿مِزَاجُهَا كَافُوْرًا﴾ (۷۶۔۵) جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔

﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ﴾ (۸۳۔۲۷) اور اس میں تسنیم کے پانی کی آمیزش ہوگی۔

﴿مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا﴾ (۷۶۔۷) جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔

(م س س)

اَلْمَسُّ کے معنی چھونا کے ہیں اور یہ لَمْسٌ کے ہم معنی ہیں لیکن گاہے لَمْسٌ کسی چیز کی تلاش کرنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں وہ چیز مل بھی جائے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (رجز والوافر)

(۴۰۷) وَاَلْمِسُهٗ فَلَا اَجِدُهٗ

میں اسے تلاش کرتا ہوں لیکن وہ نہیں ملتا۔ مگر مس کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب ''حاسہ لمس'' کے ساتھ اس کا ادراک بھی ہو۔ اور کنایۃً مجامعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مَسَّ الْمَرْأَةَ وَ مَاسَّهَا کے معنی عورت سے مجامعت کے ہیں۔ اور قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ (۲۔۲۳۶) اور اگر تم عورتوں کو ان سے مجامعت سے پہلے طلاق دے دو۔

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ (۲۔۲۳۶) اور اگر تم عورتوں کو ان سے مجامعت سے پہلے طلاق دے دو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔

ایک قرأت میں مَالَمْ تُمَاسُّوْهُنَّ ہے۔ ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ﴾ (۳۔۴۷) میرے ہاں بچہ کیوں کر ہوگا حالانکہ کسی نے مجھے ہاتھ تو لگایا نہیں۔

اور کنایۃً مَسِيْسٌ مجامعت کو کہتے ہیں اور مجازاً مَسٌّ کا اطلاق جنون پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (۲۔۲۷۵) جیسا کہ کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔

اور مَسٌّ کا لفظ ہر اس تکلیف کے لیے بول دیا جاتا ہے۔ جو انسان کو پہنچے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ﴾ (۲۔۸۰) اور کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں...... چھو ہی نہیں سکے گی۔

﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ﴾ (۲۔۲۱۴) ان کو بڑی بڑی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں۔ ﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ (۵۴۔۴۸) (اب) آگ کا مزہ چکھو۔

﴿مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾ (۲۱۔۸۳) کہ مجھے ایذا ہو رہی ہے ﴿مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ﴾ (۳۸۔۴۱) شیطان نے مجھ کو

---

[1] قائلہ اعرابی وقد مر فی (ل م س)

اذیت دے رکھی ہے۔
﴿مَّسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِىْ اٰيَاتِنَا﴾ (۱۰۔۲۱) تکلیف پہنچنے کے بعد تو ہماری آیتوں میں حیلے کرنے لگتے ہیں۔
﴿وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ﴾ (۱۷۔۶۷) اور جب تم کو تکلیف پہنچتی ہے۔...........

(م س ح)

اَلْـمَسْـحُ (ف) کے معنی کسی چیز پر ہاتھ پھیرنے اور اس سے نشان اور آلائش صاف کر دینے کے ہیں اور کبھی صرف کسی چیز پر ہاتھ پھیرنا اور کبھی ازالہ اثر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
مَسَحْتُ يَدِىْ بِالْمِنْدِيْلِ: میں نے رومال سے ہاتھ پونچھا اور گھسے ہوئے چکنے درھم (سکے) کو مَسِيْحٌ کہا جاتا ہے اور ہموار اور چکنی جگہ کو مکان اَمْسَحُ کہہ دیتے ہیں۔
مَسَحَ الْاَرْضَ: اس نے زمین کی پیمائش کی۔ پھر جس طرح (مجازاً) ذَرْعٌ (ناپنا) کے معنی چلنا اور مسافت طے کرنا آجاتے ہیں۔ اسی طرح مَسْحٌ کا لفظ بھی چلنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
مَسَحَ الْبَعِيْرُ الْمَفَازَةَ وَذَرَعَهَا: اونٹ نے بیابان کو عبور کیا۔ اصطلاح شریعت میں مَسْحٌ کے معنی اعضاء پر پانی گزارنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
مَسَحْتُ لِلصَّلٰوةِ وَتَمَسَّحْتُ: میں نے نماز کے لیے مسح کیا۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ﴾ (۵۔۶) اور سر کا مسح کر لیا کرو اور پاؤں دھو لیا کرو۔ اور کبھی مَسِسْتُ کی طرح مَسَحْتُهٗ بِالسَّيْفِ کے معنی بھی تلوار سے مارنا کے آجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:[1]
﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾ (۳۸۔۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ بعض نے کہا ہے کہ دجال کا نام مَسِيْحٌ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کے چہرے کی ایک جانب مسخ ہو چکی ہو گی۔ چنانچہ مروی ہے انه لا عين له ولا حاجب کہ اس کے ایک جانب کی آنکھ اور بھویں کا نشان تک نہیں ہوگا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ زمین میں سیاحت کرتے تھے۔ اور ان کے زمانہ میں ایک گروہ تھا۔ جنہیں زمین میں سیاحت کی وجہ سے مَشَّائِيْنَ اور سَيَّاحِيْنَ کہا جاتا تھا بعض کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے مس کرنے سے چونکہ کوڑھی تندرست ہو جاتے تھے۔ اس لیے آپ علیہ السلام کو مسیح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بطن مادر سے پیدا ہوئے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بدن پر تیل کی مالش کی گئی ہے۔ اس لیے انہیں مسیح کہا گیا ہے۔
بعض کا قول ہے کہ یہ عبرانی لفظ مشوح سے معرب ہے جیسا کہ موسیٰ عبرانی لفظ موشیٰ سے معرب ہے (:۔) بعض کا قول ہے کہ مسیح اسے کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ مٹی ہوئی ہو اور مروی ہے[2] ان الدجال ممسوح اليمنى

---

[1] روى ذالك عن ابن عباس وقتادة ومقاتل وغيرهم واختاره الزمخشرى لكن الرازى ذهب الى ان المراد منه المسح باليد لا بالسيف وهذا اقرب وقد حقق الآلوسى البحث ورد المعنى الاول ردا بليغا (راجع ۲۳/۱۷۵۔۱۷۹) وقارن القبتى ۳۷۹ والطبرى ۲۳/۱۰۰ والقرطبى ۲۳/۱۹۵ والبحر ۷/۳۹۶ واللدر ۲۰۹۔

[2] قد ذكر هذه الاقوال ابن الاثير فى النهايه (مسح) ۱۲۔

وان عیسی ممسوح الیسری کہ دجال کی دائیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بائیں آنکھ مٹی ہوئی ہوگی۔اس کے معنی یہ ہیں کہ دجال علم وعقل، حلم اور دیگر اخلاق جمیلہ سے کلیۃ محروم ہوگا اس کے برعکس عیسیٰ علیہ السلام کی بائیں آنکھ مٹنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہالت، حرص اور دیگر اخلاق مذمومہ سے پاک تھے۔

پھر جس طرح مَسٌّ اور لَمْسٌ کے الفاظ کنایۃً مجامعت کے لیے آجاتے ہیں۔اسی طرح مَسْحٌ بھی مجامعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔معمولی پسینے پر بھی مَسِیْحٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔اور مِسْحٌ ٹاٹ کو کہتے ہیں۔اس کی جمع مُسُوْحٌ و اَمْسَاحٌ آتی ہے۔اَلتِّمْسَاحُ مگرمچھ کو کہتے ہیں اور تشبیہ کے طور پر سرکش آدمی کو بھی تِمْسَاحٌ کہہ دیتے ہیں۔

(م س خ)

اَلْمَسْخُ: کے معنی شکل وصورت بگاڑ دینا اور اخلاق وعادات خراب کر دینا کے ہیں۔بعض حکماء نے کہا ہے کہ مسخ دوقسم پر ہے ایک مسخ خاص یعنی شکل وصورت بگاڑنا یہ خاص قوم کے ساتھ خاص دور میں ہوا تھا دوم مسخ عام یعنی اخلاق وعادات کا بگاڑنا یہ ہر دور میں ہوسکتا ہے کہ انسان جانوروں کے سے اخلاق اختیار کرلے مثلاً اس کے اندر کتے کی سی شدت حرص پیدا ہو جائے یا خنزیر کی طرح جنسی خواہش میں اندھا ہو جائے یا بیل کی سی حماقت اختیار کرے۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ﴾ (۵-۶۰)

اور ان میں سے بندر اور سور بنا دیئے۔

کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے۔کہ یہاں بندر اور خنزیر بنا دینے سے ان کے اخلاق وعادات بگاڑ دینا مراد ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَكَانَتِهِمْ﴾ (۳۶-۶۷) تو ان کی جگہ ان کی صورتیں بدل دیں۔

میں مسخ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔اگرچہ پہلے معنی زیادہ واضح ہیں۔ [1] اور اَلْمَسِيْخُ وہ کھانا جو بے مزہ ہو۔چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ [2] (المتقارب)

(۴۰۸) وَاَنْتَ مَسِيْخٌ كَلَحْمِ الْحُوَارِ

اور تو حوار یعنی اونٹ کے نوزائیدہ بچے کے گوشت کی طرح بے مزہ ہے۔

مَسَخْتُ النَّاقَةَ: میں نے ناقہ کو دبلا کر کے اس کی شکل بگاڑ دی۔

اَلْمَاسِخِيُّ کے معنی کمان ساز کے ہیں یہ مَاسِخَةٌ قبیلہ کی طرف منسوب ہے۔جو کمانیں بنایا کرتا تھا پھر ہر کمان

---

[1] ذهب الى الاول ابن عباس وايضا روى عنه ان المسخ بمعنى الهلاكة (روح المعانى ۲۳/۴۲)

[2] البيت لاشعر الرقبان الاسدى الجاهلى (اسمه عمرو بن حارثه) يهجو رجلا اسمه رضوان وكان نزل به فلم يقره (ترجمة فى المرزبانى ۱۹) وتمامه: فلا انت حلو ولامر وفى رواية الامالى (۲/۲۱۱) سيلخ ميلخ وفى اللسان مسيخ مليخ بدل وانت مسيخ راجع اللسان والتاج (ضرر، مسخ) ومجالس ثعلب (۱: ۱۹۸) والمسط (۲: ۸۳) وما ذكره المولف رواية ابى زيد فى النوادر (۷۳) والبيت فى الميدان (۲: ۲۳۴، ۱۸۶، ۲۵۱) و المؤتلف (۴۷، ۱۳۳) والجمهرة (۲: ۲۱۱، ۲۵۱) والمرزبانى ۱۹ والمخصص (۵: ۱۱/۱۴: ۳۸) وكتاب الابدال (۳۵۰) ومحاضرات المؤلف (۱/۳۱۳) والحيوان للجاحظ (۱: ۳۰۱) وتهذيب الالفاظ والابيات ستة وفى المؤتلف (۳۰) والمعجم للمرزبانى (۳۵) فى رواية ثعلب عزاه الى عمرو بن ثعلبة الشيانى وهو شاعر جاهلى خبيث۔

سازکو ماتحی (منسوبا) کہا جانے لگا ہے۔جیسا کہ ہر آہنگر کو ھَالِکِیٌّ کہا جاتا ہے۔

(م س د)

اَلْمَسَدُ: کھجور کے درخت کی پتے نکالی ہوئی شاخوں کا ریشہ، جسے بٹ کر رسی بنائی جاتی ہے [1] قرآن پاک میں ہے:۔

﴿حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ (۱۱۱۔۵) یعنی کھجور کے پٹھوں سے بٹی ہوئی رسی۔

اِمْرَءَةٌ مَّمْسُوْدَةٌ: بٹی ہوئی رسی کی طرح گتھے ہوئے گوشت والی (اور معتدل قامت) عورت۔

(م س ک)

اِمْسَاكُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز سے چمٹ جانا اور اس کی حفاظت کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ (۲۔۲۲۹) پھر (عورت کو) یا تو بطریق شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

﴿وَیُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَے الْاَرْضِ﴾ (۲۲۔۶۵) اور وہ آسمان کو تھامے رہتا ہے کہ زمین پر نہ گر پڑے۔

اِسْتَمْسَكْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو پکڑنے اور تھامنے کا ارادہ کرنا کے ہیں۔جیسے فرمایا:﴿فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ﴾ (۴۳۔۴۳) پس تمہاری طرف جو وحی کی گئی ہے اسے مضبوط پکڑے رہو۔

﴿اَمْ آتَیْنَاهُمْ كِتٰبًا مِنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ﴾ (۴۳۔۲۱) یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی تو یہ اس سے (سند) پکڑتے ہیں۔

محاورہ ہے۔

تَمَسَّكْتُ بِهٖ وَمَسَكْتُ بِهٖ: کسی چیز کو پکڑنا اور تھام لینا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ (۶۰۔۱۰) اور کافر عورتوں کی ناموس قبضے میں نہ رکھو (یعنی کفار کو واپس دے دو۔

اَمْسَكْتُ عَنْهُ كَذَا: کسی سے کوئی چیز روک لینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ﴾ (۳۹۔۳۸) تو وہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں۔

اور کنایہ کے طور پر امساک بمعنی بخل بھی آتا ہے اور مُسْكَةٌ مِّنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ: اس قدر کھانے یا پینے کو کہتے ہیں جس سے سدرمق ہو سکے۔

اَلْمَسَكُ: (چوڑا) ہاتھی دانت کا بنا ہوا زیور جو عورتیں کلائی میں پہنتی ہیں۔اَلْمَسْكُ: کھال جو بدن کے ڈھانچے کو تھامے رہتی ہے۔

(م ش ج)

اَلْمَشِیْجُ: مخلوط شے۔ج اَمْشَاج قرآن پاک میں ہے ﴿اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ﴾ (۷۶۔۲) (نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں۔

یعنی خون کی مختلف خلطوں سے اور مختلف خلطوں سے

---

[1] کذا ذکرہ القبتی فی غریبہ (۵۴۲) وقال عروۃ بن الزبیر ھوا السلسلۃ التی ذکرھا اللہ تعالیٰ فی سورۃ الحاقۃ (۳۲) انظر الطبری (۳۰/۳۴۰) وروی عن مجاھد سفیان انظر المشکل (۱۲۳۔ ۱۲۲) فیہ، کذالك قال ابن عباس۔

مختلف قویٰ مراد ہیں۔ ❶ جن کی طرف کہ آیت ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ اِلٰی قَوْلِهٖ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ (۲۳۔۱۲) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

(م ش ی)

اَلْمَشْیُ: (ض) کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف قصد اور ارادہ کے ساتھ منتقل ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ﴾ (۲۔۲۰) جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَّمْشِي عَلٰى بَطْنِهِ الایة﴾ (۲۴۔۴۵) ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔

﴿يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲۵۔۶۳) جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

﴿فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا﴾ (۶۷۔۱۵) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور کنایۃ مَشْیٌ کا لفظ کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ (۶۸۔۱۱) طعن آمیز اشارتیں کرنے والا چغلیاں لیے پھرنے والا۔

اور کنایۃ کے طور پر مَشْیٌ کے معنی مسہل پینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

شَرِبْتُ مَشْيًا وَمَشْوًا: میں نے مسہل دوا پی۔ اَلْمَاشِيَةُ: مویشی یعنی بھیڑ بکری کے ریوڑ کو کہتے ہیں۔ اور اِمْرَاَةٌ مَّاشِيَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے بہت ہوں۔

(م ص ر)

اَلْمِصْرُ: ہر محدود شہر کو (جس کے گرد فصیل ہو) مصر کہتے ہیں۔ اور مَصَّرْتُ مِصْرًا کے معنی شہر آباد کرنے کے ہیں۔ دراصل مِصْرٌ دو چیزوں کے مابین حد کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہجر شہر میں مکانات کے بیع ناموں کی شروط میں یہ الفاظ خاص طور پر لکھے جاتے تھے۔

اِشْتَرٰى فُلَانٌ الدَّارَ بِمُصُوْرِهَا: فلاں نے یہ مکان اس کی حدود (اربعہ) کے ساتھ خرید کیا۔ اور کسی شاعر نے کہا ہے ❷ (البسیط)

(۴۰۹) وَجَاعِلُ الشَّمْسِ مِصْرًا لَاخَفَاءَ بِهٖ
بَيْنَ النَّهَارِ وَبَيْنَ اللَّيْلِ قَدْ فَصَلَا

(بلاشبہ) اللہ تعالیٰ نے سورج کو رات اور دن کے درمیان حد فاصل بنا رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿اُدْخُلُوْا مِصْرَ﴾ (۱۲۔۹۹) مصر میں داخل ہو جاؤ۔

میں مصر سے مشہور شہر مصر مراد ہے۔ اور تخفیف کے طور پر اسے منصرف کر دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے کوئی ایک شہر مراد ہے۔ ❸

اَلْمَاصِرُ: دو پانیوں کے درمیان حد فاصل۔ مَصَرْتُ

---

❶ وفی غریب القبتی (۵۰۲): یرید اختلاط ماء الرجل بماء المرئة وکذا قال قال ابن عباس وغیره علی ما فی الفخر (۲۹۱/۲۹) والطبرانی (۱۲۶/۲۹) وانظر احکام شافعی (۱۸۸/۲۔۱۸۹)

❷ وفی اللسان قال امیة یذکر حکمة الخالق وقال ابن البری البیت لعدی بن زید العبادی وهو الصواب راجع تفسیر الطبری (۱: ۷۱) والخفاجی شرح الدرة (۹٤) والبیت ایضا فی البحر (۱: ۲۲۰/۱: ٤٥٥)

❸ والیه ذهب عامة المفسرین وحکی عن مالك انه مصر مسکن فرعون وفی مصحف عبدالله بن مسعود بلا الف ولام یؤید ذالك (روح المعانی ۱: ۲۵۰)

النَّاقَةَ کے معنی اونٹنی کو انگلیوں کے اطراف سے دوہنا کے ہیں۔اسی سے محاورہ ہے۔لَهُمْ غَلَّةٌ يَمْتَصِرُوْنَهَا۔ ان کے پاس کچھ غلہ ہے۔ جسے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے استعمال کرتے ہیں۔ثوب مُمَصَّرٌ: (گیرو سے رنگا ہوا کپڑا) گہرا رنگا ہوا کپڑا۔

نَاقَةٌ مَصُورٌ کم اور بمشکل دودھ دینے والی اونٹنی۔

حسن نے کہا ہے لا بَاْسَ بِكَسْبِ التَّيَّاسِ مَالَمْ يَمْصُرْ وَلَمْ يَبْسُرْ: کہ سانڈ والے کی کمائی میں کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ انگلیوں سے نہ نچوڑے۔اور نہ ہی مادہ کی خواہش کے بغیر نر سانڈ اس سے جفتی کھائے۔

اَلْمَصِيْرُ: آنت۔ج مُصْرَانٌ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صَار سے مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم ظرف ہے۔اور آنت کو مَصِيْرٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ طعام کی قرارگاہ بنتی ہے۔

(م ص غ)

اَلْمُضْغَةُ: گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا جو چبانے کے لیے منہ میں ڈالا جاسکے۔شاعر نے کہا ہے ❶ (الوافر)

(۴۱۰) يُلَجْلِجُ مُضْغَةً فِيْهَا اَنِيْضٌ

وہ گویا نیم پختہ گوشت کی بوٹی کو منہ میں پھراتا ہے۔پھر جنین کی اس حالت کو جو علقہ کے بعد ہوتی ہے۔

مضغۃ۔کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا﴾ (۲۳۔۱۴) اور لوتھڑے کی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔اور فرمایا: ﴿مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ (۲۲۔۵) بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی۔

اَلْمُضَاغَةُ: چبانے سے جو آخرکار منہ میں باقی رہ جائے۔

اَلْمَاضِغَان: دونوں جبڑے۔کیونکہ ان سے کھانا چبایا جاتا ہے۔اَلْمَضَائِغُ: (واحد مَضِيْغَةٌ) وہ تانت جو کمان کے دونوں سروں پر کسی ہوتی ہیں۔

(م ض ی)

اَلْمُضِيُّ وَالْمَضَاءُ: کسی چیز کا گذر جانا اور چلے جانا یہ اعیان واحداث دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہیں۔

﴿وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۴۳۔۸) اور اگلے لوگوں کی مثال گذر گئی۔

﴿فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۸۔۳۹) تو اگلے لوگوں کی سنت گذر چکی ہے (وہی ان کے حق میں برتی جائے گی۔

(م ط ر)

اَلْمَطَرُ کے معنی بارش کے ہیں اور جس دن بارش برسی ہو اسے يَوْمٌ مَّطِيْرٌ وَمَاطِرٌ وَمُمْطِرٌ کہتے ہیں۔وَادٍ مَطِيْرٌ باراں رسیدہ وادی۔مَطَرَتْنَا السَّمَآءُ وَاَمْطَرَتْنَا کے معنی بارش برسنا کے ہیں۔

مَا مُطِرْتُ مِنْهُ بِخَيْرٍ: مرا از وخیرے نہ رسید۔بعض نے کہا ہے کہ مَطَرَ اچھی اور خوشگوار بارش کے لیے بولتے ہیں اور اَمْطَرَ عذاب کی بارش کے لیے ❷ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ قاله زبير و قد مر فى (لجج)

❷ الفرق منقول عن ابى عبيدة وعلماء اللغة وذكره الحريرى فى الدرة وعزاه الى بعض علماء التفسير ورده فى الكشاف والخفاجى فى الدرة (۲۳) اذا لواقع فى القرآن اتفاقا لا وضعًا۔

﴿وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۷۳) اور ان پر ایک بارش برسائی سو جو بارش ان (لوگوں) پر برسی جوڈرائے گئے تھے بری تھی۔

﴿وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ (۷۔۸۴) اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی۔ سو دیکھ لو کہ گنہگاروں کا کیسا انجام ہوا۔

﴿وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً﴾ (۱۵۔۷۴) اور ان پر (کھنگر کی) پتھریاں برسائیں۔

﴿فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۸۔۳۲) تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔

مَطَّرَ وَتَمَطَّرَ کے معنی بارش کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ زمین پر چلے جانے کے ہیں۔ چنانچہ باراں کی رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ مُّتَمَطِّرٌ کہا جاتا ہے: اَلْمُسْتَمْطِرُ: بارش طلب کرنے والا، کھلا میدان جہاں بارش سے کوئی روک نہ ہو۔ اور کنایہ کے طور پر طالب خیر یعنی سائل کو مُسْتَمْطِرٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے (المتقارب)

(۴۱۱) فَوَادٍ خِطَاءٌ وَوَادٍ مَطِرٌ

ایک وادی میں وہ قدم یعنی آہستہ چلتا ہے اور دوسری میں بارش کی طرح دوڑتا ہے۔

(م ط ی)

اَلتَّمَطِّيْ (تفعل) اس کے اصل معنی اَلْمَطَا (پیٹھ) کو بڑھانے اور لمبا کرنے کے ہیں (جیسا کہ انگڑائی لیتے وقت انسان کرتا ہے۔ اور کنایہ کے طور پر اکڑ کر چلنے کے معنی میں آتا ہے) قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى﴾ (۷۵۔۳۳) پھر اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا چل دیا۔

اَلْمَطِيَّةُ: وہ اونٹ جس کی اَلْمَطَا یعنی پیٹھ پر سواری کی جاتی ہے اور اِمْتَطَيْتُهٗ: (افتعال) کے معنی ہیں: میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوا اسی سے مجازاً اس رفیق کو جس پر انسان کو پورا بھروسہ ہو مِطًى کہا جاتا ہے جیسے ظَهْرٌ

(مع)

مَعَ: اجتماع کے معنی کو چاہتا ہے۔ خواہ وہ اجتماع مکانی ہو جیسے هُمَا مَعًا فِي الدَّارِ: وہ دونوں ایک مکان میں ہیں۔ اور خواہ (۲) زمانی جیسے: هُمَا وُلِدَ امَعًا وہ دونوں ایک وقت میں پیدا ہوئے۔

اور (۳) خواہ معنوی اعتبار سے ہو جیسے: اَخٌ یا اَبٌ وغیرہما اسمائے اضافی ہیں کہ ایک آدمی کو اسی وقت دوسرے کا بھائی کہا جاسکتا ہے۔ جب وہ بھی اس کا بھائی ہو۔

کبھی (۴) وہ اجتماع رتبہ اور شرف کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے هُمَا مَعًا فِي الْعُلُوِّ وہ دونوں بلند رتبہ ہونے میں برابر ہیں۔

اور کبھی مَعَ کا لفظ معنی نصرت کو چاہتا ہے۔ اس وقت یہ منصور یعنی جس کی مدد کی جاتی ہے۔ اس کا مضاف الیہ بنتا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (۹۔۴۰) کہ غم نہ کر، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

تو یہاں مَعَ کے مضاف الیہ یعنی نا ضمیر سے منصور مراد ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ناصر ہے۔ جس کی معیت نا ضمیر کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ نیز فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ (۱۶۔۱۲۸) کچھ شک نہیں کہ جو پرہیز گار ہو.........خدا ان کا مددگار ہے۔

﴿وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ﴾ (۵۷۔۴) اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (۲۔۱۵۳) بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

﴿اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۸۔۱۹) اور خدا تو مومنوں کے ساتھ ہے۔

اور موسیٰ علیہ السلام کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

﴿اِنَّ مَعِیَ رَبِّی سَیَھْدِیْنِ﴾ (۲۶۔۶۲) میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔وہ مجھے رستہ بتائے گا۔

رَجُلٌ اِمَّعَۃٌ: اناڑی آدمی جو ہر ایک کے ساتھ ہو جائے۔

اَلْمَعْمَعَۃُ: آتش زدگی کی آواز۔لڑائی میں بہادروں کا شور۔

اَلْمَعْمَعَانُ: لڑائی کی شدت۔

(م ع ز)

اَلْمَعْزُ: بکریاں۔قرآن پاک میں ہیں:۔

﴿وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ﴾ (۶۔۱۴۳) اور دو بکریوں میں سے۔

اَلْمَعِیْزُ: بکریوں کے ریوڑ کو کہتے ہیں جیسا کہ ضَئِیْنٌ۔ بھیڑوں کے ریوڑ پر بولا جاتا ہے۔

رَجُلٌ مَّاعِزٌ: سخت جسم والا آدمی۔ اَلْاَمْعَزُ وَالْمَعْزَاءُ: سخت جسم والا آدمی۔ اَلْاَمْعَزُ وَالْمَعْزَاءُ: سخت زمین اِسْتَمْعَزَ فِیْ اَمْرِہٖ: کسی کام میں کوشش کرنا۔

(م ع ن)

مَاءٌ مَّعِیْنٌ: جاری پانی کو کہتے ہیں۔یہ مَعَنَ الْمَاءُ فَھُوَ مَعِیْنٌ سے ماخوذ ہے مَمْعَانٌ: پانی بہنے کی جگہ اَمْعَنَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑ میں دور نکل جانا۔

اَمْعَنَ بِحَقِّیْ: اس نے میرے حق کا انکار کر دیا۔ فُلَانٌ مَّعَنَ فِیْ حَاجَتِہٖ اس نے اپنی حاجت میں کوشش کی۔ بعض نے کہا ہے کہ مَاءٌ مَّعِیْنٌ میں مَعِیْنٌ عین سے مشتق ہے اور اس میں میم زائدہ ہے۔

(م ق ت)

اَلْمَقْتُ کے معنی کسی شخص کو فعل قبیح کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے بہت بغض رکھنے کے ہیں۔ یہ مَقَتَ مَقَاتَۃً فَھُوَ مَقِیْتٌ وَمَقَتَہٗ فَھُوَ مَقِیْتٌ وَمَمْقُوْتٌ سے اسم ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّ مَقْتًا وَّ سَآءَ سَبِیْلًا﴾ (۴۔۲۲) یہ نہایت بے حیائی اور (خدا کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا۔ جاہلیت میں اپنے باپ کی بیوہ سے شادی کرنے کو نِکَاحُ الْمُقِیْتِ کہا جاتا تھا۔اَلْمُقِیْتُ کی اصل قُوَّۃٌ ہے جس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

(م ک ک)

مَکَّۃُ: یہ ایک مشہور شہر کا نام ہے۔اور تَمَکَّکْتُ الْعَظْمَ سے مشتق ہے۔جس کے معنی ہڈی سے گودا اور مغز نکالنے کے ہیں۔

اِمْتَکَّ الْفَصِیْلُ مَا فِیْ ضَرْعِ اُمِّہٖ: اونٹ کے بچے نے اپنی ماں کے تھنوں سے سارا دودھ چوس لیا۔اسی سے

---

❶ قاله امرؤ القيس فی فرس وصدره: له وثبات كوثب الظباء۔ والقصيدة مقيدة القافيه فی ٤٤ بيتا وهی فی ديوانه (صنعة السندوبی (٥٢۔٥٧) والبيت فی آخر القصيدة وبعده المقطع۔ وتعدو كعد ونجاة الظباء۔ اخطاها الحادف المقتدر۔ والبيت فی العقد الثمين (١٢٨) والمعانی للقبتی (٢٠) وكتاب الخيل لابی عبيدة (١٤٠) وقال فی الآخره: وقد تروى هذه الابيات لربيعة بن جشم النمری وراجع للبيت محاضرات الأدباء (٤ : ٦٤١) واللسان (خطا) وخطاءٌ جمع خطوة قال ابن البر معناه ای تخطو مرة فتكف عن العدد وتعدد ومرة عدوا يشبه المطروفی رواية ابی عبيدة: فواد خطيط وكذا فی المعانی للقبتی ٢٠ مع اختلاف طفيف فی رواية وفی روايته كصوب الخريف والمعنى واحد لان صوب الخريف يقع بموضع ويخطی اُخرى ١٢۔

تَـمَكُّكٌ بمعنی استقصاء استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث ہے۔ ❶ (۱۲۳) ((لَا تَـمَكُّوْا عَلٰى غُرَ مَاءِ كُمْ)) اپنے قرضداروں سے مطالبہ میں اصرار نہ کرو۔

اور مَكَّة کو مَـكَّه اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حدود کے اندر ظلم کرنے والوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ خلیل کا قول ہے کہ روئے زمین کے وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے اسے مکہ کہا گیا ہے جیسا کہ مغز ہڈی کے درمیان ہوتا ہے۔

اَلْمَكُّوْكُ: (والجمع مکاکی) صواع کی طرح کا ایک طاس جو پانی پینے اور غلہ ماپنے کے کام آتا ہے (یہ صاع کا ½۱ ہوتا ہے)۔

(م ک ث)

اَلْـمَـكْـثُ: کسی چیز کے انتظار میں ٹھہرے رہنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَـمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ﴾ (۲۷۔۲۲) ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔

ایک قرأت میں مُكُثٌ ہے۔ نیز فرمایا۔

﴿اِنَّكُمْ مَاكِثُوْنَ﴾ (۴۳۔۷۷) تم ہمیشہ (اسی حالت میں) رہو گے۔

﴿قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا﴾ (۲۸۔۲۹) تو اپنے گھر والوں سے کہنے لگے کہ تم یہاں ٹھہرو۔

(م ک ر)

اَلْـمَكْرُ کے معنی کسی شخص کو حیلہ کے ساتھ اس کے مقصد سے پھیر دینے کے ہیں۔ یہ دو قسم پر ہے (۱) اگر اس سے کوئی اچھا فعل مقصود ہو تو محمود ہوتا ہے ورنہ مذموم۔

چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿وَ اللّٰـهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ (۳۔۵۴) اور خدا خوب تدبر کرنے والا ہے۔

پہلے معنی پر محمول ہے۔ اور دوسرے معنی کے متعلق فرمایا:۔

﴿وَلَا يَـحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ (۳۵۔۴۳) اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔

﴿وَ اِذْ يَـمْـكُـرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۸۔۳۰) اور (اے محمدؐ) اس وقت کو یاد کرو۔ جب کافر لوگ تمہارے بارے میں چال چل رہے تھے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَمَـكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا﴾ (۲۷۔۵۰) اور وہ ایک چال چلے اور ہم بھی ایک چال چلے۔

میں دونوں معنی مذکور ہیں۔ یعنی مَكَرُوْا سے مکر مذموم اور مَكَرْنَا سے مکر محمود مراد ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مکر خداوندی کے معنی بندے کو ڈھیل دے رکھنے اور دنیوی ساز و سامان پر خوب قدرت دینے کے ہیں اسی لیے امیر المومنینؓ نے فرمایاں۔ (۱۲۳)

مَنْ وُسِّعَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ وَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّهٗ مُكِرَ بِهٖ فَهُوَ مَـخْـدُوْعٌ فِيْ عَقْلِهٖ۔ کہ جس پر اس کی دنیا فراخ کر دی گئی ہو اور وہ یہ نہ سمجھا ہو کہ اسے ڈھیل دی گئی ہے۔ تو وہ فریب خوردہ اور احمق ہے۔

(م ک ن)

اَلْمَكَانُ: اہل لغت کے نزدیک مکان اس جگہ کو کہتے ہیں جو کسی جسم پر حاوی ہو۔ بعض متکلمین کے نزدیک یہ من قبیل عرض ہے اور جسم حاوی و محوی دونوں کے

❶ انظر للحديث في الفائق (۲/۲ ۲) والنهاية وفيه لا تتمككوا...... وفي رواية لا تمككوا (مكلك ٤/۳٤۹) راجع غريب أبي عبيد ۳/۱۲۳)

اجتماع سے عبارت ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جسم حاوی کی سطح (باطن) جسم محوی کی سطح پر محیط ہو تو گویا ان کے نزدیک ان دونوں جسموں کے باہم مل جانے کا نام مکان .... ہے۔قرآن پاک میں ہیں۔ ﴿مَكَانًا سُوًى﴾ (۲۰۔۵۸) ایک ہموار مکان میں۔ ﴿وَإِذَآ أُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا﴾ (۲۵۔۱۳) اور جب یہ دوزخ کی کسی تنگ جگہ میں (زنجیروں میں جکڑ کر) ڈالے جائیں گے۔

مَكَّنْتُهٗ وَمَكَّنْتُ لَهٗ: میں نے اسے تسلط یا قدرت دی فَتَمَكَّنَ چنانچہ اس نے قدرت حاصل کر لی۔قرآن پاک میں ہیں۔

﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۰) اور ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا۔

﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ﴾ (۴۶۔۲۶) اور ہم نے ان کو ایسے مقدور دیئے تھے۔ جو تم لوگوں کو نہیں دیئے۔

﴿اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ﴾ (۲۸۔۵۷) کیا ہم نے ان کو جگہ نہیں دی۔

﴿وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۸۔۶) اور ملک میں ان کو قدرت دیں۔

﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ﴾ (۲۴۔۵۵) اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ مستحکم و پائیدار کرے گا۔

﴿فِیْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ (۲۳۔۱۳) ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں۔

اور اَمْكَنْتُ فُلَانًا مِنْ فُلَانٍ کے معنی کسی کو دوسرے پر قدرت دینے کے ہیں۔ مَكَانٌ وَمَكَانَةٌ جگہ اور حالت کو کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اِعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ﴾ (۳۹۔۳۹) اپنی جگہ پر عمل کیے جاؤ۔

ایک قراءت میں مَكَانَاتِكُمْ بصیغہ جمع ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ﴾ (۸۱۔۲۰) جو صاحب قوت، مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا ہے۔ میں مکین بمعنی متمکن یعنی صاحب قدر و منزلت ہے۔ مَكِنَاتُ الطَّيْرِ وَمُكُنَاتُهَا: پرندوں کے گھونسلے۔

اَلْمَكْنُ: سوسمار وغیرہ کے انڈے۔ آیت کریمہ: ﴿بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ﴾ (۳۷۔۴۹) محفوظ انڈے۔[1]

خلیل کا قول ہے کہ لفظ مکان (صیغہ ظرف) مفعل کے وزن پر ہے اور یہ كَوْنٌ سے مشتق ہے پھر کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے اسے فعال کا حکم دے کر اس سے تَمَكَّنَ تَمَسْكَنَ وغیرہ مشتقات استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے مَنْزِل سے تَمَنْزَلَ وغیرہ۔

(م ک و)

مَكَا الطَّيْرُ يَمْكُوْا مُكَاءً کے معنی پرند کے سیٹی بجانے کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَالْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً﴾ (۸۔۳۵) میں ان کی نماز کو مکاء کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ وہ نماز بے روح ہونے کے اعتبار سے پرندوں کی سیٹی کے بمنزلہ ہے اور مکاء ایک پرند کا نام ہے۔

---

[1] وعلى هذا وزنه فعلون والصحيح انه من الكن معناه الحفظ والستر وليس من هذه المادة۔

مکت استه: گوز مارنا۔

(م ل ل)

اَلْمِلَّةُ: دین کی طرح ملت بھی اس دستور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی زبان پر بندوں کے لیے مقرر فرمایا تا کہ اس کے ذریعہ وہ قرب خداوندی حاصل کر سکیں۔

دین[1] اور ملت میں فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف اس نبی کی طرف ہوتی ہے جس کا وہ دین ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۳۔۹۵) پس دین ابراہیم کی پیروی کرو۔

﴿وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِ یْ﴾ (۱۲۔۳۸) اور اپنے باپ دادا...... کے مذہب پر چلتا ہوں۔

اور اللہ تعالیٰ یا کسی افراد امت کی طرف اسکی اضافت جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس قوم کی طرف بحیثیت مجموعی مضاف ہوتا ہے۔ جو اس کے تابع ہوتی ہے۔ اور افراد امت کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی۔ اس لیے مِلَّةُ اللّٰهِ یا مِلَّتِیْ اور مِلَّةُ زَیْدٍ کہنا جائز نہیں۔ جیسا کہ دِیْنُ اللّٰهِ وَ دِیْنُ زَیْدٍ کا استعمال جائز ہے (اسی طرح کسی فریضہ کی نسبت بھی مِلَّة کی طرف نہیں کی جاتی) لہٰذا اَلصَّلٰوةُ مِلَّةُ اللّٰهِ کہنا جائز نہیں ہے (اس کے برعکس اَلصَّلٰوة دِیْنُ اللّٰهِ کہنا صحیح ہے)

اصل میں مِلَّةٌ کا لفظ اَمْلَلْتُ الْكِتَابَ سے مشتق ہے جس کے معنی لکھوانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ﴾ (۲۔۲۸۲) اور جو شخص قرض لے وہی (دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے۔

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾ (۲۔۲۸۲) اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔

مِلَّةٌ اور دین میں دوسرا فرق یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے من جانب اللہ مشروع ہونے کے لحاظ سے مِلَّةٌ کہا جاتا ہے۔ اور اس کے قائم کرنے اور بجا لانے والے کے لحاظ سے دین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دین کے معنی طاعت وفرمانبرداری کے ہیں۔ مَلَّ خُبْزَهٗ یَمُلُّهٗ مَلًّا کے معنی گرم راکھ پر روٹی پکانے کے ہیں۔ اور راکھ پر پکی ہوئی روٹی کو خُبْزُ مَلَّةٍ کہا جاتا ہے اور اَلْمَلِیْلُ وہ چیز کہلاتی ہے جسے آگ میں پھینک دیا گیا ہو۔ اور وہ حرارت جو انسان محسوس کرتا ہے۔ اسے مَلِیْلَةٌ کہا جاتا ہے۔

مَلِلْتُ الشَّیْءَ اَمَلُّهٗ کے معنی کسی چیز سے بد دل ہو کر اس سے اعراض کر لینے کے ہیں۔ اَمْلَلْتُهٗ مِنْ كَذَا۔ کسی کو کسی چیز سے بد دل کر دینا۔ حدیث میں ہے [1] (۱۲۴)

((تَكَلَّفُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِیْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا)) وہ عمل بجا لاؤ جن کی طاقت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں اُکتائے گا۔ آخر کار تم ہی اُکتا جاؤ گے۔ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بھی

---

[1] والحدث بتغير الالفاظ فی البخاری ومسلم والموطا مالك من حديث عائشة قاله صلی الله عليه وسلم فی شان امرة لاتنام من الليل (الزرقانی ۲۴۳۔۲۴۴) والحديث فی المستدرك للحاكم والنسائی (انظر كنز العمال ج۳ رقم ۱۶۹۔

ملول ہو جاتا ہے جیسا کہ لفظ حتی سے وہم ہوتا ہے۔ بلکہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اکتائے گا نہیں آخر کار تم ہی اکتا جاؤ گے۔

(م ل ح)

اَلْـمِـلْحُ: اس پانی کو کہتے ہیں جو متغیر ہو کر جم جائے یعنی نمک بن جائے اور صرف متغیر پانی کو بھی مِلْحٌ کہہ دیتے ہیں چنانچہ کھاری پانی کو مَـاءٌ مِـلْـحٌ کہا جاتا ہے۔اور مَـاءٌ مَـالِحٌ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَهٰـذَا مِـلْحٌ اُجَـاجٌ﴾ (۲۵۔۵۳) اور یہ کھاری ہے کڑوا۔ مَلَّحْتُ الْقِدْرَ کے معنی ہنڈیا میں نمک ڈالنے کے ہیں۔اور اَمْـلَـحْتُهَـا کے معنی زیادہ نمک ڈال کر خراب کر دینے کے۔اور نمک لگا کر خشک کی ہوئی مچھلی کو سَـمْـكٌ مَلِيْحٌ کہتے ہیں۔پھر مِلْحٌ سے استعارہ کے طور پر مَـلَاحَةٌ بمعنی خوبروئی آتا ہے۔اور رَجُـلٌ مَلِيْحٌ اس خوبرو آدمی کو کہتے ہیں جس کا حسن خوب غور کے بعد محسوس ہو۔

(م ل ک)

اَلْـمَلِكُ: بادشاہ جو پبلک پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ لفظ صرف انسانوں کے منتظم کے ساتھ خاص ہے۔یہی وجہ ہے کہ مَـلِكُ الـنَّـاسِ تو کہا جاتا ہے لیکن مَـلِكُ الْاَشْيَاءِ کہنا صحیح نہیں ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿مٰـلِكِ يَـوْمِ الـدِّيْـنِ﴾ (۱۔۳) انصاف کے دن کا حاکم۔ میں ملک کی اضافت یوم کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ یہ اصل میں ملک الملک فی یوم الدین ہے۔یعنی قیامت کے دن اسی کی بادشاہت ہوگی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿لِـمَـنِ الْـمُـلْكُ الْيَـوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۱۶۔۴۰) آج کس کی بادشاہت ہے، خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

اور مِلْكٌ کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے عَمَلاً کسی کا متولی اور حکمران ہونے کو کہتے ہیں۔ دوم حکمرانی کی قوت اور قابلیت کے پائے جانے کو کہتے ہیں۔خواہ بالفعل اس کا متولی ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ پہلے معنی کے لحاظ سے فرمایا۔

﴿اِنَّ الْـمُـلُـوكَ اِذَا دَخَـلُـوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا﴾ (۲۷۔۳۴) بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں۔تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اور دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا:۔

﴿اِذْ جَـعَـلَ فِيْـكُـمْ اَنْبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ (۵۔۲۱) کہ اس نے تم میں پیغمبر کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔ تو اس آیت میں نبوّت کو خاص اور ملوکیت کو عام قرار دیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل سارے کے سارے بادشاہ نہیں تھے۔ کیونکہ یہ تو حکمت الٰہی کے ہی منافی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ رؤساء کی کثرت میں خیر نہیں ہوتی لہٰذا یہاں جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں ملک کا انتظام سنبھالنے کے قابل بنایا۔ تو یہاں ملک کا لفظ سیاست کی قابلیت اور قوت پیدا کر دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ملک ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سیاست کا مالک ہو۔ خواہ وہ اپنے نفس کی سیاست کرے بایں طور پر کہ نفس کو خواہشات سے روک رکھنے پر اسے قدرت ہو۔ یا دوسروں کی سیاست کرے اور عام اس سے کہ بالفعل لوگوں کو بادشاہ ہو یا نہ ہو جیسا کہ گزر چکا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَـقَـدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ

اٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا﴾ (۴۔۵۴) ہم نے خاندان ابراہیم علیہ السلام کو کتاب اور دانائی عطا فرمائی تھی اور سلطنت عظیم بخشی تھی۔

حقیقی بادشاہت چونکہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس لیے فرمایا:۔ ﴿لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ﴾ (۶۴۔۱) اس کی (سچی) بادشاہی ہے اور اس کی تعریف نامتناہی ہے۔ ﴿قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ (۳۔۲۶) کہو کہ اے خدا، اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔

پس ملک کے معنی زیر تصرف چیز پر بذریعہ حکم کنٹرول کرنے کے ہیں۔ اور ملک بمنزلہ جنس کے ہیں۔ لہٰذا ہر مُلْكٌ کو مِلْكٌ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر ملک کو مُلک نہیں کہہ سکتے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَلَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا﴾ (۲۵۔۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں اور نہ مرنا ان کے اختیار میں ہے۔ اور نہ جینا اور نہ مر کر اٹھ کھڑے ہونا۔ اور فرمایا۔

﴿اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ﴾ (۱۰۔۳۱) یا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔ ﴿قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا﴾ (۷۔۱۸۸) کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ علیٰ ہذا القیاس بہت سی آیات ہیں (جن سے ثابت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے) حتیٰ کہ انسان تو اپنے حواس اور اپنی ذات کے نفع و نقصان پر بھی قدرت نہیں رکھتا چہ جائے کہ۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ذمہ دار بنے۔ اَلْمَلَکُوْتُ یہ مَلَكٌ کا مصدر ہے اور (رَحَمُوْتٌ وَرَھَبُوْتٌ کی طرح اس میں تاء زائدہ ہے۔ اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ملک کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ فرمایا۔

﴿وَ کَذٰلِکَ نُرِیْ اِبْرٰھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۶۔۷۵) اور ہم اس طرح ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے۔

﴿اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۸۵) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں نظر نہیں کی۔

اَلْمَمْلَکَۃُ کے معنی سلطنت کے ہیں۔ اور مملوک کا لفظ عرف میں غلام مملوک پر بولا جاتا ہے۔ دوسری ملکیت کو مملوک نہیں کہتے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَبْدًا مَّمْلُوْکًا﴾ (۱۶۔۷۵) ایک غلام ہے۔ اور کبھی عام املاک پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ جَوَّادٌ بِمَمْلُوْکِہٖ کہ فلاں اپنے املاک میں سخی ہے۔

اَلْمِلْکَۃُ: خاص کر عبید یعنی غلاموں کا مالک ہونے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ حَسَنُ الْمِلْکَۃِ: یعنی فلاں اپنے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔ اور قرآن پاک میں غلاموں کے ملک کو یَمِیْنٌ کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ (۲۴۔۵۸) تمہارے غلام لونڈیاں.......... اجازت لیا کریں۔

﴿اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ (۴۔۳) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔

﴿اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُنَّ﴾ (۲۴۔۳۱) یا لونڈی

غلاموں (کے سوا)

اَلْمُلُوْكَةُ: یہ بمعنی مِلک کے آتا ہے جیسے: مَمْلُوْكٌ مُّقِرٌّ بِالْمُلُوْكَةِ وَالْمِلْكَةِ وَالْمِلْكِ: یعنی ملک کا اقرار کرنے والا غلام۔

مِلَاكُ الْاَمْرِ: کسی چیز کا سرمایہ جس کے سہارے پر وہ قائم ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے۔

اَلْقَلْبُ مِلَاكُ الْجَسَدِ: کہ دل پر جسم کا دارومدار ہے۔

اَلْمِلَاكُ کے معنی تزویج کے ہیں۔ اور اَمْلَكُوْهُ کے معنی ہیں کہ انہوں نے اس کا نکاح کر دیا پھر خاوند کو عورت کا منتظم ہونے کے لحاظ سے اس کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی کے لحاظ سے کسی نے کہا ہے۔

كَادَ الْعَرُوْسُ اَنْ يَّكُوْنَ مَلِكًا کہ خاوند قریب قریب بادشاہ ہی ہوتا ہے۔

مَلِكُ الْاِبِلِ وَالشَّاةِ: اس اونٹ یا بکری کو کہتے ہیں۔ جو دوسروں کے آگے آگے چلتی ہے۔ دوسرے چونکہ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لیے تشبیہ کے طور پر اس کو ملک کہا جاتا ہے۔ ایک محاورہ ہے۔

مَالِاَحَدٍ فِيْ هٰذَا مَلْكٌ وَمِلْكٌ غَيْرِيْ کہ میرے سوا اس پر کسی کا اختیار یا قبضہ نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا﴾ (۲۰۔۸۷) ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلاف نہیں کیا۔ اور ایک قرأت میں کسرہ میم کے ساتھ ہے۔

مَلَكْتُ الْعَجِيْنَ: آٹے کو اچھی طرح سے گوندھا۔

حَائِطٌ لَيْسَ لَهٗ مِلَاكٌ: دیوار میں پائیداری نہیں ہے۔

اَلْمَلَكُ: علمائے نحو اس لفظ کو مَلَائِكَةٌ سے ماخوذ مانتے ہیں۔ اور اس کی میم کو زائدہ بناتے ہیں۔ لیکن بعض محققین نے اسے ملک سے مشتق مانا ہے۔ اور کہا ہے کہ جو فرشتہ کائنات کا انتظام کرتا ہے۔ اسے فتحہ لام کے ساتھ مَلَكٌ کہا جاتا ہے۔ اور فتحہ لام کے ساتھ ملک کہا جاتا ہے۔ اور انسان کو مَلِكَ کہتے ہیں معلوم ہوا کہ مَلَكٌ تو مَلَائِكَةٌ میں شامل ہے لیکن کل مَلَائِكَةٌ مَلَكٌ نہیں ہوتے۔ بلکہ ملک کا لفظ ان فرشتوں پر بولا جاتا ہے جن کی طرف کہ آیات۔

﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ (۷۹۔۵) پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتے۔

﴿فَالْمُقَسِّمَاتِ اَمْرًا﴾ (۵۱۔۴۰) پھر چیزیں تقسیم کرتے ہیں۔

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾ (۷۹۔۱) ان (فرشتوں) کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔

﴿وَالْمَلَكُ عَلٰى اَرْجَآئِهَا﴾ (۶۹۔۱۷) اور فرشتے اس کے کناروں پر (اتر آئیں گے)

﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ (۲۔۱۰۲) اور (ان باتوں کے بھی پیچھے لگ گئے) جو دو فرشتوں پر اتری تھیں۔ اور ان کے علاوہ دوسری آیات میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور اسی سے مَلَكُ الْمَوْتِ (موت کا فرشتہ) ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ﴾ (۳۲۔۱۱) کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔ تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔

(م ل ء)

اَلْمَلَاءُ: وہ جماعت جو کسی امر پر مجتمع ہو تو نظروں کو ظاہری حسن و جمال اور نفوس کو ہیبت و جلال سے بھر دے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾

(۲۔۲۴۶) بھلا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا۔ ﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖ﴾ (۷۔۲۷) اور قوم فرعون میں جو سردار تھے کہنے لگے۔

﴿اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ﴾ (۲۸۔۲۰) کہ (شہر کے) رئیس تمہارے بارے میں صلاحیں کرتے ہیں۔

﴿قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ﴾ (۲۷۔۲۹) وہ کہنے لگی کہ اے اہل دربار! میری طرف ایک نامہ گرامی ڈالا گیا ہے۔

ان کے علاوہ بہت سی آیات ہیں۔ جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ مَلَأُ الْعُيُوْنِ: یعنی سب اسے عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں گویا اس نے ان کی نظروں کو اپنے جلوہ سے بھر دیا ہے۔ اسی سے کہا گیا ہے:۔

شَابٌّ مَالِئُ الْعَيْنِ: اپنی خوبصورتی سے آنکھ کو بھر دینے والا نوجوان۔ اَلْمَلَاءُ

اخلاق جو حسن سے بھرپور ہو [1]۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔ [2]

(الوافر)

(۴۱۲) فَقُلْنَا اَحْسِنِىْ مَلَأً جُهَيْنَا

تو ہم نے کہا کہ اے جھینہ اپنے اخلاق درست کرو۔ مَالَأْتُهٗ کے معنی کسی کا معاون بننے اور اس کے گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ شَايَعْتُهٗ کے معنی کسی کے طرف داروں میں داخل ہونے کے آتے ہیں۔ محاورہ ہے۔

هُوَ مَلِئٌ بِكَذَا: یعنی وہ فلاں چیز سے پر ہے۔ اَلْمُلَاءَةُ زکام جو فضلہ سے دماغ کو بھر دے۔ اور مُلِئَ فُلَانٌ وَاَمْلَاَ کے معنی زکام زدہ ہونے کے ہیں۔

اَلْمِلْءُ: کسی چیز کی اتنی مقدار جس سے کوئی برتن بھر جائے۔ محاورہ ہے۔

اَعْطِنِىْ مِلْأَهٗ وَمِلْأَيْهِ وَثَلَاثَةَ اَمْلَائِهٖ: مجھے ایک، دو، یا تین پیمانے بھر کر دو۔

(م ل ی)

اَلْاِمْلَاءُ کے معنی امداد یعنی ڈھیل دینے کے ہیں اسی سے مَلَاوَةٌ مِنَ الدَّهْرِ یا مَلِيٌّ مِّنَ الدَّهْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنی عرصہ دراز کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاهْجُرْنِىْ مَلِيًّا﴾ (۱۹۔۴۶) اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔

تَمَلَّيْتَ دَهْرًا: تمہاری عمر دراز نہ ہو۔

تَمَلَّيْتُ الثَّوْبَ: میں نے اس کپڑا سے بہت فائدہ اٹھایا۔

تَمَلّٰى بِكَذَا: اس نے فلاں چیز سے عرصہ تک فائدہ اٹھایا۔

مَلَاكُ اللّٰهِ: (بغیر ہمزہ) اللہ تیری عمر دراز کرے۔ چنانچہ اسی سے عِشْتَ مَلِيًّا کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں تم عرصہ دراز تک جیتے رہو۔

اَلْمَلَا: (اسم مقصور) وسیع ریگستان۔

بعض نے کہا ہے کہ اَلْمَلَوَانِ کے معنی ہیں "لیل و نہار" مگر اصل میں یہ لفظ رات دن کے تکرار اور ان کے امتداد

---

[1] وفی الحدیث "احسنوا املاء کم" قاله صلی الله علیه وسلم لاصحابه حین ضربوا الرجل الذی بال فی المسجد (اللسان) والفائق (۲/۲۵۴)۔

[2] قاله الجهنی واوله: تنادوا یا لهثة اذاراٌ ونا۔ وبعضهم فسر الملاء ههنا بالظن والبیت فی اللسان (ملاء جهن) وابن الانباری فی شرح السبع (۴۶۵) والحماسة بشرح المرزوقی رقم (۱۵۲) فی ۱۵ بیتاوالمقطوعة من المنصفات والجهنی هو عبدالشارق بن عبدالعزیٰ الجهنی الجاهلی۔

پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ لیل ونہار کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶ (الطّویل)

(۴۱۴) نَهَارٌ وَلَيْلٌ دَائِمٌ مَلَوَاهُمَا
عَلٰى كُلِّ حَالِ الْمَرْءِ يَخْتَلِفَانِ

رات دن کا تکرار ہمیشہ رہتا ہے اور ہر حالت میں یہ مختلف ہوتے رہتے ہیں۔

اگر مَلَوَان کا اصل معنی لیل ونہار ہوتا تو ان کی ضمیر کی طرف مضاف ہو کر استعمال نہ ہوتا اور آیت کریمہ:۔ ﴿وَاُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِیْ مَتِیْنٌ﴾ (۷۔۱۸۳) اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں۔ میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔ میں اُمْلِیْ لَهُمْ کے معنی مہلت دینے کے ہیں۔ نیز فرمایا۔ ﴿اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ﴾ (۳۔۱۷۸) کہ ہم ان کو مہلت دیئے جاتے ہیں۔ تو یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿اَلشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ﴾ (۴۷۔۲۵) شیطان نے یہ کام ان کو مزین کر دکھایا اور انہیں طول (عمر کا وعدہ) دیا۔

میں اَمْلَا کے معنی اَمْهَلَ یعنی مہلت دینے کے ہیں۔

ایک قراءت میں اَمْلَا لَهُمْ ہے جو اَمْلَيْتُ الْكِتَابَ اُمْلِيْهِ اِمْلَاءً سے مشتق ہے اور اس کے معنی تحریر لکھوانے اور املا کروانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَهِیَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ (۲۵۔۵) اور وہ صبح شام اس کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ اصل میں اَمْلَيْتُ اَمْلَلْتُ (مضاعف) ہے۔ دوسرے لام کو تخفیف کے لیے یا (ے تبدیل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾ (۲۔۲۸۲) تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔

(م ن ن)

اَلْمَنُّ: ایک وزن کا نام ہے اس کا تثنیہ مَنَّان اور جمع اَمْنَانٌ آتی ہے۔ کبھی ایک نون کو الف سے تبدیل کر کے مَنًا بنا لیتے ہیں اس کی جمع اَمْنَاءٌ ہے۔ اور ہر اندازہ کی ہوئی چیز کو مَمْنُوْنٌ۔ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسے مَوْزُوْنٌ کہتے ہیں۔

اَلْمِنَّةُ کے معنی بھاری احسان کے ہیں۔ اور یہ دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک منت بالفعل جیسے مَنَّ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانٍ۔ یعنی فلاں نے اس پر گرانبار احسان کیا۔ اسی معنی میں فرمایا:۔ ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۔۱۶۴) خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ (۴۔۹۴) تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے پھر خدا نے تم پر احسان کیا۔

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۱۴) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر بھی احسان کیے۔

﴿يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ (۱۴۔۱۱) خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (نبوت) کا احسان کرتا ہے۔

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ (۲۸۔۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں۔ ان پر احسان کریں۔

---

❶ قاله ابن مقبل (واسمه تميم بن ابى بن مقبل) راجع للبيت اللالئى مع السمط (۵۳۳) والاقتضاب (۴۷۲) والخزانة (۳: ۲۷۵) والعينى (۴: ۵۴۲) واللسان (ملاء) وبعضهم نسبه لاعرابى من بنى مقبل راجع الحصرى (۴: ۶۸) وفى البلدان لابن مقبل اوابن احمر والبيت فى الروض (۱: ۲۶) والعينى على ابن هشام وقبله: الا ياد يار الحى بالسبعان۔ امل عليها بالبلى الملوان راجع ترجمته فى الاصابة رقم ۸۶۲ والخزانة (۱: ۱۱۳)

اور یہ یعنی منت بالفعل درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔اور دوسرے معنی مِنَّة بِالْقَوْلِ یعنی احسان جتلانا گو انسانی معاشرہ میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔مگر جب کفران نعمت ہو رہا ہو تو اس کے اظہار میں کچھ قباحت نہیں ہے۔اور چونکہ (بلاوجہ) اس کا اظہار معیوب ہے اس لیے مشہور ہے۔
اَلْمِنَّةُ تَهْدِمُ الصَّنِيْعَةَ: منت یعنی احسان رکھنا احسان کو برباد کر دیتا ہے۔اور کفران نعمت کے وقت چونکہ اس کا تذکرہ مستحسن ہوتا ہے اس لیے کسی نے کہا ہے۔ اِذَا كُفِرَتِ النِّعْمَةُ حَسُنَتِ الْمِنَّةُ۔ جب نعمت کی ناشکری ہو تو احسان رکھنا ہی مستحسن ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿يَمُنُّونَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدَاكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ (۴۹۔۱۷) یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں۔کہ مسلمان ہو گئے ہیں۔کہدو کہ اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو۔بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے۔کہ اس نے تمہیں ایمان کا رستہ دکھایا۔
میں ان کی طرف سے منت بالقول یعنی احسان جتلانا مراد ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منت بالفعل یعنی انہیں ایمان کی نعمت سے نوازنا مراد ہے جیسا کہ بعد میں اَنْ هَدَاكُمْ لِلْاِيْمَانِ کے لفظ سے خود ہی اس کی تشریح کر دی ہے اور آیت کریمہ:۔﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً﴾ (۴۷۔۴) پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ مال لے کر۔میں مَنًّا کے لفظ سے انہیں بلا معاوضہ رہا کر دینے کی طرف اشارہ ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۸۔۳۹) یہ ہماری بخشش ہے اسے خرچ کر دو یا...... رکھ چھوڑو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔
میں فَامْنُنْ کے معنی خرچ کرنے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرْ﴾ (۷۴۔۶) اور (اس نیت سے) احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو۔
میں بعض نے کہا ہے کہ مِنَّة بالقول مراد ہے یعنی احسان جتلانا اور اسے بہت بڑا خیال کرنا۔ ❶ بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ زیادہ کی طلب کے لیے احسان نہ کر۔ ❷ اور آیت کریمہ:﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ (۹۵۔۶) ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔
میں بعض نے غیر ممنون کے معنی غیر محدود (یعنی ان گنت) کیے ہیں۔جیسا کہ دوسری جگہ "بِغَيْرِ حِسَابٍ" فرمایا ہے:۔ بعض نے اس کے معنی غیر مقطوع ولا منقوص کے ہیں۔ ❸ یعنی ان کا اجر نہ منقطع ہوگا اور نہ ہی کم کیا جائے گا۔اسی سے اَلْمَنُوْن، بمعنی موت ہے۔ ❹ کیونکہ وہ تعداد کو گھٹاتی اور عمر کو قطع کر دیتی ہے۔بعض نے کہا ہے کہ مِنَّة بالقول بھی اس سے ہے کیونکہ احسان جتلانا

---

❶ هذا ما ذهب اليه الحسن وابن ابى ليلى وعلى هذا يكون تستكثر محذوما بلا الناهية بدلا من تمنن اى لاتمنن ولا تستكثر وهن شان المان بما يعطى ان يستكثره ويراه كثيرا ۱۲۔
❷ وهذا هو المنقول عن ابن عباسؓ واكثر اصحاب التفاسير فعلى هذا المعنى يكون تستكثر منصوبا بان المقدرة ويؤيدهٗ قراءة ابن مسعود ان تستكثر باظهار ان مختصرا من روح المعانى (۲۹/۱۱۹۔۱۲۰)
❸ قارن اضداد ابى الطيب (۶۲۳۔ ۶۲۴)۔
❹ وايضا سمى الدهر المنون بهذا المعنىٰ ويكون واحدً اوّجمعاً (اضداد ابى الطيب (۶۲۳)

نعمت کو قطع کر دیتا ہے اور شکر گذاری کے انقطاع کو مقتضی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ (۲۔۵۷) اور تمہارے لیے من سلوی اتارتے رہے۔

میں مَـنٌّ سے شبنمی گوند مراد ہے۔ جورات کو درخت کے پتوں پر جم جاتی تھی اور سلویٰ ایک پرند کا نام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی سے ان احسانات کی طرف اشارہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کیے تھے اور یہ دونوں اصل میں ایک ہی چیز سے عبارت ہیں۔ لیکن ان پر احسان کرنے کے لحاظ سے اسے مَـنٌّ کہا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ نعمت ان کے لیے باعث اطمینان تھی اسے سلویٰ فرمایا ہے۔ جو کہ تسلی سے ماخوذ ہے۔

(مَنْ)

اس سے ذوی العقول مراد ہوتے ہیں۔ اور غیر ذوی العقول پر اس کا اطلاق یا تو اس وقت (۱) ہوتا ہے۔ جب وہ ذوی العقول کے بالتبع مراد ہوں مثلاً: رَاَیْتُ مَنْ فِی الـــدَّارِ۔ کہہ کر گھر کے لوگ اور بہائم دونوں مراد لیے جائیں۔ اور اس (۲) وقت جب اہل نطق کے ساتھ شامل کر کے پھر ان کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَـمِـنْهُـمْ مَّـنْ يَمْشِىْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّـمْشِـىْ عَلٰى رِجْلَيْنِ﴾ الْاٰية تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ اور یہ تنہا غیر ذوی العقول کے لیے استعمال نہیں ہوتا اسی لیے بعض محدثین نے اغنام (عوام) سے انسانیت کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ مَـنْ استفہامیہ کے ساتھ ان کے متعلق سوال کرنا غلط ہے۔ پس آیت میں تنبیہ ہے کہ وہ بمنزلہ جانوروں کے ہیں یا ان سے بھی کمتر درجہ کے ہیں۔

"مَنْ" واحد، جمع، مذکر، مونث سب کے لیے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت۔ ﴿وَ مِـنْهُـمْ مَّـنْ يَّسْتَـــمِـعُ﴾ (۶۔۲۵) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو تمہاری باتوں کی طرف کان رکھتے ہیں۔ میں من کے بعد ضمیر واحد مذکر لائی گئی ہے۔ اور آیت ﴿وَ مِـنْهُـمْ مَّنْ يَّسْتَـمِـعُوْنَ اِلَيْكَ﴾ (۱۰۔۴۲) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں۔ میں مَـنْ کی طرف ضمیر جمع لوٹ رہی ہے نیز فرمایا:۔ ﴿وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ﴾ (۳۳۔۳۱) اور جو تم میں سے خدا............ کی فرمانبردار رہے گی۔

(مِنْ)

یہ حرف جار ہے اور یہ ابتدائی (۱) غایت (۲) تبعیض (۲)، تبین (۳)، کے لیے آتا ہے۔ اور حرف (۴) نفی اور استفہام کے ساتھ ہو تو استغراق جنس کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَـمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ﴾ (۶۹۔۴۷) پھر تم میں سے کوئی۔ اور کبھی (۵) عوض کے لیے ہوتا ہے جیسے خُـذْ هٰذَا مِـــنْ ذٰلِكَ یعنی اس کے عوض میں یہ لے لو۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنِّـىْ اَسْـكَـنْـتُ مِنْ ذُرِّيَّتِـىْ بِوَادٍ﴾ (۱۴۔۳۷) میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں لا بسائی ہے۔

میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے۔ کیونکہ وہاں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے بعض آباد ہوئے تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مِنَ السَّـمَـآءِ مِـنْ جِبَالٍ فِيْهَـا مِنْ بَـرَدٍ﴾ (۲۴۔۴۳) اور آسمان میں جو (اولوں کے) پہاڑ ہیں ان

سے اولے نازل کرتا ہے۔

میں (۱) ہوسکتا ہے کہ مِنْ جِبَالٍ منصوب عَلَى الْمَفْعُوْلِيَةِ ہو ای یُنَزِّلَ مِنَ السَّمَآءِ جِبَالًا تو مِنْ اولی برائے ظرفیت ہے اور ثانی برائے مفعولیہ اور ثالث برائے تبیین۔ اور اولوں کے جبال اتارنے سے بکثرت اولے نازل کرنا مراد ہے جیسا کہ محاورہ ہے۔ عِنْدَهُ جِبَالٌ مِنْ مَّالٍ۔ یعنی اس کے پاس بہت سامان ہے۔

بعض (۲) نے کہا ہے کہ مِنْ جِبَالٍ منصوب علی الظرفیۃ بھی ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اولے پہاڑوں سے نازل ہوتے ہیں اور مِنْ بَرَدٍ منصوب علی المفعولیہ ہو تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ وہ آسمان کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

بعض (۳) کے نزدیک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مِنْ بَرَدٍ موضع رفع میں ہو۔ اور مِنْ جِبَالٍ منصب علی المفعولیۃ ہو۔ تو گویا اصل عبارت یوں ہے۔ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ جِبَالًا فِیْهَا بَرَدٌ اور جبال کا لفظ مَا نَزَلَ مِنَ السَّمَآءِ کی عظمت اور کثرت کو ظاہر کرتا ہے۔ ❶ اور آیت کریمہ:۔

﴿فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ﴾ (۵۔۴) تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو کھا لیا کرو۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے۔ ❷ کہ من زائدہ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ من زائدہ نہیں ہے۔ بلکہ تبعیضیہ ہے کیونکہ بعض مَآ اَمْسَكْنَ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا کھانا جائز نہیں ہے۔ جیسے خون، غدودیں اور وہ چیزیں جو قاذورات سے مختلط ہوتی ہیں اور ان کے تناول سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔

(م ن ع)

اَلْمَنْعُ: یہ عطا کی ضد ہے۔ رَجُلٌ مَانِعٌ وَ مَنَّاعٌ: بخیل آدمی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾ (۱۰۷۔۷) اور برتنے کی چیزیں عاریۃً نہیں دیتے۔

﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ﴾ (۵۰۔۲۵) جو مال میں بخل کرنے والا ہے۔ اور منع کے معنی حمایت اور حفاظت کے بھی آتے ہیں اسی سے مکان منیع کا محاورہ ہے جس کے معنی محفوظ مکان کے ہیں اور منع کے معنی حفاظت کرنے کے فُلَانٌ ذُوْ مَنَعَةٍ وہ بلند مرتبہ اور محفوظ ہے کہ اس تک دشمنوں کی رسائی ناممکن ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۔۱۴۱) کیا ہم تم پر غالب نہیں تھے؟ اور تم کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچایا نہیں؟

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۴) اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو خدا کی مسجدوں سے منع کرے۔ اور آیت۔

﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ (۷۔۱۲) میں مَا مَنَعَكَ کے معنی ہیں کہ کس چیز نے تمہیں اکسایا۔ اور بعض نے اس کا معنی مَا الَّذِیْ سَدَّكَ وَحَمَلَكَ عَلٰى تَرْكِ ذٰلِكَ کیا ہے یعنی کس نے تجھے روکا اور ترک سجود پر اکسایا۔ اَوَ اِمْرَاَةٌ مَنِيْعَةٌ عفیفہ عورت۔

---

❶ ذكر المؤلف ثلاث توجيهات من الاعراب وقد ذكر هذه الثلاثة اصحاب التفاسير فلا بدع فيه وقد نسب صاحب الروح احتمال الثالث الى الفراء والاولان تبتغيير يسير الى الاخفش (١٧٢/١٨) وانوار التنزيل (٢٥٧/٢)۔

❷ اى الاخفش وكنى عنه الطبرى ببعض نحوى البصرة قال الطبرى وخطاءهُ البصريون والخلاف فيه مشهور والحق الجواز ولذا قال علماء التفسير "وان اكل فلاتا كل (م۔ ٣)

اور مَنَاعِ اسم فعل بمعنی اِمْنَعْ (امر) جیسے نَزَالِ بمعنی اَنْزِلْ۔

(م ن ی)

اَلْمَنْیُ کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔ مَنٰی لَكَ الْمَانِیْ: مقدر کنندہ نے تیرے لیے مقدر کر دیا ہے۔اسی سے بعض کے نزدیک مَــنْ ایک وزن کا نام ہے❶

﴿اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ یُّمْنٰی﴾ (۷۵۔۳۷) کیا وہ منی جو (رحم میں) ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا؟ ﴿مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰی﴾ (۵۳۔۴۶) (یعنی) نطفے سے جو (رحم میں) ڈالا جاتا ہے۔

یعنی نطفہ سے جو قدرت الٰہی کے ساتھ اس چیز کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ جو اس سے پیدا ہونا ہوتا ہے۔اسی سے مَنِیَّةٌ بمعنی اجل مقدر ہے۔والجمع :مَنَایَا۔

اَلتَّمَنِّیْ کے معنی دل میں کسی خیال کے باندھنے اور اس کی تصویر کھینچ لینے کے ہیں۔ پھر کبھی یہ تقدیر محض ظن وتخمین پر مبنی ہوتی ہے۔اور کبھی غور وفکر کا نتیجہ اور مبنی بر حقیقت۔مگر عام طور پر تمنی کی بنا چونکہ ظن وتخمین پر ہی ہوتی ہے اس لیے اس پر جھوٹ کا رنگ غالب ہوتا ہے۔کیونکہ اکثر طور پر تمنی کا لفظ دل میں غلط آرزوئیں قائم کر لینے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی﴾ (۵۳۔۲۴) کیا جس چیز کی انسان آرزو کرتا ہے وہ اسے ضرور ملتی ہے۔

﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ﴾ (۲۔۹۴) تو موت کی آرزو تو کرو۔﴿وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗ﴾ (۶۲۔۷) اور یہ ہرگز نہیں کریں گے۔

اَلْاُمْنِیَّةُ: کسی چیز کی تمنا سے جو صورت ذہن میں حاصل ہوتی ہے اسے اُمْنِیَّةٌ کہا جاتا ہے اور کذب چونکہ کسی غیر واقعی چیز کا تصور کر کے اسے لفظوں میں بیان کر دینے کو کہتے ہیں۔تو گویا تمنی جھوٹ کا مبدء ہے۔لہٰذا جھوٹ کو تمنی سے تعبیر کرنا بھی صحیح ہے اسی معنی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔❷

مَا تَغَنَّیْتُ وَلَا تَمَنَّیْتُ مُنْذُ اَسْلَمْتُ کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں نہ راگ گایا ہے اور نہ جھوٹ بولا ہے۔ اور امنیۃ کی جمع امانی۔آتی ہے۔❸ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ﴾ (۲۔۷۸) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی) کتاب سے واقف نہیں ہیں۔

مجاہد نے اِلَّا اَمَانِیَّ کے معنی اِلَّا كَذِبًا یعنی جھوٹ کیے ہیں۔اور دوسروں نے اَمَانِیَّ سے بے سوچے سمجھے تلاوت کرنا مراد لیا ہے کیونکہ اس قسم کی تلاوت بھی اس اُمْنِیَّة سے زیادہ وقت نہیں رکھتی ہے۔جس کی بنا تخمینہ پر ہوتی

---

❶ منسوب الی الاخفش کما فی الروح (۵۹/۲۷)۔

❷ انظر لقول عثمان غریب القرآن للقبتی (۵۵) والنهایة لابن الاثیر (۴: ۱۹) واللسان (منی) والفائق (۱/۱۶۳) وفی کتاب الاشربة للقبتی و"ولا تفتیت" ای ولا تشبهت بالفتیان ولایصح۔ ورواه ابویعلی الموصلی فی مجمعه باسناد ضعیف من روایة انس عنه فی اثناء حدیث (راجع تخریج الاحیاء للعراقی (۳/۳۱۹) وفی روایة الفائق ایضا فی جاهلیة ولا اسلام۔

❸ بتشدید الیاء وتخفیفها و بالثانی قرء ابوجعفر وشیبة (ابن الانباری ۲۴۲)

ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ﴾ (۲۲۔۵۲) اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا۔مگر (اس کا یہ حال تھا کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں (وسوسہ) ڈال دیتا تھا۔

میں اُمْنِيَّة کے معنی تلاوت کے ہیں اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تمنی ظن وتخمین سے بھی ہوتی ہے۔اور مبنی برحقیقت بھی۔ اور چونکہ آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک پر روح الامین جو وحی لے کر اترتے تھے آپؐ اس کی تلاوت کے لیے مبادرت کرتے تھے۔حتیٰ کہ آپؐ کو آیت ﴿لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ﴾ اور ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ کے ذریعہ منع فرما دیا گیا۔الغرض اس وجہ سے آپ کی تلاوت کو تمنی سے موسوم کیا ہے۔اور متنبہ کیا ہے کہ ایسی تلاوت میں شیطان کا دخل غالب ہو جاتا ہے۔[1] اسی معنی میں آنحضرتؐ نے بھی فرمایا ہے[2]

(۱۲۵) اِنَّ الْعَاجِلَةَ مِنَ الشَّيْطَانِ کہ جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔مَنَّيْتَنِيْ كَذَا کے معنی فریب دہی سے جھوٹی امیدیں دلانے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک نے شیطان کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ﴾ (۴۔۱۱۹) اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا۔

(م ہ د)

اَلْمَهْدُ: گہوارہ۔جو بچے کے لیے تیار کیا جائے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ (۱۹۔۲۹) کہ ہم اس سے کہ گود کا بچہ ہے، کیونکر بات کریں؟ اور اَلْمَهْدُ وَالْمِهَادُ: ہموار اور درست کی ہوئی زمین کو بھی کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا﴾ (۲۰۔۵۳) وہ (وہی تو ہے) جس نے تم لوگوں کے لیے زمین کو فرش بنایا۔

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا﴾ (۷۸۔۶) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟

اور یہ ایسے ہی ہے۔جیسا کہ دوسری آیت میں زمین کو فراش کہا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ (۲۔۲۲) جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا۔

مَهَّدْتُّ لَكَ کے معنی کسی چیز کو تیار اور ہموار کرنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا﴾ (۷۴۔۱۴) اور ہر طرح سامان میں وسعت دی۔

اِمْتَهَدَ السَّنَامُ کے معنی کوہان کے مِهَاد یا مَهْد یعنی فرش کی طرح ہموار ہو جانے کے ہیں۔

---

[1] اشارة الى قصة ذكر ها بعض علماء التفسير اى تلك الغرانيق العلى وان شفا عتهن لترتجى۔ ذهب الحافظ بناء على كثرة الطريق الى ان لها اصلاً الفتح (۸/۳۳۳) لكن المحققين افكروه راجع الفخر (۶/۲۴۵۔۲۴۶) وقارن ما ذكره القبتى فى غريبه (۵۵۔۵۶) و فى اللسان (هنى) قال الازهرى والتلاوة سميت امية لان تالى القرآن اذامر باية رحمة تمنا ها واذا مر بآية عذاب تمنى ان يوقاه

[2] انظر لتخريجه (ع ج ل) ۱۲۔

(م ھ ل)

اَلْــمَهْــلُ: کے معنی حلم وسکون کے ہیں۔اور مَهَلَ فِیْ فِعْلِهٖ کے معنی ہیں اس نے سکون سے کام کیا۔ اور مَهْلًا کے معنی رِفْقًا کے ہیں۔یعنی جلدی مت کرو۔ مَهَّـلْتُهٗ: کسی کو مَهْلًا کہنا اور اَمْهَـلْتُهٗ کے معنی کسی کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾ (۸۶۔۱۷) تو تم کافروں کو مہلت دو، پس چند روز ہی مہلت دو۔

اَلْمُهْلُ: تلچھٹ کو بھی کہتے ہیں۔ [1] چنانچہ فرمایا:۔

﴿كَـالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ﴾ (۴۴۔۵۴) جیسے پگھلا ہوا تانبا پیٹوں میں۔(اس طرح) کھولے گا۔

(م و ت)

اَلْـمَوْتُ: یہ حیات کی ضد ہے۔لہٰذا حیات کی طرح موت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

اول قوت نامیہ (جوکہ انسان، حیوانات اور نباتات (سب میں پائی جاتی ہے) کے زوال کو موت کہتے ہیں جیسے فرمایا:۔

﴿يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۵۷۔۱۷) زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔

﴿اَحْيَيْنَـا بِـهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا﴾ (۵۰۔۱۱) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔

دوم (۲) حس وشعور کے زائل ہو جانے کو موت کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا﴾ (۱۹۔۲۳) کاش میں اس سے پہلے مر چکتی۔

﴿ءَ اِذَا مَـا مِـتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا﴾ (۱۹۔۶۶) کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔

سوم (۳)۔قوت عاقلہ کا زائل ہو جانا: اور اسی کا نام جہالت ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ﴾ (۶۔۱۲۲) بھلا جو پہلے مردہ تھا۔ پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّكَ لَا تُسْـمِعُ الْمَوْتٰى﴾ (۲۷۔۸۰) کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے۔

میں اسی معنی کے لحاظ سے کفار کو موتی کہا ہے۔

چہارم (۴):۔غم: جو زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کر دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿وَ يَـاْتِيْـهِ الْـمَـوْتُ مِـنْ كُـلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِـمَيِّتٍ﴾ (۱۴۔۱۷) اور ہر طرف سے اسے موت آ رہی ہوگی۔ مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا۔ میں موت سے یہی معنی مراد ہیں۔

پنجم (۵): موت بمعنی نیند ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ اَلــنَّـوْمُ مَوْتٌ خَفِيْفٌ وَالْمَوْتُ نَوْمٌ ثَقِيْلٌ کہ نیند ہلکی سی موت ہوتی ہے۔ اور موت بھاری نیند کا نام ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو توفی سے تعبیر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ﴾ (۶۔۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔ ﴿اَللّٰـهُ يَتَـوَفَّـى الْاَنْـفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ

---

[1] قال ابو بكر الصديق ادفنو في ثوبي هذين فانهما للمهل والتراب۔ الفائق (۲/۲۵۸)۔

فِیْ مَنَامِھَا﴾ (۳۹۔۴۲) اور خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔ اور جو مرے نہیں ان کی روحیں سوتے میں قبض کر لیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ﴾ (۳۔۱۶۹) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ..........زندہ ہیں۔

میں شہداء کی روحوں سے موت کی نفی مراد ہے۔ اور اس میں ان کی روحوں کے عیش و آرام میں ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان سے اس حزن کی نفی ہے۔ جس کا کہ ابھی آیت ﴿وَیَاْتِیْہِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ﴾ میں ذکر ہو چکا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ (۳۹۔۳۰) (اے پیغمبر) تم بھی مر جاؤ گے اور یہ بھی مر جائیں گے۔ میں بعض نے مَیِّتٌ کے معنی سَتَمُوْتُ کیے ہیں۔ یعنی تم عنقریب فوت ہو جاؤ گے۔ تو اس سے متنبہ کیا ہے کہ موت سے کسی کو بھی چارہ کار نہیں ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (السریع)

(۴۱۴) اَلْمَوْتُ حَتْمٌ فِیْ رِقَابِ الْعِبَادِ

ہر انسان کو حتماً مرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلْمَیِّتُ کے معنی جسم سے روح کے الگ ہونے کے نہیں ہیں۔ بلکہ جسم کا تدریجاً تحلیل ہونا اور گھٹنا مراد ہے۔ یعنی انسان جب تک زندہ رہتا ہے۔ تدریجاً مرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❷ ()

یَمُوْتُ جُزْءً افَجُزْءً ا

کہ وہ تدریجاً تحلیل ہو جائے گا۔

اور اسی معنی کے لحاظ سے بعض نے انسان کو مَائِتٌ (بصیغہ فاعل) کہا ہے۔ اور انہوں نے میّت و مائت میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ مَائِتٌ کے معنی تحلیل ہونے والے کے ہیں۔ اور مَیِّتٌ بمعنی مردہ کے۔

قاضی علی ابن عبدالعزیز نے کہا ہے کہ ہماری زبان (یعنی عربی) میں مَائِتٌ بایں معنی ثابت نہیں ہے۔ اَلْمَیْتُ یہ مَیِّتٌ کا مخفف ہے اور مَوْتٌ مَائت کا محاورہ مبالغہ پر محمول ہے۔ جیسا کہ شِعْرٌ شَاعِرٌ وسَیْلٌ سَائِلٌ وغیرہا ہیں۔ اور بَلَدٌ یعنی شہر پر مَیِّتٌ اور مَیْتٌ دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

سُقْنَاہُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ: ہم اس کو ایک مری ہوئی بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ (۷۔۵۷)

﴿بَلْدَۃً مَّیْتًا﴾ (۲۵۔۴۹) شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ کو)۔

اَلْمَیْتَۃُ: اس حیوان کو کہتے ہیں جس کی روح بغیر تزکیہ کے زائل ہو گئی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ﴾ (۵۔۳) تم پر مرا ہوا جانور حرام ہے۔ ﴿اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً﴾ (۶۔۱۴۵) بجز اس کے کہ وہ

---

❶ وصدرہ: قد کان لہ فی الموت راحۃ (مقید القافیہ) والبیت فی الحصری (۱: ۱۱۷۔۱۱۸) فی ثلاثۃ قال ابو اسحاق رُوِیَت لمحمد بن عبداللہ بن الحسن بن الحسین وقد رویت لاخیہ موسیٰ وکان زید بن علیؓ کثیراً ینشدو روی فی العقد (۴: ۳۳، ۴۷۳) ثلاثۃ وغراہ لزید بن علی والبیان والتبیین (۱: ۱۹۶) وفی ذیل الامالی (۳: ۱۴۳) ان ابن الاشعث لما ھزم اتی سجستان فولی شاماً فانشد فی ثلاثۃ ۱۲۔

❷ لم اجدہ ویرجیٰ ۱۲

مرا ہوا جانور ہو۔

اَلْمَوْتَانُ: یہ حیوان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔اور مَوَتَان یامَوَاتٌ بنجر زمین کو کہتے ہیں۔محاورہ ہے:۔ وَقَعَ فِی الْاِبِلِ مَوْتَانٌ کَثِیْرٌ: بہت سے اونٹ مر گئے۔

نَاقَةٌ مُمِیْتَةٌ وَّ مُمِیْتٌ: جس ناقہ کا بچہ مرگیا ہو۔اِمَاتَةُ الْخَمْرِ: (کنایۃ) شراب کو پکا کر اس کا جوش مارنا۔

اَلْمُسْتَمِیْتُ: موت کا سامنا کرنے والا۔نڈر آدمی۔

شاعر نے کہا ہے ❶ (الوافر)

(۴۱۶) فَاَعْطَیْتُ الْجِعَالَةَ مُسْتَمِیْتًا

تو میں نے موت سے نہ ڈرنے والے کو انعام دیا۔

اَلْمَوْتَةُ: ایک قسم کا جنون گویا اس سے علم وعقل مردہ ہو جاتا ہے اسی سے مردہ دل آدمی کو مَوْتَانُ الْقَلْبِ اور عورت کو مَوْتَانَةُ الْقَلْبِ کہا جاتا ہے۔

(م و ج)

اَلْمَوْجِ: سمندر سے پانی کی جو لہر مغرب کی طرف سے اٹھتی ہے اسے موج کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فِیْ مَوْجٍ کَالْجِبَالِ﴾ (۱۱۔۴۲) لہروں میں (چلنے لگی) (لہریں کیا تھیں) گویا پہاڑ (تھے)

﴿یَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ﴾ (۲۴۔۴۰) جس پر لہر چلی آتی ہو اور اس کے اوپر اور لہر آرہی ہو۔مَاجَ کَذَا یَمُوْجُ وَتَمَوَّجَ تَمَوُّجًا موج کی طرح مضطرب ہونا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

﴿وَ تَرَکْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ﴾ (۱۸۔۹۹) (اس (روز) ہم ان کو چھوڑ دیں گے۔کہ (روئے زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں۔

(م و ر)

اَلْمَوْرُ: کے معنی تیز رفتاری کے ہیں۔اور یہ مَارَیَمُوْرُ مَوْرًا سے ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿یَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا﴾ (۵۲۔۹) جس دن آسمان لرزنے لگے گا کپکپا کر۔

مَارَ الدَّمُ عَلٰی وَجْهِهٖ کے معنی چہرہ پر تیزی سے خون جاری ہونے کے ہیں۔اور مَوْرٌ غبار کو بھی کہتے ہیں۔جو ہوا میں ادھر ادھر اڑتا ہے۔اور نَاقَةٌ تَمُوْرُ فِیْ مَیْرِهَا کے معنی ہیں: اونٹنی کا تیز رفتاری کی وجہ سے غبار اڑاتے ہوئے چلے جانا اور تیز رو اونٹنی کو مَوَّارَةٌ کہا جاتا ہے۔

❀❀❀

❶ فی معجم البلدان (۳: ۴۷۴) قاله الاسدی وفی التبریزی: وقال شفیق بن سلیك الاسدی وهو شاعر اسلامی قاله معتذرا الی الضحاك (ابوانس الضاحك بن قیس بن خالد الشیبانی الفهری شهد صفین مع معاویة و غلب علی دمشق ودعا الی بیعة ابن الزبیر ثم دعا الی نفسه فقتل مراج راهط سنة ٦٥ راجع الاصابة ٦٤ : ٤ وتمامه: خفیف الحادهن فتیان جرم"
والبیت فی اللسان والحکم (جعل) والحماسة، مع المرزوقی رقم ٢٦١ فی ستة١٢۔

کِتَابُ النُّوْن

(ن ب ء)

اَلنَّبَاء: کے معنی خبر مفید کے ہیں جو علم یا غلبہ ظن کا فائدہ دے۔ اور حقیقی معنی کے لحاظ سے کسی خبر پر نبا کا لفظ استعمال نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس میں تین چیزیں موجود نہ ہوں۔ یعنی نہایت (۱) مفید (۲) ہونا اور اس سے علم (۳) یا غلبہ ظن کا حاصل ہونا۔ اور نَبَا صرف اس خبر کو کہا جاتا ہے۔ جس میں کذب کا احتمال نہ ہو۔ جیسے خبر متواتر، خبر الٰہی، اور خبر نبوی اور لفظ نَبَاء چونکہ معنی خبر کو متضمن ہوتا ہے۔ اس لیے اَخْبَرْتُهٗ بِكَذَا کی طرح اَنْبَاْتُهٗ بِكَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور معنی علم کو متضمن ہونے کی وجہ سے اَعْلَمْتُهٗ كَذَا کی طرح اَنْبَاْتُهٗ كَذَا بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ﴾ (۳۸۔۶۷، ۶۸) کہہ دو کہ یہ ایک بڑی (ہولناک چیز کی) خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے۔

﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ﴾ (۷۸۔۱،۲) یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔ کیا بڑی خبر کی نسبت؟

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ﴾ (۶۴۔۵) کیا تم کو ان لوگوں کے حال کی خبر نہیں پہنچی جو پہلے کافر ہوئے تھے۔ تو انہوں نے اپنے کاموں کی سزا کا مزہ چکھ لیا۔ ﴿تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ﴾ (۱۱۔۴۹) یہ حالات منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں۔ جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں۔

﴿تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآئِهَا﴾ (۷۔۱۰۱) یہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو سناتے ہیں۔ ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ﴾ (۱۱۔۱۰۰) یہ (پرانی) بستیوں کے تھوڑے سے حالات ہیں جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿اِنْ جَآئَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ (۴۹۔۶) اگر کوئی بدکار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔

میں متنبہ کیا ہے کہ اگر کوئی خبر کسی اہم واقعہ کی حامل ہو تو اگرچہ اس کے صحیح ہونے کا یقین یا ظن غالب حاصل ہو جائے لیکن جب تک اس پر نظر ثانی اور اچھی طرح سے اس کی جانچ پڑتال نہ ہو جائے اسے بیان کرنے میں توقف کرنا چاہیے۔

نَبَّأْتُهٗ وَاَنْبَأْتُهٗ کے معنی خبر دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

﴿اَنْبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (۲۔۳۱) اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ ﴿اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ﴾ (۲۔۳۳) کہ...... تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب انہوں نے ان کو ان کے نام بتائے۔ ﴿نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ﴾

(۱۲۔۳۷) کہ میں تم کو اس کی تعبیر بتادوں گا۔
﴿وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۱۵۔۵۱) اور ان کو ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا حال دو۔
﴿قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ﴾ (۱۰۔۱۸) کہہ دو کیا تم خدا کو ایسی چیز بتاتے ہو جس کا وجود اسے نہ آسمانوں میں معلوم ہوتا ہے اور نہ زمین میں۔
﴿اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ﴾ (۱۳۔۳۳) کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جن کو وہ......... معلوم نہیں کرتا۔
﴿نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (۶۔۱۴۳) اگر سچے ہو تو مجھے سند سے بتاؤ۔
﴿قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ﴾ (۹۔۹۴) خدا نے ہمیں تمہارے سب حالات بتا دیئے ہیں۔
اور نَبَّاتُہٗ میں اَنْبَاتُہٗ کی بنسبت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا﴾ (۴۱۔۵۰) پس کافر جو عمل کرتے ہیں۔ وہ ہم ان کو ضرور جتائیں گے۔
﴿يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ﴾ (۷۵۔۱۳) اس دن انسان نے جو عمل آگے بھیجے۔ اور جو پیچھے چھوڑے ہوں گے۔ سب بتا دیئے جائیں گے۔
اور اس سے ابلغ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آیت کریمہ:۔
﴿فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ (۶۶۔۳) تو جب وہ ان کو جتائی تو پوچھنے لگیں گے کہ آپ کو یہ کس نے بتایا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔

میں اس خبر کے محقق اور من جانب اللہ ہونے پر شبہ کرنے کے لیے جواب میں اَنْبَاءَ کی بجائے نَبَّاءَ کہا ہے۔ کیونکہ یہ اس سے ابلغ ہے۔
اسی طرح آیت کریمہ:۔
﴿قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ﴾ (۹۔۹۴) خدا نے ہمیں تمہارے سب حالات بتا دیئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۶۳۔۸) پھر جو جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتائے گا۔ بھی اس لیے ابلغ ہونے پر دال ہیں۔ اَلنُّبُوَّۃُ: وہ سفارت جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ان کے امور دنیوی اور اخروی میں خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جاری ہوتی ہے اسے نبوت کہا جاتا ہے۔ اور نبی کو نبی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کی خبر دیتا ہے۔ جن پر عقول سلیمہ مطمئن ہوتی ہیں۔ اور نَبِیٌّ ہوسکتا ہے کہ فعیل بمعنی فاعل سے ہو۔ چنانچہ فرمایا: ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْ﴾ (۱۵۔۴۹) (اے پیغمبر) میرے بندوں کو بتا دو۔
﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ﴾ (۳۔۱۵) (اے پیغمبر ان سے) کہو کہ بھلا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں؟
اور یہ بھی کہ فعیل بمعنی مفعول سے ہو یعنی خبر دیا گیا کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔
﴿نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ (۶۶۔۳) مجھے اس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔
تَنَبَّاَ فُلَانٌ کے معنی دعویٰ نبوت کرنے کے ہیں اور وضع لغوی کے اعتبار سے نبی کے متعلق اس کا استعمال صحیح ہونا

چاہیے تھا۔کیونکہ یہ باب تفعیل کا مطاوع ہوتا ہے، جیسے: زَیَّنَهٗ فَتَزَیَّنَ وَحَلَّاهُ فَتَحَلّٰی وَجَمَّلَهٗ فَتَجَمَّلَ وغیرہ۔
لیکن جھوٹا دعویٰ نبوت کرنے والے کے حق میں متعارف ہونے کی وجہ سے سچے نبی کے حق میں اس کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے اور صرف مدعی کاذب کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے تَنَبَّاءَ مُسَیْلَمَةُ یعنی مُسَیلَمه نے جھوٹا دعویٰ نبوت کیا۔ پھر اس بات پر متنبہ کرنے کے لیے کہ اس کی خبریں منجانب اللہ نہیں ہوتی تھیں نبی کی تصغیر کرکے مُسَیْلَمَةُ نُبَیِّءُ سَوْءٍ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے اسکا کلام سن کر کہا تھا۔ وَاللّٰهِ مَا خَرَجَ هٰذَا الْکَلَامُ مِنْ اِلٍّ: کہ اللہ کی قسم: یہ ال یعنی اللہ کا کلام نہیں ہے۔ اَلنَّبْأَةُ: پست اور خفی آواز۔

(ن ب ت)

اَلنَّبْتُ وَالنَّبَاتُ: ہر وہ چیز جو زمین سے اگتی ہے۔ اسے نَبْتٌ یَا نَبَاتٌ کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ تنہ دار ہو جیسے درخت۔ یا بے تنہ جیسے جڑی بوٹیاں لیکن عرف میں خاص کر نبات اسے کہتے ہیں جس کے تنہ نہ ہو۔ بلکہ عوام تو جانوروں کے چارہ پر ہی نبات کا لفظ بولتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ ﴿لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا﴾ (۷۸۔۱۵) تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں۔
میں نبات سے مراد چارہ ہی ہے۔ لیکن یہ اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور نباتات، حیوانات اور انسان سب پر بولا جاتا ہے۔ اور اِنْبَاتٌ (افعال) کا لفظ ان سب چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ (۸۰۔۲۷تا۳۱) پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاری۔ اور زیتون اور کھجوریں، اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارہ۔
﴿فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا﴾ (۲۷۔۶۰) (ہم نے) پھر اس سے سرسبز باغ اگائے تمہارا کام تو نہ تھا۔ کہ تم ان کے درختوں کو اگاتے۔
﴿یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۱) اسی پانی سے وہ تمہارے لیے کھیتی اور زیتون اگاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾ (۷۱۔۱۷) اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔
کی تفسیر میں علمائے نحو نے لکھا ہے کہ یہاں نَبَاتًا مصدر من غیر بابہٖ ہے اور اِنْبَاتًا کی جگہ پر استعمال ہوا ہے۔ ❶ دوسرے علماء کے نزدیک نَبَاتًا حال ہے۔ مصدر نہیں ہے۔ اور اس سے متنبہ کیا ہے کہ انسان بھی ایک طرح سے نبات میں داخل ہے کیونکہ اس کی ابتدائی نشأت بھی تراب ہی سے ہے۔ اور پھر وہ نبات ہی کی طرح بڑھتا ہے اگرچہ اس میں نبات سے کچھ زائد اوصاف پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔
﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ (۴۰۔۶۷) وہی تو ہے جس نے تم کو پہلے مٹی سے پیدا کیا

❶ نسب الالوسی هذا القول الی ابی حیان النحوی وجماعة من العلماء وعلی هذا ایكون نباتا مصدراً منصوبًا لا بنبت روح المعانی (۲۸۔۷۵) ۱۲۔

پھر نطفہ بنا کر۔اور آیت کریمہ:۔﴿وَّ اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ (۳۔۳۷) اور اسے اچھی طرح پرورش کیا۔
بھی اس معنی پر محمول ہے۔اور آیت کریمہ:۔﴿تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ﴾ (۲۳۔۲۰) (یعنی زیتون کا درخت کہ)...... روغن...... لیے ہوئے اگتا ہے۔
میں باء تعدیۃ کے لیے نہیں ہے کیونکہ نَبَتَ: خود فعل متعدی ہے۔ بلکہ حال کے لیے ہے: اور تقدیر یہ ہے تَنْبُتُ حَامِلَةً لِلدُّهْنِ: یعنی وہ درخت اس حال میں اگتا ہے کہ روغن اس میں بالقوۃ موجود ہوتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے: اِنَّ بَنِیْ فُلَانٍ لَنَابِتَةُ شَرٍّ کہ فلاں لوگ فساد کی جڑ ہیں۔
نَبَتَتْ فِيهِمْ نَابِتَةٌ: یعنی ان کی نئی پود جوان ہوگئی۔

(ن ب ذ)

اَلنَّبْذُ کے معنی کسی چیز کو درخور اعتناء نہ سمجھ کر پھینک دینے کے ہیں۔اسی سے محاورہ مشہور ہے۔
نَبَذْتُهُ نَبْذَ النَّعْلِ الْخَلِقِ: میں نے اسے پرانے جوتے کی طرح پھینک دیا۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ﴾ (۱۰۴۔۴) وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔
﴿فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ (۳۔۱۸۷) تو انہوں نے اسے پس پشت پھینک دیا۔
یعنی انہوں نے اسے قابل التفات نہ سمجھا۔ نیز فرمایا:
﴿نَبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ (۲۔۱۰۰) تو ان میں ایک فریق نے اس کو بے قدر چیز کی طرح پھینک دیا۔﴿فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ﴾ (۲۸۔۴۰) تو ہم نے ان کو اور ان کے لشکر کو پکڑلیا۔اور دریا میں ڈال دیا۔
﴿فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ﴾ (۳۷۔۱۴۵) پھر ہم نے ان کو فراخ میدان میں ڈال دیا۔
﴿لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ﴾ (۶۸۔۴۹) تو وہ چٹیل میدان میں ڈال دیئے جاتے۔
اور آیت کریمہ:۔
﴿فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ (۸۔۵۸) تو ان کا عہد انہی کی طرف پھینک دو (اور برابر کا جواب دو) میں فَانْبِذْ عَلٰى سَوَاءٍ کے معنی یہ ہیں کہ معاہدہ صلح سے دستبردار ہو جاؤ لہٰذا یہاں معاہدہ صلح سے دستبردار ہونے کے لیے مجاز اَنْبِذْ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جیسا کہ آیت کریمہ:۔﴿فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ن السَّلَمَ﴾ ((۱۶۔۸۶۔۸۷) تو ان کے کلام کو مسترد کر دیں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔
میں قول (اور متکلم) کے متعلق اِلْقَاءَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اور آیت:۔
فَانْبِذْ الخ میں متنبہ کیا ہے کہ (اس صورت میں) ان کے معاہدہ کو مزید مؤکد نہ کیا جائے۔ بلکہ حسن معاملہ سے اسے فسخ کر دیا جائے اور ان کے رویہ کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے۔ یعنی جب تک وہ معاہدہ کو قائم رکھیں اس کا احترام کیا جائے۔ فَانْتَبَذَ فُلَانٌ کے معنی اس شخص کی طرح یکسو ہو جانے کے ہیں جو اپنے آپ کو ناقابل اعتبار سمجھتا ہو۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا﴾ (۱۹۔۲۲) اور وہ اس بچے کے ساتھ حاملہ ہوگئیں اور اسے لے کر ایک دور جگہ چلی گئیں۔

اور قَعَدَ نَبْذَةً وَنُبْذَةً کے معنی یکسو ہو کر بیٹھ جانے کے ہیں اور راستہ میں پڑے ہوئے بچے کو صَبِیٌّ مَنْبُوْذٌ وَنَبِیْذٌ کہتے ہیں۔جیسا کہ اسے مَلْقُوْطٌ یا لَقِیْطٌ کہا جاتا ہے لیکن اس لحاظ سے کہ کسی نے اسے پھینک دیا ہے۔ اسے مَنْبُوْذٌ کہا جاتا ہے۔اور اٹھائے جانے کے لحاظ سے "لَقِیْطٌ" کہا جاتا ہے۔اَلنَّبِیْذُ: اصل میں انگور یا کھجور کو کہتے ہیں۔ جو پانی میں ملائی گئی ہو۔ پھر خاص قسم کی شراب پر بولا جاتا ہے۔

(ن ب ز)

اَلنَّبْزُ کے معنی کسی کو برے نام کے ساتھ پکارنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ (۴۹۔۱۱) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

(ن ب ط)

اَلْاِسْتِنْبَاطُ: کے معنی استخراج کے ہیں۔جیسے فرمایا:۔

﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ (۴۔۸۳) اور اس کو پیغمبر اور اپنے سرداروں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کر لیتے۔اور یہ اَنْبَطْتُ کَذَا سے استفعال کا صیغہ ہے جس کے اصل معنی پانی نکالنے کے ہیں اور کنواں کھودنے کے بعد جو پہلی دفعہ پانی نکالا جاتا ہے اسے نبط کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ اَنْبَطُ: اسپ سفید بغل۔اسی سے نَبَطٌ ایک مشہور قوم کا نام ہے۔

(ن ب ع)

اَلنَّبْعُ کے معنی چشمہ سے پانی پھوٹنے کے ہیں۔اور یہ نَبَعَ الْمَاءُ یَنْبُعُ (ن) نُبُوْعًا وَنَبْعًا کا مصدر ہے اور اَلْیَنْبُوْعُ اس چشمہ کو کہتے ہیں جس سے پانی اُبل رہا ہو اس کی جمع ینابیع آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَهٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۹۔۲۱) کیا تم نے نہیں دیکھا۔کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا ہے۔ پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا ہے۔

اَلنَّبْعُ ایک قسم کا درخت جس کی کمانیں بنتی ہیں۔

(ن ب و)

اَلنَّبِیُّ: (بدون ہمز) کے متعلق بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہموز ہے لیکن اس میں ہمزہ متروک ہو چکا ہے۔اور اس پر وہ مُسَیْلَمَةُ نُبَیِّءُ سُوْءٍ کے محاورہ سے استدلال کرتے ہیں۔ [1]

مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ نَبْوَةٌ بمعنی رفعت سے مشتق ہے اور نبی کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر معزز اور بلند اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ [2] جیسا کہ آیت کریمہ:۔

﴿وَّ رَفَعْنٰهُ مَکَانًا عَلِیًّا﴾ (۱۹۔۵۷) اور ہم نے ان کو بلند درجات سے نوازا۔

کے مفہوم سے سمجھا جاتا ہے۔پس معلوم ہوا کہ نبی بدوں

---

[1] ای لا جماع العرب انه بالهمزة ۱۲۔

[2] وفی الفائق ومنه (نبوة) زعم ان اشتقاق النبی منه وهو غیر متقبل عند محققة اصحابنا ولا یعرج علیه (۲: ۲۶۲)

ہمزہ (مہموز) سے ابلغ ہے کیونکہ ہر مُنَبَّأٌ لوگوں میں بلند قدر اور صاحب مرتبہ نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کو ازراہ بغض یَا نَبِیَّ اللّٰہِ کہہ کر پکارا تو آپ نے فرمایا❶ (۱۲۵)

((لَسْتُ بِنَبِیءِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ نَبِیُّ اللّٰہِ)) کہ میں نبی اللہ نہیں ہوں بلکہ نَبِیُّ اللّٰہِ ہوں۔

اَلنَّبْوَۃُ وَالنَّبَاوَۃُ کے معنی بلندی کے ہیں۔اسی سے محاورہ ہے۔

نَبَا بِفُلَانٍ مَکَانُہٗ: کہ اسے یہ جگہ راس نہ آئی۔جیسا کہ قَضَّ عَلَیْہِ مَضْجَعُہٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی بے چینی سے کروٹیں لینے کے ہیں۔نَبَا السَّیْفُ عَنِ الضَّرِیْبَۃِ: تلوار کا اچٹ جانا۔پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر نَبَا بَصَرُہٗ عَنْ کَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے کراہت کرنے کے ہیں۔

(ن ت ق)

نَتَقَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو کھینچ کر ڈھیلا کر دینے کے ہیں۔جیسے نَتَقَ عُرَی الْحِمْلِ: اس نے بوجھ کی گرہیں کھول دیں۔قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَھُمْ﴾ (۷۔۱۷۱) اور جب ہم نے ان کے سروں پر پہاڑ اٹھا کھڑا کیا۔

اسی سے استعارہ کے طور پر کثیر الاولاد عورت کو اِمْرَءَۃٌ نَاتِقٌ کہا جاتا ہے۔❷ اور اس عورت کے ساتھ تشبیہ دے کر زود آتش افروز چقماق کو بھی زَنْدٌ نَاتِقٌ کہتے ہیں۔

(ن ث ر)

نَثَرَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو بکھیرنے اور پراگندہ کر دینے کے ہیں۔

یہ نَثَرْتُہٗ (ض) کا مصدر ہے۔اور اِنْتَثَرَ (انفعال) کے معنی بکھر جانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ﴾ (۸۲۔۲) اور جب تارے جھڑ پڑیں۔

اور پہنی ہوئی زرہ کو نَثْرَۃٌ کہا جاتا ہے۔

نَثَرَتِ الشَّاۃُ: بکری کا چھینک کر فضلہ باہر پھینکنا اور چھینک سے جو فضلہ ناک سے بہہ نکلتا ہے اسے بھی نَثْرَۃٌ کہا جاتا ہے کبھی نَثْرَۃٌ کا لفظ ناک پر بھی بولا جاتا ہے۔ اسی سے نَثْرَۃٌ ایک ستارے کا نام ہے جسے اَنْفُ الْاَسَدِ کہا جاتا ہے۔محاورہ ہے۔

طَعَنَہٗ فَانْتَثَرَ: اسے نیزہ مارا تو وہ ناک کے بل گر پڑا۔

اَلْاِسْتِنْثَارُ: ناک میں پانی چڑھا کر جھاڑنا۔

(ن ج د)

اَلنَّجْدُ کے معنی بلند اور سخت جگہ کے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ﴾ (۹۰۔۱۰) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

میں نَجْدَیْنِ کا لفظ حق و باطل، صدق و کذب اور حسن و قبیح، قول و عمل کے لیے بطور مثال ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں راستے واضح کر دیے ہیں۔جیسے

---

❶ رواہ الحاکم فی المستدرك والحدیث غیر صحیح لان فی سندہ حمران من غلاۃ الشیعۃ ومما یدل علی ان الصحیح انہ بالھمزۃ قرء مھموزا فی السبعۃ

❷ وفی الحدیث علیکم بالابکار فانھن افواھا وانتق ارحاما (انظر النھایۃ (۱۳۱/۴) والفائق (۶۵/۳)۔

فرمایا:۔
﴿اِنَّا ھَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ﴾ لایۃ (۷۶۔۳) اور اسے رستہ بھی دکھایا۔

اَلنَّجْدُ: (ایضاً) ایک علاقے کا نام ہے اور اَنْجَدَہٗ کے معنی نجد کا قصد کرنے کے ہیں۔ اور رَجُلٌ نَجِدٌ وَنَجِیْدٌ وَنَجْدٌ کے معنی مشہور طاقت ور اور بہادر آدمی کے ہیں۔ اور اِسْتَنْجَدَہٗ فَاَنْجَدَنِیْ کے معنی ہیں: میں نے اس سے فریاد کی تو اس نے بہادری اور قوت سے میری مدد کی اور کبھی اِسْتَنْجَدَ فُلَانٌ کے معنی قوی ہونا کے بھی آجاتے ہیں۔ اور تکلیف زدہ اور مغلوب آدمی کو مَنْجُوْدٌ کہا جاتا ہے۔ گویا وہ نَجْدَۃٌ یعنی شدت میں گرفتار ہے۔

اَلنَّجْدُ: (ایضاً) پسینہ۔ نَجَدَہُ الدَّھْرُ کے معنی کسی کو قوی کر دینے کے ہیں۔ گویا وہ تجربہ حاصل کر کے قوی ہو گیا۔ ❶

اسی سے فُلَانٌ ابْنُ نَجْدَۃَ کَذَا کا محاورہ ہے یعنی وہ اس کام میں ماہر ہے۔

اَلنِّجَادُ: مکان کی آرائشگی کا سامان یہ (نَجَدَ) کی جمع ہے۔

نَجَّادٌ فرش ساز و آنچہ بستر و بالین دوزد۔ نِجَادُ السَّیْفِ: تلوار لٹکانے کا پرتلہ۔

اَلنَّاجُوْدُ: شراب صاف کرنے کی صافی۔ راؤوق۔

(ن ج س)

اَلنَّجَاسَۃُ کے معنی پلیدی کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔ نجاست: (۱) حسی یا مادی جس کا ادراک حس سے ہو سکتا ہو۔ نجاست (۲) معنوی: جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہو۔ چنانچہ نجاست معنوی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے متعلق فرمایا:۔
﴿اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ﴾ (۹۔۲۸) مشرک تو پلید ہیں۔

نَجَّسَہٗ کے معنی: کسی چیز کو نجس کر دینا کے ہیں۔ نیز اس کے معنی ازالہ نجاست بھی آتے ہیں۔ اور اسی سے تَنْجِیْسُ الْعَرَبِ ہے یعنی تعویذ گنڈا۔ جو شیطانی نجاست کو دور کرنے کے لیے بچے کے گلہ میں لٹکاتے تھے۔

نَاجِسٌ وَنَجِیْسٌ ایک بری اور لاعلاج بیماری۔

(ن ج م)

اَلنَّجْمُ: اصل میں طلوع ہونے والے ستارے کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع نُجُوْمٌ آتی ہے۔ اور نَجَمَ (ن) نُجُوْمًا وَنَجْمًا کے معنی طلوع ہونے کے ہیں۔ نَجم کا لفظ کبھی اسم ہوتا ہے۔ اور کبھی مصدر اسی طرح نجوم کا لفظ کبھی قُلُوْبٌ وَ جُیُوْبٌ کی طرح جمع ہوتا ہے اور کبھی طُلُوْعٌ وَغُرُوْبٌ کی طرح مصدر اور تشبیہ کے طور پر سبزہ کے اگنے اور کسی رائے کے ظاہر ہونے پر بھی نَجَمَ النَّبْتُ اَوِ الْقَرْنُ وَنَجَمَ لِیْ رَأْیٌ نَجْمًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

نَجَمَ فُلَانٌ عَلَی السُّلْطَانِ: بادشاہ سے بغاوت کرنا۔ نَجَّمْتُ الْمَالَ عَلَیْهِ: اس کے اصل معنی تو ستاروں کے طلوع کے لحاظ سے قرض کی قسطیں مقرر کرنے کے ہیں۔ مثلاً: فلاں ستارے کے طلوع پر مال کی اتنی قسط ادا کرتا رہوں گا۔ مگر عرف میں مطلق اقساط مقرر کرنے پر

---

❶ وفی المثل "وانہ، لمنجد" المیدانی (۱/۲۹)۔

بولا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۶) اور لوگ ستاروں سے بھی رستے معلوم کرتے ہیں۔
﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ﴾ (۳۷۔۸۸) تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی۔
یعنی علم نجوم سے حساب نکالا۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى﴾ (۵۳۔۱) تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نجم سے مراد ستارہ ہے اور طَلَعَ کی بجائے هَوٰى کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے کہ طلوع کے معنی پر تو لفظ نجم ہی دلالت کر رہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نجم سے مراد ثریا یعنی پروین ہے۔ کیونکہ اہل عرب جب مطلق اَلنَّجْم کا لفظ بولتے ہیں تو پروین ہی مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ مقولہ ہے [1] (الرمل)

طَلَعَ النَّجْمُ غُدَيَّهْ
وَابْتَغَى الرَّاعِيْ شُكَيَّهْ

صبح کا ستارہ طلوع ہوا اور چرواہے نے اپنا مشکیزہ سنبھالا۔
بعض نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں النجم سے مراد نجوم القرآن ہیں۔ کیونکہ وہ بھی تدریجاً معین مقدار میں نازل ہوتا رہا ہے اور ھــوی سے اس کا نزول مراد ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔
﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ (۵۶۔۷۵) ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم۔
میں بھی مواقع النجوم .... کی دو طرح تفسیر بیان کی گئی ہے۔ یعنی بعض نے مواقع النجوم سے مراد ستاروں کے منازل لیے ہیں اور بعض نے نجوم القرآن مراد لیے ہیں۔
اَلتَّنَجُّمُ: علم نجوم کے حساب سے کوئی پیش گوئی کرنا۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾ (۵۵۔۶) اور بوٹیاں اور درخت سجدے کر رہے ہیں۔
میں نجم سے بے تنہ نباتات یعنی جڑی بوٹیاں مراد ہیں اور بعض نے ستارے مراد لیے ہیں۔

(ن ج و)

اصل میں نَجَاءٌ کے معنی کسی چیز سے الگ ہونے کے ہیں۔ اسی سے نَجَا فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی نجات پانے کے ہیں۔ اور اَنْجَيْتُهٗ وَنَجَّيْتُهٗ کے معنی نجات دینے کے چنانچہ فرمایا:۔
﴿وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۷۔۵۳) اور جو لوگ ایمان لائے...... ان کو ہم نے نجات دی۔ ﴿اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ﴾ (۲۹۔۳۳) ہم آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو بچالیں گے۔
﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ (۲۔۴۹) جب ہم نے تم کو قوم فرعون سے خلاصی بخشی۔
﴿فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۱۰۔۲۳) لیکن جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔ ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ﴾ (۷۔۸۳) تو ہم نے ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچالیا۔ مگر ان کی بی بی۔ ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا﴾ (۷۔۷۲) پھر ہم نے ہود علیہ السلام اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے۔ ان کو نجات بخشی۔

[1] انظر للكلمة الميداني والبحر (۸/۱۵۷) والمرزوقي (۴۷۹) اوفي المعاني للقبتي عشاء وكساء بدل غديه وشكيه بغير عزو۔

﴿نَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا﴾ (۳۷۔۱۱۵) اور ان کو اور ان کی قوم کو...... نجات بخشی۔

﴿نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ نِعْمَةً﴾ (۵۴۔۳۴) ان کو پچھلی رات ہی سے بچالیا اپنے فضل سے۔

﴿وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۴۱۔۱۸) اور جو ایمان لائے...... ان کو ہم نے بچالیا۔

﴿نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۱۱۔۵۸) اور انہیں عذاب شدید سے نجات دی۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا﴾ (۱۰۔۱۰۳) اور ہم اپنے پیغمبروں کو...... نجات دیتے رہے ہیں۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ (۱۹۔۷۲) پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے۔

اَلنَّجْوَةُ وَالنَّجَاةُ: بلند جگہ، جو بلندی کی وجہ سے اپنے ماحول سے الگ معلوم ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ سیلاب کی زد سے محفوظ ہونے کی وجہ سے اسے نَجْوَةٌ یا نَجَاةٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے نَجَّيْتُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کو نَجْوَةٌ یعنی علیحدہ بلند جگہ پر چھوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ﴾ (۱۰۔۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے۔

اور نَجَوْتُ کے معنی درخت یا بکری کا پوست اتارنا بھی آتے ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ ان دونوں معنی میں مشترک ہے۔ اس لیے شاعر نے کہا ہے [1] (الطّويل)

(۴۱۸) فَقُلْتُ اَنْجُوَا عَنْهَا نَجَا الْجِلْدِ اِنَّهٗ
سَيُرْضِيْكُمَا مِنْهَا سَنَامٌ وَّغَارِبُهٗ

میں نے کہا کہ اس کا پوست اتارلو بے شک اس کی کوہان اور کندھے تمہارے لیے کافی ہوں گے۔ نَاجَيْتُهٗ کے معنی سرگوشی کرنے کے ہیں۔ مگر اس کے اصل معنی بلند زمین پر کسی کے ساتھ تنہا ہونے کے ہیں۔ بعض نے اسے نَجَاةٌ سے لیا ہے۔ لہٰذا نَاجَيْتُهٗ کے اصل معنی کسی معاملہ میں دوسرے کی رہائی کے لیے اس کی مدد کرنے کے ہیں۔ یا اپنے بھید کو دوسروں پر افشا ہونے سے بچانے کے ہیں۔ تَنَاجَى الْقَوْمُ لوگوں کا باہم سرگوشی کرنا۔

چنانچہ فرمایا:۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ (۵۸۔۹) مومنو! جب تم آپس میں سرگوشیاں کرنے لگو تو گناہ اور زیادتی، پیغمبر کی نافرمانی کی باتیں نہ کرنا۔ بلکہ نیکوکاری اور پرہیزگاری کی باتیں کرنا۔

﴿اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً﴾ (۵۸۔۱۲) جب تم پیغمبروں کے کانوں میں کوئی بات کہو تو بات کہنے سے پہلے (مساکین

---

[1] البیت فی اللسان (نجا، جمع) غیر منسوب والخزانة (٤ : ٢٧٠/٢ : ٢٢٧) والبیت من شواهد سیبویه فی الکتاب والتنبیهات للبکری علی القالی واصلاح المنطق ٩٤ ونسبه ابن البری بعید الرحمن بن حسان بن ثابت لکنه لابی الغمر الکلابی (کذا قال العینی ونسبه ابی العباب للصاغانی ولکن نقد علیه صاحب الخزانة والبیت مما اورده العلما شاهدا علی انه یجوز اضافة الشیء الی نفسه اذا اختلف اللفظان فان النجا والجلد مترادفان وقد تضایفا راجع الخزانة (٤ : ٢٧٠-٢٧٢) وابن ولاد ١١٢ و ذهب السیرانی فی شرح ابیات الاصلاح: ان النجا ههنا بمعنی النجو منصوب علی انه مفعول مطلق والبیت ایضا فی امالی الزجاجی والنبهات لابی القاسم البصری (علی بن حمزه)١٢۔

کو) کچھ دے دیا کرو۔

اَلنَّجْوٰی: یہ اصل میں مصدر ہے جیسے فرمایا:۔

﴿اِنَّمَا النَّجْوَی مِنَ الشَّیْطَانِ﴾ (۵۸۔۱۰) (کافروں کی) سرگوشیاں تو شیطان (کی حرکات) سے ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُهُوا عَنِ النَّجْوٰی﴾ (۵۸۔۸) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ اَسَرُّوا النَّجْوَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۲۱۔۳) اور ظالم لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ میں نَجْوٰی کے ساتھ اَسَرُّوْا کا لفظ لا کر متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے ہر طرح سے اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ کیوں کہ نَجْوٰی اگرچہ خفیہ ہوتا ہے لیکن کبھی قبل از وقت افشاء ہو جاتا ہے۔ نیز فرمایا:۔ ﴿مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ (۵۸۔۷) (کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع اور) کانوں میں صلاح مشورہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے۔

اور لفظ نَجْوٰی کبھی بطور وصف کے بھی آ جاتا ہے اور واحد و جمع دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ مثلا: هُوَ نَجْوٰی وَهُمْ نَجْوٰی قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ اِذْهُمْ نَجْوٰی﴾ (۱۷۔۴۷) اور جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں۔

اَلنَّجِیُّ کے معنی سرگوشی کرنے والے کے ہیں یہ بھی واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا﴾ (۱۹۔۵۲) اور باتیں کرنے کے لیے نزدیک بلایا۔

﴿فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا﴾ (۱۲۔۸۰) جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔

اِنْتَجَیْتُ فُلَانًا: کسی کو راز دار بنانا۔

اَنْجٰی فُلَانٌ: بلند زمین پر جانا۔

هُمْ فِیْ اَرْضِ نَجَاةٍ: وہ ایسی سرزمین میں ہیں جس کے درختوں سے لاٹھیاں اور کمانیں بنائی جاتی ہیں۔ اور اَلنَّجَا اس لکڑی کو کہتے ہیں۔ جس کا پوست اتار دیا گیا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ نَجَوْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کے منہ کی بدبو سونگھنے کے ہیں۔ اور شعر سے استدلال کیا ہے [1] (الوافر)

(۴۱۹) نَجَوْتُ مُجَالِدًا فَوَجَدْتُ مِنْهُ
كَرِیْحِ الْكَلْبِ مَاتَ حَدِیْثُ عَهْدٍ

تو بقول بعض اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے مجالد کے منہ کی بو سونگھی تو اس سے تازہ مرے ہوئے کتے کی سی بدبو پائی۔

میں کہتا ہوں کہ اگر وہ محض اس شعر کی بنا پر نَجَوْتُ کے یہ معنی بیان کرتے ہیں تو یہ شعر ان کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ شاعر کی مراد تو یہ ہے کہ میں نے مجالد سے سرگوشی کی تو مرض بخر کی وجہ سے اس کے منہ سے مجھے مردہ کتے کی سی بدبو آئی۔ اور کنایہ کے طور پر نَجْوٌ کے معنی پائخانہ

[1] فی اللسان (نجا) غیر منسوب والبیت لحکم بن عدل فی قصیدة ٤٤ بیتا یهجو فیها محمد بن حسان بن سعد کما فی الاغانی (٢ : ٤١٢) و عیون الاخبار (٤ : ٦٢) وفی البیت تحریف دان نقله ایضا صاحب اللسان والصواب فی الروایة نجوت محمدا بدل نجوت محالدا کما فی الحیوان (١ : ٢٥١) فعلی هذا لاشاهد ١٢۔

کے بھی آتے ہیں۔محاورہ ہے: شَرِبَ دَوَاءً فَمَا اَنْجَاهُ: اس نے دوا پی لیکن ٹٹی نہ آئی۔

اَلْاِسْتِنْجَاءُ کے معنی استنجاء کرنے اور رفع حاجت۔کے لیے علیحدہ جگہ تلاش کرنے کے ہیں۔جیسا کہ تَغَوَّطَ کے معنی پست جگہ تلاش کرنے کے آجاتے ہیں کبھی استنجاء کے معنی ازالہ نجاست کے لیے مٹی کا ڈھیلا تلاش کرنا بھی ہوتے ہیں۔جیسے اِسْتَجْمَرَ: پتھر تلاش کرنا۔

اَلنَّجَأَةُ (مہموز) نظر بد لگانا۔حدیث میں ہے۔ [1]

اِدْفَعُوْا نَجَأَةَ السَّآئِلِ بِاللُّقْمَةِ: یعنی سائل کی حریصانہ نظر کو لقمہ سے دور کرو۔

(ن ح ب)

اَلنَّحْبُ: اس نذر کو کہتے ہیں جس کا پورا کرنا واجب ہو۔محاورہ ہے۔

قَضٰی فُلَانٌ نَحْبَهٗ یعنی فلاں نے اپنی نذر پوری کی قرآن میں ہے:۔

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ﴾ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں۔(۳۳۔۲۳)

مجازاً اس سے موت مراد لی جاتی ہے۔جیسا کہ قَضٰی اَجَلَهٗ اَوِ اسْتَوْفٰی اَكْلَهٗ اَوْ قَضٰی مِنَ الدُّنْیَا حَاجَتَهٗ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں۔اور ان سے موت مراد ہوتی ہے۔

اَلنَّحِیْبُ کے معنی گریہ زاری اور آواز کے ساتھ رونے کے ہیں۔اور نُحَابٌ کھانسی کو کہتے ہیں۔

(ن ح ت)

نَحَتَ (ض) کے معنی لکڑی، پتھر یا اس قسم کی سخت چیزوں کو تراشنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ﴾ (۲۶۔۴۹) اور تکلیف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر......گھر بناتے ہو۔

نُحَاتَةٌ: تراشہ۔وہ ریزے جو کاٹنے سے گریں اور انسانی فطرت کو اس لحاظ سے کہ انسان کی ساخت اس کے مطابق بنائی گئی ہے نَحِیْتَةٌ کہا جاتا ہے۔اور اس لحاظ سے کہ وہ انسان کے اندر پیوست کی گئی ہے غریزہ کہلاتی ہے۔

(ن ح ر)

اَلنَّحْرُ: سینہ کا بالائی حصہ جہاں پر ہار پڑا رہتا ہے۔نَحَرْتُهٗ: کسی کے سینہ پر مارنا۔اسی سے نَحْرُ الْبَعِیْرِ ہے جس کے معنی اونٹ کے سینہ پر برچھا مار کر اسے ذبح کرنے کے ہیں۔

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔

﴿فَنَحَرُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ﴾ (۲۔۷۱) انہوں نے اس بیل کو ذبح کیا۔اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔پھر نَحْرُ الْبَعِیْرِ کی تشبیہ سے اِنْتَحَرُوْا عَلٰی كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز پر باہم لڑائی کرنے کے ہیں۔

نَحْرَةُ الشَّهْرِ وَنَحِیْرُهٗ: مہینہ کے پہلے دو دن اور تیسری رات کی مجموعی مدت۔

اور بقول بعض، مہینے کے آخری دن کو بھی نَحِیْرَةٌ کہا جاتا ہے۔گویا وہ اپنے سے پہلے دنوں کو تحریر کر ڈالتا ہے۔

---

[1] انظر للحدیث الفائق (۲/۲۶۵) وفیه رُدُّوا بدل ادفعوا۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ (۱۰۸۔۲) اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو۔

میں خاص کر ان ہر دو ارکان یعنی نماز اور قربانی ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں عبادتیں ضروری ہیں۔ اور ہر دین اور ہر دور میں یہ واجب رہی ہیں۔ بعض نے کہا ہے یہاں وَانْحَرْ کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے ہیں۔ ❶ (۱۲۶)

اور بعض نے کہا ہے کہ ریاضت کے ذریعہ نفس کشی مراد ہے۔

اَلنِّحْرِيْرُ: کسی چیز کا ماہر وحاذق۔

(ن ح س)

اَلنُّحَاسُ: دھواں، بغیر شعلہ کے آگ کی لپٹ۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ﴾ (۵۵۔۳۵) تم پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا۔

تو یہاں نُحَاسٌ کے معنی آگ کی لپٹ کے ہیں۔ اور لپٹ کا رنگ چونکہ تانبے جیسا ہوتا ہے لہٰذا تشبیہاً نُحَاس کے معنی تانبا بھی آجاتے ہیں۔

اَلنَّحْسُ: (منحوس) یہ سعد کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ﴾ (۵۴۔۱۹) سخت منحوس دن میں۔

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ﴾ (۴۱۔۱۶) ہم نے ان پر نحوست کے دنوں میں زور کی ہوا چلائی۔

اور ایک قرأت میں نَحْسَاتٍ بِفَتْحِ الْخَاءَ ہے۔ جس کے معنی بعض نے منحوس اور بعض نے سخت سردی والے دنوں کے کیے ہیں۔ اصل میں نَحَسَ کے معنی افق آسمان کے سرخ ہو کر نحاس کی طرح ہو جانے کے ہیں۔ اور یہ نحوست کے لیے ضرب المثل ہے۔

(ن ح ل)

اَلنَّحْلُ: شہد کی مکھی۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ (۱۶۔۶۸) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا۔ اَلنَّحْلَةُ وَالنِّحْلَةُ: اس عطیہ کو کہتے ہیں جو تبرعا دیا جائے۔ یہ ہبہ سے خاص ہے۔ کیونکہ ہر ہبہ کو نحْلَة تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر نحْلَه کو ہبہ نہیں کہتے۔ میرے خیال میں یہ نَحْلٌ سے مشتق ہے۔ اور اس میں مکھی کے فعل کے معنی ملحوظ ہیں۔ تو گویا نَحْلَتُهُ کے معنی نَحْلٌ کی طرح عطیہ دینے کے ہیں جس پر کہ آیت:۔ ﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ الْاٰيَة میں متنبہ کیا ہے۔ حکماء کا بیان ہے کہ نَحْل جن پودوں سے غذا لیتی ہے۔ انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں۔ پہنچاتی بلکہ الٹا فائدہ پہنچاتی ہے۔ اور شہد جیسی شفا بخش چیز لوگوں کو حاصل کر کے دیتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق بیان فرمایا ہے۔

اور نَحْلَةٌ وَنِحْلَةٌ: صداق یعنی عورتوں کے مہر کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے مقابلہ میں سوائے لذت اندوزی کے

❶ وفي السنن للبيهقي والتاريخ للبخاري منسوب الى عليؓ وانس ولكن قال صاحب الجوهري النقي ان هذاه الرواية مضطربة ورواية انس غير صحيحة وقال ابن كثير والصحيح ان المراد منه الزبيحة وقال الجصاص هو معناه الحقيقي الذى يفهم عند الاطلاق (احكام القرآن ۳/۵۱۵)

اور کوئی مالی معاوضہ حاصل نہیں ہوتا۔اسی سے اولاد کو عطیہ دینے پر نَحَلَ ابْنَهٗ كَذَا وَاَنْحَلَهٗ بولتے ہیں۔اور اسی سے نَحَلْتُ الْمَرْءَةَ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔﴿وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (۴۔۴)اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔اور نَحِلَ جِسْمُهٗ کے معنی دبلا ہو کر مکھی کی طرح باریک ہو جانے کے ہیں۔ اور اسی سے تیز تلواروں کو ان کی دھاروں کے باریک ہونے کی وجہ سے نَوَاحِلُ کہا جاتا ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نِحْلَةٌ کو اصل قرار دے کر نحل کو اس سے مشتق مانا جائے۔کیونکہ مکھی سے جو شہد حاصل ہوتا ہے وہ بھی فائدہ بخش ہونے کے لحاظ سے ایک قسم کی عطا ہی ہوتی ہے۔

اَلْاِنْتِحَالُ کے معنی کسی چیز کا ادعاء کرنے اور لینے کے ہیں اسی سے فُلَانٌ يَنْتَحِلُ الشِّعْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی شعری سرقہ کرنے کے ہیں۔واللہ اعلم۔

نحن

نَحْنُ: (ہم) اسے ضمیر متکلم مع الغیر کہتے ہیں۔قرآن پاک میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق نَحْنُ کا لفظ استعمال کیا ہے۔جیسے فرمایا:۔

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (۱۲۔۳) اے پیغمبر علیہ السلام ہم تمہیں ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔اس کی تاویل میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد تو ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔لیکن شاہی خطابات کی طرح صیغہ جمع استعمال کیا گیا ہے۔اور بعض نے کہا ہے ذات! باری تعالیٰ اپنے متعلق اس قسم کے الفاظ ان افعال کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔جو بواسطہ ملائکہ یا اولیاء اللہ کے سرانجام پاتے ہیں تو نَحْنُ سے مراد اللہ تعالیٰ اور وہ فرشتے یا اولیاء کرام ہوتے ہیں۔جن کے ذریعہ وحی، مومنین کی نصرت کفار کی ہلاکت اور اس قسم کے دیگر افعال سرانجام پاتے ہیں۔جن کا ذکر کہ آیت:۔

﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ (۷۹۔۵) پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔

میں پایا جاتا ہے۔اس بنا پر آیت کریمہ:۔

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ﴾ (۵۷۔۸۵) اور ہم اس مرنے والے سے تم سے بھی زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں۔

میں نَحْنُ سے حالت نزع کے وقت حاضر ہونے والے فرشتے مراد ہوں گے۔جن کا ذکر کہ آیت:۔

﴿تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۱۶۔۲۸) میں پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ قرآن پاک کا نزول بھی قلم، لوح محفوظ اور جبریل علیہ السلام کی وساطت سے ہوا ہے۔لہٰذا آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ (۱۵۔۹) بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے۔میں بھی تَنْزِيْل کو بصیغہ جمع ذکر فرمایا ہے۔

(ن خ ر)

نَخِرَةٌ بوسیدہ: قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ (۷۹۔۱۱) بھلا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے۔

یہ نَخِرَتِ الشَّجَرَةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی تیز ہوا چلنے سے بوسیدہ درخت میں آواز پیدا ہونے کے ہیں۔

اور اَلنَّخِيْرُ: خراٹے کی آواز جو نیند کی حالت میں ناک

سے نکلتی ہے۔ اور ناک کے دونوں نتھنوں کو جن سے آواز نکلتی ہے نُخْرَتَان یا مَنْخَرَیْنِ کہتے ہیں۔

اَلنَّخُوْرُ: وہ اونٹنی کہ جب تک اس کے نتھنوں میں انگلی ڈال کر سہلایا نہ جائے۔ دودھ نہ دے۔

اَلنَّاخِرُ خراٹے بھرنے والے آدمی کو نَاخِرٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے محاورہ ہے۔

مَابِالدَّارِ نَاخِرٌ: گھر میں کوئی نہیں رہا۔

(ن خ ل)

اَلنَّخْلُ: کھجور کا درخت۔ یہ واحد و جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃٍ﴾ (۶۹۔۷) جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

﴿کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ﴾ (۲۰۔۱۴۸) اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہوتے ہیں۔

﴿وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّھَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ﴾ (۵۰۔۱۰) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔

اس کی جمع نَخِیل آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ﴾ (۱۶۔۶۷) اور کھجور کے میووں سے بھی۔

اَلنَّخْلُ (مصدر کے معنی چھلنی سے آٹا چھاننے کے ہیں)۔

اور اِنْتَخَلْتُ الشَّیْءَ کے معنی عمدہ چیز منتخب کر لینے کے۔

(ن د د)

نَدِیْدُ الشَّیْءِ: وہ کسی چیز کی ذات یا جوہر میں اس کا شریک ہو اور یہ مماثلت کی ایک قسم ہے کیونکہ مثل کا لفظ ہر قسم کی مشارکت پر بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر ہر نِدٌّ کو مِثْلٌ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر مِثْلٌ نِدٌّ نہیں ہوتا۔

اور نِدٌّ، نَدِیْدٌ، نَدِیْدَۃٌ تینوں ہم معنی ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا﴾ (۲۔۲۲) پس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا﴾ (۲۔۱۶۵) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک خدا بناتے ہیں۔

﴿وَتَجْعَلُوْنَ لَہٗٓ اَنْدَادًا﴾ (۴۱۔۹) اور بتوں کو اس کا مد مقابل بناتے ہو۔

اور ایک قراءت میں ﴿یَوْمَ التَّنَادِّ﴾ (۴۰۔۳۲) تشدید دال کے ساتھ ہے۔ اور نَدَّ یَنِدُّ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی دور بھاگنے کے ہیں اور قیامت کے روز بھی چونکہ لوگ اپنے قرابتداروں سے دور بھاگیں گے جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ﴾ مذکور ہے اس لیے روز قیامت کو یَوْمَ التَّنَادِّ بتشدید الدال کہا گیا ہے۔

(ن د م)

اَلنَّدْمُ وَالنَّدَامَۃُ کے معنی فوت شدہ امر پر حسرت کھانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ﴾ (۵۔۳۱) پھر وہ پشیمان ہوا۔

﴿عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ نٰدِمِیْنَ﴾ (۲۳۔۴۰) تھوڑے ہی عرصے میں پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے اصل معنی حزن کا ندیم بن جانے کے ہیں۔ اور نَدِیْمٌ نُدْمَانَ اور مُنَادِمٌ تینوں قریب المعنی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مُنَادَمَۃٌ اور مُدَاوَمَۃٌ دونوں قریب المعنی ہیں۔ اور بقول بعض اور ہم پیالہ (شراب نوش) کو ندیمان اس لیے

کہا جاتا ہے۔ کہ انجام کار وہ اپنے فعل پر پشیمان ہوتے ہیں۔

(ن د ی)

اَلنِّدَآءُ کے معنی آواز بلند کرنے کے ہیں اور کبھی نفس آواز پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿...... مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ (۲۔۱۷۱) جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

میں نداء سے مراد آواز اور پکار ہے۔ یعنی وہ چوپائے صرف آواز کو سنتے ہیں۔ اور اس کلام سے جو مفہوم ہوتا ہے۔ اسے ہرگز نہیں سمجھتے۔ اور کبھی اس کلام کو، جس سے کوئی معنی مفہوم ہوتا ہو اسے نِـــــدَاءٌ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰی﴾ (۲۶۔۱۰) اور جب تمہارے پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ﴾ (۵۔۵۸) اور جب تم لوگ نماز کے لیے اذان دیتے ہو۔

میں نماز کے لیے اذان دینا مراد ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ (۶۲۔۹) جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے۔

میں بھی نداء کے معنی نماز کی اذان دینے کے ہیں۔ اور شریعت میں نِدَاءُ الصَّلٰوۃِ (اذان) کے لیے مخصوص اور مشہور کلمات ہیں اور آیت کریمہ:۔ ﴿اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِیْدٍ﴾ (۴۱۔۴۴) ان کو گویا دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔ میں ان کے متعلق نداء کا لفظ استعمال کر کے متنبہ کیا ہے کہ وہ حق سے بہت دور جا چکے ہیں۔ نیز فرمایا۔

﴿وَاسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ﴾ (۵۰۔۴۱) اور سنو! جس دن پکارنے والا نزدیک کی جگہ سے پکارے گا۔

﴿وَ نَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ﴾ (۱۹۔۵۲) اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب سے پکارا۔ ﴿فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ﴾ (۲۷۔۸) جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے تو ندا آئی۔ اور آیت کریمہ ﴿اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا﴾ (۱۹۔۳) جب انہوں نے اپنے پروردگار کو دبی آواز سے پکارا۔ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق نَادٰی کا لفظ استعمال کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زکریا علیہ السلام نے اپنے گناہ اور احوال سیئہ کے باعث اس وقت اپنے آپ کو حق اللہ تعالیٰ سے دور تصور کیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے کی حالت ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ﴾ (۳۔۱۹۳) اے پروردگار! ہم نے ایک ندا کرنے والے کو سنا۔ جو ایمان کے لیے پکار رہا تھا۔ میں منادی کا لفظ عقل، کتاب منزل، رسول مرسل اور ان آیات الٰہیہ کو شامل ہے۔ جو ایمان باللہ کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان چیزوں کو مُنَادِی لِلْاِیْمَانِ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ

ندا کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ اور وہ پکارنے والے کی طرح ایمان لانے کی طرف دعوت دے رہی ہیں۔

اصل میں نِدَاءٌ نَدًی سے ہے جس کے معنی رطوبت نمی کے ہیں۔ اور صَوْتٌ نَّدِیٌّ کے معنی بلند آواز کے ہیں۔ اور آواز کے لیے نداء کا استعارہ اس بنا پر ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہوگی اس کی آواز بھی بلند اور حسین ہوگی اس سے فصیح شخص کو کثرت ریق کے ساتھ متصف کرتے ہیں اور نَدًّی کے معنی مجلس کے بھی آتے ہیں اس کی جمع اَنْدَاءٌ وَاَنْدِيَةٌ آتی ہے۔ اور درخت کو بھی نَدًّی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ نمی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ تَسْمِيَةُ الْمُسَبَّبِ بِاسْمِ السَّبَبِ کے قبیل سے ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (الرجز)

(۴۲۰) كَالْكَرْمِ اِذَا نَادٰى مِنَ الْكَافُوْرِ

جیسا کہ انگور کا خوشہ غلاف (پردہ) سے ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ندا کرنے والے کی آواز ہوتی ہے۔

کبھی نداء سے مراد مجالست بھی ہوتی ہے۔ اس لیے مجلس کو اَلنَّادِیْ وَالْمُنْتَدٰی وَالنَّدِیّ کہا جاتا ہے۔ اور نادی کے معنی ہم نشین کے بھی آتے ہیں قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ﴾ (۹۶۔۱۷) تو وہ اپنے یاران مجلس کو بلا لے۔

اور اسی سے شہر مکہ میں ایک مقام کا نام دَارُ النَّدْوَةِ ہے۔ کیونکہ اس میں مکہ کے لوگ جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور کبھی نَدًی سے مراد سخاوت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ اَنْدٰی كَفًّا مِنْ فُلَانٍ: وہ فلاں سے زیادہ سخی ہے۔

هُوَ يَتَنَدّٰى عَلٰى اَصْحَابِهٖ: وہ اپنے ساتھیوں پر بڑا فیاض ہے۔

مَا نَدَيْتُ بِشَيْءٍ مِنْ فُلَانٍ: میں نے فلاں سے کچھ سخاوت حاصل نہ کی۔

مُنْدِيَاتُ الْكَلِمِ: رسوا کن باتیں جو مشہور ہو جائیں۔

(ن ذ ر)

اَلنَّذْرُ: کے معنی کسی حادثہ کی وجہ سے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

نَذَرْتُ لِلّٰهِ نَذْرًا: میں نے اللہ کے لیے نذر مانی قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾ (۱۹۔۲۶) میں نے خدا کے لیے روزے کی نذر مانی ہے۔

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ﴾ (۲۔۲۷۰) اور تم خدا کی راہ میں جس طرح کا خرچ کر دیا کوئی نذر مانو۔

اَلْاِنْذَارُ کے معنی کسی خوفناک چیز سے آگاہ کرنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل تَبْشِيْرٌ کے معنی کسی اچھی بات کی خوشخبری سنانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى﴾ (۹۲۔۱۴) سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کر دیا۔

﴿اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (۴۱۔۱۳) میں تم کو کیسے چنگھاڑ (کے عذاب) سے آگاہ کرتا ہوں۔ جیسے عاد اور ثمود پر چنگاڑ (کا عذاب) آیا تھا۔

﴿وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ﴾ (۴۶۔۲۱) اور (قوم) عاد کے بھائی (ہود علیہ السلام) کو یاد کرو

❶ قد مر تخريجه في (ك ف ر)

کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں (ہدایت کی) اور اللہ کے (عذاب) سے ڈرایا۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ﴾ (۴۶۔۳) اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی ہے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

﴿لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (۴۲۔۷) یعنی مکے کے رہنے والوں اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں ان کو راستہ دکھاؤ۔

﴿وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ﴾ (۴۲۔۷) اور انہیں قیامت کے دن کا بھی.....خوف دلاؤ۔

﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ﴾ (۳۶۔۶) تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو متنبہ نہ کیا گیا تھا۔متنبہ کر دو۔

اَلنَّذِيْرُ کے معنی مُنْذِر یعنی ڈرانے والا ہیں۔اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے۔جس میں خوف پایا جائے۔خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۴۶۔9) اور میرا کام تو علانیہ ہدایت کرنا ہے۔

﴿وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾ (۳۵۔۳۷) اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا۔

﴿نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ﴾ (۷۴۔۳۶) اور بنی آدم علیہ السلام کے لیے موجب خوف ہے۔

﴿اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۱۱۔۲۵) میں تم کو کھول کھول کر ڈر سنانے والا آیا ہوں۔

﴿اِنِّىْ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ﴾ (۱۵۔۸۹) کہ میں تو اعلانیہ ڈر سنانے والا ہوں۔

اور نَذِيْرٌ کی جمع نُذُرٌ آتی ہے جیسے فرمایا:

﴿هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى﴾ (۵۳۔۵۶) یہ (محمد ﷺ) بھی اگلے ڈر سنانے والوں میں سے ایک ڈر سنانے والے ہیں۔

یعنی انہی کی جنس سے ہے جن کے ساتھ پہلے لوگوں کو ڈرایا گیا۔نیز فرمایا۔

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ﴾ (۵۴۔۲۳) قوم ثمود نے بھی ہدایت کرنے والوں کو جھٹلایا۔

﴿وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ﴾ (۵۴۔۴۱) اور قوم فرعون کے پاس بھی ڈر سنانے والے آئے۔

﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ﴾ (۵۴۔۱۶) سو (دیکھ لو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا۔

نَذَرْتُ: کسی چیز کو جان کر اس سے چوکس رہنے کے معنی ہیں۔

(ن ز ع)

نَزَعَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو اس کی قرارگاہ سے کھینچنے کے ہیں۔جیسا کہ کمان کو درمیان سے کھینچا جاتا ہے اور کبھی یہ لفظ اعراض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور محبت یا عداوت کے دل سے کھینچ لینے کو بھی نَزْعٌ کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِىْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ (۷۔۴۳) اور جو کینے ان کے دلوں میں ہوں گے۔ہم سب نکال ڈالیں گے۔

اِنْتَزَعْتُ اٰيَةً مِّنَ الْقُرْاٰنِ فِىْ كَذَا: آیت کو کسی واقعہ میں بطور مثال کے پیش کرنا۔

تَنَزِعُ فُلَانٌ كَذَا: کے معنی کسی چیز کو چھین لینے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ (۳۔۲۶) اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾ (۷۹۔۱) ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نَازِعَات سے مراد فرشتے ہیں جو روحوں کو جسموں سے کھینچتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ تَنْزِعُ النَّاسَ﴾ (۵۴۔۱۹،۲۰) ہم نے ان پر سخت منحوس دن میں آندھی چلائی وہ لوگوں کو اس طرح اکھیڑ ڈالتی تھی۔

میں تَنْزِعُ النَّاسَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہوا اپنی تیزی کی وجہ سے لوگوں کو ان کے ٹھکانوں سے نکال باہر پھینک دیتی تھی بعض نے کہا ہے کہ لوگوں کی روحوں کو ان کے بدنوں سے کھینچ لینا مراد ہے۔

اَلتَّنَازُعُ وَالْمُنَازَعَةُ: باہم ایک دوسرے کو کھینچنا اس سے مخاصمت اور مجادلہ یعنی باہم جھگڑا کرنا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ﴾ (۴۔۵۹) اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقعہ ہو تو رجوع کرو۔

﴿فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ﴾ (۲۰۔۶۲) تو وہ باہم اپنے معاملے میں جھگڑنے لگے۔

اَلنَّزْعُ عَنِ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز سے رک جانے کے ہیں۔ اور اَلنُّزُوْعُ: سخت اشتیاق کو کہتے ہیں۔

وَنَازَعَتْنِیْ نَفْسِیْ اِلٰی کَذَا: نفس کا کسی طرف کھینچ کر لے جانا۔ کسی کا اشتیاق غالب آ جانا۔ اَنْزَعَ الْقَوْمُ: اونٹوں کا اپنے وطن کا مشتاق ہونا۔

رَجُلٌ اَنْزَعُ کے معنی سر کے بال جھڑ جانا کے ہیں۔ اور نَزْعَةٌ: سر کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سے بال جھڑ جائیں۔ اور تانیث کے لیے نَزْعَاءُ کی بجائے زَعْرَاءُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

بِئْرٌ نَزُوْعٌ: کم گہرا کنواں جس سے ہاتھ کے ذریعہ بغیر رسی کے پانی نکالا جا سکے۔

شَرَابٌ طَیِّبُ الْمَنْزَعَةِ: لذیذ شراب کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس معنی میں قرآن پاک خِتٰمُهٗ مِسْكٌ کا محاورہ استعمال کیا ہے۔

(ن ز غ)

اَلنَّزْغُ کے معنی کسی کام کو بگاڑنے کے لیے اس میں دخل انداز ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ﴾ (۱۲۔۱۰۰) اور اس کے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا۔

(ن ز ف)

نَزَفَ الْمَآءُ کے معنی کنویں سے تدریجاً سارا پانی کھینچ لینے کے ہیں۔ اور بِئْرٌ نَزُوْفٌ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کا پانی خشک ہو گیا ہو۔

نُزْفَةٌ چلو بھر پانی۔ اس کی جمع نُزَفٌ آتی ہے۔

نُزِفَ دَمُهٗ اَوْ دَمْعُهٗ: خون یا آنسوؤں کا کُلِّیَّۃً نکل جانا۔ اسی سے سَکْرَانٌ نَزِیْفٌ ہے جس کے معنی بدمست کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۹) اس سے نہ تو سر میں درد ہوگا اور نہ ان کی عقلیں ضائع ہوں گی۔

ایک قراءت میں یُنْزِفُوْنَ ہے جو کہ اَنْزَفُوْا (افعال) سے ہے۔ جس کے معنی شراب کے ختم ہونے یا عقل کے ضائع ہو جانے کے ہیں۔ اصل میں یہ اَنْزَفُوْا سے ہے جس کے

معنی کنویں کا پانی ختم ہو جانے کے ہیں اور اَنْزَفْتُ الشَّیْءَ میں نَزَفْتُهٗ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔
نَزَفَ الرَّجُلُ فِی الْخُصُوْمَةِ: جھگڑے میں دلیل سے خاموش ہو جانا۔ مثل مشہور ہے۔
هُوَ اَجْبَنُ مِنَ الْمَنْزُوْفِ ضَرِطًا: وہ منزوف سے بھی زیادہ بزدل ہے۔

(ن ز ل)

اَلنُّزُوْلُ: (ض) اصل میں اس کے معنی بلند جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ نَزَلَ عَنْ دَابَّتِهٖ: وہ سواری سے اتر پڑا۔
نَزَلَ فِیْ مَکَانِ کَذَا: کسی جگہ پر ٹھہرنا۔
اَنْزَلَ (افعال) اتارنا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبَارَکًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ﴾ (۲۳۔۲۹) ہم کو مبارک جگہ اتاریو اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔
نَزَلَ بِکَذَا وَاَنْزَلَهٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر عذاب یا نعمتوں کے نازل کرنے سے ان کا وقوع یا عطا کرنا مراد ہوتا ہے اور یہ یا تو بعینہٖ اس چیز کے نازل کرنے کے ذریعہ ہوتا ہے، مثلاً قرآن پاک کا نازل فرمانا اور یا ان چیزوں کے اسباب پیدا کر کے ان کی طرف ہدایت کر دینے کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ لوہا، لباس اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو اتارنا مراد ہے چنانچہ انعامات کے نازل کرنے کے متعلق فرمایا:۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ﴾ (۱۸۔۱) سب تعریف خدا ہی کو ہے۔ جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر یہ کتاب نازل کی۔
﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ (۴۲۔۱۷) خدا ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔
﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ﴾ (۵۷۔۲۵) اور لوہا پیدا کیا۔
﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ (۵۷۔۲۵) اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (یعنی قواعد عدل) ﴿وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ﴾ (۳۹۔۶) اور اسی نے چار پایوں میں سے آٹھ جوڑے بنائے۔
﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا﴾ (۲۵۔۴۸) اور ہم آسمان سے پاک اور (نتھرا ہوا) پانی برساتے ہیں۔
﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾ (۷۸۔۱۴) اور نچڑے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔
﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ﴾ (۷۔۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔
﴿اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۵۔۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔
﴿اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۲۔۹۰) خدا جس پر چاہتا ہے اپنی مہربانی سے نازل فرماتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰی اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ﴾ (۲۹۔۳۴) ہم اس بستی کے رہنے والوں پر اس سبب سے کہ یہ بدکاری کرتے ہیں۔ آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔
عذاب کے متعلق اِنْزَالٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک اور فرشتوں کے نازل کرنے کے متعلق اِنْزَال اور تَنْزِیْل دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے کہ تَنْزِیْل کے معنی ایک چیز کو مَرَّةً بعد اخریٰ اور متفرق طور پر نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور

اِنْزَالٌ کا لفظ عام ہے۔ جو ایک ہی دفعہ مکمل طور پر کسی چیز کو نازل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ آیات ملاحظہ ہو جہاں تَنْزِیْل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ﴾ (۲۶۔۱۹۳) اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔

ایک قراءت میں نزل ہے۔

﴿نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا﴾ (۱۷۔۱۰۶) اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ (۱۵۔۹) بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے۔

﴿لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ هٰذَا الْقُرْاٰنُ......﴾ (۲۵۔۳۲) کہ اس پر قرآن پاک ایک ہی بار کیوں نہیں اتارا گیا۔

﴿وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰی بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۹۸) اور اگر ہم اس کو کسی غیر اہل زبان پر اتارتے۔

اور اِنْزَال کے متعلق فرمایا: ﴿ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۹۔۲۶) پھر خدا نے اپنے پیغمبر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسلی نازل فرمائی۔ اور (تمہاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے آسمان سے اتارے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ﴾ (۴۷۔۲۰) کہ جہاد کی کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوئی؟ لیکن جب کوئی صاف معنوں کی سورت نازل ہو۔

میں پہلی بار نُزِّلَ اور دوسری بار اُنْزِلَ کا لفظ ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ منافقین کا مطالبہ تو یہ تھا کہ یکے بعد دیگرے جہاد کے احکام نازل ہوں تاکہ وہ انہیں سرانجام دے سکیں۔ لیکن جب انہیں صرف ایک مرتبہ ہی جہاد کا حکم دیا گیا۔ تو وہ کنارہ کش ہو گئے۔ اور اس کی تعمیل نہ کی پس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مطالبہ تو بہت سے احکام کے نازل ہونے کا کرتے تھے۔ مگر ایک حکم بھی بجا نہیں لاتے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (۴۴۔۳) ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (۲۔۱۸۵) روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے۔ جس میں قرآن پاک اول اول نازل ہوا۔

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (۹۷۔۱) ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔ میں تَنْزِیْل کا لفظ ترک کر کے خاص کر اِنْزَالٌ کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ حدیث میں ہے ❶ (۱۲۷) ((اِنَّ الْقُرْاٰنَ نَزَلَ دَفْعَةً وَاحِدَةً اِلٰی سَمَاءِ الدُّنْیَا ثُمَّ نَزَلَ نَجْمًا فَنَجْمًا)) کہ قرآن پاک ایک ہی دفعہ آسمان دنیا پر نازل کیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (۹۔۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق اور اس قابل ہیں کہ جو احکام شریعت خدا نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمائے ہیں۔ ان سے واقف ہی نہ ہوں۔ میں عام معنی لینے کی غرض سے خاص کر اِنْزَالٌ کا لفظ لایا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر

---

❶ رواہ ابن ابی حاتم وابن مردویہ عن ابن عباس (ابن کثیر ۱/۲۱۶) وفی مجمع الزوائد (۷/۱۴۰)۔ ورجال البزار رجال الصحیح فی اسناد الطبرانی عمرو بن عبدالغفار وھو ضعیف لٰکن لفظہ انزل القرآن جملة واحدة حتی وضع فی بیت العزة فی السماء الدنیا ونزلہ جبریل علی محمد ﷺ بجواب کلام العباد واعمالھم ۱۲۔

چکے ہیں کہ اِنْزَال تَنْزِیْل سے عام ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ﴾ (۵۹۔۲۱)
اگر ہم یہ قرآن پاک کسی پہاڑ پر نازل کرتے ہیں۔
میں نَزَّلْنَا کی بجائے اَنْزَلْنَا کا لفظ لا کر متنبہ کیا ہے کہ جو کتاب ہم نے تم پر رات میں نازل کی ہے۔ اگر اسے پہاڑ پر ایک دفعہ بھی نازل کر دیتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے وہ دبا جاتا ہے اور وہ آیت کریمہ: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَسُوْلًا یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ (۶۵۔۱۰،۱۱) خدا نے تمہارے پاس نصیحت کی کتاب بھیجی ہے۔ اور اپنے پیغمبر بھی بھیجے ہیں۔ جو تمہارے سامنے...... پڑھتے ہیں۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اِنْزَالِ ذکر سے آنحضرت کی بعثت مراد ہے۔اور آپ ﷺ کو لفظ "ذِکْر" سے موسوم کرنا ایسے ہی ہے جیسے حضرت عیسی علیہ السلام کو کَلِمَةٌ سے موسوم کیا گیا ہے لہٰذا اس تفسیر کی بنا پر رَسُوْلًا کا لفظ ذِکْرًا سے بدل الکل ہوگا۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رسول کا ذکر ہے۔تو اس صورت میں رَسُوْلًا کا لفظ ذِکْرًا کا مفعول ہوگا۔اور تَنَزَّلَ کا لفظ بھی نَزَلَ بِهٖ کی طرح (صلہ بار کے ساتھ) استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے۔نَزَلَ الْمَلَكُ بِكَذَا وَتَنَزَّلَ بِهٖ: فرشتہ اسے لے کر اترا۔مگر یہ محاورہ باری تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ﴾ (۲۶۔۱۳۹) اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔نیز فرمایا: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ (۹۷۔۴)
اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں۔

﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ﴾ (۱۹۔۶۴) کہ ہم تمہارے پروردگار کے حکم کے سوا اتر نہیں سکتے۔
﴿یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ﴾ (۶۵۔۱۲) ان میں خدا کے حکم اترتے رہتے ہیں۔
اور جو کلام افترا اور جھوٹ ہو یا شیاطین کی طرف سے القاء کیا گیا ہو اس کے متعلق صرف تَنَزُّلٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّیٰطِیْنُ﴾ (۲۶۔۲۱۰)
اور اس قرآن کو شیطان لے کر نازل نہیں ہوا۔ ﴿عَلٰی مَنْ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیْنُ﴾ الایة (۲۶۔۲۲۰۔۲۲۱) کہ شیطان کس پر اترتے ہیں (ہر گنہگار جھوٹے پر)
اَلنُّزُلُ: (طعام مہمانی) وہ کھانا جو آنے والے مہمان کے لیے تیار کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰی نُزُلًا﴾ (۳۲۔۱۹) ان کے رہنے کے لیے باغ میں یہ مہمانی۔
﴿نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۱۹۸) یہ خدا کے ہاں سے ان کی مہمانی ہے۔
اور دوزخیوں کے متعلق فرمایا:
﴿لَاٰکِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ اِلٰی قَوْلِهٖ هٰذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّیْنِ﴾ (۵۶۔۵۶) جزا کے دن یہ ان کی ضیافت ہوگی۔
﴿فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ﴾ (۵۶۔۹۳) (تو اس کے لیے) کھولتے پانی کی ضیافت ہے۔
اَنْزَلْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کی مہمانی کرنے کے ہیں اور نَازِلَةٌ مصیبت اور سختی کو کہتے ہیں۔اس کی جمع نَوَازِلُ آتی ہے۔
اَلنِّزَالُ: (مصدر مفاعلہ) کے معنی دو گروہوں کا باہم لڑنے

کے لیے میدان جنگ میں اترنے کے ہیں۔اور نَــــزَلَ فُــلَانٌ کے معنی مقام منیٰ میں اترنا بھی آتے ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے❶ (الطّویل)

(۴۴۱) اَنَازِلَةٌ اَسْمَاءُ اَمْ غَيْرُ نَازِلَةٍ

کیا اسماء میدان منیٰ میں فروکش ہوگی یا نہیں۔

اَلــنُّــزَالَةُ وَالــنُّزْل: کنایۃً مرد کے مادہ منویہ کو کہتے ہیں جب کہ وہ خارج ہو چکا ہو اور طَــعَــامٌ نُزْلٌ یا ذُوْ نُزُلٍ کے معنی پاکیزہ اور بابرکت طعام کے ہیں۔پھر طعام نُزُلٍ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر نَـــزِلٌ کے معنی جمع ہونے کی جگہ فرودگاہ کے بھی آتے ہیں۔

(ن س ء)

اَلــنَّــسْءُ کے معنی کسی چیز کو اس کے وقت سے مؤخر کر دینے کے ہیں۔اور اسی سے نُسِئَتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ ہے۔جس کے معنی عورت کے حیض میں مقررہ ایام میں تاخیر کے ہیں۔جس سے اس کے حاملہ ہونے کی امید کی جا سکے۔اور ایسی عورت کو نَسُوْءٌ کہا جاتا ہے۔

اور نَسَأَ اللّٰهُ فِيْ اَجَلِكَ اور نَسَأَ اللّٰهُ بَعْلَكَ کا محاورہ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔جو کہ درازیٔ عمر کی دعا کے لیے بولتے ہیں۔

اَلنَّسِيْئَةُ: اس کے معنی کسی چیز کو ادھار پر فروخت کرنے کے ہیں۔اسی سے وہ نَسِئٌ ہے۔جس کا جاہلیت میں رواج تھا۔ یعنی وہ کسی ماہِ حرام کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ﴾ (۹۔۳۷) امن کے کسی مہینہ کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ (۲۔۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں۔میں ایک قراءت نَنْسَأْهَا بھی ہے جس کے معنی کسی چیز کو بھلا دینے یا ابطال حکم کے ذریعہ مؤخر کر دینے کے ہیں۔

اَلْــمِــنْسَــاءُ: عصا جس کے ذریعہ کسی چیز کو پیچھے ہٹایا جائے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَـاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ﴾ (۳۴۔۱۴) جو ان کے عصا کو کھاتا رہا۔

نَسَاءَتِ الْاِبِـلُ فِـیْ ظَـمَـئِهَـا يَوْمًا اَوْيَوْمَيْنِ: اونٹوں کے پانی پلانے کے دن کو ایک یا دو روز مؤخر کر دینا شاعر نے کہا ہے❷ (الطّویل)

(۴۴۲) وَعَنْسٍ كَاَلْوَاحِ الْاِرَانِ نَسَأْتُهَا
اِذَا قِيْلَ لِلْمَشْبُوْبَتَيْنِ هُمَا هُمَا

اور تابوت کے تختوں جیسے سفید اونٹوں کو میں نے ہنکایا جب یہ کہا گیا کہ زہرہ اور مشتری دونوں طلوع ہو گئے۔

اَلــنَّــسُــوْءُ: (ایضاً) تازہ دودھ جو زیادہ دیر تک پڑا رہنے سے کھٹا ہو جائے۔اور اس میں پانی ملا لیا جائے۔

(ن س ب)

اَلــنَّــسْبُ وَالنِّسْبَةُ کے معنی اَبَوَیْن میں سے کسی ایک کی طرف سے رشتہ داری کے ہیں اور نسب دو قسم

---

❶ قاله عامر بن الطفيل الغنوى وتمامه...... ابينى لنا يا اسم ما انت فاعله والبيت فى النقائض (۲۸۸) واللسان والمقاييس (نزل) وملحقات ديوانه (۱۵۸) واصلاح يعقوب (۳۰۹) وذيلى الامالى (۱۱۴) والخزانة (۳: ۴۴) وشرح السبع (ابن الانبارى (۵۳۶)۔

❷ قَالَهُ شماخ فى قصدية راجع ديوانه (۸۹) والبيت فى مجالس ثعلب (۲۵۴) واللسان (ارن، خشب) غير منسوب وغريب القرآن للقبتى (۳۵۵) والقرطبى (۲۸۰)۔

پر ہے۔ نَسْبٌ بِالطُّوْلِ: یعنی وہ رشتہ جو آباء اور ابناء کے درمیان پایا جاتا ہے: دوم نَسْبٌ بِالْعَرْضِ یعنی وہ رشتہ جو بنوا الْاَعْمَام یعنی عم زاد بھائیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا﴾ (۲۵۔۵۴) پھر اس کو صاحب نسب اور صاحب قرابت دامادی بنایا۔ فُلَانٌ نَسِیْبُ فُلَانٍ وہ فلاں کا قریبی رشتہ دار ہے۔ اور نِسْبَۃٌ کے معنی ان دو مقداروں کے درمیان باہمی مناسبت کے بھی آتے ہیں۔ جن میں کسی قسم کی مجانست ہو اسی سے نَسِیْبٌ کا لفظ ہے۔ جس کے معنی اشعار میں عورت کے محاسن ذکر کر کے اس کے ساتھ عشق کا اظہار کرنے کے ہیں۔ اور یہ نَسَبَ الشَّاعِرُ بِالْمَرْءَۃِ نَسْبًا وَّنَسِیْبًا کا مصدر ہے۔

(ن س خ)

اَلنَّسْخُ: اس کے اصل معنی ایک چیز کو زائل کر کے دوسری کو اس کی جگہ پر لانے کے ہیں۔

جیسے۔ دھوپ کا سائے کو...... اور سائے کا دھوپ کو زائل کر کے اس کی جگہ لے لینا یا جوانی کے بعد بڑھاپے کا آنا وَغَیْرُ ذٰلِكَ پھر کبھی اس سے صرف ازالہ کے معنی مراد ہوتے ہیں جیسے فرمایا۔ ﴿فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ﴾ (۲۲۔۵۲) تو جو (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے۔

اور کبھی صرف اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی اس سے معاً دونوں معنی مفہوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا نَسْخُ الْكِتَابِ یعنی کتاب اللہ کے منسوخ ہونے سے ایک حکم کو زائل کر کے پھر اس کی بجائے دوسرا حکم نازل کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (۲۔۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے نَسْخ اور اِنْسَاء کے معنی اس پر عمل سے منع کرنے یا لوگوں کے دلوں سے فراموش کر دینے کے لیے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نَسَخْتُ الْكِتَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو آیت بھی ہم نازل کرتے ہیں یا اس کے نزول کو ایک وقت تک کے لیے ملتوی رکھتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔

نَسْخُ الْكِتَابِ کے معنی کتاب کی کاپی کرنے کے ہیں۔ یہ پہلی صورت کے ازالہ کو مقتضی نہیں ہے۔ بلکہ کسی دوسرے مادہ میں اس جیسی دوسری صورت کے اثبات کو چاہتا ہے جیسا کہ بہت سی شمعوں میں انگوٹھی کا نقش بنا دیا جاتا ہے۔

اَلْاِسْتِنْسَاخُ: کسی چیز کے لکھنے کو طلب کرنے یا لکھنے کے لیے تیار ہونے کے ہیں کبھی اِسْتِنْسَاخُ بمعنی نسخ بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۴۵۔۲۹) جو کچھ تم کیا کرتے تھے، ہم لکھواتے جاتے تھے۔ اور علم وراثت میں "مُنَاسَخَةٌ" کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وارث یکے بعد دیگرے مرتے رہیں اور میراث تقسیم نہ ہوئی ہو۔

تَنَاسُخُ الْاَزْمِنَةِ وَالْقُرْاٰنِ: ایک قوم کا گزر جانا اور دوسری کا اس کے قائم مقام ہونا۔

اور تَنَاسُخِیَّةٌ اس فرقے کو کہتے ہیں جو شریعت کے ثابت کردہ حشر ونشر کا انکار کرتے ہیں۔ اور ارواح کے مختلف

اجسام میں منتقل ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

(ن س ر)

اَلنَّسْرُ: گدھ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ (۷۱۔۲۳) اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا۔

میں نسر ایک بت کا نام ہے اور اَلنَّسْرُ نَسَرَا الطَّائِرُ الشَّیْءَ بِمِنْسِرِہٖ: کا مصدر بھی آتا ہے جس کے معنی پرند کا چونچ سے کوئی چیز اٹھانا یا اسے ٹھونکنا کے ہیں۔

نَسْرُ الْحَافِرِ گھوڑے کے سم کے درمیان کا ابھرا ہوا گوشت۔

اَلنَّسْرَان: دو ستارے ہیں جن میں سے ایک کو نَسْرِ (طائر) اور دوسرے کو نَسْرِ (واقع) کہا جاتا ہے۔

نَسَرْتُ کَذَا: کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے تناول کرنا جیسا کہ پرند چونچ بھرتا ہے۔

(ن س ف)

نَسَفَتِ الرِّیْحُ الشَّیْءَ کے معنی ہوا کے کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کے ہیں۔ اور نَسَفْتُہٗ وَانْتَسَفْتُہٗ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا﴾ (۲۰۔۱۰۵) خدا ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔

اور نَسَفَ الْبَعِیْرُ الْاَرْضَ بِمُقَدَّمِ رِجْلِہٖ کے معنی اونٹ کا اپنے اگلے پاؤں کے ساتھ مٹی کو پھینکنا کے ہیں۔ اور گھاس کو جڑ سے اکھاڑ کر چرنے والی اونٹنی کو نَاقَۃٌ نَسُوْفٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا﴾ (۲۰۔۹۷) پھر اس کی راکھ کو اڑا کر دریا میں بکھیر دیں گے۔

یعنی ہم نُسَافَه کی طرح اسے پھینک دیں گے اور نُسَافَۃٌ کے معنی اڑتی ہوئی غبار کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر جھاگ کو بھی نُسَافَه کہتے ہیں۔ اور اِنَاءٌ نَسْفَانُ، بھرے ہوئے برتن کو کہتے ہیں۔ جس پر جھاگ غالب ہو۔

اُنْتُسِفَ لَوْنُہٗ: غبار آلود ہونے کی وجہ سے کسی شخص کی رنگت کا متغیر ہو جانا۔ جیسا کہ اِغْبَرَّ وَجْهُہٗ کا محاورہ ہے

اَلنُّسْفَۃُ: سنگ پائے خار۔

کَلَامٌ نَسِیْفٌ: سخن پنہاں۔ جو متغیر اور بودا ہو۔

(ن س ک)

اَلنُّسُكُ کے معنی عبادت کے ہیں۔ اور نَاسِكٌ عابد کو کہا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ ارکان کے ادا کرنے کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔ اَلْمَنَاسِكُ اعمال حج ادا کرنے کے مقامات اَلنَّسِیکَۃُ خاص کر ذبیحہ یعنی قربانی کو کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ (۲۔۱۹۶) تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ﴾ (۲۔۲۰۰) پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو۔

﴿مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ﴾ (۲۲۔۶۷) ایک شریعت مقرر کر دی جس پر وہ چلتے ہیں۔

(ن س ل)

اَلنَّسْلُ کے معنی کسی چیز سے الگ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔

نَسَلَ الْوَبَرُ عَنِ الْبَعِیْرِ: اون اونٹ سے الگ ہوگئی۔

اور نَسَلَ الْقَمِيْصُ عَنِ الْاِنْسَانِ کے معنی قمیص کے بدن سے الگ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶ (الطّویل)

(۴۲۲) فَسُلِّیْ ثِیَابِیْ عَنْ ثِیَابِكِ تَنْسُلِیْ

تو اپنے کپڑوں کو میرے کپڑوں سے کھینچ لے تاکہ جدا ہو جائیں۔

اَلنُّسَالَةُ: (داڑھی سے) گرے ہوئے بال یا پرند کے پر جو جھڑ کر گر پڑتے ہیں۔

اَنْسَلَتِ الْاِبِلُ: اونٹوں کی اون جھڑنے کا وقت آ گیا۔ اسی سے نَسَلَ یَنْسِلُ نَسْلَانًا ہے جس کے معنی تیز دوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۶) اور وہ ہر بلندی سے دوڑ رہے ہوں گے۔

اَلنَّسْلُ: اولاد کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اپنے باپ سے جدا ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ﴾ (۲۔۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں) کی نسل کو نابود کر دے۔

اور تَنَاسَلُوْا کے معنی تَوَالَدُوْا کے ہیں۔ نیز جب کوئی انسان دوسرے سے خیرات طلب کرے۔ تو کہا جاتا ہے۔ فَخُذْ مَا نَسَلَ لَكَ مِنْهُ عَفْوًا کہ جو کچھ ملے وہی لے لو۔

(ن س ی)

اَلنِّسْيَانُ یہ نَسِيْتُهٗ نِسْيَانًا کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کو ضبط میں نہ رکھنے کے ہیں۔ خواہ یہ ترک ضبط ضعف قلب کی وجہ سے ہو یا از راہ غفلت ہو۔ یا قصداً کسی چیز کی یاد بھلا دی جائے حتیٰ کہ وہ دل سے محو ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ (۲۰۔۱۱۵) ہم نے پہلے آدم علیہ السلام سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ دیکھا۔

﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ﴾ (۳۲۔۱۴) سو اب آگ کے مزے چکھو۔ اس لیے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

﴿فَاِنِّیْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَ مَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ﴾ (۱۸۔۶۳) تو میں مچھلی وہیں بھول گیا۔ اور مجھے آپ سے اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

﴿لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِيْتُ﴾ (۱۸۔۷۳) کہ جو بھول مجھ سے ہوئی اس پر مواخذہ نہ کیجیے۔

﴿فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ (۵۔۱۴) مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی۔ ایک حصہ فراموش کر دیا۔

﴿ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ يَدْعُوْۤا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ﴾ (۳۹۔۸) پھر جب وہ اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دے دیتا ہے۔ تو جس کام کے لیے پہلے اس کو پکارتا ہے۔ اسے بھول جاتا ہے۔ اور آیت

---

❶ والبیت لامری القیس واولہ: وان تك قد ساء تك منی خلیقة۔ والبیت فی المعلقة مع التبریزی ۲۱ والسیوطی ۷ واللسان (ثوب) ومختار الشعرا الجاهلی (۱:۱۰) والجمهرة (۹۷) والعقد الثمین (۴۷) والمعانی للقبتی (۴۸۲) و دیوانه بشرح ابن الانباری رقم ۲۱۔

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى﴾ (۸۷۔۶) ہم تمہیں پڑھائیں گے۔ کہ تم فراموش نہ کرو گے۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسا بنا دے گا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سنو گے اسے بھولنے نہیں پاؤ گے۔ پھر ہر وہ نسیان جو انسان کے قصد اور ارادہ سے ہو۔ وہ مذموم ہے اور جو بغیر قصد اور ارادہ کے ہو اس میں انسان معذور ہے۔ اور حدیث میں جو مروی ہے ❶ (۱۲۸)

((رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطأُ وَالنِّسْيَانُ)) کہ میری امت کو خطا اور نسیان معاف ہے تو اس سے یہی دوسری قسم کا نسیان مراد ہے۔ یعنی وہ جس میں انسان کے ارادہ کو دخل نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ﴾ (۳۲۔۱۴) سو اب آگ کے مزے چکھو اس لیے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

میں نسیان بمعنی اول ہے یعنی وہ جس میں انسان کے قصد اور ارادہ کو دخل ہو اور کسی چیز کو حقیر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا جائے۔

پھر جب نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے ازراہِ اہانت انسان کو چھوڑ دینے اور احکام الٰہی کے ترک کرنے کی وجہ سے اسے سزا دینے کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا﴾ (۷۔۵۱) تو جس طرح یہ لوگ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اس طرح آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔

﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ (۹۔۶۷) انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (۵۹۔۱۹) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے۔

میں متنبہ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے سے ہی معرفت الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا انسان کا اللہ تعالیٰ کو بھلا دینا خود اپنے آپ کو بھلا دینے کے مترادف ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ﴾ (۱۸۔۲۴) اور جب خدا کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو۔

کے ابن عباسؓ نے یہ معنی کیے ہیں کہ جب تم کوئی بات کہو اور اس کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو یاد آنے پر ان شاء اللہ کہہ لیا کرو۔ اسی لیے ابن عباسؓ کے نزدیک حلف میں کچھ مدت کے بعد بھی انشاء اللہ کہنا جائز ہے۔ اور عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نَسِيْتَ بمعنی اِرْتَكَبْتَ ذَنْبًا کے ہے۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب تمہیں کسی گناہ کے ارتکاب کا خیال آئے تو اس وسوسہ کو دفع کرنے کے لیے خدا کے ذکر میں مشغول ہو جایا کرو تا کہ وہ وسوسہ دفع ہو جائے۔ ❷

النِّسْيُ کے اصل معنی مَايُنْسٰى یعنی فراموش شدہ چیز کے ہیں جیسے نِقْضٌ بمعنی مَا يُنْقَضُ آتا ہے۔ مگر عرف میں

❶ رواہ الطبرانی عن ثوبان وفیہ وما استکرھوا علیہ (راجع الفتح للنبھانی (۲/۱۳۵)

❷ راجع الفتح للشوکانی (۳ : ۲۸۰) انہ کان یری الاستثناء ولو بعد سنۃ ولقول عکرمۃ راجع الطبری۔

نِسْیٌ اس معمولی چیز کو کہتے ہیں جو درخور اعتنا، نہ سمجھی جائے اور اسی سے اہل عرب کا مقولہ ہے۔اِحْفَظُوْا اَنْسَاءَ کُمْ (کوچ کے وقت اپنی) معمولی چیزوں کا خیال رکھو جو عموماً بھول جاتی ہیں۔شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۴۲۳) کَاَنَّ لَهٗ فِی الْاَرْضِ نِسْیًا تَقُصُّهٗ۔

گویا زمین میں اس کی کوئی چیز گری ہوئی ہے۔ جسے وہ تلاش کر رہا ہے۔اور آیت کریمہ:۔﴿وَ کُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا﴾ (۱۹۔۲۳) اور میں بھولی بسری ہوگئی ہوتی۔ میں نَسْیًا کے معنی ہیں کہ میں اس حقیر چیز کے بمنزلہ ہوتی۔جس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا اگرچہ وہ بھولی ہوئی نہ ہو۔ پھر بھولی بسری ہوئی چیز کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے مَنْسِیًّا کا لفظ لایا گیا ہے۔کیونکہ نَسْیٌ کے معنی اس معمولی چیز کے ہیں۔ جو درخور اعتنا نہ ہو۔ اور اس کا فراموش ہونا ضروری ہے۔

اور ایک قراءت میں نَسِیًّا ہے جو کہ مصدر بمعنی مفعول کے ہیں۔جیسے:۔عَصٰی عَصِیًّا وَّعِصْیَانًا اور آیت کریمہ:۔

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ (۲۔۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کر دیتے ہیں۔ میں اِنْسَا کے معنی قوت الٰہیہ کے ذریعہ دلوں سے محو کرنے اور فراموش کرا دینے کے ہیں۔

اَلنِّسَآءُ وَالنِّسْوَانُ وَالنِّسْوَةُ: یہ تینوں اِمْرَءَةٌ کی جمع مِنْ غَیْرِ لَفْظِهٖ ہیں۔جیسے مَرْءٌ کی جمع قوم آ جاتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ﴾ (۴۹۔۱۱) اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں۔

﴿نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ﴾ (۲۔۲۲۳) (تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہے......

﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ﴾ (۳۳۔۳۰) اے پیغمبر کی بیویو!۔

﴿وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ﴾ (۱۲۔۳۰) اور شہر میں عورتیں گفتگوئیں کرنے لگیں۔

﴿مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾ (۱۲۔۵۰) کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

اَلنَّسَا (عرق النساء) ایک رگ کا نام ہے اس کا تثنیہ نَسَیَانِ اور جمع اَنْسَاءٌ آتی ہے۔

(ن ش ی)

اَلنَّشْأُ وَالنَّشْاَۃُ: کسی چیز کو پیدا کرنا اور اس کی پرورش کرنا۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی﴾ (۵۶۔۶۲) اور تم نے پہلی پیدائش تو جان ہی لی ہے۔

---

[1] قاله عمرو بن عامر الشفری الازدی وتمامه علیٰ امهاوان تخاطبك تبلت قال ابن البری وبلت (بالفتح) اذ قطع وبالکسر اذ سکن والبیت فی الکامل (۴۹۷) والاقتضاب (۴۱۷) واللسان ونسا، بلت) والمفضلیات (۱:۱۰۷) والطبری (۱۶:۶۶) والطبرسی (۲۹:۹۳) وفی روایة اذ ماغدت بدل علی امهاوان تحدثك بدل ان تخاطبك وکذا روایة الکامل (۸۳۹) وفی روایة وان تکلمك والبیت فی مجالس ثعلب (۳۵۳) وفیه علی وجهها بدل علیٰ امها والقصیدة مفضلیة وهی فی منتهی الطلب (۲:۲۰۵۔۲۰۷) والاغانی (۲۱:۹۰۔۹۱) وبعضهافی الخزانة (۲:۱۸) والبیت ایضا فی تهذیب الالفاظ (۵۰۸) والمحاضرات للمؤلف (۳:۲۳۱) والمرزوقی (۱۳۵۸) و غریب القرآن (۲۷۳)۔

نَشَأَ فُلَانٌ کے معنی بچہ کے جوان ہونے کے ہیں۔اور نوجوان کو نَاشِیٌ کہا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:۔
﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً﴾ (۷۳۔۶) کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بہیمی کو) سخت پامال کرتا ہے۔
میں نَاشِئَةٌ کے معنی نماز کے لیے اٹھنے کے ہیں۔اسی سے نَشَأَ السَّحَابُ کا محاورہ ہے جس کے معنی فضا میں بادل کے رونما ہونے اور آہستہ آہستہ بڑھنے کے ہیں۔قرآن میں ہے:۔﴿وَیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ (۱۳۔۱۲) اور بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے۔
اَلْاِنْشَاءُ: (افعال) اس کے معنی کسی چیز کی ایجاد اور تربیت کے ہیں۔عموماً یہ لفظ زندہ چیز...... کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿قُلْ هُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ﴾ (۶۷۔۲۳) وہ خدا ہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔نیز فرمایا:۔
﴿هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (۵۳۔۳۲) وہ تم کو خوب جانتا ہے۔جب اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔
﴿ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِیْنَ﴾ (۲۳۔۳۱) پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کی۔
﴿وَنُنْشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (۵۶۔۶۱) اور تم کو ایسے جہان میں جس کو تم نہیں جانتے پیدا کر دیں۔
﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ﴾ (۲۳۔۱۴) پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا۔
﴿ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ﴾ (۲۹۔۲۰) پھر خدا ہی پچھلی پیدائش پیدا کرے گا۔
ان تمام آیات میں انشاء بمعنی ایجاد استعمال ہوا ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔اور آیت کریمہ:۔
﴿اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِؤُنَ﴾ (۵۶۔۷۱،۷۲) بھلا دیکھو جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرتے ہیں۔
میں آگ کا درخت اگانے پر بطور تشبیہ انشاء کا لفظ بولا گیا ہے۔اور آیت کریمہ:۔
﴿اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ﴾ (۴۳۔۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔
میں یُنَشَّاُ کے معنی تربیت پانے کے ہیں۔یعنی عورت جو زیور میں تربیت پاتی ہے۔ایک قراءت میں یَنْشَأُ ہے یعنی پھلے پھولے۔

(ن ش ر)

اَلنَّشْرُ: کے معنی کسی چیز کو پھیلانے کے ہیں۔
یہ کپڑے اور صحیفے کے پھیلانے، بارش اور نعمت کے عام کرنے اور کسی بات کے مشہور کر دینے پر بولا جاتا ہے۔
چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ (۸۱۔۱۰) اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے۔
﴿وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ م بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ﴾ (۴۲۔۲۸) اور وہی تو ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا اور اپنی رحمت (یعنی بارش کی برکت) کو پھیلا دیتا ہے۔اور آیت کریمہ:۔
﴿وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا﴾ (۷۷۔۳) اور بادلوں کو (پھاڑ

کر) پھیلا دیتی ہے۔

میں نَاشِرَاتِ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو ہواؤں کو پھیلاتے ہیں یا اس سے وہ ہوائیں مراد ہیں جو بادلوں کر بکھیرتی پھرتی ہیں۔

اور نَاشِرٌ کی جمع نَشْرٌ آتی ہے۔ چنانچہ ایک قراءت میں نُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِہٖ بھی ہے جو کہ وَالنَّاشِرَاتِ کے ہم معنی ہے اور اسی سے سَمِعْتُ نُشْرًا حَسَنًا کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں: میں نے اچھی شہرت سنی۔

نَشِرَ الْمَیِّتُ نُشُوْرًا کے معنی میت کے (از سرنو زندہ ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ﴾ (۶۷۔۱۵) اسی کے پاس قبروں سے نکل کر جانا ہے۔

﴿بَلْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ نُشُوْرًا﴾ (۲۵۔۴) بلکہ ان کو مرنے کے بعد جی اٹھنے کی امید ہی نہیں تھی۔

﴿وَلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیَاۃً وَّلَا نُشُوْرًا﴾ (۲۵۔۳) اور نہ مرنا ان کے اختیار میں ہے۔ اور نہ جینا اور نہ مرکر اٹھ کھڑے ہونا۔

اَنْشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ کے معنی میت کو زندہ کرنے کے ہیں۔ اور نُشِرَ اس کا مطاوع آتا ہے۔ جس کے معنی زندہ ہوجانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿ثُمَّ اِذَا شَاءَ اَنْشَرَہٗ﴾ (۸۰۔۲۲) پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔

﴿فَاَنْشَرْنَا بِہٖ بَلْدَۃً مَّیْتًا﴾ (۴۳۔۱۱) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کردیا۔

بعض نے کہا ہے کہ نَشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ وَاَنْشَرَہٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن درحقیقت نَشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ نَشَرُ الثَّوْبِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۴۲۵) طَوَتْکَ خُطُوْبُ دَھْرِکَ بَعْدَ نَشْرٍ
کَذَاکَ خُطُوْبُہٗ طَیًّا وَّ نَشْرًا

تجھے پھیلانے کے بعد حوادث زمانہ نے لپیٹ لیا اسی طرح حوادث زمانہ لپیٹتے اور نشر کرتے رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَجَعَلَ النَّھَارَ نُشُوْرًا﴾ (۲۵۔۴۷) اور دن کو اٹھ کھڑا ہونے کا وقت ٹھہرایا۔

میں دن کے نشور بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو کاروبار کے پھیلانے اور روزی کمانے کے لیے بنایا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَمِنْ رَّحْمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ﴾ (۲۸۔۷۳) اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن کو بنایا۔ تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اس میں اس کا فضل تلاش کرو۔

اور اِنْتِشَارُ النَّاسِ کے معنی لوگوں کے اپنے کاروبار میں لگ جانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ﴾ (۳۰۔۲۰) پھر اب تم انسان ہوکر جابجا پھیل رہے ہو۔

﴿فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا﴾ (۳۳۔۵۳) تو جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔

﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۶۲۔۱۰) پھر جب نماز ہوچکے تو اپنی اپنی راہ لو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نَشَرُوْا بمعنی اِنْتَشَرُوْا کے آتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

---

[1] البیت لابی العتاھیۃ وقد مر تخریجہ فی (طوی) وفی المطبوع "طیا ونشرا" مقلوب والتسدید من المراجع۔ ۱۲

﴿وَإِذَا قِيْلَ انشُزُوا فَانشُزُوا﴾ (۵۸۔۱۱) اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ میں ایک قراءت فَاِذَا قِيْلَ انْشُرُوْا فَانْتَشِرُوْا بھی ہے۔ یعنی کہا جائے کہ منتشر ہو جاؤ تو منتشر ہو جایا کرو۔

اَلْاِنْتِشَارُ کے معنی چوپایہ کی رگوں کا پھول جانا...... بھی آتے ہیں۔ اور نَوَاشِرُ باطن ذراع کی رگوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بدن میں منتشر ہیں۔

اَلنَّشْرُ: (ایضا) پھیلنے والے بادل کو کہتے ہیں۔ اور یہ بمعنی مَنْشُوْرٌ بھی آتا ہے۔ جیسا کہ نَقْضٌ بمعنی منقوض آجاتا ہے۔ اسی سے محاورہ ہے:۔ اِكْتَسَى الْبَازِيْ رِيْشًا نَشْرًا: یعنی باز نے لمبے چوڑے پھیلنے والے پروں کا لباس پہن لیا۔

اَلنَّشْرُ (ایضاً) خشک گھاس کو کہتے ہیں۔ جو بارش کے بعد سرسبز ہو کر پھیل جائے اور اس سے سرپستان کی سی کونپلیں پھوٹ نکلیں یہ گھاس بکریوں کے لیے سخت مضر ہوتی ہے۔ اسی سے نَشَرَتِ الْاَرْضُ فَهِيَ نَاشِرَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں نشر گھاس پھوٹنے کے ہیں۔

نَشَرْتُ الْخَشَبَ بِالْمِنْشَارِ کے معنی آرے سے لکڑی چیرنے کے ہیں۔ اور لکڑی چیرنے کو نشر اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے چیرتے وقت نشارہ یعنی برادہ پھیلتا ہے۔ اور نَشْرَةٌ کے معنی افسوس کے ہیں جس سے مریض کا علاج کیا جاتا ہے۔

(ن ش ز)

اَلنَّشْزُ: بلند زمین کو کہتے ہیں۔ اور نَشَزَ فُلَانٌ کے معنی بلند زمین کا قصد کرنے کے ہیں۔ اسی سے نَشَزَ فُلَانٌ عَنْ مَقَرِّہٖ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کے اپنی قرار گاہ سے اوپر ابھر آنے کے ہیں۔ اور ہر اوپر اٹھنے والی چیز کو نَاشِزٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَإِذَا قِيْلَ انشُزُوا فَانشُزُوا﴾ (۵۸۔۱۱) اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔

اور نَشْزٌ وَانْشَازٌ کے معنی زندہ کرنا...... بھی آتے ہیں۔ کیونکہ زندگی میں بھی ایک طرح کا ابھار پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَانظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ (۲۔۲۵۹) اور (وہاں) گدھے کی ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم ان کو کیونکر جوڑ دیتے ہیں اور ان پر (کس طرح) گوشت (پوست) چڑھا دیتے ہیں۔ اور نُنشِزُهَا کے نون پر ضمہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں۔ اور نُشُوْزُ الْمَرْءَةِ کے معنی عورت اپنے شوہر کو برا سمجھے اور سرکشی کرنے اور کسی دوسرے مرد پر نظر رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ﴾ (۴۔۳۴) اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی (اور بدخوئی) کرنے لگی ہیں۔

چنانچہ اس معنی کے پیش نظر شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۴۲۶) اِذَا جَلَسْتَ عِنْدَ الْاِمَامِ كَاَنَّهَا
تَرٰى رُفْقَةً مِّنْ سَاعَةٍ تَسْتَحِيْلُهَا

اور عِرْقٌ نَّاشِزٌ کے معنی پھولی ہوئی رگ کے ہیں۔

---

[1] البیت للفرزدق فی نشوز المرءة النوار ابنة اعین بن ضبعة المجاشعی) فی قصیدة (۲۸) بیتا راجع دیوانه (۲ : ۶۲) وفیه قعدت بدل جلست وکانما بدل کانها فی المعانی للقبتی (۸۱۵، ۸۴۵) صدره : تراها اذا صطلك الخصوم کانها...... وقبله: وما خاصم الاقوام من ذی خصومة۔ کورها مشنوء الیها حلیلها۔

(ن ش ط)

اَلنَّشْطُ (ض) کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا﴾ (۷۹۔۲) اور ان کی قسم جو آسانی سے کھول دیتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ نَاشِطَاتِ سے مراد ستارے ہیں جو مشرق سے نکل کر حرکت فلک سے مغرب کی طرف جاتے ہیں۔یا خود مشرق سے مغرب کو چلے جاتے ہیں۔یا خود مشرق سے مغرب کو چلتے ہیں اور یہ "ثَوْرٌ نَاشِطٌ" کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایک علاقہ سے نکل کر دوسرے علاقہ میں جانے والے بیل کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ نَاشِطَاتٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو امور کو طے کرتے ہیں۔اور یہ نَشَطْتُ الْعُقْدَةَ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی گرہ لگانے کے ہیں اور یہاں خاص کر نَشْطٌ کے لفظ سے جس کے معنی آسانی سے کھلنے والی گرہ کے ہیں۔اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ فرشتے نہایت آسانی سے ان امور کو سرانجام دے رہے ہیں جن پر کہ وہ مامور ہیں۔

بِئْرٌ اَنْشَاطٌ: کم گہرا کنواں جس سے پانی کا ڈول ایک ہی جھٹکے میں باہر آ جائے۔

اَلنَّشِيْطَةُ: اس مال کو کہتے ہیں جو رئیس قوم تقسیم غنیمت سے قبل اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ نَشِيْطَةٌ ان اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو بلا قصد ہاتھ لگ جائیں اور حدی خواں کے بغیر ہی نشاط سے چلتے ہوں۔

نَشَطَتْهُ الْحَيَّةُ اسے سانپ نے کاٹ کھایا۔

(ن ص ب)

نَصْبُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو کھڑا کرنے یا گاڑ دینے کے ہیں۔مثلاً: نیزے کے گاڑنے اور عمارت یا پتھر کو کھڑا کرنے پر نَصْبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔اور نَصِيْبٌ اس پتھر کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر (بطور نشان کے) گاڑ دیا جاتا ہے۔اس کی جمع نَصَائِبُ وَنَصَبٌ آتی ہے۔جاہلیت میں عرب جن پتھروں کی پوجا کیا کرتے اور ان پر جانوروں کو بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔انہیں نُصُبٌ کہا جاتا تھا۔[1] چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ﴾ (۷۰۔۴۳) جیسے وہ عبادت کے پتھروں کی طرف دوڑتے ہیں۔نیز فرمایا:۔

﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ (۵۔۴) اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے۔

اس کی جمع اَنْصَابٌ بھی آتی ہے۔چنانچہ فرمایا:۔﴿وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ (۵۔۹۰) اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیاطین سے ہیں۔

اور نَصْبٌ و نَصَبٌ کے معنی تکلیف و مشقت کے ہیں۔اور آیت کریمہ۔

﴿بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ﴾ (۳۸۔۴۱) ایذا اور تکلیف میں ایک قراءت نَصَبٍ بھی ہے اور یہ بُخْلٍ و بَخَلٍ کی طرح ہے قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ﴾ (۳۵۔۳۵) یہاں نہ ہم کو رنج پہنچے گا۔

---

[1] قارن الطبری (۲۹: ۵۵۔۵۶) والقرطبی (۲۹/۲۹۶) والشوکانی (۲۸۶) والغریب للقبتی (۴۸۶)

وَانْصَبَنِیْ کَذَا کے معنی کسی کو مشقت میں ڈالنے اور بے چین کرنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے (1) ()

(۴۲۷) تَأَوَّبَنِیْ هَمٌّ مَعَ اللَّیْلِ مُنْصِبٌ

میرے پاس رات کو تکلیف دہ غم بار بار لوٹ کر آتا ہے۔

اور عِیْشَةٌ رَاضِیَةٌ کی طرح هم نَاصِبٌ کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے۔

اَلنَّصَبُ کے معنی مشقت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ (۱۸۔۶۲)

اس سفر سے ہم کو بہت تھکان ہوگئی ہے۔

اور نَصِبَ (س) فَهُوَ نَصِبٌ وَنَاصِبٌ کے معنی تھک جانے یا کسی کام میں سخت محنت کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ﴾ (۸۸۔۳) سخت محنت کرنے والے، تھکے ماندے۔

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ (۹۴۔۷) تو جب فارغ ہوا کرو۔ تو (عبادت میں) محنت کیا کرو۔ اَلنَّصِیْبُ کے معنی معین حصہ کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَمْ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ﴾ (۴۔۵۴) کیا ان کے پاس بادشاہی کا کچھ حصہ ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِیْنَ أُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ (۴۔۵۱) بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا۔

اور نَاصَبَهُ الْحَرْبَ وَالْعَدَاوَةَ وَنَصَبَ لَهٗ کے معنی کسی کے خلاف اعلان جنگ یا دشمنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ اس میں لفظ حَرْبٌ یا عَدَاوَةٌ کا حذف کرنا بھی جائز ہے۔ تَیْسٌ اَنْصَبُ وَشَاةٌ اَوْ عَنْزَةٌ نَصْبَاءُ کھڑے سینگوں والا مینڈھا یا بکری۔

نَاقَةٌ نَصْبَاءُ: ابھرے ہوئے سینہ والی اونٹنی نِصَابُ السِّکِّیْنِ وَنَصَبُهٗ کے معنی چھری کے دستہ ہیں۔ اور اسی سے نِصَابُ الشَّیْءِ کا محاورہ ہے جس کے معنی اَصْلُ الشَّیْءِ ہیں۔ تَنَصَّبَ الغبار۔ غبار کا اڑنا۔ نَصَبَ السِّتْرَ: پردہ اٹھانا۔ نَصْبٌ (اعراب) زبر کو کہتے ہیں۔ اور نَصْبٌ ایک قسم کا راگ بھی ہے۔

(ن ص ح)

اَلنُّصْحُ: کسی ایسے قول یا فعل کا قصد کرنے کو کہتے ہیں۔ جس میں دوسرے کی خیر خواہی ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ (۷۔۷۹) میں نے تم کو خدا کا پیغام سنا دیا۔ اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم ایسے ہو کہ خیر خواہوں کو دوست ہی نہیں رکھتے۔

﴿وَ قَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ (۷۔۲۱) اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔ ﴿وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ﴾ (۱۱۔۳۴) اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

---

(1) البیت مطلع قصیدة قالها ابو قران طفیل بن کعب الغنوی فی فرسان قومه وعجزه...... وجاء من الاخبار مالا اکذب والقصیدة فی دیوانه (۱۷۔۲۷) والبیت فی اللسان (عقب) والطفیل جاهلی مشهور بالحر لحسن وصفه للخیل راجع لترجمته الشعراء (۴۲۲۔۴۲۴) والاشتقاق۔ (۲۷۰)۔

یہ یا تو نَصَحْتُ لَهُ الْوُدَّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی سے خالص محبت کرنے کے ہیں۔اور نَاصِحُ الْعَسَلِ خالص شہد کو کہتے ہیں۔اور یا یہ نَصَحْتُ الْجِلْدَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی چمڑے کو سینے کے ہیں۔اور نَاصِحٌ کے معنی درزی اور نِصَاحٌ کے معنی سلائی کا دھاگہ کے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔

﴿تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ (۶۶۔۸) خدا کے آگے صاف دل سے توبہ کرو۔

میں نُصُوْحًا کا لفظ بھی مذکورہ دونوں محاوروں میں سے ایک سے ماخوذ ہے۔اور اس کے معنی خالص یا محکم توبہ کے ہیں۔اس میں نَصُوْحٌ وَ نِصَاحٌ دولغت ہیں جیسے ذَهُوْبٌ وَذَهَابٌ کسی شاعر نے کہا ہے [1] ()

(۴۲۸) اَحْبَبْتُ حُبًّا خَالَطَتْهُ نَصَاحَةٌ

میں اس سے خالص محبت رکھتا ہوں۔

(ن ص ر)

اَلنَّصْرُ وَالنُّصْرَةُ کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ (۶۱۔۱۳) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی۔﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ﴾ (۱۱۰۔۱) جب اللہ کی مدد آ پہنچی۔

﴿وَ انْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ﴾ (۲۱۔۶۸) اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (۳۔۲۰) اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا۔

﴿وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۔۲۵۰) اور (لشکر) کفار پر فتح یاب کر۔

﴿وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۰۔۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا﴾ (۴۰۔۵۱) ہم اپنے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں۔

﴿وَ مَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ﴾ (۹۔۷۴) اور زمین میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔

﴿وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا﴾ (۴۔۴۵) اور خدا ہی کافی کارساز اور کافی مددگار ہے۔

﴿وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ﴾ (۲۔۱۰۷) اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۴۶۔۲۸) تو جن کو ان لوگوں نے......خدا کے سوا معبود بنایا تھا۔انہوں نے ان کی کیوں مدد نہ کی۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں (نَصَرَ) کا لفظ استعال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اپنے بندے کی مدد کرنا کے معنی تو ظاہر ہیں۔اور بندہ کے اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے اس کے بندوں کی مدد، حدود الٰہی کی حفاظت، اس کے عہود کی رعایت، احکام شریعت کی بجا آوری اور اس کے نواہی سے اجتناب کرنا مراد ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ﴾ (۵۷۔۲۵) اور اس لیے کہ جو اس کی مدد کرتے ہیں خدا ان کو معلوم کر لے

---

[1] لم اجده فی المراجع ۱۲۔

﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (۴۷۔۷) اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔
﴿كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (۶۱۔۱۴) خدا کے مددگار بن جاؤ۔
اَلْاِنْتِصَارُ وَالْاِسْتِنْصَارُ کے معنی طلب نصرت کے ہیں قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ﴾ (۴۲۔۳۹) اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم و تعدی ہو تو مناسب طریقے سے بدلہ لیتے ہیں۔
﴿وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ﴾ (۸۔۷۲) اور اگر وہ تم سے دین کے معاملات میں مدد طلب کریں۔ تو تم کو مدد کرنا لازم ہے۔
﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ﴾ (۴۲۔۴۱) اور جس پر ظلم ہوا ہو وہ اگر اس کے بعد انتقام لے۔
﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ (۵۴۔۱۰) تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ (باری تعالیٰ) میں ان کے مقابلے میں کمزور ہوں تو (ان سے) بدلہ لے۔
میں اُنْصُرْ کی بجائے اِنْتَصِرْ کہنے سے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ جو تکلیف مجھے پہنچ رہی ہے وہ گویا تجھے (ذات باری تعالیٰ) پہنچ رہی ہے کیونکہ میں تیرے حکم سے ان کے پاس گیا تھا لہٰذا میری مدد فرمانا گویا تیرا اپنی ذات کے لیے انتقام لینا ہے۔ اَلتَّنَاصُرُ کے معنی باہم تعاون کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ﴾ (۳۷۔۲۵) تم کو کیا ہوا کہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔
اور بعض کے نزدیک عیسائیوں کو بھی نَصَارٰی اس لیے کہا گیا ہے کہ انہوں نے نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ کا نعرہ لگایا تھا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ (۶۱۔۴) جیسے عیسیٰؑ بن مریم نے حواریوں سے کہا، بھلا کون ہیں جو خدا کی طرف بلانے میں میرے مددگار ہوں؟ تو حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نصرانی کی جمع ہے جو نصران (قریہ کا نام) کی طرف منسوب ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ﴾ (۲۔۱۱۳) یہود کہتے ہیں کہ عیسائی رستے پر نہیں۔
نُصِرَ اَرْضُ بَنِيْ فُلَانٍ کے معنی بارش برسنے کے ہیں۔ کیونکہ بارش سے بھی زمین کی مدد ہوتی ہے اور نَصَرْتُ فُلَانًا: جس کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں یہ یا تو نَصْرُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے اور یا نَصْرٌ بمعنی عَوْن سے

(ن ص ف)

نِصْفُ الشَّيْءِ کے معنی ۱/۲ حصہ کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ﴾ (۴۔۱۲) اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں اگر ان کے اولاد نہ ہو تو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے۔
﴿وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ (۴۔۱۱) اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔
﴿فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ (۴۔۱۷۶) تو اس کو بھائی کے ترکہ میں سے آدھا حصہ ملے گا۔
اِنَاءٌ نِصْفَانُ: آدھا بھرا ہوا برتن۔
نَصَفَ النَّهَارُ وَانْتَصَفَ: دن کا نصف ہو جانا دوپہر کا

وقت نَصَفَ الْإِزَارُ سَاقَهٗ: ازار کا نصف پنڈلی تک ہونا۔

نَصِیْفٌ: غلہ ناپنے کے ایک پیمانے کا نام ہے گویا وہ مِکْیَالِ اَکْبَرِ (بڑے پیمانے) کا نصف ہے اور اس کے معنی عورتوں کی اوڑھنی یا دوپٹہ بھی آتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۴۲۹) سَقَطَ النَّصِیْفُ وَلَمْ تُرِدْ اِسْقَاطَهٗ
فَتَنَاوَلَتْهُ وَاتَّقَتْنَا بِالْیَدِ

اوڑھنی سر سے گری اور اس نے عمداً نہیں گرائی تھی پھر اس نے (بدحواسی میں) اسے سنبھالا اور ہاتھ کے ذریعہ ہم سے پردہ کیا۔

بَلَغْنَا مَنْصِفَ الطَّرِیْقِ: ہم نے آدھا سفر طے کرلیا۔

اَلنَّصَفُ: متوسط عمر کی عورت، ادھیڑ عمر۔

اَلْمُنَصَّفُ: شراب جو آگ پر پکانے کے بعد آدھا رہ گیا ہو۔

اَلْاِنْصَافُ کے معنی کسی معاملہ میں عدل سے کام لینے کے ہیں۔ یعنی دوسرے سے صرف اسی قدر فائدہ حاصل کرے جتنا کہ اسے پہنچا ہے۔

اور نَصَفَةٌ کے معنی خدمت بھی آتے ہیں۔ اور خادم کو نَاصِفٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع نُصُفٌ آتی ہے۔ اس نام میں اشارہ ہے کہ خدام کو حق خدمت پورا پورا ملنا چاہیے۔

اَلْاِنْتِصَافُ وَالْاِسْتِنْصَافُ: طلب خدمت کرنا۔

(ن ص ی)

اَلنَّاصِیَةُ کے معنی پیشانی یا پیشانی کے بالوں کے ہیں کہا جاتا ہے:۔

نَصَوْتُ فُلَانًا وَّانْتَصَیْتُهٗ وَنَاصَیْتُهٗ: میں نے اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑا۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِهَا﴾ (۱۱۔۵۶) جو چلنے پھرنے والا ہے وہ اس کو چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے۔ میں "اخذ نَاصِیَة" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چلنے پھرنے والی چیز پر پوری قدرت حاصل ہے۔

﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِیَةِ نَاصِیَةٍ﴾ (۹۶۔۱۵) تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے [2] (۱۲۹) کہ انہوں نے فرمایا۔ مَالَکُمْ تَنْصُوْنَ مَیِّتَکُمْ تم میت کی ناصیۃ کیوں باندھتے ہو اور فُلَانٌ رَأْسُهُمْ وَعَیْنُهُمْ کی طرح فُلَانٌ نَاصِیَةُ قَوْمِهٖ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی سردار کے ہیں۔

اِنْتَصَی الشَّعْرُ: بالوں کا بڑھ جانا۔

اَلنَّصِیُّ: ایک قسم کا عمدہ چارہ۔

پھر اس کے ساتھ تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے:۔ فُلَانٌ نَصِیَّةُ الْقَوْمِ کہ فلاں ان میں بہتر ہے۔

---

[1] قاله النابغة الذبياني (٦٠٤ء) فی وصف "متجردة" زوجة نعمان بن المنذر ولا جل هذا الشعر قال صالح بن حسان المدني: ان الشاعر كان مخنثا (شرح ديوان نابغة ٣٠) وراجع للقصة ايضا الشعراء والاغاني والبيت فی ديوانه ٣٠ وامالی المرتضی (١: ٤٤٦) ومختار الشعر الجاهلی (١: ١١٢) والعقد الثمين ٠(١ فی ٣٣) بيتا والبحر (٧: ٢٢٩، ٢٢٤) والحصری (١: ٢٦٥) والعينی (١: ٨٣) والفائق (٢: ٢٧٥) والعمدة (١: ٢٦٣) وادروه فی العمدة فی امثله الاختراع وهو مغاير عند العلماء والسرقة والتوحيد بوجوه وانظر الاول فی المحاضرات للموئف (١: ٨٧)۔

[2] وفی غريب ابی عبيد (٤/٣١٤): علام بدل مالكم والحدث فی الفائق (٢/٢٧٨) ولفظه كما فی ابی عبيد ١٢۔

(ن ض ج)

نَضِجَ اللَّحْمُ (ض) نُضْجًا وَنَضْجًا کے معنی گوشت کے پوری طرح پک جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ (۴۔۵۶) جب ان کی کھالیں گل اور جل جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔

اسی سے نَاقَةٌ مُنْضِجَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی حاملہ اونٹنی کے مدت ولادت سے تجاوز کر جانے کے ہیں۔ اور پختہ رائے آدمی کو نَضِيْجُ الرَّأْيِ کہا جاتا ہے۔

(ن ض د)

نَضَدْتُّ الْمَتَاعَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ کے معنی سامان کو قرینے سے اوپر نیچے رکھنے کے ہیں۔ اور قرینے سے رکھے ہوئے سامان کو مَنْضُوْدٌ یا نَضِيْدٌ کہا جاتا ہے۔ اور جس تخت پر سامان جوڑ کر رکھا جائے اسے بھی نَضِيْدٌ کہتے ہیں...... اسی سے استعارۃً فرمایا:۔

﴿طَلْعٌ نَضِيْدٌ﴾ (۵۰۔۱۰) جن کا گابھا تہ برتہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا:۔

﴿وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (۵۶۔۲۹) اور تہ بہ تہ کیلوں۔

اور مجازاً گہرے بادل کو بھی نَضَدٌ کہا جاتا ہے۔ اور اَنْضَادُ الْقَوْمِ کے معنی لوگوں کی مختلف جماعتوں کے ہیں۔ اور نَضْدُ الرَّجُلِ کے معنی آدمی کے اعمام واخوال کے ہیں جن کی مدد سے وہ مضبوط ہوتا ہے۔

(ن ض ر)

اَلنَّضْرَةُ وَالنَّضَارَةُ کے معنی حسن اور تروتازگی کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ (۸۳۔۲۴) تم ان کے چہروں سے راحت کی تازگی معلوم کرلوگے۔

﴿وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا﴾ (۷۶۔۱۱) اور تازگی اور خوشدلی عنایت فرمائے گا۔

اور نَضَرَ وَجْهُهٗ يَنْضُرُ فَهُوَ نَاضِرٌ (نَصَرَ) سے آتا ہے۔ اور بعض نے نَضِرَ يَنْضَرُ یعنی باب عَلِمَ سے مانا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے۔ (۷۵۔۲۲) نَضَّرَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ: اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو تروتازہ (یعنی خوش وخرم) رکھے۔

غُصْنٌ اَخْضَرُ وَ نَاضِرٌ تروتازہ ٹہنی۔

اور سونے کو بھی اس کی تروتازگی اور حسن کے باعث نَضْرٌ وَنَضِيْرٌ کہا جاتا ہے۔ وَقَدَحٌ نُضَارٌ: (راضافت کے ساتھ) پیالہ کو کہتے ہیں۔ جو عمدہ لکڑی سے بنا ہوا ہو۔

(ن ط ح)

اَلنَّطِيْحَةُ: سینگ لگنے سے مری ہوئی بکری۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ﴾ (۵۔۳) اور جو جانور گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے۔

اَلنَّطِيْحُ وَالنَّاطِحُ: اس آہو یا پرند کو کہتے ہیں۔ جو شکاری کی طرف سیدھا آئے۔ گویا وہ سینگ سے مارنا چاہتا ہے۔ ایسے شکار کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی سے نَوَاطِحُ الدَّهْرِ ہے جس کے معنی شدائد زمانہ کے ہیں۔ اور فَرَسٌ (نَطِيْحٌ) اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی

پیشانی کے دونوں طرف سفید ہوں۔

(ن ط ف)

اَلنُّطْفَةُ: (ضمہ نون) اصل میں تو آب صافی کو کہتے ہیں مگر اس سے مرد کی منی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ (۲۳۔۱۳)
پھر اس کو ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔
﴿مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ (۷۶۔۲) نطفہ مخلوط سے
﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى﴾ (۷۵۔۳۷) کیا وہ منی کا، جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا۔

اور کنایہ کے طور پر موتی کو بھی نُطْفَةٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے صَبِيٌّ مُنَطَّفٌ ہے یعنی وہ لڑکا جس نے کانوں میں موتی پہنے ہوئے ہوں۔

اَلنَّطَفُ کے معنی ڈول کے ہیں اس کا واحد بھی نُطْفَةٌ ہی آتا ہے اور لَيْلَةٌ نَطُوْفٌ کے معنی برسات کی رات کے ہیں جس میں صبح تک متواتر بارش ہوتی رہے۔

اَلنَّاطِفُ: سیال چیز کو کہتے ہیں۔ اسی سے نَاطِفٌ بمعنی شکرینہ ہے اور فُلَانٌ مُنْطِفُ الْمَعْرُوْفِ کے معنی ہیں۔ فلاں اچھی شہرت کا مالک ہے۔ اور فُلَانٌ يَنْطِفُ بِسُوْءٍ کے معنی برائی کے ساتھ آلودہ ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ فُلَانٌ يُنَدِّيْ بِهٖ کا محاورہ ہے۔

(ن ط ق)

عرف میں نُطْقٌ ان اَصوات مقطعہ: کو کہا جاتا ہے۔ جو زبان سے نکلتی ہیں۔ اور کان انہیں سن کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ﴾ (۳۷۔۹۲) تمہیں کیا ہوا کہ تم بولتے نہیں۔

یہ لفظ بالذات صرف انسان کے متعلق بولا جاتا ہے دوسرے حیوانات کے لیے بالتبع استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَلْمَالُ النَّاطِقُ وَالصَّامِتُ کا محاورہ ہے جس میں ناطق سے حیوان اور صامت سے سونا چاندی مراد ہے۔ ان کے علاوہ دیگر حیوانات پر ناطق کا لفظ مقید یا بطور تشبیہ استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ( )

(۴۳۰) عَجِبْتُ لَهَا اَنّٰى يَكُوْنُ غِنَاؤُهَا
فَصِيْحًا وَلَمْ تَفْغَرْ لِمَنْطِقِهَا فَمَا

مجھے تعجب ہوا کہ وہ کتنا فصیح گانا گاتی ہے حالانکہ اس نے گویائی کے لیے منہ نہیں کھولا۔

اہل منطق قوتِ گویائی کو نطق کہتے ہیں۔ جب وہ انسان کی تعریف کرتے ہوئے اَلْحَيُّ النَّاطِقُ ...... کہتے ہیں تو ناطق سے ان کی یہی مراد ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ نطق کا لفظ مشترک ہے جو قوت نطقیہ اور کلام ملفوظ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ کبھی نَاطِقٌ کے معنی اَلدَّالُ عَلَى الشَّيْءِ کے بھی آتے ہیں اسی بنا پر ایک حکیم سے پوچھا گیا کہ اَلنَّاطِقُ الصَّامِتُ کسے کہتے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا: اَلدلائل الْمُخْبِرَةُ وَالْعِبَرُ الْوَاعِظَةُ۔

اور آیت کریمہ:

[1] قاله حميد بن ثور يصف حمامة وفى لسان العرب (فغر) بمنطقها بدل لمنطقها والبيت من شواهد الكشاف (۱۱۹) والكامل (۸۴۹) فى ثمانية ابيات والحصرى (۱ : ۲۷۱) فى عشرة والبلدان ويلمليم) وطبقات الشافعيه الكبرى (۱ : ۱۱۱) فى ۱۳۸ بيت والوسيط (۱۲۸۔۱۲۹) والسمط (۳۸۲) فى خمسة والامالى (۱ : ۱۳۹) والوحشيات (۳۱۷) فى سبعة والمحاضرات للمولف (۲ : ۶۶) وادب الكاتب (۲۳) ونثار الازهار ۷۸ والخزانة (۱ : ۱۷/۴ : ۲۹۹) والحيوان (۳ : ۱۹۸)

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ﴾ (۲۱۔۶۵) کہ تم جانتے ہو یہ بولتے نہیں۔
میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ وہ ذوی النطق اور ذوی العقول کی جنس سے نہیں ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (۴۱۔۲۱) جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اس نے ہم کو بھی گویائی دی۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نطق اعتباری مراد ہے کیونکہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ تمام چیزیں حقیقتاً ناطق نہیں ہیں۔اور آیت کریمہ:۔﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ (۲۷۔۱۶) ہمیں (خدا کی طرف سے) جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ میں پرندوں کی آواز کو محض حضرت سلیمان علیہ السلام کے لحاظ سے نطق کہا ہے کیونکہ وہ ان کی آوازوں کو سمجھتے تھے اور جو شخص کسی چیز سے کوئی معنی سمجھتا ہو تو وہ چیز خواہ صامت ہی کیوں نہ ہو۔اس کے لحاظ سے تو ناطق کا حکم رکھتی ہے۔اور آیت کریمہ:۔
﴿هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ (۴۵۔۲۹) یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں سچ سچ بیان کر دے گی۔
میں کتاب کو ناطق کہا ہے لیکن اس کے نطق کا ادراک صرف آنکھ ہی کر سکتی ہے۔ جیسا کہ کلام بھی ایک کتاب ہے۔ لیکن اس کا ادراک حاسۂ سماعت سے ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:۔﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (۴۱۔۲۱) اور وہ اپنے چمڑوں یعنی اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی؟ وہ کہیں گے: جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اسی نے ہم کو بھی گویائی دی۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نطق صوتی مراد ہے اور بعض نے نطق اعتباری مراد لیا ہے۔اور عالم آخرت کی اصل حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ نطق درحقیقت لفظ کو کہتے ہیں۔کیونکہ وہ معنی کو لپیٹنے اور محصور کرنے میں بمنزلہ نطاق کے ہوتا ہے۔
اَلْمِنْطَقُ وَالْمِنْطَقَةُ: کمر بند کو کہتے ہیں اور شاعر کے قول ❶

(۴۳۱) وَاَبْرَحُ مَا اَدَامَ اللّٰهُ قَوْمِیْ
بِحَمْدِ اللّٰهِ مُنْتَطِقًا مُجِيْدًا

جب تک میری قوم زندہ ہے، میں بحمد اللہ عمدہ گوشاعر رہوں گا۔
میں بعض نے کہا ہے مُنْتَطِقًا کے معنی جانباً کے ہیں یعنی گھوڑے کو آگے سے پکڑ کر کھینچتا رہوں گا اور اس پر سوار نہیں ہوں گا۔ ہاں اگر اس معنی میں کوئی دوسرا شعر نہ آیا ہو تو یہاں منطق سے مراد وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جس نے کمر پر نطاق باندھا ہوا ہو۔ جیسا کہ مقولہ مشہور ہے ❷ وَمَنْ يَطُلْ ذَيْلُ اَبِيْهِ يَنْتَطِقُ بِهٖ یعنی جس کے باپ

---

❶ قاله خداش بن زهير و فى اللسان (نطق) على الاعداد بدل بحمد الله وفى ديوانه رهطى بدل قومى والبيت من شواهد ابى عبيدة فى مجازه (۱:۳۱۶) رقم ۳۶ والعينى (۲:۶۴)

❷ وفى رواية "هن ابيه" بدل ذيل ابيه (نطق) وفى اللسان (اير) أيرابيه وانظر للمثل للسان (نطق) وجمهرة الامثال (۱۸۷) ومجمع الامثال (۲:۲۵۶) والفائق (۱:۳۱) والمشكل للقبتى ۶۴ والحيوان للجاحظ (۳:۴۲) والعيون فى مقدمته ۱۲۔

کے فرزند زیادہ ہوں گے۔ تو وہ ان کی وجہ سے طاقت ور اور توانا ہو جائے گا۔
اور بعض نے کہا ہے کہ مُنْتَطِقٌ کے معنی عمد گو کے ہیں۔

(ن ظ ر)

اَلنَّظَرُ کے معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اس کا ادراک کرنے کے لیے آنکھ یا فکر کو جولانی دینے کے ہیں۔ پھر کبھی اس سے محض غور وفکر کرنے کا معنی مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس معرفت کو کہتے ہیں۔ جو غور وفکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: نَظَرْتَ فَلَمْ تَنْظُرْ تو نے دیکھا لیکن غور نہیں کیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
﴿قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ (۱۰۔۱۱) ان کفار سے کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ میں اُنْظُرُوْا کے معنی غور کرنے کے ہیں۔ اگرچہ کچھ عوام کے نزدیک زیادہ تر نظر کا لفظ رؤیۃ بصری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن خواص کے نزدیک یہ عام طور پر بصیرت کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (۷۵۔۲۲،۲۳) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے۔
نَظَرْتُ اِلٰى كَذَا کے معنی کسی چیز کی طرف نظر اٹھانے کے ہیں۔ خواہ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔ اور نَظَرْتُ فِيْهِ کا معنی کسی چیز کو دیکھ کر اس میں غور کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ (۸۸۔۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں۔
نَظَرْتُ فِيْ كَذَا کے معنی کسی چیز میں غور کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ﴾ (۳۷۔۸۸،۸۹) تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی اور کہا میں تو بیمار ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۸۵) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں...... نظر نہیں کی۔
میں آسمان وزمین کی خلقت میں جو جو حکمتیں مضمر ہیں۔ ان پر فکر و تامل کی ترغیب دی گئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کی طرف نظر کرنے سے ان پر احسان اور لطف کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور کفار کی طرف نظر نہ کرنے کے معنی ان سے لطف و کرم اور افاضہ انعامات کو روک لینے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔
﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (۳۔۷۷) ان سے خدا نہ تو کلام کرے گا اور نہ قیامت کے روز ان کی طرف دیکھے گا اور آیت کریمہ:۔
﴿كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (۸۳۔۱۵) بے شک یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے۔ بھی اس معنی پر محمول ہے۔
اور اَلنَّظَرُ بمعنی انتظار بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ نَظَرْتُهٗ وَانْتَظَرْتُهٗ دونوں کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
﴿وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ﴾ (۱۱۔۱۲۲) اور (نتیجہ اعمال کا) تم بھی انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔
﴿فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

﴿قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ﴾ (۱۰۔۱۰۲) سوجیسے برے دن ان سے پہلے لوگوں پر گذر چکے ہیں اسی طرح کے دنوں کے یہ منتظر ہیں۔ کہدو کہ تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (۵۷۔۱۳) کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجیے۔ کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

﴿اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰهُ﴾ (۳۳۔۵۳) کھانے کے لیے..... اور اس کے پکنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔

﴿فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (۲۷۔۳۵) اور دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں۔ ﴿هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ﴾ (۴۳۔۶۶) یہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ قیامت ان پر ناگہاں آموجود ہو۔ اور ان کو خبر تک نہ ہو۔

﴿هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۲۔۲۱۰) کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان پر خدا (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں آنازل ہو اور فرشتے بھی (اتر آئیں)

﴿وَمَا یَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً﴾ (۳۸۔۱۵) اور یہ لوگ تو صرف ایک آواز کا انتظار کرتے ہیں۔

اور اَنْظَرْتُهٗ کے معنی اَخَّرْتُهٗ یعنی مؤخر کرنے اور مہلت دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَ مَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ﴾ (۱۵۔۸) اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملتی۔

﴿قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ﴾ (۷۔۱۴،۱۵) اس نے کہا کہ مجھے اس دن تک مہلت عطا فرماؤ جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا (اچھا) ﴿فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ﴾ (۱۱۔۵۵) تجھ کو مہلت دی جاتی ہے میرے بارے میں جو تدبیر (کرنی چاہو) کرلو اور مجھے مہلت نہ دو۔ ﴿لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِیْمَانُهُمْ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ﴾ (۳۲۔۲۹) کہ کافروں کو ان کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ﴾ (۴۴۔۲۹) پھر ان پر نہ تو آسمان و زمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی۔ یہاں ان سے اِنْظَارٌ کی نفی کر کے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس پر کہ آیت کریمہ: ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ (۷۔۳۴) جب وہ وقت آجاتا ہے تو نہ تو ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی۔ میں متنبہ کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ (۷۔۱۴۳) اے میرے پروردگار! مجھے جلوہ دکھا کہ میں تیرا دیدار (بھی) کروں۔ کی کچھ تشریح پہلے گذر چکی ہے۔ اور اس کے حقائق پر مفصل بحث اس کے بعد دوسری کتاب (تفسیر القرآن) میں بیان ہوگی۔

اور نَظْرٌ کا لفظ کسی معاملہ میں متحیر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾

(۲۔۵۵) تو تم کو بجلی نے آ گھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔
﴿وَ تَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ (۷۔۱۹۸) آنکھیں کھولے تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ مگر (دراصل) کچھ نہیں دیکھتے۔ نیز فرمایا:
﴿وَتَرٰاهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خَاشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ﴾ (۴۲۔۴۵) اور تم ان کو دیکھو گے کہ دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے۔ ذلت سے عاجزی کرتے ہوئے چھپی (اور نیچی) نگاہ سے دیکھ رہے ہوں گے۔
﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ (۱۰۔۴۳) اور بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں۔ تو کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے۔ اگر کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔
ان تمام آیات میں نَظَرٌ کے معنی حیرت زدہ ہو کر دیکھنے کے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح دیکھنا بے معنی ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ (۲۔۵۰) اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا اور تم دیکھ ہی تو رہے تھے۔
میں بعض نے تَنْظُرُوْنَ کے معنی مشاہدہ کے لکھے ہیں۔ اور بعض نے عبرت حاصل کرنے کے۔ اور شاعر کے قول ❶ (الرمل)
(۴۲۳) نَظَرَ الدَّهْرُ اِلَيْهِمْ فَابْتَهَلْ
میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ زمانہ نے خیانت کی اور انہیں ہلاک کر ڈالا۔"
اور حَیٌّ نَظَرٌ اس قوم کو کہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے اس قدر قریب فروکش ہوں کہ ان کے خیمے آمنے سامنے نظر آتے ہوں۔ اور آبادی میں اسی قسم کے قرب سے حدیث میں کفار سے دور رہنے کا حکم دیتے ہیں فرمایا ❷ (۱۳۰)
لَا يُتَرَاءٰى نَارَاهُمَا کہ مسلمان کفار سے اتنی دور ہوں کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے۔ اور نَظِيْرٌ کے معنی ہم مثل کے ہیں۔ اصل میں نظیر بمعنی مُنَاظِرٌ ہے گویا ایک دوسرے کو دیکھ کر باہم موازنہ کرتے ہیں۔
وَبِهٖ نَظْرَةٌ (وہ آسیب زدہ ہے) شاعر نے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ❸ ()
(۴۲۴) وَقَالُوْا بِهٖ مِنْ اَعْيُنِ الْجِنِّ نَظْرَةٌ
اور لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔ اور اسے کسی جن کی نظر لگی ہوئی ہے۔
اَلْمُنَاظَرَةُ کے معنی مباحثہ یعنی بحث ونظر میں باہم مقابلہ کرنے اور ہر ایک کے اپنی رائے علی وجہ البصیرۃ ظاہر کرنے کے ہیں۔ اور نَظَرٌ کے معنی بحث کرنا بھی آتے ہیں۔ اور قیاس سے عام ہے کیونکہ ہر قیاس کو نَظَرٌ کہہ

---

❶ قاله لبيد وصدره۔ "في قروم سادة من قومه" انظر ديوانه، ۱۷ (طبعه ليدن (۱۸۹۱ء) والطبرسي (۲۸۰۳) وقد مرفي ابهل)
❷ اخرجه النسائي وابوداؤد وقد مر تخريجه، في (رء ی)
❸ نسبه صاحب مصارع العاشق (۱۲۹۔۱۳۰) برواية ابن الاعرابي الیٰ مجنون بني عامر وتمامه...... ولو عقلوا قالوا به اعين الانس وفي محاضرات المؤلف (۳: ۸۶) عجزه: ولو صدقوا قالوا به نظرة الانس وقبله: وَجَاءٗ واليه بالتعاويذ والرقیٰ وصبوا عليه الماء من الم النكس۔

سکتے ہیں لیکن ہر نظر قیاس نہیں ہوتی۔

(ن ع ج)

اَلنَّعْجَةُ کی جمع نِعَاجٌ آتی ہے اور اس کا اطلاق بھیڑ، نیل گاؤ اور پہاڑی بکریوں میں سے مادینہ پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

﴿اِنَّ هٰذَا اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ (۳۸۔۲۳) یہ میرا بھائی ہے اس کے ہاں ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے۔

نَعِجَ الرَّجُلُ: بھیڑ کا گوشت کھانے سے بدہضمی ہونا۔

اَنْعَجَ الرَّجُلُ: موٹی بھیڑوں کا مالک ہونا۔ اَلنَّعْجُ کے معنی سپیدی یا سپید ہونے کے ہیں اور اَرْضٌ نَاعِجَةٌ نرم زمین کو کہتے ہیں۔

(ن ع س)

اَلنُّعَاسُ کے معنی اونگھ یا ہلکی سی نیند کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ﴾ (۸۔۱۱) جب اس نے ...... تمہیں نیند کی چادر اڑھا دی۔

﴿اَمَنَةً نُّعَاسًا﴾ (۳۔۱۵۴) تسلی...... یعنی نیند بعض نے کہا ہے کہ یہاں نُعَاسٌ سے مراد سکون اور اطمینان ہے اور یہ آنحضرت ﷺ کے قول مبارک کی طرف اشارہ ہے (۱۳۱)[1]

((طُوْبٰی لِكُلِّ عَبْدٍ نُوَمَةٍ)) کہ ہر باسکون آدمی کے لیے خوشخبری ہے۔

(ن ع ق)

نَعَقَ الرَّاعِیْ بِصَوْتِهٖ کے معنی چرواہے کے چلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿كَمَثَلِ الَّذِیْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً﴾ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

(ن ع ل)

اَلنَّعْلُ کے معنی جوتا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ (۲۰۔۱۲) تو اپنا جوتا...... اتار دو تم یہاں پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو۔

اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کی حفاظت کے لیے جو چمڑا یا لوہا لگایا جاتا ہے اسے بھی نعل الفرس کہتے ہیں۔ اسی طرح نیام شمشیر کے بائیں جانب جو لوہا لگایا جاتا ہے اسے نَعْلُ السَّيْفِ کہا جاتا ہے۔ فَرَسٌ مُنْعَلٌ وہ گھوڑا جس کے رُسْغ کے نیچے بالوں پر سفید نشان ہو۔

اور پاپوش پوش کو نَاعِلٌ وَ مُنْعَلٌ کہا جاتا ہے اور کبھی اس سے مالدار آدمی بھی مراد لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اَلْحَافِیْ سے مراد فقیر ہوتا ہے۔

(ن ع م)

اَلنِّعْمَةُ: اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اور یہ فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے جو کسی حالت کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ جیسے جِلْسَةٌ وَرِكْبَةٌ۔ وغیر ذالک

اور نَعْمَةٌ کے معنی تَنَعُّمٌ یعنی آرام آسائش ہیں اور یہ فَعْلَةٌ کے وزن پر ہے۔ جو مرۃ لیے استعمال ہوتا ہے جیسے ضَرْبَةٌ وَشَتْمَةٌ اور نِعْمَةٌ کالفظ اسم جنس سے جو قلیل و کثیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں

---

[1] وفی المعاجم نعق الراعی بغنمه ۱۲۔

ہے: ﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (۱۴-۳۴) اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔
﴿اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ (۲-۴۰) میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے
﴿وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (۵-۴) اور میں نے اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔
﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۳-۱۷۴) پھر خدا کی نعمتوں کے ساتھ واپس آئے۔ وَغَیْــــرَ ذَالِكَ
اَلْإِنْـعَامُ (افعال) کے معنی دوسروں پر احسان کرنے کے ہیں۔ اور یہ لفظ صرف اسی وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب مُنْعَمْ علیه ذوی العقول سے ہو لہٰذا اَنْـعَمَ فُلَانٌ عَلٰی فَرْسِہٖ کہنا درست نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (۱-۶) جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا۔
﴿وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ﴾ (۳۳-۳۷) اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا یہ کہتے تھے۔
﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ (۴۳-۵۹) وہ تو ہمارے ایسے بندے تھے جن پر ہم نے فضل کیا تھا۔
اَلنَّعْمَآءُ یہ ضَرَّآءُ کے مقابلہ میں آتا ہے۔
چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ﴾ (۱۱-۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔
اور نَعْمٰی بُؤْسٰی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور نَعِیْمٌ کے معنی نِعْمَةٌ کَثِیْرَةٌ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:
﴿فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ﴾ (۵۶-۱۲) نعمتوں کی بہشت میں۔
﴿جَنّٰتِ النَّعِيْمِ﴾ (۲۱-۸) نعمت کے باغ میں۔
تَنَعُّمٌ کے معنی خوش حال ہونے اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کے ہیں اور نَعَّمَہٗ کے معنی کسی کو آسودہ حال بنانے کے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ﴾ (۸۹-۵) اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے۔
طَعَامٌ نَاعِمٌ: (عمدہ کھانا) جَارِيَةٌ نَاعِمَةٌ: نازک اندام لڑکی۔ اور اَلنَّعَم کا لفظ خاص کر اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ اور اونٹوں کو نَعَمٌ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ عرب کے لیے سب سے بڑی نعمت تھے اس کی جمع اَنْعَامَ آتی ہے۔ لیکن اَنْعَام کا لفظ بھیڑ بکری اونٹ اور گائے سب پر بولا جاتا ہے۔ مگر ان جانوروں پر اَنْعَامٌ کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے۔
جب اونٹ بھی ان میں شامل ہوں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ﴾ (۴۳-۱۲) اور تمہارے لیے کشتیاں اور چار پائے بنائے۔
﴿وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا﴾ (۶-۱۴۱) اور چارپایوں میں بوجھ اٹھانے والے (یعنی بڑے بڑے بھی) پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے بھی)۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ﴾ (۱۰-۲۴) پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں۔ مل کر نکلا۔
میں اَنْعَامَ کا لفظ عام ہے۔ جو تمام جانوروں کو شامل ہے۔
نَعَامٰی۔ جنوبی ہوا جو نرمی سے چل رہی ہو۔ اور شتر مرغ

کو ''نَــعَـامَةٌ'' کہا جاتا ہے۔کیونکہ وہ خلقت میں اونٹ کے مشابہ ہوتا ہے۔اور پہاڑ یا کنویں کے اوپر سائباں کے مانند بنی ہوئی عمارت جو کہ دور سے شتر مرغ کی طرح دکھائی دیتی ہو۔اس کو بھی نَعَامَةٌ کہا جاتا ہے (1) نَعَائِمُ منازل قمر سے ایک منزل کا نام ہے۔(2) جو شتر مرغ کی ہم شکل فرض کی گئی ہے......اور شاعر کے قول (3) (الکامل)

(۴۳۴) وَابْنُ النَّعَامَةِ عِنْدَ ذٰلِكَ مَرْكَبِي

اور میری سواری میرا گھوڑا ابن نعامہ ہوگا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ابن نعامۃ سے شاعر نے خود اپنے پاؤں مراد لیے ہیں۔اور سرعت رفتاری میں انہیں اِبْــنِ نَــعَامَه کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔کیونکہ نعامہ کے معنی باطن قدم کے بھی آتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ اہل عرب نے یہ معنی بھی اِبْــنُ الــنَّعَامَة کے محاورہ سے ہی اخذ کیا ہے۔اور تَنَعَّمَ فُلَانٌ جس کے معنی آہستہ آہستہ چلنے کے ہیں، نِعْمَة سے مشتق ہے۔

نِــعْــمَ کلمہ مدح ہے جو بِــئْـــسَ فعل ذم کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نِــعْــمَ الْــعَبْدُ اِنَّــهٗ اَوَّابٌ﴾ (۳۸۔۳۰) بہت خوب بندے تھے اور (خدا کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔

﴿فَــنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ﴾ (۳۔۱۳۶) اور اچھے کام کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے۔

﴿نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ (۸۔۴۰) وہ خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔

﴿وَالْاَرْضَ فَــرَشْــنٰهَــا فَــنِــعْــمَ الْمٰهِدُوْنَ﴾ (۵۱۔۴۸) اور زمین کو ہم ہی نے بچھایا تو (دیکھو ہم) کیا خوب بچھانے والے ہیں۔

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ﴾ (۲۔۲۷۱) اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے۔

اور محاورہ ہے:۔

اِنْ فَــعَــلْتَ كَذَا فَبِهَا وَنَعِمَتْ: اگر تم نے ایسا کیا تو خوب کیا اور یہ اچھی عادت ہے۔

غَسَّــلْتُــهٗ غَسْلًا نَــعِمًّا: میں نے اسے اچھی طرح دھویا۔

فَعَلَ كَذَا وَاَنْعَمَ: اس نے فلاں کام کیا اور خوب کیا۔نَعَّمَ الــلّٰــهُ بِكَ عَيْنًا: اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرے یا تمہاری وجہ سے دوسروں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

نَعَمْ: یہ کلمہ ایجاب ہے اور لفظ نعمت سے مشتق ہے۔

اور نَــعَــمْ وَنُعْمَةُ عَيْنٍ وَنُعْمٰى عَيْنٍ وَنُعَامُ عَيْنٍ وغیرہ (ان سب کا ماخذ نعمت ہی ہے) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تمام مرکبات اَنْعَمَ سے ماخوذ ہوں جس کے معنی نرم اور سہل بنانے کے ہیں۔

---

(1) انظر المخصص ۵/۱۳۵۔

(2) "هی" منزلة من منازل القمر بها ثمانية نحوم اربعة فی المحرة وتسمیٰ الواردة واربعة خارجه تسمی الصادرة (الحیوان ۴/۳۵۱)

(3) اختلفت الروایات فی صدره ونسبته ففی الصحاح (نعم) ومختارا الشعر الحاهلی (۱ : ۳۰۴) قاله عنترة فی سبعة ابیات وصدره: فیکون مرکبك القعود و رحله وکذا فی المخصص (۱۳/۳۰۶) والحکم والعقد ۳۵ وابن الشجری فی حما رتبه ۸ وامالیه (۱ : ۲۶۱) والمعانی للقبتی ۹۰ وفی ذیل الصحاح انه لخززین لوذان وکذا فی اللسان (عتق) وابن خالویه والحیوان (۴ : ۳۶۳۔۳۶۴) مع اَرْبَعَة اخروفیه حد جه بدل رحله ویوم ذاك بدل عند ذاك و کتاب الخیل لابن زیاد الاعرابی (۹۲) یعنی بابن النعامة فرسا یقال له غراف بن نعامة کانت له کما فی الخزانة البغدادیة (۳/۱۱) والبیان للجاحظ (۳/۱۷۹) وامالی ابن الشجری (۱ : ۳۶۰) والشاعر جاهلی قدیم راجع الخزانة والموتلف (۱۰۲) والمعنی البیت انظر لمعانی للقبتی ۹۰۔

(ن غ ض)

اَلْاِنْغَاضُ کے معنی دوسرے کے سامنے تعجب سے سر ہلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ﴾ (۱۷۔۵۱) تو تعجب سے تمہارے آگے سر ہلائیں گے۔

نَغَضَ نَغْضَانًا: کپکپی کے ساتھ سر اور دانت ہلانا۔

اَلنَّغْضُ: بہت سر ہلانے والا نر شتر مرغ۔

اَلنُّغْضُ: کندھے کے کنارے کی پتلی ہڈی

(ن ف ث)

اَلنَّفْثُ ۔ کے معنی تھوڑا سا تھوکنے یا تھتکارنے کے ہیں۔ اور یہ تفل (تھوکنا) سے کم درجہ ہوتا ہے۔ اور افسوں یا جادو کرنے والے کے گنڈوں پر پڑھ کر پھونکنے کو بھی نَفَثٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ﴾ (۱۱۳۔۴) اور گنڈوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔

اور اسی سے اَلْحَيَّةُ تَنْفُثُ السُّمَّ (سانپ زہر اگلتا ہے) کا محاورہ ہے مثل مشہور ہے[1] ()

لَوْ سَأَلْتَهٗ نُفَاثَةَ سِوَاكٍ مَا اَعْطَاكَ اگر تو اس سے مسواک کا ایک ریزہ بھی طلب کرے تو نہ دے (یعنی وہ نہایت بخیل ہے) اور نُفَاثَة سِوَاكٍ اس ریزہ کو کہا جاتا ہے جو مسواک کرنے سے دانتوں میں رہ جاتا ہے۔ اور اسے پھینک دیا جاتا ہے۔

دَمٌ نَفِيْثٌ: خون جو زخم سے بہہ نکلے۔ مثل مشہور ہے[2]۔

لَا بُدَّ لِلْمَصْدُوْرِ اَنْ يَّنْفُثَ درد سینہ کے مریض کو تھوکنے سے چارہ نہیں۔

(ن ف ح)

نَفَحَ (ن) نَفْحًا الرِّيْحُ: ہوا کا چلنا۔

لَهٗ نَفْحَةٌ طَيِّبَةٌ: وہ سخی ہے۔

اور کبھی بطور استعارہ شر کے لیے بھی نَفْحَةٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ﴾ (۲۱۔۴۶) اور اگر ان کو تمہارے پروردگار کا تھوڑا سا عذاب بھی پہنچے۔

نَفَحَتِ الدَّابَّةُ: جانور کا سم سے مارنا۔

نَفَحَهٗ بِالسَّيْفِ: ہلکی سی تلوار مارنا۔

اَلنَّفُوْحُ (من النوق): وہ اونٹنی جس کے تھنوں سے بغیر دوہنے کے دودھ نکل پڑے (مِنَ الْقِسِیِّ) دور تک تیر پھینکنے والی کمان۔

اَنْفِحَةُ الْجَدِیْ: بکری کے شیر خوار بچے کے پیٹ سے ایک زردی چیز نکالتے ہیں۔ اور ایسے پشم کے لتہ میں لپیٹ کر پنیر کی طرح خشک کر لیتے ہیں عوام اسے مَجْبَنَةٌ کہتے ہیں۔

(ن ف خ)

اَلنَّفْخُ کے معنی کسی چیز میں پھونکنے کے ہیں۔

---

[1] كذا في المعاجم۔

[2] الاولى ان يكون بالف الاشباع اى ان ينفثا وقرينه، وللذى فى الصدر ان يبعثا (رسالة ابن القارح الى ابى العلاء المعرى الذى اجاب عنها فى رسالة خاصة سماها "الغفران" انظر رسائل البلغاء نشر كرد على معرض (٢٦٥) ومثله فى الفائق (٢ : ٩) قال عمر بن عبدالعزيز لعبيد الله بن عبدالله بن عتبة حتى متى تقول الشعر فقال: لا بد للمصدور ان يسيلا۔ وللذى فى الصدر ان يبعثا ١٢۔

جیسے فرمایا:۔

﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ﴾ (۲۷۔۸۷) اور جس دن صور پھونکا جائے گا۔

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ﴾ (۳۶۔۵۱) اور (جس وقت) صور پھونکا جائے گا۔

﴿ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ أُخْرٰى﴾ (۳۹۔۶۸) پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا۔

اور یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا :۔ ﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ﴾ (۷۴۔۸) جب صور پھونکا جائے گا۔

اور اسی سے نَفْخُ الرُّوْحِ ہے جس کے معنی اس دنیا میں کسی کے اندر روح پھونکنے کے ہیں چنانچہ آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔

﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (۱۵۔۲۹) اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔محاورہ ہے:۔

اِنْتَفَخَ بَطْنُهٗ: کا پیٹ پھول گیا۔

اور اسی سے بطور استعارہ اِنْتَفَخَ النَّهَارُ کا محاورہ ہے جس کے معنی دن کے بلند ہونے کے ہیں۔اور نَفْخَةُ الرَّبِيْعِ کے معنی موسم بہار کی تروتازگی کے ہیں۔اور موٹے آدمی کو رَجُلٌ مَنْفُوْخٌ کہا جاتا ہے۔

(ن ف د)

اَلنَّفَادُ: (س) ختم ہو جانا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ﴾ (۳۸۔۵۴) یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اور اس معنی میں فعل نَفِدَ (س) استعمال ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:۔

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ﴾ (۱۸۔۱۰۹) کہہ دو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں، سمندر ختم ہو جائے۔﴿مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ﴾ (۳۱۔۲۷) تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔

اَنْفَدُوْا: ان کا توشہ ختم ہو گیا۔اور خَصْمٌ مُنَافِدٌ دوسرے کی حجت کو ختم کرنے کے لیے جھگڑنے والے کو کہتے ہیں۔اور نَافَدْتُهٗ وَنَفَدْتُهٗ کے معنی دوسرے کی دلیل کو ختم کرنے کے ہیں۔

(ن ف ذ)

نَفَذَ السَّهْمُ فِي الرَّمِيَّةِ نُفُوْذًا وَّنَفَاذًا کے معنی تیر کے نشانہ سے پار ہو جانے کے ہیں۔اور نَفَذَ فُلَانٌ فِي الْاَمْرِ نَفَاذًا کے معنی کسی کام کو کر گزرنے کے اور اَنْفَذْتُهٗ (افعال) کے معنی پار کرنے کے ہیں۔

جیسے فرمایا:۔

﴿إِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ﴾ (۵۵۔۳۳) اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان و زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ۔اور زور کے سوا تو تم نکل سکتے ہی نہیں۔نَفَّذْتُ الْاَمْرَ تَنْفِيْذًا حکم نافذ کرنا۔ نَفَّذْتُ الْجَيْشَ فِي الْغَزْوِ: غزوہ میں لشکر بھیجنا...... حدیث میں ہے۔[1] (۱۳۰)

[1] من جملة وصاياه صلى الله عليه وسلم فى مرض موته راجع البخارى۔

نَفِّذُوْا جَیْشَ اُسَامَةَ کہ جیش اسامہ کو روانہ کردو۔
اَلْمَنْفَذُ باہر نکلنے کا راستہ۔

(ن ف ر)

اَلنَّفْرُ: (عن) کے معنی کسی چیز سے روگردانی کرنے اور (الی کے ساتھ) کسی کی طرف دوڑنے کے ہیں۔جیسا کہ فَزَعٌ کا لفظ الی اور عن دونوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔محاورہ ہے۔
نَفَرَ عَنِ الشَّیْءِ نُفُوْرًا: کسی چیز سے دور بھاگنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ (۳۵۔۴۲) تو اس سے ان کی نفرت ہی بڑھی۔
﴿وَ مَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ (۱۷۔۴۱) مگر وہ اس سے اور بدک جاتے ہیں۔
نَفَرَ اِلَی الْحَرْبِ (ض ن) نَفَرًا: لڑائی کے لیے نکلنا اور اسی سے ذی الحجہ کی بارھویں تاریخ کو یَوْمَ النَّفْرِ کہا جاتا ہے۔کیوں کہ اس روز حجاج منیٰ سے مکہ معظّمہ کو واپس ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا﴾ (۹۔۴۱) تم سبکسار ہو یا گراں بار (یعنی مال و اسباب تھوڑا رکھتے ہو یا بہت) گھروں سے نکل آؤ۔
﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا﴾ (۹۔۳۹) اگر نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا۔
﴿مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۳۸) تمہیں کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد) کے لیے نکلو۔﴿وَمَا کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ﴾ (۹۔۱۲۲) اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں۔تو یوں کیوں نہیں کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے۔
اَلْاِسْتِنْفَارُ: (۱) جنگ کے لیے نکلنے کی ترغیب دینا (۲) لوگوں کو لڑائی سے بھاگ جانے پر اکسانا (۳) ڈر کر بھاگ جانا۔اور آیت کریمہ:۔﴿کَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ﴾ (۷۴۔۵۰) گویا گدھے ہیں کہ بدک جاتے ہیں۔
میں مُسْتَنْفِرَةٌ: اگر کسرہ فاء کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی نَافِرَةٌ یعنی ڈر کر بھاگنے والا کے ہوں گے۔اور فتح فاء کے ساتھ ہو تو مُنْفَرَةٌ: کے ہم معنی ہوگا یعنی بھگایا ہوا۔
اَلنَّفْرُ وَالنَّفِیْرُ وَالنَّفْرَةُ: بھاگنے والے آدمیوں کا گروہ۔
اَلْمُنَافَرَةُ مفاخرۃ میں محاکمہ کرنا۔اسی سے اُنْفِرَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی مفاخرۃ میں غالب ہونے کا فیصلہ دیے گئے ہیں۔مشہور مقولہ ہے۔
نُفِّرَ فُلَانٌ (بزعم اہل جاہلیت) شیطان کو بھگانے کے لیے بچے کا کوئی نام رکھنا۔چنانچہ ایک اعرابی کا بیان ہے کہ میری پیدائش پر کسی نے میرے والد سے کہا: نَفِّرْ عَنْهُ کہ اس سے شیطان کو بھگاؤ۔تو والد نے میرا نام قُنْفُذٌ اور کنیت اَبُو الْعِدَا رکھ دی۔
نَفَرَ الْجِلْدُ: جلد میں ورم ہو جانا۔
ابو عبید کا قول ہے کہ یہ نِفَارُ الشَّیْءِ عَنِ الشَّیْءِ سے ہے جس کے معنی ایک چیز کے دوسری سے دور اور الگ ہونے کے ہیں۔

(ن ف س)

اَلنَّفْسُ کے معنی روح کے آتے ہیں۔چنانچہ فرمایا۔﴿اَخْرِجُوْا اَنْفُسَکُمْ﴾ (۶۱۔۹۳) کہ نکال لو اپنی جانیں۔﴿وَ اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِیْ

اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ﴾ (۲-۲۳۵) اور جان رکھو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خدا کو سب معلوم ہے۔ اور ذیل کی دونوں آیتوں۔

﴿تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ﴾ (۵-۱۱۶) اور جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے۔ اور جو تیرے ضمیر میں ہے میں اسے نہیں جانتا ہوں۔

﴿وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (۳-۳۰) اور خدا تم کو اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے۔

میں نفس بمعنی ذات ہے اور یہاں نَفْسَهٗ کی اضافت اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ مغایرۃ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوئی سے پاک ہے۔ بعض کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی طرف نفس کی اضافت اضافتِ ملک ہے۔ اور اس سے ہمارے نفوس امارہ مراد ہیں، جو ہر وقت برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔

اَلْمُنَافَسَةُ: کے معنی نفوس فاضلہ کے ساتھ اتصال اور تشبیہ حاصل کرنے کے لیے...... مجاہدہ نفسانی (نفس کشی) کے ہیں۔ بدوں اس کے کہ دوسروں کو اس سے ضرر پہنچے۔ قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ (۸۳-۲۶) تو (نعمتوں کے) شائقین کو چاہیے کہ اس سے رغبت کریں۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۵۷-۲۱) بندو! اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف لپکو۔

اَلنَّفَسُ کے معنی سانس کے ہیں۔ جو منہ اور ناک کے نتھنوں کے ذریعہ بدن کے اندر جاتا اور باہر نکلتا ہے۔ اور یہ روح کے لیے بمنزلہ غذا کے ہے۔ جس کے انقطاع سے روح زائل ہو جاتی ہے۔ اور نَفَسٌ کے معنی کشائش اور فراخی کے بھی آتے ہیں اور اسی سے ایک روایت میں ہے۔[1] (۱۳۰) ((اِنِّیْ لَا جِدُ نَفَسَ رَبِّكُمْ مِّنْ قِبَلِ الْیَمَنِ)) کہ میں یمن کی جانب سے کشائش اور فراخی یعنی نصرت الٰہی پاتا ہوں (انصار کا یمنی ہونا اس احساس کی تصدیق کے لیے کافی ہے) اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا[2] (۱۳۱) ((لَا تَسُبُّوْا الرِّیْحَ فَاِنَّهَا مِنْ نَّفَسِ الرَّحْمٰنِ)) ہوا کو برا بھلا مت کہو۔ بے شک یہ خدائے رحمٰن کے نفس سے ہے یعنی اس سے غم دور ہوتا ہے۔ اور دعا میں ہے [3] (۱۳۲) اَللّٰهُمَّ نَفِّسْ عَنِّیْ اے اللہ! میری تکلیف دور فرما۔ تَنَفَّسَتِ الرِّیْحُ: عمدہ ہوا چلنا۔ شاعر نے کہا ہے[4] (الطویل)

(۴۳۵) فَاِنَّ الصَّبَارِیْحٌ اِذَا مَا تَنَفَّسَتْ

---

[1] الحدیث فی الفائق وفی الطبرانی نفیر ربکم وبهذ اللفظ ذکره صاحب الکشاف وفی روایة نفس الرحمن انظر اللسان (نفس) والمشکل للقبتی والغزالی فی الاحیاء (۲۲۲/۳) قال العراقی فی تخریجه اشار به الی اویس القرنی ولم اجدله اصلا و فی مناقب اهل الیمن احادیث ۱۲۔

[2] قطعة من الحدیث اخرجه، الترمذی فی جامعه والبیهقی فی سننه۔

[3] قطعة من الدعا ابن السنی فی الیوم واللیله (تحفة الذاکرین۔

[4] قالته امرءة نجدیة فی ثلاثة ابیات ولشعرها قصة راجع القالی (۲: ۱۷۷) وفی محاضرات المؤلف (ر۰٤ ۵۵) انشده المجنون فی الریح المستطابة وقبله: احذبردها او تشف منی حرارة علی کبد لم یبق الّا رسومها والبیت فی اللسان (نسم) بغیر عزو۔

عَلٰی نَفْسٍ مَحْزُوْنٍ تَجَلَّتْ هُمُوْمُهَا

بے شک باد صبا ایسی ہوا ہے کہ اس کے چلنے سے مغموم دلوں کے تمام غم دور ہو جاتے ہیں۔اَلنِّـفَـاسُ کے معنی عورت کے بچہ جننے یا حالت زچگی میں ہونے کے ہیں۔ اور اس عورت کو جو حالت نفاس میں ہو نُـفَسَاءُ کہا جاتا ہے اس کی جمع نُفَاسٌ آتی ہے۔اور صَبِیٌّ مَنْفُوْسٌ کے معنی نوزائیدہ بچہ کے ہیں۔

تَـنَـفَّسَ النَّهَارُ: دن کا چڑھنا، دوپہر ہونا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ﴾ (۸۱۔۱۸) اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے۔

اور نَـفِسْتُ بِكَذَا کے معنی کسی چیز کو عزیز سمجھنے اور اس پر بخل کرنے کے ہیں۔اور اسی سے نَفِیْسٌ وَ مَنْفُوْسٌ بِهٖ اور مُنْفِسٌ ہے جس کے معنی قیمتی چیز کے ہیں۔

(ن ف ش)

اَلنَّفْشُ (ن) کے معنی اون دھنکنے اور پھیلانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (۱۰۲۔۵) جیسے دھنکی ہوئی ہوئی رنگ برنگ کی اون۔

نَفْشُ الْغَنَمِ: (رات کے وقت) بکریوں کا بغیر چرواہے کے (چرنے کے لیے) منتشر ہونا۔

اَلـنَّـفَـشُ: (بفتح الفاء اسم) وہ بکریاں جو رات کو بغیر چرواہے کے چرنے کے لیے منتشر ہو گئی ہوں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ﴾ (۲۱۔۷۸) جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں۔

اِلْاِبِلُ النَّـوَافِـشُ: رات کو بغیر چرواہے کے چرنے والے اونٹ۔

(ن ف ع)

اَلنَّفْعُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے خیرات تک رسائی کے لیے استعانت حاصل کی جائے۔یا وسیلہ بنایا جائے پس نفع خیر کا نام ہے۔اور اس کی ضد ضَـــرٌّ ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ (۲۵۔۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں۔

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا﴾ (۷۔۱۸۸) کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔

﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ﴾ (۶۰۔۳) نہ تمہارے رشتے ناتے کام آئیں گے اور نہ اولاد۔﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ﴾ (۳۴۔۲۳) اور خدا کے ہاں (کسی کے لیے) سفارش فائدہ نہیں دے گی۔

﴿وَلَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْ﴾ (۱۱۔۳۴) تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔وَغَیْـــرِ ذالك من الایَاتِ یعنی اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔

(ن ف ق)

نَـفَقَ (ن۔س) اَلشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے ختم ہونے یا چلے جانے کے ہیں۔اور چلے جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔(۱) خوب فروخت ہونے سے جیسے نَـفَـقَ الْبَیْعُ: (سامان) خوب فروخت ہونا۔اسی سے نَـفَـاقُ الْاَیِّـمِ ہے جس کے معنی بیوہ عورت سے نکاح کے طلب گاروں کا بکثرت ہونا کے ہیں۔

نفق الْقَوْمُ: بازار کا پر رونق ہونا۔

(۲) بذریعہ مرجانے کے، جیسے نَفَقَتِ الدَّآبَّةُ نُفُوْقًا: جانور کا مرجانا۔

(۳) بذریعہ فنا ہوجانے کے جیسے نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ: دراہم خرچ ہوگئے۔ اَنْفَقْتُهَا: ان کو خرچ کردیا۔

اَلْاِنْفَاقُ کے معنی مال وغیرہ صرف کرنا کے ہیں۔ اور یہ کبھی واجب ہوتا ہے۔ اور کبھی مستحب اور مال اور غیر مال یعنی علم وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا۔

﴿اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۹۴) اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرو۔

﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنَاکُمْ﴾ (۶۳۔۱۰) اور جو (مال) ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے ..... خرچ کرلو۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ﴾ (۳۔۹۲) مومنو! جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (راہ خدا میں) صرف نہ کروگے کبھی نیکی حاصل نہیں کرسکو گے۔ اور جو چیز تم صرف کرتے ہو۔ خدا اس کو جانتا ہے۔

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ﴾ (۳۴۔۳۹) اور تم جو چیز خرچ کروگے۔ وہ اس کا (تمہیں) عوض دے گا۔

﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ﴾ (۵۷۔۱۰) جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا۔ وہ ..... برابر نہیں۔

علیٰ ہذا القیاس اس قسم کی بہت سی آیات ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِکُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْ اِذًا لَّاَمْسَکْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ﴾ (۱۷۔۱۰۰) کہو اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ ہوجانے کے خوف سے ان کو بند کر رکھتے۔

میں خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ کے معنی مفلس ہونے کا خوف کے ہیں اور یہ اَنْفَقَ فُلَانٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی مال کے خرچ ہوجانے کے بعد قلاش ہوجانے کے ہیں۔ یہاں اِنْفَاقَ بمعنی اِمْلَاق ہے۔ جیسے فرمایا:۔ ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ﴾ (۱۷۔۳۱) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔

نَفَقَةٌ (اسم) جو چیز خرچ کی جائے۔ فرمایا:۔

﴿وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ﴾ (۲۔۲۷۰) اور تم خدا کی راہ میں جس طرح کا خرچ کرو۔

﴿وَ لَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً﴾ (۹۔۱۲۱) اور (اسی طرح) وہ جو خرچ کرتے ہیں۔

اَلنَّفَقُ: آر پار ہونے والا کوچہ یا سرنگ جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ فرمایا:۔

﴿فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۶۔۳۵) اور اگر طاقت، ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈھ نکالو۔

اور اسی سے نَافِقَاءُ الْیَرْبُوْعِ ہے یعنی جنگلی چوہے کا بل جس کے دو دھانے ہوں۔ نَافَقَ الْیَرْبُوْعُ وَنَفَقَ: جنگلی چوہیا اپنے بل کے دہانے سے داخل ہوکر دوسرے سے نکل گئی اور اسی سے نِفَاقٌ ہے۔ جس کے معنی شریعت میں دورخی اختیار کرنے (یعنی شریعت میں ایک دروازے سے داخل ہوکر دوسرے سے نکل جانا) کے ہیں چنانچہ اسی معنی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ ﴿اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (۴۔۱۴۵) کچھ شک

نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے۔

نَيْفَقُ السَّرَاوِيْلَ: پاجامے کا نیفہ۔

(ن ف ل)

اَلنَّفْلُ: بعض کے نزدیک نفل اور غنیمت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ان میں صرف اعتباری فرق ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ فتح کے بعد چھینا ہوا مال ہوتا ہے، اسے غنیمت کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا غیر لازم ہونے کے لحاظ سے نفل کہلاتا ہے۔

بعض کے نزدیک ان میں نسبت عموم وخصوص مطلق ہے۔ یعنی غنیمت عام ہے اور ہر اس مال کو کہتے ہیں۔ جو لوٹ سے حاصل ہو خواہ مشقت سے ہو یا بلا مشقت کے، فتح سے قبل حاصل ہو یا بعد میں استحقاق سے حاصل ہو یا بغیر استحقاق کے اور نفل خاص کر اس مال کو کہتے ہیں۔ جو غنیمت سے قبل از تقسیم حاصل ہوا ہو۔

بعض کے نزدیک نَفَلٌ وہ مال ہے جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے اور اسے فے بھی کہتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے جو سامان وغیرہ تقسیم غنائم کے بعد بانٹا جاتا ہے۔ اسے نفل کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ﴾ الْاٰية (۸۔۱) (اے محمد ﷺ! مجاہد لوگ) آپ سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ (کہ کیا حکم ہے) اصل میں اَنْفَالٌ نَفْلٌ سے ہے جس کے معنی واجب پر زیادتی کے ہیں اور اسے نَافِلَةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (۱۷۔۷۹) اور بعض حصہ شب میں بیدار ہوا کرو۔ اور تہجد کی نماز پڑھا کرو۔ (یہ شب خیزی) تمہارے لیے (سبب زیادت ثواب اور نماز تہجد تم پر) نفل ہے اور آیت کریمہ:۔

﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً﴾ (۲۱۔۷۲) اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام عطا کیے اور مستزاد و برآن یعقوب علیہ السلام۔

میں نَافِلَةً بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اولاد کی اولاد ہے۔ محاورہ ہے۔

نَفَلْتُهٗ كَذَا: میں نے اسے بطور نفل کے دیا۔

نَفَلَهُ السُّلْطَانُ: بادشاہ نے اسے تبرع کے طور پر قتیل کا سامان دے دیا۔ اَلنَّوْفَلُ: عطائے کثیر۔ اِنْتَفَلْتُ مِنْ كَذَا: میں نے اس سے چن لیا اِنْتَقَيْتُ مِنْهُ۔

(ن ق ب)

اَلنَّقْبُ کے معنی دیوار یا چمڑے میں سوراخ کرنے کے ہیں اور ثَقْبٌ کے معنی لکڑی میں سوراخ کرنے کے...... محاورہ ہے۔ نَقَبَ الْبَيْطَارُ سُرَّةَ الدَّابَّةِ: بیطار نے جانور کی ناف میں مِنْقَبٌ (نشتر) کے ساتھ سوراخ کر دیا۔

مَنْقَبٌ: سوراخ کرنے کی جگہ۔

نَقَبَ الْحَائِطُ: دیوار میں نقب لگائی گئی۔

نَقَّبَ الْقَوْمُ: قوم کا چلنا پھرنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ﴾ (۵۰۔۳۶) وہ شہروں میں گشت کرنے لگے کیا کہیں بھاگنے کی جگہ ہے، كَلْبٌ نَقِيْبٌ: کتا جس کے گلے میں آواز کمزور کرنے کے لیے سوراخ کر دیا گیا ہو۔

اَلنُّقْبَةُ: ابتدائی خارش۔ ج۔ نُقَبٌ

اَلنَّاقِبَةُ: ناسور۔ زخم جو کئی روز تک ایک پہلو پر لیٹے رہنے

کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔
اَلنُّقْبَةُ: ازار کی مثل ایک قسم کا کپڑا۔ جس میں سوراخ ہونے کی وجہ سے تکہ لگایا جاتا ہے۔
اَلْمَنْقَبَةُ: اصل میں پہاڑ کی درہ کے کہتے ہیں۔ اور بطور استعارہ شریفانہ کارنامہ کو مَنْقَبَۃٌ کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لیے کہ اس کا اچھا اثر باقی رہ جاتا ہے۔ اور یا اس لیے کہ وہ بھی اسی کی رفعت کے لیے بمنزلہ منہاج کے ہے۔
اَلنَّقِیْبُ: کسی قوم کے حالات جاننے والا۔
ج نُقَبَاءُ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا﴾ (۵۔۱۲) اور ان میں ہم نے بارہ سردار مقرر کیے۔

(ن ق ذ)

اَلْاِنْقَاذُ: کسی خطرہ یا ہلاکت سے خلاصی دینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْهَا﴾ (۳۔۱۰۲) اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔ اَلنَّقِذُ: بمعنی چھڑایا ہوا۔ فَرَسٌ نَقِیْذٌ: دشمن کے ہاتھ سے چھینا ہوا گھوڑا گویا وہ ان سے بچایا گیا ہے ج نَقَائِذُ:

(ن ق ر)

اَلنَّقْرُ: (ن) کسی چیز کو کھٹکھٹانا حتیٰ کہ اس میں سوراخ ہو جائے۔
اَلْمِنْقَارُ: کھٹکھٹانے کا آلہ جیسے پرند کی چونچ یا چکی کو کندہ کرنے کے اوزار وغیرہ۔
نَقَرْتُ عَنِ الْاَمْرِ: کسی معاملہ کی چھان بین کرنا۔
نَقَرْتُهٗ: بطور استعارہ بمعنی غیبت کرنا۔ جیسا کہ ایک عورت نے اپنے خاوند سے کہا۔ مُرَّبِیْ عَلٰی بَنِیْ نَظَرٍ وَّلَا تَمُرَّبِیْ عَلٰی بَنَاتِ نَقْرٍ۔ کہ مجھے مردوں کے پاس لے کر گزرنا جو نظر ڈالتے ہیں۔ اور عورتوں کے پاس سے لے کر نہ گزرنا جو عیب لگاتی اور غیبت کرتی ہیں۔
اَلنُّقْرَةُ: (۱) گڑھا جس میں سیلان کا پانی باقی رہ جاتا ہے۔ (۲) گردن کے پچھلے حصے کے گڑھے کو نُقْرَةُ الْقَفَا کہا جاتا ہے۔
اَلنَّقِیْرُ: کھجور کی گٹھلی کے گڑھے کو کہتے ہیں۔ اور یہ حقیر چیز کے لیے ضرب المثل ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَ لَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا﴾ (۴۔۱۲۴) اور تل برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔
اور اَلنَّقِیْرُ اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس میں گڑھا کر کے اس میں نبیذ ڈالتے ہیں کہا جاتا ہے هُوَ کَرِیْمُ النَّقِیْرِ: فلاں شریف الاصل ہے یعنی بعد از تفتیش۔
اَلنَّاقُوْرُ کے معنی صور یعنی بگل کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ﴾ (۷۴۔۸) جب صور پھونکا جائے گا۔
نَقَرْتُ الرَّجُلَ: زبان کو تالو سے لگا کر آواز نکال کر کسی آدمی کو بلانا۔
نَقَرْتُ الرَّجُلَ: کسی شخص کو جماعت سے خاص کر علیحدہ بلانا گویا زبان کے ذریعہ آواز نکال کر خاص کر اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس طور سے بلانے کو نَقْرٰی کہا جاتا ہے۔ (دَعَوْتُهُمُ النَّقْرٰی: میں نے خاص طور پر انہیں بلایا۔

(ن ق ص)

اَلنَّقْصُ: (اسم) حق تلفی اور یہ نَقَصْتُهٗ:(ن)

فَھُوَ مَنْقُوْصٌ کا مصدر بھی ہے جس کے معنی گھٹانے اور حق تلفی کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ﴾ (۲۔۱۵۵) اور جانوں اور مالوں...... کے نقصان سے۔ ﴿وَاِنَّا لَمُوَفُّوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ﴾ (۱۱۔۱۹) اور ہم ان کو ان کا حصہ پورا پورا بلا کم وکاست دینے والے ہیں۔
﴿ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْکُمْ شَیْئًا﴾ (۹۔۴) اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور نہ کیا۔

(ن ق ض)

اَلنَّقْضُ: یہ ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنی کسی چیز کا شیرازہ بکھیرنے کے ہیں جیسے نَقَضْتُ الْبِنَاءَ: عمارت کو ڈھانا۔ اَلْحَبْلَ: رسی کے بل اتارنا۔ اَلْعَقْدَ: گرہ کھولنا۔
اَلنِّقْضُ وَالنَّقْضُ: یہ دونوں بمعنی منقوض آتے ہیں۔لیکن بکسر النون زیادہ تر عمارت کے لیے آتا ہے۔اور بفتح النون کا عام استعمال اشعار کے متعلق ہوتا ہے۔اسی سے دبلے اونٹ اور زمین کی پرت کو جو کھمبی وغیرہ کے نکلنے سے پھٹ جاتی ہے،نِقْضٌ کہا جاتا ہے۔پھر نَقْضُ الْحَبْلِ وَالْعَقْدِ سے استعارہ کے طور پر عہد شکنی کے لیے بھی نقض کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَھُمْ﴾ (۸۔۵۶) ہر بار اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔
﴿اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ﴾ (۲۔۲۷) جو خدا کے اقرار کو......توڑ دیتے ہیں۔
﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا﴾ (۱۶۔۹۱) اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو نہ توڑو۔
اور اسی طرح کلام وشعر میں مُنَاقَضَۃٌ ہے جیسا کہ جریر اور فرزدق کے نقائض شعریہ مشہور ہیں۔اَلتَّنَاقُضُ: وہ قضیے جن میں سے ایک کا صدق دوسرے کے کذب کو مستلزم ہو جیسے ایک ہی چیز کے متعلق ایک ہی حالت میں ھُوَ کَذَا وَلَیْسَ بِکَذَا کا حکم لگانا۔
اِنْتَقَضَ: (افتعال) اِنْتِقَاضًا کے معنی عمارت مسمار ہونے یا رسی کھل جانا کے ہیں۔اور اسی سے اِنْتَقَضَتِ الْقَرْحَۃُ ہے یعنی زخم کا اچھا ہونے کے بعد خراب ہو جانا۔
اِنْقَضَتِ الدَّجَاجَۃُ: مرغی کا انڈا دیتے وقت کڑکڑانا۔
اَلْاِنْتِقَاضُ کے اصل معنی آواز کے نہیں ہیں۔بلکہ کسی چیز کے اس طرح ٹوٹنے کے ہیں۔کہ اس سے آواز پیدا ہو۔ پھر اس کا اطلاق آواز پر ہونے لگا ہے۔اور آیت کریمہ:۔
﴿اَلَّذِیْ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ﴾ (۹۴۔۳) جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔
میں اَنْقَضَ کے معنی کمر کو اس طرح توڑنا کے ہیں کہ اس سے کڑکڑانے کی آواز سنائی دے۔
اَلْاِنْقَاضُ: بیٹھے ہوئے جانور کو للکارنے کی آواز۔شاعر نے کہا ہے [1] (الرجز)

(۴۳۶) اَعْلَمْتُھَا الْاِنْقَاضَ بَعْدَ الْقَرْقَرَۃِ

یعنی میں نے اسے انقاض کے بعد قرقرہ کی آواز سنائی۔

---

[1] وفی اللسان (نقض شھبرہ) قالہ شظاظ اللص الغبی وقبلہ: "رب عجوز من نمیر شھبرۃ" وفی اللسان (قرقر) علمتھا بدل اعلمتھا وفی الاشتقاق لبن درید (٥٤٤) اناس بدل نمیر راجع للبیت ومعناہ ایضا المعانی الکبیر للقیتی قال الانقاض والقرقرۃ صوتان من اصوات الابل ومعنی البیت انھا کانت لھا بعیر مسن یقرقر قَرْکَبَۃٌ وذھب بہ وترک لھا بکرا تنقض بہ وفی الاشتقاق خلاف ذالک۔

نَقِيضُ الْمَفَاصِلِ: جوڑوں کے کڑکڑانے کی آواز۔

(ن ق م)

نَقِمْتُ الشَّیْءَ وَنَقَمْتُهٗ: کسی چیز کو برا سمجھنا۔ یہ کبھی زبان کے ساتھ عیب لگانے اور کبھی عقوبت (سزا دینے) پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ﴾ (۸۵۔۸) ان کو مومنوں کی یہی بات بری لگتی تھی۔کہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

﴿وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۹۔۷۴) اور انہوں نے (مسلمانوں میں) عیب ہی کونسا دیکھا ہے سوا اس کے کہ خدا نے اپنے فضل سے ...... ان کو دولت مند کر دیا۔

﴿هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ﴾ الآیۃ (۵۔۵۹) تم ہم میں برائی ہی کیا دیکھتے ہو۔

اور اسی سے نَقْمَةٌ بمعنی عذاب ہے قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ﴾ (۷۔۱۳۶) تو ہم نے ان سے بدلہ لے کر ہی چھوڑا۔کہ ان کو دریا میں غرق کر دیا۔

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا﴾ (۳۰۔۴۷) سو جو لوگ نافرمانی کرتے تھے ہم نے ان سے بدلہ لے کر چھوڑا۔

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ﴾ (۴۳۔۲۸) تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ سو دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

(ن ک ب)

نَكَبَ عَنْ كَذَا: کسی چیز سے پھر جانا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ﴾ (۲۳۔۷۴) وہ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

اَلْمَنْكِبُ: کندھا۔ج: مَنَاكِبُ۔ اور اسی سے بطور استعارہ زمین کے راستوں پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا﴾ (۶۷۔۱۵) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور یہ زمین کے لیے بطور استعارہ ایسے ہی استعمال ہوا جیسا کہ آیت کریمہ:۔

﴿مَا تَرَكَ عَلٰی ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (۳۵۔۴۵) تو روئے زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔ میں ظَهْرِ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مَنْكِبُ الْقَوْمِ: قوم کا کندھا یعنی رئیس جیسا کہ رأس بمعنی رئیس اور یَدٌ بمعنی نَاصِرٌ آ جاتا ہے۔ لِفُلَانٍ النِّكَابَةُ فِیْ قَوْمِهٖ: فلاں کے پاس قوم کی ریاست ہے۔

اَلْاَنْكَبُ (۱) ٹیڑھے شانے والا (۲) اونٹ جو ایک جانب جھک کر چلے۔

اَلنَّكَبُ: ایک قسم کی بیماری جو شانے میں ہوتی ہے (ترکی میں اسے قو لاغو کہا جاتا ہے)۔

اَلنَّكْبَاءُ: اپنی سمت سے پھر کر چلنے والی ہوا۔

نَكَبَتْهُ حَوَادِثُ الدَّهْرِ: مصیبت پہنچانا۔

(ن ک ث)

اَلنَّكْثُ: کے معنی کمبل یا سوت ادھیڑنے کے ہیں۔اور یہ قریب قریب نَقْضٌ کے ہم معنی ہے۔اور بطور استعارہ عہد شکنی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہیں:۔
﴿وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ﴾ (۹۔۱۲) اور اگر اپنی قسمیں توڑ ڈالیں۔
﴿اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ﴾ (۷۔۱۳۵) تو وہ عہد توڑ ڈالتے ہیں۔
اَلنِّكْثُ وَالنَّكِيْثَةُ ...... مِثْلُ النِّقْضِ وَالنَّقِيْضَةِ)
اور نَكِيْثَةٌ ہر اس مشکل معاملہ کو کہتے ہیں جس میں لوگ عہد و پیمان توڑ ڈالیں۔ شاعر نے کہا❶ (الطویل)
(۴۳۷) مَتٰى يَكُ اَمْرٌ لِلنَّكِيْثَةِ اَشْهَدِ
جب کوئی معاملہ عہد شکنی کی حد تک پہنچ جائے تو میں حاضر ہوتا ہوں۔

(ن ک ح)

اصل میں نکاح بمعنی عقد آتا ہے۔ اور بطور استعارہ جماع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ اصل میں بمعنی جماع ہو اور پھر عقد میں بطور استعارہ ہوا ہو۔ کیوں کہ عربی زبان میں جماع کے معنی میں تمام الفاظ کنائی ہیں۔ کیونکہ نفس فعل کی طرح صراحتاً اس کا تذکرہ بھی مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ جو زبان ذکر فحش سے اس قدر گریزاں ہو وہ ایک مستحسن امر کے لیے قبیح لفظ استعمال کرے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ (۲۴۔۳۲) اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو۔
﴿اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (۳۳۔۴۹) جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے۔
﴿فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ﴾ (۴۔۲۵) تو ان لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو۔
علیٰ ہذا القیاس متعدد آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

(ن ک د)

اَلنَّكَدُ: ہر وہ چیز جو صعوبت سے حاصل ہو۔ اسی سے سخت خو کو جو سائل کو بمشکل کچھ دینے پر راضی ہو۔ نَكَدٌ وَنَكِدٌ کہا جاتا ہے۔ اور کم دودھ والی اونٹنی کو جو بمشکل دوہی جاسکے، نَاقَةٌ نَكْدَاءُ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا﴾ (۷۔۸۵) اور جو خراب ہے اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے۔ ناقص ہوتا ہے۔

(ن ک ر)

اَلْاِنْكَارُ: ضد عرفان اور اَنْكَرْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کی عدم معرفت کے ہیں اس کے اصل معنی انسان کے دل پر کسی ایسی چیز کے وارد ہونے کے ہیں جسے وہ تصور میں نہ لاسکتا ہو۔ لہٰذا یہ ایک درجہ کی جہالت ہی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ﴾ (۱۱۔۷۰) جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں جاتے (یعنی وہ کھانا نہیں کھاتے) تو ان کو اجنبی سمجھ کر دل میں خوف کیا۔
﴿فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ﴾

---

❶ قاله طرفة اوله و قربت بالقربى وجدك انه وفى اللسان (نكث) عقد بدل امر والبيت فى العقد الثمين ۵۸ وفى روايته عهد بدل امر۔

(۱۲۔۵۸) تو یوسفؑ کے پاس گئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا۔اور وہ اس کو نہ پہچان سکے۔

اور کبھی یہ دل سے انکار کرنے پر بولا جاتا ہے۔اور انکار لسانی کا اصل سبب گو انکار قلب ہی ہوتا ہے۔لیکن بعض اوقات انسان ایسی چیز کا بھی انکار کر دیتا ہے جسے دل میں ٹھیک سمجھتا ہے۔ایسے انکار کو کذب کہتے ہیں۔جیسے فرمایا۔

﴿یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا﴾ (۱۰۱۔۸۳) یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں۔مگر واقف ہو کر ان سے انکار کرتے ہیں۔

﴿فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ﴾ (۲۳۔۶۹) اس وجہ سے ان کو نہیں مانتے۔

﴿فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ﴾ (۴۰۔۸۱) تو خدا کی کن کن نشانیوں کو نہ مانو گے۔

اور اَلْمُنْكَرُ ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقول سلیمہ قبیح خیال کریں یا عقل کو اس کے حسن و قبح میں توقف ہو۔مگر شریعت نے اس کے قبیح ہونے کا حکم دیا ہو۔ چنانچہ آیات:۔

﴿الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۹۔۱۱۲) نیک کاموں کا امر کرنے والے اور بری باتوں سے منع کرنے والے۔

﴿كَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ﴾ (۵۔۷۹) اور برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے۔ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔

﴿وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۳۔۱۱۴) اور بری باتوں سے منع کرتے۔

﴿وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ﴾ (۲۹۔۲۹) اور اپنی مجلسوں میں ناپسندیدہ کام کرتے ہو۔

تَنْكِیْرُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو بے پہچان کر دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا﴾ (۲۰۔۴) اس کے تخت کی صورت بدل دو۔

اور اس کے بالمقابل تعریف کے معنی کسی چیز کو معروف بنانے کے ہیں۔اور علمائے نحو کے نزدیک کسی اسم کو مخصوص صیغہ پر بنانے کے ہوتے ہیں۔نَكَرْتُ عَلٰی فُلَانٍ وَاَنْكَرْتُ: کسی کو عملاً کسی کام سے روک دینا۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ﴾ (۲۲۔۴۴) میرا عذاب کیسا سخت تھا۔

اَلنُّكْرُ: مکاری یا مشکل امر جو سمجھ میں نہ آسکے۔اور نَكُرَ نِكَارَةٌ: کسی معاملہ کا دشوار ہونا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّكُرٍ﴾ (۵۴۔۶) جس دن بلانے والا ان کو ایک ناخوش چیز کی طرف بلائے گا۔

اور حدیث میں ہے۔❶ (۱۳۲) ((اِذَا وُضِعَ الْمَیِّتُ فِی الْقَبْرِ اَتَاهُ مَلَكَانِ مُنْكَرٌ وَّنَكِیْرٌ)) کہ جب میت قبر میں اتار دی جاتی ہے۔تو اس کے پاس مُنْكَر وَنَكِیْر دو فرشتے آتے ہیں۔اور استعارۃ مُنَاكَرَةٌ بمعنی مُحَارَبَةٌ استعمال ہوتا ہے۔

(ن ک س)

اَلنَّكْسُ: (ن) کے معنی کسی چیز کو الٹا کر دینے کے ہیں اور اسی سے نُكِسَ الْوَلَدُ ہے......یعنی ولادت

❶ رواه النسائی (۱/۲۳٤) واصحاب السنن

کے وقت بچے کا پاؤں کا سر سے پہلے باہر نکلنا۔

﴿ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ﴾ (۲۱۔۶۵) پھر شرمندہ ہو کر سر نیچا کرلیا۔

اَلنَّكَسُ: صحت یابی کے بعد مرض کا عود کر آنا۔ اور نَكْسٌ فِي الْعُمُرِ کے متعلق فرمایا:۔

﴿وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ (۳۶۔۶۸) اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں۔ اسے خلقت میں اوندھا کردیتے ہیں۔

جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۱۶۔۷۰) اور تم میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ نہایت خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں۔

اور ایک قراءت میں نُنْكِسْهُ ہے۔

اخفش کا قول ہے کہ نُنَكِّسْهُ (بتشدید الکاف) کے معنی کسی چیز کو سرنگوں کردینے کے ہوتے ہیں۔ اور نِكْسٌ اس تیر کو کہتے ہیں جس کا فوق ٹوٹ گیا ہو اور اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے لگا دیا گیا ہو۔ ایسا تیر چونکہ ردی ہو جاتا ہے۔ اس لیے تشبیہ کے طور پر کمینے آدمی کو بھی نِكْسٌ کہا جاتا ہے۔

(ن ک ص)

اَلنُّكُوْصُ: (ن ص) کسی چیز سے پیچھے ہٹنا۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (۸۔۴۸) تو پسپا ہو کر چل دیا۔

(ن ک ف)

نَكَفْتُ مِنْ كَذَا وَاسْتَنْكَفْتُ مِنْهُ کے معنی کسی چیز کو اپنے لیے باعث عار سمجھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ﴾ (۴۔۱۷۲) مسیح علیہ السلام اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ خدا کے بندے ہوں۔

﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا﴾ (۴۔۱۷۳) اور جنہوں نے (بندہ ہونے سے) عار وانکار اور تکبر کیا۔

اصل میں یہ نَكَفْتُ الشَّيْءَ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو دور ہٹا دینے کے ہیں اور اسی سے نَكْفٌ ہے یعنی رخسار سے ہاتھ کے ساتھ آنسو پونچھنا اور بَحْرٌ لَّا يُنْكَفُ بے پایاں سمندر کو کہتے ہیں۔

اَلِانْتِكَافُ: ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلا جانا۔

(ن ک ل)

نَكَلَ عَنِ الشَّيْءِ: کسی کام سے کمزور اور عاجز ہو جانا۔

نَكَّلْتُهٗ: کسی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینا۔ اور نِكْلٌ جانور کی بیڑی اور لگام کے لوہے کو کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بھی چلنے سے مانع ہوتے ہیں۔ اس کی جمع اَنْكَالٌ ہے۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا﴾ (۷۳۔۱۲) کچھ شک نہیں کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی آگ ہے۔

نَكَّلْتُهٗ: کسی کو عبرت ناک سزا دینا۔ اس سے اسم نَكَالٌ ہے جس کے معنی عبرت ناک سزا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ (۲۔۶۶) اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لیے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ عبرت بنا دیا۔ ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۵۔۳۸) ان کے فعلوں

کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے۔

اور حدیث میں ہے۔❶ (۱۳۳) ((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ النَّکَلَ عَلَی النَّکَلِ)) کہ قوی آدمی جو طاقت ور گھوڑے پر سوار ہو اللہ تعالیٰ کو پیارا لگتا ہے۔

(ن م م)

اَلنَّمُّ (ن) کے معنی چغلی کھانے کے ہیں۔ اور چغلخوری کو نَمِیْمَۃٌ کہا جاتا ہے۔ نَمَّامٌ: چغل خور۔ قرآن پاک میں ہے۔

ھَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِیْمٍ: طعن آمیز اشارتیں کرنے والا۔ چغلیاں لئے پھرنے والا (۶۸۔۱۱)

اصل میں نَمِیْمَۃٌ کے معنی ھَمْسٌ (پاؤں کی آہٹ) اور حرکت خفیفہ کے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:۔ اَسْکَتَ اللّٰہُ نَأْمَتَہٗ: خدا اس کی حرکت کو بند کر دے یعنی وہ مر جائے۔

اَلنَّمَّامُ: گھاس جس کی خوشبو اس کے وجود پر دلالت کرے۔

اَلنَّمْنَمَۃُ: قریب قریب خطوط گویا کتابت میں قلت حرکت پر دال ہیں۔

(ن م ل)

نَمْلَۃٌ: چیونٹی (ج۔ نمل) قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿قَالَتْ نَمْلَۃٌ یّٰاَیُّھَا النَّمْلُ﴾ (۲۷۔۱۸) تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو!

طَعَامٌ مَّنْمُوْلٌ: طعام جس میں چیونٹیاں پڑ گئی ہوں۔

نَمْلَۃٌ: (۱) ایک قسم کا پھوڑا۔ جو پہلو میں نکلتا ہے۔ اور اس کی شکل چیونٹی جیسی ہوتی ہے۔ (۲) جانور کے کھر کا شگاف۔

اور اسی سے فَرَسٌ نَّمِلُ الْقَوَائِمِ کا محاورہ ہے یعنی سبک پاؤں والا گھوڑا جو ایک جگہ پر سکون سے کھڑا نہ ہو اور مجازاً اَلنَّمْلُ بمعنی نَمِیْمَۃٌ بھی آتا ہے۔ اور یہ معنی چیونٹی کی چال سے ماخوذ ہے۔ ھُوَ نَمِلٌ وَذُوْنَمْلَۃٍ وَ نَمَّالٌ کے معنی چغل خور کے ہیں۔

تَنَمَّلَ الْقَوْمُ: مال جمع کرنے کے لیے چیونٹیوں کی طرح پھیل گئے۔ اسی سے ھُوَ اَجْمَعُ مِنْ نِمْلَۃٍ کا محاورہ ہے۔ یعنی وہ چیونٹی سے بھی زیادہ ذخیرہ اندوز ہے۔

اَلْاَنْمِلَۃُ: انگلیوں کے اطراف۔ ج۔ انامل

(ن ھ ج)

اَلنَّھْجُ کے معنی کھلے راستہ کے ہیں۔ اور نَھَجَ الْاَمْرُ وَاَنْھَجَ کے معنی ہیں: کسی امر کا واضح ہونا۔

اَلْمَنْھَجُ وَالْمِنْھَاجُ: کشادہ راہ۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّ مِنْھَاجًا﴾ (۵۔۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک فرقے کے لیے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔

اور اسی سے نَھَجَ الثَّوْبُ وَاَنْھَجَ ہے۔ جس کے معنی کپڑے میں بوسیدگی کے آثار ظاہر ہونے کے ہیں۔

اَنْھَجَہُ الْبِلٰی: کپڑے کو بوسیدگی نے جھرجھرا کر دیا۔

(ن ھ ر)

اَلنَّھْرُ: بافراط پانی بہنے کے مجری کو کہتے ہیں۔ کی جمع اَنْھَارٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ فَجَّرْنَا خِلٰلَھُمَا نَھَرًا﴾ (۱۸۔۳۳) اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔ ﴿وَ اَلْقٰی فِی

❶ الحدیث فی الفائق (۲/۳۹۱)۔

الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَبِکُمْ وَ اَنْھٰرًا وَّ سُبُلًا﴾ (۱۶۔۱۵) اور اس نے زمین پر پہاڑ بنا کر رکھ دیے کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے اور نہریں اور رستے بنا دیے۔ اور جنت میں لوگوں پر جو فیض اور فضل الٰہی جاری ہوگا اسے بھی بطور مثال کے اَنْھَارٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ﴾ (۵۴۔۵۴) جو پرہیز گار ہیں وہ باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔

﴿وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْھٰرًا﴾ (۷۱۔۱۲) اور تمہیں باغ عطا کرے گا۔ اور (ان میں) تمہارے لیے نہریں بہا دے گا۔

﴿جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ (۲۔۲۵) (نعمت کے) باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

اَلنَّھْرُ کے معنی وسعت اور فراخی کے بھی آتے ہیں۔ (تَشْبِیْھًا بِنَھْرِ الْمَاءِ) اور اسی سے اَنْھَرْتُ الْمَآءَ (پانی بہانا) ہے۔

اور اَنْھَرَ الْمَآءُ کے معنی پانی کے جاری ہونے کے ہیں۔

نَھْرٌ وَ نَھِرٌ نہر جس میں پانی فراوانی سے بہہ رہا ہو۔

ابوذویب نے کہا ہے [1]

(۴۳۸) اَقَامَتْ بِهٖ فَابْتَنَتْ خَیْمَةً
عَلٰی قَصَبٍ وَفُرَاتٍ نَھِرٍ

اَلنَّھَارُ: (ن) شرعاً طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب کے وقت کو نَھَارٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن لغوی لحاظ سے اس کی حد طلوع شمس سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَةً﴾ (۲۵۔۶۲) اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔

﴿اَتٰھَآ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْنَھَارًا﴾ (۱۰۔۲۴) ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم عذاب آ پہنچا۔

اور کبھی بَیَاتٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ﴿اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَھَارًا﴾ (۱۰۔۵۰) تو اگر اس کا عذاب تم پر ناگہاں آ جائے رات کو یا دن کو۔

رَجُلٌ نَھِرٌ: دن کو لوٹ مارنے والا۔

اَلنَّھَارُ: حباری کا بچہ۔

اَلْمَنْھَرَةُ: آبادی کے درمیان کھلی جگہ کو کہتے ہیں جیسے وہ جگہ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔

اَلنَّھْرُ وَالْاِنْتِھَارُ: سختی سے جھڑکنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْھَرْ ھُمَا﴾ (۱۷۔۲۳) تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا۔

﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ﴾ (۹۳۔۱۰) اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

(ن ھ ی)

اَلنَّھْیُ: کسی چیز سے منع کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی﴾ (۹۶۔۹،۱۰) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے (یعنی) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے۔

معنوی لحاظ سے نہی بالقول اور بالفعل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور نہی بالقول عام ہے کہ صیغہ اِفْعَلْ کے ذریعہ ہو جیسے اِجْتَنِبْ کَذَا (اس سے دور رہو) یا صیغہ لَا تَفْعَلْ

[1] البیت فی دیوانه۔ ۱۲

کے ذریعہ ہو۔لیکن لفظی لحاظ سے صرف "لَا تَفْعَلْ" کو نہیں ہے۔پس صیغہ لَا تَفْعَلْ لفظاً و معنیً دونوں لحاظ سے نَھْیٌ ہوگا۔جیسے فرمایا:۔

﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (۲۔۳۵) لیکن اس درخت کے...... پاس نہ جانا۔

اسی بنا پر شیطان نے کہا تھا۔

﴿مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ﴾ (۷۔۲۰) کہ تم کو تمہارے پروردگار نے اس درخت سے صرف اس لیے منع کیا ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ (۷۹۔۴۰) اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا۔

میں نَھْیٌ سے نفس کو شہوات سے روکنا اور ان کے قصد سے دفع کرنا مراد ہے نہ کہ زبان سے صرف لَا تَفْعَلْ کہہ دینا۔اسی طرح نَھْی عَنِ الْمُنْکَرِ بھی عام ہے۔جو کہ ہاتھ اور زبان کے ساتھ روکنے اور دل سے برا سمجھنے کو شامل ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا﴾ (۱۱۔۶۲) کیا تم ہم کو ان چیزوں کے پوجنے سے منع کرتے ہو جن کو ہمارے بزرگ پوجتے آئے ہیں؟ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ﴾ (۱۶۔۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے منع کرتا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کے امر و نہی سے امر خیر کی ترغیب دینا اور شر سے روکنا مراد ہے۔اور یہ ممانعت بعض امور سے عقل کے ذریعہ کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے۔اور بعض کاموں سے بذریعہ شریعت کے منع فرما دیا ہے جو ہمارے لیے مقرر فرمائی ہے۔

اَلْاِنْتِهَاءُ: کسی ممنوع کام سے رک جانا قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (۸۔۳۸) (اے پیغمبر) کفار سے کہہ دو کہ اگر وہ اپنے افعال سے باز آ جائیں تو جو ہو چکا وہ انہیں معاف کر دیا جائے گا۔﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴾ (۱۹۔۴۶) اگر تو باز نہ آئے گا۔تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۱۶) کہ نوح علیہ السلام اگر تم باز نہ آؤ گے تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ (۵۔۹۱) تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیے۔

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ (۲۔۲۷۵) تو جس شخص کے پاس خدا کی نصیحت پہنچی اور وہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا۔

میں فَانْتَهٰى کے معنی اس کی نہایت کو پہنچنے یعنی رک جانے کے ہیں۔

اَلْاِنْهَاءُ: اصل میں اس کے معنی نھایة کو پہنچا دینے کے ہیں۔پھر عرف میں مطلقاً کسی خبر کے پہنچا دینے پر بولا جاتا

ہے جیسے: اَنْھَیْتُ اِلٰی فُلَانٍ خَبَرَ کَذَا: میں نے اس کے پاس فلاں خبر پہنچا دی۔

نَاھِیْكَ مِنْ رَجُلٍ: فلاں آدمی تجھے کافی ہے۔ یعنی وہ تیرے مطلوب کی غایت ہے گویا کسی دوسرے کی طلب سے تجھے منع کرتا ہے۔ نَاقَةٌ نِھْیَةٌ: انتہائی موٹی اونٹنی۔

اَلنُّھْیَةُ: عقل جو انسان کو قبیح باتوں سے روکتی ہو اس کی جمع نُھًی آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّھٰی﴾ (۲۰۔۵۴) بے شک ان (باتوں) میں عقل والوں کے لیے (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

تَنْھِیَةُ الْوَادِیْ: وادی کا آخری کنارہ جہاں کہ سیلان رک جاتا ہے۔

نِھَایَةُ النَّھَارِ دن کا بلند ہونا۔

طَلَبَ الْحَاجَةَ حَتّٰی نَھِیَ عَنْھَا: اس نے اپنی حاجت کو طلب کیا حتیٰ کہ اس کی طلب کرنے کے بعد اس سے رک گیا اور اس میں کامیاب ہونا شرط نہیں ہے۔

(ن و ب)

اَلنَّوْبُ: کسی چیز کا بار بار لوٹ کر آنا۔ یہ نَابَ (ن) نَوْبَةً وَ نَوْبًا کا مصدر ہے۔ اور شہد کی مکھی کو نَوْبٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی قرار گاہ کی طرف لوٹ کر جاتی ہے۔

نَابَتْهُ نَائِبَةٌ: یعنی اسے ایسی مصیبت پہنچی جس کے دوبارہ آنے کا بھی امکان ہے۔

اَلْاِ نَابَتُہُ اِلَی اللّٰہِ: توبہ اور اخلاص عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَخَرَّ رَاکِعًا وَّاَنَابَ﴾ (۳۸۔۲۴) اور جھک کر گر پڑے اور (خدا کی طرف رجوع کیا۔

﴿وَاِلَیْكَ اَنَبْنَا﴾ (۶۰۔۴۰) اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں۔

﴿وَاَنِیْبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ﴾ (۳۹۔۵۴) اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو۔

﴿مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ﴾ (۳۰۔۳۱) (مومنو!) اس (خدا) کی طرف رجوع کیے رہو۔

فُلَانٌ یَنْتَابُ فُلَانًا: وہ اس کے پاس آتا جاتا ہے۔

(ن و ح)

نُوْحٌ: یہ ایک نبی کا نام ہے دراصل یہ نَاحَ یَنُوْحُ کا مصدر ہے جس کے معنی بلند آواز کے ساتھ گریہ کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ نَاحَتِ الْحَمَامَةُ نُوْحًا: فاختہ کا نوحہ کرنا۔ نوح کے اصل معنی عورتوں کے ماتم کدہ میں جمع ہونے کے ہیں۔ اور یہ تَنَاوُحٌ سے مشتق ہے جس کے معنی تَقَابَلٌ کے ہیں۔ جیسے جَبَلَانِ مُتَنَاوِحَانِ دو متقابل پہاڑ۔ رِیْحَانِ یَتَنَاوَحَانِ دو متقابل ہوائیں۔

اَلنَّوَائِحُ: نوحہ گر عورتیں۔ اَلْمَنُوْحُ: مجلس گریہ۔

(ن و ر)

اَلنُّوْرُ: وہ پھیلنے والی روشنی جو اشیاء کے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور یہ دو قسم پر ہے۔ دنیوی اور اخروی۔ نور دنیوی پھر دو قسم پر ہے۔ معقول (۱) جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے یعنی امور الٰہیہ کی روشنی جیسے عقل یا قرآن پاک کی روشنی۔ دوم (۲) محسوس جس کا تعلق بصر سے ہے جیسے چاند، سورج، ستارے اور دیگر اجسام نیرہ۔ چنانچہ نور الٰہی کے متعلق فرمایا ﴿قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ﴾ (۵۔۱۵) بے شک تمہارے خدا

کی طرف سے نور اور روشن کتاب آ چکی ہے۔
﴿وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾ (۶-۱۲۲) اور اس کے لیے روشنی کر دی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔ کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے۔ جو اندھیرے میں پڑا ہو اور اس سے نکل نہ سکے۔
﴿مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ (۴۲-۵۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔
﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (۳۹-۲۲) بھلا جس شخص کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی پر ہو۔ ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَّهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۲۴-۳۵) روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔ خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے۔ سیدھی راہ دکھاتا ہے۔
اور نور حسی کے متعلق فرمایا:۔
﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ (۱۰-۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا۔
یہاں خاص کر سورج کو ضیاء اور قمر کو نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ضَوْءٌ نور سے اخص ہے۔
﴿وَقَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ (۲۵-۶۱) اور چمکتا ہوا چاند بھی بنایا۔

یعنی روشنی بنایا۔ اور بعض آیات میں نور عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
﴿وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ﴾ (۶-۱) اور اندھیرا اور روشنی بنائی۔
﴿وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ (۵۷-۲۸) اور تمہارے لیے روشنی کر دے گا۔ جس میں چلو گے
﴿وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا﴾ (۳۹-۶۹) اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ اور نور اخروی کے متعلق فرمایا:۔
﴿نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا﴾ (۶۶-۸) ان کا نور ایمان ان کے آگے اور داہنی طرف (روشنی کرتا ہوا) چل رہا ہوگا۔ اور وہ خدا سے التجا کریں گے کہ اے پروردگار! ہمارا نور ہمارے لیے پورا کر۔ ﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (۵۷-۱۳) کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجیے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔
﴿فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾ (۵۷-۱۳) اور وہاں نور تلاش کرو۔ محاورہ ہے۔
(اَنَارَ اللّٰهُ كَذَا وَنَوَّرَهٗ) اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو روشن کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کو نور کہنا مُنَوِّرٌ ہونے کے لحاظ سے ہے۔
چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۲۴-۲۵) خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔
نیز اس کا اپنی ذات کو نور کہنا روشنی میں مبالغہ کی وجہ سے ہے۔

اَلنَّارُ: اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ﴾ (۵۶۔۷۱) بھلا دیکھو کہ جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ (۲۔۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔اور نار کا اطلاق صرف حرارت اور نارِ جہنم پر بھی ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

﴿اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۲۲۔۷۲) وہ دوزخ کی آگ جس کا خدا نے کافروں سے وعدہ کیا ہے۔

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (۲۔۲۴) تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ﴾ (۱۰۴۔۶) وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔

الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں نَــارٌ کا لفظ جہنم پر بولا گیا ہے اور نار بمعنی نارِ حرب بھی آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ﴾ (۵۔۶۴) یہ جب لڑائی کی آگ جلاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ نار اور نور کی اصل ایک ہی ہے اور عام طور پر یہ لازم ملزوم ہوتے ہیں۔لیکن نار کو مُقْوِیْنَ کے لیے متاع دنیوی قرار دیا ہے۔اور نور کو متاع اخروی ہے۔ اسی کے لیے نور کے متعلق اِقْتِبَـــاسٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (۵۷۔۱۳) کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

تَنَوَّرْتُ نَارًا میں نے آگ دیکھی۔

اَلْمَنَارَةُ: یہ یا تو نور سے مَفْعَلَةٌ کے وزن پر ہے اور یا نار سے جیسے مَنَارَةُ السِّرَاجِ (چراغ پایہ) یا وہ جس پر کہ اذان دی جاتی ہے اور مَنَارُ الْاَرْضِ: راستہ معلوم کرنے کے نشانات کو کہتے ہیں۔ ❶

اَلنَّوَارُ: جائے تہمت سے نفرت کرنا۔

نَارَتِ الْمَرْاَةُ (ن) نُوْرًا وَّنَوَارًا: عورت کا تہمت سے دور رہنا

نُوْرًا الشَّجَرَةِ وَنَوَّارُهٗ: درخت کی کلیاں کیونکہ وہ سفیدی میں نور کے مشابہ ہوتی ہیں۔نُوْرٌ گودنے کا پوڈر۔ اور اسی سے محاورہ ہے:نَوَّرَتِ الْمَرْءَ ةُ يَدَهَا: عورت کا ہاتھ پر گودنا اور گودنے سے چونکہ عضو کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے اس لیے اسے تَنْوِیْرٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

(ن و س)

اَلنَّــاسُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل اُنَاسٌ ہے۔ہمزہ کو حذف کر کے اس کے عوض الف لام لایا گیا ہے۔اور بعض کے نزدیک نَسِیَ سے مقلوب ہے اور اس کی اصل اِنْسِیَانٌ بروزن اِفْعِلَانٌ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں نَاسَ یَنُوْسُ سے ہے جس کے معنی مضطرب ہونے کے ہیں۔اور نُسْتُ الْاِبِلَ کے معنی اونٹ ہنکانے کے ہیں۔بعض کا قول ہے کہ ذونواس بادشاہ کی وجہ تلقیب بھی یہی تھی کہ اس کے دراز گیسو اس کی پشت پر لہرایا کرتے تھے۔اس صورت میں اس کی تصغیر نُوَیْسٌ ہوگی۔قرآن پاک میں ہے:۔

❶ وفی الحدیث لعن اللہ من غیر منارِ الارض (الفائق ۲/۲۹۳)۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ (۱۰۴۔۱) کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

کبھی مجاز اَنَاسٌ کا عام معنی مراد نہیں ہوتا بلکہ صرف فضلاء لوگ مراد ہوتے ہیں اس وقت اس میں اِنْسَانِیَۃ کا معنی ملحوظ ہوتا ہے۔ یعنی جس میں کہ فضیلت، ذکر، اخلاق حمیدہ اور خصوصیات انسانی علی وجہ الاتم پائی جاتی ہیں کیونکہ جو چیز اپنے خواص سے عاری ہو وہ اس نام کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً ہاتھ میں اگر اس کے خصوصی وظیفہ کو ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو اس پر اور سریر کے پایہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا۔ پس آیت کریمہ:۔

﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (۲۔۱۳) جس طرح اور لوگ ایمان لائے تم بھی لے آؤ۔

میں اَلنَّاسُ سے کوئی خاص انسان مراد نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کی طرح ایمان لے آؤ جن میں انسانیت کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح آیت:۔

﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴۔۵۴) یا جو خدا نے لوگوں کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس پر حسد کرتے ہیں۔

میں بھی اَلنَّاسُ سے خاص لوگ مراد نہیں ہیں۔ بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن میں انسانیت کے اوصاف پائے جاتے ہیں اور کبھی اس سے نوع انسانی مراد لی جاتی ہے اور بعض نے آیت مذکورہ کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

(ن و ش)

اَلنَّوْشُ: کے معنی کسی چیز کو پکڑنا کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے [1] (الطویل)

(۴۳۹) تَنُوْشُ الْبَرِيْرَ حَيْثُ طَابَ اِهْتِصَارُهَا۔

وہ وہاں سے پیلو کھاتی ہے جہاں سے خوب جھکی ہوئی ہوں۔

بَرِيْرٌ کے معنی پیلو کے ہیں اور اِهْتِصَارٌ کے معنی مائل کرنے اور جھکانے کے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

هَصَرْتُ الْغُصْنَ: میں نے ٹہنی کو جھکایا۔

تَنَاوَشَ الْقَوْمُ: کسی چیز کو پکڑنا قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ﴾ (۳۴۔۵۲) (اب) ...... ان کا ہاتھ ایمان کے لینے کو کیونکر پہنچ سکتا ہے؟ یعنی وہ دور جگہ سے ایمان کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ جب کہ انہوں نے قریب جگہ سے اسے حاصل نہیں کیا جس وقت کہ ایمان لانا اور اسی سے انتفاع حاصل کرنا ان کے اختیار میں تھا۔ تو یہ آیت کریمہ:۔ ﴿يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا﴾ الایۃ (۶۔۱۵۹) مگر جس روز تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آ جائیں گی تو ...... اس وقت اسے ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ایک قراءت میں اَلتَّنَاؤُشُ ہمزہ کے ساتھ ہے تو اس صورت میں یا تو یہ نَأْشٌ سے مشتق ہوگا جس کے معنی طلب کے ہیں اور یا اس کا ہمزہ واؤ سے مبدل ہوگا جیسے اُقِّتَتْ وَاَدْؤُرٍ میں ہے جو کہ اصل میں وُقِّتَتْ وَاَدْوُرٍ ہے۔

(ن و ص)

نَاصَ اِلٰى كَذَا کے معنی کسی کے پاس پناہ

---

[1] قالہ ابو ذؤیب الھذلی وصدرہ: فما ام خشف بالعلایہ شادن۔ والبیت فی اللسان (نوش، علا) ودیوان الھذلیین (۱: ۲۲) ومعجم البلدان (رسم: علایہ) والمعانی الکبیر (۷۲۱) والمحکم (علو) وفی روایتھما نال بدل طاب واھتصارھا ای جذبھا۔

لینے کے ہیں۔ اور نَـاصَ عَنْهُ يَنُوْصُ نَوْصًا کے معنی کسی کام سے پیچھے ہٹ جانا اور اس سے پھر جانا کے ہیں۔ اور مَنَاصٌ جائے پناہ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَّ لَاتَ حِيْـنَ مَـنَاصٍ﴾ (۳۸-۳) اور وہاں کہیں پناہ لینے کا وقت نہیں رہا تھا۔

(ن و ل)

اَلــنَّوْلُ کے معنی تناول کے ہیں اور یہ نِـلْـتُ كَذَا اَنُوْلُ نَوْلًا سے آتا ہے۔ اور اَنَلْتُهٗ (افعال) کے معنی کسی چیز کے عطا کرنے کے ہیں۔ اور یہ عَـطَـوْتُ كَذَا بمعنی تَـنَاوَلْتُ اور اَعْـطَيْتُهٗ بمعنی اَنَـلْتُهٗ کی طرح ہے۔ پھر نِـلْـتُ اصل میں نَـوِلْتُ ہے اور محاورہ ہے:۔ وَمَـا كَانَ نَوْلُكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا: یعنی ایسا کرنے میں تمہاری بہتری نہیں ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (الوافر)

(۴۴۰) جَزِعْتَ وَلَيْسَ ذٰلِكَ بِالنَّوال

تم گھبرا گئے ہو اور یہ درست نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نوال بمعنی صواب ہے اصل میں نوال اس عطا کو کہتے ہیں جو انسان حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہیں کہ اس سے تیری مراد حاصل نہیں ہوسکتی۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿لَـنْ يَّـنَـالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّـنَـالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (۲۲-۳۷) خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ اس تک تمہاری پرہیز گاری پہنچتی ہے۔

(ن و م)

اَلــــنَّــــوْمُ: اس کی تفسیر کی گئی ہے اور مختلف اعتبارات سے تمام وجوہ صحیح ہوسکتی ہیں۔ بعض نے زعم کیا ہے کہ بخارات کی رطوبت سے اعصاب دماغ کے ڈھیلا ہونے کا نام نوم ہے۔ اور بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا بغیر موت کے روح کو قبض کر لینے کا نام نوم ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اَللّٰـهُ يَتَـوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَـوْتِهَا وَالَّتِىْ لَمْ تَمُتْ فِىْ مَنَامِهَا﴾ (۳۹-۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)۔

اور بعض نوم کو موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل کہتے ہیں رَجُلٌ نَؤُوْمٌ وَنُوَمَةٌ: بہت زیادہ سونے والا۔ اور مَنَامٌ بمعنی نوم آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ مِـنْ اٰيٰتِـهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ﴾ (۳۰-۲۳) اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے تمہارا رات میں ......سونا۔
﴿وَجَـعَـلْـنَـا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ (۷۸-۹) اور نیند کو تمہارے لیے موجب آرام بنایا۔
﴿لَا تَـاْخُـذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ (۲-۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔
نیز اَلنَّوْمَةُ کے معنی خامل الذکر یعنی گم نام بھی آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔
اِسْتَـنَامَ فُلَانٌ اِلٰى كَذَا: کسی چیز سے اطمینان حاصل کرنا۔ مَـنَامَةٌ: لباس خواب۔ نَـامَـتِ السُّوْقُ: کساد بازاری ہونا۔
نَامَ الثَّوْبُ: (لازم و متعدی) کپڑے کا پرانا ہونا یا کرنا۔

---

❶ قاله لبيد واوله: وقفت بهن حتیٰ قال صحبی والبيت فی اللسان (نول) ۱۲

ان دونوں معنی میں نَــــامَ کا لفظ تشبیہ کے طور پر مجازاً استعمال ہوتا ہے۔

(ن و ن)

اَلــنُّــوْنُ: حرف ہجا میں سے ایک حرف کا نام ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نٓ وَالْـقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ (۶۸۔۱)ن،قلم اور جو(اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

اور نون بڑی مچھلی کو بھی کہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ﴾ (۲۱۔۸۷)اور ذاالنون کو یاد کرو جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہوکر،چل دیئے۔

میں یونس علیہ السلام کو ذَا الــنُّـوْن کہا ہے۔کیونکہ انہیں مچھلی نے نگل لیا تھا۔اور حارث بن ظالم کی تلوار کا نام بھی ذَالنُّوْن تھا۔

(ن و ی)

نَــاءَ بِـجَانِبِهٖ يَنُوْءُ وَيَنَاءُ کے معنی پہلو پھیر لینے کے ہیں۔

ابوعبیدہ کے نزدیک نَاءَ مثل نَاعَ کے ہیں جس کے معنی اٹھنے کے ہیں اور اَنَاءَ تُهٗ کے معنی اٹھانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مَآ اِنَّ مَـفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ﴾ (۲۸۔۷۶) کہ ان کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔اور آیت کریمہ۔﴿نَــاَ بِـجَانِبِهٖ﴾ (۱۷۔۸۳)اور پہلو پھیر لیتا ہے۔میں ایک قراءت نَــاءَ بروزن نَاعَ ہے جس کے معنی پہلو اٹھانا کے ہیں اور یہ تکبر سے کنایا ہوتا ہے جیسا کہ شَمَخَ بِاَنْفِهٖ وَازْ وَرَّجَانِبُهٗ کا محاورہ ہے۔

ابوعمر کا قول ہے ❶ کہ نَایٰ بروزن نَـعٰی کے ہے جس کے معنی اعراض کرنے کے ہیں اور ابوعبیدہ کے نزدیک نَــاَیَ يَـنْــاَیُ کے معنی دور ہونے کے ہیں اور اسی سے اِنْتَاَیَ بروزن اِفْتَعَلَ ہے اور مُنْتَاَیٌ کے معنی مکان بعید کے ہیں۔اور اسی سے نُؤْیٌ ہے جس کے معنی خیمے کے گردا گرد گڑھے کے ہیں جو بارش کے پانی کو اس سے دور رکھتا ہے۔اور نَاَیَ بِجَانِبِهٖ کے معنی پہلو تہی کرنے کے ہیں۔

اَلنِّيَّةُ: یہ نَوَيْتُ کا مصدر ہے اور کبھی بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی کسی کام کی جانب دل سے متوجہ ہونے کے ہیں۔یہ نَاَیَ کے باب سے قطعاً نہیں ہے۔

(ن ی ل)

اَلــنَّيْلُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔اور یہ نِـلْتُــهٗ اَنَــالُهٗ نَيْلًا کا مصدر ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ (۳۔۹۲)تم کبھی نیکی حاصل نہیں کر سکو گے۔

﴿وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْـلًا﴾ (۹۔۱۲۰)یا دشمنوں سے کوئی چیز لیتے۔

﴿لَـمْ يَنَالُوْا خَيْرًا﴾ (۳۳۔۲۵) کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے۔

❀❀❀

❶ هـو ابـو عـمـر وبن العلاء بن عمار التيميمى المازنى عالم البصرة المشهور ١٥٤ تراجمه فى مراتب النحويين ١٣۔٢٠ واخبـار الـنـحـويـين (٢٢۔٢٥) وطبقات النحويين للزبيدى (٢٨۔٣٤) والمزهر (٣٩٨۔٣٩٩) والبغيه (٣٦٧) وطبقات القراء (١: ١٨٨۔٢٩٢)

کتَابُ الوَاو

(و ب ر)

اَلْــوَبَــرُ کے معنی ببری اور اون کے ہیں اس کی جمع اَوْبَارٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ مِـنْ اَصْـوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا﴾ (۱۶۔۸۰) اوران کی اون اور پشم ہے۔

اور جو لوگ پشم کے خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں انہیں سُكَّانُ الْوَبَرِ (بادیہ نشین) کہا جاتا ہے۔

بَنَاتُ اَوْبَرَ: ردی قسم کے کھمبے جن پر ببری کی طرح کا مادہ ہوتا ہے۔چھوٹی اور ردّی قسم کی سانپ کی چھتری۔

وَبَّرَتِ الْاَرْنَبُ: خرگوش کا اپنے پاؤں کے پچھلے حصہ کے لٹکے ہوئے بالوں سے اپنے قدموں کے نشانات کو مٹانا۔وَبَرَا الرَّجُلُ فِیْ مَنْزِلِهٖ: اپنے مکان سے باہر نہ نکلنا۔یہ وَبْـرٌ یعنی پشم کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے گھر کے اندر پشم کی طرح پڑا ہوا ہے، جیسا کہ تَـلَبَّـدَ بِـمَكَانِ كَذَا کا محاورہ ہے یعنی وہ اپنے مکان کا لبدہ بنا ہوا ہے۔

وَبَارِ بعض نے کہا ہے کہ قوم عاد کے ایک علاقہ کا نام ہے۔

(و ب ق)

وَبَـقَ (ض) وَبَقًا و مَوْبِقًا...... کے معنی ضعیف اور گراں بار ہو کر ہلاک ہو جانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُـمْ مَّوْبِقًا﴾ (۱۸۔۵۲) اور ہم ان کے بیچ میں ہلاکت کی جگہ بنا دیں گے۔

اَوْبَقَهٗ: كَذَا ہلاک کرنا۔

﴿اَوْ يُـوْبِـقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا﴾ (۴۲۔۳۴) یا ان کے اعمال کے سبب ان کو تباہ کر دے۔

(و ب ل)

اَلْـوَبَـلُ وَالْـوَابِلُ کے معنی بڑی اور بھاری بوندوں والی بارش کے ہیں۔چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَـاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا﴾ (۲۔۲۶۵) مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقعہ ہو (جب) اس پر بارش ہو۔

پھر معنی ثقل کے لحاظ سے ہر اس چیز کو وَبَالٌ کہا جاتا ہے۔جس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ذَاقُـوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ﴾ (۵۹۔۱۵) اپنے کاموں کی سزا کا مزہ چکھ چکے ہیں۔

وَبِيْـلٌ: وہ طعام یا گھاس جس کے کھانے سے بدہضمی اور ضرر کا اندیشہ ہو۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاَخَذْنَاهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا﴾ (۷۳۔۱۶) تو ہم نے اس کو بڑے وبال میں پکڑ لیا۔

(و ت د)

اَلْوَتْدُ وَالْوَتِدُ (ج اَوْتَادًا) کے معنی میخ کے ہیں۔وَتَـدْتُـهٗ اَتِدُهٗ وَتْدًا کے معنی کسی چیز میں میخ لگا کر اسے مضبوط کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ (۷۸۔۷) اور پہاڑوں کو (اس کی) میخیں نہیں ٹھہرایا۔ اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں ٹھہرانے کی کیفیت اس کے بعد بیان ہوگی۔ ❶ اور کبھی وَتِدٌ کی تاء کو ساکن اور پھر دال میں ادغام کر کے وَدٌّ بھی پڑھ لیتے ہیں۔

اَلْوَتِدَانِ: دونوں کانوں کے سامنے کے حصے جو میخ کی طرح ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

(و ت ر)

اَلْوَتْرُ: (طاق) یہ اعداد شفع کی ضد ہے جس کی بحث آیت ﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ (۸۹۔۳) اور جفت اور طاق کی (قسم) کے تحت گزر چکی ہے۔ ❷ اَوْتَرَ۔ وتر نماز پڑھنا۔ اَلْوَتْرُ وَالْوِتْرُ وَالتِّرَةُ کے معنی کینہ کے ہیں اور اسی سے وَتَرْتُهٗ (ض) ہے جس کے معنی کسی کو تکلیف پہنچانے یا اس کا حق کم کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ (۴۷۔۳۵) وہ ہرگز تمہارے اعمال کو کم (اور گم) نہیں کرے گا۔

اَلتَّوَاتُرُ: کسی چیز کا یکے بعد دیگرے آنا۔ محاورہ ہے جَاءُوْا تَتْرٰی (وہ یکے بعد دیگرے کچھ وقفہ کے بعد آئے) قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرٰی﴾ (۲۳۔۴۴) پھر ہم پے در پے اپنے پیغمبر بھیجتے رہے۔

لَا وَتِيْرَةَ فِيْ كَذَا وَلَا غَمِيْزَةَ وَلَا غَيْرُ: اس میں عقلی کمزوری یا کوئی دوسرا عیب نہیں ہے اور تَوَاتُرٌ سے وَتِيْرَةَ ہے جس کے معنی سَجِيَّةٌ (طبعی عادت کے) بھی آتے ہیں۔ نیز وَتِيْرَةٌ کا لفظ حسب ذیل معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ حلقہ جس پر بچے تیراندازی کی مشق کرتے ہیں۔

(۲) نرم زمین

(۳) ناک کے نتھنوں کا درمیانی پردہ۔

(و ت ن)

اَلْوَتِيْنُ: (رگ جان) اس رگ کو کہتے ہیں جو جگر کو خون پہنچاتی ہے۔ اور اس کے کٹ جانے سے انسان مر جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ﴾ (۶۹۔۴۶) پھر اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔

اَلْمُوَاتَنَةُ: (مفاعلہ) کے معنی شاہ رگ کی طرح قریب ہونے کے ہیں گویا آیت:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس کے زیادہ قریب ہیں۔ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

اِسْتَوْتَنَ الْاِبِلُ: موٹاپے کی وجہ سے اونٹ کی رگ گردن کا غلیظ اور موٹا ہو جانا۔

(و ث ق)

وَثِقْتُ بِهٖ اَثِقُ ثِقَةً: کسی پر اعتماد کرنا اور مطمئن ہونا۔

اَوْثَقَهٗ...... (افعال) زنجیر میں جکڑنا، رسی سے کس کر

---

❶ وفی القرآن: وفرعون ذی الاوتاد (۳۸۔۱۲) قال البیضاوی معناہ ذوالجموع الکثیرۃ وفی الکتاب ذوالملک الثابت (کذا فی الروح ۲۳۔۱۵۵)

❷ ملاحظہ ہو عنوان (ش ف ع)

باندھنا۔

اَلْوَثَاقُ وَالْوِثَاقُ اس زنجیر یا رسی کو کہتے ہیں۔جس سے کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلاَ یُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ﴾ (۸۹۔۲۶) اور نہ کوئی ایسا جکڑنا جکڑے گا۔

﴿حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ (۴۷۔۴) یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) قید کرلو۔

اَلْمِیْثَاقُ کے معنی پختہ عہد و پیان کے ہیں۔جو قسموں کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہو۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ﴾ (۳۳۔۷) اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا۔

﴿وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا﴾ (۳۳۔۷) اور عہد بھی ان سے پکا لیا۔

اَلْمَوْثِقُ: (اسم) پختہ عہد و پیان کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ......مَوْثِقَهُمْ﴾ (۱۲۔۶۶) کہ جب تک تم خدا کا عہد نہ دو۔

اَلْوُثْقٰى: یہ اَوْثَقُ (افعل) کی مؤنث ہے اور قریب قریب مَوْثِقٌ کے ہم معنی ہے قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (۲۔۲۵۶) اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی۔

ثِقَةٌ: قابل بھروسہ آدمی، مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔جیسے رَجُلٌ ثِقَةٌ وَقَوْمٌ ثِقَةٌ۔اور بطور استعارہ مَوْثُوْقٌ (معتمد) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

نَاقَةٌ مُوَثَّقَةُ الْخَلْقِ: مضبوط بناوٹ کی اونٹنی۔

(و ث ن)

اَلْوَثَنُ: (بت) اس کی جمع اَوْثَانٌ ہے اور اَوْثَانٌ ان پتھروں کو کہا گیا ہے جن کی جاہلیت میں پرستش کی جاتی تھی۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا﴾ (۲۹۔۲۵) کہ تم جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو لے بیٹھے ہو۔ ❶

اَوْثَنْتُ فُلَانًا: کسی کو بڑا عطیہ دینا۔

اَوْثَنْتُ مِنْ كَذَا: کسی کام کو کثرت سے کرنا۔

(و ج ب)

اَلْوُجُوْبُ: (ض) کے معنی ثبوت کے ہیں اور واجب کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ممکن کے بالمقابل۔یعنی وہ چیز جو ضروری الثبوت ہو اور اس کا ارتفاع فرض کرنے سے محال لازم آئے جیسے کہا جاتا ہے۔

وُجُوْدُ الْوَاحِدِ مَعَ وُجُوْدِ الْاِثْنَیْنِ وَاجِبٌ: دو کے ساتھ ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۲) وہ کام جس کے نہ کرنے سے انسان قابل ملامت سمجھا جائے یہ دو قسم پر ہے۔(الف) واجب مِنْ جِهَةِ الْعَقْلِ، جیسے اللہ کی وحدانیت اور نبوت کہ ان کی معرفت عقلاً واجب ہے۔(ب) واجب مِنْ جِهَةِ الشَّرْعِ، یعنی وہ فعل جس کا وجوب شریعت سے ثابت ہو جیسے: وُجُوْبُ الْعِبَادَاتِ الْمُوَظَّفَةِ یعنی فرضی عبادات کا وجوب

وَجَبَتِ الشَّمْسُ کے معنی سورج کے گرنے یعنی غروب ہونے کے ہیں۔چنانچہ معنی سقوط کے لحاظ سے فرمایا۔

❶ انظر (۲۹۔۷)

﴿فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا﴾ (۲۳۔۳۶) تو جب وہ اپنے پہلوں پر گر پڑیں۔

وَجَبَ الْقَلْبُ وُجُوْبًا: دل کا دھڑکنا، اس میں بھی معنی سقوط معتبر ہے اور اَوْجَبَ (افعال) بھی ان تمام معانی میں استعمال ہوتا ہے اور کبائر گناہ کو مُوْجِبَات کہا گیا ہے کیونکہ ان کے ارتکاب سے دوزخ کا عذاب واجب ہو جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ واجب کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک وہ چیز جس کا عدم ناممکن ہو جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ دوسرے واجب اسے کہتے ہیں جس میں موجود ہونے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو اور فقہا کا یہ کہنا کہ واجب وہ ہے جس کے نہ کرنے سے انسان عقوبت کا مستحق ہو تو یہ تَعْرِيْفُ الشَّيْءِ بِالْعَوَارِضِ کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ استحقاق عقوبت اس کا وصف لازم نہیں ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے۔ جس طرح کہ انسان کی تعریف میں کہا جائے: مُسْتَقِيْمُ الْقَامَةِ وَالْمَاشِيْ عَلَى الرِّجْلَيْنِ۔

(و ج د)

اَلْوُجُوْدُ (ض) کے معنی کسی چیز کو پالینا کے ہیں اور یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) حواس خمسہ میں سے کسی ایک حاسہ کے ساتھ ادراک کرنا جیسے وَجَدْتُّ زَيْدًا (حاسہ بصر) وَجَدْتُّ طَعْمَهٗ۔ (حاسہ ذوق) وَجَدْتُّ سَمْعَهٗ۔ (حاسہ سمع) وَجَدْتُّ خَشُوْنَتَهٗ (حاسہ لمس)

(۲) قوی باطنہ کے ساتھ کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے وَجَدْتُّ الشِّبَعَ (میں نے سیری کو پایا) کہ اس کا تعلق قوت شہویہ کے ساتھ ہے۔

وَجَدْتُّ الْحُزْنَ اَوِ السَّخَطَ (میں نے غصہ یا غم کو پایا) اس کا تعلق قوت غضبیہ کے ساتھ ہے اور بذریعہ عقل کے کسی چیز کو پالینا جیسے اللہ تعالیٰ یا نبوت کی معرفت کہ اسے بھی وِجْدَان کہا جاتا ہے۔ جب وجود (پالینا) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو اس کے معنی محض کسی چیز کا علم حاصل کر لینا کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ جوارح اور آلات کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل کرنے سے منزہ اور پاک ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ﴾ (۷۔۱۰۱) اور ہم نے ان میں سے اکثروں میں عہد (کا نباہ) نہیں دیکھا اور ان میں اکثروں کو (دیکھا تو) .... بد عہد دیکھا اس کے بالمقابل معدوم کے بھی کئی معنی آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو پالینا کسی ایسے طریق سے ہوتا ہے جو تمام مذکورہ وجوہ سے بالا ہو۔ اور کبھی کسی چیز پر تمکن (قدرت) حاصل کر لینے کو بھی وجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ (۹۔۵) تم مشرکوں پر جہاں قدرت پاؤ قتل کر دو اور آیت کریمہ:۔

﴿فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ﴾ (۲۸۔۱۵) تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں۔ میں بھی وجد بمعنی تمکن ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَجَدتُّ امْرَاَةً ....يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ﴾ (۲۷۔۲۳۔۲۴) میں نے ایک عورت دیکھی ...... (وہ اور اس کی قوم) آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں، میں وجود بلحاظ بصر

اور بصیرت مراد ہے کیونکہ ہد ہد نے آنکھوں سے ان کو دیکھا بھی تھا اور پھر بصیرت سے ان کی حالت کا اندازہ بھی لگایا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کا وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا الایۃ کہنا صحیح نہیں ہوسکتا (کیونکہ تمام قوم کو تو اس نے سورج کی پرستش کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ کچھ اعتبار اور قیاس سے بھی کام لیا تھا) اور آیت:

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ (۴۔۴۳) اور تمہیں پانی نہ ملے میں لَمْ تَجِدُوْا بمعنی لَمْ تَقْدِرُوْا ہے یعنی اگر تمہیں پانی پر قدرت نہ ہو۔ اور آیت:۔

﴿مِنْ وُّجْدِكُمْ﴾ (۶۵۔۶) مقدور کے مطابق۔

میں وُجْـــدِ سے مقدور یا مالی حالت مراد ہے۔ اور غنی (تونگری) کو وُجْدٌ اور جِدَةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور وُجْد میں وَجدٌ اور وِجْد (بفتحہ واؤ وکسرہ آں) بھی حکایت کیا گیا ہے۔ اور وَجْدٌ کے معنی غم اور محبت کے بھی آتے ہیں۔ اور مَوْجِدَةٌ غصہ کو کہتے ہیں۔ اور وجود کے معنی گمشدہ چیز کو پالینا بھی آتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ موجودات تین قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو ازلی اور ابدی ہو۔ یعنی اس کی ابتداء اور انتہا نہ ہو اور یہ صرف ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ دوم وہ ہے جو مبداء اور منتہیٰ رکھتی ہو جیسے اس دنیا میں انسان اور عالم دنیا کے دیگر جواہر۔ تیسری قسم موجودات کی وہ ہے جن کا مبدا تو ہے لیکن منتہیٰ نہیں ہے۔ جیسے عالم آخرت کا انسان۔

(و ج س)

اَلْوَجْسُ کے معنی صورت خفی کے ہیں اور تَوَجُّسٌ (تفعل) خفی آواز سننے کی کوشش کرنے کو کہتے ہیں۔ اور اِیْجَاسٌ کے معنی دل میں کوئی بات محسوس کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی﴾ (۲۰۔۶۰) (اس وقت) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔ لہٰذا وَجْسٌ اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی (خطرہ) کے بعد دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو چیز مبداء بنتی ہے اسے هَاجِسٌ اور اس کے بعد کی حالت کو وَاجِسٌ کہا جاتا ہے۔

(و ج ف)

اَلْوَجِیْفُ کے معنی تیز رفتاری کے ہیں اور اَوْجَفْتُ الْبَعِیْرَ کے معنی ہیں: میں نے اونٹ کو تیز دوڑایا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِكَابٍ﴾ (۵۹۔۶) کیونکہ اس کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ۔ مثل مشہور ہے۔

اَدَلَّ فَاَمَلَّ وَاَوْجَفَ فَاَعْجَفَ: یعنی گھوڑے کو تیز دوڑا کر دبلا کر دیا۔ وَجَفَ الشَّیْءُ: کسی چیز کا مضطرب ہونا۔ قَلْبٌ وَاجِفٌ: مضطرب دل جیسے فرمایا:۔

﴿قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ﴾ (۷۹۔۸) اس دن (لوگوں کے) دل خائف ہو رہے ہوں گے۔

یعنی مضطرب اور پریشان ہوں گے جیسا کہ قلوب کے اضطراب کے لیے طَائِرَةٌ یا خَافِقَةٌ وغیرہ الفاظ بطور استعارہ ہوتے ہیں۔

(و ج ل)

اَلْوَجَلُ کے معنی دل ہی دل میں خوف محسوس کرنے کے ہیں اور یہ باب وَجِلَ یَوْجَلُ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی ڈرنے یا گھبرانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (۸۔۲) مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔

﴿اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ﴾ (۱۵۔۵۲) (انہوں نے کہا) ہمیں تو تم سے ڈر لگتا ہے۔ یہ وَجِلٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: ڈرنے والا۔

﴿وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ (۲۳۔۶۰) اور ان کے دل...... ڈرتے رہتے ہیں۔

(و ج ہ)

اَلْوَجْهُ کے اصل معنی چہرہ کے ہیں۔ ج وُجُوْهٌ۔ جیسے فرمایا:۔

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ﴾ (۵۔۶) تو اپنے منہ اور ہاتھ دھولیا کرو۔

﴿وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾ (۱۴۔۵۰) اور ان کے چہروں پر آگ لپٹ رہی ہوگی۔

اور چونکہ کہ استقبال کے وقت سب سے پہلے انسان کا چہرہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے کسی چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے اسے وجہ کہہ لیتے ہیں۔ نیز ہر چیز کے اشرف حصہ اور مبدا پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے وَجْهُ كَذَا اس کا اول حصہ۔

وَجْهُ النَّهَارِ: دن کا اول حصہ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (۵۵۔۲۷) اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت) جو صاحب جلال وعظمت ہے۔...... باقی رہ جائے گی۔ میں بعض نے وجہ سے ذات باری تعالیٰ مراد لی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَجْهُ رَبِّكَ سے اعمال صالحہ مراد ہیں۔ جن سے ذات باری تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود ہوتی ہے۔ نیز فرمایا:۔

﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۱۵) تو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے۔

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ (۲۸۔۸۸) اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ﴾ (۳۰۔۳۸) جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں۔

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ (۷۶۔۹) اور کہتے ہیں کہ ہم تو خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں۔

ان تمام آیات میں بعض نے کہا ہے کہ وجہ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے لہٰذا آیت كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ کے معنی یہ ہیں کہ باستثناء ذات باری تعالیٰ ہر چیز نابود ہونے والی ہے۔ اور اسی قسم کی دوسری آیات میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ مروی ہے کہ ابی عبداللہ بن الرضا نے کہا ہے کہ سبحان اللہ لوگ بہت بڑا کلمہ کہتے ہیں۔

آیت هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ میں توجہ کے معنی جہت قصد کے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ بقا صرف انہیں اعمال کو حاصل ہوگی۔ جن سے ذات باری تعالیٰ کا قصد کیا جائے اور دیگر آیات بھی اسی معنی پر محمول ہیں۔ اور یہی معنی آیت ﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ﴾ (۳۰۔۳۸) جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں۔ اور

﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ (۱۸۔۲۸) اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ میں مراد ہیں۔ اور آیت:۔

﴿وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (۷۔۲۹) اور ہر نماز کے وقت سیدھا (قبلے کی طرف)

رخ کیا کرو۔
میں بعض نے کہا ہے کہ وجوہ سے مراد چہرے ہیں۔اور یہ فَعَلْتُ كَذَا بِيَدِىْ کی طرح بطور استعارہ کے استعمال ہوتا ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ وجہ کے معنی متوجہ ہونے کے ہیں اور اقامت کے معنی استقامت کا قصد کرنے کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نماز میں خالص رضا الٰہی کا قصد کرو۔(یعنی ریا کاری وغیرہ سے کام نہ لو) چنانچہ آیات
﴿فَإِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ﴾ (۳۔۲۰) (اے پیغمبر) اگر لوگ تم سے جھگڑنے لگیں تو کہدو کہ میں اور میرے پیروکار تو اللہ کے فرمانبردار ہو چکے ہیں۔
﴿وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (۳۱۔۲۲)اور جو اپنے تئیں خدا کا فرنبردار کر دے اور نیکو کار بھی ہو تو اس نے مضبوط دستاویز ہاتھ میں لے لی۔﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ﴾ (۴۔۱۲۵)اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے۔جس نے حکم خدا کو قبول کیا۔
﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ﴾(۳۰۔۳۰)تو تم ایک طرف ہو کر دین (خدا کے رستے) پر سیدھا منہ کیے چلے جاؤ۔
میں وجہ سے خدا کی رضا جوئی اور اس کی جانب متوجہ ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اور استعارہ کے طور پر مذہب یا طریقہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔اسی طرح فرمایا:۔
﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾ (۹۲۔۱۹،۲۰)اور (اس لیے) نہیں (دیتا کہ) اس پر کسی کا احسان ہے جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے۔اور آیت:۔
﴿اٰمِنُوْا بِالَّذِيْ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ﴾ (۳۔۷۲) کہ جو کتاب مومنوں پر نازل ہوئی اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو۔ میں وجہ النہار کے معنی دن کے شروع حصہ کے ہیں۔وَاَجْهَتُ فُلَانًا کے معنی کسی کے آمنے سامنے ہونے کے ہیں۔اور وَجْهٌ کے معنی قصد بھی آتے ہیں اور جِهَةٌ اور وَجْهَةٌ کے معنی مقصد کے ہیں یعنی کسی چیز کی طرف متوجہ ہونے کی جگہ۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ (۲۔۱۴۸)اور ہر ایک فرقے کے لیے ایک سمت مقرر ہے۔تو وِجْهَةٌ سے شریعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:۔
﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ (۵۔۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لیے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔
اَلْجَاهُ: مرتبہ۔بعض نے کہا ہے کہ یہ وجہ سے مقلوب ہے لیکن وجہ کا لفظ عزت مرتبہ اور چہرہ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اور جَاهٌ کے معنی صرف مرتبہ کے آتے ہیں۔
وَجَّهْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو ایک جانب بھیجنے کے ہیں اور تَوَجَّهَ کے معنی از خود جانے کے۔
فُلَانٌ وَجْهُ الْقَوْمِ کے معنی رئیس قوم کے ہیں۔جیسا کہ قوم کے رئیس اور سردار کو رَأْسُهُمْ وَ عَيْنُهُمْ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔فُلَانٌ وَجِيْهٌ

اَوْ ذُوْجَـاہٍ: فلاں صاحب وجاہت ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَجِيْهًـا فِـي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (۳۔۴۴)اور جو دنیااور آخرت میں باآبرو ہوگا۔

ایک محاورہ ہے۔

اَحْمَقُ مَا يَتَوَجَّهُ بِهٖ: یعنی وہ انتہائی درجہ کا احمق ہےاور کبھی بِـهٖ کوحذف کر کےبھی بولتے ہیں۔اور مطلب یہ ہے کہ حماقت کی وجہ سے وہ کوئی کام بھی صحیح طور پرنہیں کر سکتا۔

اَلتَّـوْجِيْهُ: علم عروض میں اس حرف کو کہتے ہیں۔جوالف تاسیس اورحرف روی کے درمیان ہو۔

(و ح د)

اَلْـوَحْـدَةُ کے معنی یگانگت کے ہیں اور واحدة درحقیقت وہ چیز ہے جس کا قطعاً کوئی جزء نہ ہو پھراس کا اطلاق ہر موجود پر ہوتا ہے۔حتیٰ کہ ہر اسم عدد اس کے ساتھ متصف ہوسکتا ہے۔جیسے عَشْـرَةٌ وَاحِدَةٌ (ایک عشرہ) مَـائَةٌ وَاحِـدَةٌ (ایک سو) اَلْفٌ وَاحِدٌ (ایک ہزار پس وَاحِـدٌ کا لفظ مشترک ہے جو چھ طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) واحد بلحاظ جنس یا نوع کے، جیسے کہا جاتا ہے کہ انسان اور فرس دونوں ایک ہی ہیں یعنی بلحاظ جنس ایک ہی ہیں۔یا زید اور عمرو ایک ہیں یعنی بلحاظ نوع کے ایک ہیں۔

(۲) واحد باالاتصال۔یعنی کئی اجزاء مل کر ایک ہو جائیں عام اس سے کہ وہ اتصال۔خلقی ہو جیسے شخص واحد یا صناعی ہو جیسے: حِرْفَةٌ وَاحِدَةٌ۔

(۳) یکتا اور بےنظیر خواہ وہ یکتائی بلحاظ خلقت کے ہو جیسے اَلشَّـمْـسُ وَاحِدَةٌ یا بلحاظ دعوےفضیلت کے ہو جیسے فُـلَانٌ وَاحِـدُ عَـصْرِہٖ :فلاں یکتائے روزگار ہے۔یاھُـوَ نَسِيْـجُ وَحْدِہٖ: (وہ اپنی طرز کا) ایک ہے یعنی صاحب الرائے ہونے میں اس کا کوئی شبہ نہیں۔ [1]

(۴) وہ جس میں تجزی ممتنع ہوخواہ وہ امتناع صغر جم کی وجہ سے ہو، جیسے ذرہ یا صلابت کی وجہ سے، جیسے الماس یعنی ہیرا۔

(۵) بمعنی مبدا آتا ہے۔خواہ وہ مبدائے اعداد ہو جیسے وَاحِدٌ اِثْنَانِ یا مبدء خط جیسے نقطہ۔

الحاصل: ان سب اقسام کو وحدۃ کے معنی عارض ہوتے ہیں لیکن۔(٦) جب واحد کا لفظ باری تعالیٰ پر بولا جاتا ہے۔جیسے اَلـلّٰهُ وَاحِدٌ تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس میں تجزی یا تکثر ناممکن ہو اور اس قسم کی وحدت چونکہ بمشکل ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔اس لیے فرمایا:۔

﴿وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُـؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾ (۳۹۔۴۸)اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے۔تو جولوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔

اَلْـوَحْـدُ کے معنی اکیلا کے ہیں اور غیر اللہ کی صفت بھی واقع ہوتا ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [2] (البسیط)

(۴۴۱) عَلٰی مُسْتَأْنِسٍ وَحْدٍ

لیکن اَحَدٌ کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بولا جاتا ہے۔جیسا

---

[1] وقالت عائشة فی عمرؓ كان والله احوذ يا نسيج وحده اللسان (وحد (ا ن س)

[1] قاله النابغة "وتكملة البيت۔ كان رحلي وقد زال النهار بنا۔ هزى الجليل على مستانس وحده وقد مر تخريجه فى (ا ن س)

کہ پہلے گزر چکا ہے اور ھُوَ نَسِیْجُ وَحْدِہٖ کی طرح فُلَانٌ لَا وَاحِدَ لَہٗ کا محاورہ بھی مشہور ہے اور ذم کے لیے ھُوَ عُیَیْرُ وَحْدِہٖ یا جُحَیْشُ وَحْدِہٖ کہا جاتا ہے یعنی وہ کمزور رائے ہے اور جب معمولی سی مذمت کرنا مقصود ہوتی ہے تو رُجَیْلُ وَحْدِہٖ کہہ دیتے ہیں۔

(و ح ش)

اَلْوَحْشُ: یہ اَلْاِنْسُ کی ضد ہے اور وہ جانور جو انسان سے مانوس نہیں ہوتے، انہیں وَحْشٌ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع وُحُوْشٌ ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ﴾ (۸۱۔۵) اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں گے۔

اور مَکَانٌ وَحْشٌ: اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی آبادی نہ ہو۔جیسے کہا جاتا ہے۔

لَقِیْتُہٗ بِوَحْشٍ اِصْمِتَ یعنی میں نے ویران جگہ میں اس سے ملاقات کی۔ ❶

بَاتَ فُلَانٌ وَحْشًا: اس نے بھوکے رات گزاری اس کی جمع اَوْحَاشٌ آتی ہے۔

اور وَحْشٌ سے اَرْضٌ مُوْحِشَۃٌ (ویران جگہ) کا محاورہ ہے اور اس کی طرف نسبت کے وقت وَحْشِیٌّ کہا جاتا ہے۔اور وَحْشِیٌّ اِنْسِیٌّ کے بالمقابل آتا ہے۔اور کسی شے کی ہر وہ جہت جو انسان کی طرف ہو اسے اِنْسِیٌّ اور دوسری جانب وحشی کہا جاتا ہے۔چنانچہ اسی معنی میں وَحْشِیُّ الْقَوْسِ وَاِنْسِیُّہٗ کا محاورہ آتا ہے۔

(و ح ی)

اَلْوَحْیُ کے اصل معنی اشارہ سریعہ کے ہیں۔

اور اس کے معنی سرعت کو متضمن ہونے کی وجہ سے ہر تیز رفتار معاملہ کو اَمْرٌ وَحْیٌ کہا جاتا ہے۔اور یہ (وحی) کبھی رمز و تعریض کے طور پر بذریعہ کلام کے ہوتی ہے۔ اور کبھی [۲] صوت مجرد کی صورت میں ہوتی ہے۔یعنی اس میں ترکیب الفاظ نہیں ہوتی۔ اور کبھی [۳] بذریعہ جوارح کے اور کبھی [۴] بذریعہ کتابت کے۔اس بنا پر آیت۔

﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓی اِلَیْھِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّ عَشِیًّا﴾ (۱۹۔۱۱) پھر وہ (عبادت کے) حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو ان سے اشارے سے کہا کہ صبح و شام خدا کو یاد کرتے رہو۔

میں بعض نے اَوْحٰی کے معنی رمز اور بعض نے کَتَبَ (لکھنا) اور بعض نے اعتبار کر لینا کیے ہیں اور آیت:

﴿وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (۶۔۱۱۲) اور اسی طرح ہم نے شیاطین (سیرت) جنوں اور انسانوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے تھے۔

میں بھی وحی کا لفظ مذکورہ بالا وجوہ پر حمل کیا جا سکتا ہے۔اور آیت:

﴿وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ﴾ (۶۔۱۲۲) اور شیطان (لوگ) اپنے رفیقوں کے دلوں پر یہ بات ڈالتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اِیْحَاءٌ بمعنی وسوسہ اندازی کے

❶ ای بمکان لا انیس فیہ انظر للکلمۃ المیدانی (۲/۱۸۴)

ہے جس کی طرف کہ آیت:

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۱۱۴-۴) (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

نیز حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا❶ (۱۳۴)((وَاِنَّ لِلشَّيْطَانِ لِمَّةً)) کہ شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔اور شریعت میں کلمہ الہیہ کو وحی کہا جاتا ہے۔جو انبیاء و اولیاء کی طرف القاء کیا جاتا ہے جو انبیا و اولیاء کی طرف القاء کیا جاتا ہے اس کی چند صورتیں ہیں۔

جیسا کہ آیت:۔

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ الآیة (۴۲-۵۱) اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے۔مگر الہام (کے ذریعہ) سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو خدا چاہے القا کرے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی (۱) یا تو فرشتہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتا ہے اور اس کا کلام سنائی دیتا ہے۔جیسا کہ حضرت جبریل علیہ السلام ایک معین شکل میں آکر آنحضرت ﷺ تک پیام رسالت پہنچایا کرتے تھے۔چنانچہ جملہ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا میں اس معنی کو بیان فرمایا ہے۔

وحی کی دوسری صورت یہ ہے کہ پردے کے پیچھے سے کلام سنائی دے۔جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور یہی معنی مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ کے ہیں وحی کی یہ دونوں قسمیں انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔

وحی کی تیسری صورت القاء فِي الرَّوْعِ کی ہے یعنی دل میں کسی بات کا ڈال دینا۔جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا:❷ (۱۳۵) ((اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ)) کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔

اور کبھی (۴) وحی بذریعہ الہام ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔

﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ﴾ (۲۸-۷) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاؤ۔اور کبھی وحی تسخیری ہوتی ہے یعنی کسی چیز کو اس کے کام پر مامور کرنا جیسے فرمایا:۔

﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ (۱۶-۶۸) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا:

اور کبھی نیند میں خواب کے ذریعے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا❸ (۱۳۶)((اِنْقَطَعَ الْوَحْيُ وَبَقِيَتِ الْمُبَشِّرَاتُ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ)) کہ وحی تو منقطع ہو چکی ہے مگر مبشرات یعنی رویا مومن باقی رہ گئے ہیں۔اور وحی کی ان ہر سہ اقسام یعنی الہام تسخیر اور رؤیا پر آیت اِلَّا وَحْيًا دلالت کرتی ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ﴾ (۶-۹۳)

---

❶ وتمامه وللملك لمة فامالمة الشيطان فايعاد بالشر وتكذيب بالحق الحديث رواه ' بن حبان فی (زوائد ص ۴۰)۔

❷ الحديث فی الفائق (۲/۲۸۵) وانظر لتخريجه فی وروع) و (نفث)

❸ قد مر تخريجه ف (ب ش ر) ۱۲

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ، افترا کرے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو۔

عام ہے اور ہر اس شخص پر چسپاں ہوسکتی ہے جو مذکورہ بالا اقسام وحی میں سے کسی ایک قسم کی وحی کا جھوٹا دعویٰ کرے۔اور آیت:۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ﴾ اَلْاٰيَةِ (۲۱۔۲۵) اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی...... میں بھی وحی کا لفظ جمیع انواع وحی کو شامل ہے۔کیونکہ اس آیت میں وحی کے تحت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کا ذکر ہے اور ان دونوں چیزوں کی معرفت اولوالعزم پیغمبروں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ چیز جس طرح شارع علیہ السلام سے بذریعہ سماعت کے حاصل ہوسکتی ہے۔ایسے ہی عقل و الہام سے بھی حاصل ہوسکتی ہے...... پس اس میں صرف اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ شخص کبھی بھی اللہ تعالیٰ کا سچا پیغمبر نہیں ہوسکتا۔جسے باری تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی وجوب عبادت کے متعلق معرفت حاصل نہ ہو۔اور آیت:۔

﴿وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ﴾ (۵۔۱۱۱) اور جب میں نے حواریوں کو حکم بھیجا۔

میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے سے حضرت عیسیٰ کی وساطت سے ان کو حکم دینا مراد ہے۔اور آیت:

﴿وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ﴾ (۲۱۔۷۳) اور ان کو نیک کام کرنے...... کا حکم بھیجا۔

میں بھی لوگوں کی طرف وحی کرنے سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انہیں ان باتوں کا حکم دینا مراد ہے۔اور آیات۔

﴿اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۶۔۱۰۶) اور جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آتا ہے اس کی پیروی کرو۔

﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (۱۰۔۱۵) میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (۱۸۔۱۱۰) کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے۔

میں خاص وہ وحی مراد ہے جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص تھی۔اور آیت:۔

﴿وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ﴾ (۱۰۔۸۷) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی۔

میں موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف یکساں قسم کی وحی بھیجنا مراد نہیں ہے۔بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی تو حضرت جبریل کی وساطت سے آتی تھی مگر ہارون علیہ السلام کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جبریل علیہ السلام دونوں کی وساطت سے وحی کی جاتی ہے۔اور آیت:

﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ﴾ (۸۔۱۲) جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو ارشاد فرماتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ لوح وقلم کی وساطت سے وحی بھیجنا مراد ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا﴾ (۴۱۔۱۲) اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا۔

میں آسمان سے مراد اہل سماء ہیں تو یہاں الْمُوحٰی اِلَیْھِمْ (یعنی جن کی طرف وحی کی تھی) محذوف ہے اور اہل سماء سے مراد چونکہ فرشتے ہی ہیں اس لیے اصل میں ﴿وَاَوْحٰی اِلَی الْمَلٰٓئِکَةِ﴾ (۸۔۱۲) ہے کہ ہم نے فرشتوں کی طرف وحی بھیجی۔ پس یہ مذکورہ بالا آیت کے ہم معنی ہوگی۔

اور اگر مُوْحٰی اِلَیْھِمْ سے آسمان ہی مراد لیے جائیں تو لوگ آسمانوں کے غیر جاندار ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے وحی تسخیری مراد ہوگی۔ اور جن کے نزدیک آسمان زندہ اور جاندار مخلوق ہیں۔ ان کے نزدیک وحی بذریعہ کلام مراد ہوگی۔ اور آیت:۔

﴿بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا﴾ (۹۹۔۵) کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کا حکم بھیجا ہوگا۔

میں وحی کے پہلے معنی یعنی وحی تسخیری مراد لینا اقرب معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت:

﴿لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ﴾ (۲۰۔۱۱۴) اور قرآن پاک کی وحی جو تمہاری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اسکے پورا ہونے سے پہلے قرآن پاک کے (پڑھنے) کے لیے جلدی نہ کرو۔ میں آنحضرت ﷺ کو تثبت کے ساتھ وحی کو سننے اور اس کی تلقی میں عجلت کو ترک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

(و د د)

اَلْوُدُّ: کے معنی کسی چیز سے محبت اور اس کے ہونے کی تمنا کرنا کے ہیں۔ یہ لفظ ان دونوں معنوں میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کی تمنا اس کی محبت کے معنی کو متضمن ہوتی ہے۔ کیونکہ تمنا کے معنی کسی محبوب چیز کی آرزو کرنا کے ہوتے ہیں۔ اور آیت۔ ﴿وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ (۳۰۔۲۱) اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کردی۔ اور نیز آیت۔ ﴿سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (۱۹۔۹۶) خدا ان کی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کردے گا۔ میں اس الفت کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ آیت ﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۸۔۶۳) اور اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت

﴿قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی﴾ (۴۲۔۲۳) کہدو کہ میں اس کا تم سے صلہ نہیں مانگتا مگر (تم کو) قرابت کی محبت (تو چاہیے) میں مودت کے معنی محض محبت کے ہیں [1] اور آیت ﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ﴾ (۸۵۔۱۴) اور وہ بخشنے والا (اور) محبت کرنے والا ہے۔

اور نیز۔ ﴿اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ﴾ (۱۱۔۹۰) بے شک میرا پروردگار رحم والا اور محبت والا ہے۔ میں وَدُوْدٌ اسمائے حسنٰی سے ہے اور اس میں محبت کے ان معنوں کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت: ﴿فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ﴾ (۵۔۵۴) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے۔ اور جسے

[1] الاستثناء منقطع لان القرابة لیست من جنس الاجر فالفاء للبیته وهی بمعنی اللام ومعناه الا ان تو دو نی لقرابتی منکم والفتوحات (ص۷۲ جو ۱۴)

وہ دوست رکھیں۔میں پائے جاتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے بندوں سے محبت کرنے اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے مودت کے معنی ان کی نگہداشت کرنے کے ہیں۔ مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں کبھی بھی چھوٹے سے اس کے چھوٹا پن اور کسی بڑے سے اس کی بڑائی کے سبب غافل نہیں ہوتا اور میں ودود اور شکور ہوں لہٰذا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت:

﴿سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (۱۹۔۹۷) کے بھی وہی معنی ہوں جو کہ آیت: ﴿سَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ ہیں۔

اور مَوَدَّةٌ بمعنی تمنا کے متعلق فرمایا:

﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ (۳۔۹۶) (اے اہل اسلام) بعضے اہل کتاب اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ تم کو گمراہ کردیں۔ ﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ﴾ (۱۵۔۲) کسی وقت کافر لوگ آرزو کریں گے اے کاش وہ مسلمان ہوتے۔

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ (۳۔۱۱۸) اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو تمہیں تکلیف پہنچے۔

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ (۲۔۱۰۹) بہت سے اہل کتاب (اپنے دل کی جلن سے) یہ چاہتے ہیں:۔ ﴿وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ﴾ (۸۔۷) اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان و شوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آجائے۔ ﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا﴾ (وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں (اسی طرح) تم بھی کافر ہو کر (سب برابر ہو جاؤ)

﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ﴾ (۷۰۔۱۱) (اس روز) گنہگار خواہش کرے گا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے (یعنی) اپنے بیٹے۔

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۵۸۔۲۲) جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔

نیز اس آیت میں کفار سے موالات اور انکی پشت پناہی سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (۶۰۔۱) مومنو! (اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مکے سے نکلے ہو) تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

تو یہاں مَوَدَّتْ سے تعلقات محبت یعنی خیر خواہی وغیرہ مراد ہے۔

﴿كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ﴾ (۴۔۷۳) گویا تم میں اور اس میں دوستی تھی ہی نہیں۔

فُلَانٌ وَدِيْدُ فُلَانٍ وہ فلاں کا دوست ہے۔

اَلْوُدُّ ایک بت کا نام تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف

ہے بعض نے کہا ہے کہ اس بت کو انتہائی محبوب سمجھنے کی وجہ سے اسے وُدٌّ کہتے تھے اور یا ان کے اس اعتقاد کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اور اس بت کے درمیان رابطہ محبت پایا جاتا ہے، اسے وُدّ کہا گیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس قسم کی قباحتوں سے پاک ہے۔

اَلْوَدُّ کے معنی وَتَدٌ یعنی میخ کے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اصل میں وَتْدٌ ہو تاء دال میں مدغم ہوکر وَدٌّ ہوگیا ہو۔اور ہو سکتا ہے کہ میخ کے ایک جگہ پر جمے رہنے یا جس چیز میں لگائی جائے اس میں مضبوطی کے ساتھ لگ جانے کی وجہ سے اس سے محبت کے معنی لے کر (اسے وَدٌّ کہہ دیا گیا ہو)۔

(و د ع)

اَلدَّعَةَ کے معنی آرام اور فراخی عیش کے ہیں اور وَدَعْتُ کَذَا أَدَعُهٗ وَدْعًا (ب) کے معنی ہیں: تَرَکْتُهٗ وَادِعًا۔ یعنی پرسکون طریقہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا بعض کا قول ہے کہ اس کا فعل ماضی اور اسم فاعل استعمال نہیں ہوتا صرف یَدَعُ اور دَعْ یعنی فعل مضارع اور امر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ [1] اور آیت ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ﴾ (۹۳-۳) میں ایک قرأت تخفیف دال کے ساتھ بھی منقول ہے۔ [2] شاعر نے کہا ہے۔ [3] ()

(۴۴۲) لَيْتَ شِعْرِيْ عَنْ خَلِيْلِي مَا الَّذِيْ
غَالَهٗ فِيْ الْحُبِّ حتی وَدَعَهٗ

کاش! مجھے میرے دوست کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اسے محبت سے کس چیز نے روک دیا کہ وہ اسے چھوڑ بیٹھا ہے۔

اَلتَّوَدُّعُ کے معنی تن آسان ہونے کے ہیں۔اور فُلَانٌ مُتَّدِعٌ وَمُتَوَدِّعٌ وَفِیْ دَعَةٍ کے معنی ہیں کہ فلاں آسودہ حال اور عیش و آرام میں ہے۔ اصل میں یہ معنی ودع بمعنی تَرَكَ سے ماخوذ ہیں۔یعنی اس نے مشقت اور تکلیف کے سبب طلب معاش کے لیے جدوجہد کرنا چھوڑ دیا ہے۔

اَلتَّوْدِيْعُ: یہ بھی دَعَةٌ (سکون) سے مشتق ہے اور تودیع کے اصل معنی مسافر کو الوداع کہنے کے ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ اسے سفر کی تکالیف سے محفوظ رکھے اور اسے آرام کی حالت میں پہنچا دے پھر یہ لفظ مسافر کو رخصت کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسا کہ لفظ تسلیم، اصل میں اس کے معنی سلامتی کی دعا کے ہیں کہا جاتا ہے وَدَّعْتُ فُلَانًا (میں نے فلاں کو چھوڑ دیا) چنانچہ آیت: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾ (۹۳-۳) (اے محمد!) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔

---

[1] هذا قول علماء النحو وفي الحديث ودعوا الحبشة ماودعوكم وفي المستوفي ان كل ذالك وارد في كلام العرب ولاعبرة بكلام النحاة (روح المعاني ۱۵٦/۳۰)

[2] قال ابن جني وهي قراءة النبي صلى الله عليه وسلم وفيه تفصيل ذكره صاحب الروح (۱۵٦/۳۰)۔

[3] والبيت مما اختلف في نسبته وروايته ففي اللسان والمحكم (ودع) في الودبدل في الحب۔ قال الازهري: روى ابن اخي الاصمعي ان هذا الشعر لانس بن زنيم الليثي الصحابي وفيه عن اميري موضع عن خليلي وفي الطبرسي (۳۰: ۱٦۳) وروح المعاني (۳۰: ۵٦) والاشباه النحويه (۱: ۲۱۵) والبحر (۸: ۴۸۵) وابن خالويه (۱۱۷) او العيون (۳: ۱۵٦) معزوالي ابي الاسود الدئلي وفي الاصابة رقم (۲٦۷) في ثلاثة قالها في عبدالله بن عامر حين ابطاء عليه عطاءه والبيت في البلدان (رسم: ودعان) بغير عزو (في حماسة البحري ۳۷۳) برواية اخرى ايضا لانس بن انس الليثي وايته' سل اميري مالذي غيرلي۔ وده والنفع حتى ودعه

میں وَدَّعْتُ فُلَانًا (میں نے فلاں کو چھوڑ دیا) کی طرح صرف چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کنایہ کے طور پر میت کو مُوْدَعٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اِسْتَوْدَعْتُكَ غَيْرَ مُوْدَعٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی درازی عمر کی دعا کے ہیں۔اور اسی سے شاعر کا قول ہے۔ ❶

(۴۴۳) وَدَّعْتُ نَفْسِيْ سَاعَةَ التَّوْدِيْعِ

کہ الوداع کے وقت میری جان ہوا ہوگئی۔

(۴۴۴) تُعَفِّي بذيل المرط اِذَا جِئْتُ مَوْدِقِي

تُعَفِّيْ کے معنی نشان مٹانے کے ہیں اور مرط بڑی چادر کو کہتے ہیں جو ستر کے لیے عورتیں اوپر اوڑھتی ہیں یہاں شاعر نے قدم کے پڑنے کی جگہ کو موضع مطر کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور شعر کے معنی یہ ہیں کہ جب میں اپنی محبوبہ کے پاس آتا ہوں تو وہ اپنی چادر سے میرے قدموں کے نشان مٹا دیتی ہے۔

(و د ق)

اَلْوَدْقُ : بعض نے کہا ہے کہ بارش میں جو غبار سا نظر آتا ہے اسے وَدْقٌ کہا جاتا ہے۔اور کبھی اس سے مراد بارش بھی ہوتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ﴾ (۲۴۔۴۳) پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل کر (برس) رہا ہے۔

اور گرمی کی شدت سے ہوا میں جو لہریں نظر آتی ہیں انہیں وَدِيْقَةٌ کہتے ہیں۔اور وَدَقَتِ الدَّابَّةُ وَاسْتَوْدَقَتْ کے معنی ہیں: مادہ چوپایہ کا نر کی خواہش کے وقت، رطوبت نکالنا چنانچہ اس مادہ (چوپایہ) کو جو نر کی خواہش میں رطوبت نکال رہی ہو، وَدِيْقٌ یا وَدُوْقٌ کہتے ہیں۔

اور جہاں بارش ہوئی ہو اس جگہ کو مَوْدِقٌ (ظرف) کہا جاتا ہے۔شاعر نے کہا ہے ❷ (الطّویل)

(و د ی)

اَلْوَادِيْ: اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہتا ہو اسی سے دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ زمین کو وادی کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ (۲۰۔۱۲) تم (یہاں) پاک میدان (یعنی) طوی میں ہو۔

اس کی جمع اَوْدِيَةٌ آتی ہے جیسے نَادٍ کی جمع اَنْدِيَةٌ اور نَاجٍ کی جمع اَنْجِيَةٌ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر اس سے اپنے اپنے انداز کے مطابق نالے بہہ نکلے۔

اور حدیث میں ہے ❸ (۱۳۷)

((لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَّابْتَغٰى ثَالِثًا)) کہ اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہش مند ہوگا۔

---

❶ لم اجده ۱۲۔

❷ قاله امرئو القيس وصدره: دخلت على بيضاء جم عظامها وفي ديوانه ۹۰ (السند وبى) بذيل الدعر بدن بذيل المرط راجع ديوانه و للسان (ودق) والعقد الثمين (۱٤۱) ومختار الشعر الجاهلى (۱ : ٦۰)

❸ رواه الترمذى (۲ : ۵۷) عن انس بن مالك واحمد و الشيخان عن ابن عباس و مسلم فى صحيحه عن ابن الزبير وابن ماجة عن ابى هريرة والبخارى فى التاريخ عن بريرة وفى كنز العمال (ج۳ رقم ۱۱۱٦ ـ ۱۱۲۰) باختلاف الفاظه وفى محاضرات الادباء (٤/۴۳۳ :) كان فى مصحف عبدالله بن مسعود رضى الله عنه۔

اور استعارہ کے طور پر مذہب، طریقہ اور اسلوب بیان کو وادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
فُـلَانٌ فِیْ وَادٍ غَیْرِ وَادِیْكَ کہ فلاں کا مسلک تجھ سے جداگانہ ہے اور قرآن پاک نے شعراء کی مذمت کرتے ہوئے ان کے متعلق کہا ہے۔
﴿اَلَمْ تَـرَ اَنَّهُـمْ فِـیْ كُـلِّ وَادٍ یَّهِیْـمُـوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۵) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں۔
تو یہاں فِـیْ كُـلِّ وَادٍ سے مختلف اسالیب سخن مراد ہیں جیسے، مدح، ہجو، جدل، غزل وغیرہ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶ ()

(۴۴۵) اِذَا مَـاقَـطَـعْـنَا وَادِیًا مِنْ حَدِیْثِنَا
اِلٰی غَیْرِهٖ زِدْنَا الْاَحَادِیْثَ وَادِیًا

جب ہم موضوع سخن کی ایک وادی کو قطع کر لیتے ہیں تو دوسری وادی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور کنایہ کے طور پر مرد کی اس رطوبت کو وَدْیٌ کہا جاتا ہے جو عورت سے لذت اندوزی کے وقت یا پیشاب کے بعد خارج ہوتی ہے اور اَمْـذٰی وَ اَمْـنٰی کی طرح اودی (افعال) کے معنی نر کا ودی (رطوبت) خارج کرنے کے ہیں اور یہ مَـذٰی وَاَمْنٰی کی طرح مجرد و مزید فیہ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔
اَلْـوَدِیُّ: چھوٹے پودے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی پانی کی طرح طول میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔
اَوْدَاهُ کے معنی ہلاک کرنے کے ہیں گویا اس کے خون کو بہا دیا اسی سے وَدَیْـتُ الْـقَتِیْلَ کا محاورہ ہے جس کے معنی مقتول کا خون بہا ادا کرنے کے ہیں اور دِیَةٌ اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَـدِیَةٌ مُّسَـلَّـمَةٌ اِلٰٓی اَهْلِهٖ﴾ (۴۔۹۲) تو وارثان مقتول کو خون بہا دینا۔

(و ذ ر)

یَـذَرُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو قلت اعتداد کی وجہ سے پھینک دینے کے ہیں۔ (پھر صرف چھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے)۔ اس کا فعل ماضی استعمال نہیں ہوتا چنانچہ فرمایا:۔
﴿قَـالُوْا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ یَـعْبُـدُ اٰبَآؤُنَا﴾ (۷۔۷۰) وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم اکیلے خدا ہی کی عبادت کریں اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں ان کو چھوڑ دیں؟
﴿وَ یَـذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ﴾ (۷۔۱۲۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔
﴿فَذَرْهُمْ وَ مَا یَفْتَرُوْنَ﴾ (۶۔۱۳۷) تو ان کو چھوڑ دو کہ وہ جانیں اور انکا جھوٹ۔
ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور آیت:۔ ﴿وَ یَـذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ (۲۔۲۳۴) اور عورتیں چھوڑ جائیں۔
میں یَتْـرُكُوْنَ یا یَخْلُفُوْنَ کی بجائے یَذَرُوْنَ کا صیغہ اختیار کرنے میں جو خوبی ہے وہ اس کے بعد دوسری کتاب میں بیان کریں گے۔
اَلْـوَذْرَةُ: گوشت کی چھوٹی سی بوٹی کو کہتے ہیں اور قلت

❶ لم اجدہ ۱۲۔

اعتناء کے سبب اسے اس کا نام سے پکارتے ہیں جیسا کہ حقیر شخص کے متعلق ھُوَ لَحْمٌ عَلٰی وَضَمٍ یعنی وہ ذلیل ہے) محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(و ر ث)

اَلْوَرَاثَۃُ وَالْاِرْثُ کے معنی عقد شرعی۔ یا جو عقد کے قائم مقام ہے کے بغیر کسی چیز کے ایک شخص کی ملکیت سے نکل کر دوسرے کی ملکیت میں چلے جانا کے ہیں۔ اسی سے میت کی جانب سے جو مال ورثاء کی طرف منتقل ہوتا ہے اسے اِرْثٌ تُرَاثٌ اور مِیْرَاثٌ کہا جاتا ہے اور تُـراث اصل میں وُراث ہے واوٗ (مضموم) کے شروع میں آنے کی وجہ سے اسے تا سے تبدیل کر لیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا﴾ (۸۹۔۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

اور حج کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶ (۱۳۸) ((اُثْبُتُوْا عَلٰی مَشَاعِرِكُمْ فَاِنَّكُمْ عَلٰی اِرْثِ اَبِیْكُمْ)) کہ اپنے مشاعر (مواضع نسک) پر ٹھہرے رہو تم اپنے باپ (ابراہیم علیہ السلام) کے ورثہ پر ہو۔ تو یہاں ارث کے معنی اصل اور بقیہ نشان کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ❷ ()

(۴۴۶) فَیَنْظُرُ فِیْ صُحُفٍ كَالرِّیَا
فِیْهِنَّ اِرْثُ كِتَابٍ مُحِیَ

وہ صحیفوں میں تانت باندھنے والے کی طرح غور کرتا ہے جن میں کہ مٹی ہوئی کتابت کا بقیہ ہے۔ اور محاورہ میں وُرِثْتُ مَالًا عَنْ زَیْدٍ وَّوَرِثْتُ زَیْدًا (میں زید کا وارث بنا) دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ﴾ (۲۷۔۱۶) اور سلیمان داؤد علیہ السلام کے قائم مقام ہوئے۔

﴿وَّ وَرِثَهٗ اَبَوٰهُ﴾ (۴۔۱۱) اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں۔

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ (۲۔۲۳۳) اور اسی طرح نان ونفقہ بچے کے وارث کے ذمہ ہے۔ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا﴾ (۴۔۱۸) مومنو! تم کو جائز نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔

اور اَوْرَثَنِی الْمَیِّتُ كَذَا کے معنی ہیں میت نے مجھے اتنے مال کا وارث بنایا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ كَلٰلَةً﴾ (۴۔۱۱) اور اگر ایسے مرد یا عورت کی میراث ہو جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا۔

اور اَوْرَثَنِی اللّٰهُ كَذَا کے معنی کسی چیز کا وارث بنا دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْكِتٰبَ﴾ (۴۰۔۵۳) اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا۔

﴿وَاَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِیْنَ﴾ (۴۴۔۲۸) اور ہم نے

---

❶ الحدیث باختلاف الفاظه فی ابوداؤد والترمذی (۲/۹۹۔۱۰۰) مع تحفة الاحوری والنسائی (۲/۴۵) وابن ماجة (۲/۲۲۳) والحاکم (۱/۴۶۲) والبیهقی فی سنن الکبری (۵/۱۱۵) والشافعی فی رسالته (رقم ۱۳۲) من طریق سفیان ابن عیینة باسناده وقال الترمذی حدیث سریع حدیث حسن لا نعرفه الامن حدیث ابن عیینه عن عمرو بن دینار وانظر لتخریجه ایضا (الفتح الکبیر ۲/۳۳۴)

❷ لم اجده ۱۲۔

دوسرے لوگوں کو ان کا مالک بنا دیا۔

﴿وَ اَوْرَثَکُمْ اَرْضَهُمْ﴾ (۳۳۔۲۷) اور ان کی زمین ...... کا تم کو وارث بنایا۔

﴿وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ﴾ (۷۔۱۳۶) اور جو لوگ (کمزور سمجھے جاتے تھے) ان کو...... وارث کر دیا۔ ہر وہ چیز جو بلا محنت و مشقت حاصل ہو جائے اسکے متعلق وَرَثَ کَذَا کہتے ہیں اور جب کسی کو خوشگوار چیز بطور عطیہ دی جائے تو اُوْرِثَ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْهَا﴾ (۴۳۔۷۲) اور یہ جنت جس کے تم مالک کر دیئے گئے ہو۔ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۰،۱۱) یہی لوگ میراث حاصل کرنے والے ہیں (یعنی جو...... میراث حاصل کریں گے)۔

اور آیت: ﴿وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ﴾ (۱۹۔۶) اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو۔

میں وراثت سے مراد مال کا ورثہ نہیں ہے بلکہ علم و فضل اور نبوت کا ورثہ مراد ہے کیونکہ دنیا کے مال کی تو انبیاء کرام کی نظر میں کچھ قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی فکر کریں۔ بلکہ وہ نہ مال کو جمع کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے مالک بنتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔

❶ (۱۳۹) ((اِنَّا مَعَاشِرَ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَاهُ صَدَقَةٌ)) ہم انبیاء کا گروہ جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اور ہمارا کوئی وارث نہیں بن سکتا۔

تو یہاں مَعَاشِرَ الْاَنْبِیَاءِ منصوب عَلَی الْاِخْتِصَاصِ ہے اور تَرَکْنَاهُ سے مراد علم ہے اور اس صدقہ میں تمام امت برابر کے شریک ہے۔ اور جو حدیث میں آیا ہے ❷ (۱۴۰) ((اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ)) (کہ علماء کرام انبیاء عظام کے وارث ہیں) تو اس سے مراد بھی ورثہ علم ہی ہے اور اس پر ورثہ کا اطلاق اس لیے ہوا ہے کہ کسی احسان اور معاوضہ کے بغیر ملتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا ❸ (۱۴۱) ((اَنْتَ اَخِیْ وَوَارِثِیْ)) تو میرا بھائی اور وارث ہے لیکن ساتھ ہی فرما دیا وَمَا اَرِثُكَ کہ میں تیرا وارث نہیں ہوں گا اسی طرح فرمایا ❹ (۱۴۲)

((مَا وَرَّثَتِ الْاَنْبِیَاءُ قَبْلِیْ کِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ)) کہ مجھ سے پہلے انبیاء کا ورثہ کتاب اللہ اور میری سنت ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو وارث کہا ہے کیونکہ آخر کار تمام اشیاء اسی کی ملک میں جانے والی ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ ﴿وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۳۔۱۸۰) اور آسمانوں اور زمین کا وارث خدا ہی ہے۔

---

❶ الحدیث باختلاف الفاظه فی السنن الکبری للنسائی واصله متفق علیه بطرق من حدیث عائشة وانظر لتخریجه کنز العمال (۱۱: رقم ۹۰۔۹۳) واللالی المصنوعة ج۲ ص۴٤۲

❷ رواه ابوداؤد والترمذی وابن ماجة وزوائد ابن حبان رقم (۸۰) وفیه ان العلماء من حدیث ابی الدرداء (حدیث واه) وله طرق عند الطبرانی وفی الباب عن البراء بن عمرو بن العاص وراجع تخریج الکشاف للحافظ ابن حجر رقم (۱۱۷ ص ۱۲٤)۔

❸ وفی روایة انت وارثی وعن ابن بریدة عن ابیه مرفوعا ان وصیی و وارثی علی بن ابی طالب اللالی المصنوعة (ج۱ ص۳۵۹) وفی الخصائص من سنن الکبری للنسائی حدیث طویل فی اخوة علی علیّ قال العراقی فی تخریج الاحیاء (ج۲۔ ص۱۹۰) وکل ما ورد فی اخوته فضعیف لایصح من شیء۔

❹ قطعة من حدیث سابق ولم اجده بهذا اللفظ ۱۲۔

اور فرمایا:۔

﴿وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ﴾ (۱۵۔۲۳) اور ہم ہی (سب کے) وارث (مالک) ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے وارث ہونے کے متعلق (یہ بھی) امر وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (کہ آج کس کی بادشاہت ہے) کے ساتھ منادی فرمائیں گے تو جواب میں کہا جائے گا۔ ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۴۰۔۱۶) خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

وَرِثْتُ عِلْمًا مِنْ فُلَانٍ کے معنی کسی سے علم حاصل کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَرِثُوا الْكِتٰبَ﴾ (۷۔۱۶۹) جو کتاب کے وارث بنے۔

﴿أُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ (۴۲۔۱۴) (اور جو لوگ) ان کے بعد خدا کی کتاب کے وارث ہوئے۔

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ﴾ (۳۵۔۱۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا......

﴿يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ (۲۱۔۱۰۵) میرے نیکوکار بندے ملک کے وارث ہوں گے۔

اور وراثت حقیقی تو یہ ہوتی ہے کہ انسان کو ایسی چیز حاصل ہو جائے جس کے متعلق اس پر نہ کوئی محاسبہ ہو اور نہ کسی قسم کی ذمہ داری عائد ہو۔اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے چونکہ دنیا سے بوقت ضرورت قدر کفایت سے زیادہ نہیں لیتے اور پھر اسے جائز طریقہ سے حاصل کرتے ہیں تو جو شخص دنیا کو ان شرائط کے ماتحت حاصل کرے گا اس پر کسی قسم کا محاسبہ یا عقاب نہیں ہوگا بلکہ وہ مال اس کے لیے عفو وصفو ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے۔

(۱۴۲) ((مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ فِي الدُّنْيَا لَمْ يُحَاسِبْهُ اللّٰهُ فِي الْاٰخِرَةِ)) کہ جو شخص دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرلے گا۔آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کسی قسم کا محاسبہ نہیں ہوگا۔

(و ر د)

اَلْوُرُوْدُ: یہ اصل میں وَرَدْتُّ الْمَاءَ (ض) کا مصدر ہے جس کے معنی پانی کا قصد کرنے کے ہے۔پھر ہر جگہ کا قصد کرنے پر بولا جاتا ہے اور پانی پر پہنچنے والے کو وَارِدٌ اور پانی کو مَوْرُوْدٌ کہا جاتا ہے اور اَوْرَدَ الْاِبِلَ: (افعال) عَلَى الْمَاءِ کے معنی اونٹوں کو پانی پر وارد کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ﴾ (۲۸۔۲۳) اور جب مدین کے پانی کے مقام پر پہنچے۔

اَلْوِرْدُ: اس پانی کو کہتے ہیں جو وارد ہونے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔اور یہ صَدْرٌ (لوٹنا) کی ضد بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور بخار کی باری کے دن کو بھی وِرْدٌ کہتے ہیں۔

اور تقطیع کے طور پر دوزخ کی آگ میں داخل ہونے پر بھی وَرَدَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔جیسے فرمایا۔

﴿فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ﴾ (۱۱۔۹۸) اور ان کو دوزخ میں جا اتاوے گا اور جس مقام پر وہ اتارے جائیں گے وہ برا ہے۔

﴿اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا﴾ (۱۹۔۸۷) دوزخ کی طرف پیاسے......

﴿اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۸) تم (سب) اس میں داخل ہو کر رہو گے۔

﴿مَّا وَرَدُوْهَا﴾ (۲۱۔۹۹) تو اس میں داخل نہ

ہوتے۔

اَلْــوَارِدُ: (ایضاً) اس شخص کو بھی کہا گیا ہے جو قافلے کے آگے جا کر پانی لاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ ﴿فَـاَرْسَـلُـوْا وَارِدَهُمْ﴾ (۱۲۔۱۹) اور انہوں نے (پانی کے لیے) اپنا سقا بھیجا۔

ہر وہ شخص جو پانی پر پہنچ جائے اسے بھی وارد کہا جاتا ہے۔ اور آیت

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (۱۹۔۷۱) اور تم میں سے کوئی (شخص) نہیں مگر اسے اس پر سے گزرنا ہوگا۔

میں بعض نے وَارِدُهَا کو وَرَدْتُ مَاءَ كَذَا۔ کے محاورہ سے لیا ہے جس کے معنی پانی پر حاضر ہونے کے ہیں اور اس میں اترنا شرط نہیں ہے [1] اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں اترنا بھی شرط ہے اور اولیاء اللہ اور صالحین بھی ایک مرتبہ دوزخ کی آگ میں داخل ہوں گے لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کی حالت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سی ہوگی کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا۔ تو ان پر آگ کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ [2] چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۲۱۔۶۹) ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب سلامتی بن جا)

اور اس مسئلہ پر بحث کے لیے ذرا تفصیل درکار ہے۔ جو یہاں پر ہمارا مقصد نہیں۔

اور جس شخص کو باری کا بخار چڑھا ہوا ہو اسے بھی مَوْرُوْدٌ کہا جاتا ہے اور شَعْرٌ وَارِدٌ لمبے بالوں کو کہتے ہیں۔ جو عورت کی کمر یا اس کے سرینوں تک دراز ہوں۔

اَلْــوَرِيْدُ: رگ جس کا تعلق جگر اور دل کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ خون اور روح کا مجری بنتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَنَـحْـنُ اَقْـرَبُ اِلَيْـهِ مِـنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔

یعنی اس کی روح سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اَلْــوَرْدُ: اصل میں گل سرخ کو کہتے ہیں۔ اور یہ وَارِدٌ سے ہے جس کے معنی قافلے سے پہلے پانی پر آنے والا کے ہیں۔ مشہور ہے کہ گلاب کا پھول تمام پھولوں سے پہلے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے وَرْدٌ کہا جاتا ہے۔ پھر ہر درخت کے پھول کو (مجازاً) وَرْدٌ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ درخت کے پھولدار ہونے پر وَرَّدَ الشَّجَرُ بولا جاتا ہے۔ پھر گھوڑے کے رنگ کو بھی گل سرخ کے ساتھ تشبیہ دے کر فَــرَسٌ وَرْدٌ کہا جاتا ہے۔ اور آثار قیامت کے طور پر جب آسمان سرخ ہو جائے گا تو اسے بھی قرآن پاک نے وَرْدَةٌ کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ (۵۵۔۳۷) تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا (تو وہ کیسا ہولناک دن ہوگا)۔

---

[1] قال في روح المعاني واردها اي داخلها كما ذهب الى ذالك جمع كثير من سلف المفسرين واهل السنة وفي معناه رواية جابر بن عبدالله مرفوعا اخرجه احمد والحكم الترمذي وابن المنذر والحاكم وصححه جماعة عن ابي اميه وقد ذكر الامام الرازي لهذا الدخول عدة فوائد فليراجع وعند الحسن وقتادة المرور كما روى ذالك عن عبدالله بن مسعود كذا في الروح ١١١/١٦۔

[2] وهو قول عبدالله بن مسعود في رواية ابن ابي حاتم عنه واخرجه عبد بن حميد عن وليد بن نمير ايضا ويدل عليه قوله تعالىٰ ولما ورد ماء مدين راجع الروح وابن كثير ١٢۔

(و ر ق)

اَلْوَرْقُ: درخت کے پتے۔ اس کی جمع اَوْرَاقٌ اور واحد وَرَقَۃٌ آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا﴾ (۶۔۵۹) اور کوئی پتہ نہیں جھڑتا مگر وہ اس کو جانتا ہے۔

اور وَرَّقَتِ الشَّجَرَۃُ کے معنی درخت کا پتے دار ہونا کے ہیں اور سرسبز خوبصورت پتے دار درخت کو وَارِقَۃٌ کہا جاتا ہے۔ عَامٌ اَوْرَقُ کے معنی قحط سالی کے ہیں۔ اور اَوْرَقَ فُلَانٌ کے معنی ناکام ہونے کے ہیں گویا وہ پتے دار درخت ہے جو بدون ثمر کے ہے اور اس کے بالمقابل آیت ﴿وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ﴾ (۱۸۔۳۴) اور اس کو پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔

میں مال کا ثمر کہا ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ❶ اور رنگ کی تروتازگی کے لحاظ سے خاکستری رنگ کے اونٹ کو بَعِيْرٌ اَوْرَقُ کہا جاتا ہے اسی طرح حَمَامَۃٌ وَرْقَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنی خاکی رنگ کی کبوتری یا فاختہ کے ہیں۔

اَوْرَقَ: (ایضاً) مال دار ہونا۔ گویا کثرت کے لحاظ سے مال کو درخت سے پتوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ مال کو ثَرٰی تُرَابٌ یا سَيْلٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس معنی میں کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔ لَهٗ مَالٌ كَالتُّرَابِ اَوِ السَّيْلِ اَوِ الثَّرٰى: یعنی وہ بہت زیادہ مالدار ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷ (الرجز)

(۴۴۷) وَاغْفِرْ خَطَايَايَ وَثَمِّرْ وَرَقِي

میری خطائیں معاف فرما اور میرا مال بڑھا دے۔ اور اَلْوَرِقُ (بکسر الراء) خصوصیت کے ساتھ دراہم کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ﴾ (۱۸۔۱۹) تو اپنے میں سے کسی کو یہ سکہ دے کر شہر بھیجو۔

ایک قراءت میں بِوَرْقِكُمْ وَبِوُرْقِكُمْ ہے اور یہ وَرْقٌ وَوَرِقٌ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ جیسے كَبْدٌ وَ كَبِدٌ۔

(و ر ی)

وَارَيْتُ كَذَا: کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ﴾ (۷۔۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔

تَوَارٰی: (لازم) چھپ جانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ (۳۸۔۳۲) یہاں تک کہ (آفتاب) پردے میں چھپ گیا۔

وَرَّى الْخَبَرَ کے معنی توریہ کرنے کے ہیں۔ یعنی اصل بات کو چھپا کر اسے کسی اور طریقہ سے ظاہر کرنا...... (اس طور پر کہ جھوٹ بھی نہ ہو۔ اور اصل مقصد بھی ظاہر نہ ہونے پائے) چنانچہ حدیث میں ہے۔ ❸ (۱۴۳) ((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اراد غزوا وری بغیرہ)) کہ آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تو توریہ سے کام لیتے۔

اَلْوَرٰی: بقول خلیل مخلوقات کو کہتے ہیں جو ایک وقت میں

---

❶ قد مر فی (ث م د) ۱۲

❷ قالہ العجاج وقبلہ: ایاك ادعو فتقبل ملقی والشطر فی اللسان (ورق۔ بلق) او مجالس ثعلب وتھذیب الاصلاح (۱ : ۱۷۵) ابن خالویہ ۲۵ والصاحبی (۱۸۷) واضداد ابی الطیب (۲۶۲) والارجوزۃ فی دیوانہ (۳۴۔ ۳۵)۔

❸ رواہ البخاری (۴۱۴) وایضا فی مواضع ۱۲۔

زمین پر موجود ہو۔اس میں ماضی اور مستقبل کی نسل شامل نہیں ہوتی اوران کو اَلْوَرٰی اس لیے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ اپنے اشخاص سے زمین کو چھپائے ہوئے ہیں۔

اَلْـوَرَآءَ کے معنی خلف یعنی پچھلی جانب کے ہیں۔مثلاً جو زید کے پیچھے یابعد میں آئے اس کے متعلق وَرَاءَ زَیْدٍ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ مِـنْ وَّرَآءِ اِسْـحٰـقَ یَعْقُوْبَ﴾ (۱۱۔۷۱) اور اسحاق کے بعد یعقوب (کی) خوش خبری دی۔

﴿ارْجِـعُوْا وَرَآئَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُوْرًا﴾ (۵۷۔۱۳) پیچھے کولوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو۔

﴿فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ﴾ (۴۔۱۰۲) تو وہ پرے ہو جائیں۔

اور کبھی بمعنی قُـــدَّامٌ (سامنے کی طرف) بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ كَـانَ وَرَآءَ هُـمْ مَّـلِكٌ یَّـاْخُـذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا﴾ (۱۸۔۷۹) اوران کے سامنے (کی طرف) ایک بادشاہ تھا جو ہرایک کشتی کوزبردستی چھین لیتا تھا۔اورآیت:۔

﴿اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾ (۵۹۔۱۴) یادیواروں کی اوٹ میں۔ میں دیوار کی دونوں جانب مراد ہوسکتی ہیں۔کیونکہ جو شخص کسی ایک جانب میں ہوگا تو دوسری جانب اس کے لیے وَرَاءَ ہی ہوگی۔اورآیت: ﴿تَرَكْتُمْ مَّـا خَـوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ (۶۔۹۵) اور جو (مال ومتاع) ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔

میں مرنے کے بعد پیچھے چھوڑ آنا مراد ہے۔اوراس میں ان کے لیے سرزنش ہے کہ تم نے مال خرچ کر کے ثواب آخرت کیوں نہ حاصل کیا۔

اورآیت:۔

﴿فَـنَـبَـذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِـمْ﴾ (۳۔۱۸۷) تو انہوں نے اس کو پس پشت پھینک دیا۔

بھی تبکیت (ملامت) پر محمول ہے کہ انہوں نے نہ تو کتاب اللہ پر عمل ہی کیا اور نہ کبھی اس کی آیات پر غور کیا۔اورآیت

﴿فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ (۲۳۔۷) اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں۔

میں وَرَآءَ ذَالِكَ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ان بیان کردہ حلائل کے علاوہ دیگر کا خواہش مند ہو یا ذوات المحارم سے تعرض کرے گا تو اس نے حدود شریعت سے تجاوز کیا اور اس کی حرمت کے پردہ کو چاک کر ڈالا۔اورآیت۔

﴿وَ یَـكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ (۲۔۹۱) (یعنی) یہ اس کے سوا اور (کتاب) کو نہیں مانتے۔

میں وَرَآءَهٗ سے دوسری آسمانی کتابیں مراد ہیں۔اور وَرِیَ الـزَّنْـدُ یَـرِیْ وَرْیًا کے معنی چقماق کے پیچھے سے آگ نکالنے کے ہیں تو گویا اس میں آگ کے پوشیدہ ہونے کے معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الرمل)

(۴۴۸) كَكُمُوْنِ النَّارِ فِیْ حَجَرِهٖ

جیسے پتھر کے اندر آگ پوشیدہ ہوتی ہے۔

---

[1] قاله ابو نواس (الحسن بن هانئ) وصدره: یكن الشنآن فیه لنا...... والبیت فی طرائف الشعراء (۷۳) ومجموعة المعانی (۱۶۷) والعقد (۱ : ۲۵۲) وفی الموشح للمرزبانی ۲۷۳ : اخذ علی بن المبارك علی ابی نواس فی شعره فی حرفین احد. هما هذا البیت وقال انما كان ینبغی له ان یقول فی حجرها بدل فی حجره والثانی فی قوله: اسرع من قول قطاة قَطًّا وكان ینبغی له ان یقول قطا بالتخفیفِ انظر الحیوان للجاحظ (۲ : ۳۳)

چنانچہ قرآن میں ہے:۔
﴿اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ﴾ (۵۶۔۷۱) بھلا دیکھوتو جوآگ تم درخت سے نکالتے ہو۔اور کامیاب شخص کے متعلق کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ وَارِی الزَّنْدِ : فلاں کا چقماق آگ دینے والا ہے۔یعنی وہ کامیاب ہے اوراس کے بالمقابل کَابِیُ الزَّنْدِ کے معنی ناکام کے ہیں۔اور چربی دار گوشت کو اَللَّحْمُ الْوَارِیْ کہا جاتا ہے۔اَلْوَرَآءُ: (ایضاً) اولاد کی اولاد یعنی پوتے یا نواسے کو کہا جاتا ہے اور وَرَاءَكَ کسی کام پر ابھارنے کے لیے بولا جاتا ہے۔یعنی پیچھے ہٹ جاؤ۔چنانچہ محاورہ ہے۔

وَرَاءَكَ اَوْسَعُ لَكَ: اس میں وَرَاءَكَ منصوب بفعل مضمر ہے یعنی اِئْتِ وَرَاءَكَ اور بعض نے اس کا اصل یکُنْ اَوْسَعَ لَكَ بیان کیا ہے اَیِ تَنَحَّ وَائْتِ مَکَانًا اَوْسَعَ لَكَ۔

التَّوْرَاةُ: اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہیں ورثہ میں ملی تھی۔بعض نے کہا ہے کہ یہ فَوْعَلَةٌ کے وزن پر ہے اوراس میں تاء واؤ سے مبدل ہے جیسے تَیْقُوْرٌ جو وَقَارٌ سے بنا ہے اصل میں وَیْقُوْرٌ ہے اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے اورانہوں نے اسے تَفْعَلَةٌ کے وزن پر نہیں بنایا کیونکہ یہ وزن کلام عرب میں قلیل الوجود ہے۔

(و ز ر)

اَلْوَزَرُ: پہاڑ میں جائے پناہ۔قرآن پاک میں ہے۔﴿کَلَّا لَا وَزَرَ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ﴾ (۷۵۔۱۱) بے شک کہیں پناہ نہیں اس روز پروردگار ہی کے پاس جانا ہے۔

اَلْوِزْرُ: کے معنی بارگراں کے ہیں اور یہ معنی وَزَرٌ سے لیا گیا ہے جس کے معنی پہاڑ میں جائے پناہ کے ہیں اور جس طرح مجازاً اس کے معنی بوجھ کے آتے ہیں اسی طرح وِزْرٌ بمعنی گناہ بھی آتا ہے (اسی کی جمع اَوْزَارٌ ہے) جیسے فرمایا:۔

﴿لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ کَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۱۶۔۲۵) (اے پیغمبر! ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی (اٹھائیں گے) جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَ لَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ (۲۹۔۱۳) اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی۔

اور دوسروں کا بوجھ اٹھانے کی حقیقت کی طرف آنحضرتؐ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا [1] (۴۴)

((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً کَانَ لَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَیْرِ اَنْ یُّنْقَصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَیْءٌ وَّمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَیِّئَةً کَانَ لَهٗ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا)) کہ جس شخص نے اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر ملے گا اوران لوگوں کا بھی اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے بدوں اس کے کہ ان کے اجر میں کسی قسم کی کمی ہو اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا بوجھ ہوگا اوران لوگوں کا بھی جو اس پر عمل کریں گے۔

---

[1] الحدیث ذکرہ مسلم فی صحیحه من حدیث جریر بن عبدالله و الغزالی فی الحیاء (راجع تخریج العراقی ۲/۷۳) اشار الیه القبتی فی غریبه' انظر القرطبی (۱۳/۳۳۱) والبحر (۷/۱۴۴)۔

تو یہاں ان لوگوں کے اجر یا بوجھ سے ان کی مثل اجر یا بوجھ مراد ہے اور آیت کریمہ میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔اور آیت:۔ ﴿وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (۶۔۱۶۵) اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ مَحْمُوْل عَنْهُ یعنی وہ دوسرا اس گناہ سے بری ہو جائے (لہٰذا ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے) اور آیت۔ ﴿وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ﴾ (۹۴۔۲) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا۔

میں وِزْرٌ سے مراد وہ لغزشیں ہیں جو جاہلی معاشرہ کے رواج کے مطابق قبل از نبوت آنحضرت ﷺ سے سرزد ہوئی تھیں۔

اَلْوَزِیْرُ: وہ ہے جو امیر کا بوجھ اور اس کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہو۔اور اس کے عہدہ کو وِزَارَةٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ﴾ (۲۰۔۲۹) اور میرے گھر والوں میں سے (ایک کو) میرا وزیر (یعنی مددگار) مقرر فرما۔

اَوْزَارُ الْحَرْبِ: اس کا مفرد وِزْرٌ ہے اور اس سے مراد اسلحہ جنگ ہے [1] اور آیت کریمہ:۔ ﴿وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ﴾ (۲۰۔۸۷) بلکہ ہم لوگوں کے زیوروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔میں زیورات کے بوجھ مراد ہیں۔

اَلْمُوَازَرَةُ: (مفاعلة) کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنے کے ہیں اور وَازَرْتُ فُلَانًا مُوَازَرَةً کے معنی ہیں: میں نے اس کی مدد کی۔

(وزع)

وَزَعْتُهُ عَنْ كَذَا کے معنی کسی آدمی کو کسی سے کام سے روک دینا کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ﴾ (۲۷۔۱۷) اور سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں اور انسانوں کے لشکر جمع کیے گئے اور وہ قسم وار کیے گئے تھے۔

تو یُوْزَعُوْنَ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عساکر باوجود کثیر التعداد اور متفاوت ہونے کے غیر مرتب اور منتشر نہیں تھے۔جیسا کہ عام طور پر کثیر التعداد افواج کا حال ہوتا ہے بلکہ وہ نظم وضبط میں تھے کہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے تھے اور بعض نے یُوْزَعُوْنَ کے یہ معنی کیے ہیں کہ لشکر کا اگلا حصہ پچھلے کی خاطر رکا رہتا تھا۔اور آیت:۔ ﴿وَیَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَی النَّارِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ﴾ (۴۱۔۱۹) جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے تو ترتیب وار کر لیے جائیں گے۔

میں یُوْزَعُوْنَ سے انہیں عقوبت کے طور پر روک لینا مراد ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ﴾ (۲۲۔۲۱) اور ان کے مارنے ٹھوکنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہونگے۔ محاورہ ہے [2] (۱۴۴) لَا بُدَّ لِلسُّلْطَانِ مِنْ وَزَعَةٍ کہ سلطان کے لیے محافظ دستہ یا کارندوں کا ہونا ضروری ہے۔

---

[1] وفی القرآن: ﴿حتیٰ تضع الحرب اوزارها﴾ (٤٧: ٤)

[2] قاله الحسن البصری لما ولی القضاء وازدحم الناس علیه فاذوه انظر المیدانی (رقم ٢١٠٤) واللسان (وزع) والنهایة (٤/٢٢١) والفائق (٢/٣٠٥) (٣/١٦٠) وفی حدیث ابی بکر و قد شکی الیه بعض عماله لیقتص منه فقال: انا اقید من وزعة الله (الفائق ٢/٣٨٤ وغریب ابی عبید ٣/٢٢٨)

جولوگوں کو بے قانون ہونے سے روکیں۔
بعض نے کہا ہے کہ وُزُوْعٌ کے معنی کسی چیز پر فریفتہ ہونے کے ہیں اور محاورہ ہے۔
اَوْزَعَ اللّٰهُ فُلَانًا: اللہ تعالیٰ نے فلاں کو شکر گزاری کا الہام کیا۔بعض نے کہا کہ یہ بھی اَوْزَعَ بِالشَّیْءِ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی کسی چیز کا شیدائی بننے کے ہیں تو اَوْزَعَ اللّٰهُ فُلَانًا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی شکر گزاری کا شیدائی بنادیا اور رَجُلٌ وَزُوْعٌ کے معنی کسی چیز پر فریفتہ ہونے والا کے ہیں۔اس بنا پر آیت کریمہ:۔
﴿رَبِّ اَوْزِعْنِی اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ﴾ (۲۷۔۱۹) اے پروردگار! مجھے توفیق عنایت کر کہ جو احسان تو نے مجھ پر کیے ہیں ان کا شکر کروں۔میں بعض نے اَوْزِعْنِیْ کے معنی اَلْهِمْنِیْ کیے ہیں یعنی مجھے شکر گزاری کا الہام کر مگر اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ مجھے شکر گزاری کا اس قدر شیفتہ بنا کہ میں اپنے نفس کو تیری ناشکری سے روک لوں۔

(و ز ن)

اَلْوَزْنُ: (تولنا) کے معنی کسی چیز کی مقدار معلوم کرنے کے ہیں اور یہ وَزَنْتُهٗ (ض) وَزْنًا وَزِنَةً کا مصدر ہے اور عرف عام میں وزن اس مقدار خاص کو کہتے ہیں جو ترازو یا قبان کے ذریعہ معین کی جاتی ہے اور آیت کریمہ:۔
﴿وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ﴾ (۱۷۔۳۵) ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو۔اور نیز آیت کریمہ۔
﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۵۔۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو۔میں اس بات کا حکم دیا ہے کہ اپنے تمام اقوال و افعال میں عدل و انصاف کو مدنظر رکھو۔اور آیت:۔
﴿وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ﴾ (۱۵۔۱۹) اور اس میں ہر ایک سنجیدہ چیز اگائی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ شئی موزون سے سونا، چاندی وغیرہ معدنیات مراد ہیں۔اور بعض نے ہر قسم کی موجودات مراد لی ہیں اور آیت کے معنی یہ کیے ہیں۔کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو اعتدال اور تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔جس طرح کہ آیت:۔
﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (۵۴۔۴۹) ہم نے ہر چیز اندازہ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔
سے مفہوم ہوتا ہے۔اور آیت:۔
﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ﴾ (۷۔۷) اور اس روز (اعمال کا) تلنا برحق ہے۔میں بتایا ہے۔
کہ قیامت کے دن نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حساب لیا جائے گا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (۲۱۔۴۷) اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے۔
قرآن پاک میں (قیامت کے روز اعمال کی ترازو کے لیے) بعض مقامات پر میزان لفظ واحد آیا ہے۔اور بعض جگہوں پر موازین لفظ جمع۔پس جہاں کہیں لفظ واحد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔وہاں محاسب (حساب لینے والا) کا اعتبار کیا ہے۔کہ وہ اکیلی ذات الٰہی ہے اور جہاں لفظ جمع آیا ہے۔وہاں لوگوں کا اعتبار کیا ہے۔کیونکہ ہر ایک کے اعمال کی ترازو الگ الگ ہوگی۔

وَزَنْتُ لِفُلَانٍ وَوَزَنْتُهٗ کے معنی کسی کو تول کر دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾ (۸۳۔۳) اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔

محاورہ ہے۔

قَامَ مِيْزَانُ النَّهَارِ: یعنی دوپہر ہوگئی۔

(و س و س)

اَلْوَسْوَسَةُ: اس برے خیال کو کہتے ہیں۔جو دل میں پیدا ہوتا ہے اور اصل میں یہ وَسْوَاسٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی زیور کی چھنکار یا ہلکی سی آہٹ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ﴾ (۲۰۔۱۲۰) تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۱۱۴۔۴) (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

اور وَسْوَاسٌ کے معنی شکاری کے پاؤں کی آہٹ کے بھی آتے ہیں۔

(و س ط)

وَسَطُ الشَّيْءِ: ہر چیز کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں۔جہاں سے اس کے دونوں اطراف کا فاصلہ مساوی ہو۔اور اس کا استعمال کمیتہ متصلہ یعنی ایک جسم پر ہوتا ہے۔جیسے وَسَطُهٗ صُلْبٌ (اس کا درمیان سخت ہے)۔

ضَرَبْتُهٗ وَسَطَ رَاْسِهٖ: لیکن وَسْطٌ (بالسکون) کیت منفصلہ پر بولا جاتا ہے۔یعنی دو چیزوں کے درمیان فاصل کو وَسْطٌ کہا جاتا ہے۔جیسے وَسْطُ الْقَوْمِ كَذَا کہ وہ لوگوں کے درمیان فاصل ہے۔

نیز اَلْوَسَطُ: (بفتح السین) اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو دو مذموم اطراف کے درمیان واقع ہو یعنی معتدل جو افراط و تفریط کے بالکل درمیان ہوتا ہے۔مثلاً جود کہ بخل اور اسراف کے درمیانی درجہ کا نام ہے اور معنی اعتدال کی مناسبت سے یہ لفظ عَدْلٌ۔ نَصَفَة سَوَاءٌ کی طرح ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لیے بولا جاتا ہے مثلاً جو شخص اپنی قوم میں بلحاظِ حسب سب سے بہتر اور اونچے درجہ کا ہو اس کے متعلق "هٰذَا أَوْسَطُهُمْ حَسْبًا" کہا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں (امت مسلمہ کے متعلق) فرمایا۔

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (۲۔۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا۔ اسی طرح آیت:۔

﴿قَالَ اَوْسَطُهُمْ﴾ (۶۰۔۲۰) ایک جوان جوان میں فرزانہ تھا بولا۔

میں بھی اوسط کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے۔اور کبھی (۳) کنایۃً رذیل چیز پر بھی بولا جاتا ہے۔جسے کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ وَسَطٌ مِّنَ الرِّجَالِ کہ فلاں کم درجے کا آدمی ہے یعنی درجہ خیر سے گرا ہوا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (۲۔۲۳۸) مسلمانو! سب نمازیں خصوصاً بیچ کی نماز (یعنی) عصر) پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ وسطی سے مراد صلوۃ ظہر ہے کیونکہ وہ دن کے درمیانی حصہ میں ادا کی جاتی ہے اور بعض اس

سے صلوٰۃ مغرب مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ تعداد رکعات کے لحاظ سے ثنائی اور رباعی نمازوں کے درمیان میں ہے اور بعض نے صلوٰۃ فجر مراد لی ہے کیونکہ وہ دن اور رات کی نمازوں کے درمیان میں ہے جیسا کہ دوسری آیت فرمایا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ (۱۷۔۷۸) (اے محمد ﷺ) سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر) عصر، مغرب عشاء کی نمازیں اور صبح کو قرآن پاک پڑھا کرو۔

اور صلوٰۃ وسطیٰ کو خاص کرا لگ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ صبح کا وقت سستی اور غفلت کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اٹھنے کے لیے نیند کی لذت کو چھوڑنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ صبح کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ❶ (۱۴۵)

اور جو لوگ اس سے صلوٰۃ عصر مراد لیتے ہیں۔ ❷ جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے ایک حدیث میں بھی مروی ہے تو وہ اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ سے یہ بیان کرتے ہیں کہ عصر کا وقت عوام کے کاروبار کا وقت ہوتا ہے اس لیے نماز میں سستی ہو جاتی ہے بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان کے اول یا آخر میں فرصت کا وقت مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زجرا فرمایا: ❸ (۱۴۶) ((مَنْ فَاتَتْهُ صَلٰوۃُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ)) کہ جس نے عصر کی نماز ضائع کر دی گویا اس نے اپنے اہل وعیال اور مال کو برباد کر دیا۔

(و س ع)

اَلسَّعَةُ کے معنی کشادگی کے ہیں اور یہ امکنہ، حالت اور فعل جیسے قدرت، جود وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ وسعت مکانی کے متعلق فرمایا:۔

﴿اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ﴾ (۲۹۔۵۶) میری زمین فراخ ہے۔

﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً﴾ (۴۔۹۷) کیا خدا کا ملک فراخ نہیں تھا۔

اور وسعت حالت کے متعلق فرمایا:۔

﴿لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ﴾ (۶۵۔۷) صاحب وسعت کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے ﴿عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ﴾ (۲۔۲۳۶) (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق...... اَلْوُسْعُ: اس طاقت کو کہتے ہیں جو اس کام سے ذرا زیادہ ہو جو اس کے ذمہ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲۔۲۸۶) خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ میں تنبیہ فرمائی ہے کہ خدا بندے کے ذمہ اتنا ہی کام لگاتا ہے جو اس کی طاقت سے ذرا کم ہوتا ہے اور بعض نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن احکام کا انسان کو مکلّف بناتا ہے۔ ان کا ثمرہ وسعت یعنی وہ جنت ہے جس

---

❶ انظر کنز العمال (۷/۴۹۰) (ابو الشیخ فی کتاب الاذان عن ابی محذورة) وعن بلال۔

❷ کما ھو مروی عن الحسن وعلی و ابن مسعود وابن عباس وخلق کثیر الحدیث الذی اشار الیه المؤلف فی ذالك فقد رواہ مسلم عن حدیث علیؓ فی قصه یوم الْاَحْزَابِ۔ شغلونا عن الصلوة الوسطی صلوة العصر ملاء الله بیوتهم نارًا۔ وحدیث مصحف عائشة وحفصة مشهور فی هذه المسئله رواه مالك وابوداود (روح المعانی ص۱۳۵ ج۲)

❸ متفق علیه من حدیث ابن عمر انظر الکافی لابن حجر (۱۸۸) و ۱۵۱ رقم (۴۱۵) وکنز العمال (۷/۲۷۱۔۲۷۳)۔

کی پہنائی ارض وسما ہے ❶ جیسا کہ اس کی تائید میں دوسری جگہ فرمایا:۔
﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾ (۲۔۱۵۸) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔
اور آیت:۔
﴿وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ (۲۰۔۹۸) اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔
میں اللہ تعالیٰ کے احاطہ علمی کا بیان ہے۔ جیسے دوسری جگہ اس مفہوم کو:۔ ﴿اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ (۶۵۔۱۲) خدا اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے، سے تعبیر فرمایا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ (۳۔۷۳) اور خدا کشائش والا اور علم والا ہے۔
اور نیز آیت کریمہ:۔
﴿وَکَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَکِیْمًا﴾ (۴۔۱۳۰) اور خدا بڑی کشائش اور حکمت والا ہے۔
میں اللہ تعالیٰ کا بلحاظ علم، قدرت، رحمت وفضل کے وسیع ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ آیت:
﴿وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ (۶۔۸۱) میرا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
﴿وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ﴾ (۷۔۱۵۶) اور جو میری رحمت ہے وہ ہر چیز کو شامل ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت۔
﴿وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾ (۵۱۔۴۷) اور ہم کو سب مقدور ہے، میں اللہ تعالیٰ کی اس وسعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت:
﴿اَلَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾ (۲۰۔۵۰) وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی اور پھر راہ دکھائی۔
میں بیان کیا جاتا ہے (یعنی خلق وہدایت کے فیضان سے وہ ہر چیز کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے)
وَسِعَ الشَّیْءُ اِتَّسَعَ کے معنی کسی چیز کے فراخ ہونا کے ہیں اور اَلْوُسْعُ کے معنی تونگری اور طاقت کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ مشہور ہے۔ هُوَ یُنْفِقُ عَلٰی قَدْرِ وُسْعِهٖ کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔
اَوْسَعَ فُلَانٌ: وہ غنی اور صاحب وسعت ہوگیا۔ فَرْسٌ وَسَاعُ الْخَطْوِ: وہ گھوڑا جو لمبی لمبی ڈگ بھرتا ہوا نہایت تیزی سے دوڑے۔ ❷

(و س ق)

اَلْوَسَقُ کے معنی متفرق چیزوں کو یکجا اکٹھا کرنے کے ہیں چنانچہ وَسَقْتُ (ض) اَلشَّیْءَ کے معنی ہیں: میں نے اس شے کے متفرق اجزاء کو اکٹھا کیا اور بوجھ کی معین مقدار۔ مثلاً ایک اونٹ کے بار کو بھی وَسَقٌ کہا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وسق ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے۔ اسی سے اَوْسَقْتُ الْبَعِیْرَ (افعال) ہے جس کے معنی اونٹ پر بوجھ لادنے کے ہیں۔
نَاقَةٌ وَاسِقٌ: حاملہ اونٹنی۔ اس کی جمع مَوَاسِیْقُ آتی

❶ کما فی آیة (۵۷۔۲۱)
❷ وصدرة القطوف وقد مر فی (ق ط ف) وفی المثل قد یبلغ القطوف الوساع انظر المیدانی (رقم ۲۸٤٤)۔

ہے۔

وَسَّقْتُ الْحِنْطَةَ: میں نے گیہوں کا ایک وسق بھرا۔

وَسَقَتِ الْعَيْنُ الْمَاءَ: آنکھ پانی سے بھر گئی۔ مشہور محاورہ ہے۔

لَا اَفْعَلُهٗ مَا وَسَقَتْ عَيْنِي الْمَاءَ: کہ جب تک میری آنکھ میں پانی ہے (یعنی زندگی بھر) یہ کام نہیں کروں گا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴾ (۸۴۔۱۷) اور رات کی اور جن چیزوں کو اکٹھا کر لیتی ہے۔ ان کی۔

بعض نے کہا ہے کہ ما وسق سے مراد رات کی تاریکی ہے جبکہ پوری طرح چھا جائے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ما وسق سے طوارق (رات میں واقع ہونے والے حوادث) مراد ہیں۔

اَلْوَسِيْقَةُ: اونٹوں کے گلہ کو کہتے ہیں جیسے رُفْقَةٌ کے معنی انسانوں کی جماعت کے ہیں۔

اَلْاِتِّسَاقُ کے معنی کسی چیز کے اجزاء کے مجتمع اور (پورے طور پر) اکٹھا ہو جانا کے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ﴾ (۸۴۔۱۸) اور چاند کی جب وہ کامل ہو جائے۔

(و س ل)

اَلْوَسِيْلَةُ کے معنی کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنے کے ہیں۔ چنانچہ معنی رغبت کو متضمن ہونے کی وجہ سے یہ وَصِيْلَةٌ سے اخص ہے۔ ﴿وَابْتَغُوٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾ (۵۔۳۵) اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرو۔

درحقیقت توسل الی اللہ، علم و عبادت اور مکارم شریعت کی بجا آوری سے طریق الٰہی کی محافظت کرنے کا نام ہے اور یہی معنی تقرب الی اللہ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والے کو وَاسِلٌ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے علاوہ تَوَسُّلٌ کے معنی چوری کرنا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔

اَخَذَ فُلَانٌ اِبِلَ فُلَانٍ تَوَسُّلًا: اس نے فلاں کے اونٹ چوری کر لیے۔

(و س م)

اَلْوَسْمُ: (ض) کے معنی نشان اور داغ لگانے کے ہیں اور سِمَةٌ علامت اور نشان کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

وَسَمْتُ الشَّيْءَ وَسْمًا: میں نے اس پر نشان لگایا۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾ (۶۸۔۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

یعنی اس کی ناک پر ایسا نشان لگائیں گے جس سے اس کی پہچان ہو سکے گی۔ جیسا کہ مومنین کے متعلق فرمایا:۔

﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ (۸۳۔۲۴) تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے۔

﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔

﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ (۲۔۲۷۳) اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لو گے۔

اَلتَّوَسُّمُ کے معنی آثار و قرائن سے کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرنا کے ہیں اور اسے علم ذکانت، فراست اور فطانت بھی کہا جاتا ہے حدیث

میں ہے۔ ❶ (۱۴۷)

((اِتَّقُوْا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))

یعنی مومن کی فراست سے ڈرتے رہو وہ خدا تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے نورِ توفیق سے دیکھتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ﴾ (۱۵۔۷۵)

بے شک اس (قصے) میں اہل فراست کے لیے نشانیاں ہیں۔

یعنی ان کے قصہ میں عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے بہت سے نشانات ہیں۔

اَلْوَسِمِیُّ: موسم بہار کی ابتدائی بارش کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس سے زمین پر گھاس کے نشانات ظاہر ہو جاتے ہیں۔اور تَوَسَّمْتُ جس کے معنی علامت سے پہچان لینے کے ہیں۔

دراصل یہ لفظ وسمی گھاس کے تلاش کر لینے پر بولا جاتا ہے۔

فُلَانٌ وَسِیْمُ الْوَجْهِ: فلاں خوب رو ہے۔

هُوَ ذُوْ وَسَامَةٍ: وہ صاحب جمال ہے۔

فُلَانَةٌ ذَاتُ مِیْسَمٍ: فلاں عورت صاحب حسن و جمال ہے۔

فُلَانٌ مَوْسُوْمٌ بِالْخَیْرِ: اس کے چہرہ سے خیر ٹپکتی ہے۔

قَوْمٌ وَسَامٌ: خوبصورت لوگ۔

مَوْسِمُ الْحَاجِّ: حجاج کے جمع ہونے کا زمانہ اس کی جمع مَوَاسِمُ ہے اور وَسَّمُوْا کے معنی موسم میں حاضر ہونے کے ہیں۔

جیسا کہ عَرَّفُوْا وَحَصَّبُوْا وَعَیَّدُوْا کے معنی عرفہ، محصب اور عید گاہ میں جمع ہونے کے ہیں اور جس جگہ پر حجاج کنکر پھینکتے ہیں اسے مُحَصَّبٌ کہا جاتا ہے۔

(و س ن)

اَلْوَسْنُ وَالسِّنَةُ کے معنی غفلت یا اونگھ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ (۲۔۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

رَجُلٌ وَسْنَانٌ: اونگھنے والا مرد۔

تَوَسَّنَ الْمَرْاَۃَ: سوئی ہوئی عورت سے مجامعت کرنا۔

وَسِنَ وَاَسِنَ کے معنی کنویں کی بدبو سے بے ہوش ہونیکے ہیں۔مصنف کی رائے یہ ہے کہ یہ معنی نیند کی مناسبت سے لیا گیا ہے نہ کہ غشیان یعنی ڈھانپنے کے معنی سے۔

(و س ی)

مُوْسٰی: حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

جو لوگ اسے عربی مانتے ہیں ان کے نزدیک یہ موسی الحدید سے منقول ہے جس کے معنی استرے..... کے ہیں اور اَوْسَیْتُ رَأْسَهٗ کے معنی ہیں: میں نے استرے سے اس کا سر مونڈ ڈالا۔

(و ش ی)

وَشَیْتُ (ض) اَلشَّیْءَ وَشْیًا کے معنی کسی چیز میں اس کے تمام رنگ کے خلاف اور رنگ لگانا کے ہیں اسی سے وَشْیَةٌ بروزن فَعْلَةٌ ہے جس کے معنی کسی ایسے رنگ کا نشان یا داغ کے ہیں (جو سارے بدن کے رنگ کے خلاف ہو۔) قرآن پاک میں ہے:۔

---

❶ رواه الترمذی والبخاری فی تاریخه من حدیث ابی سعید (راجع لطرقه کنز العمال (۱۱/۸۵) واللآلی المصنوعة (۳۲۹۔۳۳۰) و تخریج العراقی علی الاحیاء (۲/۳۹۴)۔

﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا﴾ (۲۔۷۱) وہ بالکل صحیح سالم ہو اور اس پر کسی قسم کا داغ نہ ہو۔

اور ثَوْرٌ مُوَشَّى الْقَوَائِمِ: اس بیل کو کہتے ہیں جس کی ٹانگوں پر اس کے سارے بدن کے رنگ کے خلاف نشانات ہوں۔ (یہ تو اس کے اصل معنی ہیں) اس کے بعد یہ لفظ کلام میں رنگ آمیزی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ مَوَّهَهٗ وَزَخْرَفَهٗ کی طرح کہا جاتا ہے۔

وَشّٰى فُلَانٌ كَلَامَهٗ: اس نے اپنی بات میں جھوٹ بول کر رنگ آمیزی کی اور اس میں تمویہ سے کام لیا اور اسی سے اَلْوَاشِیْ ہے جس کے معنی چغلخوری کے ہیں۔

(و ص ب)

اَلْوَصَبُ کے معنی دائمی مرض کے ہیں اور وَصِبَ فُلَانٌ (س) فَهُوَ وَصِبٌ کے معنی دائمی مرض میں مبتلا ہونے کے ہیں۔

اَوْصَبَهٗ كَذَا فَهُوَ يَتَوَصَّبُ: اسے فلاں بیماری لگ گئی چنانچہ وہ بیمار پڑ گیا۔ جیسے اَوْجَعَهٗ فَهُوَ يَتَوَجَّعُ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ﴾ (۳۷۔۹) اور ان کے لیے عذاب دائمی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا﴾ (۱۶۔۵۲) اور اسی کی عبادت لازم ہے۔

میں اس شخص کے لیے وعید ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے۔ کہ ایسے شخص کو دائمی عذاب کی سزا ملے گی۔

اور یہاں دین بمعنی طاعت ہے اور واصب بمعنی دائم اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو ہر حالت میں ہمیشہ اسی کی عبادت کرنا چاہیے جیسا کہ فرشتوں کے متعلق فرمایا:۔

﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (۶۶۔۶) جو ارشاد خدا ان کو فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں ملتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔

وَصَبَ وُصُوْبًا: کسی چیز کا دائم اور ثابت رہنا۔

وَصَبَ الدَّيْنُ: قرض کا واجب اور لازم ہو جانا۔

مَفَازَةٌ وَاصِبَةٌ: دور تک پھیلا ہوا بیابان جس کی انتہا نہ ہو۔

(و ص د)

اَلْوَصِيْدُ: اصل میں اس احاطہ کو کہتے ہیں جو مویشی کے لیے پہاڑ میں بنا لیا جائے اور آیت: (۱۸۔۱۸) میں اس کے معنی غار کا صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں اسی سے اَوْصَدْتُ الْبَابَ وَاٰصَدْتُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے دروازے کو بند کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ﴾ (۹۰۔۲۰) یہ لوگ آگ میں بند کر دیئے جائیں گے۔

ایک قرات مُؤْصَدَةٌ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اور آیت کے معنی ہیں: اس آگ کو ان پر بند کر دیا جائے گا۔

اَلْوَصِيْدُ (ایضاً) پودا، جس کی جڑیں زیادہ گہری نہ ہوں۔

(و ص ف)

اَلْوَصْفُ کے معنی کسی چیز کا حلیہ اور نعت بیان کرنے کے ہیں اور کسی چیز کی وہ حالت جو حلیہ اور نعت کے لحاظ سے ہوتی ہے اسے صِفَةٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ زِنَةٌ ہر چیز کی مقدار پر بولا جاتا ہے۔

اور وصف چونکہ غلط اور صحیح دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ﴾ (۱۶۔۱۱۶) اور یونہی جھوٹ جو تمہاری زبان پر آئے مت کہہ دیا کرو۔ میں تنبیہ کی ہے وہ (یہود) جو کچھ بیان کرتے ہیں سراسر جھوٹ ہے اسی طرح آیت: ﴿رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۸۰) یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں..... صاحب عزت ہے، میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات سے متصف نہیں ہے جن کا کہ اکثر لوگ اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل اور ان باتوں سے جو کفار اس کی طرف منسوب کرتے ہیں بہت بلند اور دور ہے اسی لیے فرمایا: ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (۳۰۔۲۷) اور اس کی شان نہایت بلند ہے۔

اِتَّصَفَ الشَّیْءُ: کے معنی ہیں کہ بظاہر دیکھنے میں یہ چیز اس صفت کے ساتھ متصف ہوسکتی ہے۔

وَصَفَ الْبَعِیْرُ وُصُوْفًا اونٹ کا عمدہ رفتار ہونا۔

اَلْوَصِیْفُ: خادم اور خادمہ کو وَصِیْفَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے محاورہ ہے۔

وَصُفَتِ الْجَارِیَةُ: کنیز خدمت کے لائق ہوگئی۔

(و ص ل)

اَلْاِتِّصَالُ کے معنی اشیاء کے باہم اس طرح متحد ہو جانے کے ہیں جس طرح کہ قطر دائرہ کی دونوں طرفیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کی ضد انفصال آتی ہے۔ اور وَصْلٌ کے معنی ملانے کے ہیں اور یہ اسم عین اور معنی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ وَصَلْتُ فُلَانًا صلہ رحمی کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ (۲۔۲۷) اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اسی کو قطع کیے ڈالتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ (۴۔۹۰) مگر جو لوگ ایسے لوگوں سے تعلق رکھتے ہوں جن میں اور تم میں (صلح کا) عہد ہو۔ میں يَصِلُوْنَ کے معنی منتسب ہونے کے ہیں۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ مُتَّصِلٌ بِفُلَانٍ: یعنی فلاں اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ لَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ﴾ (۲۸۔۵۱) اور ہم پے در پے ان لوگوں کے پاس (ہدایت کی) باتیں بھیجتے رہے ہیں۔

میں وَصَّلْنَا الْقَوْلَ کے معنی متواتر بات کہنے کے ہیں یعنی ہم..... ان کے پاس لگاتار اپنا کلام بھیجتے رہے ہیں۔

مُوْصِلُ الْبَعِیْرِ: اونٹ کا مفصل، جوڑ جو دو اعضا کے درمیان ہوتا ہے مثلاً ران اور عجز کے درمیان کا جوڑ اور آیت۔

﴿وَّ لَا وَصِيْلَةٍ﴾ (۵۔۱۰۳) اور نہ وصیلہ ہے۔

میں وصیلہ سے مراد وہ بکری ہے جو (دو دو مادینہ بچے دینے کے بعد ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ بچہ دے)۔ (جاہلیت میں) اس مادہ کی وجہ سے نر بچہ کو بھی ذبحہ نہ کرتے اور کہتے کہ وَصَلَتْ اَخَاهَا کہ یہ اپنے بھائی سے مل گئی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَلْوَصِیْلَةُ کے معنی آبادی اور زرخیزی کے ہیں اور وسیع زمین کو بھی اَلْوَصِیْلَةُ کہا

جاتا ہے۔

محاورہ ہے: ھٰذَا وَصَلُ ھٰذَا۔

یعنی (یہ اس کی مثل ہے) یہ اس کا صلہ ہے۔

(و ص ی)

اَلْوَصِیَّۃُ: واقعہ پیش آنے سے قبل کسی کو ناصحانہ انداز میں ہدایت کرنے کے معنی میں آتا ہے اور یہ اَرْضٌ وَاصِیَۃٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیوستہ گیاہ یعنی باہم گتھی ہوئی گھاس والی زمین کے ہیں اور اَوْصَاہُ وَوَصَّاہُ کے معنی کسی کو وصیت کرنے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَوَصّٰی بِھَآ اِبْرَاھِیْمُ بَنِیْہِ وَیَعْقُوْبُ﴾ (۲۔۱۳۲) اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اس بات کی وصیت کی اور یعقوب علیہ السلام نے بھی۔

ایک قرأت میں اَوْصٰی ہے۔

نیز فرمایا:

﴿وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ﴾ (۲۹۔۸) اور ہم نے انسان کو حکم دیا۔

﴿مِنْ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصِیْ بِھَآ اَوْدَیْنٍ﴾ (۴۔۱۰) وصیت کی تعمیل کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض کے

﴿حِیْنَ الْوَصِیَّۃِ اثْنٰنِ﴾: (۵۔۱۰۶) کہ وصیت کے وقت... تم دو مرد۔

وَصّٰی: (ایضاً) کسی کی فضیلت بیان کرنا۔

تَوَاصَی الْقَوْمُ: ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (۱۰۳۔۳) اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

﴿اَتَوَاصَوْا بِہٖ بَلْ ھُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ﴾ (۵۱۔۵۳) کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے آئے ہیں؟ بلکہ یہ شریر لوگ ہیں۔

(و ض ع)

اَلْوَضْعُ: (نیچے رکھ دینا) یہ حَطٌّ سے عام ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَّاَکْوَابٌ مَّوْضُوْعَۃٌ﴾ (۸۸۔۱۴) اور آبخورے (قرینے سے) رکھے ہوئے۔

اور اسی سے مَوْضِعٌ ہے جس کی جمع مَوَاضِعُ آتی ہے جس کے معنی ہیں جگہیں یا موقعے۔ جیسے فرمایا۔

﴿یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ﴾ (۵۔۱۳) یہ لوگ کلمات (کتاب) کو ان کے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔

اور وَضْعٌ کا لفظ وضع حمل اور بوجھ اتارنے کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے وَضَعَتِ الْمَرْءَۃُ الْحَمْلَ وَضْعًا: عورت نے بچہ جنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا وَضَعَتْھَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُھَآ اُنْثٰی وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ﴾ (۳۔۳۶) جب ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور جو کچھ ان کے ہاں پیدا ہوا تھا خدا کو

---

(1) قالہ ابو عبیدۃ فی مجازہ (۱/۱۳٦) وجری علیہ ابن قتیبۃ (۱۳۳) ولکن نقد علیہ النحاس فی الناسخ والمنسوخ (۱۰۹) والطبری فی تفسیر (۹۵/۲۰) راجع البحر (۳/۳۱۵) والقرطبی (۵/۳۰۸)۔

(2) وھی قراءۃ نافع وابن عمر من اھل المدینۃ والباقون وصّی (تفسیر ابی حیان ۱/۳۹۸) وقد ذکر ابو حیان فی ھذا الموضع ان مصحف اھل المدینۃ مخالف لمصحف اھل العراق فی اثنی عشر حرفا فراجعہ ۱۲۔

خوب معلوم تھا تو کہنے لگیں کہ پروردگار میرے تو لڑکی ہی ہوئی ہے۔
لیکن اَلْوُضْعُ وَالتُّضَعُ کے معنی عورت کے آخر طہر میں حاملہ ہونے کے ہیں۔ وَضَعْتُ الْحِمْلَ: میں نے بوجھ اتار دیا اور اتارے ہوئے بوجھ کو مَوْضُوْعٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:۔
﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ (۵۵۔۱۰) اور اسی نے خلقت کے لیے زمین بچھائی۔
میں وضع سے مراد خلق و ایجاد (یعنی پیدا کرنا) ہے۔ اور وَضْعُ الْبَیْتِ کے معنی مکان بنانے کے آتے ہیں۔
چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ (۳۔۹۵) پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿وَ وُضِعَ الْکِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ﴾ (۱۸۔۴۹) اور عملوں کی کتاب کھول کر رکھی جائے گی۔
میں وضع کتاب سے قیامت کے دن اعمال کے دفتر کھولنا اور ان کی جزا دینا مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
﴿وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا﴾ (۱۸۔۱۳) اور قیامت کے دن وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔
وَضَعَتِ (ف) الدَّابَّةُ فِیْ سَیْرِهَا: سواری تیز رفتاری سے چلی۔ اور تیز رفتار سواری کو حَسَنَةُ الْمَوْضُوْعِ (وَحَسَنُ الْمَوَاضِعِ کہا جاتا ہے۔
اَوْضَعْتُهَا میں نے اسے دوڑایا۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ﴾ (۹۔۴۷) اور تم میں (فساد ڈلوانے کی غرض) سے دوڑے دوڑے پھرتے۔ اور وضع کا لفظ سَیْرٌ یعنی چلنے کے معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اَلْقٰی بَاعَهٗ وَثِقْلَهٗ: میں قیام کرنے سے کنایہ ہوتا ہے۔
اَلْوَضِیْعَةُ: (رعایت) کی جو اصل قیمت میں کی جائے۔
وَضَعَ الرَّجُلُ فِیْ تِجَارَتِهٖ: اس نے تجارت میں نقصان اٹھایا۔
رَجُلٌ وَضِیْعٌ: نہایت خسیس آدمی۔ (باب کَرُمَ) یہ رَفِیْعٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بلند قدر کے ہیں۔

(و ض ن)

اَلْوَضْنُ: اس کے اصل معنی زرہ بافی کے ہیں۔ اور استعارۃً کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ بننے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ﴾ (۵۶۔۱۵) (جواہرات) سے مرصع پلنگوں پر......۔
اور اسی سے وَضِیْنُ النَّاقَةِ ہے جس کے معنی حزام یعنی پالان کسنے کی رسی کے ہیں۔ اس کی جمع وُضُنٌ ہے۔

(و ط ء)

وَطُؤَالشَّیْءُ فَهُوَ وَطِیْءٌ: کے معنی کسی چیز کے پامال ہونے کے ہیں۔
اَلْوِطَاءُ: ہر اس شے کو کہتے ہیں جو پاؤں کے نیچے روندی جائے جیسے فراش وغیرہ۔
وَطَأْتُ لَهٗ بِفِرَاشِهٖ کسی کے لیے فراش بچھانا۔
وَطَأْتُهٗ (ف) بِرِجْلِیْ وَطْأً وَطْأَةً وَّوِطَاءَةً وَّتَوَطَّأْتُهٗ کسی چیز کو پاؤں سے روندنا قرآن پاک میں

ہے:۔﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً﴾ (۷۳۔۶) کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بہیمی کو) سخت پامال کرتا ہے۔

ایک قرأت میں وِطَاءً ہے۔اور حدیث میں ہے۔

❶ (۱۴۸)((اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ))

اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت کو سخت کر یعنی انہیں ذلیل کر۔

وَطِئَ امْرَءَ تَهٗ عورت سے ہمبستری کرنا۔یہ لفظ اگرچہ اپنے اصل معنی کے لحاظ سے جماع کے معنی میں بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے۔لیکن عرف میں بمنزلہ لفظ صریح کے ہے۔

اَلْمُوَاطَاةُ: اس کے معنی موافقت کے آتے ہیں۔اور اصل معنی دوسرے کے نشان قدم پر اپنا قدم رکھنے کے ہیں۔چنانچہ آیت اِنَّمَا النَّسِیُٔ کے آخر میں فرمایا ﴿لِيُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ﴾ (۹۔۳۷) تاکہ ادب کے مہینوں کو، جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔گنتی پوری کرلیں۔

(و ع د)

اَلْوَعْدُ: (وعدہ کرنا) کا لفظ خیر و شر (یعنی اچھے اور برے (وعدہ) دونوں پر بولا جاتا ہے۔اور اس معنی میں وَعَدَ يَعِدُ وَعْدًا وَّمَوْعِدًا وَ مِيْعَادًا استعمال ہوتا ہے۔مگر اَلْوَعِيْدُ کا لفظ خاص کر شر (یعنی دھمکی اور تہدید) کے لیے بولا جاتا ہے۔اور اس معنی میں باب اَوْعَدَ (تَوَعَّدَ) استعمال ہوتا ہے۔اور وَاعَدْتُهٗ (مُفَاعَلَة) وَتَوَاعَدْنَا (تفاعل) کے معنی باہم عہد و پیمان کرنا کے ہیں (قرآن کریم میں وَعْدٌ کا لفظ خیر و شر دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے (چنانچہ وعدہ خیر کے متعلق فرمایا)

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ......﴾ (۱۴۔۲۲) جو وعدہ خدا نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا۔﴿اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا﴾ (۲۸۔۶۱) بھلا جس شخص سے ہم نے نیک وعدہ کیا۔

﴿وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً﴾ (۴۸۔۲۰) خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا:۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۴۔۵۵) جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ان سے خدا کا وعدہ ہے۔الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں وَعَدَ کا لفظ خیر کے متعلق استعمال ہوا ہے اور وعدہ شر یعنی وعید کے معنی میں فرمایا۔

﴿وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ (۲۲۔۴۷) اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔اور خدا اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا۔

کفار چونکہ آنحضرت ﷺ سے عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ کرتے تھے اس لیے لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ میں وَعْدٌ بمعنی وَعِيْدٌ ہوگا نیز فرمایا:۔

﴿قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ اَلنَّارُ ط وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۲۲۔۷۲) کہدو کہ میں تم کو اس سے بھی بری چیز بتاؤں؟ وہ دوزخ کی آگ ہے جس کا خدا نے کافروں سے وعدہ کیا ہے۔﴿اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ﴾ (۱۱۔۸۱) ان کے عذاب کے وعدے کا وقت صبح ہے۔

---

❶ متفق علیه من حديث ابي هريرة رضي الله عنه في قصة القنوت في الصبح و مسند احمد (۱۲/۲۵۰) بتحقيق احمد شاكر وابن سعد في طبقاته راجع تخريج الكشاف (۱۱۱۔۱۱۲)

﴿فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا﴾ (۷۔۷) تو جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہواسے لے آؤ۔
﴿وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ﴾ (۱۰۔۴۶) اگر ہم کوئی عذاب جس کا ان لوگوں سے وعدہ کرتے ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے (نازل) کریں۔
﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ﴾ (۱۴۔۴۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے۔اس کے خلاف کرے گا۔
﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ﴾ (۲۔۲۶۸) (اور دیکھنا) شیطان (کا کہانہ ماننا وہ) تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے۔
اور کبھی وعــد کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوتا ہے۔یعنی بیک وقت خیر وشر دونوں معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
﴿اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ﴾ (۱۰۔۵۵) اور یہ بھی سن رکھو کہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔
﴿اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ﴾ (۶۔۱۳۵) کچھ شک نہیں کہ جو وعدہ تم سے کیا جاتا ہے۔ وہ وقوع میں آنے والا ہے۔
میں قیامت کے روز جزائے اعمال کا وعدہ مراد ہے کہ اگر اعمال اچھے ہوں گے تو نتائج بھی خوشگوار ہوں گے اگر برے ہوں گے تو نتائج بھی تباہ کن ہوں گے۔
اَلْمَوْعِدُ وَالْمِيْعَادُ: یہ دونوں لفظ کبھی مصدر اور کبھی اسم ظرف بن کر استعمال ہوتے ہیں۔ (اور اسم ظرف ہونے کی صورت میں ان سے وعدہ کا زمانہ یا مقدم وعدہ مراد ہے) چنانچہ فرمایا:
﴿فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا﴾ (۲۰۔۵۸) تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کرلو۔ ﴿بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا﴾ (۱۸۔۴۸) لیکن تم نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہارے لئے قیامت کا کوئی وقت مقرر ہی نہیں کیا۔ ﴿مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ﴾ (۲۰۔۵۹) (موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ) آپ کے لیے یوم زینت کا وعدہ ہے۔
﴿بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا﴾ (۱۸۔۵۸) مگر ان کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے کہ اس کے عذاب سے کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے۔ ﴿قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ﴾ (۳۴۔۳۰) کہدو کہ تم سے ایک دن کا وعدہ ہے۔
﴿وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ﴾ (۸۔۴۲) اگر تم جنگ کے لیے آپس میں قرارداد کر لیتے تو وقت معین پر جمع ہونے میں تقدیم وتاخیر ہو جاتی...... اور لفظ مُوَاعَدَة (مفاعلة) کے متعلق فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ (۲۔۲۳۵) مگر پوشیدہ طور پر ان سے قول وقرار نہ کرنا۔
﴿وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً﴾ (۷۔۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔
﴿وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (۲۔۱۵۱) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کی میعاد مقرر کی۔
ان دونوں آیتوں میں ثَلَاثِيْنَ وَاَرْبَعِيْنَ وَاعَدْنَا کی ظرف نہیں ہیں۔ بلکہ مفعول بہ ہیں اور ان کا مضاف محذوف ہے یعنی اِنْقِضَاءَ ثَلَاثِيْنَ وَ اَرْبَعِيْنَ یعنی تیس اور چالیس رات کے گزرنے کا وعدہ کیا۔ اور آیت۔

﴿وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ﴾ (۲۰۔۸۰) اور (تورات دینے کے لیے) تم سے کوہ طور کی داہنی طرف مقرر کی۔
میں بھی یہی تاویل ہوگی یعنی یہاں جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ ظرف نہیں ہے بلکہ مفعول بہ ہے اور اس کا مضاف محذوف ہے۔ یعنی اِتْيَانَ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ۔ اور آیت۔
﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ﴾ (۸۵۔۲) اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے۔ میں یوم موعود سے قیامت مراد ہے جیسا کہ آیت۔ ﴿مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۵۶۔۵۰) (سب) ایک روز مقرر کے وقت پر جمع کیے جائیں گے۔
میں میقات یوم معلوم قیامت کا دن مراد ہے۔
اور اَلْاِيْعَادُ (افعال) بمعنی تہدید کے متعلق فرمایا:۔ ﴿وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۷۔۸۶) اور ہر راستے پر مت بیٹھا کرو کہ تم ڈراتے اور راہ خدا سے روکتے ہو۔
اور لفظ وعید کے متعلق ارشاد ہے۔
﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ﴾ (۱۴۔۱۴) یہ اس شخص کے لیے ہے جو قیامت کے روز میرے سامنے کھڑے ہوئے سے ڈرے اور میرے عذاب سے خوف کرے۔
﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (۵۰۔۴۵) پس جو ہمارے عذاب کی وعید سے ڈرے۔ اس کو قرآن پاک سے نصیحت کرتے رہو۔
﴿لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ﴾ (۵۰۔۲۸) ہمارے حضور میں ردّ وکد نہ کرو۔ ہم تمہارے پاس پہلے ہی عذاب کی وعید بھیج چکے تھے۔
اور محاورہ ہے۔
رَأَيْتُ اَرْضَهُمْ وَاعِدَةً: یعنی ان کی زمین سے اچھی پیداوار کی امید ہے۔
يَوْمٌ وَاعِدٌ: بہت گرم یا بہت سرد دن۔
وَعِيْدُ الْفَحْلِ: حملہ کے وقت نر اونٹ کا بڑ بڑانا اور آیت:۔
﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۲۴۔۵۵) اور جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، میں لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ ...... الخ وعدہ کی تفسیر ہے۔ جیسا کہ آیت:۔
﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ (۴۔۱۰) خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے۔ کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔
میں جملہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ: وصیت کی تفسیر واقع ہوا ہے۔ اور آیت۔
﴿وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ﴾ (۸۔۷) اس وقت کو یاد کرو جب تم سے خدا وعدہ کرتا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا مسخر ہو جائے گا۔ میں اَنَّهَا لَكُمْ اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ سے بدل ہے۔ اور اصل عبارت یوں ہے۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ اَنَّ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ لَكُمْ یعنی یا تو قافلہ ہاتھ لگے گا اور

یا لشکر سے مقابلہ ہوگا اور مال غنیمت حاصل ہوگا۔

اَلْعِدَةُ: یہ وَعْدٌ سے اسم ہے اور اس کی جمع عِدَاتٌ آتی ہے اور وعد کا لفظ مصدر ہے جس کی جمع نہیں آتی اور وَعَدْتُ دو مفعول کو چاہتا ہے......اور دوسرا مفعول ظرف زمان، مکان یا کوئی اور چیز ہوتی ہے۔جیسے۔

وَعَدْتُ زَیْدًا یَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْ مَکَانَ کَذَا اَوْ اَنْ اَفْعَلَ کَذَا وغیرہ۔

پس آیت وَاعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً میں وَاعَدْنَا کا دوسرا مفعول اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً نہیں ہوسکتا کیونکہ وعدہ کا وقوع اربعین کے اندر نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد ہوا ہے لہٰذا اس کا دوسرا مفعول اِنْقِضَاءَ الْاَرْبَعِیْنَ یا تَمَامِ الْاَرْبَعِیْنَ ہوگا۔ورنہ اس کے بغیر کلام صحیح نہیں ہوسکتا۔

(و ع ظ)

اَلْوَعْظُ: کے معنی ایسی زجروتوبیخ کے ہیں جس میں خوف کی آمیزش ہو خلیل نے اس کے معنی کئے ہیں ''خیر کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے دل میں رقت پیدا ہو اور عِظَةٌ و مَوْعِظَةٌ دونوں اسم ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ﴾ (۱۶۔۹۰) تمہیں نصیحت کرتا ہے۔تاکہ تم یاد رکھو۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَةٍ﴾ (۳۴۔۴۶) کہدو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔

﴿ذٰلِکُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ﴾ (۵۸۔۳) مومنو! اس حکم سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے۔

﴿قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ (۱۰۔۵۷) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ پہنچی۔

﴿وَ جَآءَکَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِکْرٰی﴾ (۱۱۔۱۲۰) اور ان قصص میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا اور نصیحت اور عبرت ہے۔

﴿وَ هُدًی وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ (۳۔۱۳۸) اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

﴿وَ کَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِیْلًا﴾ (۷۔۱۴۵) اور ہم نے (توراۃ کی) تختیوں میں ان کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ﴾ (۴۔۶۳) تم ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں نصیحت کرو۔

(و ع ی)

اَلْوَعْیُ: (ض) کے معنی (عموماً) بات وغیرہ کو یاد کر لینا کے ہوتے ہیں۔جیسے وَعَیْتُهٗ فِیْ نَفْسِیْ: میں نے اسے یاد کرلیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لِنَجْعَلَهَا لَکُمْ تَذْکِرَةً وَّتَعِیَهَآ اُذُنٌ وَّاعِیَةٌ﴾ (۶۹۔۱۲) تاکہ اس کو تمہارے لیے یادگار بنائیں اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔

اَلْاِیْعَاءُ: (افعال) کے معنی ساز وسامان کو وَعَاء (ظرف) میں محفوظ کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

جَمَعَ فَاَوْعٰی: مال جمع کیا اور بند رکھا (۷۰۔۱۸) شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

(۴۴۹) وَالشَّرُّ اَخْبَثُ مَا اَوْعَیْتَ مِنْ زَادٍ

[1] قالہ عبید بن الابرص وصدرہ : والخیر وان طال الزمان بہ۔ والبیت فی التاج واللسان (وعی) وذیل کتاب الابدال لابی الطیب اللغوی (۱ : ۹۳) والکامل للمبرد (۹۷) وفی مجمع الامثال للمیدانی رقم ۱۹۰٤ وزعموا ان ھذا البیت قالتہ الجن وقیل بل ھو لعبید بن الابرص وادرج فی العقد الثمین (۱۸٤) فی ملحقات دیوان طرفۃ۔

اور شر سب سے برا زاد ہے جو انسان جمع کرتا ہے۔

اَلْوِعَاءُ: کے معنی بوری یا تھیلا کے ہیں جس میں دوسری چیزیں اکٹھی کر کے رکھی جائیں اس کی جمع اَوْعِیَةٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَبَدَأَ بِاَوْعِیَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِیْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِیْهِ﴾ (۱۲۔۷۶) پھر یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کے شلیتے سے پہلے ان کے شلیتوں کو دیکھنا شروع کیا پھر اپنے بھائی کے شلیتے میں سے اس کو نکال لیا۔

وَلَا وَعْیَ عَنْ کَذَا: اس کے بغیر طبیعت کو سکون نہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔

مَالِیْ عَنْهُ وَعْیٌ: مجھے اس سے چارہ کار نہیں۔

وَعَی الْجَرْحُ یَعْیِ وَعْیًا: زخم میں مِدَّۃ یعنی گندہ مواد بھر گیا۔

وَعَی الْعَظْمُ: ہڈی کا (ٹوٹنے کے بعد) مضبوط ہو جانا اور قوت کو جمع کر لینا۔

اَلْوَاعِیَةُ: (ایضاً) چیخنے والی۔

سَمِعْتُ وَعَی الْقَوْمِ: میں نے قوم کی چیخ وپکار کی آواز سنی۔

(و ف د)

وَفَدَ الْقَوْمُ (ض) وِفَادَةً: لوگوں کا وفد بن کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا اور وفد یا وفود ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے بادشاہوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور اسی سے وَافِدٌ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو سب سے آگے نکل جانے والا ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا﴾ (۱۹۔۸۵) جس روز ہم پرہیزگاروں کو خدا کے سامنے بطور مہمان جمع کریں گے۔

(و ف ر)

اَلْوَفْرُ: مال کثیر کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی کمی نہ ہو اور وَفَرْتُهٗ (س) وَفْرًا وَوُفُوْرًا وَفِرَةً کے معنی کسی چیز کو پورا کرنے کے ہیں۔ اور وَفَّرْتُهٗ (تفعیل) تکثیر کے لیے آیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُکُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا﴾ (۱۷۔۶۳) تو تم سب کی سزا جہنم ہے (اور وہ) پوری پوری سزا دے)

وَفَرْتُ عِرْضَهٗ: میں نے اس کی عزت کو کم نہیں کیا۔

اَرْضٌ فِیْ نَبْتِهَا وَفْرَةٌ: وہ زمین جس میں پوری طرح گھاس جمی ہوئی ہو۔

رَأَیْتُ فُلَانًا ذَا وِفَارَةٍ: میں نے فلان کو عقل ومروت میں کامل پایا۔

اَلْوَافِرُ: علم عروض کی اصطلاح میں ایک بحر کا نام ہے (جس میں مفاعلتن چھ بار آتا ہے)

(و ف ض)

اَلْاِیْفَاض: (افعال) کے معنی تیز روی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی کسی کے وَفْضَة کو اٹھا کر اس طرح تیزی سے بھاگنے کے ہیں کہ اس سے خشخشہ کی آواز پیدا ہو اور وَفْضَةٌ چمڑی کے ترکش کو کہتے ہیں اس کی جمع وِفَاضٌ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿کَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ﴾ جیسے شکاری شکار کے جال کی طرف دوڑتے ہیں۔ (۷۰۔۶۳) بعض نے

کہا ہے کہ اَوْفَاضٌ تیز رو جماعتوں کو کہتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔
لَقِیْتُہٗ عَلٰی اَوْفَاضٍ: میں اسے عجلت میں ملا۔اس کا واحد وَفْضٌ ہے جس کے معنی جلدی کے ہیں۔

(و ف ق)

اَلْوَفْقُ: دو چیزوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہونے کو کہتے ہیں قرآن نے اعمال کے نتائج کو......
﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ (۷۸۔۲۶)(یہ) بدلہ ہے پورا پورا۔
کہا ہے اور یہ وَافَقْتُ فُلَانًا وَ وَافَقْتُ الْاَمْرَ (میں نے اسکی موافقت کی یا اسے پالیا) کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔
اَلْاِتِّفَاقُ: انسان کے کسی کام کا تقدیر کے مطابق ہو جانا اور یہ خیر وشر دونوں میں بولا جاتا ہے جیسے اِتَّفَقَ لِفُلَانٍ خَیْرٌ: فلاں کو اتفاق سے خیر حاصل ہوگئی۔
اِتَّفَقَ لَہٗ شَرٌّ اسے اتفاق سے برائی پہنچی یہی مفہوم توفیق کا ہے (مگر یہ متعدی ہے) اور عرف میں یہ خیر کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے (یعنی اسباب کا مقصد کے مطابق مہیا کردینا) اور شر میں استعمال نہیں ہوتا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿وَ مَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ﴾ (۱۱۔۸۸) اور مجھے توفیق کا ملنا خدا ہی کے فضل سے ہے۔محاورہ ہے: اَتَانَا لِتِیْفَاقِ الْھِلَالِ وَمِیْفَاقِہٖ: میرے پاس رویئت ہلال کے موقع پر آیا۔

(و ف ی)

اَلْوَافِیْ: مکمل اور پوری چیز کو کہتے ہیں جیسے: دِرْھَمٌ وَافٍ، کِیْلٌ وَافٍ وَغَیْرُ ذَالِكَ اَوْفَیْتُ الْکَیْلَ وَالْوَزْنَ: میں نے ناپ یا تول کر پورا پورا دیا۔
قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَ اَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ﴾ (۱۷۔۳۵) اور جب کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو۔
وَفٰی بِعَھْدِہٖ (ض) وَفَاءً وَّاَوْفٰی: اس نے عہد و پیمان پورا کیا۔یعنی اس کی خلاف ورزی نہیں کی اس کی ضد غَدْرٌ ہے۔جو نقض عہد اور عدم وفا کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔لیکن قرآن پاک میں اَوْفٰی (افعال) استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا:۔
﴿وَ اَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ﴾ (۲۔۴۰) اور اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا اور میں اس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔
﴿وَ اَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عٰھَدْتُّمْ﴾ (۱۶۔۹۱) اور جب خدا سے عہد واثق کرو تو اس کو پورا کرو۔﴿بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ وَ اتَّقٰی﴾ (۳۔۷۶) ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرے اور خدا سے ڈرے۔
﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا﴾ (۲۔۱۷۶) اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں۔
﴿یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ﴾ (۷۶۔۷) یہ لوگ نذریں پوری کرتے ہیں۔﴿وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ﴾ (۹۔۱۱۱) اور خدا سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔
اور آیت۔
﴿وَاِبْرٰھِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی﴾ (۵۳۔۳۷) اور ابراہیم علیہ السلام کی جنہوں نے (حق طاعت ورسالت) پورا کیا۔میں وفّٰی سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان مطالبات کو پورا کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کرڈالی جن کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (۹۔۱۱۱) خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اور اس کے عوض میں ان کے لیے بہشت تیار کی ہے۔

میں ارشاد فرمایا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مال صرف کیا تو دوسری طرف لڑکے کی قربانی پیش کرنے میں بھی کچھ دریغ نہ کیا حالانکہ وہ انہیں ان کی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اور وفیٰ سے جن باتوں کے پورا کرنے پر متنبہ کیا ہے وہ وہی ہیں جن کی طرف کہ آیت:۔

﴿وَاِذِابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (۲۔۱۲۴) اور جب پروردگار نے چند باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ میں ارشادفرمایا ہے۔

اور تَوْفِیَةُ الشَّیْءِ کے معنی بلا کسی قسم کی کمی کے پورا پورا دے دینے کے ہیں۔اور اِسْتِیْفَاء کے معنی (اپنا حق) پورا لے لینے کے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ وُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ (۳۔۲۵) اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

﴿وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ﴾ (۳۔۱۵۸) اور تم کو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۹۔۱۰) جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا۔

﴿مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا﴾ (۱۱۔۱۵) جولوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں پورا پورا دے دیتے ہیں۔

﴿وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ﴾ (۸۔۶۰) اور تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔

﴿فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ﴾ (۲۴۔۳۹) تو اس سے اس کا حساب پورا پورا چکا دے۔

اور کبھی تَوَفّٰی کے معنی موت اور نیند کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا﴾ (۳۹۔۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ﴾ (۶۔۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے۔

﴿قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾ (۳۲۔۱۱) کہدو کہ موت کا فرشتہ تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ﴾ (۱۶۔۷۰) اور خدا ہی نے تم کو پیدا کیا پھر وہی تم کو موت دیتا ہے۔

﴿الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ﴾ (۱۶۔۲۸) (ان کا حال یہ ہے کہ جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے لگتے ہیں۔

﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ (۶۔۶۱) (تو) ہمارے فرشتے ان کی روح قبض کر لیتے ہیں۔

﴿اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ﴾ (۱۳۔۴۰) یا تمہاری مدت حیات پوری کر دیں۔

﴿وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾ (۳۔۱۹۳) اور ہم کو دنیا سے

نیک بندوں کے ساتھ اٹھا۔

﴿وَ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ﴾ (۷۔۱۲۶) اور ہمیں ماریو تو مسلمان ہی ماریو۔

﴿تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا﴾ (۱۲۔۱۰۱) مجھے اپنی اطاعت کی حالت میں اٹھائیو۔

اور آیت:

﴿يٰعِيْسٰٓى اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ (۳۔۵۵) عیسیٰ علیہ السلام! میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ توفی بمعنی موت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مدارج کو بلند کرنا مراد ہے۔ مگر حضرت ابن عباسؓ نے توفی کے معنی موت کیے ہیں۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو فوت کر کے پھر زندہ کر دیا تھا۔

(و ق ب)

اَلْوَقْبُ کے اصل معنی چٹان، پتھر وغیرہ میں گڑھا کے ہیں۔ اور وَقَبَ (ض) کے معنی گڑھے وغیرہ میں داخل ہو کر غائب ہو جانے کے ہیں اسی سے وَقَبَتِ الشَّمْسُ ہے جس کے معنی آفتاب غروب ہونے کے ہیں۔ اور وَقَبَ الظَّلَامَ کے معنی تاریکی چھا گئی اور اشیاء اس کے اندر غائب ہو گئیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾ (۱۱۳۔۳) اور شب تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے۔

اَلْوَقِيْبُ: گھوڑے کے ذکر کے ایستادہ ہونے کی آواز۔

وَقَبَهٗ وَقْبَةً: اس نے اسے اکٹھا کر لیا۔

(و ق ت)

اَلْوَقْتُ: کسی کام کے لیے مقررہ زمانہ کی آخری حد کو کہتے ہیں۔ اس لیے یہ لفظ معین عرصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے۔

وَقَّتُّ كَذَا: میں نے اس کے لیے اتنا عرصہ مقرر کیا۔ اور ہر وہ چیز جس کے لیے عرصہ متعین کر دیا جائے موقوت کہلاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (۴۔۱۰۳) بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔

﴿وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ﴾ (۷۷۔۱۱) اور جب پیغمبر اکٹھے کیے جائیں گے۔

اَلْمِيْقَاتُ: کسی شے کے مقررہ وقت یا اس وعدہ کے ہیں جس کے لیے کوئی وقت متعین کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا﴾ (۷۸۔۱۷) بے شک فیصلے کا دن مقرر ہے۔

﴿اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ﴾ (۴۴۔۴۰) کچھ شک نہیں کہ فیصلے کا دن...... اٹھنے کا وقت ہے۔ ﴿اِلٰى مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۵۶۔۵۰) سب ایک روز مقرر کے وقت پر جمع کیے جائیں گے۔

اور کبھی مِيْقَاتٌ کا لفظ کسی کام کے لیے مقرر کردہ مقام پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے مَوَاقِيْتُ الْحَجِّ یعنی مواضع (جو احرام باندھنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔)

(و ق د)

وَقَدَتِ النَّارُ (ض) وُقُوْدًا وَوَقْدًا: آگ روشن ہونا۔

اَلْوَقُوْدُ: ایندھن کی لکڑیاں جن سے آگ جلائی جائے۔ اور آگ کے شعلہ کو بھی وُقُوْدٌ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ﴾ (۲۔۲۴) جس کا

ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ (۳۔۱۰) اور یہ لوگ آتش جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ اَلنَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (۸۵۔۵) آگ کی خندقیں جن میں ایندھن جھونک رکھا تھا۔ اِسْتَوْقَدْتُّ النَّارَ: آگ جلانے کی تیاری کرنا اور کبھی بمعنی اَوْقَدْتُّھَا میں نے آگ جلائی بھی آجاتا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ (۲۔۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے شب تاریک میں آگ روشن کی۔ ﴿وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ﴾ (۱۳۔۱۷) اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔

﴿فَاَوْقِدْ لِىْ يٰهَامٰنُ﴾ (۲۸۔۳۸) تو ہامان! میرے لیے (گارے کو) آگ لگا (کر اینٹیں پکا) دو۔ ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ﴾ (۱۰۴۔۶) خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔

اور اسی سے وَقْدَةُ الصَّيْفِ کا محاورہ ہے جس کے معنی گرمی کی شدت کے ہیں۔

اِتَّقَدَ فُلَانٌ غَضَبًا فلاں غصہ سے بھڑک اٹھا اور استعارہ کے طور پر وَقَدَ وَاتَّقَدَ: لڑائی بھڑکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اَلْاِشْتِعَال وَالْاِسْتِعَارَةُ وغیرہ الفاظ اس معنی میں بطور مجاز استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ (۵۔۶۴) یہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں تو خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔

اور کبھی استعارہ کے طور پر چمک دمک کے معنی میں آتا ہے۔ اِتَّقَدَ الْجَوْهَرُ وَالذَّهَبُ: جوہر یا سونے کا چمکنا۔

(و ق ذ)

اَلْوَقْذُ: (ض) کے معنی شدت ضرب کے ہیں اور جس جانور کو لاٹھی یا پتھر سے مار دیا جائے اسے موقوذۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَالْمَوْقُوْذَةُ﴾ (۵۔۳) اور جو چوٹ لگ کر مر جائے۔

(و ق ر)

اَلْوَقْرُ: کان میں بھاری پن۔ وَقَرَتْ اُذُنُهٗ تَقِرُ وَتَوْقَرُ: کان میں ثقل ہونا) یعنی باب ضَرَبَ وَفَتَحَ سے آتا ہے۔ لیکن ابوزید نے اسے سَمِعَ سے مانا ہے۔ اور اس سے مَوْقُوْرَةٌ صفت مفعولی...... ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَفِىْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ﴾ (۶۔۲۵) اور کانوں میں ثقل پیدا کر دیا۔ نیز وِقْرٌ کا لفظ گدھے یا خچر کے ایک بوجھ پر بھی بولا جاتا ہے۔ ❶ جیسا کہ وَسْقٌ کا لفظ اونٹ کے بوجھ کے ساتھ مخصوص ہے اور اَوْقَرْتُهٗ کے معنی بوجھ لادنے کے ہیں۔ نَخْلَةٌ مُوْقِرَةٌ وَمُوْقَرَةٌ: پھل سے لدی ہوئی کھجور۔

اَلْوَقَارُ۔ کے معنی سنجیدگی اور حلم کے ہیں۔ ❷ باوقار اور حلیم آدمی کو وَقُوْرٌ، وَقَارٌ اور مُتَوَقِّرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا﴾ (۷۱۔۱۳) تم کو کیا ہوا کہ تم خدا کی عظمت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔

فُلَانٌ ذُوْ وَقْرَةٍ: فلاں بردبار ہے۔ اور آیت:۔

---

❶ وفی القرآن ﴿فالحاملات وقرا﴾

❷ وقد وقر الرجل فهو وقور

﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ (۳۲۔۳۳) اور اپنے گھروں میں پڑی رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قَرْنَ، وَقَار بمعنی سکون سے ہے اور بعض نے کہا ہے۔کہ یہ وَقَرْتُ، اَقِرُ، وَقْرًا سے ہے۔جس کے معنی بیٹھ رہنا کے ہیں۔ ❶

اَلْوَقِیْرُ: بھیڑ بکری کا بہت بڑا ریوڑ۔

یہ بھی وقار سے ہے گویا کثرت تعداد اور سست رفتاری کی وجہ سے اس میں وقار یعنی سکون پایا جاتا ہے۔

(و ق ع)

اَلْوُقُوْعُ: کے معنی کسی چیز کے ثابت ہونے اور نیچے گرنے کے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔

وَقَعَ الطَّیْرُ وُقُوْعًا: پرند نیچے گر پڑا۔

اَلْوَاقِعَهُ: اس واقعہ کو کہتے ہیں جس میں سختی ہو۔اور قرآن پاک میں اس مادہ سے جس قدر مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔وہ زیادہ تر عذاب اور شدائد کے واقع ہونے کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔چنانچہ فرمایا:۔﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا کَاذِبَةٌ﴾ (۵۶۔۲۹) جب واقع ہونے والی واقع ہو جائے اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں۔

﴿سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ﴾ (۷۰۔۲) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا۔جو نازل ہو کر رہے گا۔

﴿فَیَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ (۶۹۔۱۵) تو اس روز ہو پڑنے والی (یعنی قیامت) ہو پڑے گی۔

اور کسی قول کے وقوع سے اس کے متضمن (مفہوم) کا واقع ہو جانا مراد ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا﴾ (۲۷۔۸۵) اور ان کے ظلم کے سبب ان کے حق میں وعدہ عذاب پورا ہو کر رہے گا۔

یعنی ان پر وہ عذاب اتر پڑا جس کا کہ ان کے ظلم کے سبب ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔نیز فرمایا:۔﴿وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (۲۷۔۸۲) اور جب انکے بارے میں عذاب کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے۔

یعنی جب ان علاماتِ قیامت کا ظہور ہو جائے گا۔جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

﴿قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ﴾ (۷۔۷۱) ہود علیہ السلام نے کہا کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب کا نازل ہونا مقرر ہو چکا ہے۔

نیز فرمایا:۔

﴿اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾ (۱۰۔۵۱) کیا جب وہ آ واقع ہوگا۔تب اس پر ایمان لاؤ گے۔

﴿فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ﴾ (۴۔۱۰) تو اس کا ثواب خدا کے ذمے ہو چکا۔

یہاں لفظ وقوع کا استعمال محض تو کید وجوب کے لیے ہے۔(معنی اس کے بغیر ہی صحیح ہو سکتے تھے) جیسا کہ آیت

---

❶ وفی الروح (۲۲/۶)۔قرء الاکثر وقِرن بکسر القاف من وقریقر وقارا اذا ثبت وسکن واصله وقرن فضُعِل به مافعل بعِدِ من وعد۔

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۰۔۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔

اور آیت:۔

﴿كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۰۔۱۰۳)

اس طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔ میں حَقٌّ کا لفظ محض تو کید کے لیے استعمال ہوا ہے ورنہ یہ معنی علینا سے بھی مفہوم ہو سکتا تھا۔ اور آیت:۔

﴿فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴾ (۱۵۔۲۹) تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔

میں قَعُوْا کا لفظ مبادرت اِلَى السُّجُوْدِ کے معنی کو ظاہر کرتا ہے۔

وَقَعَ الْمَطَرُ: بارش ہونا۔ مَوَاقِعُ الْغَيْثِ: جن مقامات پر بارش برسی ہو۔ (1)

اَلْمُوَاقَعَةُ: باہم جنگ کرنا۔ نیز کنایہ کے طور پر اس کے معنی عورت سے مجامعت کے بھی آتے ہیں۔ اَلْاِيْقَاعُ: (افعال) واقع کرنا۔ سخت معرکہ قائم کرنا۔ اور کنایۃ وَقْعَةٌ کے معنی جنگ بھی آتے ہیں۔ (والجمع وقائع)

وَقْعُ الْحَدِيْدِ: لوہے کی آواز (تلواروں کے کھٹکھٹانے کی آواز) محاورہ ہے۔

وَقَعْتُ الْحَدِيْدَةَ (ف) وَقْعًا مِيْقَعَةً: یعنی سان پر تلوار وغیرہ کا تیز کرنا۔ نیز وقع کا لفظ سقوط شدید یعنی دھما کہ پر بھی بولا جاتا ہے اور اسی سے اَلْوَقِيْعَةُ (فی الانسان) ہے جس کے معنی کسی کی غیبت کرنے کے ہیں۔

اور اَلْحَافِرُ الْوَاقِعُ: اس گھوڑے کو کہتے ہیں۔ جس کے سم سنگستان میں چلنے سے گھس گئے ہوں۔

اَلْوَقِيْعَةُ: (ایضاً) وہ جگہ جہاں بارش کا پانی ٹھہر جاتا ہو (والجمع الوقائع) مَوْقِعٌ: پرند کا مستقر (ج مَوَاقِعُ)

اَلتَّوْقِيْعُ: سواری کی پیٹھ میں زخم کے نشان کو کہتے ہیں اسی طرح کتاب پر نشان لگانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی سے اَلتَّوْقِيْعُ کے معنی کسی چیز کا گمان کرنا بھی آتے ہیں۔

(وق ف)

وَقَفْتُ الْقَوْمَ (ض) وَقْفًا (متعدی) لوگوں کو ٹھہرانا اور وَقَفُوْا۔ وُقُوْفًا (لازم) ٹھرنا۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْؤُلُوْنَ﴾ (۳۷۔۲۴) اور ان کو ٹھہرائے رکھو کہ ان سے کچھ پوچھنا ہے۔

اور اسی سے بطور استعارہ وَقَفْتُ الدَّارَ آتا ہے جس کے معنی مکان کو وقف کر دینے کے ہیں۔ نیز اَلْوَقْفُ کے معنی ہاتھی دانت کا کنگن بھی آتے ہیں اور حِمَارٌ مُوَقَّفٌ اس گدھے کو کہتے ہیں جس کی کلائیوں پر کنگن جیسے سفید نشان ہوں جیسا کہ فرس مُحَجَّلٌ اس گھوڑے کو کہا جاتا ہے۔ جس کے پاؤں میں حجل کی طرح سفیدی ہو۔

مَوْقِفُ الْاِنْسَانِ: انسان کے ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور اَلْمُوَافَقَةُ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے معاملہ کو اسی چیز پر روک دے جس پر کہ دوسرے نے روکا ہے۔ (ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا ہونا)

---

(1) وفی القرآن ﴿فلا اقسم بمواقع النجوم﴾ (۵۶۔۵) فالمراد من المواقع ھھنا المغارب کما جاء فی روایة ابن جریر عن قتادة وعند البعض نجوم القرآن راجع الروح (۱۳۲/۲۷) وقد مر البحث فی حرف النون۔

اَلْوَقِیْفَۃُ: بھگایا ہوا شکار جو شکاری کے تعاقب سے عاجز ہو کر ٹھہر جائے۔ یہاں تک کہ وہ اسے شکار کرلے۔

(و ق ی)

وَقَیْتُ الشَّیْءَ (ض) وِقَایَۃً وَوِقَاءً کے معنی کسی چیز کو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَوَقٰھُمُ اللّٰہُ﴾ (۷۶۔۱۱) تو خدا ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔

﴿وَمَالَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ وَّاقٍ﴾ (۱۳۔۳۴) اور ان کو خدا کے عذاب سے کوئی بھی بچانے والا نہیں۔

﴿مَالَكَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ﴾ (۱۳۔۳۷) تو خدا کے سامنے نہ کوئی تمہارا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔

﴿قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ (۶۶۔۶) اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش جہنم سے بچاؤ۔

اَلتَّقْوٰی: اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقوی ہے جو گناہ کا موجب ہو۔ اور یہ بات محظورات شرعیہ کے ترک کرنے سے حاصل ہوجاتی ہے۔ مگر اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لیے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ سے مروی ہے ❶ (۱۴۹) ((اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَمَنْ وَّقَعَ حَوْلَ الْحِمٰی فَحَقِیْقٌ اَنْ یَّقَعَ فِیْہِ)) ''حلال بھی بین ہے اور حرام بھی بین ہے اور جو شخص چراگاہ کے اردگرد چرائے گا تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے۔'' (یعنی مشتبہ چیزیں اگرچہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں لیکن ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی چھوڑ دیا جائے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (۷۔۳۵) جو شخص (ان پر ایمان لاکر) خدا سے ڈرتا رہے گا اور اپنی حالت درست رکھے گا۔ ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا﴾ (۱۶۔۱۲۸) کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہیں اللہ ان کا مددگار ہے

﴿وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ زُمَرًا﴾ (۳۹۔۷۳) اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کو گروہ گروہ بنا کر بہشت کی طرف لے جائیں گے۔

پھر تقوی کے چونکہ بہت سے مدارج ہیں اس لیے آیت ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ﴾ (۲۔۲۸۱) اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم خدا کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے۔

اِتَّقُوْا رَبَّکُمْ (لوگو) اپنے پروردگار سے ڈرو۔ (۳۱۔۳۳)

﴿وَیَخْشَ اللّٰہَ وَیَتَّقْہِ﴾ (۲۴۔۵۲) اور اس سے ڈرے گا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ (۴۔۱) اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو۔ اور قطع مودت ارحام سے۔

﴿اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ﴾ (۳۔۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا

---

❶ رواہ النسائی ص(۲۰۳ ج۲) وسائر اصحاب السنن۔ ۱۲

کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

میں ہر جگہ تقویٰ کا ایک خاص معنی مراد ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔ ❶

اِتَّقٰی فُلَانٌ بِکَذَا کے معنی کسی چیز کے ذریعہ بچاؤ حاصل کرنے کے ہیں۔ اور آیت:۔

﴿اَفَمَنْ یَّتَّقِیْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۳۹۔۲۴) بھلا جو شخص قیامت کے دن اپنے منہ سے برے عذاب کو روکتا ہوا۔

میں اس عذاب شدید پر تنبیہ کی ہے جو قیامت کے دن ان پر نازل ہوگا اور یہ کہ سب سے بڑی چیز جس کے ذریعہ وہ عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے وہ ان کے چہرے ہی ہوں گے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَتَغْشٰی وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾ (۱۴۔۵۰) اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔

﴿یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ﴾ (۵۴۔۴۸) اس روز منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے۔

(و ک ی)

اَلْوِکَاءُ کے معنی کسی چیز کا سر بند کے ہیں۔ ❷

اور کبھی وِکَاءٌ اس ظرف کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جس میں کوئی چیز ڈال کر اس کا منہ باندھ دیا گیا ہو۔ اسی سے اَوْکَأْتُ فُلَانًا ہے جس کے معنی کسی کے لیے تکیہ لگا دینے کے ہیں۔

تَوَکَّأَ عَلَی الْعَصَا: اس نے عصا پر ٹیک لگائی اور اس سے قوت حاصل کی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿هِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّؤُا عَلَیْهَا﴾ (۲۰۔۱۸) (انہوں نے کہا) یہ میری لاٹھی ہے اس پر میں سہارا لگاتا ہوں۔

اور حدیث میں ہے ❸ (۱۵۰)

((کَانَ یُوْکِیْ بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ)) (یعنی بالکل خاموش یا نہایت تیزی سے طواف کرتے تھے) اس کے معنی یہ ہیں کہ سعی سے ان کے مابین کو اس طرح پر کر دیتے تھے جیسا کہ مشکیزہ کو بھرنے کے بعد اس کا منہ باندھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ مشک کا منہ باندھنے کے لیے اَوْکَیْتُ السِّقَاءَ (یعنی یاء کے ساتھ) بولتے ہیں اور اوکات (ہمزہ کے ساتھ) اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

(و ک د)

وَکَّدْتُ وَاَکَّدْتُ (تفعیل) کے معنی کسی بات یا معاملہ کو محکم اور پختہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِهَا﴾ (۱۶۔۹۱) اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو۔

اور وہ تسمہ جس سے زین کے اگلے حصہ کو کس کر باندھ دیتے ہے اسے (بھی) تاکید یا توکید کہا جاتا ہے۔ اور اَلْوِکَادُ اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دودھ دوہتے

---

❶ وفی المطبوع ومن یخش اللّٰه مصحف ۱۲

❷ وفی الحدیث: ان العین وکاء السه فاذا نامت العینا ن استطلق الوکاء (الفائق ۲/۳۱۴)

❸ والحدیث فی الفائق (۲/۳۱۴) موقوف علی الزبیرؓ قال ابو عبید فی غریبه (۴/۸) وهو عندی من امساك الکلام وفیه تفسیر آخرانه یروی عنه قال کان یوکی مابین الصفا والمراوة سعیا فان کان هذا محفوظا فوجهه ان یملاء ما بینهما سعیًا لا یمشی علی هینته فی شیء من ذالك شبه بالسقاء وغیره' یملاء ثم یوکاء علیه حیث انتهی امتلاء ها وایضا انظر مجمع البحار الانوار (۳/۴۶۱۔)

وقت گائے (کی ٹانگیں) باندھ دیتے ہیں۔
خلیل نے کہا ہے کہ اَیْمَانٌ (یعنی قسموں) کی پختگی کے لیے اَکَّدْتُّ زیادہ مناسب ہے اور باقی اقوال کے متعلق وَکَّدْتُّ زیادہ صحیح ہے۔لہٰذا عقد ایمان کے لیے اَکَّدْتُّ اور حلف وغیرہ کے لیے وَکَّدْتُ کہا جائے گا۔اور وَکَّدَ وَکْدَہٗ کے معنی کسی کی طرح قصد کرنے اور اس جیسے اخلاق اختیار کرنے کے ہیں۔

(و ک ز)

اَلْوَکْزُ: (س ض) کے معنی کچوکا لگانے، دھکا دینے اور مکا مارنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی﴾ (۲۸۔۱۵) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کو مکا مارا۔

(و ک ل)

اَلتَّوکِیْلُ کے معنی کسی پر اعتماد کر کے اسے اپنا نائب مقرر کرنے کے ہیں اور وَکِیْلٌ فَعِیْلٌ (بمعنی مفعول) کے وزن پر ہے۔قرآن میں پاک ہے:۔﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا﴾ (۴۔۸۱) اور خدا ہی کافی کار ساز ہے۔یعنی اپنے تمام کام اسی کے سپرد کار ساز ہے۔یعنی اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دیجیے اور کارسازی کے لیے اسی کو کافی سمجھیے اور آیت کریمہ:۔
﴿حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ﴾ (۳۔۱۷۳) ہم کو خدا کافی ہے۔اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔
بھی اسی معنی پر محمول ہے۔اور آیت کریمہ:۔
﴿وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ﴾ (۳۹۔۴۱) اور اے پیغمبر! تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔
کے معنی یہ ہیں کہ تم ان کے اعمال کے ذمہ دار اور محافظ نہیں ہو۔جیسے دوسری جگہ فرمایا:۔
﴿لَّسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی﴾ (۸۸۔۲۲۔۲۳) تم ان پر داروغہ نہیں ہو، ہاں جس شخص نے منہ پھیرا......
اور اسی معنی میں فرمایا:۔
﴿قُلْ لَّسْتُ عَلَیْکُمْ بِوَکِیْلٍ﴾ (۶۔۶۶) کہہ دو کہ میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں۔
﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوَاہُ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْہِ وَکِیْلًا﴾ (۲۵۔۴۳) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔تو کیا تم اس پر نگہبان ہو سکتے ہو۔
﴿اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا﴾ (۴۔۱۰۹) اور کون ان کا وکیل بنے گا۔
یعنی ان کی طرف سے کون ذمہ داری اٹھائے گا۔
اَلتَّوَکُّلُ: (تفعل) اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے۔
اول (صلہ لام کے ساتھ) تَوَکَّلْتُ لِفُلَانٍ یعنی میں فلاں کی ذمہ داری لیتا ہوں چنانچہ وَکَّلْتُہٗ فَتَوَکَّلَ لِیْ کے معنی ہیں: میں نے اسے وکیل مقرر کیا۔تو اس نے میری طرف سے ذمہ داری قبول کر لی۔
(علیٰ [۲] کے ساتھ) تَوَکَّلْتُ عَلَیْہِ کے معنی کسی پر بھروسہ کرنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۱۴۔۱۱) اور خدا ہی پر مومنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے
﴿وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ﴾ (۶۵۔۳) اور جو خدا پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔﴿رَبَّنَآ عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا﴾ (۶۰۔۴) اے

ہمارے پروردگار! تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے۔
﴿وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا﴾ (۵۔۲۳) اور خدا ہی پر بھروسہ رکھو۔
﴿وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ (۴۔۸۱) اور خدا پر بھروسہ رکھو اور خدا ہی کافی کارساز ہے
﴿تَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (۱۱۔۱۲۳) اور اسی پر بھروسہ رکھو۔
﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ﴾ (۲۵۔۵۸) اور اس خدائے زندہ پر بھروسہ رکھو جو کبھی نہیں مرے گا۔ وَاكَلَ فُلَانٌ: دوسرے شخص پر اعتماد کرکے اپنا کام ضائع کردینا۔
تَوَاكَلَ الْقَوْمُ: لوگوں نے اپنے کام ایک دوسرے پر ڈالنا شروع کردیئے۔
رَجُلٌ وُكَلَةٌ۔ تُكَلَةٌ: وہ آدمی جو خود کمزور ہو اور ہر کام میں دوسروں کا سہارا تلاش کرے۔
اَلْوَكَالُ: چوپایہ، جانور میں عیب کو کہتے ہیں یعنی یہ کہ وہ دوسرے جانور کے چلنے کے بغیر تنہا نہ چلے۔
بعض نے وکیل کی تفسیر کفیل کے ساتھ کی ہے کہ وکیل کفیل کو کہتے ہیں۔ مگر وکیل کفیل سے اعم ہے کیونکہ ہر کفیل وکیل بھی ہوتا ہے لیکن ہر وکیل کا کفیل ہونا ضروری نہیں ہے۔

(و ل ج)

اَلْوُلُوْجُ: (ض) کے معنی کسی تنگ جگہ میں داخل ہونے کے ہیں۔
﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (۷۔۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور آیت:
﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ﴾ (۲۲۔۶۱) (کہ خدا) رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔
میں اس نظام کائنات پر متنبہ کیا گیا ہے جو اس عالم میں رات کے دن میں اور دن کے رات میں داخل ہونے کی صورت میں قائم ہے اور مطالع شمسی کے حساب سے رونما ہوتا رہتا ہے۔
اَلْوَلِيْجَةُ: وہ شخص ہے جو دوسری قوم سے ہو لیکن تم اسے اپنا معتمد بنالو اور یہ فُلَانٌ وَلِيْجَةٌ فِي الْقَوْمِ کے محاورہ سے لیا گیا ہے یعنی وہ جو قوم میں داخل ہو جائے اور ان میں سے نہ ہو عام اس سے کہ انسان ہو یا کوئی دوسری چیز قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً﴾ (۹۔۱۶) اور انہوں نے خدا اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو ولی دوست نہیں بنایا۔
جیسا کہ مومنین کے متعلق دوسری جگہ فرمایا:۔
﴿النَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ﴾ (۵۔۵۱) اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔
رَجُلٌ خُرَجَةٌ وُلَجَةٌ: بہت زیادہ اندر اور باہر آنے جانے والا آدمی۔

(و ل د)

اَلْوَلَدُ: جو جنا گیا ہو۔ یہ لفظ واحد (مذکر مؤنث) چھوٹے بڑے سب پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ﴾ (۴۔۱۱) اور اگر اولاد نہ ہو۔
﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ﴾ (۶۔۱۰۱) اس کے اولاد کہاں سے ہو۔

اور وَلَـــدٌ کا لفظ مثنی پر بھی بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (۱۲۔۲۱) یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔

﴿وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ﴾ (۹۰۔۳) اور باپ (یعنی آدم علیہ السلام) اور اس کی اولاد کی قسم۔

ابوالحسن کا قول ہے کہ وَلَدٌ کا لفظ بیٹے اور بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے اور وُلْدٌ وَوِلْدٌ کے معنی اہل وعیال کے ہیں۔محاورہ ہے:۔وُلِدَ فُلَانٌ فلاں پیدا ہوا...... قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ﴾ (۱۹۔۳۳) اور جس دن میں پیدا ہوا مجھ پر سلام (ورحمت) ہے۔

﴿وَسَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ﴾ (۱۹۔۱۵) اور جس دن وہ پیدا ہوئے ان پر سلام ورحمت ہے۔

اور باپ کو والد اور ماں کو والدہ کہتے ہیں اور دونوں کو الدین کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ﴾ (۷۱۔۲۸) اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو معاف کرنا۔

اَلْــوَلِیْدُ: عرف میں نوزائیدہ بچے پر بولا جاتا ہے۔اگرچہ نعمت کے لحاظ سے ہر چھوٹے بڑے کو ولید کہنا صحیح ہے۔جیسا کہ تازہ چنے ہوئے پھل کو جَنِیٌّ کہا جاتا ہے۔پھر جب بچہ بڑا (یعنی بالغ) ہو جائے تو اسے وَلِیْدٌ نہیں کہتے ہیں۔

اس کی جمع وِلْدَانٌ ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا﴾ (۷۳۔۱۷) (اس دن سے (کیونکر بچوگے) جو بچوں کو بوڑھا کردے گا۔

اَلْوَلِیْدَةُ: عرف عام میں کنیزک کے ساتھ مختص ہے اور لِدَةٌ خاص کر تِرْبٌ (لنگوٹیا) کو کہتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔

فُــلَانٌ لِـدَةُ فُـلَانٍ وَتِرْبُهٗ: فلاں اس کا ہم عمر ہے یہ اصل میں وِلْدَةٌ تخفیف کے لیے واؤ ساقط ہوگئی ہے۔

تَوَلُّدُ الشَّیْءِ مِنَ الشَّیْءِ: ایک چیز کا دوسری سے پیدا ہونا۔

اور وَلَـــدٌ کی جمع اَوْلَادٌ آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (۸۔۲۸) تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔

﴿اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ (۶۴۔۱۴) تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔

ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد انسان کے لیے آزمائش ہے۔مگر بعض اولاد دشمن ثابت ہوتی ہے پہلی آیت میں سب کو فتنہ قرار دیا ہے۔لیکن دوسری آیت میں بعض کو دشمن قرار دیا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ وَلَدٌ کی جمع وُلْدٌ بھی آتی ہے جیسے اَسَدٌ کی جمع اُسْدٌ مگر ہوسکتا ہے کہ ولد کا لفظ مفرد ہو جیسے بُخْلٌ وَبَخَلٌ اور عَرَبٌ و عُرْبٌ کہ یہ دونوں مفرد ہیں...... مثل مشہور ہے۔

وُلْدُكِ مَنْ دَمّٰی عَقِبَیْكِ: یعنی تیرا لڑکا تو وہی ہے جو تیری ایڑیوں کو خون آلود کرے یعنی جو تمہارے بطن سے پیدا ہوا ہو اور ایک قرأت میں ہے۔

﴿مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوُلْدُهٗ﴾ (۷۱۔۲۱) جن کو ان کے مال اور اولاد نے...... کچھ فائدہ نہیں دیا۔ [1]

(و ل ق)

اَلْــوَلْقُ کے معنی تیز روی کے ہیں اور وَلَقَ الرَّجُلُ: (ض) کے معنی جھوٹ بولنا کے ہیں۔

[1] وفی القرآن وعلی المولود له (۲/۲۳۳) ای الاب او العصبة ۱۲۔

اور آیت:

﴿اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ﴾ (۲۴۔۱۵) جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے۔ میں ایک قرأت تَلِقُوْنَهٗ بھی ہے ❶ یعنی کذب بیانی کے لیے جلدی کرتے تھے اور یہ جَاءَتِ الْاِبِلُ تَلِقُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی اونٹوں کے تیز رفتاری کے ساتھ آنے کے ہیں۔ اَلْاَوْلَقُ: جس کی عقل میں فتور ہو۔

رَجُلٌ مَالُوْقٌ وَمُؤْلَقٌ: پاگل اور دیوانہ آدمی۔ نَاقَةٌ وَلْقَى: تیز رو اونٹنی۔

اَلْوَلِيْقَةُ: ایک قسم کا کھانا جو گھی سے تیار ہوتا ہے۔

اَلْوَلَقُ: نیزے کا بہت ہلکا زخم۔

(و ل ی)

اَلْوِلَاءُ وَالتَّوَالِیْ کے اصل معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو۔ پھر استعارہ کے طور پر قرب کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ خواہ وہ قرب بلحاظ مکان یا نسب اور یا بلحاظ دین اور دوستی یا نصرت کے ہو اور یا بلحاظ اعتقاد کے۔ اَلْوِلَايَةُ (بکسر الواؤ) کے معنی نصرت اور وَلَايَةٌ (بفتح الواؤ) کے معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔ ❷ بعض نے کہا ہے کہ یہ دَلَالَة وَدِلَالَة کی طرح ہے یعنی اس میں دو لغت ہیں۔ اور اس کے اصل معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔

اَلْوَلِیُّ وَالْمَوْلٰی: یہ دونوں کبھی اسم فاعل یعنی مُوَالٍ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی اسم مفعول یعنی مُوَالٰی کے معنی میں آتے ہیں۔ اور مومن کو ولی اللہ تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مولی اللہ کہنا ثابت نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَوْلَاهُمْ دونوں طرح بول سکتے ہیں۔ چنانچہ معنی اول یعنی اسم فاعل کے متعلق فرمایا:۔

﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۔۲۵۷) جو لوگ ایمان لائے ان کا دوست خدا ہے۔

﴿اِنَّ وَلِیِّ يَ اللّٰهُ﴾ (۷۔۱۹۶) میرا مددگار تو خدا ہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۳۔۶۸) اور خدا مومنوں کا کارساز ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۴۷۔۱۱) یہ اس لیے کہ جو مومن ہیں ان کا خدا کارساز ہے۔

﴿نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ﴾ (۸۔۴۰) خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی﴾ (۲۲۔۷۸) اور خدا (کے دین کی رسی) کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست ہے۔ اور دوسرے معنی یعنی اسم مفعول کے متعلق فرمایا:۔ ﴿قُلْ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ (۶۲۔۶) کہدو کہ اے یہود! اگر تم کو یہ دعویٰ ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں۔

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ﴾ (۶۶۔۴) اور پیغمبر (کی ایذا) پر باہم اعانت کروگی تو خدا ان کے

---

❶ مروی عن عائشة والآیة فی شان حدیث الافك (اللسان ولق) والنوادر لابی مسهل (۱/۳۱۶) وابدال ابی الطیب (۲/۳۱۲) والمشكل للقبتی (۱۹) والقراءات الشاذه (۱۰۰) لابن خالویه ۱۲۔

❷ كذا قال ابو عبیدة فی مجازه (۱/۴۰۵) ومنه اخذ البخاری تفسیر هذه الكلمة (فتح الباری ۸/۳۲۹)

حامی اور دوست دار ہیں۔
﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ﴾ (۶۔۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس بلائے جائیں گے اور آیت:
﴿وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ﴾ (۱۳۔۱۱) اور خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ میں وَالٍ کے معنی وَلِیٌّ کے ہے۔ اور متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے درمیان ولایۃ کی نفی کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ؔ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ (۵۔۵۱) اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہی میں سے ہوگا۔
﴿لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ﴾ (۹۔۲۳) اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی ایمان کے مقابل کفر کو پسند کریں) تو ان سے دوستی نہ رکھو۔
﴿وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ﴾ (۷۔۳) اور اس کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو۔
﴿مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا﴾ (۸۔۷۲) تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کو ان کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں۔
﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ﴾ (۶۰۔۱) مومنو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔
اور آیت:
﴿تَرٰی كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ کے آخر میں فرمایا۔
﴿وَ لَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ﴾ (۵۔۸۱) اور اگر وہ خدا پر اور پیغمبر پر اور جو کتاب ان پر نازل ہوئی تھی اس پر یقین رکھتے تو ان لوگوں کو دوست نہ بناتے۔ اور کفار اور شیاطین کے درمیان دنیا میں موالات تو ثابت ہے۔ لیکن آخرت میں ان کے درمیان دوستی کی نفی کی گئی ہے چنانچہ دنیا میں ان کی باہم موالات کے متعلق فرمایا:۔
﴿اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ﴾ (۹۔۶۷) منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس (یعنی) ایک ہی طرح کے ہیں۔
نیز فرمایا:
﴿اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۷۔۳۰) ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو رفیق بنالیا۔
﴿اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾ (۷۔۲۷) ہم نے شیطانوں کو ان ہی لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔
﴿فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ﴾ (۴۔۷۶) سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔
پھر جس طرح ان کے درمیان باہم دوستی کو ثابت کیا ہے اسی طرح دنیا میں کفار پر شیاطین کو تسلط بھی دے رکھا ہے۔
چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ﴾ (۱۶۔۱۰۰) اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں۔
اور آخرت میں ان کی باہم دوستی کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:۔
﴿يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا﴾ (۴۴۔۴۱) جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہیں آئے گا۔
﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ﴾ (۲۹۔۲۵) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے (کی دوستی) سے انکار کرو گے۔
﴿قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا﴾ (۲۸۔۶۳) الآیۃ۔ اور جن لوگوں پر عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔
اور تَوَلّٰی کا لفظ جب متعدی بِنَفْسِہٖ ہوتا ہے۔
تو معنی ولایۃ اور قریب ترین مواضع سے اس کے حصول کو چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی سے کہا جاتا ہے۔ وَلَّيْتُ سَمْعِيْ كَذَا وَوَلَّيْتُ عَيْنِيْ كَذَا: میں نے اپنے کان یا آنکھ کو فلاں چیز پر لگایا۔
وَلَّيْتُ وَجْهِيْ كَذَا: میں اپنے چہرے کے ساتھ اس پر متوجہ ہوا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ (۲۔۱۴۴) سو ہم تمکو اسی قبلے کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو۔ چہرہ پھیرنے کا حکم دیں گے۔ اب اپنا چہرہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور تم لوگ جہاں ہوا کرو (نماز پڑھنے کے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کرلیا کرو۔
اور جب بذریعہ عــن کے متعدی ہو تو خواہ وہ عن لفظوں میں مذکور ہو یا مقدر، اس کے معنی اعراض اور دور ہونا کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ تعدیہ بذاتہٖ کے متعلق فرمایا:۔
﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ (۵۔۵۱) اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا۔ وہ بھی انہی میں سے ہوگا۔
﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۵۔۵۶) اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر سے دوستی کرے گا۔ اور تعدیہ بعن کے متعلق فرمایا:۔
﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ﴾ (۳۔۶۳) تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو خدا مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔
﴿اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ﴾ (۸۸۔۲۳) ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا۔
﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا﴾ (۳۔۶۴) اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہدو کہ تم گواہ رہو۔
﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (۴۷۔۳۸) اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔
﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (۶۴۔۱۲) اور اگر تم منہ پھیر لو گے تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کر پہنچا دینا ہے۔
﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ﴾ (۸۔۴۰)

اور اگر روگردانی کریں تو جان رکھو کہ خدا تمہارا حمایتی ہے۔

﴿فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (۳۔۸۲) تو جو اس کے بعد پھر جائیں وہ بدکردار ہیں اور

تَوَلّٰی (بمعنی اعراض) کے معنی کبھی پیٹھ پھیرنا کے ہوتے ہیں اور کبھی توجہ نہ کرنے اور ترک قرب۔ کے چنانچہ فرمایا۔

﴿وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ﴾ (۸۔۲۰) اور اس سے روگردانی نہ کرو اور تم سنتے ہو۔

یعنی ان لوگوں کا کردار ادا نہ کرو جن کی صفت یہ تھی کہ:

﴿وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا﴾ (۷۱۔۷) اور کپڑے اوڑھ لیے اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کے قول کی نقالی کرو۔ جن کے متعلق فرمایا:۔

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ﴾ (۴۱۔۲۶) اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو۔ اور (جب پڑھنے لگیں تو) شور مچا دیا کرو۔

محاورہ ہے۔

وَلَّاہُ دُبُرَہٗ: یعنی ہزیمت کھا کر بھاگ جانا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ اِنْ یُّقَاتِلُوْكُمْ یُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ﴾ (۳۔۱۱۱) اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔

﴿وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ﴾ (۸۔۱۶) اور جو شخص جنگ کے روز ان سے پیٹھ پھیرے گا۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا﴾ (۱۵۔۵) مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

میں ولی سے ایسا لڑکا مراد ہے جو اولیاء اللہ سے ہو۔ اور آیت

﴿خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ﴾ (۱۹۔۵) اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ موالی سے عم زاد بھائی مراد ہیں۔ ❶ اور بعض نے دور کے رشتہ دار مراد لیے ہیں۔ ❷ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ (۱۷۔۱۷) اور نہ اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے کوئی اس کا مددگار نہیں ہے۔

میں مطلق ولی کی نفی نہیں ہے بلکہ وَلِیٌّ مِنَ الذُّلِّ کی نفی ہے یعنی اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے اس کا کوئی ولی نہیں ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کے سب نیک بندے اس کے اولیاء سے ہیں۔ لیکن وہ اولیا من الذل نہیں ہیں کہ کسی پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو ان سے امداد کی ضرورت ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا﴾ (۱۸۔۱۷) اور جس کو گمراہ کرے تو تم اس کے لیے کوئی دوست راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔

اَلْوَلْیُ: (ایضاً) وہ بارش جو رسمی یعنی موسم بہار کی پہلی بارش کے بعد متصل برسے اسے وَلْیٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمَوْلٰی کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) غلام کو آزاد کرنے والا (۲) آزاد شدہ غلام (۳) حلیف (۴) عم زاد بھائی (۵) پڑوسی۔

---

❶ هذا هو المروی عن الاصم ۱۲۔

❷ علی ماروی عن ابن عباس ومجاهد روح المعانی (ص۷۵ ج ۱۶)

اور ہر وہ شخص جو دوسرے کے معاملہ کا والی ہو وہ بھی اس کا مولا کہلاتا ہے۔

فُلَانٌ اَوْلٰی بِکَذَا: فلاں اس کا زیادہ حق دار ہے قرآن میں ہے:۔

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۳۳۔۶) پیغمبروں مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ ﴿اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ﴾ (۳۔۶۸) ابراہیم سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں۔ جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔

﴿فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا﴾ (۴۔۱۳۵) تو خدا انکا خیرخواہ ہے۔ ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ﴾ (۳۳۔۶) اور رشتہ دار آپس میں زیادہ حق دار ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت

﴿اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی﴾ (۷۵۔۳۴) افسوس ہے تم پر پھر افسوس ہے۔

میں بھی اولی اسی محاورہ سے ماخوذ ہے اور اَوْلٰی لَكَ وَیلَكَ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ عذاب تیرے لیے اولٰی ہے یعنی تو عذاب کا زیادہ سزاوار ہے۔[1]

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فعل متعدی بمعنی قرب کے ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَوْلٰی بمعنی اِنْزَجِرْ سے یعنی اب بھی باز آجا۔

وَلِیَ الشَّیْءُ الشَّیْءَ: دوسری چیز کا پہلی چیز کے بعد بلا فصل ہونا

اَوْلَیْتُ الشَّیْءَ الشَّیْءَ: دوسری چیز کو پہلی چیز کے ساتھ ملانا۔

اَلْوَلَاءُ: میراث جو آزادکردہ غلام سے حاصل ہوتی ہے اور احادیث میں وَلَاء کی بیع اور اسکے ہبہ سے منع کیا گیا ہے۔[2] (۱۵۳)

اَلْمُوَالَاۃُ کے معنی متابعت کے ہیں یعنی اشیاء کا یکے بعد دیگرے واقع ہونا۔

(و ہ ب)

وَهَبْتُهٗ (ف) هِبَةً وَمَوْهِبَةً وَّمَوْهِبًا: بلا عوض کوئی چیز دے دینا یا کچھ بخش دینا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحَاقَ﴾ (۶۔۶۵) اور ہم نے ان کو اسحاق (اور یعقوب علیہما السلام) بخشے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ﴾ (۱۴۔۳۹) خدا کا شکر ہے۔ جس نے مجھے بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام بخشے۔

﴿اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا﴾ (۱۹۔۱۸) انہوں نے کہا کہ میں تو تمہارے پروردگار کا بھیجا ہوا یعنی فرشتہ ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں پاکیزہ لڑکا بخشوں۔

یہاں فرشتے کا لڑکا بخشنے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا محض سبب ہونے کی بنا پر ہے (ورنہ حقیقت میں بخشنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے)

---

[1] قاله محی السنة وذهب صاحب غرة التنزیل انه من الولی بمعنی القرب ویفهم من کلام المحلی ان الاول اسم فعل بمعنی التهدید والثانی افعل التفضیل والصحیح مافی الفائق (۲/۳۱۶) انه کلمة لهف و وعید۔

[2] رواه الجماعة "من حدیث ابن عمرو بمعناه عند الحاکم وابن حبان والبیهقی وجمع ابونعیم طرقه فرواه عن خمسین رجلا من اصحاب عبدالله بن دینار عنه (النیل ۵/۷۴۔۷۵) وایضا کنزالعمال ۱۲۔

اور ایک قرأت میں لِیَھَبَ بھی ہے جو اللہ کی طرف منسوب ہے۔تو یہ نسبت حقیقی ہوگی اور پہلی یعنی فرشتے کی طرف مجازی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَوَھَبَ لِیْ رَبِّیْ حُکْمًا﴾ (۲۶۔۲۱) خدا نے مجھ کو نبوت وعلم بخشا۔

﴿وَوَھَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ﴾ (۳۸۔۳۰) اور ہم نے داود کو سلیمان علیہما السلام عطا کیے۔

﴿وَوَھَبْنَا لَهٗ اَھْلَهٗ﴾ (۳۸۔۴۳) اور ہم نے ان کو اہل وعیال بخشے۔

﴿وَ وَھَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ ھٰرُوْنَ نَبِیًّا﴾ (۱۹۔۵۳) اور اپنی مہربانی سے ان کو ان کا بھائی ہارون پیغمبر عطا کیا۔

﴿فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ﴾ (۱۹۔۵) تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

﴿اِنْ وَّھَبَتْ نَفْسَھَا﴾ (۳۳۔۵۰) اگر اپنے تئیں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لینے کے بغیر نکاح میں آنا چاہتی ہے۔)

﴿رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ﴾ (۲۵۔۷۴) ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کو چین اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

﴿وَ ھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ (۳۔۸) ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما۔

﴿وَھَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ﴾ (۳۸۔۳۵) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا کر کہ میرے بعد کسی کا شایان نہ ہو۔

اور وَاھِبٌ وَوَھَّابٌ دونوں اسمائے حسنٰی سے ہیں۔ [1] اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو بقدر استحقاق بخشا ہے اس لیے خدا تعالیٰ کو اَلْوَھَّابُ کہا جاتا ہے۔اَلْاِتِّھَابُ: (افتعال) ہدیہ قبول کرنا۔حدیث ہے۔ [2] (۱۵۴)

((لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ لَّا اَتَّھِبَ اِلَّا مِنْ قُرَشِیٍّ اَوْ اَنْصَارِیٍّ اَوْ ثَقَفِیٍّ)) میں نے عزم کر لیا ہے کہ قرشی یا انصاری یا ثقفی قبیلہ کے سوا کسی کا ہدیہ قبول نہیں کروں گا۔

(و ھ ج)

اَلْوَھَجُ کے معنی گرمی کی حرارت یا روشنی کے ہیں اور یہی معنی وَھَجَانٌ کے ہیں۔چنانچہ آیت:۔

﴿وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّھَّاجًا﴾ (اور آفتاب کو) روشن چراغ بنایا۔

میں وَھَّاجٌ کے معنی (بافراط) روشنی کرنے والا کے ہیں۔

وَھَجَتِ النَّارُ: (ف ض س) آگ روشن ہونا۔

تَوَھَّجَ الْجَوْھَرُ: جوہر چمک اٹھا۔

(و ھ ن)

اَلْوَھْنُ کے معنی (کسی معاملہ میں جسمانی طور پر کمزور ہونے یا اخلاقی کمزوری ظاہر کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ﴾ (۱۹۔۴۷) اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں بڑھاپے کے سبب کمزور ہو گئی ہیں۔

---

[1] انظر الآیة (۳۔۷)

[2] قطعة من الحدیث انظر الفائق (۲/۳۱۷) وفی النسائی عن ابی ھریرة: او دوسی۔

﴿فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ﴾ (۳۔۱۴۶) تو جو مصیبتیں ان پر واقع ہوئیں ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری۔

﴿وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ﴾ (۳۱۔۱۴) تکلیف پر تکلیف سہہ کر۔ یعنی جوں جوں پیٹ میں حمل کا بوجھ بڑھتا ہے کمزوری پر کمزوری بڑھتی چلی جاتی ہے۔

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (۳۔۱۳۸) اور دیکھو بددل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔

﴿وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ﴾ (۴۔۱۰۴) اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا۔

﴿ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِيْنَ﴾ (۸۔۱۸) (بات یہ ہے) کچھ شک نہیں کہ خدا کافروں کی تدبیر کو کمزور کر دینے والا ہے۔

(و ھ ی)

اَلْوَهْىُ: کے معنی چمڑے کے کپڑے یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا شگاف ہو جانا کے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:۔

وَهَتْ عَزَالَى السَّحَابِ بِمَائِهَا: بادل کے دھانے پر پانی کے زور سے ڈھیلے ہو گئے۔ یعنی خوب بارش ہوئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِىَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ﴾ (۶۹۔۱۶) اور آسمان پھٹ جائے گا اور اسکی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اور وَهِىَ الشَّىْءُ کے معنی بندش کا ڈھیلا پڑ جانا کے ہیں۔

(و ی)

وَیْ (اسم صورت) یہ کلمہ حسرت وندامت اور اظہار تعجب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے۔

وَیْ لِعَبْدِ اللّٰهِ: عبداللہ پر افسوس یا تعجب ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (۲۸۔۸۲) ہائے شامت! خدا ہی تو...... جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے۔

﴿وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (۲۸۔۸۲) ہائے خرابی! کافر نجات نہیں پا سکتے۔

بعض وَیْ لِزَيْدٍ (بصلہ لام) اور بعض وَیْ زَيْدٍ (بغیر لام) بولتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَيْكَ اصل میں وَيْلَكَ ہی ہے لام حذف ہونے کے بعد وَيْكَ رہ گیا ہے۔

(و ی ل)

اَلْوَيْلُ اصمعی نے کہا ہے کہ وَيْلٌ برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حسرت کے موقع پر ویل اور تحقیر کے لیے ویس اور ترحم کے لئے ویح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وَيْلٌ جہنم میں ایک وادی کا نام ہے تو ان کا یہ مقصد نہیں کہ یہ اس کے وضعی معنی ہیں۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے متعلق قرآن پاک نے یہ کلمہ استعمال کیا ہے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ اس میں ضرور داخل ہوں گے۔ [1] چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] قال السيد الآلوسى (؟ وجاء فى الحديث بطريق صحيح الفاظا عن رسول الله الويل وادٍ فى جهنم الخ واطلاقه على ذالك اما حقيقه شرعية واما مجاز لغوى من اطلاق لفظ الحال على المحل ولا يمكن ان يكون حقيقة لغوية لان العرب تكلمت به فى نظمها ونثر هاقبل ان يجيئ القرآن ولم تطلقه على ذالك (۲۷۴/۱) فهذا يؤيد ما قال المولف انه معمول على المجاز ۱۲۔

﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ (۲۔۷۹) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے، اس لیے کہ ایسے کام کرتے ہیں ﴿وَ وَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ (۱۴۔۲) اور کافروں کے لیے (سخت عذاب کی جگہ) خرابی ہے۔

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴾ (۴۵۔۷) ہر جھوٹے گنہگار پر افسوس ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۱۹۔۳۷) سو جو لوگ کافر ہوئے ان کو خرابی ہے۔

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾ (۸۳۔۱) ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ﴾ (۱۰۴۔۱) ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے۔

﴿يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ (۳۶۔۵۲) (اے ہے) ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے (جگا) اٹھایا۔

﴿يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾ (۲۱۔۱۴) ہائے شامت بے شک ہم ظالم تھے۔

﴿يٰوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ﴾ (۶۸۔۳۱) ہائے شامت ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے۔

❀❀❀

کِتَابُ الْھَاءِ

(ھ ب ط)

اَلْھُبُوْطُ (ض) کے معنی کسی چیز کے قہراً یعنی بے اختیاری کی حالت میں نیچے اتر آنا کے ہیں۔ جیسا کہ پتھر بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے اور اَلْھَبُوْط (بفتح الہاء) صیغہ صفت ہے یعنی نیچے گرنے والی چیز۔

ھَبَطَ: (فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے جیسے ھَبَطْتُ اَنَا: میں نیچے اتر پڑا و ھَبَطْتُ غَیْرِیْ دوسرے کو نیچے اتار دیا۔ قرآن میں ہے:۔

﴿وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۷۴) اور بعض پتھر ایسے بھی (ہوتے ہیں) جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔

اور جب لفظ ھَبوط انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے بخلاف لفظ اِنْزَالٌ (الافعال) کے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر باشرف چیزوں کے لیے استعمال کیا ہے جیسے ملائکہ، قرآن، بارش وغیرہ اور جہاں کہیں کسی چیز کے حقیر ہونے پر تنبیہ مقصود ہے۔ وہاں لفظ ھُبُوْط استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۲۔۳۶) اور ہم نے حکم دیا کہ تم (سب اتر جاؤ تم ایک کے دشمن ایک۔

﴿فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِیْهَا﴾ (۷۔۱۳) تو بہشت سے نیچے اتر کیونکہ تیری ہستی نہیں کہ تو بہشت میں رہ کر شیخی مارے۔

﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ (۲۔۶۱) (اچھا تو) کسی شہر میں اتر پڑو۔ کہ جو مانگتے ہو (وہاں) تم کو ملے گا۔

یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ سے ان کا شرف ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے مابعد کی آیت۔

﴿وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۶۱) اور ان پر ذلت اور محتاجی لیس دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں آ گئے۔ اس وہم کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا﴾ (۲۔۳۸) ہم نے حکم دیا کہ تم سب (کے سب) یہاں سے اتر جاؤ۔ محاورہ ہے۔ ھَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَ الْعَلِیْلِ: بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا یعنی (لاغر کر دیا) اور اَلْھَبِیْطُ: اونٹ وغیرہ کو کہتے ہیں۔ جو غذا کے ناقص اور مالک کی بے اعتنائی کی وجہ سے لاغر ہو جائے۔

(ھ ب و)

ھَبَا (ن) اَلْغُبَارُ کے معنی غبار کے اڑنے اور فضا میں پھیل جانے کے ہیں اور ھَبْرَةٌ (بروزن) غَبْرَةٌ اور ھَبَاءٌ کے معنی غبار یا ان کے باریک ذرّات کے ہیں جو کمرے کے اندر روشندان سے دھوپ کی کرنیں اندر

پڑنے سے اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ (۲۵۔۲۳) اور ان کو اس طرح رائیگاں کردیں گے۔ جیسے بکھری ہوئی دھول۔
﴿فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا﴾ (۵۶۔۶) تو (پہاڑ ایسے) ہو جائیں گے (جیسے) ذرّے پڑے ہوئے اڑ رہے ہیں۔

(ھ ج د)

اَلْهُجُوْدُ کے معنی نیند کے ہیں اور نائم (سوئے ہوئے) آدمی کو هَاجِدٌ کہا جاتا ہے اور هَجَّدْتُهٗ فَتَهَجَّدَ (ازالہ ماخذ) کے معنی ہیں: میں نے اس کی نیند کو دور کیا تو وہ جاگ گیا جیسا کہ مَرَّضْتُهٗ کے معنی ہوتے ہیں: میں نے اس کے مرض کو دور کیا قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ (۱۷۔۷۹) اور رات کے وقت میں نماز تہجد بھی پڑھا کرو۔ [1]
اس آیت میں رات کے قیام میں قرآن پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسے دوسری جگہ اسی کو ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗ﴾ (۷۳۔۲) رات (کے وقت نماز) میں کھڑے رہا کرو ساری رات سے کم یعنی آدھی رات۔
قیام کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔
اَلْمُتَهَجِّدُ کے معنی رات کو نیند سے اٹھ کر نماز پڑھنے والا کے ہیں۔
اَهْجَدَ الْبَعِيْرُ: کے معنی اونٹ کا خواب کے وقت اپنا سینہ زمین پر رکھ دینے کے ہیں۔

(ھ ج ر)

اَلْهَجْرُ وَالْهِجْرَانُ کے معنی ایک انسان کے دوسرے سے جدا ہونے کے ہیں عام اس سے کہ یہ جدائی بدنی ہو یا زبان سے ہو یا دل سے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ﴾ (۴۔۳۴) پھر ان کے ساتھ سونا ترک کرو۔
میں مفارقت بدنی مراد ہے اور کنایتاً ان سے مجامعت ترک کردینے کا حکم دیا۔ اور آیت ﴿اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ (۲۵۔۳۰) کہ میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔
میں دل یا دل اور زبان دونوں کے ذریعہ جدا ہونا مراد ہے (یعنی نہ تو انہوں نے اس کی تلاوت کی اور نہ ہی اس کی تعلیمات کی طرف دھیان دیا) اور آیت:۔
﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا﴾ (۷۳۔۱۰) اور وضع داری کے ساتھ ان سے الگ تھلگ رہو۔
میں تینوں طرح الگ رہنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی جمیلاً کی قید لگا کر اس طرف اشارہ کردیا ہے کہ حسنِ سلوک اور مجالست کسی صورت میں بھی ترک نہ ہونے پائے۔ اس طرح آیت ﴿وَاهْجُرْنِىْ مَلِيًّا﴾ (۱۹۔۴۶) اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔ میں بھی ترک بوجوہ ثلاثہ مراد ہے۔ اور آیت:۔ ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (۷۴۔۵) اور ناپاکی سے دور رہو میں بھی ہر لحاظ سے رجز کو ترک کردینے کی ترغیب ہے۔
اَلْمُهَاجَرَةُ کے اصل معنی تو ایک کے دوسرے سے کٹ جانے اور چھوڑ دینے کے ہیں جیسے فرمایا:۔ ﴿وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا﴾ (۲۔۲۱۸) اور خدا کے لیے وطن

---

[1] من الاضداد یاتی بمعنی النوم و الیقظة (ابو الطیب ۶۷۸۔۶۸۱) وفیه اکثر ما یقال فی النائم الها جدو فی المستیقظ المتهجد و کذا قال ابن الاعرابی راجع اللسان (هجد) ۱۲۔

چھوڑ گئے اور (کفار سے) جنگ کرتے رہے۔

اور آیات قرآنیہ۔

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ﴾ (۵۹۔۸) (فے کے مال میں) محتاج مہاجرین کا (بھی) حق ہے۔ جو (کافروں کے ظلم سے) اپنے گھر اور مال سے بے دخل کر دیئے گئے۔

﴿وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ﴾ (۴۔۱۰۰) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے۔

﴿فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۴۔۸۹) تو جب تک (یہ لوگ) خدا کی راہ میں (یعنی خدا کے لیے) ہجرت نہ کر آئیں ان میں سے (کسی کو بھی اپنا) دوست نہ بنانا۔

میں مہاجرت کے ظاہر معنی تو دارالکفر سے نکل کر دارالاسلام کی طرف چلے آنے کے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ کرام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی لیکن بعض نے کہا ہے۔ کہ ہجرت کا حقیقی اقتضاء یہ ہے کہ انسان شہوت نفسانی، اخلاق ذمیمہ اور دیگر گناہوں کو کلیتۃً ترک کر دے اور آیت:۔

﴿اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ﴾ (۲۹۔۲۶) اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ) میں تو دیس چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف (جہاں کہیں اس کو منظور ہوگا) نکل جاؤں گا۔ کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی قوم کو خیر باد کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف چلا جاؤں گا۔ اور فرمایا:۔

﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا﴾ (۴۔۹۷) کیا اللہ تعالیٰ کی (اتنی لمبی چوڑی) زمین (اس قدر) گنجائش نہیں رکھتی تھی کہ تم اس میں (کسی طرف کو) ہجرت کر کے چلے جاتے۔

ہاں جس طرح ظاہری ہجرت کا اقتضا یہ ہے کہ انسان خواہشات نفسانی کو خیر باد کہہ دے۔ اس طرح دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے میں بھی مجاہدہ بالنفس کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں مروی ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے ایک جہاد سے واپسی کے موقع پر صحابہ کرام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا[1]: (۱۵۵)

((رَجَعْتُمْ مِّنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ)) کہ تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہو۔ یعنی دشمن کے ساتھ جہاد کے بعد اب نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔[2] (۱۵۶)

((هَاجِرُوْا وَلَا تَهَجَّرُوْا)) یعنی صحیح طور پر مہاجر ہو اور عمل کو ترک کر کے محض زبان سے مہاجر ہونے کے جھوٹے دعاوی نہ کرو۔

اَلْهُجْر کے معنی ہذیان کے ہیں جس کے برا ہونے کی وجہ

---

[1] وفي البيهقي في الزهد والديلمي في مسنده من حديث جابر قَدَّمْتُمْ بدل رجعتم وزاد قيل وما الجهاد الاكبر قال مجاهدة العبد هواه وفيه ضعف واورده النسائي في الكنى من قول ابراهيم بن عبلة احد التابعين وفي الكشاف ان النبي ﷺ رجع من بعض غزواته فقال رجعنا الحديث قال الحافظ في تخريجه هكذ ذكره الثعلبي بغير سند (راجع تخريج الكشاف ص ١١٤ رقم ٣٣) وكنز العمال (٢٨٦/٤)۔

[2] موقوف على عمرؓ والمستدرك للحاكم (٨/٣) غريب ابى عبيد (٣١١/٣) والحديث في الفائق (٢١٦/٢) بطوله عن زربن حبيش ١٢۔

سے اسے ترک کر دینا چاہیے اور حدیث میں ہے۔❶ (۱۵۷) ((لَا تَقُوْلُوْا هُجْرًا)) فحش کلامی نہ کرو۔

اور اَهْجَرَ فُلَانٌ کے معنی ہی اس نے قصداً فحش کلامی کی اور هَجَرَ الْمَرِيْضُ کے معنی مریض کے بے ہوشی میں بڑبڑانے کے ہیں۔ اور آیت:۔

﴿مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۷)

(تو تم) اکڑ اکڑ کر شغل بناتے ہو بیہودہ بکواس کرتے (الٹے پاؤں بھاگتے)

میں ایک قرأت تُهْجِرُوْنَ (باب افعال سے) بھی ہے۔ اور کبھی هجر (بکواس) میں مبالغہ کرنے والے کو بھی مُهْجِر کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو اس لحاظ سے هُجْر کے معنی قصداً بکواس کرنا بھی آ جاتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے❷ (الطّویل)

(۴۷۰) كَمَا جِدَةِ الْاَعْرَاقِ قَالَ ابْنُ ضَرَّةٍ
عَلَيْهَا كَلَامًا جَارَ فِيْهِ وَاَهْجَرَا

شریف النسل عورت کی طرح جس کی سوکن کے لڑکے نے اس کے بارے میں بے انصافی اور فحش کلامی کی ہو (اور وہ اپنی براءت کے لیے بار بار ہاتھ اٹھا رہی ہو)

اور محاورہ ہے: رَمَاهُ بِهَاجِرَةِ كَلَامِهٖ: یعنی فلاں نے اس کو فحش گالیاں دیں۔ اور فُلَانٌ هِجِّيْرَاهُ کے معنی ہیں۔❸ کہ فلاں کا یہ شیوہ بن چکا ہے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی آدمی کسی چیز کا کثرت سے ذکر کرے اور مریض کی طرح اس کے متعلق ہر وقت بڑبڑاتا رہے اور هَجِيْرٌ کا لفظ اصل میں تو عادات ذمیمہ کے متعلق بولا جاتا ہے۔ مگر جو لوگ اسکے صحیح معنوی استعمال کا لحاظ نہیں کرتے وہ اسے اس کی ضد (یعنی اچھی عادت کے معنی) میں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔

اَلْهَجِيْرُ وَالْهَاجِرَةُ کے معنی دوپہر کا وقت، کے ہیں۔ کیونکہ عموماً مسافر سخت گرمی کی وجہ سے اس وقت سفر کو ترک کر کے راحت حاصل کرتا ہے تو گویا اسے لوگوں نے چھوڑ دیا اور اس وقت نے لوگوں کو چھوڑ دیا۔

اَلْهِجَارُ: یہ عقال و زمام کے وزن پر ہے اور اسکے معنی اونٹ کا پاؤں باندھنے کی رسی، کے ہیں وہ رسی چونکہ دوسرے اونٹوں سے علیحدگی کا سبب بنتی ہے اس لیے اسے هِجَارٌ بھی کہتے ہیں۔ اور مَهْجُوْرٌ اس اونٹ کو کہتے ہیں۔ جو هِجَار (رسی) کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ اور پھر اونٹ کی اس رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر کمان کی تانت کو بھی هِجَارُ الْقَوْسِ کہہ دیا جاتا ہے۔

(ھ ج ع)

اَلْهُجُوْعُ کے معنی رات کو سونا کے ہیں۔

قرآن میں ہے۔

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۷)

---

❶ وتمام الحديث زوروا القبور ولا تقولوا هجراره عن زيد بن ثابت' الفتح الكبير للنبهانی (۱۴۴/۲) والنهاية (۲۵۵/۴) واللسان والمجمع (هجر) واضداد ابی الطيب (۶۸۵) والطبرانی فی الصغير (۱۸۳) او الفائق (۳۲۱/۲)۔

❷ قاله شماخ بن ضرار الغطفانی يصف سير ناقته ويشبه ذراعيها فی مشيها بذراع امرءة صفتها كذا وفی رواية ديوانه ممجدة الاعراق بدل كما جدة الاعراق والبيت فی اللسان (هجر) وامالی المرتضیٰ (۱: ۵۵۶) وفی ديوانه من قصيدة طويلة (۲۶۔۳۴)۔

❸ وفی الفائق (۳۲۱/۲)۔ كان عمرؓ يطوف بالبيت وهو يقول ربنا اتنا الخ...... ماله هجيری سواه وراجع ايضا غريب ابی عبيد (۳۱۸/۳) وفيه (۳۱۸/۳) وفيه غيرها) وفی (ج) مسند عمر (۱۵۱۴)۔

اور وہ (عبادت) میں مشغول رہنے کے سبب رات کو بہت کم سوتے تھے۔

اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور یہ بھی کہ وہ رات کو سوتے ہی نہیں تھے۔"

کیونکہ قلیل کا لفظ جس طرح نہایت تھوڑی چیز کے معنی میں آتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہو اس طرح کبھی نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔محاورہ ہے۔لَقِیْتُهٗ بَعْدَ هُجْعَةٍ کہ میں اسے رات کو کچھ دیر سو لینے کے بعد ملا اور هُجَعٌ (مثل قُوَمٌ) مدہوش اور بےخود آدمی کو کہتے ہیں۔جو ہر چیز سے غافل ہو۔

(ھ د د)

اَلْهَدُّ کے معنی کسی چیز کو زور کی آواز کے ساتھ گرا دینے یا کسی بھاری چیز کے گر پڑنے کے ہیں اور کسی چیز کے گرنے کی آواز کو هَدَّۃ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا﴾ (۱۹۔۹۰) زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔

اور وَهَدَوْتُ الْبَقَرَةِ: کے معنی گائے کو ذبح کرنے کے لیے زمین پر گرانے کے ہیں اور هِدٌّ بمعنی مَهْدُوْدٌ (یعنی) گرائی ہوئی چیز کے، آتا ہے جیسے ذِبْحٌ بمعنی مَذْبُوحٌ اور کمزور بزدل آدمی کو بھی هِدٌّ کہا جاتا ہے۔

ایک محاورہ ہے۔

مَرَرْتُ بِرَجُلٍ هَدَّكَ مِنْ رَجُلٍ: میں ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو تیرے لیے فلاں وصے کافی ہے اصل میں اس کے معنی ہیں کہ جس کا وجود تجھے بے چین اور مضطرب کرتا ہے۔

هَدَّدْتُ فُلَانًا وَتَهَدَّدْتُهٗ: میں نے اسے دھمکایا اور ڈرایا۔

اَلْهَدْ هَدَةُ: بچے کو سلانے کے لیے تھپکی دینا اور ہلانا۔

اَلْهُدْهُدُ: ایک پرندے کا نام ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مَا لِیَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ﴾ (۲۷۔۲۰) کیا سبب ہے کہ ہدہد نظر نہیں آتا۔

اس کی جمع هَدَا هِدُ آتی ہے۔اور هُدَ اهِدُ ضمہ کے ساتھ واحد ہے۔شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۴۱۵) کَهُدَا هِدٍ کَسَرَ الرُّمَاةُ جَنَاحَهٗ
يَدْعُوْ لِقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ هَدِيْلَا

وہ اس حمام کی طرح پریشان تھا جس کے بازو شکاریوں نے توڑ دیئے ہوں اور وہ راستہ میں کھڑا واویلا کر رہا ہو۔

(ھ د م)

اَلْهَدْمُ (ض) کے اصل معنی عمارت کو گرا دینا

---

[1] قاله الراعی النمیری اعبید بن حصین من فحول الشعراء) (والبیت من قصیدة جمهریه (۳۳۱۔۳۳۷) فی نحو ۸۵ بیتا یمدح فیها عبدالملك بن مروان ویشکو السعاة مطلعها: مابال وفلك بالفراش رحیلا اقذی بینك ام اردت رحیلا۔ وبعد البیت: وقع الربیع وقد تقارب خطوه۔ ورای لعقوته ازل نسولا۔ البیت فی الحمهرة (۳۳۵) والبلدان (رسم: بغیبغة اواللسان والصحاح (هد هد. هدل) والحیوان (۳: ۲٤۳) والحمهرة لابن درید ۷۲ او امالی الزجاجی ٥٤ والمعانی للقبتی ۱۸۸، ۳۰۰ والشاعر شبه رجلا اخذ المصدق ابله بهدهد کسرجناحه وقبل البیت: اخذوا حمولته فاصبح قاعدا لایستطیع عن الدیار حویلا یدعو امیر المؤمنین و دونه خرق تجربه الریاح ذیولا۔ والراعی ممن ذکر الحمع فی الطبقة الاولی من الشعراء لاسلامیین وکان یقدم الفرزوق علی الحریر فاسکتفه فهجاه بقصیدته البائیة اولها۔ اقل اللوم عادل والعتابا۔ وقولی ان اصبت لقدر اصابا۔ راجع الحمحی ۱۷۳ والاغانی (۳۰/۱٦۸۔۱۷۳)

کے ہیں اس سے فعل هَـــدَمَ آتا ہے اور گری ہوئی چیز کو هَـــدَمٌ کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے استعارہ کے طور پر رائیگاں خون کو دَمٌ هَـدَمٌ کہا جاتا ہے اور یہی معنی هِـدْمٌ بکسر الہا کے ہیں لیکن یہ خاص کر بوسیدہ کپڑے پر بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اَهْدَامٌ آتی ہے۔ اور هَـدَّمْـتُ الْبِـنَاءَ کے معنی بھی عمارت کو گرا دینے کے ہیں مگر اس میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿لَّهُـدِّمَـتْ صَوَامِعُ﴾ (۲۲۔۴۰) تو (نصاریٰ) کے صومعے بھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

(ھ د ی)

اَلْهِـــدَايَةُ کے معنی لطف وکرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں اور اسی سے هَـدِيَّةٌ (فعلۃ) ہے جس کے معنی اس تحفہ کے ہیں۔ جو بغیر معاوضہ کے دیا جائے۔ اور هَـوَادِي الْوَحْشِ جنگلی جانوروں کے پیش رو دستے کو کہتے ہیں جو گلے کا رہنما ہوتا ہے۔ عرف میں دلالت اور رہنمائی کے لیے هَـدَيْـتُ (افعال) استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَهْـدَيْـتُ الْهَـدِيَّةَ: میں نے ہدیہ بھیجا اور اَهْـدَيْـتُ اِلَـى الْبَيْتِ: میں نے بیت اللہ کی طرف ہدی بھیجی۔ یہاں پر شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر هَـدَايَـه کے معنی لطف وکرم کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں تو پھر کفار کو دوزخ کی طرف دھکیلنے کے لیے یہ لفظ کیوں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ ﴿فَـاهْـدُوْهُـمْ اِلَـى صِـرَاطِ الْجَحِيْمِ﴾ (۳۷۔۲۳) پھر ان کو جہنم کے راستے پر چلا دو۔ ﴿وَ يَهْـدِيْـهِ اِلَـى عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ (۲۲۔۴) اور دوزخ کے عذاب کا رستہ دکھائے گا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہدایت کے اصل معنی تو لطف وکرم کے ساتھ رہنمائی کے ہی ہیں۔ لیکن یہاں کفار کے متعلق مبالغہ کے لیے بطور تہکم یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت۔ ﴿فَبَشِّـــرْهُـــمْ بِـعَـذَابٍ اَلِـيْـمٍ﴾ (۸۴۔۲۴) تو (اے پیغمبر!) انہیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔

میں عذاب کے متعلق لفظ بشارت استعمال کیا ہے اور شاعر نے اپنے کلام [1] ()

(۴۵۲) تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ

ان کا باہمی تحیہ تلوار کی دردناک ضرب ہے

میں ضرب وجیع کے متعلق تحیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرف سے ہدایت کی ہے۔

(۱) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے سے کی ہے اور اسی معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمیع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار چیز کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿رَبُّـنَـا الَّـذِىٓ اَعْـطٰـى كُـلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَـــدٰى﴾ (۲۰۔۵۰) ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان کی خاص اغراض پورا کرنے کی) راہ دکھائی۔

(۲) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ نجات کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ آیت: ﴿وَجَـعَـلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْـدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾ (۳۱۔۲۴) اور ہم نے

[1] قاله عمر وبن معدی کرب وصدره: وخيل قدد لفت لهابخيل...... انظر لتخريجه (ب ش د)

بنی اسرائیل میں سے (دین کے) پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے، میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(۳) سوم ہدایت بمعنی توفیق خاص آیا ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (۴۷۔۱۷) جو لوگ روبراہ ہیں (قرآن کے سننے سے) خدا ان کو زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

﴿مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ (۶۴۔۱۱) اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ﴾ (۱۰۔۹) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کیے ان کے ایمان کی برکت سے ان کو ان کا پروردگار (نجات کا) رستہ دکھائے گا۔ ﴿وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۲۹۔۶۹) اور جن لوگوں نے ہمارے دین (کے کام) میں کوشش کی۔ ہم (بھی) ان کو ضرور اپنے رستے دکھائیں گے۔

﴿وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾ (۱۹۔۷۶) اور جو لوگ راہ راست پر ہیں اللہ ان کو (روز بروز) زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۔۲۱۳) تو خدا نے (اپنی عنایت سے) مسلمانوں کو راہ دکھادی۔

﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۲۔۱۴۲) جس کو چاہتا ہے (دین کا) سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

(۴) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۵) (بلکہ) وہ انہیں (منزل) مقصود تک پہنچا دے گا۔ اور آیت ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ﴾ میں فرمایا: ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ (۷۔۴۳) خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں کا رستہ دکھایا اور اگر خدا ہم کو رستہ نہ دکھاتا تو ہم رستہ نہ پاسکتے۔

ہدایت کے یہ چاروں اقسام ترتیبی درجات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی جسے پہلے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو۔ وہ دوسرے درجہ ہدایت پر فائز نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ تو شرعا مکلّف ہی نہیں رہتا۔ علی ہذا القیاس جسے دوسرے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو وہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہدایت سے بہرہ یاب نہیں ہوسکتا اور جسے چوتھے درجہ کی ہدایت حاصل ہو تو اسے پہلے تینوں درجات لازماً حاصل ہوں گے۔ اسی طرح تیسرے درجہ کی ہدایت کا حصول پہلے دو درجوں کی ہدایت کو مستلزم ہے اور اس کے برعکس درجہ اولیٰ کا حصول درجہ ثانیہ کو اور ثانیہ کا حصول ثالثہ کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک انسان کسی دوسرے کو صرف دعوت الی الخیر اور رہنمائی کے ذریعہ ہی ہدایت کرسکتا ہے باقی اقسام ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ لہٰذا جن آیات میں ہدایت کی نسبت پیغمبر یا کتاب یا دوسرے انسانوں کی طرف کی گئی ہے وہاں صرف راہ حق کی طرف رہنمائی کرنا مراد ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۴۲۔۵۲)

اور بے شک (محمدؐ) سیدھا رستہ دکھاتے ہیں۔
﴿یَھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (۳۲۔۲۴) جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے۔
﴿وَ لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ﴾ (۱۳۔۷) اور ہر ایک قوم کے لیے رہنما ہوا کرتے ہیں۔
اور جن آیات میں پیغمبروں یا دوسرے لوگوں سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہاں باقی اقسام ہدایت مراد ہیں۔ چنانچہ فرمایا:
﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ (۲۸۔۵۶) (اے محمدؐ) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے۔
اور قرآن پاک میں جہاں کہیں ظالموں اور کافروں کو ہدایت سے روک دینے کا ذکر آیا ہے۔ وہاں یا تو ہدایت بمعنی ثالث ہے یعنی وہ توفیق خاص جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا ہوتی ہے ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور یا ہدایت بمعنی رابع ہے کہ اللہ انہیں آخرت میں ثواب کی طرف ہدایت نہیں دے گا اور نہ ہی انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ چنانچہ آیت یَھْدِیْ اللّٰہِ قَوْمًا' کے آخر میں فرمایا۔
﴿وَاللّٰہُ لَا یَھْدِیْ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (۹۔۱۱۹) اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔
﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۱۶۔۱۰۷) یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا اور اس لیے کہ خدا کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔
جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر یا کسی انسان کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دینے پر قدرت نہیں رکھتے بلکہ ہدایت خدا تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تو وہاں دعوت الی الحق اور صحیح رہنمائی کے علاوہ باقی اقسام ہدایت مراد ہیں یعنی کسی کو عقل اور توفیق بخشنا یا جنت میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قدرت میں نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
﴿لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۲۔۲۷۲) (اے محمد ﷺ) تم ان لوگوں کو ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو۔ بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے۔ ہدایت بخشتا ہے۔
﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَمَعَھُمْ عَلَی الْھُدٰی﴾ (۶۔۳۵) اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔
﴿وَ مَآ اَنْتَ بِھٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ﴾ (۲۷۔۸۱) اور نہ اندھوں کو گمراہی سے (نکال کر) رستہ دکھا سکتے ہو۔
﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی ھُدٰھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ﴾ (۱۶۔۳۷) اگر تم ان (کفار) کی ہدایت کے لیے للچاؤ تو جس کو خدا گمراہ کر دیتا ہے اس کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔
﴿وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ھَادٍ﴾ (۳۹۔۳۶) اور جس کو خدا گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔
﴿وَمَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ﴾ (۳۹۔۳۷) اور جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔
﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۲۸۔۵۶) (اے محمدؐ) تم جس کو دوست رکھتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔ بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے۔ ہدایت کرتا ہے۔
اور اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۰۔۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ مومن ہو جائیں۔

اورآیت:﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ﴾ (۱۸۔۱۷) جس کو خدا ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ہدایت کا طلبگار اور متلاشی ہو اسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت یاب ہونے کی توفیق بخشا۔ اور راہ جنت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کے برعکس جو شخص کفر وضلالت کا خواہاں رہتا ہے وہ توفیق الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۔۲۶۴) اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اور دوسری آیت میں کٰفِرِيْنَ کی جگہ ظٰلِمِيْنَ ہے۔ اور آیت۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (۳۹۔۳) بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے۔ ہدایت نہیں دیتا۔

میں كَاذِبٌ كَفَّارٌ سے مراد وہ شخص ہے جو ہدایت الٰہی کے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ اگر چہ اس کے وضعی معنی نہیں ہیں لیکن حاصل مطلب یہی ہے۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت قبول نہیں کرتا اسے اللہ تعالیٰ بھی ہدایت نہیں بخشا جیسے محاورہ ہے۔ مَنْ لَمْ يَقْبَلْ هَدِيَّتِيْ لَمْ اُهْدِلَهٗ وَمَنْ لَّمْ يَقْبَلْ عَطِيَّتِيْ لَمْ أُعْطِهِ......یعنی جو شخص میرے ہدیہ یا عطیہ کو قبول نہیں کرے گا میں بھی اسے ہدیہ نہیں دوں گا۔ یا آپ کہیں: مَنْ رَغِبَ عَنِّيْ لَمْ اَرْغَبْ فِيْهِ کہ جو شخص مجھ سے اعراض کرتا ہے مجھے بھی اس کی ضرورت نہیں پس آیت۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۲۔۲۵) اور خدا بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اور دوسری آیت میں اَلْفَاسِقِيْنَ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت

﴿اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى﴾ (۱۰۔۳۵) بھلا جو حق کا رستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ یا وہ کہ جب تک کوئی اسے رستہ نہ بتائے رستہ نہ پائے۔

میں ایک قرأت لَا يَهْدِيْ اِلَّا اَنْ يُّهْدٰى ہے۔ یعنی وہ دوسرے کی رہنمائی نہیں کرسکتا بلکہ وہ خود رہنمائی کا محتاج ہے مطلب یہ ہے کہ ان میں علم ومعرفت حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور اگر انہیں کوئی شخص ہدایت دے بھی تو بیکار ہے۔ کیونکہ وہ بت (پتھر وغیرہ کی) بے جان مورتیاں ہیں پس اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى سے بظاہر اگر چہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہدایت دینے سے وہ ہدایت پا سکتے ہیں۔ لیکن یہ مجاز پر محمول ہے۔ جیسا کہ محض صوری مشابہت کی وجہ سے ان بتوں کو آیت:۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ (۷۔۱۹۴) (مشرکو!) جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، تمہاری طرح کے بندے ہی ہیں۔ میں عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ کہدیا ہے حالانکہ وہ بے جان مجسمے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا:﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ

وَ الْاَرْضِ شَيْـئًـا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ﴾ (۱۶۔۷۳) اور خدا کے سوا ان کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمینوں میں روزی دینے کا ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ (کسی اور طرح کا) مقدور رکھتے ہیں۔

اور آیات کریمہ:۔﴿اِنَّا هَدَيْنٰـهُ السَّبِيْلَ﴾ (۷۶۔۳) اور اسے رستہ بھی دکھا دیا۔

﴿وَهَدَيْنٰـهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (۹۰۔۱۰) اور اس کو (خیر،شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

﴿وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (۳۷۔۱۰۸) اور ان کو سیدھا رستہ دکھایا۔

میں خیر وشر اور ثواب وعقاب کا رستہ مراد ہے۔جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے عقل وشریعت کے ذریعہ انسان کو ہدایت فرمائی ہے اور یہی معنی آیت:﴿فَرِيْـقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ﴾ (۷۔۳۰) ایک فریق کو تو اس نے ہدایت دی اور ایک فریق پر گمراہی ثابت ہو چکی۔

میں مراد ہیں اور آیت:﴿وَمَـنْ يُّـؤْمِـنْ بِـاللّٰهِ يَهْدِ قَـلْبَـهٗ﴾ (۶۴۔۱۱) اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے۔وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔

میں ہدایت سے توفیق الٰہی مراد ہے جو کہ مومن کے دل میں القاء کی جاتی ہے اور وہ اپنے مشاغل میں اس سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (۴۷۔۱۷) اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو وہ ہدایت مزید بخشتا ہے۔

لفظ ہدایت کبھی متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ لام یا الیٰ کے متعدی ہوتا ہے، چنانچہ تعدیہ بواسطہ الیٰ کے متعلق فرمایا:۔﴿فَـقَـدْ هُـدِيَ اِلٰـى صِـرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۳۔۱۰۱) اور جس نے خدا (کی ہدایت کی رسی) کو مضبوط پکڑ لیا وہ سیدھے رستے لگ گیا۔

﴿وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۶۔۸۰) اور ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔

اور نیز فرمایا:۔

﴿اَفَـمَـنْ يَّهْـدِيْٓ اِلَـى الْـحَـقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ﴾ (۱۰۔۳۵) بھلا جو شخص حق کا رستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى .... وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى﴾ (۷۹۔۱۸۔۱۹) کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے اور میں تمہیں تمہارے پروردگار کا رستہ بتاؤں تاکہ تجھ میں خوف پیدا ہو۔اور تعدیہ بنفسہٖ کے متعلق فرمایا:

﴿وَّلَهَـدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ (۴۔۶۸) اور سیدھا رستہ بھی دکھاتے۔

﴿وَهَـدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (۳۷۔۱۱۸) اور ہم نے انہیں سیدھا رستہ دکھایا۔

﴿اِهْـدِنَـا الـصِّـرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (۱۔۵) ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔

﴿اَتُـرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ﴾ (۴۔۸۸) کیا تم چاہتے ہو کہ جس شخص کو خدا نے گمراہ کر دیا اس کو رستے پر لے آؤ۔

﴿وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا﴾ (۴۔۱۶۸) اور نہ انہیں رستہ ہی دکھائے گا۔

﴿اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ﴾ (۱۰۔۴۳) تو کیا تم اندھوں کو رستہ دکھاؤ گے۔

﴿وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ (۴۔۱۷۶) اور اپنی طرف (پہنچنے کا) سیدھا رستہ دکھائے گا۔ پھر ہدایت و تعلیم دو باتوں کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی ایک یہ کہ معلم اپنی طرف سے کما حقہ سمجھانے کی کوشش کرے اور دوسرے یہ کہ متعلم استفادہ کرنے کی کوتاہی سے کام نہ لے اگر ہادی یا معلم اپنی طرف سے تعلیم میں پوری کوشش کرے لیکن متعلم میں قبولیت کی صلاحیت نہ ہو تو اس کے عدم قبول کے لحاظ سے آپ (مجازاً) یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ہدایت نہیں کی اور ہادی کے اپنی کوشش صرف کرنے کے لحاظ سے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس نے ہدایت اور تعلیم دی پس جب عدم قبولیت کی صورت میں (نفی اور اثبات کے ساتھ) دونوں طرح کہنا صحیح ہے تو کفار کے ہدایت الٰہی کو قبول نہ کرنے کے لحاظ سے یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت نہیں دی کیونکہ ہدایت و تعلیم پر قبولیت کا ثمرہ مرتب نہیں ہوا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی۔ کیونکہ انہی مبداء ہدایت یعنی (عقل و حواس) عطا فرمائے۔ پس آیت:۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۹۔۱۹) اور خدا ظالم یا ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

میں نفی معنی اول (یعنی عدم قبولیت) پر محمول ہوگی اور آیت: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ (۴۱۔۱۷) اور جو ثمود تھے ان کو ہم نے سیدھا رستہ دکھا دیا تھا۔ مگر انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنا پسند کیا۔

میں اثبات ہدایت دوسرے معنی بَذْلُ السَّعْيِ یعنی کوشش کرنے کے لحاظ سے ہوگا۔ لیکن جہاں قبولیت حاصل نہ ہو وہاں یہ کہنا زیادہ اولی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت کی لیکن اس نے ہدایت الٰہی کو قبول نہ کیا۔ جیسا کہ آیت ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ الاية﴾ میں ہے اور آیت:

﴿لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى قَوْلِهٖ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ (۲۔۱۴۲) (تم کہدو) کہ مشرق اور مغرب سب خدا ہی کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے۔ سیدھے رستے پر چلاتا ہے۔ الخ...... اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی۔ میں اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس سے رہنمائی حاصل کی اور آیت۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (۱۔۵) ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔

اور آیت: ﴿وَلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ (۴۔۶۸) اور سیدھا رستہ بھی دکھا دیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ہدایت سے ہدایت عامہ یعنی قرآن پاک اور انبیاء کرام کے ذریعہ ہدایت کرنا مراد ہے۔ اور یہ اگرچہ ہمیں حاصل ہے۔ لیکن ہمیں حصول ثواب کے لیے ان کلمات کے زبان سے ادا کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ جس طرح کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ الخ پڑھنے یعنی آپ پر درود بھیجنے کے ہم مکلف ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آپ پر رحمت بھیجتے اور آپ کے لیے دعا اور استغفار کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیت:۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾

(۳۳۔۵۶) خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر وردگار پر درود بھیجتے ہیں ۔۔ سے ثابت ہوتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ یہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ گمراہی اور شہوات نفسانیہ کے پنجہ میں گرفتار ہونے سے حفاظت کی دعا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں توفیق الٰہی کی طلب کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ آیت:
﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (۴۷۔۱۷) اور جو ہدایت یافتہ ہیں وہ ان کو مزید ہدایت بخشتا ہے۔ میں وعدہ فرمایا ہے۔ اور بعض نے آخرت میں ہدایت الی الجنۃ مراد لی ہے۔ اسی طرح آیت
﴿وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ (۲۔۱۴۳) اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی۔
میں بھی ہدایت سے ۔ توفیق الٰہی مراد ہے۔ جس کا ذکر کہ آیت۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ میں پایا جاتا ہے۔
اَلْهُدٰى اور هَدَايَةٌ اگر چہ لغۃً ہم معنی ہیں۔ لیکن قرآن پاک نے هُدًى کا لفظ خاص کر ہدایت الٰہی کے لیے استعمال کیا ہے اور کسی انسان کی طرف اس کی نسبت نہیں کی چنانچہ فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۲۔۱) خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ (۲۔۵) یہی لوگ اپنے پروردگار (کی طرف) سے ہدایت پر ہیں۔ ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (۲۔۱۵۸) لوگوں کے لیے رہنما ہے۔ ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ﴾ (۲۔۳۸) جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے (تو اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔
﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾ (۲۔۱۲۰) کہہ دو کہ خدا کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے۔
﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ﴾ (۱۶۔۳۷) اگر تم ان (کفار) کی ہدایت کے لیے للچاؤ تو جس کو خدا گمراہ کر دیتا ہے۔ اس کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔
﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ (۲۔۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی۔
اَلْاِهْتِدَاءُ: (ہدایت پانا) کا لفظ خاص کر اس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو امور دنیوی یا اخروی کے متعلق انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا﴾ (۶۔۹۸) اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ (جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں) ان سے رستہ معلوم کرو۔
﴿اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا﴾ (۴۔۹۸) اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں۔ کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں۔
لیکن کبھی اِهْتِدَاءٌ کے معنی طلب ہدایت بھی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔
﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (۲۔۵۱) اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب

اور معجزے عنایت کیے تا کہ تم ہدایت حاصل کرو۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (۲۔۱۵۰) سوان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔

﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (۳۔۲۰) اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بے شک ہدایت پالیں۔

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (۲۔۱۳۷) تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو تو ہدایت یاب ہو جائیں۔

اَلْمُهْتَدِيْ: اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالم کی اقتداء کر رہا ہو چنانچہ آیت:

﴿اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ﴾ (۵۔۱۰۴) بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے ہوں اور نہ کسی کی پیروی کرتے ہوں۔ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ نہ وہ خود عالم تھے اور نہ ہی کسی عالم کی اقتداء کرتے تھے۔ اور آیت:

﴿فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا﴾ (۱۰۔۱۰۸) تو جو کوئی ہدایت حاصل کرے تو ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

میں اِهْتِدَاء کا لفظ طلبِ ہدایت، اقتداء اور تحری ہدایت تینوں کو شامل ہے۔ اسی طرح آیت: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ﴾ (۲۷۔۲۴) اور شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ کر کے دکھائے ہیں۔ اور ان کو رستے سے روک رکھا ہے پس وہ رستے پر نہیں آتے۔

میں بھی لَا يَهْتَدُوْنَ سے تینوں قسم کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے اور آیت:۔﴿وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى﴾ (۲۰۔۸۲) اور جو توبہ کرلے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے۔ پھر سیدھے راستہ پر چلے اس کو میں بخش دینے والا ہوں۔

میں اِهْتَدٰى کے معنی لگاتار ہدایت طلب کرنے اور اس میں سستی نہ کرنے اور دوبارہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے کے ہیں۔ اور آیت:۔

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ کے بعد فرمایا:۔﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ (۲۔۱۵۷) اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔

میں مُهْتَدُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس کے حصول کے لیے کوشش کی اور اس کے مطابق عمل بھی کیا چنانچہ انہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ﴾ (۴۳۔۴۹) اے جادوگر! اس عہد کے مطابق جو تیرے پروردگار نے تجھ سے کر رکھا ہے، اس سے دعا کر۔ بے شک ہم ہدایت یاب ہوں گے۔ اور هَدْيٌ کا لفظ خاص کر اس جانور پر بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کی طرف (ذبح کے لیے) بھیجا جائے۔ اخفش نے اس کا واحد هَدْيَةٌ لکھا ہے نر کی طرح مادہ جانور پر بھی ہدی کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ جو بطور صفت کے

استعمال ہوتا ہے۔ جو بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ﴾ (۲۔۱۹۲) اور اگر (رستے میں) روک لیے جاؤ۔ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو)

﴿هَدْیًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ (۵۔۹۵) قربانی کعبے پہنچائی جائے ﴿وَ الْهَدْیَ وَ الْقَلَآئِدَ﴾ (۵۔۹۷) اور قربانی کو اور ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹے بندھے ہوں۔

﴿وَالْهَدْیَ مَعْكُوفًا﴾ (۴۸۔۲۵) اور قربانیوں کو بھی کہ اپنی جگہ پہنچنے سے رکی رہیں۔

اَلْهَدِیَّةُ: ان تحائف کو کہا جاتا ہے جو ہم ایک دوسرے کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ﴾ (۲۷۔۳۵) اور میں ان کی طرف کچھ تحفہ بھیجتی ہوں۔

﴿بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ﴾ (۲۷۔۳۶) بلکہ اپنے تحفے سے تم ہی خوش ہوتے ہوں گے۔

اَلْمِهْدَیٰ: طباق وغیرہ جس میں ہدیہ بھیجا جاتا ہے۔ اور اس شخص کو جو بہت زیادہ تحائف پیش کرنے کا عادی ہو اسے مِهْدَاءٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

وَاِنَّكَ مِهْدَاءُ الْخَنَانَطِفُ الْحَشَا

بے شک تو فحش گو اور بد باطن ہے۔

اَلْهَدِیُّ کے معنی قربانی کا جانور اور دلہن اور سیرت کے آتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے۔

هَدَیْتُ الْعَرُوْسَ اِلٰی زَوْجِهَا: دلہن کو شوہر کے پاس بھیجا۔ مَا اَحْسَنَ هَدِیَّةَ فُلَانٍ وَهَدْیَهٗ: یعنی اس کی سیرت کتنی اچھی ہے۔ فُلَانٌ یُهَادِیْ بَیْنَ اثْنَیْنِ: فلاں دو آدمیوں پر سہارا لے کر ان کے درمیان چلتا ہے۔ تَهَادَتِ الْمَرْءَةُ: عورت کا قربانی کے جانور کی طرح لڑکھڑا کر چلنا۔

(ه ر ت)

آیت کریمہ:۔ ﴿وَمَآ اُنْزِلَ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے۔) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت ماروت پر اتری تھیں۔

کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتوں کے نام ہیں اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ انسانوں یا جنوں میں سے دو شیطانوں کے نام ہیں۔ اور یہ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ سے بدل البعض ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ جیسا کہ اَلْقَوْمُ قَالُوْا كَذَا زَیْدٌ وَعَمْرٌو میں زید اور عمرو قوم سے بدل البعض ہونے کی بناء پر مرفوع ہیں۔

لغت میں اَلْهَرْتُ کے معنی منہ کی باچھوں کا کشادہ ہونا کے ہیں اور اسی سے فَرَسٌ هَرِیْتُ الشِّدْقِ کا محاورہ ہے یعنی وہ گھوڑا جس کی باچھیں وسیع ہوں اور اصل میں یہ لفظ هَرَتَ (ض ن) ثَوْبَهٗ سے مشتق ہے جس کے معنی کپڑا پھاڑنے کے ہیں اور جس عورت کی شرمگاہ کثرت

---

[1] قاله حسيل بن عرفطة بن فضلة الاسدی مخضرمی رای رسول الله ﷺ وروی عنه وهو ممن غير عليه السلام اسماء هم فسماه حسينا (الاصابة رقم ۱۷۱۷) وعده ابوزيد فی نوادره من شعراء الجاهلية وذكره عنهم (كما فی لبيا (۳: ۱٤٦) هذا الاسم حسنا وهو تحريف والبيت وجدته بعد الكلال فی الحيوان (۳: ۱۰۲۔۱۰۳) (ثم فی ٤۹٤) فی اربعة ابيات وعجزه: شديد السباب رافع الصوت غالبه۔ وفی المطبوع تطف الحشا بدل نطف النشا محرف والتصويب من المراجع ۱۲۔

جماع سے کشادہ ہوگئی ہوا سے اَلْھَرِیْتُ کہا جاتا ہے۔

(ھ ر ع)

ھَرِعَ وَاُھْرِعَ کے معنی سختی اور تخویف سے ہانکنے اور (اور چلانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ﴾ (۱۱۔۷۸) اور لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ ان کے پاس بے تحاشہ دوڑتے ہوئے آئے۔

اور ھَرِعَ بِرُمْحِهٖ فَتَهَرَّعَ کے معنی نیزے کو سرعت کے ساتھ کسی کی طرف سیدھا کرنے کے ہیں اور ھَرِیْعٌ تیز اور چلا کر رونے والے کو کہتے ہیں۔

اَلْھَرِیْعُ (ایضاً) وَالْھَرْعَةُ: چھوٹی جوں کو کہتے ہیں۔

(ھ ر ن)

ھٰرُوْنَ: (موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی کا نام ہے (یہ اسم عجمی ہے اور کلام عرب میں مادہ مستعمل نہیں ہے۔

(ھ ز ز)

اَلْھَزُّ کے معنی کسی چیز کو زور سے ہلانے کے ہیں۔ جیسے ھَزَزْتُ الرُّمْحَ: میں نے نیزہ زور سے ہلایا اِھْتَزَّ: افتعال اس کا مطاوع ہے۔ اس طرح ھَزَزْتَ فُلَانًا لِلْعَطَآءِ کے معنی ہیں ''میں نے فلاں کو بخشش کے لیے حرکت دی'' یعنی وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ قرآن میں ہے:۔

﴿وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ﴾ (۱۹۔۲۵) اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ۔

﴿فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ﴾ (۲۷۔۱۰) جب اسے دیکھا تو (اس طرح) ہل رہی تھی گویا سانپ ہے اِھْتَزَّتِ النَّبَاتُ: نباتات (سبزے) کا لہلہانا چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ (۲۲۔۵) پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں۔ تو وہ شاداب ہوجاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے۔

اِھْتَزَّ الْكَوْكَبُ فِيْ اِنْقِضَاضِهٖ: ستارے کا تیزی کے ساتھ ٹوٹنا اور سَیْفٌ ھَزْھَازٌ کے معنی لچکدار تلوار کے ہیں اور شفاف پانی کو مَاءٌ ھَزْھِزٌ کہا جاتا ہے اسی طرح ھُزْھُزٌ کے معنی سبک اور ہلکے پھلکے آدمی کے بھی آتے ہیں۔

(ھ ز ء)

اَلْھَزْءُ کے معنی اندرونی طور پر کسی کا مذاق اڑانا کے ہیں۔ اور کبھی یہ مذاق کی طرح گفتگو پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ قصداً مذاق اڑانے کے معنی میں فرمایا:۔

﴿اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا﴾ (۵۔۵۸) یہ اسے بھی ہنسی اور کھیل بناتے ہیں۔

﴿وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَا ۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا﴾ (۴۵۔۹) اور جب ہماری کچھ آیتیں اسے معلوم ہوتی ہیں تو ان کی ہنسی اڑاتا ہے۔

﴿وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا﴾ (۲۱۔۳۶) اور جب کافر تم کو دیکھتے ہیں تو تم سے استہزاء کرتے ہیں۔

﴿اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ (۲۔۶۷) کیا تم ہم سے ہنسی کرتے ہو۔ ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ (۲۔۲۳۱) اور خدا کے احکام کو ہنسی (اور کھیل) نہ بناؤ۔

اس آیت میں انہیں سخت سرزنش کی گی ہے۔ اور ان کی خباثت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ایات الٰہی کا علم اور ان کی صداقت سے آگاہ ہونے کے بعد ان کا مذاق اڑاتے

ہیں۔ ھَزِئْتُ بِہٖ وَاسْتَھْزَأْتُ کے معنی کسی کا مذاق اڑانے کے ہیں اور اَلْاِسْتِھْزَاءُ: اصل میں طلب ھزء کو کہتے ہیں۔ اگرچہ کبھی اس کے معنی مذاق اڑانا بھی آجاتے ہیں۔ جیسے اِسْتِجَابَۃٌ کے اصل معنی طلب جواب کے ہیں۔ اور یہ اِجَابَۃٌ (جواب دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿قُلْ اَبِاللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ وَرَسُوْلِہٖ کُنْتُمْ تَسْتَھْزِءُ وْنَ﴾ (۹۔۶۵) کہو کیا تم خدا اور اسکی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی کرتے تھے۔

﴿وَ حَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُ وْنَ﴾ (۱۱۔۸) اور جس چیز کے ساتھ یہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو گھیر لے گی۔

﴿وَمَا یَاْتِیْھِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُ وْنَ﴾ (۱۵۔۱۱) اور ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا تھا مگر اس کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔

﴿اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَ یُسْتَھْزَاُ بِھَا﴾ (۴۔۱۴۰) کہ جب تم (کہیں) سنو کہ خدا کی آیتوں سے انکار ہورہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔

﴿وَ لَقَدِ اسْتُھْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِکَ﴾ (۶۔۱۰) اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمسخر ہوتے رہے۔

حقیقی معنی کے لحاظ سے استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے جیسا کہ لہو ولعب کا استعمال باری تعالیٰ کے حق میں جائز نہیں ہے لہٰذا آیت:

﴿اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَ یَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ﴾ (۲۔۱۵) (ان) منافقوں سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیے جاتا ہے کہ شرارت وسرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

میں یَسْتَھْزِئُ کے معنی یا تو اِسْتِھْزَاء کی سزا دینے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ دیر تک مہلت دی اور پھر انہیں دفعتہً پکڑ لیا یہاں امہال کو اِسْتِھْزَاء سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اس سے انہوں نے ھُزْءٌ کی طرح دھوکا کھایا پس یہ استدراج کے ہم معنی ہے جیسے فرمایا:۔

﴿سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (۷۔۱۸۲) ان کو بتدریج اس طرح سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔

اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر وہ استہزاء اڑا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے استہزاء سے باخبر ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ بھی ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو دھوکا دے اور وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہو کر اسے اطلاع دیے بغیر اس سے احتراز کرے تو کہا جاتا ہے۔ خَدَعَہٗ یعنی وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہے۔

ایک حدیث میں ہے:۔ (۱۵۸)[1] ((ان المستھزئین فی الدنیا یفتح لھم باب من الجنۃ فیسرعون نحوہ فاذا انتھوا الیہ سد علیھم)) کہ جو لوگ دنیا میں دین الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں قیامت کے دن ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا جب یہ لوگ اس میں داخل ہونے کے لیے سرپٹ دوڑ کر وہاں پہنچیں گے تو وہ دروازہ بند کر دیا جائے گا۔

[1] مروی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ من التابعین تحت تفسیر الآیۃ ﴿فضرب بینھم بسوء باطنہ فیہ الرحمۃ وظاھرہ من قبلہ العذاب﴾ (الحدید)

چنانچہ آیت:﴿فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ﴾ (۸۳۔۳۴) تو آج مومن کافروں سے ہنسی کریں گے۔
میں بعض کے نزدیک ضحک سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت ﴿سَخِرَ اللّٰہُ مِنْھُمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (۹۔۷۹) خدا ان پر ہنستا ہے اور ان کے لیے تکلیف دینے والا عذاب تیار ہے۔ میں بھی اس قسم کی تاویل ہو سکتی ہے۔

(ھ ز ل)

اَلْھَزْلُ کے معنی لا حاصل اور بے نتیجہ بات کے ہیں گویا وہ ھُزَال (لاغری) ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ﴾ (۸۶۔۱۳،۱۴) کہ یہ کلام (حق کو باطل سے) جدا کرنے والی ہے اور بیہودہ بات نہیں۔

(ھ ز م)

اَلْھَزْمُ کے اصل معنی کسی خشک چیز کو دبا کر توڑ دینے کے ہیں۔خشک اور پرانے مشکیزہ کو دبا کر توڑ ڈالنے یا تربوز، ککڑی وغیرہ کے توڑنے پر ھزم کا لفظ بولا جاتا ہے اور اسی سے ہزیمت (بمعنی شکست) ہے جس طرح حَطْمٌ یا کَسْرٌ کا لفظ (مجازاً) شکست کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح ھَزَمَ کا لفظ بھی اس معنی میں بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَھَزَمُوْھُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ تو طالوت علیہ السلام کی فوج نے خدا کے حکم سے ان کو ہزیمت دی۔(۲۔۲۵۱)﴿جُنْدٌ مَّا ھُنَالِکَ مَھْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ﴾ (۳۸۔۱۱) یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے یہ بھی ایک لشکر ہے۔ [1]

اور فَاقِرَۃٌ کی طرح ھَازِمَۃٌ بھی بڑی مصیبت کو کہتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔اَصَابَتْہُ ھَازِمَۃُ الدَّھْرِ: اسے بڑی مصیبت پہنچی۔
ھَزَمَ الرَّعْدُ: گرج کی آواز کا شکستہ ہونا۔
اَلْمِھْزَامُ: ایک لکڑی جس کے سرے پر آگ لگا کر بچے کھیلتے ہیں۔گویا وہ اس سے دوسرے لڑکوں کو ہزیمت دیتے ہیں اور کمینے (دنی) شخص کے متعلق ھَزَمَ وَاھْتَزَمَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(ھ ش ش)

اَلْھَشُّ: (ض) کے معنی بھی ھَزٌّ کی طرح کسی چیز کو حرکت دینے کے ہیں۔لیکن یہ کسی نرم چیز کو حرکت دینے پر بولا جاتا ہے۔جیسے ھَشَّ الْوَرَقَ: درخت سے پتے جھاڑنا قرآن پاک میں ہیں۔
﴿وَاَھُشُّ بِھَا عَلٰی غَنَمِیْ﴾ (۲۰۔۱۸) اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔
ھَشَّ الرَّغِیْفُ فِی التَّنُّوْرِ: روٹی کا تنور میں پھول کر نرم ہو جانا۔
نَاقَۃٌ ھَشُوْشٌ: نرم مزاج اور بہت دودھ دینے والی اونٹنی اور وہ گھوڑا جسے بہت زیادہ پسینہ آئے۔ اسے بھی ھَشُوْشٌ کہا جاتا ہے۔اس کے بالمقابل جس گھوڑے سے پسینہ نہ آئے اسے صَلُوْدٌ کہا جاتا ہے۔رَجُلٌ ھَشُّ الْوَجْہِ: ہشاش بشاش آدمی۔
اور ھَشَشْتُ وَھَشَّ لِلْمَعْرُوْفِ (ض): سخاوت کے وقت خوش ہونا۔
فُلَانٌ ذُوْھَشَاشٍ: نیک خو اور سخی مرد۔

[1] وایضا انظر (٥٤۔٤٥)

(ھ ش م)

اَلْھَشْمُ: اصل میں سوکھی یا نرم چیز کے توڑنے پر بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاَصْبَحَ ھَشِیْمًا تَذْرُوْہُ الرِّیٰحُ﴾ (۱۸۔۴۵) پھر وہ چورا چورا ہوگئی کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔

﴿فَکَانُوْا کَھَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ (۵۴۔۳۱) تو وہ ایسے ہو گئی جیسے باڑ والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔اور ہڈی وغیرہ (سخت چیز) کے توڑنے پر ھَشْمٌ بولا جاتا ہے۔اور اسی سے ھَشَمْتُ الْخُبْزَ کا محاورہ ہے۔جس کے معنی سوکھی روٹی کو توڑ کر ثرید بنانے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے ❶ ()

(۴۵۳) عَمْرُو الْعَلَا ھَشَمَ الثَّرِیْدَ لِقَوْمِہٖ
وَرِجَالُ مَکَّۃَ مُسْنِتُوْنَ عِجَافٌ

عمرو العلا نے خشک سالی کے زمانہ میں اپنی قوم کو ثرید کھلایا جب کہ مکہ مکرمہ کے سردار قحط سالی کی وجہ سے دبلے ہو رہے تھے۔

ھَاشِمَۃٌ: سر کا زخم جس سے کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ جائے۔

اِھْتَشَمَ کُلَّ مَا فِیْ ضَرْعِ النَّاقَۃِ اونٹنی کے پستانوں سے تمام دودھ نچوڑ لیا۔محاورہ ہے۔

تَھَشَّمَ فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ: کسی پر مہربان ہونا۔

(ھ ض م)

اَلْھَضْمُ: (ض) کے اصلی معنی کسی نرم چیز کو کچلنا کے ہیں۔محاورہ ہے۔ھَضَمْتُہٗ فَانْھَضَمَ میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ ٹوٹ گیا۔اور باریک سرکنڈا جسے بانسری کی طرح بجایا جاتا ہے اسے مَھْزُوْمَۃٌ کہتے ہیں اور اسی سے نازک بانسری کو مِزْمَارٌ مُّھْضَمٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

وَنَخْلٍ طَلْعُھَا ھَضِیْمٌ: اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہونے کی وجہ سے کچلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اَلْھَاضُوْمُ: کھانا ہضم کرنے کا چورن بَطْنٌ ھَضُوْمٌ پچکا ہوا پیٹ۔کَشْحٌ مِھْضَمٌ: پتلی کمر۔

اِمْرَءَۃٌ ھَضِیْمَۃُ الْکَشْحَیْنِ: پتلی کمر والی عورت اور استعارہ کے طور پر ھَضْمٌ: بمعنی ظلم بھی آتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَا یَخَافُوْنَ ظُلْمًا وَّلَا ھَضْمًا﴾ (۲۰۔۱۱۲) تو ان کو ظلم کا خوف ہوگا اور نہ نقصان کا۔

(ھ ط ع)

ھَطَعَ الرَّجُلُ بِبَصَرِہٖ کے معنی ہیں: اس نے نظر جما کر دیکھا اور گردن اٹھا کر چلنے والے اونٹ کو بَعِیْرٌ مُّھْطِعٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مُھْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِھِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْھِمْ طَرْفُھُمْ﴾ (۱۴۔۴۳) (اور لوگ) سر اٹھائے ہوئے

---

❶ عمرو العلاء ھاشم بن مناف جد رسول اللہ ﷺ ویکنی اباںضلۃ راجع الطبقات (۱: ۴۳) والاشتقاق والبدایہ والنھایہ (۲: ۳۵۲) ورسائل جاحظ ۶۸ ونوادر ابی زید (۱۶۷) وصبح الاعشی (۱: ۱۵۸) والبخلاء (۲۳۰) والخلاف فی القائل نسبہ بعضھم الی ابن الزبعری۔ راجع السیرۃ (۱: ۹۴) والعینی (۱: ۱۴) وابن ابی الحدید (۴۵۳/۳۰) وامالی المرتضی (۱: ۱۵۸/۲: ۲۶۹) وفی اللسان (ھشم) منسوب الی بنت ھاشم وفی الکامل (۲۱۶) بغیر عزو وفیہ وعمر والذی بدل عمرو والعلا وقال الصواب عمرو العلی والشطر الثانی فی البحر (۵: ۳۰۰) وفی تاریخ الطبری (۲: ۱۲) والمرزبانی ۳ قالہ مطرو وبن کعب الخزاعی ۱۲۔

(میدان قیامت کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے۔ان کی نگاہیں ان کی طرف لوٹ نہ سکیں گی۔

﴿مُهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ﴾ (۵۴۔۸)اس بلانے والے کی طرف دوڑتے جاتے ہوں گے۔

(ھل)

هَلْ: یہ حرف استخبار اور کبھی استفہام کے لیے آتا ہے۔جیسے قرآن پاک میں ہے:۔

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا﴾ (۶۔۱۴۹) کہدو کہ تمہارے پاس کوئی سند ہے (اگر ہے) تو اسے ہمارے سامنے نکالو۔

اور کبھی تنبیہ، تبکیت یا نفی کے لیے چنانچہ آیات:۔﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ (۱۹۔۹۸) بھلا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا (کہیں) ان کی بھنک سنتے ہو۔

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ (۱۹۔۶۵) بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔

﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ﴾ (۶۷۔۳) ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو کیا تجھے (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟

میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں۔اور آیات:۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۲۔۲۱۰) کیا یہ لوگ اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان پر خدا (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں نازل ہو۔اور فرشتے بھی اتر آئیں۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۶۔۱۵۸) یہ اس کے سوا اور کس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ﴾ (۴۳۔۶۶) یہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ قیامت......

﴿هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۷۔۱۴۷) یہ جیسے عمل کرتے ہیں ویسا ہی ان کو بدلہ ملے گا۔

﴿هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (۲۱۔۳) یہ شخص (کچھ بھی) نہیں ہے مگر تمہارے جیسا آدمی ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر تنبیہ اور اس کی سطوت سے تخویف کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

(ھ ل ل)

اَلْهَلَالُ: مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کے چاند کو کہتے ہیں۔پھر اس کے بعد اسے قمر کہا جاتا ہے اس کی جمع اَهِلَّةٌ ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ﴾ (۲۔۱۸۹) (اے محمدؐ) لوگ تم سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے) کہدو کہ وہ لوگوں کے (کاموں کی) میعادیں اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہے۔یعنی ہلال کے طلوع ہونے اور اس کے کم و بیش ہونے کی حکمت پوچھتے ہیں۔

تشبیہ کے طور پر هَلَالٌ کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(۱) شکار کرنے کا نیزہ جو ہلال کی طرح دو شاخ کا ہوتا ہے۔(۲) ایک قسم کا زہریلا سانپ (۳) کنویں کے تلے میں تھوڑا سا پانی جو گول دائرے کی شکل پر ہوتا ہے۔(۴) چکی کا کنارہ۔(جب کہ ٹوٹ جائے)

اَهَلَّ الْهِلَالُ کے معنی چاند نظر آنے کے ہیں۔اور

اِسْتَهَلَّ کے معنی رویت ہلال ہیں۔لیکن کبھی استہلال بمعنی ہلال بھی آ جاتا ہے جیسے اِسْتِجَابَۃٌ بمعنی اَجَابَۃٌ الْاِھْلَالُ کے معنی چاند کے نظر آنے پر آواز بلند کرنے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ عام آواز بلند کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اسی سے تشبیہاً اَھَلَّ الصَّبِیُّ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بچے نے آواز بلند کی اور آیت۔

﴿وَمَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ﴾ (۲۔۱۷۳) اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے۔

کے معنی ہیں کہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے یعنی جو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ اِھْلَال اور تَھَلُّلٌ کے معنی لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے کے ہیں۔اور یہ لفظ جملہ مخفف ہے۔جیسے کہ تَبَسْمَلَ وَبَسْمَلَۃٌ اور نَحْوَ قَلَّ وَحَوْقَلَۃٌ کے معنی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہنے کے ہیں اور اسی سے اِھْلَالِ بِالْحَجِّ ہے جس کے معنی بلند آواز سے تلبیہ کہنے کے ہیں اور باریک جھر جھرے کپڑے کو ثواب مُھَلْھَلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شعر مُھَلْھَلٌ ہے جس کے معنی عمدہ شعر کے ہیں۔

(ھ ل ک)

اَلْھَلَاكُ: یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ایک یہ کہ کسی چیز کا اپنے پاس سے جاتے رہنا خواہ وہ دوسرے کے پاس موجود ہو جیسے فرمایا:۔

﴿ھَلَكَ عَنِّی سُلْطَانِیَہْ﴾ (۶۹۔۲۹) ہائے! میری سلطنت خاک میں مل گئی۔

دوسرے [۲] یہ کہ کسی چیز میں خرابی اور تغیر پیدا ہو جانا۔ جیسا کہ طعام (کھانا) کے خراب ہونے پر ھَلَكَ الطَّعَامُ بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَیُھْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ﴾ (۲۔۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی نسل کو نابود کر دے۔موت [۳] کے معنی میں جیسے فرمایا: ﴿اِنِ امْرُؤٌا ھَلَكَ﴾ (۴۔۱۷۷) اگر کوئی ایسا مرد مر جائے۔

اور قرآن پاک نے کفار کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ﴾ (۴۵۔۲۴) اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔

قرآن پاک میں ہلاکت کا لفظ بری موت کے لیے استعمال ہوا ہے صرف آیت (۲۔۲۵) اور آیت ﴿وَلَقَدْ جَآئَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّمَّا جَآئَکُمْ بِهٖ حَتّٰی اِذَا ھَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا﴾ (۴۰۔۳۴) اور پہلے یوسف (علیہ السلام) بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔تو جو وہ لائے تھے اس سے تم ہمیشہ شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔

میں موت کے معنی مراد ہیں۔ چہارم [۴] یہ کہ کسی چیز کا اس دنیا سے کلی طور پر معدوم ہو جانا۔ اور یہی معنی فنا کے ہیں جس کی طرف کہ آیت: ﴿کُلُّ شَیْءٍ ھَالِكٌ اِلَّا وَجْھَهٗ﴾ (۲۸۔۸۸) اس کی ذات (پاک) کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ [۵] عذاب، خوف اور فقر پر بھی ہلاکت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیات:۔

﴿وَمَا یُھْلِکُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ﴾

(۶۔۲۶) مگر (ان باتوں سے) اپنے آپ ہی کو ہلاک کرتے ہیں اور (اس سے) بے خبر ہیں۔
﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ (۱۹۔۷۴) اور ہم نے ان سے پہلے بہت سی امتیں ہلاک کر دیں۔ ﴿وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا﴾ (۷۔۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے تباہ کر ڈالیں۔
﴿فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنَاهَا﴾ (۴۳۔۴۵) اور بہت سی بستیاں ہیں کہ ہم نے ان کو تباہ کر ڈالا۔
﴿اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا﴾ (۷۔۱۵۵) کیا تو اس فعل کی سزا میں جو ہم سے بے عقل لوگوں نے کیا ہے ہمیں ہلاک کر دے گا؟
میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور آیت:۔
﴿فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (۴۶۔۵)
سو اب وہی ہلاک ہوں گے۔ جو نافرمان تھے۔
میں ہلاکت سے ہلاکت کبری یعنی عذاب مراد ہے۔ جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا (۱۵۹)
لَا شَرَّ كَشَرٍّ بَعْدَهُ النَّارُ کہ اس شر کے برابر کوئی شر نہیں ہے جس کے بعد دوزخ کا سامنا ہو۔ اور فرمایا:۔
﴿وَمَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ﴾ (۲۷۔۴۹) اور ہم تو اس کے گھر والوں کے موقعہ ہلاکت پر گئے ہی نہیں۔
اَلْهُلْكُ کے معنی ہلاک کرنے کے ہیں اور جو چیز مُوَدِّيْ اِلَى الْهَلَاكِ یعنی موجب ہلاکت ہو اسے تَهْلُكَةَ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (۲۔۱۹۵)
اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔
اور اِمْرَءَةٌ هَلُوْكٌ کے معنی نازک خرام عورت کے ہیں۔ گویا وہ چلتے وقت زمین پر گری پڑتی ہے شاعر نے کہا ہے (1) (الطّویل)

(۴۵۴) مَرِيْضَاتُ اَوْبَاتِ التَّهَادِيْ كَاَنَّمَا
تَخَافُ عَلٰى اَحْشَائِهَا اَنْ تَقَطَّعَا

وہ عورتوں کے درمیان مریض کی طرح لڑکھڑا کر اس انداز سے چلتی ہے گویا اسے اپنی کمر یا انتڑیوں کے کٹ جانے کا اندیشہ ہے۔
اور کنایۃ کے طور پر هَلُوْكٌ کا بدکار عورت کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مائل ہو کر خراماں خراماں چلتی ہے۔
اَلْهَالِكِيُّ اصل میں یہ هَالِكَةٌ قبیلہ کے ایک آہنگر کا نام تھا پھر اس مناسبت سے ہر آہنگر کو هَالِكِيٌّ کہا جانے لگا ہے۔
اَلْهُلْكُ: (ایضاً) برباد ہونے والی چیز۔

(ھ ل م)

هَلُمَّ: (اسم فعل) کے معنی کسی چیز کی طرف بلانے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل هَالُمَّ ہے۔ اور یہ لَمَمْتُ الشَّیْءَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی اصلاح کرنے کے ہیں۔ هَا کا الف حذف ہونے کے بعد هَلُمَّ بن گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل هَلْ اَلَمَّ ہے گویا یہ اصل میں هَلْ لَّكَ فِيْ كَذَا اَمَّهٗ...... (بمعنی قصدہ) کا مخفف ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

---

(1) فی الحماسة لابی تمام (۲: ۹۳) قاله مسلم بن الولید وفی المرزوقی رقم (۸۴۹۸) "آخر" وفی المحاضرات للمؤلف (۲: ۱۳۹) ویستحسن للسعدی ای لرجل من بنی سعد وبعده: تسیب انسیاب الایم اخصره الندی۔ فرفع من اعطافه ماتر فعا۔ والبیتان فی الحیوان (۴: ۲۵۹) وفی روایته مریضة اثناء التهادی ویرفع من اطرافه بدل فرفع من اعطافه والبیت فی مجموعة المعانی (۲۵۹)۔

﴿وَ الْقَآئِلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا﴾ (۳۳۔۱۸) اور اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔ بعض اسے فعل غیر متصرف مانتے ہیں اور تثنیہ، جمع (نیز تذکیر وتانیث) میں اسے ایک ہی حالت پر رہنے دیتے ہیں اور قرآن پاک بھی اسی کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اور بعض فعل متصرف مانتے ہیں (اور آخر میں ضمائر کا الحاق کرتے ہیں جیسے) هَلُمَّا، هَلُمُّوْا، هَلُمِّیْ، هَلْمُمْنَ۔

(ھ م م)

اَلْھَمُّ کے معنی پگھلا دینے والے غم کے ہیں اور یہ ھَمَمْتُ الشَّحْمَ فَانْھَمَّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے چربی کو پگھلایا چنانچہ وہ پگھل گئی اصل میں ھَمَّ کے معنی اس ارادہ کے ہیں جو ابھی دل ہی میں ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ ()

(۴۵۵) وَھَمُّكَ مَالَمْ تُمْضِهٖ لَكَ مُنْصِبٌ

اور جب تک تو اپنے ارادے کو پورا نہ کرے وہ تجھے بے چین رکھے گا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِذْ ھَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْا﴾ (۵۔۱۱) جب ایک جماعت ...نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں۔

﴿وَ لَقَدْ ھَمَّتْ بِهٖ وَ ھَمَّ بِهَا﴾ (۱۲۔۲۴) اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور وہ اس کا قصد کر لیتے (اگر)

﴿اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا﴾ (۳۔۱۲۲) اس وقت تم میں سے دو جماعتوں نے جی چھوڑ دینا چاہا۔

﴿لَھَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ﴾ (۴۔۱۱۳) تو ان میں سے ایک جماعت......قصد کر ہی چکی تھی۔

﴿وَھَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ﴾ (۹۔۱۳) اور انہوں نے پیغمبر (خدا کے جلاوطن کرنے کا عزم مصمم کر لیا)

﴿وَھَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ﴾ (۴۰۔۵) اور ہر امت نے اپنے پیغمبر کے بارے میں یہی قصد کیا کہ......۔

اَھَمَّنِیْ كَذَا: مجھے فلاں چیز نے بے چین کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَھَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ (۳۔۱۵۴) اور کچھ لوگ جن کو جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ محاورہ ہے: هٰذَا رَجُلٌ ھَمُّكَ مِنْ رَجُلٍ اَوْ ھَمَّتُكَ مِنْ رَجُلٍ: وہ آدمی تجھے بس کرتا ہے (بمعنی نَاھِیْكَ) اَلْھَوَامُّ حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑے۔ رَجُلٌ ھَمٌّ: پیر فرتوت، مونث ھِمَّةٌ گویا کبرسنی نے اسے پگھلا دیا ہے۔

(ھ م د)

ھَمَدَتِ النَّارُ کے معنی آگ کا بجھ جانا کے ہیں۔ اور خشک اور بنجر زمین کو اَرْضٌ ھَامِدَةٌ کہتے ہیں اور نَبَاتٌ ھَامِدَةٌ کے معنی خشک گھاس کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَ تَرَی الْاَرْضَ ھَامِدَةً﴾ (۲۲۔۵) اور (اے دیکھنے والے) تو دیکھتا ہے (کہ ایک وقت میں) زمین خشک (پڑی ہوتی ہے)

اَلْاِھْمَادُ (افعال) کے معنی کسی جگہ اقامت کرنے کے ہیں گویا وہ سکونت پذیر ہو کر بجھ گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اہماد کے معنی سرعت رفتاری کے بھی آتے ہیں۔ اگر یہ قول صحیح ہو تو یہ لفظ اِشْكَاءٌ کی طرح (اضداد سے) ہوگا۔ جو کبھی شکایت کرنے اور کبھی ازالہ شکایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(ھ م ر)

اَلْھَمْرُ (ض) کے معنی آنسو یا پانی بہا دینے

❶ لم اجده۔

کے ہیں۔جیسے هَمَرَهُ فَانْهَمَرَ: اس نے پانی بہایا چنانچہ وہ بہہ پڑا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ﴾ (۵۴۔۱۱) پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دہانے کھول دیئے۔

هَمَرَ مَا فِي الضَّرْعِ: تھنوں سے تمام دودھ دوہ لینا۔ هَمَرَ الرَّجُلُ فِي الْكَلَامِ: باتوں میں بہ جانا (یعنی بکواس کرنا) فُلَانٌ يُهَامِرُ الشَّيْءَ کوئی چیز مقدار سے زیادہ لے لینا۔چٹ کر جانا اور اسی سے محاورہ ہے۔

هَمَرَ لَهُ مِنْ مَّالِهِ: اس نے اسے بہت زیادہ مال دیا۔

اَلْهَمِيْرَةُ: بہت بوڑھی عورت۔

(ھ م ز)

اَلْهَمْزُ کے اصل معنی کسی چیز کو دبا کر نچوڑنے کے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے: هَمَزْتُ الشَّيْءَ فِي كَفِّيْ میں نے فلاں چیز کو اپنی ہتھیلی میں دبا کر نچوڑا اور اس سے حرف ہمزہ ہے جو کہ زبان کو جھٹکا دے کر پڑھا جاتا ہے اور همز کے معنی غیبت کرنا بھی آتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ (۶۸۔۱۱) طعن آمیز اشارتیں کرنے والا، چغلیاں لئے پھرنے والا۔اور هَامِزٌ وَهَمْزَةٌ وَهَمَّازٌ کے معنی عیب چینی کرنے والا کے ہیں جو قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (۱۰۴۔۱) ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغلخور کی خرابی ہے۔

شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

(۴۵۶) وَاِنْ اغْتَبْتُ فَاَنْتَ الْهَامِزُ اللُّمَزَة

اگر غیبت کی جائے تو تو طعن آمیز اشارتیں کرنے والا بدگو ہے۔

قرآن میں ہے۔﴿مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ (۲۳۔۹۷) کہو اے پروردگار میں شیاطین کے وساوس سے پناہ مانگتا ہوں۔

(ھ م س)

اَلْهَمْسُ کے معنی خفی آواز کے ہیں اور هَمْسُ الْاَقْدَامِ کے معنی ہیں پاؤں کی ہلکی سی آہٹ۔

قرآن میں ہے: ﴿فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا﴾ (۲۰۔۱۰۸) تو تم خفی آواز کے سوا کوئی آواز نہ سنو گے۔

(ھنا)

هُنَا (یہاں) یہ زمانہ اور جگہ قریب کی طرف اشارہ کرنے کے آتا ہے۔لیکن عموماً جگہ کی طرف اشارہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ذا، ذاك ذالك، کی طرح هُنَا هُنَاكَ وَهُنَالِكَ تینوں طرح بولا جاتا ہے۔قرآن میں ہے: ﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ﴾ (۳۸۔۱۱) یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے یہ بھی ایک لشکر ہے۔

﴿اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (۵۔۲۴) ہم یہیں بیٹھے رہیں

---

[1] البيت لزياد الاعجم وصدره: وقدني بودى اذا الاقيتني...... وفي رواية وان اغيّب على البناء للمجهول وفي رواية اللسان (همز) والطبرسي (۳۰: ۲۲۹) وان تعنيبت وكنت بدل فانت والبيت من شواهد ابى عبيدة فى مجازه رقم (۲۹۴) وفى روايته۔ اذا لقيتك تبدى لى مكاشره۔ وان اغيت فانت العائب اللمزه۔ راجع ايضا شواهد الكشاف (۴۰) واللسان (همز) والطبرى (۱۰۔۱۵۶) (۳۰/۲۹۱) والسحاوندى (۱: ۲۰۱) واصلاح يعقوب (۴۲۸) واعراب ثلاثين (۱۸۰) وزياد الاعجم هو زياد بن سليمان الاعجم ويكنى ابا امامة له ترجمة فى المؤتلف (۱۳۱) والاغانى (۱۴۔۹۸)

گے۔﴿هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ﴾ (۱۰-۳۰) وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرے گا۔

﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۳۳-۱۱) وہاں مومن آزمائے گئے۔

﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ﴾ (۱۸-۴۴) یہاں (سے ثابت ہوا کہ) حکومت سب خدائے برحق کی ہے۔

﴿فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ﴾ (۷-۱۱۹) اور وہ مغلوب ہو گئے۔

(ھ ن)

هُنٌ: شرمگاہ یا اس قسم کی قبیح الذکر چیزوں سے کنایہ ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:۔ فِیْ فُلَانٍ هَنَاتٌ: فلاں میں بری خصلتیں ہیں اور روایت (۱۶۰) سَتَكُوْنُ هَنَاتٌ (عنقریب فتنہ و فساد ظاہر ہوں گے) میں بھی هَنَاتٍ اسی معنی پر محمول ہے۔

(ھ ن ء)

اَلْهَنِيْئُ: ہر وہ چیز جو بغیر مشقت کے حاصل ہو جائے اور نتائج کے اعتبار سے بھی خوش کن ہو اصل میں یہ لفظ طعام کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور هَنِیءَ الطَّعَامُ فَهُوَ هَنِیْءٌ کے معنی طعام کے خوشگوار ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ (۴-۴) تو اسے ذوق شوق سے کھالو۔

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ (۶۹-۲۴) اور جو (عمل) تم ایام گزشتہ میں آگے بھیج چکے ہو۔ اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۷۷-۴۳) جو (عمل) تم کرتے رہے تھے اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔

اَلْهِنَاءُ: ایک قسم کا تارکول جو (خارشی اونٹ پر) ملا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: هَنَأْتُ الْاِبِلَ فَهِيَ مَهْنُوْءَةٌ یعنی میں نے اونٹ پر تارکول ملا۔

(ھ و د)

اَلْهُوْدُ کے معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا کے ہیں اور اسی سے اَلتَّهْوِيْدُ (تفعیل) ہے جس کے معنی رینگنے کے ہیں۔ لیکن عرف میں هُوْدٌ بمعنی تَوْبَةٌ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ (۷-۱۵۶) ہم تیری طرف رجوع کر چکے۔ بعض نے کہا ہے لفظ یہود بھی اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ سے ماخوذ ہے۔ یہ اصل میں ان کا تعریفی لقب تھا۔ لیکن ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد ان پر بطور علم جنس کے بولا جاتا ہے نہ کہ تعریف کے لیے جیسا کہ لفظ نصاریٰ اصل میں مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ سے ماخوذ ہے۔ پھر ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد انہیں اسی نام سے اب تک پکارا جاتا ہے۔ هَادَ فُلَانٌ کے معنی یہودی ہو جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ (۲-۶۲) جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی۔ کیونکہ کبھی اسم علم سے بھی مسمیٰ کے اخلاق و عادات کا لحاظ کر کے فعل کا اشتقاق کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص فرعون کی طرح ظلم و تعدی کرتا ہے تو اس کے متعلق تَفَرْعَنَ فُلَانٌ (کہ فلاں فرعون بنا ہوا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح تَطَفَّلَ فُلَانٌ کے معنی طفیلی یعنی طفیل نامی شخص کی طرح بن بلائے کسی کا مہمان بننے کے ہیں۔

تَھَوَّدَ فِیْ مَشْیِہٖ کے معنی نرم رفتاری سے چلنے کے ہیں۔ اور یہود کے توراۃ کی تلاوت کے وقت آہستہ آہستہ جھومنے سے یہ معنی لیے گئے ہیں۔

ھَوَّدَ الرَّائِضُ الدَّآبَّۃَ: رائض کا سواری کو نرمی سے چلانا

ھُوْدٌ: اصل میں ھَائِدٌ کی جمع ہے جس کے معنی تائب کے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کا نام ہے ❶

(ھ و ر)

ھَارَ الْبَنَاءُ تَھَوَّرَ: کے معنی ہیں عمارت منہدم ہوگئی اور یہی معنی اِنْھَارَ کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ فَانْھَارَ بِہٖ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ﴾ (۹۔۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارے پر رکھی کہ وہ اس کو دوزخ کی آگ میں لے گری۔

ایک قرأت میں ھَارَ ہے اور بِئْرٌ ھَائِرٌ وَھَارٌ وَھَارٍ وَمُھَارٍ: ویران کنویں کو کہتے ہیں پھر ویران کنویں کی مناسبت سے..... کمزور اور عاجز آدمی کو بھی ھَارٍ یا ھَائِرٌ کہا جاتا ہے۔

تَھَوَّرَ اللَّیْلُ: رات کا سخت تاریک ہونا۔

تَھَوَّرَ الشِّتَآءُ: کے معنی جاڑے کا اکثر موسم گزر جانے کے ہیں اور بعض نے تَھَیَّرَ: کہا ہے جو اجوف یائی (ھ ی ر) ہے کیونکہ اگر یہ واوی ہوتا تو تَھَیَّرَ کی بجائے تَھَوَّرَ کہا جاتا۔

(ھ و ن)

اَلْھَوَانُ: اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

(۱) انسان کا کسی ایسے موقعہ پر نرمی کا اظہار کرنا جس میں اس کی سبکی نہ ہو یہ قابل ستائش ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا﴾ (۲۵۔۶۳) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر متواضع ہو کر چلتے ہیں۔

اور آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔(۱۶۱) اَلْمُؤْمِنُ ھَیِّنٌ لَیِّنٌ: کہ مومن متواضع اور نرم مزاج ہوتا ہے۔ دوم ھَانٌ بمعنی ذلت اور رسوائی کے آتا ہے یعنی دوسرا انسان اس پر مسلط ہو کر اسے سبکسار کرے تو یہ قابل مذمت ہے چنانچہ اس معنی میں فرمایا: ﴿فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ﴾ (۴۶۔۲۰) سو آج تم کو ذلت کا عذاب ہے ﴿فَاَخَذَتْھُمْ صٰعِقَۃُ الْعَذَابِ الْھُوْنِ﴾ (۴۱۔۱۷) تو..... کڑک نے ان کو آ پکڑا اور وہ ذلت کا عذاب تھا۔

﴿وَ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ﴾ (۲۔۹۰) اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

﴿وَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ﴾ (۳۔۱۷۸) اور آخر کار ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ﴾ (۲۲۔۵۷) ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَ مَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ﴾ (۲۲۔۱۸) اور جس کو خدا ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔

ھَانَ الْاَمْرُ عَلٰی فُلَانٍ (علی کے ساتھ) کے معنی کسی معاملہ کے آسان ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ﴾ (۱۹۔۲۱) کہ یہ مجھے آسان ہے۔

❶ ھود بن عبداللہ یتصل نسبہ الی نوح علیہ السلام بسبع وسائط ارسل الی قوم عاد انظر لِقصّتہ فی القرآن (۷۔۶۵ تا ۷۲) (۲۶۔۱۳۲ تا ۱۴۰ و (۴۶۔ ۲۱ تا ۲۶)

﴿وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ (۳۰۔۲۷) اور یہ اس پر بہت آسان ہے۔

﴿وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا﴾ (۲۴۔۱۵) اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے ہو۔

هَاوُوْنَ: کمزور یہ هَوْنٌ سے ہے اور چونکہ فَاعُلٌ کا وزن کلام عرب میں نہیں پایا اس لیے هَاوُنٌ کی بجائے هَاوُوْنٌ (بروزن فاعول) کہا جاتا ہے۔

(ھ و ی)

اَلْهَوٰی: (س) اس کے معنی خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ اور جو نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو اسے بھی هَوٰی کہہ دیتے ہیں کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کو اس کے شرف ومنزلت سے گرا کر مصائب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اور آخرت میں اسے هَاوِيَةٌ (دوزخ) میں لے جا کر ڈال دیں گی۔

اَلْهَوِيُّ: (ض) کے معنی اوپر سے نیچے گرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ﴾ (۱۰۱۔۹) اسکا مرجع ہاویہ ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ هَوَتْ اُمُّهٗ کی طرح ایک محاورہ ہے اور بعض کے نزدیک دوزخ کے ایک طبقے کا نام ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔" اور بعض نے آیت: ﴿وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔ میں هَوَاءٌ کے معنی خالی یعنی بے قرار کے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا﴾ (۲۸۔۱۰) موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل بے قرار ہو گیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خواہشات انسانی کی اتباع کی سخت مذمت کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ﴾ (۴۵۔۲۳) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔ ﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى﴾ (۳۸۔۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا۔ ﴿وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ﴾ (۱۸۔۲۸) اور وہ اپنی خواہش کی پیروی نہ کرتا ہے۔ اور آیت: ﴿وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ﴾ (۲۔۱۲۰) اگر تم ان کی خواہشوں پر چلو گے۔ میں اَهْوَاءٌ جمع لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ ان سے ہر ایک کی خواہش دوسرے سے مختلف اور جدا ہے۔ اور یہ کہ ایک کی خواہش غیر متناہی ہونے میں اَهْوَاء کا حکم رکھتی ہے لہٰذا ایسی خواہشات کی پیروی کرنا سراسر ضلالت اور اپنے آپ کو ورطہ حیرت میں ڈالنے کے مترادف ہے نیز فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۴۵۔۱۸) اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا ﴿وَ لَا تَتَّبِعُوْا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا﴾ (۵۔۷۷) اور اس قوم کی خواہشوں پر مت چلو (جو تم سے پہلے) گمراہ ہو چکے ہیں۔ ﴿قُلْ لَّا اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ﴾ (۶۔۵۶) (ان لوگوں سے) کہہ دو کہ میں تمہاری خواہشوں پر نہیں چلتا۔ ایسا کروں تو میں گمراہ ہو چکا ہوں گا۔

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (۴۲۔۱۵) اور ان (یہود ونصاریٰ کی خواہشوں پر مت چلو اور ان سے (صاف) کہہ دو کہ میرا تو اس پر ایمان ہے۔ جو خدا نے اتارا۔

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۲۸۔۵۰) اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

اَلْهُوِيُّ: (بفتح الہا) کے معنی پستی کی طرف اترنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل هُوِيٌّ (بضم الہا) کے معنی بلندی پر چڑھنے کے ہیں۔ ❶ شاعر نے کہا ہے ❷ (الکامل)

(۴۵۷) يهوِىْ محارِمَها هُوِىَّ الْاَجْدَلِ

اس کی تنگ گھاٹیوں میں صفرہ کی طرح تیز چلتا ہے۔

اَلْهَوَاءُ: آسمان وزمین کے مابین فضا کو کہتے ہیں۔ اور بعض نے آیت: ﴿وَ اَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔ کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی بے قرار ہونے میں هَوَاء کی طرح ہوں گے۔

تَهَاوَى: (تفاعل) کے معنی ایک دوسرے کے پیچھے مَهْوَاة (یعنی گڑھے) میں گرنے کے ہیں۔

اَهْوَاهُ: اسے فضا میں لے جا کر نیچے دے مارا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى﴾ (۵۳۔۵۳) اور اسی نے الٹی بستیوں کو دے پٹکا۔

اِسْتَهْوٰى کے معنی عقل کو لے کر اڑنے اور پھسلا دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ﴾ (۶۔۷۱) جیسے کسی کو شیاطین (جنات) نے...... بھلا دیا ہو۔

(ھ ی ت)

هَيْتَ اور هَلُمَّ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں اور آیت: ﴿وَ قَالَتْ هَيْتَ لَكَ﴾ (۱۲۔۲۳) کہنے لگی (یوسف علیہ السلام) چلے آؤ۔ میں ایک قرأت هِئْتُ لَكَ بھی ہے۔ جس کے معنی تَهَيَّاتُ لَكَ کے ہیں یعنی میں تیرے لیے تیار ہوں اور هَيَّتَ بِهٖ وَتَهَيَّتَ کے معنی هَيْتَ لَكَ کہنے کے ہیں۔

هَاتِ: (اسم فعل) لاؤ۔ تثنیہ اور جمع کے لیے هَاتِيَا وَهَاتُوْا آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾ (۲۔۱۱۱) (اے پیغمبر علیہ السلام) ان سے تم کہہ دو کہ...... دلیل پیش کرو۔ فراء کا کہنا ہے کہ کلام عرب میں هَاتَيْتُ مستعمل نہیں ہے یہ صرف اہل حیرہ کی لغت ہے اور اس سے لَا هَاتِ (فعل نہی) استعمال نہی ہوتا۔ خلیل نے کہا ہے کہ اَلْمُهَاتَاهُ وَالْهِتَاءُ (مفاعلہ) ھات صیغہ امر ہے

هَيْهَاتُ یہ کلمہ کسی چیز کے بعید از قیاس ہونے کو بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس میں هَيْهَاتَ هَيْهَاتِ اور هَيْهَاتًا تین لغت ہیں اور اسی سے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ﴾ (۲۳۔۳۶) جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (بہت) بعید اور (بہت) بعید ہے۔

زجاج نے هَيْهَاتَ کے معنی اَلْبُعْدُ کیے ہیں دوسرے

---

❶ قال الخناجي في شرح الدرة (۲۵۲) ليس هذا مما اتفقوا عليه بل هو قول لبعض اهل اللغة (انظر ايضًا شرح اشعار صفديل للمرزوقي ۱۲۔

❷ لابي كبير الهذلي عامر بن الحلبس) يصف تابط شرابا لشجاعة ومسدر واذا رميت به الفحاج رأيتَهٗ...... والبيت في الحماسة (مع المرزوقي ۹۱۔۱۲) وفيه غوار بها بدل محار مها واللسان (خرم) وشواهد الكشاف ۹۶ والبحر (۵: ۴۲۹) والسيوطي ۸۱۔

اہل لغت نے کہا ہے کہ زجاج کو (لِمَا) کے نام کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ اس کی اصل بَعُدَ الْاَمْرُ وَالْوَعْدُ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ہے اور اس میں ایک لغت هَيْهَا بھی ہے۔ اَلْفَسْوِیُ نے کہا ہے کہ هَيْهَاتِ کسرہ تا کے ساتھ هَيْهَاتَ (بفتحہ تاء) کی جمع ہے۔

(ھ ی ج)

هَاجَ الْبَقْلُ: (ض) کے معنی بقول کے پک کر زور پڑ جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا﴾ (۳۹۔۲۱) پھر وہ (پک کر) خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو (کہ) زرد ہو گئی ہے۔

اور اَهْيَجَتِ الْاَرْضُ کے معنی زمین کے خشک گھاس والی ہونے کے ہیں۔ هَاجَ الدَّمُ وَالْفَحْلُ هَيْجًا وَهِيَاجًا کے معنی خون یا نر اونٹ کے جوش مارنے کے ہیں اور هَيَّجْتُ الشَّرَّ وَالْحَرْبَ کے معنی شر یا لڑائی بھڑکانے کے اسی سے اَلْهَيْجَاءُ (بالمد والقصر) ہے جس کے معنی لڑائی کے ہیں۔ اور هَيَّجْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی اونٹ کو برانگیختہ کرنے کے ہیں۔

(ھ ی م)

رَجُلٌ هَيْمَانُ وَهَائِمٌ: سخت پیاسا آدمی۔ هَائِمٌ کی جمع هِيْمٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ﴾ (۵۶۔۵۵) اور پیو گے بھی تو اس طرح جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔

اَلْهِيَامُ: اونٹ کی ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے اسے اتنی پیاس لگتی ہے کہ سیر نہیں ہوتا۔ اور شوریدگی عشق کے لیے یہ کلمہ ضرب المثل ہے۔ هَامَ عَلٰی وَجْهِهٖ سرگردان پھرنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۵) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں۔

یعنی مدح، ذم وغیرہ ہر قسم کے موضوع سخن میں وہ مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں اور اسی سے اَلْهَائِمُ عَلٰی وَجْهِهٖ ہے جس کے معنی سرگردان پھرنے کے بھی آتے ہیں۔ اور شوریدہ عشق اور پیاسا ہونے کے بھی اور هِيْمٌ کے معنی پیاسے اونٹوں کے ہیں اور خشک ریت بھی چونکہ پیاسے اونٹوں کی طرح پانی نگل لیتی ہے اس لیے خشک ریت کو اَلْهِيَام کہا جاتا ہے۔

(ھ ی ء)

اَلْهَيْئَةُ: اصل میں کسی چیز کی حالت کو کہتے ہیں اس سے کہ وہ حالت محسوسہ ہو یا معقولہ، لیکن عموماً یہ لفظ حالت محسوسہ یعنی شکل وصورت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ﴾ (۳۔۴۹) کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بہ شکل پرند بناتا ہوں۔

اَلْمُهَايَاةُ: (مہموز) جس کے لیے لوگ تیار ہوں۔ اور اس پر موافقت کا اظہار کریں۔

هَيَّاَ کے معنی کسی معاملہ کے لیے اسباب مہیا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا﴾ (۱۸۔۱۰) اور ہمارے کام میں درستی (کے سامان) مہیا کر۔

﴿وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا﴾ (۱۸۔۱۶) اور تمہارے کاموں میں آسانی (کے سامان) مہیا کرے گا۔

اور اِيَّاكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا، میں ایک لغت هِيَّاكَ اَنْ

تَفْعَلَ کَذَا بھی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1]

(۴۵۸) هِيَّاكَ هِيَّاكَ وَحَنْوَاءَ الْعَنَقِ

گردن مروڑنے یعنی تکبر سے دور رہو۔

(ھا)

هَا: یہ حرف تنبیہ ہے اور ذَا، ذِہ، اُوْلَاءِ اسم اشارہ کے شروع میں آتا ہے اور اس کے لئے بمنزلہ جز سمجھا جاتا ہے مگر هَـا اَنْتُمْ میں حرف ھا استفہام کے لیے ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿هَـاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ﴾ (۳۔۶۶) دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا۔

﴿هَـاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ﴾ (۳۔۱۱۹) دیکھو تم ایسے (صاف دل) لوگ ہو کہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہو۔

﴿هَـاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاءِ جٰدَلْتُمْ﴾ (۴۔۱۰۹) بھلا تم لوگ......ان کی طرف سے بحث کر لیتے ہو۔

﴿ثُـمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۲۔۸۵) پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو۔

﴿لَآ اِلٰـى هٰٓؤُلَاءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاءِ﴾ (۴۔۱۴۳) نہ ان کی طرف (ہوتے ہو) نہ ان کی طرف

هَاءُمُ (اسم فعل) بمعنی خُذْ بھی آتا ہے اور هَاتِ (لاؤ) کی ضد ہے اور اس کی گردان یوں ہے۔

هَاؤُمَ، هَاؤُمَا، هَاؤُمُوْا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿هَـاؤُمُ اقْرَءُوا كِتٰبِيَهْ﴾ (۶۹۔۱۹) لیجیے میرا اعمالنامہ پڑھیے۔ اور اس میں ایک لغت بغیر میم کے بھی ہے۔ جیسے هَا، هَاآ، هَاؤُا، هَائِیْ، هِأْنَ بروزن خِفْنَ بعض اس کے آخر میں ك ضمیر کا اضافہ کر کے تثنیہ جمع اور تذکیرو تانیث کے لیے ضمیر میں تبدیلی کرتے ہیں۔ جیسے هَـاكَ، هَاكُمَا الخ

اور بعض اسم فعل بنا کر اسے هَـاءَ يَهَـاءُ بروزن خَـافَ يَخَاف کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک هَـائٰـى يُهَائِیْ مثل نَـادٰى يُـنَادِى ہے اور بقول بعض متکلم مضارع کا صیغہ اَهَاءُ بروزن اَخَالُ آتا ہے۔

❀❀❀

[1] وفی اللسان (حنو) انشده اللحیانی عن الکسائی وصدره: یاخالِ هلا قلت اِذْاَعْطَیْتَنِی۔ وایضا اللسان (هیا) والبیت فی ابدال ابی الطیب ۲/۵۷۰ وبعده۔ اعطیتنیها فاتیا اضراسها۔ لوتعلف البیض به لم نیفلق قال صاحب الابدال وعند الفراء انما یقال هیاك فی موضع زجر ولا یقولون هیاك اکرمت ۱۲۔

کِتَابُ الْیَاء

(ی ب س)

یَبِسَ (س) اَلشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کا خشک ہو جانا کے ہیں۔ اور تر گھاس جب خشک ہو جائے تو اسے یَبْسٌ (بسکون الباء) کہا جاتا ہے اور جس جگہ پر پانی ہو اور پھر خشک ہو جائے اسے یَبَسٌ (بفتح البا) کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا﴾ (۲۰۔۷۷) تو ان کے لیے دریا میں لاٹھی مار کر خشک راستہ بنا دو۔

اور پنڈلیوں کے جن حصوں پر گوشت نہیں ہوتا ان کو اَیْبَسَانِ (تثنیہ) کہا جاتا ہے۔

(ی ت م)

اَلْیُتْمُ کے معنی نابالغ بچہ کے شفقت پدری سے محروم ہو جانے کے ہیں۔ انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یتیم کا اعتبار ماں کی طرف سے ہوتا ہے اور جانور کے چھوٹے بچے کے بن ماں کے رہ جانے کو یُتْــــم کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی﴾ (۹۳۔۶) بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی۔

﴿یَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا﴾ (۷۶۔۸) یتیموں اور قیدیوں کو۔ یَتِیْم کی جمع یَتَامٰی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَ اٰتُوا الْیَتٰمٰی اَمْوَالَهُمْ﴾ (۴۔۲) اور یتیموں کا مال (جو تمہاری تحویل میں ہو) ان کے حوالے کر دو۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی﴾ (۴۔۱۰) جو لوگ یتیموں کا مال (ناجائز طور پر) کھاتے ہیں۔ ﴿وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی﴾ (۲۔۲۲۰) اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

مجازاً ہر یکتا اور بے مثل چیز کو عربی میں یتیم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ گوہر یکتا کو دُرَّة یَتِیْمَة کہہ دیتے ہیں۔ اور اس میں اس کے مادہ کے منقطع ہونے پر تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور دُرَّةٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر یکتا مکان کو بھی یتیم کہہ دیا جاتا ہے۔

(ی د ی)

اَلْیَـدُ کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں یہ اصل میں یَدْیٌ (ناقص یائی) ہے کیونکہ اس کی جمع اَیْدٍ وَیَدِیٌّ اور تثنیہ یَـدَیَان اور فعل یَـدَیْتُـهٗ آتا ہے جس کے معنی ہاتھ مارنے کے ہیں۔

عام طور پر اس کی جمع اَیْدٍ (افعل) آتی ہے کیونکہ اکثر طور پر فعل (بسکون عین) کی جمع افعل استعمال ہوتی ہے۔ جیسے فَلْسٌ وَاَفْلُسٌ وَکَلْبٌ وَاَکْلُبٌ لیکن کبھی اس کی جمع یَدِیٌّ (فعیل) بھی آ جاتی ہے جیسے عَبْدٌ وَعَبِیْدٌ اور کبھی فَـعَلٌ (بفتح العین) کی جمع بھی اَفْـعَلٌ کے وزن پر آ جاتی ہے جیسے زَمَـنٌ ، اَزْمُـنٌ وَجَبَـلٌ ، اَجْبُـلٌ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْ هَـمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْـدِیَهُـمْ عَـنْكُمْ﴾ (۵۔۱۱) جب ایک جماعت نے

ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں تو اس نے ان کے ہاتھ روک دیئے۔

﴿اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ﴾ (۷۔۱۹۵) یا ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں۔

استعارہ کے طور پر یَـدٌ کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے بمعنی نعمت، اور اسی سے یَدَیْتُ اِلَیْهِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی پر احسان کرنے کے ہیں۔اس کی جمع اَیَادٍ آتی ہے اور کبھی یَدِیٌّ بھی آجاتی ہے۔شاعر نے کہا ہے ❶ ()

(۹۵۹) فَاِنَّ لَهٗ عِنْدِیْ یَدِیًّا وَّاَنْعُمَا

کیونکہ اس کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔

(۲) کسی چیز پر قبضہ یا ملک جیسے هٰذَا فِیْ یَدِ فُلَانٍ (یہ فلاں کے اختیار میں ہے) قرآن پاک میں ہے:۔﴿اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ (۲۔۲۳۷) ہاں اگر عورتیں مہر بخش دیں یا مرد، جن کے قبضہ قدرت میں عقد نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں۔

نیز محاورہ:۔وَقَعَ فِیْ یَدَیْ عَدْلٍ: وہ عدل کے ہاتھوں میں چلا گیا۔(۳) بمعنی قوت جیسے لِفُـلَانٍ یَدٌ عَلٰی کَذَا فلاں کو اس پر قدرت حاصل ہے مَـالِیْ لِکَذَا یَدٌ اَوْ مَالِیْ بِهٖ یَدَانِ: یہ میری قدرت سے باہر ہے۔شاعر نے کہا ہے ❷ (الکامل)

(۴۶۰) فَاعْمَدْ لِمَا تَعْلُوْ فَمَا لَكَ بِالَّذِیْ لَا تَسْتَطِیْعُ مِنَ الْاُمُوْرِ یَدَانِ

جو کام تو کر سکتا ہے اس کا قصد کیجیے اور جو امور تیری استطاعت سے بالا ہیں ان سے تعلق مت رکھیے۔اس معنی کے لحاظ سے تشبیہ کے طور پر دَهْـرٌ کی طرف بھی یَـدٌ کی اضافت ہوتی ہے۔جیسے یَدُ الدَّهْرِ اَوْ یَدُ الْمِسْنَدِ اور شاعر نے ہوا کی طرف ید کی نسبت کرتے ہوئے کہا ہے ❸ (الکامل)

(۴۶۱) بِیَدِ الشَّمَالِ زِمَامُهَا

جب کہ اس کی باگ ڈور شمالی ہوا کے ہاتھ میں تھی کیونکہ ہوا میں زور اور قوت ہوتی ہے۔

وَضَعَ یَـدَهٗ فِیْ کَذَا کے معنی کسی کام کو شروع کرنے کے ہیں اور اطلاق اَلْیَـدِ وَاِمْسَاکُهَا: سخاوت اور بخل سے کیا ہوتا ہے جیسا کہ سخی کے متعلق یَـدُهٗ مُـطْلَقَةٌ اور بخیل کے متعلق یَـدُهٗ مَغْلُوْلَةٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

❶ لاعشی القیسی الجاهلی یمدح نعمان بن المنذر و صدره : فلن اذکر النعمان الابصالح.......... ولم اجد فی دیوانه والبیت فی اللسان (یدی سود، نعم) وشواهد الکشاف والمحکم (نعم) ونسبه الی النابغة وابن البری نسبه بضمرة بن ضمرة النهشلی

❷ لکعب بن سعد الغنوی کما فی اللسان (وعلا) والقالی (۲: ۳۱۴) وهو الصواب لان فی اول الابیات خطاب لابنه علی بن کعب وقیل لعلی بن عدی الغنوی وقال بعضهم لعلی بن العذیر الغنوی کما فی البیان (۳: ۸۰) والاضداد للاصمعی ۷ السجستانی ۱۰۸ وابن الانباری ۴۳، ۵۷ والسمط (۱: ۸۳) وتهذیب الالفاظ (۴۰۴) واضدادو ابن السکیت (۱۶۶) وابی الطیب (۴۰۱) والبحر (۵: ۱۵۸) (۳: ۵۲۴)

❸ قطعة بیت للبید فی معلقته (۱۵۸) والبیت بتمامه وغداة ریح قد کشفت وقرة۔ اذا صبحت...... والبیت فی اللسان (ید) والانصاف (۱۴۴) والصناعتین (۲۸۵) والعمدة (۱: ۲۶۹) الحصری) (۴: ۱۲۳) وشرح السبع لابن الانباری ۵۷۸ وشرح العشر للتبریزی (۱۵۸) وفی روایة قدوزعت بدل قد کشفت ۱۲۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (۵۔۶۴) اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہی کے ہاتھ بندھے جائیں اور ایسا کہنے کے سبب ان پر لعنت ہو، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

محاورہ ہے: نَفَضْتُ يَدِيْ عَنْ كَذَا: میں نے فلاں چیز سے ہاتھ جھاڑ لیا یعنی اسے چھوڑ دیا۔

اَيَّدَ (تفعیل) کے معنی کسی کی تائید یا اس کی مدد کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (۵۔۱۱۰) جب میں نے روح القدس (یعنی جبریل) سے تمہاری مدد کی۔اور آیت کریمہ۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ (۲۔۷۹) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔

میں کتابت کو ہاتھوں کی طرف نسبت کرکے ان تحریروں کے بناوٹی ہونے پر تنبیہ کی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ: ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ (یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ان کی دروغ بیانی پر تنبیہ کرنے کے لیے قول کی نسبت اَفْوَاه کی طرف کی ہے اور آیت کریمہ:۔ ﴿اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَا﴾ (۷۔۱۹۵) یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں۔

میں اَيْدٍ (ہاتھ) سے مراد قوت ہے اسی معنی میں فرمایا: ﴿اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ﴾ (۳۸۔۴۵) جو قوت والے اور صاحب نظر تھے۔

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ﴾ (۳۸۔۱۷) اور ہمارے بندے داؤد علیہ السلام کو یاد کرو جو صاحب قوت تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (۹۔۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

میں عَنْ يَّدٍ سے مراد یہ ہے کہ اس نعمت کے عوض جوان کی سکونت گاہوں میں برقرار رکھے جانے سے انہیں حاصل ہوئی ہے، جزیہ ادا کریں تو عَنْ يَّدٍ موضع حال میں ہے۔

اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تمہاری حاکمیت اور اپنی محکومی کا اقرار کرتے ہوئے جزیہ ادا کریں۔محاورہ ہے: خُذْ كَذَا اَثَرَ ذِيْ يَدَيْنِ (۴) يَدٌ بمعنی حامی اور مددگار کے آتا ہے جیسے اَنَا يَدُكَ (میں تمہارا مددگار ہوں) فُلَانٌ يَدُ فُلَانٍ (وہ فلاں کا مددگار ہے) اسی معنی میں اولیاء اللہ کو اَيْدِ اللّٰهِ کہا جاتا ہے۔اسی بنا پر آیت کریمہ:۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ (۴۸۔۱۰) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں۔خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

میں آنحضرت ﷺ کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ قرار دیا ہے۔ یعنی جب آپؐ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے تو گویا اللہ کا ہاتھ ان پر ہے۔اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اللہ عزوجل فرماتے ہیں۔ [1] (۱۶۲) ((لا يزال العبد يتقرب الى بالنوافل حتى احبه فاذا احببته كنت سمعه الذى يسمع به

[1] الحديث باختلاف الفاظه فى الطب عن ابى امامة وابن عساكر عن انسؓ وعائشة والحكيم ع طس ابونعيم فى الطب ق فى الزهد (انظر كنزالعمال رقم (۱۱۵۶-۶۱)

وبصره الذی یبصره ویده التی یبطش بھا))
''بندہ نوافل کے ذریعہ برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں پھر جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں ہی اس کا کان ہوتا ہوں جس سے سنتا ہے اور میں ہی اس کی آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ ہوتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔''

﴿مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ﴾ (۳۶۔۷۱) جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائیں۔

اسی طرح آیت:

﴿لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ (۳۸۔۷۵) جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔

میں اللہ کے اپنے ہاتھ کے ساتھ پیدا کرنے سے وہ خصوصی تولیّت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے اور اس عنایت ربانی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ یَدٌ کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ وہ اعضاء انسانی میں سب سے اعلیٰ عضو ہے جس کے ذریعہ انسان کوئی کام سرانجام دیتا ہے لہٰذا یہاں لفظ ید سے تشبیہ کا وہم نہیں ہونا چاہیے۔ بعض نے کہا ہے کہ بِیَدَیَّ کے معنی بِنِعْمَتِہٖ ہے اور قَطَعْتُہٗ بِالسِّکِّیْنِ کی طرح یہاں باء آلہ کے لیے نہیں ہے بلکہ خَرَجَ بِسَیْفِہٖ کی طرح باء بمعنی مع کے ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اسے پیدا کیا درآں حالا یکہ ہمارے دنیوی اور اخروی انعامات اس کے شامل حال تھے جن کی رعایت کرکے وہ سعادت کبریٰ حاصل کرسکتا ہے۔

رَجُلٌ یَدِیٌّ وَامْرَءَۃٌ یَدِیَۃٌ: ماہر کاریگر مرد عورت۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ لَمَّا سُقِطَ فِیْ اَیْدِیْھِمْ﴾ (۷۔۱۴۹) اور جب وہ نادم ہوئے۔

میں سُقِطَ فِیْ اَیْدِیْھِمْ معنی نادم ہونے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔ فُلَانٌ سُقِطَ فِیْ یَدِہٖ وَاُسْقِطَ وہ پشیمان ہوا یا اس کے معنی حسرت سے ہاتھ ملنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیْهِ عَلٰی مَآ اَنْفَقَ فِیْھَا﴾ (۱۸۔۴۲) تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿فَرَدُّوْا اَیْدِیَھُمْ فِیْٓ اَفْوَاھِھِمْ﴾ (۱۴۔۹) تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دیئے۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے حق بات کو قبول نہ کیا جس کے قبول کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا جیسا کہ محاورہ ہے۔ رَدَّ یَدَہٗ فِیْ فَمِہٖ: یعنی اس کی بات نہ مانی۔

بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ انہوں نے انبیاء کرام کے ہاتھوں کو ان کے مونہوں کی طرف لوٹا دیا یعنی ان سے کہنے لگے کہ اپنے مونہوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہو اور بعض نے اَیْدِیْھِمْ سے مراد انعامات لیے ہیں یعنی انہوں نے پیغمبروں تک کی تکذیب کرکے ان کے احسانات کو ان کے مونہوں پر دے مارا یعنی ان کے نصائح اور مواعظ پر کان نہ دھرا جو ان کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔

(ی س ر)

اَلْیُسْرُ کے معنی آسانی اور سہولت کے ہیں۔ عُسْرٌ کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ

الْعُسْرَ﴾ (۲۔۱۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے۔اور سختی نہیں چاہتا۔

﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا﴾ (۶۵۔۷) خدا عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشے گا۔

﴿وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا﴾ (۱۸۔۸۸) بلکہ اس سے نرم بات کہیں گے۔

﴿فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا﴾ (۵۱۔۳) پھر نرمی سے چلتی ہیں۔

تَيَسَّرَ كَذَا وَاسْتَيْسَرَ کے معنی آسان ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (۲۔۱۹۶) اگر رستے میں روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو، کردو۔

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ (۷۳۔۲۰) تو جتنا آسانی سے ہو سکے پڑھ لیا کرو۔

اسی سے اَيْسَرَتِ الْمَرْاَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی عورت کے سہولت سے بچہ جننے کے ہیں۔

يَسَّرْتُ كَذَا کے معنی کسی کام کو آسان اور سہل کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ﴾ (۵۴۔۱۷) اور ہم نے قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا۔

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ﴾ (۱۹۔۹۷) (اے پیغمبر) یہ (قرآن) تمہاری زبان میں آسان (نازل) کیا ہے۔

اَلْيُسْرٰى: (اسم) بمعنی يُسْر قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾ (۹۲۔۷) اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ (۹۲۔۱۰) اسے سختی میں پہنچائیں گے۔ میں عُسْرٰی کے ساتھ تَيسير کا لفظ بطور تہکم لایا گیا ہے۔ جس طرح کہ آیت۔

﴿فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (۴۵۔۸) میں عذاب کے متعلق بشارت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اَلْيَسِيْرُ وَالْمَيْسُوْرُ سہل اور آسان۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا﴾ (۱۷۔۲۸) تو ان سے نرمی سے بات کہہ دیا کرو۔

اور کبھی يَسِيْر کے معنی حقیر چیز بھی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿يُضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا﴾ (۳۳۔۳۰) اس کو دوگنی سزا دی جائے گی اور یہ (بات) خدا کو آسان ہے۔

میں لفظ يَسِيْرًا کے معنی آسان اور سہل کے ہیں اور آیت

﴿وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا﴾ (۳۳۔۱۴) اور اس کے لیے بہت کم توقف کریں۔

میں اس کے معنی بہت کم عرصہ کے ہیں۔

اَلْمَيْسَرَةُ وَالْيَسَارُ کے معنی غنا اور مالی وسعت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ (۲۔۲۸۰) تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو)

اور يَسَارٌ کا لفظ کبھی يَمِيْن کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے بعض اس کو يِسَارٌ بکسرالیا پڑھتے ہیں۔ اَلْيَسَرَاتُ: پاہائے سبک

اَلْمَيْسِرُ: (قمار بازی) یہ بھی يُسْرٌ سے مشتق ہے (کیونکہ قمار بازی میں بھی بلا تکلف مال حاصل ہو جاتا ہے۔

(ی ق ن)

اَلْیَقِیْنُ کے معنی کسی امر کو پوری طرح سمجھ لینے کے ساتھ اس کے پایہ ثبوت تک پہنچ جانے کے ہیں۔ اسی لیے یہ صفات علم سے ہے اور معرفت، درایۃ وغیرہ سے اس کا درجہ اوپر ہے یہی وجہ ہے کہ عِلْمُ الْیَقِیْنِ کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے۔ لیکن مَعْرِفَۃُ الْیَقِیْنِ نہیں بولتے۔ اور علم الیقین، وعین الیقین، وحق الیقین میں قدرے معنوی فرق پایا جاتا ہے۔ جسے ہم اس کتاب کے بعد بیان کریں گے۔ اِسْتَیْقَنَ وَاَیْقَنَ یقین کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ﴾ (۴۵۔۳۲) ہم اس کو محض ظن ہی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا۔

﴿وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ﴾ (۵۱۔۲۰) اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

﴿لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ﴾ (۴۵۔۴) یقین کرنے والوں کے لیے اور آیت کریمہ:۔

﴿وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا﴾ (۴۔۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے قتل ہو جانے کا یقین نہیں ہے بلکہ ظن وتخمین سے ان کے قتل ہو جانے کا حکم لگاتے ہیں۔

(ی م م)

اَلْیَمُّ کے معنی دریا اور سمندر کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ﴾ (۲۸۔۷) تو اسے دریا میں ڈال دینا۔ یَمَّمْتُ کَذَا وَتَیَمَّمْتُ: قصد کرنا قرآن میں ہے۔ ﴿فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا﴾ (۵۔۶) تو پاک مٹی لو۔ یَمَّمْتُہٗ بِرُمْحِیْ میں نے اسے نیزے کا نشانہ بنایا اَلْیَمَامُ: جنگلی کبوتر کو کہتے ہیں اور یَمَامَۃٌ ایک عورت کا نام تھا جس کے نام پر (صوبہ یمن کے ایک) شہر کا نام اَلْیَمَامَۃ رکھا گیا تھا۔

(ی م ن)

اَلْیَمِیْنُ کے اصل معنی دایاں ہاتھ یا دائیں جانب کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ﴾ (۳۹۔۶۷) اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔

میں حق تعالیٰ کی طرف یمین کی نسبت مجازی ہے۔ جیسا کہ ید وغیرہا کے الفاظ باری تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں آسمان کے لیے یمین اور بعد میں آیت:۔

﴿وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾ (۳۹۔۶۷) (اور قیامت کے دن) تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔ ارض کے متعلق قَبْضَۃٌ کا لفظ لانے میں (ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ ہے) جو اس کتاب کے بعد بیان ہوگا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّکُمْ کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ﴾ (۳۷۔۲۸) تم ہی ہمارے پاس دائیں (اور بائیں) سے آتے تھے۔

میں یمین سے مراد جانب حق ہے یعنی تم جانب حق سے ہمیں پھیرتے تھے اور آیت کریمہ:۔

﴿لَاَخَذْنَا مِنْہُ بِالْیَمِیْنِ﴾ (۶۹۔۴۵) تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔

میں دایاں ہاتھ پکڑ لینے سے مراد روک دینا ہے۔ جیسے

محاورہ ہے:۔ خُذْ بِيَمِيْنِ فُلَانٍ عَنْ تَعَاطِي الْهِجَاءِ: یعنی فلاں کو ہجو سے روک دو۔

بعض نے کہا ہے کہ انسان کا داہنا ہاتھ چونکہ اعضا میں افضل سمجھا جاتا ہے اس لیے معنی یہ ہونگے کہ ہم بہتر حال میں بھی اسے باشرف اعضا سے پکڑ کر منع کر دیتے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ﴾ (۵۶۔۲۷) اور دہنے ہاتھ والے۔

میں داہنی سمت والوں سے مراد اہل سعادت ہیں کیونکہ عرف میں میامن (بابرکت) کو یمین اور مشائم (منحوس) کو شمال کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر یمین کا لفظ برکت وسعادت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ﴾ (۵۶۔۹۰،۹۱) اگر وہ دائیں ہاتھ والوں (یعنی اصحاب خیر وبرکت) سے ہے تو (کہا جائے گا کہ) تجھ پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام۔ اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الوافر)

(۴۶۲) اِذَا مَا رَايَةٌ رُفِعَتْ لِمَجْدٍ
تَلَقَّاهَا عَرَابَةُ بِالْيَمِيْنِ

جب کبھی فضل ومجد کے کاموں کے لیے جھنڈا بلند کیا جاتا ہے تو عَرَابَةُ اسے خیر وبرکت کے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔

نیز اَلْيَمِيْنِ بمعنی دایاں ہاتھ سے استعارہ کے طور پر لفظ يَمِيْنٌ قسم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ (عرب) قسم کھاتے یا عہد کرتے وقت اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر مارتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (۶۸۔۳۹) یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو قیامت کے دن تک چلی جائیں گی۔

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾ (۶۔۱۰۹) اور یہ لوگ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ (۲۔۲۲۵) خدا تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

﴿وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ﴾ (۹۔۱۲) اگر عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں۔ ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور عربی محاورہ وَيَمِيْنُ اللّٰهِ (اللہ کی قسم) میں يَمِيْن کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کی جاتی ہے۔ کہ قسم کھانے والا اللہ کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ اور جب ایک شخص دوسرے سے عہد وپیمان باندھتا ہے تو وہ اس کا مَوَالِي الْيَمِيْن کہلاتا ہے اور کسی چیز پر ملک اور قبضہ ظاہر کرنے کے لیے فِيْ يدِ یْ کی بنسبت مِلْكُ يَمِيْنِيْ کا محاورہ زیادہ بلیغ

---

[1] قاله شماخ بن ضرار النهشلى يمدح عرابة الاوسى، فيما بذل له وسق بعير تمرا وكان مدحه سببا لاشتهار الاوسى الصحابى والبيت فى الشعراء (۱:۲۷۸) والاصابة (۴:۲۳۴) والخزانة (۱:۴۵۳/۲:۲۲۳) والبحر المحيط (۱:۱۶۰) والعمدة (۱:۴۱/۲:۱۳۱) وامالى القالى (۱:۲۷۱) واسد الغابة (۳:۳۹۹) ونقد الشعر ۲۵ وهو غير منسوب فى الطبرى (۲۳:۳۲) واللسان (يمن والسمط (۶۰۷) وابن الشجرى (۲:۱۶۵) والكامل (۱۳۳، ۶۴۵) والمشكل للقبتى (۱۸۸) وقبانه: رايت عرابة الاوسى يسمو۔ الى الخيرات منقطع القرين والبيتان فى تاريخ الطبرى (۲:۱۹۱) والمنتخب ۳۸۴ ونقد الشعر (۱:۱۹۰) وابن الانبارى (۵۷۵) والعقد (۲:۲۸۸)۔

ہے۔ اسی بنا پر غلام او رلونڈیوں کے بارے میں قرآن پاک نے اس محاورہ کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (۴۔۲۵) جو تمہارے قبضے میں آ گئی ہوں۔

اور حدیث میں حجر اسود کو یمین اللہ کہا گیا ہے۔ [1] (۱۶۳) کیونکہ اس کے ذریعہ قرب الٰہی کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

یَمِیْنٌ سے یُمْنٌ کا لفظ ماخوذ ہے جو خیر و برکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:۔ هُوَ مَيْمُوْنُ النَّقِيْبَةِ: وہ سعادت مند ہے اور مَيْمَنَةٌ کے معنی دائیں جانب بھی آتے ہیں۔

(ی ن ع)

يَنَعَتِ (ف) اَلثَّمْرَةُ يَنْعًا وَيُنْعًا وَاَيْنَعَتْ (افعال) اَيْنَاعًا کے معنی پھل کے پک کر بالکل تیار ہو جانے کے ہیں اور پختہ پھل کو يَانِعَةٌ يَا مُوْنِعَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ﴾ (۶۔۱۰۰) یہ چیزیں جب پھلتی ہیں تو ان کے پھلنے کو اور جب پک کر تیار ہو جاتی ہیں تو ان کے پکنے پر نظر کرو۔

ابن ابی اسحاق کی قراءت میں وَيُنْعِهٖ (ضمہ یاء کے ساتھ) ہے۔ جو کہ يَانِعٌ کی جمع ہے اور يَانِعٌ کے معنی نہایت پختہ پھل کے ہیں۔

(ی ء س)

اَلْيَأْسُ: (مصدر س) کے معنی نا امید ہونے کے ہیں۔ اور يَئِسَ (مجرد) وَاسْتَيْاَسَ (استفعال) دونوں ہم معنی ہیں جیسے عَجَبَ فَاسْتَعْجَبَ وَسَخِرَ وَاسْتَسْخَرَ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا﴾ (۱۲۔۸۰) جب وہ اس سے نا امید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ﴾ (۱۲۔۱۱۰) یہاں تک کہ جب پیغمبر نا امید ہو گئے۔

﴿قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ﴾ (۶۰۔۱۳) جس طرح کافروں کو مُردوں (کے جی اٹھنے) کی امید نہیں اسی طرح ان لوگوں کو بھی آخرت (کے آنے) کی امید نہیں۔

اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ: تو نا امید (اور) ناشکرا (ہو جاتا) ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ (۱۳۔۳۱) تو کیا مومنوں کو اس سے اطمینان نہیں ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنی اَفَلَمْ يَعْلَمْ کے ہیں یعنی کیا انہوں نے اس بات کو جان نہیں لیا مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ اس کے حقیقی معنی ہیں بلکہ یہ اس کے لازم معنی ہیں کیونکہ کسی چیز کے انتفاء کا علم اس سے نا امید ہونے کو مستلزم ہوتا ہے لہٰذا یہاں بھی (بلحاظ قرائن) یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ يَيْئَسُ بمعنی يَعْلَمُ ہے۔

(ی و م)

اَلْيَوْمَ: (ن) یہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے۔ اور عربی زبان میں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

---

[1] والحدیث فی نزھۃ المجالس ۱۲۔

خواہ وہ زمانہ (ایک دن کا ہو یا اک سال اور صدی کا یا ہزار سال کا ہو) کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو۔قرآن پاک میں ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ﴾ (۳۔۱۵۵) جو لوگ تم سے (احد کے دن) جب کہ...... دو جماعتیں ایک دوسرے سے گتھ ہو گئیں (جنگ سے بھاگ گئے۔

﴿قُلْ اَئِنَّکُمْ لَتَکْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ﴾ (۴۱۔۹) کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔

میں زمین کو دو دن میں پیدا کرنے کے معنی اور اس کی تحقیق اس کے بعد دوسری کتاب میں بیان کی جائے گی اور کبھی یَوْمٌ کے بعد "اذ" بڑھا دیا جاتا ہے اور (اضافت کے ساتھ) یَوْمَئِذٍ پڑھا جاتا ہے اور یہ کسی معیّن زمانہ کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے اس صورت میں یہ معرب بھی ہو سکتا ہے۔اور "اذ" کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے مبنی بھی۔جیسے فرمایا:۔

﴿وَ اَلْقَوْا اِلَی اللّٰهِ یَوْمَئِذِ نِ السَّلَمَ﴾ (۱۶۔۸۷) اور اس روز خدا کے سامنے سرنگوں ہوں جائیں گے۔

﴿فَذٰلِكَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ﴾ (۷۴۔۹) وہ دن بڑی مشکل کا دن ہوگا۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ ذَکِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ﴾ (۱۴۔۵) اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ۔ میں ایام کی لفظِ جلالت کی طرف اضافت تشریفی ہے اور ایام سے وہ زمانہ مراد ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل و انعام کے سمندر بہا دیئے تھے۔

(یٰسٓ)

یٰسٓ: (۳۶۔۱) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی اے انسان کے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ دوسرے اوائل سُوَر کی طرح یہ بھی حروف مقطعات سے ہے۔

(الیاء)

یہ حروف ندا میں سے ہے اور دور سے کسی کو آواز دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔مگر جب ذات باری تعالیٰ کو دعا کے وقت یا رب کہا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت دور ہے بلکہ اس امر پر تنبیہ کے لیے ہے کہ دعا کنندہ اپنے آپ کو اللہ کی مدد اور اس کی توفیق سے دور خیال کرتا ہے۔

❀❀❀

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
فَقَدْ تَمَّتْ بِفَضْلِ اللّٰهِ تَعَالٰی